اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ)

(جلد: ۴)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ)

(جلد: ۴)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب	:	تفسیر روح القرآن
مؤلف	:	ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ناشر	:	ادارہ هُدًى لِلنَّاسِ
کمپوزنگ	:	زاہد حسین
پرنٹرز	:	محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور
تاریخ اشاعت دوئم	:	جنوری 2012ء
تعداد	:	1000
قیمت	:	750 روپے

109512

ملنے کا پتہ

۱۔ 343-مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔فون:042-35426800

۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انار کلی لاہور۔

۳۔ مکتبہ ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور۔

۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔

۵۔ ۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔فون: 042-37248676-37320961
ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 042-35417074

۶۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔
موبائل: 0300-8485030۔فون: 042-37225030

Marfat.com

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پر ادارہ ھُدًی لِلنَّاسِ نے اس کتاب کا نام ''دروس القرآن'' کی بجائے ''تفسیر روح القرآن'' تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئینِ کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کر لیں، اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

Marfat.com

فہرست مضامین

تعارف 1

مشرکین مکہ کے اللہ کے متعلق تصورات 9

''اللہ'' وحدہ لاشریک ہے: 13

انسان کی حقیقت: 15

ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے: 16

قرآن میں اجل مسمیٰ کا مفہوم: 17

دینی جماعتوں کیلئے اجل مسمیٰ: 17

آیات کا مرکزی مضمون: 20

زمین وآسمان کا صرف ایک ''الہٰ'' ہے: 20

مشرکین کے آخرت پر اشتباہات اور ان کا جواب: 21

شفاعت کی شرائط: 23

حق مبین ''حضور ﷺ اور قرآن پاک: 24

''مکہ'' پورے جزیرۂ عرب کا تجارتی مرکز تھا: 27

قوموں کی تباہی کا اصل سبب شریعت کی نافرمانی ہے: 28

کیا ہم شریعت کے پاسدار ہیں؟ 29

عبداللہ ابن ابی امیہ کا حضور ﷺ سے معجزے کا مطالبہ: 30

مشرکینِ مکہ کا دوسرا مطالبہ: 31

معتبر ایمان: 31

کیا پیغمبر انسان نہیں ہوتے؟ 32

پیغمبر کو انسان نہ سمجھنے کی وجہ اور اس کا جواب: 34

اللہ تعالیٰ کی آیات اور اسکے انبیاء کی تکذیب کرنے والوں کا انجام: . 38

معذب مقامات کے متعلق حضور ﷺ کا طرزِ عمل: 39

مکذب قوم کسے کہتے ہیں؟ 39

اللہ کی رحمت کا لازمی تقاضہ ''قیامت کا ظہور ہے'': 41

پیغمبر کی دعوت کے نتیجہ میں ہمیشہ دو گروہ وجود میں آتے ہیں: 42

اللہ ہر خیر وشر کے کام کی مکمل جزا وسزا دے گا: 44

توحید کی اہمیت: 50

اسلام کا نظریہ توحید: 51

انسان کے اعمال اس کے مقصدِ حیات کے پرتو ہوتے ہیں: 52

اللہ کی نظر میں انسان کی اصل کامیابی: 53

کامیاب زندگی گزارنے کی کنجی: 53

تمہید: 57

اللہ کے اختیارات اور اس کی صفات میں کوئی اور شریک نہیں: 57

قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کے دلائل: 59

قرآن میں کوئی غیر فصیح لفظ استعمال نہیں ہوا: 59

قرآن میں انسانی اصلاح وفلاح کی تمام ہدایات موجود ہیں: 61

قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت اسکی پیش گوئیاں ہیں: 62

قرآن کی دعوت پھیلانے کا ذمہ دار ہر مسلمان ہے: 63

قرآن کریم سے متعلق ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟ 64

قرآن کریم سے متعلق اپنی ذمہ داریاں کیسے ادا کی جاسکتی ہیں: 65

کفار حضور ﷺ کو اپنے بیٹوں سے بڑھ کر پہچانتے ہیں: 66

مشرک سب سے بڑا ظالم ہے: 68

فلاح سے مراد دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح ہے: 69

جس کی آخرت اجڑتی ہے اسکی دنیا بھی محفوظ نہیں رہتی: 69

قیامت کے دن ہر قسم کے مشرک کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے گا: 71

مشرکینِ مکہ کا مجموعی طرزِ عمل اور اس کے اسباب: 75

حق کو تسلیم نہ کرنے والوں کا رویہ: 75

دھیان دینے سے اللہ کسی کی سمجھنے کی طاقت کو سلب نہیں کرتا: 76

ذاتِ باری تعالیٰ کی پہچان کے لئے کسی معجزے کی ضرورت نہیں: 77

مغرب زدہ افراد کی طرف سے عام طور پر کیا جانے والا سوال اور اس کا جواب: 79

Marfat.com

قوموں کے عروج وزوال میں اخلاقی عوامل کا بڑا کردار ہے: 80
اللہ کے دین سے اعراض، درحقیقت زندگی سے انکار ہے: 81
تبلیغ کے کام کو یکسر روک دیا جائے تو اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے: ... 81
آخرت کا انکار ہی اصل میں ہمیشہ سے انسانی بگاڑ کی بنیادی
وجہ رہی ہے: 82
تقویٰ والوں کیلئے آخرت بہتر ہے: 88
تمہید: 92
تبلیغ دین میں صبر اور استقامت ضروری ہے: 94
کفار کے ایمان نہ لانے پر پریشان نہ ہوں: 96
قبولِ حق کے لئے سننے اور سمجھنے کی صلاحیت ضروری ہے: 98
عقل والوں کیلئے نشانیاں: 101
کچھ لوگوں میں قبولِ حق کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے: 104
توحید ہر نفس کے اندر موجود ہے: 106
تمہید: 108
عذابِ الٰہی کے تدریجی مراحل: 108
دل کی سختی سے مراد: 110
مَا ذُکِّرُوْا بِہٖ سے مراد: 113
آج اللہ ظالم قوتوں کی جڑ کیوں نہیں کاٹ رہا؟ 115
انبیاء ورسل کی اصل حیثیت: 119
حضور ﷺ کے متعلق اختلافات کو دور کرنے کا واحد ذریعہ
قرآن ہے: 122
حضور ﷺ قرآن کی نظر میں: 122
تمہید: 126
قیامت کے دن نہ کوئی حامی ہوگا نہ شفیع ہوگا نیک عمل ہی کام
آئیں گے: 127
رسول ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ غریب صحابہ کو اشراف قریش کی
وجہ سے دور نہ کرو: 129
ظلم کا مفہوم 132
اللہ کی رضا کا معیار سیم و زر اور دنیا کا ٹھاٹھ باٹھ نہیں بلکہ اس کی
شکر گزاری ہے: 133
اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان پر سلام بھیجتا ہے: 135
اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے: 136
توبہ اور اصلاح کے بعد گناہ معاف ہو جاتے ہیں: 137
آیاتِ الٰہی کی تفصیل سے اہلِ ایمان اپنی منزل متعین کر سکتے ہیں: 138
جو اللہ کے سوا کسی کو پکارتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے: 139
رسول ﷺ کا کام اللہ کا پیغام کھول کر بیان کرنا ہے: 143
عذاب کا فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ کرتا ہے: 144
اگر عذاب کا فیصلہ رسول کے پاس ہوتا تو جھگڑے کا فیصلہ ہو
چکا ہوتا: 145
وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ کا مفہوم: 146
غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے: 147
مفاتح الغیب کا مطلب: 148
نیند اور موت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور نیند بھی موت ہی کی
طرح ہے: 150
اللہ نے انسانوں پر اپنے نگران مقرر کر رکھے ہیں: 151
اللہ تعالیٰ سب سے بہتر حساب کرنے والا ہے: 153
انتہائی مصیبت میں انسان صرف اللہ کو پکارتا ہے: 154
اللہ تعالیٰ ہر طرف سے عذاب بھیجنے پر قادر ہے: 156
امتِ اسلامیہ میں اختلاف: 158
تمہید: 162
رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری حق بات پہنچا دینا ہے: 163
دنیا کا ہر کام اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کے علم اور مشیت سے ہوتا ہے: ... 164
گستاخان رسول ﷺ کی محفلوں میں نہیں جانا چاہیے: 165
رسول ﷺ کے بھول جانے میں بھی حکمت ہے: 167
قیامت کے دن کافروں کی طرف سے نہ کوئی سفارش قبول ہوگی نہ کوئی معاوضہ
قبول ہوگا: 173
تمہید: 179
اللہ حاکمِ مطلق ہے: 179

Marfat.com

اللہ پر توکل کرنے والوں کی شان: 181

اللہ کو صرف مان لینا ہی کافی نہیں' اصل چیز مکمل سپردگی ہے: 181

اللہ کو کس طرح مانیں: 183

''نماز'' سب سے بڑی مظہرِ عبودیت: 184

تقویٰ کیا ہے؟ 185

نماز کی پابندی اور تقویٰ کا حصول' آخرت پر یقین کے بغیر ممکن نہیں: 186

اللہ نے یہ دنیا بے مقصد نہیں بنائی: 187

قیامت کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شبہ نہیں: 188

اگر حقیقی قوت کا سرچشمہ اللہ ہے تو پھر آج مسلمانوں کی ایسی حالت کیوں؟ 190

ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے معاشی' سماجی اور تمدنی حالات: 192

تمہید: 196

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ دعوتِ حق: 198

بت پرستی کی آڑ میں دراصل شیطانی اور طاغوتی قوتیں اپنی پرستش کرواتی ہیں: 199

ہمارے معاشرے کی بت پرستی: 200

فطرتِ سلیم کے مالک انسان کو اللہ کی ذات کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی: 201

یقین کے تین درجات: 203

فلسفی اور پیغمبر میں فرق: 203

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ پر یقین و ایمان: 203

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت: 204

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے ان کی قوم پر حجت قائم کر دی: 214

اللہ تعالیٰ جس کے چاہتا ہے درجے بلند کر دیتا ہے: 215

نسبی شرافت بھی اعمالِ صالحہ سے ہی فائدہ مند ہوتی ہے: 217

دینِ ابراہیمی کے بارے میں قریشِ مکہ کی غلط فہمی: 218

اولادِ حضرت ابراہیم: 218

بنی اسرائیل کا مطلب: 218

حضرت یعقوب نے اپنی اولاد سے صرف اللہ کی بندگی کا عہد لیا تھا: 219

اہلِ ایمان ہمیشہ آخرت کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں: 220

بنی اسماعیل و بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد ایک اللہ کو ماننے والے تھے: 222

انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے جہان والوں پر فضیلت دی ہے: 223

لوگوں کو ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے: 224

اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے: 225

اگر اللہ کے برگزیدہ بندے بھی شرک کرتے تو ان کے سب نیک اعمال اکارت جاتے: 226

رسول اللہ ﷺ کو تسلی: 228

سابقہ شریعتوں کی پیروی کا حکم: 231

رسول اللہ ﷺ جو دین پیش کرتے ہیں اس میں ان کا کوئی ذاتی مفاد نہیں: 231

تمہید: 234

رسالتِ محمدی کے بارے میں اہلِ کتاب کا جھوٹ: 234

اہلِ کتاب دینی بصیرت سے بے بہرہ ہیں: 235

اہلِ کتاب کے انکار کی دو ممکنہ وجوہ: 236

کیا حضرت موسیٰ بشر نہیں تھے؟ 237

انسانوں کا بنایا ہوا کوئی قانون کماحقہٗ انسانی ضروریات کو پورا نہیں کرتا: 237

اہلِ کتاب نے تورات کو ورق ورق کر دیا: 238

تمہید: 268

اللہ تعالیٰ کی کوئی بیوی نہیں' اس لئے اولاد کہاں سے آئی: 268

اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے: 270

اللہ ہی تمہارا رب ہے: 271

بندگی بھی خالق کی کی جائے: 272

نگاہیں اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتیں: 272

Marfat.com

اللہ ہر چیز کو دیکھتا ہے: 274
اللہ تعالیٰ علیم اور خبیر ہے: 274
کھلی دلیل کے بعد جس نے بصیرت سے کام لیا اس نے اپنا ہی فائدہ کیا
جو اندھا بنا رہا اس نے اپنا ہی نقصان کیا: 275
اللہ تعالیٰ اپنی دلیلیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے: 277
"دَرَسْتَ" کا مطلب: 277
اللہ کا رسول اسی کی پیروی کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتا ہے: 279
ہر حال میں حاکم حقیقی صرف اللہ ہی ہے: 280
مشرکین سے اعراض کا حکم: 281
ہدایت صرف اللہ دیتا ہے: 281
انسان کو اطاعت و معصیت کا اختیار دیا گیا ہے: 281
رسول کی ذمہ داری دعوت و تبلیغ ہے' لوگوں کو ایمان پر لانا رسول کی
ذمہ داری نہیں: 282
تمہید: 285
مسلمانوں کو کفار کے معبودوں کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے: 286
اللہ تعالیٰ کے سامنے ہر ایک کو صرف اپنا حساب دینا ہے: 289
جس جائز کام کے کرنے سے مفاسد کا خطرہ ہو اسے چھوڑنا واجب ہو جاتا
ہے: 289
مسلمانوں کی خواہش تھی کہ کافروں کو کوئی نشانی دکھادی جائے تاکہ وہ
ایمان لائیں: 292
کفار اپنے مطالبے میں مخلص نہیں ہیں: 293
سرکشوں پر دعوت و تبلیغ کوئی اثر نہیں کرتی: 293
جن کے دل الٹ دیئے جائیں' وہ کسی صورت میں بھی ایمان نہیں
لائینگے: 295
مشیت اور رضا کے مفہوم میں فرق: 296
ہر کام اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے: 297
منصف صرف اللہ تعالیٰ ہے: 300
مسلمانوں کیلئے صرف وحی الٰہی پر مشتمل علم ہی قابلِ بھروسہ ہے: 302
تمہید: 304
اللہ ہی حاکم اور مختار کل ہے: 305
جن جانوروں پر اللہ کا نام لیا جائے ان کا گوشت کھاؤ: 307
حرام و حلال کا فیصلہ صرف اللہ کا حق ہے: 308
گناہ کو ظاہراً اور باطناً چھوڑ دو: 308
جن پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا ان کو نہ کھاؤ' ورنہ مشرک ہو جاؤ گے: .. 310
زندگی فرائض کی ادائیگی کا نام ہے: 313
مسلمانوں کو ایسی روشنی دی گئی ہے جس سے وہ خود بھی راہ پاتے ہیں اور
دوسروں کو بھی راہ دکھاتے ہیں: 314
کفار و مشرکین گمراہیوں کے حصار میں ہیں جس سے وہ نکلنا نہیں
چاہتے: 315
کفار رسالت کا مطالبہ کرتے ہیں: 317
رسالت اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے: 318
کفار کو ذلت و عذابِ شدید ہوگا: 318
تمہید: 320
کفار کا فکری جمود: 322
اپنا اپنا جائزہ: 325
اللہ کا راستہ سیدھا ہے جو چاہے اس پر چل کر فائدہ حاصل کرلے: . 326
دار السلام کا مطلب: 327
مومنوں کا اللہ ولی ہوگا: 330
حساب، جنوں اور انسانوں دونوں سے لیا جائے گا: 331
کفار مکہ جنوں کو مشکل کشا سمجھتے تھے: 332
شیطان انسانوں کو گمراہ کرتا ہے: 332
کافر جن اور گمراہ انسان ایک دوسرے کے دوست ہیں: 334
جو قرآنی تعلیمات سے منہ پھیر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر ایک شیطان مسلط
کر دیتا ہے: 335
تمہید: 338
کیا جنوں کے الگ رسول تھے؟ 340
حضرت محمد ﷺ جنوں اور انسانوں سب کی طرف رسول ہیں: 341
اللہ تعالیٰ بغیر اپنی ہدایت پہنچائے کسی بستی والوں کو ہلاک نہیں کرتا: 342

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کفار کو ان کے جرم کی نوعیت کے مطابق درجہ بدرجہ سزا دے گا: 343

اللہ غنی اور رحیم ہے: 345

اللہ تعالیٰ کفار کو ختم کر کے نئی نسل پیدا کرنے پر قادر ہے: 346

اللہ نے جس کا وعدہ کیا ہے وہ آ کر رہے گی اور کوئی اللہ کے قابو سے باہر نہیں ہوگا: 348

رسول اللہ ﷺ کو فرمایا جا رہا ہے کہ کفار کو کہہ دیں تم اپنے طریقے پر چلو میں اپنے طریقے پر چلتا ہوں: 348

مشرکین اللہ کے لئے الگ حصہ نکالتے اور اپنے معبودوں کے لئے الگ حصہ نکالتے: 351

کفار اللہ کی پرواہ کئے بغیر اپنے شرکاء کا حصہ بڑھا دیتے: 352

مشرکین کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا: 353

تمہید: 357

حرام و حلال اور حصے مقرر کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے: 358

پھلوں کے فوائد 359

اللہ تعالیٰ کے ہم پر احسانات: 360

اللہ کا قرب اللہ کی نعمتوں کے صحیح استعمال سے حاصل ہوتا ہے: 361

ان نعمتوں میں غریبوں کا حصہ 361

زکوٰۃ کا نصاب: 362

اللہ تعالیٰ اسراف سے منع کرتا ہے: 362

اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو انسان کی ضرورتوں کے لئے پیدا کیا: 363

شیطان کے وسوسوں اور فتنوں سے بچنا چاہیے: 364

کفار نے جو حلال حرام بنا رکھا ہے اس کی سند مانگی جا رہی ہے: 366

ملتِ ابراہیمی میں چار چیزوں کی ممانعت: 368

ممنوع چیز کھانے کی اجازت کی وجوہ: 368

یہود پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بعض جانور حرام کر دیئے گئے: 370

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہم بالکل سچے ہیں": 371

مشرکین اور بنی اسرائیل کو دھمکی: 372

تمہید: 374

مشرکین نے کہا کہ اگر ہمارا اور ہمارے آباؤ اجداد کا رویہ اللہ کو ناپسند ہوتا تو وہ ہمیں روک دیتا: 375

مشرکین سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم کہتے ہو کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں صحیح ہے تو اس کی سند لاؤ: 375

اللہ جبر کا طریقہ اختیار نہیں کرتا: 377

اگر مشرکین کے حمایتی گواہی دے بھی دیں تو آپ ﷺ ان کی پیروی نہ کریں: 378

مشرکین مکہ آخرت کے منکر تھے اس لئے برائی کرنے سے نہیں ڈرتے تھے: 379

وہ شرک کرتے تھے: 379

غلط فہمی کی وضاحت: 380

حرام کردہ چیزیں: 380

شرک کی ممانعت: 381

والدین کی نافرمانی منع ہے: 382

مفلسی کے خوف سے اولاد کو قتل نہ کرو: 384

فواحش کے قریب مت جاؤ: 386

قتل ناحق سے منع کیا گیا ہے: 387

یتیموں کے حقوق: 390

یتیموں کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے ارشادات: 392

یتیموں کی کفالت کے بارے میں قوانین: 394

ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو: 397

ہمیشہ حق و انصاف کے مطابق بات کرو: 400

اللہ سے کئے عہد کو پورا کرو: 401

تورات مکمل ہدایت اور رحمت تھی: 405

Marfat.com

تعارف' زمانہ نزول اور بنیادی مضامین

سورۃ الانعام قرآن پاک کی چھٹی سورۃ ہے۔اس کا نام الانعام قرآن پاک کی دوسری اکثر سورتوں کی طرح صرف نام ہے' عنوان نہیں۔ یعنی ''الانعام'' سے یہ مقصد نہیں کہ اس سورۃ میں مویشیوں کے بارے میں کوئی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں یا حلت وحرمت کے حوالے سے تفصیلی احکام دیئے گئے ہیں یا اس کے منافع اور نقصانات کے پہلو سے کچھ نصیحتیں کی گئی ہیں بلکہ مقصود اس سے نام ہونے کے حوالے سے صرف اس سورۃ کا تعین اور تعارف ہے کیونکہ کسی بھی نام سے اس کا مسمّٰی مراد ہوتا ہے' نام کا مفہوم معتبر نہیں ہوتا یعنی وہ نام سن کر اس کے معنی پر غور نہیں کیا جاتا' بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ کس کا نام ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ عبداللہ کو بلا کر لاؤ تو اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ کے بندے کو ڈھونڈ کر لاؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آدمی کو لاؤ' جس کا نام عبداللہ ہے۔ اسی طرح اس سورۃ کا نام ''الانعام'' صرف اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کے سولہویں اور سترہویں رکوع میں' دو تین دفعہ اس لفظ کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے اس سورۃ کا نام الانعام قرار دیا گیا۔

اس سے پہلے سورۃ فاتحہ کے بعد چار سورتیں گزری ہیں اور وہ چاروں مدنی سورتیں ہیں۔ یہ پہلی مکی سورۃ ہے۔ مکی سورۃ سے مراد یہ ہے کہ یہ سورۃ ہجرتِ مدینہ سے پہلے نازل ہوئی۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کے مندرجات کا ذکر کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات میں اس کا نزول ہوا ہے انہیں ذکر کر دیں تاکہ اس کے مندرجات اور تعلیمات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تیرہ سالہ مکی زندگی کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور تین سال پر محیط ہے۔ یہ وہ دور ہے' جب خاموش تبلیغ کا حکم دیا گیا اور لوگوں کو اعلانیہ اسلام کی دعوت دینے کی ابھی اجازت نہیں تھی۔ اس دوران آنحضرت ﷺ نے صرف ان لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی' جن سے آپ کے قریبی تعلقات تھے یا جو لوگ قرابت داروں میں اعتماد کے لائق تھے۔ چونکہ اس دور میں دعوت کیلئے سب سے بڑا ذریعہ باہمی تعلق تھا' اس لحاظ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تعلقات کے حوالے سے دعوت کے پھیلانے میں سب سے مؤثر کام کیا کیونکہ آپ مکہ معظمہ کی ایک بااثر شخصیت تھے۔ آپ ایک معزز تاجر سمجھے جاتے تھے اور اپنی سیرت و کردار کے حوالے سے نہایت نیک نام تھے۔ ایک کاروباری آدمی کے تعلقات چونکہ نسبتاً زیادہ وسیع ہوتے ہیں' اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تعلقات کی وسعت اور اپنی شخصیت کی نیک نامی کو اسلام کیلئے استعمال کیا' جس کے نتیجے میں اس دور میں جتنے بڑے بڑے لوگ مسلمان ہوئے' وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے اور آپ ہی کی کاوشوں کے نتیجے میں دائرۂ اسلام میں آئے۔

دوسرا دور' چوتھے اور پانچویں سن نبوی پر محیط ہے۔ ان دو سالوں میں آنحضرت ﷺ نے کھل کر تبلیغ و دعوت کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے اپنے خاندان کو جمع کر کے' ان کے سامنے اسلام کی دعوت رکھی اور پھر صفا پہاڑی پر چڑھ کر آپ نے تمام اہل مکہ کو اللہ کے دین کی طرف بلایا۔ نتیجتاً مکے کے شر پسند آپ کی مخالفت پر تل گئے اور آپ کی دعوت کے راستے میں امکانی مشکلات اٹھانے کیلئے کوشاں رہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سب سے پیش پیش خود آنحضرت ﷺ کا اپنا پڑوسی اور اپنا حقیقی چچا' ابولہب تھا۔ ان دو سالوں میں اگرچہ مخالفت خوب ہوئی' لیکن اس مخالفت میں اذیت رسانی کا عمل

Marfat.com

نسبتاً حد سے بڑھنے نہیں پایا اور اگر اس کا ہدف کوئی بنا بھی تو وہ غریب لوگ تھے' جن بے چاروں کا پشت پناہ کوئی نہیں تھا۔ لیکن چھٹے سن نبوی سے لے کر دس سن نبوی تک' یہ وہ تیسرا دور ہے' جب مخالفت نے باقاعدہ مزاحمت کی شکل اختیار کر لی اور اہل مکہ کے باوقار اور سنجیدہ لوگوں نے بھی اپنے نظام جاہلیت اور اس پر مبنی اپنے اقتدار کیلئے اس دعوت کو ایک خطرہ سمجھنا شروع کر دیا اور یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر اس دعوت کو نفوذِ عام کا موقع مل گیا تو ہمارا تمام تر وقار خاک میں مل جائے گا اور ہماری یہ مصنوعی چودھراہٹیں ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ اس لئے اب ان کی مخالفت بلکہ ان کی تذلیل اور اذیت رسانی کا ہدف صرف غریب لوگ نہ رہے بلکہ خود آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور باقی تمام مسلمان بھی ان سے محفوظ نہیں تھے۔ اس صورتحال کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو مشورہ دیا کہ تم حبشہ کی طرف ہجرت کر جاؤ' میں نے سنا ہے کہ وہاں کا بادشاہ نہ خود کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ کسی پر ظلم ہونے دیتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ مسلمانوں کی بیشتر تعداد حبشہ ہجرت کر گئی۔ وہاں کے بادشاہ نجاشی نے ان کو اپنے ملک میں نہ صرف عزت سے رہنے کی اجازت دی بلکہ جب قریش کے بھیجے ہوئے سفیر اس کے پاس تحائف لے کر پہنچے اور مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے کیونکہ یہ ہمارے ملک سے بے دین ہو کر بھاگے ہوئے لوگ ہیں' تو نجاشی نے صورتحال معلوم کرنے کے بعد مسلمانوں کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

مکی زندگی کا چوتھا دور' دس سن نبوی کے بعد آخری تین سالوں پر محیط ہے۔ ان سالوں میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وفات پا گئیں' ابوطالب دنیا سے اٹھ گئے۔ یہی دو شخصیتیں تھیں' جو آنحضرت ﷺ کی پشت پناہی کر رہی تھیں اور ان کے اثر و رسوخ کے باعث قریش کسی خطرناک اقدام سے پس و پیش کر رہے تھے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ابوطالب بنو ہاشم کے سردار ہیں اور وہ پوری طرح آنحضرت ﷺ کو اپنی پناہ میں لے چکے ہیں۔ اگر حضور کو کوئی نقصان پہنچا ہے تو یقیناً بنو ہاشم' اس کے قصاص کیلئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور عرب اس سے خوب واقف تھے کہ کسی ایک قبیلے کا قصاص کیلئے اٹھ کھڑا ہونا قبائلی زندگی میں کیا معنی رکھتا ہے۔ بعض دفعہ اس کے نتیجے میں ایسی لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں' جو حرب بسوس کی طرح بیسیوں سال چلتی ہیں۔ وہ اس سے پہلے جنگوں کے تھکائے ہوئے لوگ تھے' اس لئے وہ مزید کسی جنگ میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ لیکن جناب ابوطالب کے اٹھ جانے کے بعد' اب بنو ہاشم کی سربراہی ابولہب کے پاس آئی تو اس بدبخت نے آنحضرت ﷺ کو قبیلے کا تحفظ فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ اب قریش ایک طرح سے آزاد تھے کہ وہ جب چاہتے کسی بھی خطرناک اقدام کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان آخری تین سالوں میں' آپ بے پناہ مشکلات سے دوچار ہوئے اور آپ کے ساتھی بھی بری طرح ادھیڑے کھدیڑے گئے۔ انہی سالوں میں معلوم ہوتا ہے کسی وقت اس سورۃ کا نزول ہوا ہے کیونکہ اس کی تائید میں ہمیں حضرت عبداللہ ابن عباس ﷛ کی روایت ملتی ہے کہ حضرت اسماء بنت یزید ﷝ جو حضرت معاذ بن جبل کی چچازاد بہن ہیں' وہ کہتی ہیں کہ جب یہ سورۃ نبی کریم ﷺ پر نازل ہو رہی تھی' اس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے۔ میں اس کی نکیل پکڑے ہوئے تھی اور بوجھ کے مارے اونٹنی کا یہ حال ہو رہا تھا' معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ہڈیاں اب ٹوٹ جائیں گی۔ حضرت اسماء بنت یزید ﷝ چونکہ ایک انصاریہ خاتون تھیں اور ہجرت کے بعد ایمان لائی تھیں' اگر قبول اسلام سے پہلے محض بر بنائے عقیدت وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مکہ حاضر ہوئی ہوں گی تو یقیناً یہ حاضری آپ کی مکی زندگی کے آخری سال ہی میں ہوئی ہوگی' اس سے پہلے اہلِ یثرب کے ساتھ آپ کے تعلقات اتنے بڑھے ہی نہ تھے کہ وہاں سے کسی عورت کا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ممکن ہوتا۔

حضرت اسماء بنت یزید ﷝ کا اسلام لانے سے پہلے مکہ معظمہ میں آنحضرت کی خدمت میں آنے سے تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ مدینہ طیبہ میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کوششوں سے تیزی سے اسلام پھیل رہا تھا اور اوس و خزرج کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا' جس میں آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں اکثر باتیں نہ ہوتی ہوں۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ جب آدمی کسی بڑی شخصیت کے بارے میں ایسی باتیں سنتا

Marfat.com

ہے' جس سے اس کی محبوبیت عظمت اور غیر معمولی پن کا احساس ہوتا ہو تو دل میں یہ خیال مچلنے لگتا ہے کہ کاش! میں ایسی عظیم شخصیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ ابھی چونکہ یہ بات معلوم نہ تھی کہ حضور مدینہ تشریف لاتے بھی ہیں یا نہیں اور اگر تشریف آوری کا ارادہ بھی ہو تو کب تک ایسا ہو سکے گا' معلوم ہوتا ہے حضرت اسماء بنت یزید کی محبت وعقیدت نے جوش مارا اور آپ اسلام قبول کرنے سے پہلے آنحضرت کی زیارت کیلئے مکہ معظمہ چلی آئیں۔ عقیدت ومحبت میں آپ کی اونٹنی کی مہار تھامے کھڑی تھیں' جب اتفاق سے اس سورۃ کا نزول ہوا۔

ہماری ان گذارشات سے ایک تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سورۃ مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی ہے اور ساتھ ہی' ہم نے مکی زندگی کے آخری دونوں ادوار کے حوالے سے مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جس کشمکش کا ذکر کیا ہے' اس سے یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ ایسی نازک صورتحال میں جبکہ مسلمانوں کی واضح اکثریت ہجرت کر کے حبشہ جا چکی تھی اور کچھ لوگ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ جا چکے تھے' ایک محدود تعداد مکہ معظمہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھی اور مخالفت کی چکی کی تیزی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ مشرکین مکہ کسی آخری اقدام کیلئے پرتول رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں مسلمانوں کو اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ مصائب کو برداشت کرنے اور حالات کا سامنا کرنے کیلئے' انہیں ایسے مضبوط بنیادی احساسات سے بہرہ ور کیا جائے' جس سے ان طوفانوں کا سامنا کرنا' ان کیلئے آسان ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ انہیں ایسے مضبوط عقائد سے مسلح کر دیا جائے' جس کے نتیجے میں اللہ کی ذات کا استحضار' اس کی ذات سے گہری محبت' مصائب میں اس پر بے پناہ اعتماد' اس کی قدرتوں کا غیر متزلزل یقین اور اس کی راہنمائی کی امید' ہر وقت ان کے دل ودماغ میں موجزن رہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی ان کے دل ودماغ میں اتار دی جائے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے' اللہ کے راستے میں اگر یہاں قربانی بھی دینی پڑتی ہے تو یہ کوئی نقصان کا سودا نہیں بلکہ اس کے بدلے میں ہمیشہ رہنے والی دنیا میں وہ ابدی راحتیں اور خوشیاں نصیب ہوں گی جن کا تصور بھی آج مشکل ہے اور مزید یہ کہ اس صورتحال میں جس میں مسلمان گھر گئے تھے آنحضرت ﷺ کی ذات تو نمونے کے طور پر موجود تھی ہی' ساتھ ساتھ ایک ایسی ذات کی زندگی کو بھی ایسی ہی کشمکش سے گزرتے ہوئے دکھانے کا بھی انتظام کیا جائے' جس کے ساتھ قریش کو اپنے نسبی تعلق کا دعویٰ ہے اور وہ سمجھتے یہ ہیں کہ ہم ان کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مضبوط یقین' اللہ کے راستے میں ان کی قربانیاں اور اللہ کے ساتھ ان کے راست تعلق کو واضح کیا جائے تاکہ مسلمانوں کو اس کشمکش سے گزرنا آسان ہو جائے۔ چنانچہ یہی وہ بنیادی مضامین ہیں' جو ان کے ضمنی مباحث کے ساتھ سورۃ الانعام میں بیان کئے گئے۔ لیکن ان میں اہم تر موضوع چونکہ مکہ معظمہ میں ایک مضبوط سیرت وکردار کے حوالے سے افراد سازی کا ہے۔ اس لئے زیادہ تر زور اس سورۃ میں اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے دیا گیا ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے' جو لوگ مکی زندگی میں قبول اسلام میں سبقت کر رہے ہیں' آئندہ یہی اسلامی زندگی اور امت اسلامیہ کی تعمیر وتشکیل میں ہراول دستے کے طور پر اپنا رول ادا کریں گے۔ یہی لوگ آنے والی امت کا نمونہ بنیں گے اور انہی کے جرأت مندانہ اقدامات' انہی کی قربانیاں اور انہی کی وفاشعاریاں اس امت کی آئندہ تاریخ کا وہ عظیم سرمایہ ہوں گی' جو قیامت تک امت اسلامیہ کو روشنی مہیا کرتا رہے گا۔ اس لئے انتہائی ضروری تھا کہ سب سے پہلے ان کی سیرت وکردار کی تشکیل کیلئے' ان بنیادی چیزوں پر زور دیا جائے' جو افراد سازی کیلئے انتہائی ضروری ہیں اور افراد میں دل ودماغ کی تیاری' فکری راست روی اور عملی اصابت اور پختگی کیلئے راہنمائی کا کام دے سکتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم اس پہلو کے حوالے سے انسانی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی تمام عملی قوتیں بلکہ اس کے شعوری فیصلے بھی' ان تصورات اور خیالات کے زیر اثر وجود میں آتے ہیں' جو شعوری اور غیر شعوری طور پر انمٹ نقوش کی صورت میں اس کے دل ودماغ میں پیوست ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تصورات ہیں' جو اس کی پوری زندگی پر حکمرانی کرتے ہیں۔

Marfat.com

اس کی بے عملی کو قوت محرکہ بن کر حرکت میں تبدیل کرتے اور اچھائی اور برائی کے لحاظ سے اس کی ایک جہت مقرر کرتے ہیں۔ جب بھی کسی فرد یا کسی قوم میں تشکیل کردار کا مرحلہ درپیش ہو تو اس میں اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ اس قوم کے خیالات و احساسات کو صحیح رخ پر ڈالنے کی کوشش کی جائے اور اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اعمال خود بخود سلامتی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اگر خدانخواستہ ان خیالات و احساسات میں کوئی کجی پیدا ہو جائے تو پھر اعمال کی اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہیں رہتی۔ دنیا میں ہم افراد اور قوموں میں اچھے اور برے کی جو تقسیم دیکھتے ہیں وہ بظاہر ان کے اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے لیکن حقیقت میں اس کا سر رشتہ خیالات کی اصلاح یا بگاڑ کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ اس کو سمجھنے کیلئے ایک مثال پر غور فرمایئے کہ ایک آدمی زخمی حالت میں سڑک پر کراہ رہا ہے۔ اسے دیکھنے والوں میں تین قسم کے لوگ دکھائی دیں گے۔ ایک شخص اسے دیکھتا ہے اور بے نیازی کی نظر ڈال کر اپنی راہ لیتا ہے جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ دوسرا شخص اپنی سواری سے اترتا ہے۔ بجائے اس کی نبض دیکھنے کے اس کی گھڑی اتارتا ہے دل کی دھڑکن سننے کی بجائے اس کی جیب خالی کرتا ہے اور رفو چکر ہو جاتا ہے اور تیسرا آدمی بے تابی اور بے قراری کی تصویر بنے اس کی نبض ٹٹولتا ہے اس کے بعد دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اسے اس میں زندگی کی رمق دکھائی دیتی ہے تو فوراً اس کی زندگی بچانے کیلئے اپنی امکانی مساعی سے دریغ نہیں کرتا۔ غور فرمایئے! یہاں عمل کا محرک ایک ہے یعنی زخمی کا سڑک پر تڑپنا۔ لیکن اس کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہونے والے اعمال تین طرح کے ہیں۔ ایک کا عمل انسانیت سے بے نیازی کا۔ دوسرے کا سراسر دشمنی کا اور تیسرے کا ہمدردی اور خیر خواہی کا ہے۔ آخر اعمال میں یہ اختلاف کیوں ہے؟

اگر آپ گہری نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اعمال کا اختلاف دراصل اندر کے خیالات اور تصورات کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ جس کے دل میں انسانیت کی طرف سے بے نیازی اور لاپرواہی پائی جاتی ہے اس کے عمل میں بھی وہی لاپرواہی اور بے نیازی کارفرما ہے اور جس کے قلبی خیالات میں انسانیت کیلئے دشمنی اور سنگدلی پنہاں ہے اس کا عمل بھی اسی سنگدلی کی تصویر ہے اور جس آدمی کے دل میں انسان کیلئے خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے اس کا عمل بھی اسی جذبے کا پرتو اور عکس ہے۔ اسی مثال پر قیاس کرتے ہوئے آپ اس حقیقت کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ انسانی عمل کا برا یا اچھا ہونا اس کا تمام تر دارومدار دل کے تصورات احساسات اور خیالات کے اچھے اور برے ہونے پر ہے۔ آپ جس قسم کے خیالات دل میں بسا لیں گے اسی قسم کے اعمال ظہور پذیر ہوں گے۔

ہماری قریبی تاریخ میں حصول علم کے لئے باہر جانے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مگر ان میں دو نام ایسے ہیں یعنی ''علامہ اقبال'' اور ''محمد علی جوہر'' کہ جب وہ ولایت سے پڑھ کر لوٹے تو بجائے ان سے متاثر ہونے کے وہ ان کی فکر اور تہذیب کے باغی بن کر آئے۔ اقبال خود کہتے ہیں کہ

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

یہ خاک مدینہ و نجف اصل میں تعبیر ہے ان قلبی خیالات و احساسات کی جو ان کی والدہ کی تربیت نے ان کے اندر ودیعت کر دیئے تھے جس کی وجہ سے ان کے اندر ایک ایسی قوت پیدا ہو گئی جو ہر طرح کے خیالات کا مقابلہ کرنے میں ان کی معاون اور مددگار ثابت ہوئی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

Marfat.com

یہی چیز ہم امت مسلمہ کے مختلف ادوار میں دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین' جن کی اکثریت عرب جیسی جاہل' اجڈ' اخلاق کے نام سے نا آشنا' ایک دوسرے کے خون کی پیاسی اور اس چندروزہ زندگی کو اپنی منزل سمجھنے والی قوم سے تعلق رکھتی تھی مگر جب ان کے خیالات تبدیل کر دیئے گئے تو وہ قوم جو بت پرستی کی وجہ سے زندگی کا محدود تصور رکھتی تھی' اس نے زندگی کے بارے میں ایسے حیرت انگیز تصورات انسانیت اور تاریخ کو دیئے کہ جس کے بارے میں اقبال کہتا ہے:

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ راز اس نے پایا انہیں کے جگر میں

وہ جو اس زندگی کو اپنی حقیقی منزل اور اس زندگی کے شب و روز کو اپنی تگ و دو کا حاصل اور انسانیت کا آخری افق گردانتی تھی۔ جب اس نے اس افق کے پار ایک دوسری دنیا کو اپنے قلب و نظر میں اتار لیا تو پھر اس زندگی اور اسباب زندگی کیلئے پریشان ہونا اور اندیشہ ہائے سود و زیاں میں مبتلا رہنا' ان کیلئے ایک عیب بن گیا۔ اب وہ زندگی زندہ رہنے کو نہیں بلکہ اس زندگی کو اُس عظیم مقصد کیلئے قربان کرنے کو سمجھنے لگے جس کا تصور انہیں اسلام نے دیا تھا۔ کبھی وہ دوسرے کی زندگی چھین کر کامیابی سے ہمکنار ہوتے تھے۔ لیکن اب اس عظیم مقصد کے راستے میں زندگی ہار کر' وہ کامیابی کا تصور کرتے تھے۔

حضرت علیؓ' حضرت زید بن حارثہؓ' حضرت جعفر طیارؓ' حضرت عبداللہ ابن رواحہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین' زخم کھا کر گرتے ہیں تو ان کی زبان سے نکلتا ہے فزت و رب الکعبہ ''رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا''۔ اقبال اس سے متاثر ہو کر کہتا ہے:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

یہ زندگیوں میں حیرت انگیز انقلاب کس بات کا نتیجہ تھا۔ صرف اس بات کا کہ ان کے دل و دماغ میں صالح خیالات پاکیزہ احساسات اور بلند تصورات پیدا کر دیئے گئے تھے۔

یہی احساسات اور تصورات ان کیلئے' وہ قوی محرک ثابت ہوئے' جس نے ان کی زندگی کو بدل ڈالا اور ان کے خیالات کے مطابق' ان سے اعمال کا ظہور ہونے لگا۔ پاکیزہ احساسات نے زندگی کو پاکیزہ بنایا' بلند خیالات نے زندگی میں اولوالعزمی پیدا کی اور آخرت کی طلب نے دنیا اور دولت دنیا سے محبت کے بحران کو سر کیا۔ اقدارِ حیات کے صحیح تصور کے پیدا ہو جانے سے مقاصدِ زندگی میں بلندی اور وسعت پیدا ہوئی۔ جواب دہی کے احساس نے وقت کی قدر و قیمت اور اخوت و انسانیت کی نزاکت کا احساس پیدا کیا۔ الغرض ان کی زندگی میں اندر کی دنیا کی تبدیلی نے باہر کی ہر چیز اور ہر تصور کو بدل کر رکھ دیا۔ قبیلے کی تنگنائے میں رہنے والے لوگ' آفاق گیری کا تصور لے کر اٹھے۔ امیدوں اور آرزوؤں میں زندگی گزارنے والے لوگ' مقاصد جلیلہ کی بہار بن کر چھا گئے اور تاریخ پر یہ بات واضح کر دی کہ

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

مختصر یہ کہ انسانی اعمال کا تمام تر دارومدار اس کے ان خیالات اور تصورات پر ہے' جو اس کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکے ہیں۔ مکی زندگی میں چونکہ پیش نظر صرف یہ بات تھی کہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو آئندہ چل کر اسلامی زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکیں' اس لئے تمام مکی سورتوں

Marfat.com

میں صرف دو باتوں پر زور دیا گیا۔ ایک بنیادی تصورات پر جنہیں عقائد کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرے اسلامی اخلاق پر۔ چنانچہ پورے تیرہ سالہ دور میں سوائے چند ابتدائی احکام کے کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ تمام تر زور انہی دونوں باتوں پر رہا تاکہ ایک ایسا انسانی گروہ تیار ہو جائے جو اللہ کی عبودیت اور اطاعت میں پوری امت کیلئے نمونہ بن سکے۔ وہ تین تصورات جن کا ابھی میں نے ذکر کیا' وہ ہیں توحید' رسالت اور آخرت۔ ان سے مقصود یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اور حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے' جس طرح کائنات کو تخلیق کرنے کیلئے کوئی اس کا شریک نہیں' اسی طرح اس کے حاکم حقیقی ہونے میں بھی' کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ وہ تمام کائنات پر اس طرح بھی حکومت کر رہا ہے کہ اس نے اسباب پیدا کر دیئے ہیں اور اسباب کے مطابق زندگی گزارنے کا ہر ایک کو پابند کر دیا گیا ہے اور یہ اس کی وہ اطاعت ہے' جسے غیر اختیاری اطاعت کہا جاتا ہے۔ جس میں کوئی مخلوق اپنی مرضی کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتی۔ لیکن ایک دوسری اس کی حاکمیت ہے' جسے تشریعی حاکمیت کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس اللہ نے تمہیں تخلیق کیا ہے' جو تمہیں رزق دیتا ہے' جس نے تمہارے لئے زندگی کے امکانات پیدا فرمائے ہیں' جس کی پیدا کردہ زمین پر تم رہتے ہو اور جس کے آسمان کی چھت کے نیچے تم زندگی گزار رہے ہو' جس کے کارکنانِ قضا و قدر اور جس کے پیدا کردہ عناصر کائنات' ہر وقت زندگی کی آسانیاں مہیا کرنے کیلئے تمہاری خدمت میں لگے ہوئے ہیں' اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ تم پر حکمرانی کرے اور اس کی حکومت مطلقہ کی موجودگی میں تمہیں اس کی مخلوق ہوتے ہوئے اور اس کا رزق کھاتے ہوئے اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہوئے ہرگز اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم کسی اور کے سامنے سر جھکاؤ' کسی اور سے عبادت اور عبودیت کا تعلق پیدا کرو اور کسی کی غیر مشروط اطاعت کرو۔ اسی طرح وہی ذات اس لائق ہے کہ تم ہمیشہ اس پر توکل کرو' نازک سے نازک حالات میں اسی سے مدد چاہو' اپنی تنہائیوں کو اسی کے ذکر سے آباد کرو اور ہر وقت اسے اپنا نگران اور نگہبان سمجھو اور اس بات کو ذہن نشین کر لو کہ اسی کی اطاعت کے نتیجے میں تمہیں اس دنیا کی کامیابی اور آخرت میں سرخروئی نصیب ہوگی۔ یہ وہ عقیدہ ہے جسے عقیدہ توحید کہتے ہیں۔ اس عقیدۂ توحید کو قبول کر لینے کے بعد خود بخود ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اطاعت اسی کی کرنی ہے اور حاکمیت اسی کو زیب دیتی ہے اور رضا صرف اسی کی حاصل کرنی ہے تو پھر معلوم تو ہونا چاہئے کہ وہ کن باتوں میں راضی ہے؟ اس کا قانون کیا ہے؟ اس کے احکام کیا ہیں؟ اس کی بندگی کا طریقہ کیا ہے؟ جس واسطے سے ہمیں ان سوالوں کا جواب ملتا ہے اس کو رسالت کہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے رسول ہماری اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے تشریف لاتے رہے اور انہوں نے اللہ کی طرف سے' ہمیں قانون کی کتابیں دیں اور اللہ کی اطاعت و عبادت کے حوالے سے ہماری ایک ایک ضرورت کو پورا کیا۔ لیکن پھر ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر ہم اللہ کے احکام کے مطابق' اس کی رضا کے حصول کیلئے زندگی گزارتے ہیں تو اس کی جزاء کیا ہوگی اور اگر کوئی اس کے مخالف زندگی گزارتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ کیا یہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد ہم میں سے ہر شخص ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد کوئی نئی زندگی نہیں ہوگی' جس میں جزاء اور سزا کا تحقق ہو سکے۔ ان باتوں کا تفصیلی جواب اللہ کی طرف سے اس کے رسولوں نے دیا ہے کہ یہ زندگی مستقل ختم ہونے والی نہیں ہے۔ یہ دارالعمل ہے' دارالجزاء کے طور پر ایک اور دنیا ہے' جس میں سب کو زندہ کر کے وہاں کھڑا کیا جائے گا' اللہ کی عدالت ہوگی' ایک ایک عمل کا حساب ہوگا' اطاعت گزار لوگ جزاء سے نوازے جائیں گے اور نافرمان جہنم کی آگ میں جلیں گے۔ اس عقیدہ کو عقیدۂ آخرت کہا جاتا ہے۔ مکی زندگی کے یہ تین بنیادی عقیدے ہیں' جس پر تیرہ سال تک زور دیا جاتا رہا اور اس کے نتیجے میں وہ کردار وجود میں آیا' جس کا اس سے پہلے تذکرہ ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی تطہیر کیلئے اخلاقیات کی تعلیم بھی جاری رہی اور دونوں کو دل و دماغ میں راسخ کرنے کیلئے تربیت کا عمل بھی جاری رہا۔ آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین میں ان تصورات کو راسخ کرنے کی کوشش فرمائی۔ جس کی مثالوں سے حدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں کہ دو دن کے فاقے کے

Marfat.com

بعد آنحضرت ﷺحضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو ساتھ لئے ایک انصاری صحابی کے باغ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے جیسے ہی آنحضرت اور آپ کے ساتھیوں کو دیکھا' خوشی سے بے قابو ہو گئے۔ آگے بڑھ کر کھجوروں اور انگوروں کے کچھ خوشے توڑ کر آپ کی خدمت میں پیش کئے اور گھر میں کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ شدید بھوک کے باعث' حضرت عمر فاروق ﷺ نے جلدی سے چند دانے انگوروں کے توڑ کر کھانے کا ارادہ کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: عمر ٹھہر جاؤ! یہ تم جو چند دانے انگوروں کے کھانے لگے ہو' قیامت کے دن ان کا بھی حساب ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراسیمگی کے عالم میں عرض کیا کہ حضور ﷺ دو دن کے فاقے کے بعد' ان چند دانوں کا بھی حساب دینا ہوگا؟ فرمایا: مجھے قسم ہے' اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے' تم سے وہاں ایک ایک نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

جن لوگوں کی تربیت آنحضرت نے اس طرح فرمائی' وہ اگر مستقبل کے صدیق و فاروق نہ بنتے تو اور کیا ہوتے؟ اس تربیت کے نتیجے میں انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ایک ایک بات کا حساب دینا ہے۔ اللہ نے ان کو دنیا کی سب سے بڑی حکومت عطا فرمائی' لیکن اس احساس کی گراں باری کے باعث وہ ہمیشہ پیوندزدہ کپڑے پہنتے' فاقے کرتے اور ایک ایسی زندگی گزار کے گئے کہ جس سے زیادہ پاکیزہ زندگی کا شاید تصور بھی ممکن نہ ہو۔ ان کی اس تمام پاکیزہ سیرت و کردار کا سر رشتہ' جب ہم تلاش کرتے ہیں تو وہ کہیں اور نہیں صرف انہی عقائد کے ساتھ بندھا ہوا ہے' جو پوری تیرہ سالہ مکی زندگی میں ان کے دل و دماغ میں اتارے گئے اور یہی وہ تصورات ہیں' جو کسی بھی زندگی کی پاکیزگی کی ضمانت ہیں۔ اسی سے وہ مضبوط کردار جنم لیتا ہے کہ آپ اس پر کیسی بھی ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیں وہ کبھی بھی کمزوری کا شکار نہیں ہوگا۔ حکومت جیسی نازک ذمہ داری بھی ان پر ڈال دی جائے تو وہ تخت حکومت پر بیٹھ کر بھی فقیری کر کے دکھائیں گے۔ ظفر علی خاں نے ٹھیک کہا

بادشاہی میں فقیری کا چلن رکھتے ہیں
دوش پر بار امانت کا اٹھانے والے

آج بھی ضرورت اسی بات کی ہے کہ اگر ہم ایک صالح معاشرہ تیار کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی انہی بنیادوں پر افراد سازی کا کام کرنا ہوگا۔ ان صالح افراد سے جو معاشرہ بنے گا' اس کا ایک ایک فرد' ہر سطح پر متمکن ہو کر اپنی اندرونی خوبیوں کا جب اظہار کرے گا تو پورا ملک اور پورا معاشرہ مکارمِ اخلاق کے پھولوں سے مہک اٹھے گا۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ٹھیک کہا

تو خاک میں مل اور آگ میں جل' جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر' بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ کی پہلی آیت کا آغاز ہی عقیدۂ توحید سے ہو رہا ہے۔

Marfat.com

سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّ خَمْسٌ وَّسِتُّوْنَ اٰيَةً وَّ عِشْرُوْنَ رُكُوْعًا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۂ انعام مکی ہے اور اس میں ایک سو پینسٹھ آیتیں اور بیس رکوع ہیں — شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۭ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ① هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ۭ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ②

ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیرا اور روشنی بنائی پھر بھی کافر (اور چیزوں کو) خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں ف۔ وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر (مرنے کا) ایک وقت مقرر کر دیا۔ اور ایک مدت اس کے ہاں اور مقرر ہے پھر بھی تم (اے کافرو خدا کے بارے میں) شک کرتے ہو

<u>آیت:۱</u> اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۭ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ O ''تعریف یا شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے' جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکی اور روشنی کو' پھر تعجب ہے (ان پر) کہ جن لوگوں نے کفر کیا' وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں''

جب یہ سورۃ نازل ہوئی ہے' اس وقت دنیا میں غالب قوت بے خدا تہذیب تھی' یعنی ایک ایسی تہذیب' جو ان تصورات سے وجود میں آئی تھی' جس میں اللہ کے وجود کا کوئی تصور نہیں تھا یا اللہ کے وجود کو تسلیم کیا بھی جاتا تھا تو اس کے تصورِ حاکمیت کا تو دور دور تک کوئی تصور موجود نہ تھا۔ وہ اللہ کو آسمانوں کا رب سمجھتے تھے۔ زمین کے رب انہوں نے نجانے کہاں کہاں اور کیسے کیسے بنا رکھے تھے۔ مذہبی طور پر وہ کسی بھی رب کو تسلیم کرتے' لیکن عام معاشرتی' سیاسی اور اجتماعی زندگی میں ایک ہی معبود تھا' جس کی ساری دنیا میں پوجا ہو رہی تھی' وہ' وہ تھا جسے ہم مادہ' دنیا' دولتِ دنیا' طاقت' عزت' پرسٹیج' معیارِ زندگی' شہرت اور حکومت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی کا سکہ چلتا تھا اور اسی کی طاقت اور حکومت کے سامنے سب سرنگوں ہوتے تھے۔ فکر یہ نہیں تھی کہ انسانیت کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ہم جس کا کھاتے ہیں اور جس نے ہمیں تخلیق کیا ہے' ہم اپنے اس خالق و مالک کے بارے میں بھی کبھی سوچیں کہ وہ کون ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟ آخر اس زندگی کا انجام کیا ہے؟ کونسی منزل ہے' جس کی طرف ہم بڑھ رہے ہیں؟ لیکن اہل دنیا کو ان باتوں کے سننے کا ہوش نہ تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہی وہ حقائق ہیں جن سے اس دنیا میں بھی انسانیت زندہ ہے اور انسان کا مستقبل محفوظ ہے اور قیامت میں انہی تصورات

Marfat.com

کے صحیح حل پر ہماری کامیابی کا دارومدار ہے۔قرآن کریم نے انہی تصورات کو انسانوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی اور جیسا کہ اس سورۃ کے تعارف میں عرض کیا جاچکا ہے کہ ان تصورات میں سب سے بنیادی تصور یا عقیدہ عقیدۂ توحید ہے جس سے باقی عقائد یا تصورات خود بخود پھوٹتے ہیں اس لئے اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے اسی عقیدے کا ذکر کیا جارہا ہے۔

سورۃ کا آغاز ''الحمد'' سے کیا جارہا ہے۔''حمد'' کا معنی ہے ''ثنائے جمیل''۔یعنی اچھی صفتیں بیان کرنا۔اگر کسی کی بری صفتیں بیان کی جائیں تو یہ حمد نہ ہوگی حمد پر الف لام ہے یہ استغراق کیلئے بھی ہوسکتا ہے اور جنس کیلئے بھی۔اس صورت میں الحمد للہ کے معنی یہ ہوں گے کہ حمد وثناء میں سے جو کچھ اور جیسا کچھ بھی کہا جاسکتا ہے وہ سب اللہ ہی کیلئے ہے کیونکہ خوبیوں اور کمالوں میں سے جو کچھ بھی ہے سب اسی سے ہے اور اسی میں ہے۔

مشرکین مکہ کے اللہ کے متعلق تصورات:

''حمد'' کے لفظ سے پروردگار کے بارے میں ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ بھی مقصود ہے۔نزول قرآن کے وقت لوگوں میں جو گمراہیاں پائی جاتی تھیں ان میں ایک گمراہی یہ تھی کہ وہ اللہ کی الوہیت اور بادشاہوں کی بادشاہت کو آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ سمجھتے تھے۔لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہوکر انعام دینے لگتا ہے کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے اس لئے خیال کرتے تھے کہ اللہ کا بھی ایسا ہی حال ہے۔وہ کبھی ہم سے خوش ہوجاتا ہے کبھی غیض وغضب میں آجاتا ہے۔طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھاووں کی رسم اسی اعتقاد سے وجود میں آئی۔لوگ دیوتاؤں کا جوش غضب ٹھنڈا کرنے کیلئے قربانیاں کرتے اور ان کی نظر التفات حاصل کرنے کیلئے نذریں چڑھاتے۔انسانوں کو چونکہ بالعموم مصیبتوں سے واسطہ رہتا ہے لہٰذا وہ اسے اللہ کی ناخوشی کا اظہار جان کر اللہ سے ہمیشہ ڈرتے اور اسے ایک ہولناک ذات تصور کرتے۔وہ سمجھتے کہ جس ذات کی ناخوشی کی وجہ سے بجلیاں کڑکتی اور کوندتی ہیں بادل گرجتے اور درندے دھاڑتے ہیں وبائیں پھوٹتی ہیں آب وآتش بھی بے قابو ہوکر موت کی تباہیاں لاتے ہیں خود وہ ذات کس قدر غضبناک اور ہولناک ہوگی۔اس آیت کریمہ میں ''الحمد'' کا لفظ لاکر یہ تصور دیا جارہا ہے کہ ''حمد'' اگر ثنائے جمیل کو کہتے ہیں تو ثنائے جمیل تو کسی جمیل کی ہوسکتی ہے کسی ہولناک کی تو نہیں ہوسکتی۔اگر اس کی تعریف خوبصورت ہے تو وہ خود کتنا خوبصورت ہوگا۔خوبصورت ذات سے پیار کیا جاتا ہے ڈرا تو نہیں جاتا۔چنانچہ اس عقیدہ کی اصلاح کیلئے قرآن نے جابجا واضح کیا کہ اللہ اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے اور سچی عبودیت اسی کی عبودیت ہے جس کیلئے معبود صرف معبود ہی نہ ہو بلکہ محبوب بھی ہو اور کافر اور مومن میں فرق یہ بتایا کہ کافر ہمیشہ اپنے معبودوں کو اس طرح پیار کرتے ہیں جیسے اللہ سے پیار کرنا چاہئے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کیلئے ہوتی ہے۔(البقرہ:١٦٥)

مزید یہاں تک فرمایا کہ اگر تم اللہ سے محبت کا حق ادا کرو اور حق ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود پروردگار تم سے محبت کرے گا۔میں نہیں سمجھتا کہ ایک فانی انسان کیلئے اس سے بڑھ کر بھی کوئی اعزاز کی بات ہوسکتی ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O

(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہہ دو اگر واقعی تم اللہ سے محبت رکھنے والے ہو تو چاہئے کہ میری پیروی کرو (میں تمہیں محبت الٰہی کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں اگر تم نے ایسا کیا تو صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اللہ سے محبت کرنے والے ہوجاؤ گے بلکہ خود) اللہ تم سے محبت

Marfat.com

کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے" (آل عمران: ۳۱)

اللہ کی ذات کے بارے میں' اس کے ہولناک اور ہیبت ناک ہونے کا تصور' ایک اور غلط فہمی سے بھی پیدا ہوا۔ پہلی آسمانی کتابوں میں اور خود قرآن کریم میں بھی بار بار فرمایا گیا اتقوا اللہ "اللہ سے ڈرو"۔ لوگوں نے اس سے یہ سمجھا کہ اس سے مراد شاید اللہ کی ذات سے ڈرنا ہے کیونکہ وہ ایک ہیبتناک اور ہولناک ذات ہے' جو جابر و قاہر بادشاہوں کی طرح' بات بات پر بگڑتی اور لوگوں کو سزائیں دیتی ہے حالانکہ اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں تھا۔ اس کا نہایت واضح مفہوم یہ ہے کہ اللہ تمہاری محبوب ذات ہے' تم اس سے عشق و محبت کا دعویٰ رکھتے ہو' جس سے محبت کی جاتی ہے' اس کی ایک ایک ادا اور ایک ایک اشارے پر جان نچھاور کی جاتی ہے' اس کے بارے میں یہ تصور بھی ممکن نہیں ہوتا کہ اپنی کسی بات پر اسے ناراض ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس لئے تمہیں بھی چاہئے کہ اپنے اللہ کے احکام کی اطاعت اور اس کے قرب کے حصول کی خواہش میں کبھی کوئی ایسا کام نہ کرنا' جس سے پروردگار تم سے ناراض ہو جائے۔ ظاہر ہے' یہ ناراضگی اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ تمہاری اپنی پیدا کردہ ہوگی۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ تمہیں جو اللہ سے ڈرنے کو کہا جاتا ہے' وہ اس لئے نہیں کہ اللہ بادشاہوں کی طرح بلاوجہ ناراض ہوتا ہے بلکہ اس سے ڈرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک عادل ذات ہے۔ اس کی صفتِ عدل کا تقاضہ ہے کہ وہ نیک اعمال پر جزاء کی صورت میں رحمت کا معاملہ فرمائے اور بداعمالیوں پر سزا دے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نظام عالم تہ و بالا ہو کر رہ جائے اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو زندگی گزارنے کیلئے جو ایک نظام بخشا ہے' جسے ہم اسلامی شریعت کہتے ہیں' اس کی پابندی خواب و خیال ہو کر رہ جائے۔ جس قانون کی اطاعت پر خوشنودی نہیں ملتی اور اس کی معصیت پر سزا کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا' دنیا میں احمق سے احمق آدمی بھی اس کی پابندی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اپنے دیئے ہوئے نظام کے بارے میں' اس صفتِ عدل کے تقاضے کو بروئے کار نہ لاتا تو نظامِ عالم کے ساتھ ساتھ خود انسانی زندگی درہم برہم ہو جاتی۔ کسی کا کوئی حق محفوظ نہ رہتا' کسی کی جان مال' عزت آبرو کا کوئی تحفظ نہ ہوتا۔ اللہ کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کو حاصل کرنے کی کسی کو فکر نہ ہوتی۔ قاتل کو قتل سے کوئی نہ روک سکتا کیونکہ اسے معلوم ہوتا کہ قتل کرنے کے نتیجے میں اسے کوئی سزا نہیں ملے گی اور اللہ کے راستے میں کوئی قربانی نہ دیتا۔ کوئی بھی سر کٹوانے کو تیار نہ ہوتا کیونکہ اسے خوب معلوم ہوتا کہ یہاں اجر و ثواب اور بدلے کا کوئی تصور نہیں۔ اس لئے پروردگار جب یہ کہتا ہے کہ "لوگو! اللہ سے ڈرو" تو مطلب یہ ہے کہ بداعمالیوں کے انجام سے ڈرو۔ مزید یہ بات بھی کہ اللہ نے دنیا میں ایک قانون مکافات کو مستقل حیثیت سے جاری و ساری فرمایا ہے۔ انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسری تمام مخلوقات حتیٰ کہ عناصر کائنات میں بھی اس مکافات عمل کے قانون کو ہم جابجا جاری و ساری دیکھتے ہیں یعنی اس نے ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ مقرر کیا ہے اور جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے' وہ اپنے اثرات و نتائج بھی رکھتی ہے تو جس طرح خدا نے اجسام و مواد میں خواص و نتائج رکھے ہیں' اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں' اسی طرح روح انسانی کے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں' معنوی مؤثرات سے روح متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں' جن سے بچنے کیلئے اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ یہ اللہ ہی کا مقرر کردہ قانون ہے تو اس قانون کی گرفت سے ڈرنا' گویا اللہ سے ڈرنا ہے۔

ہمیں چونکہ اس مکافات عمل کے قانون کا صحیح احساس نہیں اس لئے ہم بار بار اعمال کی جزا و سزا میں الجھ کر رہ جاتے ہیں حالانکہ قرآنِ کریم اسی کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے اور پھر یہ بات ایسی ہے کہ جس کی مثالیں ہماری گرد و پیش میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً آگ جلاتی ہے' پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے' سنکھیا کھانے سے موت' دودھ سے طاقت آتی ہے' کونین سے بخار رک جاتا ہے۔ جب اشیاء کی ان تمام مکافات پر ہمیں تعجب نہیں ہوتا

Marfat.com

کیونکہ یہ ہماری زندگی کی یقینیات ہیں تو پھر اعمال کی مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے؟ افسوس ہم اپنے فیصلوں میں کتنے ناہموار ہیں۔

ہم گیہوں بوتے ہیں اور ہمارے دل میں کبھی یہ خدشہ نہیں گزرتا کہ گیہوں پیدا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی ہم سے کہے کہ ممکن ہے' گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے تو ہم اسے پاگل سمجھیں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ فطرت کے قانونِ مکافات کا یقین ہماری طبیعت میں راسخ ہو گیا ہے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ خطرہ نہیں گزر سکتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے جوار دے دے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ اچھے قسم کا گیہوں لے کر برے قسم کا گیہوں دے دے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ پھر بتاؤ! جو فطرت' گیہوں کے بدلے گیہوں اور جوار کے بدلے جوار دے رہی ہے کیونکر ممکن ہے کہ اچھے عمل کے بدلے اچھا اور برے عمل کے بدلے برا نتیجہ نہ رکھتی ہو۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ط سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ O وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ O

جو لوگ برائیاں کرتے ہیں' کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ایسے لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ دونوں برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے تو افسوس ان کے اس فیصلے پر! O اور اللہ نے زمین اور آسمان کو بے کار اور عبث نہیں بنایا ہے بلکہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور اس لئے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ ملے اور یہ بدلہ ٹھیک ٹھیک ملے گا کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا O ‏ (الجاثیہ:۲۲-۲۱)

''حمد'' کے لفظ سے ان حقائق کو منکشف فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور ظلمتوں اور نور کو وجود بخشا۔

آیت کریمہ کے اس ٹکڑے میں دو باتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ ایک اللہ کے وجود کا اثبات اور دوسرا' اللہ کے ساتھ ہر طرح کے شرک کی تردید۔ قرآن کریم کا مکی سورتوں میں طرزِ استدلال یہ ہے کہ وہ عقل' فطرت اور شواہد قدرت سے دلائل بہم پہنچاتا ہے اور کبھی مشرکین مکہ کے مسلمات کو بنائے دلیل بنا کر دلیل کی عمارت اٹھاتا ہے۔ ان آیات میں ان دونوں طریقوں سے دلائل مہیا فرمائے ہیں۔ سب سے پہلے ہم اس آیت کی روشنی میں' اللہ کے وجود پر گفتگو کرتے ہیں۔ مشرکین مکہ اگرچہ اللہ کے وجود کے قائل تھے۔ کیونکہ اللہ کے وجود کا انکار گزشتہ صدی کے کمیونسٹوں کے سوا تاریخ انسانی میں شاید کبھی بھی کسی قابل ذکر گروہ نے نہیں کیا۔ البتہ اس کے ساتھ شرک عموماً کیا گیا۔ لیکن پروردگار کا کرم یہ ہے کہ وہ جن آیات میں شرک کی تردید کرتا ہے' عموماً انہی آیات میں اپنے وجود پر استدلال بھی کرتا ہے۔ اس آیت میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بظاہر تو اس آیت میں شرک کی تردید کی گئی ہے اور اس کیلئے عقلی استدلال سے بھی کام لیا گیا ہے اور مشرکین کے مسلمات سے بھی۔ لیکن اشارۃً اپنے وجود پر بھی دلیل ارشاد فرمائی ہے۔ وہ اس طرح کہ انسانوں کے پاس کسی چیز کے جاننے کے دو ذریعے ہیں۔ 1- حواس 2- عقل۔

''حواس'' سے مراد ہے دیکھنے' سننے' چکھنے' سونگھنے اور چھونے کی قوت۔ ہم محسوسات کی دنیا میں انہی پانچوں ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہیں۔ جن چیزوں کا تعلق مشاہدات سے ہے' انہیں ہم دیکھ کر جانتے ہیں۔ جن کا تعلق مسموعات سے ہے' انہیں ہم سن کے سمجھتے ہیں۔ جن چیزوں کا تعلق ملموسات سے ہے اسے ہم چھو کر جانتے ہیں۔ جن چیزوں کا تعلق خوشبویات سے ہے' انہیں ہم سونگھ کر معلوم کرتے ہیں اور جن چیزوں کا تعلق ماکولات سے

Marfat.com

ہے' ان کا ہم چکھ کر یقین کرتے ہیں۔ غور فرمالیجئے! ہمارے پاس تمام معلومات کیلئے یہی پانچ طریقے ہیں' لیکن کتنی ایسی باتیں ہیں' جو ان پانچ ذرائع سے ہمیں معلوم نہیں ہوتیں۔ ان کے جاننے کا ہمارے پاس ذریعہ عقل ہے۔ لیکن عقل کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ حواس خمسہ سے بے نیاز ہو کر کوئی نئی چیز دریافت کرے بلکہ وہ انہی کی مہیا کردہ معلومات سے استنباط اور استخراج کے ذریعے نئی ایجادات یا نئی معلومات فراہم کرتی ہے۔ لیکن اس کا دائرۂ کار حواس خمسہ کی طرح عالم محسوس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ حواس خمسہ کا کام مزدوروں جیسا ہے اور عقل کا کام معمار جیسا۔ جس طرح مزدور کسی بھی عمارت کیلئے میٹریل فراہم کرتے ہیں اور معمار اس میٹیریل سے ایک عمارت بنا کر کھڑی کر دیتا ہے' جس سے مزدور بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ اسی طرح عقل بھی حواس خمسہ کے مہیا کردہ میٹریل یعنی معلومات سے استنباط اور استخراج کے ذریعے' نئی چیزیں وجود میں لاتی ہے' جس سے حواس خمسہ بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں میں ایسا گہرا رشتہ ہے کہ عقل کی دریافت کردہ کوئی چیز' حواس خمسہ کی مہیا کردہ معلومات سے غیر متعلق نہیں ہوسکتی۔ یہ ممکن نہیں کہ حواس خمسہ کسی اور طرح کی معلومات مہیا کریں اور عقل بالکل ایک نئی دنیا سامنے لا رکھے بلکہ اسی طرح' جس طرح مزدور جیسا میٹریل فراہم کرتے ہیں' معمار ویسی ہی عمارت بناتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ مزدور تو کچی اینٹیں' روڑے اور گارا فراہم کریں اور معمار تاج محل بنا کر کھڑا کر دے۔ یہی حال عقل اور حواس خمسہ کا ہے چونکہ انسان کے پاس یہی دونوں علم کے ذرائع ہیں۔ اس لئے جب کبھی اسے ایسی چیز سے واسطہ پڑتا ہے' جس کا تعلق عالم محسوس سے نہ ہو تو اس کا علم بے بس ہو کر اپنی بے بسی کے اعتراف کی تصویر بنا کھڑا رہ جاتا ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر اللہ کے وجود کا مسئلہ ہے کہ کیا واقعی پروردگار کا وجود ہے یا نہیں۔ چنانچہ جب ہم ان دونوں ذرائع سے اس سلسلے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہماری کوئی مدد نہیں کرتے کیونکہ ان دونوں کا تعلق عالم محسوس سے ہے اور اللہ تعالیٰ جسم سے پاک ذات ہے' ایک لامحدود ذات ہے جبکہ حواس اور عقل محدود ہیں۔ اس لئے ہم لاکھ کوشش کریں' لامحدود ذات کو اپنے محدود دائرے میں لانے سے عاجز ہیں۔ جس طرح ایک حوض کا پانی گلاس میں نہیں ڈالا جاسکتا اور ایک دریا کو حوض میں بند نہیں کیا جاسکتا حالانکہ یہ دونوں محدود ہیں۔ پھر اللہ کی ذات جو کہ غیر محدود ہے' اسے عقل کے تنگ دامن میں کس طرح سمیٹا جاسکتا ہے۔ اکبر مرحوم نے ٹھیک کہا

جو ذہن میں گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

مشکل یہ ہے کہ پروردگار کے وجود پر یقین لانا عقیدۂ توحید کی پہلی کڑی ہے اور عقیدۂ توحید پورے دین کی بنیاد ہے اور ہمارے دونوں علمی ذرائع' اس گتھی کو سلجھانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر رہے تو آخر اس مشکل کو حل کیسے کیا جائے؟ چنانچہ اسی گتھی کو سلجھانے کیلئے اللہ کے پیغمبر آئے' ان پر اللہ کی کتابیں اتریں اور اس آیت کریمہ نے بھی اسی گتھی کو سلجھانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے علم و معرفت کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے' وہ یہ کہ اللہ کو جاننے کا طریقہ یہ ہرگز نہیں کہ اسے حواس اور عقل کی مدد سے جانا جائے بلکہ اس کے جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی صفات کی مدد سے' اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ پروردگار کی معرفت تو ایک مشکل بات سہی' لیکن جن لوگوں کو ہم علم و معرفت کے حوالے سے' اخلاق کی بلندی کے حوالے سے' کارہائے نمایاں کے حوالے سے' انکشاف اور اکتشاف کے حوالے سے اور ایجاد و اختراع کے حوالے سے عظمت کا مینار سمجھتے ہیں' غور کرو! ان کو جاننے کا طریقہ کیا ہے؟ کیا کسی بڑے آدمی کو دیکھنے سے' اس کی حقیقی عظمت نظر آجاتی ہے؟ کیا کسی موجد کو دیکھنے سے' اس کی قوت ایجاد دکھائی دے دیتی ہے؟ کیا کسی معمار کو دیکھنے سے' اس کا وہ جوہر جو پتھر کو آئینے کی شکل دیتا ہے' نظر آجاتا ہے؟ کیا اگر تمہارے سامنے بقراط اور سقراط اور افلاطون کو لا کر کھڑا کر دیا جائے یا ارسطو مجسم شکل میں تمہارے سامنے آجائے یا لقمان کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو کیا وہ جوہر جس کی وجہ سے

Marfat.com

دنیا میں ان کا نام ہے' وہ تمہاری آنکھوں کے راستے سے تمہارے علم کا حصہ بن جائے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ سارے عام انسانوں جیسے' انسان تھے۔ ان کو دیکھو گے تو صرف ایک انسان کے سراپا کو دیکھو گے۔ ان کی حقیقت عظمت اور حقیقی معرفت کو کبھی نہ پا سکو گے کیونکہ ان کو جاننے کا صحیح راستہ انہیں دیکھنا نہیں بلکہ ان کی صفات کو جاننا ہے۔ معمار اپنی تعمیر میں' شاعر اپنے شعر میں' ناظم اپنے نظم میں' ادیب اپنے ادب میں' خطیب اپنی خطابت میں' فلسفی اپنے فلسفہ میں اور مفکر اپنی فکر میں نظر آتا ہے۔ یہ معرفت کا وہ صحیح طریقہ ہے جو حقیقی معرفت کا سراغ دیتا ہے۔ بالکل اسی طریقہ سے تم اپنے خالق و مالک کو جان سکتے ہو۔ وہ خالق ہے تو اس کی صفتِ تخلیق میں اسے دیکھو' وہ مالک ہے تو اس کی ملک میں اسے جانو' وہ رازق ہے تو اس کی رزق رسانی میں اسے تلاش کرو' وہ رحیم ہے تو اس کے رحم و کرم کے آئینے میں اسے ڈھونڈو۔ اس طرح تمہیں ہوا کا ایک جھونکا' پانی کی ایک بوند' روشنی کی ایک کرن' درخت کے ایک ایک پتے کی ساخت اور پھول کی ایک ایک پنکھڑی' حتیٰ کہ خود انسان کی اپنی ذات' اس کی خبر دیتی ہوئی معلوم ہو گی۔

یہی وہ طریقہ ہے' جس سے فی الجملہ اللہ کی معرفت حاصل ہوتی اور اس کی ذات کا یقین پیدا ہوتا ہے اور اسی سے حواس وغیرہ کی پیدا کردہ کوتاہیوں اور گمراہیوں کا بہت حد تک ازالہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اسی طریقہ کو استعمال کرتے ہوئے جا بجا اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی قدرتوں کو ذکر کیا۔ ایک دانۂ گندم کو اگانے کیلئے' جس طرح پروردگار کی صفات کا ظہور ہوتا ہے اور اس کی قدرت کی نمود ہوتی ہے' قرآنِ کریم کی کئی آیتوں میں اس کا ذکر کیا گیا۔ اقبال نے انہی آیتوں کا ایک معنی خیز ترجمہ کیا' جس سے ہم بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ صفات کے ذریعے موصوف کو سمجھنا یہی اصلاً صحیح طریقہ ہے اور باقی تمام وضعی طریقے' وہ صفات سے خالی اور فانی مخلوقات کو سمجھنے میں تو معاون ہو سکتے ہیں' لیکن اس میں نہیں۔ اقبال کہتا ہے

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؎
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب

ان تمام سوالوں کا جواب اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ اللہ کریم کی ذات ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے پروردگار کو کیسے پہچانا؟ فرمایا: شہتوت کے پتے سے۔ پوچھنے والے نے حیران ہو کر کہا کیا مطلب؟ آپ نے فرمایا: شہتوت کا پتہ بکری کھاتی ہے تو مینگنی کر دیتی ہے' ریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو ریشم پیدا کرتا ہے اور ختن کا ہرن کھاتا ہے تو اس کی ناف سے کستوری نکلتی ہے۔ اگر شہتوت کے پتے میں بجائے خود کوئی صلاحیت ہوتی تو وہ ہر جگہ یا مینگنی بنتا یا ریشم بنتا اور یا کستوری۔ لیکن کسی جگہ ریشم' کسی جگہ کستوری اور کسی جگہ گوبر' معلوم ہوتا ہے' یہ پتے کی خصوصیت نہیں بلکہ کوئی اور ہاتھ ہے' جو یہ کام کر رہا ہے' وہ ہاتھ میرے اللہ کا ہاتھ ہے۔

"اللہ" وحدہٗ لاشریک ہے:

دوسری بات جو اس آیت کریمہ میں کہی گئی ہے' وہ اس کائنات کے خالق کے ساتھ مخلوق کو شریک ٹھہرانا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں شاید ہی کوئی قوم ایسی گزری ہو' جس نے اللہ کی ذات و صفات میں مخلوق کو شریک نہ ٹھہرایا ہو۔ ہمارے قریبی ہمسائے میں ہندو رہتے ہیں' جن کے

Marfat.com

بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے شرک کی کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے ہر اس قوت کے سامنے سر جھکایا' جس سے انہیں خوف محسوس ہوا یا نفع کی امید ہوئی۔ چنانچہ ہر وہ چٹان' جو ان کے راستے میں حائل ہوئی۔ ہر وہ دریا' جس کی طغیانی نے ان کے دل کو دہلایا اور ہر زہریلا جانور' جس سے انہیں خوف محسوس ہوا۔ انہوں نے اس کے سامنے سر جھکا دیا۔ اسی طرح دودھ دینے والی گائے' چمکتا سورج' درخشاں ستارے' سایہ دینے والے درخت' غرض جہاں انہیں نفع کی امید ہوئی' ان کے سامنے وہ عبودیت اور بندگی کے مراسم بجالائے اور پھر اس پر بس نہیں بلکہ مختلف قوموں نے مظاہر فطرت اور مظاہر قدرت کی پوجا کی اور بادشاہوں کو صرف اس لئے پوجا کہ وہ خدا کے اوتار ہیں اور بعض قوتوں کو دیوتا مان کر ان کی طرف عجیب وغریب صفات کا انتساب کیا اور عموماً بادشاہوں نے انہی دیوتاؤں کی طرف اپنا نسب منسوب کیا اور مذہبی گروہ' ان کی تائید کرتے رہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ فرعون ونمرود جیسے لوگ' ربوبیت کا دعویٰ کرتے رہے اور اسی سے شہہ پا کر لوگوں نے تقدس کا لبادہ اوڑھا اور قسیس وراہب بن کر اپنی پوجا کرانے لگے۔

غرضیکہ! جب ہم مختلف قوموں کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ عیسائی باوجود آسمانی مذہب رکھنے کے' تین خداؤں کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہود نے بھی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا ڈالا اور خود اپنے بارے میں عجیب وغریب تصورات اپنا لئے۔ مجوسیوں نے یزدان اور اہرمن کے نام سے دو خداؤں کی پوجا کی' ہندوؤں نے تینتیس کروڑ خدا بنا ڈالے اور مشرکین عرب نے تو ہر پتھر کو الوہیت کے منصب پر فائز کر دیا۔ بعض دفعہ تو اس شرک کے نتیجے میں ایسے ایسے لطیفے دیکھنے میں آتے ہیں کہ آدمی انسانی عقل کے بارے میں بدگمان ہونے لگتا ہے۔ مثلاً ہندو پانی کو جل دیوتا مانتے ہیں اور آگ کو بھی دیوتا قرار دے کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ لیکن لطیفے کی بات یہ ہے کہ ایک دیوتا کو چولہے کے اوپر رکھا جاتا ہے اور دوسرے دیوتا کو نیچے جلایا جاتا ہے۔ اوپر والا ابل کر نیچے والے دیوتا پر گرتا ہے تو دونوں بھسم ہو جاتے ہیں۔ ہر گھر میں روز یہ تماشہ ہوتا ہے' لیکن یہ شرک ختم ہونے میں نہیں آتا اور ان دیوتاؤں کے بارے میں کوئی بدگمان نہیں ہوتا۔ آخر ایسی انسانی عقل کے بارے میں بدگمانی نہ ہو تو اور کیا ہو۔ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان جب اکڑنے پہ آتا ہے تو اللہ کے سامنے اکڑ جاتا ہے اور جب جھکنے پہ آتا ہے تو پتھروں کے سامنے جھک جاتا ہے اور اپنے جیسے انسانوں کی پوجا کرنے لگتا ہے؟ قرآنِ کریم نے اسی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور تمام فکری قوتیں' جو انسانی زندگی میں روشنی کی طرح ہیں اور تمام جہالتیں' کج رویاں اور گمراہیاں اندھیروں کی مانند ہیں۔ انسانی ضرورت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو روشنی اگرچہ اس کی سب سے بڑی ضرورت ہے لیکن تاریکی بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ان تمام کا خالق صرف پروردگار عالم ہے اور اس کے مقابلے میں ہر چیز مخلوق ہے' چاہے وہ مظاہر قدرت وفطرت ہوں' چاہے وہ تخت پر فائز بادشاہ ہوں' چاہے تقدس کے دعویدار مذہبی پیشواؤں' چاہے اس کائنات کی کوئی بھی قوت ہو' وہ بہرحال مخلوق ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک مخلوق خالق کی ہمسر ہو سکتی ہے؟ اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو انسانو! تم نے اللہ کے ساتھ مخلوقات کو شریک کیوں کر رکھا ہے؟ اس پر اظہار تعجب کرتے ہوئے پروردگار فرماتا ہے:

﴿ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ O "پھر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے' اپنے رب کے ہمسر بناتے ہیں"﴾

ثُمَّ اظہار تعجب کیلئے بھی آتا ہے۔ اس پر پروردگار تعجب کا اظہار فرما رہے ہیں کہ ایسی بے عقلی کی بات شاید ہی کبھی کسی نے سوچی ہو کہ مخلوق کو خالق کے برابر لا کر بٹھا دیا جائے۔

اسی آیت میں اگر مزید غور کیا جائے تو اللہ کی وحدانیت پر بھی اس میں دلیل دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ نے جو بے شمار مخلوقات پیدا فرمائی ہیں۔ ان میں جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں ان میں تضاد اور تخالف نظر آتا ہے یعنی اپنی صفات میں وہ ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔ اسی

Marfat.com

آیت میں دیکھ لیجئے آسمان اور زمین بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ظلمت اور نور بالکل ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ لیکن اس کائنات کے مجموعی مقصد کیلئے' ان میں ایک حیرت انگیز سازگاری پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے کیلئے ناگزیر ہے اور اگر ان میں سے ایک کا وجود ختم کر دیا جائے تو دوسرے کی شخصیت نہ صرف کہ نامکمل رہ جائے بلکہ وہ اپنی اصل حیثیت ہی کھو بیٹھے۔ اس لئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس تضاد کے باوجود' ان میں جو باہمی توافق اور سازگاری پائی جاتی ہے کہ کائنات کے مجموعی مقصد کو بروئے کار لانے کیلئے سب ایک دوسرے کے مدد و معاون ہیں' مثلاً ایک دانہ گندم ہی کو دیکھ لیجئے۔ ایک کسان اس کو زمین میں دفن کر دیتا ہے۔ زمین کی قوت روئیدگی اس کو زمین سے باہر لاتی ہے اور سے پروان چڑھاتی ہے۔ آسمان سے پانی برستا ہے تو اس زمین کی آبیاری کا سامان ہوتا ہے۔ سورج کی کرنیں سمندر سے پانی کے ڈول بھر بھر کے کھینچتی ہیں اور ابر کی چادریں بچھاتی ہیں اور ہوا ان چادروں کو کھینچتے ہوئے کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ موسم کے تغیرات' پودوں کو پکانے اور لہکانے میں اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ سورج اور چاند' اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں۔ یہ سارے مل کر ایک دانہ گندم کی تیاری میں باوجود متضاد ہونے کے' جس طرح ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ اگر اس کائنات کا مالک ایک اللہ کے سوا کوئی اور بھی ہوتا تو یہ توافق تخالف کے اندر اور یہ سازگاری تضاد کے اندر کہاں سے وجود میں آتی بلکہ ان متضاد قوتوں کو مختلف خدا' اپنی طرف کھینچتے تو اس کے نتیجے میں زمین و آسمان تباہ و برباد ہو جاتے۔

مختصر یہ کہ اس آیت کریمہ میں انتہائی خوبصورتی سے عقیدۂ توحید کو بیان کیا گیا ہے' جس میں اللہ کے وجود کو ثابت کرنے کیساتھ ساتھ کس طرح عقلی انداز میں شرک کی تردید فرمائی گئی اور پھر کس قدر حکیمانہ طریقے سے اللہ کی وحدانیت پر استدلال فرمایا گیا ہے۔ دوسرا عقیدہ جس پر قرآن زیادہ زور دیتا ہے اور اللہ کے نبی ہمیشہ اسکی تاکید فرماتے رہے' وہ ہے ''عقیدہ آخرت اور انسان کی اصل حیثیت''۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اسی موضوع کو چھیڑا گیا ہے۔

آیت:۲ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝

''وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر ایک مدت ٹھہرائی اور مدت مقررہ اسی کے علم میں ہے پھر تعجب ہے کہ تم کج بحثیاں کرتے ہو۔

انسان کی حقیقت:

اس آیت کریمہ میں مختلف حقائق کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلی حقیقت یہ کہ اللہ جو ساری کائنات کا خالق ہے' وہی اے انسانو! تمہارا بھی خالق ہے۔ لیکن ذرا اس کے کمال تخلیق کو ملاحظہ کرو کہ اس نے تمہیں مٹی سے بنایا۔ جیسے باقی ارضی مخلوقات کا آغاز مٹی سے ہی ہوا' لیکن انسان کو بطورِ خاص اس بات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا فرما کر جن صلاحیتوں اور جن کمالات سے نوازا ہے' اگر کبھی تمہیں اس کا ادراک ہوتا تو تم کبھی اپنے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے۔ ذرا اپنی حالت پر غور کرو کہ تم شاید تمام مخلوقات کی نسبت زیادہ کمزور اور بے بس پیدا کئے گئے ہو۔ پیدائش کے فوراً بعد نہ تم کسی کو پہچان سکتے ہو' نہ تم اپنی غذا حاصل کر سکتے ہو۔ تم سراسر اپنے والدین کے رحم و کرم پر ہو۔ لیکن جب تم پروان چڑھ جاتے ہو اور جوان ہونے کے بعد علمی اور عملی زندگی میں مصروف ہو جاتے ہو اور پھر تمہاری صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقع ملتا ہے۔ تو ایسی ایسی حیرت انگیز ایجادات' تمہاری ذہنی قابلیت کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں کہ دیکھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ تم نے لوہے میں قوت پرواز پیدا کی ہے' تم نے تاریکیوں کو روشنی میں بدل دیا ہے' تم نے کمپیوٹر کی صورت میں انسانی دماغ کا متبادل تیار کر دیا ہے' تم نے زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ایجادات سے انسانی زندگی کو مالا مال کیا ہے' لیکن اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں' یہ کمال اس خالق کا ہے' جس نے تمہارے اندر یہ صلاحیتیں پیدا فرمائی ہیں۔ اب

Marfat.com

بجائے اس کے کہ تم اس کی شکر گزاری کرتے ہوئے اس کی معرفت پیدا کرو اور پھر اس کی خوشنودی کے حصول کو زندگی کا مقصد بناؤ تم ہو کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو

دوسری بات اس کے ساتھ ہی جس کی طرف متوجہ کیا گیا' وہ یہ ہے کہ انسان کی خودسری کا عالم یہ ہے کہ وہ اللہ کے سامنے اکڑ جاتا ہے اور اس کے احکام کو توڑتا ہے جبکہ اس کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ اگر انسان میں ذرا بھی خودشناسی کا جوہر ہوتا تو اس کی اپنی بے حقیقتی اس کی نگاہوں کے سامنے رہنی چاہئے تھی کہ مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق کو کیا یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اپنے اندر غرور اور نخوت پیدا کرے۔ اسے تو اپنی حقیقت کو محسوس کر کے سراپا انکسار ہونا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی خدارسیدہ درویش بے خیالی میں جا رہا تھا کہ سامنے سے آنے والے ایک متکبر آدمی سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس متکبر آدمی نے غصے میں لال پیلا ہو کر کہا کہ تمہیں کچھ معلوم ہے' میں کون ہوں' تم اندھے ہو' تمہیں معلوم نہیں کس سے ٹکرا رہے ہو؟ اس درویش نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ جی ہاں! میں جانتا ہوں' آپ کون ہیں اس نے کہا کہ تم کیا جانتے ہو؟ درویش نے کہا: جی میں یہ جانتا ہوں کہ آپ کی تخلیق ایک گندے پانی سے ہوئی' پھر جب تک آپ ماں کے پیٹ میں رہے' گندہ خون آپ کی غذا رہا' پھر جب آپ دنیا میں تشریف لے آئے تو اس وقت سے لے کر آج تک آپ کا حال یہ ہے کہ آپ رسیلے پھلوں کو کھاتے ہیں' خوشبودار نعمتوں سے شادکام ہوتے ہیں اور نجانے کیسی کیسی نعمتیں آپ کی بھوک کی نذر ہوتی ہیں۔ لیکن پیٹ میں کچھ وقت گزرنے کے بعد یہی رنگارنگ نعمتیں سڑ کر تعفن دینے لگتی ہیں اور وہ دن دور نہیں' جب آپ کی موت آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دے گی تو گھر والے آپ کو ایک بے کار چیز سمجھ کر قبر میں چھوڑ آئیں گے اور پھر قبر میں آپ کے جسم کو حشرات الارض کھائیں گے' یہ ہے آپ کی زندگی کی حقیقت اور میں یہی جانتا ہوں۔ اگر آپ اس کے سوا کچھ اور ہیں تو وہ آپ فرما دیجئے۔

تیسری بات جو اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمائی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ تم خوب جانتے ہو کہ تمہیں مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ بھی تمہارا دعویٰ ہے کہ تم قبروں میں جانے کے بعد مٹی ہو جاؤ گے۔ لیکن اس سے جو تم نتیجہ نکالتے ہو' اس سے زیادہ بے وقوفی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم مٹی سے پیدا تو ہوئے ہو' لیکن قبر میں جب دوبارہ مٹی ہو جاؤ گے تو تمہیں دوبارہ پیدا نہیں کیا جا سکتا؟ ذرا سوچو کہ اس سے زیادہ نادانی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر تمہیں پہلے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے تو آخر اب دوبارہ مٹی سے پیدا ہونے میں کیا رکاوٹ ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (الرعد:۵)

اور اگر تم تعجب کرنا چاہو تو نہایت ہی عجب ہے' ان کی یہ بات کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ نئی خلقت میں آئیں گے؟

ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہے:

چوتھی بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے' وہ یہ ہے ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ ''پھر ایک مدت مقرر کر دی گئی'' یعنی انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ جب تک چاہے' اس دنیا میں رہے بلکہ اس کی ایک مدت مقرر ہے' جو اسے اس دارالعمل میں عمل کرنے اور آخرت کی تیاری کیلئے دی گئی ہے۔ اصلاً جو اس کی منزل ہے' وہ آخرت ہے۔ یہاں تو ایک مختصر قیام ہے اور وہ بھی آخرت کی تیاری میں صرف ہو گا' جو مستقل زندگی ہے۔ توجہ یہ دلائی جا رہی ہے کہ باقی حقائق کی طرح موت بھی ایک اٹل حقیقت ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انسان اس بات کو جانتے ہوئے بھی اپنی موت سے کبھی نہیں ڈرتا اور کبھی بھول کر بھی اسے یہ خیال نہیں آتا کہ میں تو یہاں ایک خاص پیریڈ کیلئے بھیجا گیا ہوں' جیسے ہی یہ گزرے گا' مجھے واپس بلا لیا جائے گا۔ پھر اس گزرے ہوئے پیریڈ کا وہاں جا کر حساب بھی دینا ہے' آخر میں نے اس کی کیا تیاری کی ہے؟ مزید اس بات کی طرف توجہ دلائی جا رہی

Marfat.com

ہے کہ اے مشرکینِ عرب! تمہیں قیامت آنے کا یقین پیدا نہیں ہوتا بلکہ تم اسے خلافِ عقل یا عقل سے مستبعد سمجھتے ہو لیکن تمہیں یہ سامنے کی بات کیوں دکھائی نہیں دیتی کہ روز تمہارے سامنے جنازے اٹھتے ہیں' قبریں بنتی ہیں' ایک موت کا ہمہ گیر قانون ہے' جس نے پوری انسانی آبادی کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے اور ہر فرد اپنی اپنی باری پر مرنے پر مجبور ہے' کسی کو بھی اس سے مجال انکار نہیں۔ لیکن اس سے جو نتیجہ قبول کرنا چاہئے' وہ نجانے تمہیں قبول کرنے میں کیوں عذر ہے کہ جب اس دنیا میں ایک ایک کر کے انسان مر رہا ہے تو آخر سب کا ایک ہی دن مرجانا' تمہارے لئے قابل قبول کیوں نہیں؟ اور یہ سب کا ایک دن مرنا' وہی ہے' جس کو اجل مسمیٰ کہا گیا اور اس کا علم کسی کو نہیں دیا گیا۔ اس کا آنا یقینی ہے' لیکن متعین وقت کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ وہ اجل مسمیٰ اللہ کے پاس ہے اور وہی تمہاری حقیقی منزل ہے۔ یہاں تمہیں اسی کی تیاری کرنی چاہئے کیونکہ وہاں تمہیں اسی کی عدالت سے واسطہ پڑے گا' وہ اس دن تم سے پوچھے گا کہ جن کو تم نے شریک بنا رکھا تھا' بتلاؤ وہ کہاں ہیں؟ انہیں بلاؤ تاکہ وہ تمہاری مدد کریں۔

قرآن میں اجلِ مسمیٰ کا مفہوم:

اجلِ مسمیٰ کا لفظ مختلف معنی میں قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ ایک تو اسی معنی میں جس کا ابھی ذکر ہوا۔ یعنی قیامت کے معنی میں۔ دوسرا اسکا معنی وہ مقررہ پیمانہ ہے' جو کسی قوم کے اخلاقی زوال کی اس آخری حد کی خبر دیتا ہے' جب قانون الٰہی حرکت میں آ کر اسکو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ پیمانہ افراد کی مدت حیات کیطرح نہیں ہے کہ کوئی نیک ہو یا بد' جو مدت حیات اس کیلئے مقرر ہے' اسکے ختم ہو جانے پر وہ لازم مرجاتا ہے۔ بلکہ یہ اخلاقی قوانین کے تابع ہے۔ جب تک کوئی قوم اپنے ایمان و کردار کو محفوظ رکھے گی' خدا اس کو قائم رکھے گا' یہاں تک کہ وہ اجلِ مسمیٰ آ جائے' جو اس پوری کائنات کیلئے اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ اس پیمانہ کے اخلاقی ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک قوم کا پیمانہ لبریز ہونے کی آخری حد تک پہنچ رہا ہو اور اس کی اجلِ مسمیٰ آئی کھڑی ہو' لیکن سوئی کے آخری نکتہ پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ قوم توبہ اور اصلاح کے ذریعہ سے اپنے زندہ رہنے کا حق بحال کر لے۔ گویا یہ قوموں کے عروج و زوال کا پیمانہ ہے اور انسانی تاریخ ہر دور میں اسکی شہادت دیتی ہے۔ ہمارے سامنے روس کے زوال کا سفر اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا اور چند سال پہلے کوئی ہوش مند اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح امریکہ اور بعض دوسرے ملکوں کو ان کی طاقت نے بدمست کر دیا ہے۔ پوری دنیا میں جس طرح انہوں نے ظلم کی رات تان رکھی ہے' اس کو دیکھتے ہوئے' یہ پیش گوئی کرنا کوئی مشکل نہیں کہ ایسی قومیں دیر تک عروج آشنا نہیں رہتیں۔

دینی جماعتوں کیلئے اجلِ مسمیٰ:

جس طرح قوموں کے عروج و زوال اور افراد کی حیات و ممات کے حوالے سے ایک اجلِ مسمیٰ ہے۔ اسی طرح خیر کی قوتوں اور غلبہ دین کے کام کرنے والوں کیلئے بھی ایک اجلِ مسمیٰ ہے۔ کیونکہ کوئی کام اچھا ہو یا برا' باقی مخلوقات اور اعمال کیلئے' اللہ نے جو قوانین مقرر کر رکھے ہیں' وہ ان سے باہر نہیں۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ اس نے جس طرح ہر قوم کیلئے ایک اجل مقرر کی ہے۔ اسی طرح اس نے ہر چیز اور ہر کام کیلئے' ایک اجل مقرر کی ہے۔ آپ چولہے پر ابلنے کیلئے پانی کی ہنڈیا چڑھاتے ہیں' اس کو گرم کرنے کیلئے نیچے آگ جلاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ پانی ابلنے میں نہیں آیا تو آپ بے صبرے ہونے لگتے ہیں اور بعض دفعہ آگ بجھا کر اٹھ جاتے ہیں۔ آپ کا یہ عمل قیامت تک بھی' ہنڈیا میں ابال نہیں آنے دے گا کیونکہ ہنڈیا کے ابلنے کیلئے ایک اجل' یعنی وقت مقرر ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اس پانی کو وہ مطلوبہ حرارت پہنچ جائے گی' جو اس کے ابلنے کیلئے ضروری ہے تو تب یہ پانی ابلے گا اور جب تک یہ حرارت اسے میسر نہیں آتی' وہ کبھی نہیں ابلے گا۔ چاہے آپ بے دلی سے کتنی ہی دفعہ ناتمام کوششیں کرتے رہیں۔ یہی حال دنیا میں

Marfat.com

خیر کی قوتوں کے نتیجہ خیز ہونے کا ہے کہ ان کی کامیابی کیلئے جتنی جدوجہد' جتنا اخلاص' جتنی سرفروشی اور جتنی قربانی کی ضرورت ہے' جب تک اس حد تک یہ ضرورت پوری نہیں کی جائے گی' اس وقت تک اس کے نتیجہ خیز ہونے کی اجل نہیں آئے گی۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ حدیبیہ میں' جہاں چودہ سو سے زیادہ مسلمان آنحضرت ﷺ کے ہم رکاب تھے' آپ کو اطلاع دی گئی کہ پانی بالکل ختم ہو گیا ہے۔ نہ پینے کو ہے اور نہ وضو کرنے کو۔ ڈھور ڈنگر پیاس کی وجہ سے بلک رہے ہیں اور سب مسلمان پریشان ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اس انصاری صحابی کو بلاؤ' جو میری ضرورت کیلئے پانی اپنے پاس رکھتا ہے۔ جب ان انصاری صحابی کو بلایا گیا تو معلوم ہوا کہ پانی ان کے پاس بھی ختم ہو چکا ہے۔ تب آپ نے ایک بڑا پیالہ منگوایا اور اپنا دست مبارک اس میں رکھا اور ان انصاری صحابی کو حکم دیا کہ اپنا مشکیزہ میرے ہاتھ پر الٹ دو۔ چنانچہ مشکیزہ الٹا گیا' اس میں سے چند قطرے پانی کے گرے۔ ان قطروں نے جیسے ہی حضور ﷺ کے ہاتھ کو مس کیا' پانچ فوارے ہاتھ سے پھوٹے' پیالہ پانی سے بھر گیا۔ آپ نے حکم دیا کہ اپنے اپنے برتن بھر لو۔ چنانچہ چودہ سو آدمیوں نے اپنی ضرورت کے مطابق پانی جمع کیا۔ لیکن پیالہ اس وقت تک ابلتا رہا جب تک حضور نے ہاتھ نہیں اٹھالیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فواروں کا ابلنا یقیناً آنحضرت ﷺ کا معجزہ تھا اور اللہ کی طرف سے تائید و نصرت۔ لیکن اس کیلئے یہ کیا ضروری تھا کہ مشکیزہ آپ کے ہاتھوں پر الٹا جاتا؟ اصل میں بتانا یہ مقصود تھا کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ کی طرف سے تمہیں تائید و نصرت سے نوازا جائے تو اس کا قانون یہ ہے کہ اپنے پاس موجود صلاحیتوں' توانائیوں اور سرفروشیوں کے آخری قطرے تک کو جب تک تم اللہ کے راستے میں نچوڑ نہیں دو گے' اس وقت تک اللہ کی طرف سے تائید و نصرت نہیں آئے گی۔

؎ بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ؕ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ
اور آسمان اور زمین میں وہی (ایک) خدا ہے۔ تمہاری پوشیدہ
جَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴿٣﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ
اور ظاہر سب باتیں جانتا ہے اور تم جو عمل کرتے ہو سب سے واقف ہے۔ اور خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی اُن
رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٤﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ
لوگوں کے پاس نہیں آتی مگر یہ اُس سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ جب اُن کے پاس حق آیا تو اُس کو بھی جُھٹلا دیا۔
فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٥﴾ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ
سو اُن کو اُن چیزوں کا جن سے یہ استہزاء کرتے ہیں عنقریب انجام معلوم ہو جائے گا۔ کیا اُنہوں نے نہیں

Marfat.com

أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن

دیکھا کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنی اُمتوں کو ہلاک کر دیا جن کے پاؤں ملک میں ایسے جما دیئے تھے کہ تمہارے

لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِن

پاؤں بھی ایسے نہیں جمائے اور اُن پر آسمان سے لگاتار مینہ برسایا اور نہریں بنا دیں جو اُن کے

تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا

(مکانوں کے) نیچے بہہ رہی تھیں پھر اُن کو اُن کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا۔ اور اُن کے بعد اور اُمتیں پیدا کر

آخَرِينَ ﴿٦﴾ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ

دیں اور اگر ہم تم پر کاغذوں پر لکھی ہوئی کتاب نازل کرتے اور یہ اُسے اپنے ہاتھوں سے بھی

لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧﴾ وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ

ٹٹول لیتے۔ تو جو کافر ہیں وہ یہی کہہ دیتے کہ یہ تو (صاف اور) صریح جادو ہے ف۱ اور کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر)

عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ﴿٨﴾ وَ

پر فرشتہ کیوں نازل نہ ہوا (جو ان کی تصدیق کرتا) اگر ہم فرشتہ نازل کرتے تو کام ہی فیصل ہو جاتا پھر انہیں (مطلق) مہلت

لَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ﴿٩﴾ وَ

نہ دی جاتی ف۲ نیز اگر ہم کسی فرشتے کو بھیجتے تو اُسے مرد کی صورت میں بھیجتے اور جو شبہ (اب) کرتے ہیں اُسی شبہ میں اُنہیں

لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا

پھر ڈال دیتے۔ اور تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ تمسخر ہوتے رہے ہیں سو جو لوگ اُن میں سے تمسخر کیا کرتے

كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١٠﴾ ع

تھے اُن کو تمسخر کی سزا نے آ گھیرا

Marfat.com

آیات کا مرکزی مضمون:

سورۃ انعام کی پہلی دو آیتوں میں توحید اور آخرت پر جو مضبوط دلائل دیئے گئے اس کے بعد کسی اشتباہ کی گنجائش رہتی ہے نہ انکار کی۔ اس لئے کہ اہل دانش کیلئے بھی اس میں غور وفکر کا پورا سامان فراہم کر دیا گیا ہے اور عام لوگوں کیلئے خود ان کے مسلمات کو دلیل بنا کر اس کے لازمی نتائج کو ان کے سامنے واضح کر دیا گیا ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے ضدی اور متعصب طبیعتیں بجائے عقل ودانش کی بات ماننے کے اپنے تعصبات کی اس حد تک اسیر ہوتی ہیں کہ جلدی کوئی بات ان کے دل ودماغ میں اترنے نہیں پاتی۔ جب وہ دلائل کی دنیا میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتی ہیں تو قسم قسم کے شبہات کا اظہار کر کے اپنے تعصبات کو پختہ کرنے اور صحیح بات کی قبولیت کے سامنے دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہاں بھی مشرکینِ مکہ ایسی ہی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ توحید کے دلائل کا رد تو نہیں کر سکے اور نہ آخرت کا جواب دینا ان کیلئے ممکن رہا۔ لیکن دونوں حوالوں سے انہوں نے اپنے اشتباہات کا ذکر کیا ہے اور اپنے تئیں انہوں نے یہ سمجھا کہ ایسے اشتباہات کی موجودگی میں ہم اللہ کی وحدانیت اور قیامت کے وقوع پذیر ہونے کو کیسے مان سکتے ہیں۔ چنانچہ دونوں حوالوں سے جو انہوں نے اعتراضات اور اشتباہات پیش کئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے پروردگار عالم کو بھی دنیوی بادشاہوں پر قیاس کیا اور یہ خیال کیا کہ جس طرح دنیا کا کوئی بادشاہ مرکز سے دور دراز علاقوں میں خود آ جا نہیں سکتا اور براہ راست ان علاقوں کی نگرانی کرنا اور وہاں کے انتظامات کی دیکھ بھال کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس لئے تمام بادشاہوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دور دراز علاقوں میں اپنے صوبیدار مقرر کرتے ہیں یا اپنے نمائندے بھیج کر ان علاقوں کے انتظامی معاملات کو چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بھی ایسی ہی حدود میں محدود رہ کر کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ آسمانوں اور زمین کے درمیان بے حد وحساب فاصلہ ہے وہ چونکہ آسمانوں پر مقیم ہے اس لئے کیسے ممکن ہے کہ اپنے مرکز سے نہایت دور فاصلے پر واقع اس زمین کے کرہ کی اور اس پر بسنے والی انسانی مخلوق کی وہ خود نگرانی کر سکے ان کی ضروریات کا خیال کر سکے اور تمام ضروری معاملات کو نبٹا سکے؟ یقیناً اس نے بھی زمین کے انتظامات چلانے کیلئے اپنے کچھ نمائندے مقرر کر رکھے ہیں جن کو اس نے کچھ اختیارات سونپ رکھے ہیں۔ چنانچہ کوئی ان میں لوگوں کے رزق کا سامان کر رہا ہے کوئی اولاد عطا کرنے پر لگا ہوا ہے کوئی مصیبتوں کو دور کرتا ہے کوئی بارشیں برساتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ اللہ کے ان کارندوں یا نمائندوں کو ہم براہ راست خوش کرنے کی کوشش کریں ان کا ذکر کریں ان کی پوجا پاٹ کریں ان کے نام پر قربانیاں دیں ان کے سامنے دست دعا پھیلائیں اور اس میں شرک کی ایسی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ اللہ ہی کے مقرر کردہ لوگ ہیں۔ بڑی ذات وہی ہے اور اسی بڑی ذات نے ان کو اپنے اختیارات میں شریک کر رکھا ہے انہی اشتباہات کے جوابات ان آیات میں دیئے گئے ہیں۔

آیت ۳: وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ O

اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی وہ تمہارے خفیہ اور علانیہ کو جانتا ہے اور جو کمائی تم کر رہے ہو اسے بھی جانتا ہے۔

زمین وآسمان کا صرف ایک ''الٰہ'' ہے:

وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ ؕ ''اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی''۔ یعنی تم غلط سمجھے ہو کہ آسمان پر اس کی

Marfat.com

حکمرانی ہے اور زمین پر کسی اور کی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح وہ آسمانوں پر پورے جاہ وجلال اور مکمل اختیارات کے ساتھ حکمرانی کر رہا ہے' اسی طرح زمین پر بھی کر رہا ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ

وہی ہے جو آسمان کا بھی معبود ہے اور وہی زمین کا بھی معبود ہے اور وہ علیم وحکیم ہے۔ (الزخرف:۸۴)

آیت کے اس ٹکڑے میں صرف یہی بات نہیں کہ ان کے اس فاسد خیال کا ازالہ کیا گیا ہے کہ زمین اور آسمان دونوں کا الہ ایک نہیں ہوسکتا کیونکہ اتنے دور دراز فاصلوں کا وہ انتظام نہیں چلاسکتا بلکہ اس میں دونوں کا الہ اور معبود ہونے کی دلیل بھی دی گئی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اگر آسمان اور زمین دونوں کا خدا ایک نہ ہوتا بلکہ آسمان کا خدا اور ہوتا اور زمین کا اور تو یہ دونوں کبھی قائم نہ رہ سکتے کیونکہ زمین وآسمان میں کائنات کے مجموعی مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے جو ہم آہنگی سازگاری اور موافقت رکھی گئی ہے' وہ ان دونوں میں ایک خدا کے وجود اور ایک ہی خدا کے ارادہ کے کارفرما ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اگر دونوں کے خدا جدا جدا ہوتے تو دو ہی صورتیں ممکن تھیں یا تو دونوں برابر کے اختیارات رکھتے مگر برابر کے اختیارات رکھنے والوں میں یہ کبھی ممکن نہیں ہوتا کہ ان میں تصادم نہ ہو۔ زمین اگر قوت روئیدگی کو بروئے کار لانا چاہتی تو آسمان اپنے اثرات کو روک لیتا اور آسمان اگر کرم فرمائی کرتا تو زمین اس کے سامنے اپنا سینہ بند کر لیتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اس زمین پر گھاس کا ایک تنکا نہ اگتا۔ زمین کی ضرورت ہوتی کہ آسمان سے پانی برسے اور آسمان کا خدا اس پر آگ برساتا۔ اہل زمین روشنی اور دھوپ کے محتاج ہوتے اور آسمان میں چمکنے والا سورج اپنی روشنی روک لیتا۔ غرضیکہ ایک دوسرے سے عدم تعاون اور دونوں جگہ مختلف ارادوں کی کارفرمائی اور اسکے نتیجے میں ہونے والا یقینی تصادم' دونوں کو تباہ کر دیتا۔ اسلئے قرآن کریم نے ایک جگہ کہا کہ اگر زمین وآسمان میں دو "الہ" ہوتے تو زمین وآسمان تباہ ہوجاتے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ ایک خدا زیادہ طاقت کا مالک ہوتا اور دوسرا خدا اس کے سامنے کمزور ہوتا۔ وہ جب اپنی قدرت کا اظہار کرتا تو کمزور خدا اسکے سامنے دبکا رہتا حالانکہ اہل علم یہ بات جانتے ہیں کہ خدا تو ہوتا ہی وہ ہے' جو سب سے عظیم' سب سے اکبر اور تمام قدرتوں کا مالک ہوتا ہے۔ اس لئے دو خداؤں میں سے چھوٹا خدا اور سب کچھ ہوسکتا ہے' لیکن خدا نہیں ہوسکتا۔ مختصر یہ کہ آسمان وزمین کا قیام وبقاء اور ان دونوں کے نظم ونسق کا میابی اور سازگاری سے رواں دواں رہنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آسمان وزمین کا خدا' معبود اور الہ ایک ہی ہے۔

مشرکین کے آخرت پر اشتباہات اور ان کا جواب:

دوسرا اشتباہ ان کا آخرت کے بارے میں تھا۔ انہیں اولاً تو آخرت کے وقوع پذیر ہونے کا یقین نہیں تھا۔ وہ بار بار ایک سیدھی سی بات کہتے تھے کہ ہم جب مر کے قبروں میں چلے جائیں گے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمین ہماری لاشوں کو کھا جائے گی اور ہم مٹی میں تبدیل ہوجائیں گے اور ہمارے جسم کا کوئی حصہ باقی نہیں رہے گا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمیں دوبارہ زندہ کر دیا جائے؟

سابقہ آیت کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا کہ تمہیں یہ بات تسلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا' تمہارے جسم کے تمام اجزاء مٹی سے تیار ہوئے ہیں اور مٹی ہی سے تمہیں غذا مہیا کی جارہی ہے تو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ پہلی دفعہ تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں مٹی سے پیدا کر دیا' اب جب دوبارہ تم مٹی ہوجاؤ گے تو پھر وہ تمہیں مٹی سے کیوں زندہ نہیں کرسکتا؟ لیکن اس آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں اسی آخرت کے حوالے سے ان کے ایک اور اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ چلئے یہ بات مان بھی لی جائے کہ ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے تو یہ بات کیسے باور کی جاسکتی ہے کہ ہمارے

Marfat.com

ایک ایک عمل کا وہاں ریکارڈ موجود ہوگا اور زندگی میں تمام کیے ہوئے کاموں کا وہاں ہم سے حساب لیا جائے گا۔ یہ تو سراسر انہونی باتیں ہیں' جنہیں عقل قبول نہیں کرسکتی۔ مزید وہ یہ بات بھی کہتے تھے کہ چلئے ہم بدرجۂ آخر یہ بھی مان لیتے ہیں کہ حساب کتاب ہوگا۔ لیکن ہمیں اس کا کیا ڈر کیونکہ اگر حساب کتاب کے نتیجے میں ہمیں وہاں کوئی مشکل پیش آئی بھی تو آخر جن قوتوں کو ہم اپنی زندگی میں پوجتے رہے ہیں ہمیشہ ان کے نام کی ہم نے قربانیاں دی ہیں اور زندگی بھر انہیں خوش کرنے کی کوشش کی ہے تو کیا یہ اللہ کی شریک قوتیں وہاں ہمارے کسی کام نہیں آئیں گی؟ وہ اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں پکڑا بھی تو یہ ہمارے شرکاء ہمیں اللہ کی گرفت سے چھڑا لیں گے۔ مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ بیٹیاں اپنے باپوں سے ضد کر کے ہر بات منوا لیا کرتی ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ بیٹیاں اپنے اللہ سے ہمیں نہ چھڑا سکیں؟ ان کے اس طرح کے بے سروپا اشتباہات اور اعتراضات تھے' جن کا یہاں جواب دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ O

وہ تمہارے خفیہ اور اعلانیہ کو جانتا ہے اور جو کمائی تم کر رہے ہو اسے بھی جانتا ہے۔

اس میں ان کے دونوں اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے کہ اے مشرکین عرب! تم یہ سمجھتے ہو کہ اگر قیامت وقوع پذیر ہوئی بھی تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کا حساب کیسے لے گا؟ اسلئے کہ تم میں سے ایک ایک فرد کے اعمال کی تفصیل یقیناً اس کے علم میں نہیں ہوگی۔ اسے کیا خبر کہ تم تنہائیوں میں خفیہ طریقے سے کیا کرتے رہے ہو اور تمہاری زندگی کے معمولات کی تفصیلات کیا ہیں؟ تمہارے یہ تصورات سراسر غلط ہیں۔ تم نے اللہ تعالیٰ کو بھی مخلوق پر قیاس کرتے ہوئے ایک محدود علم کا مالک سمجھا ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو' انسانوں کی طرح اس کی رسائی بھی تمہاری تنہائیوں تک نہیں ہے۔ جیسے ایک انسان دوسرے انسان کے تمام معاملات سے آگاہ نہیں ہوسکتا' اسی طرح پروردگار بھی نہیں ہوسکتا حالانکہ اس کے علم کی وسعت' اس کی قدرت کی وسعت کی طرح بے پناہ ہے۔ وہ دنیا کی ہر چیز سے واقف ہے۔ وہ تو فرماتا ہے کہ صحرا کی وسعتوں میں کوئی پتہ نہیں گرتا' مگر وہ اسے جانتا ہے اور کوئی رطب و یابس ایسا نہیں جو اس کے علم کی وسعتوں سے باہر ہو۔ سمندر کی انتہائی تہہ میں اگر کوئی مچھلی حرکت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حرکت سے واقف ہے۔ انسانی اعمال تو دور کی بات' انسانی احساسات تک سے پروردگار آگاہ ہے اور پھر یہی نہیں کہ اس کے علم کی وسعتیں بے کنار ہیں بلکہ اس کی قدرتوں کا عالم یہ ہے کہ جب وہ حساب کتاب لے گا تو وہاں کوئی آدمی جھوٹ بول کر یا سخن سازی سے کام لے کر بچ نہیں سکے گا' وہاں منہ پر مہر لگا دی جائے گی' ہر آدمی کے ہاتھ اللہ سے باتیں کریں گے اور اس کے پاؤں اس کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ ایسی صورت حال میں یہ بدگمانی کرنا کہ پروردگار ہمارا حساب کتاب نہیں لے سکے گا' سراسر جہالت اور نادانی کی بات ہے۔ دوسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی جارہی ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ جن قوتوں کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے' وہ تمہیں اللہ کی گرفت اور اس کے عذاب سے بچا لیں گی۔ وہ اللہ سے سفارش کریں گی اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کے سامنے مجبور ہو کر تمہاری ساری نافرمانیوں کو بخش دے گا۔ اس لئے تم زندگی میں ہر طرح کے عمل کرنے کیلئے آزاد ہو کیونکہ وہاں کی دار و گیر سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اس آیت میں یہ تصور دیا جارہا ہے کہ اندازہ کرو' اگر شفاعت اور سفارش کے اس لایعنی تصور کو قبول کر لیا جائے تو پھر آخرت کے وقوع پذیر ہونے کا فائدہ ہی کیا ہے اور اللہ تعالیٰ بار بار ہمیں قیامت سے ڈرنے اور اس دن کی تیاری کرنے کا جو حکم دیتا ہے اس کا کیا حاصل بلکہ دنیا کے دار العمل ہونے کا تصور ہی غلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس طالب علم کو یہ معلوم ہو کہ میں کورس کی کتاب کو چاہے ہاتھ لگاؤں یا نہ لگاؤں' مجھے صرف یہ تکلف کرنا ہے کہ امتحان کے دنوں میں کمرۂ امتحان میں بیٹھوں اور کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر چلا آؤں' میرے والد کی سفارش ایسی زوردار ہے کہ ایگزامینرز کو مجھے پاس کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس تصور کی

109512

Marfat.com

موجودگی میں اندازہ فرمائیے کہ یہ طالب علم پڑھنے کی زحمت کیوں کرے گا۔ پھر اس طالب علم کیلئے آخر اس امتحان کا تصور کیا معنی رکھتا ہے تو کیا اللہ کے بارے میں بھی ہم ایسا ہی تصور رکھتے ہیں کہ اس نے زمین پر انسانوں کو پیدا کیا' ان کی طرف پیغمبر بھیجے' کتابیں اتاریں' احکام شریعت کا انہیں پابند کیا اور بار بار یہ بتایا کہ دنیا میں جیسی زندگی گزارو گے قیامت کے دن اسی کا پھل کاٹو گے۔ حسنِ عمل کے نتیجے میں جنت کے مستحق ٹھہرو گے اور بدعملی اور نافرمانی کی صورت میں جہنم کا ہولناک انجام تمہارا مقدر ہوگا۔ اگر سفارش کا یہ تصور قبول کر لیا جائے تو یہ سارے اسلامی تصورات ایک کھیل بن کے رہ جاتے ہیں اور اگر اس میں مزید ایک بات کا اضافہ کر لیا جائے' جو سفارش کے اس بیہودہ تصور کے حاملین میں ہمیشہ موجود رہتا ہے تو پھر آخرت کا تصور اور بھی مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ وہ تصور یہ ہے کہ ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو پکڑتا ہے تو عموماً فرشتوں کی غیر مصدقہ یا نامکمل اطلاعات پر پکڑتا ہے اور ان کے سفارشی دنیا کے سفارشیوں کی طرح پروردگار سے جا کر یہ کہیں گے کہ یا اللہ! آپ نے جس آدمی کو پکڑا ہے' آپ نہیں جانتے یہ شخص کیسا ہے۔ آپ کو غلط اطلاعات پہنچائی گئیں ہیں اور آپ نے ذاتی طور پر علم نہ ہونے کی وجہ سے ان اطلاعات پر اعتماد کرتے ہوئے' اس شخص کو سزا دینے کا حکم دے دیا ہے۔ ہم آپ کے بھروسے کے لوگ ہیں اور ہم اس شخص کو جانتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے دامن گرفتہ لوگوں میں سے ہے۔ ہم اپنے ذاتی علم کی بناء پر سفارش کرتے ہیں کہ یہ شخص بہت اچھا ہے۔ آپ کو پہنچنے والی اطلاعات جھوٹی یا نامکمل ہیں۔ اس لئے ہماری سفارش پر آپ اس کو چھوڑ دیں۔ اندازہ فرمائیے کہ جو آدمی اللہ کے علم کے بارے میں یہ تصور رکھتا ہو اور اس لئے سفارش کو ضروری سمجھتا ہو' نجانے وہ اللہ کریم کے بارے میں کیا تصورات رکھتا ہے۔ ان سب کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے وہ کام بھی جانتا ہے' جو تم نے اعلانیہ انجام دیئے اور تمہارے ان اعمال سے بھی واقف ہے' جو تم نے تنہائیوں میں خفیہ طریقے سے تمام نگاہوں سے چھپا کر کیے۔ تمہارا کوئی سفارشی اس کے علم سے بڑھ کر تمہارے اعمال سے واقف نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے مکمل واقفیت اور اپنی مکمل قدرت کی بناء پر جو تمہیں سزا دے گا' وہ جس طرح حقیقت اور عدل پر مبنی ہوگی' اسی طرح وہ مکمل علم پر بھی مبنی ہو گی کیونکہ وہ جانتا ہے جو کچھ تم زندگی میں کرتے رہے ہو۔

شفاعت کی شرائط:

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے تاکہ کسی طرح کی غلط فہمی نہ ہو کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل اور اپنے نیک بندوں کو شفاعت کا حق عطا کرے گا اور یہ لوگ لوگوں کی شفاعت کریں گے' لیکن اس کی چند شرائط ہیں۔

1- شفاعت اس کی ہوگی جس' کا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ کافر کی سفارش کوئی پیغمبر اور رسول' نہ دنیا میں کر سکتا ہے' نہ آخرت میں کر سکے گا۔

2- شفاعت اس کیلئے ہوگی' جس کے اعمال میں قانونِ نجات کے حوالے سے کچھ کمی رہ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو یہ عزت بخشیں گے کہ وہ ایسے آدمی کی سفارش کریں اور اس کی نجات میں جو کچھ کمی رہ گئی ہے' اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائیں۔

3- یہ جلیل القدر شخصیات بھی اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی مرضی سے شفاعت نہیں کر سکیں گی بلکہ اس کی سفارش کریں گے جس کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت مرحمت ہوگی۔ قرآنِ کریم نے کئی جگہ شفاعت کا ذکر فرمایا ہے اور ہر جگہ اس کے ساتھ بِـاِذْنِـہٖ کی قید لگائی ہے یعنی جو بھی سفارش کرے گا' اس (اللہ) کی اجازت سے کرے گا' اپنی مرضی سے نہیں۔

سب سے زیادہ شفاعت کا حق رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے۔ آپ شفاعت کبریٰ کے منصب پر فائز کیے جائیں گے اور گناہ گار بندوں کی بہت بڑی تعداد میں سفارش فرمائیں گے۔ احادیث میں اس کا جابجا ہمیں ذکر ملتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایسی احادیث بھی کم نہیں ہیں' جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ

Marfat.com

جب بھی کسی صحابی نے آنحضرت ﷺ سے شفاعت کی درخواست فرمائی تو آپ نے فرمایا کہ

''اپنے اچھے اعمال سے میری مدد کرنا' تا کہ میں تمہاری شفاعت کرسکوں''۔

اگلی آیات میں' توحید اور آخرت کے حوالے سے' ان کے اشتباہات کا جواب دینے کے بعد' تعجب کے اظہار کے طور پر فرمایا جارہا ہے۔

آیت: ۴-۵ وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ O فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ط فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ O ''اور نہیں آتی ان کے پاس' ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی' مگر یہ اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔ سو انہوں نے واضح حق کو بھی جھٹلا دیا' جبکہ وہ ان کے پاس آیا تو عنقریب اس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی' جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں''۔

حق مبین ''حضور ﷺ اور قرآنِ پاک:

توحید و قیامت پر اس قدر ٹھوس دلائل اور ان کے تمام اعتراضات کا جواب مل جانے کے بعد' ان باتوں کی تکذیب کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن حیرت ہے کہ یہ لوگ پھر بھی اللہ کی آیات سے اعراض کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے تعصبات میں اس قدر پختہ ہو چکے ہیں کہ حق کی کوئی بات اور حق کی تائید میں کوئی دلیل' ان کے دل و دماغ پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے رویے کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد ایک سے ایک بڑا معجزہ' انہوں نے دیکھا اور ایک سے ایک بڑھ کر نشانی' ان کے سامنے آئی۔ مگر ان کے اعراض میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ان کا آنحضرت ﷺ اور اسلام کے بارے میں جو رویہ سالہا سال پہلے تھا' وہ آج بھی اسی پر قائم ہیں اور حق سے اعراض کی ان کی انتہاء یہ ہے کہ کھلا اور واضح حق ان کے سامنے آیا تو اس کو ماننے سے انہوں نے انکار کر دیا' اس سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ اسے حق سے تعبیر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ اس کے من جانب اللہ ہونے میں اہلِ مکہ کو کم از کم کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس کے بارے میں چند ایسے واضح دلائل ہیں کہ جن کا انکار کرنا اہلِ مکہ کیلئے ممکن نہیں۔ مثلاً سب سے پہلی یہ بات کہ یہ قرآنِ کریم' جس ذات عزیز پر نازل ہوا' وہ کہیں باہر سے تشریف نہیں لائے بلکہ مکہ میں انہی میں سے ایک معزز خاندان قریش اور بنو ہاشم میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان سے مکہ والے واقف تھے' پھر ان کا بچپن اور لڑکپن ان کے سامنے گزرا۔ ایک بے عیب جوانی جس کی نظیر شاید دنیائے عرب میں ممکن نہ ہو' اس کے ایک ایک لمحے سے اہلِ مکہ واقف تھے۔ جب وہ عملی زندگی میں داخل ہوا تو ان کی شب و روز کامیابیاں' حتیٰ کہ ان کے بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات اور معاملات' اس کا کوئی حصہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ایک معزز خاندان میں ان کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد ایک عائلی زندگی' انہی کی ہمسائیگی میں انہوں نے گزاری۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ عرب کی زندگی سے مختلف زندگی سے وہ کبھی واقف نہیں رہے۔ انہوں نے دینیات کے حوالے سے کبھی کسی سے کچھ نہیں سیکھا۔ تجارت کے سلسلے میں باہر کے چند سفر ان کو ضرور پیش آئے' اس کے علاوہ انہوں نے کبھی کسی ملک میں جا کر نہیں دیکھا۔ انہی کی طرح وہ اپنی ذات میں بھی پڑھے لکھے نہ تھے۔ وہ حروف تہجی کی شناخت نہ رکھتے تھے' اپنا نام لکھنا نہیں جانتے تھے' حتیٰ کہ لکھے ہوئے کو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ ایسا پاکیزہ شخص' جس کی زندگی میں کوئی تصنع نہیں' جو انہی کی طرح علمی زندگی سے بالکل سادہ اور علمی تجربات سے یکسر کورا' اسی حالت میں ان کے سامنے اس نے چالیس سالہ زندگی گزاری۔ یہ اسے ہمیشہ صادق اور امین کہہ کر پکارتے رہے۔ ان چالیس سالوں میں کبھی ایک دفعہ بھی جھوٹ بولنا اس سے ثابت نہیں بلکہ جب اس نے پوری قوم سے پوچھا کہ بتاؤ تمہیں کبھی مجھ سے جھوٹ کا تجربہ ہوا ہے تو سب نے بیک زبان کہا کہ تو ہماری نگاہوں میں صادق اور امین ہے۔ چالیس سالہ زندگی گزارنے کے بعد اچانک وہ

Marfat.com

پاکیزہ شخص غارِ حرا سے اتر کر آتا ہے اور اس کی زبان مبارک سے ایک ایسے کلام پاک کا چشمہ ابلنے لگتا ہے کہ جس کی فصاحت و بلاغت‘ جس کی علمی سنجیدگی‘ جس کے خیالات کی بلندی‘ جس کے پیش کردہ نظام کی ہم آہنگی‘ یکا یک اپنے سننے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ وہ ایک ایسا کلام لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے‘ جس کے اسلوب پر مشتمل کلام چالیس سالوں میں کبھی کسی نے اس سے نہیں سنا۔ وہ قوموں کے بارے میں اور سابقہ مذاہب کے حوالے سے‘ وہ باتیں کہتا ہے‘ جس سے نہ وہ خود واقف تھا‘ نہ اس کی قوم واقف تھی۔ وہ معرفتِ حق سے لے کر کائنات اور انسان کے عرفان کے حوالے سے ایسی ایسی باتیں کہتا ہے‘ جس کا تصور بھی اس معاشرے اور اس ماحول میں ممکن نہیں اور پھر وہ بار بار اپنی قوم سے کہتا ہے کہ لوگو! جس نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہ بولا ہو‘ کیا وہ اللہ پر کبھی جھوٹ باندھنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ اور پھر جو کلام میں تمہارے سامنے اللہ کے حوالے سے پیش کر رہا ہوں‘ تم اگر اسے میرا کلام سمجھتے ہو تو میں تمہاری ہی طرح ایک عرب ہوں‘ تم اہل زبان ہو‘ تم اس جیسا کلام تیار کر کے دکھا دو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس جیسی پوری کتاب لے آؤ میں تو کہتا ہوں‘ اس جیسی دس سورتیں بلکہ ایک ہی سورۃ بنا کر دکھا دو۔ اتنا واضح اور حتمی چیلنج جو اس کتاب میں آج بھی موجود ہے‘ شاید ہی کسی صاحبِ کتاب نے اپنے مخاطبوں کے سامنے پیش کیا ہو۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کی قوم نے اسے اذیتیں پہنچائیں‘ دکھ دیئے‘ اس پر ایمان لانے والوں کیلئے زندگی اجیرن کر دی‘ حتیٰ کہ وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر بھی انہوں نے انہیں آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ مسلسل لڑائیوں تک نوبت پہنچی‘ اہلِ مکہ نے بار بار شکست کے زخم اٹھائے‘ مسلمانوں کو شہید کیا تو خود بھی اس راستے میں مرتے رہے اور اپنے بچوں کو قربان کراتے رہے‘ بالآخر اسی کشمکش میں مکہ سرنگوں ہو گیا۔ ان کی طاقت ٹوٹ گئی‘ اللہ نے بیشتر کو ایمان کی دولت سے نوازا‘ لیکن قرآن کا چیلنج اپنی جگہ باقی رہا۔

یہ دو بالکل سامنے کی دلیلیں ہیں‘ ایک ذات رسالت مآب ﷺ کی شخصیت اور دوسرا قرآنِ کریم کا معجز ہونا۔ ان دونوں حوالوں سے پروردگار ارشاد فرما رہے ہیں کہ اتنا واضح حق ان کے سامنے آیا‘ لیکن انہوں نے اتنے واضح حق سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ یہ برابر اس کا تمسخر اڑاتے رہے۔ جب اللہ کے پیغمبر‘ ان سے یہ کہتے کہ تم حق کے انکار کرنے سے باز آ جاؤ ورنہ ہو سکتا ہے پہلی قوموں کی طرح تم پر بھی عذاب کا کوڑا برسے‘ تو یہ لوگ بجائے ڈر کر راہ راست اختیار کرنے کے‘ اس کا مذاق اڑاتے بلکہ بار بار مطالبہ کرتے کہ جس عذاب سے ہمیں ڈرا رہے ہو‘ اسے لے کیوں نہیں آتے؟ جب کبھی آنحضرت ﷺ انہیں اسلام کے غلبۂ عمومی کے بارے میں آگاہ فرماتے کہ وہ وقت دور نہیں جب خود اس مکہ پر اسلام کا غلبہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ زمین کے بڑے حصے پر مسلمانوں کو خلافت عطا فرمائے گا۔ اسی زندگی میں ان کو ایسی عزت و سرفرازی اور خوشحالی سے نوازا جائے گا‘ جس کا آج تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس پر وہ مسلمانوں کی غربت کا مذاق اڑاتے کہ ماشاء اللہ یہ ہیں وہ لوگ جنہیں کل کو تمام دنیا کی امامت و قیادت ملنے والی ہے‘ آج ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے‘ نہ پہننے کو کپڑا اور خواب یہ دیکھ رہے ہیں قیصر و کسریٰ پر حکومت کرنے کے۔ انہی دنوں میں بعض دفعہ ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ حضور ﷺ نے ذاتی حیثیت میں بعض باتوں کی نشاندہی فرمائی‘ لیکن مشرکینِ عرب کسی بات کا اثر قبول کرنا تو دور کی بات ہے‘ اس کو سنجیدگی سے لینے کو بھی تیار نہ تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے کعبۃ اللہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے کعبۃ اللہ کا دروازہ کھولنے کو کہا۔ اس نے نہایت بدتمیزی سے انکار کر دیا۔ آپ نے اصرار فرمایا تو اس نے جھڑک دیا۔ تب آپ نے فرمایا کہ عثمان وہ کیسا وقت ہو گا‘ جب اللہ کے گھر کی چابی میرے پاس ہو گی‘ میں جسے چاہوں گا دوں گا؟ تو اس نے حیران ہو کر کہا کہ کیا اس وقت قریش ذلیل ہو گئے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں اس وقت قریش کی عزت میں اضافہ ہو گا۔ یہی وہ کامیابی کی خبریں ہیں‘ جو ہجرت کے بعد اسلام کے غلبۂ عمومی کی شکل میں تمام دنیا کے سامنے آنے والی تھیں اور اس آیت کریمہ کے آخری حصے میں اسی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے کہ آج تم جن کامیابیوں کو محض فرضی دعوے سمجھ کر تمسخر کا نشانہ بنا رہے ہو‘ وہ وقت دور نہیں جب وہ حقیقت بن کر تمہارے سامنے

Marfat.com

آئیں گے اور اسی طرح جس عذاب کو تم استہزاء میں اڑا رہے ہو وہ اگرچہ اجتماعی شکل میں تو نہیں آئے گا لیکن جزوی شکل میں ضرور اس کا اظہار ہوگا۔ چنانچہ جنگِ بدر اللہ کی طرف سے ان پر عذاب ہی کی ایک جزوی شکل تھی جس طرح تین سو تیرہ نہتے مسلمانوں سے ایک ہزار مکہ کے جنگجو سپاہیوں کو نہ صرف شکست سے دوچار ہونا پڑا بلکہ ان کی قیادت کی پہلی صف پوری کی پوری قتل ہوگئی اور دوسری صف تقریباً گرفتار ہوگئی اور پیچھے صرف وہ لوگ رہ گئے' جو صرف اپنے مقتولوں اور اپنے گرفتار شدگان کا مرثیہ کہہ سکتے تھے۔ پھر ان لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حیران کن طریقے سے ان کی گرفتاریاں ہوئیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے سرکٹ کے گرتے رہے جبکہ بعض مسلمانوں کے ہاتھوں میں تلواریں تک بھی نہ تھیں۔ خود بعض گرفتار ہونے والوں نے بعد میں بتایا کہ ہمیں جس نے گرفتار کیا' وہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا اور بعض لوگ جو قتل ہوئے ان کی لاشوں پر سیاہ نشان پڑے ہوئے تھے' جو اس بات کی علامت تھے کہ یہ کسی مسلمان کی ضرب سے قتل نہیں ہوئے بلکہ ان کے قاتل انسانوں کے علاوہ کوئی اور ہیں۔ بعد میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بعض فرشتوں نے ان کو گرفتار کیا اور بعض فرشتوں نے ان کی گردنوں پر ضربیں لگائیں۔ ظاہر ہے کہ جس جنگ میں فرشتے اپنا کردار ادا کریں' وہ ایک طرف اگر مسلمانوں کی اللہ کی طرف سے کھلی کھلی نصرت اور تائید ہے تو دوسری طرف غیر مسلموں کیلئے' وہ اللہ کا عذاب ہے۔ پھر یہ سلسلہ رکا نہیں' فتح مکہ تک یہ لوگ مسلسل اس طرح کے عذابوں اور سزاؤں سے دوچار ہوتے رہے۔ بعض دفعہ ان پر قحط کی صورت میں ایسا شدید عذاب آیا کہ تمام اہلِ مکہ بلبلا اٹھے اور ابوسفیان نے کافر ہوتے ہوئے بھی آنحضرت ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپ کی قوم بھوکی مر رہی ہے۔ چنانچہ آپ نے ان کی مدد کیلئے مدینہ منورہ سے غلے کے اونٹ لاد کے بھیجے اور عذاب ٹلنے کی دعا بھی فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی رسول اپنی امت کی عداوت سے ہجرت کر جاتا ہے تو عموماً اس قوم کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا بلکہ اسے عذاب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن مشرکین مکہ جزوی عذابوں کا شکار تو ہوئے' اجتماعی عذاب سے اسلئے بچ گئے کہ مکہ کے رہنے والوں نے مجموعی طور پر اللہ کے دین کا انکار نہیں کیا بلکہ مختلف اوقات میں ان میں اسلام کا سلسلہ جاری رہا اور اسلام لانے والے چھپ چھپ کر مدینہ طیبہ پہنچتے رہے اور معاہدہ حدیبیہ کے بعد ساحل سمندر کو انہوں نے اپنا ٹھکانہ بنایا۔

جہاں تک اسلام کے غلبۂ عمومی کا تعلق ہے' جس کا آنحضرت ﷺ مختلف وقتوں میں مشرکین مکہ کے سامنے تذکرہ فرماتے تھے اور جیسا کہ عرض کیا جاچکا' وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے' لیکن ہجرت کے فوراً بعد آنحضرت ﷺ کی بیان کردہ ایک ایک خبر صداقت کے قالب میں ڈھلنے لگی۔ کوئی دن نہیں گزرتا تھا' جب اسلام اور مسلمانوں کی کامرانیوں کا سفر آگے نہیں بڑھتا تھا۔ دوسرے ہی سال جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح نے سیاسی' نفسیاتی اور جنگی نکتہ نگاہ سے پورے جزیرۂ عرب میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا راستہ کھول دیا۔ پھر چند سالوں میں مدینہ طیبہ کے اندر یہود کی قوت تباہ ہوگئی اور بیرونِ مدینہ سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا علاقہ' بڑی تیزی سے اسلام کی قلمرو میں شامل ہوگیا۔ جنگ خندق میں کفر نے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اسلامی قوت کو مٹانا چاہا' لیکن ناکامیوں کی رسوائی کے سوا نہیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ تین ہی سال بعد آخر مکہ سرنگوں ہوگیا اور اس طرح کفر کی قوت اسلام کے سامنے ڈھیر ہوگئی۔

یہ مختصر سی ان کامیابیوں کی تاریخ ہے' جس کے بارے میں اس آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ عنقریب تم ان خبروں کو اپنی آنکھوں سے وقوع پذیر ہوتا دیکھو گے' جن کا آج تم تمسخر اڑا رہے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ مکہ نے جو دیکھا سو دیکھا' ان کے سردار ابوسفیان نے تو اپنی آنکھوں سے ایک ایسا منظر دیکھا' جس نے یقیناً ان کی پوری شخصیت کو ہلا کے رکھ دیا ہوگا' مسلمانوں کی فوجیں جب فتح مکہ کیلئے اہلِ مکہ کے سر پر جا پہنچیں اور انہوں نے رات کو دور دور تک اپنے چولہے جلائے تو مکہ والے یہ آگ دیکھ کر حیران اور سراسیمہ ہو کر مکہ سے باہر نکل آئے۔ ابوسفیان ان میں سب سے آگے تھا۔

Marfat.com

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو دیکھ لیا۔ پکڑ کے لے گئے آنحضرت ﷺ سے ان کیلئے امان حاصل کی' پھر ایک بلند چوٹی پر کھڑا کر کے کہا' میں تمہیں مسلمانوں کی قوت کا نظارہ کرانا چاہتا ہوں' چنانچہ جب مسلمان فوج حرکت میں آئی اور ایک ایک قبیلہ اپنی مخصوص وردی میں' اپنے مخصوص ہتھیاروں کے ساتھ دریا کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا آگے بڑھا تو ابوسفیان سراسیمہ ہو کے رہ گیا۔ بالآخر حیرانی کے عالم میں انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عباس تمہارا بھتیجا تو بہت بڑا بادشاہ ہو گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ابوسفیان اب بھی آنکھیں کھولو' معلوم ہوتا ہے تمہاری آنکھوں کا پردہ اب بھی دور نہیں ہوا۔ یہ بادشاہت نہیں' نبوت ہے۔

اندازہ فرمائیے! ابوسفیان جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ باتیں کر رہے تھے تو کیا ان کے کان میں کوئی کہہ نہیں رہا ہو گا کہ ابوسفیان' یہ اسلامی غلبے کا وہی منظر ہے' جسکے بارے میں تمہیں مکی زندگی میں آنحضرت ﷺ خبریں دیا کرتے تھے اور تم مذاق اڑایا کرتے تھے۔ آج دیکھو! وہ حقیقت بن کر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔

قرآنِ کریم' ذات رسالت مآب ﷺ اور پیش آنے والے حالات سے استدلال کرنے کے بعد' اب اگلی آیت میں مشرکین مکہ کے سامنے ایک تاریخی شہادت پیش کر رہا ہے کہ اگر وہ اپنے تعصبات میں اس قدر اندھے ہو گئے ہیں کہ نہ انہیں آنحضرت کی ذات میں حق کی کوئی نشانی دکھائی دیتی ہے اور نہ قرآنِ کریم میں تو کم از کم تاریخ کے آئینہ کو تو غور سے دیکھیں۔ اس سے تو انہیں کوئی کد نہیں ہونی چاہئے۔

آیت:٦ اَلَمۡ یَرَوۡا کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَکِّنۡ لَّکُمۡ وَ اَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ عَلَیۡہِمۡ مِّدۡرَارًا ۪ وَّ جَعَلۡنَا الۡاَنۡہٰرَ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمۡ فَاَہۡلَکۡنٰہُمۡ بِذُنُوۡبِہِمۡ وَ اَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِیۡنَ O ''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا' جن کو ہم نے ملک میں وہ قوت وسطوت دے رکھی تھی' جو تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب مینہ برسائے اور نہریں جاری کیں' جو ان کے نیچے بہتی تھیں۔ پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں''۔

''مکہ'' پورے جزیرۂ عرب کا تجارتی مرکز تھا:

مکے والوں کو ہدایت قبول کرنے میں جن چیزوں نے روکا' ان میں سے ایک چیز ان کا یہ پندار تھا کہ ہم پورے جزیرۂ عرب میں سب سے زیادہ مالدار' خوشحال اور طاقتور قوم ہیں۔ اپنی اس خوشحالی پر اس قدر نازاں تھے کہ اس کے مقابلے میں کوئی بھی نصیحت قبول کرنے کو تیار نہیں تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اپنے انجام کے بارے میں سوچنے کیلئے بھی تیار نہیں تھے۔ ممکن ہے' آپ کو یہ خیال آئے کہ وہ تو نہایت پسماندہ علاقے کے رہنے والے لوگ تھے' جہاں خوشحالی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سال بہ سال حاجی وہاں زیارت کعبہ کیلئے جاتے تو حج کے دنوں میں کوئی تجارت ہو جاتی' اس پر ان کے سال بھر کی گزر بسر کا دارومدار تھا۔ ان کے پاس ایسی کون سی خوشحالی تھی' جس کی وجہ سے وہ اپنے انجام سے بے فکر ہو گئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکہ اور اہلِ مکہ کی تاریخ کے حوالے سے ہمارے یہاں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ یہ موقع نہیں کہ ان کی تفصیل بیان کی جائے' بس اتنا جان لیجئے کہ مکہ پورے جزیرۂ عرب میں مرکز اجتماع بھی تھا اور مرکز اعصاب بھی۔ پوری قبائلی زندگی کی قوت کا سرچشمہ اسی شہر کو کہا جا سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ پورے جزیرۂ عرب میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ جہاں تک خوشحالی کا تعلق ہے' یہ لوگ اتنے بڑے تاجر تھے کہ ایک طرف ان کے قافلہ ہائے تجارت اگر یمن کی طرف جاتے تھے تو دوسری طرف

Marfat.com

عراق، شام، مصر اور چین تک، ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی۔ چمڑے کی صنعت خود مکہ معظمہ میں بڑی ترقی پر تھی اور بھی بعض چیزیں خود مکے میں تیار ہوتی تھیں۔ وہ ایسا پسماندہ شہر نہیں تھا، جیسا تصور ہماری تاریخوں نے دے رکھا ہے۔ مزید یہ کہ خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے پورے جزیرۂ عرب میں آزادی سے تجارتی کارواں لے کر صرف قریش ہی کو آنے جانے کی سہولت حاصل تھی کیونکہ ان کے احترام کے باعث کوئی قبیلہ بھی کبھی ان پر دست درازی کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ ان تجارتی سفروں کے نتیجے میں غیر ملکی اشیاء نہ صرف یہ کہ ان کے زیر استعمال تھیں بلکہ ان کے بازاروں میں ان کی بھرمار تھی۔ مکہ کے بازار بہت پر رونق بازار تھے۔ مزید جس چیز نے انکا دماغ خراب کر رکھا تھا، وہ انکی زمینیں اور وہ باغات تھے، جو طائف سے لے کر نجران تک ایک بڑے وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایسی صورتحال میں اگر انہیں اپنی دولت و امارت پر غرہ نہ ہوتا اور اس کے نتیجے میں ان میں نخوت پیدا نہ ہوتی تو یہ تعجب کی بات ہوتی۔ لیکن قرآنِ کریم ان کی دو طرح سے غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہے۔ ایک یہ کہ تم ہزار دولت مند، ہزار قوت و سطوت کے مالک سہی، لیکن تمہاری خوشحالی اور دولتمندی اور تمہاری قوت و سطوت اس کا عشر عشیر بھی نہیں، جیسی قوت اور خوشحالی ہم نے ان قوموں کو دے رکھی تھی، جنہیں تم قومِ عاد اور قوم ثمود یا قومِ شعیب اور قومِ لوط کے نام سے جانتے ہو۔ انہیں جو اقتدار اور اثر و رسوخ میسر تھا، تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور انہوں نے اپنے پیچھے جو تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی آثار چھوڑے ہیں، وہ ان کی عظمت کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ تم آخر کون سی دولتمندی اور امارت ہے، جس پر ناز کر رہے ہو؟

قوموں کی تباہی کا اصل سبب شریعت کی نافرمانی ہے:

دوسری یہ بات کہ اگر خوشحالی اور قوت بقاء کی ضمانت ہوتیں تو یہ قومیں آج تاریخ میں عبرت نہ بن چکی ہوتیں۔ جب ان جیسی قومیں باقی نہ رہیں تو کیا تم محض اپنی دولت اور قوت کے باعث باقی رہ جاؤ گے؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی زندگی اور اس کی بقاء صرف اس بات سے وابستہ ہے کہ اس کا اپنے رب اور اس کے بندوں سے کیسا رشتہ ہے؟ کیا وہ اپنی حدود بندگی کو پہچانتی ہے یا نہیں؟ کیا اسے احساس ہے کہ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس حوالے سے اس پر کیا ذمہ داریاں ہیں؟ جس نے ان اخلاقیات کو پیدا کر لیا، اسے ایک عمر دراز میسر آئی اور وہ دوسری قوموں میں نیک نامی کے ساتھ یاد رکھی گئی، لیکن جس نے ان حقیقتوں سے سرتابی کی، وہ مذکورہ قوموں کی طرح تباہی اور بربادی کی علامت بن گئی۔ اس لئے تم اگر اس انجام سے بچنا چاہتے ہو تو اپنی طاقت و امارت کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ کہیں تم بھی تو وہی غلطی نہیں کر رہے، جو تم سے سابقہ قوموں نے کی اور تباہ ہو گئیں۔ اس لئے تمہیں اپنے اندر عرفانِ ذات اور حقیقت کا شعور پیدا کرنا چاہئے کیونکہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ کا قانون ایک قطعی اور اٹل قانون ہے، اس میں کوئی لچک نہیں۔ وہ تمام قوموں کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے اور وہ قانون وہ ہے، جس کا اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ دیکھو! ہم نے ان قوموں کو کس قدر ترقی دی تھی۔ اس زمین میں ان کو کیسا تمکن اور کیسی خوشحالی عطا کی تھی کہ ان کے گھروں کے نیچے سے نہریں بہتی تھیں اور موسلا دھار بارشوں نے ان کی سرزمینوں کو سرسبز بنا رکھا تھا اور وہ اپنے پاس ایسے لہلہاتے باغ رکھتے تھے کہ صنعائے یمن کی طرح ان کے باغوں کے نیچے سے کوئی آدمی سر پر ٹوکری رکھ کر گزر جاتا تھا تو باغ سے باہر نکلتے نکلتے اس کی ٹوکری پھلوں سے اٹ جاتی تھی۔ یعنی قدرت نے انہیں ایسی سرسبز و شاداب زمین عطا کی تھی، جس میں ایسے رسیلے پھلوں کے باغات تھے اور ایسے محلات سے انہیں نوازا تھا کہ جن کے دائیں بائیں سے نہریں رواں تھیں۔ لیکن جب انہوں نے اللہ کے قانون کو توڑا یعنی بجائے اللہ کی اطاعت کرنے کے، انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی تو ہمارا قانون حرکت میں آیا۔ اسی کا ذکر یہاں فرمایا جا رہا ہے:

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ”ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا“

یعنی ہم کسی قوم کو بلا وجہ نہیں پکڑتے بلکہ جب بھی ہم کسی کو پکڑتے ہیں تو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک اور جگہ

Marfat.com

بھی اس اصول کو بیان فرمایا:

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ج ''ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا'' (العنکبوت:۴۰)

اور اس کے بعد کئی قوموں پر آنے والے عذاب کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ کسی پر تیز آندھی آئی' کسی کو ایک تیز چیخ نے آ پکڑا' کسی کو زمین میں دھنسا دیا گیا' کسی کو پانی میں غرق کر دیا گیا۔ لیکن ان تمام عذابوں کا سبب صرف ایک تھا۔ وہ تھا قوموں کا گناہوں کا ارتکاب کرنا۔ گناہ کیا ہے؟ اللہ کی شریعت نافرمانی۔ اللہ تعالیٰ جن باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے' اسے نہ کرنا اور جن باتوں سے رکنے کا حکم دیتا ہے' اس کے ارتکاب پر اصرار کرنا۔ یہ وہ گناہ ہے' جس پر ہمیشہ اللہ کے عذاب کا کوڑا برستا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب تک ان گناہوں کا ارتکاب افراد کی حد تک رہتا ہے تو قدرت اغماض سے کام لیتی ہے۔ لیکن جب گناہوں کا ارتکاب وبائی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اجتماعی ادارے اس کا شکار ہونے لگتے ہیں اور اقتدار اس کا پشت پناہ بن جاتا ہے تو پھر بالعموم اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ لیکن عذاب آنے سے پہلے پہلے افراد کو بھی اور اداروں کو بھی اور بعض دفعہ حکومتوں کو بھی مختلف جھٹکے دیئے جاتے ہیں' مختلف مصائب کا شکار کیا جاتا ہے' مختلف حوادث سے انہیں دوچار کیا جاتا ہے' تاکہ وہ اللہ کی طرف لوٹ آئیں۔ ایسی صورتحال میں جب کچھ لوگوں کے ہاتھ اللہ کے سامنے پھیلتے ہیں اور وہ اپنی مصیبتوں کا شکوہ کرتے ہیں تو وہاں سے بقول اکبر ایک ہی جواب ملتا ہے

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

اللہ کے جس قانون اور اس کی جس سنت کا یہاں تذکرہ ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ گناہوں کی پاداش میں پکڑا کرتا ہے' کیا ہمارے لئے ضروری نہیں کہ اس آئینہ میں ہم بھی اپنی قسمت تلاش کرنے کی کوشش کریں اور اپنی اصل صورت کی شناخت کریں؟ اپنی پوری تاریخ کو غور سے دیکھیں کہ کیا ہم نے انفرادی گناہوں کے ساتھ ساتھ کہیں اجتماعی گناہوں کا ارتکاب تو نہیں کیا؟ ہم میں سے ہر شخص واقف ہے کہ یہ ملک ہم نے اسلام کے نام پر اللہ سے مانگا تھا اور بار بار اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تو ہمیں ہندو کی غلامی سے نجات دے دے اور ایک قطعۂ زمین عطا فرما' جس پر ہم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں۔ ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ وہاں ہم تیرے قانون کو نافذ کریں گے اور تیرے رسول کی سنت کا وہاں چلن ہوگا۔ لیکن اس طویل تاریخ میں ہم نے یہ وعدہ کہاں تک ایفا کیا ہے' اس کا جواب صرف اپنے آپ سے ہی پوچھا جانا چاہئے۔

کیا ہم شریعت کے پاسدار ہیں؟

اس ملک کے حاصل کرنے کے بعد جس طرح ہمارے امراء' جاگیرداروں اور سیاستدانوں نے' اس ملک کے وسائل کی لوٹ مار کی ہے اور یہاں کے بسنے والوں کیلئے' جس طرح زندگی عذاب بنائی ہے۔ اگر یہ بھی کوئی گناہ ہے تو اس کا ارتکاب ہم نے اس وسعت کے ساتھ کیا ہے کہ دنیا بھی ہماری کرپشن پر بلبلا اٹھی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی تباہی صاف نظر آ رہی ہے' ہم عالمی استعمار کے ہدف بن کر رہ گئے ہیں' ہماری سرحدیں بری طرح غیر محفوظ ہیں' اندرون ملک لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ درپیش ہے۔ بایں ہمہ! ہمارے اندر اس احساس کی شاید شدید کمی ہے کہ جب بھی ہمیں کبھی اپنی قیادت کے انتخاب کا موقع ملتا ہے تو ہم انہی لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں' جنہوں نے اس سے پہلے برس ہا برس تک ہمیں زخم لگائے۔ اے کاش! ہم اس آیت کریمہ سے سبق سیکھیں اور اللہ کے عذاب کے نازل ہونے سے پہلے اپنی عاقبت کیلئے کچھ کر لیں۔

اس آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا: وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ''ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں''۔

Marfat.com

اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو بیان کیا جا رہا ہے کہ مشرکین مکہ اپنے آپ کو نجانے کیا سمجھتے ہیں۔ اللہ کی قدرت کے سامنے وہ بڑی بڑی قومیں نہ ٹھہر سکیں کہ آج ان کے ناموں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اگر ان پر خدا کا عذاب آیا تو آخر یہ کس طرح باقی رہ سکیں گے؟ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ زمین کی آبادی تمہارے دم قدم سے ہے۔ اللہ کی قدرت کاملہ کا تو عجیب حال ہے کہ وہ ایک طرف اگر بڑی بڑی قوموں کو تباہ کرتا ہے تو ساتھ ہی دوسری قوموں کو اس طرح بسا بھی دیتا ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ زمین سے کوئی قوم اٹھالی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس قدرت و حکمت کا کیا کہنا کہ روزانہ لاکھوں انسان ہلاک ہوتے رہتے ہیں، مگر کہیں خلاء نظر نہیں آتا۔ ٹھیک کہا کسی نے

؎ خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

ایک مرتبہ میدان عرفات میں جہاں تقریباً بیس لاکھ انسانوں کا مجمع تھا یہ خیال آیا کہ آج سے تقریباً ستر اسی سال پہلے اس سارے مجمع میں سے کسی انسان کا وجود نہ تھا اور اس جگہ پر تقریباً اتنے ہی انسان دوسرے موجود تھے، جن کا آج نام ونشان نہیں ہے۔ اسطرح انسانوں کے ہر اجتماع اور لوگوں کے ہر جھرمٹ کو جب اسکے ماضی اور مستقبل کیساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ ایک بہت ہی موثر واعظ نظر آتا ہے۔ اسلئے ایک صاحب بصیرت آدمی کیلئے اس میں کس قدر بصیرت اور عبرت کا سامان ہے کہ لوگ آتے اور جاتے ہیں، اس کائنات کا خالق اس مخلوق کو اپنے قانون کے مطابق بقاء بھی دیتا ہے اور ہلاک بھی کرتا ہے۔ اسلئے ہم اگر یہاں بقاء حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس آیت کریمہ کے دیئے ہوئے اصول سے فائدہ اٹھا کر اپنی بقاء کا سامان کرنا چاہئے۔

مشرکین مکہ نے اپنی دین دشمنی اور اندھے تعصب کے باعث جس طرح قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ کی ذات کو ماننے سے انکار کیا، اس کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اب اگلی آیات میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ وہ قرآن کریم کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے بلکہ اس کیلئے انہوں نے کچھ ایسے اعتراضات تیار کر رکھے تھے، جن کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا قرآن کریم جیسے واضح حق کو تسلیم نہ کرنا چنداں قابل تعجب نہیں ہے کیونکہ جب تک ہمارے اعتراضات دور نہیں ہوتے، ہم قرآن کریم کو ایسے کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ چنانچہ اگلی آیات میں قرآن کریم نے ان کے اعتراضات کا ذکر بھی کیا ہے اور جواب بھی دیا ہے۔

آیت: ۷ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ ''اگر ہم تم پر کوئی ایسی کتاب اتارتے، جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہوتی اور یہ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے، جب بھی یہ کفر کرنے والے یہی کہتے کہ یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے''۔

عبداللہ ابن ابی امیہ کا حضور ﷺ سے معجزے کا مطالبہ:

حدیث میں آتا ہے کہ عبداللہ بن ابی امیہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک معاندانہ مطالبہ پیش کیا اور کہا کہ میں تو آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لا سکتا، جب تک کہ میں یہ واقعہ نہ دیکھ لوں کہ آپ آسمان میں چڑھ جائیں اور وہاں سے ہمارے سامنے ایک کتاب لے کر آئیں، جس میں میرا نام لے کر یہ لکھا ہو کہ میں آپ کی تصدیق کروں اور یہ سب کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ یہ سب کچھ کر بھی دکھائیں، میں تو جب بھی مسلمان ہوتا نظر نہیں آتا۔ قرآن کریم نے اس کا جو جواب دیا ہے، اس کا ذکر کرنے سے پہلے میں رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ صاحب جنہوں نے

Marfat.com

یہ معاندانہ مطالبہ پیش کیا تھا اور ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ آپ یہ کر بھی دکھائیں تو میں پھر بھی مسلمان نہیں ہوں گا۔ یہ صاحب مسلمان ہوئے اور اللہ نے ان کو ایسی استقامت عطا فرمائی کہ غزوۂ طائف میں وہ شہید ہوئے۔ قرآن کریم نے اس کا جو جواب دیا ہے' اس کی بنیاد ان کے رویے پر رکھی گئی ہے۔ یعنی ان کا رویہ یہ ہے کہ اس مطالبے سے پہلے وہ بیسیوں معجزات دیکھ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے کانوں سے کنکریوں کو کلمہ پڑھتے ہوئے سنا' اپنی آنکھوں سے پتھروں کو دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کو سلام کہہ رہے ہیں' ان کی ایک بہت بڑی تعداد نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا' ان کے سامنے کھانے میں اضافہ ہوا اور اس طرح کے کئی معجزات ان کی آنکھوں سے سامنے ظہور پذیر ہوئے۔ اگر صرف معجزہ ان کی ہدایت کیلئے کافی ہوتا تو یہ اس سے پہلے معجزات دیکھ کر ایمان لا چکے ہوتے۔ لیکن ان کا رویہ یہ رہا کہ جب بھی ان کے سامنے کسی معجزے کا ظہور ہوا' انہوں نے ہمیشہ اسے جادو کہہ کر اس کا تمسخر اڑایا اور حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اب بھی اللہ کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں کہ وہ آسمان سے تحریری شکل میں قرآن پاک کو نازل کر دے۔ وہ اگر تورات کو پتھر کی تختیوں پر کندہ کر کے دے سکتا ہے تو قرآنِ کریم کو تحریری شکل میں نازل کرنا اس کیلئے کوئی مشکل بات نہیں۔ لیکن یہ مشرکینِ مکہ چونکہ معجزات کا مطالبہ قبولیت حق کے ارادے سے نہیں کر رہے بلکہ ان کا مقصود کج بحثی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے معجزات کا ظاہر کرنا کوئی کھیل نہیں ہے کہ ایسے غیر سنجیدہ لوگوں کے کہنے پر معجزات اترنے شروع ہو جائیں۔ اس کے بعد کی آیت کریمہ میں ان کا ایک اور مطالبہ اور اس کا جواب ذکر کیا گیا ہے۔

آیت:۸ وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ○ ''کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا' پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی''۔

مشرکین مکہ کا دوسرا مطالبہ:

ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے واقعی اپنا پیغمبر بھیجا ہے تو پھر یہ عجیب بات ہے کہ خداوند کائنات کا پیغمبر اور وہ دنیا میں اس طرح آئے کہ نہ ساتھ کوئی ہٹو بچو کہنے والا ہو' نہ کوئی اس کی حفاظت کرنے والا' نہ کوئی اس کی خدمت بجا لانے والا' جس کا جی چاہے اسے کہہ ڈالے تو اسے روکنے والا کوئی نہیں۔ جو تکلیف اسے پہنچانا چاہے' ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔ عجیب بات ہے کہ خداوند ذوالجلال کا پیغمبر اور اس طرح بے یار و مددگار کہ پتھر کھانے اور گالیاں سننے کیلئے رہ جائے۔ اگر یہ اللہ کا پیغمبر ہوتا تو یقیناً اسکے ساتھ کوئی فرشتہ اترتا' جو اسکی حفاظت کرتا۔ اسکا رعب بٹھاتا اور لوگوں کو یقین دلاتا کہ یہ واقعی اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہے اور مافوق الفطری طریقے سے اسکے کام انجام دیتا اور بعض لوگ یہ کہتے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ مجھ پر ایک فرشتہ وحی لے کر اترتا ہے اور وہ فرشتہ مجھ سے باتیں کرتا ہے تو وہ صرف آپ ہی سے باتیں کیوں کرتا ہے اور آپ ہی کو نظر کیوں آتا ہے؟ وہ ہمیں دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ اور وہ کھلم کھلا آپکی نبوت کی منادی کرتا ہوا نظر کیوں نہیں آتا؟ تاکہ سب لوگ اسے دیکھیں اور سب سنیں۔

معتبر ایمان:

پروردگار نے اس اعتراض کے جواب میں فرمایا:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ''اگر ہم کہیں فرشتہ اتار دیتے تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا''

مطلب اس کا یہ ہے کہ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کیلئے' جو مہلت تمہیں ملی ہوئی ہے۔ یہ اسی وقت تک ہے' جب تک حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ جہاں غیب کا پردہ چاک ہوا' پھر مہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ اس کے بعد تو صرف حساب ہی لینا باقی رہ

Marfat.com

جائے گا۔اس لئے کہ دنیا کی زندگی تمہارے لئے ایک امتحان کا زمانہ ہے اور امتحان اس امر کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل وفکر کے صحیح استعمال سے اس کا ادراک کرتے ہو یا نہیں اور ادراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کی مطابق درست رکھتے ہو یا نہیں۔ اس امتحان کیلئے غیب کا غیب رہنا شرط لازم ہے۔تمہاری دنیوی زندگی جو دراصل مہلتِ امتحان ہے' اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے' جب تک غیب' غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا' یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کی بجائے نتیجۂ امتحان نکلنے کا وقت آ پہنچے گا۔لہٰذا تمہارے مطالبہ کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے سامنے فرشتے کو اسکی اصلی صورت میں نمایاں کر دیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ابھی تمہارے امتحان کی مدت ختم نہیں کرنا چاہتا۔

مختصر یہ کہ ایمان وہ معتبر ہے' جو غیب میں رہتے ہوئے' آفاق وانفس اور عقل وفطرت کے ان دلائل کی بنیاد پر لایا جائے' جن کی انبیاء دعوت دیتے ہیں۔اس ایمان کا کوئی بھروسہ نہیں اور اللہ کے یہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں' جو کشف حجاب اور حقائق کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد لایا جائے۔

بعض لوگوں نے ایک تیسرا مطالبہ کیا تھا کہ بجائے انسان کو پیغمبر بنانے کے فرشتے کو پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا؟ چنانچہ قرآن کریم اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

آیت:9 وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ O اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے' کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے' جس میں اب پڑ رہے ہیں۔

کیا پیغمبر انسان نہیں ہوتے؟

مشرکینِ مکہ کے اس مطالبے کا ایک پس منظر ہے۔ وہ یہ ہے کہ باقی بہت سی قوموں کی طرح ان کا انسان کے بارے میں یہ تصور تھا کہ وہ فرشتوں کے مقابلے میں ایک کم تر درجہ کی مخلوق ہے اور اللہ کا نمائندہ اور اس کا پیغمبر چونکہ اللہ سے قریبی تعلق رکھنے کا دعویٰ رکھتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کی طرف سے پیغام وصول کرتا ہوں اور انسانوں تک پہنچاتا ہوں۔ظاہر ہے' اللہ سے باتیں کرنا' اس کے احکام سننا اور اس کا پیغام وصول کرنا' یہ کسی انسان کا کام تو نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کام انسان کے مرتبے سے بہت بلند ہے۔اس لئے کسی پیغمبر کا انسان ہونا یا کسی انسان کا پیغمبر ہونا' یہ ان کے نزدیک ناقابل فہم بات تھی۔عجیب بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے کئی جگہ اس کا تذکرہ کیا اور خود رسول اللہ ﷺ کی زبان سے قرآن کریم میں یہ اعلان کروایا گیا کہ میں انسان ہوں' فرشتہ نہیں۔لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں' جو انسان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اس لئے وہ اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں کہ انسان پیغمبر بھی ہو سکتا ہے یا پیغمبر انسان ہو سکتا ہے۔ جہاں جہاں قرآن کریم نے پیغمبر کے انسان ہونے کو واضح کیا ہے' وہ ان مقامات کی عجیب وغریب تاویلیں کرتے ہیں حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی بعض آیات میں انسان کی عزت وعظمت کی گواہی دی ہے اور ایسی جگہوں کی قسم کھائی ہے' جن کا تعلق انبیاء کرام کی دعوت اور ان کی شخصیتوں سے ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تمام انبیاء کرام حضرت آدم کی اولاد سے ہیں اور آدم کو اللہ نے مسجود ملائک بنایا تھا اور مزید یہ بات بھی کہ اللہ کے نبی دنیا میں انسانوں کی اصلاح کیلئے آتے ہیں اور انسانی اصلاح کیلئے صرف یہ کافی نہیں کہ انہیں اصلاح کی ہدایات جاری کر دی جائیں اور زندگی کے معمولات کو مرتب کرنے کیلئے چند احکامات دے دیئے جائیں بلکہ انسانی کمزوری یہ ہے کہ جب تک وہ احکام اور ہدایت کے مطابق عمل نہیں دیکھتا' اس وقت تک اس کی طبیعت عمل پر آمادہ نہیں ہوتی۔ حقیقت

Marfat.com

بھی یہی ہے کہ کسی بھی ہدایت پر عمل کرنا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب آدمی اس کے عملی نمونہ کو دیکھے اور اگر اس حکم کا تعلق دل و دماغ کی کیفیوں سے بھی ہو تو پھر تو یہ ہرگز ممکن نہیں کہ محض حکم سے وہ نتائج حاصل کئے جا سکیں۔ اگر یہ باتیں واقعی صحیح ہیں اور انسانی ہدایت کیلئے واقعی ضرورتیں ہیں تو یہ ضرورتیں انسان تو مہیا کر سکتا ہے' کوئی جن یا فرشتہ تو نہیں کر سکتا۔ انسان نماز میں خشوع و خضوع پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کا تعلق دل کے گداز سے ہے۔ فرشتہ تو دل کے احساسات سے ہی بے خبر ہے' وہ سوز و گداز کی کیا تعلیم دے سکتا ہے۔ روزہ' اس لئے مشروع کیا گیا ہے کہ آدمی اپنی جسمانی ضرورتوں یعنی بھوک' آرام اور جنسی خواہش پر غلبہ حاصل کر سکے۔ ظاہر ہے' یہ چیزیں انسانی خصوصیات میں سے ہیں۔ فرشتوں کو اللہ نے ان سے معرا پیدا فرمایا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر کوئی فرشتہ پیغمبر بن کر آتا تو وہ انسانوں کو عملی ہدایت دینے سے ہرگز قاصر رہتا۔ نہ اسے بھوک لگتی' نہ اسے موسم کی شدت پریشان کرتی' نہ اسے کبھی کوئی بیماری لاحق ہوتی' نہ اسے بیوی بچوں کی ضرورت ہوتی' نہ وہ گھر بنانے کا محتاج ہوتا' نہ وہ انسانی معاشرت کی ضرورتوں کو سمجھ سکتا' نہ وہ انسانی معاش کے خدوخال کو پہچانتا۔ غرضیکہ وہ پوری انسانی زندگی سے فرشتہ ہونے کی وجہ سے بے بہرہ ہوتا تو وہ انسانوں کو کیا راہنمائی دیتا۔ اس لئے یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم جس بات کا مطالبہ کر رہے ہو' وہ تو سراسر عقل و دانش اور انسانی اصلاح و ہدایت کی ضرورتوں سے ہٹا ہوا مطالبہ ہے۔ اس لئے پیغمبر کا انسان ہونا انسانی ہدایت کیلئے ازبس ضروری ہے۔ دوسری بات اس میں جو ارشاد فرمائی جا رہی ہے' وہ یہ ہے کہ چلئے اگر تمہارے مطالبے پر ہم کسی فرشتے ہی کو پیغمبر بنا کر بھیج دیتے تو ہم اس کو فرشتے کی شکل میں تو نہیں بھیج سکتے تھے۔ وہ اپنی اصلی شکل میں تو تمہیں دکھائی نہیں دے سکتا کیونکہ فرشتہ ایک لطیف مخلوق ہے اور لطیف مخلوق انسانی نگاہ میں نہیں آ سکتی تو آخر اس کا تمہارے پاس آنے کا کیا فائدہ ہوتا؟ دو صورتیں ممکن تھیں۔ ایک یہ کہ تمہیں اس کو اصلی شکل میں دکھایا جاتا۔ مگر تم اس کا تحمل نہیں کر سکتے تھے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کو دو دفعہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے۔ ایک دفعہ مکہ معظمہ میں' وہ زمین و آسمان کے درمیان ایک بہت بڑی کرسی پر فروکش تھے۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ کے وجود نے پورے آسمان کو گھیرا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے سینکڑوں پر ہیں' جو مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ ایسے مرعوب ہوئے کہ آپ کو بخار چڑھ گیا اور گھر میں اس حال میں تشریف لائے کہ آپ بار بار فرما رہے تھے کہ مجھے کوئی کپڑا اوڑھا دو۔ چنانچہ کوئی چادر لے کر لیٹ گئے اور جب طبیعت سنبھلی تو تب آپ نے حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ واقعہ سنایا۔ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ عام انسانوں کی نسبت اللہ کی جانب سے مضبوط دل و دماغ اور اعلیٰ صلاحیتیں اور توانائیاں دے کر پیدا کئے گئے تھے۔ اگر آپ کا حضرت جبرائیل کو دیکھ کر یہ حال ہے تو دوسرا کوئی آدمی کسی فرشتے کو دیکھنے کا تحمل کیسے کر سکتا ہے؟

دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتے کو انسانی شکل میں بھیجا جائے۔ چنانچہ حضرت جبرائیل جب بھی حضور کے پاس حاضر ہوتے تو عموماً انسانی شکل میں ہوتے۔ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام میں بہت خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ حضرت جبرائیل عام طور پر ان کی شکل میں آیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انہیں آنحضرت ﷺ سے باتیں کرتے سنا اور ایک دفعہ تو بیسیوں صحابہ نے انہیں دیکھا۔ یہ مشہور حدیث ہے' جو حدیث جبرائیل کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ غالباً حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی اس کے راوی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور حضور کے سامنے آ کر سلام کہہ کر دوزانو بیٹھ گیا۔ لیکن عجیب بات یہ کہ بجائے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کے' اس نے حضور ﷺ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔ پھر اس نے حضور ﷺ سے سوالات شروع کئے۔ سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے اس کا جواب دیا تو اس نے دوسرا سوال پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ پھر تیسرا سوال احسان کے بارے میں تھا

Marfat.com

اور چوتھا قیامت کے بارے میں۔ صحابہ کرام اس بات پر حیران ہو رہے تھے کہ وہ ہر سوال کے جواب پر کہتا صدقت یا محمد "اے محمد ﷺ آپ نے سچ کہا" صحابہ کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ سوال بھی کرتا ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔ سوال کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے اس کا جواب معلوم نہیں اور تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ اسے جواب پہلے سے معلوم ہے اور مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ صحابہ اس کے لباس کو دیکھتے تھے تو اس پر گرد کا نشان تک نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں پڑوس سے اٹھ کر آیا ہے۔ لیکن جب اس کی شکل دیکھتے تھے تو وہ کسی کی پہچان میں نہیں آتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مدینے سے باہر کا کوئی اجنبی آدمی تھا۔ انہی حیرتوں میں اس شخص نے حضور سے اجازت چاہی اور سلام کہہ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد حضور ﷺ نے حضرت عمر فاروق ؓ سے فرمایا کہ اس جانے والے کو واپس بلاؤ۔ وہ باہر نکلے تو باہر کوئی نہیں تھا۔ بہت حیران ہوئے کہ کیا اس کو زمین نگل گئی آخر وہ کہاں گیا؟ حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ وہ جبرائیل امین تھے جو تمہاری تعلیم کیلئے آئے تھے۔

اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ کسی فرشتے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنا تو انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ البتہ یہی ایک صورت ممکن ہے کہ فرشتہ انسانی شکل میں آئے۔ جیسے حضرت جبرائیل تشریف لاتے تھے۔ لیکن ایسی صورت میں بھی سوال اٹھانے والے پھر یہی سوال اٹھائیں گے کہ یہ پیغمبر فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے۔ یہی وہ بات ہے جو اس آیت کریمہ کے آخر میں کہی جا رہی ہے کہ فرشتے کے انسانی شکل میں آنے سے بھی وہی گھپلا پیش آتا جواب پیش آ رہا ہے کہ جن لوگوں کو پیغمبر پر ایمان نہیں لانا تھا وہ برابر یہی کہتے کہ ہم نے تو فرشتے کا مطالبہ کیا تھا ایک انسان کو پیغمبر بنا کر کیوں بھیج دیا۔

پیغمبر کو انسان نہ سمجھنے کی وجہ اور اس کا جواب:

یہاں تک تو مشرکین مکہ کے شبہات کا جواب تھا۔ لیکن اس ضمن میں پہلی قوموں اور خود مسلمانوں کے حوالے سے اس بات کا تذکرہ بھی ہوا کہ بہت سے لوگ نبوت اور بشریت میں تضاد سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ نبوت ایک مرتبۂ عظیم کا نام ہے اور انسان یا بشر ہونا یہ پستی کی علامت ہے تو ایسی پست مخلوق کو اتنا بلند مرتبہ عطا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں اب تک اس طرح کی بحثیں جاری ہیں کہ پیغمبر انسان ہو سکتا ہے یا نہیں حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کیلئے باقی تمام مخلوقات پر افضل ہونے کی جو سب سے بڑی دلیل ہے وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو نبوت عطا نہیں فرمائی سوائے انسانوں کے۔ جب بھی دنیا میں کوئی نبی اور رسول آیا وہ انسانوں ہی میں سے آیا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ جو چیز انسانوں کیلئے قدر و منزلت کا باعث ہوئی ہے انسان اسی کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

اس غلط فہمی کی بنیاد اصل میں یہ ہے کہ جب آدمی اپنی کمزوریوں کو دیکھتا ہے اور گرد و پیش میں پھیلے ہوئے انسانوں کو اخلاق رذیلہ کا ارتکاب کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اصل میں انسان یہی لوگ ہیں پیغمبر بھی اگر انسان ہیں تو وہ بھی یقیناً ایسی ہی کمزوریوں کے حامل ہوں گے؟ حالانکہ حقیقت اگر دیکھی جائے تو وہ یہ ہے کہ ہم جنہیں انسان سمجھتے ہیں یہ انسانوں کی شکلیں تو ہیں لیکن انسانیت کے پیکر نہیں۔ حقیقی انسان تو اللہ کے نیک بندے اس کے ولی اور سب سے کامل ترین انسان اللہ کے نبی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں انسان کو احسن تقویم میں پیدا کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے وہاں قسمیں ان چیزوں کی کھائی ہیں جن سے اولوالعزم رسولوں کی تاریخ وابستہ ہے۔ ان کے واسطے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اگر حقیقی انسان دیکھنا چاہتے ہو تو ان اولوالعزم رسولوں کو دیکھو جن کی یہ نسبتیں ہیں۔ رسول ہی انسان بلکہ کامل ترین انسان ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کی وہ منزل ہے جس کی طرف انسانیت بڑھتی ہے۔ یہ وہ نمونہ ہے جس کی نقل اختیار کرنے کیلئے ہمیشہ انسانیت سرگرم عمل رہتی ہے۔ یہ وہ مینارۂ نور ہیں جس سے

Marfat.com

نوعِ انسانی کو روشنی ملتی ہے۔ یہ حق کا وہ مظہر ہیں جس سے اللہ کی حقانیت اور صداقت نمایاں ہوتی ہے۔ یہ اپنی ذات میں یقیناً انسان ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی صفات میں ملکوتی صفات سے بڑھ کر تقدس اور پاکیزگی رکھتے ہیں۔ ان کے قلب منور میں انوارِ الٰہی اس طرح جاں گزین ہوتے ہیں کہ شاید فرشتے بھی اسکے تحمل سے عاجز ہوں۔ اسکو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ پہاڑ سے نکلنے والا ہر پتھر، پتھر ہی کہلاتا ہے اور ہیرا بھی پہاڑ ہی سے نکلتا ہے۔ اپنی ذات میں وہ بھی پتھر ہی ہے۔ لیکن اپنی قدر و قیمت میں وہ دنیا بھر کے پتھروں سے بالا قیمت اور قدر و منزلت میں کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ وہ اپنی ذات میں پتھر ضرور ہے لیکن اپنی صفات میں وہ پتھر نہیں۔ یہی حال اللہ کے نبیوں اور رسولوں کا ہے کہ وہ اپنی ذات میں انسان اور بشر ہوتے ہیں لیکن اپنی صفات میں وہ انسانیت کیلئے آخری منزل، اعلیٰ مثال اور اعلیٰ ہدف ہوتے ہیں۔ بالخصوص سرکار دو عالم ﷺ تو وہ ذات گرامی ہیں جو انسانیت کے گل سرسبد اور انسانیت کبریٰ کی معراج ہیں۔ قدرت نے انہیں ذات و صفات کے حوالے سے انسانیت کے اس اعلیٰ مقام پر فائز کیا ہے جس کی دوسری مثال شاید فطرت کے تصور میں بھی نہیں۔ بقول اسد ملتانی

اے سب جمیلوں سے جمیل اے سب حسینوں سے حسیں
اے رحمتہ للعالمیں
اے وہ کہ تیری مثل فطرت کے تصور میں نہیں
اے رحمتہ للعالمیں

مشرکین مکہ کے سوالات کی بحث کو لپیٹتے ہوئے اگلی آیت میں پروردگار نے نبی کریم ﷺ کو تسلی دی ہے۔

آیت: ۱۰ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے آن گھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

جیسے کہ اس سے پہلے تذکرہ ہو چکا ہے کہ اس سورۃ کی بیشتر آیات کا نزول مکی زندگی کے آخری دور میں ہوا اور یہ وہ زمانہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں پر مظالم کی انتہاء ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اہلِ مکہ نے دعوت حق کی طرف سے کان بالکل بند کر لئے ہیں اور اسلامی تحریک جیسے ایک بند گلی میں داخل ہو گئی ہے جس کا بظاہر کوئی مستقبل نہیں۔ ایسی صورتحال میں رسول اللہ ﷺ پر جو گزرتی ہو گی اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لئے سرکار دو عالم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ اس بات کی بالکل پرواہ نہ کریں کہ یہ لوگ آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ آپ کا مذاق نہیں اڑاتے بلکہ اللہ کے دین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مزید یہ بات بھی کہ اللہ کے رسول کے ساتھ لوگوں کا یہ رویہ پہلی دفعہ وجود میں نہیں آیا بلکہ یہ تو کافروں کی ایک مستقل روایت رہی ہے کہ جب بھی کوئی دنیا میں اللہ کا رسول اللہ کی طرف سے دعوت حق لے کر آیا ہے تو انہوں نے ہمیشہ اس کا مذاق اڑایا اس کو تکلیفیں پہنچائیں اور حتی الامکان کوشش کی کہ اس کی دعوت پھیلنے نہ پائے تو یہ تو ان کا پرانا وطیرہ ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اللہ کے رسولوں نے ہمیشہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے امکانی مساعی سے کبھی دریغ نہیں کیا اور وہ برابر اپنی دعوت میں لگے رہے۔ اس لئے آپ انبیاء کرام اور ان کی قوموں کی اس پوری تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے دل گرفتہ ہونے کی بجائے حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کی نئی مثالیں قائم فرمائیں کیونکہ

؎ زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درس صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

Marfat.com

اس آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں ارشاد فرمایا گیا کہ اے پیغمبر! آپ یہ بھی نہ سمجھئے کہ یہ لوگ جو تمسخر اڑا رہے ہیں' ان کو ہمیشہ اس کی کھلی چھٹی ملی رہے گی۔ ایسا نہیں ہوگا' بلکہ وہ وقت دور نہیں' جب یہ لوگ اپنے جرائم کی پاداش میں پکڑے جائیں گے اور یہی استہزاء اور یہی ان کی حرکتیں' ان کیلئے وبال جان ثابت ہوں گی اور عذاب کا باعث بن جائیں گی۔

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ
کہو کہ (اے منکرینِ رسالت) ملک میں چلو پھرو پھر دیکھو کہ جھٹلانے
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١١﴾ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
والوں کا کیا انجام ہوا؟ (ان سے) پوچھو کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے کس کا ہے کہہ دو
قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا
خدا کا۔ اس نے اپنی ذات (پاک) پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن جس میں کچھ بھی
رَيْبَ فِيْهِ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢﴾ وَلَهٗ مَا
شک نہیں ضرور جمع کرے گا۔ جن لوگوں نے اپنے تئیں نقصان میں ڈال رکھا ہے وہ ایمان نہیں لاتے۔ اور جو
سَكَنَ فِى الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ
مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔ اور وہ سنتا جانتا ہے۔ کہو کیا میں خدا کو چھوڑ کر کسی
اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ
اور کو مددگار بناؤں کہ (وہی تو) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی (سب کو) کھانا دیتا ہے اور خود کسی سے
قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
کھانا نہیں لیتا (یہ بھی) کہہ دو کہ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہوں۔ اور یہ کہ تم (اے پیغمبر)

Marfat.com

الْمُشْرِكِينَ ﴿١٤﴾ قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ

مشرکوں میں نہ ہونا۔ (یہ بھی) کہہ دو کہ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب

عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ

کا خوف ہے۔ جس شخص سے اُس روز عذاب ٹال دیا گیا اُس پر خدا نے (بڑی) مہربانی فرمائی۔ اور یہ کھلی

الْمُبِينُ ﴿١٦﴾ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ

کامیابی ہے۔ اور اگر خدا تم کو کوئی سختی پہنچائے تو اُس کے سوا اس کو کوئی دُور کرنے والا نہیں۔ اور اگر نعمت

يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٧﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ

و راحت عطا کرے تو کوئی اُس کو روکنے والا نہیں) وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور وہ اپنے بندوں پر غالب

عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿١٨﴾

ہے اور وہ دانا اور خبردار ہے۔

تمہید:

گزشتہ رکوع میں پروردگار عالم نے توحید، رسالت اور آخرت جیسے اساسی عقائد کو بیان فرمایا اور ان کی تفہیم اور اثبات کیلئے ایسے دلائل فراہم کیے، جن کے بعد ان عقائد کا انکار کرنا کم از کم ایک صاحب عقل و دانش اور تعصب سے خالی آدمی کیلئے ممکن نہیں رہتا۔ پھر اس ضمن میں مشرکینِ مکہ نے توحید، آخرت اور ذات رسالت مآب ﷺ کے حوالے سے اعتراضات کے ساتھ ساتھ، بعض عجیب و غریب مطالبات بھی کیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب بھی عطا فرمایا۔ لیکن اس تمام اتمام حجت اور افہام و تفہیم کے بعد بھی، جب مشرکینِ مکہ نے اپنا رویہ نہ بدلا، بلکہ بجائے ایمان لانے کے تمسخر اور استہزاء میں اور بڑھتے چلے گئے اور وقت کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو اذیت دینے میں اور کھل کھیلنے لگے تو گزشتہ رکوع کی آخری آیت میں پروردگار نے آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ ان بدبختوں کی ایذا رسانی اور تمسخر سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس لئے کہ یہ رویہ آپ کے ساتھ ایک نافرمان قوم کے حوالے سے کوئی پہلا واقعہ نہیں بلکہ تمام انبیاء و رسل کو نافرمان قوموں کے اسی رویہ سے واسطہ پڑتا رہا۔ اس راہ کی دو لازمی سنتیں

Marfat.com

رہی ہیں۔ایک یہ کہ جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف اللہ کا دین لے کر آیا ہے تو اس قوم نے حتی الامکان اس دعوت کو قبول کرنے کی بجائے اس آنے والے رسول کا تمسخر اڑایا اور اس کیلئے زندگی دشوار کر دی۔ دوسری سنت یہ رہی ہے کہ اس رویے پر اللہ کے اولوالعزم رسولوں نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا اور انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور تبلیغ و دعوت کے فرض کی انجام دہی میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ یہ دونوں سنتیں یعنی دونوں رویے تبلیغ و دعوت کی تاریخ میں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے اے پیغمبر ﷺ آپ کو اس سے ہرگز اثر قبول نہیں کرنا چاہئے بلکہ آپ کو اپنی تبلیغ و دعوت کی مساعی میں اضافہ کر دینا چاہئے کیونکہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ان بدبختوں کا انجام پوری طرح واضح ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جو قوم بھی کسی رسول کی دعوت کو رد کر دیتی ہے۔ بالآخر اللہ کے عذاب کا شکار ہوتی ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا یہ استہزاء آمیز رویہ ان کیلئے کس بدترین عذاب کا باعث بننے والا ہے۔ لیکن آپ کو ان کے انجام سے متعلق چونکہ پوری آگاہی ہے اس لئے ان کو اس بدترین انجام سے بچانے کی یہی ایک صورت ہے کہ آپ اپنی کوششوں کو مزید تیز کر دیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ہم پچھلے رکوع میں پڑھ چکے ہیں۔ آج کے رکوع کی پہلی آیت میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ ان مشرکینِ مکہ کو سمجھایئے کہ تمہیں اگر دلائل کے حوالے سے میری دعوت سمجھ نہیں آ رہی اور معجزات کا ظہور تمہارے لئے بے اثر ثابت ہو رہا ہے تو پھر کم از کم تاریخ کے آئینے میں ان قوموں کا انجام دیکھنے کی کوشش کرو جو تم سے پہلے اس صورتحال سے گزری تھیں۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

آیت:۱۱ قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ثُمَّ انْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝ ''کہو! ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟''۔

اللہ تعالیٰ کی آیات اور اسکے انبیاء کی تکذیب کرنے والوں کا انجام:

دیکھو! انبیاء ان کی طرف دعوت لے کر آئے۔ لیکن انہوں نے اسے درخورِ اعتناء سمجھنے کی بجائے وہی رویہ اختیار کیا جو تم کر چکے ہو۔ تو دیکھو پھر ان کا انجام کیا ہوا۔ ان کی تاریخ تمہارے اپنے ملک میں جا بجا پھیلی ہوئی ہے۔ تم ان قوموں کی تاریخ کے پیشتر واقعات سے واقف ہو کیونکہ وہ آج تک تمہاری قوم میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے ہیں اور مزید یہ کہ تم اپنے تجارتی اسفار میں ان کے کھنڈرات سے بھی گزرتے ہو اور ان کے یہ کھنڈرات ان کے اقتدار ان کی عظمت ان کی خوشحالی اور ان کی طاقت کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری قومیں اپنے اپنے وقتوں میں نہایت ترقی یافتہ قومیں تھیں اور نہایت پرتعیش زندگی گزار رہی تھیں۔ لیکن ان کے عقائد اور اخلاق کے بگاڑ نے جب ناگفتہ بہ صورت اختیار کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کیلئے پیغمبر اور رسول بھیجے۔ جب انہوں نے ان کی دعوت قبول کرنے کی بجائے ان کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا جو مشرکینِ مکہ آنحضرت ﷺ سے اختیار کر چکے ہیں تو بالآخر ان میں سے ایک ایک قوم اللہ کے بدترین عذاب کا شکار ہوئی۔ یہ تاریخ کی ایسی یقینی اور قطعی شہادت ہے کہ جس سے انکار کرنا مشرکینِ مکہ کیلئے ممکن نہ تھا کیونکہ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے وہ اپنے تجارتی اسفار میں ان علاقوں سے گزرتے تھے جہاں کبھی یہ قومیں آباد تھیں۔ ان کی توجہ اس چیز کی طرف دلائی جا رہی ہے کہ ذرا ان کھنڈرات پر کھڑے ہو کر غور کرنے کی زحمت کرو کہ یہ اتنی ترقی یافتہ قومیں آخر اس بدترین انجام کا شکار کیوں ہوئیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح انہوں نے اپنے پیغمبروں کی ہر بات کو سمجھنے سے انکار کیا اور بالآخر اس انجام کو پہنچیں کہیں اے مشرکینِ مکہ! تمہارا بھی یہی انجام نہ ہو۔

اس آیت کریمہ میں اگرچہ دونوں جملے آپس میں پوری طرح پیوست اور نہایت مربوط ہیں لیکن حقیقت میں دو الگ الگ باتیں ہیں جو اپنی انتہاء میں تو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں لیکن اپنی ابتداء میں دونوں جدا جدا ہیں۔ پہلا یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو۔ اس سے بظاہر

Marfat.com

یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کوئی سیر سپاٹے کا حکم ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ تباہ شدہ قوموں کے آثار شاید انسانوں کیلئے دلچسپی اور خوشی کا باعث ہوتے ہیں۔ اسلئے جا کر ایسی تباہ شدہ قوموں کے کھنڈرات اور ان کے آثار کو دیکھ کر خوشی حاصل کرو اور وقت گزاری کا اچھا سامان پیدا کرو۔ لیکن دوسرے جملے میں واضح طور پر اس حکم کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ان علاقوں میں جا کر سیر کرنا مقصود نہیں' نہ وہاں سے کلچر یا تاریخ نکالنا مقصود ہے۔ بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ اصلاً یہ تباہ شدہ بستیاں ان قوموں کی ہیں' جنہوں نے اللہ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور پیغمبروں کی تکذیب کی تھی۔ اسلئے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ آخر یہ قومیں اس انجام کو کیوں پہنچیں؟ جب تم اس نیت اور اس ارادے سے وہاں جاؤ گے تو تم جیسے جیسے ان کے اعمال سے واقف ہوتے جاؤ گے' تمہیں ویسے ویسے وہاں سے عبرت اور نصیحت کا خزانہ ہاتھ آئے گا۔ تم اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ کہیں ہم اس رویے کو اختیار تو نہیں کر چکے' جس رویے کے نتیجے میں ان قوموں کو یہ انجام دیکھنا پڑا۔ اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام ہمیں یہ بات بتانا چاہتا ہے کہ جب کبھی تم ایسی بستیوں سے گزرو' جو کبھی اللہ کے عذاب کا شکار ہوئیں اور اچانک انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا تو وہاں کسی اور چیز کو تلاش مت کرو' بلکہ وہاں سے عبرت حاصل کرو۔

معذب مقامات کے متعلق حضور ﷺ کا طرزِ عمل:

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جنگِ تبوک کیلئے تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں قوم صالح کے کھنڈرات سے گزرے۔ لیکن وہاں رکے نہیں۔ اگرچہ آپ نے حضرت صالح علیہ السلام کی طرف منسوب بعض چیزوں کی نشاندہی بھی فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ دیکھو! یہ وہ کنواں ہے' جس سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔ لیکن مسلمانوں کو حکم دیا کہ جلدی سے یہاں سے گزرنے کی کوشش کرو کیونکہ یہ ایک منحوس جگہ ہے۔ یہاں اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ یہاں سے جلدی نکلو اور ساتھ ہی اللہ سے پناہ مانگو کہ یا اللہ! ہمیں ایسی صورتحال میں کبھی مبتلا نہ کرنا کہ ہم دنیا کیلئے عبرت بن کر رہ جائیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ منیٰ کے پہلو میں وہ جگہ ہے' جہاں ابرہہ پر پرندوں کے ذریعے اللہ نے سنگ باری کروائی تھی اور جس کے نتیجے میں اس کی ہزاروں افراد پر مشتمل فوج تباہ ہو کر رہ گئی اور خود ابرہہ بھی اس حال میں جہنم رسید ہوا کہ اس کا گوشت گل گل کر گرتا جا رہا تھا' حتیٰ کہ راستے ہی میں اسے موت آ گئی۔ وہاں بھی آنحضرت ﷺ نے حجاج کو ٹھہرنے سے منع فرمایا ہے کہ یہ جگہ جائے عبرت ہے' جائے قیام نہیں۔ اس سے معذب قوموں کی تباہ شدہ بستیوں کے بارے میں اسلامی رویہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم نے آج باقی دنیا کی طرح ایسی بستیوں کو یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ ہمارے اہل علم کی تحقیق اور ریسرچ کی جگہ ہے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ جیسی جگہیں ہمارے لئے سیر گاہیں اور دلچسپی کی جگہ بن کے رہ گئی ہیں۔ ہمارے اہل علم وہاں سے کلچر نکالنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اگرچہ بجائے خود یہ تصور کہ کلچر تباہ شدہ کھنڈرات سے نکلتا ہے اور یہ نظریات سے جنم نہیں لیتا بہت محلِ نظر ہے۔ تاہم میں اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ آپ یہ کام بھی جاری رکھیے' لیکن ایسے کھنڈرات اور تباہ شدہ بستیوں سے صرف کلچر ہی نہیں' عبرت حاصل کرنے کی بھی کوشش کی جائے کیونکہ اصل مقصود تو یہی ہے۔ لیکن یہاں تو حال یہ ہے' جیسے مقصود انور نے نوحے کے انداز میں کہا تھا۔

؎ عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

مکذب قوم کسے کہتے ہیں؟

اس آیت کا ایک اور پہلو بھی نہایت قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اس سرزمین' یعنی زمینِ عرب میں گھوم پھر کے دیکھو کہ

Marfat.com

مکذب قوموں کا انجام کیا ہوا۔ سوال یہ ہے کہ جن کو مکذبین کہا گیا ہے' انہوں نے کس بات کی تکذیب کی؟ اور اصل وہ موضوع بحث کیا تھا' جس میں وہ اللہ کے رسولوں سے الجھتے تھے؟ موضوع بحث یہ تھا کہ اللہ کے رسول انہیں یہ دعوت دیتے تھے کہ اس پوری کائنات اور خود تمہارا خالق اللہ ہے۔ اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے' اسی نے تمہیں زندگی دی ہے' اسی نے تمہارے لئے زندگی کے امکانات پیدا کئے ہیں' وہی تمہیں رزق دیتا ہے' اس کی بے شمار نعمتیں ہیں' جن سے تم لذت اندوز ہوتے ہو۔ تمہاری ساری صلاحیتیں' توانائیاں' احساسات' انفعالات' آرزوئیں اور امنگیں' سب اس کی عطا کردہ ہیں۔ تم ازاول تا آخر اس کے زیرِ احسان ہو اور اسی کی قدرت کی گرفت میں بھی ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ جب تم اسی کی دی ہوئی زندگی گزار رہے ہو' اسی کا دیا ہوا رزق کھاتے ہو' اسی کی زمین پر رہتے ہو' اسی کی عطا کی ہوئی قوتوں سے متمتع ہو رہے ہو' تو کیا تمہاری زندگی' تمہارے احساسات' تمہاری صلاحیتوں' تمہاری عقل و دانش اور تمہارے گھروں سے لے کر تمہارے اجتماعی اداروں تک' صرف اسی کی حکومت اور اسی کی مرضی کا تسلط نہیں ہونا چاہیے؟ جب اسی نے تمہیں وجود دیا اور تمہیں زندگی بخشی ہے تو کیا اس کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس وجود اور زندگی پر حکمرانی کرے؟ جب اس نے تمہیں شعور اور عقل سے نوازا ہے تو کیا اس شعور اور عقل کی حدود مقرر کرنا اور فکری رہنمائی مہیا کرنا اسی کا حق نہیں ہے؟ اگر تم ان باتوں کو مانتے ہو تو پھر تم اس کے سوا کسی اور کے سامنے کیسے جھکتے ہو؟ تم اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی بجائے اپنی مرضی کی زندگی کیوں گزارتے ہو؟ لیکن ان قوموں نے بجائے ان باتوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کے اس سے انکار کا رویہ اختیار کیا اور انہوں نے صاف کہا کہ ہم قانون خداوندی کو نہیں مانتے۔ ہم تو قانون نفس پر چلتے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ ہمارے پروردگار نے عطا کیا ہے' لیکن ہم اس پر کوئی پابندی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ممکن ہے یہ باتیں آپ کو عجیب لگتی ہوں کہ ان باتوں میں بڑی دانش اور بڑی اپیل ہے تو آخر وہ اس دعوت کو قبول کیوں نہیں کرتے تھے۔ لیکن اگر ہم خود اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم اپنی انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک' کس کی راہنمائی میں زندگی گزارتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا رویہ معذب قوموں سے مختلف نہیں کیا ہم اپنی ذات میں شریعت اسلامی کی پابندیوں کو قبول کرتے ہیں اور کیا ہمارے اجتماعی ادارے اللہ کے بھیجے ہوئے قانون کی پیروی کرنے کیلئے تیار ہیں؟ باوجود اس کے کہ ہم اللہ کی حاکمیت کے قائل ہیں' لیکن کیا ہم اپنا تختِ اقتدار اللہ کی شریعت کیلئے خالی کرنے کی زحمت گوارا کر سکتے ہیں؟ پورا عالم اسلام' ان تمام باتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ان تمام باتوں کا انکار کرتا ہے۔ یہی رویہ ان کا بھی تھا۔ بالآخر اسی کی پاداش میں اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے۔

یہاں معلوم ہوتا ہے پروردگار اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ لوگو! اگر تمہیں انبیاء کی دعوت ویسے سمجھ نہیں آتی اور تم اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہو تو یہ بات سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہاری طرح ان قوموں نے بھی اسی طرح کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا تو آج ان کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ کیا ان کی تباہی اور بربادی کی داستانیں اور ان کے کھنڈرات تمہیں سمجھانے کیلئے کافی نہیں ہیں؟ کاش! کوئی ان کھنڈرات پر کھڑا ہو کر اسی طرح ان کی تباہی کے اسباب پوچھ سکتا اور اللہ کے نبیوں کی دعوت کی صداقت و حقانیت کے متعلق بھی ان سے سوال کر سکتا' جیسے آنحضرت ﷺ نے غزوۂ بدر کے بعد مقتولین بدر سے کیا تھا۔ آپ نے ان تمام بڑے بڑے قریش کے سرداروں سے' جن کی لاشیں آپ نے ایک بند کنویں میں پھنکوا دیں تھیں' کنویں کے منڈیر پر کھڑے ہو کر پوچھا تھا کہ اے ابوجہل! اے عتبہ! اے شیبہ اور اے فلاں اے فلاں تمہیں اب تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں تمہیں جو کچھ کہتا تھا' وہ سچ تھا اور تمہارا رویہ غلط تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ حضور ﷺ یہ لوگ تو مر چکے ہیں۔ یہ تو اب کچھ بھی سن نہیں سکتے۔ آپ نے فرمایا: یہ سنتے ہیں' لیکن جواب نہیں دے سکتے۔ یہاں مکذبین کے انجام کی طرف توجہ دلا کر مشرکینِ مکہ سے بھی وہی سوال کیا جا رہا ہے جو ان قوموں اور ان کے رسولوں کے درمیان موضوع بحث اور کشمکش کا عنوان بنا رہا۔ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

آیت:۱۲　قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ O ''ان سے پوچھو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دو! اللہ ہی کا ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت کے دن کی طرف جس میں ذرا شبہ نہیں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے''۔

اللہ کی رحمت کا لازمی تقاضہ ''قیامت کا ظہور ہے'':

معذب قوموں کی تاریخ کا آئینہ مشرکینِ مکہ کے سامنے رکھ کر ان سے سوال کیا جا رہا ہے کہ یہ قومیں جن پر اللہ کا عذاب آیا وہ اللہ کی حاکمیت کو قبول کرنے سے منکر تھیں اور اپنے اختیار اور ارادے کو اللہ کے سامنے سپر انداز کرنے کیلئے تیار نہ تھیں اور اپنی طاقت، حکومت اور خوشحالی پر انہیں اتنا غرہ تھا کہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ کوئی ان کی گرفت نہیں کر سکتا۔ مشرکینِ مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ دیکھو! یہ قومیں عبرت کا سامان بن کے رہ گئی ہیں۔ ان کے کھنڈرات ان کی تباہی کی داستانیں دھراتے ہیں۔ اس آئینہ کو دیکھتے ہوئے اب تم جواب دو کہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک کون ہے؟ اگر وہ قومیں خود اپنی مالک ہوتیں تو اس طرح تباہی کا شکار نہ ہوتیں اور اگر اللہ ہر چیز پر قادر نہ ہوتا اور تمام قوتوں کا مالک نہ ہوتا تو ان خود سر قوموں کو کبھی تباہ نہ کر سکتا۔ کیا تمہیں اب بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی کہ زمین و آسمان کا مالک اللہ کے سوا اور کوئی نہیں؟

قرآن کریم کا یہ سوال افہام و تفہیم کی ایک آخری کوشش بھی ہے اور اتمام حجت بھی ہے کیونکہ مشرکینِ مکہ اگر اس قدر وضاحت اور معذب قوموں کی تاریخ سے واقف ہونے کے بعد بھی سمجھنے کیلئے تیار نہیں اور وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہونا چاہتے ہیں جس سے پہلی قومیں دوچار ہو چکی تھیں تو پھر انہیں اس دن کا انتظار کرنا چاہئے جس دن تمام بڑے بڑے بادشاہ اور حکمران اور تمام جبابرہ و قیاصرہ دم بخود اپنے انجام کی فکر میں کھڑے ہوں گے اور فضا پر اللہ کا جلال برس رہا ہوگا کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ انتہائی سراسیمگی کی حالت میں اچانک ایک پر جلال آواز تمام لوگوں کی قوت سماعت سے ٹکرائے گی:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ ''بتلاؤ آج کس کی حکومت ہے؟''

ظاہر ہے اس کے جواب میں سناٹا اور گہرا ہو جائے گا۔ سینوں میں دل ڈوبنے لگیں گے۔ کسی کو لب ہلانے کی جرأت نہیں ہوگی۔ پھر خود ہی پروردگار جواب دیں گے:

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ''آج! خدائے واحد و قہار کی حکومت ہے'' (المومن:۱۶)

جن لوگوں کو آج اس کی حکومت کا یقین نہیں وہ جب یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور اپنے کانوں سے سنیں گے تو سوائے خون کے آنسو رونے کے اور کچھ نہیں کہہ سکیں گے۔ اس لئے مشرکینِ مکہ پر اتمام حجت کرتے ہوئے ان سے یہ سوال کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے وہ اس کا کیا جواب دیں گے حالانکہ وہ عقیدۃً اس بات کو مانتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کا خالق و مالک اللہ ہی ہے لیکن چونکہ اس کے نتائج اور لوازم کو ماننے سے انکار کر رہے ہیں اس لئے وہ اس کا جواب دینے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اس لئے پروردگار نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپ سبقت کرتے ہوئے خود ہی فرمائیے قُلْ لِّلّٰهِ ''کہہ دیجئے! (آسمانوں اور زمین پر حکومت) اللہ ہی کی ہے''۔

یہاں ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس میں کیا شبہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کا مالک اللہ ہی ہے؟ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ زمین پر بسنے والے اس کے محبوب فرستادہ لوگوں کا نہ صرف انکار کرتے ہیں تمسخر اڑاتے ہیں اذیتیں پہنچاتے ہیں بلکہ ان کی زندگی دشوار کر دیتے ہیں۔ لیکن

Marfat.com

پروردگاران میں سے کسی کو نہیں پکڑتا تاوقتیکہ اجتماعی عذاب نہ آ جائے۔ ان اوباشوں میں سے کسی کے ہاتھ نہیں توڑتا' کسی کو سزا نہیں دیتا۔ سوچنے والا سوچ کررہ جاتا ہے کہ آخر یہ کیا ہے' اگر چند لوگ اپنے انجام کو پہنچیں تو شاید باقیوں کے ہوش ٹھکانے آ جائیں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جارہا ہے

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ "اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کرلی ہے"

قوموں کے مجرمانہ رویئے' اللہ کے قانون اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ ظالمانہ طرز عمل کا نتیجہ تو یہی ہونا چاہئے کہ انہیں فوراً اس کی پاداش میں پکڑ لیا جائے۔ قومیں بھی اس عذاب کا شکار ہوں اور اس اجتماعی عذاب سے پہلے افراد بھی فرداً فرداً اسی بھٹی میں ڈالے جائیں۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مکافاتِ عمل کے اس قانون کا نتیجہ تو یہی ہونا چاہئے' لیکن اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کرلی ہے۔ اس لئے وہ مکافاتِ عمل کے قانون کو رحمت کی چھلنی میں چھاننے کے بعد کام کرنے کا موقع دیتا ہے یعنی ایسی مکذب قوموں کے رویے کی سزا تو یہی ہونی چاہئے۔ لیکن اس کی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ جس طرح ایک پودا بیماری کا شکار ہوتا ہے تو اسے فوراً موت کے حوالے نہیں کردیا جاتا بلکہ اس کے باغبان کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ علاج کے ذریعے اسے بچالے۔ کوئی آدمی بیماری کی گرفت میں آتا ہے تو فوراً اس کا آخری وقت نہیں آجاتا بلکہ بیمار کو سنبھلنے' علاج کرانے اور صحت کی تدابیر کو بروئے کار لانے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی فرد یا قوم بداعمالیوں کا شکار ہوتی ہے یا تکذیب کی راہ پر چل نکلتی ہے تو فوراً اس کو سزا نہیں دی جاتی بلکہ اسے بھی سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ایک جگہ پروردگار نے فرمایا کہ اگر لوگوں کی بداعمالیوں پر اللہ تعالیٰ فوراً گرفت فرماتا تو زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا باقی نہ رہتا کیونکہ کون ہے' جو کسی نہ کسی بدعملی کا شکار نہیں ہوتا؟ لیکن یہ اس کی رحمت کا تقاضہ ہے کہ اس نے یہاں نباتات' حیوانات اور انسانوں میں بھی ایک تاجیل کا قانون مقرر کردیا ہے کہ یہاں ہر ایک کو موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرے۔ مگر جب وہ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور وہ اجل آ پہنچتی ہے' جو اس کی مہلت کی آخری حد ہے تو پھر اس کو مزید موقع نہیں دیا جاتا۔ یہاں بھی اسی قانون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اگر ابھی تک اللہ کے عذاب سے بچے ہوئے ہیں تو صرف اس لئے کہ اللہ کی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ انہیں مہلت دی جائے۔ شاید یہ اپنے آپ کو سنبھال لیں۔ لیکن جب یہ مہلت ختم ہوجائے گی تو پھر اللہ کے عذاب سے انہیں کوئی نہیں بچاسکے گا۔

پیغمبر کی دعوت کے نتیجہ میں ہمیشہ دو گروہ وجود میں آتے ہیں:

جس طرح اس کی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی بھی مجرم کو جلد سزا نہ دی جائے بلکہ اسے پورا سنبھلنے کا موقع ملنا چاہئے۔ اسی طرح اس کا تقاضہ ایک اور بھی ہے، وہ یہ کہ اس دنیا میں خیر وشر کی ایک کشمکش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خیر کی بالادستی کیلئے' اپنے پیغمبر اور رسول بھیجے۔ ان کی تبلیغ اور دعوت کے نتیجے میں ہمیشہ دو جماعتیں پیدا ہوتی رہیں۔ ایک جماعت' جنہوں نے اللہ کی دعوت کو قبول کیا اور اپنی زندگی کو اللہ کے احکام کے مطابق مقدور بھر گزارنے کی کوشش کی اور پھر اس دین کی بالادستی کیلئے انہوں نے امکانی مساعی کو بروئے کار لاتے ہوئے جو ان سے ہوسکتا تھا انہوں نے کیا۔ اس راستے میں مال بھی لٹایا' پسینہ بھی بہایا' بچوں کا مستقبل بھی قربان کیا' اگر ضرورت پڑی تو جان بھی نچھاور کردی۔ دوسری جماعت' خیر کی بالادستی کی مخالف اور پیغمبروں کی دعوت کی دشمن بن کر اٹھتی ہے اور وہ اپنی زندگی میں کوئی بھی تبدیلی قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ وہ جیسے جیسے اس دعوت کے نفوذ کو دیکھتے ہیں' ان کا غصہ بھڑکتا ہے اور وہ پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو اذیتوں کا نشانہ بناتے ہیں' جو ان سے بڑا سے بڑا ظلم ممکن ہوتا ہے وہ کر گزرتے ہیں۔ بعض دفعہ ان کو ملک سے نکلنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ بس چلے تو ان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اب سوال یہ ہے کہ خیر وشر کی اس کشمکش میں' ایک نے ظلم کیا' دوسرے نے ظلم سہا۔ ایک

Marfat.com

نے دکھ دیا' دوسرے نے دکھ اٹھایا۔ ایک نے درندگی کی' دوسرا درندگی کا نشانہ بنا۔ ایک نے عزت لوٹی' دوسرے کی عزت لٹی۔ ایک نے قتل کیا' دوسرا مقتول ہوا۔ اگر اس کائنات میں یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے تو سوال یہ ہے کہ خیر کی بالادستی کیلئے پھر کون قربانی دیئے' پسینہ بہانے' مال لٹانے اور جاں فروشی کیلئے تیار ہوگا؟ وہ دیکھے گا کہ اس دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ عموماً خیر کی قوتیں ناکام ہو جاتی ہیں کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔

خیر و شر کی کشمکش سے قطع نظر بھی' اگر صرف عام انسانی زندگی کو دیکھا جائے تو اس میں بھی ہم آئے دن حوادث کا سامنا کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کا گھر لٹ رہا ہے۔ کسی کا بیٹا اندھی گولی کا نشانہ بن رہا ہے۔ کسی کا سہاگ اجاڑا جا رہا ہے۔ کسی کی جان لی جا رہی ہے۔ یہ لوگ وقت کے قانون کو پکارتے ہیں' لیکن بالعموم شنوائی نہیں ہوتی۔ اگر کبھی ہوتی بھی ہے تو ضروری نہیں کہ مجرم پکڑا جائے اور جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے' اس کی اشک شوئی کا سامان ہو سکے۔ مثال کے طور پر ایک خاتون جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اسی کی دیکھ بھال اور پرورش کیلئے وہ اپنے آپ کو وقف کر دیتی ہے۔ لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے' برتن مانجھتی ہے' لوگوں کے کپڑے دھوتی ہے' زندگی کا ہر دکھ اٹھاتی ہے تاکہ وہ اپنے بچے کو پال سکے۔ حتیٰ کہ اللہ کے کرم سے بچہ جوان ہو جاتا ہے۔ محنت مزدوری کر کے گھر کی ضروریات کو پورا کرنے لگتا ہے۔ ماں کی خوشیوں کا اب کوئی ٹھکانہ نہیں' وہ اللہ کا شکر ادا کرتی ہے کہ اسے لوگوں کے گھروں کی محنت کی ذلت سے نجات ملی۔ اچانک ایک دن اس کا بیٹا کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اس خاتون کی نگاہوں میں دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ اب اسکے سوا اس کیلئے کوئی چارہ نہیں کہ لوگوں سے جا جا کر فریاد کرے' پولیس تھانوں کے پھیرے لگائے' عدالتوں کے چکر لگائے' شاید اس کے بیٹے کے قاتل کو سزا مل سکے اور اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ لیکن ایک دن پولیس اسے یہ کہہ کر کیس داخل دفتر کر دیتی ہے کہ ہم نے ہر چند کوشش کی' لیکن تمہارے بیٹے کا قاتل ہم تلاش نہ کر سکے۔ سوال یہ ہے کہ یہ خاتون جب راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ شکایت کرے گی

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

تو اس کا جواب کون دے گا؟ یہ ایک اندوہناک کہانی اس ماں کی ہے' جس کے بیٹے کا قاتل پکڑا نہیں جا سکا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اذیتناک کہانیاں اور بھی ہیں کہ کسی بدبخت نے کہیں بم پھینکا' سینکڑوں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے۔ کسی دہشت گرد نے پٹڑی اکھاڑ دی' سینکڑوں لوگ حادثے کا شکار ہو گئے یا کسی بڑی طاقت کے ظالم حکمران نے کسی چھوٹے ملک کے کمزور باسیوں کو موت کا نشانہ بنایا اور یہ سارے قاتل پکڑے بھی گئے۔ ظالم حکمران کو تو خیر کون سزا دے گا؟ لیکن دہشت گرد اگر سزا پا بھی لے تو کون سی عدالت ہے' جو ایک دہشت گرد سے سینکڑوں جانوں کا بدلہ لے سکے۔ اس کے پاس تو صرف ایک جان ہے۔ صرف وہی جان چھینی جا سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ دنیا اندھیر نگری ہے' یہاں کسی ظالم کے ظلم کی سزا نہیں۔ کسی بڑے ظالم کو پکڑا نہیں جا سکتا' کسی سینکڑوں جانیں لینے والے دہشت گرد سے ایک جان کے سوا اور جان نہیں لی جا سکتی؟ اگر اللہ نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے تو کیا اس کی رحمت کا تقاضہ نہیں کہ وہ جس طرح ان مجرموں کو قرار واقعی سزا دے' اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کے راستے میں قربانیاں دی ہیں' تکلیفیں اٹھائی ہیں' بعض دفعہ سر کٹوایا' ان کی خدمتوں اور قربانیوں کا صلہ دے؟ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پروردگار نہ رحمٰن ہے' نہ رحیم ہے۔ اس لئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے۔ اس کی رحمت کا تقاضہ یقیناً یہی ہے کہ اس کے جاں نثار نوازے جائیں اور مجرم اپنے انجام کو پہنچیں۔ لیکن اس کیلئے اس دنیا کی وسعتیں کافی نہیں۔ اس کے لئے ایک اور دنیا بسانی ہوگی اور وہاں پوری طرح اللہ کی صفت رحمت کا ظہور ہوگا۔ اس لئے فرمایا

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ''وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا' قیامت کے دن کی طرف' جس میں ذرا شبہ نہیں ہے''۔

Marfat.com

یہ رحمت کے ذکر کے بعد قیامت میں جمع کرنے کا تذکرہ' اسی حوالے سے ہے کہ رحمت کا لازمی تقاضہ قیامت کا وجود ہے کیونکہ یہی وہ دن جس میں پیغمبروں سے لے کر عام صالحین تک' اپنی اپنی قربانیوں اور خدمتوں کا صلہ پائیں گے بلکہ ایک حدیث کے مطابق' جب اس راستے پر چلنے والوں کو ان کی تکلیفوں کا صلہ ملے گا تو وہ تمنا کریں گے کہ کاش! ہماری کھالیں' قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں۔ اسی طرح' ہر چھوٹا بڑا مجرم اپنے انجام کو پہنچے گا۔ جس نے جتنی جانیں لی ہوں گی' اسے اتنی دفعہ جان دینے کے دردناک انجام سے دوچار کیا جائے گا۔ جب اسے جہنم میں جلایا جائے گا اور اس کی کھال جل کر جھڑ جائے گی تو اسے نئی کھال پہنا دی جائے گی اور ہر دفعہ اسے نئی اذیت سے گزرنا ہوگا۔

اللہ ہر خیر و شر کے کام کی مکمل جزا و سزا دے گا:

بات اگرچہ طویل ہوتی جا رہی ہے' لیکن جی چاہتا ہے کہ پروردگار کی رحمت کا ایک اور پہلو آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ وہ یہ کہ ہم لوگ اپنے علم کی کوتاہی کے باعث صرف اتنا جانتے ہیں کہ جب ایک آدمی کوئی جرم کرتا ہے تو اس جرم کی فوری سزا اسے ملنی چاہئے۔ اسی طرح جب کوئی آدمی کوئی بھلائی کرتا ہے یا کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیتا ہے تو اسے فوری طور پر کسی انعام سے نوازا جانا چاہئے۔ لیکن یہ بات ہمارے تصور میں کبھی نہیں آتی کہ ہم اس دنیا میں اس بات کا بالکل اندازہ نہیں کر سکتے کہ وقتی طور پر ہونے والا جرم' کیا کیا وسعتیں رکھتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے نتائج کس قدر وسعت پذیر ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی نے قتل کیا۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس نے ایک آدمی کی جان لی اور اگر وہ شخص صاحب اولاد تھا تو اس نے ایک گھر کو ویران کیا اور بچوں کو یتیم بنا کر لاوارث کر دیا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہونے والا ہے' ہم اس سے بالکل بے خبر ہیں حالانکہ ہمارے مشاہدے کی بات ہے کہ جو عورت شوہر کے قتل ہونے کے بعد بیوہ ہو گئی۔ بہت امکان ہے کہ وہ حالات کے دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکے اور کسی غلط راستے پر چل نکلے۔ بچے جب یتیم ہو گئے' اس کا قوی امکان ہے کہ وہ تعلیم نہ حاصل کر سکیں' مناسب تربیت نہ ہونے کے نتیجے میں وہ بگاڑ کا شکار ہو جائیں اور معاشرے کیلئے ان کا وجود ایک مصیبت کا باعث بن جائے۔ ایک شخص نے ان کے باپ کی جان لی تھی۔ یہ اس عمل کے نتیجے میں اگر بگاڑ کا شکار ہوتے ہیں تو نجانے کتنے لوگوں کی جانیں لیں گے۔ ان کے باپ کے قاتل نے ایک گھر اجاڑا تھا۔ لیکن یہ بچے بدراہ ہو کر نجانے کتنے گھر اجاڑیں گے۔ پھر اگر یہ تفکر و تدبر کا سفر جاری رکھا جائے تو یہ آئندہ چل کر اجڑنے والے گھر' وہاں بگڑنے والے بچے اور بیوہ ہونے والی عورتیں' نجانے وقت کے ساتھ ساتھ کتنے معاشروں کی تباہی کا باعث بنیں گی اور اسکے نتائج کہیں جا کر میں تبدیل ہوں گے بھی یا نہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اللہ کے علم میں مستقبل کی چونکہ پوری تصویر موجود ہے۔ اسلئے اسکے علم کے مطابق' جس آدمی نے کسی کو قتل کر کے آئندہ دور تک بگاڑ اور مسائل کا جو سلسلہ جنم دیا' ہونا یہ چاہئے کہ پروردگار اپنے علم کے مطابق صرف اس سے قصاص لینے کا حکم نہ دے' بلکہ اس کیلئے جہنم کی دائمی سزا رکھے۔ کیونکہ ایک ایسا عمل' جس نے غیر متناہی تباہی کا راستہ کھولا ہے' اس کی سزا بھی غیر متناہی ہونی چاہئے۔ لیکن آپ اللہ کی رحمت کا اندازہ فرمائیں کہ وہ قاتل کو اس بات کا موقع دیتا ہے کہ وہ قصاص میں قتل ہونے سے پہلے پہلے اگر اخلاص سے توبہ کر لیتا ہے تو اسکا قصاص میں قتل ہونا اس کیلئے ایک مکمل سزا بن جائے گا اور آخرت میں عین ممکن ہے کہ اللہ کے یہاں وہ مغفرت کا سزاوار ٹھہرے۔

بالکل اسی طرح ایک آدمی جب کوئی بھلائی کرتا ہے تو ہم اس کا صلہ وقتی طور پر دے کر اس کا حق نبٹا دینا چاہتے ہیں حالانکہ برائی کی طرح' بھلائی بھی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھا' اس بے سہارا کو سہارا دیا' اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کر کے معاشرے کا ایک کارآمد فرد بنایا' عین ممکن ہے آئندہ چل کر یہ بے سہارا لڑکا بہت سے بے سہارا لوگوں کا سہارا بن جائے۔ اسی طرح کوئی بھی آغاز کیا جانے والا نیا کام' بظاہر ایک ذرے کی حیثیت رکھتا ہے اور شاید اس کی افادیت ایک دانے جتنی بھی نہ ہو۔ لیکن جس طرح ایک دانہ سات سو دانوں میں تبدیل ہوتا ہے اور ایک ذرہ' صحرا کی وسعت

Marfat.com

پھیل جاتا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر نیک کام کو جسے اخلاص سے شروع کیا جائے ایسی وسعتیں عطا فرماتا ہے کہ جس کا اندازہ کرنا لمحۂ موجود میں ممکن نہیں ہوتا۔مثلاً دارالعلوم دیوبند کا آغاز ایک انار کے درخت کے نیچے ایک استاد اور ایک طالب علم سے ہوا تھا۔لیکن ہماری تاریخ میں اس کی جو خدمات اور کارنامے ہیں' تاریخ اس سے ہمیشہ گراں بار رہے گی۔علی گڑھ کی ابتداء ایک سکول سے ہوئی تھی۔لیکن وہ بڑھتے بڑھتے ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا اور پھر اس سے نکلنے والے لوگوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی۔ایسی بے شمار مثالیں ہیں' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک معمولی نیک کام' ایک بہت بڑے خیر کا خیمہ بن جاتا ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت بے کراں کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ پروردگار ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک صلہ قیامت کے دن عطا فرمائیں گے اور وہ صلہ دنیا میں اس کے محدود آغاز کے حوالے سے نہیں ہوگا۔بلکہ اس نے اپنی تمام وسعتوں سمیت جو آخری شکل اختیار کی ہوگی' اس کی نسبت سے اس کو بدلہ دیا جائے گا تو صلہ لینے والا خود حیران ہوگا کہ میرے نامہ عمل میں تو ایسا کوئی عمل نہ تھا' جس سے میں اتنا نوازا جاتا۔تب اسے معلوم ہوگا کہ راہِ حق میں تیرا دیا ہوا ایک ایک پیسہ اور اس راستے میں بہنے والے پسینے کا ایک ایک قطرہ' آج اجر و ثواب کے پہاڑ اور سمندر میں تبدیل ہو چکا ہے اور وہی ہے' جس کو آج تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا وہ پہلو ہے' جو بالعموم انسانی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ''جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے''۔اس آیت کریمہ میں ایک دفعہ پھر تدبر فرمایئے کہ پہلے علم و دانش کی روشنی میں اور اس کے بعد تاریخ کے آئینے میں' اللہ تعالیٰ کی صفت حاکمیت کو واضح فرما کر یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ کی شریعت کے مطابق زندگی گزارنا اور اللہ کی حاکمیت کے تقاضوں کو بروئے کار لانا' یہ علم و دانش اور تاریخ کی وہ شہادت ہے' جس سے انکار ممکن نہیں۔لیکن مشرکینِ مکہ اس کو سمجھنے کی بجائے الٹے رخ پر سفر کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے کرتوت تو اس قابل ہیں کہ ان پر اللہ کا عذاب آ جائے' لیکن وہ صرف اس لئے ٹلا ہوا ہے کہ اللہ کی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ انہیں مزید سنبھلنے کا موقع دیا جائے۔لیکن اگر اب بھی وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کیلئے تیار نہیں ہیں تو پھر انہیں سوچ لینا چاہئے کہ وہ گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں۔اس کا احساس انہیں اس وقت ہوگا جب وہ قیامت کو اپنے سامنے پائیں گے۔لیکن تب انہیں اس احساس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

قیامت اور آخرت کے منکرین کو جو اشتباہات رہے ہیں۔ان میں سے بعض کا تعلق تو اللہ کی بے پایاں قدرت سے ہے۔اس کا ذکر تو اس آیتِ کریمہ میں ہو گیا۔لیکن بعض اشتباہات کا تعلق' اس بات سے ہے کہ انہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ چلیئے اگر مان بھی لیا جائے کہ تمام دنیا کو ایک دفعہ فنا کر دیا جائے گا اور پھر دوبارہ اسے زندہ کیا جائے گا۔ایک میدان حشر ہوگا' جس میں سب جمع ہوں گے اور حساب کتاب کے مرحلے سے گزریں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ایک ایک آدمی کے اعمال کی خبر کیسے ہوگی۔اربوں' کھربوں مخلوق میں' ایک ایک آدمی اپنی زندگی میں کروڑوں اعمال کرتا ہے۔اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پوری دنیا کے اعمال کی تعداد کہاں تک پہنچے گی کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایک آدمی کا اعمال نامہ پوری طرح محفوظ ہو اور اسکے اندھیرے اجالے کے تمام اعمال کا علم ہر لحاظ سے مکمل ہو؟ یہ وہ بات ہے جسکا سمجھ میں آنا آسان نہیں۔چنانچہ اسی حوالے سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔

آیت:۱۳ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ O ''اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے' جو چیز شب میں ساکن ہوتی ہے اور جو دن میں متحرک ہوتی ہے۔وہ سمیع و علیم ہے''۔

یعنی لوگوں کو یہ شبہ ہے کہ ایک ایک آدمی کے عمل سے اللہ تعالیٰ کیسے باخبر ہو سکتے ہیں؟ اس لئے انہیں بتایا جا رہا ہے کہ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ شب کی تاریکیوں میں جو چیز ساکن ہوتی ہے اور دن کی روشنی میں جو چیز بھی متحرک ہوتی ہے' سب اللہ ہی کے اختیار' اسی کے قبضۂ قدرت اور اسی کے

Marfat.com

کنٹرول میں ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکے اور اس کے اذن کے بغیر اپنی جگہ سے سرک سکے۔ رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں اس کے لئے یکساں ہیں۔ وہ ہر جگہ سے سب کو اکٹھا کر دے گا اور جس طرح اس کی قدرت سب پر محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس لئے کہ وہ سمیع وعلیم ہے۔ صحرا میں کوئی پتہ گرتا ہے تو وہ اس کی آہٹ سنتا ہے۔ دل و دماغ میں خیال کی کوئی لہر اٹھتی ہے تو وہ اسے جانتا ہے۔ انسانی دماغ چونکہ اس کے علم کی وسعتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا اس لئے عجیب وغریب شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

پروردگار عالم کی قدرت کی ہمہ گیری اس کے علم کی بے انتہاء وسعت اور اس کی رحمت بے کراں کا مدلل ذکر فرمانے کے بعد آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے لوگوں کے سامنے ایک سوال رکھا جا رہا ہے جو بیان کردہ صورتحال کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

آیت: ۱۴ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ O ''کہو! کیا میں اللہ کے سوا جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں؟ اور وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں۔ کہہ دو! مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور تم ہرگز مشرکوں میں سے نہ بنو''۔

سوال یہ کیا جا رہا ہے کہ تم اس بات کو مان چکے ہو کہ آسمانوں اور زمین کا مالک اور حاکم حقیقی صرف اللہ ہے اور یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ رات اور دن کی تاریکی اور روشنی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اس کی گرفت میں ہے۔ ہر چیز اس کے قبضہ اختیار میں ہے۔ وہ انسانوں کے ایک ایک عمل اور ایک ایک احساس سے واقف بھی ہے اور ان پر پوری طرح اختیار بھی رکھتا ہے اور مزید یہ کہ یہ بات بھی تم مان چکے ہو کہ انسانی زندگی اس کی بقا کے سامان اس کا رزق اس کے احساسات اس کی توانائیاں سب کچھ اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ یعنی ہم صرف اس کی مخلوق ہی نہیں بلکہ اس کے محکوم اور اس کے ممنون احسان بھی ہیں۔ پوچھا یہ جا رہا ہے کہ جب تم یہ سب کچھ تسلیم کرتے ہو اور میں تمہیں جس بات کی دعوت دے رہا ہوں وہ انہی مسلمات کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ کسی ذات کو حاکم تسلیم کرنا اور پھر محکومیت سے انکار کرنا کسی کو اپنا مالک سمجھنا اور مملوکیت سے منحرف ہو جانا کسی کو رازق جاننا اور اس کے رزق کے تقاضوں کو پورا نہ کرنا یہ وہ تضاد ہے جس کی نہ کوئی قانون اجازت دے سکتا ہے اور نہ اخلاق اس کی توجیہ کر سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ جب صورت حال یہی ہے جو میں نے بیان کی تو پھر کیا میں اس اللہ کو جسے میں حاکم حقیقی رازق حقیقی محسن حقیقی اور رحیم و کریم ذات کے طور پر مانتا ہوں کیا میں اسے چھوڑ کر کسی اور کو اپنا ولی بنا لوں؟ یعنی میں یہ سمجھوں کہ اس کے سوا میرا اور کوئی ہمدرد و غمگسار کوئی اور پالنے والا اور کوئی اور میرا کارساز ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص بھی ان مقدمات پر غور کرے گا جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں تو وہ کبھی اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا کہ ایسا کرنا کسی طرح بھی مناسب ہے۔ پھر اس سوال کی حقانیت کو مزید واضح کرنے کیلئے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔

ایک یہ کہ وہ صرف تمہارا ہی خالق نہیں وہ تمام آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور تم جانتے ہو کہ تمہاری زندگی اسی زمین و آسمان کی کارفرمائی کی مرہون منت ہے۔ تم جو غذا کھاتے ہو اس کا ایک دانہ اس وقت تک اگ نہیں سکتا جب تک زمین اپنی روئیدگی کے خزانے صرف نہیں کرتی اور وہ اس وقت تک برگ و بار نہیں لا سکتا جب تک موسموں کے تغیرات بادلوں کی کرم فرمائیاں ہواؤں کی چارہ جوئیاں سورج اور چاند کی مہربانیاں پوری طرح بروئے کار نہیں آتیں۔ اس سے اندازہ کرو کہ جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے تم اس کی عنایات کے کس قدر حصار میں ہو۔ تو کیا یہ سب کچھ دیکھ کر بھی تم اسے چھوڑ کر کسی اور کو کارساز بناؤ گے؟

دوسری بات یہ فرمائی کہ وہ تمہیں کھلاتا ہے خود نہیں کھاتا یعنی وہ تمہارا رب ہے اور اس کی ربوبیت صلب پدر سے لے کر شکم مادر تک اور پھر مہد

Marfat.com

سے لے کر لحد تک مسلسل تمہاری نمود و پرداخت کا فرض انجام دیتی ہے۔ اس کی نگرانی کی نگاہ اگر ذرا تم سے تغافل برتے تو تم اپنے بچپنے کی بے بسی کے نذر ہو جاؤ اور اس کے عطا کردہ حواس و عقل، تم سے اگر چھین لئے جائیں تو تم جیتے جی ذلت اور حرماں نصیبی کا پیکر بن جاؤ تو کیا یہ ربوبیت کا فیضان، جو ہر وقت تمہیں اپنی آغوش میں لئے رہتا ہے، اس کو نظر انداز کر کے تم کسی اور کو اپنا کارساز بنا لو گے؟ یہ وہ سوالات ہیں، جو آنحضرت ﷺ کے واسطے سے نوع انسانی کے سامنے رکھے جا رہے ہیں۔

ربوبیت کے اس حوالے کے ساتھ ساتھ ایک تعریض بھی ہے کہ وہ کھلاتا ہے، خود نہیں کھاتا یعنی جو ذات تمہیں کھلاتی ہے، اس کے تم شریک ٹھہراتے ہو اور اس کی اطاعت سے انکار کرتے ہو اور نادانی کی انتہا ہے کہ ان قوتوں کے سامنے جھکتے ہو اور ان بتوں کو سجدے کرتے ہو، جنہوں نے نہ کسی چیز کو پیدا کیا اور نہ وہ تمہیں کھلانے پلانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جن بتوں کے سامنے تم سر جھکاتے ہو، تم ان کے کھانے پینے کیلئے ان کی خدمت میں حلوہ اور پوڑیوں کی نیازیں پیش کرتے ہو اور نجانے کن کن نعمتوں کے چڑھاوے چڑھاتے ہو اور تمہارا تصور یہ ہے کہ وہ ان کھانوں کی خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے کھانے پینے میں تمہارے محتاج ہیں۔ اسی طرح جن بڑے لوگوں کو تم نے تخت ربوبیت پر فائز کیا، انہوں نے خود تمہیں کیا دیا۔ الٹا تم نے ان کیلئے تخت ربوبیت بچھایا کیونکہ کوئی فرعون یا نمرود، دنیا میں خدائی کے ٹھاٹ نہیں جما سکتا، جب تک اس کے نام نہاد بندے، اسے ٹیکس اور نذرانے نہ دیں۔ اس طرح کسی صاحب قبر کی شان معبودیت قائم نہیں ہو سکتی، جب تک اس کے پرستار، اس کا شاندار مقبرہ تعمیر نہ کریں۔ کسی دیوتا کا دربار خداوندی سج نہیں سکتا، جب تک اس کے پجاری اس کا مجسمہ بنا کر کسی عالی شان مندر میں نہ رکھیں اور اسے تزئین و آرائش کے سامانوں سے آراستہ نہ کریں۔ سارے بناوٹی خدا بیچارے خود اپنے بندوں کے محتاج ہیں۔ صرف ایک خداوند عالم ہی وہ حقیقی خدا ہے۔ جس کی خدائی آپ اپنے بل بوتے پر قائم ہے اور جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اللہ بھی تو اپنے نام پر قربانیاں دینے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ ہم سال بہ سال اس کے نام پر قربانی دیتے ہیں اور مختلف وقتوں میں، حسب توفیق اس کی رضا کیلئے جانور ذبح کرتے ہیں تو یہ بھی تو اس کو کھلانے کی ایک صورت ہوئی۔ یہ سراسر کم فہمی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی صدقات کا حکم دیا ہے، وہاں انسانی ضرورتوں کا حوالہ بھی دیا ہے اور ساتھ ہدایات بھی جاری فرمائی ہیں کہ دیکھنا! ان صدقات سے غریبوں کو فائدہ پہنچانا اور مستحقین کو کھلانا۔ غیر مستحق لوگوں کو ہرگز نہ دینا اور اپنے بارے میں بطور خاص فرمایا کہ تم جو قربانی دیتے ہو، اللہ کو اس کا گوشت پوست نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دلوں کا تقویٰ اس تک پہنچتا ہے۔ یعنی وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ تم جو مخلوقِ خدا کی خدمت کرتے ہو اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہو، یہ ان پر احسان دھرتے ہو یا یہ سب کچھ اللہ کی رضا کیلئے کرتے ہو۔ چنانچہ یہ حصول رضا کا تصور اور صرف اسی کو خوش کرنے کی فکر، یہ وہ تقویٰ ہے جو اللہ کو مطلوب ہے اور یہ اصلاً ذریعہ ہے، جس کے نتیجے میں اعمال صحیح صورت اختیار کرتے ہیں۔

سوال کو بہمہ وجوہ پوری گہرائی کے ساتھ ذکر فرمانے کے بعد، جواب کی ذمہ داری مخاطبوں پر ڈال دی گئی ہے۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ مشرکینِ مکہ اس کا کیا جواب دیں گے کیونکہ گزشتہ کئی سالوں کی تبلیغ و دعوت کے نتیجے میں ان سعادت مندوں کے سوا، جو ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہوئے، باقی لوگوں نے سوائے ضد اور ہٹ دھرمی یا دشمنی اور شقاوت کے، کسی بات کا اظہار نہیں کیا۔ اس لئے ان سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ اس کے سوال کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے، اپنے غلط رویے سے تائب ہو کر ایمان کا راستہ اختیار کریں گے۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ اپنے مشرکانہ رویے کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ تم اگر اپنے رویے سے نہیں رک رہے ہو تو تم جانو اور تمہارا خدا جانے

Marfat.com

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ

''کہہ دیجئے! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں''

اور اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کردوں' سو میں تو اسی کے حکم کی تعمیل کروں گا' تم میں سے کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے۔ آیت کے اس حصے سے ہمیں دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ اللہ کے پیغمبر کو تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں چاہے کیسے ہی نامساعد حالات سے واسطہ پڑے' وہ کبھی بھی حالات سے متاثر ہو کر' اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں کمی نہیں آنے دیتا۔ مخالفتوں کا بڑے سے بڑا طوفان بھی' اس کے عزم اور اس کی یکسوئی میں کبھی فرق پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہاں بھی اسی عزم و ہمت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تم جو کر سکتے ہو کرو' میں تو اللہ کے حکم کی تعمیل میں کبھی کمی کرنے کو تیار نہیں۔

دوسری بات' جو ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسانی اصلاح کیلئے پیغمبروں کی طرح بعض دوسرے لوگ بھی محنت کرتے ہیں۔ ان میں بھی مصلحین ہیں' شعراء' مصنفین' وعظ کہنے والے اور نصیحت کرنے والے بھی ہیں' ذکر کی مجلسیں قائم کر کے تزکیے کا کام کرنے والے بھی ہیں۔ لیکن ان تمام میں بالعموم ایک بات دکھائی دیتی ہے کہ یہ جس بات کی دعوت دیتے ہیں' عموماً خود ان کا عمل اس کی مکمل تصویر نہیں ہوتا۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ ان کا عمل اپنی دعوت کے بالکل برعکس ہو کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی دعوت میں مخلص نہیں ہیں۔ یہاں جو بات کہنی ہے' وہ یہ ہے کہ پوری طرح ان کا عمل' ان کی دعوت کا عکاس نہیں ہوتا۔ ان کی کمزوریاں' ان کی دعوت کے باوجود' ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ وہ ہر چند کوشش کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو بہتر طور پر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ لیکن کبھی وہ اس میں کامیاب ہوتے ہیں' کبھی نہیں ہوتے۔ اللہ کے عظیم بندے جن کو ہم اولیاءِ کرام کے نام سے جانتے ہیں' وہ تو بہت حد تک اپنی دعوت کی تصویر ہوتے ہیں۔ لیکن عام طور پر دوسرے مصلحین' وہ اپنی دعوت کے ترجمان تو ہوتے ہیں' لیکن پوری طرح نمونہ نہیں ہوتے۔

ہماری قریبی تاریخ میں جن لوگوں نے ایک وسیع سطح پر مسلمانوں کے دل و دماغ پر اثر ڈالا' ان میں علامہ اقبال کا نام بڑا محترم ہے۔ اقبال ایک نہایت قابل قدر اور قابل احترام شخصیت ہیں۔ میں ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہوں اور جو انہوں نے کام کیا ہے' دل کی گہرائی سے اس کا قدردان ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بہت نیک آدمی تھے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی اپنی زندگی' ان کی دعوت کی تصویر نہیں تھی۔ وہ مسلمان نوجوانوں کو جہد مسلسل اور عمل پیہم کی تصویر دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ ہر مسلمان نوجوان' ستاروں پر کمندیں ڈالے۔ ہر نوجوان کی جوانی بے داغ' ضرب کاری اور اس کے عزم کی توانائی راستے کی بڑی سے بڑی صعوبت کو پگھلا کر رکھ دے اور اس امت کا ہر چھوٹا بڑا آدمی' اپنے آپ کو اللہ کا آخری پیغام جانے۔ ان کی یہ تمام باتیں' ان کے اخلاص کی دلیل ہیں۔ لیکن ان کی ذاتی زندگی نہایت ڈھیلی ڈھالی' آسانیوں میں ڈھلی ہوئی اور اضمحلال کا شکار تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ آپ مسلمان قوم کو جس بے پناہ قوت کا درس دیتے ہیں' خود آپ کی زندگی میں تو وہ دکھائی نہیں دیتا؟ انہوں نے جواب میں نہایت سچی بات فرمائی کہ آدمی جو بات کہے' خود اس پر عمل بھی کر کے دکھائے' یہ شان تو صرف پیغمبروں کی ہے' ورنہ عام طور پر کہنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں اور عمل کرنے والے اور ہوتے ہیں۔

چنانچہ اسی سچائی کی تائید میں فرمایا جا رہا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں یعنی میرا کام صرف دعوت دینا نہیں بلکہ میں اپنی دعوت کا نمونہ بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت اس دعوت پر عمل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود' میں اس کے مطابق زندگی گزار کے دکھاؤں گا تا کہ بعد میں لوگ اس نمونے سے فائدہ اٹھا سکیں اور یہ معلوم ہو سکے کہ ایک پیغمبر کی زندگی میں اور دوسرے لوگوں

Marfat.com

کی زندگی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی پوری زندگی اس بات کی تصویر ہے کہ آپ نے جس بات کا حکم اپنی امت کو دیا' اس پر نہ صرف خود عمل کر کے دکھایا بلکہ اصل حکم سے بھی بڑھ کر عمل کر کے دکھایا۔ مثال کے طور پر آپ نے امت کو پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا اور خود ہمیشہ آٹھ نمازیں پڑھیں۔ آپ نے امت پر زکوٰۃ فرض فرمائی اور باقی مال کو امت کیلئے حلال وطیب ٹھہرایا' لیکن خود اپنے گھر میں مال رکھنے کو کبھی پسند نہ فرمایا' جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کبھی آپ پر زکوٰۃ فرض نہ ہو سکی۔ جو آیا اور جتنا آیا' اس کو اللہ کے راستے میں لٹا دیا۔ مختلف علاقوں کے فتح ہو جانے کے بعد اسباب اور غلے کے اونٹ لدے ہوئے آتے' لیکن آپ اس وقت تک گھر نہ جاتے' جب تک اہلِ مدینہ میں انہیں تقسیم نہ فرما دیتے۔ اسی طرح بعض دفعہ خزانے تک آئے' لیکن آپ نے اس کا ایک ایک درہم مسلمانوں میں تقسیم فرما دیا۔ لوگوں کو دنیا اور دولت دنیا سے بے رغبتی کا حکم دیا اور خود اپنا عمل یہ تھا کہ نماز عصر کے فوراً بعد گھر تشریف لے گئے' تھوڑی دیر کے بعد واپس تشریف لائے تو لوگوں کو حیران دیکھ کر فرمایا کہ میں اس لئے چلا گیا تھا کہ مجھے یاد آیا کہ میرے بستر پر چند اشرفیاں پڑی رہ گئی تھیں' میں نے سوچا کہ کیا خبر کس وقت اللہ کی طرف سے بلاوا آ جائے تو کیا میں اس طرح اللہ سے ملوں گا کہ میرے گھر میں دنیا کا مال پڑا ہوا ہوگا۔ ظفر علی خاں نے ٹھیک کہا تھا

قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا اور تین دن سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر اپنا یہ حال کہ ہے چولہا بجھا ہوا

بدترین حالات میں بھی اللہ کے رسول کو جو نمونہ بننے کا حکم دیا جاتا ہے' اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انسانی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ جہاں کتابیں نازل فرماتا ہے' وہیں اپنے رسول بھی بھیجتا ہے اور ہدایت الٰہی' دونوں کے دم قدم سے پھیلتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتاب اللہ یقیناً ہدایت اور نور بن کے آتی ہے۔ اسی سے رسول کا دل روشن ہوتا ہے اور اسی سے امت کی راہوں کو جلا ملتی ہے۔ مگر اس ہدایت کیلئے دلوں کے راستے اس وقت کھلتے ہیں' جب ان کے سامنے ایک ایسی شخصیت اپنا فرض انجام دیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے' جس کا ایک ایک عمل اس کتاب کے نور سے روشن اور جس کی ایک ایک بات اس ہدایت کا ثبوت ہے۔ چنانچہ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ شخصیت اپنی قربانی' اپنی سرفروشی' اپنی جاں سپاری اور اپنے مسلسل عمل سے' اس ہدایت کو لوگوں تک پہنچا رہی ہے تو وہ اس شخصیت کے زور اور اس کے کردار و عمل کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ امتیں' صرف صداقتوں اور اچھائیوں سے وجود میں نہیں آتیں۔ بلکہ امت کی شخصیت کی تعمیر' ہمیشہ داعی کی شخصیت کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ اکبر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کس قدر سادہ انداز میں اس بات کو واضح کیا

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

نصابِ تعلیم چاہے کیسا بھی بنا لیا جائے۔ نونہالوں کی سیرت وکردار کی تعمیر اس نصاب تعلیم سے کبھی نہیں ہوتی بلکہ ان کی شخصیت کو بنانے اور ان کے خیالات کو صحیح جہت دینے اور ان کے عزائم میں رسوخ پیدا کرنے میں اصل کردار صرف استاد کا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جس طرح آنحضرت ﷺ کو امت کیلئے نمونہ بنایا گیا ہے' اسی طرح امت کے صالحین کو بھی اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ تم بھی حتی الامکان اپنے فکر و عمل سے' اپنے ماحول میں نمونہ بننے کا فرض انجام دو۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ کمزور طبیعتیں جب دیکھیں گی کہ اس ماحول میں سچائیوں پر عمل کرنے والے اور اس کے نتیجے میں مختلف مصائب سے دوچار ہونے والے یہاں کچھ اور لوگ بھی ہیں تو ان کو ایک حوصلہ ملے گا اور وہ کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ شاید اسی لئے ہمیں جو دعائیں سکھائی

Marfat.com

گئی ہیں‘ ان میں ایک دعا یہ بھی ہے

﴿ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ''یا اللہ! ہمیں متقین کا امام بنا''﴾

ایک نیک آدمی کی بڑی سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ متقی بن جائے۔ لیکن یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تم سے مطلوب صرف یہ نہیں ہے کہ تم نیکوکاری کی زندگی گزارو بلکہ اس سے بڑھ کر تمہارا ہدف یہ ہونا چاہئے کہ تم دوسروں کیلئے نیکی میں نمونہ بن جاؤ تا کہ لوگ تمہاری مثال دے کر نیکی اور نیکوکاروں کو سپورٹ کر سکیں یعنی جب کبھی یہ بحث ہو کہ آج کل اپنی اصل تنخواہ میں رشوت لئے بغیر‘ کوئی آدمی گزارا نہیں کر سکتا۔ تو ہر سطح پر ملازمین میں کچھ لوگ تو ایسے ہونے چاہئیں کہ جن کا حوالہ دے کر لوگ کہہ سکیں کہ اگر آج کے دور میں رشوت سے بچنا ممکن نہ ہوتا اور صرف تنخواہ میں گزارا کرنا ناممکن ہوتا تو فلاں فلاں لوگ کیسے گزارا کر رہے ہیں۔ یہ ہے نمونہ بننے کا مطلب کہ ہر شعبہ زندگی میں چاہے وہ مزدوروں کا شعبہ ہو‘ چاہے کارخانہ داروں کا‘ چاہے کاشتکاروں کا چاہے زمینداروں کا‘ چاہے عام لوگوں کا چاہے حکمرانوں کا‘ ہر سطح پر ایسے لوگوں کا وجود ضروری ہے‘ جس سے دوسرے لوگوں کو حوصلہ ملے اور مایوس ہونے والوں کو اپنی مایوسی سے نکلنے کا موقع ملے۔

توحید کی اہمیت:

اس آیت کے آخر میں فرمایا: وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ''آپ مشرکوں میں سے نہ ہو جائیں''۔ تعجب کی بات ہے‘ اللہ کا نبی تو دنیا میں توحید کا سب سے بڑا علمبردار ہوتا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ شرک میں مبتلا ہو جائے؟ لیکن قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب ہے کہ وہ بعض دفعہ خطاب آنحضرت ﷺ کو کرتا ہے‘ لیکن روئے سخن مخالفین کی طرف ہوتا ہے اور عتاب کا ہدف بھی مخالفین ہوتے ہیں۔ یہاں بھی خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ کو ہے‘ لیکن سنایا مخالفین کو جا رہا ہے کہ شرک ایسی منحوس چیز ہے کہ پیغمبر جو سراسر روشنی ہے‘ ہم اس تاریکی کو اسکے قریب بھی پھٹکتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تو تم خود اندازہ کر لو کہ تم جو سرتاپا شرک میں ملوث ہو‘ تمہارا انجام کیا ہوگا؟ پھر اگلی آیت میں آنحضرت ﷺ ہی کی زبان سے اس بات کو ایک دوسرے انداز میں مستحکم کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۵ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ ''کہہ دو! اگر میں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی‘ تو میں ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں''۔

توحید کے مختلف گوشوں کو مستحکم کرنے اور شرک کے ہر ممکن خطرے سے بچانے کیلئے‘ جن جن ہدایات کی ضرورت تھی‘ وہ ایک ایک کر کے عطا کی جا رہی ہیں اور اس طرح عقیدۂ توحید کو ایک جامع اور کامل شکل دی جا رہی ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بار بار اس کا واسطہ ذات رسالت مآب ﷺ کو بنایا جا رہا ہے حالانکہ اللہ کے یہاں ان کا جو مقام و مرتبہ ہے‘ اس کی گہرائی اور گیرائی کو سمجھنا بندوں کیلئے تو ویسے ہی ممکن نہیں۔ پوری کائنات ان کے پاؤں کی دھول کے بھی برابر نہیں ہو سکتی۔ بایں ہمہ! بار بار انہی کو خطاب کیا جا رہا ہے اور انہی سے ان باتوں کا اظہار کرایا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاید ہمیں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تم توحید کی عظمتوں کو دل میں اتارنے کی کوشش کرو اور شرک کی شناعت کو پوری طرح سمجھنے اور اس کی گندگی سے بچنے کا پوری طرح اپنے اندر عزم پیدا کرو کیونکہ اگر اس میں ذرا بھی کمزوری قابل برداشت ہوتی تو نبی کریم ﷺ سے ان باتوں کا اظہار نہ کرایا جاتا۔ وہی ایک ذات والا صفات ایسی ہو سکتی ہے‘ جنہیں شاید شریعت کی پابندیوں سے استثناء مل سکتا۔ لیکن اگر وہ بھی اللہ کی نافرمانی یا توحید میں کسی کمی بیشی کی صورت میں‘ اللہ کے

Marfat.com

عذاب سے خوفزدہ ہیں تو پھر اور کون ہے، جو اس سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟

ہر دور کے انسانوں میں ہم یہ کمزوری دیکھتے ہیں کہ وہ جن لوگوں کو عظمتوں کا پیکر سمجھتے ہیں۔ انہیں شرعی احکام کی پابندیوں سے بھی مستثنیٰ سمجھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہیں سے شرک کو راستہ ملتا ہے اور لوگ ایسے باعظمت لوگوں کے بارے میں آہستہ آہستہ خدائی صفات کا تصور کرنے لگتے ہیں اور بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ بعض لوگ شاید اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اس کی عبادت سے بھی مستثنیٰ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے بزرگانِ دین میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ بڑے عظیم مقام و مرتبہ کے مالک ہیں۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ وہ جوانی میں کسی جنگل سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان کے سامنے ایک روشنی نمودار ہوئی۔ سر اٹھا کے دیکھا تو ایک شہزادہ سا نظر آیا، پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اس کی آواز آئی کہ عبدالقادر! جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں تمہارا خدا ہوں۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری بہت عبادت کی، میں تم سے بہت خوش ہوں، چنانچہ اس خوشی میں میں تمہیں اپنی عبادت سے رخصت دے رہا ہوں، آج کے بعد تم پر کوئی پابندی نہیں۔ شیخ کہتے ہیں کہ مجھے معاً خیال آیا کہ عبادت سے رخصت تو آنحضرت ﷺ کو بھی نہ ملی، آپ شدید بیماری میں بھی نماز کی پابندی فرماتے رہے اور زندگی میں کوئی نماز کبھی آپ کی قضا نہ ہو سکی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس کی پابندی سے حضور ﷺ مستثنیٰ نہ ہوئے، مجھے اس سے مستثنیٰ کیا جا رہا ہے؟ اللہ نے میری مدد فرمائی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شیطان ہے، جو مجھے ورغلانا چاہتا ہے۔ میں نے فوراً کہا لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ شیطان چیختا ہوا بھاگا۔ لیکن جاتے ہوئے اس نے پھر کمند پھینکی۔ کہنے لگا کہ عبدالقادر! تمہیں تمہارے علم نے بچا لیا، ورنہ نجانے اب تک میں کتنے زاہدوں کو برباد کر چکا ہوں۔ حضرت شیخ کہتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ یہ ظالم اب بھی باز نہیں آیا، چنانچہ میں نے کہا کہ مجھے میرے علم نے نہیں بچایا بلکہ میرے اللہ نے مجھے بچایا ہے۔ ان آیات میں آنحضرت ﷺ کو خطاب اور آپ کے واسطے سے ان توحیدی کلمات کو کہلوانا شاید اس کا یہ مطلب ہے کہ لوگ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ وہ بنیادی عقیدہ ہے، جس میں کسی کو بھی استثنیٰ حاصل نہیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر تو دنیا میں کوئی ذات نہیں اور اگر آپ بھی اس کے پابند ہیں تو اور کوئی کس شمار قطار میں ہے۔

اسلام کا نظریہ توحید:

اسلام نے مسلمانوں کو جس عقیدۂ توحید کی تعلیم دی ہے۔ وہ محض ایک نظریاتی بحث اور علم کلام کا کوئی مسئلہ نہیں کہ جس کا تعلق صرف کتابی زندگی سے ہو اور عملی زندگی میں اس سے کوئی واسطہ نہ پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید مسلمانوں کی زندگی میں ایک ایسی زندہ قوت کا نام ہے، جس کی موجودگی سے مسلمان زندہ ہیں اور جس کے نکل جانے سے مسلمانوں کی اسلامی زندگی موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم عقیدۂ توحید پر غور کرتے ہیں تو اس کی بنیاد سب سے پہلے اس تصور پر اٹھائی گئی ہے کہ زمین و آسمان اور خود حضرت انسان کا خالق و مالک اور حاکم حقیقی، صرف خداوند ذوالجلال ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے زندگی گزارنے کا ایک نظام دے اور اس نظام کے حوالے سے قیامت کے دن اس سے باز پرس کرے۔ اس بنیاد کو اگر سمجھ لیا جائے تو پھر یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ ان بنیادی تصورات میں آخرت میں جواب دہی کا احساس اور اپنی بداعمالی کے نتیجے میں جہنم کے عذاب کے خوف کو اگر دل و دماغ میں راسخ نہ کیا جائے تو یہ بنیادی تصورات، مذہبی ضرورت کو تو پورا کر سکتے ہیں، لیکن اگر مذہب کا مقصد انسانی زندگی کی اصلاح، شائستگی، تطہیرِ فکر اور تہذیبِ نفس ہے تو یہ اس وقت تک انسانی زندگی میں پیدا نہیں کئے جا سکتے، جب تک آدمی قیامت کے دن اپنی بداعمالی کے نتیجے سے فکر مند نہیں ہوگا اور اللہ کے عذاب سے لرزاں و ترساں نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ جب تک ان میں قیامت کے عذاب کا خوف باقی رہا اور اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس

Marfat.com

زندہ رہا' ان کی زندگیاں بے عملی اور بدعملی کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ وہ اگر تختِ حکومت پر بھی بیٹھتے تھے تو اس یوم عظیم کا ڈر انہیں ظلم کرنے سے روکتا تھا اور معمولی سے معمولی آدمی بھی' جب ان سے انصاف مانگنے آتا تھا تو وہ یہ سوچ کر سہم جاتے تھے کہ آج میں نے اگر اسے انصاف نہ دیا تو کل جب میں اللہ کی عدالت میں کھڑا ہوں گا تو میرے ساتھ کیا گزرے گی اور جب انہیں اپنوں کی خواہشیں یا حالات کا دباؤ راہ راست سے ہٹانے کی کوشش کرتا تو ہمیشہ یہی فکر انہیں راہِ راست پر رکھتی تھی۔ تاریخ کی نہایت ممتاز شخصیت حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جب انہوں نے ظلم سے حاصل کی ہوئی تمام دولت اور تمام جائیداد خاندان سے چھین کر بیت المال کو واپس کر دی اور خود خلفاء کی اولاد ہوتے ہوئے بھی اپنے پاس بھی کچھ نہ رہنے دیا تو گھر میں غربت نے بسیرا کر لیا۔ ایک دن گھر تشریف لائے تو بیٹیوں نے آگے بڑھ کر آپ کا اس طرح استقبال کیا کہ انہوں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے یہ حالت دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تو آپ کی پھوپھی صاحبہ نے بتایا کہ گھر میں سوائے مسور کی دال اور پیاز کے اور کچھ نہ تھا' بچیوں نے دونوں چیزیں ابال کر اپنا پیٹ بھرا ہے' آپ کو چونکہ پیاز کی بو سے بہت نفرت ہے' ان کا گمان ہے کہ شاید ان کے منہ سے بو آتی ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ بیٹیو! تم میں سے ایک ایک مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے' وہ سب تمہارے لئے ہے۔ لیکن اس سے زیادہ بیت المال سے لے کر اگر تمہاری نذر کر دوں تو یقیناً گھر کی حالت بدل سکتی ہے۔ مگر کل کو مجھے اس کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ پھر تمہارے باپ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اس لئے میں یہ تو برداشت کر سکتا ہوں کہ ہم گھر میں فاقوں سے گزارا کر لیں' لیکن میں قیامت کے عذاب کا سامنا نہیں کر سکتا اور اس کے بعد انہوں نے یہی آیت پڑھی کہ میں اس بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۔ چنانچہ اسی زندہ توحید کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں اتارنے کیلئے جہاں بنیادی تصورات پر زور دیا گیا' وہیں اس عذاب عظیم کا احساس بھی دلایا گیا' جس سے فی الواقع انسانی اعمال میں تبدیلی آتی ہے اور انسانی خواہشوں پر غلبہ پانے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

انسان کے اعمال اس کے مقصدِ حیات کے پرتو ہوتے ہیں:

ایک اور حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان تمام تصورات اور بنیادی احساسات میں یقیناً اتنی قوت ہے کہ ان کے قبول کر لینے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ زندگی میں تبدیلی نہ آئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ یہ تصورات کبھی دل و دماغ میں اترنے نہیں پاتے' جب تک آدمی ایک اور بات کا فیصلہ نہ کرے۔ وہ بات یہ ہے کہ آخر زندگی گزارنے والا اپنے سامنے زندگی کی کامیابی اور اس کی کامرانی کسے قرار دیتا ہے اور اس کے سامنے وہ کون سی منزل اور کون سا ہدف ہے' جس کو حاصل کر لینا' اس کے نزدیک زندگی کی کامیابی ہے؟ یہ وہ بات ہے' جس کے فیصلے پر باقی تمام فیصلوں کا دارومدار ہے۔ ایک آدمی اگر حصولِ اقتدار کو اپنی کامیابی کی منزل قرار دیتا ہے تو اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہو سکتی کہ اس کے اپنے اخلاق اور اللہ سے اس کا تعلق اور بنیادی اقدار سے اس کی وابستگی کا عالم کیا ہے۔ اسے تو اقتدار چاہئے' چاہے اس کیلئے اسے بڑے سے بڑا ظلم اور بڑے سے بڑے گناہ کا ارتکاب ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسی طرح اگر ایک آدمی' کامیابی دولت مندی کو سمجھتا ہے تو اس کیلئے یہ بات بے معنی ہے کہ جائز ناجائز اور حلال اور حرام کی کیا اہمیت ہے۔ ہماری قریبی تاریخ میں غیر مسلم صحافیوں میں ایک مشہور صحافی سردار دیوان سنگھ مفتون گزرے ہیں۔ انہوں نے ایک زمانے میں خواجہ حسن نظامی مرحوم اور ملا واحدی مرحوم کے ساتھ مل کر ایک اخبار جاری کیا تھا۔ ملا واحدی لکھتے ہیں کہ میرا گھر دفتر اخبار سے متصل تھا۔ میں دفتر سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلا جاتا اور کبھی ضرورت ہوتی تو دفتر کا چکر بھی لگا لیتا۔ میں نے ایک روز گئی رات دیکھا کہ دفتر میں لائٹ جل رہی ہے۔ میں دفتر آیا' دیکھا سردار صاحب میز پر بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا سردار صاحب! کیا آپ صبح سے کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا جی ہاں! تہجد کے وقت دیکھا تو پھر

Marfat.com

سردار صاحب کام کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اگلی شام تک ناگزیر ضروریات کے علاوہ وہ مسلسل کام میں لگے رہے۔ میں نے حیران ہو کر ان سے کہا! میں دیکھ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ کل سے آپ مسلسل کام کر رہے ہیں۔ آخر آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ کہنے لگے تاکہ میں ایک کامیاب زندگی گزار سکوں۔ میں نے پوچھا آپ کے نزدیک کامیاب زندگی کا تصور کیا ہے؟ کہنے لگے' جب میں مروں تو کم از کم اپنے بینک میں ایک لاکھ روپیہ چھوڑ کر جاؤں۔ اس زمانے کا ایک لاکھ ممکن ہے آج کے ایک کروڑ کے برابر ہو۔ ممکن ہے آپ اسے ایک انفرادی واقعہ کہہ کر نظرانداز کر دیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ اسی طرح کے مقاصد زندگی ٹھہرا چکے ہیں اور پھر اسی کیلئے محنت کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہاں قرآن کریم نے توحید کے وسیع تر تصور کے ساتھ ساتھ' اس بنیادی بات کو نظرانداز نہیں کیا کہ جہاں تمہارے لئے عقیدۂ توحید کو دل و جان سے قبول کرنا ضروری ہے' وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے اپنی کامیابی کا ہدف تو مقرر کرو۔ اسی پر باقی تمام باتوں کا دارومدار ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

آیت:۱۶ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ O ''جو شخص اس دن' اس (عذاب) سے دور رکھا گیا' درحقیقت وہی ہے' جس پر خدا نے رحم فرمایا اور یہی کھلی کامیابی ہے''۔

اللہ کی نظر میں انسان کی اصل کامیابی:

قرآن کریم نے اور بھی کئی جگہ انسان کی اس کامیابی کی خبر دی ہے کہ اقتدار کا حصول' عزت و شہرت یا دولت مندی درحقیقت یہ کامیابیاں نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی ضرورتوں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ حقیقی کامیابی تو یہ ہے کہ ایک مسلمان زندگی اس طرح گزارے جس کے نتیجے میں وہ عذاب جہنم سے بچ جائے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب ہو اور اللہ خوش ہو کر جنت کی نعمتوں کا اسے حقدار بنا دے۔ یہی وہ کھلی کامیابی ہے' جس کے علاوہ اور کسی کامیابی کا تصور بھی صحیح نہیں۔ ظاہر ہے' یہ کامیابی اسی خوش نصیب کو مل سکتی ہے' جس نے اپنی پوری زندگی احکام شریعت کی تعمیل اور اللہ کی رضا کی طلب میں نہایت اخلاص اور دردمندی سے گزاری ہو۔ جس نے نہ کبھی حقوق اللہ کو پامال کیا ہو اور نہ حقوق العباد تلف کئے ہوں' اس کے نتیجے میں اسے وہ ابدی زندگی نصیب ہو سکتی ہے' جس کو یہاں الفوز المبین قرار دیا گیا ہے۔

انسانی زندگی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اس کی سمت سفر اور منزل کے صحیح تعین میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں' ان میں ایک بہت بڑی دشواری یہ ہے کہ آدمی یہ نہ سمجھ سکے کہ میرے نفع و ضرر کا مالک کون ہے۔ جیسے جیسے آدمی اس میں الجھتا جاتا ہے' ویسے ویسے اس کیلئے آستانے بدلتے رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اس کی زندگی شکست و ریخت کا شکار ہوتی ہے۔ اس لئے اگلی آیت کریمہ میں انسانی زندگی کی اس بنیادی حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے' جس کا سمجھنا اگرچہ آسان نہیں' لیکن اسی پر انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۷ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ O

''اور اگر اللہ تجھ کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کا دور کرنے والا بن سکے اور اگر کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

کامیاب زندگی گزارنے کی کنجی:

جو بات اس آیت کریمہ میں کہی گئی ہے کہ آدمی اپنے نفع و ضرر کا مالک صرف اللہ ہی کو سمجھے۔ یہ عقیدۂ توحید کی آخری بات ہے اور اس کے قبول

Marfat.com

کرنے اور اسے اختیار کر لینے کے بعد زندگی مکمل تبدیل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسے قبول کرنے میں تو شاید دشواری نہ ہو' مگر اس پر عمل کرنا آسان نہیں۔ دنیا میں بہت سے قوت کے آستانے ہیں' بہت سے تخت اقتدار بچھے ہوئے ہیں' بڑی بڑی حویلیاں ہیں' جہاں وڈیرے کبریائی کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ انسانی برادری میں کبر و نخوت کے بے شمار دعویدار ہیں' جو دوسرے کا سر اٹھا کر چلنا برداشت نہیں کرتے اور کتنے ایسے معاشی ساہوکار ہیں' جن کے حکم کی مخالفت انسان کے معاش کو تنگ کر دیتی ہے۔ نتیجتاً اس کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اللہ تعالیٰ ہی کو نفع و ضرر کا مالک سمجھنا اور اس کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا کسی کے سامنے سر نہ جھکانا' کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرنا اور کسی کی بندگی بجا نہ لانا' یہ بہت مشکل کام ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے یہ بات فرمائی گئی ہے کہ آپ اپنے سارے مقامات اور مراتب کے باوجود جب تک اس بات کا یقین پیدا نہیں کریں گے کہ آپ کے نفع و ضرر کا مالک بھی اور آپ کی امیدوں کا پورا کرنے والا بھی' صرف خداوند عالم ہے۔ اس وقت تک آپ توحید میں کامل نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر موحد کون ہوگا چونکہ یہ ایک مشکل بات تھی' اس لئے بطور خاص آپ کو خطاب کر کے یہ بات کہی گئی ہے اور پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ عام انسانوں کے حوالے سے بھی قرآن کریم نے جا بجا اس کا ذکر کیا اور آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات اور دعاؤں میں بھی اسے دہرایا' تا کہ اس مشکل' لیکن ناگزیر احساس کو انسانی زندگی کا چلن بنا دیا جائے۔ ارشاد فرمایا:

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهٖ

''یعنی اللہ تعالیٰ نے جو رحمت لوگوں کیلئے کھول دی اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو روک دے اس کو کوئی کھولنے والا نہیں''

صحیح احادیث میں ہے کہ رسول کریم ﷺ اپنی دعاؤں میں اکثر یہ کہا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ

یعنی اے اللہ! جو آپ نے دیا' اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جو آپ نے روک دیا' اس کا کوئی دینے والا نہیں اور کسی کوشش والے کی کوشش آپ کے مقابلہ میں نفع نہیں دے سکتی۔

امام بغوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس آیت کے تحت حضرت عبداللہ ابن عباس ﷺ سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک سواری پر سوار ہوئے اور مجھے اپنے پیچھے ردیف بنا لیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اے لڑکے!۔ میں نے عرض کیا' حاضر ہوں۔ کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اللہ کو یاد رکھو! اللہ تم کو یاد رکھے گا۔ تم اللہ کو یاد رکھو گے تو اس کو ہر حال میں اپنے سامنے پاؤ گے' تم امن و عافیت اور خوش عیشی کے وقت اللہ تعالیٰ کو پہچانو تو تمہاری مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ تم کو پہچانے گا' جب تم کو سوال کرنا ہو تو صرف اللہ سے سوال کرو اور مدد مانگنی ہو تو صرف اللہ سے مدد مانگو۔ جو کچھ دنیا میں ہونے والا ہے' قلم تقدیر اس کو لکھ چکا ہے۔ اگر ساری مخلوقات مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نفع پہنچا دیں' جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں نہیں رکھا تو وہ ہرگز ایسا نہ کر سکیں گے اور اگر وہ سب مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نقصان پہنچاویں' جو تمہاری قسمت میں نہیں ہے تو ہرگز اس پر قدرت نہ پائیں گے۔ اگر تم کر سکتے ہو کہ یقین کے ساتھ اس پر عمل کرو تو ایسا ضرور کر لو' اگر اس پر قدرت نہیں تو صبر کرو کیونکہ اپنی خلاف طبع چیز پر صبر کرنے میں بڑی خیر و برکت ہے اور خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کے ساتھ ہے اور مصیبت کے ساتھ' راحت اور تنگی کے ساتھ' فراخی ہے۔ (یہ حدیث ترمذی اور مسند احمد میں بھی بسند صحیح مذکور ہے)

Marfat.com

افسوس کہ قرآن کے اس واضح اعلان اور رسول کریم ﷺ کی عمر بھر کی تعلیمات کے باوجود یہ امت پھر اس معاملہ میں بھٹکنے لگی۔ سارے خدائی اختیارات مخلوقات کو بانٹ دیئے۔ آج ایسے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے، جو مصیبت کے وقت بجائے اللہ تعالیٰ کو پکارنے اور اس سے دعا مانگنے کے مختلف ناموں کی دہائی دیتے اور انہی سے مدد مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان تک نہیں ہوتا۔ انبیاء واولیاء کے توسل سے دعا مانگنا دوسری بات ہے، وہ جائز ہے اور خود نبی کریم ﷺ کی تعلیمات میں اسکے شواہد موجود ہیں۔ لیکن براہ راست کسی مخلوق کو حاجت روائی کیلئے پکارنا، اس سے اپنی حاجتیں مانگنا، اس قرآنی حکم کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ (آمین)

اسی بات کی تائید، استحکام اور مزید وضاحت کیلئے ارشاد فرمایا:

آیت:۱۸ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ط وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ O ''اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ حکیم وخبیر ہے''۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہی اپنے سب بندوں پر غالب وقادر ہے۔ سب اس کے قبضہ اختیار اور اس کے کنٹرول میں ہے، سب اس کی قدرت کے تحت اور محتاج ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انسان خواہ اللہ کا رسول ہو اور خواہ وہ دنیا کا شہنشاہِ اعظم ہو، اپنے ہر ارادہ میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا اور اس کی ہر مراد کبھی پوری نہیں ہوتی۔

آیت میں قاھر کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کو سمجھ لینا چاہئے۔ قہر کا لفظ عربی میں اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا جس معنی میں اردو میں استعمال ہوتا ہے بلکہ اس کے معنی اختیار، قابو، حکومت اور تسلط میں رکھنے کے آتے ہیں۔ انگریزی لفظ (Control) کا جو مفہوم ہے وہی مفہوم عربی میں اس لفظ کا ہے اسی سے لفظ قہار مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جس کے معنی کنٹرولر کے ہیں یعنی تمام جہان اور اس کے تمام بندے ہر آن اس کی مٹھی اور اس کے قابو میں ہیں وہ ان کو قابو میں رکھنے کیلئے نہ کسی مددگار کا محتاج ہے اور نہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ جب وہ ان کو پکڑنا یا اکٹھا کرنا چاہے تو کوئی اس کی گرفت سے نکل سکتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ وہ حکیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ حکیم اسلئے ہے کہ اسکے تمام افعال عین حکمت ہیں اور خبیر اس لئے کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ

ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر (قرینِ انصاف) کس کی شہادت

اللّٰهُ ۖ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ وَاُوحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ

ہے۔ کہدو کہ خدا ہی مجھ میں اور تم میں گواہ ہے۔ اور یہ قرآن مجھ پر اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس کے ذریعے

Marfat.com

وَمَنْ بَلَغَ ۭ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ۭ قُلْ لَّآ

سے تم کو اور جس شخص تک وہ پہنچ سکے اس کو آگاہ کر دوں۔ کیا تم اس بات کی شہادت دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ

اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ⑲

اور بھی معبود ہیں (اے محمدؐ!) کہہ دو کہ میں تو (ایسی) شہادت نہیں دیتا۔ کہہ دو کہ صرف وہی ایک معبود ہے اور جن کو تم

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ

لوگ شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان (ہمارے پیغمبرؐ) کو اس

خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑳ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى

طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں جنہوں نے اپنے تئیں نقصان میں ڈال رکھا ہے

عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ㉑ وَيَوْمَ

ایمان نہیں لاتے۔ اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے جس نے خدا پر جھوٹ افترا کیا یا اس کی آیتوں کو جھٹلایا۔ کچھ

نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَاۗؤُكُمُ الَّذِيْنَ

شک نہیں کہ ظالم لوگ نجات نہیں پائیں گے۔ اور جس دن ہم سب لوگوں کو جمع کریں گے پھر مشرکوں سے پوچھیں گے

كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ㉒ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا

کہ (آج) وہ تمہارے شریک کہاں ہیں جن کا تمہیں دعویٰ تھا۔ تو ان سے کچھ عذر نہ بن پڑے گا اور بجز اس کے

كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ㉓ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ

(کہ) کچھ چارہ نہ ہوگا کہ کہیں خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم شریک نہیں بناتے تھے۔ دیکھو انہوں نے اپنے اوپر

Marfat.com

مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۲۴﴾

کیسا جھوٹ بولا اور جو کچھ یہ افترا کیا کرتے تھے سب ان سے جاتا رہا۔

تمہید:

گزشتہ آیات میں جو سلسلہ مضامین چل رہا ہے اس میں توحید پر زور دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان ہو رہی ہیں۔ بالخصوص جن صفات کا تعلق انسانیت سے زیادہ گہرا ہے اس کو سوالات کی صورت دے کر دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ پوچھا جا رہا ہے کہ ذرا بتاؤ زمین و آسمان کس کے قبضے میں ہیں اور ان کا مالک اور حاکم حقیقی کون ہے؟ بتاؤ اس زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ بتاؤ اس پوری کائنات کو رزق کون دے رہا ہے؟ ذرا غور کرو! اس پوری کائنات پر کس کا غلبہ اور کنٹرول ہے اور گہری نظر سے دیکھو کہ نفع و ضرر کا مالک کون ہے؟ ان تمام باتوں کا جواب آخر اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ ہی ان صفات کا حامل ہے اور وہی اس لائق ہے کہ ہمارے سر اسی کے سامنے جھکیں اور ہماری زندگیاں اسی کے راستے پر نچھاور ہوں۔

عقیدۂ توحید پر یہ موثر انداز بیان اور نہایت زوردار طریق استدلال مشرکینِ مکہ کو مبہوت کئے دے رہا تھا۔ ان کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ وہ علمی یا عقلی انداز میں اس کا جواب دے سکتے۔ لیکن تعصب کے ہاتھوں وہ اس حد تک اندھے ہو چکے تھے کہ اس دعوت کو قبول کرنے کیلئے بھی تیار نہیں تھے اس کیلئے انہوں نے ایک راستہ نکالا اور آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ آپ ہم سے جو کچھ کہہ رہے ہیں اور جس حیثیت سے کہہ رہے ہیں کیا اس کی گواہی دینے والا دنیا میں کوئی موجود ہے؟ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ تم ہماری طرح ایک آدمی ہو ہماری طرح مکی زندگی کی فضاؤں میں محصور علم سے کوسوں دور اور ہمارے اندر ہی تمام عمر گزار دینے والے۔ اس لئے ہم صرف تمہارے کہنے سے ایسی بڑی بڑی باتیں کیسے تسلیم کر لیں۔ ہمارے ہمسائے میں اہل کتاب رہتے ہیں جو اپنے پاس مذہب بھی رکھتے ہیں اور علم بھی۔ ہم نے ان سے بھی پوچھ لیا انہیں بھی انکار ہے کہ ان کی کتابوں میں نہ تمہاری رسالت کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ ایسی باتوں کا جو تم ہم سے منوانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس لئے ہم تو اس وقت تک ماننے کو تیار نہیں ہیں جب تک تم ہمارے سامنے ان باتوں کا کوئی گواہ پیش نہ کرو۔ اس پر یہ ارشاد فرمایا گیا:

آیت:۱۹ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ط قُلِ اللّٰهُ قف شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ قف وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ط قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ج قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ O ”پوچھو! شہادت کیلئے سب سے بڑا کون ہے؟ کہو اللہ! وہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔ کیا تم اس بات کے گواہ بنتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں؟ کہہ دو! میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ کہہ دو! وہ تو بس ایک ہی معبود ہے اور میں ان سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو“۔

اللہ کے اختیارات اور اس کی صفات میں کوئی اور شریک نہیں:

مشرکینِ مکہ کے سوال کے جواب میں پروردگار ارشاد فرما رہے ہیں کہ اے پیغمبر! ان سے پوچھو کہ یہ جس گواہی کے طلب گار ہیں ان کے

Marfat.com

نزدیک اس گواہی کا اہل کون ہے؟ یعنی وہ کون ہے، جس کی گواہی ان کے نزدیک قابل قبول ہوسکتی ہے؟ کیونکہ جب ایک ایسے مخاطب سے واسطہ ہو، جس کی ہٹ دھرمی کا بار بار تجربہ ہورہا ہو، وہ جب کسی گواہی کو طلب کرے تو عقل ودانش کا تقاضا یہ ہے کہ خود اسی سے پوچھ لیا جائے کہ تم بتاؤ! تمہارے نزدیک کس گواہ کی گواہی قابل قبول ہے تاکہ بعد میں وہ ہٹ دھرمی کا ثبوت نہ دے سکے۔ چنانچہ مشرکین سے ہی کہا جارہا ہے کہ تم خود اس گواہ کو تجویز کرو تاکہ پھر تم انکار نہ کرسکو۔ ظاہر ہے مشرکینِ مکہ اس کا کیا جواب دے سکتے تھے۔ اس لئے پروردگار نے آنحضرت ﷺ سے فرمایا کہ تم ان سے کہو کہ بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جو مسئلہ مختلف فیہ ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے یا اس کے ساتھ اس کی ذات یا اس کی صفات میں کوئی اور شریک بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب اللہ کے سوا کون دے سکتا ہے کیونکہ وہی یہ بات بتا سکتا ہے کہ اس نے اپنی صفات یا اپنے اختیارات میں کسی اور کو شریک کیا ہے یا نہیں۔ مخلوق میں اگر کوئی اس کا دعویٰ کرے تو وہ ایک بلا دلیل دعویٰ ہے کیونکہ کوئی مخلوق بھی خدائی معاملات کو جاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ مشرکینِ مکہ اس بات کو تو تسلیم کرتے تھے کہ اللہ ہی اس کائنات کا خالق ہے، وہی رزق دینے والا ہے، وہی زندگی اور موت کا مالک ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان کو یہ بھی خیال تھا کہ اتنی بڑی کائنات کا انتظام وانصرام تنہا اللہ کیلئے چلانا ممکن نہیں۔ یقیناً اس نے کائنات کے نظام میں بہت سی قوتوں کو شریک کررکھا ہے اور ان کی مدد سے وہ زمین وآسمان کے نظام کو چلارہا ہے۔ اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ نے یہ جو ایک بات فرض کرلی ہے، آخر اس کی دلیل کیا ہے؟ اب بجائے اس کے کہ اس بات کی وہ دلیل خود فراہم کریں، الٹا وہ آنحضرت ﷺ سے مطالبہ کررہے ہیں کہ آپ اللہ کے وحدہٗ لاشریک ہونے کی گواہی پیش کریں۔ اس لئے ان سے کہا جارہا ہے کہ اس بات کی گواہی کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور شریک بھی ہے، ظاہر ہے اللہ کے سوا تو کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی ادارے کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اتنے بڑے ادارے کے اختیارات کا مالک صرف اس کا سربراہ نہیں بلکہ کچھ اور لوگ بھی اس میں شریک ہیں۔ کچھ لوگ اس کا انکار کریں کہ اس کے اختیار میں کوئی شریک نہیں۔ اب اس کا فیصلہ اس کے سوا ممکن نہیں کہ خود سربراہ سے پوچھا جائے کہ کیا آپ نے اپنے اختیارات میں کسی اور کو شریک کررکھا ہے؟ یہاں بھی یہی کہا جارہا ہے کہ اے پیغمبر! تم ان کو یہ بات کہو کہ تم جس گواہی کے طلب گار ہو، وہ ظاہر ہے اللہ کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔ اس بات کو واضح کرنے کے بعد ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ اگر تمہیں یہ بات سمجھ میں آرہی ہے تو آؤ پھر میں اللہ ہی کو اپنے اور تمہارے درمیان گواہ بناتا ہوں اور اسی سے ہم سب پوچھنے کی جسارت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں یہ بتائے کہ اس کے اختیارات میں کوئی اور شریک ہے یا نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ سے پوچھنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس لئے کہ کسی انسان کی یہ مجال تو نہیں کہ وہ براہِ راست اللہ سے رابطہ قائم کرسکے یا وہ براہ راست اللہ سے کسی طرح کا استفادہ کرسکے۔ اس لئے کہ انسان کو اللہ نے علم کے دو ہی ذرائع بخشے ہیں، ایک حواس اور دوسرا عقل اور ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ حواس اور عقل، دونوں کا دائرہ صرف عالمِ محسوسات تک ہے۔ اس کے ماورا جو کچھ ہے، اس میں نہ حواس دخل دے سکتے ہیں اور نہ عقل۔ اس میں بے شمار مخلوقات بھی ہیں۔ اللہ کی ذات تو بہت عظیم ہے۔ انسانی حواس اور عقل کی رسائی تو ان مخلوقات تک بھی ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ فرشتے اللہ کی مقدس مخلوق ہیں۔ لیکن اس کا علم ہمیں مذہب نے دیا ہے، حواس اور عقل تو اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتے اور جہاں تک تعلق ہے پروردگارِ عالم کا، وہ تو ایک لامحدود ذات ہے اور انسانی عقل کو چاہے کتنی بھی اہمیت دے دی جائے، اس کی وسعتیں بہرحال محدود ہیں۔ وہ اللہ جیسی لامحدود ذات کے بارے میں یہ دعویٰ بھی نہیں کرسکتی کہ وہ اس کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ سکتی ہے کیونکہ اگر ایسا ممکن ہوسکے تو پھر اللہ لامحدود نہیں رہے گا، بلکہ محدود ہوجائے گا۔ اسی کی طرف اکبر نے اشارہ کرتے ہوئے کہا

ع جو ذہن میں گھر گیا لاانتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

Marfat.com

اسی لئے قرآن کریم نے ہمیں یہ بتایا کہ تم اللہ تعالیٰ سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس کے استفادہ کی تین ہی شکلیں ہیں، جس کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا

کسی بشر کی یہ مجال نہیں کہ وہ اللہ سے براہ راست بات کر سکے، سوائے وحی کے یا حجاب کے پیچھے سے یا رسول (قاصد) کی معرفت (الشوریٰ:۵۱)

یعنی یا تو اللہ سے رابطے کی شکل یہ ہے کہ اللہ کسی پر اپنی وحی اتارے یعنی اس کے دل پر اپنا کلام نازل کرے اور یا پردے کے پیچھے سے کلام فرمائے۔ درخت طور کے پردے کے پیچھے سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اور یا وہ کسی رسول اور قاصد کو بھیجے، جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتے رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور بندوں کے درمیان اصل واسطہ وحی الٰہی ہے اور یہی وہ ذریعہ ہے، جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں۔ اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ دیکھو! یہ قرآن میری طرف وحی کیا جا رہا ہے اور اسی کے ذریعہ سے اللہ یہ گواہی دے رہا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں۔ قرآن کریم میں صاف صاف اس نے فرمایا کہ لوگو! تمہارا معبود صرف ایک اللہ ہے، اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شریک کرنے والے کو کبھی نہیں بخشے گا۔ ہاں اور بڑے سے بڑا جرم کرنے والے کو وہ چاہے گا تو بخش دے گا۔ لیکن اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے کو کبھی معافی نہیں ملے گی۔ یہ اللہ کی وہ گواہی ہے جو مشرکینِ مکہ کے جواب میں دی جا رہی ہے۔

قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کے دلائل:

کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ آپ نے مشرکینِ مکہ کے مقابلے میں قرآن کریم کے ذریعہ اللہ کی گواہی پیش کی حالانکہ مشرکینِ مکہ نہ رسول اللہ کو اللہ کا رسول مانتے تھے اور نہ قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب تسلیم کرتے تھے۔ جب انہیں یہ دونوں حیثیتیں تسلیم ہی نہیں تو اس شہادت اور گواہی کی قدر و قیمت ان کی نگاہوں میں کیا ہوگی؟ بات اصل میں یہ ہے کہ ایک بات اگر قابل تسلیم بلکہ واجب التسلیم ہو اور عقل و دانش اس کا انکار نہ کر سکتے ہوں تو محض کسی کے انکار کر دینے یا نہ ماننے سے اس کی واقعی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ صحیح ہے کہ مشرکینِ مکہ قرآن کریم کو وحی الٰہی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ عقل و دانش کے نزدیک قابل قبول تھا؟ یا کسی بات کو قبول کرنے کے جتنے پیمانے بھی ہو سکتے ہوں، کیا ان پیمانوں میں سے کسی کے بھی یہ مطابق تھا؟ کیونکہ قرآنِ کریم کی جہاں تک صداقت، حقانیت اور وحی الٰہی ہونے کا تعلق ہے، اس پر اتنے مضبوط دلائل قائم ہیں کہ ایک عقل کا اندھا ہی اس سے انکار کرے تو کرے، دوسرا کوئی آدمی اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہم نہایت اختصار سے اس کے حوالے سے چند باتیں عرض کرتے ہیں، جن سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن کریم کو وحی الٰہی کے طور پر قبول نہ کرنا کیا واقعی اس کا کوئی جواز ہے؟ میں محض تفہیم کیلئے کہتا ہوں کہ قرآن کریم کے تین پہلو ہیں، جو غور و فکر کیلئے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

قرآن میں کوئی غیر فصیح لفظ استعمال نہیں ہوا:

1- ''قرآن'' کلام لفظی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو انہی حروف اور الفاظ میں پیش فرمایا ہے، جس میں قریش گفتگو کرتے تھے اور جو زبان عرب میں عام بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس دور کے بڑے بڑے شعراء اور علماء اسی میں شعر کہتے اور ادبی شہ پارے پیش کرتے تھے۔ اسی زبان

Marfat.com

میں قرآنِ پاک کوپیش کیا گیا ہے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی چاہے وہ کتنی ترقی یافتہ ہو اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا ممکن نہیں ہوتا کہ اس کا ایک ایک لفظ فصاحت و بلاغت کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ خود ہر زبان کے اندر بعض ایسے الفاظ استعمال ہوتے رہتے ہیں' جن کو خود اہل زبان فصیح تسلیم نہیں کرتے۔ جب بھی کوئی مصنف اپنی کتاب تصنیف کرتا ہے تو وہ اپنے وقت کی زبان ہی میں اسے لکھتا ہے اور جب کبھی اسے وہ بات لکھنے کی نوبت آتی ہے' جس کیلئے زبان میں کوئی فصیح لفظ نہیں تو وہ مجبور ہے کہ زبان کے غیر فصیح لفظ سے کام چلائے۔ لیکن قرآنِ پاک کی حیرت انگیز خوبی یہ ہے' جو اسے کلام اللہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ قرآن کریم میں باوجود اس کے کہ لاکھوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں' لیکن ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں۔ جب بھی کبھی ایسا موقع آیا کہ قرآن کریم کو وہ بات کہنا پڑی' جس کے لئے عربی زبان میں کوئی فصیح لفظ موجود نہیں تھا تو حیران کن بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے وہ بات کہی' لیکن غیر فصیح لفظ کے استعمال کا عیب قرآنِ کریم میں پیدا نہیں ہونے دیا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ قرآنِ کریم نے عربی زبان کو ایک نیا خوبصورت اور فصیح لفظ عطا کیا اور بعض دفعہ لفظ کی بجائے ایسی فصیح عبارت آرائی سے کام لیا گیا کہ وجدان کو جھک کر اسے سجدہ کرنا پڑا۔ میں اس کی صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ قرآنِ کریم کو جب یہ ضرورت پیش آئی کہ موت کا وہ تصور پیش کرے جو اسلام نے پیش کیا ہے تو اس نے دیکھا کہ پوری عربی زبان میں باوجود اس کے کہ وہ دنیا کی سب زبانوں میں ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے سب سے مالدار زبان ہے۔ لیکن اس تصور کیلئے اس کے پہلو میں کوئی لفظ نہیں جو اسلام پیش کرنا چاہتا ہے۔ ویسے عربی زبان میں موت کیلئے پچیس الفاظ مستعمل ہیں' لیکن ان تمام الفاظ میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ موت مکمل فنا ہو جانے کا نام ہے۔ لیکن اسلام نے جب یہ بتایا کہ موت مکمل فنا ہونے اور بالکل ختم ہو جانے کا نام نہیں ہے کہ جس میں دوسری زندگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو' بلکہ موت اس زندگی سے واپس بلانے کا نام ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب مرنے والے کو اٹھا کر اللہ کی بارگاہ میں زندگی کا حساب دینے کیلئے کھڑا کیا جائے گا کیونکہ اسلام کی نگاہ میں موت بقول اقبال تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے

ے موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

بلکہ اسلام کی نگاہ میں مکمل فنا تو اللہ سے کٹ جانے کے مترادف ہے اور یہ بات عقل و دانش اور اسلامی مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ اقبال نے اسی سلسلے میں کیسی خوبصورت بات کہی ہے۔

ے یہ نقطہ میں نے سیکھا بو الحسن سے
کہ جاں جاتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

چنانچہ قرآنِ کریم نے جب موت کے بارے میں اپنا تصور پیش کیا تو اس کیلئے ایک نیا لفظ (تَـوَفِّـی) دیا اور اسی سے بننے والا لفظ (وفات) ہے' جو اردو میں عام استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں پہلے نہیں تھا۔ یہ قرآن کریم کا عطیہ ہے' جو اس نے عربی زبان کو عطا کیا۔ اس لفظ نے موت کا ایک نیا تصور دیا۔

ایک دوسری مثال دیکھئے۔ ہم ارض وسما کا عام استعمال کرتے ہیں۔ یعنی زمین و آسمان۔ آپ کیلئے یہ بات حیران کن ہوگی کہ قرآنِ کریم نے

Marfat.com

ہمیں یہ بتایا کہ اللہ نے جس طرح سات آسمان بنائے ہیں' اسی طرح سات زمینیں بھی بنائی ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ قرآن کریم جا بجا سمٰوٰت ''سما'' کی جمع کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ لیکن ارض کی جمع اس نے پورے قرآن کریم میں ایک دفعہ بھی استعمال نہیں کی حالانکہ عربی زبان میں ارض کی جمع اراضی مستعمل ہے۔ لیکن ساتھ ہی فصحائے عرب یہ بھی کہتے ہیں کہ اراضی غیر فصیح لفظ ہے حالانکہ عربی کی ساری کتابوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم چونکہ ہر عیب سے پاک ہے' اس لئے قرآن کریم نے اسے کہیں استعمال نہیں کیا اور جہاں ضرورت پڑی' وہاں بھی اس لفظ کی جمع استعمال کرنے کی بجائے واحد ہی استعمال کیا گیا اور جمع کے معنی پیدا کرنے کیلئے خوبصورت عبارت آرائی سے کام لیا گیا۔ مثلاً قرآنِ کریم نے جب یہ بتانا چاہا کہ اللہ نے جس طرح سات آسمان پیدا فرمائے ہیں' اسی طرح سات زمینیں بھی پیدا کی ہیں۔ اب ضرورت تھی کہ زمینوں کیلئے جمع کا لفظ لایا جاتا۔ لیکن دیکھئے قرآنِ کریم کیا کہتا ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾

اللہ وہ ہے' جس نے پیدا کئے سات آسمان' اب اس کے بعد ہونا چاہئے تھا خَلَقَ سَبْعَ اَرَضِیْ اور پیدا کیں سات زمینیں' لیکن دیکھئے آیت کریمہ میں الارض کا واحد لفظ لایا گیا اور یہ فرمایا گیا کہ

''اللہ وہ ہے' جس نے پیدا کئے سات آسمان اور زمینیں بھی اتنی'' (الطلاق:۱۲)

یہاں اس نے الارض کو واحد استعمال کیا' لیکن عبارت آرائی سے وہ مفہوم پیدا کر دیا تاکہ قرآن کریم میں غیر فصیح لفظ کے استعمال کا الزام نہ آئے۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ کیا یہ شان کسی انسانی کلام کی ہو سکتی ہے؟

قرآن میں انسانی اصلاح وفلاح کی تمام ہدایات موجود ہیں:

-2 قرآنِ کریم کا دوسرا پہلو انسانی اصلاح وفلاح کیلئے اس کا پیش کردہ نظام زندگی ہے' جس میں آئین وقانون سے لے کر آداب زندگی تک سب کچھ شامل ہے۔ اس میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی سمیت زندگی کے ایک ایک شعبے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ پھر تمام کی بہتری کیلئے احکام اور ہدایات دی گئی ہیں۔ قوموں کے عروج وزوال کے اصول وضع کئے گئے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی آداب تک کا ذکر کیا گیا ہے۔ انسانی نفسیات احساسات اور انفعالات تک کو زیر بحث لایا گیا ہے اور نہایت حکیمانہ ہدایات عطا فرمائی گئی ہیں غرضیکہ پوری زندگی کی راہنمائی کیلئے ایک اچھوتے انداز میں مکمل نظام زندگی عطا فرمایا گیا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ زندگی کے اس پورے نظام میں کیا مجال ہے' جو کہیں تضاد دکھائی دے' کہیں ادھورے پن اور نارسائی کا احساس ہو اور کہیں انسان کو ہدایات دیتے ہوئے طبقات کے احساسات کو در آنے کا موقع دیا گیا ہو۔ جب کہ ہم مختلف ممالک اور مختلف قوموں کی آئینی اور قانونی کاوشوں کو دیکھتے ہیں کہ آئے دن تغیر کا شکار ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں 73ء کا آئین بنا۔ آئین بنانے والے ابھی تھکاوٹ ہی اتار رہے تھے کہ اس میں ترامیم کا سلسلہ بھی چل نکلا اور آج تک یہ سلسلہ نہ صرف رکنے نہیں پایا بلکہ وقت کے ساتھ فزوں تر ہوتا جا رہا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ انسانی کاوشیں' ناتمامی اور نارسائی کا ہمیشہ شکار رہتی ہیں' وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا احساس ابھرتا ہے اور تغیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کیونکہ اللہ کی کتاب ہے' اس کا ہر قانون قطعی' اس کی ہر ہدایت مکمل اور اس کا ہر محاکمہ وقت کی آلودگی سے بے نیاز ہے۔

Marfat.com

قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت اسکی پیشین گوئیاں ہیں:

3- قرآن کریم کا تیسرا پہلو اس کی پیش کردہ پیش گوئیاں ہیں' جن میں علمی بھی ہیں اور واقعاتی بھی۔ ہم علمی پیش گوئیوں کو ابھی زیر بحث نہیں لاتے البتہ واقعاتی پیش گوئیوں کے حوالے سے ایک دو واقعے عرض کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد قیصر و کسریٰ یعنی سلطنتِ ایران اور سلطنت روما کے درمیان ہونے والی جنگ سے ہر پڑھا لکھا آدمی واقف ہے۔ اس جنگ نے چند سالوں میں پوری رومی سلطنت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایرانی فوج ایک طرف تو عرب کے ہمسائے میں یعنی شرق اردن تک پہنچ گئی اور دوسری طرف قسطنطنیہ کے سامنے اس کی فوجوں نے پڑاؤ ڈال دیا۔ رومی سلطنت کے شہنشاہ ہرقل نے نہایت ذلیل شرائط پر صلح کرنے کی کوشش کی' لیکن ایران کا بدمست حکمران اس پر بھی تیار نہ ہوا۔ حالات پر نظر رکھنے والے پیش گوئیاں کر رہے تھے کہ اب سلطنت روما کے دن گنے جا چکے ہیں۔ عین ان حالات میں سورۃ روم نازل ہوتی ہے اور اس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ رومی تمہاری قریبی سرزمین میں مغلوب ہو گئے' لیکن چند ہی سالوں میں وہ اس مغلوبیت سے اٹھیں گے اور دوبارہ ایران پر غالب آجائیں گے۔ اس آیت کے نازل ہو جانے کے بعد مشرکینِ مکہ نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ لیکن چند ہی سالوں میں حالات کا رخ بدلا اور وہ رومی سلطنت' جس کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اس کا حکمران' ملک کے عقبی حصے سے فوجیں لے کر نکلا اور ایران کو فتح کرتا ہوا' اسکے دارالخلافہ تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ اس کو جلا کر خاکستر کر ڈالا۔ آج تک عیسائی مؤرخین اس بات پر حیران ہیں کہ محمد ﷺ مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے' جو دنیا کا ایک کونہ ہے' وہاں تک کوئی اطلاع پہنچتے پہنچتے مہینے لگ جاتے تھے۔ نجانے اس کے پاس اطلاعات کا کون سا ذریعہ تھا' جس ذریعہ پر اعتماد کرتے ہوئے اس نے ایک حیرت انگیز پیش گوئی کی جس کو اس وقت کوئی عقل مند آدمی قبول کرنے کو تیار نہ تھا' لیکن وہ حرف بحرف پوری ہوئی۔ اے کاش! ان کو یہ خبر ہوتی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اطلاعات کا ذریعہ اللہ کی وحی تھی کیونکہ آپ اللہ کے رسول تھے۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ اگر یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل کردہ نہ ہوتی تو اس میں ایسی محیر العقول پیش گوئی کس طرح ممکن تھی۔

دوسری مثال دیکھئے کہ قرآن کریم نے فرعون کے بارے میں یہ بتایا کہ اسے اس کی فوجوں سمیت بحر قلزم میں غرق کر دیا گیا۔ لیکن اس کے جسم کو ہم نے نجات دے دی تاکہ وہ بعد کے لوگوں کیلئے عبرت کا سامان بنا رہے۔ اس طرح قرآنِ کریم نے اس کے جسم کے محفوظ ہونے کی خبر دی' لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کا جسم کہاں ہے۔ غیر مسلم مؤرخین ہمیشہ اس کا مذاق اڑاتے رہے کہ قرآنِ کریم نے یہ غلط خبر دی ہے ورنہ کہیں تو اس کا جسم موجود ہوتا۔ لیکن تقریباً آج سے پونے دو سو سال پہلے جب اہرام مصر کی کھدائی ہوئی' اس میں بعض دوسرے فراعنہ سمیت اس کی لاش بھی ملی اور ماہرین نے اس کی علامتوں سے واضح طور پر اندازہ کر لیا کہ یہ وہی فرعون ہے' جو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں بحر قلزم میں غرق ہو کر مرا تھا اور آج اس کی لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرمائیے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے' جس بات کی خبر قرآن کریم نے دی تھی' وہ کس طرح صحیح ثابت ہوئی۔ کیا کسی انسان کے بس میں یہ بات ہو سکتی ہے کہ وہ دو ہزار سال پہلے کا ایک واقعہ اس طرح حتمی انداز میں پیش کرے' جب کہ پوری دنیائے انسانیت اس سے بالکل بے خبر ہو اور بالآخر ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ کا نشیب و فراز اس کو صحیح ماننے پر مجبور ہو جائے۔ یہ قرآن کریم کے کتاب اللہ ہونے کے وہ حتمی دلائل ہیں' جس کا انکار کرنا کم از کم ایک صاحب عقل و دانش آدمی کیلئے ممکن نہیں۔

ذہنوں میں پھر اس بات کو تازہ کر لیجئے کہ مشرکینِ مکہ نے مطالبہ اس بات کا کیا تھا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں' اس پر کسی کی گواہی لائیے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ معاملہ چونکہ صفاتِ خداوندی کا ہے' اس لئے اس پر کسی کو گواہی دینے کا اگر حق ہے تو وہ خود پروردگار عالم ہے۔ اس کی

Marfat.com

گواہی صرف وحی الٰہی کی صورت میں ممکن ہے اور آج ہمارے سامنے وحی الٰہی کی حامل زندہ کتاب قرآن کریم کی شکل میں موجود ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ کتاب واقعی وحی الٰہی کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے اور یہ واقعی کتاب اللہ ہے تو یہ اس کے یقینی دلائل میں سے چند دلائل ہیں' جو آپ کے سامنے ذکر کئے گئے ہیں اور جس کا انکار کرنا کسی کور باطن ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ چنانچہ دلائل کے ذکر کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ مشرکینِ مکہ سے پوچھو کہ کیا تم اب بھی یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے اور اگر واقعی تم ایسی گواہی دیتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی میں وہاں تک پہنچ گئے ہو' جہاں انسان انسان نہیں رہتا بلکہ دیوار بن جاتا ہے۔ اسے سمجھانا دیوار سے سر پٹخنے کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں تمہاری اس گواہی کی کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتا۔ تم اگر اس انتہائی خست تک پہنچ گئے ہو کہ اندھیرے اور اجالے میں فرق کرنے سے عاجز ہو گئے ہو تو پھر میں تمہارا ساتھ دینے سے تو رہا۔ میں تو وہ بات کہوں گا' جس کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کیونکہ میں نے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور رسول صرف وہ بات کہتا ہے' جس کا حکم اس کا پروردگار دیتا ہے۔ میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اس کائنات کا ایک ہی معبود' ایک ہی الٰہ اور ایک ہی حاکم حقیقی ہے اور تم نے جتنے شریک ٹھہرا رکھے ہیں' چاہے وہ دیوتا ہوں' ملائکہ ہوں' گزری ہوئی برگزیدہ شخصیات ہوں یا تمہاری اٹھائی ہوئی قبریں' میں ان تمام سے اپنی برأت اور بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کی معرفت سے پروردگار نے مشرکینِ مکہ پر حجت تمام فرما دی۔ اب ان کیلئے اس بات کا کوئی موقع نہیں رہا کہ وہ قیامت کے دن یہ کہہ سکیں کہ ہمارے سامنے حق کے اظہار میں کوئی کمی رہ گئی تھی' جس کی وجہ سے ہم حق کا راستہ اختیار نہ کر سکے۔ چنانچہ پوری استدلالی قوت سے ان کے شکوک و شبہات کے کانٹے بھی نکال دیئے گئے اور انذار کے ذریعہ سے پوری طرح انہیں جھنجھوڑ بھی دیا گیا۔

قرآن کی دعوت پھیلانے کا ذمہ دار ہر مسلمان ہے:

اسی آیت کے ضمن میں ایک اور لفظ بھی ذکر فرمایا گیا ہے' جس کا تعلق مشرکینِ مکہ سے نہیں بلکہ بعد میں آنے والی امت اسلامیہ سے ہے۔ وہ لفظ ہے' وَمَنْۢ بَلَغَ'' یعنی اس دعوت کے مخاطب اور اس اتمام حجت کا ہدف صرف مشرکینِ مکہ نہیں بلکہ آنے والی نوعِ انسانی کے افراد اور بالخصوص امتِ اسلامیہ ہے۔ علماء نے اس کے دو مفہوم مراد لئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں قرآنِ کریم کے ذریعے جو دعوت دے رہا ہوں' وہ صرف مشرکینِ مکہ تک محدود نہیں بلکہ قیامت تک جس جس شخص تک یہ قرآن کریم اور اس کی دعوت پہنچے' وہ بھی میرا مخاطب ہے۔ اس لئے سعید بن جبیر رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس آدمی تک قرآن پہنچ جائے' اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ لیا کیونکہ وہ براہ راست اس قرآن کریم کے واسطہ سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کا مخاطب ہے۔ اس لئے امت اسلامیہ کے ایک ایک فرد کے یہ سوچنے کی بات ہے کہ میں اپنے گھر میں جو قرآنِ کریم کو ایک اونچے طاق پر سجا کر یہ سمجھ لیتا ہوں کہ میں نے قرآنِ پاک کا حق ادا کر دیا' اصلاً اس کے واسطے سے حضور ﷺ مجھ سے مخاطب ہیں اور وہ پوچھ رہے ہیں کہ میں نے اس قرآن کے واسطے سے جن جن باتوں کا تمہیں حکم دیا اور جن جن باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی' کیا تم نے ان تمام باتوں کو زندگی میں داخل کر لیا ہے اور کیا تمہاری زندگی واقعی اس کتاب خداوندی کی ہدایات کے مطابق گزر رہی ہے؟

دوسرا اس کا مفہوم جو علماء نے سمجھا وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ قرآن کریم کے واسطے سے یہ فرما رہے ہیں کہ میری طرف جو قرآنِ کریم وحی کیا گیا' وہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے لوگوں کو خبردار کروں کہ دیکھنا اگر تم نے زندگیاں اس ہدایت خداوندی سے آزاد ہو کر گزاریں تو یہ زندگی بھی تباہ ہو جائے گی اور آخرت میں بھی برے انجام سے واسطہ پڑے گا۔ لیکن یہ ذمہ داری صرف میری نہیں' بلکہ یہ ذمہ داری میں آگے منتقل کر رہا ہوں کہ آج یہ دعوت پیش کرنے کی ذمہ داری اور اللہ کے دین کے نفاذ کی ذمہ داری جو میں ادا کر رہا ہوں یہ ہر اس شخص کی ذمہ داری ہے' جس تک یہ اللہ کی

Marfat.com

کتاب پہنچے۔اس کا فرض ہے کہ وہ اس کتاب کو سمجھے' سیکھے دوسروں تک پہنچائے' اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے' اس کی تعلیمات کو حرزِ جان بنائے' معاشرے میں اس کا چلن عام کرنے کیلئے اپنا رول ادا کرے' اجتماعی زندگی میں اس کے نفاذ کا راستہ کھولنے کیلئے تمام امکانی مساعی کو بروئے کار لائے اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو یہ ذمہ داری سے پہلو تہی کرنے والی بات ہوگی' جس کی کل کو جواب دہی کرنی پڑے گی۔اس لحاظ سے قرآن کریم اور اس کی دعوت کا ایک ایک شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

اس ذمہ داری کا ذکر قرآن کریم میں مختلف حوالوں سے اور بھی کئی جگہ کیا گیا ہے۔ارشاد خداوندی ہے:

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ

''ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلتی' تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرے اور پھر وہ واپس اپنے گروہ کی طرف لوٹتی' تاکہ وہ انہیں خبردار کرے'' (التوبہ:۱۲۲)

''فرقہ'' کہتے ہیں بڑی جماعت اور بڑے گروہ کو اور ''طائفہ'' سے مراد ہے چھوٹی جماعت۔کہنا یہ ہے کہ جہاں بھی مسلمانوں کا کوئی گروہ آباد ہے یا کوئی بستی قائم ہے' اس گروہ اور اس بستی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک اچھی خاصی تعداد کو دین میں تفقہ پیدا کرنے اور گہری سمجھ پیدا کرنے کیلئے' اہل علم کے پاس بھیجے اور وہاں سے وہ اللہ کے دین کو سمجھ کر یعنی قرآن وسنت کو سیکھ کر واپس آئے اور وہ اس گروہ یا اس بستی کے رہنے والوں کو اللہ کے احکام سے باخبر کرے' ان کے غلط کاموں پر انہیں ٹوکے' صحیح باتوں کا حکم دے' اس طرح ان کی زندگی میں اصلاح کے عمل کو رواج دے تاکہ ان کی دنیا بھی اچھی ہو اور آخرت بھی سرخرو ہو سکے۔اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ امت کے ایک ایک فرد' ایک ایک بستی اور ایک ایک گروہ پر وہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے' جس کی ادائیگی کیلئے اللہ کے نبی دنیا میں تشریف لاتے رہے اور آنحضرت ﷺ کے بعد چونکہ کسی پیغمبر کو آنا نہیں تھا' اس لئے رسول اللہ ﷺ اس معاملے میں زیادہ فکرمند رہتے تھے اور آپ مختلف اوقات میں اپنی امت کو اس ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے تاکید فرماتے تھے۔ایک موقع پر فرمایا کہ لوگو! تم میں سے جو موجود ہے' اسے میری یہ باتیں اور دین کے احکام ان لوگوں تک پہنچانے چاہئیں جو یہاں موجود نہیں اور ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ممکن ہے کہ تم جن لوگوں تک میرے احکام پہنچاؤ' وہ ان احکام کو سمجھنے اور اس کی ذمہ داری ادا کرنے میں تم سے زیادہ باصلاحیت ثابت ہوں۔یہی بات پیش نظر آیت کریمہ میں بھی کہی گئی ہے کہ جن لوگوں تک بھی قرآن کریم کی دعوت پہنچے ان لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔اس کے پیغام کو خود اختیار کریں اور اپنے گھروں میں اس کا چلن عام کر دیں اور اس کو اپنے گھروں اور اپنے معاشرے میں یہ حیثیت دے دیں کہ جب بھی رہنمائی کا موقع ہو قرآن کریم مختلف زبانوں اور مختلف حوالوں سے بولتا ہوا سنائی دے۔بڑے غلطی کریں تو چھوٹے اسی قرآن کریم کی مدد سے توجہ دلائیں اور چھوٹے اگر کوتاہیاں کریں تو بڑے اسی تعلیم کی روشنی میں ان کو راہ راست دکھائیں اور ضرورت پڑے تو ان کی سرزنش بھی کریں۔

قرآن کریم سے متعلق ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟

قرآن کریم کے حوالے سے اگر امت کے ہر فرد کی واقعی یہی ذمہ داری ہے' جیسا کہ ہم یہاں دیکھ رہے ہیں تو یہ ذمہ داری ظاہر ہے کہ نہ تو صرف قرآن کریم کی تلاوت سے پوری ہو سکتی ہے اور نہ صرف تراویح میں سن لینے سے اس کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ کبھی کبھی مختلف مجالس میں کسی وعظ کے سن لینے سے یا مختلف مواقع پر چند آیات کا ایک مختصر سا کورس کرا دینے سے یہ ذمہ داری ادا ہو سکتی ہے۔اس کیلئے تو انتہائی ضروری ہے کہ پورے

Marfat.com

قرآن پاک کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ بے شک اس کے عربی الفاظ پر گرفت نہ ہو سکے لیکن اس کا مفہوم اس کی مراد پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔ بالخصوص اس کے احکام کو اچھی طرح از بر کرلیا جائے تاکہ زندگی میں اس کی خلاف ورزی کم از کم بے خبری کی وجہ سے تو نہ ہو سکے۔

یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس میں سے کوئی بات بھی مشکل نہیں جسے ہم اختیار نہ کر سکتے ہوں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمارے اندر وہ احساس پیدا ہو جائے جس کا کبھی علامہ اقبال نے سید سلیمان ندوی مرحوم کو اپنے بچپن کا واقعہ سناتے ہوئے ذکر کیا تھا۔ اقبال نے کہا کہ میں بچپن ہی سے قرآن پاک کو بہت شوق اور خوش الحانی کے ساتھ ہر صبح کو نماز کے بعد تلاوت کرنے کا عادی رہا ہوں۔ ایک روز اسی طرح میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا کہ میرے والد میرے پاس سے گزرے اور کہنے لگے کہ بیٹے جب میں تمہیں قرآن پاک پڑھتا ہوا دیکھتا ہوں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں کسی دن ایک خاص بات بتاؤں۔ میں نے کہا ضرور فرمائیے۔ چند دن گزر گئے تو میں نے ایک دن اصرار کر کے پوچھا کہ بابا آپ کہتے تھے کہ میں کسی دن ایک بات بتاؤں گا تو آج بتائیے نا۔ کہنے لگے کہ بیٹے ایسی کوئی خاص بات نہیں صرف یہ کہنا تھا کہ جب بھی تم قرآنِ کریم پڑھو تو یہ سمجھ کر نہ پڑھنا کہ یہ کتاب چودہ سو سال پہلے نازل ہوئی تھی بلکہ یہ سمجھ کر پڑھنا کہ میں اس وقت جو کچھ پڑھ رہا ہوں وہ اس وقت مجھ پر نازل ہو رہا ہے اور میں خود اس کا مخاطب ہوں یعنی اس کا ایک ایک حکم میرے لئے ہے اس کی ایک ایک ہدایت مجھ سے مخاطب ہے اس کی ایک ایک نصیحت میری اصلاح کیلئے ہے۔ جب تم ایسا کرو گے تو تمہاری زندگی میں ایک تبدیلی آئے گی۔ شاید یہی وہ احساس ہے جس کے زیر اثر اقبال نے یہ شعر کہا

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف
(بال جبریل)

قرآن کریم سے متعلق اپنی ذمہ داریاں کیسے ادا کی جاسکتی ہیں:

جب اس امت کا ایک ایک فرد قرآنِ کریم کو اس طرح پڑھے کہ وہ خود اس سے مخاطب ہے اور براہ راست اسے احکام دے رہا ہے تو اس سے وہ جو گہرا اثر قبول کرے گا وہ تو اپنی جگہ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ شدید احساس بھی ہوگا کہ قرآن کریم کے حوالے سے جتنی بھی ذمہ داریاں ہو سکتی ہیں (اس کا ذکر پہلے ہو بھی چکا ہے) میں ان سب کا مخاطب ہوں۔ اس لئے یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں معاشرے میں جس حیثیت کا بھی مالک ہوں اور ماحول میں میرا جو مقام بھی ہے میں اس کے حوالے سے اپنا فرض انجام دینے کی کوشش کروں۔ امت میں ظاہر ہے کہ ہر سطح کے لوگ ہیں۔ غریب بھی ہیں امیر بھی۔ عالم بھی ہیں جاہل بھی محکوم بھی ہیں حاکم بھی۔ مؤثر بھی ہیں متاثر بھی۔ انفرادی زندگی گزارنے والے بھی ہیں اجتماعی اداروں کو چلانے والے بھی۔ حتیٰ کہ صاحبان اقتدار بھی۔ اگر ان میں سے ایک ایک فرد اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے تو پورے ملک اور پورے معاشرے میں نہ تو قرآنِ کریم کی بالادستی میں کوئی رکاوٹ حائل ہو سکتی ہے اور نہ معاشرے کی اصلاح میں کوئی تاخیر ممکن ہے۔ اس لئے مَنْۢ بَلَغَ کہہ کر قرآن کریم نے ہماری اصلاح و کامرانی کی ایک ایسی ماسٹر کی (چابی) ہمارے حوالے کر دی ہے جس سے ہم اپنے مسائل اور اپنی الجھنوں کا ایک ایک تالہ کھول سکتے ہیں اور اپنی قسمت بنانے اور سنوارنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

گزشتہ آیت کی تفسیر میں ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ مشرکینِ مکہ کے کچھ لوگوں نے آنحضرت سے جب گواہی طلب کی تھی تو یہ بھی کہا تھا کہ ہم تو آپ اور آپ کے دین کے بارے میں اہل کتاب سے بھی پوچھ چکے ہیں انہیں صاف انکار ہے کہ ہم آپ کے بارے میں اپنی کتابوں میں کوئی چیز نہیں پاتے۔ چنانچہ اسی حوالے سے اگلی آیت کریمہ میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

Marfat.com

آیت: ۲۰ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ O ''جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے''۔

کفار حضور ﷺ کو اپنے بیٹوں سے بڑھ کر پہچانتے ہیں:

اے مشرکین مکہ! تم یہ کہتے ہو کہ اہل کتاب قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور ان کی کتابیں اس سے بالکل خالی ہیں۔ تم اصلاً ان اہل کتاب سے ملتے ہو جو تمہاری طرح جوشِ تعصب میں بالکل اندھے ہو چکے ہیں۔ عقل و دانش اور ہدایت و نصیحت کی کوئی بات جس طرح تم پر اثر انداز نہیں ہوتی، اسی طرح ان پر بھی اثر نہیں کرتی۔ تمہیں غرورِ نفس اور جہالت نے ہدایت اور حقیقت سے دور رکھا ہے اور انہیں غرور نسب اور حسد نے اسلام قبول کرنے سے روک رکھا ہے۔ تم دونوں کا چونکہ مضمون مشترک ہے، اس لئے تم دونوں اسلام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کیلئے مل جل کر سازش کرتے ہو۔ سازش کے شرکاء تو کبھی صحیح گواہی نہیں دے سکتے۔ اس لئے وہ لوگ اگر ایسا کہتے ہیں تو انہیں ایسا ہی کہنا چاہئے۔ لیکن اہل کتاب میں صالحین کا ایک گروہ بھی تو ہے، جو اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے اللہ سے ڈرتا ہے یا جھجک محسوس کرتا ہے۔ ان سے پوچھ کر دیکھو! وہ تمہارے سامنے تاریخ کی اس واضح شہادت کو کبھی چھپانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ چنانچہ ان کے حوالے سے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ قرآنِ کریم اور رسول اللہ ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں یعنی جس طرح آدمی اپنے بیٹے کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔ بیسیوں بچوں میں ملا جلا اپنا بچہ دور سے پہچان میں آ جاتا ہے۔ اسی طرح باطل کے ہجوم میں بھی، وہ اس حق کو پہچانتے ہیں اور کفار کی اڑائی ہوئی دھول میں بھی اللہ کے نبی کو پہچانتے ہیں۔ پھر جس طرح ایک باپ نہ صرف کہ بیٹے کو پہچانتا ہے بلکہ اس کے پیراہن کی خوشبو کو بھی پہچانتا ہے، اس کے نقوش قدم بھی اس کیلئے اجنبی نہیں ہوتے، اس کی علامتیں اس کیلئے جانی پہچانی ہوتی ہیں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ اہل کتاب کیلئے جانے پہچانے اور آپ کی ہدایت کی خوشبو ان کے مذہبی ذوق کے نہایت موافق اور آپ کے آثار و سنن، سابق انبیاء کے آثار و سنن کے نہایت مشابہ ہیں۔

حدیث میں آتا ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کیونکہ حضرت عبداللہ یہود کے بڑے علماء میں سے تھے اور اب اسلام قبول کر چکے تھے کہ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ آپ حضور ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو، اس کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے کہا! حقیقت یہ ہے کہ ہم حضور ﷺ کو اپنے بیٹوں سے زیادہ جانتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اپنے بیٹے کے بیٹا ہونے کی میرے پاس صرف ایک گواہی ہے، وہ ہے بیٹے کی ماں۔ اگر اس نے سچ بولا ہے تو وہ واقعی میرا بیٹا ہے اور اگر اس نے خیانت کی ہے تو میں ایک ایسے لڑکے کو اپنا بیٹا سمجھتا ہوں، جو حقیقت میں میرا بیٹا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیٹے کے بارے میں میرا علم ظنی ہے، یقینی نہیں۔ لیکن حضور کے بارے میں ہماری پہچان یقینی ہے کیونکہ حضور ﷺ کی علامتیں، آپ کی صفات اور آپ کی خصوصیات، اللہ کی کتاب تورات میں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ جب ہم نے حضور ﷺ کو ان کا مصداق پایا تو وہ چونکہ اللہ کی طرف سے یقینی اطلاعات ہیں تو ہمیں ان کی وجہ سے یقین ہو گیا کہ آپ واقعی اللہ کے وہی رسول ہیں، جسکی ہماری کتابوں نے گواہی دی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض اہل کتاب نے آنحضرت ﷺ کو صرف ظاہری علامتوں سے پہچاننے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جو علامتیں آپ کے اخلاق کے حوالے سے ان کی کتابوں میں بیان کی گئی تھیں، جب تک اس کی تصدیق نہیں کر لی، اس وقت تک وہ ایمان نہیں لائے۔ اہلِ کتاب میں سے ایک شخص جن کا

Marfat.com

نام زید بن سعنہ ہے' ان سے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ قرض لیا۔ واپسی کی کوئی تاریخ طے ہوگئی۔ لیکن وہ واپسی کی تاریخ سے کئی روز پہلے مطالبہ کرنے کیلئے آ پہنچے۔ آپ نے صرف یہ فرمایا کہ بھئی ابھی تو واپسی کا وقت نہیں آیا۔ لیکن انہوں نے بجائے اپنی غلطی کو سمجھنے کے' سخت رویہ اختیار کیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ تک کہہ ڈالا کہ تم جو آل عبدالمطلب ہو تم تو ہمیشہ کے نادہند ہو۔ تم قرض لیتے ہو' لیکن تمہیں واپسی کی فکر نہیں ہوتی۔ جب وہ بدزبانی میں یہاں تک پہنچ گیا تو صحابہ کرام جو حضور اکرم ﷺ کے ادب کی وجہ سے خاموش بیٹھے سب کچھ دیکھ رہے تھے' ان میں اشتعال پیدا ہوا اور حضرت عمر فاروق ؓ نے اٹھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے ڈانٹا۔ تب حضور ﷺ نے سختی سے حضرت عمر فاروق سے فرمایا: اسے چھوڑ دو۔ آپ نے فرمایا: تم نے سے ڈانٹ کر اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے عرض کی کہ حضور آپ دیکھ نہیں رہے' وہ کیسے بدزبانی کر رہا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہیں دونوں کو سمجھانا چاہئے تھا۔ مجھے کہتے کہ قرض لیا تھا تو واپسی کی فکر بھی کرنی چاہئے تھی۔ اسے کہتے کہ تقاضہ کرتے ہوئے شائستگی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اب جبکہ تم نے اس کے ساتھ سختی کی ہے' اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اسی وقت اس کا قرض ادا کرو اور سختی کے بدلے میں اصل قرض سے زائد ادا کرو۔ اس شخص نے اپنا قرض وصول کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد غسل کر کے واپس آیا اور آکر عرض کی حضور ﷺ مجھے مسلمان کیجئے۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نے بتایا کہ میں پہلی آسمانی کتابوں کا عالم ہوں۔ میں نے حضور کی ایک ایک علامت دیکھ لی تھی' لیکن ایک علامت دیکھنا باقی تھا۔ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ نبی آخرالزمان اس قدر حلیم اور بردبار ہوں گے کہ لوگوں کی سختی اور بدتمیزی ان کی بردباری کو شکست نہیں دے سکے گی۔ کہا آج میں صرف اس علامت کو دیکھنے اور آزمائش کرنے آیا تھا۔ جب یہ علامت بھی پوری ہوگئی تو اب اسلام لانے میں دیر نہیں کی جاسکتی۔

ایسے اور اہل کتاب کے بہت سے واقعات ہیں' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فی الواقع آنحضرت کو پوری طرح پہچانتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ واقعی اسی طرح پہچانتے تھے تو پھر وہ ایمان کیوں نہیں لاتے تھے؟ اس کے بارے میں اس آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں کو گھاٹے میں ڈالا' وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں ہر بیماری کا علاج ممکن ہے' لیکن خودکشی کا کوئی علاج نہیں۔ آپ کسی بھی خودکشی کرنے والے کو کسی ایک جگہ سے روک لیں گے' دوجگہ سے روک لیں گے' لیکن اگر وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اس نے خودکشی ضرور کرنی ہے تو آپ کہاں کہاں اسے روکیں گے۔ یہ لوگ بھی ایمانی خودکشی کا فیصلہ کر چکے تھے اور حسد اور بغض نے ان کو اس حد تک اندھا کر دیا تھا کہ آخرت کو جانتے ہوئے بھی' آخرت کو بھول چکے تھے۔

بگڑی ہوئی قوموں میں بگاڑ کی کوئی ایک شکل وصورت نہیں ہوتی۔ بگڑے ہوئے لوگ بھی سب یکساں نہیں ہوتے۔ اہل کتاب میں بھی ایک تو ایمان نہ لانے والوں میں یہ لوگ تھے' جن کو حسد اور بغض نے ایمان لانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ لیکن ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کو بےفکروں کا گروہ کہنا چاہئے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض ہی نہیں تھی کہ نبی آخرالزماں تشریف لا چکے ہیں۔ وہ ہمیں کسی بات کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ ہمیں ہمارے برے انجام سے بچانا چاہتے ہیں۔ وہ دنیا کے اللے تللوں اور عیش وعشرت کی مستیوں میں اس حد تک ڈوب چکے تھے کہ انہیں سوائے اپنے شغل بےکار کے اور کسی بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی مثال دیکھنا چاہیں تو ہمارے گردوپیش میں بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ ایسے لوگ جنہوں نے حرام ذرائع سے دنوں میں دولت پیدا کی ہے۔ جنہوں نے عہدہ ومنصب سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا کا مال جمع کر لیا اور بری صحبتوں میں پڑ کر ناؤنوش کی زندگی اختیار کر چکے ہیں۔ یہ لوگ جب بھی کسی تقریب میں اکٹھے ہو کر معصیت کا کاروبار کر رہے ہوتے ہیں یا ہر سال کے آغاز میں سال کا پہلا دن منا رہے ہوتے ہیں یا کسی بھی حوالے سے عیش وعشرت کی کوئی تقریب پیدا کر لیتے ہیں تو آپ ان لوگوں سے کبھی بات کر کے

Marfat.com

دیکھئے۔ انہیں ان کی موت یاد دلایئے' شرافت اور شائستگی کی بات چھیڑ کر دیکھئے' شرم وحیا کا تذکرہ کر کے دیکھ لیجئے' ملک کے بگڑے ہوئے حالات کا واسطہ دیجئے' کوئی سی بھی سنجیدہ بات نہ صرف کہ ان کے قریب سے بھی ہو کر نہیں گزرتی' بلکہ وہ انہیں قابل نفرت معلوم ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی بات ہو' آپ ان کی معلومات پر حیران رہ جائیں گے۔ لیکن دین اور آخرت کی بات' ایسا معلوم ہوگا کہ وہ شاید پہلی دفعہ سن رہے ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے' جن کے بارے میں قرآن کریم نے کہا:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ

''یہ لوگ دنیا کے ظاہر کو اچھی طرح جانتے ہیں' لیکن آخرت سے بالکل غافل ہیں'' (الروم:۷)

اہل کتاب میں بھی اس طرح کے لوگ بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ انہیں ان موضوعات سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان کے بارے میں قرآنِ کریم کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا ہے۔ یعنی وہ دنیا کی سرمستیوں میں ڈوب کر' آخرت کی فلاح کو بھول چکے ہیں۔ اس لئے وہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ایمان ان کی سوچ سے اب میل نہیں کھاتا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے انسانوں کا طبقہ صرف دولتمندوں اور صاحب منصب لوگوں میں ہوتا ہے چونکہ ان کے یہاں دولت کی ریل پیل ہوتی ہے اور وہ مسائل کی پریشانیوں سے دور ہوتے ہیں۔ اس لئے ایمان وعمل کی باتیں ان کیلئے اجنبی ہو جاتی ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس طرح کے لوگ آپ کو غربا میں بھی ملیں گے۔ وہ مزدور' جو دن بھر کی مزدوری سے رات کو روٹی کھانے کے قابل ہوتا ہے۔ ان میں بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے' جنہیں دین کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ پہلے طبقے کو مسائل سے لاتعلقی گمراہ کرتی ہے اور دوسرے طبقے کو مسائل کا ہجوم کسی اور طرف دیکھنے کا موقع نہیں دیتا۔ یہ دونوں ہی اپنی جانوں کے دشمن اور اپنے انجام سے بے خبر لوگ ہیں۔ جب تک گہری منصوبہ بندی اور نہایت دلسوزی کے ساتھ ان لوگوں میں کام کا راستہ نہیں نکالا جائے گا' اس وقت تک ان کی سوچ میں تبدیلی نہیں آسکتی۔

عقیدۂ توحید اور شرک کے ابطال کے سلسلہ میں اللہ کی گواہی اور اہل کتاب کی گواہی کے ذکر کرنے اور اس ضمن میں بعض ضمنی مباحث کے چھڑ جانے کی وجہ سے بعض حکیمانہ باتیں ارشاد فرمانے کے بعد اب پھر اسی بحث کو مکمل کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۲۱ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے' جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا اس کی آیات کی تکذیب کی۔ بے شک یہ ظالم فلاح پانے والے نہیں''۔

مشرک سب سے بڑا ظالم ہے:

یعنی جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ کی گواہی یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور اہل کتاب پہلی آسمانی کتابوں کی گواہی سے قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی گواہی دے چکے۔ تو ان دونوں گواہیوں کے مکمل ہونے کے بعد اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور نامراد کون ہو سکتا ہے' جو اس گواہی کے خلاف اللہ پر جھوٹ باندھے اور یہ کہے کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنے ساتھ شریک بنا رکھا ہے اور یا قرآن کریم کی ان آیات کی تکذیب کرے' جس میں واضح طور پر توحید کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے دلائل مہیا کئے گئے ہیں؟ ظلم کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اس جگہ رکھنا' جو اس کی اصل جگہ نہیں یا اس کا استعمال اس طرح کرنا' جو اس کے استعمال کا صحیح طریقہ نہیں۔ مثلاً قمیض کو شلوار کی جگہ استعمال کرنا' شلوار کو قمیض کی جگہ استعمال کرنا۔ یہ ثابت ہونے کے بعد کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں اور وہ اپنی ذات اور صفات میں وحدۂ لاشریک ہے' اس کے بعد بھی اس کی صفات میں کسی اور کو شریک سمجھ

Marfat.com

کر اس کے سامنے سر جھکانا' اس سے مرادیں مانگنا' اسکے سامنے دست سوال پھیلانا' اس کو غیر مشروط اطاعت کا مستحق سمجھنا' یہ سراسر اللہ کے ساتھ ظلم ہے۔ کیونکہ الوہیت حاکمیت' کبریائی' یہ سراسر اسی کو زیب دیتے ہیں اور جب ان صفات کو کسی اور کے سر پر سجا دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صفات کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے کیونکہ انہیں غلط جگہ پر رکھ دیا ہے۔ اسی طرح جس انسان کو اللہ نے تکوینی طور پر بندہ پیدا فرمایا ہے' وہ مجبور ہے کہ پاؤں کے بل چلے' سر سے سوچے' ہاتھوں سے پکڑے' منہ سے کھائے' زبان سے بولے' آنکھوں سے دیکھے' کانوں سے سنے اور ناک سے سونگھے۔ وہ اس کے خلاف کسی طرح بھی زندگی گزارنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور وہ بہر صورت انہی پابندیوں کے مطابق زندگی کے اعمال بروئے کار لانے پر مجبور ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک بندہ ہے۔ کوئی اس کا آقا ہے' جس کی وہ بندگی بجا لا رہا ہے۔ اب عدل اور انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ جس طرح وہ مجبوراً بندہ بن کر زندگی گزارتا ہے' اسی طرح وہ اپنے اختیار اور ارادے کے ساتھ بھی اللہ ہی کی بندگی میں زندگی گزارے اور اپنے سر کو صرف اسی کے سامنے جھکائے کیونکہ سر اسی لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اپنے دل کو اسی کی محبت سے آباد کرے کیونکہ دل اسی کی محبت سے آباد ہوتا ہے۔ اعضاء و جوارح سے اسی کے احکام بجا لائے کیونکہ یہ اعضاء اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ تمام کاموں میں شیطان یا اپنے نفس کی بندگی کرتا ہے تو یہ سراسر اپنی ذات' اپنے شعور' اپنے اختیار اور اپنی شخصیت کے ساتھ ظلم ہے۔ اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جو ایسے واضح دلائل کے بعد بھی اپنا رویہ تبدیل نہیں کرتا تو ایسے شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے۔

فلاح سے مراد دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح ہے:

آیت کے آخری حصہ میں فرمایا کہ ایسے ظالموں یعنی اللہ کے نافرمانوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ ظالموں کو کبھی فلاح نہیں دیتا۔ اس سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ فلاح سے مراد آخرت کی فلاح ہے۔ جیسے اس سے پہلے میں عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا بگڑا ہوا طبقہ چونکہ آخرت کے بارے میں سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتا اور اگر کبھی تھوڑی بہت توجہ دیتا بھی ہے تو یہ کہہ کر آگے نکل جاتا ہے کہ جب حشر کا دن آئے گا' اس وقت دیکھا جائے گا۔ لیکن میں یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں کہ فلاح سے مراد صرف آخرت کی فلاح نہیں بلکہ دنیا کی فلاح بھی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مومن کا اصل مقصود آخرت میں فلاح حاصل کرنا ہے۔ لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ دنیا کی فلاح حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں اس حد تک مربوط ہیں کہ جو خوش نصیب ہے' وہ دونوں سے نوازا جاتا ہے اور جو بدنصیب اور نامراد ہے' وہ دونوں سے محروم رہتا ہے کیونکہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء۔ اس دار العمل میں' جس نے ایمان و عمل کا حق ادا کر دیا' اسے دنیا کی فلاح بھی مل جائے گی اور آخرت کی فلاح بھی اور جو اس دار العمل میں ایمان و عمل سے تہی دامن رہا' اسے نہ دنیا کی کامیابی نصیب ہوگی' نہ آخرت کی۔ لیکن یہ غلط فہمی بہر حال دور ہونی چاہئے کہ اگر ہم اللہ کے احکام پر عمل نہیں کریں گے تو ہماری آخرت تو ویران ہوگی' لیکن ہماری دنیا کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ اصل میں ہماری کوتاہ نظری ہے۔ اگر ہم گہری نظر سے دیکھیں اور وسیع نظر سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ جس کی آخرت اجڑتی ہے' اس کی دنیا بھی آباد نہیں رہتی کیونکہ آخرت بداعمالیوں کے نتیجے میں اجڑتی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ بداعمالیاں یا اللہ کی نافرمانیاں دنیا کی زندگی پر اثر انداز نہ ہوں۔

جس کی آخرت اجڑتی ہے اسکی دنیا بھی محفوظ نہیں رہتی:

میں صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ جو آدمی اللہ کے احکام کے مطابق حلال و حرام کی پابندی نہیں کرتا بلکہ وہ ہوس دنیا میں

Marfat.com

شریعت کا ایک ایک حکم توڑ دیتا ہے' آپ یقین کیجئے اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر دیکھ لیجئے کہ حرام کمائی کرنے والا شخص اور اس سے متمتع ہونے والے اس کے اہلِ خانہ عموماً پرسکون اور طویل زندگی سے محروم رہتے ہیں۔ ایسے خاندانوں میں جوانی کی موتیں بڑھ جاتی ہیں اور اگر کسی کو لمبی عمر ملتی بھی ہے تو وہ دوسروں کیلئے عبرت بن جاتی ہے۔ ایسے لوگ بیچارے کبھی اپنی نیند سے نہیں سو سکتے۔ خواب آور گولیاں ان کی زندگی کا سہارا بن جاتی ہیں۔ بالعموم ایسے گھرانوں میں آپ دیکھیں گے' بچے اپنے ماں باپ کے فرمانبردار نہیں ہوتے۔ گھر اگر ماں باپ اور بچوں کی مسکراہٹوں سے روشن ہوتا ہے اور ان کے باہمی محبت اور پیار سے رہنے کو ہی گھر کہا جاتا ہے تو جس گھر میں بچے والدین کیلئے عذاب بن جائیں' وہ گھر اپنے رہنے والوں کو گھر کا سکون تو کیا دے البتہ وہ ایک جہنم ضرور بن جائے گا۔ اگر ماں باپ میں غیرت وحمیت کا جذبہ باقی ہے تو اولاد ان کیلئے سوہانِ روح بن جاتی ہے اور ماں باپ اولاد کیلئے گھر میں پڑی ہوئی پرانی چیز کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ پھر جن گھروں میں دین نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی' بظاہر کروڑوں کی بنی ہوئی خوبصورت کوٹھیاں اللہ کے نام اور اس کے ذکر سے بالکل بیگانہ رہتی ہیں تو ایسے گھر بالعموم خبیث روحوں اور فاسق و فاجر جنات کا مسکن بن جاتے ہیں۔ باخبر لوگ جانتے ہیں کہ جس طرح انسانوں میں نیک و بد کی تقسیم ہے' اسی طرح جنات میں بھی ہے اچھے برے ہر طرح کے جن موجود ہیں۔ ان میں شریعت کے پابند اور شریف جنات کبھی آبادیوں کا رخ نہیں کرتے۔ ہمیشہ بگڑے ہوئے اور فاسق و فاجر جنات انسانوں کو ستانے اور محض دل بہلاوے کیلئے آبادیوں کا رخ کرتے ہیں اور ان گھروں کو اپنا مسکن بناتے ہیں' جہاں انہیں اپنی پسند کی زندگی نظر آتی ہے اور جہاں شریعت کی پابندی ہو اور ہر لحاظ سے گھر میں نیکی کا دور دورہ ہو' کبھی یہ خبیث روحیں اس کی طرف منہ بھی نہیں کرتیں۔ آنحضرت ﷺ نے ایک نوجوان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بیٹے! جب تم اپنے گھر میں جاؤ تو اہلِ خانہ کو سلام کہو۔ سلام چونکہ سلامتی کی دعا ہے' اس لئے فرمایا کہ اس سے تمہیں بھی سلامتی میسر آئے گی اور تمہارے گھر والوں کو بھی' اس کے بعد اگر نماز اور قرآن کی پابندی کے ساتھ ساتھ سوتے اور اٹھتے ہوئے ان دعاؤں کو اپنا معمول بنا لیا جائے' جو حضور سے منقول ہیں تو گھروں میں ایسے اثرات کبھی داخل نہیں ہوتے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ کی نافرمانی گھروں میں کس طرح کے مسائل پیدا کرتی ہے بلکہ میں تو آپ سے یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچوں کے اخلاق پاکیزہ ہوں اور آپ کا گھر پاکیزگی کا نمونہ ہو تو اپنے آپ کو پاکیزگی کا پیکر بنائیے۔ جس گھر میں بھی ایک بار بدکاری داخل ہو جاتی ہے' یقین جانیے ان کی اولاد کو بدراہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ ہے وہ چیز' جس کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ ظالموں کو فلاح نہیں دیتا۔ اگر مزید دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ کسی بھی انسانی معاشرے میں کوئی بھی ہونے والا عمل چاہے وہ اچھا ہو یا برا صرف عمل کرنے والے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے اثرات رفتہ رفتہ پھیلتے جاتے ہیں۔ جس طرح کسی بستی کی گندگی صرف وہیں تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کے اثرات بعض دفعہ وبا کی صورت میں پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یہی حال انسانی اعمال کا بھی ہے۔ جب بداعمالیاں کسی آبادی میں بڑھ جاتی ہیں تو اس کے نتائج بد سے پوری آبادی کو سابقہ پیش آتا ہے۔ کسی بھی آبادی کے بگڑے ہوئے نوجوان' اس پوری آبادی کیلئے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ جس طرح شرم و حیاء کو خطرات لاحق ہوتے ہیں' اسی طرح ہر گھر اپنا تحفظ کھو دیتا ہے۔ ایک گھر میں آنے والی حرام کمائی' پڑوس میں رہنے والے نوجوانوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ ان کے ہاتھوں یا یہ گھر لٹے گا اور یا وہ بھی حرام کمائی کے رسیا ہو جائیں گے۔ نتیجہ پورے معاشرے کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ظلم کے اثرات صرف آخرت ہی میں نہیں' دنیا میں بھی انسان کا مقدر بنتے ہیں۔

اگلی آیت کریمہ میں وہ بدنصیب جو کبھی بھی دنیا میں راہ راست اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور بے فکری میں اس مہلت عمل کو ضائع

Marfat.com

دیتے ہیں‘ ان کے حسرت ناک انجام کی خبر دی جارہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۲۲ "وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُن فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ انظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝" (یاد کرو اس دن کو) جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے۔ پھر پوچھیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمہارے وہ شریک کہاں ہیں‘ جن کو تم ہمارا شریک گمان کرتے تھے؟ پھر ان کے فریب کا پردہ چاک ہو جائے گا‘ مگر یہ کہ وہ کہیں گے! ہمارے رب اللہ کی قسم‘ ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو! انہوں نے کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولا اور ان کا سارا افترا ہوا ہو گیا۔

قیامت کے دن ہر قسم کے مشرک کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے گا:

اس آیت کا پہلا لفظ "یوم" دل ہلا دینے والا ہے۔ اس لفظ سے مشرکین کو جھنجھوڑتے ہوئے توجہ دلائی جارہی ہے کہ آج تو تم اللہ کے رسول کے مقابلے میں بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہو اور اس کی وہ باتیں‘ جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں اور جس کا ایک ایک لفظ حیات بخش ہے‘ تم ان کو چٹکیوں میں اڑاتے ہو اور بڑی سے بڑی دلیل کو پرکاہ کے برابر اہمیت دینے کو تیار نہیں ہو۔ لیکن کاش! تمہیں معلوم ہوتا کہ تمہیں ایک ایسے دن سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ جہاں تم اللہ کی قدرت کی گرفت میں نہایت بے کسی کی تصویر بنے اپنے سامنے جہنم کو دہکتا ہوا دیکھو گے اور کوئی صورت وہاں سے بچ نکلنے کی نہیں ہو گی۔ کہا اس دن کی ہولناکی کو یاد کرو اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ وہاں ہم تم سب کو جمع کریں گے کہ دنیا میں جتنے بھی قسم کے مشرک ہیں اور وہ جیسا کیسا بھی شرک کرتے ہیں ان میں سے ایک ایک کو پکڑ کر لایا جائے گا۔ ان میں بتوں کے پجاری بھی ہوں گے‘ دیوتاؤں کے عبادت گزار بھی۔ مظاہر فطرت کی پوجا کرنے والے بھی ہوں گے اور بزرگوں کے مجسموں کے سامنے سجدہ ریز ہونے والے بھی۔ ان میں وہ بھی ہوں گے‘ جنہوں نے اللہ والوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا اور ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے وقت کے حکمرانوں کو دیوتاؤں کی اولاد سمجھ کر رب بنا کر پوجا اور ان کو اللہ کی زمین پر خدائی کے اختیارات دیئے اور ایسے بھی ہوں گے‘ جنہوں نے اللہ کے قانون کے مقابلے میں طاغوت کے قانون کے نفاذ میں جان لڑائی ہو گی اور اللہ کی کبریائی کو اپنے عمل اور اپنے اختیار سے بار بار چیلنج کیا ہو گا۔ ان سب کو وہاں جمع کیا جائے گا اور یہ اپنی مکروہ صورتیں لئے بے بسی کی تصویر بنے اپنے انجام کے منتظر ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے کہ تم نے دنیا میں جو تصورات قائم کر رکھے تھے‘ تم نے جن جن قوتوں یا جن جن شخصیتوں کو اللہ کی قدرتوں اور اس کی کبریائی میں شریک کر رکھا تھا اور تمہیں یقین تھا کہ آخرت محض ایک افسانہ ہے‘ جس کا کوئی وجود نہیں اور اگر اس کا کوئی وجود ہے بھی تو یہ جن قوتوں کو ہم نے عمر بھر اللہ کا شریک سمجھ کر پکارا ہے‘ وہ یقیناً ہماری دستگیری کریں گی اور اللہ کی گرفت سے ہمیں چھڑا لیں گی۔ آج بتاؤ وہ تمہارے شرکاء کہاں ہیں؟ اب انہیں پکارو تا کہ وہ تمہیں ہماری گرفت سے بچا سکیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے‘ جس کا ذکر ابھی ہم نے اشارۃً کیا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تمام مشرکین کو جمع کرے گا تو ان میں صرف عبادت اور پوجا پاٹ کے نام پر یا استمداد اور استعانت کے حوالے سے شرک کرنے والے ہی مراد نہیں‘ بلکہ سیاست‘ حکومت اور قانون کے حوالے سے جن جن قوتوں کو اللہ کا شریک بنایا گیا ہے‘ ان کے پرستار بھی سب وہاں جمع کئے جائیں گے۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اللہ کے قانون پر دوسرے قوانین کو برتری کیوں دی تھی؟ ان سے یہ بھی سوال کیا جائے گا کہ اگر تم اللہ کی بے پناہ قدرت کے قائل تھے تو پھر اس کے باغیوں سے اللہ سے بڑھ کر خوفزدہ کیوں تھے؟ تم اگر جانتے تھے کہ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے سر نہیں جھکایا جا سکتا تو تم نے حکمرانوں اور سیاسی شخصیتوں کے سامنے سر کیوں

Marfat.com

جھکایا یہ محض مفروضہ نہیں حقیقت ہے کہ آج کے دور میں اگرچہ بت نہیں پوجے جاتے' لیکن ہیرو زپرستی اور شخصیتوں کے مجسمے بنا کر انہیں دل و دماغ کا حصہ بنا دینا اور ہر ڈکٹیٹر اور آمر کی تصویریں تمام پرائیویٹ اور پبلک جگہوں پر اس طرح آویزاں کرنا کہ وہ انسانی سوچ پر مسلط ہو کر رہ جائیں' یہ اس جدید دور کا وہ شرک ہے جو ہر جگہ کیا جا رہا ہے۔ ایسے تمام شرک کرنے والوں کو اللہ اس دن جمع کرے گا۔ یہ امت مسلمہ جو توحید کی امانت کی امین بنائی گئی ہے۔ جسے سب سے زیادہ شرک سے احتراز کرنا چاہئے' ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرح کا شرک ہر سطح پر اس امت میں بھی ہو رہا ہے۔ شخصی مثال دینا اگرچہ اچھا نہیں لگتا لیکن جلے ہوئے دل سے رہا بھی نہیں جاتا۔ آپ کو یاد ہو گا چند سال پہلے ایک جمہوری حکومت کے زمانے میں ہی ملکہ برطانیہ یہاں تشریف لائی تھیں جس طرح اس کے سامنے ہمارے ملک کی قیادت اور ہمارے ملک کی اجتماعی دانش' سجدہ ریز ہوتی رہی' وہ تو ایک الگ تکلیف دہ کہانی ہے۔ لیکن میں اجتماعی سیاسی قوت کے حوالے سے عرض کرتا ہوں کہ قومی اسمبلی پورے ملک کی اجتماعیت کی غماز ہوتی ہے اور اس کا وقار پورے ملک کا وقار سمجھا جاتا ہے اور قومی اسمبلی کا سپیکر پوری اسمبلی کے وقار کی علامت ہوتا ہے۔ لیکن ان گنہگار آنکھوں نے بلکہ پوری قوم نے ٹی وی پر یہ مکروہ منظر دیکھا کہ ہماری قومی اسمبلی کا سپیکر پوری طرح رکوع میں جھک کر ملکہ معظمہ کے سامنے کورنش بجالایا اور ساتھ یہ گزارش کی کہ محترمہ ملکہ! ہم اس سے پہلے بھی آپ کے غلام تھے اور اب بھی آپ کے غلام ہیں۔ یہ آج کے دور کا وہ شرک ہے جو پوری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ہر کمزور قوت والے کے سامنے جھک رہا ہے۔ ان تمام مشرکین کو پرانے مشرکوں سمیت اللہ اس دن جمع کرے گا اور پوچھے گا کہ اب بلاؤ ان تمام شرکاء کو' جن کے بارے میں تم یہ سمجھتے تھے کہ وہ تمہیں ہر طرح کی گرفت سے بچا سکتے ہیں۔

آیت: ۲۳ اس کے بعد اگلی آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ جب ان کو اس سوال کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہ دیکھیں گے کہ جن کو انہوں نے آج تک اللہ کا شریک بنا رکھا تھا' وہ خود وہاں ذلیل کھڑے ہیں اور انہیں دم مارنے کی مجال نہیں تو ان کے وہ تصوات جو ان کے بارے میں انہوں نے قائم کر رکھے تھے انہیں ان کے بارے میں یقین ہو جائے گا کہ ان کی حیثیت فریب نظر سے زیادہ نہیں تھی۔ چنانچہ اب ان کی بے بسی دیکھ کر یہ فریب نظر باقی نہیں رہے گا۔ لیکن جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا لیتا ہے' وہ بھی جھوٹ کا سہارا لیں گے اور جھوٹ بولتے ہوئے کہیں گے کہ پروردگار! ہم تو شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔

آیت: ۲۴ اللہ تعالیٰ تیسری آیت میں اس پورے منظر کو ہماری نگاہوں کے سامنے لا رہا ہے اور اس وقت مشرکینِ مکہ کے سامنے یہ منظر پیش کیا گیا تھا کہ ذرا دیکھو! آج جس شرک پر تم اس قدر ثابت قدم ہو کہ اس کیلئے مرنے مارنے کیلئے تیار ہو اور دنیا کی کوئی دلیل اس کے مقابلے میں تمہیں سننا گوارا نہیں اور اس شرک ہی کو تم دنیا کی سب سے بڑی حقیقت سمجھ رہے ہو اور ان شرکاء کو واقعی ایک حقیقت جان کر تم ان کی مذمت میں ایک لفظ سننا گوارا نہیں کرتے۔ لیکن قیامت کے دن' جب اللہ کے سامنے تمہیں کھڑا کیا جائے گا تو تم صاف کہو گے کہ ہم تو مشرک نہیں تھے۔ ذرا سوچو کہ جس شرک کی حمایت تم قیامت کے دن نہ کر سکو گے اور تمہیں اپنے بچاؤ کیلئے جھوٹ بولنا پڑے گا' اگرچہ جھوٹ بولنے سے تم بچ نہیں سکو گے' کیا یہ بہتر نہیں کہ آج اس سے توبہ کر لو لیکن یہ انسانیت کی بدنصیبی ہے کہ انسان بالعموم جب تک خطرات کو اپنے نگاہوں سے نہیں دیکھ لیتا' اسے ہزار سمجھایا جائے' اس سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ مشرکینِ مکہ کو پہلے دلائل سے سمجھایا گیا' زوردار طریقہ سے شرک کی تردید کی گئی' اب ان کا اخروی انجام ان کی نظروں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ لیکن پھر بھی چند خوش نصیبوں کے سوا بڑی تعداد نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ کتنے سالوں تک انہوں نے مسلمانوں سے ایک کشمکش جاری رکھی۔ جب تک اسلامی قوت کے سامنے وہ تقریباً بے بس نہیں ہو گئے' انہوں نے اپنی ہٹ اور ضد نہیں چھوڑی۔ لیکن اس پر بھی اللہ کا جتنا شکر ادا کیا جائے تھوڑا ہے کہ بالآخر انہوں نے حق کو قبول کیا اور جزیرہ عرب میں اسلامی انقلاب کو قدم جمانے کا موقع مل گیا۔

Marfat.com

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ

اور اُن میں بعض ایسے ہیں کہ تمہاری

قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِن يَرَوْا كُلَّ

(باتوں کی) طرف کان رکھتے ہیں اور ہم نے اُن کے دلوں پر تو پردے ڈال دیئے ہیں کہ اُن کو سمجھ نہ سکیں اور کانوں

آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ

میں ثقل پیدا کر دیا ہے (کہ سُن نہ سکیں) اور اگر یہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی تو اُن پر ایمان نہ لائیں۔ یہاں تک

كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ

کہ جب تمہارے پاس تم سے بحث کرنے کو آتے ہیں تو جو کافر ہیں کہتے ہیں یہ (قرآن) اور کچھ بھی نہیں صرف پہلے لوگوں

يَنْأَوْنَ عَنْهُ ۖ وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ

کی کہانیاں ہیں وہ اس سے (اوروں کو بھی) روکتے ہیں اور خود بھی پرے رہتے ہیں۔ مگر ان باتوں سے اپنے آپ

تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ

ہی کو ہلاک کرتے ہیں اور (اس سے) بےخبر ہیں۔ کاش تم (ان کو اُس وقت) دیکھو جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے

رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٧﴾ بَلْ بَدَا لَهُم مَّا كَانُوا يُخْفُونَ

کیے جائیں گے اور کہیں گے کہ اے کاش ہم پھر (دُنیا میں) لوٹا دیئے جائیں تاکہ اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں اور مومن ہو

مِن قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٢٨﴾ وَقَالُوا

جائیں۔ ہاں یہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے (آج) اُن پر ظاہر ہو گیا ہے۔ اور اگر یہ (دُنیا میں) لوٹائے بھی جائیں تو جن (کاموں)

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ

سے اُن کو منع کیا گیا تھا وہی پھر کرنے لگیں۔ کچھ شک نہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہماری جو دُنیا کی زندگی ہے بس یہی

وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۚ قَالَ

(زندگی) ہے اور ہم (مرنے کے بعد) پھر زندہ نہیں کیے جائیں گے اور کاش تم (ان کو اُس وقت) دیکھو جب یہ اپنے پروردگار کے

Marfat.com

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٠﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا

سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور وہ فرمائے گا کیا یہ (دوبارہ زندہ ہونا) برحق نہیں تو کہیں گے کیوں نہیں پروردگار کی قسم (بالکل برحق)

بِلِقَاءِ اللَّهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَا حَسْرَتَنَا عَلَىٰ

ہے۔ خدا فرمائے گا اب کفر کے بدلے (جو دنیا میں کرتے تھے) عذاب (کے مزے) چکھو۔ جن لوگوں نے خدا کے روبرو حاضر ہونے کو

مَا فَرَّطْنَا فِيهَا وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَاءَ

جھوٹ سمجھا وہ گھاٹے میں آ گئے۔ یہاں تک کہ جب ان پر قیامت ناگہاں آ موجود ہو گی تو بول اٹھیں گے کہ (ہائے) اس تقصیر پر افسوس

مَا يَزِرُونَ ﴿٣١﴾ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۖ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ

ہے جو ہم نے قیامت کے بارے میں کی۔ اور وہ اپنے (اعمال کے) بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو جو بوجھ یہ اٹھا

خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٣٢﴾ قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ

رہے ہیں بہت برا ہے۔ اور دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور مشغولہ ہے۔ اور بہت اچھا گھر تو آخرت کا گھر ہے (یعنی) ان کے لیے جو

الَّذِي يَقُولُونَ ۖ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ

(خدا سے) ڈرتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ ان (کافروں) کی باتیں تمہیں رنج پہنچاتی ہیں (مگر) یہ تمہاری تکذیب

اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٣٣﴾

نہیں کرتے بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں

..................☆......☆......☆..................

گزشتہ آیات میں اسلام کے بنیادی عقائد بالخصوص توحید پر قرآن کریم نے جس طرح نہایت مثبت دلائل دیئے ہیں' اس سے زچ مشرکینِ مکہ نے آخر یہ کہا کہ تم جو کچھ ہم سے کہہ رہے ہو اور جس طرح نبوت کا دعویٰ کر رہے ہو' کیا اس پر تمہارے پاس کوئی شہادت اور کوئی ایسی موجود ہے کہ جو ہمارے لئے بھی قابل قبول ہو اور ہم اس کے نتیجے میں اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں؟ چنانچہ اس کے جواب میں پروردگا قرآنِ کریم کو بطور گواہی کے پیش کیا اور بتایا کہ اللہ کا کوئی شریک ہے یا نہیں' اس کا اصل جواب یا اس کی اصل گواہی تو خود پروردگار کی ذات ہے کیونکہ

Marfat.com

بتا سکتا ہے کہ اس نے کسی کو اپنے اختیارات میں شریک کیا ہے یا نہیں۔ لیکن اللہ کی گواہی دنیا میں چونکہ وحی الٰہی سے ممکن ہے اور آج اللہ کی وحی قرآنِ کریم کی صورت میں نازل ہو رہی ہے' اس لئے قرآنِ کریم کی گواہی ہی اصل میں اللہ کی گواہی ہے۔ اتنی واضح' حتمی اور قطعی شہادت کے بعد بھی ان لوگوں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو قرآنِ کریم نے اس کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا اور انہیں ان کے انجام سے ڈرایا۔ لیکن اس وقت پیش نظر آیت کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ مشرکینِ مکہ کا مجموعی رویہ تو نہایت مایوس کن ہے' لیکن ان میں بظاہر کچھ لوگ آپ کے پاس قرآن کریم کی ہدایات کو سننے کیلئے بھی آتے ہیں۔ دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ شاید ہدایت قبول کرنے کیلئے حاضر ہوئے ہیں' لیکن حقیقت میں ان کا ارادہ کچھ اور ہوتا ہے۔ بظاہر وہ بہت قریب ہو کر سنتے ہیں' لیکن ہدایت سے پھر بھی دور رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

آیت:۲۵ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ O ''اور ان میں ایسے بھی ہیں' جو تمہاری بات پر کان لگاتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں' کہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن پیدا کر دیا ہے' کہ اس کو نہ سن سکیں اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے' یہاں تک کہ جب یہ تمہارے پاس حجت کرتے آئیں گے تو یہ کافر کہیں گے کہ یہ تو اگلوں کا فسانہ ہے''۔

مشرکینِ مکہ کا مجموعی طرزِ عمل اور اس کے اسباب:

آیت کی وضاحت سے پہلے ہم اس کے چند الفاظ کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں' ''اَكِنَّةً'' کِن اور کنان کی جمع ہے۔ اس کے معنی پردہ اور ڈھکنے کے ہیں اور ''وَقْرًا'' بوجھ' ثقل' گرانی اور بہرہ پن کو کہتے ہیں۔ یہاں اس پردے اور گرانی سے معنوی اور روحانی پردہ اور گرانی مراد ہے' جو دلوں اور کانوں کو سننے اور سمجھنے سے محروم کر دے۔ اس آیت کریمہ میں قلوب کی نسبت سے اَنْ يَّفْقَهُوْهُ کو ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی انکے دلوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے تاکہ وہ بات کو سمجھ نہ سکیں۔ لیکن ''آذان'' یعنی کانوں کی نسبت سے فعل ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب ہے کہ جو فعل خود بخود سمجھ آ رہا ہوا سے عام طور پر حذف کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں ''اَنْ يَّسْمَعُوْهُ'' محذوف ہے کہ انکے کانوں میں گرانی پیدا کر دی گئی ہے' تاکہ وہ سن نہ سکیں۔ اب اس آیت کی وضاحت ملاحظہ فرمایئے اس آیت کریمہ میں مختلف باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جسے ہم ایک ترتیب سے ذکر کرتے ہیں۔

حق کو تسلیم نہ کرنے والوں کا رویہ:

1- مشرکینِ مکہ میں سے بعض لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو نہایت کان لگا کر آپ کی بات سنتے ہیں کیونکہ سماع صرف سننے کو اور استماع بہت غور سے سننے کو کہتے ہیں۔ ان کا یہ کان لگا کر سننا بظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ سمجھنے اور قبول کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ لیکن اس آیت کے آخری حصے میں اس بات کو کھول دیا گیا ہے کہ یہ لوگ آپ کے پاس بات سمجھنے اور قبول کرنے کیلئے نہیں آتے بلکہ صرف اس لئے آتے ہیں کہ بات کو الجھائیں اور آپ سے کسی نہ کسی بات میں جھگڑا پیدا کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بات کے سننے کے نتیجے میں دو رویے انسان میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اس کے اندر خیر کا غلبہ غالب ہے تو وہ بات کو سن کر سمجھنے اور اس کے بعد قبول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جو آدمی خیر سے محروم ہو جاتا ہے' وہ اس بات کا اظہار تو نہیں ہونے دیتا کہ میں بات کو سننا نہیں چاہتا' بلکہ وہ اپنی بدنیتی کو چھپانے کیلئے کٹ حجتی اور فضول بحث سے کام لیتا ہے۔

Marfat.com

سمجھانے والا یہ سمجھتا ہے کہ شاید اسے بات سمجھ نہیں آ رہی' اس لئے وہ اپنی پوری توانائی صرف کر ڈالتا ہے۔ لیکن اس کی نیت میں چونکہ فتور ہوتا ہے' اس لئے وہ بجائے سمجھنے کے نئی نئی باتیں نکالتا اور بالآخر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کبھی کوئی مخاطب یا سامع یہ رویہ اختیار کرے تو ایک مبلغ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شخص محض وقت ضائع کرنا چاہتا ہے یا دوسرے لوگوں کیلئے غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں حق سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے' یہ محض مفروضہ نہیں' بلکہ جس آدمی کو بھی کبھی تبلیغ و دعوت کا مرحلہ پیش آیا ہے' اسے ایسی صورت حال سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔

دھیان دینے سے اللہ کسی کی سمجھنے کی طاقت کو سلب نہیں کرتا:

2- دوسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی جا رہی ہے کہ یہ لوگ بظاہر جو آپ کی طرف کان لگا کر سن رہے ہیں' ممکن ہے آپ کو یہ خیال ہو کہ یہ شاید آپ کی بات کو سمجھ کر قبول کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں۔ اس لئے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن پیدا کر دیا ہے' جس کے نتیجے میں نہ یہ بات سن سکتے ہیں' نہ سمجھ سکتے' ہیں اس لئے قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ایک نہایت توجہ طلب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دلوں پر پردہ ڈالنے اور کانوں میں گرانی پیدا کرنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ اس سے خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان بنیادی صلاحیتوں سے محروم کر کے قبولیت حق کے قابل نہیں رہنے دیا تو پھر ان کا اس میں قصور کیا ہے؟ آدمی جب تک کسی بات کو سنتا اور سمجھتا نہیں' ظاہر ہے اسے قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ لوگ اگر اس سے محروم کر دیئے گئے ہیں تو پھر ان کے ایمان نہ لانے اور ہدایت کو اختیار نہ کرنے پر انہیں مجرم کیوں ٹھہرایا جا رہا ہے؟ اس لئے سب سے پہلے اس بات کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ کا ایک قانون ہے جسے قرآنِ کریم میں ایک سے زیادہ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اپنی آسان تعبیرات کے ذریعے اسے مزید سمجھایا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو متعدد صلاحیتیں دے کر پیدا فرمایا اور انسان کو اس سے کام لینے کیلئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ قوتیں اور وہ صلاحیتیں اس وقت تک کام کرتی ہیں' جب تک آدمی ان قوتوں سے کام لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان سے کام لینا چھوڑ دے یا ان سے غلط کام لینا شروع کر دے تو وہ قوتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے بازو میں پکڑنے' مارنے' مدافعت کرنے اور بوجھ اٹھانے جیسی قوتیں پیدا کی ہیں۔ یہ جب تک اپنے ہاتھ کو ایسے ہی کسی کام کیلئے استعمال میں لاتا رہتا ہے تو نہ صرف یہ کہ یہ ہاتھ ٹھیک کام کرتا ہے بلکہ اس کی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے' لیکن اگر وہ اسے عضو معطل بنا دے' یعنی اسے کسی طرح باندھ کے رکھ دے کہ وہ حرکت نہ کر سکے تو چند روز کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ ہاتھ مفلوج ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دل کو حق کو سمجھنے اور کانوں کو ہدایت کی بات سننے کی صلاحیت سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ جب تک آدمی ان دونوں قوتوں سے سننے اور سمجھنے کا کام لیتا ہے اور صحیح کام لیتا ہے تو یہ دونوں قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں' لیکن جب ان دونوں سے اس کا اصل کام نہیں لیتا یا سرے سے کام ہی نہیں لیتا تو اللہ کا وہ فطری قانون حرکت میں آتا ہے' وہ ان دونوں قوتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اس کے بعد بظاہر آدمی سنتا ہے' لیکن وہ حقیقت میں نہیں سنتا۔ بظاہر آدمی کا دل حرکت کرتا ہے' لیکن حقیقت میں وہ سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآنِ کریم نے متعدد جگہ ارشاد فرمایا کہ ان کے دل ہیں' لیکن وہ سمجھتے نہیں' ان کے کان ہیں' لیکن وہ سنتے نہیں یہ لوگ ڈنگروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو باتیں اصل میں سمجھنے کی اور سننے کی ہیں یعنی جن باتوں کا تعلق اللہ کی ہدایت سے ہے یہ لوگ ان باتوں کو سننے اور سمجھنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے' جسے قرآنِ کریم نے مہر لگانے سے تعبیر کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اسے آسان کر کے سمجھایا۔ ارشاد فرمایا: کہ انسان کا دل ایک آئینہ کی مانند ہے' جس

Marfat.com

میں نور اور آب وتاب ہے اور یہی وہ آب وتاب ہے' جس سے وہ اللہ کی ہدایت کو سنتا اور سمجھتا ہے اور اسی کو قبولیتِ حق کی استعداد کہتے ہیں۔ جب ایک آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے آئینۂ دل پر ایک داغ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو یہ داغ مٹ جاتا ہے اور اگر وہ مسلسل گناہ کرتا رہتا ہے تو مسلسل داغ پڑنے کے باعث ایک دن ایسا آتا ہے کہ یہ آئینۂ قلب بالکل بے نور ہو کے رہ جاتا ہے۔ جس طرح آئینہ اگر اپنی آب وتاب کھو دے اور زنگ آلود ہو جائے تو اس میں شکل دیکھی نہیں جا سکتی' اسی طرح یہ آئینۂ قلب جب داغ دار ہو کر بے نور ہو جاتا ہے تو اب اس میں کوئی حق کی بات داخل نہیں ہو سکتی اور یہ تبدیلی چونکہ اللہ کے قانون کے مطابق آتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں۔

3- تیسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی جا رہی ہے کہ یہ لوگ بار بار آپ سے معجزات' یعنی نشانیاں دکھانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس سے پہلے ہم اسی سورۃ میں ان مطالبات میں سے چند ایک کا تذکرہ پڑھ بھی چکے ہیں۔ مثلاً ان کے مطالبات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اللہ کی طرف سے قرآنِ کریم ایک مطبوع اور مجلد شکل میں نازل ہونا چاہئے' جسے ہم اپنے ہاتھوں سے چھو سکیں اور اپنی آنکھوں سے پڑھ سکیں۔ بلکہ نام بنام ہمیں مخاطب کیا جانا چاہئے کہ اس قرآنِ کریم کو قبول کرو۔ اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ آپ پر ایک فرشتہ اترنا چاہئے' جو آپ کی حفاظت کرے۔ جب آپ باہر نکلیں تو ہٹو بچو کہتا ہوا آپ کا راستہ صاف کرے۔ اپنی خاص شکل وصورت میں لوگوں کو بتائے کہ یہ اللہ کے نبی ہیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ اللہ کا نبی عام انسانوں میں سے اٹھا دیا جائے اور وہ اللہ کا نمائندہ ہونے کے باوجود لوگوں کی گالیاں سنتا پھرے اور ان کی اذیتیں برداشت کرے۔ اسی طرح کے ان کے مطالبات تھے' جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار کرتے رہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ چونکہ ان کے ایمان کے شدید خواہش مند رہتے تھے' اسلئے طبعی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ یہ نشانیاں اگر انہیں دکھا دی جائیں تو شاید یہ مسلمان ہو جائیں۔ اسلئے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر انہیں دنیا جہان کی نشانیاں بھی دکھا دی جائیں تو بھی یہ کبھی مسلمان نہیں ہوں گے۔ اس لئے کہ اگر ان کا ایمان نشانیوں سے معلق ہے تو اس کائنات میں نشانیوں کی کیا کمی ہے؟ یہ سورج کا چمکنا' چاند کا دمکنا' ستاروں کا جھلملانا' کلیوں کا چٹکنا' پانی کا بہنا' آبشاروں کا گرنا' بادلوں کا گرجنا' زمین کا قوت روئیدگی سے مالا مال ہونا اور زمین پر مخملی فرش کا بچھ جانا اور گندم کا نقرئی لباس پہننا اور ایک بیج کا بڑھتے بڑھتے قد آور درخت بن جانا اور پھل دار درختوں کا شہد سے بھرے ہوئے پھلوں سے لد جانا' ان میں سے کون سی چیز ہے' جو اللہ کی نشانی نہیں؟ اگر آدمی نشانی ہی سے اللہ اور اس کی ہدایت تک پہنچنا چاہتا ہے تو ان میں سے ایک ایک نشانی اس کیلئے کافی ہے۔ جو آدمی ان نشانیوں میں سے کسی سے فائدہ نہیں اٹھاتا' اسے دنیا بھر کی نشانیاں بھی دکھا دی جائیں تو وہ کبھی راہ راست پر نہیں آئے گا۔

ذات باری تعالیٰ کی پہچان کے لئے کسی معجزے کی ضرورت نہیں:

اس لئے اے پیغمبر! آپ ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں کہ یہ شاید اس لئے ہدایت پر نہیں آ رہے کہ انکی مطلوبہ نشانیاں ان کو نہیں دکھائی جا رہیں' بلکہ ان کا ہدایت کی طرف نہ آنا' اس کا سبب ان کا رویہ ہے' جس کے سبب سے یہ قبولیت حق کی استعداد سے محروم ہو چکے ہیں۔ اگر یہ اپنا رویہ درست کر لیں اور اپنی آنکھوں پر سے تعصب کی پٹیاں اتار دیں اور دل ودماغ پر پڑے ہوئے پردے جھٹک دیں تو معمولی سے معمولی نشانی بھی ان کیلئے ہدایت کا سبب بن سکتی ہے۔

جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ آپ نے فرمایا شہتوت کے پتے سے۔ سائل نے حیران ہو کر پوچھا وہ کیسے؟ آپ نے کہا: میں نے دیکھا کہ بکری شہتوت کا پتہ کھاتی ہے تو مینگنیاں کرتی ہے۔ ریشم کا کیڑا شہتوت کھاتا ہے تو ریشم بنتا ہے اور ختن کا

Marfat.com

ہرن شہتوت سے غذا حاصل کرتا ہے تو اس کی ناف سے کستوری نکلتی ہے۔ اگر شہتوت کا پتہ موثر بالذات ہوتا تو ہر جگہ اسکا نتیجہ بھی ایک ہی ہوتا یا مینگنی بنتا یا ریشم یا کستوری۔ لیکن یہ جو ہم تین مختلف نتائج دیکھتے ہیں' جبکہ تینوں کی غذا ایک ہے۔ اس سے مجھے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اصلاً یہ شہتوت کا کمال نہیں' بلکہ کوئی اور ہاتھ ہے' جو یہاں کارفرما ہے جو کبھی کستوری بناتا ہے اور کبھی ریشم بناتا ہے۔ وہ ہاتھ میرے اللہ کا ہاتھ ہے۔

اندازہ فرمایئے! چونکہ ہدایت حاصل کرنے والے کا دماغ بالکل صاف اور صحیح رخ پر کام کر رہا ہے' اس لئے صرف ایک شہتوت کے پتے نے اسے معرفتِ حق تک پہنچا دیا۔ اس سے بھی آسان مثال دیکھئے کہ کسی بدوی نے کسی سے پوچھا کہ تم یہ کیسے جانتے ہو کہ اس کائنات کا کوئی خالق بھی ہے؟ اس نے کہا کہ میں جب صحرا میں سفر کرتے ہوئے کہیں اونٹ کی لید دیکھتا ہوں تو مجھے وہاں سے قافلے کے گزرنے کا یقین ہو جاتا ہے' وہ اسطرح کہ صحرا میں بدامنی کے باعث کوئی اکیلا وکیلا آدمی سفر نہیں کر سکتا۔ میں لید کو دیکھ کر یہ خیال کرتا ہوں کہ یقیناً یہاں سے کوئی اونٹ پر سوار مسافر گزرا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ مسافر چونکہ تنہا سفر نہیں کر سکتا' اس لئے مجھے اس بات کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہاں سے کوئی قافلہ گزرا ہے۔ یہ تمثیل سنا کر اس بدوی نے کہا کہ اگر میں اونٹ کی لید دیکھ کر ایک قافلے کا یقین کر لیتا ہوں تو اس کائنات کو محوِ سفر دیکھ کر اس کائنات کے خالق و مالک کا یقین کیسے نہ کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ دل و دماغ اگر باطل اثرات کی کہر میں لپٹے ہوئے نہ ہوں تو پھر اس کائنات کی ایک ایک نشانی ہر پڑھے لکھے اور ان پڑھ کو اللہ کی معرفت دینے کیلئے کافی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سائنسدان اپنی لیبارٹری میں کام کر رہا تھا کہ اسکی پوتی کھیلتے کھیلتے وہاں پہنچ گئی۔ اچانک اس سائنسدان کا دھیان اس پوتی کی طرف ہوا تو نظر اسکے کان پر جا پڑی لپکتا ہوا اس بچی کے پاس آیا اور اسکا کان پکڑ کر کہنے لگا کہ سماعت کا یہ چھوٹا سا پرزہ ایک ایسی حیرت انگیز چیز ہے' اگر یہ ناکارہ ہو جائے یا کٹ جائے تو ساری دنیا کے سائنسدان ملکر یہ کان نہیں بنا سکتے۔ پھر تھوڑے سے تأمل کے بعد کہنے لگا کہ جس ذاتِ عزیز نے ایسا حیرت انگیز پرزہ بنایا ہے کہ وہ سنتا ہے تو کیا وہ خود نہیں سنتا ہوگا۔ اس مثالوں سے یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ اگر وہ اپنا رویہ درست کر لیں تو پھر اللہ کے دین کو سمجھنا اور قبول کرنا اور اپنے خالق و مالک کو جان لینا' ان کیلئے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

4- چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی جا رہی ہے کہ جن طبیعتوں پر نصیحت اور دلیل کا اثر نہ ہوتا ہو' وہ بعض دفعہ مشاہداتی چیزوں سے اثر قبول کرتی ہیں۔ اس لئے ان سے آخری بات یہ کہی جا رہی ہے کہ دیکھو! تم اپنے تجارتی اسفار میں ان قوموں کی تباہ شدہ بستیوں سے گزرتے ہو' جن کی طرف کبھی ہدایت کیلئے اللہ کے نبی آئے تھے اور انہوں نے بجائے ہدایت قبول کرنے کے' تمہاری طرح رویہ اختیار کیا' بالآخر اللہ کے عذاب سے یہ قومیں تباہ ہو گئیں۔ ان کے کھنڈرات اور ان کی تباہ شدہ بستیاں اور ان کے ہاتھوں سے تراشے ہوئے محلات آج بھی ان کی عبرت کی داستان سنانے کیلئے تمہارے راستوں میں موجود ہیں۔ تم اگر ہر طرح کی دلیل قبول کرنے سے محروم ہو چکے ہو' تو ان مشاہداتی دلائل کو دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب ان کے سامنے پہلی قوموں کی تاریخ ان کی طرف آنے والے انبیاء کے واقعات ان قوموں کا رویہ اور اس کے نتیجے میں ان کے عبرت ناک انجام کی تفصیل بیان کی جاتی ہے تو یہ بجائے اس سے عبرت حاصل کرنے کے یہ کہتے ہیں کہ آپ ہمیں کیا کہانیاں سناتے رہتے ہیں اور آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآنِ کریم اللہ کی کتاب ہے حالانکہ اس میں سوائے پہلے لوگوں کی بے سروپا کہانیوں کے اور کیا رکھا ہے۔ آپ کے پاس چونکہ کوئی نئی بات کہنے کیلئے نہیں' اس لئے آپ ہمیں پرانی باتیں سناتے رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نادان لوگوں کا عموماً یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص انہیں حق کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے نئی بات کیا کہی' یہ تو سب وہی پرانی باتیں ہیں' جو ہم پہلے سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ گویا ان احمقوں کا نظریہ یہ ہے کہ کسی بات کے حق ہونے کیلئے اس کا نیا ہونا بھی ضروری

Marfat.com

ہے اور جو بات پرانی ہے وہ حق نہیں ہے حالانکہ حق ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ اللہ کے دیئے ہوئے علم کی بنا پر جو لوگ انسانوں کی رہنمائی کیلئے آگے بڑھے ہیں وہ سب قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی امر حق کو پیش کرتے آئے ہیں اور آئندہ بھی جو اس منبع علم سے فائدہ اٹھا کر کچھ پیش کرے گا وہ اسی پرانی بات کو دہرائے گا۔ البتہ! نئی بات صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو اللہ کی روشنی سے محروم ہو کر ازلی و ابدی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور اپنے ذہن سے کچھ نظریات گھڑ کر انہیں حق کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بلاشبہ ایسے نادرہ کار ہو سکتے ہیں کہ وہ بات کہیں جو ان سے پہلے کبھی دنیا میں کسی نے نہ کہی ہو۔

مغرب زدہ افراد کی طرف سے عام طور پر کیا جانے والا سوال اور اس کا جواب:

5- پانچویں بات جو اس آیت کریمہ میں ہمیں اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ پہلی معذب قوموں کی تاریخ کا نہ صرف مذاق اڑاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ یہ صرف پہلی قوموں کی بے سروپا داستانیں ہیں جو آپ ہم سے بیان کرتے رہتے ہیں بلکہ اس آیت میں ایک لفظ کا استعمال ہوا ہے "یُجَادِلُوْنَکَ" کہ وہ آپ سے آ کر جھگڑتے ہیں یعنی برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انہیں برہمی آخر کس بات سے ہوتی تھی۔ وہ بات اصل یہ تھی کہ قرآنِ کریم جب ان قوموں کی تاریخ بیان کرتا ہے تو صرف انکے واقعات کو بیان نہیں کرتا بلکہ درحقیقت وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ قوموں کا ابھرنا اور فنا ہونا اتفاقی واقعات کے طور پر ظہور میں نہیں آتا' بلکہ اس میں اصل دخل اخلاقی عوامل کو ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زندگی کے اخلاقی عناصر سے خالی ہو جاتی ہے تو قدرت کا قانون اسکو فنا کر دیتا ہے اور کوئی دوسری قوم اسکی جگہ اٹھا کھڑی کرتا ہے' جو کردار و اخلاق میں اس سے بہتر ہوتی ہے۔ یہ عاد' ثمود' مدین' سبا' قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ یونہی اتفاقی طور پر فنا نہیں ہوئیں بلکہ یہ عروج و زوال کے اسی خدائی ضابطہ کا نشانہ بنیں۔ یہ قومیں چونکہ اخلاقی اور روحانی بیماریوں میں مبتلا ہو گئی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح اور ان کے علاج کیلئے روحانی و اخلاقی طبیب یعنی انبیاء بھیجے۔ ان انبیاء نے سر توڑ کوشش کی کہ اپنی قوم کی بیماریاں دور کریں' لیکن ان کی قوموں نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فنا کر دیا۔ یہ تاریخ سنا کر قرآن نے عربوں کو متنبہ کیا کہ اس وقت تمہارے سامنے بھی زندگی اور موت کا یہی مرحلہ ہے۔ تمہارے اندر بھی خدا کا رسول آ گیا ہے۔ اگر تم نے اس کی بات نہ سنی تو تم بھی اسی طرح فنا کر دیئے جاؤ گے۔ یہ وہ بات تھی' جس بات سے اہل عرب کے پندار پر سخت چوٹ پڑتی تھی۔ وہ اس بات پر برہم ہو جاتے تھے کہ وہ کسی اخلاقی اور روحانی بیماری میں مبتلا ہیں' جس کے نتیجے میں ان پر عذاب الٰہی آ سکتا ہے۔ مزید یہ بات بھی ان کو بعید از عقل معلوم ہوتی تھی کہ قومی عروج و زوال میں اخلاقی عوامل کو بھی دخل ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قومیں بھی اسی طرح جیتی اور مرتی ہیں' جس طرح ایک فرد یا ایک درخت پیدا ہوتا ہے' جوان ہوتا' بوڑھا ہوتا ہے پھر مر جاتا یا سوکھ جاتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتیں' جوان ہوتیں اور فنا ہو جاتی ہیں۔ اس کا کردار و ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے ہرگز تیار نہ تھے کہ قومیں اخلاق و ایمان کی بناء پر تباہ ہوتی ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب گردش روزگار کے کرشمے ہیں۔ واضح ہے کہ جب ان کا نظریہ یہ تھا تو قرآن کے اس تاریخی نقطہ نظر پر ان کا بھڑک اٹھنا اور لڑنے کیلئے تیار ہو جانا ناقابل فہم نہیں ہے۔

یہ چند نکات جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں' یہ مشرکینِ مکہ کے مجموعی طرز عمل اور اس کے اسباب کو پوری طرح ہمارے سامنے اجاگر کر دیتے ہیں۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یقیناً اس سے مختلف نہیں ہو سکتا' جس کا ذکر اگلی آیت میں کیا جا رہا ہے۔ فرمایا:

Marfat.com

آیت:۲۶ وَهُمۡ يَنۡهَوۡنَ عَنۡهُ وَيَنۡـَٔوۡنَ عَنۡهُ‌ۚ وَاِنۡ يُّهۡلِكُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ○ ’’اور یہ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی گریز کرتے ہیں اور یہ درحقیقت اپنے آپ ہی کو تباہ کر رہے ہیں' لیکن احساس نہیں کر رہے‘‘۔

قوموں کے عروج وزوال میں اخلاقی عوامل کا بڑا کردار ہے:

بجائے اس کے کہ وہ قرآنِ کریم کی نصیحت' اس کے طرز استدلال اور معذب قوموں کے انجام سے کوئی سبق سیکھتے' ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود بھی اسلام کی طرف آنے سے اعراض کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے بدگمان کر کے یا بالجبر روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کیلئے جو بھی ان سے بن پڑتا ہے' وہ کرگزرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ مکی زندگی کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی دعوت سے جس طرح اعراض کیا اور جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیتے تھے' جس طرح ان کو اذیتوں کا نشانہ بنایا' وہ ایک دلخراش داستان ہے۔ حضور ﷺ کی دعوت اور قرآن کریم کا مذاق اڑانا اور اگر حضور قرآن پڑھیں تو اوباش لوگوں کا قریب کھڑے ہو کر شور مچانا اور دوسروں کو سننے نہ دینا اور اگر کوئی غریب مسلمان ان کے قابو آ جاتے تو اسے مار مار کر ادھ موا کر دینا حتیٰ کہ بعض دفعہ غیر انسانی رویہ اختیار کرنا' یہ سب ان کا روز کا معمول تھا۔ اس کا حوالہ دے کر ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم شاید اس طرح قرآنی دعوت کو پھیلنے سے روک دیں گے اور رفتہ رفتہ یہ تحریک ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی ہے۔ وہ حقیقت میں اس تحریک کو روکنے میں تو کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ اس کے اثرات کو پھیلنے سے روک سکتے ہیں کیونکہ اللہ کے دین کی دعوت تو ہوا اور روشنی کی مانند ہے جس کا راستہ روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا البتہ ان کا یہ رویہ خود ان کی ہلاکت کا باعث ضرور ہو گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت ان کیلئے ایک زندگی بخش پیغام ہے۔ اس کا انکار کرنا یا اس کو روکنے کی کوشش کرنا' یہ درحقیقت زندگی سے دشمنی ہے۔ اگر یہ لوگ اس سے باز نہیں آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خود اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ لیکن انہیں اس کا شعور نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ بات کہ اللہ کے دین سے اعراض اور معاشرے میں اس کے نفوذ کی کوششوں کو ناکام کرنا' یہ درحقیقت زندگی کا راستہ روکنا ہے اور یہ معاشرے کی ہلاکت کا باعث ہے۔

اس کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں سب سے پہلی بات تو یہ کہ اللہ کے رسول کی دعوت کو اگر مکمل طور پر پھیلنے سے روک دیا جائے اور اس کے راستے میں ایسے موانع حائل کر دیئے جائیں' جس سے وہ یکسر رک کر رہ جائے تو اس کے نتیجے میں بالعموم اللہ کا عذاب آیا کرتا ہے۔ مشرکینِ مکہ کو حقیقت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو روک کر فی الحقیقت عذاب کو دعوت دے رہے ہو' اندازہ کرو اگر اللہ کا عذاب آ گیا تو تمہارا انجام کیا ہو گا اور دوسری بات یہ کہ جس معاشرے میں اللہ کی ہدایت کے اثرات ختم ہو جائیں وہ معاشرہ ہلاکت سے کبھی نہیں بچتا۔ بعض بالکل سامنے کی باتیں ہیں' لیکن نجانے ہم ان باتوں پر کیوں غور نہیں کرتے۔ آخر ہمیں یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ معاشرہ خوبصورت مکانوں کا نام نہیں' بلکہ آسودہ مکینوں کا نام ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کبھی گھروں میں جھانک کر دیکھ لیجئے کہ جس گھر میں بیوی عفت مآب نہیں اور شوہر غیرت مند نہیں' وہ دونوں ایک دوسرے کیلئے قابل اعتماد نہیں۔ مزید یہ کہ حقوق وفرائض کے حوالے سے وہ دونوں اگر ایک دوسرے کیلئے امین نہیں تو کیا یہ گھر بتاہی سے بچ سکتا ہے۔ اگر ان لوگوں نے حیوانی زندگی اختیار نہیں کی اور انسانی اقدار کی کچھ رمق ان میں باقی ہے تو ان دونوں کے بگاڑ کے بعد ان کی یکجائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ان کو اللہ نے اولاد دی ہے اور یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بنیادی اخلاق اور شرم وحیا سے عاری ہو جاتا ہے اور ان کے تعلقات کے بگاڑ کے نتیجے میں ہر وقت گھر میں چخ چخ رہتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس گھر کو دو طرح کے نتیجوں سے نہیں بچا سکتی۔ ایک تو یہ کہ ان کی بداخلاقی کے نتیجے میں ان کے بچے بھی بداخلاق ہوں گے اور یہ گھر گھر نہیں رہے گا بلکہ قحبہ خانہ بن جائے گا اور دوسری یہ بات کہ ان کی نااتفاقی کی صورت میں بچے ان کے نافرمان ہوں گے۔ اسلئے جیسے ہی بچوں

Marfat.com

خود فیصلہ کرنے کا موقع ملے گا اور ان کے والدین کہولت اور ضعیفی کی عمر کو پہنچ جائیں گے تو اس گھر میں ظلم کا وہ تماشہ مچے گا' جس سے لوگ عبرت پکڑیں گے۔

اللہ کے دین سے اعراض، درحقیقت زندگی سے انکار ہے:

جس معاشرے میں ایسے گھروں کی فراوانی ہوگی اور ایسی ہی اولاد پروان چڑھے گی تو یہ پیشگوئی کرنے کیلئے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ معاشرہ ہلاکت وتباہی سے نہیں بچ سکتا۔ اس صورت حال میں والدین مظلومیت کی تصویر بنے اولڈ ہومز میں پہنچ جائیں گے یا ہسپتالوں میں سسک سسک کر جان دے دیں گے اور اولاد بینک لوٹے گی' عزتیں پامال کرے گی' لا اینڈ آرڈر کے مسئلے کو اور گہرا کر دے گی' نتیجتاً یہ قوم ایسے تباہی کے راستے پر چل نکلے گی' جن کے مقدر میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا یہی وہ بات ہے جو یہاں فرمائی جارہی ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں' لیکن انہیں اس کا شعور نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کسی بھی قوم کیلئے سب سے بڑا حادثہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی بڑے حادثے کا شکار ہو جائے' بلکہ بڑا حادثہ یہ ہے کہ اس قوم کو حادثے کا احساس نہ ہو۔ سچ کہا کسی نے

حادثے سے بڑا حادثہ یہ ہوا لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

اگلی آیات کریمہ میں قرآن کریم سے انکار کرنے والوں اور اس کی تعلیمات کا تمسخر اڑانے والوں کا انجام ذکر کیا جا رہا ہے:

آیت: ۲۷-۲۸ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ O بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ O ''اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے' جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کئے جائیں گے۔ پس کہیں گے کہ کاش! ہم پھر واپس کئے جائیں کہ مانیں اور اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں اور ایمان والوں میں سے بنیں۔ 27 بلکہ یہ تو ان پر وہی حقیقت ظاہر ہوئی ہے' جو وہ اس سے پہلے اپنے دل میں چھپاتے تھے اور اگر یہ لوٹائے جائیں تو وہی کریں گے' جس سے روکے گئے' یہ بالکل جھوٹے ہیں''۔

تبلیغ کے کام کو یکسر روک دیا جائے تو اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے:

اس آیت کریمہ میں دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ یہ لوگ جس طرح آج آپ سے اور مسلمانوں سے سلوک کر رہے ہیں' آپ اس سے بددل نہ ہوں۔ یہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود آپ کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ البتہ اپنے کرتوتوں سے اپنی عاقبت ضرور تباہ کرلیں گے اور دوسری بات جو سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ ہے کہ قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ نے افہام وتفہیم کے جتنے اسالیب ممکن ہو سکتے تھے' اور تبلیغ ودعوت کے جو طریقے مؤثر ہو سکتے تھے ان میں سے ہر طریقہ اور ہر اسلوب اپنے مخاطبین کو ہدایت کی طرف لانے کیلئے استعمال کیا ہے۔ اس آیت میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے' اسے آخری طریقہ کہنا چاہیے۔ نصیحت اور استدلال کے تمام مروجہ اسالیب اور طریقوں کو آزمانے کے بعد' اس آخری طریقے کو آزمایا جارہا ہے کہ شاید وہ لوگ اسی طریقے سے راہ راست پر آسکیں۔ یعنی اگر وہ بات سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہیں تو ہوسکتا ہے کہ انہیں اپنے انجام کا خوف سوچنے پر مجبور کر دے کیونکہ یہ بات وہ لوگ جانتے تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ وہ قرآن کریم کو بے شک اللہ کی کتاب نہ مانتے ہوں' لیکن حضور کی زبان سے نکلنے والی خبر کا انکار کرنا ان کیلئے آسان نہ تھا۔ اسلئے جب حضور ﷺ انہیں اس طرح کی آیات پڑھ کر سناتے تھے تو یقیناً

Marfat.com

ایک دفعہ تو ان کے دل ہل جاتے ہوں گے کیونکہ اس میں جس طرح ان کے ہولناک انجام کو بیان کیا گیا ہے' کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور مزید یہ بات بھی کہ آدمی چاہے کیسا گیا گزرا بھی کیوں نہ ہو وہ کبھی نہ کبھی اپنی عاقبت کے بارے میں ضرور سوچتا ہے۔ جب ان لوگوں کو اپنی عاقبت کے حوالے سے اسطرح کی باتیں سننے کو ملتی تھیں تو یا تو وہ اس پر بھڑکتے اور مسلمانوں کی دشمنی پر تل جاتے تھے اور یا دہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

آخرت میں ان کے ساتھ جو کچھ گزرنے والی ہے اس کا پورا منظر ان کے سامنے لا کھڑا کیا گیا ہے کہ ایک طرف دہکتا ہوا جہنم ہے' جس کی ہولناکی الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی اور دوسری طرف ان کی بے بسی ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں ہماری بداعمالیوں کی پاداش میں ایسے جہنم میں پھینکا جائے گا جس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ آخری کوشش کے طور پر وہ اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ کاش! ہمیں واپس لوٹا دیا جائے تو ہم ایمان لائیں گے اور کبھی اللہ کی آیات کی تکذیب نہیں کریں گے۔ اس میں آئندہ بہتر اور فرمانبردار زندگی کی ضمانت بھی دی جارہی ہے اور ساتھ ساتھ اپنے گناہوں کا اعتراف بھی ہو رہا ہے کہ ہم آج تک آیات خداوندی کی تکذیب کرتے رہے اور ایمان کے کبھی قریب نہیں پھٹکے' لیکن اب ہم ایسا نہیں کریں گے۔ اس کے جواب میں پروردگار ارشاد فرما رہے ہیں کہ تم اب جو بات کہہ رہے ہو کوئی نئی بات نہیں' اس لئے کہ جہاں تک رسول اللہ ﷺ اور ان کی دعوت کے حق ہونے کا تعلق ہے' یہ تم دنیا میں بھی جانتے تھے کیونکہ تمہیں یقین تھا کہ حضور نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور قرآنِ کریم اپنی اعجازی صفات کے ساتھ ناقابل انکار ہے۔ تم اپنے دل میں اس کی صداقت کے قائل تھے' لیکن تم نے اس سچائی کو زبان پر لانا کبھی گوارا نہ کیا۔ آج تم نے چونکہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور پھر یہ کہ سب کچھ اپنے ہولناک انجام سے ڈر کر کہہ رہے ہو' اس لئے اس ایمان کا کیا بھروسہ اور اس ایمان کی کیا قدر و قیمت اور مزید یہ کہ جب تم پہلے دل میں ایمان رکھتے ہوئے محض غرورِ نفس اور حبِ دنیا کی وجہ سے اس کا اظہار نہ کر سکے اور برابر جھوٹ بولتے رہے تو اب اگر تمہیں واپس دنیا میں بھیج دیا جائے تو اس وقت تو تم خوف کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے ایمان کا یقین دلا رہے ہو لیکن جب تم واپس جاؤ گے تو اپنے جھوٹ کی عادت بد کی وجہ سے اور اپنے پندارِ نفس کے باعث پھر وہی کفر کا رویہ اختیار کرو گے' جو پہلے کرتے رہے ہو۔

رسول اللہ ﷺ اور قرآنِ کریم کے انکار کی پاداش میں قیامت کے دن ان کے ساتھ جو گزرے گی اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا جارہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت اور قرآنِ کریم کی حقانیت پر نہایت محکم دلائل کے باوجود یہ لوگ ایمان نہ لا کر قیامت کے دن جس انجام کو پہنچیں گے' اس کی وجہ اصل میں کیا ہے اور پھر یہ وجہ ان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ پوری انسانی تاریخ میں حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی اور آج تک بھی انسانی بگاڑ کا سب سے بڑا سبب یہی ہے' جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا جارہا ہے۔ ارشاد ہے

آیت: ۲۹ وَقَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۝ "کہتے ہیں کہ زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد' ہم اٹھائے نہیں جائیں گے"۔

آخرت کا انکار ہی اصل میں ہمیشہ سے انسانی بگاڑ کی بنیادی وجہ رہی ہے:

یعنی اہل مکہ اور باقی انسانوں کے بگاڑ کے نتیجے میں ان کے ہولناک انجام کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں۔ یہ شب و روز کا سلسلہ جو چل رہا ہے موت اس کا اختتام ہے اور زندگی کی اس شام کے بعد کسی اور صبح کے طلوع ہونے کا تصور بھی محال ہے اور اگر کچھ لوگ اس کو کسی حد تک مانتے بھی تھے تو یقین انہیں بھی نہیں تھا کہ قیامت واقعی آئے گی۔ اپنے اس اعتقاد کی وجہ سے وہ یہ بات سننے کے بھی روادار نہ تھے کہ اپنی زندگی کے معمولات میں اس لئے کمی بیشی کی جائے اور اپنے اختیار پر اس لئے کچھ پابندیاں قبول کر لی جائیں کہ قیامت کے دن چونکہ حساب

Marfat.com

دینا ہے' اس لئے اگر ہم نے ان پابندیوں کو قبول نہ کیا اور من مرضی کی زندگی اختیار کرتے رہے تو وہاں کیا جواب دے سکیں گے۔ جب ایسی کوئی بات ان سے کہی جاتی تھی تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور کہتے تھے کہ جب ایسی کسی زندگی کا تصور ہمارے نزدیک ممکن ہی نہیں تو تم آخر ہمیں اس سے ڈراتے کیوں ہو؟ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ موت کے بعد قبر میں جانا ہے اور قبر میں مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو جانا ہے۔ دوبارہ جی اٹھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو جواب دہی کیسے ہوگی؟ جواب دہی کا مرحلہ تو جب آئے گا' جب ہم واقعی دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور واقعی کوئی عدالت قائم ہوگی۔ جب یہ ساری انہونی باتیں ہیں تو تم ہماری زندگی کا عیش مکدر کیوں کرتے ہو۔ یہیں کے غم اصل غم ہیں اور یہیں کی خوشیاں اصل خوشیاں ہیں۔ جس نے ان غموں پر قابو پالیا اور ان خوشیوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا' اس نے گویا زندگی کی کامیابیاں حاصل کر لیں اور جو یہاں کی خوشیاں حاصل کرنے میں ناکام رہا' محرومیاں ایسے شخص کا مقدر ہوں گی۔ اس لئے ہمیں جو کچھ کرنا ہے' اسی دنیا میں اور اسی دنیا کیلئے کرنا ہے۔ ہمارا مقصد اس دنیا اور اس زندگی میں خوشیوں کا حصول اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنا ہے۔ اس میں اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ کیا ہونا چاہئے' اور کیا نہیں ہونا چاہئے یہ سراسر کتابی باتیں ہیں اور کمزور لوگوں کے بہلاوے ہیں۔ جس شخص کو زندگی پر سوار ہونے کی قدرت حاصل ہے' اسے اپنی قدرت اور قوت کے بل بوتے پر زندگی کی ہر خوشی کو حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس لئے تم بار بار آخرت کے تذکرے سے ہمارے رنگ میں بھنگ مت ڈالو۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ ہم سونا چاہتے ہیں تو تم ہمیں آنے والے دن کا تصور دے کر جگا دیتے ہو۔ ہم دولت کے حصول کیلئے کوئی بھی ذریعہ اختیار کرنا چاہتے ہیں' جس سے ایک بڑا دولت کا انبار ہمارے ہاتھ آئے اور تم جواب دہی کا تصور لے کر بیٹھ جاتے ہو۔ ہم تو تمہارے ان تصورات سے تنگ آ گئے۔ اس لئے مہربانی کرو' ہمیں اپنی مرضی کی زندگی گزارنے دو یہ وہ تصورات تھے' جن کے تحت وہ زندگی گزارتے تھے اور آج کا انسان بھی انہی تصورات کے ساتھ جی رہا ہے۔ اسلئے وہ کسی بھی پابندی کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اس کا معبود مادہ ہے اور دولت وہ آستانہ ہے جس پر اس کا سر جھکتا ہے اور عہدہ و منصب' وہ قبلہ مقصود ہے' جس کا وہ زندگی بھر طواف کرتا رہتا ہے اور قوت و لذت وہ منزل ہے' جسکے حصول کیلئے وہ ہمیشہ سرگرم سفر رہتا ہے۔ چنانچہ یہی بات مشرکینِ مکہ کہتے تھے کہ ہماری زندگی تو یہ دنیا کی زندگی ہے' ہمیں یقین ہے کہ ہم دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔ اسلئے ہم تمہاری کسی بات کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ قیامت کے انکار کی صورت میں ان نادانوں کے ساتھ قیامت کے دن کیا گزرنے والی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

آیت:۳۰ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ ''اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو' جب یہ اپنے رب کے حضور کھڑے کئے جائیں گے' وہ ان سے پوچھے گا! کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے؟ وہ جواب دیں گے' ہاں ہمارے رب کی قسم' یہ امر واقعہ ہے۔ (اللہ) فرمائے گا! پس چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں''۔

اس آیت کے پہلے جملے کے الفاظ تو نہایت مختصر ہیں جس کا ترجمہ ہم نے یہ کیا ہے کہ ''اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو' جب یہ اپنے رب کے حضور کھڑے کئے جائیں گے''۔ لیکن اگر ہم تصور میں کسی طرح اس منظر کو سمیٹ سکیں تو ممکن نہیں ہے کہ ہمارے جسم پر کپکپی نہ چھوٹے۔ غور کیجئے! بے بس انسانوں کا ایک جم غفیر اپنے گناہوں کا پشتارہ اٹھائے ہوئے اور اپنے جرائم کی فائل لئے نہایت بے بسی کے عالم میں ایک ایسی عدالت میں کھڑا ہوگا' جسکا منصف اعلیٰ ہمہ مقتدر خداوند ذوالجلال ہوگا۔ اگر کسی آدمی کو ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ جیسی معمولی عدالت میں کھڑے ہونے کا بھی اتفاق ہوا ہو تو اسے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی بھی عدالت میں اپنی جزا سزا کا انتظار اور عدالت کے جج کا سامنا کس قدر مشکل کام ہے حالانکہ یہ عدالتیں انسانوں کی عدالتیں ہیں۔ اس میں فیصلہ سنانے والا بھی ایک بے بس انسان ہوتا ہے۔ لیکن جس عدالت میں سامنا خداوند ذوالجلال سے ہوگا' اس میں قطع نظر اس سے کہ فیصلہ

Marfat.com

کیا ہوتا ہے' خود پروردگار کے سامنے کھڑا ہونا ہی بجائے خود ایک دل دہلا دینے والی بات ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ایک جگہ بتلایا ہے کہ جو آدمی اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا یہی ہے جس نے نفس کو لگام دے لی اور اپنی خواہشات پر قابو پالیا اور بالآخر جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا اب قیامت کے دن فی الواقع اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہوگا۔ ایک بے بس اور بے کس انسان جو کمزوریوں اور ناتوانیوں کا پتلا ہے' وہ اس منظر کی تاب کیسے لا سکے گا۔ پروردگار اپنی قدرت کاملہ سے شاید اس لئے ان کو زندہ رکھے گا تاکہ یہ جہنم کا عذاب چکھیں' ورنہ انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ ایسی صورت حال میں اپنے آپ کو سنبھال سکے اور دل اس کا پھٹنے سے بچ جائے۔ چنانچہ جس وقت انسانوں کا یہ جم غفیر پروردگار کے جلال سے پانی پانی ہو رہا ہوگا کہ اچانک ان سے پوچھا جائے گا بتلاؤ! تم دنیا میں جس قیامت کا انکار کرتے رہے' آج اس قیامت کا منظر تمہارے سامنے ہے' اب جواب دو کہ کیا یہ امر واقعہ ہے یا نہیں وہ جواب میں کہیں گے ''بَلٰی وَ رَبِّنَا'' ہاں! ہمارے رب کی قسم' یہ امر واقعہ ہے۔ جس قیامت کا وہ زندگی بھر انکار کرتے رہے' اب کس آمادگی کے ساتھ وہ اس کا اقرار کریں گے اور ساتھ ہی اپنے رب کی قسم کھائیں گے اور رَبِّنَا کہہ کر اللہ کو یاد کریں گے لیکن یہ آمادگی' یہ تسلیم اور یہ اطاعت وانقیاد بعد از مرگ واویلا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں' اس لئے کہ آج ان کا قیامت کو تسلیم کرنا اس لئے ہے کہ اس کا انکار کرنے کی گنجائش نہیں' وہ خود قیامت کے حصار میں ہیں' ان کا انجام انہیں دکھائی دے رہا ہے۔ پروردگار کا جلال انہیں سراسیمہ کر رہا ہے' اس لئے اس وقت کا اقرار اور یقین ایک بے قدر و قیمت چیز ہے کیونکہ ایمان دنیا میں انسان کے عقل و شعور کا امتحان ہے۔ دنیا میں ہزاروں ایسے مواقع ہیں' جو انسان کو ایمان سے روکتے بلکہ اس کے خلاف اکساتے ہیں۔ لیکن اللہ اپنے دلائل انفس و آفاق دکھا کر اور اپنے رسول اور کتابیں بھیج کر انسان کیلئے ایمان کو آسان بھی کرتا ہے اور اس کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اس لئے جب تک آدمی دنیا میں ہے' وہ اس امتحان اور آزمائش میں ہے کہ آیا وہ ایمان لاتا ہے یا نہیں۔ لیکن جب وہ موت کی وادی میں داخل ہو جاتا ہے تو ہر چیز اس کے مشاہدے میں آنا شروع ہو جاتی ہے' اب اگر وہ ایمان لانا چاہے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ آنکھوں دیکھا ایمان اللہ کے نزدیک ایمان نہیں بلکہ مشاہدہ ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے کہ کسی آدمی کو کسی امتحان کی تیاری کیلئے ایک مدت تک موقع دیا جائے اور جب وہ کمرہ امتحان میں پہنچ جائے' تو وہاں جا کر یہ کہے کہ مجھے اب تک اس بات کا یقین نہیں تھا کہ واقعی امتحان ہوگا' اب مجھے یقین آ گیا ہے اس لئے اب مجھے اس کی تیاری کا موقع دیا جائے۔ ظاہر ہے کسی بھی امیدوار کو اس کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اس لئے یہاں قیامت کے دن یہ لوگ اگرچہ اب قیامت کا اعتراف کریں گے لیکن بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اقرار و ایمان کی قدر فرمائے۔ انہیں جہنم کا مزا چکھنے کا حکم دیں گے۔

جہنم کوئی چکھنے کی چیز نہیں بلکہ یہ تو جسم و جان کے سب سے بڑے ابتلا کا نام ہے۔ لیکن دنیا میں جہنم کا انکار کرنے والوں نے دنیا کو بجائے آخرت کی تیاری کیلئے استعمال کرنے کے صرف دنیا کی نعمتوں کو کھانے پینے کی چیز سمجھا اور ساری زندگی لذت کام و دہن میں گزاری اس لئے ان سے کہا جا رہا ہے کہ چونکہ تمہیں لذت ہی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت معلوم ہوتی رہی ہے آج اسی لذت کے حوالے سے ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اب جہنم کے عذاب کو بھی چکھ کر دیکھو' تاکہ تمہیں اندازہ ہو کہ اپنے خالق و مالک کے احکام کا انکار کرنا اور حقائق کو تسلیم نہ کرنا کیسے ہولناک نتائج کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔

جہنم کے عذاب کی شدت' وسعت اور اس کی گہرائی تو واقعی دل دہلا دینے والی ہے اور کوئی بھی قرآن پاک کا پڑھنے والا یا اسلامی تعلیمات کو جاننے والا اس سے بے بہرہ نہیں ہو سکتا لیکن اگر مزید غور کیا جائے تو جہنم کی سزا کے بارے میں بعض اور ہولناک چیزیں سامنے آتی ہیں' جو پتہ پانی کر دینے کیلئے کافی ہیں۔ مثلاً دنیا میں کوئی ایسی سزا نہیں جس کی کیفیت اور کمیت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمی نہ ہوتی ہو۔ کسی آدمی کو اگر عمر قید ہو جائے تو ہر دن کے گزرنے سے اس کی قید کی مدت میں ایک دن کی کمی ہو جاتی ہے اور جیسے جیسے دن گزرتے ہیں اس کی مدت قید کم ہوتی جاتی ہے اور قیدی کو یہ

Marfat.com

امید زندہ رکھتی ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ قید کے دن گزر جائیں گے اور میں آزاد فضا میں سانس لے سکوں گا۔ لیکن جہنم کی سزا عجیب سزا ہے کہ کافروں کو چونکہ ابدی عذاب کی سزا ملے گی' اس لئے کسی دن کے گزرنے سے ان کے عذاب کی مدت میں کمی نہیں ہو گی۔ کیونکہ ان کی سزا لا انتہا ہے' اس لئے ہر گزرنے والا دن ان کی سزا میں اضافہ محسوس کرائے گا' کمی کا احساس نہیں ہو گا۔

اسی طرح دنیا میں شدید سے شدید سزا کی شدت میں بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمی ہو جاتی ہے' جس آدمی کو چکی پیسنے کا حکم ملتا ہے۔ شروع دنوں میں اس کے ہاتھوں میں چھالے پڑتے ہیں' پھر وہ زخموں میں تبدیل ہوتے ہیں' پھر خون بہتا ہے' آخر گٹے بننے لگتے ہیں۔ گٹے بننے کے بعد چکی پیسنے والے کی تکلیف میں کمی ہو جاتی ہے۔ اب نہ اس کو زخم پریشان کرتے ہیں نہ اس کے بازو شل ہوتے ہیں کیونکہ روز کی مشقت نے اس کے اعصاب کو سخت کر دیا ہے۔ لیکن جہنم کی سزا عجیب سزا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا' اس کی کیفیت اور شدت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جہنم کی آگ جب جہنمیوں کی کھالوں کو جلا دے گی اور ان کی کھالیں جل کر جھڑ جائیں گی تو اللہ فرماتا ہے ہم ان کو نئی کھالیں پہنا دیں گے۔ نئی کھال پہننے کے بعد ہر جہنمی از سر نو جلنے کی تکلیف محسوس کرے گا چونکہ کسی کو مرنے نہیں دیا جائے گا اس لئے بار بار کھالیں بدلنے سے بار ہا ران کی اذیت میں اضافہ ہو گا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہنم کا عذاب کیسا ہولناک عذاب ہو گا' جس کے بارے میں یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنے کفر کے باعث اب اس عذاب کا مزا چکھو گے جس کا تم مذاق اڑایا کرتے تھے۔

جہنم میں اہل جہنم پر جو گزرے گی' وہ تو ایک دلخراش داستان ہے ہی لیکن ان قیامت کا انکار کرنے والوں کے اپنے احساسات بھی ان کیلئے نہایت تکلیف دہ ہوں گے۔ ایک آدمی جب محسوس کرتا ہے کہ میں جس مصیبت میں گرفتار ہوں وہ میری اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے تو وہ وقت سے پہلے اور عذاب شروع ہونے سے پہلے اپنے ہی پیدا کردہ عذاب کی گرفت میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہو گا کہ جب قیامت کا انکار کرنے والوں کو اچانک قیامت سے سابقہ پیش آئے گا تو وہ خود اپنے آپ کو ملامت کریں گے۔ چنانچہ ان کے احساس کی کیفیت قرآن کریم نے اگلی آیت میں بیان کی ہے۔ ارشاد ہے۔

آیت:۳۱ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ ''گھاٹے میں رہے وہ لوگ' جنہوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آپہنچے گی' وہ کہیں گے کہ ہائے افسوس! ہماری اس کوتاہی پر' جو اس باب میں ہم سے ہوئی اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ جان رکھو کہ نہایت ہی برا ہو گا وہ بوجھ' جو یہ اٹھائیں گے''۔

اس آیت کریمہ میں چند باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے پہلی یہ بات کہ قیامت کا انکار کرنے والے ہمیشہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ چونکہ قیامت کا کوئی وجود نہیں اس لئے جو لوگ قیامت کی تیاری میں اپنی زندگی پر بہت سی پابندیاں لگائے رکھتے ہیں اور حلال و حرام' جائز و ناجائز اور صحیح و غلط کے بکھیڑے میں پڑے رہتے ہیں' جس کے نتیجے میں زندگی کی بیشتر خوشیوں اور عیش و عشرت سے انہیں محروم ہونا پڑتا ہے' وہ سراسر اپنی دنیوی زندگی کیلئے خود ایک عذاب پیدا کرتے ہیں اور خود ہی اپنے لئے بہت ساری تکلیفیں اٹھاتے اور برداشت کرتے رہتے ہیں اس لئے عقل کی بات یہ ہے کہ وہ بھی ہماری طرح قیامت کے تصور سے جان چھڑائیں اور ہماری طرح زندگی کی ہر جائز و ناجائز نعمت سے لذت اندوز ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے گھاٹے کا سودا کیا ہے' یہ بے وقوف یہ سمجھتے رہے کہ قیامت چونکہ محض ایک بے وقوفوں کا تصور ہے' اس لئے اسکی تیاری کا کیا سوال؟ لیکن جب قیامت ان کے سروں پر آپہنچے گی تو تب ان کو اندازہ ہو گا کہ ہم جس کو کامیاب زندگی سمجھتے تھے وہ تو سراسر خسارے اور گھاٹے کا سودا تھا۔ اور اس وقت ان کا یہ احساس سوائے انہیں دکھ دینے کے

Marfat.com

اور کچھ نہ دے سکے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ملحد نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ تم مسلمان چونکہ قیامت پر یقین رکھتے ہو اس لئے اس کی تیاری میں بہت ساری چیزوں سے دست کش ہو جاتے ہو اور بہت ساری مشقتیں برداشت کرتے ہو۔ پانچ وقت کی نمازیں' سردیوں کے موسم میں ٹھنڈے پانی سے وضو' گرمیوں میں جلتی ہوئی مسجد میں ظہر اور عصر کی نمازیں' پھر اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت سے انفاق فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ کے نام سے دولت کا نقصان اور جہاد فی سبیل اللہ کیلئے سب کچھ تیاگ دینے کا عزم اور نجانے کیا کیا مصیبتیں ہیں جو تم نے اپنے سر لے رکھی ہیں۔ حالانکہ قیامت ایک موہوم تصور کے سوا کچھ نہیں تو تم کیوں اتنی تکلیفیں اٹھاتے ہو ممکن ہے آپ یہ سمجھیں کہ یہ پرانی باتیں ہیں' آج تو اس طرح شاید کوئی نہ سوچتا ہو' لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج کا دانشور بھی خوفِ فسادِ خلق سے زبان سے کہنے کی ہمت کرے یا نہ کرے لیکن دل میں اس کا یقین ہرگز نہیں رکھتا بلکہ ہمارے یہاں تو ایسے شعراء اور ادیب بھی موجود ہیں جنہوں نے کھل کر اس کا مذاق بھی اڑایا۔ ان میں ایک بڑا نام مرزا غالب کا ہے انہوں نے تو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے' اس کے انکار تک کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا وہ فرماتے ہیں۔

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

اور جواب دہی کے تصور کو ہلکا کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی اپنا کوئی دمِ تحریر بھی تھا

مزید فرماتے ہیں:

گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور عدم صاحب بھی مذاق اڑاتے ہوئے فرماتے ہیں

آگے چل کر حساب ہونا ہے
اس لئے بے حساب پی لیجے
دو ہی گھونٹ ہیں جام کے اندر
کر کے زیر نقاب پی لیجے

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس ملحد کے جواب میں فرمایا کہ بات یہ ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ قیامت کا کوئی وجود نہیں اگر تمہاری بات کل کو سچ نکلی تو میں بھی بچ گیا اور تم بھی بچ گئے' رہی یہ بات دنیا میں بعض پابندیاں قبول کرنے کی تو ہم اسے مشقت نہیں' اپنے لئے راحت سمجھتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک صاف ستھری زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن اگر تمہاری بات غلط نکلی اور میری بات صحیح ثابت ہوئی اور قیامت واقعی آ گئی تو میں تو بچ گیا تم بتاؤ تمہارا کیا بنے گا۔ چنانچہ جب قیامت واقعی برپا ہو جائے گی تو اس کے حوالے سے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اسکا انکار کیا تھا وہ گھاٹے میں پڑے۔ آج انکے پاس سوائے پچھتانے کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ پھر انکے حالات کی منظر کشی کی گئی ہے کہ جب اچانک قیامت انکے سروں پر آ پہنچے گی اور

Marfat.com

دیکھ لیں گے کہ جسکا ہم انکار کرتے رہے وہ تو حقیقت نکلی تو تب وہ پچھتائیں گے اور تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہائے ہماری شامت اب ہم کیا کریں۔ کیونکہ آج ہم جس صورت حال میں گرفتار ہو گئے ہیں وہ ہماری اپنی کوتاہیوں اور اپنی کم فہمیوں کا نتیجہ ہے ہمیں ہر ممکن طریقے سے اللہ کے رسول نے سمجھایا لیکن ہم نے اسکی کوئی بات مان کے نہیں دی۔ اور ہم اپنے انکار پر اڑے رہے۔ اب قیامت سامنے ہے ایک ایک لمحے اور ایک ایک عمل کا حساب پوچھا جائے گا۔ ہم نے چونکہ اسکی تیاری ہی نہیں کی اسلئے ہمارے پاس سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں۔ آیت کے آخر میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اب انکا حال یہ ہوگا کہ یہ اپنے کفر و معصیت کے بوجھ اور اپنی زندگی بھر کی بداعمالیاں اپنی کمروں پر اٹھائے کھڑے ہوں گے۔ ممکن ہے آپکے ذہن میں یہ بات آئے کہ انسانی اعمال جسم تو نہیں رکھتے جنہیں اٹھانے کی نوبت آئے اور نہ ان کا وزن ہوتا ہے کہ انکا بوجھ محسوس ہو لیکن یہ باتیں اب ماضی کا قصہ ہیں۔ اب تو ہم اپنی گاڑیوں کے ٹائروں میں باقاعدہ تلوا کر ہوا بھرواتے ہیں۔ اگر ہوا کا وزن ہماری گرفت میں آ گیا ہے تو کل اگر اعمال کے وزن کا بھی اندازہ ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں اور پھر وہ عدالت تو دنیا کی عدالت نہیں ہوگی وہ تو اللہ کی عدالت ہے جس میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہر عمل کو مجسم شکل میں سامنے لایا جائے گا حتیٰ کہ دنیا میں ہم نے جن چیزوں کی چوری کی ہوگی اور جو کچھ چرایا ہو گا وہ اسی حالت میں ہمارے کندھوں پر لاد دیا جائے گا اور ہم اسی حالت میں بارگاہ حق میں کھڑے کئے جائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دن خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں کہا کہ لوگو کل میں تمہیں اس حالت میں نہ دیکھوں کہ تم میں سے کسی نے کسی کا اونٹ چوری کیا ہو اور وہ قیامت کے دن اس حال میں میرے پاس آئے کہ اونٹ اس کی گردن پر بیٹھا بلبلا رہا ہو اور وہ مجھ سے فریاد کرے کہ حضور مجھے اس بوجھ سے نجات دلایئے۔ فرمایا میں اسوقت کسی کی مدد نہیں کروں گا کیونکہ آج میں نے تمہیں اللہ کے احکام پہنچا دیئے ہیں۔ اسکے بعد حضور نے مختلف جانوروں کا ذکر کیا' زمین کا ذکر فرمایا' سونا چاندی' درہم و دینار کا بھی تذکرہ کیا اور یہ فرمایا کہ تم جو کچھ بھی چوری کرو گے کل کو وہی چیز تمہاری گردن پر سوار ہوگی۔ اے کاش آج ہم بھی سوچ لیں کہ ہم نے جسطرح خیانت' رشوت اور غبن میں دنیا بھر میں نام پیدا کیا ہے اور بالخصوص ہمارا بالائی طبقہ جسطرح اس میں گردن تک دھنسا ہوا ہے اسے آج سوچ لینا چاہئے کہ کل کو قیامت کے دن اسکا کیا جواب دے سکیں گے۔

قیامت کے انکار کے نتائج اور اس کا انجام ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا جا رہا ہے کہ چونکہ قیامت کا انکار دنیا کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے اور دنیا سے غائت درجہ محبت کا ثمر ہے اس لئے ضروری ہے کہ دنیا کی حقیقت واضح کر دی جائے۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

آیت ۳۲: وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O ''دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشہ ہے۔ آخرت ہی کا مقام ان لوگوں کیلئے بہتر ہے' جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لو گے؟''۔

یعنی یہ دنیا کی زندگی جس نے تمہیں آخرت سے غافل کر دیا ہے' سوائے بے نتیجہ لھو و لعب اور چند روزہ دل بہلاوے کے اور کیا ہے؟ اصل شے تو دار آخرت اور اس کی زندگی ہے جو آخرت سے ڈرنے والوں کیلئے اس دنیا کی زندگی سے کہیں بہتر ہے بس کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔ اس آیت کریمہ میں یہ جو فرمایا گیا کہ دنیا کی زندگی تو صرف ایک کھیل اور تماشہ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کی زندگی میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے اور یہ محض کھیل اور تماشے کے طور پر بنائی گئی ہے۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی حقیقی اور پائیدار زندگی کے مقابلہ میں یہ زندگی ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ دیر کھیل اور تفریح میں دل بہلائے اور پھر اصل سنجیدہ کاروبار کی طرف واپس ہو جائے۔ نیز اسے کھیل اور تماشے سے تشبیہ اس لئے بھی دی گئی ہے کہ یہاں حقیقت کے مخفی

Marfat.com

ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور ظاہر پرست انسانوں کیلئے غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کے بہت سے اسباب موجود ہیں اور ان غلط فہمیوں میں پھنس کر لوگ حقیقت نفس الامری کے خلاف ایسے ایسے عجیب طرز عمل اختیار کرتے ہیں جن کی بدولت ان کی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا بن کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص یہاں بادشاہ بن کر بیٹھتا ہے اس کی حیثیت حقیقت میں تھیٹر کے اس مصنوعی بادشاہ سے مختلف نہیں ہوتی جو تاج پہن کر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اس طرح حکم چلاتا ہے گویا کہ وہ واقعی بادشاہ ہے حالانکہ حقیقی بادشاہی کی اس کو ہوا تک نہیں لگی ہوتی۔ ڈائریکٹر کے ایک اشارے پر وہ معزول ہو جاتا ہے' قید کیا جاتا ہے اور اس کے قتل تک کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی تماشے اس دنیا میں ہر طرف ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی ولی یا دیوی کے دربار سے حاجت روائیاں ہو رہی ہیں' حالانکہ وہاں حاجت روائی کی طاقت کا نام ونشان تک موجود نہیں۔ کہیں کوئی غیب دانی کے کمالات کا مظاہرہ کر رہا ہے' حالانکہ غیب کے علم کا وہاں شائبہ تک نہیں۔ کہیں کوئی لوگوں کا رازق بنا ہوا ہے حالانکہ بیچارہ خود اپنے رزق کیلئے کسی اور کا محتاج ہے۔ کہیں کوئی اپنے آپ کو عزت اور ذلت دینے والا' نفع اور نقصان پہنچانے والا سمجھے بیٹھا ہے اور یوں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجا رہا ہے گویا کہ وہی گرد و پیش کی ساری مخلوق کا خدا ہے' حالانکہ بندگی کی ذلت کا داغ اس کی پیشانی پر لگا ہوا ہے اور قسمت کا ایک ذرا سا جھٹکا اسے کبریائی کے مقام سے گرا کر انہی لوگوں کے قدموں میں پامال کر سکتا ہے' جن پر وہ کل تک خدائی کر رہا تھا۔ یہ سب کھیل جو دنیا کی چند روزہ زندگی میں کھیلے جا رہے ہیں' موت کی ساعت آتے ہی یکلخت ختم ہو جائیں گے اور اس سرحد سے پار ہوتے ہی انسان اس عالم میں پہنچ جائے گا' جہاں سب کچھ عین حقیقت کے مطابق ہو گا اور جہاں دنیوی زندگی کی ساری غلط فہمیوں کے چھلکے اتار کر ہر انسان کو دکھا دیا جائے گا کہ وہ صداقت کا کتنا جوہر اپنے ساتھ لایا ہے جو میزان حق میں کسی وزن اور کسی قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا ہو۔

تقویٰ والوں کیلئے آخرت بہتر ہے:

اس آیتِ کریمہ میں اگر مزید تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے دو جملے ہیں اور دونوں جملوں میں جو بات کہی گئی ہے ان میں تقابل پایا جاتا ہے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا گیا کہ یہ زندگی صرف لہو ولعب ہے اور دوسرے جملے میں کہا گیا ہے کہ آخرت کا گھر ان لوگوں کیلئے بہتر ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ جو لوگ اللہ سے نہیں ڈرتے ان کیلئے تو یہ گھر دار العذاب ہو گا وہ تو بہتری کا تصور بھی نہیں کر سکتے اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت فی نفسہٖ ایک دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتیں' بلکہ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں۔ دنیا اللہ نے آخرت کی تیاری کیلئے پیدا فرمائی اور آخرت دنیا میں کئے ہوئے اعمال کا نتیجہ اور ان کی جزا ہے۔ جن لوگوں نے اس دنیا کو دار العمل سمجھ کر لہو ولعب میں زندگی نہیں گزاری۔ یعنی انہوں نے زندگی کے مقاصد کو پہچانا اور پوری دنیوی زندگی ان مقاصد کے حصول کی تگ ودو میں صرف کر ڈالی وہ دنیا کو ایک کھلنڈرے کا کھیل سمجھنے کی بجائے اس کی سنجیدگی کو لئے ہوئے زندگی گزارتے رہے اور ہمیشہ ان کے سامنے آخرت کی منزل رہی۔ زندگی کے ہر مرحلے میں خوف خدا سے ان کا احساس اور ان کا ہر عمل گراں بار رہا۔ ایسے لوگوں کیلئے یہ زندگی بالکل آخرت ہی کی طرح اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ اگر مقصود آخرت ہے تو اس مقصود کو حاصل کرنے کیلئے دنیا کی زندگی کا ہونا ضروری ہے' اگر یہ دنیا کی زندگی نہ ہوتی تو ہم آخرت کو حاصل کرنے کیلئے کچھ بھی نہ کر سکتے۔ اہل علم کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ جو چیز محبوب ہوتی ہے اس تک پہنچنے کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے جو چیز واجب ہوتی ہے اس کا مقدمہ اور اس کا ذریعہ بھی واجب ہوتا ہے' اس لحاظ سے یہ کہنا چاہئے کہ آخرت بھی صرف اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے بہتر ہے اور دنیا بھی ایسے ہی لوگوں کیلئے بہتر ہے' جنہوں نے اللہ سے ڈر کر آخرت کی تیاری کی۔ رہی یہ بات کہ اسے پھر لہو ولعب سے تعبیر کیوں کیا گیا ہے تو اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کہ اس دنیا میں لہو ولعب کی طرف لے جانے والی چیزیں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں اور خود لہو ولعب کے میلانات خواہشات کی صورت میں آدمی کے اندر اس فراوانی سے پائے جاتے ہیں کہ ان سے بچنا صرف اسی آدمی کیلئے ممکن ہے

Marfat.com

جس پر آخرت' کی طلب اللہ کی محبت اور اس کی ناراضگی کا خوف غالب رہتا ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں براہ راست آنحضرت ﷺ کو خطاب ہے اور مکے کے ماحول میں جو کچھ آپ کے ساتھ گزر رہی تھی اس پر آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۳۳ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ O ''اے محمد! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں' ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے۔ لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے' بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں''۔

رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کے دو حصے ہیں ایک وہ حصہ ہے جو آپ نے چالیس سال کی عمر تک نبوت سے پہلے مکے میں گزارا اس میں جیسے ہی آپ شعور اور بلوغ کی عمر کو پہنچے جس میں آدمی کے اعمال کا لحاظ شروع ہوتا ہے اور آدمی اپنے اچھے یا برے اعمال سے پہچانا جاتا ہے' اس وقت سے لے کر نبوت کے دعوے تک ایک حیران کن چیز دکھائی دیتی ہے کہ مکے کا کوئی فرد ایسا نہیں جو آپ کے سیرت و کردار کے گن نہ گاتا ہو۔ لوگ اپنی مجلسوں میں آپ کی پیاری شکل و صورت کے ساتھ آپ کی بلند کرداری کے حوالے دیتے۔ بوڑھیاں جہاں آپ کی من موہنی صورت کی تعریف کرتیں وہیں آپ کے پیارے عادات و اطوار کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللساں رہتیں۔ مکے کی عام شہری زندگی میں عام انسانی اخلاق کا معیار انتہائی پست ہونے کے باوجود اعلیٰ اخلاق و اطوار کو پسندیدہ نگاہ سے ضرور دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے تمام مکے کے لوگ آپ کے اخلاق و اطوار کو دیکھ کر آپ کو الصادق اور الامین کہہ کر پکارتے تھے۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ کوئی آپ کو محمد ﷺ کہہ کر پکارے بلکہ جب آپ کو کہیں آتا دیکھتے تو ہمیشہ یہی کہتے کہ امین آ گیا اور اگر آپ سے کوئی معاملہ کرتے تو انہیں یہ اعتماد ہوتا کہ وہ ایک صادق آدمی سے معاملہ کر رہے ہیں' لیکن جیسے ہی آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو کل تک آپ کی بلائیں لینے والے اور محبت سے آپ کا تذکرہ کرنے والے آپ کے دشمن ہو گئے۔ طرح طرح سے آپ کو تکلیفیں دی جانے لگیں۔ اور کوئی ایسا دکھ نہیں تھا جو آپ کو نہیں پہنچایا گیا۔ آپ کو مجنوں اور ساحر تک کہا گیا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کبھی کسی نے آپ کو شخصی حیثیت سے جھوٹا کہنے کی جرأت کبھی نہ کی۔ آپ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپ پر یہ الزام نہ لگایا کہ آپ دنیا کے کسی معاملے میں کبھی جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہوں نے جتنی بھی آپ کی تکذیب کی اور جب بھی آپ کو جھوٹا کہا تو وہ اس لئے نہیں کہا کہ وہ شخصی طور پر آپ کو جھوٹا سمجھتے تھے بلکہ اس لئے کہا کہ وہ آپ کی نبوت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ابوجہل آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ اس نے خود نبی کریم ﷺ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

انا لا نکذبک ولکن نکذب ما جئت به

''ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں' اسے جھوٹ قرار دیتے ہیں''۔

جنگ بدر کے موقع پر اخنس بن شریق نے تخلیہ میں ابوجہل سے پوچھا کہ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں سچ بتاؤ' کہ تم محمد کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ ابوجہل نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ بلاشبہ محمد (ﷺ) سچے ہیں۔ انہوں نے عمر بھر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن بات یہ ہے کہ قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنو قصی میں ساری خوبیاں اور کمالات جمع ہو جائیں' باقی قریش خالی رہ جائیں' اس کو ہم کیسے برداشت کریں؟ جھنڈا بنو قصی کے ہاتھ میں ہے۔ حرم میں حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمت وہ انجام دیتے ہیں' بیت اللہ کی دربانی اور اس کی کنجی ان کے پاس ہے۔ اب اگر نبوت بھی ہم انہیں کی تسلیم کر لیں تو باقی قریش کے پاس کیا رہ جائے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ قبائلی زندگی میں ہر قبیلے کا سردار ہر چیز برداشت کر سکتا ہے لیکن دوسرے قبیلے کی عظمت اور عزت کو اپنے سے بڑھتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتا' اسے ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ میں کوئی ایسا کام نہ کروں جس سے میرے قبیلے پر حرف آ سکتا ہو یا

Marfat.com

میری عزت میں کمی آسکتی ہو اور جہاں تک عربوں کا تعلق ہے' بالخصوص قریش ان میں یہ بیماری تو سب سے زیادہ تھی وہ مر جاتے تھے' لیکن بڑائی کا احساس نہیں مرنے دیتے تھے۔ ابو جہل حمیت جاہلی اور قبائلی رعونت کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے اسے اس امت کا فرعون قرار دیا تھا اس نے آخر دم تک اپنی اس خصوصیت کو باقی رکھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب بدر کا معرکہ ختم ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کون ہے جو دیکھے کہ ابوجہل کا انجام کیا ہوا؟'' اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کی تلاش میں بکھر گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے اس حالت میں پایا کہ ابھی سانس آ جا رہی تھی۔ انہوں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھا اور سر کاٹنے کیلئے داڑھی پکڑی اور فرمایا او اللہ کے دشمن! آخر اللہ نے تجھے رسوا کیا نا؟ اس نے کہا: ''مجھے کاہے کو رسوا کیا؟ کیا جس شخص کو تم لوگوں نے قتل کیا ہے اس سے بھی بلند پایہ کوئی آدمی ہے؟ یا جس کو تم لوگوں نے قتل کیا اس سے بھی اوپر کوئی آدمی ہے؟ پھر بولا کاش! مجھے کسانوں کے بجائے کسی اور نے قتل کیا ہوتا' اس کے بعد کہنے لگا مجھے بتاؤ آج فتح کس کی ہوئی؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا' اللہ اور اس کے رسول کی۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود سے...... جو اس کی گردن پر پاؤں رکھ چکے تھے...... کہنے لگا: او بکری کے چرواہے! تو بڑی اونچی اور مشکل جگہ پر چڑھ گیا...... واضح رہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مکے میں بکریاں چرایا کرتے تھے۔

اس گفتگو کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا سر کاٹ لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لا کر حاضر کرتے ہوئے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! یہ رہا اللہ کے دشمن ابوجہل کا سر''۔ آپ ﷺ نے تین بار فرمایا: ''واقعی۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں'' اس کے بعد فرمایا:

اَللّٰهُ اَکْبَرُ' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَ نَصَرَ عَبْدَهٗ وَ هَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ

''اللہ اکبر' تمام حمد اللہ کیلئے ہے' جس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا' اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تنہا سارے گروہوں کو شکست دی''

پھر فرمایا' چلو مجھے اس کی لاش دکھاؤ۔ ہم نے آپ ﷺ کو لے جا کر لاش دکھائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا' یہ اس امت کا فرعون ہے۔

اس واقعہ سے آپ کو قریش کی حمیت جاہلی' پندار نفس اور بگڑی ہوئی ذہنیت کا انداز ہو گیا ہو گا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو صرف اس لئے قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھے کہ بنو قصی ان پر غالب آجائیں گے جو حضور کا خاندان ہے۔ اس وجہ سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ کہہ کر تسلی دی ہے کہ یہ تکذیب دراصل تمہاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے اور اس آیت کے آخری جملے میں نہایت پیار بھرے انداز میں آپ کو تسلی دی گئی کہ اس تمام خاک بازی اور تمام استہزاء کے ہدف تنہا تم ہی تو نہیں ہو اصل ہدف تو ہم اور ہماری کتاب ہے پھر تم اپنے دل کو آزردہ کیوں کرو۔ معاملے کو ہم پر چھوڑ دو ساتھ ہی ان کیلئے ظالمین کا لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ ان کے کرتوتوں کا نقصان خود انہیں کو پہنچے گا کسی اور کو نہیں لیکن یہ بدقسمت اور نامراد لوگ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں نہ تمہارا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ خدا کا۔ اس لئے جس طرح ہم تحمل و بردباری کے ساتھ اسے برداشت کئے رہے ہیں اور ڈھیل پہ ڈھیل دیئے جا رہے ہیں تم بھی انہیں نظرانداز کرو۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى

اور تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے جاتے رہے تو وہ تکذیب اور

Marfat.com

مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ

ایذا پر صبر کرتے رہے یہاں تک کہ اُن کے پاس ہماری مدد پہنچتی رہی اور خدا کی باتوں کو کوئی بھی بدلنے والا

وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣٤﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ

نہیں۔ اور تم کو پیغمبروں (کے احوال) کی خبریں پہنچ چکی ہیں (تو تم بھی صبر سے کام لو)۔ اور اگر اُن کی رُوگردانی تم

اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ

پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالو یا آسمان

سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى

میں سیڑھی (تلاش کرو) پھر اُن کے پاس کوئی معجزہ لاؤ اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٣٥﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ

کر دیتا پس تم ہرگز نادانوں میں نہ ہونا۔ بات یہ ہے کہ (حق کو) قبول وہی کرتے ہیں جو سُنتے بھی ہیں۔

وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ

اور مُردوں کو تو خدا (قیامت ہی کو) اُٹھائے گا۔ پھر اُسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے وقف اور کہتے ہیں کہ اُن پر اُن کے پروردگار

عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ

کے پاس سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی۔ کہہ دو کہ خدا نشانی اُتارنے پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ

اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ

نہیں جانتے۔ اور زمین میں جو چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں سے اُڑنے والا

بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ

جانور ہے اُن کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں ہم نے کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں کسی چیز (کے لکھنے) میں

اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِی

کوتاہی نہیں کی پھر سب اپنے پروردگار کی طرف جمع کیے جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بہرے

Marfat.com

الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ

اور گونگے ہیں (اس کے علاوہ) اندھیرے میں پڑے ہوئے جس کو خدا چاہے گمراہ کردے۔ اور جسے چاہے

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ

سیدھے رستے پر چلادے (۳۹) کہو (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو تو کیا تم

اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ

(ایسی حالت میں) خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ اگر سچے ہو (تو بتاؤ) (۴۰) (نہیں) بلکہ (مصیبت کے وقت تم) اسی

فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع

کو پکارتے ہو تو جس دکھ کے لیے اسے پکارتے ہو۔ وہ اگر چاہتا ہے تو اس کو دور کر دیتا ہے اور جن کو تم شریک بناتے ہو

تمہید:

گزشتہ آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کو ایک خاص پہلو سے تسلی دی گئی تھی جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگلی آیت کریمہ میں یہی تسلی کا مضمون جاری ہے لیکن اس کا انداز دوسرا ہے اس میں ایک طرف تو کلام کے تیور بدل گئے ہیں اور لہجہ ذرا تیکھا ہو گیا ہے اور ساتھ ہی دعوت و اصلاح اور پیغمبر کی ذمہ داریوں کے حوالے سے چند اصول بیان فرمائے گئے ہیں۔ جن کی پابندی کرنے اور جن کو نگاہوں میں رکھنے کا آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے۔ جہاں تک ان آیات میں کلام کے تیور بدلنے کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان آیات میں خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ سے ہے، لیکن روئے سخن قریش کے ان ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کی طرف ہے جو کسی طرح بھی راہ راست اختیار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ البتہ وقتاً فوقتاً نئے سے نئے معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے اور بظاہر تاثر یہ دیتے تھے کہ اگر یہ نشانی اور یہ معجزہ ہمیں دکھا دیا جائے تو ہم ایمان لانے کو تیار ہیں اور اس کے ساتھ ہی رویہ ان کا یہ تھا کہ ان کی مخالفت میں روز بروز شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی اور اذیت رسانی کا عمل اپنی انتہا کو چھو رہا تھا، جس کا برداشت کرنا بعض دفعہ مسلمانوں کیلئے مشکل ہو رہا تھا اس سلسلے میں جو اصولی باتیں فرمائی گئی ہیں اور جن کی حیثیت سنت اللہ اور قانون خداوندی کی ہے۔ ان کا ذکر کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک اور بات کی وضاحت کردوں تاکہ اللہ کی اس سنت کو سمجھنے میں سہولت پیدا ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی قرآن کریم میں تسلی کے اس مضمون کی تکرار دیکھتا ہے کہ بار بار آنحضرت ﷺ کو مخالفین کی مخالفت پر تسلی دی جا رہی ہے اور آپ کا حوصلہ بڑھایا جا رہا ہے تو ذہن میں دو سوال ابھرتے ہیں۔

1- اللہ کے تمام رسول نہایت بلند ہمت اور بلند حوصلہ رہے ہیں، انہوں نے بگڑے ہوئے حالات کے طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے اور کبھی سراسیمہ نہیں ہوئے اور محمد رسول اللہ ﷺ تو سید الرسل اور خاتم الرسل ہیں آپ یقیناً ان تمام اولوالعزم رسولوں سے بڑھ کر صاحب عزیمت اور حوصلہ مند ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ بار بار آپ کو تسلی دینے کی ضرورت پیش آ گئی ہے؟

Marfat.com

2- قرآنِ کریم عربی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جس کی مثال لانا انسانی صلاحیت سے بالاتر بات ہے۔ لیکن جب ہم اس میں اس مضمون کا تکرار دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی بات بار بار کیوں کہی جا رہی ہے اس لئے کہ اعلیٰ پائے کی کتابوں میں کسی بھی بات کو دھرا کر کہنا ایک عیب سمجھا جاتا ہے۔ تو قرآن کریم تو ایسے ہر عیب سے پاک ہے تو پھر اس مضمون کے بار بار لائے جانے کا آخر کیا مطلب ہے؟

یہ دونوں سوال اصل میں قرآنِ کریم کی حیثیت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں ہم نے اس کتاب کو بھی باقی کتابوں جیسی ایک کتاب سمجھا ہے۔ دنیا بھر میں تمام شعبہ ہائے علم پر لکھی جانے والی تمام کتابوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ علم کے جس گوشے پر بحث کرتی ہیں' اس کی اساسی باتیں' اس کے ضمنی مباحث' اس سے پیدا ہونے والے نتائج کے بارے میں ضروری اصلاحات اور ہدایات کو ابواب اور فصول باندھ کر ایک ترتیب سے ذکر کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کو دھرایا نہیں جاتا اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جس آدمی کو جس شعبۂ علم سے استفادہ کرنا ہے وہ اس کی متعلقہ فصل نکال کر ان ضروری باتوں کو ایک دفعہ دیکھ لے گا اور ان سے فائدہ اٹھا لے گا۔ اس لئے کسی بھی بات پر بحث کرتے ہوئے کسی ایک بات کو تکرار کے ساتھ ذکر کرنا ایسی کتابوں کیلئے باعث عیب سمجھا جاتا ہے' لیکن جب ہم قرآنِ کریم کو بھی اسی طرح ایک خالصتاً علمی کتاب سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اس میں کسی ایک بات کے تذکرے کو کسی ایک ہی جگہ کافی نہ سمجھ کر بار بار ذکر کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب کے قاری پر یا تو عدم اعتماد کیا جا رہا ہے اور یا لکھنے والا لکھنے کا سلیقہ نہیں جانتا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم اللہ کی وہ واحد کتاب ہے کہ جس کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے اور دنیا کی کوئی کتاب اس لحاظ سے اس کی نقل کرنے سے عاجز ہے کیونکہ یہ کتاب صرف تھیورائیکل بک نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ایک ایسی گائیڈ بک اور راہنما کتاب ہے جو اپنے پیغمبر کے ساتھ نازل ہوتی اور چلتی ہے۔ اس کی دعوت جن حالات سے گزرتی ہے اور خود اسے اور اس کے ساتھیوں کو جن جن مراحل سے جیسے جیسے گزرنا پڑتا ہے یہ کتاب برابر ان کو ہدایات دیتی ہے اور ان کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دیتی ہے خدشات کو اطمینان سے بدلتی ہے اور اشتعال اور ہراس کی صورت میں کبھی شہد کی طرح مٹھاس بن کر اور کبھی شبنم کی طرح ٹھنڈک بن کر ان کے حوصلے کا سامان کرتی ہے۔ ذرا تصور کیجئے کہ اگر یہ حکم ایک دفعہ دے دیا جاتا کہ لوگو! دین کی راہ میں تمہیں مشکلات پیش آئیں گی' تمہیں ان پر صبر کرنا ہے اور اس کے بعد مسلسل تیرہ سال مکی زندگی میں اور کئی سال تک مدنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور صحابہ کرام مسلسل اس کٹھالی میں ڈال کر بے پناہ مصائب سے آزمائے جاتے تو کیا یہ ایک جملے پر مشتمل تسلی اس پورے سفر میں کافی ہو سکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ جب مکے کی سڑکوں پر گزرتے ہوئے دیکھتے کہ حضرت خباب ؓ کو دھونکنی دی جا رہی ہے اور کبھی انہیں دہکتے انگاروں کی سیج پر لٹایا جا رہا ہے اور کبھی حضرت بلال ؓ کو دیکھتے کہ ان کا بدبخت آقا آگ کی طرح تپتی ہوئی ریت پر انہیں گھسیٹ رہا ہے اور کبھی ان کے گلے میں رسی ڈال کر اوباشوں کے سپرد کر رہا ہے کہ انہیں پورے مکے میں گھسیٹتے پھرو۔ ایسے ایک ایک واقعہ پر تکلیف اٹھانے والوں کا جو حشر ہوتا تھا اور خود حضور کا دل جیسے خون ہو ہو جاتا تھا اور جسم و جان کی صلاحیتیں دم توڑنے لگتی تھیں اور آئے دن کی اذیتیں حوصلوں کو شکستہ کرنے لگتی تھیں تو کیا ضرورت نہیں تھی کہ آسمان سے بار بار تسلی اور اطمینان کی شبنم برسے' بار بار جبرائیل آئیں اور حوصلہ دیں اور بار بار اللہ تعالیٰ ظالموں کو وعید سنائیں اور ان مظلوموں کو انعامات کی نوید دیں۔ اگر اس پر غور کیا جائے تو یقیناً آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کوئی بھی تحریک جو جان و تن کے جانگسل مراحل سے گزرتی ہے اس کیلئے سب سے بڑی قوت کا سامان یہ حوصلہ دینے کا عمل ہی ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے ایک آدمی حوصلہ پاتا اور آخری دم تک لڑنے کیلئے تیار رہتا ہے۔ یہ وہ سبب ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم بار بار آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی دیتا ہے۔ چنانچہ پیش نظر آیت کریمہ میں یہی تسلی کا مضمون ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ نے اپنی سنت کو بھی بیان کر دیا ہے تا کہ امت مسلمہ اچھی طرح اس بات کو سمجھ لے۔ ارشاد ہوتا ہے

Marfat.com

آیت:۳۴ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ○ ''اور تم سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا تو انہوں نے جھٹلائے جانے اور ایذا دیئے جانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی' اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور پیغمبروں کی کچھ سرگزشتیں تو تمہیں پہلے ہی پہنچ چکی ہیں''۔

تبلیغِ دین میں صبر اور استقامت ضروری ہے:

اس آیت کریمہ میں چند باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

1- آپ کی امت دعوت جس طرح آپ کی تکذیب کر رہی ہے اور آپ کو ایذا پہنچا رہی ہے۔ یہ دنیا کا پہلا واقعہ نہیں آپ سے پہلے جتنے رسول آئے ہیں ان میں سے ہر رسول کے ساتھ یہی کچھ پیش آیا ہے۔ وہ اپنے اللہ کی طرف سے جو ہدایت لے کر آئے ان کی امتوں نے نہ صرف قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ ان کو رسول ماننے سے بھی انکار کر دیا اور بار بار یہ کہا کہ نہ تم اللہ کے رسول ہو اور نہ وہ دعوت جو تم ہمارے سامنے پیش کرتے ہو ہم اسے قبول کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اور رسولوں نے جب انتہائی خیر خواہی کے ساتھ بار بار اس دعوت کو پیش کیا تو ان کی یہ عدم قبولیت ضد کی شکل اختیار کر گئی اور اس پر چڑ کر اور برہم ہو کر انہوں نے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ بعض انبیاء اس سلسلے میں قتل کر دیئے گئے اور کتنے رسول ہیں جن کو زندگی بچانے کیلئے اللہ کے حکم سے ہجرت کرنا پڑی۔ ہر رسول کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بے سہارا نہیں چھوڑیں گے' جب ہماری بے بسی اور مصیبت انتہاء کو پہنچے گی تو یقیناً اس کی نصرت نازل ہو کر ہمیں سہارا دے گی۔ لیکن قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اس یقین کے باوجود مخالفتیں اور اذیتیں اس حد تک پہنچ گئیں کہ بار بار ان کا پیمانہ صبر لبریز ہوتا رہا' چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو یہ بتایا گیا کہ ابھی آپ اور آپ کے ساتھیوں پر تو وہ وقت نہیں آیا' جو پہلے رسولوں اور ان کی امتوں پر گزر چکا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ

''کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ تم پر ابھی وہ وقت نہیں آیا جو تم سے پہلی امتوں پر گزر چکا انہیں جسمانی اور مالی مصیبتیں پہنچیں اور وہ مصائب سے جھنجھوڑ ڈالے گئے یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی پکار اٹھے کب آئے گی اللہ کی مدد''۔

آنحضرت ﷺ کے بعض صحابہ بھی بعض دفعہ ایسے ہی احساس سے مغلوب ہوئے تو آنحضرت ﷺ کو تسلی دینا پڑی۔ حضرت خباب ؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مشرکین نے مجھے بے حد اذیتیں پہنچائیں جب میرے لئے ان کا برداشت کرنا بے حد مشکل ہو گیا تو میں آنحضرت ﷺ کی تلاش کیلئے نکلا' میں نے دیکھا کہ آپ کعبۃ اللہ کے سائے میں بیٹھے تھے۔ میں حضور کے پاس پہنچتے ہی بے ساختہ رو پڑا اور عرض کی کہ حضور اب یہ مصیبتیں برداشت نہیں ہوتیں' ظالموں نے دکھ پہنچانے میں انتہا کر دی' آپ ان کیلئے اللہ سے بددعا کیوں نہیں فرماتے؟ کہ اللہ ان پر اپنا عذاب نازل فرمائے۔ حضرت خباب کہتے ہیں کہ یہ سنتے ہی آنحضرت ﷺ کا چہرہ مبارک غصہ سے تمتمانے لگا اور مجھ سے فرمایا کہ خباب تم سے پہلی امتوں پر ایسا وقت گزر چکا ہے کہ لوہے کی کنگھیوں سے زندہ حالت میں ان کا گوشت نوچ ڈالا گیا' کتنے لوگ تھے جن کو دیواروں میں چن دیا گیا لیکن انہوں نے اپنے اللہ سے شکایت نہیں کی۔ آخر

Marfat.com

اللہ کی نصرت آن پہنچی۔ مزید فرمایا کہ خباب تم جلدی کر رہے ہو' وہ وقت دور نہیں' جب اللہ تعالیٰ اس دین کو غلبہ عطا فرمائے گا اور اس کی برکت سے حالات اس حد تک تبدیل ہوں گے کہ آج جبکہ تمہیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ کل کو تمہیں روٹی کھانے کو بھی ملے گی یا نہیں' اُس وقت تم زکوٰۃ کا مال جھولیوں میں ڈال کر زکوٰۃ لینے والوں کو تلاش کرو گے اور تمہیں زکوٰۃ لینے والے نہیں ملیں گے۔ مختصر یہ کہ آنحضرت ﷺ سے یہ فرمایا جارہا ہے کہ آپ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اہل دنیا نے ہمیشہ اللہ کے رسولوں اور حق کے علمبرداروں کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔

2- دوسری بات یہ فرمائی کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس صورت حال سے دل برداشتہ ہونے کی بجائے یا بار بار مشرکین کے کہنے پر اللہ سے ان کے منہ مانگے معجزات طلب کرنے کی بجائے اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے اور ان کے مصائب پر صبر کرنا چاہئے اور یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ صبر کا معنی بے بسی کی تصویر بن جانا نہیں بلکہ صبر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ہمت اور حوصلے سے حالات کا مقابلہ کریں' اس راستے کی تکلیفوں کو برداشت کریں اور ہر ممکن طریقے سے دعوت الی اللہ کے کام کو جاری رکھیں۔ مصائب کی وجہ سے حوصلہ ہار کر کام کو روک دینا اور دعوت الی اللہ کو ملتوی کر دینا یا دینی ذمہ داریوں کو معطل کر دینا' اس کی تو کبھی بھی اجازت نہیں البتہ! اس بات کی گنجائش ضرور ہے کہ آپ حالات کو دیکھتے ہوئے دعوت الی اللہ کے طریقے کو بدلیں حالات کے تیوروں کو پہچانتے ہوئے حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کریں۔

جس طرح پانی کا سفر اور اس کی روانی کا عمل کبھی نہیں رکتا' اگر درمیان میں کوئی چٹان حائل ہو جائے تو بجائے اس سے سر پٹخنے کے' پانی دائیں بائیں سے اپنا راستہ نکال لیتا ہے۔ اسی طرح دعوت الی اللہ کے کام کرنے والوں کو یہ بتایا جارہا ہے کہ تمہیں بھی اگر ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرنا پڑے تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانے کا کوئی سوال نہیں' البتہ اپنے طریقے اور حکمت عملی میں تبدیلی کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہی صبر کا مفہوم ہے اور آنحضرت ﷺ کو اسی بات کا حکم دیا جارہا ہے۔

3- تیسری بات یہ فرمائی جارہی ہے کہ تمہیں اپنا کام کرنا ہے' جس کی ذمہ داری تم پر ڈالی گئی ہے' اس سے رک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چاہے حالات کیسے بھی منہ زور کیوں نہ ہوں اور مخالفین کو اپنا کام کرنا ہے ان کا کام ہے کہ آپ کا راستہ روکنے کیلئے ہر طرح کے موانع پیدا کریں' بدگمانیاں پھیلائیں' تہمتیں دھریں' سراسیمہ کرنے کیلئے جسمانی اذیتیں پہنچائیں' وہ جو کچھ بھی کریں انہیں کرنا چاہئے کیونکہ مخالفین کی سنت یہی ہے لیکن آپ اس کے مقابلے میں اپنی دعوت کے عمل کو جاری رکھیں' ان دونوں طریقوں کے پہلو بہ پہلو چلنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اس کٹھالی سے کندن بن کر نکلیں گے۔ مسلسل صبر سے آپ کے اندر اللہ پر بے پناہ اعتماد' اپنے مقصد سے بے پناہ لگاؤ' مشکل حالات میں زندگی گزارنے کا ہنر' جذبات پر قابو پالینے کا طریقہ اللہ کے سامنے رات کی تاریکی اور تنہائی میں تضرع اور عاجزی کا اظہار اور اللہ سے بے پناہ تعلق کے نتیجے میں گناہ سے بچنے کی صلاحیت اور خیر کی طرف لپکنے کا جذبہ ایسی صفات پیدا ہوں گی اور اس کے نتیجے میں جو خوبصورت سیرت و کردار وجود میں آئے گا دشمن اس کا دیر تک مقابلہ نہیں کر سکے گا اور دوسری طرف مخالفین اپنے طرز عمل کے نتیجے میں بعض رزائل کا شکار ہوں گے۔ ان کے اندر سنگدلی پیدا ہوگی' حق سے نفور اور بڑھے گا' دین بیزاری کا جذبہ گہرا ہو جائے گا' دنیا کی محبت ان کو اور اپنا گرویدہ بنالے گی۔ یہ تو ان لوگوں کا حال ہوگا جو مخالفین کے سرغنہ ہوں گے۔ البتہ انہی میں اس کشمکش کے نتیجے میں ایسے بھی نکلیں گے جو مسلمانوں کے صبر' پامردی اور ان کے خوبصورت سیرت و کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس طرح سے یہ قافلہ خود بخود مضبوط ہوتا جائے گا ورنہ اس کشمکش کا یہ نتیجہ تو بہر صورت نکل کر رہے گا کہ اللہ کی مدد آئے گی' اس کی دو صورتیں ممکن ہیں' ایک تو یہ کہ اللہ دین کو غلبہ دے گا اور مسلمانوں کی جماعت کو غالب کر دے گا۔ جیسے بالآخر اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو سرزمین عرب میں غلبہ دیا اور یا پھر یہ ہوگا کہ اللہ کا عذاب آجائے گا

Marfat.com

اللہ کے رسول اور اس کے ساتھیوں کو وہاں سے نکال لیا جائے گا اور کافر تباہ کر دیئے جائیں گے۔

یہ ہے وہ اللہ کی سنت جس کا یہاں ذکر فرمانے کے بعد فرمایا: کہ اللہ کے کلمات کو بدلنے والا کوئی نہیں یعنی دعوت الی اللہ کی کشمکش میں یہ وہ ناگزیر راستے ہیں جن سے رسولوں کو بھی گزرنا پڑتا ہے اور ان پر ایمان لانے والوں کو بھی۔ اگر ان طریقوں کو کسی کیلئے بدلنا ہوتا تو یقیناً رسول اللہ ﷺ کیلئے بدلا جاتا کیونکہ آپ سید الرسل اور اس کائنات کے گلِ سر سبد ہیں لیکن آپ ہی سے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی یہ سنت کبھی نہیں بدلتی اور پھر مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ پہلے رسولوں کی سرگزشتیں تو آپ کے پاس آ چکیں۔ ان میں سے ایک ایک سرگزشت آپ کو یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ دین کی دعوت دینے والوں کے ساتھ کیا گزرتی ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کامیاب و کامران فرماتا ہے اور کافروں کو تباہ کر دیتا ہے۔ کتنی قومیں ہیں۔ جن کے کھنڈرات سے مشرکینِ مکہ ہمیشہ گزرتے تھے انہیں ان کی طرف اشارہ کر کے بتایا جا رہا ہے کہ ان معذب قوموں کے انجام پر غور کرو کہ یہ کیسی عظیم قومیں تھیں لیکن جب انہوں نے رسولوں کی دعوت ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے کفر پر قائم رہنے پر اصرار کیا تو بالآخر ان کا انجام کیا ہوا۔ قوم ثمود کو دیکھو قوم عاد کو دیکھو اہل مدین کو دیکھو قوم لوط کو دیکھو ان میں سے ایک ایک کا انجام عبرت حاصل کرنے کیلئے کافی ہے اس لئے تم ان سے عبرت حاصل کرو۔

اگلی آیت کریمہ میں اسی سنت اللہ کے دوسرے پہلو کو بیان فرمایا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کی طبیعت کے خاص انداز کو بھی نمایاں کیا جا رہا ہے اور اس پر ہدایات دی جا رہی ہیں۔ ارشاد ہے:

آیت: ۳۵ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ O ”اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکو کہ ان کے پاس کوئی نشانی لا دو تو کر دو اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو“۔

کفار کے ایمان نہ لانے پر پریشان نہ ہوں:

اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلی بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر عتاب فرمایا جا رہا ہے' لیکن میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں کہ بظاہر اس عتاب کے مخاطب تو حضور ہیں لیکن اصل روئے سخن ان بڑے بڑے کافروں کی طرف ہے جو ضد اور ہٹ دھرمی میں اسلام کی طرف آنے کیلئے بالکل تیار نہیں تھے۔ کافر چونکہ اللہ کے خطاب کا مستحق نہیں ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر سے اس طرح خطاب فرماتے ہیں کہ جو بات کافروں کے کہنے کی ہوتی ہے' ان کو سنا دی جاتی ہے' لیکن ان سے براہِ راست نہیں کہی جاتی۔ لیکن اس عتاب کا جو سبب ہے' اس کو پیش نظر رکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک محبت آمیز عتاب ہے۔ کیونکہ اس کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت اور آپ کے مزاج میں انسانی ہمدردی اور خیر خواہی کوٹ کوٹ بھری ہوئی تھی' آپ دن بھر جن ظالموں کے ظلم کا شکار ہوتے تھے۔ رات کو انہی کی ہدایت کیلئے دعائیں مانگتے تھے۔ آپ کی یہ شدید خواہش ہوتی کہ کسی طرح کافر اسلام کی طرف آ جائیں تاکہ جہنم میں جانے سے بچ جائیں' اللہ کے رسول کو چونکہ کافر کے انجام کے بارے میں اس طرح کا یقین ہوتا ہے گویا کہ اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس لئے وہ بے تاب ہو کر ان کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ اس پر نئی نئی نشانیاں دکھانے کا مطالبہ کرتے ہیں' تو اس کے رسول کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اگر یہ مطلوبہ نشانیاں ان کو دکھا دی جائیں تو ممکن ہے یہ لوگ راہ راست اختیار کر لیں اور ایمان

Marfat.com

آئیں۔ چنانچہ اسی بے ساختہ خواہش کے حوالے سے آنحضرت پر یہ محبت آمیز عتاب فرمایا جارہا ہے کہ ہر ممکن طریقے سے زبردستی ان کو ایمان دینا اللہ کی سنت اور اس کی مشیت کے تو خلاف ہے لیکن آپ اس کیلئے بہت ہی خواہش مند ہیں تو پھر اپنی سی کوشش کر دیکھئے۔ زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو' جو تمہارے خیال میں اس بے یقینی کے جمود کو توڑ سکے اور ان کافروں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکے۔ اس طرح سے کافروں کو یہ بات سنائی جارہی ہے کہ تم بار بار حضور سے جو مطالبات کر رہے ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں حضور تمہارے ہادی بن کر آئے ہیں ان سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرو نہیں کرو گے تو اپنا ہی انجام بگاڑو گے۔

اس کے بعد پروردگار اپنی سنت کو بیان فرمارہے ہیں کہ ہمارا یہ قانون نہیں ہے کہ ہم کسی کو زبردستی ایمان پر مجبور کریں اور ان کو ایسی ایسی نشانیاں دکھائیں کہ وہ مجبور ہو کر اسلام قبول کرلیں۔ اگر اللہ کو یہ منظور ہوتا تو یہ سارا کام تو اس کے ایک تخلیقی اشارے سے ممکن تھا۔ پھر اسے پیغمبر بھیجنے اور کتابیں اتارنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہر بچہ پیدا ہوتے ہی کلمہ پڑھنے لگتا اور بڑا ہو کر شریعت کے احکام اس کی فطرت کی آواز بن جائے وہ زندگی بھر خود بخود اس پر چلتا رہتا۔ اس نے انسانی اصلاح کیلئے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ زبردستی کا طریقہ نہیں اور نہ حیرت انگیز نشانیاں دکھا کر قلب و دماغ کو معطل کرنے کا طریقہ ہے بلکہ اس نے جو طریقہ پسند کیا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے کان' آنکھ اور عقل وادراک کو استعمال کریں۔ آفاق وانفس کے دلائل پر غور کریں' اللہ کے رسول کی باتیں سنیں' ان پر غور وفکر کے بعد اپنے اختیار وارادہ سے ایمان کی راہ اختیار کریں۔ کیونکہ انسان کو اللہ نے عقل وادراک اور اختیار وارادہ کی جس قوت سے بہرہ ور فرمایا ہے ایمان اصل میں اسی کی آزمائش ہے اور اس کیلئے اللہ کے نبیوں نے استدلال کی قوت سے کام لیا ہے۔ بعض دفعہ ان کے ہاتھ سے معجزات کا جو ظہور ہوتا ہے' وہ صرف یہ بتانے کیلئے ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے نبی ہیں۔ انسانی ہدایت کا دارومدار ان معجزات پر نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کی استدلالی قوت' ان کی مضبوط شخصیت' ان کے دل موہ لینے والے اخلاق' اور ان پر ایمان لانے والوں میں روز بروز خیر کی طلب اور خوبصورت سیرت و کردار پر ہوتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو دعوت الی اللہ کا اصل سرمایہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے یہ فرمایا جارہا ہے کہ آپ اسی فطری طریق پر کام جاری رکھیں۔ جو انبیاء اور رسولوں کا ہمیشہ طریقہ رہا ہے۔ رہے ان کے مطلوبہ معجزات تو آپ ان چیزوں کو اپنی طبیعت پر غالب نہ آنے دیں اور یہ نہ سمجھیں کہ اگر یہ ان کے مطالبات پورے کر دیئے جائیں تو شاید وہ ایمان لے آئیں۔ یہ چیز اللہ کی سنت کے موافق نہیں۔ اس لئے آپ اللہ کی سنت کے مطابق اپنے کام کو جاری رکھیں یعنی آپ ان کے ایمان کی آرزو میں جذبات سے اتنے مغلوب نہ ہو جائیں کہ اللہ کی حکمت اور سنت نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ اسی کے بارے میں فرمایا:

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ''کہ آپ جاہلوں میں سے مت بنیں''۔

یہاں جاہل کے لفظ کو سمجھ لینا چاہئے تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو بات یہ ہے کہ عربی میں جہل کا لفظ علم اور حلم دونوں کی ضد کی حیثیت سے آتا ہے بلکہ اس کا غالب استعمال 'حلم' کے ضد کی حیثیت ہی سے ہے۔ اسی وجہ سے اس کے معنی ہوتے ہیں جذبات سے مغلوب ہو جانا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی طہارت فطرت کے سبب سے جذباتِ نفس اور خواہشاتِ نفس سے تو کبھی مغلوب نہیں ہوتے لیکن جذبات خیر میں سے کسی جذبہ کا غلبہ ان پر بھی کبھی کبھی اتنا ہو جاتا ہے جو حدِ مطلوب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بجائے خود نہایت اعلیٰ بات ہے لیکن حضرت انبیاء چونکہ معیار اور کسوٹی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس پہلو میں بھی ان کو حد مطلوب سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ نبی کے اندر اس بات کی شدید آرزو ہوتی ہے کہ اس کی قوم ایمان لائے تاکہ وہ عذاب الٰہی سے بچ جائے۔ یہ جذبہ نبی کی رافت ورحمت کی دلیل اور اس کی غیرتِ حق کی شہادت ہے۔ لیکن یہ جذبہ بھی مطلوب

Marfat.com

اسی حد تک ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ کی اس سنت سے ہم آہنگ ہے۔ جو لوگوں کے کفر و ایمان کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کی طرف آیت ۳۴ میں اشارہ گزرا ہے۔ اگر اس حد سے اس کے آگے بڑھنے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اس سے روک دیتا ہے۔

چنانچہ یہاں بھی آنحضرت ﷺ کو غیرت حق اور انسانوں کے ایمان لانے کے حوالے سے انتہا درجے کی خیر خواہی کے جذبے سے مغلوب ہونے سے روکا ہے کہ یہ جذبہ اپنے تئیں کتنا بھی محمود کیوں نہ ہو اللہ کی اس سنت کے موافق نہیں جو اس نے انسانی ہدایت کیلئے مقرر فرمائی ہے۔ اس لئے آپ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ بجائے اس جذبہ خیر خواہی سے مغلوب ہونے کے اللہ کی سنت کے مطابق اپنے کام کو جاری رکھیئے اور اس کے نتائج کو خدا پر چھوڑ دیئے اور یہ نہ خیال کیجئے کہ اگر ان کو بڑی بڑی نشانیاں نہ دکھائی گئیں تو یہ ایمان نہیں لائیں گے جنہیں ایمان لانا ہوتا ہے انہیں بڑی نشانیاں دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کیلئے چند بنیادی صفات کا پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے جس کا آغاز اس صفت سے ہوتا ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت ۳۶: اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ "بات تو وہی مانیں گے جو سنتے سمجھتے ہیں۔ رہے یہ مردے تو اللہ ان کو اٹھائے گا' پھر یہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے"۔

قبولِ حق کے لئے سننے اور سمجھنے کی صلاحیت ضروری ہے:

یعنی ایمان لانے کیلئے اور اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے کیلئے سب سے پہلی صفت جو درکار ہے وہ یہ ہے کہ جس کو دعوت دی جائے وہ اسے غور سے سنے اور سمجھے (اس آیت کریمہ میں یَسْمَعُوْنَ اپنے مکمل معنی میں ہے یعنی جو سنیں بھی اور سمجھیں بھی) جو مخاطب سرے سے سنتا ہی نہیں یا سنتا ہے لیکن سمجھتا نہیں تو اس کیلئے حق کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کریم نے ایک سے زیادہ جگہوں پر ایسے کافروں کیلئے جو حق کے ساتھ متذکرہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے کہ ان لوگوں کی آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں' ان کے دل ہیں' لیکن سمجھتے نہیں' ان کے کان ہیں لیکن سنتے نہیں' یہ ڈنگروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ کیونکہ حیوانات میں سے بھی اکثر حیوانات اپنے مالک کی بات سنتے ہیں اور اس کے مطابق چلنے کی کوشش کرتے ہیں' اگرچہ بہیمیت کے وصف کے باعث سرکشی ان میں غالب ہوتی ہے لیکن پھر بھی فی الجملہ وہ مالک کی اطاعت کرتے ہیں لیکن جو شخص انسان ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے حقیقت نہیں دیکھتا اور کانوں سے سن کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اور سمجھنے کے باوجود دل کو قبولیت کیلئے کھلنے نہیں دیتا۔ وہ یقیناً حیوانات سے بھی گیا گزرا ہے۔ تو جو لوگ حیوانات سے بھی گزر جائیں ان کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ نشانیاں اور معجزات دیکھ کر ایمان لے آئیں گے یہ بہت بڑی خوش فہمی ہے یا ان کے ساتھ خیر خواہی کے جذبے سے مغلوب ہو جانے والی بات ہے یہاں یہی بات فرمائی جا رہی ہے کہ آپ اس جذبے سے مغلوب نہ ہوں کیونکہ یہ لوگ چونکہ آپ کی بات کو نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں اس لئے ان سے کسی طرح بھی حق کی قبولیت کی امید رکھنا عبث ہے۔ یہ تو فی الحقیقت مردہ ہیں۔ جن کے بظاہر جسم بڑے تنومند' شخصیتیں بڑی دلکش' باتوں کے بہت تیز' دنیوی معاملات میں بڑے معاملہ فہم' لیکن حق اور سچ کے حوالے سے اور اساسی حقائق کی قبولیت کے اعتبار سے یہ مردہ ہیں۔ جن کے دل و دماغ کی ساری صلاحیتیں بالکل مفلوج ہو چکی ہیں۔ اس لئے ان سے کسی قسم کی توقع رکھنا تو ایسے ہی ہے جیسے کسی مردے سے زندگی کی توقع رکھی جائے کیونکہ زندگی جسم کی حرکت کا نام نہیں بلکہ دل کی بیداری کا نام ہے اور جب دل مر جاتا ہے تو پھر آدمی بظاہر زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہوتا اس لئے اقبال نے کہا

Marfat.com

اے دل زندہ کہیں تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اور ہمیں اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس نے توجہ دلائی کہ

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا جارہا ہے کہ یہاں اب ان کے راہ راست پر آنے کی کوئی امید نہیں۔ اس لئے کہ اپنی حقیقی زندگی سے یہ لوگ محروم ہوچکے ہیں۔ اس لئے ان مردہ لوگوں کے بارے میں آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ اب تو ان مردوں کو اللہ قیامت کے دن ہی اٹھائے گا اور پھر یہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ یعنی ان کو یہ بات تو بھول چکی کہ اسی نے ان کو زندگی عطا کی ہے اور اسی نے ان کو دنیا میں ایک خاص مقصد کیلئے بھیجا ہے اب جب کہ ان کو اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا تو تب ان کو اندازہ ہوگا کہ انہوں نے کیسی کیسی مجرمانہ خیانتیں کی ہیں' کس طرح یہ ناشکری کا ارتکاب کرتے رہے ہیں اور حق کے مقابلے میں معاندانہ روش اختیار کر کے انہوں نے کس طرح اپنی قسمت پھوڑی ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں ان شامت زدوں اور عقل کے دشمنوں کی ایک اور بات کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو ان کی بے بصیرتی کا شاہکار ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۳۷ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ ''اور یہ کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی نشانی اتار دے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کریمہ میں انہوں نے جس نشانی کا مطالبہ کیا وہ کوئی عام معجزہ نہیں بلکہ اس نشانی سے مراد یہ ہے کہ تم جو ہمیں ہمیشہ ڈراتے رہتے ہو کہ اگر تم ایمان نہ لائے اور تم نے میری دعوت قبول نہ کی تو اندیشہ ہے کہ تم پر خدا کا عذاب آجائے' اور پھر تم باقی قوموں کے حوالے دے دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو کہ باقی قومیں بھی اسی طرح تباہ ہوئیں' اگر واقعی تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو بہتر ہے کہ عذاب میں سے کچھ حصہ تم ہم پر اتار دو' تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ تم واقعی اپنے دعوے میں صحیح ہو اور عجیب بات یہ ہے کہ مشرکین مکہ میں سے بڑے بڑے کافر نہ صرف اس عذاب کا مذاق اڑاتے بلکہ بار بار اس کا مطالبہ کرتے اور کئی دفعہ تو براہ راست اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہتے کہ محمد اگر تیرے واقعی پیغمبر ہیں اور یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے تو اس کی پاداش میں ہم پر پتھروں کی بارش برسا' یا ہم پر کوئی اور عذاب الیم لا۔ ایسے ہی لوگوں کے جواب میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ ان لوگوں نے عذاب کو بھی کھیل سمجھ لیا ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ اگر عذاب آگیا تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہ ان کی بے بصیرتی اور کوتاہ فہمی ہے کہ ایک بہت بڑے خطرے کو آواز دے رہے ہیں اور غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا کمزور حکمران ہے کہ وہ ان پر عذاب نازل کرنے پر قادر نہیں۔ جس طرح کسی بھی کمزور سلطنت میں خودسر اور بدمعاش قسم کے لوگ سلطنت کو چیلنج کرنے لگتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہمارا کمزور حکمران ہماری گرفت نہیں کرسکتا۔ ان کا شاید اللہ کے بارے میں یہی گمان تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ان کو ڈھیل دینا اور پکڑنے میں جلدی نہ کرنا اس کا سبب ہی یہ ہے کہ وہ قادر مطلق ہے' وہ جب کسی کو پکڑنا چاہتا ہے اسے کوئی مشکل پیش نہیں آتی' وہ کمزور حکمرانوں کی طرح جرائم پیشہ لوگوں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔ مزید فرمایا کہ ان میں سے

Marfat.com

اکثر لوگ جانتے نہیں کہ عذاب نہ آنے کی حکمتیں کیا ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ ابھی تک عذاب سے بچے ہوئے ہیں اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں لاتا جب تک اس پر آخری حد تک اتمام حجت نہیں کر لیتا اور یہ بات پوری طرح کھل نہیں جاتی کہ ان میں کوئی ایسا صالح عنصر باقی نہیں رہا جس سے بھلائی کی امید کی جا سکے اور یہ قوم پوری طرح نیکی اور خیر کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اہل مکہ کے بارے میں ابھی تک چونکہ یہ وقت نہیں آیا اور دعوت اپنے آخری مراحل کو نہیں پہنچی اس لئے یہ لوگ اللہ کے عذاب سے بچے ہوئے ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھائیں' غلط فہمی میں مبتلا ہو کر مزید دلیر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان نادانوں کو یہ خیال بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ان کو نہ پکڑنا ان کے تمام تر کفر اور طغیان کے باوجود اللہ کی رحمت کا ظہور ہے۔ یہ بھی اس کا قانون ہے کہ بجائے غضب ناک ہونے کے عموماً انسانوں کے ساتھ وہ رحمت کا معاملہ کرتا ہے وہ غضب ناک ہوتا تو انکار کے پہلے ہی مرحلے میں تمام منکروں اور کافروں کو جلا کر راکھ کر دیتا لیکن اپنے پیغمبر اور ان کے ایمان لانے والوں کو اذیتوں میں مبتلا دیکھ کر بھی انہیں مہلت پہ مہلت دیئے جا رہا ہے کہ شاید یہ اس سے فائدہ اٹھا کر سنبھل جائیں اور اللہ کی رحمت کاملہ کے مستحق بن جائیں۔ رہی یہ بات کہ اللہ کی دی ہوئی یہ مہلت کب ختم ہوتی ہے اور کب اس کی آخری حد آتی ہے' یوں تو اس کا علم سراسر اللہ کو ہوتا ہے' لیکن اس کی آخری علامت یہ ہے کہ جب اللہ اپنے رسول کو ہجرت کرنے کا حکم دیتا ہے اور وہ اپنے دعوت کے مرکز کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف کا رخ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مہلت کی آخری حد آ گئی' اس کے بعد اللہ تعالیٰ کافروں کو زیادہ دیر دنیا میں زندہ رہنے کا موقع نہیں دیتا' اگر ان کی ایک بڑی تعداد سنبھلنے میں جلدی کرے تو باقی لوگ بچ جاتے ہیں ورنہ سب عذاب کا شکار ہوتے ہیں۔ اللہ کا رسول لوگوں میں اس طرح ہوتا ہے جیسے جسم میں روح' روح نکل جائے تو جسم مر جاتا ہے۔ پھر اس کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہوتا اسی طرح اللہ کے رسول کے ہجرت کر جانے کے بعد وہ امت چونکہ مردہ ہو جاتی ہے اس لئے اس کو ختم کر دیا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ سے خطاب کر کے سورۃ انفال میں کہا گیا ہے کہ اے پیغمبر جب تک آپ ان میں موجود ہیں' اس وقت تک ہم ان کو عذاب دینے والے نہیں اسی طرح جب تک آپ کے ساتھی ان میں اللہ کے سامنے استغفار کرنے کیلئے موجود ہیں اور وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اس وقت تک بھی اللہ ان پر عذاب نہیں بھیجے گا۔ اندازہ فرمائیے کہ قوم جن سے دشمنی کرتی ہے اور جنہیں اذیتیں دیتی ہے وہی اصل میں ان کیلئے روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے ان کی زندگی کا رشتہ قائم ہے بلکہ انہی کی وجہ سے ان کو رزق ملتا ہے۔ آج بھی اگر یہ امت کسی بڑے عذاب سے بچی ہوئی ہے تو اس کا سبب وہ اللہ والے اور وہ دین کی دعوت پیش کرنے والے اور وہ دین کے پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے والے ہیں' جو تکلیفیں اور دکھ اٹھا کر بھی اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ قوم بدنصیبی سے انہیں ذلیل کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتی وہ بدنصیب امتوں کی طرح ان کو اپنا دشمن خیال کرتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہی ان کی زندگی' ان کی سرفرازی اور ان کی بقا کے ضامن ہوتے ہیں۔ سچ کہا کسی نے

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

بلاشبہ کسی بات کو سمجھنے کیلئے بعض دفعہ نشانیوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور اللہ کے نبیوں کی سچائی کی دلیل بالعموم امتیں معجزات کو ہی سمجھتی رہی ہیں۔ اس لئے معجزات کا طلب کرنا بھی چنداں قابل اعتراض نہیں۔ لیکن منہ مانگی نشانیوں پر اصرار کرنا یا عذاب کو دعوت دینا' یہ ایک ایسی بگڑی ہوئی ذہنیت کا اظہار ہے جس کے بعد قبولیت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور ہدایت سے محرومی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک سلیم الفطرت لوگوں کا تعلق ہے ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ایک ایک مخلوق کو بجائے خود اپنی ذات کی نشانی بنایا ہے۔ اس لئے نصیحت حاصل کرنے والے کیلئے یہاں

Marfat.com

نشانیوں کی کوئی کمی نہیں اسی سلسلے میں ارشاد فرمایا جارہا ہے۔

آیت:۳۸ وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ ؕ مَا فَرَّطۡنَا فِى الۡكِتٰبِ مِنۡ شَىۡءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمۡ يُحۡشَرُوۡنَ ○ ''اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر چلتا ہو اور کوئی پرندہ نہیں جو فضا میں اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتا ہو مگر یہ سب تمہاری ہی طرح امتیں ہیں۔ اور ہم نے اپنی کتاب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے پروردگار کے حضور اکٹھے کیے جائیں گے''۔

عقل والوں کیلئے نشانیاں:

اس آیت کریمہ میں بظاہر صرف جانوروں اور پرندوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ کہہ کر معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کی نشانیوں کی طرف اشارہ ہے اور توجہ دلائی گئی ہے کہ تم ایک نشانی مانگتے ہو یہ آفاق تو نشانیوں سے بھرپور ہیں۔ صرف دیکھنے والی نگاہ چاہئے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی چپہ ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی نشانی دیکھنے والی نگاہ کیلئے موجود نہ ہو' ہر جگہ دل کو کھینچنے' آنکھوں کو بیدار کرنے اور کانوں کو کھولنے کیلئے دل فریب مناظر' بے حجاب جلوے اور شیریں نغمے موجود ہیں۔ باقی کائنات کو تو چھوڑیئے صرف زمین ہی کو دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ کہ اس کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ اس کی تہہ میں آب شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں۔ گہرائی سے سونا چاندی نکل رہا ہے۔ سائے کیلئے درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ چلنے پھرنے کیلئے سبزے کا ایک مخملیں فرش بچھا دیا گیا ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک کیلئے سبزے کی چادریں بچھادی گئی ہیں۔ پھولوں میں رنگ وحسن پیدا کر دیا گیا ہے۔ میدانوں کے اکتائے ہوئے لوگوں کیلئے سربفلک پہاڑ اٹھادیئے ہیں' ان میں آبشاریں ہیں جو سینوں کو مسرت سے بھرے دے رہی ہیں۔ اس میں قسم قسم کے درخت ہیں جن کی حسن افروزی اپنی ایک شان رکھتی ہے۔ پھر باغ وانہار ہیں' سبزیاں ہیں' پھل ہیں' قسم قسم کی بیلیں ہیں' پھر زمین کے چارپائے' فضا کے پرندے' پانی کی مچھلیاں' یہ سب کیا ہے؟ ظاہر ہے یہ ساری چیزیں انسان کی ضرورت کیلئے ضروری نہیں تھیں۔ انسان کیلئے لکڑی کی ضرورت تھی۔ لیکن کیا ضروری تھا کہ درختوں کو چھتریاں بنادیا جاتا' انسان کو غلے کی ضرورت تھی لیکن لہلہاتی فصل کو نقرئی لباس پہنانے کی کیا ضرورت تھی۔ پرندے گوشت کیلئے ضروری سہی لیکن ان کی خوبصورت آوازیں' کوئل کی کوک' مور کا ناچ' پپیہے کی پی' چڑیوں کے چہچہے اور عام پرندوں کے ترانے یہ تو انسان کی ضرورت نہ تھے اور اگر آسمان کی طرف دیکھا جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہم پر ایک چھت تانی گئی ہے۔ لیکن ستاروں کا نظام اور ان کی سیر وگردش' سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی' چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ' فضائے آسمانی کی وسعت اور اس کی نے نیرنگیاں' بارش کا سماں اور اس کے تغیرات یہ سب کیا ہے؟

سورۃ النحل کی آیت نمبر ۶۵ تا ۶۹ میں کائنات کی ہم آہنگی کے حوالے سے بعض نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو ہمارے روزمرہ کی چیزیں ہیں۔ اور انسان ہدایت پانا چاہے تو یہ اس کی ہدایت کیلئے کافی ہیں۔ ہم اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں:

''اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے زمین کو زندہ کیا اس کے خشک ہوجانے کے بعد۔ بے شک اس میں ان لوگوں کیلئے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں اور بے شک تمہارے لئے چوپایوں میں بڑا سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں۔ پینے والوں کیلئے نہایت خوشگوار اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی۔ تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے۔ ان لوگوں کیلئے

Marfat.com

جو عقل سے کام لیتے ہیں اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر القا کیا کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو چھتیں اٹھاتے ہیں ان میں چھتے بنا' پھر ہر قسم کے پھلوں/ پھولوں سے رس چوس' پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے مشروب نکلتا ہے۔ جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اس میں لوگوں کیلئے شفا ہے۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے۔ ان لوگوں کیلئے جو غور کرتے ہیں''۔

ان آیات میں اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارات ہیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے' اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے' اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں ان سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کیلئے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے پھر اسی بارش کے پرورش کئے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر لیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر' درختوں کی شاخوں پر' انگور کی ٹٹیوں میں اپنا چھتہ بنا لیتی ہیں۔ پھول پھول کے رس چوس کر ان کو جمع کرتی ہیں۔ جن کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف۔ انسان ان کو نوشِ جان کرتا ہے۔ ان سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی' ان مناظر کو جو شخص بھی دیدۂ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کر سکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مظاہر بالکل ایک حادثے کی طرح ظہور میں آ گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہم ایک فطرت رکھتے ہیں اسی طرح یہ حیوانات بھی ایک مخصوص جبلت رکھتے ہیں۔ جس طرح ہم شعور' ادراک اور جذبات رکھتے ہیں اسی طرح جانور اور حیوانات اپنے جبلی تقاضوں اور اپنے منشاء تقدیر کے اعتبار سے اپنے اندر شعور' ادراک اور جذبات رکھتے ہیں۔ جس طرح ہمارے اجتماعی شعور نے بعض آثار و نتائج کو جنم دیا ہے اور اس سے بعض حیرت انگیز ادارے وجود میں آئے ہیں۔ اسی طرح جانوروں کی زندگی میں بھی ہمیں اس اجتماعی شعور کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے ایک سیاسی نظام کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ہر فرد اپنا حصہ ادا کر رہا ہے اسے سمجھنا ہو تو چیونٹیوں کی زیر زمین زندگی کو مطالعہ کرنا چاہئے اور اسی طرح مکھی کے اجتماعی تحفظ کے انتظامات کو دیکھنا چاہئے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے ان کے اندر کیسی پیش بینی پائی جاتی ہے۔ جماعتی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے' کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے بلکہ بعض دفعہ تو بعض مخلوقات میں ایسی حیرت انگیز صلاحیتوں کا سراغ ملتا ہے جس سے آدمی ششدر رہ جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سمندر میں یوں تو مچھلیوں کی بے شمار انواع ہیں لیکن ان میں خاص طور پر دو طرح کی مچھلیوں کا سفر بہت حیرت انگیز ہے۔

1- سامن مچھلی:

یہ اگر کسی ندی میں پیدا ہو تو جوان ہونے کے بعد یہ پہلے دریا میں اور وہاں سے سمندر میں چلی جاتی ہے۔ وہاں مدتوں رہتی ہے اور جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی موت قریب آ گئی ہے تو وہ واپس چل پڑتی ہے۔ یہ سمندر اور دریا سے ہوتی ہوئی ندی کے اس مقام پر جا رکتی ہے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اگر دوران سفر وہ کسی غلط ندی کی طرف مڑ جائے تو اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور واپس آ جاتی ہے۔

2- ایل مچھلی:

یہ کسی ندی میں ہو یا دریا میں جوان ہونے کے بعد اپنے وطن سے چل پڑتی ہے اور ہزاروں میل دور جزائر برمودہ (اوقیانوس) میں چلی جاتی ہے۔ وہاں بچے دے کر مر جاتی ہے۔ یہ بچے وہاں سے چل کر اپنی ماں کے وطن میں آ جاتے ہیں اور وہاں سے پھر جزائر برمودہ میں پہنچ کر پہلے بچے دے

Marfat.com

ہیں بعدازاں مرجاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ وجود میں آ گیا ہے اور اپنے ہی بل پر چل رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے؟ اگر اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے تو کیا وہ سب کچھ بنا کر ایک گوشہ میں بے تعلق ہو کر بیٹھ گیا ہے یا براہ راست اس پوری کائنات کی حفاظت فرما رہا ہے؟ کیا یہ سب کچھ کسی اندھی بہری قوت قاہرہ کا ظہور ہے یا کسی قدیر و قیوم، علیم و حکیم اور رحمان و رحیم ہستی کی قدرت و رحمت کا فیضان ہے؟ کیا یہ مختلف ارادوں، متضاد قوتوں اور بے شمار دیویوں دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے یا ایک ہی خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کی ایک جلوہ گاہ ہے؟ کیا یہ سارا کارخانہ بالکل بے مقصد، بے غایت اور بے انجام نظر آتا ہے یا اس کی ایک ایک چیز پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے جس کا ظہور قطعی اور یقینی ہے؟ کیا اس کے ظاہر و باطن سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ انسان اس کے اندر شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ کھائے پیئے، عیش کرے اور ایک دن ختم ہو جائے یا اس سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ جس قادر نے یہ دنیا بنائی ہے، جس حکیم نے اس کے ایک ایک ذرے میں اپنی حکمت کی شان دکھائی ہے، جس رحیم نے اپنی ربوبیت و رحمت کے یہ خوانِ نعمت بچھائے ہیں، وہ ایک دن سب کو ضرور اکٹھا کرے گا اور ہر ایک کی نیکی، بدی کو ضرور تولے گا اور پھر اس کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرے گا؟

انسان کی فطرت اگر مسخ اور اس کی عقل اگر مفلوج نہ ہوگئی ہو تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ ان سب باتوں میں سے دوسری ہی بات صحیح ہے۔ اگر یہی صحیح ہے اور بدیہی طور پر یہی صحیح ہے تو قرآن اسی کو ماننے کی دعوت دے رہا ہے۔ پھر اس کو ماننے کیلئے کسی معجزے کی کیا ضرورت ہے۔ اس حقیقت کی شہادت تو اس کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ اس کا گواہ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کے اندر کی شہادتوں سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے تو باہر کی ان نشانیوں ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھ لے جو نیچے بھی موجود ہیں اور اوپر بھی۔

اس آیت کریمہ کے آخری دو جملوں میں مزید دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح یہ صحیفۂ کائنات مختلف لانواع نشانیوں سے لبریز ہے جس میں مشاہداتی نشانیاں بھی ہیں، علمی بھی، آفاقی بھی ہیں، انفسی بھی، تاثراتی بھی ہیں، انفعالی بھی، ذہنی بھی ہیں اور ذوقی بھی۔ ہر طرح کا فرد اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسی طرح کتاب خداوندی یعنی قرآن کریم بھی ہر طرح کے دلائل اور ہر طرح کی نشانیوں سے بھرپور ہے۔ اللہ کے وجود اس کی وحدانیت انسان کی اصل حیثیت اور اس کی عبدیت، کائنات سے انسان کا رشتہ، خود پروردگار سے اس کے رشتے کی نزاکت، شریعت بطور انسانی ضرورت اور اللہ کی ہدایت اور راہنمائی کی طلب اور حاجت ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جس پر قرآن کریم نے مختلف اسالیب کے ساتھ اور مختلف انداز میں دلائل کا ایک انبار نہ لگایا ہو۔ اسی کے بارے میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے کتاب میں یعنی قرآن کریم میں دلائل کی حد تک کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن جن لوگوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ہے اور ہدایت سے منہ موڑ کر محرومی اپنا مقدر بنا چکے ہیں ان کو نہ صحیفۂ کائنات کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ صحیفۂ قرآن۔ اس لئے اے پیغمبر یہ لوگ اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ یہ چونکہ ہر طرح کی نشانی سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو ہدایت سے محروم کر چکے ہیں۔ اب تو ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے کہ جب یہ اپنے رب کی طرف لے جائے جائیں گے اور قیامت کے دن بارگاہ خداوندی میں ان کی حاضری ہوگی۔ تب ان کی آنکھیں کھلیں گی کہ دنیا میں مسلسل ہدایت سے منہ پھیر کر ہم نے کس طرح اپنی تباہی کو دعوت دی اور آج وہ تباہی ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ لیکن اس وقت ان کا آنکھیں کھولنا اور اپنے کئے پر پچھتانا ان کے کسی کام نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ وہ تو دارالجزاء ہے دارالعمل کا دور تو بیت گیا۔

Marfat.com

اگلی آیت کریمہ میں ان کی اس محرومی اور بدنصیبی کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ارشاد فرمایا:

آیت:۳۹ وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُکۡمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ؕ مَنۡ یَّشَاِ اللّٰہُ یُضۡلِلۡہُ ؕ وَمَنۡ یَّشَاۡ یَجۡعَلۡہُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ O ''اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا یہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے''۔

کچھ لوگوں میں قبولِ حق کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے:

یعنی یہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی انتہائی موثر دعوت اور قرآن کریم کا معجزانہ بیان اور کائنات میں ہر طرف بکھری ہوئی نشانیاں دیکھ کر راہ ہدایت اختیار نہیں کرتے بلکہ ان کا انکار عناد کی صورت اختیار کر گیا ہے ان کی مخالفت دشمنی میں تبدیل ہو گئی ہے اور ہر صحیح اور حق بات انہیں گالی سنائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جن بنیادی صلاحیتوں کی وجہ سے آدمی اپنی غلطی کو سمجھتا یا صحیح بات کو قبول کرتا ہے یہ ان تمام بنیادی صلاحیتوں سے حتیٰ کہ احساسات سے بھی عاری ہو گئے ہیں کیونکہ کسی بات کو سمجھنے کیلئے تین باتوں کی ضرورت ہے۔پہلی یہ بات کہ جب اسے کوئی صحیح بات سمجھائی جائے تو وہ گوش ہوش سے سنے اور کھلے دل سے قبول کرے۔لیکن جو آدمی سننے سے ہی انکار کر دے اسے ظاہر ہے دنیا کی کوئی طاقت ہدایت نہیں دے سکتی۔

دوسری بات جس کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر صحیح بات کی طلب پیدا ہو اور وہ اسے جاننے کیلئے دوسرے سے خود پوچھے یا اسے اگر کوئی بات سمجھائی جائے اور اسے کوئی بات سمجھ نہیں آتی یا اس کے ذہن میں کوئی سوال یا اشتباہ پیدا ہوتا ہے تو اسے دور کرنے کیلئے خود زبان کھولے۔لیکن جو آدمی نہ خود پوچھے نہ جاننے کی کوشش کرے نہ اس کے اندر اس کی طلب پیدا ہو ظاہر ہے ایسے آدمی کو کون سمجھا سکتا ہے۔

تیسری بات جس کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی جہالت اور تاریکی کے ماحول سے نکل کر روشنی اور علم کے ماحول کو اختیار کرے۔وہ بجائے تاریکی سے پیار کرنے کے روشنی سے پیار کرے اور جہاں جہاں بھی اسے روشنی دکھائی دے یا جہاں سے اسے روشنی مل سکتی ہو دیوانہ وار اس کی طرف لپکے۔لیکن اگر اسے روشنی سے نفرت ہو جائے اور وہ تاریکی ہی میں رہنا پسند کرے یعنی علم سے اس کو نفور ہو اور جہالت سے محبت تو ایسے آدمی کو بھی راہ راست دکھانا بہت مشکل کام ہے۔اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کر رہے ہیں اور وہ کسی طرح بھی ایمان لانے کیلئے تیار نہیں غور سے دیکھو وہ بہرے ہیں کہ آپ کی دعوت کو سن نہیں سکتے اور گونگے ہیں کہ آپ سے کچھ پوچھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ نہ روشنی کی کوئی کرن ان تک پہنچ سکتی ہے اور نہ وہ خود روشنی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ایسی صورت حال میں وہ اگر اللہ کی آیات کی تکذیب کر رہے ہیں اور ہدایت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں تو اے پیغمبر! آپ ان کے بارے میں ہرگز پریشان نہ ہوں وہ بالکل اس قابل نہیں ہیں کہ وہ آپ کی باتیں سن کر سمجھ سکیں اور پھر اسے قبول کر کے ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہوں کیونکہ وہ ان بنیادی صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ آخر وہ اس صورت حال سے دوچار کیوں ہوئے اور کیوں اپنے بنیادی صلاحیتیں کھو بیٹھے؟ کیا وہ پیدائشی طور پر معذور لوگ تھے یا وہ کسی سبب سے اس انجام کو پہنچے؟ چنانچہ اس حوالے سے اسی آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں جو قرآن کریم میں متعدد مواقع پر ذکر کی گئی ہے۔اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس نے انسان کو حواس خمسہ اور عقل کے جوہر سے نوازا ہے۔اس کے گرد و پیش میں اور خود اس کی فطرت کے اندر اپنی ذات کے عرفان کیلئے نشانیاں رکھی ہیں تاکہ ان سے کام لے کر آدمی اللہ کی معرفت حاصل کر سکے اور اللہ

Marfat.com

دیئے ہوئے طریقے کو اختیار کر سکے۔ پھر اللہ نے مزید کرم یہ فرمایا کہ صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ انسانی ہدایت اور اس کی راہنمائی کیلئے اپنی کتابیں اتاریں' اپنے رسول بھیجے اور انہوں نے سال ہا سال تک انسانی ہدایت کیلئے جان توڑ کوشش کی۔ جب ان تمام امکانات اور کوششوں کے باوجود ایک آدمی راہِ راست اختیار نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اسے ایک خاص حد تک ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کیلئے مہلت دیتے ہیں۔ آخر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسے ان صلاحیتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو دل پر مہر لگانا کہا جاتا ہے اور جو آگے بڑھ کر ان تمام امکانات سے فائدہ اٹھاتا ہے' اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرتا ہے اللہ اس کیلئے صراطِ مستقیم کھول دیتے ہیں اور وہ ہدایت کا راستہ پالیتا ہے۔ یہ اس کی سنت ہے یہ لوگ اس سنت کی گرفت میں ہیں۔ رہی یہ بات کہ ہدایت کی طرف چلنے والے کو اللہ کس طرح توفیق سے نوازتا ہے اور مسلسل انکار کرنے والے کو کس طرح محروم کرتا اور راہِ راست سے بھٹکاتا ہے۔ اس کو مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے خدا کا بھٹکانا یہ ہے کہ ایک جہالت پسند انسان کو آیاتِ الٰہی کے مطالعہ کی توفیق نہ بخشی جائے اور ایک متعصب غیر حقیقت پسند طالب علم اگر آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرے بھی تو حقیقت رسی کے نشانات اس کی آنکھ سے اوجھل رہیں اور غلط فہمیوں میں الجھانے والی چیزیں اسے حق سے دور سے دور تر کھینچتی چلی جائیں۔ بخلاف اس کے اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ ایک طالبِ حق کو علم کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشی جائے اور اللہ کی آیات میں اسے حقیقت تک پہنچنے کے نشانات ملتے چلے جائیں۔ ان تینوں کیفیتوں کی بکثرت مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جن کے سامنے آفاق اور انفس میں اللہ کی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر وہ جانوروں کی طرح انہیں دیکھتے ہیں اور کوئی سبق حاصل نہیں کرتے اور بہت سے انسان ہیں جو حیوانات (Zoology)' نباتات (Botany)' حیاتیات (Biology)' ارضیات (Geology)' فلکیات (Astronomy)' عضویات (Physiology)' علم التشریح (Anatomy) اور سائنس کی دوسری شاخوں کا مطالعہ کرتے ہیں' تاریخ' آثارِ قدیمہ اور علوم اجتماع (Social Sciences) کی تحقیق کرتے ہیں اور ایسی ایسی نشانیاں ان کے مشاہدے میں آتی ہیں جو قلب کو ایمان سے لبریز کر دیں۔ مگر چونکہ وہ مطالعہ کا آغاز ہی تعصب کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر دنیا اور اس کے فوائد و منافع کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لئے اس مشاہدہ کے دوران میں ان کو صداقت تک پہنچانے والی کوئی نشانی نہیں ملتی' بلکہ جو نشانی بھی سامنے آتی ہے وہ انہیں الٹی دہریت' الحاد' مادہ پرستی اور نیچریت ہی کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ ان کے مقابلہ میں ایسے لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جو آنکھیں کھول کر اس کارگاہِ عالم کو دیکھتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

گزشتہ آیت کریمہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے عذاب لانے کا مطالبہ کیا تھا اور مختلف وقتوں میں وہ قیامت کا مذاق تو اڑاتے ہی رہتے تھے۔ اگلی آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی مطالبے کو ایک خوبصورت دلیل انفسی کی صورت میں توحید کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور ان کی گمراہی کو اس طرح مبرہن کر دیا ہے کہ جس کا جواب دینا ان کیلئے ممکن نہیں۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۴۰۔۴۱ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ O بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ O ''ذرا غور کر کے بتاؤ! اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی عذاب آئے یا قیامت تم پر آ پہنچے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ بولو اگر تم سچے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پکارو گے پھر وہ اگر چاہے گا تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دے گا۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو بھول جاتے ہو''۔

Marfat.com

توحید ہر نفس کے اندر موجود ہے:

گزشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ تم ایک نشانی کا مطالبہ کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تمہارے گردوپیش میں ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے مثال کے طور پر حیوانات کی زندگی کے مشاہدہ کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس کے بعد اب ایک دوسری نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جارہا ہے جو خود منکرین حق کے اپنے نفس میں موجود ہے۔ جب انسان پر کوئی بڑی آفت آجاتی ہے یا موت اپنی بھیانک صورت کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوتی ہے اس وقت ایک اللہ کے دامن کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ اسے نظر نہیں آتی۔ بڑے بڑے مشرک ایسے موقع پر اپنے معبودوں کو بھول کر خدائے واحد کو پکارنے لگتے ہیں۔ غالی سے غالی دہریہ بھی اللہ کے آگے دعا کیلئے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اسی نشانی کو یہاں حق نمائی کیلئے پیش کیا جارہا ہے کیونکہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خدا پرستی اور توحید کی شہادت ہر انسان کے نفس میں موجود ہے، جس پر غفلت و جہالت کے خواہ کتنے ہی پردے ڈال دیے گئے ہوں، مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی وہ ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو اسی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی۔ جب مکہ معظمہ نبی ﷺ کے ہاتھ پر فتح ہوگیا تو عکرمہ جدہ کی طرف بھاگے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حبش کی راہ لی۔ راستہ میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرہ میں گئی۔ اول اول تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا۔ مگر جب طوفان کی شدت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہوگیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کے سوا کسی کو پکارنے کا نہیں ہے، وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں۔ اس وقت عکرمہ کی آنکھیں کھلیں اور ان کے دل نے آواز دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو؟ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا وہ نیک بندہ ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے اور ہم خواہ مخواہ اس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عکرمہ کی زندگی میں فیصلہ کن لمحہ تھا۔ انہوں نے اسی وقت اللہ سے عہد کیا کہ اگر میں اس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد ﷺ کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اور بعد میں آکر نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ اپنی بقیہ عمر اسلام کیلئے جہاد کرتے گزار دی اور خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ

اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی امتوں کی طرف پیغمبر بھیجے پھر (اُن کی نافرمانیوں کے سبب) ہم انہیں سختیوں

لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ

اور تکلیفوں میں پکڑتے رہے تاکہ عاجزی کریں۔ تو جب اُن پر ہمارا عذاب آتا رہا کیوں نہیں عاجزی کرتے رہے

قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا

مگر اُن کے تو دل ہی سخت ہوگئے تھے۔ اور جو وہ کام کرتے تھے شیطان اُن کو اُن کی نظروں میں آراستہ کر دکھاتا تھا۔ پھر جب

Marfat.com

ذُكِّرُوا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ

اُنہوں نے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی فراموش کر دیا تو ہم نے اُن پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب ان

اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ

چیزوں سے جو اُن کو دی گئی تھیں خوب خوش ہو گئے تو ہم نے اُن کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہو کر رہ گئے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ

غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔ اور سب تعریف خدائے رب العالمین ہی کو سزاوار ہے۔ ان کافروں سے کہو

اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ

کہ بھلا دیکھو تو اگر خدا تمہارے کان اور آنکھیں چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو خدا کے سوا کون سا معبود ہے

يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

جو تمہیں یہ نعمتیں پھر بخشے؟ دیکھو ہم کس کس طرح اپنی آیتیں بیان کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ لوگ روگردانی کرتے ہیں

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ

کہو کہ بھلا بتاؤ تو اگر تم پر خدا کا عذاب بے خبری میں یا خبر آنے کے بعد آئے تو کیا ظالم لوگوں

اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ

کے سوا کوئی اور بھی ہلاک ہوگا؟ اور ہم جو پیغمبروں کو بھیجتے رہے ہیں تو خوشخبری سنانے اور

مُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾

ڈرانے کو پھر جو شخص ایمان لائے اور نیکوکار ہو جائے تو ایسے لوگوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ اندوہناک ہوں گے

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اُن کی نافرمانیوں کے سبب انہیں عذاب ہوگا۔

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ

کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ (یہ کہ) میں غیب جانتا ہوں اور

Marfat.com

لَا اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ قُلْ هَلْ

نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں جو مجھے (خدا کی طرف سے) آتا ہے

یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۵۰

کہہ دو کہ بھلا اندھا اور آنکھ والا برابر ہوتے ہیں؟ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے

تمہید:

سورۃ انعام میں آغاز سے اب تک مسلسل اساسی اور بنیادی عقائد پر نہایت مدلل انداز کے ساتھ زور دیا جارہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مشرکین کی جانب سے پیش کیے جانے والے اعتراضات اور مطالبات کا بھی جواب دیا جارہا ہے۔ گزشتہ آیتوں میں بالخصوص ان کے مطالبۂ عذاب کا ذکر کیا گیا اور اس کے نتائج پر ان کو توجہ دلا کر تنبیہ بھی کی گئی۔ بالخصوص آخری دو آیتوں میں ان کے مطالبے ہی کو ایک خوبصورت دلیل کی شکل دے کر ان پر ایک طرح سے اتمام حجت کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس رکوع کے آغاز ہی میں، جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، پروردگار نے اپنے فضل و کرم سے، باوجود اتمام حجت کرنے کے، قوموں پر عذاب نازل ہونے کے پراسس کو بیان کیا ہے، جس کی حیثیت سنت اللہ کی ہے۔ یعنی وہ اللہ کا ایک ایسا قانون ہے اور ایک ایسی روایت ہے، جس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ اس لئے مشرکین مکہ کے سامنے اسے بیان فرما کر انہیں یہ سمجھایا گیا ہے کہ تم جو بار بار اللہ کے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو، تمہیں اس کی اس سنت اور اس کے تدریجی عمل کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، تاکہ تمہیں یہ بات سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے کہ اب تک تم پر جو اللہ کا عذاب نہیں آیا تو اس کی حقیقی وجہ کیا ہے اور اگر تم نے اب بھی اپنا رویہ نہ بدلا تو عین ممکن ہے کہ تم اللہ کی اس سنت کی گرفت میں آ جاؤ اور مزید یہ بھی کہ صرف اس سنت اللہ ہی کو بیان نہیں کیا گیا، بلکہ اس پر تاریخی روایت اور تاریخی شہادت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ مشرکین مکہ کو سمجھنے میں مزید آسانی ہو اور وہ ہدایت کا راستہ اختیار کرنا چاہیں تو انہیں کوئی عذر پیش نہ آئے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

آیت: ۴۲-۴۳ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ O فَلَوْلَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ O ''اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی امتوں کے پاس اپنے رسول بھیجے، پس ان کو مالی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا کیا۔ تاکہ وہ خدا کے آگے جھکیں تو کیوں جب ان پر ہماری پکڑ آئی تو خدا کی طرف نہ جھکے، بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کی نگاہوں میں اسی عمل کو کھبا دیا، جو وہ کرتے رہے''۔

عذاب الٰہی کے تدریجی مراحل:

ان دونوں آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب کے اس پراسس اور اس تدریجی عمل کے پہلے حصے کو بیان فرمایا ہے، جس کے بعد پھ

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا عذاب کسی بھی قوم پر نازل ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس تاریخی روایت کو بھی بیان کیا ہے جو اس حقیقت پر شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اسے تو ہم بعد میں بیان کریں گے سب سے پہلے اللہ کی اس سنت اور اس پر اس کو سمجھ لینا چاہئے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ نے اس زمین پر انسان کو بسایا ہے اور ان کو اس زمین پر خلافت کا تاج بھی پہنایا ہے۔ اس کو بہت ساری مخلوقات پر فضیلت بھی عطا فرمائی ہے۔ اس زمین پر درحقیقت اسی کی فرمانروائی ہے اور وہی اس گلشنِ ہستی کا گلِ سرسبد ہے جس سے اس چمن کو آراستہ کیا گیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے عذاب کا شکار بنایا جائے اور بلاوجہ اسے تباہ کر دیا جائے۔ مشرکین بار بار جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں انہوں نے عذاب کو بھی ایک کھیل سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ کسی بھی قوم پر اللہ کا عذاب اس کی مکمل تباہی اور اس کی جڑ کٹ جانے کے مترادف ہے۔ کسی بھی گلشن کا سجانے والا بلاوجہ کبھی اپنے گلشن کو اجاڑنا پسند نہیں کرتا۔ وہ تو ان لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتا جو اس گلشن کی بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ اسی لئے ہمیشہ فساد فی الارض کا ارتکاب کرنے والوں کو سزا کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خود وہ اس چمن کو برباد کر دے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس نے قوموں پر عذاب بھیجے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ دراصل کسی بھی قوم پر عذاب اس وقت بھیجتا ہے جب کہ اس قوم کا وجود اس گلشن کیلئے تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لئے اس کے یہاں حقیقی ترجیح اس بات کو حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے ہر گروہ کو حتی الامکان اس تباہی اور اس عذاب سے بچائے۔ اس لئے اس کی سنت یہ ہے کہ جب بھی کہیں بگاڑ پھیلتا ہے اور انسان گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو وہ ان کی ہدایت اور اصلاح کیلئے اپنے رسول بھیجتا ہے اپنی کتابیں اتارتا ہے۔ رسول دنیا میں آ کر اللہ کی کتاب کی دی ہوئی روشنی کے مطابق بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں خون کے گھونٹ پی پی کر ان کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں اور ان کی زندگی سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ جب تک ان میں خیر کی کوئی امید باقی رہتی ہے اور کسی ایک آدمی کے اصلاح پذیر ہونے کی بھی امید کی جا سکتی ہے اللہ کے یہ فرستادہ لوگ اللہ کے حکم سے اپنے کام کو جاری رکھتے ہیں۔ لیکن جب یہ قوم ان کی دعوت کے ساتھ نامناسب طرزِ عمل اختیار کرتی ہے حتی کہ اپنے ان محسنوں کے ساتھ دشمنی کا رویہ اختیار کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں تنبیہ کرنے اور اپنے نبیوں اور رسولوں کی صداقت کو واضح کرنے کیلئے وقتاً فوقتاً انہیں مصائب میں مبتلا کرتا ہے۔ ان مصائب کیلئے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو لفظ استعمال فرمائے ﴿الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾۔ بَاْسَآءِ کا معنی ہے مالی دشواریاں اور مالی مصیبتیں اور ضَرَّآءِ کا معنی ہے جسمانی عوارض اور جسمانی مصیبتیں یعنی اس قوم کو کبھی تو اس طرح مالی مشکلات میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ ان کے کاروبار میں تعطل پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تجارتیں نقصان کا شکار ہوتی ہیں کھیتیاں ویران ہونے لگتی ہیں۔ بعض دفعہ ملک قحط سالی کا شکار ہو جاتا ہے بارشیں روک دی جاتی ہیں یا بارشوں کی کثرت سے سیلاب کی صورت پیدا کر دی جاتی ہے۔ صنعتی اداروں میں باہمی خلفشار کے نتیجے میں پہیہ جام ہونے لگتا ہے۔ ملک سیاسی طور پر سیاسی انارکی کا شکار ہو کر بے استحکامی کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور کبھی بڑی سے بڑی توانا قوم کو بھی جو اپنے یہاں ایک مضبوط صحت کا نظام رکھتی ہے جسمانی بیماریوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ جب ان کے اخلاق بگڑتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بعض ایسی بیماریاں جنم لیتی ہیں جن کی نہ تشخیص ہو سکتی ہے نہ تجویز ممکن ہوتی ہے۔ وبائیں پھیلنے لگتی ہیں متعدی امراض میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ پہلے بھی ہوتا رہا آج بھی قدرت بعض دفعہ کہیں کہیں اس کے جھٹکے دیتی ہے۔ مغربی دنیا میں ایڈز کی بیماری کا پھیلنا آج تک ایک لاینحل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ کینسر نے پوری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے اور اب مختلف قسم کا یرقان لاعلاج ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح کے مصائب میں اللہ کی ہدایت کا راستہ روکنے والی قوموں اور رسولوں پر ایمان نہ لانے والوں کو اس لئے مبتلا کیا جاتا ہے تاکہ وہ اللہ کے سامنے عاجزی اختیار کریں اس کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی بندگی کو سمجھیں اور اس کے سامنے فروتنی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی عبادت اور عبودیت کیلئے جھکیں یعنی یہ تکلیفیں اور مصائب محض ان کو پریشان کرنے کیلئے نہیں ہوتے بلکہ یہ بتانے کیلئے ہوتے ہیں کہ تمہارا کوئی آقا و مالک بھی ہے۔ اس زمین کا کوئی نگران بھی ہے۔ تم اگر اس کی ہدایت کو قبول نہیں کر

Marfat.com

رہے اور تم نے اس کے ہر حکم کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اس کے رسولوں سے مسلسل بدسلوکی کر رہے ہو اور زمین کو تم نے فساد سے بھر دیا ہے تو اس طرح کی تکلیفوں میں انہیں مبتلا کر کے بتلایا جاتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ تم کسی کی گرفت میں نہیں آ سکتے' یہی چھوٹی چھوٹی مصیبتیں کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہیں اس لئے اس کی ذات کے سامنے جھکو اور اس کے رسولوں پر ایمان لا کر اس کی اطاعت اور اس کی بندگی اختیار کرو۔

دل کی سختی سے مراد:

دوسری آیت میں بجائے اس کے کہ یہ بتایا جاتا کہ بگڑی ہوئی قومیں جب اس طرح کی تنبیہات کے بعد بھی راہ راست پر نہیں آتیں تو پھر اللہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اسی بات کو ایک سوال کی شکل دی گئی' ہے جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ انسانی فطرت لازماً اپنے پروردگار کے احساس سے بہرہ ور ہے۔ جب کبھی اس پر غفلت کے پردے پڑنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصائب کی صورت میں تنبیہات اس کے پردوں کو چاک کرتی ہیں تو انسان فوراً اپنی فطرت کو پہچانتا ہے اس کی آواز پر کان دھرنے لگتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایمان کی دعوت کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جب کوئی قوم حد سے گزر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے اس کی فطرت مردہ ہو چکی ہے۔ پھر وہ ان مصائب کی کوئی نہ کوئی تاویل کرتی ہے اور کوئی نہ کوئی عقلی توجیہ کر کے اپنی بے عملی بدعملی بلکہ بے دینی کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ فرمایا ان لوگوں کا بھی یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے مصائب کا ان پر نزول ہوا تو یہ کیوں نہیں اس کے سامنے جھکے۔ پھر خود ہی اس کا جواب دیا کہ اس لئے نہیں جھکے کہ یہ اپنی فطرت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے دل جہاں سے ان کو فطرت کی آواز سنائی دے سکتی ہے' وہ اتنے سخت ہو گئے کہ انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور انسان کا دل جب سخت ہو جاتا ہے' یعنی اپنے اللہ کی اطاعت سے انکار کر دیتا ہے تو پھر اس سے کسی خیر کی توقع نہیں رہتی۔ پھر ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل ہونے والے مصائب کو تنبیہ سمجھ کر اپنی غلطیوں سے توبہ کرنے کی کوشش کریں' وہ کوئی نہ کوئی اس کی توجیہ کر کے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو جن لوگوں سے واسطہ پڑا' ان کو بھی وقتاً فوقتاً ایسے مصائب سے دوچار کیا گیا۔ لیکن قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اس کے نتیجے میں اللہ کے سامنے جھکتے' انہوں نے اس کی تاویلیں کیں اور اپنی روش پر قائم رہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم جن مصائب سے گزر رہے ہیں' یہ غلط بات ہے کہ یہ اللہ کی نافرمانی کا نتیجہ ہے یا اللہ ہمیں اس سے تنبیہ کر رہا ہے۔ بلکہ یہ تو وقت کے وہ انقلابات اور وہ اتفاقی حوادث ہیں' جن سے ہمیشہ انسانوں کو واسطہ پڑتا رہا ہے۔ کہا:

قَدْ مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَ السَّرَّآءُ

''اگلے بھی ایسے گرم اور نرم حالات سے دوچار ہوتے رہے ہیں'' (الاعراف: ۹۵)

یہ تو دنیا کی ریت ہے' ہم کوئی پہلی دفعہ اس طرح کے حالات سے دوچار نہیں ہوئے۔ برا وقت بھی اچھے وقت کی طرح گزر جاتا ہے' یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ عجیب بات ہے کہ جو بات آج کا دانشور اور ہمارا پڑھا لکھا طبقہ ایسے حالات میں کہا کرتا ہے' وہی بات ساڑھے چودہ سو سال پہلے کا مشرک بھی کہتا تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی فطرت ہر دور میں ایک رہی ہے اور ایک ہی رہے گی۔ اس لئے جب بھی کبھی ایسے حالات پیدا ہوں گے اور اللہ اپنے بندوں پر مہربانی فرماتے ہوئے ان کو یہ چھوٹے چھوٹے مصائب کی صورت میں جھٹکے دے گا تاکہ وہ راہ راست پر آ جائیں تو ہمیشہ کی طرح دو طرح کے گروہ پیدا ہوں گے۔ ایک وہ گروہ جو ان مصائب کو واقعی تنبیہات سمجھ کر ایمان کے راستے پر آ جائے گا اور ہدایت اختیار کر لے گا اور دوسرا وہ گروہ جو مختلف اسباب کے تحت اپنے بگاڑ میں اور پختہ ہوتا جائے گا۔ اس کا سبب بھی یہاں بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی اللہ کے نبی اور اس کے رسول یا مصلحین دنیا

Marfat.com

میں اصلاح کا عمل شروع کرتے ہیں تو ابلیس بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت ان کا راستہ روکنے اور انسانوں کو بگاڑ میں پختہ کرنے کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا لشکر جس میں زندگی کے ہر طبقے کا نمائندہ موجود ہوتا ہے' وہ ان کو زندگی کے ہر شعبے میں پھیلا دیتا ہے' تا کہ لوگوں کو اصلاح کے عمل سے متاثر ہونے سے روکے اور شیطان کا یہ لشکر سارا زور اس بات پر صرف کرتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو' یہ مت سمجھو کہ اس میں کسی غلطی یا بگاڑ کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے۔ تمہارے تمام اعمال اور تمہاری زندگی کے تمام اطوار بالکل ٹھیک جہت پر جا رہے ہیں۔ تمہاری علمی کاوشیں' تمہارے کاروبار کے طریقے' تمہارے تہذیبی و ثقافتی ادارے' تمہارے اجتماعی عوامل ان میں کہیں بھی ٹیڑھ نہیں پایا جاتا۔ اس لئے تمہیں اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ یہ شیطانی لشکر جب پوری طرح ان کے اعمال کو ان کے سامنے خوبصورت پیرائے میں پیش کر کے ان کو ہر طرح سے مطمئن کر دیتا ہے تو یہ وہ موقع ہے جسے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دل سخت ہو گئے۔ اب وہ کسی ہدایت کو سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ ان کے اہل علم اپنے علمی پندار کی وجہ سے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہماری علمی دریافتوں اور ہمارے علمی رویے کو کون چیلنج کر سکتا ہے؟ وہ چونکہ کبھی اپنے علمی رویے پر نظر ثانی کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے اس لئے یہ ان کا علمی پندار ان کو بالآخر محرومی کی دلدل میں اتار دیتا ہے۔ اقبال مرحوم نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''بعض لوگوں کو کنج تنہائی میں بیٹھے بیٹھے ہمہ دانی کا دعویٰ ہونے لگتا ہے'' ظاہر ہے کہ یہ ہمہ دانی کا دعویٰ آدمی میں ایک ایسے پندار کو جنم دیتا ہے' جس پر کسی نصیحت کے اثر کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح دولت کا نشہ دولت مندوں کو کسی کی بات سننے پر کبھی آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ بیوروکریٹس میں اقتدار کا خمار کسی بات کے سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ حکمرانوں میں حکومت کا طنطنہ ایک ایسا آہنی پردہ ثابت ہوتا ہے' جس میں کسی صحیح بات کا دخل ممکن نہیں ہوتا۔ یہ دل کی وہ سختی ہے جو انسان کو ہدایت سے محروم کر دیتی ہے۔ دل عجیب چیز ہے۔ یہ جب تک نرم ہے تو پھول کی پتی سے بھی زیادہ نرم ہے لیکن جب سخت ہوتا ہے تو پتھروں کی سنگینی بھی اس کے سامنے چھوٹ جاتی ہے۔ پتھر باوجود اس کے کہ ہماری نگاہوں میں اس قدر سخت چیز ہے کہ جس میں کسی چیز کی جوت لگنا ممکن نہیں۔ لیکن قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کا خوف ان میں بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ ان میں بعض پتھر ایسے ہیں کہ جو اللہ کے خوف سے پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی رواں ہو جاتا ہے اور بعض پتھر پہاڑ کی بلندی سے اللہ کے خوف کے باعث لڑھک جاتے ہیں۔ لیکن انسان کا دل جو گوشت کا لوتھڑا ہے' وہ اس قدر سخت ہو جاتا ہے کہ اس پر نہ اللہ کا کلام اثر کرتا ہے اور نہ اللہ کے رسول کی معجز بیانی۔

دل کی کیفیت کو پوری تفصیلات سے سمجھنا تو انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ہم اپنے معمولات میں بعض لوگوں کے طرز عمل کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور سمجھ سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بیمار لوگوں میں بھی دو طرح کا طرز عمل پایا جاتا ہے۔ بعض مریض ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے صحیح طرز فکر اور صحیح احساس کے باعث' معمولی سے معمولی بیماری کو بروقت محسوس کر کے' اسے دور کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن بعض بیمار ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انہیں بیماری کا احساس دلانا بھی بجائے خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس میں لکھا ہے کہ کسی شخص نے بقراط سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک مہلک امراض کیا کیا ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ کوئی مرض ایسا نہیں' جس کی دوا اللہ نے پیدا نہ کی ہو۔ لیکن ایک مرض ہے' جو لا علاج ہے اور کوئی بڑے سے بڑا مسیحا بھی اس کا علاج نہیں کر سکتا۔ کہا

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں
سبب یا علامت گر اس کو سجھائیں
تو تشخیص میں سو نکالے خطائیں

Marfat.com

یہ وہ شخص ہے' جس کا اپنے مرض کی جانب سے دل سخت ہو گیا ہے اور اب اس کی یہ کیفیت باقی نہیں رہی کہ وہ اپنے مرض کا صحیح احساس کر سکے۔ بقراط نے کہا کہ ایسے مریض کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ روح دل اور اخلاق کی بیماریاں بھی جسمانی بیماریوں کی طرح ہی ہیں' صرف ناموں کا فرق ہے۔ جسمانی بیماریوں کو اگر ہم بخار' نزلہ' کینسر اور یرقان وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے ہیں تو روحانی بیماریاں اعتقادات' اخلاقیات' اعمال' معاملات اور آدابِ زندگی کا بگاڑ کہلاتی ہیں۔ جس طرح ایک آدمی اپنی جسمانی بیماریوں سے بے حس ہو جاتا ہے' اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بعض دفعہ آدمی اپنی روحانی اور اخلاقی بیماریوں کو سمجھنے سے عاری ہو جاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے' جس کو یہاں دل کا سخت ہونا کہا گیا ہے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ جسمانی بے حسی پیدا کرنے کیلئے باقاعدہ کوششیں نہیں کی جاتیں' لیکن روحانی بے حسی پیدا کرنے کیلئے تو پورا ایک ابلیسی لشکر ہے جو مختلف صورتوں میں ہر دور میں موجود رہا ہے۔ یہ مشرکینِ مکہ کے اندر بھی تھا جس کے آثار ہمیں ان کی تاریخ میں ملتے ہیں اور قرآن کریم نے بھی کئی جگہ ان کا ذکر کیا ہے اور آج ہمارے گردوپیش میں بھی موجود ہے۔ اگر آدمی تھوڑی سی گہری نگاہ سے دیکھے تو اسے ہر اجتماعی ادارے میں اس ابلیسی لشکر کے ارکان کام کرتے دکھائی دیں گے۔ آپ یونیورسٹیوں تک میں دیکھیں گے کہ ایسے اساتذہ کرام موجود ہیں' جو مسلمان کہلانے کے باوجود اسلام کے خلاف ایسی بدگمانیاں نوجوانوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس کی امید شاید کسی کافر سے بھی نہ کی جا سکے۔ وہ اس طرح اسلوب بدل بدل کر اور مختلف عنوانات کے تحت بچوں کی برین واشنگ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں یہی بچے بڑے ہو کر اخلاقی مفاسد کا بھی شکار ہوتے ہیں اور زندگی میں ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہو کر قومی زندگی کو مسموم بھی کرتے ہیں۔ ہمارے اخبارات کے دامن ایسے کالموں سے بھرپور ہوتے ہیں' جنہوں نے ہمارے قومی کردار اور افکار پر نہایت خطرناک اثرات ڈالے ہیں اور پھر ہمیں شاید معلوم نہیں کہ تمام لادینی قوتوں اور بیرونی ممالک کی جانب سے یہاں ہمیشہ ایک پانچواں کالم کام کرتا ہے' جو بعض دفعہ غیر محسوس طریقے سے ایسے ایسے خیالات کو دل و دماغ میں راسخ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ جب تک گہری نظر سے نہ دیکھا جائے' اس کی سُمّیت کا صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ آج کل ہمارے اخبارات میں ایسی ہی قوتوں کے زیرِ اثر بعض ایسے ایسے اسلامی کالم لکھوائے جا رہے ہیں جو عام نگاہوں میں ممکن ہے اسلام کی کوئی خدمت دکھائی دیتی ہو' لیکن حقیقت میں وہ ایسا مخفی زہر ہے جس سے ہماری پوری قومی زندگی متاثر ہو رہی ہے۔ اس طرح کے تمام کالموں میں اسلام کے مبلغ بن کر اور اسلامی قوتوں کے ساتھ قریبی تعلق کا اظہار کرنے کے بعد دینی سیاسی جماعتوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ آپ اگر یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان آپ کو قبول کر کے آپ کو اسمبلی میں پہنچائیں اور وہاں پہنچ کر آپ اسلامی نظام لانے میں کامیاب ہوں تو اس کیلئے ضروری ہے کہ جو چیزیں مسلمان قوم قبول کر چکی ہے' آپ ان کی مخالفت نہ کریں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ چیزیں غلط ہیں اور اسلام انہیں قبول نہیں کرتا' لیکن سوال یہ ہے کہ ایک تو یہ بات کہ صحیح اور جائز کیا ہے اور ایک یہ کہ آج کے دور میں کیا چل سکتا ہے؟ اس سلسلے میں ہمیں زیادہ آئیڈیلسٹ نہیں ہونا چاہئے' بلکہ حقیقت پسند بن کر زمینی حقیقتوں کو سمجھ کر معروضی حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسلام کی وہ تاویل لوگوں کے سامنے رکھنی چاہئے' جو ان کیلئے قابلِ قبول ہو سکتی ہو۔ مثلاً آپ ان کے سامنے فنونِ لطیفہ کے بارے میں کچھ نہ کہیں' اس لئے کہ یہ فنون ہماری ثقافتی بلکہ تہذیبی زندگی میں رچ بس گئے ہیں اور ہمارے مزاج کا اس طرح حصہ بن گئے ہیں کہ اب ان کی مخالفت کرنا گویا اپنی مخالفت کو دعوت دینا ہے۔ اسی طرح اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ خواتین کی رائے اپنے حق میں کر سکیں تو پھر ضروری ہے کہ آپ حجاب اور نقاب کے مسئلے کو نہ چھیڑیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اب نقاب پہننا اور حجاب میں رہنا پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ملک کا کاروباری طبقہ آپ کے بارے میں بدگمان نہ ہو تو پھر سود کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں کہنا چاہئے' کیونکہ اس سے یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ آپ ملک کی اقتصادیات کو تلپٹ کر کے رکھ دیں گے اور ظاہر ہے کاروباری طبقہ اس کو ایک لمحے کیلئے بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اسلام میں جہاد کی اہمیت کچھ بھی ہو' آپ

Marfat.com

بھول کر بھی اسے زبان پر نہ لایئے۔ ورنہ دہشت گردی کا الزام آپ پر چسپاں ہو جائے گا اور آپ قابل قبول تو کیا ہوں گے لوگ آپ سے خوف کھانے لگیں گے۔

اندازہ کریں! بظاہر یہ مشورے کس قدر پسندیدہ ہیں اور کس قدر مصلحت پر مبنی اور حکمت کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آپ یہ اصول تسلیم کر لیں کہ آپ ہر وہ بات کہیں گے جو سننے والے کیلئے قابل قبول ہو تو پھر آپ بتایئے! آپ کون سی بات کہیں گے؟ ایک بے نماز کیلئے نماز قابل قبول نہیں، رشوت لینے والے کیلئے حلال کمائی کا تصور دہشت ناک تصور ہے، سیاست دانوں کو آداب سیاست کا وعظ کہنا بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے، حکمرانوں کو آداب حکومت سمجھانا دشمنی مول لینے والی بات ہے۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ ہم شاید وہاں پہنچ گئے ہیں، جس کے بارے میں مولانا روم نے ایک مثال دی تھی کہ کوئی آدمی کسی مصور کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا کہ صاحب میرے بازو پر شیر کی تصویر بنا دیں۔ اس نے جب تصویر بنانے کیلئے پرکار کی سوئی چبھوئی تو اس نے تکلیف محسوس کر کے پوچھا کہ یہ آپ کیا بنانے لگے ہیں؟ مصور نے کہا: شیر کی دم بنانے لگا ہوں۔ اس شخص نے کہا: چھوڑیئے! کیا دم کٹے شیر نہیں ہوتے؟ کچھ اور بنایئے۔ اس نے پھر سوئی چبھوئی، تکلیف ہوئی تو اس نے پھر پوچھا کہ اب آپ کیا بنانے لگے ہیں؟ مصور نے کہا: ٹانگیں بنانے لگا ہوں۔ اس نے کہا: یہ رہنے دیجئے، اس شیر نے کہاں چل کر جانا ہے۔ اس نے پھر سوئی چبھوئی تو اس شخص نے پوچھا کہ اب آپ کیا بنا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اس کا پیٹ بنانے لگا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ کوئی سچ مچ کا شیر تھوڑا ہے، جس نے کچھ کھانا پینا بھی ہے۔ آپ اسے رہنے دیجئے کچھ اور بنایئے۔ مصور نے پرکار زمین پر رکھ دی اور کہا کہ اللہ نے ایسا شیر پیدا نہیں کیا، جس کی نہ ٹانگیں ہوں، نہ پیٹ ہو، نہ دم ہو اور وہ پھر بھی شیر ہو۔ شیطانی قوتوں نے انسانوں کو ایمانی ہدایت سے دور رکھنے اور دل و دماغ کو مسموم کرنے کیلئے جو طریقے اختیار کئے ہیں اور جس طرح لوگوں کے افکار اور اعمال کو آراستہ کر کے انہیں دکھایا ہے اس کی یہ چند مثالیں ہیں جن کا میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا ہے۔ شیطانی قوتوں کا یہ حربہ ہر دور میں کامیاب رہا ہے اور مشرکین مکہ اسی کی گرفت میں تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ شیطان کی اسی گرفت سے نکالنے کیلئے پروردگار لوگوں کو ان مصائب سے دوچار کرتا ہے کہ شاید وہ اللہ کی طرف رجوع کریں۔ لیکن جب وہ اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتے ہیں اور ان مصائب کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر کے، اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں تو پھر اللہ کی سنت کا دوسرا مرحلہ سامنے آتا ہے، جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا گیا ہے:

آیت: ۴۴ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ ”تو جب انہوں نے فراموش کر دیا اس چیز کو، جس سے ان کو یاد دہانی کی گئی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر اترانے لگے، جو انہیں دی گئی تو ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا۔ وہ بالکل ہک دک رہ گئے“۔

مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ سے مراد:

اس آیت کریمہ میں مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ کے دو مطلب علماء نے مراد لئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وہ مصائب ہیں، جن سے انہیں دوچار کیا گیا تھا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ جب انہوں نے ان مصائب کی پرواہ نہ کی اور جس مقصد کیلئے ان مصائب میں انہیں مبتلا کیا گیا تھا اسے قبول نہ کیا تو پھر اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ انہیں جس بات سے نصیحت کی گئی تھی یعنی اللہ کے رسول کی دعوت اور اللہ کی کتاب کے واسطے سے، جب انہوں نے اس پر کان نہ دھرے تو تب اس سنت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مصائب کو ختم کر دیتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مصائب کا ایک وقتی دور آیا تھا، جیسے ہر قوم پر آیا کرتا ہے، وہ گزر گیا۔ اس لئے اس کا کوئی تعلق پیغمبر کی دعوت سے ہرگز نہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم پھر انہیں ڈھیل

Marfat.com

دے دیتے ہیں اور اس ڈھیل کو مزید موثر بنانے کیلئے ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیتے ہیں۔ یعنی وقت پر بارشیں ہونے لگتی ہیں' کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں' پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے' پھل دار درخت پھلوں سے گراں بار ہو جاتے ہیں' زمین سبزے کا مخملی لباس پہن لیتی ہے' جانوروں میں دودھ کی فراوانی ہو جاتی ہے' صنعتوں کا پہیہ تیزی سے چلنے لگتا ہے' کاروبار میں تیزی آ جاتی ہے دولت کی ریل پیل ہو جاتی ہے اور ہن برسنے لگتا ہے' جس چیز میں یہ قوم ہاتھ ڈالتی ہے وہ سونا بن جاتی ہے نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ سے اور دور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر کرنے کی بجائے اترانے لگتے ہیں۔ دولت کے نشے میں تمام انسانی اقدار اور شرم وحیا کی تمام حدود کو پامال کر دیتے ہیں۔ اخلاقیات کا ایک ایک بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔ اللہ کے رسولوں کی دعوت' ان کیلئے ایک اجنبی بلکہ مکروہ آواز بن جاتی ہے۔ پھر اللہ کا عذاب حرکت میں آتا ہے اور اچانک ان کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ اب وہ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے بارش والی رات میں باڑے کے ایک کونے میں سمٹی ہوئی بکریاں اور یا اس آدمی کی طرح جو اپنے جھونپڑے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پناہ لئے ہوئے ہو اور سر پر گھٹا تلی کھڑی ہو بادل کڑکتے ہوں اور بجلی کوندرہی ہو کہ اچانک اس کے سر سے چھت اڑ جائے اب وہ جس طرح بے بسی کی تصویر بن کر اور حواس باختہ ہو کر رہ جاتا ہے اسے کچھ نہیں سوجھتا کہ اب وہ کیا کرے یہ لوگ اس سے زیادہ بے بس ہوتے ہیں۔ ان کا سارا کروفر' ان کا سارا ٹھاٹھ باٹھ ان کی ساری سطوتیں ان کی اس بے بسی میں کچھ کام نہیں آتیں' اب موت ان کے شکار میں ہوتی ہے اور یہ موت کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ان پر گزرتی ہے' اس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۴۵ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ''بس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا تھا اور شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے۔ تمام عالم کا رب''۔

پھر ان کی جڑ کاٹ کے رکھ دی جاتی ہے۔ یعنی ان کو دنیا سے مٹا دیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی بداطواریوں کے باعث شجرِ انسانیت کے برگ و بار تو پہلے ہی ضائع کر ڈالے تھے' وہ زمین پر انسانوں کی طرح نہیں بلکہ حیوانوں یا درندوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے اقدار انسانیت کا جنازہ نکال دیا تھا۔ اب لے دے کے ان کی جڑ باقی تھی کیونکہ پہلے مصائب نے ان کو جڑ سے نہیں اکھاڑا تھا اس عذاب نے آ کر انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اس کی تاریخی شہادت دیکھنی ہو کہ کس طرح ایسی قومیں اللہ کے عذاب کا شکار ہو کر دنیا سے مٹائی جاتی رہی ہیں تو اس کیلئے قومِ عادٗ قومِ ثمودٗ قومِ صالح اور قومِ لوط کے کھنڈرات کو دیکھ لینا کافی ہے۔ آغاز کلام میں اسی کا حوالہ دیا گیا تھا کہ اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اچھی طرح سمجھ لو کہ تم بھی انہی راہوں پر چل رہے ہو' جن راہوں پر وہ قومیں چلتی ہوئی تباہی کے انجام سے دوچار ہوئیں۔ اگر تم نے راہ ہدایت اختیار نہ کی تو تم بھی اس انجام سے بچ نہ سکو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا اللہ کا بسایا ہوا ایک چمن ہے' جس میں قومیں رنگا رنگ پھولوں کی طرح بہار دے رہی ہیں۔ جب ان میں کوئی زہریلا درخت پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی ایک ایک چیز بدبو دینے لگتی ہے اس سے نکلنے والی گیس اس سے نکلنے والی شاخیں' اس سے نکلنے والی بو' جب سمیت پھیلانے لگتی ہے تو اللہ جو اس چمن کا نگران ہے وہ شروع شروع میں اسے پھیلنے سے روکتا ہے اور اس کے علاج کی فکر کرتا ہے۔ لیکن جب اس کا پھیلاؤ بڑھنے لگتا ہے تو پھر وہ اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ قوموں کے ساتھ بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایسی قوموں کو ظالم کہا گیا ہے۔ یعنی وہ ظلم کی وجہ سے اپنے برے انجام سے دوچار ہوئیں۔ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کے رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ اسے اس طرح استعمال کرنا جو اس کے استعمال کا طریقہ نہیں۔ یہ لوگ ان معنوں میں ظالم تھے کہ انہوں نے ایک ایک نعمت اور ایک ایک صلاحیت کا غلط استعمال کیا۔

Marfat.com

نے ان کو سر دیا تھا اللہ کے سامنے جھکانے کیلئے انہوں نے غیر اللہ کے سامنے جھکا کر ظلم کیا۔ انہیں دل بخشا گیا تھا اللہ کے تصور اور اس کی محبت سے آباد رکھنے کیلئے۔ انہوں نے تمام طاغوتی قوتوں کو اپنے دل میں بسا کر اس دل سے ظلم کیا۔ اللہ نے ان کو ایک ایک نعمت عطا فرمائی تھی' تاکہ یہ لوگ اللہ کا شکر ادا کریں۔ انہوں نے کفرانِ نعمت کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اس کے نتیجے میں یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچے۔

آج اللہ ظالم قوتوں کی جڑ کیوں نہیں کاٹ رہا؟

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ آج دنیا میں کیسی کیسی ظالم قوتیں ہیں' جنہوں نے انسانیت کا مستقبل ہولناک بنا دیا ہے۔ انسانوں پر وہ ظلم ڈھائے جا رہے ہیں کہ گزشتہ ادوار میں جنہیں ہم قرون مظلمہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایسے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے انسان دشمنی کی کوئی ایسی مثال ہمیں ڈھونڈے سے نہیں ملتی' فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے جو کچھ اس سے پہلے بوسینیا میں ہو چکا ہے' چیچنیا میں جو قیامت گزر گئی' افغانستان میں انسان دشمنی اور درندگی کے جو ریکارڈ قائم کئے گئے اور آج تک ان کا سلسلہ جاری ہے اور کرنے والے ہاتھ وہ ہیں جنہیں اپنی تہذیب و تمدن اور انسان دوستی کے بڑے دعوے ہیں۔ آخر ان ظالموں کی جڑ کیوں نہیں کاٹی جاتی۔ یہ ظالم قوتیں روز افزوں سرفراز کیوں ہیں دنیا ان کے سامنے کیوں بے بس ہوتی جا رہی ہے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اللہ کا ایک قانون ہے کہ جب وہ قومیں جو اللہ کے دین کی علمبردار ہیں اور جنہیں دنیا میں عدل و احسان قائم کرنا ہے۔ اپنے مقصدِ زندگی کو بھول جائیں اور خود اپنے اپنے ممالک میں اللہ کی نافرمانی اور انسانی ظلم کی داستانیں دھراتے ہوئے کبھی اللہ کا خوف محسوس نہ کریں' اللہ اگر انہیں دنیوی جاہ و منزلت اور دولت دنیا کے خزانے حوالے کر دے تو انہیں کفر کی خدمت یا اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے استعمال کریں اور خود دینی قوتوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائیں کہ انہیں دیکھ کر کفر بھی شرمانے لگے تو پھر اللہ تعالیٰ ان ظالم قوتوں سے وہ کام لیتا ہے' جو ایک ڈاکٹر ایک سڑ جانے والے عضو کو کاٹنے اور اسے انسانی جسم سے الگ کرنے کیلئے خنجر اور نشتر سے لیتا ہے۔ پھر دنیا میں بظاہر اسلامی خلافت بھی موجود ہو تو تقدیر چنگیز خان کے نشتر سے مسلمان امت کا آپریشن کرتی ہے' تاکہ اس سے فاسد مادہ نکلے اور اس میں نشاۃ ثانیہ کے امکانات پیدا ہوں اور اگر مسلمان اپنی اصل حیثیت کو برصغیر میں گم کر دے تو تیمور جیسے لوگوں سے تقدیر آپریشن کے نشتر کا کام لیتی ہے۔ اسی کو اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ

ع تقدیر کے نشتر ہیں تیمور ہوں یا چنگیز

قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

"اسی طرح ہم ظالموں کو ظالموں پر مسلط کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے انہیں سزا دلواتے ہیں" (الانعام:۱۲۹)

یہ آج جو کچھ ہو رہا ہے' یہ امت مسلمہ کو ان کے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔ عوام نے جس طرح ظالموں کو برداشت کیا یا ظالموں کی خوشامد کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے ظلم کی تائید کی اور دونوں نے مل کر اللہ کے دین کا راستہ روکا اور بعض علاقوں میں دین کے حوالے سے بے حسی اور بے اعتنائی کا ثبوت دیا گیا اور مجموعی طور پر دنیا کو اپنا مقصد زندگی بنا کر دین کو اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا اور غضب خدا کا پورے عالمِ اسلام میں کہیں بھی اللہ کی حاکمیت کو نافذ کرنا تو دور کی بات ہے' برداشت بھی نہیں کیا گیا اور جو قوتیں اس کیلئے کوشاں ہیں انہیں اپنے اپنے ملکوں میں نہ صرف اجنبی بنا دیا گیا بلکہ انہیں اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا اور اب رفتہ رفتہ انہیں ایک گالی بنا دیا گیا ہے۔ یہ وہ اعمال ہیں' جس کی پاداش میں امت مسلمہ آج عذاب کی گرفت میں ہے اور مغربی قوتوں

Marfat.com

سے ان کے اعمال کی سزا دلوائی جا رہی ہے۔ آج اس عذاب سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ امت مسلمہ مجموعی طور پر یا اس کا کوئی ایک ملک اسلام کا نمائندہ بن جائے۔ اسلام کو اپنا آئین بنا کر زندگی کے ہر شعبے کو اسلام کی تحویل میں دے دے اور پھر اول و آخر اسلام کا نمائندہ بن کر اپنے ملک کی ترقی کے اسباب پیدا کرے اور حکمت و بصیرت سے کام لیتے ہوئے مشکلات میں اپنے لئے راستہ نکالے۔ شروع میں قدرت کی طرف سے ان کے اخلاص کی آزمائش ہوگی' لیکن بالآخر یہ ملک ایک عظیم قوت بن کر اٹھے گا اور قدرت ان کو اسی طرح نوازے گی جیسے قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کو نوازا گیا۔ پھر آج کی ظالم قوتیں یا اس کے سامنے جھک جائیں گی یا مٹ جائیں گی۔ تاریخ کے ہر دور میں قدرت کا یہی قانون کارفرما رہا ہے اور آج بھی اللہ کی اس سنت کے بدل جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ''وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' یعنی ہر طرح کا شکر اور ہر طرح کی تعریف اس اللہ کیلئے ہے' جو جہانوں کا رب ہے۔ یعنی جس کی صفت ربوبیت نے تمام انسانوں کو زندگی کے امکانات عطا فرمائے ہیں۔ وہ ایک بچے سے لے کر بوڑھے تک اور ایک عام فرد سے لے کر ایک قوم تک اور قوم سے لے کر تمام اقوام دنیا تک صرف زندگی ہی نہیں دیتا بلکہ زندگی کے امکانات زندگی کے اسباب زندگی کے وسائل ظاہری اور معنوی' ہر حیثیت سے عطا کرتا ہے کیونکہ وہ سب کا رب ہے' سب کا پالنہار ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے اس طرح زندگی کے اسباب فراہم کر کے زندگی کو عام کیا ہے' وہ کبھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ دنیا میں زندگی دشوار بنادی جائے۔ چنانچہ جب ایسی قومیں سر اٹھاتی ہیں' جو دنیا میں زندگی کو دشوار کر دیتی ہیں تو پھر ان کو مٹا دینے اور ان کی جڑ کاٹ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی قوت کو ختم کر دیا ہے جو انسانی زندگی کیلئے تباہ کن اور مہلک تھی اور جس کی موجودگی میں باقی انسانیت کے پھلنے پھولنے کے امکانات روز بروز کم ہوتے جا رہے تھے۔ ایسی قوت کی موت گویا دوسروں کیلئے زندگی کا پیغام ہے۔ اس لئے جب ایسا کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو جس طرح ایک بدمعاش اور ڈاکو کے مر جانے سے پوری بستی سکھ کا سانس لیتی ہے اور اس پر اللہ کا شکر بجالاتی ہے اسی طرح ایسی قوم کے تباہ کر دینے سے پوری نوعِ انسانی' بلکہ کائنات کی دوسری مخلوقات بھی اللہ کی تعریف میں رطب اللساں ہوتی ہیں اور اس کا شکر ادا کرتی ہیں۔ سورۃ البقرہ اور دوسرے پارے کے آخر میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اگر ہم اس طرح بعض قوموں کو تباہ نہ کرتے تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اہل دنیا پر بہت فضل و کرم کی نگاہ رکھتا ہے۔ اس لئے وہ ظالم قوتوں کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ اس لحاظ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مغربی قوموں کا ظلم جس حد تک پہنچ چکا ہے' شاید وہ تاریخ میں زیادہ عرصہ تک اپنا رویہ باقی نہ رکھ سکیں۔ امت مسلمہ کیلئے یہ ایک موقع ہے کہ وہ اپنے فرض کو پہچانے اور اللہ کے دین کی علمبردار بن کر شہادتِ حق کا فرض انجام دینے کیلئے اٹھ کھڑی ہو۔ اس کے نتیجے میں اللہ کا یہ قانون ضرور حرکت میں آئے گا کہ وہ کمزوروں کو طاقت عطا فرماتا ہے اور ظالم قوتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

یہاں ایک اور بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ ان آیات میں جو کچھ فرمایا جا رہا ہے اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں' جو بار بار اللہ کے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کے سامنے اللہ نے اپنی سنت کو پوری تفصیل سے بیان فرما کر یہ واضح کر دیا ہے کہ ہم کسی بھی قوم پر عذاب لانے سے پہلے پوری طرح اس پر اس کو بروئے کار لاتے ہیں جو اس کیلئے ضروری ہے اور اس قوم پر پوری طرح اتمام حجت کرتے ہیں تاکہ کل کو وہ کوئی عذر پیش نہ کر سکیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تاریخی طور پر پہلی معذب قوموں کا حوالہ دے کر مشرکین مکہ اور ان عذاب کا مطالبہ کرنے والوں پر یہ بات کھول دی گئی ہے کہ جو لوگ اس طرح عذاب کا مطالبہ جاری رکھتے ہیں انہیں کبھی ہدایت سے نوازا نہیں جاتا۔ وہ بالآخر اس عذاب کی گرفت میں آکر رہتے ہیں۔ اس لئے اے مشرکین مکہ! اگر تم نے یہ سلسلہ جاری رکھا اور اپنی روش سے باز نہ آئے تو بالآخر تم بھی اسی انجام کو پہنچو گے' جس انجام سے پہلی امتیں دوچار ہو چکی ہیں۔

Marfat.com

مشرکین مکہ کے مطالبۂ عذاب پر بہت کچھ کہا جاچکا' لیکن اگلی آیت کریمہ میں ایک دوسرے پہلو سے اسی مطالبہ کا جواب دیا جارہا ہے: ارشاد ہوتا ہے۔

آیت:۴۶ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ط اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ O ''کہو! بتاؤ اگر اللہ تمہارے سمع و بصر کو سلب کر لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے' جو اس کو واپس لا دے؟ دیکھو! کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں' پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں''۔

رسول اللہ ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ ان مشرکین مکہ سے کہئے کہ تم جو بار بار اللہ کے عذاب کا مطالبہ کر کے اپنی تباہی اور ہلاکت کو دعوت دے رہے ہو' تمہیں شاید یہ گمان ہے کہ ایسے عذاب کا لانا شاید اللہ کی قدرت سے بہت مستبعد بات ہے حالانکہ اگر تم اپنی قوتوں اور صلاحیتوں پر غور کرو جن کی وجہ سے تم زندگی اور دنیا کے مزے لوٹ رہے ہو اور اس میں ایسے اندھے ہوئے ہو کہ نہ تمہیں اللہ کی نشانیاں نظر آتی ہیں اور نہ تمہیں اپنا انجام دکھائی دیتا ہے۔ ذرا ان قوتوں ہی پر تھوڑا سا غور کر لو کہ تمہاری تمام معلومات کا دارومدار بنیادی طور پر تمہارے سمع و بصر پر ہے۔ تمہارے مشاہدات کی دنیا تمہاری قوت بصر کے نتیجے میں ہے اور تمہارے منقولات اور محسوسات کی تمام کائنات تمہاری قوت سمع سے وابستہ ہے۔ اگر یہ دو قوتیں تم سے چھین لی جائیں تو بتاؤ! یہ اس دنیا میں تم کیسے زندگی گزارو گے؟ تمہارے زندگی سے مزہ اٹھانے اور زندگی گزارنے کے یہی دو ذریعے ہیں۔ اگر تمہیں ان دونوں سے محروم کر دیا جائے تو یہ زندگی تمہارے لئے عذاب بن جائے۔ تم ہر قدم اٹھانے اور ہر کام کرنے سے پہلے' سو دفعہ اللہ سے پناہ مانگو گے کہ میں کس عذاب میں مبتلا کر دیا گیا ہوں۔ پھر جہاں تک تمہاری معنوی رعنائیوں کا تعلق ہے اور تمہارے باطنی احساسات کی دنیا جس سے قائم ہے وہ تمہارا دل ہے۔ اگر اس پر مہر کر دی جائے اور اس کو ماؤف اور معطل کر دیا جائے تو تمہارے اندر کی دنیا اندھیر ہو کر رہ جائے۔ آدمی بعض دفعہ کوئی بات نہ دیکھ سکتا ہے' نہ سن سکتا ہے۔ لیکن اپنے باطنی احساسات میں مگن رہ کر تنہائی اور بے بسی میں بھی وقت گزار لیتا ہے۔ لیکن اگر یہ دولت اس سے چھین لی جائے تو اب اس میں اور جمادات میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ کیا ایسی زندگی کا تصور بھی ایک انسان کیلئے عذاب سے کم ہے۔ تم اللہ سے عذاب مانگتے ہو' ذرا اندازہ تو کرو۔ اس بڑے عذاب کو تو چھوڑ' خود تمہاری زندگی کس قدر عذاب کے قریب ہے اور تم کس قدر اپنے انجام کی گرفت میں ہو۔ لیکن تمہیں بجائے اس کے کہ اس کا ہوش پیدا ہو' تم بار بار اللہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو۔

اس بات کی طرف بھی اشارہ محسوس ہوتا ہے کہ تم جو بار بار رسول اللہ ﷺ سے کوئی نہ کوئی نشانی مانگتے ہو' حالانکہ تمہارے پاس یہ قوتیں' جن کے ذریعے سے تم زندگی کی خوشیوں سے متمتع ہو رہے ہو' بجائے خود اللہ کی کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک نشانی بھی تم سے چھن جائے' تب تمہیں اندازہ ہو کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ آنکھ ہی کو دیکھ لو۔ یہ اس کی رحمتوں کا خزانہ ہے' جس کے نتیجے میں انسان پر لطف و لذت کی ایک ایسی بے کراں دنیا وجود میں آتی ہے کہ جس کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے' جب آدمی اس نعمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کسی اندھے سے پوچھ کر دیکھئے کہ طلوع صبح کا حسن کیا ہوتا ہے۔ شام جب پردۂ شب میں محجوب ہوتی ہے تو وہ کیسے کیسے تسکین و اطمینان کے خزانے لٹا کے جاتی ہے۔ رات کا آرام و راحت اپنے اندر قدرت کی کتنی بڑی دولت کا حامل ہے۔ زمین پر پھیلے ہوئے بے کراں مناظرِ حسن اور آسمان پر سورج چاند اور ستاروں کی پھیلی ہوئی خوبصورت کائنات اللہ کی کتنی بڑی عنایت ہے۔ آدمی ان میں سے کسی ایک بات پر بھی غور کرے تو وہ کبھی اس کی گرفت سے نکل نہ سکے۔ اسی طرح یہ کان کا ایک چھوٹا سا پرزہ' جس کے نتیجے میں ہم چڑیوں کے چہچہوں سے لے کر آواز اور سُر کے بے کراں سمندر سے جس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں اور جس طرح کانوں کے ذریعے

Marfat.com

سرود وغنا کی آبشار آدمی کے اندر گرتی ہے کبھی آدمی اس نعمت کی وسعتوں پر غور کرے تو شاید اسے اس نعمت کی کسی حد تک قدر و قیمت کا احساس ہو سکے۔ اللہ نہ کرے کوئی آدمی خطرے میں گھر جائے اور قوت سماعت جواب دے جائے تو مدد دینے والے اس کو مدد دینے کیلئے چیختے رہیں وہ محض اس نعمت سے محرومی کے باعث کسی کو مدد کیلئے پکار بھی نہیں سکے گا۔ یہ بظاہر ایک مختصر سا آلۂ سماعت ہے اور آنکھ بظاہر دو سوراخوں کا نام ہے' لیکن اگر اللہ نہ کرے کوئی آدمی اس سے محروم ہو جائے تو دنیا بھر کے سائنسدان اس نعمت سے آدمی کو بہرہ ور نہیں کر سکتے۔ کسی سائنسدان کی پوتی کھیلتی ہوئی اس کی لیبارٹری میں چلی گئی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا تو نجانے کیسے کان پر نظر آ کر رک گئی۔ سائنسدان اٹھ کر اپنی اس بچی کے پاس آیا اور اس کے کان کو پکڑ کر کہنے لگا: بظاہر یہ ایک چھوٹا سا آلہ ہے' لیکن یہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اگر یہ ضائع ہو جائے تو ہم سارے سائنسدان مل کر اسے نہیں بنا سکتے اور پھر رک کر کہنے لگا کہ جس ذات نے یہ آلہ سماعت پیدا کیا ہے' کیا وہ ذات خود نہیں سنتی ہو گی اور دل تو ایک ایسی عظیم نعمت ہے کہ نہ صرف کہ زندگی کا سررشتہ اس سے وابستہ ہے بلکہ انسانی احساسات' تخیلات' تصورات' خوشی اور غم کی لہریں' وہ سب اسی مرکز سے اٹھتی ہیں۔ نیکی اور بدی کے تصورات' یہیں جنم لیتے اور یہیں جڑ پکڑتے ہیں۔ اگر یہ گھروندا مسمار ہو جائے تو انسانیت کا گھر اجڑ جاتا ہے۔ اندازہ فرمایئے! یہ اللہ کی کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔ کیا ان نشانیوں کے بعد بھی یہ لوگ اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں؟ اگر نشانی کا مطالبہ کسی بات کو سمجھنے کیلئے ہے تو اس کیلئے تو یہی نشانیاں کافی ہیں اور اگر محض بات کو الجھانے کا ارادہ ہو تو پھر اس بکھیڑے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کیلئے آدمی کی فاسد نیت ہی کافی ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ دیکھو! ہم کیسے مختلف پہلوؤں سے اپنی آیتیں پیش کرتے ہیں۔ کس طرح ہم بات کو سمجھاتے ہیں' کس طرح ہر بات کو پانی کیے دیتے ہیں تاکہ سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ لیکن انکار کرنے والوں کو دیکھو کہ وہ پھر بھی اس سے اعراض کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کی طرف سے تو اس کے سارے انکار کے باوجود افہام و تفہیم اور تبشیر و انذار کی صورت میں رحمت کی برکھا برس رہی ہے اور ادھر یہ پتھر بنے سنگدلی کا ثبوت دیتے ہوئے بات کے انکار پر تلے ہوئے ہیں۔ بس ان کا حال ایسا ہی ہے' جیسے کسی شاعر نے کہا کہ

ادھر لاکھ سخن یوں اضطراب میں
اُدھر ایک خاموشی میرے سب کے جواب میں

انسانوں کا باہم یہ معاملہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن اللہ کی نظر التفات جس کو کائنات ترستی ہے اور جس کے نتیجے میں زندگی عطا ہے' اس کے ساتھ یہ معاملہ صرف بدنصیب ہی کر سکتے ہیں اور مشرکین مکہ ایسے ہی بدنصیب لوگ تھے۔

اسی مطالبۂ عذاب کے حوالے سے اگلی آیت کریمہ میں ایک اور پہلودار بات فرمائی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۴۷ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ O ''پوچھو! بتاؤ کہ اللہ کا عذاب تم پر بے خبری میں اچانک آ دھمکے یا ڈنکے کی چوٹ آئے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہو گا؟''۔

اس آیت کریمہ میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً ۔ ''بَغْتَةً'' کے معنی کسی چیز کے اچانک و فعتاً بغیر کسی نوٹس کے بالکل بے خبری میں آ جانے کے ہیں' ''جَهْرَةً'' کے معنی ہیں' کھلم کھلا ڈنکے کی چوٹ' دن دھاڑے۔ یعنی اے پیغمبر! ان سے پوچھئے کہ جس عذاب کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں وہ چپکے سے یا کھلم کھلا دن دھاڑے آ جائے تو کیا انہوں نے اس کو روکنے کا کوئی انتظام کر رکھا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس سے بچنے کیلئے ایسے انتظامات کر لئے ہیں کہ وہ عذاب ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر کچھ ایسے انتظامات نہیں ہیں اور ظاہر ہے اللہ کے عذاب سے بچنے کیلئے کوئی بھی انتظام ممکن نہیں تو یہ

Marfat.com

آخر کس برتے پر اللہ کے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی احمقانہ بات ہے' جس کی امید کسی پاگل سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ان کی جسارت کی داد دیجئے کہ یہ مسلسل اس کا مطالبہ کئے جا رہے ہیں اور دوسری یہ بات کہ اگر یہ عذاب آ جائے تو انہیں خوب معلوم ہے کہ اس کا نشانہ کون بنے گا یہ بجلی اگر گری تو انہیں خوب اندازہ ہے کہ کس کا گھر جلے گا۔ اس لئے کہ اللہ کا عذاب تو ہمیشہ اس کے نافرمانوں پر آتا ہے۔ ان لوگوں پر آتا ہے' جو اللہ کی بجائے کسی اور کو خدا مانتے ہیں۔ جنہوں نے دنیا میں اس کے شریک بنا رکھے ہیں وہ زندگی اس کے احکام کے مطابق گزارنے کی بجائے' اس کی معصیت میں گزارتے ہیں اور وہ کھلم کھلا اس کی عظمت و کبریائی کو تسلیم کرنے کی بجائے' اس کی حاکمیت کو چیلنج کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ رویہ مسلمانوں کا تو نہیں مشرکین مکہ کا ہے تو پھر جب بھی عذاب آیا تو یہی لوگ اس کی زد میں آئیں گے تو یہ ظالم لوگ خود اپنی شامت کو دعوت کیوں دے رہے ہیں۔ دراصل یہاں جو بات فرمائی گئی ہے' گزشتہ آیات میں جس سنت اللہ کا تذکرہ ہوا ہے یہ اسی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ جس قوم میں اللہ کے رسول آتے ہیں' جب وہ قوم اللہ کے رسولوں کو ماننے سے انکار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو متنبہ کرنے کیلئے' ان کو مختلف قسم کی تکالیف میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن ان تکالیف میں جس طرح کافر مبتلا ہوتے ہیں' اسی طرح مسلمان بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ کافر یا تو ان تکلیفوں سے متاثر ہو کر راہ راست کی طرف آ جاتے ہیں اور اللہ کو پہچان کر اس کا دین اختیار کر لیتے ہیں اور یا ان کے دل مزید سخت ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ کے دین کے خلاف اور کھل کھیلتے ہیں۔ مسلمان ان تکالیف میں مبتلا ہو کر اللہ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان تکلیفوں سے اللہ کے ساتھ ان کا رشتہ اور مضبوط ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان مصائب پر صبر کے نتیجے میں ان کی سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی ہے اور اس میں اور زیادہ جلا پیدا ہوتی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ان تکالیف کا سامنا جس طرح کافروں کو کرنا پڑتا ہے مسلمان بھی کرتے ہیں۔ لیکن جب اللہ کا عذاب آ جاتا ہے تو اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو اس علاقے سے نکال لیا جاتا ہے اور عذاب کا شکار صرف کافر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی قوم پر اللہ کا عذاب آیا تو ان کی طرف آنے والے رسول کو اپنے ماننے والوں سمیت ہجرت کر جانے کا حکم دیا گیا۔ تمام معذب قوموں کی تاریخ پڑھ جایئے' آپ کو ہر طرف یہ اصول کارفرما دکھائی دے گا۔ سورۃ انفال میں اسی اصول کا تذکرہ کرتے ہوئے کافروں کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اے پیغمبر! جب تک آپ ان میں ہیں' اس وقت تک ہم ان کو عذاب نہیں دیں گے۔ مطلب یہ کہ جب ہم ان کو عذاب دینے کا فیصلہ کریں گے تو آپ کو وہاں سے نکال لیں گے اور آپ کے متبعین بھی آپ کے ساتھ ہجرت کر کے عافیت کی جگہ پر چلے جائیں گے۔ یہاں اسی اصول کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ نادانو اس عذاب کا شکار تو تمہیں ہی ہونا ہوگا' مسلمان تو اس کے فضل و کرم سے بچا لئے جائیں گے تو پھر تم آخر کس کیلئے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو۔

اگلی آیت کریمہ میں پیغمبروں کی اصل حیثیت کو واضح کیا جا رہا ہے تاکہ قومیں جو بار بار ان سے عذاب کا مطالبہ کرتی ہیں' ہو سکتا ہے ان کی اصل حیثیت کو جاننے کے بعد اپنے رویے پر نظر ثانی کریں۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۴۸-۴۹ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ ''اور ہم رسولوں کو تو صرف خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے ہی بنا کر بھیجتے ہیں۔ تو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اصلاح کر لی' ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم ہوگا' اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا' ان کی نافرمانی کی پاداش میں' ان کو عذاب پکڑے گا''۔

انبیاء و رسل کی اصل حیثیت:

جب بھی اللہ کا کوئی رسول کسی قوم کی طرف ان کی ہدایت کیلئے آیا تو عموماً اس قوم کا رویہ یہ رہا کہ ان کے اندر شاید ان کا کوئی دشمن اتر آیا ہے یا

Marfat.com

کوئی ایسا اجنبی ہے جس نے ان سے ایسی باتیں کہنا شروع کر دی ہیں' جس کا سننا بھی ان کو گوارا نہیں حالانکہ رسول ان کے پاس ایک حیات بخش پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ بالکل ان سے سامنے کی باتیں کہتا ہے کہ اللہ تمہارا خالق ہے' تم اس کی مخلوق ہو' تمہیں وہ رزق دیتا ہے' اسی نے تمہیں اولاد دی ہے' یہ زندگی کا سروسامان سارا اسی کا عطا کردہ ہے۔ خود یہ زمین' یہ تمہارا ملک' یہ اسی کی ملک ہے۔ تمہاری تمام صلاحیتیں' تمہارے جسم و جان کی رعنائیاں' سب اسی کی دین ہیں۔ میں تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ اس کی ان تمام نعمتوں اور تمام احسانات کا تم پر کوئی حق بھی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس حق کو کس طرح ادا کرنا ہے اور اس کا کیا جواب دینا ہے۔ اسی طرح میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے اور اس کا تم سے کیا رشتہ ہے۔ وہ تم سے کن باتوں کی وجہ سے راضی ہوتا ہے اور کن سے ناراض ہوتا ہے۔ خود تمہارے باہمی رشتوں کے حقوق و فرائض کیا ہیں۔ تمہیں یہاں کیسی زندگی گزارنی چاہئے' جس کے نتیجے میں تمہیں یہاں ایک اچھی زندگی میسر آئے۔ تم خوف اور حزن سے بچ جاؤ' تمہارے اندر آپس کی تلخیاں پیدا نہ ہوں' جان مال اور عزت و آبرو ہر چیز سلامت رہے اور موت کے بعد بھی جو زندگی آنے والی ہے' اس میں بھی تمہیں سرخروئی نصیب ہو۔ اندازہ فرمایئے! ان میں سے ہر بات آدمی کی گم شدہ متاع ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ لوگ اس رسول کی طرف لپکتے ہوئے جائیں اور اپنی زندگی کے اسرار اور زندگی گزارنے کے طریقوں کا علم اس سے سیکھیں۔ لیکن بالکل اس کے برعکس نجانے اس سے کیوں دشمنی شروع کر دی جاتی ہے اور کیوں ان کا راستہ روکنا' وہ اپنی زندگی کا فرض سمجھ لیتے ہیں۔ اس لئے یہاں اس آیت کریمہ میں مشرکین مکہ کو یہی بات سمجھائی جا رہی ہے کہ نادانو! اللہ کا آخری رسول تمہیں زندگی دینے کیلئے آیا ہے اور ایک زندگی بخش پیغام لے کر تمہارے پاس آیا ہے۔ تم بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے اس سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو۔ کہا باقی رسولوں کی طرح اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ تمہیں یہ بتانے کیلئے آیا ہے کہ دیکھو! اگر اللہ کی فرمانبرداری میں زندگی گزارو گے تو ہم تمہارے پاس بشارتیں لے کر آئیں گے اور اگر اس کی نافرمانی کرو گے تو پھر ہم تمہارے انجام سے تمہیں خبردار کرنے کیلئے آئے ہیں' یہ ہماری اصل حیثیت ہے۔ اس میں ہم سے لڑنے اور بار بار عذاب کا مطالبہ کرنے کی آخر کیا تک ہے؟ رہی یہ بات کہ اگر تم ہماری دعوت کو قبول کر لو گے تو ہم اس پر تمہیں کیا بشارت دیں گے۔ اس کی وضاحت اسی آیت کے دوسرے جملے میں فرمائی گئی۔ فرمایا:

فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

"تو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اصلاح کر لی تو ان کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ کوئی غم"

میں نہیں سمجھا کہ اس سے بڑھ کر ایک آدمی کیلئے کیا بشارت ہو سکتی ہے۔ ایمان لا کر خود اس کی اپنی جہت متعین ہو جاتی ہے اور اصلاح کے نتیجے میں وہ ایک صاف ستھرے اور اجلے کردار کا مالک بن جاتا ہے اور اس کے بعد یہ بات کہ نہ اسے مستقبل کا کوئی خوف ہو گا اور نہ ماضی کی محرومیاں کبھی اسے پریشان کریں گی۔ یہی تو دو باتیں ہیں' جن کے حصول کیلئے دنیا سرگرداں ہے۔ دنیا بھر کے علم و ادب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں اور عقل و دانش کا سارا سرمایہ اسی کے حصول میں صرف ہو رہا ہے لیکن ناکامیاں ہیں کہ وہ بار بار انسان کا مقدر بنتی جا رہی ہیں تو جو اللہ کے رسول یہ عظیم نعمت لے کر آئے ہیں اور اتنی بڑی خوشخبری سنانے کیلئے آئے ہیں' اس کی طرف تو یہ سمجھتے ہوئے لپکنا چاہئے کہ

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اور دوسری ان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ خبردار کرنے کیلئے آئے ہیں۔ اس کی وضاحت دوسری آیت میں فرمائی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

"اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا' ان کی نافرمانی کی پاداش میں' ان کو عذاب پکڑے گا"۔

Marfat.com

دنیا میں ہر خطرے سے آگاہ کرنے والے اور ہر مصیبت سے بچانے والے کو اپنا سب سے بڑا محسن خیال کیا جاتا ہے۔ دنیا و آخرت کا سب سے بڑا خطرہ اللہ کی ناراضگی اور اس کے نتیجے میں اس کی طرف سے ملنے والا عذاب ہے۔ یہ رسول اسی سے خبردار کرنے اور بچانے کیلئے آتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ دنیا ان سے وہی ایمان و ہدایت کا راستہ سیکھے' جس سے وہ دنیا کی سعادتوں کی مستحق بنے اور اللہ کے عذاب سے بچ جائے۔ لیکن یہ مشرکین مکہ اور اسی طرح کی باقی کافر قومیں' بجائے اس کے کہ اللہ کے رسول سے یہ سبق سیکھیں' وہ بار بار کبھی اس سے عذاب کا مطالبہ کرتی ہیں' حالانکہ وہ عذاب کیلئے دنیا میں نہیں آتے' بلکہ عذاب سے بچانے کیلئے آتے ہیں اور کبھی قسم قسم کی نشانیاں ان سے مانگی جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ زندگی کے مسائل حل کرنے کیلئے آتے ہیں اور انسانوں کیلئے انسانی زندگی کو آسان کرنے اور مشکلات سے بچنے کے طریقے سکھانے کیلئے آتے ہیں' کسی شعبدہ بازی کیلئے تشریف نہیں لاتے۔ خوارق و عجائب کا ظہور رسولوں کے خصائص میں سے نہیں اور نہ ان کی تعلیم و دعوت کے لوازم میں سے ہے۔ بلکہ اگر ان کا ظہور ہوتا بھی ہے تو محض اتمام حجت کیلئے ہوتا ہے۔ لیکن لوگ ہمیشہ ان سے اسی طرح کی باتوں کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں لوگوں کے سامنے پیغمبروں کی اصل حیثیت کو بیان کرنا مقصود ہے' وہیں شاید رسول اللہ ﷺ کیلئے ایک تسکین و تسلی کا پیغام بھی ہے کہ آپ کا چونکہ کام صرف تبشیر و انذار ہے تو آپ کی ساری توجہات اسی طرف رہنی چاہئیں۔ رہے مشرکینِ مکہ کے وہ مطالبات جن کا تعلق آپ کے فرائض سے نہیں' آپ ان کو خدا پر چھوڑ دیجئے' ان کی وجہ سے کبھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

قوموں کے راہ ہدایت اختیار کرنے میں جو چیزیں موانع ثابت ہوئی ہیں اور جن کی وجہ سے لوگ پیغمبروں سے عجیب و غریب مطالبات کرتے رہے' بلکہ ایمان لانے والی قومیں بھی اپنے دور زوال میں جن اسباب سے گمراہ ہوتی رہیں' ان میں سب سے بڑا سبب اللہ کے نبیوں اور اس کے رسولوں کی اصل حیثیت کو نہ سمجھنا ہے۔ کافر دشمنی میں آ کر مخالفتوں اور اذیتوں کی انتہا کر دیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اس پر انہیں عذاب سے ڈراتا ہے تو وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔ گزشتہ آیت میں اس حوالے سے پیغمبروں کی حیثیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن غلط فہمی کی بنیاد صرف یہی نہیں' بلکہ اور بھی چند در چند غلط فہمیوں کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ اس مخالفتوں اور اذیتوں کے طوفان اٹھنے سے پہلے بہت سارے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں' جو پیغمبر کے بارے میں غلط تصورات رکھتے ہیں' اس لئے پیغمبر پر ایمان نہیں لاتے کہ وہ انہیں اپنے تصورات کے مطابق دکھائی نہیں دیتا۔ انہوں نے اپنے تصورات میں یہ بات بٹھا رکھی ہوتی ہے کہ پیغمبر مافوق الفطرت مخلوق ہوتا ہے۔ وہ انسانوں میں سے کوئی انسان نہیں ہوتا' اس کی صفات غیر معمولی ہوتی ہیں' اس کے ساتھ اللہ کے خزانے اترتے ہیں' وہ کاہنوں سے بڑھ کر غیب کی اطلاعات دیتا ہے' بلکہ وہ عالم الغیب ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ پیغمبر میں اس طرح کی باتیں نہیں دیکھتے تو پھر وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یقیناً یہ پیغمبر نہیں۔ آنحضرت ﷺ کے بارے میں بھی مشرکین مکہ نے یہی طرز عمل اختیار کیا۔ قرآن کریم نے ان کی بات کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

قَالُوْا مَا لِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ط

''وہ کہتے ہیں' یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ (الفرقان: ۷)

یعنی وہ ہماری طرح کھانا کھاتا ہے' کاروبار کیلئے بازار جاتا ہے ضروریات کیلئے بازار کا رخ کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تو ہماری طرح ایک آدمی ہے۔ حالانکہ آدمی کو پیغمبر یا پیغمبر کو آدمی نہیں ہونا چاہئے اور جب یہ دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ بھی بعض دفعہ آنے والے حالات میں دشواریوں کا شکار ہوتے ہیں وہ حیران ہوتے کہ یہ کیسا پیغمبر ہے' جو غیب کے حالات سے واقف نہیں۔ مختصر یہ کہ جس طرح سابقہ آیت میں پیغمبروں کی حیثیت کے

Marfat.com

حوالے سے ان کی بعض غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے‘ اسی طرح آنے والی آیت کریمہ میں ایک دوسرے پہلو سے ان کے تصورات کی اصلاح فرمائی گئی ہے اور اس آیت میں اس طرح کھول کر بات کہی گئی ہے‘ گویا اس حوالے سے حرف آخر کہہ دیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۵۰ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ’’کہہ دو! میں تمہارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں‘ جو مجھ پر آتی ہے۔ کہہ دو! اندھے اور بینا‘ دونوں یکساں ہو جائیں گے‘ کیا تم غور نہیں کرتے؟‘‘۔

حضور ﷺ کے متعلق اختلافات کو دور کرنے کا واحد ذریعہ قرآن ہے:

ایک دفعہ میرے ایک بہت عزیز دوست نے مجھ سے کہا کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں علماء میں بعض اختلافات کا تذکرہ ہم سنتے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہم خود بھی ان اختلافات کا شکار ہوتے ہیں۔ تو میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کی ضرور مدد کروں گا۔ لیکن میں اس کیلئے طریقہ ذرا مختلف اختیار کروں گا کیونکہ اگر میں مروج طریقہ اختیار کروں تو ممکن ہے آپ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔ مروج طریقے سے میری مراد یہ تھی کہ آپ کوئی بات مجھ سے پوچھیں تو اس میں جو میری رائے ہو میں اسے دلائل سے ثابت کر دوں۔ اس سے آپ بظاہر مطمئن بھی ہو جائیں تو واقعہ یہ ہے کہ وہ تو میری رائے کی نمائندگی ہوگی۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو کچھ میں ثابت کروں وہ پورا حق نہ ہو یا کم از کم آپ اس کے بارے میں یکسو نہ ہوں۔ اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ترجمے والا قرآن پاک جو آپ کی نظر میں قابل اعتماد ہو وہ آپ لے کر بیٹھ جائیں۔ جو اختلافی بات آپ مجھ سے پوچھنا چاہتے ہیں‘ وہ پوچھیں۔ میں بجائے اس کے کہ اپنی طرف سے کچھ کہوں میں آپ کے سامنے ایک یا ایک سے زیادہ آیات قرآنی پڑھوں گا آپ قرآن کریم کھول کر اس کا ترجمہ دیکھ لیجئے۔ آپ ماشاءاللہ پوسٹ گریجوایٹ ہیں عربی بھی ممکن ہے تھوڑی بہت جانتے ہوں‘ اس لئے آپ کو ترجمہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی اور آپ یقیناً صحیح بات تک پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہماری چند گھنٹے نشست رہی‘ وہ ایک ایک سوال کرتے رہے اور میں قرآن کریم کی آیات کھول کر ان کے سامنے رکھتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام اختلافی امور میں بالکل یکسو ہو گئے۔ میں آپ سے بھی یہی کہتا ہوں کہ دیکھ لیجئے! آنحضرت ﷺ کے بارے میں ہمارے یہاں کس طرح اختلافی باتیں کی جاتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ اگر ہم بھی یہی طریقہ اختیار کریں کہ بجائے ادھر ادھر کی لمبی چوڑی باتیں کرنے کے قرآن کریم کو کھلی آنکھوں سے پڑھیں کیونکہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کوئی عقائد سے متعلق بات جس کا تعلق ہمارے ایمان سے ہے یہ ممکن نہیں کہ قرآن کریم نے اسے کھول کر بیان نہ کیا ہو۔ احکام اور آداب زندگی کی تفصیلات تو ہم حدیث اور سنت میں دیکھتے ہیں۔ لیکن عقائد میں سے کوئی عقیدہ ایسا نہیں‘ جو اساسی عقائد میں سے ہو قرآن کریم نے اسے کھول کر بیان نہ کیا ہو۔ اس لئے ہمارے لئے بھی یہی ایک عافیت کا راستہ ہے کہ ہم ایسے اختلافی معاملات میں قرآن پاک کو حکم بنائیں۔ اس لئے میں ہمیشہ قرآن پاک کے پڑھنے پڑھانے پر اصرار کرتا ہوں کہ ہم نے اس سے تعلق توڑ کر اور اس سے بے خبر رہ کر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہت نقصان اٹھایا ہے۔ کم از کم اب اس سے توبہ کرنی چاہئے۔

حضور ﷺ قرآن کی نظر میں:

اب اس آیت کریمہ کو دیکھئے کہ کس طرح ایک ایک بات کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور مشرکین مکہ اور بعض دوسری قوموں کی اللہ

Marfat.com

پیغمبروں کے حوالے سے جو غلط فہمیاں تھیں' ان کا کس طرح سدِّ باب کیا گیا۔ سب سے پہلے اس بات کا تذکرہ کیا گیا' جس کا عموماً مشرکین مکہ طعنہ بھی دیتے تھے اور مطالبہ بھی کرتے تھے کہ آپ کیسے اللہ کے نبی ہیں' جن کے سر پر صرف فقر کا تاج ہے اور غربت جس کا اوڑھنا بچھونا ہے؟ اگر آپ واقعی اللہ کے نبی ہوتے تو آپ کے ساتھ دولت کے خزانے دائیں بائیں چلتے یا آپ کی دسترس میں ہر وقت اس طرح خزانے رہتے کہ لوگ جو کچھ مانگتے' آپ ان کو عطا کرتے؟ گویا یہ تصور کرلیا گیا کہ خزانوں پر براہ راست دسترس اللہ کے نبیوں کو ہوتی ہے۔ وہ جس طرح چاہیں' اس میں تصرف کریں۔ اس کا ازالہ کرنے کیلئے فرمایا گیا کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ جب یہ میرا دعویٰ نہیں تو تم اس کا مجھے الزام کیوں دیتے ہو اور اس پر مجھ سے بحث کیوں کرتے ہو۔ میں جس کی دعوت لے کر آیا ہوں تم مجھ سے بحث ان باتوں میں کرو۔ جن کا میں دعویٰ ہی نہیں رکھتا' اس کو مدار بحث بنانا' یہ تو ایک نامعقول بات ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ اگر اللہ کے خزانوں پر دسترس براہ راست اللہ کے نبیوں کو نہیں اور خصوصاً آنحضرت ﷺ بھی یہ فرما رہے ہیں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے نہیں تو بتایئے کیا کسی اور کے پاس ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہم نے اللہ کے اولیاء کے بارے میں جو تصورات اختیار کر رکھے ہیں اور پھر جس طرح ہم ان کے سامنے دست سوال پھیلاتے ہیں' اس آیت کو سامنے رکھیئے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے۔ البتہ یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے کہ اللہ کے رسول کسی کو کچھ عطا نہیں کر سکتے اور ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ کے رسول بعض دفعہ اللہ کے بندوں کو بہت کچھ عطا کرتے ہیں۔ لیکن وہ اللہ کے عطا کرنے پر عطا کرتے ہیں۔ خزانوں کا مالک اللہ ہے۔ اللہ کے رسول اس کی طرف سے قاسم بن کر آتے ہیں۔ آنحضرت نے خود ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ "میں تو بس تقسیم کرنے والا ہوں' عطا اللہ فرماتا ہے" ﴾

اس کے بعد فرمایا کہ میں غیب نہیں جانتا۔ کیونکہ لوگ پیغمبروں کے بارے میں یہ غلط فہمی بھی رکھتے تھے کہ وہ کاہنوں کی طرح شاید غیب کی خبریں بتانے کیلئے آتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ سے مشرکین مکہ اس طرح کے سوالات کرتے کہ بتایئے کہ میری شادی ہوگی یا نہیں' میرے یہاں اولاد ہوگی یا نہیں' نر ہوگی یا مادہ' میرے کاروبار میں برکت ہوگی یا نہیں؟ اسی طرح آنے والے حالات کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات کئے جاتے۔ اور کبھی یہ پوچھا جاتا کہ بتایئے قیامت کب آئے گی' اس کا ٹھیک وقت کون سا ہے؟ ایسے تمام سوالات کا جواب ایک ہی عطا فرمایا گیا کہ میں غیب نہیں جانتا۔ یہ صفت اللہ کی ہے' دنیا میں جو کچھ ہو چکا جو ہو رہا ہے اور جو آئندہ ہوگا۔ ازل سے لے کر ابد تک ایک ایک بات کی خبر وہ صرف اللہ کو ہے۔ میں خدائی صفات لے کر نہیں آیا' میں اس کا ایک بندہ ہوں۔ میں صرف وہ بات جانتا ہوں' جس کا علم اللہ کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو بے پناہ علم عطا فرماتا ہے۔ بالخصوص آنحضرت ﷺ تو علم الاولین والآخرین کے حامل ہیں۔ آپ کو وہ کچھ عطا فرمایا گیا' جس کا دنیا میں کوئی اور تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود آپ سے یہ کہلوایا جا رہا ہے کہ آپ یہ کہیں کہ میں غیب نہیں جانتا۔ کیونکہ علم غیب ایک خاص اصطلاح ہے' جس کا معنی ہے' ان دیکھی اور ان جانی باتوں کا ذاتی طور پر جاننا' جس کا بتانے والا کوئی اور نہ ہو اور دوسری یہ بات کہ ازل سے لے کر ابد تک ہر طرح کی مغیبات کا علم رکھنا' جسے علم کلی کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اللہ کے علم کے ساتھ خاص ہیں۔ ذاتی علم صرف اللہ کا ہے اور کلی علم بھی صرف اللہ کا ہے۔ اللہ نے اپنے رسول کو علم عطا فرمایا ہے۔ وہ آپ کا ذاتی علم نہیں اور آپ کو جزوی علم عطا فرمایا ہے کلی نہیں۔ آپ ساری دنیا سے بڑے عالم ہیں۔ لیکن اللہ کے علم کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ نے بہت دفعہ ماضی کے واقعات کے بارے میں اور مستقبل کے حالات سے متعلق ایسی باتیں ارشاد فرمائیں' جس کا ایک ایک حرف صحیح ثابت ہوا۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ کی دین اور اس کی عطا ہے' کیونکہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ایسے علم کو علمی زبان میں علم غیب نہیں کہتے اور ایسے علم والے کو عالم الغیب نہیں کہا جاتا۔ اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کہیئے کہ میں غیب نہیں جانتا۔ یعنی میں علم

Marfat.com

غیب نہیں رکھتا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ بات کہنا شاید غلط نہیں ہوگا کہ جب آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی جو تمام دنیا سے بڑھ کر عالم ہیں اور جن پر اللہ کی وحی اترتی ہے' وہ اگر غیب نہیں جانتے تو کسی ولی یا کسی عالم کے بارے میں ایسی بات کہنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔

تیسری بات جس کی وجہ سے امتوں میں اختلاف رہا ہے اور یہ امت بھی اس کی وجہ سے اختلاف کا شکار ہے حالانکہ وہ بالکل سہل' سادہ اور سامنے کی بات ہے اور قرآن کریم میں یہاں بھی اس کے علاوہ متعدد جگہوں میں اسے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں فرشتہ ہوں بلکہ میں ایک انسان ہوں اور یہی بات دوسری جگہ بھی آپ سے کہلوائی گئی۔ مشرکین مکہ یہ سمجھتے تھے کہ پیغمبر انسان نہیں ہوتا کیونکہ انہیں غلط فہمی یہ تھی کہ فرشتے شاید انسانوں سے افضل ہیں اور انسانوں کی مخلوقات میں کوئی خاص حیثیت نہیں۔ لیکن قران کریم نے ہمیں یہ بتایا کہ اللہ نے انسانوں کو تمام مخلوقات پر شرف عطا فرمایا ہے اور وہ شرف یہی ہے کہ اس نے نبیوں اور رسولوں کو انسانوں میں سے اٹھایا اور انسانوں میں پیدا کیا ورنہ جہاں تک شخصی اور نوعی زندگی کا تعلق ہے انسان ملائکہ کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ وہ نورانی پاکیزہ مخلوق ہے ان سے کبھی گناہ کا صدور نہیں ہوتا انہیں اللہ کا قرب میسر ہے' وہ براہ راست کارکنان قضا وقدر ہیں' اس لحاظ سے انسان ان کے برابر نہیں ہوسکتا۔ ہمیں تو صرف یہی ایک شرف میسر ہے' جس نے ہمیں فرشتوں سے اشرف بنا دیا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو نبوت عطا فرمائی۔ اب اگر اس کا بھی انکار کر دیا جائے تو پھر ہمارے پاس آخر شرف کا اور سبب کیا ہے۔ غلط فہمی کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو اپنے جیسا انسان سمجھنے لگتے ہیں اور جب ہم اپنی کمزوریوں اور اپنی جبلی خصلتوں کو دیکھتے ہیں اور نیت کے فساد کے ساتھ ساتھ بعض دفعہ جب فکری فساد بھی ہمارے سامنے بداعمالیوں اور بداطواریوں کی ایک دنیا لاکر کھڑی کر دیتا ہے تو ہم انسان کے بارے میں ایک بری رائے رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی تناظر میں جب اللہ کے نبیوں کو بھی دیکھتے ہیں تو پھر ہمیں یقین نہیں آتا کہ وہ انسان ہیں۔ یہ اصل میں ہماری کوتاہ فہمی ہے۔ اللہ کے نبی اپنی ذات میں انسان ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی صفات میں باقی انسانوں سے بالکل اسی طرح بہت بلند ہوتے ہیں' جس طرح ایک ہیرا اپنی ذات میں ایک پتھر ہوتا ہے' لیکن اپنی صفات میں وہ پتھروں سے بہت بلند ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام صفات کے باوجود ہم اس کی اصل حیثیت کا انکار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح پیغمبر اپنے تمام تر اللہ سے قرب اور اپنی غیر معمولی صفات کے باوجود اپنے اندر انسانی خصائص رکھتے ہیں اور وہ انسانوں ہی کیلئے نمونہ بن کر دنیا میں تشریف لاتے ہیں۔ مزید ایک بات یہ بھی کہ ہم صرف پیغمبروں کی ذات کو تو دیکھتے ہیں' لیکن اس طرف کبھی دھیان نہیں دیتے کہ انسان کیلئے اصل باعث شرف وہ اس کا علم ہے اور علم کا سب سے پاکیزہ غلطیوں سے پاک اور بے پناہ وسعتیں لئے ہوئے اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ وحی الٰہی ہے۔ وحی الٰہی سے بہرہ ور اور اس شرف سے مشرف صرف اللہ کے نبی ہوتے ہیں۔ وہ اگرچہ اپنے اندر انسانی احساسات کی ناہمواریاں' انسانی عقل کی ناتمامیاں' انسانی جذبات کی فراوانیاں' انسانی حوصلوں کی ناآسودگیاں' سب کچھ رکھتے ہیں' لیکن وحی الٰہی انہیں ان تمام کمزوریوں سے اور عصمت الٰہی ان تمام ہیجانوں سے ہر طرح بچا کے رکھتی ہے۔ ان کا یہی وہ شرف ہے' جس نے ان کو جسد انسانیت میں دیدۂ بینا کی حیثیت دی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں اور باقی تمام نوع انسانی ان کے مقابلے میں اندھوں کا گروہ ہے۔ اس لئے راہنمائی انہی کو زیب دیتی ہے۔ انہوں نے انسانی تعلیمات کے تمام گوشوں کو اللہ کے دیئے ہوئے یقین سے معمور کیا ہے۔ وہ عالم الٰہیات' عالم ملکوت اور عالم مغیبات کی ایک ایک چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ باقی دنیا کا تمام علم سرمایہ ظن وتخمین کا نتیجہ اور قیاسات کا سرمایہ ہے۔ اسی کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ میری اصل حیثیت کو سمجھو کہ جو تم سمجھتے ہو وان میں سے میں کچھ نہیں۔ لیکن میں جو کچھ ہوں' تم اس کا ادراک نہیں رکھتے۔ میری اصل حیثیت یہ ہے کہ مجھ پر جو وحی کی جاتی ہے' میں اس کی پیروی کرتا ہوں۔ تم اس فرق کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ دنیا میں علم کے ہزاروں ذرائع ہیں اور نجانے کون کون کس کس ذریعے سے استفادہ کر رہا ہے۔ لیکن ان تمام کا حاصل سوائے گمان

Marfat.com

کے اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن یقین واذعان کا سرمایہ جوانسان کی اصل ضرورت ہے' وہ صرف وحی الٰہی سے نصیب ہوتا ہے اور اس کا مؤرد اور اس کا منبع میں ہوں۔ گویا اس زمین پر میں خالق کائنات کی طرف سے اس کا نمائندہ اور وائسرائے بن کے آیا ہوں۔ یہ میری اصل حیثیت ہے۔ جب تک اسے قبول نہیں کرو گے' اس وقت تک تم مجھ پر ایمان نہیں لا سکتے۔ پہلی امتوں کو یہی بات سمجھنے میں ٹھوکر لگی۔ اس لئے انہوں نے اپنے پیغمبروں کو ان کی محبت کے غلو میں آ کر نجانے کیا سے کیا بنا دیا' لیکن ان کی اصل حیثیت کا ادراک نہ کر سکے۔ آنحضرت ﷺ نے اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا تھا' جس کو حالی نے شعر کا لباس پہنایا

تم اوروں کی مانند دھوکہ نہ کھانا
کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا
بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ
اسی طرح میں بھی ہوں اک اس کا بندہ
مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ
اور جو لوگ خوف رکھتے ہیں کہ اپنے

يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا
پروردگار کے رُوبرُو حاضر کیے جائیں گے (اور جانتے ہیں کہ) اُس کے سوا نہ تو اُن کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارش

شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿51﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ
کرنے والا، اُن کو اس (قرآن) کے ذریعے سے نصیحت کر دو تاکہ پرہیزگار بنیں۔ اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار سے

بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ
دُعا کرتے ہیں (اور) اُس کی ذات کے طالب ہیں اُن کو (اپنے پاس سے) مت نکالو۔ اُن کے حساب (اعمال) کی جوابدہی

مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ
تم پر کچھ نہیں اور تمہارے حساب کی جوابدہی اُن پر کچھ نہیں (پس ایسا نہ کرنا)، اگر اُن کو نکالو گے تو ظالموں

Marfat.com

مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ

ہیں ہو جاؤ گے ۝ - اور اسی طرح ہم نے بعض لوگوں کی بعض سے آزمائش کی ہے کہ (جو دولتمند ہیں وہ غریبوں

مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَ

کی نسبت) کہتے ہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم میں سے فضل کیا ہے (خدا نے فرمایا) بھلا خدا شکر کرنے

اِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ

والوں سے واقف نہیں ؟ اور جب تمہارے پاس ایسے لوگ آیا کریں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو (ان سے) سلام

رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢ ا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ

علیکم کہا کرو خدا نے اپنی ذات (پاک) پر رحمت کو لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی بری حرکت

تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور نیکوکار ہو جائے تو وہ بخشنے والا مہربان ہے ۝ اور اسی طرح ہم اپنی آیتیں کھول

الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ

کھول کر بیان کرتے ہیں (تاکہ تم لوگ ان پر عمل کرو) اور اس لیے کہ گنہگاروں کا رستہ ظاہر ہو جائے - اے پیغمبر! کفار

اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَاۗءَكُمْ ۙ

سے کہہ دو کہ جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو مجھے ان کی عبادت سے منع کیا گیا ہے (یہ بھی) کہہ دو کہ میں تمہاری خواہشوں

قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

کی پیروی نہیں کروں گا ایسا کروں تو گمراہ ہو جاؤں اور ہدایت یافتہ لوگوں میں نہ رہوں -

تمہید:

گزشتہ آیات میں ہم مشرکینِ مکہ کی جانب سے مختلف قسم کے مطالبات پڑھ چکے ہیں۔ وہ ایک سے ایک بڑی نشانی مانگتے رہے۔ بالآخر انہوں نے عذاب کا مطالبہ بھی کر ڈالا کہ اگر تم واقعی اللہ کے نبی ہو اور جو کچھ تم کہتے ہو وہ اللہ کی جانب سے کہتے ہو تو پھر یا تو اس پر کوئی بہت بڑی نشانی لاؤ تاکہ ہم ماننے پر مجبور ہو جائیں یا جس طرح تم بار بار کہتے ہو کہ جن قوموں میں اللہ کے رسول آئے انہوں نے جب مسلسل ان کی تکذیب کی تو آخر ان پر اللہ کا عذاب آ گیا تم بھی ہم پر عذاب کیوں نہیں لے آتے یا عذاب کا کوئی حصہ کیوں نہیں لے آتے تاکہ ہمیں تمہاری نبوت اور تمہاری صداقت کا یقین ہو جائے۔

Marfat.com

قرآنِ کریم اس وقت پیش نظر آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو حکم دے رہا ہے کہ آپ ان کے مطالبات پر نہ جایئے اگر بقول ان کے انہیں کوئی بہت بڑی نشانی دکھا بھی دی جائے جس سے وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں تو مجبوری کا ایمان تو اللہ کے نزدیک معتبر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایمان تو دراصل انسان کے شعور اس کی قوتِ تمیز اور اس کی قوتِ اختیار کا امتحان ہے اور اگر انہیں ایمان لانے پر مجبور کر دیا جائے تو یہ پھر اختیار کا امتحان نہ ہوا بلکہ یہ تو جبر ہوا اور اللہ تعالیٰ کسی کو بھی جبر کے ذریعے صاحب ایمان نہیں بناتا۔ ایمان لانے کیلئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اس آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۵۱ وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ۝ ''اور تم اسی کے ذریعے سے خبردار کرو ان لوگوں کو جو ڈر رکھتے ہیں اس بات کا' کہ وہ اپنے رب کے پاس اکٹھے کئے جائیں گے' اس حال میں کہ اس کے سامنے نہ ان کا کوئی حامی ہوگا' نہ شفیع تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں''۔

قیامت کے دن نہ کوئی حامی ہوگا نہ شفیع ہوگا نیک عمل ہی کام آئیں گے:

یعنی مشرکینِ مکہ میں سے ان لوگوں پر جو مختلف قسم کی نشانیوں یا عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں ان پر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ درحقیقت اس صلاحیت سے محروم ہیں جس کی موجودگی کے بغیر آدمی اللہ پر ایمان لانا تو درکنار اللہ اور اس کے دین کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس آیتِ کریمہ میں اس صلاحیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ آپ اس قرآن کریم کے ذریعے (کیونکہ یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں جو دین آپ لے کر آئے ہیں اس کی پوری دعوت پیش کی گئی ہے اور جو شریعتِ اسلامی آپ اللہ کے بندوں پر نافذ کرنا چاہتے ہیں وہ اسی کتاب کے اندر موجود ہے) سے ان لوگوں کو خبردار کیجئے۔ جن کے اندر اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ یہ زندگی بہرحال ختم ہونی ہے ہر شخص کو ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور لمبی برزخی زندگی گزارنے کے بعد بالآخر قیامت کے دن اللہ کے حضور پیشی ہونی ہے وہاں پوری زندگی کے بارے میں باز پرس ہوگی ایک ایک عمل کے بارے میں پوچھا جائے گا ایک ایک لمحے کا حساب لیا جائے گا جس آدمی کو اللہ کے سامنے اس جواب دہی کا احساس ہوگا وہ یقیناً یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ اگر میں نے یہ زندگی اس طرح نہ گزاری جس طرح اللہ کا حکم ہے اور جسے بتانے کیلئے اس نے اپنی کتابیں اتاری ہیں' اپنے رسول بھیجے ہیں تو میں اللہ کے سامنے کھڑا ہو کر کیا جواب دے سکوں گا۔ احساس کا پہلا لمحہ اسے سوچنے پر مجبور کرے گا اور اگر یہ لمحہ رائیگاں نہ گیا تو یقیناً وہ شخص اس حقیقت کی تلاش میں نکلے گا اور بالآخر ایمان کی دولت سے ہمکنار ہو جائے گا۔ اس آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو یہ توجہ دلائی جا رہی ہے کہ آپ ان انسانوں میں سے ایسے لوگوں کو تلاش کریں جن کے اندر قیامت کے آنے اور دوسری زندگی سے دوچار ہونے کا اگر یقین نہیں تو کم از کم اس کا تصور تو موجود ہو کیونکہ یہی تصور انہیں بالآخر صحیح فیصلے پر پہنچائے گا اور ساتھ ہی دوسری بات یہ فرمائی کہ جب انہیں اس بات کا بھی یقین ہوگا کہ میں جب اللہ کے روبرو حاضر ہوں گا تو وہاں اللہ کے سوا میرا کوئی حمایتی اور سفارش کرنے والا نہیں ہوگا میں تن تنہا بارگاہ حق میں کھڑا ہوں گا میرا نامہ اعمال میرے ہاتھ میں ہوگا' جلال خداوندی برس رہا ہوگا' میں اپنے پسینے میں ڈوبا ہوا ہوں گا اور جب مجھ سے ایک ایک بات کا حساب مانگا جائے گا تو میرا چونکہ دامن یکسر ایمان اور اعمال صالحہ سے خالی ہوگا تو ظاہر ہے میں کسی بات کا جواب نہیں دے پاؤں گا تو پھر میرے ساتھ کیا گزرے گی۔ اس آیت کریمہ میں بطور خاص اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہاں ان کیلئے نہ کوئی حمایتی ہوگا نہ کوئی مددگار اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پر ایمان نہ لانے کا جہاں ایک سبب ہے آدمی کا قیامت کو نہ ماننا اور دوسری زندگی کو محض ایک واہمہ سمجھنا۔ اسی طرح دوسرا سبب اس کا یہ ہے کہ بعض لوگ قیامت کے آنے کو تسلیم کرتے تھے لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی یقین رکھتے تھے کہ ہم نے اللہ کے جو مختلف شرکاء بنا رکھے ہیں تو اگر قیامت کے دن ہم سے باز پرس ہوئی بھی تو وہ یقیناً ہمیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے۔

Marfat.com

مشرکینِ مکہ بتوں کے ساتھ ساتھ فرشتوں کو بھی اللہ کا شریک مانتے تھے بلکہ انہیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جب پروردگار ہماری گرفت فرمائے گا اور قیامت کے دن ہمیں عذاب دینا چاہے گا تو اس کی یہ بیٹیاں اپنے باپ کو مجبور کر دیں گی کہ وہ ہمیں چھوڑ دے بالآخر باپ اپنی بیٹیوں کی بات مان کر ہمیں چھوڑ دے گا۔ چنانچہ اس تصور نے ان کو اپنی اصلاح کی فکر اور شرعی پابندیوں سے بالکل آزاد کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ میں دو گروہ تھے۔ ایک قیامت کا نہ ماننے والا اور دوسرا شفاعت باطل کے اس تصور کی وجہ سے قیامت کے دن کی باز پرس کو ایک بے فائدہ مشق سمجھنے والا۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو یہ دونوں گروہ ماننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ اگر کوئی لڑکا کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ امتحان نہیں ہوگا اور یا اگر امتحان ہوا بھی تو اگزامینر میرا پرچہ خود حل کر دیں گے یا پیپر دیکھنے والے میرے سفارشیوں کے کہنے پر مجھے پاس کر دیں گے تو ایسے لڑکے کو آپ کبھی امتحان کی تیاری پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ آپ اسے امتحان کی تیاری کا کہیں گے تو وہ آپ کا مذاق اڑائے گا کہ جب امتحان ہونا ہی نہیں تو تیاری کس بات کی۔ اگر آپ اسے فیل ہونے سے ڈرائیں گے تو وہ ہنس کر کہے گا کہ مجھے معلوم ہے کہ میں پیپر دوں یا نہ دوں یا پیپروں میں کچھ بھی لکھوں مجھے بہر حال کسی کے کہنے پر پاس کر دیا جائے گا تو دونوں صورتوں میں وہ کبھی بھی امتحان کی تیاری میں سنجیدہ نہیں ہو سکتا زندگی بھی ایک امتحان ہے' اس میں کامیابی کیلئے اللہ اور رسول پر ایمان لانا اس کے نازل کردہ شرعی احکام کو تسلیم کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ضروری امور ہیں۔ ظاہر ہے یہ تیاری وہی کرے گا جسے امتحان کا یقین ہو اور ساتھ ہی وہ یہ سمجھتا ہو کہ امتحان میں میری کامیابی یا ناکامی کا دارومدار میری تیاری اور امتحان میں میرے پیپر حل کرنے پر ہے۔ یہی بات اس آیت کریمہ میں فرمائی گئی ہے کہ اے پیغمبر اس وقت دنیا میں آپ کی ذات اور قرآن کریم ہدایت کے دو سرچشمے ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کیلئے ضروری ہے کہ ایک تو اللہ کے سامنے جواب دہی کا یقین ہو اور دوسرے اس بات کا یقین کہ قیامت کے دن سرخروئی اور کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے کہ آدمی شفاعت باطل پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنے ایمان و عمل اور اللہ کے فضل پر بھروسہ رکھے اور ساتھ ہی یہ تصور بھی کہ اگر شریعت کا حق ادا کرنے کی کوشش کے باوجود کوئی کمی بیشی رہ گئی تو اللہ کی اجازت سے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت بھی میسر آ سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں اللہ کے رسول اور قرآن کی دعوت سے فائدہ اٹھانے کیلئے جن دو بنیادی تصورات کو مدار بنایا گیا ہے یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ کہیں بھی انسانی زندگی میں اس کے خلاف ہوتا نظر نہیں آتا مشرکینِ مکہ تو ان دو باتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ایمان کی دولت سے محروم رہے اور آج امت مسلمہ کی مجموعی زندگی انہی دونوں باتوں میں کمزوری کے باعث شریعت اسلامی کی مکمل پابندی سے محروم ہے۔ باوجود اس کے کہ ہم قیامت کے آنے کا علم رکھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ قیامت کے دن ایمان و عمل ہی کام آئیں گے لیکن چونکہ ان دونوں باتوں کا ہمیں پوری طرح یقین نہیں ہے۔ اس لئے زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آتے ہیں کہ ہم مسلمان ہوتے ہوئے بھی کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ اس بارے میں اللہ اور رسول کے احکامات کیا ہیں۔ خوشی کے لمحات ہوں یا غم کے' عہدہ و منصب کے حصول کا ہیجان ہو یا کسی عہدہ و منصب کے چھن جانے کا اندیشہ۔ کسی بھی کاروبار میں منفعت کی امید ہو یا نقصان کا خوف تو ہم سب سے پہلے اسلامی شریعت سے اپنا تعلق توڑتے ہیں اور ایسے موقع پر جو کچھ ہمارے جی میں آتا ہے یا جدھر حالات کا بہاؤ ہمیں لے جاتا ہے یا جس طرف امیدوں کا پلڑا جھکنے لگتا ہے ہم اسی کے مطابق اپنے عمل کو متعین کرتے ہیں اور اسی کی مطابقت سے اپنی کاوشوں کیلئے ایک جہت طے کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ اپنی منزل اور نصب العین تک بدلنا پڑے تو اس سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مجھے یہ بات بالکل سمجھ نہیں آتی کہ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یا کروں گا اسے میرا خدا دیکھ رہا ہے اور میرے ہر عمل محفوظ کیا جا رہا ہے اور قیامت کی اچھی بری زندگی کا دارومدار میرے انہی اعمال پر ہے اس یقین کے ہوتے ہوئے میں پھر بھی اللہ کی نافرمانی کر

Marfat.com

ہوئے اسلامی شریعت کے احکام کو توڑوں یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ ہماری زندگیوں میں جو بڑے بڑے خلا اور جھول واقع ہو گئے ہیں، ہمیں مان لینا چاہئے کہ وہ صرف اس لئے ہیں کہ ہم قیامت کو مانتے بھی ہیں اور جانتے بھی ہیں، لیکن اس کا یقین ہمارے دل و دماغ کا حصہ نہیں، جب تک اس یقین سے ہمارا دل و دماغ روشن نہیں ہے اس وقت تک ہماری زندگی اس دو عملی سے خالی نہیں ہوگی۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کو جو یہ بنیادی ہدایت دی جا رہی ہے اس کی کس حد تک اہمیت ہے۔

جب بھی کسی فرد کو قیامت کا یقین نہیں ہوتا یا شفاعت باطل کے تصور سے وہ قیامت کے دن کی باز پرس سے پریشان نہیں ہوتا اس وقت تک جس طرح وہ ایمان لانے سے گریز کرتا ہے، اسی طرح وہ ایمان نہ لانے کے حوالے سے بہانے بھی تراشتا ہے۔ چنانچہ انہی بہانوں میں سے یہ بھی ایک بہانہ ہے جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۵۲ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ط مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ O ’’اور تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجئے، جو صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں اور نہ تمہاری ذمہ داری کا کوئی حصہ ان پر ہے، کہ تم ان کو اپنے سے دور کر کے ظالموں میں سے بن جاؤ‘‘۔

رسول ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ غریب صحابہ کو اشرافِ قریش کی وجہ سے دور نہ کرو:

روایات میں آتا ہے کہ مشرکینِ مکہ میں سے بعض بڑے بڑے لوگوں نے حضرت ابو طالب سے ملاقات کی اور کہا کہ ہم تمہارے بھتیجے کی باتوں پر غور کرنے کو تیار ہیں اور سمجھنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا دعوت پیش کرتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس نے اپنے اردگرد ایسے لوگ جمع کر رکھے ہیں جو انتہائی غریب اور معاشرے کے دھتکارے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں سے کچھ غلام ہیں اور کچھ ہمارے ہی آزاد کردہ ہیں ایسے بے یار و مددگار ہیں اور کچھ جن کی معاشرے میں کوئی اہمیت نہیں، ظاہر ہے کہ ہم ان کی موجودگی میں کس طرح آپ کے بھتیجے کے پاس جا سکتے اور اس کی بات سن سکتے ہیں۔ اس لئے آپ اپنے بھتیجے سے کہئے کہ وہ ہمارے لئے ایک وقت مقرر کرے اور اس میں ان تمام لوگوں کو دور ہٹا دے، ہمیں ان کی پرچھائیں بھی گوارا نہیں۔ اس طرح ہم الگ بیٹھ کر ان سے بات چیت کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو طالب نے آنحضرت ﷺ کو اس کا مشورہ دیا کہ آپ ان اشراف قریش سے الگ ملنے کا انتظام کریں یا جب بھی وہ آنا چاہیں تو آپ اپنے غریب ساتھیوں کو وہاں سے دور ہٹا دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس پر سوچنا شروع کیا۔ صحابہ تک جب یہ بات پہنچی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت ﷺ کو مشورہ دیا کہ حضور اس میں حرج ہی کیا ہے، ہم لوگ تو ہر وقت آپ کے پاس آنے جانے والے اور خدمت میں بیٹھنے والے لوگ ہیں۔ اگر اشراف قریش ہمارے ساتھیوں کی موجودگی میں ملنا پسند نہیں کرتے تو کوئی حرج نہیں، آپ ان سے الگ مل لیا کیجئے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت عمر فاروق کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ فوراً حضور کی خدمت میں پہنچے، معافی چاہی کہ میں نے آپ کو غلط مشورہ دیا اور آپ سے درخواست کی کہ آپ اللہ سے میرے لئے استغفار کریں تاکہ وہ میرا یہ گناہ معاف فرما دے۔ اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ یہ مت سمجھئے کہ یہ لوگ اس طرح امتیازی سلوک کرنے سے راہ راست پر آ جائیں گے یہ محض ان کا ایک بہانہ ہے۔ اصل بیماری ان کی وہی ہے کہ وہ اللہ کے سامنے حاضری کا اندیشہ نہیں رکھتے۔ آپ ان کے ساتھ کیسا بھی عزت کا سلوک کریں وہ کبھی آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ رہی یہ بات کہ آپ ان کی خاطر ان غریب لوگوں کو دور کریں، یہ کسی طرح مناسب نہیں۔ یہاں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ ہے وَلَا تَطْرُدِ۔

Marfat.com

اطرادعربی زبان میں دھتکارنے اور بدسلوکی سے نکالنے کو کہتے ہیں۔قریش چونکہ غریب لوگوں کیلئے یہی لفظ استعمال کرتے تھے اس لئے قرآن کریم نے ان کے مطالبے کو رد کرتے ہوئے انہی کا لفظ استعمال کیا' تا کہ ان کا جرم ریکارڈ پر رہے اور جب وہ اس کا جواب دیکھیں تو مزید انہیں اپنے جرم کی شدت کا احساس ہو اور ان کے خبث باطن پر چوٹ لگے۔آگے بڑھنے سے پہلے ایک تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے وہ یہ کہ مشرکینِ مکہ کا یہ مطالبہ محض اتفاقی نہیں تھا بلکہ یہ ان کی معاشرتی اقدار اور ان کے تصورِ حیات کا نتیجہ تھا۔مکہ معظمہ کی زندگی درحقیقت ایک طبقاتی زندگی تھی۔وہاں کے رہنے والے یوں تو کئی طبقات میں بٹے ہوئے تھے لیکن امیر' غریب اور حسب ونسب کی تقسیم سب سے زیادہ گہری تھی۔قریش کسی کو جو ان کے اپنے خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو اپنے ہم پلہ ماننے کو تیار نہیں تھے۔اور جہاں تک غریب لوگوں کا تعلق ہے وہ ان کو اپنی خدمت کیلئے تو برداشت کر سکتے تھے لیکن یہ سوچنا بھی انہیں گوارا نہیں تھا کہ یہ بھی معاشرے کے قابل ذکر لوگ ہیں۔حیرت اور تشویش کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم یہاں ان کے جس رویے کو بری طرح تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے اور جس طرح اسے جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتا ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ امت مسلمہ میں اس کے آثار بھی باقی نہ رہتے' لیکن انتہائی دکھ کی بات ہے کہ باقی عالم اسلام کو تو چھوڑیئے خود یہ ملک جس کو وجود ہی اسلام کے نام سے ملا ہے' اس میں ابھی تک نہایت گہری طبقاتی تفریق پائی جاتی ہے۔جاگیردار' امراء' بڑے بڑے خاندانوں کے لوگ' فوج' سیاستدان اور بیوروکریٹس سارے ملک کے عوام کو اپنے ہاری اور کمین سمجھتے ہیں۔اس لئے اپنے اپنے دوائر میں ان کے ساتھ نہایت توہین آمیز سلوک روا رکھنا بلکہ ظلم کرنا بھی ان کیلئے کوئی غلط بات نہیں۔یہی حال مشرکینِ مکہ کا تھا اس لئے ان کا حضور سے یہ مطالبہ کوئی حیرت انگیز مطالبہ نہ تھا بلکہ ان کی معاشرتی زندگی کا نتیجہ تھا۔قرآنِ کریم نے اس پر آنحضرت ﷺ کو جو ہدایات دی ہیں' اس میں سب سے پہلی بات جو محسوس کرنے کی ہے وہ اس آیت کریمہ کا لہجہ ہے۔جس میں بظاہر تنبیہ کا انداز ذرا تیکھا ہو گیا ہے۔اس میں خطاب چونکہ آنحضرت ﷺ کو ہے اس لئے بعض طبیعتوں کو گراں گزرتا ہے۔لیکن اگر قرآن کریم کا ایک اسلوب سمجھ لیا جائے تو پھر یہ واہمہ پیدا نہیں ہوتا وہ یہ ہے کہ جب بھی کفار کی جانب سے ایسی کوئی بے سروپا بات کہی جاتی ہے یا کوئی لایعنی مطالبہ کیا جاتا ہے تو قرآن کریم میں پروردگار اس کا جواب دیتے ہوئے کفار کو مخاطب نہیں کرتے۔جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ پروردگار ان کو مخاطب کرے۔اس لئے اس میں خطاب رسول اللہ ﷺ کو فرمایا جاتا ہے۔لیکن روئے سخن کفار کی طرف ہوتا ہے' یا یوں کہہ لیجئے کہ بات حضور سے کی جا رہی ہوتی ہے لیکن سنائی کفار کو جاتی ہے۔اس لئے اس میں تنبیہ کا انداز اگر تیکھا ہو جاتا ہے یا کہیں غضب کا اظہار نظر آتا ہے تو اس کا تعلق اللہ کے رسول سے نہیں بلکہ ان کفار سے ہوتا ہے تا کہ وہ اچھی طرح اپنے انجام کے بارے میں سوچ لیں۔ یہاں بھی خطاب آنحضرت ﷺ سے ہو رہا ہے لیکن تنبیہ اور تہدید کا تعلق مشرکینِ مکہ سے ہے۔

دوسری چیز جو اس میں بہت قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ کفار مکہ جن لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کو تیار نہیں بلکہ انہیں اپنے قریب آنا بھی ان کیلئے گوارا نہیں اور وہ حضور سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہماری موجودگی میں آپ ان کو دور رہنے کا حکم دیں۔کیسی دلنواز بات ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی کی وکالت فرما رہے ہیں۔ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو ابھی تک غلامی کا عذاب جھیل رہے ہیں اور ان میں وہ بھی ہیں جو نئے نئے غلامی کی زنجیریں کاٹ کے نکلے ہیں۔لیکن معاشرے میں ان کو تحفظ دینے والا کوئی نہیں۔ان میں ایسے بھی ہیں جو کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق نہیں رکھتے باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں اور یہ تمام لوگ ساتھ ساتھ اس قدر بے سروسامان بھی ہیں کہ نہ پہننے کو مناسب کپڑا ہے اور نہ کھانے کو ڈھب کی روٹی پیٹ پر پتھر باندھتے اور چیتھڑے پہنتے ہیں لیکن اسلام کی موجودہ قوت یہی لوگ ہیں۔ان کے بارے میں پروردگار ارشاد فرما رہے ہیں کہ آپ ان لوگوں کو اپنی صحبت سے دور مت ہٹایئے ان کا حال یہ ہے کہ وہ صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔یعنی اہل دنیا سے اگرچہ ان کو کوئی ایسا قابل ذکر تعلق نہیں اور لوگ بھی ان کا نام لینے کے روادار نہیں' لیکن

Marfat.com

انہوں نے اپنا رشتہ اللہ سے جوڑ رکھا ہے' وہ اس ذات کو پکارتے ہیں جس کو پکارنے والا کبھی محروم نہیں رہتا اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انہیں دولت دنیا کے نہ ہونے کے باعث غربت اور غریبی کے طعنے ملتے ہیں۔ انہیں نجانے کیسے کیسے خطابات سے یاد کیا جاتا ہے اور خود ان کے شب و روز اللہ ہی بہتر جانتا ہے کیسی تلخیوں میں گزرتے ہیں۔ لیکن ان سارے دکھوں کے باوجود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ان میں سے کوئی چیز نہیں مانگتے' وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں تو صرف اس لئے کہ وہ اپنے رب کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ کی خوشنودی کے مقابلے میں دنیا بھر کی دولت خزف ریزوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ کسی بھی تحریک کا سرمایہ اس کے جانثار اور فدا کار لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگیاں تک اس تحریک پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ جنہوں نے محض اللہ کی رضا کیلئے دنیا کی ہر نعمت سے منہ موڑ لیا ہے اور دنیا کا ہر دکھ اسلام اور ایمان کی خاطر برداشت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ یہ لوگ اس لائق ہیں کہ آپ کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں یا وہ نابکار جنہیں آپ کی نبوت تک گوارا نہیں۔ وہ محض بہانے تراشتے ہیں تاکہ آپ کیلئے ایسے حالات پیدا کریں کہ آپ کے جانثار بھی آپ سے دور ہو جائیں۔ اس لئے آپ ان کو ہرگز اپنے سے دور نہ ہٹائیے۔ وہ لوگ جن کا آپ کے سوا دنیا میں کوئی نہیں اور وہ آپ کی صحبت میں اللہ کی رضا کو ڈھونڈتے ہیں' وہی آپ کی عنایت کے ہر طرح مستحق اور آپ کی توجہ کے حقدار ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان غریبوں کو جس طرح اپنے سینے سے لگایا کہ انہوں نے اگر اپنی جانثاری میں کبھی کمی نہیں کی تو حضور کی شفقتیں بھی ہمیشہ ان پر پھوار کی طرح برستی رہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے غریبوں ہی میں زندگی گزارنا اور غریبوں ہی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اپنا معمول بنا لیا اور یہاں تک اللہ کے حضور عرض کی کہ یا اللہ میں چاہتا ہوں کہ میں غریبوں کے ساتھ زندہ رہوں اور قیامت کے دن غریبوں کے ساتھ اٹھایا جاؤں۔ سردار دیوان سنگھ مفتون متحدہ ہندوستان میں ریاست اخبار کے ایڈیٹر تھے اور وہ اپنی طرز کے واحد آدمی تھے جب انہوں نے آنحضرت ﷺ کا یہ قول سنا تو بے ساختہ کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ جن ہونٹوں سے یہ قول نکلا ہے میں ان ہونٹوں کو بوسہ دوں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں غریبوں کا ساتھ دینے کے دعوے تو بہت رہے ہیں لیکن اگر کسی نے غربت کو عزت دی ہے اور فقر کو اپنا فخر فرمایا ہے اور فی الواقع غریبی امیری کا فرق مٹا کے رکھ دیا ہے اور طبقات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے تو وہ صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ غیر مسلموں نے بھی جب کبھی غیر جانبداری سے آپ کے اس طرز عمل کو دیکھا ہے تو تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکے۔ یوں تو اس کی مثالیں تاریخ میں بھری پڑی ہیں۔ لیکن ہماری قریبی تاریخ میں لاہور ہی میں ہری چند اختر کے نام سے ایک شاعر گزرے ہیں جو تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے انہوں نے کہا تھا

؎ جس کی حکمت نے یتیموں کو کیا درِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

آنحضرت ﷺ کے اس طرز عمل کے نتیجے میں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ یہ غریب لوگ جنکو اشراف قریش اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے انکا اس حد تک احترام کرتے تھے کہ دنیا شاید اسکی مثال لانے سے عاجز ہو۔ ان غریب غلاموں میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام سب سے نمایاں ہے کیونکہ انہیں سب سے زیادہ آنحضرت کا قرب اور خدمت کا شرف میسر آیا۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور نے انہیں کعبۃ اللہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان کہنے کا حکم دیا تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ کل کا غلام آج کا کس قدر نامور فرد بن چکا ہے اور خلافتِ راشدہ میں انکے مقام و مرتبہ کا عالم یہ تھا کہ ایک دفعہ حضرت ابوسفیان اور حضرت عکرمہ جیسے بڑے بڑے اشراف قریش حضرت عمر فاروق ؓ کے گھر کے سامنے اذن باریابی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ دروازے پر ایک لڑکا دربانی کے فرائض انجام دے رہا تھا کہ اتنے میں حضرت بلال ؓ تشریف لائے انہیں دیکھ کر دربان ایک طرف ہٹ گیا وہ بغیر

Marfat.com

اجازت طلب کئے اندر داخل ہوئے۔ حضرت فاروق اعظم ﷺ نے جیسے ہی دیکھا کہ بلال آئے ہیں' اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: جاء سیدنا و خادم سیدنا ''ہمارا آقا آ گیا اور ہمارے آقا کا خادم آ گیا''۔ ابوسفیان برداشت نہ کرسکے' بول اٹھے کہ یہ دن بھی آنا تھا کہ اشراف قریش اجازت کے طلبگار ہیں اور ایک آزاد کردہ غلام آتا ہے تو بغیر اجازت طلب کئے اندر چلا جاتا ہے۔ حضرت عکرمہ جو ابوجہل کے بیٹے تھے کہنے لگے ابوسفیان ہمیں شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں بلانے والے نے سب کو ایک ہی وقت میں بلایا تھا۔ اس پکار پر جس نے پہلے لبیک کہا وہ آگے رہے گا اور جو پیچھے رہا وہ پیچھے رہے گا اس لئے اس میں شکایت کا کوئی موقع نہیں۔

مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ اس میں انبیاء کرام کی طبیعت کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے اور اس حوالے سے یہ ہدایت دی گئی ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ انبیاء کرام اللہ کے عطا کردہ مزاج کی وجہ سے اپنے اندر یہ امتیازی چیز رکھتے ہیں کہ انہیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ صرف ایک چیز کی خواہش اور طلب ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ ہدایت لے کر آئے ہیں وہ ان کی ہدایت کو قبول کرلیں۔ یہ ان کی خواہش بعض دفعہ اس حد تک ان پر غالب آجاتی ہے کہ وہ زندگی کی تمام آسانیوں بلکہ ضروریات تک کو دعوت و تبلیغ کی نذر کردیتے ہیں اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر ان کے ایمان اور ان کی مغفرت کیلئے دعائیں مانگتے ہیں اور ان کے ایمان کیلئے جو بھی مناسب تجویز ان کے سامنے آتی ہے وہ اس پر عمل کرنے کیلئے تیار ہوجاتے ہیں بعض دفعہ تو یہ صورت حال ہوتی ہے جس کی مثال انجیل میں دی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ لوگو! تم نے دیکھا نہیں کہ جب کسی ریوڑ کے مالک کی ریوڑ میں سے کوئی بھیڑ گم ہوجاتی ہے تو وہ اس کی تلاش میں ندیوں' نالوں اور صحراؤں تک میں مارا مارا پھرتا ہے اور وہ اس تگ و دو میں اپنے ریوڑ تک کو بھول جاتا ہے اور جب اسے وہ بھیڑ مل جاتی ہے تو پھر واپس اپنے لوگوں میں آکر کہتا ہے کہ لوگو میرے ساتھ خوشیاں مناؤ کہ مجھے اپنی بھیڑ مل گئی ہے۔ یہ کیفیت ایک پیغمبر کی ہوتی ہے۔ یہاں پروردگار اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ تمہیں اپنی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو تلاش کرنا چاہئے' لیکن ایک ایک بھیڑ کے پیچھے اس قدر سرگرداں نہیں ہونا چاہئے کہ باقی ریوڑ کا خیال بھول جائے اور ممکن ہے کہ ان کو نقصان پہنچ جائے اس لئے کہ اگر آپ کی دعوت کے مخاطبین میں سے ایک ایک آدمی مسلمان نہیں ہوتا یعنی اگر آپ کی ایک ایک بھیڑ واپس اپنے گلے میں نہیں آتی تو آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ جو بھیڑ اپنے گلے سے اتنی دور نکل جائے وہ حقیقت میں بھیڑیئے کا حصہ ہوتی ہے۔ اسی طرح جو آدمی ایمان کیلئے تبلیغ و دعوت کی ساری کاوشوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ آپ سے اس کے بارے میں بالکل نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ ایمان کیوں نہیں لایا۔ البتہ اگر آپ نے ان اشراف قریش کو قریب کرنے کیلئے ان غریب لوگوں کو اپنے سے دور کردیا تو قیامت کے دن جب اس بارے میں آپ سے سوال ہوگا تو یہ اشراف قریش جن کیلئے ایمان کی خواہش میں آپ یہ سب کچھ کررہے ہیں وہ وہاں آپ کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ وہاں آپ کو خود ہی اس کا جواب دینا پڑے گا۔ اس لئے فرمایا کہ آپ ان غریب لوگوں کو اپنے سے دور نہ کریں۔ یہی آپ کی مجلس کی زینت اور آپ کے قافلے کا زیور ہیں اور اگر آپ نے خدانخواستہ ان کو دور کردیا تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

ظلم کا مفہوم

یہاں بظاہر ظالم کا لفظ آنحضرت ﷺ کے حوالے سے عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ظلم کا معنی بے انصافی یعنی ایک کا حق دوسرے کو دے دینا ہے یہاں یہ لفظ محبت کے حوالے سے استعمال ہو رہا ہے کہ آپ کی محبت اور شفقت کے مستحق یہ غریب لوگ ہیں جنہوں نے سب کچھ آپ اور اسلام کیلئے قربان کردیا ہے وہی اس قابل ہیں کہ آپ کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں اور آپ کی توجہ سے بہرہ ور ہوں۔ اگر آپ ان کی بجائے

Marfat.com

اشراف قریش کو دے دیں گے تو یہ ان معنوں میں ظلم ہوگا کہ حق ان غریب صحابہ کا تھا آپ نے اشراف قریش کو دے دیا۔ یہ گویا ایک ایسا گلہ ہے جو کبھی کبھی محبت کرنے والوں کی زبان پر آجایا کرتا ہے۔ صحابہ چونکہ جاں نثار اور فداکار ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے محب اور عشاق بھی تھے انہیں بجا طور پر یہ گلہ زیب دیتا تھا کیونکہ ان میں بعض تو ایسے تھے جن کیلئے حضور سے چند لمحے دور رہنا بھی بڑا گراں گزرتا تھا جیسے ایک مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح یہ لوگ حضور کی صحبت سے باہر اپنے لئے زندگی دشوار سمجھتے تھے۔ ایک صحابی کا واقعہ اہل تفسیر نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک دن آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ حضور جب تک میں آپ کی صحبت میں رہتا ہوں' دل کو ایک اطمینان میسر رہتا ہے' لیکن جب گھر چلا جاتا ہوں تو باوجود اس کے کہ اہلِ خانہ موجود ہوتے ہیں لیکن میرا دل اچاٹ ہو جاتا ہے' میں جب تک آپ کو دیکھ نہیں لیتا مجھے چین نہیں پڑتا۔ کہا حضور یہاں تو ہمیں یہ نعمت میسر ہے کہ بار بار آپ کی زیارت ہوتی ہے لیکن قیامت کے دن جب آپ جنت کے اعلیٰ ترین درجے میں ہوں گے اور اگر ہمیں اللہ تعالیٰ نے جنت عطا کی بھی تو ظاہر ہے کہ ہم بہت نچلے درجے میں ہوں گے وہاں آپ کی زیارت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو حضور اس جنت کا کیا فائدہ جس میں آپ کی زیارت نہ ہو سکے۔ اس پر قرآن کریم کی ایک آیت نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے انہیں قیامت کے دن حضور کا ساتھ نصیب ہوگا۔ حضور چاہے کتنے بھی بلند مقام پر ہوں حضور کی زیارت سے وہ برابر سعادت اندوز ہوتے رہیں گے۔

اشراف قریش کا یہ مطالبہ کہ ہم غریب مسلمانوں کے ساتھ آپ سے ملاقات نہیں کر سکتے یہ ہماری بڑائی اور عظمت کے خلاف ہے۔ آنے والی آیت کریمہ میں ان کے اس قول اور ان کی خواہش کے پیچھے جو چیز کارفرما تھی اور جو ان کی اصل بیماری تھی اس سے پردہ اٹھایا جارہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۵۳ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لِّيَقُوۡلُوۡۤا اَهٰٓؤُلَاۤءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِنَا ؕ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰكِرِيۡنَ ○ ''اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے کہ وہ کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کیلئے چنا کیا اللہ شکر گزاروں سے اچھی طرح واقف نہیں''۔

اللہ کی رضا کا معیار سیم وزر اور دنیا کا ٹھاٹھ باٹھ نہیں بلکہ اس کی شکر گزاری ہے:

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ ان کے ان تمام مطالبات کا سبب اور مسلمانوں کو بنظر حقارت دیکھنے کی وجہ ان کی یہ گمراہی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی فرد یا کسی قوم کی عظمت اور بڑائی کا سبب اس فرد یا اس قوم کی خوشحالی ہے جس کے پاس درہم و دینار اور سیم وزر کی بہتات ہے ان کی نگاہ میں وہ آدمی عزت والا اور بڑا ہے اور جس بیچارے کو نان شبینہ کے سوا کچھ میسر نہیں اور وہ زندگی کی گاڑی کو بڑی مشکل سے گھسیٹ رہا ہے وہ چاہے اپنے سیرت و کردار کے اعتبار سے کیسا بھی عظیم کیوں نہ ہو ان کے نزدیک وہ ایک معمولی اور ناقابل ذکر آدمی ہے۔ عزت اور ذلت' عظمت اور نکبت کے انہوں نے یہ جو معیارات بنا رکھے تھے انہی کی وجہ سے وہ ان گمراہیوں میں مبتلا تھے۔ وہ یہ بات کسی طرح سمجھنے کیلئے تیار نہیں تھے کہ دولت آدمی کیلئے عزت کی علامت نہیں اور غربت آدمی کی ذلت کا نشان نہیں۔ یہ تو دنیا کی ضروریات ہیں اس سے عزت اور ذلت کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے اسی کو حقیقی معیار سمجھ کر اپنی تمام فلاسفی کی عمارت تعمیر کی تھی۔ اور یہی وہ بنیادی خرابی تھی جس نے مکے کے معاشرے کو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا۔ قرآنِ کریم ان کی اس گمراہی کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کو منکشف فرما رہا ہے کہ امارت اور غربت، عزت اور ذلت کی علامتیں نہیں بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے آزمائش ہیں۔ امیر اس لئے امیر نہیں کہ وہ اس کا حقدار ہے اور غریب اس لئے غریب نہیں کہ وہ اس کا سزاوار ہے بلکہ اللہ کی مشیت دونوں حوالوں سے کارفرما ہے وہ جس کو امیر بناتا ہے تو اس کی امارت اس کیلئے آزمائش ہوتی ہے اور جسے غربت سے دوچار کرتا ہے اسے غربت کے ذریعے آزماتا ہے۔ امیر

Marfat.com

کو مال و دولت دے کر آزمایا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر اس کا شکر گزار متواضع اور فرمانبردار بندہ بنتا ہے یا مغرور اور متکبر ہو کر اکڑنے والا اترانے والا غریبوں کو دھتکارنے والا اور خدائی نعمتوں کا اجارہ دار بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک غریب آدمی کو جب وہ غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کیلئے دیتا ہے کہ کیا وہ اپنی غربت پر صابر اور اپنی نانِ جویں پر قانع، اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر میں خوددار ہے یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت، بے حوصلہ، تقدیر سے شاکی، خدا سے برہم اور ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ وہ امتحان ہے جس میں امیر اور غریب دونوں کو مبتلا کیا جاتا ہے۔ جو اس امتحان میں پورا اترتا ہے وہ اللہ کے یہاں عزت پاتا ہے اور جو ناکام ہوتا ہے وہ ذلیل ہو جاتا ہے۔ رہی مال و دولت اس کا عزت اور ذلت سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ عرض کیا گیا یہ تو ایک آزمائش ہے۔ اس آزمائش کے نتیجے میں جس نے تقویٰ کو پالیا وہ عزت کا مستحق بن جاتا ہے اور جس نے تقویٰ کے برعکس زندگی گزاری اور ایمان و عمل کی بجائے درہم و دینار کی غلامی اختیار کر لی۔ دنیا چاہے اس کے بارے میں کچھ بھی سمجھے اللہ کی نگاہ میں وہ کسی طرح کی عزت مستحق نہیں ہوتا۔ آنحضرت ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں نہایت زوردار انداز میں فرمایا تھا کہ اے قریش کے لوگو! تمہاری عزت و سطوت کے تمام جھوٹے دعوے آج میں اپنے قدموں تلے روندتا ہوں۔ آج کے بعد کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔ یہ ایک ایسا زلزلہ آسا اعلان تھا جس نے پوری انسانی تہذیب و ثقافت کو متاثر کیا۔ امراء نے اس حقیقت کو جان کر دولت کو اللہ کی امانت سمجھا۔ اس پر بھروسہ کرنے کی بجائے اسے خلق خدا کی خدمت اور مکارمِ اخلاق کی تعمیر کیلئے استعمال کرنا شروع کر دیا اور اپنی ذات کی کمزوریوں کو درہم و دینار کی اوٹ میں چھپانے کی بجائے اللہ کے تقویٰ سے آراستہ غریب اور پسے ہوئے طبقے اس نوید جاں فزا کے بعد نئی قوت سے سرشار ہو کر اٹھے اور انہوں نے اقدار انسانیت راہنما بنا کر دنیا میں ایک ایسی تاریخ مرتب کی جس پر قیامت تک اسلام اور مسلمان فخر کرتے رہیں گے۔

قریش کی جس گمراہی کا ذکر کیا گیا ہے اس کا اثر یہیں تک محدود نہیں رہا کہ انہوں نے دولتِ دنیا کو صرف عزت و ذلت کا معیار سمجھا ہو بلکہ آگے بڑھ کر وہ ایک اور خباثت اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ کسی کے پاس سیم و زر کی بہتات اور دولت کی ریل پیل یہ اللہ کی نگاہ میں اس کے مقبول ہونے کی علامت ہے، جب اللہ کسی سے خوش ہوتا ہے تو وہ اسے خوشحال کر دیتا ہے اور جب کسی سے ناراض ہوتا ہے تو اسے بدحال بنا کر دنیا کی تلخیوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی سمجھنے لگے کہ دولت دنیا چونکہ اللہ کی پسندیدگی کی علامت ہے اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر خیر اور بھلائی کی بات وہ اللہ کی طرف سے جب عطا ہوتی ہے تو دولت مندوں کو ہوتی ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن اگر اللہ تعالیٰ اپنی رضا اور اپنی نعمتوں سے کسی کو نوازے گا تو اس کے وہ بندے ہوں گے جن کو اس نے دنیا میں خوشحالی عطا فرمائی تھی۔ رہے وہ لوگ جو دنیا میں تنگی اور ترشی سے گزارا کرتے رہے وہ آخرت میں اسی سلوک کے مستحق سمجھے جائیں گے اور دنیا میں بھی کسی خیر اور بھلائی سے کبھی ان کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اپنے اسی فرسودہ فلسفے سے استدلال کرتے ہوئے وہ مسلمانوں پر طعن توڑتے تھے جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں اللہ نے جن پر احسان فرمایا ہے یعنی ان کو اپنے دین کی دولت سے نوازا ہے اور آخرت میں یہی لوگ کامیاب و کامران ہوں گے اور جنت کی نعمتیں ان کو عطا کی جائیں گی۔ اگر یہ لوگ کسی قابل ہوتے تو دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کو اس طرح برے حالوں میں کیوں رکھتا۔ ان کی جسارتوں کا عالم یہ تھا وہ نبی کریم ﷺ سے بھی درگزر نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کو بھی استہزاء کا نشانہ بناتے اور یہ کہتے کہ نبوت تو اللہ کا ایک بہت بڑا منصب ہے یہ تو کسی چھوٹے معمولی آدمی کو کبھی عطا ہونے والا نہیں اگر اللہ کی جانب سے نبوت ہوتی تو یقیناً مکے کے روسا یا طائف کے امراء کو ملتی۔ تم ایک یتیم، نادار اور غریب آدمی ہو تمہیں نبوت کیسے مل سکتی ہے۔ اصل بیماری وہی ہے کہ انہوں نے دنیا اور دولت دنیا کو عزت اور اللہ کی خوشنودی کا معیار سمجھا اور پھر اس سے نتائج نکالتے چلے گئے۔ پروردگار نے ان کی اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے

Marfat.com

اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰکِرِیۡنَ کیا اللہ تعالیٰ شکرگزار بندوں سے اچھی طرح واقف نہیں۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم نے دین کو دنیا پر قیاس کر کے یہ سمجھا ہے کہ جسے دنیا ملی ہے ظاہر ہے دین کا مستحق بھی وہی ہے حالانکہ خدا کا دین سونا، چاندی یا ریشم اور مخمل نہیں، جس کی کاٹھی اور جس کے جھول گدھوں، خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ تو آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے یہ صرف ان کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکرگزار ہیں۔ جنہوں نے اللہ کی نعمتوں کی قدر کی، جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنہوں نے اپنے کان کھلے رکھے، جنہوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہیں باندھی اور جنہوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہیں ہونے دیا۔ رہے وہ نابکار اور ناشکرے لوگ جنہوں نے خدا کی بخشی ہوئی تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں کو اللہ ہی کے خلاف استعمال کیا ان کیلئے اس نعمت میں کوئی حصہ نہیں۔ دنیا نیک و بد دونوں کو مل جاتی ہے۔ یہ تو خزف ریزے ہیں جو کسی کے نصیب میں بھی ہو سکتے ہیں لیکن دین کی نعمت صرف انہی کو ملتی ہے جو اللہ کے شکرگزار بندے ہیں اور جن کا ظرف اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ جن کی زندگی صرف کھانے پینے، نائو نوش، اوڑھنے پہننے اور ضروریاتِ زندگی تک محدود ہے اور ان کی ساری اولوالعزمیاں عزت اور لذت کے حصول میں صرف ہوتی ہیں وہ بہتر حیوانی زندگی کو مقصدِ انسانیت سمجھتے ہیں۔ انہیں دنیا تو مل سکتی ہے لیکن ایسے انسانیت سے بے خبر لوگوں کو دین نصیب نہیں ہوتا۔ دین کیلئے حیوانی زندگی سے ہاتھ اٹھانا، حیوانی خصائص سے ارفع و اعلیٰ ہونا، حرص و ہوا سے ایثار و استغنا کی منزل تک پہنچنا، دنیا اور دولت دنیا کو منتہا اور مقصود سمجھنے کی بجائے اللہ کی رضا کو اور خدمت انسانیت کو مقصود بنانا یہ وہ چند باتیں ہیں جن کے بغیر دین نہیں ملتا اور اگر مل بھی جائے تو اس کے مقاصد نصیب نہیں ہوتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں یہاں شکرگزار کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ صحابہ کے پاس دولتِ دنیا نہ سہی، ٹھاٹھ باٹھ اور کروفر نہ سہی، انسانیت کے یہ جواہر ان کی گردنوں میں آویزاں تھے اور خوشنودیٔ مولیٰ ان کی پیشانی کا جھومر تھی یہ وجہ ہے کہ اشراف قریش کی نگاہ میں وہ کچھ بھی نہیں تھے اس لئے کہ یہ بصیرت سے محروم لوگ تھے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی نگاہ میں وہ انسانیت کا گلِ سرسبد تھے اور پوری اللہ کی زمین پر یہی وہ لوگ تھے جس کی وجہ سے اللہ کی دھرتی قائم تھی اور انسانیت جن پر فخر کرتی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت کی تاریخ کے اتنے بڑے لوگوں کو اگر انہوں نے طعنوں اور حقارت بھرے طرزِ عمل سے پریشان و مغموم کیا ہے جس سے ان کی دل آزاری ہوئی ہے تو کیسے ممکن تھا کہ اللہ کی طرف سے ان کی اشک شوئی نہ ہوتی اور ان کے مرتبہ و مقام کے مطابق پروردگار کی رحمت ان پر نہ برستی۔ اس لئے آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے:

آیت:54 وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَیۡكُمۡ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰی نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ۝ ''اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آیا کریں جو ہماری آیات پر ایمان لائے تو تم ان کو کہو کہ تم پر سلامتی ہو تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے گا پھر اس کے بعد وہ توبہ اور اصلاح کر لے گا تو وہ بخشنے والا اور مہربان ہے''۔

اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان پر سلام بھیجتا ہے:

اشراف قریش کا اصرار تو یہ تھا کہ آپ انہیں اپنے سے دور کریں تاکہ ہم آپ کے پاس آسکیں۔ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ آیات میں آنحضرت ﷺ کو ان سے منع فرمادیا کہ آپ اشراف قریش کی خاطر ان صحابہ کو ہرگز اپنی صحبت سے دور نہ فرمائیں۔ تصور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ نے جب یہ مژدہ صحابہ کو سنایا ہو گا تو صحابہ یہ سن کر اپنی قسمت پر ناز کرتے ہوئے یقیناً آنحضرت کی بارگاہ کی طرف دیوانہ وار بڑھے ہوں گے۔ کیونکہ انہیں حضور سے چند لمحوں کی جدائی بھی گوارا نہ تھی اور پھر جب انہوں نے دیکھا کہ ان چند لمحوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے خود مداخلت فرمائی ہے تو اب ان کے شوق کی فراوانی اور اس کی وسعت کا کیا

Marfat.com

اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس بے تابی اور بے چینی سے لپکتے ہوئے حضور کی خدمت میں آئے ہوں گے۔ بخدا ان غریب صحابہ کی عزت وحرمت کا کیا ٹھکانہ ہے اور دنیا میں شاید ہی کسی کو اس سے پہلے کبھی یہ عزت ملی ہو اور آئندہ تو ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وحی الٰہی کا سلسلہ بند ہو گیا کہ خود پروردگار اپنے عظیم رسول کو جس کے سامنے کائنات کی عظمتیں ہیچ ہیں حکم دے رہا ہے کہ جب آپ کے یہ غریب صحابہ آپ کے پاس آئیں تو آپ ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہماری طرف سے انہیں سلام پہنچائیں اور سلامتی کی نوید سنائیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اتنے بڑے اعزاز پر صحابہ کی کیفیت کیا ہوگی۔ لیکن آج ہم جب ساڑھے چودہ سو سال کے بعد بھی اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کرتے ہیں تو بے ساختہ یہ خیال آتا ہے

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کرلی ہے:

اس آیت میں سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کا لفظ استعمال ہوا ہے ہم بھی اپنی مجلسی زندگی میں السلام علیکم استعمال کرتے ہیں یہ وہی لفظ ہے ہم اسے کسی مجلس میں آتے ہوئے سلامِ اجازت کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یا کسی مجلس سے رخصت ہوتے ہوئے سلام رخصت کے طور پر بولتے ہیں لیکن عربوں میں اس کا ایک اور استعمال بھی ہے۔ قرآن کریم نے اسی معنی میں یہاں استعمال کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے ملنے آتا ہے تو اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے خود آگے بڑھ کر سلام کہا جاتا ہے اسے خیر مقدمی سلام کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ قیامت کے دن فرشتے اہل جنت کا استقبال اسی لفظ سے کریں گے اور ان کو خوش آمدید کہتے ہوئے انہیں جنت میں داخلے کی درخواست کریں گے۔ یہاں بھی حضور سے فرمایا جارہا ہے کہ جب وہ آپ کی مجلس میں آئیں تو آپ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کہہ کر ان کا خیر مقدم کریں۔ اس سے ان کے دل میں جو کھٹکا پیدا ہو گیا تھا کہ شاید ہمیں حضور کی صحبت سے کبھی کبھی دور رہنا پڑے گا اور کہیں یہ ہمارے لئے محرومی کا باعث نہ بن جائے یہ کھٹکا ان کا دور ہو جائے گا۔ جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ پروردگار خود ان پر سلامتی بھیج رہے ہیں اور چونکہ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ سلامتی بھیجی جارہی ہے اس لحاظ سے کہ سلامتی میں حضور کی دعا بھی شامل ہے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مزید ارشاد ہوا ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ "تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے"﴾ اس میں مخاطب صحابہ ہیں اگرچہ یہ رحمت پوری کائنات کیلئے ہے لیکن صحابہ کو مخاطب کر کے بطور خاص نوازا جارہا ہے۔ احادیث مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کو بیان کرتے ہوئے حضرت سلمان فارسی فرماتے ہیں کہ ہم نے تورات میں یہ لکھا دیکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین اور اس کی ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا تو صفت رحمت کے سو حصے کر کے اس میں سے ایک حصہ ساری مخلوقات کو تقسیم کر دیا چنانچہ انسان اور جانور اور دوسری مخلوقات میں جہاں بھی کوئی رحمت کا پایا جاتا ہے وہ اسی حصہ تقسیم شدہ کا اثر ہے۔ ماں باپ اور اولاد میں بھائی بہنوں میں شوہر بیوی میں عام رشتہ داروں میں پڑوسیوں اور دوسرے دوستوں میں جو باہمی ہمدردی اور محبت ورحمت کے تعلقات مشاہدہ کئے جاتے ہیں وہ سب اسی ایک حصہ رحمت کے نتائج ہیں۔ باقی ننانوے حصے رحمت کے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے رکھے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنی مخلوق پر کیسی اور کس درجے ہے۔ یہ تو عام مخلوقات کا حال ہے۔ لیکن جن خوش نصیب انسانوں سے خطاب فرما کر پروردگار اپنی رحمت کا ذکر فرما رہا ہے کیا کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی کچھ رحمت ان کے حال پر ہوگی اور پھر مزید یہ کہ اس آیت کریمہ میں رحمت کے ذکر کے ساتھ ساتھ رَبُّكُمْ کا ذکر بھی ہے یعنی وہ ذات جس نے اپنے اوپر رحمت لازم کی وہ صرف خالق کائنات اور تمہارا خالق ہی نہیں بلکہ تمہارا رب بھی ہے۔ رب کا معنی ہے زندگی کے ہر دور ہر حال اور ہر ضرورت کے مطابق تربیت کا سامان کرنے والا۔ اس کی ادنیٰ مثال دیکھنی ہو تو ماں کی ذات میں دیکھ لو اس کے اندر تربیت اور پرورش کا جو بے پناہ جذبہ ہمیں ماں کی صورت میں دکھائی

Marfat.com

ہے کہ وہ دنیا کا ہر دکھ اٹھا کر اپنے بچے کے سکھ کا انتظام کرتی ہے وہ بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرتے ہوئے اپنے بچے کو خطرے میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی۔ وہ زندگی کی ہر راحت اپنے بچے پر قربان کر دیتی ہے۔ اس کی نگرانی کی آنکھ اور اس کے دل میں محبت کے جوش سے اٹھنے والا ولولہ برابر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہ پرورش کی ایک محدود مثال ہے' پروردگار اس سے بڑھ کر اپنے بندوں کی ضروریات کو جاننے والا اور ایک ماں سے بڑھ کر پرورش کا جوش اپنے اندر رکھنے والا ہے۔ جب وہ کسی کو اپنی رحمت کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا تعارف بھی کراتا ہے کہ میں تمہارا رب ہوں اور پھر میں نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ پھر ان صحابہ کی قسمت اپنی سرفرازی اور اپنی گراں باری میں کیا قدر و قیمت رکھتی ہوگی۔

توبہ اور اصلاح کے بعد گناہ معاف ہو جاتے ہیں:

انسانی زندگی کتنی بھی پاکیزہ کیوں نہ ہو' اس میں کبھی کسی چال کا لڑکھڑاہٹ سے آشنا نہ ہونا اور کسی خیال میں گناہ کی آلودگی کا در نہ آنا یہ اللہ کے نبیوں کے سوا بہت مشکل بات ہے۔ اس لئے پروردگار نے اپنے بندوں کی فطری کمزوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی رحمت کا اظہار توبہ کی صورت میں فرمایا۔ یہاں بطور خاص ان صحابہ کو سابقہ اور موجودہ غلطیوں اور کوتاہیوں کے حوالے سے یہ مژدہ سنایا جا رہا ہے کہ اس بات کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا کہ تم سے پہلے بھی غلطیاں ہوئی ہوں اور آئندہ بھی شاید ہوں لیکن گھبرانے کی بات نہیں ہم تمہارے لئے بطور خاص اور پوری نوع انسانی کیلئے بطور عام ایک ضابطہ عطا فرما رہے ہیں کہ

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

یعنی جو آدمی جہالت سے کوئی برا کام کر بیٹھے اور اس کے بعد وہ توبہ کر لے اور اپنے عمل کو درست کر لے تو اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والے ہیں اس کے گناہ کو معاف فرما دیں گے اور بہت رحمت کرنے والے ہیں کہ صرف معافی پر کفایت نہ ہوگی بلکہ انعامات سے بھی نوازا جائے گا۔

اس آیت میں لفظ جہالت سے بظاہر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ گناہ کی معافی کا وعدہ صرف اس صورت میں ہے جب کہ ناواقفیت اور جہل کے سبب سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے' جان بوجھ کر گناہ کرنے والا اس حکم میں داخل نہیں' لیکن حقیقت یہ نہیں کیونکہ جہالت سے مراد اس جگہ عملِ جہالت ہے' یعنی ایسا کام کر بیٹھے جیسا نتیجہ سے جاہل و بے خبر کیا کرتا ہے' یہ ضرور نہیں کہ وہ واقع میں جاہل ہو' اس کی تائید خود لفظ جہالت سے بھی ہوتی ہے کہ یہاں لفظ جہل کے بجائے جہالت کا لفظ شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کیلئے ہی استعمال کیا گیا ہے کیونکہ جہل تو علم کا مقابل ہے اور جہالت حلم و وقار کے مقابل ہے یعنی لفظ جہالت محاورات میں بولا ہی جاتا ہے عملی جہالت کیلئے اور اگر غور کیا جائے تو گناہ جب بھی کسی سے سرزد ہوتا ہے تو اس عملی جہالت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے' اسی لئے بعض بزرگوں کا قول ہے کہ جو شخص اللہ و رسول ﷺ کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ جاہل ہے' مراد اس سے یہی عملی جہالت ہے ناواقف اور بے علم ہونا ضروری نہیں کیونکہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی بے شمار نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کرنے سے ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے خواہ غفلت و جہل کی وجہ سے سرزد ہوا ہو یا جان بوجھ کر شرارتِ نفس اور اتباعِ ہویٰ کی وجہ سے۔

اس جگہ یہ بات خاص طور پر قابل نظر ہے کہ اس آیت میں گناہگاروں سے مغفرت اور رحمت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے ایک توبہ' دوسرے اصلاحِ عمل' توبہ کے معنی ہیں گناہ پر ندامت۔ حدیث میں ارشاد ہے انما التوبه الندم ''یعنی توبہ نام ہے ندامت کا''۔

دوسرے آئندہ کیلئے اصلاح عمل' اس اصلاح عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا عزم اور پورا اہتمام کرے اور یہ بھی شامل ہے کہ سابقہ گناہ سے جو حقوق کسی کے ضائع ہوئے ہیں تا حدِ اختیار ان کو ادا کرے خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد' حقوق اللہ کی مثال نماز'

Marfat.com

روزہ‘ زکوٰۃ‘ حج وغیرہ فرائض میں کوتاہی کرنا ہے اور حقوق العباد کی مثال کسی کے مال پر ناجائز قبضہ وتصرف کرنا‘ کسی کی آبرو پر حملہ کرنا‘ کسی کو گالی گلوچ کے ذریعہ یا کسی دوسری صورت سے ایذاء پہنچانا ہے۔

اس لئے تکمیلِ توبہ کیلئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ گزشتہ گناہ پر ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے اور آئندہ کیلئے اپنے عمل کو درست رکھے‘ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو نمازیں یا روزے غفلت سے ترک ہو گئے ہیں ان کی قضا کرے‘ جو زکوٰۃ نہیں دی گئی وہ اب ادا کرے قربانی یا صدقۃ الفطر جیسے واجبات میں کوتاہی ہوئی ہے تو ان کو ادا کرے‘ حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہیں کیا تو اب ادا کرے اور خود نہ کر سکے تو حج بدل کرائے اور اگر اپنے سامنے حج بدل اور دوسری قضاؤں کا موقع پورا نہ ملے تو وصیت کرے کہ اس کے وارث اس کے ذمہ عائد شدہ واجبات کا فدیہ یا بدل کا انتظام کریں‘ خلاصہ یہ ہے کہ اصلاح عمل کیلئے صرف آئندہ کا عمل درست کر لینا کافی نہیں‘ پچھلے فرائض وواجبات کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح حقوق العباد میں اگر کسی کا مال ناجائز طور پر لیا ہے تو اس کو واپس کرے یا اس سے معاف کرائے اور کسی کو ہاتھ یا زبان سے ایذا پہنچائی ہے تو اس سے معاف کرائے‘ اور اگر اس سے معاف کرانا اختیار میں نہ ہو مثلاً وہ مر جائے یا ایسی جگہ چلا جائے جس کا اس کو پتہ معلوم نہیں تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس شخص کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرتے رہنے کا التزام کرے‘ اس سے امید ہے کہ صاحبِ حق راضی ہو جائے گا اور یہ شخص سبکدوش ہو جائے گا۔ اگلی آیت کریمہ میں حاصل مضمون کے طور پر آخری بات فرمائی گئی۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۵۵ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ”اور اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ اہل ایمان کی روش بھی واضح ہو جائے اور مجرموں کا رویہ بھی بے نقاب ہو جائے“۔

اس آیت کریمہ میں لِتَسْتَبِيْنَ کا معطوف علیہ محذوف معلوم ہوتا ہے ہم نے اس کو ترجمے میں کھول دیا۔ اس طرح کی حذف کی مثالیں قرآن کریم میں عام ہیں اور قرآن کریم کا یہ خاص اسلوب ہے۔

آیاتِ الٰہی کی تفصیل سے اہلِ ایمان اپنی منزل متعین کر سکتے ہیں:

حاصل مضمون کے طور پر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے مشرکینِ مکہ کی روش کے ساتھ ساتھ ان کے مطالبات اور ان کے دلائل بھی دیکھے اور قرآن کریم نے ان کے الجھے ہوئے خیالات کے ازالے اور راہنمائی کیلئے نہایت مؤثر دلائل ارشاد فرمائے اور ساتھ ہی ساتھ قرآنی تعلیمات آنحضرت ﷺ کی تربیت کے نتیجے میں صحابہ کرام کی صورت میں جو نہایت خوبصورت اور دل آویز کردار تیار ہوا اس کی جھلک بھی ہم نے دیکھی۔ دونوں کے انجام کو ہمارے سامنے کھول کے رکھ دیا گیا۔ ایک کا انجام دنیا میں رسوائی اور آخرت میں تباہی اور دوسرے کا انجام دنیا میں بھی کامرانی آخرت میں بھی فوز وفلاح ٹھہرا۔ ان دونوں کی تفصیلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے یہ تمام تفصیلات اس لئے کھول کر بیان کر دی تاکہ قرآن کریم پڑھنے والوں اور اس سے راہنمائی حاصل کرنے والوں کو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے کہ قرآن کریم کی دعوت کیا ہے اور اس کے ماننے والوں کا سیرت وکردار کیسا ہوتا ہے اور مشرکین کی الجھنیں کیا ہیں اور ہر دور میں ان کا انجام کیا ہوا ان دونوں باتوں کے واضح ہو جانے کے بعد کسی قرآن کریم کے طالب علم کیلئے ہدایت وضلالت کے حوالے سے فیصلہ کرنا اس قدر آسان ہو گیا ہے کہ اب اس فیصلہ سے صرف وہی محروم رہ سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ رکھی ہو اور یا وہ ہواءِ نفس کا شکار ہو گیا ہو کیونکہ جو آدمی بھی نفس کی خواہشات کو اپنے راہنما بنا لیتا ہے اس کیلئے کسی صحیح بات کو قبول کرنا اور خیر وشر میں تمیز کرنا سب سے مشکل کام ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

آنے والی آیت کریمہ میں شرک کی تردید کے ساتھ ساتھ اس سے پیدا ہونے والے نتائج اور اس کی ہمہ گیری کو ایک نئے پہلو سے نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۵۶ قُلۡ اِنِّیۡ نُهِيۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهۡوَآءَكُمۡ ۙ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَـا مِنَ الۡمُهۡتَدِيۡنَ ۝ ”کہہ دو کہ مجھے تو ان کی عبادت سے روکا گیا ہے جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو' کہہ دو میں تمہاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چل سکتا اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو جاؤں گا اور پھر راہ پانے والوں میں سے نہ بن سکوں گا“۔

جو اللہ کے سوا کسی کو پکارتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے:

اس آیت کریمہ میں دو دفعہ قُلْ کا لفظ آیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ جو کچھ اس آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے وہ مشرکینِ مکہ کے سوالات' شبہات' اعتراضات اور مطالبات کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ عام طور پر معترضین کے سوالات وشبہات کا ذکر نہیں کرتا' البتہ! اس کے جواب سے ایک گہری نظر رکھنے والا سمجھ لیتا ہے کہ یہ کسی سوال کا جواب ہے یا محض براہ راست ایک ہدایت ہے۔ چنانچہ گزشتہ آیات کے ہم جب پس منظر کو دیکھتے ہیں' جس میں مسلسل عقائد پر بحث ہو رہی ہے اور توحید کو بطور خاص دلائل سے مدلل کیا جا رہا ہے تو جب ہم آیت نمبر ۱۴ پر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ آپ مخالفت کے اس ہجوم اور انکار کرنے والوں کے طوفان میں استقامت کی تصویر بن کے کھڑے ہو جائیں اور ان کے سامنے دوٹوک اعلان کر دیں کہ تم میری دعوت کو قبول کرو یا نہ کرو اور شرک کو چھوڑو یا نہ چھوڑو لیکن مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام کا اعلان کروں۔ اور سب سے پہلا مسلمان بن کر کھڑا ہو جاؤں تا کہ لوگ میری استقامت کو دیکھتے ہوئے میری دعوت کو قبول کرنے کا شاید حوصلہ کر سکیں اور مزید یہ بھی فرمایا گیا کہ مجھے اس بات کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں مشرکین کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھوں اور شرک کی معمولی آلائش بھی مجھے نہیں لگنی چاہیے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں اسی بات کو اسی تسلسل میں ایک نئے پہلو سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جن قوتوں کو تم اللہ کے شریک کے طور پر پکارتے ہو تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ یہ شاید پوجا پاٹ کا معاملہ ہے۔ پوجا پاٹ تو کسی کی بھی کر لی جائے اور نام کسی کا بھی جپ لیا جائے اور سر کسی کے سامنے بھی جھکا لیا جائے اس سے باقی زندگی کے اسلوب میں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے آیت کے آغاز ہی میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ مجھے صرف شرک سے ہی نہیں روکا گیا بلکہ اس کے نتیجے میں زندگی میں جو ایک ہمہ گیر تبدیلی آتی ہے اور جس سے منزل اور جہت سب کچھ بدل کے رہ جاتا ہے مجھے اس سے روکا گیا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا نام عبادت اور بندگی ہے یعنی میں اس بات کا پابند کیا گیا ہوں کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی اختیار نہ کروں' یعنی میری زندگی کا ہر لمحہ اور میرے رویے کا ہر پہلو اور میرے فیصلے کا ہر گوشہ اور میرے اختیارات کا ہر فیصلہ اللہ کی بندگی کے سائے میں ہو اور کہیں بھی اس کے اختیار، اس کی بڑائی اور عظمت اور اس کی حاکمیت سے تجاوز کرنے کا شائبہ بھی نہ پایا جائے۔ میں جس طرح اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے سر نہ جھکاؤں اسی طرح میں معاشرت' معیشت' تہذیب' تمدن' سیاست' عدالت' حتیٰ کہ حکومت میں بھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروں۔ میری ذات اور میرے گھر سے لے کر اجتماعی زندگی تک میری معاشرت اور معیشت صرف اللہ کے حکم کے تابع ہو۔ میرا معاش چاہے وہ کسی ذریعے سے بھی ہو وہ اس نظام معاش کے تحت ہو جو ہمیں اسلامی شریعت نے عطا کیا ہے اور میری اجتماعی زندگی کے تمام مراحل چاہے اس کا تعلق عدالت سے ہو' چاہے سیاست سے ہو' چاہے پارلیمنٹ سے ہو اور چاہے ایوان ہائے حکومت سے ہر جگہ اللہ کا حکم اور اس کی خوشنودی میرے پیش نظر ہو اور وہی میری راہنما ہو۔ یہ وہ عبادت اور بندگی ہے جو اصلاً میرے پیش نظر ہے اور اس میں میں اللہ کے ساتھ

Marfat.com

کسی اور کو شریک کرنے سے روک دیا گیا ہوں چونکہ امر و نہی میں اللہ کے نبی اور رسول کی ذات فکری اور عملی نمونہ ہوتی ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اس روکے جانے کے نتیجے میں اللہ کا نبی اس کے مطابق عمل کا نمونہ بن کر اس طرح اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ تمام دنیا اس سے روشنی پاتی ہے۔ اس کے بعد دوسری دفعہ لفظ قُلْ کہہ کر تمام دنیا کے مشرکین کی ایک اور غلط فہمی دور کی گئی ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے زندگی میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ اللہ کی بندگی کا مفہوم ان کے نزدیک اللہ کو خالق کائنات اور کائنات کی سب سے بڑی ذات اور اسی سے مصیبت اور ضرورت کے وقت تنہائی میں مناجات کے سوا اور کچھ نہیں اگر کوئی آدمی اللہ سے یہ تعلق رکھتا ہے تو وہ اللہ کو مانتا ہے چاہے اس کی زندگی کی منزل اور اس کے گزارنے کا طریقہ کچھ بھی ہو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جو آدمی اپنے اللہ کی بندگی کرتا ہے وہ اپنی زندگی کے کسی بھی فیصلے کے وقت سب سے پہلے شریعت اسلامی کو دیکھے گا اور اس کے مطابق اپنا عمل تجویز کرے گا۔ لیکن جو آدمی اللہ کو ماننے کا صرف وہ تصور رکھتا ہے جس کا اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے وہ زندگی گزارتے ہوئے کبھی ایک لمحے کو بھی یہ سوچنا گوارا نہیں کرتا کہ اس بارے میں اللہ کا حکم کیا ہے کیونکہ اللہ اور بندے کا معاملہ اس کے نزدیک ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جو صرف پوجا پاٹ کی حد تک محدود ہے۔ رہے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معاملات ان کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ انسان اس میں آزاد ہے۔ اس کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے سامنے سب سے بڑا راہنما اس کے دل کی خواہشات ہیں وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی میری اپنی زندگی ہے اس کو گزارنے کا حق مجھے ہے اسے کس طرح گزارا جانا چاہئے اس کا فیصلہ کرنے کا حق بھی مجھے ہی ہے۔ چنانچہ میں اس کیلئے آزاد ہوں کہ میں زندگی میں ہر وہ کام کروں جو میری خواہش نفس کہتی ہے اسی کو یہاں اَھْوَآئَکُمْ کہہ کر ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی تم نے چونکہ اپنے آپ کو اللہ کے احکام اور اس کی شریعت سے آزاد سمجھ رکھا ہے اور تم صرف اس کو مصیبت کے وقت پکار کے یہ سمجھتے ہو کہ تم نے اس کو ماننے کا حق ادا کر دیا اس حوالے سے اگر تم اس کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک بنا لیتے ہو اور پھر تم ان کو بھی پکارنے لگتے ہو تو تمہارے نزدیک اس سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے اس تصور نے زندگی کے مجموعی رویے کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ اب تم جو کام بھی کرتے ہو یا کرو گے وہ تو من مرضی سے کرو گے اور اگر تم پر کوئی باہر کی قوت کا دباؤ ہو گا تو وقتی طور پر اسے مان لو گے لیکن جب بھی تمہیں اپنی مرضی بروئے کار لانے کا موقع ملے گا تو تم اس سے کبھی دریغ نہیں کرو گے کیونکہ تمہاری زندگی میں اصل حکمران اور اصل راہنما وہ تمہاری یہی ہوائے نفس اور نفسانی خواہشیں ہیں۔ کہا میں چونکہ اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ کی بندگی کی دعوت دینے کیلئے آیا ہوں اگر میں تمہاری بات کو کسی حد تک بھی قبول کر لوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں بھی تمہاری طرح اللہ کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی بندگی شروع کر دوں اور پھر میں اللہ کا بندہ ہونے کی بجائے بندۂ نفس یا بندہ شکم یا بندہ ہوس بن کر زندگی گزاروں اگر اللہ نہ کرے میں ایسا ہو جاؤں تو پھر میری گمراہی میں کیا دیر ہے اور پھر مجھے اس گمراہی سے کون بچا سکتا ہے؟ اس تصور کو قبول کر لینے کے بعد اندازہ فرمایئے کہ اگر میں راہ راست اختیار کرنا بھی چاہوں تو مجھے ہدایت کون دے سکتا ہے؟ کیونکہ بندگی رب اور بندگی نفس میں اتنا کھلا تضاد ہے کہ ایک معمولی عقل و خرد کا آدمی بھی اگر کبھی غیر جانبداری سے غور کرے تو اسے تضاد کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہئے۔ سامنے کی بات ہے کہ ہمیں اللہ نے پیدا کیا وہی ہمیں رزق دیتا ہے اسی نے ہمیں بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں زندگی اس کی دین ہے اور زندگی گزارنے کیلئے جو اس نے حواس اور عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ یہ اس کا سب سے بڑا احسان ہے۔ پھر اس نے ہمیں خیر و شر کی تمیز سے بہرہ ور فرمایا ہے بلکہ ہمارا ایک ایک رونگٹا اس کے احسانات کا مرہونِ منت ہے۔ اب اگر پروردگار ہم سے یہ سوال کرے کہ جب تمہارے وجود اور تمہارے جسم و جان سے لے کر تمہاری ایک ایک نعمت میری دی ہوئی اور میری عطا ہے تو پھر تم میرے احکام کی اطاعت کی بجائے اپنے ہوائے نفس کی اطاعت کیوں کرتے ہو۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی غلام اپنے آقا

Marfat.com

یہ کہنا شروع کردے کہ میں ہر طرح آپ کا غلام اور آپکا بندہ ہوں میں آپ کو اپنا آقا تسلیم کرتا ہوں' لیکن میں زندگی میں ہر کام اپنے نفس سے پوچھ کر کروں گا۔ آپکی اطاعت کرنا میرے بس کی بات نہیں تو کیا یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ اسکے بعد اس کا آقا اسکے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ قرآن کریم بار بار انسانوں سے اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد سوال کرتا ہے کہ بتاؤ تمہیں یہ سب کچھ کس نے دیا ہے اور اگر یہ اللہ ہی نے دیا ہے تو پھر تم خود ہی فیصلہ کرو کہ تمہیں بندگی کس کی کرنی چاہئے۔ اقبال نے ایسے ہی سوالات پر مشتمل چند آیات کا کیسا خوبصورت ترجمہ کیا ہے جس میں یہی بات پوچھی گئی ہے۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ ساز گار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نور آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب
دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

یہ زمین بھی اور اس پر ساری نعمتیں بھی اللہ کی عطا ہیں تو پھر کیا اس زمین پر بسنے والوں کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کریں؟

قُلْ اِنِّىْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ
کہہ دو کہ میں تو اپنے پروردگار کی دلیل
رَّبِّىْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۚ مَا عِنْدِىْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۚ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا
روشن پر ہوں اور تم اس کی تکذیب کرتے ہو جس چیز (یعنی عذاب) کے لیے تم جلدی کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں ہے
لِلّٰهِ ۚ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِىْ
(ایسا) حکم اللہ ہی کے اختیار میں ہے وہ سچی بات بیان فرماتا ہے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ جس چیز
مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِىَ الْاَمْرُ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ
کے لیے تم جلدی کر رہے ہو اگر وہ میرے اختیار میں ہوتی تو مجھ میں اور تم میں فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور خدا ظالموں سے
بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ۗ وَيَعْلَمُ مَا
خوب واقف ہے۔ اور اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اُسے جنگلوں اور

Marfat.com

فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ

دریاؤں کی سب چیزوں کا علم ہے اور کوئی پتہ نہیں جھڑتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور زمین کے

ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٩﴾ وَهُوَ

اندھیروں میں کوئی دانہ اور کوئی ہری اور سوکھی چیز نہیں ہے مگر کتاب روشن میں لکھی ہوئی ہے اور وہی

الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ

تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر

فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا

رکھتا ہے پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے تاکہ (یہی سلسلہ جاری رکھ کر زندگی کی) معین مدت پوری کر دی جائے پھر تم

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ

سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس روز) وہ تم کو تمہارے عمل جو تم کرتے ہو (ایک ایک کر کے) بتائے گا۔ اور وہ اپنے

حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا

بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگہبان مقرر کیے رکھتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے

يُفَرِّطُوْنَ ﴿٦١﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَ

فرشتے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور وہ کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر (قیامت کے دن تمام) لوگ اپنے مالک حق

هُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿٦٢﴾ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ

خدائے تعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے۔ سن لو کہ حکم اسی کا ہے اور وہ نہایت جلد حساب لینے والا ہے۔ کہو بھلا تم کو جنگلوں اور

الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَىِٕنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ

دریاؤں کے اندھیروں سے کون مخلصی دیتا ہے (جب) کہ تم اسے عاجزی اور نیاز پنہانی سے پکارتے ہو اور کہتے ہو اگر خدا ہم کو

مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ

اس (تنگی) سے نجات بخشے تو ہم اس کے بہت شکر گزار ہوں۔ کہو کہ خدا ہی تم کو اس (تنگی) سے اور ہر سختی سے نجات بخشتا ہے

Marfat.com

تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ
پھر (تم) اُس کے ساتھ شرک کرتے ہو۔ کہہ دو کہ وہ (اس پر) بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے
فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ
پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں فرقہ فرقہ کر دے اور ایک کو دوسرے (سے لڑا کر آپس) کی لڑائی
بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾
کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح بیان کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ سمجھیں۔

مشرکین مکہ کی جانب سے آنحضرت ﷺ سے نئے نئے مطالبات کئے جا رہے تھے۔ آنے والی آیت کریمہ میں انہی میں سے ایک مطالبے کا اشارۃً ذکر ہو رہا ہے اور نہایت موثر انداز میں اس کا جواب ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

آیت:57 قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ کَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ O ”کہہ دو! میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے۔ وہ چیز میرے پاس نہیں ہے، جس کیلئے تم جلدی مچائے ہوئے ہو۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی حق کو واضح کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے“۔

رسول ﷺ کا کام اللہ کا پیغام کھول کر بیان کرنا ہے:

اس آیتِ کریمہ میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ چند باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ میں تمہاری اصلاح کیلئے اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کے آیا ہوں اور تمہاری زندگی کی راہنمائی کیلئے اس نے مجھ پر جو کتاب اتاری ہے میں وہ بلا کم و کاست تم تک پہنچا رہا ہوں اور تمہاری ہدایت و اصلاح کیلئے جو کوشش بھی مجھ سے ممکن ہے، میں اپنی ہمت سے بڑھ کر اسے ادا کر رہا ہوں۔ گویا میرے اور تمہارے درمیان جو معاملہ چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ تمہارے عقائد تمہارے معاملات اور تمہارے اخلاق میں جو فساد پیدا ہو چکا ہے میں اس نسخۂ کیمیا سے کام لے کر جو اللہ نے مجھ پر اتارا ہے تمہاری اصلاح کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب ہونا تو یہ چاہئے کہ اس دعوت و تبلیغ یا اصلاح و ہدایت کے عمل میں تمہیں کسی بات پر اعتراض ہے یا تمہیں کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی تو سنجیدگی سے اسے پیش کرو میں پوری متانت اور توجہ سے اسے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ اپنی زندگی کی اصلاح کر لو اس سے تمہاری دنیا بھی بہتر ہو جائے گی اور آخرت میں بھی کامیاب و کامران ٹھہرو گے۔ تم بجائے میری بات پر توجہ دینے کے مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرنے لگتے ہو اور کبھی نئی نئی نشانیاں دیکھنا چاہتے ہو حالانکہ کسی بات کو سمجھنے یا اس کو باور کرنے کیلئے بینات اور

Marfat.com

دلائل کی ضرورت ہوتی ہے میں تمہارے سامنے ایک سے ایک بڑھ کر بینہ پیش کر چکا ہوں۔ حتیٰ کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے پیغمبر ہونے اور میری دعوت وتبلیغ کے برسرحق ہونے کی سب سے بڑی گواہی خود اللہ کی ذات ہے۔ اس نے اپنی یہ گواہی قرآن کریم کی صورت میں پیش فرمائی ہے اور یہ بات بھی دلائل سے واضح ہو چکی کہ قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی عقل کا اندھا ہی شک کر سکتا ہے۔ اب بجائے اس بینہ کو قبول کرنے اور اس پر غور کرنے کے تم نے صاف صاف اسے ماننے سے انکار کر دیا اور جب بینہ ہی قابل تسلیم نہ ٹھہرا تو جس کے ثبوت کیلئے وہ بینہ آیا ہے وہ خود قابل تسلیم کیسے ٹھہرے گا۔ اس لئے تم نے میری یعنی اللہ کے رسول کی تکذیب کر دی اور بار بار عذاب کا مطالبہ کرنے لگے کہ اگر تم واقعی اللہ کے نبی ہو تو اللہ کا عذاب ہمیں دکھاؤ اور تم اتنی بات نہیں سمجھتے کہ عذاب تو تباہی اور ہلاکت کا ذریعہ ہے اس کے آ جانے کے بعد مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے اور یہ عذاب قوم کی کمر توڑ کے رکھ دینا ہے۔ لیکن تم نے اسے ایک مذاق سمجھ رکھا ہے اور بار بار اس کا مطالبہ کر رہے ہو اگر تم اس بات پر غور کرو تو شاید تمہیں اپنی نامعقولیت کا خود ہی احساس ہونے لگے۔

عذاب کا فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ کرتا ہے:

دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ کہ تم عقل سے اس حد تک عاجز ہو اور یا شاید تم سنجیدگی سے سوچنا نہیں چاہتے کہ میں تمہارے سامنے اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ رسول کا کام رسالت یعنی اللہ کا پیغام پہنچانا ہے اور اس کی عطا کردہ بصیرت کے مطابق لوگوں کی اصلاح کرنی ہے۔ اس کیلئے رسول کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تمہارے سامنے علمی استدلال' اخلاقی بلندی اور عملی پاکیزگی سے اپنی بات اور اپنے مؤقف کو پوری طرح ثابت کرے اور اس میں کوئی کمی نہ رہے۔ رہی یہ بات کہ اگر تم اسے قبول نہیں کرتے ہو تو پھر تم پر خدا کا عذاب آتا ہے یا نہیں یہ اختیار تو صرف اللہ کا ہے۔ اللہ کا رسول تو دنیا میں عذاب لانے یا عذاب لانے کا اختیار لے کر نہیں آتا۔ چنانچہ جس چیز کا اختیار میرے پاس نہیں اور جس کا میں نے دعویٰ بھی نہیں کیا۔ تم اس کا مطالبہ مجھ سے کیوں کرتے ہو میں تو اگر عذاب کا ذکر کرتا ہوں تو تمہارے سامنے تمہاری بھلائی اور تمہاری عافیت کیلئے سنت اللہ کو ذکر کرتا ہوں کہ پہلی قوموں کی تاریخ تمہارے سامنے ہے۔ دیکھ لو ان کی ہدایت کیلئے جب بھی رسول آئے اور انہوں نے جب ان کی تکذیب کی تو پھر اللہ کے عذاب نے انہیں تباہ کر دیا۔ تم اللہ کی مملکت میں انہی کی طرح ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہو۔ تم بھی اگر اس کے بھیجے ہوئے رسول اور اس کی دعوت کی تکذیب کرو گے تو یقیناً تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔ میری اس بات کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے کہ تم میری دعوت پر غور کرو اور اللہ کے عذاب سے ڈر کر اللہ کے سامنے عاجزی اور ایمان کا راستہ اختیار کرو لیکن تم بار بار مجھ ہی سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو۔ خود اندازہ کرو کہ یہ بات عقل کے کس قدر خلاف ہے۔ اس لئے کہ اپنی تمام خرابیوں کے باوجود تم اتنی بات تو سمجھتے ہو کہ کسی قوم کو مہلتِ عمل دینا یا کسی قوم پر عذاب بھیجنا اور ان کو ہلاک اور تباہ کر دینا اس کا تعلق سراسر ایک اور اختیار سے ہے اور تم جانتے ہو کہ اس طرح کے ہر حکم اور اختیار کا مالک صرف اللہ ہے۔ میں تو اس کا فرستادہ ہوں میں خود بھی اسی کے حکم کا پابند ہوں جب تک اس نے تمہیں مہلت عمل دے رکھی ہے میں پابند ہوں کہ تم تک اس کا دین پہنچاؤں اور تم اس بات کے پابند ہو کہ میری دعوت کو غور سے سنو اسے قبول کرو۔

تیسری بات جس کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی رسول کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے اور وہ قوم اس رسول کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے انکار اور تکذیب کا راستہ اختیار کرتی ہے تو کیا اس قوم کو یونہی چھوڑ دیا جائے اور وہ مسلسل تکذیب کرتی رہے اور آنے والی نسلیں ان اسی تکذیبی عمل کی وارث بنیں یا یہ ہونا چاہئے کہ اس قوم کو سزا کے طور پر تباہ کر دیا جائے اور اس طرح حق کے حق ہونے کو واضح کر کے دنیا پر اس کی بر

Marfat.com

اور سچائی کو ظاہر کر دیا جائے۔ اگر پہلی صورت پر عمل کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کائنات کا کوئی حاکم نہیں یہ اپنے تئیں خود ہی پیدا ہوئی ہے اور اس میں رہنے والے خودرو پودوں کی طرح اپنی مرضی کی زندگی گزارنے میں آزاد ہیں اور اگر واقع میں ایسا نہیں تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تکذیب کرنے والی قومیں ہمیشہ کیلئے تکذیب میں آزاد نہیں چھوڑی جاتیں بلکہ ایک خاص حد تک پہنچ کر ان کی گرفت ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ خاص حد کیا ہے اور قوموں کے بارے میں اس طرح کے فیصلے کرنے کا اختیار کسے ہے؟ اور کس کا علم اتنا وسیع ہے؟ جو قوموں کے بارے میں اس طرح کے صحیح فیصلے کر سکتا ہے مشرکین مکہ کو یہ توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تم اپنی تمام تر جہالت کے باوجود اتنا تو سمجھتے ہو کہ یہ اختیار اور علم کی یہ وسعت اور پاکیزگی اللہ کی صفت ہے اس لئے یہاں آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ وہی حق کو واضح کرے گا۔ کیونکہ وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں اسی بات کو ایک اور پہلو اور ایک مختلف انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۵۸ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ O ’’کہہ دو! اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی‘ جس کیلئے تم جلدی مچائے ہوئے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں سے خوب باخبر ہے‘‘۔

اگر عذاب کا فیصلہ رسول کے پاس ہوتا تو جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا:

اس آیت کریمہ میں علمی نکات تو کئی ہیں۔ لیکن بطور خاص دو باتوں کو نمایاں کیا گیا ہے ایک یہ بات کہ تم جو بار بار مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو اور اس کی جلدی مچا رہے ہو تم نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر یہ اختیار میرے پاس ہوتا کہ میں جب چاہتا تمہیں عذاب سے تباہ کر دیتا تو کچھ معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ تم اب تک تباہ ہو چکے ہوتے کیونکہ تم نے میری دعوت کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے تم خود بھی اگر غور کرو کہ ایسے سلوک کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے تو یقیناً تمہیں فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی اس لئے کہ تم خوب جانتے ہو کہ میری ذاتی زندگی برس ہا برس تمہارے سامنے گزری ہے‘ تم گواہی دیتے ہو کہ میں نے ایسی پاکیزہ زندگی گزاری ہے جس میں کسی اخلاقی عیب کا کبھی تمہیں سراغ تک نہ مل سکا تم ہمیشہ مجھے الصادق اور الامین کہہ کر پکارتے رہے ہو اور پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ جو کلام میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اس کا جواب لانا تمہارے بس میں نہیں۔ اگر وہ میرا کلام ہوتا تو میں بھی تمہاری ہی طرح ایک عرب ہوں اور اسی ماحول میں میں نے پرورش پائی ہے اس کلام کا جواب دینے میں تمہیں کبھی دشواری پیش نہ آتی۔ پھر جس طرح میں نے تمہارے ایک ایک دروازے پر دستک دی ہے اور کوئی سی ایسی مشکل نہیں جو اس راستے میں میرے لئے پیدا نہ کی گئی ہو اور میں نے اسے خندہ پیشانی سے برداشت نہ کیا ہو۔ تمہاری گالیاں سن کر میں نے دعائیں دیں‘ تم نے مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر اذیتوں کی انتہا کر دی لیکن میں نے کبھی کوئی نا ملائم جملہ تک تمہارے لئے نہیں کہا۔ تم نے میرے راستے میں کانٹے بچھائے ہیں میرے ساتھیوں کو دہکتے انگاروں پر لٹایا ہے لیکن میں نے ہمیشہ تمہارے سامنے پھول پیش کئے اور تمہیں جنت کا راستہ دکھایا۔ اس پوری کشمکش کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے کہ میں تمہاری اذیتوں سے تنگ آ کر تم پر عذاب کے بارے میں سوچنے لگوں کیونکہ بڑے سے بڑے انسان کے صبر کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے اور میں نجانے کب سے اس انتہا کو چھو رہا ہوں۔ ذرا غور کرو اگر یہ عذاب لانا میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہارے ان مظالم کی وجہ سے کیا تم پر عذاب وارد نہ کر چکا ہوتا اور بہت پہلے میں تمہیں تباہ کر کے اپنے دل کو ٹھنڈا کر چکا ہوتا۔ لیکن یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے عذاب کا اختیار صرف اپنے پاس رکھا ہے‘ کسی انسان بلکہ اپنے پیغمبر تک کو نہیں دیا۔

دوسری بات جس کو ذکر کیا جا رہا ہے وہ اسی پہلی بات کا نتیجہ ہے وہ یہ کہ کسی قوم کو مہلتِ عمل کس حد تک ملنی چاہئے۔ اس کا دار و مدار اس بات پر ہے

Marfat.com

کہ یہ معلوم ہو کہ اس قوم کے لوگوں میں قبولیتِ ایمان کی استعداد کہاں تک ہے جب تک اس بات کا اچھی طرح یقین نہ ہو جائے قوم کے بارے میں عذاب کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے اگر ان لوگوں میں ایک عنصر ایسا باقی ہو جن میں قبولیت ایمان کی استعداد ابھی تک بالکل ختم نہیں ہوئی اور اس کے سوتے بالکل خشک نہیں ہو گئے اس وقت تک اس پر عذاب لانے کا فیصلہ کرنا یقیناً عدل کے تقاضے کے خلاف ہو گا اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ گھی نکالنے کیلئے دودھ کو بلونے والا اس وقت تک بلوتا رہتا ہے جب تک اس دودھ میں گھی کا آخری حصہ باقی ہوتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ گھی کی آخری تلچھٹ تک نکال لی گئی ہے تو پھر وہ بلونا بند کر دیتا ہے اور اگر وہ اپنے بلونے کے عمل کو پہلے بند کر دے یہ سمجھ کر کہ دودھ لسی بن چکا ہے اسے ضائع کر دے تو یہ اللہ کی نعمت کی ناقدری ہو گی اور ایک غلط عمل ہو گا جس کا جواب دینا پڑے گا۔ اسی طرح ایک پیغمبر جس قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے اس کے ایک ایک فرد پر اس امید کے ساتھ محنت کرتا ہے کہ شاید اس میں قبولیت ایمان کی استعداد کا کوئی سوتا باقی رہ گیا ہو اور میری کوشش سے ممکن ہے وہ کھل جائے اور اس کو اللہ ایمان کی توفیق دے دے۔ اب یہ بات کہ اس نعمت سے وہ قوم آخری حد تک کب محروم ہوتی ہے اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ چنانچہ یہاں یہی بات فرمائی جا رہی ہے کہ تم جو عذاب کیلئے جلدی مچائے ہوئے ہو۔ قدرت تم پر مہربان ہے وہ تمہیں آخری حد تک قبولیت ایمان کا موقع دینا چاہتی ہے لیکن تم ایسے بدنصیب ہو بجائے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے الٹا اس سے لڑ رہے ہو اور اس تاخیر کو اپنے لئے نعمت سمجھنے کی بجائے اللہ کے نبی پر طعن و تشنیع کا ذریعہ بنا رہے ہو۔

آیت کا آخری لفظ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ کہ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے اس کے تین مفہوم سمجھ میں آتے ہیں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ کا مفہوم:

1- رسول اللہ ﷺ اپنی تمام تر مخلصانہ مساعی کے باوجود جب مشرکین کے تمرد اور طغیان کو دیکھ رہے ہیں کہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور ان کی اذیتوں میں تیزی آتی جا رہی ہے اور یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ان پر عذاب نازل نہیں ہو رہا تو آپ یہ معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں کہ یا اللہ میں تو اپنے امکانی مساعی جاری رکھوں گا لیکن ان کا معاملہ تیرے سپرد ہے تو چاہے تو ان پر عذاب نازل فرما اور چاہے تو ان کو ایمان کی توفیق دے دے کیونکہ ان کی قسمت بدلنا تو میرے اختیار میں نہیں میں نے تو اپنی سی ساری کاوشیں کر کے دیکھ لیں لیکن ان کی بدنصیبی شاید ان کا مقدر بنتی جا رہی ہے۔ ان کی سنگدلی کی یہ انتہا ہے کہ میں تیری رحمت ان کے سامنے پیش کرتا ہوں لیکن یہ مسلسل اپنے اوپر ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ میں ان کے سامنے تیری نعمتوں کی خوشخبریاں پیش کرتا ہوں لیکن یہ اس کے جواب میں پتھروں کے طلبگار ہوتے ہیں۔ میں ان کو مچھلی دیتا ہوں اور یہ سانپ پکڑنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جسے علمی زبان میں تفویض کہا جاتا ہے۔

2- یہ دھمکی ہے کہ ظالمو تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا یہ رویہ شاید مسلسل جاری رہے گا اور تم میری دعوت کے ساتھ یہی سلوک مسلسل جاری رکھو گے، تمہیں اس سے بے خبر نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ تم میں سے ایک ایک آدمی کی کرتوتوں سے واقف ہے۔ وہ برابر تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے اس کی نگاہیں برابر تمہارا تعاقب کر رہی ہیں۔ وہ جو تمہیں مہلت پر مہلت دے رہا ہے اور تم بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے اپنی سرکشی سے رکنے کی بجائے بڑھتے جا رہے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس طرح بچ جاؤ گے بلکہ تم اپنی فائل کو بھاری کرتے جا رہے ہو اور تمہارا نامہ عمل اور سیاہ ہوتا جا رہا ہے۔ تم جیسے جیسے آگے بڑھو گے ویسے ویسے قیامت کے دن تمہارے لئے جواب دہی مشکل ہو گی کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام ظالموں کو پوری طرح جانتے ہیں ان کے اعمال سے واقف ہیں ان کے کرتوت اس کی نگاہوں میں ہیں اس لئے جب وہ ایک ایک کا حساب مانگے گا تو سوچ لو تمہارے ساتھ کیا گزرے گی اور اگر اس نے یہیں تم پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تو یہ مت سمجھو کہ تم میں سے کوئی ظالم اس سے بچ نکلے گا کیونکہ تم میں سے ایک ایک اس کی نگاہوں میں ہے۔

Marfat.com

3- پہلے بھی یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ مشرکین میں سے ایک بڑا طبقہ تو ایسا تھا جو قیامت کے آنے کو ویسے ہی خلاف عقل سمجھتا تھا اس لئے وہ اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو قیامت کے آنے کو ممکن تو سمجھتے تھے لیکن اس میں تمام لوگوں کا حساب اور ایک ایک عمل کی جواب دہی ان کے نزدیک ناقابل تصور تھی انہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ اربوں کھربوں مخلوق جب میدان حشر میں جمع ہو گی اولاً تو ان کا شمار ہی ممکن نہیں ہو گا اور پھر ان میں سے ہر ایک کے اعمال وہ تنی بڑی تعداد میں ہوں گے کہ اس کا تصور بھی ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ پھر ان تمام اعمال کا ایک ایک کر کے حساب لینا اور اس پر جزا یا سزا کا فیصلہ کرنا یہ تو بالکل ہی ناممکن سی بات ہے۔ اس لئے جب انہیں قیامت کے دن جواب دہی سے ڈرایا جاتا تو وہ اس طرح کی باتوں سے قیامت کا مذاق اڑاتے اور بنیادی بات یہی کہتے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ایک آدمی کے اعمال سے واقف ہو۔ چنانچہ اس کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ ان کے ایک ایک عمل کو جانتا ہے اس لئے تم جو سمجھتے ہو کہ بے خبری میں وہاں تم بچ نکلو گے۔ کہا یہ ممکن نہیں۔

یہاں چونکہ اللہ کے علم کی وسعت کی بات چھڑی ہے تو اگلی آیت کریمہ میں پروردگار نے کرم فرمایا کہ اپنے علم کی وسعتوں کو نہایت آسان انداز میں ہمارے سامنے واضح فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۵۹ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ O ''اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا اور بر و بحر میں جو کچھ ہے' اس سے وہ واقف ہے۔ کوئی پتہ نہیں گرتا' مگر وہ اس کو جانتا ہے اور نہ زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا ہے اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے' مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے''۔

غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے:

اس آیت کریمہ میں مفاتح کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ مَفتح اور مِفتح دونوں کی جمع ہو سکتی ہے پہلی صورت میں اس کا معنی ہو گا خزانے اور دوسری صورت میں اس کا معنی ہو گا خزانوں کی کنجیاں یا چابیاں۔ بات ایک ہی ہے کہ اسی کے پاس غیب کے خزانے ہیں یا غیب کے خزانوں کی کنجیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کے پاس کنجیاں ہوں گی خزانے بھی اسی کے پاس ہوں گے۔ پھر یہاں عِنْدَهٗ کے لفظ کو مقدم کر کے قواعد عربیت کے مطابق حصر اور اختصاص کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے یعنی ان خزائن غیب کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال مثلاً حیات' علم' قدرت' سمع' بصر' ارادہ' مشیت' خلق اور رزق وغیرہ بہت ساری ہیں۔ وہ ان تمام صفات میں ایسا کامل ہے کہ اسکے سوا کوئی مخلوق کسی صفت میں اسکے برابر نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان صفات میں دو صفتیں ایسی ہیں جن پر قرآنِ کریم نے سب سے زیادہ زور دیا ہے ایک صفت علم اور دوسری صفت قدرت' اس کا علم تمام موجود اور غیر موجود ظاہر اور مخفی بڑے اور چھوٹے ہر ذرہ ذرہ پر حاوی اور محیط ہے۔ اسی طرح اسکی قدرت بھی ایک ایک چیز پر حاوی ہے۔ ان دونوں صفتوں کو قرآنِ کریم نے بار بار اسلئے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی آدمی ان صفتوں کا یقین اور استحضار اپنے اندر پیدا کر لے تو وہ کبھی گناہ کے قریب نہیں جا سکتا۔ اگر ایک آدمی کو اس بات کا یقین ہو جائے اور یہ یقین ہر وقت اس کے دل و دماغ میں مستحضر رہے کہ میرا کوئی لمحہ ایسا نہیں جو اللہ کے علم میں نہ ہو میں ہزار تاریکیوں اور تنہائیوں میں چھپ کر بھی کوئی کام کروں لیکن میرا اللہ اس سے واقف ہے۔ میں برابر اسکی نگاہوں میں ہوں۔ اسکے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح اسکی نافرمانی کرنے والا ایک عام فرد ہو یا کوئی وقت کا شہنشاہ یا وہ نافرمانی کرنے والے

Marfat.com

چند آدمی ہوں یا دنیا بھر کے لوگ اللہ کی قدرت ایسی بے پناہ ہے کہ اسکی گرفت اور پکڑ سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ شہنشاہ بھی اسکے سامنے اسی طرح عاجز ہیں جیسے ایک عام بے یارو مددگار شخص اور جسطرح اسکی قدرت ایک آدمی کی گرفت کر سکتی ہے اسی طرح ساری دنیا کو اس کیلئے پکڑنا آسان ہے۔ جب اسکی ان دو صفات کا علم کسی کے رگ وپے میں اتر جاتا ہے تو پھر نہ تو وہ اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور نہ کبھی وہ غیر خدا سے ڈرتا ہے اسے چونکہ اس بات کا یقین ہے کہ اللہ میرے حال سے واقف ہے اور میں اسکے دین کی خاطر بڑی قوتوں سے ٹکرا رہا ہوں اور اسے یقین ہے کہ اللہ سے بڑھ کر کسی کی قدرت نہیں تو پھر وہ وقت کے فراعنہ اور نمارده کو بھی پتلیوں سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ بڑی بڑی حکومتوں کو ڈھلتے ہوئے سایوں کی طرح دیکھتا ہے۔

مفاتح الغیب کا مطلب:

اس آیت میں مفاتح الغیب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی غیب کے خزانے اسلئے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں یا وجود میں تو آ چکی ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیا۔ پہلی قسم کی مثال وہ تمام حالات وواقعات ہیں جو قیامت سے متعلق ہیں یا کائنات میں آئندہ پیش آنے والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی ستارہ یا سیارہ کب کیا شکل اختیار کرے گا۔ اسکی گردشیں اور اسکے آثار کائنات میں کیا نتائج پیدا کریں گے۔ یا سائنسدانوں کے بقول کائنات جو برابر وسعت پذیر ہوتی رہتی ہے اس کا انجام کیا ہوگا کیونکہ بقول اقبال

ے یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

یا اس طرح کی باتیں کہ کون کب اور کہاں پیدا ہوگا؟ کیا کیا کام کرے گا؟ کتنی عمر ہوگی؟ عمر میں کتنی دفعہ سانس لے گا؟ کتنے قدم اٹھائے گا؟ کہاں مرے گا؟ کہاں دفن ہوگا؟ وغیرہ۔

اور دوسری قسم کی مثال وہ حمل ہے جو عورت کے رحم میں وجود تو اختیار کر چکا ہے لیکن اس کے تغیرات سے کوئی واقف نہیں نہ اسکی جبلتوں سے کوئی آگاہ ہے، نہ کوئی یہ جانتا ہے۔ وہ کتنی عمر لے کر آئے گا شقی ہوگا یا سعید ہوگا' نیک خصلت ہوگا یا بدخصلت ہوگا' اس طرح کی چیزیں وجود میں آ جانے کے باوجود بھی مخلوق کے علم ونظر سے غائب ہیں۔ یہ جو تفصیل عرض کی گئی ہے اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو مسئلہ علم غیب پر سطحی نظر میں جو شبہات عوام کو پیش آیا کرتے ہیں خود بخود ختم ہو جائیں۔ لیکن عام طور پر لوگ غیب کے لغوی معنی لیتے ہیں کہ جو چیز ہمارے علم ونظر سے غائب ہو خواہ دوسروں کے نزدیک اس کے علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں' اس کو بھی غیب کہنے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے شبہات سامنے آتے ہیں مثلاً علم نجوم یا پامسٹری وغیرہ سے جو آئندہ واقعات کا علم حاصل کیا جاتا ہے یا کشف والہام کے ذریعے کسی شخص کو آئندہ واقعات کا علم ہو جاتا ہے یا مون سون کا رخ اور اسکی قوت ورفتار کو دیکھ کر موسمیات کے ماہرین ہونے والے بادوباراں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور ان میں بہت سی باتیں صحیح بھی ہو جاتی ہیں اور یہ سب چیزیں عوام کی نظر میں علم غیب ہوتی ہیں' اسلئے آیت مذکورہ پر یہ شبہات ہونے لگتے ہیں کہ قرآن کریم میں تو علم غیب کو ذات خداوندی کی خصوصیت بتلایا گیا ہے اور مشاہدہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ جواب واضح ہے کہ کشف والہام یا وحی کے ذریعہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندہ کو کسی آئندہ واقعہ کی اطلاع دے دی تو قرآنی اصطلاح میں وہ علم غیب نہ رہا۔ اسی طرح اسباب وآلات کے ذریعہ جو علم حاصل کیا جا سکے وہ بھی اصطلاح قرآن کے لحاظ سے علم غیب نہیں جیسے محکمہ موسمیات کی خبریں یا نبض دیکھ کر مریض کے مخفی حالات بتلا دینا یا علم نجوم یا پامسٹری کی مدد سے کچھ اندازے کر لینا۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم کے متعلق دو چیزیں حق تعالیٰ کی خصوصیات میں سے ہیں' جن میں کوئی فرشتہ یا رسول یا کوئی دوسری مخلوق شریک نہیں' ایک

Marfat.com

غیب دوسرے موجودات کا علم محیط اس آیت کریمہ کے پہلے جملہ میں پہلی خصوصیت کا بیان ہے

عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ

اور بعد کے جملوں میں تمام کائنات وموجودات کے علم محیط کا ذکر اس طرح فرمایا کہ پہلے ارشاد ہوا

وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ

یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے ہر اس چیز کو جو خشکی میں ہے اور جو دریا میں ہے۔ مراد اس سے کل کائنات وموجودات ہے۔ جیسے صبح وشام کا لفظ بول کر پورا زمانہ اور مشرق ومغرب کا لفظ بول کر پوری زمین مراد لی جاتی ہے۔ اسی طرح بر و بحر یعنی خشکی اور دریا بول کر مراد اس سے پورے عالم کی وسعتیں ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہٗ کا علم تمام کائنات پر محیط ہے۔

آگے اس کی مزید تشریح وتفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا تمام کائنات پر احاطہ علمی صرف یہی نہیں کہ بڑی بڑی چیزوں کا اس کو علم ہو بلکہ ہر چھوٹی سے چھوٹی مخفی سے مخفی چیز بھی اس کے علم میں ہے۔ فرمایا: وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا یعنی سارے جہاں میں کسی درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا جو اس کے علم میں نہ ہو مراد یہ ہے کہ ہر درخت کا ہر پتہ گرنے سے پہلے اور گرنے کے وقت اور گرنے کے بعد اس کے علم میں ہے وہ جانتا ہے کہ جو پتہ درخت پر لگا ہوا ہے کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہوگا اور کب اور کہاں گرے گا اور پھر وہ کس کس حال سے گزرے گا' گرنے کا ذکر شاید اسی لئے کیا گیا ہے کہ اس کے تمام حالات کی طرف اشارہ ہو جائے کیونکہ پتہ کا درخت سے گرنا اس کے نشو ونما اور نباتی زندگی کا آخری حال ہے' آخری حال کا ذکر کر کے تمام حالات کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ یعنی ہر وہ دانہ جو زمین کی گہرائی اور اندھیری میں کہیں پڑا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ پہلے درخت کے پتہ کا ذکر کیا جو عام نظروں کے سامنے گرتا ہے اس کے بعد دانہ کا ذکر کیا جو کاشتکار زمین میں ڈالتا ہے یا خود بخود کہیں زمین کی گہرائی اور اندھیری میں مستور ہو جاتا ہے' اس کے بعد پھر تمام کائنات پر علم باری تعالیٰ کا حاوی ہونا تر اور خشک کے عنوان سے ذکر فرمایا اور فرمایا کہ یہ سب چیزیں اللہ کے نزدیک کتاب مبین میں لکھی ہوئی ہیں' کتابِ مبین سے مراد بعض حضرات مفسرین کے نزدیک لوح محفوظ ہے اور بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد علمِ الٰہی ہے اور اس کو کتابِ مبین سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جیسے لکھی ہوئی چیز محفوظ ہو جاتی ہے اس میں سہو ونسیان کی راہ نہیں رہتی' اسی طرح اللہ جل شانہٗ کا یہ علم محیط صرف تخمینی نہیں بلکہ یقینی ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں کہ اس طرح کا علم محیط جس سے کائنات کا کوئی ذرہ اور اس کا کوئی حال خارج نہ ہو صرف ذات حق جل شانہٗ کے ساتھ مخصوص ہے۔ سورۃ لقمان میں ہے:

اِنَّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ

"یعنی اگر کوئی دانہ رائی کے برابر ہو پھر وہ پتھر کے جگر میں پیوست ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں کہیں ہو اللہ تعالیٰ ان سب کو جمع کر لیں گے بیشک اللہ تعالیٰ لطیف اور ہر چیز سے خبردار ہے" (لقمن:۱۶)

جس طرح اللہ تعالیٰ جنگل میں گرنے والے ایک ایک پتے کو اور زمین کی تاریکیوں میں گرنے والے ایک ایک دانے کو جانتا ہے اور ہر رطب و

Marfat.com

یا بس اس کے علم میں ہے اور وہ اپنے علم کے مطابق اپنی قوت کاملہ سے ان کی دیکھ بھال اور نمود و پرداخت فرما رہا ہے اسی طرح انسانی جنگل میں پیدا ہونے والا ہر شخص اور موت سے ہمکنار ہو کر دانے کی طرح زمین کی وسعتوں میں سما جانے والا ہر آدمی اللہ کے علم میں ہے اور اس کی قدرت کاملہ برابر اس کی دیکھ بھال بھی کر رہی ہے اور اسے حیات و موت کے تسلسل سے گزار بھی رہی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں اگلی آیت میں فرمایا:

آیت: ۶۰ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى ج ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ O ’’اور وہی ہے جو تمہیں رات میں وفات دیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے۔ پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تا کہ مدت معین پوری کی جائے۔ پھر اسی کی طرف تمہارا لوٹنا ہے۔ پھر وہ تمہیں باخبر کرے گا اس چیز سے جو تم کرتے رہے‘‘۔

نیند اور موت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور نیند بھی موت ہی کی طرح ہے:

اس سے پہلے یہ بات گزر چکی کہ مشرکین مکہ کیلئے بات سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اور پھر ایک ایک آدمی کے اعمال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا باخبر ہونا اور اس پر باز پرس کرنا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ان کی اسی بات کا جواب دینے کیلئے گزشتہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنی وسعت علم اور قدرت کاملہ کو ذکر فرمایا۔ اب اسی بات کو مزید واضح فرمایا جا رہا ہے اور اس کیلئے ایک ایسی آسان مثال دی جا رہی ہے کہ معمولی عقل آدمی بھی اس پر غور کرے تو اس کیلئے مرنے کے بعد زندہ ہونا اور پھر قیامت کا وقوع پذیر ہونا اور اس میں جواب دہی کے عمل کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا فرمایا جا رہا ہے کہ تم روزانہ رات کو جب نیند آتی ہے تو سو جاتے ہو۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ نیند بھی اللہ کی طرف سے مسلط جاتی ہے وہ اس کا ایک بیش بہا عطیہ ہے۔ اگر وہ کسی سے نیند کی صلاحیت چھین لے تو آدمی اپنے طور سے یا ڈاکٹروں کی مدد سے اس نعمت کو حاصل نہیں سکتا۔ اس لئے جب ایک آدمی سوتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سلانے سے سوتا ہے اور پھر جب آدمی گہری نیند سو جاتا ہے تو اس حواس معطل ہو جاتے ہیں نہ وہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے نہ سونگھتا ہے نہ محسوس کرتا ہے اور نہ کسی بات کو سمجھتا ہے۔ اس کو پڑے ہوئے دیکھ کر صاف محسوس ہے کہ یہ شخص موت کی وادی میں پہنچ گیا ہے۔ اسی لئے شاید نیند کو موت کی بہن کہا جاتا ہے اور پھر جب صبح ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سونے والوں کو نیند اٹھاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں نیند کو وفات سے تعبیر کیا گیا ہے اور بیداری کو موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہا یہ وہ عمل جس سے تم روزانہ گزرتے ہو کہ پہلے تم بیدار تھے پھر سو گئے اور سونے کے بعد پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی زندہ ہوتا پھر وہ مر جاتا ہے پھر وہ لمبی مدت تک اپنی قبر میں رہے گا اور جب قیامت آئے گی تو اسے قبر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو وہ اٹھتے ہی پوچھے گا کہ نے مجھے میری نیند سے اٹھا دیا۔ گویا اسے عالم برزخ کا قیام جو موت کے بعد شروع ہوتا ہے ایک نیند محسوس ہو گا اور قیامت کے دن زندہ ہو کر اٹھنا ایسے ہی لگے گا جیسے آدمی نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم روزانہ اس عمل سے گزرتے ہو کہ بیداری کے بعد تم نیند کا ہوتے ہو اور نیند کے بعد تم بیدار ہوتے ہو تمہیں اس میں کبھی کوئی شبہ نہیں ہوتا تو جب تمہیں اس زندگی کے خاتمے پر موت آئے گی تو ایسے ہی ہے جیسے آ جائے۔ اور پھر قیامت کے دن تمہیں زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی نیند سے اٹھ کھڑا ہو۔ تو تم نیند اور بیداری کو تو سمجھتے ہو تو مر اس کے بعد پھر زندہ ہونے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ آخر ان دونوں میں کیا جوہری فرق ہے؟ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیند ایک ہلکی ہے اور موت ایک گہری نیند ہے۔ تو یہ شدت اور خفت کا فرق ہوا جوہری فرق تو کوئی نہ ہوا اسی طرح زندگی کے خاتمے پر جب ہم اللہ کے روبرو حا جائیں گے تو اگر اس پر اس کو پوری طرح سمجھ لیا جائے تو کوئی اشتباہ نہیں ہونا چاہئے بجز اس کے کہ آدمی کج فہمی کا شکار ہو جائے۔

Marfat.com

اسی طرح اس آیت کریمہ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جب تم نیند سے اٹھتے ہو تو تم نے رات کی نیند سے پہلے دن میں جو اعمال کیے ہوتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ ان اعمال سے بے خبر ہوتا ہے؟ کیا تمہاری نیند سے اللہ تعالیٰ کے علم سے تمہارے اعمال نکل جاتے ہیں؟ یا کیا تم خود اپنے اعمال کو بھول جاتے ہو؟ اگر ایسا نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ تمہاری دن بھر کی کارکردگی سے پوری طرح آگاہ رہتا ہے تو آخر تمہارے زندگی بھر کے اعمال سے وہ کیوں آگاہ نہیں ہوگا اور تمہارے نامۂ عمل کی شکل میں اسے تمہارے سامنے پیش کرنے اور اس کے بارے میں باز پرس کرنے میں آخر اسے کیا مشکل پیش آئے گی؟ اصل میں جو چیز قیامت کے تصور کو قبول کرنے میں تمہارے لئے رکاوٹ بن رہی ہے وہ یہ ہے کہ جب تمہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ جب اللہ کے روبرو تمہاری حاضری ہوگی تو وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کس طرح کے اعمال کرتے آئے ہو اور اس کے نتیجے میں جس صورتحال سے تمہیں واسطہ پڑے گا وہ تمہارے لئے ایک ایسا ڈراؤنا خواب ہے جسے تم کسی طرح بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ اس لئے تم قیامت کا انکار کرتے ہو لیکن اگر آنکھیں بند کرنے سے خطرہ ٹل سکتا ہے تو پھر تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر یہ ایک احمقانہ حرکت ہے تو پھر تمہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ تمہیں اپنے اللہ کے پاس ہی جانا ہے' وہ تمہیں بتلائے گا جو کچھ تم دنیا میں کرتے رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ کی صفت علم کی وسعتوں کو بیان کرنے کے بعد اگلی آیت کریمہ میں اس کے کمال قدرت کو بیان کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۶۱-۶۲ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ط حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ O ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ط اَلَا لَهُ الْحُكْمُ قف وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ O ''اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ تم پر اپنے نگران مقرر رکھتا ہے' یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچتا ہے تو ہمارے فرستادے ہی اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ اس کام میں کوتاہی نہیں کرتے' پھر وہ سب اپنے مولائے حقیقی' اللہ ہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ خبردار کہ فیصلے کا سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ سب سے زیادہ تیز حساب چکانے والا ہے''۔

اللہ نے انسانوں پر اپنے نگران مقرر کر رکھے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی ذات صرف کمال علم سے متصف نہیں یعنی وہ ہر چیز کو جانتی تو ہو لیکن ضروری نہیں کہ ہر چیز اس کے قبضۂ اختیار میں بھی ہو اس آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح وہ کائنات کے ایک ایک ذرے اور نوع انسانی کے ایک ایک فرد سے آگاہ ہے اسی طرح وہ اپنی مخلوقات میں سے ہر ایک پر حاوی بھی ہے۔ قاہر کا معنی پیچھے گزر چکا۔ قاہر کا معنی ہوتا ہے کنٹرولر' یعنی وہ اپنے بندوں پر اور بندوں میں صرف نوع انسانی ہی نہیں تمام مخلوقات شامل ہیں پوری طرح حاوی ہے' ان پر نگران ہے ان پر گرفت کر سکتا ہے' اپنے احکام دینے کا حق رکھتا ہے اور تکوینی احکام سے تو مخلوقات میں سے کسی کو بھی مفر نہیں۔ مخلوقات میں سے ہر مخلوق زندگی اور موت، زندگی کی ضروریات' زندگی کے امکانات اور اپنی قسمتوں کے بارے میں اللہ کے احکام کی پابند ہے اور پھر ایسا نہیں کہ وہ دنیا کو پیدا کرنے کے بعد پوری طرح ان کے وجود اور ان کی ضروریات سے آگاہ نہ ہو۔ جس طرح کسی بھی گلے کا چرواہا اپنی بھیڑوں کو بعض دفعہ گم کر بیٹھتا ہے اور اس کی نگاہ ہٹ جانے کی وجہ سے بعض دفعہ کوئی بکری اور بھیڑ ادھر ادھر بھاگ نکلتی ہے۔ اللہ اپنی کسی بھیڑ سے بے خبر نہیں۔ وہ مخلوقات کا ایسا نگران ہے کہ اس کا علم بھی مکمل ہے اور اسکی گرفت اور اسکا کنٹرول بھی کامل ہے۔ یہاں تک کہ اس نے کارکنان قضا و قدر اور اپنے غیر مرئی حفاظتی دستوں کو نوع انسانی کے جسم و جان اور ان کی ضروریات کی حفاظت کیلئے اس طرح مقرر کر رکھا ہے کہ جب بھی کوئی آدمی کسی ان دیکھے خطرے کا شکار ہوتا ہے یا اپنی ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے تو اس کے یہ غیبی لشکر برابر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے سائنسدان بتاتے ہیں کہ اربوں کی تعداد میں روزانہ زمین کی طرف شہاب ثاقب گرتے ہیں جن میں سے بعض دفعہ ایک ایک شہاب ثاقب ٹنوں وزن کا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے انہیں زمین پر

Marfat.com

آنے سے کون روکتا ہے اگر اللہ تعالیٰ راستے میں حفاظتی قوتوں کو مقرر نہ فرماتا تو زمین اور اس پر بسنے والی مخلوق اشہب ثاقب کی بارش سے تباہ ہو جاتی۔ خود زمین کی حرکتوں کا توازن اور زمین سمیت تمام کروں کا اپنے محور میں سمٹ کر رہنا' کسی نگرانی کے بغیر تو ممکن نہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین اور اہل زمین تباہی کا شکار ہو جاتے اور پھر اسی مقرر کردہ رفتار کے نتیجے میں شب و روز وجود میں آتے ہیں۔ اگر اس رفتار میں کمی بیشی کر دی جائے تو ماہ جون کا گرم دن طویل ہو سکتا ہے اور جنوری کی ٹھنڈی راتیں وسعت پذیر ہو سکتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین پر بسنے والی مخلوق یا جھلس کر مر جائے گی یا منجمد ہو کر تباہ ہو جائے گی۔ آغاز آفرینش میں جب زمین ٹھنڈی ہوئی تو دو گیسیں یعنی نائیٹروجن اور آکسیجن باہم مل کر ہوا میں تبدیل ہو گئیں۔ نائٹروجن کی مقدار 78.09 فیصد تھی اور آکسیجن 20.95 فیصد۔ آکسیجن ایک آتش پذیر گیس ہے اگر فضا میں اس کی مقدار زیادہ ہوتی تو آسمانی بجلی کے ایک شرر سے آگ بھڑک اٹھتی اور سب کچھ جل جاتا اور اگر موجودہ مقدار سے نصف ہوتی تو نہ چولہوں میں آگ جلتی اور نہ حیوانی زندگی باقی رہتی۔

سمندر کے پاس ہوا کا دباؤ 15 پاؤنڈ فی انچ ہوتا ہے اور ہزار فٹ کی بلندی پر تقریباً 14.5 پاؤنڈ فی انچ۔ انسان کے کندھے اندازاً دس مربع انچ جگہ گھیرتے ہیں ان پر ہوا کا دباؤ گیارہ سو ساٹھ پاؤنڈ یعنی ساڑھے چودہ من ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان اس بوجھ کے نیچے پس کیوں نہیں جاتا جواب یہ ہے کہ اس حکیم مطلق اور عقل کل نے ہوا اور پانی دونوں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ ان کا دباؤ ہر سمت سے ہر سمت کو ہوتا ہے یعنی اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر اس لئے اس بوجھ کا احساس نہیں ہوتا۔

اسی طرح غیر مرئی مخلوقات جو ہمارے گردوپیش میں موجود ہیں وہ بالعموم انسان کو نقصان پہنچانے سے عاجز رہتی ہیں۔ انہیں انسان کو نقصان پہنچانے سے کون روکتا ہے اور کون ہیں جو انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہی ہیں جس کو پروردگار یہاں حَفَظَةً کے نام سے تعبیر کر رہا ہے۔ حَفَظَة جمع ہے حافظ کی، حفاظت کرنے والا۔ یعنی انسانی زندگی اور اس طرح باقی مخلوقات کی زندگی کی حفاظت کرنے کیلئے اللہ نے ایسے لشکر مقرر کر رکھے ہیں جسے ہم دیکھ نہیں پاتے۔ لیکن اپنے گردوپیش میں محسوس ضرور کر سکتے ہیں اور یہ جو چند مثالیں پیش کی گئی ہیں ان کے آئینے میں ان کی جھلک دیکھ بھی سکتے ہیں۔ جس ذات والا صفات کے یہ بے پناہ انتظامات ہیں کون آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ اس کی قدرت کی وسعتوں کا عالم کیا ہوگا اور کون ہے جو اس کی گرفت سے نکل کر بھاگ سکتا ہے۔ اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اے مشرکین مکہ تم جو اپنے اللہ پر دلیر ہوتے جا رہے ہو تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ اس کی قدرتیں بے پناہ ہیں۔ تمہارا اس زمین پر رہنا اور یہاں قسم قسم کی نعمتوں سے متمتع ہونا حتیٰ کہ اللہ کی بارگاہ میں سرکشی کر گزرنا یہ بھی صرف اس کے حلم اور رحمت کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ ورنہ تم اس کی گرفت سے کسی وقت بھی آزاد نہیں ہو وہ جب چاہے تمہیں پکڑ سکتا ہے اور جب چاہے اس کے مقرر کردہ نگران تم پر عذاب مسلط کر سکتے ہیں۔ اب بجائے اس کے کہ تم اللہ کے انعامات اور احسانات کی قدر کرو اور اس کا شکر بجا لاؤ تم برابر دلیر ہو کر اس کی بارگاہ میں گستاخیاں کرتے ہو اور اس کے رسول سے بار بار عذاب کا مطالبہ کرتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ زندگی ہمیشہ کی زندگی نہیں ہے۔ تمہیں یہاں رہنے کی ایک مقرر مدت دی گئی ہے جیسے ہی مدت پوری ہو جائے گی تمہاری واپسی کا فیصلہ ہو جائے گا۔ یہی واپسی کا فیصلہ ہے جسے موت کہا جاتا ہے چنانچہ جب تمہاری موت کا وقت آ جائے گا تو پھر مت سمجھو کہ تم اللہ کی مقرر کردہ موت سے بچ نکلو گے بلکہ وہ فرشتے جو تمہارے گردوپیش میں ہیں جیسے ہی انہیں اللہ کی طرف سے حکم آئے گا وہ فوراً تمہاری جان قبض کر لیں گے اور وہ فرشتے اور وہ کارکنان قضا و قدر اس قدر اللہ کے احکام کی تعمیل میں سراپا انتظار رہتے ہیں کہ ادھر حکم ملتا ہے ادھر تعمیل حکم میں جٹ جاتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے سرتابی انہیں جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے اس میں ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کبھی وہ جان قبض کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے جس طرح وہ ایک آدمی کی جان نہایت آسانی سے نکالتے ہیں بڑے سے بڑا شہنشاہ بھی اسی طرح ان کے ہاتھوں میں بے دست و پا ہوتا ہے۔ ہم نے

Marfat.com

آنکھوں سے بار ہا دیکھا کہ ایک نہایت صحت مند اور توانا آدمی جس کی قوت کے مقابل بعض دفعہ کوئی نہیں ہوتا لیکن جب موت آجاتی ہے تو اس کی ساری قوتیں دھری رہ جاتی ہیں۔ آنِ واحد میں وہ موت کا لقمہ بن کے رہ جاتا ہے۔ تخت نشیں بادشاہوں کو اس کے کارندے اس طرح دبوچتے ہیں کہ تخت و تاج اس کا صرف ماتم کرنے کیلئے باقی رہ جاتے ہیں۔ پھر اسی پر بس نہیں کہ اللہ کے اس عالمی قانون کے تحت تمہیں بھی موت آئے گی اور اللہ کے فرستادے تمہاری بھی جان قبض کریں گے بلکہ تمہیں اور باقی ساری دنیا کو بھی اللہ ہی کی طرف لے جایا جائے گا یعنی ایک ایک آدمی جو موت کا شکار ہوتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ مرنے کے بعد وہ زندگی کی ذمہ داریوں سے چھوٹ جاتا ہے بلکہ موت اصلاً اسے اس دارالعمل سے دارالجزاء کی طرف لے جانے کا نام ہے۔ اسے ڈیوٹی سے واپس بلا کر دارالجزاء میں حساب دینے کیلئے کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ بتاؤ تم نے اپنے فرائض کی ادائیگی اور اپنی ڈیوٹی کے انجام دینے میں کہاں تک اخلاص اور دیانت وامانت کا ثبوت دیا ہے اور مزید یہ بھی یاد رکھو کہ تمہیں جس اللہ کی بارگاہ میں لے جایا جائے گا کاش تم آج اس بات پر غور کر لو کہ وہی تمہارا حقیقی مولیٰ ہے۔ اس آیت میں مولیٰ کا لفظ اسی طرف توجہ دلانے کیلئے استعمال ہوا ہے۔ مولیٰ کا معنی ہوتا ہے خیر خواہ' حمایتی' ذمہ دار' نگران' کارساز۔ ان تمام حوالوں سے اگر کوئی مولیٰ کہلانے کا حق رکھتا ہے تو وہ صرف خداوند ذوالجلال ہے۔ کہاں اس کے مولیٰ ہونے کا تو تمہیں یہ فائدہ اٹھانا چاہئے تھا کہ اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارتے' اس کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور پھر قیامت کے دن اس کی مہربانیوں سے فیض یاب ہوتے اور وہی چونکہ حقیقی خیر خواہ اور حمایتی ہے۔ جب ایمان واطاعت کا سرمایہ لے کر اس کی بارگاہ میں پہنچتے تو کیسے کیسے اس کی محبت اور حمایت تمہارے کام آتی۔ لیکن تم نے اس کی ولایت اور حمایت چھوڑ کر نجانے کس کس کو مولیٰ بنایا اب جب کہ تم قیامت میں اس کی عدالت میں کھڑے کئے جاؤ گے تو وہاں تمہارے یہ شرکا جن کو تم اپنے مولیٰ اور اپنے سفارشی سمجھتے تھے' تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔ بلکہ وہ اس بات پر الٹا شاکی ہوں گے کہ ان بدبختوں نے ہمیں اللہ کا شریک کیوں بنایا۔ ہم نے تو ان سے ہرگز یہ نہیں کہا تھا کہ ہم اللہ کی صفات میں شریک ہیں۔ وہاں وہ بھی اسی کے حکم کے بندۂ بے دام ہوں گے اور اسی کے حکم کے انتظار میں لرزاں و ترساں کھڑے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ سب سے بہتر حساب کرنے والا ہے:

آیت کے آخری حصے میں فرمایا وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ وہ حساب لینے میں سب سے زیادہ تیز ہے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا کہ مشرکین مکہ کو قیامت کے دن حساب کتاب کے سلسلے میں جو شبہات تھے ان میں ایک شبہ یہ تھا کہ اربوں کھربوں مخلوق کے بے شمار اعمال کا حساب آخر کس طرح ممکن ہو گا۔ اولاً تو یہ اعمال کسی کے علم میں ہی نہیں ہوں گے اور اگر مان بھی لیا جائے کہ اللہ ایک ایک آدمی کے عمل سے واقف ہے تو یہ بات تو کسی طرح بھی قرین عقل نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا حساب لے ڈالے۔ اس لئے فرمایا کہ نادانو! تم اللہ کو بھی اپنے اوپر قیاس کرتے ہو۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت تو کسی کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کبھی ایسی مشینیں بھی ایجاد ہو جائیں گی جو پوری پوری کمپنیوں کا حساب چند گھنٹوں میں ختم کر دیں لیکن آج جبکہ اس طرح کے تجربات ہمارے سامنے ہیں' آج بھی نجانے کتنے ذہن ہیں جن میں ابھی تک اس طرح کے واہمے تیر رہے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ تمہیں اللہ کے اگر کمال قدرت کا یقین ہو تو تمہارے لئے اتنی بات بس کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے تیز حساب لینے والا ہے۔ ظاہر ہے اس کی تیزی اس کی اپنی شان کے لائق ہے اور اس کے لئے تو شاید چند لمحوں کی بھی ضرورت نہ ہو۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے محض ہمارے سمجھانے کی غرض سے معلوم ہوتا ہے ارشاد فرمایا کہ "ساری دنیا کا حساب صبح سے لے کر دوپہر تک کے وقت میں ختم کر دیا جائے گا"۔ یعنی اتنی دیر لگے گی جتنی دیر میں صبح سے دوپہر تک دن ڈھلتا ہے۔

اگلی آیات کریمہ میں انسان کی نفسیاتی کمزوری اور توحید پر ایک داخلی دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

آیت:۶۳-۶۴ قُلْ مَنْ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ O قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ O ''ان سے پوچھو خشکی اورتری کی تاریکیوں سے ان کو کون نجات دیتا ہے جبکہ اسی کو تم پکارتے ہو گڑگڑا کراور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکرگزار بندوں میں سے بن جائیں گے' کہہ دو اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے اس مصیبت سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے بھی لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو''

انتہائی مصیبت میں انسان صرف اللہ کو پکارتا ہے:

اس آیت کریمہ میں نہایت اختصار سے کئی بے حد اہم باتوں کیطرف توجہ دلائی گئی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اے مشرکینِ مکہ تمہیں چونکہ اللہ تعالٰی کی بے پناہ قدرتوں کا یقین نہیں ہے۔ اسلیئے تم کبھی قیامت کا مذاق اڑاتے ہو کہ قیامت کا وقوع کیسے ممکن ہے۔ کبھی اس میں حساب کتاب اور اعمال کی جانچ پرکھ کو استہزاء کا موضوع بناتے ہو اور کبھی عذاب کو مذاق کا نشانہ بناتے ہو یعنی تمہارا بنیادی روگ یہ ہے کہ تمہیں اللہ کی بے پناہ قدرتوں کا ادراک نہیں ہے اگر ایسا ہے تو اے پیغمبر ان سے پوچھیے کہ جب تم کبھی بر و بحر کی ظلمتوں یعنی مصیبتوں میں گھر جاتے ہو یعنی کبھی تمہارے بحری جہاز طوفان میں گھر جاتے ہیں یا خشکی کے کسی سفر میں تم طوفانِ باد و باراں کی نذر ہو جاتے ہو کیونکہ بعض دفعہ ناگہانی آفتیں جسطرح پانی کے سفر میں آتی ہیں' خشکی کے سفر میں بھی تو آتی ہیں اسطرح کے پیش آنے والے واقعات میں تم بتاؤ تمہیں کون ان مصیبتوں سے نجات دیتا ہے اگر تم سمجھتے ہو کوئی اور نجات دیتا ہے تو اس کا نام لو لیکن اس سوال پر یقیناً تمہاری زبانیں گنگ ہو جائیں گی۔ کیونکہ تمہارے اپنے تصورات میں بھی اسکا اور کوئی جواب ممکن نہیں کہ اللہ ہی ایسی مصیبتوں سے نجات دیتا ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم بتاؤ تمہیں اسکے کمال قدرت کا یقین کیوں نہیں آتا اور تم اسکے علم اور قدرت کی وسعتوں پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟

دوسری بات ان کی داخلی کمزوری کو توحید کی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ تم جب کبھی بر و بحر کی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتے ہو اور تمہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب ان مصیبتوں سے نجات دینے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تو پھر تم اسے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے مدد کیلئے پکارتے ہو اور ساتھ ہی یہ کہتے ہو کہ اگر اللہ نے اس مصیبت سے ہمیں نجات دے دی تو ہم اس کے شکرگزار بندے بن جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو بات تمہیں مصیبت میں گھر کے سمجھ میں آتی ہے وہ تمہیں عام زندگی میں اور زندگی کی ہمہمی میں اور آسودگیوں سے بہرہ ور ہوتے ہوئے اور خوشحالیوں میں شب و روز گزارتے ہوئے سمجھ کیوں نہیں آتی بھنور میں پھنس کر تو تم اللہ کو پکارتے ہو لیکن جب کنارے پر آ جاتے ہو تو تمہیں وہ شریک یاد آ جاتے ہیں جو تم نے اس کے ساتھ بنا رکھے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری فطرت کی کچھ آلودگیاں ہیں جس نے تمہاری فطرت کو بگاڑ رکھا ہے اور وہ تم نے باطل عقائد اور تصورات کے نتیجے میں پیدا کر رکھی ہیں۔ جب حالات کا دباؤ تمہیں ان آلودگیوں سے آزاد کر دیتا ہے اور تمہاری فطرت صحیح کام کرنے لگتی ہے تو تم اس وحدانیت کو نہ صرف سمجھنے لگتے ہو بلکہ اسے قبول بھی کر لیتے ہو۔ لیکن جب تمہیں پھر وہی گندا ماحول میسر آتا ہے تو جس طرح آنکھوں میں پانی اتر آئے تو آدمی دیکھنے سے معذور ہو جاتا ہے یا کانوں میں پردہ آ جائے تو آدمی سن نہیں سکتا اسی طرح تم بھی فطرت کی آواز سے محروم ہو کر شرک میں آلودہ ہو جاتے ہو۔ یہ وہ نہایت سہل اور آسان سی دلیل ہے جس کو ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے اور یہی وہ دلیل ہے جس سے کئی لوگوں نے راہ راست پائی۔ پہلے بھی ذکر ہو چکا کہ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے جو فتح مکہ کے بعد بھاگ کر یمن جانا چاہتے تھے اس لئے واپس پلٹ آئے کہ راستے میں جب ان کی کشتی طوفان میں پھنس گئی اور محسوس ہوا کہ اب بچنے کی کوئی صورت نہیں تو تمام مسافروں نے کہا کہ اب صرف اللہ ہی کو پکارنے کا وقت ہے اس کے سوا ہمیں اور کوئی

Marfat.com

نہیں دے سکتا تو عکرمہ نے دل میں سوچا کہ یہی تو وہ بات ہے جس کی طرف ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ بیس سال سے دعوت دے رہے ہیں۔ اگر یہ بات طوفان میں گھر کے صحیح ہے تو اپنے گھر میں صحیح کیوں نہیں۔ یہ دلیل ان کو واپس لے آئی اور وہ مشرف بہ اسلام ہو کر شہادت کے منصب کو پہنچے۔

آج بھی ہم اپنے گردوپیش میں بہت سارے ایسے واقعات دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی جس نے کبھی مسجد کا راستہ نہیں دیکھا اور جس کی زبان پر کبھی اللہ کا نام تک نہیں آیا جو مذہب کو ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں سمجھتا جب کبھی حالات کی گرفت میں آتا ہے اور مصائب اس کی کمر توڑ دیتے ہیں تو پھر چپکے چپکے راتوں کو چھپ کر اللہ کو پکارتا ہے اور اس کی مدد طلب کرتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی داخلی زندگی میں اور اس کی فطرت میں اللہ کی وحدانیت کا ایک ایسا بے پناہ تصور موجود ہے جسے غلط تعلیم وتربیت کے ذریعہ دبایا تو جا سکتا ہے لیکن ختم نہیں کیا جا سکتا۔

تیسری چیز جو اس آیت کریمہ کے بین السطور میں جھلکتی ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ کا بگاڑ یہ تھا کہ جب وہ مصیبتوں میں گھرتے تھے تو اللہ کو پکارتے تھے لیکن جب مصیبتوں سے نکل جاتے تو پھر اللہ سے بے نیاز ہو جاتے اور کبھی انہیں بھول کر بھی خدا کی یاد نہ آتی۔ بلکہ پھر وہی غلط اعتقادات اور غلط خیالات جو انہوں نے بنا رکھے تھے اسی کے مطابق زندگی گزارتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بتوں کے پجاری تھے اور اللہ کے ساتھ نجانے انہوں نے کس کس کو شریک بنا رکھا تھا۔ بایں ہمہ! مصیبت کے وقت ان کو اللہ ضرور یاد آتا تھا اور اسی لئے وہ خالصتاً اس کو پکارتے تھے لیکن اس قوم یا اس شخص کے بارے میں کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے جو مصیبت کے وقت بھی اللہ کو یاد نہ کرے۔ ہم اس امت میں جو اللہ کو ایک مانتی' رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرتی اور اسلامی شریعت کو قبول کرتی ہے' ایسے بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں کہ ان سارے اعتقادات کے باوجود وہ بیماریوں میں مبتلا ہو کر بھی اللہ کو کبھی یاد نہیں کرتے' وہ علاج کی تلاش میں یورپ کا طواف کریں گے' دنیا بھر کی خاک چھانیں گے' ایک ایک آستانے پر جائیں گے۔ لیکن مصیبت کے ان لمحات میں بھی اللہ کے سامنے جھکنا اور اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا انہیں گوارا نہیں ہوگا۔ اے کاش ہم اس بات کو سمجھتے کہ ہماری بہت ساری مصیبتیں ہماری بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ قرآن کریم میں پروردگار نے فرمایا ہے:

وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ

''جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے' وہ تمہارے اعمالِ بد کا نتیجہ ہے اور بہت سے برے اعمال کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں''۔ (الشوریٰ-۳۰)

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کسی انسان کو کسی لکڑی سے معمولی خراش لگتی ہے یا قدم کو کہیں لغزش ہو جاتی ہے یا کسی رگ میں خلش ہوتی ہے یہ سب کسی گناہ کا اثر ہوتا ہے اور جو گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں وہ بہت ہیں''۔

مقصد یہ ہے کہ مسلمان کو عام طور پر جب کبھی بیماریوں یا مصائب سے واسطہ پڑتا ہے تو یہ مصائب مسلمانوں کیلئے ایک طرح کی رحمت ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے غافل انسانوں کو چونکایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے اعمالِ بد کا جائزہ لے کر ان سے باز آنے کی فکر میں لگ جائیں اور آخرت کی بڑی اور سخت سزا سے محفوظ رہیں۔ ظاہری اسباب سے کام لینا غلط یا ممنوع نہیں۔ لیکن صرف ظاہری اسباب پر بھروسہ کر کے بیٹھ جانا اور مصیبتوں میں کبھی اللہ کی طرف متوجہ نہ ہونا یہ تو ایک ایسا مکروہ عمل ہے جو مشرکین مکہ کے عمل سے بھی بدتر ہے۔ وہ بھی کم از کم ایسی ناگفتہ بہ حالت میں وقتی طور پر ہی سہی اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے اور ہم اگر بالکل اس کی طرف رجوع نہ کریں اور پھر ہم صاحب ایمان بھی ہوں تو اندازہ کریں یہ کس قدر غلط بات ہے۔

مشرکین مکہ کو عذاب نہ آنے کی وجہ سے جب کہ وہ اس کا بار بار مطالبہ کر رہے تھے یہ شبہ ہو رہا تھا کہ شاید عذاب لانا اللہ تعالیٰ کے بس میں نہیں

Marfat.com

اس لئے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم اور صفتِ قدرت کو واضح کرنا ضروری سمجھا گیا۔لیکن اب پھر اصل مضمون کو بحث کے اختتام کے طور پر لے لیا گیا ہے اور ایک اچھوتے انداز سے نہایت مؤثر انداز میں اس کا تذکرہ فرمایا جارہا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

آیت:٦٥ قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّ يُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَفۡقَهُوۡنَ ○ ''کہہ دو! خدا قادر ہے' اس بات پر کہ تم پر تمہارے اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب اٹھادے یا تم کو گروہ در گروہ کر کے آپس ہی میں گتھم گتھا کردے اور ایک کو دوسرے کے تشدد کا مزا چکھادے۔دیکھو! کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں' تاکہ وہ سمجھیں''۔

اللہ تعالیٰ ہر طرف سے عذاب بھیجنے پر قادر ہے:

مشرکین مکہ جو بار بار عذاب الٰہی کا مطالبہ کر کے اللہ کے غضب کو دعوت دے رہے تھے انہیں متنبہ کیا جارہا ہے کہ اللہ کے عذاب کو آتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ہوا کا ایک طوفان تمہیں اچانک برباد کرسکتا ہے زلزلے کا ایک جھٹکا تمہاری بستیوں کو پیوند خاک کردینے کیلئے کافی ہے۔قبیلوں' قوموں اور ملکوں کی عداوتوں کے میگزین میں ایک چنگاری وہ تباہی پھیلا سکتی ہے کہ سالہا سال خون ریزی اور بدعملی سے نجات نہ ملے بس اگر عذاب نہیں آرہا تو یہ تمہارے لئے غفلت و مدہوشی کی پینک نہ بن جائے کہ مطمئن ہو کر صحیح و غلط کا امتیاز کئے بغیر اندھوں کی طرح زندگی کے راستے پر چلتے رہو۔غنیمت سمجھو کہ اللہ تمہیں مہلت دے رہا ہے اور وہ نشانیاں تمہارے سامنے پیش کررہا ہے جن سے تم حق کو پہچان کر صحیح راستہ اختیار کرسکو۔

اس آیت میں عذاب کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں اور پھر لفظ عَذَابًا کو تنوین کے ساتھ نکرہ لاکر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ان تینوں قسموں میں عذاب کی اور قسمیں بھی شامل ہوسکتی ہیں اور ان سے ملتی جلتی تمام صورتیں مراد ہیں۔چنانچہ گزشتہ معذب قوموں کی تاریخ جب ہم دیکھتے ہیں تو اس میں ہمیں ان تمام صورتوں پر مشتمل عذاب دکھائی دیتا ہے۔حضرت عبداللہ ابن عباس اور مجاہد وغیرہ آئمہ تفسیر نے فرمایا کہ اوپر کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ اور بے رحم حکام مسلط ہوجائیں اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ اپنے نوکر غلام اور خدمت گار یا ماتحت ملازم بے وفا' غدار' کام چور اور خائن ہوجائیں۔چنانچہ صاحب معارف القرآن نے اس کی تائید میں تفصیل سے آنحضرت ﷺ کے بعض ارشادات نقل کئے ہیں اور بعض وضاحتیں فرمائی ہیں۔ہم اسے یہاں نقل کئے دیتے ہیں' انہوں نے لکھا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کے چند ارشادات سے بھی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ شعب الایمان بیہقی رسولِ کریم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے: كَمَا تَكُوْنُوْنَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ یعنی ''جیسے تمہارے اعمال بھلے یا برے ہوں گے ویسے ہی حکام اور امراء تم پر مسلط کئے جائیں گے''۔یعنی اگر تم نیک اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو گے تو تمہارے حکام و امراء بھی رحم دل' انصاف پسند ہوں گے اور تم بدعمل ہوگے تو تم پر حکام بھی بے رحم اور ظالم مسلط کردیئے جائیں گے' مشہور مقولہ اَعۡمَالُكُمۡ عُمَّالُكُمۡ کا یہی مفہوم ہے۔

اور مشکوٰۃ میں بحوالہ حلیہ ابی نعیم روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں' میرے سوا کوئی معبود نہیں' میں سب بادشاہوں کا مالک اور بادشاہ ہوں' سب بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں' جب میرے بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں اور حکام کے قلوب میں ان کی شفقت و رحمت ڈال دیتا ہوں اور جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حکام کے دل ان پر سخت کردیتا ہوں' وہ ان کو ہر طرح کا برا عذاب چکھاتے ہیں' اس لئے تم حکام اور امراء کو برا کہنے میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو' بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف

Marfat.com

رجوع اور اپنے عمل کی اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ' تا کہ تمہارے سب کاموں کو درست کر دوں''۔

اس طرح ابوداؤ' نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کسی امیر اور حاکم کا بھلا چاہتے ہیں تو اس کو اچھا وزیر اور اچھا نائب دے دیتے ہیں کہ اگر امیر سے کچھ بھول ہو جائے تو وہ اس کو یاد دلا دے اور جب امیر صحیح کام کرے تو اس کی مدد کرے اور جب کسی حاکم وامیر کے لئے کوئی برائی مقدر ہوتی ہے تو برے آدمیوں کو اس کے وزراء اور ماتحت بنا دیا جاتا ہے۔ (الحدیث)

ان روایات اور آیتِ مذکورہ کی متذکرہ تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو جو تکالیف اور مصائب اپنے حکام کے ہاتھوں پہنچتے ہیں وہ اوپر سے آنے والا عذاب ہے اور جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ذریعہ پہنچتے ہیں وہ نیچے سے آنے والا عذاب ہے۔ یہ سب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتے' بلکہ ایک قانونِ الٰہی کے تابع انسان کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں' حضرت سفیان ثوری رحمت اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو میں اس کا اثر اپنے نوکر...... اور اپنی سواری کے گھوڑے اور بار برداری کے گدھے کے مزاج میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ سب میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں' مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا

ے خلق را باتو چنیں بدخو کنند
تا ترا ناچار رو آنسو کنند

یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہارے بالا دست حکام یا ماتحت ملازموں کے ذریعہ تمہارے خلافِ مزاج تکلیف دہ معاملات کا ظاہری عذاب تم پر مسلط کر کے درحقیقت تمہارا رخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں تا کہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے اعمال کو درست کر کے آخرت کے عذاب اکبر سے بچ جاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفسیر کے مطابق حکام کا ظلم و جور اوپر سے آنے والا عذاب ہے اور ماتحت ملازموں کی بے ایمانی' کام چوری' غداری' نیچے سے آنے والا عذاب ہے اور دونوں کا علاج ایک ہی ہے کہ سب اپنے اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بے راہ روی سے باز آ جائیں تو قدرت خود ایسے حالات پیدا کر دے گی کہ یہ مصیبت رفع ہو ورنہ صرف مادی تدبیروں کے ذریعہ ان کی اصلاح کی امید اپنے نفس کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں' جس کا تجربہ ہر وقت ہو رہا ہے

ے خویش را دیدیم و رسوائی خویش
امتحانِ ماکن اے شاہ بیش

اوپر اور نیچے کے عذاب کی جو مختلف تفسیریں آپ نے ابھی سنی ہیں درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں' کیونکہ لفظ عَذَابًا جو اس آیت میں آیا ہے درحقیقت ان تمام تفسیروں پر حاوی ہے' آسمان سے برسنے والے پتھر' خون' آگ اور پانی کا سیلاب اور بالا دست حکام کا ظلم و جور یہ سب اوپر سے آنے والے عذاب میں داخل ہیں اور زمین شق ہو کر کسی قوم کا اس میں دھنس جانا یا پانی میں غرق ہو جاتا یا ماتحت ملازموں کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہو جانا یہ سب نیچے سے آنے والے عذاب ہیں۔

تیسری قسم عذاب کی جو اس آیت میں ذکر کی گئی ہے وہ یہ ہے اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا یعنی تمہاری مختلف پارٹیاں بن کر آپس میں بھڑ جائیں اور باہم ایک دوسرے کیلئے عذاب بن جائیں۔ اس میں لفظ یَلْبِسَکُمْ لبس کے مادہ سے بنا ہے' جس کے اصلی معنی چھپا لینے اور ڈھانپ لینے کے ہیں' اسی معنی

Marfat.com

سے لباس ان کپڑوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کے بدن کو ڈھانپ لے اور اسی وجہ سے التباس بمعنی شبہ واشتباہ استعمال ہوتا ہے کہ جہاں کسی کلام کی مراد مستور ہو صاف اور کھلی ہوئی نہ ہو۔

اور لفظ شِیَعَ شِیْعَۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کسی کا پیرو اور تابع' قرآن مجید میں ہے وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ ''یعنی نوح علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں ابراہیم علیہ السلام'' اسی لئے عرف ومحاورہ میں لفظ شیعہ ایسی جماعت کیلئے بولا جاتا ہے جو کسی خاص غرض کیلئے جمع ہوں اور اس غرض میں ایک دوسرے کے معاون ہوں' جس کا بامحاورہ ترجمہ آج کل کی زبان میں فرقہ یا پارٹی ہے۔

اسی لئے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ عذاب کی ایک قسم یہ ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے' اسی لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا: لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ كُفَّارًا یَّضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ ''یعنی تم میرے بعد پھر کافروں جیسے نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو''۔ (اخرج ابن ابی حاتم عن زید بن اسلم) مظہری۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جا رہے تھے' ہمارا گزر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی ہم نے بھی دو رکعت ادا کی۔ اس کے بعد آپ ﷺ دعا میں مشغول ہو گئے اور بہت دیر تک دعا کرتے رہے' اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا۔ ایک یہ کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے' اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ دوسری یہ کہ میری امت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے یہ بھی قبول فرمالی۔ تیسری دعا یہ کی کہ میری امت آپس کے جنگ وجدل سے تباہ نہ ہو' مجھے اس دعا سے روک دیا گیا۔ (مظہری بحوالہ بغوی)

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے' جس میں تین دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے کہ میری امت پر کسی دشمن کو مسلط نہ فرمانا جو سب کو تباہ و برباد کر دے یہ دعا قبول ہوئی اور آپس میں نہ بھڑ جائیں اس دعا کو منع کر دیا گیا۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اس قسم کے عذاب تو نہ آئیں گے جیسے پچھلی امتوں پر آسمان یا زمین سے آئے جس سے ان کی پوری قوم تباہ و برباد ہو گئی۔ لیکن ایک عذاب دنیا میں اس امت پر بھی آتا رہے گا وہ عذاب آپس کی جنگ وجدل اور فرقوں اور پارٹیوں کا باہم تصادم ہے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے امت کو فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم ہو کر باہمی آویزش اور جنگ وجدل سے منع کرنے میں انتہائی تاکید سے کام لیا ہے اور ہر موقع پر اس سے ڈرایا ہے کہ تم پر خدا تعالیٰ کا عذاب اس دنیا میں اگر آئے گا تو آپس ہی کی جنگ وجدل کے ذریعہ آئے گا۔

سورہ ہود کی ایک آیت میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت سے آیا ہے:

وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ

''یعنی لوگ ہمیشہ آپس میں اختلاف ہی کرتے رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی''۔ (ھود)

امتِ اسلامیہ میں اختلاف:

اس سے واضح ہوا کہ جو لوگ آپس میں (بلاوجہ شرعی) اختلاف کرتے ہیں وہ رحمت خداوندی سے محروم یا بعید ہیں۔ ایک آیت میں ارشاد ہوا:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

Marfat.com

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا

ان تمام آیات آیات کا حاصل یہ ہے کہ اختلاف بڑی منحوس اور مذموم چیز ہے۔ آج دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں کی پستی اور بربادی کے اسباب پر غور کیا جائے تو اکثر مصائب کا سبب یہی آپس کا اختلاف نظر آئے گا۔ ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں یہ عذاب ہم پر مسلط ہو گیا کہ وہ قوم جس کا مرکز اتحاد ایک کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تھا اس کلمہ کو ماننے والا زمین کے کسی خطہ میں ہو کسی زبان کا بولنے والا ہو کسی رنگ کا ہو کسی نسل و نسب سے متعلق ہو سب بھائی بھائی تھے' کوہ و دریا کا تفاوت ان کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا' ان کی قومی وحدت صرف اس کلمہ سے وابستہ تھی۔ عربی' مصری' شامی' ترکی' ہندی' چینی کی تقسیمیں صرف شناخت اور تعارف کیلئے تھیں اور کچھ نہیں۔ بقول اقبال مرحوم

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

آج دوسری قوموں کی دسیسہ کاریوں اور مسلسل کوششوں نے پھر ان کو نسلی لسانی وطنی قومیتوں میں بانٹ دیا اور پھر ان میں سے ہر ایک قوم و جماعت اپنے اندر بھی تشتت اور انتشار کا شکار ہو کر مختلف پارٹیوں میں بٹ گئی۔ وہ قوم جس کا شعار غیروں سے بھی عفو و درگزر اور ایثار تھا اور جھگڑے سے بچنے کیلئے اپنے بڑے سے بڑے حق کو چھوڑ دیتی تھی' آج اس کے بہت سے افراد ذرا ذرا سی حقیر و ذلیل خواہشات کے پیچھے بڑے سے بڑے تعلق کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہی وہ اغراض و اہواء کا اختلاف ہے جو قوم و ملت کیلئے منحوس اور اس دنیا میں نقد عذاب ہے۔

البتہ اس میں وہ اختلاف رائے داخل نہیں جو قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے اصولِ اجتہاد کے ماتحت فروعی مسائل میں فقہاء امت کے اندر قرنِ اول سے صحابہ و تابعین میں ہوتا چلا آیا ہے' جن میں فریقین کی حجت قرآن و سنت اور اجماع سے ہے' اور ہر ایک کی نیت قرآن و سنت کے احکام کی تعمیل ہے مگر قرآن و سنت کی مجمل یا مبہم الفاظ کی تعبیر اور ان سے جزوی' فروعی مسائل کے استخراج میں اجتہاد اور رائے کا اختلاف ہے۔ ایسے ہی اختلاف کو ایک حدیث میں رحمت فرمایا گیا ہے۔

جامع صغیر میں بحوالۂ نصر مقدسی و بیہقی و امام الحرمین یہ روایت نقل کی ہے کہ اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَةٌ ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے''۔ امتِ محمدیہ ﷺ کی خصوصیت اس لئے اختیار فرمائی گئی کہ اس امت کے علماء حق اور فقہاء متقین میں جو اختلاف ہو گا وہ ہمیشہ اصولِ قرآن و سنت کے ماتحت ہو گا اور صدق نیت اور للّٰہیت سے ہو گا کوئی نفسانی غرض جاہ و مال کی ان کے اختلاف کی محرک نہ ہو گی۔ اس لئے وہ کسی جنگ و جدل کا سبب بھی نہ بنے گا بلکہ علامہ عبدالرؤف مناوی شارح جامع صغیر کی تحقیق کے مطابق فقہاء امت کے مختلف مسالک کا وہ درجہ ہو گا جو زمانہ سابق میں انبیاء علیہم السلام کی مختلف شرائع کا تھا کہ مختلف ہونے کے باوجود سب کی سب اللہ ہی کے احکام تھے۔ اسی طرح مجتہدین امت کے مختلف مسلک اصول قرآن و سنت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے سب کے سب احکامِ خدا اور رسول ﷺ ہی کہلائیں گے۔

اس اجتہادی اختلاف کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے شہر کی بڑی سڑکوں کو چلنے والوں کی آسانی کیلئے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ایک حصہ پر بسیں چلتی ہیں دوسرے پر دوسری گاڑیاں یا ٹرام اسی طرح سائیکل سواروں اور پیادہ چلنے والوں کیلئے روڈ کا علیحدہ ایک حصہ ہوتا ہے ایک روڈ کے کئی حصوں میں یہ تقسیم بھی اگرچہ ظاہری طور پر ایک اختلاف کی صورت ہے' مگر چونکہ سب کا رخ ایک ہی سمت ہے اور ہر ایک پر چلنے والا ایک ہی منزل

Marfat.com

مقصود پر پہنچے گا اس لئے راستوں کا یہ اختلاف بجائے مضر ہونے کے مفید اور چلنے والوں کیلئے وسعت و رحمت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آئمہ مجتہدین اور فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی کا مسلک باطل نہیں اور جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں ان کو دوسروں کے نزدیک گنہگار کہنا جائز نہیں۔ آئمہ مجتہدین اور فقہاء امت کے مذاہب کے اختلاف کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ ایک مجتہد نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ اس کے نزدیک راجح ہے مگر اس کے مقابل دوسرے مجتہد کے مسلک کو بھی وہ باطل نہیں کہتے بلکہ ایک دوسرے کا پورا احترام کرتے ہیں۔ فقہاء صحابہ و تابعین اور آئمہ اربعہ کے بے شمار حالات و واقعات اس پر شاہد ہیں کہ فقہی مسلک بہت سے مسائل میں مختلف ہونے اور علمی بحثیں جاری رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا مکمل اعتقاد و احترام کرتے تھے۔ جنگ و جدل اور خصومت و عداوت کا وہاں کوئی احتمال ہی نہ تھا۔ مذاہب فقہاء کے متبعین اور مقلدین میں بھی جہاں تک صحیح علم و دیانت رہے ان کے بھی باہمی معاملات ایسے ہی رہے۔

بہت سے لوگ جو اس حقیقت سے واقف نہیں وہ مذاہب فقہاء اور علماءِ حق کے فتووں میں اختلاف کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو ہم کدھر جائیں' حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ جس طرح کسی بیمار کے معاملہ میں ڈاکٹروں طبیبوں کا اختلاف رائے ہوتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے فنی اعتبار سے زیادہ ماہر اور تجربہ کار کون ہے' بس اس کا علاج کرتے ہیں' دوسرے ڈاکٹروں کو برا نہیں کہتے۔ مقدمہ کے وکیلوں میں اختلاف ہو جاتا ہے' تو جس وکیل کو زیادہ قابل اور تجربہ کار جانتے ہیں اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں' دوسروں کی بدگوئی کرتے نہیں پھرتے۔ یہی اصل یہاں ہونا چاہئے جب کسی مسئلہ میں علماء کے فتوے مختلف ہو جائیں تو مقدور بھر تحقیق کرنے کے بعد جس عالم کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ اور افضل سمجھیں اس کا اتباع کریں اور دوسرے علماء کو برا بھلا کہتے نہ پھریں۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کہ ماہر مفتی کا انتخاب اور درصورت اختلاف ان میں سے اس شخص کے فتوے کو ترجیح دینا جو اس کے نزدیک علم اور تقویٰ میں سب سے زیادہ ہو یہ کام ہر صاحب معاملہ مسلمان کے ذمہ خود لازم ہے' اس کا کام یہ تو نہیں کہ علماء کے فتووں میں کسی فتوے کو ترجیح دے لیکن یہ اسی کا کام ہے کہ مفتیوں اور علماء میں جس کو اپنے نزدیک علم اور دیانت کے اعتبار سے زیادہ افضل جانتا ہے اس کے فتوے پر عمل کرے۔ مگر دوسرے علماء اور مفتیوں کو برا کہتا نہ پھرے۔ ایسا عمل کرنے کے بعد اللہ کے نزدیک وہ بالکل بری ہے۔ اگر حقیقۃً کوئی غلطی فتویٰ دینے والے سے ہو بھی گئی تو اس کا وہی ذمہ دار ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نہ ہر اختلاف مطلقاً مذموم اور نہ ہر اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب ہے اگر چور ڈاکو باغی ایک جماعت بنا کر باہم متفق ہو جائیں تو کون نہیں جانتا کہ ان کا یہ اتفاق مذموم اور قوم کیلئے مہلک ہے اور اس کے خلاف جو سعی و عمل عوام یا پولیس وغیرہ کی طرف سے اس جماعت کی مخالفت میں ہوتا ہے وہ ہر عقلمند کی نظر میں اختلاف محمود و مفید ہے۔

معلوم ہوا کہ خرابی اختلاف رائے میں نہیں اور نہ کسی ایک رائے پر عمل کرنے میں ہے بلکہ ساری خرابیاں دوسروں کے متعلق بدگمانی اور بدزبانی سے پیش آتی ہیں جو علم و دیانت کی کمی اور اغراض و اہواء کی زیادتی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور جب کسی قوم یا جماعت میں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو ان کیلئے یہ اختلاف رحمت بھی اختلاف عذاب کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے اور مسلمان پارٹیاں بن کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل اور بعض اوقات قتل و قتال تک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن اور دل آزار کلمات کو تو مذہب کی حمایت سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ مذہب کا اس غلو اور زیادتی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ یہ وہی جدال ہے جس سے رسول کریم ﷺ نے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ صحیح احادیث میں اس کو قوموں کی گمراہی

Marfat.com

سبب قرار دیا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۭ ﴿٦٦﴾

اور اس (قرآن) کو تمہاری قوم نے جھٹلایا حالانکہ وہ سراسر حق ہے۔ کہہ دو کہ میں تمہارا داروغہ نہیں ہوں

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ

ہر خبر کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری

يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰي يَخُوْضُوْا فِيْ

آیتوں کے بارے میں بیہودہ بکواس کر رہے ہوں تو اُن سے الگ ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ

حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰي

اور باتوں میں مصروف ہو جائیں۔ اور اگر یہ بات شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے پر ظالم لوگوں کے ساتھ

مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَمَا عَلَي الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ

نہ بیٹھو ۔ اور پرہیزگاروں پر اُن لوگوں کے حساب کی کچھ بھی جواب دہی نہیں

مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰي لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا

ہاں نصیحت تاکہ وہ بھی پرہیزگار ہوں ۔ اور جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا

دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ

بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے اُن کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے اُن سے کچھ کام نہ رکھو۔ ہاں اس (قرآن) کے

نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ڰ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ

ذریعے سے نصیحت کرتے رہو تاکہ (قیامت کے دن) کوئی اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت میں نہ ڈالا جائے (اُس روز) خدا کے سوا

وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا

نہ تو کوئی اُس کا دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا۔ اور اگر وہ ہر چیز (جو روئے زمین پر ہے بطور) معاوضہ دینا چاہے تو وہ اس

بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا

سے قبول نہ ہو۔ یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے اُن کے لیے پینے کو کھولتا ہوا پانی اور دُکھ دینے والا

Marfat.com

يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

عذاب ہے اس لیے کہ کفر کرتے تھے

تمہید:

قرآنِ کریم اپنی بہت سی امتیازی خصوصیات کے باعث دنیا کی ایک منفرد کتاب ہے جس کی مثال پوری دنیا میں نہ کہیں موجود ہے اور نہ ممکن ہے۔ ہر کتاب کسی ایک شعبۂ علم سے بحث کرتی ہے تو اس کے اصولی مباحث ابواب میں تقسیم کر کے ضمنی بحثوں کو فصول میں پھیلا کر اس شعبۂ علم سے متعلق ضروری باتوں کو سمیٹ لیتی ہے اور خاتمۃ الکتاب میں اس کا ایک خلاصہ دے کر بحث کا حق ادا کر دیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جو بات کہنا تھی وہ مکمل ہوگئی۔ لیکن اس کتاب کا موضوع چونکہ انسانی اصلاح اور اس کی ہدایت ہے اس لئے وہ انسانی احساسات انفعالات اور تصورات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ہر مرحلے پر دعوت کے اسلوب کو متعین کرتی' آنے والی مشکلات کا حل دیتی اور پیغمبر کیلئے حوصلے کا سامان کرتی اور مخاطبین کیلئے ترغیب و ترہیب کے ذریعے قبولیت کے امکانات کو اجاگر کرتی ہوئی' دعوتی مراحل سے قدم قدم گزرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایسی صورتحال میں یقیناً اس کے اسلوب میں بار بار تبدیلی آئے گی' مضامین میں تنوع ہوگا' لہجہ بار بار بدلے گا اور بعض دفعہ ایک ہی بات کو مختلف اسالیب میں بھی دہرایا جائے گا اور کبھی شبنمی زبان میں خطاب کیا جائے گا اور کبھی برق و رعد کی صورت میں دل ہلا دینے والا انداز اختیار کیا جائے گا اگر یہ تصورات قاری کے ذہن میں موجود رہیں تو تب وہ اس کتاب سے صحیح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اگر وہ یہ سمجھے کہ آرام کرسی پر لیٹ کر یا محض علمی تجسس کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے میں یہ کتاب پڑھ رہا ہوں تو اسے یہ کتاب بہت اجنبی دکھائی دے گی لیکن جب وہ یہ محسوس کرے کہ میں ایک میدانِ دعوت سے گزر رہا ہوں جس میں انسانی بگاڑ کی چند در چند صورتیں اس کے سامنے ہیں' جذبات کا ایک طوفان ہے جو اس کا راستہ روک رہا ہے طبیعتوں کا ہیجان قدم قدم پر مسائل کھڑے کر رہا ہے۔ ایسی صورتحال میں جب وہ قرآنِ کریم کو دیکھے گا تو تب اسے اندازہ ہوگا کہ کس طرح وہ انگلی پکڑ کر اپنے داعی کو ساتھ ساتھ چلاتا ہے۔ یہاں بھی ہم ویسی ہی صورتحال دیکھ رہے ہیں۔ مشرکینِ مکہ کبھی کوئی سوال اٹھا رہے ہیں' قرآن اس کا جواب دے رہا ہے۔ کبھی وہ کوئی نشانی مانگ رہے ہیں اور خود آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں میں بھی ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔ قرآن اس کی حکمتیں واضح کر رہا ہے۔ کبھی وہ بڑھتے بڑھتے مطالبۂ عذاب تک جا پہنچے ہیں اور پھر جب اس کو پورا نہیں کیا جا رہا تو وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اللہ اس پر قادر نہیں ہے تو انہیں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تو ہر بات پر قادر ہے اس کیلئے کوئی مشکل نہیں' اس کے پاس عذاب دینے کی ہزار صورتیں ہیں۔ وہ تمہیں کسی وقت کسی طرح کے عذاب میں مبتلا کر سکتا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ شاید وہ لوگ سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن جب انہوں نے ہر طرح سے اپنے دل و دماغ کو بند کر لیا ہے' معلوم ہوتا ہے کہ سننے اور سمجھنے والی صلاحیتوں پر تالے لگ گئے ہیں تو تب آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے:

آیت:۶۶ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ ''اور تمہاری قوم نے اس کی تکذیب کردی حالانکہ وہ بالکل حق ہے۔ کہہ دو! میں تمہارے اوپر کوئی داروغہ مقرر نہیں ہوا ہوں''۔

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری حق بات پہنچا دینا ہے:

اس آیت کریمہ میں تین باتوں کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ پہلی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ لوگ اگر راہِ راست اختیار نہیں کر رہے حالانکہ آپ نے ترغیب اور ترہیب ہر طرح کا انداز اختیار کر کے دیکھ لیا ہے' ان کی ڈھٹائی کا حال یہ ہے کہ انہیں عذاب سے ڈرایا گیا' لیکن انہوں نے اس کا بھی تمسخر اڑایا اور اس کی تکذیب کی۔ آپ سے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان لانے کی بجائے یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ عذاب کی بھی پرواہ نہیں کرتے تو آپ بھی ان کی پرواہ چھوڑ دیں۔ اب رہی یہ بات کہ ان کے ساتھ کیا ہوگا یہ اب آپ کا کام نہیں بلکہ ہمارا کام ہے آپ کو یہ سوچ کر ہرگز پریشان اور مغموم نہیں ہونا چاہئے کہ یہ لوگ ایمان کی دولت سے محروم رہے۔ ایمان کی دولت ان لوگوں کو ملتی ہے جو اس کیلئے چاہت رکھتے ہیں اور پھر اس کیلئے کوشش کرتے ہیں۔ ایمان کوئی ایسی گری پڑی چیز نہیں کہ ناقدر شناس لوگوں کو دے دی جائے۔ اس لئے آپ خاطر جمع رکھیں اور ہرگز اس صورت حال سے اثر قبول نہ کریں دوسری بات یہ فرمائی جا رہی ہے کہ جہاں تک عذاب کا تعلق ہے یہ مشرکین یہ سمجھتے ہیں کہ عذاب محض ڈراوا ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں حالانکہ وہ ایک حقیقت ہے وہ جب اللہ فیصلہ کرے تو ہو کے رہنے والی چیز ہے' جب اس کے نازل ہونے کا وقت آجائے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو روک نہیں سکتی۔ اس لئے کہ عذاب صرف ایک سزا کا نام نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں بھی حق ہے کیونکہ اللہ کے غضب کا اظہار ہے اور اس لئے بھی حق ہے کہ اس کے ذریعے سے حق و باطل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اہلِ حق باقی رہتے ہیں اور سرفراز کئے جاتے ہیں اور انکار کرنے والے اس عذاب کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر اسے ماننے سے انکار کر رہے ہیں اور اس کی حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہے تو یہ ان کی اپنی جہالت اور بے بصیرتی ہے۔ حق' حق ہے چاہے اسے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے۔ جو اسے تسلیم کر لیتا ہے اس کی عظمت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اہلِ حق میں شمار کر لیا اور اس نے حق کو پہچان کر اپنی بصیرت کا ثبوت دیا اور جو آدمی اس حق کو قبول کرنے اور سمجھنے سے انکار کر دیتا ہے وہ حیوانوں سے بھی بدتر ٹھہرتا ہے کیونکہ اس نے اس کا انکار کر کے حق سے اپنا تعلق توڑ لیا ہے اور اپنے آپ کو بے بصیرت ثابت کر دیا ہے' یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی سورج کے وجود کا انکار کر دے جبکہ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کئے رہے اور شور مچائے کہ میں سورج کو ماننے سے انکار کرتا ہوں تو ہر آدمی اس پر ہنسے گا اور کہے گا کہ ایک مسلّم بات کا انکار کر کے تم اپنی جہالت پر مہر لگا رہے ہو اور جہاں تک آفتاب کے وجود اور اس کی تابانی کا تعلق ہے تمہارے انکار سے اس میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوگا۔

تیسری بات یہ فرمائی جا رہی ہے کہ آپ ان مشرکین کے سامنے کھول کر یہ بات بیان فرما دیں کہ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ اگر عذاب نہ آیا تو شاید مجھ سے تمہارے ایمان نہ لانے کی باز پرس ہوگی حالانکہ میرا کام تبلیغ و دعوت اور انذار کرنا ہے۔ اس میں بفضلہٖ تعالیٰ میں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تم نے دنیا کی ہر تکلیف اور ہر اذیت مجھے پہنچائی قدم قدم پر میرے راستے میں کانٹے بچھائے۔ ناگفتہ بہ مصائب سے مجھے دوچار کیا' میرے ساتھیوں کو ہر طرح ادھیڑا کھدیڑا' میری دعاؤں کے مقابلے میں تم نے مجھے گالیاں دیں۔ لیکن اس کے باوجود میں نے خون کے گھونٹ پی پی کر تمہاری خیر خواہی اور ہمدردی کا حق ادا کیا' تمہارے ایک ایک دروازے پر میں نے دستک دی۔ اس لئے جہاں تک میرے فرض کی ادائیگی کا تعلق ہے میں اسے ادا کر چکا ہوں۔ رہی یہ بات کہ لازماً تمہیں ایمان و اسلام کی راہ پر چلنے پر مجبور کر دوں اور بہر صورت تمہیں دولتِ ایمان سے بہرہ ور کر دوں اور تمہارے نہ چاہتے ہوئے بھی میں ایمان تمہارے گلے سے نیچے اتار دوں یہ نہ میری ذمہ داری ہے اور نہ یہ میرے بس میں ہے کیونکہ میں تم پر مبشر اور منذر بن کر آیا ہوں کوئی داروغہ بن کر نہیں آیا۔ لیکن تم اگر عذاب ہی کیلئے مچلے ہوئے ہو اور نادانوں کی طرح اس پر ضد کر رہے ہو تو سنو:

Marfat.com

آیت:۶۷ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ز وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ O ''ہر بات کیلئے ایک وقت مقرر ہے اور تم عنقریب جان لوگے''۔

دنیا کا ہر کام اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کے علم اور مشیت سے ہوتا ہے:

نَبَاءٌ کسی اہم حادثہ کی خبر کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اس عذاب کی خبر ہے جو قرآن دے رہا ہے۔ مُسْتَقَر موضع استقرار اور وقت استقرار دونوں مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی مصدر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی کام اتفاق سے نہیں ہوتا بلکہ ہر کام اور ہر واقعہ اللہ کے علم اور اس کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ چاہے وہ پتہ گرنے کا ہو یا ایٹم بم گرنے کا' اللہ کے علم سے باہر نہیں۔ پیچھے ہم پڑھ چکے ہیں کہ پروردگار فرماتا ہے کہ جنگل میں کوئی پتہ نہیں گرتا' مگر اللہ اسے جانتا ہے اور کوئی خشک وتر چیز ایسی نہیں جو اللہ کے علم میں نہ ہو زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں گرتا مگر اللہ کی کتاب علم میں وہ محفوظ ہوتا ہے۔ جس طرح دنیا کا ہر واقعہ اور دنیا کی ہر بات اللہ کے علم میں ہے اسی طرح اس کی قدرت میں بھی ہے۔ اس لئے اللہ خوب جانتا ہے کہ کسی قوم پر عذاب آنا چاہئے یا نہیں اور اگر عذاب آنا ہے تو اس کا وقت کونسا ہے اور اس کی جگہ کونسی ہے کیونکہ دنیا کے ہر واقعہ کا وقت اور اس کی جگہ اللہ کی تقویم میں پہلے سے طے ہے۔ اے مشرکینِ مکہ تم پر اگر ابھی تک عذاب نہیں آیا اور تم مجھ سے بار بار اس کا مطالبہ کر رہے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ عذاب لانا میرا کام نہیں کیونکہ میں اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں' دنیا میں عذاب لانے کیلئے تو نہیں آیا۔ میری تمام مساعی کا حاصل تمہیں عذاب سے بچانا ہے۔ لیکن تم اگر اپنی کرتوتوں سے مسلسل عذاب کو دعوت دے رہے ہو تو یقیناً وہ اللہ کے علم میں ہے اور وہی جانتا ہے کہ اس کے آنے کا وقت کیا ہے۔ لیکن تمہیں اس بات کا یقین رکھنا چاہئے کہ اگر علمِ خداوندی میں اس کا فیصلہ ہو چکا ہے تو اس کا آنا اٹل ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ اب رہی یہ بات کہ وہ وقت کونسا ہوگا تو اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ تمہیں اللہ نے جو مہلت عمل دے رکھی ہے جب تک اس کی آخری گھڑی نہیں آجاتی یعنی تمہارے اندر جو قدرت نے ایمان قبول کرنے کی جو استعداد رکھی ہے جب تک اس کا آخری ٹانکہ نہیں ٹوٹ جاتا اس وقت تک عذاب نہیں آئے گا۔ لیکن جیسے ہی وہ مقررہ گھڑی پہنچ جائے گی' جس میں تم اپنی مہلت عمل کھو بیٹھو گے تو پھر تمہارے عذاب کے آنے میں کوئی تاخیر نہیں ہوگی۔

سلسلۂ بیان جہاں تک پہنچ چکا ہے' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کی دعوتی اور تبلیغی کاوشیں ایک خاص مرحلے میں داخل ہو گئی ہیں۔ ایک طرف تو آنحضرت ﷺ اپنے جانثاروں کی معیت میں تبلیغ وتذکیر کے بھرپور عمل سے مکہ معظمہ میں رہنے والے لوگوں کو دولتِ ایمان سے منور کر دینا چاہتے ہیں اور آپ کی شدید خواہش ہے کہ مکہ معظمہ اللہ کا گھر اور مہبط وحی ہونے کی وجہ سے اس کا حق رکھتا ہے کہ یہ مرکز اسلام بنے اور یہیں سے اسلام کا نور پوری دنیا میں پھیلے اور وہ اسی صورت ممکن ہے کہ یہاں کے رہنے والے اسلام کی دعوت قبول کریں اور اس کے دست وبازو بن کر اس تحریک کو پوری دنیا میں پھیلا دیں اور دوسری طرف مشرکینِ مکہ کا حال یہ ہے کہ وہ دعوت وتبلیغ پر تو کیا کام کریں گے وہ تو عذاب کی دھمکیوں کو بھی خاطر میں لانے کو تیار نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس دعوت اور اس دین کا مذاق اڑانا ایک معمول بنا لیا ہے۔ حضور جس کسی مجلس میں بھی جاتے ہیں اور جس قبیلے کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہیں۔ آپ کو نہایت ناگوار صورتحال سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور بعض دفعہ ایسی ناگفتنی باتیں سنی پڑتی ہیں کہ جن کا برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی صورتحال کے حوالے سے آنحضرت اور مسلمانوں کو خاص ہدایات دی جا رہی ہیں۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۶۸ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ط وَ

Marfat.com

یُنسِیَنَّکَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ O ''اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں مین میکھ نکالتے ہیں' تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ' یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں' اور اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو''۔

گستاخانِ رسول ﷺ کی محفلوں میں نہیں جانا چاہیے:

اس آیت کریمہ کے پہلے جملے سے صورتحال کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں کفارِ مکہ کے جس طرزِ عمل سے واسطہ پڑ رہا تھا اس کی نمایاں بات یہ تھی کہ وہ اللہ کی آیات میں خوض کرتے تھے۔ خوض کا معنی کسی چیز میں گھس جانے کا ہے۔ اسی سے خوض فی الحدیث کا محاورہ نکلا ہے' جس کے معنی ہیں ''بال کی کھال ادھیڑنا' مین میکھ نکالنا' کسی بات پر اعتراض' نکتہ چینی اور کٹ حجتی کے نئے نئے پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرنا''۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو کئی جگہ استعمال کیا ہے اور ہر جگہ قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ یعنی مخاطب جب کسی بات کو سنجیدگی سے لینے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے دل لگی اور مذاق میں اڑا دینا چاہے تو اسی کو خوض سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آگے آنے والی تیسری آیت میں ان کے اس طرزِ عمل کو متعین کرتے ہوئے لہو و لعب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوض ہی کی تشریح ہے یعنی بجائے اس کے کہ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے پاس ہدایت کی دولت لے کر آئے ہیں اور ان کی زندگی کو صحیح راستے پر ڈالنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک ایسا استقرار' ایک ایسی سنجیدگی' ایک ایسا وقار' ایک ایسی خوش اسلوبی اور حقوق و فرائض میں ایک ایسی پاسداری پیدا ہوگی کہ جس سے ان کی دنیا بھی جنت کا نمونہ بن جائے گی اور آخرت میں وہ اللہ کی رضا سے نوازے جائیں گے۔ لیکن ان کا طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس تھا کہ وہ حضور کی ذات کو مذاق کا نشانہ بناتے' قرآن پاک کی آیات کا مذاق اڑاتے' احکام خداوندی کو تعریض کی سان پر چڑھاتے اور ہر سیدھی بات کو بگاڑ کر پیش کرتے۔ حتیٰ کہ ان کی حد درجہ بڑھی ہوئی زبانوں سے نہ اللہ کی عزت محفوظ تھی اور نہ اللہ کے احکام کی۔ یہ صورتحال واضح کرنے کے بعد حضور کو ایک بنیادی ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب کبھی آپ کو اس صورتحال سے واسطہ پڑے تو پھر آپ کو کیا کرنا چاہئے کیونکہ اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ آنحضرت ﷺ میں کفار کے ایمان لانے کی جو شدید خواہش پائی جاتی ہے اور آپ جس طرح ان کے ایمان کیلئے رات دن دعوت و تبلیغ میں لگے رہتے ہیں اور بار بار اللہ سے اس کی التجائیں بھی کرتے ہیں اور ہر طرح کی صورتحال کا مقابلہ کرتے ہوئے ان کے دل و دماغ میں اللہ کے دین کو اتار دینا چاہتے ہیں اس کے پیشِ نظر یقیناً اس بات کا ہرگز امکان نہیں تھا کہ آنحضرت ﷺ کفارِ مکہ کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے اپنی مساعی کو روک دیں گے کیونکہ آپ کے سامنے تو ایک ہی دھن تھی کہ ہر صورت میں اللہ کا دین ان تک پہنچانا ہے اور تبلیغی کاوشوں سے ان کو اللہ کے راستے کی طرف مائل کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ ان کا طرزِ عمل کیا ہے وہ ہزار تکلیف دہ ہو لیکن حضور تو اس سے رکنے والے نہیں تھے اور آپ کی تربیت کے نتیجے میں مسلمان بھی ہرگز اس سے اثر قبول کرنے والے نہیں تھے۔ اس لئے پروردگار نے بنفسِ نفیس اس میں مداخلت ضروری سمجھی اور آپ کو یہ ہدایت دی گئی کہ جب آپ ان کی یہ کیفیت دیکھیں تو آپ ان سے اعراض فرمائیں یعنی ان سے کنارہ کش ہو جائیں۔ علماء نے اس سے جو کچھ سمجھا ہے اور آپ اور ہم بھی جب اس میں غور کرتے ہیں تو جو حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں' ان میں سے چند ایک کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ اس میں خطاب براہِ راست آنحضرت ﷺ سے ہے تو کیا یہ حکم صرف حضور کی ذات کیلئے تھا یا تمام ان لوگوں کیلئے ہے جو آپ کے طریقے پر چلتے ہوئے ایسے ناموافق حالات میں تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیں۔ انہیں آیات کے سیاق کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے اسلوب میں ایک ارتقاء پایا جاتا ہے کہ شروع میں خطاب آنحضرت کی ذات گرامی سے ہے اور اگلی آیت میں یہی بات ایک دوسرے اسلوب

Marfat.com

سے تمام مسلمانوں سے کہی جارہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات حضور کے ساتھ خاص نہیں بلکہ قیامت تک کیلئے تبلیغ و دعوت کا کام کرنے والوں کو یہی ہدایت پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اب رہی یہ بات کہ یہ ہدایت کیوں دی جارہی ہے یا اس ہدایت کی صحیح صورت کیا ہے۔ اس کا یہ مفہوم تو ہرگز نہیں ہوسکتا کہ جہاں بھی کبھی ایسی صورت حال نظر آئے تو وہاں تبلیغی مساعی کو روک دیا جائے بلکہ اس کی صحیح صورت جو سمجھ میں آتی ہے اور جو ان آیات میں واضح ہے وہ وہ ہے جس کا ذکر قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر پہلے سے یہ بات معلوم ہو کہ فلاں صاحب یا فلاں گروہ دین کے بارے میں معاندانہ روش رکھتے ہیں اور وہ اپنی تہذیب کے سارے دعووں کے باوجود اس قدر غیر مہذب ہیں کہ داعی کے جذبات کی بھی انہیں پرواہ نہیں ہوتی اور وہ بے دھڑک اللہ اور رسول کے بارے میں بدزبانی کرنے لگتے ہیں تو ایسے لوگوں کے پاس تو ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ البتہ! اگر اس بات کا یقین نہ ہو اور آدمی حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یا بے خبری میں کسی ایسی تقریب یا ایسی مجلس میں چلا جائے جس میں وقتی طور پر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ اس مجلس کے شرکاء اللہ اور رسول کے بارے میں بدزبانی کرنے لگیں، دینی اقدار کا مذاق اڑائیں یا شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر بے حیائی کا ماحول پیدا کردیں تو پھر اس حکم کا مفہوم یہ ہے کہ آپ وہاں سے اٹھ جائیے کیونکہ حکمتِ تبلیغ کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ وہاں بیٹھ کر ان کے اس طرزِ عمل کو تقویت نہ پہنچائیں اور نہ انہیں روکنے اور سمجھانے کی کوشش کریں کیونکہ جب ایک آدمی کسی کی مخالفت میں ہیجان کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کی کیفیت بخار میں مبتلا اس شخص جیسی ہوتی ہے جس کے سر کو بخار چڑھ جائے اور وہ دیوانگی میں اول فول بکنے لگے۔ اب اگر آپ اسے سمجھانے کی کوشش کریں گے تو وہ دیوانگی میں اور ناروا باتیں کہے گا اور اس کا طرزِ عمل پہلے سے زیادہ ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ اس لئے اگر آپ اس کی اصلاح چاہتے ہیں تو اب حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہاں سے خاموشی سے اٹھ جائیے البتہ! صحیح اور مناسب موقع کی تلاش میں رہیے اور جب بھی ایسا موقع ملے تو اپنی بات ان تک پہنچانے اور سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی آدمی اللہ کے دین کو اور انسانی اصلاح کو اپنا مشن بنالیتا ہے اور اللہ کے نبیوں کی طرح ہر وقت اسی حوالے سے سوچتا ہے تو اس کیلئے ایسے ناموافق حالات میں بھی کوئی موقعہ تلاش کرلینا ناممکن نہیں ہوتا۔ لیکن اس کیلئے شرط یہ ہے ایک تو اپنے اندر فرض کی آگ لگی ہو اور دوسری گہری بصیرت سے اللہ نے بہرہ ور فرمایا ہو۔ ہماری قریبی تاریخ میں ایک بڑے نامور سکالر گزرے ہیں جن کا نام تھا مولانا عبدالماجد دریا آبادی جو ادیب، مورخ، صحافی اور تذکرہ نگار ہونے کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں جانے پہچانے اور ایک مفسر ہونے کی حیثیت سے علماء میں معروف ہیں۔ ایک زمانہ کہ نئے نئے علی گڑھ سے پڑھ کر نکلے چونکہ ان کا بنیادی مضمون فلسفہ تھا اس کے بکھیڑوں میں ایسے الجھے کہ اسلام ہی سے نکل بھاگے اور اس کے بہت سارے بنیادی عقائد سے انکار کردیا۔ جن اللہ کے بندوں نے انہیں دوبارہ راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ان میں اکبر الہ آبادی مرحوم بھی تھے۔ مولانا عبدالماجد خود لکھتے ہیں کہ مجھ سے اکبر نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ تمہیں اسلامی عقائد اپیل نہیں کرتے اور قرآنِ کریم کی پیش کردہ تعلیمات سے تم مطمئن نہیں ہو لیکن تم چونکہ عربی زبان کے طالب علم ہوا تنا تو تم جانتے ہو کہ جہاں تک عربی ادب کا تعلق ہے۔ قرآن جیسی کوئی کتاب اس زبان میں موجود نہیں تو تم قرآن کریم کو عربی ادب عالیہ کی ایک اعلیٰ کتاب سمجھ کر پڑھ لیا کرو۔ اس کی تعلیمات سے تم کوئی غرض نہ رکھو۔ صرف اس کی عبارت سے اعلیٰ عربی سیکھنے کی کوشش کرو جو کسی اور کتاب سے ممکن نہیں۔ اب یہ ایک ایسا بے ضرر سا مشورہ تھا کہ مولانا عبدالماجد کو اس سے کیا انکار ہوسکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کریم کو محض عربی زبان کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تو اس کے کلام کے سحر میں ڈوبتے چلے گئے۔ اللہ نے دست گیری فرمائی، دوبارہ اسلام کی آغوش میں آئے اور تفسیر ماجدی کے نام سے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں قرآنِ پاک کی تفسیر لکھی۔ یہی وہ بات ہے جو یہاں کہی جارہی ہے کہ وقتی طور پر تو تم اس مجلس سے اٹھ جاؤ۔ لیکن اس انتظار میں رہو کہ کب وہ اس ناپاک مشغلے سے نکل کر کسی سنجیدہ مصروفیت میں مشغول ہوتے ہیں

Marfat.com

ان کا رویہ سنجیدہ ہوتا ہے' تب اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔

رسول ﷺ کے بھول جانے میں بھی حکمت ہے:

دوسری بات جو اس آیت کریمہ میں فرمائی ہے وہ یہ کہ

وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ

''اور اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو''

اس میں سب سے پہلے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس حکم میں یہاں تک شدت پائی جاتی ہے کہ اگر کسی وقت بھول کر بھی ایسے بے ہودہ لوگوں کی مجلس میں آدمی پہنچ جائے یعنی ذہن میں اس وقت یہ خیال نہ رہے کہ یہ لوگ کیسے ہیں اور یا یہ بات یاد نہ رہے کہ اللہ نے ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ تو جیسے ہی یاد آئے تو فوراً وہاں سے اٹھ جاؤ اور ایسے ظالموں کے ساتھ مت بیٹھو۔ حکم کی یہ شدت اور ان کیلئے ظالم کے لفظ کا استعمال یہ ہمیں ایک اور بات کی طرف راہنمائی دیتا ہے۔ وہ یہ کہ ان کے ساتھ بیٹھنا جن کی زبانوں اور جن کے طرز عمل سے نہ اللہ اور رسول کی ذات محفوظ ہے اور نہ دینی اقدار' سراسر ایک بے حمیتی کی بات ہے کیونکہ جس آدمی میں حمیت اور غیرت ہوتی ہے' وہ کبھی کسی ایسی مجلس میں بیٹھنا گوارا نہیں کرتا جہاں اس کے بزرگوں اور واجب الاحترام چیزوں کا ادب اور احترام نہ کیا جاتا ہو بلکہ اس کی توہین کی جاتی ہو۔ جس طرح کوئی بھی باغیرت آدمی ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا کبھی گوارا نہیں کرتا جو اس کے ماں باپ کی توہین کے در پے ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول کی عزت کا معاملہ تو اس سے کہیں زیادہ نازک ہے۔ اس لئے اگر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بیٹھنے والا اسلامی حمیت سے بالکل محروم ہے اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی ایسی مجالس میں بیٹھتا ہے یا ایسے لوگوں سے ملتا ہے وہ شروع شروع میں تو بے حمیتی کا شکار ہوتا ہے' لیکن رفتہ رفتہ وہ نفاق کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اسلام کیا ہے اور کفر کیا ہے وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس کے فوائد اور اس کے مفادات کہاں محفوظ ہیں۔ اس آیت کریمہ میں جو حکم دیا گیا ہے۔ سورۃ النساء نے اسی آیت کا حوالہ دے کر اس متذکرہ حقیقت کو نمایاں کیا ہے وہاں ارشاد فرمایا گیا ہے:

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِىْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۝

''اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مژدہ سنا دو کہ ان کیلئے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کیلئے ہے۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو' جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو' یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے''۔ (النساء:۱۳۸-۱۴۰)

نفاق کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی دل سے تو کافر ہے لیکن زبان سے اسلام کا نام لے اور دوسری صورت یہ ہے کہ دل سے آدمی کافر تو نہ ہو'

Marfat.com

لیکن اپنے مفادات کی حفاظت یا فوائد حاصل کرنے کیلئے اسے کفر اور کافر کی خدمت کرنے سے دریغ نہ ہو اور تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی اسلام اور کفر کے درمیان غیر جانبدار ہو کر رہ جائے کہ زبان سے بے شک کلمہ بھی پڑھے' اپنے آپ کو مسلمان بھی کہے' لیکن اسلام کے اجتماعی تقاضوں کے حوالے سے یا اسلام اور کفر میں تصادم کے وقت وہ بالکل ایک غیر جانبدار آدمی ہو۔ کفر غالب آ جائے تو وہ اس کے ساتھ ہو اور اسلام کو غلبہ ملے تو مسلمان ہونے کی وجہ سے اسلام سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن اگر کبھی کفر کی خدمت میں اسلام کے کاشانے پر قیامت بھی گزر جائے اور مسلمان چاہے اپنی تاریخ سے بھی محروم ہو جائیں تو اسے تب بھی کوئی پرواہ نہ ہو۔ نفاق کی یہ تمام شکلیں ہم آج کے دور میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں میں اور بڑے بڑے صاحب منصب افراد میں دیکھتے ہیں۔ حقیقت میں ایسے لوگ ایک ہی آستانے پر جھکتے ہیں جس کو آستانہ اقتدار یا آستانہ دولت کہا جاتا ہے اور نفاق کی یہ لعنت صرف اسلئے مسلمانوں میں آئی ہے کہ فرنگی نظام تعلیم نے اسلام کے بارے میں ان کو غیر جانبدار بنا دیا ہے۔ تعصب' رجعت پسندی' مذہبی انتہا پسندی' اور پھر بنیاد پرستی ایسے الفاظ کی اوٹ میں مسلمانوں کو ایمانی غیرت و حمیت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا نازک موضوع ہے کہ جس کا ذکر کرتے ہوئے شرم بھی آتی ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے۔ ایک طرف آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کا طرزِ عمل دیکھئے کہ قرآن کریم ایسی مجالس سے انہیں روکتا ہے کیونکہ وہ اسلام کی حمیت میں کہیں بھی جانے سے رکتے نظر نہیں آتے' پیش نظر چونکہ اسلام کا غلبہ اور اس کی نشر و اشاعت ہے اس لئے وہ ہر طرح کی صورتحال کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم انہیں حمیت کا سبق پڑھا رہا ہے کہ تمہارا زورِ تبلیغ اپنی جگہ اور تمہارا اخلاص بالکل بجا لیکن حکمت تبلیغ اور حمیت اسلامی کے اپنے تقاضے ہیں جن پر کان دھرنا ضروری ہے۔ اور دوسری طرف ہمارا حال ہے کہ ہم نے نفاق کو غیر جانبداری اور روشن خیالی کا نام دے کر آج کا چلن بنا دیا ہے۔ ظفر علی خاں نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا تھا۔

تم سمجھتے ہو پرایوں نے کیا ہم کو تباہ ‏ بندہ پرور کہیں اپنوں کا یہ کام نہ ہو
یوں تو شرمِ پیمبر ہے انہیں بھی لیکن ‏ ان کو ڈر یہ ہے کہ ناراض کہیں ٹام نہ ہو
اُس مسلمان سے سو بار ہے کافر اچھا ‏ جس مسلمان کے پیش نظر انجام نہ ہو

اسی ہدایت کے ضمن میں جو اس آیت کریمہ کے آخری جملے میں دی گئی ہے' ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں خطاب آنحضرت ﷺ کو براہِ راست ہے کہ اگر آپ کو شیطان بھلا دے اور آپ کو یہ بات یاد نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے لوگوں میں بیٹھنے سے منع فرمایا ہے تو آپ یاد آنے کے بعد ان لوگوں میں مت بیٹھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ بھی اللہ کے احکام کو بھول جاتے تھے اور شیطان کا آپ پر اثر ہو جاتا تھا یا کم از کم بات کہ آپ بھول سکتے تھے اور شیطان کا آپ پر اثر ہونا ممکن تھا۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو اس سے بڑا خطرناک نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ کے احکام آپ نے اللہ کے بندوں تک پہنچائے ہیں' ان کے محفوظ اور صحیح ہونے کی کیا ضمانت باقی رہ جاتی ہے۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان احکام کو محفوظ رکھنے میں نسیان کا شکار ہوئے ہوں یا شیطانی اثر کا تو پھر آخر ہم کس طرح اطمینان سے اللہ کی شریعت پر عمل کر سکتے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کون سا حکم صحیح ہے اور کونسا صحیح نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس شبے کے ازالے کیلئے چند باتیں گزارش کر دی جائیں۔ سب سے پہلی بات جیسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ خطاب آنحضرت ﷺ کو اس لئے ہے کہ آپ براہ راست اللہ کے رسول ہیں۔ اس لئے کلام خداوندی کے آپ اولین مخاطب بھی ہیں۔ لیکن حقیقت میں پوری امت اسلامیہ کے ارباب علم اور تذکیر و دعوت کا کام کرنے والوں کو یہ ہدایت دی جا رہی ہے یہی وجہ ہے ان آیات میں اسلوبِ کلام ارتقاء پذیر ہوتے ہوئے اگلی آیت کریمہ میں جمع کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اور اس میں تمام متقی مسلمانوں کے حوالے

Marfat.com

بات کی جا رہی ہے۔ اگر اس بات کو سمجھ لیا جائے تو پھر آنحضرت ﷺ کے بارے میں پیدا ہونے والا اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری بات جو اس حوالے سے پیش نظر رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سرے سے احکام کے محفوظ یا غیر محفوظ ہونے کی کوئی بحث نہیں ہو رہی بلکہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں سے جو بات کہی جا رہی ہے وہ یہ کہ آپ کو لوگوں کے ایمان سے جو گہری وابستگی ہے اور آپ ان کے بارے میں جس طرح ہمیشہ متفکر اور پریشان رہتے ہیں اور ان کے دل و دماغ میں ایمان اتارنے کیلئے جس طرح آپ کچھ بھی کر گزرنے کیلئے بے قرار رہتے ہیں۔ یقیناً یہ جوش تبلیغ اور مخلوقِ خدا سے گہری ہمدردی اللہ سے تعلق کی ایک مضبوط دلیل ہے اور آپ اسی کی رضا کے حصول کیلئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ یہ یقیناً ایک نیکی اور خیر کا کام ہے اور اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے تھوڑی ہے۔ لیکن اللہ کا نبی چونکہ خیر اور نیکی کے معاملے میں بھی ایک نمونہ ہوتا ہے' اس لئے نیکی کے راستے پر چلتے ہوئے اگر کبھی وہ مشیتِ ایزدی کو ذرا سا بھی نظر انداز کرنے لگتا ہے یا سنت الٰہی سے اس کا طرزِ عمل معمولی سا بھی متصادم ہونے لگتا ہے تو وحی الٰہی آ کر اسے روک دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اللہ کا رسول دنیا میں خلق خدا کو اللہ کے راستے کی ہدایت دینے کیلئے آتا ہے اور پوری زندگی کا سرمایہ وہ اس راستے میں جھونک دیتا ہے۔ اس کی ہر قربانی صرف اس لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستے پر ڈال دے۔ ظاہر ہے ایمان کی یہ حرص اپنے قریبی عزیزوں کے بارے میں اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اللہ کے نبی کا باپ یا کوئی قریبی عزیز کفر کی حالت میں مر جاتا ہے تو اس کیلئے اللہ سے مغفرت کی دعا کرنا بظاہر ایک کارِ خیر اور بہت بڑی نیکی ہے جو سراسر پیغمبر کی قلبی رقت اور خلق خدا سے گہری محبت کا نتیجہ ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے باپ کیلئے دعائے مغفرت کرنے سے روک دیا کیونکہ اس کی موت کفر کی حالت میں ہوئی اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ کافر چاہے اللہ کے رسول کا باپ کیوں نہ ہو وہ اس کی مغفرت کبھی نہیں فرماتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ کا نبی چونکہ دینی حمیت اور محبتِ الٰہی کا کامل نمونہ ہوتا ہے اور ایک کافر کیلئے دعائے مغفرت چاہے وہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو محبتِ الٰہی اور دینی حمیت کے خلاف ہے۔ اس لئے پیغمبر کو اس سے روک دیا جاتا ہے حالانکہ کافر کیلئے دعائے مغفرت کرنا نہ گناہ ہے اور نہ کوئی غلط بات۔ اسی طرح یہاں بھی ہر حالت میں تبلیغ و دعوت سے کام لینا سراسر ایک نیکی ہے۔ لیکن اللہ نے اپنے دین کی نشر و اشاعت کیلئے جس حکمت تبلیغ کو پسند فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ جس اسلامی حمیت کا حکم دیا ہے یہ چیز چونکہ اس سے میل نہیں کھاتی۔ اس لئے نبی کریم ﷺ کو اس سے روک دیا گیا۔ لیکن کافروں کے ایمان لانے کیلئے آپ کی طبیعت میں جو شدید حرص پائی جاتی تھی اور آپ ان کو جہنم کے عذاب سے بچانے کیلئے جس طرح شدید خواہش مند رہتے تھے اس کی وجہ سے اس بات کا امکان ضرور تھا کہ شیطان اسی حرص اور محبت کو بڑھا کر اور اسے غلبہ دے کر آپ کی نگاہوں سے اس حکم کو اوجھل کر دیتا اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس کا مبدأ اور اس کا سبب سراسر تبلیغ و دعوت کا جوش ہے' حکمِ الٰہی کی مخالفت نہیں اور نہ حکمِ الٰہی کو بھول جانا ہے۔ اس لئے اس کو احکام خداوندی کے بھول جانے پر محمول کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

لیکن اسی ضمن میں ایک اور بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے جسے علما نے کھول کر بیان کیا ہے کہ جہاں تک اللہ کے نبی کے بھول جانے کا تعلق ہے اس کا ہر وقت امکان ہے۔ البتہ! اس کے بھولنے میں اور ہمارے بھولنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ اگر بھولتا ہے تو اس کے پیچھے حکمتِ الٰہی کارفرما ہوتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ بھولتا نہیں بلکہ اس کو بھلایا جاتا ہے' یہ بتانے کیلئے کہ ہر طرح کی بھول چوک سے پاک اور مبرا صرف اللہ کی ذات گرامی ہے۔ اللہ کے نبی چونکہ انسان ہوتے ہیں۔ اس لئے قدرت انہیں کبھی کبھی خود بخود بھلاتی ہے تاکہ لوگ کہیں ان کو خدا نہ بنا بیٹھیں۔ البتہ! ان کا بھولنا یا قدرت کی طرف سے ان کا بھلانا سراسر وقتی ہوتا ہے۔ ہم جب بھولتے ہیں تو کبھی ہمیں دوبارہ ہوش آتا ہے اور کبھی نہیں آتا اور کبھی بھول ہی کو ہم اپنی زندگی کا سرمایہ بنا لیتے ہیں اور اگر کبھی بھول سے نکلتے ہیں تو بہت کچھ کھو دینے کے بعد۔ لیکن اللہ کے نبی کو اگر کبھی ایسا موقع پیش آتا ہے تو آسمان سے

Marfat.com

جبرائیل اترتے ہیں اور فوراً آ کر آپ کی بھول کی اصلاح کرتے ہیں یعنی آپ کا بھولنا اس لئے تھا تا کہ لوگ آپ کو خدا نہ سمجھیں۔ لیکن وحی کا نازل ہو کر آپ کی بھول کی اصلاح کر دینا یہ اس لئے ہے تا کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ساری دنیا بھی اگر کسی بات کو بھول جائے تو اللہ ان کو یاد دلانے کی کبھی ذمہ داری قبول نہیں فرماتے۔ لیکن اللہ کا رسول اگر بھول جائے تو اولاً تو وہ بھولنا احکام خداوندی میں نہیں ہوتا بلکہ آداب اسلامی میں ممکن ہے لیکن اس کی بھی فوراً آ کر اصلاح کر دی جاتی ہے اور اسی سے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں فرق واضح ہوتا ہے اور یہ بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ اللہ کا نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس سے کبھی کسی لغزش کا صدور نہیں ہوتا اور اگر کسی اجتہادی معاملے میں کوئی لغزش ہو جائے تو اللہ اس پر اسے باقی نہیں رہنے دیتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ نبوت کے بعد کسی نبی کا غلطی کرنے یا احکام شریعت میں بھول جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ کا نبی تو نبوت سے پہلے بھی معصوم ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات ہمیشہ اس کی حفاظت فرماتی ہے اگر کبھی اس کی طبیعت میں ایسی کوئی خواہش پیدا ہو جو بظاہر پروردگار کو پسند نہ ہو تو پروردگار ایسے کام کو اس سے صادر نہیں ہونے دیتا۔ ارباب سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت کے لڑکپن کے زمانے میں جبکہ آپ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ خود فرماتے ہیں کہ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ مکہ معظمہ میں کوئی ایسی تقریب ہو رہی ہے جس میں باہر سے قصہ گو حضرات کو بلایا جا رہا ہے۔ عرب میں تفریح کیلئے مختلف تقریبات میں جہاں موسیقی اور گانے بجانے کا اہتمام ہوتا تھا وہیں کہانیاں سنانے والوں کو قسم قسم کی کہانیاں سنانے کیلئے بلایا جاتا تھا۔ جیسے آج کل ہمارے یہاں سٹیج شو یا اوپن ایئر تھیٹر چلتے ہیں اور اس میں مختلف ڈرامے دکھائے جاتے ہیں یا مختلف تمثیلی پروگرام کئے جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے ساتھ بکریاں چرانے والے ساتھی سے کہا کہ تم اگر میری بکریوں کا خیال رکھو تو میں جا کر اس تقریب میں شامل ہو جاؤں! اس نے شوق سے اجازت دے دی۔ آپ مکہ معظمہ اپنے دوستوں کے ساتھ اس تقریب میں شامل ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ جب ہم وہاں پہنچے تو ابھی یہ تقریب شروع نہیں ہوئی تھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نیند طاری فرما دی اور جب میں نیند سے بیدار ہوا تو رات گزر چکی تھی اور سورج کی دھوپ میرے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہاں کسی تقریب کا نام ونشان نہ تھا اور لوگ نجانے کب سے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ یہ تو حضور کے بچپن کا واقعہ ہے لیکن آپ کے بھرپور جوانی کے دنوں میں جبکہ بیت اللہ کی تعمیر ہو رہی تھی اور آپ بھی دوسرے اشراف قریش کے ساتھ پتھر اٹھا رہے تھے چونکہ کندھے پر کرتے کے سوا کوئی اور کپڑا نہ تھا اس لئے پتھر کی رگڑ سے کندھے کے چھل جانے کا اندیشہ تھا۔ حضرت عباس ؓ آپ کے چچا نے آپ سے کہا کہ بھتیجے سب لوگوں نے اپنے تہمند اتار کر اپنے کندھوں پر تہہ کر کے رکھے ہوئے ہیں تا کہ ان کے کندھوں پر زخم نہ آئیں تم بھی اپنا تہمند اتار کر کندھے پر رکھ لو عرب چونکہ تہمند باندھتے اور اس کے اوپر لمبا کرتہ پہنتے تھے۔ تہمند اتارنے سے اگرچہ ستر نہیں کھلتا تھا لیکن ستر کھل جانے کا امکان تو ہر وقت تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ کے چچا نے آگے بڑھ کر آپ کا تہمند کھینچنے کی کوشش کی۔ محض اس تصور سے کہ ہو سکتا ہے اس طرح میرا ستر کھل جائے آپ شرم وحیا کے گہرے جذبات کے زیر اثر بے ہوش ہو کر گر گئے۔ جیسے ہی آپ گرے حضرت عباس ؓ نے گھبرا کر آپ کا تہمند چھوڑ دیا اور بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر حضور نے کسی فرشتے کو بھی دیکھا۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ اللہ کے نبی کی نبوت سے پہلے بھی کس طرح حفاظت کی جاتی ہے اور کس طرح عصمت ایک جزو غیر منفک کی طرح اس کے ساتھ رہتی ہے تو نبوت کے بعد تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ سے کبھی کسی ایسے عمل یا فکر کا صدور ہو جسے خلاف شریعت کہا جا سکتا ہے۔ البتہ! جیسے کہ عرض کیا کہ اجتہادی لغزش کی اصلاح بھی وحی الٰہی کے ذریعے کر دی جاتی ہے۔

بعض دفعہ آپ سے کوئی بھول اس لئے کرائی جاتی ہے تا کہ احکام شریعت کی وضاحت ہو سکے۔ یوں تو زبانی بھی احکام شریعت بیان ہوتے ہیں اور حضور بیان فرماتے بھی تھے۔ لیکن جن احکام کا تعلق عمل سے زیادہ گہرا ہو اسے عمل کے ذریعے ہی بیان کرنا زیادہ موثر ہوتا ہے۔ میں اس کی صرف

Marfat.com

ایک مثال عرض کرتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ نے ظہر یا عصر کی چار رکعت نماز پڑھائی لیکن دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ پیچھے نماز پڑھنے والے تمام صحابہ نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ چار رکعت کی بجائے آپ نے دو رکعت کیوں پڑھائی لیکن پوچھنے کی ہمت اس لئے نہ کر سکے کہ ایک تو ادب مانع تھا اور دوسری یہ بات کہ ہوسکتا ہے کہ یہ نماز چار کی بجائے دو رکعت کر دی گئی ہو۔ لیکن صحابہ کرام میں ایک صحابی جو ہاتھوں میں معمولی طوالت کی وجہ سے ذوالیدین کے نام سے معروف تھے وہ اٹھے اور انہوں نے ادب سے عرض کیا۔ اَقُصِرَتِ الصلوٰۃ ام نسیت یا رسول اللّٰہ ''اے اللہ کے رسول کیا نماز مختصر ہوگئی یا آپ بھول گئے''۔ آپ نے فرمایا کل ذالک لم یکن ''کچھ بھی نہیں ہوا'' انہوں نے عرض کی کہ آپ نے دو رکعت نماز پڑھائی ہے۔ آپ نے صحابہ کی طرف دیکھا انہوں نے تائید کی' تب حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر مزید دو رکعت نماز پڑھا کر چار رکعت کی نماز مکمل فرما دی۔ یہ احکام کا ابتدائی زمانہ تھا جبکہ نماز میں بات کر لینا جائز تھا اور اس سے نماز ٹوٹتی نہیں تھی۔ پھر رفتہ رفتہ نماز کے احکام مکمل ہوتے گئے اور نماز کی ایک خاص تہذیب ہوتی گئی اور اس نے وہ صورت اختیار کی جیسے اب ہم نماز پڑھتے ہیں۔ اس واقعہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بھول کے ذریعے مسلمانوں کو یہ طریقہ سمجھایا کہ اگر تم کبھی چار رکعت کی بجائے دو رکعت پر سلام پھیر دو تو پھر تمہیں کیا کرنا چاہئے اور اس میں ایک تسلی بھی ہے کہ اگر تم نماز میں بھول جاؤ تو یہ انسانی فطرت ہے اس پر دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ دیکھو ہم نے اپنے رسول کو بھلایا تاکہ تمہیں مسئلہ بھی معلوم ہو جائے اور تمہارے اطمینان کا باعث بھی ہو۔ اگر یہ نمونہ صحابہ کے سامنے نہ ہوتا تو میرا گمان یہ ہے کہ جب کبھی وہ نماز میں بھولتے تو نجانے کب تک اپنی غفلت پر اللہ کے سامنے روتے اور مغفرت طلب کرتے۔ اللہ کی وہ رحمت جس کی چادر ہمیشہ بندوں پر تنی رہتی ہے اس کی چند در چند شکلیں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

اگلی آیت کریمہ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ تبلیغ و دعوت کی یہ حکمت صرف آنحضرت ﷺ ہی کیلئے نہیں بلکہ تمام مسلمان اس کے مخاطب ہیں۔ البتہ تبلیغ و دعوت کی فکر سے وہ کبھی بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۶۹ وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○ ''جو اللہ سے ڈرتے ہیں' ان پر ان لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں' بس یاد دہانی کر دینا ہے' تاکہ وہ بھی ڈریں''۔

اس آیت کریمہ میں ایک تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ گزشتہ آیت کریمہ میں واحد کے صیغے سے خطاب' اگرچہ آنحضرت ﷺ کو تھا۔ لیکن کلام کا رخ مسلمانوں کی طرف تھا اور اس آیت میں مسلمانوں کیلئے جمع کے صیغے لا کر اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے تاکہ یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ یہ ہدایت صرف آنحضرت ﷺ کو دی جا رہی ہے۔ لیکن اصلاً جس پر زور دیا جا رہا ہے وہ دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ اس دور کے مسلمان یعنی صحابہ کرام اس بات سے شدید لرزاں و ترساں رہتے تھے کہ اگر یہ کافر لوگ مسلمان نہیں ہوتے' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری تبلیغی کاوشوں میں کوئی کمزوری ہے اور اگر ایسا ہے تو یقیناً کل کو یعنی قیامت کے دن ہم سے اس کا سوال ہوگا تو پھر ہم اس کا کیا جواب دے سکیں گے۔ اس خیال کے باعث جہاں وہ تبلیغی کاوشوں میں ہر وقت اضافے کی فکر میں رہتے تھے اور اسے زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی کوشش کرتے تھے' وہیں وہ اللہ سے اس کیلئے استغفار بھی کرتے رہتے تھے اس لئے انہیں تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ کی تبلیغی مساعی میں بفضلہٖ تعالیٰ کوئی کمی نہیں' کمی جو کچھ ہے وہ کافروں کی طلب میں ہے۔ جب تک ان کے اندر ایمان کی طلب پیدا نہیں ہوتی اور جب تک ان کے سامنے قیامت کی جواب دہی کا احساس توانا نہیں ہوگا اور جب تک وہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا شروع نہیں کریں گے اور جب تک وہ اپنے انجام کی فکر نہیں کریں گے اس وقت تک آپ کی مساعی مثمر نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے آپ کو اس بات کا اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ کل کو اللہ تعالیٰ آپ سے یہ سوال کریں گے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے تھے۔ ان کے ایمان نہ لانے کا سوال ان سے ہوگا اور وہی اس پاداش

Marfat.com

میں پکڑے جائیں گے۔ دوسری بات جس پر زور دیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ یقیناً ان کے ایمان کے بارے میں آپ سے سوال تو نہیں ہوگا لیکن کسی صورت بھی آپ کو اس حکمت تبلیغ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو گزشتہ آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہے۔ البتہ! یہ بات پیشِ نظر رہے کہ نصیحت کرنا یعنی تبلیغ و دعوت سے کام لینا' یہ بہرحال آپ کی ذمہ داری ہے۔ اس کے بارے میں کل کو آپ سے ضرور باز پرس ہوگی۔ اس لئے آپ برابر اس فکر میں رہیں کہ جب بھی آپ کو سازگار موقع ملے اور آپ اس کی امید کر سکیں کہ اب ان سے بات کہی جا سکتی ہے تو آپ اس سے ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

یہاں شاید ایک بات کی وضاحت ضروری ہو وہ یہ ہے کہ یہاں ذکرٰی کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے نصیحت۔ اس کا ایک واضح مفہوم یہ ہے کہ اگر لوگ تبلیغ و دعوت پر کان نہ دھریں اور اسے قبول کرنے کیلئے کسی طرح بھی تیار نہ ہوں تو یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ پھر آپ کو اس فکر میں پریشان نہیں ہونا چاہئے کہ میں ان کو کس طرح بدلوں اور کس طرح ان کو صاحب ایمان بنادوں کیونکہ وہ وقت کی غالب قوت ہیں اور میں ان کو زور سے تو بدل نہیں سکتا۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے موقع پر ان کے تعاقب میں لگے رہنا اور بہرصورت ان کو دعوت دیتے رہنا یہ آپ کی ذمہ داری نہیں بلکہ آپ کا کام یہ ہے کہ جب بھی ناموافق حالات میں آپ کیلئے امید کی کوئی کرن روشن ہو اس میں آپ نصیحت کرنے کو کبھی نہ بھولیں۔ لیکن بعض لوگوں نے اس کا یہ مفہوم لے لیا ہے کہ اپنے حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنا اور حکومت کو غلط پالیسیوں سے روکنے کیلئے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ان تمام ذرائع سے کام لینا جو حکومت کو مجبور کرنے کیلئے آج کے دور میں مروج ہیں اور اگر حکومت ظلم پر اتر آئے تو اس کے سامنے تن کے کھڑے ہو جانا اور اس راستے میں آنے والی مصیبتوں کو برداشت کرنا اس کی ضرورت نہیں بس آپ نے لکھ کر یا بول کر نصیحت کر دی ہے تو آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اسی طرح انسانی معاشرے میں زندگی کے بعض دوائر ایسے ہوتے ہیں جس میں اگر کوشش کی جائے تو قانون کے اندر رہتے ہوئے بھی خیر کو غالب قوت بنایا جا سکتا ہے۔ اگر کہیں بھی مسلمانوں کے کسی گروہ کو ایسی ہی کسی جگہ میں غالب قوت حاصل ہے اور پھر وہاں بھی یہ سمجھنا کہ بس نصیحت کر دینا کافی ہے اور اس سے آگے بڑھ کر کچھ کرنا وہ ہماری ہرگز ذمہ داری نہیں اور اس آیتِ کریمہ سے اس بات کو نکالنا یہ سراسر تحریف معنوی ہے۔ مثلاً ایک باپ کو اپنے گھر میں ایک غالب حیثیت حاصل ہے وہ اپنے بچوں کو اگر اسلامی احکام پر عمل کرنے کیلئے مجبور کرنے کی بجائے صرف نصیحت پر اکتفا کرتا ہے تو وہ اپنی ذمہ داری سے تساہل برت رہا ہے۔ اسی طرح کسی بھی ادارے میں اگر شریعت اسلامی کے بنیادی احکام کی مخالفت ہو رہی ہے اور اس کا سربراہ صرف نصیحت پر اکتفا کر کے بیٹھ جاتا ہے لیکن اگر اس کے ادارتی احکام کی مخالفت ہوتی ہے تو اس میں وہ طاقت استعمال کرتا ہے تو یہ وہ طرزِ عمل ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

مختصر یہ کہ حالات اجازت نہ دیتے ہوں اور بگاڑ اس حد تک بڑھ جائے کہ خیر کی قوت مغلوب ہو جائے اور کسی سطح پر بھی خیر کو غلبہ میسر نہ آ سکے تو پھر تو یقیناً مسلمانوں کی ذمہ داری صرف نصیحت کرنا ہے اور خود شریعت اسلامی کی پابندی ہے لیکن اگر کہیں بھی قدم اس سے آگے بڑھایا جا سکتا ہو اور وہ شرعی احکام اور اسلامی مزاج کے عین مطابق ہو تو پھر اس آیت کا سہارا لے کر اپنے آپ کو الاؤنس دینا یہ سراسر ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرنا ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں ایسے ہی کافر معاشرے بلکہ معاند معاشرے کے بارے میں ایک دوسرے پہلو سے ہدایات دی جا رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۷۰ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ ''ان لوگوں کو چھوڑو جنہوں نے اپنے دین کو ایک کھیل تماشہ بنا رکھا ہے اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور اسی کے ذریعے سے یاددہانی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی جان اپنے کئے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے

Marfat.com

جائے۔ اللہ کے آگے نہ اس کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ سفارشی اور اگر وہ ہر معاوضہ بھی دے تو بھی اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ یہی لوگ ہیں' جو اپنے کئے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کئے جائیں گے۔ ان کے لئے کھولتا پانی پینے کو اور ایک دردناک عذاب ہوگا ان کے کفر کی پاداش میں''۔

قیامت کے دن کافروں کی طرف سے نہ کوئی سفارش قبول ہوگی نہ کوئی معاوضہ قبول ہوگا:

اس آیت کا پہلا لفظ وَذَر نہیں ہے بلکہ واؤ الگ ہے اور ذر الگ ہے۔ جس کا معنی ہے چھوڑ دو۔ یہ وَذَرَ سے امر ہے۔ اس میں آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی دی جارہی ہے اور مشرکینِ مکہ اور اس دور کے کافر معاشرے کے اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ بھی بیان کی جارہی ہے۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ ان لوگوں کو انکی حالت پر چھوڑ دیجئے اور آپ ان کیلئے نہ پریشان ہوں اور نہ ان کا تعاقب کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ انہوں نے جو رویہ اختیار کرلیا ہے اس میں اصلاح کو قبول کرنے کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ اللہ کا رسول دنیا میں لوگوں کی اصلاح کیلئے آتا ہے وہ انہیں سمجھاتا ہے کہ تمہاری زندگی غلط رخ پر چل رہی ہے۔ جس کا نتیجہ تباہی اور ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوگا تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ تمہارا ایک خالق ہے' لیکن تمہارا خالق تم سے کیا چاہتا ہے وہ کن باتوں میں راضی ہوتا ہے اور کن باتوں میں ناراض ہوتا ہے تمہیں اس کی کوئی فکر نہیں اسی طرح اس نے تمہیں بے شمار نعمتیں دے رکھی ہیں جن میں تمہاری اولاد بھی شامل ہے اور تمہارے اپنے جسم و جان' تمہاری صلاحیتیں اور تمہاری توانائیاں بھی۔ تمہیں انکے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ تمہارے خالق اور تمہارے پروردگار نے ان نعمتوں کے حوالے سے تم پر کیا فرائض عائد کئے ہیں۔ تم زندگی سے متمتع ہو رہے ہو۔ لیکن تمہیں بالکل ہوش نہیں کہ اس زندگی کے تمہارے پروردگار نے کیا مقاصد مقرر کئے ہیں' جنہیں حاصل کرنے اور جن کے مطابق زندگی گزارنے کی تمہیں فکر ہونی چاہئے۔ چنانچہ انہی باتوں کو لے کر اور انہی کی بنیاد پر تمہاری اصلاح کیلئے اللہ کا رسول تم میں مبعوث ہوا۔ لیکن تم نے بجائے اس اصلاحی عمل سے فائدہ اٹھانے اور ان باتوں کے قبول کرنے کے جس سے تمہاری زندگی کی نہج درست ہو سکتی ہے اور تم اپنی منزل مراد تک پہنچ سکتے ہو تم نے اس دین کو کھیل تماشہ بنالیا۔ چنانچہ ان کا طرزِ عمل یہ ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ جن بنیادی عقائد کو پیش کرتے' یہ لوگ اُن کا مذاق اڑاتے' مسلمان نمازیں پڑھتے یہ انکی نقلیں اتارتے۔ قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے اذان کو ایک مذاق بنا رکھا تھا۔ اسکی نقلیں بھی اتارتے اور اسکا تمسخر بھی اڑاتے۔ جب انہیں قیامت کی بازپرس سے ڈرایا جاتا تو وہ عجیب و غریب طریقے سے اسکا تمسخر اڑاتے اور جب قرآن کریم انکے سامنے پڑھا جاتا تو چونکہ وہ عربی زبان کے تیور شناس تھے اور اسکے ذوق سے بھی بہرہ ور تھے اس لئے انکے بڑے بڑے لوگوں کی یہ کوشش ہوتی کہ یا تو قرآن کریم کسی کو پڑھنے نہ دیا جائے اور اگر اسے روکا نہ جاسکے تو پھر اسے سننے نہ دیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ جب بھی کسی مجلس میں جاتے تو آپ ان کے سامنے قرآن کریم پڑھتے۔ بعض دفعہ ان کے اندر سے گزرتے ہوئے قرآن کریم کی تلاوت کرتے۔ ایک تو کلام خداوندی کا اپنا اعجاز اور پھر لحن پیغمبر کا اپنا سحر۔ لوگ دل تھام کے رہ جاتے کیونکہ کہ اگر کلام عمدہ ہو اور سننے والا ذوق آشنا ہو تو اسکے اثر سے بالکل بے بہرہ رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے اگر کوئی خوبصورت آواز میں کلام اقبال پڑھتا ہوا گزرے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ چلتے ہوئے قدم نہ رک جائیں اور قرآن کریم تو کلام اللہ ہے۔ اس لئے قرآن کریم ہی نے ہمیں بتایا کہ اشراف قریش یہ کہتے تھے کہ اس قرآن کریم کو مت سنو اور جب یہ پڑھا جائے تو شور مچاؤ' اسطرح ممکن ہے کہ تم اس کی تاثیر پر غالب آجاؤ ورنہ تم لوگوں کو اس کے اثر سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر ؓ نے اپنے گھر سے باہر ایک چبوترہ سا بنالیا تھا جس میں وہ نماز کے دوران بلند آواز سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے رقتِ قلبی سے نوازا تھا اس لئے تلاوت کرتے ہوئے خوب روتے۔ ان کی تلاوت سننے کیلئے عورتیں بچے اور بوڑھے جمع ہو جاتے۔ چنانچہ اشراف قریش فکرمند ہوئے اور حضرت صدیق اکبر ؓ کو مجبور کیا کہ آپ اپنی نماز اپنے گھر میں پڑھیں' ورنہ ہمارے لوگوں کو آپ گمراہ کردیں گے۔

Marfat.com

اس بات کو یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن ان کی اصلاح کیلئے آیا ہے اور پیغمبران کی زندگیوں میں انقلاب برپا کرنے کیلئے مبعوث ہوا ہے اور وہ ان کے سامنے ایک دین پیش کر رہا ہے جس میں ان کی دنیوی اور اخروی کامیابیاں ہیں۔ لیکن یہ بجائے اس کے کہ سنجیدگی سے اس کو سمجھیں اور پھر کوئی فیصلہ کریں انہوں نے تو اسے کھیل تماشہ بنالیا ہے۔ ہر اصلاحی کوشش اور ہر دعوتی عمل ان کے مذاق کا نشانہ بن رہا ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ ان کی اصلاح کی فکر چھوڑ دیں کیونکہ جب تک یہ دین کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوں گے اس وقت تک آپ کی کاوشیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتیں۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ یہی نہیں کہ انہوں نے دین کو کھیل تماشا بنالیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کھیل تماشے کو اپنا دین بنالیا ہے۔ دین کا معنی ہے طرزِ زندگی، اسلوبِ حیات، مقاصدِ زندگی، تہذیب زندگی اور نظامِ زندگی یہ سب کچھ ان کے نزدیک کھیل تماشے کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی صرف عیش وعشرت اور کھانے پینے کا نام ہے جو جی میں آئے کرو۔ زندگی کی ہر خواہش کو زندگی کا مقصد سمجھو اور اسی زندگی کی راحتوں اور خوشیوں کو زندگی کی منزل بنالو اس بات پر کبھی مت غور کرو کہ زندگی کا کوئی مقصد بھی ہوسکتا ہے بلکہ اس بات پر یقین رکھو کہ زندگی ایک ہی دفعہ ملتی ہے اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ آدمی اس میں جس قدر عیش وعشرت کرسکتا ہے اور جس قدر نعمتوں سے شادکام ہوسکتا ہے اور جس قدر بڑے بڑے مناصب حاصل کرسکتا ہے اور جس قدر دولت جمع کرسکتا ہے بس اسے اسی کی فکر کرنی چاہئے کیونکہ یہ بات صحیح ہے اور یہ غلط اور یہ ہونا چاہئے اور یہ نہیں ہونا چاہئے یہ سراسر جذباتی باتیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کس طرح ہو۔ کہا یہ ان کا دین ہے جب کوئی قوم انہی باتوں کو اپنا دین بنالے تو ظاہر ہے اللہ کی طرف سے آنے والا دین ان کی زندگیوں میں کوئی جگہ نہیں بنا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی فرد اور کسی بھی قوم کو بگاڑنے میں جس چیز نے سب سے زیادہ موثر رول ادا کیا ہے وہ یہی تصور ہے کہ آمی زندگی کی اصل منزل عیش وعشرت کو بنالے۔ اس کے بعد کوئی محنت طلب کام، کوئی جان توڑ کوشش، ایثار وقربانی کی کوئی صورت، فرائض کی بجا آوری کا کوئی اسلوب اس کیلئے اجنبی ہوکر رہ جاتا ہے اس کے دماغ پر تو صرف ایک دھن سوار رہتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ اپنی ناتمام آرزوؤں کو کیسے پورا کرسکتا ہوں۔ میری ناآسودہ تمنائیں کس طرح آسودہ ہوسکتی ہیں۔ اسے عیش وعشرت اور جنسی تعیش کی کسی سطح پر بھی قرار نصیب نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ایسی جوع البقر کا شکار ہوتا ہے جس میں ہل من مزید کے نعرے اور نئی سے نئی طلب کے سوا اس کی اور کوئی منزل نہیں ہوتی۔ ایسے آدمی یا ایسے معاشرے کو زندگی کے سنجیدہ مقاصد کی طرف موڑنا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے۔ پیغمبر دنیا میں سب سے موثر شخصیت لے کر آتا ہے اور اس پر نازل ہونے والی کتاب اپنی اثر آفرینی میں صفت اعجاز سے متصف ہوتی ہے اور اس کا لایا ہوا دین اپنی دانش وحکمت میں بجائے خود سب سے بڑی اپیل رکھتا ہے۔ لیکن انہیں بھی کہا جا رہا ہے کہ آپ ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ یہ اب اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کی اصلاحی کاوشوں کو قبول کریں کیونکہ انہیں ایک ایسی بیماری لگ گئی ہے کہ جب بھی کسی قوم کو وہ بیماری لگتی ہے تو وہ قوم ناقابل اصلاح ہوجاتی ہے۔ اس بیماری کا ذکر اسی آیت کے اگلے حصے میں کیا جا رہا ہے۔ فرمایا: غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا انہیں حیات دنیا نے دھوکہ دے رکھا ہے یا دھوکے میں ڈال رکھا ہے یعنی ان مشرکینِ مکہ نے اپنی دنیوی زندگی کے بارے میں بعض تصورات اختیار کر رکھے ہیں، جن کی وجہ سے ان کی پوری زندگی غلط راستے پر گئی ہے اور یہ تصورات ان کیلئے ایسا فریب نظر ثابت ہوئے ہیں کہ ان کی زندگی کا زاویہ ٹیڑھا ہوکر رہ گیا ہے۔ انکے دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ایسی کجی کا شکار ہوئی ہیں کہ کوئی چیز ان کو صحیح صورت میں نظر نہیں آتی۔ انکے وہ تصورات جس نے ان کی ہر چیز کو بدل کے رکھ دیا ہے بنیادی طور پر دو ہیں۔

پہلا تصور یہ ہے کہ وہ اپنی دنیوی زندگی کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی ازاول تا آخر یہی ہے اس کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ موت مکمل

Marfat.com

ہو جانے کا نام ہے۔ یہیں کی خوشیاں اصل خوشیاں ہیں اور یہیں کے غم اصل غم ہیں۔ جو یہاں محروم رہا وہ ایک مکمل محروم آدمی ہے اور جسکو یہاں خوشیاں مل گئیں اس نے زندگی کے اصل پھل کو پالیا۔ یہاں کی محرومیوں کے بارے میں یہ سوچنا کہ کسی دوسری دنیا میں اسکی تلافی ہو سکے گی اور یہاں کی قربانی اور ایثار کا بدلہ کسی اور جہان میں مل سکے گا یہ سراسر احمقانہ باتیں ہیں۔ زندگی کے بارے میں انکے اس تصور نے ان کو مادی زندگی' دولت دنیا کی طلب' اپنے سر پر کلغی سجانے کی ہوس' اپنے محل کو استوار کرنے کی خواہش' اپنی ہی ذات کا پندار اور ہوائے نفس پر اصرار نے انکو ایسا اندھا کیا تھا کہ وہ حقوق وفرائض کے ہر طرح کے تصور سے بالکل محروم ہو گئے تھے۔ صحیح اور غلط' اچھائی اور برائی انکے نزدیک محض تصوراتی باتیں بن کے رہ گئی تھیں۔ جب کوئی فرد یا کوئی قوم ان تصورات کو بنیاد بنا کر زندگی کی تعمیر کرتی ہے تو اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی زندگی میں اخلاقی قدروں اور روحانی عظمتوں کو کوئی اہمیت دینے کیلئے تیار ہو سکتی ہے' محض ایک خواب وخیال ہے۔ یہ لوگ چونکہ اس بنیادی تصور کے تحت زندگی گزار رہے تھے۔ اسلئے قرآن کریم آنحضرت ﷺ سے کہہ رہا ہے کہ جب تک یہ لوگ اپنے اس بنیادی تصور کے دھوکے سے باہر نہیں نکلتے اور اپنی حیات دنیا کی صحیح حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے اس وقت تک آپ ان سے اپنی اصلاح ودعوت کے نتیجے میں کسی تبدیلی کی امید مت کیجئے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان کے انجام کے بارے میں آپ فکر مند نہ ہوں۔

دوسرا تصور جس نے ان کی زندگی کو بالکل گہنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ یہ تھا وہ دیکھ رہے تھے کہ مکہ معظمہ اور تمام باقی دنیا کے رہنے والے کافر ایک ایسی زندگی گزار رہے تھے جس میں اللہ کی حاکمیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ یا تو دوسری دنیا کے تصور سے ہی نا آشنا تھے اور اگر قیامت کا ان کے یہاں کوئی تصور تھا بھی تو وہاں ایک ایک عمل کی جواب دہی ان کیلئے ایک ناقابل فہم بات تھی اس لئے ان کی پوری زندگی اللہ کی بغاوت میں گزر رہی تھی اور پوری زمین ایک فساد سے بھر چکی تھی جس میں ظلم ہو رہا تھا' بے حیائی سر عام ناچ رہی تھی' نچلے طبقے پسے جا رہے تھے' مراعات یافتہ طبقے نے اپنی خدائی کے آستانے بنا رکھے تھے اور یہ بگاڑ پر مبنی نظام صدیوں سے چل رہا تھا اور کہیں بھی اس میں رخنہ اندازی نظر نہیں آتی تھی۔ دولت کی ریل پیل تھی لیکن صرف مراعات یافتہ طبقہ کے گھروں میں' طاقت اور قوت تھی تو صرف ظالموں اور اللہ کے نافرمانوں کے ہاتھوں میں' زندگی کی تمام آسائشیں ان کے پاس تھیں جو آخرت کی زندگی سے یکسر منکر تھے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اگر کہیں اللہ کا تصور باقی تھا اور کچھ لوگ ایمان کے دعوے دار بھی تھے اور اس کے مطابق اللہ کی فرمانبرداری بھی کر رہے تھے اور بالخصوص مکہ معظمہ میں تو اللہ کا ایک رسول مبعوث ہو چکا تھا اور اس کے ماننے والے شب وروز اللہ کی رضا کے حصول میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے گھروں میں فقر وفاقہ کے پہرے تھے۔ زندگیاں ان کی محرومیوں کی تصویر تھیں' مظلومیت ان کا مقدر بن چکی تھی۔ یہ لوگ یقیناً حق پر تھے لیکن دنیا کی کوئی آسائش ان کے پاس نہ تھی۔ مشرکینِ مکہ اور دوسرے کافر یہ کہتے تھے کہ اگر ہمارا رویہ غلط ہے اور زندگی کے بارے میں ہمارے تصورات باطل ہیں تو پھر ہمیں یہ زندگی کی نعمتیں کیوں حاصل ہیں؟ ہم زندگی کی آسائشوں سے بہرہ ور کیوں ہیں؟ دولت اور طاقت ہمارے پاس کیوں ہے؟ اگر ہم واقعی غلط راستے پر چل رہے ہیں تو یہ چیزیں ہم سے چھن جانی چاہئیں بلکہ ہم پر اللہ کا عذاب ٹوٹ پڑنا چاہئے اور تم اگر برسر حق ہو تو ہماری جیسی آسائش کی زندگی تمہیں میسر آنی چاہئے اور قوت وطاقت تمہارے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ لیکن ہماری اور تمہاری صورتحال بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہم صحیح راستے پر ہیں اور اللہ ہم سے راضی ہے۔ اس لئے اس نے ہمیں اچھے حالوں میں رکھا ہے اور تم غلط راستے پر ہو اس لئے تم سے ناراض ہے اور اس نے تمہیں یہاں مصیبتوں میں مبتلا کر رکھا ہے اور تمہارے بقول اگر واقعی قیامت آنے والی ہے تو وہاں بھی ہم دنیا کی طرح آسودہ حال ہوں گے اور تم وہاں بھی اپنی دنیا کی طرح برے حالوں میں رکھے جاؤ گے۔ یہ وہ تصور ہے جس نے ان کو ایک فریب میں مبتلا کر رکھا ہے یعنی دنیا اور دولت دنیا اور دنیا کی آسائشوں کی چمک دمک یہاں کی لطف ولذت کی چکا چوند اور یہاں کے تخت وتاج کے کروفر نے انہیں ایسا فریب دے رکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو برسرِ حق سمجھتے اور اسی

Marfat.com

حالت میں رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ فریب نظر اس دور کے ساتھ مخصوص نہیں اور دنیا نے دھوکہ دہی کی یہ واردات صرف ان لوگوں کے ساتھ نہیں کی تھی بلکہ آج بھی پوری دنیا اس فریب میں مبتلا ہے۔ امت مسلمہ جس نے اس فریب کا پردہ چاک کرنا تھا اور جس کے ہاتھوں میں قرآن وسنت کی شمع آج بھی روشن ہے وہ اسے کسی بند کوٹھڑی میں بند کر کے اپنی اور لوگوں کی نگاہوں سے اس طرح چھپا کے بیٹھی ہے کہ خود اس مرض کا شکار ہو کے رہ گئی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ زندگی کے بارے میں یہ تصور غلط ہے۔ لیکن جب ہم ان کے مجموعی رویے کو دیکھتے ہیں تو ان کی ایک بڑی اکثریت کو اسی فریب کا شکار پاتے ہیں۔ نچلے طبقے کو جانے دیجئے' اس لئے کہ زندگی کے فیصلوں میں انہیں کبھی کوئی جگہ نہیں ملتی۔ فیصلے ہمیشہ بالا دست طبقہ کرتا ہے اور زندگی کی راہوں کا تعین ہمیشہ ان کی صوابدید سے ہوتا ہے۔ اس لئے جب ہم اپنے بالا دست طبقے کو دیکھتے ہیں جن میں ہمارا مقتدر طبقہ اور اصحاب علم ودانش دونوں شامل ہیں ان کے رویے کو دیکھ لیجئے کہیں دور دور تک نظر نہیں آتا کہ ان کے یہاں کہیں آخرت کا تصور پایا جاتا ہے اور یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ واقعی اس زندگی کے کچھ اہداف اور کچھ مقاصد بھی ہیں اور قیامت کے دن اس زندگی کے بارے میں باز پرس بھی ہوگی۔ اس کی ایک بڑی آسان مثال جس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی آدمی کو دیکھ لیجئے اگر اس نے اپنی زندگی کا کوئی ہدف مقرر کر لیا ہے تو وہ زندگی کی تفریحات اور تمدنی تقریبات کیلئے جب بھی وقت نکالے گا تو یہ سوچ کے نکالے گا کہ میرے ہدف کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ جب وہ یہ دیکھے گا کہ اس سے میرا ہدف متاثر ہو رہا ہے تو وہ فوراً اپنی ان غیر ضروری مصروفیات میں تبدیلی لانے کی کوشش کرے گا یا سرے سے انہیں قربان کر دے گا۔ آپ کسی تاجر ہی کو دیکھ لیجئے اگر اس کے بیرونی دنیا سے تجارتی روابط ہیں تو عموماً ہفتے کے پانچ دن جس طرح اس کے مصروفیت میں گزرتے ہیں کہ دوسری کسی مصروفیت کیلئے اس کے پاس بڑی مشکل سے وقت نکلتا ہے۔ اس لئے کہ ایک ہدف اس کے سامنے ہے وہ اپنے تمام اوقات کی تقسیم اسی ہدف کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ اب اگر ہمارے زندگی کا بھی کوئی ہدف ہے تو پھر آخر ہماری زندگی میں یہ بڑے بڑے جھول کیوں ہیں کہ ہم ایک غریب ملک کے باسی ہیں اور اب تک ہم پسماندگی کا شکار ہیں۔ ہمیں اس صورت حال سے نکلنے کیلئے شدید محنت کی ضرورت ہے۔ ہمارا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک شخص جب تک اس محنت کی نذر نہیں ہو جائے گا اس وقت تک ہم اس پسماندگی سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے لوگ حتیٰ کہ ہمارے حکمران اس بات کو سننے کے بھی روادار نہیں کہ کھیلوں میں بڑھتی ہوئی دلچسپی اور جوئے پر مشتمل سکیمیں' بڑھتی ہوئی فضول خرچی کی عادتیں اور راتوں رات دولت مند بننے کی خواہشیں وہ چیزیں ہیں جو محنت کے جذبے کو مار دیتی ہیں۔ لیکن ہم یہ بات کبھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ ہم نے کرکٹ جیسے کھیل کو قومی کھیل کا درجہ کیوں دے رکھا ہے۔ بعض دفعہ پانچ پانچ دن کے میچ مسلسل ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں اور یہ صرف اپنے ملک کے نہیں بلکہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی کوئی میچ ہو رہا ہے ہم اسے اپنے نوجوانوں کو دکھانا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ان کے شوق فضول میں کہیں کمی نہ آجائے۔ نتیجہ اس کا کیا ہوتا ہے کہ دفتروں میں کام برائے نام رہ جاتا ہے' کارخانوں میں پروڈکشن کم ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ اپنے ملک میں ہونے والے بڑے میچوں میں کئی کئی ارب روپے کا نقصان ملک کو برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن جب اس پر توجہ دلائی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب یہ کرکٹ ٹیم ہمارے ملک کے تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ۔ حالانکہ کرکٹ ٹیم کے اکثر کھلاڑی باہر جا کر جو ہمارا تعارف دوسری قوموں کو کراتے ہیں وہ ایک بدچلن' آوارہ' بدقماش نوجوانوں کا ہوتا ہے وہ تمام عیوب مغربی دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب ان نوجوانوں میں پائے جاتے ہیں' حتیٰ کہ جوئے تک میں ان کا ملوث ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ ہم اگر مسلمان ہیں تو کیا ہمارا یہ تعارف ہے جو دنیا کو کرانا چاہتے ہیں۔

Marfat.com

دنیا کی محبت کے اسیر اور دولت دنیا کے فریب کا نشانہ تو اہل دنیا ہمیشہ رہے' لیکن آج کی مہذب دنیا نے' جس طرح دولت دنیا کو باقاعدہ ایک فن بنا کر علمی اور تہذیبی انداز میں پیش کیا ہے بلکہ جس طرح قوموں کے مقاصد زندگی میں اسے سب سے بڑا درجہ دے دیا گیا ہے یہ وہ صورت حال ہے کہ دو' تین صدیاں پہلے کی دنیا کم از کم اس کا شکار نہیں تھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج تمام دنیا کا مرکز ثقل اور مطاف معدہ بن کر رہ گیا ہے۔ ساری دنیا اس قبلۂ مقصود کا طواف کر رہی ہے۔ دنیا کی ترقی اور پسماندگی کے فیصلے اسی حوالے سے ہوتے ہیں اور مشکل یہ ہے کہ اسلام کے دیئے ہوئے بنیادی تصورات بالکل اس سے میل نہیں کھاتے۔ بات طویل ہوتی جا رہی ہے کہنا صرف یہ ہے کہ وہ اس فریب نظر کا شکار تھے کہ ہم چونکہ ایک خوشحال زندگی گزار رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہم سے راضی ہے اور ہم برسر حق ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ انہیں اصلاً جس چیز نے فریب دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ دنیا اور آخرت کے بارے میں اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ یہ دنیا دارالعمل ہے دارالجزاء نہیں۔ یہاں ہمیں اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے بھیجا گیا ہے اس لحاظ سے یہ دنیا دارالعمل ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کے دین اور اس کی شریعت کے حوالے سے ابتلاء' آزمائش اور امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں آدمی اگر کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کی جزاء اسے یہاں نہیں ملتی اور اگر کوئی برائی کرتا ہے تو اس کی سزا بھی یہاں نہیں ملتی۔ یہاں تو نعمت دے کر بھی آزمایا جاتا ہے اور تکلیف پہنچا کر بھی آزمایا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑی آزمائش یہ ہے کہ ہمیں زندگی گزارنے کے طریقے سکھا کر اور بنیادی ایمانیات کا علم دے کر ہمارا امتحان لیا گیا ہے کہ کیا ہم اس پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ اگر اس راستے پر چلتے ہوئے ہمیں کسی کشمکش سے واسطہ پڑتا ہے تو کیا اس میں محنت' اولوالعزمی اور صبر کا ثبوت دیتے ہیں یا نہیں اگر یہاں ہم اپنا فرض ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید ہماری پشت پناہ ہوگی اور اگر کمزوری دکھائیں گے تو غالب قوتوں کی آماجگاہ بننا پڑے گا۔ لیکن رہی یہ بات کہ کافر قوموں یا کافر افراد کو ان کے جرائم کی سزا کب ملے گی تو اس کی جگہ یہ دنیا نہیں اس کی جگہ آخرت ہے۔ بعض دفعہ کافر کو نعمتیں دے کر خوب گراں بار کر دیا جاتا ہے' لیکن اصلاً اس کی یہ آزمائش ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ نعمتیں شاید اللہ کے یہاں میرے مقبول ہونے کی علامتیں ہیں تو وہ تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعض دفعہ کفار کی سرکشی حد سے گزر جاتی ہے تو دنیا میں ان کو مٹا کر دوسری قوموں کو لایا جاتا ہے۔ لیکن یہ اللہ کی وہ سنت ہے جو تفصیل طلب ہے جس کا ذکر پھر کبھی آئے گا۔ اس وقت تو صرف یہ کہنا ہے کہ مشرکینِ مکہ کو جس فریب نے تباہ کیا وہ یہ بات تھی کہ ان کی خوشحالیاں شاید ان کے راہ راست پر ہونے کی دلیل ہیں حالانکہ ایسا نہیں یہ تو ان کیلئے آزمائش ہے کیونکہ یہ دنیا دارالابتلاء ہے اور جہاں تک جزاء و سزا کا تعلق ہے وہ آخرت میں ہوگی۔ ان کی اس اصل بیماری کا ذکر کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ جس مہلک بیماری کا شکار ہیں اس سے جانبر ہونے کی تو کوئی امید کرنا مشکل ہے۔ اس لئے آپ ان کی فکر کرنا چھوڑ دیں۔ البتہ! جب بھی آپ اس کا موقعہ مناسب پائیں تو انہیں نصیحت ضرور کریں اور انہیں برابر اس بات سے آگاہ کرتے رہیں کہ تم اپنے ان تصورات سے نکلو یا نہ نکلو لیکن میں تمہیں برابر اس بات سے آگاہ کرتا رہوں گا کہ قیامت ہر حال میں آئے گی۔ تمہیں وہاں اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ پروردگار کو یہ منظور نہیں ہے کہ تم کل کو وہاں جا کر یہ کہہ سکو کہ ہمیں کسی نے آنے والے انجام سے آگاہ نہیں کیا اور تم یہ سمجھو کہ ہم اپنے اعمال کی پاداش میں محض اس لئے پکڑے گئے ہیں کہ ہمیں اس کے بارے میں بتایا نہیں گیا تھا اور مزید یہ فرمایا کہ انہیں اس بات سے بھی آگاہ کرو کہ دنیا میں جب کوئی آدمی پکڑا جاتا ہے تو عموماً اس کے حمایتی اور اس کے مددگار اسے بچانے کی کوشش کرتے ہیں کبھی اس کے سفارشی اسے سفارش کر کے چھڑا لیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ معاوضہ دے کر چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن قیامت کے دن ان میں سے کوئی ذریعہ تمہارے کام نہیں آئے گا۔ وہاں اللہ کے سامنے نہ تمہارا کوئی حمایتی اور کارساز ہوگا نہ تمہارا کوئی سفارشی ہوگا اور نہ وہاں تم سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور اگر تم ہر وہ معاوضہ جس کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ بھی دے ڈالو تو اسے بھی قبول نہیں کیا

Marfat.com

جائے گا۔ یہ بات اس لئے فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب یہ کافر لوگ اپنی بداعمالیوں کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے تو ایک ایک کافر یہ چاہے گا کہ اگر میری اولاد بھی فدیہ میں قبول کرلی جائے تو میں اسے بھی دینے کو تیار ہوں تاکہ میں اس انجام سے بچ سکوں۔ لیکن وہاں کوئی معاوضہ اور کوئی فدیہ نہیں چل سکے گا۔ بالآخر یہ لوگ اپنے گناہوں کی پاداش میں ہلاکت کی نذر ہو کر رہیں گے اور پھر جب انہیں جہنم پر لایا جائے گا تو اللہ فرماتا ہے کہ سب سے پہلے انہیں کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ معلوم ہوتا ہے یہ کھولتا ہوا پانی جو انہیں پینے کو ملے گا' یہ جہنم کے اندر نہیں ہوگا بلکہ جب یہ لوگ جہنم کے پاس لائے جائیں گے تو پیاس سے بدحال ہوں گے اور بار بار پانی مانگتے ہوں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم یہاں مہمان بن کے آئے ہو اس لئے جیسی پہلی مہمانی ہر آنے والی مہمان کی مشروبات سے کی جاتی ہے اور اس کے بعد کھانا پیش کیا جاتا ہے انہیں بھی پہلی مہمانی کے طور پر کھولتا ہوا پانی پیش کیا جائے گا اور پھر جہنم کے اندر ان کو عذاب الیم میں مبتلا کر دیا جائے گا جو دردرساں بھی ہوگا اور دردناک بھی۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَ

کہو کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیز کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکے نہ بُرا۔ اور جب ہم کو خدا نے

نُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ

سیدھا رستہ دکھا دیا تو (کیا) ہم اُلٹے پاؤں پھر جائیں؟ (پھر ہماری ایسی مثال ہو) جیسے کسی کو جنات نے جنگل

فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا قُلْ

میں بھلا دیا ہو (اور وہ) حیران (ہو رہا ہو) اور اُس کے کچھ رفیق ہوں جو اُس کو رستے کی طرف بلائیں کہ ہمارے پاس

اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۚ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾ وَ

چلا آ۔ کہہ دو کہ رستہ تو وہی ہے جو خدا نے بتایا ہے۔ اور ہمیں تو یہ حکم ملا ہے کہ ہم خدائے رب العالمین کے فرمانبردار ہوں۔ اور یہ

اَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۚ وَهُوَ الَّذِىٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَ

(بھی) کہ نماز پڑھتے رہو اور اس سے ڈرتے رہو۔ اور وہی تو ہے جس کے پاس تم جمع کیے جاؤ گے۔ اور

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ وَيَوْمَ يَقُوْلُ

وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو تدبیر سے پیدا کیا ہے۔ اور جس دن وہ فرمائے گا کہ ہو جا تو (حشر برپا)

كُنْ فَيَكُوْنُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ ۚ عٰلِمُ

ہو جائے گا ف۲ اس کا ارشاد برحق ہے۔ اور جس دن صور پھونکا جائے گا (اُس دن) اُسی کی بادشاہت ہوگی۔ وہی

Marfat.com

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (۷۳)

پوشیدہ اور ظاہر (سب) کا جاننے والا اور وہی دانا اور خبردار ہے۔

تمہید:

گذشتہ آیات میں مشرکینِ مکہ کے طرزِ عمل کی پوری تفصیل ہم پڑھ چکے ہیں۔ اس میں ہم نے ان کے مطالبات اور آئے دن ان کی نئی نئی نشانیاں مانگنے کی تفصیلات بھی پڑھی ہیں اور پھر جس طرح وہ آنحضرت ﷺ کی تبلیغ و دعوت کی کوششوں کا مسلسل مذاق اڑا رہے تھے' اسے بھی ہم نے دیکھا ہے۔ اس سے مجموعی طور پر ان کا جو رویہ سامنے آتا ہے' وہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں بالکل سنجیدہ نہیں ہیں۔ بلکہ دنیوی کھیل تماشے کو انہوں نے زندگی کا مقصود بنالیا ہے اور کسی طور بھی اسے چھوڑنے اور بدلنے کیلئے وہ تیار نہیں۔ اس لئے گزشتہ آیت میں پروردگار نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے' جو طرزِ عمل یہ اختیار کر چکے ہیں' اس میں آپ کی دعوت کی قبولیت کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس لئے اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے تو آپ کو اس سے آزردہ نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ! جب بھی کوئی موافق لمحہ ملے تو انہیں نصیحت کے انداز میں ان کے انجام سے ضرور ڈرانا چاہئے تاکہ یہ کل کو اللہ کے یہاں یہ حجت نہ لاسکیں کہ ہمیں تو کسی نے ہمارے انجام کے بارے میں آگاہ ہی نہیں کیا۔ اب جو آیت کریمہ ہم پڑھ رہے ہیں' اس میں ہم ایک نئی صورتحال دیکھ رہے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ کے بین السطور میں ان کے نئے طرزِ عمل کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے کہ صرف یہی بات نہیں کہ وہ دین اسلام کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں بلکہ وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو ان کے دین سے پھیر کر پرانے دین پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کیلئے جو کچھ بھی ان سے بن پڑتا ہے' اس سے وہ دریغ نہیں کرتے اور بار بار ان سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم اپنا تعلق اللہ سے توڑ کر ان چیزوں سے قائم کرو' جن سے ہم قائم کر چکے ہیں یعنی جن قوتوں کو ہم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے' تم بھی انہیں اللہ کے شریک مانو اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرو جو ہم کر رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہو رہا ہے:

آیت: ۷۱ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ''کہہ دو! کیا ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں' جو نہ تو ہمیں نفع پہنچاتی ہیں' نہ نقصان اور ہم پیٹھ پیچھے پھینک دیئے جائیں' بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی اس شخص کی مانند جس کو شیطانوں نے بیابان میں سرگشتہ و حیران چھوڑ دیا' اس کے ساتھی اسے سیدھی راہ کی طرف بلا رہے ہیں کہ ہماری طرف آجاؤ؟ کہہ دو! اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم اپنے آپ کو عالم کے رب کے حوالے کریں''۔

اللہ حاکمِ مطلق ہے:

مشرکینِ مکہ کی ان کاوشوں کے جواب میں جو وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیرنے کیلئے کر رہے تھے' آنحضرت ﷺ کو یہ جواب دینے کا حکم

Marfat.com

دیا جارہا ہے کہ تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اللہ سے رشتہ توڑ کر ان چیزوں سے جوڑ لیں اور ان کو پکارنا شروع کر دیں جن کو تم پکار رہے ہو یعنی جن سے تم مدد طلب کرتے ہو' جن سے تم مرادیں مانگتے ہو' جن کے سامنے تم سر جھکاتے ہو اور مشکل وقتوں میں جن کو تم یاد کرتے ہو' کیا تم چاہتے ہو کہ ہم بھی تمہاری طرح یہ احمقانہ رویہ اختیار کر لیں؟ کہ ایک طرف تو وہ خداوند ذوالجلال ہے' جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔ انسان کو نہ صرف وجود بخشا بلکہ اسے کائنات کا گلِ سرسبد بنایا۔ اس کے سر پر عزت و تکریم کا تاج سجایا اور جو ہر حال میں انسانی زندگی میں رہنمائی دیتا ہے' مشکلات میں کام آتا ہے' جو ہماری ایک ایک ادا سے واقف ہے اور ہمارے ایک ایک عمل کا نگران ہے' جس کے سہارے یہ زندگی کا رشتہ قائم اور جس کی عطاو بخشش سے ہماری ضرورتیں پوری ہوتیں اور ہماری الجھنیں دور ہوتی ہیں' اس سے تعلق توڑ کر کیا ان ناچیز چیزوں یا ان نام نہاد قوتوں سے ہم اسی طرح کا رشتہ قائم کر لیں کہ ان کے سامنے عبودیت کا سر جھکائیں' ان سے مرادیں مانگیں' ان سے ہر آن مدد طلب کریں حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ وہ نہ کسی کو نفع دینے پر قادر ہیں اور نہ کسی کو نقصان پہنچانے پر۔ اس آیتِ کریمہ میں اشارہ کئی طرح کی چیزوں کی طرف ہے' جس میں بت بھی شامل ہیں اور باقی مشرکینِ مکہ کے بنائے ہوئے اللہ کے شرکاء بھی۔ جہاں تک بتوں کا تعلق ہے ان کی بے بسی تو ہر معمولی عقل والے آدمی کے سامنے بھی عیاں ہے۔ وہ نہ بول سکیں' نہ دیکھ سکیں۔ ان کے چہرے پر مکھی بیٹھ جائے تو وہ اسے اڑا نہ سکیں۔ کوئی چیز ان سے چھین لی جائے تو وہ اسے بچا نہ سکیں۔ خود پتھر سے ان کا سر کچل ڈالو وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکیں۔ ایسے بے بس اور بے کس خداؤں کو خداوند ذوالجلال کے مقابلے میں حقیقی خدا کا درجہ دینا یا اس کا شریک ٹھہرانا دنیا کا سب سے بڑا اعجوبہ ہے۔ لیکن مشرک قومیں ہمیشہ اس کا ارتکاب کرتی رہی ہیں اور اگر اس سے دوسرے شرکاء مراد لئے جائیں' جن میں مظاہر فطرت بھی ہیں اور ان کے نام نہاد دیوتا بھی اور قدرت کی وہ طاقتیں بھی ہیں' جنہیں ہمارے لئے مسخر کیا گیا ہے۔ لیکن بظاہر ان کی طاقت اور قوت کو دیکھتے ہوئے مشرکین نے ہمیشہ ان کو بھی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا اور اسی طرح انسانی زندگی میں کتنے تخت و تاج کے ایسے مالک گزرے ہیں' جنہوں نے اپنی سلطنت اور دولت کے زور پر لوگوں سے اپنی بندگی کروائی اور اپنی ربوبیت کے دعوے کئے۔ یہ بظاہر لوگوں کو نفع پہنچاتے بھی ہیں اور بگڑ جائیں تو نقصان بھی دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ بھی نفع اور نقصان پر قادر نہیں ہیں۔ اگر کسی کو نفع پہنچاتے ہیں یا نقصان تو وہ بھی صرف اللہ کی مشیت کے تحت ہوتا ہے۔ اگر اللہ نہ چاہے تو ان کی ساری ربوبیت دھری رہ جاتی ہے اور ان کی ساری قوتیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ان تمام کے حوالے سے کہا جارہا ہے کہ تم یہ چاہتے ہو کہ جو خود محتاج ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کی احتیاج دوسری نوعیت کی ہے اور خود ذاتی طور پر نفع و نقصان پر قادر نہیں ہیں تو کیا اللہ کے مقابلے میں ہم ان کو پکارنا شروع کر دیں؟ یہ تم نے جو فطرت اور قدرت کے مظاہر کو اللہ کے شریک بنا رکھا ہے' آخر ان کے پاس کیا قدرت ہے' یہ کسی کا کیا بنا سکتے ہیں اور کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ یہ سورج' چاند' ستارے' جن کو مختلف قوموں نے اللہ کے شریک بنا کر ان کی پوجا کی ہے یہ بیچارے تو خود آسمان کی وسعتوں میں اللہ کے حکم کے مطابق اپنا فرض انجام دینے میں شب و روز لگے ہوئے ہیں اور کبھی اس میں سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے۔ یہ خود سب سے بڑے غلام ہیں' وہ ہمیں کیا دے سکتے ہیں؟ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا

ے ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
جو خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

رہے یہ دنیا کے تاجدار' یہ اپنے آپ کو ہزاران داتا یا لکھ داتا کہیں اور چاہے تو عالمگیر اور شاہجہاں بن کے بیٹھ جائیں اور چاہے اپنے آپ کو عالم پناہ سمجھیں۔ لیکن یہ بھی اپنی ذات میں وہ تمام کمزوریاں رکھتے ہیں' جو دوسرے انسانوں میں ہیں بلکہ ان کا دستِ سوال ایک عام آدمی کی نسبت زیادہ دور تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ایک عام آدمی کشکول پھیلاتا ہے جبکہ یہ زبردستی ٹیکس اور خراج وصول کرتے ہیں حالانکہ دونوں میں کیا فرق ہے

ے مانگنے والا گدا ہے' صدقہ مانگے یا خراج

Marfat.com

البتہ! یہ فرق ضرور ہے کہ ایک گداگر گدائی کرتا ہے تو شرماتا بھی ہے اور اپنے آپ کو گداگر سمجھتا ہے۔ لیکن ایک طاقتور اور بادشاہ وسیع پیمانے پر گدائی کرتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اپنے آپ کو عالم پناہ بھی سمجھتا ہے۔ اسی لئے یہاں فرمایا جارہا ہے کہ حقیقت میں نفع ونقصان کے مالک یہ بھی نہیں، یہ قوت سراسر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ پر توکل کرنے والوں کی شان:

اسلامی تاریخ کے بے شمار واقعات ہیں، جو اس حقیقت پر شاہد وعادل ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضور ﷺ ایک سفر میں صحابہ کرام کے ہمراہ تھے، دوپہر کی چلچلاتی دھوپ سے بچنے کیلئے صحابہ دور دور تک سائے کی تلاش میں پھیل گئے تو حضور نے بھی ایک درخت پر اپنی چادر ڈالی اور اس کے سائے میں لیٹ گئے۔ نجانے کیسے وہاں دبے پاؤں ایک کافر آ پہنچا۔ آنحضرت ﷺ کی تلوار درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس نے وہ تلوار اتاری اور بے نیام کر کے کہنے لگا کہ محمد (ﷺ)! اب تم بتاؤ، تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے اطمینان سے جواب دیا، اللہ۔ اس سے اس پر ایک ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اس نے کانپتے ہوئے تلوار نیام میں داخل کر دی اور آپ کے پاس بیٹھ کر معافیاں مانگنے لگا۔ عہد نبوت اور عہد صحابہ میں تو آپ کو قدم قدم پر ایسے واقعات ملیں گے، لیکن ہم اپنی قریبی تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ جب بھی کبھی اللہ والوں نے اللہ کو راضی کر کے اس پر اعتماد کر لیا ہے اور اسی کے توکل پر دین کی خدمت میں جت گئے ہیں تو اللہ کی قوتیں ہمیشہ ان کے ہم رکاب رہی ہیں اور اس راستے میں اگر کبھی انہیں بادشاہوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے تو یہ مخالفتیں ان کے سامنے جھک گئی ہیں اور اللہ نے انہیں ہمیشہ سرخرو فرمایا ہے۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ، جنہیں آپ نے دہلی میں سلطان الہند بنا کر بھیجا۔ تغلق خاندان کا کوئی بادشاہ، ان سے بگڑ گیا اور اس نے اپنے سفر کے دوران راستے ہی سے پیغام بھیجا کہ میرے دہلی پہنچنے سے پہلے پہلے آپ دہلی سے نکل جائیے۔ حضرت نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ نے سن کر فرمایا ''ہنوز دلی دور است'' کہ ابھی دلی دور ہے یعنی تم یقیناً اس ملک کے بادشاہ ہو اور تمہارے پاس قوت ہے، تم جب بھی چاہو مجھے نکال سکتے ہو۔ لیکن تمہیں کیا خبر کہ اصل قوتوں کا مالک تو کوئی اور ہے اور تم کیا جانو کہ تم دلی پہنچ بھی سکتے ہو یا نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ دلی پہنچنا اس کے نصیب میں نہ ہوا اور وہ راستے ہی میں دم توڑ گیا۔

مغلیہ دور میں ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں، جن کا نام تو احمد تھا۔ لیکن وہ ''ملا جیون'' کے نام سے مشہور تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ ان کے شاگرد تھے۔ شاہجہان ان کے عقیدت مندوں میں تھا۔ ایک دفعہ نجانے کیا بات ہوئی کہ شاہجہان نے بگڑ کر انہیں دارالخلافہ سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ آپ سن کے خاموش رہے، لیکن اسی دن ظہر کے وقت وزیر اعظم حاضر خدمت ہوا تو حضرت ملا جیون بیٹھے ظہر کی نماز کیلئے وضو کر رہے تھے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ میں بادشاہ کی طرف سے معذرت پیش کرنے کیلئے حاضر ہوا ہوں۔ بادشاہ سلامت کو اپنے حکم دینے پر افسوس ہے۔ وہ حکم واپس لیتے ہیں اور آپ سے معافی کے طلبگار ہیں۔ حضرت ملا جیون نے فرمایا کہ بادشاہ خوش نصیب ہے کہ بچ گیا۔ ورنہ وضو کرنے کے بعد دو نفل نماز پڑھ کر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی دیر تھی کہ بادشاہ تباہ ہو جاتا۔ ہماری یہی فوجیں ہیں جس سے ہم بادشاہوں کی فوجوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بادشاہ کو اپنی فوجوں پر ناز ہے، لیکن اسے معلوم نہیں کہ اصل قوت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ کو صرف مان لینا ہی کافی نہیں، اصل چیز مکمل سپردگی ہے:

چنانچہ مشرکینِ مکہ کو اس آیت کریمہ میں یہی بات سمجھائی جارہی ہے کہ تمام قوتوں کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم جہاں کہیں تھوڑی بہت قوت

Marfat.com

کی رمق دیکھتے ہوئا سے اللہ کا شریک بنا کر پوجنے لگتے ہو۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی نالائق سمندر کو نظر انداز کرے جہاں سے پانی بھاپ بن کے اٹھتا ہے فضا میں ابر کی چادروں کی صورت میں پھیل جاتا ہے پھر مختلف علاقوں میں چھم چھم برستا ہے ندی نالوں کو سیراب کرتا ہے اور کہیں کہیں جوہڑوں کو بھر دیتا ہے۔ اب کوئی آدمی اگر کسی جوہر کے کنارے یہ سمجھ کے بیٹھ جائے کہ یہی پانی کا حقیقی سرچشمہ ہے اور یہیں سے مجھے سیرابی ملے گی اور وہ بالکل نہ سمجھ سکے کہ اصل سرچشمہ کوئی اور ہے یہ ندی نالے اور یہ جوہڑ اس کی عطا سے زندہ اور سیراب ہیں۔ یہ مشرکین بھی اصل زندگی اور قوت کے سرچشمے سے تعلق توڑ کر اس کی چھوٹی بڑی نمود سے فریب کھا کر اصل قوت سے رشتہ جوڑنے کی بجائے مسلمانوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ تم بھی اپنا تعلق اصل سرچشمے سے توڑ لو۔

آنحضرت ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ نادانو! تم نے تو یہ احمقانہ حرکت کر کے اپنی قسمت پھوڑ لی لیکن ہم تو یہ حماقت نہیں کر سکتے۔ اگر ہم یہ حماقت کریں کے تو یہ تو بالکل ایسا ہی ہوگا کہ ایک آدمی اپنی منزل کی طرف سیدھے راستے پر چلتا ہوا جب منزل آشنائی کے مرحلے میں داخل ہو تو وہ الٹے پاؤں چلنا شروع کر دے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل اس کی سرگرانی اور سرگشتگی میں اضافہ تو کر سکتا ہے لیکن اسے منزل کا وصل کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ زندگی بھر سفر ہی میں رہے گا اور اسی سرگرانی میں بالآخر زندگی کا خاتمہ کر بیٹھے گا۔ ظاہر ہے یہ طرزِ عمل کسی سلیم الفطرت اور صحیح الدماغ کا نہیں ہو سکتا۔ یہ حرکت وہی کر سکتا ہے جسے فکری بے شعوری فکری ناپختگی اور خواہشوں کی اسیری اور غلط راہنمائی اور باطل صحبتوں نے باؤلا کر دیا ہو۔ اس لئے قرآنِ کریم اس کی مثال دیتے ہوئے مسلمانوں کی طرف سے کہتا ہے کہ اگر ہم دوبارہ شرک کی اس آلودگی کو قبول کر لیں اور دوبارہ اس گندگی میں داخل ہو جائیں جبکہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی اور ہم شرک کی گندگی سے نکل کر توحید کے صراطِ مستقیم پر آ گئے تو یہ ہمارا طرزِ عمل ایسا ہی ہوگا جیسے اس آدمی کا جو اپنی سواری پر سوار لق و دق بیابان میں سیدھے راستے پر منزل کی طرف رواں دواں ہو لیکن کچھ بیابانی شیطانی قوتیں اسے باؤلا کر دیں اور وہ دل و دماغ کی سلامتی سے محروم ہو کر صحیح راستہ چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔ اس کے ساتھی اس کو برابر پکاریں کہ راستہ وہ نہیں جدھر تم جا رہے ہو سیدھا راستہ وہ ہے جس پر ہم چل رہے ہیں۔ لیکن وہ ان کی بات سن کے نہ دے بلکہ سمجھنے سے بھی معذور ہو جائے۔ وہ اول فول بکتا اور منہ سے جھاگ نکالتا صحرا کی وسعتوں میں بھٹکتا ہی چلا جائے تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ وہ کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ کہا اے مشرکین مکہ! تمہارا حال اسی شخص جیسا ہے کہ زندگی کے صحرا میں اللہ کے رسول نے تمہارے لئے ایک صراطِ مستقیم واضح کی جو لوگ اس پر ایمان لائے وہ اس راستے پر تمہارے سامنے چل رہے ہیں۔ تم انہیں دیکھو وہ فکری طور پر مطمئن قلبی طور پر شاداں و فرحاں اور زندگی کی تلخیوں کے باوجود اپنے مقاصد سے نہایت مخلص اور آخرت کے سفر میں رواں دواں اور سیرت و تعمیر کے اُجلے پن میں دوسروں کیلئے نمونہ بن کر زندگی گزار رہے ہیں اور تمہیں برابر پکار رہے ہیں کہ دیکھو! زندگی کے راز کو اور اس کی آسودگی کو ہم نے پا لیا ہے تم جس صحرا میں خواہشات اور مصنوعی خداؤں کو اللہ کے شریک بنا کر زندگی کی اکائی کو مسلسل تشتت و افتراق کی نذر کر کے جس طرح زندگی گزار رہے ہو اس سے سوائے اس کے کہ تم بکھر کے رہ گئے ہو اور تمہارے معاملات اور تمہارے اخلاق زندگی کے مقاصد سے عاری ہونے کی وجہ سے انسانیت کیلئے ایک تہمت بن کے رہ گئے ہیں۔ نہ تمہاری کوئی منزل ہے نہ تمہارا کوئی راستہ اب بھی اپنی غلطی کو سمجھو اور اس بات کو تسلیم کر لو کہ انسانی زندگی کے سفر میں اگر کوئی حقیقی راہنمائی ممکن ہو سکتی ہے تو وہ اس کے سوا ہرگز کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اللہ کی دی ہوئی راہنمائی کو قبول کیا جائے کیونکہ جس نے ہمیں پیدا کیا وہ ہماری فطرت کو جانتا ہے ہماری طبعی خصوصیات کو سمجھتا ہے ہمارے طبعی عوامل اس کے سامنے ہیں ہماری خواہشات اور ہمارے انفعالات پوری طرح اس کے سامنے واضح ہیں۔ وہ ہمارے بگاڑ اور سنوار کے تمام راستوں سے واقف ہے ہماری کمزوریوں کو بھی جانتا اور ہماری خوبیوں کو بھی سمجھتا ہے۔ اس لئے جب وہ مکمل علم رکھنے والی ذات ہمیں کوئی راہنمائی دے گی تو وہی ہمارے لئے حقیقی راہنما ہوگی۔ یہاں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت

Marfat.com

ہے۔ یعنی وہی حقیقی راہنمائی ہے، وہی صحیح اور سیدھا راستہ ہے۔ اس لئے اے مشرکینِ مکہ ہمیں تو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس راہنمائی کو قبول کر کے اپنے آپ کو رب العالمین کے سپرد کر دیں۔ یہی ہمارے لئے عافیت اور خیریت کا راستہ ہے اور اسی سے ہم حقیقی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں تم ہم سے جو مطالبہ کر رہے ہو کہ ہم جانتے بوجھتے اپنے صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راستے پر چل نکلیں۔ ظاہر ہے ایسا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے، جس کی شیطانی قوتوں نے مت ماردی ہو، عقل مفلوج کر دی ہو اور دماغ معطل کر دیا ہو۔ ہم بفضلہٖ تعالیٰ اللہ کی رحمت کے سائے میں جی رہے ہیں۔ اس لئے ہم لغو فیصلہ کبھی نہیں کر سکتے۔

اللہ کو کس طرح مانیں:

اس آیت کریمہ کے آخری جملے پر غور فرمائیے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو رب العالمین کے سپرد کر دیں۔ اس میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ہمیں اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ لِنُسْلِمَ کا لفظ استعمال ہوا۔ جس کا مصدر اسلام ہے اور اسلام کا معنی ہے سپرد کر دینا یعنی اپنی ذات، اپنی صلاحیتیں، اپنی توانائیاں، اپنا اثر و رسوخ، اپنا عہدہ و منصب، اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینا۔ اس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ صرف اس کا مان لینا کافی نہیں ہے کیونکہ اللہ کو مانتے تو مشرکین بھی تھے، وہ بھی اس کو سب سے بڑا رب تسلیم کرتے تھے اسے خالق کائنات سمجھتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس کے دوسروں کو شریک بھی کرتے تھے اور پھر اللہ کو ماننے کا ان کی زندگیوں پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اس لئے یہاں دو باتیں فرمائی جارہی ہیں۔ ایک تو یہ بات کہ اللہ کو اس طرح مانو کہ ماننے کے جتنے سابقے اور لاحقے ہو سکتے ہیں، وہ سب اللہ کے حوالے کر دو۔ اس میں کسی اور شریک کی گنجائش نہیں اور دوسری یہ بات کہ زندگی ایک اکائی ہے اسے تقسیم مت کرو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ سر اللہ کے سامنے جھکایا جائے اور حکم کسی اور کا مانا جائے۔ عبادت گاہوں میں بندگی اللہ کی ہو، لیکن گھروں میں، بازاروں میں، اجتماعی اداروں میں، عدالت گاہوں میں حتیٰ کہ حکومت کے ایوانوں میں، کسی اور کی حکومت ہو اور کسی اور کا قانون چلے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی ایسا کرتا ہے، اس نے اللہ کی ذات کی کبریائی اور اس کی حاکمیت کو عبادت گاہ کی چار دیواری میں محدود کر دیا ہے۔ کہا ہم یہ تقسیم قبول نہیں کر سکتے۔ ہمیں تو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم زندگی کا ہر شعبہ اور زندگی کے تمام دائروں میں اسی کے حکم کو تسلیم کریں اور اپنی پوری زندگی اس کے قبضے میں دے دیں۔ ہمارا کوئی طرزِ عمل اور ہمارا کوئی فیصلہ، اس کی حاکمیت سے آزاد نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ ہم میں سے ہر ایک کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے

؎ میں تو کیا میرا سارا مال و منال
میرا گھر بار میرے اہل و عیال
میرے ان ولولوں کا جاہ و جلال
میری عمرِ رواں کے ماہ و سال
میرا سب کچھ مرے خدا کا ہے

یہ تقسیم ہم اس لئے بھی قبول نہیں کر سکتے کہ ہمارا جو رب ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور جس سے ہم نے تعلق جوڑا ہے، وہ کائنات کے کسی ایک حصے کا رب تو نہیں، وہ تو رب العالمین ہے۔ جب اس کی ربوبیت اور اس کی حاکمیت تمام جہانوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے احکام کی گرفت میں ہے اور اس کی قدرت کائنات کی ایک ایک چیز کو تھامے ہوئے ہے اور اس کی مخلوقات کا ایک ایک فرد اس کی وسعتوں کے حصار میں ہے تو ہم اپنی زندگی کا کوئی شعبہ اس سے آزاد کیسے رکھ سکتے ہیں اور رب العالمین کہہ کر ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کیا جارہا ہے کہ نادانو! تم جن کے

Marfat.com

سامنے ہمیں جھکانا چاہتے ہو یا جن چیزوں کے بارے میں تم ہمیں مجبور کر رہے ہو کہ ہم بھی تمہاری طرح ان کو پوجنا اور ان کو پکارنا شروع کر دیں جبکہ وہ نفع ونقصان پر بھی قادر نہیں تو تم ہی بتاؤ کہ اس سے بڑھ کر حماقت کی اور کیا بات ہوگی کہ ہم جس ذات پر ایمان لائے ہیں۔ وہ رب ہے اور رب اس ذات کو کہتے ہیں جو اپنی مخلوق کی ایک ایک ضرورت پر نظر رکھتا ہو، اس کی زندگی کے تغیرات اور اس کی نوع بنوع ضرورتوں کو سمجھتا ہو اور جیسے جیسے ضرورت بدلتی ہو ویسے ویسے اس کی ربوبیت کی کارفرمائیاں بھی ساتھ بدلتی جاتی ہوں۔ مثلاً بچہ پیدا ہوتا ہے تو نہایت بے بسی اور بے کسی کی تصویر بن کے آتا ہے۔ لیکن اس کے پیدا ہونے سے پہلے ماں کے اندر ممتا کا جوش پیدا کیا جاتا ہے۔ باپ کے دل میں شفقت جوش مارنے لگتی ہے۔ اس کے کندھے اس کا بوجھ اٹھانے کیلئے بے قرار ہونے لگتے ہیں۔ بچے کو ابھی نہایت نرم غذا چاہئے، اس لئے ماں کا سینہ اس کی غذا کیلئے ابلنے لگتا ہے۔ پھر جیسے جیسے بچے کا معدہ مضبوط غذا کو ہضم کرنے کے قابل ہوتا جاتا ہے تو ماں کے دودھ میں بھی دھنیت کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور جب بچہ روٹی کھانے کے قابل ہوتا ہے تو اس کا معدہ بھی ساتھ ساتھ اس کو ہضم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور بچہ روٹی کھانا سیکھ جاتا ہے۔ جب تک وہ بیٹھ نہیں سکتا تو ماں کی بانہیں اس کیلئے پنگھوڑے کا کام دیتی ہیں۔ جب وہ چلنے لگتا ہے تو ماں انگلی پکڑ کے چلاتی ہے۔ اب اس کے اندر حواس کام کرنے لگتے ہیں کیونکہ اب اسے حواس کی ضرورت ہے اور جب وہ سکول کی عمر کو پہنچتا ہے تو شعور آنکھیں کھولنے لگتا ہے۔ جیسے جیسے اس کا جسم ترقی کرتا ہے، ویسے ویسے اس کی صلاحیتیں ترقی کرتے کرتے عقل کی حدود میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اب عقل اور تجربے کی روشنی زندگی میں اس کی راہنمائی کا کام دیتی ہیں۔ نئی نئی نعمتیں، نئی نئی امنگیں، نئی نئی ہمتیں اس کے ہم رکاب چلتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ جدھر قدم اٹھاتا ہے، ربوبیت اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے تو حضور ﷺ سے جو جواب دلوایا جا رہا ہے، اس میں آخری بات یہ فرمائی جا رہی ہے کہ نادانو! ہمارا رشتہ تو ایسی ذات کے ساتھ ہے، جس کی کرم فرمائیاں ہمارے حال پر ربوبیت کی شکل میں اس طرح مہربان ہیں اور تم ہمیں ایسی ذات سے تعلق توڑنے اور ان نام نہاد قوتوں سے تعلق جوڑنے پر مجبور کر رہے ہو، جو خود دوسروں کی محتاج ہیں۔ تم تو باؤلے ہوئے ہو، اس لئے تمہیں تو یہ سمجھ نہیں آ رہی۔ لیکن ہم سے تو یہ توقع نہ رکھو کہ ہم کبھی اس بے ہودگی کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم کے اس بیان اور انداز سے ایک قاری اور سامع کے دل میں اگر وہ قرآن کو قرآن میں ڈوب کے پڑھتا ہے تو یقیناً یہ احساس جاگنے لگتا ہے کہ یا اللہ! میں بھی اس بات کی خواہش رکھتا ہوں کہ میں اپنا سب کچھ تیری ذات کے حوالے کر دوں اور میں بھی قرنِ اول کے مسلمانوں کی طرح ہو جاؤں کہ میری زندگی پر صرف تیری شریعت کی چھاپ ہو اور میرا مقصد تیری رضا کے حصول کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ جب طبیعتوں میں بے ساختہ احساس ابلتا ہے تو اللہ کی رحمت جوش میں آتی ہے۔ اب تک تو غیب کے صیغے سے ہدایات دی جا رہی تھیں، اب براہ راست خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ اسلئے اسلوب غیب سے خطاب کی طرف ملتفت ہو جاتا ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ تم اگر اس راستے پر چلنا چاہتے ہو تو سب سے پہلا یہ کام کرو۔

آیت ۷۲: وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ ''اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور وہی ہے، جس کے حضور تم سب اکٹھے کئے جاؤ گے''۔

''نماز'' سب سے بڑی مظہر عبودیت:

یعنی سب سے پہلا یہ کام کرو کہ نماز قائم کرو۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے، جس سے پوری طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو آدمی اپنی ذات اور اپنی ذات سے متعلق تمام علائق کو اللہ کے سپرد کرنا چاہتا ہے، اس کی صورت کیا ہونی چاہئے۔ نماز کی کیفیت پر اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے

Marfat.com

انسان کا اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے کا کیا معنی اور مفہوم ہے؟ آدمی جب نماز کا آغاز کرتا ہے تو سب سے پہلے ہاتھ اٹھاتا ہے اور انہیں کندھوں سے اوپر کانوں کے برابر تک اٹھا کر فی الحقیقت یہ اعلان کرتا ہے کہ میں اللہ کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہوئے اللہ سے غلامی کا عہد کرتا ہوں اور تمام دنیا اور اس میں بڑائی کے دعوے داروں کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکتا ہوں اور پھر وہ ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے یعنی اللہ کی کبریائی کا اعلان کرتے ہوئے' ہاتھ باندھ کر سرتاپا غلام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دنیا میں دین اور بے دینی کی جو اصل جنگ ہے' اس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ انسانی زندگی اور پھر پوری کائنات میں اصل بڑائی کا مستحق کون ہے؟ دنیا نے اس کبریائی اور عظمت کے تخت پر نجانے کس کس کو فائز کیا ہے۔ لیکن ایک نماز پڑھنے والا سب سے پہلے اسی بنیادی حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ میں دنیا میں ہر آستانے پر جھکنے اور ہر تخت کے سامنے سر جھکانے اور ہر قوت کے مظہر سے ڈرنے اور ہر جبروت کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ میرا آستانہ میری کبریائی کا مرکز میرے لئے قوت کا سرچشمہ اور میری نگاہ میں عظمت و کبریائی کی مستحق صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس لئے میں اس کے سوا کسی اور کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ یہ قول و اقرار اور یہ نعرہ دراصل پوری دنیا کی قوتوں سے تصادم اختیار کرنے والی بات ہے اور اس راستے پر چلنے کا حوصلہ وہی شخص کر سکتا ہے' جس نے سوچ سمجھ کر اللہ سے اپنا رشتہ جوڑا ہو۔ چنانچہ نماز کے آغاز ہی سے اس سفر کا آغاز ہو جاتا ہے اور پھر اعتراف و اقرار اور بندگی و غلامی کی جتنی صورتیں اور جتنے مظاہر ہو سکتے ہیں' ایک نمازی ان تمام کو اختیار کرتا ہے۔ وہ زبان سے ثناء کرتا ہے' پھر بار بار اللہ کی عظمت کا نعرہ لگاتا ہے' اللہ سے پناہ کی درخواست کرتا ہے سورۃ فاتحہ کی شکل میں حمد و ثناء کے ساتھ ساتھ اللہ سے صراط مستقیم کا طلب گار ہوتا ہے پھر کبھی اس کے سامنے رکوع کی شکل میں جھکتا ہے اور کبھی سجدے کی صورت اپنا سب کچھ اس کے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ علامتی طور پر روزانہ پانچ وقت اللہ سے وفاداری کا عہد و اقرار بھی کرتا ہے اور اپنی عبودیت کے تمام سرمائے کو اس کے حوالے کرنے کا اعلان بھی کرتا ہے۔ اس لئے یہاں سب سے پہلے نماز کا حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم سوچ سمجھ کے نماز پڑھو گے اور پھر پورے معاشرے میں نظامِ صلوٰۃ قائم کر دو گے' جس کے نتیجے میں نماز کے مراکز قائم ہوں گے' اللہ کی عظمت اور اس کی کبریائی کے ہمہ پہلو اعلان کیلئے پانچ وقت اذانیں ہوں گی' معاشرے کا ایک ایک فرد ہر نماز کے وقت میں مسجد کا رخ کرے گا' اس طرح پوری آبادی میں پانچ وقت بار بار اللہ کے ساتھ لو لگانے اور ہر طرح اسی کو اپنی ذات کا مرجع و ماویٰ سمجھنے کی ایک مشق بھی ہوتی رہے گی اور ایک اظہار بھی جاری رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اللہ سے وابستگی اور اس سے مکمل تعلق اور خود سپردگی کی اور بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے؟

تقویٰ کیا ہے؟

مزید فرمایا کہ نماز کے ذریعے جب تم نے اچھی طرح اللہ سے اپنا تعلق قائم کر لیا تو اب اجتماعی زندگی میں اس کو جاری و ساری کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اپنے اندر تقویٰ کی دولت پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تقویٰ کیا ہے؟ نہایت اختصار کے ساتھ اگر اسے الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام شرعی حدود و قیود اور تمام شریعت کے عائد کردہ حقوق و فرائض کی نگہداشت کرنا اور اپنے آپ کو اس کا پابند بنا لینا' اس کا نام تقویٰ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس پابندی کے اظہار میں صرف جسم ہی شامل نہ ہو بلکہ اس کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوں۔ آدمی زندگی کے ہر عمل میں اس کا ارتکاب کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچے کہ میں جو کچھ کرنے لگا ہوں کیا میرا یہ عمل شریعت کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور کیا میرے دل و دماغ میں اللہ کی رضا کے حصول اور اللہ کے رسول کے کامل اتباع کے سوا کوئی اور جذبہ کارفرما تو نہیں؟ بس اس صلاحیت کو اپنے اندر پیدا کرنا اور اپنی پوری زندگی کو اس کی تصویر بنا دینا۔ یہ ہے وہ تقویٰ جس کا یہاں حکم دیا جا رہا ہے۔ جب آدمی اس تقویٰ کی زنجیر اپنی صلاحیتوں کو پہنا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں اس نور کی روشنی اتر آتی ہے اور اس کا دل و دماغ اسی کی چمک دمک سے روشن ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت اسی کے پرتو میں ڈھلتی ہے تو پھر وہ ایک ایسا متقی

Marfat.com

انسان بن جاتا ہے‘ جس کی پوری زندگی اللہ کے سامنے خودسپردگی کی علامت ہوتی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں یہی بات فرمائی جارہی ہے کہ اگر تم واقعی اپنے آپ کو رب العالمین کے سپرد کرنا چاہتے ہو تو تمہیں یہ دو کام کرنے ہوں گے۔ ایک نماز کی پابندی اور دوسرا تقویٰ کا اہتمام۔

نماز کی پابندی اور تقویٰ کا حصول‘ آخرت پر یقین کے بغیر ممکن نہیں:

عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے اس حد تک وابستہ ہیں کہ جب نماز سے آدمی محروم ہو جاتا ہے تو تقویٰ کا سررشتہ خودبخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور جب وہ نماز کی حقیقت سے وابستہ ہو جاتا ہے تو تقویٰ خودبخود اس کے اندر اترنے لگتا ہے۔ لیکن اس آیت کریمہ کے تیسرے جملے میں ایک اور حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کی گئی ہے کہ تم اگر یہ دونوں دولتیں حاصل کرنا چاہتے ہو تو وہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تم اپنے دل و دماغ میں ایک تصور کو مستحکم نہ کرلو کیونکہ اس کے استحکام کے بغیر نماز اور تقویٰ کی فکر انسان میں پیدا نہیں ہوتی اور جب وہ تصور مستحکم ہو جاتا ہے تو پھر نماز اور تقویٰ سے دور رہنا اور زندگی کی تعمیر سے بے نیاز ہونا یہ تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے اور وہ تصور کیا ہے؟ وہ یہ احساس ہے کہ مجھے ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہے کیونکہ کوئی بھی دنیا میں آنے والا اللہ کے پیغمبروں سمیت ایسا نہیں جسے یہاں سے کوچ نہ کرنا ہو۔ جو بھی اس دنیا میں آتا ہے‘ وہ جانے کیلئے آتا ہے۔ یہ دنیا نہ ہمیشہ قائم رہے گی اور نہ کوئی اس دنیا میں آنے والا ہمیشہ باقی رہے گا۔ امیر مینائی نے بڑی سچی بات کہی

> جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
>
> جب احمدِ مرسل نہ رہے‘ کون رہے گا

یعنی اگر کسی کو دنیا میں ہمیشہ رہنا ہوتا تو شاید وہ حضور ﷺ کی ذات مبارک ہوتی۔ کیونکہ یہ دنیا انہی کے لئے بسائی گئی اور وہ اللہ کے بعد اس دنیا پر سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ لیکن اللہ کا یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ اللہ کے سوا ہر ایک کو یہاں سے جانا ہے اور ہر ایک کو موت آتی ہے۔ صرف ایک اللہ کی ذات ہے‘ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور اسی احساس اور تصور کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ صرف یہی بات کافی نہیں کہ مجھے ایک دن موت سے ہمکنار ہونا ہے بلکہ اس احساس میں یہ بات بھی شامل ہونی چاہئے کہ مرنے کے بعد مجھے ایک طویل عرصے تک عالم برزخ میں رہنا ہے اور اس کے بعد مجھے میدانِ حشر میں اللہ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ جہاں مجھ سے میری زندگی کا حساب مانگا جائے گا۔ پوچھا جائے گا کہ تم زندگی کیسے گزار کے آئے ہو؟ اس کے ایک ایک لمحے کا حساب دو‘ کیونکہ زندگی عطا کرنے والے نے زندگی تمہیں امانت کے طور پر دی تھی۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے اس امانت میں خیانت تو نہیں کی اس کو اسی طرح گزارا‘ جس طرح اللہ نے اپنی کتابوں اور اپنے رسولوں کی معرفت تمہیں ہدایت بخشی تھی؟ یہ دو باتیں کہ ایک دن مرنا ہے اور پھر ایک ایک زندگی کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے‘ اس سے زندگی میں وہ تبدیلی آتی ہے‘ جس کے نتیجے میں نمازیں بھی قائم ہوتی ہیں اور تقویٰ کی زندگی بھی وجود میں آتی ہے۔

قیامت اور اس کی تفصیلات کے بارے میں ہمیشہ ہی اہل دنیا کو شبہات رہے ہیں۔ مشرکینِ مکہ بھی ایسے ہی شبہات کی گرفت میں تھے۔ کوئی سرے سے اس کا منکر تھا کوئی مانتا تھا‘ لیکن تفصیلات کو قبول کرنے سے انکاری تھا اور جو لوگ فکر و دانش کی دولت سے کسی حد تک مالا مال بھی تھے ان کی نارسائی بعض دفعہ ان کو یہ بات سمجھنے سے محروم رکھتی تھی کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے اور یہ کیوں ضروری ہے کہ ایک دن قیامت آجائے۔ چنانچہ قیامت کے وجود پر عقل و دانش اور حکمت کے حوالے سے اگلی آیت کریمہ میں توجہ دلائی جارہی ہے۔ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

آیت:۷۳ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط وَ یَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ ط قَوْلُهُ الْحَقُّ ط وَ لَهُ الْمُلْكُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ط عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ط وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ O ''اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے غایت کے ساتھ۔ جس دن کہے گا ہو جا تو ہو جائے گا اس کی بات شدنی ہے اور اسی کی بادشاہی ہو گی جس دن صور پھونکا جائے گا۔ وہ غائب وحاضر سب کا علم رکھنے والا اور وہ حکیم وخبیر ہے''۔

اللہ نے یہ دنیا بے مقصد نہیں بنائی:

اس آیت کریمہ میں حکمت ودانش کے پہلو سے اور فکری کج روی کے علاج کے طور پر اور مشرکین مکہ کی جانب سے اٹھائے جانے والے اعتراضات کے ازالے کیلئے مختلف باتیں ارشاد فرمائی گئیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ آسمان وزمین میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار و دلائل موجود ہیں، وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں، جو اس نے محض اپنا جی بہلانے کیلئے بنایا ہو۔ یہ ایشور جی کی لیلا نہیں ہے۔ دراصل یہ ایک نہایت سنجیدہ کام ہے، جو حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے۔ ایک مقصد عظیم اس کے اندر کارفرما ہے اور اس کا ایک دور گزر جانے کے بعد ناگزیر ہے کہ خالق اس پورے کام کا حساب لے جو اس دور میں انجام پایا ہو اور اسی دور کے نتائج پر دوسرے دور کی بنیاد رکھے۔ یہی بات ہے جو دوسرے مقامات پر یوں بیان کی گئی ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

''اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ فضول پیدا نہیں کیا'' (ال عمران:۱۹۱) اور

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ

''ہم نے آسمان وزمین اور ان چیزوں کو جو آسمان وزمین کے درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے'' (الانبیاء:۱۶) اور

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ

''تو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے؟'' (المومن:۱۱۵)

دنیا میں کوئی معمولی عقل کا آدمی بھی کسی ایسی چیز کے بنانے میں محنت، دولت اور ذہانت صرف نہیں کرتا، جس کا مقصد کوئی نہ ہو اور اگر کوئی شخص ایسا کرے تو دیکھنے والا یقیناً اس کی دماغی صحت کے بارے میں شبہ کرے گا۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی شخص کو بنانے والے اور کسی چیز کو ایجاد کرنے والے کے متعین کردہ مقصد سے اختلاف ہو اور وہ مقصد کو زیادہ اہمیت نہ دیتا ہو۔ لیکن سرے سے یہ بات کہ کوئی بے مقصد ایجاد، کوئی بے مقصد صنعت اور کوئی بے مقصد تخلیق کبھی کسی صاحب فن اور کبھی کسی دانشور سے وجود میں آئی ہو، ایسا کبھی نہیں ہوتا اور اگر ایسا ہو تو اسے بے عقلی اور حماقت کی بات سمجھا جاتا ہے تو وہ پروردگار جو قدیر، علیم، حکیم اور رحمان ورحیم ہے اور جس کی حکمتوں کو سمجھنے کیلئے بڑے بڑے دانشوروں کی دانشیں بے مایہ ثابت ہوتی ہیں، اس کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ اس نے یہ کارخانہ قدرت اور یہ طویل وعریض کائنات اور خود اس میں حضرت انسان کو بے مقصد پیدا کیا ہو گا، یہ سراسر ایک ایسی ناقابل قبول بات ہے، جسے کبھی انسانی عقل قبول نہیں کر سکتی۔ سورج چمکتا ہے، چاند دمکتا ہے، ستارے جھلملاتے ہیں، پانی بہتا ہے، کلیاں چٹکتی ہیں، بادل گرجتے ہیں، ندی نالے روشوں کی صورت میں جاری وساری ہیں، دریاؤں میں طوفان اٹھتے ہیں، گھنگور گھٹائیں امڈ کے آتی ہیں۔ تخلیق کا یہ حیرت انگیز کارخانہ ہے، جو ہمارے ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ہر مخلوق کے پیدا کیے جانے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ تو یہ حضرت انسان جو اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے اور جسے

Marfat.com

تمام کائنات میں غیر معمولی صلاحیتوں اور عقل و شعور کی دولت سے نوازا گیا ہے۔ جس کی دماغی رعنائی کا حال یہ ہے کہ اس نے لوہے میں قوت پرواز پیدا کردی ہے اور مختلف دھاتوں کو جوڑ کر کمپیوٹر اور روبوٹ کی شکل میں انسانی دماغ کا متبادل پیدا کردیا ہے۔ خود اس کے اندر کی صلاحیتیں بعض دفعہ انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ اس کے دل کی گہرائیاں' سمندروں کی گہرائیوں کو شرمندہ کرتی ہیں۔ اس کے ارادوں کی بلندیاں' پہاڑوں کی بلندیوں پر غالب آجاتی ہیں۔ اس کا سوز و گداز' سورج کی روشنی اور بجلی کی تیزی کو ماند کرکے رکھ دیتا ہے۔ اس کے احساسات کی نرمی' پھول کی پنکھڑی کی نرمی سے زیادہ نازک ہے تو کیا ایک ایسی مخلوق' جس کے سر پر پروردگار نے عظمت و تکریم کا تاج سجایا ہے' اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں؟ یہ دنیا میں اچھائی کرے یا برائی' ظلم کرے یا رحم' یہ دنیا کو بے حیائی سے بھردے اور انسانیت کا دامن تار تار کردے یا چیتھڑوں میں لپٹ کر اور پیٹ پر پتھر باندھ کر عظمتِ انسانیت کے نقوش ثبت کردے۔ ہر حال میں وہ خود رو پودوں کی طرح' ایک نہ ایک دن موت کا شکار ہو کر مل دل کے رہ جائے اور اس کے اعمال پر نہ کوئی جزا ہو نہ سزا تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اس کائنات اور خود حضرت انسان کو پیدا کرنے والے کے نزدیک نیکی اور بدی میں کوئی فرق نہیں۔ ظلم اور عدل اس کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ جس خالق کی خلقت کے ہر گوشے میں اس کی حکمت قدرت رحمت اور ربوبیت کے آثار موجود ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ انسان کسی طرح ان کا احاطہ نہیں کرسکتا' اس کی نسبت کوئی انسان کس طرح یہ باور کرسکتا ہے کہ اس کے نزدیک نیکی بدی اور عدل اور ظلم سب برابر ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ سراسر اللہ کی حکمت و دانش اور اس کی صفتِ عدل و علم سے انحراف کے مترادف ہوگا اور پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی قربانی کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور کسی برائی میں کوئی بری بات نہیں۔ پیغمبر دنیا میں انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کیلئے زندگی کا اثاثہ تک قربان کرگئے اور انہوں نے جیتے جی ایک لمحہ بھی چین کا نہیں گزارا۔ اسی طرح ان کے راستے پر چلنے والے لوگوں نے ہمیشہ زندگی کے نذرانے پیش کئے' دولت والوں نے دولت لٹائی' محنت کرنے والوں نے محنت کا پھل پیش کیا' کوئی غم ایسا نہیں' جو اس راستے میں نہیں اٹھایا گیا۔ اگر یہ تصور قبول کرلیا جائے تو آخر ان قربانیوں اور محنتوں کا مفہوم کیا ہوگا اور اسی طرح ایسے ظالم بھی اس دنیا میں گزرے' جنہوں نے کھوپڑیوں کے مینار بنوائے اور آج بھی ایسے ظالم موجود ہیں' جو شہروں اور قوموں کو تباہ کرچکے اور کررہے ہیں۔ کیا کوئی دن ایسا نہیں آئے گا' جب ان کے ظلم کی ان کو سزا ملے گی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات نے ظلم کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے اور برائی سے اسے کوئی تعرض نہیں تو پھر تو یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس کائنات کا وجود واقعی ایک کھیل تماشہ ہے بلکہ صرف کھیل ہی نہیں' ایک ظالمانہ کھیل ہے۔ لیکن اس تصور کو انسانی احساس اور انسانی عقل و دانش کبھی قبول نہیں کرسکتے۔ اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ نے یہاں توجہ دلائی ہے کہ تم خود جب ان باتوں پر غور کرو گے تو تم اسی نتیجے پر پہنچو گے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو برحق اور ایک غایت اور مقصد کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ اسی طرح اے انسانو! تمہیں بھی ایک بامقصد زندگی دے کر یہاں دنیا میں بھیجا گیا ہے اور اسی مقصد کے حوالے سے ایک دن آئے گا جب تم سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ تم نے اس کے مطابق زندگی گزاری یا نہیں؟

قیامت کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شبہ نہیں:

اس کے بعد مزید ایک شبہ کا ازالہ فرمایا جارہا ہے۔ مشرکینِ مکہ ہمیشہ مذاق اڑاتے ہوئے یہ بات کہتے تھے کہ اتنی بڑی کائنات کا ایک ہی وقت میں دفعتاً تباہ ہوجانا' جسے قیامت کہا جاتا ہے' آخر یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسی طاقت کہاں سے وجود میں آئے گی' جو ایک حکم کے ذریعے پوری کائنات کا فانوس گل کرکے رکھ دے؟ بادشاہ ملکوں کو تباہ کرتے ہیں تو انہیں کس قدر قوت فراہم کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کی ساری تگ و تاز کا ہدف صرف زمین میں بسنے والے ہوتے ہیں۔ آسمان کی رفعتوں کو کون چھو سکتا ہے؟ انہیں آخر کون توڑ ڈالے گا' ستارے آخر کیوں بے نور ہو کر گرجائیں گے؟ چلئے اگر اسے مان بھی

Marfat.com

لیا جائے کہ یہ کائنات ایک دن تباہ ہو جائے گی' لیکن یہ ماننے کی تو کوئی وجہ نہیں کہ دوبارہ یہ کائنات پھر وجود میں آ جائے گی۔ نئی زمین ہو گی' نیا آسمان ہو گا' ایک محشر بپا ہو گا اور تمام لوگ قبروں سے نکل نکل کر اس محشر کی طرف جا رہے ہوں گے۔ یہ سراسر تصوراتی باتیں ہیں' جن کا وقوع بالکل ناممکن سی بات ہے۔

اس شبے کے ازالے کیلئے فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے اللہ کی قدرت کو بھی اپنی قوتوں پر قیاس کر رکھا ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو جس طرح تمہیں ہر کام کرنے کیلئے اس کے اسباب فراہم کرنے پڑتے ہیں' شاید اللہ بھی انہی چیزوں کا محتاج ہے۔ اس لئے تمہیں قیامت کا وجود سمجھ میں نہیں آ رہا حالانکہ اس کی قدرت کا عالم یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو وجود دینا چاہتا ہے یا کسی چیز کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو صرف حکم دیتا ہے کہ ہو جا۔ یعنی وجود میں آ جا یا تباہ ہو جا تو جیسا حکم دیا جاتا ہے' وہ چیز فوراً ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ جب ہر چیز کا وجود اور اس کی بقاء کا دارومدار اللہ کے حکم پر ہے تو پھر قیامت کے آنے میں آخر کیا استبعاد اور کیا مشکل ہے؟ جب وہ حکم دے گا تو کائنات ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور جب وہ اس کے وجود میں آنے کا حکم دے گا تو کائنات وجود میں آ جائے گی۔ مزید فرمایا کہ یہ مت سمجھو کہ اس کا قول اور اس کا حکم شرمندہ تعمیل نہیں ہوتا اور کام کرنے والے اس کے حکم کی تعمیل میں شاید پس و پیش کرتے ہوں۔ فرمایا ایسا نہیں ہوتا' بلکہ اس کا قول شدنی ہے' یعنی اس کا ہر حکم ہو کے رہتا ہے۔ کیونکہ اس کی حکومت کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ آج بھی تکوینی طور پر سورج کے کرہ سے لے کر معمولی ذرے تک پر اس کی حکومت ہے۔ ایک ایک چیز کی زندگی اور موت اور اس کی بقاء اور امکانات' سب اس کے قبضے میں ہیں۔ لیکن آج اس کے تکوینی عمل کی کاروائی اور کارفرمائی پوری طرح ہماری نگاہوں میں نہیں۔ ہم اس کے تخلیقی اظہار کو تو دیکھ رہے ہیں' لیکن اس کے تخلیقی عمل' اس کی کنہ' اس کے تہہ منظر اور اس کی حقیقت سے ہم آگاہ نہیں اور پھر اس نے اپنی مخلوقات میں سے بعض مخلوقات کو جو کسی حد تک عمل کی آزادی دے رکھی ہے' اس نے بھی ہماری نگاہوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ لیکن قیامت کے دن پوری طرح اس کی حکومت اور اس کے احکام کا نفاذ اور اس کی صورت ہماری نگاہوں کے سامنے ہو گی۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن اسی کی حکومت ہو گی حالانکہ آج بھی اسی کی ہے۔ لیکن اس دن پوری طرح ہم اس کی جلوہ گری دیکھیں گے۔ تب ہمیں کسی حد تک احساس ہو گا کہ اس کی قدرت کی بے پناہی کا عالم کیا ہے۔ یہی بات قرآنِ کریم نے دوسری جگہ بھی ذکر فرمائی ہے اور وہاں اس کے تیور بہت تیکھے ہیں۔ وہاں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ بتاؤ آج کس کی حکومت ہے؟ دنیا میں نام نہاد تخت و تاج کے دعوے دارو! تم نے اپنی جہاں پناہی کے دعوے کر رکھے تھے اور تمہیں اپنی طاقتوں اور حکومتوں کا بڑا گھمنڈ تھا۔ بتاؤ! آج کس کی حکومت ہے؟ کس کی مجال ہو گی کہ وہ اس کا جواب دے سکے۔ پھر خود ہی ارشاد فرمائے گا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ''آج اسی اللہ کی حکومت ہے' جو واحد بھی ہے اور قہار بھی''۔ اگرچہ اللہ کی قدرت اور اس کی حکومت کا تصور اور اس کا یقین قیامت کے وقوع میں پیدا ہونے والے تمام شبہات کا ازالہ کر دیتا ہے۔ لیکن محض آسانی کیلئے ایک سبب کا ذکر بھی فرما دیا جس سے معلوم ہو سکے کہ قیامت کا وقوع کیسے ہو گا اور کس سبب سے ہو گا۔ اس دن صور پھونکا جائے گا۔ اس کی صحیح کیفیت کیا ہو گی؟ اس کی تفصیل تو ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ قرآن سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے حکم سے ایک مرتبہ صور پھونکا جائے گا اور سب ہلاک ہو جائیں گے۔ پھر نہ معلوم کتنی مدت کے بعد جسے اللہ ہی جانتا ہے۔ دوسرا صور پھونکا جائے گا اور تمام اولین و آخرین از سر نو زندہ ہو کر اپنے آپ کو میدان حشر میں پائیں گے۔ پہلے نفخ صور پر سارا نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا اور دوسرے نفخ صور پر ایک دوسرا نظام نئی صورت اور نئے قوانین کے ساتھ قائم ہو جائے گا۔ جس کی ایک مخلوق حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پھونک میں یہ طاقت ہے کہ وہ سینگ جیسے ایک آلے میں پھونکیں گے تو یہ انقلاب برپا ہو جائے گا۔ یعنی ہر چیز پہلے تباہ ہو جائے گی اور پھر وجود میں آ جائے گی تو خود خالق کائنات کی قوت اور قدرت کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ اگر اس کا یقین نصیب ہو جائے تو دین کی کسی بات میں شبہ پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

Marfat.com

مشرکینِ مکہ ایک اور اعتراض بھی کیا کرتے تھے یا شبے کا اظہار کرتے تھے کہ چلیئے اگر قیامت آ بھی گئی تو یہ تو ہرگز ممکن نہیں کہ ہمارے ایک ایک عمل سے پروردگار واقف ہو اور پھر اس طرح کا انتظام کیا جائے کہ اربوں کھربوں مخلوق کا اس طرح حساب لیا جائے کہ ایک ایک عمل ان کے سامنے ہو اور ایک ایک بات کی جواب طلبی کی جائے؟ ہر آدمی ایک دن میں ہزاروں اعمال کرتا ہے۔ ایک آدمی کی پوری زندگی کے اعمال کا حساب لینا ممکن نہیں۔ چہ جائیکہ قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوق کا حساب لے لیا جائے۔ اس کے ازالے کیلئے فرمایا جارہا ہے کہ پروردگار غیب اور شہادت کا عالم ہے یعنی جو کچھ سامنے ہوتا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو ہزار پردوں میں چھپ کے ہوتا ہے وہ اس سے بھی آگاہ ہے۔ جو چیزیں انسانی علم میں ہیں وہ بھی اس کے علم میں ہیں لیکن جو چیزیں انسانی علم کی دسترس سے باہر ہیں پروردگار انہیں بھی جانتا ہے۔ جب اس کے علم کی وسعتوں کا عالم یہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی قدرتوں کی وسعتوں کا ذکر تو پہلے پڑھ چکے ہو تو پھر آخر اس شبے کی کیا بنیاد باقی رہ جاتی ہے کہ وہ ہمارے اعمال کو کیونکر جانے گا اور کیسے سب کا حساب لے گا۔

اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے یہاں سفارش اور شفاعت کا جو غلط تصور مشہور ہو گیا ہے اس کا بھی شاید اس میں ازالہ فرمایا جارہا ہے۔ جہاں تک صحیح شفاعت کا تعلق ہے وہ تو یقیناً رسول اللہ ﷺ بھی فرمائیں گے اور اللہ کے نیک بندے بھی۔ اگرچہ اس کے اپنے قواعد وضوابط ہیں۔ لیکن شفاعت کا یہ تصور جیسا ہم دنیا میں سفارش کا مفہوم جانتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب اقتدار کسی مجرم کو کوئی سزا دیتا ہے تو اس کے کسی دوست سے سفارش کروائی جاتی ہے اور اس کا دوست جا کر اسے یہ کہتا ہے کہ آپ نے جو اس کو سزا دی ہے وہ بالکل حق ہے۔ لیکن بات اصل میں یہ ہے کہ آپ تک جو اطلاعات پہنچی ہیں اور جو چیزیں آپ کے علم میں لائی گئی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ ظاہر ہے ان کی بنیاد پر دی جانے والی سزا بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ میں چونکہ اس شخص کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور اس کے بارے میں زیادہ معلومات رکھتا ہوں اس لئے میں اپنے علم کی بنیاد پر آپ سے یہ گزارش کرنے آیا ہوں کہ صحیح حالات یہ ہیں۔ آپ کو محض غلط اطلاع دے کر آپ سے غلط فیصلہ کروایا گیا ہے۔ آپ میرے بیان کردہ حالات پر یقین کریں اور اپنا فیصلہ بدل لیں۔ اللہ تعالیٰ یہاں فرما رہے ہیں کہ تمہارا پروردگار غیب وشہادت کا عالم ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ حکیم بھی ہے۔ اس کا کوئی فیصلہ بھی حکمت کے خلاف نہیں ہوتا اور اس کے کسی فیصلے میں کبھی عدل مجروح نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ خبیر بھی ہے وہ ہر ایک کے بارے میں ذاتی طور پر مکمل علم رکھتا ہے۔ اس لئے اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ علم میں کمی کی وجہ سے یا حالات کو نہ جاننے کے باعث کوئی غلط فیصلہ کر دے۔

اگر حقیقی قوت کا سرچشمہ اللہ ہے تو پھر آج مسلمانوں کی ایسی حالت کیوں؟

آخر میں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اوپر جو فرمایا گیا کہ نفع ونقصان کا حقیقی مالک اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جبکہ آج جن حالات سے ہمیں سابقہ درپیش ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ جیسی منہ زور قوت پوری مسلمان امت کو خطرے کی زد میں لے چکی ہے اور ہم مسلسل حوادث کا شکار ہو رہے ہیں اور ہماری گزشتہ کئی صدیوں کی تاریخ میں پہلے بھی اس طرح کے واقعات ہو چکے ہیں کہ اس دور کی بڑی قوتوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا تو اگر واقعی اللہ کے سوا کوئی اور نقصان پہنچانے والی قوت نہیں تو پھر یہ کافر قوتیں مسلمانوں کو کیوں نقصان پہنچاتی رہی ہیں اور آج بھی رہی ہیں؟ بات یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی ہم بظاہر نفع ونقصان پر قادر قوتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے جس کا ابھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اگر ایک حقیقت کو سمجھ لیا جائے تو پھر یہ غلط فہمی ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کو ماننے والی امتیں اور اس کے دین کی علمبردار قوتیں جب اپنے اصل مشن کو چھوڑ دیتی ہیں اور اللہ سے تعلق توڑ کر اور اس کے دین سے بے وفائی کرتے ہوئے وہ بھی اپنی زندگی کے مقاصد وہی بنا لیتی ہیں جو

Marfat.com

امتوں کے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ بڑی بڑی کافر قوتوں کو ان کو سزا دینے کیلئے متعین کر دیتا ہے۔ ہم بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ظالم اور کافر قوتیں' شاید اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے طور سے ایسا کر رہی ہیں۔ لیکن حقیقت میں قدرت ان سے وہی کام لیتی ہے جو ایک ڈاکٹر کسی مریض کے ناکارہ عضو کو کاٹنے کیلئے خنجر اور نشتر سے کام لیتا ہے۔ بظاہر خنجر اور نشتر کاٹتے ہیں اور دیکھنے والا انہی کی کاٹ پر نظریں جما کر رہ جاتا ہے۔ لیکن حقیقت بین نگاہ اس بات کو سمجھتی ہے کہ کاٹنے والا ڈاکٹر کا ہاتھ ہے۔ یہ خنجر اور نشتر تو محض ایک ذریعہ اور آلہ کار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسی جابر اور ظالم قوتوں کے ساتھ بالآخر قدرت کیا سلوک کرتی ہے؟ اس کیلئے اس کا الگ قانون ہے۔ لیکن اپنے ماننے والوں سے جو اس کے ساتھ بے وفائی اور انحراف کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں' وہ ایسی ہی جابر قوتوں سے ان کو سزا دیتا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا

؎ تقدیر کے نشتر ہیں تیمور ہوں یا چنگیز

بظاہر یہ سمجھا گیا کہ چنگیز اور تیمور نے کس قدر مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ اللہ نے ان کے ذریعے سے ہمارے اجتماعی جسم کا فصد کھولا اور ہمارے گناہوں کی سزا دی۔ اس طرح جب ہم سے گندا خون نکل گیا اور ہم نے اس سے کسی حد تک عبرت پکڑی تو بالآخر چنگیز کی اولاد کو مخلص علماء کی کاوشوں کے نتیجے میں اسلام کی دولت سے مشرف فرمایا اور اسلامی تاریخ نئی توانائی سے ہمکنار ہوئی۔ اب بھی اگر مسلمانوں نے اپنی دینی کج رویوں کو نہ پہچانا تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ آج کے چنگیز کے ہاتھوں امت مسلمہ کو کیسی کیسی سزائیں ملیں گی۔ لیکن پھر ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ انہی میں سے کسی کو اسلام کی علمبرداری کی توفیق دے دے گا۔ اس لئے کہ اسلام کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ اس کے ماننے والے' جب اس کی علمبرداری چھوڑ کر اپنے آپ کو مغلوب کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی علمبرداری کیلئے کسی اور کو چن لیتا ہے اور ان نام نہاد مسلمانوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ تاریخ سے بھی اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔

؎ ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

گزشتہ کئی رکوعوں سے اسلام اور کفر' قریش مکہ اور آنحضرت ﷺ میں جو کشمکش جاری ہے' اس کی ہم نے تفصیل دیکھی ہے۔ جس میں کفارِ مکہ کی جانب سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے متبعین کو دی جانے والی اذیتوں' دعوت اسلامی کا راستہ روکنے کی کوششوں' بعض دفعہ آنحضرت ﷺ کی جان لینے کی سازشوں اور آپ کی دعوت کو نشانہ تضحیک بنانے کیلئے مختلف قسم کے مطالبوں کی ایک سرگزشت ہے' جو گزشتہ رکوعوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ مشرکینِ مکہ کو ان کے اعتراضات وشبہات کے جواب میں مطمئن کرنے کیلئے آنحضرت ﷺ کی تبلیغی مساعی کو بھی پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور عقائد حقہ کو واضح کرنے کیلئے علمی' فطری' آفاقی' انفسی اور استخراجی دلائل کی قوت سے کام لیا گیا ہے۔ اب آنے والی آیات میں ایک ایسے تاریخی کردار کے وجود سے استشہاد کیا جا رہا ہے' جس کی قدر و قیمت اور عظمت نہ صرف بنی اسرائیل' بلکہ قریش مکہ میں بھی مسلم ہے۔ ان کا سارا سرمایۂ غرور ہی یہ تھا کہ جس طرح ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں' اسی طرح ہم ان کی ملت پر بھی قائم ہیں۔ ہمارا طریقہ وہی ہے جو ہمارے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر وہ یہ الزام لگاتے تھے کہ انہوں نے دینِ ابراہیم چھوڑ دیا ہے اور نئے دین کے نام پر وہ معاشرے میں بے دینی پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں اب ان کے سامنے یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ تم جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر ہونے کے دعویدار ہو' تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اصل دعوت کیا تھی اور تمہارا طرزِ عمل کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت

Marfat.com

سے آج محمد ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے شرک کا انکار کیا ہے اور سب نے مصنوعی خداؤں سے منہ موڑ کر صرف ایک مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیا ہے' اسی طرح کل یہی کچھ ابراہیم علیہ السلام بھی کر چکے ہیں اور جس طرح آج محمد ﷺ اور ان پر ایمان لانے والوں سے تم لوگ جھگڑ رہے ہو' اسی طرح کل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی ان کی قوم یہی جھگڑا کر چکی ہے اور کل جو جواب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو دیا تھا' آج محمد ﷺ اور ان کے پیرووں کی طرف سے تمہارے لئے بھی وہی جواب ہے۔ محمد ﷺ اس راستہ پر ہیں جو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور نسلِ ابراہیمی کے تمام انبیاء کا راستہ رہا ہے۔ اب تم جو ان کی پیروی سے انکار کر رہے ہو' تمہیں معلوم ہو جانا چاہئے کہ تم انبیاء کے طریقہ سے ہٹ کر ضلالت کی راہ پر جا رہے ہو۔

ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے معاشی' سماجی اور تمدنی حالات:

لیکن یہ بات واضح رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی قوم کی نزاع کی حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے مذہبی وتمدنی حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جدید اثری تحقیقات کے سلسلہ میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہو گیا ہے' جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تھے بلکہ دورِ ابراہیمی میں اس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی' اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑی ہے۔ سر لیونارڈ وولی (Sir Leonard Wolley) نے اپنی کتاب ("Abraham," London, 1935) میں ان تحقیقات کے جو نتائج شائع کئے ہیں' ان کا خلاصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ۲۱۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں' جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ظہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں' شہر "اُر" کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی اور بعید نہیں کہ پانچ لاکھ ہو۔ یہ ایک بڑا صنعتی وتجارتی مرکز تھا۔ ایک طرف پامیر اور نیلگری تک سے وہاں مال آتا تھا اور دوسری طرف اناطولیہ تک سے اسکے تجارتی تعلقات تھے۔ جس ریاست کا یہ صدر مقام تھا' اسکی حدود موجودہ حکومتِ عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھیں۔ ملک کی آبادی بیشتر صنعت وتجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو تحریرات آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا' انکا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سود خوری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آپس میں بہت مقدمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے خداؤں سے انکی دعائیں زیادہ تر درازیِ عمر' خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔

1- عَمیلو: یہ اونچے طبقے کے لوگ تھے' جن میں پجاری' حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔

2- مِشکینو: یہ تجار' صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔

3- اَردو: یعنی غلام۔

ان میں سے پہلے طبقہ' یعنی عَمیلو کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے اور ان کی جان و مال کی قیمت' دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

یہ شہر اور یہ معاشرہ تھا' جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا اور ان کے خاندان کا جو حال ہمیں تلمود میں ملتا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عَمیلو طبقہ کے ایک فرد تھے اور ان کا باپ ریاست کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا۔

"اُر" کے کتبات میں تقریباً ۵ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ خدا

Marfat.com

تھا' جو ربُّ البلد' مہادیو یا رئیس الآلہہ سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ اُر کا رب البلد ''ننار'' (چاند دیوتا) تھا اور اسی مناسبت سے بعد کے لوگوں نے اس شہر کا نام ''قمرینہ'' بھی لکھا ہے۔ دوسرا بڑا شہر لَرسہ تھا' جو بعد میں اُر کے بجائے مرکز سلطنت ہوا۔ اس کا رب البلد ''شماس'' (سورج دیوتا) تھا۔ ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے' جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کئے گئے تھے اور لوگ اپنی مختلف فروعی ضروریات ان سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی اور زمینی دیوتاؤں اور دیویوں کی شبیہیں بتوں کی شکل میں بنالی گئی تھیں اور تمام مراسم عبادت' انہی کے آگے بجالائے جاتے تھے۔

''ننار'' کا بت اُر میں سب سے اونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب ''ننار'' کی بیوی ''نن گل'' کا معبد تھا۔ ننار کے معبد کی شان ایک شاہی محل سرا کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ایک پوجارن جا کر اس کی دلہن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں (Religious Prostitutes) کی سی تھی۔ وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو ''خدا'' کے نام پر اپنی بکارت (عزت) قربان کردے۔ کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو ''راہِ خدا'' میں کسی اجنبی کے حوالے کرنا' عورت کیلئے ذریعہ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں کہ اس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پوجاری حضرات ہی ہوتے تھے۔

ننار محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ ملک کا سب سے بڑا زمیندار' سب سے بڑا تاجر' سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغ' مکانات اور زمینیں اس مندر کیلئے وقف تھیں۔ اس جائیداد کی آمدنی کے علاوہ کسان' زمیندار' تجار' سب ہر قسم کے غلے' دودھ' سونا' کپڑا اور دوسری چیزیں لاکر مندر میں نذر بھی کرتے تھے' جنہیں وصول کرنے کیلئے مندر میں ایک بہت بڑا اسٹاف موجود تھا۔ بہت سے کارخانے مندر کے ماتحت قائم تھے۔ تجارتی کاروبار بھی بہت بڑے پیمانے پر مندر کی طرف سے ہوتا تھا۔ یہ سب کام دیوتا کی نیابت میں پوجاری ہی انجام دیتے تھے۔ پھر ملک کی سب سے بڑی عدالت مندر ہی میں تھی۔ پوجاری اس کے جج تھے اور ان کے فیصلے ''خدا'' کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ خود شاہی خاندان کی حاکیت بھی ننار ہی سے ماخوذ تھی۔ اصل بادشاہ ننار تھا اور فرماں روائے ملک اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ اس تعلق سے بادشاہ خود بھی معبودوں میں شامل ہو جاتا تھا اور خداؤں کے مانند اس کی پرستش کی جاتی تھی۔

اُر کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں حکمران تھا' اس کے بانی اول کا نام ''اُرنمّو'' تھا۔ جس نے ۲۳۰۰ برس قبل مسیح میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے حدود مملکت مشرق میں سوسہ سے لے کر مغرب میں لُبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اسی سے اس خاندان کو ''نمّو'' کا نام ملا جو عربی میں جا کر ''نمرود'' ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور اس قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہوئی۔ پہلے عیلامیوں نے اُر کو تباہ کیا اور نمرود کو ننار کے بت سمیت پکڑ کر لے گئے۔ پھر لرسہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی' جس کے ماتحت اُر کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور لرسہ اور اُر دونوں اس کے زیر حکم ہو گئے۔ ان تباہیوں نے ننار کے ساتھ اُر کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

تعین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے ادوار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کا اثر اس ملک کے لوگوں نے کہاں تک قبول کیا۔ لیکن ۱۹۱۰ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ حمورابی (بائبل کے اَمرافیل) نے جو قوانین مرتب کئے تھے' وہ شہادت دیتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ' ان کی تدوین میں مشکوٰۃ نبوت سے حاصل کی ہوئی روشنی کسی حد تک ضرور کارفرما تھی۔ ان قوانین کا مفصل کتبہ ۱۹۰۲ بعد مسیح میں ایک فرانسیسی مفتش آثار قدیمہ کو ملا

Marfat.com

اوراس کا انگریزی ترجمہ C.H.W. John نے ۱۹۰۳ بعد مسیح میں (The Oldest Code of Law) کے نام سے شائع کیا۔اس ضابطہ توانین کے بہت سے اصول اور فروع موسوی شریعت سے مشابہت رکھتے ہیں۔

یہ اب تک کی اثری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدہ اور بت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا' بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری معاشی' تمدنی' سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام' اسی عقیدے پرمبنی تھا۔اس کے مقابلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کی جو دعوت لے کر اٹھے تھے' اس کا اثر صرف بتوں کی پرستش ہی پر نہ پڑتا تھا' بلکہ شاہی خاندان کی معبودیت اور حاکمیت' پوجاریوں اور اونچے طبقوں کی معاشرتی' معاشی اور سیاسی حیثیت اور پورے ملک کی اجتماعی زندگی اس کی زد میں آ جاتی تھی۔ان کی دعوت کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ نیچے سے اوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت ادھیڑ ڈالی جائے اور اسے ازسرنو توحید الہٰ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔اسی لئے ابراہیم علیہ السلام کی آواز بلند ہوتے ہی عوام اور خواص' پوجاری اور نمرود سب کے سب بیک وقت اس کو دبانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

.... ﷲ ...... ﷲ ...... ﷲ ....

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب

اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۴﴾

ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تم بتوں کو کیا معبود بناتے ہو۔میں دیکھتا ہوں کہ تم اور تمہاری قوم صریح گمراہی میں ہو۔

وَكَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَكُوْنَ مِنَ

اور ہم اسی طرح ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے تاکہ وہ خوب یقین کرنے والوں میں ہو جائیں (ف ا لعینی)

الْمُوْقِنِیْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ

جب رات نے اُن کو (پردۂ تاریکی سے) ڈھانپ لیا تو (آسمان میں) ایک ستارا نظر پڑا۔کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے۔جب

Marfat.com

أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ الْأٰفِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ

وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں پھر جب چاند کو دیکھا کہ چمک رہا ہے تو کہنے لگے یہ میرا پروردگار

فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَأَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿٧٧﴾

ہے لیکن جب وہ بھی چھپ گیا تو بول اُٹھے کہ اگر میرا پروردگار مجھے سیدھا رستہ نہیں دکھائے گا تو میں اُن لوگوں میں ہو جاؤں گا جو

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ أَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ أَفَلَتْ قَالَ

بھٹک رہے ہیں۔ پھر جب سورج کو دیکھا کہ جگمگا رہا ہے تو کہنے لگے میرا پروردگار یہ ہے یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی

يٰقَوْمِ إِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٨﴾ إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ

غروب ہو گیا تو کہنے لگے لوگو! جن چیزوں کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو میں اُن سے بیزار ہوں۔ میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے

السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٧٩﴾ ۚ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ

تئیں اُسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ اور ان کی قوم

قَالَ أَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ أَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ

اُن سے بحث کرنے لگی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں (کیا) بحث کرتے ہو اُس نے تو مجھے سیدھا رستہ دکھا دیا

إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ أَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٠﴾

ہے۔ اور جن چیزوں کو تم اُس کا شریک بناتے ہو میں اُن سے نہیں ڈرتا۔ ہاں جو میرا پروردگار کچھ چاہے میرا پروردگار اپنے علم سے

وَكَيْفَ أَخَافُ مَآ أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا

ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کیا تم خیال نہیں کرتے۔ بھلا میں ان چیزوں سے جن کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو کیونکر

لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَأَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۚ

ڈروں جب کہ تم اس سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ شریک بناتے ہو جس کی اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ اب دونوں

Marfat.com

إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ
فریق میں سے کون سا فریق امن (اور جمعیت خاطر) کا مستحق ہے اگر سمجھ رکھتے ہو (تو بتاؤ) جو لوگ ایمان لائے اور اپنے
أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٨٢﴾
ایمان کو (شرک کے) ظلم سے مخلوط نہیں کیا ان کے لیے امن (اور جمعیت خاطر) ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں

تمہید:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت آپ کے زمانے کے حالات اور آپ کی دعوت کی ہمہ گیری اور اس کی تفصیل آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب ایک اور بات جس کا سمجھنا بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کوئی قوم چاہے کس قدر بگڑی ہوئی بھی کیوں نہ ہو وہ اپنے غلط سے غلط طرزِ عمل کے بارے میں بھی یہ کوشش کرتی ہے کہ کسی نہ کسی دلیل کا سہارا تلاش کرے کیونکہ جاہل سے جاہل آدمی کی بھی فطرت میں اللہ نے حیاء کا ایک مادہ رکھا ہے جس کی وجہ سے بے دلیل بات پر اڑنا اس کیلئے آسان نہیں رہتا۔ جب بھی کوئی صحیح بات کسی غلط آدمی کو بھی سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ جواب میں یہ نہیں کہتا کہ میں تمہاری صحیح بات کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں اور مجھے اپنی غلط بات پر اصرار ہے بلکہ وہ اپنی غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کیلئے دلیل کی شکل میں یا کسی اور صورت میں سہارا تلاش کرتا ہے اور اس کو اپنے لئے پناہ بنالیتا ہے۔ مشرکینِ مکہ بھی اپنی بت پرستی پر مبنی غلط طرزِ عمل میں ایسی ہی صورت حال سے گزر رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے جب مسلسل ان کی بت پرستی اور ان کے غلط طرزِ عمل پر بھرپور تنقید فرمائی تو انہوں نے جواب میں جس بات پر اصرار کیا اور جسے اپنے لئے بہت بڑا سہارا سمجھا وہ یہ بات تھی کہ ہم اصلاً ملت ابراہیمی پر قائم ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت صرف ان کی نگاہ ہی میں نہیں بلکہ تمام مذاہب کی نگاہ میں ایک مسلم واجب الاحترام قائد کی سی تھی جس سے کسی کو بھی انکار نہیں تھا کیونکہ بنی اسرائیل اس سے پہلے ہدایت کے دعویدار اور اللہ کی کتاب اور اس کے دین کے وارث تھے۔ وہ بھی اپنے آپ کو اپنے جدِّ امجد حضرت یعقوب علیہ السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وارث سمجھتے تھے اور قریش بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وارث تھے اور خود اسلام کا دعویٰ بھی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ملت ابراہیم پر مبعوث کیا گیا ہے اور آپ ان کے دین کی تجدید کیلئے تشریف لائے ہیں۔ قریشِ مکہ چونکہ براہ راست حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کے بنائے ہوئے اللہ کے گھر کے متولی ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ان کا زیادہ وارث سمجھتے تھے اور غلط فہمی یہ تھی کہ وہ جو دین اپنے پیچھے چھوڑ کے گئے تھے ہم آج تک اس پر قائم ہیں اور یہ ہماری بت پرستی اصلاً حضرت ابراہیم کی وراثت ہی کا حصہ ہے۔ ظاہر ہے ایسی مسلمہ قیادت کی موجودگی میں وہ آنحضرت ﷺ کی بات سننے کیلئے بالکل تیار نہیں تھے۔

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اسی حوالے سے کیا جا رہا ہے کہ تم اپنے آپ کو بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے سمجھو اس میں کوئی غلط بات نہیں۔ لیکن تمہارا یہ کہنا کہ تم ان کے دین کے وارث ہو یہ سراسر ایک غلط فہمی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جس دعوت کو لے کر آئے

Marfat.com

تھے اور جس دین کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے اور جس دین کا مرکز انہوں نے بیت اللہ کو بنایا تھا' وہ وہ دین نہیں' جس پر تم قائم ہو' بلکہ اس کو زندہ کرنے کیلئے تو رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا۔ تمہارا جو طرزِ عمل ہے اور تم جس طرح بت پرستی کو اپنا دین بنا چکے ہو' حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اسے بدلنے کیلئے تشریف لائے تھے۔ تمہارا دین ٹھیک وہی ہے' جو ان کی قوم کا تھا اور رسول اللہ ﷺ کا دین وہ ہے' جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا۔ اس لئے تم اپنے طرزِ عمل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وارث نہیں ہو۔ بلکہ ان کی اس کافر قوم کے وارث ہو' جس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کشمکش پیش آئی اور بالآخر انہیں اپنا وطن چھوڑ کر نجانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑی۔ اب اگر یہ بات قریش مکہ سمجھ جائیں کہ ان کا طرزِ عمل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے بالکل برعکس ہے تو ان کا وہ سارا سرمایۂ افتخار اور ان کی دینی زندگی کا سہارا' یعنی ملت ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ اس کا طلسم پاش پاش ہو جاتا ہے کیونکہ ملت ابراہیمی بت پرستی نہیں' بت شکنی ہے۔ تمام مشرکانہ عقائد کو چھوڑ کر اور مشرکانہ رویوں سے توبہ کر کے خالصتاً اللہ کے راستے کو اختیار کرنا ہے اور یہ وہ طریقہ ہے جس کی دعوت لے کر حضور ﷺ اٹھے ہیں۔ لیکن مشرکینِ مکہ آپ کے ساتھ وہی کچھ کر رہے تھے' جو حضرت ابراہیم کی قوم نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ چنانچہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت اور ان کی دعوت اور دعوت کے اثبات کیلئے ان کی پیش کردہ دلیل کو بیان کیا جا رہا ہے۔ تاکہ مشرکینِ مکہ کو پوری طرح اپنی غلطی کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

آیت: ۷۴

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ''اور یاد کرو! جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا: تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو؟ میں تو تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں''۔

اس آیت کریمہ میں متعدد باتیں توجہ طلب ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام صراحت کے انداز میں آزر لیا گیا ہے' جبکہ ہمارے کئی محترم مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام آزر نہیں بلکہ تارخ ہے۔ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نہیں' بلکہ چچا تھے اور عربی زبان میں چچا کو والد کے نام سے یاد کرنا ایک معروف بات ہے اور دوسری یہ بات کہ آزر کو بطور خاص اس لئے ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ نمرود کے وزیر اور اس شہر کے سب سے بڑے بت خانے کے نگران پجاری تھے اور وہ صرف بت پرست ہی نہیں تھے بلکہ بت گر بھی تھے اور اس معاشرے میں بت گری چونکہ ایک معزز اور وسیع ذریعۂ معاش کے طور پر متعارف تھا اور پھر اس بت خانے کا انچارج پجاری ہونا' یہ ایسے ہی تھا جیسے بادشاہ کے بعد دوسرے نمبر کا آدمی۔ تو آزر کی اس حیثیت کی وجہ سے جو اسے اس کے اپنے خاندان اور ملک میں حاصل تھی' اس کو یہاں حضرت ابراہیم کے باپ کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام اصل میں تارخ تھا' لیکن آزر ان کا تخلص تھا اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی آدمی کا تخلص یا خطاب اس کے نام پر غالب آ جاتا ہے اور اسی کی شہرت ہو جاتی ہے۔ جب بھی اس آدمی کا تذکرہ ہوتا ہے تو عموماً معروف لقب یا خطاب سے ہوتا ہے۔ نام بالعموم ذکر نہیں کیا جاتا۔ ہمارے یہاں اس کی بہت مثالیں ہیں۔ حسرت موہانی کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے' شورش کاشمیری کا نام کتنے لوگ جانتے ہیں' نسیم حجازی کے نام کو گھر والوں کے سوا شاید ہی کوئی جانتا ہو' نعیم صدیقی صاحب کے نام سے ان کے عمر بھر کے ساتھی واقف ہوں تو ہوں' لیکن عام پڑھنے والے بالکل نہیں جانتے۔ اسی طرح آزر کا نام اگر متروک ہو گیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ دونوں رائیں اپنے نزدیک قابل احترام اور اہمیت کے قابل ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے یہاں جس صراحت کے ساتھ آزر کو بطور نام کے ذکر کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا عام انداز یہ نہیں کہ وہ اس قدر قطعی انداز میں کسی کا نام لے اور مزید یہ کہ قرآن کریم کی حیثیت چونکہ مہیمن کی ہے' یعنی وہ پہلی آسمانی کتابوں کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے' جو ان کے حاملین نے ان میں پیدا کر دی تھیں۔ یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آج بھی اگر ہم تورات

Marfat.com

کے مختلف تراجم دیکھیں تو اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے نام کا تلفظ ہر ترجمے میں ہمیں مختلف ملے گا۔ اسلئے یہاں قرآن کریم نے اصلاح فرماتے ہوئے قطعی انداز میں فرمایا کہ اس کا نام آزر تھا۔ اسلئے یہی بات زیادہ اپیل کرتی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ نہیں' بلکہ آزر تھا۔

دوسری بات جو اس آیت کریمہ سے سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ کہ یوں تو اللہ کے رسولوں کی تاریخ دعوت اور ان کی شخصیتوں میں قدم قدم پر اللہ کی شان اور اس کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات عموماً جو دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ جب قوموں کا بگاڑ انتہائی شدت اختیار کر جاتا ہے تو اس کی اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے کسی رسول کو بھیجتے ہیں اور اس کی معرفت کلمۂ حق کی زندگی کا سامان کرتے ہیں تو یہ نعرۂ حق بلند وہاں سے ہوتا ہے' جہاں سے اس کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اہل مصر کی اصلاح کیلئے بھیجا تو ان کی پرورش کا سروسامان وہاں کیا گیا جو اس معاشرے کی ساری خرابیوں کا مرکز تھا' یعنی فرعون کا گھر۔ وہاں آپ کی تربیت ہوئی وہیں آپ پلے بڑھے اور وہیں سے کلمۂ حق کا آغاز ہوا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ عراق میں جس طرح مظاہر فطرت کی پوجا ہو رہی تھی اور بت پرستی مختلف صورتوں میں جس طرح پورے جوبن پر تھی اس کو بدلنے کی کوئی کوشش اس بگڑے ہوئے معاشرے میں بظاہر ناممکن سی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اللہ نے جب اس قوم کی اصلاح کا ارادہ فرمایا تو اپنا رسول اپنی معروف سنت کے مطابق اور اپنی قدرت بالغہ کے اظہار کے طور پر وہاں سے اٹھایا جو بت پرستی کا مرکز اور اس برائی کا سرچشمہ تھا۔ یعنی آزر کا گھر۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ وہ سب سے بڑے بت خانے کا سب سے بڑا افسر تھا اور نمرود کے بعد اسے دوسری حیثیت حاصل تھی اور پھر جس جرأت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے سامنے کلمۂ حق بلند فرمایا' اس سے اللہ کی اس شان کا پوری طرح اظہار ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ دعوتِ حق:

تیسری بات جو اس آیت میں نمایاں ہے' وہ یہ ہے کہ اللہ کے رسولوں کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ اپنی دعوت کا آغاز ہمیشہ اپنے خاندان اور اپنے گھر سے کرتے رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو بھی حکم دیا گیا تھا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کہ سب سے پہلے اپنے خاندان کو اور اپنے قریبی عزیزوں کو ان کے برے انجام اور اللہ کے عذاب سے ڈراؤ۔ چنانچہ اسی لئے آپ نے اپنے خاندان کو اپنے گھر میں دعوت دی اور ان کے سامنے اپنی دعوتِ ہدایت پیش فرمائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسی سنت کے مطابق سب سے پہلے اپنے گھر سے اس کا آغاز کیا۔ گھر کے بڑے ہونے کی حیثیت سے اپنے باپ کے سامنے سب سے پہلے اس دعوت کو رکھا اور نہایت قطعیت و حکمت کے ساتھ اس کی اور اس کی قوم کی برائی کو واضح کیا اور اپنی دعوت کو صاف صاف پیش فرمایا۔ اس آیت کریمہ میں تو وہ دعوت اختصار کے ساتھ پیش کی گئی ہے لیکن سورۃ مریم میں اس کو زیادہ تفصیل سے بیان فرمایا گیا:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا ○ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ○ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ○ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ○ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ○

"یاد کرو! جب اس نے اپنے باپ سے کہا: اے میرے باپ! آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں' جو نہ سنتی ہیں' نہ دیکھتی ہیں اور نہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں؟ اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے' جو آپ کے پاس نہیں آیا' تو میری پیروی کیجئے' میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کیجئے۔ شیطان خدائے رحمان کا بڑا نافرمان ہے۔ اے

Marfat.com

میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ آپ کو خدائے رحمان کی طرف سے کوئی عذاب نہ آ پکڑے کہ آپ شیطان کے ساتھی بن کے رہ جائیں۔ اس نے جواب دیا' ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے منحرف ہو رہے ہو؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ اب تم میرے پاس سے یک دم دفع ہو جاؤ'' (مریم:۴۲-۴۶)

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو دعوت دیتے ہوئے سب سے پہلے اس کی اور اس کی قوم کی بنیادی برائی کا ذکر فرمایا کہ آپ نے بتوں کو خدا بنا رکھا ہے' لیکن یہاں جو بات اختصار سے کہی گئی ہے' اسے سورۃ مریم میں اور بعض دوسرے مقامات پر کھول دیا گیا ہے' تاکہ یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو کہ بت پرستی محض بتوں کے سامنے جھک جانے کا نام نہیں' بلکہ اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ یہاں سب سے پہلے اس برائی کی جو ظاہری صورت ہے اس پر تنقید فرمائی اور اس کے بعد اسے کھلی کھلی ضلالت اور گمراہی قرار دے کر دوسرے مقامات پر اس کی وضاحت فرما دی گئی کہ یہ پتھر کے بتوں کے سامنے جھکنا' محض ایک علامت ہے۔ حقیقت میں اس کے پیچھے ایک بہت بڑی گمراہی کارفرما ہے' جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ اس ظاہری گمراہی پر تنقید کرتے ہوئے دوسری جگہ بھی فرمایا: اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ''کیا تم پوجتے ہو ان چیزوں کو' جن کو خود اپنے ہی ہاتھوں گھڑتے ہو'' (الصّٰفّٰت:۹۵) یعنی اپنی گمراہی اور بے عقلی ملاحظہ کرو کہ پہاڑ سے پتھر اٹھا کر تم اپنے کارخانے میں لے آتے ہو اور ان کو ایک شکل دے کر اس کی پوجا کرنا شروع کر دیتے ہو۔ حالانکہ خدا تو کائنات کا خالق ہے' وہ ہر مخلوق کی تخلیق فرماتا ہے۔ خود تمہیں بھی اسی نے پیدا کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کی ساتھ اپنے ہاتھوں سے گھڑے ہوئے بتوں کو شریک کرتے ہوئے تمہیں اپنی حماقت کا ذرا احساس نہیں ہوتا کہ ایک پتھر' پتھر ہے چاہے اسے کیسی ہی خوبصورت شکل کیوں نہ دے دی جائے اور سورۃ مریم میں اس تنقید کو مزید کھول دیا گیا ہے کہ آدمی جب کسی کے سامنے جھکتا ہے اور اپنی بندگی اور اس کے الوہیت کا اقرار کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مختلف مواقع پر ضرورتوں اور کمزوریوں کا شکار ہوتا ہے۔ کبھی مصیبتیں آ گھیرتی ہیں' کبھی مالی دشواریاں پریشان کرتی ہیں' کبھی اور چند در چند ضرورتیں ہیں' جو انسان کو بے بس کر کے رکھ دیتی ہیں۔ جس ذات کو انسان اپنا الٰہ اور خدا بناتا ہے' اس کے بارے میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری ایسی تمام ضرورتوں اور حاجتوں اور میری بے بسی اور بے کسی میں' وہ ذات میرے لئے سہارا ہو گی۔ میں تکلیف میں ہوں گا تو وہ تکلیف دور کرے گی' مجھے نقصان سے بچائے گی اور جب مجھے کسی فائدے کی ضرورت ہو گی اور میں دست سوال اس کے سامنے دراز کروں گا تو وہ مجھے مالا مال کر دے گی۔ لیکن ابا جان آپ اور آپ کی قوم اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کے سامنے جھکتے ہو دست سوال دراز کرتے ہو مرادیں مانگتے ہو' اپنی سب امیدیں ان سے وابستہ کرتے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو وہ نہ تمہیں دیکھتے ہیں نہ وہ تمہاری بات سنتے ہیں اور نہ کسی ضرورت میں وہ تمہارے کام آ سکتے ہیں تو پھر ان پتھروں سے سر پھوڑنے کا فائدہ۔ یہ تو وہ تنقید ہے جو ان کی ظاہری برائی پر کی گئی ہے کیونکہ دیکھنے والی نگاہ انہیں پتھروں کے سامنے ہی جھکتا ہوا دیکھتی ہے۔

بت پرستی کی آڑ میں دراصل شیطانی اور طاغوتی قوتیں اپنی پرستش کرواتی ہیں:

لیکن اگلی آیات میں اس کی حقیقت بھی کھولی گئی کہ یہ پتھروں کے خدا اصل میں یہ مقصود نہیں ہیں۔ ان کے پردے میں شیطانی اور طاغوتی قوتیں اپنی بندگی کرواتی ہیں۔ دنیا کا ہر استبدادی نظام اور تمام مفاد پرست گروہ اور مشیخیت کے دعوے دار اور مذہب کے نام پر فوائد حاصل کرنے والے لوگ سب اپنے اپنے دائرے میں ایسے ہی پردوں میں اپنی بندگی کرواتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو دلوں میں اتار کر اپنی پوجا کروانا اپنی بڑائی اور عظمت کا ایک طلسم طاری کر کے اپنے مفادات کو محفوظ کرنا یہ اسی بت پرستی کی شاخیں ہیں۔ دنیا میں جب کبھی بت پرستی ہوئی ہے تو عوام کو تو جانے دیجئے خواص نے کبھی بھی پتھروں کو پتھر سمجھ کے نہیں پوجا وہ جانتے ہیں کہ یہ پتھر' یہ مجسمے' یہ بظاہر بت' خدا رسیدہ شخصیتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے پردے میں' ہم ان کو پوجتے ہیں اور جب وہ

Marfat.com

خوش ہو جاتے ہیں تو ہم پر انعامات کی بارش کرتے ہیں اور کبھی یہ سمجھا جاتا ہے کہ کچھ اوتار ہیں دیوتاؤں کے جن کی یہ شکلیں ہیں اور بادشاہ بھی چونکہ کسی نہ کسی دیوتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا اور اسی حوالے سے ان کی ملی بھگت ہوتی تھی اور وہ انہی کا سہارا لے کر اپنی ربوبیت کا صور پھونکتے تھے اور آج کے دور میں اگر دیکھا جائے تو اس بت پرستی نے اگرچہ شکل بدل لی ہے' لیکن اس کی روح آج بھی کارفرما ہے۔ یہ ہیرو ورشپ' یعنی شخصیتوں کی پوجا۔ ان کے مجسموں کا احترام' ایئر ٹائٹ شیشوں کے بکسوں میں ان کی لاشوں کی حفاظت اور پھر طرح طرح کے طریقے سے دلوں میں ان کے زندہ رکھنے کی کوشش اور سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کو پراپیگنڈے کے زور سے لوگوں کے سامنے معصوم بنا کر پیش کرنا اور سادہ دل عوام کو یہ یقین دلا دینا کہ تمہارا لیڈر کبھی غلطی نہیں کر سکتا اور ان سے ہر طرح کی قربانیوں کا مطالبہ کرنا اور انہی کے حوالے سے خیر وشر کی تمیز میں ان کو فیصلہ کن حیثیت دے دینا' یہ آج کی وہ بت پرستی ہے' جو پوری آب وتاب سے آج بھی زندہ ہے۔ مسلمان قوم جو توحید کی علمبردار اور اپنے پیغمبر کی ذات کی فدا کار ہے' وہ بھی اس سحر سے محفوظ نہیں۔

ہمارے معاشرے کی بت پرستی:

ہم آج بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایک سیاسی لیڈر' اسلامی مسلمات کا انکار کرتا ہے' عبادات کا مذاق اڑاتا ہے' اخلاص وعمل کو بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کا نام دے کر مسترد کر دیتا ہے اور صاف صاف باطل قوتوں کے ہاتھوں میں کھیلتا ہے' حتیٰ کہ ملک کی آئینی سرحدیں بھی اس کے ہاتھوں محفوظ نظر نہیں آتیں' بایں ہمہ بے شمار لوگ اسے نہ صرف سپورٹ کرتے ہیں بلکہ اسے اپنی محبت وعقیدت کا مرجع سمجھتے ہیں۔ غور فرمایئے! اس سے بڑی بت پرستی اور کیا ہوگی۔ اُس زمانے کی بت پرستی بھی انسان سے خدا پرستی اور اس کا دین چھینتی تھی' آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ یہی وہ چیز ہے' جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام تنقید فرما رہے ہیں اور اس تنقید کا دائرہ چونکہ زندگی کے ہر زاویئے پر محیط تھا' اس لئے ان کے والد نے شروع ہی میں سخت ترین طرزِ عمل اختیار کیا۔ آپ کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی اور پوری قوم آپ کی دشمنی کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اور آپ کی دعوت کا مطالعہ کرتے ہوئے' دماغ میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ کہا جاتا ہے کہ آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں جو کچھ دیکھتا ہے' اس کے والدین جیسی اس کی تربیت کرتے ہیں' اس کی تعلیم جو اسے سکھاتی ہے اور معاشرے میں جن باتوں کا چلن ہوتا ہے' ایک بچہ تربیت کے تمام مراحل میں انہی باتوں کو قبول کرتا ہے اور اس کی زندگی انہی کی تصویر بن جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم نے بت پرستی اور بت گری کے مرکز میں آنکھ کھولی' اپنے چاروں طرف اسی کی کارفرمائی دیکھی' ان کی تربیت انہی بنیادوں پر ہوئی' معاشرے کو اسی دلدل میں دھنسا ہوا دیکھا اور پورے معاشرے میں اس کے برخلاف کہیں سے کوئی ایک آواز بھی کبھی سنائی نہ دی سوچنے کی بات ہے کہ شرک کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں انہوں نے توحید کی روشنی کہاں سے لی؟ گندگی میں پلنے والے کیڑوں میں رہ کر خوشبو کے ذوق سے کیسے آشنا ہوئے۔ اگلی آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے:

آیت: ۷۵   وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ ''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے' تاکہ وہ اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور کاملین یقین میں سے بنے''۔

اس آیت کریمہ میں مختلف حقائق کی طرف راہنمائی فرمائی گئی ہے۔ ان کا ذکر کرنے سے پہلے صرف ایک لفظ کی وضاحت ضروری ہے۔ آیت میں ''ملکوت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ملکوت کا لفظی مفہوم عزت واقتدار' بادشاہی اور سلطنت ہے۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ خدا کی اس تکوینی بادشاہی کیلئے استعمال ہوا ہے' جو آسمان اور زمین بلکہ ہر چیز پر قائم ودائم ہے۔

Marfat.com

فطرت سلیم کے مالک انسان کو اللہ کی ذات کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی:

اس آیت میں غور کرنے سے سب سے پہلی جو چیز سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسانی ارواح کو پیدا فرمایا تھا تو انسانی ارواح سے ایک عہد لیا تھا۔ آپ اسے عہد فطرت کہہ لیجئے یا عہد الست۔ اس میں روحوں سے پوچھا گیا تھا کہ بتلاؤ کیا میں تمہارا رب ہوں یا نہیں؟ سب نے بیک زبان کہا تھا کہ آپ یقیناً ہمارے رب ہیں اور ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ دنیا میں جو شخص بھی پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ اس عہد کی یادداشت لے کر آتا ہے۔ اگر ماحول، والدین کی تربیت اور تعلیم اسے نہ بگاڑیں تو اس کے تحت الشعور اس عہد کی یاد زندہ رہتی ہے۔ جب کبھی وہ اس کائنات پر غور کرتا ہے تو وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے۔ لیکن جب والدین کی تربیت، تعلیم اور ماحول اس کی فطرت کو بگاڑ دیتے ہیں تو اس کا یہ عہد طاقِ نسیان میں چلا جاتا ہے اور اس وقت تک اس کے دل و دماغ میں تازہ نہیں ہوتا، تاوقتیکہ پیغمبرانہ تبلیغ و دعوت سے دوبارہ اس عہد کو یاد نہ دلایا جائے۔ اللہ کے نبی چونکہ نخلِ فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں، وہ ماحول کی گندگی میں رہنے کے باوجود اپنی فطرت سلیم کے اثرات سے کبھی بے نیاز نہیں ہوتے۔ وہ نبوت سے پہلے بھی عصمت کے حصار میں رہتے ہیں۔ قدرت ان کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ پتھروں کے ڈھیر میں، ہیرے کی مانند چمکتے رہتے ہیں چونکہ ان کی فطرت اپنی سلامتی پر قائم رہتی ہے، اس لئے قدرت ان پر نبوت سے پہلے ایک انعام کا آغاز کرتی ہے اور پھر نبوت کے ساتھ اس انعام کی تکمیل کر دیتی ہے۔ نبوت تو انبیاء کی خصوصیت ہے لیکن یہاں میں جس انعام کا ذکر کرنے لگا ہوں، وہ صرف انبیاء کی خصوصیت نہیں، بلکہ جس کی فطرت سلیم عہد الست پر قائم ہو قدرت کا یہ انعام برابر اس پر بھی جاری رہتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کیلئے قرآن کریم توجہ دلاتا ہے:

﴿ اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ''کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین میں خدا کی بادشاہی پر غور نہیں کیا؟'' ﴾

یعنی غور و فکر کا یہ انعام اللہ تعالیٰ ہر اس بندے پر فرماتے ہیں جو اپنی فطرت کی سلامتی پر قائم ہوتا ہے۔ اس کی فطرت چونکہ بار بار اس کے عہد الست کو یاد کراتی ہے اس لئے وہ بار بار اپنی اس متاع کو تلاش کرتا ہے، جس کی یاد اس کے تحت الشعور سلگتی رہتی ہے اور وہ اللہ کے ملکوت میں برابر غور و فکر کرتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں وہ کلید اس کے ہاتھ آتی ہے، جس سے صحیح فکر اور صحیح عمل کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی سے زندگی کا سرا بھی ہاتھ آتا ہے اور اسی سے اس کے منتہا کا بھی پتا چلتا ہے۔ اقبال شاید ایسی ہی کسی کشمکش میں مبتلا تھا، جب اس نے یہ بات کہی تھی

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتداء کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہاء کیا ہے

اسی فکر میں سوچنے والا برابر یہ سوچتا ہے کہ اس دنیا کا کوئی خالق ہے یا خود بخود وجود میں آگئی ہے؟ اگر کوئی خالق ہے تو کیا وحدہ لاشریک ہے یا اس کا کوئی اور شریک بھی ہے؟ پھر یہ دنیا کبھی ختم بھی ہوگی یا ہمیشہ قائم رہے گی؟ اگر اس کا کوئی خالق و مالک ہے تو اس کی صفات و خصوصیات کیا ہیں اور کس لئے اس نے اتنا بڑا عالم کھڑا کر دیا ہے؟ اس دنیا میں حق و باطل کیلئے کوئی معیار ہے یا یہ کوئی اندھیر نگری ہے؟ آسمانوں اور زمین میں ایک ہی قادر قیوم کی بہر حکمت کارفرما ہے یا اس کے اندر الگ الگ مشیتیں اور الگ الگ ارادے زور آزمائی کر رہے ہیں؟ یہ اور اسی قبیل کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کے صحیح حل پر ہی صحیح فکر اور صحیح عمل کی بنیاد ہے۔ ایک سلیم الفطرت آدمی اللہ کے اس انعام سے جب نوازا جاتا ہے تو برابر یہ غور و فکر جاری رکھتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ خالق کائنات کے وجود سے آشنا ہوتا ہے۔ اللہ کے نبی نبوت سے پہلے سب سے زیادہ اس انعام سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ وہ اپنے معصوم ہونے کی وجہ سے یوں تو ہر شرک اور ہر گناہ کی آلودگی سے محفوظ رہتے ہیں اور ان کی فطرت ہر طرح کے برے تاثر سے بچی رہتی ہے۔ لیکن غور و فکر کا

Marfat.com

یہ سلسلہ اللہ کی ذات کو جاننے کیلئے نہیں بلکہ اس کی صفات کو پہچاننے اور اپنے فرائض کو سمجھنے کیلئے برابر جاری رہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی انعام سے نوازا تھا اور اس طرح نوازا تھا کہ وہ پتھروں کے اس ڈھیر میں ہیرے سے بڑھ کر روشنی دینے لگے تھے۔

یہاں رک کر ایک بات سمجھ لینی چاہئے کہ کائنات پر غور وفکر اور تفکر کا یہ انداز جس کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے' یہ تو اللہ کے نیک بندوں اور انبیاء کرام کا حصہ ہے۔ لیکن جہاں تک کائنات پر محض غور وفکر کا تعلق ہے' وہ تو ایک سائنسدان بھی کرتا ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ سائنسدان کی نگاہ اپنی ذات اور اپنے محدود ماحول کے محور تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسے صرف اشیاء کے خواص کو جاننے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے سوا اور کسی بات کی فکر نہیں ہوتی۔ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو دیکھتا ہے' لیکن صرف اس کے فوائد کو تلاش کرتا ہے اور وہ صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ جس طرح اس سے گلقند تیار ہوتا ہے' کیا کوئی اور چیز بھی اس سے بنائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ لیکن اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اگر صرف اس سے گلقند بنانا ہی مقصود ہوتا تو اس کیلئے پھول کے حسن و جمال اور اس کی رعنائی و دلکشی اور اس کی عطر بیزی و شادابی کی آخر کیا ضرورت تھی؟ پھول کی ایک ایک پنکھڑی پر جس طرح فیاضی کے ساتھ گلکاری کی گئی ہے کیا یہ بھی گلقند کیلئے ضروری تھی؟ لیکن ایک سائنسدان' ان باتوں پر غور نہیں کرتا کہ اس کا صانع کون ہے اور اس کو یہ رعنائی اور دلکشی عطا کرنے والی ذات کون سی ہے۔ وہ کبھی اس پردے کے پیچھے جھانک کر اس ہاتھ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا' جس نے پھول کو حسن و جمال سے نوازا ہے۔ نیوٹن نے سیب کے درخت سے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا تو اس کے ذہن میں معاً یہ خیال آیا کہ آخر یہ سیب زمین ہی پر کیوں گرتا ہے' خلا تو اس کے چاروں طرف ہے' اور طرف کیوں نہیں گرتا؟ اس سے اس کے ذہن میں زمین کی کشش کا تصور پیدا ہوا' جو آگے چل کر بہت سی تحقیقات اور انکشافات میں معاون ثابت ہوا۔ اس نے یہ بات ثابت کی کہ زمین میں ایک کشش ہے اور یہاں ایک قانون جذب و کشش کارفرما ہے اور یہیں تک اس کی نگاہ رک کے رہ گئی۔ لیکن اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کہ آخر وہ کون ہے جس نے کائنات کی ایک ایک چیز کو جذب و کشش کے اس قانون سے باندھ رکھا ہے۔ بس سائنسدان اور اللہ والوں کے غور وفکر میں یہی فرق ہے کہ سائنسدان کی سوچ پر صرف مفاد کا غلبہ ہے اور ذمہ داری کے احساس کا فقدان ہے۔ لیکن اللہ والے جب اس تفکر اور تدبر سے کام لیتے ہیں تو وہ شے کی حقیقت کو تلاش کرتے ہیں اور بالآخر اس کے خالق تک پہنچ جاتے ہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا تھا

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کی رحمت کے فیضان کی پہلی صورت یہی رہی ہے کہ باقی انبیاء کی طرح انہوں نے زمین و آسمان کے ملکوت پر غور جاری رکھا۔ وہ اللہ کے وجود سے عہد فطرت کے باعث آشنا تھے۔ لیکن اب اس کی تفصیلات جاننے کی فکر میں تھے۔ جیسے آنحضرت ﷺ عمر کے ساتھ ساتھ تنہائی پسند ہوتے گئے اور مسلسل تحنث میں بتلا رہے۔ علماء کہتے ہیں ''تحنث'' اللہ کے ملکوت میں غور وفکر کا نام ہے۔ آپ اللہ کو یاد کرتے' اس سے محبت کرتے تھے۔ لیکن محبت کے طریقے اور یاد کی اداؤں کو جاننا چاہتے تھے۔ آپ اس فکر میں تھے کہ آخر انسانی زندگی کے مقاصد کیا ہیں؟ یہی حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا۔ پھر اس انعام کی تکمیل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت سے مشرف فرمایا اور جس راز کو وہ جاننا چاہتے تھے وحی الٰہی کی صورت میں وہ راز ان پر واشگاف کردیا گیا۔ اب اس راز سے آگاہی کی ہر پیغمبر کیلئے ابتداء تو وحی الٰہی کی صورت میں ہوتی ہے جس سے وہ یقین کی دولت سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن یقین کی چونکہ کیفیت ایک نہیں' اسلئے یہ یقین آئے دن بڑھتا رہتا ہے' تاآنکہ انہیں ان مراحل سے گزارا جاتا ہے جس کی ایک شکل معراج بھی ہے۔ ہر پیغمبر کو اس کی شان کے مطابق معراج سے نوازا گیا ہے۔ تاکہ وہ جب دنیا کی ہدایت کیلئے اٹھے تو اللہ کی ذات اس کی صفات ایمانیات سے

Marfat.com

متعلق تمام تفصیلات اللہ کے وعدوں اس کی وعیدوں اور آنے والی دنیا کے بارے میں ایک ایک چیز سے متعلق وہ اس یقین سے بہرہ ور ہو' جو اللہ کے نبیوں کی خصوصیت رہی ہے۔

یقین کے تین درجات:

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے' وہ تو صرف زبان کے اقرار اور دل کی تصدیق کا نام ہے' جس میں علمی اعتراف بھی کافی ہوتا ہے۔ لیکن یقین اس سے بڑھ کر ایک چیز کا نام ہے' جسے اہل علم تین کیفیتوں کے حوالے سے جانتے ہیں۔ کبھی وہ علم الیقین ہوتا ہے' کبھی عین الیقین اور کبھی حق الیقین۔ اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ آدمی دور سے کسی اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک یقین پیدا ہوتا ہے کہ کہیں آگ سلگ رہی ہے اور اس یقین کی بنیاد یہ علم ہوتا ہے کہ دھواں ہمیشہ آگ ہی سے اٹھتا ہے۔ اسے علم الیقین کہتے ہیں۔ اگر یہ دیکھنے والا جہاں آگ سلگ رہی ہے وہاں جا کر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ واقعی آگ سلگ رہی ہے۔ اب اسے جو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد یقین حاصل ہوگا' اسے عین الیقین کہتے ہیں۔ پھر اگر وہ اس آگ میں انگلی ڈال کر دیکھے اور اس کی انگلی جل جائے تو آگ کی یہ تپش اور انگلی کی جلن اس کو جو یقین دے گی' اسے حق الیقین کہتے ہیں۔ اللہ کے نبی ان تینوں طرح کے یقینوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

فلسفی اور پیغمبر میں فرق:

یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں رہے کہ اندازوں' ظن وتخمین اور قیاسات کی مدد سے بعض علمی نتائج تک پہنچ جانا اور غور وفکر کے نتیجے میں بعض تصورات قائم کر لینا' یہ کسی بھی پڑھے لکھے آدمی اور کسی بھی فلسفی کیلئے ہر وقت ممکن ہے اور تمام فلسفی ہمیشہ اسی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ایک فلسفی میں اور اللہ کے رسول میں یہ فرق ہوتا ہے کہ فلسفی اگر اپنی علمی حدود سے واقف ہے تو وہ اپنے نتائج فکر کو یہ کہہ کر پیش کرے گا کہ میرا گمان ہے کہ ایسا ہوگا۔ لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ واقعی ضرور ایسا ہوگا کیونکہ اس کی فکری کاوشیں اسے ایک گمان تو دے سکتی ہیں' یقین نہیں دے سکتیں۔ لیکن اللہ کے نبی چونکہ غور وفکر کی نعمت کے ساتھ ساتھ وحی الٰہی اور ملکوت کے مشاہدے سے بھی نوازے جاتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ انہیں یقین واذعان کی دولت سے مشرف فرماتے ہیں اور یہی وہ یقین کی قوت ہے' جس کی وجہ سے وہ دنیا بھر کی مخالفتوں کا سامنا کرتے' دکھ اٹھاتے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں' لیکن انہیں کبھی ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ممکن ہے ہماری دعوت وہ نتائج پیدا نہ کرے جس کا ہم دعویٰ کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی ایک ایک بات کے بارے میں پوری طرح یقین کی دولت سے بھرپور ہوتے ہیں اور پھر یہی وہ دولت ہے' جو دنیا میں تقسیم ہوتی اور برگ وبار پیدا کرتی ہے اور قیامت تک اسی سے ہدایت کے پھول کھلتے رہیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام کو ایسے ہی یقین واذعان کی دولت سے مالا مال فرمایا گیا تھا اور اسی کے نتیجے میں آپ سے وہ حیران کن کارنامے ظہور پذیر ہوئے جو اگر ایک طرف آپ کی عبدیت کی ہمیشہ زندہ رہنے والی مثالیں ہیں تو دوسری طرف اللہ پر بے پناہ یقین اور اذعان کا اظہار بھی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ پر یقین وایمان:

اللہ کی توحید کی دعوت کے نتیجے میں جن اذیتوں سے آپ کو گزرنا پڑا' حتیٰ کہ آپ کو آگ کے الاؤ میں ڈال کر جلانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن

Marfat.com

ایسے ہر نازک موقع پر آپ نے اللہ پر جس بے پناہ اعتماد کا ثبوت دیا وہ سراسر اللہ پر یقین اور اذعان ہی کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ انسانی ہمت' استقامت' صبر اور استقلال کی ایک حد ہے جس سے آگے بڑھنا پڑے تو انسانی قوت کو شکست ہونے لگتی ہے۔ لیکن اللہ کا نبی بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام' جس طرح ان مراحل سے آسانی سے گزرے' وہ صرف اللہ کے ساتھ ان کے قریبی تعلق اور اس پر بے پناہ یقین اور اعتماد کا نتیجہ تھا۔ اس سے بڑھ کر اور زندہ مثال کیا ہوگی کہ جب آپ کو آگ کے الاؤ میں پھینکا جانے لگا تو روایات میں آتا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور آ کر کہا: ''اے اللہ کے خلیل! سامنے آگ کا الاؤ روشن ہے۔ چند لمحوں کے بعد آپ اس کی نذر ہونے والے ہیں۔ اتنی بڑی آگ میں گرائے جانے کے بعد بچ جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں یہ آگ کا الاؤ بجھا دوں یا آپ کو اٹھا کر لے جاؤں یا کسی اور طرح آپ کی مدد کروں؟'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس نازک موقع پر بھی کس قدر ایمان محکم کا ثبوت دیا' نہایت اطمینان سے فرمایا: ''جبرائیل! یہ بتایئے پروردگار میری حالت سے آگاہ ہیں یا نہیں؟ اگر وہ آگاہ ہیں اور یقیناً ہیں' کیونکہ کوئی چیز ان کے علم سے باہر نہیں تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ان کی بجائے آپ سے مدد طلب کروں؟ اگر انہیں میرا بچانا منظور ہے تو خود بچالیں گے اور اگر منظور نہیں تو پھر مجھے بھی منظور نہیں''۔ موت کو سامنے دیکھتے ہوئے یہ اطمینان اور اللہ پر بے پناہ بھروسہ' یہ ابراہیمی یقین ہے' جو آج بھی اس امت میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال نے اسی کی مثال دیتے ہوئے کہا

؎ یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

یہ یقین و اذعان کی اعلیٰ ترین مثال ہے' جس سے اللہ کے رسول نوازے جاتے ہیں اور اسی قوت کے بل بوتے پر وہ اللہ کے دین کی دعوت دیتے ہیں اور اس راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ یقین و اذعان کی یہ نعمت اللہ کے نبیوں کی معرفت اہل دنیا کو نصیب ہوتی ہے اور اسی دولت کو لٹانے کیلئے دنیا میں اللہ کے رسول مبعوث کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ جب تک دنیا اس دولت سے بہرہ ور نہیں ہوتی' اسے اللہ کی صفات کی معرفت تو کیا نصیب ہوگی' وہ اس کی ذات سے معمولی تعلق بھی پیدا نہیں کر سکتی اور اس کے نتیجے میں ان کی زندگی کا پورا نظام اور زندگی کے تمام اہداف بے سمت اور بے منزل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی کے حقیقی مقاصد سے بیگانہ ہو کر بہیمانہ زندگی اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کا آغاز اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اللہ کے نبی اور رسولوں پر ایمان لایا جائے۔ چنانچہ ہر نبی سب سے پہلے ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ جو اس دعوت کو قبول کر لیتا ہے' وہ اس راستے کا مسافر بن جاتا ہے اور پھر بقدر ہمت اور بقدر توفیق اس راستے میں منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت:

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہی دعوت اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور انہیں اللہ پر آخرت پر اور اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دی' انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ تم جو مشرکانہ زندگی اختیار کر چکے ہو' اس کی تمہاری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں جبکہ تم اللہ کو مانتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ اس کائنات کا خالق وہی ہے اور ساری قوتیں اسی کے پاس ہیں تو پھر تم نے یہ چھوٹے بڑے اس کے ساتھ شریک کیوں بنا رکھے ہیں؟ تم مظاہر قدرت کو کس طرح کی قوتوں میں شریک سمجھتے ہو' حتیٰ کہ تم نے انہی کو اور ان کا اوتار سمجھ کر بادشاہ کو اپنا رب بنا رکھا ہے اور انہی کی پوجا کرتے ہو اور پوری زندگی کے معاملات

Marfat.com

نے انہی کے ہاتھ میں دے رکھے ہیں۔ جب آپ یہ دعوت لے کر اٹھے تو آپ نے اس کیلئے جو طریقہ اختیار فرمایا' وہ دعوت کے عام طریقوں سے ہٹا ہوا طریقہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم اپنے اندر چند خصوصیات رکھتی تھی اور دراصل یہ ان کی خصوصیت نہیں ہر قوم کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور اس کی چند نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی بھی چند خصوصیات تھیں۔ ان میں سے دو بہت نمایاں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی بات کو قبول کرنے سے پہلے حجت بازی سے کام لیتی تھی۔ ہر بات کو سمجھنے کیلئے دلیل طلب کرنا اور پھر دلیل میں الجھاؤ پیدا کرنا اور مین میخ نکالنا' یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ہر چھوٹا بڑا اس عادت بد کا شکار تھا۔ چنانچہ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ خود بادشاہِ وقت' جو نمرود کے نام سے معروف ہے۔ اس سے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملاقات ہوئی تو اس نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس بات پر دلیل طلب کی کہ رب تو میں ہوں' تم کس رب کی ربوبیت کی دعوت دیتے ہو؟ تو آپ نے فرمایا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ یعنی زندگی اور موت اس کے قبضے میں ہے۔ تو اس الجھے ہوئے دماغ والے نے کہا کہ یہ دونوں کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ ایک بے گناہ کو مار ڈالا اور ایک پھانسی کے مستحق کو رہا کر دیا۔ کہا دیکھو! میں بھی زندہ کر سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں۔ حضرت ابراہیم سمجھ گئے کہ یہ شخص بات کو الجھانا چاہتا ہے اور سیدھے طریقے سے سمجھنا شاید اس کے بس میں نہیں۔ اس لئے آپ نے اپنی دلیل پر اصرار کی بجائے فوراً ایک دوسری دلیل پیش کی' جس میں الجھاؤ پیدا کرنا نمرود کیلئے آسان نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میرا رب تو وہ ہے جو مشرق سے سورج کو نکالتا ہے۔ تم اگر رب ہو تو مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اب یہ کافر مبہوت اور ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کے چھوٹے بڑے لوگوں کا یہ ایک مخصوص مزاج تھا۔

دوسری ان کی خصوصیت یہ تھی کہ جب وہ کسی بات کو ماننا نہیں چاہتے تھے یا دلیل سے مطمئن نہیں ہوتے تھے تو مشتعل ہو کر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اصل بات اور اصل دعوت دھری کی دھری رہ جاتی اور لڑائی کا خاتمہ اور حالات کا سدھار ایک مسئلہ بن جاتا' لوگ اسی میں الجھ کے رہ جاتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ اپنی قوم کے مزاج سے آشنا تھے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دعوت پیش کرتے ہوئے ان چیزوں کا پوری طرح خیال رکھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ میں اپنی دعوت مدلل انداز میں قوم کے سامنے پیش کروں۔ لیکن دلیل کا انداز ایسا ہونا چاہئے' جسے الجھانے کا ان کو موقع نہ مل سکے اور دھیرے دھیرے اپنی دلیل کو اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ وہ خود اس کی گرفت میں آ کر رہ جائیں اور دوسری یہ بات کہ انداز ایسا اختیار کیا جائے' جس میں ان کو مشتعل ہونے کا موقع نہ ملے۔ بجائے اسکے کہ براہ راست انہیں دعوت دی جائے اور ان کے عقائد باطلہ کی تردید کی جائے۔ بات کو خود کلامی کے انداز میں' لیکن انہیں سنا کر پیش کیا جائے۔ چنانچہ آگے آنے والی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت کو جس طرح مدلل انداز میں پیش فرمایا ہے' اس میں یہ دونوں احتیاطیں صاف نظر آتی ہیں اور اگر ان کو ذہن میں رکھا جائے تو دلیل کا اسلوب سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اس سے پیشتر کہ ہم ان آیات کو پڑھیں اور اس پر غور کریں ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ سے پیوستہ آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ پر ایمان لانے کی دعوت اپنے باپ کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور ان کے عقائد باطلہ کی تردید بھی فرما چکے ہیں تو یہاں کیا اس کا اعادہ کیا جا رہا ہے یا کوئی نئی بات کہی جا رہی ہے؟ بات اصل میں یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی جب ہم تاریخ دعوت کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو سب سے پہلے خاموش تبلیغ کا حکم دیا گیا اور جستہ جستہ لوگوں تک بات پہنچانے کی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد اپنے قریبی عزیزوں کو دعوت دینے کا حکم دیا گیا۔ عام دعوت کا حکم بہت دیر سے آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بالعموم انبیاء کی دعوت ان تین مراحل سے ہو کر گزرتی ہے۔ یقیناً

Marfat.com

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو بھی انہی تینوں مراحل سے گزارا گیا ہوگا۔ یہاں اب جو دعوت پیش کی جارہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسرا اور آخری مرحلہ ہے۔ یعنی عام لوگوں میں دعوت کا آغاز کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی ابتداء آنحضرت ﷺ کی طرح ایک پہاڑی پر چڑھ کر نہیں کی گئی بلکہ آہستہ آہستہ خاص انداز میں لوگوں میں نفوذ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی لئے کبھی ہمیں یہاں رات کو دعوت دینے کا منظر نظر آتا ہے اور کبھی دن کو اور کبھی ستارے کو مدار دلیل بنایا جارہا ہے اور کبھی چاند اور سورج کو۔ یہ وضاحتیں پیش نظر رہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انداز تبلیغ کو سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ اب ہم ان آیات کو پڑھتے ہیں۔

آیت: ۷۶-۷۷-۷۸ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ O فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّىْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِىْ رَبِّىْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۤلِّيْنَ O فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِىۡۤءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ O ’’پس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو ڈھانپ لیا' اس نے ایک تارے کو دیکھا' بولا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا' اس نے کہا! میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتے دیکھا' بولا! یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا' اس نے کہا! اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا۔ پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا' بولا! یہ میرا رب ہے' یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! میں ان چیزوں سے بری ہوں' جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو‘‘۔

ان آیات کریمہ میں ستارے' چاند اور سورج کو مدار بحث اور مدار دلیل بنایا گیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم یوں تو بے شمار بتوں کو پوجا کرتی تھی۔ لیکن ان کے شرکاء میں سب سے زیادہ جن کی پوجا ہوتی اور جن کی طاقت کو اپنی زندگی میں موثر مانا جاتا تھا وہ ستارے چاند اور سورج تھے یا یوں کہہ لیجئے کہ مظاہر فطرت کو ان کی زندگیوں میں دیوتاؤں کی حیثیت حاصل تھی اور بادشاہ کو بھی انہی میں سے کسی دیوتا کا اوتار مان کر اس کی پوجا کی جاتی تھی۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے عام دعوت میں انہی کو اپنے سامنے رکھا اور موضوع بحث بنایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رات کے کسی موقع پر لوگ کسی جشن یا تقریب میں جمع ہوں گے اور زہرا ان کے سروں پر چمک رہا ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ادھر جا نکلے۔ آپ چونکہ ایک بڑے باپ کے بیٹے بھی تھے اور اپنے باغیانہ خیالات کی وجہ سے شہرت بھی پاچکے تھے' اس لئے لوگوں نے انہیں گھیر لیا تو آپ نے اس موقع کو غنیمت جان کر ایک خاص انداز میں ان کے سامنے اپنی دعوت پیش فرمائی اور ان کے تمام مذہبی خیالات کا دارومدار جن مظاہر فطرت کی پرستش پر تھا' ان کا بطلان بھی کیا۔ وہ چونکہ ستاروں میں سے زہرا کی پوجا کرتے تھے اور اس وقت اتفاق سے سر پر زہرا چمک رہا تھا' اسی کی طرف متوجہ ہو کر ان کو سناتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں آپ نے فرمایا: هٰذَا رَبِّىْ ’’یہ ہے میرا رب‘‘ یعنی تمہارے خیال کے مطابق' یہی میرا رب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت تمام ستاروں میں اسی کی چمک اور اسی کی درخشندگی سب سے نمایاں ہے۔ لوگوں نے ان کی زبان سے یہ بات سن کر ایک اطمینان اور خوشی محسوس کی کہ یہ نوجوان تو اللہ کے سوا کسی اور کو مانتا ہی نہیں۔ اب اگر اس نے زہرا کو اپنا رب کہا ہے تو اس سے بڑھ کر اطمینان بخش بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ زہرا کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور ہو سکتا ہے اس کی چمک دمک کی تعریف بھی کی ہو' تاکہ سننے والوں میں یہ بات اچھی طرح راسخ ہو جائے کہ زہرا کی ربوبیت کی اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو اس بلند آسمان پر اس کا وجود اور اس کی درخشندگی ہے۔ اس کی یہ نور افشانی اور اس کی یہ رعنائی اور دلکشی یقیناً بے سبب تو نہیں ہو سکتی۔ جس میں یہ چمک دمک اور عظمت ہو اسے ضرور رب ہی ہونا چاہئے۔ زہرا چونکہ باقی ستاروں میں جلدی ماند پڑ جانے والا

Marfat.com

ستارہ ہے۔ چنانچہ جب کچھ دیر کے بعد وہ روشنی کھونے لگا‘ حتٰی کہ وہ ڈوب گیا تو آپ نے خود کلامی کے انداز میں لیکن انہیں سناتے ہوئے فرمایا کہ میری پسندیدگی کی وجہ یا اس کو رب کہنے کا سبب‘ اس کا طلوع ہونا اور اس کا بلندیوں پر چمکنا تھا۔ لیکن اگر یہ بھی بے نور ہو جاتا اور ڈوب جاتا ہے تو ایسی بے ثبات چیزوں سے میں دل نہیں لگا سکتا۔ ڈوب جانے والی چیزیں تو مجھے یوں بھی پسند نہیں‘ چہ جائیکہ میں انہیں اپنا رب بنالوں۔ غور فرمایئے کہ اس میں دعوت کا انداز بالکل نہیں سننے والوں سے بالکل خطاب نہیں کیا جا رہا۔ البتہ ایک خاص طریقے سے ایک بات ضرور کہہ دی گئی ہے‘ جس سے سننے والے دل و دماغ اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلے موقع سے اتنا ہی فائدہ اٹھانا مقصود تھا۔ تاکہ اس قوم کو بھڑکنے کا موقع نہ ملے۔ لیکن سننے والے ضرور سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔

پھر رات کے کسی ایک ایسے ہی موقع پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ستارہ تو صرف دمکتا ہے‘ ٹمٹماتا ہے‘ زہرا کی درخشندگی نسبتاً نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن چاند تو اپنی خوبی، رعنائی اور اپنی چمک دمک میں ستاروں سے کہیں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر اپنے مخصوص انداز میں خود کلامی کرتے ہوئے فرمایا کہ ”یہ ہوگا میرا رب“ یعنی جیسے تم اس کو رب سمجھتے ہو بلکہ تم تو اوروں کو بھی سمجھتے ہو‘ لیکن یہ ان میں چونکہ نمایاں ہے۔ اس لئے ممکن ہے‘ یہ میرا رب ہو۔ لیکن صاف نظر آتا ہے کہ یہ چاند کے رب ہونے کا اعتراف نہیں بلکہ ان کے عقیدے کو ان کے سامنے بیان کر کے ان کی کمزوری کو واشگاف کرنا مقصود ہے۔ انداز وہ اختیار کیا گیا ہے‘ جس سے وہ لوگ مشتعل ہونے کی بجائے یہ سمجھ کے قریب آئیں کہ شاید انہی کی بات کو مانا جا رہا ہو۔ لیکن جب چاند بھی اپنے وقت پر ڈوب گیا تو اب آپ نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ لیکن خطاب ان سے پھر بھی نہیں فرمایا۔ صرف اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ میں تو اس کی چمک دمک کا اسیر ہو گیا تھا اور اس کے حسن نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ سارا حسن اور اس کی یہ روشنی بھی فریب نظر یا خدمت کی انجام دہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ چمکتا ہے تو خود نہیں‘ بلکہ اسے کوئی اور چمک دیتا ہے۔ لیکن یہ ڈوب جانے کیلئے اسی طرح مجبور ہے‘ جس طرح ستارے ڈوب جاتے ہیں۔ ڈوب جانے والوں کو اگر رب مان لیا جائے تو اس سے بڑی گمراہی اور کیا ہوگی۔ لیکن اس کے حسن کی تاثیر نے ایک دنیا کو مبہوت کر رکھا ہے۔ وہ صرف اس کا حسن اور رعنائی دیکھتی ہے۔ وہ اس کے اختتام اور اس کے ڈوب جانے کو نہیں دیکھتی اور یہ مرحلہ اتنا گراں ہے کہ اس میں میرے رب نے اگر میری رہنمائی نہ کی تو میں بھی شاید راہ راست پر نہ رہ سکوں۔ پہلی آیت میں ستارے کے ڈوبنے پر صرف اتنا ہی فرمایا تھا کہ میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس آیت میں سوچنے والوں کو قدم آگے بڑھانے کا اشارہ دیا ہے کہ ڈوبنے والوں کو پسند کرنا تو صرف غلطی ہوگی۔ لیکن ان کو رب بنالینا‘ یہ تو ضلالت اور گمراہی ہے اور کسی ضلالت کا ارتکاب کرنا‘ یہ ایسی بات نہیں کہ جسے آرام سے قبول کر لیا جائے۔ یہ تو نہایت تاسف کی بات ہے۔ اسلئے میں خود بھی اسے اختیار نہیں کر سکتا اور اگر کوئی اور اختیار کرتا ہے تو اس پر دکھ کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تیسری آیت کریمہ میں سورج کا ذکر فرمایا گیا۔ پہلے دونوں واقعے تو رات کے ہیں‘ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی روز دن کے وقت تبلیغ و دعوت کا کوئی موقع ہاتھ آیا تو آپ نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا لب و لہجہ پہلے سے کچھ بدلا ہوا ہے اور تیکھا ہو گیا ہے۔ کیونکہ آپ نے سورج کو دیکھ کے فرمایا‘ جو پوری آب و تاب سے آسمان پر چمک رہا تھا کہ ”یہ ہوگا میرا رب“ اور ساتھ ہی طنز کیا کہ یہ سب سے بڑا جو ہے۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس قوم کو جس چیز نے دھوکہ دے رکھا ہے‘ وہ ان ستاروں کا آسمان کی بلندیوں پر ہونا‘ پھر ان کا آب و تاب سے چمکنا۔ یہ ان کی عظمت کے دلائل ہیں اور جہاں بھی عظمت پائی جاتی ہو‘ وہاں ربوبیت بھی پائی جانی چاہئے۔ اس لئے انہوں نے ان کو اپنا رب بنا رکھا تھا۔ آپ نے انہیں طنز کرتے

Marfat.com

ہوئے فرمایا کہ دیکھو! یہ سورج سب سے زیادہ چمکدار بھی ہے اور سب سے بڑا بھی لیکن میں تمہیں اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اپنی چمک دمک اور بڑائی کے باوجود کیا اپنی حالت کو قائم رکھ سکتا ہے؟ ظاہر ہے، وہ بھی اپنی حالت کو کیسے قائم رکھ سکتا ہے۔ اپنے وقت پر وہ بھی ڈوب گیا۔ اس طرح گویا آسمان پر ان کے سارے معبود جب ایک ایک کر کے زوال کا شکار ہو گئے اور ان کی عظمتیں فنا ہو گئیں تو تب آپ ان سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے، اے قوم! میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم اللہ کے شریک ٹھہراتے ہو۔ اس طرح آپ نے پہلی دونوں آیتوں میں اپنی فطرتِ سلیم کا آئینہ ان کے سامنے رکھا، تاکہ وہ لوگ اس آئینہ میں اپنے منہ دیکھ لیں اور ساتھ ساتھ دلائل سے ان کو قائل بھی کرتے گئے اور جب یہ دلائل مکمل ہو گئے اور بات اپنے انجام کو پہنچ گئی تو آپ نے صاف طور پر انہیں دعوت دیتے ہوئے ان کی گمراہی پر توجہ دلائی اور پھر وہ کلمہ حق جس سے پوری طرح راہ راست کھل کر سامنے آجائے، اس کا واشگاف انداز میں اعلان فرمایا:

آیت: ۷۹ اِنِّی وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ O ''میں نے اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں''۔

یہ ملتِ ابراہیم اور اسلام کا وہ کلمہ جامعہ ہے، جس سے اسلام کے اساسی عقیدے، یعنی عقیدۂ توحید کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب نماز کی نیت باندھتے ہیں اور نماز چونکہ سب سے زیادہ بندے کی عبدیت اور اللہ کی الوہیت کو دل و دماغ میں راسخ کرتی ہے، تو ہم اسی آیت سے نماز کا آغاز کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے اسی کلمۂ اسلام کو پیش فرمایا، جس میں آپ کی پوری دعوت بھی سمٹ آئی ہے اور اپنے بارے میں بھی پوری طرح بات کو کھول دیا گیا ہے اور اس دلیل کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے، جس سے ان کا پوری طرح بطلان ہو جاتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے یہ بات فرمائی کہ تم نے اپنی پوری زندگی تقسیم کر رکھی ہے۔ تم اللہ کو مانتے بھی ہو، لیکن زندگی کے تمام فیصلے اور زندگی کے تمام رویوں میں اس کے احکام ماننے کی بجائے غیر اللہ کی اطاعت کرتے ہو اور جا بجا ان کی پرستش بھی کرتے ہو۔ اس لئے میری دعوت کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ میں نے اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ کیونکہ یہاں ''وَجَّھْتُ'' اَسْلَمْتُ کے معنی میں ہے۔ میری زندگی کا کوئی لمحہ اس کی بندگی سے آزاد نہیں جس طرح میری عبادت اس کیلئے ہے، اسی طرح میری اطاعت بھی اسی کیلئے ہے۔ جس طرح میں عبادت گاہ میں اس کے سامنے جھکتا ہوں، اسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی میرا وہی آستانہ ہے۔ جس سے میں راہنمائی طلب کرتا ہوں۔ پھر اس پر دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم آسمانوں کی بلندیوں پر چمکنے والے ستاروں کی چمک دمک کے اسیر ہو کر ان کی پوجا کرتے ہو اور زمین پر تخت و تاج کے مالک بندوں کے سامنے سر جھکاتے ہو، نجانے کتنی زمینی قوتیں ہیں، جن کو تم اپنے معبود سمجھتے ہو۔ حالانکہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا تو صرف اللہ ہے۔ تم جن قوتوں کو اپنا معبود سمجھتے ہو، تمہاری طرح اللہ کی بے بس مخلوق ہیں۔ اس لئے اس کی موجودگی میں، یعنی خالق کے ہوتے ہوئے، مخلوق کو رب کیسے مانا جا سکتا ہے؟ ایک دوسری جگہ قرآن کریم نے اسی دلیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَھُنَّ

''سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، اس اللہ کو سجدہ کرو، جس نے ان کو پیدا کیا ہے'' (حم السجدہ: ۳۷)

پھر حنیف کا لفظ کہہ کر توحید کی گرفت کو مزید واضح فرمایا کہ میں نے اس طرح اپنا آپ اللہ کے سپرد کر دیا ہے کہ اب میرا کوئی ایسا تعلق غیر کے ساتھ نہیں ہو سکتا، جو اللہ کے تعلق سے متصادم یا اس کو کمزور کرنے والا ہو۔ کیونکہ جس طرح غیر اللہ کی عبادت کرنا اور ان کی غیر مشروط اطاعت کرنا

Marfat.com

اللہ کی ذات وصفات میں کسی حد تک بھی شریک کرنا شرک ہے' اسی طرح اس کی عبادت واطاعت میں کسی کو اس طرح شریک کرنا کہ جس سے اللہ کے تعلق کو نقصان پہنچتا ہو اور عبدیت کے مزاج میں شکست وریخت پیدا ہوتی ہو' وہ بھی سراسر عقیدہ توحید کے خلاف ہے اور شرک کو تقویت دینے کا باعث ہے۔ کہا میں ان میں سے کسی بھی گمراہی کیلئے تیار نہیں کیونکہ میں ایک موحد ہوں' مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ یہ سارے شرک کے انداز ہیں اور میں ان سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

اللہ کے نبیوں نے جب بھی بگڑی ہوئی قوم کے سامنے اپنی دعوت توحید پیش کی ہے اور ان کے شرک کی تردید کی ہے تو قوم نے کبھی بھی اسے آسانی سے قبول نہیں کیا۔ بلکہ جہاں تک ان کا بس چلا' انہوں نے دعوت کا راستہ بھی روکا اور دعوت پیش کرنے والے کو اذیتیں بھی پہنچائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی اس دعوت کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کیلئے انہوں نے ہر وہ حربہ اختیار کیا' جو شرک قومیں اختیار کرتی رہی ہیں۔ اگلی آیات کریمہ میں اسی کا ذکر ہے۔ فرمایا:

آیت: ۸۰-۸۱ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ○ وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ ''اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے جواب دیا: کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ درآنحالیکہ اس نے میری رہنمائی فرمائی اور میں ان سے نہیں ڈرتا' جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔ مگر یہ کہ کوئی بات میرا رب ہی چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ تو کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے؟ اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں' جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے' جن کے باب میں اس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری۔ تو ہم دونوں گروہوں میں سے امن واطمینان کا زیادہ سزاوار کون ہے اگر تم جانتے ہو؟''۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم ایک جھگڑالو قوم تھی' بال کی کھال اتارنا اور بات بات میں الجھنا' یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ ودعوت میں بھی انہوں نے اسی رویے سے کام لیا۔ اللہ کے بارے میں قسم قسم کی باتیں کہنے لگے' جیسے ہر دور کے مشرکین کہتے رہے ہیں۔ اس کے جواب میں ابراہیم علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ تم اللہ کے بارے میں مجھ سے کس بنیاد پر جھگڑتے ہو؟ کیونکہ اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں کچھ بھی جاننے کا ذریعہ وحی الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں' جسے وضعی علوم کے واسطے سے جان لیا جائے وحی الٰہی صرف اللہ کے رسولوں پر اترتی ہے۔ انہی کے واسطے سے دنیا کو پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی ذات کیسی ہے' اس کی صفات کیا ہیں' وہ وحدہٗ لاشریک ہے' کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں' کوئی بھی اس کی ذات میں شریک نہیں' وہ کن باتوں میں راضی ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے۔ یہ سراسر وہ علم ہے' جو رسولوں پر نازل ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ نے نبوت دی ہے مجھ پر وحی اترتی ہے۔ اس لئے اللہ کی راہنمائی کے مطابق اور اس کے دیئے ہوئے علم سے میں تمہاری رہنمائی کر سکتا ہوں۔ لیکن تم اس علم سے بالکل بے خبر ہو تو پھر تم مجھ سے اللہ کے بارے میں کس طرح جھگڑتے ہو کیونکہ راستے کا جاننے والا اور راستے سے بے خبر' دونوں برابر تو نہیں ہوتے۔ اگر منزل پر پہنچنا مقصود ہو تو عقل کی بات یہ ہے کہ جو راستے سے واقف ہو اسی کو راہنما بنایا جانا چاہئے۔ وہ چھوٹا بھی ہو تو محض اس لئے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ چھوٹا ہے بڑے اس کے پیچھے کیسے چلیں۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ کسی راستے پر چلنے والے بھی چلنے سے پہلے پوچھتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اس راستے کو جاننے والا ہے؟ اور اگر ان میں سے کوئی بھی چھوٹا ہونے کے باوجود راستے

Marfat.com

کو جاننے والا ہو تو اسی سے کہا جاتا ہے کہ تم آگے چلو اور ہمیں راستہ دکھاؤ۔ جو لوگ اس بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ کبھی بھی منزل تک نہیں پہنچ پاتے' ہمیشہ راستے کی بھول بھلیوں میں الجھ کر منزل گم کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام یہی فرمارہے ہیں کہ مجھے اللہ نے ہدایت دی ہے۔ میں بتا سکتا ہوں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے اور توحید کا صحیح تصور کیا ہے۔ تم بے علمی سے اگر میری بات قبول کرنے سے انکار کرو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔

دوسری بات اس آیت کریمہ میں یہ کہی جارہی ہے کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے نام نہاد معبودوں سے ڈرانا شروع کیا کہ ہم نے اللہ کے ساتھ جن کو شریک بنا رکھا ہے تم اگر ان کی تردید کرتے ہو اور ہمیں بھی ان کو معبود ماننے اور اللہ کی صفات میں ان کو شریک جاننے سے روکتے ہو تو یاد رکھو کہ یہ بہت پہنچے ہوئے لوگ ہیں ان میں بڑی قوتیں ہیں یہ تمہیں نقصان پہنچائیں گی تم پر ان کی مار پڑ سکتی ہے تم کسی نہ کسی بڑے حادثے سے دوچار ہو سکتے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آیت کریمہ میں یہ فرمارہے ہیں کہ جن چیزوں کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے میں ان سے نہیں ڈرتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ باقی مخلوقات کی طرح بے بس مخلوق ہیں۔ وہ نفع و نقصان کی مالک نہیں' اللہ کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ اگر اللہ نہ چاہے تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں! اگر اللہ کو منظور ہو کہ مجھے کوئی نقصان پہنچے تو پھر کسی کے ذریعے بھی پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اگر اللہ میری حفاظت فرمائیں تو دنیا کی ساری مخلوق بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس لئے جن سے تم مجھے ڈراتے ہو میں ان سے ہرگز نہیں ڈرتا۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اللہ کی قدرت بے پناہ ہے اور اس کے مقابلے میں کسی کو کوئی طاقت حاصل نہیں اسی طرح اس کا علم بھی ہر چیز کو محیط ہے۔ وہ میری کسی ضرورت اور کسی کمزوری سے بے خبر نہیں' وہ میری ہر حالت سے آگاہ ہے۔ اس لئے اگر اسے میری بھلائی منظور ہے تو کوئی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کی بے خبری میں مجھے کوئی نقصان پہنچائے۔ نقصان پہنچانے والے بے خبر ہو سکتے ہیں' لیکن اللہ کی ذات کسی چیز سے بے خبر نہیں۔ اس کی قدرت بھی بے پناہ ہے اور اس کا علم بھی بے پایاں۔ جس آدمی کو اللہ کے علم اور قدرت پر بھروسہ ہو اور وہ اپنے آپ کو پوری طرح اس کے سپرد کر چکا ہو اس کو اللہ تعالیٰ دل کا ایسا اطمینان اور ایسی قوت سے مشرف فرماتے ہیں کہ راہ حق میں بڑی سے بڑی رکاوٹ اس کا راستہ نہیں بدل سکتی اور اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے دنیا بھر کی مخالفت بھی اس کو کبھی پریشان نہیں کر سکتی۔ وہ اس راستے میں ہر آنے والی تکلیف کو اللہ کا انعام سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں اس کی نگاہوں میں ہوں اور اس کی حفاظت ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ مجھے اگر پھر بھی کوئی نقصان پہنچتا ہے تو یہ میرے کسی گناہ کا نتیجہ ہے۔ مجھے اپنے گناہوں کی فکر ہونی چاہئے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کی حفاظت مجھ سے اٹھ جائے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی جن کو اس طرح کا یقین میسر آجاتا ہے وہ اللہ کے راستے میں سر تو کٹوا دیتے ہیں' لیکن دشمن اپنی ساری طاقتوں کے باوجود انہیں کلمۂ حق کہنے سے روک نہیں سکتا اور نہ انہیں جھکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ صلاح الدین شہید مدیر "تکبیر" ایک دفعہ پنجاب یونیورسٹی میں میرے مہمان تھے۔ انہوں نے بتایا کہ افغان مجاہدین نے مجھ سے کہا کہ آپ کی زندگی کو بہت خطرہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے تحفظ کیلئے کوئی انتظام کریں۔ صلاح الدین صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کا بہت شکریہ' زندگی موت اللہ کے قبضے میں ہے۔ جب تک اس کو منظور ہے' میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پھر ان سے انہوں نے ایک سوال کیا کہ آپ مجھے یہ بتائیے کہ کیا آپ مصر کے صدر انوار السادات جیسا میرا تحفظ کر سکتے ہیں یا ہندوستان کے وزیراعظم اندرا گاندھی جیسی سکیورٹی مجھے فراہم کر سکتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ یہ تو ہم سے ممکن نہیں۔ صلاح الدین صاحب نے کہا: دیکھئے! اس قدر سکیورٹی کے باوجود وہ دونوں اپنی موت کو نہ روک سکے اور میرا بھی جو موت کا وقت مقرر ہے' مجھے بھی آپ اس سے نہیں بچا سکیں گے۔

اس کے بعد کی آیت کریمہ میں اظہار تعجب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ کس قدر عجیب بات ہے کہ تم اللہ جیسی عظیم ذات کے ساتھ اس کی مخلوق

Marfat.com

شریک ٹھہرا رہے ہو اور پھر ان کے ساتھ وہ معاملہ کر رہے ہو جو تمہیں اللہ کے ساتھ کرنا چاہئے۔ ان سے امیدیں باندھتے ہو ان سے خوف کھاتے ہو ان کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہو ان کے سامنے سر جھکاتے ہو غرضیکہ تم نے انہیں اللہ کی صفات میں شریک کر رکھا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے کوئی دلیل تم پر نازل نہیں کی۔ جس کی بنیاد پر تم نے انہیں اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے۔ ذرا غور کرو! اس سے بڑھ کر اور کیا جرم ہوگا؟ اگر تم دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کے ساتھ کسی اور کو اس کے اختیار میں شریک قرار دے کر اس کے ساتھ ویسے ہی ادب و احترام اور خوف و رجا کا معاملہ کرنے لگو جیسے بادشاہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور بادشاہ کے اختیارات تم اپنے تئیں اسے سونپ دو تو جب بادشاہ کو اس کی خبر ہوگی کہ تم نے اس طرح کی حرکت کی ہے تو اندازہ کر سکتے ہو کہ بادشاہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ حالانکہ بادشاہ بھی باقی انسانوں کی طرح ایک انسان ہے۔ وہ بھی احتیاجات سے پاک نہیں۔ کسی اور کو اس کا ہمسر بنا دینا' یہ کوئی غیر معمولی واقعہ بھی نہیں۔ بایں ہمہ اس کی غیرت جوش میں آئے گی تو وہ تمہیں وہ سزا دے گا' جو دوسروں کیلئے عبرت بن جائے۔ لیکن اللہ جیسی عظیم ذات جو خالق کائنات' ہر طرح کی احتیاج سے پاک اور ہر طرح کی ہمسری سے ماورا ہے' تم اس کے ساتھ اس کی مخلوقات میں سے کسی کو شریک کرتے ہو۔ جبکہ اس نے تمہیں اس شرکت کا حق نہیں دیا تو کیا تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ اس پر تمہاری گرفت ہو سکتی ہے اور تمہیں کسی خطرناک انجام سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے؟ بلکہ تمہاری جسارت کا عالم یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ تم اپنے انجام سے ڈرو' تم اپنے نام نہاد شرکاء کے عتاب سے مجھے ڈرا رہے ہو حالانکہ وہ بھی میری طرح ایک مخلوق ہیں' جو احتیاجات میرے ساتھ لگی ہیں' ان سے وہ بھی مبرا نہیں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ تم یہ معاملہ اس صورت میں کر رہے ہو کہ تم اللہ کے وجود کو مانتے بھی ہو' اس کی قدرتوں کے بھی قائل ہو یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ کائنات کا خالق وہی ہے اور زندگی اور موت اسی کے قبضے میں ہے۔ اس ایمان کے اعتبار سے تو میں اور تم دونوں برابر ہیں۔ لیکن میں صرف اس کی ذات اور اس کی چند صفات ہی کو تسلیم نہیں کرتا' بلکہ اس کو ہر طرح وحدہ لاشریک بھی سمجھتا ہوں اور اسی کو اس کائنات کا اور اپنا حقیقی حکمران جانتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اپنے انجام سے ڈرنا مجھے چاہئے یا تمہیں؟ ہم دو گروہ ٹھہرے' تم ہی فیصلہ کرو' ہم دونوں میں سے کون سا گروہ ہے جو اللہ کے عتاب اور غضب سے اور اس کے عذاب سے امن میں ہے' میں یا تم؟ کیا تم اتنی واضح باتوں کے بعد بھی ہوش میں نہیں آؤ گے اور اپنی گمراہیوں پر اور اپنے انجام پر غور نہیں کرو گے جبکہ اس کی ذات و صفات کا معاملہ اس قدر نازک ہے اور وہ اس معاملے میں اس قدر غیرت مند ہے کہ اس میں معمولی کمی بیشی بھی انسان کو خوفناک انجام سے دوچار کر سکتی ہے۔ اس حوالے سے ارشاد فرمایا:

آیت:۸۲ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ O ''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا' وہی لوگ ہیں' جن کیلئے امن اور چین ہے اور وہی راہ یاب ہیں''۔

توحید کے باب میں یہ آخری بات ہے' جس سے عقیدۂ توحید کی نزاکت کا احساس ہوتا ہے کہ خدا کو مان لینا اور اس کی کسی حد تک عبادت بھی کر لینا اس کا اعتبار اس وقت تک نہیں ہو سکتا اور اللہ کے یہاں اس کی کوئی قدر و قیمت اس وقت تک نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ آدمی ہر طرح کے ظلم سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھے۔ ظلم سے مراد یہاں ہر طرح کی کوتاہی نہیں اور نہ حدود سے تجاوز ہے' بلکہ اس سے مراد شرک ہے کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام ظلم سے مراد حقوق و فرائض سے کوتاہی سمجھے اور اس وجہ سے بہت پریشان ہوئے کہ کون ایسا آدمی ہوگا' جو زندگی میں کبھی نہ کبھی حد سے تجاوز یا کوتاہی کا ارتکاب نہیں کرتا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معمولی کوتاہیاں بھی قیامت کے دن ہمیں امن سے محروم رکھیں گی اور ہم وہاں فلاح و کامیابی حاصل نہیں کر پائیں گے۔ چنانچہ بعض صحابہ اسی پریشانی کے باعث آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی پریشانی اور خوف کا

Marfat.com

اظہار کیا آنحضرت نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ نہیں' جو تم سمجھ رہے ہو۔ بلکہ اس سے مراد شرک ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ "بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے" ﴾

اس لئے اگر کوئی آدمی قیامت کے دن' عذاب سے بچنا چاہتا ہے اور اس کی یہ آرزو ہے کہ میں اللہ کے عتاب سے امن میں رہوں تو اسے توحید کے معاملے میں نہایت محتاط رہنا چاہئے اور اللہ کی ذات وصفات میں کبھی شرک کی پرچھائیں بھی گوارا نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن اگر رویہ یہ ہو جائے جیسے ہمارا ہے کہ ہم اس معاملے میں حد درجہ غافل ثابت ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں اس حوالے سے بڑی بڑی باتیں نہ صرف برداشت کر لی جاتی ہیں بلکہ ان پر تنقید کرنا رواداری کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے دینی اعتقادات میں جابجا ایسی دراڑیں پڑی ہیں' جس سے عقیدۂ توحید بھی معرض خطر میں ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اس صورت حال کی طرف گہرے طنز کے انداز میں توجہ دلائی تھی۔ اے کاش! اس سے ہم اپنے رویے پر غور کرنے کیلئے تیار ہو جائیں۔ انہوں نے کہا تھا

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر — جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر — جو کوکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں — پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
شہیدوں سے جاجا کے مانگیں دعائیں — مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے — نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

وَتِلۡكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيۡنٰهَآ

اور یہ ہماری

اِبۡرٰهِيۡمَ عَلٰى قَوۡمِهٖ‌ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ‌ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيۡمٌ

دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلے میں عطا کی تھی۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کر دیتے ہیں۔ بیشک

عَلِيۡمٌ ﴿۸۳﴾ وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ‌ؕ كُلًّا هَدَيۡنَا‌ۚ وَنُوۡحًا هَدَيۡنَا

تمہارا پروردگار دانا اور خبردار ہے۔ اور ہم نے ان کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بخشے۔ (اور) سب کو ہدایت دی۔ اور پہلے نوحؑ

مِنۡ قَبۡلُ‌ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيۡمٰنَ وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡسُفَ وَ

کو بھی ہدایت دی تھی اور ان کی اولاد میں سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور

Marfat.com

مُوسٰى وَهٰرُونَ ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٨٤﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَ

موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی۔ اور ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلا دیا کرتے ہیں۔ اور زکریاؑ اور یحییٰؑ اور

عِيسٰى وَإِلْيَاسَ ۚ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِينَ ﴿٨٥﴾ وَإِسْمٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ

عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو بھی۔ یہ سب نیکوکار تھے اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ

وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِينَ ﴿٨٦﴾ وَمِنْ اٰبَائِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَ

اور لوطؑ کو بھی اور اُن سب کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔ اور بعض بعض کو اُن کے باپ دادا اور اولاد

إِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٨٧﴾ ذٰلِكَ

اور بھائیوں میں سے بھی اور اُن کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔ یہ خدا کی

هُدَى اللّٰهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ

ہدایت ہے اس پر اپنے بندوں میں سے جسے چاہے چلائے۔ اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو

عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٨٨﴾ أُولٰئِكَ الَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ

عمل وہ کرتے تھے سب ضائع ہو جاتے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم (شریعت) اور نبوت

وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا

عطا فرمائی تھی اگر یہ (کفار) ان باتوں سے انکار کریں تو ہم نے اُن پر ایمان لانے کے لیے ایسے لوگ مقرر کر دیئے

بِكٰفِرِينَ ﴿٨٩﴾ أُولٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ

ہیں کہ وہ اُن سے کبھی انکار کرنے والے نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی تھی تو تم اُنہیں کی ہدایت کی

لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِينَ ﴿٩٠﴾

پیروی کرو۔ کہہ دو کہ میں تم سے اس (قرآن) کا صلہ نہیں مانگتا۔ یہ تو جہان کے لوگوں کے لیے محض نصیحت ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم ؑ کے ذریعے ان کی قوم پر حجت قائم کر دی:

آیت:۸۳ وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

''یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر قائم کرنے کیلئے بخشی ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں بے شک تیرا رب حکیم اور علیم ہے''۔

یہ بات ہم ایک سے زیادہ مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ مکی سورتوں کا موضوع عقائد کی اصلاح ہے اور عقائد میں بھی سب سے زیادہ اور سب سے پہلے عقیدۂ توحید پر زور دیا جاتا ہے۔ کیونکہ باقی دونوں عقیدے اسی عقیدے سے پھوٹتے ہیں۔ اگر یہ عقیدہ محفوظ نہ رہے تو دوسرے دونوں عقیدے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اب تک سورۃ انعام میں مختلف حوالوں سے اور مختلف اسالیب میں عقیدۂ توحید پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلے میں مشرکین کی جانب سے اٹھائے جانے والے اعتراضات اور مطالبات کا مناسب جواب دیا گیا ہے اور بار بار انہیں کبھی تفہیم کے انداز میں اور کبھی تنبیہ کے انداز میں وارننگ دی گئی ہے کہ اگر تم نے اپنے عقائد کی اصلاح نہ کی اور تم شرک سے باز نہ آئے تو تم پر اللہ کا عذاب بھی آ سکتا ہے۔ گزشتہ رکوع میں خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالہ سے عقیدۂ توحید کو ایک نئے اسلوب میں واضح فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم سے چونکہ قریش مکہ کا رشتہ دو گونہ تھا وہ ان آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نسبی وارث بھی سمجھتے تھے اور دینی وارث بھی۔ اس لحاظ سے حضرت ابراہیم ان کیلئے سب سے بڑا سرمایۂ افتخار تھے اور ہر بات پر وہ بار بار انہی کا حوالے دیتے تھے۔ چنانچہ گزشتہ رکوع میں ان کو یہ بتایا گیا کہ دیکھو حضرت ابراہیم مشرک نہیں تھے بلکہ وہ تو توحید کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ البتہ ان کی قوم مشرک تھی اور اللہ کے ساتھ بہت سی چیزوں کو انہوں نے شریک بنا رکھا تھا اور ابراہیم کی ساری دعوت اپنی قوم کو انہی چیزوں سے ہٹا کر توحید کے راستے پر ڈالنے کیلئے تھی جس طرح تم آج محمد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کر رہے ہو اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے ان کی بھی محض اس لئے مخالفت کی تھی کہ وہ شرک کی تردید کرتے اور توحید کی دعوت دیتے تھے۔ پھر شرک کی تردید میں اور اللہ کی وحدانیت پر جو انہوں نے دلیل پیش فرمائی اور جس دلیل کی بنیاد پر انہوں نے صاف صاف اللہ کی توحید کو پیش کیا اس کا ذکر فرمایا گیا ہے اور یہ وہ دلیل ہے جس نے ابراہیم کی قوم کو اگر ایک طرف لاجواب کیا تو دوسری طرف ان کو اتنا مشتعل کر دیا کہ وہ ابراہیم کی دعوت کو ہر ممکن طریقے سے روکنے اور ختم کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے اس پیش نظر آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو ان کے سامنے دلیل پیش کی تھی وہ ان کے اپنے زرخیز دماغ کی سوچ کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ سراسر اللہ کی دین تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گزشتہ رکوع سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ایک تفکر اور تدبر کرنے والے دماغ کے مالک تھے وہ کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرتے اور اس سے اللہ کی وحدانیت پر استدلال کرتے یا استدلال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن یہ دلیل محض ان کے تفکر کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ یہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ تھی یعنی اس کا مفہوم یہ ہے کہ ابراہیم مسلسل کائنات پر غور کرتے رہے اور وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے رہے کہ یا اللہ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تو اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور تو نے ہی ہر چیز کو تخلیق فرمایا اور زندگی اور موت تیرے ہی قبضے میں ہے لیکن یہ میں نہیں جانتا کہ تو کیسا ہے؟ تیری صفات کیا ہیں؟ تیری رضا کا حصول کس طرح ممکن ہے' میں تیری مخلوق تو ہوں لیکن میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ میں کیا کروں؟ جس کے نتیجے میں تجھے پالوں اور تیری رضا حاصل کر لوں اس طرح کی باتیں ہیں جو نبوت سے پہلے مستقبل کے پیغمبر کے غور کا موضوع ہوتی ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ نبوت ملنے سے چند سال پیشتر آپ میں تنہائی پسندی کا ذوق بڑھ گیا تھا اور آپ مسلسل غور و فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ غار حرا میں کئی کئی دنوں تک قیام فرماتے اعتکاف کی حالت میں رہتے اور آپ کی عبادت حدیث کی زبان میں تحنث کہی گئی ہے یعنی آپ مسلسل اللہ کی صفات کی معرفت اور اپنے مقصد زندگی کے حوالے سے غور و فکر میں ڈوبے رہتے اور یہ غور

Marfat.com

انبیا میں بڑھتا جاتا ہے تا آنکہ اللہ کا فرشتہ آ کر ان کے سامنے حقیقت واشگاف کر دیتا ہے اور پھر ان پر اللہ کی کتاب اترتی ہے انہیں ہدایت سے نوازا جاتا ہے اور جب انہیں حکم ملتا ہے کہ جاؤ اپنی قوم کو جا کر سمجھاؤ تو انہیں قوم کے پاس دعوت لے جانے سے پہلے دعوت کو پیش کرنے کا طریقہ اور اس کو موثر بنانے کیلئے دلائل عطا کئے جاتے ہیں تا کہ وہ قوم کو اس دعوت کو قبول کرنے کیلئے آمادہ کر سکیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے غور وفکر کے تسلسل میں بالآخر جب نبوت سے سرفراز ہوئے اور پھر قوم کے سامنے انہیں دعوت پیش کرنے کا حکم دیا گیا تو اللہ نے یہ دلیل انہیں سکھائی جس کا ذکر گزشتہ رکوع میں ہوا اور یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ دلیل ہم نے ابراہیم کو عطا کی تھی تا کہ اس دلیل کو پڑھنے والا اس بات میں یکسو ہو جائے کہ اس دلیل میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جو اس سے نتیجہ نکالا گیا ہے اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں اسلئے کہ قلب و ذہن کی کاوشوں میں چاہے وہ ہزار اخلاص کا نتیجہ ہوں یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں غلطی کا امکان نہیں ہو سکتا کیونکہ کہ انسان کی کوئی کاوش غلطی سے مبرا نہیں۔ غلطی سے مبرا اور پاک اگر کوئی چیز ہے تو صرف وہ علم ہے جو اللہ کی طرف سے وحی الٰہی کے ذریعے رسولوں کو عطا ہوتا ہے تو جب کسی شعبۂ علم یا کسی بات کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اسے اللہ نے نازل فرمایا ہے تو پھر اس کے بارے میں بحث ختم ہو جاتی ہے۔ اب اسے یا ماننا ہے اور سرخرو ہونا ہے اور یا انکار کر کے برباد ہونا ہے۔ اس لئے یہاں ہماری یکسوئی اور ہمارے اطمینان کیلئے ارشاد فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام یقیناً غور وفکر کرنے کے عادی تھے لیکن اس دلیل کو ان کے محض غور وفکر کا نتیجہ نہ سمجھنا بلکہ یہ اللہ کی جانب سے عطا کردہ علم ہے جو ہر طرح کی غلطی اور تسامح سے پاک ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں یہ بھی فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو یہ حجت اور دلیل اس لئے عطا کی تھی تا کہ وہ اپنی قوم کے مقابل اسے پیش فرمائیں اور ان پر حجت تمام فرمائیں اور ان کے شرک اور کفر کی تردید میں اسے استعمال کریں۔ یہ کام وہ ہے جو پیغمبر نبوت ملنے کے بعد کرتا ہے اگر چہ وہ نبوت سے پہلے بھی اللہ کے علم میں نبی اور رسول ہوتا ہے لیکن خود اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ مجھ پر یہ ذمہ داری ڈالنے والا ہے اس لئے قوم کی اصلاح کے بارے میں وہ ذمہ دار بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بھی رسول کو نبوت سے پہلے قوم کے عقائد کی اصلاح کیلئے کوشش کرتا ہوا کبھی نہیں دیکھتے وہ ایک سیرت واخلاق کی نظافت وطہارت اور آب وتاب رکھنے والی شخصیت کا حامل تو ہوتا ہے اس کی اپنی ذات یقیناً ہر طرح کے عیب سے پاک ہوتی ہے۔ وہ فکر اور عمل کی کسی کج روی کا شکار نہیں ہوتا اسے مسلسل اللہ کی صفات اور اپنے مقصد حیات کو جاننے کی فکر بھی ہوتی ہے لیکن قوم کی اصلاح کے بارے میں وہ فکر مند ہوتے ہوئے بھی کسی تبلیغ ودعوت سے کام کہیں نہیں لیتا یہ کام وہ اس وقت کرتا ہے جب اللہ کی طرف سے اس پر مامور کیا جاتا ہے۔ یہ دلیل جو آپ کو عطا کی گئی اور پھر کہا کہ اس سے قوم پر حجت تمام کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب آپ کو نبوت کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد پھر یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ اس دلیل میں اگر ہم تکرار کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ غیرِ خدا کو کہا گیا ہے کہ میرا رب ہے حالانکہ کوئی پیغمبر اپنے رب کے بارے میں کسی شک میں مبتلا نہیں ہوتا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ محض اپنی قوم کو سمجھانے کیلئے ایک اسلوب بیان تھا' عقیدے کا اظہار نہیں تھا۔ دلیل کا ایک انداز تھا جس کا مفہوم زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ جیسے تم کہتے ہو کہ یہ ہمارا رب ہے اسی طرح تم یہ بھی سمجھتے ہو کہ یہ میرا بھی رب ہے تو چلو تمہارا سمجھنا اپنی جگہ لیکن آگے بڑھ کر ہم یہ تو دیکھیں کہ جس کی چمک دمک سے تم نے خدائی اخذ کی ہے لیکن ڈوب جانے کے بعد اب اس کی لاش تمہارے قدموں میں پڑی ہے بتاؤ اب اس کی ربوبیت اور خدائی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

اللہ تعالیٰ جس کے چاہتا ہے درجے بلند کر دیتا ہے:

اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ ہم جس کے چاہتے ہیں۔ درجے بلند کر دیتے ہیں بات چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہو رہی ہے صاف مطلب یہ ہے کہ ہم نے ابراہیم کے درجات بلند کئے اور درجات کو یہاں جمع لایا گیا اور ساتھ تنوین بھی لائی گئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف درجے ہی

Marfat.com

بلند نہیں کئے گئے بلکہ درجوں پر درجے بلند کئے گئے یعنی مسلسل اللہ کی طرف سے نوازشات کی ایک بارش تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر برستی رہی۔ یوں تو پوری زندگی حضرت ابراہیم کی ذات اللہ کی نوازشات کا مورد رہی ہے لیکن جوانی' آغاز نبوت اور نبوت کے سفر میں مسلسل یہ انعامات خود بولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ جب تک آپ کو نبوت نہیں ملی تو اللہ کا آپ پر سب سے بڑا انعام یہ تھا کہ آپ کو ایک غوروفکر کرنے والا دماغ عطا فرمایا گیا۔ جوانی دیوانی کہلاتی ہے جس میں غوروفکر تو دور کی بات ہے سرمستیاں اور بداعمالیاں اس کی پہچان سمجھی جاتی ہیں اور اگر کبھی دماغ سوچتا بھی ہے تو ہمیشہ انہی راہوں پر چلنے کیلئے لیکن ایسی سوچ جو بے سمت نہ ہو اور جس کی ایک متعین جہت ہو اور جو مسلسل اپنی منزل کی تلاش میں ہو یہ اللہ کی وہ عطا ہے جس سے اس کی خاص بندے یا اس کے نبی نوازے جاتے ہیں۔ بعض ایسے نوجوان بھی ہوتے ہیں جو جوانی کو عیاشیوں میں ڈبونے سے تو اجتناب کرتے ہیں لیکن یہ بات کہ انہیں اس کائنات میں غوروفکر کی ایک ایسی عادت ہو جس میں وہ صحیح سمت پر آگے بڑھنا چاہتے ہوں ایسے نوجوانوں کو ڈھونڈا جائے تو لاکھوں میں شائد چند مل سکیں۔ سائنسدانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ غوروفکر ہی انہیں سائنس میں آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے لیکن ان کا غوروفکر خاص حد سے کبھی آگے نہیں نکلتا۔ اور ایک خاص دائرے کی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرتا۔ نیوٹن کو دیکھ لیجئے اس نے غوروفکر ہی کے نتیجے میں کیسے کیسے اصول دریافت کئے۔ لیکن اس کا یہ غوروفکر مخلوقات تک محدود رہا لیکن بالکل سامنے کی بات کہ آخر پوری کائنات کو اصول کشش کے ساتھ کس نے باندھ رکھا ہے اور وہ ذات کونسی ہے اس منزل تک کبھی اس کا دھیان نہیں پہنچا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر باقی انبیاء کی طرح اللہ کا پہلا انعام یہ ہے کہ اللہ نے انہیں نہ صرف غوروفکر کی عادت سے نوازا بلکہ ان کو صحیح سمت بھی عطا فرمائی اور بالآخر ان کو منزل آشنا بنایا یہ بات جو میں نے عرض کی ہے کہ کم خوش نصیب لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی مرحلے پر رک کر کبھی غوروفکر کرنے کے عادی ہوں۔ یہ بات صرف افراد ہی کی حد تک نہیں تو میں بھی اسی شناخت سے گزرتی ہیں جب کسی قوم پر اللہ کا کرم ہوتا ہے تو وہ قوم لاابالی پن اور حد سے بڑھی ہوئی لاپرواہی سے بچ کر غوروفکر کرنے کی عادت بنالیتی ہے جب کوئی حادثہ یا سانحہ ہوتا ہے تو اس کے سوچنے سمجھنے والے دماغ مسلسل اس پر غوروفکر کے بعد اپنے لئے صحیح نتائج اخذ کرتے اور اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جو قوم اس نعمت سے محروم ہوتی ہے ان کی پیٹھ پر حوادث کا بڑے سے بڑا کوڑا بھی برستا ہے تو وہ چیخنے چلانے کے بعد پھر اپنے ڈگر پر چل پڑتی ہے نہ رکنے کی کوشش کرتی ہے اور نہ رک کر سوچنے کی عادت پیدا کرتی ہے اپنے آپ ہی کو دیکھ لیجئے سقوط ڈھاکہ کی صورت میں ہم کتنے بڑے سانحے سے دوچار ہوئے لیکن اس قوم کے سوچنے والے دماغوں نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا کوئی عدالتی کمیشن بٹھایا بھی تو اس کی رپورٹ کو روک لیا گیا۔ جہاں تک اجتماعی طرز عمل کا تعلق ہے حکمرانوں سے لے کر عوام تک دور دور تک کوئی تبدیلی تو کیا تبدیلی کے آثار تک بھی نظر نہ آئے کسی شاعر نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا تھا

؎ سانحے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں سانحہ دیکھ کر

روڈ ایکسیڈنٹ میں کسی کا زخمی ہوجانا پریشان کن تو ہے لیکن تعجب خیز نہیں لیکن یہ بات انتہائی تشویش اور تعجب کی ہے کہ سڑک پر زخمی تڑپ رہا ہو اور گزرنے والوں میں کوئی رک کر اس کو مدد دینے کی کوشش نہ کرے۔ ایکسیڈنٹ سے ایک زندگی کو خطرہ ہوتا ہے اور اس رویے سے انسانیت خطرے کا شکار ہوجاتی ہے۔ یہاں اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جن درجات کا ذکر فرمایا ہے ان کی تفصیل تو بہت طویل ہے لیکن ان میں سب سے پہلا درجہ جو انہیں دوسروں سے نمایاں کرتا ہے وہ ان کا صحیح سمت میں مسلسل غوروفکر کرنا تھا جس سے بطور خاص اللہ نے انہیں بہرہ ور فرمایا تھا' اس کے علاوہ جو انعامات ہوئے ہیں اس کو سمجھنے کیلئے ان کی زندگی میں مسلسل ایثار و قربانی کی داستان کو پڑھ لینا چاہئے کہ وہ ایک ایک کر کے سب کچھ اللہ کے راستے

Marfat.com

قربان کرتے چلے گئے اور قدرت نے اس پر مسلسل انعامات کی بارش برسائی۔وطن چھوڑا تو اس سے بہتر وطن عطا فرمایا' مشرک عزیزوں سے قطع تعلق کیا تو اللہ نے ایسی صالح اور نامور اولاد عطا فرمائی جن سے امتیں وجود میں آئیں۔ہجرت کی صورت میں ملکوں ملکوں کی خاک چھاننا پڑی تو اس کے بدلے میں اللہ نے بیت اللہ کی ہمسائیگی عطا فرمائی اور اپنے گھر کا متولی بنا کر دنیا بھر کا امام بنا دیا اور مزید انعامات کو دیکھنے کیلئے اس کی بعد کی آیات کو غور وفکر سے پڑھنا چاہئے جن میں سے ایک ایک آیت سے ان پر انعامات کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ بے شک تیرا رب حکمت والا اور علم والا ہے یعنی جب کسی کو وہ عطا کرتا ہے تو وہ اندھے کی بانٹ کی طرح نہیں ہوتا کہ جو سامنے آیا اس کو دے ڈالا مستحق محروم رہ گیا غیر مستحق کا دامن بھر دیا۔اللہ کی عطا تو اس کی علم اور حکمت کا نتیجہ ہوتی ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کون اس عطا کا استحقاق رکھتا ہے اور کون ہے جو اس کی عطاؤں کا حقیقی شکر گزار ہوگا۔اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس نے جو بے شمار انعامات سے نوازا تو یہ اس کے علم وحکمت کا تقاضہ تھا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام یقیناً جائز طور پر اس کا استحقاق رکھتے تھے اور پھر انہوں نے شکر گزاری سے ہر طرح اپنے آپ کو اس کا سزاوار ثابت کیا۔

نسبی شرافت بھی اعمالِ صالحہ سے ہی فائدہ مند ہوتی ہے:

اسکے بعد کی آیات کو پڑھنے سے پہلے دو باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں پہلی بات یہ کہ ذاتی صلاحیت وشرافت کے علاوہ جو چیز آدمی کو دوسروں سے معزز بناتی اور ممتاز کرتی ہے وہ اس کی نسبی شرافت ہے۔ایک آدمی اپنی ذات میں کتنا بھی عظیم ہو لیکن اگر وہ نسبی شرافت سے تہی دامن ہے تو کبھی نہ کبھی اسکے چھینٹے اس کی ذات پر پڑے بغیر نہیں رہتے۔اگرچہ ذاتی شرافت ان چیزوں سے ماورا ہوتی ہے لیکن اللہ کے انعامات میں جہاں آدمی کی ذاتی صلاحیت وشرافت ہے اسی طرح قدرت کا یہ بھی بہت بڑا انعام ہے کہ اسے شرافتِ نسب سے نوازا جائے اور یہ نسبی شرافت اگرچہ صرف اس بات کا نام ہے کہ اسکے آباؤ اجداد کیسے ہیں۔لیکن اگر اس میں اس بات کا بھی اضافہ ہو جائے کہ اس کے آباؤ اجداد بھی عظیم ہوں اور آگے اولاد بھی ویسی ہی عظمتوں کی وارث ثابت ہو تو پھر تو عزت وافتخار میں وہ اضافہ ہوتا ہے کہ جس میں کسی اور اضافے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسی نسبی شرافت سے نوازا تھا کہ آپکے آباؤ اجداد میں انبیاء ورسل گزرے تھے اور جہاں تک اولاد کا تعلق ہے اس میں باقی دنیا کے بارے میں تو ہم نہیں جانتے لیکن جہاں تک مشرق وسطیٰ کا تعلق ہے اس میں جتنے نبی اور رسول آئے وہ سارے آپ ہی کی اولاد میں سے تھے۔جن کی تفصیل ان آیات میں آرہی ہے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ انسان کی اللہ کے یہاں سرفرازی اور سرخروئی کیلئے اگرچہ ذاتی ایمان وعمل ہی کام آئیں گے، نام ونسب نہ کوئی فائدہ دے گا نہ کوئی نقصان دے گا۔اگر آدمی کا دامن ایمان وعمل سے خالی ہے تو اس کے آباؤ اجداد کا ایمان وعمل اس کے کسی کام نہیں آئے گا اور اگر وہ خود اس دولت سے بہرہ ور ہے تو اس کے آباؤ اجداد خدانہ کرے اگر کافر بھی ہوں تو اس کا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔لیکن یہ بھی امر واقع ہے کہ اپنے ذاتی ایمان وعمل کے ساتھ ساتھ اگر اللہ تعالیٰ نسبی شرافت بھی عطا فرمائے تو یہ اس کا بہت بڑا انعام ہے اس پر آدمی جائز حد تک فخر بھی کر سکتا ہے اور اللہ کا شکر بھی ادا کرنا چاہئے اور قیامت کے دن یقیناً اسے اس نسبی شرافت کا فائدہ بھی پہنچے گا۔لیکن اگر وہ نسبی شرافت سے بہرہ ور ہو کر بھی اپنی زندگی ایمان وعمل کے خلاف گزارتا ہے تو یہی عظمت قیامت کے دن اس کے عذاب میں اضافے کا سبب بھی بنے گی۔مثلاً کوئی آدمی سید ہے اور خود بھی ماشاء اللہ بہت نیک آدمی ہے تو آنحضرت ﷺ سے اس کا یہ نسبی رشتہ قیامت کے دن اس کے درجات میں بلندی کا باعث بنے گا لیکن وہ اگر سید ہونے کے باوجود بداعمالیوں کا ارتکاب کرتا ہے اور اسے یہ بھی خیال نہیں آتا کہ میں آل رسول میں سے ہو کر یہ کیا حرکتیں کرتا ہوں تو قیامت کے دن صرف اپنی بداعمالیوں کی سزا ہی

Marfat.com

نہیں پائے گا بلکہ سید ہونے کی وجہ سے دوسروں سے بڑھ کر اسے سزا ملے گی۔

دینِ ابراہیمی کے بارے میں قریشِ مکہ کی غلط فہمی:

دوسری بات ان آیات کو پڑھنے سے پہلے جو ذہن میں رہنی چاہئے وہ یہ ہے کہ قریشِ مکہ بار بار اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں اور ہمارا دین ملت ابراہیمی ہے ہم اسی طرح زندگی گزار رہے ہیں جس طرح ہم نے اپنے آباؤ اجداد انہی کے واسطے سے ہمیں ابراہیم کی یہ وراثت ملی ہے یہی ہمارے لئے فخر کی بات ہے ظاہر ہے ہم اس کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے یہ کہتے کہ تم ابراہیمی دین چھوڑ کر بے دین ہو گئے ہو تمہیں واپس اپنے دین میں آنا چاہئے لیکن تم بجائے اپنی فکر کرنے کے ہمیں سمجھانے پر تلے ہوئے ہو غلط راستے پر ہیں۔ ہمیں اسلام قبول کر لینا چاہئے انہیں یہ بات بتائی جا رہی ہے کہ تم نے حضرت ابراہیم اور ملت ابراہیمی کے بارے میں جو تصورات رکھے ہیں وہ سراسر مصنوعی اور غلط ہیں۔ آؤ! ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کے آباؤ اجداد کیسے تھے اور آگے ان کی اولاد کیسی تھی ان میں کتنے بڑے بڑے پیغمبر ہوئے وہ دنیا میں صرف اس لئے آئے تھے کہ توحید کی تعلیم دیں اور شرک کا خاتمہ کریں۔ ان کی پوری پوری زندگیاں شرک کی تردید میں توحید کو قائم کرنے میں گزریں۔ اسی راستے میں انہوں نے ایک سے ایک بڑھ کے دکھ اٹھائے لیکن مرتے دم تک وہ اسی کی دعوت دیتے رہے لیکن تم اس کے بالکل برعکس شرک کو اپنا دین بنا رکھا ہے اور پھر تمہیں اصرار یہ ہے کہ یہی ابراہیم کا طریقہ تھا۔ اس پر انہیں حضرت ابراہیم اور ان کے خاندان کی تفصیل بتائی جا رہی ہے کہ شاید وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی گمراہی سے باز آ جائیں چنانچہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

آیت: ۸۴ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ ''اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کئے' ان میں سے ہر ایک کو ہدایت بخشی' اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت بخشی اس سے پہلے اور اس کی ذریت میں سے داؤد' سلیمان' ایوب' یوسف' موسیٰ اور ہارون کو بھی' اور ہم نیکو کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں''۔

اولادِ حضرت ابراہیم:

سب سے پہلے یہاں حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کا ذکر فرمایا گیا۔ درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں دو بیٹے سب سے زیادہ نامور ہوئے' حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق۔ حضرت اسماعیل سب سے بڑے اور حضرت اسحاق ان سے چھوٹے ہیں۔ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ نبی کریم ﷺ انہی کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا ذکر آگے آ رہا ہے اور حضرت اسحاق یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے ہیں اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام کا خطاب اسرائیل تھا۔ اسرائیل عبرانی لفظ ہے اس کا معنی ہے عبداللہ۔

بنی اسرائیل کا مطلب:

جس قوم کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے وہ حضرت یعقوب کی اولاد ہیں کیونکہ بنی اسرائیل کا معنی ہے حضرت یعقوب کی اولاد۔ ظاہر

Marfat.com

حضرت یعقوب کی اولاد حضرت اسحاق کی اولاد ہے اور حضرت اسحاق کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہے اس لحاظ سے اسماعیل اور اسحاق دونوں کی اولادیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل ہیں۔ قریش مکہ کو یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم جانتے ہو کہ جس طرح تم حضرت اسماعیل کے واسطے سے حضرت ابراہیم کی نسل سے تعلق رکھتے ہو اسی طرح بنی اسرائیل بھی حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔ چنانچہ تم دونوں کے جو جد امجد ہیں یعنی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق ذرا اندازہ کرو وہ کیسے تھے اور آگے ان کی اولاد کیسی تھی کیا وہ لوگ شرک کرتے تھے یا وہ صرف اللہ کی توحید کی قائل تھے اور اس کی بندگی میں کسی اور کو شریک کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی بھی اسی توحید پر قائم رہ کر گزاری اور اپنی قوم اور اپنی اولاد کو اسی کی تعلیم دیتے رہے اور جوان پر ایمان نہ لائے زندگی بھر اسی توحید ہی کی وجہ سے ان کے ساتھ ان کی کشمکش جاری رہی اور جب ان کا آخری وقت آیا تو بجائے اس کے کہ انہیں یہ فکر ہوتی جیسا کہ دنیا میں ہر باپ کو ہوتی ہے کہ میرے بعد میرے بچے کس طرح جئیں گے اور ان کی زندگی کی ضروریات کا کیا بنے گا۔ اس بارے میں وہ انہیں ہدایات دیتے اور نصیحتیں کرتے لیکن قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ آخری وقت میں بھی انہیں اگر فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ یہ کہیں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک تو نہیں ٹھہرائیں گے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ کے سولہویں رکوع میں حضرت یعقوب جو حضرت ابراہیم کے پوتے اور بنی اسرائیل کے جد امجد ہیں کے بارے میں بتایا گیا ہے:

اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ ۖ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ○

''کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا بچو میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے ان سب نے جواب دیا ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیم اسماعیل اور اسحاق نے خدا مانا ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں'' ﴿البقرہ:۱۳۳﴾

حضرت یعقوب نے اپنی اولاد سے صرف اللہ کی بندگی کا عہد لیا تھا:

اس سے آپ اندازہ کریں کہ حضرت یعقوب آخری وقت میں اپنی اولاد کے بارے میں کسی اور بات کی فکرمندی کا اظہار نہیں فرما رہے انہیں اس بات کی کوئی فکر معلوم نہیں ہوتی کہ ان کے بعد ان کی ضرورتوں کا کیا بنے گا' انہیں صرف فکر اس بات کی ہے کہ یہ میرے بعد کسی اور کی بندگی شروع نہ کر دیں یعنی کسی اور کے سامنے سر نہ جھکائیں' کسی اور کی نماز نہ پڑھنے لگیں' کسی اور کو سجدہ نہ کریں' کسی اور سے مدد نہ مانگیں' کسی اور کی غیر مشروط اطاعت نہ کریں' کسی اور کو اللہ کی کسی صفت میں شریک نہ بنائیں۔ کیونکہ یہ سارے حقوق اللہ کے ہیں' اس کے سوا کسی کے ساتھ یہ معاملات نہیں کئے جا سکتے۔ بچوں نے اپنی اس تربیت کے مطابق جو انہیں اپنے باپ سے ملی تھی جو جواب دیا ہے وہ یہود اور قریش مکہ کی آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہے کہ ہم تو اسی ایک اللہ کی بندگی اور عبادت کریں گے اور ہم اسی ایک معبود کے عبد بن کے رہیں گے جو آپ کے بزرگوں یعنی حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کا خدا ہے اور ہم اپنی پوری زندگی اسی کے مسلم بن کر اسی کے سپرد کر دیں گے اور ہماری زندگی کا کوئی شعبہ اس سے آزاد نہیں ہوگا اور ہمارا کوئی فیصلہ اس کے احکام سے ہٹا ہوا نہیں ہوگا اس سے پہلے کی آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم' حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی تھی کہ دیکھنا جس طرح تمہاری زندگی صرف ایک اللہ کی بندگی میں گزرے اس طرح تمہاری موت بھی اسی طریقے پر آنی چاہئے۔ اس

Marfat.com

قدر واضح تاریخی شواہد کے بعد آخر اس بات کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ قریش یا یہود جو اپنے آپ کو حضرت ابراہیم سے نسبی اور دینی وراثت میں شریک سمجھتے ہیں وہ کسی اور کو اللہ کی ذات وصفات میں شریک کریں اور پھر اس بات کا بھی کیا جواز ہے کہ وہ اپنی دنیا کے بارے میں اور دنیوی ضرورتوں کے حوالے سے ہمیشہ پریشان بھی رہیں اور اس کیلئے ہر ممکن مساعی بھی بروئے کار لائیں۔ لیکن انہیں اس بات کی کبھی فکر نہ ہو کہ جس دین اور جس توحید اور جس صراط مستقیم کی دعوت حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد نے اپنی اولاد اور لوگوں کے سامنے رکھی تھی اور مرتے وقت بھی جس کی فکر کی تھی اس کی انہیں کبھی کوئی فکر نہ ہو۔

اہلِ ایمان ہمیشہ آخرت کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں:

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی اور ان کے راستے پر چلنے والے لوگ ہمیشہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک جس بات کی فکر میں ہمیشہ ڈوبے رہتے ہیں وہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہوتی ہے۔ ضروریات دنیا نہیں بلکہ دین ہوتا ہے۔ وہ وسائل دنیا کو ضرورت کی حد تک حاصل کرتے ہیں لیکن ان کا مقصدِ زندگی ہمیشہ دین ہوتا ہے اور وہ مرتے ہوئے بھی اپنی اولاد کو اسی کی وصیت کرتے ہیں اور یہی ان کے نزدیک سب سے بڑا سرمایہ ہے جو اپنی اولاد کے سپرد کر کے جاتے ہیں۔ اسلامی تاریخ تو ایسی مثالوں سے مالا مال ہے۔ ہمارے خلفائے راشدین کی زندگیاں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں لیکن میں یہاں صرف پانچویں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ذکر کروں گا کہ جب ان کا آخری وقت آیا تو انہوں نے اپنے گیارہ بیٹوں کو بلایا۔ سب آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا بیٹو میں تمہارے لئے دنیا چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ میرے پاس جو کچھ تھا تم پر خرچ کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا لیکن یہ میں کبھی نہ کر سکا کہ بیت المال میں سے تمہیں وہ کچھ دے دوں جو تمہارا حق نہیں۔ لیکن یہ بات میری یاد رکھنا کہ اگر تم نے اپنے اندر نیکی پیدا کی اور اللہ سے لو لگائی اور اس سے وفاداری کا ثبوت دیا تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے نیک بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا اس لئے تمہیں بھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ تمہیں دنیا بھی دے گا اور آخرت بھی۔ چنانچہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ان بچوں نے باپ کی نصیحت پلے باندھی۔ دنیا بھی کمائی لیکن ترجیح ہمیشہ دین کو دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بڑے بیٹے کو لوگوں نے اس حال میں دیکھا کہ انہوں نے ایک دن میں سو غلام خرید کے آزاد کئے۔ اگر ایک غلام چند ہزار کا بھی سمجھا جائے تو اندازہ لگایئے کہ اللہ نے انہیں کتنی بڑی دولت عطا کی تھی حالانکہ اپنے باپ سے انہیں صرف پانچ درہم وراثت میں ملے تھے۔ اس کے برعکس حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد آنے والے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے بھی گیارہ بیٹے تھے اور وہ اپنے پیچھے لاکھوں کی صورت میں وراثت چھوڑ گیا تھا اس لئے ہر ایک کے حصے میں ایک بڑی دولت آئی تھی۔ لیکن انقلابات زمانہ ملاحظہ فرمایئے کہ ہشام کے بیٹوں کو لوگوں نے بازار میں بھیک مانگتے دیکھا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تم نے اپنے شرک کیلئے حضرت ابراہیم کو حوالہ بنایا حالانکہ ان کی اور ان کی اولاد کی سوچ کا عالم تو یہ تھا کہ وہ اپنی زندگیوں میں بھی اور مرتے ہوئے بھی صرف اللہ کے دین کی وصیت کرتے تھے اور اسی پر قائم رہنے کی تلقین کرتے تھے اور اللہ کے دین کی بنیاد کلمہ توحید ہے جس میں شرک کو ایک لمحے کیلئے بھی برداشت نہیں کیا جاتا۔

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نوح علیہ السلام حضرت ابراہیم کے آباؤ اجداد میں سے تھے۔ تورات میں اگرچہ اس کا ذکر نہیں لیکن تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح نے حضرت ابراہیم کی تربیت فرمائی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ براہ راست ان سے نسبی اور اصلاحی رشتہ رکھتے تھے۔ تالمود کی یہ روایت میں نہیں کہہ سکتا کہاں تک صحیح ہے یہ زمانہ چونکہ قبل از تاریخ کا زمانہ کہا جاتا ہے اس لئے کوئی بات کہنا بہت مشکل ہے۔ البتہ! قرآن کریم کے اس انداز بیان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

Marfat.com

ان سے تھے۔ جہاں تک نوح علیہ السلام کی زندگی اور دعوت کا تعلق ہے قرآن کریم اور دوسری آسمانی کتابوں نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ انہوں نے لمبی عمر پائی اور سینکڑوں سالوں تک وہ لوگوں کو اللہ کی توحید کی دعوت دیتے رہے اور جب قوم کی اکثریت نے نو سو سال کی کشمکش کے بعد بھی اسے ماننے سے انکار کر دیا تو بالآخر طوفانِ نوح نے اس قوم کو تباہ کر دیا اور پھر حضرت نوح اور جوان پر ایمان لائے تھے ان کی اولاد سے دوبارہ دنیا آباد ہوئی۔ اس سے قریشِ مکہ کو یہ بات بتائی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم ہی نہیں بلکہ ان کے آباؤ اجداد بھی توحید ہی کی دعوت اور خدمت کیلئے دنیا میں بھیجے گئے تھے اور ان کی دعوت کو قبول نہ کرنے کے نتیجے میں دنیا ایک بہت بڑی تباہی کا سامنا کر چکی ہے۔ لیکن تمہاری جسارت کی انتہاء ہے کہ تم اب تک شرک پر اصرار کر رہے ہو اور اپنے شرک کا جواز حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کو بناتے ہو حالانکہ اللہ نے ان سب کو اسی صراط مستقیم کی ہدایت دی تھی جس کی طرف رسول اللہ ﷺ تمہیں بلا رہے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم کی اولاد میں چند بڑے بڑے نام لئے جا رہے ہیں جن سے قریش مکہ اور یہود دونوں واقف تھے اور جن میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی نہ کسی صورت میں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی سیادت سے نوازا تھا۔ ان میں سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر ہے جو حضرت طالوت کے جانشین بنے اور پھر بالآخر اللہ نے انہیں رسالت دی اور ایک بڑی حکومت سے نوازا۔ پھر ان کے جانشین ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے وہ اللہ کے نبی بھی ہیں اور ایک بہت بڑے تاجدار بھی۔ اللہ نے ان کو ایسی حکومت عطا فرمائی جیسی نہ اس سے پہلے کسی کو ملی تھی نہ اس کے بعد کسی کو عطا ہوئی۔ اسی طرح حضرت ایوب علیہ السلام اللہ کے نبی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے قبیلے کے سربراہ اور خاندانی وجاہت رکھتے تھے اور اللہ نے دینی قیادت و سیادت کے ساتھ ساتھ دنیوی امارت سے بھی نوازا تھا۔ اس کے بعد یوسف علیہ السلام کا ذکر ہے ان کا واقعہ تو قرآنِ کریم نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزند ارجمند‘ اللہ کے نبی اور مصر کے تاجدار گزرے ہیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا تذکرہ ہے یہ دونوں اللہ کے نبی تھے اور بنی اسرائیل جیسی بہت بڑی قوم کے دینی اور دنیوی سربراہ بھی تھے۔ اللہ نے ان سب سے بندوں کی ہدایت کا کام لیا انہیں بڑی عظمتیں بخشیں۔ اہل دنیا میں بھی سربلند رہے اور آخرت میں بھی اللہ کے یہاں ان کا بڑا مقام و مرتبہ ہے اور تاریخ میں ہمیشہ اپنے کارناموں اور اپنی دینی ہدایت کے باعث زندہ و تابندہ رہیں گے۔ لیکن یہ جو کچھ انہیں عطا ہوا قریش مکہ کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ اس وجہ سے عطا نہیں ہوا تھا کہ وہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے اور اس وجہ سے اللہ نے انہیں دنیوی اور اخروی سعادتوں سے بہرہ ور فرمایا بلکہ یہ سب کچھ انہیں اس لئے عطا ہوا کہ وہ محسنین میں سے تھے اور اللہ محسنوں کو اسی طرح بدلہ دیتا ہے۔ محسن سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے ان کو مقصد زندگی سے بہرہ ور فرمایا اپنی شریعت ان پر نازل فرمائی‘ اپنے احکام سے انہیں آگاہ کیا‘ صراط مستقیم ان پر کھول دی اور ان پر اس کے حوالے سے ذمہ داریاں ڈالی گئیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور اللہ سے وفاداری کا حق ادا کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی بلکہ وہ ہمیشہ اس کیلئے زیادہ سے زیادہ وفاداری‘ جاں سپاری اور ایثار و قربانی سے کام لیتے رہے جو کچھ ان کے بس میں تھا انہوں نے سب کچھ اس راستے میں جھونک دیا اللہ کی رضا کے حصول میں اپنی ہمت و استطاعت سے بڑھ کر اطاعت و عبدیت کا حق ادا کرنا‘ اسے احسان کہتے ہیں اور یہ لوگ اس صفت احسان کے حامل تھے۔ اسی وجہ سے اللہ نے ان کو سارے مرتبے عطا فرمائے۔ تمہیں ان کی زندگیوں سے سبق لینا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ تم بھی اگر چاہتے ہو کہ تمہیں اللہ کے یہاں آخرت میں سرخرو ہونے کا موقع ملے اور اللہ دنیا میں بھی تمہیں اپنے انعامات سے نوازے تو وہ راستہ اختیار کرو جو انہوں نے اختیار کیا تھا کہ صرف اللہ ہی سے اپنا تعلق جوڑا اور اسی کی اطاعت میں زندگی گزاری اور اس کی عبادت اور بندگی میں کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرایا۔ لیکن تم اس سے سرکشی اختیار کر کے شرک کا ارتکاب کرتے ہو اور غضب یہ کہ اسے حضرت ابراہیم کی طرف منسوب بھی کرتے ہو یہ ایک ایسی ڈھٹائی ہے جس سے دنیا بھی تباہ ہو سکتی ہے اور

Marfat.com

آخرت بھی۔اس کے بعد کچھ مزید انبیاء کا تذکرہ کیا گیا۔

آیت:۸۵-۸۶ وَزَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيسٰى وَ اِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ O وَاِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ۭ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ O ''اورزکریا' یحیٰ' عیسیٰ اورالیاس کوبھی' یہ سب نیکوکاروں میں سے تھےاوراسماعیل' یسع' یونس اورلوط کو بھی اور ان میں سے ہرایک کوہم نے عالم والوں پرفضیلت بخشی''۔

بنی اسماعیل و بنی اسرائیل کے آباؤاجدادایک اللہ کو ماننے والے تھے:

یہ چاروں اللہ کے مشہوراورعظیم پیغمبر ہیں۔عیسیٰ علیہ السلام تو عیسائی امت کی وجہ سے بہت ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ان کو اللہ نے غیر معمولی معجزات سے نوازا تھا۔ان کی دنیوی زندگی کا بظاہر اختتام بھی غیر معمولی طریقے سے ہوااورمسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ قرب قیامت میں آنحضرت ﷺ کے خلیفہ کی حیثیت سے دوبارہ تشریف لائیں گےاورغلبۂ اسلام کومکمل کریں گے۔حضرت یحییٰ انہی کے ہمعصر' پیش رواورعزیزوں میں سے ہیں۔حضرت زکریا حضرت یحییٰ کے والد گرامی اور حضرت الیاس وہی پیغمبر ہیں جنہیں تورات ایلیا کے نام سے یاد کرتی ہے۔ان چاروں میں قدر مشترک ان کا زہد' فقراور دنیا سے بے رغبتی ہے۔یہ دنیا اوراہل دنیا سے بے نیاز خالصتاً اللہ کی رضا میں شاکر' اللہ کے برگزیدہ بندے تھےاورانہی صفات کے اشتراک کے باعث انہیں ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ان کی غیر معمولی شخصیتوں کے حوالے سے لوگوں نے ان کے بارے میں بہت کچھ افراط وتفریط سے بھی کام لیا ہے۔اسلئے ان کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ ان کی شخصیتوں میں صفات کے اعتبار سے کتنا بھی غیر معمولی پن ہولیکن اپنی ذات میں وہ اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے خدانہیں تھے۔جیسے لوگوں نے ان میں سے بعض کی پوجا شروع کردی اورعیسائی صرف ان کی وجہ سے گمراہ ہوئےاوران کو جو کچھ معجزات عطا ہوئے اوران کی شخصیتوں میں جوایک جاذبیت عظمت اورغیر معمولی پن نظر آتا ہے وہ صرف اس ہدایت اوراس صلاح وتقویٰ کے باعث ہے جو اللہ سے تعلق کے باعث ان کی شخصیتوں کا امتیازی پہلو تھا۔وہ اپنی تمام تر عظمتوں میں اللہ پرایمان رکھنے والےاس کی شریعت پر چلنے والے اللہ کی ذات وصفات میں شریک نہ کرنے والےاورقوم کوتوحید کی دعوت دینے والے اللہ کے نیک بندے تھے' جنہوں نے دنیا میں ہرطرح سے شرک کی جڑ مارنے کی کوشش کی اورلوگوں کو اللہ کی وحدانیت پرایمان لانے کی ترغیب دی اے مشرکین مکہ اوراے امت نصاریٰ تم نے نجانے یہ شرک کا مرض کہاں سے پال لیا ہے۔دیکھو جہاں جہاں بھی عظمتیں نظرآتی ہیں وہ سب اللہ کی بندگی کے باعث اوراللہ کی توحید سے وابستگی کا نتیجہ ہیں۔اگلی آیت میں مزید چار پیغمبروں کا ذکر فرمایا گیا۔جن میں پہلے نمبر پرحضرت اسماعیل ہیں جوقریش کے جدامجد اورحضرت ابراہیم کے بڑے صاحبزادے ہیں اس رکوع کے آغاز میں جہاں انبیاء کا ذکر شروع ہوا وہاں سب سے پہلے حضرت اسحاق جوحضرت اسماعیل کے بھائی ہیں ان کا ذکر کیا گیااورپھران کی اولاد میں اٹھنے والے جستہ جستہ پیغمبروں کا ذکر ہے۔اب آخر میں حضرت اسماعیل کا ذکر کیا جارہا ہے تاکہ سلسلہ ابراہیمی کو مکمل کرتے ہوئے یہ بتایا جائے کہ وقت کی سب سے بڑی قومیں بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کے آباؤاجداد توحید کے علمبردار تھےاوروہ دنیا میں اسی کی تعلیم اور ترغیب کیلئے تشریف لائے تھےاوراسی بنیاد پران کی اپنی قوموں سے کشمکش جاری رہی۔لیکن نجانے ان دونوں قوموں نے شرک کا جواز کہاں سے پیدا کرلیا۔حضرت اسماعیل کے بعد حضرت یونس کا ذکر ہے جواللہ کے مشہور پیغمبر ہیں جونینوا میں مبعوث ہوئےاورایک لاکھ انسانوں کی ہدایت کیلئے بھیجے گئےاوراس کے بعد حضرت لوط کا ذکر ہے یہ حضرت ابراہیم کے بھتیجے ہیں انہی کے زیرتربیت رہے۔اللہ نے انہیں نبوت سے نوازا انہوں نے اپنی قوم کوتوحید کی دعوت دی' بری عادتوں کو چھوڑنے کا حکم د

Marfat.com

...م اخلاق کی تعلیم دی۔ لیکن قوم نے بجائے قبول کرنے کے جب انتہائی دشمنی اور کمینگی کا ثبوت دیا تو اللہ نے ان پر عذاب نازل کیا اور آج بھی وہ قوم مردار کے نیچے ابدی نیند سو رہی ہے اور اس کے گردو پیش میں ان کے کھنڈرات پھیلے ہوئے ہیں۔ درمیان میں حضرت یسع کا ذکر آیا ہے یہ ہماری تاریخ ...ے ایک غیر معروف نام ہے لیکن پہلی آسمانی کتابوں میں الیسع سے ملتے جلتے دو نبیوں کے ناموں کا ذکر ہے ایک الیشع جن کا زمانہ ۷۱۳ قبل مسیح بتایا جاتا ...۔ دوسرے یسعیاہ جن کا زمانہ ۶۲۰ قبل مسیح کہا جاتا ہے۔ پہلا نام قرآن کے تلفظ کے زیادہ قریب ہے اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہی پیغمبر مراد ہیں۔ ...ن جن پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے صرف یہی نسل ابراہیمی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ جیسے اس سے پہلے عرض کیا جا چکا کہ مشرق وسطیٰ میں آنے والے بیشتر ...ء حضرت ابراہیم ہی کی اولاد سے تھے۔ ان میں سے اس مختصر تعداد کا ذکر کرنا صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ وہ پیغمبر ہیں جن سے اس وقت کی قومیں ...رف تھیں۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ تمام انبیاء کا ذکر کیا جائے بلکہ صرف یہ توجہ دلانا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کی نسل سے جتنے پیغمبر اٹھائے جن میں سے ایک یہ ہیں وہ سب اسی سلسلۂ ہدایت کے افراد تھے جس ہدایت کو لے کر رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے ہیں اور وہ دنیا کو صرف اللہ کے آستانے پر ...انے کیلئے آئے تھے اور باقی ہر آستانے سے ان کا تعلق توڑ کر صرف ایک اللہ سے وابستگی ان کا مقصود تھا تا کہ مشرکینِ مکہ کو اپنے غلط طرز عمل کا احساس ہو ...۔ البتہ ایک بات جو یہاں قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہاں چونکہ ان انبیاء کا تذکرہ ہو رہا ہے جو حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے تھے لیکن ان میں دو ...ر ایسے ہیں جنہیں حضرت ابراہیم کی ذریت قرار دینا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ ان میں سے ایک تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں آپ کو اللہ نے بغیر باپ کے ...فرمایا اور سلسلۂ نسب چونکہ باپ سے چلتا ہے۔ تو ان کو حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے کیسے کہا جا سکتا ہے اور دوسرے حضرت لوط علیہ السلام ہیں وہ ...رت ابراہیم کے بھتیجے ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں بھی یہ کہنا کہ وہ آپ کی اولاد میں سے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھتیجے کو بیٹا کہنا اور ...کو باپ کہنا یہ عرب کی طرح تقریباً ہر قوم میں ایک معروف بات رہی ہے اس لئے یہاں اسی عرف کے مطابق حضرت لوط کو آپ کی اولاد میں شامل کیا ...یا۔ جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے انہیں یقیناً اللہ نے اپنی قدرت سے بغیر باپ کے پیدا کیا لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی والدہ محترمہ ...رت ابراہیم کی نسل سے تھیں۔ اس لحاظ سے وہ حضرت ابراہیم کی دختری اولاد تھے اور دختری اولاد کو اپنی اولاد کہنا اور اپنے سلسلۂ نسب میں شامل کرنا ...ئی تعجب کی بات نہیں۔ خود نبی کریم ﷺ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کی اولاد نسب کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ کی ...رف منسوب ہے۔ سیدوں کو حضور کی اولاد میں شمار کیا جاتا ہے جبکہ وہ آپ کی صاحبزادی کی اولاد ہیں۔ آخر میں تمام انبیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ...رمایا کہ ہم نے ان سب کو جہان والوں پر فضیلت دی تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں کتنے ایسے پیغمبر گزرے ہیں کہ اہل دنیا نے جن کی دعوت کو ...ول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ان میں ایک خاصی تعداد انہی کی نافرمان امت کے ہاتھوں قتل بھی ہوئی اور ایک معتد بہ تعداد ایسے پیغمبروں کی بھی ہے جن کو ...نتی کے پیروکار ملے وہ ساری زندگی اپنی قوم کے ساتھ کشمکش میں مبتلا رہے۔ لیکن ان کی تمام تر تبلیغی مساعی کے باوجود قوم کی غالب اکثریت ان کی دعوت ...و قبول کرنے سے منکر رہی۔ ظاہر ہے ایسے پیغمبر جو لوگوں کے ہاتھوں قتل ہوئے یا ان کی دعوت کو قبول عام نہ مل سکا ان کے بارے میں یہ کہنا کہ اللہ نے ...ہیں اہل جہان پر فضیلت عطا فرمائی تھی یہ کہاں تک صحیح ہے۔

...نبیاء کو اللہ تعالیٰ نے جہان والوں پر فضیلت دی ہے:

بات اصل میں یہ ہے کہ وہ فضیلت جس کا تعلق نبوت سے ہے وہ سراسر اللہ کی عطا ہے وہ ایک منصب ہے جسے اہل دنیا نہیں بلکہ اللہ عطا فرماتے ہیں اور یہ منصب جسے مل جاتا ہے وہ اپنی اس منصب کی عظمت کے باعث تمام دنیا سے بالا بلند ہو جاتا ہے دنیا چاہے اسے قبول کرے یا نہ کرے وہ اپنی اس

Marfat.com

منصبی فضیلت کے باعث ہر حال میں عزت وشرف کا مالک رہتا ہے۔ کسی چمن میں اگر پھول کھلتا ہے تو اس کی شادابی اور رعنائی اور اس کی دلکشی اور عطر بیزی اس بات کی محتاج نہیں کہ اس کے گردوپیش میں رہنے والے اس سے اپنے مشام جان کو معطر کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ بے ذوقوں کے ہجوم میں رہ کر بھی پھول ہی رہتا ہے اور اس کی انفرادیت میں کبھی کمی پیدا نہیں ہوتی۔ اندھوں کا کوئی ہجوم اگر پتھروں کے ڈھیر پر زندگی گزار رہا ہو اور ان کے سامنے اگر ہیرے رکھ دیئے جائیں تو وہ اپنی بصارت سے محرومی کے باعث ان ہیروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو وہ پتھروں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ بے شک انہیں اٹھا کر پھینک دیں یا انہیں توڑ پھوڑ دیں کیونکہ وہ دیکھ نہیں پاتے کہ ان کی آب وتاب کا عالم کیا ہے لیکن ان کی اس ناقدری کے باوجود ہیرے کی عظمت اور اس کی آب وتاب میں کبھی کمی نہیں آتی۔ اسی طرح پیغمبر اپنی قوم کی جانب سے چاہے کسی بھی سلوک کا مستحق سمجھا جائے لیکن وہ اپنی ذاتی وجاہت، شخصی عظمت، تعلیم کی کشش، مقصد کی شناخت، مکارم اخلاق کی انفرادیت اور انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کے باعث ہر حال میں ایسی ہی چمک دمک کا مالک رہتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک جلتی ہوئی شمع یا بادلوں میں گھرا ہوا چاند۔ وقت کے حالات کا تناؤ، غلط رویوں کا چلن بگڑی ہوئی قوم کی ضد اور انانیت کا غبار ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر اس سورج کی چمک کو دبائے رکھے لیکن تاریخ بالآخر ان کی عظمت کو سلام کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور وہ چند افراد جو پیغمبر کی زندگی میں مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں وہ بڑھتے بڑھتے ایک امت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کی زندگیوں کو دیکھ لیجئے۔ ان کی قوموں نے انکے ساتھ کیا سلوک کیا وہ اپنے پیچھے گنتی کے چند متبعین چھوڑ گئے لیکن آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں انکے نقوش قدم کو تلاش کر رہی اور انکی عظمتوں کو سلام کر رہی ہیں۔ اس سے قرآن پاک کا یہ کہنا ایک حقیقت بن کر ابھرتا ہے کہ ہم نے ان کو جہانوں پر فضیلت دی تھی۔ یہاں چونکہ ایک بہت مختصر تعداد کا ذکر ہوا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ کیا دنیا کو ہدایت کے راستے پر چلانے کیلئے صرف یہی ایک مختصر سا گروہ بھیجا گیا تھا کیا یہی توحید کے پرستاروں کا قافلہ ہے جو چند نفوس قدسیہ پر مشتمل ہے جبکہ دنیا اہل شرک سے بھری ہوئی ہے اس لئے اگلی آیت میں اس غلط فہمی کا ازالہ فرمایا گیا۔

آیت: ۸۷ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ”اور ان کے آباؤ اجداد ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے اور ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو ہم نے صراط مستقیم کی ہدایت بخشی“۔

لوگوں کو ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے:

یہ نہ سمجھا جائے کہ توحید کے پرستار اور ہدایت پر چلنے والے یہی چند گنتی کے نفوس ہیں جن کا یہاں ذکر ہوا ہے بلکہ ان کے آباؤ اجداد میں بھی ان کی اولاد میں سے بھی اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی بڑی تعداد کو نبوت کے شرف سے مشرف فرمایا اور پھر انہوں نے اللہ کی توحید کی دعوت دیتے ہوئے اور اس کی ہدایت کو عام کرتے ہوئے کتنے ملکوں اور کتنی قوموں کو فیض یاب کیا اور کہاں کہاں یہ ہدایت کا سلسلہ پھیلا اور کتنی نسلیں اس سے مستفید ہوتی رہیں اور اسی طرح اللہ نے ان کی اولادوں میں سے کتنے لوگ اور ان کی برادری میں سے کتنے افراد اور ان کے آباؤ اجداد میں سے کتنے گروہ ایسے تھے جنہیں انبیاء کے راستے پر چلایا اور جو کام دنیا میں انبیاء کرام انجام دینے کیلئے آتے ہیں وہ ان کے ہاتھوں سے انجام دلوایا اور انہوں نے نبیوں ہی کی طرح جان جوکھوں میں ڈال کر مسلسل دکھ اٹھا کر اپنا سب کچھ اسی راستے میں جھونک کر اللہ کے دین کو سربلند کیا اور دنیا کو توحید سے آشنا کر کے اللہ سے ان کا ربط مستحکم کیا اور انسان جو اللہ سے کٹ کر اور شیطان سے جڑ کر خود اپنا دشمن ہو جاتا ہے اس کو اللہ کے راستے پر ڈالا۔

Marfat.com

اس کی انسانیت کو زندہ کیا اور اس طرح انسانی قافلے کو اپنی اصل منزل کا مسافر بنایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے یہی دو راستے نکالے ہیں کہ وہ لوگوں کی ہدایت اور اصلاح کیلئے اپنے پیغمبر بھیجتا ہے اور پیغمبروں کی معیت اور ان کی نصرت کیلئے ان کے ماننے والوں کو مکلف بناتا ہے اور جب پیغمبر دنیا سے اپنا فرض انجام دینے کے بعد چلے جاتے ہیں تو ان پر ایمان لانے والے لوگ نئے آنے والے پیغمبر تک اس تبلیغ و دعوت کے فرض کو انجام دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ چند انبیاء کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی سنت کا ذکر فرمایا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور ان کی برادریوں میں ہم نے دونوں طرح کے لوگ اٹھائے' نبوت بھی صرف انہی پر محدود نہیں اور بھی نبی آتے رہے اور پھر یہ ہدایت کا کام نبیوں ہی پر منحصر ہو کر نہیں رہا بلکہ ان پر ایمان لانے والے اس فرض کی انجام دہی کو آگے بڑھاتے رہے اور یہ سفر جاری رہا کیونکہ جب تک زمین پر نوع انسانی باقی ہے اس کا ایک ایک فرد اس ہدایت کا مخاطب اور ذمہ دار ہے۔ جس ہدایت کو لے کر اللہ کے نبی آتے ہیں جن میں سے سب سے پہلا نقطہ' نقطہ' توحید ہے۔ جس کے بارے میں سب سے پہلے سوال ہوگا۔ اس لئے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ نوع انسانی کے افراد کی موجودگی میں ہدایت کا یہ سلسلہ رک جائے' نبی مبعوث نہ ہوں یا ان کے راستوں پر چلنے والے سلسلۂ دعوت کو روک دیں اگر ایسا ہو جائے تو یہ کہا جائے گا کہ انسانوں کو ہدایت دینا اللہ نے اپنے ذمے لیا تھا کیونکہ قرآن کریم میں صاف فرمایا گیا ہے اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡهُدٰی ''بے شک ہدایت دینا ہماری ذمہ داری ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ دعوت کو روک کر اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی۔ یہ بات چونکہ ناممکن ہے اس لئے پروردگار نے اپنی ذمہ داری ادا فرماتے ہوئے اور انسانوں کی اس کمزوری کا لحاظ فرماتے ہوئے سلسلۂ ہدایت کو کبھی رکنے نہیں دیا۔ ہر دور میں پیغمبر آتے رہے یا ان کے متبعین کام کرتے رہے۔ اب رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد چونکہ سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا اور انسانوں کو ایک مرکز اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے بار بار تبدیلی کے عمل کو روک دیا گیا تو اب یہ ذمہ داری اس امت مسلمہ کی ٹھہری کہ وہ اس فرض کو انجام دے جو ہر دور میں انبیاء کے ذریعہ انجام دیا جاتا رہا اور اس صراط مستقیم کی طرف لوگوں کو بلائے جس پر چل کر آخرت کی کامیابیوں کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ اللہ کی ہدایت اور وہ راستہ ہے اسکے علاوہ کوئی ہدایت اور کوئی اور طریقہ اللہ کے یہاں قابل اعتبار نہیں۔ اگلی آیت میں اسی کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

آیت:۸۸ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوۡ اَشۡرَكُوۡا لَحَبِطَ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝

''یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کر رہ جاتا''۔

اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے:

اس آیت کریمہ میں سب سے پہلے ھُدَی اللّٰہِ پر زور دیا گیا ہے ''یہ اللہ کی ہدایت ہے''، یعنی زندگی کا طریقہ جس پر چل کر دنیا اور آخرت دونوں سنور سکتی ہیں اور زندگی صحیح رخ پر رواں دواں رہ سکتی ہے اور انفرادی اور اجتماعی مصالح ٹھیک بروئے کار لائے جا سکتے ہیں اور انسانی تہذیب و تمدن افراط و تفریط سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور حقوق و فرائض کی تقسیم اپنے صحیح محمل میں رہ کر جاری و ساری رہ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ اور یہ راہنمائی اللہ کی عطا کردہ اور اس کی نازل کردہ ہے۔ پروردگار چونکہ ہماری فطرت کو پیدا کرنے والا اور ہماری ضرورتوں سے آشنا ہے۔ وہ ہمارے حسن و خوبی سے بخوبی واقف اور ہمارے احساسات سے خم و پیچ سے کما حقہ شناسا ہے اس لئے جب زندگی گزارنے کا طریقہ وہ عطا فرما رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پیش نظر ہماری زندگی کی تمام ضرورتیں اور تمام تقاضے ہیں۔ جب ہم اس ہدایت پر عمل کریں گے اور جب ایک ایک ضرورت کو پورا ہونے کا موقع ملے گا اور ایک ایک تقاضہ اپنا جواب پائے گا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ کہیں اشتعال پیدا ہو یا کہیں تشنگی کا احساس پریشان کرے یا کہیں محرومی کے سائے پڑنے کا

Marfat.com

اندیشہ ہو اس لئے اگر انسانی قافلہ خود اپنا دشمن نہیں تو اسے یہ بالکل سامنے کی بات پلے باندھ لینی چاہئے کہ یہی زندگی کا طریقہ اور یہی انسانی سدھار کا نسخہ ہے جس سے مجھے بہر صورت فائدہ اٹھانا ہے تاکہ میں خسارے میں نہ پڑوں ورنہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زندگی کے بے شمار راستے ہیں اور زندگی کی راہنمائی دینے والے لاتعداد رہنما ہیں ہر ایک نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں کہ جو آدمی کسی مشین کو پوری طرح نہیں سمجھتا وہ اس کے مقاصد سے واقف نہیں وہ اسے آپریٹ کرنا نہیں جانتا' اسے نہیں معلوم اس سے کون سی پیداوار لی جاسکتی ہے' یہ کس کس خرابی کا شکار ہوسکتی ہے' وہ اس کے بارے میں گائیڈ بک تیار کرنے بیٹھ جائے تو اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو گی لیکن عجیب بات ہے کہ ہم ہر مشین کو چلانے کیلئے اس کے ماہر انجینئر کو تلاش کرتے ہیں اور ہر کام کرنے سے پہلے اس کام کے سمجھنے والے کو ڈھونڈتے ہیں لیکن انسانی مشین اور انسانی زندگی جو سب سے نازک اور سب سے پیچیدہ ہے یہ نجانے ہم نے کس کس اناڑی کے سپرد کر رکھی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ صدیوں تک انسانی قافلہ ٹھوکریں کھاتا ہے لیکن اس کو یہ بالکل جانی پہچانی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تک تم وہ راہنمائی قبول نہ کرو گے جو انسانی زندگی کے خالق اور اس کے عالم نے مہیا کی ہے اس وقت تک تم ان ٹھوکروں سے کبھی نہیں بچ سکو گے۔ اس لئے یہاں بڑا زور دے کر فرمایا گیا کہ ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے۔ نقصانات سے یا ناکامیوں سے بچنا چاہتے ہو اور کامیابیوں سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو تو سیدھے طریقے سے اس ہدایت کو اختیار کرلو لیکن ساتھ ہی یہ بات یاد رکھو کہ یہ ہدایت ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی یہ اسے ملتی ہے جسے اللہ چاہتا ہے۔ اس کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ اللہ جسے چاہتا ہے اسے نبوت کے منصب پر فائز کرتا ہے پھر اس پر اپنی ہدایت نازل فرماتا ہے اور اس کے واسطے سے باقی انسانوں کو ملتی ہے۔ اگر انسان از خود چاہیں کہ وہ اللہ سے اس راہنمائی کو طلب کرلیں تو یہ ان کیلئے ممکن نہیں، اس لئے جتنے رسول دنیا میں آئے ہیں وہی منارۂ نور ہیں۔ انسان کو رہنمائی کیلئے انہی کی طرف دیکھنا چاہئے۔ روشنی کا آخری منبع و مصدر محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن پر سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا گیا اور قیامت تک کیلئے انسانی ضرورتوں کی رہنمائی کیلئے ان پر آخری کتاب اتار دی گئی اور انہیں منبع نور بنا کر قیامت تک کیلئے انسانوں کو ان سے اکتسابِ فیض کرنے کا حکم دیا گیا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اس ہدایت کو اختیار کرنا چاہتا ہے اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس ہدایت کے حتمی اور صحیح ہونے کا یقین پیدا کرے اور پھر کامل اخلاص کے ساتھ ہر طرح کے ذہنی تحفظات سے آزاد ہو کر اسی راہنمائی کو اپنا مقصود بنائے اور پھر اس راستے پر چلنے کا عزم لے کر اللہ سے اس کی توفیق مانگے۔ یہ وہ صحیح طریقہ ہے جس کے نتیجے میں اللہ کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور یہاں یہ جو فرمایا گیا کہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اس کا یہی مفہوم ہے۔

اگر اللہ کے برگزیدہ بندے بھی شرک کرتے تو ان کے سب نیک اعمال اکارت جاتے:

تیسری بات اس آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ سابقہ آیات میں جن برگزیدہ افراد کا ذکر کیا گیا ہے اور جن کے بارے میں بتایا گیا کہ اللہ نے ان کو بڑے بڑے مقامات سے نوازا اور یہ اللہ کے نہایت برگزیدہ بندے تھے۔ اگر یہ بھی اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک ٹھہراتے جس طرح اے مشرکو تم اس کے ساتھ شریک ٹھہرا رہے ہو تو یاد رکھو باوجود اس کے کہ یہ لوگ بڑے بڑے مقامات کے حامل اور اللہ کے یہاں قربِ خاص کے مستحق ہیں اور انہوں نے زندگی بھر اللہ کی اطاعت اور اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کی اگر یہ بھی کہیں اس جرم کا ارتکاب کر بیٹھتے تو انہوں نے اپنی زندگی میں جو بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اطاعت و فدویت کی جو اعلیٰ مثالیں قائم کیں اور جو نمونہ کے اعمال کیے وہ سب دھرے رہ جاتے اور اللہ کا غضب ان پر ایسا نازل ہوتا کہ ان کی یہ ساری کاوشیں اور ان کے یہ تمام اعمال ان کے کسی کام نہ آتے اور یہ قیامت کے دن نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو جو کچھ بھی اللہ کی جانب سے عطا ہوا اس کا سبب صرف یہ تھا کہ انہوں نے موحد بن کر زندگی گزاری۔ اپنی عبادت

Marfat.com

اطاعت اور بندگی میں کبھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا۔ لیکن اگر یہ تمہاری طرح کہیں یہ جرم کر بیٹھتے تو یہ مقامات تو کیا اللہ کی معمولی رضا کو بھی کھو دیتے اور یہ بات ان کے کسی کام نہ آتی کہ وہ حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں کیونکہ اللہ کے یہاں نسب کام نہیں آتا بلکہ اعمال کام آتے ہیں اور اعمال بھی وہ جو خالصتاً اللہ کیلئے کئے جائیں اگر ان میں کہیں شرک کا شائبہ بھی شامل ہو جائے تو اللہ کبھی انہیں قبول نہیں کرتا۔

اس آیت کریمہ میں جسے اللہ کی ہدایت کہہ کر اس کے اتباع پر زور دیا گیا ہے اگلی آیت کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس ہدایت کو حاصل کرنے کا اصل ذریعہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۸۹ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ O ''یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائی تو اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں گے تو کچھ پرواہ نہیں ہم نے اس کیلئے ایسے لوگ مامور کر دیئے ہیں جو اس کے منکر نہیں''۔

زندگی کی راہنمائی کیلئے تین چیزیں درکار ہوتی ہیں۔

1- ایک ایسی کتاب جس میں زندگی کے تمام معاملات کے حوالے سے ایک قانون دیا گیا ہو پھر قانون کے نافذ کرنے کیلئے قوت حاکمہ کی ہیئت ترکیبی کی تفصیل بھی دی گئی ہو اور اللہ سے چونکہ بندوں کا تعلق صرف ضابطے کا نہیں بلکہ رابطے کا بھی ہے۔ اس لئے اس میں پروردگار سے تعلق جوڑنے کی تمام ممکن ہدایات بھی دی گئی ہوں اور پھر اس کیلئے ترغیب اور ترہیب سے کام بھی لیا گیا ہو۔ انسانی زندگی صرف قانون کی عملداری سے مکمل نہیں ہوتی بلکہ اس کی حقیقی پہچان اخلاقیات سے ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کتاب میں مکارم اخلاق کی تفصیل بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ حقوق و فرائض کا ایک پورا ضابطہ جسے اخلاق کے ساتھ مربوط کر دیا جائے اور قانون کا تحفظ بھی اسے حاصل ہو۔

2- کتاب کے صحیح فہم کا ایک نمونہ اور ایک آئیڈیل ہمارے سامنے ہو جس کو دیکھ کر ہم اندازہ کر سکیں کہ کتاب کے سمجھنے اور اس کے مفاہیم کے تعین میں ہمیں کن حدود کا خیال رکھنا ضروری ہے اور حتی الامکان یہ نمونہ ایسا ہو جو کتاب کے مبہمات کو کھول دے' اس کے اجمالات کی تفصیل بیان کر دے' احکام کو عملی شکل دے دے اور آداب کو شخصیت کا سراپا عطا کر دے۔

3- اس کتاب پر عمل درآمد کیلئے ایک ایسی مرکزی شخصیت ہو جو پورے جوش و جذبہ سے اس کتاب کے علم کو عام کرے' اس کے فہم کو آسان کرے' اس کے مطابق اخلاق تیار کرے اور پھر اس کے ہمہ جہتی نفاذ کیلئے پوری کوششیں بروئے کار لائے۔

انہی تینوں ضرورتوں کو یہاں کتاب' حکم اور نبوت کے نام سے یاد فرمایا گیا کہ اللہ نے ہدایت دینے کیلئے جو انبیاء مبعوث فرمائے انکے ذریعے سے یہ تینوں ضرورتیں پوری فرمائیں۔ ان پر کتاب نازل کی گئی جو انسانی ہدایت کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی تھی اور پھر انہیں اس کتاب کا صحیح فہم اور اسکے اصولوں کو معاملات زندگی پر منطبق کرنے کی صلاحیت اور مسائل حیات میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کی خداداد قابلیت بھی عطا فرمائی تھی۔ اور پھر انہیں انسانی زندگی کی راہنمائی کیلئے پوری طرح کتاب سے آشنا کرنے اور انکی زندگیوں میں اس کتاب کو نافذ کرنے کا ایک عزم بالجزم بھی عطا فرمایا تھا جو انکے تمام احساسات پر غالب آ گیا تھا۔ اسکو یہاں نبوت سے تعبیر فرمایا گیا۔ یعنی یہ لوگ جنکا یہاں ذکر ہوا ہے انہیں اللہ نے یہ کتاب' حکم اور نبوت کی نعمت سے مشرف فرمایا تھا اور انہوں نے اس نعمت کی قدر کی خود بھی برگزیدہ ہوئے اور انسانوں کو بھی اس سے سیراب فرمایا۔ اب رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے مشرکین مکہ کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اب یہی نعمتیں ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا کی ہیں اور انکے واسطے سے ہم تمہیں نوازنا چاہتے ہیں۔ اب ہونا تو یہ

Marfat.com

چاہئے کہ تم اس نعمت کی قدر کرو اور تم بھی اللہ کے انعامات کے مستحق ٹھہرو جو پہلے اسکی قدر کرنے والے حاصل کر چکے ہیں لیکن اگر تم نے اسکی قدر کرنے کی بجائے اپنا یہی رویہ جاری رکھا تو پھر رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ اسکی ہرگز پرواہ نہ کریں ہم نے اس ذمہ داری کو اٹھانے کیلئے ایسے لوگوں کو مقرر کر دیا ہے جو اسکو اٹھانے میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیں گے اور کبھی اسکی ناقدری نہیں کریں گے۔ جن حالات میں یہاں یہ بات کہی جا رہی ہے حقیقت یہ ہے ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اس کتاب خداوندی کی حقانیت اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو تسلی:

ہم جانتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی سورتوں میں سے ہے اور مکہ معظمہ میں مسلسل تیرہ سال بتدریج جس طرح مخالفت کی چکی شدید سے شدید تر ہوتی گئی ہے وہ کسی بھی تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں ہے۔ ہر آنے والا دن آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کیلئے اذیت رسانی اور مخالفت کا نیا پیغام بن کر طلوع ہوتا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مشرکینِ مکہ میں انتقام کی آگ شدید ہوتی گئی۔ زندگی کا کوئی دکھ اور انسانی طاقت کا کوئی حربہ ایسا نہیں جو انہوں نے اس تحریک کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو ہراساں کرنے کیلئے استعمال نہ کیا ہو۔ بار بار آنحضرت ﷺ کو قتل کرنے کے منصوبے بنے۔ مسلمان اس اذیت رسانی کے عمل سے تنگ آ کر ایک سے زیادہ مرتبہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ سازشوں اور منصوبوں کی بڑھتی ہوئی آگ سے بچنے کیلئے تین سال تک آنحضرت اور آپ کے ساتھیوں نے شعب ابی طالب میں محصور رہ کر وقت گزارا۔ حتیٰ کہ مکی زندگی کے آخری سال جب حضور نے طائف کا سفر کیا تو اس میں جو قیامت گزری ہے ہر مسلمان اس سے واقف ہے۔ انہی سالوں میں جبکہ مخالفت کی بھٹی پورے جوش سے دہک رہی تھی' یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔ اور اس میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ان کی مخالفت کی پرواہ نہ کریں۔ حالانکہ ان کی مخالفت مسلمانوں کیلئے ایک بڑا عذاب بن چکی ہے اور تحریک اسلامی کے بچ نکلنے یا آگے بڑھنے کی کوئی صورت بظاہر دکھائی نہیں دیتی۔ ظاہر بیں نگاہیں صاف دیکھ رہی ہیں کہ اس صورتحال سے بچ نکلنا مسلمانوں کیلئے ناممکن ہوتا جا رہا ہے جو مسلمان مکہ معظمہ میں باقی ہیں وہ مسلسل اذیتوں سے حوصلہ ہار دیں گے اور یا موت سے ہمکنار ہو جائیں گے اور آنحضرت ﷺ کو قریش مکہ کسی وقت بھی موقع پا کر قتل کر دیں گے اور جو مسلمان ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں جا چکے ہیں وہ غریب الوطنی کی موت مارے جائیں گے۔ لیکن پروردگار فرما رہے ہیں کہ اے پیغمبر آپ ان کے رویے اور ان کی مخالفت کی ہرگز پرواہ نہ کریں اگر یہ آپ پر ایمان نہیں لا رہے تو نہ لائیں ہم نے ایمان لانے کیلئے ایک ایسی قوم مقرر کر دی ہے جو اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے گی اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ کبھی بھی اس ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کرے گی۔ ایسے ناگفتہ بہ اور ناموافق حالات میں اتنی بڑی پیش گوئی اور وہ بھی پوری تحدی اور قطعیت کے ساتھ کرنا جبکہ حالات دور دور تک اس کا ساتھ دیتے نظر نہیں آتے یہ کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ایسی پیش گوئی پورے یقین کے ساتھ اللہ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا اس لئے کہ اگر رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جبکہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا ہو کوئی آدمی یہ کہے کہ ابھی اس تاریکی سے سورج طلوع ہونے والا ہے تو کوئی سننے والا کبھی اس کا یقین نہیں کرے گا۔ جھلس ڈالنے والے صحرا میں جہاں دور دور تک پانی کا نشان تک نہ ہو کوئی آدمی چشمہ ابلنے کی بات کرنے لگے تو یقیناً سننے والے اس کی دماغی صحت کا مذاق اڑائیں گے جبکہ یہ دونوں باتیں کسی نہ کسی حد تک ممکن دکھائی دیتی ہیں۔ صحرا میں چشمے کا نکل آنا اور اندھیرے کے بعد سورج کا طلوع ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔ لیکن ڈوبتی ہوئی تحریک اور بند گلی میں گھر جانے والا قافلہ کسی انقلاب کا پیش خیمہ بن جائے یا مستقبل قریب میں اس کے ہاتھوں انقلاب کی شمع جلنے لگے' یہ ایک ایسی انہونی بات ہے کہ جس کا کبھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قرآن کریم پورے یقین و اذعان سے یہ بات کہہ رہا ہے کہ یہ

Marfat.com

آفتاب طلوع ہو کے رہے گا البتہ کب طلوع ہوگا یہ تم نہیں جانتے ہو۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ تمہارا کام صرف اس سحر کی امید میں رات کی تاریکی سے لڑنا ہے اور اپنے سفر کو جاری و ساری رکھنا ہے۔ تم اپنے حوصلوں کو باقی رکھو اور اس نوید جانفزا کو یقینی سمجھ کر اسکے انتظار میں اس کشمکش میں ثابت قدم رہو۔ اس لحاظ سے اگر اتنے بڑے دعوے کو قرآن پاک کے سچا ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے برحق ہونے کی دلیل نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں جس طرح یہ نوید سنائی جارہی ہے کہ عنقریب ایک قوم اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے گی اور پھر یہ انقلاب تیزی سے آگے بڑھے گا اسی طرح یہ بات بھی اس سے مترشح ہوتی ہے کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام قبول کر چکے اور اذیتوں سے گزر رہے ہیں لیکن انہوں نے کسی وقت بھی استقامت کا دامن نہیں چھوڑا۔ انہیں اور مستقبل قریب میں ایمان لانے والوں کی استقامت کو خراج تحسین پیش کیا جارہا ہے اور یا یوں کہہ لیجئے کہ اللہ کے راستے میں ان کی ثابت قدمی اور استقامت کو شرف قبول بخشا جارہا ہے۔ چنانچہ تاریخ ان دونوں باتوں کو ثابت کرتی ہے کہ مکے سے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد جس طرح تیزی سے اسلام پھیلا اور حدیبیہ کے معاہدے کے بعد جس طرح اس میں مزید تیزی آئی اور فتح مکہ کے بعد جس طرح فوج در فوج لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا وہ تمام اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ اور پروردگار کے اس دعویٰ کی روشن دلیلیں ہیں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں اسلام اور مسلمانوں کو جن مراحل سے گزرنا پڑا اور پھر حضور کے انتقال پر ملال کے بعد صحابہ کو عرب کی جس عظیم بغاوت کو کچلنا پڑا اور پھر جس طرح وقت کی بڑی بڑی قوتیں اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور جس طرح مسلمانوں نے استقامت اور شجاعت سے ان کا مقابلہ کیا وہ قرآن کریم کے اس کلمۂ تحسین کی زندہ گواہیاں ہیں جو صحابہ کی سرفروشانہ کارناموں نے تاریخ کے سپرد کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں پروردگار جس طرح یہ فرمارہا ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لاتے تو نہ لائیں آپ کو ہرگز اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ ہم نے اس کیلئے ایک ایسی قوم اٹھا دی ہے اور مقرر کر دی ہے کہ جو اس راستے پر ایسی ثابت قدمی سے چلے گی کہ کبھی لڑکھڑاہٹ ان کے قدموں میں نہیں آئے گی اور کبھی کفر اور نافرمانی کا چھینٹا ان کے دامن پر نہیں پڑنے پائے گا اس حوالے سے جب ہم صحابہ کی زندگیوں کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کیسے کیسے نامساعد حالات میں آنحضرت ﷺ ان کے سامنے جب اس طرح کی پیش گوئیاں فرماتے تھے تو وہ اس کا یقین کیسے کر لیتے تھے اور پھر بڑی سے بڑی مخالفت میں ثابت قدم کیسے رہتے تھے۔ یہ ہر سوچنے والے دماغ کیلئے ایک ایسا لمحہ فکریہ ہے جو قوموں کی تاریخ میں غور کرنے والوں کو ہمیشہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مکی زندگی میں جس طرح یہ پیش گوئی ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے لیکن مسلمانوں نے اسے دل و جان سے قبول کیا۔ اسی طرح جنگ بدر کے موقع پر جب حضور مسلمانوں کو لے کر قریش کے ایک ہزار کے عظیم اور مسلح لشکر کے مقابلے میں نکلے تو ہر دیکھنے والی نگاہ سہی جارہی تھی کہ یا اللہ آخر یہ کیا مقابلہ ہے کہ ایک طرف مسلح لوگوں کا ایک عظیم لشکر ہے اور دوسری طرف مٹھی بھر مدینہ کے بخار کے مارے ہوئے فاقوں کے ستائے ہوئے غیر مسلح لوگ ہیں۔ لیکن انہوں نے جس پامردی اور حوصلہ مندی سے اس پوری صورتحال کا مقابلہ کیا وہ حیران کر دینے والی بات ہے اور دنیا میں شاید ہی ہمیں اس کی کوئی مثال مل سکے۔ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی آنحضرت ﷺ سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان کی گرفتاری کا وقت آیا تو ان کے وہ بارہ حواری جو ان کے خاص مقرب لوگ تھے وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے اور انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ لیکن ادھر صحابہ کا حال یہ تھا کہ جب راستہ میں آنحضرت ﷺ نے ان سے مشورہ لیا کہ ایک طرف قافلہ تجارت ہے اور دوسری طرف قریش کا لشکر بتاؤ کدھر جانا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی اشاروں سے یہ بات بھی واضح کر دی کہ میں تو لشکر کے مقابلے میں جانے کو ترجیح دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے دونوں میں سے ایک میں کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے تو صحابہ نے جواب میں جو کہا وہ تاریخ میں ہمیشہ آب زر سے لکھا جائے گا۔ مہاجرین میں سے حضرت مقداد بن عمرو نے اس سوال کے جواب میں عرض

Marfat.com

کیا۔ یارسول اللہ جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے اسی طرف چلئے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ نہیں ہم کہتے ہیں چلئے آپ اور آپ کا خدا دونوں لڑیں اور ہم آپ کے ساتھ جانیں لڑائیں گے جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔ انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ اٹھے۔ انہوں نے عرض کی:

لقد اٰمنا بک و صدقناک و شهدنا ان ما جئت به هو الحق و اعطیناک عهودنا و مواثیقنا علی السمع و الطاعة. فامض یا رسول الله لما اردت. فوالذی بعثک بالحق لو استعرضت بنا هٰذا البحر فخضته لخضناه معک وما تخلف منا رجل واحد وما نکره ان تلقی بناعدونا غدًا انا لنصبر عند الحرب صُدُقٌ عندک اللقآء و لعل الله یریک منا ما نقر به عینک نسربنا علیٰ بر کة الله

''ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسول، جو کچھ آپ نے ارادہ فرمالیا ہے اسے کر گزریئے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں لیکر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم آپ کے ساتھ کود یں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے، مقابلہ میں سچی جانثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں کہ اللہ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھوا دے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیں''۔

صحابہ کی زندگی ایسی سرفروشانہ مثالوں سے بھرپور ہے۔ ان کے اسی کردار کی یہاں تحسین فرمائی جارہی ہے اور آنے والے حالات میں ان کی مزید استقامت کی پیش گوئی بھی فرمائی گئی ہے۔

اگلی آیت کریمہ اسی سلسلہ بیان سے منسلک ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کے حوالے سے اس رکوع میں چل رہا ہے۔

آیت:۹۰ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ ''یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے تو تم بھی انہی کے طریقے کی پیروی کرو اعلان کر دو میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں بس عالم والوں کیلئے ایک یاد دہانی ہے''۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ ان کے آباؤ اجداد اور ان کی ذریت میں سے جن جن لوگوں کو نبوت و رسالت سے مشرف فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی ہدایت نازل ہوئی۔ باقی لوگوں نے جتنے طریقے نکال رکھے ہیں وہ اللہ کی ہدایت نہیں بلکہ اس سے بغاوت ہے۔ اب یہی اللہ کی ہدایت رسول اللہ ﷺ پر نازل کی جارہی ہے۔ اس لئے اس ہدایت اور سابقہ پیغمبروں کی ہدایت میں اتصال اور یک رنگی دکھانے کیلئے فرمایا جارہا ہے کہ اے پیغمبر آپ ان لوگوں کی ہدایت کی پیروی کریں مقصود یہ ہے کہ ان کی ہدایت کے تین پہلو ہیں آپ بھی اپنی ہدایت میں انہی تین پہلوؤں کی پابندی فرمائیں۔

1- اللہ نے انہیں فروع میں اختلاف کے باوجود جو اصولِ دین عطا فرمائے تھے آپ بھی انہی اصول کو اختیار کریں اور اپنی ہدایت کا مدار انہی اصول کی تبلیغ و دعوت اور اس کے بروئے کار لانے پر رکھیں وہ اصول دین وہی ہیں جنہیں ہم عقائد کہتے ہیں یعنی توحید، رسالت اور آخرت۔ اللہ نے جتنے بھی پیغمبر بھیجے وہ انہی تینوں اصولوں کی دعوت دینے کیلئے تشریف لائے اور انہی بنیادوں پر انہوں نے زندگی کی عمارت استوار کی۔ آپ سے پہلے آیا

Marfat.com

جارہا ہے کہ آپ بھی انہی اصولوں پرشریعت کی عمارت اٹھائیں اور انہی تینوں کو دل و دماغ میں راسخ کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اسی پر زندگی کی اصلاح اور بقاء کا دارو مدار ہے۔

سابقہ شریعتوں کی پیروی کا حکم:

2- سابقہ پیغمبروں نے جب بھی اپنی قوموں کے سامنے اللہ کے دین کو پیش کیا تو ان قوموں نے کبھی بھی ان کی دعوت کو آرام سے قبول نہیں کیا۔ایک طویل کشمکش کا سلسلہ جاری رہا اور اس سفر میں زندگی کا کوئی دکھ ایسا نہیں جس سے ان پیغمبروں کو واسطہ نہ پڑا ہو گویا اس راہ میں اللہ کے نبیوں کا ستایا جانا اس راستے کی ایک ایسی لازمی سنت ہے جس سے ہر پیغمبر کو گزرنا پڑتا ہے۔اس لئے اے محمد ﷺ آپ بھی چونکہ انہی کی طرح اللہ کے دین کی دعوت دینے کیلئے تشریف لائے ہیں تو آپ کو اپنی قوم کی طرف سے ایسی ہی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جیسے آپ سے پہلے پیغمبروں کو کرنا پڑا جیسے ان کا کبھی کوئی دن آرام سے نہیں گزرا اور کبھی کوئی رات چین سے نہیں کٹی۔آپ کو بھی انہی دکھوں سے واسطہ پڑے گا۔کیونکہ یہ اس راستے کی لازمی سنتیں ہیں جن سے گزرے بغیر کبھی تبلیغ و دعوت کا عمل کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتا۔اس لئے ایسی کشمکش میں جس طرح پہلے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا اور استقامت دکھائی آپ بھی اسی طرح استقامت دکھا کر ان کی سنت کی پیروی فرمائیں۔

رسول اللہ ﷺ جو دین پیش کرتے ہیں اس میں ان کا کوئی ذاتی مفاد نہیں:

3- اللہ تعالیٰ کی عادت یہ رہی ہے کہ جب بھی وہ اپنا کوئی نیا رسول بھیجتا ہے اور اس پر نئی شریعت اتارتا ہے تو شریعت کے احکام میں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ سابقہ شریعت کے بعض احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام اتارے جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سابقہ شریعت کے احکام ہی جو پہلی شریعتوں کے حاملین نے نذرِ تغافل کئے ہوتے ہیں یا انہیں تحریف کا شکار بنالیا جاتا ہے انہیں از سرِ نو زندہ کر کے نازل کر دیا جاتا ہے اور کبھی وہ احکام جن کا چلن سابقہ امت میں جاری ہوتا ہے انہی کو نئی شریعت کا حصہ بنا دیا جاتا ہے آنخضرت ﷺ کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ آپ کی شریعت میں اگر سابقہ شریعتوں کے احکام اتارے جائیں تو آپ ان کی پابندی کریں اور اگر کسی معاملے میں کوئی حکم نازل نہیں کیا جاتا لیکن سابقہ شریعت میں وہ حکم موجود ہے تو آپ کو اس کی پابندی کرنی چاہیے۔چنانچہ آنخضرت کا یہ طریقہ تھا کہ جب تک کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوتا تھا آپ تورات کے احکام کی پابندی فرماتے تھے۔یہاں اسی بات کا تذکرہ کیا جارہا ہے کیونکہ مقصود تو صرف اس بات کی تعلیم دینا ہوتا ہے کہ اطاعت و عبادت کا مستحق صرف اللہ ہے۔جس طرح اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اس کی اطاعت میں بھی کوئی اس کا ہمسر نہیں سابقہ شریعتیں اسی کے احکام تھیں اسلئے واجب التعمیل تھیں اور اب نئی شریعت بھی اسی کے احکام پر مشتمل ہے اسلئے اب اس کی تعمیل کرنا ہوگی اور جب تک کوئی نیا حکم نہیں آتا سابقہ شریعت قابل عمل رہے گی اور اگر اسی کے کسی حکم کو نئی شریعت میں اتار دیا جاتا ہے تو وہ دائمی شریعت کا حصہ بن جائے گا۔آخر میں فرمایا جارہا ہے کہ دیکھو میں تمہارے سامنے جو اللہ کا دین پیش کررہا ہوں اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں بلکہ اللہ کا ہر پیغمبر امت کی بھلائی کیلئے آتا ہے اور میں بھی تمہاری بھلائی کیلئے اللہ کا دین تمہارے سامنے پیش کررہا ہوں اور میں اس پر کسی اجر کا طالب نہیں مجھے یہ دولت اللہ کی طرف سے مفت ملی ہے اور میں اسے مفت بانٹ رہا ہوں۔تم اگر اسے قبول کرلو گے تو اپنی دنیا اور عاقبت بنالو گے اور قبول نہیں کرو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔میں کوئی کاروبار نہیں کررہا کہ اگر تم نے میری دعوت قبول نہ کی تو میرا کاروبار بیٹھ جائے گا یہ کوئی دکانداری نہیں نبوت ہے جسے قبول کرنے پر تمہاری دنیا اور آخرت کا دارو مدار ہے اور مزید فرمایا کہ یہ دین اور یہ شریعت جو میں لے کر آیا

Marfat.com

ہوں اسکی حیثیت ذکریٰ کی ہے۔ ذکریٰ کا معنی ہے یاددہانی۔ یعنی وہ حقائق اور عوامل جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں اور جنہیں تمہاری خواہشات نفس نے دبا رکھا ہے میں انہی کو از سر نو زندہ کرنے اور تمہارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور یہود سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ تمہارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے تم دیکھ سکتے ہیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ان میں سے کوئی بات نئی نہیں بلکہ یہ وہی ہدایت الٰہی ہے جسے حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبر لے کر آئے۔ میں اسی کی یاددہانی کرا رہا ہوں اور لوگوں نے اس میں جو گمراہیاں پیدا کر لی ہیں اور جن بدعات کو دین کا حصہ بنالیا ہے اور جن گمراہ کن راستوں پر وہ چل نکلے ہیں میں خالص دین پیش کر کے ان تمام گمراہیوں کا علاج کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے ان میں کوئی نئی بات نہیں کہ جسے تم اچنبھا سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کر دو۔ یہ تو تمہارے اپنے اندر کی یعنی فطرت کی وہ گمشدہ متاع ہے اور انبیاء کا وہ ورثہ ہے جسے تم نے بگاڑ کے رکھ دیا ہے اور میں تمہارے سامنے اس کو اپنی اصلی شکل میں پیش کر رہا ہوں تو تمہیں تو آگے بڑھ بڑھ کر اسے قبول کرنا چاہیے نہ کہ میری مخالفت کرنی چاہیے۔

وَمَا قَدَرُوا

اور ان

اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ

لوگوں نے خدا کی قدر جیسی جاننی چاہیے تھی نہ جانی. جب اُنہوں نے کہا کہ خدا نے انسان پر (وحی اور کتاب وغیرہ) کچھ

مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ

بھی نازل نہیں کیا. کہو کہ جو کتاب موسیٰؑ لے کر آئے تھے اُسے کس نے نازل کیا تھا جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت

تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ

تھی اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق (پر نقل) کر رکھا ہے اُن (کے کچھ حصے) کو تو ظاہر کرتے ہو اور اکثر کو چھپاتے ہو اور

تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾

تم کو وہ باتیں سکھائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا. کہہ دو (اس کتاب کو) خدا ہی نے (نازل کیا تھا) پھر ان کو

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ

چھوڑ دو کہ اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں. اور (ویسی ہی) یہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے بابرکت جو اپنے سے پہلی

اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ

(کتابوں) کی تصدیق کرتی ہے اور (جو) اس لیے (نازل کی گئی ہے) کہ تم مکے اور اُس کے آس پاس کے لوگوں کو آگاہ کر دو۔ اور

Marfat.com

بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى

جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کی پوری خبر رکھتے ہیں اور

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ افترا کرے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ

قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ

آئی ہو اور جو یہ کہے کہ جس طرح کی کتاب خدا نے نازل کی ہے اس طرح کی میں بھی بنا لیتا ہوں۔ اور کاش تم ان ظالم یعنی

الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ

مشرک لوگوں کو اس وقت دیکھو جب موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں اور فرشتے ان کی طرف عذاب کے لیے ہاتھ بڑھا رہے

تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ

ہوں۔ کہ نکالو اپنی جانیں آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم خدا پر جھوٹ بولا کرتے تھے اور

وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا

اس کی آیتوں سے سرکشی کرتے تھے۔ اور جیسا ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ایسا ہی آج اکیلے اکیلے

خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى

ہمارے پاس آئے اور جو (مال و متاع) ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ

مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ

تمہارے سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کی نسبت تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے (شفیع اور ہمارے) شریک ہیں

بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

(آج) تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو گئے اور جو دعوے تم کیا کرتے تھے سب جاتے رہے۔

Marfat.com

تمہید:

سورۃ الانعام میں باقی مکی سورتوں کی طرح بنیادی انسانی مفاسد کی اصلاح پر زور دیتے ہوئے اسلام کے تینوں عقائد کو مسلسل بیان کیا جا رہا ہے اور ان میں چونکہ عقیدۂ توحید سب سے بنیادی عقیدہ ہے' اس لئے سب سے زیادہ اس کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ مشرکینِ مکہ کو چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے نسبی اور دینی تعلق کی بنیاد پر یہ دعویٰ تھا کہ ہم تو انہی کے طریقے پر ہیں اور یہی طریقہ ہدایت کا طریقہ ہے' لہٰذا ہم اس سے کسی طرح دستبردار نہیں ہو سکتے۔ گزشتہ آیات میں ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت اور ان کی دعوت کو پوری تفصیل سے بیان فرمایا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ ان کی دعوت کا اساسی پہلو' جس پر وہ زندگی بھر اپنی قوم سے لڑتے رہے' وہ عقیدۂ توحید تھا اور پھر اس عقیدہ کو واضح کرنے کیلئے انہوں نے جو دلائل اپنی قوم کو دیئے' ان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس بات کو مزید مؤکد کرنے کیلئے ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد میں سے کئی انبیاء و رسل کا ذکر کیا گیا اور یہ دکھایا گیا کہ جو دعوت رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں' یہی دعوت حضرت ابراہیم اور ان تمام رسولوں کی تھی۔ اس لئے اگر تم ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنی نسبت میں سچے ہو تو پھر تمہیں آگے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی پیش کردہ دعوت کو قبول کرنے میں تأمل نہیں ہونا چاہئے۔ اب پیش نظر آیات میں اس دعوت کے حوالے سے اور بالخصوص قرآن کریم کے نزول اور اس کی حقانیت کے حوالے سے مشرکینِ مکہ جو کچھ کہتے اور جو اعتراضات کرتے تھے' ان کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اہل کتاب ان کی پشت پناہی کرتے ہوئے اور ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے' جو کچھ ان کو سکھاتے پڑھاتے تھے' اس کا تذکرہ کر کے اہل کتاب پر ایک جامع تنقید فرمائی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

آیت:۹۱ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ O ''اور انہوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی' جبکہ یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر بھی کوئی چیز نہیں اتاری۔ ان سے پوچھو! وہ کتاب کس نے اتاری' جسکو موسیٰ روشنی اور لوگوں کیلئے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے' جسکو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو اور تم کو ان باتوں کی تعلیم دی گئی' جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا؟ کہہ دو! اللہ ہی نے۔ پھر ان کو انکی کج بحثیوں میں چھوڑ دو کھیلتے رہیں''۔

رسالتِ محمدی کے بارے میں اہلِ کتاب کا جھوٹ:

یہ سورۃ اگرچہ مکی ہے' اس لئے اس میں بار بار اہل مکہ ہی سے خطاب ہو رہا ہے۔ لیکن اس آیت کریمہ میں جس اعتراض کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر پروردگار کی جانب سے اس کا جو جواب دیا گیا ہے' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے جب رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ میں تھے اور ابھی آپ کی دعوت کو اہل کتاب سے واسطہ نہیں پڑا تھا' اس وقت بھی اہل کتاب اسلامی دعوت سے بالکل بے خبر نہیں تھے۔ انہیں اہل مکہ کی طرف سے برابر اس کی اطلاعات پہنچتی رہتی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ اس دعوت میں دلچسپی لینے لگے تھے اور رفتہ رفتہ ان کی تشویش یہ دیکھ کر بڑھتی جا رہی تھی کہ جس طرح اس دعوت میں ملتِ ابراہیمی اور مرکزِ ابراہیم کو مرکزی حیثیت دی جا رہی ہے' اس کے نتیجے میں اس دعوت کی ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے' ہماری حیثیت کا باقی رہنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس لئے انہیں اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ آخری نبی ہیں اور ان کی دعوت وہ آخری دعوت ہے' جس کا ہدف پوری نوع انسانی ہے اور جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس دعوت کے حاملین دنیا کی امامت و سیادت

Marfat.com

کے منصب پر فائز کئے جائیں گے۔ اور اگر ہم نے اس دعوت کو کامیاب ہونے کا موقع دے دیا تو اس کی کامیابی یقیناً ہماری موت اور تباہی ثابت ہوگی۔ اس لئے وہ دور بیٹھ کر بھی اہل مکہ کی پیٹھ ٹھونکتے اور حتی الامکان ان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ یہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے جب آنحضرت ﷺ کی نبوت اور قرآن کریم کے نزول کے بارے میں ان سے استفسار کیا کیونکہ خود مشرکینِ مکہ اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ ہم مذہب کے بارے میں بالکل امی اور جاہل لوگ ہیں اور اہل کتاب چونکہ ایک مذہب اور ایک کتاب رکھتے ہیں' اس لئے اس نئی بعثت اور نئے نازل ہونے والے مذہب کے بارے میں وہ ہماری بہتر راہنمائی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب راہنمائی کی غرض سے ان کی طرف رجوع کیا تو وہ عجیب مشکل میں پڑ گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر ہم نے مشرکینِ مکہ کو یہ بتایا کہ تم میں جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ مجھ پر اللہ کی وحی اترتی ہے اور مجھ پر ایک کتاب نازل ہو رہی ہے' یہ بالکل غلط بات ہے کیونکہ نبی ہمیشہ بنی اسرائیل میں آتے رہے ہیں اور آئندہ بھی اگر نبوت آئے گی تو بنی اسرائیل میں آئے گی' تم میں یا کسی اور قوم میں ہرگز نہیں آسکتی تو اس سے اندیشہ تھا کہ مشرکینِ مکہ اور عرب' جو قومی عصبیت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور معمولی معمولی باتوں پر ان کی حمیتِ قومی بھڑک اٹھتی اور پھر وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اہل کتاب کا یہ جواب سن کر کہ نبوت تو بنی اسرائیل ہی کا ورثہ ہے' بنی اسماعیل اس سے مشرف نہیں ہو سکتے' حمیت میں مبتلا ہو جاتے اور بھڑک کر نہ چاہتے ہوئے بھی رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آتے۔ اہلِ کتاب نے یہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے ان کو جو جواب دیا وہ خود بھی جانتے تھے کہ یہ جواب غلط ہے۔ لیکن انہوں نے متذکرہ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ذہنی تحفظات کے ساتھ یہ کہا کہ یہ صاحب جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور وہ قرآن کریم کو اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب کہتے ہیں' یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز بھی آج تک نہیں اتاری کیونکہ کسی بشر کی یہ مجال نہیں کہ وہ اللہ کے کلام یا اس کی نازل کردہ وحی کا تحمل کر سکے۔ کہاں پروردگارِ عالم اور کہاں یہ زمین پر بسنے والا معمولی انسان۔ اس لئے یہ بالکل ناممکن بات ہے کہ کسی انسان پر اللہ کی جانب سے کوئی چیز اترے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں ان کی اس بات پر قرآن کریم نے مختلف پہلوؤں سے گفتگو فرمائی ہے۔

اہلِ کتاب دینی بصیرت سے بے بہرہ ہیں:

سوال کا اصل جواب دینے سے پہلے ایک تمہید اٹھائی گئی ہے' جس میں ان کی ذہنی نارسائی اور دینی ناپختگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ انہیں خطاب کئے بغیر' بالواسطہ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ جو بات انہوں نے کہی کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری' اگر یہ بات مشرکینِ مکہ کہتے تو چنداں تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ وہ مذہب اور مذہبی متعلقات سے بالکل بے خبر اور نابلد لوگ ہیں۔ ایک جاہل محض اپنی جہالت کی وجہ سے کوئی بھی ایسی ویسی بات کہہ دے تو اس کی جہالت کی وجہ سے قابل معافی اور قابل درگزر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اہل کتاب کی طرف سے اس بات کا کہا جانا' یہ نہایت تکلیف دہ اور قابلِ اعتراض بات ہے کیونکہ وہ خود اپنے پاس ایک کتاب رکھتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے۔ اس دعوے کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری' آخر اس میں کیا صداقت ہو سکتی ہے؟ اس لئے وہ خود بھی جانتے تھے کہ یہ بات غلط ہے۔ لیکن اب جبکہ انہوں نے یہ بات کہی ہے تو ان کی بات کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باوجود اہل کتاب ہونے کے ابھی تک وہ دینی احساسات اور دینی بصیرت سے کوسوں دور ہیں۔ وہ اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں' لیکن اللہ کی صفات اور اس کی حکمتوں کو بالکل نہیں جانتے کیونکہ اگر وہ جانتے ہوتے تو ایسی بات کہنے کی کبھی جسارت نہ کرتے۔ ان کی اس بات کے دو ہی مفہوم ہو سکتے ہیں۔

Marfat.com

اہلِ کتاب کے انکار کی دو ممکنہ وجوہ:

ایک تو یہ کہ اللہ نے کسی شخص پر بھی کوئی چیز اس لئے نہیں اتاری کہ یہ بات اللہ کی قدرت سے بعید ہے۔ وہ اس بات پر قادر نہیں کہ کسی انسان پر اپنا کلام اتارے اور کسی کو کتاب سے نوازے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی قدرت کے بارے میں نجانے کیا تصور رکھتے ہیں۔ جس پروردگار کی قدرت کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے چھوٹی سے چھوٹی مخلوق' جنہیں غیر مسلح آنکھ سے دیکھنا بھی شاید ممکن نہ ہو' وہ انہیں بھی زندگی گزارنے اور ضروریات کے حصول کا طریقہ القا فرماتا ہے۔ وہ شہد کی مکھی کو تعلیم دیتا ہے کہ وہ شہد کس طرح تیار کرے' کس طرح جڑی بوٹیوں اور پھلوں کا رس چوسے' کس طرح اسے موسمی آلودگیوں سے محفوظ رکھے اور کس طرح اس چھتے کے قریب بھی کسی دوسرے جانور کو نہ آنے دے' جس میں شہد تیار کیا جا رہا ہے۔ تاکہ یہ خالص شہد کسی مضر اثر کا شکار نہ ہو سکے۔ زمین اور پانی میں پھیلی ہوئی بے شمار مخلوقات جی رہی ہیں۔ ان کو جینے کا طریقہ' حفاظت کے اسباب' توالد تناسل کا فہم' اولاد کی نمود و پرداخت کا جذبہ' گھر بنانے کی ترکیب اور شام کو اپنے گھر لوٹ کے آنے کی ترغیب جیسی باتوں سے کون آشنا کرتا ہے؟ جس ذات خداوندی نے دلوں میں القا کے ذریعہ ان ضرورتوں کو پورا کیا ہے' اس کیلئے کیا مشکل ہے کہ وہ انسانوں کے دل و دماغ میں اپنا کلام نازل فرمائے اور اپنی تعلیم کا انہیں ذریعہ بنائے۔ اس طرح کی بات' جیسے اہل کتاب نے کہی ہے' صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے' جسے اللہ کی قدرت پر یقین نہ ہو۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے یہ بات اس خیال سے کہی ہے کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری کیونکہ کسی بشر پر کسی چیز کا اتارنا یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ اگر انہوں نے واقعی یہ بات اس خیال سے کہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی عظمت کو اور اس کی حکمت کو نہیں پہچانا۔ جس پروردگار کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر ودیعت کردہ ہر طلب اور ہر تقاضے کا بہتر سے بہتر جواب دے' اس سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسان کے سب سے بڑے تقاضے ''طلب ہدایت'' کا کوئی جواب نہ دے۔ اس نے ہمارے اندر پیاس کا ایک تقاضہ پیدا کیا تو اس کا جواب دینے اور اس کی تسکین کیلئے' اس نے زمین کے اندر پانی کی سوتیں جاری کر دیں اور آسمان سے چھم چھم پانی برسایا۔ پہاڑوں پر برف کی تہیں جما دیں تاکہ وہ پگھل پگھل کر ہماری ضرورت کو پورا کرتی رہیں۔ پھر زمین کے مختلف اطراف میں اس نے سمندروں کے ذخیرے پھیلا دیئے۔ اسی طرح اس نے ہمیں بھوک کا احساس دیا تو اسے پورا کرنے کیلئے زمین کو روئیدگی کے خزانوں سے مالا مال کر دیا۔ عناصر قدرت کو ہماری یہ ضرورت پورا کرنے پر اس طرح لگا دیا کہ وہ شب و روز اس میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کے جتنے بھی احساسات ہمیں عطا کئے گئے' ان میں سے کوئی ایسا نہیں' قدرت نے جس کا جواب دینے میں کمی فرمائی ہو۔ ہمیں اس نے جمالیاتی ذوق بخشا تو ہمارا گردوپیش' اس نے حسن و جمال سے مالا مال کر دیا۔ پھولوں کی دلکشی اور رعنائی' پرندوں کے خوبصورت نغمے' پہاڑوں سے گرتی ہوئی آبشاریں' میدانوں میں بل کھاتی ہوئی جدولیں' کھیتوں میں نقرئی لباس پہنے ہوئے کھڑی فصلیں' برسات میں اٹھتی ہوئی گھنگھور گھٹائیں اور زمین پر پھیلا ہوا سبزے کا مخملی فرش' خوبصورت نین نقشوں والے چہرے' دل فریب اور فتنہ خیز ادائیں' یہ سب جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان ہیں۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ جس طرح اس نے جمالیاتی ذوق کی تسکین کیلئے حسن آرائی فرمائی ہے' اسی طرح حسن کی عزت افزائی کیلئے پگھلنے والا دل اور نظر نواز نگاہیں بھی عطا کی ہیں۔ وہ حسن کو اگر شوخیاں دیتا ہے تو عشق کو گرمیاں بھی عطا کرتا ہے اور اس کو سوز و گداز دے کر سرتاپا حسن کا جواب بنا دیتا ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جس پروردگار کی حکمت نے ایک ایک تقاضے کو جواب عنایت فرمایا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ طلب ہدایت جو زندگی کا سب سے بڑا تقاضا اور سب سے بڑی ضرورت ہے' قدرت اس سے صرف نظر فرما لے اور اس کا کوئی جواب نہ دے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً کھانے پینے والے حیوانات تو زمین پر چلتے پھرتے دکھائی دیتے' لیکن انسانیت دم توڑ جاتی اور یہاں بسنے والا انسان' اسی طرح زندگی گزارتا یا زندہ رہتا

Marfat.com

کوئی چیز گزارتا' جس طرح جنگل میں حیوان زندگی گزارتے ہیں۔ جس میں طاقت ہوتی ہے' وہ جنگل میں گھومتا پھرتا ہے اور جو کمزور ہوتا ہے' وہ اپنے بھٹ میں چھپ کر وقت گزارتا ہے اور یا پھر طاقتور کے ہاتھوں مارا جاتا ہے اور اس کی خوراک بن جاتا ہے۔ اگر کوئی بھی ہوش وخرد رکھنے والا شخص اس نتیجے کو قبول نہیں کرسکتا تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ جیسی علیم وحکیم ذات' وہ کبھی بھی طلب ہدایت جیسی بنیادی ضرورت کو نظر انداز فرما کر انسان کو اس سے محروم نہیں کرسکتی تھی چنانچہ اس نے محروم نہیں کیا۔

کیا حضرت موسیٰ بشر نہیں تھے؟

اہل کتاب نے یہ بات کہہ کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اہل کتاب ہو کر بھی اللہ کی قدر وعظمت سے واقف نہیں۔ اگر وہ اس کی قدرت اور حکمت سے آگاہ ہوتے تو وہ کبھی اس طرح کی بے سروپا بات نہ کہتے۔ اس طرح پہلے ہی جملے میں ان کی علمی بے مائیگی' دینی بے بصیرتی اور عقلی کوتاہی کو ذکر فرمانے کے بعد پھر ان کی بات کا جواب دیا۔ فرمایا: اے پیغمبر ان سے پوچھئے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی چیز نازل نہیں کی تو موسیٰ علیہ السلام بھی تو ایک بشر اور ایک انسان تھے اور تمہارا یہ ایمان ہے کہ ان پر کتاب تورات نازل ہوئی تھی۔ بتاؤ! یہ کتاب ان پر کس نے نازل کی تھی؟ ظاہر ہے کہ اہل کتاب نہ تو یہ کہہ سکتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام سرے سے بشر ہی نہ تھے اور نہ اس بات کا انکار کرسکتے تھے کہ اللہ نے ان پر کتاب نازل کی تھی۔ جب یہ دونوں باتیں تاریخ کا حصہ ہیں اور انہیں تسلیم بھی ہیں تو پھر انہوں نے کس حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔ اس جواب کے ضمن میں تورات کی حیثیت اور شان کو بیان کرتے ہوئے' یہ بھی واضح فرمادیا کہ موسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب اتاری گئی تھی' اس کی دو صفتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ نور تھی اور دوسرا یہ کہ وہ لوگوں کیلئے ہدایت تھی۔ اس میں دراصل اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ دنیا میں جو بھی کتاب انسانی ہدایت کیلئے نازل ہوئی ہے' اللہ نے یہ دونوں صفتیں اس کتاب میں ضرور رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انجیل کیلئے بھی' ان دونوں صفتوں کا ذکر کیا گیا اور قرآن کریم کیلئے بھی۔ کیونکہ یہی دونوں چیزیں' انسانی زندگی کیلئے بنیادی ضرورتیں ہیں۔ انسان اپنی سوچ اور اپنے خیال میں ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا ہے۔ وہ جب اپنی دماغی قوت سے کام لے کر انفرادی یا اجتماعی فیصلے کرتا ہے تو بہت دفعہ اس میں ایسی ایسی غلطیاں کر جاتا ہے جو انسانی خرابی ہی نہیں بلکہ بعض دفعہ تباہی پر منتج ہوتی ہیں۔ اس لئے انسانی زندگی کو اس تباہی سے بچانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اسے ایک ایسا نور اور روشنی عطا کی جائے' جو اس کی ذہنی اور فکری الجھنوں میں اس کی راہنمائی کرسکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جب بھی کسی پیغمبر پر کوئی کتاب نازل فرماتا ہے تو اس کتاب کے ذریعے اس قوم کی ذہنی الجھنوں اور فکری نارسائیوں کا علاج کرتا ہے۔ وہ عالم مابعد الطبیعات' عالم الٰہیات' زندگی کے اجتماعی تہذیبی اور تمدنی مسائل' انسانی نفسیات پر مبنی حقوق وفرائض' طاقت مل جانے کے بعد اس پر ضبط کی طاقت اور کمزوری اور ناتوانی میں صبر کی قوت' تنہائیوں میں پاکیزہ رہنے کی صلاحیت' یہ سب چیزیں انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں اور یہ اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتیں' جب تک کہ دماغی اور قلبی فیصلے صحیح حوالوں سے کرنے کی توفیق نصیب نہ ہو۔ اس لئے ہر کتاب کو اس راہنمائی کیلئے نور بنا کر نازل کیا گیا۔

انسانوں کا بنایا ہوا کوئی قانون کماحقہٗ انسانی ضروریات کو پورا نہیں کرتا:

انسان کی دوسری ضرورت اس کی انفرادی اور اجتماعی معاملات میں ہمواری پیدا کرنے کیلئے ایسا آئین اور قانون ہے یا زندگی کے ایسے عدالتی اور اخلاقی ضوابط ہیں' جن کی راہنمائی اور جن کی نگرانی میں انسانی زندگی کا سفر محفوظ اور خوشگوار گزرے۔ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی قانون اور کوئی آئین بھی کماحقہٗ اس ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا۔ اس لئے اللہ کتاب اتار کر اور اپنا پیغمبر بھیج کر اس راہنمائی اور ہدایت کا سامان کرتا ہے۔ کہا یہ وہ انسانی ضرورتیں

Marfat.com

ہیں جن کیلئے کتابیں اترتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام بھی اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اللہ کی طرف سے جو کتاب لائے تھے وہ انہی صفات کی حامل تھی۔ اے اہل کتاب آج اگر انہی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے محمد کریم ﷺ مبعوث ہوئے ہیں اور وہ انسانوں کے پاس اللہ کی عطا کردہ کتاب لے کر آئے ہیں تو تم آخر اس سے انکار کیوں کر رہے ہو۔ یہاں تک جو کچھ فرمایا گیا' یہ اہل کتاب کو جواب دینے کی حد تک تو کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کا جواب دینے سے قاصر رہے اور ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں اور قرآن کریم نے خود ہی اس کا جواب دیا۔ آنحضرت ﷺ سے کہا گیا کہ یہ تو کیا جواب دیں گے' آپ فرما دیجئے کہ تورات کو موسیٰ علیہ السلام پر اللہ ہی نے نازل فرمایا تھا۔ اسی طرح آج قرآن بھی اسی نے نازل فرمایا ہے۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض مذہبی رہنماؤں نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی' لیکن قرآن کریم نے جب ان پر تنقید فرمائی جس کی وجہ سے خود اپنی قوم کو بھی انہیں منہ دکھانا مشکل ہو گیا تو ان کے بعض دوسرے مذہبی رہنماؤں نے اپنے ان علماء پر شدید گرفت کی اور پھر انہیں مذہبی سربراہی سے الگ کر دیا۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔ لیکن جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے۔ محض دفع الوقتی کیلئے کچھ لوگوں نے اگر اسے ناپسند کیا ہے تو یہ ان کا قومی طرز عمل نہیں' قومی طرز عمل وہی ہے جو ان کی اس بات سے جھلکتا ہے۔ کیونکہ اہل کتاب آنحضرت ﷺ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے ہر غلط سے غلط کام اور غلط سے غلط بات کہنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ جھوٹ بولنا ان کیلئے معمولی بات تھی اور ان کا انفرادی اور اجتماعی کردار دینی حوالوں سے بھی اس قدر بگڑ چکا تھا کہ ان سے کسی بھی غلط سے غلط بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔

اہلِ کتاب نے تورات کو ورق ورق کر دیا:

اس لئے اسی آیت کریمہ میں اسی جواب کے ساتھ ان سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم اگرچہ اپنے پاس ایک کتاب رکھتے ہو اور دعویٰ تمہارا یہ ہے کہ کسی اور قوم میں نہ کوئی نبی آسکتا ہے' نہ کوئی کتاب اتر سکتی ہے۔ لیکن خود اس کتاب کے ساتھ تمہارا طرز عمل کیا ہے؟ اللہ نے تمہیں ایک ایسی کتاب عطا فرمائی' جو سراپا نور اور لوگوں کیلئے ہدایت تھی۔ لیکن تم نے اسے قراطیس بنا کر رکھ دیا۔ قراطیس جمع ہے قرطاس کی۔ قرطاس کا معنی ہے کاغذ۔ کاغذ سے مراد وہ کاغذ نہیں' جو ہم آج استعمال کرتے ہیں بلکہ اس سے مراد اس کاغذ سمیت ہر وہ چیز ہے' جس پر لکھا جاسکے۔ چاہے وہ جھلی ہو' چاہے وہ اونٹ کے شانے کی ہڈی ہو' چاہے کوئی صاف سپاٹ پتھر کی سل۔ محاورے کو دیکھتے ہوئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرانِ کریم ان سے یہ کہہ رہا ہے کہ تم نے اس عظیم کتاب کو بھی ورق ورق کر کے رکھ دیا ہے۔ یعنی تم نے اس کے پرزے اڑا دیئے۔ لیکن ہمارے علماء اس کا مطلب یہ مراد لیتے ہیں کہ آج جس طرح ہمارے ہاتھوں میں قرآن پاک دوگتوں میں بند (مابین الدفتین) ایک محفوظ کتاب کی شکل میں ہے' انہوں نے تورات کو اس طرح محفوظ نہیں رکھا۔ بلکہ اس کو الگ کاغذوں کی شکل میں' مختلف حصوں میں تقسیم کر کے رکھا۔ جس کے نتیجے میں انہیں اس کتاب کے بعض حصوں کو چھپانے میں آسانی پیدا ہو گئی اور یہ آسانی اس وجہ سے بھی پیدا ہوئی کہ کتاب عام ہاتھوں میں نہیں تھی۔ بلکہ مخصوص لوگ اس کو اپنے پاس رکھتے تھے اور وہی اس کی مدد سے لوگوں کی راہنمائی کرتے تھے۔ جس طرح ہندوؤں میں صرف برہمن اپنی مذہبی کتاب پڑھ سکتا ہے اور وہی اپنی مذہبی کتابوں کا عالم ہوتا ہے۔ ان میں بھی بالعموم حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد یہ خدمت انجام دیتی تھی اور ان کا مذہبی طبقہ' جو اس کتاب کے علماء پر مشتمل تھا' وہ اس سازش میں اس کا شریک رہتا تھا۔ اسی وجہ سے قرآن کریم جا بجا ان پر اخفائے کتاب کا الزام عائد کیا۔ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی ان پر یہی الزام عائد کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا یہ چراغ تمہیں اس لئے دیا گیا تھا کہ تم کسی اونچے طاق پر اسے رکھو تاکہ پورے گھر میں اس کی روشنی پھیلے لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانک کر رکھ دیا۔ یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے کتاب کو کاغذوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم کتاب کے زیادہ حصے کو چھپاتے ہو اور

Marfat.com

کے کم حصے کو ظاہر کرتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کا یہ طرزِ عمل، اللہ کی کتاب کے ساتھ ان کی زندگی کا وہ بگاڑ تھا، جس کے وہ اس حد تک عادی ہو گئے تھے کہ ان کی پوری دینی زندگی اس سے متاثر ہو کر رہ گئی تھی۔ اور تورات کی شکل میں جو ان کو قانون ملا تھا، وہ ان کی عدالتوں سے رخصت ہو گیا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ جب بھی انہیں کوئی مشکل پیش آتی تو وہ اللہ کی کتاب میں کمی بیشی کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ دو یہودی زنا کے جرم میں پکڑے ہوئے حضور ﷺ کی عدالت میں لائے گئے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ! تمہاری کتاب میں زنا کی سزا کیا ہے؟ انہوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے شہر میں گھمانا۔ ان کا ایک مشہور عالم ابن صوریا اس مجلس میں موجود تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اے ابن صوریا میں تمہیں اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ کو نبوت دی اور تورات جیسی کتاب اس پر اتاری اور جس اللہ نے بنی اسرائیل کو بحر قلزم سے پار اتارا۔ تم مجھے بتاؤ کہ کیا تورات میں زنا کی یہی سزا ہے جو بیان کی گئی ہے؟ اس نے کہا کہ اگر آپ مجھے اتنی سخت قسم نہ دیتے تو میں کبھی آپ کو نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب یہ زنا جیسی برائی ہمارے بڑے لوگوں میں پھیل گئی تو ان میں شادی شدہ لوگوں کو سنگسار کرنا ہمارے لئے مشکل ہو گیا کیونکہ وہ اپنے اثر و رسوخ کے باعث اس سزا سے بچ نکلتے تھے تو پھر ہمارے یہاں یہ قانون ٹھہرا کہ اگر کوئی غریب پکڑا گیا تو اس پر حد جاری کر دی گئی اور اگر کوئی امیر پکڑا گیا تو اس طرح معمولی سزا پا کر چھوٹ گیا۔ ایک اور موقع پر یہودی عالم جو اصل بات کو چھپا کر غلط بات بتا رہا تھا اور عبداللہ ابن سلام جو یہودی عالم تھے اور اب مسلمان ہو چکے تھے، وہ پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس شخص سے کہا کہ او اللہ کے دشمن! ذرا تورات کے اس ورق سے ہاتھ اٹھا، جس میں تم نے اصل حکم چھپا رکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں قرآن کریم ان کے جس جرم کا ذکر کر رہا ہے، وہ کس طرح ان کے علماء میں پھیل چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے قرآن پاک کی حفاظت کا انتظام کیا اور جس طرح قرآن پاک کے ساتھ مسلمانوں نے والہانہ تعلق رکھا۔ پہلی امتوں میں دور دور تک ہمیں اس کا تصور نہیں ملتا۔ آنحضرت ﷺ روزانہ جہری نمازوں میں بلند آواز سے لمبی لمبی سورتوں کی تلاوت فرماتے تھے۔ جنہیں سن سن کر مسلمان یاد بھی کرتے اور اپنے حفظ کی اصلاح بھی کرتے۔ صدیق اکبر نے اپنے دورِ خلافت میں پہلی فرصت میں قرآن پاک کو ایک مجلد کتاب کی شکل میں محفوظ کر دیا۔ حضرت عثمان غنی نے اس کی متعدد نقلیں تیار کروائیں اور پورے عالم اسلام میں اسے پھیلا دیا۔ پھر مسلمانوں کے قرآن کریم کے ساتھ شغف کے نتیجے میں جو مختلف قرآنی علوم وجود میں آئے، وہ تو ایک مستقل داستان ہے۔ لیکن صرف اس کی کتابت کے حوالے سے مسلمانوں کا اس سے ایسا والہانہ تعلق رہا ہے کہ ایک طرف تو کتابت کے فن نے حیرت انگیز حد تک ترقی کی اور دوسری طرف بادشاہ اور حکمران بھی قرآن پاک کی کتابت کرنا، اپنے لئے باعث فخر و سعادت سمجھنے لگے۔ دور نہ جائیے، ہندوستان کا سب سے بڑا نیک دل حکمران اورنگ زیب عالمگیر باقاعدہ قرآنِ کریم کی کتابت کرتا تھا اور اتنا بڑا بادشاہ ہونے کے باوجود خزانے سے اپنے لئے تنخواہ لینا جائز نہیں سمجھتا تھا۔ اسلئے ٹوپیاں سی کر اور قرآن پاک لکھ کر اپنی گزر بسر کا انتظام کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ ان اہلِ کتاب سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہارا اپنی کتاب سے یہ رویہ رہا کہ تم نہ صرف اس کی حفاظت میں مخلص نہیں رہے، بلکہ قصداً اس کے احکام کو چھپاتے رہے ہو۔ اسلئے آج اگر اللہ نے نوعِ انسانی پر کرم فرمایا اور بنی اسماعیل میں ان نے اپنا آخری پیغمبر مبعوث کیا اور اس پر اپنی آخری کتاب اتاری تو تم بجائے اس کے کہ اپنے طرزِ عمل پر نادم ہوتے اور آگے بڑھ کر اس تحریک کا ہراول دستہ بنتے، تم جھوٹ بول بول کر لوگوں کو ایمان قبول کرنے سے روکتے اور اس قافلے کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بنتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم زندگی کو ایک کھیل سمجھتے ہو۔ اگر تمہیں ذرا بھی اس میں سنجیدگی کا احساس ہوتا تو تم کبھی اس طرح کی بے سروپا حرکتیں نہ کرتے۔ اس لئے حضور سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان پر بات واضح کرنے کے بعد ان کو چھوڑ دیجئے کہ جو یہ کھیل کھیل رہے ہیں اس میں لگے رہیں اور پھر اس کا انجام دیکھیں۔ اگلی آیت کریمہ

Marfat.com

میں قرآن پاک کی اصل حیثیت اور اسکی عظمت کو بیان کیا گیا ہے اور پھر اس پر مختلف دلائل ذکر فرمائے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۹۲ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا ط وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ O ''اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری بابرکت' تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلے کی چیز کی (تاکہ تو خوشخبری دے) اور تاکہ ہوشیار کردے ام القریٰ اور اس کے اردگرد والوں کو اور جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کریں گے''۔

گزشتہ آیت کی تشریح کے ضمن میں یہ بات گزری ہے کہ یہود نے اہل مکہ سے یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کبھی کوئی چیز نہیں اتاری قرآن کریم نے ان کی اس لغو بات کا ذکر کرتے ہوئے مختلف پہلوؤں سے اس کا جواب دیا لیکن اس آیت کریمہ سے ان کی ایک اور بات کی طرف اشارہ معلوم ہو رہا ہے جس کا ذکر تمام احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے کہ وہ عموماً یہ بات کہا کرتے تھے کہ جب مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تورات اللہ کی کتاب ہے اور وہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور موسیٰ علیہ السلام اللہ کے سچے رسول تھے تو پھر اس کتاب کی موجودگی میں آخری کتاب کے نزول کی ضرورت کیا ہے۔ تورات ہمارے ہاتھوں میں ہے اور خود قرآن کریم اس کی تصدیق بھی کرتا ہے اور وہ ہمیں زندگی کے تمام معاملات میں راہنمائی بھی مہیا کر رہی ہے تو پھر آنحضرت ﷺ کی بعثت اور قرآن کریم کا نزول محض تکلف کے سوا اور کیا ہے جس کے نتیجے میں البتہ ایک لڑائی ضرور چھڑ گئی ہے جس سے پورے مشرق وسطیٰ کے امن کو خطرہ ہے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کیا یہ مناسب نہیں کہ تورات کی راہنمائی پر اکتفا کرلیا جائے اور قرآن کریم اور آنحضرت کا انکار کر کے معاملات کو یکسو ہونے کا موقع دیا جائے اس آیت کریمہ میں پروردگار ان کی اس بے ہودہ بات کا ذکر کئے بغیر اشارۃً جواب دے رہا ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی کتاب' اس کا پیغام' اس کی دعوت اور اس کی شریعت پوری طرح محفوظ رہتی ہے اللہ تعالیٰ کبھی نیا رسول مبعوث نہیں کرتا اور نئی کتاب نازل نہیں فرماتا اسی طرح جب تک موجود کتاب نئے مسائل کو حل کرنے کے قابل رہتی ہے اور اس کا فہم رکھنے والے اپنے اندر دعوت اسلامی کا ذوق اور پیش آمدہ مسائل کے حوالے سے اجتہادی فکر کے حامل رہتے ہیں تو تب بھی نئی کتاب کا نزول نہیں ہوتا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ابھی نئی کتاب اور نئے رسول کا زمانہ نہیں آیا اور بلا ضرورت کسی رسول کو بھیج کر اور کسی کتاب کو اتار کر اللہ تعالیٰ کبھی بھی لوگوں میں خلفشار پیدا نہیں فرماتے۔ لیکن جب اس کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر محض اس خلفشار سے بچنے کیلئے انسانی ضرورت کے پورا کرنے کی بجائے انسان کو گمراہی اور فکری نارسائی میں چھوڑ دینا پروردگار کی حکمت کے خلاف ہے۔ جہاں تک یہود کی اس بات کا تعلق ہے کہ تورات کی موجودگی میں قرآن کریم کی کیا ضرورت ہے۔ گزشتہ آیت میں اسی حوالے سے ان کے سامنے آئینہ رکھا گیا ہے کہ وہ اس میں اپنے اصلی خدوخال پہچاننے کی کوشش کریں اور بتائیں کہ خود انہوں نے آج تک تورات اور اس کی تعلیمات کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اس کے احکام کو چھپانا' انہیں تحریف کی نذر کرنا ان میں معنوی ترامیم کرنا ان میں عجیب و غریب تاویلیں کر کے ان کا مفہوم کچھ سے کچھ بنا دینا اور حالات پر اس کے انطباق کو محض اپنی خواہشات کی وجہ سے اس حد تک مشکل بنا دینا کہ لوگ اسے ناقابل عمل سمجھ کر چھوڑ دیں۔ یہ صدیوں سے ان کا وطیرہ ہے کیا اپنے اس طرز عمل اور تورات کے بیشتر حصے کو چھپا دینے اور ضائع کر دینے کے بعد بھی یہود یہ کہنے کی پوزیشن میں ہیں کہ تورات اب بھی دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتی ہے اور جہاں تک حامل تورات کا تعلق ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام کا جن کی بیان کردہ تشریح و تفسیر اور جن کا عمل اور جن کا برپا کردہ انقلاب ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے تو کیا ایسی صورتحال میں کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی تورات دنیا کی رہنمائی کرتے ہوئے ان کی دینی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے یہی وجہ ہے جس

Marfat.com

وجہ سے قرآن پاک کا نزول اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت ناگزیر ٹھہری اور پروردگار نے انسانوں پر اپنا فضل فرمایا کہ اس نے انسانیت کو گمراہی اور ضلالت کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے سے نکالنے کیلئے اپنا نبی بھیجا اور اپنی کتاب اتار کر اہل دنیا کو روشنی اور ہدایت سے مشرف فرمایا۔ یہ تو وہ بات ہے جو ان آیات کے بین السطور سے ہمیں سمجھ میں آتی ہے اور جس کے باعث قرآن پاک کی ضرورت ہم پر عیاں ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ قرآن کریم جیسی کتاب کن صفات کی حامل ہے اور پہلی آسمانی کتابوں سے وہ کس طرح مربوط ہے اس کو سمجھنے کیلئے ہم اس آیت کریمہ کے ایک ایک لفظ پر غور کریں گے۔ سب سے پہلی بات جو اس آیت میں فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کو ہم نے نازل کیا ہے۔ ظاہر ہے جس کتاب کو اللہ تعالیٰ نازل فرمائیں گے وہی کتاب منزل من اللہ ہوگی اور وہی کتاب یہ حق رکھے گی کہ ساری دنیا اپنی فلاح اور نجات کیلئے اس کتاب کے مندرجات کی پیروی کرے البتہ یہ بات قابل توجہ ہو سکتی ہے کہ یہاں یہ جو دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس کتاب کو ہم نے نازل کیا ہے اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن کریم نے مختلف جگہوں میں تمام ان لوگوں کو جو قرآن کریم کو کتاب اللہ تسلیم نہیں کرتے چیلنج دیا ہے کہ اگر تمہاری نگاہ میں یہ کتاب اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ حضور نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے یا کوئی اور آدمی اسے لکھ کر آپ کو دیتا ہے تو اس کو ثابت کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ جیسے رسول اللہ ﷺ ایک عرب ہیں تم بھی عرب ہو۔ جس ماحول میں انہوں نے تربیت پائی ہے اسی ماحول کے تم بھی پروردہ ہو۔ علم کے جن جن گوشوں تک رسائی آنحضرت کیلئے ممکن ہو سکتی ہے وہ گوشے تمہارے لئے بھی کھلے ہیں۔ عرب ہونے کی وجہ سے جو زبان وہ بولتے ہیں وہی زبان تم بھی بولتے ہو۔ قریش اور بنوسعد میں انہوں نے تربیت پائی ہے جس کی وجہ سے ان کی زبان فصیح ہوگئی ہے تو تم میں بھی قریشی اور بنوسعد کے ہزاروں لوگ موجود ہیں تو تم سب مل کر بڑی آسانی سے اس قرآن سے بہتر کتاب لا سکتے ہو۔ اگر یہ کتاب واقعی کتاب اللہ نہیں ہے تو پھر تم ایسا ضرور کر گزرو تاکہ تم آسانی سے اپنی بات کا ثبوت پیش کر سکو۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ساتھ ہی یہ کہا کہ تم کبھی نہیں کر سکو گے تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب' کتاب اللہ ہے۔ قرآن کریم نے یہ چیلنج اس وقت دیا تھا جب قرآن نازل ہو رہا تھا اس واقعہ کو آج تقریباً ساڑھے چودہ سو سال گزر گئے' لیکن اس طویل تاریخ میں یہ چیلنج چیلنج ہی رہا اور آج بھی ہم اسے قرآن کریم میں پڑھتے ہیں اور آج کی دنیائے کفر بھی اس چیلنج کے جواب میں خاموش ہے یہ سب سے بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ اس کتاب کو اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کے بعد اس آیت کریمہ میں قرآن کریم کی چند صفات بیان کی گئی ہیں جن میں سے ہر صفت بجائے خود ایک دلیل کا درجہ رکھتی ہے۔ ان میں سب سے پہلی صفت جو بیان کی گئی ہے وہ ہے ''مبارک''، یعنی اس کتاب کو اللہ نے مبارک بنا کر نازل فرمایا۔ مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب جس کے نزول کے بعد اس پر ایمان لانے والوں کو ایک ایسی زندگی نصیب ہوتی اور دنیا ایک ایسی نعمت سے سرشار ہو جاتی ہے جس میں انسانیت کو جلا ملتی' دلوں کو سکون ملتا' معاملات میں ہمواری پیدا ہوتی اور دنیا کی سب سے بڑی متاع ''امن'' سے دنیا ہمکنار ہوتی ہے۔ انسانیت کی ہر قدر روز بروز پھلتی پھولتی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کے مقاصد بروئے کار آتے دکھائی دیتے ہیں انسانیت کا قافلہ آئے دن نئی منزلوں کی خبر لاتا ہے اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو قرآن کریم دو حوالوں سے کتاب مبارک ثابت ہوا ہے۔ پہلا حوالہ واقعاتی ہے یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی تعلیمات میں اللہ نے خیر و برکت بھر دی ہے۔ البتہ ان تعلیمات کا دارومدار اخلاص سے ان پر عمل کرنے اور اجتماعی زندگی میں ان کے نفاذ پر ہے پھر اس کتاب میں انسانی فلاح و بہبود کے ایسے اصول پیش کئے گئے ہیں کہ کوئی بھی غیر جانبدار غور و فکر کرنے والا شخص انسانی معاملات کی خوش اسلوبی اور انسانی بھلائی کو بروئے کار لانے کیلئے اس سے بہتر اصول کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ انسانی احساسات کی اصلاح کیلئے صحیح عقائد کی ایسے اسلوب میں تعلیم دی گئی ہے جو دلوں کے دروازوں پر دستک دیتی ہے۔ جس سے دلوں کی بند کلیاں کھلتیں اور دماغی الجھنوں کو سکون ملتا ہے۔ پھر اجتماعی زندگی کو ہمواری سے رواں دواں رکھنے کیلئے ایک ایسا آئین' دستور اور قانون دیا گیا ہے

Marfat.com

جس میں انسانی طبقات کو نہیں بلکہ صرف انسانی بھلائی کو موضوع بنایا گیا ہے اور عدل واحسان کے سایہ تلے اس کے پروان چڑھنے کے سامان کئے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فلسفۂ قانون کی گرہیں بھی کھولی گئی ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس قانون کا رشتہ اخلاق سے باندھ دیا گیا ہے اور پھر اخلاقِ فاضلہ کی تلقین اس طرح فرمائی گئی ہے کہ جس کے ساتھ عملی شواہد بھی کارفرما دکھائی دیتے ہیں اور خود اخلاقی تفصیلات پوری وسعت کے ساتھ انسانی عمل کو متاثر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ انسانی زندگی کو علم کے نور سے روشن کرنے کیلئے علمی ترغیب کے ساتھ ساتھ علمی مبادیات اور اس کے اساسی موضوعات کو بھی چھیڑا گیا ہے اور علم کو ایک نور قرار دے کر جہالت کا ہر پہلو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ غرضیکہ پوری انسانی زندگی کو اس کتاب میں اس ایجاز اور اعجاز کے ساتھ ڈسکس کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے اہل علم اس میں غور کرتے ہیں ہر دفعہ ایک نئی علمی دنیا ان کے سامنے واشگاف ہوتی ہے۔

اس کتاب مبارک کے مبارک ہونے کا دوسرا پہلو تاریخی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تورات کی کتاب پیدائش باب نمبر ۲۴ میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت دی تھی۔ جس کے الفاظ یہ ہیں کہ ''خداوند فرماتا ہے اس لئے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی''۔ اس بشارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس برکت سے مراد ایک امت کا اٹھایا جانا ہے جو پوری نوع انسانی کی ہدایت کا باعث بنے اور جس کی سیاسی طاقت دنیا کے بیشتر حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور وہ دنیا کے بڑے بڑے پھاٹکوں پر اس طرح قابض ہو جائے کہ بڑی بڑی قومیں اس کی پناہ میں آ جائیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اگرچہ بنی اسرائیل کو بھی بطور ایک امت کے اٹھایا گیا اور انہوں نے ایک طویل عرصے تک دنیا کی مذہبی راہنمائی کا جیسا کیسا فرض بھی انجام دیا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطور خاص اللہ کے گھر کی تعمیر کرتے ہوئے جس امت کے اٹھائے جانے کی دعا فرمائی تھی اس کا تعلق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھا اور مرکز اس کا وہی اللہ کا گھر تھا جسے حضرت ابراہیم تعمیر کر رہے تھے اور اسی امت میں آخری رسول کو بھیجے جانے کی دعا مانگی گئی تھی۔ چنانچہ اس دعا کو اللہ نے قبول فرمایا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سارے عرب میں پھلی پھولی۔ لیکن ان کا مرکز یہی مکہ معظمہ اور اللہ کا گھر رہا اور ان کی سیاسی طاقت کا سرچشمہ اسی شہر میں بسنے والے قریش بنے لیکن جب اس قوم کو اللہ نے برکت دینے کا فیصلہ فرمایا تو ان میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ قریش اور دوسرے لوگوں نے اسلام قبول کیا اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس مرکز اسلام سے قوت کے اس طوفان کو نکالا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ربع صدی میں دنیا کی بڑی حکومتوں پر غلبہ حاصل کر لیا' بڑی بڑی قوموں کے تخت الٹ دیئے' دنیا سے جہالت اور شرک کے مرکزوں کو اس طرح ختم ہونے پر مجبور کر دیا کہ پارسیوں کا آتش کدہ ہمیشہ کیلئے بجھ گیا' رومیوں کا شرک کا مرکز تباہ و برباد ہو گیا۔ جہالت کو پاؤں سمیٹنے پر مجبور کر دیا گیا' عدل واحسان کی ایسی بہار آئی کہ زمین کے بڑے حصے پر اللہ نے مسلمانوں کی ایک عادلانہ حکومت قائم فرما دی جس نے صدیوں تک زمین کے پھاٹکوں پر قوموں کی نگرانی کی اور انسانیت کی راہنمائی کا فرض انجام دیا۔ ان دونوں حوالوں سے جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ سارے امکانات اور تمام اسباب قرآن کریم کی تعلیمات کے نتیجے میں اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ساتھ پیدا ہوئے اس لئے اس کتاب کو مبارک ٹھہرایا گیا۔

دوسری صفت اس کی بیان فرمائی ''مصدق''۔ مصدق کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہے تصدیق کرنے والا یعنی یہ قرآن کریم پہلی آسمانی کتابوں کی تمام محفوظ اور صحیح باتوں کی تصدیق کرتا ہے یہ ان کتابوں کے منزل من اللہ اور سچا ہونے کی تصدیق کرتا ہے وہ جن بنیادی عقائد کو بیان کرتی ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے۔ لیکن ان کے ماننے والوں نے جیسی کچھ ان میں تحریفات کی ہیں اور جو کچھ خیانتیں کی ہیں ان کی نشان دہی بھی کرتا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا ان کتابوں سے ایک مضبوط رشتہ ہے کہ وہ کتابیں جس سرچشمۂ ہدایت سے نکلی ہیں اسی سرچشمہ ہدایت سے اس کا صدور ہوا ہے ان کتابوں

Marfat.com

نے جن عقائد اور تعلیمات کو پیش کیا انہی کو یہ پیش کرتا اور ساتھ ساتھ خیانتیں پکڑتا ہے اور غلطیوں کی اصلاح بھی کرتا ہے۔ اللہ کے جن رسولوں پر وہ کتابیں اتریں وہ اسی سلسلہ نبوت سے تعلق رکھتے تھے جس کی آخری کڑی رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن کریم پر ایمان ان کتابوں پر ایمان اور قرآن کریم کا انکار ان کتابوں کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ یہ ایک ہی تاریخ اور ایک ہی حقیقت کا تسلسل ہیں۔

مصدق کا دوسرا معنی ''مصداق'' ہے۔ یعنی یہ قرآن کریم اور ذات رسالت مآب ﷺ وہ ہیں جن کی پہلی آسمانی کتابوں اور پہلے رسولوں نے بشارت دی تھی۔ ان کی نمایاں خصوصیات کو انہوں نے کھول کھول کر بیان کیا تھا حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کا نام مبارک بھی اور آپ کے وطن کا حوالہ بھی ان کتابوں میں موجود تھا۔ آپ کے عادات وخصائل کو بھی ان کتابوں میں ذکر کیا گیا تھا۔ آپ کی کامیابیوں کی خبر بھی ان کتابوں میں موجود تھی۔ حضور اور یہ قرآن جب آئے ہیں تو ٹھیک ان بشارتوں کی مصداق بن کے آئے ہیں۔ ان کی جیسی جیسی خصوصیات بیان کی گئی تھیں یہ بالکل اس کا عکس اور اس کا سراپا ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اہل کتاب نے ہمیشہ ان علامتوں کو مٹانے یا بگاڑنے کی کوشش کی' لیکن جو کچھ ان کی نظر سے بچی رہ گئیں وہ بھی ایک غیر جانبدار مبصر کیلئے اس بات کو ثابت کرنے اور ہدایت حاصل کرنے کا کافی سامان اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اور اہل کتاب میں سے جو علماء مسلمان ہوئے ان کی گواہیاں اور ان کی شہادتیں تاریخ کا حصہ ہیں جن سے اہل کتاب کے اس جرم کی تفصیل معلوم ہوتی ہے اور بہت ساری علامتوں کی حقیقت بھی ہمارے سامنے کھلتی ہے۔ ان دونوں حوالوں سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم تو دراصل اس ضرورت کی تکمیل ہے جس کے لئے پہلی آسمانی کتابیں اتاری گئی تھیں اور ان تمام تعلیمات کا اتمام ہے جس کی نوع انسانی کے قافلے کو قیامت تک ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ جو لوگ پہلے سے آسمانی کتابیں اپنے پاس رکھتے ہیں اور وہ شریعت خداوندی اور کتاب اللہ کے مزاج سے بھی شناسا ہیں وہ قرآن کریم کو آگے بڑھ کر قبول کریں اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انہیں ضد ہے کہ اگر یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہوتی اور حضور واقعی اللہ کے رسول ہوتے تو پھر انہیں بنی اسرائیل میں آنا چاہئے تھے یہ بنی اسماعیل میں کیسے آگئے۔ ظاہر ہے کہ اس ہٹ دھرمی کا تو دنیا میں کوئی علاج نہیں۔

تیسری صفت ''لِتُنْذِرَ'' سے بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ کتاب اسی مقصد کیلئے اتاری گئی ہے جس مقصد کیلئے پہلی کتابیں نازل کی گئی تھیں۔ ان کا مقصد بھی ایک ہی تھا کہ انسانوں کو یہ بتایا جائے کہ تم اگر صحیح راستہ اختیار کرو گے اور پیغمبر پر ایمان لا کر اللہ کی شریعت پر چلتے ہوئے اللہ کی رضا کے حصول کو اپنا مقصد بنا لو گے تو تمہارے لئے دنیوی اور اخروی کامیابی کی بشارتیں ہیں۔ لیکن اگر تم نے پیغمبر پر ایمان لانے اور کتاب اللہ کی دی ہوئی ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو یہ کتاب تمہیں تمہارے برے انجام سے ڈراتی ہے اور تمہیں وارننگ دیتی ہے کہ دنیا بھی تمہاری تباہ ہو جائے گی اور آخرت میں تم ایک ہولناک عذاب میں مبتلا کر دیئے جاؤ گے۔ دنیا میں جتنے رسول آئے اور جتنی کتابیں نازل ہوئیں ان کا یہی مقصد رہا کہ نیک لوگوں کو وہ دنیوی اور اخروی کامیابیوں کی بشارت دیں اور بدچلن اور نافرمان لوگوں کو دنیوی ناکامیوں اور آخرت کے عذاب سے ڈرائیں۔ یہی مقصد اس قرآن کریم کا بھی ہے اس کو بھی اس لئے اتارا گیا ہے تاکہ یہ ام القریٰ کے رہنے والوں اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو اس بات سے انذار کرے کہ اگر تم رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لاؤ گے اور قرآن کریم کی دی ہوئی ہدایت کو قبول نہیں کرو گے تو تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔ اس لحاظ سے پہلی آسمانی کتابیں اور قرآن کریم ایک ہی مقصد کے حامل ہیں اور بنیادی ہدایت اور بنیادی مقصد میں ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ فلاح وکامرانی کے تصورات اور ناکامی اور نامرادی کی حقیقت دونوں کے نزدیک بالکل یکساں ہے۔ دونوں ایک ہی راستے کی خبر دیتے ہیں اور ایک ہی راستے سے ڈراتے ہیں۔ تمام کتابوں میں جو زندگی کے بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں اور جن بنیادی عقائد پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے وہی قرآن کریم میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن کریم اس سند کے

Marfat.com

ساتھ اتصال رکھتا ہے جو سند تمام کتابوں کو اللہ کے ساتھ جوڑتی ہے۔ یہ سند کا اتصال اور مقصد کی ہم آہنگی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم اسی سلسلہ ہدایت کی آخری کڑی ہے۔ جس کی پہلی کڑیاں تورات' زبور' انجیل اور دوسری آسمانی کتابیں رہی ہیں۔ اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد قرآن کریم کے انکار کرنے اور دوسری کتابوں کے ماننے کی کوئی وجہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں رہتی۔ اگر پہلی کتابیں صحیح ہیں تو قرآن پاک بھی صحیح ہے اور قابل قبول ہے اور اگر قرآن کریم غلط اور نا قابل قبول ہے تو پہلی آسمانی کتابوں سے کسی طرح کا رشتہ قائم رکھنا بھی نا قابل فہم بات ہے۔ مزید ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے تا کہ آپ ام القریٰ یعنی مکہ معظمہ اور مَنْ حَوْلَهَا یعنی اس کے اردگرد کے لوگوں کو ڈرائیں مَنْ حَوْلَهَا سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ حضور شاید اسی علاقے کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور تمام دنیا کی ہدایت کیلئے آپ کو نہیں بھیجا گیا تھا کیونکہ قرآن کریم میں کئی جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کے آیا ہوں اور ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تا کہ میں تمہیں اس کے ذریعے انذار کروں اور ان لوگوں کو بھی جن تک یہ قرآن کریم پہنچے۔ اس لئے یہاں مراد مکہ معظمہ کا اردگرد نہیں بلکہ ساری دنیا ہے کیونکہ مکہ معظمہ کو پوری زمین کا نصف ہونے کی حیثیت حاصل ہے کہا جاتا ہے کہ یہ زمین کی ناف ہے اس لئے ساری دنیا کو اس کا حول یعنی اس کا اردگرد قرار دیا گیا ہے۔ لیکن دوسری وجہ اس کی ایک اور بھی ہے وہ یہ کہ پہلے نبی بنی اسرائیل کی طرف آتے رہے اور بنی اسماعیل کی طرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں آیا۔ اب ضروری تھا کہ بنی اسماعیل یعنی قریش کو اس دعوت کا ہدف اولین بنا کر ان پر اتمام حجت کیا جاتا اور پھر وہیں سے پوری دنیا کی ہدایت کا سروسامان کیا جاتا۔ کیونکہ قریش بنی اسماعیل کے سربراہ تھے اور ان کی مرکزی آبادی مکہ تھی۔ بنی اسماعیل کتاب و نبوت سے ناآشنا امی لوگ تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اسماعیل کی نسل سے وہ ایک رسول اٹھائے گا جس سے تمام دنیا کی قومیں برکت پائیں گی۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے یہ وعدہ پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے وہ قوم اگر اس کو قبول کر لیتی ہے تو وہ قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز ہوتی ہے اور اگر اس کو رد کر دیتی ہے تو چونکہ اس پر اللہ کی حجت پوری ہو چکتی ہے وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس اتمام حجت کیلئے اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو بنی اسماعیل کے اندر مبعوث فرمایا۔ رسولوں کے باب میں سنت اللہ یہ بھی ہے کہ وہ جس قوم کے اندر بھیجے جاتے ہیں خاندانی اعتبار سے اس کے اشراف میں سے ہوتے ہیں اور وہ اپنی دعوت و انذار میں اول مخاطب قوم کے اعیان و اکابر ہی کو بناتے ہیں۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی بعثت مکہ میں ہوئی جو اہل عرب کا دینی و سیاسی مرکز اور قریش کا مستقر تھا۔ اسی اعتبار سے اس کو یہاں ام القریٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

چوتھی صفت قرآن کریم کی جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب پر وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں یعنی اس کتاب کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ایسے لوگوں کو سمیٹا ہے اور ان لوگوں کو متاثر کیا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ لوگ اس قرآن کی دعوت سے متاثر ہوتے ہیں جو اس بات کے قائل ہو چکے ہیں کہ اس دنیا کو ہمیشہ نہیں رہنا اور یہ ہماری زندگی ہمیشہ رہنے والی نہیں' ہمیں بھی مرنا ہے اور ایک دن اس زندگی کی بساط بھی الٹنی ہے' پھر قیامت برپا ہوگی اور ہم میں سے ہر شخص کو اللہ کے سامنے اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ جو شخص اپنے اندر یہ فکرمندی پیدا کر چکا ہے وہ قرآنِ کریم کی دعوت سے متاثر ہوتا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو دنیا پرست اور خواہش نفس کے بندے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زندگی ہی مستقل زندگی ہے اس کے بعد کسی اور زندگی سے واسطہ پڑنے والا نہیں۔ ان کی نظر اس افق سے پار دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی وہ اسی زندگی کو اپنی خواہشات نفس کو پورا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اسی کی خوشیوں کو حاصل زندگی اور اسی کے غموں کو ہمیشہ کی محرومیاں سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کی منزل اور ان کا ہدف خواہشات نفس کے

Marfat.com

حصول کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایسے لوگوں میں مقاصد زندگی کا تصور اور مقاصد کی خاطر قربانی اور ایثار کرنے کا جذبہ' دوسروں کے کام آنے کی خواہش اور اخلاقیات کے تصور کا دور دور تک وجود نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کریم کی دعوت سے ان لوگوں کو ہمیشہ چڑ ہوتی ہے تو ایسے لوگ اس کی دعوت کو کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم آخرت کی تیاری کی بار بار ترغیب دیتا ہے اور یہ لوگ سرے سے آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتے تو ایسے لوگ اس طرح کی باتوں کو وہم وگمان سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہیں ہوتے تو انہیں قبول کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے یہاں فرمایا جارہا ہے کہ قرآن کریم کی دعوت سے جو لوگ متاثر ہوتے ہیں وہ آخرت پر یقین رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ دنیا کی حرص میں ڈوبے رہنے والے لوگ کبھی قرآن پاک کے قریب نہیں آتے۔ اس لئے اس نے اپنی دعوت سے جن لوگوں کو متاثر کیا وہ خواہش نفس کے بندے نہیں بلکہ آخرت کے مسافر ہیں اور اس کی تعلیم کے نتیجے میں ان میں ایک ایسا کردار وجود میں آیا جس نے باقی تمام انسانوں سے ان کو ممتاز کر دیا۔ دوسرے لوگ اگر صرف اپنی دنیا بنانے کیلئے دوسروں کی دنیا اجاڑنے سے دریغ نہیں کرتے تو یہ لوگ دوسروں کا گھر بسانے کیلئے اپنا گھر بھی قربان کر دیتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے پیش نظر صرف اپنی ذات کا تحفظ اپنے بچوں کے مستقبل اور اپنے مال و دولت میں اضافے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کریم سے متعلق لوگ اپنی ذات کو مٹا کر دوسروں کو زندگی دینا' اپنی خوشیوں کو دوسروں پر نثار کرنا اور اپنے مال و دولت کو راہ حق میں لٹانا اور اپنے بچوں کو موہوم مستقبل کیلئے نہیں بلکہ اخروی زندگی کیلئے تیار کرنا ان کا ہدف بن جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے کئی جگہ دونوں طرح کی سیرت و کردار کو آمنے سامنے رکھ کر تقابل کیا اور بتایا کہ یہ وہ سیرت و کردار ہے جو کفر کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اور یہ وہ کردار ہے جو قرآن کی دعوت نے پیدا کیا۔ مثال کے طور پر ہم سورۃ الفرقان کو دیکھ سکتے ہیں جس میں دونوں کردار آمنے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں ان کا تقابل کر کے قرآن پھر سوچنے کا موقع فراہم کرتا ہے کہ بتاؤ انسانی زندگی کی بقا اور انسانی خوشیوں کے دوام کیلئے کون سا کردار قبول کرنا چاہیے۔ ایک آدمی اگر اپنا دشمن نہیں ہو گیا یا کوئی معاشرہ اگر خودکشی کا فیصلہ نہیں کر چکا تو اس کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ کسی معاشرے کو زندہ رکھنے کیلئے بہتر' خدا ترس اور پاکیزہ کردار کے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے یا بد چلن اور بدکردار لوگوں کی؟ تو جو کتاب ایسے سیرت و کردار کے لوگوں کو پیدا کرتی ہے کہ جن کی سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں یعنی شب و روز انہیں سب سے زیادہ دلچسپی اور سب سے زیادہ لگاؤ نمازوں یعنی اللہ کی عبادت سے ہوتا ہے۔ ذکر اللہ ان کی خوراک بن جاتی ہے۔ ان کی طبیعت کا ہیجان صرف اللہ کے ذکر سے سکون پکڑتا ہے وہ اپنے غموں اور دکھوں میں صرف اللہ کے ذکر کے ذریعے غالب آتے ہیں ان کا کاروبار صرف اللہ کے ذکر سے ہر طرح کی خیانت سے محفوظ رہتا ہے ان کی شخصیتوں پر نمازوں اور اللہ کے ذکر کی چھاپ ایسی گہری رہتی ہے کہ یہی ان کی پہچان بن جاتی ہے۔ وہ فاتح بھی ہوتے ہیں تو ان میں غرور پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ان کی راتوں کی سجدہ ریزیاں انہیں اللہ کے حکم کے خلاف سر اٹھانے نہیں دیتیں۔ وہ اگر مفتوح ہوتے ہیں تو وہ ہراساں کبھی نہیں ہوتے کیونکہ نمازوں کا قیام ان کے اندر وہ اولوالعزمی پیدا کرتا ہے جو انہیں کسی کے سامنے جھکنے نہیں دیتی۔ کہا جاتا ہے کہ قیصر نے اپنے جاسوس مسلمانوں کے لشکر میں بھیجے کہ جا کر معلوم کرو مسلمانوں کی فتوحات کا سبب کیا ہے۔ یہ اپنے اسباب اور اپنے وسائل میں ہم سے بہت کمزور ہیں لیکن میدان جنگ میں ہمیشہ کیوں غالب رہتے ہیں۔ جاسوسوں نے مسلمانوں میں کئی دن گزارے اور واپس جا کر جو رپورٹ دی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ عجیب لوگ ہیں کہ دن کو جب ان کو گھوڑوں پر سوار دیکھو تو تم ان سے بڑھ کر کسی کو شاہسوار نہیں پاؤ گے' لیکن راتوں کو جب ان کو مصلے پر کھڑا دیکھو تو ان سے بڑھ کر تم کسی کو درویش نہیں دیکھو گے۔ یہ دن کے شاہسوار ہیں اور رات کے درویش اور عبادت گزار۔ یہی بات یہاں فرمائی جارہی ہے کہ قرآن کریم کی دعوت سے متاثر ہونے والے لوگ وہ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ قرآن کریم کی دعوت کا اصل ہدف آخرت ہے اور ان کے اندر جو سیرت و کردار پیدا ہوتا ہے اس کا نمایاں

Marfat.com

وصف اللہ کا ذکر اللہ کی عبادت اور اللہ سے لو لگانا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے پوری انسانی زندگی تطہیر کے عمل سے گزر کر پاکیزہ ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم کی یہ صفات بیان کرنے کے بعد فیصلہ ایک قاری پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جس کتاب کی یہ خصوصیات اور یہ صفات ہوں اور جس کی تعلیمات نے ایسے سیرت و کردار کے حامل لوگ پیدا کئے ہوں کیا وہ کتاب ایسی ہو سکتی ہے جسے کسی جھوٹے انسان نے گھڑ لیا ہو اور وہ جسارت کر کے یہ دعویٰ کر رہا ہو کہ یہ کتاب مجھ پر اللہ نے نازل کی ہے۔ جو آدمی بھی اللہ سے ڈر کر ان صفات پر غور کرے گا وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ایسی کتاب سوائے کتاب اللہ کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

اس رکوع کی یہ دونوں آیتیں جو اس وقت ہمارے زیر مطالعہ ہیں ان میں اگرچہ روئے سخن یہود کی طرف ہے لیکن خطاب اصلاً مشرکینِ مکہ سے ہے کیونکہ مکی سورۃ ہونے کی وجہ سے اصل وہی مخاطب ہیں۔ یہود چونکہ اس نئی اٹھنے والی تحریک سے خوف زدہ تھے اس لئے در پردہ اس تحریک کو ناکام کرنے اور آنحضرت ﷺ کیلئے مشکلات پیدا کرنے کیلئے مشرکینِ مکہ کو تدابیر سمجھاتے اور ان کی پیٹھ ٹھونکتے رہتے تھے اور مشرکینِ مکہ بھی مضمون واحد ہونے کی وجہ سے آنحضرت کی مخالفت کے حوالے سے بار بار ان سے رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت کی بعثت اور قرآن کریم کے نزول کے حوالے سے انہوں نے جو کچھ مشرکینِ مکہ سے کہا قرآن کریم نے اس کا جواب دیا۔ لیکن اس کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ اہل کتاب نے جو کچھ اللہ کی وحی کے نزول کے سلسلے میں کہا ہے وہ اصلاً اس بات کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی قدر و منزلت سے اہل کتاب ہونے کے باوجود بھی آگاہ نہیں۔ اس پر ان کو تاریخی اور علمی انداز میں جو کچھ کہا گیا اسکے ضمن میں ان کے طرز عمل پر ان کو شرم بھی دلائی گئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بالواسطہ ان کی اصلاح سے مایوسی کا اظہار بھی فرمایا گیا۔ آئندہ بننے والی تاریخ میں اور نئی اٹھتی ہوئی امت کے حوالے سے ہدایت کا سرچشمہ چونکہ قرآن کریم ہے اسلئے پھر قرآن کریم کی حقیقی قدر و عظمت کو واضح کرنے کیلئے قرآن کریم کی صفات بیان کی گئیں اور اس پر ایمان لانے والوں کا ایک سراپا بھی سامنے رکھ دیا گیا تاکہ علمی اور عملی دونوں نمونوں کو دیکھ کر راہ ہدایت اختیار کرنے والوں کو ایک اپیل بھی میسر آئے اور آسانی بھی محسوس ہو۔ اب اگلی آیات کریمہ میں روئے سخن پھر مشرکینِ مکہ کی طرف پلٹ گیا ہے کیونکہ اس سورۃ کے اصل مخاطب وہی ہیں اور ان کو انہی دونوں بنیادوں کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش فرمائی جا رہی ہے کہ اہل کتاب اسلئے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے اللہ کی قدر و عظمت نہ پہچانی اور دوسرا ان کی گمراہی کا سبب یہ ہوا کہ وہ وحی خداوندی کی حیثیت اور بالخصوص قرآن کریم کی افادیت اور اہمیت کو صحیح طور پر ادراک نہ کر سکے۔ اے مشرکینِ مکہ تمہارا معاملہ اس سے بھی بدتر ہے کہ انہوں نے صرف معرفت حق میں کوتاہی کی اور اسکے نتیجے میں گمراہی کا شکار ہوئے تم سرے سے اللہ کے ساتھ شریک کرنے کا دعویٰ لے بیٹھے۔ حالانکہ علمی اور عملی اعتبار سے اس سے بڑا ظلم یا اس سے بڑی اندھیر نگری اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف وحی الٰہی کی اہمیت ہی کو نظر انداز کر رہے تھے تم نے تو وحی الٰہی حتیٰ کہ قرآن کریم کے نزول کو بھی ایک تمسخر بنا کے رکھ دیا۔ ظاہر ہے یہ باتیں ایسے معمولی جرائم نہیں جن کو نظر انداز کیا جا سکے۔ اسلئے ہم تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں کہ تم نے اگر اپنا رویہ نہ بدلا تو تم اپنی موت کے وقت بھی اور قیامت کے برپا ہونے کے بعد بھی ایک ہولناک انجام سے دوچار کئے جاؤ گے۔ چنانچہ یہ باتیں پیش نظر رہیں تو اگلی آیات کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

آیت: ۹۳-۹۴ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِىَ اِلَىَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَىْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰۤئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ

Marfat.com

ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ O ''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے' جو اللہ پر جھوٹ (تہمت) باندھے یا دعویٰ کرے کہ مجھ پر وحی آئی ہے' درآنحالیکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو اور (اس سے) جو دعویٰ کرے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے' میں بھی اتار دوں گا؟ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو' جب کہ یہ ظالم موت کی جان کنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں حوالہ کرو! آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا بوجہ اسکے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض کرتے تھے اور بالآخر تم آئے ہمارے پاس اکیلے اکیلے' جیسا کہ ہم نے تم کو اول مرتبہ پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا' سب تم نے پیچھے چھوڑا اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے' جنکے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ وہ تمہارے معاملہ میں ہمارے شریک ہیں۔ تمہارا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا ہے اور جو چیزیں تم گمان کئے بیٹھے ہو' وہ سب ہوا ہو گئیں''۔

اہل کتاب نے تو اللہ کریم کی معرفت حقیقی سے محروم ہو کر صرف یہ بات کہی کہ اللہ کی قدرت سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی بندے پر اپنا کلام اتارے گویا انہیں اللہ کی قدرت اور اس کی حکمت میں شبہ ہوا اور یا وہ اس کی قدرت وحکمت کو پہچاننے میں کوتاہ ثابت ہوئے۔ لیکن اے مشرکین مکہ! تم نے تو اللہ کی معرفت میں کوتاہی ہی نہیں کی بلکہ اس کی شان میں بے جا جسارت کی انتہا کر دی کہ تم جانتے ہو کہ وہی اس کائنات کا اور تمہارا خالق ہے تم یہ بھی مانتے ہو کہ وہی تمہیں رزق دیتا ہے اور وہی تمہاری مصیبتوں کو دور کرنے والا ہے تم اس کی عظمتوں سے کسی نہ کسی حد تک واقف بھی ہو اور اس کا اعتراف بھی کرتے ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ تم نے اس کی کوئی ایسی صفت نہیں چھوڑی جس میں تم نے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔ حتیٰ کہ اس کی عبادت اور بندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں تم نے غیر اللہ کو شریک نہیں کیا۔ جو آدمی اللہ کے حقوق سے کسی حد تک بھی واقف ہے اور وہ اس کی کبریائی پر یقین بھی رکھتا ہے وہ معمولی عقل سے بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ اللہ کی عبادت اور بندگی میں کسی کو شریک ٹھہرانا اور اس کی صفات میں کسی اور کو دخیل بنا دینا اس سے بڑھ کر ذات خداوندی کی کوئی اور حق تلفی نہیں ہو سکتی اور جو کسی کا بھی حق تلف کرتا ہے وہ ظلم کرتا ہے اور جو اللہ کا حق تلف کرتا ہے وہ صرف ظلم ہی نہیں کرتا بلکہ وہ سب سے بڑا ظلم کرتا اور سب سے بڑا ظالم ثابت ہوتا ہے۔ مزید یہ بات کہ اگر ایک آدمی انسانی شرف اور عظمت کا قائل ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ زمین کی تمام مخلوقات پر اللہ نے انسان کو شرف عطا فرمایا ہے اور عناصر فطرت تک کو اس کا خادم بنا کر اسے مخدوم ہونے کی عزت بخشی ہے۔ وہ کسی طرح بھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے سر جھکائے یعنی جو مخلوقات خادموں کی طرح اس کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں یہ مخدوم اپنے مقام ومنصب کو بھول کر اپنے خادموں کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگے' ان کے سامنے سر جھکانے لگے حتیٰ کہ سجدہ ریز ہو جائے تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس بے وقوف شخص نے اپنے منصب' اپنی ذات' اپنی شخصیت اور اپنے مقام کے ساتھ وہ ظلم کیا ہے جس سے بڑھ کر ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا اور پھر یہ دونوں باتیں یعنی مخدوم کا خادم کے سامنے جھکنا اور اللہ جیسی عظیم ذات کے ساتھ مخلوق کو شریک بنانا یہ ایسی لایعنی اور حماقت کی باتیں ہیں کہ اسے سوائے ظلم یا اندھیر نگری کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یعنی یہ اس لئے بھی ظلم ہے کہ یہ اللہ کی اور اپنی حق تلفی ہے اور اس لئے بھی ظلم ہے کہ یہ سراسر نادانی' حماقت اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے۔ اس لئے اس آیت کریمہ کے آغاز ہی میں فرمایا کہ تم نے اللہ پر یہ جھوٹ باندھ کر کہ اس نے مخلوق کو اپنا شریک بنا رکھا ہے ایک ظلم عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی طرح اگلے جملے میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اہل کتاب نے وحی الٰہی یا قرآن کریم کی حقیقی اہمیت وافادیت کو نہ سمجھتے ہوئے بے سروپا باتیں کہیں۔ لیکن تم نے ان سے بھی قدم آگے بڑھا کر ایسی باتیں کہیں جو نہ صرف وحی الٰہی اور قرآن کریم کی عظمت وافادیت کو نہ جاننے کا نتیجہ ہیں بلکہ وہ انسانیت اور اللہ کے ساتھ انسان کے تعلق کا ایک مذاق اڑانے کے مترادف بھی ہے کہ جب تم نے یہ کہنا شروع کیا کہ جس طرح محمد ﷺ یہ کہتے ہیں کہ مجھ پر اللہ نے وحی اتاری ہے اور یہ قرآن مجھ پر ایک فرشتہ لے کر اترتا ہے۔ ایسی ہی وحی ہم پر بھی اترتی ہے

Marfat.com

اور ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کر سکتے ہیں۔ البتہ ہم اسے چونکہ کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں اس لئے ہم ایسا کلام پیش نہیں کر رہے ورنہ اس طرح کا کلام لانا ہمارے لئے کوئی مشکل بات نہیں۔ قرآن کریم نے ان کی اس یاوہ گوئی کا تذکرہ بعض دوسرے مقامات پر بھی کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ

''اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں' کہتے ہیں! بس کر و' سن لیا' اگر ہم چاہتے تو ہم بھی اسی طرح کا کلام پیش کر دیتے' یہ ہے کیا' یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے'' (انفال:۳۱)

اس ہذیان اور یاوہ گوئی کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ دعویٰ کہ جس طرح کی وحی حضور پر اترتی ہے ایسی ہی وحی ہم پر بھی اترتی ہے اس میں جرأت اور جسارت دیکھنے کی چیز ہے۔ ایسا لگتا ہے ان کے نزدیک نبوت ایک کھیل ہے رسالت ایک مذاق ہے کہ جو آدمی جب چاہے یہ دعویٰ لے کر کھڑا ہو جائے کہ اللہ نے مجھ پر وحی اتاری ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور بھی اپنے طور پر یہ دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جس کی حقیقت کوئی نہیں اور یا پھر مطلب یہ ہے کہ وہ بے شک اللہ کے نبی ہوں لیکن ہم اس قدر اللہ کے عذاب سے مستغنی ہیں کہ ہم بالکل اس کی گرفت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس لئے اس طرح کا دعویٰ کر دینا ہمارے لئے کوئی مشکل بات نہیں اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ محمد ﷺ جسے اللہ کی وحی قرار دیتے ہیں ہم اس کو وحی نہیں سمجھتے کیونکہ ہم اس جیسا کلام لانے پر قادر ہیں۔ ہم جب چاہیں اس طرح کی کتاب اور اس طرح کا خوبصورت کلام پیش کر سکتے ہیں۔ البتہ پیش ہم اس لئے نہیں کرتے کہ ہم اس جہالت کو وزن دینا نہیں چاہتے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جب بھی دنیا میں کبھی کوئی صداقت ظاہر ہوتی ہے تو جن لوگوں کے پندار پر اس کی زد پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کے مقابل میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ اسی طرح کی یاوہ گوئی اور دھونس سے اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے دام فریب میں پھنسے ہوئے عوام ان کی صلاحیتوں سے مایوس ہو کر اس صداقت کو اختیار نہ کر لیں۔ قریش مکہ بھی اس وقت اسی قسم کی بے بسی اور صورتحال سے دوچار تھے۔ قرآن کریم ان کو بار بار چیلنج کر رہا تھا کہ تم اگر اسے اللہ کا کلام نہیں سمجھتے تو اس کی مثال لاؤ۔ اب بجائے اس کے کہ وہ اپنے عجز کا اعتراف کرتے وہ اس طرح کی بے سروپا باتیں کرتے اور سبب اس کا ظاہر ہے کہ وہ اپنی جرأتوں اور جسارتوں میں اللہ کی گرفت اور اس کی سزا کو بھول چکے تھے انہیں یہ بات سمجھ آنا مشکل ہو رہی تھی کہ اللہ کے رسول کی مخالفت کرنا بلکہ اس کا تمسخر اڑانا یہ اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ لیکن وہ بجائے اس کے کہ سنجیدگی سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے وہ انتہائی بے خوف ہو کر آئے دن ان جسارتوں میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ قرآن کریم ان کی اس حماقت اور بے عقلی پر توجہ دلانے کے بعد اب ان کے انجام سے انہیں اس طرح ڈرا رہا ہے کہ خطاب ان سے نہیں کیا جا رہا کیونکہ وہ خطاب کے قابل نہیں رہے۔ آنحضرت سے مخاطب ہو کر یہ کہا جا رہا ہے کہ اس وقت یہ ظالم لوگ انجام سے بے خوف ہو کر جس طرح بڑھتے چلے جا رہے ہیں کہ ان کا رکنا محال دکھائی دیتا ہے۔ کاش آپ انہیں اس وقت دیکھیں جب یہ ظالم موت کی جان کنی میں مبتلا ہو کر بے بسی کی تصویر بنے حیات دنیا سے اس حال میں رخصت ہو رہے ہوں گے کہ فرشتے ان کے سامنے نہایت ہولناک انداز میں کھڑے ان سے جان حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہے ہوں۔ حالانکہ جب بھی کسی آدمی کا آخری وقت آتا ہے تو فرشتہ اللہ کے حکم سے اس سے پوچھے بغیر اس کی جان نکال لیتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے ان کی جان نکالنے والے فرشتے ان کی ہولناکی میں اضافہ کرنے کیلئے انہی سے کہیں گے کہ لاؤ اپنی جانیں ہمارے حوالے کرو پھر دیکھو ہم تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ اب جو ان کے ساتھ سلوک کیا جائے گا اور جن سزاؤں سے انہیں گزارا جائے گا ان میں سب سے نمایاں بات یہ ہوگی کہ وہ ہر قدم اپنے لئے حد سے بڑھی ہوئی ذلت محسوس کریں گے۔ جب کسی آدمی کو انتہائی سزا ملتی ہے تو اسے صرف سزا کا ہوش ہوتا ہے باقی ہر طرح کے احساس عاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کافروں پر معلوم ہوتا ہے عذاب دوگونہ ہوگا۔ ایک تو عذاب کی شدت سے تڑپ رہے ہوں گے اور ساتھ ہی ذلت کا احساس

Marfat.com

ان کو بری طرح پامال کر رہا ہوگا اور یہ ان کے ساتھ اس لئے ہوگا کہ دنیا میں انہوں نے اللہ کے رسول' دین حق اور مسلمانوں کے ساتھ جو ذلت آمیز سلوک کیا تھا اور نہایت تکبر اور غرور سے جس طرح انہیں ذلت آمیز کچوکے لگائے تھے آج اس کی یہ سزا ملے گی کہ انہیں قدم قدم پر اپنی شدید ذلت کا احساس ہو گا۔ اس کے بعد کی آیت کریمہ میں اب براہ راست پروردگار ان ظالموں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اب آ گئے ہو تم ہمارے پاس بالکل اسی طرح یکہ و تنہا جس طرح تم دنیا میں بالکل اکیلے اور تنہا گئے تھے۔ اگر ماں تمہیں نہ تھامتی اور اس کی بانہیں تمہارا بوجھ نہ اٹھائیں تو تم اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل بھی نہ تھے۔ آج تم اس سے بڑھ کر بے کس اور بے بس اور ہر طرح کی معاونت سے محروم اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے ہو اور جس مال و دولت کا تمہیں بڑا غرہ تھا وہ سب پیچھے چھوڑ آئے ہو اور جن معاونین کے جتھوں اور جن فوجوں پر تمہیں بڑا بھروسہ تھا اور جن کے بل بوتے پر تم کسی کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھے اور پھر جن کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا تھا اور تمہارا دعویٰ یہ تھا کہ اگر قیامت میں ہمیں پکڑا گیا تو اللہ کے یہ شریک ہماری مدد کریں گے اور ہمیں چھڑا لیں گے۔ کہاں ہیں یہ سارے تمہارے سفارشی اور تمہارے مددگار کہاں چلے گئے ان میں سے کسی کو ہم تمہارے ساتھ نہیں دیکھ رہے۔ بالآخر ان کافروں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار پائیں گے اور ہر طرح کا تعلق' ہر طرح کا سہارا اور ہر طرح کا علاقہ ان سے کٹ جائے گا اور جن کی مدد اور جن کی یاوری پر انہیں بڑا بھروسہ تھا اور جن کے سہارے پر یہ بڑے بڑے دعوے کرتے تھے وہ سب خواب و خیال ہو جائیں گے۔ اب اللہ کا عذاب انہیں اپنی گرفت میں لے لے گا لیکن وہاں ان کی چیخیں سننے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ کاش! قرآن کی دعوت سے فائدہ نہ اٹھانے والے اپنے اس انجام کو سامنے رکھیں اور پھر سوچیں کہ ہمارا طرزِ عمل ہمیں کس طرف لے جا رہا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ

بیشک خدا ہی دانے اور

وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ

گٹھلی کو پھاڑ کر (ان سے درخت وغیرہ) اگاتا ہے وہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور وہی بے جان کا جاندار سے نکالنے

اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَ

والا ہے۔ یہی تو خدا ہے پھر تم کہاں بہکے پھرتے ہو۔ وہی (رات کے اندھیرے سے) صبح کی روشنی پھاڑ نکالتا ہے اور

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِي

اُسی نے رات کو (موجب) آرام (ٹھیرایا) اور سورج اور چاند کو (ذرائع) شمار بنایا ہے۔ یہ خدا کے (مقرر کیے ہوئے) اندازے ہیں جو غالب

جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا

(اور) علم والا ہے۔ اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں اُن سے رستے

Marfat.com

الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

معلوم کرو عقل والوں کے لیے ہم نے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ اور وہی تو ہے جس نے تم کو ایک شخص

فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

سے پیدا کیا پھر (تمہارے لیے) ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی سمجھنے والوں کے لیے ہم نے (اپنی) آیتیں کھول

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ

کھول کر بیان کر دی ہیں اور وہی تو ہے جو آسمان سے مینہ برساتا ہے۔ پھر ہم ہی (جو مینہ برساتے ہیں) اُس سے ہر طرح کی روئیدگی

فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ

اُگاتے ہیں پھر اُس میں سے سبز سبز کونپلیں نکالتے ہیں۔ اور ان کونپلوں میں سے ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے دانے

النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ

نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور

وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا

زیتون اور انار جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور نہیں بھی ملتے۔ یہ چیزیں جب پھلتی ہیں تو اُن کے

اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

پھلوں پر اور (جب پکتی ہیں تو) اُن کے پکنے پر نظر کرو۔ اُن میں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں (قدرت خدا کی بہت

يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَ

سی) نشانیاں ہیں۔ اور ان لوگوں نے جنوں کو خدا کا شریک ٹھیرایا۔ حالانکہ اُن کو اُسی نے پیدا کیا اور بے سمجھے (جھوٹ

خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا

بہتان) اُس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں بنا کھڑی کیں وہ ان باتوں سے جو اُس کی نسبت بیان کرتے ہیں پاک ہے اور (اُس

يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

کی شان) اُن سے بلند ہے۔

سورۃ الانعام میں باقی مکی سورتوں کی طرح توحید، رسالت اور آخرت کو بنیادی عقائد کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور مختلف اسالیب میں

Marfat.com

اس پر بحث جاری ہے۔ انداز اس کا یہ ہے کہ زیادہ تر زور عقیدۂ توحید پر دیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اور کبھی اس کے ضمن میں رسالت اور آخرت کو بھی موضوع بنایا جاتا ہے۔ دلائل کا انداز بے حد متنوع ہے' کہیں دلائل آفاق کا ذکر ہے کہیں دلائل انفس کا۔ کہیں عقلی دلائل سے کام لیا جاتا ہے' کہیں فطری اور تاریخی دلائل سے۔ دو رکوع پہلے تاریخی دلائل کے ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت اور ان کی دعوت کی تفصیلات کو بیان کرتے ہوئے ان کے استدلال کے انداز کو بھی واضح فرمایا گیا۔ لیکن اس سلسلۂ دلائل میں بطور خاص یہ بات نظر آتی ہے کہ موضوع کو ثابت کرنے کیلئے صرف دلائل کا انبار فراہم نہیں کیا جاتا جو عام طور پر علمی کتابوں کا اسلوب ہوتا ہے بلکہ دلائل کے ساتھ ساتھ تحریک اور زندگی کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور مخاطبوں کی جانب سے پیش کردہ مطالبات ان کی ذہنی الجھنوں اور ان کے اعتراضات کا ازالہ کرنے کی کاوشیں بھی جاری رہتی ہیں اور ان کو صراط مستقیم کی طرف مائل کرنے کیلئے ترغیب اور ترہیب کا انداز بھی پہلو بہ پہلو چلتا رہتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان ضرورتوں کے حوالے اسے اس کی ہمہ گیری کے باوصف مضمون اور موضوع کا سررشتہ کہیں چھوٹنے نہیں پاتا۔ آدمی اس کو پڑھتے ہوئے محسوس کرتا ہے کہ میں زندگی کے ایک عمل سے گزر رہا ہوں جس میں تبلیغ و دعوت رواں دواں ندی کی طرح آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن مخالفتوں اور مطالبات کے پتھر بھی بار بار اس میں آ آ کر گرتے ہیں لیکن یہ ندی ان سے پہلو بچاتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھتی ہے۔ ان آیات میں بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلۂ دلائل کو بیان کرتے ہوئے مخالفین کے رویے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ درمیان میں ان کے دل و دماغ کی بنیادی خرابیوں کی طرف توجہ بھی دلائی گئی ہے اور دنیا کی بے ثباتی اور آخرت میں پیش آنے والی صورت حال سے بھی آگاہ کیا گیا ہے لیکن پھر اچانک سلسلۂ بیان اسی اصل موضوع کی طرف پلٹ گیا ہے جو اس سورۃ کا اصل مدعا ہے۔ چنانچہ اس رکوع کے آغاز سے ہی مسلسل کئی آیات تک اسی بنیادی عقیدۂ توحید پر دلائل آفاق کا ذکر کیا جا رہا ہے اور ضمناً رسالت اور آخرت کے عقیدے کو بھی اس طرح ثابت کیا جا رہا ہے کہ دل و دماغ ہموار ہوئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۹۵-۹۶-۹۷ إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى ط يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ط ذٰلِكُمُ اللَّهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ O فَالِقُ الْإِصْبَاحِ ج وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ط ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ O وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِىْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ O ''بے شک! اللہ ہی دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ برآمد کرتا ہے' زندہ کو مردہ سے اور وہی برآمد کرنے والا ہے' مردہ کو زندہ سے۔ بس وہی اللہ ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔ وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک حساب سے رکھے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے۔ تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کیلئے تفصیل سے بیان کر دی ہیں' جو جاننا چاہیں''۔

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات بابرکات کے وجود اور وحدانیت پر دلائل عطا فرمائے ہیں اور ضمناً عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ آخرت کو بھی نہایت آسان صورت میں واضح فرمایا ہے۔ لیکن انداز ایسا ہے جس سے براہ راست دل پر دستک محسوس ہوتی ہے۔ علمی انداز جو علمی مقدمات پر مشتمل ہو اس سے کسی بات کو ثابت کرنا عام اہل علم کا انداز ہے لیکن اس سے دماغ کو وقتی طور پر متاثر تو کیا جا سکتا ہے لیکن سکون اور اطمینان مہیا کرنا یہ اس سے بہت نادر ہوتا ہے۔ عموماً علمی استدلال جانبین کی طرف سے دماغی کشتی بن کے رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم اگرچہ ہر طرح کے طریق استدلال کو استعمال کرتا ہے لیکن اس کا پسندیدہ انداز یہی ہے۔ وہ موصوف کو اس کی صفات سے ثابت کرتا ہے۔ وہ خالق کے ثبوت کیلئے مخلوق کے وجود سے استدلال

Marfat.com

کرتا ہے' وہ ایک موجود چیز ہے جس کا علم اور یقین ہر پڑھے لکھے اور ان پڑھ کے دل میں موجود ہے، سے اُس ذات پر استدلال کرتا ہے جو نہ حواس کی گرفت میں آتی ہے اور نہ عقلی پیمانے اس کو سمیٹ سکتے ہیں۔ جس طرح کسی شاعر کے تعارف کیلئے اس کی شکل وصورت' اس کا نین نقشہ بیان نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اصل تعارف اس کے اشعار ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے ایک ایک شعر میں نظر آتا اور پہچانا جاتا ہے۔ معمار اپنی تعمیر سے' خطیب اپنے خطبے سے' ناظم اپنے نظم سے اور قائد اپنی قیادت سے اور سیاست دان اپنی سیاست سے اپنی صحیح پہچان ثابت کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا صحیح تعارف اور اس کے وجود پر صحیح استدلال اس کی صفات سے ہی ممکن ہے۔ اس لئے ان آیات میں یہی طریق استدلال بروئے کار لایا گیا ہے۔ سب سے پہلے زمین کی چھوٹی چھوٹی یعنی سامنے کی چیزوں سے استدلال کیا گیا ہے اور پھر رفتہ رفتہ استدلال میں وسعت آتی گئی ہے۔ دلائل قدم قدم آگے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں اور بالآخر پوری کائنات کی وسعتوں میں جانی پہچانی چیزیں دلائل کے طور پر پیش کر دی گئی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اللہ سے انکار اور یا اس کے ساتھ شرک کی جتنی صورتیں بھی ممکن ہوسکتی ہیں ان کی تردید کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلی چیز جس سے استدلال کیا جا رہا ہے وہ ایک ایسی چیز ہے جس سے دنیا کا کوئی فرد ناواقف نہیں ہوسکتا۔ بچوں کو چھوڑ کر کسی بھی باشعور آدمی سے پوچھا جائے کہ تمہیں یہ جو روٹی کھانے کو ملتی ہے یہ کہاں سے آتی ہے اور تم جن پھلوں سے لذت کام و دہن کا سامان کرتے ہو وہ تمہیں کہاں سے حاصل ہوتے ہیں تو کوئی آدمی آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو یہ نہ جانتا ہو کہ یہ چیزیں ہمیں کہاں سے ملتی ہیں اور ان کے وجود میں آنے کا پراسس کیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اللہ ہی کی ذات ہے جو دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والی ہے۔ دانہ پھٹتا ہے تو ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے وجود میں آتے ہیں۔ ایک گٹھلی پھٹتی ہے تو اس سے ایک قدآور درخت جنم لیتا ہے یہی دانے جمع ہو کر کھلیان بنتے اور ہماری غذا کا سامان کرتے ہیں اور وہی پھل دار درخت پھلوں کے انبار پیدا کرتے اور انسانوں کی غذا اور لذت کام و دہن کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ جس ذاتِ خداوندی نے ہماری ان ضرورتوں کو پورا فرمایا ہے جن کے بغیر زندگی کی بقاء کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اس ذات کے وجود کا انکار یا اس کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانا بجائے خود ایک بہت بڑی حماقت اور جہالت کی بات ہے لیکن اگر اس پورے سلسلہ عمل کو دیکھا جائے جس سے یہ ہماری غذا وجود میں آتی ہے تو آدمی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ ایک کاشتکار زمین کے سینے میں اناج کا ایک دانہ دفن کرتا ہے۔ اس پر سہاگہ پھیر کر اس کو پوری طرح چھپا دیتا ہے۔ زمین کی مٹی کی خصوصیت یہ ہے کہ جو چیز اس میں دفن کر دی جائے وہ گل سڑ جاتی ہے اور زمین اس کو نگل لیتی ہے' لیکن یہاں حیرت کی بات ہے کہ دو تین روز کے بعد ہی ہم دیکھتے ہیں کہ زمین میں دراڑیں پیدا ہوتی ہیں اور اس دانے کے اندر سے نکلتی ہوئی سوئی کو ہم دیکھتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے ایک پودے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو جاتی ہے پھر اس سے خوشے نکلتے ہیں' ایک ایک خوشے میں سات سات بالیاں وجود میں آتی ہیں اور ہر بالی میں سو دانے پڑتے ہیں۔ اس طرح ایک دانہ سات سو دانوں کی وسعتوں میں ڈھل جاتا ہے۔ حیرت کی بات ہے یہ دانہ کس نے پھاڑا' زمین کا سینہ کس نے شق کیا پھر یہ سوئی جو نکلی اس کو ایک پودے کی شکل کس نے دی اور پھر اسی پر بس نہیں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی آبیاری کا سامان کیا جائے کیونکہ اگر اس کو پانی نہ ملا تو یہ پودا سوکھ کے ضائع ہو جائے گا۔ چنانچہ سمندر اور دریاؤں سے سورج کو حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کے کھینچو اور پھر فضاء کی وسعتوں میں ابر کی چادروں کی شکل میں بچھا دو۔ پھر ہوا کو حکم دیا جاتا ہے کہ جہاں دانہ گندم نے اپنی آغوش کھول کر ایک پودے کو نکالا ہے وہاں ابر کی چادروں کو لے جا کر چھم چھم پانی برساؤ اور زمین کو حکم دیا جاتا ہے کہ تمہیں جتنا پانی اپنی آبیاری کیلئے ضروری ہے وہ نگل لو اور باقی اگل ڈالو تاکہ وہ پانی کے ذخیروں میں پہنچ کر محفوظ ہو جائے۔ ہاں یہ دیکھنا کہ ضرورت سے زیادہ نگل کر کہیں زمین کو دلدل نہ بنا دینا ورنہ کوئی پودا وہاں اگ سکے گا نہ انسانی آبادی وہاں ممکن رہے گی اور پھر مزید یہ کہ سورج کو حکم دیا کہ تم اپنی حدت

Marfat.com

اور تمازت سے غلّے کو پکاؤ اور چاند کو حکم دیا کہ تم ان میں نرمی اور گداز پیدا کرو۔ موسمی تغیرات کو اپنا فرض انجام دینے کی ہدایت کی گئی۔ اس طرح تمام عناصر قدرت ایک دانہ گندم اور گٹھلی کے ایک پودے کو پروان چڑھانے اور اس کی نمود و پرداخت کو بروئے کار لانے میں اس طرح جت جاتے ہیں کہ انہیں سوائے اس کام کے کسی اور کام کا ہوش ہی معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جب ان کی باہمی خصوصیات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ زمین اور آسمان دونوں ایک دوسرے کے مقابل اور متضاد ہیں۔ پانی اور دھوپ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ مٹی اور ہوا میں کوئی موافقت نہیں لیکن یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں کہ یہ تمام متضاد عناصر مل کر باہمی توافق پیدا کرتے اور کندھے سے کندھا ملا کر ایک فرض کی ادائیگی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اگر یہ سب اپنے طور پر ایسا کر رہے ہوتے تو ان کا باہمی تضاد ختم ہو جاتا۔ لیکن وہ تو علی حالہ قائم رہتا ہے لیکن فرض کی ادائیگی میں کبھی کمی نہیں آتی۔ انہی باتوں کی طرف توجہ دلانے کیلئے یہاں اشارہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو تم غذا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور تمہاری غذا کا سر رشتہ ایک ایک دانے اور ایک ایک گٹھلی کے ساتھ وابستہ ہے اور تمہاری آنکھوں کے سامنے انہی سے کھیت لہلہاتے اور باغ بہار دیتے نظر آتے ہیں اور تم ان کی نمود و پرداخت پر جب غور کرتے ہو تو تمام عناصر قدرت اس میں اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہاں کوئی اللہ کی ذات نہ ہوتی' کوئی یہاں رزق دینے والا نہ ہوتا' کوئی پیدا کرنے والا خالق نہ ہوتا تو تم یہ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور جن سے تم لذت کام و دہن کا کام بھی لیتے ہو اور جس سے تم اپنی شکم پری کی ضرورت پوری کرتے ہو آخر یہ سب کچھ کہاں سے آ گیا۔ کیا ایک ایک دانہ اور ایک ایک پھل اور ایک ایک پودا اور سبزے کی ایک ایک ٹہنی کیا اللہ کے وجود پر دلالت نہیں کرتی؟ کیا ہوا کے جھونکے کیا سورج کی کرنیں کیا پانی کی بوندیں اور کیا بادلوں کی کڑک اور کیا بجلی کی چمک اور کیا شگوفوں کی تازگی اور کیا پھولوں کی رعنائی اور کیا پھلوں کی مہک اور مٹھاس کسی خالق کے وجود کی طرف توجہ دلاتی ہوئی نظر نہیں آتی؟ کیا ان میں سے ایک ایک چیز اس کی ذات کی نغمہ سنجی کرتی ہوئی سنائی نہیں دیتی؟ اگر واقعی ایسا ہے اور یقیناً ہے تو پھر ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لے کر کائنات کے بڑے سے بڑے کرے تک ہر چیز اللہ کے وجود پر دلالت کر رہی اور شہادت دے رہی ہے۔ اسی طرح ایک اور حقیقت بھی اپنی طرف ہمیں متوجہ کر رہی ہے جس کی طرف میں نے اشارہ بھی کیا ہے کہ ہمیں غذا کی فراہمی کیلئے تمام عناصر قدرت اور عناصر فطرت مل کر مصروف عمل ہیں۔ اور ان میں آپس میں اس حد تک تضاد ہے کہ ان کی خصوصیات اور ان کے فرائض بالکل ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ لیکن یہاں اس خدمت کو انجام دیتے ہوئے ہم ان میں ایسا توافق اور ایسی مطابقت دیکھتے ہیں جس کی کوئی وجہ اس کے سوا سمجھ میں نہیں آتی کہ یہاں کا پورا سلسلۂ مخلوقات ایک پروردگار کے حکم کے تابع ہے' وہ جس طرح اور جیسا ان کو کرنے کا حکم دیتا ہے وہ ویسا ہی کرنے اور حکم بجا لانے پر مجبور ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان کا آقا' ان کا خالق و مالک ایک نہ ہوتا بلکہ ایک سے زیادہ ہوتے تو کیا ان متضاد عناصر میں ہمیں کہیں توافق نظر آ سکتا تھا۔ ایک اگر آسمان کا خدا ہوتا اور دوسرا زمین کا تو کیا آسمان کا خدا زمین کے پودوں کی نمود و پرداخت کیلئے سورج اور چاند کو ان کی موافقت میں کام کرنے کی اجازت دیتا؟ کیا آسمان سے بارش برستی؟ کیا شبنم سخاوت سے کام لیتی؟ کیا سورج زمین کے ایک ایک دانے کو اسی طرح پکاتا؟ کیا چاند ایک ایک پھل میں ایسے ہی گداز پیدا کرتا؟ یقیناً ایک سے زیادہ خدا ہونے کی صورت میں ایسا کبھی بھی ممکن نہ ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مخلوق یا تو وجود میں ہی نہ آتی اور اگر آتی بھی تو خداؤں کی باہمی چپقلش کے نتیجے میں مخلوق اور زمین و آسمان تباہ و برباد ہو جاتے۔ پھر ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا پروردگار صرف دانے اور گٹھلی ہی کا پروردگار نہیں جس سے تمہیں رزق بہم پہنچتا ہے بلکہ جس طرح وہ سڑی ہوئی گٹھلی سے ایک ہرے بھرے درخت کو نکالتا ہے اور پھر اس ہرے بھرے درخت پر ایک وقت آتا ہے کہ مردنی چھا جاتی ہے اور بالآخر وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کائنات کی ہر زندہ چیز کو پردۂ عدم سے نکال رہا ہے اور پھر زندگی ملنے کے بعد دوبارہ اس کو موت کا شکار بھی کر دیتا ہے۔ یعنی زندگی اور

Marfat.com

موت اس کے قبضے میں ہے وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے یعنی پردۂ عدم سے ایک زندہ چیز کو منصۂ شہود پہ لاتا ہے پھر زندگی کے سفر کے خاتمے پر اس پر موت طاری کر دیتا ہے۔ یہ بے جان چیزوں سے زندگی کے اظہار اور زندگی کے اوپر موت اور فنا کے طاری ہونے کی ایک جامع تعبیر ہے۔ چاہے آپ اس کو مثال کے طور پر سمجھانے کیلئے یوں کہہ دیں کہ وہ انڈے سے مرغی کو نکالتا ہے اور مرغی سے انڈے کو پیدا کرتا ہے لیکن یہ صرف ایک مثال ہے اصل بات جو کہنے کی ہے وہ یہی ہے کہ زندگی اور موت اس کے قبضے میں ہے۔ وہ عدم سے زندگی کو وجود دیتا ہے اور پھر زندگی کے اوپر جب چاہتا ہے موت اور فنا طاری کر دیتا ہے اور یہ اس کا ایک ایسا اٹل قانون ہے کہ اس سے انسان بھی گزر رہے ہیں' حیوان بھی اور کائنات کا ایک ایک فرد اس قانون کی گرفت میں ہے۔ پھر جس طرح افراد اس سے دوچار ہوتے ہیں اسی طرح قومیں بھی پردۂ عدم سے نکلتی ہیں دنیا پر اپنی سطوتوں کے پھریرے لہراتی ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہی قومیں پردۂ عدم میں جا چھپتی ہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کا بھی اس کائنات میں مالکانہ اور خود مختارانہ تصرف ہوتا تو کبھی کسی ایک ہی گوشہ میں اس قانون کو باطل کر کے بھی دکھاتا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ یہ زندگی اور موت کا جو اٹل قانون اللہ نے بنا دیا ہے اس کی کارفرمائی اربوں سال سے جاری ہے اور جاری رہے گی۔ یہ اس کے قوانین بجائے خود اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ یہاں ایک ہی ذات کی کارفرمائی ہے اگر اس کے علاوہ کوئی اور مقتدر ذات بھی ہوتی تو کبھی تو ان قوانین کی شکست و ریخت کی صورت نظر آتی۔

اس آیت کریمہ میں الفاظ کی تعبیر بھی قابل توجہ ہے کہ پہلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے لیکن اس کے بعد بجائے یُخْرِجُ کے مُخْرِجُ الْمَیِّتِ فرمایا گیا یعنی وہ مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے یعنی فعل کی بجائے اس میں فاعل استعمال کیا گیا وجہ اس کی یہ ہے کہ فعل صرف صدور فعل اور اظہارِ فعل پر دلالت کرتا ہے لیکن اسم فاعل ایک عزم' فیصلے' اقتدار اور قوت کی خبر بھی دیتا ہے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی زندگی سے بہرہ ور نہیں ہوتا تو اس کو زندگی عطا کر دینا اللہ کی قدرت کا اظہار ہے۔ لیکن جب اسے زندگی مل جاتی ہے تو وہ زندگی کی بقاء کیلئے کوشاں رہتا ہے اب اگر اللہ تعالیٰ اس سے زندگی چھیننا چاہتے ہیں تو وہ یقیناً اس پر راضی نہیں ہوتا اور وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ میں اپنی زندگی بچاؤں۔ حیوانات میں بھی یہ طرز عمل ہمیں نظر آتا ہے اور انسان تو اپنی عقل سے کام لے کر اپنے بچاؤ کی ایسی ایسی تدبیریں کرتا ہے کہ آدمی دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ عدم سے وجود دینے پر قادر ہے اسی طرح وہ وجود کو دوبارہ پردۂ عدم میں لے جانے پر بھی قادر ہے۔ کوئی اس بات کی طاقت نہیں رکھتا کہ اللہ اس کی زندگی واپس لینا چاہے تو وہ دینے سے انکار کر دے جس طرح ایک عام آدمی اس کے سامنے بے بس ہے۔ بادشاہ اور ارباب اقتدار بھی اسی طرح اس کے سامنے عاجز ہیں۔ جو بڑے بڑے بادشاہ اپنے آپ کو رب تک کہلاتے رہے ہیں اور اپنے آپ کو جہاں پناہ اور جہاں گیر تک کے القاب سے ملقب کرتے رہے ہیں جب ان کی بھی موت کا وقت آیا تو وہ اپنے سارے کروفر اور لشکروں سمیت اپنے آپ کو موت سے نہ بچا سکے۔ یہاں ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ وہ ذات خداوندی جو ایک دانے اور گٹھلی سے لے کر تمام کائنات کی زندگی اور موت پر قدرت رکھتی ہے جس نے تمہیں زندگی سے نوازا اور پھر اس کے امکانات بھی پیدا فرمائے جس نے تمہاری بقاء اور تسلسل کو باقی رکھا اور جس نے تمہیں گوناں گوں نعمتوں سے گراں بار کیا اور جس کی قدرت اور جس کی ربوبیت تم اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی دیکھ رہے ہو اور تمہارا انگ انگ جس کے احسانات میں جکڑا ہوا ہے اور تمہاری فعلی اور انفعالی قوتیں جس کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور تم صاف محسوس کرتے ہو کہ ایک ہی ذات کی قدرت ہے جو تم پر اور پوری کائنات پر حاوی ہے تو پھر تم اس کو چھوڑ کر ادھر ادھر کی وادیوں میں کیوں بھٹکتے پھر رہے ہو۔ یہی تمہارا اللہ ہے پھر تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔ آخر تمہاری عقل کام کیوں نہیں دیتی اور تم اس سامنے کی بات کو دیکھنے سے عاجز کیوں ہوئے جاتے ہو۔

Marfat.com

اگلی آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح تمہارا پروردگار زمین اور زمین کی مخلوقات کا خالق اور مالک ہے اور ان پر اپنی بے پناہ قدرت رکھتا ہے اور جس طرح وہ ایک دانے کو پھاڑتا اور گٹھلی کو شق کرتا ہے اسی طرح جب رات کے طاری ہونے کے بعد تاریکی گہری ہو جاتی ہے اور آسمان کی وسعتوں میں ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کے سوا کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظلمت کی حکمرانی شاید کبھی زوال پذیر نہیں ہوگی اور ہم شاید کبھی روشنی کی شکل نہیں دیکھ سکیں گے کہ اچانک ظلمت کی اس تنی ہوئی چادر میں شگاف پیدا ہوتا ہے۔ اس تنی ہوئی چھت میں دراڑ ابھرتی ہے جو بڑھتے بڑھتے روشنی کی لکیر کی شکل میں صبح کی نوید بن جاتی ہے۔ کہا دیکھو جس طرح وہ پروردگار زمین پر قدرت کاملہ رکھتا ہے اسی طرح آسمان پر بھی اسی کی حکومت ہے اور وہی تاریکی کو پھاڑ کر صبح برآمد کرتا ہے۔ لیکن یہ مت سمجھو کہ صبح برآمد ہونے تک جو رات طاری تھی وہ شاید تمہاری محرومی کا کوئی باب تھی یا تمہارے لئے کوئی سزا تھی جس سے تمہیں گزارنے کے بعد روشنی کی نعمت عطا کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح صبح اللہ کی بیش بہا نعمت ہے اسی طرح رات اور رات کی تاریکی بھی صبح ہی کی طرح اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس لئے یہاں فرمایا کہ وہی اللہ نے جس نے رات کو سکن بنایا۔ سکن ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں آدمی آرام اور راحت محسوس کرتا ہے اور جس میں دل کو سکون ملتا ہے۔ اس لئے قرآن پاک میں گھر کو بھی سکن قرار دیا اس لئے کہ دن بھر کی کلفتوں کا مارا ہوا آدمی جب گھر پہنچتا ہے تو اس کی ساری کلفتیں دور ہو جاتی ہیں۔ اللہ کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے دن کو حصول معاش کا ذریعہ بنایا اور رات کو آرام و راحت کا وسیلہ قرار دیا۔ چنانچہ سورۃ النباء میں ارشاد فرمایا گیا:

و جعلنا نومکم سُباتًا و جعلنا اللیل لباسًا و جعلنا النھار معاشا (النبا:۱۱-۹)

اللہ نے تمہارے لئے نیند کو دافع کلفت بنایا اور رات کو پردہ پوش بنایا اور دن کو حصول معاش کا ذریعہ بنایا۔

دن کے اجالے میں آدمی رزق کی تلاش اور ضروریات کے حصول میں نکلتا ہے مزدوری کرتا ہے' محنت کرتا ہے' ملازمت کرتا ہے' زراعت کرتا ہے' تجارت کرتا ہے حتیٰ کہ حکمرانی کرتا ہے۔ لیکن یہ ساری وہ ذمہ داریاں ہیں دن کے وقت جن کی ادائیگی ایک آدمی کی ذمہ داری ہے۔ لیکن دن میں محنت کرنے والا ظاہر ہے لامتناہی حد تک تو محنت نہیں کر سکتا۔ ایک خاص دورانیہ کے بعد وہ تھک جاتا ہے تب وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ مجھے آرام ملنا چاہئے تاکہ میں آرام کے بعد تازہ دم ہو کر پھر محنت کرنے کے قابل ہو سکوں۔ زندگی میں اگر محنت ایک لازمی عنصر ہے اور کارکردگی پر زندگی کی کامیابی کا دارومدار ہے تو پھر قوت کارکردگی کی بحالی اور دوبارہ اپنے آپ کو محنت کے قابل بنانا یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کام کرنا اس لئے پروردگار نے انسانوں پر اپنا کرم فرمایا کہ جس طرح اس نے دن کی روشنی محنت اور کام کرنے کیلئے عطا فرمائی اسی طرح محنت کے جذبے کو باقی رکھنے اور اس کی بحالی کیلئے رات پیدا فرمائی تاکہ اس میں آرام کر کے ہم دوبارہ کام کے قابل ہو سکیں۔

رات اور دن کی شناخت یا ضرورت جو انسانوں میں عام طور پر جانی پہچانی جاتی ہے وہ سورج اور چاند ہیں۔ سورج دن کا بادشاہ ہے تو چاند رات کا راجا ہے اس لئے صبح اور رات کو ذکر کرنے کے بعد سورج اور چاند کا ذکر فرمایا کہ دیکھو تمام زمینی زندگی کا دارومدار سورج پر ہے یہ وہ تنور ہے جس کی حرارت سے زمین کا تمام کارخانہ چل رہا ہے لیکن اگر یہ سورج پردۂ شب میں محجوب نہ ہوتا تو رات کو کبھی وجود نہ ملتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم اپنی قوت کارکردگی کی بحالی کیلئے آرام کی دولت سے محروم رہتے۔ اس لئے پروردگار نے دن کو سورج کی حکمرانی عطا فرمائی۔ لیکن رات کو ہمیں چاند عطا فرمایا جس کے بارے میں حیران کن بات یہ ہے کہ اس کی روشنی اپنی نہیں بلکہ وہ سورج سے مستعار لیتا ہے اسی کا عکس اس کی روشنی کا باعث بنتا ہے اور اسی سے وہ دنیا کو روشن کرتا ہے۔ لیکن سورج سے وہ روشنی تو لیتا ہے حدت اور تمازت نہیں لیتا۔ سورج میں ایک تیزی ہے اس میں آسودگی ہے سورج گرمی پہنچاتا ہے یہ

Marfat.com

ٹھنڈک بانٹتا ہے۔ اس کا حسن دل کو سکون بخشتا ہے اور اس کی رعنائی آنکھوں کو نور عطا کرتی ہے۔ بڑے اس کے حسن سے محظوظ ہوتے اور بچے اس کو کھلونا سمجھ کے کھیلتے ہیں اور اس کی یہ آسودگی دینے والی روشنی ہمارے آرام میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ پھر ان دونوں کو اللہ نے اس طرح پیدا فرمایا اور اس طرح ڈیوٹی پر لگا رکھا ہے کہ دونوں اپنے اپنے مدار میں محوِ سفر ہیں کبھی ان میں آج تک تصادم نہیں ہوا۔ دونوں زمین اور اہل زمین کی ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں لیکن اپنے اپنے فرض کی ادائیگی میں کبھی ان میں تخلف نہیں ہوا اور مزید یہ کہ یہ اپنی مرضی کے مختار نہیں ہیں کہ جب چاہیں چمکیں اور جب چاہیں نہ چمکیں اور اپنی حرکت و رفتار میں جب چاہیں تبدیلی کر لیں۔ سورۃ یٰسین میں پروردگار فرماتے ہیں کہ "ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر دی ہیں کیا مجال ہے کہ وہ اس میں کمی بیشی کر سکے"۔ مزید فرمایا کہ سورج کی یہ مجال نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کے بس میں ہے کہ وہ دن سے آگے نکل جائے۔ ہر ایک اپنے مدار میں محوِ پرواز ہے۔ یعنی جس طرح زمین کی ایک ایک چیز اللہ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی اور اس کے احکام کی پابند رہ کر اپنے فرائض ادا کرنے پر مجبور ہے اسی طرح آسمان کے تمام چھوٹے بڑے کرے ان کو اللہ نے جس حساب سے پیدا فرمایا ہے اور جو کچھ ان پر فرائض عائد کئے گئے ہیں وہ ان میں کبھی پس و پیش نہیں کر سکتے۔ اور دوسرا مفہوم اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو ایک حساب کیلئے پیدا فرمایا ہے ہم چاند سے بھی اپنا حساب معلوم کرتے ہیں اور سورج سے بھی۔ یعنی ان کے طلوع و غروب اور ان کی رفتار کا ایک خاص حساب مقرر کر دیا گیا ہے جس کے ذریعے انسان سالوں، مہینوں، گھنٹوں کا بلکہ منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب بآسانی لگا سکتا ہے۔ اربوں سال سے یہ کرے آسمان پر چمک رہے ہیں اور انسان ان سے اپنے حساب کی ضرورت پوری کر رہا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اتنے اربوں سالوں سے کبھی ان کی رفتار میں معمولی سا تغیر بھی پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہماری تمام جنتریاں اور ہمارے تمام کیلنڈر غلط ہو جاتے۔

یہاں ایک بات سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ ہمارے یہاں دو طرح کے حساب رائج ہیں۔ ایک کو ہم عیسوی کہتے ہیں اور دوسرے کو ہجری۔ عیسوی حساب سورج سے متعلق ہے یعنی یہ شمسی تقویم ہے جس سے زیادہ تر دنیا کا نظام چلتا ہے اس کو عام طور پر انگریزی یا مغربی حساب کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ اس کی نسبت عیسوی کے لفظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے تو عیسیٰ علیہ السلام صرف عیسائیوں کے نہیں بلکہ وہ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے بھی واجب الاحترام ہیں۔ ان کی طرف منسوب کوئی حساب بھی غیر مسلم حساب نہیں کہا جا سکتا وہ بھی ہمارا طریق حساب ہے ہم اس کو بھی استعمال کرتے ہیں اور کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ دوسرا حساب قمری ہے یعنی اس کا تعلق چاند سے ہے لیکن اس کی نسبت آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا رشتہ اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ گہرا ہے۔ تقسیم یہ ہے کہ معاملات کیلئے تو شمسی حساب کو پیش نظر رکھنا چاہئے اس سے آسانی رہتی ہے لیکن جہاں تک عبادات کا تعلق ہے اس کا تعلق قمری یعنی ہجری سن سے ہونا چاہئے کیونکہ عبادات میں یہی طریقہ مناسب ہے یعنی یہ معلوم کرنا کہ رمضان کب ہوگا، حج کے ایام کون سے ہیں، عیدیں کب ہوں گی ان کا تعلق قمری حساب سے ہے، شمسی سے اگر ہو تو دشواری کا باعث ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں یہ دونوں حساب کے سلسلے جاری ہیں ایک کو معاملات کیلئے اور دوسرے کو عبادات کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہئے کہ چونکہ سن ہجری کا تعلق آنحضرت ﷺ سے ہے اور پھر عبادات اور اسلامی تاریخ کا دار و مدار بھی زیادہ تر اسی حساب پر ہے اس لئے امت پر فرض ہے کہ وہ اس حساب کو قائم اور باقی رکھیں۔ اس قمری حساب کو بالکل نظر انداز اور محو کر دینا گناہِ عظیم ہے جس سے اس امت کو بچنا چاہئے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ رات اور دن کا یہ نظام، سورج اور چاند کی گردش اور اہل زمین کے معاملات میں ان کی فرائض کی بجا آوری میں یکسانی اور حساب میں ان کی حرکت اور گردش کی پابندی اور ایسی ہی اور بہت ساری حکمتیں جو ہماری نگاہوں سے مخفی ہیں ان میں کبھی تخلف کا نہ ہونا اور کبھی کسی قباحت کا در نہ آنا یہ اس وجہ

Marfat.com

نہیں ہے کہ سورج اور چاند میں کوئی اپنی ذاتی خوبی ہے بلکہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ یہ منصوبہ بندی اس خداوند ذوالجلال کی ہے جو عزیز بھی ہے اور علیم بھی۔

عزیز کا معنی ہے سب سے بلند اور سب پر غالب اور علیم کا معنی ہے ہر چیز کا مکمل علم رکھنے والا' ہر ضرورت کو جاننے والا' ہر ایک کی قسمت اور مستقبل کو پہچاننے والا اور ہر چیز کی بے پایاں وسعتوں کا علم رکھنے والا۔ وہ ذات چونکہ سب سے بلند اور سب پر غالب ہے اس لئے سورج اپنی تمام تر عظمت اور اپنی تمام تر بے پناہی کے باوجود اس کے حکم سے سرتابی بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی رفتار اور حرکت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا اسی طرح چاند پوری طرح اس کے احکام کی گرفت میں ہے اور زمین اپنی قوت روئیدگی میں کبھی تخلف نہیں کر سکتی۔ اس دنیا کی ہر چیز کو جہاں جہاں اور جس جس کام پر لگا دیا گیا ہے اس میں کمی بیشی کرنا کسی کے بس میں نہیں۔ رہی یہ بات کہ اگر کہیں کوئی کمی بیشی یا خرابی پیدا ہو جائے تو کائنات کی بے پناہ وسعتوں میں اندازہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کہاں خرابی پیدا ہوئی ہے۔ فرمایا کہ تمہیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف عزیز ہی نہیں علیم بھی ہے۔ ایک ایک چیز کی کیفیت اس کی نگاہوں میں ہے اس لئے کہیں اگر کوئی تبدیلی ہوتی ہے تو وہ اس کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہتی۔ سورج اور چاند اور زمین پر تمام چھوٹی بڑی نعمتوں کو اس طرح اللہ کے احکام کی گرفت میں دکھانے سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز ایک ہی پروردگار کے احکام میں جکڑی ہوئی ہے تو پھر سورج اور چاند کو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرنے کا کیا جواز ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن

''تم سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو' بلکہ اس اللہ کو سجدہ کرو' جس نے ان کو پیدا کیا'' (حم سجدہ:۳۷)

اس لئے کہ سجدہ کا مستحق تو وہ ہے جو سب کا خالق ہے اس کی موجودگی میں مخلوق کو سجدہ کرنا اس سے بڑی جہالت کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تو یہ سورج اور چاند جب اللہ کی مخلوق ہیں اور پھر وہ اپنی مرضی کے مختار بھی نہیں وہ ہم سے بڑھ کر اللہ کے احکام کی گرفت میں ہیں وہ اپنے آپ کو اس گرفت سے نکالنے پر قادر نہیں تو تمہاری قسمتیں بنانے یا تمہیں مصیبتوں سے نکالنے میں تمہیں کیا مدد دے سکتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ وہ تو تمہاری خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور تم ان کے مخدوم ہو۔ صبح سے شام تک سورج اپنی روشنی سے تمہاری خدمت انجام دیتا ہے اور چاند رات بھر تمہاری خدمت میں مصروف رہتا ہے کس قدر نادانی کی بات ہے کہ ایک مخدوم اٹھ کر اپنے خادم کو سجدہ کرنے لگے' اس کی خدمت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جائے اگر دنیا میں کوئی بادشاہ یا کوئی حکمران اپنے چاکروں اور اپنے درباریوں سے اس طرح کی حرکت کرے تو یقین کر لیا جائے گا کہ اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے تو اے دنیا کے مشرکو! تمہیں آخر یہ بالکل سادہ سی بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی اسلئے ان آیات میں ان تمام چھوٹے بڑے کروں کا ذکر کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم ان کے مخدوم ہو اس لئے مخدوم بن کے رہو لیکن اس ذات کے سامنے جھکو جس ذات نے ان بڑے بڑے کروں کو تمہاری خدمت پر لگا رکھا ہے' جس کی قدرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں' جس کی عظمتوں کی کوئی انتہاء نہیں۔ اگلی آیت کریمہ میں ستاروں کے وجود اور اہل زمین کیلئے ان کی خدمات سے توحید پر استدلال کیا جا رہا ہے کیونکہ مشرکین عرب ستاروں کو بھی اللہ کا شریک بناتے تھے اور ان کے اثرات کو مستقل بالذات سمجھ کر ان کے سامنے دست سوال پھیلاتے تھے اور دنیا کے بعض حصوں میں تو انہیں دیوتا کی حیثیت حاصل تھی اور بعض مشرک گروہ ان کو اللہ کا اوتار قرار دیتے تھے اس لئے ایسے تمام مشرکانہ امور کی تردید کیلئے ستاروں کی خدمات کی طرف توجہ دلا کر انسانی اصلاح کا اسے ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تو وہ ذات ہے جس نے ستاروں کو تمہارے لئے پیدا کیا اس میں سب سے پہلی بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح تم اللہ کی مخلوق ہو

Marfat.com

اور مخلوق ہونے کی وجہ سے اللہ کے شریک نہیں ہو سکتے بلکہ تم اس کے بندے ہو وہ تمہارا معبود ہے اور تمہاری ہر طرح کی عبادتوں اور اطاعتوں کا وہی مستحق ہے اسی طرح ستارے بھی مخلوق ہونے کی وجہ سے اللہ کے بندے ہیں وہ اپنے فرائض میں آزاد نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی پابندی میں مجبور محض ہیں' وہ اس سے سرتابی کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ آسمان کی وسعتوں میں جو خدمت ان کے سپرد کی گئی ہے پوری مستعدی سے اسے انجام دینے کے پابند ہیں۔ دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ انہیں ہم نے تمہاری خدمت کیلئے پیدا کیا گویا وہ تمہارے خادم ہیں اور تم ان کے مخدوم ہو۔ تم ان کو آسمان کی بلندیوں پر دیکھتے ہو اور خود زمین کی پستیوں کے مکین ہو' شاید اس وجہ سے تمہیں یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ ان کی بلندیاں شاید ان کی سربلندی کا باعث ہوں اور ممکن ہے وہ اپنے اندر کوئی غیر معمولی قوتیں بھی رکھتے ہوں حالانکہ وہ جہاں کہیں بھی ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت کیلئے بنایا ہے ان کا رات بھر ٹمٹمانا' ان کا روشنی دینا وہ تمہارے لئے ہے یہ سب کچھ وہ تمہارے لئے اور اللہ کے حکم کی تعمیل میں کر رہے ہیں۔ اسی خدمت کی مزید وضاحت کیلئے فرمایا کہ تم خوب جانتے ہو کہ جب تم بر و بحر کی تاریکیوں میں سفر کرتے ہو اور صحراؤں کی وسعتوں میں تمہارے پاس سمتِ سفر کے تعین کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اور سمندر کی بے کراں پہنائیوں میں کوئی صورت نہیں ہوتی جس سے تمہیں یہ معلوم ہو سکے کہ تمہیں کدھر جانا ہے اور تمہاری منزل کدھر ہے لیکن یہ ستارے ہیں جو تمہاری سمت سفر اور منزل کو متعین کرنے اور راستے کی شناخت میں تمہاری مدد کرتے ہیں تم ان سے اس طرح راستہ جانتے ہو جس طرح راستے کی برجیوں سے راستہ معلوم کیا جاتا ہے اور تم ان سے سمتِ سفر متعین کرنے میں اس طرح مدد لیتے ہو جس طرح سمندروں کے دیدبانوں میں جلتے ہوئے چراغ بحری جہازوں کو سمت سفر بتاتے ہیں یہ ستارے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے راستے کی برجیاں اور یا مینارۂ نور۔ عجیب بات ہے کہ جس اللہ کی مخلوق کی یہ حیثیت ہو کہ وہ رات بھر چمک چمک کر تھک جائیں لیکن محض تمہاری خدمت کیلئے آنکھ نہ جھپکیں تم بجائے اس کے کہ انہیں اللہ کی طرف سے متعین کردہ خادم سمجھو اور اللہ کی اس بے پایاں عنایت کا شکر بجا لاؤ انہی کو اللہ کی صفات میں شریک بنا کر پوجا کرنے لگتے ہو اور ان سے اپنی مشکلوں میں مدد کے طالب ہوتے ہو۔ کسی مخدوم کا اپنے خادم سے یہ طرزِ عمل کسی حوالے سے بھی صحت مندانہ طرزِ عمل نہیں کہلا سکتا بلکہ دنیائے فکر میں اسے نہایت فروتنی کی علامت اور خست کی انتہاء سمجھا جاتا ہے۔

اگر تدبر سے کام لیا جائے تو اس آیت کریمہ کے بین السطور میں ایک اور حقیقت بھی جھلکتی دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ ستارے آسمان کی وسعتوں میں رواں دواں ہیں اور انسان زمین کی پستیوں میں رہتا ہے اور زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ ہمارے حدودِ علم سے ماوراء ہے۔ بظاہر آسمانی مخلوق اور زمینی مخلوق میں کوئی نسبت ہے اور نہ کوئی رابطہ لیکن اس کے باوجود ستارے راستے بتانے اور منزل کی خبر دینے کی خدمت اہل آسمان کیلئے نہیں بلکہ اہل زمین کیلئے انجام دے رہے ہیں۔ اوپر کی مخلوق نیچے کی مخلوق کو کبھی دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی اور تاریکیوں میں بسنے والے نور کے جھرمٹ میں رہنے والوں سے کبھی کوئی رشتہ قائم کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر یہ نورانی مخلوق اپنے تفوق اور اپنی نورانیت کے احساس میں آزاد ہوتی تو وہ کبھی اہل زمین کی کسی خدمت کیلئے سوچنے کی زحمت بھی نہ اٹھاتی۔ لیکن ان کا اہل زمین کی یہ خدمت انجام دینا کیا اس بات کی خبر نہیں دیتا کہ وہ یقیناً کسی کے حکم کے پابند ہیں اور وہ حکم دینے والا وہ ہے جو بیک وقت زمین اور آسمان کا حاکم ہے اور جس کو زمین اور آسمان دونوں کی مصلحتیں ایک ساتھ عزیز ہیں۔ زمینوں اور آسمانوں میں یقیناً پستیوں اور بلندیوں کا فرق ہے لیکن اس حاکم کی حکمت میں اس فرق کا کوئی تصور نہیں وہ خوب جانتا ہے کہ کس مخلوق سے کس طرح اور کون سا کام لینا ہے۔ اگر زمین کا مالک کوئی اور ہوتا اور آسمان کا حاکم کوئی اور تو ستارے کیا آسمان کی کوئی مخلوق بھی زمین اور اہل زمین کے حال پر کبھی توجہ نہ کرتی لیکن آسمان کی تمام مخلوقات اور وہاں کے تمام ستارے اور سیارے جس طرح انسانوں کی خدمت میں لگا دیئے گئے ہیں یہ یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ ان

Marfat.com

دونوں کا خدا اور ان دونوں کا مالک ایک ہے۔ یہاں اسی دلیل کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے اور قرآن کریم نے اسے ایک اور جگہ کھول کر بھی بیان فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ

''اور وہی ذات ہے' جو آسمان میں بھی الٰہ ہے اور زمین میں بھی الٰہ ہے'' (الزخرف:۸۴)

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے ان لوگوں کیلئے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں جو جانتے ہیں یا جاننا چاہتے ہیں۔ اس میں دو باتیں فرمائی جا رہی ہیں ایک یہ کہ دانے اور گٹھلی کا پھاڑنا زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو نکالنا۔ تاریکی سے صبح کا برآمد کرنا اور سورج اور چاند کو ایک حساب سے اور ایک خدمت کیلئے پیدا کرنا اور اسی طرح ستاروں کو اہل زمین کی خدمت کیلئے تخلیق فرمانا یہ سب نشانیاں ہیں جس سے تم اپنے خالق کو پہچان سکتے ہو کیونکہ نشانی دلیل ہوتی ہے اس کیلئے جس کی وہ نشانی ہوتی ہے اس سے وہ پہچانا جاتا ہے اور اس کے بارے میں وہ سب کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے جس پر نشانی دلالت کرتی ہے ان میں سے ایک ایک چیز خود بول رہی ہے کہ ہمیں کس نے پیدا کیا ہے ہم کس کے احکام کی پابندی میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور وہ کون قادر مطلق ہے جسکی قدرت کے سامنے تمام چھوٹے بڑے کرّے بے بس ہیں۔ یہ ایسی وسیع اور روشن نشانیاں ہیں جن کی موجودگی میں کسی اور نشانی کا مطالبہ ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اگر کوئی آدمی اللہ کی معرفت کا طالب ہے اور وہ اس کی صفات کو جاننا چاہتا ہے تو اس کیلئے تو یہ نشانیاں بس کرتی ہیں لیکن ان تمام نشانیوں کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی بار بار پیغمبر سے اور نشانی لانے کا مطالبہ کرتا ہے جیسے کہ مشرکین مکہ کرتے تھے کہ ہمیں کوئی ایسی نشانی دکھاؤ یعنی ایسا کوئی معجزہ دکھاؤ جس سے ہمیں اللہ کی توحید' آپ کی رسالت اور آخرت کا یقین آ جائے۔ انہیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر ایسی واضح نشانیاں بھی تمہیں راہ راست نہیں دکھا سکیں تو کوئی اور نشانی تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکے گی۔ آیت کے آخری لفظ میں مشرکین مکہ کا اپنی ضد پر اصرار اور ان کی ہٹ دھرمی کا سبب بھی بیان فرما دیا کہ یہ لوگ نشانیاں رکھتے ہوئے بھی بار بار نشانیوں کا جو مطالبہ کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علم کے دشمن ہیں۔ کسی چیز کو جاننا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب آدمی اپنے اندر اس کی طلب پیدا کرے اور اس کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھے لیکن جو شخص ان دونوں چیزوں سے نابلد ہو اس کے سامنے بڑی سے بڑی دلیل بھی بے کار ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا کہ ہم نے یہ نشانیاں ان لوگوں کیلئے بیان کی ہیں جو جانتے ہیں یا جاننا چاہتے ہیں یعنی یا تو وہ پہلے سے علم کی وادی میں موجود ہیں اور جب بھی ان کے پاس علم کی کوئی بات آتی ہے وہ آگے بڑھ کر اسے قبول کرتے ہیں اور یا پھر یہ ہے کہ علم کی طلب ان کے اندر ہے ان کی خواہش ہے کہ جس بات کو وہ نہیں جانتے انہیں وہ بات بتلائی جائے۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب یہ نشانیاں بیان کی جاتی ہیں تو وہ اس سے فوراً فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مشرکین مکہ چونکہ اس بنیادی صفت سے عاری ہیں اور انہوں نے اپنی بے بصیرتی کے باعث اپنے آپ کو ہٹ دھرمی کا مریض بنا لیا ہے اس لئے ان لوگوں کیلئے اس سے فائدہ اٹھانا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ یہاں یَعْلَمُوْنَ کا لفظ دونوں معنوں پر دلالت کر رہا ہے۔ جس کا میں نے اس وضاحت میں ذکر کر دیا ہے کیونکہ فعل اظہار فعل پر بھی دلالت کرتا ہے اور ارادۂ فعل پر بھی اس لئے یَعْلَمُوْنَ کا معنی ہو کہ وہ لوگ جو جانتے ہیں یا جاننا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں طرح کے لوگ ہیں جو ہدایت حاصل کر سکتے ہیں لیکن اگر کسی شخص میں ان دونوں صفات میں سے کوئی صفت بھی نہ ہو تو وہ بڑی سے بڑی رہنمائی سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا' یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ تاریک راستے میں جلتی ہوئی شمع سے دو طرح کے لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں ایک وہ جو آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو کھولنے کا ارادہ اور نیت رکھتے ہیں اور جس نے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ آنکھیں نہیں کھولے گا تو اس کیلئے چاہے آپ کتنی شمعیں جلا دیں وہ اس روشنی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ وہ یقیناً کسی کھائی میں گر کر ہلاک ہو جائے گا۔

Marfat.com

اگلی آیت کریمہ میں انسان کی اپنی ذات اس کے تخلیقی عمل اور اس پر اللہ کی عنایات کے تذکرے سے اللہ کی ذات اور اس کی توحید پر استدلال کیا جارہا ہے۔ارشادفرمایا:

آیت:۹۸ وَهُوَ الَّذِیٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ O

''اور وہی ہے' جس نے تم کو پیدا کیا' ایک ہی جان سے۔پھر ہر ایک کیلئے ایک مستقر اور ایک مستودع ہے۔ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کیلئے تفصیل سے بیان کردی ہیں' جو سمجھیں''۔

اس آیت کریمہ کا ایک ایک لفظ گہرے تدبر اور غور وفکر کا طالب ہے گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ دلائل آفاق اور خارجی دنیا کے تذکرے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر استدلال کیا ہے۔لیکن اس آیت کریمہ میں خود انسان کے وجود اور اس کی نفسی حقیقتوں سے استدلال کیا جارہا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا ہی گیا گزرا ہے کہ وہ خارجی دنیا اور کائنات کے حقائق پر نظر کرنے سے قاصر ہے تو اسے اپنے ظاہر و باطن کو دیکھنا اور اپنے اوپر نعمتوں کو پہچاننا مشکل نہیں ہونا چاہئے اگر وہ تھوڑا سا بھی تامل کرے تو یقیناً وہ قرآن کریم کے اس استدلال کو سمجھ سکتا ہے اس لئے یہاں براہ راست انسانوں سے خطاب کر کے فرمایا جارہا ہے کہ دیکھو اللہ وہ ذات ہے' جس نے تمہیں نفس واحدہ سے پیدا کیا اولاً تو انسان کا مخلوق ہونا اور اس کی تخلیق میں کسی اور کا شریک نہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اللہ کی ذات اور اس کی صفت تخلیق میں کوئی شریک نہیں اور یہی دلیل توحید کیلئے کافی ہونی چاہئے۔لیکن اس آیت کریمہ میں تخلیق کیلئے خَلَقَ کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اَنْشَاَ کا لفظ استعمال ہوا۔ان دونوں کے معنی میں فرق ہے۔خَلَقَ کا معنی ہے کسی چیز کا عدم سے وجود میں لے آنا' ایک معدوم کو موجود کردینا لیکن اَنْشَاَ کے معنی میں اس سے زیادہ وسعت ہے اس میں تخلیق کا معنی بھی شامل ہے لیکن اسی پر اکتفا نہیں بلکہ اس میں نمود و پرداخت اور تربیت کے تمام مراحل کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنا' زندگی کے تمام امکانات کو مہیا کرنا ہر پیدا ہونے والی ضرورت کو وقت سے پہلے جان کر پہلے سے اس کی تدبیر بروئے کار لانا۔یہ تمام چیزیں اس لفظ کی معنویت میں شامل ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کو اس طرح قدم قدم آگے بڑھنے کے امکانات سے بہرہ ور فرمایا اور ہر سطح پر اس کی ضروریات کو اس طرح پورا فرمایا اور ہر مرحلے پر اس کی ہدایات کے ایسے سامان فرمائے کہ ان کی تفصیل دیکھ کر آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔کیونکہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ تمام مخلوقات کے بچوں سے زیادہ بے بسی کی تصویر ہوتا ہے۔ایک بلی کا بچہ آنکھیں کھولتے ہی اپنی ماں کے پستان تلاش کر لیتا ہے' مرغی کا بچہ چند گھنٹوں کے بعد اپنی ماں کے پیچھے چلنے لگتا ہے' ایک بھینس کا بچہ چند ہی گھنٹوں میں اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا اپنی غذا کی جگہ پہنچ جاتا ہے۔لیکن انسان کا بچہ جب زمین پر اترتا ہے تو نہ خود چل سکتا ہے نہ پکڑ سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے کسی طرح کا احساس بھی اپنے اندر نہیں رکھتا لیکن عجیب بات ہے کہ ان تمام چیزوں کی تلافی کیلئے ماں کے سینے میں ممتا کا جوش پیدا کردیا جاتا ہے اس کی بانہیں بے تابانہ اپنے بچے کو اٹھانے کیلئے لپکتی ہیں۔باپ کے کندھے اس کا بوجھ اٹھانے کیلئے بے قرار ہو جاتے ہیں۔ماں جوش محبت میں اسے سینے سے لگاتی ہے تو وہیں اس کیلئے غذا کے سوتے جاری کردیئے جاتے ہیں پھر وہ آہستہ آہستہ حواس سے نوازا جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ O

''اللہ وہ ذات ہے' جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس طرح نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔پھر اس نے تمہیں قوت سماعت عطا کی' قوت بصارت عطا کی اور عقل و خرد سے نوازا تا کہ تم شکر ادا کرو'' (النحل:۷۸)

Marfat.com

یعنی انسان کو جن علمی خزانوں سے مالا مال کیا ان میں سب سے پہلے مشاہداتی قوت پھر سماعی قوت یعنی مشاہدات کے بعد مسموعات کا علم اور سمعی و بصری ذرائع سے کام لینے کا جذبہ اور اسی کے ضمن میں باقی حواس کو بھی شامل سمجھئے کیونکہ یہ دونوں ذرائع باقی حواس کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔لیکن جہاں حواس اپنا سفر مکمل کر لیتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ عقل و خرد کا چراغ روشن فرماتے ہیں جس میں دماغ اپنا کام کرتا ہے اور قلبی بصیرت اپنا فرض انجام دیتی ہے۔ اَفۡـِٕدَةَ دماغی اور قلبی دونوں قوتوں پر دلالت کرتا ہے۔پھر ان نعمتوں کے ساتھ ساتھ انسان کی غذائی ضرورتوں کیلئے سطح زمین پر دسترخوان بچھا دیا گیا ہے' آسمان سے پانی برستا ہے اور عناصر قدرت اس دسترخوان کو سجانے کیلئے ہمہ وقت اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔پھر نسل انسانی کی بقا کیلئے انسان ہی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا گیا اور پھر آگے توالد و تناسل سے انسانی قافلے کو اس طرح پروان چڑھایا گیا کہ آغاز حضرت آدم اور حضرت حوا سے ہوا اور بڑھتے بڑھتے یہ قافلہ اربوں تک پہنچ گیا۔ان میں اگرچہ شکلوں صورتوں زبانوں اور لہجوں کا اختلاف ہے لیکن جبلی تقاضوں اور فطری داعیات کے لحاظ سے کامل اتفاق پایا جاتا ہے۔ایک بہت بڑا اختلاف ہم مرد اور عورت میں دیکھتے ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ سازگاری کے جو ظاہری محرکات پائے جاتے ہیں اس کا نتیجہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کیلئے ایک کشش اور ایک ضرورت محسوس کرتے ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ دوسرے کیلئے اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتا ہے اور جب تک ان دونوں میں فطری اور شرعی طریقے سے یکجائی پیدا نہیں ہوتی وہ خلا بھرنے کا نام نہیں لیتا اس طرح انسانی قافلے کا ایک ساتھ چلنا خاندان اور قوموں کی شکل اختیار کرنا اور انسانی معاشرے کا وجود میں آنا کیا بجائے خود اس بات کی دلیل نہیں کہ اگر اس انسانی قافلے کا خالق ایک نہیں بلکہ دو ہوتے تو ان میں یہ یکسانی یہ ہم آہنگی پھر ان کو قدم قدم پر ضرورتوں کا مہیا کرنا ہر سطح پر ان کی نمود و پرداخت اور ان کی تربیت کے امکانات کو بروئے کار لانا کیا دو خداؤں کی صورت میں ایسا دور دور تک ممکن ہو سکتا ہے۔اس لئے یہاں اللہ کی وحدانیت پر استدلال کرتے ہوئے توجہ دلائی جا رہی ہے کہ انسانو! خود اپنے تخلیقی عمل اور اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے انسانی قافلے کو اور اب تمہاری ضرورتوں کی تکمیل کیلئے اللہ کی بے کراں نعمتوں کو دیکھو یہ سب کس بات پر دلالت کر رہی ہیں کیا اس بات پر کہ خدا ایک ہے اور وہی تمہارا اللہ ہے یا اس بات پر کہ یہاں مختلف قوتیں' مختلف قوانین یا مختلف دیوتا اپنی اپنی خدائی کا صور پھونک رہے ہیں اور یہ کائنات ان کی ایک رزم گاہ ہے جس میں یہ تصادم جاری ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ جو ہمیں نمود و پرداخت کا عمل دکھائی دیتا ہے اور جس میں قدم قدم پر انسان نوازا جا رہا ہے کیا اس کا دور دور تک امکان ہو سکتا تھا؟ پھر اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف تمہیں پیدا ہی نہیں فرمایا بلکہ اس نے تمہارے لئے مستقر بھی پیدا فرمایا جس طرح جب ایک بچہ جوان ہو جاتا ہے تو ماں باپ کو اس کا گھر بسانے کی فکر ہوتی ہے' چنانچہ جب اس کا گھر بسانے کا فیصلہ ہوتا ہے تو پہلے اس کیلئے گھر بنایا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے جب انسانوں کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو پہلے ان کیلئے ایک مستقر بنایا یعنی ایک ایسی جگہ جہاں جا کر وہ رہ سکیں اور بس سکیں۔یقیناً وہ جگہ ایسی ہونی چاہئے جہاں ان کے قرار' ان کی سکونت اور رہائش کی آسانیاں میسر ہوں' جہاں وہ ساری چیزیں موجود ہوں جو ایک گھر کو گھر بناتی ہیں اور جو رہنے والوں کی ضرورت ہوتی ہیں اس حوالے سے جب ہم دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ تمام زمین پر جہاں جہاں بھی نسل انسانی آباد ہے پروردگار نے کس طرح اس کے رہنے اور بسنے کے امکانات اور وسائل مہیا فرما دیئے ہیں۔پہاڑوں کے غار اور سایہ دار درختوں کے جھنڈ اور چٹانوں کے سائے یہ تو وہ چیزیں ہیں جو حیوانوں کو بھی میسر ہیں لیکن انسان نے اس سے بہت آگے قدم بڑھایا اور اس کی فطرت میں یہ بات ڈال دی گئی کہ تم اگر اس دنیا میں تسخیر کا عزم لے کر نکلو گے تو اس کی ایک ایک چیز تمہارے لئے ہے۔صرف اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہے چنانچہ انسان نے پہاڑوں کے سینے چیر ڈالے' فضاؤں میں کمندیں ڈالیں' لوہے میں قوت پرواز پیدا کر دی' سمندر کی تہوں میں اتر گیا' ہر جگہ سے اس نے اپنی قوت تسخیر سے خراج وصول کیا اور یہ صرف اس لئے

Marfat.com

ہوا کہ اللہ نے پہلے سے یہ خزانے اسی کیلئے پیدا فرمائے تھے اور اس میں تجسس وجستجو کا مادہ رکھا تھا اور حوصلہ مندی اس کے ہم رکاب کر دی گئی تھی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا تھا کہ قدرت نے زمین کو اس کیلئے مستقر ٹھہرایا تھا۔ ذرا اندازہ فرمائیے کہ یہ مستقر انسان کیلئے ایسا کافی ثابت ہوا ہے کہ انسان پیدا بعد میں ہوتا ہے زمین اپنی آغوش اس کیلئے پہلے کھول دیتی ہے وہ اندر سمٹ کر بیٹھتا ہے آکسیجن اسے ڈھونڈ لیتی ہے۔ باہر نکلتا ہے تو ہوائیں اس سے اٹھکیلیاں کرتی ہیں، گھٹائیں اس کے استقبال کیلئے جھوم کے اٹھتی ہیں، سورج اپنی روشنی سے اس کے راستے کو روشن کرتا ہے، زمین اپنا سینہ اس کیلئے وا کر دیتی ہے کیونکہ اس کا مستقر اس سے بخل نہیں کر سکتا اور اللہ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم یہاں اس حقیقت کو واشگاف کر رہا ہے کہ انسانو! اگر اس زمین وآسمان کے الگ الگ خدا ہوتے تو کیا زمین پر اترنے کے بعد تمہارے لئے یہی امکانات مہیا ہوتے اور تمہارے تخلیقی عمل سے لے کر تمہارے زندگی گزارنے کے آخری مرحلے تک اسی طرح تمہاری نگرانی، تمہاری حفاظت اور تمہاری دیکھ بھال ہوتی۔ یقیناً یہ پورا سلسلۂ عمل ایک ہی اللہ کے وجود اور ایک ہی معبود اور تمہارے عبد ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اس نے تمہارے لئے زمین کو مستقر بنایا ہے اور یہاں وہ آنے والے ایک ایک شخص کو جانتا اور پہچانتا ہے اس کے مطابق اسے رہنے کی جگہ کھانے پینے کا سامان اور زندگی کی ضروریات مل رہی ہیں اسی طرح اس نے اس زمین کو مستودع بھی بنایا ہے۔ مستودع اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کسی چیز کو امانتاً ودیعت کر دیا جاتا اور دفن کر دیا جاتا ہے اور جہاں دفن کیا جاتا ہے اس جگہ کی ذمہ داری ہے کہ جب اس امانت کو اس سے واپس مانگا جائے تو وہ امانت حوالے کر دے۔ بتایا جا رہا ہے کہ یہ زمین تمہارے لئے مدفن بنائی گئی ہے کہ زندگی گزارنے کے بعد یہی زمین جو تمہیں قرار کیلئے جگہ دیتی تھی وہی تمہیں دفن کیلئے قبر دے گی اور جس طرح اس نے تمہارے قرار اور رہنے کیلئے سہولتیں مہیا کی تھیں اسی طرح تمہارا مدفن بننے کے بعد تمہیں اپنی آغوش میں سنبھال کے رکھے گی لیکن چونکہ تمہیں اس کی آغوش میں امانت کے طور پر رکھا جا رہا ہے اس لئے جب قیامت آئے گی اللہ تعالیٰ اسے حکم دے گا کہ ہماری امانت ہمیں واپس کر دو چنانچہ وہ ایک ایک دفن ہونے والے کو اپنے اندر سے نکالے گی اور میدان حشر کی طرف ہانک دے گی۔ مزید یہ توجہ دلائی جا رہی ہے کہ جس طرح اللہ نے جتنے انسانوں کو اس زمین پر پیدا فرمایا تھا اور اس زمین پر انہیں ٹھہرایا تھا وہ ان میں سے ایک ایک کو جانتا تھا اس لئے ایک ایک کو اس نے رزق پہنچایا۔ اسی طرح جس جس کو اس زمین میں دفن ہونے کا موقع ملے گا یعنی جو بھی یہاں موت کا شکار ہوگا چاہے اس کی قبر کہیں بھی ہو اسے بھی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ط

''اور نہیں ہے، زمین پر کوئی جاندار، مگر اللہ ہی اس کو روٹی دیتا ہے اور دنیا میں اس کے مستقر کو بھی جانتا ہے اور مر جانے پر اس کے سپرد کئے جانے کی جگہ کو بھی جانتا ہے'' (ھود:٦)

یعنی جس طرح وہ ہر زندہ شخص سے باخبر ہے اور اسے رزق پہنچا رہا ہے اور اس کی زندگی اور موت سے بخوبی واقف ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ بھول گیا ہو اور صدیاں اس کو زندگی میں گزر گئی ہوں اور کبھی اس کو موت نہ آئے۔ کیونکہ اللہ کے علم سے وہ نکل چکا اب ظاہر ہے اسے موت کیسے آ سکتی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا میں ایسی کوئی مثال نہیں کیونکہ اللہ کا علم مکمل ہے وہ کبھی کسی سے بے خبر نہیں ہوتا اسی طرح جو آدمی مر جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی بے خبر نہیں ہوتا وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کہاں دفن ہوا زمین میں دفن ہوا یا سمندر میں یا درندہ اس کو کھا گیا ہر چیز اللہ کے علم میں ہے اس لئے جب قیامت آئے گی تو ہر شخص کو اسی جگہ سے اٹھایا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہو اس کی موت کہاں ہوئی تھی چاہے اس کے جسم کا کوئی ذرہ بھی باقی نہ رہا ہو اور ہر چیز مٹی ہو چکی ہو یا اس کی لاش گل سڑ چکی ہو تو اگر وہ ایک سڑی ہوئی

Marfat.com

سے قدآور درخت نکال سکتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کے اندر زندگی کے آثار ہیں تو وہ زمین کے ذروں سے مرنے والے کا جسم بھی نکال لے گا۔ کیونکہ وہ مستقر سے بھی واقف ہے اور مستودع سے بھی واقف ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس طرح ہم نے یہ نشانیاں کھول کے بیان کر دی ہیں ان لوگوں کیلئے جو سمجھتے ہیں۔ گزشتہ آیت میں یَعْلَمُوْنَ کا لفظ تھا اور یہاں یَفْقَهُوْنَ کا لفظ ہے۔ علم عقل و شعور کا فعل ہے اور تفقہ دل کا۔ قرآن کریم نے ان دونوں لفظوں کو ان معنوں میں کئی جگہ استعمال کیا حقیقت تو اللہ جانتا ہے لیکن غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خارجی عالم کی نشانیاں اور آفاقی دلائل انسان کی علمی اور مشاہداتی قوتوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس لئے ان سے وہی ہدایت پا سکتا ہے جو علمی پیمانوں سے کام لیتا ہے اور دماغی قوتوں کو استعمال کر کے بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جہاں تک انسان کے اپنے تخلیقی عمل اور اس کو عطا کردہ اللہ کی نعمتوں اور اس کی عنایات اور انسان کی داخلی زندگی کے احساسات اور انفعالات کا تعلق ہے اس میں دماغی کاوشیں کم اور قلبی بصیرتیں زیادہ کام دیتی ہیں۔ اس لئے پہلے علم و شعور کو متوجہ کیا گیا اور یہاں قلبی بصیرت پر توجہ دلائی جا رہی ہے کیونکہ جب تک ان دونوں کو بروئے کار نہیں لایا جاتا اللہ کی معرفت اور اس کی ہدایت کا سفر طے کرنا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اللہ کی ذات چونکہ حواس اور عقل کی گرفت میں نہیں آتی تو جو آدمی خوگر پیکر محسوس بن کر علم کی دنیا میں داخل ہوتا ہے اور وہ انہی کی مدد سے یقین و اذعان کا سفر طے کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ دولت کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ اس کے لئے دل کی بصیرت، دل کی ہم آہنگی اور دل کی روشنی ضروری ہے یہ وہ نور ہے جو اس راستے پر چلنے والے کو روشنی مہیا کرتا ہے۔ اس لئے اس آیت کریمہ کے آخر میں بطور خاص اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

دلائل آفاق اور دلائل انفس میں سے چند ایک سے استدلال کرنے کے بعد اب پروردگار اپنی رحمت، ربوبیت، قدرت اور حکمت سے توحید اور معاد پر اگلی آیت کریمہ میں استدلال فرما رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۹۹ وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ O ''اور وہی ہے، جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اس سے ہر چیز کے انکھوے نکالے۔ پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخیں اگائیں، جس سے ہم تہہ بہ تہہ دانے پیدا کر دیتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے لٹکتے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار باہم دگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی، ہر ایک کے پھل کو دیکھو! جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو! جب وہ پکتا ہے، بیشک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لانا چاہتے ہیں''۔

گزشتہ آیت کریمہ میں انسان کی تخلیق اور اس کی نمود و پرداخت کا ذکر تھا اب اپنی ربوبیت عامہ اور ربوبیت خاصہ سے توحید اور معاد پر استدلال فرمایا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے یہ بات فرمائی کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا اس میں سب سے پہلے اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہاں السماء کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی عام طور پر آسمان کر دیا جاتا ہے لیکن عربی زبان میں سماء صرف آسمان کو نہیں کہتے بلکہ ہر وہ چیز جو سر کے اوپر سایہ کرتی یا بلندی پر ہے اسکو سماء کہہ دیتے ہیں۔ اس لئے بادل کو بھی سماء کہا جاتا ہے یہاں سماء سے مراد بھی اوپر سے یا بادل سے مراد ہے۔ پھر اس کے بعد فرمایا کہ پھر ہم نے اس سے ہر چیز کی نبات پیدا کی۔ نبات کہتے ہیں ہر وہ چیز جو زمین سے اگتی ہے اور ہر وہ شگوفہ جو کہیں سے پھوٹتا ہے اس لئے ترجمے میں ہم نے اس کیلئے انکھوے کا لفظ استعمال کیا۔ اس میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پانی کا ذکر سب سے پہلے اس لئے فرمایا کہ پانی زمین پر زندگی کی نمود اور زندگی کی بقاء کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور پھر ہماری غذا کا دار و مدار زمین سے اگنے والی چیزوں پر ہے اور زمین سے

Marfat.com

کوئی چیز اگ نہیں سکتی جب تک کہ پانی سے اسکی آبیاری نہ کی جائے اس لئے پانی کے برسنے کا ذکر فرمانے کے بعد پھر فرمایا کہ ہم نے اس کے ذریعے زمین سے ہرا گنے ولی چیز نکالی۔اس میں زور اس بات پر ہے کہ آسمان سے پانی بھی اللہ نے اتارا اور زمین سے ہر چیز بھی اللہ ہی نے نکالی۔اسکا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ بارش برساتا ہے وہی زمین سے نباتات بھی اگاتا ہے۔گویا دونوں کا خدا ایک ہے۔اگر دونوں کے خدا جدا جدا ہوتے تو زمین وآسمان میں یہ توافق اور پانی اور زمین میں یہ موافقت اور بادل اور ہوا میں یہ مناسبت کبھی پیدا نہ ہوتی۔آسمان کا خدا اگر پانی برساتا تو زمین کا خدا اسے زمین پر نہ پہنچنے دیتا یا زمین کو حکم دیتا کہ تم اپنا سینہ اس کیلئے بند کرلو اور اس کیلئے اپنی قوت روئیدگی کو بروئے کار آنے سے روک دو اور اگر زمین کبھی دھوپ سے جل کر پانی کی طالب ہوتی تو آسمان کا خدا بادلوں کو حکم دے دیتا کہ تمہیں برسنے کی ہرگز اجازت نہیں تو اندازہ فرمایئے! انسان کی غذا کا سروسامان کہاں سے ہوتا اور اللہ جو اپنے آپکو رب کہتا ہے اس کی ربوبیت کیسے وجود میں آتی اس لئے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ یہ ربوبیت کا عمل جو تم اپنے ساتھ اپنے اندر اور اپنے باہر پھیلا ہوا دیکھ رہے ہو اور جس سے تم ہر لحہ بہرہ ور ہو رہے ہو اور جس کی ہمہ گیری نے پوری انسانی زندگی کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے اگر تم اسکو کھلی نظر سے دیکھو تو تمہیں یہ بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہونی چاہئے کہ اس پوری کائنات کا اور تمہارا خدا اور رب ایک ہی ہے اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں۔پھر اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ پھر اس انکھوے سے ہم نے سرسبز شاخیں اگائیں جن سے ہم تہہ بہ تہہ دانے پیدا کر دیتے ہیں۔اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس رحیم وکریم کا اپنے ساتھ معاملہ دیکھو کہ تم ایک دانہ زمین کے سپرد کرتے ہو اس سے وہ کسطرح ایک پودا پیدا کرتا ہے پھر اسکو خوشے لگتے ہیں ان میں تہہ بہ تہہ دانے پڑتے ہیں اور ایک دانہ سات سو دانے کی صورت میں تمہیں لوٹایا جاتا ہے۔یہ اسکی ربوبیت خاصہ اور اس کی رحمت کاملہ کا ظہور ہے جو باقی معاملات کی طرح غذا کے معاملے میں بھی تمہارے ساتھ بروئے کار لایا جاتا ہے کہ تمہاری ذراسی محنت تمہارے لئے غذا کے خزانے اگل دیتی ہے۔تم زمین میں ہل چلاتے ہو آبیاری کا سامان کرتے ہو اور تھوڑے سے دانے ہر فصل کے زمین میں بکھیر دیتے ہو لیکن پھر خود بخود غذا کے بروئے کار آنے کا عمل وجود میں آتا ہے اور تم محدود غلے کے عوض میں کھلیان اٹھا کے اپنے گھر لے جاتے ہو۔اس عمل کے بروئے کار آنے میں ایک ایک مرحلہ اللہ کے وجود پر دلالت کرتا ہے اور چند دانوں کا کھلیان میں تبدیل ہو جانا اور چند گٹھلیوں سے قد آور سایہ دار اور ثمر آور درختوں کا ایک باغ تیار ہو جانا یہ اللہ کی وہ رحمت ہے جس سے تمہیں گراں بار کیا جاتا ہے۔ہونا تو یہ چاہئے کہ تم اس پورے عمل کو دیکھتے ہوئے اور اسکی نظر عنایت کو پہچانتے ہوئے نہ صرف اس کے وجود کو تسلیم کرو بلکہ اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔لیکن تم نے اس سامنے کی بات کو ماننے کی بجائے نجانے کیسے کیسے اسکے شریک بنا رکھے ہیں اور کس طرح اس کی قدرتوں کو تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔پھر اس کے بعد چند پھلوں اور ان کے بروئے کار آنے کے عمل کو اسطرح آنکھوں کے سامنے لایا گیا ہے کہ جس سے اس کی رحمت برستی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ساتھ ہی آدمی کے جمالیاتی ذوق کو تسکین بھی ملتی ہے اور پھلوں میں ذکر ان پھلوں کا کیا گیا ہے جن سے عرب پوری طرح واقف تھے۔جن میں سے بعض کو وہ غذا کے طور پر استعمال کرتے اور بعض کو لذت کام ودہن کیلئے پھر جس طرح ایک پھل اپنے شگوفے سے لے کر اپنے وجود تک پھر آغاز سے لے کر پکنے تک جن مراحل سے گزرتا ہے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ان میں سے ایک ایک مرحلے کو گہری نگاہ سے دیکھو کیا تمہیں اس میں اللہ کی قدرت کارفرما دکھائی نہیں دیتی اور ہر مرحلے پر اس کی وحدانیت جھلکتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی؟ سب سے پہلے کھجور کا ذکر فرمایا کہ دیکھو اس درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا پھر اس سے لٹکتے ہوئے بوجھل خوشوں کا وجود میں آنا کیا اس سے اللہ کی قدرت وحکمت اور اس کی رحمت وربوبیت کا یقین پیدا نہیں ہوتا۔کیونکہ جہاں تک کھجور کی ضرورت مجرد غذا کی ہے اس کی فراہمی کیلئے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی گٹھلی سے درجہ بہ درجہ ایک تن آور درخت بنے۔پھر ایک خاص مرحلہ پر پہنچ کر اس کے اندر گابھا

Marfat.com

اور خوشے پیدا ہوں پھر ان کے اندر ننھی ننھی کیریاں بیٹھیں پھر وہ درجہ بہ درجہ پھل بنے پھر پک کر اور بوجھل ہو کر ان کے خوشے زمین کی طرف لٹک آئیں اور انسان کو زبان حال سے دعوتِ شوق دیں یہ سارا عمل دل گواہی دیتا ہے کہ اسی لئے ہے کہ انسان پر خدا کی قدرت اس کی ربوبیت اور اس کی حکمت کے اسرار ظاہر ہوں۔ لیکن یہ سائنس کا عجیب اندھا پن ہے کہ اس کو حکمت تو نظر آتی ہے لیکن حکیم نظر نہیں آتا۔ ربوبیت تو اس کو دکھائی دیتی ہے، لیکن رب کا سراغ اس کو کہیں نہیں ملتا اور اس سے زیادہ عجیب معاملہ ان لوگوں کا ہے جو دیکھتے ہیں کہ کھجور کے درخت سے پیدا ہونے سے لے کر اس کے پھولنے پھلنے اور پکنے تک تمام عناصر کائنات نے اس کی دیکھ بھال اور غور و پرداخت میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ تب کہیں کھجور کا ایک خوشہ تیار ہوا لیکن پھر بھی وہ اس سفاہت میں مبتلا ہیں کہ یہ کائنات مختلف ارادوں اور بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے اور اس سے زیادہ عجیب معاملہ ان سادہ لوگوں کا ہے جو ربوبیت اور پروردگاری کے یہ سارے سروسامان دیکھ رہے ہیں ان سے متمتع اور محظوظ بھی ہو رہے ہیں لیکن یہ سوال ان کے ذہن میں کبھی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ سب کچھ مہیا کرنے والے کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں۔ ان نعمتوں کے بارے میں کوئی پرسش کا دن بھی آنے والا ہے یا نہیں؟ گویا دینے والے نے حق تو ان کو سارے بخش دیئے لیکن ذمہ داری ان پر کوئی بھی نہیں ڈالی۔

اس آیت کریمہ کے آخری حصے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس آیت میں جن نعمتوں اور جن پھلوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک ایک کو ان کے پھلنے سے لے کر ان کے پکنے کے مراحل تک ہر مرحلے کو غور سے دیکھو تمہیں ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے اللہ کی قدرت، حکمت، ربوبیت، صناعی، کاریگری، باریک بینی، فیض بخشی اور اس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اتنی شہادتیں تمہارے سامنے آئیں گی کہ تم ان کو دیکھ کر ششدر رہ جاؤ گے اور پھر یہ بھی فرمایا کہ اللہ کی ان تمام نعمتوں کو بیک وقت نہ دیکھو بلکہ ہر ایک نعمت کو الگ الگ گہری نظر سے دیکھو تو تمہیں اس کی ایک ایک شاخ اور ایک ایک پھول اور ایک ایک پھل معجزہ دکھائی دے گا اور اس کی چھوٹی بڑی چیز اللہ کی قدرت کی داستاں کہتی ہوئی سنائی دے گی تم پیغمبر سے ایک ایک نشانی اور ایک ایک معجزہ طلب کرتے ہو حالانکہ اگر کھلی آنکھوں سے دیکھو تو اللہ کی نعمتوں میں قدرت کے اعجاز کے ہزاروں شاہکار جلوہ نما ہیں۔ لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک طرف وہ اپنی ذہانت کے مظاہرے کا اتنا شوقین ہے کہ تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات سے تہذیب و ثقافت تلاش کرتا پھرتا ہے اور اسے کہیں سے ٹوٹا ہوا مرتبان بھی مل جائے تو وہ اس کی آڑھی ترچھی لکیروں سے اس عہد کے آرٹ، کلچر، تہذیب اور اس دور کے مذہب، سیاست غرضیکہ ہر چیز پر ایک فلسفہ اور ایک فرضی تاریخ مرتب کر کے دکھا دے گا، لیکن اللہ کی ایک ایک نعمت جس طرح اللہ کی حکمت اور اس کی قدرت کو نمایاں کر رہی ہے اسے دیکھنے اور اسے سمجھنے کی اسے توفیق نہیں ہوتی۔ وجہ اس کی وہی ہے جس کا اس آیت کے آخری جملے میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ ان نعمتوں سے ہدایت کا راستہ پانا اس کیلئے مقدر ہوتا ہے جو ایمان لانے کا ارادہ کرے کیونکہ کسی حقیقت کے تسلیم کئے جانے کیلئے تنہا یہ کافی نہیں ہوتا کہ وہ واضح اور ثابت ہو بلکہ اس کیلئے اول شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر اس کے قبول کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اس لئے فرمایا گیا کہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لانے کا ارادہ رکھتے ہوں اور جنہوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے ان کیلئے کوئی نشانی بھی نظر نواز نہیں ہو سکتی اور جنہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہیں ان کیلئے کوئی نغمہ بھی فرحت بخش نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد اگلی آیت کریمہ میں مشرکین عرب کی اسی بدنصیبی اور حماقت کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ چونکہ ان میں ہدایت کا راستہ اختیار کرنے کی معمولی طلب بھی موجود نہیں اس لئے قرآن کریم جیسی کتاب کو سن کر بھی اور اللہ کی کھلی کھلی نشانیاں دیکھ کر بھی ان کا حال یہ ہے کہ وہ کائنات کی حقیر قوتوں کو اللہ کے شریک بنانے سے دریغ نہیں کرتے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا:

آیت: ١٠٠ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا

Marfat.com

یَصِفُوْنَ O ''اور انہوں نے' جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے۔ حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کیلئے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے' جو یہ بیان کرتے ہیں''۔ 100

مشرکین عرب بہت سی قوتوں کو اور بہت سی شخصیات کو اللہ کا شریک بنا کر پوجتے تھے اور اپنی مشکلات میں ان سے مدد مانگتے تھے۔ انہی میں سے جنات بھی تھے جن کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ مختلف علاقوں میں یا مختلف جگہوں میں ان جنات کا بسیرا ہوتا ہے اور وہاں وہ ایک طرح سے اپنی حکومت قائم رکھتے ہیں۔ اسی لئے وہ بعض درختوں' بعض ٹیلوں' بعض پہاڑوں اور بعض وادیوں کو مختلف جنات سے منسوب کرتے تھے۔ اس لئے جب وہ کسی ایسی جگہ کے پاس سے گزرتے تو وہ جنات کی جے پکارتے اور ان آستانوں پر چڑھاوے چڑھاتے اور بعض دفعہ وہاں بندگی کی رسوم بھی بجالاتے اور اگر کہیں اس کے آس پاس رات گزارنے کا موقع ملتا تو وہ بلند آواز سے ان سے پناہ اور مدد طلب کرتے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان جنات کی ناراضگی ہمارے لئے مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔ اس لئے ان کو خوش رکھنا ضروری ہے۔ اللہ کی بڑی مخلوقات تین ہیں انسان' فرشتے اور جنات اور ان میں جنات کو سب سے فروتر مقام حاصل ہے اس لئے بطور خاص یہاں ان کا تذکرہ کیا گیا۔ کہ کائنات کی ایک ایک چیز تو خدا اور اس کی صفات سے متعلق وہ شہادتیں فراہم کررہی ہے۔ جن کا تذکرہ گزشتہ آیات میں ہوا لیکن اے مشرکین عرب تمہاری خردباختگی اور تمہاری حماقت کا یہ عالم ہے کہ تم نے سب سے مرتبے میں کم تر مخلوق یعنی جنات کو اللہ کی صفات میں شریک کرڈالا ان کی بندگی کرنے لگے اور ان سے مدد ماننے لگے حالانکہ جس طرح اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی پیدا کیا ہے اور یہ بالکل واضح بات ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی کوئی مخلوق آخر اس کی خدائی میں کیسے شریک ہوسکتی ہے۔ یہ بات اس آیت کریمہ میں بطور خاص اس لئے فرمائی گئی ہے کہ مشرکین عرب اس بات کا عقیدہ رکھتے تھے کہ ساری کائنات کا خالق اللہ ہی ہے اس عمل تخلیق میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں اس لئے فرمایا گیا کہ جب تم سب کو اور جنات کو بھی اس کی مخلوق سمجھتے ہو تو پھر اللہ کے ساتھ ان کو شریک کیسے ٹھہراتے ہو۔ اس کے بعد ان کی شرک کی عادت سیۂ کو مزید نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا شرک صرف جنات تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے اللہ کیلئے بیٹے اور بیٹیاں بھی تراش رکھے ہیں کیونکہ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ممکن ہے وہ کسی کو اللہ کا بیٹا بھی قرار دیتے ہوں اور یا پھر یہاں ضمناً عیسائیوں کا ذکر کردیا گیا ہے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے بیٹا مانتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ ان کے ان باطل عقائد اور ان واہیات اقوال پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ تو پھر آخر وہ کس بنیاد پر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ اللہ اس سے پاک ہے اور بلند ہے جو کچھ یہ بیان کرتے ہیں۔ یہ سبحان کا لفظ تنزیہ کا کلمہ ہے یعنی اس لفظ سے اللہ کی پاکیزگی اور شریک سے اس کے پاک ہونے کو بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی دلیل بھی ہے یہ بات ہر عقل مند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اگر کسی ذات کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی جائے جو اس کی مسلمہ حیثیت اور اس کی مسلمہ صفات کے خلاف ہو تو کوئی عقل مند آدمی اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر کسی شخص کو بادشاہ تسلیم کیا جائے اور پھر اس کے بارے میں کہا جائے کہ وہ کسی کا ملازم یا غلام ہے تو بادشاہت اور غلامی میں چونکہ کھلا تضاد ہے اس لئے کوئی آدمی اسے قبول نہیں کرے گا۔ اسی طرح اگر کسی ذات کے بارے میں یہ بات ثابت ہو کہ وہ بہت سرمایہ دار' بہت خدا ترس اور بہت مخیّر آدمی ہے تو کوئی آدمی اگر اس کے بارے میں یہ کہے کہ اس نے فلاں آدمی سے دس روپے چھین لئے ہیں یا اس نے کسی کا سو روپیہ دینا ہے اور وہ ادا نہیں کرتا تو کوئی اس بات کو صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ اسلئے کہ ایک سرمایہ دار' معزز اور فیاض آدمی سے اس کا امکان نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جو ذات خالق مالک' قدیر' علیم اور کریم و رحیم ہے اس کو ان صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات

Marfat.com

اس کی ان تمام صفات کی نفی کے مترادف ہے جن کا ماننا از روئے عقل وفطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے انسان ان تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے ان صفات کے علم کی روشنی ہی نے اس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اس کا شریک قرار دے دیا جائے اور اس کو بیٹوں اور بیٹیوں کا باپ بنا دیا جائے تو پھر وہ خدا کہاں رہا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف لفظ سبحان توجہ دلا رہا ہے۔

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ

(وہی) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا (ہے)۔ اُس کے اولاد کہاں سے ہو جب کہ

تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

اُس کی بیوی ہی نہیں۔ اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ

یہی (اوصاف رکھنے والا) خدا تمہارا پروردگار ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (وہی) ہر چیز کا پیدا کرنے

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَهُوَ يُدْرِكُ

والا (ہے) تو اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا نگران ہے۔ (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اُس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور

الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ

وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے اور وہ بھید جاننے والا خبردار ہے (اے محمدﷺ ان سے کہہ دو کہ) تمہارے (پاس) پروردگار کی طرف سے

فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ

(روشن) دلیلیں پہنچ چکی ہیں تو جس نے (اُن کو آنکھ کھول کر) دیکھا اس نے اپنا بھلا کیا اور جو اندھا بنا رہا اس نے اپنے حق میں بُرا کیا

بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ

اور میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں اور ہم اسی طرح اپنی آیتیں پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ کافر یہ نہ کہیں کہ تم (یہ باتیں

وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ

اہل کتاب سے) سیکھے ہوئے ہو اور تاکہ سمجھنے والے لوگوں کے لیے تشریح کر دیں۔ اور جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے

Marfat.com

رَبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

پاس آتا ہے اسی کی پیروی کرو اس (پروردگار) کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور مشرکوں سے کنارہ کر لو۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ

اور اگر خدا چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم کو اُن پر نگہبان

حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾

مقرر نہیں کیا اور نہ تم اُن کے داروغہ ہو۔

تمہید:

گزشتہ رکوع میں اللہ کے خالق کائنات ہونے اور اس کی وحدانیت پر دلائل آفاق اور دلائل انفس ہم نے پڑھے جن کی روشنی میں اللہ کو اپنی ذات اور صفات میں وحدہ لاشریک ثابت کیا گیا اور اس قدر آسان انداز میں یہ دلائل دیئے گئے کہ معمولی عقل کا آدمی بھی اللہ کی وحدانیت میں شک وشبہ کا شکار نہیں ہوسکتا۔ بایں ہمہ! مشرکین عرب کی کوتاہ فکری اور خست نظر کا عالم یہ تھا کہ اتنے واضح اور مضبوط دلائل سن کر بھی انہوں نے اللہ کی مخلوقات میں سے ایک غیر مرئی مخلوق جس کی طرف کوئی بہت قابل تعریف اعمال بھی منسوب نہیں کیے جاتے کو اللہ کا شریک بنا ڈالا اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا اللہ کیلئے بیٹے اور بیٹیوں کے قائل ہوگئے اور ان سے مرادیں مانگنے لگے۔ اس پس منظر میں پیش نظر آیت کریمہ پر ایک اور پہلو سے اللہ کے وحدہ لاشریک ہونے کے دلائل دیئے جارہے ہیں اور اس کی ربوبیت اور اس کی عبودیت کو دل ودماغ میں اتارنے کیلئے نہایت موثر پیرایہ اختیار فرمایا جارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۰۱ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ O ''وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اس کے اولاد کہاں سے آئی جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے''۔

اللہ تعالیٰ کی کوئی بیوی نہیں' اس لئے اولاد کہاں سے آئی:

بَدِيْعُ اسم صفت ہے اس کا فعل ماضی بَدَعَ ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو پہلی مرتبہ بغیر کسی نمونے اور بغیر کسی مثال کے عدم سے وجود میں لانا۔ آپ آسانی کیلئے اس کا معنی ایجاد کرنا بھی کرسکتے ہیں یعنی اللہ ایک ایسی ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین یعنی پوری کائنات کو ایجاد کیا ہے' وہ اس پوری کائنات کا موجد ہے اس کی اس ایجاد سے پہلے نہ یہ دنیا تھی نہ دنیا کی کوئی چیز صرف اللہ کی ذات تھی جو ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔ جب اس کے اس تخلیقی عمل سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا اور ہر چیز دنیا میں اس کی تخلیق اور ایجاد سے وجود میں آئی ہے تو پھر اس کی ذات کے حوالے سے اولاد کا کیا معنی؟ اولاد تو اس کی ہوتی ہے جو خود کسی کی اولاد ہو اور جس کو وجود کسی اور نے دیا ہو اور سلسلہ تناسل کیلئے اس عمل کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہ ہو' جب دنیا کی ہر چیز کا وجود اللہ کی صفت تخلیق سے قائم ہے تو پھر کسی بھی مخلوق کو اس کی اولاد تسلیم کرنا یہ اس کی تسلیم کردہ صفت تخلیق کے بالکل خلاف ہے۔ اگر

Marfat.com

خالق ہے اور وہ ہر چیز کی تخلیق اور ایجاد پر قدرت رکھتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے اولاد کی ضرورت ہو یا اس سے اولاد وجود میں آئے اور مزید یہ کہ اگر اولاد کو اسی طرح تصور کیا جائے جس طرح مخلوقات میں اولاد ہوتی ہے تو اس کا تو ایک فطری عمل یہ ہے کہ اولاد کیلئے جس طرح باپ کا ہونا ضروری ہے اسی طرح ماں کا ہونا بھی ضروری ہے یعنی تنہا باپ سے اولاد نہیں ہوتی یا یوں کہہ لیجئے کہ تنہا کسی شخص سے اولاد نہیں ہوتی۔ میاں بیوی کے فطری ملاپ سے یہ رشتہ وجود میں آتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کیلئے یہ بھی تصور کیا جائے گا کہ اس کی ایک بیوی بھی ہے اور ایسا تصور کرنا ضروری ہوگا۔ اگر یہ یقین کر لیا جائے کہ اللہ کی کوئی اولاد ہے غنیمت ہے کہ مشرکین میں سے کوئی بھی اللہ کی بیوی ہونے کا قائل نہیں کیونکہ یہ ایک ایسی گری ہوئی حرکت ہے جس کا اللہ کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا اگرچہ جن لوگوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں ان سے اس طرح کی گراوٹ کچھ بعید بھی نہیں کیونکہ مشرک قوموں نے اپنے دیوتاؤں کی ایک نہیں کئی کئی بیویاں ایجاد کر رکھی تھیں اور ان کی طرف ایسے ایسے اعمال منسوب کیے جاتے تھے جس کا انتساب کسی بھی شریف مرد یا شریف عورت کی طرف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اگر یہ ایسی کوئی حرکت اللہ کریم کے بارے میں کر گزرتے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اس لئے میں نے کہا کہ یہ غنیمت ہے کہ ایسا کوئی عقیدہ مشرکین میں نہیں پایا جاتا تھا۔ یہاں یہ جو فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ چونکہ ہر چیز کا خالق ہے اس کے اولاد کس طرح ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اللہ کے خالق ہونے کے اعتبار سے اس کی چند مخصوص صفات ہیں جو اسے مخلوق کی صفات سے الگ کرتی ہیں۔ اللہ کی ذات ازلی اور ابدی ہے نہ اس کی ابتداء ہے اور نہ اس کی کوئی انتہا۔ وہ ہر طرح کی جسمانی آلودگی سے پاک ہے وہ اپنے وجود اور قرار کیلئے نہ کسی زمان کا محتاج ہے اور نہ کسی مکان کا' نہ اسے بھوک لگتی ہے نہ پیاس' نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ' اس کی کوئی صفت بھی حدود میں محدود نہیں۔ اس کی ذات وصفات ہر طرح کے تشبیہ اور تمثیل سے پاک ہیں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اللہ کی کوئی اولاد بھی ہے تو یہ بات طے شدہ ہے کہ اولاد اپنی بہت ساری صفات میں اپنے ماں باپ کا عکس ہوتی ہے۔ اس کی جنس اور باپ کی جنس میں یکسانی اور یک رنگی ہوتی ہے اس کی عادات وخصوصیات میں بہت حد تک والدین کے ساتھ ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ اپنی فطری ضرورتوں میں بالکل اپنے باپ کی تصویر ہوتی ہے۔ وہ وہی احتیاجات رکھتی ہے جو اس کا باپ رکھتا ہے۔ اس کی ذات و صفات کی وہی حدود ہیں جو اس کے باپ کی ہیں۔ اگر اللہ نہ کرے اس بے ہودگی کو قبول کر لیا جائے کہ پروردگار کی کوئی اولاد بھی ہے۔ تو اولاد کو خالق کی صفات سے متصف ماننا پڑے گا اور یا مخلوق کو خالق کی صفات میں شریک ماننا پڑے گا یہ دونوں باتیں چونکہ ناممکن ہیں اس لئے فرمایا کہ اللہ کی اولاد کہاں سے آئی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی کوئی اولاد بھی ہو۔ بالکل سامنے کی بات ہے کہ دنیا کی ہر چیز اس کی مخلوق ہے اس لئے جن کو تم اللہ کی اولاد سمجھتے ہو وہ عقلاً اور نقلاً کسی طرح بھی اولاد نہیں ہو سکتے البتہ وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور وہ بھی انہی صفات سے متصف ہیں اور انہیں احتیاجات کے اسیر ہیں جن احتیاجات میں تم بندھے ہوئے ہو۔ اور جس طرح تم فنا و بقاء کے اصولوں سے وابستہ ہو انہی اصولوں سے وہ بھی وابستہ ہیں۔ جس طرح تم اللہ کے احکام کے پابند ہو اسی طرح وہ بھی اللہ کے احکام کے پابند ہیں اور وہ بھی اسی طرح مخلوقات کا حصہ ہیں جیسے دنیا کی ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ یہ بالکل سامنے کی باتیں ہیں جو معمولی عقل والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ان باتوں کو نظر انداز کر کے تم نے اللہ کے شریک کیسے بنا لئے۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اللہ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے اسی طرح وہ ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے۔ اس کا علم محدود نہیں بلکہ لامحدود ہے۔ جن باتوں کو دنیا کا بڑے سے بڑا باخبر بھی نہیں جان سکتا۔ اللہ انہیں بھی جانتا ہے۔ قریب اور بعید دیکھنے والے آلات جن چیزوں کا ادراک نہیں کر سکتے' اللہ کے حدود علم میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں بلکہ اس کے علم کی وسعتوں کا عالم یہ ہے کہ جو کام ابھی تخیل کی حدود سے بھی ماوراء ہوتا ہے اللہ اسے بھی جانتا ہے' جب اس کے علم کی وسعتوں کا یہ حال ہے تو پھر آخر اسے کسی شریک یا اولاد کی کیا ضرورت ہے۔ نہ اس کی قدرت کی کوئی اتھاہ ہے اور نہ اس کے علم کی کوئی انتہاء۔ تو پھر آخر ایسی کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنے لئے

Marfat.com

اولاد پیدا کرے اولاد تو بڑھاپے کی لاٹھی ہوتی ہے۔ ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے۔ جب باپ کمانے کے قابل نہیں رہتا' اولاد اس کی کفالت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی ہر کمزوری سے پاک ہے تو پھر اس کی اولاد کیوں ہوگی۔ مزید یہ تصور بھی ذہن میں رکھیئے کہ مشرکین مکہ فرشتوں کو جو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے تو یہ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ فرشتے کسی کے خالق ہیں' البتہ ان کا خیال یہ تھا کہ بیٹیاں چونکہ باپ کی لاڈلی اور چہیتی ہوتی ہیں اس لئے وہ بہت دفعہ ضد کر کے بہت کچھ منوالیتی ہیں۔ اللہ چونکہ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے اور کائنات کی وسعتیں بے حد و بے کنار ہیں ایک تنہا شہنشاہ اس پوری کائنات کا انتظام کیسے چلاسکتا ہے اور اسے تمام مخلوقات کی ضروریات کا مکمل علم کیسے ہوسکتا ہے۔ ضروری ہے کہ اختیارات میں تقسیم ہو' مختلف اختیارات' مختلف مخلوقات کے حوالے کئے جائیں۔ کائنات کو صوبوں میں تقسیم کیا جائے اور صوبوں کے الگ الگ والی ہوں۔ وہ اپنے اپنے مفوضہ اختیارات سے اپنی اپنی مملکت کا انتظام چلائیں اور دنیا والوں کی ضرورتوں سے اپنے علم کے مطابق اللہ کو آگاہ کریں۔ کیونکہ ایک ایک فرد کے ذاتی احوال کی خبر ایک تنہا اللہ کی ذات کو کیسے ہوسکتی ہے دراصل وہ اللہ تعالیٰ کو بھی ایک عام بادشاہ تصور کرتے تھے جس طرح بادشاہ اپنی مملکت کے بارے میں انتظام و انصرام چلانے اور حالات جاننے میں اپنے گورنرز اور اپنے عمال کے محتاج ہوتے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنی بیٹیوں' اپنے بیٹوں' اپنے دیوتاؤں اور اوتاروں کا محتاج ہے۔ اس کا غضب جب کسی پر بھڑکتا ہے تو یہ لوگ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتے ہیں اور قیامت کے دن بھی جب وہ کسی کو پکڑے گا تو یہ اس کے سامنے سفارش کریں گے اور یہ کہہ کر چھڑالیں گے کہ پروردگار آپ کو اس شخص کے بارے میں صحیح اطلاعات میسر نہیں۔ ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ کو بتایا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح بات یہ ہے جو ہم آپ کے سامنے بیان کررہے ہیں۔

اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے:

چنانچہ اس طرح وہ اپنے دامن گرفتہ لوگوں کو اللہ سے چھڑالیں گے اور دنیا میں بھی جب ان کا کوئی اپنا ان سے مدد مانگتا ہے یا ان سے مدد کا طالب ہوتا ہے تو وہ اللہ سے کہہ کر اس کی ضروریات کو پورا کرادیتے ہیں کیونکہ اللہ کے علم میں اس کی ضروریات نہیں ہوتیں۔ ایسی ہی غلط باتوں اور بیہودہ خیالات کی تردید کیلئے فرمایا جارہا ہے کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ جس طرح اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اسی طرح وہ اپنی ہر مخلوق کی ضروریات اس کے اعمال' اس کی قسمت' اس کے مبدا و معاد اور اس کے انجام سے بھی باخبر ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا کسی کو جاننے کا دعوے دار بھی وہ کچھ نہیں جانتا جو اللہ کے علم میں ہے۔ آدمی کے سب سے زیادہ قریب اس کی بیوی ہوتی ہے اور اولاد کو سب سے زیادہ ماں باپ جانتے ہیں لیکن یہ سب بھی ایک دوسرے کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے جو اللہ ان کے بارے میں جانتا ہے۔ اس کے علم کی وسعتوں کا تو عالم یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کوہ طور پر نبوت دی گئی اور یہ حکم دیا گیا کہ جاؤ فرعون کے پاس اور اسے سمجھاؤ کہ وہ راہ راست اختیار کرے کیونکہ وہ بڑا سرکش ہوگیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا اللہ میں جانے کیلئے تیار ہوں لیکن تھوڑی سے مہلت دی جائے کہ میں ایک پہاڑی درے میں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ آیا ہوں' موسم کی شدت سے بچنے کیلئے نہ ان کے پاس تحفظ کا سامان ہے اور نہ وہ راستے سے باخبر ہیں وہ تو وہیں سردی سے مرجائیں گے۔ مجھے اتنی مہلت دیجئے کہ میں انہیں کسی محفوظ مقام پر چھوڑ آؤں اور اس کے بعد میں فرعون کے پاس جاتا ہوں۔ پروردگار نے فرمایا کہ موسیٰ تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم تمہارے بیوی بچوں سے بے خبر ہیں۔ اس کے بعد حکم دیا کہ جس چٹان پر کھڑے ہو اس پر عصا مارو۔ عصا مارنے سے وہ چٹان پھٹی تو اس کے اندر سے ایک اور چھوٹی چٹان برآمد ہوئی۔ پھر حکم ہوا اس پر بھی عصا مارو۔ تو اس سے ایک بڑا پتھر نکلا اب حکم ہوا کہ اس پر بھی عصا مارو۔ یہ پتھر پھٹا تو اس سے ایک چھوٹا سا جانور نکلا جس کے منہ میں گھاس کی ایک پتی تھی اور وہ اسے کھا رہا تھا۔ پروردگار نے فرمایا موسیٰ تین چٹانوں میں نگاہوں سے دور اس جانور کو بھی ہم جانتے ہیں اور اسے رزق بھی پہنچاتے ہیں تو

Marfat.com

ہم تیرے بیوی بچوں سے بے خبر ہوں گے۔ اسی لئے قرآن پاک نے ایک اور جگہ اصولی انداز میں فرمایا: اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ''کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا''۔ یعنی جو ہر چیز کا خالق ہے کیا وہ اپنی مخلوق سے بے خبر رہ سکتا ہے جس طرح دریا اپنی موج سے بیگانہ نہیں رہ سکتا اس طرح پروردگار اپنی مخلوق سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ وہ ہر مخلوق کو بھی جانتا ہے اور اس کی ضروریات کو بھی جانتا ہے۔ اس کو کوئی نہیں بتا سکتا کہ کسی مخلوق کے ساتھ اس کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اور جب قیامت کے دن وہ کسی کو پکڑے گا تو اسے کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ آپ کی اطلاعات درست نہیں ہیں۔ کیونکہ وہی ایک ذات ہے جس کی اطلاعات اور جس کا علم ہر طرح کی غلطی، ہر طرح کی خطا سے پاک ہے اور جس کے علم پر نارسائی کا کوئی چھینٹا اڑ کر بھی نہیں پڑ سکتا۔ جب وہ ہر چیز کا خالق بھی ہے اور اس کا علم بے پایاں بھی ہے تو پھر اس کے سوا کسی اور کو رب ماننے کا کیا جواز ہے؟ اسلئے فرمایا:

آیت: ۱۰۲ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیۡءٍ فَاعۡبُدُوۡهُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ وَّكِیۡلٌ ۝

''وہی اللہ تمہارا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے تو اس کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے''۔

اللہ ہی تمہارا رب ہے:

یہی اللہ جسے تم خالق کائنات جانتے ہو وہی تمہارا رب بھی ہے لیکن تمہیں نجانے یہ کیوں غلطی لگی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا رب بھی ہو سکتا ہے۔ ہر دور کی جاہلیت میں رب ہر اس قوت کو سمجھا گیا ہے جس کے ہاتھ میں وسائل رزق، وسائل معاش اور وسائل اختیار ہوتے ہیں۔ جو تخت و تاج پر متمکن ہوتا ہے اور فوجوں کے بل بوتے پر گردنوں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے اور ملک کے تمام وسائل پر قابض ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ میری رعایا چونکہ میری محتاج ہے میری مرضی اور میری اجازت کے بغیر نہ انہیں رزق میسر آ سکتا ہے اور نہ ان کی زندگی کی بقاء کی ضمانت مل سکتی ہے۔ میں جسے چاہوں زندہ رہنے دوں جسے چاہوں مار ڈالوں، جسے چاہوں آزادی دوں اور جسے چاہوں حوالہ زنداں کر دوں۔ اس لحاظ سے میں ان کی زندگیوں اور قسمتوں کا مالک ہوں۔ یہ اختیار مجھے بلاوجہ نہیں ملا یقیناً میں کسی بڑی قوت کا اوتار ہوں۔ اس لحاظ سے انہیں نہ صرف میری حکومت تسلیم کرنی چاہئے بلکہ ان کی پیشانیاں اور ان کے دل بھی میرے سامنے جھکنے چاہئیں۔ مقتدر طبقہ اور مذہبی طبقہ آپس میں ملی بھگت کر کے اپنی اپنی ربوبیت کا طوق انسانوں کے گلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اپنے رب ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ مصر کے فراعنہ اور عراق کے نمارده اپنے آپ کو رب کہلاتے تھے۔ اس طرح سے وہ اپنے اقتدار کو مذہب کے واسطے سے دوام بخشتے تھے۔ اس ربوبیت میں چونکہ مذہبی روح بھی کارفرما ہوتی تھی اس لئے اس واسطے سے غیر مرئی قوتوں حتی کہ مقدس شخصیات کو بھی اس ربوبیت میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ اس طرح سے عام سوچنے والے ماؤف ہو جاتے تھے اور کسی بڑی ذات کے سامنے جھکنے کا احساس ان کے سامنے جھک جانے کی وجہ سے مردہ ہو جاتا تھا۔ بالآخر اس کے نتیجے میں اصحاب اقتدار کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں رہتا تھا وہ تمام وسائلِ معاش پر قابض ہو کر اپنی من مرضی کرنے میں کلیتہً اپنے آپ کو آزاد سمجھتے تھے۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ جب تمہیں اللہ نے پیدا کیا ہے اور وہ تمہاری ضرورتوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے وسائل رزق کا خالق بھی وہی ہے۔ دنیا کی کوئی قوت اور رزق کا کوئی شمہ بھی اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ اس نے تمہیں صرف زندگی نہیں دی بلکہ زندگی کے تمام امکانات مہیا کرنے والا بھی وہی ہے۔ جب ایک بچہ دنیا میں آتا ہے تو اپنی بے بسی اور بے کسی میں تمام مخلوقات سے بڑھ کر ہوتا ہے نہ وہ کوئی چیز پکڑ سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے زمین پر آنے سے پہلے ماں باپ کا وجود اس کا بوجھ اٹھانے کیلئے تیار کر دیا جاتا ہے۔ ماں اسے پیار سے سینے سے لگاتی ہے تو وہیں اس کے لئے غذا

Marfat.com

کے سوتے جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کی ہر ضرورت' ہر آسائش کو مدنظر رکھا جاتا ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں حواس آنکھیں کھولنے لگتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب عقل کا دیا روشن ہو جاتا ہے اور زندگی کے تمام امکانات اس کے سامنے روشن ہو جاتے ہیں وہ زمین کا رخ کرتا ہے تو زمین کی قوت روئیدگی اپنا سینہ اس کیلئے کھول دیتی ہے۔ اس کے اندر قوت تسخیر جنم لیتی ہے تو اسی جوہر عقل سے کام لے کر وہ بڑی سے بڑی قوت کو زیر نگیں کر لیتا ہے۔ وہ اولوالعزمی کا پیکر بن کر اٹھتا ہے تو عناصر فطرت اس کے ہاتھوں میں مسخر ہو جاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ یہی شخص جو اللہ کی ربوبیت سے قدم قدم آگے بڑھا ہے وہ قوت' طاقت اور حکومت پر قابض ہو کر اپنے رب ہونے کا اعلان کرنے لگتا ہے۔

بندگی بھی خالق کی کی جائے:

اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ جو تمہارا خالق ہے تمہارا رب بھی وہی ہے تمہیں عمر کے ہر لمحے میں اسی نے تھاما اور ہاتھ پکڑ کر آگے چلایا ہے۔ اس لئے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ شکر اسی کا بجا لایا جائے اور اسی کی راہنمائی میں زندگی گزاری جائے اور زندگی کو اسی کی امانت سمجھ کر اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی جائے اسی سے زندگی کی تنہائیاں آباد کی جائیں اور سینے بھی اسی کی یاد سے معمور ہوں۔ اسی کی غیر مشروط اطاعت کی جائے کیونکہ جب یہ بات مان چکے ہو کہ ہر چیز کا خالق وہی ہے تو پھر بندگی اسی کی کرو یہ بندگی کا لفظ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے بندگی کا معنی ہے بندہ ہونا۔ بالکل سامنے کی بات ہے کہ جو شخص کسی کا بندہ ہوتا ہے وہ اپنی مرضی کا مختار نہیں ہوتا اس کی کوئی چیز اپنی نہیں رہتی' وہ اپنا نصب العین متعین کرنے میں آزاد نہیں ہوتا وہ کسی اور کو اس بندگی میں شریک نہیں کر سکتا یعنی ایسا نہیں کر سکتا کہ اپنے آقا کی موجودگی میں کسی اور کو بھی آقا مان لے۔ اس لئے یہاں بندگی کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارا سر بھی اسی کے سامنے جھکنا چاہئے' تمہارا دست سوال کسی اور کے سامنے دراز نہیں ہونا چاہئے۔ تمہارے سینے میں کسی اور کیلئے اس کے برابر جگہ نہیں ہونی چاہئے' تمہارے دل کی دھڑکنیں اسی کیلئے وقف رہنی چاہئیں۔ تم عبادت گاہ میں جس طرح اس کے سامنے جھکنے کے مکلف ہو۔ اسی طرح اصول معاشرت' اصول سیاست' نظام تعلیم' تہذیبی آداب' ثقافی رسم و رواج' اصول حکومت' غرضیکہ ہر چیز میں تم اسی کی راہنمائی کے پابند ہو۔ وہ چونکہ اپنی کسی صفت میں شرکت گوارا نہیں کرتا' تمہاری بندگی میں بھی اس کو کسی کی شرکت گوارا نہیں۔ تم نماز اسی کی پڑھو گے تو آئین اور قانون بھی اسی کا مانو گے تمہاری عدالتوں میں قانون اسی کا چلے گا' ملک کا ہر ادارہ اسی کے دیئے ہوئے نظام کی راہنمائی میں اپنا کام کرے گا کیونکہ وہ ہر چیز پر وکیل ہے یعنی وہ جس طرح قدم قدم پر تمہارا خیر خواہ' تمہارا سہارا اور تمہاری حفاظت کرنے والا ہے اس طرح تمہارے افکار و اعمال کا نگران بھی ہے۔ وہ برابر اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ تم اپنی زندگی کے کسی عمل میں اس کی ربوبیت اور اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک تو نہیں کر رہے ہو اور اس کی یہ نگرانی اس قدر مکمل ہے کہ تم اسے شاید نہ دیکھ سکو۔ لیکن تم ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہو۔ اگلی آیت کریمہ میں یہی بات کہی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۰۳ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ز وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ج وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ O ''اس کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے''۔

نگاہیں اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتیں:

ادراک کے دو معنی ہوتے ہیں ایک ہے دیکھنا' دوسرا ہے احاطہ کر لینا۔ یعنی انسانی نگاہیں اللہ کو دیکھ نہیں سکتیں کیونکہ انسانی نگاہوں میں وہ قوت نہیں جو اس کی ذات کا ادراک کر سکیں اور اس کے جمال اور جلال کا تحمل کر سکیں۔ ایک مخلوق اپنے خالق کے دیدار کا تحمل کر بھی کیسے سکتی ہے۔ اس میں کو

Marfat.com

شبہ نہیں کہ جسے اللہ سے محبت نصیب ہو جاتی ہے وہ ہر محبت کرنے والے اور چاہنے والے کی طرح وصال محبوب کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح میں اپنے محبوب کے وصال سے بہرہ ور کیا جاؤں۔ دنیا کے تمام عشاق ہمیشہ محبوب کے وصال کیلئے تڑپتے رہے ہیں۔ اگر یہ زندگی اس کیلئے کفایت نہیں کرتی تو ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ایک اور زندگی بھی ملے تو ہم وصال محبوب کی خواہش میں اسے گزار دیں۔ غالب کہتا ہے

ے یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
کچھ اور جیتے ہوتے یہی انتظار ہوتا

اللہ سے عشق اور محبت تو سب سے پاکیزہ اور سب سے عظیم جذبہ ہے جسے یہ نصیب ہو جاتا ہے اس کے فرط شوق کا کیا ٹھکانہ ہو سکتا ہے۔ ہزار ادب مانع ہو دل تو اسی کیلئے مچلتا ہے۔ حضرت موسیٰ کلیم اللہ چونکہ اللہ کی بارگاہ میں بہت مقرب تھے اس لئے اسی جذبے کے ہاتھوں مجبور ہو کر جرأت کر بیٹھے کہ یا اللہ مجھے اپنے دیدار سے نواز میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ پروردگار نے فرمایا: لَنْ ترانی تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے اور محض تسلی کیلئے فرمایا کہ پہاڑ کو دیکھو جو اپنی سنگینی اور صلابت میں اپنی مثال آپ ہے۔ ایک انسان کی استقامت ظاہر ہے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ فرمایا اس کو دیکھو اگر یہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تو تم بھی مجھے دیکھ لو گے چنانچہ جب اللہ کی تجلی اس پر پڑی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان چاہے موسیٰ کلیم اللہ جیسا پیغمبر کیوں نہ ہو وہ اللہ کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا اور اس کے دیدار کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں یعنی اسے دیکھ نہیں سکتیں البتہ یہ ضرور ہے کہ قیامت میں اہل جنت، جنت میں اللہ کا دیدار کریں گے۔ جب اہل جنت ہر طرح کی نعمتوں سے نواز دیئے جائیں گے اور ان کی خوشیاں اور ان کی مسرتیں انتہاؤں کو چھو رہی ہوں گی کہ اچانک ایک دن آواز آئے گی کہ اے جنت کے باسیو! کیا تمہیں کسی اور نعمت کی خواہش ہے تاکہ ہم تمہیں وہ بھی دے دیں۔ تمام اہل جنت کہیں گے یا اللہ یہاں وہ کچھ پایا جس کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں تھا اور وہ نغمے سماعت نواز ہوئے جو کسی کان نے سنے نہیں تھے اور دل و دماغ کو ان نعمتوں کی خوشیوں سے مشرف کیا گیا جو کبھی تخیل کی بلند پروازی کے باوجود تخیل میں نہ آ سکی تھیں۔ اب ایسی اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے جس کی ہم خواہش کریں۔ نعمتیں غالب آ گئیں اور ہماری خواہشیں مغلوب ہو گئیں۔ آواز آئے گی کہ ایک نعمت ابھی باقی ہے، درمیان سے پردہ ہٹ جائے گا۔ پروردگار اپنے حسن و جمال کی تابانیوں کے ساتھ سامنے جلوہ فرما ہوں گے۔ اہل جنت اپنی پروردگار کے دیدار سے آنکھیں روشن کریں گے اور ایسے مسحور و مخمور ہوں گے کہ جنت کی نعمتیں اس کے سامنے گرد ہو کر رہ جائیں گی۔ لیکن دنیا میں اس نعمت کی صرف چاہت پالی جا سکتی ہے۔ اس نعمت کو حاصل نہیں کیا جا سکتا لیکن جنت میں چونکہ یہ نعمت ملنے والی ہے اس لئے اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ نگاہیں اسے دیکھ نہیں سکتیں حالانکہ اہل جنت تو اسے دیکھیں گے۔ اس لئے اس کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے کہ نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکیں گی۔ دنیا میں تو دیکھ بھی نہیں سکتیں قیامت کو دیکھیں گی لیکن احاطہ نہیں کر پائیں گی۔ اسی بات کی تائید آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے ہوتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تمام مخلوق جو پہلے دن سے آج تک پیدا ہوئی اور قیامت تک پیدا ہوگی وہ سب جمع ہو کر اللہ کی ذات کا احاطہ کرنا چاہے تو نہیں کر سکے گی۔ قیامت میں فی الجملہ دیدار تو ہوگا لیکن ذات خداوندی کا احاطہ نہیں ہو سکے گا۔ رہی یہ بات کہ معراج کے سفر میں کیا آنحضرت ﷺ نے پروردگار کو دیکھا تھا یا نہیں؟ حضرت عائشہ تو فرماتی ہیں کہ میں نے خود آنحضرت ﷺ سے سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ میں اسے کیسے دیکھ سکتا تھا؟ اس سے تو بات ختم ہو جانی چاہئے لیکن سورۃ النجم کے بعض اشاروں سے بعض اہل علم یہ گمان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا دیدار کیا تھا لیکن وہ اس سر کی آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے کیا تھا۔ محی الدین ابن عربی نے ایک اور بات کہی ہے وہ ظاہر ہے ان کی ذاتی رائے ہے۔ جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا آسمانوں اور زمین کے درمیان

Marfat.com

محدود ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے کائنات ختم ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ کو آگے بھی لے جایا گیا اس کے آگے جو کچھ ہے ان کے بقول وہ عالم آخرت ہے اس کے احکام بالکل جدا ہیں وہاں اگر حضور نے اللہ کو دیکھا ہو تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ انسانی آنکھ حتیٰ کہ پیغمبر بھی اللہ کو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے عالم آخرت میں تو سارے اہل جنت دیکھیں گے یہ تو ایک ضمنی بحث تھی۔

اللہ ہر چیز کو دیکھتا ہے:

اصل بات جو کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ دیکھو تم اپنے اللہ کے بارے میں یقین کرتے ہوئے یہ بات کبھی نہ بھولو کہ وہ برابر تمہاری نگرانی کر رہا ہے اگرچہ تمہاری نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں لیکن وہ تو تمام نگاہوں کو پا رہا ہے۔ تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے لیکن تم تو اس کی نگاہوں میں ہو۔ ایک چاہنے والے کی صرف وصال محبوب ہی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کیلئے یہ بات بس کرتی ہے کہ میں اگرچہ اپنے محبوب کے وصال سے مشرف نہیں کیا جا رہا لیکن میرے لئے یہ بات کیا کم ہے کہ میں اپنے محبوب کی نگاہوں میں ہوں۔ اس کی مجھ پر نظر ہے اور وہ ہمیشہ مجھے اپنی نگاہوں میں رکھتا ہے۔ عشاق کا تو یہ حال ہوتا ہے اور وہ اسی میں مخمور رہتے ہیں

؎ گو سرسری ہی دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں
ہم خوش ہیں کہ ہیں کسی کی نگاہ میں

اللہ تعالیٰ علیم اور خبیر ہے:

آیت کے دوسرے جملے میں پہلے جملے کی بات کو اپنی صفات سے مدلل فرمایا کہ یہ جو فرمایا کہ تم اسے نہیں دیکھ سکتے کہا اس لئے نہیں دیکھ سکتے کہ وہ لطیف ہے اور لطیف چیز نگاہوں میں نہیں آیا کرتی۔ لطیف کثیف کا متضاد ہے۔ کثیف چیز وہ ہوتی ہے جس کو حواس محسوس کر سکیں اور لطیف کو حواس محسوس نہیں کر سکتے۔ البتہ! لطیف چیز کو اگر محسوس کرنا ہو تو ضرور ہے کہ کثیف کو اس کے ساتھ لگا دیا جائے۔ کثافت جب لطافت کے ساتھ لگ جائے گی تو لطیف کا احساس ہونے لگے گا۔ غالب نے کیا خوب کہا

؎ لطافت بے کثافت جلوہ آرا ہو نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

بادِ بہاری نظر نہیں آتی اسکا احساس اس وقت ہوتا ہے جب چمن کا زنگار اس کے ساتھ شامل ہو کر اسکا احساس دلاتا ہے وہ ایک ایک پھول چھو کر گزرتی ہے اور مشامِ جان کو معطر کرتی ہوئی اپنا احساس دلاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ ہر طرح کی کثافتوں سے ماوراء اور پاک ہے اور پھر اس کی لطافت بھی ایک مخلوق کی لطافت نہیں جس میں فی الجملہ محسوس ہونے کی رمق پائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ خالق کی لطافت ہے جس کا احساس صرف مخلوقات کے آئینہ میں تو کیا جا سکتا ہے اور جس کا ادراک ایک ایک مخلوق کے پردے میں واضح ہے لیکن براہ راست اس کا احساس اور ادراک ممکن نہیں۔

لطیف کا دوسرا معنی ہے باریک بین۔ کہ اللہ وہ ذات ہے کہ تم اسے دیکھ تو نہیں سکتے لیکن وہ خود اتنا باریک بین ہے کہ کوئی چیز ہزار پردوں کے پیچھے بھی چھپی ہوئی ہو اس کی نگاہوں میں بالکل نمایاں ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ خبیر بھی ہے کہ ہر چیز دنیا میں اس کے سامنے ہے اس کی نگاہوں میں روشن ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کا علم اور اس کی خبر بھی مکمل ہے وہ نہایت باخبر ذات ہے کہ ایک خیال کرنے والا اپنے خیال کو بھول سکتا ہے ایک

Marfat.com

کرنے والا اپنے عمل سے بے بہرہ ہو سکتا ہے لیکن اللہ کے علم وخبر سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں۔ بعض دفعہ بڑے سے بڑا دانشور اپنے تخیلات میں الجھ کے رہ جاتا ہے۔ اس کے خیالات کا تانا بانا اس کی اپنی گرفت میں نہیں آتا لیکن اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ جس ذات کا علم اور جس کی آگاہی اس قدر مکمل اور محیط ہو چاہنے والوں کیلئے تو بڑی دولت ہے کہ وہ ہر وقت اس کے سامنے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تصور کہ انسان خطا کا پتلا ہے نجانے کب اس کے تخیل میں کوئی برائی داخل ہو جاتی ہے کب اس کا احساس بھٹکنے لگتا ہے کب اس کی نظر پاکیزگی کھو دیتی ہے' کب اس کی خواہش نفس اس کو مغلوب کر لیتی ہے' کب اس کی نیت میں فساد پیدا ہو جاتا ہے' وہ ذات جس کے علم وخبر کے سامنے ان میں سے ایک ایک چیز ظاہر و باہر ہے اگر وہ ان پر گرفت کرنے لگا تو پھر کیا ہوگا اس لئے بعض اہل علم نے کہا کہ لطیف کا ایک معنی مہربان بھی ہے کہ وہ خبیر ذات جس طرح اپنے علم وآگہی میں مکمل ہے اسی طرح اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے۔ اس کی مہربانیاں بندوں کی کمزوریوں کو ہمیشہ نظر انداز فرماتی ہیں۔ شاید اسی تصور میں ڈوب کر کسی پنجابی شاعر نے کہا تھا

جے میں ویکھاں عملاں ولے کجھ نئیں میرے پلے
جے ویکھاں تیری رحمت ولے بلے بلے بلے

غور فرمایئے! سلسلۂ بیان کس طرح قدم قدم آگے بڑھ رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے اس کلام کے مخاطب ایک ایسے متکلم کے سامنے ہیں جو انتہا درجے کی ہمدردی اور غمگساری کا جذبہ رکھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے مخاطبوں کو وہ آب حیات ضرور پلا دوں جو ان کیلئے زندگی بخش ہے اور جس سے دور رہ کر یہ لوگ ہلاکت کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اس لئے وہ نہایت رحمت ورأفت سے فطری اصول کے مطابق اپنی گفتگو کے اسالیب بار بار بدلتا ہے۔ دل کے خیالات کو بدلنے کیلئے دلائلِ آفاق اور دلائل انفس سے کام لیتا ہے اور عقل کو سپر انداز کرنے کیلئے الزامی طرز تکلم اختیار کرتا ہے اور اس سلسلے میں اپنے مخاطب کے احساسات کو بار بار کچوکے دے کر راہ راست اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے احساسات کو چھیڑ کر اس کے انجام سے اسے باخبر کرتا ہے اور اللہ کے تعلق کے حوالے سے اس کے انفعالی جذبوں کو ہوا دیتا ہے اس طرح زندگی کے تمام پہلو بار بار اس کے خطاب کا ہدف بنتے ہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ کسی طرح اپنے مخاطبوں کو اس برے انجام سے بچایا جائے جس کی طرف وہ اپنی جہالت' عصبیت' کور ذوقی' بے عقلی' ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی تمام کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے گفتگو کو سمیٹ کر ایک نتیجے پر لانے کیلئے ایک ایسی بات کہی جا رہی ہے جس سے اتمام حجت بھی ہو رہا ہے اور سوچنے کیلئے کچھ لمحے میسر بھی آ رہے ہیں۔ ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

آیت:۱۰۴ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ O ''اب تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت بخش آیتیں آ چکی ہیں تو جو بصیرت سے کام لے گا اپنے ہی کو نفع پہنچائے گا اور جو اندھا بنا رہے گا اس کا وبال اسی پر آئے گا اور میں تم پر کوئی نگران مقرر نہیں''۔

کھلی دلیل کے بعد جس نے بصیرت سے کام لیا اس نے اپنا ہی فائدہ کیا

جو اندھا بنا رہا اس نے اپنا ہی نقصان کیا:

اس آیت کریمہ میں بصائر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بصیرت کی جمع ہے۔ بصیرت سوجھ بوجھ کو بھی کہتے ہیں اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے دلائل وبراہین کو بھی کہا یہ جا رہا ہے اور کہنے والی ذات کریم بظاہر رسول اللہ ﷺ کی ہے لیکن حقیقت میں اس کلام کا متکلم اللہ تعالیٰ ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ

Marfat.com

جب پروردگار اپنی مخلوق اور نبی اپنی امت کو یہ بات کہے کہ ہماری طرف سے تمام سوجھ بوجھ کی باتیں آ گئی ہیں جو سوجھ بوجھ کو انگیخت کرنے والی ہیں اور جن سے عقل روشن ہوتی راستے کھلتے' دل کی بند کلی کھلتی اور دماغ کی الجھنیں دور ہوتی ہوں اور جس کے آنے کے بعد اگر آدمی ہٹ دھرم نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے اطمینان خاطر اور سکونِ قلوب میسر نہ آئے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرح سے اتمام حجت کیا جا رہا ہے کہ ایسے واضح دلائل کے آ جانے کے بعد بھی اگر تم ایمان نہیں لاتے ہو تو خود سوچو کہ تم کس انجام کی طرف بڑھ رہے ہو۔ پھر اس اتمام حجت کو مزید واضح کرنے کیلئے فرمایا کہ ایسی روشن دلیلوں کے بعد ضرورت اس بات کی نہیں کہ مزید معجزات اور دلائل نازل ہوں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھا جائے کھلی عقل سے ان پر غور کیا جائے اور کھلے دل سے ان کو قبول کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رہے کہ جو آدمی ایسا کرے گا وہ اپنا بھلا کرے گا اسکی اپنی قسمت سنور جائے گی اس کی دنیا بھی بن جائے گی اور اس کی آخرت بھی اس کیلئے خوشیوں کا سبب بنے گی۔ کیونکہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا دارومدار اس فیصلے پر ہے کہ وہ اس ہدایت کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ قبول کر لیتا ہے تو اس نے اپنے آپ کو بچا لیا لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ اندھے پن کا ثبوت دیتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ان دلائل پر کھلے دل و دماغ سے غور کرے وہ انہیں سننے سے بھی انکار کر دیتا ہے اور اگر سنتا ہے تو بے خیالی اور بے دلی سے سن کر انہیں جھٹک دیتا ہے اور کسی طرح بھی غور و فکر کا کوئی لمحہ اس پر صرف کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا تو یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی کے سر پر سورج چمک رہا ہو لیکن وہ آنکھیں کھولنے سے انکار کر دے۔ دھوپ اس کی آنکھوں پر پڑ رہی ہو لیکن وہ بار بار چیخ چیخ کے یہ کہے کہ میں اس دھوپ کی افادیت سے انکار کرتا ہوں' میں اس روشنی کے وجود کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی یقیناً کسی نہ کسی کھائی میں گر کر مرے گا۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت اس برے انجام سے نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ راستے کی کھائیوں یا خطرناک موڑوں سے بچنے کیلئے دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک چشم بینا اور دوسری روشنی۔ اگر روشنی نہ ہو تو آنکھ کا وجود بے کار ہے اور اگر آنکھ نہ ہو تو روشنی بے سود ہے۔ اللہ نے ہر بینا آدمی کو دل و نگاہ کی آنکھیں بخشی ہیں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ زندگی کے سفر میں اسے راہنمائی کا نور بھی عطا کیا جائے لیکن اس نور کے آنے کے بعد اگر وہ آنکھیں کھولنے سے انکار کر دے تو اسے تباہی سے بچانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کو چونکہ ایک انتہائی غم گسار دل دے کر بھیجا گیا ہے جو اپنے مخاطبوں کے ایمان نہ لانے سے کڑھتا اور جلتا ہے اس لئے آنحضرت کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے آپ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا یعنی آپ اس کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ یہ لوگ ایمان قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ آپ کا کام مسلسل تبلیغ و دعوت سے کام لے کر ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنا ہے سو وہ آپ کر رہے ہیں یہ اگر آپ کی کوششوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور انہوں نے اپنی بداعمالیوں سے اپنے دلوں کو پتھر بنا لیا ہے تو اس کیلئے آپ سے باز پرس نہیں ہو گی اس لئے آپ ان سے صاف کہہ دیجئے کہ میرا کام تم تک دین پہنچانا تھا سو میں نے پہنچا دیا۔ میں تم پر کوئی نگران بن کر نہیں آیا ہوں کہ ضرور ہی تمہیں ایمان کی دولت دے کر چھوڑوں۔ اس آیت کا آخری جملہ بھی اللہ کا کلام ہے لیکن آنحضرت کی زبان سے اسے اس طرح ادا کرایا گیا ہے کہ درمیان میں لفظ قُلْ نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کی وحی براہ راست لسان نبوت پر ہے یوں ارشاد نہیں ہوا کہ ان لوگوں سے کہہ دو بلکہ کہنے کی بات پیغمبر نے خود براہ راست فرما دی۔ وحی کی یہ قسم روح نبوت کے غائت قرب و اتصال کی دلیل ہے۔ گویا منبع فیض کا فیضان خود زبان رسالت سے چھلک رہا ہے۔ ''گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود'' شاید اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔

اسی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

آیت: ۱۰۵ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ ''اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں

Marfat.com

مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اس کو اچھی طرح واضح کر دیں ان لوگوں کیلئے جو جاننا چاہیں"۔

اللہ تعالیٰ اپنی دلیلیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے:

یعنی جس طرح ہم نے گزشتہ کئی آیات میں اپنی نشانیاں جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ جن میں سے بعض کے رشتے خود انسانی ضمیر کے اندر پیوست ہیں اور بعض ایسی نشانیاں جن سے عقل راہنمائی حاصل کرتی اور دل کو جلا ملتی ہے۔ مختلف پہلوؤں سے پوری طرح کھول کر بیان کی ہیں۔ اسی طرح پورے قرآن کریم میں بار بار ان نشانیوں کو مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا مقصود اس سے صرف یہ ہے کہ انسانوں کو اس بات کی شکایت نہ رہے کہ ایمان کو قبول کرنے کیلئے ہمیں وہ آسانیاں فراہم نہ کی گئیں جس سے ہمارے دل و دماغ ہموار ہوتے اور ہماری دماغی اور قلبی الجھنیں دور ہوتیں اور ہم آسانی سے ایمان قبول کر لیتے یعنی اتمام حجت اور انسان کی راہنمائی کیلئے جیسے جیسے دلائل ضروری تھے ہم نے یہاں بھی اور پورے قرآن کریم میں بھی جابجا ان کی چمن آرائی کی ہے' جو آدمی بھی اس گلستان میں داخل ہوتا ہے اسے یہ شکایت نہیں رہتی کہ میرے مشامِ جاں کو معطر کرنے کا ساماں نہیں کیا گیا یا یہاں رنگا رنگ پھولوں کی کمی ہے میں نظر افروزی کے اسباب کہاں سے لاؤں۔ چنانچہ دلائل اور نشانیاں اس فراوانی اور زوردار طریقے سے بیان کی گئی ہیں کہ جو لوگ ایمان قبول نہیں بھی کرتے وہ بھی بالعموم پکار اٹھتے ہیں یا دلوں میں اس بات کے قائل ہو جاتے ہیں چاہے اپنے دوسرے مفادات کی وجہ سے ایمان قبول کرنے کا اعلان نہ کریں کہ واقعی پیغمبر نے اللہ کی کتاب کو سنانے اور دعوتِ دین پیش کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور اس نے پوری طرح ایک ایک بات ہمیں پڑھ کر سنا دی ہے۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس طرح مختلف طریقوں سے آیات بیان کی ہیں کہ بالآخر یہ لوگ کہہ اٹھیں دَرَسْتَ کہ واقعی اے پیغمبر تو نے اللہ کی کتاب پڑھ کر ہمیں سنا دی۔ چاہے وہ اس بات کا اعتراف اپنی زبان قال سے کریں اور چاہے زبان حال سے۔

"دَرَسْتَ" کا مطلب:

دَرَسْتَ کا یہاں میں نے ترجمہ کیا ہے کہ تو نے پڑھ کے سنا دیا' واقعی ہم اس کے قائل ہو گئے اور ہم تک یہ بات پہنچ گئی حقیقت یہ ہے کہ یہ محض قرآن کا دعویٰ نہیں بلکہ امر واقع ہے۔ پہلی امتوں میں بھی لوگ اس اعتراف پر مجبور ہوتے رہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جن لوگوں سے آپ کو واسطہ پڑا اور آپ نے جس طرح ان کو اللہ کا دین پہنچایا اور جس طرح کتاب اللہ کی آیتیں بار بار ان کو پڑھ کر سنائیں اور اس کی تعلیمات جس طرح طریقے طریقے سے ان کے گوش گزار کرنے کی کوشش کی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کا بدترین دشمن ابوجہل بھی اپنی بے مثل دشمنی کے باوجود اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا حالانکہ اس کی بے مثل دشمنی کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اس بات کا اعتراف کبھی نہ کرتا اور کبھی حضور کی صداقت کی بات زبان پر نہ لاتا کیونکہ اس کی دشمنی تاریخ میں ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ہر پیغمبر کو اپنے مرتبہ اور مقام کے مطابق دشمنوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بدترین دشمن فرعون سے واسطہ پڑا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی دشمنی میں ثابت قدم نہ رہ سکا۔ جب موت سامنے نظر آئی اور بحر قلزم میں ڈوبنے لگا تو اس کی زبان پر کلمہ جاری ہو گیا لیکن قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اس کے ایمان کو قبول نہیں کیا گیا بلکہ فرمایا گیا کہ تم اب ایمان لاتے ہو جب کہ اس سے پہلے تم نافرمان رہے ہو اور تم بدترین مفسدین میں سے تھے۔ لیکن ابوجہل جب جنگ بدر میں زخمی ہو کر سکرات الموت میں مبتلا

Marfat.com

تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود اس کے سر پر پہنچے اسے ملامت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اب تم نے دیکھ لیا اپنا انجام تو وہ نہایت بے فکری سے کہنے لگا کہ کیوں شیخی بگھارتے ہو ایک آدمی کو اس کی قوم نے مار ڈالا تو اس میں شیخی بگھارنے اور بڑھ ہانکنے والی کیا بات ہے اور جب حضرت عبداللہ ابن مسعود اس کے سینے پر بیٹھ کر اس کی گردن کاٹنے لگے تو کہنے لگا کہ نیچے سے گردن کاٹنا تاکہ لمبی گردن دیکھ کر لوگوں کو اندازہ ہو کہ یہ کسی سردار کی گردن ہے۔ ایسا بدترین دشمن جو مرتے دم تک اپنا رویہ نہ بدلے شاید ہی تاریخ میں کسی نے دیکھا ہو۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے اسے اس امت کا بدترین فرعون قرار دیا۔ لیکن اس کے اعتراف کا حال یہ تھا کہ اپنے ایک ساتھی کے سوال کے جواب میں اس نے ایک دفعہ کہا کہ میں محمد ﷺ کو جھوٹا نہیں کہتا وہ ہمارے سامنے پلا بڑھا اور جوان ہوا اور اب اس کے سر میں سفید بال آگئے ہیں لیکن اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ وہ نبوت کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے میں جو اس پر ایمان نہیں لاتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قبیلہ بنو ہاشم کا آدمی ہے اس کی عزت اور اس کی کامیابی بنو ہاشم کی عزت اور کامیابی ہے ہم قبیلوں میں ہمیشہ چشمک جاری رہتی ہے اور ہر قبیلہ دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم مسلسل بنو ہاشم سے مقابلہ کرتے رہے اب جبکہ ہم ان کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی بھی ہے اب اگر ہم اسے بطور نبی قبول کر لیں تو یہ ایک ایسی عزت اور تفوق کی بات ہے جس میں ہم ان کی کبھی ہمسری نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے بنو ہاشم ہمیشہ کیلئے ہم سے آگے بڑھ جائیں گی۔ اس وجہ سے میں محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ و دعوت کا یہ اثر ہے کہ بدترین دشمن بھی آپ کی صداقت کا انکار کرنے سے عاجز ہے۔

دَرَسْتَ کا دوسرا معنی ایک اور ہے وہ یہ ہے کہ تم جو ایک حیرت انگیز کلام ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو جس کی زبان فصاحت و بلاغت میں اس مقام کو پہنچی ہوئی ہے کہ جس کا مقابلہ کرنا انسانی طاقت سے ماورا ہے اور اس میں جو علوم و معارف بیان کئے جا رہے ہیں ہمارے ماحول میں تو کیا پوری دنیا میں بھی اس کی مثال موجود نہیں۔ اس میں ایسے ایسے تاریخی حقائق ذکر کئے جا رہے ہیں جس سے انسان آج تک بے خبر رہا ہے اور اگر کہیں کوئی پیشگوئی کی جا رہی ہے تو وہ بالآخر نوشتہ دیوار اور پتھر کی لکیر ثابت ہوتی ہے۔ ایسی حیرت انگیز کتاب محمد (ﷺ) کے بس کی بات تو نہیں ہو سکتی وہ تو ہمارے بھائی بیٹے، ہمارے سردار کے پوتے ہیں، اسی ماحول میں ان کی تربیت ہوئی جس میں ہم پلے بڑھے وہ ہماری طرح بالکل امی محض ہیں۔ ان کی معلومات ذرائع وہی ہیں جو ہمارے ہیں اور وہ وہی زبان بولتے ہیں جو ہم سب قریش بولتے ہیں۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایسی بے مثال زبان اور ایسے علوم معارف کی حامل کتاب ہمارے سامنے پیش کر دیں جس کی ان سے کسی طرح توقع نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ جب وہ قرآن سے ہٹ کر کوئی بات کہتے ہیں اس کی زبان میں اور قرآن کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب انہوں نے تو نہیں لکھی البتہ کوئی انہیں سکھا تا پڑھاتا ہے یا لکھ کے دے دیتا ہے اور وہ اسے لا کر لوگوں کو سنا دیتے ہیں۔ چنانچہ یہی بات کہی جا رہی ہے کہ تم کہیں سے پڑھ کے آگئے ہو یا تم کو کسی نے سکھا پڑھا دیا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کسی عجمی غلام کا نام بھی لیا جو مکہ معظمہ میں رہتا تھا لیکن جس کا تعلق کسی عجمی ملک سے تھا۔ وہ وہاں کی چونکہ بعض باتیں ذکر کرتا رہتا تھا اس لئے لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ حیرت انگیز باتیں وہ حضور کو سکھاتا ہے قرآن کریم نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ نادانو وہ ایک عجمی شخص ہے وہ ٹھیک سے عربی بھی نہیں بول سکتا اور یہ قرآن تو عربی مبین میں ہے تو اس نے ایسی فصیح و بلیغ زبان میں کتاب کیسے پیش کر دی اور پھر ایک عجمی آدمی بقول تمہارے ایسی کتاب لا سکتا ہے تو تم سارے مل کر اس کی مثال کیوں پیش کرتے۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن کریم میں مختلف مواقع پر عربوں کو اور باقی ساری دنیا کو بار بار یہ چیلنج دیا کہ تم اس قرآن جیسی کتاب لکھ کے لاؤ

Marfat.com

جیسا کوئی حصہ بنا کر لے آؤ اور اس میں جنات سے اگر مدد لے سکتے ہو تو وہ بھی لے لو لیکن صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج تک اس چیلنج کا جواب نہ دیا جا سکا مزید فرمایا کہ جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے اور جو اس قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے ان کا حال تو یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی بات کے پردے میں اپنی محرومی کو چھپانا چاہتے ہیں۔ لیکن جو لوگ علم کے طالب ہیں ہم نے مختلف اسالیب میں قرآنی تعلیمات کو ان کے لئے کھول کر بیان کر دیا ہے جو لوگ اس سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں ان کی تشنگی دور کرنے کا سامان اس میں موجود ہے۔

ان آیات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت ایک سخت کشمکش کے دور سے گزر رہی ہے۔ قرآن کریم بارش کی طرح نازل ہو رہا ہے۔ دلائل کی روشنی سورج کی کرنوں کی طرح پھیل رہی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس کی قبولیت کیلئے دل کھلیں، مخالفت زور پکڑتی جا رہی ہے اور مخالفین مخالفت میں ہر طرح کا حربہ آزمانے پر تُل گئے ہیں۔ وہ آنحضرت کو ناکام کرنے کیلئے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اذیتیں بھی پہنچا رہے ہیں اور نئے سے نئے مطالبوں کے ساتھ الجھانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ فطری بات ہے کہ آنحضرت اور مسلمان اس صورت حال سے متاثر ہو کر پریشان بھی ہوتے ہیں اور بار بار اللہ سے ان کو ایمان دینے کی دعائیں بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں آنحضرت اور مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

آیت: ۱۰۶-۱۰۷ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ O وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ O "تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے اعراض کرو اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کر پاتے اور ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں مقرر کیا ہے اور نہ تم ان کے ضامن ہو"۔

اللہ کا رسول اسی کی پیروی کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتا ہے:

آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ مشرکین مکہ کا رویہ کچھ بھی ہو مخالفت کی صورت میں اور مطالبات کی شکل میں وہ چاہے کتنا بھی آپ کو الجھانے کی کوشش کریں، ہراساں کر کے آپ کا راستہ بند کرنے کی کوشش کریں یا ایمان کے وعدوں سے مطالبات کے پورا ہونے کی شکل میں آپ کو امیدیں دلائیں، آپ کسی بات پر بھی توجہ نہ دیجئے بلکہ آپ اس چیز کی پیروی کیجئے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر وحی کی جا رہی ہے جو عقائد آپ پر نازل کئے جا رہے ہیں اور پھر جس طرح دلائل سے مرصع کر کے انہیں آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے آپ انہیں اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ اخلاقیات کی جو تعلیم دی جا رہی ہے آپ اپنے آپ کو اور اپنے او پر ایمان لانے والوں کو اس سے مزین کریں۔ دعوت دین کو مقصود بنا کر اپنے سفر کو جاری رکھیں۔ پیش نظر صرف یہ بات رہنی چاہئے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں یہ جملہ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ مشکلات کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ آپ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ بے شک آپ کی مخالفت روز بروز آپ کے کام کو سخت کر رہی ہے اور امیدیں روز بروز ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اسلامی تحریک کسی بند گلی میں داخل ہو رہی ہے لیکن آپ کو اس بات کا یقین رکھنا چاہئے کہ ہر کام کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے دلوں کا پھیرنے والا بھی وہی ہے تمام قدرتوں اور قوتوں کا مالک بھی وہی ہے اس لئے آپ حالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنا کام کرتے رہئے اور انجام کو اللہ کے سپرد کیجئے۔ وہ آپ کو ہر طرح کے خطرے سے محفوظ رکھے گا اور ان لوگوں کو اپنی حدود سے نکلنے نہیں دے گا۔

Marfat.com

ہر حال میں حاکم حقیقی صرف اللہ ہی ہے:

دوسری بات جو اس سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں آپ کی دعوت کا اصل موضوع اور اصل ہدف جو ہمیشہ آپ کے سامنے رہنا چاہئے اور تمام تبلیغی مساعی جس کے گرد جاری رہنی چاہئیں وہ یہ عقیدہ ہے کہ اللہ ہی حاکم حقیقی ہے اس کائنات کا حقیقی مالک وہی ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں اس لئے اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارا آقا ہے' آقائی اسی کو زیب دیتی ہے اور پھر یہ بندگی اور آقائی جزوقتی اور محدود نہیں بلکہ آدمی پیدا ہونے سے لے کر مرتے دم تک اللہ کا بندہ ہے اور اس کی زندگی کے تمام شعبے اللہ کی بندگی کے حامل ہیں۔ زندگی کا کوئی فیصلہ اور کوئی رویہ اللہ کی حاکمیت اور اس کی کبریائی سے باہر نہیں جس طرح ایک مسلمان اللہ کے گھر میں اس کی بندگی بجالاتا ہے اسی طرح وہ اپنے گھر میں' بازاروں اور منڈیوں میں کاروبار کرتا ہوا' عدالتی کرسی پر جج ہو کر بھی' حکومت کے ایوان میں حاکمِ وقت کی حیثیت سے داخل ہونے کے بعد بھی' وہ اللہ ہی کا بندہ ہے۔ اللہ ہی کا قانون مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر غالب ہوتا ہے۔ اسی قانون سے وہ اصول معاشرت' اصول معیشت' اصول تہذیب' اصول تعلیم' اصول سیاست اور اصول حکومت لیتا ہے غرضیکہ اس کی زندگی کا کوئی حصہ بھی اللہ کی حاکمیت سے آزاد نہیں ہوتا۔ وہ اول و آخر اللہ کا بندہ ہے اور ہر حال میں اللہ اس کا آقا اور اس کا معبود ہے۔ یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جس کے گرد پوری اسلامی تعلیمات گھومتی ہیں اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر پوری اسلامی عمارت استوار ہوتی ہے۔ آج بھی دنیا کی اصلاح کا یہی مجرب نسخہ ہے۔ دنیا نے اپنی بھلائی کیلئے مختلف آئین اور قانون اور مختلف زندگی کے رویے اپنا رکھے ہیں۔ آمریت ہی آمر مطلق اور بادشاہت میں بادشاہ سرچشمۂ قانون اور حاکمیت کی علامت ہے اور جمہوریت میں عوام کو سرچشمہ اقتدار کہا جاتا ہے اور اشتراکیت میں پارٹی اقتدار کا سرچشمہ ہوتی ہے اور یہی وہ بنائے فساد ہے جس نے پوری دنیا کو فساد سے بھر دیا ہے۔ اس لئے قرآن کریم اس بنیاد کو ڈھا کر ہمیں اسلامی تعلیم کی نئی بنیاد فراہم کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ کوئی حاکمِ حقیقی اور کوئی معبود مطلق نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور تم اپنی بندگی اور اپنی اطاعت میں آزاد نہیں ہو۔ یہی وہ آستانہ ہے جس سے وابستگی تمہاری دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی آج زبوں حالی کا کوئی سبب اگر ہے تو وہ اسی بنیاد سے کٹ جانا ہے۔ کافر اپنے کفر کے ساتھ قائم ہے کفر اپنے مَالَهٗ وَمَا عَلَيْهِ کے اعتبار سے کتنا بھی غلط ہو لیکن دنیا میں اس کے اور اس سے وابستگی کے بھی کچھ فوائد ہیں کیونکہ دنیا میں غلط سے غلط چیز بھی کوئی نہ کوئی فائدہ رکھتی ہے۔ مٹی بھی منفعت سے خالی نہیں' زہر بھی بعض دفعہ تریاق ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح کفر بھی اگرچہ انسانیت کا دشمن اور اخلاقیات کیلئے مہلک ہے لیکن دنیوی اسباب کے ساتھ ساتھ اس کے بھی کچھ فوائد ہیں اور اسلام تو سراسر امن و فلاح کا دین اور دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا پیغامبر ہے لیکن آج مسلمانوں نے رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ وہ نام اسلام کا لیتے ہیں لیکن اسلام کے اجتماعی نظام سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ ان کے اپنے ملکوں کے آئین سراسر اسلام سے بغاوت پر مبنی ہیں۔ ان کی زندگی کا مجموعی رویہ وہی ہے جو کافر قوموں کا ہے ان کی زندگیوں کے کامیابیوں کے پیمانے کافروں ہی کے حاصل کردہ ہیں۔ ان کی تہذیب انہی کی تہذیب ہے ان کی ایک اقلیت مسجدوں میں جا کر سجدہ ریز ہوتی ہے۔ لیکن مسجدوں سے باہر پوری زندگی شیاطین اور طاغوت کے حوالے ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلانا چاہتے ہیں اور کفر پر لعنت بھی بھیجتے ہیں۔ لیکن زندگی کا رویہ اسلام سے وابستگی نہیں بلکہ اس سے بغاوت پر مشتمل ہے یہ وہ رویہ ہے جسے منافقت کہا جاتا ہے۔ منافقت دنیا میں کبھی عزت کی ضمانت نہیں دیتی۔ اس سے کبھی اجتماعی زندگی میں ہمواری پیدا نہیں ہوتی یہ کبھی بھی قومی توانائی کی باعث نہیں ہوتی۔ اس سے کبھی بھی اجتماعی سیرت و کردار کی تعمیر نہیں ہوتی نتیجتاً قوم ذلت و رسوائی میں ہو کر وقت سے پہلے اپنے انجام سے دوچار ہو جاتی ہے۔ آج مسلمان اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ آپ کے پیش

Marfat.com

جو آپ کا اصل ہدف ہے وہی رہنا چاہیے۔

مشرکین سے اعراض کا حکم:

رہی یہ بات کہ یہ مشرک لوگ کیا کر رہے ہیں آپ ان سے اعراض فرمائیں' آپ تبلیغ و دعوت کا حق ادا کر چکے اب بار بار ان کے پیچھے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بے تابانہ ان کا پیچھا کرنے کی کوئی حاجت نہیں وہ فخر و غرور سے دل کے دروازے اگر بند کر چکے ہیں تو آپ مشتاقانہ ان کے دروازوں پر دستک نہ دیں۔ لوگوں کی ہدایت کیلئے دعا کرنا آپ کے رحمت للعالمین ہونے کا تقاضہ سہی' لیکن ان کی روش کو دیکھتے ہوئے ان کے توہین آمیز رویے کو بڑھتے ہوئے اور آخرت سے مسلسل انکار کرتے ہوئے دیکھ کر بھی اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا کر اصرار سے ان کی ہدایت کی دعا مانگنا کسی طور ضروری نہیں اور اگر وہ بے جا نئی نئی نشانیاں مانگیں اور نئے نئے مطالبات کریں تو ان پر کان دھرنے کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں۔ ان کے کفر کی وجہ سے ان کے انجام کو دیکھتے ہوئے یقیناً آپ کے دل کو دکھ ہوتا ہے آپ دل گرفتگی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آپ بہت دفعہ اس کیلئے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

ہدایت صرف اللہ دیتا ہے:

یہ سب کچھ اپنی جگہ بجا لیکن ہدایت پیغمبر کی خواہش سے نہیں بلکہ ہدایت حاصل کرنے والے کی طلب اور اخلاص سے نصیب ہوتی ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ جو آدمی جس راستے کی طرف بڑھتا ہے وہ اسی راستے کی آسانیاں اس کیلئے مہیا کرتا ہے۔ اس نے ہر انسان کو عقل و شعور اور اختیار کی دولت سے نوازا ہے پھر اس پر پیغمبر بھیج کر اور کتابیں اتار کر اس کی عقل و شعور کا سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ اب ان دونوں کی مدد سے اس کیلئے صحیح اور غلط میں امتیاز کرنا یہ اس کا اصل امتحان ہے۔ یہ اللہ کا وہ قانون ہے جو اس نے اپنے بندوں کیلئے مقرر فرمایا ہے۔ جو آدمی رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ساتھ اس قانون کے مطابق جیسا سلوک کرے گا ویسے ہی نتیجے سے اسے سابقہ پیش آئے گا۔ اگر وہ اپنی عقل اور شعور سے کام لے کر آنحضرت کی دعوت کو قبول کرتا ہے تو کامیابیاں اسے خوش آمدید کہیں گی اور اگر وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ مخالفت پر اتر آتا ہے تو پھر اللہ کے قانون کے مطابق وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اب اگر آنحضرت کی دعاؤں سے وہ لوگ جو کسی طرح بھی ہدایت کا راستہ اختیار کرنے کیلئے تیار نہیں' ہدایت سے نواز دیئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اپنا قانون توڑ ڈالا اور اس نے ان لوگوں کو ہدایت دے دی جو ہدایت کے طالب نہیں تھے۔ یہ تو ایک طرح کا جبر ہوگا کہ ایک آدمی دوسرے راستے پر چلنا چاہتا ہے لیکن پروردگار اس کی خواہش کے برعکس اسے دوسرے راستے پر چلا دیتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ بار بار اس بات کا اظہار کر چکے ہیں کہ ہم کسی پر زبردستی نہیں کرتے اور بالجبر کسی کو صحیح راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اس لئے اگلی آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ چاہتا یعنی وہ زبردستی چاہتا کہ لوگوں کو اپنے راستے پر زبردستی ڈال دے تو کوئی بھی دنیا میں شرک کرنے کی جرأت نہ کرتا جس طرح جن و انس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات اللہ کے تکوینی احکام کے تحت زندگی گزارنے کی پابند ہیں۔ زمین کی نباتات اور حیوانات' آسمان کے ثوابت' سیارے اور شمس و قمر حتیٰ کہ فرشتوں جیسی مقدس مخلوق بھی اللہ کے تکوینی احکام میں بندھی ہوئی ہے۔ انہیں جس کام اور ڈیوٹی پر لگا دیا گیا ہے وہ اس سے کبھی انحراف نہیں کر سکتے یہ صرف انسان اور جن ہیں جنہیں اطاعت و معصیت کا اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار ان کا امتحان ہے۔

انسان کو اطاعت و معصیت کا اختیار دیا گیا ہے:

اب اگر کسی تکوینی حکم کے ذریعے انہیں اللہ کی اطاعت کا پابند کر دیا جائے تو پھر ان کا امتحان کہاں رہا وہ تو باقی مخلوقات کی طرح بے اختیار ہو کر

Marfat.com

اللہ کے احکام کی اطاعت کریں گے اور یہ سراسر انسانوں کے مقصد تخلیق کے خلاف ہے۔ اسے تو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے اور پھر خلافت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا ہے تا کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ زمین پر رہ کر اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور زمین کو امن و آشتی کا مرکز بنا دیتا ہے یا نافرمانی کرتا ہے اور زمین کو فتنہ وفساد سے بھر دیتا ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن پاک نے بعض اور مواقع پر بھی فرمائی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ''دین میں کوئی جبر نہیں'' یعنی اللہ کی اطاعت اختیار کرنے اس کا دین اختیار کرنے اور اس کے احکام بجالانے میں اللہ نے جبر کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ آگے فرمایا کہ ہم نے ہدایت کو گمراہی سے الگ کر کے اور کھول کے بیان کر دیا ہے تا کہ سمجھنے والوں کو راستہ اختیار کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ دشمنان دین نے تو مختلف مواقع پر لوگوں کو زبردستی اسلام قبول کرانے کا الزام لگایا لیکن غیر جانبدار غیر مسلموں نے بھی ہمیشہ اعتراف کیا کہ قرن اول سے لے کر آج تک کبھی کسی کو مسلمانوں نے زبردستی مسلمان نہیں کیا۔ مسلمانوں کے انتہائی عروج میں بھی جب وہ دنیا کے ایک بڑے حصے پر ایک غالب قوت کی حیثیت سے حکومت کر رہے تھے اس وقت بھی ان کی ریاستوں میں غیر مسلم اپنی مذہبی آزادیوں سمیت خوش وخرم زندگی گزار رہے تھے ان کی عبادت گاہیں کھلی تھیں اور ان کے مذہبی اداروں کو مذہبی تعلیم دینے کی آزادی تھی البتہ یہاں ضروری ہے کہ ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے لوگوں نے مذکورہ آیت یعنی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ سے غلط مطلب نکالنے کی کوشش کی ہے اس کا صاف اور سیدھا مطلب تو وہی ہے جو ابھی ذکر ہوا کہ دین قبول کرنے میں کوئی اکراہ اور جبر نہیں۔ ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ چاہے دینِ اسلام قبول کرے اور چاہے نہ کرے اور یہی آزادی اس کا اصل امتحان ہے جس کا نتیجہ قیامت کے دن سامنے آئے گا۔ لیکن لوگوں نے اس کا یہ مطلب لینے کی کوشش کی کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں یعنی دین پر عمل کرنے میں یا عمل کرانے میں کوئی پابندی نہیں۔ اس لئے اگر اسلامی حکومت قائم ہوتی ہے تو لوگوں کو اس بات کی آزادی ہوگی کہ وہ نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں' زکوۃ دیں یا نہ دیں' احکام شریعت کی پابندی کریں یا نہ کریں' شرم وحیا کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھیں یا نہ رکھیں' اسلامی قانون نافذ کریں یا نہ کریں' غرضیکہ پورے دین اسلام کے بارے میں مسلمان صرف اس بات کے پابند ہیں کہ وہ اسلام کا نام لیں قرآن پڑھیں اور اپنی مرضی سے جس بات پر چاہیں عمل کریں۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس آیت کا یہی مفہوم ہے کہ یہ ایک خود اختیاری کام ہے جس پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کریم کتاب آئین اور کتاب ہدایت نہیں بلکہ صرف ایک کتابِ نصیحت ہے۔ حضور دنیا میں ادیان باطلہ کو ختم کر کے دینِ حق کو غالب کرنے کیلئے نہیں آئے تھے بلکہ چند باتوں کی نصیحت کرنے کیلئے تشریف لائے تھے اور آپ نے مسلسل ۲۳ سال تک باطل قوتوں سے جو چو مکھی لڑائی لڑی وہ سب بلا وجہ تھی۔ آپ نے ناحق اس کے لئے جنگیں لڑیں' آپ نے خواہ مخواہ اسلامی شریعت کے نفاذ کیلئے عدالتیں قائم کیں۔ آپ نے نہ جانے کیوں حدود اللہ کا نظام قائم فرمایا؟ آپ نے' اللہ ہی بہتر جانتا ہے کیوں شرعی احکام کی بجا آوری اور لوگوں سے اس پر عمل کروانا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ٹھہرایا۔ آنحضرت کے یہ کئے ہوئے سارے کام اگر صحیح تھے تو پھر مان لینا چاہئے کہ اس آیت سے جو مطلب نکالنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے وہ سراسر اس آیت پر الزام ہے۔ ایک معمولی عقل بھی اس بات کو سمجھتی ہے کہ جس ریاست میں آئین اور قانون کی بالادستی ہو اس میں اس کی مخالفت کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ قانون شکنی ایک جرم سمجھی جاتی ہے' احتسابی ادارے ہمیشہ قانون کی پابندی کرواتے اور قانون شکنوں کو گرفتار کرتے اور عدالتیں ان کو سزائیں سناتی ہیں۔

رسول کی ذمہ داری دعوت وتبلیغ ہے' لوگوں کو ایمان پر لانا رسول کی ذمہ داری نہیں:

اگر اسلام بھی اللہ کا نازل کردہ ایک آئین اور قانون ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس پر عمل کرنے کی پابندی نہ ہو اور ریاست اس میں اپنا کردار

Marfat.com

کرے۔ بہرحال یہ ایک ضمنی بات تھی اصل بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جبراً ان لوگوں کو مسلمان نہیں بنائے گا بلکہ یہ اپنے اختیار سے اگر چاہیں تو اسلام قبول کریں گے۔ آنحضرت سے کہا جارہا ہے کہ آپ کو ان پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ زبردستی اسلام ان کے دلوں میں اتاریں بلکہ آپ کی حیثیت ایک داعی اور مبلغ کی ہے آپ کا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کریں اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ آپ کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہیں اور نہ آپ کی ذمہ داری اور جوابدہی میں یہ بات شامل ہے کہ آپ کے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کریں کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔ پس آپ کے لئے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی آپ کو دکھادی گئی ہے اس کے اجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہیں اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہیں۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں انہیں سینے سے لگائیں اور ان کا ساتھ نہ چھوڑیں خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں اور جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑیں۔ جس انجام بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مصر ہیں اس کی طرف جانے کیلئے انہیں چھوڑ دیں۔

وَلَا تَسُبُّوا

اور جن لوگوں کو یہ مشرک

الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا

خدا کے سوا پکارتے ہیں اُن کو بُرا نہ کہنا کہ یہ بھی کہیں خدا کو بے ادبی سے بے سمجھے بُرا

بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ

(نہ) کہہ بیٹھیں۔ اس طرح ہم نے ہر ایک فرقے کے اعمال (اُن کی نظروں میں) اچھے کر دکھائے ہیں پھر

مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٠٨﴾ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ

اُن کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے تب وہ اُن کو بتائے گا کہ وہ کیا کیا کرتے تھے۔ اور یہ لوگ خُدا کی سخت

جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا

سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں کہہ دو کہ نشانیاں تو

الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٩﴾

سب خُدا ہی کے پاس ہیں۔ اور (مومنو!) تمہیں کیا معلوم ہے (یہ تو ایسے بدبخت ہیں کہ اُن کے پاس) نشانیاں آ بھی جائیں

Marfat.com

وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ

تب بھی ایمان نہ لائیں۔ اور ہم اُن کے دلوں اور آنکھوں کو اُلٹ دیں گے (تو) جیسے یہ اس (قرآن) پر پہلی دفعہ

وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١٠﴾

ایمان نہیں لائے (ویسے پھر نہ لائیں گے) اور اُن کو چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی میں بہکتے رہیں ف۔

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا

اور اگر ہم اُن پر فرشتے بھی اُتار دیتے اور مُردے بھی اُن سے گفتگو کرنے لگتے اور ہم سب

عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ

چیزوں کو اُن کے سامنے لا موجود بھی کر دیتے تو بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ اِلّا ماشاء اللہ بات یہ ہے

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ﴿١١١﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا

کہ یہ اکثر نادان ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے شیطان (سیرت) انسانوں

شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ

اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع

الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١١٢﴾

کی باتیں ڈالتے رہتے تھے اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے تو اُن کو اور جو کچھ یہ افترا کرتے ہیں اسے

وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ

چھوڑ دو اور (وہ ایسے کام) اس لیے بھی (کرتے تھے) کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے دل ان کی باتوں

وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ ﴿١١٣﴾ أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَ

پر مائل ہوں اور وہ انہیں پسند کریں اور جو کام وہ کرتے تھے وہی کرنے لگیں ف۔ (کہو) کیا میں خدا کے سوا اور منصف

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ

تلاش کروں حالانکہ اُس نے تمہاری طرف واضح المطالب کتاب بھیجی ہے۔ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب

Marfat.com

الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ

(تورات) دی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق نازل ہوئی ہے تو تم ہرگز شک کرنے

مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ

والوں میں نہ ہونا اور تمہارے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں۔ اس کی باتوں کو

لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ

کوئی بدلنے والا نہیں اور وہ سنتا جانتا ہے۔ اور اکثر لوگ جو زمین پر آباد ہیں (گمراہ ہیں) اگر تم ان کا

يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ

کہا مان لوگے تو وہ تمہیں خدا کا رستہ بھلا دیں گے۔ یہ محض خیال کے پیچھے چلتے اور نرے اٹکل کے تیر

اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ

چلاتے ہیں۔ تمہارا پروردگار ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اور ان

وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

سے بھی خوب واقف ہے جو رستے پر چل رہے ہیں۔

تمہید:

گزشتہ آیات میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ جہاں تک نبی کریم ﷺ کی دعوت کو سمجھنے اور قبول کرنے کا تعلق ہے اور اس کے فہم اور سہولت کیلئے جس طرح کے دلائل درکار تھے انہیں ایک ایک کر کے اس طرح کھول کر بیان کردیا گیا ہے کہ اب اگر کوئی آدمی اس دعوت کو سمجھنا اور راہ ہدایت اختیار کرنا چاہے تو اس کیلئے کسی چیز کی کمی نہیں بلکہ صاف فرمایا گیا کہ تمہارے رب کی جانب سے بصیرتوں کا وافر سامان اور سوجھ بوجھ کے دلائل کا ایک ذخیرہ نازل کردیا گیا ہے۔ اب بجز اس کے کہ کوئی آدمی آنکھیں بند کرلے اور اندھا بن کر راستہ طے کرنا چاہے تو وہ تو ظاہر ہے کسی نہ کسی کھائی میں گر کر مرے گا ورنہ ان ہدایات اور ان دلائل کے آجانے کے بعد انسانی زندگی کا راستہ طے کرنے میں اب کوئی دشواری باقی نہیں رہی۔ یوں سمجھئے کہ دعوت دین کا ایک چمن ہے جو چاروں طرف کھل گیا ہے اور رنگ و بو کا ایک سیل ہے جو مشام جان کو معطر کرنے کیلئے پوری طرح بروئے کار آرہا ہے اور دلائل کی باد بہاری ہے جو ایک ایک پھول سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چہل قدمی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اگر کسی کی قوت شامہ جواب دے چکی اور کسی کی بینائی گم ہوچکی ہے تو ایسے ہزاروں چمن بھی اس کیلئے بیکار ہیں۔ اس صورت حال کو واضح کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم دیا جارہا ہے اور ساتھ ساتھ تسلی بھی دی جارہی ہے کہ زندگی کے سفر کیلئے آپ کو جو ہدایات دے دی گئی ہیں آپ نہایت اطمینان سے اس پر سفر جاری رکھیے اور انسانی اصلاح کا جو طریقہ آپ پر نازل کردیا گیا ہے اس کے مطابق لوگوں کی اصلاح کی کوشش جاری رکھیے لیکن اس کے باوجود بھی اگر لوگ ایمان قبول نہ کریں تو آپ ہرگز ان کی فکر نہ فرمائیں اور مخالفت کرنے والوں سے حق تبلیغ ادا کرنے کے بعد بالکل صرف نظر کرلیں۔ اس طرح سے ان آیات میں اتمام حجت ہوتا بھی نظر آتا ہے ایک ترک تعلق

Marfat.com

اور بے نیازی کے رویے کی بھی تلقین محسوس ہوتی ہے اور مشرکین کے عقائد باطلہ پر تنقید بھی مکمل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اور اس صورت حال کے ساتھ ساتھ جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرکین مکہ کی جانب سے مخالفت تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور اذیت رسانی کا عمل ظلم کی انتہاؤں کو چھونے لگا ہے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ایسی صورت حال میں یقیناً مسلمانوں کے دلوں اور ان کے دماغوں میں ایک ہیجان کی کیفیت ہوگی اور وہ مشرکین مکہ کے خلاف اپنے جذبات میں ایک آگ لگی ہوئی محسوس کرتے ہوں گے تو یہ ایک فطرت کا اصول ہے کہ جب بھی معاملہ اشتعال کی حدوں کو چھونے لگے تو پھر صحیح سے صحیح راستے کی دعوت دینے والے لوگ بھی اپنے مخالفوں کے بارے میں احتیاط کے تقاضوں کو پوری طرح بروئے کار لانے سے عاجز ہو جایا کرتے ہیں اور اس بات کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر جذبات میں اعتدال پیدا نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ طریق تخاطب میں تلخی کا زہر نہ پیدا ہو جائے اور تبلیغ و دعوت کا عمل بجائے نفوذ اختیار کرنے کے کھلے مقابلے کی شکل اختیار نہ کر جائے۔ چنانچہ ایسے موقع پر انتہائی ضروری ہوتا ہے کہ اہل دعوت کو اپنے آپ پر قابو رکھنا اور احتیاط کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کا حکم دیا جائے۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں ایسی ہی حکمت پرور ہدایات دی جا رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۰۸ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ ''اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں' ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل پیوست کر رکھا ہے۔ پھر ان کے رب ہی کی طرف' ان سب کا پلٹنا ہے تو وہ انہیں اس سے آگاہ کرے گا' جو وہ کرتے رہے ہیں''۔

مسلمانوں کو کفار کے معبودوں کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے:

اس آیت کریمہ کا سیاق کلام واضح کرتے ہوئے ہم نے جو گزارشات پیش کی ہیں ان کی تائید ابن جریر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے اہل تاویل نے اس آیت کے شان نزول کے طور پر بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت ابوطالب بیمار پڑے اور اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ مرض مرض الوفات ثابت نہ ہو تو اشراف قریش جواب اسلام اور مسلمانوں کی اذیت رسانی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے قتل کے منصوبے بنانے لگے تھے انہوں نے سوچا کہ ہم محمد ﷺ کو ابوطالب کی زندگی میں تو قتل نہ کر سکے۔ لیکن اگر ان کی وفات کے بعد ہم نے یہ اقدام کیا تو تمام عرب اپنی قومی روایات کے مطابق اسے نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے کہ جب تک بنوہاشم کا سردار زندہ تھا تو تم یہ حرکت نہ کر سکے لیکن اب اس کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد تم نے یہ کیا کمینی حرکت کی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ حضرت ابوطالب کی زندگی ہی میں انہی کے ذریعے اس معاملے کا کوئی تصفیہ کر لیا جائے۔ چنانچہ بڑے بڑے اشراف قریش حضرت ابوطالب کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے بھتیجے نے ہمارے بتوں اور ہمارے دین پر مسلسل تنقید سے جو صورت حال پیدا کر دی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اسے دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ بجائے اسکے کہ اس کا کوئی خطرناک نتیجہ برآمد ہو آپ اپنے بھتیجے سے ہمارا کوئی تصفیہ کرا دیں ہم نہیں چاہتے کہ یہ معاملہ زیادہ آگے بڑھے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے معبودوں پر تنقید کرنا بند کر دے ہمارے دین کو غلط کہنا چھوڑ دے۔ وہ اس بات پر ہم سے معاہدہ کر لے کہ وہ ہمارے معبودوں کو کچھ نہیں کہے گا اور ہمارے دین کو تنقید کا نشانہ نہیں بنائے گا تو ہم اس کے معبود اور اس کے دین کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے وہ اپنا راستہ اختیار کرے لیکن ہم سے تعرض کرنا چھوڑ دے۔ چنانچہ حضرت ابوطالب نے آنحضرت ﷺ کو بلا بھیجا اور کہا کہ دیکھو یہ قریش کے بڑے بڑے سردار آئے ہیں یہ تم سے کوئی بات کرنا چاہتے

Marfat.com

اسے غور سے سنو۔ آپ نے براہ راست ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ ہمیں اور ہمارے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ برا بھلا نہ کہیں اور ہم آپ کو اور آپ کے معبود کو چھوڑ دیں گے اس طرح باہمی مخالفت ختم ہو جائے گی۔ حضور نے فرمایا کہ اچھا یہ بتلاؤ اگر میں تمہاری یہ بات مان لوں تو کیا تم ایک ایسا کلمہ کہنے کیلئے تیار ہو جاؤ گے جس کے کہنے سے تم سارے عرب کے مالک ہو جاؤ اور عجم کے لوگ تمہارے مطیع فرمان بن جائیں۔ ابو جہل نے کہا کہ ایسا کلمہ ایک نہیں ہم دس کہنے کو تیار ہیں بتلاؤ وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ﴿لا الہ الا اللہ﴾ یہ سنتے ہی وہ لوگ بھڑک اٹھے۔ ابو طالب نے حضور سے کہا کہ میرے بھتیجے اس کلمہ کے سوا کوئی اور بات کہو کیونکہ تمہاری قوم اس کلمہ سے گھبرا گئی ہے۔ آپ نے فرمایا چچا جان میں تو اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا کلمہ نہیں کہہ سکتا۔ اگر یہ لوگ آسمان سے آفتاب اتار کر میرے ہاتھ پر بھی رکھ دیں میں جب بھی اس کلمہ کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کہوں گا اس پر یہ لوگ ناراض ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ یا تو آپ ہمارے معبودوں کو برا کہنے سے رک جائیں ورنہ ہم آپ کو بھی گالیاں دیں گے اور آپ کے معبود کو بھی۔

اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس آیت کریمہ میں بہت سی پر حکمت ہدایات ارشاد فرمائی گئی ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلی بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا یعنی خطاب مسلمانوں سے ہے نبی کریم ﷺ سے نہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ کو اللہ نے جس طرح مکارم اخلاق اور تحمل کا پیکر بنایا تھا اس کو دیکھتے ہوئے آپ سے تو اس بات کی امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ ان کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے یا ان کی کسی بات پر مشتعل ہو کر گالی تو دور کی بات ہے کبھی کوئی درشت کلمہ بھی اپنی زبان سے نکالیں گے۔ البتہ مسلمانوں سے یہ اندیشہ کیا جاسکتا تھا کہ جب ان کے سامنے قریش دریدہ دہنی اور بدزبانی کا ارتکاب کریں وہ بھی جواب میں ان کے بتوں یا ان کے دوسرے معبودوں کے بارے میں کوئی سخت جملہ کہہ دیں۔ چنانچہ انہیں خطاب کر کے یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ تم اسلام کا ہراول دستہ ہو۔ اسلامی دعوت اور اسلامی قافلے کا دارومدار تمہاری تبلیغی مساعی پر ہے اور تمہاری تبلیغی مساعی کی کامیابی کا دارومدار تمہارے تحمل اور بردبار رویے پر ہے اگر تم نے مشرکین کے رویے سے مشتعل ہو کر کوئی سخت رویہ اختیار کر لیا اور انہی کی زبان میں جواب دینے لگے تو اس سے مقابلہ تو ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بہت مشکل ہو جائے گی کہ مخالفین میں سے کوئی آدمی اپنے پرانے دین اور پرانے رویے سے کٹ کر آپ کی دعوت کو قبول کر لے۔ اس لئے جس فرد یا جس گروہ کے پیش نظر اپنے نقطہ نگاہ کو لوگوں تک صرف پہنچانا ہی نہیں بلکہ ان کے دل و دماغ میں اتارنا بھی مقصود ہو اس کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت کو کبھی ذاتیات کا رنگ اختیار نہ کرنے دے۔ مخالفین اسے ہر چند مشتعل کر کے ذاتیات میں الجھانے کی کوشش کریں' لیکن اس کی پوری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ بات اصول وعقائد ہی تک محدود رہے۔ تنقید ہو تو صرف مخالفین کے خیالات پر لیکن اس کا اسلوب اس قدر نرم اور محبت آمیز ہونا چاہئے جو طبیعتوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اگر خدانخواستہ تلخ اسلوب اختیار کر لیا جائے اور انہی کی زبان میں جواب دینے کی کوشش کی جائے تو پھر اس بات کا شدید امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ مخالفین میں جذبہ جاہلی بھڑک اٹھے اور وہ بجائے بات قبول کرنے کے اس دعوت کو ختم کرنے کا فیصلہ کرنے لگیں۔ آیت کے دوسرے جملے میں اس کی حکمت واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر قوم کو اپنی روایات' اپنی رسوم اور اپنے معتقدات حد درجہ عزیز ہوتے ہیں وہ اس پر کبھی کھلی تنقید برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے بلکہ وہ ایسی کسی تنقید پر بھی مرنے مارنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ایک مبلغ اور ایک مصلح کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت کے اسلوب سے جذبات میں اشتعال نہ پیدا ہونے دے۔ ایک تو اپنے اعتقادات کے خلاف کسی بات کو قبول کرنا بجائے خود کسی بھی آدمی کیلئے آسان نہیں ہوتا لیکن اگر وہ یہ محسوس کرے کہ میرے اعتقادات کے بارے میں نامناسب زبان استعمال کی جا رہی ہے تو پھر تو وہ اپنے اعتقادات کے خلاف کسی بات پر غور و فکر کرنا تو

Marfat.com

دور کی بات ہے سننا بھی برداشت نہیں کرتا۔ اس لئے جس شخص یا جس قوم کے پیش نظر یہ مقصد ہو کہ مجھے لوگوں کے غلط خیالات کی اصلاح کر کے صحیح خیالات ان کے دل و دماغ میں اتارنے ہیں۔ وہ کبھی یہ غلطی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے درشت رویہ اختیار کریں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ مکہ معظمہ میں بیت اللہ کے سامنے بیٹھے ہوئے پاکستان کے ایک بڑے عالم دین سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے باتوں باتوں میں بتایا کہ کل میرے پاس اسلام آباد سے ایک صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے مجھے اپنی ایک تصنیف دی کہ میں اسے پڑھ کر اپنی رائے دوں۔ میں نے وہ تصنیف دیکھی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں مولانا مودودی کے خلاف نہایت غیض و غضب کے انداز میں فتوے کی زبان میں بہت درشت باتیں کہی گئیں تھیں۔ دوسرے روز وہ مصنف ان محترم مولانا سے اپنی کتاب کے بارے میں رائے معلوم کرنے کیلئے آئے تو انہوں نے ان سے فرمایا کہ یہ کتاب پڑھ کر مجھے خیال ہوا ہے کہ آپ مولانا مودودی اور ان کی جماعت کو غالباً اولیاء کا گروہ سمجھتے ہیں جو نہایت خدا رسیدہ اور بے نفس لوگ ہیں تو مصنف یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے کہنے لگے حضرت میں نے تو انہیں اپنی کتاب میں گمراہ لکھا ہے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تو یہ محترم مولانا کہنے لگے کہ میرا گمان ہے کہ آپ نے یہ کتاب اس غرض سے لکھی ہے کہ اسے پڑھ کر مولانا اور ان کے متبعین اپنے خیالات کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اسے وہ مان لیں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں میں نے یہ کتاب تو اسی مقصد کیلئے لکھی ہے تو یہ مولانا کہنے لگے کہ آپ نے اس مقصد کیلئے جو زبان اختیار کی ہے اس زبان میں کوئی آدمی بھی اپنی مخالفانہ بات کو صرف اسی صورت میں قبول کر سکتا ہے کہ وہ انتہائی بے نفس اور خدا رسیدہ آدمی ہو اسے اپنی مخالفت میں کہی جانے والی بات پر نہ غصہ آئے نہ اشتعال پیدا ہو ورنہ جہاں تک انسانی فطرت کا تعلق ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنے مالوفات اور اپنے معتقدات اس حد تک عزیز ہوتے ہیں کہ وہ اس کے خلاف بات سننے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں تبلیغ و دعوت کے کام میں جو ناکامیاں دیکھنے میں آتی ہیں ان کے چند در چند اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم جب مخالف کے غلط خیالات پر تنقید کرتے ہیں تو ہماری تنقید صرف اسکے خیالات تک محدود نہیں رہتی بلکہ مخالف کی ذات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور دوسری یہ بات کہ ہمارا رویہ اس قدر جارحانہ ہوتا ہے کہ مخالف بات کو قبول کرنا تو درکنار سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتا بلکہ عموماً اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے اور پھر ایک ایسا تصادم وجود میں آتا ہے جو بعض دفعہ جانبین کی جانیں لے کر بھی ٹلتا نہیں اس لئے یہاں پر فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے ہر امت کیلئے ان کے اعمال کو ان کے دلوں میں کھبا دیا ہے اور یہ ہم نے کیا ہے یعنی یہ اللہ نے فطری قوانین بنائے ہیں یہ انہی قوانین فطرت میں سے ہے۔ کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس کے بغیر انسانی اجتماعی زندگی میں شیرازہ بندی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وہ اپنی روایات اور اپنے مالوفات کے ساتھ گہری وابستگی ہے جو عصبیت کی شکل اختیار کر کے کسی بھی قوم کے اجتماعی وجود کو سہارا دیتی ہے اسی سے خاندان اور قومیں وجود میں آتی ہیں۔ اسی سے وطن کا دفاع کرنا انسان کا جزو ایمان بن جاتا ہے۔ اسلئے جہاں تک اس کی افادیت کا تعلق ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ اسلئے اس کو ختم کرنے کی کوئی کوشش بھی کبھی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مفید عصبیت کو باقی رکھتے ہوئے اور فطری اصول کا لحاظ کرتے ہوئے جو غلط چیزیں اس میں شامل ہو گئی ہیں جس نے اس کی فطری افادیت کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسلئے یہاں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا کہ قوم کے عقائد و اعمال کی تطہیر تو ضروری ہے لیکن یہ کام نہایت حکمت و دانش کے ساتھ ہونا چاہیے۔ جارحانہ طریقے سے فطری تصادم شروع ہوتا ہے۔ اس سے بچتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ تنقید خیالات کی حد تک رہے۔ ذاتیات اس میں شامل نہ ہونے پائیں اسلوب ایسا میٹھا اور دل نشین ہو کہ سننے والا یہ محسوس کرے کہ میرے دل پر شبنم برس رہی ہے۔ اس کی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے تئیں کسی بھی تنقید کو شاید قبول کرنا گوارا کر لے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کے سامنے ہر ایک کو صرف اپنا حساب دینا ہے:

اس آیت کریمہ کے تیسرے جملے میں مسلمانوں کو ایک طرح سے تسلی دی گئی ہے کہ تم نے آنحضرت ﷺ کی رفاقت میں تبلیغ دین اور دعوت الی اللہ کے سلسلے میں جو مساعی انجام دی ہے اور اس راستے میں جس طرح بڑی سے بڑی تکلیفیں برداشت کیں اس کے بعد بھی اگر لوگ دین کے مقابلے میں اپنی معاندانہ روش سے باز نہیں آتے تو یقیناً آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور کبھی کبھی طبیعتوں میں اشتعال بھی پیدا ہونے لگتا ہے کہ یہ لوگ آخر اپنی انسانیت کہاں کھو بیٹھے ہیں کہ ہم ان کے سامنے وہ بات رکھ رہے ہیں جو انسانیت کا سرمایہ اور فطرت اور عقل کا تقاضہ ہے اور یہ اس کے مقابلے میں شرک کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں اور اس پر انہیں اصرار بھی ہے حالانکہ شرک کو نہ عقل قبول کرتی ہے اور نہ فطرت اسے برداشت کرتی ہے اور جہاں تک انسانی شرف کا تعلق ہے یہ کسی طرح اس سے میل نہیں کھاتا لیکن عجیب بات ہے کہ مشرکین کو اس پر پھر بھی اصرار ہے ایسی باتیں سوچ کر یقیناً صحابہ کے جذبات میں ایک ہیجان پیدا ہوتا۔ انہیں تسلی دی جارہی ہے کہ تمہیں اس صورت حال سے اس درجہ متاثر نہیں ہونا چاہئے کہ تم جذباتی ہیجان کا شکار ہو جاؤ کیونکہ تم ایک فرض انجام دے رہے ہو اور یہ سمجھ کر انجام دے رہے ہو کہ اسی پر عاقبت میں سرخرو ہونے کا دارومدار ہے اور ان کے بارے میں تم اس لئے متفکر ہو کہ اگر وہ تمہاری دعوت کو قبول نہیں کرتے تو عاقبت میں انہیں سخت انجام سے دوچار ہونا پڑے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ عاقبت سے تمہیں بھی دوچار ہونا ہے اور انہیں بھی اور وہ لوگ اگر اس کی پرواہ نہیں کرتے تو تم ان کے اس رویے کو عاقبت پر چھوڑو۔ اللہ تعالیٰ وہاں ان سے خود پوچھ لے گا کہ وہ دنیا میں کیا کرتے رہے ہیں۔ تم نے اپنا فرض انجام دے کر اپنی عاقبت سنوار لی اور وہ لوگ اگر اپنی عاقبت کے بگاڑ پر تلے ہوئے ہیں تو تمہارا اس پر مشتعل ہونا یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہر آدمی اپنے اعمال کا اللہ کے سامنے جواب دہ ہے یہ لوگ بھی جب اس کے پاس پہنچیں گے تو اپنے اعمال کا پورا سرمایہ لے کر جائیں گے وہاں انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہم نے دنیا میں کس قدر خسارے کا سودا کیا۔

جس جائز کام کے کرنے سے مفاسد کا خطرہ ہو اسے چھوڑنا واجب ہو جاتا ہے:

یہ چند اہم نکات ہیں جو اس آیت کریمہ کی تشریح کے ضمن میں ہم نے آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں لیکن جب مجموعی طور پر اس آیت کریمہ کی ہدایات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اس سے چند مزید سبق حاصل ہوتے ہیں جن کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں اس بات سے روکا گیا ہے کہ یہ مشرکین جن کو معبود کے طور پر پکار رہے ہیں تم انہیں گالی نہ دو کیونکہ ان کے معبود دو طرح کے ہیں ایک کا تعلق تو محض ان کے تصورات سے ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ انہی تصورات کو انہوں نے محسوس شکل دینے کیلئے ان کے بت بنائے ان کے مجسمے کھڑے کئے اور ان کی پوجا شروع کر دی۔ اور دوسرے وہ ہیں جن کی واقعی شخصیتیں ہیں اور وہ ساتھ ساتھ تقدس اور احترام کا رشتہ بھی رکھتی ہیں مثلاً یہ مشرکین فرشتوں کو پوجتے تھے۔ وہ یقیناً قابل احترام ہستیاں ہیں اسی طرح بعض انبیاء کرام کی یہ پوجا کرتے تھے اور ان کے بارے میں مافوق الفطرت احساسات رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے اس مشرکانہ رویے پر تنقید تو ہو سکتی ہے لیکن جن کو انہوں نے شریک بنا رکھا ہے وہ انبیاء کرام ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے بھی واجب الاحترام ہیں اسلئے ان کو گالیاں دینے یا برا کہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور دوسری بات جو اس سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ توحید کو مثبت انداز میں ثابت کرنا اور عقل و فطرت کے مطابق ٹھہرانا اور شرک کو بالکل بے ثبات و بے بنیاد ثابت کرنا یہ دعوت کا اصل مقصود ہے اور جہاں تک تعلق ہے ان کے معبودوں کو برا کہنے کا اس کو زیادہ سے زیادہ ایک جائز کام کہا جا سکتا ہے لیکن مقصود تو بالکل نہیں کیونکہ ایک مبلغ کے پیش

Marfat.com

نظر ایک مشرک سے شرک کو چھڑا کر اسے توحید کے راستے پر ڈالنا ہے۔ دل شکنی اور دل آزاری تو کسی طرح بھی ایک مبلغ کے پیش نظر نہیں ہو سکتی' بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایسا کوئی عمل جو بظاہر جائز بھی ہو لیکن مقاصد شرعیہ میں شامل نہ ہو لیکن اس سے کچھ مفاسد کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ان مفاسد کے پیش نظر اس عمل کو ترک کر دینا واجب ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں کوئی انسان خود تو اپنے ماں باپ کو گالی نہیں دیتا لیکن جب وہ کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دے اور اس کے نتیجے میں وہ دوسرا اسکے ماں باپ کو گالی دے تو اس گالی دلوانے کا سبب چونکہ یہ خود بنا ہے اس لئے یوں سمجھو کہ اس نے خود گالی دی۔ ایک دوسری حدیث سے بھی ہمیں اس کی مثال ملتی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ بیت اللہ زمانہ جاہلیت میں کسی حادثہ میں منہدم ہو گیا تھا تو قریش مکہ نے اپنے وسائل سے اس کی دوبارہ تعمیر کی لیکن وسائل کی کمی کے باعث اس کا کچھ حصہ تعمیر سے باہر رکھنا پڑا جسے آج حطیم کہا جاتا ہے اور دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ بیت اللہ کے مشرق اور مغرب میں دو دروازے تھے ایک نکلنے کیلئے تھا اور دوسرا داخل ہونے کیلئے۔ لیکن قریش نے مغربی دروازہ بند کر دیا صرف مشرقی دروازہ کھلا رہنے دیا اور مزید انہوں نے یہ کیا کہ دروازے کو بجائے زمین کے برابر رکھنے کے سطح زمین سے خاصہ بلند رکھا تا کہ کوئی شخص بدوں اجازت داخل نہ ہو سکے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بیت اللہ کی موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر کے مطابق بنا دوں۔ مگر خطرہ یہ ہے کہ تمہاری قوم یعنی عرب نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں بیت اللہ کو منہدم کرنے سے کہیں ان کے دلوں میں کوئی شبہات نہ پیدا ہو جائیں اسلئے میں نے اپنے ارادہ ترک کر دیا۔ ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کو بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنانا ایک کار ثواب تھا مگر اس پر لوگوں کی ناواقفیت کے سبب ایک خطرہ کا ترتب دیکھ کر آپ نے اس ارادہ کو ترک فرما دیا اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کسی جائز بلکہ ثواب کے کام پر کوئی غلط نتیجہ نکلنے کا اندیشہ ہو تو وہ جائز کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے۔

لیکن یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بہت ضروری ہے کہ کسی فساد اور خرابی کے اندیشے سے ہر کام نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ اس میں تقسیم یہ ہے کہ بعض اسلامی احکام مقاصد شرعیہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اپنی ذات میں صرف اطاعت ہیں اور ان پر ثواب ملنے کی امید کی جا سکتی ہے۔ کسی فساد اور خرابی کے اندیشے سے صرف یہ ثواب اور اطاعت کے کام چھوڑے جا سکتے ہیں۔ رہے وہ کام جن کی حقیقت مقاصد شرعیہ کی ہے ان کو کسی طرح چھوڑا نہیں جا سکتا۔ مثلاً اگر جہاد فرض ہو جائے تو جہاد و قتال کو اس خیال سے نہیں چھوڑا جا سکتا کہ اس کے نتیجے میں خونریزی ہو گی آبادیاں برباد ہوں گی بہت سے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ اسی طرح تبلیغ دین ایک فریضہ ہے وہ محض اس خیال سے روکا نہیں جا سکتا کہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں یا اس کے نتیجے میں کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت حسن بصری اور امام محمد بن سیرین ایک جنازہ کی نماز میں شرکت کیلئے گئے وہاں دیکھا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی اجتماع ہے۔ اس کو دیکھ کر ابن سیرین تو واپس آ گئے مگر حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ لوگوں کی غلط روش کی وجہ سے ہم اپنے ضروری کام کیسے چھوڑ دیں۔ نماز جنازہ فرض ہے اس کو کسی دینی نقصان کے اندیشے سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ ہاں اس بات کی کوشش کی جائے کہ خرابی باقی نہ رہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں اگر ان کو کرنے سے کچھ لوگ غلط فہمی یا غلط کاری کا شکار ہوتے ہوں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے ہاں جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہیں اور ان کو ترک کر دینے سے کوئی دینی مقصد فوت نہیں ہوتا' ایسے کاموں کو دوسروں کی غلط فہمی یا غلط کاری کے اندیشے کی وجہ سے چھوڑ دینا چاہئے۔

Marfat.com

مسلمانوں کو تبلیغ دین اور دعوت الی اللہ کے سلسلے میں نہایت گراں قدر پراز حکمت ہدایات دینے کے بعد روئے سخن پھر مشرکین کی طرف پھر گیا ہے اور اگلی آیت کریمہ میں ان کے مطالبات اور ان کی مشرکانہ روش کو بیان کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور انسانی فطرت کے بگاڑ کی انتہاء بھی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۰۹ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ ''اور وہ اللہ کی پکی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا پتہ کہ جب وہ نشانی آجائے گی تو وہ ایمان نہیں لائیں گے''۔

جہد کا معنی انتہائی کوشش اور بھرپور جدوجہد کے ہیں اور یہاں اس لفظ کا استعمال چونکہ قسم کے ساتھ ہوا ہے اس لئے اس کا مفہوم ہوگا پکی قسمیں کھانا۔ گزشتہ آیات کے تفصیلی مطالب اور بھرپور دعوت کو دیکھتے ہوئے مشرکین مکہ کا یہ نیا مطالبہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان کے بگاڑ کی انتہا ہے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی بات سے بھی اثر پذیر ہونے کیلئے تیار نہیں ان کے پہلوؤں میں دل نہیں پتھر معلوم ہوتے ہیں۔ پتھر بھی بعض دفعہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق اللہ کے خوف سے پھٹ جاتے اور ان سے چشمے رواں ہو جاتے ہیں اور بعض دفعہ اللہ کی خشیت سے بلندیوں سے لڑھک جاتے ہیں، لیکن انسانی دلوں کی سنگینی کا عالم یہ ہے کہ داعی اللہ کا نبی ہے جس کی شخصیت پتھروں کو موم کر دیتی ہے اور جس زبان میں وہ دعوت دے رہا ہے وہ قرآن کریم کی زبان ہے یعنی خالق و مالک کا کلام اور پھر اس دعوت کے پیچھے جو ذات داعی کی حیثیت سے کھڑی ہے اس سے بڑھ کر اپنے مخالفین کا غمگسار اور ہمدرد یقیناً اس دھرتی نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ وہ خون جگر پی پی کر انہیں راہ ہدایت دکھا رہا ہے۔ ان کی گالیاں سن کر دعاؤں سے نواز رہا ہے ان کے دکھ اٹھا کر ان کو برے انجام سے بچانا چاہتا ہے لیکن یہ اس کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے نئے نئے پینترے بدل کر نئے نئے مطالبات اس کے سامنے رکھ رہے ہیں ایک سے ایک بڑی نشانی دیکھ چکے ہیں پھر کائنات کا چپہ چپہ اللہ کی نشانیوں سے بھرپور ہے اور یہ نشانیاں ان کے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مزید یہ کہ اللہ کے رسول کی ذات بجائے خود سب سے بڑی نشانی ہے قرآن کریم اپنی معجزانہ شان میں اللہ کا نشان ہے پھر حضور کے معجزات ایک بڑی تعداد میں اب تک یہ لوگ دیکھ چکے ہیں۔ بایں ہمہ! ان کا پھر نشانیوں کیلئے مطالبہ کرنا صاف بتا رہا ہے کہ وہ ہدایت اختیار کرنا نہیں چاہتے بلکہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو بے اثر کرنے کیلئے نئے نئے حربے ایجاد کر رہے ہیں۔ چنانچہ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ قریشی سرداروں نے مطالبہ کیا کہ اگر ہمارے سامنے کوہ صفا سونا بن جائے تو ہم آپ کی نبوت اور رسالت کو مان لیں گے اور مسلمان ہو جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اچھا معاہدہ کرو اگر یہ معجزہ ظاہر ہو گیا تو تم سب مسلمان ہو جاؤ گے۔ انہوں نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کیلئے کھڑے ہو گئے کہ اس پہاڑ کو سونا بنا دیجئے لیکن حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر نازل ہوئے کہ اگر آپ چاہیں تو ہم ابھی اس پورے پہاڑ کو سونا بنا دیتے ہیں لیکن قانون الٰہی کے مطابق اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لائے تو اللہ کا عذاب آئے گا اور سب کو ہلاک کر دیا جائے گا تاریخ بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ تاریخ کی تمام معذب قومیں اسی صورت حال سے دوچار ہوئیں۔ ان کے رسول ان کو دعوت دیتے رہے۔ وہ رسولوں کے ذریعہ معجزات بھی دیکھتی رہیں لیکن آئے دن اپنے منہ مانگے معجزات دیکھنے پر اصرار کرتی رہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے آپ سے ایسے ہی معجزے کا مطالبہ کیا۔ ان کے سامنے پہاڑ پھٹا اس کے اندر سے ایک زندہ اونٹنی برآمد ہوئی لیکن یہ قوم اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائی۔ بالآخر اللہ کے عذاب کا شکار ہوئی کیونکہ پروردگار کا قانون یہ ہے کہ وہ قوموں کو یہ بتانے کیلئے کہ تمہاری طرف آنے والا رسول اللہ ہی کا رسول ہے کبھی کبھی رسول کے ہاتھ پر معجزات ظاہر کرتا ہے لیکن اگر وہ قوم ان معجزات کو دیکھنے کے بعد بھی منہ مانگے معجزات پر اصرار کرتی ہے تو

Marfat.com

انہیں ہر چند اس سے روکا جاتا ہے لیکن اگر ان کا اصرار جاری رہتا ہے تو یہ معجزہ دکھادیا جاتا ہے اور پھر ان کے ایمان نہ لانے کی صورت میں ان پر اللہ کا عذاب آجاتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت حال درپیش ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ حضور اللہ کے آخری رسول ہیں۔ آپ کے بعد انسانی اصلاح کیلئے کوئی رسول نہیں آئے گا۔ انسانی اصلاح کے انقلاب کو حضور کے ہاتھ پر مکمل ہونا ہے۔ اس لئے قریش مکہ کو سمجھایا جارہا ہے کہ تم اتنا بڑا خطرہ انگیخت نہ کرو عذاب کو دعوت نہ دو اس انقلاب کو اپنی تکمیل کی طرف بڑھنے دو۔ آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ انکے مطالبوں پر توجہ نہ فرمائیں بلکہ انکے مطالبوں پر صاف صاف انہیں بتادیں کہ جن نشانیوں کا تم مجھ سے مطالبہ کرتے ہو۔ انکے حوالے سے تمہیں یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ نشانیاں دکھانا یا نہ دکھانا یہ صرف اللہ کا کام ہے کیونکہ تخلیق کے عمل کا وہی مالک ہے دنیا میں ہر تبدیلی اسی کے حکم سے آتی ہے میں تو اللہ کا رسول ہوں' میں نذیر اور بشیر بن کے آیا ہوں' نشانیاں دکھانے والا بن کے نہیں آیا' میرا کام تو یہ ہے کہ میں اللہ کی کتاب اور اسکا دین تم تک پہنچاؤں' تمہارے ذہنی اور قلبی کانٹوں کو چنوں' تمہاری ذہنی آسودگی اور قلبی اطمینان کا سامان کروں اور اپنی شخصیت کا سارا سرمایہ اس راستے میں جھونک دوں کیونکہ دل و دماغ کی تبدیلی ہی سے انسانی تبدیلی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں اور وہ انقلاب مکمل ہوسکتا ہے۔ جس کیلئے میں آیا ہوں تمہیں میری کوئی بات اگر سمجھ نہیں آرہی یا میری کسی بات میں تمہیں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو تو میں اسے دور کرنے کی پوری کوشش کروں گا کیونکہ یہ میری ذمہ داری ہے رہا نشانیاں دکھانا تو یہ سراسر میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ بہت سی نشانیاں دکھاچکا اور آئندہ بھی چاہے گا تو دکھائے گا لیکن اسے مجھ پر ایمان لانے کیساتھ مشروط نہ کرو۔ یہاں رک کر ذرا غور فرمائیے کہ مشرکین مکہ اپنے ایمان کو ان نشانیوں کے ساتھ وابستہ کر رہے تھے اور قسمیں کھا کھا کر یقین بھی دلا رہے تھے اور ان نشانیوں کا ظاہر کردینا اللہ کی قدرت کیلئے نہایت معمولی بات ہے لیکن اسکے مقابلے میں جو کہا جارہا ہے وہ آنحضرت ﷺ اور آپ کی دعوت کیلئے انتہائی مشکلات پیدا کرنے کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اللہ اور اللہ کے رسول کو چونکہ اس دعوت کا یقین پیدا کرنا ہے اور انسانی اصلاح کو مثبت بنیادوں پر اٹھانا ہے۔ اسلئے وہ کوئی ہیجان انگیز صورت حال پیدا کر کے وقتی اصلاح کی صورت پیدا کرنا پسند نہیں کرتا اور مزید یہ بات بھی کہ جنہیں اپنے برسر حق اور سچا ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے وہ اسطرح کے سہاروں کے بل بوتے پر تبلیغ و دعوت کی عمارت استوار نہیں کیا کرتے۔ اسلئے صاف فرمادیا کہ اے پیغمبر کہہ دو کہ یہ آیات اور نشانیاں سراسر اللہ کے قبضے میں ہیں۔ تم مجھے اللہ کا ایک بندہ سمجھ کر اور اس کا رسول جان کر میری دعوت پر غور کرو اور پھر ردو قبول کا فیصلہ کرو۔ اسکے بعد وَمَا یُشۡعِرُکُمۡ سے مسلمانوں سے خطاب فرمایا جارہا ہے۔

مسلمانوں کی خواہش تھی کہ کافروں کو کوئی نشانی دکھادی جائے تا کہ وہ ایمان لائیں:

اس میں مسلمانوں کی ایک دبی خواہش کی طرف اشارہ ہے۔ مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ کی صحبت میں رہ کر جہاں اور بے شمار پاکیزہ صفات اپنے اندر پیدا کیں اور اپنے احساسات کو آنحضرت کے احساسات کا عکس بنایا انہی میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ہم قرآن کریم میں بار بار پڑھ چکے ہیں کہ کفار کے ایمان لانے کی حرص آنحضرت ﷺ میں انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی۔ خود قرآن کریم نے اس کی شہادت دیتے ہوئے فرمایا: حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ ہمارا پیغمبر تمہارے ایمان کا انتہاء درجہ حریص واقع ہوا ہے۔ وہ ہر وقت تمہارے ایمان کی حرص میں مبتلا رہتا ہے اس کیلئے کوششیں کرتا ہے سمجھاتا بجھاتا ہے' خون جگر پی کر اور دکھ اٹھا اٹھا کر دل و دماغ کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے پھر راتوں کو بجائے آرام کرنے کے اللہ کے حضور تمہارے ایمان کیلئے دعائیں کرتا ہے۔ یہ احساس مسلمانوں میں بھی منتقل ہوگیا تھا وہ بھی ہر وقت اسی آگ میں جلتے تھے۔ وہ اس بات کے شدید خواہش مند تھے کہ کاش ہمارے یہ قومی بھائی امت اسلامیہ کا حصہ بن جائیں' کاش یہ لوگ بھی ہمارے قافلے میں شریک ہوکر اپنی دنیا اور آخرت سنوار لیں اس لئے جب بھی ان کی جانب سے کوئی بھی مطالبہ آتا اور وہ کسی نئی نشانی کو دیکھنے کی خواہش کرتے تو باوجود اس کے کہ وہ بار ہا نشانیاں دیکھ بھی چکے لیکن پھر بھی مسلمانوں میں یہ خواہش انگڑائیاں لینے

Marfat.com

کہ ہم مانتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے دعووں میں سچے نہیں لیکن پھر بھی ایک تجربہ کر لینے میں کیا حرج ہے۔ اللہ کریم کیلئے کسی بڑی سے بڑی نشانی کو دکھا دینا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ اگر پہلے متاثر نہیں ہو سکے اب ہو جائیں اور راہ راست اختیار کر لیں یہی پوشیدہ خواہش بعض دفعہ نہایت ادب و احترام لئے ہوئے زبان تک آجاتی اور دبی دبی زبان میں آنحضرت سے گزارشات شروع ہو جاتیں۔

کفار اپنے مطالبے میں مخلص نہیں ہیں:

یہاں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں تمہیں کیا خبر تم تو صرف ان کی چرب زبانی دیکھتے ہو اور ان کا بار بار قسمیں کھانا سنتے ہو لیکن ان کے دلوں کی جو کیفیت ہے اسے تو ہم جانتے ہیں اس لئے ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ اگر انہیں ان کی یہ منہ مانگی نشانی دکھا بھی دی گئی تو وہ ایمان پھر بھی نہیں لائیں گے اس لئے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب کسی نشانی کا نہ دیکھنا نہیں ہے بلکہ اس کا سبب اور ہے۔ جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ اگر ان کا ایمان نشانیوں کو دیکھنے سے وابستہ ہوتا تو اب تک انہوں نے ایک سے ایک بڑھ کر نشانی دیکھی' کائنات کا ایک ایک گوشہ ایسی نشانیوں سے بھرپور ہے جو اللہ کی ذات وصفات پر دلالت کرتی ہیں اور پھر سب سے بڑی نشانی آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے آپ کی جاذب نظر شخصیت' آپ کی من موہنی عادات' آپ کا بے مثل اخلاق' آپ کی نہایت صاف ستھری سیرت' پھر آپ کی محیر العقول صفات' ان میں سے کون سے ایسی چیز ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور نشانی ہو سکتی ہے اور مزید یہ بات بھی کہ خود حضور کے دست اقدس پر اب تک کس قدر معجزات کا ظہور ہو چکا اور جنہیں یہ لوگ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ چکے۔ ان کے سامنے چاند دو ٹکڑے ہوا' ابوجہل کی مٹھی میں کنکریوں نے کلمہ پڑھا' انہوں نے خود پتھروں کو حضور کو سلام کرتے سنا' مختصر سا کھانا ان کے سامنے آنحضرت کی دعا سے سینکڑوں کیلئے کفایت کر گیا' ان کی نظروں کے سامنے آنحضرت سے جانوروں نے سرگوشیاں کیں' لیکن ان میں سے کوئی سی نشانی بھی انہیں اسلام کی طرف مائل نہ کر سکی تو اب جس نشانی کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں یہ محض ان کا ایک فریب ہے۔ جس سے وہ اپنے لوگوں کو مطمئن رکھنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی صفوں میں دراڑیں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا یہ حقیقی سبب نہیں۔ اس لئے اگر اب ان کو یہ نشانی دکھا بھی دی گئی تو وہ ایمان پھر بھی نہیں لائیں گے۔ البتہ اس کا ایک خطرناک نتیجہ نکل سکتا ہے۔ جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جا چکا کہ اس کے نتیجے میں ان پر اللہ کا عذاب اتر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ان کے ایمان نہ لانے کا حقیقی سبب کیا ہے؟ تو اس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۱۱۰

وَ نُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَ اَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝ ''اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو الٹ دیں گے' جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیں گے''۔

سرکشوں پر دعوت و تبلیغ کوئی اثر نہیں کرتی:

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان نہ لانے کا حقیقی سبب بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی سنت اور قانون کو بھی بیان فرمایا ہے۔ حقیقی سبب کا ذکر اس آیت کے آخری جملے میں ہے اور سنت اللہ کا بیان آیت کے شروع میں۔ ہم پہلے اس حقیقی سبب کا ذکر کرتے ہیں ان کے ایمان نہ لانے کا حقیقی سبب ان کا نشانی نہ دیکھنا نہیں ہے بلکہ ان کا وہ طغیان اور سرکشی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنی قوت وقابلیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور پیغمبر کی دعوت ان کے غرور نفس اور ان کے پندار سیادت پر شاق گزرتی ہے جب بھی کوئی قوم اس مرض میں مبتلا ہوتی ہے تو وہ عموماً ہدایت قبول کرنے سے محروم رہتی

Marfat.com

ہے اس کا پندارِ نفس اسے کوئی بات سننے اس پر غور کرنے پھر اسے قبول کرنے سے رکاوٹ بن جاتا ہے اور جب اس کی یہ عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اور وہ کسی طرح بھی اسے بدلنے کیلئے تیار نہیں ہوتی اور وہ اپنی ذات کے گنبد سے باہر نکلنے پر بالکل آمادہ نہیں ہوتی اور اپنے علم و دانش کے خول میں اس طرح اپنے آپ کو بند کر لیتی ہے کہ کوئی بھی سوجھ بوجھ کی بات اور عقل و دانش کا کوئی حصہ کبھی اس کے دل و دماغ میں اترنے نہیں پاتا تو پھر اللہ کا وہ قانون حرکت میں آتا ہے جس کے نتیجے میں ایسا فرد یا ایسی قوم ہدایت سے محروم کر دی جاتی ہے۔ اللہ کے اس قانون کی وضاحت ایک سے زیادہ دفعہ ہم کر چکے ہیں۔ سلسلۂ کلام کی وضاحت کیلئے مختصراً عرض کئے دیتے ہیں کہ اس کائنات میں بھی اور انسان کے اپنے وجود کے اندر بھی خالق کائنات نے اپنی جوان گنت نشانیاں پھیلا دی ہیں جو لوگ ان پر غور کرتے اور اس غور و فکر سے جو بدیہی نتائج ان کے سامنے آتے ہیں ان کو حرزِ جان بناتے ہیں ان کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہ تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود اندھے بہرے بنے اپنے طغیان اور سرکشی میں مگن رہتے ہیں اور قرآن اور پیغمبر کی بار بار تذکیر کے بعد بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولتے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو الٹ دیا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح فکر و نظر کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتے ہیں پھر بڑی سے بڑی نشانی اور بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ یہاں دلوں اور نگاہوں کو الٹنے کا یہی مفہوم ہے کہ وہ سیدھے دیکھنے کی بجائے الٹے دیکھتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کی بجائے الٹی راہ چلتے ہیں ان کی فکر بھی کج روی کا شکار ہو جاتی ہے پھر وہ احول کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویئے ہی سے دیکھتے ہیں۔ ہم اپنی عام زندگی میں بھی بہت دفعہ اس صورت حال کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی جب تک کسی کی محبت کا اسیر رہتا ہے تو وہ محبت اس کی آنکھوں اور دل پر ایسا فریب طاری کر دیتی ہے کہ وہ اس کی برائیوں کو بھی نیکیاں سمجھتا ہے اور اس کی کمزوریاں بھی اسے خوبیاں معلوم ہوتی ہیں لیکن جب کسی حادثے یا واقعہ کی وجہ سے محبت کی جگہ نفرت لے لیتی ہے تو اس شخص کی نگاہوں کا زاویہ اور دل کا سانچہ اس طرح تبدیل ہوتا ہے کہ اب اس کی اچھی باتیں بھی اس کو بری لگنے لگتی ہیں جس کا ایک نظر دیکھ لینا کبھی اس کیلئے راحت بخش ہوتا تھا اب اس کا نام لینا بھی اسے گوارا نہیں ہوتا۔ بقول شاعر

؎ وہی کافر کہ جس کا نام تسکین دل و جاں تھا
ستم ہے اب اسی کے نام سے تکلیف ہوتی ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی صحیح یا غلط راستے کو اختیار کرنے کیلئے بنیادی کردار جو چیز ادا کرتی ہے وہ دل اور نگاہوں کا صحیح سمت میں کام کرنا ہے جب انکی سمت بدل جاتی ہے اور زاویہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے تو پھر ہزار کوشش کرو صحیح بات بھی سمجھ میں آنا مشکل ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی کا منہ کا ذائقہ بگڑ جائے تو اسے شہد بھی کڑوا معلوم ہوتا ہے تو اللہ کے دین اور پیغمبر کی دعوت کے بارے میں جب کوئی قوم طغیانی اور سرکشی میں مبتلا ہو کر اور مسلسل اسکی اسیر رہ کر اپنی دماغی قوتوں، قلبی توانائیوں اور بصیرتوں کو زنگ آلود کر لیتی ہے تو اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے۔ اور اسے ایمان سے محروم کر دیا جاتا ہے اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ غیر مسلموں کے ایمان لانے کی خواہش جو مسلسل آپکے دلوں میں چٹکیاں لے رہی ہے اسکا دکھ مبارک سہی لیکن جن لوگوں کیلئے آپ اس کی خواہش رکھتے ہیں انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے اللہ کے قانون کو دعوت دی اور آخر کار وہ اس کے قانون کی گرفت میں ایسے آئے کہ ایمان سے محروم کر دیئے گئے اس لئے اب اگر انہیں ہزاروں نشانیاں بھی دکھا دی جائیں تب بھی ان کے ایمان لانے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ وہ خود تو اس سے بالکل محروم ہو چکے البتہ اب ان کے ایمان لانے کی ایک ہی شکل ہے جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

Marfat.com

آیت:۱۱۱ وَلَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ الۡمَلٰۤـئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الۡمَوۡتٰى وَحَشَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ كُلَّ شَىۡءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَجۡهَلُوۡنَ O ''اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ان کے آگے گروہ در گروہ اکٹھی کر دی جاتیں، جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا آنکہ اللہ چاہے۔ لیکن ان کی اکثریت مبتلائے جہل ہے''۔

جن کے دل الٹ دیئے جائیں، وہ کسی صورت میں بھی ایمان نہیں لائینگے:

اللہ کی طرف سے چونکہ ان کے طرز عمل کی وجہ سے ان کی ہدایت سے محرومی کا فیصلہ ہو چکا اب صرف وہی نشانی نہیں جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں بلکہ اگر آپ ان پر فرشتے بھی اتار دیں جن کو یہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور قبریں ان کیلئے کھول دیں اور یہ اپنے جس عزیز سے بات کرنا چاہیں اس سے باتیں بھی کریں اور دنیا بھر کی وہ تمام چیزیں یا تمام افراد جنہیں دیکھنے کی یہ خواہش کریں ہم انہیں گروہ در گروہ ان کی آنکھوں کے سامنے بھی لا کھڑا کریں یعنی ان کے مشاہدات کو ہم بے حد و کنار حد تک کھول دیں اور یہ ایسی ایسی نشانیاں ملاحظہ کریں جس کے بعد کسی بھی اپنے مشاہدات پر یقین رکھنے والے کیلئے اللہ کی ذات وصفات اور اس کے رسولوں کی حقانیت کا انکار کرنا مشکل ہو جائے تو یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لئے کہ ایمان کیلئے قبولیت کی جس استعداد کی ضرورت ہے یہ اس سے محروم کئے جا چکے۔ ہاں اب اگر یہ ایمان لا سکتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اللہ یہ چاہے کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں لیکن اللہ کا چاہنا اور اس کی مشیت اس کی حکمت سے الگ نہیں۔ جس بات کو اس کی حکمت چاہتی ہے اسی بات کا تقاضا اس کی مشیت کرتی ہے اور اس کی حکمت نے رد وقبول کے جو پیمانے بنا دیئے ہیں اور مشیت کے جو ضابطے مقرر کر دیئے ہیں ظاہر ہے مشیت اس کے خلاف کبھی کام نہیں کرتی ہم بار بار یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ ایمان اسے نصیب ہوتا ہے، جس کے دل میں ایمان لانے کی خواہش ہوتی ہے پھر وہ اس خواہش کو بروئے کار لانے کیلئے محنت کرتا ہے اور اللہ سے توفیق مانگتا ہے لیکن جو آدمی ان بنیادی صفات سے عاری ہو جاتا ہے اللہ کی مشیت کبھی اس کے حسب حال نہیں ہوتی۔ اس کو بالکل اسی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ نے انسانی اعضاء میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا فرمائی ہے۔ ہاتھ میں پکڑنے کی طاقت ہے' آنکھ میں دیکھنے کی' کان میں سننے کی' ناک میں سونگھنے کی اور دل میں دھڑکنے کی۔ لیکن یہ طاقت اس وقت تک کام کرتی ہے جب تک ان اعضاء کو کام کرنے کا موقع دیا جائے اور آمادہ حرکت رکھا جائے اور اگر ان میں سے کوئی سا عضو بھی معطل کر کے رکھ دیا جائے۔ مثلاً ہاتھ باندھ دیا جائے تو ایک عرصہ گزرنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہاتھ مفلوج ہو گیا ہے کیونکہ اس کے کام کرنے کی صلاحیت کا دارومدار اس بات پر تھا کہ اسے نہ صرف کام کرنے دیا جاتا بلکہ صحیح طریقے سے اور حدود میں رہ کر اس سے کام لیا جاتا۔ یہی حال انسان کے دل و دماغ کی قوتوں کا ہے جب تک ان سے صحیح طریقے سے اور فطری حدود میں رہ کر کام لیا جاتا ہے تو وہ اللہ کو اللہ کے رسولوں کو اور صراط مستقیم کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتا لیکن جب سرکشی اور طغیان سے ان کا زاویہ بدل دیا جاتا ہے اور ان کی نہج تبدیل کر دی جاتی ہے تو پھر اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے تو اللہ کی مشیت ان کی ایمان سے محرومی کا فیصلہ کر دیتی ہے اب ان لوگوں کی محرومی کا چونکہ فیصلہ ہو چکا اب یہ اپنے طور پر تو کبھی ایمان نہیں لے سکتے اب ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا قانون واپس لے کر زبردستی ان کو ایمان سے نواز دے اور یہ ظاہر ہے اللہ کی مشیت کے خلاف ہے وہ جس طرح کسی کو زبردستی کافر نہیں بناتا اسی طرح وہ کسی کو زبردستی ایمان بھی نہیں دیتا لیکن لوگ چونکہ ان حقائق سے بے خبر ہیں اس لئے وہ اپنی جہالت سے قسم قسم کی باتیں کہتے اور سنتے ہیں لیکن اگر یہ حقیقت پیش نظر رہے تو پھر وہ ہر چیز کو اس کے محمل میں رکھنے کا ہنر سیکھ جائیں۔

یہاں چونکہ بار بار مشیت کا لفظ استعمال ہوا ہے اس سے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارے قارئین اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی نہ کر جائیں اور

Marfat.com

کہیں وہ مشیت کو اللہ کی رضا کے معنی میں نہ لینے لگیں اس لئے ہم ایک محقق کے قلم سے اس کی وضاحت مستعار لیتے ہیں۔

مشیت اور رضا کے مفہوم میں فرق:

قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضا میں بہت بڑا فرق ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ کسی چیز کا اللہ کی مشیت اور اس کے اذن کے تحت رونما ہونا لازمی طور پر یہ معنی نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی واقعہ کبھی صدور میں نہیں آتا جب تک اللہ اس کے صدور کا اذن نہ دے اور اپنی عظیم الشان اسکیم میں اسکے صدور کی گنجائش نہ نکالے اور اسباب کو اس حد تک مساعد نہ کر دے کہ وہ واقعہ صادر ہو سکے۔ کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا قتل، کسی ظالم و مفسد کا ظلم وفساد اور کسی کافر و مشرک کا کفر و شرک اللہ کی مشیت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اسی طرح کسی مومن اور کسی متقی انسان کا ایمان وتقویٰ بھی مشیت الٰہی کے بغیر محال ہے۔ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر مشیت کے تحت رونما ہوتے ہیں۔ مگر پہلی قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے اور اس کے برعکس دوسری قسم کے واقعات کو اس کی رضا اور اس کی پسندیدگی و محبوبیت کی سند حاصل ہے۔ اگرچہ آخر کار کسی خیر عظیم ہی کیلئے فرمانروائے کائنات کی مشیت کام کر رہی ہے لیکن اس خیر عظیم کے ظہور کا راستہ نور و ظلمت، خیر و شر اور صلاح و فساد کی مختلف قوتوں کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما ہونے ہی سے صاف ہوتا ہے۔ اسلئے اپنی بزرگ تر مصلحتوں کی بنا پر وہ طاعت اور معصیت، ابراہیمیت اور نمرودیت، موسویت اور فرعونیت، آدمیت اور شیطنت، دونوں کو اپنا اپنا کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس نے اپنی ذی اختیار مخلوق (جن اور انسان) کو خیر اور شر میں سے کسی ایک کے انتخاب کر لینے کی آزادی عطا کر دی ہے۔ جو چاہے اس کارگاہ عالم میں اپنے لئے خیر کا کام پسند کرے اور جو چاہے شر کا کام۔ دونوں قسم کے کارکنوں کو، جس حد تک خدائی مصلحتیں اجازت دیتی ہیں، اسباب کی تائید نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کی رضا اور اس کی پسندیدگی صرف خیر ہی کیلئے کام کرنے والوں کو حاصل ہے اور اللہ کو محبوب یہی بات ہے کہ اسکے بندے اپنی آزادیِ انتخاب سے فائدہ اٹھا کر خیر کو اختیار کریں نہ کہ شر کو۔

اس کے ساتھ یہ بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ دشمنانِ حق کی مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مشیت کا بار بار حوالہ دیتا ہے اس سے مقصود دراصل نبی ﷺ اور آپ کے ذریعہ سے اہل ایمان کو یہ سمجھانا ہے کہ تمہارے کام کی نوعیت فرشتوں کے کام کی سی نہیں ہے جو کسی مزاحمت کے بغیر احکامِ الٰہی کی تعمیل کر رہے ہیں۔ بلکہ تمہارا اصل کام شریروں اور باغیوں کے مقابلہ میں اللہ کے پسند کردہ طریقہ کو غالب کرنے کیلئے جدوجہد کرنا ہے۔ اللہ اپنی مشیت کے تحت ان لوگوں کو بھی کام کرنے کا موقع دے رہا ہے جنہوں نے اپنی سعی وجہد کیلئے خود اللہ سے بغاوت کے راستے کو اختیار کیا ہے اور اسی طرح وہ تم کو بھی جنہوں نے طاعت و بندگی کے راستے کو اختیار کیا ہے، کام کرنے کا پورا موقع دیتا ہے۔ اگرچہ اس کی رضا اور ہدایت و رہنمائی اور تائید و نصرت تمہارے ہی ساتھ ہے کیونکہ تم اس پہلو میں کام کر رہے ہو جسے وہ پسند کرتا ہے لیکن تمہیں یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی فوق الفطری مداخلت سے ان لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دے گا جو ایمان نہیں لانا چاہتے یا ان شیاطین جن وانس کو زبردستی تمہارے راستہ سے ہٹا دے گا جنہوں نے اپنے دل و دماغ اور دست و پا کی قوتوں کو اور اپنے وسائل و ذرائع کو حق کی راہ روکنے کیلئے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نہیں، اگر تم نے واقعی حق اور نیکی اور صداقت کیلئے کام کرنے کا عزم کیا ہے تو تمہیں باطل پرستوں کے مقابلہ میں سخت کشمکش اور جدوجہد کر کے اپنی حق پرستی کا ثبوت دینا ہوگا۔ ورنہ معجزوں کے زور سے باطل کو مٹانا اور حق کو غالب کرنا ہوتا تو تمہاری ضرورت ہی کیا تھی، اللہ خود ایسا انتظام کر سکتا تھا کہ دنیا میں کوئی شیطان نہ ہوتا اور کسی شرک و کفر کے ظہور کا امکان نہ ہوتا۔

گزشتہ آیات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے اگر بیک نظر مجموعی شکل میں دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں

Marfat.com

اس وقت اسلامی دعوت اور جاہلیت قدیمہ میں سخت کشمکش جاری ہے۔ ظلم اور اذیت کی چکی پوری شدت سے چل رہی ہے ایک طرف آنحضرت ﷺ اور مسلمان تبلیغ و دعوت میں پورا زور صرف کر رہے ہیں اور دوسری طرف مخالفین ان کا راستہ روکنے اور اس نئی تحریک کے آگے بڑھنے کے امکانات کو ختم کرنے کیلئے ہر حربہ استعمال کرنے پر تلے ہوئے ہیں اس لئے صرف اذیت اور مخالفت پر ہی اکتفا نہیں کیا جا رہا بلکہ لوگوں کو اپنے سابقہ خیالات پر مطمئن رکھنے کیلئے بار بار نشانیاں دکھانے کا مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے اور پھر آئے دن اس کیلئے نئے نئے اسالیب اختیار کئے جا رہے ہیں اور اپنے ان مطالبات کو بظاہر اس شد و مد سے بیان کیا جا رہا ہے کہ مسلمان بھی بعض دفعہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ان کے دل میں بھی خیال آتا ہے کہ شاید یہ اب جس نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں اسے دیکھ کر ہی راہ راست پر آجائیں۔ اس لئے قرآن کریم مخالفین کے درپردہ عزائم کو ساتھ ساتھ بے نقاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو اصل صورت حال سے آگاہ کر رہا ہے اور بالواسطہ انہیں موجودہ حالات میں اپنی مخلصانہ مساعی کے بل بوتے پر راستہ نکالنے کی ترغیب دے رہا ہے لیکن حالات چونکہ بہت بپھرے ہوئے ہیں اس لئے بار بار مختلف طریقوں سے مسلمانوں کی تسلی کا سامان بھی کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ پیش نظر آیات میں اس وقت کے معروضی حالات میں جس طرح کی تشفی اور اطمینان درکار تھا اس کا ایک خاص طریقے سے ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۱۲-۱۱۳ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ○ ''اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے اشرار کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ ایک دوسرے کو پرفریب باتیں القا کرتے ہیں' دھوکہ دینے کیلئے اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے۔ تو تم ان کو ان کی انہی افترا پردازیوں میں پڑے رہنے دو اور ایسا اس لئے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور تا کہ وہ اس کو پسند کریں اور تا کہ جو کمائی انہیں کرنی ہے' وہ کر لیں''۔

ہر کام اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے:

اس وقت کے حالات میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کیلئے جو سب سے تکلیف دہ بات محسوس ہوتی ہوگی وہ یقیناً یہ ہوگی کہ اللہ کے آخری نبی اپنی دلنواز شخصیت اور قرآن کریم جیسے معجزانہ کلام کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ معدودے چند لوگوں کے سوا کوئی سننے کا روادار نہیں ہوتا۔ بلکہ اشراف قریش نے تہیہ کر لیا ہے کہ لوگوں کو اپنے دام فریب سے نکلنے نہیں دیں گے اور اس دعوت کی طرف کسی کو بڑھنے کا راستہ نہیں دیں گے۔ جبکہ ان کے پاس سوائے جاہلیت قدیمہ کی چند رسوم کے اور کچھ بھی نہیں۔ ان کے پاس کوئی علم ہے نہ کوئی نظریہ۔ نہ وہ اپنے تئیں ایسے اخلاق کے حامل ہیں جس سے لوگ گرویدہ ہوں لیکن پھر بھی باہمی ہزاروں اختلافات کے باوجود اس نوزائیدہ دعوت کے خلاف سب اکٹھے ہو گئے۔ اب ان کو نہ عربوں کی عالی ظرفی کا پاس ہے نہ انہیں قبیلوں میں باہمی رواداری کا۔ وہ اس شدت پر اتر آئے ہیں کہ مسلمان حفاظت خود اختیاری کے طور پر شعب ابی طالب میں محصور ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان سب نے ایکا کر لیا ہے کہ وہ اسلام کی اس دعوت کو کسی طور بھی آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ان احساسات کے پیش نظر انہیں تسلی دی جا رہی ہے کہ مخالفت کا یہ طوفان جس طرح روز بروز شدت سے بڑھتا جا رہا ہے یہ تاریخ میں پیش آنے والا پہلا واقعہ نہیں تم انبیاء کرام کی تاریخ کا مطالعہ کر کے دیکھو تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ جب بھی اللہ کا کوئی نبی دنیا میں مبعوث ہوا ہے تو ہر نبی کی امت دعوت نے اس کے ساتھ اور اس کی دعوت کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک کیا ہے۔ زندگی کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو اس راستے میں نبی اور اس پر

Marfat.com

ایمان لانے والوں نے برداشت نہ کیا ہو اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے مخاطب لوگ اپنے سارے اختلافات کے باوجود اس دعوت الی اللہ کی مخالفت میں ہمیشہ یکجا ہوتے رہے ہیں۔ اس لئے آج جو کچھ آپ کے ساتھ پیش آ رہا ہے یہ تو اس راستے کی لازمی سنت ہے۔ کیونکہ

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے وہ درس صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

یہ تاریخ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اللہ کے نبی اور ان کے راستے پر چلنے والے مصلحین ہمیشہ انسانی بھلائی اور ان کی دنیا و آخرت سنوارنے کیلئے ان کی اصلاح کا کام شروع کرتے ہیں اور اس کیلئے وہ ہر طرح ایثار اور قربانی سے کام لیتے ہیں۔ زندگی کی بڑی سے بڑی صعوبت برداشت کرتے ہیں۔ بعض دفعہ پوری زندگی محض لوگوں کی ہمدردی اور غمگساری میں اس طرح گزار دیتے ہیں کہ کوئی ایک رات بھی انہیں آرام گزارنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن قوم کی طرف سے ان کو جو جواب ملتا ہے وہ ایسا حیران کن ہوتا ہے کہ تاریخ کا طالب علم اس کی کوئی بھی توجیہ کرنے سے عاجز رہتا ہے۔ وہ انہیں بھلائی کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کی قوم انہیں پتھر مارتی ہے وہ انہیں دعاؤں سے نوازتے ہیں اور قوم انہیں گالیاں دیتی ہے وہ ان کے گھر اور ان کی آبادیاں بسانا چاہتے ہیں اور یہ ان کے گھر کھود ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں حقوق و فرائض سے آشنا کر کے ان کی زندگی ان کیلئے آسان کر دیں اور اللہ سے ان کا رشتہ جوڑ کر آخرت میں ان کی سرخروئی کا امکان پیدا کر دیں لیکن قوم اس کے جواب میں ان کی جان لینے کے درپے ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ انہیں قتل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ یہ وہ رویہ ہے جو تاریخ ایک امر واقعہ کے طور پر ہمارے سپرد کرتی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ آپ لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے یہ کوئی نیا نہیں لوگوں نے ہمیشہ پہلے بھی ایسا ہی کیا ہے آج بھی وہ ایسا ہی کریں گے۔ اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ ان کے اس رویے کو پروردگار نے اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے اشرار کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے۔ پروردگار کا اسے اپنی طرف منسوب کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ہمارا بنایا ہوا ایک فطری قانون ہے جس پر ہمیشہ عمل ہوتا رہا ہے اور جو کام ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق ہوتا ہے دوسرے لفظوں میں اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ ہم نے کیا ہے یعنی ہم نے قانون بنا دیا ہے کہ جس آدمی یا جس قوم نے اپنے سیرت و کردار کو بگاڑ لیا ہے اور وہ یکسر اللہ سے اپنا تعلق توڑ چکے ہیں اور انسانیت ان کے اندر قریب المرگ ہے یا مر چکی ہے۔ ایسے لوگ کبھی بھی اللہ کے نبی کی دعوت پر فوری طور پر لبیک نہیں کہہ سکتے۔ جو آدمی ایک خاص سمت میں راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہو آپ کیلئے یہ بات آسان نہیں کہ آپ اس کا راستہ بدل سکیں۔ سگریٹ نوشی کوئی ایسی عادت نہیں جس کے بغیر زندگی گزارنا دشوار ہو لیکن آپ کسی بھی سگریٹ پینے والے سے آسانی سے اس کی یہ عادت چھڑا نہیں سکتے۔ گالی دینا' جھوٹ بولنا' شیخی بگھارنا' دل آزاری کرنا' دوسرے کی تحقیر کرنا ایسے کام ہیں جنہیں کوئی بھی ہوش مند آدمی پسند نہیں کر سکتا لیکن جو لوگ ان عادات کے رسیا ہو گئے ہیں آپ اگر چاہیں کہ ان سے یہ عادات چھڑوا دیں آپ کو اس کیلئے بڑی طویل محنت کرنا پڑے گی اور اللہ کی طرف سے نازل کردہ دین تو انسان سے پوری زندگی تبدیل کرنے کا تقاضہ کرتا ہے وہ اس کے نظریات کو بدلتا ہے اس کے احساسات کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے طور اطوار کو صحیح سمت دیتا ہے اس کے معاملات میں خوش اطواری پیدا کرتا ہے اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی تہذیب' تمدن اور ثقافت کے حوالے سے بالکل ایک نئی صورت اختیار کرتی ہے۔ اندازہ فرمائیے اتنی بڑی تبدیلی کی دعوت کو کس طرح آسانی سے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے جب بھی یہ تبدیلی کی دعوت کسی بھی قوم کو دی گئی ہے تو اس نے اس دعوت اور اس دعوت لانے والے کا راستہ روکنے کی کوشش کی ہے اور یہ چونکہ ایک فطری پراسس ہے اس لئے اللہ نے اسے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے لیکن اس کے ضمن میں مسلمانوں سے بات بھی کہی جا رہی ہے کہ یہ تو اس دعوت کے راستے کی ابتدائی مشکلات ہیں لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ اللہ نے سچائی اور خیر کی فطرت میں غلبہ

Marfat.com

فرمایا ہے اگر سچائی کی دعوت دینے والے استقامت اور اخلاص سے ایثار اور قربانی کا حق ادا کرتے ہوئے مسلسل کام کرتے رہیں تو ایک وقت آتا ہے جب حق غالب ہو کے رہتا ہے اس لئے مسلمانوں کے ساتھ اب جو کچھ ہو رہا ہے یہ اس راستے کا ایک لازمی تقاضہ ہے لیکن اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان جس طرح قدم قدم آگے بڑھ رہے ہیں یقیناً ایک بہتر مستقبل ان کے انتظار میں ہے۔ مزید یہ بھی فرمایا جا رہا ہے کہ تم ان مخالفین کے طریق مخالفت کو پہچانو انبیاء کی تاریخ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ آپس میں چاہے کتنا بھی اختلاف رکھتے ہوں یہ دعوت اسلامی کی مخالفت میں سب اکٹھے ہو جایا کرتے ہیں اور پھر طرح طرح کے طریقے سے ایسا پرفریب انداز اختیار کرتے ہیں جس سے عوام کو صحیح بات سمجھنا آسان نہیں رہتا اور یہ پرفریب باتیں وہ مسلسل ایک دوسرے کو منتقل بھی کرتے رہتے ہیں یعنی ایک دوسرے کی تائید میں زبان وقلم کا استعمال جاری رکھتے ہیں اور آئے دن اللہ کے نبیوں اور ان پر ایمان لانے والوں کے بارے میں ایسے ایسے الزامات اٹھاتے ہیں اور اس طرح ان کی کردار کشی کرتے ہیں اور ایسی ایسی باتیں ان کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ جس سے بے خبر عوام ان کی طرف سے زیادہ سے زیادہ بدگمان ہو جاتے ہیں اور انسانی فطرت یہ ہے کہ جب ایک آدمی بدگمانیوں کا ہدف بن جاتا ہے اور بدنامیاں اور رسوائیاں کامیابی سے اس کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں تو پھر اسے اپنی بات لوگوں تک پہنچانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مشرکین مکہ نے بھی آنحضرت ﷺ کے خلاف ایسے ہی الزامات کا ایک طوفان اٹھا رکھا تھا۔ حضور جب شرک کی تردید کرتے تو وہ لوگوں کو یہ باور کراتے کہ دیکھو یہ شخص تمہارے آباؤ اجداد کو مشرک کہتا ہے۔ جب آپ ان کے اس رویے پر تنقید فرماتے کہ تم نے اپنے طور پر حلت وحرمت کا اختیار کس طرح سنبھال لیا ہے کہ جس جانور کو چاہتے ہو حلال کر دیتے ہو جس کو چاہتے ہو حرام کر دیتے ہو۔ تو قریش مکہ عوام کو یہ کہہ کر گمراہ کرتے کہ دیکھو یہ شخص کس طرح تمہارے مذہبی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے اور کس طرح تمہارے دین کو بگاڑ رہا ہے۔ اور پھر اس معاملے میں مشرکین مکہ اکیلے نہیں تھے بلکہ اہل کتاب بھی برابر ان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ عربوں کو اُمی کہہ کر اور جاہل بتا کر ہمیشہ ان کی تنقیص کرتے تھے اور کسی طرح بھی ان کو قابل ذکر نہیں سمجھتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں وہ برابر ان کو نئی نئی باتیں سجھاتے اور پوری طرح سے ان کی پشت پناہی کرتے۔ آج کے دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی اللہ کا بندہ قومی سطح پر ہمہ گیر اصلاح کا کوئی پروگرام لے کر اٹھتا ہے تو کس طرح ہمارے دانشور باہمی اختلافات کے باوجود اس کی مخالفت میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ اس کی کردار کشی میں لگ جاتے ہیں۔ ایک پانچواں کالم حرکت میں آتا ہے جو تمام مخالفین میں واسطہ شر کا کام دیتا ہے اور نئے نئے اتہامات اور نئے نئے الزامات اختراع کرتا ہے۔ اس طرح سے اس پروگرام کو ناکامی سے دوچار کر دیا جاتا ہے اور اس میں جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اسی کو یہاں زخرف القول قرار دیا گیا ہے یعنی لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے پرفریب باتوں کا ایک جال بچھا دیا جاتا ہے۔

آیت کریمہ کے آخر میں پھر اسی بنیادی حقیقت کو جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے تبلیغ ودعوت کے نکتہ نگاہ سے دوبارہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے یعنی وہ جو کچھ کر رہے ہیں اور جس طرح اپنی عاقبت کی بربادی کیلئے رات دن لگے ہوئے ہیں یہ سب کچھ وہ اپنے طور سے کبھی نہیں کر سکتے تھے اللہ نے ان کو اس کیلئے مہلت دی اور ان کو یہ دی ہوئی مہلت اصل میں اسلامی قوتوں کیلئے مہمیز کا کام دیتی ہے یعنی جب وہ ایک غلط کام کیلئے اور صحیح کام کو ناکام کرنے کیلئے اس قدر مساعی بروئے کار لا رہے ہیں تو پھر اے مسلمانو! تم جو اللہ کے دین کے غلبے کیلئے کوشاں ہو تمہیں ان کے مقابلے میں اسی قدر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح باد مخالف کی تندی عقاب کو اونچا اڑنے پر مجبور کرتی ہے اور جب نوا کو اثر اندازی میں دشواری پیدا ہوتی ہے تو اسے مزید تیز ہونا پڑتا ہے اسی طرح اسلامی قوتوں کو جب ان مخالفانہ قوتوں سے سخت مقابلے کا سامنا ہوتا ہے تو انہیں بھی اپنی کوششوں میں بیش

Marfat.com

ازبیش تیزی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن رہی یہ بات کہ جن کو برائی پھیلانے کی مہلت ملی ہے وہ اپنے کام سے رکتے ہیں یا نہیں مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ جس تہمت طرازی کے کام میں لگے ہوئے ہیں انہیں ان کا کام کرنے دو۔اس سے آپ دل شکستہ نہ ہوں انہیں اپنا کام کرنا ہے اور آپ کو اپنا کام۔وہ اپنے کام کی سزا بھگتیں گے اور آپ کے کام کی جزا اللہ کے یہاں بہت بڑی ہے اور مزید یہ بات بھی کہ انجام کار غلبہ آپ کی دعوت کو ملے گا وہ آخر نا کام و نامراد ہو کر رہیں گے اس کے بعد کی آیات کریمہ میں ایک مزید حقیقت سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے کہ اسلامی دعوت کی مخالفت کرنے والوں کو اللہ جو مہلت عمل دیتا ہے وہ اس لئے بھی ہوتی ہے تا کہ جتنے ان جیسے برے لوگ ہیں جن کے دل و دماغ ان کی طرح بگڑ چکے ہیں اور جنہوں نے صرف دنیا کو اپنا مقصد زندگی بنالیا ہے اور انہیں اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کہ ایک دن انہیں موت بھی آنی ہے اور جواب دہی کیلئے اللہ کے حضور حاضر بھی ہونا ہے۔وہ لوگ باطل کی دعوت دینے والوں اور اسلامی دعوت کی مخالفت کرنے والوں کا ساتھ دیں اور ان کی دعوت پر ان کے دل مائل ہوں اور وہ ان جیسی زندگی کو پسند کر کے اپنی اس روش پر مزید ثابت قدم ہو جائیں جو چند روزہ زندگی کے فوائد جمع کرنے کیلئے انہوں نے اختیار کر رکھی ہے۔جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی دعوت دینے والوں کیلئے امکانات کھلے رکھے ہیں اور لوگوں کیلئے اس بات کے امکانات مہیا کئے ہیں کہ وہ اس دعوت کو قبول کریں اور اپنی دنیا اور آخرت کا سامان کرلیں اور پھر ایک حق کا قافلہ بن کر اللہ کی زمین پر حق کو غالب کر دیں۔یہی سارے امکانات اہل باطل کو بھی اللہ نے دے رکھے ہیں اس طرح یہ ایک برابر کا مقابلہ جاری رہتا ہے اور جیت اس کا مقدر بنتی ہے جو حق کا راستہ اختیار کر کے اخلاص عمل کا ثبوت دے کر راہ کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اللہ کو راضی کر لیتا ہے۔اس طرح حق غالب آجاتا ہے اور باطل سرنگوں ہو جاتا ہے۔

اندازہ فرمایئے! کس طرح راہ حق کے مسافروں کیلئے ایک ایک حکمت واضح کی جارہی ہے راستے میں پیش آنے والی مشکلات پر قابو پانے کیلئے ان کی ہمتوں کو توانا کیا جارہا ہے اور صاف صاف یہ بات کھول کر بیان کی جارہی ہے کہ دنیا کے بگڑے ہوئے لوگ ایک قافلہ بن کر تمہاری مخالفت میں اٹھیں گے اور ہر ممکن طریقے سے تمہارا راستہ روکنے کی کوشش کی جائے گی۔تمہاری کامیابی کا راستہ صرف اس عزم جواں میں پوشیدہ ہے جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ کی زبان سے کرایا جارہا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۱۴-۱۱۵ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ○ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ ”کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور منصف ڈھونڈوں‘ درآنحالیکہ وہی ہے‘ جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری مفصل اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ جانتے ہیں یہ تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے‘ حق کے ساتھ۔تو تم ہرگز شک میں پڑنے والوں میں سے نہ ہو۔جیو اور تمہارے رب کی بات پوری ہوئی ٹھیک ٹھیک اور عدل کے ساتھ اور کوئی نہیں جو اس کی باتوں کو بدل سکے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے“۔

منصف صرف اللہ تعالیٰ ہے:

استدلال کے مختلف طریقوں سے اسلامی دعوت اور توحید کی حقانیت کو ثابت کرنے اور پیش کردہ مطالبات کا جواب دینے کے بعد نہایت استقلال اور استقامت کے ساتھ آنحضرت ﷺ سے یہ کہلوایا جارہا ہے کہ اب جبکہ پوری طرح حق واضح ہو چکا تو کیا میرے لئے اس بات کا امکان موجود ہے کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو یہ حق دوں کہ وہ مجھے بتائے کہ مجھے زندگی کس طرح گزارنی ہے یعنی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے کیا اسلوب ہو

Marfat.com

چاہئے۔اس کیلئے آئین اور قانون کیا ہو اس کی حلت و حرمت کا حق کسے حاصل ہو کون ہے جو میری زندگی کے ہر موڑ پر میری رہنمائی کرے؟ ظاہر ہے کہ یہ حق اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں دیا جاسکتا۔ وہی ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معاملات میں حکم اور منصف بننے کا حق رکھتا ہے۔اور پھر اس کا مزید کرم یہ ہے کہ اس نے اپنا یہ حق ثابت کرنے اور اپنی رہنمائی کو واضح کرنے کیلئے ایک مفصل کتاب بھی نازل کر دی ہے اس کتاب کو دیکھتے ہوئے ایک غیر جانبدار آدمی جسے عصبیت نے اندھا نہ کر رکھا ہو وہ کبھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی ہو سکتی ہے اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جس پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے وہ اللہ کا پیغمبر نہیں کیونکہ اس کتاب کی عجیب شان ہے کہ اس کی زبان اور اس کی پیش کردہ تعلیم اپنے اندر ایک ایسا اعجاز رکھتی ہے جس نے تمام جن وانس کو گنگ کر کے رکھ دیا ہے ہر جاننے اور پہچاننے والا اسے پڑھ کر یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کتاب کی ایک آیت کی مثل لانا بھی انسانی طاقت سے ماوراء ہے تو جس کتاب کی شان یہ ہو اس کے نازل ہو جانے کے بعد میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم کیسے تسلیم کرلوں۔اس کتاب کی یہاں چند صفات بیان کی گئی ہیں۔

1- وہ اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ظاہر ہے جس کتاب میں یہ اعجازی شان پائی جاتی ہو وہ اللہ ہی کی طرف سے ہی نازل ہو سکتی ہے۔

2- وہ ایک کتاب کامل اور کتاب معجز ہے کہ سارا جہاں اس کے مقابلے سے عاجز ہے۔

3- تمام اہم اور اصولی مضامین اس میں بہت مفصل اور واضح انداز میں بیان کر دیئے گئے ہیں کہ زندگی کا کوئی حل طلب مسئلہ اسکی تعلیم سے باہر نہیں رہا۔

4- یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اہل کتاب کا وہ گروہ جو آخرت پر یقین رکھتا ہے اور اپنی کتاب کی تعلیم پر عامل ہے وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور یہی اہل کتاب کا وہ گروہ ہے جو آنحضرت ﷺ پر ایمان بھی لایا۔

قرآن کریم کی یہ صفات بیان کرنے کے بعد رسول کریم ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہوں حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ حضور تو کبھی بھی شبہ کرنے والوں میں سے نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ نہ میں نے کبھی شک کیا اور نہ کبھی سوال کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سوال اگرچہ آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن روئے سخن دوسروں کی طرف ہے اور مقصود اس سے یہ بتانا ہے کہ قرآن کریم کی صداقت کے بارے میں اگر آنحضرت ﷺ بھی شبہ کریں تو اللہ کے نزدیک وہ بھی قابل قبول نہیں تو دوسرا کوئی کس شمار قطار میں ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں اس کتاب کی قدر و عظمت کیا ہے۔اس کے بعد اگلی آیت میں قرآن کریم کی اور دو صفات بیان ہوئی ہیں یعنی قرآنِ کریم ایک کامل کلام ہے۔سچائی میں بھی اور عدل میں بھی تو یہاں جو یہ فرمایا جارہا ہے کہ تیرے رب کے کلمے سچائی اور عدل میں پورے ہیں مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم ان دونوں پہلوؤں میں ہر لحاظ سے مکمل ہے۔قرآن کریم کے کل مضامین دو قسم کے ہیں ایک وہ جن میں تاریخ عالم کے عبرت آموز حالات و واقعات اور نیک اعمال پر وعدہ اور برے اعمال پر سزا کی وعید بیان کی گئی ہے اور دوسرے وہ جن میں انسان کی صلاح و فلاح کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ان دونوں قسموں کے متعلق قرآن مجید میں یہ صفتیں بیان ہوئیں صدقاً و عدلاً۔صدق کا تعلق پہلی قسم سے ہے یعنی جتنے واقعات و حالات یا وعدہ و وعید قرآن میں بیان کئے گئے ہیں وہ سب سچے اور صحیح ہیں ان میں کسی غلطی کا امکان نہیں اور عدل کا تعلق دوسری قسم یعنی احکام سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام عدل پر مبنی ہیں اور لفظ عدل کا مفہوم دو معنی کو شامل ہے۔ایک انصاف جس میں کسی پر ظلم اور حق تلفی نہ ہو اور دوسرے اعتدال کہ نہ بالکل انسانی نفسانی خواہشات کے تابع ہوں اور نہ ایسے جن کو انسانی جذبات اور اس کے فطری ملکات برداشت نہ کر سکیں۔مزید فرمایا کہ قرآنی احکام کی ایک صفت یہ ہے کہ کوئی ان کو بدلنے والا نہیں۔بدلنے کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی اس میں غلطی ثابت کرے اس لئے بدلا جائے اور یا یہ کہ کوئی دشمن

Marfat.com

زبردستی اس کو بدل ڈالے۔ یہ دونوں باتیں قرآنی احکام میں ممکن نہیں۔ اس میں غلطی کا امکان اس لئے نہیں کہ یہ احکام دینے والا اللہ تعالیٰ ہے جس کا علم اس قدر مکمل ہے کہ وہ ہر زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور انسانی فطرت اور احساسات پر ان کے پڑنے والے اثرات کو بتمام وکمال جانتا ہے۔ اس کا علم انسانی حدود میں محدود نہیں اور نہ انسانی جذبات سے متاثر ہونے والا ہے اور نہ اس پر وقت کے اثرات کا سایہ پڑتا ہے جبکہ انسانی قوانین اور دساتیر کا حال یہ ہے کہ آج ایک قانون بنتا ہے ایک خاص وقت گزرنے کے بعد قانون بنانے والے اسے واپس لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی پارلیمانی تاریخ کو پڑھ کر دیکھ لیجئے خاص طور پر مغربی ممالک میں جن کو اپنے قانون اور فلسفہ قانون پر بڑا ناز ہے قدم قدم پر آپ کو اس کی مثالیں ملیں گی۔

حقائق اور صداقتوں پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور ہزار بچتے ہوئے بھی جس کے اثر سے بچنا بعض دفعہ مشکل ہو جاتا ہے وہ انسانی آراء کی قلت وکثرت ہے اس کا ذکر اگلی آیات کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۱۶-۱۱۷ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ ''اور اس زمین والوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اگر تم نے ان کی بات مانی تو وہ تمہیں خدا کے راستے سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ یہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔ بے شک! تیرا رب خوب جانتا ہے اُن کو جو اس کے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں اور خوب جانتا ہے اُن کو جو ہدایت یاب ہیں''۔

مسلمانوں کیلئے صرف وحی الٰہی پر مشتمل علم ہی قابلِ بھروسہ ہے:

انسانی علم کی کمزوری یہ ہے کہ وہ علم کی افادیت اور اسکی صداقت کا پوری طرح قائل ہے لیکن عجیب بات ہے کہ پوری طرح اس پر بھروسہ نہیں کرتا وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ کسی بڑی سے بڑی حقیقت کو اکثریت قبول نہیں کر رہی تو وہ بجائے حقیقت کا ساتھ دینے کے اکثریت کے ساتھ چلنا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ جب بھی کوئی حقیقت اور صداقت بگڑے ہوئے لوگوں کے سامنے آتی ہے تو وہ نہ صرف کہ اسکا خیر مقدم نہیں کرتے بلکہ اسکی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سوسائٹی کے لیڈر اور قوم کے اشرار اسلئے انکی پشت پناہی کرنے لگتے ہیں کہ اس سے ان کو اپنا مفاد خطرے میں نظر آتا ہے اور عوام اسلئے اسکو قبول کرنے سے ہچکچاتے ہیں کہ وہ اپنے رسوم ورواج اور اپنے آبائی طریقے کے بندے ہوتے ہیں اسلئے ہر وہ بات انکو بری لگتی ہے جو ان کے اختیار کردہ مذہبی روایات کے خلاف ہوتی ہیں چاہے وہ کتنی بڑی حقیقت کیوں نہ ہو اور اپنی تائید وتصدیق میں اپنی پشت پر کتنی ہی واضح حجتیں رکھتی ہو۔ یہاں قرآن کریم اسی حقیقت کو واشگاف کر رہا ہے کہ کسی صداقت اور حقیقت کو ماننے کیلئے اکثریت کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو کہا جا رہا ہے کیا وہ خود صداقت ہے یا نہیں اور کیا سنجیدہ ذی علم اور صاحب کردار لوگ اس کے حق میں شہادت دیتے ہیں یا نہیں۔ چاہے ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے بعض ناصحوں نے اس سے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے کہ سارا ایتھنز تمہارے خیالات سے برہم ہے کیا تم کو ان کی کچھ پرواہ نہیں اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ مجھے صرف اس ایک انسان کی پرواہ ہے جو دانش مند ہو۔ قرآن کریم یہاں صرف دانش مند انسان کی پرواہ کا حکم نہیں دیتا اگرچہ دانش مند انسان کی تائید ایک حیثیت رکھتی ہیں بلکہ وہ علم کیلئے علم کی تائید چاہتا ہے اور علم بھی وہ جسکے پیچھے علم الٰہی ہو یہی وہ علم ہے جو زندگی کا راہنما بن سکتا ہے اور انسانوں کو یہ علم انبیاء کی معرفت اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ وہی جانتا ہے ہدایت اور ضلالت کیا ہے اور کون برسر ہدایت ہے اور کون برسر ضلالت۔ اسلئے مسلمانوں کو صرف اسی وحی الٰہی کے عطا کردہ علم پر بھروسہ کر کے اپنی دنیا اور عاقبت سنوارنی چاہئے۔

Marfat.com

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ

تو جس چیز پر (ذبح کے وقت) خُدا کا نام لیا جائے اگر تم اس

كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ

کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو تو اُسے کھا لیا کرو۔ اور سبب کیا ہے کہ جس چیز پر خدا کا نام لیا جائے تم اُسے نہ کھاؤ حالانکہ

عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ

جو چیزیں اس نے تمہارے لیے حرام ٹھیرا دی ہیں وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں (بےشک اُن کو نہیں کھانا چاہیے)

اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ

مگر اس صورت میں کہ اُن کے (کھانے کے) لیے ناچار ہو جاؤ۔ اور بہت سے لوگ بے سمجھے بُوجھے اپنے نفس کی خواہشوں سے

هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ

لوگوں کو بہکا رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ایسے لوگوں کو جو (خُدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے باہر نکل جاتے ہیں تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے

الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور ظاہری اور پوشیدہ (ہر طرح کا) گناہ ترک کر دو۔ جو لوگ گناہ کرتے ہیں وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے ف۱

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ

اور جس چیز پر خُدا کا نام نہ لیا جائے اُسے مت کھاؤ کہ اُس کا کھانا گناہ ہے — اور شیطان (لوگ)

الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ

اپنے رفیقوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑا کریں — اور اگر تم لوگ اُن کے کہے پر

اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ

چلے تو بے شک تم بھی مشرک ہوئے ف۲ بھلا جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اُس کو زندہ کیا اور اُس کے لیے روشنی

نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ

کر دی جس کے ذریعے سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہوا

Marfat.com

بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ

ہو اور اُس سے نکل ہی نہ سکے - اسی طرح کافر جو عمل کر رہے ہیں وہ انہیں اچھے معلوم ہوتے ہیں ف۳ - اور

كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۚ وَ

اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کیے کہ اُن میں مکاریاں کرتے رہیں اور

مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ

جو مکاریاں یہ کرتے ہیں اُن کا نقصان انہیں کو ہے اور اس سے بے خبر ہیں ف۴ - اور جب اُن کے پاس کوئی آیت

اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘ

آتی ہے تو کہتے ہیں کہ جس طرح کی رسالت خدا کے پیغمبروں کو ملی ہے جب تک اسی طرح کی رسالت ہم کو نہ ملے ہم

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۗ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا

ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ رسالت کا کون سا محل ہے اور وہ اپنی پیغمبری

صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

کسے عنایت فرمائے۔ جو لوگ جرم کرتے ہیں ان کو خدا کے ہاں ذلت اور عذاب شدید ہوگا اس لیے کہ مکاریاں کرتے تھے۔

تمہید:

گزشتہ آیات میں اللہ کی توحید پر مسکت اور فیصلہ کن دلائل دینے کے بعد فرمایا کہ کیا ان دلائل کے آجانے اور عقیدۂ توحید کی اس مکمل وضاحت کے بعد اس بات کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو منصف، فیصل اور حاکم کی حیثیت سے تسلیم کروں؟ جبکہ اللہ نے اپ حاکمیت کی عملی شکل کو متعین کرتے ہوئے اور اپنے فیصلوں کو عملی صورت دیتے ہوئے قرآن جیسی مفصل کتاب بھی نازل فرما دی ہے جسکی صداقت ا حقانیت کا عالم یہ ہے کہ جو اہل کتاب آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ چونکہ اللہ سے ڈرتے ہوئے خیانت کا ارتکاب کرنے سے گریز کرتے ہیں اسلئے اقر کرتے ہیں کہ یہ کتاب واقعی اللہ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اور جس کی تعلیمات کا حال یہ ہے کہ اسکے بیان کردہ وعدو وعید، پیش گوئیاں اور تار واقعات سچائی کے ترازو میں اپنی سچائی ثابت کر چکے ہیں اور جسکے احکام اور جس کے دیئے ہوئے قوانین عدل اور اعتدال کی مکمل شان لئے ہوئے ہیں رہی یہ بات کہ اب لوگوں کی اکثریت راہ حق پر چلنے اور صحیح بات کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اسلئے کہ صحیح بات کا فیصلہ علم استدلال کی قوت سے ہوتا ہے اور عوام ہمیشہ ظن و تخمین پر زندگی گزارتے ہیں جس کا علمی دنیا اور زندگی کے حقائق میں کوئی وزن نہیں۔ ان کا حال تو یہ

Marfat.com

یہ اللہ کے بارے میں کھلے عام اقرار کرتے ہیں کہ ہم اس کو خالق مانتے ہیں، رازق مانتے ہیں، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہی پوری کائنات کا مالک ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہی ذات ہے جو غیب و حضور ہر بات کو جاننے والی ہے وہی اسباب سے ماوراء دعاؤں کو سنتا ہے۔ ان سارے مسلمات کے بعد بھی ان کا حال یہ ہے کہ جس ذات کو وہ کائنات کا خالق و مالک مانتے ہیں اسے غیر مشروط قانون سازی اور حلت و حرمت کا حق دینے کو تیار نہیں۔ یہ حق انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کو، اپنے نام نہاد مذہبی راہنماؤں کو اور اپنے کاہنوں کو دے رکھا ہے اور یا عام زندگی کے معاملات میں تہذیبی تمدنی اور سیاسی زندگی میں یہ حق ان کے سربرآوردہ لوگ اور ان کی نام نہاد حکومتوں کے سربراہ استعمال کرتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جائز طور پر ہمارا حق ہے ہم اسے جیسے چاہیں استعمال کریں اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آگے آنے والی تین چار آیات میں اسی بنیادی بات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۱۱۸-۱۱۹ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ○ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ○ ''بس تم کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو اور تم کیوں نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو جبکہ اس نے تفصیل سے بیان کردی ہیں وہ چیزیں جو تم پر حرام ٹھہرائی ہیں اس استثناء کے ساتھ جس کے لئے تم مجبور ہو جاؤ اور بے شک بہتیرے ایسے ہی ہیں جو لوگوں کو کسی علم کے بغیر اپنی بدعات کے ذریعے سے گمراہ کر رہے ہیں تیرا رب خوب واقف ہے ان حد سے بڑھنے والوں سے''۔

اللہ ہی حاکم اور مختار کل ہے:

ان آیات میں بظاہر ان جانوروں کے گوشت کھانے کا حکم دیا گیا ہے جنہیں اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے اور اس بات پر تنقید کی گئی ہے کہ جن جانوروں کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جاتا ہے تم آخر انہیں کیوں نہیں کھاتے؟ لیکن اصل میں یہ اصولی بحث ہے جس کی طرف یہاں توجہ دلائی گئی ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے اشارہ کرچکے ہیں کہ اللہ کو خالق و مالک ماننے کے باوجود اس کے اختیارات کسی اور کو تفویض کردینا بنیادی طور پر ہر امت کی گمراہی کا سبب رہا ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم کسی کو اپنا حاکم و مالک تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کیلئے اختیارات ماننے کو تیار نہیں ہیں یا اس کے اختیارات میں کسی اور کو شریک کردیتے ہیں تو آخر اس کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کا کیا فائدہ ہوا اگر وہ واقعی حاکم ہے تو اختیارات کا سرچشمہ بھی وہی ہے کیونکہ حاکمیت مختار ہونے کا ہی دوسرا نام ہے اور پھر اگر کسی کو حاکم ماننے والے اپنی مرضی سے جب چاہیں اس کے اختیارات میں دوسرے کو شریک کردیں تو پھر اختیارات کا سرچشمہ تو یہ ماننے والے ٹھہرے وہ حاکم بے چارہ تو ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہوگا کہ جب چاہا اسے کوئی اختیار دے دیا اور جب چاہا اس سے اختیار چھین لیا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اختیارات میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ جس کو حاکم تسلیم کرتے ہیں کیا اس کی غیر مشروط اطاعت کا دم بھرتے ہوئے اسے ہر سطح پر حلت و حرمت اور جائز اور ناجائز قرار دینے اور صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنے کا حق بھی دیتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ حقیقت میں اختیارات اسی ایک اختیار سے جنم لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ پوری کائنات کا حاکم حقیقی ہے باقی پوری کائنات میں تو تکوینی طور پر اس نے اپنے اختیارات نافذ کر رکھے ہیں، لیکن انسانوں کو چونکہ اس نے اطاعت اور معصیت کی آزادی دے رکھی ہے اس لئے ان کی جزا و سزا کو اس نے اس بات سے وابستہ کردیا ہے کہ انسان اپنے اختیار اور ارادہ سے اللہ کے اختیارات کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ ان مشرکینِ مکہ کا حال یہ تھا کہ وہ اللہ کو سب کچھ ماننے کے باوجود اس کے ان اختیارات میں خود بھی دخل دیتے تھے اور ان کو بھی دخیل بناتے تھے جن کو انہوں نے اللہ کے ساتھ شریک بنا رکھا تھا اور اس کا زیادہ اظہار جانوروں کی

Marfat.com

قربانیوں یا جانوروں کا گوشت کھانے کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ پیچھے گزر چکا کہ انہوں نے جانوروں میں تقسیم کر رکھی تھی کہ بعض جانور انہوں نے اپنے لئے حلال کر رکھے تھے اور بعض بتوں کی طرف منسوب کر کے لوگوں کیلئے ان کا استعمال ممنوع قرار دے دیا تھا۔ بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام جیسے ناموں سے انہوں نے مختلف قسم کے جانور از خود اور اپنے آباؤ اجداد کے حوالے سے لوگوں پر حرام کر دیئے تھے اور دعویٰ ان کا یہ تھا کہ چونکہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں تو ہمارے آباؤ اجداد نے جن جانوروں کا کھانا حرام قرار دے دیا تھا یقیناً ان کو ابراہیم کی شریعت سے یہ احکام ملے ہوں گے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ان کی اسی گمراہی پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ حلت وحرمت کا اختیار اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں۔ اور تمہیں یہ جو دعویٰ ہے کہ یہ ابراہیمی شریعت کا ورثہ ہے تو تمہارے پاس اس کی کوئی علمی سند ہو تو لاؤ جو اہل کتاب تمہاری پیٹھ ٹھونکتے رہتے ہیں ان سے پوچھو کہ ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے اور اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر تم نے اللہ کا یہ اختیار اپنے ہاتھوں میں کیوں لے لیا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ قوموں کے بگاڑ کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ تمام قوموں میں یہ شرک بھی ہوتا رہا کہ غیر اللہ کو سجدہ ہوتے رہے' چڑھاوے چڑھائے جاتے رہے' مرادیں مانگی جاتی رہیں لیکن متمدن اور مہذب دنیا میں جبکہ ریاستیں وجود میں آئیں اور ان پر حکمرانوں نے حکومتیں بھی کیں ان میں جو نہایت خطرناک شرک ہوتا رہا وہ متذکرہ شرک کے ساتھ ساتھ اصل شرک یہ تھا کہ وہ اپنی مطلق العنانی اور اپنی غیر مشروط حاکمیت کو کسی طرح بھی چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ حاکم حقیقی تو اصل میں اللہ کی ذات ہے تم حاکم ہو کر بھی اس کے بندے ہو۔ تمہارا کام اس کے احکام نافذ کرنا ہے۔ خود اپنے آپ کو دنیا کی گردنوں پر مسلط کرنا نہیں ہے تو وہ اس پر بگڑ جاتے تھے وہ آج کے دور کی طرح زیادہ سے زیادہ اس بات کو ماننے کو تیار تھے کہ مذہب کی اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ یہ بندے اور اللہ کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔ انسان کی پرائیویٹ زندگی میں مذہب روشنی دیتا ہے۔ آدمی پریشان ہوتا ہے تو وہ اللہ سے مدد مانگتا ہے۔ کوئی آدمی اس کا تقرب چاہتا ہے تو وہ تنہائی میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ ہفتے بعد عبادت گاہ میں جا کر اس کی نماز پڑھتا ہے اور اس کے حضور دعا کیلئے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ رہی پبلک زندگی جو گلی محلے سے شروع ہوتی اور زندگی کے مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی حکومت کے ایوان تک پہنچتی ہے اس سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اللہ کا کام یہ ہے کہ وہ ہماری تنہائیوں کو آباد رکھے' ہماری مرادیں پوری کرے' ہمیں پریشانیوں سے بچائے' ہمیں رزق دے اور ہمیں اولاد سے نوازے۔ لیکن جہاں تک زندگی گزارنے کے طریقے کا تعلق ہے اور اجتماعی زندگی میں قانون اور آئین کی ضرورت کا تعلق ہے یہ کام خود انسان مل کر آپس میں کریں گے۔ اللہ کا یا مذہب کا اس سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہی وہ گمراہی تھی جو سابقہ امتوں میں پائی جاتی تھی جس نے ان کو پوری طرح شیاطین اور نفسانیت کی گرفت میں دے دیا تھا اور یہی گمراہی آج کی دنیا میں مذہب کے انکار کی صورت میں یا مذہب کے اقرار کے ساتھ ساتھ سیکولرازم کی شکل میں پوری دنیا پر حاوی ہے انتہائی دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ امت مسلمہ جس کو دنیا کی رہنمائی کیلئے اٹھایا گیا اور جن کے دین نے ان کو جو تعلیم دی تھی اس کی بنیاد ہی یہ تھی کہ تم از اول تا آخر اللہ کے بندے ہو اور اللہ تمہارا فرمانروا ہے۔ سروری اور کبریائی کی جتنی بھی قابل عزت شکلیں ہیں وہ سب اسی کو زیب دیتی ہیں انسان دنیا میں اس کی بندگی اور اس کی مرضی' اختیار' قانون اور آئین کو نافذ اور جاری وساری کرنے کیلئے بھیجا گیا ہے اور اگر یہ بڑائی اور یہ عظمت کوئی شخص یا کوئی قوم خود اوڑھ لیتی ہے تو یہ شرک ہے اور یہی آذر کا طریقہ ہے جس کو توڑنے کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے تھے۔ بقول اقبال

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

Marfat.com

جن جانوروں پر اللہ کا نام لیا جائے ان کا گوشت کھاؤ:

لیکن آج اس امت کا حال یہ ہے کہ دنیا کے نقشے پر سب سے زیادہ حکومتیں اس کی ہیں۔ زمین کا بڑا رقبہ اس کے قبضے میں ہے۔ سمندروں کے تمام قابل ذکر ساحلوں پر اس کی حکمرانی ہے اور بیشتر ملک اس کے اپنی آزادانہ حکومتیں رکھتے ہیں لیکن غضب خدا کا، پورے عالم اسلام میں ایک ملک بھی ایسا نہیں جس نے پوری طرح اللہ کے دین اور اس کی حاکمیت کو اپنے ملک میں نافذ کیا ہو۔ کہیں ملوکیت کی شکل میں' کہیں آمریت کی صورت میں اور کہیں مغربی جمہوریت کے انداز میں اللہ کی حاکمیت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اس کے قانون کے مقابلے میں قانون سازی ہو رہی ہے اس کے آئین کے توڑ پر آئین بنائے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ممالک کو مسلمان کہلاتے ہوئے بھی اس بات پر شرم آتی ہے کہ وہ اپنے ملک کے ساتھ اسلامی کا لفظ لگائیں اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں بظاہر نہایت سادہ انداز میں جس حقیقت کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ کس قدر عظیم اور گھمبیر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک دوسری بات بھی ذہن میں رکھیئے کہ یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ جن جانوروں پر اللہ کا نام لیا جائے تم انہیں کھاؤ اور اس کے بعد فرمایا اگر تم اس کی آیات اور اس کے احکام پر ایمان لانے والے ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مسلمان ہو کر بھی بعض ایسے جانوروں کو جن پر اللہ کا نام لیا جاتا تھا کھاتے نہیں تھے یہ بجائے خود ایک دوسری حقیقت کی طرف رہنمائی کی جا رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ نے چونکہ ملت ابراہیمی کا نام لے کر مذہب کے حوالے سے بعض جانور اپنے اوپر حرام کر لئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جب سورۃ النحل میں جیسا کہ اگلی آیت میں بیان کیا جا رہا ہے تفصیل سے بیان کر دیا کہ حرام جانور کون کون سے ہیں ان کے علاوہ باقی جتنے جانوروں کو تم نے اپنے طور پر حرام کر رکھا ہے وہ ہرگز حرام نہیں بلکہ حلال ہیں بس شرط یہ ہے کہ ان حلال جانوروں کو ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام لے کر ذبح کرو۔ لیکن بعض ایسے مسلمان جن کے دل و دماغ سے ابھی سابقہ محرمات کی تقدیس نہیں نکلی تھی اور وہ ایمان لانے کے بعد بھی ابھی قدیمی تعلقات سے اپنے دماغوں کو پوری طرح لاتعلق نہیں کر پائے تھے ان کا حال یہ تھا کہ جب ایسے کسی جانور کا گوشت ان کے سامنے آتا تو وہ سابقہ تعلق کیوجہ سے اسے کھانے سے احتراز کرتے تھے کیونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ سابقہ مذہبی رشتوں کو توڑنا اور نئے مذہب کو پوری طرح عملی صورت دینا انسان کیلئے آسان نہیں ہوتا اس کیلئے دل کی جس مضبوط آمادگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہے چنانچہ یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تم اگر اپنے ایمان میں سچے ہو اور تم اگر اپنے دور جاہلیت سے پوری طرح لاتعلق ہو چکے ہو تو پھر سابقہ دین سے تمہاری یہ رواداری کیوں ہے۔ تمہیں یکسو ہو جانا چاہئے کہ جس دین کو تم نے قبول کیا ہے اس کو اگر صحیح سمجھ کے قبول کیا ہے اور سابقہ مذہب کو تم نے غلط سمجھ کے چھوڑا ہے تو پھر یہ تذبذب کی کیفیت کیوں ہے ان کی اس کیفیت کو سمجھنے کیلئے اگر ہم برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ دیکھیں تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے جس طرح مشرکینِ مکہ کو بعض جانوروں سے ایک مذہبی رشتہ رہا ہے اور اس حصار سے وہ نکلنے کیلئے تیار نہیں تھے اسی طرح برصغیر میں جو مسلمان ہندو مذہب سے نکل کے آئے مدت دراز تک وہ گائے کی محبت سے اپنا دامن نہ چھڑا سکے اس کی پوجا تو انہوں نے ترک کر دی لیکن ان میں بہت سے لوگ ایسے رہے جو بنی اسرائیل کی طرح اس سے یکسر تعلق توڑنے اور اس کا گوشت کھانے کیلئے تیار نہیں ہوتے تھے اور اسی بات کے زیر اثر ہمارے بعض عملیات کرنے والوں نے ان کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے عملیات کی تاثیر کیلئے یہ شرط رکھی کہ تم گائے کا گوشت نہیں کھاؤ گے ورنہ یہ تعویذ اثر نہیں کرے گا۔ چنانچہ اسی مشرکانہ تصور کو ختم کرنے کیلئے علما کا یہ طریقہ رہا کہ جب وہ کسی ہندو کو مسلمان کرتے تھے تو اسے گائے کا گوشت بھی کھلاتے تھے تاکہ اس کے دل سے اس جانور کی عقیدت ختم ہو جس کو اس نے آج تک دیوتا کی حیثیت دے رکھی تھی۔

Marfat.com

حرام وحلال کا فیصلہ صرف اللہ کا حق ہے:

دوسری آیت کریمہ میں اسی بات کو مزید مؤکد کرتے ہوئے اور انسانی ذہن کو جھنجھوڑتے ہوئے سوال کیا گیا ہے کہ جب تم نے اپنے ایمان سے اس بات کا اقرار کرلیا ہے کہ حاکمیت مطلقہ اللہ ہی کو زیب دیتی ہے اور کسی اور کو اس میں شریک کیا جائے تو وہ شرک ہے اور اللہ نے تمہارے لئے حرام چیزیں کھول کر بیان کردی ہیں تو پھر آخر ان جانوروں کے گوشت کھانے سے احتراز کرنے کا جن کو دور جاہلیت میں تم حرام سمجھتے رہے ہو' کیا جواز ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا سوال ہے جو آج امت مسلمہ کی طرف بھی متوجہ ہے اور قیامت تک آنے والی نوع انسانی سے یہ سوال پوچھا جائے گا۔ کہ جب تمہارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت نے ایک ریاست قائم فرما کر اس کی آئینی شکل کو پوری طرح واضح فرما دیا تو پھر تمہاری زندگی میں سیکولرازم جیسی دوعملی کی آخر کیا گنجائش ہے کہ جب اس نے حلال اور حرام کا فیصلہ کردیا ہے اب تمہارے لئے اس کا کیا جواز ہے کہ تم ازسرنو آزادانہ قانون سازی کرنے لگو اور جو حق اللہ کا ہے اس کو خود استعمال کرنے لگو۔ رہے وہ لوگ جو اس پر دلیل بازی کرتے ہیں کہ مذہب صرف پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا پبلک زندگی سے کوئی تعلق نہیں ان کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ بہت سے لوگ اپنی خواہشات اور خودساختہ باتوں سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے پاس آخر اس علم کا حوالہ کیا ہے انسان اللہ کی مخلوق ہے اس مخلوق اور خالق کے درمیان جو رشتہ ہونا چاہئے اس کی وضاحت صرف اللہ کی جانب سے اللہ کے رسول ہی کرسکتے ہیں اور اس کو آئینی اور قانونی شکل اللہ کی نازل کردہ کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ہی مل سکتی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو جامعیت' کاملیت اور خاتمیت کے ساتھ مسلمانوں کو دیا جاچکا ہے اس میں تو بار بار کہا گیا ہے کہ تم پورے اسلام کو اختیار کرو اور پوری زندگی اسلام میں داخل کردو اور یہ بھی بار بار فرمایا گیا ہے کہ حلت وحرمت یعنی غیر مشروط قانون سازی اللہ کا حق ہے۔ اس کے مقابلے میں تم جس سیکولرازم کی بات کرتے ہو اس کی سند امریکہ یا آسمانِ مغرب سے تو مل سکتی ہے لیکن اللہ کی کتاب یا اللہ کے رسول سے تو نہیں مل سکتی اور ایک مسلمان اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایات کا پابند ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی دانش اسی صورت میں قابل قدر ہے کہ وہ اس منزل من اللہ العلم کے خلاف نہ ہو جو شخص اس علمی حوالے کو نظرانداز کرکے ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے یا وہ صریحاً اس علم کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے تو یہ وہ شخص ہے جو حد سے تجاوز کررہا ہے کیونکہ بندہ ہوتے ہوئے اسے اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکانا تھا جب وہ انکار اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی حد سے تجاوز کررہا ہے ایسے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ اس بات کو ہرگز نہ بھولو کہ تمہارا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ اس سے پہلے فرمایا تھا کہ تمہارا رب ہدایت یافتہ لوگوں کو جانتا ہے اب اس کے مقابلے میں یہ جملہ فرمایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو جانتا ہے انہیں بہتر سے بہتر جزا سے نوازے گا اور حد سے گزرنے والوں کو بھی جانتا ہے تو وہ اس کی سزا سے بچ نہیں سکیں گے۔

اگلی آیت کریمہ میں ایک اور اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے جو اس سابقہ حقیقت سے جنم لیتی ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۲۰ "وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ○"

چھوڑو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اس کے باطن کو بھی بے شک جو لوگ گناہ کمارہے ہیں وہ عنقریب اپنی اس کمائی کا بدلہ پائیں گے"۔

گناہ کو ظاہراً اور باطناً چھوڑ دو:

اس آیت کریمہ میں ایک حقیقتِ نفسی کو بیان کیا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ انسان جب اپنی کسی برائی پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے یا اس کیلئے صحیح راہ پر

Marfat.com

دشوار ہونے لگتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اس طرح کا رویہ اختیار کروں کہ جانبین کو خوش رکھ سکوں تو پھر وہ عموماً اس طرح کی باتیں کرتا ہے کہ آپ میری ظاہری حالت پر نہ جایئے آپ جس بات کی دعوت دے رہے ہیں میں اسے دل و جان سے قبول کرتا ہوں اور میرا دل پوری طرح اس پر مطمئن ہے رہی یہ بات کہ میرے عمل میں اس کا اظہار نہیں ہو رہا یا میں اس برائی کے مظاہر سے ابھی تک دامن نہیں چھڑا سکا تو اس کی آپ پرواہ نہ کریں وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہو جائے گا۔ قرآن کریم اس کی طرف توجہ دلا رہا ہے کہ ہر برائی کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک اس کا باطنی پہلو اور دوسرا اس کا ظاہری پہلو۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ ہر برائی کی ایک حقیقت ہے جس کا مسکن انسان کا نفس اور اس کا دل ہے۔ دوسرے اس کے وہ مظاہر و اشکال ہیں جن میں انسانی زندگی کے اندر وہ نمایاں ہوتی ہے مثلاً شرک کی ایک تو حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں کسی کو شریک مانا جائے اور دوسرے اس کی ظاہری شکلیں ہیں مثلاً اصنام، انصاب، بحیرہ، سائبۃ، وصیلہ، حام اور اس نوع کی دوسری چیزیں جو کسی شرکیہ عقیدے یا تصور کا عملی مظہر اور نشان ہیں۔ جب تک ان دونوں کا استیصال نہ ہو اور دونوں کو جڑ سے نہ اکھاڑا جائے اس وقت تک برائی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ان دونوں میں بڑا گہرا ربط اور تعلق ہوتا ہے یہ ایک دوسرے کے سہارے سے پروان چڑھتے اور غذا اور قوت حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں حکم دیا جا رہا ہے کہ تم شرک کی جس آلائش میں مبتلا ہو اس کیلئے صرف یہ کافی نہیں کہ تم شرک کو دل سے نکالنے کا دعویٰ کرو اور یہ کہو کہ توحید کو میں نے دل میں بسا لیا ہے اور میں اللہ کی ذات وصفات اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ جن چیزوں کو تم شریک ٹھہراتے رہے ہو مثلاً جن جانوروں کو تم مقدس جان کر ان کی تعظیم بجالاتے رہے ہو اللہ نے ان کا گوشت اگر حلال کیا ہے اور تم سابقہ تعظیمی تعلق کی وجہ سے اسے کھانے سے احتراز کر رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شرک کی جس حقیقت کو تم نے دل سے نکال دیا ہے تم اس کے مظاہر کو ختم نہیں کرنا چاہتے۔ اس سے ایک ہی بات نکلتی ہے کہ تم اصلاً اپنے دعوے میں سچے نہیں ہو ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ تم شرک کی شکلوں کو توڑنے اور ان کو ختم کرنے سے پس و پیش کرتے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد شرک کے تمام آثار و مظاہر کو یک قلم ختم کر دیا اور جہاں جہاں بھی مشرکین نے بت کھڑے کر رکھے تھے یا قربانی کیلئے آستانے بنا رکھے تھے یا دعاؤں کیلئے استھان مقرر کر رکھے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان تمام کا خاتمہ فرما دیا اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسانی اصلاح کیلئے جس طرح قلب و ضمیر کی تصدیق ضروری ہے اسی طرح آدمی کا ظاہر بھی اس کے مطابق بدلنا چاہئے۔ جس برائی کو آدمی دل سے برائی سمجھتا ہے اگر اس کے مطابق عمل جاری ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ برائی سے دامن کشاں نہیں ہونا چاہتا۔ ہم بہت دفعہ اپنی زندگی میں اس دو عملی کو جا بجا دیکھتے ہیں۔ آپ کسی لڑکی کو اگر اس حالت میں دیکھیں کہ ننگے سر کھلے چہرے بازو اور کھلا گریبان لے کر وہ اپنے تعلیمی ادارے میں جاتی یا اپنے دفتر میں یا بازار میں نامحرموں کے ساتھ چلتی پھرتی ہے اور آپ اسے توجہ دلاتے ہوئے کہیں کہ بیٹی تم ایک مسلمان لڑکی ہو شرم و حیا تمہارا زیور ہے، تم اس طرح نامحرموں میں گھوم رہی ہو یہ تو ہرگز مناسب نہیں تو آپ کو بہت دفعہ یہ جواب سننا پڑے گا کہ صاحب جانے دیجئے پردہ اصل میں دل کا پردہ ہے شرم و حیا کا تعلق دل سے ہے آپ ظاہری باتوں پر نہ جایئے تو یہاں صاف فرمایا جا رہا ہے کہ ظاہری اور باطنی دونوں گناہ چھوڑ دو۔ جس طرح بے حیائی اور بے شرمی دل میں بری ہے اسی طرح جسم پر اس کا اظہار بھی برا ہے اگر شرم و حیا آپ کا گریبان بند نہیں کرتا اور آپ کی بانہیں نہیں ڈھانپتا اور آپ کے سر پر آنچل نہیں ڈالتا تو دل میں شرم و حیا کے ہونے کا آخر فائدہ کیا ہے اس لئے قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ

"اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت بھٹکو خواہ ظاہری ہوں یا باطنی"

Marfat.com

تو اس سے معلوم ہوا کہ سیرت و کردار کی تعمیر اور ایمان کی پختگی کیلئے ظاہر و باطن دونوں کی تطہیر ضروری ہے اور دونوں کو ساتھ ساتھ چلنا چاہئے آدمی کی زبان پر نماز کی فرضیت کا ذکر ہو لیکن نماز نہ پڑھے' زبان پر سنت سے محبت کے تذکرے ہوں لیکن وضع قطع' تراش خراش' بود و باش اور تمام تمدن اظہار کی صورتیں وہ سراسر سنت کے خلاف ہوں تو ہمیں یہ اصول یاد رکھنا چاہئے جو اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد دھمکی دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ جو لوگ اس قدر وضاحت و صراحت کے بعد بھی شرک سے تعلق توڑنے کیلئے تیار نہیں اور گناہ ان کی زندگی سے نکل نہیں پاتا۔ چونکہ یہ مکی ہے یہاں تو صرف نصیحت ہی کی جا سکتی ہے یا انجام سے ڈرایا جا سکتا ہے اس لئے انہیں ان کے انجام سے ڈراتے ہوئے فرمایا گیا کہ وہ وقت دور نہیں جب وہ اپنے اعمال کی سزا پائیں گے۔ اس سے یا تو آخرت مراد ہے کہ آخرت میں بہر صورت اپنے انجام کو ہر آدمی دیکھے گا اور یا پھر چند ہی سال بعد مدینے میں جو ریاست قائم ہونے والی ہے جس کے نتیجے میں اللہ کا دین نافذ ہو جائے گا اور فتح مکہ کے بعد یہ مکہ کے لوگ بھی اس دین کے سامنے سرنگوں ہوں گے اور اس کے بعد آج جو کچھ کہہ رہے ہیں اور کر رہے ہیں یا تو اس سے تائب ہو جائیں گے اور یا پھر سزا کے عمل سے گزریں گے۔

اگلی آیت کریمہ میں اسی مضمون کے ایک اور گوشے کو واضح کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۲۱ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ط وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ج وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ O ''اور تم نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو بے شک یہ نافرمانی ہے شیاطین القاء کر رہے ہیں اپنے ایجنٹوں کو تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہا مانو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے''۔

جن پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا ان کو نہ کھاؤ' ورنہ مشرک ہو جاؤ گے:

گزشتہ آیات میں ان چیزوں کے کھانے کا حکم دیا گیا تھا جن کو انہوں نے اپنے شرکیہ عقائد کے تحت حرام قرار دے رکھا تھا لیکن اللہ نے انہیں حلال قرار دیا اور یہ فرمایا کہ اگر انہیں اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو تم انہیں شوق سے کھاؤ۔ وہ اللہ کی نعمتیں ہیں جن سے تمہیں ہر طرح فائدہ اٹھانے کا حق ہے اب اس آیت میں اہل عرب کے عقیدے کی رو سے ان مباح چیزوں کے کھانے کی ممانعت فرما دی جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ پہلے مشرکین عرب کی اس گمراہی پر تنقید فرمائی کہ تم نے بعض جانور جو اپنے شرکیہ عقائد کے تحت حرام کر لئے ہیں تمہیں آخر ان کو حرام کرنے کا کیا حق ہے اور اب ان کی اس گمراہی پر توجہ دلائی جا رہی ہے کہ جتنے حلال اور مباح جانور ہیں ان کی جان لینا اور انہیں ذبح کر کے کھانا یہ کسی کا اپنا اختیار نہیں یہ اختیار صرف اس کا ہے جس نے انہیں جان عطا کی ہے تم اپنے بتوں کا نام لے کر یا بغیر کسی کا نام لئے اپنی مرضی سے ان کی گردن کاٹ دیتے ہو تو آخر تمہیں ان کی جان لینے کا حق کس نے دیا ان کا گوشت صرف اسی صورت میں حلال ہو سکتا ہے کہ ان کی جان لیتے ہوئے اس کا نام لیا جائے جو ان کا خالق ہے اور اگر اس کا نام نہ لیا جائے تو پھر وہ حلال اور مباح جانور بھی حرام ہو جائے گا۔ چنانچہ جب قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی تو وہ لوگ جو پہلے ہی اس بات پر برافروختہ تھے کہ اس نبی نے ہمارے عقائد کے مطابق جو حرام جانور تھے ان کو حلال کر دیا ہے اور اب وہ مزید سیخ پا ہوئے یہ سن کر کہ جن پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اس کا کھانا حرام ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک ہمارے آباؤ اجداد جو اللہ کے نام کے بغیر جانور ذبح کرتے رہے اور کھاتے رہے کیا وہ سب حرام خور تھے اور آج ہم بھی حرام خوری کر رہے ہیں یقیناً اس پروپیگنڈے نے شدت اختیار کی ہو گی اور مسلمانوں کی مخالفت میں اس کی وجہ سے مزید تیزی آئی ہو گی۔ چنانچہ اہل کتاب نے جب یہ دیکھا کہ آگ دہک اٹھی ہے تو انہوں نے اس میں مزید ایندھن ڈالا اور مشرکین کو

Marfat.com

پٹی پڑھائی کہ تم مسلمانوں سے یہ کہو کہ تم عجیب لوگ ہو جس کو اللہ مارتا ہے یعنی وہ طبعی موت مرتا ہے جس کو مردار کہتے ہیں اسے تو تم حرام کہتے ہو لیکن جس کو تم خود مارتے ہو یعنی ذبح کرتے ہو چاہے اللہ کا نام لے کر ہی سہی اسے حلال کہتے ہو۔ یہ کیا بے عقلی کی بات ہے اس طرح ایک طرف سے عقل کے نام پر مسلمانوں پر بے عقلی کا الزام لگایا جا رہا تھا اور دوسری طرف آباؤ اجداد کے حوالے سے جذبات میں آگ لگائی جا رہی تھی۔ اس صورت حال میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لوگ کس طرح آنحضرت اور مسلمانوں کے ساتھ الجھتے بھی ہوں گے اور مذاق بھی اڑاتے ہوں گے۔ چنانچہ اس پوری صورتحال کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا کہ ان کے بڑے بڑے اشرار اور ان کے سرغنے وہ اس مخالفت میں ایک دوسرے کو مہمیز بھی کر رہے ہیں اور استعمال بھی اور ایسی صورت حال میں اس پروپیگنڈے اور مخالفت کے طوفان سے کمزور مسلمانوں کا متاثر ہو جانا خلاف توقع نہیں۔ اس لئے صاف فرمایا جا رہا ہے کہ یہ معاملہ چونکہ بہت اصولی ہے اور عقیدۂ توحید سے اس کا گہرا تعلق ہے اس لئے اگر تم نے ان کی بات مانی تو جس طرح وہ مشرک ہیں تم بھی مشرک ہو جاؤ گے کیونکہ ان کا رویہ کھلی کھلی اللہ کی نافرمانی ہے اور نافرمانی کو تو کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

مندرجہ بالا بحث کو دیکھتے ہوئے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی جانور کے ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا اس قدر ضروری کیوں قرار دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر اس کا کھانا ہی حرام ہو آخر اس میں کیا حکمت ہے؟ حقیقت میں اس کے اندر کیسی کیسی حکمتیں پوشیدہ ہیں یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن غور و فکر کے بعد بہت ساری حکمتیں ذہنی افق پر ابھرتی ہیں جن میں سے ہم چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

1- بالکل سامنے کی بات ہے کہ جس طرح ہم اپنے اندر جان رکھتے ہیں اور اس سرمائے کو اس حد تک عزیز رکھتے ہیں کہ حتی المقدور اس پر آنچ نہیں آنے دیتے اس کو بچانے کیلئے بڑے سے بڑے خطرے سے لڑ جاتے ہیں اور اگر کوئی ظالمانہ طریقے سے کسی بھی انسان کی جان لیتا ہے تو انسانی تہذیب اس پر چیخ اٹھتی ہے اور اسے انسانیت کا دشمن اور ظالم قرار دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہر جاندار اور ہر ذی روح اپنی روح اور جان کو عزیز سمجھتا ہے اور اس کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اگر اسے بولنے یا لکھنے کا موقع ملے تو وہ بھی احترام جان پر نجانے کیا کچھ کہے اور لکھے اور کبھی اس بات کی اجازت نہ دے کہ کوئی شخص بھی اس کی جان لینے کا روادار ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ہر جاندار کی جان ہماری ہی طرح قابل احترام ہے تو پھر ہم اپنی مرضی سے کسی کی جان کیسے لے سکتے ہیں اور کسی بھی جانور کی جان لینا ہمارے لئے کس طرح جائز ہو سکتا ہے جاندار خود اجازت دے نہیں سکتا کیونکہ وہ بول نہیں سکتا اور اگر وہ بول بھی سکتا تو تب بھی اس کی اجازت بے معنی ہوتی کیونکہ وہ خود اپنی جان کا مالک نہیں بلکہ یہ تو کسی بڑی ذات کا عطیہ ہے البتہ اس کی جان لینے کی اجازت صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتی ہے کہ جس نے یہ امانت اس کے سپرد کی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ جس نے یہ جان پیدا کی ہے اور جو اس جاندار کا خالق ہے وہ اگر اجازت دے تو تب تو اس کا جان لینا جائز ہو سکتا ہے ورنہ اس کے علاوہ کوئی اور دوسری صورت ممکن نہیں۔ تو اس کی اجازت دینے کی یہی ایک صورت ہے کہ جن جانوروں کو اس نے حلال قرار دیا ہے یعنی ہمیں ان سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے ہم ان کی جان لیتے ہوئے اس کا نام لیں گویا یہ ایک طرح کا اعلان ہوگا کہ ہم اپنی مرضی سے اس کی جان نہیں لے رہے بلکہ جو اس کا خالق ہے اس کا نام لے کر اس کی اجازت سے اور اس کے دیئے ہوئے حق کو ہم استعمال کرتے ہوئے اس کی جان لے رہے ہیں۔ اس طرح اللہ کے خالق و مالک ہونے پر یقین اور پختہ ہو جائے گا اور اس کی کبریائی کو دل و دماغ میں مستحکم ہونے کا راستہ ملے گا۔

2- کسی بھی منعم کی عطا کردہ نعمت کا حقیقی شکر یہ ہے کہ اس کی نعمت کو استعمال کرتے ہوئے اس بات کا احساس بھی کیا جائے اور اعلان بھی کہ فلاں منعم نے یہ نعمت مجھے عطا کی ہے۔ یہ ایک طرح سے اس کے منعم ہونے کا اعتراف بھی ہوتا ہے اور اس اعتراف سے جس پر نعمت کی گئی ہے اس

Marfat.com

کے دل و دماغ میں اپنے منعم کیلئے جذباتِ عقیدت میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر نعمت اللہ نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے ضروری ہے کہ دنیا کے عام قاعدے کے مطابق اپنے منعم کے احسانات کا اعتراف ہوتا کہ دل و دماغ میں اس کیلئے جذبات عقیدت و محبت پیدا ہوں اور اس کی دھرتی پر رہنے والوں کو پتہ چلے کہ اس دھرتی پر احسانات کرنے والی ذات اور انعامات دینے والا منعم حقیقت میں کون ہے اور اگر نعمتوں کو استعمال تو کیا جائے لیکن اللہ جیسے منعم حقیقی کا نام لینا بھی پسند نہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی بھی جانور یا کسی نعمت کا تصرف کرنے والا شخص حقیقی تصرف نہیں کر رہا بلکہ وہ ظالمانہ اور غاصبانہ تصرف کر رہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ غصب سے کوئی حق قائم نہیں ہوتا بلکہ یہ جسارت اور بے جا جرأت ہے جو اللہ کے یہاں سزا کا باعث بنے گی کیونکہ دنیا و آخرت میں کسی بھی غاصب کو غصب کرنے کی وجہ سے سزا سے چھوڑا نہیں جائے گا۔

3- آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو کام بھی اللہ کا نام لئے بغیر کیا جائے وہ بے برکت ہوتا ہے برکت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں حقیقی اضافہ نہیں ہوتا' اس کا فیض جاری ہونے سے رک جاتا ہے۔ اس کے جو حقیقی مقاصد ہیں وہ کبھی بروئے کار نہیں آتے بلکہ بعض دفعہ اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ بجائے برکت کے اس میں بے برکتی پیدا ہوتی ہے اور کام کرنے والی کی سیرت و کردار پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اصول اگر عام معاملات میں ہے تو کسی جانور کی جان لینا تو اپنے اندر اس سے کہیں بڑھ کر نزاکت رکھتا ہے اس نزاکت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں حد درجہ احتیاط برتی جائے اسی احتیاط کا پہلا سبق یہ ہے کہ جب بھی اس طرح کا کوئی کام کرو خاص طور پر کسی جانور کو ذبح کرو تو اللہ کا نام لے کر کرو تاکہ تمہاری زندگیوں میں خالق اور مخلوق کے درمیان جو رشتہ ہونا چاہئے اس کا صحیح احساس پیدا ہو اور منعم اور منعم علیہ کے درمیان جو جذبات عقیدت و محبت پیدا ہونے چاہئیں وہ پیدا ہوں اور اس کے نتیجے میں سیرت و کردار کی تعمیر میں مدد ملے۔

4- اس سے شرک کا ایک بہت وسیع دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ ادیان کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی ان کی نذر اور ان کے چڑھاوے کو ابتدائے تاریخ سے عبادات میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اس اہمیت کے سبب سے مشرکانہ مذاہب میں بھی اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا جو قوم بھی کسی غیر اللہ کی عقیدت و نیاز مندی میں مبتلا ہوئی اس نے مختلف شکلوں سے غیر اللہ کو راضی کرنے کیلئے جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ قرآن میں شیطان کی جو دھمکی انسانوں کو گمراہ کرنے کے باب میں مذکور ہوئی ہے اس میں بھی اس ذریعۂ ضلالت کا شیطان نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسلام میں شرک کے ان تمام راستوں کو بند کر دینے کیلئے جانوروں کی جانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام کا قفل لگا دیا گیا ہے۔ جس کو خدا کے نام کی کنجی کے سوا کسی اور کنجی سے کھولنا حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کنجی کے بغیر کسی اور کنجی سے اس کو کھولنے یا اس کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ کام بھی ناجائز اور جس جانور پر یہ ناجائز تصرف ہوا وہ جانور بھی حرام۔

5- اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں صرف یہی چیز ناجائز نہیں ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے بلکہ یہ بھی ناجائز ہے کہ کسی جانور کو اللہ کا نام لئے بغیر ہی ذبح کر دیا جائے اس سے مستثنیٰ صرف وہ صورت ہو سکتی ہے۔ جس میں بھول چوک کا دخل ہو اور یہ بھول چوک بھی معاف صرف اہل ایمان کیلئے ہے اسلئے کہ ان کے دل اور ارادے میں اللہ کا ایمان اور اس کا نام موجود ہوتا ہے صرف کسی وقتی غفلت سے اس کے اظہار میں سہو ہو سکتا ہے۔

ہم مسلسل ان آیات کے بین السطور میں یہ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ آیتیں مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہیں جبکہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان کشمکش اپنے عروج پر تھی اور مشرکینِ مکہ مسلمانوں کو ہراساں کرنے اور ان کو اس نئے دین سے پھیرنے کیلئے تمام امکانی حربے استعمال کر

Marfat.com

رہے تھے۔ نئے نئے سوالات اور مطالبے بھی کئے جا رہے تھے' اذیت میں تیزی پیدا کی جا رہی تھی' کمزور مسلمانوں کو بری طرح ادھیڑا کھدیڑا جا رہا تھا' استہزا اور تمسخر کا نشانہ بھی بنایا جا رہا تھا ایسی صورت حال میں معنوی تربیت اور دل و دماغ کی آبیاری کیلئے دلائل کی بارش بھی ہو رہی ہے۔ مناسب احکام بھی دیئے جا رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ طبیعتوں کو حوصلہ دینے کیلئے تسلی بھی دی جا رہی ہے اور حوصلہ افزائی بھی کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اگلی چند آیات میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے ان کی اصل حیثیت کا احساس دلا کر ان کے حوصلوں کو بلند کیا جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ تسلی کا مضمون بھی نازل کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۲۲-۱۲۳ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○ ''کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس کی شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا۔ ہے کافروں کیلئے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیئے گئے ہیں اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے''۔

یہاں اس آیت کریمہ میں موت سے مراد جہالت و بے شعوری کی حالت ہے اور زندگی سے مرد علم و ادراک اور حقیقت شناسی کی حالت ہے جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راہ راست کیا ہے وہ طبیعات کے نقطہ نظر سے چاہے ذی حیات ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو انسان کی زندگی میسر نہیں وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے مگر زندہ انسان نہیں۔ زندہ انسان درحقیقت صرف وہ شخص ہے جسے حق اور باطل' نیکی اور بدی' راستی اور نا راستی کا شعور حاصل ہے۔

زندگی فرائض کی ادائیگی کا نام ہے:

حقیقت یہ ہے کہ زندگی اور موت ایک تو طبعی چیز ہے کہ جب تک آدمی کے اندر جان ہے ہم اسے زندہ سمجھتے ہیں اور جب اس کے اندر سے جان نکل جاتی ہے تو اسے مردہ قرار دے دیا جاتا ہے لیکن زندگی صرف اسی چیز کا نام نہیں بلکہ حقیقی زندگی اس سے بڑھ کر ایک اور چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے ہر مخلوق کو جبلی طور پر یا شعوری طور پر زندگی کے کچھ نہ کچھ مقاصد دے کر پیدا فرمایا ہے چنانچہ وہ مخلوق جب تک ان مقاصد کو بروئے کار لاتی اور اپنا یہ فرض ادا کرتی رہتی ہے اس وقت تک اسے زندہ کہا جاتا ہے لیکن جب وہ اپنا فرض انجام دینا بند کر دیتی ہے یا فرض انجام دینے سے عاجز ہو جاتی ہے تو اسے مردہ قرار دے دیا جاتا ہے عام مخلوقات کو دیکھئے زمین کی نباتات' آسمان کے ثوابت' سیارے اور ستارے' پانی' ہوا اور آگ۔ یہ سب اپنی جبلت کے تحت اپنی اپنی زندگی کے فرائض ادا کرتے ہیں اور جب تک یہ فرائض ادا کرتے رہتے ہیں انہیں زندہ سمجھا جاتا ہے درخت جب تک سایہ دیتا یا پھل پیدا کرتا ہے تو اسے باقی رکھا جاتا ہے کیونکہ وہ زندہ ہے۔ پانی جب تک بہتا ہے اور پیاس بجھانے اور آبیاری کا کام دیتا ہے تو اس کی زندگی باقی رہتی ہے۔ پھول جب تک مہکتا ہے' کلی چٹکتی ہے' آگ جلاتی ہے اور گھاس مخملیں فرش کی طرح بچھ جاتی ہے تو انہیں محنت سے باقی رکھا جاتا ہے لیکن جب یہ اپنے فرائض انجام دینے سے انکار کر دیتے ہیں تو انہیں اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے خود انسانوں کو دیکھئے کہ جو انسان کہیں ملازمت کرتا ہے جب تک وہ ملازمت

Marfat.com

کے فرائض ادا کرتا ہے وقت پر آتا اور جاتا ہے اور مفوضہ ڈیوٹی انجام دیتا ہے تو اسے اس کے کام پر باقی رکھا جاتا ہے لیکن جب وہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے یا کام سے عاجز ہو جاتا ہے تو اسے اس کام سے فارغ کر دیا جاتا ہے اور زندہ ہونے کے باوجود اسے مردہ قرار دے کر نکال دیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا ہے کہ زندگی اصل میں مقاصد کو بروئے کار لانے اور فرائض کے انجام دینے کا نام ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کا مقصد زندگی کیا ہے اور اس کے فرائض کیا ہیں؟ جو شخص انسان کو خودرو پودے کی طرح سمجھتا ہے تو وہ یقیناً یہ خیال کرتا ہے کہ انسان گھاس پھوس کی طرح خود پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح ایک دن مل دل کے ختم ہو جائے گا اور جو اسے ایک حیوان کی طرح سمجھتا ہے اور ایک انسان' گدھے اور کتے میں کوئی فرق نہیں کرتا تو وہ یقیناً یہی سمجھے گا کہ انسان کا کام بھی صرف کھانا پینا' بچے پیدا کرنا' نفسانی خواہشات کو بروئے کار لانا ہے۔ لیکن جس آدمی کو اللہ نے بصیرت عطا کی ہے وہ یقیناً انسان کو نباتات و جمادات اور حیوانات سے مختلف سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ باقی ساری مخلوقات اپنی جبلت اور حواس کے تحت زندگی گزار رہی ہیں اور اسی کے مطابق ان کو فرائض بھی دیئے گئے ہیں اور وہ اپنے فرائض ادا کرنے کی اس طرح پابند ہیں کہ اس سے انحراف کرنے کی ان کے اندر طاقت ہی نہیں لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے جبلت اور حواس کے علاوہ جوہر عقل بھی عطا کیا ہے اور ساتھ ساتھ اختیار کی آزادی بھی دی ہے اور اس کو یہ حق دیا ہے کہ تم اس میں رہ کر اپنا راستہ طے کرنے کیلئے آزاد ہو چاہے صحیح راستہ اختیار کرو چاہے غلط اور اس پر مزید یہ کہ زندگی کے وہ مسائل جو عقل کی گرفت میں نہیں آتے بعض دفعہ عقل اس کے بارے میں غلط فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ اس کی راہنمائی کیلئے اللہ نے رسول مبعوث کئے' ان پر اپنی کتابیں اتاریں اور اپنے رسولوں کو معصومیت کے ساتھ ساتھ وحی کی راہنمائی بھی بخشی اور انہیں اس بات کا پابند ٹھہرایا کہ وہ انسانی زندگی کی جتنی بھی ضرورتیں ہیں اور انسان کے جتنے مسائل ہیں وحی الٰہی کی روشنی میں انسانوں کے سامنے اس کا حل پیش کریں اور ایسے بنیادی اصول دیں جس سے انسانی زندگی ہمیشہ اکتساب فیض کرتی رہے۔ اسی طرح پوری تفصیل کے ساتھ ان کیلئے مقاصد زندگی متعین کر دیئے اور انہیں بروئے کار لانے کا طریقہ بھی واضح کر دیا۔

مسلمانوں کو ایسی روشنی دی گئی ہے جس سے وہ خود بھی راہ پاتے ہیں اور دوسروں کو بھی راہ دکھاتے ہیں:

ہم اس سے پہلے یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ چونکہ مقاصد زندگی کو بروئے کار لانا اور اپنے فرائض کو ادا کرنا یہی زندگی ہے تو اسی اصول کے مطابق زندہ انسان وہ ہوگا جو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ مقاصد زندگی اور عائد کردہ فرائض کو ادا کرنے کی کوشش کرے گا اور اللہ کے رسول کی تعلیمات کو حرز جان بنائے گا۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں یہی فرمایا گیا ہے کہ انسان اللہ کی اس راہنمائی کو قبول کئے بغیر ایسا ہے کہ جیسے ابھی اس کو زندگی نہیں ملی وہ حالتِ عدم میں ہے۔ لیکن جب اس کے سامنے اللہ کی طرف سے کوئی رسول مبعوث ہوتا اور وحی الٰہی اترتی اور کتاب نازل ہوتی ہے تو یہ وہ نور اور روشنی ہے جو اس کی اندھیری رات میں چراغ بن کر چمکتی ہے اور اسے موت کی تاریکیوں سے نکال کر زندگی کا نور عطا کرتی ہے۔ اب اگر وہ اسے قبول کر لیتا ہے تو وہ زندہ انسان ہے لیکن جو اسے قبول نہیں کرتا وہ مردہ ہے کہ اس نے اپنے لئے عدم کو پسند کیا عدم کا رہنے والا ظاہر ہے' ہستی کا باسی تو نہیں ہو سکتا۔ یہ مشرکین مکہ اور دوسرے لوگ جو اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں یہ دراصل زندگی کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں اور مسلمان چونکہ اس دعوت کو قبول کر چکے ہیں اس لئے وہ زندہ ہیں تو اس طرح سے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے کہ تم ان شیاطینِ جن وانس کی غوغا آرائی کی پرواہ نہ کرو تم کو اللہ نے زندگی بخشی ہے تو زندگی کا پیام لے کر آگے بڑھو۔ تمہیں جو روشنی عطا ہوئی ہے اس روشنی میں خود بھی چلو اور دوسروں کو بھی روشنی عطا کرو اب تمہارے لئے یہ زیبا نہیں کہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے والوں کی خرافات پر کان دھرو۔ یہ کافر لوگ چونکہ اپنے اوہام اور اپنی بدعات کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور وہ موت کی ان وادیوں سے نکلنے کیلئے کسی طرح تیار نہیں ہیں اور وہ دیوانوں کی طرح تاریکیوں میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے

Marfat.com

پاؤں مار رہے ہیں اور ساتھ ساتھ کیچڑ بھی اچھالتے ہیں تو تمہیں ان کی ہرگز پرواہ نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے تمہیں ان مُردوں جیسا نہیں رکھا بلکہ تمہیں زندگی کی نعمت عطا فرمائی اور ساتھ ہی فرمایا کہ ان لوگوں کو جو ہم نے نور اور روشنی عطا کی ہے یہ اس کو لے کر لوگوں میں چلتے پھرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ روشنی گھر میں چھپا کے رکھنے کی چیز نہیں ہوتی اسے تو دیوار کی منڈیر پر رکھا جاتا ہے تاکہ اس کی روشنی گھر میں بھی پھیلے اور دوسرے بھی اس سے فائدہ اٹھائیں اور ساتھ ہی اس میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ اللہ نے اب جو روشنی قرآن وسنت کی شکل میں مسلمانوں کو دی ہے یہ کسی مسجد، خانقاہ یا کسی حجرے کی چیز نہیں ہے کہ وہیں یہ ٹمٹماتی رہے بلکہ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ جہاں جہاں زندگی کے دوائر موجود ہیں وہاں وہاں وہ اس روشنی کو لے کر پہنچیں اور وہاں وہاں اس روشنی کو پھیلائیں جہاں تاریکیوں نے بسیرا کر رکھا ہے کیونکہ ایک مومن کی ذمہ داری دین کی روشنی سے صرف اپنے آپ کو روشن کر لینے اور اپنے دل کو مزین کر لینے سے پوری نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کے گھروں کو معاشرے کی ہر بند گلی کو اور زندگی کے ہر پر پیچ راستے کو روشن کرنا بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کیونکہ ان کے ہاتھ میں ایک مشعل دی گئی ہے اور باقی سب لوگ اس روشنی کے محتاج بھی ہیں اور انتظار میں بھی، ضروری ہے کہ مشعل بردار ہر ضرورت کی جگہ اس مشعل کو لے کر پہنچے اور اگر لوگ محض اس لئے ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے رہے کہ کسی نے ان کو روشنی نہ دکھائی تو اللہ کے یہاں مسلمانوں سے اس کا سخت حساب لیا جائے گا کہ تم جانتے تھے کہ دنیا قسم قسم کی تاریکیوں میں مبتلا ہے اور تم پر جو روشنی اتاری گئی تھی وہ ان تمام تاریکیوں کو دور کر سکتی تھی لیکن تم صرف اپنی ذات کی حد تک ہی اس روشنی کو لے کر بیٹھے رہے حالانکہ تمہاری ذمہ داری یہ تھی کہ تم اس بات کا احساس اپنے اندر پیدا کرتے کہ

> ہم کو بخشی ہیں خدا نے دہری دہری خدمتیں خود تڑپنا ہی نہیں اوروں کو تڑپانا بھی ہے
>
> خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام ہم کو اس ظلمت کدے میں نور پھیلانا بھی ہے

اس آیت کے آخری جملے میں مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جس کا ذکر پہلے بھی مختلف حوالوں سے ہو چکا ہے کہ یہ لوگ جو اس تاریکی میں پڑے رہنے پر بضد ہیں اور اسلام کی دعوت پر کان دھرنے کیلئے تیار نہیں۔ اور اللہ کی عطا کردہ روشنی سے وحشت زدہ ہو رہے ہیں اس سے تمہیں دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ اللہ کا یہ قانون ہے کہ اس نے چونکہ انسان کو اختیار کی آزادی دے رکھی ہے وہ اپنے اختیار سے جس راستے پر چلنا پسند کرتا ہے وہ وہی راستہ اس کیلئے کھول دیتا ہے اور جو چیز اسے مرغوب ہوتی ہے وہی چیز اس پر مسلط کر دی جاتی ہے۔ وہ کسی پر جبر نہیں کرتا ہدایت اور ضلالت دونوں میں اس نے انسان کو آزادی دے دی ہے اور دونوں کے اس نے وسائل پیدا فرما دیئے ہیں۔ اب ان میں انتخاب کرنا یہ انسان کا اپنا کام ہے جب وہ صحیح راستے کا انتخاب کر لیتا ہے اور پھر اللہ سے توفیق مانگتا ہے تو اللہ اپنی توفیق سے اسے نواز دیتے ہیں اور اللہ نے مزید آسانیاں پیدا کرنے کیلئے اپنے رسول اور کتابیں بھیجیں اور یہ وحی کی روشنی اتاری لیکن جو شخص اس روشنی کے سامنے آنکھیں بند کر لیتا ہے بلکہ روشنی دکھانے والوں کا دشمن ہو جاتا ہے کہ تمہاری روشنی سے میری نیند خراب ہوتی ہے میرے مفادات پر چوٹ پڑتی ہے۔ میرے برے ارادوں کو بروئے کار آنے میں دشواری پیدا ہوتی ہے تو یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اس کو ایسا کرنے دو۔ وہ قانون قدرت کے تحت ایسا کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو ان باتوں سے اثر لئے بغیر اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے کیونکہ مردہ آدمی کی موت سے عبرت تو حاصل کی جا سکتی ہے لیکن زندگی کے سفر میں رکاوٹ نہیں آنی چاہیے۔

کفار و مشرکین گمراہیوں کے حصار میں ہیں جس سے وہ نکلنا نہیں چاہتے:

اس آیت کریمہ میں اللہ کے جس قانون کا ذکر فرمایا گیا ہے اس کیلئے تزیین کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کی ہم نے اگرچہ وضاحت کر دی ہے لیکن

Marfat.com

بہتر ہے کہ اس کو مزید کھول دیا جائے بات یہ ہے کہ ہم اگر اپنی حالت پر غور کریں یا اپنے گردوپیش میں دیکھیں تو آپ کو ہر آدمی بالخصوص پڑھا لکھا اور علم و دانش رکھنے والا آدمی اس بات کا مریض ملے گا کہ وہ اپنی سوچ' اپنے خیالات اور اپنی بات کے سوا کسی اور کی سوچ اور بات کو مناسب اہمیت دینے کو کبھی تیار نہیں ہوتا بالخصوص کسی دانشور سے بات کر کے دیکھئے تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ وہ بات بات پر اپنی ذات کا حوالہ دیتا ہے کہ میرا یہ خیال ہے' میں یہ سمجھتا ہوں' میرے مطالعے کا حاصل یہ ہے۔ چاہے اس کا مطالعہ یک رخا کیوں نہ ہو اور چاہے وہ اپنی سوچ اور علم میں بہت محدود حیثیت کا مالک کیوں نہ ہو۔ لیکن اسے اپنی نارسائی' اپنی کوتاہ علمی اور اپنی بصیرت میں کمی کا کبھی احساس نہیں ہوتا وہ اس احساس سے کبھی نکلنے نہیں پاتا کہ میرے علاوہ بھی میرے گردوپیش میں بہت سے ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جو علم و دانش میں مجھ سے بہت آگے ہیں اور مزید یہ بھی کہ میرا علمی میدان اگر طبیعات تک محدود ہے تو بالکل سیدھی سی بات ہے کہ میں الٰہیات' روحانیات اور آسمانی مذاہب کے بارے میں زیادہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن یہ ایک ایسا گہرا مرض ہے کہ اتنی کھلی اور واضح بات کو بھی سمجھنا اکثر لوگوں کیلئے دشوار ہو جاتا ہے وہ اپنے محدود اور یک رخے علم کے باوجود آپ کو اپنی بات پر ہمیشہ اصرار کرتے دکھائی دیں گے۔ علامہ اقبال نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ "بعض لوگ کنجِ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے ہمہ دانی کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں" انہوں نے چونکہ اپنی تنہائی کے گوشے یا اپنی چھوٹی سی لائبریری سے باہر کبھی جھانک کے نہیں دیکھا وہ کنویں کے مینڈک کی طرح اسی کو ساری دنیائے علم سمجھتے ہیں نتیجہ ظاہر ہے کہ چونکہ وہ اس کے سوا کچھ اور جانتے نہیں۔ اس لئے جب اپنے علم سے مختلف بات سنتے ہیں تو اس کا تسلیم کرنا انہیں مشکل ہو جاتا ہے پھر وہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے گرد علم کے نام سے جو ایک بے خبری کا حصار کھینچ رکھا ہے اس سے کبھی نکلنے نہ پائیں۔ مولانا روم نے ٹھیک فرمایا تھا کہ اصلاً آدمی اپنی ذات کا عاشق ہوتا ہے اسے اپنی ذات اور اپنے خیالات ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اس آدمی سے پیار کرتا ہے جس میں اسے اپنی ذات کا عکس نظر آتا ہے یا جس سے اسے اپنے خیالات کی تائید ملتی ہے وہ ایک اچھے خطیب' ادیب' قلم کار' مصور یا کھلاڑی کا جو سراپا بنا لیتا ہے بس جو اس سراپا کے مطابق اسے نظر آتا ہے اس سے وہ پیار کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ اپنی ذات سے پیار کرتا ہے بس یہ ایک ایسی فطری بات ہے جو اللہ کے دوسرے قوانین فطرت کی طرح انسانوں میں کارفرما ہے اب جب تک کوئی آدمی اپنے اس حصار کو توڑ کر باہر نہیں نکلتا وہ باہر کی بڑی سے بڑی حقیقت سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ کے نبی انہی حقیقتوں کو واشگاف کرنے کیلئے آتے ہیں کیونکہ وہ سب سے زیادہ اللہ کے قوانین فطرت کا علم رکھتے ہیں اس لئے ان قوانین کے مطابق زندگی گزارنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔ یہ مشرکینِ مکہ بھی اسی قانون فطرت کی گرفت میں تھے۔ وہ اپنے اسی حصار میں رہنے پر اصرار کر رہے تھے جس کا ڈھانچہ انہوں نے از خود تیار کیا اور پھر قانون فطرت کے مطابق جب پیار کرتے کرتے اس کے اسیر ہو گئے تو یہ ڈھانچہ ان کیلئے حصار بن گیا جس طرح گھر کی چار دیواری میں سمٹ کے رہنے والا باہر آئی ہوئی بہار سے کبھی فائدہ نہیں اٹھاتا وہ کواڑ بند کر کے جب تک گھر میں سمٹا رہے گا اسے کیا خبر کہ چمن میں کیسے پھول کھلے ہیں' کیسی کلیاں چٹک رہی ہیں' کس طرح گھٹا تلی کھڑی ہے' ہوائیں کس طرح اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی ہیں' زمین نے کس طرح سبز مخمل کا لباس پہن لیا ہے۔ اس باتوں سے وہ تب روشناس ہو گا جب وہ گھر کے حصار سے نکلے گا۔ یہ مشرکینِ مکہ بھی پیغمبر کی دعوت سے اس وقت فائدہ اٹھائیں گے جب وہ اپنے شرک اور کفر کے حصار سے نکل کر اس دعوت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اس سے نکلنے کی کوشش ان کا کام ہے۔ اس کے بعد اس راستے کو آسان کرنا اور راستے کی مشکلات کو دور کرنا یہ اللہ کا کرم ہے جو ہمیشہ وہ اپنے بندوں پر فرماتا ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک دوسرے پہلو سے مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اسلامی دعوت کے مقابلے میں اشراف قریش روز بروز اپنی مخالفتوں اور اذیتوں میں تیزی پیدا کرتے جا رہے ہیں اور ان کی ہر ممکن کوشش ہے کہ کسی طرح اس روشنی کو

Marfat.com

دیں اور اسلام کی اس مشعل کو ہمیشہ کیلئے گل کردیں تو تمہیں اس سے ہرگز خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے یہ دنیا کا کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ جب بھی کسی بستی میں دعوتِ حق بلند ہوئی ہے تو وہاں کے بڑے بڑے لوگوں میں جن کا باطل سے مفاد وابستہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ یہی رویہ اختیار کرتے ہیں وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اگر یہ دعوت کامیاب ہوگئی تو ہمارے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے اور ہم نے جو لوگوں کو آج تک غلام بنا رکھا ہے اور بھیڑ بکریوں کی طرح انہیں ہمیشہ ہانکتے رہے' جب ان میں آزادی کا شعور پیدا ہوگا تو یہ لوگ غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکیں گے۔ اور یہ اللہ کے سامنے جھکنے والے کسی اور کے سامنے جھکنے سے انکار کردیں گے اور جب وہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں سب کیلئے پیدا کی ہیں تو وہ استیصال کرنے والے ہاتھ توڑ ڈالیں گے تو یہ باتیں انہیں ڈراؤنے خواب کی طرح بدحواس کردیتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ اسلامی قوت کا راستہ روکنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر وہ طرح طرح سے تدبیریں کرتے ہیں' سازشوں کے جال پھیلاتے ہیں' لوگوں کے جذبات انگیخت کرتے ہیں اور ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ اس تحریک کو ختم کردیا جائے تو جب ہمیشہ ہر اٹھنے والی صداقت کے ساتھ یہی حادثہ پیش آیا ہے اور یہ اس راستے کی لازمی سنت ہے تو پھر اس سے اثر قبول کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ لوگ تو اسی تاریخی روایت کے مطابق اپنی حرکتیں جاری رکھیں گے اور تمہیں اللہ کے حکم کے مطابق اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہئیں لیکن وہ وقت دور نہیں کہ یہ ان کی سازشیں اور تدبیریں الٹی انہی پر آگریں گی اور یہی لوگ آہستہ آہستہ یا تو اس دعوت کو قبول کرکے اپنی آخرت بنالیں گے اور یا وہ ہمیشہ کیلئے عبرت کا نشان بن کے رہ جائیں گے۔ چنانچہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ انہوں نے اپنی اذیتوں سے اگرچہ مسلمانوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا اور پھر وہاں بھی ان کو اطمینان کا سانس نہیں لینے دیا لیکن ہجرت کے آٹھویں سال ہی میں بالآخر مکہ سرنگوں ہوگیا اور اہلِ مکہ یا تو مسلمان ہوگئے اور یا ختم ہوگئے۔

ابھی ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین مسلسل اسلامی دعوت کے مقابلے میں آئے دن نئی نئی تدبیر میں سوچتے اور نئی نئی شرارتیں کرتے تھے۔ انہی تدبیروں اور شرارتوں میں سے ایک کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آرہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۲۴ وَاِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰى نُؤۡتٰى مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَـتَهٗ ؕ سَيُصِيۡبُ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيۡدٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَمۡكُرُوۡنَ ○ ''اور جب ان کے پاس آتی کوئی آیت تو کہتے ہم تو ماننے کے نہیں جب تک ہم کو بھی وہی کچھ نہ ملے جو اللہ کے رسولوں کو ملا اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنا منصب رسالت کس کو بخشے جو لوگ شرارت کررہے ہیں اللہ کے ہاں ان کو ان کی اس چالبازی کی پاداش میں ذلت اور عذاب شدید نصیب ہوگا''۔

کفار رسالت کا مطالبہ کرتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ جب ان کے پاس اللہ کی کوئی آیت' عام اس سے کہ وہ کوئی نشانی ہو یا کوئی ہدایت وتنبیہ' آتی تو وہ یہ کہتے کہ ہم تو اس وقت تک ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں جب تک ہمیں بھی وہ رسالت نہ ملے جس کے مدعی یہ رسول ہیں آخر ان کو کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ انہیں خدا نے اپنا رسول بنایا اور ہمیں نظر انداز کردیا۔ درآنحالیکہ پشتہا پشت سے قیادت وسیادت اور دولت وامارت ہمارا حصہ ہے۔ ٹھیک یہی بات' جیسا کہ قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئی' قریش کے اکابر کہتے تھے۔ ان کو بھی وہی گھمنڈ تھا جو ان کے پیشرو مستکبرین اور مکذبین انبیاء کو تھا کہ اگر خدا کسی کو رسالت ہی دینے والا تھا تو کیا اس تاج کیلئے اس کو ابنی (محمد ﷺ) کا سر موزوں نظر آیا' آخر مکہ یا طائف کے کسی سردار پر اس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ ظاہر ہے کہ یہ بات

Marfat.com

وہ تو محض چالبازی کے طور پر کہتے تھے' اس سے مقصود ان کا محض اپنی انانیت اور خود فریبی کیلئے ایک پردہ فراہم کرنا اور اپنے عوام کو بے وقوف بنانا ہوتا تھا۔ سادہ لوح عوام دینوی اسباب و وسائل کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ جن کو دنیا میں بڑا دیکھتے ہیں' سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی یہی بڑے ہوں گے۔ اس ذہن کے لوگ آسانی سے اس قسم کے چکموں میں آجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس بات کو مکر سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ ایک سیاسی اشغلا تھا۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ یہ ان مستکبرین کو جواب ہے اور گو لفظاً سخت نہیں ہے لیکن معناً بہت سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منصب رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کس و ناکس بن جائے یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ مخمل اور زربفت کی جھول نہیں ہے جو بسا اوقات گدھوں پر بھی نظر آجاتی ہے۔ بلکہ یہ خلعتِ الٰہی اور تشریف آسمانی ہے جو انہی کو نصیب ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرمائے۔

رسالت اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے:

اس ٹکڑے سے جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ نبوت و رسالت ایک موہبت ربانی اور ایک عطیہ الٰہی ہے جو صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کیلئے انتخاب فرمائے وہیں یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کیلئے انتخاب انہی کو فرماتا ہے جو اپنی اکتسابی صلاحیتوں اور خوبیوں کے اعتبار سے نوع انسانی کے گل سر سبد نخل فطرت کے بہترین ثمر اور کمال انسانیت کے مظہر اتم ہوتے ہیں۔

سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ۔ اَجْرَمُوْا

میں اگرچہ انکے وہ تمام جرائم اور ان کی وہ ساری چال بازیاں شامل ہیں جن کے وہ مرتکب ہوئے لیکن یہاں اس سے انکے اس استکبار کی طرف خاص اشارہ ہو رہا ہے جسکا اظہار انہوں نے

لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ

میں کیا۔ اسی استکبار کے تعلق سے ان کیلئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت بھی ہے اور عذاب شدید بھی۔

کفار کو شدید ذلت و عذاب شدید ہوگا:

چنانچہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لائے اور برابر اس استکبار کے مرض میں مبتلا رہے اللہ نے انہیں دنیا ہی میں اس کی سزا دی۔ جنگِ بدر میں ان کے بڑے بڑے سرداروں کی پہلی صف نہایت ذلت آمیز عذاب کا شکار ہوئی۔ ستر قتل ہوئے اور ستر گرفتار ہوئے ان کے بڑے بڑے سرداروں کو کھینچ کر ایک بند کنویں میں پھینکا گیا تو کنویں کی منڈیر پر کھڑے ہو کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ او قتل ہونے والے سردارو تمہیں اب تو معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں تمہیں جس چیز کی طرف بلاتا تھا وہ حق تھی اور میں واقعی اللہ کا رسول ہوں اور تمہیں میں جس عذاب سے ڈراتا تھا وہ عذاب اب تمہارے سامنے ہے۔ حضرت عمر فاروق نے یہ سن کر عرض کیا کہ حضور آپ جن لوگوں سے مخاطب ہیں وہ تو مر چکے ہیں وہ تو آپ کی بات سن نہیں سکتے آپ نے فرمایا کہ وہ تم سے زیادہ سنتے ہیں۔ البتہ جواب نہیں دے سکتے۔ یعنی یہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ تھا کہ وہ آنحضرت کی باتیں سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے اور یقیناً اس ذلت کو بھی محسوس کر رہے ہوں گے جس ذلت کا وہ شکار ہوئے اور اسی طرح جو باقی بچے اور پھر وہ ایمان نہ لائے تو فتح مکہ کے موقع پر ان میں سے ایک ایک آدمی جو اپنے آپ کو نجانے کیا سمجھ رہا تھا ہاتھ باندھے آنحضرت ﷺ کے سامنے کھڑا تھا اور آپ نے جب پر جلال انداز میں فرمایا

Marfat.com

...نہ بتاؤ آج میں تم سے کیا سلوک کروں وہ جو کچھ آج تک آنحضرت کی شان میں اور مسلمانوں کے ساتھ کر چکے تھے اس کی ایک ایک بات انہیں ان کے
...ل ہونے کا یقین دلاتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی وہ مردم شناس لوگ تھے وہ آنحضرت ﷺ کے مکارمِ اخلاق سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ
...دنے آپ کو رحمت بنا کر بھیجا ہے اور عفو و درگزر آپ کی خصوصی صفات ہیں۔ چنانچہ سب نے بیک زبان کہا کہ آپ کریم ہیں کریم کے بیٹے ہیں ہم آپ
...ی کرامت نفس کو جانتے ہوئے آپ سے بہتر سلوک کے امیدوار ہیں۔ تب آپ نے فرمایا کہ جاؤ آج تم سب آزاد ہو میں تم سے وہی کہتا ہوں جو
...ضرت یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں اللہ تمہارے گناہ معاف کرے کیونکہ وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے پھر ان
...ے تکبر اور استکبار پر مزید چوٹ لگانے کیلئے آپ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ کعبے کی چھت پر چڑھ کر اذان کہو چنانچہ جیسے ہی کعبے کی چھت پر حضرت بلال
...نے اذان کہنا شروع کی تو یہ لوگ جو ہاتھ باندھے کھڑے تھے تلملاتے اور کھولتے رہے کہ یہ وہ غلام ہے جو کوڑیوں میں بکتا تھا اور جس کے ساتھ ہم نے
...ترین سلوک روا رکھا تھا آج اللہ کے گھر کی چھت پر ہمارے سامنے اللہ کی کبریائی کا اعلان کر رہا ہے اور ہمارے تکبر پر ٹھوکریں لگا رہا ہے اور جہاں تک
...مت کے عذاب کا تعلق ہے وہ تو اپنے کفر اور شرک کے باعث سب مشرکوں اور کافروں کو پہنچے گا لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو عذاب بھی دگنا دیا
...ے گا ایک ان کے کفر و شرک کا اور دوسرا ان کے استکبار کا۔

.................﴿اللہ﴾......﴿اللہ﴾......﴿اللہ﴾.................

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ
جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ
يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ
کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے
كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَهٰذَا
اس طرح خدا ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے ۔ اور یہی تمہارے
صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾
پروردگار کا سیدھا رستہ ہے۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں اُن کے لیے ہم نے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان
لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ وَ
کر دی ہیں ۔ اُن کے لیے اُن کے اعمال کے صلے میں پروردگار کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہی اُن کا دوستدار ہے

Marfat.com

يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَٰمَعْشَرَ ٱلْجِنِّ قَدِ ٱسْتَكْثَرْتُم مِّنَ

اور جس دن وہ سب (جن و انس) کو جمع کرے گا۔ (اور فرمائے گا کہ) اے گروہ جنات تم نے انسانوں سے بہت (فائدے)

ٱلْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَآؤُهُم مِّنَ ٱلْإِنسِ رَبَّنَا ٱسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا

حاصل کیے۔ تو جو انسانوں میں اُن کے دوست دار ہوں گے وہ کہیں گے کہ پروردگار ہم ایک دوسرے سے فائدے

بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَآ أَجَلَنَا ٱلَّذِىٓ أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ ٱلنَّارُ مَثْوَىٰكُمْ

اُٹھاتے رہے اور (آخر) اس وقت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔ خدا فرمائے گا (اب) تمہارا ٹھکانا دوزخ

خَٰلِدِينَ فِيهَآ إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٨﴾ وَكَذَٰلِكَ

ہے۔ ہمیشہ اس میں (جلتے) رہو گے مگر جو خدا چاہے۔ بے شک تمہارا پروردگار دانا اور خبردار ہے۔ اور اسی طرح

نُوَلِّى بَعْضَ ٱلظَّٰلِمِينَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴿١٢٩﴾

ہم ظالموں کو اُن کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے پر مسلّط کر دیتے ہیں۔

تمہید:

متذکرہ بالا پوری صورتحال کو سامنے رکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ مشرکین مکہ اور دیگر مشرکین نے اسلام قبول نہ کرنے کے بظاہر مختلف بہانے تراش رکھے تھے اور وہ اپنے انکار کے اصل سبب کو چھپانے کیلئے نئے سے نئے عذر اختراع کرتے رہتے تھے اور نئے نئے مطالبات رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کر کے لوگوں کو مطمئن رکھنے کی کوشش بھی کرتے اور اپنے انکار کے اصل سبب پر پردہ ڈالنے کی بھی سعی ناتمام کرتے۔ لیکن قرآن کریم نے ان کی اس حرکت کا پردہ بار بار چاک کیا اور گزشتہ آیت میں جیسا کہ اس کی تفصیل عرض کی گئی بتایا گیا کہ ان کے انکار کا اصل سبب ان کا استکبار ہے جس کی ان کو دنیا میں بھی ملی اور آخرت میں وہ مزید اس کی سزا پائیں گے۔ لیکن مزید تدبر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو قرآن کریم قدم قدم ہماری فکر کو غذا دیتا آگے بڑھ رہا ہے اور توجہ دلا رہا ہے کہ استکبار اور تکبر کا پیدا ہونا اس کی بھی یقیناً کوئی علت ہے۔ یہ بلا سبب پیدا نہیں ہوتی اور اگر یہ پیدا ہو بھی جائے تو آدمی اس میں اس حد تک اندھا نہیں ہو جاتا کہ وہ گردو پیش پھیلی ہوئی کھلی کھلی علامتوں کو دیکھنے کے باوجود اس سے کوئی سبق نہ لے سکے۔ اس کے سامنے دعوت اپنی حقانیت اور صداقت کی تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو لیکن وہ اس پر کوئی اثر نہ پیدا کر سکے۔ پھر اس دعوت کو پیش کرنے والا اپنی ذات میں بجائے ایک معجزانہ شخصیت رکھتا ہو لیکن یہ لوگ اس سے بھی متاثر ہونے سے انکار کر دیں۔ پھر دعوت پیش کرنے کا انداز اور دعوتی خطاب کے جاندار، موثر خوبصورت اسالیب جو بجائے خود اپنے اندر نہایت جاذبیت اور اپیل رکھتے ہوں بھی اپنی تمام اثر آفرینی کے باوجود کام دکھانے سے عاجز نظر آئیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ استکبار اگرچہ انکار کی بظاہر علت ہے لیکن حقیقی علت نہیں ہے۔ حقیقی علت اس کے سوا کچھ اور ہے۔ لیکن اس کو شروع میں

Marfat.com

لئے ذکر نہیں کیا گیا کہ ظاہری علت کو نظرانداز کر کے کئی پردوں میں چھپی ہوئی علت کو بیان کرنا' یہ اپنے سننے والوں اور اپنے مخاطب لوگوں کو امتحان میں ڈالنے سے کم نہیں اور کسی بھی صداقت کی دعوت چونکہ اپنے اندر ایک سادگی' تسہیل اور وضاحت وصراحت رکھتی ہے' جو دل ودماغ کو بدلنے کیلئے انتہائی ضروری ہے' اس کے فطری اسلوب کے یہ بات خلاف ہے کہ آسانی سے سمجھ آنے والی علتوں کو نظرانداز کر کے ایک گہری اور دقیق علت کا ذکر کیا جائے۔ چنانچہ پہلے اس علت کو بیان کیا گیا' جو سمجھ میں آسکتی تھی اور جو یقیناً ایک علت کے طور پر کارفرما بھی تھی اور اب اگلی آیت کریمہ میں اس حقیقی علت کو بیان کیا جارہا ہے' جس کی حیثیت علت العلل سے کم نہیں۔ لیکن یہ علت ابتداء میں پیدا نہیں ہوجاتی۔ اس کا شکار ہونے والا شخص' رفتہ رفتہ اپنے کفروانکار کی وجہ سے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ کفر کے اس سفر میں بتدریج اس کے کفر کی علتیں سامنے آتی ہیں اور اس کی اصلاح کیلئے ایک داعی ان کی طرف توجہ بھی دلاتا ہے تاکہ خرابی کو مزید بڑھنے سے روکنے کیلئے ابھی سے اس کا علاج کرلیا جائے۔ لیکن جب مریض بدپرہیزی سے باز نہیں آتا اور علاج کو قبول کرنے کی بجائے' علاج اور معالج سے دشمنی پراتر آتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ اس حقیقی علت کا شکار ہوجاتا ہے' جو یہاں کارفرما فطری قوانین میں سے ایک اہم قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اس کی وضاحت کیلئے ارشاد فرمایا گیا:

آیت:۱۲۵ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ''اللہ جس کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے' اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے' اس کے سینہ کو بالکل تنگ کردیتا ہے' گویا اسے آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہے۔ اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کردیتا ہے ان لوگوں پر' جو ایمان نہیں لاتے''۔

اس آیت کریمہ کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ گہرے تدبر کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس لئے میں سب سے پہلے اس کے بعض الفاظ کے معانی کا ذکر کرتا ہوں۔ اس کے پہلے جملے میں ہدایت کا ذکر آیا ہے۔ میں گزشتہ کسی درس میں ہدایت کے مختلف معانی بیان کرچکا ہوں' اب انہیں دہرانا نہیں چاہتا' البتہ یاددہانی کیلئے صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ ہدایت کا ایک معنی ہے راستہ دکھانا' رہنمائی کرنا' بات کو آسان کردینا' قبولیت کیلئے آمادگی پیدا کرنا اور دوسرا اس کا معنی ہے' قلبی نور وبصیرت۔ یعنی طبیعت میں اس طرح کی کیفیت پیدا کردینا جس سے بات قبول کرنے میں کوئی دقت باقی نہ رہے۔ اس کے بعد ذکر آیا ہے شرح صدر کا۔ شرح صدر اصل میں اسی ہدایت کا ثمر اور اس کا نتیجہ ہے۔ البتہ ہدایت کے دونوں معنوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہئے کہ شرح صدر کی کیفیت دونوں معنوں میں الگ الگ ہوگی' جس کا آگے وضاحت میں ذکر آئے گا۔

''حَرَجَ'' کا معنی ہوتا ہے ''جھاڑیوں سے بھری ہوئی تنگ جگہ''۔ یعنی ایک جگہ یا ایک راستہ جو پہلے ہی تنگ ہے' اس کو جھاڑیاں اگ آنے کے باعث مزید تنگ کردیا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ ''ضَيِّقًا'' کی تاکید کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ يَصَّعَّدُ اس کا مصدر تصعد ہے۔ اس کا معنی ''بہ تکلف اور بہ مشقت کسی بلندی پر چڑھنا ہے''۔ یعنی آدمی کسی ایسی بلندی پر چڑھے جس میں اس کی سانس پھول جائے' پھیپھڑے جواب دینے لگیں اور پسینہ پسینہ ہوجائے۔ ''السَّمَآءِ'' یہ آسمان اور بادل پر بھی بولا جاتا ہے اور فضا پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے' یہاں یہ فضا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت کریمہ میں' ان کے انکار کی اصل علت کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن انکار کی کیفیت پیش نظر رہنی چاہئے۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام مشرکین عرب' شاید ایک طرح کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ یعنی تمام کا حال یہ تھا کہ وہ کسی طرح بھی اسلام کا نام سننے کے روادار نہیں تھے۔ وہ اسلامی دعوت اور آنحضرت ﷺ کی ذات کو کسی طرح بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ یقیناً عام مشرکین کا یہی طرز عمل تھا۔ لیکن اگر یہ بات کہی جائے تو یہ انسانی فطرت کی شاید صحیح

Marfat.com

ترجمانی ہو کہ انکار کرنے والوں میں انکار کی کیفیت یکساں نہیں ہوتی۔ اکثریت تو ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے، جن کا ابھی ذکر ہوا۔ لیکن ایک قابل ذکر تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے، جو اسلامی دعوت کو سنتے اور بعد میں اس پر غور بھی کرتے ہیں، لیکن اس دعوت کی بعض باتیں ان کے فکری سانچے میں اترنے میں نہیں آتیں۔ انہوں نے اپنے ذہن اور دماغ کو جس طرح کے سانچے میں ڈھال لیا ہوتا ہے۔ اس میں صرف وہی بات داخل ہو سکتی ہے جو اس سانچے سے میل کھاتی ہو۔ رہی اس سے مختلف بات تو وہ کبھی اس میں داخل نہیں ہونے پاتی۔ اس لئے کہ وہ اپنے سانچے کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیتے اور اپنی سوچ میں کسی تبدیلی کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتے، بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ کے کواڑ اس طرح قوت سے بند کریں کہ بہار کا موسم آ کر گزر جائے، لیکن اس کی کوئی خوشبو اور اس کی خوشگوار ہوا کا کوئی جھونکا کبھی ان کے کواڑوں سے گزر نہ سکے۔

کفار کا فکری جمود:

اس صورت حال پر اگر آپ غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ مرض دو طرح کا ہے۔ ایک جامد انکار کا اور دوسرا فکری جمود کا۔ اگرچہ انجام دونوں کا ایک ہے کہ دونوں ہی اسلام کی دولت کو قبول کرنے سے محروم رہتے ہیں، لیکن یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے اپنی بلاغت لسانی سے دونوں باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور اس کی طرف راہنمائی آیت کے دوسرے حصے سے ہو رہی ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے، اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کفر اور شرک کی اس گندگی کو، جو ایمان نہیں لاتے، ان پر مسلط کر دیتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ محرومی کی دو سزائیں ہیں، جو دو الگ الگ مجرموں کیلئے تجویز کی گئی ہیں، جن میں سے پہلا مجرم وہ ہے، جو اسلامی دعوت پر کان تو دھرتا ہے، لیکن اس کا فکری جمود اس کے دل و دماغ تک اسے پہنچنے نہیں دیتا چونکہ وہ اپنے دماغ کا کوئی دریچہ اور اپنے دل کا کوئی دروازہ، اس کیلئے کھولنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ اس دعوت اسلامی کے نتیجے میں، اسے ایک بلند چڑھائی چڑھنے کیلئے کہا جا رہا ہے، جس کا تصور ہی اس کو پسینہ پسینہ کر دینے کیلئے کافی ہے۔ وہ اس کیلئے سوچتا ضرور ہے، لیکن اس کے دل و دماغ کی تنگی اس کے احساس میں مزید شدت پیدا کر دیتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ یقیناً یہ دعوت قابلِ توجہ تو ہے، لیکن میرے دل و دماغ میں اس کیلئے کوئی گنجائش نہیں اور میری زندگی کے سفر میں چونکہ مفادات کے بندھن بہت مضبوط ہیں اور یہ دعوت ایثار و قربانی کا تقاضہ کرتی ہے، میں اسے کسی طور قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے دماغ اور نفس کے تقاضوں کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں اور یہاں مجھے اللہ کے احکام کے سامنے سپر انداز ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ جیسے جیسے اپنی سوچ میں آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کے دل کی گھٹن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ جب اس دعوت اور اپنی زندگی میں کوئی مطابقت نہیں دیکھتا تو محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک ایسا بوجھ ہے، جو مجھ سے کبھی اٹھایا نہ جائے گا۔ اس لئے وہ عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ راہ فرار اختیار کرے۔

دوسرا وہ شخص ہے، جو سرے سے دعوتِ اسلامی اور دینِ اسلام کے نام سے بھی چڑتا ہے۔ اسے اس کی ہر بات بری محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے اعتقادات باطلہ میں اس حد تک راسخ ہے کہ اسلامی دعوت کی ایک ایک بات پر وہ لڑنے مرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے اس رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک کے ڈھیروں تلے دب کے رہ جاتا ہے اور اسلام کی صحت مند ہوا کا کوئی جھونکا کبھی اس کے قریب بھی نہیں بھٹک سکتا۔ اس طرح یہ دونوں گروہ اپنے اپنے احوال کے مطابق محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ پروردگار نے یہاں اس محرومی کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ قدرت نے ان کی گمراہی کا سامان تو خود کیا ہے تو اس میں آخر ان کا قصور کیا ہے لیکن اگر گزشتہ مختلف آیات کی تفسیر کے ضمن میں ہماری وضاحتیں ذہن میں رہیں تو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ ان وضاحتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کا

Marfat.com

دل ایک آئینہ کی مانند ہے جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس آئینہ پر ایک داغ پڑ جاتا ہے اگر یہ شخص توبہ کے آنسوؤں سے اس داغ کو دھو دیتا ہے تو آئینے کی اصل شکل وصورت اور حیثیت بحال ہو جاتی ہے لیکن اگر یہ گناہ پر گناہ جاری رکھتا ہے تو داغ پہ داغ بڑھتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے کہ یہ آئینہ داغ داغ ہو کر اپنی آب وتاب کھو دیتا ہے اور بالکل بے نور ہو جاتا ہے' یہی وہ وقت ہے جب قبولیت حق سے اس کی محرومی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس کو مزید سمجھنے کیلئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم اور اس کے دل ودماغ کی صلاحیتوں میں یہ قانون رکھا ہے کہ جب تک ان صلاحیتوں سے صحیح طریقے سے کام لیا جاتا رہے تو یہ صلاحیتیں زندہ رہتی ہیں لیکن جب ان کو ان کے اصل کام سے روک دیا جائے یا ان سے وہ کام لینا شروع کر دیا جائے جس کام کیلئے ان کے خالق نے ان کو نہیں بنایا تو یہ صلاحیتیں دم توڑ جاتی ہیں مثلاً ہاتھ کو اللہ نے پکڑنے اور چھونے کیلئے پیدا کیا اس میں قوت لامسہ رکھی ہے۔ آدمی اس سے زندگی کے بہت سے کام لے سکتا ہے لیکن اگر آپ اس ہاتھ کو کسی چیز سے باندھ دیں اور اس کو عضو معطل بنا کے رکھ دیں تو ایک عرصہ گزرنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہاتھ مفلوج ہو گیا ہے' یہی حال باقی اعضاء جسم اور ان کی صلاحیتوں کا ہے اور یہی کیفیت آدمی کے دل ودماغ کی بھی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت اور دنیا اور زندگی کے حقائق کو دیکھنے اور سمجھنے کیلئے پیدا کیا۔ لیکن جب اسے شرک' کفر اور ناشکری میں استعمال کیا جانے لگے تو آہستہ آہستہ وہ اپنی اصل خصوصیات سے محروم ہو جاتا ہے اس محرومی کا اصل سبب تو وہ شخص ہے جس نے اس کو اصل کام نہیں کرنے دیا اور اس کو معطل رکھ کر مفلوج کر دیا لیکن یہ قوانین چونکہ اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب فرما کر یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسا کیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے عہد الست کی صورت میں ہر آدمی کی فطرت میں اپنی معرفت اور قبولیت حق کا مادہ رکھا ہے اور پھر اس عہد الست کی یاددہانی کیلئے ہم نے اس پوری کائنات کو اپنی نشانیوں سے بھر دیا اور ان نشانیوں کو سمجھنے کیلئے ہم نے انسانوں کو جوہر عقل سے نوازا لیکن ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہم نے ان کی آسانی کیلئے اپنے رسول بھیجے' اپنی کتابیں اتاریں۔ پھر ہر رسول سے معجزات کا ظہور کیا تاکہ لوگوں کو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو کہ یہ لوگ دنیا میں اللہ کے نمائندے ہیں۔ پھر اللہ نے اپنے آخری رسول کو بھیجا تو اس پر جو کتاب اتاری اس کو بجائے خود معجزہ بنا دیا کہ دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز ہو گئی اور خود پیغمبر کی اپنی ذات' اپنی جاذب نظر شخصیت' اپنے مکارم اخلاق' اپنے پاکیزہ طور اطوار اور غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث خود ایک عظیم معجزہ ٹھہری یہ سب کچھ اس لئے کیا تاکہ لوگ اس پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے میں دشواری محسوس نہ کریں۔ لیکن معدودے چند لوگوں کے سوا جب ایک بڑی تعداد نے اس دعوت پر کان دھرنے سے انکار کر دیا یا اپنے دل ودماغ کے دروازے اس پر بند کر لئے تو اللہ کا وہ فطری قانون حرکت میں آیا جس کا پہلے ذکر ہو چکا جس کے نتیجے میں وہ قبولیت حق سے اس طرح محروم کئے گئے کہ کچھ لوگ تو سینہ کی انتہائی گھٹن اور تنگی کا شکار ہوئے اور کچھ پر کفر اور شرک کی گندگی اس طرح مسلط کر دی گئی کہ وہ اسی کے نیچے دب کے رہ گئے۔ لیکن جن لوگوں نے اس دعوت کی قبولیت کیلئے کوشش کی' اسے سمجھنا چاہا' اگرچہ اسے قبول کرنے میں ہزار دشواریاں تھیں اور جسم وجان کے ساتھ ساتھ گھر اور مال کی قربانیاں بھی تھیں' لیکن انہوں نے پھر بھی ہمت دکھائی تو اللہ نے ان کیلئے اس راستے کو اس طرح آسان فرمایا کہ ان کو دو طرح کی ہدایت سے نوازا۔ کسی کیلئے تو قبولیت آسان کر دی گئی اور وہ اسلام کی آغوش میں آ گیا اور کسی کیلئے دل اور ضمیر کی بصیرت کا راستہ کھولا اور اس کے شک وشبہ کے ایک ایک کانٹے کو اس طرح چن دیا کہ اس کے دل ودماغ ہر طرح کے شک وشبہات سے نجات پا گئے اور ان کے دل کو ایسی کشادگی ملی کہ عالم غیب کی مشکل سے مشکل باتیں عالم الٰہیات کے مشکل مراحل اور ان دیکھی حقیقتوں کا سفر ان کیلئے انتہائی آسان ہو گیا اور شاید یہی وہ چیز ہے جس کی طرف ہمیں ایک حدیث سے بھی راہنمائی ملتی ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے شرح صدر یعنی سینہ اسلام کیلئے کھول دینے کی تفسیر دریافت کی آپ

Marfat.com

نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ایک روشنی ڈال دیتے ہیں جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے سمجھنے اور قبول کرنے کیلئے کھل جاتا ہے (یعنی حق بات کو آسانی سے قبول کرنے لگتا ہے اور خلاف حق سے نفرت اور وحشت ہونے لگتی ہے)۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے جس سے وہ شخص پہچانا جائے کہ اس کو شرح صدر حاصل ہو گیا ہے فرمایا علامت یہ ہے کہ اس شخص کی ساری رغبت آخرت اور اس کی نعمتوں کی طرف ہو جاتی ہے۔ دنیا کی بے جا خواہشات اور فانی لذتوں سے گھبراتا ہے اور موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنے لگتا ہے۔

صحابہ کرام کو جب ہم دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایک صحابی کو شرح صدر سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم کہتا ہے کہ جب ان پر قرآن کریم کے احکام پڑھے جاتے ہیں تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں اور جھک جاتے ہیں اور یہ بات ذہن میں رہے کہ قرآن پاک کے بعض احکام اُس دور میں اپنے اندر شدید آزمائش بھی رکھتے تھے۔ مثلاً جب مسلمانوں کو راہ حق میں ایک سے ایک بڑی آزمائش درپیش تھی اور قرآن انہیں صبر کی تعلیم دے رہا تھا۔ مسلمان اکثریت کی مخالفت کے حصار کے باعث آئے دن مالی دشواریوں میں انتہاء درجہ پھنستے چلے جا رہے تھے لیکن قرآن کریم ان کو انفاق کا حکم دے رہا تھا اور پھر مدنی زندگی میں جہاد و قتال کا حکم اس مختصر سے گروہ کیلئے پوری دنیا سے لڑ جانے کے مترادف تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہر اترنے والے حکم پر ان کے دلوں میں بجائے تنگی آنے کے انشراح میں اضافہ ہوتا تھا وہ ایک ایک حکم پر اللہ کا شکر بجالاتے تھے اس صورت حال کو جب آدمی دیکھتا ہے تو ان کے طبعی اطمینان اور ہر حکم کی تعمیل کو شرح صدر کے سوا اور کسی نام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور یہ اللہ کی وہ توفیق اور کرم ہے جو سراسر اسی کی عنایت سے نصیب ہوتا ہے اور اس کی بعض مثالیں تو خود دورِ صحابہ میں بھی حیران کن تھیں۔

حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عام الوفود میں جب پورے جزیرۂ عرب سے اسلام قبول کرنے یا دین کا علم حاصل کرنے کیلئے وفد پر وفد آ رہے تھے اور ملک کے کونے کونے سے لوگ مدینے کی طرف امڈے چلے آ رہے تھے انہی وفود میں سے ایک وفد یمن سے بھی آیا جو چند افراد پر مشتمل تھا۔ آنحضرت کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی وفد آتا تو آپ چند روز اسے ٹھہرنے کا حکم دیتے تاکہ وہ دین کی ضروری باتیں سیکھے اور مدینے کے اسلامی معاشرے میں رہ کر اسلامی معاشرتی زندگی سے پوری طرح آگاہی حاصل کرے۔ چنانچہ یمن کے اس وفد کو بھی چند دن مدینے میں ٹھہرایا گیا اور دوسرے وفود کی طرح جب یہ لوگ روانہ ہونے لگے تو آنحضرت ﷺ نے ان کو تحائف اور ہدایا دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ جب سب لوگ اپنا اپنا تحفہ لے چکے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم میں سے کوئی شخص رہ تو نہیں گیا جس کو یہ تحفے نہ ملے ہوں۔ انہوں نے عرض کی کہ حضور ایک نوجوان ہے جس کو ہم پیچھے سامان کی حفاظت کیلئے چھوڑ آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور اسے بھی بھیجو۔ چنانچہ وہ نوجوان آیا جس کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں اٹھتی جوانی تھی بالکل نوخیز اور الھڑ عمر آنحضرت سے آ کر ملا۔ حضور نے اس کو تحائف دینے کا حکم دیا اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا حضور میں اس مقصد کیلئے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ آپ نے نہایت شفقت سے پوچھا کہ اچھا جوان تم بتاؤ تم کیا مقصد لے کر آئے ہو؟ اس نے کہا حضور میری خواہش یہ ہے کہ آپ میرے لئے تین باتوں کی دعا فرما دیں۔ ایک یہ کہ اللہ مجھ پر اپنا رحم فرمائے اور دوسری یہ بات کہ اللہ مجھے بخش دے اور تیسری یہ بات کہ اللہ تعالیٰ میرے دل کو مستغنی کر دے۔ چنانچہ حضور نے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہ خداوندی میں عرض کی۔ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ یا اللہ اس پر رحم فرما وَاغْفِرْلَهٗ اور اس کی مغفرت فرما وَاجْعَلْ غِنَاهُ فِي قَلْبِهٖ اور اس کے دل کو مستغنی کر دے۔ چنانچہ یہ وفد واپس چلا گیا۔ چند مہینوں کے بعد حضور حج پر تشریف لے گئے وہاں اسی وفد کے چند افراد آپ سے ملے لیکن وہ نوجوان ان میں نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس نوجوان کی ادائیں اب تک یاد تھیں۔ چنانچہ آپ نے اس نوجوان کے بارے میں پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا حضور اس کا آپ کیا پوچھتے ہیں اس جیسا کوئی نوجوان ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ دنیا میں رہ

Marfat.com

آخرت کا مسافر ہے ہر وقت اس پر آخرت کا احساس مسلط رہتا ہے۔وہ دنیا کی نعمتوں سے مستفید ہوتا ہے لیکن ان سے جی نہیں لگاتا وہ اللہ کے احکام کی تعمیل میں شب وروز اس طرح کوشاں رہتا ہے کہ وہ ہر دن کو آخری دن سمجھتا ہے اور ہر رات کو آخری رات۔آپ نے ان کی باتیں سن کر فرمایا:

﴿ اِنِّی لَاَرْجُوْ اَنْ یَمُوْتَ جَمِیْعًا میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ اسے دل جمعی کی موت دے گا﴾

انہوں نے پوچھا حضور کیا ہر آدمی دل جمعی کی موت نہیں مرتا آپ نے فرمایا دل جمعی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی مرنے والا دنیا سے جاتا ہوا بھی دنیا ہی کی محبت میں چیختا ہوا جاتا ہے اسے آخری وقت بھی فکر اگلی دنیا کی نہیں بلکہ پیچھے کی ہوتی ہے کہ میری اولاد کا کیا بنے گا میں جو کام شروع کر چکا تھا وہ تکمیل پذیر کیسے ہوگا۔میں نے اتنی دولت جمع کی اب اس کا کیا بنے گا یعنی دنیا کی ایک ایک بات اس کی فکرمندی کا سبب ہوگی اسے وہ یکسوئی اور دلجمعی نصیب نہیں ہوگی جو منزل کی طرف بڑھنے والوں کی نصیب ہوتی ہے۔

اپنا اپنا جائزہ:

اس آیت کریمہ کی اس پوری تفسیر کو سامنے رکھیں تو ہمارے لئے اس میں غور وفکر کا بہت سا سامان ہے کیونکہ اس میں بعض علامتیں ایسی بیان کر دی گئی ہیں جو آدمی کو تفکر اور تدبر کی دعوت دیتی ہیں اور جس کی روشنی میں آدمی کو اپنا جائزہ لینا آسان ہو جاتا ہے۔ہم اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں پڑھ چکے ہیں کہ اللہ جب کسی کے سینے کو کھولتا ہے تو اس کی علامت یہ ہے کہ اس کے دل میں ایک نور پیدا کرتا ہے۔جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے سمجھنے اور قبول کرنے کیلئے کھل جاتا ہے اور جب کسی کے بارے اللہ محرومی کا فیصلہ کرتا ہے تو حق کی قبولیت اور نیکی کی طرف میلان اس کیلئے ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے یعنی جب وہ اللہ کا ذکر سنتا ہے تو اس کو وحشت ہونے لگتی ہے اور جب کفر وشرک کی باتیں سنتا ہے تو ان میں دل لگتا ہے اس علامت کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اپنا احتساب اور اپنے اصل مقام کی پہچان آدمی کیلئے کس قدر آسان ہو جاتی ہے۔وہ اپنے دل ودماغ کا جائزہ لے کر اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ میرے دماغی رجحانات اور قلبی میلانات کا رخ کس طرف ہے کیا مجھے نیکی اچھی لگتی ہے یا برائی؟ کیا میں نیک لوگوں کی صحبت پسند کرتا ہوں یا برے لوگوں کی؟ کیا قرآن کی تلاوت میں میرا دل لگتا ہے یا افسانے پڑھنے اور ڈرامے دیکھنے میں؟ کیا اسلامی قوتوں اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں میرے اندر فکرمندی پیدا ہوتی ہے یا محض اپنی ذات اور اپنی ضروریات کے حوالے سے میں فکرمند ہوتا ہوں۔کیا مسلمانوں کی اجتماعی حالت میرے غور وفکر اور میری فکرمندی کا موضوع ہے یا صرف اپنی اور اپنے متعلقات کی فکر ہی میری سوچ کا اصل میدان ہے؟ اس سے بڑی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میں اللہ کی عنایات کا مورد ہوں یا اللہ کی التفات مجھ سے ہٹ چکی ہے۔لیکن یہ سوچ یہ احتساب اور یہ جائزے کی خواہش یہ بھی تو اللہ کی دین ہے یہ اسی دل میں پیدا ہوتی ہے جس پر اللہ کا کرم ہوتا ہے اور جس میں کبھی ان باتوں کا گزر نہیں ہوتا اسے سمجھ لینا چاہئے کہ میں اللہ کی رحمت سے بہت دور ہوں۔

اسلام کی قبولیت کے راستے میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ تھی اور جو مشرکین مکہ کے اسلام نہ قبول کرنے کی اصل علت تھی اس کو منکشف کرنے اور مشرکین مکہ کی حالت نفسی کو پوری طرح کھول دینے کے بعد پھر ہمارے تدبر کو دعوت دی گئی ہے کہ غور کرو اسلام کی دعوت کو قبول کرنا کس قدر آسان اور سہل ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ اس راستے کی مشکلات جو مشرکین نے خود پیدا کی ہیں اور جس کے نتیجے میں اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے اس کو وہ سمجھیں اور اس سے تائب ہو کر اسلام کی طرف بڑھیں اور پھر وہ دیکھیں گے کہ اس کو سمجھنے اور اس کو قبول کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اسی بات کو بیان کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

آیت:۱۲۶ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ط قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ O ''اور یہ تیرے رب کی راہ سیدھی۔ہم نے اپنی آیتیں تفصیل سے بیان کردی ہیں ان لوگوں کیلئے' جو یاددہانی حاصل کریں''۔

اللہ کا راستہ سیدھا ہے جو چاہے اس پر چل کر فائدہ حاصل کر لے:

اس آیت کا پہلا حصہ نہایت غور طلب ہے۔عربیت کے لحاظ سے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اشارہ کے اندر فعل کے معنی پائے جارہے ہیں۔اس وجہ سے مستقیما یہاں صراط کی صفت کی بجائے حال واقع ہو رہا ہے جس میں یہ زور دینا مقصود ہے کہ اے مشرکین مکہ تم جس دین کو قبول کرنے میں الجھ رہے ہو بلکہ تم اس کی دشمنی میں اندھے ہوئے جارہے ہیں اور اس کی قبولیت کیلئے تم بار بار شرطیں عائد کر رہے ہو اور قسم قسم کے مطالبے کر رہے ہو وہ تو اپنے تمام اس قدر واضح اور آسان ہے اور اس کا راستہ اس قدر مستقیم ہے کہ اس میں کوئی اینچ پینچ نہیں' کوئی خطرناک موڑ نہیں' کوئی ایسا الجھاؤ نہیں جس میں آدمی الجھ کر منزل کھوٹی کر بیٹھے۔اس کی تعلیمات نہایت آسان' نہایت واضح' فطرت کے نہایت قریب اور قابل عمل ہیں۔مرور زمانہ سے کبھی ان میں کہنگی نہیں ہوسکی۔اس کا کوئی حکم انسانی استطاعت اور انسانی مزاج سے ہٹا ہوا نہیں۔اس کا ہر قانون اعتدال کی شان لئے ہوئے ہے اور اس راستے پر چلتا آدمی قدم قدم پر اللہ کی رحمت محسوس کرتا ہے اور پھر مزید یہ کہ اسلام کے اس راستے کو فرمایا گیا ہے کہ یہ تیرے رب کا راستہ ہے جس میں بیک وقت دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ایک تو لفظ رب کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ جس ذات نے تمہیں پیدا کیا اور پھر تمہاری بے بسی کی عمر میں جس طرح اس نے تمہاری زندگی کے امکانات اور تمہاری ضرورتوں کو پورا کرنے کے سامان پیدا فرمائے اور پھر جس طرح اس نے تمہیں حواس اور جوہر عقل سے نوازا اور قدم قدم زندگی کی بدلتی ہوئی ضرورتوں میں اس نے جس طرح تمہاری راہنمائی کی بالکل اسی طرح زندگی کی ہمہ گیر ضرورتوں اور نوع انسانی کی ہمہ گیر تبدیلیوں اور اجتماعی زندگی کی ہمہ گیر وسعتوں میں ضرورت تھی کہ تمہیں ایک ایسا نظام زندگی دیا جاتا اور دل کی بیداری کیلئے ایک ایسا اعتقادی شعور دیا جاتا جس سے آسانی سے اپنی زندگی کا سفر انفرادی بھی اور اجتماعی بھی جاری وساری رکھ سکو چنانچہ دین کا یہ کشادہ راستہ کھول کر اور صراط مستقیم عطا کر کے تمہاری اس ضرورت کو پورا کیا گیا ہے اور مزید اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ جس ذات نے اے پیغمبر آپ پر یہ دین اتارا ہے وہ آپ کا رب ہے یعنی صرف رب ہی نہیں بلکہ آپ کا رب ہے چنانچہ رب کی اضافت رسول اللہ ﷺ کی ذات کی طرف ایک طرف تو آنحضرت کی تسلی کا سامان ہے اور آپ کی انتہائی اعزاز کا باعث ہے اور ساتھ ہی مشرکین مکہ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم جس رب کی دی ہوئی نعمتوں سے مستفید ہو رہے ہو دنیا میں اگر اسے کسی سے خصوصی نسبت ہے تو وہ اس ذات بابرکات سے ہے جسے تم مکہ کی گلیوں میں اذیت دے کر خوش ہوتے ہو اور جس کے لائے ہوئے دین کا تم تمسخر اڑاتے ہو اور تمہیں اندازہ نہیں کہ تم جو کچھ اس ذات کے ساتھ کر رہے ہو وہ اسکے ساتھ نہیں کر رہے بلکہ تم اللہ کے ساتھ کر رہے ہو کیونکہ محمد ﷺ کو اللہ سے اس قدر قریبی تعلق حاصل ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف فرمارہے ہیں اس لئے اس کی دشمنی کرتے ہوئے اور اس کے بارے میں ناروا منصوبے کرتے ہوئے یہ کبھی نہ بھولنا کہ اس کے بارے میں جو بھی تم کرنا چاہو گے وہ اصلاً اللہ کے خلاف اقدام ہوگا سوچ لو اس کا انجام کیا ہوسکتا ہے۔ان باتوں کے بعد فرمایا کہ ہم نے اللہ کے احکام اور قرآن کریم کی آیات کو نہایت تفصیل سے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے جس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔پھر اپنے متذکرہ قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دین اسلام اور اسلامی دعوت اپنی تمام تر وضاحت کے باوجود مفید اسی کیلئے ہوگی جو اس سے فائدہ اٹھانا چاہے گا یعنی جو اس سے نصیحت اور یاددہانی حاصل کرے گا۔لیکن جس طرح وہ شخص جو اپنی آنکھیں بند رکھے اللہ تعالیٰ کبھی اسے مشاہدات

Marfat.com

دولت عطا نہیں کرتا' جو اپنے کان بند رکھے وہ کبھی خوبصورت نوائیں اور دل آویز صدائیں نہیں سن سکتا اور کبھی فطری موسیقی سے لذت اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس طرح جو اسلام کی طرف سے اپنے دل ودماغ کو بند کر لیتا ہے' وہ کبھی اس کی قبولیت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

اگلی آیت کریمہ میں ان خوش قسمت لوگوں کا صلہ اور اجر بیان کیا جارہا ہے جنہوں نے اللہ کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں کو صحیح رخ پر لگایا اور صحیح راستے پر چلنے کی کوشش کی اور راستے کے موانع کے سلسلے میں اللہ نے ان کی مدد فرمائی اور انہیں شرح صدر کی دولت سے نوازا یہ بجائے خود بہت بڑا انعام ہے۔ لیکن اس انعام کے بعد پھر ایمان وعمل اور قربانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں پورا اترنے والوں کو اللہ تعالیٰ اس انعام سے نوازتے ہیں۔ جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر کیا جارہا ہے ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۲۷ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O ''ان کیلئے' ان کے رب کے پاس سکھ کا گھر ہے اور وہ ان کا کارساز ہے' ان کے اعمال کے صلہ میں''۔

دارالسلام کا مطلب:

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ان کے اعمال کے صلہ میں جو انعام عطا فرمائیں گے اس کو اس آیت کریمہ میں دارالسلام کہا گیا ہے۔ اصحاب علم نے دارالسلام کے مختلف معانی بیان کئے ہیں۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ کے قرینہ سے بعض اہل تاویل نے اس کا ترجمہ جنت کیا ہے یقیناً جنت کا ایک نام دارالسلام بھی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے راستے پر چلنے والے لوگوں کو قیامت کے دن جنت عطا فرمائے گا اور وہ ایسا سلامتی کا گھر ہے جس میں نہ کوئی خوف ہوگا نہ پریشانی ہوگی کوئی غم اہل جنت کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گا کوئی ناخوشگوار بات ظہور میں نہیں آئے گی۔ ہر طرف سلامتی کے چرچے ہوں گے سلام سلام کی آوازیں ہوں گی اور آدمی ہر وقت خوشیوں اور مسرتوں کے جھولے میں جھولے گا۔ یقیناً ایک شخص کیلئے جنت سے بڑھ کر کسی انعام کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب وہ وہاں کی نعمتوں کو دیکھے گا اور اپنے اجر وثواب کو ملاحظہ کرے گا تو اس دنیا میں اٹھائے ہوئے صدمے اور راہِ حق میں برداشت کی ہوئی مشکلات اس کو نہایت ہیچ نظر آئیں گی کیونکہ ان مشکلات اور اذیتوں کو اس معاوضے اور اجر وثواب سے کوئی نسبت نہیں ہوگی۔ چنانچہ اس صلے کو دیکھ کر آنحضرت کے ارشاد کے مصداق جنتی تمنا کریں گے کہ کاش ہم کو اس سے بڑھ کر اذیتیں دی جاتیں بلکہ ہماری کھالوں کو قینچیوں سے کاٹا جاتا تاکہ ہم یہاں بیش از بیش نعمتوں سے نوازے جاتے اور پھر یہ نعمتیں ایسی ہوں گی جن کو اس سے پہلے کسی آنکھ نے دیکھا نہیں ہوگا اور ان کی دلنوازی کا حال یہ ہوگا کہ کبھی ایسی دلنواز صدا کسی کان میں کبھی پڑی نہیں ہوگی اور انسانی حدود سے ماوراء ہونے کا یہ حال ہوگا کہ کبھی ان نعمتوں کا تصور بھی انسانی دلوں میں نہیں گزرا ہوگا۔ ظاہر ہے اس سے بڑھ کر اور کون سا صلہ ہو سکتا ہے۔ جس کی تمنا کی جاسکے۔

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

بعض دوسرے اہل تاویل نے دارالسلام کو جنت تک محدود نہیں رکھا وہ عِنْدَ رَبِّهِمْ کو اس کا قرینہ نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہ دنیا اور آخرت اور ان کی تمام نعمتیں اللہ ہی کی جانب سے عطا ہوتی ہیں اور اللہ ہی ان کا مالک اور عطا کرنے والا ہے اس لحاظ سے صرف جنت کا اسے قرینہ قرار دینا کسی طرح بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دارالسلام جس طرح جنت ہے اسی طرح دنیا بھی ہے کیونکہ دارالسلام کا ایک معنی اللہ کا گھر بھی ہے کیونکہ سلام اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے تو اللہ کا گھر جس طرح جنت اور آخرت ہے اسی طرح دنیا بھی ہے دونوں پر اس کی تجلیات برستی ہیں'

Marfat.com

دونوں اس کی تحویل میں ہیں، دونوں کی نگرانی وہی فرماتا ہے اور دونوں کے امکانات اور دونوں کی نعمتوں کا وہی خالق ہے۔ اس لئے دارالسلام سے دونوں کو مراد لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور مزید یہ بھی کہ آخرت میں جس طرح جنت ہے اسی طرح جہنم بھی ہے۔ جنت اگر دارالسلام ہے تو جہنم دارالعذاب ہے۔ اسی طرح دنیا بھی دو حصوں پر مشتمل ہے اللہ کے اطاعت گزاروں کیلئے یہ دارالسلام ہے اور اللہ کے نافرمانوں کیلئے یہ دارالحزن اور دارالابتلا ہے۔ جو لوگ اللہ کے راستے کے مسافر بن جاتے اور ایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارتے اور شریعت کے احکام کی پابندی کرتے ہیں نفسانیت کو کبھی اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتے، ہر کام کرنے سے پہلے شریعت اسلامی کے احکام کو یاد کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کی طلب ان کا مقصود اور منتہا بن جاتی ہے ان کیلئے یہ دنیا یقیناً دارالسلام ہے ایک تو اس وجہ سے کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو میری ہدایت کی پیروی کرتا ہے اس کیلئے اس دنیا میں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی حزن۔ ظاہر ہے کہ جسے خوف و حزن سے بچا لیا جائے اس کیلئے یہ دنیا یقیناً دارالسلام ہے۔ ممکن ہے آپ کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اسلامی شریعت پر چلنے والے بھی تو ہمیشہ پریشانیوں سے محفوظ نہیں رہتے کبھی ذاتی پریشانیاں، کبھی اولاد کی پریشانیاں، کبھی معاشرتی اور معاشی پریشانیاں، کبھی استبدادی قوتوں کی جانب سے داروگیر، سو طرح کی پریشانیاں ہیں جن میں صاحب ایمان بھی مبتلا ہوتے ہیں تو پھر ان کیلئے یہ دنیا دارالسلام کیسے ہوئی؟ بات یہ ہے کہ یہ سوچ غلط فہمی یا کم علمی کا نتیجہ ہے اگر دو باتوں کو سمجھ لیا جائے تو یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ جن پریشانیوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے جو صاحب ایمان لوگوں کو بھی پیش آتی ہیں ان کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ پریشانیاں کچھ تو فطری ہیں جنہیں اصل میں پریشانیاں نہیں کہنا چاہئے وہ اس زندگی کے لازمی تقاضے ہیں۔ جو کاروبار کرتا ہے اسے کبھی نقصان بھی ہوتا ہے جو پیدا ہوتا ہے وہ کبھی نہ کبھی موت کی اذیت سے بھی دوچار ہوتا ہے، جو صحت مند ہے وہ کبھی نہ کبھی بیمار بھی ہوتا ہے اور جو خوش ہے وہ کبھی نہ کبھی غمگین بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں چونکہ زندگی کا لازمی تقاضہ ہیں اس لئے سلامتی کی ضد نہیں ہیں۔ بلکہ یہی تو وہ چیزیں ہیں جن سے زندگی کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے اور خوشی کا تصور ابھرتا ہے۔ غالب نے اسی کی وضاحت کرتے ہوئے شاید کہا تھا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

جو بیمار نہیں ہوتا اسے صحت کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوتا، جسے بھوک نہیں لگتی وہ کھانے پینے کی لذت سے بھی آشنا نہیں ہوتا جسے مسلسل کام سے تھکاوٹ نہیں ہوتی اسے آرام و راحت کی قدر بھی نہیں ہوتی جسے دھوپ پریشان نہیں کرتی وہ سائے کی آسودگی کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ چیزوں کا صحیح احساس ہمیشہ تضادات سے پیدا ہوتا ہے ایک منفی چیز مثبت کا تصور ابھارتی ہے اس لئے جن چیزوں کو ہم خوف و حزن یا پریشانیوں کا نام دیتے ہیں اصلاً وہ اس کی متضاد چیزوں کا احساس دلانے کیلئے ضروری ہیں اور یا یوں کہنا چاہئے کہ خوشی اور مسرت کا احساس ان کے بغیر کبھی وجود میں نہیں آتا تو جو چیز کسی خوشگوار چیز کا باعث بنتی ہے وہ چیز ناگوار بھی ہو تو اسے ناگوار نہیں کہا جا سکتا اس لئے اس دنیا کو دارالسلام کہنا غلط نہیں اور دوسری یہ بات کہ یہاں کی مشکلات جو اچھے لوگوں کو پیش آتی ہیں وہ انہیں بطور سزا کے پیش نہیں آتیں بلکہ اس لئے پیش آتی ہیں کہ ان کے اندر جو مخفی صلاحیتیں اور جو مضمر اچھائیاں ہیں ان کو ابھارا اور نمایاں کیا جائے۔ جو شخص پانی میں کود کر غوطے نہیں کھاتا اور ڈبکیاں برداشت نہیں کرتا اس کے اندر چھپی ہوئی تیراکی کی قوت بھی وجود میں نہیں آتی۔ جس شخص میں کوئی ہنر چھپا ہوا ہے یا کوئی خوبی پوشیدہ ہے، اس کو نمایاں کرنے اور بروئے کار لانے کیلئے اس کو بعض مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ کچھ ایکسرسائز کرائی جاتی ہیں، کسی محنت کے عمل سے متعلق کیا جاتا ہے تب وہ ایک اچھا کھلاڑی بنتا ہے، ایک اچھا خطیب بنتا ہے، ایک اچھا ادیب بنتا ہے، ایک اچھا مصور بنتا ہے، ایک اچھا معلم بنتا ہے حتی کہ ایک اچھا کاشتکار بنتا ہے۔ اگر اسے اس محنت کے پراسس سے نہ گزارا جاتا تو اس کی یہ

Marfat.com

صلاحیتیں بھی بروئے کار نہ آتیں اسی طرح ایک مسلمان کو چونکہ ایک سچا انسان' ایک مخلص مسلمان' ایک ایثار پیشہ شخص دوسروں کے کام آنے والا کارکن اپنی خودی کی حفاظت کرنے والا اور خطرات سے کھیلنے والا اور محض اللہ کی رضا کا طالب اور آخرت کا مسافر بننا مقصود ہے تو ان خوبیوں کو بروئے کار لانے کیلئے جن جن مراحل سے گزرنا ضروری ہے اور جن مشقتوں کو اٹھانا واجب ہے اور جن امتحانات سے سابقہ ضروری ہے ان سب سے ایک مومن کو گزارا جاتا ہے تا کہ ان صفات کا حامل ایک مومن تیار ہو سکے تو یہ چونکہ تیاری کیلئے لازمی مشقیں ہیں اس لئے ان سے گزرتے ہوئے ان کو سزائیں سمجھنا یہ کوتاہ فہمی کی دلیل ہے یا ان کو پریشانیاں خیال کر کے ان سے پریشان ہونا یہ کم ہمتی پر دلالت کرتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ بعض اللہ والوں نے ایسے ایسے گوشوں کو واشگاف کیا ہے جن کی طرف عموماً دھیان نہیں جاتا۔ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نے ایک دفعہ ایک نشست میں ارشاد فرمایا کہ صحت بھی اللہ کی نعمت ہے اور بیماری بھی اللہ کی نعمت ہے بلکہ بیماری صحت سے بڑی نعمت ہے حالانکہ ہم بیماری کو ہمیشہ ایک پریشانی بلکہ مصیبت جانتے ہیں لیکن حاجی صاحب نے دلیل دیتے ہوئے فرمایا کہ بڑی نعمت وہ ہوتی ہے جو آدمی کو اپنے محبوب کے قریب کر دے اس کا مطلوب اس کیلئے آسان کر دے۔ صحت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساسات آدمی کو دوسری مصروفیات میں گم کر کے اللہ کی طرف سے غافل کر دیتے ہیں اور آدمی بجائے اللہ کی محبت کا حق ادا کرنے کے دوسری محبتوں میں کھو جاتا ہے۔ اس لئے وہ نعمت ہونے کے باوجود آدمی کے اپنے غلط اعمال کے باعث بعض دفعہ مصیبت بن جاتی ہے۔ لیکن بیماری اس لئے اللہ کی بڑی نعمت ہے کہ جیسے جیسے بیماری کی شدت بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہوتا جاتا ہے۔ ہر کسک اور ہر ٹیس پر مریض اللہ کو یاد کرتا ہے اور جب بیماری کی شدت بے قابو ہونے لگتی ہے تو آدمی بے چین ہو کر اللہ سے دعا کرنے لگتا ہے اس وقت وہ سب سے زیادہ اللہ کے قریب ہوتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ جن چیزوں کو ہم پریشانیاں سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ پریشانیاں نہیں ہوتیں بلکہ اگر انہیں صحیح تناظر میں دیکھا جائے تو وہ آسانیوں' راحتوں اور بعض دفعہ کامرانیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں اور مزید یہ بات بھی کہ ایک مومن کو اسلام کی طرف سے جو سوچ نصیب ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب اس کو کوئی خوشی میسر آتی ہے تو وہ اللہ کا شکر بجالاتا ہے کہ اس خوشی کو حاصل کرنے والا میں نہیں ہوں یعنی یہ میری کسی ذاتی خوبی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا عطا کرنے والا میرا رب ہے اور جب اسے کوئی ناخوشی کی بات پیش آتی ہے تو وہ اسے بھی انہونی نہیں سمجھتا وہ جانتا ہے کہ کوئی بات بھی اللہ کے علم کے بغیر اور بدوں اس کی اجازت کے وقوع پذیر نہیں ہوتی تو یہ بظاہر جو پریشانی مجھے پیش آ رہی ہے یہ یقیناً اللہ کی جانب سے ہے تو جب اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے تو پھر اس کی دور رس نظر اس پریشانی میں نہیں الجھتی بلکہ وہ اس سرچشمہ فیض کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ چونکہ ہر مسلمان کا محبوب ہے اس لئے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرے محبوب نے ایک پریشانی پیدا کر کے مجھے یاد فرمایا ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ کیونکہ وصال کے لمحے اس سے پہلے پیش آنے والی ناخوشگواریوں کو بھی لطف و لذت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ وہ تو محبوب کی لاگ کو بھی بقول غالب لگاؤ سمجھتا ہے اللہ کی ذات کے ساتھ تو کسی لاگ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہاں سے جو کچھ عطا ہوتا ہے چاہے کسی صورت میں ہو وہ تو لگاؤ ہی لگاؤ ہے۔ بلکہ محبت کے شناور تو محبوب کی دشمنی کو بھی خوشی کا باعث سمجھتے ہیں۔ نجانے کس کا شعر ہے

گو دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں
ہم خوش ہیں کہ ہیں کسی کی نگاہ میں

دشمنی کا تصور اللہ کے ساتھ تو ویسے ہی بے ادبی ہے اس لئے وہ جس طرح بھی اپنے کسی بندے کو یاد کرتا ہے اس میں بندے کی عزت افزائی اور اس کی تربیت کا سامان ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ایک مومن کو پیش آمدہ حالات کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو پھر اس دنیا کو کوئی وجہ نہیں ہے کہ

Marfat.com

دارالسلام نہ سمجھا جائے۔ علاوہ ازیں ایک اور حقیقت بھی ہے جس کا نگاہوں میں رہنا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ اسلامی نظام زندگی ایک نہایت مربوط متوازن اور ایک اکائی کی شکل رکھتا ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں کو اس صورت میں اپنی خیر وفلاح سے نوازتا ہے جب اس کو بلاکم وکاست مکمل طور پر مسلمانوں پر نافذ کیا جائے اور مسلمان پوری طرح اپنی زندگیاں اس نظام کی تحویل میں دے دیں اس کے بعد اللہ کی طرف سے کامرانیوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور پھر کوئی حزن و ملال مسلمان معاشرے کو پریشان نہیں کرتا۔ جس گھر میں میاں بیوی ایک دوسرے کے حق آشنا اور ماں باپ اور اولاد شفقت اور احترام میں اپنا اپنا فرض انجام دینے والے ہوں وہ گھر جنت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور جس معاشرے میں حق ہمسائیگی ادا ہو رہا ہو اور اس معاشرے کے رہنے والے اللہ کی جانب سے معاشرتی فرائض کے ادا کرنے والے ہوں اور ایثار اور غمگساری ان کی معاشرت کا سب سے اہم حصہ ہو تو ایسا معاشرہ اولاً تو ناخوشگواریوں کا شکار نہیں ہوتا اور اگر کوئی ایک فرد یا کوئی ایک گھر کسی ناگہانی آفت کا شکار ہو بھی جائے تو اس کی مصیبت میں شریک ہونے والے اور اس کے غم کا بوجھ اٹھانے والے اتنی بڑی تعداد میں لوگ ہوتے ہیں کہ غم میں مبتلا ہونے والا شخص اپنے غم کو بھول جاتا ہے اور پھر جب معاشرہ ایک ریاست میں تبدیل ہوتا ہے اور ریاست کے چلانے والے خلافت راشدہ کی روایات کے امین ثابت ہوں تو پوری ریاست دورِ خلافت راشدہ کی طرح ایک جنت کا نمونہ بن جاتی ہے جس میں سوائے سلامتی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وجہ سے دارالسلام سے دنیا اور آخرت دونوں کو مراد لینا زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتا ہے۔

مومنوں کا اللہ ولی ہوگا:

مسلمانوں کے اجر وثواب اور صلے کے سلسلے میں دوسری بات جو ارشاد فرمائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ صرف انکی دنیا اور آخرت دارالسلام ہی نہیں بنے گی بلکہ انکا پروردگار ان کا ولی بھی ہوگا۔ ولی آپ جانتے ہیں ہمدرد و غمگسار' کارساز اور دوست کو کہتے ہیں ایمان کے راستے پر چلنے والے لوگوں کیلئے سب سے بڑا انعام یہ ہوگا کہ اللہ انہیں اپنی ولایت سے نوازے گا۔ یعنی انہیں اپنے دوستوں میں شامل فرمالے گا۔ اپنی دوستی اور رحمت کی چادر ان پر ڈال دے گا دنیا میں ان کی ہر موقع پر مدد فرمائے گا اور آخرت میں اپنی رضا اور خوشنودی کا اعلان کر کے انہیں اپنی محبت میں مخمور کردے گا اور یہ ایک ایسا انعام ہے کہ دنیا میں صحیح طور پر اسکے لطف ولذت کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ اللہ اور بندے میں محبت اور خُلّت کے لحاظ سے کوئی نسبت نہیں کہاں خالق کائنات اور کہاں زمین کے چھوٹے سے کرّے کا باسی حضرت انسان۔ اسے کیا نسبت ہے خالق کائنات سے لیکن اللہ کے کرم کی کیا انتہاء ہے وہ محض اس کے ایمان وعمل کے نتیجے میں اپنی دوستی سے اسے نواز دیتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ اتنے بڑے بڑے انعامات یاد رکھو اس وجہ سے نہیں ملیں گے کہ اس امت کے افراد ہو یا تم کسی خاص نسب سے تعلق رکھتے ہو یا تم کسی خاص علاقے میں پیدا ہوئے ہو بلکہ یہ سب کچھ اسلئے تمہیں عطا ہوگا کہ تم نے اعمال کئے ہیں جو تمہارے اللہ کو پسند ہیں۔ اس لئے تمہارے اعمال کے باعث اور تمہاری قربانیوں کے صلے میں اللہ تعالیٰ تم پر اپنی عنایات فرمائیں گے۔

مسلمانوں پر عطاء بخشش اور انعامات کے تذکرے کے بعد روئے سخن انہی مشرکین اور ان کے اکابر مجرمین کی طرف پھر گیا ہے جو اس سے مخاطب تھے چنانچہ ارشاد فرمایا جارہا ہے:

آیت: ۱۲۸-۱۲۹ وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ''اور اس دن کا دھیان کرو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے

Marfat.com

کہے گا' اے جنوں کے گروہ! تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا اور انسانوں میں سے ان کے ساتھی کہیں گے' اے ہمارے رب! ہم نے ایک دوسرے کو استعمال کیا اور ہم پہنچ گئے اپنی اس مدت کو' جو تو نے ہمارے لئے ٹھہرائی۔ فرمائے گا! تمہارا ٹھکانہ اب جہنم ہے' ہمیشہ کیلئے اس میں رہو۔ مگر جو اللہ چاہے' بے شک تیرا رب حکیم وعلیم ہے اور اسی طرح ہم مسلط کر دیتے ہیں ظالموں کو ایک دوسرے پر' بسبب ان کی کرتوتوں کے''۔

اس آیت کریمہ کا سب سے پہلا لفظ ''یوم'' نہایت قابل توجہ ہے اس میں جنوں اور انسانوں کو خطاب کر کے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ آج تمہیں اسلامی دعوت اپنی ساری اثر انگیزی اور اثر آفرینی کے باوجود اپیل نہیں کر رہی۔ تم نہ صرف اسے قبول کرنے سے انکاری ہو بلکہ اس کی مخالفت میں پوری طرح تلے ہوئے ہو۔ لیکن تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تم ہمیشہ یہاں نہیں رہو گے موت کا شکار بنو گے' پھر ایک وقت آئے گا جب تمہیں زندہ کیا جائے گا اور اللہ کے حضور تمہاری پیشی ہو گی اور اس دن تم پر کیا گزرے گی۔ کیا اس دن کی ہولناکی کے بارے میں تم نے کبھی سوچا ہے یہ زندگی کا سفر کوئی بہت طویل نہیں اس کے بعد عالم برزخ میں تم قیامت کا انتظار کرو گے لحاظ سے عملی طور پر قیامت کے آنے میں اور تم میں تمہاری چند سالہ دنیوی زندگی ہی تو حائل ہے چند سالوں کے بعد تم جن مراحل میں مبتلا ہونے والے ہو اور تمہارا انجام جن ہولناکیوں سے دوچار ہونے والا ہے کیا تم نے کبھی اس کا بھی خیال کیا ہے تم سے ایک ایک بات کی باز پرس ہو گی۔ تمہاری ایک ایک حرکت تمہارے سامنے کھول دی جائے گی تمہارے کرتوت خود بولیں گے۔ جہنم تمہارے سامنے دھک رہا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ پورے جلال میں ہوں گے۔ بتاؤ اس دن کیا کرو گے؟ اور آج تم اسلام کی مخالفت میں جس طرح ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہو اور تم سمجھتے ہو کہ تمہاری اس اجتماعی قوت کو کوئی نہیں توڑ سکتا لیکن تمہیں اس بات کا خیال نہیں آتا کہ تم سب کے سب اجتماعی طور پر اللہ کے سامنے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کئے جانے والے ہو۔ وہاں تم ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کر سکو گے اور تم سب کو ایک ایسے ہمہ گیر عذاب کا شکار ہونا ہو گا جس سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی تمہاری مدد کو کوئی نہیں پہنچے گا۔ اس دن اللہ کی مشیت کے سوا کسی چیز کی حکمرانی نہیں ہو گی۔ اس طرح تم سب اللہ کے حضور جمع کئے جاؤ گے۔ اب بجائے اس کے کہ تم آج اس کے ازالے اور تدارک کیلئے سوچو اور اس سے بچ نکلنے کی تدبیر کرو لیکن تمہاری بے بصیرتی اور کوتاہ فہمی کا حال یہ ہے کہ جو طوفان تمہارے سر پر تلا کھڑا ہے اس کے بارے میں تمہیں سوچنا بھی نصیب نہیں ہو رہا۔

حساب، جنوں اور انسانوں دونوں سے لیا جائے گا:

اس آیت میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ خطاب جنوں اور انسانوں دونوں سے ہو رہا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جس طرح تکلیف شرعی کے مکلف یعنی احکام شریعت کی بجا آوری کے پابند انسان ہیں اس طرح جنات بھی ہیں جس طرح اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب انسانوں کو دینا ہے اس طرح جنوں کو بھی ان تمام مراحل سے گزرنا ہے۔ اس لئے اس دن کی یاد دہانی کے بعد دونوں سے خطاب فرمایا جا رہا ہے لیکن جن چونکہ ایک بالادست قوت ہے اور پھر جنات کے بارے میں مشرکین مکہ مشرکانہ تصورات بھی رکھتے تھے اس لئے سب سے پہلے انہی کو خطاب کیا جا رہا ہے تاکہ مشرکین مکہ کو اندازہ ہو کہ کل کو جس طرح ہم پکڑے جائیں گے اسی طرح جن جنات کو ہم اپنی مدد کیلئے پکارتے ہیں وہ بھی پکڑے جانے والے ہیں اور دوسری وجہ دونوں سے خطاب کی یہ بھی ہے کہ عرب جاہلیت میں جنوں کو عربوں کی مذہبی اور سماجی زندگی میں بڑا دخل ہو گیا تھا۔ کہانت اور ساحری کی گرم بازاری تو ان کے دم قدم سے تھی ہی شاعری تک کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ یہ جنات الہام کرتے ہیں اور ہر بڑے شاعر کے ساتھ کوئی نہ کوئی جن ضرور ہوتا ہے۔ اسی بناء پر وہ آنحضرت کے متعلق بھی یہ کہتے تھے کہ ان کے ساتھ بھی کوئی جن ہے ہر وادی کے الگ الگ جن مانے جاتے تھے اور سفر و حضر، جنگ و صلح اور فتح کے معاملات میں ان کے تصرفات کا بڑا دخل سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے دونوں سے بیک وقت خطاب فرمایا جا رہا ہے اور جنوں کے بارے میں جیسا کہ میں نے

Marfat.com

عرض کیا عرب مشرکانہ خیالات رکھتے تھے اور ان کی ایک طرح سے پوجاپاٹ بھی کرتے تھے اور ان سے مدد کے طالب بھی ہوتے تھے اس لحاظ سے سب سے پہلے انہی سے خطاب فرمایا اور بجائے اس کے کہ ان کے ذاتی ایمان وعمل کو حوالہ بنایا جاتا اصل مخاطب چونکہ انسان ہیں اس لئے ان کے اس جرم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو انہوں نے انسانوں کے حوالے سے کیا ہے۔

کفارِ مکہ جنوں کو مشکل کشا سمجھتے تھے:

یعنی صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اللہ کی توحید اور اس کے دین کا حق ادا نہ کیا بلکہ انہوں نے انسانوں کے بگاڑنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی اور پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہاں تمام جن مخاطب نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بھی وہ بگڑے ہوئے لوگ مراد ہیں جنہوں نے انسانوں میں بگاڑ اور مشرکانہ تصورات پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا اور وہ کام کیا جو ان کے جدامجد اور ان کے پیرومرشد ابلیس نے اللہ کے سامنے کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا بلکہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس عزم صمیم کا اظہار کیا تھا کہ اے پروردگار آپ نے چونکہ آدم کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں مجھے راندۂ درگاہ قرار دیا ہے اس لئے آدم کی اولاد کی تباہی اور گمراہی میں میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔ یہ ابلیس قرآن کے ارشاد کے مطابق چونکہ جن ہے اس کی اولاد ظاہر ہے جنات پر مشتمل ہے اور ان بے شمار صدیوں میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسکی تعداد کہاں تک پھیل چکی ہوگی اور پھر وہ جنات بھی جو اس کی اولاد میں شامل نہیں لیکن اس کی فکر کے حامل اور اس کے خیالات کے امین ہیں وہ بھی ان میں شامل ہیں۔ ان تمام نے مل کر انسانوں کے بگاڑ میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور ابلیس نے جو کچھ اپنے رب کے حضور میں سرکشی دکھاتے ہوئے کہا تھا اس کو پوری طرح بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کریم نے ایک سے زیادہ جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے ایک جگہ اس نے کہا:

اَرَئَیْتَکَ ھٰذَا الَّذِیْ کَرَّمْتَ عَلَیَّ ز لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۶۲)

''بھلا یہ ہے وہ، جس کو تو نے میرے اوپر فضیلت بخشی ہے؟ اگر تو نے مجھے قیامت تک کیلئے مہلت دی تو میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا، صرف تھوڑے ہی مجھ سے بچ رہیں گے''۔

شیطان انسانوں کو گمراہ کرتا ہے:

دوسرے مقام پر ہے:

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ط وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَهُمْ شٰکِرِیْنَ ۝

''میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے داہنے سے، ان کے بائیں سے، ان کی راہ ماروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا'' (اعراف: ۱۶-۱۷)

یہاں اصحاب ذوق آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ''اِسْتَکْثَرْتُمْ'' کے لفظ میں نہایت لطیف تلمیح ہے۔ ابلیس کے قول ﴿ وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَهُمْ شٰکِرِیْنَ اور لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ کی طرف۔ یعنی اللہ تعالیٰ ابلیس کے ان فرزندان معنوی کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ تم نے تو اپنے

Marfat.com

ابلیس کا مشن بڑی کامیابی سے پورا کیا کہ ذریت آدم میں سے بہتوں کو اپنے فتراک ضلالت کا نخچیر بنالیا اور بڑی سعادتمند نکلی یہ اولادِ آدم کہ اس سادہ لوحی کے ساتھ تمہارے دامِ فریب میں پھنس گئی۔ اس طرح سے جنات کی اپنی بدعملیوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کو گمراہ کرنے کا اصل جرم ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور ساتھ ساتھ انسانوں کو شرم اور غیرت دلانے کیلئے یہ بتایا جائے گا کہ جنات نے تو تمہیں گمراہ کر کے اپنے پیشوا ابلیس کا مشن بڑی کامیابی سے پورا کیا لیکن تم نے اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے سے تو انکار کیا لیکن اپنے دشمنوں کے ہتھے ایسے چڑھے کہ انہی کے اشاروں پر چلتے ہوئے اپنی دنیا اور آخرت برباد کر لی اس کے بعد جنات کی طرف سے کوئی جواب مذکور نہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی سرکشی کے انجام کو دیکھتے ہوئے یہ ہمت نہیں پڑے گی کہ وہ اپنی کارستانیوں کا کوئی جواب دے سکیں بلکہ وہ اس حد تک سہم جائیں گے کہ معذرت کرنا بھی ان کیلئے مشکل ہو جائے گا۔ لیکن انسانوں کا وہ گروہ جنہوں نے ان شیاطین جن کی پیروی کر کے اپنی عاقبت تباہ کی وہ یہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے ایک دوسرے کی معیت اور رفاقت سے دنیا میں خوب ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ اس یوم الحساب کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا۔ فائدہ اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے آلہ کار بنے ہم نے ان کی پوجا کی' ان کے تھانوں پر نذریں اور قربانیاں پیش کیں اور ان کے کہے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا۔ اسی طرح ہمارے کاہنوں' ساحروں اور سیانوں نے ان کو اپنے مقاصد مذمومہ کیلئے طرح طرح سے استعمال کیا۔ یہاں تک کہ یہ دن آیا اور ہمیں اپنے اس عمل کے انجام پر غور کرنے کی توفیق نہ ملی۔ اس اعترافِ جرم کے بعد وہ یہ چاہیں گے کہ ہم اللہ سے معافی کی درخواست کریں اور چونکہ ہم نے یہ جرائم جنوں کی رفاقت میں کیے ہیں اس لئے دونوں کیلئے اللہ سے عفو و درگزر مانگیں۔ لیکن پروردگار ان کی بات تمہید پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دے گا اور ان کو معذرت اور درخواستِ معافی کا موقع دیئے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ بس اب تمہارا ٹھکانہ یہی دوزخ ہے جس میں تمہیں ہمیشہ رہنا ہے اب باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو۔ عذر' معافی' توبہ اور اصلاح کے سب دروازے بند ہو گئے ہیں۔ یہاں یہ جو فرمایا گیا کہ تم اب اس جہنم میں ہمیشہ رہو گے مگر وہ جو تیرا رب چاہے۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ اشتباہ پیش آیا ہے کہ قرآن کریم نے اور کئی جگہ واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ کافر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور وہ کبھی اس سے نکالے نہیں جائیں گے لیکن یہاں استثناء کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ جو تیرا رب چاہے۔ حالانکہ بات واضح ہے کہ یہاں مَـا ہے مَنْ نہیں۔ من کا اطلاق بالعموم ذی روح اور ذی شعور مخلوقات پر ہوتا ہے لیکن مَـا کا اطلاق بالعموم جمادات و نباتات اور حیوانات پر ہوتا ہے یا کسی اور ایسی چیز پر جس میں نہ جان ہو نہ ادراک۔ اس طرح صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ کچھ لوگ جہنم سے نکال بھی لئے جائیں گے بلکہ مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے شفاعت کرنے والے کسی نہ کسی طرح بچا لیں گے یا اور کسی طرح ان مجرمین کو مدد پہنچ جائے گی اور یہ عذاب سے بچ نکلیں گے اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ وہاں اللہ کی مشیت اور اس کی مرضی کے بغیر کسی کا کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔ نہ کوئی مدد دے سکے گا نہ کسی کی شفارش کام آئے گی وہاں تو وہی ہو گا جو اللہ کی مشیت چاہے گی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ یہاں بحث یہ نہیں ہے کہ کون ہمشہ جہنم میں رہے گا اور کون نہیں بلکہ بتلانا صرف یہ ہے کہ قیامت کے دن حکمرانی تکوینی اور تشریعی طور پر صرف اللہ ہی کی ہو گی اور اگر دوسرا مفہوم بھی لیا جائے تو تب بھی بات صاف ہے۔ کیونکہ دوسری نصوص میں قرآن شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی نہیں چاہے گا کہ کسی کافر کو جہنم سے نکالے اس لئے اسے ہمیشہ یہیں رہنا پڑے گا۔

کافروں کے بارے میں قرآنِ کریم کی بیان کردہ یہ سزا کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے' بعض لوگوں کے نزدیک نہایت سخت ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ جس آدمی نے کفر اور شرک کا ارتکاب کیا ہے ظاہر ہے کہ یہ گناہ اس نے صرف اپنی زندگی میں کیا ہے اور زندگی اس کی چند سالوں پر محیط ہے۔ عجیب

Marfat.com

بات ہے کہ جو گناہ چند سالوں کی مدت میں کیا گیا ہے اس کی سزا ابد الآباد تک ہو یہ کسی طرح بھی جرم اور سزا میں مناسبت نہیں رکھتا انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ سزا ہمیشہ جرم کے مطابق ہونی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات سراسر کوتاہ فہمی پر دلالت کرتی ہے۔ دنیا میں کوئی عدالت سزا دیتے ہوئے یہ نہیں دیکھتی کہ جرم کرنے والے نے جرم کرتے ہوئے کتنا وقت لگایا ہے بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اس کے جرم کی نوعیت کیا ہے اور اس نے جرم کر کے نقصان کتنا پہنچایا ہے ایک آدمی جو کئی گھنٹے بہت مشقت اٹھا کر کسی گھر میں یا کسی دکان میں نقب لگاتا ہے لیکن وہ چند سو یا چند ہزار چرا پاتا ہے اور دوسرا شخص ایک مختصر وقت میں حفاظتی انتظام کو معطل کر کے بینک کا سیف کاٹ کر لاکھوں یا کروڑوں روپے نکال کر لے جاتا ہے تو وقت تو پہلے مجرم نے زیادہ صرف کیا اور دوسرے نے کم لیکن سزا دوسرے مجرم کو زیادہ ملے گی۔ کیونکہ اس نے نقصان زیادہ کیا ہے اسی طرح کوئی آدمی دن بھر کسی کو حبس بے جا میں رکھتا ہے اور تشدد کرتا ہے اور دوسرا آدمی کسی عفت مآب خاتون کی عزت لوٹتا ہے یا ایک لمحے میں کسی کی جان لے لیتا ہے تو آپ خوب جانتے ہیں کہ سزا کس کو زیادہ ملے گی حالانکہ جان لینے والے یا عزت لوٹنے والے نے وقت بہت مختصر صرف کیا ہے لیکن نقصان ایسا کیا ہے جس کی کوئی تلافی ممکن نہیں' شرک اور کفر کا ارتکاب کرنے والا اگرچہ اپنی مختصر عمر میں ایک جرم کا ارتکاب کرتا ہے لیکن وہ جرم ایسا کرتا ہے جس کی شناعت اور قباحت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس عالم کون و مکاں کی سب سے قیمتی متاع اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی حرمت ہے۔ جو آدمی شرک کرتا ہے وہ اس کی حرمت کو چیلنج کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے وہ اس کی ذات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑے گناہ اور جرم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس پر جو سزا تجویز کی گئی ہے وہ خلود فی النار یعنی ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ تیرا رب حکیم اور علیم ہے یعنی جو کچھ فرمایا جا رہا ہے یہ محض کسی حکمران کی ذاتی ناراضگی اور اس کے غضب کا نتیجہ نہیں بلکہ تمہارے اس رب کے فیصلے ہیں جو تمام حکمتوں اور ہر طرح کے علم سے متصف بلکہ سرچشمہ ہے۔

کافر جن اور گمراہ انسان ایک دوسرے کے دوست ہیں:

گزشتہ آیت کریمہ میں ہمیں یہ بتایا گیا کہ دنیا میں انسانوں اور جنوں نے اللہ کی نافرمانی اور شرک کے ارتکاب میں ایک دوسرے کیساتھ ہمیشہ تعاون کیا۔ انسانوں نے جنات کی مدد سے اپنی کہانت اور ساحری کا دھندا چلایا اور لوگوں کو گمراہ کیا اور جنوں نے ان گمراہ انسانوں سے اپنی بندگی کروائی۔ اگلی آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ انکے درمیان یہ سازگاری اور باہمی موافقت یہ اس وجہ سے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ظالموں اور مشرکوں اور دوسرے تمام بگڑے ہوئے لوگوں میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ گمراہی اور بگاڑ کے پھیلانے میں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہوتے ہیں جس طرح ہر مخلوق اپنے ہم جنس سے پیار کرتی ہے اسی طرح خیالات میں ہم آہنگی رکھنے والے اور ذوق میں اشتراک کے حامل ہمیشہ ایک دوسرے سے قریبی تعلق محسوس کرتے ہیں اور وہ برائی کے سفر میں ہمیشہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ جنات اور انسانوں میں بظاہر کوئی قدرِ مشترک نہیں لیکن برائی سے تعلق اور پیار انکو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے اور پھر وہ اس کام میں ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جن وانس میں یہ موافقت تو بہت غور و فکر کے بعد سمجھ میں آتی ہے لیکن آج اگر ہم پورے عالم اسلام کے حکمرانوں اور غیر مسلم دنیا کے حکمرانوں کو دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ نام نہاد دہشت گردی کی مخالفت کے حوالے سے جسطرح انہوں نے دینی قوتوں اور دین کی ہر قدر کو تباہ کرنے میں ایک دوسرے سے تعاون کیا ہے اور جسطرح اسلامی تشخص کو پامال کیا ہے وہ تو ہمارے سامنے کی بات ہے کہ عالم اسلام کے بیشتر حکمرانوں نے اس مقصد کیلئے غیر مسلم حکمرانوں کے ساتھ مکمل تعاون کیا ہے اور یہ بھول گئے کہ ہمارے تعاون کے نتیجے میں جو کچھ مسلمانوں پر گزرے گی جسطرح ان کا خون بہے گا' جس طرح اسلامی تاریخ لہولہان ہوگی' جس طرح اسلامی تہذیب کو نقصان پہنچے گا' صدیوں میں اس کی تلافی شاید نہ ہو سکے اور پھر اسکے بارے میں ایک دن اللہ کے حضور بھی جواب دینا پڑے گا لیکن

Marfat.com

ان کی باہمی یگانگت اور باہمی موافقت نے ان کو نہ صرف کسی بات پر غور کرنے کا موقع نہ دیا بلکہ جس نے انکو سمجھانا چاہا وہ اس کے بھی دشمن ہو گئے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کیلئے اس آیت کریمہ میں نُـوَلِّی کا لفظ استعمال ہوا جس کا ایک معنی یہ ہے کہ ہم دوست بنا دیتے ہیں اور باہمی موافقت پیدا کر دیتے ہیں جس کی وضاحت ہم نے اوپر کی ہے اور دوسرا معنی اس کا اہل علم نے یہ کیا ہے کہ ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں۔ گزشتہ آیت کریمہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ جنات انسانوں کو گمراہی پھیلانے میں استعمال کرتے ہیں اور اپنی مرضی پر انہیں چلا کر خود انہیں بھی تباہ کرتے ہیں اور انکے زیر اثر لوگوں کو بھی اس کے بارے میں پروردگار فرما رہے ہیں کہ وہ خود سے ایسا نہیں کر سکتے وہ اسلئے ایسا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ ہم انہیں ایسا کرنے دیتے ہیں، مطلب اسکا یہ ہے کہ اللہ نے جنات کو یہ قوت نہیں دی کہ وہ جس آدمی پر چاہیں قبضہ جمالیں اور جیسے چاہیں اسے استعمال کریں۔ لیکن جب ایک آدمی اسلامی شریعت کے احکام سے روگردانی کرتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے اسلام کے خلاف طرز عمل اختیار کر لیتا ہے اور اپنی زندگی اسلامی احکام کے بالکل برعکس گزارنے میں فخر محسوس کرتا ہے اور قرآن وسنت کو کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیتا تو وہ اپنے اعمال سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے حصار سے نکل جاتا ہے یہ وقت ہوتا ہے جب شیطانی جناتی قوتوں کو اسے ورغلانے یا اسے نقصان پہنچانے کا موقع ملتا ہے۔ جن انسانوں کا ذکر سابقہ آیات میں کیا گیا ہے وہ ایسے ہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے دین کو ماننے سے انکار کیا اور ایک مشرکانہ زندگی اپنی مرضی سے اختیار کی چنانچہ اللہ کا قانون حرکت میں آیا۔ اللہ کا حفاظت کرنے والا ہاتھ ان سے اٹھ گیا اور وہ آہستہ آہستہ شیاطین کے قبضے میں آ گئے۔

جو قرآنی تعلیمات سے منہ پھیر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے:

قرآن کریم نے ایک اور جگہ اسی حقیقت کو بیان فرمایا:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝

''جو آدمی اللہ کے ذکر سے اعراض کرتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں۔ پھر وہ اس کا ساتھی بنا رہتا ہے''

(الزخرف: ۳۶)

ذکر سے مراد ہر اچھی بات کی نصیحت بھی ہے اور قرآن کریم بھی ہے کیونکہ ذکر قرآن پاک کے ذاتی ناموں میں سے ایک نام ہے یعنی جب کوئی آدمی اللہ کی کتاب یعنی قرآن کی تعلیمات سے منہ پھیر لیتا ہے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے یا اس پر عمل کرنے سے فرار اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں وہ ہمیشہ اسے اس طرح کھینچے پھرتا ہے جیسے ایک مخمور آدمی کا ہاتھ پکڑنے والا اسے جہاں چاہے لے جاتا ہے یا جیسے ایک سوار اپنے گھوڑے کے قابو آ جائے تو وہ اسے جس کھائی میں چاہتا ہے پھینک دیتا ہے یہی حال اس آدمی کا ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا یہ ہے کہ جو زندگی میں گزار رہا ہوں یہ میں شاید اپنی مرضی سے گزار رہا ہوں حالانکہ وہ تو ایک شیطان کے قبضے میں ہوتا ہے جو اسے جہاں چاہتا ہے لئے پھرتا ہے اور جو چاہتا ہے اس سے کرواتا ہے لیکن یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ شخص اللہ کے دین کو چھوڑ دیتا ہے۔ آج بھی ہم چاروں طرف ہمیشہ اس طرح کی شکایتیں سنتے ہیں کہ آسیب اور جنات کا اثر عام ہوتا جا رہا ہے اور پھر ہم اس کیلئے پیشہ ور عاملوں کے چکر لگاتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم اپنے گھروں کو اسلامی احکام کی مخالفت سے پاک کر لیں اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کے مطابق اپنے اور اپنے گھروں کے معمولات کو درست کر لیں تو کوئی جن یا کوئی شیطان ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتا ان کو یہ جرأت اس وقت ہوتی ہے جب ہم اپنے آپ کو اللہ کی رحمت سے محروم کر لیتے ہیں۔ کاش ہم کبھی اپنے اعمال پر غور کر سکیں تو دنیا کے نقصان سے بھی بچیں اور آخرت بھی سنوار لیں۔

Marfat.com

يٰمَعْشَرَ

اے جنوں اور

الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ

انسانوں کی جماعت کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آتے رہے جو میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے

وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ

اور اس دن کے سامنے آموجود ہونے سے ڈراتے تھے۔ وہ کہیں گے کہ (پروردگار) ہمیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔ ان

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ ذٰلِكَ

لوگوں کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ اور (اب) خود اپنے اوپر گواہی دی کہ کفر کرتے تھے (اے محمدؐ) یہ

اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ

(جو پیغمبر آتے رہے اور کتابیں نازل ہوتی رہیں تو) اس لیے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے اور وہاں کے

لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَرَبُّكَ

رہنے والوں کو (کچھ بھی) خبر نہ ہو۔ اور سب لوگوں کے بلحاظ اعمال درجے (مقرر) ہیں اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں خدا ان سے بےخبر نہیں۔ اور

الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا

تمہارا پروردگار بے پروا (اور) صاحب رحمت ہے۔ اگر چاہے تو (اے بندو) تمہیں نابود کر دے اور تمہارے بعد جن لوگوں

يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ

کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے جیسا تم کو بھی دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ جو وعدہ تم سے

لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ

کیا جاتا ہے وہ (وقوع میں) آنے والا ہے اور تم (خدا کو) مغلوب نہیں کر سکتے۔ کہہ دو کہ لوگو تم اپنی جگہ عمل کیے جاؤ میں (اپنی جگہ)

اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ

عمل کیے جاتا ہوں۔ عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ آخرت میں (بہشت) کس کا گھر ہوگا۔ کچھ شک نہیں کہ

Marfat.com

لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ

مشرک نجات نہیں پانے کے۔ اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں یعنی کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا

الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ج

بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔ اور اپنے خیال (باطل) سے کہتے ہیں کہ یہ (حصہ) تو خدا کا اور یہ ہمارے شریکوں (یعنی

فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ج وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ

بتوں) کا۔ تو جو حصہ اُن کے شریکوں کا ہوتا ہے وہ تو خدا کی طرف نہیں جا سکتا۔ اور جو حصہ خدا کا ہوتا ہے وہ

يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ط سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ

اُن کے شریکوں کی طرف جا سکتا ہے۔ یہ کیسا بُرا انصاف ہے ف۱۔ اسی طرح بہت سے مشرکوں کو اُن کے شریکوں

مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا

نے اُن کے بچوں کو جان سے مار ڈالنا اچھا کر دکھایا ہے۔ تاکہ انہیں ہلاکت میں ڈال دیں اور اُن کے دین کو اُن

عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

پر خلط ملط کر دیں۔ اور اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے تو اُن کو چھوڑ دو کہ وہ جانیں اور اُن کا جھوٹ۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ق صلے لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ

اور اپنے خیال سے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ چارپائے اور کھیتی منع ہے۔ اسے اس شخص کے سوا جسے ہم چاہیں کوئی نہ

بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ

کھائے اور (بعض) چارپائے ایسے ہیں کہ اُن کی پیٹھ پر چڑھنا منع کر دیا گیا ہے۔ اور بعض مویشی ایسے ہیں جن پر

اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ط سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَقَالُوْا

ذبح کرتے وقت خدا کا نام نہیں لیتے۔ سب خدا پر جھوٹ ہے۔ وہ عنقریب اُن کو اُن کے جھوٹ کا بدلہ دے گا۔ اور یہ بھی

مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى

کہتے ہیں کہ جو بچہ اُن چارپایوں کے پیٹ میں ہے وہ خاص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں کو

Marfat.com

أَزْوَاجِنَا ۚ وَإِن يَكُن مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ

(اس کا کھانا) حرام ہے۔ اور اگر وہ بچہ مرا ہوا ہو تو سب اس میں شریک ہیں (یعنی اسے مرد اور عورتیں سب کھائیں)

وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٣٩﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ

عنقریب خدا اُن کو ان کے ڈھکوسلوں کی سزا دے گا۔ بیشک وہ حکمت والا خبردار ہے۔ جن لوگوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی

سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۚ قَدْ

سے بے سمجھی سے قتل کیا اور خدا پر افترا کر کے اُس کی عطا فرمائی ہوئی روزی کو حرام ٹھیرایا وہ گھاٹے میں پڑ گئے۔

ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٤٠﴾

وہ بے شبہ گمراہ ہیں اور ہدایت یافتہ نہیں ہیں

تمہید:

اگلی آیت کریمہ میں ایک اور سوال کا ذکر کیا جارہا ہے جو جنوں اور انسانوں سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ جس سے صرف یہ تصور دینا مقصود ہے کہ اس دن تم اس سوال کا جواب اگر چہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اور اپنے قصور کو تسلیم کر کے دو گے لیکن اس وقت تمہارا اعتراف تمہارے کسی کام نہیں آئے گا بجز اس کے کہ تمہارے پچھتاوے میں اضافہ ہو لیکن اگر آج تم اس تصور کو یقینی بنا کر کوئی فائدہ اٹھا سکو تو کل کو اس یقینی پیش آنے والے انجام سے بچ سکتے ہو اور مزید اس سے یہ تصور دینا بھی مقصود ہے کہ تم خود اس دن اعتراف کرو گے کہ ہمارے پاس عذر پیش کرنے کیلئے کچھ نہیں ہے۔ اگر آج تم اپنی حالت پر اس دن پیش آنے والی صورت حال کو سامنے رکھ کر غور کرنے کی زحمت کر لو تو اس سے تمہاری دنیا بھی بن سکتی ہے اور آخرت بھی چنانچہ ارشاد فرمایا جارہا ہے:

آیت: ۱۳۰ يَٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۚ قَالُوا شَهِدْنَا عَلَىٰ أَنفُسِنَا ۖ وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ O "اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول نہیں آئے؟ جو تمہیں میری آیتیں سناتے اور تمہارے اس دن کی ملاقات سے تم کو ہوشیار کرتے ہوئے؟ وہ بولیں گے ہم خود اپنے خلاف شاہد ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ بیشک وہ کافر ہے"۔

پروردگار جن وانس سے قیامت کے دن یہ سوال فرمائے گا کہ کیا دنیا میں تمہارے پاس میرے فرستادہ لوگ تمہیں سمجھانے کیلئے نہیں آئے تھے۔ انہوں نے کیا میرے احکام تم تک نہیں پہنچائے تھے اور کیا تمہیں کھول کھول کر یہ بات واضح نہیں کر دی تھی کہ تمہاری زندگی اور آخرت کی کامیابی اللہ کے احکام کو ماننے اور اسکے مطابق زندگی گزارنے میں ہے؟ اور پھر تمہیں انہوں نے کیا ان امتوں کی مثالیں دے کر اور ان کے واقعات بیان کر کے (جن امتوں کی تاریخ سے تم خود واقف بھی تھے) نہیں سمجھایا تھا کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی اور اللہ سے اپنا تعلق استوار نہ کیا اور اسکے احکام کی اطاعت نہ کی تو تم اس عذاب اور اس انجام سے نہیں بچ سکو گے جسکا شکار وہ معذب قومیں ہوئیں؟ اور تمہیں ہر پہلو سے تمہاری طرف سے تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کر کے پوری طرح یہ بات واضح کرنے کی کوشش نہیں کی کہ تمہیں یہاں ہمیشہ نہیں رہنا ہر ایک کو ایک نہ ایک دن موت کا مزا چکھنا ہے اور پھر برزخی زندگی گزار کر ایک نہ

Marfat.com

ایک دن اللہ کے سامنے حاضری دینی ہے اور یقیناً اسکی عدالت میں پیش ہونا ہے وہاں تم سے تمہارے ایک ایک عمل اور زندگی کے ایک ایک لمحے کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ آج اگر تم نے اسکی فکر نہ کی تو بتاؤ کل اس کا کیا جواب دے سکو گے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں یہ لوگ جو آج کسی طرح بھی اللہ کے نبی کی دعوت پر کان دھرنے کیلئے تیار نہیں بلکہ اس دعوت کا مذاق اڑانا اور توہین کرنا ان کا معمول بن گیا ہے اور وہ اپنے نخوت و تکبر میں کوئی سی نصیحت سننے کے روادار نہیں' لیکن اس دن صاف صاف اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے اور اپنے قصور کو تسلیم کریں گے اور برملا اس بات کو مانیں گے کہ یقیناً تیرے سمجھانے والے اور راہ راست دکھانے والے ہمارے پاس آئے تھے لیکن ہم نے ان کی ایک بات بھی مان کے نہ دی اور ہم نے اپنے کفر' شرک اور سرکشی میں کوئی تبدیلی لانا گوارا نہ کیا۔ کفار اور مشرکین کا یہ جواب صرف یہیں نہیں قرآن کریم نے اور بھی بعض جگہ نقل کیا ہے۔ سورۃ الملک میں بیان فرمایا گیا ہے:

كُلَّمَآ اُلْقِیَ فِيهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ○ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ○ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ○ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ج فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ○ (الملک:۸-۱۱)

''جب جب اس میں جھونکی جائے گی کوئی پارٹی۔ دوزخ کے داروغے اس سے سوال کریں گے' کیا تمہارے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے' ہاں! بے شک ہمارے پاس آگاہ کر دینے والا آیا تھا۔ لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہا کہ خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے' تم لوگ تو ایک بڑی گمراہی میں مبتلا ہو۔ اور وہ کہیں گے' اگر ہم سننے اور سمجھنے والے لوگ ہوتے تو دوزخ میں پڑنے والے نہ بنتے۔ پس وہ اپنے جرم کا اعتراف کر لیں گے' پس دفع ہوں یہ دوزخ والے''۔

تصور فرمایئے کہ مشرکین مکہ کا طرز عمل جو سراسر تکبر اور نخوت پر مبنی تھا جس میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کیلئے بجز تحقیر اور استہزاء اور اذیت رسانی کے ان کے پاس کچھ نہیں تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں جس بات کی طرف دعوت دی جا رہی ہے اس کی نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ ہماری زندگی میں اس کیلئے کوئی گنجائش لیکن جب وہ قیامت کے دن اس بے بسی کا شکار ہوں گے جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے تو اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے دل کی کیا کیفیت ہوگی اور وہ کس طرح خون کے آنسو روئیں گے۔ لیکن آج ان کا رونا کسی کام نہیں آئے گا قرآن کریم یہ جذباتی اور ہولناک منظر ان کے سامنے رکھ کر انہیں توجہ دلانا چاہتا ہے کہ نادانو! آج ہی کچھ غور کر لو تو شاید کل کو اپنے اس انجام بد سے بچ سکو ورنہ اس انجام کا آنا تو اس قدر یقینی ہے جس طرح آج تمہارا وجود تمہارے سامنے ہے جس طرح تم آج سورج کو طلوع ہوتا اور ڈوبتا دیکھتے ہو اسی طرح اس انجام کو بھی دیکھو گے لیکن پھر اس سے بچنے کی تمہارے پاس کوئی صورت نہیں ہوگی۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس آیت کریمہ میں دو باتوں کی تشریح ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کے اعتراف گناہ کو بیان کرتے ہوئے جملہ معترضہ کے طور پر اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو آخر قبول کیوں نہیں کرتے حالانکہ اللہ کے رسول کی ذات خود اپنے اندر اس قدر اعجازی شان رکھتی ہے کہ معمولی سوج بوجھ والا آدمی بھی پیغمبر کو دیکھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس کی دل آویز شخصیت' اس کا دل موہ لینے والا سراپا' اس کے چہرے کا نور' اس کی پیشانی سے اٹھتی ہوئی روشنی' اس کی زبان سے ٹپکنے والا امرت اور اس کے معاملات کی سچائی' اس کے اخلاق کی بلندی' اس کی خاندانی شرافت' اس کی امانت و صداقت ان میں سے کون سی بات ہے کہ دشمن بھی جس سے انکار کرنے کی جرأت کر سکیں اور پھر اس کی زبان سے ادا ہونے والا اللہ کا کلام جو اپنی فصاحت و بلاغت میں معجزانہ شان کے ساتھ ساتھ معانی اور مفاہیم کا ایسا سمندر کہ

Marfat.com

جس کی گہرائی کا اندازہ کرنا انسانی بس سے ماورا ہے۔ جس کا پیش کردہ نظام زندگی ہر طرح کے تضاد سے پاک ہر طرح کی نارسائی سے مبرا اور صداقت و حقانیت اور واقعیت کی ہر ترازو میں تلنے والا اور جس کی پیش کردہ پیشگوئیاں اور علمی انکشافات تاریخ کا ناقابل تردید باب' لیکن مشرکین مکہ اور اس دور کے دوسرے کفار جو قیامت کے دن اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے' لیکن آج وہ کسی طرح بھی قرآن اور صاحب قرآن سے متاثر ہونے کیلئے تیار نہیں۔ اس کی حقیقت کھولتے ہوئے بیان فرمایا گیا ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو ان کی دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر دیا ہے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ جو لوگ اللہ کے دین کی دعوت لیکر ہمارے سامنے آئے ہیں وہ دنیوی اعتبار سے ہمارے مقابلے میں نہایت فروتر ہیں' انہیں کوئی خوشحال زندگی میسر نہیں معمولی ضروریاتِ دنیا سے بھی تہی دامن ہیں اور ہم ان کے مقابلے میں نہایت پرتکلف زندگی بسر کر رہے ہیں' دنیا کی ہر آسودگی ہمیں میسر ہے ہمارے پاس وہ سب کچھ ہے جسکا وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے اور پھر جس زندگی کے رویے سے ہمیں وہ روکنا چاہتے ہیں اگر وہ رویہ غلط ہوتا تو یقیناً پروردگار ہمیں اس کی سزا دیتا اور دنیوی خوشحالی ہم سے چھین لیتا سزا کے طور پر ہمیں مختلف مصائب کا شکار کرتا اور ہمارے مقابلے میں پیغمبر اور اس کے ماننے والوں کو دنیوی نعمتوں سے نوازتا۔ لیکن جب ایسا نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ کی نگاہ میں پسندیدہ لوگ ہیں اور ہمیں جس بات کی دعوت دی جا رہی ہے اس میں قطعاً کوئی سچائی نہیں۔ مشرکین مکہ دراصل اس فریب میں مبتلا ہوئے کہ اگر ہمارا طرز عمل غلط ہوتا تو ہم یقیناً سزا کے مستحق ہوتے اور دنیوی اقتدار اور اس کی خوشحالیاں ہمیں کبھی میسر نہ آتیں حالانکہ دنیا کا یہ نظام جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہا بلکہ ابتلا کے اصول پر چل رہا ہے۔ جس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے۔ جس طرح حق کیلئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ جدوجہد کے نتیجے میں اپنے لئے راستہ نکالے اسی طرح باطل کیلئے بھی کوئی رکاوٹ نہیں وہ جسطرح چاہے زندگی گزارے اور جس طرح چاہے اپنے لئے نفوذ کے وسائل پیدا کرے یہاں انفرادی طور پر بھی ہر شخص کی آزمائش ہو رہی ہے اور اجتماعی طور پر بھی قومیں آزمائی جا رہی ہیں کسی کو نعمتیں دے کر آزمایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یا نہیں اور کسی کو فقر و فاقہ میں مبتلا کر کے آزمایا جاتا ہے کہ وہ بدحالی میں بھی صبر کر کے اللہ کو یاد کرتا ہے یا نہیں اور قومیں کبھی دولت اور اقتدار سے آزمائی جاتی ہیں اور کبھی قومی مسائل سے دوچار کر کے اور اقتدار سے محروم کر کے آزمائی جاتی ہیں۔ رہی جزا اور سزا یہ دنیا اس کی جگہ نہیں اسکی جگہ آخرت ہے۔ مشرکین مکہ اور دوسرے کفار چونکہ اس بات کو نہیں سمجھے اسلئے دنیوی زندگی کے دھوکے میں آ گئے اور اپنی دولت مندی اور خوشحالی کو اللہ کے ہاں رضامندی کی دلیل سمجھ کر اس پر اترا گئے اور تباہ ہو گئے اس میں ہمارے لئے غور و فکر کا ایک وسیع باب موجود ہے کہ ہم بھی اپنی حالت پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ کہیں ہم بھی اسی فریب نظر کا شکار تو نہیں ہمارا مقتدر اور خوشحال طبقہ کیا اسی طرح کی فریب خوردگی میں مبتلا تو نہیں اور کیا ہمارا پسماندہ طبقہ اور غریب لوگ کیا تقدیر کے شاکی ہو کر ایسی ہی صورت حال سے دوچار تو نہیں۔

کیا جنوں کے الگ رسول تھے؟

دوسری بات جو اس آیت میں وضاحت طلب ہے وہ یہ ہے کہ اس میں رُسُلٌ مِّنكُمْ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اے جنو اور انسانو! اللہ نے تمہی میں سے تمہارے پاس رسول بھیجے ہیں یعنی انسانوں میں سے انسانوں کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور جنوں میں سے جنوں کو اور یہ بات قرین عقل بھی معلوم ہوتی ہے کہ انسانی اصلاح و ہدایت کیلئے اگر کسی جن کو رسول بنا کر بھیجا جاتا تو یقیناً اس کی زبان اور ہوتی وہ اپنی اصل حیثیت میں کبھی نظر نہ آتا اسکا مزاج اور اس کی طبیعت انسانوں سے یکسر مختلف ہوتی۔ اسکے سوچنے سمجھنے کا انداز اسکے احساسات کی دنیا یقیناً انسانوں سے متفاوت ہوتی ایسی صورت حال میں انسان اس کی تعلیم و تبلیغ اور اس کی عملی نمونے سے کیا فائدہ اٹھاتے اور وہ کس طرح انسانوں کے سامنے اللہ کی طرف سے اتمام حجت

Marfat.com

کرسکتا بالکل یہی صورت حال اس وقت بھی ہوتی جب انسان جنوں کی طرف اللہ کے رسول بن کے آتے۔ وہ بھی ان کیلئے نہ اسوہ ثابت ہوتے نہ عملی پیکر بنتے نہ اتمام حجت کر سکتے زیادہ سے زیادہ دونوں میں کوئی اشتراک ہوسکتا تو عقائد اور اخلاق کے بعض اصولوں میں ہوسکتا۔ رہی شریعت' قانون اور معاشرت یقیناً اسکے مسائل دونوں میں الگ الگ ہیں اسلئے ان میں کسی اشتراک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسلئے یہ بات سمجھنا عقل کے عین مطابق ہے کہ انسانوں کی طرف انسان رسول بن کے آئے اور جنوں کی طرف جنات۔ قرآن وسنت میں چونکہ اس بارے میں واضح طور پر کوئی بات نہیں کہی گئی اسلئے علما نے اس سلسلے میں مختلف طرز عمل اختیار کئے ہیں۔

بعض کا کہنا یہ ہے کہ رسول اور نبی صرف انسان ہی ہوئے اور ہوتے چلے آئے ہیں' جنات کی قوم میں سے کوئی شخص رسول بلاواسطہ نہیں ہوا بلکہ ایسا ہوا ہے کہ انسانی رسول اور پیغمبر کا کلام اپنی قوم کو پہنچانے کیلئے جنات کی قوم میں کچھ لوگ ہوئے ہیں جو درحقیقت رسولوں کے قاصد اور پیغامبر ہوتے تھے' مجازی طور پر ان کو بھی رسول کہہ دیا جاتا ہے' ان حضرات کا استدلال قرآن مجید کی ان آیات سے ہے' جن میں جنات کے ایسے اقوال مذکور ہیں کہ انہوں نے نبی کا کلام یا قرآن سن کر اپنی قوم کو پہنچایا مثلاً:

وَلَّوۡا اِلٰی قَوۡمِهِمۡ مُّنۡذِرِیۡنَ

اور سورۃ جن کی آیت

قَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا یَّهۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ   وغیرہ

حضرت محمد ﷺ جنوں اور انسانوں سب کی طرف رسول ہیں:

لیکن ایک جماعت علماء اس آیت کے ظاہری معنی کے اعتبار سے اس کی بھی قائل ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ سے پہلے ہر گروہ کے رسول اس گروہ میں سے ہوتے تھے' انسانوں کے مختلف طبقات میں انسانی رسول آتے تھے اور جنات کے مختلف طبقات میں جنات ہی میں سے رسول ہوتے تھے' حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ ﷺ کو سارے عالم کے انسانوں اور جنات کا واحد رسول بنا کر بھیجا گیا اور وہ بھی کسی ایک زمانہ کیلئے نہیں بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام جن وانس آپ ﷺ کی امت ہیں اور آپ ﷺ ہی سب کے رسول وپیغمبر ہیں۔ اس بات کی تائید بعض روایات سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ کی جنات سے ملاقاتوں کا تذکرہ ہے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک سے زیادہ مرتبہ آنحضرت کے ساتھ جنات سے ملاقات کیلئے گئے ان کو ایک دائرہ میں بٹھا کر آپ خود آگے بڑھ گئے۔ حضرت عبداللہ وہاں بیٹھے کچھ سایوں کو آتے جاتے دیکھتے رہے اور آنحضرت کو انہوں نے قرآن پاک پڑھتے بھی سنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور مختلف اوقات میں قرآن پاک کی تعلیم اور اللہ کے احکام پہنچانے کیلئے جنات سے ملاقاتیں فرماتے تھے اور پھر امت کے بڑے بڑے اہل علم اور اکابر اولیا کے بارے میں تواتر سے یہ باتیں تاریخ میں نقل ہوئی ہیں کہ جنات ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل رہے اور اپنی اصلاح کیلئے ان سے اکتساب فیض بھی کرتے رہے اور وہ ہمیشہ آنحضرت ﷺ پر ایمان ہی کا تذکرہ کرتے رہے انہوں نے اپنے کسی پیغمبر کا کبھی ذکر نہیں کیا اس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ حضور کی بعثت سے پہلے ممکن ہے ان میں خود ان کے اندر سے پیغمبر آتے رہے ہوں لیکن آنحضرت کی تشریف آوری کے بعد جن وانس سب کے رسول حضور ہی ہیں۔ البتہ ان کی اصلاح وہدایت کیلئے جس طرح آج انسانوں میں انسان کام کر رہے ہیں اسی طرح ان میں جنات کام کر رہے ہیں اور ان پر ہماری پوری شریعت بلاکم وکاست نافذ ہے یا ان کیلئے کچھ خصوصی احکام بھی ہیں ان تفصیلات کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

Marfat.com

اگلی آیت کریمہ میں اس اہتمام کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا رہا ہے کہ اللہ نے انسانوں اور جنوں کی ہدایت کیلئے ہمیشہ رسول مبعوث کئے اور ہمیشہ ان پر اپنے احکام نازل فرمائے۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۱۳۱ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ O ''یہ اس وجہ سے ہے کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے ظلم کی پاداش میں، اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں''۔

اللہ تعالیٰ بغیر اپنی ہدایت پہنچائے کسی بستی والوں کو ہلاک نہیں کرتا:

اللہ تعالیٰ نے جتنی مخلوقات بھی پیدا فرمائی ہیں محض اپنے فضل و کرم سے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کی ہے کہ ان تمام کو زندگی گزارنے کا طریقہ میں سکھاؤں گا۔ چنانچہ آپ تمام حیوانات حتیٰ کہ حشرات الارض تک کو دیکھ لیجئے ان میں سے ہر ذی روح اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھے جس مقصد کیلئے پیدا کیا گیا ہے اس کے مطابق مجھے زندگی کس طرح گزارنی ہے؟ پرندے کو سکھایا گیا ہے کہ ہوا میں کس طرح اڑنا ہے، مچھلی کو بتایا گیا ہے کہ پانی میں کس طرح تیرنا ہے، جنگل کے جانور پوری طرح اپنی جبلت اور احساسات کے تحت اپنے زندگی کے فرائض ادا کرنے اور زندگی کے وسائل حاصل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ گندگی میں پلنے والا کیڑا بھی خوب جانتا ہے کہ اسے کس طرح زندگی گزارنی ہے کیونکہ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اسکا فیضان جس طرح تخلیقی عمل کی صورت میں جاری ہے اسی طرح ہدایت یعنی زندگی کی رہنمائی کی شکل میں بھی رواں دواں ہے۔ انسان حیوانی مخلوقات کی ایک برتر شکل ہے اس کو حواس کے ساتھ ساتھ جوہر عقل سے بھی نوازا گیا اور پھر چونکہ اسے ایک مکلف مخلوق بنایا گیا اور اس بات کا پابند ٹھہرایا گیا کہ تمہاری زندگی کے مقاصد صرف اس زندگی تک محدود نہیں بلکہ اس کا رشتہ اگلی زندگی سے جڑا ہوا ہے اسلئے تم نے یہ زندگی اس طرح گزارنی ہے جس سے آخرت کی زندگی سدھر جائے۔ آخرت کی زندگی کا سدھار اور کامیابی چونکہ صرف انسانی حواس اور عقل سے ممکن نہیں تھی اسلئے اللہ نے وحی الٰہی کے ذریعے انسانوں کی رہنمائی فرمائی اور جہاں کہیں بھی انسانوں کو پیدا فرمایا وہیں اپنے رسول بھیجے، اپنی کتابیں اتاریں اور پوری طرح انسانوں اور جنوں پر اتمام حجت کر دیا تاکہ کل کو وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم سے جن باتوں کا سوال کیا جارہا ہے ہمیں ان کے بارے میں کوئی راہنمائی نہیں دی گئی تھی کیونکہ اگر انسانوں کو یہ نہ بتایا جاتا کہ تمہاری زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اور کن باتوں میں تمہارا پروردگار راضی ہے اور پھر قیامت کے دن ان سے انہی باتوں کا سوال ہوتا اور انہی پر ان کو سزا بھی ملتی تو یقیناً ان پر بڑا ظلم ہوتا۔ جس نوکر کو یہ نہ بتایا جائے کہ تمہاری ڈیوٹی کیا ہے لیکن اسے پکڑ کر سزا دے دی جائے تو ہر کوئی یہی کہے گا کہ اس نوکر کے ساتھ ظلم ہوا ہے کہ جب وہ جانتا ہی نہیں کہ مجھے کرنا کیا ہے تو آخر اسے سزا کس بات پر دی جارہی ہے۔ چنانچہ یہاں اللہ تعالیٰ یہی بیان فرمارہے ہیں کہ ہم نے انسانوں اور جنوں میں رسول بھیجے اور راہنمائی عطا فرمائی اسکی وجہ یہی ہے کہ تیرا رب رحیم و کریم ہے وہ کسی بستی والوں کو اس طرح سزا نہیں دیتا کہ پہلے ان کو یہ نہ بتایا جائے کہ تمہارا خالق و مالک تم سے کیا چاہتا ہے اگر یہ بعثت انبیاء کا سلسلہ نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ کسی کو بھی دنیا میں اس بات کی خبر نہ ہوسکتی تھی کہ وہ زندگی کس طرح گزاریں جس سے ہمارا اللہ راضی ہو؟ چنانچہ بعثت انبیاء کا حقیقی مقصد یہی اتمام حجت رہا ہے تاکہ کل کو جن و انس میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں تو کوئی سمجھانے والا نہیں آیا آخر ہمیں سزا کس بات کی دی جارہی ہے؟ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی رحمت کی وجہ سے اس خود عائد کردہ ذمہ داری کو جس طرح پورا فرمایا ہے اس سے زیادہ کا تو کیا اس سے برابر کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ انسانی ہدایت اور اسکی راہنمائی کیلئے یہ بات کافی تھی کہ کسی طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کا کوئی مجموعہ انسانوں کی ہر بستی میں بھیج دیا جاتا اور انہیں حکم دے دیا جاتا کہ اسکی پابندی کرو اور جو اس سے انکار کرتا اسے تباہ کر دیا جاتا لیکن جو طریقہ پروردگار نے اختیار فرمایا کہ اپنے رسول بھیجے، کتابیں اتاریں اور پھر اپنے انبیاء اور رسولوں کو زندگی

Marfat.com

اس کام پر لگائے رکھا ان کی قوموں نے ہر چند اذیتیں پہنچائیں، رکاوٹیں کھڑی کیں لیکن ان کی سرکشی کے باوجود بھی اس کام کو روکنے کی کبھی اجازت نہ فرمائی۔ بعض انبیاء شہید ہوئے دنیا کا ہر دکھ رسولوں نے اٹھایا لیکن یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ کبھی کبھی قوموں پر عذاب بھی آئے۔ لیکن عموماً صدیوں تک قوموں کی ہر طرح کی سرکشی کو برداشت کیا لیکن یہ سلسلہ ہدایت کبھی رکنے نہ پایا' اسی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کفر اور شرک پر ابدی عذاب کیوں رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تبلیغ و دعوت کے عمل میں انتہا سے بڑھ کر کوشش فرمائی گئی ہے اور انسانی قافلے کے گلہائے سر سبد اس کیلئے کوشاں رہے ہیں اور اس کوشش کی ہر قیمت ادا بھی کرتے رہے اور انسانوں کے کسی گروہ نے اگر پھر بھی اپنی سرکشی اور بغاوت کا رویہ نہیں چھوڑا اور وہ بھی کسی معمولی حاکم کے مقابلے میں نہیں بلکہ کائنات کے حاکم اعلیٰ کے مقابلے میں تو معمولی عقل کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسے شدید جرم کی سزا ایسی ہی ہونی چاہئے اور مزید یہ بات کہ اللہ حاکم الحاکمین ہے' شہنشاہِ کائنات ہے۔ بادشاہ جو بھی کرے اسے قانون کی حیثیت حاصل ہوتی ہے لیکن وہ شہنشاہِ کائنات یہ فرما رہا ہے کہ اگر کسی بستی والوں کو ہم بغیر راہنمائی کا حق ادا کئے سزا میں ہلاک کر دیتے تو یہ ان پر ظلم ہوتا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفت رحمت کا سب سے بڑا تقاضہ اس کی صفت عدل ہے اور یہی وہ صفت ہے جس نے کائنات کے نظام کو ثبات و قرار بخشا ہے اور اسی کے نتیجے میں بعثت انبیاء اور ہدایت کا سلسلہ وجود میں آیا اور یہی وہ صفت ہے جنت اور جہنم کا وجود جس کا اظہار ہے اسلئے اس صفت کے بروئے کار لانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس حد تک ہم پر احسان فرمایا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے مجرم کو اس کے جرم سے بڑھ کر سزا نہیں دی گئی اور کسی چھوٹے مجرم کو بڑے مجرم کے برابر عذاب نہیں دیا گیا اور ہر چھوٹی بڑی نیکی کا الگ الگ پیمانہ رکھا ہے تاکہ کسی کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق شکایت پیدا نہ ہو سکے۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے:

آیت: ۱۳۲ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ ''اور ہر ایک کیلئے درجے ہیں' ان کے عمل کے اعتبار سے اور تیرا رب اس چیز سے بے خبر نہیں ہے' جو وہ کرتے رہے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کفار کو ان کے جرم کی نوعیت کے مطابق درجہ بدرجہ سزا دے گا:

عدل و انصاف میں انسان انتہائی کوشش بھی کرے تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ جس آدمی نے جو جرم کیا ہے اور اس سے جو نقصان پہنچا ہے اسے سامنے رکھ کر سزا تجویز کرے کہ ایک سزا چوری کی ہو اور ایک ڈاکے کی' ایک قتل کی ہو اور ایک مار پیٹ کی' ایک عزت لوٹنے کی ہو اور ایک مال لوٹنے کی' ایک کسی ایک انسان کی جان لینے کی ہو اور ایک کسی بستی اجاڑ دینے کی۔ یہ الگ الگ سزائیں مقرر کرنا یقیناً عدل و انصاف کا تقاضہ ہے اور انسان اس پر قدرت بھی رکھتا ہے۔ لیکن اگر انسانوں کا ایک گروہ مل کر کہیں ڈاکہ ڈالتا ہے اس میں عزتیں بھی لٹتی ہیں اور کچھ لوگ مارے بھی جاتے ہیں اگر ڈاکوؤں کا یہ گینگ پکڑا جاتا ہے تو سب کو ایک ہی سزا ملتی ہے یہ متعین کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ صرف مال کس نے لوٹا ہے' عزت کس نے پامال کی اور قتل کس نے کیا اور پھر اس بات کا تعین کہ ان جرائم میں تمام شریک لوگ جرم کے احساس اور شدت میں سب برابر تھے یا ان میں فرق تھا اس کا جاننا تو انسانوں کیلئے ہرگز ممکن نہیں۔ اسی طرح جو آدمی اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے' اس کے دین کی توہین کرتا ہے' اس کے پیغمبر کی بے ادبی کرتا ہے' مسلمانوں کی تحقیر کرتا ہے' اس کے احساسات کو جاننا اور اس طرح کے تمام جرائم کرنے والوں کو الگ الگ حیثیتوں میں تقسیم کرنا یہ کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں کیونکہ اس کیلئے صرف ظاہری نگاہ کافی نہیں بلکہ ایسی نگاہ کی ضرورت ہے جو دلوں کے احساسات کا جائزہ لے سکے' جو جرم کے پس منظر میں جھانک سکے' جو ہر گناہ کی شدت کو ترازو میں تول سکے۔ لیکن پروردگار کے عدل و انصاف پر قربان جایئے اس آیت کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن جب ہم ان کافروں اور مشرکوں کو سزا دیں گے تو سب کی سزا یکساں نہیں ہوگی۔ جس طرح کافر اور منافق کی سزا میں فرق ہوگا اسی طرح ایک عام کافر اور ایک معاند کافر میں بھی فرق ہوگا۔ ایسے

Marfat.com

لوگ بھی ہوں گے جنہوں نے صرف اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہوگا یا اسکا انکار کیا ہوگا لیکن وہ لوگ بھی ہوں گے جنہوں نے اللہ کے دین کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی ہوں گی اللہ کے پیغمبر اور مسلمانوں کو ستایا ہوگا پھر اس بہیمیت اور درندگی میں بھی احساس اور شدت کے مدارج ہوں گے ان تمام کا لحاظ رکھتے ہوئے سب کو یکساں عذاب نہیں دیا جائے گا بلکہ ہر طرح کے کافروں کی الگ الگ کیٹیگریز ہوں گی اور ان کے مطابق نہیں جہنم کی مختلف وادیوں میں بھیجا جائے گا اور اس لئے شاید جہنم کو ایک وادی نہیں رکھا گیا بلکہ اس کو مختلف وادیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر وادی عذاب دہی کی شدت میں دوسری وادی سے مختلف ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ جہنم کی بعض وادیاں ایسی ہیں کہ باقی جہنم اس سے پناہ مانگتا ہے۔ ہم مشرکین مکہ کا جب تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابوجہل تو ایک ہی تھا دوسرا کوئی لعین اس کا ہم پلہ نہ تھا اگرچہ مکہ اس وقت مخالفین سے بھرا ہوا تھا لیکن مخالفت میں سب یکساں نہ تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی جو بعد میں مسلمان ہوئے' کفر کی حالت میں بھی مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ شعب ابی طالب میں بعض کفار در پردہ کچھ نہ کچھ اشیاء خورد و نوش بھیجتے رہتے تھے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام مجرموں کا جرم ایک سطح کا نہیں ہوتا لیکن انسانی قانون ہمیشہ ان سے ایک طرح کا سلوک کرتا ہے لیکن اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ہر ایک کیلئے درجات رکھے ہیں یعنی ہر جرم کا ارتکاب کرنے والوں میں درجے ہیں اور اس کا دارومدار ان کے اعمال کی نوعیت اور حیثیت پر ہے۔ لیکن ان باتوں کا تعین چونکہ انسانی عقل اور انسانی علم سے ماوراء ہے۔ اس لئے فرمایا کہ تمہارا رب چونکہ ہر ایک کے عمل سے اور اس کے تہہ منظر سے بھی واقف ہے اس لئے اس کیلئے کوئی دشواری نہیں کہ وہ ان کے اعمال سے اعتبار سے ان میں درجہ بندی کرے اور پھر اس کے مطابق انہیں سزا دے۔ خود آنحضرت ﷺ نے اللہ کے دیئے ہوئے علم کے مطابق فتح مکہ کے موقعہ پر بعض لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیا حالانکہ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اپنے جرائم کے اعتبار سے قتل کا مستحق نہ ہو لیکن ان میں سے چند ایک کا انتخاب یقیناً اس وجہ سے تھا کہ ان کے کفر اور دشمنی کی شدت دوسروں سے کہیں بڑھ کر تھی اور انصاف کا یہی تقاضہ تھا کہ ان کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ اسی سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عذاب میں درجہ بندی ہوگی اس طرح عطاء بخشش میں بھی درجہ بندی ہوگی۔ اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت انسانی بخشش و نجات کا ذریعہ ہے اور یہی دولت انسان کو جنت میں لے جائے گی۔ لیکن جنت بھی ایک درجے کا نام نہیں وہاں اللہ کی بندگی اور اطاعت کرنے والے اطاعت و بندگی میں اپنے مدارج کے اعتبار سے جنت میں مختلف درجات میں رکھے جائیں گے۔ شہداء جنت کے اس درجے میں ہوں گے جو ان کیلئے مخصوص ہوگا لیکن درجات کا تفاوت ان میں بھی ہوگا کیونکہ شہادت میں جان تو سارے دیتے ہیں لیکن احساسات میں یقیناً فرق ہوتا ہے اور اس کا جاننے والا صرف پروردگار ہے۔ وہی جانتا ہے اور وہی اپنے علم کے مطابق درجہ بندی کرے گا۔ یہی حال باقی نیکیوں کا بھی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا علم اپنے انصاف کے مطابق عطاء و بخشش کے فیصلے کرے گا اور لوگ اس سے بہرہ ور ہوں گے۔

انسانی سرشت عجیب واقع ہوئی ہے یہ بعض دفعہ خیر سے شر کا مفہوم نکالتی اور بعض دفعہ شر سے خیر کا پہلو اخذ کرتی ہے۔ دناءت پسند طبیعتیں بالعموم احسانات سے متاثر ہونے کی بجائے اور زیادہ اکڑتی اور بگاڑ کا شکار ہوتی ہیں۔ بجائے اپنے محسن کے سامنے جھکنے اور اس کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے اسی کے خلاف معاندانہ رویہ اپنا لیتی ہیں کفر اور شرک تمام برائیوں کی جڑ ہے جس طبیعت میں یہ دونوں چیزیں جگہ بنا لیتی ہیں وہاں کسی بھی اچھائی اور خوبی کا باقی رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مشرکینِ مکہ اور دیگر کفار کا یہی حال تھا کہ وہ بجائے اس کے کہ اللہ کے آخری نبی کی کاوشوں اور تبلیغ دین کی محنتوں کو اللہ کا احسان جان کر اس کا شکریہ ادا کرتے اور آگے بڑھ کر اسلام کی آغوش میں آ جاتے۔ انہوں نے اسے بھی اپنی خستِ طبع کے باعث غلط معنوں میں لیا اور بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے اسے تمسخر کا نشانہ بنایا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ گویا اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت قبول کرنے کے محتاج ہیں کہ اگر یہ لوگ ہدایت قبول نہیں کریں گے تو خدا کی خدائی میں شاید کوئی کمی آ جائے گی اور پیغمبر کی پیغمبری شاید ان کے بغیر چل نہ سکے گی۔ چنانچہ ان

Marfat.com

اس غلط سوچ اور خست طبع کو نمایاں کرنے اور حقیقت حال کو واضح کرنے کیلئے اگلی آیت کریمہ میں نہایت قیمتی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جس سے صرف انہی کو راہنمائی دینا مقصود نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے ایک مشعل جلانا ہے جس سے وہ ہمیشہ ہدایت وضلالت کے امور میں آسانی سے فیصلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۳۳ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ؇ ''اور تیرا رب' بے نیاز رحمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے' تم کو فنا کر دے اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جس کو چاہے لائے' جس طرح اس نے تم کو پیدا کیا دوسروں کی نسل سے''۔

اللہ غنی اور رحیم ہے:

آیت کی تشریح سے پہلے آیت کے پہلے جملے کو دیکھئے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے ''تیرا رب غنی رحمت والا ہے'' اس میں رب کی دو صفات بیان ہوئی ہیں ''غنی'' اور ''رحمت والا'' قاعدے کے اعتبار سے غنی کے بعد 'وا' یعنی حرف عطف آنا چاہئے تھا لیکن یہاں حرف عطف ساقط کر دیا گیا اس میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ ایک موصوف میں کئی صفات ہو سکتی ہیں اور اللہ تعالیٰ تو بے شمار صفات سے متصف ہیں مثلاً ایک آدمی خطیب بھی ہو سکتا ہے ادیب بھی' شاعر بھی ہو سکتا ہے نثر نگار بھی' فلسفی بھی ہو سکتا ہے سائنسدان بھی' لیکن ہر صفت اپنے اپنے وقت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لیکن جب کسی موصوف کے حوالے سے صرف اس کی صفات کا تذکرہ مقصود ہو یعنی یہ بتلانا مقصود ہو کہ اس میں یہ یہ صفات پائی جاتی ہیں تو ہر صفت کے بعد دوسری صفت کے ساتھ حرف عطف لایا جائے گا۔ لیکن جب کہیں ایک سے زیادہ صفات بغیر حرف عطف کے لائی جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صفات بیک وقت موصوف میں پائی جاتی ہیں ان کا ظہور موصوف سے ایک ہی وقت میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی وقت میں بے نیاز بھی ہیں اور رحمت والے بھی ہیں۔ ان سے بے نیازی کا ظہور بھی ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ رحمت بھی اپنا عمل جاری رکھتی ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غنی اور بے نیاز ہے یعنی اس کی کوئی غرض کسی سے اٹکی ہوئی نہیں ہے اس کا کوئی مفاد کسی سے وابستہ نہیں وہ اپنی کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں اس کی شان اور عظمت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ کسی مثبت یا منفی بات سے اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ ساری دنیا اس کی حمد وثناء کے ترانے گانے لگے اور دن رات اس کی عبادت اور بندگی میں جتی رہے تو اس کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا اور اگر دنیا کا ایک ایک فرد اس کی بندگی سے انکار کر دے تو اس کی شان اور عظمت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ ''اگر تم میں سے ہر مسلمان کا دل اس طرح اللہ کی محبت سے بھرپور اور روشن ہو جائے جس طرح محمد ﷺ کا دل ہے تو اللہ کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا اور اگر تم میں سے ہر شخص ابلیس کی طرح نافرمان ہو جائے تو اس کی شان میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی''۔ وہ نہ تمہاری سلامیوں کا محتاج ہے نہ تمہاری نذر و نیاز کا' اپنے بے شمار خزانے تم پر لٹا رہا ہے لیکن وہ اس کے بدلے میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ اس کی اصل شان اس کے استغناء میں ہے۔ ہر چیز اس کی محتاج ہے لیکن وہ ہر احتیاج سے پاک ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق اور اپنے بندوں سے ایسا ہی مستغنی ہے تو پھر وہ اپنے بندوں کو راہ راست پر چلانے کیلئے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے بار بار راہنمائی کیوں دیتا ہے اور وہ کیوں اپنے رسولوں کو اس راستے میں مخالفتیں برداشت کرنے اور اذیتیں سہنے پر مجبور کرتا ہے اس کے نافرمان بندے اس کے رسولوں سے جو بھی سلوک کریں اور اس کے دین کا کیسا ہی تمسخر اڑائیں وہ بالعموم برداشت کرتا ہے اور لوگوں کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے اور پھر یہ سلسلہ ایک دو روز کا نہیں بلکہ حضرت آدم سے لے کر خاتم النبیین کی بعثت تک یہی سلسلہ جاری رہا ہے اور آج بھی اس کے

Marfat.com

راستے پر چلنے والے انہی راہوں کو روشن رکھے ہوئے ہیں اور اس کو نہ ماننے والے اپنی اپنی روش پر قائم ہیں۔ اس کے استغناء کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ کبھی لوگوں کے حال پر توجہ نہ دیتا۔ زیادہ سے زیادہ ضابطے کی کارروائی تک اپنے آپ کو محدود رکھتا۔ لیکن جس طرح ان کی اصلاح وہدایت کیلئے ہمیشہ سے کوششیں ہوتی آئی ہیں اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گویا انسانوں کی طرف سے ان کی بندگی اور عبادت کا محتاج ہے کہ اگر یہ ایسا نہیں کریں گے تو اس کی کبریائی میں کوئی کمی آ جائے گی اسلئے یہاں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں غنی اور بے نیاز ہے اسے تمہاری کسی بات کی پرواہ نہیں لیکن وہ ساتھ ہی ساتھ رحمت والا بھی ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے اور یہ اس کی مہربانی اور رحمت کا ظہور یوں تو مختلف شانوں کے ساتھ ہر وقت جاری رہتا ہے لیکن ہدایت کے معاملے میں اس کا ظہور دو طرح سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ وہ انسانوں کو راہ راست پر چلنے کی جو تلقین کرتا ہے اور حقیقتِ نفس الامری کے خلاف طرز عمل اختیار کرنے سے جو منع کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ تمہاری راست روی سے اس کو کوئی فائدہ اور غلط روی سے اس کو کوئی نقصان پہنچتا ہے بلکہ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اس راست روی میں تمہارا اپنا فائدہ اور غلط روی میں تمہارا اپنا نقصان ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر تم اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق معاشرت اختیار نہیں کرو گے تو تمہارے گھر اجڑ جائیں گے۔ تمہارا معاشرہ تباہ ہو جائے گا اگر تم اس کی راہنمائی کو نظر انداز کر کے اور اس کے احکام سے سرتابی کر کے کاروبارِ زندگی چلاؤ گے تو تہذیب بھی تباہ ہو گی' تمدن بھی اپنا راستہ بدل لے گا اور زندگی اس طرح غلط رخ پر چل نکلے گی کہ تمہاری اجتماعی زندگی طبقات کا شکار ہو کر تباہی کے راستے پر جا پڑے گی اور اگر تم نے اس کی کبریائی کو تسلیم کر کے اسکے عطا کردہ قانون کی پابندی نہ کی تو تم آمریت کی زد میں آ جاؤ گے کچھ بعید نہیں کہ تم غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیئے جاؤ۔ ان تمام قباحتوں سے بچانے کیلئے وہ تمہیں صحیح طرز عمل کی تعلیم دیتا ہے اور یہ سراسر اس کی رحمت کا تقاضہ ہے کیونکہ اس کی رحمت تمہارے کسی نقصان' کسی دکھ اور کسی حادثے کو برداشت نہیں کرتی وہ تمہیں ایسے تمام حوادث سے بچانا چاہتی ہے بلکہ جب تدبر کا ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ اس کی رحمت جس طرح انسانوں کو راست روی کی تعلیم دیتی ہے اسی طرح یہ بھی دکھا دیتا ہے کہ اگر انسان غلط روی سے رکتے نہیں ہیں تو اس کی رحمت کے ظہور کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ انسانوں کی کوتاہیوں پر کبھی جلدی گرفت نہیں کرتا وہ انسانوں کو سزا دینے پر کبھی خوش نہیں ہوتا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے انہیں غلط انجام سے روکنا چاہتا ہے اسلئے وہ گرفت میں جلدی کرنے کی بجائے ڈھیل پے ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ تبلیغ ودعوت کے ذریعے ان کی غلطیاں بھی ان پر واضح کرتا ہے تاکہ لوگ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو سمجھ کر صحیح راستے کی طرف پلٹ آئیں اور پھر اس کی رحمت کی انتہاء یہ ہے کہ جس طرح وہ تبلیغ ودعوت کے سلسلے کو بند نہیں کرتا کہ وہ کفار کے کفر اور مشرکین کے شرک اور نافرمانوں کی نافرمانیوں سے ناراض ہو کر اللہ کے نبیوں کا بھیجنا اور کتابوں کا اتارنا بند کر دے اسی طرح وہ ان تمام نافرمانوں کی روزی کبھی نہیں روکتا جس طرح وہ اپنے ماننے والوں کو رزق دیتا ہے اسی طرح نہ ماننے والوں کو بھی دیتا ہے بلکہ بعض دفعہ ان کی آزمائش کیلئے انہیں زیادہ رزق دیتا ہے تاکہ وہ اللہ کی رحمت کو محسوس کر کے یا تو پلٹ آئیں اور یا کفرانِ نعمت کی انتہاء پر پہنچ کر تباہی کا شکار ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کفار کو ختم کر کے نئی نسل پیدا کرنے پر قادر ہے:

اللہ کی رحمت کا یہ طرز عمل بعض دفعہ بگڑے ہوئے انسانوں میں راہ راست کی طرف آنے کی بجائے یہ سوچ پیدا کرتا ہے کہ ہم اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں لیکن وہ نہ تو اپنی نعمتیں ہم سے روکتا ہے اور نہ اس کا پیغمبر اپنی کاوشیں ترک کرتا ہے بلکہ اس کی رحمتیں ہیں کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں ہمارے انکار اور طغیان کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم پر عذاب کا کوڑا برستا لیکن بجائے عذاب آنے کے اس کا رسول رحمت اللعالمین بن کے آیا اور جو پر کتاب اتری ہے اس کی شان بھی یہ ہے کہ وہ بھی اپنے ماننے والوں کیلئے رحمت بن کے آئی ہے اور پھر اس کی کتاب میں بار بار ہمیں ترغیب دے

Marfat.com

راہ ہدایت کی طرف لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کا پیغمبر نا صرف کہ اپنی شخصیت کی پوری توانائیاں ہمیں ہدایت دینے کیلئے صرف کر رہا ہے بلکہ راتوں کو جاگ جاگ کر ہمارے ایمان کیلئے دعائیں بھی کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جس عذاب اور جس گرفت سے ہمیں ڈرایا جا رہا ہے وہ محض ایک افسانہ ہے اللہ میں ہرگز اس کی قوت نہیں کہ وہ ہمیں سزا دے سکے اگر ایسا ہوتا تو یہ ہمیں ڈھیل پر ڈھیل نہ ملتی شاید اسی وسوسے کے ازالے کیلئے اور اسی غلط سوچ کو دور کرنے کیلئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہیں سزا دینے کی قدرت حاصل نہیں اس کی قدرت کا عالم تو یہ ہے کہ وہ اگر چاہے تو چشم زدن میں تمہیں تباہ و برباد کر دے بلکہ تمہارا نام ونشان مٹا دے کیونکہ یہاں لفظ ہلاکت کا استعمال نہیں ہوا۔ یُذْهِبْكُمْ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے کہ تمہیں لے جائے یعنی تمہارا نام ونشان تک مٹا دے اور تمہیں ملیامیٹ کر دے اور پھر یہ نہ سمجھو کہ تمہیں تباہ کر دینے سے دنیا بے آباد ہو جائے گی اور زمین پر بسنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ فرمایا جس طرح اس میں تمہیں تباہ کرنے کی قدرت ہے اسی طرح دنیا کو آباد کرنے کی بھی اس میں قدرت ہے۔ آخر ایک صدی پہلے جو نسل آج زمین پر آباد ہے ان میں سے کون اس زمین پر آباد تھا یقیناً وہ اور لوگ تھے جو تم سے پہلے زمین پر رہتے تھے۔ لیکن آج ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں اس طرح جب وہ تمہیں مٹا دے گا تو تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ سے آج تک جاری وساری ہے قومیں آتی اور جاتی ہیں لیکن زمین اس کی قدرت سے ہمیشہ آباد رہتی ہے۔ پھر ساتھ ہی ساتھ مَـا کا لفظ لا کر ایک اور سوال کا جواب بھی دے دیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نوع انسانی کا سلسلہ نسل انسانی سے قائم ہے اگر تمام انسان ایک دفعہ مٹا دیئے جائیں تو نئے انسان آخر کس نسل سے وجود میں آئیں گے۔ یہاں مَنْ کی بجائے مَـا کا لفظ لا کر اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کیونکہ مَـا کا غالب استعمال بے جان چیزوں کیلئے ہوتا ہے اور مَـنْ کا استعمال جاندار چیزوں کیلئے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا عالم تو یہ ہے کہ وہ اس بات کا محتاج نہیں کہ وہ انسانوں کو انسانوں ہی سے پیدا کرے وہ جب چاہے انسانوں کو بغیر کسی سبب کے بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی قدرت سے یہ کوئی بعید نہیں کہ وہ اس صحرا کی جس چیز کو چاہے تمہاری جگہ لینے کیلئے کھڑی کر دے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے ایک جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کیونکہ بنی اسرائیل بھی قریش کی ہی طرح ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے پر بڑا ناز کرتے تھے اس لئے حضرت مسیح نے ان سے فرمایا کہ تم اس بات پر گھمنڈ نہ کرو کہ تم ابراہیم کی اولاد ہو میرا خداوند چاہے تو ریگستان کے ذروں سے ابراہیم کیلئے اولاد کھڑی کر دے۔ یہاں قریش سے بھی ان کے غرور پر ضرب لگاتے ہوئے یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تم اللہ کی نگاہ میں بے جان مخلوق کی مانند ہو جس طرح صحرا میں خودرو پودے اگتے ہیں تم اس سے بھی زیادہ بے قدر و قیمت ہو اسلئے تم جیسے پودوں کو مسل کر تم سے بہتر پودوں کو اٹھا کھڑا کرنا اللہ کیلئے کوئی مشکل بات نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ جس ذات والا صفات کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں غنی ہے لیکن بندوں کے معاملات میں وہ رحیم و کریم ہے اور قدرتیں اس کی بے پناہ ہیں جب چاہے اپنے ماننے والوں کو نواز سکتا ہے اور اپنے نافرمانوں کو تباہ کر سکتا ہے اور وہ صاف صاف اپنے پیغمبروں کے ذریعے یہ بات واضح کر رہا ہے کہ نبی آخر الزماں کے آ جانے کے بعد تمہاری قسمت میزان میں ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے تم اگر اس دعوت کو قبول کرو گے تو اللہ کی نعمتوں کے مستحق ٹھہرو گے اور قیامت کے دن جنت تمہارے انتظار میں ہوگی اور اگر اس دعوت کو رد کر دو گے تو عین ممکن ہے کہ انکار کر دینے والی قوموں پر جس طرح عذاب آتا رہا ہے تم پر بھی وہ عذاب آ جائے ورنہ قیامت کا آنا تو بہر حال یقینی ہے اور اس دن تمہیں جواب دینا پڑے گا کہ تم نے اس دعوت کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ چنانچہ یہی بات اگلی آیت کریمہ میں فرمائی جا رہی ہے۔

آیت: ۱۳۴ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ O ''اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ آ کے رہے گی اور

Marfat.com

تم ہمارے قابو سے باہر نہیں جاسکتے''۔

اللہ نے جس کا وعدہ کیا ہے وہ آ کر رہے گی اور کوئی اللہ کے قابو سے باہر نہیں ہوگا:

رسول اللہ ﷺ اہل مکہ کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے جہاں دعوت کی افادیت' اہمیت اور اس کی ضرورت پر گفتگو فرماتے وہاں دو باتوں کا تذکرہ بھی ہوتا۔ ایک تو یہ بات کہ تمہارے گردوپیش میں ان قوموں کے کھنڈرات موجود ہیں اور تم اپنے تجارتی اسفار میں ان کھنڈرات گزرتے بھی ہو جنہوں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت کو قبول نہ کیا اور بالآخر عذاب کا شکار ہوگئیں۔ تم نے بھی اگر آج اس دعوت کو قبول نہ کیا اور اپنے رویے کو نہ بدلا تو ایسا ہی عذاب تم پر بھی آسکتا ہے اور دوسری یہ بات کہ تمہیں یہاں ہمیشہ تو زندہ نہیں رہنا ہر مرنے والے کی طرح تمہیں بھی مرنا ہے اور تم غلط سمجھتے ہو کہ موت کے ساتھ تم ہمیشہ کیلئے فنا ہو جاؤ گے تمہیں یقین رکھنا چاہئے کہ ایک دن جسے قیامت کہتے ہیں سب انسانوں کو زندہ کر کے اٹھایا جائے باقی انسانوں کے ساتھ تم بھی محشر میں جمع کیے جاؤ گے۔ اللہ کے سامنے حاضری ہوگی وہاں تمہیں اس بات کا جواب دینا پڑے گا کہ تم نے اسلام کو قبول کرنے سے کیوں انکار کیا؟ کہا یہ دونوں باتیں ہو کے رہیں گی۔ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اللہ کا عذاب بھی آسکتا ہے اور قیامت تو بہرصورت اپنے وقت پر آئے گی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھو کہ اگر اس کا عذاب آ گیا تو تمہیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ تم اس عذاب کی گرفت سے بچ نکلو گے قیامت کے دن تمہارے شریک تمہیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے۔ اس کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ معجزین کا ایک معنی تو یہ ہے کہ تم اس کو پکڑنے سے اور عذاب دینے سے عاجز کرنے والے نہیں ہو اور دوسرا معنی اس کا یہ ہوتا ہے کہ تم ایسے نہیں ہو کہ اللہ تمہیں پکڑے اور تم اس کے قبضے سے نکل جاؤ وہ تم پر قابو نہ پا سکے۔ تم جواب تک اس کی گرفت سے بچے ہوئے ہو تو یہ محض اس کی رحمت کا ظہور ہے کہ اس نے تمہیں ڈھیل دے رکھی ہے لیکن جب گرفت کرنا چاہے گا تو پھر اس کی گرفت سے تم نہیں بچ سکتے۔ مصر کے فراعنہ' عراق کے نماردہ اور اسی طرح اور بڑے بڑے طاقت و جبروت کے پیکروں کی تاریخ تمہارے سامنے ہے وہ جب اللہ کی گرفت میں آئے تو پھر ان کی طاقت و حشمت انہیں نہ بچا سکی وہ تاریخ میں آج عبرت کے طور پر یاد کیے رہے ہیں۔ تم ان کے مقابلے میں کسی بھی حیثیت کے مالک نہیں ہو اس لئے جب پروردگار تمہیں پکڑنا چاہے گا تو تم اس کی پکڑ سے کس طرح بچ سکو گے۔

ان آیات پر غور کیجئے تبلیغ و دعوت کے حوالے سے اور افہام و تفہیم کی رُو سے کوئی پہلو ایسا باقی نہیں رہ گیا جس کے حوالے سے مشرکینِ مکہ کو سمجھانے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ ترغیب اور ترہیب کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہ گیا جسے چھیڑا نہ گیا ہو استدلال کا کوئی پہلو ایسا نہیں بچا جس سے دماغوں کو ہموار کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ اب اس کے بعد ایک ہی بات باقی رہ جاتی ہے جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے۔

آیت: ۱۳۵ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ''کہہ دو اے میرے ہم قوموا تم اپنے طریقے پر چلو میں اپنے طریقے پر چلتا ہوں۔ تم جلد جان لو گے کہ انجام کار کی کامیابی کس کا حصہ ہے۔ یقیناً ظالم فلاح پانے والے نہیں ہو سکتے''۔

رسول اللہ ﷺ کو فرمایا جا رہا ہے کہ کفار کو کہہ دیں تم اپنے طریقے پر چلو میں اپنے طریقے پر چلتا ہوں:

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم نے اگر میری دعوت کو قبول نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور میری کوئی دلیل تم پر اثر انداز نہیں ہو رہی اور تمہارے دل پتھروں سے بڑھ کر سخت ہو گئے ہیں اور تم نے انسانیت سے بالکل ناطہ توڑ لیا ہے اور ترغیب اور ترہیب کا کوئی لہجہ تم پر اثر انداز نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب

Marfat.com

ہے کہ تبلیغ ودعوت کا معاملہ اپنی انتہاء کو پہنچ گیا' کیونکہ کاوشیں مکمل ہو گئیں' انکار کی روش بھی مکمل ہو گئی یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں اتمام حجت کا اعلان ہو جاتا ہے۔ یہاں آنحضرت ﷺ سے اتمام حجت کرایا جا رہا ہے کہ تم نے اگر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تم کسی قیمت پر میری دعوت پر کان نہیں دھرو گے تو پھر میں آخری بات کہے دیتا ہوں

تم اپنی خُو نہ بدلو گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں　　سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے تم خفا کیوں ہو

کہ تم اپنے انکار پر قائم رہو اور اپنی اذیت رسانی کے عمل کو جاری رکھو لیکن میں اپنے کام سے نہیں رک سکتا میں تمہاری اذیتوں کے مقابلے میں بھی تمہیں اللہ کے دین کی دعوت دیتا رہوں گا' البتہ یہ ضرور ہے کہ تمہیں اگر یہ قبول نہیں تو تم مجھے یہ کام دوسروں میں کرنے دو۔ لیکن یہ کام بہر حال ہوگا کیونکہ تم اگر اپنی جفائیں نہیں چھوڑ سکتے تو میں اپنی وفائیں کیسے چھوڑ دوں۔ مریض اگر کھانا پینا بالکل چھوڑ دے تو تیماردار آخری دم تک مریض کو کھلانے کی کوشش جاری رکھتا ہے۔ یہ کفر اور شرک کے مریض جب تک آخری ہچکی نہیں لے لیتے پیغمبر اپنے کام سے کبھی فارغ نہیں ہوتا۔ جب تک اسے ہجرت کا حکم نہیں ملتا وہ آخری لمحے تک اپنے کام کو جاری رکھتا ہے اس کا طرز عمل کچھ اس طرح کا ہوتا ہے

جفا سے ہٹو تم وفا سے ٹلوں میں　　نہ یہ بات ہو گی نہ وہ بات ہو گی

البتہ! ایک بات یاد رکھو کہ یہ بات میں تمہیں برملا بتائے دیتا ہوں کہ آج تم بے شک میری دعوت کو قبول نہ کرو لیکن تم عنقریب دیکھ لو گے کہ اچھا انجام کس کو ملتا ہے اور کون برے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

یہاں عَـاقِبَةُ الدَّارِ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یوں تو عاقبت کا معنی صرف انجام ہوتا ہے خواہ نیک انجام ہو یا بد لیکن بعض اوقات یہ مخصوص طور پر خیر وفلاح کے انجام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ قابل ذکر انجام تو وہی ہے جو اس فلاح وسعادت کا حامل ہو کیونکہ یہ فلاح وسعادت ہی کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد ہے نامرادی اور خسران کا انجام وہ تو اس مقصد سے انحراف کا لازمہ ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہ لفظ اسی خیر وفلاح کے انجام کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ مشرکینِ مکہ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہیں عنقریب اندازہ ہو جائے گا کہ یہ خیر وفلاح کس کا مقدر بنتی ہے تم بظاہر دنیا کی خوش عیشیوں میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو کامیاب وکامران سمجھتے ہو لیکن تمہیں اندازہ نہیں کہ تم ہلاکت اور بربادی کے انجام کی طرف بڑھ رہے ہو اور مسلمان جو تمہاری اذیتوں کی وجہ سے زار و نزار ہیں تمہیں معلوم نہیں کہ وہ ایک روشن مستقبل کو سامنے پا رہے ہیں جو عنقریب ان کے انتظار میں ہے اور یہ روشن مستقبل اور یہ خوبصورت انجام دو صورتوں میں ان کا استقبال کرے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ آخرت میں تو بالکل واضح ہے کہ آخرت کی کامیابیاں تو یقیناً اہل ایمان کا حصہ ہیں۔ جہاں تک دنیا کی فلاح وکامرانی کا تعلق ہے اس لفظ میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے اسی وجہ سے الدار کو بغیر صفت کے لایا گیا ہے اگر اس سے مراد صرف دار آخرت ہوتا تو پھر الدار الاخرۃ آتا۔ یہاں صرف الدار لا کر اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دار دنیا اور دار آخرت دونوں ہیں اس لحاظ سے یہ ایک پیش گوئی بھی ہے اور ایسے وقت میں کی جا رہی ہے جب کہ اسلامی دعوت کے پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کے امکانات روز بروز مسدود ہوتے جا رہے تھے اور دشمن یہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ یہ نوزائدہ تحریک چند دنوں تک خود اپنی موت آپ مر جائے گی۔ لیکن یہاں پیش گوئی فرمائی جا رہی ہے کہ اے مشرکین مکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اسلامی دعوت کا انجام کیا ہوتا ہے اور تمہاری اس ہٹ دھرمی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہجرت کے سات سال بعد ہی اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا کہ وہ لوگ جو اسلام کا نام سننے کے روادار نہیں تھے اور جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے قتل کے منصوبے بنائے تھے ان میں بڑے بڑے سردار تو جنگ بدر میں قتل کر دیئے گئے اور جو باقی بچے وہ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت

Marfat.com

کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے معافی کے طلبگار تھے اور وہ نہایت لجاجت سے حضور ﷺ سے اپنی جان بخشی کی درخواست کر رہے تھے اس سے انہوں نے بھی اور ساری دنیا نے اس پیش گوئی کی صداقت پورے ہوتے دیکھی کہ کفر کی قسمت میں سوائے ذلت وندامت کے اور کچھ نہ آیا اور مسلمانوں کو اللہ نے اپنی پیش گوئی کے مطابق ایک روشن اور کامیاب مستقبل سے نوازا اور یہ جو بظاہر کفار مکہ کو زندگی ملی اور پھر وہ اسلام کی دولت سے مشرف ہوئے یہ بھی اس لئے ہوا کہ مکے میں ہجرت کے بعد بھی اسلام کی قبولیت کا سلسلہ رکا نہیں۔ اندر ہی اندر تبلیغ ودعوت کا یہ سلسلہ جاری رہا اور فرداً فرداً لوگ اسلام قبول کرتے رہے اگر یہ لوگ کہیں بالکل اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیتے تو اللہ کی سنت کے مطابق آنحضرت کی ہجرت کے بعد اللہ کا عذاب ان پر نازل ہو جاتا۔ البتہ جن لوگوں کو بالکل اسلام قبول نہ کرنا تھا وہ جنگ بدر اور اس کے بعد کی جنگوں میں اللہ کے عذاب کا شکار ہو کر جہنم واصل ہوئے یہ جو میں نے عرض کیا کہ یہ لوگ اس لئے اجتماعی عذاب سے بچ گئے کہ ان میں قبولیت ایمان کا سلسلہ دھیرے دھیرے جاری رہا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ واقعہ حدیبیہ کے موقع پر جس طرح کی صورت حال پیدا ہوئی اس میں صاف نظر آ رہا تھا کہ اب مسلمانوں اور قریش مکہ میں تصادم ہوا ہی چاہتا ہے لیکن اللہ نے محض اپنے فضل وکرم سے اس تصادم سے جانبین کو محفوظ رکھا اور اس کی وجہ قرآن کریم میں یہ بیان فرمائی گئی کہ مکہ معظمہ میں ایک معتد بہ تعداد نو مسلم لوگوں کی تھی جن سے مسلمان بالکل ناواقف تھے اگر یہ تصادم ہو جاتا تو ممکن تھا کہ خود یہ نو مسلم مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مارے جاتے۔ اللہ کو یہ بات منظور تھی کہ ان کی زندگی بچائی جائے اور ان سے اللہ کے دین کی سربلندی میں کام لیا جائے۔ چنانچہ حدیبیہ کے ایک ہی سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ سے جو لوگ چھپتے چھپاتے ساحل سمندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ان کی تعداد ستر (۷۰) کے قریب تھی اور جو لوگ نہ نکل سکے اور فتح مکہ کے بعد مسلمانوں میں شامل ہو سکے ان کی تعداد ان سے بھی زیادہ تھی۔ یہی وہ قبولیت ایمان کا سلسلہ تھا جس نے اہل مکہ کو اجتماعی عذاب سے محفوظ رکھا۔ چنانچہ یہاں آخرت کی کامیابی کے ساتھ ساتھ اسی کامیابی کی پیش گوئی کی گئی ہے جو چند ہی سالوں میں حرف بحرف پوری ہوئی۔

اس آیت کریمہ کے آخری جملے میں اس پوری صورتحال کو سمیٹتے ہوئے ایک اصولی بات فرمائی گئی کہ تم بھی اور قیامت تک آنے والے انسان بھی اس بات کو یاد رکھیں کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ یہاں فلاح وکامرانی ظالموں کو کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ اگر ظالم کہیں بظاہر کامیاب دکھائی دیتے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ جسے کامیابی سمجھا جاتا ہے وہ کامیابی کی صورت ہوتی ہے حقیقت نہیں اور دوسری یہ بات کہ ظالموں کو کامیابی اس وقت ملتی ہے جب مظلوم اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اللہ سے مدد مانگتے ہوئے ظالم کے مقابلے میں اٹھنے سے کمزوری کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں چونکہ ظالم کے سامنے کوئی مقابل قوت نہیں ہوتی تو ایک مخصوص وقت کیلئے قدرت ایسے ظالموں کو من مانی کرنے کیلئے چھٹی دے دیتی ہے اور ان سے ان مظلوموں کو سزا دلوانے کو کام لیتی ہے جو ان ظالموں کے خلاف جدوجہد سے انکار کرتے یا تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے کہ قدرت کا یہ بھی قانون ہے کہ وہ ظالموں سے ظالموں کو سزا دلواتا ہے اور جس طرح ایک ڈاکٹر نشتر سے ناسور زدہ حصے کو کاٹنے کا کام لیتا ہے اسی طرح ان ظالموں کو بھی تقدیر کے نشتر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن اصول اپنی جگہ ہے کہ اللہ ظالموں کو کبھی کامیابی عطا نہیں فرماتا۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ ظالموں سے کیا مراد ہے ہم پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ ظلم شرک کا دوسرا نام ہے کائنات میں چونکہ اللہ کا تکوینی نظام کارفرما ہے اور یہاں کی ہر چیز اس کی حاکمیت کی پابند ہے۔ چھوٹے بڑے کرے اسی کے حکم کے تحت محو گردش ہیں۔ اس کا ایک قطعی قانون ہے جس کے مطابق پوری کائنات محو سفر ہے اور اسی میں اس کائنات کی زندگی کا راز مضمر ہے۔ جس دن سورج اپنا اصل فرض انجام دینے سے قاصر رہے گا تو وہ بجھ کے رہ جائے گا جو کرہ اپنے مدار سے نکل جائے گا وہ ٹوٹ کر تباہ ہو جائے گا' جو درخت اپنی جڑوں سے اکھڑ جاتا ہے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی زندگی اللہ کے اس قانون کی پابندی میں ہے۔ جس قانون کا اسے پابند بنایا گیا ہے۔ اسی طرح انسان بھی ایک تکوینی قانون کے

Marfat.com

ساتھ ساتھ تشریعی قانون کا پابند بنایا گیا ہے۔ اسی کیلئے اللہ نے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں اتاری ہیں اور اسی قانون کی پابندی اور اس کے مطابق عمل کرنے میں اس کی فلاح وکامرانی کا راز مضمر ہے اور یہ بتادیا گیا ہے کہ جس طرح پوری کائنات اللہ کی اطاعت میں زندگی گزار رہی ہے اور جس سمت میں اس کا سفر جاری ہے تم بھی اپنی زندگی کا سفر اگر تشریعی نظام کی اطاعت کرتے ہوئے اسی سمت میں جاری رکھو گے تو کامیابی اور کامرانی تمہارا نصیب ہوگی لیکن اگر تم اس کی الٹی سمت چلنے کی کوشش کرو گے تو تباہ وبرباد ہوجاؤ گے اور یہ الٹی سمت سفر کرنے کو ہی کفر اور شرک کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور انسانوں پر انسان جو ظلم توڑتے ہیں وہ بھی اس وقت ممکن ہوتا ہے جب انسان اس نظام شریعت سے باغی ہوجاتے ہیں۔ اسی سے آج کی امت مسلمہ کی نامرادی اور بدنصیبی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ آج امت مسلمہ جس طرح قدم قدم پر ناکامیوں اور نامرادیوں سے دوچار ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نے اجتماعی ظلم کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس نے ہر قدم پر کفر اور شرک کا ارتکاب کیا ہے۔ اللہ کے دین اور اس کے احکام کو ماننے سے انکار کرنا یہ کفر ہے اور اللہ کے احکام اور اسکے قانون میں کسی دوسرے قانون کو شریک کرنا اللہ کی کبریائی اور حاکمیت میں کسی دوسرے کی حاکمیت کو دخیل کرنا یہ شرک ہے اور پوری امت مسلمہ آج اس کفر اور شرک کا ارتکاب کررہی ہے۔ اللہ کا وہ قانون جو قرآن وسنت کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے تمام ممالک اسلامیہ میں کہیں بھی پوری طرح نافذ نہیں۔ سعودی عرب میں حدود اللہ نافذ ہیں پورا دین نہیں اور باقی کسی ملک میں حدود اللہ بھی نافذ نہیں۔ ہم یا تو اسے قبول کرنے سے انکار کرچکے اور یا ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ ہم مسجد میں جاکر اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور مسجد سے باہر نکل کر باقی تمام شعبہ ہائے زندگی میں دوسرے قوانین کی پیروی کرتے ہیں اور اللہ کے قانون کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ آپ خود اندازہ فرمالیجئے کہ اس صورت حال کو کفر اور شرک کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے اور یہی وہ ظلم ہے جس کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے۔

اگلی آیات کریمہ میں مشرکین عرب کے اس ظلم یعنی شرک کی تفصیل بیان کی جارہی ہے دورِ جاہلیت میں جس پر یہ لوگ عامل تھے اللہ کے ساتھ ان کا شرک مختلف انواع پر مشتمل تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ شرک کی ایسی کوئی قسم باقی نہیں رہ گئی تھی جس کا یہ لوگ ارتکاب نہیں کرتے تھے اور ویسے بھی دیکھا جائے تو جس طرح دنیا بھر کے موحدین اپنے نظریہ توحید میں موافقت اور مماثلت رکھتے ہیں اسی طرح مشرکین میں بھی بہت حد تک دنیا بھر میں توافق پایا جاتا ہے کسی بھی علاقہ کے مشرکین کو دیکھ لیجئے شرک کے اظہار کی صورتوں میں تھوڑا بہت اختلاف آپ کو ملے گا لیکن بنیادی مشرکانہ تصورات میں آپ کو مکمل موافقت نظر آئے گی چنانچہ ان آیات میں ان کے شرک کی تمام تفصیلات کو ذکر کرنا ممکن نہیں البتہ اس کی اہم تر صورتوں کو ذکر کردیا گیا ہے اور اسی پر باقی کو قیاس کیا جاسکتا ہے ارشاد خداوندی ہے:

آیت:۱۳۶ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ج فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ج وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ط سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ O ''ان لوگوں نے اللہ کیلئے خود اسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کیلئے ہے' ان کے گمان کے مطابق اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کیلئے ہے۔ پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کیلئے ہے' وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا۔ مگر جو اللہ کیلئے ہے' وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ''۔

مشرکین اللہ کے لئے الگ حصہ نکالتے اور اپنے معبودوں کے لئے الگ حصہ نکالتے:

اس آیت کریمہ میں ان کے شرک کی تین جہتوں کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تردید بھی

Marfat.com

فرمائی گئی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ انہوں نے کھیتیوں اور مویشیوں میں سے دو حصے مقرر کر رکھے ہیں ایک اللہ کیلئے اور ایک ان دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جنات اور آسمانی ستاروں اور بزرگان سلف کی ارواح کیلئے جن کے بارے میں ان کا گمان ہے کہ وہ ان پر نظر کرم رکھتے ہیں اور انہی کے واسطے سے اللہ کی نعمتیں اور اس کی عنایات انہیں میسر آتی ہیں اور دوسرا حصہ خود اللہ تعالیٰ کیلئے جو کہ تمام نعمتوں کا خالق ہے اور اسی نے اپنے بندوں کو یہ سب کچھ عطا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر گرفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ یہ سارے مویشی اللہ ہی کے پیدا کردہ ہیں اور اسی کی مہربانیوں سے تمہیں میسر آئے ہیں تو پھر تم کس حق کے تحت دوسروں کیلئے حصہ مقرر کرتے ہو؟ اور کس حوالے سے ان کو نذر و نیاز پیش کرتے ہو؟ یہ نمک حرامی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اپنے محسن کے احسان کو جو اس نے سراسر خود اپنے فضل و کرم سے تم پر کیا ہے دوسروں کی مداخلت اور ان کے توسط کا نتیجہ قرار دیتے ہو اور شکریہ کے استحقاق میں انہیں اس کے ساتھ شریک کرتے ہو اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ یہ جو اللہ کا حصہ تم نے مقرر کیا ہے یہ تم نے اپنے گمان اور اپنے ارادے سے کیا ہے اور تم خود اپنے قانون ساز بن بیٹھے ہو کہ تم جو حصہ چاہتے ہو اللہ کیلئے مقرر کر دیتے ہو اور جو حصہ چاہتے ہو دوسروں کیلئے طے کر دیتے ہو حالانکہ اپنی بخشش کا اصل مالک و مختار خود اللہ ہے اور یہ بات اسی کی شریعت کے مطابق طے ہونی چاہئے کہ اس بخشش میں سے کتنا حصہ اس کے شکریہ کیلئے نکالا جائے اور باقی میں کون کون حق دار ہے یعنی تم دو طرح کے شرک کا ارتکاب کر رہے ہو ایک تو یہ کہ اللہ کی پیدا کردہ نعمتوں میں تم نے بغیر کسی اختیار کے حق تصرف استعمال کیا اور دوسری یہ بات کہ تم نے بغیر کسی حق کے قانون سازی کا حق بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔

کفار اللہ کی پرواہ کئے بغیر اپنے شرکاء کا حصہ بڑھا دیتے:

حالانکہ عقل کی بات یہ ہے کہ جو کسی نعمت کا مالک ہے وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس میں تصرف کرے اور پھر اس میں حصے مقرر کرنا اور کسی کو دینا یا نہ دینا اس کا تعلق سراسر قانون سازی سے ہے اس کا حق بھی اسی کو پہنچتا ہے جو اس نعمت کا مالک ہے تو تم نے یہ دونوں حقوق آخر کس اختیار سے حاصل کئے۔ جبکہ ان نعمتوں میں سے نہ تم کسی چیز کے خالق ہو اور نہ کسی کے مالک ہو اور تیسری بات جو اور بھی حیران کن ہے وہ یہ ہے کہ تم حقوق کے تعین اور حقوق کی ادائیگی میں اپنے شرکاء کو اللہ پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ خالق و مالک تو صرف اللہ ہے اور جنہیں اس تخلیق اور ملکیت میں کوئی دخل نہیں تم نے انہیں اللہ پر فوقیت دے کر ان کے مرتبے کو بڑھایا اور اللہ کے مرتبے کو گھٹا کر اللہ کی توہین کی مشرکین مکہ کا طریقہ یہ تھا کہ جو حصہ وہ خدا کے نام پر نکالتے تھے اس میں طرح طرح کی چالبازیاں کر کے کمی کرتے رہتے تھے اور ہر صورت سے اپنے خود ساختہ شریکوں کا حصہ بڑھانے کی کوشش کرتے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جو دلچسپی انہیں اپنے شریکوں سے ہے وہ خدا سے نہیں۔ ان کے اس طرز عمل کی دو وجوہ معلوم ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مشرکین جن کو خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے ان کے بارے میں ان کا خیال یہ ہوتا کہ ان کی تمام نقد ضروریات انہی سے وابستہ ہیں اور اگر خدا سے کوئی ضرورت وابستہ ہے بھی تو بہر حال وہ بھی انہی کی وساطت سے پوری ہوتی ہے یہاں تک کہ اگر خدا نہ بھی پوری کرنی چاہے جب بھی اگر یہ شرکاء چاہیں تو کسی نہ کسی طریقے سے پوری کرا ہی لیتے ہیں۔ ایسے تصورات کی موجودگی میں خدا کی حیثیت نعوذ باللہ من ذالک گھر کے ایک بڑے بوڑھے ناکارہ وجود کی سی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ مشرکین اسی حیثیت سے اسکے ساتھ معاملہ کرتے تھے۔ اس کے نام پر روایت کے تحت کچھ نکال تو دیتے لیکن اگر اتفاق سے کسی بت کے نام کی بکری مر گئی یا چوری ہو گئی اس کے نام کا غلہ چوہے کھا گئے تو اس کی تلافی لازماً خدا کے حصے میں سے کر دی جاتی اور اگر یہ کسی قسم کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصہ پر آجاتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی تلافی فرعومہ معبودوں کے حصے کے مال سے کرنے کی جرأت کریں۔ فرمایا کہ کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔ اول تو سب کچھ بخشا ہوا خدا کا اور اس کے حصہ میں یہ من مانا بٹوارا اور پھر فرضی معبودوں کی یہ ناز برداری اور معبود حقیقی سے یہ لاپرواہی اور اس کی یہ ناقدری۔

Marfat.com

دوسری وجہ ان توہمات کی یہ تھی کہ جہلاء عرب اپنے مال میں سے جو حصہ خدا کیلئے نکالتے تھے وہ فقیروں' مسکینوں' مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مد میں صرف کیا جاتا تھا اور جو حصہ شریکوں کی نذر و نیاز کیلئے نکالتے تھے وہ یا تو براہ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاووں کی صورت میں پیش کیا جاتا تھا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پجاریوں تک پہنچ جاتا تھا اسلئے ان خود غرض مذہبی پیشواؤں نے صدیوں کی مسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ خدا کے حصہ میں کمی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن خدا کے پیاروں کے حصہ میں کمی نہ ہونی چاہئے بلکہ حتی الامکان کچھ بیشی ہی ہوتی رہے تو بہتر ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں شرک کے دوررس اثرات میں سے ایک نہایت خطرناک صورت کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۱۳۷ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ O ''اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کیلئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے۔ تا کہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے۔ لہٰذا انہیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں''۔

مشرکین کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا:

مشرکین عرب کی جہالت نے ان کے مشرکانہ اثرات کو صرف ان کے مالوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کی جانیں بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہیں بہت سے مشرکین اپنے نام نہاد شریکوں کی خوشنودی کیلئے اپنی اولاد بھی ان کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ ان کے کاہنوں نے ان کو یہ بات سمجھائی تھی کہ بعض ایسے سرکش جن بھی ہیں جو تمہاری آبادیوں پر مسلط ہیں۔ اگر تم نے اپنی اولاد کی قربانی دے کر ان کی خوشنودی حاصل نہ کی تو وہ تمہیں اور تمہارے خاندان کو تباہ کر دیں گے۔ چنانچہ ان کی خوشنودی کے حصول کیلئے بعض جہلا اپنے بچوں کو ان کے نام پر قربان کرتے تھے اور یہ جہالت مشرکین عرب یا مشرکین مکہ تک محدود نہ تھی بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں تاریخ ہمیں اس کے شواہد دکھاتی ہے اور ہمارے قریبی ملک ہندوستان میں تو آج بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں اور یہ شاید انہی خیالات کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمانوں میں بھی کہیں نہ کہیں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ البتہ اس آیت کریمہ میں تین باتیں قابل توجہ ہیں۔ 1- شُرَكَآؤُهُمْ کا لفظ 2- لِيُرْدُوْهُمْ اور 3- وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ۔

جہاں تک شُرَكَآؤُهُمْ کا تعلق ہے یہاں یہ ایک دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے جو پہلے استعمال سے مختلف ہے۔ سابقہ آیت میں جنہیں شریک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے وہ ان کے معبود ہیں جن کی برکت یا سفارش یا توسط کو یہ لوگ نعمت کے حصول میں مددگار سمجھتے تھے اور شکر نعمت کے استحقاق میں انہیں خدا کے ساتھ حصہ دار بناتے تھے۔ لیکن اس آیت میں شریک سے مراد وہ انسان اور شیطان ہیں جنہوں نے قتل اولاد کو ان لوگوں کی نگاہ میں ایک جائز اور پسندیدہ فعل بنا دیا تھا انہیں شریک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے جس طرح پرستش کا مستحق تنہا اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح بندوں کیلئے قانون بنانے اور جائز اور ناجائز کی حدیں مقرر کرنے کا حقدار بھی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا جس طرح کسی دوسرے کے آگے پرستش کے افعال میں سے کوئی فعل کرنا اسے اللہ کا شریک بنانے کا ہم معنی ہے اسی طرح کسی کے خود ساختہ قانون کو برحق سمجھتے ہوئے اس کی پابندی کرنا اور اس کے مقرر کئے ہوئے حدود کو واجب الاطاعت ماننا بھی اسے خدائی میں اللہ کا شریک قرار دینے کا ہم معنی ہے۔ یہ دونوں افعال بہرحال شرک ہیں۔ خواہ ان کا مرتکب ان ہستیوں کو زبان سے الٰہ اور رب کہے یا نہ کہے۔ جن کے آگے وہ نذر و نیاز پیش کرتا ہے یا جن کے مقرر کئے ہوئے قانون کو واجب الاطاعت مانتا ہے۔

لِيُرْدُوْهُمْ کا معنی ہے تاکہ وہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کر دیں۔ اس سے مراد اخلاقی ہلاکت بھی ہے کہ جو انسان سنگدلی اور شقاوت کی اس حد کو

Marfat.com

پہنچ جائے کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے لگے۔ اس میں جوہر انسانیت تو در کنار جوہر حیوانیت تک باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح اس سے مراد بچوں کا تنگدستی کے خوف سے یا آبادی کے بڑھ جانے کے خوف سے ہلاک کرنا بھی ہے جس کے نتیجے میں ایک وقت آتا ہے کہ پوری قوم ہلاکت کے دہانے پر پہنچ جاتی ہے کیونکہ جو قوم اپنے حامیوں اور اپنے تمدن کے کارکنوں اور اپنے میراث کے وارثوں کو پیدا نہیں ہونے دیتی یا پیدا ہوتے ہی خود اپنے ہاتھوں انہیں ختم کر ڈالتی ہے وہ بالآخر تباہی کا شکار ہو جاتی ہے۔ میں محض بات سمجھانے کیلئے کہتا ہوں کہ آج ہماری آبادی چودہ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور جس مکار دشمن سے ہمیں واسطہ ہے اس کی آبادی (۸۰) کروڑ سے متجاوز ہے اور یہ بات کہنے کیلئے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں کہ اگر ہمیں آبرومندانہ زندگی گزارنی ہے تو ایک نہ ایک دن اس دشمن سے ہمیں فیصلہ کن جنگ لڑنا پڑے گی کیونکہ ایک فوجی شکست ہی ہندوستان کو راہ راست دکھا سکتی ہے وہ ایک بھیڑیا ہے جسے بکریوں جیسی منطق سے مرعوب نہیں کیا جا سکتا۔ اسے اپنی رائے بدلنے کیلئے شیر کا فولادی پنجہ دکھانے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کیا یہ بات قرین عقل ہو گی کہ چودہ کروڑ آبادی رکھنے والا ملک (۸۰) کروڑ کے مقابلے میں اپنی آبادی کو کم رکھنے یا کم کرنے کے بارے میں سوچے۔ اسے آسان سے آسان لفظوں میں خودکشی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ہمارے وسائل کم ہیں تو اس کیلئے صرف یہ گزارش ہے کہ بھٹو صاحب کے زمانے کی ڈرلنگ رپورٹ اگر دیکھ لی جائے تو اس کا جواب آسانی سے مل جائے گا۔

وَ لِيَلۡبِسُوۡا عَلَيۡهِمۡ دِيۡنَهُمۡ اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔ شرک کا لازمی نتیجہ دین میں اشتباہ پیدا ہونا ہے کیونکہ جب اصل ماخذ محفوظ نہ رہے اور آئے دن نئی نئی مشرکانہ باتیں اور نئی نئی بدعات پیدا ہوتی رہیں تو پھر دین کا اشتباہ سے محفوظ رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مشرکین عرب کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہا السلام کی جس شریعت کے وہ وارث تھے وہ ان کے مشرکانہ تصورات کی ایسی نذر ہوئی کہ اس کی کوئی چیز بھی اپنی اصل جگہ باقی نہ رہی نتیجتاً ان کا پورا دین مشتبہ ہو کر رہ گیا۔

اس آیت کریمہ کے آخری جملہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اگر یہ لوگ اپنا رویہ نہیں بدلتے اور اسلام کو قبول نہیں کرتے تو آپ کو اس پر فکرمند نہیں ہونا چاہئے کیونکہ پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ کی مشیت میں کفر اور اسلام' اچھائی اور برائی دونوں کیلئے امکانات کھلے رکھے ہیں۔ جو شخص جس راہ پر جانا چاہتا ہے اسے جانے کا موقع میسر ہے البتہ قیامت میں سب کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اگلی تین آیات کریمہ میں ان کی خود ساختہ شریعت جسکا دارومدار سراسر ان کے علماء اور ان کے کاہنوں کے فتاویٰ اور خیالات پر تھا اسکا ذکر فرمایا گیا ہے اور پھر ان کی نامرادی پر تاسف کا اظہار کیا گیا ہے کہ اللہ کے آخری رسول کے آ جانے کے بعد بھی وہ لوگ راہ راست کو اختیار نہ کر سکے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰ وَقَالُوۡا هٰذِهٖۤ اَنۡعَامٌ وَّ حَرۡثٌ حِجۡرٌ ۖ لَّا يَطۡعَمُهَاۤ اِلَّا مَنۡ نَّشَآءُ بِزَعۡمِهِمۡ وَ اَنۡعَامٌ حُرِّمَتۡ ظُهُوۡرُهَا وَ اَنۡعَامٌ لَّا يَذۡكُرُوۡنَ اسۡمَ اللّٰهِ عَلَيۡهَا افۡتِرَآءً عَلَيۡهِ ؕ سَيَجۡزِيۡهِمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ۝ وَ قَالُوۡا مَا فِىۡ بُطُوۡنِ هٰذِهِ الۡاَنۡعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوۡرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزۡوَاجِنَا ۚ وَاِنۡ يَّكُنۡ مَّيۡتَةً فَهُمۡ فِيۡهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجۡزِيۡهِمۡ وَصۡفَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ حَكِيۡمٌ عَلِيۡمٌ ۝ قَدۡ خَسِرَ الَّذِيۡنَ قَتَلُوۡۤا اَوۡلَادَهُمۡ سَفَهًۢا بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّ حَرَّمُوۡا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افۡتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدۡ ضَلُّوۡا وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ ۝

''اور کہتے ہیں! فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے' ان کو نہیں کھا سکتے' مگر وہی جن کو ہم چاہیں' اپنے گمان کے مطابق اور کچھ چوپائے ہیں' جن کی پیٹھیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اور کچھ چوپائے ہیں' جن پر خدا کا نام نہیں لیتے' محض اللہ پر افترا کے طور پر۔ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کا بدلہ دے گا اور

Marfat.com

کہتے ہیں کہ فلاں قسم کے چوپائیوں کے پیٹ میں جو ہے وہ بس ہمارے مردوں کیلئے خاص ہے اور ہماری عورتوں کیلئے حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ عنقریب اللہ ان کو ان کی اس تشخیص کی سزا دے گا۔ بے شک! وہ حکیم وعلیم ہے۔ وہ لوگ نامراد ہوئے جنہوں نے محض بے وقوفی سے بغیر کسی علم کے اپنی اولاد کو قتل کیا اور اللہ نے انہیں جو روزی بخشی اس کو اللہ پر افترا کر کے حرام ٹھہرایا' یہ گمراہ ہوئے اور ہدایت پانے والے نہ بنے''۔

یہ کسی حد تک تفصیل ہے ان کے پروہتوں' مجاوروں اور کاہنوں کے فتاویٰ کی جو انہوں نے سراسر اپنے نفس سے گھڑے اور ان کا انتساب اللہ کی طرف کیا۔ بعض کھیتیوں اور بعض جانوروں کی نذر مان کر یہ پابندی لگا دیتے تھے کہ اس نذر اور نیاز کو ہر ایک نہیں کھا سکتا بلکہ اس کو وہی کھا سکتا ہے جن کیلئے ان کے پروہتوں نے ان کو جائز قرار دے رکھا ہے۔ اسی طرح بعض جانوروں پر سواری انہوں نے ممنوع قرار دے رکھی تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے وہی جانور تھے جن کو وہ کسی استھان کی نذر کر دیتے تھے اور بعض جانوروں پر اللہ کا نام لینا ناجائز سمجھتے تھے کیونکہ یہ ان کے کسی نہ کسی بت یا کسی شریک کے نام منسوب کیا جا چکا تھا اس لئے اللہ کا اس پر نام لینا کسی طرح وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے یعنی نہ اللہ کے نام سے ان کو وہ ذبح کرنا جائز سمجھتے تھے اور نہ ان پر سوار ہو کر حج کرنا مشروع سمجھتے تھے کیونکہ حج کے دوران جانور پر سوار ہو کر تلبیہ کہنا پڑتا تھا اور اس میں اللہ کا نام آتا تھا اسی طرح یہ نذر کیئے ہوئے جانور اگر حاملہ ہوتے تو جو کچھ ان کے پیٹ میں ہوتا اس کو وہ مردوں کیلئے حلال سمجھتے اور عورتوں کیلئے حرام لیکن اگر وہ زندہ پیدا ہونے کی بجائے مردہ حالت میں پیدا ہوتا تو سب کیلئے حلال سمجھتے تھے۔ یہ ان کی خود ساختہ شریعت تھی جو ان کے مذہبی اجارہ داروں نے اپنے طور سے بنائی تھی اس طرح سے انہوں نے شریعت مقرر کرنے اور قانون سازی کا حق جو سراسر اللہ کی صفت ہے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا اور یہ شرک کی وہ مکروہ ترین شکل تھی جس کا ذکر بار بار قرآن کریم کر رہا ہے آخری آیت میں ازراہ تاسف فرمایا جا رہا ہے کہ اس شرک کے نتیجے میں اللہ نے جو ان کو اولاد بخشی اس کو انہوں نے قتل کیا اور جو ان کو رزق بخشا اس کو انہوں نے اپنے اوپر حرام قرار دے لیا نتیجہ کیا ہوا کہ گمراہ ہوئے اور ساری کوششوں کے باوجود راہ ہدایت نہ پا سکے۔ ان تمام تفصیلات میں امتِ مسلمہ کیلئے ایک سے ایک بڑا درس عبرت ہے کیونکہ ان میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا ارتکاب اس امت کے جہلاء بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ أَنْشَأَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ

اور خدا ہی تو ہے جس نے باغ پیدا کیے چھتریوں پر چڑھائے ہوئے

وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ

بھی اور جو چھتریوں پر نہیں چڑھائے ہوئے وہ بھی اور کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح کے پھل ہوتے ہیں اور زیتون اور

وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ

اور انار جو بعض باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض باتوں میں نہیں ملتے جب یہ چیزیں پھلیں

Marfat.com

اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٤١﴾

تو اُن کے پھل کھاؤ اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو اور بیجا نہ اُڑانا۔ کہ خدا بے جا

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا

اُڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور چارپایوں میں بوجھ اُٹھانے والے (یعنی بڑے بڑے بھی) پیدا کیے اور زمین سے لگے ہوئے

تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٤٢﴾ ثَمٰنِيَةَ

(یعنی چھوٹے چھوٹے بھی)۔ (پس) خدا کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔ وہ تمہارا صریح دشمن ہے (یہ بڑے

اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ

چھوٹے چارپائے) آٹھ قسم کے (ہیں) (دو دو) بھیڑوں میں سے اور دو (دو) بکریوں میں سے (یعنی ایک ایک نر اور ایک ایک

حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ

مادہ) (اے پیغمبر ان سے) پوچھو کہ (خدا نے) دونوں (کے) نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں (کی) مادینوں کو یا جو بچہ مادینوں کے پیٹ

بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٤٣﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ

میں لپٹ رہا ہو اسے۔ اگر سچے ہو تو مجھے سند سے بتاؤ۔ اور دو (دو) اونٹوں میں سے اور دو (دو) گایوں میں سے (ان کے بارے

اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ

میں بھی) ان سے پوچھو کہ (خدا نے) (دونوں (کے) نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں (کی) مادینوں کو یا جو بچہ مادینوں کے پیٹ

اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ

میں لپٹ رہا ہو اُس کو۔ بھلا جس وقت خدا نے تم کو اس کا حکم دیا تھا تم اس وقت موجود تھے؟ تو اُس شخص سے

اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ

زیادہ کون ظالم ہے جو خدا پر جھوٹ افترا کرے تاکہ ازراہِ بیدانشی لوگوں کو گمراہ کرے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٤﴾ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ

کچھ شک نہیں کہ خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں میں

Marfat.com

إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ إِلَّآ أَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا

اُن میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو یا

مَّسْفُوْحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَإِنَّهٗ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ

بہتا لہو یا سُور کا گوشت کہ یہ سب ناپاک ہیں یا کوئی گناہ کی چیز ہو کہ اُس پر خُدا کے سوا کسی اور کا نام لیا

بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤٥﴾

گیا ہو۔ اور اگر کوئی مجبور ہو جائے لیکن نہ تو نافرمانی کرے اور نہ حد سے باہر نکل جائے تو تمہارا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ

اور یہودیوں پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے۔ اور گایوں اور بکریوں سے اُن کی

حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ أَوِ الْحَوَايَآ أَوْ

چربی حرام کر دی تھی سوا اس کے جو اُن کی پیٹھ پر لگی ہو یا اوجھڑی میں ہو

مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿١٤٦﴾

یا ہڈی میں ملی ہو یہ سزا ہم نے اُن کو اُن کی شرارت کے سبب دی تھی۔ اور ہم تو سچ کہنے والے ہیں۔

فَإِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهٗ عَنِ

اور اگر یہ لوگ تمہاری تکذیب کریں تو کہہ دو تمہارا پروردگار صاحب رحمت وسیع ہے۔ مگر اس کا عذاب گنہگار

الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٤٧﴾

لوگوں سے نہیں ٹلے گا

تمہید:

گزشتہ پانچ آیتوں میں مشرکین عرب نے اللہ کے پیدا کردہ جانوروں اور اس کی نعمتوں میں جس طرح مشرکانہ تصورات اختیار کر لئے تھے اور قدم قدم پر مشرکانہ اعمال کا اتکارب کر رہے تھے' اس کی تفصیل بیان کی گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ان کے مشرکانہ رویہ کا جو نتیجہ دنیا اور آخرت میں نکل سکتا تھا' اس کا ذکر فرمایا گیا تھا۔ اب پیش نظر رکوع میں عقلی اور نقلی انداز میں ان کے مشرکانہ رویہ پر تنقید فرمائی گئی ہے اور نہایت جامع اور مسکت دلائل کے ساتھ ان کے تصورات کی غلطیوں اور ان کے عقائد کی خرابیوں کو واضح فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت: ۱۴۱-۱۴۲ "وَهُوَ الَّذِيْٓ أَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ إِذَآ أَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۡ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ O وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ إِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ O" اور وہی خدا ہے جس نے باغ پیدا کیے کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور کچھ نہیں چڑھائے جاتے اور کھجور اور کھیتی پیدا کی مختلف النوع پیداوار کی اور زیتون اور انار باہم دگر

Marfat.com

ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ان کے پھلوں سے فائدہ اٹھاؤ جب وہ پھلیں اور اس کی کٹائی کے وقت اس کے حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو' اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اس نے چوپایوں میں بڑے قد کے بھی پیدا کیے اور چھوٹے قد کے بھی۔ تو اللہ نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے' اس سے فائدہ اٹھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے''۔

حرام وحلال اور حصے مقرر کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے:

ان آیات کریمہ میں بہت سارے حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن میں سے چند ایک کی طرف ہم ایک ترتیب سے اشارہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ تم نے اللہ کی نعمتوں اور خاص طور پر اس کے پیدا کردہ جانوروں میں اپنی مرضی سے جو قانون سازی کی ہے اور جس طرح حلت وحرمت کا اختیار استعمال کیا ہے کہ جس کو چاہا حلال کر دیا اور جسے چاہا حرام بنا ڈالا اور پھر اس کے کھانے کی اجازت جس کسی کو چاہا دی اور جس کو نہ چاہا نہ دی اور پھر جس طرح تم نے مردوں اور عورتوں کیلئے الگ الگ احکام مخصوص کیے۔ اس قانون سازی سے صاف نظر آتا ہے کہ تمہارے مذہبی رہنماؤں نے گویا یہ سمجھ لیا ہے کہ تمام انسان ان کے محکوم ہیں' وہ ان پر غیر معمولی اختیارات کے مالک ہیں اور انہیں یہ حق حاصل ہے کہ جس کیلئے جو چاہیں حدود مقرر کر دیں اور جس جانور کے بارے میں جیسے چاہیں حلت وحرمت کا اختیار استعمال کریں۔ یہ غیر مشروط قانون سازی اس بات کی غماز ہے کہ وہ اپنے آپ کو مطاع مطلق جانتے ہیں اور انہیں غیر محدود اختیارات حاصل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ حیثیت انہوں نے کس دلیل کی بنیاد پر حاصل کی؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح تم اللہ کی مخلوق ہو' تمہارے مذہبی رہنما بھی اللہ ہی کی مخلوق ہیں اور جنہیں انہوں نے اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں شریک بنا رکھا ہے وہ بھی اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ تو ایک مخلوق کو یہ بات کسی طرح زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی جیسی مخلوق پر غیر مشروط حاکمانہ اقتدار کا دعویٰ کرے اور مطلقاً قانون سازی کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لے اور پھر جو اس قانون کی فرمانبرداری نہ کرے اسے دنیا اور آخرت میں قابل تعزیر ٹھہرائے کیونکہ یہ لامحدود اختیارات تو صرف اسے حاصل ہو سکتے ہیں جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے' جو انسانوں کا خالق ہونے کے ساتھ ساتھ مالک بھی ہے' رازق بھی ہے اور حاکم حقیقی بھی۔ اس لیے چونکہ انسانوں کو پیدا کیا اور انہیں رزق دیتا ہے تو اسے بجا طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مخلوق پر جیسے چاہے احکام نازل کرے اور جس طرح کی پابندیاں مناسب سمجھے لگائے اور جو اس کے احکام کی اطاعت کرے انہیں وہ نیک جزا دے اور جو مخالفت اور نافرمانی کرے اسے سزا دے کیونکہ خالق و مالک ہونے کی حیثیت سے اطاعت صرف اسی کو زیب دیتی یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مشرکین عرب کو یہ بات تسلیم تھی کہ ہمارا پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے اور ہمارے زیر تصرف جتنی بھی نعمتیں ہیں ان سب کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ اس لئے ان کے مسلمہ عقیدے کو بنیاد بنا کر دلیل کی یہ عمارت اٹھائی جا رہی ہے کہ دیکھو! اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے قسم قسم کے باغات پیدا فرمائے اور پھر عربوں میں چونکہ دو قسم کے باغات پائے جاتے تھے' بطور خاص ان کا ذکر فرمایا کہ ایک تو وہ باغات ہیں کہ جن کی بیلوں کو ٹٹیوں پر چڑھایا جاتا ہے یعنی وہ درختوں کی طرح اپنے تنوں پر کھڑے نہیں ہوتے بلکہ وہ بیلوں کی طرح پھیلتے ہیں اور وہ بیلیں بھی ایسی ہیں کہ انہیں زمین پر پھیلایا نہیں جا سکتا کیونکہ ان کو اگر زمین پر کھلا چھوڑ دیا جائے تو نہ انہیں پھل لگتا ہے اور نہ وہ پھول سکتی ہیں بلکہ سڑ جاتی ہیں اور اگر انہیں پھل لگ بھی جائے تو بڑھنے اور پکنے نہیں پاتا۔ اس کی سب سے عمدہ مثال انگور ہے جو عربوں کو بہت مرغوب۔ اس کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی تھیں تب وہ پھل دیتی تھیں اور لذت کام و دہن کا کام دیتی تھیں اور دوسرے باغات ایسی بیلوں پر مشتمل تھے جن کی بیلیں زمین پر کھلی چھوڑ دی جاتی تھیں اور وہ مٹی کی آلودگی کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی تھیں اور اگر انہیں کسی چیز پر چڑھا دیا جائے تو پوری نشو و نما سے محروم ہو جاتیں اول تو ان پر پھل نہ آتا اور اگر آتا بھی تو بڑھنے اور پکنے نہ پاتا۔ اس کی مثال خربوزہ' ککڑی اور تربوز جیسے پھل ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے اپنے کھیتوں

Marfat.com

دیکھنے کے عادی ہیں۔ اس کے بعد ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو پودوں کی طرح اپنے تنوں پر کھڑی ہوتی تھیں اور ان میں سے بعض قد آور درختوں کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ اس کی بہترین مثال کھجور کا درخت ہے اور جو تنے پر کھڑی ہو کر صرف ایک پودا بنتی اور بہار دیتی ہے' اس کی کئی قسمیں ہیں جن میں گندم اور جو زیادہ معروف ہیں۔ ان مختلف قسم کی نعمتوں کا تصور فرمایئے' یہ بیک وقت غذا بھی ہیں اور لذت کام و دہن کا سامان بھی۔ آدمی زندہ رہنے کیلئے غذا کا محتاج ہے اور ذوق کی سیرابی کیلئے پھل کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں جن نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے' وہ ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں بلکہ ان میں بعض نعمتیں تو ایسی ہیں کہ وہ ایک ایک ہو کر بھی دونوں ضرورتوں کیلئے کفایت کرتی ہیں اور عرب چونکہ کھانے پینے کے معاملے میں خوش ذوق ہونے کے ساتھ ساتھ کفایت پسند بھی تھے ان کیلئے اپنی مشکل اور مہماتی زندگی میں ایسی نعمتیں قوت کا سامان تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں کھجور کی نعمت ہے' یہ بیک وقت غذا بھی ہے اور پھل بھی۔ ہم چونکہ اپنی مخصوص عادات کے باعث گندم یا چاول سے ہٹ کر غذائی ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہیں اس لئے ہمارے لئے اس کو سمجھنے میں دشواری پیش آ سکتی ہے۔ لیکن عربوں کی عادت یہی تھی کہ وہ صرف کھجور پر گذارہ کر سکتے تھے۔ اسی سے پیٹ بھرتے اور اسی سے لذت کام و دہن کا کام لیتے اور جنگوں میں ان کے تیز رفتار حملوں کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ انہیں اپنے ساتھ رسد کے طور پر کسی بڑے غذائی ذخیرے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہر سپاہی کھجوروں کا ایک تھیلا اپنے گھوڑے کی پشت یا اپنی پشت پر اٹھا سکتا تھا اور یہی ان کی کئی دنوں کی ضرورت کیلئے کافی ہوتا تھا اور کبھی حملوں میں وقفہ ہوتا تو باربرداری یا سواری کیلئے جو اونٹ ساتھ رکھتے تھے' ان کو ذبح کر کے گوشت کو پر تکلف دعوت کے طور پر استعمال کرتے تھے اور ایک اونٹ سو آدمیوں کی ضرورت کیلئے کافی ہوتا تھا۔

پھلوں کے فوائد

دوسری بات جس کی طرف توجہ فرمائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ ذرا ان نعمتوں کو دیکھو کہ ہم نے کس طرح ان کی پیداوار اور ان کی لذت میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھا ہے۔ ایک ہی زمین ہے اور ایک طرح کے پودے' ایک ہی طرح کی بارش کا پانی انہیں سیراب کرتا ہے' ایک جیسی ہوا ان کو لوریاں دیتی ہے' سورج کی کرنیں یکساں طور پر ان پر برستی ہیں' چاند اپنی حلاوت کے خزانے سب پر لٹاتا ہے۔ بایں! ہمہ ان کی پیداوار اور ان کی لطف و لذت میں کھانے والے فرق محسوس کرتے ہیں۔ آج بھی عرب میں اور عرب سے باہر بھی اگر دیکھا جائے تو یہ بات حقیقت نظر آتی ہے کہ بیسیوں قسم کی کھجوریں کاشت کی جا رہی ہیں جو اپنی پیداوار میں اور اپنی لطف و لذت میں باہم دگر مختلف ہیں۔ اسی طرح یہ ایک ہی زمین مختلف قسم کے غلوں سے گراں بار ہے جو اپنی تاثیر' اپنی غذائیت اور اپنی افادیت میں باہم دگر نہایت صحت مندانہ اختلاف رکھتے ہیں۔ اس خالق و مالک کی نعمتوں کا کیا کہنا جس نے ایک ایک نعمت میں یہ تنوع اور یہ حسن رکھا ہے اور پھر انہی نعمتوں میں پروردگار نے عربوں کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے زیتون اور انار کا بھی ذکر فرمایا۔ زیتون بیک وقت عربوں کیلئے غذا بھی تھا اور پھل بھی اور انار تو ان کے نہایت پسندیدہ پھلوں میں شامل تھا۔ ان دونوں پھلوں کو دیکھئے تو یہ اللہ کی صنعت' اس کی قدرت اور اس کی رحمت کا مظہر نظر آتے ہیں۔ غلے کا پودا ہو یا پھل کا درخت' اسے مناسب پانی نہ ملے اور دھوپ مسلسل اس کو جلاتی رہے تو یہ عموماً نقصان کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن زیتون عجیب درخت ہے جتنا اسے سایہ سے بچا کر رکھئے اور جتنی تیز دھوپ اس پر پڑے اتنا ہی اس کا تیل زیادہ شفاف اور روشنی دینے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا تیل جس طرح صاف شفاف روشنی کیلئے (جو ہر طرح کے دھویں کی آلودگی سے پاک ہو) استعمال ہوتا تھا' اسی طرح اس کا پھل کھانے کے کام بھی آتا تھا۔ آج بھی عرب دونوں ضرورتوں کیلئے اس کو استعمال کرتے ہیں۔ بجلی آ جانے کے بعد تیل کو جلانے کی ضرورت تو نہیں رہی لیکن گھی کی جگہ اس کا استعمال پوری دنیا میں سب سے زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے چونکہ اس کی پیداوار باقی دنیا میں زیادہ نہیں ہوتی اور یا

Marfat.com

اس پر زرعی ماہرین نے بعض دوسرے علاقوں میں کامیاب تجربے نہیں کئے اس لئے اس کے تیل کا استعمال مہنگا ہونے کی وجہ سے زیادہ نہیں ہو پا رہا۔ اگر کہیں تجربات کے نتیجہ میں اس کی پیداوار اتنی بڑھ جائے کہ عام ضرورت کیلئے کفایت کر سکے تو یہ اللہ کی ایسی پاکیزہ نعمت ہے کہ دوسرے تمام تیل اس کے سامنے نہ صرف غیر مقبول ہو جائیں بلکہ ڈاکٹر اسے صحت کی ضرورت کے طور پر استعمال کرنے پر زور دیں۔ اسی طرح اس کے عام ہونے کے ساتھ جس طرح آج اس کا پھل جو شکل وصورت میں جامن کی طرح ہوتا ہے' عربوں کے ناشتے کا حصہ ہے' باقی لوگوں میں بھی مقبول ہو جائے اور اچار کے طور پر استعمال ہونے لگے اور جہاں تک انار کا تعلق ہے' اس کی افادیت اور بعض بیماریوں میں علاج کی ضرورت کے طور پر اطباء میں ہمیشہ قابل تسلیم رہی ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ یونانی طب کے زوال اور مغربی طب کے عروج کے ساتھ ساتھ اس کی افادیت اور اہمیت کی طرف چنداں توجہ نہیں دی جا رہی' ورنہ یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ پھل بہت سی بیماریوں میں تریاق کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں تک اس کی خوبصورتی کا تعلق ہے' اس کے کھلنے کے ساتھ ہی آدمی یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ کہ ایک ترتیب کے ساتھ لگے ہوئے دانے اپنی خوش رنگی اور لطف ولذت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق کو اس طرح اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ اللہ کی قدرت یاد آتی ہے۔ ایک چھوٹا سا ظرف ہے جس کے اندر اللہ نے غذائیت' افادیت' صحت وتوانائی اور حسن آرائی کا ایک خزانہ جمع کر دیا ہے۔ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی مثال صحیح طور پر اسی پر صادق آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہم پر احسانات:

اس کے بعد ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ ہم نے تمہیں یہ نعمتیں اس لئے عطا فرمائی ہیں کہ تم ان نعمتوں کو اپنی غذائی ضرورتوں اور لذت کام ودہن کیلئے اپنے استعمال میں لاؤ اور جب تمہاری شدید بھوک اس سے مٹے اور بھوک کی آگ ٹھنڈی ہو اور تمہاری لطف ولذت کی ضرورت اس سے پوری ہو تو تمہارے اندر ان نعمتوں کے دینے والے کی احسان شناسی کا جذبہ ابھرے اور یہی وہ جوہر ہے جس کے نتیجہ میں انسان کو ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ میرے اللہ نے سب سے پہلے تو یہ دولت عطا فرمائی کہ مجھے بھوک کا احساس بخشا۔ ہم چونکہ عقل رکھتے ہوئے بھی کوتاہی فکر کا شکار رہتے ہیں اور بہت ساری سامنے کی باتوں کو بھی سمجھنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اللہ کی بعض نعمتوں کا بھی پوری طرح ادراک نہیں ہو پاتا' انہی میں سے ایک یہ نعمت بھی ہے جسے بھوک کا احساس کہتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ بھوک کا احساس نہ ہونا یہ ایک بیماری ہے اور جو لوگ اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں' ان سے پوچھئے وہ اپنے اندر کتنا بڑا خلا محسوس کرتے ہیں۔ آپ ان کو کیسی ہی بڑی سے بڑی نعمت کھلا دیجئے' وہ اس کے حقیقی لطف سے ہمیشہ محروم رہیں گے کیونکہ کسی بھی نعمت کا حقیقی مزہ اس وقت آتا ہے جب آدمی اس کی طلب محسوس کرتا ہے۔ آپ نے خود دیکھا ہو گا کہ بغیر بھوک کے مرغ مسلم بھی بے مزہ معلوم ہوتا ہے اور شدید بھوک میں خشک روٹی بھی مزہ دے جاتی ہے۔ تو سب سے پہلی تو یہ نعمت ہے جو اللہ اپنی مخلوق کو عطا فرماتا ہے لیکن یہ نعمت اپنی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے مزید نعمتوں کی طالب ہوتی ہے اگر آدمی کو وہ نعمتیں میسر آ جائیں تو اس کے اندر خود بخود ایک احساس ابھرتا ہے جسے احسان شناسی کہتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ میری اس بھوک کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے تو صرف یہ بات کافی تھی کہ سادہ اور سپاٹ طریقے سے کوئی سی نعمت بھی عطا کر دی جاتی جس سے میرا پیٹ بھر جاتا لیکن یہ کیا بات ہے کہ مجھے صرف گندم ہی نہیں دی گئی بلکہ اس کیلئے ایسے پودوں کے کھیت اٹھائے گئے جنہیں دیکھ کر یوں احساس ہوتا ہے جیسے زمین نے اپنے اندر سے سونا اگل دیا ہو۔ مجھے ضرورت تھی چلچلاتی دھوپ سے بچنے کیلئے سائے کی' اس کیلئے سایۂ دیوار کافی تھا لیکن میرے لئے چھتریوں والے درخت کھڑے کر دیئے گئے۔ مجھے اپنی بھوک مٹانے کیلئے کوئی ایک غلہ کفایت کر سکتا تھا لیکن یہ رنگارنگ متنوع قسم کے غلے کیوں پیدا کر دیئے گئے۔ پانی میری پیاس بجھانے کیلئے کافی تھا لیکن اس کی کیا ضرورت تھی کہ چشمے ابالے جاتے' آبشاریں گرائی جاتیں

Marfat.com

دریا بہائے جاتے' پہاڑوں پر برف جمائی جاتی' گھٹائیں جھوم جھوم کر اٹھتیں اور رم جھم سے لے کر موسلا دھار بارشیں تک برستیں۔ یہ قسم قسم کی نعمتوں کی بہار' آخران کی کیا ضرورت تھی؟ چنانچہ آدمی جب ان چیزوں پر غور کرتا ہے تو اسے صاف محسوس ہوتا ہے کہ میرا رب صرف رازق ہی نہیں' وہ محسن بھی ہے۔ وہ نہایت جواد' کریم اور مہربان بھی ہے۔ اس کی بخشش اور اس کی عطائیں بے حد و بے شمار ہیں۔ اس نے بغیر میرے کسی استحقاق کے میرے لئے یہ تنوعات' یہ بوقلمونیں' یہ رنگ آرائیوں اور رعنائیوں پر مشتمل جو دستر خوان بچھایا ہے' وہ یقیناً اس کے انعامات اور اس کی فیاضیوں کا آئینہ دار ہے۔ یہ احساس جیسے جیسے توانا ہوتا جاتا ہے' ویسے ویسے آدمی اپنے اللہ کے قریب ہوتا جاتا ہے اور اس کے دل میں یہ خیال مچلنے لگتا ہے کہ جس محسن نے یہ بے شمار احسانات کئے ہیں' یقیناً اس نے مجھ پر ذمہ داریاں بھی ڈالی ہوں گی۔ پھر وہ ان ذمہ داریوں کے حوالے سے ضرور مجھ سے ایک دن باز پرس بھی کرے گا۔

اللہ کا قرب اللہ کی نعمتوں کے صحیح استعمال سے حاصل ہوتا ہے:

اگر میں نے ان نعمتوں کا حق ادا کرتے ہوئے اپنے مالک کو پہچانا اور اس کے احکام کی پیروی کی اور وہ زندگی گزاری جس پر وہ راضی ہے اور اس کی وفاداری کا حق ادا کیا تو وہ یقیناً مجھے بہتر سے بہتر جزا سے نوازے گا۔ لیکن اگر میں نے نعمتوں کو استعمال تو کیا لیکن اپنے محسن کو پہچاننے سے انکار کر دیا اور زندگی کفرانِ نعمت کرتے ہوئے گزاری تو یقیناً مجھے ایک دن اس کی سزا ملے گی اور میں ہمیشہ کی نامرادی کا شکار ہو جاؤں گا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تم اللہ کی نعمتوں کو کھاؤ اور استعمال کرو۔ لیکن ان نعمتوں کو استعمال کرتے ہوئے اس غلط تصور کی گرفت میں نہ آ جانا جس میں دوسرے مذاہب کے لوگ آئے۔ بدھ مت کے ماننے والوں نے اللہ کے قرب کا ذریعہ بھکشوازم کو سمجھا ہندوؤں نے جوگی پن کو اور عیسائیوں نے رہبانیت کو۔ یہ سب اس غلطی کا شکار ہوئے کہ اللہ کا تقرب اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم دنیا اور اس کی نعمتوں سے دور رہیں گویا ان کے نزدیک ترک لذات اور دنیوی نعمتوں سے پرہیز سے انسان کو وہ پاکیزگی ملتی ہے جس کے نتیجے میں اللہ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دنیا تو ایک گندگی ہے اگر ہم نے اسے اختیار کر لیا تو ہماری زندگی گندگی سے آلودہ ہو جائے گی اور ہم اللہ کے قرب سے محروم ہو جائیں گے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہی تینوں مذاہب کے ماننے والے اور ان کے مذہبی رہنما آج تک اس تصور کو ایک حقیقت سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کا اجتماعی رویہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایک محدود اقلیت کو چھوڑ کر ان مذاہب کے ماننے والے ترک لذات تو دور کی بات ہے ترک محرمات کیلئے بھی تیار نہیں۔ مذہبی طور پر وہ قرب الٰہی کیلئے دنیا چھوڑنا ضروری سمجھتے ہیں لیکن زندگی گزارنے کیلئے انہوں نے نہ صرف دنیا بلکہ دنیا کے ہر گناہ کو اپنے لئے ضروری سمجھ لیا ہے۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ان کے اس مذہبی تصور کو دنیا نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ورنہ نوع انسانی کا قافلہ بہت پہلے ختم ہو چکا ہوتا۔ نہ انسانی سلسلہ آگے چلتا نہ تہذیب پیدا ہوتی نہ تمدن کو ارکن ملتے۔ اجتماعی زندگی کا تصور بالکل ختم ہو کر رہ جاتا اسی لئے پروردگار یہاں حکم دے رہا ہے کہ کہیں تم اس تصور کو قبول نہ کر لینا' اللہ کا قرب اللہ کی نعمتوں کو چھوڑ کر نہیں ملتا بلکہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر منعم حقیقی کو پہچاننے سے نصیب ہوتا ہے۔ نعمتوں کا صحیح استعمال' ان کا صحیح تصور' ان کے بارے میں اللہ کے احکامات اور ان کی پابندی اور ان کے بارے میں آنحضرت کا طرز عمل اللہ کے قرب کے ضامن ہیں اس لئے فرمایا کہ تم ان نعمتوں کو استعمال کرو لیکن ساتھ ہی ساتھ ان نعمتوں کا اور اللہ کا حق ادا کرو۔ حقہ میں ضمیر کا مرجع ایک ایک نعمت بھی ہے اور اللہ کی ذات بھی۔ دونوں سے مراد ایک ہی ہے کہ ان نعمتوں کو خود بھی استعمال کرو اور اس پر شکر ادا کرو اور ان نعمتوں میں جو ان لوگوں کا حق ہے جو ان نعمتوں سے محروم ہیں' ان کا حق بھی ادا کرو۔

ان نعمتوں میں غریبوں کا حصہ:

رہا یہ بات کہ غریبوں کا حق صاحب نعمت اور صاحب استطاعت لوگوں کے مال و دولت میں کیا ہے یہاں اس کی تفصیل بیان نہیں فرمائی گئی

Marfat.com

کیونکہ یہ مکی سورۃ ہے اور اور مکی زندگی میں بالعموم احکام کا نزول نہیں ہوا اس لئے اس سے زکوٰۃ مراد لینا مشکل ہے البتہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ اللہ نے تمہیں جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں' ان میں سے غریبوں کیلئے خیرات کرو۔ لیکن بعض اہل علم نے اس سے زکوٰۃ مراد لی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مکی زندگی ہی میں زکوٰۃ فرض ہوگئی تھی اور اس آیت میں زمین کی زکوٰۃ یعنی عشر مراد ہے۔

زکوٰۃ کا نصاب:

البتہ! جہاں تک زکوٰۃ کی تفصیلات یعنی مقدار زکوٰۃ نصاب کا تعین اور مصارف وغیرہ کا تعلق ہے اس کے احکام مدینہ طیبہ میں آئے۔ اس لئے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنی کھیتی کاٹیں یا پھل توڑیں تو جو محتاج لوگ وہاں جمع ہو جائیں' جو ان کی استطاعت میں ہو ان کو دے دیں لیکن کوئی مقدار معین نہیں کی گئی البتہ مدینہ طیبہ میں جا کر اس کے تفصیلی احکام آئے اور مقدار بھی مقرر ہوئی۔ پھر جس طرح دوسرے اموال کے نصاب اور مقدار زکوٰۃ کی تفصیلات آنحضرت نے بیان فرمائیں اسی طرح زمین کی زکوٰۃ کی تفصیلات بھی بیان فرمائیں۔ حضرت معاذ بن جبل ؓ' حضرت عبداللہ بن عمر ؓ اور حضرت جابر بن عبداللہ ؓ جیسے صحابہ سے ان تفصیلات پر مشتمل روایات احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بارانی زمینوں میں جہاں بارش پر پیداوار کا دارومدار ہے' پیداوار کا دسواں حصہ اور جو زمینیں کنوں اور نہروں سے سیراب ہوتی ہیں' ان میں پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہے۔ اسلام نے دراصل اصول یہ اختیار کیا ہے کہ جس پیداوار میں محنت اور خرچ کم ہے اس میں زکوٰۃ کی مقدار زیادہ ہے اور جس میں محنت اور خرچ زیادہ ہے اس میں زکوٰۃ کی مقدار زیادہ ہے۔ مثلاً اگر کسی زمین سے کوئی قدیم خزانہ یا کوئی کان نکل آئے تو اس کا پانچواں حصہ بطور زکوٰۃ کے ادا کرنا لازم ہے اور جیسا کہ عرض کیا بارانی زمینوں میں دسواں حصہ اور کنویں یا نہری پانی سے سیراب ہونے والی زمینوں سے بیسواں حصہ لازمی ہے اور سونا یا چاندی یعنی روپیہ پیسہ میں خرچ زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس کی زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ ادا کیا جاتا ہے اور مویشیوں میں سو بکریوں سے کم میں اور اونٹوں میں پانچ اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے لیکن زمین کی پیداوار میں کوئی نصاب مقرر نہیں کیا گیا۔ زمین کی پیداوار چاہے تھوڑی ہو یا زیادہ' دسواں یا بیسواں حصہ نکالنا ضروری ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کی نعمتوں کو استعمال تو کرو لیکن اس میں اسراف یعنی فضول خرچی مت کرنا۔ نہ بے جا خرچ کرنا نہ بے ضرورت خرچ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ اسراف سے منع کرتا ہے:

اب سوال یہ ہے کہ یہاں اسراف سے کیا مفہوم ہے؟ بعض اہل علم نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ یہاں چونکہ نعمتوں کا حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ اس کے کوئی مقدار مقرر نہیں فرمائی گئی تو ممکن تھا کوئی صاحب اس کا یہ مطلب سمجھتے کہ آدمی کے پاس جو کچھ آئے' وہ اللہ کی راہ میں دے دینا ضروری ہے۔ چنانچہ یہاں اسی کو اسراف سے تعبیر فرمایا گیا ہے کہ سب کچھ اللہ کی راہ میں نہ دے دینا اگر ایسا کرو گے تو تم پر جو حقوق عائد کئے گئے ہیں' ان کی ادائیگی کیسے کر سکو گے۔ مثلاً ایک باپ اپنے اوپر اپنی بیوی' اپنے بچوں اور والدین زندہ ہیں تو ان کے بھی حقوق رکھتا ہے جو اس کے فرائض ہیں۔ اگر یہ اپنے گھر کا سارا اثاثہ اٹھا کر اللہ کی راہ میں دے دے تو یہ حقوق کیسے ادا ہوں گے اور اللہ کے یہاں جب اس کی بازپرس ہوگی تو یہ کیا عذر کرے گا۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک زمیندار اپنی زمین کی ساری پیداوار حکومت کے کارندوں کو دے دے لیکن مالیہ ادا نہ کرے' ظاہر ہے وہ گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔ یہی حال ایک مسلمان کا بھی ہے' وہ اپنے اہل خانہ' اپنے والدین' اپنے اقربا' اپنے پڑوسی اور ملک و ملت کے لحاظ سے اپنے ذمہ جو فرائض رکھتا ہے' ان کے ادا نہ کرنے کے

Marfat.com

جرم میں ماخوذ ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک صحابی نے مرض الوفات میں حضور سے پوچھا کہ میں اپنا سارا مال اللہ کے راستے میں دے دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے پوچھا: نصف دے دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے پوچھا: ایک تہائی دے دوں؟ فرمایا: ہاں! ایک تہائی دے دو اور مزید فرمایا کہ اپنے وارثوں کو کھاتا پیتا چھوڑ کر جاؤ' بجائے اس کے وہ ناداری کا زخم اٹھائیں۔ البتہ! یہ بات کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی زکوٰۃ ادا نہیں فرمائی اور نہ شاید حضرت صدیق اکبرؓ نے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ کبھی اپنے پاس کوئی مال نہ رکھا۔ حضور کے پاس ہزاروں لاکھوں آتے لیکن اس پر ایک رات نہ گزرتی کہ آپ انہیں لوگوں کی ضرویات پر خرچ کر دیتے حتیٰ کہ مرض الوفات میں آپ نے حکم دیا کہ گھر میں چند اشرفیاں پڑی ہیں' انہیں خیرات کر دو۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ ازواجِ مطہرات بھول گئیں اور انہیں خیرات نہ کر سکیں۔ آپ نے اسی وقت انہیں خیرات کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ کیا محمد (ﷺ) اپنے اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ دنیا کا مال اس کے گھر میں پڑا ہوگا؟ اس بارے آپ کا طرزِ عمل یہ تھا جس کی تصویر ظفر علی خان نے کھینچی ہے

ے قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر
اور اپنا یہ حال کہ ہے چولہا بجھا ہوا

صدیق اکبرؓ آنحضرت ﷺ کی اسی سنت کے امین تھے۔ آغازِ اسلام میں نہایت مالدار تھے لیکن مدینہ طیبہ میں ڈھب کے کپڑے پہننے کو بھی میسر نہ تھے۔ جنگِ تبوک میں گھر کا سارا اثاثہ لا کر حضور کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ انہیں چونکہ آنحضرت کا جانشین بننا تھا' اس لئے وہ ہو بہو آنحضرت کی سیرت و کردار کا عکس تھے اور مزید یہ بات کہ جب اسلام اور مسلمانوں کو ایک ایک پائی کی ضرورت لاحق ہو تو پھر سب کچھ دے دینا بھی مسلمانوں کیلئے ضروری ہو جاتا ہے اس لئے حضرت صدیق اکبر کا عمل اسی پر تھا جو ان کے اپنے مقام و مرتبہ کے عین مطابق تھا۔

اسراف نہ کرنے کا دوسرا مفہوم یہ ہے جو زیادہ طبیعت کو لگتا ہے کہ ایک طرف اللہ کے راستے میں مسلمانوں کا حق ادا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی اسراف سے روکا جا رہا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو آدمی اپنی ذاتی زندگی میں جائز ضرورتوں سے بڑھ کر تکلفات' پھر تعیشات اور اللے تللوں اڑا دینے کی عادت رکھتا ہے' اس کے اندر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا کبھی ذوق پیدا نہیں ہوتا اور نہ وہ اپنی تعیشات سے اتنی گنجائش رکھتا ہے کہ وہ مسلمانوں پر خرچ کرنے کیلئے مال بچا سکے۔ ان کے کتوں پر آپ کو مخملی جھول دکھائی دیں گے لیکن ان کے ہمسائے میں بے کفن کو کفن دینے کی ان کو گنجائش نہیں ہوگی۔ ان کے شکاری جانور گوشت اور پھلوں سے پالے جائیں گے لیکن ان کے دروازے سے سائل ہمیشہ خالی ہاتھ واپس جائے گا کیونکہ ان کے ذوق میں ان تعیشات نے اللہ کے حق یا مسلمانوں کی ضرورتوں کیلئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ چنانچہ یہاں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تم اللہ کا حق اسی صورت ادا کر سکو گے جب کہ تم اسراف اور فضول خرچی سے بچو۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے ایک دوسری جگہ اس بات کو صراحتاً بھی ذکر فرمایا۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت 26 اور 27 میں فرمایا گیا ہے: ''اور قرابت دار' مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے''۔ یعنی ان حقوق کی ادائیگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم اپنی ضروریات اور خواہشات کے معاملے میں معتدل' کفایت شعار اور میانہ رو بنو کیونکہ اگر تم مسرف اور فضول خرچ بنو گے تو پھر تمہارے یہاں ان حقوق کے ادا کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے گی۔

اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو انسان کی ضرورتوں کے لئے پیدا کیا:

اگلی آیت کریمہ میں بھی زیرِ بحث آیت کریمہ کی طرح بنائے استدلال نعمتوں کو بناتے ہوئے دو نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ متذکرہ نعمتوں کا تعلق

Marfat.com

غلے اور پھلوں سے تھا اور اس آیت میں جن نعمتوں کا بیان ہو رہا ہے ان کا تعلق مویشیوں اور چارپایوں سے ہے۔ ارشاد فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے چارپایوں میں سے دو طرح کے جانور پیدا فرمائے اور ان کیلئے حمولۃ اور فرش کے الفاظ استعمال کئے۔ حمولۃ فعولۃ کے وزن پر اس چارپائے کو کہتے ہیں جو سواری اور بار برداری کیلئے موزوں ہو جیسے اونٹ' گھوڑے اور خچر وغیرہ اور فرش کا استعمال تین چیزوں پر ہوتا ہے: ۱) ایسا قطعہ زمین جہاں نباتات کی کثرت ہو' ۲) اس کھیتی کو بھی کہتے ہیں جو ابھی اپنے ڈنٹھلوں پر کھڑی نہ ہوئی ہو' ۳) وہ چارپائے اور حیوانات جو سواری اور بار برداری کی بجائے صرف گوشت کی ضرورت پوری کرنے کیلئے پالے جاتے ہیں اور جو اپنے قد وقامت میں سواری اور بار برداری کے جانوروں سے چھوٹے ہیں جیسے بھیڑ بکریاں وغیرہ۔ اس آیت کریمہ میں یہی مراد ہے۔ جس طرح سابقہ آیت میں انسان کی دو ضرورتوں کے حوالے سے دو دو نعمتوں کا ذکر فرمایا یعنی غذا کی ضرورت اور لذت کام و دہن کیلئے یہاں بھی دو ضرورتوں کے حوالے سے دو طرح کے جانوروں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے ایک طرح کے وہ جانور جو سواری اور بار برداری کیلئے استعمال ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جانور جو گوشت خوری اور دوسری ضرورتوں کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ کوئی ضرورت ایسی نہیں جس سے اللہ جیسے کریم نے تغافل فرمایا ہو یا صرف نظر کیا ہو بلکہ اس نے تو ایسی ایسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں بلکہ ایک ایک نعمت میں غذائیت کے اعتبار سے ایسا تنوع رکھا ہے کہ انسان کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اس کی افادیت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ہر حال میں انسانی ضرورتوں کیلئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ انسان جس طرح غذائیت اور لذت کام و دہن کیلئے مختلف قسم کی ضرورتیں رکھتا ہے' اسی طرح سواری کیلئے بھی مختلف جانوروں کا محتاج ہے۔ اور مزید کہ غذا میں صرف غلہ اور لذت کام و دہن میں صرف پھل انسانی ضرورت کیلئے کافی تو ہیں لیکن انسانی ذوق کی تسکین کیلئے کافی نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے غلے اور پھلوں کے ساتھ ساتھ گوشت بھی عطا فرمایا تاکہ انسان کی غذائیت کو مکمل کیا جائے اور ساتھ ساتھ اس کے ذوق کی تسکین کا سامان بھی ہو سکے۔ سواری کی ضرورت بھی کسی ایک جانور کی تخلیق کے ساتھ پوری ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک جانور کی تخلیق پر اکتفا نہیں فرمایا مختلف قسم کے چھوٹے بڑے جانور گھوڑے اور خچروں سے لے کر اونٹوں اور ہاتھیوں تک مختلف رفتار کے حامل مختلف انداز سے چلنے والے کوئی پتھریلے علاقے کا چلنے والا اور کوئی ریت کے صحرا پر کامیابی سے دوڑنے والا' کوئی مختصر سفر کے لئے مفید اور کوئی لمبے سفر کی صعوبتیں اٹھانے کے لائق ہر طرح کا جانور پیدا کر کے انسانی سفر کو آسان فرمایا اور ایک جگہ قرآن کریم میں مزید یہ بھی فرمایا کہ ہم نے یہ یہ جانور تمہارے لئے پیدا کئے ہیں لیکن آئندہ چل کر وہ تمہارے لئے کیا کیا پیدا کرے گا تم آج اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے چنانچہ آج ہم جن تیز رفتار سواریوں کے ذریعے برق رفتاری سے اڑے پھرتے ہیں اور دنوں کا سفر گھنٹوں اور منٹوں میں طے کرتے ہیں شاید اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ان نعمتوں کا ذکر فرمانے کے بعد پھر وہی بات فرمائی جس کا ذکر سابقہ آیت میں ہوا تھا کہ اللہ کی یہ نعمتیں تمہیں اس لئے دی گئی ہیں کہ تم انہیں اللہ کا رزق سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھاؤ یہ اللہ کے تقرب کے راستے میں حائل ہونے والی نعمتیں نہیں ہیں بشرطیکہ تم انہیں استعمال کرتے ہوئے ذہن سے یہ بات فراموش نہ ہونے دو کہ ان نعمتوں کا پیدا کرنے والے نہ تم خود ہو نہ تمہارے نام نہاد شرکاء بلکہ اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے اور پھر ان کے استعمال کے طریقے بھی اس نے تمہیں بتائے ہیں اگر تم انہیں اسی کی عنایت اور بخشش سمجھ کر اس کے احکام کے مطابق استعمال کرو تو بجائے اس کے کہ یہ تمہارے اور اللہ کے درمیان ایک رکاوٹ بن جائیں یہ اللہ کی معرفت اور خود تمہاری اپنی معرفت کا وسیلہ ثابت ہوں گے۔

شیطان کے وسوسوں اور فتنوں سے بچنا چاہیے:

جیسے جیسے تم ان سے فائدہ اٹھاؤ گے ویسے ویسے اللہ کے احسانات کی حقیقت تم پر کھلے گی اور تم مسلسل اپنے آپ کو اللہ کے احسانات تلے دبتا ہوا

Marfat.com

محسوس کرو گے اسی سے تمہیں بندگی کا سراغ ملے گا اور اسی سے اللہ کی کبریائی ذہنوں میں راسخ ہوتی چلی جائے گی اور یہی وہ دو تصور ہیں یعنی اپنی عاجزی اور عبدیت اور اللہ کی کبریائی اور اس کی الوہیت جو انسان اور بندے کے درمیان حقیقی تعلق کی بنیاد ہیں اور اسی پر تقرب الی اللہ کی عمارت اٹھائی جاسکتی ہے لیکن اس میں خرابی اس وقت پڑتی ہے جب آدمی اس سفر میں شیطانی وسوسوں کا شکار ہو کر ان تصورات کو قبول کرنے لگتا ہے جو شیطان انسان کے دل میں ڈالنا چاہتا ہے کبھی تو وہ انسان کو اس نسیان کا شکار کرتا ہے کہ تم بھی خودرو پودوں کی طرح اس زمین پر پیدا ہوئے ہو اور یہ نعمتیں بھی اسی طرح اپنے آپ پیدا ہوگئی ہیں کسی خدا کا کوئی وجود نہیں تم خود اپنی قسمت اور اپنی زندگی کے ذمہ دار ہو یہ چند روزہ زندگی اپنی خواہشات کے حوالے سے اسی طرح گزارو کہ جس میں ہر طرف خوشیوں کے ترانے بج رہے ہوں اور آنے والے وقت کا اندیشہ کبھی تمہارے قریب بھی نہ بھٹکنے پائے اور یہ یقین رکھو کہ تمہیں کسی کے سامنے جواب دہی کا کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ یہ چند روزہ زندگی یہی زندگی ہے اس کے بعد ہمیشہ کی موت ہے اور کبھی انسان کے دل میں شیطان شرک کا بیج ڈالتا ہے اور آہستہ آہستہ انسان کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ کر دیتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے اور وہی شہنشاہِ کائنات ہے لیکن اتنی وسیع و عریض کائنات کا انتظام و انصرام ایک ذات کے بس کی بات نہیں ہے یقیناً اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے اختیارات میں شریک کر رکھا ہے اور اپنے کائنات کے مختلف حصے ان کے سپرد کر رکھے ہیں اس لئے اگر ہم اپنی زندگی میں اللہ کے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس نے جن قوتوں کو اپنے اختیارات میں شریک کر رکھا ہے انہیں خوش کرنے کی کوشش کریں چنانچہ اسی تصور سے بت پرستی دیوتاؤں اور اوتاروں کی پرستش جنات اور فرشتوں سے استعانت جیسے مشرکانہ توہمات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ شیطان کے فتنوں سے ہوشیار رہنا اور اس کے نقوش قدم کی کبھی پیروی نہ کرنا کیونکہ تمہارے جدامجد حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے باعث جب شیطان کو وہاں سے دھتکار کے نکالا گیا تو اس نے اپنے اللہ سے قیامت تک کیلئے زندگی کی مہلت مانگی تھی اور ساتھ ہی اس نے صاف صاف اس بات کا اعلان کیا تھا بلکہ ایک طرح سے الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ آدم کی اولاد کو اپنے مقدور کی حد تک فتنوں میں ڈالے گا' اپنی طرف سے ان کیلئے حلال و حرام ٹھہرائے گا اور خدا کے بخشے ہوئے چوپایوں میں بتوں کے نام پر نیاز اور قربانی ان سے دلوائے گا چنانچہ سورۃ النساء میں اس کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اس نے کہا:

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ

''اور شیطان نے کہا میں تیرے بندوں میں سے ایک متعین حصہ ہتھیا کے رہوں گا اور میں ان کو گمراہ کروں گا ان کو آرزوؤں کے سبز باغ دکھاؤں گا اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے'' (النساء:۱۱۹)

شیطان کے اس الٹی میٹم سے اس کی دشمنی پوری طرح نمایاں ہو رہی ہے اور وہ یہ تہیہ کئے بیٹھا ہے کہ جس پر اس کا بس چلے گا اس کو وہ کبھی اللہ کے بتائے ہوئے صحیح راستے پر چلنے نہیں دے گا بلکہ ہر ممکن طریقے سے اس کے دل و دماغ میں وسوسہ اندازی کرے گا اور اس کی عاقبت تباہ کر دے گا۔ اس لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ شیطان تمہارا کھلا کھلا دشمن ہے کہ اس نے اپنی دشمنی کو چھپایا نہیں بلکہ پہلے ہی دن صاف صاف اس کا اعلان کیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ تم اسی دشمن سے راہنمائی لیتے ہو اور اللہ جو تمہارا محسن ہے۔ جس نے تمہیں ہزاروں قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے' جس نے تمہیں زندگی اور زندگی کے امکانات دے کر نجانے کیسی کیسی صلاحیتوں سے گراں بار کر رکھا ہے لیکن تم اپنے اس محسن کو بھول جاتے ہو اور اس دشمن کے ساتھ اس کی راہنمائی میں چلنا پسند کرتے ہو یہ غیر اللہ کو اللہ کی صفات میں شریک کرنا یہ شیطان کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ جس میں اس نے تمہیں مبتلا کر رکھا ہے۔

Marfat.com

اگلی آیت کریمہ میں اسی شیطانی فتنے کو اس طرح کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے اور جانوروں میں مشرکین عرب میں جس طرح مشرکانہ تصورات اختیار کر رکھے تھے اور جن کا سابقہ آیات میں ذکر ہو چکا ہے ان پر اس وضاحت اور سلاست کے ساتھ تنقید فرمائی گئی ہے کہ تسہیل مطالب کیلئے اس سے زیادہ آسان اسلوب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۴۳-۱۴۴ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ O وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ O ”چوپایوں کی آٹھوں قسموں کو لو بھیڑوں میں سے نر و مادہ دو اور بکریوں میں سے نر و مادہ دو پھر ان سے پوچھو کہ ان دونوں کے نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادینوں کو یا اس بچے کو جو ان مادینوں کے رحم میں ہے اگر تم سچے ہو تو کسی سند کے ساتھ مجھے بتاؤ۔ اسی طرح لو اونٹوں میں سے نر و مادہ دو اور گائے بیل میں سے نر و مادہ دو پھر پوچھو کہ ان دونوں نروں کو حرام ٹھہرایا ہے یا ان کی ماداؤں کو یا اس بچے کو جو ماداؤں کے پیٹ میں ہے کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ نے تمہیں اس کی ہدایت فرمائی تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بغیر کسی علم کے بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا“۔

کفار نے جو حلال حرام بنا رکھا ہے اس کی سند مانگی جا رہی ہے:

ثمانیة کا معنی ہے آٹھ بلکہ آٹھوں اور ازواج زوج کی جمع ہے اس کا اطلاق جوڑے پر بھی ہوتا ہے اور جوڑے کے ایک ایک فرد پر بھی۔ عربی زبان میں دونوں طرح یہ لفظ مستعمل ہے۔ سابقہ مضمون کو نہایت آسان شکل میں بالکل الگ الگ کر کے سوال کی صورت میں ان کے سامنے رکھا ہے اور پھر خود ان سے اس کا جواب طلب کیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اب تک تم پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جتنی نعمتوں سے تم متمتع ہو رہے ہو جن میں جانور بھی شامل ہیں۔ ان سب کو اللہ نے پیدا فرمایا ہے ان کی تخلیق میں اور پھر ان کی زندگی کی بقاء اور زندگی کے امکانات میں کسی کا کوئی دخل نہیں لیکن اے مشرکینِ عرب تم نے نجانے کس طرح ان جانوروں میں سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام کر ڈالا ہے اور پھر مزید تقسیم یہ کہ بعض کے مذکر حلال ہیں اور مونث حرام اور بعض کے مونث حلال ہیں اور مذکر حرام اور پھر اگر تم نے بعض جانوروں کے مذکر اور مونث دونوں حلال ٹھہرائے ہیں تو مادہ کے پیٹ کے بچے کو کہیں حلال کر دیا ہے اور کہیں حرام ٹھہرا دیا ہے یہ جو پوری مشرکانہ کارروائی ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے نہایت وضاحت سے ان سے سوال کیا جا رہا ہے کہ تمہارے یہاں جو جانور سواری یا کھانے کیلئے استعمال ہوتے ہیں وہ چار ہیں اور جب ان کو مذکر اور مونث کے طور پر الگ الگ لو تو آٹھ ہو جائیں گے۔ ان میں بھیڑ اور بکری ہیں اور گائے اور اونٹ ہیں۔ ان میں سے صاف صاف بتاؤ کہ کیا بھیڑ اور بکریاں اور ان کے مذکر آخر ان میں سے کون سا حلال ہے اور کون سا حرام۔ اس طرح اونٹ اور گائے میں مذکر اور مونث دونوں کو سامنے رکھو اور پھر بتاؤ کہ ان میں حلال کون ہے اور حرام کون۔ ظاہر ہے کہ ان کی تخلیق ان کی جسمانی ساخت ان کی غذا اور ان کی زندگی کا مقصد سب یکساں ہے۔ ان آٹھوں میں باہمی کوئی اختلاف نہیں ایک طرح کی غذا کھا کے پلتے ہیں ایک طرح کے فوائد اپنے پالنے والوں کو باہم پہنچاتے ہیں ایک طرح کی زندگی گزارتے ہیں اور ایک طرح کی زندگی کے وظائف ادا کرنے کے پابند ہیں۔ پھر آخر کیا تک ہے کہ تم نے ان میں سے بعض کو حلال کر دیا ہے اور بعض کو حرام اور ستم بالائے ستم یہ کہ اگر مذکر مونث دونوں حلال ہیں تو تم ان کے پیٹ کے بچوں

Marfat.com

کو حرام کر دیتے ہو اور اگر وہ مردہ شکل میں پیدا ہو تو حلال کر دیتے ہو اور پھر حلال میں بھی تقسیم ہے کہ کبھی مردوں کیلئے حلال اور کبھی عورتوں کیلئے حلال اور اسی طرح کبھی دونوں میں سے کسی ایک کیلئے حرام آخر یہ جو گورکھ دھندہ تم نے بنا رکھا ہے آنحضرت سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان سے پوچھو کہ مجھے علم کے حوالے سے بتلاؤ کہ تمہاری اس قانون سازی کا جواز کیا ہے تم نے حلت و حرمت کی سند کہاں سے حاصل کی ہے۔ دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ تم جو کچھ کہتے ہو عقل اور فطرت اس کی تصدیق کریں لیکن ہر عقلمند آدمی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ عقل اور فطرت تمہاری ان لغویات کی کبھی تصدیق نہیں کر سکتیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ چونکہ تم اس حلت و حرمت کا انتساب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہو تو پھر صاف صاف بتلاؤ کہ کیا تمہارے پاس کوئی صحیفہ ابراہیمی ہے جس کی سند کی بنیاد پر تم یہ ساری باتیں کہتے ہو اور اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر تم ہی بتلاؤ کہ تمہارے ان تصورات اور عقائد کی آخر کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔

دوسری آیت کے آخر میں فرمایا کہ نہ تو تاریخ مذہب ان باتوں کی تائید کرتی ہے اور نہ عقل و فطرت تو بدرجہ آخر یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر بقول تمہارے یہ چیزیں اللہ ہی نے حرام کی تھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً تم اس وقت موجود ہو گے اور تم نے خود اپنے کانوں سے اللہ کا یہ حکم سنا ہو گا۔ ظاہر ہے یہ بات کہنے کی کون جرأت کر سکتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ جب ان تین باتوں میں سے کوئی بھی نہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم عقل و فطرت، تاریخ اور خود اپنے آپ پر اس طرح کی باتیں کہہ کر ظلم کر رہے ہو۔ لیکن مزید ستم یہ ہے کہ تم اس ظلم کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جس طرح عیسائیت کو پال نے بگاڑا اور اسے پٹڑی سے اتارا اسی طرح بت پرستی اور تمہارے مشرکانہ تصورات کی ابتدا عمرو بن لحی نامی آدمی کے ذریعے ہوئی۔ تم جو باربار ان باتوں کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے ہو تمہیں خوب معلوم ہے کہ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا سارا ریکارڈ جو تورات کے صحیفوں میں بھی موجود ہے تمہارے سامنے لا کر رکھ دیا ہے اس کا ایک ایک حرف گواہی دے رہا ہے کہ حضرت ابراہیم کو نہ صرف یہ کہ شرک اور مشرکانہ رسوم سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ انہوں نے اپنے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل سے شرک کی جڑ اکھاڑ دی تھی۔ لیکن تم ان تمام دلائل کو دیکھتے ہوئے جو آفتاب سے زیادہ روشن ہیں اپنی کوتاہیوں پر پھر بھی اصرار کر رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سراسر ایک زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہو۔ تو ایسا آدمی جو جان بوجھ کر حقیقت کا چہرہ بگاڑے اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے اور تاریخ شاہد ہے اور تمہارے گرد و پیش پھیلے ہوئے معذب قوموں کے کھنڈرات اپنی خاموشی سے گواہی دے رہے ہیں کہ ایسا ظلم کرنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا وہ فلاح تو خیر کیا پائیں گے وہ تو دنیا کیلئے درسِ عبرت بن کے رہ جاتے ہیں۔ اس لئے آخر میں فرمایا کہ اللہ ظالم قوم کو کبھی راہ یاب نہیں فرماتا اس کا ایک مطلب تو تاریخ کی شہادت کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ قیامت اور آخرت میں یہ لوگ ناکام و نامراد ہو کر جہنم کا ایندھن بنیں گے لیکن یہاں صاف صاف چونکہ آنحضرت سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ان مشرکینِ مکہ سے یہ یہ پوچھیئے اس سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ آیت کا یہ آخری حصہ شاید ایک پیش گوئی کی حیثیت رکھتا ہے یعنی یہ پیش گوئی کی جا رہی ہے کہ آج جبکہ تمہارے اشراف اور تمہارے سادات سر سے پاؤں تک دعوت اسلامی کا راستہ روکنے میں مصروف ہیں اور تم زندگی کا ہر دکھ اور ہر تکلیف مسلمانوں کو پہنچا کر ان کو اسلام سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے ہو اور تم سمجھتے ہو کہ شاید اس طرح تم اسلام کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے لیکن ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ تم نے ظلم کا جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کے نتیجے میں ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملے گا اور اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا حضور کی دعوت پھیلے گی اور وہ دن دور نہیں جب کہ فتح مکہ کے بعد تم ہاتھ باندھے حضور کے سامنے کھڑے ہو کر زندگی کی بھیک مانگتے نظر آؤ گے۔

اگلی آیت کریمہ میں حلت و حرمت کے حوالے سے تحقیقی انداز میں ایک بات فرمائی جا رہی ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۱۴۵ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ

Marfat.com

خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O ''کہہ دو میں تو اس وحی میں جو مجھ پر آئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی چیز جس کو وہ کھائے حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ یہ چیزیں بیشک ناپاک ہیں یا فسق کر کے اس کو غیر اللہ کیلئے نامزد کیا گیا ہو اس پر بھی جو مجبور ہو جائے نہ چاہنے والا بنے اور نہ حد سے بڑھنے والا تو تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے''۔

ملتِ ابراہیمی میں چار چیزوں کی ممانعت:

سابقہ دو آیات میں جو ان سے سوالات کئے گئے اور ایک ایک جانور کے حوالے سے الگ الگ پوچھا گیا کہ جو جانور تمہارے یہاں گوشت کھانے یا سواری کیلئے استعمال ہوتے ہیں تم علمی، تاریخی، عقلی اور فطری لحاظ سے بتاؤ کہ ان میں سے کون سا جانور حلال اور کونسا حرام ہے اور تم ملتِ ابراہیمی کے حوالے سے جس طرح ان میں حلال وحرام کے فیصلے کئے ہیں آخر تمہارے پاس اس کی کیا سند ہے۔ ظاہر ہے وہ اس کا کیا جواب دے سکتے تھے۔ ان کے سکوت اور بے بسی کو دیکھتے ہوئے خود قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے اور آنحضرت کو حکم دیا کہ آپ ان کو بتائیے کہ جہاں تک ملت ابراہیمی میں حرام کردہ جانوروں کا تعلق ہے مجھ پر اس سلسلے میں جو وحی اتری ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف چار ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ کہتے ہو وہ سراسر تمہارے آباؤ اجداد میں سے کسی کی ایجاد ہے یا تم نے خود یہ بدعات اختراع کی ہیں یہاں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ (جو وحی مجھ پر اتری۔ یہ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اگر میں اپنی طرف سے اپنے جی سے گھڑ کے کوئی بات کہوں گا تو وہ بھی اسی طرح غلط ہوگی جیسے تم کہتے ہو کیونکہ حلت وحرمت اختیار سراسر اللہ کو زیب دیتا ہے۔ اس لئے اللہ نے مجھ پر جو وحی اتاری ہے اس کے حوالے سے میں کہہ رہا ہوں کہ صحیح بات یہ ہے کہ ملت ابراہیمی میں صرف چار چیزیں حرام ہیں۔ ان چار چیزوں کا ذکر کرنے سے پہلے ایک غلط فہمی کا دور کرنا ضروری ہے جو بعض اہل علم کو اس آیت کریمہ کے سمجھنے میں لاحق ہوئی ہے وہ اس سے یہ سمجھے ہیں کہ اسلامی شریعت میں صرف چار چیزیں حرام ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں اور بھی کئی چیزیں حرام ہیں مثلاً درندے حرام ہیں، شکار کرنے والے جانور حرام ہیں، اسی طرح اور بھی۔ اس لئے اگر یہ بات سمجھ لی جائے کہ یہاں صرف ملت ابراہیمی کے حوالے سے بحث ہو رہی ہے اسلامی شریعت کے حوالے سے نہیں کیونکہ مشرکین مکہ سے جھگڑا یہ نہیں تھا کہ جو جانور اسلامی شریعت میں حرام نہیں ہیں انہوں نے وہ حرام کیسے کر دیئے ہیں بلکہ مدار نزاع یہ تھا کہ تم ہر حلال اور حرام کے حوالے سے نام ملت ابراہیمی کا لیتے ہو حالانکہ ملت ابراہیمی میں ان چار چیزوں کے سوا کوئی چیز حرام نہیں۔ تو پھر تم نے یہ جو پوری شریعت مدون کر ڈالی ہے آخر اس کی سند کیا ہے۔

ممنوع چیز کھانے کی اجازت کی وجوہ:

وہ چار چیزیں جن کو ملت ابراہیمی میں حرام کیا گیا تھا ان کا ذکر کرنے سے پہلے فرمایا گیا ہے کہ میں تو کسی بھی کھانے والے پر جو ان نعمتوں کو کھائے ان چار چیزوں کے سوا کسی اور چیز کو حرام نہیں پاتا۔ طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ ''کوئی بھی کھانے والا جو ان نعمتوں میں سے کسی نعمت کو کھائے'' سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان نعمتوں کو کھانا اور ان سے فائدہ اٹھانا یہ کسی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا جیسا کہ مشرکین عرب نے بعض جانوروں کے گوشت کو عورتوں کیلئے حرام قرار دے دیا تھا اور مردوں کے ساتھ انہیں مخصوص کر دیا تھا اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمہاری اس طرح کی باتیں بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہیں وہ چار چیزیں جو حرام کی گئیں وہ ہیں مردار، بہایا ہوا خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو یا غیر اللہ کیلئے نذر کر دیا گیا ہو۔ ان میں متذکرہ تین چیزوں کی حرمت چونکہ ظاہری نجاست کی وجہ سے ہے جو ان چیزوں میں پائی جاتی ہے مثلاً مردار اور بہایا ہوا خون اور سور کا گوشت

Marfat.com

بجائے خود اپنے اندر ایک پلیدی رکھتے ہیں لیکن غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جانے والا یا نذر کیا جانے والا جانور اپنے اندر کوئی ظاہری نجاست نہیں رکھتا۔ البتہ! اس کے اندر ایک باطنی نجاست ہے اور وہ شرک ہے کہ جب اس نے اسے اللہ کے نام کی بجائے کسی اور نام پر ذبح کیا یا نذر کیا تو اس نے شرک کر کے اس جانور کو نجس کر دیا یہ عقائدی نجاست ظاہری نجاست سے بھی بڑھ کر ہے اسی عقائدی نجاست کو یہاں فسق سے تعبیر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ادیان کی طرح ملت ابراہیمی میں بھی اشیاء کی حلت و حرمت محض حکمی نہیں بلکہ فطری و عقلی بھی ہے۔ البتہ اگر یہی ناپاک اور حرام چیزیں بھی اضطرار کی حالت میں کھانی پڑ جائیں کہ کوئی ایسا وقت آ جائے کہ آدمی کے پاس ان کے سوا اور کوئی چیز کھانے کو نہ ہو یا آدمی کافروں کے ہاتھوں کہیں گرفتار ہو جائے اور وہ اس مومن کو کسی کمرے میں بند کر کے یہی حرام چیزیں اسکے پاس رکھ دیں اور کئی دنوں تک اس کو باہر نہ نکالیں اب اگر وہ ان سے اجتناب کرے تو مر جائے اور اگر وہ زندہ رہنا چاہے تو ان کو استعمال کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں اللہ نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ ایسی صورت حال میں ایک مومن جان بچانے کیلئے ان حرام چیزوں کو استعمال کر سکتا ہے پھر بھی شرط یہ ہے کہ دل میں یہ تصور پوری طرح توانا رہے کہ ان چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے میں کبھی ان کے قریب جانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن جان بچانے کی مجھے چونکہ اجازت دی گئی ہے اس لئے میں چاہت کے ساتھ نہیں نہ بغاوت کرتے ہوئے بلکہ مجبوری کی وجہ سے انہیں کھانے پر مجبور ہوں اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ وہ انہیں اس حد تک کھائے اور استعمال کرے جس سے اس کی جان بچ جائے اس کو مزے لے لے کر کھانا اور اس کو اپنی غذا بنا لینا یہ مجبوری کی صورت میں بھی جائز نہیں اگر ان دونوں احتیاطوں کے ساتھ ایسی حرام چیز کا استعمال کر لیا جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ درگزر اور رحم کا سلوک فرماتے ہیں۔ ان حرام کردہ اشیاء میں لحم خنزیر تو ایک واضح سی بات ہے البتہ میتہ کے بارے میں سورۃ المائدہ میں تفصیل گزر چکی ہے اس کو دیکھ لینا چاہئے اسی طرح دم مسفوح (بہایا ہوا خون) سے مراد وہ خون ہے جو زخم کی صورت میں یا ذبح کرنے کے نتیجے میں جانور کے جسم سے نکلتا ہے البتہ گوشت کے اندر کچھ ایسا خون ضرور رہ جاتا ہے خاص طور پر پھیپھڑا' کلیجی اور تلی میں کہ جس کا نکلنا دھونے سے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ اس کو اللہ نے حرام نہیں فرمایا اگر اسے حرام کر دیا جاتا تو یہ انسانوں کیلئے ایک ایسی دشواری ہوتی جس پر عمل کرنا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہوتا۔

اس آیت میں یہ جو فرمایا گیا کہ ملت ابراہیمی میں صرف چار چیزیں حرام تھیں اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت کے مدعی ہیں اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے واسطے سے وہ بھی اپنا تعلق ملت ابراہیمی سے جوڑتے ہیں حالانکہ ان میں کئی اور چیزیں بھی حرام تھیں۔ تورات اب بھی جن کا ذکر کرتی ہے اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ پہلی یہ بات کہ قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ ساری چیزیں جو شریعت محمدی میں حلال ہیں وہ بنی اسرائیل کیلئے بھی حلال تھیں البتہ ان میں سے بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں تورات کے نازل کئے جانے سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے محض اپنے ذوق یا اپنی کسی بیماری کے باعث اپنے اوپر ممنوع کر لیا تھا یعنی ان کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ لیکن یہودی فقہاء نے بعد میں مستقلاً ان اشیاء کو حرام ٹھہرا لیا اور پھر تورات میں باقاعدہ اس کو شامل کر دیا گیا ان اشیاء میں اونٹ' خرگوش اور سافان شامل تھے۔ دوسری بات یہ کہ بعض چیزیں یہود پر ان کی سرکشی کے باعث حرام کی گئی تھیں چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اس بات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۴۶ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَا اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ O ''اور جو یہودی ہوئے ان پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کئے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو یہ ہم نے

Marfat.com

ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی اور ہم بالکل سچے ہیں''۔

یہود پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بعض جانور حرام کر دیئے گئے:

تورات کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہود کی قوم تاریخ کے مختلف ادوار اور مختلف انبیاء و رسل کی بعثت کے زمانے میں مختلف حالات سے گزری ہے اور اس نے زمانے کے تلخ اور شیریں گھونٹ برابر پیئے ہیں اور ان کی تاریخ عروج و زوال کی ایک عبرت خیز اور دلچسپ داستان ہے۔ لیکن ایک بات جو برابر ان کی زندگی کے حالات سے سامنے آتی ہے وہ اللہ کے احکام کے سلسلے میں ان کی سرکشی ہے۔ وہ اللہ کے نبیوں پر ایمان بھی لاتے رہے لیکن جب بھی انکو موقع ملا بار بار ان سے سرکشی کا اظہار ہوا اسلئے قدرت کی طرف سے وہ متعدد دفعہ جزوی عذابوں کا شکار ہوئے۔ کئی دفعہ اللہ کا عتاب ان پر برسا اور انکو راہ راست پر چلانے کیلئے بعض دفعہ انہیں سخت احکام بھی دیئے گئے۔ انہی احکام کے سلسلے میں اس آیت میں ان محرمات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو بطورِ خاص یہود پر حرام تھے۔ لیکن آیت کے آخری حصے میں صاف بتلا دیا گیا ہے کہ یہ احکام ان کی اصل شریعت کا حصہ نہیں تھے بلکہ انکی اصل شریعت تو شریعت محمدی ہی کا عکس تھی۔ البتہ! یہ جو سخت احکام ان میں آئے یہ انکی سرکشی کو کنٹرول کرنے کیلئے تھے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں ان پر حرام کی گئیں۔ وہ اس وجہ سے نہیں تھیں کہ فی نفسہٖ ان چیزوں کے اندر حرمت کی کوئی علت موجود تھی بلکہ انکی حرمت میں اصل دخل بنی اسرائیل کے فسادِ مزاج کو تھا جس طرح ایک طبیب بسا اوقات کسی مریض کو ایک جائز و طیب چیز کے استعمال سے بھی روک دیتا ہے کہ اس سے اسکی صحت جسمانی کو ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اخلاقی فساد کے سبب سے سزا کے طور پر بہت سی جائز چیزیں بھی ان پر حرام ٹھہرا دی تھیں۔ اس اخلاقی فساد کو قرآن کریم نے اس آیت میں بغی کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جسکے معنی سرکشی کے ہیں بنی اسرائیل کی اس سرکشی کا ذکر تورات اور انبیاء کے صحیفوں میں اس کثرت سے آیا ہے کہ آدمی پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جسکو انہوں نے بخوشی قبول کیا ہو جو حکم بھی انکو دیا گیا اول تو انہوں نے اپنے سوال در سوال کی کثرت ہی سے اس کو نہایت بوجھل بنا دیا جسکی ایک مثال سورۃ البقرہ میں گائے کی قصے میں گزر چکی ہے۔ پھر اسکو مانا بھی تو اس سے گریز و فرار کی اتنی راہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکال لیں کہ عملاً وہ حکم ان کیلئے بالکل بے اثر ہو کر رہ گیا۔ ان کے اس فرار پسندانہ اور باغیانہ مزاج کا اثر قدرتی طور پر ان کی شریعت پر بھی پڑا جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا پر حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کو نہایت سخت قوانین میں باندھا۔ جن کو قرآن میں اصر و اغلال یعنی بندھن اور طوق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ توارت میں اسرائیلی شریعت کے احکام پڑھیئے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دوسری چیزوں سے قطع نظر صرف طہارت ہی کے احکام پڑھیے اور دیکھیے کہ حیض، نفاس، جنابت اور بعض بیماریاں مثلاً جریان اور برص وغیرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں ان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے۔ تو آدمی کا رواں رواں اس رب کا شکر گزار ہوتا ہے جس نے ہمیں ملت اسلام کی ہدایت بخشی جو ان تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے پاک ہے۔ کھانے پینے کے باب میں بھی صرف وہی بندشیں نہیں تھیں جو بیان ہوئیں یہ بندشیں تو صرف چوپایوں کی حلت و حرمت کے متعلق بیان ہوئی ہیں اس سے زیادہ پابندی پرندوں اور دریائی جانوروں کے معاملے میں تھی۔ احبار باب ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جانوروں میں سے جن کے پر اور چھلکے ہیں وہ ان کے ہاں جائز تھے باقی سب حرام تھے۔ اسی طرح پرندوں میں سے صرف شکاری پرندے ہی حرام نہیں تھے بلکہ قاز، بط اور بگلے وغیرہ بھی حرام تھے۔

اس آیت کریمہ میں چندان محرمات کا ذکر کیا گیا ہے جو یہود پر بطور خاص حرام کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو ایسے جانور ہیں جو ناخن رکھتے ہیں اور دوسری چیز جانوروں کی چربی۔ جہاں تک تعلق ہے ناخن والے جانوروں کا اس کا مفہوم سمجھنے کیلئے تورات کی تصریحات کو دیکھنا ضروری ہے۔ انکی

Marfat.com

سامنے رکھیں تو اس کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ہاں چوپایوں میں سے صرف وہ چوپائے حلال تھے جن کے پاؤں چرے ہوئے ہوں اور وہ جگالی بھی کرتے ہوں۔ اس روشنی میں ذِیْ ظُفُرٍ یعنی ناخن والے جانور کا مفہوم متعین کیا جائے تو اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سُم کی شکل میں بالکل بند البتہ ان کے سامنے کے حصے پر ناخن ہیں۔ یہود پر اس طرح کے تمام جانور جیسا کہ کُل کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے علی الاطلاق حرام تھے۔ اس وجہ سے ان پر بعض وہ جانور بھی حرام ہو گئے جو ملت ابراہیمی میں جائز تھے مثلاً اونٹ اور خرگوش وغیرہ۔ دوسری چیز جو ان پر حرام کی گئی وہ ناخن والے جانوروں کی چربی تھی تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ہر قسم کی چربی مراد ہے لیکن تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو چربی گوشت کے جز کی حیثیت رکھتی ہو۔ کمر' آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح شامل ہو کہ اس کو با آسانی الگ نہ کیا جا سکے اس کا کھانے والوں پر حرام کرنا یقیناً ایک ایسی سختی ہے جس کا انسانوں کیلئے تحمل بہت مشکل ہے اور عقل سے بھی بعید ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے احکام نہیں دیئے ہوں گے یہ تشدد یہود کے کاہنوں اور فقیہوں نے اپنی طرف سے بڑھایا ہوگا اور یہ اس تشدد پر ایک مزید اضافہ ہے' جو ان کی شریعت میں پہلے بھی کچھ کم نہ تھا۔ اسلئے قرآن کریم نے اس کی اصلاح کرتے ہوئے اور اصل حکم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان پر ہم نے جو چربی حرام کی تھی وہ' وہ نہیں تھی جو کمر' آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح لگی ہوئی ہو کہ با آسانی ان کو الگ نہ کیا جا سکے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''ہم بالکل سچے ہیں'':

آخر میں فرمایا کہ ہم نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اسلئے کہ ہم نہایت راست باز اور سچے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو سچے کہنا اور اس پر زور دینا بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن جب اس کے پس منظر کو دیکھا جائے تو پھر اس کی بلاغت اور حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حلت و حرمت کے باب میں مشرکین عرب نے جو زیادتیاں کیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی اس خاص صفت میں اپنے شرکاء کو انہوں نے شریک کیا اور ان کے مذہبی رہنما جس طرح بار بار اس حرم کی تقدیس کو پامال کرتے رہے وہ تاریخ مذہب کا نہایت اندوہناک باب ہے پھر انہی کی طرح اہل کتاب نے تاریخ کے مختلف ادوار میں جس طرح اللہ کی نازل کردہ کتابوں میں تحریف اور ترمیم کی اور جس طرح حرام کو حلال اور حلال کو حرام میں تبدیل کیا اور جس طرح بعض ایسی چیزیں محرمات میں شامل کر دی گئیں جو اللہ کی جانب سے نازل نہیں ہوئیں ان تمام باتوں کی تردید اور اس کی اصلاح کیلئے ضروری ہے کہ اصلاح کرنے والا پوری طرح اپنی حیثیت کا اظہار کرے تاکہ حدود سے تجاوز کے نتیجے میں غلط بیانی اور دروغ گوئی کی جو خاک اڑائی گئی ہے اور جس طرح حقیقت کا چہرہ بگاڑ دیا گیا ہے اسکی اصلاح ممکن ہو سکے اور کہنے والا چیلنج کے انداز میں نہایت تحکم سے یہ بات کہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ میرا پروردگار کہہ رہا ہے اور میرے پروردگار کی کہی ہوئی باتوں اور اسکے احکام میں کبھی جھوٹ یا شک کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اسلئے قرآن کریم میں اور بھی کئی جگہ پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے؟ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بسنے والے انسانوں میں مفادات کے زیر اثر یا دباؤ کے تحت سچ کی پوری پاسداری کرنا بعض دفعہ بہت مشکل ہو جاتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کو ایسی کوئی مشکل یا ایسی کوئی مصلحت درپیش نہیں' اسلئے وہاں سے جو بھی بات آتی اور جو حکم نازل ہوتا ہے اس کی صداقت اور قطعیت میں کوئی کلام نہیں ہوتا۔ اسلئے اب اس حلت و حرمت کے حوالے سے بھی جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس میں سچ کے سوا کسی اور بات کو ہرگز دخل نہیں کیونکہ ہم سب سے بڑھ کر سچے ہیں۔

اب ذرا پلٹ کر ایک نگاہ ان چند آیات پر پھر ڈال لیجئے کہ جس میں سب سے پہلے حلت و حرمت کے حوالے سے مشرکین عرب اور ضمنی طور پر اہل کتاب کی گمراہیوں اور حدود سے تجاوزات کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد عقلی اور فطری دلائل دیتے ہوئے ان کی غلطی کو واضح کیا اور یہ بات سمجھائی

Marfat.com

کہ کسی چیز کو حلال یا حرام کہنا جائز یا ناجائز قرار دینا اس ذات کی صفت ہے جو خالق' مالک اور حاکم حقیقی ہے۔ اس کی مخلوقات میں سے کسی کو ہرگز یہ حق نہیں دیا جا سکتا۔ اس بنیاد پر دلیل کی عمارت اٹھاتے ہوئے اللہ کی پیدا کردہ مختلف نعمتوں کا ذکر فرمایا اور بطور خاص وہ نعمتیں ذکر فرمائی گئیں جن پر انسانی زندگی گزر بسر کا دارومدار ہے اور پھر ان جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے جن کیلئے انسان شدید قسم کی احتیاج رکھتا ہے۔ چونکہ حلت وحرمت کی گمراہی کا زیادہ تر تعلق جانوروں سے رہا ہے اسلئے ایک ایک جانور کا نام لے لے کر جو عرب میں معروف بھی تھے اور ان کی ضرورتوں میں مستعمل بھی۔ سوال کیا گیا کہ بتاؤ آ ان جانوروں میں سے مذکر اور مونث سمیت کون سا حلال ہے اور کون سا حرام اور اگر یہ مذکر اور مونث حلال ہیں تو پھر ان کا پھل یعنی ان کی اولاد یقیناً بھی حلال ہوگی۔ یہی عقل اور فطرت کا فتویٰ ہے' لیکن اگر تم اس سے مختلف رائے رکھتے ہوئے حلت وحرمت کا کوئی الگ فیصلہ کرتے ہو' بتاؤ اس کی سند ہے؟ کسی صحیفہ آسمانی کی گواہی پیش کرو یا اور کوئی دلیل لاؤ جس کو اہل علم اور اہل عقل قبول کر سکیں؟ اس کے بعد نہایت تحقیقی انداز اور ہمدردی کے لب و میں فرمایا کہ تم حلال وحرام کردہ جانوروں کے بارے میں ہمیشہ ملت ابراہیمی کا حوالہ دیتے ہو ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ ملت ابراہیمی میں کون سے جانور تھے۔ اس کے بعد ایک ضمنی سوال جو ممکن ہے مشرکین کی طرف سے اٹھایا گیا ہو اس کا جواب دیا۔ سوال یہ تھا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ملت ابرا میں جو جانور حلال کئے تھے وہ صرف یہی چار ہیں' جبکہ یہود پر تو اور چیزیں بھی حرام کی گئیں چنانچہ اس بات کی حقیقت واضح کی گئی اور بتلایا کہ ان پر جو چیزیں حرام ہوئیں یا تو ان کی اپنی حرام کردہ چیزیں تھیں اور یا ان کی سرکشی کے باعث یہ سخت احکام ان پر نازل ہوئے ان تمام باتوں کی وضاحت ہو کے بعد بحث کا کوئی گوشہ تشنہ باقی نہیں رہتا جو آدمی کفر کی محبت یا عصبیت جاہلی میں بالکل اندھا نہ ہو گیا ہو اس کیلئے یہ ممکن نہیں کہ اس قدر وضاحت بعد بھی وہ بات کو نہ سمجھے۔ اسلئے اگلی آیت کریمہ میں ان سے صاف صاف وہ بات فرمائی جا رہی ہے جو ایسی صورت حال میں کہی جانی چاہئے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۴۷ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ "پس اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرموں سے ٹالا نہ جا سکے گا"۔

مشرکین اور بنی اسرائیل کو دھمکی:

اس آیتِ کریمہ میں مشرکین اور بنی اسرائیل کو صاف صاف دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم اس بحث کے تمام گوشوں کے واضح ہو جانے کے بعد بھی راہ راست اختیار نہیں کرتے ہو اور تم برابر اللہ کے آخری رسول کو جھٹلاتے ہو تو پھر یاد رکھو تمہارا انجام اچھا نہیں ہوگا تمہیں غلط فہمی یہ ہے کہ تم نے اب تک جو کچھ کیا اس پر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تم پر زمین پھٹ جاتی یا آسمان سے تم پر پتھر برستے' لیکن جب تمہاری کسی طرح بھی گرفت نہیں ہوئی تو تم یہ سمجھ بیٹھے کہ تمہیں شاید کوئی پکڑ نہیں سکتا اور یا جو کچھ تمہیں اللہ کا رسول کہہ رہا ہے اس کی شاید کوئی حقیقت نہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تمہارا معاملہ اگر کسی عام بادشاہ سے ہوتا تو تم بہت پہلے تباہ کر دیئے جاتے' تمہارا سابقہ اس خداوند ذوالجلال سے ہے جو صاحب جلال ہوتے ہوئے بھی پکڑنے میں کبھی جلدی نہیں کرتا وہ جس قوم کی طرف اپنے رسول کو بھیجتا ہے اسے آخری حد تک مہلت دیتا ہے اور اس بات کا انہیں موقع بہم پہنچاتا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو بدلنا چاہیں تو انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ وہ ہزار اذیتیں پہنچاتے ہیں لیکن پیغمبر اللہ کے حکم سے برابر ان کی ایک ایک بات کا جواب دیتا اور ایک ایک شبے کو دور کرتا ہے اور پھر گاہے گاہے پیغمبر سے معجزات کا صدور بھی ہوتا ہے تا کہ ان کو یہ یقین لانے میں آسانی رہے کہ یہ شخص عام انسانوں جیسا نہیں بلکہ یہ اللہ کا بندہ اور رسول ہے' اس کا انکار کرنے والے روز بروز انکار میں شدت پیدا کرتے چلے جاتے ہیں' لیکن وہ پھر بھی انہیں مہلت پہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے بلکہ وہ

Marfat.com

(او)ر حکمران نہیں کہ اسے پکڑنے کی جلدی ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ ہوسکتا ہے میرے یہ دشمن طاقتور ہو کر میری طاقت کی حدود سے نکل جائیں' لیکن (ا)ے قریش اور اے اہل کتاب تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ مہلت بہرحال مہلت ہے یہ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گی اس سے اللہ کی پکڑ میں کچھ تاخیر (ہوس)کتی ہے لیکن اس سے اسکی وہ سنت باطل نہیں ہو جاتی ہے جو مجرموں کی پکڑ کیلئے اس نے ٹھہرا رکھی ہے۔ اسلئے جب اس کی سنت کے ظہور کا وقت آئے گا (ک)سی کے ٹالے نہیں ٹلے گا۔ اسلئے عقل کی بات یہ ہے کہ اللہ نے محض اپنی رحمت سے تمہیں ڈھیل دے کر جو سنبھلنے کا موقع دیا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ اور (اس) کے عذاب کو دعوت نہ دو کیونکہ

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

.... ﷲ ...... ﷲ ...... ﷲ ....

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا
جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے

أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ
اور نہ ہمارے باپ دادا (شرک) کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح اُن لوگوں نے تکذیب کی تھی

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ
جو اُن سے پہلے تھے یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزہ چکھ کر رہے۔ کہہ دو کیا تمہارے پاس کوئی سند ہے

عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا
(اگر ہے) تو اُسے ہمارے سامنے نکالو۔ تم محض خیال کے پیچھے چلتے اور اٹکل کے تیر

تَخْرُصُونَ ﴿١٤٨﴾ قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ
چلاتے ہو۔ کہہ دو کہ خدا ہی کی حجت غالب ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت

أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ
دے دیتا۔ کہو کہ اپنے گواہوں کو لاؤ جو بتائیں کہ خدا نے یہ چیزیں حرام کی ہیں پھر اگر وہ

حَرَّمَ هَٰذَا ۖ فَإِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ
(آکر) گواہی دیں تو تم اُن کے ساتھ گواہی نہ دینا اور نہ اُن لوگوں کی خواہشوں

Marfat.com

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ

کی پیروی کرنا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور (بتوں کو) اپنے پروردگار

بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا

کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ کہہ کہ (لوگو) آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے پروردگار نے

تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ

تم پر حرام کی ہیں (ان کی نسبت اس نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے) کہ کسی چیز کو خدا کا شریک نہ بنانا۔ اور ماں باپ (سے بدسلوکی نہ

اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ

کرنا بلکہ) سلوک کرتے رہنا اور ناداری (کے اندیشے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا کیونکہ تم کو اور ان کو ہمیں رزق دیتے ہیں اور بےحیائی کے

مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ

کام ظاہر ہوں یا پوشیدہ ان کے پاس نہ پھٹکنا اور کسی جان (والے) کو جس کے قتل کو خدا نے حرام کر دیا ہے قتل نہ کرنا۔ مگر جائز طور پر (یعنی جس کا

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

شریعت حکم دے) ان باتوں کا وہ تمہیں ارشاد فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

تمہید:

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ مشرکین عرب نے حلت و حرمت کے حوالے سے جو بدعات ایجاد کی تھیں اور جس طرح اللہ کا یہ حق اپنے لئے اور اپنے نام نہاد شرکاء کیلئے مباح کر لیا تھا پروردگار نے مسلسل اس پر تنقید فرمائی اور اس سلسلے میں جو مشرکین یا اہل کتاب کی طرف سے سوالات اٹھائے گئے یا اشتباہات پیدا کیے گئے اس کا جواب اس طرح مسکت انداز میں دیا گیا کہ مشرکین تقریباً بےبس ہو کر رہ گئے اور پھر ساتھ ہی ساتھ انہیں تنبیہ بھی کی گئی کہ تم پر جو ابھی تک اللہ کا عذاب نہیں آیا تو اسے اپنے لئے پروانہ اباحت نہ سمجھو بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ڈھیل ہے' جو تمہیں دی گئی ہے۔ اب پیش نظر آیت میں مشرکین کی طرف سے آخری معارضہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ایک ایسا بےبس آدمی کیا کرتا ہے کہ جب وہ دلائل سے تہی دامن ہو جاتا ہے۔ تو اپنی انا اور ضد سے باز نہیں آتا اور یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے مجھے راہ راست اختیار نہیں کرنا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

<u>آیت:۱۴۸-۱۴۹</u> سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ○ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ "جنہوں نے شرک کیا' وہ کہیں گے! اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔ اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے بھی' جو ان سے پہلے گزرے' یہاں تک کہ انہوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ پوچھو! تمہارے پاس ہے اس کی کوئی سند کہ تم اس کو ظاہر کر سکو۔ تم محض گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہو۔ کہہ دو کہ اللہ تو

Marfat.com

بس حجت ہے پہنچ جانے والی اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا''۔

مشرکین نے کہا کہ اگر ہمارا اور ہمارے آباؤ اجداد کا رویہ اللہ کو ناپسند ہوتا تو وہ ہمیں روک دیتا:

مشرکین مکہ جب دلائل کے میدان میں بے بس ہو گئے تو آخری بات انہوں نے یہ کہی کہ آپ جو ہمارے مشرکانہ رویے پر اعتراض کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنی طرف سے اللہ کے شرکاء بنا رکھے ہیں اور بہت ساری چیزوں کو ان کی طرف منسوب کر کے انہیں حرام اور حلال کر لیا ہے سوال یہ ہے کہ اگر ہمارا یہ مشرکانہ رویہ اور یہ ہمارا حلال وحرام کرنا غلط ہے تو اللہ ہمیں اس سے روک کیوں نہیں دیتا۔ اس میں یہ طاقت ہے وہ جس کام سے چاہے روک دے اور جو کام چاہے لے لے یہ رویہ ہم نے آج اختیار نہیں کیا بلکہ ہمارے آباؤ اجداد بھی ایسا ہی کرتے رہے۔ صدیوں سے ہم یہ طرز عمل اختیار کر چکے ہیں لیکن اللہ نے ہمیں اس سے کبھی نہیں روکا اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اور ہمارے آباؤ اجداد کی یہ روش یقیناً اللہ کو پسند ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم ایسا ہی کریں اگر وہ نہ چاہتا تو یا ہمیں اس سے روک دیتا یا ہمیں اس کی سزا دیتا۔ ان کی اس جاہلانہ بات کے سلسلے میں چند باتیں ان آیات میں فرمائی گئی ہیں۔ پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ مشرکین مکہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ جو آج ہمارا رویہ ہے یہی رویہ ہمارے آباؤ اجداد کا بھی تھا۔ اللہ نے نہ انہیں روکا نہ ہمیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ایسا ہی چاہتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان سے پہلے شرک کرنے والوں کا رویہ بھی یہی رہا ہے اور وہ اپنے رویے کی تائید میں ایسی ہی بے سروپا باتیں کرتے رہے، جیسی یہ کرتے ہیں۔ لیکن ایک حقیقت ہے، جس کو یہ چھپا رہے ہیں اور یا شاید انہیں معلوم نہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کے رویے نے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ بالآخر نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے اس زمین پر ان کے گردوپیش میں معذب قوموں کی بستیاں پھیلی ہوئی ہیں اور وہی تاریخ میں ان سے پہلے گزرنے والی قومیں ہیں، ان کے کھنڈرات صاف گواہی دے رہے ہیں کہ ان پر اللہ کے رسول آئے اور انہوں نے مسلسل ان کو راہ راست دکھانے کی کوشش کی۔ انہیں شرک سے روکا اور ہر طرح سے ان کو غلطیوں سے بچانا چاہا۔ لیکن جب وہ اپنے طرز عمل سے باز نہ آئے تو بالآخر اللہ کا عذاب ان پر ٹوٹا اور وہ تباہ کر دیئے گئے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ ان کی تاریخ سے عبرت حاصل کریں اور اپنے رویے کی اصلاح کریں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ بڑی ڈھٹائی سے اپنے رویے کے ساتھ ساتھ اپنے آباؤ اجداد کا اس طرح تذکرہ کر رہے ہیں گویا ان کے مشرکانہ رویے نے شاید ان کا کچھ نہیں بگاڑا حالانکہ یہ قوم شعیب، قوم لوط اور قوم عاد سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کی قومیں ہیں اور انہی کی اولاد میں سے ہیں ان کی طرف انبیاء و رسل آئے اور وہ اپنے زمانے اور اپنے نسب کے اعتبار سے مشرکین عرب کیلئے آباؤ اجداد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا انجام ان کے سامنے ہے یہ اپنے تجارتی اسفار میں ان کے علاقوں سے گزرتے بھی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ ان سے عبرت پکڑتے اور اپنے مشرکانہ رویہ سے توبہ کرتے لیکن جب اللہ کسی کے دل پر مہر لگا دیتا ہے تو اس کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

مشرکین سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم کہتے ہو کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں صحیح ہے تو اس کی سند لاؤ:

دوسری بات جو اس سلسلے میں فرمائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اے مشرکین مکہ تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ اگر ہمارا مشرکانہ رویہ غلط ہوتا اور شرک کوئی برائی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے روک دیتا۔ لیکن اس نے ہمیں اس سے نہیں روکا بلکہ ہم مسلسل شرک کا ارتکاب کرتے چلے آ رہے ہیں اور وہ روکنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی ہمیں اس سے نہیں روک رہا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم ایسا ہی کریں اور جب وہ ایسا چاہتا ہے تو ہم تو اس کے بے بس

Marfat.com

بندے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی چاہت کی مخالفت کرسکیں۔ اب اگر شرک کوئی برائی ہے تو پھر ہمارا اس میں کیا قصور ہے کیونکہ ہم نے تو اللہ کے چاہنے سے ایسا کیا اس کے جواب میں یہاں فرمایا جارہا ہے کہ اللہ کس بات کو چاہتا ہے اور کس بات کو نہیں چاہتا۔ اس کے جاننے کا طریقہ یہ نہیں کہ یہ دیکھا جائے کہ لوگ کیا کررہے ہیں اور لوگ جس طرح کے اعمال کررہے ہوں اسے اللہ کی مشیت اور اس کی مرضی سمجھ لیا جائے۔ اگر خدانخواستہ اس کی مشیت اور مرضی کا یہ مفہوم ہے پھر یہ تو ایک ایسی دلیل ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی حماقت کے جواز میں پیش کی جاسکتی ہے۔ ہر ظالم ظلم کرتے ہوئے اور ہر بدمعاش بدمعاشی کرتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ مجھے ایسا کرنے سے پروردگار نے نہیں روکا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ یہی چاہتا ہے کہ میں ایسا ہی کروں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی یہ زمین برائیوں اور گناہوں سے بھر جائے، ظلم اور فساد یہ سمجھ کے کیا جائے کہ اللہ کی مشیت اور مرضی یہی ہے۔ اس لئے یہاں فرمایا جارہا ہے کہ اے پیغمبر! انہیں یہ کہیئے کہ اللہ کی پسند یا ناپسند معلوم کرنے کا ذریعہ تمہاری اپنی زندگی اور تمہارے اپنے اعمال نہیں ہیں کہ تم جو کچھ کرگزرو وہ عنداللہ ثواب بن جائے اس کیلئے کسی علمی سند کی ضرورت ہے اس لئے اگر تمہارے پاس ایسا کوئی علم ہے جس سے معلوم ہو کہ تم جو کچھ کررہے ہو اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے اور یا اللہ اس سے راضی ہے تو اسے ہمارے سامنے پیش کرو اور ایسے علم کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ نے انسان کو جو عقل سلیم اور فطرت صحیحہ عطا فرمائی ہے وہ اس بات کی گواہی دے کہ واقعی جو کچھ ہم کررہے ہیں یقیناً اللہ اس سے راضی ہے کیونکہ اگر اللہ اس سے راضی نہ ہوتا تو ہماری عقل سلیم اور ہماری فطرت کبھی اس کی تائید نہ کرتی۔ دنیا میں کوئی برائی ایسی نہیں ہے عقل عام جس کا ادراک نہ کرسکے۔ ہاں اگر کسی معاشرے میں برائی کا چلن اس قدر عام ہوجائے کہ نیکی کا وجود آہستہ آہستہ دم توڑ جائے اور اس معاشرے کا رہنے والا ایک ایک فرد بالآخر نیکی کے احساس سے محروم ہوکر برائی ہی کو نیکی سمجھنے لگے تو ایسے معاشرے میں تو یقیناً عقل اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہے ورنہ عام طور پر عقل اور فطرت نیکی کا احساس اور برائی کی شناخت رکھتی ہیں۔ یہاں بھی جو لوگ برائی کے اس خطرناک حملے سے محفوظ رہے ہیں ان کی فطرت اور ان کی عقل سے پوچھا جارہا ہے کہ ان کے پاس اگر اس مشرکانہ رویے کے جواز کا کوئی علم ہے تو وہ اسے پیش کریں۔ علم کی دوسری صورت یہ ہے کہ جن مقدس شخصیات کو وہ اپنی رہنما یا اللہ کے نبی اور رسول کے طور پر مانتے ہیں۔ ان کے حوالے سے قابل اعتبار ذرائع کے ذریعے یہ ثابت کریں کہ انہوں نے ان کے رویے کے مطابق کوئی اللہ کا حکم ان کیلئے چھوڑا ہوا ان کا کوئی صحیفہ ان کے پاس ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ جو کچھ کررہے ہیں واقعی اللہ نے اس کی انہیں اجازت دی ہے اور اگر یہ علم کی دونوں صورتیں نہ ہوں تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں وہ سوائے اٹکل پچو اور ظن وتخمین کے اور کچھ نہیں۔ یہاں مشرکین مکہ سے یہی کہا جارہا ہے کہ علم نام کی کسی چیز سے تم واقف نہیں۔ تمہاری زندگی کے تمام فیصلے سراسر ظن وتخمین پر مبنی ہیں۔ خالص ظن تو دنیوی معاملات میں بھی بھروسہ کے لائق نہیں ہوتا دینی معاملات تو اپنے اندر بہت نزاکت رکھتے ہیں۔ اس میں تو کوئی بات محض اندازے سے نہیں کہی جاسکتی۔ ہر بات کیلئے وحی الٰہی کی سند کی ضرورت ہوتی ہے اور مشرکین مکہ چونکہ وحی الٰہی سے بالکل بے بہرہ تھے اس لئے وہ دینی معاملات میں بھی ظن وتخمین ہی سے کام لیتے تھے اور یہی ان کی گمراہی کا بڑا سبب تھا۔

تیسری بات یہاں یہ فرمائی جارہی ہے کہ اے مشرکین مکہ تم تو علمی دنیا سے بالکل بے بہرہ لوگ ہو تمہارے پاس دلیل نام کی کوئی چیز نہیں۔ اس لئے اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ یہاں چونکہ دلیل ہی کارآمد ہوتی ہے اور اٹکل پچو تو سراسر گمراہی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے جہاں تک دلیل کا تعلق ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے اور وہ دلیل بھی ایسی ہے جو دلوں میں اتر جانے والی ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے اور قرآن کریم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے شرک کی تردید اور توحید کے اثبات میں جو کچھ فرمایا ہے ان میں ایک ایک دلیل دلوں میں اتر جانے والی ہے۔ ان میں دلائل آفاق بھی ہیں اور دلائل انفس بھی جن کا ذکر قرآن کریم میں بھی کیا گیا ہے اور خود ہمارے گردوپیش میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک دلیل ایسی ہے کہ اگر آدمی اپنے قلب وضمیر

Marfat.com

کے دروازے اس کے سامنے بند نہ کرے تو وہ دل میں اترے بغیر نہیں رہتی اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ دلیل تو صرف اللہ کے پاس ہے جو اس نے اپنے رسول کے ذریعے بندوں تک پہنچا دی ہے اور مراد اس سے قرآنِ کریم ہے جو اپنی ذات اور اپنے مندرجات میں دلائل کا ایک ایسا خزانہ ہے کہ جس کی موجودگی میں مزید کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اللہ جبر کا طریقہ اختیار نہیں کرتا:

چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی جارہی ہے کہ اللہ کا قانون جو پیچھے کئی دفعہ بیان ہو چکا یہ نہیں کہ وہ لوگوں کو زبردستی کسی راستے پر چلنے کیلئے مجبور کرے بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس نے ہدایت کو بھی کھول کر بیان کر دیا ہے اور ضلالت کو بھی۔ صحیح بات کو بھی واضح کر دیا گیا ہے اور غلط کو بھی۔ پھر لوگوں کو آزادی دے دی گئی ہے کہ تم چاہو تو ہدایت کا راستہ اختیار کرو اور چاہو تو گمراہی کا۔ جو راستہ بھی اختیار کرو گے ہم اس کے امکانات پیدا کر دیں گے اور ایک خاص حد تک ہم تمہیں اس پر چلنے کی اجازت دے دیں گے۔ اگر تم نیکی کا راستہ اختیار کرو گے تو نیکی کے راستے پر چلنے کیلئے آسانیاں مہیا کریں گے' اپنی تائید و نصرت سے نوازیں گے' دنیا میں بھی سرفراز کریں گے اور آخرت میں بھی سرخرو کریں گے اور اگر برائی اور گمراہی کا راستہ اختیار کرو گے تو اپنی عالمگیر مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہم جس حد تک مناسب سمجھیں گے اس کیلئے بھی امکانات پیدا کر دیں گے۔ لیکن صحیح راستہ اختیار کرنے پر ہم اجر و ثواب سے نوازیں گے اور غلط راستہ اختیار کرنے پر دنیا اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ اس کا قانون ہے ہدایت و ضلالت کے سلسلے میں جس کے مطابق وہ دنیا میں بندوں سے معاملہ کر رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی آدمی غلط راستے پر چل رہا ہے اور اللہ اسے اس راستے پر نہ صرف کہ چلنے سے روکتا نہیں بلکہ اسے چلنے کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اس پر راضی بھی ہے۔ وہ راضی تو انہی باتوں پر ہے جنہیں اس نے اپنے پیغمبروں کے واسطے سے اپنی کتابوں کے ذریعہ واضح کر دیا ہے۔ رہی یہ بات کہ برے راستے پر چلنے والے کو وہ روکتا نہیں تو یہ اصلاً اس کا وہ قانون ہے جسے قانونِ مشیت کہہ لیجئے جس کے مطابق اس نے انسانوں کو خیر اور شر کی آزادی دے رکھی ہے اور اسی میں انسانیت کا امتحان ہے۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ جبر اور طاقت سے بندوں کو کسی راستے پر چلنے پر مجبور کرتا ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اسے توحید پسند ہے یا شرک' اسے اسلام پسند ہے یا کفر۔ یقیناً وہ توحید اور اسلام کو پسند کرتا ہے۔ اس صورت میں اگر اسے جبر ہی کرنا تھا تو پھر وہ سب کو اسلام پر چلنے کیلئے مجبور کرتا اور دنیا میں کوئی آدمی مسلمان ہوئے بغیر نہ رہتا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ جب بھی اللہ کے پیغمبر دنیا میں اسلام کی دعوت لے کر آئے ہیں انہیں قدم قدم پر دشواریاں پیش آئی ہیں اور آج بھی دنیا میں اسلام کی نسبت کفر کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کہیں بھی جبر کا طریقہ پسند نہیں فرمایا۔ اس نے انسانوں کو اختیار دے کر ان کا امتحان لیا ہے کہ دیکھتے ہیں وہ کونسا راستہ پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت کے آخری ٹکڑے میں یہی بات فرمائی گئی ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا چونکہ اس نے سب کو ہدایت نہیں دی اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زبردستی ہدایت دینا پسند نہیں کرتا تو جب بالجبر اس نے ہدایت دینا پسند نہیں کیا تو وہ تم سے زبردستی شرک کیسے کروا سکتا ہے تو پھر تمہارا یہ کہنا کہ ہم تو اللہ کے جبر کا شکار ہیں۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم شرک کریں اور ان کے طیبات کو حرام کریں۔ اس لئے ہم ایسا کر رہے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم محض ایک عذرِ باطل سے کام لے رہے ہو جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کے بعد اگلی آیت کریمہ میں اسی سلسلے کی آخری بات فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہوا:

آیت:۱۵۰ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ

Marfat.com

اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَھُمْ بِرَبِّھِمْ یَعْدِلُوْنَ O ''کہو! لاؤ اپنے ان گواہوں کو جو شاہد ہیں کہ اللہ نے فلاں چیز حرام ٹھہرائی ہے۔ پس اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دیجیو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے، جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں''۔

اگر مشرکین کے حمایتی گواہی دے بھی دیں تو آپ ﷺ ان کی پیروی نہ کریں:

اب مشرکین مکہ سے یہ آخری بات کہی جا رہی ہے عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی آدمی اپنی کسی غلط بات پر اڑ جاتا تو اس کا مخاطب اسے یہ کہتا کہ تم میری کسی دلیل کو مان کے نہیں دے رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنی بات پر بے حد یقین ہے تو پھر میرا مطالبہ یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ بالکل صحیح ہے۔ عربوں کے یہاں چونکہ جھوٹی گواہی بڑا عیب سمجھا جاتا تھا خاص طور پر ذمہ دار لوگ اس سے بہت بچتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ گواہی اصل میں انسان کی پوری شخصیت کا امتحان ہے اور اس طرح اسے اپنی پوری شخصیت داؤ پر لگانا پڑتی ہے۔ اس لئے وہ حتی الامکان جھوٹی گواہی دینے سے بچتے تھے۔ اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تم دینی معاملات میں جن لوگوں کی پیروی کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں صحیح راہنمائی دے رہے ہیں تو انہیں پکڑ کے لاؤ وہ سب لوگوں کے سامنے گواہی دیں کہ جن جن چیزوں کو انہوں نے حرام کر رکھا ہے اور جن جن چیزوں کا حصہ انہوں نے بعض بعض کیلئے مخصوص کر رکھا ہے واقعی ان چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے اور اللہ ہی نے ان میں خصوصیت پیدا کی ہے۔ بہت امکان ہے کہ وہ گواہی اور شہادت کی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے یہ جسارت کرنے کی ہمت نہ کریں۔ لیکن اگر وہ اس حد تک ڈھٹائی پر اتر آئیں کہ ایک چیز کو غلط سمجھتے ہوئے بھی اس کی شہادت دینے کو تیار ہو جائیں تو آنحضرت ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان کی اس گواہی کو تسلیم مت کریں بلکہ آپ اپنی دعوت و شہادت پر جمے رہیں اور ان لوگوں کی خواہشات و بدعات کی پرواہ نہ کریں۔ یہاں ان کی بدعات کو اَھْوَآء کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے اس لئے کہ جس چیز کے حق میں نہ کوئی نقلی دلیل ہو نہ عقلی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کے اختیار کرنے والوں کی خواہش ہی پر مبنی ہو سکتی ہے اور جن کی راہنما ان کی خواہش ہو ان کے انجام کے بارے میں پیش گوئی کرنے کیلئے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں اور مزید یہ بات بھی کہ جن لوگوں سے یہاں گواہی کا مطالبہ کیا گیا ہے ان کی تین صفات بھی بیان کی گئی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ایسے لوگوں سے بڑی سے بڑی برائی کی بھی توقع کی جا سکتی ہے اور ان کیلئے بڑا سے بڑا جھوٹ بولنا بھی کبھی مشکل نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر یہ لوگ اپنے غلط رویے کے بارے میں بھی شہادت دینے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں تو یہ چنداں تعجب خیز نہیں ہونا چاہئے۔ ان کی پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے۔ آیات سے مراد آیاتِ خداوندی بھی ہو سکتی ہے اور آیات قرآنی بھی۔ جہاں تک آیات خداوندی کا تعلق ہے وہ تو اس کائنات کے ذرے ذرے میں دکھائی دیتی ہیں۔ خود انسان کا ایک ایک رونگٹا اللہ کی نشانی ہے۔ انسان کا سراپا اس کی شخصیت، اس کے اعضاء و جوارح، اس کے دل و دماغ کی قوتیں، اس کے نفسی احساسات، اس کی قوت واہمہ اور متخیلہ، اس کے انفعالی جذبات، اس کی فعلی قوتیں، ان میں سے کونسی چیز ہے جو اللہ کے وجود پر دلالت نہیں کرتی۔ جو بلید و غبی انسان یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اللہ کی توحید کی بجائے شرک کا رویہ اختیار کرتا ہے اس سے آخر کسی خیر کی توقع کیسے ہو سکتی ہے اور اگر اس سے آیات قرآنی مراد لی جائے تو تب بھی بات واضح ہے کہ قرآن کریم نے بار بار مشرکین مکہ کو چیلنج کیا ہے کہ اس قرآن جیسی ایک آیت ہی بنا کر لے آؤ اور جن جن کو اپنی مدد کیلئے بلا سکتے ہو سب کو بلا لاؤ۔ لیکن مشرکین عرب اسلام سے انتہائی دشمنی کے باوجود اس چیلنج کو قبول نہ کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود آیات قرآنی کا یہ کہہ کر انکار کرتے رہے کہ ہم اسے اللہ کی وحی ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

Marfat.com

مشرکین مکہ آخرت کے منکر تھے اس لئے برائی کرنے سے نہیں ڈرتے تھے:

ان کی دوسری صفت جو بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ مجھے مر کر فنا نہیں ہو جانا بلکہ ایک دن دوبارہ زندہ بھی ہونا ہے اور پھر قیامت کے دن اللہ کے سامنے حاضری ہوگی۔ وہاں زندگی اور زندگی کے ایک ایک عمل کے بارے میں جواب دہی کرنی پڑے گی اور اگر میں اس میں سرخرو نہ ہو سکا تو ہمیشہ کا عذاب میرے انتظار میں ہوگا۔ وہ کبھی بھی اپنے رویے پر غور کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ کبھی اس کی زندگی میں سنجیدگی نہیں آ سکتی' وہ کبھی اپنے مقصد زندگی میں یکسو نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ذہن میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آخر میں اپنی خواہشات نفس کی بجائے کسی اور کی پیروی کیوں کروں۔ یہ مشرکین عرب اسی لئے سنجیدگی سے دعوت اسلامی کو نہیں لیتے تھے اور کسی برائی کرنے سے نہیں چوکتے تھے کیونکہ انہیں آخرت کا یقین نہیں تھا۔ ایسے لوگ اگر غلط شہادت دینے کیلئے تیار ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

وہ شرک کرتے تھے:

تیسری صفت ان کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں کسی بھی شخص کی گمراہی کی یہ انتہاء ہے کہ اللہ جو خالق' رازق اور مالک ہے اور جس کی وحدانیت پر کائنات کا ایک ایک ذرہ گواہ ہے۔ آدمی اس کا رزق بھی کھائے اور پھر اس کا ہمسر بھی ٹھہرائے اور یہ خیال کرے کہ اس کائنات میں اللہ جیسی اور قوتیں بھی ہیں۔ ایسی حرکت وہی شخص کر سکتا ہے جو شرافت کی آخری حد سے بھی گر گیا ہو اور جس میں انسانیت کا نام تک باقی نہ رہا ہو تو یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ چونکہ اس طرح کے عقائد رکھتے ہیں اور اس معاملے میں اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں۔ اسلئے ان سے کسی بھی برائی کی توقع رکھنا بعید از قیاس نہیں اسلئے اگر یہ اتنی واضح ہدایات اور اتنے مضبوط دلائل کے بعد بھی یہ بات سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہوتے تو اے پیغمبر آپ کو ہرگز پریشان نہیں ہونا چاہئے۔

سلسلۂ کلام جہاں تک پہنچ چکا ہے اور مشرکین مکہ کی تین صفات بیان کر کے جس طرح ان پر فرد جرم عائد کر دی گئی ہے اس کے بعد تو یوں لگتا ہے کہ اب ان پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور آنحضرت ﷺ کو ہجرت کا حکم دے دیا جائے گا۔ لیکن اللہ کے کرم کا کیا کہنا کہ بجائے ان پر عذاب بھیجنے اور ان کی محرومی کا فیصلہ کرنے کے سلسلۂ کلام کو مزید آگے بڑھایا جا رہا ہے اور ان سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنی نادانی سے چند طیبات کو محرمات میں تبدیل کر کے اور اللہ کے حلت و حرمت کے حق کو اپنے اور اپنے نام نہاد شرکاء کیلئے مباح کر کے یہ سمجھ رہے ہو کہ یہ ملت ابراہیمی ہے حالانکہ اس کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم اس سے پہلے یہ بات بتا چکے ہیں کہ ملت ابراہیمی میں جو چیزیں حرام کی گئی تھیں وہ صرف چار تھیں۔ مردار' دم مسفوح' خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر نامزد کیا ہوا جانور۔ لیکن عجیب بات ہے کہ تم ان سب کو اپنے لئے حلال سمجھتے ہو۔ مزید برآں اللہ اور بندوں کے حقوق و معاملات سے متعلق بہت سی چیزیں اللہ نے حرام کی تھیں تم نے ان کو اختیار کر رکھا ہے۔ آؤ ہم تمہیں اب بتاتے ہیں کہ وہ کیا کیا چیزیں تھیں جو تمہارے رب نے حرام کی تھیں چنانچہ اب اس رکوع میں انہی چیزوں کو بیان کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۵۱ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ "کہو! آؤ میں سناؤں' جو چیزیں تم پر تمہارے رب نے حرام کی ہیں' وہ یہ ہیں کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو' ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی اور

Marfat.com

بے حیائی کے کاموں کے پاس نہ پھٹکو' خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا' اس کو قتل نہ کرو' مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں ہدایت فرمائی ہے' تاکہ تم سمجھو'۔

غلط فہمی کی وضاحت:

میں اس سے پہلے یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ قرآن پاک کا اسلوب یہ ہے کہ جس بات کو اہمیت کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اسے قُلْ کہہ کر آنحضرت ﷺ سے بیان کروایا جاتا ہے حالانکہ پورا قرآن کریم آنحضرت کی زبان ہی سے ادا ہوا ہے لیکن کسی خاص حکم کیلئے ''قُلْ'' کہنا یہ اس کو اہمیت دینے پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی جن جن چیزوں کو بیان کرنا مقصود ہے اسے لفظ ''قُلْ'' سے شروع کیا جارہا ہے۔ مزید اس میں اہمیت کی بات یہ ہے کہ قُلْ کے بعد تَعَالَوْا کا استعمال ہوا ہے تَعَالَوْا کا معنی ہے آؤ' حالانکہ جنہیں حضور یہ آیات پڑھ کے سنا رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہی تو ہیں انہیں کہنا کہ آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کے سناؤں جنہیں اللہ نے حرام کیا ہے یہ عجیب سی بات لگتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف عربی زبان ہی میں نہیں بلکہ ہر زبان میں خطاب اور گفتگو کے جو طریقے مروج رہے ہیں ان میں یہ طریقہ بھی ہر زبان میں آج بھی رائج ہے کہ جب کسی مخاطب کو کسی بات کی طرف اہمیت دلانا مقصود ہوتا ہے اور یا متکلم یہ چاہتا ہے کہ میں اپنی بات کو مخاطب کے ذہن میں اتار دوں تو وہ اسے آؤ کہہ کے مخاطب کرتا ہے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ تم جس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہو یا جس حقیقت سے تم واقف نہیں ہو آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ حقیقت کیا ہے یا وہ حقیقت کتنی عظیم ہے یہاں بھی شاید یہی مقصود ہے۔ اس آیت کریمہ میں پانچ چیزوں کو بیان کیا گیا ہے جنہیں اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ پیشتر اسکے کہ میں انہیں بیان کروں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک بات عرض کردوں جو اگر ذہن میں رہے تو ایک غلط فہمی سے بچا جاسکتا ہے۔ جو اس رکوع کے مطالعہ سے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے وہ غلط فہمی یہ ہے کہ یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہیں لیکن اس کے بعد پورے رکوع میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سب کو حرف نہی کی بجائے یعنی منفی انداز میں بیان کرنے کی بجائے ان میں سے بعض کو مثبت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً شرک' قتلِ اولاد' فحشا' قتل نفس اور اکل مال یتیم کا ذکر تو منفی پہلو سے ہے اور والدین کے ساتھ احسان' ایفائے کیل و میزان' قول وعمل میں اہتمام عدل اور ایفائے عہد الٰہی کا ذکر مثبت اسلوب سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی کا استنباط ایک بدیہی چیز ہے۔ جب ایک شئے کا اثباتی انداز میں حکم ہے تو اس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ جو چیز اس کی ضد ہے اس کی لازماً ممانعت ہے۔ اسی طرح ایک چیز کی ممانعت ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ اس کا مقابل پہلو مطلوب ہے یعنی اگر شرک کی نہی ہے تو توحید مطلوب ہے اسی طرح اگر والدین کے حقوق کی ادائیگی کا حکم ہے تو ان کے ساتھ بدسلوکی اور ان کی نافرمانی حرام ہے' اس اسلوب کی روشنی میں وہ تمام باتیں جو بیان تو ہوئی ہیں اثبات کے الفاظ میں لیکن ہیں وہ ''حَرَّمَ'' ہی کے تحت اس مثبت اسلوب کو اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں ان باتوں کو بھی نمایاں کرنے کا موقع مل جاتا ہے جو محض نہی کے انداز میں حرام کرنے سے نمایاں نہ ہوتیں۔ مختصر یہ کہ اس طرح سے ان آیات میں دس چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو حرام ٹھہرائی گئی ہیں' وہ یہ ہیں۔

حرام کردہ چیزیں:

1- اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت واطاعت میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ 2- والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرنا۔ 3- فقر وافلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینا 4- بے حیائی کے کام کرنا۔ 5- کسی کو ناحق قتل کرنا۔ 6- یتیم کا مال ناجائز طور پر کھا جانا۔ 7- ناپ تول میں کمی کرنا۔ 8- شہادت یا فیصلہ

Marfat.com

میں بے انصافی کرنا۔ 9-اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا نہ کرنا۔ 10-اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کرنا۔

اس سے پہلے کہ ہم ان میں سے ایک ایک کی وضاحت کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احادیث میں یا صحابہ کرام سے ان آیات کے جو فضائل منقول ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر کر دیں۔ حضرت کعب احبار ﷺ جو ایک یہودی عالم تھے اور حضرت عمر فاروق ﷺ کے زمانے میں مسلمان ہوئے وہ کہا کرتے تھے کہ قرآن مجید کے یہ احکام وہ ہیں جن سے تورات کا آغاز ہوتا ہے اور مزید یہ کہ یہی وہ دس احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتھر کی تختیوں پر لکھ کر دیئے گئے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ یہی وہ آیات محکمات ہیں جن کا ذکر سورۃ ال عمرآن میں آیا ہے اور جن پر آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں متفق رہی ہیں ان میں سے کوئی چیز کسی مذہب وملت اور کسی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئی۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کا ایسا وصیت نامہ دیکھنا چاہے جس پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہو تو وہ ان آیات کو پڑھ لے۔ ان میں وہ وصیت موجود ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم سے اس امت کو کی۔

حاکم نے بروایت حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے بتایا۔ کون ہے جو مجھ سے تین آیتوں پر بیعت کرے۔ پھر یہی تین آیتیں تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس بیعت کو پورا کرے گا اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہو گیا۔

ان محرمات وممنوعات کی فہرست میں سب سے پہلی چیز جس کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ شرک کی ممانعت ہے۔ یعنی نہ خدا کی ذات میں کسی کو اس کا شریک ٹھہراؤ' نہ اس کی صفات میں' نہ اس کے اختیارات میں اور نہ اس کے حقوق میں۔

شرک کی ممانعت:

ذات میں شرک یہ ہے کہ جوہر الوہیت میں کسی کو حصہ دار قرار دیا جائے۔ مثلاً نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث' مشرکین عرب کا فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینا اور دوسرے مشرکین کا اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے شاہی خاندانوں کو جنس آلہہ کے افراد قرار دینا۔ یہ سب شرک فی الذات ہیں۔

صفات میں شرک یہ ہے کہ خدائی صفات جیسی کہ وہ خدا کیلئے ہیں' ویسا ہی ان سب کو یا ان میں سے کسی صفت کو کسی دوسرے کیلئے قرار دینا۔ مثلاً کسی کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس پر غیب کی ساری حقیقتیں روشن ہیں یا وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے یا وہ تمام نقائص اور تمام کمزوریوں سے منزہ اور بالکل بے خطا ہے۔

اختیارات میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے جو اختیارات صرف اللہ کیلئے خاص ہیں ان کو یا ان میں سے کسی کو اللہ کے سوا کسی اور کیلئے تسلیم کیا جائے۔ مثلاً فوق الفطری طریقے سے نفع وضرر پہنچانا' حاجت روائی ودستگیری کرنا' محافظت ونگہبانی کرنا' دعائیں سننا اور قسمتوں کو بنانا اور بگاڑنا۔ نیز حرام وحلال اور جائز وناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کیلئے قانون وشرع تجویز کرنا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کیلئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر خدا کے جو مخصوص حقوق ہیں۔ ان میں سے کوئی حق خدا کے سوا کسی اور کیلئے مانا جائے۔ مثلاً رکوع وسجود' دست بستہ قیام' سلامی وآستانہ بوسی' شکر نعمت یا اعتراف برتری کیلئے نذر ونیاز اور قربانی' قضائے حاجات اور رفع مشکلات کیلئے منت' مصائب ومشکلات میں مدد کیلئے پکارا جانا اور ایسی ہی پرستش وتعظیم وتمجید کی دوسری تمام صورتیں اللہ کے مخصوص حقوق میں سے ہیں۔ اسی طرح کسی کا

Marfat.com

ایسا محبوب ہونا کہ اس کی محبت پر دوسری سب محبتیں قربان کی جائیں اور ایسا مستحق تقویٰ وخشت ہونا کہ غیب وشہادت میں اس کی ناراضی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی سے ڈرا جائے' یہ بھی صرف اللہ کا حق ہے اور یہ بھی اللہ ہی کا حق ہے کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور اس کی ہدایت کو صحیح وغلط کا معیار مانا جائے اور کسی ایسی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈالا جائے جو اللہ کی اطاعت سے آزاد ایک مستقل اطاعت ہو اور جس کے حکم کیلئے اللہ کے حکم کی سند نہ ہو۔ ان حقوق میں سے جو حق بھی دوسرے کو دیا جائے گا وہ اللہ کا شریک ٹھہرے گا خواہ اس کو خدائی ناموں سے کوئی نام دیا جائے یا نہ دیا جائے۔

توحید چونکہ پورے دین کی بنیاد اور تمام احکام کی اساس ہے اس لئے یہاں سب سے پہلے شرک جو توحید کی ضد ہے اس کی ممانعت اور حرمت کو بیان فرمایا گیا ہے اور اس بارے میں قرآن کریم کے احکام اس قدر سخت اور واضح ہیں کہ صاف صاف فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو کسی بھی گناہ اور معصیت اور برائی کو بخش دے گا لیکن وہ شرک کو کبھی نہیں بخشے گا۔ اس لئے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو ساجھی قرار نہ دینا اگرچہ تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں یا تمہیں سولی پر چڑھا دیا جائے یا تمہیں زندہ جلا دیا جائے۔

جو اکابر اولیاء اس امت کیلئے مرجع خلائق کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں ایک بڑا مشہور نام حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ لوگوں نے اپنی جہالت سے ان کی طرف عجیب وغریب باتوں کا انتساب کر رکھا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے توحید کے اثبات اور شرک کی مذمت میں جتنا کام کیا ہے کم ہی لوگوں نے اتنا کام کیا ہوگا۔ آپ اس بارے میں اس قدر سخت اور محتاط واقع ہوئے تھے کہ وہ باتیں جن پر عمل کرنا نہ ہمارے لئے ممکن ہے اور نہ ضروری ہے آپ ان پر بھی عامل تھے اور اپنے بچوں کو بھی اس کی وصیت فرماتے تھے۔ اپنے بڑے صاحبزادے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ "بیٹے اگر تمہیں بکری کی مینگنی کی بھی ضرورت پڑے تو وہ بھی اللہ کے سوا کسی اور سے نہ مانگنا" حالانکہ اسباب کی دنیا میں ایک دوسرے سے مدد مانگنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا ہمارا روز کا معمول ہے اور اس میں شرعی طور پر کوئی قباحت بھی نہیں لیکن حضرت شیخ جیلانی چونکہ لوگوں کیلئے رہنما اور نمونہ تھے اسلئے آپکی زندگی عزیمت کی زندگی تھی اور آپ ان باتوں سے بھی بچتے تھے جن باتوں سے بچنا ہمارے لئے ضروری نہیں۔ لیکن ان کی اس بات سے یہ ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک جس معمولی بات سے بھی اللہ کے ساتھ شرک کا شبہ بھی ہو سکتا ہو وہ اس سے بھی بچتے اور پرہیز کرتے تھے۔

والدین کی نافرمانی منع ہے:

دوسری بات جس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے وہ ماں باپ کی نافرمانی ہے۔ لیکن یہاں اسکو منفی اسلوب سے بیان نہیں کیا گیا بلکہ مثبت اسلوب اختیار کرتے ہوئے فرمایا: والدین کیساتھ حسن سلوک کرو اور یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ جب والدین کیساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو انکے ساتھ بدسلوکی اور نافرمانی خود بخود حرام ہو جائے گی۔ لیکن منفی اسلوب کی بجائے یہ مثبت اسلوب اسلئے اختیار کیا گیا کہ منفی اسلوب میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو مثبت اسلوب سے کہنا مقصود ہے۔ اگر صرف یہ فرمایا جاتا کہ ماں باپ کی نافرمانی نہ کرو تو کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ میں ماں باپ کی نافرمانی تو نہیں کرتا لیکن اسکا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ان کے ساتھ حسن سلوک بھی کروں۔ کیونکہ حسن سلوک احکام کی نافرمانی سے بچنے سے ایک زائد تر چیز ہے۔ ایک آدمی اپنے ماں باپ کی لازمی ضرورتیں ماں باپ کے کہنے پر پوری کر دیتا ہے۔ لیکن نہ انکے پاس بیٹھتا ہے' نہ ان کے پاؤں دباتا ہے' بیمار ہو جاتے ہیں تو تیمارداری نہیں کرتا' اپنے دل میں ان کیلئے کوئی محبت نہیں رکھتا' اپنے بچوں پر انہیں ترجیح نہیں دیتا اور اپنے لئے انہیں عقیدت ومحبت کا مرکز نہیں سمجھتا تو وہ یقیناً اللہ کے یہاں ماخوذ ہوگا کیونکہ جہاں اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کی نافرمانی کو حرام قرار دیا ہے وہیں انہیں متذکرہ بالا چیزوں کا بھی حکم دیا ہے اور ان کے مقام ومرتبہ کا لحاظ رکھنے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ باپ کی رضامندی کو اللہ کی رضامندی اور باپ کی ناراضگی کو اللہ کی ناراضگی ٹھہرایا گیا ہے اور ماں کے قدموں کے نیچے جنت بتائی گئی

Marfat.com

ہے اور قرآن کریم میں بالعموم جہاں بھی اپنی عبادت کا حکم دیا گیا وہاں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا بھی حکم دیا اور جہاں یہ بات فرمائی گئی کہ میں نے چونکہ تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہاری زندگی کی ساری ضرورتیں پوری کی ہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ تم میرا شکر ادا کرو وہیں والدین کا شکر ادا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے بلکہ سورۃ بنی اسرائیل میں اس بات کو کھول کر بیان فرما دیا گیا ہے اور اس میں صرف والدین کی نافرمانی ہی کو حرام نہیں قرار دیا گیا بلکہ حسن سلوک کے ان تمام گوشوں کو بے نقاب کر دیا گیا ہے جن کا لحاظ رکھنا اولاد کیلئے ضروری ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہاں صرف نافرمانی کی ممانعت کی جاتی اور حسن سلوک کا حکم نہ دیا جاتا تو یہ پوری تفصیل کسی طرح سے ہمیں معلوم نہ ہو سکتی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بنی اسرائیل میں حسن سلوک کا حکم دینے کے بعد خود اس کی وضاحت بھی فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝

''اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نہ عبادت کرو مگر اسی کی اور والدین کے ساتھ احسان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان سے اظہار بیزاری ہو نہ ان کو جھڑکنا۔ ان سے سعادت مندانہ بات کرنا اور ان کیلئے مہر و وفا کے بازو جھکائے رکھنا اور دعا کرنا کہ اے ہمارے رب! تو ان پر رحم فرما' جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں مہر کے ساتھ پالا''
(بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

یوں تو والدین اولاد کے بالغ ہو جانے کے بعد اولاد کیلئے محبت و احترام اور حسن سلوک کے مستحق ہیں لیکن جب خاص طور پر ان پر بڑھاپا آتا ہے تو اب وہ اپنی کمزوری کے باعث اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے اہل نہیں رہتے۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ اولاد ان کی ضرورتوں کا بوجھ اٹھائے اور مزید یہ بات کہ جیسے جیسے والدین بڑھاپے کے اثرات کا شکار ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی متاثر ہونے لگتی ہیں اب بعض دفعہ وہ ایسی باتیں بھی کہیں گے جو عقل و خرد سے ہٹی ہوئی ہوں گی اور بعض دفعہ اپنی کمزوری کے باعث انہیں وقت بے وقت غصہ بھی آئے گا اور وہ چڑچڑے پن کا اظہار بھی کریں گے اور ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ ایک ہی بات کو بار بار دھرائیں جس سے سننے والے کو بعض دفعہ غصہ بھی آنے لگتا ہے۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں ان کے بڑھاپے کا ذکر فرمانے کے بعد خاص طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ دیکھنا انہیں اُف نہ کہنا۔ یعنی ان کی کسی بات پر بیزاری کا اظہار نہ کرنا اور اگر کوئی بات ان کی ناگوار بھی معلوم ہو تو کبھی ان کو جھڑکنے کی کوشش نہ کرنا بلکہ ان کی سخت سے سخت بات پر بھی نہایت نرم لہجے کے ساتھ سعادت مندی سے ان سے بات کرنا اور مہر و وفا کے بازو ان کے سامنے جھکائے رکھنا۔ ان میں سے ایک ایک بات غور کرنے اور پلے باندھنے کے لائق ہے۔ عام اولاد بالعموم تعلیم یافتہ نوجوان بالخصوص ان پڑھ اور بوڑھے ماں باپ کے پاس بیٹھنے اور انہیں وقت دینے سے احتراز کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے کھانے پینے کی ضرورتیں پوری کر دینے کے بعد وہ شاید اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئے ہیں حالانکہ بڑھاپے میں کھانے پینے کی ضرورت تو کم ہو جاتی ہے البتہ جس چیز کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی ان کی دلجوئی کرنے والا ہو' کوئی پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرے' چونکہ وہ کہیں آجا نہیں سکتے اس لئے گھر ہی میں سمٹ رہنے کی وجہ سے وہ اپنی اولاد سے زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اسی لئے شاید رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی محبت سے اپنی والدین کے پاس بیٹھے اور محبت سے ان کے چہرے کو دیکھے تو اللہ تعالیٰ اسے عمرہ کرنے سے بڑھ کر اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔ کیونکہ

Marfat.com

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے یہی والدین کی اس وقت سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ ہماری اولاد ہمیں وقت دے اور ہمارے پاس بیٹھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اولاد کا والدین کے پاس بیٹھنا مشکل بھی ہوتا ہے اور بعض دفعہ ناگوار بھی لیکن اجر وثواب تو انہی ناگواریوں کی برداشت پر ہی ملتا ہے۔ والدین بعض دفعہ بچوں کی طرح ایک ہی بات کو بار بار پوچھتے ہیں اور بچے چڑنے لگتے ہیں لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جب وہ بچے تھے تو ان کے ماں باپ یہ سب کچھ نہایت محبت سے نہ صرف برداشت کرتے تھے بلکہ اس پر خوش بھی ہوتے تھے۔ ایک صاحب بوڑھے ہوگئے اور ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر جوان ہوا اور ایک بڑے منصب پر فائز ہوگیا ایک روز کوٹھی کے لان میں اپنے والد کے پاس بیٹھا تھا کہ سامنے دیوار پر کوا آ کر بیٹھ گیا والد نے پوچھا بیٹے یہ کیا ہے؟ بیٹے نے ابا جان یہ کوا ہے۔ والد نے پھر پوچھا بیٹے نے پھر وہی جواب دیا۔ جب والد نے بار بار اپنے سوال کا تکرار کیا تو بیٹا تنگ آ کر برہمی کا اظہار کرنے لگا۔ اس کے والد اٹھے اور اپنے کمرے سے پرانی ڈائری نکال کر لائے اس کا ایک صفحہ نکال کر اپنے بیٹے کو پڑھنے کیلئے دیا اس میں لکھا تھا کہ آج میرا بیٹا ماشاءاللہ اڑھائی سال کا ہوگیا ہے اب وہ توتلی زبان میں باتیں کرتا ہے آج دیوار پر ایک کوا آ کر بیٹھا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ ابا جان یہ کیا ہے میں نے بتایا کہ یہ کوا ہے۔ بیٹے نے یہی سوال تقریباً ستر دفعہ کیا اور میں ہر دفعہ اس کو جواب دیتا رہا اور ہر جواب پر میری خوشی میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہ صفحہ جب بیٹا پڑھ چکا باپ نے کہا کہ بیٹے میں تو تیرے ستر دفعہ سوال کرنے پر بھی برہم نہ ہوا اور تم میرے سات دفعہ سوال کرنے پر برہم ہوگئے۔ اسلئے اس آیت کے آخر میں والدین کی تربیت کا حوالہ دیا گیا ہے کہ تم بھی اپنے والدین کیساتھ اسی طرح محبت سے پیش آؤ جیسا تمہارے والدین نے محبت سے تمہیں پالا تھا۔ اولاد والدین کا یہ رشتہ چونکہ گھر اور خاندان کی بنیاد ہے اور اسلام میں چونکہ خاندان سیاسی نظام کی بنیاد ہے اسلئے اس تعلق پر اور اسکی استواری پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس حوالے سے لاپرواہی اور بے نیازی اختیار کرنے پر سخت وعید فرمائی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رَغِمَ اَنْفُهٗ رَغِمَ اَنْفُهٗ رَغِمَ اَنْفُهٗ ''ذلیل ہوگیا' ذلیل ہوگیا' ذلیل ہوگیا'' صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کون ذلیل ہوگیا؟ فرمایا وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے ایک کو بڑھاپے کے زمانے میں پایا اور پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے کے زمانہ میں والدین کی خدمت سے جنت کا ملنا یقینی اور بڑا محروم اور ذلیل ہے وہ شخص جس نے اتنی سستی جنت کو ہاتھ سے کھو دیا۔ سستی اسلئے کہ والدین جو اولاد پر طبعی طور سے خود ہی مہربان ہوتے ہیں وہ ذرا خدمت سے بہت خوش ہو جاتے ہیں اور انکا خوش رکھنا کسی بڑی محنت کا طالب نہیں ہوتا تو جب ایک معمولی عمل سے جنت مل سکتی ہے تو خود ہی اندازہ فرمائیے کہ یہ جنت کسقدر سستی ہوئی اور اسکا حاصل نہ کرنا کس قدر محرومی کی بات ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی اپنی بدنصیبی یا لاپرواہی کے باعث والدین کی خدمت سے محروم رہتا ہے۔ اللہ کا بے حد کرم ہے کہ اللہ نے ہمیں اس کی تلافی کا بھی موقع دیا۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی اپنے والدین کا نافرمان رہا لیکن ان کی وفات کے بعد اگر وہ مسلسل اپنے والدین کیلئے مغفرت و درجات کی بلندی کیلئے دعا کرتا رہے اور اپنی محرومی کی معافی بھی مانگتا رہے تو ایک نہ ایک دن اللہ تعالیٰ اسے فرمانبرداروں میں شامل فرما دے۔

مفلسی کے خوف سے اولاد کو قتل نہ کرو:

تیسری چیز جس کو اللہ نے اس آیت میں حرام ٹھہرایا ہے وہ ہے تنگ دستی کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینا یعنی اس اندیشہ سے اولاد کو قتل کر دو کہ اولاد کیا کھائے گی' کہاں سے اس کی پرورش ہوگی' اہل عرب میں قتل اولاد کی ایک قسم تو وہ تھی جس کا تعلق مشرکانہ توہمات سے تھا' جس کا ذکر اسی سورۃ میں پیچھے گزرا ہے۔ دوسری صورت بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی تھی جس کا سبب غیرت کا ظالمانہ حد تک غلو تھا۔ تیسری یہ فقر و فا...

Marfat.com

اندیشے کی صورت تھی۔ بعض غریب لوگ تنگ دستی سے گھبرا کر یہ سنگ دلانہ حرکت کر بیٹھتے۔ اس قسم کی لرزہ خیز خبریں اب بھی کبھی کبھی ان ملکوں سے آجاتی ہیں جن میں غربت زیادہ ہے یا جہاں کسی ناگہانی آفت سے لوگ مصائب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس ظلم کا اصل باعث انسان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنا اور اپنی اولاد اور متعلقین کا روزی رساں سمجھ بیٹھتا ہے۔ حالانکہ ہر شخص کو وجود اور رزق خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ انسان ان چیزوں میں واسطہ اور ذریعہ ہونے سے زیادہ دخل نہیں رکھتا۔ اگر کسی کو خدا نے اولاد بخشی ہے تو اصلاً وہ اس کی تحویل میں خدا کی امانت ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ عقل و فطرت اور شریعت کی رُو سے اس امانت سے متعلق اس پر جو ذمہ داریاں اور جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ اپنے امکان کی حد تک ادا کرے لیکن ایک لحہ کیلئے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ خدا نے اس کو ان کا رزاق بنایا ہے اور جس رزق سے وہ پلتے ہیں وہ یہ ان کو فراہم کرتا ہے۔ ان کا رزق تو درکنار آدمی اپنا رزق بھی خدا ہی سے پاتا ہے۔ بچہ ماں کی چھاتی سے جو دودھ پیتا ہے یہ بھی ماں کا دیا ہوا نہیں بلکہ اپنے رب کا دیا ہوا پیتا ہے۔ تو جب بچہ اپنے رب کا دیا ہوا دودھ پیتا ہے تو کسی دوسرے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو اس اندیشہ سے قتل کرے کہ میں اس کی پرورش کہاں سے کروں گا؟ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں سمجھایا ہے کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَ اِيَّاهُمۡ "ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی روزی دیتے ہیں"۔

افراد کی طرح بعض اوقات حکومتیں بھی اپنے دائرہ اختیار اور اپنے فطری و شرعی حدود کار سے متجاوز ہو کر ان حدود میں مداخلت کرنے لگتی ہیں جو قدرت کے حدود ہیں۔ اس تعدی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خلق کیلئے کوئی مفید کام کرنے کی جگہ وہ اپنی صلاحیتیں نظام قدرت سے زور آزمائی میں صرف کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک فرض شناس حکومت کیلئے یہ بات تو معقول ہے کہ وہ اپنے ملک کے وسائل معاش کو ترقی دینے کیلئے بر و بحر کے ایک ایک چپہ اور ایک ایک گوشے کو چھان ڈالے اور اس راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے۔ یہ بات بھی اس کے فطری بلکہ شرعی فرائض میں سے ہے کہ وہ ملک کے عوام کو زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ وہ پبلک ہو یا پرائیویٹ، اجتماعی ہو یا خاندانی احتیاط اعتدال کفایت شعاری صحت صفائی اور محنت کی تربیت دے۔ لیکن یہ امر بالکل اسکے دائرہ اختیار اور حدود کار سے باہر ہے کہ وہ یہ منصوبہ بندی کرے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا غلہ پیدا کریں گے اور اسی حساب سے اتنے بچوں کو پیدا ہونے دیں گے اور اگر کسی ناخواندہ مہمان نے ہماری نپی روٹی اور گنی بوٹی میں حصہ دار بننے کی کوشش کی تو ہم اپنی سائنسی تدبیروں سے کام لے کر اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملے میں جو غلط فہمی عرب جاہلیت کے سنگدلوں کو لاحق ہوئی تھی اسی غلط فہمی کا شکار اس زمانے کی متمدن حکومتیں ہو رہی ہیں۔ انہیں بھی خدا پر غصہ تھا کہ جب وہ بھرپور روٹی نہیں دے رہا ہے تو دمبدم اولاد میں کیوں اضافہ کئے جا رہا ہے؟ یہ غصہ وہ اولاد کو قتل کر کے نکالتے تھے۔ اس زمانے کے متمدن انسان کو بھی یہ برہمی ہے کہ ابھی جب اپنے ہی معیار زندگی کو ہم اپنے مطلوبہ معیار پر نہ پہنچا سکے تو دوسروں کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر کس طرح اٹھالیں؟ اس برہمی یا گھبراہٹ میں انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیم بنا ڈالی۔ شکلیں ذرا بدلی ہوئی ہیں، عرب اجڈ اور گنوار تھے اس وجہ سے انہوں نے ایک ناتراشیدہ اور بھونڈی سی شکل اختیار کی، موجودہ زمانے کا انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اس لئے اس نے ایک خوبصورت سی شکل اختیار کی ہے اور نام بھی اس کا اس نے پیارا سا ڈھونڈ نکالا ہے لیکن فلسفہ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ انہوں نے بھی رزاق اپنے کو سمجھا اور یہ بھی رزاق اپنے کو سمجھے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ رزاق اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن نے عربوں پر تو ان کی غلطی واضح کر دی اور وہ یہ بات سمجھ بھی گئے، مان بھی گئے لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے جنوں کو کون سمجھائے اور کون قائل کرے!!

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ اولاد کے ظاہری اور جسمانی قتل کے بارے میں ہے لیکن اولاد کا ایک قتل معنوی اور روحانی بھی ہے وہ یہ کہ ماں باپ

Marfat.com

اولاد کو تربیت نہ دینے یا غلط تربیت کے نتیجے میں ایسی زندگی کا خوگر کر دیں جس میں اللہ رسالت اور آخرت پر ایمان اسلامی اخلاق اور اسلامی آداب کا دور دور تک پتہ نہ ہو وہ بے خدا تہذیب کا پرستار بے خدا تمدن کے تحت زندگی گزارنے والا نفسانی شہوات کا خوگر اور محض معدے کی ضروریات کی بجا آوری کیلئے پوری زندگی کے سرمائے کو جھونک دینے والا بن جائے تو یہ اس کی اخلاقی روحانی اور معنوی موت ہے جو جسمانی موت سے بھی ابتر ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کیلئے مردہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جسمانی موت تو ایک آنی وفانی تکلیف ہے جو آئی اور گزر گئی اور پسماندگان کو ایک صدمہ دے گئی جو وقت کے ساتھ ساتھ بھول جائے گا۔ لیکن ایسا بظاہر زندہ شخص جو حقیقت میں مردہ ہے اور جس میں معنوی اخلاقی اور روحانی زندگی بالکل نہیں وہ تو اپنے معاشرے کیلئے ایک ناسور بن جاتا ہے۔ اگر معاشرہ صالح ہو تو وہ اس سے جان چھڑانے یا اس کی موت کی آرزو کرتا ہے۔ اسلئے جو لوگ اپنی اولاد کی تربیت اسلامی اصولوں کے مطابق اور اسلامی مقاصد کے تحت نہیں کرتے وہ درحقیقت اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں۔ جس طرح ظاہری طور پر اولاد کو قتل کرنا جرم ہے اور کل کو اللہ کے یہاں اس کی بازپرس ہوگی اسی طرح معنوی اور اخلاقی طور پر بھی اولاد کو قتل کرنا یہ بھی ویسا ہی جرم ہے یقیناً اس کے بارے میں بھی اللہ کے یہاں پوچھا جائے گا اور جس شخص نے بھی جان بوجھ کر اپنی اولاد کو بگاڑا ہوگا وہ یقیناً بدترین سزا کا مستحق ہوگا اور جس نے محض غفلت کی وجہ سے اولاد کے بگاڑ کی فکر نہ کی ہوگی وہ بھی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ اسلئے ایک مسلمان معاشرے کو اس بات کی فکر کرنی چاہیئے کہ اگر مسلمان امت کو باقی رکھنا ہے تو اس میں قتل اولاد کا جرم نہ ہونے پائے اور اگر امت مسلمہ کی اسلامی زندگی کو باقی رکھنا ہے تو اس میں اسلامی تربیت کا ایسا انتظام ہونا چاہئے جسکے نتیجے میں ایک صالح نسل تیار ہو۔

فواحش کے قریب مت جاؤ:

اس آیت کریمہ میں چوتھی چیز جسے حرام کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ فواحش کے قریب مت جاؤ خواہ وہ اعلانیہ ہوں یا پوشیدہ۔ فواحش فاحشہ کی جمع ہے اور فحش، فحشا اور فاحشہ سب مصدر ہیں۔ اس کا اطلاق عام طور پر ایسے افعال پر ہوتا ہے جن کی برائی بالکل واضح ہو۔ قرآن میں زنا عمل قوم لوط برہنگی جھوٹی تہمت اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو فحش افعال میں شمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں چوری اور شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو من جملہ فواحش کہا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے تمام شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں۔ لیکن یہاں کھلی بے حیائی کے معنی میں استعمال ہوا ہے دلیل اسکی یہ ہے کہ یہ تمام احکام سورۃ بنی اسرائیل میں بھی بیان ہوئے ہیں اور وہاں اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَآءَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً ط وَسَآءَ سَبِيلًا

''اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے'' (بنی اسرائیل: ۳۲)

یہاں زنا کو فاحشہ فرمایا گیا ہے اور زیر بحث آیت میں اسی فاحشہ کی جمع فواحش استعمال ہوئی ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں اس سے مراد وہ کھلی ہوئی بے حیائیاں ہیں جن کا رشتہ زنا سے ملتا ہے۔ لیکن اس بے حیائی سے روکتے ہوئے یہ نہیں فرمایا کہ اس کا ارتکاب نہ کرنا بلکہ یہ فرمایا کہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکنا اور اس کے قریب نہ جانا یعنی مطلب اس کا یہ ہے کہ یہ برائی اس قدر خطرناک ہے کہ اس کے دواعی اور محرکات بھی نہایت مہلک ہیں جو بہت دور سے انسانوں پر اپنی کمند پھینکتے ہیں اور پھر اس طرح اس کو گرفتار کر لیتے ہیں کہ ان سے چھوٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی برائیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے میں آدمی کو کامیابی صرف اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنی نگاہ اپنی زبان اور اپنے دل کی پوری حفاظت کرے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آنکھ بھی زنا کرتی ہے ہاتھ بھی زنا کرتا ہے قدم بھی زنا کرتے ہیں پھر آخری عمل اس کی تائید یا تکذیب کر دیتا ہے یعنی زنا کے جو شروعات ہیں جب تک ان سے نہ بچا جائے اس وقت تک زنا سے بچنا ممکن نہیں اور جو آدمی زنا سے بچنا چاہتا ہے اس کیلئے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ

Marfat.com

اس کی شروعات کا ارتکاب کرے کیونکہ اگر وہ اس کی شروعات میں مبتلا ہو جائے گا تو پھر اس کی انتہاء سے ادھر کبھی نہیں رک سکے گا جب دل میں گندے خیالات آئیں اور دل اس میں لذت لینے لگے' نظر اپنی پاکیزگی کھو بیٹھے اور قدم مشکوک جگہوں پر چل کر جانے لگیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بے حیائی کا سفر نہ صرف کہ شروع ہو گیا ہے بلکہ رفتہ رفتہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ اعلانیہ اور پوشیدہ دونوں طرح سے بے حیائیوں سے بچو۔ اعلانیہ برائی تو اس وقت ہوتی ہے جب برائی کا سفر مکمل ہو جاتا ہے اور برائی کرنے والا اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس سے شرم و حیا اٹھالی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک پوشیدہ برائی کا تعلق ہے اس کا ارتکاب ہمیشہ شروعات کی صورت میں ہوتا ہے لیکن اگر اس سے احتیاط نہ برتی جائے تو پھر آدمی اعلانیہ برائی تک پہنچ کے رہتا ہے کیونکہ برائی ہو یا نیکی ان دونوں کا اصل منبع انسان کا دل ہے۔ کوئی نیکی اس وقت تک فروغ نہیں پاتی جب تک کہ دل کے اندر اس کی جڑ مضبوط نہ ہو اسی طرح کوئی برائی بھی اس وقت تک اعلانیہ صورت اختیار نہیں کرتی جب تک دل میں پوری طرح پیوست نہ ہو جائے کیونکہ کوئی برائی بھی جب تک دل کے اندر موجود رہتی ہے وہ کان' آنکھ' زبان' فکر اور خیال کی راہ سے برابر غذا حاصل کر کر کے توانا ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ روحانی سرطان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی لئے اسلام نے اس تمام جگہوں پر پہرہ بٹھایا ہے جہاں جہاں سے اس برائی کو غذا مل سکتی ہے۔ مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کو اسی لئے حرام کیا گیا ہے۔ ایک مرد اور عورت کو تنہا بیٹھنے اور باتیں کرنے سے روک دیا گیا ہے اور صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ جب مرد اور عورت تنہا ہوتے ہیں تو تیسرا ان میں شیطان ہوتا ہے۔ اسلئے اہل دین کا یہ کہنا یقیناً صحیح ہے کہ مخلوط طرز تعلیم کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ ایسے ادارے مسلمانوں میں اپنا جواز نہیں رکھتے جن میں مرد اور عورت کو اکٹھے کام کرنے کی مجبوری ہو عورتوں اور مردوں کے پارک الگ ہونے چاہئیں ہو سکے تو ان کی ضروریات کے حصول کے تمام مقامات الگ الگ ہوں تا کہ اس فتنہ کو کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے۔ اسلام نے حیا کو نصف ایمان قرار دیا ہے اور امت مسلمہ کی حقیقی نمود و پرداخت حیا کے سائے ہی میں ہوتی ہے۔ اسلئے اگر امت مسلمہ کے سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امت کو حقیقی توانائیوں سے محروم نہیں کرنا چاہتے تو پھر انہیں ایسے تمام دروازے بند کر دینے چاہئیں جس سے بے حیائی کے فروغ میں مدد ملتی ہو۔ اور اس برائی کو قوت حاصل ہوتی ہو کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

من حام حول حمی اوشک ان یقع فیه

''جو شخص کسی ممنوع جگہ کے گرد گھومتا ہے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ اس میں داخل بھی ہو جائے''۔

قتل ناحق سے منع کیا گیا ہے:

اس آیت کریمہ میں محرمات میں سے پانچویں چیز قتل ناحق ہے۔ اسلام نے انسانی جان کی حرمت کو بے حد اہمیت دی ہے آنحضرت ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں صاف صاف فرمایا کہ مسلمانو! تم پر کسی انسان کی جان اس کی آبرو اور اس کا مال اسی طرح محترم ہے۔ جس طرح آج کا دن اور حرم محترم ہے اور قرآن کریم نے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جو آدمی کسی مومن کو جان بوجھ کے قتل کرے گا وہ بدلے میں ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اللہ کا غضب اس پر ٹوٹے گا اور اللہ کی اس پر لعنت ہوگی اور قیامت کے دن اللہ نے اس کیلئے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔ کسی کی جان لینا تو دور کی بات ہے جان لینے کے ارادے سے کسی پر ہتھیار اٹھانے کی بھی ممانعت ہے۔ آنحضرت نے اس کے بارے میں فرمایا:

﴿ مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا ''جو آدمی ہم پر ہتھیار اٹھاتا ہے' وہ ہم میں سے نہیں'' ﴾

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں ایک شخص اس شبہ میں مارا گیا کہ وہ محض جان بچانے کیلئے اسلام قبول کر رہا تھا تو آپ نے

Marfat.com

حضرت خالد سے نہایت برہمی کے انداز میں فرمایا کہ خالد جب وہ قیامت کے دن اپنا کلمہ لے کر آئے گا تو تم اللہ کے سامنے اس کلمے کے ساتھ کیا کرو گے؟ قرآن وسنت کی تعلیمات میں سب سے زیادہ جس چیز کی تاکید ملتی ہے وہ انسانی جان کی حرمت ہے۔ جس کی حفاظت کی حضور نے سب سے زیادہ تاکید فرمائی اور صرف یہی نہیں کہ مسلمان کی جان کی حفاظت کی تاکید فرمائی بلکہ وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کی حکومت میں قانون کا پابند شہری بن کر رہ رہا ہو اس کے بارے میں فرمایا کہ

''جو کسی ذمی غیر مسلم کو قتل کر دے اس نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ دیا اور جو شخص اللہ کے عہد کو توڑ دے وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت تک پہنچتی ہو گی''

البتہ! اس قتل نفس میں بالحق کے ساتھ استثنا کیا گیا ہے کہ صرف اس شخص کا قتل کرنا اور اس کی جان لینا جائز ہے جو کسی حق شرعی یا بالفاظ دیگر قانون کے تحت مباح الدم قرار پائے یعنی اسلامی قانون اس کے خون کو مباح قرار دے دے اور اسلامی حکومت کو اجازت دے دے کہ وہ اس کی جان لے سکتی ہے۔ اس کو یہاں بالحق کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی تین صورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور دو صورتیں اس پر زائد نبی اکرم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں۔ قرآن کی بیان کردہ صورتیں یہ ہیں۔ 1- انسان کسی دوسرے انسان کے قتل عمد کا مجرم ہو اور اس پر قصاص کا حق قائم ہو گیا ہو۔ 2- دینِ حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ رہا ہو۔ 3- دارالاسلام کی حدود میں بدامنی پھیلائے یا اسلامی نظام حکومت کو الٹنے کی سعی کرے۔

باقی دو صورتیں جو حدیث میں ارشاد ہوئی ہیں یہ ہیں۔ 4- شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔ 5- ارتداد اور خروج از جماعت کا مرتکب ہو۔ ان پانچ صورتوں کے سوا کسی صورت میں انسان کا قتل انسان کیلئے حلال نہیں ہے خواہ وہ مومن ہو یا ذمی یا عام کافر۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس وقت باغیوں کے نرغے میں محصور تھے اور یہ لوگ ان کو قتل کرنا چاہتے تھے تو اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان بلوائیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں نے زمانہ اسلام میں تو کیا زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی بدکاری نہیں کی۔ نہ میں نے کسی کو قتل کیا' نہ کبھی میرے دل میں یہ وسوسہ آیا کہ میں اپنے دین اسلام کو چھوڑ دوں تو پھر تم مجھے کس بنا پر قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔

ان پانچ چیزوں کی حرمت کے بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ وہ باتیں ہیں جن کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے لیکن تم یہ باتیں تو چھوڑ چکے ہو البتہ اپنی طرف سے چند حلال جانوروں کو حرام کر کے اور بعض میں تخصیص پیدا کر کے ملت ابراہیمی کے دعوے دار بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہو۔ میں تمہیں اس لئے ملت ابراہیم کے یہ احکام سنا رہا ہوں تاکہ تم اس پر غور کرو اور سوچو کہ تم جو کچھ دعویٰ کر رہے ہو اس کا آخر ملت ابراہیم سے کیا رشتہ ہے؟ اور دوسری وجہ معلوم ہوتی ہے کہ مشرکینِ مکہ کو ان کو غور وفکر کی دعوت دی جا رہی ہے کیونکہ وہ ان پانچوں باتوں میں سے کسی میں بھی کوئی قباحت محسوس نہ کرتے تھے بلکہ ان کی زندگی میں پوری طرح رچ بس گئے تھے اور وہ اس طرح ان کے خوگر ہو گئے تھے کہ ان کی شناعت اور قباحت ان کے دل ودماغ سے نکل گئی تھی۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے یہ باتیں تو کھول کر بیان کر دی ہیں تاکہ تم ان پر غور وفکر کرو اور تمہیں اندازہ ہو کہ تم نے اپنے آپ کو ان جرائم کا خوگر بنا کر اپنے معاشرے کو کس طرح جہنم بنا رکھا ہے لیکن اس کے باوجود تمہیں غور وفکر کی کبھی توفیق نہیں ہوتی۔

Marfat.com

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا
اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا مگر ایسے طریق سے
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ
کہ بہت ہی پسندیدہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہنچ جائے۔ اور ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری
بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا
کیا کرو۔ ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق اور جب (کسی کی نسبت) کوئی بات کہو تو انصاف سے
قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾
کہو گو وہ (تمہارا) رشتہ دار ہی ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم نصیحت کرو۔
وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ
اور یہ کہ میرا سیدھا رستہ یہی ہے تو تم اسی پر چلنا۔ اور اور رستوں پر نہ چلنا کہ (ان پر چل کر)
فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾
خدا کے رستے سے الگ ہو جاؤ گے۔ ان باتوں کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔
ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا
(ہاں) پھر (سن لو کہ) ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی تھی تاکہ ان لوگوں پر جو نیکوکار ہیں نعمت پوری کر دیں اور
لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾
(اس میں) ہر چیز کا بیان (ہے) اور ہدایت (ہے) اور رحمت ہے تاکہ (ان کی امت کے) لوگ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہونے کا

اگلی آیت کریمہ میں انہی احکام عشرہ میں سے مزید چار احکام کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۵۲ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ O ”اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو بجز اس طریقے کے جو اس کیلئے بہتر ہو یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول انصاف کے

Marfat.com

ساتھ پورا رکھو۔ ہم کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور جب تم بولو تو عدل کی بات بولو خواہ (نقصان میں) کوئی تمہارا قرابت دار ہی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو یہ چیزیں ہیں جن کی اس نے تمہیں ہدایت فرمائی تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو"۔

یتیموں کے حقوق:

یتیم اکیلے اور منفرد کو کہتے ہیں جس سیپ میں ایک ہی موتی ہو اسے دُرِ یتیم کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے یتیم وہ ہے جو بچپن یا لڑکپن میں یعنی بلوغ سے پہلے باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے سے اکیلا اور تنہا رہ جائے۔ قریبی عزیزوں کے رحم و کرم پر ہو یا معاشرہ کی ہمدردی اور خیر خواہی کا محتاج ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے۔ قرآنِ پاک نے یتیموں اور مسکینوں کے حقوق اور خاندان اور معاشرے کیلئے ان کی اہمیت' ضرورت اور افادیت واضح کرنے کیلئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ سب سے پہلے مختلف اسالیب اور متعدد تاریخی حوالوں سے ایک نہایت اہم حقیقت کا انکشاف کیا ہے وہ یہ کہ تاریخ میں کتنی عظیم قومیں منصۂ شہود پر آئیں کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج تک ان کے حیرت انگیز تاریخی آثار ان کی عظمت اور قوت کی گواہی دیتے ہیں جن میں قوم عادؑ قوم ثمود اور مصر کے آل فرعون وہ مشہور قومیں ہیں جن کی تاریخ سے عرب واقف تھے اور قوت اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی قوم اس وقت دنیا میں ان کے ہم پلہ نہ تھی۔ لیکن اپنے تمام تر قوت و شوکت کے باوجود یہ قومیں اللہ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔ عذاب کا کوڑا اس بری طرح سے ان پر برسا کہ وہ تاریخ میں عبرت کا نشان بن گئیں۔ قرآن کریم ان قوموں اور ان کی وجاہتوں کا ذکر کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ ان کی تباہی اور بربادی کا سبب اپنے خالق و مالک سے انحراف اور طغیان و معصیت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے بے کس و بے بس اور سرافگندہ و درماندہ طبقات کی طرف سے لاپرواہی بلکہ ظلم تھا اور ان طبقات میں بطور خاص یتیم اور مسکین کا وہ ذکر کرتا ہے کیونکہ جو معاشرہ یتیموں کا خیال نہیں کرتا۔ اس سے باقی پسماندہ اور مظلوم طبقات کی دادرسی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ارشاد خداوندی ہے:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

"ہرگز نہیں (تباہی کا سبب اور کچھ نہیں) بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا دینے (ضروریات زندگی) کی فراہمی پر زور نہیں دیتے" (الفجر: ۱۷-۱۸)

یتیم اور مسکین کے حقوق کی عدم ادائیگی کا ذکر بطور خاص اسلئے بھی ہے کہ خاندان کسی بھی معاشرے کی اساس ہے۔ خاندان کی شکست و ریخت معاشرے کی اور آخر کار پوری قوم کی تباہی پر منتج ہوتی ہے۔ خاندان کے ارکان اربعہ والدین اولاد زوجین اور اہل قرابت ہیں اور یتیم اگر خاندان ہی کا حصہ ہے یعنی بیٹا مر جانے کے صورت میں یتیم بچہ دادا کا پوتا ہے اور بھائی کی موت کی شکل میں یہ یتیم مرحوم کے بھائی کا بھتیجا ہے۔ اب اگر ایسے یتیم کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خاندان میں کتنی دراڑیں پڑ سکتی ہیں۔ جب تک یہ یتیم بچہ ظلم کی تصویر بن کر زندگی گزارتا ہے تو دوسرے اہل قرابت چاہے لفظی ہمدردی کے سوا کچھ نہ کریں۔ لیکن اس یتیم کیساتھ ہونے والے سلوک کو نہ صرف محسوس کریں گے بلکہ خاندانی تقریبات میں موضوع سخن بھی بنائیں گے اور کبھی کبھی زیب داستاں کے طور پر بھی ذکر کریں گے۔ ایسی صورت میں خاندانی روابط اور روابط کے استحکام پر جو اثرات مرتب ہوں گے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ یہ تو وہ اثرات ہیں جو شعوری اور غیر شعوری طور پر خاندان پر اثر انداز ہوں گے۔ لیکن اسکا ایک پہلو اور بھی ہے یتیم بچہ اگر بے مروتی اور بدسلوکی کے سائے میں پروان چڑھتا ہے وہ دادا کی بے مروتی کو دیکھتا ہے تو خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے کہ یہی میرے دادا ہیں کہ میرے باپ کی زندگی میں سراپا محبت و شفقت تھے۔ وہ اپنے چچا اور تایا کے بدلے ہوئے رویہ کو دیکھتا ہے تو نہ جانے کیسے کیسے تاریک رجحانات

Marfat.com

اس کے رگ و پے میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ بچپنے کی وہ عمر جسے پیار اور محبت کی ٹھنڈک میں بسر ہونا چاہئے جب بے التفاتی بدسلوکی اور بے نیازی کی تیز دھوپ میں جلنے لگتی ہے تو اس نوخیز بچے کی محرومیاں خاندان سے نفرت بزرگوں سے بدگمانی اور انسانی جذبات سے مایوسی میں ڈھلنے لگتی ہیں۔ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ محرومیاں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح دہکنے لگتی ہیں۔ جو آخر کار بغاوت اور انتقام کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور معاشرہ ان سے بالوسطہ متاثر ہوتا ہے اور اگر اس یتیم بچے کی کفالت کرنے والے اپنے نہیں پرائے ہیں تو پھر یہ بچہ بڑا ہو کر براہ راست معاشرے سے اپنی محرومیوں کا انتقام لیتا ہے۔ یہی یتیم بچے بڑے ہو کر مسکین کہلاتے ہیں۔ کیونکہ بعد از بلوغ یتیم یتیم نہیں رہتا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو معاشرہ کا کارآمد اور معزز فرد بن جاتا ہے اور اگر خاندان یا معاشرہ کی لاپرواہی سے ضائع ہو جائے تو معاشرے کیلئے ناسور بن جاتا ہے۔ غالباً اسی بات کی طرف قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ ''تو نے اس شخص کو دیکھا' جو روز جزاء کو یا جزاء کے قانون کو جھٹلاتا ہے'' (الماعون:۱)

یعنی اسے اس بات سے انکار ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اعمال کی جزا و سزا سے گزرنا پڑے گا اور وہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ دنیا میں جزا و سزا کا قانون جاری ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے' یہاں کی ریت ہے۔

فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝

''(اس شخص کے ایسے ہی خیالات کا نتیجہ ہے) کہ یہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر آمادہ نہیں کرتا'' (الماعون:۳-۲)

اسی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ محبت و مروت اور ایثار و ہمدردی سے محروم یہ طبقہ (یعنی یتیم و مسکین) وقت آنے پر معاشرے سے انتقام لیتا ہے۔ جب یتیم کو چچا کے مظالم اور چچازاد بھائیوں کی بے اعتنائیاں یاد آتی ہیں تو وہ بڑا ہو کر چچازاد بھائیوں بلکہ تمام اہل قرابت سے اپنے زخموں کا حساب لیتا ہے اور اگر خاندان سے باہر معاشرہ بھی اس کی محرومیوں کا سبب بنتا رہا ہے تو وہ معاشرے کے افراد کو بھی زیادتیوں کا نشانہ بنا کر سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ جو ہم نوجوانوں کو بینک لوٹتے' ڈاکے ڈالتے' عفتوں کے فانوس توڑتے اور عظمتوں کے چراغ بجھاتے دیکھتے ہیں۔ یہ دراصل اپنی محرومیوں کا انتقام ہے اور پھر اس میں صرف یتامیٰ اور مساکین ہی شریک نہیں بلکہ بڑے اور خوشحال لیکن تہذیب خوردہ اور مغرب زدہ خاندانوں کے چشم و چراغ بھی ہیں جنہیں ان کی ماؤں نے اپنی سوشل مصروفیات اور بیگمات کی تفریحات کے باعث پیار نہیں دیا۔ بچے ان کے پیار کو ترستے رہے۔ لیکن وہ صنف نازک کے حقوق حاصل کرنے اور عورت کا مقام بلند کرنے کیلئے دن بھر مختلف تقریبات میں شرکت اور اس کے لئے دن میں کئی کئی دفعہ لباس بدلنے کی مصروفیت کے باعث بچوں کیلئے وقت نہ نکال سکیں اور باپ جلب زر کی دوڑ اور کلبوں کی مصروفیت کی وجہ سے بچوں کو وقت نہ دے سکے۔ آج یہ بچے انسانی احساسات سے تہی دامن انسانی معاشرے کو ادھیڑنے کھدیڑنے میں لگ گئے۔ تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ جو قومیں اپنے خاندان کے اجزا کو نہیں سمیٹتیں ان کے شیرازہ کو بکھرنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور جو قومیں اپنے مساکین یعنی معاشرہ کے گرے ہوئے اور پسماندہ افراد کو سہارا نہیں دیتیں یہی افراد معاشرے کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔ نتیجۃً معاشرہ خانہ جنگی کا شکار ہو کر قومی استحکام سے محروم ہو جاتا ہے۔ اب اس کو گرانے کیلئے چند حوادث ہی کافی ہوتے ہیں۔ مزید برآں قرآن کریم ہمیں یہ بھی آگاہی دیتا ہے کہ ایسی قومیں اور ایسے معاشرے جو یتامیٰ و مساکین کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتے ان کی صرف دنیا ہی تباہ نہیں ہوتی ان کی آخرت بھی برباد ہو جاتی ہے وہ انجام کار جہنم کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝

Marfat.com

''(اہل جہنم سے پوچھا جائے گا) کس چیز نے تمہیں جہنم میں پہنچایا؟ وہ کہیں گے ہم نمازی نہیں تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے'' (المدثر:۴۲-۴۴)

دوسری بات یہ کہ ترقی یافتہ اور شان وشوکت کی حامل اقوام وملل کے برے انجام سے استدلال کرتے ہوئے یتامیٰ اور مساکین کی طرف سے تغافل اور بدسلوکی کے نتائج سے ڈرانے کے بعد مثبت طرز استدلال کے ذریعہ قرآن نے چند ایسے تاریخی واقعات کا ذکر کیا جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ اسباب عادیہ سے ہٹ کر بھی پروردگار کی نظر کرم یتامیٰ اور مساکین کے شامل حال رہتی ہے۔ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعہ میں قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام دریا عبور کرنے کیلئے ایک کشتی پر سوار ہوئے کشتی والوں نے دونوں کا احترام کرتے ہوئے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن حضرت خضر نے اس احسان کا بدلہ یہ دیا کہ عین دریا میں کشتی کا تختہ توڑ ڈالا اور اس طرح کشتی کو بیکار کر دیا۔ پھر ایک گاؤں میں پہنچے تو گاؤں والوں نے مہمان نوازی کرنے کی بجائے کھانا تک کھلانے سے انکار کر دیا لیکن اہل دیہہ کی بدسلوکی کے باوجود حضرت خضر حضرت موسیٰ کے ساتھ دن بھر ایک دیوار مرمت کرتے رہے جو گرا چاہتی تھی۔ دونوں واقعات میں حضرت خضر کے عمل کو عام طرز زندگی اور اسلوب زندگی سے ہٹا ہوا محسوس کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعجب واستنکار کا اظہار کیا۔ اس پر حضرت خضر نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو جواب دیا قرآن کریم نے اسے اس طرح بیان کیا ہے:

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ○

''جہاں تک کشتی کا تعلق ہے، وہ چند مسکینوں کی تھی، جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اس کشتی کو بیکار کر دوں کیونکہ ان کے پیچھے ایک بادشاہ آ رہا تھا، جو ہر کشتی پر زبردستی قبضہ کر رہا تھا'' (الکہف:۷۹)

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ج فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ق رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ج

''رہا دیوار کا قصہ۔ وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی، جو اس شہر میں رہتے تھے۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کیلئے ایک خزانہ مدفون تھا اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا، اس لئے تمہارے رب نے چاہا کہ جب یہ دونوں بچے بالغ ہوں تو اپنا خزانہ نکالیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت ہے'' (الکہف:۸۲)

ان دونوں واقعات پر غور کیجئے کس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت یتیموں اور مسکینوں کی دستگیری کرتی ہے اور ایسے طریقے سے کرتی ہے جو ہمارے فہم وفراست سے بالا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ وہ پروردگار جو ایسے غیر معمولی طریقوں سے ان بے کسوں کی دستگیری فرماتا ہے اس کی رحمت ایسے معاشرے پر کیوں نہ برسے گی جو معاشرہ یتیموں اور مسکینوں کی جائے پناہ، محبتوں اور حمایت واعانت کا سرچشمہ ہوگا۔

یتیموں کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے ارشادات:

نبی کریم ﷺ نے بھی قرآن کریم کی طرح اپنے ارشادات عالیہ میں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی اور اسے مسلمان

Marfat.com

معاشرے کی اخلاقی ذمہ داری قرار دیا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

انا و کافل الیتیم له او لغیره فی الجنة هکذا و اشار بالسبابة و الوسطی و فرج بینهما شیئا

''میں اور اپنے یا پرائے یتیم کی کفالت کرنے والا آدمی جنت میں اس طرح (قریب قریب) ہوں گے اور آپ نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کر کے بتلایا اور ان کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی''

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کلمہ والی انگلی اور اس کے برابر کی بیچ والی انگلی اس طرح اٹھائی کہ ان کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا' بتلایا کہ جتنا تھوڑا سا فاصلہ اور فرق تم میری ان دو انگلیوں کے درمیان دیکھتے ہو بس اتنا ہی فاصلہ اور فرق جنت میں میرے اور اس مرد مومن کے مقام میں ہوگا جو اللہ کیلئے اس دنیا میں کسی یتیم کی کفالت اور پرورش کا بوجھ اٹھائے۔ خواہ وہ یتیم اس کا اپنا ہو جیسے پوتا یا بھتیجا وغیرہ یا پرایا ہو یعنی جس کے ساتھ رشتہ داری وغیرہ کا کوئی خاص تعلق نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کا ایک اور ارشاد دیکھئے:

من قبض یتیما من بین المسلمین الی طعامه و شرابه ادخله الجنة البتة الا ان یکون قد عمل ذنبا لا یغفر

''اللہ کے جس بندے نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم بچے کو لے لیا اور اپنے کھانے پینے میں شریک کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بالضرور جنت میں داخل کرے گا الا یہ کہ اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہو جو نا قابل معافی ہو''۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من مسح راس یتیم لم یمسحه الا للّٰه کان له بکل شعرة یمر علیها یده حسنات و من احسن الی یتیمة و یتیم عنده کنت انا و هو فی الجنة کهاتین و قرن بین اصبعیة

''جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے ہاتھ پھیرا تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا تو ہر ہر بال کے حساب سے اس کو نیکیاں ملیں گی اور جس نے اپنے زیر کفالت کسی یتیم بچی یا یتیم بچے کے ساتھ بہتر سلوک کیا تو میں اور وہ آدمی جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے اور آپ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا کر دکھایا یعنی ان دو انگلیوں کی طرح بالکل پاس پاس ہوں گے''

اندازہ فرمائیے کہ محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کیلئے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرنا کسی بڑی سعادت اور لاکھوں نیکیوں کے حصول کا سبب ہے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک پیار اور محبت آنحضرت ﷺ کے قرب کا ذریعہ ہے وہ بھی جنت میں۔ یعنی جنت میں داخلہ بجائے خود کتنی بڑی خوش بختی ہے اور پھر اس کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا قرب یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔ مزید فرمایا:

خیر بیت فی المسلمین بیت فیه یتیم یحسن الیه و شر بیت فی المسلمین بیت فیه یتیم یساء الیه

''مسلمانوں کے گھرانوں میں بہترین وہ گھرانہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے''

یعنی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کسی گھر کو اللہ کی نگاہ میں عزت و وجاہت کا حامل بنا دیتا ہے اور یتیم کے ساتھ بدسلوکی کسی گھر کو قابل نفرت بنا دیتی ہے۔ لوگ عزت و ذلت کے اسباب اور ذرائع نہ جانے کیا کیا گمان کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کی نگاہ میں بالکل دوسرے معیارات ہیں اور پھر یہ بھی یاد رہے

Marfat.com

کہ جوگھر اللہ کے یہاں بہتر ہے اس پر اس جہاں کی رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ وہیں رزق میں برکت ہوتی ہے اور گھر کے مکینوں کو نیکیوں کی توفیق ملتی ہے اور جوگھر اس کے یہاں برا ہے وہ خیر و برکت سے محروم اور توفیق خداوندی سے دور ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام نے مختلف اسالیب سے یتامیٰ و مساکین کے حقوق کے تحفظ اور ان کے مقام کے تعین اور بعثت نبوی کے وقت ان مظلوم گروہوں سے متعلق دنیا کی ذہنیت کی تبدیلی کیلئے حیرت انگیز کام کیا جس سے فی الواقع یتامیٰ اور مساکین کو ایک نئی زندگی اور ایک نیا معاشرتی مقام نصیب ہوا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محض تذکیر و ترغیب سے لائی ہوئی تبدیلی دیرپا اور مستقل نہیں ہوتی۔ اس لئے اسلام نے اسی پر اکتفا کرنے کی بجائے یتامیٰ اور مساکین کو قانونی تحفظ بھی دیا اور بیکسوں پر ہونے والے مظالم کا قانونی عمل سے انسداد کر کے رکھ دیا۔

یتیموں کی کفالت کے بارے میں قوانین:

اب نہایت اختصار سے اس آئینی اور قانونی عمل کی ایک جھلک پیش خدمت ہے جو فی الواقع انسانی معاشرتی زندگی کیلئے بیش بہا نعمت ہے۔ دور جاہلیت میں یتیموں پر جو مظالم کئے جاتے تھے اور جو زیادتیاں ہوتی تھیں ان میں سے پہلی زیادتی یہ تھی کہ مرنے والا باپ اپنے بچوں کیلئے جو مال و اسباب چھوڑ جاتا تھا یا جو حصہ بچوں کو اپنے باپ کی میراث میں سے ملنا چاہئے تھا انہیں دینے سے یکسر انکار کر دیا جاتا تھا۔ جاہلیت میں عربوں کا تصور یہ تھا کہ وراثت کا حقدار صرف وہ ہو سکتا جو اپنے اعزا و اقربا اور خاندان کو کوئی فائدہ پہنچانے کے قابل ہو۔ ان کے اپنے الفاظ میں ”کہ میراث میں اس کو حصہ دیا جائے جو گھوڑے پر چڑھ کر دشمن کو قتل کر کے مال غنیمت لانے کی استعداد رکھتا ہو۔“ مقصود ان کا یہ تھا کہ جو خاندان کو نفع پہنچانے کے قابل نہیں وہ خاندان سے کوئی چیز لینے کا بھی حقدار نہیں۔ بچیاں چونکہ پرایا دھن ہیں اور صنف نازک سے تعلق رکھتی ہیں اور چھوٹے بچے بھی کوئی فائدہ پہنچانے کے قابل نہیں اس لئے ان کو میراث میں حصہ بھی نہیں ملنا چاہئے۔ چنانچہ بالعموم یتیم بچے اور بچیاں میراث سے محروم کر دیئے جاتے تھے۔ اسلام میں جب تک میراث کا حکم نازل نہیں ہوا مسلمانوں میں دور جاہلیت کے اثرات کی وجہ سے کبھی کبھی ایسے واقعات ظہور پذیر ہو جاتے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یتیم بچوں اور بچیوں کے ساتھ کیسی کیسی زیادتیاں ہوتی تھیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جنگِ احد کے بعد حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لئے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ یہ سعد کی بچیاں ہیں جو جنگِ احد میں شہید ہوئے۔ ان کے چچا نے پوری جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کیلئے ایک حبہ تک نہیں چھوڑا۔ اب بھلا ان بچیوں سے کون نکاح کرے گا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ کا بھی سراغ ملتا ہے کہ حضرت اوس بن ثابت شہید ہو گئے تو ان کے بھتیجوں نے ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ اوس کی بیوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سارا واقعہ عرض کیا۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں بچیوں کو بطور خاص اور یتیم بچوں کو بھی بالعموم میراث میں سے حصہ دینے سے انکار کیا جاتا اور آج بھی ہمارے یہاں کم و بیش یہی طریقہ رائج ہے۔ بعض علاقوں میں بڑے بچوں کو میراث دینے کا روج ہے اور چھوٹے بچوں کو محروم کر دیا جاتا ہے۔ جہاں تک بچیوں کا تعلق ہے بہت کم گھرانے ہوں گے جہاں ان کو ان کا حق دیا جاتا ہے ورنہ مختلف حیلے بہانوں سے ان کو یہ سمجھ کر محروم کر دیا جاتا ہے کہ پرایا دھن ہیں اگر ان کو جائیداد میں سے حصہ دیا گیا تو ہمارا داماد یعنی بچی کا شوہر ہمارا شریک بن جائے گا اس لئے قرآن کریم نے سب سے پہلے میراث میں جس طرح لڑکے کا حصہ رکھا اسی طرح لڑکی کا بھی حصہ مقرر کیا اور پھر یتیموں کو بطور خاص ان کے حصے کے اموال دینے کی تاکید کی۔

اموال دیتے ہوئے بھی یتیموں کے ولی بعض زیادتیاں کرتے تھے کہ ان کے مال میں سے اچھی چیزیں نکال کر کم درجے کی چیزیں رکھ دیتے

Marfat.com

مثلاً اعلیٰ نسل کے فربہ جانور خود رکھ لیتے اور گنتی پوری کرنے کیلئے ردی نسل کے دبلے اور لاغر جانور یتیم کو دے دیتے۔ اسی طرح زیادتی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ یتیموں کے اموال کو اپنے اموال میں خلط ملط کر دیتے اور حفاظت کے بہانے سے سب آہستہ آہستہ ہڑپ کر جاتے۔ قرآن کریم نے واضح احکام دے کر ان تمام زیادتیوں کو ختم کر ڈالا اور اسے بہت بڑا گناہ قرار دیا ارشاد فرمایا:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ○

''یتیموں کا مال ان کو واپس دو۔ اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل دو اور ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے'' (النسا:۲)

یتیم بچیوں کے ساتھ زیادتی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ یتیم بچیاں جن لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں وہ ان کے مال اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا اور ان کا حقیقی محافظ تو کوئی ہے نہیں جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے تھے اور نکاح کرتے ہوئے بھی نہ ان کو ان کی حیثیت کے مطابق مہر دیا جاتا اور نہ نکاح کے بعد ان کے حقوق ادا کیے جاتے۔ یہی زیادتی آج بھی مختلف شکلوں میں مسلمانوں میں رائج ہے کہ گھر میں اگر کوئی یتیم بچی موجود ہے تو عام طور پر اس کی مرضی پوچھے بغیر بلکہ اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بالکل اس کا بے جوڑ رشتہ طے کر دیا جاتا ہے۔ وہ بیچاری بے بسی کی تصویر بنے قبولیت کے سوا کوئی راستہ اپنے سامنے نہیں پاتی۔ پھر گھر میں اس کی حیثیت ایک نوکرانی سے زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ کوئی اس کی طرف سے پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ اسکے ساتھ یہ زیادتی کیوں ہو رہی ہے؟ اس کے بارے میں بھی ارشاد فرمایا کہ ان یتیم بچیوں سے ہرگز نکاح نہ کرو اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم ان سے انصاف نہیں کر سکو گے۔ خود اپنے ضمیر سے فتویٰ طلب کرو۔ ضمیر صحیح جواب دیتا ہے۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کن جذبات کے تحت اپنا یا اپنے بچوں کا ان سے نکاح کر رہے ہو۔

یتیم بچوں اور بچیوں کے اگر محرمی رشتہ دار اور بزرگ زندہ ہیں تو وہ یتیموں کے ولی ہوں گے۔ ان کی ذاتوں کے حوالے سے اور ان کے مال اور جائیداد کے حوالے سے تمام ذمہ داریاں انہیں پوری کرنا ہوں گی۔ لیکن اگر یتیم کا کوئی بڑا یا قریبی عزیز نہ ہو یا اگر قریبی عزیز ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں ہیں کہ دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دے سکیں تو پھر اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ یتیموں کیلئے ولی کا تقرر کرے اور وقتاً فوقتاً اس بات کا جائزہ لیتی رہے کہ یتیموں کے حقوق کی پاسداری صحیح طریقے سے ہو رہی ہے۔ یا نہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

السلطان ولی من لا ولی له ''بادشاہ یعنی حکمران اس کا ولی ہے، جس کا کوئی ولی نہیں''

اسی وجہ سے اسلامی حکومتوں میں قاضیوں کے فرائض میں یہ بات شامل ہوتی تھی کہ وہ شہر میں یتامیٰ کے ولی کی ذمہ داریاں بھی ادا کریں۔ یتیموں کے ان ولیوں کی ذمہ داریوں میں سے سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بالکل اپنے بچوں کی طرح ان یتامیٰ کی پرورش اور تربیت کا اہتمام کریں۔ ان کی تعلیم کیلئے کوشش کریں۔ ان کا کردار بنانے میں امکانی مساعی سے گریز نہ کریں اور اگر اس کیلئے انہیں ایک معقول وقت صرف کرنا پڑے تو قرآن کریم نے اس کیلئے واضح احکام دیئے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

''یتیم کا جو سرپرست مالدار ہے وہ پرہیزگاری سے کام لے۔ یعنی کوئی معاوضہ نہ لے اور جو غریب ہے وہ معروف طریقے سے

Marfat.com

کھائے۔یعنی اپنا حق الخدمت اس حد تک لے کہ ہر غیر جانبدار معقول آدمی اس کو مناسب تسلیم کرے" (النساء:٦)

نیز یہ کہ جو کچھ بھی حق الخدمت وہ لے وہ چوری چھپے نہ لے بلکہ اعلانیہ متعین کر کے لے اور اس کا حساب رکھے۔یتیم کی دیکھ بھال میں اس بات کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ یتیم کا ولی اسے اس طرح کا احساس نہ ہونے دے جس سے اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہو اور اس کے سامنے اپنے بچوں کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرے کہ واقعی اسے اپنی یتیمی کا غم ستانے لگے۔کیونکہ شخصیت کی تعمیر میں عزت نفس اور خودداری بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یتیم کے ولی کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ یتیم کے اموال اور جائیداد کا تحفظ کرے۔اسے نہ صرف ضائع ہونے سے بچائے بلکہ اگر اس میں اضافے کی کوئی جائز صورت ممکن ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کرے۔اسی وجہ سے شریعت قاضی کے فرائض میں اسے شامل کرتی ہے اور فقہاء نے قرآن و سنت کی روشنی میں ایک اداراتی نظم قائم کیا ہے۔جب تک یتیم بلوغ کی عمر کو نہ پہنچ جائے اس کے اموال اور جائیداد میں سے اس کی تربیت اور پرورش پر اٹھنے والے اخراجات لئے جائیں گے۔لیکن جب وہ بلوغ کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے یہ اموال اس کے حوالے کرنے سے پہلے قرآن کریم ایک اور شرط بھی لگاتا ہے۔جس کو قرآن کریم میں رشد کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ارشاد خداوندی ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ

"اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے ناداں لوگوں کے حوالے نہ کرو۔البتہ انہیں کھانے اور پہننے کیلئے دو اور انہیں نیک ہدایت کرو۔اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کردو" (النساء:٥-٦)

ان آیات میں واضح طور پر چند باتیں کہی گئی ہیں۔پہلی یہ بات کہ یتیموں کے اموال اس وقت تک ان کے حوالے مت کرو جب تک وہ بلوغ کی عمر کو نہ پہنچیں۔کمسنی کی عمر سفاہت اور بے وقوفی کی عمر ہے اس میں مال ان کے سپرد کرنا گویا مال کو ضائع کرنے کے مترادف ہے حالانکہ مال قیام زندگی کا ذریعہ ہے۔اسے ناداں لوگوں کے اختیار اور تصرف میں نہیں دینا چاہئے۔جو اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نظام تمدن و معیشت اور بالآخر نظام اخلاق کو خراب کردیں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ یہ یتیم اپنی دیکھ بھال خود نہیں کرسکتے اور اپنی ضرورتیں پوری کرنا بھی انکے بس میں نہیں تو انکے ضروری مصارف انکے مال سے ان کے ولی پورے کریں گے۔لیکن بالکل اس طرح جیسے فکرمندی اور سمجھداری کے ساتھ اپنا مال اپنے بچوں پر خرچ کرتے ہیں۔

تیسری یہ بات کہی کہ انہیں نیک ہدایت کرو یعنی صرف ان کی ضرورتیں پوری کرنا ہی ولی کی ذمہ داری نہیں بلکہ تعمیر سیرت' کردار سازی اور تعلیم وتربیت بھی ولی کی ذمہ داری ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اگر وہ یتیم بلوغ کی عمر کو پہنچ جائیں تو اب بھی فوراً ان کے اموال ان کے سپرد نہ کردیئے جائیں بلکہ چھوٹی موٹی ذمہ داریاں ان پر ڈال کر یا کوئی ذمہ داری کا کام تفویض کر کے اس کا اندازہ لگایا جائے کہ آیا ان میں ذمہ داریاں سنبھالنے کی سمجھ بھی پیدا ہوئی ہے یا نہیں اور جسم کے ساتھ ساتھ ان کی عقلی نشوونما کا کیا حال ہے؟ ان میں اپنے معاملات کو خود اپنی ذمہ داری پر چلانے کی صلاحیت کس حد تک پیدا ہوئی ہے؟ اگر ان میں سنجیدگی اور عقلمندی پیدا ہوگئی ہے اور وہ واقعی اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل ہوگئے ہیں تو پھر اولیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کے مال ان کے حوالے کردو۔"کورٹ آف وارڈز" کا قانون انہی آیات سے ماخوذ ہے۔

Marfat.com

یہ چند قانونی احکام ہیں جن کی ایک مختصر سی تفصیل ہم نے عرض کی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں میں یتیموں کے بارے میں جو اصلاح پیدا کرنا چاہتا ہے وہ کیا ہے؟ اور پھر کس طرح یتیموں کے حوالے سے عائد شدہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے اب تک جو کوتاہیاں ہوتی رہی ہیں ان سے بچنے کیلئے قانونی احکام دیتا ہے تاکہ یتیم ہر صورت میں معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح کارآمد اور معزز ارکان معاشرہ بن کر اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیں۔تاکہ اسلامی معاشرہ اپنا صحیح کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔

ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو:

اس آیت کریمہ میں دوسرا حکم اور مجموعی طور پر احکام عشرہ میں سے ساتواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ ناپ اور تول میں کمی بیشی نہ کرو بلکہ پورا ناپو اور پورا تولو۔اس حکم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ قرآن وسنت نے اس حکم کی تعمیل پر نہایت زور دیا ہے اور اس کے خلاف کرنے پر سخت وعید سنائی ہے اور قرآن کریم نے اس حکم کی تاکید کرتے ہوئے یہاں تک بتایا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم جن بڑی بڑی گمراہیوں میں مبتلا تھی ان میں سب سے بڑی گمراہی یہ تھی کہ وہ چونکہ تجارت پیشہ لوگ تھے اس لئے ناپ اور تول میں انہوں نے دو طریقے اختیار کر رکھے تھے کہ ان کے لینے کے باٹ اور تھے اور دینے کے باٹ اور جب وہ لیتے تھے تو پورا پورا ناپ تول کے لیتے تھے اور جب دیتے تھے تو ناپ تول میں کمی کرتے اور دوسرے کو نقصان پہنچاتے تھے اور اسی وجہ سے اس قوم پر اللہ کا عذاب نازل ہوا۔پھر تیسویں پارے میں مستقل ایک سورۃ جس کا نام ہی مطففین ہے جس کی پہلی آیت میں ایسا کرنے والوں کو خرابی اور بربادی کی وعید سنائی گئی ہے۔ارشاد فرمایا کہ خرابی اور بربادی ہے تطفیف کرنے والوں کیلئے کہ جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں دیتے ہیں تو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ایسے لوگ بالآخر بربادی اور ہلاکت کا شکار ہونگے۔اسی طرح حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کے مطابق ان لوگوں کو جو تجارت میں ناپ تول کا کام کرتے تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ناپ اور تول یہ وہ کام ہیں جن میں بے انصافی کرنے کی وجہ سے تم سے پہلے کئی امتیں عذاب الٰہی کے ذریعے تباہ ہو چکی ہیں۔(دیکھنا تم ایسا نہ کرنا) ناپ تول میں کمی جسے قرآن میں تطفیف کا نام دیا گیا ہے اس کا تعلق صرف ڈنڈی مارنے اور کم ناپنے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہے۔بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا تعلق پوری کائنات سے ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔کیونکہ کائنات کا پورا نظام عدل وقسط پر قائم ہے اور اس کائنات کی ہر چیز شاہد ہے کہ اس کا خالق ومدبر قائم بالقسط ہے۔اس وجہ سے اس دنیا کی صلاح وفلاح کیلئے بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دائرہ اختیار میں کانٹے کی تول عدل وقسط کو قائم کرے۔اگر اس میں ذرا رخنہ پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی اپنے مرکز ثقل سے منحرف ہو گئی اور اب سارے نظام تہذیب وتمدن میں فساد واختلال رونما ہو کے رہے گا۔ہم اگر اپنے زندگی کے معاملات پر غور کریں تو حقیقت یہ ہے کہ عدل وقسط کا قیام ہی ہماری زندگی کی کامیابی اور اس میں توازن کا ضامن ہے اور اسی توازن سے پوری زندگی میں استواری پیدا ہوتی اور اعتدال وجود میں آتا ہے۔ایک گھر جو میاں بیوی سے وجود میں آتا ہے اور ماں باپ اور اولاد کے رشتے سے مکمل ہوتا ہے اسی کو دیکھ لیجئے کہ اگر میاں بیوی اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی اور حقوق کی پاسداری پوری طرح انجام دیتے رہیں تو اس گھر میں کبھی الجھن اور اڑچن پیدا نہیں ہوگی۔شوہر اپنی قوامیت کا پوری طرح ثبوت دے اور بیوی اطاعت ومحبت کا تو یہ گھر دنیا ہی میں جنت کا نمونہ بن جائے گا۔اسی طرح اگر اولاد ماں باپ کے احترام میں کمی نہ ہونے دے اور والدین شفقت ومحبت کے تمام پہلوؤں کو پوری طرح بروئے کار لائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ خاندان کی بنیاد استوار نہ ہو سکے۔اسی طرح معاشرے میں بسنے والے لوگ اپنے اپنے فرائض میں یکسو ہوں اور حقوق کی شناخت میں کبھی دراڑیں نہ آئیں تو اس سے عدل وقسط کی صورت میں وہ توازن پیدا ہوتا ہے جس سے یہ معاشرہ نہایت کامیابی کے ساتھ

Marfat.com

زندگی کا سفر جاری رکھتا ہے۔اس لئے یہاں جو تطفیف سے روکا جا رہا ہے اور ناپ تول میں عدل وقسط کے قائم کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے وہ صرف ناپنے اور تولنے والی چیزوں تک محدود نہیں ہو سکتا یقیناً اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے اسی لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب مؤطا میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ آپ نے ایک شخص کو نماز کے ارکان میں کمی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ تم نے تطفیف کی ہے یعنی جو حق واجب تھا وہ ادا نہیں کیا اس کو نقل کرنے کے بعد امام مالک فرماتے ہیں لِکُلِّ شَیءٍ وَفَاءٌ وَ تَطْفِیْفٌ یعنی حق کا پورا دینا اور کمی کرنا ہر چیز میں ہوتا ہے صرف ناپ تول ہی میں نہیں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہم اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں جب کمی کرتے ہیں تو تطفیف کرتے ہیں۔یعنی ایک ملازم اپنی ڈیوٹی کا معاوضہ پورا لیتا ہے لیکن ڈیوٹی کے مقررہ اوقات میں کمی کرتا ہے یا کام میں کوتاہی کرتا ہے یا معاوضہ سے زائد رشوت یا کسی اور صورت میں پیسہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ تطفیف کا ارتکاب کرتا ہے اور جب یہ برائی کسی معاشرے میں عام ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس سے نفرت رفتہ رفتہ کم ہونے لگتی ہے تو پھر اس معاشرے میں تباہی اور بربادی میں کوئی دیر نہیں ہوتی۔آج ہم اپنے ملک میں جس صورت حال سے دوچار ہیں اس میں اگر غور کیا جائے تو یہی وہ تطفیف ہے جس کے ارتکاب نے ہمیں تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ہمارا ہر ادارہ اس گناہ میں پوری طرح آلودہ ہے۔تعلیمی ادارے جو لوگوں کی راہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں ان کی انتظامیہ اور ان کے اساتذہ تک بری طرح اس میں آلودہ ہو چکے ہیں۔احتسابی اداروں کو اسی خرابی نے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔خود حکومت کے ایوان اور ہماری پارلیمنٹ کے ارکان اس سے بچے ہوئے نہیں بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ خاص رحم فرمائے۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک دفعہ مجھ سے ایک صاحب کہنے لگے کہ آپ کہتے ہیں کہ رشوت لینا حرام ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ اب تنخواہوں میں گزارا نہیں ہوتا' رشوت نہ لیں تو زندگی کیسے گزاریں میں نے ان سے کہا کہ آپ نے رشوت لے کر اپنی زندگی گزارنے اور گزارا کرنے کا ایک راستہ نکال لیا ہے۔لیکن جس سے آپ نے رشوت لی اس سے آپ نے پوچھ لیا تھا کہ اس کا بھی گزارا ہوتا ہے یا نہیں؟ انتہائی دکھ کی بات تو یہ ہے کہ ارشاد و ہدایت کے وہ ادارے اور اس کی ذمہ دار شخصیات جو کبھی اس امت کے بگاڑ کو روکنے کا آخری ذریعہ سمجھی جاتی ہیں ان کو بھی اس برائی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔دین کے نام پر دولت کمائی جاتی ہے اور ارشاد و ہدایت کی مسندوں پر بیٹھنے والے فتوحات لئے بغیر اپنے مریدوں کو دیدار تک کرانے کیلئے تیار نہیں ہوتے اور ہر وہ آدمی جوان کے پاس کچھ سیکھنے کا ارادہ لے کر جاتا ہے جب تک اپنی ہمت سے بڑھ کر نذر پیش نہیں کرتا اس وقت تک دروازہ ان کیلئے نہیں کھلتا کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ علامہ اقبال کے پاس ایسے ہی ایک صاحب بڑی عقیدت لے کر حاضر ہوئے وہ ابھی اقبال سے اظہار عقیدت ہی کر رہے تھے کہ ان کا ایک غریب مرید انہیں ڈھونڈتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ان کے سامنے اس نے ادب سے بیٹھتے ہوئے پہلے اپنی غربت کی کہانی سنائی اور پھر اپنے پلو سے ایک روپیہ نکالا جو نجانے اس نے ایک ایک آنہ کر کے کس طرح مکمل کیا تھا وہ اس نے حضرت صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور دعا کی درخواست کی۔حضرت صاحب نے بجائے خود دعا کرنے کے علامہ سے گزارش کی کہ آپ دعا فرمائیں۔علامہ نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ یا اللہ یہ غریب شخص جو بری طرح قرض میں جکڑا ہوا ہے اس کے حال پر رحم فرما جب کہ اس کے قرضہ میں مزید ایک روپے کا اضافہ ہو گیا ہے۔جو نجانے وہ کہاں سے لے کر آیا اور اس نے اپنے پیر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔کہنا یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ نے توازن قائم کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے کہ جب ناپ تول کرو تو پورا پورا ناپو اور تولو۔اور جب زندگی کے معاملات لوگوں کے ساتھ انجام دو تو اس میں بھی پوری طرح انصاف اور توازن سے کام لو کہیں بھی ڈنڈی مارنے کی کوشش نہ کرو اور ناپ تول کے بارے میں خاص طور پر آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت کرے جو بیچنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ دے اور خریدنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ نہ لے بلکہ کمی بھی ہو تو راضی ہو جائے اور ایسے ہی موقع پر ایک

Marfat.com

وزن کرنے والے کو حکم دیا کہ زِن وارجح یعنی تولو اور جھکتا ہوا تولو اور اس حوالے سے خود آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب آپ اپنا قرض ادا فرماتے تھے تو عموماً جتنا قرض ہوتا تھا اس سے کچھ زیادہ ادا فرمایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے کا آنحضرت کا ایک واقعہ ہے وہ جہاں زیر بحث بات پر دلالت کرتا ہے وہاں آپ کی حقانیت کا شاہد بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے ایک یہودی سے کچھ غلہ قرض لیا اور ادائیگی کی ایک تاریخ طے فرمالی وہ تاریخ آنے سے پہلے ہی مطالبہ لے کر حاضر ہو گیا۔ آنحضرت نے صرف اتنا فرمایا کہ ابھی تو ادائیگی کا وقت نہیں آیا تم پہلے ہی آگئے ہو۔ اس نے بجائے اپنے قصور کا اعتراف کرنے کے بدتمیزی اور گستاخی شروع کر دی۔ اب وہ جیسے جیسے گفتگو میں تیز ہوتا جا رہا تھا حضور کی خاموشی ویسے ویسے بڑھتی جا رہی تھی حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ تم جو آل عبدالمطلب ہو تم تو ہمیشہ کے نادہند ہو۔ اس پر حضرت عمر فاروق ؓ برداشت نہ کر سکے وہ اٹھے اور اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا کہ تم یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر کو سختی سے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو اور ساتھ ہی کہا کہ تمہیں اس طرح اس سے پیش نہیں آنا چاہئے تھا بلکہ تمہیں یہ چاہئے تھا کہ مجھے سمجھاتے کہ حضور اگر آپ نے قرض لیا تھا تو آپ کو ادائیگی کی فکر بھی کرنی چاہئے تھی اور اسے حسنِ معاملہ کی تلقین کرتے۔ لیکن تم نے جو اس کے ساتھ سختی کی ہے اب اس کا معاوضہ یہ ہے کہ جتنا میں نے اس سے قرض لیا ہے اسے اس سے کچھ بڑھ کر ادا کرو۔ مثلاً ایک من کے بدلے سوا من۔ چنانچہ جب اسی طرح اضافے کے ساتھ اسے اس کا قرض ادا کر دیا گیا تو وہ چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد لوٹ کے آیا اور کہا حضور میں ایک یہودی ہوں اور کتاب کا علم رکھتا ہوں میں نے اپنی کتاب یعنی تورات میں نبی آخر الزماں کی علامتیں پڑھی ہیں باقی تمام علامتیں میں آپ میں دیکھ چکا تھا صرف ایک علامت تھی جسے میں جاننا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ہماری کتاب میں یہ لکھا ہے کہ جو آخر الزماں نبی ہوں گے ان کی علامت یہ ہے کہ لوگوں کی گستاخیاں ان کے تحمل اور بردباری کو شکست نہیں دے سکیں گی۔ وہ سخت سے سخت رویہ اختیار کرنے والوں سے بھی نرمی اور حسن اخلاق سے پیش آئے گا۔ کہا آج میں اس نشانی کو دیکھنے کیلئے آیا تھا چنانچہ آج میں نے پوری طرح اس نشانی کو دیکھ لیا ہے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ واقعی وہی نبی ہیں جس کی خبر ہماری کتابوں نے دی تھی۔ اب مجھے کلمہ پڑھایئے اور مسلمان کیجئے۔

اس کے بعد اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتے۔ اس کے تین مطلب اہل علم نے بیان کئے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ نے شریعت میں جتنے احکام دیئے ہیں وہ انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کو تول کر دیئے ہیں۔ ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کے تحمل سے بڑھ کر ہو اس لئے کل کو کوئی آدمی اللہ کے سامنے یہ عذر نہیں کر سکے گا کہ شریعت میں جو احکام ہمیں دیئے گئے تھے وہ چونکہ بہت سخت تھے ہم کسی طرح اس پر عمل کر سکتے تھے اس لئے یہاں فرمایا کہ ہم چونکہ انسانی فطرت اور انسان کی صلاحیتوں کے پیدا کرنے والے ہیں ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے تحمل اور برداشت کا عالم کیا ہے اس لئے ہم نے جو بھی حکم دیا ہے وہ ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے دیا ہے اگر کوئی حکم کسی کو سخت معلوم ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ حکم میں سختی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکم پر عمل کرنے والا یا تو فسادِ نیت کا شکار ہے اور یا قوتِ ارادی کی کمزوری کا۔ ورنہ اسلامی شریعت کے احکام میں ایسی کوئی سختی نہیں جس کا تحمل انسان کیلئے مشکل ہو۔

دوسرا اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت ﷺ کا اپنا عمل یہ تھا کہ آپ ہمیشہ اصل قرض سے بڑھ کر ادا فرماتے تھے اور ہر حکم کی تعمیل میں واجب سے بڑھ کر ہمت صرف کرتے تھے جس سے امت کو یہ سبق ملتا تھا کہ اسے بھی مالی معاملات ہوں بدنی معاملات ہوں یا لین دین کے معاملات اس میں حق واجب سے بڑھ کر کوشش کرنی چاہئے اور ادائیگی کرنی چاہئے۔ اس لئے یہاں یہ بات کہہ کر یہ تسلی دی گئی ہے کہ اگرچہ آنحضرت کا اپنا اسوہ یہی ہے لیکن اس کی حیثیت تقویٰ اور اخلاق کی ہے قانون کی نہیں۔ کوئی آدمی زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے سرخرو کرنا چاہتا ہے تو اسے ایسا ہی کرنا

Marfat.com

چاہئے۔ لیکن ہر آدمی چونکہ اس کا تحمل نہیں کرسکتا اس لئے اس کو فرض یا واجب قرار نہیں دیا گیا جس آدمی نے اپنے ذمے حق کو پورا پورا ادا کر دیا ہے لیکن اس نے حق سے زائد کچھ نہیں کیا تو وہ یقیناً اللہ کے سامنے مواخذہ سے بچ جائے گا۔

تیسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ جن طبیعتوں پر نیکی کا غلبہ ہوتا ہے وہ ایسی صورت میں بھی اسلامی احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ان کی جسمانی صحت ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہوتی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ بالآخر وہ اصل احکام کی بجا آوری سے بھی معذور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شیخ فانی کو اللہ تعالیٰ نے روزے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے وہ اگر چاہے تو اسے اس بات کی اجازت ہے کہ بجائے خود روزہ رکھنے کے دوسرے کو روزہ رکھوا دے لیکن بعض نیک لوگ ایسی صورت میں بھی چاہے اس کا نتیجہ ان کی صحت کیلئے کیسا ہی خطرناک نکلے وہ روزہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے بہت بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔ ان سے یہاں فرمایا جارہا ہے کہ ہر شخص پوری دیانت وصداقت کے ساتھ شرعی احکام کی تعمیل ظاہراً و باطناً کرے۔ لیکن اگر اس کی جسمانی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی تو اسے شرعی احکام سے کشتی لڑنے کی اجازت نہیں اس کا جسم جس حد تک تحمل کرسکتا ہے وہ اسی کا پابند ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس اجازت کو بہانہ نہیں بنالینا چاہئے جس طرح ہمت سے بڑھ کر احکام کی تعمیل کوئی نیکی نہیں اسی طرح ہمت کی کمزوری کا بہانہ بنالینا بہت بڑی برائی ہے دونوں کے درمیان اعتدال اختیار کرنا ہی اصل میں اس کا صحیح مفہوم ہے۔

ہمیشہ حق وانصاف کے مطابق بات کرو:

اس آیت کریمہ میں تیسرا مگر مجموعی طور پر آٹھواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ جب تم کوئی بات کہو تو عدل اور انصاف کے ترازو میں تول کے کہو۔ اس کا تعلق بھی انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام معاملات میں پاکیزگی اور اس کے سیرت وکردار کی تعمیل میں اکل حلال کے ساتھ ساتھ جو چیز سب سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے وہ یہی چیز ہے کہ آدمی اپنے قول میں سچا اور اپنے رویے میں کھرا ہو وہ جب بھی کوئی بات منہ سے نکالے تو اسے حق اور عدل کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھ کے دیکھ لے اس میں صداقت وامانت بھی شامل ہو اور حکمت ومروت بھی یعنی نہ تو منہ سے ایسی بات نکلنی چاہئے جو جھوٹ پر مبنی ہو اور نہ زبان سے ایسی بات ادا ہونی چاہئے جو معاملات میں پیچیدگی کا باعث ہو اور د..ں کو زخم پہنچانے والی ہو۔ اس میں سی بے احتیاطی بہت ساری الجھنوں کا باعث بنتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جس: ائی نے بری طرح دراڑیں پیدا کی وہ یہی ہے کہ ہم قدم قدم پر زبان کا غلط استعمال کرتے ہیں یہ زبان اور یہ قوت گویائی جو اللہ کی بیش بہا نعمت ہے ہم ...نہایت غلط طریقے اور غلط جگہوں استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے بات بات پر جھوٹ بولنا' معمولی سے نفع کی خاطر اور معمولی لالچ میں آ کر ...ت لوجھ سے کچھ بنا دینا اور معمولی معمولی خوف کا شکار ہو کر بات سے مکر جانا اور معمولی معمولی فوائد کی خاطر عدل اور انصاف کا خون کر دینا یہ ہمارا ...زمرہ بن گیا ہے۔ اسی نے ہماری اجتماعی زندگی میں ایسے کانٹے بکھیرے ہیں جو ہمیں آنکھوں سے چننے پڑ رہے ہیں۔ ہمارا مقتدر طبقہ' ہماری عدالتیں' ...انتظامیہ' ہمارے باقی اجتماعی ادارے بھی اس برائی کا بری طرح شکار ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس بات کا شاید بالکل احساس نہیں رہا کہ ہماری زبان سے نکلنے والا ایک ایک بول کل کو میزان قیامت میں تول بن جائے گا۔ جس پر ہماری اخروی زندگی کا دارومدار ہے۔ لیکن یہاں یہ حکم جس سیاق کلام میں وارد... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دو چیزوں سے ہے ایک تو یہ کہ فرض کرو تمہیں کہیں کسی معاملے میں گواہی دینی پڑے تو تمہیں اپنی گواہی میں ...ل ...ور تسط کے تقاضوں کو پوری طرح رکھنا ہے۔ فرض کیجئے تمہاری گواہی سے ایک فریق کو فائدہ پہنچتا ہے اور دوسرے کو نقصان لیکن دونوں صورتو... تم نے اگر انصاف کے تقاضوں نہیں کیا تو کل کو دونوں فریقوں کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب تم ...ا...د... تو بالکل وہی بات کہو جو حقیقت

Marfat.com

جانتے ہو اور جس کو تمہاری آنکھوں نے دیکھا ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ تم اس میں مزید چھان بین کرلو اور اس بات کی بالکل پرواہ نہ کرو کہ تمہاری گواہی سے کسی کو فائدہ پہنچتا ہے یا نقصان بلکہ تمہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں کیا یہ میرے علم اور واقعے کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور کیا اس بارے میں اللہ کے سامنے جب مجھ سے پوچھا جائے گا تو کیا میں یہ کہہ کر سرخرو ہوسکوں گا کہ میں نے واقعی اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے غلط گواہی کو شرک کے برابر قرار دیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے یہاں شرک اتنا بڑا گناہ ہے جسے معاف کرنے سے اللہ نے انکار کردیا ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے اور اس پر قرآن کریم کی ایک آیت سے استدلال بھی فرمایا۔

دوسری چیز جو اس حکم سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا موقع دے کہ تم منصف اور جج کے مسند پر فائز کردیئے جاؤ تو فرمایا جا رہا ہے کہ تم اس مسند پر بیٹھ کر عدل اور قسط کے مطابق ٹھیک ٹھیک فیصلے کرو۔ تمہاری یہ ذمہ داری ہے کہ ہر معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کی پوری طرح چھان بین کرو۔ گواہیوں کو اچھی طرح جانچو پرکھو اور پھر صورت معاملہ کو پوری طرح سمجھنے کے بعد کامل تقویٰ اور شعور کے ساتھ معاملے کا فیصلہ کرو۔ تمہارے فیصلے سے اگر تمہارے کسی اپنے عزیز یا دوست پر ضرب پڑتی ہے تو اس کی بالکل پرواہ نہ کرو اور اگر اس سے کسی دشمن کو فائدہ پہنچتا ہو تو تب بھی تم عدل وقسط کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اسی کی تاکید کیلئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا قاضی یعنی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے تین قسم کے ہیں ان میں سے ایک جنت میں جائے گا اور دو جہنم میں جس نے معاملہ کی تحقیق شریعت کے موافق کر کے حق کو پہچانا پھر حق کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے اور جس نے تحقیق کر کے حق بات کو جان تو لیا مگر جان بوجھ کر فیصلہ اس کے خلاف کیا وہ دوزخی ہے اور اسی طرح وہ قاضی جس کو علم نہ ہو یا تحقیق اور غور وفکر میں کمی کی اور جہالت سے کوئی فیصلہ دے دیا وہ بھی جہنم میں جائے گا۔ اسی کی مزید تائید اور تاکید کیلئے فرمایا: وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبىٰ کہ تمہاری گواہی یا تمہارے فیصلے کی زد اگر تمہارے کسی قرابت دار پر پڑتی ہے تو تب بھی تمہیں عدل سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔

اللہ سے کئے عہد کو پورا کرو:

اس آیت کریمہ میں چوتھا حکم اور مجموعی طور پر احکام عشرہ کا نوواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ اللہ کے عہد کو پورا کرو اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس عہد الست کو پورا کرو جو عالم ارواح میں اللہ نے انسانی روحوں سے لیا تھا سب کو جمع کر کے پوچھا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں'' سب نے بالاتفاق کہا تھا کہ ہاں آپ ہی ہمارے رب ہیں اور ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً جتنے اللہ کے پیغمبر آئے اور کتابیں آئیں انہوں نے آکر اسی عہد کی یاددہانی کرائی۔ سعید روحوں نے اس یاددہانی کو قبول کیا اور ایمان لے آئیں۔ لیکن جنہوں نے معصیت اور بگاڑ کی شدت کے باعث اپنے آپ کو بالکل ناکارہ بنالیا تھا وہ ایمان سے محروم رہیں۔ یہاں اسی کا حکم دیا جارہا ہے کہ اللہ کے اس عہد الست کو پورا کرو جس میں تم نے اللہ کو اپنا رب مان کر یہ تسلیم کیا تھا کہ تم اللہ ہی کی بندگی اور اطاعت کرو گے۔ سو آج اسی بندگی کی دعوت لے کر ہمارے آخری رسول تم میں مبعوث ہوئے ہیں اپنے اس عہد کی پاسداری کرتے ہوئے ان پر ایمان لاؤ۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ جب ایک آدمی کلمہ طیب یا کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوتا ہے تو وہ اصلاً اللہ سے یہ عہد کرتا ہے کہ یا اللہ میں تجھے ہی الٰہ یعنی معبود برحق اور حاکم حقیقی جانتا ہوں میں نہ کسی کے سامنے عبادت کیلئے سر جھکاؤں گا اور نہ میں کسی کی غیر مشروط اطاعت کروں گا صرف تیرے ہی سامنے میرا سر جھکے گا اور تیرے ہی قانون کو میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کروں گا اور مسلمان اجتماعی طور پر یہ کلمہ پڑھتے ہوئے اسی عہد کی تجدید کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں کوئی قطعہ زمین عطا فرمائے گا جس میں ہماری اپنی حکومت ہوگی تو اس میں ہم اللہ ہی کے قانون کو نافذ کریں

Marfat.com

گے اور اسی کی غیر مشروط اطاعت کریں گے۔ کوئی ملکی قانون جو اللہ کے قانون سے متصادم ہوگا ہم اسے ماننے سے انکار کردیں گے حکمرانوں کی کوئی ایسی اطاعت جو اللہ کی اطاعت سے ٹکرائے گی ہم ایسی اطاعت کرنے سے انکار کردیں گے۔ اس حوالے سے ہمارے قرن اول کی تاریخ روشن مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ ہم نے اللہ سے کئے ہوئے اس عہد کو ہمیشہ پورا کرنے کی کوشش کی چاہے ہمیں اس کیلئے کیسی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑی ہو۔

مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے پڑوسی عیسائی ملک سے جنگ بندی کا ایک معاہدہ کیا اور ایک مدت طے پا گئی کہ اس مدت کے دوران جانبین میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرے گا۔ چنانچہ جب وہ مدت اختتام کے قریب پہنچی تو امیر معاویہ نے سرحد پر فوجیں جمع کرنے کا حکم دے دیا کہ جیسے ہی یہ مدت ختم ہو اسی دن یا اسی رات ہماری فوجیں دشمن کے ملک پر حملہ کردیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی امیر معاویہ خود فوجوں کی کمانڈ کرتے ہوئے دشمن کے ملک میں داخل ہوگئے۔ دشمن چونکہ بالکل بے خبر تھا چنانچہ یہ علاقے فتح کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے کہ اچانک انہوں نے ایک دن دیکھا کہ ایک سوار اونٹ پر بگٹٹ بھاگے ہوئے چلا آ رہا ہے اس نے ہاتھ اٹھا رکھے ہیں اور بلند آواز سے کچھ کہہ رہا ہے۔ قریب آیا تو لوگوں نے سنا کہ وہ یہ کہہ رہا تھا وَفَـــاءٌ لَا غَـــدْرًا کہ معاہدہ پورا کرنا ہے توڑنا نہیں۔ یہ سوار قریب پہنچا تو معلوم ہوا یہ فلاں صحابی ہیں امیر معاویہ خود آگے بڑھے پوچھا کہ میں نے کیا معاہدے کی خلاف ورزی کی؟ ان صحابی نے بتایا کہ میں نے خود آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ تم اس وقت تک دشمن کے ملک پر حملہ نہ کرو جب تک کہ معاہدہ ختم ہونے کی اطلاع دشمن کو نہ دے دی جائے۔ اب اگرچہ معاہدہ کی مدت ختم ہو چکی ہے لیکن دشمن اس سے بے خبر ہے آپ کو اس سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے ورنہ یہ معاہدے کی روح کی خلاف ورزی ہوگی۔ امیر معاویہ نے جب یہ آنحضرت کا ارشاد سنا اور صحابی کی وضاحت سنی تو آپ نے فوراً سر جھکا لیا اور فوجوں کی واپسی کا حکم دے دیا اور جو علاقے فتح ہو چکے تھے ان کو چھوڑ کر واپس آگئے۔

ان دونوں طرح کے عہدوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام معاہدے اور تمام وعدے جو ہم انفرادی طور پر ایک دوسرے سے کرتے ہیں یا مسلمان مملکت دوسری مملکتوں سے کرتی ہے اور مسلمان ریاستیں دوسری ریاستوں سے کرتی ہیں وہ تمام معاہدے بھی اس عہد سے مراد ہیں۔ یعنی مسلمانوں کے ایک دوسرے سے کئے ہوئے وعدے اور مسلمان ریاست کے دوسروں سے کئے ہوئے معاہدے اسی طرح پورے کرنے چاہئیں جس طرح اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام وعدے اور تمام مواعید اللہ ہی کے نام سے وجود میں آتے ہیں اور اللہ ہی نے ان کی پابندی کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر ہم ان کو توڑیں گے تو دنیا میں جو ہوگا سو ہوگا اللہ کے یہاں اس کی ہمیں جوابدہی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ قرآن کریم نے دوسری جگہ اسی حکم کو مطلق رکھا ہے یہاں تو عہد کو عہد اللہ کہا گیا ہے وہاں صرف عہد کا لفظ آیا ہے۔ فرمایا اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ج اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ”عہد کو پورا کرو بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا“ (بنی اسرائیل:۳۴)۔ یہاں عہد سے مراد ہر طرح کا عہد ہے چاہے وہ اللہ کے ساتھ ہو چاہے ریاستوں کے مابین ہو اور چاہے انفرادی طور پر باہمی معاملات میں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح آپس کے وعدوں کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اگر انفرادی طور پر اللہ کے ساتھ کوئی نذر مانتا ہے تو اسے پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمانبردار بندوں کی جن باتوں میں تعریف فرمائی ہے ان میں ایک بات یہ بھی ہے یوفون نذورھم وہ اپنی نذروں کو پورا کیا کرتے ہیں۔

اسکے بعد فرمایا کہ یہ وہ باتیں ہیں جسکی تمہیں اللہ نے وصیت فرمائی ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ پچھلی آیت میں آیت کے اختتام پر یہ فرمایا تھا کہ ان باتوں کی اللہ نے تمہیں وصیت اس لئے کی ہے تاکہ تم ان باتوں میں تعقل سے کام لو اور غور و فکر کرو اور اگلی آیت کریمہ میں اسی طرح کا جملہ لا کر آخر میں فرمایا کہ یہ تمہیں جو وصیت کی جارہی ہے یہ اسلئے ہے تاکہ تم اپنے اندر تقویٰ پیدا کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو جوہر عقل سے نوازا

Marfat.com

اور یہ ایک ایسا نور ہے کہ جس پر اگر خواہشات مفادات اور عصبیتوں کا اندھیرا غالب نہ آ جائے تو وہ انسان کو ہمیشہ راہ راست کیطرف راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن جب اس پر دوسری چیزیں پردہ ڈال دیتی ہیں تو پھر یا تو یہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے یا خواہشات کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا ہے اور خواہشات پوری کرنے کیلئے اس کیلئے دلائل گھڑتا اور ضمیر کو سلانے کی کوشش کرتا ہے۔ مشرکین مکہ مسلسل شرک اور کفر کے ارتکاب کی وجہ سے ایک ایسی اندھی عصبیت کا شکار ہو گئے تھے جسکی وجہ سے انکے عقل وشعور کے چراغ گل ہو گئے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی جہالت کو ملت ابراہیمی کا نام دے رہے تھے۔ انہیں سب سے پہلے اسی تعقل کو اختیار کرنے کی دعوت دی گئی کہ جہالت کے اندھیروں سے نکلو اور عقل کی روشنی میں خود اپنے رویے کا جائزہ لو اور پھر ملت ابراہیمی کی مزید باتیں اور مزید احکام بتا کر ان سے فرمایا کہ اگر تم نے تعقل کا سفر مکمل کر لیا ہے اور تم نے واقعتاً صحیح سمت میں غور وفکر شروع کر دیا ہے تو اب تمہاری دوسری منزل یہ ہے کہ تم تذکر سے کام لو اور اپنے اصل مقام کو سمجھنے اور مقصد حیات کو جاننے کیلئے فکر مندی پیدا کرو تمہارا اصل مقام اور مقصد تمہارے سامنے مسلسل نمایاں اور واضح کیا جا رہا ہے اگر تم عصبیت کے اندھیروں سے نکل کر ان باتوں پر غور کرو گے تو یہ یاددہانی تمہارے سامنے تمہارے اصل مقام کو واضح کر دے گی اور جب تم نے اپنی اور کائنات کی حقیقت اور پھر ان دونوں میں باہمی تعلق اور اللہ کے ساتھ اپنے رشتے کی حقیقت کو سمجھ لیا اور اس یاددہانی کی منزل سے خیریت سے گزر گئے تو پھر یقیناً تمہارے اندر تقویٰ یعنی اللہ کا خوف پیدا ہو جائے گا اور اپنے انجام کے بارے میں تمہارے اندر فکر مندی ابھرے گی اور اپنے معمولات کے حوالے سے تمہیں یہ احساس دامن گیر ہو جائے گا کہ جسطرح کی زندگی ہم گزار رہے ہیں اللہ کے سامنے جا کر ہم اسکا کیا جواب دے سکیں گے تو یہی وہ آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر آدمی اپنے مقصد حیات کو بھی پالیتا ہے اور وہ زندگی بھی اختیار کر لیتا ہے جو اسے آخرت میں سرخرو کر سکے گی۔

اب اگلی آیت کریمہ میں احکام عشرہ میں سے دسواں حکم بیان کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت: ۱۵۳ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ O ''اور یہ کہ یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے۔ تو اس کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس کی راہ سے الگ کر دیں، یہ باتیں ہیں جن کی تمہیں ہدایت فرمائی، تاکہ تم اس کے غضب سے بچو''۔

یہ دسواں حکم ہے جس سے احکام عشرہ مکمل ہو گئے اور اس میں پروردگار نے نہایت فصاحت و بلاغت سے اس حکم کی اہمیت کو نمایاں کرنے کیلئے مثبت اور منفی دونوں پہلو جمع کر دیئے ہیں۔ سب سے پہلے صراط مستقیم کی خبر دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی نہایت اہتمام سے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اے پیغمبر ان سے کہہ دیجئے کہ میں تمہیں جس راستے کی دعوت دے رہا ہوں اور جس پر میں خود اور میرے ماننے والے چل رہے ہیں یہی وہ راستہ ہے جو سیدھا راستہ ہے اور جس پر چل کر چلنے والے اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں اور انہیں اللہ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس آیت میں مُسْتَقِیْمًا جو صراط کی صفت ہے اسے حال کے طور پر لایا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ میرا راستہ اس طرح کا صراط مستقیم ہے کہ مستقیم ہونا اس کی لازمی صفت ہے جو کبھی اس سے الگ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اب اگر سیدھے راستے پر چلنا چاہتے ہو تو پھر میرا اتباع کرو کیونکہ اب کسی اور کے اتباع کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پہلے پیغمبروں اور پہلی کتابوں کا وقت گزر گیا اور پھر ان کے ماننے والوں نے اس میں بہت سی تحریف اور ترمیم کر ڈالی اور ان کے راستے کو ایسا گڈمڈ کر دیا کہ اب اس پر چلنا ممکن نہیں رہا۔ اب اس صراط مستقیم کو بتانے اور اس پر چلانے کیلئے محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا گیا ہے۔ اس لئے اب جو بھی اللہ کا قرب حاصل کرنے کیلئے صراط مستقیم پر چلنا چاہتا ہے اسے آنحضرت کا اتباع کرنا ہوگا۔ اس طرح مثبت طریقے سے اس راستے کی اہمیت اور اس کے

Marfat.com

راہنما کی خبر دے دی گئی ہے اور پھر منفی پہلو سے واضح طور پر فرمایا گیا کہ دیکھنا لوگوں نے اس راستے کے ساتھ ساتھ بہت سی پگڈنڈیاں نکال لی ہیں ان پگڈنڈیوں پر چلنے سے احتراز کرنا۔ اگر تم نے اس میں ذرا سے تساہل سے کام لیا تو وہ تمہیں اس راہ راست سے بھٹکا دیں گی۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے سامنے ایک سیدھا خط کھینچا' فرمایا یہ صراط مستقیم ہے پھر اس خط کے ساتھ ساتھ دونوں طرف آپ نے چھوٹے چھوٹے خط کھینچے۔ فرمایا یہ وہ راستے اور پگڈنڈیاں ہیں جو انسانوں اور شیطانوں نے خود نکالی ہیں۔ مزید فرمایا کہ ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان مسلط ہے جو مسلسل لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتا رہتا ہے ذرا سا غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی ہمیشہ اس صراط مستقیم پر چلانے کیلئے آتے ہیں۔ اس راستے کی راہنمائی کیلئے وہ اپنے ماننے والوں کو اللہ کی کتاب اور اپنی سنت دے کر جاتے ہیں۔ لیکن ہر رسول کی امت نے جب گمراہی کا راستہ اختیار کیا تو کتاب کو تحریف اور ترمیم کے ذریعے بگاڑا اور ہر سنت کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی بدعت ایجاد کی اور اس طرح صراط مستقیم کے پہلو بہ پہلو بے شمار راستے نکال دیئے جن میں الجھ کر امتیں بھٹک گئیں۔ دکھ تو یہ ہے کہ یہ آخری امت جس پر انبیاء کرام کی ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں اور جس نے قیامت تک انسانوں کو اس راہ راست پر چلنے کی دعوت دینی ہے اور اللہ کا دین ٹھیک ٹھیک ان تک پہنچانا ہے خود ان کا حال یہ ہے کہ دین کے تقریباً ہر شعبے میں انہوں نے بدعات ایجاد کر لی ہیں ہر سنت کے ساتھ کسی نہ کسی بدعت کا اضافہ کر لیا گیا ہے اذان سن کے دیکھ لیجئے کس طرح اس کے ساتھ اضافے ملحق کر لئے گئے ہیں جس کا نصف صدی پہلے کوئی وجود نہ تھا اور اصرار یہ ہے کہ یہی وہ اذان ہے جو ہمیں رسول اللہ ﷺ سے ملی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو سیدھے سادے مسنون طریقے کو چھوڑ کر عجیب و غریب بدعات سے بچے کا استقبال کیا جاتا ہے اور اس کے تحفظ کی کوشش کی جاتی ہے۔ عقیقہ متروک ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ نئی نئی خرافات نے لے لی ہے۔ کوئی موت واقع ہو جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ مسنون طریقے سے تین دن سوگ منایا جائے اور مرحوم کیلئے دعائے مغفرت جاری رہے ہم نے نجانے کیا کیا طریقے نکال لئے ہیں اور اس کو دین سمجھتے ہیں۔ بعض باتوں کو تو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ جو آدمی صاحب نصاب نہیں یعنی ایک غریب آدمی ہے اس پر نہ حج فرض ہوتا ہے نہ قربانی واجب ہوتی ہے اور نہ اسے زکوٰۃ دینا پڑتی ہے۔ لیکن رسوم جو بدعات بن کر دین میں داخل ہو گئی ہیں ان کی گرفت اتنی شدید ہے کہ سارے ارکان مجبوری کی وجہ سے تو ساقط ہو سکتے ہیں۔ لیکن غریب سے غریب آدمی نہ قلوں کی رسم چھوڑ سکتا ہے اور نہ چالیسویں سے معذرت کر سکتا۔ حالانکہ اہل علم خوب جانتے ہیں کہ ان رسموں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ہم نے ان کو ہر فرض سے بڑھ کر فرض سمجھ لیا ہے۔ جب سے شادی بیاہ میں کھانے پر پابندی لگی ہے اس وقت سے چالیسویں زیادہ پر رونق ہو گئے ہے اور اب چالیسویں میں بالکل اسی طرح اہتمام ہوتا ہے جیسے کبھی ولیمے میں تھا اور لوگ اس لئے اس میں شوق سے شریک ہوتے ہیں کہ ایک پر تکلف کھانا کھانے کو ملے گا۔ آخر اس سنگ دلی کی کوئی انتہا بھی ہے کہ ہم مرنے والے کی موت کا غم لگانے کی بجائے اس کے نام پر دعوتیں اڑاتے ہیں۔ تین دن نہیں گزرتے کہ قلوں کے نام پر فروٹ پارٹی ہوتی ہے ہر ساتویں دن جمعرات کو ایک پر تکلف کھانا تیار ہوتا ہے اور پھر چالیسویں کا تو ذکر ہی کیا وہ تو ایک ایسی تقریب بن گئی ہے کہ جو شادیوں سے زیادہ پر رونق ہو گئی ہے۔ اکبر مرحوم نے طنزیہ انداز میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا

؎ میں تم کو بتاؤں مرنے کے بعد کیا ہو گا
پلاؤ کھائیں کے احباب اور فاتحہ ہو گا

یہ تو چند رسموں کا ذکر ہم نے کیا ورنہ ایسی ایسی رسمیں ہمارے معاشرے میں پیدا ہو گئی ہیں جن کو سن کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے اور تصور یہ

Marfat.com

کریہ رسمیں ادا نہ کی جائیں تو ایک مسلمان کے ایمان میں شاید کوئی کمی واقع ہو جاتی ہے۔اس لئے یہاں تاکید سے فرمایا کہ صراط مستقیم اور سنت کے راستے پر چلنا' ان پگڈنڈیوں کی پرواہ نہ کرنا ورنہ تم اصل راستے سے بھٹک جاؤ گے۔

اب اگلی آیت کریمہ میں ملت ابراہیمی اور اللہ کی طرف سے ملنے والی رہنمائی کے تسلسل کو بیان کیا جارہا ہے۔ارشاد فرمایا:

آیت:۱۵۴ ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْٓ اَحْسَنَ وَ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ O ''پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی' اپنی نعمت پوری کرنے کیلئے اس پر جو خوب کار تھا اور ہر چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت' تا کہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں''۔154

تورات مکمل ہدایت اور رحمت تھی:

اس آیت کریمہ میں سب سے پہلا لفظ ثُمَّ ہے اس کا معنی ہے ''پھر'' یہ ترتیب پر دلالت کر رہا ہے یعنی جس طرح ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ دس احکام دیئے تھے جو ان کی شریعت کی اساس تھے اس طرح ہم نے یہ احکام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی دیئے جو ان کی شریعت کی اساس بنے۔آج بھی تورات اٹھا کر دیکھ لیجئے۔اس میں یہ تمام کے تمام احکام موجود ہیں الفاظ اور ترتیب میں فرق ہو سکتا ہے۔بنیادی مضمون میں کوئی فرق نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد سب سے بڑے جلیل القدر رسول ہو کر آئے اور ان کے ماننے والی امت یہود چونکہ حضور کے سامنے تھی۔اس لئے بطور خاص ان کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ بات معلوم ہو سکے کہ نبی کریم ﷺ جو شریعت لے کر آئے ہیں اور جس میں یہ تمام احکام شامل ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ وہی احکام ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملت ابراہیمی کے طور پر دیئے گئے تھے۔پھر یہی احکام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الواح پر کندہ کرا کے دیئے گئے اور اب یہی وہ دس احکام ہیں جو قرآن میں نازل کئے گئے ہیں۔اس لئے لوگوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن کریم کسی نئی بات کی دعوت لے کر نہیں آیا بلکہ یہ اس زنجیر کی آخری کڑی ہے جو پہلے رسول سے شروع ہوئی اور آنحضرت ﷺ پر آ کر مکمل ہو گئی۔اس کے بعد اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی اور پھر اس کی چند صفات بیان کی گئیں۔ایک تو اس کی صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس لئے دی گئی تا کہ ان پر اور ان کے ماننے والے مسلمانوں پر اللہ کی ہدایت کی نعمت کو مکمل کیا جائے اور ملت ابراہیمی کے بعد پوری وسعت کے ساتھ ان کو وہ احکام دے دیئے جائیں جس کی انہیں اپنے وقت میں ضرورت ہے اور اسی کو یہاں قرآن کریم نے ہر چیز کی تفصیل کا نام دیا ہے یعنی انسانی ہدایت کیلئے جس جس چیز کی ضرورت تھی اور جس جس چیز کے احکام مطلوب تھے وہ سارے تورات میں موسیٰ علیہ السلام پر نازل کر دیئے گئے۔مزید فرمایا کہ اس کتاب کی صفات میں سے ایک صفت یہ تھی کہ وہ ہدایت بن کے آئی تھی یعنی وہ کتاب صرف اس لئے نازل نہیں کی گئی تھی کہ لوگ اسے پڑھ کر صرف ثواب حاصل کریں یا اپنے مرحومین کو ایصال ثواب کریں اور یا بیماروں کیلئے اسے پڑھ پڑھ کے پھونکیں یا تعویذ بنا کر گلے میں ڈالیں تا کہ بیماروں کو شفا نصیب ہو۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلی آسمانی کتابوں اور آج قرآن مجید سے بھی یہ تینوں فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔اسے پڑھنے سے ثواب بھی ملتا ہے اس سے ایصال ثواب بھی کیا جاتا ہے اور اس کی آیات سے شفا بھی حاصل کی جاتی ہے۔لیکن یہاں کہنا یہ ہے کہ یہ اس کتاب کے ضمنی فوائد ہیں۔کتابیں آسمانوں سے ان فوائد کیلئے نازل نہیں ہوتیں بلکہ وہ تو ایک انقلاب برپا کرنے کیلئے آتی ہیں جس سے دنیا میں نیا انسان وجود میں آتا ہے اور نئی سوسائٹی جنم لیتی ہے لیکن ہماری کوتاہ فہمی یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو یہود و نصاریٰ کی طرح صرف انہی مقاصد پر منحصر سمجھتے ہیں۔توپیں اس لئے نہیں ڈھالی جاتیں کہ اس سے کووں کا شکار کیا جائے بلکہ وہ تو قلعوں کے دمدمے اور مورچے اڑانے کیلئے فائر کی جاتی ہیں۔لیکن اگر ان

Marfat.com

کے فائر کے راستے میں کوئی بڑا چھوٹا جانور آ جائے تو یقیناً مر وہ بھی جائے گا۔ یہاں پر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تورات جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی اس کی ایک صفت یہ تھی کہ وہ دنیا میں ہدایت بن کے آئی۔ یعنی وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے رہنما اور قانون بن کے آئی۔ وہ انسان کی انفرادی زندگی میں آدابِ زندگی کا درس دیتی ہے اور عدالتوں میں زندگی کے فیصلے کرتی ہے اور حاکمیت کے اداروں سے قانون بن کے بولتی ہے یہ اس کتاب کی اصل حیثیت ہے اور یہ اس کی مخصوص حیثیت نہیں بلکہ جو کتاب بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ اپنے ماننے والوں کیلئے اس طرح رہنمائی اور قانون کا فرض انجام دیتی رہی ہے اور اپنے نتیجے کے اعتبار سے ہر کتاب اسی تورات کی طرح رحمت بن کے آئی ہے۔ یعنی اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبے میں ایک ہمواری اور استواری پیدا ہوتی ہے۔ گھر جنت کا نمونہ بن جاتے ہیں اور معاشرہ مروت' خیر خواہی اور ہمدردی کا غماز بن جاتا ہے اور پورے ملک پر اللہ کی رحمتیں اس طرح برستی ہیں کہ ان کے غلوں میں اضافہ ہو جاتا ہے' ان کی فصلیں لہلہانے لگتی ہیں' ان کے پھل معمول سے زیادہ رس دینے لگتے ہیں' ایک عام خوشحالی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کتاب پر ایمان لانے والے شکر کی تصویر بھی بن جاتے ہیں۔ مسلمان اگر قرن اول کی تاریخ پڑھیں تو انہیں اندازہ ہوگا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے خلافت راشدہ اور اس کے بعد بھی مختلف ادوار میں مسلمانوں پر رحمتیں نازل فرمائیں۔ حق و باطل کے ہر معرکے میں ان کو سرخرو فرمایا اور اہل زمین میں ان کو وہ عزت عطا فرمائی کہ سر اور دل ان کے سامنے جھکتے چلے گئے اور مؤرخین بتاتے ہیں کہ اس دور کی کھجور کی گٹھلیاں دیر تک حکومت کے خزانوں میں محفوظ رہیں جس سے بعد کے آنے والوں کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ اللہ کی رحمت جب نازل ہوتی ہے تو کس طرح ہر چیز کا حجم بڑھ جاتا ہے' کس طرح ایک ایک انار سے گلاس بھر جاتے تھے اور تھوڑا کھانا بہت سے لوگوں کیلئے کفایت کر جاتا تھا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانوروں تک کی حفاظت فرماتے ہیں۔ مؤرخین بتاتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں ایک دن ایک گڈریے نے چیخ ماری۔ لوگ آواز سن کے دوڑے آئے پوچھا تمہیں کیا ہوا اس نے کہا کہ جب سے حضرت عمر بن عبدالعزیز برسر اقتدار آئے اللہ کی حفاظت ہمارے شامل حال رہی کہ کبھی کسی بھیڑیے کو میری بکریوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آج ایک بھیڑیا میری بکری اٹھا کر لے گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج دنیا میں وہ ہمارا پاسبان زندہ نہیں رہا۔ چنانچہ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ اسی دن حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے بعد نبوت' شریعت اور کتاب کے نزول کے اصل مقصد کو بیان کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے یہ کتاب اس لئے دی تھی تاکہ لوگ اس پر عمل کر کے اپنے رب سے ملاقات کا یقین پیدا کریں اور یہی اصل میں وہ مقصد حقیقی ہے جس کیلئے دنیا میں کتابیں آتی ہیں اور جس کیلئے پیغمبر تشریف لاتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب اللہ سے برگشتہ ہونا ہے اور یہ برگشتگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب اللہ کے سامنے جوابدہی کا یقین ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

یقین کریں ف اور (اے کفر کرنے والو) یہ کتاب بھی ہمیں نے اتاری ہے برکت والی۔ تو اس کی پیروی کرو اور (خدا سے) ڈرو تاکہ تم پر مہربانی کی جائے۔

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ

(اور اس لیے اتاری ہے) کہ (تم یوں نہ) کہو کہ ہم سے پہلے دو ہی گروہوں پر کتابیں اتری تھیں۔ اور ہم ان

كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا

کے پڑھنے سے (معذور اور) بے خبر تھے ؎۲۔ یا (یہ نہ) کہو کہ اگر ہم پر بھی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان لوگوں

Marfat.com

الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

کی نسبت کہیں سیدھے رستے پر ہوتے۔ سو تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے دلیل

وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ

اور ہدایت اور رحمت آ گئی ہے۔ تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرے اور ان

صَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ

سے (لوگوں کو) پھیرے۔ جو لوگ ہماری آیتوں سے پھیرتے ہیں اس پھیرنے کے سبب ہم ان

الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ

کو برے عذاب کی سزا دیں گے ﴿۱۵۷﴾ یہ اس کے سوا اور کس بات کے منتظر ہیں کہ ان

تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِىَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِىَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ

کے پاس فرشتے آئیں یا خود تمہارا پروردگار آئے یا تمہارے پروردگار کی کچھ نشانیاں آئیں (مگر) جس روز تمہارے

يَوْمَ يَاْتِىْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ

پروردگار کی کچھ نشانیاں آجائیں گی تو جو شخص پہلے ایمان نہیں لایا ہوگا اس وقت اسے

تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِىْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ

ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دے گا یا اپنے ایمان (کی حالت) میں نیک عمل نہیں کیے ہوں گے۔ (تو گناہوں

انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ

سے توبہ کرنا مفید نہ ہوگا) اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں ﴿۱۵۸﴾ جن لوگوں نے اپنے دین میں (بہت سے) رستے

كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِىْ شَىْءٍ ؕ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ

نکالے اور کئی کئی فرقے ہو گئے ان سے تم کو کچھ کام نہیں۔ ان کا کام خدا کے حوالے

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ

پھر جو جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں وہ ان کو (سب) بتائے گا ﴿۱۵۹﴾ جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو

Marfat.com

فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا

ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اُسے سزا ویسی ہی ملے گی

مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ

اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ کہہ دو کہ مجھے میرے پروردگار نے

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ

سیدھا رستہ دکھا دیا ہے (یعنی دین صحیح) مذہب ابراہیمؑ کا جو ایک (خدا) ہی کی طرف

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَ

کے تھے۔ اور مُشرکوں میں سے نہ تھے۔ (یہ بھی) کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا

مَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ

اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین ہی کے لیے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی بات

اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا

کا حکم ملا ہے اور میں سب سے اوّل فرمانبردار ہوں۔ کہو کیا میں خدا کے سوا اور پروردگار تلاش کروں

وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ

اور وہی تو ہر چیز کا مالک ہے۔ اور جو کوئی (برا) کام کرتا ہے تو اُس کا ضرر اسی کو ہوتا ہے۔ اور

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ

کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا پھر تم سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ

جانا ہے تو جن جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے وہ تم کو بتائے گا۔ اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا

خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ

نائب بنایا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کیے تاکہ جو کچھ اُس نے تمہیں بخشا ہے

Marfat.com

لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ

اُس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بیشک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے۔

وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٦٥﴾

اور بیشک وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

ملت ابراہیمی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کا ذکر فرمایا اور اب آنحضرت ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کا ذکر کیا جارہا ہے تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شریعت ابراہیمی یا ملت ابراہیمی کے جو بنیادی احکام دیئے گئے تھے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی بنیاد تھے اور انہی بنیادوں پر اسلامی شریعت کو اٹھایا گیا ہے اور وہی احکام عشرہ ابراہیمی صحیفوں کی طرح تورات میں بھی نازل ہوئے اور اب قرآن کریم میں بھی نازل کئے گئے ہیں' اس لئے اگر تم نے ملت ابراہیمی پر عمل کرنا ہے اور تم اس میں مخلص ہو تو پھر تمہیں اس ہدایت کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو ایک تسلسل کے ساتھ نوع انسانی کی طرف آتی رہی ہے اور جس کی تکمیلی اور آخری شکل قرآن پاک کی صورت میں نازل ہورہی ہے۔ البتہ یہاں ایک اعتراض ہوسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور بھی کتابیں اتریں اور پھر آخر میں بنی اسرائیل ہی کی طرف آنے والے آخری رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی لیکن یہاں اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا جواب اس کا یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر جو انجیل نازل ہوئی اس میں شریعت نہیں بلکہ حکمتِ شریعت کو بیان کیا گیا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنی امت کو تورات میں نازل کردہ شریعت پر ہی عمل کرنے کا حکم دیا اور اس سے پہلے آنے والے انبیاء کی امتیں بھی تورات ہی کی شریعت پر عمل کرنے کی پابند تھیں اس لئے تورات اور قرآن کریم کے ذکر کردینے کے بعد باقی کتابوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی چنانچہ پیش نظر آیات میں اب قرآن کریم کے نزول کی خبر دی گئی ہے اور ساتھ ہی مشرکین عرب کو تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ کتاب تم پر آخری حجت کے طور پر نازل کی جارہی ہے جس کے نتیجے میں تمہارے وہ تمام عذر بھی ختم ہو جائیں گے جو اس کتاب کے نازل نہ ہونے کی صورت میں تم اللہ کے سامنے پیش کرسکتے تھے اور وہ حجت بھی تمام ہوجائے گی جس کے بعد تمہاری بے دینی اور تمہارے موجودہ رویے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ ارشاد فرمایا جارہا ہے:

آیت:۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ O اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ص وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ O اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ج فَقَدْ جَآئَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ج فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا ط سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ O ''اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے سراپا خیر و برکت تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ مبادا تم کہو کہ کتاب بس ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر رہے۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے سو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت آگئی ہے تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں اور ان سے دوسروں کو پھیریں جو لوگ ہماری آیات سے اعراض اختیار کررہے ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب بہت برا عذاب دیں گے''۔

Marfat.com

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے نزول کو تمام نوع انسانی اور خاص طور پر عربوں پر اپنا خاص فضل و کرم قرار دیا ہے اور اس حوالے سے پہلی آیت میں قرآن پاک کیلئے ایک لفظ استعمال کیا گیا ہے جو ہم اپنی زبان میں بھی استعمال کرتے رہتے ہیں وہ لفظ ہے ''مبارک'' قرآن پاک کی زبان میں مبارک اس بارش کو کہتے ہیں جو زمین کی سیرابی' روئیدگی اور سرسبزی کا ذریعہ بنتی' اس کے خزانوں اور اس کی برکتوں کو ابھارتی اور اس کے مردہ اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد اس کو از سرِ نو حیاتِ تازہ بخشتی ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے ایک بہت بڑی حقیقت واشگاف ہو رہی ہے وہ یہ کہ اے عرب کے لوگو اور اے باقی نوع انسانی تم اس وقت روئے زمین پر جس طرح کی زندگی گزار رہے ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری انسانیت کے چشمے خشک ہو رہے ہیں۔ تمہارے شجر تہذیب کی جڑیں سوکھتی جا رہی ہیں' تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر جہالت کی ایسی خزاں چھائی ہوئی ہے کہ جس کے نتیجے میں تمہارے اخلاق اور تمہاری اقدار کا ایک ایک پتہ جھڑ گیا ہے اور ایک ایک کونپل سوکھتی جا رہی ہے اگر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کا کوئی مستقبل نہیں تم انفرادی اور معاشرتی زندگی میں اس حد تک درندگی کا شکار ہو چکے ہو کہ تمہارے معاشرے میں رہنے والے کسی فرد کی زندگی سلامت ہے نہ مال اور آبرو۔ تمہاری بظاہر انسانوں کی آبادیوں میں جنگل کا قانون جاری ہے جہاں ہر طاقت ور کمزور کو ہضم کرتا رہا ہے جس کے پاس طاقت ہے اس کیلئے کمزوروں کے حقوق غصب کر لینا ایک معمول کی بات بن چکی ہے اور جہاں تک تمہارے نام نہاد متمدن ملکوں کا تعلق ہے ان کی تمام قوتیں ایک دوسروں کو فتح کرنے اور ادھیڑنے میں لگی ہوئی ہے۔ ایرانی اور رومی طاقتیں یعنی قیصر و کسریٰ کی قوتوں نے ایک دوسرے کو فتح کرنے کیلئے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا ہے اور ہزاروں شہر تباہ کر ڈالے ہیں اگر یہ صورتحال جاری رہتی ہے تو خود اندازہ کرو کہ تمہاری بقاء کے امکانات باقی رہ جاتے ہیں۔ اس صورتحال سے تمہیں نجات دینے اور دوبارہ تمہیں انسانیت کے جامے میں لانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی کتاب اتاری ہے جو تمہارے لئے بہار کا پیغام بن کے آئی ہے۔ اگر تم اسے قبول کر لو تو تمہارے خزاں رسیدہ چمن میں پھر سے حیات تازہ کے پھول کھل سکتے ہیں۔ تمہارا معاشرہ اور تمہارا سماج پھر انسانیت کی تصویر بن سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس میں دیئے ہوئے احکام کی پیروی کرو' اس کا بتایا ہوا طرز زندگی اختیار کرو اور زندگی کے ان اصولوں کو قبول کر لو جس کی یہ کتاب دعوت دے رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے بادشاہوں اور اپنے سرداروں سے ڈرنے کی بجائے اللہ کا خوف اپنے دل میں پیدا کرو اسی کے نتیجے میں تمہیں ہر خوف سے آزادی ملے گی اور اسی سے انسانوں کو وہ حقوق مل سکیں گے جس سے انسانیت کو حیات نو نصیب ہو سکتی ہے اور جس کے نتیجے میں اللہ کی رحمت تم پر مہربان ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت کریمہ میں ان کے ایک عذر کو ختم کیا جا رہا ہے جو قیامت کے دن وہ اللہ کے حضور پیش کر سکتے تھے یعنی وہ قیامت کے دن یہ بات کہہ سکتے تھے کہ آپ ہم سے ہماری جس زندگی کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں اور ہماری گمراہیوں پر ہمیں جو سزا دینا چاہتے ہیں آخر ہم بگڑی ہوئی زندگی سے کیسے نکل سکتے تھے کیونکہ ہمارے ہاتھوں میں کوئی زندگی کی رہنما کتاب نہیں تھی' کوئی ایسا صحیفہ آسمانی نہیں تھا جس کی روشنی میں زندگی کا سفر خوش اطواری سے طے کر سکتے۔ ہمارے پاس سوائے آباؤ اجداد کی چھوڑی ہوئی رسموں کے اور سوائے اپنے جاہلانہ طور اطوار کے اور کچھ نہیں تھا تو ہم آخر اپنی اصلاح کرتے تو کیسے کرتے۔ ہم جس بات کو جانتے ہی نہیں تھے آخر اس پر عمل کیسے کرتے۔ آپ نے ہمارے ہمسائے میں اگر یہودیوں اور عیسائیوں پر کتابیں اتاری تھیں لیکن ہم ان پڑھ لوگ اس کا علم کیسے حاصل کر سکتے تھے اور پھر انہوں نے یہ سمجھ کر کہ ان کتابوں کی رہنمائی صرف بنی اسرائیل کیلئے ہے کبھی اس کی ہدایت سے ہمیں روشناس کرنے کی کوشش نہ کی اور ہمیں خود بھی جہالت کی وجہ سے کبھی ان چیزوں کا پاس نہ رہا تو اس کی موجودگی میں ہم آپ سے رحمت کے طلب گار ہیں' اس لئے آپ ہمیں اس کی سزا نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب اس لئے تم پر اتاری

Marfat.com

ہے کہ کل کو تم اپنی بے علمی اور بے خبری کا بہانہ کر کے اور اس کو جواز بنا کر اللہ سے معافی کے طلبگار نہ بن سکو اور اس کے بعد کی آیت میں ان کی مزید ایک بات کا جواب دیا گیا ہے کہ تم قیامت کے دن یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ آپ نے اہل کتاب پر کتابیں اتاریں لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کی اگر آپ ہم پر کتاب اتارتے تو آپ دیکھتے کہ ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے اور ہم وہ زندگی گزارتے جس کا آج آپ ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں اور آج ہمیں جس صورت حال سے سابقہ ہے ہم کبھی اس سے دوچار نہ ہوتے اس لئے پروردگار فرما رہے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب اس لئے تم پر اتاری ہے تاکہ یہ آخری حجت تمام کر دے اور تم قیامت کے دن کوئی بہانہ پیش نہ کر سکو اور ساتھ ہی ساتھ اس میں یہ تنبیہ بھی کی جا رہی ہے کہ اگر اس حجت کاملہ کے بعد تم اسے قبول کرنے سے انکار کرتے ہو تو پھر خود سوچ لو تمہارا انجام کیا ہو گا لیکن اس وارننگ کے ساتھ ساتھ جیسا کہ قرآن کریم کا اسلوب ہے اللہ تعالیٰ دلوں کو نرم کرنے کیلئے نہایت مربیانہ طریقے سے اس کتاب کی ان دو صفات کو بھی ذکر فرما رہے ہیں جو اس کی قبولیت کیلئے ترغیب کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ فرمایا جس طرح یہ کتاب تمہارے لئے ایک بینہ ہے کہ اس کے بعد تمہارے تمام عذر ختم ہو گئے اسی طرح یہ کتاب ہدایت اور رحمت بھی ہے یعنی یہ کتاب صرف اتمام حجت کیلئے نہیں اور نہ چند ظاہری باتوں کیلئے ہے بلکہ یہ زندگی کی رہنما کتاب ہے یہ کتابِ ہدایت ہے۔ جس میں تمہاری زندگی گزارنے کا پورا نظام دیا گیا ہے اس میں تمہارے گھر سے لے کر ایوان حکومت تک زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کیلئے رہنمائی فراہم نہ کی ہو اور پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ اگر تم اس رہنمائی کو قبول کر لیتے ہو اور اپنی زندگی اس راستے پر ڈال دیتے ہو جس کی طرف یہ کتاب رہنمائی کر رہی ہے تو پھر یہ کتاب تمہارے لئے رحمت کا پیغام ثابت ہو گی۔ تم اس کی رہنمائی میں ایک ایسی زندگی سے آشنا ہو جاؤ گے جس سے تمہاری دنیا تمہارے لئے جنت کا نمونہ بن جائے گی تم زندگی کے ہر مرحلے میں کامیابیوں سے ہمکنار کئے جاؤ گے' تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شادمانیوں کے وہ پھول کھلیں گے جن کی خوشبو تمہارے مشامِ جاں کو ہی معطر نہیں کرے گی بلکہ تمہاری عاقبت بھی اس سے سنور جائے گی۔ تم آخرت میں اللہ کی خوشنودی سے سرفراز کئے جاؤ گے اور ایک ایسی ابدی زندگی تمہارا مقدر بنے گی جس میں تم ہر خوف اور ہر حزن سے نجات پا جاؤ گے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھو کہ اگر تم نے اس آخری حجت کو جس میں تمہیں رہنمائی اور رحمت مہیا کی گئی ہے قبول نہ کیا بلکہ اس کو ماننے سے انکار کیا اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے رہے تو پھر یاد رکھو اللہ کی نگاہ میں تم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہو گا اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ ظالموں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ وہ کبھی راہ یاب نہیں ہوتے اور کبھی منزل کی خبر انہیں نہیں ملتی۔ ان کیلئے دنیا میں سوائے ناکامیوں کے دھکوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی تلخیوں سے عبارت ہوتی ہے وہ اللہ کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستوں پر ہمیشہ ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ دنیا ان کیلئے ایک ایسا مذبح بن جاتی ہے جس میں ان کے افراد اور ان کی میں ہلاکت سے دوچار ہوتی ہیں۔ قیامت کے دن ان کے اس اعراض کے رویے پر اللہ تعالیٰ ان کو بدترین سزا دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں جو کچھ عربوں کو قرآن کریم کے آخری حجت ہونے کے حوالے سے کہا جا رہا ہے وہ صرف ان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس کا مخاطب ہر دور میں نوع انسانی کا ہر گروہ ہے اور بالخصوص مسلمانوں پر تو اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے جن لوگوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا وہ تو صرف آخرت میں اپنے کفر اور انکار کی سزا بھگتیں گے لیکن دنیا میں انہیں جو مہلت دی جاتی ہے کیونکہ کفر کی پاداش میں بالعموم ان کی گرفت نہیں ہوتی اس کی وجہ سے وہ اسباب دنیا کی کشمکش میں اگر اسباب پیدا کرنے میں دوسروں سے آگے نکل گئے تو دنیا میں ان کو دنیوی کامیابیوں سے ہمکنار کیا جائے گا۔ وہ ایک چکا چوند پیدا کرنے والی ترقی سے ہمکنار ہوں گے اور اپنے سے کم ترقی یافتہ قوموں کیلئے ایک خوف کی علامت بن کر زندہ رہیں گے۔ دنیا بظاہر ان کی حیرت انگیز کامیابیوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھے گی بلکہ ان کو دوسرے لوگوں کیلئے ایک عذاب بنا دیا جائے گا لیکن امت مسلمہ کا مسئلہ

Marfat.com

اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے انہوں نے بظاہر اس کتاب کی رہنمائی کو قبول کیا لیکن حقیقت میں اس سے انکار کیا وہ برابر اللہ کی اس کتاب کی عظمت کا اقرار کرتے رہے لیکن اس کے دیئے ہوئے قانون اور نظام زندگی کو اپنے ملکوں اور اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ جس کی سزا ان کو یہ ملے گی کہ دنیا میں وہ ذلت کا شکار ہوں گے اور آخرت میں عذاب ان کا مقدر بنے گا اس لئے اس آیت کریمہ میں جو یہ فرمایا جارہا ہے کہ اللہ کی طرف سے تم پر آخری حجت آ چکی ہے تو اس کے مخاطب مسلمان بھی ہیں۔ انہیں اس پر اچھی طرح غور کرنا چاہئے کہ ہم نے اللہ کی کتاب کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ زبان سے اسے مانا ہے لیکن عمل میں داخل کرنے سے انکار کر دیا ہے اور قرآن کریم ہی میں ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات کہی ہے کہ ایسے نام ماننے والوں کو ہم نہ دنیا دیتے ہیں نہ آخرت دیتے ہیں بلکہ دنیا میں وہ ذلت کا شکار ہوں گے اور آخرت میں سخت ترین سزا سے دوچار کئے جائیں گے۔

قرآنِ کریم کی صورت میں اس آخری حجت کے آ جانے کے بعد دو لحاظ سے حجت تمام کر دی گئی ایک تو اس لحاظ سے کہ اللہ کی جانب سے قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے جو رہنمائی آنا تھی وہ آ گئی اور اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرما لیا تا کہ زمانے کے نشیب و فراز کے بعد کبھی کوئی قوم یہ کہہ سکے کہ اللہ نے اپنا جو آخری قانون نوع انسانی کیلئے اتارا تھا وہ اب چونکہ محفوظ نہیں رہا اس لئے ہم اس کتاب پر عمل کیسے کر سکتے ہیں اور دوسرا اس لحاظ سے اس کو آخری حجت اور بینہ بنایا گیا ہے کہ قرآن بجائے خود اپنی ذات میں ایک ایسی حجت اور برہان ہے جو کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں اور یہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کے چیلنج کا جواب کبھی دنیا والے نہ دے سکے اور پھر یہ بات بھی کہ یہ تورات کی طرح صرف احکام و ہدایت کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اپنے ہر دعوے اور ہر تعلیم کے دلائل و براہین بھی اپنے ساتھ لے کر نازل ہوا ہے اور وہ ایسے مضبوط و مستحکم اور ایسے عقلی اور فطری ہیں کہ انسانوں کیلئے اس کی تردید کرنا کٹ حجتی کے سوا اور کچھ نہیں آدمی کی فطرت یہ ہے کہ اگر وہ اپنے انکار اور اپنے رویے پر اڑ جائے اور کٹ حجتی کرنے لگے تو پھر جیسے کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے اسی طرح مخالفین بھی عجیب و غریب مطالبات میں اپنی انانیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ قرآن کریم کی دعوت کے سامنے بے بس ہو کر ان لوگوں نے ایسے ہی کچھ مطالبات شروع کر دیئے جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آ رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۵۸ هَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأۡتِيَهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ أَوۡ يَأۡتِيَ رَبُّكَ أَوۡ يَأۡتِيَ بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ ۗ يَوۡمَ يَأۡتِي بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفۡسًا إِيمَٰنُهَا لَمۡ تَكُنۡ ءَامَنَتۡ مِن قَبۡلُ أَوۡ كَسَبَتۡ فِيٓ إِيمَٰنِهَا خَيۡرًا ۗ قُلِ ٱنتَظِرُوٓاْ إِنَّا مُنتَظِرُونَ ۝ ”وہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو جس دن تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوگی تو کسی ایسے نفس کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کمائی ہو کہہ دو انتظار کرو ہم بھی منتظر ہی ہیں“۔

اس آیت کریمہ کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ دلائل کا سامنا کرنے سے چونکہ عاجز ہو گئے ہیں اس لئے انہوں نے ہٹ دھرم لوگوں کی طرح مطالبات شروع کر دیئے ہیں اور ان مطالبات کا ذکر قرآنِ کریم نے متعدد جگہوں پر کیا ہے جن میں سے اکثر وہ اس طرح کی باتوں کا مطالبہ کرتے۔ اگر کوئی فرشتہ قرآن لے کر محمد (ﷺ) پر اتر سکتا ہے اور وہ روزان سے ملاقات کرتا ہے تو آخر ہم سے وہ کیوں نہیں ملتا اگر ہم خود اپنی آنکھوں سے فرشتے دیکھیں اور وہ ہمیں آ کر بتائیں کہ دیکھو ہم یہ کتاب لے کر محمد (ﷺ) پر نازل ہوتے ہیں اس لئے تم اس کو مانو تو پھر ہو سکتا ہے ہم اس کو مان لیں لیکن محمد (ﷺ) کے کہنے پر کہ مجھ پر ایک فرشتہ یہ کتاب لے کر اترتا ہے یا اور بھی فرشتے وقتاً فوقتاً میں دیکھتا ہوں ہم اس کو کیسے تسلیم کر لیں اور کبھی وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم سے اپنے احکام کی تعمیل کروانا چاہتا ہے تو وہ ہمیں اپنا دیدار کیوں نہیں کرواتا' وہ کیوں نہیں ایسی صورت

Marfat.com

دیتا کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھیں اور کبھی وہ یہ کہتے کہ تم ہمیں جو بار بار ڈراتے ہو کہ اگر تم نے میری دعوت کو قبول نہ کیا اور قرآن پر ایمان نہ لائے تو تم پر اللہ کا عذاب آئے گا تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے عذاب کی کوئی ایسی شکل ہمارے سامنے آجائے کہ جس کا انکار کرنا ہمارے لئے مشکل ہو جائے اور ہم مجبور ہو کر اسے تسلیم کر لیں۔

یا اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور اپنے مشرکانہ رویے میں اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں کہ انہیں نہ اللہ کے نبی کی دعوت ہدایت دے سکتی ہے اور نہ قرآنِ کریم جیسی معجزانہ کتاب ان کو راہ راست کی طرف لا سکتی ہے اب تو شاید انہیں ہدایت کا نہیں بلکہ اس بات کا انتظار ہے کہ موت کے فرشتے آ کر ان کا گلا دبوچیں اور جب وہ اپنی آنکھوں سے ان فرشتوں کو دیکھیں گے جو ان کی جان نکالنے کیلئے آئیں گے تو انہیں یقین آجائے گا کہ واقعی فرشتوں کا بھی کوئی وجود ہے اور ہم آج تک جو فرشتوں کا مذاق اڑاتے رہے اور آنحضرت پر ان کے نزول کا تمسخر اڑاتے رہے وہ غلط تھا اور یا شاید وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اگر واقعی قیامت آنی ہے تو ٹھیک ہے قیامت آجائے اور یہ جو کہا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن اللہ مسند عدالت پر فائز ہوں گے اور وہی ہمارے بارے میں فیصلہ فرمائیں گے تو ٹھیک ہے اللہ کو بھی آنے دو جو فیصلہ ہونا ہے سو ہو جائے اور یا شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ قیامت کے آنے سے پہلے چند نشانیاں بھی ظاہر ہوں گی جس سے آدمی کو ایمان لانا ضروری ہو جائے گا تو چلیئے وہ نشانیاں بھی آجائیں یا کوئی نشانی آجائے تو پھر ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ دونوں صورتوں میں انجام ایک ہی رہتا ہے کہ یہ لوگ قرآنِ کریم کی ہدایت قبول کرنے سے محروم ہو گئے ہیں۔ اب تو ان کو ایسی ہی باتوں کا انتظار ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر فرما رہے ہیں کہ نادانو! اگر تم عالم غیب کی وہ چیزیں دیکھ لو جن پر تمہیں ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے تو اس صورت میں تو تم مشاہدے پر ایمان لاؤ گے تو مشاہدے پر تو ہر کوئی ایمان لے آتا ہے۔ اپنی دیکھی ہوئی بات کا کون انکار کر سکتا ہے' ایمان تو معتبر ہے جو غیب میں رہ کر لایا جائے کہ تم عالم غیب کی ان تمام باتوں کو مانو جنہیں تم اپنے حواس اور عقل کی مدد سے جان نہیں سکتے لیکن صرف اس لئے ان پر ایمان لے آؤ کہ اللہ کے رسول نے ان کی خبر دی ہے یہ تمہاری عقل اور شعور کا امتحان ہے اس میں جو آدمی پاس ہوتا ہے اسی کا ایمان معتبر ہوتا ہے اور تم عذاب کی کوئی صورت دیکھ کر کلمہ پڑھنے لگو تو یہ ایمان بھی قابل اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ ایمان معتبر صرف وہ ہے جو آنکھ' کان' دل' دماغ اور عقل کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے لایا جائے نہ کہ عذاب الٰہی کا ڈنڈا دیکھ کر۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی ایمان تو لایا لیکن اس نے ایمان کے مقتضیات پر عمل کرتے ہوئے اس نے اطاعت کی زندگی اختیار نہیں کی بلکہ فسق و فجور میں غرق رہا اور جب عذاب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی دیکھی تو اب اگر وہ اپنے فسق سے توبہ کرتا ہے تو جس طرح ایسی صورت میں کافر کا ایمان معتبر نہیں ہوتا اسی طرح فاسق کی فسق و فجور کی توبہ بھی قابل اعتبار نہیں ہوتی۔

اس آیت کریمہ میں آیت کا یہ ٹکڑا يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ کا ایک مفہوم تو ہم نے یہ بیان کیا کہ اللہ کے عذاب کی کوئی شکل سامنے آجائے جس سے انکار کرنا مشکل ہو جائے۔ لیکن حدیث سے اس کا ایک اور مفہوم بھی ثابت ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک یہ واقعہ پیش نہ آجائے کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہو جب لوگ یہ نشانی دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے یہی وہ وقت ہوگا جس کیلئے قرآن کریم میں یہ ارشاد ہے کہ اس وقت کسی نفس کا ایمان لانا نفع نہیں دے گا''۔

صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ بن اسید کی ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام علامات قیامت کا تذکرہ آپس میں کر رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے اس وقت آپ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ 1- آفتاب کا جانب

Marfat.com

مغرب سے نکلنا' 2-ایک خاص قسم کا دھواں' 3-دابۃ الارض' 4-یاجوج ماجوج کا نکلنا' 5-عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا' 6-دجال کا نکلنا' 7-8-9-تین جگہوں میں زمین کا دھنس جانا ایک مشرق میں ایک مغرب میں ایک جزیرۃ العرب میں' 10-ایک آگ جو عدن کے قعر سے نکلے گی اور لوگوں کو آگے آگے ہنکالے جائے گی''۔

حدیث کی روشنی میں علماء کا خیال ہے کہ ان نشانیوں میں سے آخری نشانی آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہوگا۔اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں بطور خاص اس نشانی کا ذکر کیا گیا ہے اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس واقعہ یعنی مغرب کی طرف سے آفتاب طلوع ہونے کے بعد ایک سو بیس سال تک دنیا قائم رہے گی۔یہ نشانیاں تو اللہ بہتر جانتا ہے کب ظاہر ہوں گی لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے اور قرآن کریم نے ہمیں اس کی خبر دی ہے کہ جب آدمی پر آخری وقت آتا ہے یعنی اس پر سکرات الموت طاری ہوتے ہیں تو اس وقت اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔قرآن پاک کی ایک آیت کی تشریح میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ تَوْبَةَ لَعَبْدِ تُقْبَلُ مَا لَمْ يُغَرْغَرْ

''بندہ کی توبہ اس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک اس کی روح حلق میں آکر غرغرۂ موت کی صورت پیدا نہ کردے''

کیونکہ اس آخری وقت میں موت کے فرشتے آدمی کو نظر آنے لگتے ہیں۔اگر وہ نیک آدمی ہے تو جنت کے فرشتے اس کو خوش آمدید کہنے کیلئے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔اسی لئے بعض نیک لوگ ان فرشتوں کو دیکھ کر مسکرانے لگتے ہیں۔اقبال مرحوم نے اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا

نشانِ مردِ مومن باتو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

کہ میں تمہیں مرد مومن کی نشانی بتاؤں جب اس کا آخری وقت آتا ہے تو اس کے لب پر تبسم کھیلتا ہے یہ موت کا وقت تو کسی آدمی سے بھی دور نہیں اس لئے ہر آدمی کو توبہ میں کبھی تاخیر نہیں کرنی چاہئے کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے وہ عمر کے کسی حصے میں بھی آسکتی ہے۔

جس طرح نیک آدمی کو خوش آمدید کہنے کیلئے فرشتے آتے ہیں اسی طرح بدکردار اور بدچلن آدمی کو لینے کیلئے بھی عذاب کے فرشتے آتے ہیں وہ ان کو دیکھ کر آخری وقت میں چیختا ہے یا حواس کھو دیتا ہے وہ انہیں اسے دنیا کی سرحد سے ادھر پکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم نے زندگی میں کبھی اسلام پر کان نہ دھرا اب ہم تمہیں بتائیں گے کہ تمہارے ساتھ کیا گزرتی ہے۔

اس کے بعد کی آیات کریمہ میں صاف طور پر آنحضرت ﷺ کو یہ بتادیا گیا ہے کہ آپ ان کی روش سے پریشان نہ ہوں۔افہام و تفہیم کیلئے جس قدر دلائل درکار تھے اور اس سلسلے میں جس حد تک تبلیغ و دعوت مطلوب تھی وہ ہو چکی یہ لوگ اگر اب بھی انہی مختلف راہوں کے مسافر رہتے ہیں جو انہوں نے حق کے رستے کے مقابلے میں خود سے نکال رکھی ہیں تو آپ ان کی طرف سے یکسو ہو جایئے۔آپ کا رویہ کیا ہونا چاہئے اور آپ کی زندگی کس چیز کی تصویر ہونی چاہئے اور مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے ان آیات میں اس کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

آیت:۱۵۹-تا-۱۶۴ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

Marfat.com

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ O قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ O لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ O قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ O ''جن لوگوں نے اپنے دین کوٹکڑے ٹکڑے کردیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے وہی ان کو بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا تھا۔ جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کیلئے دس گنا اجر ہے اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ اے محمد ﷺ کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ابراہیم کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو میری نماز میرے تمام مراسم عبودیت (یا قربانی) میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا''۔

اس آیت کریمہ میں خطاب نبی ﷺ سے ہے اور آپ کے واسطہ سے دین حق کے تمام پیرو اس کے مخاطب ہیں۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ اصل دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ ایک خدا کو الٰہ اور رب مانا جائے۔ اللہ کی ذات' صفات' اختیارات اور حقوق میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اللہ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے ہوئے آخرت پر ایمان لایا جائے اور ان وسیع اصول وکلیات کے مطابق زندگی بسر کی جائے جن کی تعلیم اللہ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے دی ہے۔ یہی دین تمام انسانوں کو اول یوم پیدائش سے دیا گیا ہے۔ بعد میں جتنے مختلف مذاہب بنے وہ سب کے سب اس طرح بنے کہ مختلف زمانوں کے لوگوں نے اپنے ذہن کی غلط اُپج سے یا خواہشات نفس کے غلبہ سے' یا عقیدت کے غلو سے اس دین کو بدلا اور اس میں نئی نئی باتیں ملائیں۔ اس کے عقائد میں اپنے اوہام وقیاسات اور فلسفوں سے کمی وبیشی اور ترمیم وتحریف کی۔ اس کے احکام میں بدعات کے اضافے کیے۔ خود ساختہ قوانین بنائے۔ جزئیات میں موشگافیاں کیں۔ فروعی اختلافات میں مبالغہ کیا۔ اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنایا۔ اس کے لانے والے انبیاء اور اس کے علمبردار بزرگوں میں سے کسی کی عقیدت میں غلو کیا اور کسی کو بغض ومخالفت کا نشانہ بنایا۔ اس طرح بے شمار مذاہب اور فرقے بنتے چلے گئے اور ہر مذہب وفرقہ کی پیدائش نوع انسانی کو متخاصم گروہوں میں تقسیم کرتی چلی گئی۔ اب جو شخص بھی اصل دینِ حق کا پیرو ہو اس کیلئے ناگزیر ہے کہ ان ساری گروہ بندیوں سے الگ ہو جائے اور ان سب سے اپنا راستہ جدا کر لے۔ اس لئے اے پیغمبر اور آپ کے واسطے سے اے مسلمانو! آپ کا نہ تو ان اہل کتاب سے کوئی تعلق ہونا چاہئے جنہوں نے اصل اللہ کا دین چھوڑ کر عیسائیت اور نصرانیت کے نام سے نئی نئی راہیں نکالیں اور نہ مشرکین عرب سے جنہوں نے اصل دین کا نہ صرف حلیہ بگاڑا بلکہ شرک کو اپنا طرز زندگی بنالیا اس لئے ان سے یکسر لاتعلق ہو کر اس دین کی پیروی کرو جو اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے اور جس کی روشنی میں ملت ابراہیمی کی حقیقت واضح کر دی گئی ہے لیکن مسلمانوں کو آنحضرت ﷺ نے اسی حوالے سے مزید تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانو تمہیں اس بات سے باخبر رہنا چاہئے کہ جن راہوں پر چل کر اہل کتاب تفرقہ کا شکار ہوئے حتی کہ وہ بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے تم بھی انہی راستوں پر چلو گے اور تمہارے اندر تہتر (۷۳) فرقے بن کے رہیں گے۔ صحابہ نے پریشان ہو کر پوچھا یا رسول اللہ ان میں نجات پانے والا فرقہ کون سا ہوگا فرمایا ما انا علیه و اصحابی ان میں نجات پانے والے وہ لوگ ہوں گے جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر چلیں گے یعنی جو قرآن و

Marfat.com

سنت سے راہنمائی لیں گے اور قرآن وسنت کے فہم اور اس کی تعبیر میں صحابہ کو اپنا رہنما بنائیں گے کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کے بلا واسطہ شاگرد ہیں ان کے سامنے قرآن اترا وہ ایک ایک آیت کے شان نزول سے واقف ہیں اور ان کے سامنے قرآن پاک کا دیا ہوا نظام زندگی ایک ریاست کی شکل میں نافذ ہوا عدالتوں میں اس کی رہنمائی میں فیصلے ہوتے رہے' ان کا معاشرہ قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں پر اٹھایا گیا۔ انہوں نے آنحضرت کے زیر سایہ تربیت پائی اور خود آنحضرت ﷺ کو قرآن پاک کی عملی تصویر کے طور پر دیکھا۔ جس بات کو سمجھنے میں دشواری ہوئی براہ راست حضور سے اس کی راہنمائی حاصل کی اور پھر انہی کی مدد سے قرآن کریم اور اس کی عملی تفصیلات سنت اور حدیث کی شکل میں امت کی اگلی نسلوں تک منتقل ہوئیں۔ اس لئے نجات کا اگر کوئی راستہ ممکن ہوسکتا ہے تو یقیناً وہی ہے جس کی طرف آنحضرت ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اس لئے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس امت کی ہدایت کی بنیاد قرآن وسنت ہے جن لوگوں کے نزدیک قرآن وسنت ہی اصل دین کا ماخذ ہیں وہ سارے اس حدیث کے مصداق ہیں ان میں بے شک آپس میں مسائل میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور بعض باتوں کی تعبیر میں وہ باہم دگر مختلف بھی ہوں لیکن وہ تمام اصول میں اکٹھے ہیں اس لئے بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ تمام فقہی مکاتب فکر جنہوں نے قرآن وسنت کی روشنی میں شریعت کی جزئیات مرتب کیں وہ چاہے حنفی ہوں یا شافعیؒ' مالکی ہوں یا حنبلی۔ وہ تمام کے تمام اسی نجات پانے والے گروہ سے متعلق ہیں جنہیں عام اصطلاح میں اہل سنت والجماعت کہا جاتا ہے بلکہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ ہمارے یہاں جس طبقے کو طبقۂ اہلحدیث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے وہ اگرچہ مسائل میں کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتے ہیں لیکن اصول میں یہ تمام مکاتب فکر اور اہلحدیث باہم دگر مشترک ہیں اور ان میں کوئی ایسا اختلاف نہیں جو ان کو اصولی طور پر ایک دوسرے سے جدا کرسکے۔ اختلاف وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں خواہش نفس کے غلبہ سے یا عقیدت کے غلو سے نئی نئی باتیں اختراع کی جاتی ہیں اور بدعات کو سنت کے برابر لاکھڑا کیا جاتا ہے یا عقائد میں نئے نئے فلسفوں سے متاثر ہوکر اوہام وقیاسات کو جگہ دے دی جاتی ہے۔ فروع کو اصول کا درجہ دے کر اور غیر اہم کو اہم بنا کر شریعت کا مزاج بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے یا محض اپنے گروہ کی علامت کے طور پر کسی ایسی چیز کو عبادات میں داخل کردیا جاتا ہے جو اپنے تئیں کار ثواب بھی ہو لیکن چونکہ وہ عبادت کا حصہ نہیں اس لئے اس سے دین میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے بعد مسلمانوں کو یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ اللہ نے آپ کیلئے جو دین کی راہ روشن کی ہے آپ کو اسی پر ثابت قدم رہنا ہے اور جن لوگوں نے نئے نئے راستے نکال کر فرقوں کو وجود دیا ہے اور یا خود مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں ان سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر وہ آپ کی بات کو سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہیں تو آپ ہرگز پریشان نہ ہوں ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کریں وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا ان سے جواب طلب کرے گا اور جس محرک اور داعیہ سے انہوں نے دین میں نئی نئی راہیں نکالیں وہ سب کچھ ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا جائے گا۔ ان کے نامۂ عمل کا اس طرح ان کے سامنے کھل کے آجانا اور ان کی نیتوں میں چھپے ہوئے فتور کا واشگاف ہوجانا اور دین کے نام پر ان کے مقاصد باطلہ کا لوگوں کے سامنے واضح ہوجانا اگرچہ بجائے خود بہت بڑی رسوائی ہے لیکن یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ صرف اس پر اکتفا نہیں کیا جائے گا بلکہ حق وباطل کی کشمکش میں جن لوگوں نے راہ راست اختیار کی انہیں جزا سے نوازا جائے گا اور جن لوگوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس کا ابھی تذکرہ ہوا ان کو ان کی برائیوں پر سزا ملے گی چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں پروردگار نے اپنے اسی اصول کو واضح فرمایا کہ آج اگرچہ ہم عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتے اور ہو سکتا ہے دنیا میں بہت سے لوگوں کو عذاب نہ ملے لیکن آخرت میں ہمارا یہ قانون پوری طرح کارفرما ہوگا تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص نیکیوں کا توشہ اپنے ساتھ لائے گا وہ اللہ کی رحمت کے دامن کو پوری طرح اپنے سامنے کشادہ پائے گا کہ ہم اس کی ایک ایک نیکی کو دس گنا اجر کے ساتھ

Marfat.com

گراں بار کر دیں گے بلکہ حدیث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس نے نیکی کا ارادہ کیا لیکن نیکی کر نہ سکا تو ہم اس کے ارادے کو عمل کا درجہ دے کر اس کے نامہ عمل میں ایک نیکی کا اضافہ کر دیں گے لیکن اگر کوئی اپنے ساتھ برائیاں ہی لے کر آتا ہے تو ہم تب بھی اس کے ساتھ انتقام کا سلوک نہیں فرمائیں گے بلکہ اس کی ایک برائی کی سزا ایک ہی کے برابر دی جائے گی نیکیوں کی طرح اسے دس گنا بڑھایا نہیں جائے گا اور یہ بھی ہم مہربانی فرمائیں گے کہ اگر اس نے کسی برائی کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ ارادہ چھوڑ دیا اور اس کو برا جان کر اس کے ارتکاب سے رک گیا تو ہم محض ارادہ کرنے پر اس کو برائی کی سزا نہیں دیں گے بلکہ اس کے نامہ عمل میں اسے نیکی بنا کر لکھا جائے گا اور اس کو ایک نیکی کا صلہ دیا جائے گا اور اگر اس نے زندگی کا بیشتر حصہ گناہوں میں گزارا لیکن کسی بھی مرحلے پر پہنچ کر اس نے نیکی کا راستہ اختیار کر لیا اور گناہوں سے توبہ کی طرف پلٹا تو اس کے گناہوں نے چاہے زمین و آسمان کے تمام درمیانی حصے کو بھر دیا ہو لیکن ہم پھر بھی اسے معاف کر دیں گے اور آخر میں فرمایا کہ ان دونوں گروہوں میں سے کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ نہ کسی نیکی کے اجر میں کمی کی جائے گی اور نہ کسی برائی کی سزا میں معیار سے بڑھ کر اضافہ کیا جائے گا۔ اللہ کے جزا و سزا کے اس قانون کو اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ بہت حوصلہ ملتا ہے اور اس کی شان کریمی سے دل جھوم اٹھتا ہے اور پھر کبھی کبھی دل میں ندامت بھی ہونے لگتی ہے کہ اللہ کی عطا و بخشش کا تو یہ حال ہے کہ وہ ایک نیکی کا صلہ دس گنا دیتا ہے اور برائی پر سزا اتنی دیتا ہے جتنی برائی ہے اور پھر برائیوں کی معافی کیلئے اس نے مختلف عطا و بخشش کی راہیں نکال رکھی ہیں کہ کتنی برائیاں ہیں جن کو نیکیاں کھا جاتی ہیں اور پھر توبہ کرنے سے تو بے شمار گناہ بھی دھل جاتے ہیں اور مزید اس کا فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے بعض اوقات زندگی میں ایسے رکھے ہیں جس میں اس کی عطا و بخشش پورے جوبن پر ہوتی ہے اور اس کی نوازشات حد و شمار سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ اس پوری صورت حال کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو آنحضرت کا یہ ارشاد سمجھ میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی رحمت سے دور اور بربادی کا راستہ اختیار کرنے والا اللہ کی اس بے پایاں رحمت کے باوجود صرف وہی بدنصیب ہو سکتا ہے جس نے خود برباد ہونے کا فیصلہ کر رکھا ہو ورنہ اللہ کے یہاں تو مغفرت میں کوئی دیر نہیں البتہ یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہاں مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَه فرمایا گیا ہے مَنْ عَمِلَ حَسَنَةً نہیں فرمایا یعنی یہ نہیں کہا گیا کہ جس نے نیکی کی بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ جو نیکی لے کر آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے یہاں جس نیکی کا اجر دس گنا بلکہ بعض دفعہ سات سو گنا سے بھی بڑھ جاتا ہے وہ وہ نیکی نہیں جس کو صرف عمل کی صورت دی گئی ہے بلکہ یہ وہ نیکی ہے جس کو سنبھال کر رکھا گیا ہو جس کو ضائع ہونے سے بچایا گیا ہو اور اپنی اصلی شکل و صورت میں اس کا کرنے والا اللہ کے حضور اس کو لے کر پہنچ جائے کیونکہ بہت ساری نیکیاں ایسی ہیں جو گناہوں کی وجہ سے ختم کر دی جاتی ہیں جیسے معاذ اللہ کفر و شرک تو سارے ہی اعمال صالحہ کو برباد کر دیتے ہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت سے گناہ ایسے ہیں جو بعض اعمال صالحہ کو باطل اور بے اثر کر دیتے ہیں جیسے قرآن کریم میں ہے لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى یعنی تم اپنے صدقات کو احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر باطل اور ضائع نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ کا عمل صالح احسان جتانے یا ایذا پہنچانے سے باطل اور ضائع ہو جاتا ہے اسی طرح حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں جو اعمال صالحہ نوافل اور تسبیح وغیرہ کئے جاتے ہیں وہ دنیا کی باتیں کرنے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں صرف نیکی کرنے کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ نیکی یعنی اعمال صالحہ کو موت تک محفوظ رکھ کر اللہ کے حضور لانے کا ذکر فرمایا گیا ہے یعنی اس بات کو ذہن میں متحضر رہا چاہیے کہ اگر اللہ نے کچھ اعمال صالحہ کرنے کی توفیق عطا کی ہے تو یہ اعمال صالحہ صرف اس صورت میں فائدہ دیں گے کہ موت تک کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے اعمال صالحہ کے ضائع یا حبط ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ کو صرف اس حکم دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ آپ تفرقہ پیدا کرنے والے لوگوں سے اپنے آپ کو الگ رکھیں بلکہ ساتھ ہی مثبت

Marfat.com

انداز میں یہ بھی واضح فرمادیا گیا کہ اس غلط طریقے اور غلط راستے کو چھوڑنے کے بعد ہم نے آپ کیلئے اس بات کا انتظام کیا ہے کہ آپ کو یہ بتایا جائے کہ اب آپ کیلئے زندگی کا راستہ کیا ہونا چاہئے چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں حضور کی زبان سے اعلان کروایا گیا کہ اے پیغمبران کو بتا دیجئے کہ اللہ نے مجھے تمام تمہارے غلط راستوں سے بچا کر ایک صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔ تم نے جس صراط مستقیم کو چھوڑ کر اپنی اپنی پگڈنڈیاں نکال لی تھیں اور رفتہ رفتہ اس صراط مستقیم سے منحرف ہو گئے اللہ نے وہی صراط مستقیم میرے سامنے کھول دی ہے اور یہ صراط مستقیم وہ مضبوط دین قیم ہے جو ہر طرح کی الجھنوں اور اڑچنوں سے پاک اور ہر طرح کے وسوسوں سے مبرا' ہر طرح کی آمیزشوں سے خالی اور ہر طرح کی انسانی بدعات سے بالا ہے اور یہ وہی صراط مستقیم ہے جسے ملت ابراہیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے شرک کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مینارہ نور بنا کے اٹھایا تھا اور اس دور کو ان کی ذات کے فیضان سے منور کیا گیا تھا اور حضرت ابراہیم کا حال یہ تھا کہ قرآن کریم بار باران کے ساتھ حنیف کا لفظ استعمال کرتا ہے جس کا معنی ہے ہر طرف سے کٹ کر یکسو ہو جانے والا۔ کہا وہ ابراہیم تو حنیف تھے جو شرک کے تمام آستانوں سے دور' ان کے رویوں سے متنفر' صرف ایک اللہ کے آستانے پر سر جھکانے والے تھے۔ انہیں نہ تخت و تاج اپنے سامنے جھکا سکا اور نہ کوئی بت خانہ اپنی طرف متوجہ کر سکا ان کے گھر کا ماحول جو بت گری اور بت پرستی کی تصویر تھا اور ان کے والد جو شرک کی قوتوں کے مناد اور مبلغ تھے لیکن حضرت ابراہیم نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو کر زندگی گزاری۔ ان کی پوری زندگی اللہ ہی کیلئے ایثار و قربانی سے عبارت ہے جس میں دور دور تک غیر خدا کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی چنانچہ ان کی ذات پر اللہ نے جس صراط مستقیم کو واشگاف کیا تھا آنحضرت سے کہلایا جا رہا ہے کہ وہ صراط مستقیم اب میرے سامنے کھولی گئی ہے اور میں اسی کا مبلغ اور اسی کا پیغمبر بن کر آیا ہوں تم اگر واقعی ملت ابراہیمی کے بارے میں مخلص ہو تو پھر تمہیں میرا اتباع کرنا ہو گا کیونکہ مجھ سے پہلے جو لوگ اپنے پاس اللہ کی کتاب رکھنے کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ کتاب رکھتے ہوئے بھی اس صراط مستقیم سے کوسوں دور ہیں کیونکہ انہوں نے اپنا تعلق شرک سے جوڑ لیا ہے اور جن لوگوں کو حضرت ابراہیم کی اولاد ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ اس نسبت پر فخر کرتے ہوئے نہیں تھکتے انہیں سرے سے خبر ہی نہیں کہ ملت ابراہیم کس چیز کا نام ہے اس لئے آج نجات کا راستہ صرف یہ ہے کہ ملت ابراہیمی پر عمل کرنے کیلئے میرا اتباع کرو اور یہ بھی آپ سے اعلان کروایا گیا کہ میرا اتباع کسی ایک بات میں نہیں بلکہ اللہ نے مجھے جو توحید خالص دے کر بھیجا ہے اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے اس لئے آپ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ اس بات کا اعلان کر دیں کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا صرف اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔ میری پوری زندگی کے کسی معاملے میں اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں شرک کے ایک ایک ٹانکے کو توڑ ڈالوں اور لحد سے مہد تک زندگی کے ہر تعلق اور اسلوب کو شرک سے پاک کر کے خالصتاً خدا پرستی کے راستے پر ڈالوں۔ یہ کام اگرچہ آسان نہیں لیکن مجھے بہر حال اس کام کو کرنا ہے۔ اس لئے کہ یہ کام اگرچہ مشکل ہے لیکن اپنی ذات میں سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ انسانی زندگی بلکہ کائناتی زندگی کا شرک کرنے کے بعد کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا اس لئے میں ان تمام خطرات کو انگیخت کرتے ہوئے ان کا مقابلہ کروں گا اور میں سب سے پہلے مسلمان یعنی اللہ کا فرمانبردار بندہ بن کے دکھاؤں گا۔ اس راستے میں چاہے کیسی ہی قیامتیں گزر جائیں مجھے بہر حال ایسا ہی کرنا ہے۔ اس آیت کریمہ میں نسک کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کا معنی عبادت بھی ہے اور قربانی بھی ہے اور یہاں نماز کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کا معنی لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ سورۃ کوثر میں نماز کے بعد قربانی ہی کا ذکر کیا گیا ہے:

﴿ فصل لربک و انحر پس اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی دے۔ ﴾

پھر اس کے بعد زندگی اور موت کا ان دونوں کے ساتھ خوبصورت تقابل کیا گیا ہے یعنی نماز کا تعلق زندگی سے اور قربانی کا تعلق موت سے ہے

Marfat.com

جس کا مطلب یہ ہے کہ میرا جینا بھی اللہ کے لئے اور میرا مرنا بھی اللہ کیلئے۔ میں جب تک زندہ ہوں میری زندگی نماز کی تصویر ہوگی جو اللہ کی کبریائی کے اعلان سے شروع ہوگی اور اسی کے ساتھ مناجات کرتے ہوئے ختم ہوگی اس میں جسم و جان کی مختلف حالتوں سے اپنے تعلق کے نشیب و فراز کو اللہ کی کبریائی کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے جس سے بتایا گیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اور زندگی کے ہر دور میں بالکل اسی طرح اللہ کا ہو کر جیوؤں گا جس طرح از اول تا آخر نماز اللہ ہی کیلئے پڑھی جاتی ہے' قیام بھی اسی کیلئے' رکوع بھی اسی کیلئے' قعود بھی اسی کیلئے اور سجود بھی اسی کیلئے۔ اسی طرح زندگی کا ہر دور اسی کی کبریائی سے روشن اور اسی کی ہدایت سے منور ہوگا اور جہاں تک میری موت کا تعلق ہے وہ دولت کمانے' ہوس اقتدار کا شکار ہونے خواہشوں اور آرزوؤں کو پورا کرنے اور دنیوی مہمات کو سر کرنے میں نہیں آئے گی بلکہ زندگی کو اللہ کا عطیہ سمجھ کر اسی کے نام پر قربان کروں گا اور اسی کے دین کی سربلندی کیلئے اپنا خون بہاؤں گا اور اپنا سر کٹواؤں گا۔ میری زندگی کی تصویر یہ ہوگی

ؔ میں تو کیا میرا سارا مال و ملال
میرا گھر بار میرے اہل و عیال
میرے ان ولولوں کا جاہ و جلال
میری عمر رواں کے ماہ و سال
میرا سب کچھ مرے خدا کا ہے

یہاں آنحضرت ﷺ سے جس عزم کا اعلان کروایا جارہا ہے آپ کی امت کا ایک ایک فرد بھی اسی کا مکلف ہے یعنی اس کی زندگی بھی ایسی ہونی چاہئے کہ جس کا ایک ایک لمحہ نماز اور قربانی کی تصویر ہو اور اس کی تمام تگ و تاز اور اس کی تمام سرگرمیاں صرف اللہ کیلئے ہوں اور اس کی پوری زندگی میں کہیں دو عملی کو جگہ نہ مل سکے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی توحید کے اس قافلے میں شریک ہو کر اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا رہے اور اللہ کے دین کے غلبے اور مخلوق خدا کی خدمت کیلئے اپنے فرائض کو پوری تندہی سے ادا کرے لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حالات اللہ کی خالص بندگی کی اجازت نہیں دیتے معاشرے کا بگاڑ یا استبداد کی گرفت ایسی شدید ہو جاتی ہے کہ قدم قدم پر آدمی کو طاغوتی قوتوں سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں ان کی بندگی کرنی پڑتی ہے اس طرح کے حالات میں کسی اللہ کے بندے کا یہ عزم کر کے اٹھنا کہ میں صرف اللہ ہی کیلئے جیوؤں گا اور مروں گا وہ جان پر کھیلنے کے مترادف ہوتا ہے اگر کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو یہاں اس کا راستہ دکھایا جارہا ہے کہ پھر تمہارا طرز عمل وہی ہونا چاہئے جو بارش کے پہلے قطرے کا ہوتا ہے۔ جب زمین موسم کی شدت سے تپ اٹھتی ہے اور گھاس کی آخری پتی تک موسم کی تمازت کی نذر ہو جاتی۔ ہے اور میدانوں میں خاک اڑنے لگتی ہے اور گرمی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر بادل آتا بھی ہے تو بارش کا کوئی قطرہ زمین تک آنے کی ہمت نہیں کرتا وہ جانتا ہے کہ زمین پر جاتے ہی میں جھلس کے ختم ہو جاؤں گا۔ ایسے ہولناک منظر میں یہ فیصلہ کرنا کہ کون ہمت کر کے آگے بڑھے تاکہ پیچھے قطرات کے تسلسل سے موسلا دھار بارش برسنے لگے اور زمین کی قسمت بدل جائے یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی ایک قطرہ اپنی زندگی کو قربان کرنے کیلئے تیار ہو جائے اور وہ یہ کہے کہ اگر زمین کی قسمت بدلنی ہے تو پھر کسی کو تو قربانی دینا ہوگی میں تمہاری طرف نہیں دیکھوں گا۔ میں خود وہ پہلا قطرہ بنوں گا تاکہ تم میرے حوصلے سے حوصلہ پاؤ اور پھر مسلسل میرے پیچھے آکر زمین کو سیراب کر دو۔ چنانچہ یہ پہلے قطرے کی ہمت کام آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ایک ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ اگر کبھی حالات کے تیور عام لوگوں کو غلبۂ دین کی کاوشوں میں شریک ہونے کا حوصلہ نہ دیں تو پھر مسلمان کہلانے والے ہر فرد کی یہ

Marfat.com

ذمہ داری ہے کہ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھے کہ مجھ پر چاہے کیسی قیامت گزر جائے میں یہ فرض ضرور انجام دوں گا تم اگر میرے حوصلے سے حوصلہ پا سکتے ہو تو میرے پیچھے چلے آؤ چنانچہ اس ایک مثال سے دوسروں کو حوصلہ ملتا ہے اور دین کی خشک کھیتی پھر لہلہانے لگتی ہے۔

انسانی فطرت یہ ہے کہ کبھی بھی کسی ایسے مشکل کام کیلئے وہ آسانی سے تیار نہیں ہوتی جس میں اسے ایثار و قربانی سے گزرنا پڑے ایسی صورتحال میں ہمیشہ اس کا عذر یہ ہوتا ہے کہ میں تنہا یہ کام کیسے کروں کوئی ساتھ دینے والا نہیں' کوئی آگے چلنے والا نہیں' اکیلا چنا آخر کیا پہاڑ پھوڑے گا میں سوائے اس کے کہ خود کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤں اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے اسی حوالے سے یہاں ہدایت دی جارہی ہے کہ تم میں سے ہر ایک کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ یہ کہے: ﴿ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ''میں سب سے پہلا مسلمان ہوں'' ﴾ یعنی میں آگے بڑھ کر اس بند راستے کو کھولوں گا اور حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اس طرح حوصلہ کر کے اٹھتا ہے تو پھر اس کا یہ اٹھنا بے ثمر نہیں رہتا۔ اسے دیکھ کر بہت سے لوگ حوصلہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسی طرح ایک قافلہ بن جاتا ہے جو بڑھتے بڑھتے فوز و فلاح کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے ایک اور بات کی طرف بھی راہنمائی ملتی ہے وہ یہ کہ اس میں اللہ کے رسول سے یہ اعلان کروایا جارہا ہے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا صرف اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم اس بات کے پابند ٹھہرائے گئے ہیں کہ ہماری زندگی پر صرف اللہ کی حاکمیت ہو اور ہماری پوری زندگی اسکی کبریائی کے اعلان اور اس کیلئے قربانی دیتے ہوئے گزرے اور ہم ہر حال میں اسی کی غیر مشروط اطاعت کریں اور اس کی غلامی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈالے رکھیں۔ بالکل اسی طرح اللہ کا رسول بھی اسی کا پابند ہے حالانکہ اللہ کے رسول معصوم ہوتے ہیں اور ہمارے رسول پاک تو کائنات کے گلِ سر سبد بلکہ تخلیق کائنات کے سبب ہیں لیکن ان کو بھی اسی اطاعت و بندگی کا پابند ٹھہرایا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آخری آیت سے پہلے کی آیت میں مومنوں کو جن باتوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے انہی باتوں پر سب سے پہلے آنحضرت کے ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے اندازہ کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کی ہمہ گیری' گہرائی اور گیرائی کا عالم کیا ہے۔ اللہ کے رسول سے لے کر ان کے آخری امتی تک سب اسی کے پابند ہیں اور سب اسی کے سامنے سپر انداز ہیں۔ وجہ اس کی کیا ہے اس کا ذکر اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ اے پیغمبر ان مشرکینِ مکہ سے کہو کہ میرے عزمِ صمیم کا اعلان تم نے سن لیا کیا اس کے بعد تم مجھ سے یہ امید رکھ سکتے ہو کہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو رب بنا لوں گا جبکہ میں اسی کی مخلوق کا ایک فرد ہوں بلکہ اس کی مکلف مخلوق کا نمائندہ اور سربراہ ہوں اور اس کی تمام مخلوقات کا حال یہ ہے کہ وہ ایک رب کے ساتھ کسی اور کو تسلیم نہیں کرتیں کیونکہ خداوند ذوالجلال ہی ہر چیز کا رب ہے جب پوری کائنات کا قبلہ مقصود اللہ کی ذات گرامی ہے تو میں کائنات کی مخالف سمت کا مسافر کیسے ہو سکتا ہوں؟ پوری کائنات جس سمت میں محوِ سفر ہے اس کائنات کا کوئی فرد اس کی الٹی سمت میں چلنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت حال میں تم مجھ سے یہ کیسے امید رکھ سکتے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنا لوں گا؟ رہی یہ بات کہ تم اتنی واضح دلیلوں کے بعد بھی اگر راہ راست پر نہیں آنا چاہتے ہو تو یاد رکھو اس سے کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ یہاں جو جس طرح کے اعمال کرتا ہے اسی طرح کی جزا سے بہرہ ور ہوتا ہے ہر آدمی کی برائی کا وبال اس کو خود اٹھانا پڑتا ہے۔ اس راستے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا' یہاں ہر ایک کو اپنی صلیب خود اٹھانا پڑتی ہے۔ کوئی چاہے کسی سے کتنا قریبی تعلق کیوں نہ رکھتا ہو وہ قیامت کے دن کسی اور کی طرف سے جواب دہ نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت ﷺ سے جب ولد الزنا کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس جرم میں اس بچے کا کیا قصور جرم اس کے والدین نے کیا وہی اس کی سزا بھگتیں گے۔ ان کی بدکاری کے نتیجے میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے معاشرے کو اس سے نفرت کرنے یا اسے طعن دینے سے روک دیا گیا ہے

Marfat.com

کیونکہ وہ اپنے والدین کے جرم کی طرف سے جواب دہ نہیں ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ولید بن مغیرہ اور اس کے ساتھی مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم واپس اسلام کو چھوڑ کر اپنے دین میں آجاؤ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارا دین غلط ہے اور کل کو اللہ کے یہاں جب اس بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو ہم اس ذمہ داری کو قبول کریں گے اور آپ کی طرف سے ہم جوابدہ ہوں گے۔ تو اسی آیت کی روشنی میں ان کو جواب دیا گیا ہے کہ ہر آدمی اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ دنیا میں یہ کہنے کی باتیں ہیں قیامت کے دن تو باپ بیٹے کو اور ماں بیٹی کو پہچاننے سے انکار کر دے گی۔ ہر ایک کو اپنے انجام کی فکر ہو گی اور اس دن کی ہولناکی اپنی ذات کے علاوہ کسی اور کیلئے سوچنے کی بھی مہلت نہیں دے گی۔ اس کے بعد فرمایا کہ آج مخالفین کو اگرچہ باتیں سمجھ نہیں آرہیں لیکن ان کو اس بات کا یقین رکھنا چاہئے کہ انہیں بہر صورت اور ہمیں بھی اپنے رب ہی کی طرف پلٹنا ہے پھر وہ سب کو بتائے گا کہ تم جو اختلافات کرتے تھے اس کی حقیقت کیا تھی اور تم نے اللہ کے آخری رسول کی دعوت کو قبول نہ کر کے جو جرم کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہے آج تو موقع ہے کہ ان باتوں پر غور کر کے اللہ کے سامنے جانے سے پہلے اپنی سرخروئی کا سامان کر لیں لیکن جب یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا تو پھر پچھتاوا بھی فائدہ نہیں دے گا۔

یہ سورۃ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مکی ہے۔ اور اس میں اسلام کے بنیادی عقائد اور تصورات کو بیان کرتے ہوئے عقیدۂ توحید کو پوری تفصیلات سمیت بیان کیا گیا ہے اور اس عقیدہ توحید کی وضاحت کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی اور مشرکانہ قوتوں سے ان کی کشمکش کو اس لئے کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکینِ مکہ دونوں ہی حضرت ابراہیم کے ساتھ اپنے انتساب کا دعویٰ رکھتے تھے اور مشرکینِ مکہ تو اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم ملتِ ابراہیمی کے وارث ہیں اور انہوں نے اپنے مشرکانہ رویے کو ملت ابراہیمی کا نام دے رکھا تھا اس سورۃ میں ان کے اس رویے اور ان کے جاہلانہ عقائد پر بڑی تفصیل کے ساتھ تنقید کی گئی ہے اور اس کے بعد ملت ابراہیمی کو پوری وضاحت سے پیش کیا گیا ہے اور آخر میں اس ملت ابراہیمی کے اصل وارث نبی کریم ﷺ سے ملت ابراہیمی کے بنیادی تصورات کا اعلان کروایا گیا ہے اس طرح سے اہل کتاب اور مشرکین مکہ دونوں پر حجت تمام کر دی گئی ہے کہ تم اگر واقعی ملت ابراہیمی سے اپنا تعلق رکھتے ہو تو اس کے وارث اب قیامت تک کیلئے محمد رسول اللہ ﷺ اور مسلمان ہیں اور اس کا جلی عنوان اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جس طرح حضرت ابراہیم نے حنیف بن کر زندگی گزاری یعنی ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ ہی کے ہو کے رہے اور اپنی زندگی اور موت اسی کے حوالے کر دی یہی عنوان آج رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی زندگی کا ہے اگر تم ملت ابراہیمی کے دعوے میں کچھ بھی سچے ہو تو تمہیں آپ کا اتباع کرنا ہے اس طرح بات کو مکمل کرنے کے بعد اب آخری آیت کریمہ میں مشرکینِ مکہ کو آخری تنبیہ کی جا رہی ہے۔ ارشاد فرمایا:

آیت:۱۶۵ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ ''اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے بے شک تیرا رب جلد پاداش عمل دینے والا بھی ہے اور وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے''۔

اس آیت کریمہ میں غور کرنے سے بیک وقت تین مفہوم ابھرتے ہیں جو سہ گونہ احساس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

1- اللہ نے اپنی قدرت کا احساس دلایا ہے کہ اے مشرکین مکہ تم اس لئے سرکشی دکھا رہے ہو کہ تمہیں اللہ کی قدرت کا صحیح ادراک نہیں حالانکہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ آج جہاں تم آباد ہو تم پہلی قوم نہیں ہو یقیناً تم سے پہلے اور قومیں یہاں آباد رہ چکی ہیں۔ تم آج جن چیزوں پر تصرف رکھتے ہو اور جن کی ملکیت کے دعوے دار ہو وہ یقیناً تم سے پہلے دوسروں کے زیر تصرف تھیں۔ تمہاری آبادیوں کا ایک ایک گوشہ اور تمہاری زمین کا

Marfat.com

یہ ایک تحریر خود گواہی دے رہا ہے کہ یہاں نجانے کتنے قافلے گزر چکے اور آج تمہیں ان کا جانشین بنایا گیا ہے یعنی تم ان کی جگہ آباد کیے گئے ہو اسی طرح تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ تم میں معاشی اور معاشرتی لحاظ سے سب لوگ برابر نہیں، مختلف حیثیتوں میں بے پناہ تفاوت پایا جاتا ہے۔ کوئی مفلس ہے اور کوئی مالدار، کوئی ذلیل اور کوئی عزت دار، کوئی حاکم ہے اور کوئی محکوم اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مالداری اور عزت اور حاکمیت خود انسان کے اختیار میں ہوتی تو کوئی بھی مفلسی، ذلت اور محکومیت قبول نہ کرتا۔ تمہارا اس علاقے میں آج آباد ہونا اور تمہارے درجات کا یہ تفاوت خود اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ تم حقیقت میں اختیارات کے مالک نہیں ہو بلکہ یہ اختیار کسی اور کے قبضے میں ہے کہ وہ جب چاہتا ہے کسی کو بساتا ہے اور کسی کو اکھاڑ دیتا ہے جسے چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے مار دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے عزت اور دولت سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے حالات کا شکار کر دیتا ہے یقیناً وہ اللہ کی ذات ہے جو تمام اختیارات کی مالک اور تمام قدرتوں کی حامل ہے اگر تمہیں اس کی قدرت کا یقین پیدا ہو جائے تو پھر یہ تمہارے لئے بات سمجھنا مشکل نہیں کہ تم حالت امتحان میں ہو۔ تمہیں یہاں آزمائش کے طور پر بھیجا گیا ہے اسلئے خیریت اسی میں ہے کہ اپنی حیثیت اور اپنی حالت کو سمجھو اور راہ راست کی طرف آجاؤ۔

2- مشرکین مکہ کو احساس دلایا جا رہا ہے کہ تم حرم کی سرزمین میں خدا کے خلیفہ ہو اس نے اپنی بہت ساری مملوکات اور بہت سی نعمتوں میں تمہیں اختیار دے رکھا ہے لیکن تم ان میں سے کسی کے مالک نہیں ہو، ان میں سے ہر ایک چیز تمہارے پاس امانت ہے اس لئے تمہیں اس بات کی فکر ہونی چاہئے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب اللہ تعالیٰ تم سے اس امانت کے بارے میں سوال کرے گا۔ اسی طرح تمہیں اس بات کا بھی احساس کرنا چاہئے کہ تم اگرچہ سارے اللہ کے خلیفہ ہو تم میں سے ایک ایک فرد اس خلافت ارضی میں شریک ہے لیکن تمہارے مراتب میں اس حد تک تفاوت ہے کہ کسی کا دائرۂ اختیار محدود ہے اور کسی کا وسیع اور اسی نسبت سے تم میں سے ہر ایک اختیارات اور تصرفات بھی رکھتا ہے اسلئے جس طرح اس امانت کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا اسی طرح تم میں سے ہر ایک ان اختیارات کے بارے میں بھی مسئول بنایا گیا ہے۔ اسلئے تمہیں اصل فکر مندی یہ ہونی چاہئے کہ کل کو جب یہ جوابدہی کرنی پڑے گی تو ہم اس میں کس طرح سرخرو ہو سکیں گے۔ اس کا راستہ صرف وہی ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ دعوت دے رہے ہیں۔

3- قریش مکہ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ دنیا کے سٹیج پر نمودار ہونے والی تم پہلی قوم نہیں ہو تم سے پہلے کتنی قومیں سٹیج پر نمودار ہوئیں پھر غائب ہو گئیں۔ یہاں تک کہ اللہ نے ان کی جگہ تم کو دی یہ خلافت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کے مالک نے جس باٹ اور ترازو سے ان کو تولا اسی باٹ اور اسی ترازو سے وہ تم کو بھی تولے گا اور اس کی میزان میں اگر تم پورے نہ اترے تو جس طرح اس نے دوسروں کو پھینک دیا اسی طرح تم کو بھی اٹھا پھینکے گا خدا کی جو سنت دوسروں کے معاملہ میں رہی ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ تمہارے معاملے میں بدل جائے۔ اسلئے تم اگر اپنے آپ دشمن نہیں ہو گئے ہو تو تم اپنے گردوپیش کی قوموں کی تاریخ کو جاننے کی کوشش کرو اور اس کے آئینے میں اپنی حالت پہچانو۔ اس طرح شاید تمہیں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ تم ایک عجیب غلط فہمی کا شکار ہو تم یہ سمجھتے ہو کہ تم میں سے بہت سے لوگ چونکہ مال و دولت رکھتے ہیں ان کا روبار دور تک پھیلا ہوا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے طائف میں باغات ہیں لیکن تمہارے مقابلے میں مسلمانوں میں بیشتر لوگ مالی اور معاشی لحاظ سے تنگ دستی کا شکار ہیں۔ جب تم یہ تفاوت دیکھتے ہو تو تم اسے اللہ کے یہاں قبولیت کی علامت سمجھتے ہو۔ تمہارا گمان یہ ہے کہ جو شخص یہاں اچھے حالوں میں ہے وہ یقیناً آخرت میں بھی بہتر حال میں ہوگا اور جس آدمی کو یہاں زندگی کے کٹھن مسائل درپیش ہیں وہ آخرت میں بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہوگا۔ اس بات کو دلیل بنا کر تم اپنے آپ کو اللہ کا مقبول سمجھتے ہو اور اس طرح اپنی سرکشی میں اور زیادہ دلیر ہو جاتے ہو اس لئے اس بات کو ا

Marfat.com

طرح سمجھ لو کہ زندگیوں میں یہ تفاوت اللہ کے یہاں قبولیت کی علامت نہیں بلکہ یہ اس کی طرف سے ایک امتحان ہے اس نے تمہیں یہ سب کچھ عطا کر کے آزمانا چاہا ہے کہ تم اس کے شکر گزار بنتے ہو یا ناشکرے۔ نیکیوں اور بدیوں کی جزا و سزا کا دن آگے آنے والا ہے یہ دنیا دارالجزا نہیں بلکہ دارالامتحان ہے۔ قیامت کے دن جس نے بھی اپنے رب کی ناشکری کی ہوگی وہ اس ناشکری کی سزا بھگتے گا اور جنہوں نے نیکی کا راستہ اختیار کیا ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت کا سزاوار ہوگا اور یہ مت سمجھو کہ وہ آنے والا دن بہت دور ہے وہ جلد آ کے رہے گا اور یہ بھی گمان نہ کرو کہ اس دن اربوں کھربوں مخلوق کا حساب کون لے سکے گا اور کیسے سب کو سزا دی جا سکے گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی قدرت بے پناہ ہے وہ جس کو سزا دینا چاہے گا اس میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی اور جسے وہ نوازنا چاہے گا یقیناً اس کے رحم و کرم میں اس کیلئے جگہ ہوگی کیونکہ وہ سریع العقاب بھی اور غفور رحیم بھی ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورۃ انعام مکمل ایک ہی دفعہ نازل ہوئی اور اس شان کے ساتھ نازل ہوئی کہ ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں تسبیح پڑھتے ہوئے آئے۔ بعض روایات میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ یہ سورۃ جس مریض پر پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرماتے ہیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ

(۷)

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مضامین

تعارف 1
مخالفتوں کے ہجوم میں آنحضرت ﷺ کو تسلی اور آپ کی دعوت
ذمہ داری کی حد:........................ 4
مشرکینِ قریش کو عذاب کی دھمکی:........................ 6
معذب قوموں کی تاریخ سے استدلال:........................ 7
انذار کی تفصیل:........................ 9
وزن کی وضاحت، احادیث کے شواہد:........................ 12
احسانات کے ذکر سے ملامت بھی اور دعوت بھی:........................ 16
تخلیقِ انسان کا اسلامی نقطہ نگاہ اور اس کی وضاحت:........................ 20
سجدہ کے حکم کی توضیحات:........................ 21
سرگزشتِ آدم و ابلیس پر مکرر نظر:........................ 22
حضرت آدم و ابلیس کو دو متحارب فریقوں کے طور پر زمین پر بھیجا:..... 26
بنی آدم اپنے باپ سے ابلیس کی دشمنی کو مت بھولنا:........................ 30
لباس سے مقصود ستر پوشی بھی ہے اور زینت بھی:........................ 31
اصل مقصود لباسِ تقویٰ ہے کی وضاحت:........................ 31
شیطان کا اصل ہدف لباسِ تقویٰ ہے:........................ 33
شیطان کی چال:........................ 34
آباؤاجداد کے طرزِ عمل سے استدلال:........................ 35
قریش کی دلیل کا جواب:........................ 35
اللہ "قسط" کا حکم دیتا ہے اس کی وضاحت:........................ 36
شیطان سے اثر قبول کرنے والے پیغمبر کی دعوت سے بھی اثر قبول نہیں کرتے:........................ 38
لباس کے حوالے سے ایک خاص ہدایت:........................ 39
اللہ کی نعمتوں پر پابندی اللہ کے سوا کوئی نہیں لگا سکتا:........................ 43
اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی اصل چیزیں:........................ 47
دنیا و عقبیٰ میں امان اللہ کی فرمانبرداری میں ہے:........................ 52
اللہ پر جھوٹ باندھنے اور اس کی آیات کی تکذیب کا انجام:........................ 53
تکذیب اور استکبار کا مفہوم:........................ 58
آسمانوں کے دروازے نہ کھولے جانے کا مفہوم:........................ 59
استکبار کا انجام:........................ 62
مہاد۔غواش کا مفہوم:........................ 62
اصلاح و تربیت کے دو مؤثر طریقے:........................ 63
داخلی احساسات پر اللہ کی نوازش:........................ 67
اہلِ جنت کا جذبہ شکر و سپاس:........................ 68
اہلِ جنت کی شان اور ان کی قوتوں کا عروج:........................ 71
حجاب سے مراد؟........................ 74
اہلِ جنت و جہنم کی علامات:........................ 77
جنت میں داخل ہونے کا مفہوم کیا ہے؟ اور اس کے مخاطب کون ہیں؟........................ 79
اصحاب النار کی فضیحت:........................ 80
تحریم کا مفہوم:........................ 81
جنت کی نعمتوں سے محرومی کے اسباب:........................ 81
دنیا و عقبیٰ میں ناکامی سے بچنے کا ذریعہ کتاب ہدایت سے وابستگی ہے:........................ 85
قرآنِ کریم کی صفات:........................ 86
تمہاری بدنصیبی تمہارے انجام کی منتظر ہے:........................ 88
تمہید:........................ 91
اللہ وحدہٗ لاشریک ہے:........................ 91
قرآن میں رب کی دو بنیادی صفات:........................ 92
استواء کا مفہوم:........................ 95

Marfat.com

اللہ کی حاکمیت کی ایک جھلک: 95

دعا کا مفہوم: 97

اسی مضمون کی تائید ایک منفی پہلو سے: 99

چار حقائق: 103

ایک اور اہم حقیقت: 104

توجہ طلب بات: 105

حضرت نوح اور قومِ نوح کی مثال اور اس کی وضاحت: 108

انبیاء کی دعوت کی وحدت: 109

ایک اشتباہ اور اس کا جواب: 111

حضرت نوح اور آپ کی قوم کے درمیان مکالمہ اور معارضہ، مشرکینِ مکہ کیلئے آئینہ: 112

قومِ عاد کی تاریخ: 118

ایک نکتہ کی وضاحت: 119

حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت: 120

حضرت ہود علیہ السلام اور آپ کی قوم کے درمیان مکالمہ: 122

ایک اعتراض کا جواب: 125

قوم کا جواب اور ان کے استدلال کی حقیقت: 127

لمحہ فکریہ: 129

حضرت ہود علیہ السلام کا جواب اور قومِ ہود کا انجام: 130

ثمود کی تاریخ: 135

اونٹنی کا معجزہ: 136

ترغیب وترہیب: 139

ایک عمل پر تنقید: 140

متکبرین اور مومن مستضعفین میں مکالمہ اور بعض حقائق: 141

غریب مومنوں کا جواب اور اس کے متضمنات: 143

عذاب کی کیفیت: 145

پیغمبر کا اظہارِ حسرت: 146

حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کی تاریخ: 147

حضرت لوط علیہ السلام کو قوم کا بھائی قرار نہیں دیا گیا۔ کیوں؟ 147

اسلوبِ دعوت کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ: 149

قوم لوط کی برائی کا صراحت سے ذکر اور اس کی وضاحت: 150

قوم لوط کے بگاڑ کی انتہا اور اس کے نتائج: 152

اللہ کا قانون: 153

قوم لوط پر عذاب کی وضاحت: 154

قوم شعیب کی تاریخ اور حضرتِ شعیب علیہ السلام کی دعوت: 157

قوم شعیب کی دو نمایاں خرابیاں: 158

ایک اعتراض اور اس کا جواب: 160

آیتِ کریمہ میں مضمر حقائق: 162

ایک اشتباہ کا جواب: 164

مومن کیلئے وطن کی حقیقت: 165

مسلمانوں کو وارننگ: 166

قوم شعیب پر آنے والا عذاب اور اس میں عبرت کا سامان: 167

باسا اور ضراء کا مفہوم: 170

اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سنت کا تذکرہ: 171

دوسری سنتِ الٰہی: 174

قابلِ توجہ بات: 175

دو مفہوم: 177

اللہ کا عذاب بے امان ہوتا ہے: 177

دلوں پر مہر اللہ کے عذاب کی تمہید ہے: 179

دلوں پر مہر کب لگتی ہے؟ 180

فرعون کی تحقیق: 182

آیت میں بیان کردہ تین باتوں کی وضاحت: 183

موسیٰ علیہ السلام کا تعارف، ان کی اپنی زبانی: 184

صرف بنی اسرائیل کا مطالبہ کیوں؟ 185

Marfat.com

ہر پیغمبر کے معجزات قوم کے مذاق کے آئینہ دار ہوتے ہیں: 186

قومِ فرعون کے سرداروں کی باہمی مشاورت اور اس کے پس پردہ معتقدات: 190

جادوگروں کی ذہنی سطح: 193

جادوگروں کے جادو کی حقیقت: 194

فرعون اور اس کے عمائدین پر شکست کا دوسرا زوردار حملہ: 196

فرعون کی ذہانت نے معاملے کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی: ... 197

جادگروں کا جواب جو ایمان کی رفعتوں کا امین ہے: 199

شکست کے بعد عمائدینِ سلطنت کی بوکھلاہٹ: 202

فرعون کی اذیتوں پر اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو: 204

یطّیّروا۔ طائر کا مفہوم: 209

گمراہ لوگوں کی سوچ بھی بگڑ جاتی ہے اور وہ صحیح نتائج اخذ کرنے سے محروم ہو جاتی ہے: 209

آیاتِ مفصلات کا مفہوم: 210

معجزات کی تفصیل: 211

معجزات سے پھوٹنے والی باتیں: 212

فرعون اور آلِ فرعون کا انجام: 214

قوموں کی حیاتِ اجتماعی کے بعض جھول: 222

تمہید: 225

ہمارے لئے لمحہ فکریہ: 227

واعدنا کا مفہوم: 228

مدتِ موعود پر اضافے کا سبب؟ 229

انبیاء کے معصوم ہونے کا مفہوم: 230

موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے لذتِ کیف وسماع کے بعد لذتِ دیدار کی خواہش: 231

انسان کی رسائی فکر اور تقربِ خداوندی کی انتہا: 233

تورات کا تعارف اور اس کے مقتضیات: 234

دار الفاسقین کا مفہوم: 237

انسان کی چند در چند غلط فہمیوں پر تنبیہ: 239

سامری کون تھا؟ اور اس کے کارنامے کی حقیقت: 243

خوار کی تحقیق: 243

اللہ کی نعمتوں کی ناسپاسی عقل کو ماؤف کر دیتی ہے: 246

حضرت ہارون کی برأت: 248

انبیاء سے متعلق بنی اسرائیل کا رویہ: 249

القی الالواح کا مفہوم: 249

حضرت موسیٰ کی اللہ سے دعا: 250

آیئے اپنا جائزہ لیں: 254

پس منظر: 256

بنی اسرائیل کے سرداروں کی سرکشی سے اللہ کا جلال بھڑکا تو موسیٰ علیہ السلام کی آہ وزاری: 257

آزمائش دوگونہ نتائج کی حامل ہوتی ہے: 258

موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور اللہ کا جواب: 259

وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ کی وضاحت: 262

موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے مصداق اور آنحضرت ﷺ کی صفات کی وضاحت: 263

آنحضرت ﷺ کی علامات: 269

اس کے بعد کامیابی کیلئے آنحضرت ﷺ پر ایمان اور مزید تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے: 271

قرآنِ کریم سے ایمان کی وضاحت: 271

ایمان کی تشریح حدیث سے: 275

آپ ﷺ کا احترام: 279

آپ ﷺ کی نصرت: 279

قرآن کا اتباع: 281

تمام نوعِ انسانی کو ایمان لانے کی دعوت اور آیت کے مندرجات کی

Marfat.com

تشریح: 283

آنحضرت ﷺ کے اتباع کا حکم: 289

اہلِ کتاب کے صالحین کی تحسین: 290

تضمین ختم، اصل سلسلۂ مضمون شروع۔ بنی اسرائیل کی تنظیم اور دیگر احسانات کا تذکرہ: 291

قریہ کی وضاحت اور اس میں داخل ہونے کے آداب: 295

بنی اسرائیل کے سامنے ان کی تاریخ کا آئینہ: 300

اس واقع کے مسلّم ہونے کی دلیل: 300

مقامِ واقعہ: 301

اجتماعی نافرمانی پر عذاب آتا ہے: 302

اس واقعہ پر تذکر کی نگاہ: 304

یہود پر ابدی لعنت کا اعلان: 306

بنی اسرائیل کا قومی انتشار: 310

اجتماعی اصلاح کیلئے اہلِ خیر کا مضبوط ہونا ضروری ہے: 311

آزمائش کے دو طریقے: 313

مشکل الفاظ کے معنی: 314

بنی اسرائیل کے تدریجی زوال کے اسباب: 315

نجات کا دارومدار تمسیک بالکتاب اور اقامتِ صلوٰۃ پر ہے: 318

"اذ" کا مفہوم: 325

عہدِ الست کی یاددہانی اور اس کا مفہوم: 325

عہد لینے کے اسباب: 330

عہدِ الست سے منہ پھیرنے والے فرد یا قوم کی تمثیل اور اس کے نمایاں خدوخال: 332

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مشرکین کیلئے تہدید و وعید: 334

گزشتہ بحث کا خلاصہ: 335

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ: 336

اسمائے حسنہ سے ضروری باتیں: 340

اسمائے خداوندی کی تعداد کے تعین میں دو اشکال اور اس کا جواب: 342

قبولیتِ دعا کی تین صورتیں: 345

امتِ مسلمہ کا حقیقی تعارف: 346

اسلوبِ قرآن کے فہم کیلئے ضروری ہدایات: 348

ایک سوال اور اس کا جواب: 350

ایک دوسرے پہلو سے جنون کی تردید: 355

آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی اور مشرکین کو وارننگ: 357

ایک سوال اور اس کا جواب: 361

اس رکوع کی گزشتہ آیات کے مفاہیم کا خلاصہ: 360

پیغمبر کی شناخت کے ضمن بعض گمراہیوں کی اصلاح: 362

گمراہی کے دو سبب: 366

آیات میں بیان کردہ تین حقائق: 368

شرک کے تین پہلوؤں پر گفتگو: 371

بت پرستی پر تنقید: 373

شخصیت پرستی پر تنقید: 374

دعوتِ حق کی انجام دہی کیلئے ناگزیر ہدایات: 378

اذیتوں کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کا اسوہ: 391

Marfat.com

تعارف

آج ہم محض اللہ کے فضل وکرم سے ''سورۃ الاعراف '' کا آغاز کررہے ہیں یہ سورۃ بھی سابقہ سورۃ الانعام کی طرح مکی ہے اور دونوں کے نزول کا زمانہ بھی قریب قریب معلوم ہوتا ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے پہلی کون سی سورۃ نازل ہوئی۔ قرائن سے ایسا گمان ہوتا ہے کہ جو ترتیب اس وقت سورتوں کی قرآن پاک میں ہے اسی ترتیب سے یہ دونوں سورتیں نازل ہوئی ہیں۔ دونوں کا چونکہ زمانہ قریب قریب ہے اس لحاظ سے دونوں کے مضامین میں بہت مماثلت ہے اس لئے اس سورۃ کو پڑھنے سے پہلے بہتر ہے کہ سابقہ سورۃ کا ہم نے جو تعارف کرایا تھا اس پر ایک نظر ڈال لی جائے' اس سے کم از کم یہ اندازہ ہوجائے گا کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی ہے تو اس وقت اسلامی تاریخ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو کس طرح کے حالات سے سابقہ تھا اور اسلامی دعوت کیسے جانگسل مراحل سے گزر رہی تھی البتہ اس کے اسلوب میں سورۃ الانعام کے اسلوب کی نسبت زیادہ تندی اور تیزی محسوس ہوتی ہے۔ جن بنیادی عقائد پر سورۃ الانعام میں زور دیا گیا ہے وہی بنیادی موضوعات اس کے بھی ہیں لیکن اس میں انذار زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پیمانہ صبر لبریز ہونے کو ہے اور مشرکینِ مکہ کو صاف صاف وارننگ دی جارہی ہے کہ اگر تم نے اپنے رویہ نہ بدلا اور اسلامی تحریک کو آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا یا خود اسلام کی دشمنی سے باز نہ آئے تو اللہ کا عذاب زیادہ دور نہیں۔ وہ وقت قریب آرہا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ہجرت کا حکم دیں گے اور پھر تمہارے پاس اسلام قبول کرنے کے حوالے سے بہت کم مہلت باقی رہ جائے گی اگر تم نے فیصلہ جلدی نہ کیا تو بہت اندیشہ ہے کہ تم اللہ کے عذاب کا شکار ہوجاؤ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ کی جانب سے چونکہ مخالفت بہت شدید ہوگئی ہے اس لئے آنحضرت ﷺ کو مختلف اسالیب سے تسلی دی جارہی ہے اور ضمناً ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تحریک اور اسلامی قافلہ اگرچہ سخت کٹھن حالات سے گزر رہا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے اس راستے کیلئے ہر گلی کا دروازہ بند ہوچکا ہو لیکن وہ وقت دور نہیں جب ان بند گلیوں میں سے دروازے نکلیں گے اور اللہ تعالیٰ کی عنایت خصوصی سے اس قافلے کو توانائی نصیب ہوگی اور وہ انقلاب جسے قریشِ مکہ پوری طاقت سے روک دینا چاہتے ہیں وہ ایک سیل کی طرح آگے بڑھے گا اور کفر و شرک اور موانع کے خس و خاشاک کو بہا لے جائے گا۔

اس سورۃ کا نام الاعراف ہے۔ جیسا کہ سابقہ سورتوں کی تشریح میں یہ بات ذکر ہو چکی ہے کہ قرآن کریم کی سورتوں کے نام اس طرح

Marfat.com

نہیں ہیں جس طرح مضامین کے عنوانات ہوتے ہیں کہ جس عنوان پر کوئی مضمون لکھا جاتا ہے اس میں اسی کے مالہ وماعلیہ کی تفصیلات ہوتی ہیں اور ایک مکمل تعارف کرایا جاتا ہے قرآنِ پاک کی سورتوں کے نام صرف شناخت کیلئے رکھے گئے ہیں جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اس نام کی سورۃ فلاں پارے میں یا فلاں سورۃ سے پہلے یا اس کے بعد ہے تاکہ اسے تلاش کرنے اور اس کے حوالے میں آسانی ہو۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ اگر اس کا نام البقرہ ہے تو وہاں گائے پر کوئی مضمون لکھا گیا ہے یا اس کا نام الاعراف ہے تو اعراف کی تفصیلات بیان کی گئی ہوں اس سورۃ کی چھیالیس اور سینتالیس آیت میں چونکہ اعراف اور اصحاب اعراف کا ذکر ہے اس لئے اس سورۃ کا نام محض شناخت اور پہچان کیلئے الاعراف رکھ دیا گیا ہے۔

اس سورۃ کا آغاز سورۃ البقرہ کی طرح حروف مقطعات یعنی الـمـص سے ہو رہا ہے۔ ایسے حروف اور بھی کئی سورتوں کے آغاز میں آئے ہیں۔ ہمارے مفسرین بالعموم اس کے بارے میں یہ کہہ کے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول اس کی مراد کو بہتر جانتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم ان حروف پر یہاں بحث کریں بہتر ہے کہ ہم نے سورۃ البقرہ کے آغاز میں جو کچھ لکھا ہے اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ اس سے اگرچہ کوئی حتمی اور قطعی بات تو سامنے نہیں آئے گی۔ البتہ ایک تشفی بخش نقطۂ نگاہ ضرور آپ کے سامنے آجائے گا۔

ہم یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ اس سورۃ کا نزول سخت ناساعد حالات میں ہوا ہے جبکہ مسلمانوں کیلئے مکہ کی زندگی انتہائی دشوار بنادی گئی تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت مکہ سے باہر ہجرت کر کے جا چکی تھی اور جو لوگ مکے میں موجود تھے ان کو بری طرح نشانۂ ستم بنایا جا رہا تھا۔ حالات کی ان تلخیوں نے مسلمانوں کو تو ہجرت پر مجبور کیا ہی تھا۔ خود آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی بھی متاثر ہونے کی وجہ سے مختلف احساسات سے دوچار ہو رہی تھی چنانچہ انہی احساسات کے حوالے سے اس سورۃ کی سب سے پہلی آیت میں گفتگو کی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

Marfat.com

سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ ۷ ، ۳۹ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا ۲۰۶ ، رُكُوْعَاتُهَا ۲۴

الٓمّٓصٓ ۝۱ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ
مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ
اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا
تَذَكَّرُوْنَ ۝۳ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ
هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝۴ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ
قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۵ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ
لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا
غَآئِبِيْنَ ۝۷ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝۹ وَ
لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا
مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰

المص۔ یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے تو اس کے باعث تمہارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہو،
تاکہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کر دو اور اہل ایمان کیلئے یاددہانی ہے۔ لوگو! جو چیز تمہاری طرف تمہارے
رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے ماسوا سرپرستوں کی پیروی نہ کرو بہت کم تم لوگ یاد

Marfat.com

دہانی حاصل کرتے ہو۔اور کتنی ہی بستیاں ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا تو آیا ان پر ہمارا عذاب رات میں اچانک یا دن دہاڑے جب وہ دوپہر کے آرام میں تھے تو جب ہمارا عذاب ان پر آیا تو اس کے سوا وہ کچھ نہ کہہ سکے کہ بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے۔ سو یاد رکھو ہم ان لوگوں سے پرسش کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی ہم استفسار کریں گے پھر ہم ان کے سامنے سب بیان کریں گے پورے علم کے ساتھ اور ہم کہیں غائب نہیں رہے۔ اس دن وزن دار صرف حق ہوگا تو جن کے پلڑے بھاری ٹھہریں گے وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوئے وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔ اور ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار بخشا اور تمہارے لئے معاش کی راہیں کھولیں پر تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو۔

☆ ☆ ☆

الٓمّٓصٓ O كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ O

''المص۔ یہ ایک کتاب ہے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے تو اس کے باعث تمہارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہو' تا کہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوشیار کر دو اور اہل ایمان کیلئے یاد دہانی ہے''۔1,2

مخالفتوں کے ہجوم میں آنحضرت ﷺ کو تسلی اور آپ کی دعوتی ذمہ داری کی حد:

اس آیت کریمہ میں حرج کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لغت میں حرج اس گھنی جھاڑی کو کہتے ہیں جس میں سے گزرنا مشکل ہو۔ دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کے درمیان اپنا راستہ صاف نہ پا کر آدمی کا دل آگے بڑھنے سے رکے۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ضیق صدر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ

''اے محمد ﷺ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تم دل تنگ ہوتے ہو'' (الحجر:۹۷)

یعنی تمہیں پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی ضد' ہٹ دھرمی اور مخالفت حق کا یہ حال ہے انہیں آخر کس طرح سیدھی راہ پر لایا جائے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ

''تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم پر وحی کیا جا رہا ہے اس میں سے کوئی چیز تم بیان کرنے سے چھوڑ دو اور اس بات سے دل تنگ ہو کہ وہ تمہاری دعوت کے جواب میں کہیں گے اس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا'' (ھود:۱۲)

حرج کے معنی کی اس وضاحت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہاں پروردگار آنحضرت ﷺ کو جس حرج سے بچانا چاہتے ہیں وہ اس کے حالات کی پیدا کردہ وہ صورت حال ہے جس سے آنحضرت ﷺ دوچار تھے قریش مکہ کی جانب سے روز بروز مخالفت میں شدت پیدا ہوتی جا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسلامی قوت کو بالکل کچل دینے کیلئے تیاری کر رہے ہیں انہوں نے اپنے دل تو اس دعوت کی طرف سے بند کر ہی لئے تھے

Marfat.com

گردوپیش بھی ان کے رویے سے متاثر ہورہا تھا جس کے نتیجے میں طائف میں حضور کو جو صورتِ حال پیش آئی وہ اسلامی تاریخ کا ایک اندوہناک باب ہے۔ان ناگفتہ بہ حالات میں حضور کی طبیعت میں بار بار ایک انقباض طاری ہوتا اور ایک اضطراب پیدا ہوتا تھا کہ ایسی بے پناہ مخالفتوں کے نرغے میں آخر یہ دعوت کس طرح کامیابی کا سفر جاری رکھ سکتی ہے اور میں ایک آخری رسول ہونے کی حیثیت سے نوعِ انسانی کی حالت کو بدلنے کا جو ارادہ رکھتا ہوں اس کے آخر امکانات کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔جبکہ بظاہر حالات میں اس کی کوئی گنجائش نظر نہ آتی تھی۔آپ کو تسلی دیتے ہوئے پروردگار آیت کے پہلے حصے میں یہ فرمارہے ہیں کہ اے پیغمبر آپ نے پیغمبری خود مانگ کے نہیں لی یہ کتاب آپ پر آپ کی خواہش پر نہیں اتاری جارہی اور جو ذمہ داریاں آپ پر عائد کی گئی ہیں آپ نے خود ان کی کبھی طلب نہیں کی جب یہ سب کچھ آپ کا خود اختیار کردہ نہیں ہے تو آخر اس کی تمام ذمہ داریاں آپ کے سر کیسے ہوسکتی ہیں اللہ نے خود آپ کو نبوت اور پیغمبری عطا فرمائی ہے وہی آپ پر یہ کتاب اتار رہا ہے اسی نے آپ کو اس کتاب کی تبلیغ دعوت کے کام پر مامور کیا ہے اب اس راستے میں اگر ایسی رکاوٹیں حائل ہو رہی ہیں جس سے اس دعوت کے ناکام ہو جانے کے اندیشے پیدا ہو گئے ہیں تو اس کیلئے آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اللہ کا دین ہے اسی نے محض اپنے فضل و کرم سے اس کے پہنچانے کی ذمہ داری خود لے رکھی ہے۔اسی نے آپ کو اس کام کیلئے مقرر فرمایا ہے۔اس لئے اس کام کے راستے میں حائل ہونے والے مشکلات کی فکر اگر ہونی چاہئے تو اسے ہونی چاہئے آپ کا کام تو ایک ذمہ داری ادا کرنا ہے اور اپنی ہمت کے مطابق انجام دینا ہے اگر اس کے بعد بھی یہ کام آگے نہیں بڑھتا تو آپ تو ہرگز اس کے ذمہ دار اور مکلف نہیں کیونکہ جس طرح نبوت آپ کو اللہ نے عطا کی ہے اسی طرح اس کے وسائل پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی اس پر ہے۔اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ ناممکن حالات کو ممکن بنائے اور اس کیلئے ایسا کام کرنا کوئی مشکل کام نہیں جب اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا تو وہ اپنی قدرت سے ان بند راستوں کو کھول دے گا۔آپ کو فکر اس بات کی تو ضرور ہونی چاہئے کہ آپ اللہ کے دین کی دعوت کو کس طرح بندوں تک پہنچائیں لیکن اس کیلئے امکانات پیدا کرنا یا اس راستے میں پیدا ہونے والے خدشات سے فکر مند ہونا یہ ہرگز آپ کا کام نہیں یہ اسی کا کام ہے جس نے آپ کو یہ کام سونپا ہے کیونکہ

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اس طرح سے آپ کو ایک تسلی دی جارہی ہے اور آپ کے پریشاں دل پر اطمینان اور سکینت کا مرہم رکھا جارہا ہے۔یہی وہ اطمینان افزاء آیات تھیں جن کے نزول سے اللہ کے نبی کو حوصلہ ملتا تھا اور آپ وہ کام کر گزرتے تھے جو بظاہر انسانی ہمت سے کہیں بڑھ کر تھا۔

اسی سلسلے میں دوسری فکر جو ہمیشہ آنحضرت ﷺ کو متاثر کرتی اور اندر ہی اندر آپ کو مضمحل کرتی رہتی تھی وہ یہ شدید احساس تھا کہ لوگ اگر ایمان نہیں لا رہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میری کاوشوں میں اور میری تبلیغ و دعوت میں کوئی کمی ہو۔کہیں میرے انذار و ابلاغ میں کوئی ایسی کوتاہی ہو جس کی وجہ سے لوگ متاثر نہیں ہو رہے ہوں چنانچہ اس تصور کے پیشِ نظر جیسے جیسے قریشِ مکہ کا آپ کی دعوت کی طرف سے انکار بڑھتا جارہا تھا ویسے ویسے آپ کی یہ پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔چنانچہ آیت کے دوسرے حصے میں آپ کو یہ بتایا جارہا ہے کہ آپ اللہ کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں آپ کا کام یہ ہے کہ آپ اللہ کے دین کو ٹھیک ٹھیک اس کے بندوں تک پہنچا دیں اور اس تبلیغ و دعوت میں آپ کی طرف سے کوئی تساہل ہونا چاہئے اور نہ کوئی کمی ہونی چاہئے رہی یہ بات کہ لوگ آپ کی دعوت پر ایمان کیوں نہیں لاتے تو آپ کی ہرگز یہ ذمہ داری نہیں کیونکہ آپ کا کام لوگوں تک دین پہنچانا ہے ان سے منوانا نہیں دل و دماغ اللہ کے قبضے میں ہے وہ جب چاہے اور جدھر چاہے انہیں پھینک سکتا ہے لیکن اس نے چونکہ انسان کو اختیار کی آزادی دے رکھی ہے

Marfat.com

اس لئے جب تک کوئی شخص اپنے اختیار سے دین کی طرف میلان اختیار نہیں کرتا اور اس دعوت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اس وقت تک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت عطا نہیں فرماتے اس لحاظ سے یہ بات قریشِ مکہ کے سوچنے کی ہے کہ اللہ کے رسول جیسی دل آویز شخصیت اور آپ کی لسانِ نبوت سے ہدایت کا ابلتا ہوا سرچشمہ اور آپ کا بے مثال فصاحت و بلاغت لئے ہوئے پیغام اگر ان پر اثر انداز نہیں ہو رہا تو یہ توان کی فکر مندی کی بات ہے کہ یقیناً ان میں کوئی خرابی ہے اور ان کے مزاجوں میں کوئی ٹیڑھ پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے وہ اس دعوت سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ آپ کو اس سے ہرگز فکر مند نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آپ کا کام انذار ہے اور اس میں بفضلہ تعالیٰ آپ نے کبھی کوئی کمی نہیں کی اس کیلئے آپ نے زندگی کا ایک ایک لحہ صرف کیا ہے اور اپنی صلاحیتوں کا ایک ایک قطرہ نچوڑ دیا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لا رہے تو اس آیت میں فرمایا گیا کہ یہ قرآنِ کریم تو ایک نصیحت ہے جو صرف اس آدمی کو نصیب ہوتی ہے جو ایمان لانے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھتا ہے کیونکہ نصیحت تو اس دل میں دھیرے دھیرے اترتی ہے جو دل اپنے دروازے اس کیلئے کھولتا ہے اور جو اپنے کواڑ بند کر لیتا ہے غیور خدا کا یہ غیرت مند دین کبھی اس کے دروازے کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ یہ مکے کے لوگ چونکہ اپنے اندر تبدیلی کا ادنیٰ سا ارادہ بھی پیدا نہیں کر سکے اور وہ اپنی جہالت کو نہ صرف کہ چھوڑنا نہیں چاہتے بلکہ انہیں اس پر ایک طرح سے ناز ہے۔ ایسی صورت حال میں اللہ تعالیٰ انہیں کیونکر ہدایت عطا فرما سکتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اگر ایمان نہیں لائے تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے آپ پر نہیں۔ اس لئے آپ اطمینان رکھیں ان کے ایمان نہ لانے کی باز پرس آپ سے ہرگز نہ ہو گی۔ اس لئے آپ کو پورے انشراح صدر سے اپنا کام جاری رکھنا چاہئے جس پروردگار نے آپ کو نبوت عطا فرمائی ہے وہ یقیناً راستے کی مشکلات سے باخبر ہے پھر وہ ان کو دور کرنے پر چونکہ قادر بھی ہے اس لئے جب وقت آئے گا تو وہ ان موانع کو خود دور فرما دے گا۔ اس تمہید کے بعد اگلی آیت کریمہ میں اصل بات کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

"لوگو! جو چیز تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے ماسوا سرپرستوں کی پیروی نہ کرو بہت کم تم لوگ یاددہانی حاصل کرتے ہو"۔3

مشرکینِ قریش کو عذاب کی دھمکی:

اس آیت کریمہ میں بعض اہل علم کا خیال ہے کہ خطاب مسلمانوں سے ہے لیکن سیاق کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاب مسلمانوں سے نہیں بلکہ قریشِ مکہ سے ہے آنحضرت ﷺ کو تسلی دینے کے بعد براہ راست پروردگار قریشِ مکہ سے خطاب کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ تم نے اس دعوت کا راستہ روکنے کیلئے اب تک جو کچھ کیا وہ تمہارے نامۂ عمل کو سیاہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ اب تم پر عذاب کا کوڑا برسنا شروع ہو جائے لیکن آخری وارننگ کے طور پر تمہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا جا رہا ہے اس کی پیروی کرو اسی میں تمہاری زندگی اور بقا ہے اور جن کو تم نے اللہ کے شریک بنا رکھا ہے ان کی پیروی مت کرو یہ خیالی اولیاء اور اصنام تمہارے کسی کام نہیں آ سکتے۔ وہ نہیں جانتے تمہاری زندگی کی ضروریات کیا ہیں۔ وہ جس طرح تمہیں پیدا کرنے پر قادر نہیں اسی طرح تمہیں رزق بھی نہیں دے سکتے تمہاری زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں ان کے پاس تمہارے لئے کوئی حل نہیں وہ خیالی اور مصنوعی قوتیں ہیں وہ تمہیں زندگی میں کیا رہنمائی دے سکتی ہیں۔ رہنمائی تو وہ دے سکتا ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور جس نے تمہاری فطرت تخلیق فرمائی ہے جو تمہاری انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کو جانتا ہے جس کا علم بے پناہ ہے اور جس کی حکمت بے حد وسیع ہے جو تمہارے احساسات اور انفعالات کے ایک ایک گوشے سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تمہارے احساسات سے لے کر تمہارے اعمال تک ہر چیز کی تعمیر کس چیز

Marfat.com

سے ممکن ہے اس لئے اگر چاہتے ہو کہ تمہارے گھر تمہیں آسودگی دیں اور تمہارا معاشرہ انسانوں کا معاشرہ بن جائے اور تمہارے سماج میں ہمدردی اور غمگساری کے پھول کھلیں اور تمہاری اجتماعیت مضبوط بنیادوں پر اٹھے اور اس کا دروبست مضبوط آداب کے ساتھ باندھا جائے۔ تمہارے حکمران فی الواقع تمہارے لئے چرواہے ثابت ہوں اور تمہارا ایک ایک فرد ایک دوسرے کیلئے توانائی کا باعث ہو تو پھر اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ اور ان مصنوعی اولیاء سے اپنا تعلق توڑو اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے بعد بانداز حسرت وافسوس فرمایا ہے قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ کہ تم ایسے بدنصیب لوگ ہو کہ تم پر آسمان سے رحمت کی صورت ہدایت اتر رہی ہے۔ ایک ایسا پیغام تم پر نازل کیا جارہا ہے جس کی ایک ایک بات تمہارے لئے زندگی بخش ہے۔ تمہاری طرف ایک ایسا رسول بھیجا گیا ہے جس کی دیانت وامانت اور پاکیزہ زندگی کے تم خود گواہ ہو اور ایک ایسی کتاب تم پر اتاری جارہی ہے جس کا ایک ایک بول اپنے اندر معجزانہ شان رکھتا ہے اور جس کی فصاحت و بلاغت نے تمہارے بڑے بڑے فصحاء کی زبانیں بند کردی ہیں اور جس کا ہر لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا دلوں میں اترتا جارہا ہے اس کے باوجود تم اگر ایمان نہیں لائے تو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ تم نہایت بدنصیب لوگ ہو کہ ایسی یاددہانی اور ایسی نصیحت بھی تم پر اثر انداز نہیں ہو رہی اور کس قدر کم ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس نصیحت سے اثر قبول کیا ہے ورنہ تمہاری اکثریت تو ایسے پتھروں پر مشتمل ہے جن پر نہ شبنم اثر کرتی ہے نہ بارش اثر انداز ہوتی ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں اس دعوت اور اس تنبیہ پر کان نہ دھرنے کے نتیجے میں جو قیامت برپا ہوسکتی ہے اس کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ O فَمَا كَانَ دَعْوٰهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ O

”اور کتنی ہی بستیاں ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا تو آیا ان پر ہمارا عذاب رات میں اچانک یا دن دہاڑے جب وہ دوپہر کے آرام میں تھے تو جب ہمارا عذاب ان پر آیا تو اس کے سوا وہ کچھ نہ کہہ سکے کہ بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے“۔ 5-4

معذب قوموں کی تاریخ سے استدلال:

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے کفر، مشرکوں کے شرک اور ان کی بدکرداریوں کا انجام بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی ذکر فرمایا ہے کہ تم محض اس کو ایک نصیحت سمجھ کر نظر انداز نہ کر دینا تمہارے رب کا یہ مستقل قانون رہا ہے کہ جب بھی لوگوں نے اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے انکار کیا ہے تو انہیں ہرچند سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جب وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو پھر بالآخر اللہ کا عذاب ان پر ٹوٹا اور ان کو اس طرح تباہ کر دیا گیا ہے کہ وہ بعد کے آنے والوں کیلئے عبرت کا نمونہ بن گئے۔ پھر اس عذاب کی ہولناکی کو بیان کرنے کیلئے فرمایا گیا کہ ہمارا عذاب کبھی رات کو آیا، کبھی دن کو آیا۔ کوئی سا لمحہ بھی اس کے عذاب کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا وہ جب چاہے کسی نافرمان قوم کو رات کو پکڑ لیتا ہے اور سوتے میں فنا کر دیتا ہے اور جب چاہے تو دن دہاڑے اس کا عذاب آتا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوتا۔ اس میں قآئلون کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ قیلولہ سے ہے۔ ہمارے یہاں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ قیلولہ کا معنی دوپہر کو سونا ہے حالانکہ سونا اس کے لوازم میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا معنی دوپہر کو آرام کرنا ہے۔ عرب کا ملک چونکہ گرم ملک ہے اس وجہ سے وہاں دوپہر میں لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے مقاموں، ڈیروں، خیموں اور باغوں میں دوپہر کو آرام کریں یہاں اس کا ذکر صرف اس لحاظ سے کیا جارہا ہے کہ جس طرح رات کو سونے والوں پر عذاب آتا ہے اسی طرح دن دہاڑے جاگنے والوں اور خوش گپیاں کرنے والوں اور دوپہر کو آرام کرنے والوں پر بھی آتا ہے۔ بگڑے ہوئے لوگوں کی چونکہ

Marfat.com

راتیں جاگتی ہیں اور عموماً دن سویا کرتے ہیں۔ شاید اس کی طرف بھی اشارہ کیا جارہا ہے کہ تم اپنی بدمستیوں اور نافرمانیوں میں کسی حال میں بھی اور کسی وقت بھی اللہ کے عذاب سے مامون نہیں ہو۔ اس نے تمہیں ایک مہلتِ عمل دے رکھی ہے وہ محض اپنی رحمت سے اس میں ڈھیل دیتا رہتا ہے کہ شاید تم اپنی بدکرداریوں سے توبہ کر کے راہ راست اختیار کرلو لیکن اگر تم نے اپنی روش ترک نہ کی تو اللہ کا یہ قانون ضرور حرکت میں آئے گا کہ تم اللہ کے عذاب کے شکار ہو جاؤ اور اگر تمہیں ہمارے رسول کی بار بار تنبیہات کے باوجود بھی یقین نہیں ہو رہا کہ تم پر اللہ کا عذاب آسکتا ہے تو تم اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ان بستیوں کو دیکھ لو جو اللہ کے عذاب سے تباہ ہو چکی ہیں۔ تم اپنے تجارتی اسفار میں ان بستیوں کے کھنڈرات سے گزرتے ہو اور پھر ان پر گزرنے والی قیامت کی تفصیلات سینہ بہ سینہ تم تک پہنچ چکی ہیں۔ تمہارے عام افراد بھی ان کی تاریخ سے واقف ہین اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ جس طرح تم پر اللہ کا رسول آیا ہے اسی طرح ان قوموں کی طرف بھی ان کی ہدایت کیلئے اللہ کی طرف سے رسول آئے تھے اور پھر جب انہوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو تم اختیار کر چکے ہو تو پھر ان پر اللہ کا عذاب آیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح آج تمہارے عجب اور تکبر کا عالم یہ ہے کہ تم اللہ کے رسول کی دعوت پر کان دھرنے کیلئے تیار نہیں ہو بلکہ تم اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ نہایت ذلت آمیز رویہ اختیار کرنے سے بھی جھجھکتے نہیں ہو۔ لیکن جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم جیسے بگڑے ہوئے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس وقت عذاب سے بچنے کیلئے اپنے جرائم کا بار بار اعتراف کیا جاتا ہے اور دہائی دی جاتی ہے کہ یا اللہ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی زندگیوں میں بہت ظلم کیا ہم نے خود اپنے آپ پر بھی ظلم ڈھایا کہ ہمیں بار بار ہدایت کی جاتی رہی لیکن ہم نے ہمیشہ اس سے اعراض کیا۔ اگر ہمیں موقع دیا جائے تو ہم اپنی اصلاح کرنے کو تیار ہیں لیکن اللہ کا عذاب جب آتا ہے تو پھر وہ ان آہ وزاری پر بھی رکتا نہیں۔ عذاب کا شکار لوگ ہزار منت سماجت کریں اور رونے دھونے سے بیشک آسمان سر پر اٹھالیں لیکن ان کی آہ وزاری پر اس لئے توجہ نہیں فرمائی جاتی کہ چونکہ تم نے اللہ کے رسول کی دعوت پر توجہ نہیں کی تھی آج تمہاری گریہ وزاری پر کوئی توجہ نہیں کی جائے گی۔ اس لئے یہاں بتایا جارہا ہے کہ جن معذب قوموں کے تم کھنڈرات سے گزرتے ہو ان پر جب اللہ کا عذاب آیا تھا تو انہوں نے ہر چند اپنے گناہوں اور اپنے جرائم کا اعتراف کیا اور اللہ سے معافیاں مانگیں لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی اور وہ فنا کر دیئے گئے تم بھی اسی صورت حال سے دوچار ہونے والے ہو وہ وقت دور نہیں جب تمہاری یہ سب اکڑفوں نکل جائے گی اس لئے اگر تم اپنی جان کے دشمن نہیں ہو گئے ہو اور تم نے اپنی نسلوں کو تباہ کرنے کا ارادہ نہیں کرلیا ہے تو آج اپنا رویہ بدلنے کی کوشش کرو۔ آج بدل جاؤ گے تو سب کچھ بچ جائے گا اور نہیں بدلو گے تو کل کو تمہارے آنسو بھی کام نہیں آئیں گے اور تم اپنے جرم کا اعتراف بھی کرو گے یہ اعتراف بھی تمہارے لئے سودمند نہیں ہوگا۔

اللہ کے رسول جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں اسے بالعموم دو چیزوں سے ڈراتے ہیں ایک ان کی پاداش عمل میں اچانک آنے والے عذاب سے اور دوسرے قیامت کے دن اللہ کے سامنے جوابدہی سے اور اس کے نتیجے میں ملنے والی سزا سے چنانچہ یہاں تک ذکر اس عذاب کا ہوا جو کسی وقت بھی قریشِ مکہ یا مشرکینِ مکہ پر آسکتا ہے اور اس طرح کے عذاب پہلے کئی قوموں پر آچکے ہیں جو اصلاً اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ یہاں انسان خودرو گھاس کی طرح پیدا نہیں ہوا کہ پاؤں سے مل دل کے ختم ہو جائے بلکہ اس کا ایک آقا ہے جس نے اسے ایک مقصد زندگی دے کر دنیا میں بھیجا ہے جب تک اس مقصد زندگی کے مطابق اجتماعی ذمہ داریوں کو ادا کرتا ہے تو وہ دنیا میں ہر لحاظ سے پھلتا پھولتا اور آسودگی سے زندگی گزارتا ہے لیکن جب اللہ کے احکام سے اجتماعی طور پر انکار کرنے لگتا ہے اور پھر اس کا انکار اللہ کے خاص قانون کی حدود سے ٹکرانے لگتا ہے اور اللہ کی مشیت کی برداشت آگے بڑھ جاتا ہے تو پھر اس پر اللہ کے عذاب کی گرفت آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک قومیں انفرادی بداعمالیوں کا شکار رہتی ہیں لیکن اجتماعی

Marfat.com

پراللہ کی حدود کو پامال نہیں کرتیں یا اجتماعی طور پر اللہ کے رسول اور اس کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرتیں تو اللہ ایسی قوموں کو برداشت کرتا ہے اور ان کا معاملہ صرف آخرت پر چھوڑتا ہے لیکن جب وہ اجتماعی زندگی میں حد سے آگے بڑھ جاتی ہیں تو پھر اس کائنات کا حقیقی شہنشاہ ان نام نہاد زمین کے باسیوں اور اس کے حکمرانوں پر عذاب کے ذریعے گرفت کرتا ہے اور انہیں دنیا سے مٹا کر اپنی زمین ان سے بہتر لوگوں کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر وہ ایک مدت تک آزمائش کے ترازو میں تلتے رہتے ہیں۔ شاید یہی وہ بات ہے جس کا اقبال مرحوم نے ذکر کیا ہے

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
مگر کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

چنانچہ ان آیات میں اب تک قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ نے قریشِ مکہ کو اللہ کے اس عذاب سے ڈرایا اور پہلے جو قومیں اس عذاب کا شکار ہو چکی ہیں ان کی تاریخ کے حوالے سے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی اب اگلی آیت میں قیامت کے عذاب سے اور قیامت کی باز پرس سے ڈرایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اپنی بداعمالیوں کے باوجود اس اچانک عذاب سے بچے رہتے ہیں وہ قیامت کے دن جواب دہی کیلئے پیش ہوں گے اور جو لوگ اس عذاب کا شکار بھی ہوتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے جرائم کی پوری سزا ہے بلکہ اس کی حیثیت تو بالکل ایسی ہے کہ جیسے کوئی مجرم چھوٹا پھر رہا تھا اور اچانک گرفتار کر لیا گیا اور مزید ظلم وفساد کے مواقع اس سے چھین لئے جائیں۔ تاریخ انسانی اس قسم کی گرفتاریوں کی بے شمار نظیروں سے بھری پڑی ہے لیکن اصل باز پرس تو آخرت اور قیامت کی باز پرس ہے یہ لمحوں میں گزرنے والا عذاب اس باز پرس کا حق ادا نہیں کرتا لیکن قیامت کی باز پرس کے نتیجے میں پھر ایک لمبی سزا سے اور دائمی عذاب سے واسطہ پڑنے والا ہے جس کا اگلی آیات میں ذکر کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ O فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّ مَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ O

''سو یاد رکھو ہم ان لوگوں سے پرسش کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور خود رسولوں سے بھی ہم استفسار کریں گے پھر ہم ان کے سامنے سب بیان کریں گے پورے علم کے ساتھ اور ہم کہیں غائب نہیں رہے''۔ 6-7

انذار کی تفصیل:

سب سے پہلے ان آیات کے اسلوب پر غور کیجئے کہ اس کے تیور کس قدر تیکھے ہیں یہ تصور دیا جا رہا ہے کہ ذرا اس وقت کو ذہن میں تازہ کرو جب تم سب اپنی ان تمام بے ایمانیوں اور بداعمالیوں سمیت اور اپنے تمام پندار اور تکبر وغرور کا سرمایہ ساتھ لئے ہوئے اللہ کے سامنے بے بسی کے حالت میں کھڑے ہو گے اور وہ تم سے تمہاری ایک ایک بات اور تمہاری ایک ایک حرکت کے بارے میں سوال کرے گا آج جبکہ تم اپنے اقتدار کے نشے میں اور اپنی طاقت کے گھمنڈ میں بڑی سے بڑی بات کہنے اور ہولناک سے ہولناک ظلم ڈھانے سے دریغ نہیں کر رہے اللہ کے رسول کی عظیم اور دلآویز شخصیت بھی تمہیں گستاخیوں سے روکنے کیلئے کافی نہیں اور ان پر ایمان لانے والوں کیلئے تم نے عذاب کی بھٹیاں سلگا رکھی ہیں۔ بلال جیسے وفا شعاروں کیلئے تمہارے پاس رحم ومروت کا نام تک نہیں، خباب جیسے سرفروشوں کیلئے تمہارے پاس دہکتے انگاروں کے بستر ہیں جن پر تم انہیں لٹا کر ان کے ایمان کا امتحان لیتے ہو۔ تم ایک سے ایک بڑی ظالمانہ حرکت کرتے ہو لیکن تمہارے ضمیر میں خلش تک نہیں ہوتی۔ لیکن اس دن جب تمہیں اللہ کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا تو تم خود اپنی نگاہوں سے تصور میں اپنا ایک ایک ظلم دیکھو گے تمہیں اپنی ایک ایک بات یاد آئے گی جس سے تم نے اللہ کے رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کی دل آزاری کی تھی اور جو تم بارگاہ اقدس میں گستاخیاں کرتے رہے تھے اب پروردگار پورے جلال سے تمہارے ایک ایک عمل کی تم سے باز پرس

Marfat.com

کرے گا اور وہ تم سے پوچھے گا کہ دیکھو ہمارے رسول نے جس طرح خون جگر پی پی کر تمہیں سمجھانے اور اللہ کا دین پہنچانے کی کوشش کی تم نے اس کے جواب میں کیا رویہ اختیار کیا۔ سوچ لو اس وقت تمہاری کیا حالت ہو گی اور تم اپنے موجودہ رویے کا کیا جواب پیش کر سکو گے اور پھر اس کے بعد اگلے جملے سے اللہ کے مزید جلال کا اظہار ہوتا ہے کہ وہاں سوال ان مجرموں سے تو ہو گا ہی خود اللہ کے نبیوں سے بھی پوچھا جائے گا جس کا ذکر دوسری جگہ قرآن کریم میں یہ کہہ کر فرمایا گیا ہے۔ یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ''جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا تمہیں کیا جواب ملا'' یعنی ایک طرف تو ان مجرموں سے جواب طلبی ہو گی لیکن اللہ کے جلال کا کیا ٹھکانہ ہے کہ خود اللہ کے رسول بھی جواب طلبی کی زد میں ہوں گے اور وہ اس قدر اللہ کے جلال سے کانپ رہے ہوں گے کہ صرف یہ کہہ کر چپ ہو جائیں گے کہ یا اللہ ہم جن لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے ان کے رویے کی پوری کیفیت سے ہم پوری طرح واقف نہیں کیونکہ ان کی اندرونی باتیں اور ان کی پوشیدہ حرکتیں اور ان کے بعد کے آنے والی نسلوں کا رویہ وہ تو ہم نہیں جانتے کیونکہ غیبوں کے جاننے والے تو آپ ہی ہیں حالانکہ رسولوں سے جو بات پوچھی جائے گی اس کا تعلق ان کی اپنی زندگی سے نہیں نہ ان کی ذمہ داریوں سے ہے بلکہ صرف ان کی امتوں کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا کہ انہوں نے تمہاری دعوت سے کیا سلوک کیا لیکن وہ چونکہ اللہ کے جلال کی حقیقت سے واقف ہیں اس لئے وہ کھل کے بات کہنے کی ہمت نہیں کر سکیں گے بلکہ احادیث میں قیامت کی جو تفصیلات ہمیں ملتی ہیں اس سے جو صورت حال سامنے آتی ہے اس کو تو محسوس کر کے ہی پتہ پانی ہونے لگتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ حساب کتاب کے انتظار میں کھڑے ہوں گے تو ان کی کیفیت یہ ہو گی کہ ہر شخص اپنے پسینے میں ڈوبا ہو گا اور اللہ کے جلال کی وجہ سے ایک ایسی ہیبت طاری ہو گی کہ کوئی شخص نہ بولنے کی ہمت کرے گا نہ دائیں بائیں دیکھنے کی ہمت کرے گا جب یہ انتظار نا قابل برداشت ہونے لگے گا تو کچھ لوگ اپنے اپنے انبیاء ورسل کی طرف رجوع کریں گے کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ کم از کم حساب کتاب تو شروع ہو لیکن ہر رسول اور پیغمبر اللہ کے جلال سے خوف زدہ ہونے کے باعث زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بالآخر سب آنحضرت ﷺ سے گزارش کریں گے کہ آپ اللہ سے دعا فرمائیں اور شفاعت کریں کہ وہ اپنی مخلوق کا حساب شروع کرے تب حضور فرماتے ہیں کہ میں کچھ کہنے کی بجائے سر سجدے میں رکھ دوں گا اور اب میں نہیں جانتا کہ میں کن کلمات کے ساتھ اللہ کی حمد وثناء کروں گا اس وقت وہ کلمات اللہ میرے دل میں ڈالے گا اور ان کے ذریعے سے میں اپنے اللہ کو پکاروں گا۔ دیر تک سجدے میں پڑے رہنے کے بعد اللہ کی طرف سے آواز آئے گی کہ اے محمد (ﷺ)! سر اٹھاؤ' مانگو ہم عطا کریں گے۔ تب حضور ساری امتوں کیلئے حساب کتاب شروع کرنے کی شفاعت فرمائیں گے۔ یہی وہ شفاعت کبریٰ کا مقام ہے جس پر ہمارے رسول پاک کو فائز کیا جائے گا لیکن اس صورت حال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دن اللہ کے جلال کی کیفیت کیا ہو گی؟ چنانچہ لوگوں سے جب ان کا حساب لیا جائے گا تو نہ صرف کہ بارگاہ ایزدی میں ان سے باز پرس ہو گی بلکہ جہنم میں انہیں ڈالتے ہوئے جہنم کے داروغے بھی ان سے پوچھیں گے کہ آج تمہیں جس طرح عذاب کے حوالے کیا جا رہا ہے ذرا بتلاؤ تو سہی کہ تمہاری طرف اللہ کے رسول تمہیں ہدایت دینے کیلئے نہیں آئے تھے چنانچہ قرآن کریم میں اس کی تفسیر اس طرح بیان کی گئی ہے:

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝

''جب جب ان کی کوئی بھیڑ دوزخ میں جھونکی جائے گی اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ہوشیار کرنے

Marfat.com

والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں ہمارے پاس ایک ہوشیار کرنے والا آیا تو تھا پر ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز بھی نہیں اتاری ہے' تم تو ایک بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ وہ اعتراف کریں گے کہ اگر ہم سنتے سمجھتے ہوتے تو جہنم میں پڑنے والے نہ بنتے۔ پس وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے تو لعنت ہوان دوزخیوں پر'' (الملک: ۸-۱۱)

اگلی آیت کریمہ میں اس دن کی کیفیت کو اور پر جلال بنا دیا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ اگر آج اس کے پڑھنے والے پوری طرح اس کا ادراک کر لیں تو بہت ممکن ہے وہ راہ راست اختیار کر لیں ورنہ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ محض سخن آرائی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا بیان ہے کہ اس دن کافروں کو ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا ہوگا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ اس دن کے ہولناک منظر کا پورا نقشہ تو شاید الفاظ ادا کرنے سے ویسے بھی قاصر ہوں کیونکہ کسی زبان میں بھی ابھی تک وہ وسعت پیدا نہیں ہو سکی جس میں پوری طرح اس دن کی ہولناکی کا نقشہ کھینچا جا سکے۔ ذرا اندازہ فرمایئے جب اللہ تعالیٰ عدالت کی مسند پر پورے جلال سے جلوہ افروز ہوں گے اور کافر مجرموں کی صورت اس عدالت میں اپنے کرتوتوں کو سامنے پا کر آنے والے انجام کا تصور کر کے کانپ رہے ہوں گے تو زیادہ سے زیادہ اس سے بچنے کی کوئی ہلکی سی امید ہو سکتی ہے یا عذاب میں تخفیف کی اگر کوئی کوشش کی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اپنے جرائم کو ماننے سے انکار کر دیا جائے یا جھوٹ بول کر اپنے جرائم کی شدت کو کم کر کے دکھایا جائے لیکن اللہ فرماتا ہے کہ تم ایسی کوئی کوشش بھی کرنے کی جرأت نہیں کر سکو گے کیونکہ ہم تمہاری سخن سازی سے پہلے ہی ایک ایک بات کو کھول کھول کر بیان کر دیں گے کیونکہ تمہاری کوئی بات بھی ہمارے علم سے مخفی نہیں ہے اور تمہارا کوئی کام بھی ایسا نہیں کہ جب تم وہ کام کر رہے تھے تو ہو سکتا ہے کہ تاریکی اور تنہائی میں تمہاری اپنی ذات بھی اس سے پوری طرح باخبر نہ ہو اور تمہاری نگاہیں اس سے نہ دیکھ سکیں لیکن اللہ کی ذات تو اس سے پوری طرح باخبر ہے کیونکہ اللہ فرماتا ہے کہ تم نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا ہے تم نے یہ سمجھ کے کیا ہے کہ شاید تمہارے ان کاموں کو حالات کی رفتار فنا کر دے گی اور وقت اس پر غبار ڈال کے آگے نکل جائے گا لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم جب بھی کوئی کام کرتے ہو اور جس حال میں بھی ہوتے ہو اللہ تم سے غائب نہیں ہوتا۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم برابر تمہارے ایک ایک عمل سے واقف رہے ہیں اور تمہارے کسی کام کے وقت بھی ہم وہاں سے غیر حاضر نہ تھے پھر ان کو اپنے علم وخبر کے مطابق ایک ایک بات کھول کھول کے بتائی جائے گی جہاں ان کی زندگی کا روزنامچہ ان کے سامنے کھول دیا جائے گا وہاں اللہ کے رسولوں نے جس طرح حق ابلاغ ادا کیا اور ان کی تکذیب کرنے والوں نے جس طرح جان بوجھ کر ان کی تکذیب کی اور انہوں نے جس طرح اپنے خون سے ہدایت کے دیپ جلائے اور انہوں نے جس طرح روشنی کے سامنے آنکھیں بند رکھیں انہوں نے جس طرح ان کی اذیتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور ان کی گالیاں سن کر دعائیں دیتے رہے ایک ایک چیز ان کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دی جائے گی۔ آج شاید اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہو کہ ایسی صورت حال میں ان کافروں کی کیفیت کیا ہوگی اور وہ خوف ودہشت کے کس عالم سے گزر رہے ہوں گے۔

مشرکینِ مکہ کی ایک خاصی بڑی تعداد قیامت ہی کی منکر تھی لیکن جو لوگ قیامت کے آنے کو ممکن سمجھتے تھے ان کیلئے بھی یہ بات سمجھنا بہت مشکل تھی کہ اربوں کھربوں مخلوق کو کس طرح بیک وقت زندہ کر دیا جائے گا؟ اور اگر زندہ کر بھی دیا جائے تو اتنی بڑی تعداد کا حساب لینا کس طرح ممکن ہوگا؟ اور پھر یہ بات تو ان کیلئے اور بھی حیران کن تھی کہ ہم نے زندگی بھر جو اعمال کئے ہیں جو شاید ہمیں بھی پوری طرح یاد نہ ہوں ان میں سے ایک ایک بات کی باز پرس کیسے ہوگی؟ اور ایک ایک عمل کس طرح ہمارے سامنے لایا جا سکے گا؟ یعنی قیامت میں جواب دہی کا پورا طریق کار اور اس کی پوری تفصیلات ان کیلئے ناقابل یقین تھیں اور اس لئے وہ ہمیشہ ان کا تمسخر اڑاتے تھے چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں انہی تفصیلات میں سے چند باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ ج فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ O

''اس دن وزن دارصرف حق ہوگا تو جن کے پلڑے بھاری ٹھہریں گے وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوئے وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے''۔9-8

بعض بزرگوں نے اس کے پہلے جملے کا ترجمہ اس طرح کیا ہے''اور تول اس دن ٹھیک ہوگی'' لیکن دونوں صورتوں میں مطلب اور مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس دن خدا کی میزان عدل میں وزن اور حق دونوں ایک دوسرے کے ہم معنی ہوں گے حق کے سوا کوئی چیز وہاں وزنی نہ ہوگی اور وزن کے سوا کوئی چیز حق نہ ہوگی جس کے ساتھ جتنا حق ہوگا اتنا ہی وہ باوزن ہوگا اور فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا کسی دوسری چیز کا وزن ذرہ برابر لحاظ نہ کیا جائے گا۔ باطل کی پوری زندگی خواہ وہ دنیا میں کتنی ہی طویل وعریض رہی ہو اور کتنے ہی بظاہر شاندار کارنامے اس کی پشت پر ہوں اس ترازو میں سراسر بے وزن قرار پائیں گے۔ باطل پرست جب اس میزان میں تولے جائیں گے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ دنیا میں جو کچھ وہ مدت العمر کرتے رہے وہ سب ایک پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا یہی بات ہے جو سورۃ کہف کی آیات ۱۰۳ تا ۱۰۵ میں فرمائی گئی ہے:

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا O اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًاO اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا

(الکھف:۱۰۳-۱۰۵)

''ہم تمہیں بتائیں گے کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے کون ہوں گے؟ وہ جن کی ساری سرگرمیاں طلب دنیا میں برباد ہوئیں اور وہ اس خوش گمانی میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کررہے ہیں' وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور ملاقات کا انکار کیا تو ان کے اعمال ڈھے گئے' تو ہم قیامت کے دن ان کیلئے کوئی وزن نہیں قائم کریں گے''۔

وزن کی وضاحت، احادیث کے شواہد:

بعض لوگوں کو آج بھی اور مشرکین مکہ کو خاص طور پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ چیزوں کا وزن تو سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن ایمان وکفر کا وزن اچھے برے اعمال کا وزن آخر اس کو کس طرح سمجھا جاسکتا ہے تو اس آیت میں ایک بات تو یہ صاف کردی گئی کہ اس دن ایمان اور نیک اعمال کا وزن ہوگا اور یہ باقاعدہ اپنا تول تلیں گی لیکن جہاں تک کفر اور برائیوں کا تعلق ہے وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھیں گی۔ چنانچہ احادیث سے اور قرآن کریم سے ان دونوں آیتوں کی وضاحت ملتی ہے اور جہاں تک آج کے دور کا تعلق ہے آج تو بہت ساری ایسی چیزیں ایجاد ہوچکی ہیں جو ایسی چیزوں کو تول رہی جن کو ایک زمانہ پہلے تک تولنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گزشتہ زمانے میں کون تصور کرسکتا تھا کہ ہوا بھی تولی جاسکتی ہے' برقی رو تولی جاسکتی سردی اور گرمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے' ان کے الگ الگ میٹر تیار ہوچکے ہیں' باقاعدہ ان کو ترازو میں تولا جاتا ہے۔ ہمیں بخار ہوتا ہے تو منہ میں میٹر رکھ کر

Marfat.com

دیا جاتا ہے کہ کس درجے کا بخار ہے۔ گاڑیوں والے جگہ جگہ اپنی گاڑیوں میں پاؤنڈوں کے حساب سے ہوا بھرواتے ہیں۔ روزانہ محکمہ موسمیات والے ہمیں موسم کا ٹمپریچر تول تول کر بتاتے ہیں اس لئے آج یہ باتیں سمجھنا ہمارے لئے مشکل نہیں رہا کہ قیامت کے دن اعمال کیسے تلیں گے۔ آج تو ہمارے لئے یہ بات سمجھنا بھی کوئی مشکل نہیں رہا کہ برسوں پہلے دنیا سے گئے ہوئے لوگوں کو کس طرح ان کے اعمال سمیت دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ کتنے بڑے بڑے مرحومین ہیں کہ جب ان کی برسیاں منائی جاتی ہیں تو ہر روز ٹی وی کی سکرین ہمیں ان کی آواز سناتی ہے' ان کو چلتا پھرتا دکھایا جاتا ہے' ان کو دفتر کے کام کرتے اور مختلف امور سرانجام دیتے ہوئے ہمارے سامنے لایا جاتا ہے اس لئے آج یہ تصور کرنا کوئی مشکل نہیں رہا کہ یہ کوئی ناممکن بات نہیں کہ کبھی کوئی دن ایسا آئے جب ہماری اس فضا کو ایک ٹی وی سکرین کی شکل دے دی جائے اور قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوقات کو اس میں چلتا پھرتا دکھایا جائے اور ان کے اعمال کو مجسم شکل میں سب کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا جائے کیونکہ حدیث سے جس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کے وزن ہوں گے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سارے اعمال کو مجسم شکل میں سامنے لایا جائے گا۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادات اس بات پر شاہد ہیں کہ برزخ اور محشر میں انسانی اعمال خاص خاص شکلوں اور صورتوں میں آئیں گے' قبر میں انسان کے اعمال صالحہ ایک حسین صورت میں اس کے مونس بنیں گے اور برے اعمال سانپ بچھو بن کر لپٹیں گے ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی وہ مال ایک زہریلے سانپ کی شکل میں اس کی قبر میں پہنچ کر اس کو ڈسے گا اور کہے گا میں تیرا خزانہ ہوں اسی طرح معتبر احادیث میں ہے کہ میدان حشر میں انسان کے اعمال صالحہ اس کی سواری بن جائیں گے اور برے اعمال بوجھ بن کر اس کے سر پر لادے جائیں گے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ قرآن مجید کی سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران میدان حشر میں دو گہرے بادلوں کی شکل میں آکر ان لوگوں پر سایہ کریں گی جو ان سورتوں کے پڑھنے والے تھے۔ جہاں تک ایمان و عمل کے وزن دار ہونے کا تعلق ہے اس میں بعض احادیث میں صرف ایمان یا کلمہ طیبہ کے بھاری وزن کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ترمذی' ابن ماجہ' ابن حبان' بیہقی اور حاکم نے حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ محشر میں میری امت کا ایک آدمی ساری مخلوق کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے نامۂ اعمال لائے جائیں گے اور ان میں سے ہر نامۂ اعمال اتنا طویل ہوگا کہ جہاں تک اس کی نظر پہنچتی ہے اور یہ سب نامۂ اعمال برائیوں اور گناہوں سے لبریز ہوں گے۔ اس شخص سے پوچھا جائے گا کہ ان نامۂ اعمال میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب صحیح ہے یا نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں نے تم پر کوئی ظلم کیا ہے اور خلاف واقعہ کوئی بات لکھی ہے وہ اقرار کرے گا کہ اے میرے پروردگار جو کچھ لکھا ہے سب صحیح ہے اور دل میں گھبرائے گا کہ اب میری نجات کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا ان تمام گناہوں کے مقابلے میں تمہاری ایک نیکی کا پرچہ بھی ہمارے پاس موجود ہے جس میں تمہارا کلمۂ شہادت لکھا ہوا ہے۔ وہ عرض کرے گا کہ اے پروردگار اتنے بڑے سیاہ نامۂ اعمال کے مقابلے میں یہ چھوٹا سا پرچہ کیا وزن رکھے گا اس وقت ارشاد ہوگا کہ تم پر ظلم نہیں ہوگا اور ایک پلہ میں وہ سارے گناہوں سے بھرے ہوئے نامۂ اعمال رکھے جائیں گے اور دوسرے میں یہ کلمۂ ایمان کا پرچہ رکھا جائے گا اور اس کلمہ کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور سارے گناہوں کا پلہ ہلکا ہو جائے گا اس واقعہ کو بیان کر کے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے نام کے مقابلے میں کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر کی زندگی کے کروڑوں اعمال میں جو چاہے اپنے اندر کیسی بھی شناعت رکھتے ہوں ایک کلمہ ایمان ان سب پر بھاری ہو جائے گا لیکن جہاں تک اعمال کا تعلق ہے ان کا الگ وزن ہوگا جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ نجات پا جائے گا اور جس کے گناہوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ عذاب کا شکار ہوگا۔ یہی بات قرآن کریم کی ان آیات میں کہی گئی ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوٰزِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَ اِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا وَ کَفٰی بِنَا

Marfat.com

حَاسِبِيْنَ ۵

''ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو قائم کریں گے اس لئے کسی شخص پر ادنی ظلم نہیں ہوگا جو بھلائی یا برائی ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی کسی نے کی ہو وہ سب میزان عمل میں رکھی جائے گی اور ہم حساب کیلئے کافی ہیں''۔

اور سورۃ قارعہ میں ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ

''جس کا نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ عمدہ عیش میں رہے گا اور جس کا پلہ نیکی کا ہلکا ہوگا اس کا مقام دوزخ ہوگا''۔

حضرت عبداللہ ابن عباس ؓ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا کہ جس مومن کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جنت میں ہوگا اور جس کا پلہ گناہوں کا بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔

وزنِ اعمال کے سلسلے میں مندرجہ ذیل احادیث کو غور سے دیکھ لینا چاہئے۔

بخاری و مسلم میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض موٹے فربہ آدمی آئیں گے جن کا وزن اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا اور اس کی شہادت میں آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ط ''یعنی قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قرار نہ دیں گے (مظہری)۔

اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مناقب میں یہ حدیث آئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان کی ٹانگیں ظاہر میں کتنی پتلی ہیں لیکن قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ قیامت کے میزان عدل میں ان کا وزن احد پہاڑ سے بھی زیادہ ہوگا۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ حدیث جس پر امام بخاری نے اپنی کتاب کو ختم کیا ہے اس میں یہ ہے کہ دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں مگر میزان عمل میں بہت بھاری ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہیں، اور وہ کلمے یہ ہیں:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ سبحان اللہ کہنے سے میزان عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے اور الحمدللہ سے باقی آدھا پورا ہو جاتا ہے۔

ابو داؤد، ترمذی، ابن حبان نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں حسنِ خلق کے برابر کوئی عمل وزنی نہیں ہوگا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں ایسے دو کام بتاتا ہوں جن پر عمل کرنا انسان کیلئے کچھ بھاری نہیں اور میزان عمل میں وہ سب سے زیادہ بھاری ہوں گے ایک حسن خلق دوسرے زیادہ خاموش رہنا یعنی بلاضرورت کلام نہ کرنا۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے کتاب الزہد بروایت حضرت حازم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مرتبہ جبرئیل امین تشریف لائے تو وہاں کوئی شخص خوف خدا تعالیٰ سے رو رہا تھا تو جبرئیل امین نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعمال کا تو وزن ہوگا مگر خدا و آخرت کے خوف سے رونا ایسا عمل ہے جس کو تولا نہ جائے گا بلکہ ایک آنسو بھی جہنم کی بڑی سے بڑی آگ کو بجھا دے گا۔ (مظہری)

ایک حدیث میں ہے کہ میزان حشر میں ایک شخص حاضر ہوگا جب اس کا نامۂ اعمال سامنے آئے گا تو وہ اپنے نیک اعمال کو بہت کم پا کر گھبرا

Marfat.com

گا کہ اچانک ایک چیز بادل کی طرح اٹھ کر آئے گی اور اس کے نیک اعمال کے پلے میں گر جائے گی اور اس کو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرے اس عمل کا ثمرہ ہے جو تو دنیا میں لوگوں کو دین کے احکام ومسائل بتلاتا اور سکھاتا تھا اور یہ تیری تعلیم کا سلسلہ آگے چلا تو جس جس شخص نے اس پر عمل کیا ان سب کے عمل میں تیرا حصہ بھی لگایا گیا۔(مظہری عن ابن المبارک)

طبرانی نے بروایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جائے اس کی میزان عمل میں دو قیراط رکھ دی جائیں گی اور دوسری روایت میں ہے کہ اس قیراط کا وزن احد پہاڑ کے برابر ہوگا۔

طبرانی نے بروایت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی میزان عمل میں سب سے پہلے جو عمل رکھا جائے گا وہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے اور ان کی ضروریات پورا کرنے کا نیک عمل ہے۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن علماء کی روشنائی جس سے انہوں نے علم دین اور احکام دین لکھے ہیں اور شہیدوں کے خون کو تولا جائے گا تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون کے وزن سے بڑھ جائے گا۔

اس طرح کی روایاتِ حدیث قیامت کے وزنِ اعمال کے سلسلہ میں بہت ہیں' یہاں چند کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان سے خاص خاص اعمال کی فضیلت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تمام روایات حدیث سے وزن اعمال کی کیفیت مختلف معلوم ہوتی ہے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے......انسان تولے جائیں گے وہ اپنے اپنے عمل کے اعتبار سے ہلکے بھاری ہوں گے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نامۂ اعمال تولے جائیں گے اور بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ خود اعمال مجسم ہو جائیں گے وہ تولے جائیں گے۔امام تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سب روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ ہوسکتا ہے کہ وزن مختلف صورتوں سے کئی مرتبہ کیا جائے اور ظاہر ہے کہ پوری حقیقت ان معاملات کی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں اور عمل کرنے کیلئے اس حقیقت کا جاننا ضروری بھی نہیں صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے اعمال کا وزن ہوگا' نیک اعمال کا پلہ ہلکا رہا تو عذاب کے مستحق ہوں گے۔یہ دوسری بات ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو خود اپنے فضل وکرم سے یا کسی نبی یا ولی کی شفاعت سے معاف فرما دیں اور عذاب سے نجات ہو جائے۔اس کو اختصار سے یوں سمجھنا چاہئے کہ انسان کا کارنامۂ زندگی دو پہلوؤں میں تقسیم ہوگا' ایک مثبت پہلو اور دوسرا منفی پہلو۔مثبت پہلو میں صرف حق کو جاننا اور ماننا اور حق کی پیروی میں حق ہی کی خاطر کام کرنا شمار ہوگا اور آخرت میں اگر کوئی چیز وزنی اور قیمتی ہوگی تو وہ بس یہی ہوگی۔بخلاف اس کے حق سے غافل ہو کر یا حق سے منحرف ہو کر انسان جو کچھ بھی اپنی خواہشِ نفس یا دوسرے انسانوں اور شیطانوں کی پیروی کرتے ہوئے غیر حق کی راہ میں کرتا ہے وہ سب منفی پہلو میں جگہ پائے گا اور صرف یہی نہیں کہ یہ منفی پہلو بجائے خود بے قدر ہوگا بلکہ یہ آدمی کے مثبت پہلوؤں کی قدر بھی گھٹا دے گا۔

پس آخرت میں انسان کی فلاح و کامرانی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کے کارنامۂ زندگی کا مثبت پہلو اس کے منفی پہلو پر غالب ہو اور نقصانات میں بہت کچھ دے دلا کر بھی اس کے حساب میں کچھ نہ کچھ بچا رہ جائے۔رہا وہ شخص جس کی زندگی کا منفی پہلو اس کے تمام مثبت پہلوؤں کو دبا لے تو اس کا حال بالکل اس دیوالیہ تاجر کا سا ہوگا جس کی ساری پونجی خساروں کا بھگتان بھگتنے اور مطالبات ادا کرنے ہی میں کھپ جائے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ مطالبات اس کے ذمہ باقی رہ جائیں۔

Marfat.com

زیرِ تشریح رکوع کی پہلی آیت میں آنحضرت ﷺ کے فرض منصبی کے حوالے سے آپ کو تسلی بھی دی گئی اور مخالفین کی مخالفت کی حقیقت بھی واشگاف کی گئی اس کے بعد آپ کی دعوت اور آپ پر نازل کردہ کتاب کی اتباع کا براہ راست حکم دیا گیا اور ساتھ ہی نہایت تأسف سے فرمایا کہ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو اور بہت کم یاددہانی حاصل کرتے ہو لیکن تمہیں اس کے انجام کی کچھ خبر نہیں ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کے نتیجے میں اللہ کا عذاب بھی آسکتا ہے اور پھر اس کی تائید میں مختلف قوموں کے حوالے دیئے اور پھر قیامت کی یاددلائی اور تفصیل سے اس دن کی ہولناکی کا ذکر کیا اور اس دن کافروں کے ساتھ جو کچھ گزرنے والی ہے اس کا تذکرہ فرمایا اور یہ بات بھی یاددلائی کہ اس دن تمہارا ایک ایک عمل حتیٰ کہ تمہاری نیتیں بھی حق وعدل کے ترازو میں تلیں گی اور تم اپنی آنکھوں سے اپنا انجام دیکھو گے۔ اب اس رکوع کی آخری آیت میں آخری بات فرمائی جارہی ہے کہ تمہیں ہم جو پیغمبر کی دعوت اور قرآن کے اتباع کا حکم دے رہے ہیں تو اور کچھ نہیں تو اس حوالے سے ہی اس پر غور کرو کہ اللہ کے تم پر کیا کیا احسانات ہیں تو کیا اسکے احسانات کے شکر کے طور پر اسکے دین کا اتباع کرنا اور اس کے کھولے ہوئے صراط مستقیم پر چلنا تمہارے لئے ضروری نہیں چنانچہ اس حوالے سے ارشاد فرمایا گیا:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

''اور ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار بخشا اور تمہارے لئے معاش کی راہیں کھولیں پر تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو''۔ 10

احسانات کے ذکر سے ملامت بھی اور دعوت بھی:

اس آیت کے الفاظ کو دیکھیں تو ان میں چونکہ عمومیت پائی جاتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں خطاب پوری نوع انسانی کو ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ تمام نوع انسانی کی طرف اللہ کے رسول بن کے آئے اور یہ قرآن سب کی طرف اللہ کا پیغام ہے اس لئے تمام انسانوں سے خطاب کر کے فرمایا جارہا ہے کہ دیکھو اس زمین پر اللہ نے تمہیں رہنے کی سہولتیں عطا فرمائیں اور اسی میں تمہاری زندگی کے امکانات رکھے اور تمہارے پھلنے پھولنے کے اسباب پیدا فرمائے۔ زمین کا ایک ایک انچ اس نے تمہارے لئے مسخر کر دیا اور زمین میں مضمر قوتیں تمہاری خدمت میں لگا دیں اس کے مدفون خزانے تمہاری قوت تسخیر کیلئے ہموار کر دیئے گئے۔ اس کی فضائیں اس کی ہوائیں اس کے سمندر، اس میں چمکنے والے سورج اور چاند اور اس پر تنی ہوئی آسمان کی چھت سب تمہاری خدمت میں لگا دی گئی اور پھر اس میں تمہارے لئے روزی کا سامان رکھا گیا' معیشت کی راہیں کھولی گئیں' قسم قسم کے غلے اگائے گئے اور نوع بہ نوع پھل پیدا کیے گئے۔ خوبصورتی کے وہ وہ مناظر رکھے گئے کہ آدمی دیکھ کر دنگ رہ جائے آنے جانے کیلئے راستے کھول دیئے گئے' پانی کو حکم دیا گیا کہ ہماری کشتیوں کو اٹھائے پھرے' ہواؤں نے ہمارے بادبانوں کو سہارا دیا اور ہمارے لئے جوہر عقل کی وہ نعمت عطا کی گئی جس نے ہمیں ایجادات کی دولت مرحمت کی اور ہم اس قابل ہوئے کہ ہواؤں میں اڑنے لگے اور سمندر کی گہرائیوں کی خبر لانے لگے اور پوری زمین ہماری لئے ہاتھ کی لکیروں کی طرح سمٹ کے رہ گئی۔ ان تمام احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد اس کا نتیجہ ہمارے لئے چھوڑ دیا گیا کہ خود سوچو کہ اس کے بعد تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی محسن کے احسانات کا بدلہ احسان شناسی سے ہوتا ہے اور احسان شناسی کا حق اطاعت اور خدمت کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ اللہ کے احسانات کا بدلہ بھی انسان کی طرف سے یہ ہونا چاہئے کہ وہ اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت کرے اور اس کے احکام کو قبول کر کے اس کے عطا کردہ مقاصد کو اپنی زندگی کے مقاصد بنائے اور اس کی طرف سے آنے والے رسول کی زندگی کو اپنے لئے رہنما سمجھے لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کو ادائے شکر نہیں بلکہ کفرانِ نعمت کہا جائے گا۔ انسانوں نے چونکہ بالعموم یہی رویہ اختیار کیا اس لئے نہایت افسوس سے فرمایا گیا کہ تم بہت کم شکر بجالاتے ہو۔ بجائے اللہ کی عبادت واطاعت کے تم نے اس کے شریک بنا رکھے ہیں اور بجائے اس کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے کے تم نے اس کے رسول کی مخالفت میں کمر

Marfat.com

باندھ رکھی ہے۔

اگر سیاقِ کلام کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خطاب قریشِ مکہ سے ہے اور ان پر جو اللہ نے احسانات کئے ان کا تذکرہ فرمایا جارہا ہے اس لحاظ سے اس آیت کی تشریح یہ ہوگی کہ اے قریش ہم نے تمہیں اس سرزمینِ حرم میں اقتدار بخشا اور تمہیں یہاں کے اختیارات کا مالک بنایا کیونکہ تمکین فی الارض کا معنی زمین میں اختیار و اقتدار بخشنا ہے۔ سورۃ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے سے یہی لفظ اختیار کیا گیا اور یہاں چونکہ خطاب قریش سے ہے اس لئے الارض سے مراد سرزمین حرم ہوگا اور معایش سے اشارہ ان معاشی سہولتوں اور برکتوں کی طرف ہے جو ایک وادی غیر ذی زرع میں حضرت ابراہیم کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے اہل عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً حاصل ہوئیں ہم جانتے ہیں کہ مکے کے سرزمین میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ وہاں تو کھجور کے درخت بھی دیکھنے کو نہیں ملتے۔ خشک پہاڑ اور پتھریلی زمین کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی اولاد کو یہاں ٹھہرایا اور اللہ کا گھر تعمیر کیا تو اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ میری اولاد کے دل میں اپنے گھر کی محبت پیدا فرما اور ان کو پھلوں کا رزق عطا فرما۔ چنانچہ اللہ نے ان کی دعا ایسی قبول فرمائی کہ حرم کی سرزمین مرجع خلائق بن گئی اور دنیا بھر کی نعمتیں اس سرزمین میں کھنچ کے آنے لگیں۔ اس سے چند میل کے فاصلے پر ایسی وادیاں بسائی گئیں جس میں ضرورت کی ہر چیز اگنے لگی اور قسم قسم کے پھل مکے کے بازاروں میں دستیاب ہونے لگے۔ آنحضرت کی بعثت کے وقت بھی مکے میں ہر طرح کی نعمتیں میسر تھیں اور آج بھی وہاں جانے والا ہر شخص اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا ہے کہ وہاں بظاہر کوئی چیز اگتی نظر نہیں آتی لیکن دنیا کی ہر نعمت اس کے بازاروں میں دکھائی دیتی ہے اور پھر اللہ نے مزید احسان قریش پر یہ فرمایا کہ حضور کی بعثت سے پہلے پورا عرب نفرتوں کا جہنم بن چکا تھا۔ کسی کی نہ جان سلامت تھی نہ مال، راہ چلتے قافلے لوٹ لئے جاتے تھے، ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کیلئے درندوں سے کم نہ تھا۔ لیکن قریش کو اللہ کے گھر کے متولی ہونے کے باعث احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا یہ اپنا تجارتی قافلہ لے کر جب دوسرے ملکوں کی طرف جاتے تھے تو راستے میں پڑنے والے عرب قبیلے نہ صرف کہ ان پر حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی حفاظت کرنا اور ان کو سہولتیں بہم پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے اس طرح قریش کو تجارت میں وہ آسانی پیدا ہوئی کہ جس کا اس زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور اللہ کے اس گھر کی وجہ سے سرزمین حرم امن کا گہوارہ بن گئی۔ کوئی شخص حرم کی حدود میں اور خاص طور پر بیت اللہ کے پاس اپنے باپ کے قاتل پر بھی ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ پورا عرب جو نفرتوں کی آگ میں جل رہا تھا اس میں مکے کی سرزمین ایک جنت کا نمونہ تھی۔ جس میں قریش کو اللہ نے اقتدار اور اختیار بخش رکھا تھا اور انہیں حصولِ رزق کی آسانیاں بہم پہنچا رکھی تھیں چنانچہ ان پر اپنے احسانات کا ذکر فرما کر انہیں یاد دلایا جارہا ہے کہ تمہیں چاہئے تو یہ تھا کہ اللہ کے ان احسانات کا تم شکر ادا کرتے اور تم اللہ کی بندگی کرتے ہوئے شیطانی قوتوں کے راستے پر چلنے سے انکار کردیتے لیکن افسوس یہ ہے کہ تم نے اللہ کی اطاعت کی بجائے شیطان کی اطاعت کی اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کی بجائے تم نے رسول کی مخالفت پر کمر باندھ لی حالانکہ شیطان پہلے دن سے تمہارا دشمن چلا آرہا ہے لیکن تم عجیب بے وقوف ہو کہ اپنے دشمن کو پہچاننے کی بجائے اس کی اطاعت کررہے ہو چنانچہ اگلی آیات میں انسان اور ابلیس کے تعلق کی تاریخ کو دھرایا جارہا ہے تاکہ بالعموم نوعِ انسانی اور بالخصوص قریش اپنے رویے کی غلطی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ارشاد فرمایا جاتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا

Marfat.com

يٰلِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ
السّٰجِدِيْنَ ﴿١١﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ
مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿١٢﴾ قَالَ فَاهْبِطْ
مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ
الصّٰغِرِيْنَ ﴿١٣﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿١٤﴾ قَالَ اِنَّكَ
مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿١٥﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ
الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ
وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿١٧﴾
قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ
جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٨﴾ وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ
فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا
مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا
وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ
الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَ
قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا
ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا

Marfat.com

الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٢﴾ قَالَا
رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ
فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿٢٥﴾

اور ہم نے تمہارا خاکہ بنایا پھر تمہاری صورت گری کی پھر فرشتوں کو فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ فرمایا کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا' بولا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا پھر تو یہاں سے اتر تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں گھمنڈ کرے تو نکل یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے۔ بولا اس دن تک کیلئے تو مجھے مہلت دے دے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا تو مہلت دے دیا گیا۔ بولا چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان کیلئے گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر میں ان کے آگے' ان کے پیچھے' ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے ان پر حملہ کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہ پائے گا۔ فرمایا تو یہاں سے نکل' خوار اور راندہ' ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ اور اے آدم! تم اور تمہاری بیوی رہو جنت میں اور کھاؤ پیو جہاں سے چاہو بس اس درخت کے پاس نہ پھٹکیو کہ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں میں سے بن جاؤ۔ پس شیطان نے ان کے اندر وسوسہ اندازی کی کہ عریاں کر دے ان کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھی اس نے ان سے کہا تمہارے خداوند نے تو تمہیں اس درخت سے صرف اس وجہ سے روکا کہ تم کہیں فرشتے یا ہمیشہ زندہ رہنے والے نہ بن جاؤ اور ان سے قسمیں کھائیں کہ میں تمہارے خیرخواہوں میں ہوں اس طرح اس نے فریب سے ان کو شیشے میں اتار لیا پس جب انہوں نے درخت کا پھل چکھ لیا تو ان کی شرم کی جگہیں ان کے سامنے بے پردہ ہوگئیں اور وہ اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانپنے لگے اور ان کے رب نے ان کو آواز دی کہ کیا میں نے تمہیں اس درخت سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا

Marfat.com

ہوا دشمن ہے۔ وہ دونوں بولے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اب اگر آپ نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم یقیناً نامرادوں میں سے ہو جائیں گے۔ فرمایا: اتر جاؤ! تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لئے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زیست ہے اور فرمایا وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخر نکالا جائے گا۔

..........☆.....☆.....☆..........

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ O

''اور ہم نے تمہارا خاکہ بنایا پھر تمہاری صورت گری کی پھر فرشتوں کو فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا''۔ 11

تخلیقِ انسان کا اسلامی نقطہ نگاہ اور اس کی وضاحت:

سب سے پہلے آیت کے بعض الفاظ پر غور فرمائیے۔ سب سے پہلے فرمایا خَلَقْنٰکُمْ اور پھر فرمایا صَوَّرْنٰکُمْ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جب خَلَق کا لفظ اکیلا استعمال ہوتا ہے تو یہ اپنے لوازم سمیت استعمال ہوتا ہے یعنی اس میں تخلیق کے تمام مدارج شامل ہوتے ہیں لیکن جب اس کے متعلقات میں سے کوئی متعلق اس کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تو پھر اس کا معنی ہوتا ہے خاکہ بنانا۔ تو یہاں اس کے ساتھ چونکہ صَوَّرْنٰکُمْ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا اور تمہارا مادۂ آفرینش تیار کیا پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی۔ پھر جب یہ ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے انسان وجود میں آ گیا تو اسے سجدہ کرنے کیلئے فرشتوں کو حکم دیا۔ تخلیق انسانی کے اس آغاز کو اس کی تفصیلی کیفیت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ ہم اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتے کہ مواد ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا' پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کیسے ہوئی اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیت کیا تھی۔ لیکن بہر حال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت' ان نظریات کے خلاف بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانہ میں ڈارون کے متبعین سائنس کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ان نظریات کی رو سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبۂ انسانیت تک پہنچا ہے اور اس تدریجی ارتقاء کے طویل خط میں کوئی نقطہ خاص ایسا نہیں ہو سکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر ''نوع انسانی'' کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف اس کے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت ہی سے ہوا ہے اس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں رکھتی وہ اول روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا اور خدا نے کامل انسانی شعور کے ساتھ پوری روشنی میں اس کی ارضی زندگی کی ابتدا کی تھی۔

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نقطۂ نظر ہیں اور ان سے انسانیت کے دو بالکل مختلف تصور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور کو اختیار کیجئے آپ کو انسان اصلِ حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا۔ اس کی زندگی کے جملہ قوانین' حتیٰ کہ اخلاقی قوانین کیلئے بھی آپ بنیادی اصول ان قوانین میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے۔ اس کیلئے حیوانات کا سا طرز عمل آپ کو بالکل ایک فطری طرز عمل معلوم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرز عمل اور حیوانی طرز عمل میں آپ دیکھنا چاہیں گے وہ بس اتنا ہی ہوگا کہ حیوانات جو کچھ آلات اور صنائع اور تمدنی آرائشوں اور تہذیبی نقش و نگ

Marfat.com

کے بغیر کرتے ہیں انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرے۔اس کے برعکس دوسرا تصور اختیار کرتے ہی آپ نسان کو جانور کی بجائے ''انسان'' ہونے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔آپ کی نگاہ میں وہ ''حیوانِ ناطق'' یا ''متمدن جانور'' نہیں ہوگا بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہوگا۔آپ کے نزدیک وہ چیز جو اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے اس کا نطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہوگی بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہوگی جسے اللہ نے اس کے سپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر پہلے زاویہ نظر سے یک سر مختلف ہو جائے گی۔آپ انسان کیلئے ایک دوسرا ہی فلسفۂ حیات اور ایک دوسرے ہی نظامِ اخلاق و تمدن و قانون طلب کرنے لگیں گے اور اس فلسفے اور اس نظام کے اصول و مبادی تلاش کرنے کیلئے آپ کی نگاہ خود بخود عالم اسفل کے بجائے عالم بالا کی طرف اٹھنے لگے گی۔

اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یہ دوسرا تصورِ انسان چاہے اخلاقی اور نفسیاتی حیثیت سے کتنا ہی بلند ہو مگر محض اس تخیل کی خاطر ایک ایسے نظریہ کو کس طرح رد کر دیا جائے جو سائنٹفک دلائل سے ثابت ہے لیکن جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع ڈارونی نظریۂ ارتقاء سائنٹفک دلائل سے ثابت ہو چکا ہے' سائنس سے محض سرسری واقفیت رکھنے والے لوگ تو بے شک اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہ نظریہ ایک ثابت شدہ علمی حقیقت بن چکا ہے لیکن محققین اس بات کو جانتے ہیں کہ الفاظ اور ہڈیوں کے لمبے چوڑے سروسامان کے باوجود ابھی تک یہ صرف ایک نظریہ ہی ہے اور اس کے جن دلائل کو غلطی سے دلائلِ ثبوت کہا جاتا ہے وہ دراصل محض دلائلِ امکان ہیں یعنی ان کی بنا پر زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ڈارونی ارتقاء کا ویسا ہی امکان ہے جیسا براہ راست عملِ تخلیق سے ایک ایک نوع کے الگ الگ وجود میں آنے کا امکان ہے۔

سجدہ کے حکم کی توضیحات:

مزید اس آیت میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں حضرت آدم کو خطاب نہیں بلکہ مجموعی طور پر پوری نوع انسانی کو ہے تو اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ آدم ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوع انسانی کا نمائندہ فرد ہونے کی حیثیت سے تھا تو آدم علیہ السلام کے حوالے سے جو شرف یا جو ذمہ داری یہاں مفہوم ہو رہی ہے اس میں پوری نوع انسانی برابر کی شریک ہے۔تیسری بات جو اس میں ذکر کی گئی ہے وہ آدم کو سجدہ کرنے کی ہے تو یہاں جو سجدہ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اس کو اصطلاحی سجدہ کے معنی میں لیا جائے جس طرح ہم نماز میں سجدہ کرتے ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس سجدہ میں حضرت آدم صرف جہت کا کام دے رہے تھے۔مقصود انہیں سجدہ کرنا نہ تھا بلکہ ان کی طرف سجدہ ان کو نہیں بلکہ اللہ کو کیا جا رہا تھا کیونکہ ان کو سجدہ کرنے کا حکم اللہ نے دیا تھا اس لئے ان کی طرف منہ کر کے سجدہ کرنا درحقیقت اللہ کو سجدہ کرنا تھا جس طرح آج ہم بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں تو وہ سجدہ بیت اللہ کو نہیں بلکہ اللہ کو ہوتا ہے اگر کوئی آدمی اللہ کی بجائے صرف بیت اللہ کو سجدہ کرنے کی نیت کرے تو یقین جانیئے کہ نہ صرف کہ اس کی نماز نہیں ہوگی بلکہ ایسا سجدہ بت پرستی کہلائے گا۔یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جب حج ادا کیا تو حجرِ اسود کو بوسہ دینے سے پہلے اس کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا کہ اے حجرِ اسود تو صرف ایک پتھر ہے تو نہ مجھے نفع دے سکتا ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اگر تجھے رسول اللہ ﷺ نے نہ چوما ہوتا اور ہمیں چومنے کا حکم نہ دیا ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چومتا۔دین چونکہ اتباعِ رسول کا نام ہے اس لئے ہم ہر اس کام کے کرنے کے پابند ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہو اس لئے کوئی ذات یا کوئی چیز کتنی بھی محترم ہو ہم اس کے ساتھ وہی تعلق استوار کریں گے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سجدہ یہاں اصطلاحی معنوں میں مراد نہ لیا جائے بلکہ لغوی معنوں میں مراد لیا جائے۔لغت میں سجدے کا معنی صرف جھکنا ہے یعنی کسی کے احترام میں سر جھکا دینا یا رکوع کی حالت اختیار کر لینا اس کیفیت کو سجدہ تحیت کہا جاتا تھا اور پہلی شریعتوں میں اس کی

Marfat.com

اجازت تھی۔ ہماری شریعت میں چونکہ ہر کام کی تکمیل کر دی گئی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے سوا ہر ایک کیلئے ہاتھ باندھ کے قیام کرنا یا رکوع کرنا بھی حرام ٹھہرا دیا۔ چنانچہ فرشتوں کو یہی سجدہ تعظیمی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم کیوں دیا گیا اور اس کا مقصد کیا ہے۔ غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کیلئے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا گیا چونکہ اس علاقے میں اللہ کے حکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا تھا اس لئے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے ان اختیارات کو جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مشیت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں تو تمہارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرۂ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے' نیکی کرنا چاہے یا بدی کے ارتکاب کیلئے جائے' دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمہیں اس کیلئے سازگاری کرنی ہوگی۔ مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھیے کہ ایک فرماں روا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اس علاقے میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں اور جب تک فرمانروا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے' اس وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہیں' قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام ہیں۔ البتہ! جب جس کام کے بارے میں بھی فرماں روا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انہیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقے کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے۔ حتیٰ کہ جس وقت فرمانروا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی معزولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو وہی ماتحت و خدام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے' ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر انہیں کشاں کشاں دار الفاسقین کی طرف لے جاتے ہیں۔ فرشتوں کو آدم کیلئے سربسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

سرگزشتِ آدم و ابلیس پر مکرر نظر:

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ایک نظر حضرت آدم اور ابلیس کی سرگزشت پر ڈال لینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے لیکن اس نے اس حکم کی تعمیل کی بجائے جو رویہ اختیار کیا اس میں سرسری نگاہ سے بھی جو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ ہمارے لئے راہنمائی کا اپنے اندر بہت بڑا ذخیرہ رکھتی ہیں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا لیکن کسی بھی حکم کی تعمیل سے انکار کبھی تو اس لئے ہوتا ہے کہ جسے حکم دیا جا رہا ہے وہ حکم کو سمجھ نہیں سکا اور یا اس لئے ہوتا ہے کہ اس پر ہوائے نفس کا غلبہ ہوا اور وہ اس غلبے سے مغلوب ہو کر تعمیل حکم میں کوتاہی کر گیا لیکن اس دونوں صورتوں میں وہ حکم دینے والے سے نہ کٹتا ہے اور نہ بغاوت کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ اپنی اس بدعملی یا نافرمانی میں کتنا بھی دور نکل جائے اس کی واپسی کا امکان ہر وقت رہتا ہے لیکن ابلیس نے حکم کی تعمیل سے پورے شعور کے ساتھ انکار کیا اور پھر بھی اپنے اس انکار پر ندامت تو دور کی بات ہے غور کرنے کیلئے بھی تیار نہیں ہوا بلکہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو حق بجانب قرار دیتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا یہ انکار اسے بغاوت تک لے گیا۔ اس کے مقابلے میں تعمیلِ حکم میں کوتاہی تو حضرت آدم اور حضرت حوا سے بھی ہوئی لیکن ان کی اس کوتاہی میں انکار کو دخل نہ تھا وہ کبھی اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے اللہ کا حکم ماننے سے انکار بھی ہو سکتا ہے ان سے جو کچھ بھی سرزد ہوا وہ ان کے ارادے سے نہیں ہوا بلکہ ابلیس نے حکم کے فہم میں خلط مبحث سے کام لیا اور

کو اس بات میں الجھا دیا کہ تمہیں جس بات کا حکم دیا گیا ہے اس کا مقصود تم نہیں سمجھ سکے اس طرح جب ان کے سامنے اصل حکم کا مفہوم غیر واضح کر دیا گیا تو ان کیلئے تعمیلِ حکم میں ابہام پیدا ہو گیا اور مزید یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ شیطان نے بار بار انہیں اپنی ہمدردی اور خیر خواہی کا یقین دلایا لیکن جب وہ اس پر اعتماد کرنے کیلئے تیار نہ ہوئے تو اس نے اللہ کے نام کی قسم کھا کر انہیں یقین دلایا اور وہ اس طرح سے اس کی باتوں میں آ گئے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تعمیلِ حکم سے شیطان کے بہکاوے نے روکا ورنہ ان کے اندر تعمیل حکم کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا اس لئے سب سے پہلے اس سرگزشت سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ابلیس اللہ کے حکم کا انکار کرتا ہے۔ حضرت آدم اور حضرت حوا اللہ کے حکم سے انکار نہیں کرتے بلکہ وہ ایک ابہام کا شکار ہو کر اور ایک بہکاوے میں مبتلا ہو کر تعمیلِ حکم سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

دوسری بات جو ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شیطان سے جب پروردگار نے یہ فرمایا کہ تم نے میرے حکم کی تعمیل سے انکار کیوں کیا؟ تمہیں میرے حکم کو نہ ماننے کی جرأت کیسے ہوئی؟ تو اس نے ایک لمحے کیلئے بھی عذر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اسے اپنے رویے پر کوئی ندامت ہوئی بلکہ اس نے اپنے رویے پر اصرار کرتے ہوئے یہ کہا کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔ آگ کی فطرت میں بلندی اور رفعت ہے اور مٹی کی فطرت میں پستی ہے تو میں بلندی اور رفعت کا نمائندہ ہو کر پستی کی نمائندہ مخلوق کے سامنے کیسے جھک سکتا تھا اس لئے اگر میں نے آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کیا ہے تو مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا لیکن جب حضرت آدم سے پروردگار نے یہ فرمایا کہ اے آدم اور حوا کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے تو پھر تم نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے میرے حکم سے سرتابی کیوں کی تو حضرت آدم اور حوا نے ایک لمحے کیلئے بھی اپنے اس عمل کی کوئی تاویل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جیسے ہی انہیں تنبہ ہوا وہ سرتاپا عجز کی تصویر بن کر اللہ کے سامنے جھک گئے اور مسلسل اللہ کے سامنے اپنی اس غلطی کی معافی مانگتے ہوئے روتے اور گڑگڑاتے رہے۔ سورۃ البقرہ میں یہ بھی بتایا گیا کہ حضرت آدم کو چونکہ پہلی دفعہ ایسی صورت حال سے واسطہ پیش آیا تھا اس لئے وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ اگر کبھی غلطی ہو جائے تو اس کے بعد کیا کرنا چاہئے چنانچہ جب ان سے اس غلطی کا صدور ہوا تو انہیں یہ ہرگز معلوم نہ تھا کہ اب ہم اپنے پروردگار سے اس غلطی کی معافی کیسے مانگیں۔ ان کے ذہن میں وہ الفاظ نہیں آتے تھے جو پروردگار کی شان کے لائق ہوں اور ان کے ذریعہ وہ اپنے رب کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں چنانچہ ان کی عاجزی اور گریہ وزاری نے اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان کو وہ الفاظ سکھائے جن الفاظ کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

تیسری بات جو یہاں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ابلیس نے صرف اپنی برتری ہی کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اس نے اپنی گمراہی کا الزام بھی اپنے پروردگار کو دیا اور صاف کہا کہ پروردگار آپ نے مجھے اس گمراہی میں ڈالا کیونکہ آپ نے مجھے ایک ایسے امتحان میں ڈالا جس میں سرخرو ہونا میرے بس کی بات نہ تھی اب جبکہ میں اس بارگاہ سے نکالا جا چکا ہوں اور اس کا سبب آدم بنے ہیں تو اب میں زندگی بھر انہیں اور ان کی اولاد کو گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ آدم کو جو مجھ پر فضیلت دی گئی ہے وہ ہرگز اس کے حقدار نہ تھے لیکن اس کے برعکس ہم حضرت آدم کو دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی ان کے رب نے انہیں ان کی غلطی پر ٹوکا تو وہ بجائے اپنی غلطی کا الزام اپنے رب کو دینے کے فوراً اللہ کے سامنے جھک گئے اور بار بار اس بات کا اعتراف کیا کہ مجھ سے اور حوا سے یہ غلطی ہوئی ہے اس کے ذمے دار بھی ہم خود ہیں۔ چنانچہ انہی باتوں کی طرف پیش نظر آیت کریمہ میں اشارات فرمائے گئے۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ O

”وہ دونوں بولے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اب اگر آپ نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم

Marfat.com

یقیناً نامرادوں میں سے ہو جائیں گے''۔ 23

یعنی جیسے ہی انہیں تنبہ ہوا اور پروردگار نے انہیں ان کی غلطی پر ٹوکتے ہوئے پکارا تو بے ساختہ ان پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو گناہ کے شدید احساس کے بعد طاری ہوتی ہے اور فوراً انہوں نے اپنے رب کے دروازے پر دستک دی اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے انہوں نے سب سے پہلے نجانے کتنی گریہ وزاری کے بعد اپنے رب سے وہ کلمات سیکھے جن سے وہ اپنے رب کو پکار سکیں اور پھر انہوں نے اپنے رب کو پکارتے ہوئے کہا کہ اے ہمارے رب! ہم کوئی عذر پیش نہیں کرتے کہ ہم سے یہ گناہ کیوں سرزد ہوا ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے یہ حرکت کر کے آپ کی شان میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ اپنے نفسوں کو تباہ کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے۔ کیونکہ ہماری جانیں آپ کی عطیہ ہیں، ہمارا جسم آپ کی دین ہے، ہمارے احساسات آپ کی عطا کردہ نعمت ہیں، ہماری قوتیں سراسر آپ کی بخشش ہیں، ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ سب آپ کا ہے اس لحاظ سے ان سب کا آپ کے سامنے جھکنا آپ کا حق ہے ہم نے اس حق کو کسی دوسرے کے حوالے کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اب ہم اپنے اس گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے آپ ہی سے دست بستہ پوری عاجزی کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ آپ ہمارے اس گناہ کو معاف فرما دیں ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔

جس نے دیا ہے درد وہی چارہ گر بھی ہے
کہنی ہے چارہ گر سے ہی خود چارہ گر کی بات

ہمارے اس درد کی چارہ گری صرف آپ کے ہاتھ میں ہے اس لئے ہم آپ ہی کے دروازے پر دستک دیتے ہیں اور آپ ہی کے آستانے پر سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس آستانے کے سوا ہمارا کوئی آستانہ نہیں اور اس خزانے کے سوا کوئی اور خزانہ نہیں جہاں سے یہ قیمتی سوغات ملتی ہو اس لئے آپ ہم پر رحم فرمائیں اور ہمارے گناہ کو معاف فرما دیں کیونکہ ہماری معافی کا تعلق سراسر آپ کے رحم و کرم سے ہے۔ گناہ گار کا گناہ صرف رحم و کرم کے پانی ہی سے دھل سکتا ہے اس کے علاوہ دنیا کے سمندر بھی اس گندگی کو ختم نہیں کر سکتے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ اللہ کے گھر کا طواف کر رہے تھے کہ انہوں نے عالم غیب سے ایک آواز سنی کہ کسی شخص کا نام لے کر کہا جا رہا ہے کہ ہمارے گھر سے نکل جاؤ تمہارا یہاں آنا ہمیں منظور نہیں۔ شیخ نے اس نام کے آدمی کو تلاش کرنا شروع کیا حتیٰ کہ وہ انہیں مل گئے پوچھا کہ یہ آواز جو میں سن رہا ہوں آپ کو بھی سنائی دیتی ہے یا نہیں؟ کہنے لگے میں بھی سنتا ہوں پوچھا پھر آپ یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے انہوں نے نہایت تعجب سے شیخ کی طرف دیکھا اور کہا بھلے آدمی آپ ہی مجھے بتائیں میں کہاں جاؤں؟ کیا اس دروازے کے علاوہ کوئی اور دروازہ ہے جہاں جا کر دستک دوں یا اس آستانے کے علاوہ کوئی اور آستانہ ہے جہاں جا کر سر جھکاؤں جب اس چوکھٹ کے سوا کوئی اور چوکھٹ نہیں تو میں تو جب تک معافی نہیں مل جاتی یہیں جبہ سائی کرتا رہوں گا اور یہیں اپنا سر پٹختا رہوں گا۔ اس لئے حضرت آدم اور حضرت حوا بھی یہ فرما رہے ہیں کہ تیرے سوا اور آستانہ کوئی نہیں کہ جہاں ہم جا کر معافی کے طلبگار ہوں اس لئے تو نے اگر ہمیں معاف نہ فرمایا تو پھر ہماری نامرادی اور تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جائے گی اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ گناہ ابلیس سے بھی ہوا لیکن اس نے بجائے عجز و اعتراف کے انکار و بغاوت کا راستہ اختیار کیا اور ہمیشہ کیلئے راندۂ درگاہ ہو گیا اور گناہ حضرت آدم اور حضرت حوا سے بھی ہوا لیکن وہ فوراً اللہ کی بارگاہ میں جھک گئے جس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ گناہ فرشتوں اور اللہ کے پیغمبروں کے سوا ہر مخلوق سے ہو سکتا ہے کیونکہ

چلے بچ کر کوئی کتنا وہ ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

کوئی چال لڑکھڑاہٹ سے پاک نہیں ہوتی، کوئی عمل معصیت کی جراحتوں سے محفوظ نہیں ہوتا، کوئی خیال آوارہ خیالی سے بچا ہوا نہیں ہوتا

یہاں قدم قدم پر محرکات شر اور آلودگیوں کے بھنور موجود ہیں جن سے ہر وقت محفوظ رہنا اولاد آدم کیلئے آسان نہیں کسی بھی وقت گناہ کا ظہور ہو جانا بالکل ممکن ہے اس لئے حضرت آدم کا رویہ ہمیں یہ راستہ دکھاتا ہے کہ تم گناہوں سے معصوم پیدا نہیں کئے گئے ہو تمہارا کام یہ ہے کہ کبھی اپنے اندر انکار کی جرأت نہ پیدا ہونے دینا یہ ابلیس کا رویہ ہے تم سے اگر غلطی ہو جائے اور کبھی معصیت کے راستے پر پڑ جاؤ تو متنبہ ہو جانے کے بعد فوراً توبہ کا راستہ اختیار کرنا یہی ابلیس اور آدم کے رویے میں فرق ہے اور اللہ کریم کا یہ وعدہ ہے کہ کسی کے گناہ اگر زمین و آسمان کے درمیانی حصے کو بھر بھی دیں لیکن وہ جب بھی اخلاص اور عاجزی کے ساتھ ہم سے معافی مانگے گا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا یقین دلا دے گا تو ہم اسے معاف کر دیں گے بلکہ اس کا کرم اس حد تک بے پایاں ہے کہ وہ صرف گناہوں کو معاف ہی نہیں کرتا' بلکہ گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو آدمی توبہ کرتا ہے اور پھر نیک عمل کا راستہ اختیار کر لیتا ہے:

﴿فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ ''تو اللہ ان لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں سے تبدیل کر دیتا ہے''﴾ (الفرقان:۷۰)

بلکہ بعض دفعہ تو یہ رحمت ایسے جھوم کر برستی ہے کہ گناہ صرف نیکی ہی میں تبدیل نہیں ہوتا بلکہ معافی اور توبہ کی صورت میں ڈھیروں نیکیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک صحابی کا واقعہ ہے کہ ایک دن نیند نہ کھلنے کے باعث ان کی تہجد چھوٹ گئی جب آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو چکی تھی۔ فجر کی نماز پڑھی لیکن دل غم سے نڈھال ہو رہا تھا اور بار بار آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے کہ ہائے مجھ سے تہجد کیوں چھوٹ گئی۔ پورا دن اللہ سے معافی مانگتے گزرا کہ میں یہ غفلت کی نیند کیوں سویا جس کی وجہ سے میری تہجد رہ گئی چنانچہ دوسرے روز رات کو سوتے ہوئے جب تہجد کا وقت ہوا تو دیکھا کہ انہیں کوئی جگا رہا ہے انہیں حیرت ہوئی کہ میری خواب گاہ میں کون آ گیا پوچھا کہ تم کون ہو؟ وہ بولا میں شیطان ہوں۔ پوچھا: تم کیوں آئے ہو؟ کہا میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں تہجد کیلئے اٹھا دوں۔ انہوں نے حیران ہو کر کہا کہ شیطان تو لوگوں کو تہجد کے وقت سلاتا ہے تاکہ وہ تہجد نہ پڑھ سکیں تم کیسے شیطان ہو جو مجھے تہجد کیلئے اٹھا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ کل تمہاری تہجد چھوٹ گئی اور تم نے دن بھر رو رو کر برسوں کی تہجدیں اپنے نام لکھوا لیں۔ میں آج اس لئے آیا ہوں کہ اٹھو تہجد پڑھو اور ایک ہی تہجد کا ثواب پاؤ۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آج پھر اگر تمہاری تہجد چھوٹ جائے تو تم برسوں کی تہجدیں پھر اپنے نام لکھوا لو۔ اس سے معلوم ہوا کہ تہجد پڑھنے سے تو ایک تہجد کا ثواب ملتا ہے لیکن معافی اور توبہ کی صورت میں نجانے کتنی تہجدوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ جس اللہ کی کرم نوازیوں کا یہ عالم ہے اسے پکارنے والا کیسے محروم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم اور حضرت حوا نے جب اپنی اس غلطی پر پروردگار کو مغفرت و توبہ کیلئے پکارا اور پھر بار بار عاجزی سے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ یا اللہ تیرے سوا کوئی دروازہ نہیں جہاں ہم جائیں' تیرے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کھایا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ سورۃ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے پھر ان کی توبہ قبول فرمالی اور گناہ کا یہ داغ جو ان کے دامن پر لگ گیا تھا اسے دھو ڈالا اور قیامت تک کیلئے ان کے اس حسن عمل کے طفیل یہ اصول ٹھہرا:

﴿ التائب من الذنب کمن لا ذنب له ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ نہیں کیا''۔﴾

اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا جب دنیا میں تشریف لائے ہیں تو وہ اللہ سے گناہ کی مغفرت کی سند لے کر آئے ہیں یعنی ان کا دامن ان چھینٹوں سے بالکل پاک ہو چکا تھا وہ زمین پر اس لئے نہیں بھیجے گئے تھے کہ وہ گناہ گار ہونے کے بعد جنت میں رہ نہیں سکتے تھے بلکہ ان کا زمین پر بھیجا جانا گناہوں کی معافی کے بعد تھا اور وہ اس لئے تھا کہ انہیں ان کی پیدائش سے بھی پہلے زمین پر اللہ اپنا خلیفہ بنا چکا تھا۔ پہلے پارے میں اللہ نے اس واقعے کو بیان کرنے سے پہلے فرمایا ہے کہ ہم نے فرشتوں کو یہ بات بتائی تھی کہ ہم زمین پر آدم کو اپنا خلیفہ بنا رہے ہیں اس کا

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم کی پیدائش سے پہلے اور جنت میں انہیں بھیجنے سے پہلے اور اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ حضرت آدم زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ ہوں گے اور وہ زمین پر اللہ کی طرف سے اللہ کے احکام کی تنفیذ کریں گے تو اس حقیقت کے باوجود یہ سمجھنا کہ حضرت آدم اور حضرت حوا اپنے گناہ کی سزا کے طور پر دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ یہ سراسر قرآن مجید اور پہلی آسمانی کتابوں کی صراحتوں کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہ بات کہنا کہ وہ جب زمین پر آئے تو وہ گناہ گار تھے یہ بھی حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کریم واضح طور پر یہ بات بیان کر چکا ہے کہ ان کے زمین پر آنے سے پہلے اللہ ان کی توبہ قبول فرما چکا تھا اس کے باوجود عیسائیوں کا اس مغالطے میں مبتلا ہونا کہ انسان بھی شیطان کی طرح اس دنیا میں لعنتی ہو کر اترا ہے' ایک بہت بڑی گمراہی ہے جس میں آج تک عیسائی دنیا مبتلا ہے اور پھر اس غلط عقیدے کو اختیار کرنے کے نتیجے میں عیسائیوں نے جس طرح گمراہیوں کے ردے پر ردے چڑھائے ہیں اور جس طرح کج رویوں کا راستہ اختیار کیا ہے وہ بجائے خود ایک داستان ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ حضرت آدم اور حضرت حوا ایک گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے گناہ گار ہو گئے تھے اور وہ اسی حالت میں دنیا میں اتارے گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنی ان کی اولاد پیدا ہوئی وہ ان کے گناہ کی وجہ سے گناہ گار ٹھہری۔ ذرا اس عقیدے کی غیر معقولیت پر توجہ فرمائیے کہ فرض کریں حضرت آدم و حوا اگر گناہ گار بھی ہیں تو اس کے نتیجے میں ان کی اولاد کیسے گناہ گار ٹھہرے گی کیا باپ کا گناہ اور اس کی غلطیاں اولاد کو گناہ گار بنا دیتی ہیں؟ کیا عیسائی دنیا کے قانون میں واقعی ایسا ہے کہ اگر باپ جرم کرے تو اس کی پاداش میں اس کی اولاد کو پکڑ لو؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے قانون میں اس حقیقت کو قبول کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں اور اسلام تو صاف صاف اس کی تردید کرتا ہے اور پھر اس پر بھی مزید جہالت یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہر انسان پیدائشی طور پر گناہگار ہے تو اب اس کے گناہوں سے نجات حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا غیر انسانی بیٹا دنیا میں آ کر انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بنے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (جو عیسائیوں کے بقول اللہ کا بیٹا ہیں) دنیا میں بھیجا گیا اور وہ صلیب پر چڑھ کر انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بنے اور اس طرح انسان اپنے گناہوں سے پاک ہو سکا۔ لیکن قرآن یہاں صاف بتا رہا ہے کہ حضرت آدم و حوا نے اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگی اور توبہ کی تو اللہ نے یہ توبہ قبول فرمائی اور اس کے بعد انہیں دنیا میں اترنے کا حکم دیا چنانچہ ارشاد فرمایا:

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ○

”فرمایا: اتر جاؤ! تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لئے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامان زیست ہے اور فرمایا وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخر نکالا جائے گا“۔ 24-25

حضرت آدم و ابلیس کو دو متحارب فریقوں کے طور پر زمین پر بھیجا:

زمین پر حضرت آدم اور حضرت حوا کو بھیجتے ہوئے بعض بنیادی حقیقتوں کا شعور بھی بخشا۔ سب سے پہلی یہ حقیقت ان پر منکشف فرمائی گئی کہ ہم تمہیں زمین پر محض انتقال مکانی کیلئے نہیں بھیج رہے بلکہ تمہارے بھیجنے کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو ہم زمین کے دارالامتحان میں بھیج کر یہ امتحان کرنا چاہتے ہیں کہ تمہیں جس آزمائش میں ڈالا جا رہا ہے اس میں تم پورا اترتے ہو یا نہیں وہ آزمائش یہ ہے کہ صرف تمہیں ہی نہیں بھیجا جا رہا بلکہ تمہارے ساتھ ابلیس کو بھی بھیجا جا رہا ہے۔ زمین پر تمہارا جانا درحقیقت ایک معرکہ کارزار میں اترنا ہے۔ ایک طرف تم اور تمہاری اولاد

Marfat.com

ہوگی اور دوسری طرف ابلیس اور اس کا لاؤ لشکر ہوگا۔ ابلیس نے جس طرح حضرت آدم اور حضرت حوا کو بہکانے کی کوشش کی اور اپنی حد تک تو اس نے انہیں بہکا ہی دیا لیکن اللہ نے اپنی رحمت سے انہیں تھاما اور وہ اپنی عاجزی اور استغفار سے اللہ کی اس راہ ہدایت کو پانے میں کامیاب ہوگئے اور اپنی اولاد کیلئے بھی انہوں نے اس راستے کا دروازہ کھول دیا کہ اگر تم سے کبھی غلطی ہو جائے تو بجائے شیطان کی روش اختیار کرنے کے تمہاری روش یہ ہونی چاہئے کہ تم فوراً اللہ سے مغفرت طلب کرو اور اپنے گناہوں سے توبہ کرو اس طرح اللہ تمہیں اپنی رحمت سے نوازے گا۔ چنانچہ یہاں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ ابلیس نے جس طرح جنت میں تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کی اسی طرح اب وہ دنیا میں بھی پہلے سے بڑھ کر اپنی کاروائیاں جاری رکھے گا' تمہاری کامیابی کا راستہ صرف اس احساس کو متحضر رکھنے میں ہے کہ شیطان تمہارا بدترین دشمن ہے اور تم زمین پر اس کی دشمنی کا ہدف ہو اگر تم اس کی دشمنی کو یاد رکھو گے تو یقیناً اس کے مقابلے کیلئے کوشش بھی کرو گے لیکن اگر تم اپنے دشمن ہی کو بھول گئے اور بجائے اس کو دشمن سمجھنے اور اس کی وارداتوں سے بچنے کی کوشش کرنے کے تم نے اگر اس سے سازگاری پیدا کر لی اور اس کی ہدایت پر چلنے لگے تو پھر تم اپنی دنیا بھی برباد کر لو گے اور آخرت میں بھی ناکامی تمہارا مقدر بن جائے گی۔ یہاں یہ جو فرمایا جا رہا ہے کہ تم زمین پر اتر جاؤ اور وہاں تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اس کا یہی مطلب ہے کہ شیطانی قوتیں اولاد آدم کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں گی اور یہی اس کی اصل دشمنی ہے۔ دوسری حقیقت جو یہاں واشگاف فرمائی گئی وہ یہ ہے کہ زمین ہمیشہ کیلئے تمہارا وطن نہیں وہ تمہاری عارضی رہائشگاہ ہے۔ وہاں تمہیں صرف ایک آزمائش اور امتحان کیلئے بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں تمہیں جو سر و سامان دیا جائے گا وہ بھی ایک خاص وقت تک کیلئے ہے یعنی تم زمین میں ایک مختصر عمر کیلئے جا رہے ہو۔ تم میں سے ہر ایک کی ایک مختصر اور متعین عمر ہو گی اور پوری نوع انسانی کا قیام زمین میں ہمیشہ کیلئے نہیں بلکہ ایک مختصر مدت کیلئے ہو گا۔ اس کے بعد ہم تمہیں واپس بلا لیں گے اور یہاں تمہاری زمین پر گزری ہوئی عمر کے بارے میں جواب طلبی کریں گے اور یہ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اس عارضی اور فانی وطن ہی کو اپنا حقیقی وطن سمجھ کر جس طرح اللہ کو اور اپنی حقیقی منزل جنت کو بھلایا بتاؤ تمہارے پاس اس کا کیا جواز تھا۔ چنانچہ جو لوگ زمین کی نعمتوں ہی کو اپنا سب کچھ جان کر آخرت کو نظر انداز کر چکے ہوں گے وہ آخرت میں بہت برے نتائج کا سامنا کریں گے اور جنہوں نے اپنی حقیقی منزل یعنی جنت کو یاد رکھا ہو گا اور اسی نعمت گم گشتہ کو پانے کیلئے دنیا میں کوششیں کی ہوں گی وہ بالآخر اس جنت میں پہنچ جائیں گے جہاں سے ان کے جدامجد کو نکالا گیا تھا کیونکہ اصل وطن تو ان کا وہی ہے۔ زمین میں تو ایک مختصر مدت کیلئے اور ایک خاص مقصد کیلئے انہیں بھیجا جا رہا ہے۔ اس کے بعد دوسری آیت کریمہ میں اسی بات کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ اب تم اسی زمین پر زندہ رہو گے یعنی زندگی گزارو گے اور اسی زمین میں تمہیں بالآخر موت آئے گی یعنی یہ زندگی تمہاری فانی ہوگی جس کا پہلا انجام موت ہوگا لیکن یہ مت سمجھنا کہ اس موت کے بعد تمہاری دوسری کوئی زندگی نہیں اور یہ موت تمہارے ہمیشہ کیلئے فنا ہو جانے کا نام ہے۔ ایسا نہیں ہو گا بلکہ اس کے بعد تمہیں زندہ کیا جائے گا اور اسی زمین جس میں تمہیں دفن کیا جائے گا اسی سے تمہیں نکالا جائے گا یہ اصلاً اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اولاد آدم میں ایسی گمراہ قومیں بھی ہوں گی جو یہ سمجھتی ہوں گی کہ زمین کا قیام ہی سب کچھ ہے اور یہیں کی زندگی اصل زندگی ہے' یہیں کی خوشیاں اور یہیں کے دکھ ابدی ہیں جس نے یہاں جو کچھ پا لیا وہی اس کا اصل مقدر ہے۔ یہاں موت کا شکار ہونے کے بعد ہمیشہ کیلئے فنا ہے اس کے بعد کسی دوسری زندگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ جس کو زمین کے سپرد کر دیا جاتا ہے اسے زمین کھا جاتی ہے اور زمین پر آج تک نجانے کتنی نسلیں گزر چکیں۔ اس لئے جن کو زمین کھا گئی اور وہ مٹی کی خوراک بن گئے اب انہیں کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں دفن ہوئے ہیں اور اسی مٹی سے دوبارہ زندہ کر کے کیسے اٹھائے جا سکتے ہیں۔ ان کی غلط فہمی دور کرنے کیلئے فرمایا جا رہا ہے کہ جو ذات تمہیں یہاں زندگی کے اسباب فراہم کر رہی ہے اور جو ذات تمہیں یہاں موت دے گی اس کیلئے کوئی مشکل نہیں کہ دوبارہ اسی زمین اور اسی مٹی سے تمہیں اٹھا کھڑا کرے تو یہاں اسی

Marfat.com

حقیقت کو آدم اور اولادِ آدم کے گوش گزار کیا جا رہا ہے کہ زمین پر جاؤ تو یہ سمجھ کر جاؤ کہ تم ایک دارالامتحان میں جا رہے ہو۔ وہاں تمہیں ایک خاص معرکہ درپیش ہے' ایک خطرناک دشمن تمہاری تاک میں ہے۔ وہ اس زمین ہی کے قیام کو تمہارے لئے مقصدِ زندگی بنانے کی کوشش کرے گا اور زمین کی نعمتوں کو تمہارا مقصودِ نگاہ بنا دے گا۔ دیکھنا اس کے فریب میں نہ آنا' اپنی موت کو ہمیشہ یاد رکھنا اور موت کے وقت سے چونکہ کوئی آشنا نہیں اس لئے ہمیشہ اس ناگہانی مہمان کے استقبال کیلئے اپنے آپ کو تیار رکھنا اور اس تصور کے ساتھ زندگی گزارنا کہ موت تمہاری منزل نہیں بلکہ تمہیں اصل منزل کی طرف لے جانے کا ایک راستہ ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ جب تمہیں اسی مٹی کی آغوش سے نکالا جائے گا۔ زمین چاہے تمہیں بالکل نگل جائے لیکن اللہ کے علم میں تمہارے وجود' تمہارے احساسات اور تمہارے عمل کی ایک ایک چیز محفوظ ہے۔ وہ اس روز تم سے ایک ایک عمل کا حساب لے گا۔ چنانچہ یہ مختصر بنیادی حقائق جو زندگی کے سفر کی تمہید بن سکتے تھے انہیں ذہن نشین کر کے حضرت آدم اور حضرت حوا کو دنیا میں اتارا گیا تاکہ وہ اپنی اور اپنی اولاد کیلئے انہیں رہنما اصول بنا کر زندگی گزاریں اور اسی کی آسان تعبیر وہ ہے جو ہمیں پہلے پارے میں اسی حوالے سے ملتی ہے کہ ہم نے حضرت آدم اور حضرت حوا سے کہا کہ تم زمین پر چلے جاؤ لیکن یہ یاد رکھو کہ وہاں میری جانب سے تمہارے پاس ہدایت یعنی زندگی گزارنے کا طریقہ پہنچے گا تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا اس کیلئے نہ کوئی خوف ہوگا نہ کوئی حزن' لیکن جو لوگ میری اس ہدایت کے ساتھ کفر اور تکذیب کا رویہ اختیار کریں گے یہی لوگ ہیں جو اصحاب نار ہوں گے اور ہمیشہ اس عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

چنانچہ اس کے بعد آنے والی آیت کریمہ میں خطاب بھی اسی حوالے سے ہے اور جو ہدایت عطا فرمائی جا رہی ہے اس میں بھی اس حوالے کی دہائی ہے اور یہ بھی فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے حضرت آدم کو جو ابتدائی ہدایات دے کر بھیجی تھیں یہ انہی میں سے ایک ہے اور اب ہم اس لئے اس کا تذکرہ کر رہے ہیں تاکہ لوگ اس سے یاد دہانی حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ
لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿26﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ
الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا
لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ
اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿27﴾ وَاِذَا فَعَلُوْا
فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿28﴾

Marfat.com

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ قف وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ
وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ﴿۲۹﴾
فَرِیْقًا هَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا
الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾
یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا
وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۳۱﴾ ع

''اے اولاد آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا' جو ڈھانپتا ہے تمہاری شرم کی جگہوں کو اور زینت بھی۔ مزید برآں تقویٰ کا لباس ہے' جو سب سے بہتر ہے۔ یہ اللہ کی آیات میں سے ہے' تا کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ اے آدم کی اولاد! شیطان تمہیں فتنہ میں نہ ڈالنے پائے' جیسا کہ اس نے نکال دیا تھا تمہارے ماں باپ کو بہشت سے اتروائے ان سے ان کے کپڑے' تا کہ دکھلا دے انہیں ان کی شرم گاہیں۔ وہ اور ان کا جتھہ تم کو وہاں سے تاڑتا ہے' جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے' جو ایمان نہیں لاتے۔ اور جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو! اللہ بے حیائی کا کبھی حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو' جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں؟ کہہ دیجئے (اے پیغمبر) میرے رب نے تو راستی اور انصاف کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر عبادت میں اپنا رخ اسی کی طرف کرو اور اسی کو پکارو' اسی کیلئے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے' جس طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا ہے' اسی طرح تم پھر پیدا کئے جاؤ گے۔ ایک گروہ کو اس نے ہدایت عطا فرمائی اور ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو چکی انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا رفیق بنایا اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اے اولاد آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

.................☆......☆......☆.................

یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِیْشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰی ۙ ذٰلِكَ خَیْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ

Marfat.com

اٰیٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ یَذَّکَّرُوْنَ O

''اے اولاد آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا' جو ڈھانپتا ہے تمہاری شرم کی جگہوں کو اور زینت بھی۔ مزید برآں تقویٰ کا لباس ہے' جو سب سے بہتر ہے۔ یہ اللہ کی آیات میں سے ہے' تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں''۔26

بنی آدم اپنے باپ سے ابلیس کی دشمنی کو مت بھولنا:

اس آیت کریمہ میں ایک ایک لفظ ہمیں غور اور تدبر کی دعوت دیتا ہے سب سے پہلے اس میں یہ دیکھئے کہ خطاب بنی آدم کو ہو رہا ہے کسی خاص انسانی گروہ کو نہیں اور پھر انسان کہہ کر نہیں بلکہ بنی آدم کہہ کر خطاب کیا جا رہا ہے اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اے انسانو! تم آدم کی اولاد ہو آدم تمہارے جد امجد ہیں۔ کوئی بھی صالح اولاد اپنے باپ، اس کے حالات کو، اسے پیش آنے والے واقعات کو کبھی نہیں بھولتی۔ وہ جب بھی اپنے باپ کا تذکرہ کرتی ہے تو جہاں باپ کے دوستوں کا تذکرہ کرتی ہے وہاں وہ اس کے دشمنوں کو بھی ضرور یاد رکھتی ہے کیونکہ جس طرح باپ کے دوستوں کا یاد کرنا ان کے حقِ دوستی کو ادا کرنا ہے اسی طرح باپ کے دشمنوں کو یاد رکھنا باپ کی غیرت کا ورثہ ہے اور عرب میں تو اس بات کو خاص اہمیت حاصل تھی وہ نسلوں تک بھی اپنی خاندانی دشمنی کو کبھی فراموش نہیں ہونے دیتے تھے چنانچہ اسی پس منظر میں مشرکینِ عرب کو بنی آدم کہہ کر خطاب کیا جا رہا ہے اور انہیں احساس دلایا جا رہا ہے کہ تم اپنے جد امجد کے حوالے سے اور اپنے قومی تفاخر کے حوالے سے اس بات کو یاد رکھنے کے پابند ہو کہ تمہارے جد امجد کا دشمن کون ہے اور وہ کون ذات ہے جس نے تمہارے جد امجد کو جنت میں بھی چین سے رہنے نہیں دیا اور وہاں بھی اسے بہکانے کی خطرناک کوشش کر ڈالی جس کے نتیجے میں اگر اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو وہ تمہارے جد امجد کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا اس لئے تم پر لازم ہے کہ ایسے خطرناک دشمن کو جس نے اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کی نہ صرف قسم کھا رکھی ہے بلکہ اس نے چیلنج بھی دے رکھا ہے کبھی بھولنے کی حماقت نہ کرنا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنا کہ اس نے تمہارے جد امجد پر جو سب سے پہلا حملہ کیا وہ وہ تھا جس نے انہیں حلۂ جنت سے محروم کر دیا اور وہ برہنگی کا شکار ہوئے اس لئے تم پر بھی جب وہ حملہ کرے گا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ سب سے پہلے تمہارے جنسی احساسات کو بگاڑ کر تمہیں بے لباس کر دے اور اس طرح تمہارے کپڑے اتارے کہ تم اخلاقی صفات سے بالکل محروم ہو جاؤ۔ چنانچہ اس خطاب میں ان تمام احساسات کو بیدار کرنے کے بعد پھر فرمایا جا رہا ہے کہ چونکہ اس شیطان نے سب سے پہلے تمہارے والدین کو بے لباس کر کے اپنی گمراہی کا آغاز کیا تھا تمہارے ساتھ بھی اندیشہ ہے کہ وہ ایسا ہی نہ کرے اس لئے ہم سب سے پہلے تمہیں بتاتے ہیں کہ اللہ نے تم پر ایک لباس نازل کیا ہے یعنی تمہاری فطرت پر اس کا الہام کیا ہے کہ جس طرح تمہارے رب نے تمہارے والدین کو حلۂ جنت کی صورت میں ایک لباس عطا کیا تھا جو ان کی انسانیت اور ان کی شخصیت کا نمائندہ تھا اس طرح ہم تمہیں بھی ایک لباس دے رہے ہیں اگر تم اس میں ملبوس رہو گے اور پوری طرح اس کا حق ادا کرو گے تو انسانیت کے برہنہ ہونے سے بچ جاؤ گے۔ چنانچہ یہاں جو اَنْـزَلْـنَا کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ اسی فطری الہام کی طرف اشارہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو صفات یا جو احکام انسانی زندگی کیلئے اساسی حیثیت رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ انسانوں کو پیدا کرتے ہی ان کی فطرت پر ان کا الہام کر دیتا ہے اور پھر وحی الٰہی ان کو متشکل اور مسجع کرنے میں مدد دیتی ہے یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں جو لباس کے تفصیلی احکام دیئے گئے ہیں یہ تو نزول شریعت کے بعد کی بات ہے لیکن تمہاری شخصیت کی تعمیر کیلئے چونکہ لباس کو ایک اساسی حیثیت حاصل ہے اس لئے ہم نے پہلے ہی دن تمہاری فطرت پر اس کا الہام کر دیا تھا اس کے بعد اس لباس کی جو ضروری صفات ہیں ان کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

لباس کی پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ لباس کو ساتر ہونا چاہئے یعنی لباس ایسا ہو جو تمہاری شرم کی جگہوں کو ڈھانپ دے اور اگر وہ لباس

Marfat.com

ستر پوشی کا کام نہیں دیتا اس کے علاوہ چاہے وہ کتنے ہی افادیت کے پہلو رکھتا ہو وہ ہرگز لباس کہلانے کا مستحق نہیں۔

لباس سے مقصود ستر پوشی بھی ہے اور زینت بھی:

لباس کی دوسری صفت یہ ہونی چاہئے کہ وہ ریش کا کام دے۔ ریش کا لفظ چڑیوں کے پروں کیلئے بھی آتا ہے اور اس سے زیب و زینت کا لباس بھی مراد ہوتا ہے یعنی لباس ایسا ہونا چاہئے جو موسم کی شدت سے بھی حفاظت کرے اور انسانی شخصیت' انسانی وقار میں اضافے کا باعث بھی بنے۔ قرآن کریم نے لباس کو زینت قرار دے کر شاید اس جوگیانہ تصور کی نفی کی ہے جو لباس کو ایک آلائش اور عریانی یا نیم عریانی کو مذہبی تقدس کا درجہ دیتا ہے ان کے نزدیک لباس انسان کی وقت کے ساتھ ساتھ پیدا کی جانے والی ضرورتوں میں سے ہے جیسے جیسے انسانی تہذیب آگے بڑھی ہے ویسے ویسے نئی نئی چیزیں وجود میں آئی ہیں اور انہی میں سے ایک لباس بھی ہے ورنہ انسان اپنی فطری سادگی میں جب تک زندگی گزارتا رہا ہے یا تو وہ لباس سے بالکل آزاد تھا اور یا زیادہ سے زیادہ وہ لنگوٹی باندھتا تھا اس سے زیادہ اسے کسی اور لباس کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہاں قرآن کریم پہلے انسان کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے اس تصور کا ابطال کر رہا ہے کہ پہلے انسان کی فطرت پر لباس کا الہام کیا گیا اور اس حد تک شرم و حیا اس کی طبیعت میں راسخ کر دیا گیا کہ جیسے ہی شیطان نے اس کو بے لباس کیا تو وہ سراسیمہ ہو کر رہ گیا اور شرم کے مارے اس نے اپنے آپ کو پتوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی اور مزید یہ فرمایا جا رہا ہے کہ لباس کو جہاں ہم نے ستر پوش بنایا ہے وہاں انسانی شخصیت کو تشکیل دینے والا بھی بنایا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ لباس کو اگرچہ موسم کی شدت سے بچنے اور شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ بنایا گیا ہے لیکن اس کی جو پہلی شناخت ہے وہ اس کا ستر پوش ہونا ہے اگر ایک لباس موسم کی شدت سے بچانے اور زینت آرائی میں بھی اپنی مثال آپ ہے بلکہ وہ سرتا پا زینت ہی زینت ہے لیکن وہ ستر پوشی میں ناکام رہتا ہے تو قرآن کریم کی نگاہ میں وہ لباس کہلانے کا مستحق نہیں یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو لباس پہن کر بھی ننگی ہوتی ہیں یعنی یا ان کا لباس بہت تنگ ہوتا ہے اور یا بہت باریک ہوتا ہے۔

اصل مقصود لباسِ تقویٰ ہے' کی وضاحت:

تیسری بات لباس کے سلسلے میں جو فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اسے لباسِ تقویٰ ہونا چاہئے اور یہ لباس پہلے دونوں لباسوں کی نسبت اللہ کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ایک تو لباس وہ ہے جو انسانی جسم پر نظر آتا ہے جو ستر پوش بھی ہے اور باعث زینت بھی لیکن ایک لباس وہ ہے جو انسان کی اندر کی شخصیت کو پہنایا جاتا ہے۔ یہ وہ لباس ہے جسے خشیت الٰہی' شرم و حیا اور احساس عبدیت کا نام دیا جاتا ہے یہی وہ لباس ہے جو خوف خدا سے وجود میں آتا ہے۔ اگر انسان کی اندرونی شخصیت بے لباس ہے اور یہ لباس تقویٰ اس کے نصیب میں نہیں ہوا تو باہر کی شخصیت کو آپ چاہے کتنا بھی ملبوس کر دیجئے حقیقت میں وہ ننگا ہی رہے گا اور اگر اس کے اندر لباس تقویٰ موجود ہے اور اس کی باہر کی شخصیت اگر چیتھڑوں میں بھی ملبوس ہو تو وہ برہنگی سے پاک انسانی وقار کا ایسا نمونہ ہو گی جس پر انسانیت رشک کرے گی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لباس تقویٰ یعنی اندر کے شرم و حیا کا جذبہ ہی ہے جو باہر کے لباس کی ضرورت پیدا کرتا ہے۔ جب اندر سے آدمی بے لباس ہو جاتا ہے تو پھر باہر کے لباس کو وہ اپنی شخصیت کیلئے ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ برہنگی اسے عزیز ہو جاتی ہے وہ فیشن کے نام سے اور کبھی تہذیب کے نام سے بے لباس ہونے کو اپنا مقصد زندگی بنا لیتا ہے۔ جیسے جیسے اس کا لباس اترتا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو مہذب سمجھتا ہے اور لباس اس کی نگاہ میں دقیانوسی رویہ بن کے رہ جاتا ہے۔

Marfat.com

لباس تقویٰ سے چونکہ باہر کا لباس خاص شکل اختیار کرتا ہے اور انسانی احساسات بھی خاص قالب میں ڈھلنے لگتے ہیں اس لئے شریعت نے اس کو علی الاطلاق نہیں چھوڑا بلکہ اس نے اس حوالے سے بھی راہنمائی عطا فرمائی ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ لباس تقویٰ وہ ہے جو پوری طرح ساتر ہو زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو۔ یعنی ایسا بھی نہ ہو کہ لوگ اس کی طرف انگلیاں اٹھائیں کہ دیکھو اس شخص نے کس قدر قیمتی اور کیسا بھڑکیلا لباس پہن رکھا ہے اور ایسا بھی نہ ہو کہ اللہ نے جو اس کو مالی حیثیت دے رکھی ہے اس سے بہت فروتر ہو کہ دیکھنے والا اسے نادار اور قلاش سمجھ کر اس کی مدد کرنے کیلئے تیار ہو جائے۔ اسی طرح اس کے لباس میں فخر وغرور اور تکبر وریا کا کوئی شائبہ نہ ہو اور ان ذہنی امراض کی نمائندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں اور عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگتی ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۔ اٰيٰتِ اللّٰه کا ترجمہ دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک اللہ کی نشانیاں اور دوسرا اللہ کی آیات۔ پہلے ترجمے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسانی لباس کی ضرورت کو انسانی شخصیت کی تعمیر کیلئے لازمی ٹھہرایا اور پھر جس طرح اس کی شخصیت پر اس کا الہام کیا اور پھر صرف ظاہری لباس تک بات کو محدود نہیں رکھا بلکہ انسان کی اندرونی شخصیت اور بیرونی شخصیت کو ہم آہنگ کرنے کی بھی ہدایت فرمائی بلکہ احساس کی دولت اس کے اندر ودیعت فرما کر باہر کی شخصیت کیلئے معاون بنا دیا۔ اس حقیت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ لباس بھی اللہ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں اس پر آدمی جیسے جیسے غور کرتا ہے اسے اس بات کا یقین پیدا ہوتا جاتا ہے کہ انسانی لباس کو ستر پوش اور زینت قرار دینا اور پھر لباس تقویٰ کی شکل میں اسے اصل ہدف بنا دینا اور انسانی فطرت پر اس کے الہام کی صورت میں اسے ایک محرک کی شکل دے دینا یہ اللہ کی نشانی کے سوا یا اس کی ذات کی طرف راہنمائی دینے والی چیز کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

دوسرے ترجمے کی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ یہ جو لباس کا الہام اور اس کی تفصیل وحی الٰہی کی شکل میں انسانوں کو عطا فرمائی گئی ہے یہ اللہ کی ان ہدایات میں سے ہے جو اس نے حضرت آدم کو دنیا میں بھیجتے ہوئے عطا فرمائی تھیں جس کا ذکر سورۃ البقرہ میں بھی کیا گیا ہے اور یہاں بھی آیت نمبر ۳۵ میں اس کا ذکر آرہا ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

"اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمہی میں سے رسول آئیں، تمہیں میری آیات سناتے ہوئے تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کی، ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ان کو غم لاحق ہوگا"

اور آخر میں فرمایا کہ جس طرح آدم وحوا کو ہم نے ہدایات دے کر بھیجا تھا اب تمہیں بھی انہی ہدایات میں سے کچھ باتوں کی یاددہانی کرائی جارہی ہے تاکہ تم شیطان کے نرغے میں آنے سے بچ جاؤ کیونکہ شیطان تم پر بھی ویسے ہی حملے کرے گا اور وہی داؤ چلائے گا جو اس نے تمہارے جدِ امجد پر چلائے تھے۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی بات کو کھول کر تنبیہ اور وارننگ کے انداز میں بیان کیا جارہا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"اے آدم کی اولاد! شیطان تمہیں فتنہ میں نہ ڈالنے پائے، جیسا کہ اس نے نکال دیا تھا تمہارے ماں باپ کو بہشت سے، اتروائے

Marfat.com

ان سے ان کے کپڑے' تا کہ دکھلا دے انہیں ان کی شرم گاہیں۔ وہ اور ان کا جتھہ تم کو وہاں سے تاڑتا ہے' جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے' جو ایمان نہیں لاتے''۔27

شیطان کا اصل ہدف لباسِ تقویٰ ہے:

اس آیت کریمہ میں خطاب پھر بنی آدم سے فرمایا جا رہا ہے یعنی ان کے ان احساسات کو آواز دی جا رہی ہے جو ایک صالح اور باحمیت اولاد اپنے باپ کے دشمن کے بارے میں رکھتی ہے انہی احساسات کے حوالے سے تنبیہ کے انداز میں فرمایا جا رہا ہے کہ دیکھو شیطان اور اس کی قوتیں تمہیں کسی نہ کسی فتنے میں مبتلا کرنے کی کوشش کریں گی اور ان کے فتنہ میں مبتلا کرنے کا سب سے پہلا ہدف وہی ہو گا جس کے حوالے سے حملہ انہوں نے تمہارے جد امجد پر کیا اور پھر جس طرح اس کے کپڑے اتروا دیئے ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی ایسا ہی حملہ کیا جائے اور تم بھی بے لباس کر دیئے جاؤ۔ سابقہ آیت میں لباس کے بارے میں پوری تفصیل بیان کر دی گئی ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جو لباس اللہ کے یہاں مطلوب ہے وہ لباس تقویٰ ہے اور یہی وہ لباس ہے جو ظاہری لباس کی ضرورت کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے باقی بھی رکھتا ہے۔ دیکھنا کہیں ابلیس تمہیں لباس تقویٰ سے محروم نہ کر دے اور تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ابلیس اور اس کی ہمنوا طاقتوں کے وسائل بے پناہ ہیں وہ تم پر ایسی جگہوں اور ایسے طریقوں سے حملہ آور ہو سکتے ہیں جس کا ادراک کرنا بھی تمہارے لئے مشکل ہو گا۔ وہ شکاری کی طرح گھات میں بیٹھ کر برابر تمہیں تاڑتے رہتے ہیں لیکن تم انہیں دیکھنے میں ناکام رہتے ہو۔ تم بظاہر یہ سمجھتے رہتے ہو کہ وہ تمہارے خیر خواہ ہیں اور تمہیں تعلیم دے رہے ہیں حقیقت میں وہ تمہاری برین واشنگ کر رہے ہوتے ہیں تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں تہذیب سکھائی جا رہی ہے حالانکہ وہ تمہیں لباس تقویٰ اور حمیت کے جذبات سے محروم کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ ترقیاتی کام کر رہے ہیں اور اس کیلئے انہیں اشتہار اور پبلسٹی کیلئے صنف نازک کی ضرورت پڑتی ہے لیکن وہ تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے کہ کس طرح وہ طریقے طریقے سے لڑکے اور لڑکیوں کے مل بیٹھنے کے مواقع پیدا کرتے ہیں' کس طرح انہیں الگ الگ تقسیم کر کے خلوتوں کا سامان کیا جاتا ہے اور کس طرح رفتہ رفتہ غیرت اور حمیت کو آگ لگا دی جاتی ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے جب عورت صرف عورت رہ جاتی ہے بلکہ عورت کی سطح سے گر کر وہ ایک اشتہار بن جاتی ہے یا مجلسوں کی رونق کا سامان اور اس سے وہ تقدس چھین لیا جاتا ہے جو ماں' بہن اور بیٹی کی شکل میں اسے حاصل تھا۔ یہ سب کچھ شیطان کا قبیلہ اس چابکدستی اور ذہانت سے کرتا ہے کہ جن کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جاتا ہے ان کی عقلیں ماؤف ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ اپنی نہایت روشن تاریخ کو بھول جاتے ہیں انہیں شرم و حیا کی بجائے عریانی تہذیب کے طور پر دکھائی دینے لگ جاتی ہے اور ساتر لباس انہیں وحشت اور دقیانوسیت محسوس ہونے لگتا ہے اس طرح رفتہ رفتہ پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہو جاتا ہے لیکن اولادِ آدم کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ ہمارے ساتھ شیطانی قوتیں کیا کھیل کھیل رہی ہیں۔ یہاں اسی بات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے اور صاف بتایا جا رہا ہے کہ تم جب تک کھلی آنکھوں سے اور زندہ احساس کے ساتھ شیطانی قوتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرو گے اس وقت تک وہ تمہارے ساتھ یہ کھیل کھیلتی رہیں گی اور تمہیں اس کا احساس تک نہیں ہو گا۔ اس آیت کے آخر میں شیطانی قوتوں کے حملوں سے بچنے کیلئے طریقہ سکھایا جا رہا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تم شیطانی قوتوں کا مقابلہ کر سکو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنے ایمان کا جائزہ لو شیطانی قوتوں سے مقابلہ کرنے کیلئے یہی ایک اسلحہ اور تدبیر ہے جو شیطانی قوتوں کو مغلوب کر سکتی ہے وہ اپنی ہزار کوششیں کریں اور چاہے کیسے ہی کمندیں پھینکیں اگر ایک مومن کے دل میں ایمان زندہ ہے یعنی وہ ان ہدایات پر ایمان رکھتا ہے جن کا ذکر ابھی ہو چکا تو پھر شیطانی قوتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ شیطان اس وقت حملہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جب دل ایمان کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جس طرح خالی گھر میں جنات بسیرا کر لیتے ہیں اسی طرح وہ دل جو خدا کی

Marfat.com

یاد سے غافل ہو اور جس دل میں اللہ کی اطاعت کا جذبہ کمزور پڑ جائے اور اسے یاد ہی نہ رہے کہ اللہ نے مجھے شرم وحیا اور غیرت وحمیت کی پاسداری کا حکم بھی دیا تھا اور اس کی فطرت اس حد تک مردہ ہو جائے کہ لباس تقویٰ کا جو الہام اس کی فطرت پر کیا گیا تھا وہ اس کے ادراک سے بھی محروم ہو جائے تو وہ اللہ کے قانون کی زد میں آ جاتا ہے۔ اللہ نے کئی جگہ یہ بات فرمائی ہے اور پیچھے اس کا ذکر بھی ہو چکا کہ جو شخص بھی اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے اعراض کا رویہ اختیار کرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور پھر وہی اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور ہر جگہ اسے کھینچے پھرتا ہے اب جو آدمی شیطان کے قبضے میں آ جاتا ہے اور اس سے اپنے آپ کو چھڑانے کی قوت اس کے اندر نہیں رہتی تو وہ شیطانی حملوں سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ بلکہ اس کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ شیطان کا ایجنٹ بن جاتا ہے اور اس لئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ شیطانوں کو ہم ایسے لوگوں کا سرپرست بنا دیتے ہیں جو اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان اور یقین نہیں رکھتے۔ اگلی آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان کی قوت سے محروم ہوتے ہیں جب شیطان ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ نہ صرف شیطان کے حملوں کو روکنے میں ناکام رہتے ہیں بلکہ وہ شیطان کے فتنے کے اس حد تک اسیر ہو جاتے ہیں کہ وہ اسی کی زبان بولنے لگتے ہیں اور اس کا ہر فتنہ ان کی زندگی کا عنوان اور ان کے دل کی آواز بن جاتا ہے۔ اسی کی تصویر کشی کرتے ہوئے بعض اشارے فرمائے گئے ہیں:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

"اور جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو! اللہ بے حیائی کا کبھی حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں؟" 28

شیطان کی چال:

اولاد آدم کے ذکر کے ضمن میں یہاں قریش اور عربوں کا حال بطور خاص بیان کیا جا رہا ہے کہ ذرا اندازہ کیجئے کہ کس طرح شیطان نے ان لوگوں کو فتنے کی نذر کیا اور بہکایا ہے اور کس طرح ان کو چکمہ دے کر اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ جس طرح حضرت آدم وحوا کو اس نے جنت میں بہکا کر ان کے کپڑے اتروا دیئے اور جنت میں ان کو بے لباس کر دیا تھا اس نے انہیں بہکا کر اور گمراہ کر کے حرم میں بے لباس کر دیا ہے اور حال یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ اس گمراہی کو سمجھیں الٹا اس پر دلیل بازی سے کام لے رہے ہیں اور ان کی جسارت کی انتہا یہ ہے کہ اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے۔ مفسرین نے اس کی صراحت کی ہے کہ مشرکین عرب کا حال یہ تھا کہ وہ جب کعبہ کے طواف کیلئے آتے تو یہ خیال کرتے کہ ہمارے کپڑے چونکہ آلائش دنیا اور زینت دنیا میں داخل ہیں اس لئے انہیں پہن کر ہم اللہ کے گھر کا طواف نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ کا گھر تو ایک پاکیزہ جگہ ہے اور طواف ایک عبادت ہے اگر ہم دنیا کے لباس میں طواف کریں گے تو عبادت کی حرمت پامال ہو جائے گی۔ قریش نے اس گمراہی سے اگرچہ اپنے آپ کو بچا رکھا تھا لیکن باقی پورا عرب اس گمراہی میں مبتلا تھا اور قریش ان کی اس گمراہی کے پیدا کرنے اور انہیں اس گمراہی پر باقی رکھنے میں مدد ومعاون بنے ہوئے تھے یعنی ان کو یہ بات سمجھاتے تھے کہ تمہارا لباس چونکہ آلائش دنیا سے آلودہ ہے اس لئے اب تمہارے طواف کی ایک ہی صورت ہے کہ تم کسی قریشی سے اس کا لباس مستعار لے لو اور اگر تم اس کا انتظام نہیں کر سکتے (اور ظاہر ہے کہ اس کا انتظام ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ قریش کس کس کو

Marfat.com

لباس دیتے) تو پھر مجبوری ہے کہ تم مادرزاد ننگے ہو کر اللہ کے گھر کا طواف کرو اور یہ بات صرف مردوں تک محدود نہیں تھی عورتیں بھی اس گمراہی کا شکار تھیں وہ بھی بالکل برہنہ ہو کر طواف کرتی تھیں۔ ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ یہ بات بظاہر قرین عقل معلوم نہیں ہوتی کہ قوم کے بیشتر افراد اتنی بڑی گمراہی کا شکار ہو جائیں لیکن اس بات کی کیا تاویل ممکن ہے کہ یہ ہمارا زمانہ جسے روشنی اور ترقی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ کیا اس میں آج بھی مندروں اور کلیساؤں میں عیاشی اور نفس پروری کا سامان میسر نہیں؟ اور کیا وہاں کے پروہت اور پجاری اس طرح کی شیطنت کے محافظ بن کے نہیں بیٹھے ہوئے؟ اور انہوں نے اس قسم کی گمراہیوں کو کیا مذہبی تقدس کا درجہ نہیں دیا؟ اگر آج یہ ساری خباثتیں موجود ہیں تو چودہ سو سال پہلے اس کے وجود کو ہم خلاف عقل کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عرب کے لوگ اس گمراہی میں مبتلا تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ طواف جیسی مقدس عبادت فساق وفجار کی نظربازیوں اور شرارتوں کی جولاں گاہ بن کے رہ گئی تھی اور حرم کی نظربازیوں کی لذیذ و رنگین داستانیں ان کی فاسقانہ شاعری میں اس طرح نمایاں ہوئیں کہ آج بھی آدمی انہیں پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ شیطان نے حرم میں گھسنے کیلئے کیسا مقدس مذہبی لبادہ اختیار کیا اور کس کامیابی کے ساتھ اس نے اللہ کی سب سے بڑی عبادت کو اپنی عبادت میں تبدیل کر دیا۔

آباؤ اجداد کے طرزِ عمل سے استدلال:

عجیب بات یہ ہے کہ جب مشرکینِ عرب سے یہ کہا جاتا تھا کہ تم کس قدر پستی میں اتر گئے ہو کہ اللہ کے گھر میں تم نے کپڑے تک اتار دیئے ہیں تو وہ جواب میں دو باتیں کہتے تھے۔ ایک تو یہ بات کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ اس بے سروپا دلیل پر اتنی بڑی گمراہی کی بنیاد رکھنا کس قدر تعجب خیز ہے لیکن انہیں اپنی اس دلیل پر اصرار تھا حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ یہ جس طرح اپنے اعمال کی دلیل اپنے آباؤ اجداد کے عمل کو بنا رہے ہیں اسی طرح آنے والی نسل موجودہ لوگوں کو اپنے اعمال کی دلیل بنائے گی اور اسی طرح یہ سلسلہ پہلے بھی چلتا آیا ہے اور آئندہ بھی چلتا جائے گا حالانکہ یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ غلطیاں ہر دور میں ہوئی ہیں جس طرح آج کے لوگ غلطیاں کر رہے ہیں اسی طرح ان کے آباؤ اجداد نے بھی کی ہیں اور کل کو آنے والی نسلیں بھی وہ غلطیاں کریں گی اس لئے ایک نسل کی غلطی یا گمراہی دوسری نسل کیلئے جواز نہیں بن سکتی۔ ہاں کوئی چیز اگر جواز بن سکتی ہے تو ضروری ہے کہ یا تو اس کے ساتھ علم کی روشنی ہو اور یا ہدایت کی سند ہو۔ محض یہ بات کہ پہلے ایسی غلطی ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہونی چاہئے۔ اس سے زیادہ بے اصل بات اور کوئی نہیں ہو سکتی اس لئے یہاں قرآن پاک نے اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

قریش کی دلیل کا جواب:

دوسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ یہ چونکہ مذہبی معاملہ ہے اس لئے ہمارے آباؤ اجداد اگر ایسا ہی کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی نے اس بات کا حکم دیا ہو گا کیونکہ مذہب کی کوئی بات تو اللہ کے حکم کے بغیر اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اس کے جواب میں پروردگار نے دو باتیں ارشاد فرمائیں

1۔ برہنگی ایک فاحشہ ہے یعنی ایسی بات ہے جس کو کھلی ہوئی بے حیائی کہا جاتا ہے اور عرب اپنی تمام بداخلاقیوں کے باوجود برہنگی کو بے حیائی سمجھتے تھے اور اسے ناپسند کرتے تھے کوئی بھی عزت والا عرب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی مجلس میں کپڑے اتار دے۔ اگرچہ ان کے بازاری اور گرے پڑے لوگ ایک دوسرے کے سامنے ننگا ہو جانے اور راستوں میں رفع حاجت کیلئے بیٹھ جانے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے تھے لیکن ایسا طبقہ تو ہر دور

Marfat.com

میں موجود رہا ہے۔سوال تو ان لوگوں کا ہے جو عوام کو لیڈ کیا کرتے ہیں وہ برہنگی کو بہر حال ایک بے حیائی سمجھتے تھے اور کبھی بھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے چنانچہ اس مسلمہ امر کو دلیل بناتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ جب برہنگی ایک بے حیائی ہے تو تم یہ بتلاؤ کہ اگر تم اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں کچھ بھی جانتے ہو تو کیا تم اس بات کا تصور کر سکتے ہو کہ اللہ کبھی بے حیائی کا حکم دے گا؟ اور اگر وہ واقعی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا تو پھر تم یہ کیسے کہتے ہو کہ اللہ نے ہمیں برہنہ طواف کرنے کا حکم دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے بھی تم سے یہ بات کہی اس نے تم سے جھوٹ کہا اور ایک غلط مفروضہ پر اس نے تمہاری دینی زندگی تباہ کر دی۔

2۔اگر واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ نے تمہیں اس بات کا حکم دیا ہے تو پھر تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہونا چاہئے۔کوئی علمی ثبوت جو تمہیں حضرت اسماعیل یا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہنچا ہو۔کوئی ایسی سینہ بہ سینہ روایت جس کی سند ان بزرگوں سے متصل ہو۔یقیناً تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تو پھر کیا تم اللہ پر ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں یعنی جس کی کوئی علمی سند تمہارے پاس نہیں تو بغیر علمی سند کے اور بغیر کسی آگاہی کے اللہ کریم کے بارے میں کوئی بات کہنا یہ تو اللہ پر افترا کرنے والی بات ہے اور تم جانتے ہو کہ اللہ کے بارے میں کوئی تہمت باندھنا اور اس کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنا کتنا بڑا جرم ہے کیا تم نے کبھی اس کی ہولناکی کے بارے میں سوچا ہے؟ البتہ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اللہ کن باتوں کا حکم دیتا اور کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور وہ کیا بنیادیں ہیں جن پر دینی عمارت اٹھائی جا سکتی ہے:

قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ قف وَاَقِیۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ط كَمَا بَدَاَكُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ O

"کہہ دیجئے (اے پیغمبر) میرے رب نے تو راستی اور انصاف کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر عبادت میں اپنا رخ اسی کی طرف کرو اور اسی کو پکارو اسی کیلئے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے، جس طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کئے جاؤ گے"۔29

اللہ "قسط" کا حکم دیتا ہے اس کی وضاحت:

اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ مشرکین مکہ سے کہیئے کہ تم نے جن بیہودہ باتوں کو دین بنا کر عمل کرنا شروع کر رکھا ہے اور تمہاری عبادتیں بھی اس سے متاثر ہو رہی ہیں اور تمہاری جسارت کا عالم یہ ہے کہ تم اپنی ان بیہودگیوں کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہو کہ اس نے ہمیں ان باتوں کا حکم دیا ہے۔ان باتوں کا اللہ کے دین اور اس کی عبادت سے کوئی تعلق نہیں یہ سراسر تمہاری اختراع کی ہوئی بدعات ہیں اور یا تمہاری خواہشات کا نتیجہ ہیں۔اللہ جن باتوں کا حکم دیتا ہے آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کیا ہیں۔ظاہر ہے کہ اس موقع پر نہ تو ابھی اسلامی شریعت نازل ہوئی تھی اور نہ ابھی پوری طرح اسلامی نظام زندگی کو متشکل ہونے کا موقع ملا تھا اس لئے یہاں ان باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اسلامی شریعت اور اسلامی نظام زندگی کی اساس ہیں اور ان کا ذکر بھی نہایت اختصار اور اجمال سے کیا جا رہا ہے تو اس سلسلے میں فرمایا گیا کہ میرے رب نے سب سے پہلے قسط کا حکم دیا ہے قسط ایک جامع حقیقت ہے جو شریعت الٰہی کی روح ہے اس کے اصلی معنی انصاف اور اعتدال کے ہیں یعنی ہر چیز میں ٹھیک ٹھیک نقطۂ عدل و اعتدال کا اہتمام اس کا حقیقی مفہوم ہے چونکہ اس لفظ میں ایک جامعیت پائی جاتی ہے اس لئے اس کا تعلق زندگی کے کسی ایک پہلو سے نہیں بلکہ ہر پہلو سے ہے۔ عقائد، اعمال، عبادات، اخلاق، معیشت، معاشرت، قانون، سیاست غرض ہر شعبہ زندگی میں یہی وہ اصل الاصول ہے جس پر شریعت الٰہی مبنی ہے۔ مقصو

Marfat.com

ہے کہ تمہاری پوری زندگی ایک نقطۂ عدل واعتدال پر قائم ہونی چاہئے جو افراط وتفریط سے پاک ہو نہ اس میں خواہشات کی کھائیاں ہوں اور نہ اس میں بدعات کے ٹیلے ہوں۔ اس میں تعمیل حکم میں خواہشات نفس کی وجہ سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے اور جعلی عصبیتوں کے نتیجے میں مقررہ حد سے تجاوز نہیں ہونا چاہئے چنانچہ پوری اسلامی شریعت اسی روح کی عکاس ہے جو حکم بھی انسانوں کو دیا گیا ہے وہ پوری طرح قسط کے ترازو میں تول کے دیا گیا ہے اس میں کہیں بھی افراط وتفریط کی پرچھائیں بھی نہیں پڑسکی اس حوالے سے نزول قرآن کے وقت کی انسانی زندگی بالخصوص مشرکین عرب کی زندگی کو دیکھا جائے تو وہ اس قسط کی روح سے بالکل خالی تھی۔ ان کی پوری زندگی خواہشات نفس کی تعمیل میں گزرتی تھی جس میں کہیں بھی اللہ کی عبادت اور اطاعت کی صحیح روح موجود نہیں تھی اور اگر وہ کبھی عبادت کی طرف متوجہ ہوتے تھے جس طرح انہوں نے حج کو ایک لازمی عبادت سمجھ رکھا تھا تو اس میں بھی حدود سے تجاوز کا عالم یہ تھا کہ برہنہ ہو کر طواف کرتے اور بعض دفعہ طواف کے دوران اللہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنے بتوں کی جے بھی پکارتے تھے اسی ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کی زندگی کس طرح قسط یعنی عدل واعتدال سے خالی ہو چکی تھی۔ دوبارہ انسانی زندگی میں اس نقطۂ اعتدال کو لانے کی اگر کوشش کامیاب ہوسکتی ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اس کو دو بنیادوں پر اٹھایا جائے چنانچہ اس کے بعد انہی دو بنیادوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی بنیاد یہ ہے کہ تم اپنی عبادات میں اپنے رخ اللہ کی طرف سیدھے کر لو مطلب اس کا یہ ہے کہ تمہارا ہر قول وفعل اور تمہارا ہر عمل اللہ کی عبادت بن جانا چاہئے لیکن اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس کا رخ خالصتاً اللہ کی طرف ہو اس کی کوئی جہت ادھر ادھر نہ سرکنے پائے۔ نماز پڑھو تو اس کے قبلے کی طرف منہ کر کے اور مناسک حج ادا کرو تو حج کی روح کے مطابق اور اس طریقے سے جو طریقہ تمہیں حضرت ابراہیم دے کر گئے تھے اور جسے زندہ کرنے اور تجدید کا قالب پہنانے کیلئے نبی آخر الزمان تشریف لائے ہیں۔ اگر تم اس پابندی کے ساتھ زندگی گزارو گے تو تمہارا ایک ایک عمل کم از کم ظاہری حیثیت میں نقطۂ اعتدال پر آجائے گا اور تم جہاں اللہ کی الوہیت سے اپنا رشتہ جوڑ لو گے وہاں تم میں احساس عبدیت بھی توانا ہو جائے گا۔

دوسری بنیاد جس پر تمہاری زندگی کو استوار کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اور زندگی کی ہر ضرورت پر صرف اللہ کو پکارو جب تمہارے حوصلے شکست ہونے لگیں تو حوصلوں کیلئے توفیق اللہ سے طلب کرو اور جب تمہارے سہارے ٹوٹنے لگیں تو صرف اللہ سے مدد مانگو اور اپنی تنہائیاں صرف اللہ کی مناجاتوں سے آباد کرو لیکن اس کیلئے شرط یہ ہے کہ تم اپنی عبادت اور اپنی اطاعت کو خالص اس کیلئے کر دو اگر تم اپنی عبادت کو صرف اللہ کیلئے مخصوص کر دو گے یعنی تمہارے دلوں میں اخلاص کی روح پیدا ہو جائے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری ظاہری زندگی کے ساتھ ساتھ تمہاری باطنی زندگی بھی پاکیزہ ہو جائے گی اور اسلام کا نقطۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ صرف ظاہری زندگی کو اللہ کی طرف متوجہ نہیں کرتا بلکہ باطنی اور قلبی زندگی کو بھی پاکیزہ بنا کر اللہ کیلئے مخصوص کر دیتا ہے اس میں شریعت اور طریقت کی کوئی تقسیم نہیں اس کی شریعت واجب الاتباع ہے اور اسی کی تکمیل طریقت یعنی اخلاص کے راستے پر چلنے سے ہوتی ہے۔ جو ان میں دوئی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ درحقیقت نہ شریعت کو سمجھتا ہے نہ طریقت کو اور دوسرا معنی دین کا عبادت کے بجائے اطاعت بھی کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اگر اپنے اللہ سے تعلق استوار کرنا چاہتے ہو تو وہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ تمہاری اطاعت صرف اللہ کیلئے ہو جس طرح تمہارے دل کی دنیا اس کی یاد سے آباد ہے اسی طرح تمہاری زندگی کا ایک ایک شعبہ اور ایک ایک دائرہ اور اس کا ایک ایک خط اللہ ہی کی طرف نکلتا ہو اور وہیں سے پھوٹتا ہو۔ اسلام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ انسانی زندگی کو پرائیویٹ اور پبلک زندگی میں تقسیم کیا جائے اور پھر پرائیویٹ زندگی پر مذہب کی حاکمیت تسلیم کی جائے اور پبلک زندگی پر قیصر کی۔ یہی وہ چیز ہے جہاں سے سیکولرازم کو غذا ملتی ہے انسان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا یا انسانی زندگی کو مختلف اکائیوں میں تقسیم کرنا' انسان کو شکست کرنے اور انسانی زندگی کو ویران کرنے کی کوشش ہے ظاہر ہے کہ اسلام اس کی اجازت

Marfat.com

نہیں دے سکتا یہ وہ دو بنیادیں ہیں جس پر اس زندگی کی عمارت اٹھائی جاسکتی ہے جس میں ہر قدم پر عدل واعتدال کی حکمرانی نظر آئے گی۔ افراد اور افراد کی اجتماعیت میں ایک ایسا خوبصورت نقطۂ اتصال وجود میں آئے گا جس سے اخوت، محبت اور ہمدردی کے جذبات از خود پھوٹنے لگتے ہیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا معاشرہ اور سماج خود اپنی ضرورتوں کا کفیل ہو جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ کے آخری جملے میں ایک بات فرمائی گئی ہے جو ان دونوں باتوں کیلئے محرک بنتی اور ترغیب کا سامان فراہم کرتی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ تم جس طرح اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ اللہ ہی تمہارا خالق ہے اور اسی نے تمہیں زندگی کے ساتھ ساتھ زندگی کے امکانات بھی عطا فرمائے ہیں اور پھر ایک ایک ضرورت کے پیدا ہونے سے پہلے سامان ضرورت سے آراستہ کر دیا گیا ہے اور س کے ساتھ ساتھ جوہر عقل اور علم و دانش کی تب و تاب بھی عطا فرمائی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ جس پروردگار کے عطیات کا یہ عالم ہے اور اس کی بخششیں جس طرح سے انسانوں پر برس رہی ہیں کیا اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک دن ایسا لائے جس میں پوری مخلوقات کو دوبارہ زندہ کر کے اپنی بارگاہ میں کھڑا کرے اور ان سے گزری ہوئی زندگی کا حساب طلب کرے۔ یقیناً یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جو اللہ کی نعمتوں کو محسوس کرنے کے بعد خود بخود دل و دماغ میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ آیت کے آخری حصے میں انہی دو باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ جس اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے وہی تمہیں دوبارہ پیدا کرے گا تم اسی کی طرف لوٹ کے جاؤ گے وہ تم سے زندگی کے ایک ایک عمل کا حساب لے گا۔ ظاہر ہے جس دل میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ میری زندگی اصلاً ایک مالک کی عطا کردہ ہے اور وہ میری زندگی کے ایک ایک عمل کی فائل تیار کر رہا ہے اور ایک دن ایسا آئے گا جب مجھے اس کے سامنے جواب دہی کرنا ہو گی۔ ایسے شخص کیلئے پھر اپنی من مرضی کی زندگی گزارنا یا اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے طاغوت کی اطاعت میں زندگی بسر کرنا آسان نہیں رہتا۔ اندازہ کیجئے کہ یہ وہ بنیادیں ہیں اور یہ وہ ترغیبی محرک ہے جس پر انسانی زندگی استوار کی گئی ہے لیکن انسان نے اس نقطۂ عدل واعتدال سے محروم ہونے کے بعد اپنے آپ کو جس طرح بگاڑ اور تباہ کیا ہے یوں تو پوری دنیا میں اس کی مثالیں پھیلی ہوئی ہیں لیکن مشرکین مکہ کو براہ راست ان کی زندگی کا آئینہ دکھا کر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ دیکھو تمہیں ہدایات کیا دی گئی تھیں اور تم نے اپنی زندگی کو کن ہولناک غاروں میں پھینک دیا ہے۔ اب تمہیں اس تباہی سے نکالنے کیلئے نبی آخر الزماں ﷺ کو بھیجا گیا ہے لیکن اس وقت بھی حال یہ ہے:

فَرِيقًا هَدَىٰ وَ فَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَٰلَةُ ۗ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَٰطِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ اللَّهِ وَ يَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ۝

"ایک گروہ کو اس نے ہدایت عطا فرمائی اور ایک گروہ پر گمراہی مسلط ہو چکی انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا رفیق بنایا اور سمجھتے یہ ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں"۔ 30

شیطان سے اثر قبول کرنے والے پیغمبر کی دعوت سے بھی اثر قبول نہیں کرتے:

بجائے اس کے کہ مشرکین مکہ جنہیں براہ راست آنحضرت ﷺ اللہ کی طرف سے ہدایت پہنچا رہے ہیں اور اپنی پوری شخصی توانائیوں سے لے کر انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ آگے بڑھ کر ہدایت قبول کرتے اور اپنی زندگی کو صحیح نہج پر استوار کر لیتے لیکن حال یہ ہے کہ میں سے ایک گروہ نے تو یقیناً آگے بڑھ کر اس دعوت کو قبول کیا اور اپنی زندگی سنوار لی اور دوسرا گروہ مسلسل اپنی روش پر قائم رہا بلکہ بجائے اپنی گمراہی

Marfat.com

توجہ کرنے کے آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے یہ کوشش کی کہ کسی طرح وہ اس شمع ہدایت کو گل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ پھر گمراہی اللہ کی جانب سے ان پر مسلط ہو گئی کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا کوئی قوم بجائے اللہ کے نبی کی دعوت کو قبول کرنے کے شیاطین کو اپنا ہمدرد، اپنا ساتھی اور اپنا راہنما مان لیتی ہے اور پھر زندگی کے سفر میں اسی کی راہنمائی میں سفر جاری رکھنا چاہتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کی گمراہی کا فیصلہ فرما دیتے ہیں۔ ان مشرکینِ مکہ نے بھی چونکہ اسی طرح اپنی زندگی کے سفر کو جاری رکھا ہے اور بجائے حضور کی بات کو ماننے کے شیاطین کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی روش یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنی اس گمراہی کو سمجھنے سے بھی معذور ہو گئے ہیں اور یہ گمان کرنے لگے ہیں کہ حقیقت میں وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی انسان یا کوئی گروہ اس حد تک اندھے پن کا شکار ہو جائے کہ اسے اندھیرے اور اجالے میں تمیز بھی نہ ہو سکے اور وہ صحیح اور غلط کو پہچاننے سے بالکل عاجز ہو جائے تو پھر ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کبھی زبردستی ہدایت نہیں دیتا جس طرح ایک آدمی اگر مسلسل بیٹھا رہے اور کبھی اٹھنے کی زحمت گوارا نہ کرے تو ایک وقت آئے گا کہ وہ اپاہج ہو جائے گا اس طرح جو شخص اللہ کے دیئے ہوئے جوہر عقل سے کام نہیں لیتا اور اپنے فہم و شعور کو معطل کر کے رکھ دیتا ہے اور جو لوگ اس کو صحیح راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ ان کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے تو ایک وقت آتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس کے فہم و شعور کی طاقتیں اس سے سلب کر لیتا ہے اور پھر وہ ظاہری آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دل کے نور سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

مشرکین مکہ کی بدعات اور خرافات پر تنقید فرماتے ہوئے ان کی کوتاہیوں اور برائیوں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کا صحیح راستہ بھی ان کے سامنے کھولا گیا اس کی بنیادیں بھی ان کے سامنے واشگاف کی گئیں اور پھر نہایت تاسف سے جن لوگوں نے ان ہدایات سے فائدہ نہیں اٹھایا ان کے حوالے سے اللہ کے قانون کو ذکر کیا گیا۔ اب اس کے بعد اگلی آیت کریمہ میں مثبت انداز میں اس بات کا حکم دیا جا رہا ہے جس میں انہوں نے افراط و تفریط سے کام لیتے ہوئے ایک پوری مصنوعی شریعت تصنیف کر ڈالی تھی۔ ارشاد فرمایا

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

"اے اولادِ آدم ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا"۔31

لباس کے حوالے سے ایک خاص ہدایت:

اس آیت کریمہ میں براہ راست حکم دیا گیا ہے کہ تم ہر نماز کے وقت اپنے آپ کو لباس سے آراستہ رکھو یعنی تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ کی عبادت کا تقاضہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو برہنہ پیدا کیا گیا ہے اسی برہنگی کے ساتھ وہ اللہ کی عبادت کرے یہ سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں کیونکہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے اعضائے صنفی شرم گاہ نہیں کہلاتے یعنی اسے اس طرح نہیں دیکھا جاتا جس طرح شرم کی جگہوں کو دیکھا جاتا ہے اور ان کے کھل جانے سے کوئی محسوس نہیں کرتا کہ بچہ برہنہ ہو گیا ہے اور اس سے اخلاقی صفات اور اخلاقی محرکات پر کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا لیکن بلوغ کی عمر کو پہنچنے کے بعد ہر آدمی

Marfat.com

سمجھتا ہے کہ برہنگی ایک عیب اور بے حیائی ہے۔عجیب بات ہے کہ تم نے بے حیائی کو معصومیت پر قیاس کرتے ہوئے دونوں کو ایک کر ڈالا اور اللہ کی عبادت یعنی اس کے گھر کا طواف برہنہ ہو کر کرنے لگے۔اس پر مکمل تنقید فرمانے کے بعد یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنی اس گمراہی سے توبہ کرو اور آئندہ صرف طواف ہی نہیں بلکہ نماز بھی برہنہ پڑھنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں طواف کو بھی نماز قرار دیا ہے۔اس آیت کریمہ میں اگرچہ لباس کی بجائے زینت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن ہم نے اس کا ترجمہ لباس کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے برہنہ طواف کرنا اس لئے شروع کیا تھا کہ وہ لباس کو زینت قرار دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے گھر کا طواف چونکہ ایک عاشقانہ عبادت ہے اس لئے یہ عبادت کرتے ہوئے جسم پر کوئی آرائش اور کوئی زینت نہیں ہونی چاہئے تو لباس چونکہ زینت ہے اس لئے لباس اتار کر طواف کرنا چاہئے تو یہاں قرآن کریم نے اسی زینت کے لفظ کو استعمال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ لباس جس طرح زینت ہے اسی طرح وہ برہنگی کو چھپانے اور موسم کی شدت سے بچانے کا ایک ذریعہ بھی ہے اور پھر اللہ کے سامنے جانے کیلئے آدمی کو ایسی آرائش اور زینت ضرور استعمال کرنی چاہئے جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہو کہ اللہ کی عبادت کرنے والا شخص خاص اہتمام کر کے اس کے دربار میں حاضر ہوا ہے۔اسی سے ہمیں یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جس طرح لباس کا یہ مقصد ہے کہ اسے ساتر ہونا چاہئے اور ساتر ہونے کیلئے تو ایک لنگوٹی بھی کافی ہے لیکن یہاں زینت کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ صرف لباس کو پردہ پوش ہی نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس زینت بھی ہونا چاہئے یعنی اسے ایک مکمل لباس ہونا چاہئے جس سے مکمل انسان کی شخصیت وجود میں آتی ہے اور پھر اسے اپنی پوری شخصیت لے کر اللہ کے سامنے کھڑا ہونا، جھکنا اور سجدہ ریز ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے عمل سے یہ بات ثابت کرے کہ یا اللہ میں ہر حال میں تیرا ہوں اور میں ہر حیثیت میں تیری بندگی کا اقرار کرتا ہوں اسی سے اہل علم نے احادیث کی روشنی میں یہ بات بھی سمجھی کہ جس آدمی کو پورا لباس میسر ہو لیکن وہ صرف ستر پوشی کی حد تک لباس پہن کر نماز کیلئے کھڑا ہو جائے تو اس کی نماز مکروہ ہو گی۔اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ لباس زینت اختیار کرے یعنی اس کا سر بھی ڈھکا ہوا ہو، قمیض پوری ہو، یعنی نہ اس کی کہنیاں کھلی ہوں نہ کندھے ننگے ہوں اور نہ سر بے لباس ہو۔مجبوری کی حالت میں تو ان اعضا کو کھلا رکھ کر بھی نماز ہو جاتی ہے لیکن اگر لباس میسر ہے تو ضروری ہے کہ آدمی پورے اہتمام سے اللہ کے سامنے حاضری دے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی نامکمل لباس میں نماز نہیں پڑھائی اور خود صحابہ ہمیشہ مکمل لباس میں نماز پڑھتے تھے البتہ جن صحابہ کو پورا لباس میسر نہیں تھا وہ تو جو لباس بھی مل جاتا اسے پہن کر نماز پڑھ لیتے حضرت حسن ؓ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ نماز کے وقت اپنا سب سے بہتر لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جمال کو پسند فرماتے ہیں اور میں اپنے رب کیلئے زینت و جمال اختیار کرتا ہوں اور متذکرہ آیت سے آپ استدلال فرماتے تھے۔

مشرکینِ عرب میں جس طرح برہنہ ہو کر طواف کرنے کی برائی پائی جاتی تھی اسی طرح وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ایام حج میں اچھی غذا کھانا یہ بھی سادگی کے خلاف ہے اس لئے وہ عموماً حج کے دنوں میں صرف اتنا کھاتے پیتے تھے جس سے زندہ رہا جا سکے اس سے روکنے کیلئے یہاں فرمایا گیا کہ کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو یعنی جتنی چیزیں اللہ نے کھانے پینے کیلئے جائز اور طیب پیدا فرمائی ہیں۔انسانوں کو ان سب سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے چاہے حج کی عبادت انجام دے رہے ہوں یا زندگی کی کسی اور مصروفیت میں ہوں۔اللہ کی جائز نعمتوں سے یہ سمجھ کر تمتع نہ کرنا کہ یہ شاید کوئی نیکی ہے سے روکا گیا ہے ہاں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اسراف نہ کرو۔اسراف کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا۔حد سے تجاوز کرنے کی کئی صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ حلال سے تجاوز کر کے آدمی حرام سے فائدہ اٹھانے لگے اور حرام چیزوں کو کھانے پینے اور برتنے لگے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو بلاوجہ شرعی حرام سمجھ کے چھوڑ دے جس طرح حرام کا استعمال جرم و گناہ ہے اسی طرح حلال کو حرام سمجھنا بھی قانون الٰہی کی مخالفت اور سخت گناہ

Marfat.com

ہے۔اسی طرح یہ بھی اسراف ہے کہ بھوک اور ضرورت سے زیادہ کھائے پیئے اور یہ بھی اسراف کے حکم میں شامل ہے کہ باوجود قدرت واختیار کے ضرورت سے اتنا کم کھائے جس سے کمزور ہو کر ادائے واجبات کی قدرت نہ رہے۔ مختصر یہ کہ لباس کا معاملہ ہو یا زندگی کا کوئی اور معاملہ ہر حال میں اللہ کے احکام کی اطاعت کرنا اور اس میں کسی طرح کی کمی بیشی نہ ہونے دینا یہ وہ نقطۂ اعتدال ہے جس کا ان آیات میں حکم دیا گیا ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ

الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٣٢﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا
ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا
بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا
لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٤﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ
يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ
اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٦﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى
عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ
الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ

Marfat.com

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى
اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِی النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ
اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا
هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ
ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ
لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

(اے پیغمبر!) ان سے کہیئے کہ اللہ کی اس زینت کو جسے اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے' کس نے حرام ٹھہرایا اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو؟ کہہ دو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کیلئے ہے اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کیلئے ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کر رہے' ہیں ان لوگوں کیلئے' جو علم رکھنے والے ہیں۔ (اے پیغمبر!) کہہ دیجئے کہ میرے رب نے تو حرام کی ہیں' بے حیائیاں خواہ کھلی ہوں' خواہ پوشیدہ اور حق تلفی اور ناحق زیادتی اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو' جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو' جس کا تم علم نہیں رکھتے۔ ہر قوم کیلئے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے۔ پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی۔ اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں' جو تمہیں میری آیات سنائیں تو جو کوئی نافرمانی سے بچا اور اس نے اپنی اصلاح کر لی تو ان کیلئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے اعراض کیا' وہی ہیں دوزخ والے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا' جو بالکل جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کریں یا اللہ کی سچی آیات کو جھٹلائیں؟ ان لوگوں کو ان کے نوشتہ کا حصہ پہنچے گا' یہاں تک کہ وہ گھڑی آ جائے کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کیلئے آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے' کہاں ہیں؟ وہ جواب دیں گے

Marfat.com

وہ تو سب ہم سے گم ہو گئے اور یہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ واقعی منکر حق تھے۔ اللہ فرمائے گا' جاؤ! تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ' ان امتوں کے ساتھ' جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے گزریں۔ ہر گروہ' جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے ساتھی گروہ پر لعنت کرے گا۔ یہاں تک کہ جب سب اس میں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب! یہی لوگ ہیں' جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا' ان کو دوہرا عذاب نار دیجئے۔ ارشاد ہوگا! تم سب کیلئے دوہرا عذاب ہے' مگر تم جانتے نہیں ہو۔ اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے! تم کو بھی ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی' تم بھی اپنے کیے کی پاداش میں عذاب چکھو۔

............☆......☆......☆............

مشرکینِ عرب نے بالعموم اور مشرکینِ مکہ نے بالخصوص عبادت کے تصور اور عبادت کی ادائیگی کے حوالے سے جو خلط مبحث پیدا کر رکھا تھا اور جو انہوں نے اپنی طرف سے عجیب و غریب قسم کی بدعات ایجاد کر لی تھیں اور جسے وہ منسوب بھی اللہ کی طرف کرتے تھے۔ گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس پر سخت گرفت فرماتے ہوئے نہایت محکم تنقید فرمائی ہے لیکن اگلی آنے والی آیات میں ایک دوسرے پہلو سے عتاب کے انداز میں اسی بحث کی تکمیل فرمائی گئی ہے۔ گویا کہ ان آیات کی حیثیت تتمہ اور استدراک کی ہے اور پھر عتاب کے ساتھ ساتھ ایک محکم دلیل ارشاد فرمائی گئی ہے اور انہی کے رویے کو ان کے سامنے اس طرح واضح کیا گیا ہے جس سے ہر اس آدمی کو شرم محسوس کرنی چاہئے جس کے اندر کچھ نہ کچھ اخلاقی حس اور شعور کی رمق باقی ہو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

"(اے پیغمبر!) ان سے کہئے کہ اللہ کی اس زینت کو جسے اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے' کس نے حرام ٹھہرایا اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو؟ کہہ دو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کیلئے ہے اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کیلئے ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کر رہے ہیں ان لوگوں کیلئے' جو علم رکھنے والے ہیں"۔ 32

اللہ کی نعمتوں پر پابندی اللہ کے سوا کوئی نہیں لگا سکتا:

غور فرمایئے! اس آیت کریمہ کے پہلے جملے میں مشرکین سے ایک سوال کیا جا رہا ہے لیکن اس کا انداز عتاب کا ہے گویا نہایت برہمی سے ان سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے حج اور طواف کے دوران لباس کو جس طرح اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا ہے اور اللہ کی پاکیزہ نعمتوں کو تم نے دنیا داری جان کر حتی الامکان اس سے جو گریز کی عادت بنالی ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ لباس جو انسان کیلئے ایک زینت ہے اسے اللہ کے گھر کا طواف کرتے ہوئے پہننا اسلئے حرام ہے کہ یہ تو ایک عاشقانہ عبادت ہے اس میں کسی طرح بھی انسانی جسم پر دنیا کی آلائش نہیں ہونی چاہئے اور اسی طرح تم امکانی حد تک کھانے سے بچتے ہو یہ سمجھ کر کہ عبادت میں کم سے کم کھانے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ دنیا کی ان چیزوں کا اثر انسان پر کم سے کم پڑے۔ بتاؤ تمہارے لئے ان چیزوں کو حرام کس نے کیا؟ اللہ نے بہر صورت ان چیزوں کو حرام نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے یا تو ان چیزوں کو خود حرام کیا ہے اور یا تمہارے

Marfat.com

نام نہاد دیوتاؤں اور معبودوں نے کیا ہوگا۔ کوئی سی صورت بھی ہو اللہ کی پیدا کردہ نعمتوں کو حلال یا حرام کرنے کا حق نہ تمہیں ہے اور نہ انہیں جن کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے کیونکہ کسی بھی نعمت میں تبدیلی یا پابندی کا حق صرف اسے ہو سکتا ہے جس نے اسے پیدا کیا اور جس نے اسے تمہیں بخشا ہے اور جو ان نعمتوں کو محض عطا و بخشش کے طور پر حاصل کر کے فائدہ اٹھا رہا ہے اسے تو بہر حال اس کا حق نہیں دیا جا سکتا تو پھر تم نے ایک ایسی چیز جس کا حق سراسر اللہ کی ذات کو تھا اسے تم نے از خود کیسے اختیار کر لیا اس میں غور کیجئے پہلے جملے میں سوال کی صورت میں عتاب کیا جا رہا ہے اور دوسرے جملے میں اس کی دلیل بیان فرمائی جا رہی ہے کہ ان ساری نعمتوں کو اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ جن کیلئے یہ نعمتیں پیدا کی گئی ہیں انہی کو ان کے استعمال سے روکا جا رہا ہے اور مزید عجیب بات یہ ہے کہ جس نے ان نعمتوں کو پیدا کیا ہے اس سے بالا بالا ہی یہ حرکتیں ہو رہی ہیں۔ اس سے بڑا جرم قانونی اور اخلاقی دونوں حوالوں سے کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ بادشاہ کی حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے خود بادشاہ بننے کی کوشش کی جائے یا اس کے نام پر جعلی احکام جاری کئے جائیں یہ دونوں صورتیں صرف دھوکہ دہی کی واردات نہیں بلکہ ایک باغیانہ روش کی عکاسی کرتی ہیں اس لئے مشرکین سے پوچھا جا رہا ہے کہ اس کا جواب دو کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی اور اگر آج تم اس کا جواب نہیں دیتے ہو تو کل کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ تمہارے پاس نہ آج اس کا جواب ہے نہ کل کو ہوگا پھر سوچ لو اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے بعد مزید فرمایا کہ نادانو جن نعمتوں پر تم پابندی لگا رہے ہو اور انہیں اپنے اوپر ممنوع قرار دے رہے ہو تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ اللہ نے ان نعمتوں کو اپنے بندوں ہی کیلئے پیدا کیا ہے۔ اب ایسے لوگ یا ایسے مذہب کے حاملین جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی پاکیزہ نعمتیں اور اس کے عطا کردہ لباس کو اللہ کی عبادت کرتے ہوئے استعمال کرنا دنیا داری اور گناہ ہے اور وہ اس کو مایا کا جال قرار دے کر اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ وہ نہ صرف اللہ کے دین سے باغی ہیں بلکہ وہ فطرت سے بھی بغاوت کا ارتکاب کر رہے ہیں کیونکہ اچھے سے اچھا لباس اور بہتر سے بہتر نعمت کا حصول یہ تو انسان کی فطرت کا اقتضا ہے جو مذہب اس پر پابندی لگاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ صرف اللہ کے دین سے بلکہ اپنی فطرت سے بھی جنگ کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے ایک فطری مذہب ہونے کے جہاں اور بہت سارے دلائل ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کے فطری تقاضوں کو صحیح راستے پر ڈالا اور اس کو صحیح طریقے سے ارتقاء پذیر ہونے کا موقع دیا۔ اس نے ہرگز اس پر کوئی ایسی پابندی نہیں لگائی جس سے اس کی فطری صلاحیتوں کو نقصان پہنچتا ہو اور جہاں تک اسلام کے نظام اخلاق و معاشرت کا تعلق ہے تو اس نے کی ان تمام پاکیزہ نعمتوں کو اس طرح اس میں سمو دیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کیلئے قوت کا سامان بن گئی ہیں یہ صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے طریقے پر چلنے والے اللہ کے نیک بندوں نے دنیا اور دنیا کی نعمتوں سے کبھی جی نہیں لگایا انہوں نے ہمیشہ اس کو ضروریات کا درجہ دیا' دل کو ان کی محبت سے ہمیشہ آزاد رکھا اور زندگی کی ساری توجہ اور ساری توتیں انہوں نے مقاصد زندگی پر صرف کیں اور اپنی زندگی کو ہمیشہ سادگی کا نمونہ بنائے رکھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اگر اللہ نے ان کو خوشحالی عطا فرمائی تو انہوں نے اللہ کی نعمت کے شکر کے طور پر اچھا کھایا اور پہنا اور کبھی محض اس سے اعراض نہیں برتا کہ یہ چیزیں روحانیت کے ارتقاء میں رکاوٹ بنتی ہیں البتہ یہ کوشش ضرور کی کہ ان چیزوں کو نہ مقاصد زندگی بننے دیا جائے اور نہ یہ عزت کا معیار اور علامت ٹھہریں تا کہ غریبوں کو سر اٹھا کر اسی طرح چلنے کا موقع نصیب رہے جس طرح اہل دولت و ثروت چلتے ہیں جب غربا یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا سربراہ مملکت اور ہمارا حکمران نہایت سادہ کھاتا اور پہنتا ہے تو پھر وہ کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتے لیکن انہوں نے کبھی کبھی اچھا کھایا اور پہنا بھی تا کہ لوگ اس سے غلط تاثر لے کر وہ راستہ اختیار نہ کر لیں جس کا شکار غلط مذاہب ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ سادہ لباس پہنا۔ کبھی ایسا بھی دیکھا گیا کہ آپ کے لباس میں پیوند لگے ہوئے ہیں اور ہمیشہ روکھا پھیکا کھایا اور بہت کم ایسا ہوا کہ آپ نے دو وقت کھانا تناول فرمایا ہو

Marfat.com

لیکن یہ بھی دیکھا گیا کہ اللہ نے اگر عطا کیا تو آپ نے قیمتی لباس بھی پہنا اور گوشت بھی کھایا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت ﷺ کو چودھویں رات کے چاند کی روشنی میں مسجد نبوی کے صحن میں قیمتی یمنی حلہ پہنے ہوئے تشریف فرما دیکھا تو آپ کے حسن کے جوبن کا عالم یہ تھا کہ چاند کی روشنی آپ کے چہرے کی روشنی کے سامنے مدہم پڑ گئی تھی۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ سے ملنے گھر پر حاضر ہوا' آپ باہر تشریف لائے تو جو چادر آپ کے جسم مبارک پر تھی اس کی قیمت کم از کم ایک ہزار درہم تھی۔ اس سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر اللہ عطا کرے تو یہ اس کی نعمتیں ہیں' نعمت سمجھ کر اظہار شکر کیلئے انہیں استعمال کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہمارے وہ بڑے لوگ جنہیں ہم اپنی دینی زندگی میں راہنما اور مقتدا کا درجہ دیتے ہیں ان میں امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا نام بہت وقیع ہے۔ اللہ نے انہیں علم و عمل کے ساتھ ساتھ خوشحالی سے بھی نوازا تھا۔ پورے ملک میں آپ کی تجارت پھیلی ہوئی تھی' کروڑوں کا کاروبار تھا اور اسی کے شکر کے طور پر آپ کا حال یہ تھا کہ بعض دفعہ آپ کی اوڑھی ہوئی چادر کی قیمت چار سو گنی تک پہنچتی تھی لیکن اس خوشحالی اور دولت کا اثر آپ کے دل پر نہیں تھا۔ راتوں کی عبادت' علمی معمولات' فقراء کی سرپرستی' اہل علم کی درپردہ اعانت' اہل دنیا سے گریز' مقتدر لوگوں کے سامنے استغنا اور خودداری اور جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ نعمتیں اس لئے نہیں دی گئیں کہ تم اس کو دنیا یا دنیاداری کی علامت سمجھ کر اسے گندگی سمجھو بلکہ اسے اللہ کی نعمت جان کر اللہ کی ہدایت کے مطابق انہیں استعمال کرو اور اس پر اس کا شکر بجا لاؤ مزید فرمایا کہ اے پیغمبران سے یہ بات کہہ دو کہ امر واقعہ یہ ہے کہ جن نعمتوں کو تم دنیاداری سمجھ کر یا آلائش دنیا جان کر روحانی ارتقاء کے خلاف سمجھتے ہو وہ تو اصلاً اللہ نے صاحب ایمان لوگوں کیلئے ہی عطا فرمائی ہیں۔ کافروں کو تو صرف ان میں شامل فرمایا گیا ہے کیونکہ زندگی گزارنے کیلئے انہیں ان نعمتوں کی بھی ضرورت ہے اگر انہیں غذائی ضرورتیں فراہم نہ کی جاتیں اور زندگی کے اور اسباب مہیا نہ کیے جاتے تو آخر وہ دنیا میں زندہ کیسے رہتے اور جس امتحان میں انہیں ڈالا گیا ہے وہ اس امتحان کا سامنا کیسے کرتے۔ البتہ! یہ بات ضرور سمجھنے کی ہے کہ دنیا میں بعض دفعہ کافروں کو مسلمانوں سے زیادہ نعمتیں کیوں دی جاتی ہیں جبکہ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ نعمتیں حقیقت میں تو مسلمانوں اور مومنوں ہی کا حصہ ہیں' کافر تو محض ان کی وجہ سے یہ نعمتیں پا رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ نعمتیں مومنوں ہی کا حصہ ہیں تو یہ بات بالکل واضح ہے اس لئے کہ دنیا کی ہر نعمت اللہ کی عطا و بخشش ہے وہی ان نعمتوں کا خالق ہے اور وہی ان کا عطا کرنے والا ہے اور دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ کوئی بھی عطا کرنے والا ہمیشہ اپنے وفاداروں کے علاوہ کسی اور پر اپنی بخششوں کی بارش نہیں کیا کرتا کیونکہ نمک صرف نمک حلالوں کا حصہ ہوتا ہے جو نمک حرام ہوتے ہیں وہ نعمتوں کے نہیں بلکہ سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ یہاں پھر کافروں کو کیوں دیا جا رہا ہے بلکہ بعض دفعہ مسلمانوں سے زیادہ دیا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا موجودہ انتظام آزمائش اور مہلت کے اصول پر چل رہا ہے۔ یہاں نعمتیں اس لئے نہیں دی جاتیں کہ وہ کسی کا حق ہیں بلکہ اس لئے دی جاتی ہیں تاکہ آزمائش کی جائے کہ جس کو دیا جا رہا ہے وہ اس پر شکر ادا کرتا ہے یا کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ کافروں کو زیادہ سے زیادہ عطا فرما کر زیادہ سے زیادہ امتحان کا سامان کیا جاتا ہے اس لئے کہ کسی کو زیادہ ملنا اس کے زیادہ امتحان کی دلیل ہوتی ہے جسے چھوٹا منصب دیا جاتا ہے اس کی آزمائش بھی چھوٹی ہوتی ہے اور جسے بڑا منصب دیا جاتا ہے اور بڑے مرتبے سے نوازا جاتا ہے اس کی آزمائش بھی اسی تناسب سے ہوتی ہے یہی وہ عطا و بخشش ہے جس کے حوالے سے قیامت میں کافروں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اللہ کی بے شمار نعمتیں استعمال کیں' بتاؤ ان نعمتوں کے دینے والے کا حق کیا ادا کیا اسی پر وہ پکڑے جائیں گے اور اسی حوالے سے ان کی سزا میں کمی بیشی ہوگی۔ مزید یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ مسلمانوں کو بالعموم کافروں سے کم دینا ایک طرف ان پر اللہ کا یہ احسان ہے اور دوسری طرف ان کیلئے دوگونہ آزمائش ہے۔ احسان ان معنوں میں ہے کہ جسے جتنی نعمتیں ملیں گی اتنا ہی زیادہ اسے حساب دینا ہوگا اور جس کو کم نعمتیں ملیں گی اس کا حساب بھی مختصر

Marfat.com

ہوگا۔ مسلمانوں سے اللہ چونکہ ہلکا حساب لینا چاہتا ہے اور ان پر اللہ کو آسانی مطلوب ہے اس لئے وہ انہیں کسی بڑی مشقت میں ڈالنا پسند نہیں کرتا البتہ یہ اپنی اپنی ہمت ہے کہ بعض ڈوبنے والے پایاب پانی میں بھی ڈوب جاتے ہیں اور دوگونہ آزمائش اس طرح سے ہے کہ کسی کو نعمت کا کم ملنا یہ بھی ایک آزمائش ہے کیونکہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کبھی کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کبھی کسی سے چھین کر آزماتا ہے جسے دیتا ہے اس کے بارے میں تو یہ دیکھتا ہے کہ یہ شکر ادا کرتا ہے یا نہیں اور جسے نہیں دیتا یا کم دیتا ہے اس کی یہ آزمائش کرتا ہے کہ وہ صبر کرتا ہے یا نہیں؟ کیا وہ اللہ کے بارے میں شکایت کا دفتر کھول کر تو نہیں بیٹھ جاتا اور دوسری آزمائش یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ سکھایا گیا ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت وہ دنیا اور دولت دنیا نہیں بلکہ ایمان اور حسن عمل ہے جسے اللہ نے ایمان کی دولت دے دی اور اپنے راستے پر چلنے کی توفیق بخشی بیشک اسے دنیا کم ملی ہوا سے سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ نے اس پر نظر کرم فرمائی ہے اور اسے وہ چیز عطا فرمائی ہے جو اسکی نگاہوں میں سب سے گراں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک آدمی گناہوں کا بہت بڑا ذخیرہ لے کر اللہ کے سامنے پیش ہوگا اور وہ یہ دیکھ کر سہم سہم جائے گا کہ یا اللہ اب میرا کیا بنے گا کہ اچانک اس کے ترازو کے پلڑے میں ایک عمل لا کر رکھا جائے گا جس کے نتیجے میں گناہوں کا پلڑا اوپر اٹھ جائے گا۔ یہ شخص حیران ہو کر دیکھے گا کہ میرے پاس ان گناہوں کے مقابلے میں کوئی ایسا عمل نہیں تھا جس سے میرا عمل کا پلڑا جھک سکتا یہ کیا چیز ہے جس نے مجھے مالا مال کر دیا ہے تو اسے بتایا جائے گا کہ یہ وہ کلمہ طیبہ ہے جسے پڑھ کر تم ایمان لائے تھے۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اللہ کی نگاہ میں ایمان اور حسن عمل کتنی بڑی دولت ہے اگر ایک مسلمان یا امت مسلمہ اس بڑی دولت کو رکھتے ہوئے بھی ان لوگوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھے جو ایمان وعمل کے لحاظ سے بے شک مفلس ہوں لیکن دولت کی ان کے یہاں ریل پیل ہو اور انہیں دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آئے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایمان وعمل جیسی نعمت کا حق نہیں پہچانا۔ حالانکہ دنیا اور دین کا اور ایمان اور دولت دنیا کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں۔ ایمان اسے ملتا ہے جس پر اللہ کی خصوصی نگاہ ہوتی ہے اور دنیا تو ہر ایک کو مل جاتی ہے جو اس کیلئے کوشش کرتا ہے یا جسے آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے اس لئے حضور نے فرمایا تھا کہ ''اگر پوری دنیا کی قدر و قیمت اللہ کی نگاہ میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ کسی کافر کو کبھی پانی کا گھونٹ تک نہ دیتا''۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی ساری پیدا کردہ نعمتیں حقیقت میں تو اہلِ ایمان ہی کا حصہ ہیں البتہ کافروں کو محض آزمائش کیلئے اس میں شامل کر لیا گیا ہے اور جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس میں تو یہ ساری نعمتیں اہلِ ایمان ہی کا مقدر ہوں گی۔ آخرت میں کافر کو سوائے نار جہنم کے اور کچھ نہیں ملے گا کیونکہ دنیا میں انہوں نے جو رفاہی کام کئے تھے رزق کی صورت میں اس کا بدلہ ان کو دے دیا گیا لیکن اس کی بے بہا نعمتوں کا چونکہ انہوں نے حق ادا نہیں کیا اور اللہ کی ابدی حیثیت کو انہوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس لئے انہیں ہمیشہ کے عذاب کی سزا دی جائے گی اور اہل ایمان نے چونکہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دی اور انہوں نے دنیا کی زندگی آخرت کی تیاری اور اس کے حصول میں صرف کر دی اس لئے اللہ کی ساری نعمتیں قیامت میں ان کا حصہ ہوں گی۔ آیت کے آخر حصے میں فرمایا کہ دیکھو یہ ہمارا تم پر بے پایاں احسان ہے کہ ہم تم پر اپنے احکام اور اپنی آیات کی حکمتیں کس قدر تفصیل سے بیان کر رہے ہیں۔ ان گزشتہ آیات ہی کو دیکھ لیجئے کہ جن باتوں میں اس دور کا انسان بری طرح الجھا ہوا تھا اللہ نے کس طرح مسلمانوں کیلئے ان کو آسان فرما دیا اور ایسی حکمتیں جن سے قوموں کی قومیں خالی ہو چکی تھیں۔ بے ساختہ ان کی چابیاں مسلمانوں کو عطا کر دی گئیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ علم وحکمت کا یہ سرمایہ صرف ان لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے جو علم رکھتے ہیں یا وہ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یعلمون فعل اور ارادۂ فعل دونوں طرح استعمال ہو سکتا ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ یہاں دونوں مراد ہوں کہ جو جانتے ہیں وہی ان حکمتوں کے قدردان ہوں گے اور یا یہ نعمتیں ان کیلئے چشم کشا ثابت ہوں گی جو جاننا چاہیں گے اور جو علم کے پیاسے ہوں گے۔

Marfat.com

اگلی آیت کریمہ میں مشرکین مکہ کے رویے کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں اس طرح شرم دلائی جا رہی ہے جس سے ایک بے ساختہ دلیل کی صورت بھی پیدا ہوگئی ہے اور ایک بے ساختہ تأثر بھی اس سے ابھر رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ O

''(اے پیغمبر!) کہہ دیجئے کہ میرے رب نے تو حرام کی ہیں، بے حیائیاں خواہ کھلی ہوں، خواہ پوشیدہ اور حق تلفی اور ناحق زیادتی اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو، جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو، جس کا تم علم نہیں رکھتے''۔ 33

اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی اصل چیزیں:

اس آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ ان سے یہ کہیے کہ تم عجیب نادان واقع ہوئے ہو کہ جن چیزوں کو اللہ نے حلال اور طیب پیدا فرمایا تھا اور جو اس نے اپنے بندوں کیلئے حلال کی تھیں ان کو تو تم نے اپنی نادانی اور حماقت سے حرام قرار دے دیا لیکن جو چیزیں میرے رب نے حرام کی ہیں تمہیں نہ تو ان کے بارے میں کوئی علم ہے کہ وہ کیا ہیں اور اگر تمہیں کچھ علم ہے بھی تو تم نے اپنے عمل سے ان حرام کردہ چیزوں کو اپنے لئے حلال بنا رکھا ہے اس سے بڑی تعجب کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ جو چیزیں حلال ہیں تم ان کو حرام کر دیتے ہو اور جو حرام ہیں ان کو تم حلال کر دیتے ہو پھر آپ نے ان محرمات میں سے چند چیزیں بیان فرمائیں۔ سب سے پہلی چیز یہ کہ میرے رب نے تمام بے حیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے۔ فواحش فاحشہ کی جمع ہے۔ فاحشہ ہر اس بے حیائی کو کہتے ہیں جسے ہر وہ شخص برا سمجھے اور اس سے گھن کھائے جس کی فطرت سلیم ہو اور جس کا فطری احساس زندہ ہو کیونکہ جب فطرت مردہ ہو جاتی ہے اور احساس مر جاتا ہے یا فطرت بگڑ جاتی ہے تو ایسے آدمی کو سامنے کی بات بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اسے آپ ہزار سمجھائیے وہ کبھی سمجھ کے نہیں دے گا۔ آپ یوں محسوس کریں گے کہ آپ ایک دیوار سے مخاطب ہیں بلکہ بعض دفعہ اس کے رویے اور اس کی باتوں سے آپ سٹپٹا کے رہ جائیں گے کہ جن باتوں کو ایک معمولی آدمی اپنی فطری بصیرت سے بڑی آسانی سے سمجھ لیتا ہے ایک بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ دانشور جس کی فطرت تعلیم اور ماحول نے بگاڑ دی ہے کبھی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کے خلاف ایسے ایسے دلائل لائے گا کہ آپ حیرانی میں ڈوبتے چلے جائیں گے۔ ان دونوں جشن بہاراں اور بسنت کو ایک تہوار کے طور پر بھی حکومتی سرپرستی میں منایا جا رہا ہے۔ ارباب حل وعقد اور دستر خوانی قبیلے کے دانشور اس کے حق میں وہ وہ دلیلیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے لا رہے ہیں کہ ہر درد رکھنے والا شخص دل تھام کے رہ جاتا ہے اور آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جس قوم کے لیڈ اور فیڈ کرنے والے لوگ اس سطح تک گر جائیں اس قوم کی راہنمائی کا فریضہ کون انجام دے گا اور اس ملک کے مقدر کا کیا بنے گا؟ چند دن پہلے کی بات ہے میرے اہل خانہ نے مجھ سے کہا کہ گزشتہ دو سال ہمارے پڑوسیوں نے بسنت کا تہوار نہیں منایا اس لئے کہ سوئے اتفاق سے دونوں سالوں میں انہیں کوئی نہ کوئی موت کا صدمہ پیش آتا رہا اس لئے انہوں نے اس خوشی کے موقع کو منانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں اس بات پر بہت دیر تک سوچتا رہا کہ ان کے گھروں میں ایک موت واقعہ ہوئی تو انہوں نے بسنت منانے سے انکار کر دیا اور ہم یہ جو جشن بہاراں اور بسنت منا رہے ہیں کیا اس قوم کا ان دنوں کوئی نہیں مرا۔ یہ جو فلسطین میں روزانہ جنازے اٹھتے ہیں، مقبوضہ کشمیر میں ہر روز عزتیں پامال ہوتی ہیں اور کئی نوجوانوں کو خون میں نہلایا جاتا ہے اور ہزاروں ان کے قیدی جیلوں میں سسک

Marfat.com

سسک کر مر رہے ہیں اور ہم نے اپنے پڑوس میں جس طرح مسلمانوں کے خون کو ارزاں کیا ہے اور خود اپنے ملک میں جس طرح راتوں کے اندھیرے میں عزتیں پامال کی جارہی ہیں اور ملک کی آزادی ایک سوالیہ نشان بن کے رہ گئی ہے کیا ان میں سے کوئی غم بھی ہمارے سوچنے کیلئے کافی نہیں ہے؟ اس کے باوجود ہمارے چھوٹے بڑے سمجھ سوچ سے عاری ہوتے جارہے ہیں اور کوئی دلیل کی بات سننے کا روادار نہیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری فطرتیں بگڑ گئی ہوں۔ آج ہی کے اخباروں میں دیکھ لیجئے کہ صرف لاہور میں جو مالی نقصانات ہوئے ان کو تو جانے دیجئے دس افراد موت کی بھینٹ چڑھے اور تین سو آدمی زخمی ہوئے۔ اندازہ فرمایئے! یہ اتنی بڑی قربانی کس عظیم مقصد کیلئے دی گئی ہے اور دوراتیں جس طرح ہلڑبازی میں گزری ہیں اور اس میں جس طرح ڈوپٹے ہوا میں لہراتے رہے اور آنچل نہ جانے کس کس سے ہم آغوش ہوتے رہے اور خصوصی تقریبات میں جس طرح ناؤنوش کی محفلیں گرم ہوئیں اور جس طرح شرم وحیا کا جنازہ نکلا ہے۔ کیا کوئی سوچنے کی زحمت نہیں کرے گا کہ کیا مسلمانوں کے چلن یہی ہوتے ہیں۔ کہیں ہم اللہ کے عذاب کو دعوت تو نہیں دے رہے؟ اگر ان تمام باتوں کے باوجود بھی ہم جشن بہاراں اور بسنت پر اصرار جاری رکھتے ہیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہم اللہ کی غلامی سے نکل کر نجانے کس کس طاغوت کی غلامی میں مبتلا ہورہے ہیں اور غلامی کا طوق پہن لینے کے بعد پھر سوچنے سمجھنے کی قوتیں کام نہیں کیا کرتیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا تھا

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتے ہے قوموں کا ضمیر

اللہ نے جو بے حیائی کی باتیں حرام قرار دی ہیں اور جس کو ہر مسلمان کا زندہ ضمیر پہچانتا ہے ان کے ساتھ یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ وہ صرف کھلی کھلی بے حیائیاں ہی حرام نہیں ہیں بلکہ جو پوشیدہ اور درپردہ بے حیائیاں ہیں وہ بھی حرام ہیں مراد اس سے یہ ہے کہ کھلی بے حیائی تو وہ ہوتی ہے جس کو ہر دیکھنے والی نگاہ دیکھتی اور سننے والے کان سنتے ہیں لیکن بعض بے حیائیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا احساس صرف ان کا ارتکاب کرنے والا ہی رکھتا ہے۔ مثلاً آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''آنکھ بھی زنا کرتی ہے'' آنکھ کا زنا کیا ہے نامحرم کو دیکھنا اور پھر بار بار دیکھنے کی کوشش کرنا اور اس سے ایک لذت لینا اور پھر دل اور دماغ کا زنا یہ ہے کہ منصوبہ بندی کرنے لگنا کہ بار بار دیکھنے کے مواقع کیسے پیدا ہوسکتے ہیں اور کس طرح اس بات کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے اور کونسی صورت ہو کہ ملاقات کا اہتمام ہوسکے تاکہ یہ برائی اپنے منطقی انجام کو پہنچے یہ پورا پراسس جو برائی کی تکمیل تک جاری رہتا ہے اسے سوائے کرنے والے کے اور کوئی نہیں جانتا۔ دوسروں کو کیا خبر کہ نگاہیں کس کے تعاقب میں ہیں اور دل ودماغ میں کون بسا ہوا ہے اور کس گناہ کی منصوبہ بندی ہورہی ہے یہ وہ خفیہ اور پوشیدہ بے حیائی ہے جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی برائی ہو یا نیکی اس کا اصل سرشتہ اور اس کی جڑ وہ آنکھوں یا کانوں میں نہیں ہوتی وہ دماغ اور دل میں ہوتی ہے جب تک کوئی برائی دل میں اپنا مسکن نہیں بنالیتی اس وقت تک اس کے اثرات متعدی نہیں ہوتے۔ اگر آنکھوں میں کوئی لہر پیدا ہوتی بھی ہے تو چند لمحوں کے بعد غائب ہوجاتی ہے لیکن اگر اس برائی کی جڑیں دل میں اتر جاتی ہیں تو پھر اندیشے پیدا ہونے لگتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ کوئی شخص کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اس سے تائب ہوجاتا ہے لیکن اس برائی کا احساس اس کے دل سے نکلنے نہیں پاتا چنانچہ باہر کے عوامل دل کے اس احساس کو توانا کرتے رہتے ہیں پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ اظہار کی صورت بھی پیدا کرلیتا ہے تو اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ پوشیدہ بے حیائی وہ ہے جو دل میں جگہ بنالے یا دل میں باقی رہے بے شک باہر سے اس کے رشتے کٹ گئے ہوں۔ اللہ نے اسے بھی حرام قرار دیا ہے کہ جب تک تم دل کی پاکیزگی کا سامان نہیں کروگے اس وقت تک بے حیائی سے بچ نہیں سکوگے۔ دوسری چیز جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے وہ ہے اثم۔ اس کا معنی ہے کوتاہی آثمہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز چل سکتی ہو مگر جان بوجھ کر سست چلے۔ اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہوم پیدا ہوا

Marfat.com

یعنی انسان کا اپنے رب کی اطاعت وفرمانبرداری میں قدرت واستطاعت کے باوجود کوتاہی کرنا اور اس کی رضا کو پہنچنے میں جان بوجھ کر قصور دکھانا۔ بعض احکام ایسے ہیں جن کے بجالانے کی آدمی میں ہمت نہیں ہوتی یا کسی عارضے کے باعث ہمت باقی نہیں رہتی اس میں کوتاہی ہو جانا یہ تو ایک عذر ہے لیکن جس حکم کی تعمیل کی آدمی میں ہمت ہو اور اس کے اسباب بھی میسر ہوں پھر آدمی اس میں کوتاہی کرے یہ گناہ ہے۔ کبھی یہ گناہ چھوٹا ہوتا ہے اور کبھی بڑا مثلاً گناہ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ پڑوس میں کوئی شخص بیمار تھا میں نے اس کی تیمارداری نہیں کی اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ جان بہ لب تھا مجھ سے کہا گیا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے آپ گاڑی نکالیئے اسے ہسپتال لیکر جانا ہے میں نے کوئی بہانہ کر دیا اور وہ شخص مر گیا یہ وہ گناہ ہے جو پہلے گناہ سے بہت بڑا ہے۔ اسی پر آپ قیاس کرتے چلے جایئے کہ یہ سارے گناہ کوتاہی عمل کا نتیجہ ہیں لیکن اپنے نتائج کے اعتبار سے یکساں نہیں اس لئے ان کو گناہ صغیرہ اور گناہ کبیرہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

تیسری چیز جس کو حرام کیا گیا ہے وہ ہے اَلْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ اس کا معنی ہے تعدی اور سرکشی۔ یعنی اللہ نے ایک مومن کی زندگی میں حدود کھینچ دی ہیں کہ تم ان حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتے وہ خالق کائنات کا ممنوعہ علاقہ ہے مثلاً تم ہر چیز کھا سکتے ہو مگر حرام چیز نہیں کھا سکتے یہ تمہارے کھانے پینے کے ذوق کی آخری حد ہے اس سے آگے نہ بڑھنا۔ یہی حال تمام احکام شریعت کا ہے کوئی آدمی یا کوئی قوم اگر حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب کرنے لگتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حد سے تجاوز کر رہی ہے۔ انہوں نے ایمان لا کر اللہ کی اطاعت اور بندگی کا عہد کیا تھا وہ نافرمانی کی صورت میں اس عہد کو توڑ کر حدود سے تجاوز کر رہی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی قوم صرف محرمات شرعیہ کا ارتکاب ہی نہ کرے بلکہ قانون سازی کرتے ہوئے سراسر اللہ کے قانون اور احکام کو نظر انداز کر دے یا پالیسی بناتے ہوئے اور منصوبہ بندی کرتے ہوئے قطعاً اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ اس بارے میں اللہ کے احکام کیا ہیں؟ یہ سرکشی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بغی کا ارتکاب کرنے والا کبھی تو محض ایک بے عملی کا ارتکاب کرتا ہے اور کبھی وہ بغاوت کا ارتکاب کرتا ہے جب وہ بندگی کی حد سے نکل کے اللہ کے ملک میں خود مختارانہ رویہ اختیار کرتا ہے یا خدا کی خدائی میں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجانے لگتا ہے اور اسی طرح وہ شخص بھی جو بندگان خدا کے حقوق پر دست درازی کرنے لگتا ہے۔

البَغْیَ کے ساتھ جو بِغَیْرِ الْحَقِّ کی قید لگائی گئی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی تعدی اور سرکشی حق بھی ہوتی ہے بلکہ یہ قید صرف اس جرم کی شناعت اور گھناؤنے پن کو نمایاں کرنے کیلئے ہے جیسا قرآن پاک میں یہود کے جرائم کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ نبیوں کو بغیر الحق قتل کرتے تھے حالانکہ کسی نبی کو قتل کرنا حق نہیں ہو سکتا۔ مراد یہ ہے کہ وہ ایک بہت برے فعل کا ارتکاب کرتے تھے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی اور اللہ کے مقابلے میں اپنی بندگی کی حدود سے تجاوز یہ بِغَیْرِ الْحَقِّ کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا یعنی ایک بندے کا دوسرے بندے سے معاملہ چاہے کتنا بھی غلط ہو اس بات کا بہر حال امکان رہتا ہے کہ شاید اس میں حق کا کوئی پہلو پایا جاتا ہو لیکن جہاں تک اللہ کے مقابلے میں سرکشی اور تعدی کا تعلق ہے اس میں تو ایسے کسی امکان کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا اس لئے اسے بِغَیْرِ الْحَقِّ سے تعبیر کیا گیا۔

چوتھی چیز جو اس آیت کریمہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک ٹھہراؤ۔ شریک ٹھہرانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی ذات اس کی صفات اس کے حقوق اور اس کے اختیارات میں کسی دوسرے کو شریک کر دیا جائے یعنی یہ سمجھا جائے کہ جیسی اللہ کی ذات ہے ویسا کوئی اور بھی ہے یا جیسے اس کی خصوصی صفات ہیں ایسی ہی صفات کسی اور میں بھی ہیں یا جیسے اس کے حقوق اس کے بندوں پر ہیں ایسے ہی کسی اور کے حقوق بھی ہیں اور یا جیسے وہ اختیارات رکھتا ہے ایسے ہی اختیارات کسی اور کو بھی حاصل ہیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی اختیار کی جائے وہ اللہ کے ساتھ شرک ہے۔ اللہ کی

Marfat.com

ذات میں شرک تو بہت کم ہوا ہے البتہ باقی تینوں طرح کے شرک ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔ امت مسلمہ جو توحید کی قیامت تک کیلئے علمبردار بنائی گئی ہے اس کا بھی حال یہ ہے کہ اللہ کا یہ حق کہ وہ اپنے بندوں پر مطلق العنان حاکم ہے اور غیر مشروط اطاعت اس کا حق ہے اسی طرح اختیارات اور قدرتوں میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ جس طرح اس کے سوا کسی اور کو سجدہ روا نہیں اسی طرح اس کے سوا کسی اور کی غیر مشروط اطاعت اور کسی اور کی محبت سے دل کو آباد کرنا اور کسی اور کی قدرت کو بے پناہ سمجھ کر مرعوب ہو جانا اور بجائے اس کو سہارا جاننے کے کسی اور قوت کو اپنا سہارا سمجھ لینا اور بجائے اس کے قانون کو اپنا قانون بنانے کے کسی اور وضعی قانون کو اپنا قانون بنانا اور اپنے ملک میں اس کو نافذ کر دینا یہ شرک کی چند در چند صورتیں ہیں جس کا آج بھی پورے عالم اسلام میں ارتکاب کیا جا رہا ہے اور اسی وجہ سے امت مسلمہ تاریخ کے بدترین حالات کا سامنا کر رہی ہے۔

ساتھ ہی اس کے یہ بھی فرمایا جا رہا ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند اور کوئی دلیل نہیں اتاری۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جہاں تک اللہ کو ماننے کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا ایک بدیہی تقاضہ ہے اور مشرک بھی اللہ کو مانتا ہے لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اللہ کا کوئی شریک بھی ہے تو اس کیلئے دلیل کی ضرورت ہے اور دلیل بھی ایسی جو برہان یعنی ایک حجت قاطع کی حیثیت رکھتی ہو۔ اس لئے کہ خدا کی خدائی میں یوں ہی کسی کو جوڑ دینا سارے نظام عقل و فطرت اور پورے نظام عدل و قسط کو درہم برہم کر دینا ہے۔ اتنی بڑی بات بغیر اس کے مان لینے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ اللہ نے اس کی کوئی نقلی، عقلی یا فطری دلیل اتاری ہو۔

پانچویں چیز جو حرام کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اللہ کے بارے میں کوئی ایسی بات کہو جو تم نہیں جانتے ہو یعنی تم اپنی مرضی سے حلت و حرمت کا فیصلہ کرنے لگو اور اپنی خواہشوں کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کر ڈالو اور ہو سکے تو پوری نئی شریعت تصنیف کر ڈالو لیکن دعویٰ یہ کرو کہ یہ سب کچھ ہمیں خدا نے حکم دیا ہے حالانکہ تم اللہ کی جانب سے ایسا کوئی علم نہیں رکھتے کیونکہ مشرکین مکہ کے پاس کسی شریعت کا علم محفوظ نہیں تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ لوگ مانتے تھے لیکن ان پر جو صحیفے نازل ہوئے ان میں سے کچھ بھی ان کے پاس موجود نہیں تھا اس کے باوجود یہ جتنے مشرکانہ اعمال کرتے تھے سب کی نسبت اللہ کی طرف کرتے تھے جس طرح گزشتہ رکوع میں ہم نے پڑھا ہے کہ وہ اپنی تمام بداعمالیوں کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے تو یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اے پیغمبر ان سے کہو کہ اللہ نے جو چیزیں تم پر حرام کی ہیں ان میں سے یہ ایک بات بھی ہے کہ تم اللہ پر اس طرح جھوٹ باندھنے لگو اور جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرنے لگو۔

اگلی آیت کریمہ میں وارننگ دی جا رہی ہے کہ آج جبکہ اللہ کے آخری نبی تم میں آ چکے ہیں اور قرآن کریم نازل ہو رہا ہے اور ایک ایک بات پر کھول کھول کر بیان کی جا رہی ہے لیکن تم ایمان لانے کیلئے تیار نہیں ہو تو پھر سوچ لو کہ تمہارا انجام آخر کیا ہوگا؟

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ O

''ہر قوم کیلئے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے۔ پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی''۔ 34

اس رکوع کا آغاز مشرکینِ مکہ پر عتاب سے ہوا ہے ان سے برہمی کے انداز میں ایک سوال کیا گیا ہے کہ اس سوال کے جواب پر تمہاری زندگی کا مدار ہے اور پھر ان کی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے صحیح راستہ ان پر واضح کیا گیا ہے اب انہیں آخری وارننگ دی جا رہی ہے تم یہ مت سمجھو کہ جس طرح تم اب تک اللہ کی گرفت سے بچے ہوئے ہو اسی طرح بچے رہو گے۔ یہ فی الحقیقت تمہیں ایک مہلت عمل دی گئی ہے لیکن قوانین

Marfat.com

کو دی جانے والی مہلت ہمیشہ کیلئے نہیں ہوتی جس طرح افراد کیلئے زندگی کی ایک مدت مقرر ہے انہیں بہرصورت اس مدت کے بعد موت کا شکار ہونا ہے اسی طرح قوموں کیلئے بھی مہلت عمل کی ایک مدت مقرر ہے جب قومیں اپنی اس مدت تک پہنچ جاتی ہیں تو پھر قدرت انہیں مٹا دیتی ہے اور ان کی جگہ دوسری قومیں لائی جاتی ہیں اور انہیں اس دارالامتحان میں امتحان کیلئے بٹھا دیا جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ قوموں کیلئے مقررہ مہلت عمل کیا ہے تو اس کا تعین مہینوں اور سالوں سے نہیں ہوتا جس طرح ہر فرد کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ سالوں کے اعتبار سے ایک عمر گزارتا ہے لیکن قومیں بعض دفعہ صدیوں تک بھی زندہ رہتی ہیں ان کا دارومدار ان کی ایمانی اور اخلاقی زندگی پر ہوتا ہے ان کیلئے ایک اخلاقی حد مقرر کر دی جاتی ہے جس کا علم سراسر اللہ کو ہوتا ہے جب تک وہ اپنی بداعمالیوں کے باعث اس اخلاقی حد سے نیچے نہیں گرتیں اس وقت تک انہیں اس میدان عمل سے واپس نہیں بلایا جاتا اور انہیں برابر موقع دیا جاتا ہے کہ اب بھی سنبھلنا چاہو تو سنبھل جاؤ۔ کبھی سمجھانے والے ان کی طرف بھیجے جاتے ہیں' کبھی مختلف حوادث کی صورت میں انہیں تنبیہات کی جاتی ہیں' کبھی باہر کی قومیں ان پر چڑھ دوڑتی ہیں اور اس طرح ان کو سنبھلنے پر مجبور کیا جاتا ہے لیکن جب وہ تنزل کے گڑھے میں گرتی چلی جاتی ہیں اور ان کے خیر کے سوتے آہستہ آہستہ خشک ہونے لگتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ان پر نازل ہوتا ہے اور وہ تباہ کر دی جاتی ہیں اس لئے کسی بھی قوم کو اگر یہ اندازہ کرنا ہو کہ میری مہلت عمل باقی ہے یا قریب الاختتام ہے تو اسے اپنی ایمانی اور اخلاقی حالت کا جائزہ لینا چاہئے۔ قرآنِ کریم نے مختلف قوموں کی مثالیں دے کر ہمیں اس بات کو سمجھنے میں مدد دی ہے البتہ ایک بات بار بار واضح کی گئی ہے کہ کوئی قوم بھی حادثاتی طور پر نہیں مرتی کیونکہ یہ کائنات اللہ کے زیرِ نگرانی محوِ سفر ہے یہاں ازخود کوئی حادثہ نہیں ہوتا۔ جب بھی کوئی قوم اللہ کی گرفت میں آتی ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ ہم اسے اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑتے ہیں اس لئے جس قوم کو اپنی زندگی اور اپنی بہتری مقصود ہو اسے اپنی اخلاقی حالت کے بارے میں غیر جانبدارانہ جائزہ لینا چاہئے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں قوم کی اخلاقی حالت کس سطح پر ہے۔ قوم کے حکمران' انتظامیہ' سیاست دان' تعلیم یافتہ طبقہ' مذہبی علماء' تاجر' کاشتکار' ملوں اور کارخانوں کے مزدور اور تعلیمی اداروں سے متعلق لوگ ایک ایک شعبہ زندگی کو گہری نظر سے دیکھا جائے' ان میں اخلاقی توانائی باقی ہے یا دم توڑ رہی ہے اس سے اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ یہاں بھی مشرکین مکہ سے صاف فرمایا جا رہا ہے کہ تم ہمیشہ باقی نہیں رہو گے ہر قوم کی طرح تمہاری بھی ایک مہلت عمل ہے اور ہم نے اس کی ایک مدت مقرر کر رکھی ہے تم اگر یہ چاہتے ہو کہ وہ مدت تمہاری دراز ہوتی جائے تو پھر اچھی طرح اپنا جائزہ لے کر اپنی اصلاح کی کوشش کرو۔ اللہ کا نبی تمہیں حق کی طرف بلا رہا ہے اس کی بات کو قبول کرو اور اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنی زندگی بچا لو اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو یاد رکھو جب وہ مقررہ مدت یعنی اجل آ جائے گی تو پھر نہ وہ آگے ہوگی نہ پیچھے ہوگی یعنی پھر تمہیں ایک لمحہ بھی سنبھلنے کیلئے نہیں ملے گا اور یہ بات تم سے کوئی پہلی دفعہ نہیں کہی جا رہی جب ہم نے تمہارے والدین یعنی حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کو دنیا میں بھیجا تھا تو ہم نے یہی بات ان سے بھی کہی تھی آج پھر تم سے کہہ رہے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جس پر عمل کرنے سے تم ایک آبرومندانہ زندگی گزار سکتے ہو چنانچہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں' جو تمہیں میری آیات سنائیں تو جو کوئی نافرمانی سے بچا اور اس نے اپنی اصلاح کر لی تو ان کیلئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان سے اعراض کیا' وہی ہیں دوزخ والے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔ 35-36

Marfat.com

دنیا و عقبیٰ میں امان اللہ کی فرمانبرداری میں ہے:

یہ وہ بات ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجتے ہوئے فرمائی گئی اور پھر ہر رسول نے اس کا اعادہ کیا۔ اب رسول اللہ ﷺ اسی بات کی یاد دہانی فرما رہے ہیں کہ اے مشرکینِ مکہ اگر تم اللہ کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ تمہاری غذائی ضرورتوں کا سامان تو اللہ نے زمین میں رکھا ہے لیکن تمہاری زندگی گزارنے کی راہنمائی وہ اللہ کی طرف سے آتی ہے چنانچہ وہ راہنمائی تمہارے پاس آ چکی۔ اللہ کی کتاب اتر رہی ہے میں مینارۂ نور کی طرح تمہارے اندر موجود ہوں تم میری دعوت کو قبول کرو۔ اپنے انجام سے اور اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اعمال کو درست کر لو تو پھر یہ زندگی بھی تمہاری ہے اور آخرت بھی تمہاری۔ لیکن اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا بلکہ تم نے تکبر کی روش اختیار کی اور مسلسل اس سے اعراض برتا تو پھر یاد رکھو یہاں بھی تم پر عذاب آ سکتا ہے اور آخرت میں بھی تمہیں جہنم کا ایندھن بننا ہوگا۔

زندگی کے سفر کو آسان کرنے کیلئے اس سے واضح راہنمائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس طرح قدم قدم ان آیات میں مشرکینِ مکہ کو راہنمائی دی جا رہی ہے ایسا لگتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں جنت میں لے جانا چاہتے ہیں لیکن اگر وہ پھر بھی اپنی روش سے باز نہیں آتے تو پھر ان سے آخری سوال کیا جا رہا ہے کہ تم ہی بتاؤ اس روش کے نتیجے میں جو کچھ تم پر گزرنے والی ہے اس کی ذمہ داری آخر کس پر ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ○ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِى النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۵ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ○ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ○

"تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا' جو بالکل جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کریں یا اللہ کی سچی آیات کو جھٹلائیں؟ ان لوگوں کو ان کے نوشتہ کا حصہ پہنچے گا' یہاں تک کہ وہ گھڑی آ جائے کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کیلئے آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے تھے' کہاں ہیں؟ وہ جواب دیں گے' وہ تو سب ہم سے گم ہو گئے اور یہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ' وہ واقعی منکرِ حق تھے۔ اللہ فرمائے گا' جاؤ! تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ' ان امتوں کے ساتھ' جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے گزریں۔ ہر گروہ' جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے ساتھی گروہ پر لعنت کرے گا۔ یہاں تک کہ جب سب اس میں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب! یہی لوگ ہیں' جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا' ان کو دوہرا عذاب نار دیجئے۔ ارشاد ہوگا! تم سب کیلئے دوہرا عذاب ہے' مگر تم جانتے نہیں ہو۔ اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے! تم کو بھی ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوئی' تم بھی اپنے کیے کی پاداش میں عذاب چکھو"۔ 39-38-37

Marfat.com

اللہ پر جھوٹ باندھنے اور اس کی آیات کی تکذیب کا انجام:

مشرکین مکہ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اتنی واضح ہدایات کے بعد بھی جو شخص اللہ پر جھوٹ باندھے یعنی اس کی نازل کردہ ہدایت کو قبول کرنے کی بجائے خود ایک شریعت تصنیف کرے اور پھر اللہ کی طرف اس کو منسوب کرے کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے۔ فرمایا تم بتاؤ کہ ایسے شخص یا ایسی قوم سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے کہ اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کے اس رویے کے نتیجے میں اس کی دنیا بھی برباد ہو جائے گی اور آخرت بھی جہاں تک اس چندروزہ زندگی کا تعلق ہے وہ تو یہ نوشتۂ تقدیر کے مطابق گزار ہی لیں گے لیکن انہیں اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ جن نام نہاد شریکوں کے ذریعے تم اللہ کے عذاب سے بے نیاز ہو گئے ہو جب تمہاری جان نکالنے والے فرشتے تمہارے پاس آئیں گے تو وہ تمہیں سب سے پہلے یہی پوچھیں گے کہ بتاؤ وہ تمہارے شرکاء کہاں ہیں اب ہم تمہاری گرفتاری کیلئے آ گئے ہیں انہیں آواز دو وہ تمہیں بچائیں۔ کہا اس دن یہ لوگ جو آج بات سننے کے روادار نہیں ہیں اس دن صاف اعتراف کریں گے کہ آج ہمارا کوئی مددگار نہیں ہم واقعی آج تک کفر کا ارتکاب کرتے رہے۔ جب اس طرح وہ اپنی بے بسی کا اعتراف کریں گے تو اللہ تعالیٰ نہایت بے التفاتی کے ساتھ حکم دیں گے کہ جاؤ ان گروہوں میں شامل ہو جاؤ جو تمہارے جیسے جرم کی وجہ سے تمہارے جیسے انجام سے دوچار ہونے والے ہیں اور تمہارا انجام یہ ہے کہ تم اگلے اور پچھلے سارے جہنم میں پہنچ جاؤ۔ کہا جب یہ اپنے آگے آگے جانے والے اور جہنم کی طرف بڑھنے والے کفار کو دیکھیں گے اور ان میں ان کو وہ لوگ بھی نظر آئیں گے جن میں ان کے سیاسی لیڈر بھی ہوں گے' ان کے نام نہاد مذہبی راہنما بھی اور ان کے جھوٹے پیر بھی ہوں گے جو بڑے بزرگوں کے نام پر جعلی پیری کا ڈھونگ رچاتے رہے اور ان لوگوں سے یہ کہتے رہے کہ احکام شریعت پر عمل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تمہیں بخشوانے کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں۔ تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں دیکھتے ہی یہ لوگ سرتاپا غضب بن کر ان کی طرف لپکیں گے اور اللہ سے التجا کریں گے کہ یا اللہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں بگاڑا تھا اور آج یہ لوگ ہماری بات سننے کے روادار نہیں۔ پس آپ انہیں دوہرا عذاب دیجئے۔ ایک ان کے خود بگڑنے کا اور دوسرا ان کو دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔ وہ جواب میں ان سے یہ کہیں گے کہ ہم نے تمہیں کوئی مجبور تو نہیں کیا تھا تم اگر چاہتے تو ہماری پیروی سے انکار کر سکتے تھے اور مزید یہ بات بھی کہ اگر ہم نے راہِ راست سے بھٹک کر اپنی عاقبت تباہ کی اور تمہیں بھی تباہ کیا تو تم نے بھی تو صحیح راستہ اختیار کرنے کی کوشش نہ کی تمہاری وجہ سے بھی نجانے کتنے لوگ گمراہ ہوئے اس لئے ایک دوسرے پر الزام دھرنے سے کوئی فائدہ نہیں اب تو ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اللہ کی طرف سے جواب آئے گا کہ تم سب کو دگنا عذاب دیا جائے گا لیکن تم نہیں جانتے کہ تم دگنے عذاب کے مستحق کیوں ہو؟ اس کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب تفہیم القرآن نے جو کچھ لکھا ہے ہم چاہتے ہیں آپ بھی اسے پڑھیں۔

''بات یہ ہے کہ تم میں سے ہر گروہ کسی کا خلف تھا تو کسی کا سلف بھی تھا۔ اگر کسی گروہ کے اسلاف نے اس کے لئے فکر و عمل کی گمراہیوں کا ورثہ چھوڑا تھا تو خود وہ بھی اپنے اخلاف کیلئے ویسا ہی ورثہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوا۔ اگر ایک گروہ کے گمراہ ہونے کی کچھ ذمہ داری اس کے اسلاف پر عائد ہوتی ہے تو اس کے اخلاف کی گمراہی کا اچھا خاصا بار خود اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا کہ ہر ایک کیلئے دوہرا عذاب ہے۔ ایک عذاب خود گمراہی اختیار کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔ ایک سزا اپنے جرائم کی اور دوسری سزا دوسروں کیلئے جرائم پیشگی کی میراث چھوڑ آنے کی۔''

حدیث میں اسی مضمون کی توضیح یوں بیان فرمائی گئی ہے کہ

من ابتدع بدعة ضلالة لا یرضاها الله و رسوله کان علیه من الاثم مثل اثامه من عمل بها لا ینقص ذالک من اوزارهم شیئا

Marfat.com

یعنی جس نے نئی گمراہی کا آغاز کیا جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ناپسندیدہ ہو تو اس پر ان سب لوگوں کے گناہ کی ذمہ داری عائد ہوگی جنہوں نے اس کے نکالئے ہوئے طریقہ پر عمل کیا بغیر اس کے کہ خود ان عمل کرنے والوں کی ذمہ داری میں کوئی کمی ہو۔

دوسری حدیث میں ہے

لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن ادم الاول کفل من دمها لانه اول من سن القتل

یعنی دنیا میں جو انسان بھی ظلم کے ساتھ قتل کیا جاتا ہے اس کے خون ناحق کا ایک حصہ آدم کے اس پہلے بیٹے کو پہنچتا ہے جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا

کیونکہ قتلِ انسان کا راستہ سب سے پہلے اسی نے کھولا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یا گروہ کسی غلط خیال یا غلط رویہ کی بناڈالتا ہے وہ صرف اپنی ہی غلطی کا ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ دنیا میں جتنے انسان اس سے متاثر ہوتے ہیں ان سب کے گناہ کی ذمہ داری کا بھی ایک حصہ اس کے حساب میں لکھا جاتا رہتا ہے اور جب تک اس کی اس غلطی کے اثرات چلتے رہتے ہیں اس کے حساب میں ان کا اندراج ہوتا رہتا ہے نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کا صرف اپنی ذات کی حد تک ہی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی جواب دہ ہے کہ اس کی نیکی یا بدی کے کیا اثرات دوسروں کی زندگیوں پر مرتب ہوئے۔

مثال کے طور پر ایک زانی کو لیجیے جن لوگوں کی تعلیم و تربیت سے، جن کی صحبت کے اثر سے، جن کی بری مثالیں دیکھنے سے اور جن کی ترغیبات سے اس شخص کے اندر زناکاری کی صفت نے ظہور کیا وہ سب اس کے زناکار بننے میں حصہ دار ہیں اور خود ان لوگوں نے اوپر جہاں جہاں سے اس بدنظری و بدنیتی اور بدکاری کی میراث پائی ہے وہاں تک اس کی ذمہ داری پہنچتی ہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ اس اولین انسان پر منتہی ہوتا ہے جس نے سب سے پہلے نوع انسانی کو خواہش نفس کی تسکین کا یہ غلط راستہ دکھایا۔ یہ اس زانی کے حساب کا وہ حصہ ہے جو اس کے ہم عصروں اور اس کے اسلاف سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر وہ خود بھی اپنی زناکاری کا ذمہ دار ہے۔ اس کو بھلے اور برے کی جو تمیز دی گئی تھی اس میں ضمیر کی جو طاقت رکھی گئی تھی اس کے اندر ضبط نفس کی جو قوت ودیعت کی گئی تھی اس کو نیک لوگوں سے خیر و شر کا جو علم پہنچا تھا اس کے سامنے اخیار کی جو مثالیں موجود تھی اس کو صنفی بدعملی کے برے نتائج سے جو واقفیت تھی ان میں سے کسی چیز سے بھی اس نے فائدہ نہ اٹھایا اور اپنے آپ کو نفس کی اس اندھی خواہش کے حوالے کر دیا جو صرف اپنی تسکین چاہتی تھی خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو۔ یہ اس کے حساب کا وہ حصہ ہے جو اس کی اپنی ذات سے تعلق رکھتا ہے پھر یہ شخص اس بدی کو جس کا اکتساب اس نے کیا اور جسے خود اپنی سعی سے وہ پرورش کرتا رہا، دوسروں میں پھیلانا شروع کرتا ہے۔ کسی مرض خبیث کی چھوت کہیں سے لگالاتا ہے اور اسے اپنی نسل میں اور خدا جانے کن کن نسلوں میں پھیلا کر نہ معلوم کتنی زندگیوں کو خراب کر دیتا ہے۔ کہیں اپنا نطفہ چھوڑ آتا ہے اور جس بچہ کی پرورش کا بار اسے خود اٹھانا چاہئے تھا اسے کسی اور کی کمائی کا ناجائز حصہ دار اس کے بچوں کے حقوق میں زبردستی کا شریک، اس کی میراث میں ناحق کا حقدار بنا دیتا ہے اور اس حق تلفی کا سلسلہ نہ معلوم کتنی نسلوں تک چلتا رہتا ہے۔ کسی دوشیزہ لڑکی کو پھسلا کر بداخلاقی کی راہ پر ڈالتا ہے اور اس کے اندر وہ بری صفات ابھار دیتا ہے جو اس سے منعکس ہو کر نہ معلوم کتنے خاندانوں اور کتنی نسلوں تک پہنچتی ہیں اور کتنے گھر بگاڑ دیتی ہیں۔ اپنی اولاد، اپنے اقارب، اپنے دوستوں اور اپنی سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے سامنے اپنے اخلاق کی ایک بری مثال پیش کرتا ہے اور نہ معلوم کتنے آدمیوں کے چال چلن خراب کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ جس کے اثرات بعد کی نسلوں میں مدتہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں یہ سارا فساد جو اس شخص نے سوسائٹی میں برپا کیا، انصاف چاہتا ہے کہ یہ بھی اس کے حساب میں لکھا جائے اور اس وقت

Marfat.com

تک لکھا جاتا رہے جب تک اس کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کا سلسلہ دنیا میں چلتا رہے۔

اسی پر نیکی کو بھی قیاس کر لینا چاہئے۔ جو نیک ورثہ اپنے اسلاف سے ہم کو ملا ہے اس کا اجر ان سب لوگوں کو پہنچنا چاہئے جو ابتدائے آفرینش سے ہمارے زمانہ تک اسکے منتقل کرنے میں حصہ لیتے رہے ہیں پھر اس ورثہ کو لے کر اسے سنبھالنے اور ترقی دینے میں جو خدمت ہم انجام دیں گے اس کا اجر ہمیں بھی ملنا چاہئے۔ پھر اپنی سعی خیر کے جو نقوش و اثرات ہم دنیا میں چھوڑ جائیں گے انہیں بھی ہماری بھلائیوں کے حساب سے اس وقت تک برابر درج ہوتے رہنا چاہئے جب تک یہ نقوش باقی رہیں اور ان کے اثرات کا سلسلہ نوع انسانی میں چلتا رہے اور ان کے فوائد سے خلق خدا متمتع ہوتی رہے۔

جزا کی یہ صورت جو قرآن پیش کر رہا ہے ہر صاحب عقل انسان تسلیم کرے گا کہ صحیح اور مکمل انصاف اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس سے ان لوگوں کی غلط فہمیاں بھی دور ہو سکتی ہیں جنہوں نے جزا کیلئے اسی دنیا کی موجودہ زندگی کو کافی سمجھ لیا ہے اور ان لوگوں کی غلط فہمیاں بھی جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ انسان کو اس کے اعمال کی پوری جزاء تناسخ کی صورت میں مل سکتی ہے۔ دراصل ان دونوں گروہوں نے نہ تو انسانی اعمال اور ان کے اثرات و نتائج کی وسعتوں کو سمجھا ہے اور نہ منصفانہ جزا اور اس کے تقاضوں کو ایک انسان آج اپنی پچاس ساٹھ سال کی زندگی میں جو اچھے یا برے کام کرتا ہے ان کی ذمہ داری میں نہ معلوم اوپر کی کتنی نسلیں شریک ہیں جو گزر چکیں اور آج یہ ممکن نہیں کہ انہیں اس کی جزاء یا سزا پہنچ سکے پھر اس شخص کے یہ اچھے یا برے اعمال جو وہ آج کر رہا ہے اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جائیں گے بلکہ ان کے اثرات کا سلسلہ آئندہ صدہا برس تک چلتا رہے گا' ہزاروں' لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں تک پھیلے گا اور اس کے حساب کا کھاتہ اس وقت تک کھلا رہے گا جب تک یہ اثرات چل رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ آج ہی اس دنیا کی زندگی میں اس شخص کو اس کے کسب کی پوری جزا مل جائے درآں حالے کہ ابھی اسکے کسب کے اثرات کا لاکھواں حصہ بھی رونما نہیں ہوا ہے۔ پھر اس دنیا کی محدود زندگی اور اس کے محدود امکانات سرے سے اتنی گنجائش ہی نہیں رکھتے کہ یہاں کسی کو اس کے کسب کا پورا بدلہ مل سکے۔ آپ کسی ایسے شخص کے جرم کا تصور کیجئے جو مثلاً دنیا میں ایک جنگ عظیم کی آگ بھڑکاتا ہے اور اس کی اس حرکت کے بے شمار برے نتائج ہزاروں برس تک اربوں انسانوں تک پھیلتے ہیں۔ کیا کوئی بڑی سے بڑی جسمانی' اخلاقی' روحانی' یا مادی سزا بھی' جو اس دنیا میں دی جانی ممکن ہے' اس کے اس جرم کی پوری منصفانہ سزا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح کیا دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انعام بھی جس کا تصور آپ کر سکتے ہیں کسی ایسے شخص کیلئے کافی ہو سکتا ہے جو مدۃ العمر نوع انسانی کی بھلائی کیلئے کام کرتا رہا ہو اور ہزاروں سال تک بے شمار انسان جس کی سعی کے ثمرات سے فائدہ اٹھائے چلے جا رہے ہوں۔ عمل اور جزاء کے مسئلے کو اس پہلو سے جو شخص دیکھے گا اسے یقین ہو جائے گا کہ جزا کیلئے ایک دوسرا ہی عالم درکار ہے جہاں تمام اگلی اور پچھلی نسلیں جمع ہوں' تمام انسانوں کے کھاتے بند ہو چکے ہوں' حساب کرنے کیلئے ایک علیم و خبیر خدا انصاف کی کرسی پر متمکن ہو اور اعمال کا پورا بدلہ پانے کیلئے انسان کے پاس غیر محدود زندگی اور اس کے گردوپیش جزا و سزا کے غیر محدود امکانات موجود ہوں۔

پھر اسی پہلو پر غور کرنے سے اہل تناسخ کی ایک اور بنیادی غلطی کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے جس میں مبتلا ہو کر انہوں نے آواگون کا چکر تجویز کیا ہے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھے کہ صرف ایک ہی مختصری پچاس سالہ زندگی کے کارنامے کا پھل پانے کیلئے اس سے ہزاروں گنی زیادہ طویل زندگی درکار ہے' کجا کہ اس پچاس سالہ زندگی کے ختم ہوتے ہی ہماری ایک دوسری اور پھر تیسری ذمہ دارانہ زندگی اسی دنیا میں شروع ہو جائے اور ان زندگیوں میں بھی ہم مزید ایسے کام کرتے چلے جائیں جن کا اچھا یا برا پھل ہمیں ملنا ضروری ہو۔ اس طرح تو حساب بے باق ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھتا ہی چلا جائے گا اور اس کے بے باق ہونے کی نوبت کبھی آ ہی نہ سکے گی۔

Marfat.com

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ
السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ
وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾ لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ
فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٤٢﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ
غِلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي
هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ لَقَدْ جَاءَتْ
رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَنُودُوا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنْ قَدْ
وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ
حَقًّا قَالُوا نَعَمْ فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى
الظَّالِمِينَ ﴿٤٤﴾ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا
وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ ﴿٤٥﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ
رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ

Marfat.com

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

بے شک! جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا' ان کیلئے آسمان کے دروازے ہرگز نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے' یہاں تک کہ گھس جائے اونٹ سوئی کے ناکے میں۔ ہم اسی طرح مجرموں کو بدلہ دیتے ہیں۔ ان کیلئے جہنم ہی کا بچھونا اور اوپر سے اسی کا اوڑھنا ہوگا اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کئے' ہم کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے' وہی جنت والے ہیں' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان کے سینے کی ہر خلش ہم نکال دیں گے' ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے! تعریف ہے اس اللہ کیلئے' جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا۔ اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ بخشی ہوتی تو ہم تو ہدایت پانے والے نہ بنتے۔ ہمارے رب کے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے۔ ان کو پکارا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے' جس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے ہو۔ اور جنت والے' دوزخ والوں کو پکار کر پوچھیں گے کہ ہم سے جو کچھ ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا' ہم نے اس کو بالکل سچا پایا۔ کیا تم نے بھی' جو کچھ تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا' اس کو سچا پایا؟ وہ جواب دیں گے، ہاں۔ پھر ایک منادی کرنے والا ان کے بیچ میں پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ان ظالموں پر۔ جو اللہ کی راہ سے روکتے اور ان میں کجی پیدا کرنا چاہتے تھے اور وہ آخرت کے منکر تھے۔ اور ان دونوں گروہوں کے درمیان پردے کی دیوار ہوگی اور دیوار کی بلندیوں پر کچھ لوگ ہوں گے' جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر۔ یہ لوگ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے' مگر اس کے امیدوار ہوں گے۔ اور جب ان کو اہل دوزخ کی طرف توجہ دلائی جائے گی تو وہ کہیں گے' اے رب! ہمیں ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجئے۔

..............☆......☆......☆..............

چند آیات پیشتر ایک عہد و میثاق کا ذکر ہے جو حضرت آدم اور ان کی اولاد سے اس وقت لیا گیا تھا جب انہیں زمین پر بھیجا گیا تھا اس میں یہ فرمایا گیا تھا کہ تم زمین پر چلے جاؤ لیکن یہ بات یاد رکھو کہ تمہاری غذائی ضروریات تو تمہیں زمین سے مہیا کی جائیں گی لیکن جہاں تک زندگی گزارنے کیلئے

Marfat.com

رہنمائی اور ہدایت کا تعلق ہے وہ تمہیں ہماری طرف سے آئے گی جس نے ہماری اس ہدایت کے مطابق زندگی گزاری اس کیلئے نہ تو دنیا میں خوف ہوگا نہ آخرت میں کوئی غم لیکن جن لوگوں نے ہماری آیات اور ہماری ہدایات سے انکار کیا اور اس کے خلاف رویہ اختیار کیا یہ وہ لوگ ہیں جو جہنم میں ڈالے جائیں گے اور وہ ہمیشہ اس عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ پیش نظر آیت کریمہ میں اسی عہد و میثاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ آج بھی جو لوگ چاہے وہ مشرکینِ مکہ ہوں یا کوئی اور اللہ کی آیات سے تکذیب اور استکبار کا رویہ اختیار کریں گے ان کا انجام کیا ہوگا اس کی ایک تفصیل بیان کی جارہی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِىْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ O

''بے شک! جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا' ان کیلئے آسمان کے دروازے ہرگز نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے' یہاں تک کہ گھس جائے اونٹ سوئی کے ناکے میں۔ ہم اسی طرح مجرموں کو بدلہ دیتے ہیں''۔ 40

تکذیب اور استکبار کا مفہوم:

اس آیت کریمہ میں مجرمین کے دو جرائم کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ 1- تکذیب 2- استکبار۔ تکذیب کا معنی ہے جھٹلانا اور استکبار کا معنی ہے تکبر کرنا۔ یہ حقیقت میں ایک ہی رویے کے دو پہلو ہیں ایک کا تعلق ابتدا سے ہے اور دوسرے کا انتہا سے کوئی بھی شخص جب کسی بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ کہنے والے کو یا اس کی بات کو جھوٹا بتلاتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ میں کسی طرح بھی تمہاری اس بات کو قبول نہیں کرسکتا کیونکہ تم جھوٹے آدمی ہو اور یا یہ کہ تمہاری بات جھوٹی ہے جو ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ اللہ کے نبی جب بھی کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں تو اس قوم کے بڑے بڑے لوگ خصوصاً اور عام لوگ عموماً یہی رویہ اختیار کرتے ہیں کہ اللہ کے نبی کی بات کا اعتبار کرنا ان کیلئے اس لئے مشکل ہوتا ہے کہ وہ ان کے یہاں ایک نئی بات ہوتی ہے اور پھر جب پیغمبر عالم غیب کی خبریں دیتا ہے اور وہ خبریں چونکہ ان کے احاطۂ علم میں نہیں آتیں تو وہ عموماً یا ان باتوں اور خبروں کی تردید کرتے ہیں اور یا نبی پر جھوٹا ہونے کا الزام دھرتے ہیں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ اللہ کے نبی نے اپنی قوم کو ایمان لانے کی دعوت دی ہو اور انہوں نے فوراً اسے قبول کرلیا ہو۔ بہت کم ایسی سعید روحیں ہوتی ہیں جو پہلی دعوت پر ایمان لے آتی ہیں ورنہ عموماً افراد قوم کا رویہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہیں اور کبھی دعوت میں اور کبھی حامل دعوت میں عیب نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ طریقے طریقے سے دعوت کو بے اثر کرنے اور حامل دعوت کو بے اعتبار ٹھہرانے کی کوششیں کی جاتی ہیں پھر رفتہ رفتہ ان میں تقسیم ہونے لگتی ہے جن لوگوں میں کسی حد تک قبولیت کا مادہ ہوتا ہے یا وہ شخصی پندار میں مبتلا نہیں ہوتے وہ آہستہ آہستہ اس دعوت کے قریب آنے لگتے ہیں اور بالآخر دعوت کو قبول کرلیتے ہیں لیکن دوسری طرح کے لوگ جو شخصیت کے پندار میں محصور اور اپنی عصبیت کے حصار سے نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے وہ نہ صرف کہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتے بلکہ آہستہ آہستہ ان میں ایک ضد اور ہٹ دھرمی پیدا ہوجاتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بھی نئی اور اجنبی بات کو آغاز ہی میں قبول کرلینا کسی کیلئے بھی آسان نہیں ہوتا بالخصوص ایسی قوم کیلئے تو بہت ہی مشکل ہوتا ہے جسے اپنی تاریخی عصبیتوں یا مذہبی رسوم سے جامد قسم کا تعلق ہو۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ جن باتوں کو وہ اپنا دین قرار دے چکے ہیں اور جس دین پر وہ اپنے

Marfat.com

آباؤاجداد کو چلتا ہوا دیکھ چکے ہیں اسے کسی طرح بھی چھوڑنے کیلئے تیار نہ ہوں۔اقبال مرحوم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

لیکن جن لوگوں کا رویہ اسی طرح کا ہو جائے کہ وہ دلیل کی کسی بات کو سننے پر آمادہ نہ ہوں اور اپنی انا کے گنبد سے باہر جھانکنا بھی انہیں گوارا نہ ہو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں بلکہ اس کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر اس دعوت کے ساتھ حقارت کا سلوک کرتے ہیں۔انہیں یہ بات کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہوتی کہ وہ اپنے دنیوی تفوق کے باوجود ایک غریب آدمی کی بات چاہے وہ اپنے شخصی کردار میں کیسا ہی عظیم کیوں نہ ہو قبول کرلیں وہ دلیل کے وزن کو نہیں دیکھتے بلکہ دولت کے وزن سے ہر چیز کو جانچتے ہیں۔ان کے نزدیک کردار میں عظمت نہیں ہوتی بلکہ نسب کے حوالوں اور زمینی نسبتوں کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو استکبار کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ ایک ایسا خطرناک مرض ہے جس کسی کو بھی لاحق ہو جاتا ہے کوئی بھی عقل یا ہدایت کی بات اس کے دماغ میں داخل ہونا تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔چنانچہ جس خرابی کا آغاز تکذیب سے ہوتا ہے وہ بڑھتے بڑھتے جب استکبار کی شکل اختیار کر جاتی ہے تو پھر بالعموم اللہ کی طرف سے ایسے لوگوں کی محرومی کا فیصلہ ہو جاتا ہے اس آیت کریمہ میں جہالت اور کفر کے اس رویے کی ابتدا اور انتہا کو ذکر فرما کر ایک طرح سے قرآن کریم کے مخاطبین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم جس رویے کی طرف بڑھ رہے ہو ایسا نہ ہو کہ یہ رویہ تمہیں محرومی کی منزل تک پہنچا دے۔اس لئے اگر بچنا چاہتے ہو تو اس سے بچنے کی کوشش کرو ورنہ سوچ لو کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟ کہ تم اس رویے کے ساتھ جب تک زندہ رہو گے تمہارے لئے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے کیونکہ اللہ کا یہ قانون ہے کہ جو لوگ بھی ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں ان کیلئے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔اب سوال یہ ہے کہ آسمانوں کے دروازے نہ کھولے جانے سے مراد کیا ہے؟

آسمانوں کے دروازے نہ کھولے جانے کا مفہوم:

تفسیر بحر محیط میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال اور ان کی دعاؤں کیلئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے یعنی ان کا کوئی عمل قبولیت کے مقام کو نہیں پہنچے گا اور اسی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کی کوئی دعا بھی قبول نہیں ہو گی کیونکہ اعمال کی قبولیت کا دار و مدار ایمان پر ہے جب کسی کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے تو اس کے اعمال کو آسمانوں میں اس جگہ رکھا جاتا ہے جس کو قرآن کریم میں علیین کہا گیا ہے اور جب کسی کے اعمال قبولیت کے مقام کو پہنچ جاتے ہیں تو پھر ان اعمال کی برکت سے اللہ تعالیٰ صاحب عمل کی دعائیں بھی قبول فرماتا ہے۔قرآن کریم میں ایک دوسری آیت میں اسی مضمون کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جس میں ارشاد ہے:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ

یعنی انسان کے کلمات الطیبات اللہ کے پاس لے جائے جاتے ہیں اور ان کا نیک عمل ان کو اٹھاتا ہے۔(فاطر:١٠)

یعنی انسان کے اعمال صالحہ انسان کی مناجاتوں اور دعاؤں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچانے کا باعث بنتے ہیں اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ کسی بھی عمل کو عمل صالح بننے کیلئے ایمان کی ضرورت ہے اور کسی بھی دعا کو قبولیت کے مقام تک پہنچنے کیلئے عمل صالح کی ضرورت ہے اور یہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں اگر ایمان میسر نہیں ہو گا تو کسی عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو گی اور اگر اعمال صالح نہیں ہوں گے یعنی شریعت کے مطابق نہیں ہوں گے تو اللہ کے یہاں دعائیں قبولیت کا مقام حاصل نہیں کر پائیں گی۔یہ صحیح ہے کہ دعائیں تو اللہ کافروں کی بھی سنتا ہے اور بدعمل مسلمانوں کی بھی لیکن اس حوالے

Marfat.com

سے یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ جہاں تک کافر کی دعاؤں کا تعلق ہے ان کی دعائیں اس لئے سنی جاتی ہیں تاکہ دنیا میں وہ جو انسانی بھلائی کے کام کرتے ہیں ان کا بدلہ ان کو دنیا ہی میں دے دیا جائے اور رزق اور زندگی اور اس کے متعلقات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے ذمے لے رکھا ہے وہ اس لئے عطا کردیا جاتا ہے تاکہ قیامت کے دن اسی کے حوالے سے ان سے ایمان نہ لانے کی بازپرس کی جائے۔ البتہ بدعمل مسلمانوں کی دعائیں اس لئے بعض دفعہ قبول کرلی جاتی ہیں تاکہ یہی دعائیں اور اس کے جواب میں عطا کی جانے والی نعمتیں ان کیلئے آزمائش بنادی جائیں اور اس طرح انہیں آزمایا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پاکر شکر کرتے ہیں یا کفران نعمت کرتے ہیں لیکن وہ دعائیں جو انسان کیلئے خیر کا باعث بنتی ہیں اور جس سے ایک مومن کے ایمان وعمل میں ترقی ہوتی ہے اور جس کے نتیجے میں دلوں کو سکون کی دولت ملتی ہے یہ دعائیں تو صرف اسی وقت نصیب ہوتی ہیں جب انسان اعمال صالحہ کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اگر وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو بعض دفعہ دنیا ہی میں اس کو تنبہ کرنے یا آزمائش کیلئے بعض تکالیف میں مبتلا کیا جاتا ہے اور پھر جب وہ اپنے رب کو ان تکالیف کے ازالے کیلئے پکارتا ہے اور بار بار اپنی مصیبتوں کا حوالہ دیتا ہے تو ادھر سے ایک ہی آواز آتی ہے۔ جس کو اکبر مرحوم نے نہایت احسن طریق سے ذکر کیا ہے

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

تو اس تفسیر کے مطابق یہاں یہی فرمایا جارہا ہے کہ ان کیلئے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جاتے یعنی نہ ان کے اعمال قبولیت کا مقام پاتے ہیں اور نہ ان کی دعائیں سنی جاتی ہیں۔

ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور بعض دوسرے صحابہ کرام سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بات نقل کی گئی کہ آسمان کے دروازے نہ کھولے جانے سے مراد یہ ہے کہ کفار کی ارواح کیلئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے یعنی ان کی روحیں نیچے پھینک دی جائیں گی۔ اس روایت کی تائید حضرت براء ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے ایک سے زیادہ محدثین نے ذکر کیا ہے۔ جس کا اختصار یہ ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ کسی انصاری صحابی کے جنازہ میں تشریف لے گئے۔ ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی تو ایک جگہ بیٹھ گئے اور صحابہ کرام آپ ﷺ کے گرد خاموش بیٹھ گئے' آپ نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ مومن بندہ کیلئے جب موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سفید چمکتے ہوئے چہروں والے فرشتے آتے ہیں جن کے ساتھ جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی ہے اور وہ مرنے والے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں' پھر فرشتۂ موت عزرائیل علیہ السلام آتے ہیں اور اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ رب کی مغفرت اور خوشنودی کیلئے نکلو' اس وقت اس کی روح اس طرح بدن سے بآسانی نکل جاتی ہے جیسے کسی مشکیزہ کا دہانہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے' اس کی روح کو فرشتۂ موت اپنے ہاتھ میں لے کر ان فرشتوں کے حوالہ کردیتا ہے' یہ فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں' جہاں ان کو کوئی فرشتوں کا گروہ ملتا ہے وہ پوچھتے ہیں یہ پاک روح کس کی ہے' یہ حضرات اس کا وہ نام ولقب لیتے ہیں جو عزت واحترام کیلئے اس کے واسطے دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے۔ یہاں تک کہ یہ فرشتے روح کو لے کر پہلے آسمان پر پہنچتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں' دروازہ کھولا جاتا ہے۔ یہاں سے اور فرشتے بھی ان کے ساتھ ہوجاتے

Marfat.com

ہیں یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں۔اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ علیین میں رکھواور خود اس کو واپس کر دو یہ روح پھر لوٹ کر قبر میں آتی ہے اور قبر میں حساب لینے والے فرشتے آ کر اس کو بٹھاتے اور سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے اور دین اسلام ہے۔ پھر سوال ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو تمہارے لئے بھیجے گئے ہیں کون ہیں؟ وہ کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ہیں' اس وقت ایک آسمانی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ سچا ہے' اس کے لئے جنت کا فرش بچھا دو اور جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کا دروازہ کھول دو اس دروازہ سے اس کو جنت کی خوشبوئیں اور ہوائیں آنے لگتی ہیں اور اس کا نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کے پاس اس کو مانوس کرنے کیلئے آجاتا ہے۔

اس کے بالمقابل کافر ومنکر کا جب وقتِ موت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ مہیب صورت فرشتے خراب قسم کا ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور بالمقابل بیٹھ جاتے ہیں' پھر فرشتۂ موت اس کی روح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خاردار شاخ جو گیلی اون میں لپٹی ہوئی ہو اس میں سے کھینچی جائے' یہ روح نکلتی ہے تو اس کی بدبو مردار جانور کی بدبو سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے' فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں' راہ میں جو دوسرے فرشتے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کس خبیث کی روح ہے' یہ حضرات اس وقت اس کا وہ برے سے برا نام و لقب ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا کہ یہ فلاں بن فلاں ہے' یہاں تک کہ سب سے پہلے آسمان پر پہنچ کر دروازہ کھولنے کیلئے کہتے ہیں تو اس کیلئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا بلکہ حکم ہوتا ہے کہ اس بندہ کا اعمال نامہ سجین میں رکھو جہاں نافرمان بندوں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں اور اس روح کو پھینک دیا جاتا ہے' وہ بدن میں دوبارہ آتی ہے فرشتے اس کو بٹھا کر اس سے بھی وہی سوالات کرتے ہیں جو مومن بندہ سے کئے تھے' یہ سب کا جواب یہ دیتا ہے هَاهْ هَاهْ لَا اَدْرِیْ یعنی میں کچھ نہیں جانتا' اس کیلئے..... جہنم کا فرش' جہنم کا لباس دے دیا جاتا ہے اور جہنم کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کو جہنم کی آنچ اور گرمی پہنچتی رہتی ہے اور اس کی قبر اس پر تنگ کر دی جاتی ہے۔ نعوذ باللہ منہ

اس حدیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کفار کی ارواح آسمان تک لے جائی تو جاتی ہیں لیکن آسمان کا دروازہ ان کیلئے نہیں کھلتا وہ دہیں سے پھینک دی جاتی ہیں۔ اس حدیث کی روشنی میں آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم تو واضح ہے البتہ اس کا مرادی معنی مراد لیتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بات بھی مفہوم ہوتی ہے کہ جس طرح آسمان پر صاحب ایمان لوگوں کا خیر مقدم ہوگا اور وہ نہایت عزت واحترام سے جنت میں لے جائے جائیں گے۔ اس کے بالکل برعکس کافروں کے ساتھ نہایت توہین آمیز رویہ اختیار کیا جائے گا۔ انہیں مجرموں اور بدمعاشوں کی طرح ہنکاتے ہوئے اس مقام تک پہنچا دیا جائے گا جو ان کیلئے مقدر ہوگا۔

اس کے بعد کے جملے کہ وہ کافر لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے تاوقتیکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے۔ یہ اس قسم کا اسلوب بیان ہے جس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کے سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح ان متکبرین کا جنت میں داخل ہونا بھی محال ہے۔ تعبیر کا یہ اسلوب قدیم صحیفوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً انجیل میں ہے

﴿اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا مشکل ہے اور

Marfat.com

پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔﴾

استکبار کا انجام:

قرآن اور انجیل کی تعبیر میں بس یہ فرق ہے کہ سیدنا مسیح نے سبب استکبار یعنی دولت کا حوالہ دیا ہے اور قرآن نے اصل جرم یعنی استکبار کا اور پیچھے ہم حضرت آدم اور ابلیس کے قصے میں یہ پڑھ چکے ہیں کہ ابلیس کے جنت سے نکالے جانے کا اصل سبب استکبار ہی تھا کیونکہ استکبار ایک ایسی تباہ کن برائی ہے کہ جس دل میں یہ پیدا ہو جاتی ہے اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی موت کا واقع ہونا یقینی ہو جاتا ہے وہ اس کے نتیجے میں قبولیت کی استعداد کھو دیتا ہے وہ ایمان سے اتنا دور نکل جاتا ہے جس کے بعد لوٹ آنے کے سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں' انسانیت دم توڑ جاتی ہے' اخلاق کی ایک ایک قدر آہستہ آہستہ موت کا شکار ہو جاتی ہے ایسی صورت حال میں ایسے شخص کے جنت میں داخل ہونے کی کیا امید کی جاسکتی ہے اس لئے یہ بات فرمائی گئی ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا قطعی محال ہے اسی طرح ایسے شخص کا داخل ہونا بھی بالکل محال ہے اس میں ہمارے لئے سوچنے کی دعوت بھی موجود ہے کیونکہ جدید تعلیم نے جو فکری گمراہیاں پیدا کی ہیں ان میں سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ یہاں کا ہر پڑھا لکھا آدمی جہلِ مرکب کا شکار ہے یعنی ایک شخص جس نے ساری عمر انگریزی زبان پڑھی اور ان علوم وفنون کے سیکھنے میں زندگی گزار دی جس کا علوم اسلامی سے کوئی دور کا رشتہ نہیں اور وہ عربی زبان کی شد بد سے بھی واقف نہیں لیکن جب کبھی تاریخ مذاہب' حقیقت مذاہب یا خود اسلام پر بات ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک اتھارٹی سمجھتا ہے اور جن لوگوں نے علوم اسلامیہ کی تحصیل میں عمریں کھپائیں ہیں نہایت تحقیر کے انداز میں ان کی طرف رجوع کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ دنیا کے سارے علوم بھی آدمی حاصل کر لے تو یہ سامنے کی بات ہے کہ ان کا تعلق زمینی معلومات اور انسانی عقل سے ہے اور مذہب وحی الٰہی کے نتیجے میں ملتا ہے یہ انسان کی نارسائی سے وجود میں نہیں آیا بلکہ اللہ کی ابدی راہنمائی سے عطا ہوا ہے جس میں کسی غلطی کا امکان نہیں اور یہ ان پیغمبروں کے واسطے سے انسانوں کو پہنچا ہے جو معصوم پیدا ہوتے ہیں اور پھر جس کی تفہیم وتشریح میں ان لوگوں نے زندگیاں کھپائیں ہیں جو تقویٰ اور پارسائی میں اپنی مثال آپ تھے لیکن جو شخص ان تمام کے مقابلے میں اپنی ذات اور اپنے فہم پر اصرار کرتا ہے وہ حقیقتاً استکبار کا مریض ہے۔ ایسے ہی لوگوں کیلئے اکبر مرحوم نے کہا تھا کہ

انہوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں
پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

اس آیت کریمہ میں ایسے ہی لوگوں کیلئے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں ایک مجرمین کا اور دوسرا ظالمین کا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ان دونوں الفاظ کی تشریح ہو چکی ہے اسے اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ایسے لوگ جو استکبار کے مریض ہیں وہ انسانیت کے مجرم بھی ہیں اور خود اپنی جانوں کے لئے ظالم بھی ہیں۔ اگلی آیت کریمہ میں ایسے لوگوں کو قیامت میں جو عذاب دیا جائے گا اس کی مزید شدت کو بیان کیا جا رہا ہے۔

لَهُمۡ مِّنۡ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ غَوَاشٍ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجۡزِی الظّٰلِمِیۡنَ ۝

''ان کیلئے جہنم ہی کا بچھونا اور اوپر سے اسی کا اوڑھنا ہوگا اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیں گے''۔ 41

مہاد۔ غواش کا مفہوم:

''مہادؔ'' کا معنی ہے بچھونا اور ''غواش'' غاشیہ کی جمع ہے جس کا معنی ہے ڈھانپ لینے والی چیز' اس سے مراد ہے اوڑھنا۔ مطلب یہ ہے کہ ا

Marfat.com

کیلئے اوپر اور نیچے سے جہنم ہی اوڑھنا بچھونا ہوگی۔ کسی شخص کو نہایت اذیت دینا مقصود ہو تو اس کیلئے سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ اسے دہکتے انگاروں پر لٹا دیا جائے۔ آگ سے بڑا عذاب شاید ہی دنیا میں کوئی ہو۔ آدمی کے جسم کو آگ کی لپٹ بھی چھو جائے تو نا قابل برداشت ہوتی ہے چہ جائیکہ اسے آگ کے بستر پر لٹا دیا جائے جب تک اس کی کھال جل کر اور اس کی چربی پگھل کر اس کے کوئلوں کو نہیں بجھاتی اس کی اذیت میں کمی نہیں آسکتی لیکن ایسی اذیت کے بارے میں تصور کرنا بھی کس قدر تکلیف دہ ہے جس میں صرف آگ کا بستر ہی نہ ہو بلکہ اس کے اوپر بھی آگ کا لحاف دے دیا جائے یعنی نیچے دہکتے انگارے بچھا دیئے جائیں اور اوپر آگ ہی سے اسے ڈھانپ دیا جائے۔ اس ہولناک عذاب کا تصور کرنا بھی انسانی احساس کیلئے بہت تکلیف دہ ہے چہ جائیکہ اسے برداشت کرنا۔ چنانچہ یہاں اس عذاب کو ان متکبرین کیلئے بیان کیا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن یہ لوگ اس عذاب سے دوچار کئے جائیں گے۔ اے کاش! آج دنیا میں اس عذاب سے بچنے کیلئے وہ کوئی کوشش کریں۔

اصلاح وتربیت کے دو مؤثر طریقے:

دنیا میں اصلاح اور تربیت کیلئے جتنے طریقے اختیار کئے گئے ہیں یا جتنے اسلوب آزمائے گئے ہیں ان میں سب سے مؤثر دو ہی طریقے ہیں ایک ہے ترغیب اور دوسرا ہے ترہیب یعنی کسی بھی آدمی کو اگر آپ آمادۂ عمل کرنا چاہیں تو اسے یا تو اس کے عمل کے نتیجے کے طور پر کسی بہت بڑے انعام کی ترغیب دیجئے اور یا پھر اسے کسی بہت برے انجام سے ڈرایئے یہی دو طریقے ہیں جس سے کسی بھی شخص کو آمادۂ حرکت یا آمادۂ عمل کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے بارہا تجربہ کیا ہوگا کہ ایک شخص جو کوئی پابندی قبول کرنے یا کسی طرح کی زحمت اٹھانے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتا لیکن اگر آپ اسے یقین دلا دیجئے کہ اس کے نتیجے میں تمہیں بہت اکوئی منصب مل سکتا ہے یا کوئی مالی منفعت حاصل ہوسکتی ہے تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ وہ شخص سرتاپا عمل بن جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک شخص پنے گھر میں لحاف میں لپٹا پڑا ہے شدید سردی کا موسم اور باہر ہلکی پھلکی پھوار اور یخ بستہ رات۔ اس کی بیوی کو اچانک یاد آتا ہے کہ صحن میں کچھ چیزیں پڑ رہ گئی ہیں نہ اٹھائی گئیں تو بارش سے خراب ہو جائیں گی وہ بچے کو لئے لیٹی ہوئی اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ میں اس حال میں اٹھ کر اگر باہر نکلوں گی تو اند نہ ہے کہیں بیمار نہ پڑ جاؤں۔ آپ ماشاء اللہ صحت مند ہیں باہر جائیں اور صحن میں جو چیزیں پڑی ہیں وہ اٹھا لائیں وہ کہتا ہے بھاڑ میں جائیں یہ چیزیں ان کی خاطر اپنی صحت کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اس نے ہر چند اصرار کیا لیکن یہ شخص اپنے لحاف سے نکلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اچانک باہر دروازے پر دستک ہوئی س نے وہیں سے پکار کر پوچھا کون ہے جواب ملا کہ یہاں سے چار میل کے فاصلے پر گیسٹ ہاؤس سے میں آیا ہوں وہاں تیرے افسر اعلیٰ تشریف لا ہیں انہوں نے اسی وقت تمہیں طلب کیا ہے اگر تم نے تساہل کیا تو نوکری سے نکال دیئے جاؤ گے یہ شخص جو لحاف سے نکلنے پر مستعد نہیں تھا وہ فوراً لحاف نکلا گرم کپڑے پہنے' دھسہ اوڑھا' چھتری لی اور اس کے ساتھ ہو گیا۔ چار میل گیا اور چار میل واپس آیا لیکن سردی نے نہ جانے سے اسے روکا اور نہ آ سے جبکہ یہ شخص اپنے صحن تک جانے کیلئے تیار نہیں تھا دونوں طرح کی صورتحال میں فرق یہ ہے کہ اس کے صحن میں جو چیزیں پڑی خراب ہو رہی تھیں اتنی قیمتی نہیں تھیں جسے یہ آسانی سے بنا نہ سکتا ہو اس لئے ان چیزوں کی خرابی کا ڈر اس کو ہلانے میں کامیاب نہ ہوسکا لیکن جب اس کے سامنے ایک ایسا خ آیا یعنی نوکری سے نکالے جانے کا تو فوراً اس کی قوت متخیلہ نے پوری صورتحال کو اس کے سامنے متشکل کر دیا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ اگر میری نوکر جاتی رہی تو گھر کا چولہا بجھ جائے گا' بچے سکول کی فیس نہیں دے سکیں گے' کرائے کا مکان چھن جائے گا' ہمارا سامان فٹ پاتھ پر پڑا ہوگا' زندگی موت سے بدتر ہو جائے گی۔ اس خوفناک انجام نے اس کو ہلا کے رکھ دیا اور وہ سردی کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو گیا۔ اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ غلامی کے دنوں میں لوگوں نے مالی فوائد کی خاطر ایمان بیچے' عہدہ ومنصب کی خاطر اسلامی غیرت کو تیاگ دیا' جاگیریں حاصل کرنے

Marfat.com

کیلئے اپنی قوم کے افراد جنگوں میں جھونک دیئے' محض فاتحین کا قرب حاصل کرنے کیلئے آزادی کے بدلے میں غلامی لے لی۔ اس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ترغیب اور ترہیب یہ دو ایسے محرکات ہیں جو انسان کو غلط یا صحیح کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم کا اسلوب بھی یہ ہے کہ اس نے جہاں پاکیزہ فکر اور طہارت قلب کے ذریعے انسان کو بدلا وہیں اسے ان دونوں فطری محرکات سے بھی آمادۂ عمل کرنے کی کوشش کی چنانچہ پہلے جہنم کے عذاب کا ذکر فرما کر ترہیبی محرک کا ذکر کیا اور اب اگلی آیتوں میں جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے تاکہ انسان کو اندازہ ہو سکے کہ اگر میں ایمانی زندگی اختیار کروں تو مجھے دنیا اور آخرت میں ایک آسودہ اور کامیاب زندگی نصیب ہو سکتی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

''اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیئے' ہم کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے' وہی جنت والے ہیں' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔ 42

سابقہ آیت کریمہ میں اہل جہنم کا جو طرز عمل بیان فرمایا گیا تھا یہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ وہ لوگ پیغمبر اور اس کی دعوت کی تکذیب کرتے تھے یہ لوگ ایمان لاتے ہیں انہوں نے استکبار کا رویہ اختیار کیا' ان کی زندگی کا اصل سرمایہ عمل صالح یعنی حسن عمل ہے اس کا منطقی نتیجہ ایک ہی ہونا چاہئے کہ وہ لوگ اپنے برے طرز عمل کے باعث اپنے برے انجام کو پہنچے اور یہ اپنے خوب صورت طرز عمل کے باعث اللہ کی جنت کے مستحق ہوئے یہ تو وہ بات ہے جو قرآن کریم میں بار بار دہرائی گئی ہے کیونکہ اصلاً یہی بات ہے جو دل و دماغ میں راسخ کرنے کی ضرورت ہے اور اسی کے نتیجے میں غلبۂ دین کی منزل قریب آ سکتی ہے اور انسان اپنی حقیقی زندگی اور حقیقی مقصد کو پا سکتا ہے لیکن اس آیت کریمہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان اور عمل صالح اور اس کے نتیجے کے درمیان ایک جملہ ارشاد فرمایا گیا ہے: لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا آخر اس کی کیا ضرورت تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ اسلام ایک فطری دین ہے جس طرح اس کے احکام فطرت پر مبنی ہیں اسی طرح اس کی دعوت بھی سراسر اپنے اندر فطری اسلوب رکھتی ہے اس لئے اس میں دعوت کے سلسلے میں ترغیب اور ترہیب سے کام لیا گیا ہے کیونکہ انسانی فطرت اس کے بغیر متوجہ ہی نہیں ہوتی یہ جملہ بھی اصلاً انسانی فطرت کی ایک ضرورت ہے اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اس جملہ کو لایا گیا ہے۔ انسانی احساس یہ ہے یا انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے لئے پابندیاں پسند نہیں کرتی اور جہاں بھی اسے مشکلات سے گزرنا پڑے وہ اس سے کوسوں دور بھاگتی ہے اور جہاں تک تعلق ہے ایمان و عمل کا وہ تو سراسر ایک مشکل گھاٹی ہے جس پر چڑھنا آسان نہیں۔ ایمان دل و دماغ کی پاکیزگی اور نظریاتی یکسوئی کا نام ہے جبکہ عقل نارسا کی نارسائیاں اور اس کج فکر کی کج ادائیاں اور طاغوتی قوتوں کی طرف سے پیدا کردہ فکری پیچیدگیاں اور موہوم غیر مرئی قوتوں کے حوالے سے دل و دماغ میں در آنے والے واہمے اور خدشات اور اقتدار کی ہر چوکھٹ پر جھکانے کی کوششیں کسی طرح بھی دل و دماغ کو یکسو نہیں رہنے دیتیں اسی طرح عملِ صالح نام ہے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی غیر مشروط اطاعت اور اللہ اور اس کے رسول سے بے پناہ وابستگی کا جبکہ خواہشات کی ہمہ گیری اور مفادات سے وابستگی انسان کو قدم قدم پر اللہ کی اطاعت سے پھیرتی اور اللہ اور اس کے رسول سے وابستگی سے کنارہ کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ آج بھی آپ کسی تعلیم یافتہ آدمی سے اسلامی عقائد اور اسلامی احکام کے حوالے سے بات کر کے دیکھئے وہ ہر اسلامی عقیدے میں قدم قدم پر تشکک اور اضطراب کا اظہار کرے گا اور شرعی احکام کو آج کے دور میں ناقابل عمل ٹھہرائے گا۔ آپ کسی بھی دانشور سے کہیے کہ سچ اچھا ہے یا جھوٹ تو وہ سچ پر پورا لیکچر دے دے گا لیکن اگر آپ اسے سچی زندگی گزارنے کی تلقین کریں تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھے گا۔ کسی چھوٹے بڑے منصب پر فائز آدمی سے یہ نصیحت کر کے دیکھئے کہ رزقِ حلال انسانی سیرت و کردار کی پہلی بنیاد ہے جس قوم میں رزقِ حلال باقی نہیں رہتا وہ صدق

Marfat.com

مقال سے بھی محروم ہو جاتی ہے اور پھر اس کی زندگی سیرت و کردار کے ایسے عوارض کا شکار ہوتی ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر ایسی قوم اخلاقیات سے عاری ہو کر رہ جاتی ہے اس لئے صاحب منصب لوگوں کو بالخصوص دوسرے لوگوں کیلئے نمونہ بن کر رزقِ حلال کی پابندی اختیار کرنی چاہئے اور صرف اپنی تنخواہوں پر اکتفا کر کے باقی آمدنی کا ہر راستہ بند کر دینا چاہئے تو اس کے جواب میں آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آپ کا مذاق اڑایا جائے گا بلکہ الٹا آپ سے سوال کیا جائے گا کہ کیا اس دور میں صرف تنخواہ پر گزارا کیا جا سکتا ہے؟ زندگی اس قدر مہنگی ہو گئی ہے اور زندگی کی ضروریات اس قدر گراں ہو گئی ہیں کہ وہ صرف رزق حلال میں تو پوری نہیں کی جا سکتیں۔ یہ اس قوم کے افراد کا حال ہے جو اپنے آپ کو خیر الامم کہتی ہے اور جو اب دنیا میں اللہ کے آخری دین کی امین ہے۔ ایسے ہی احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

تصور کیجئے اس وقت کا جب یہ قرآن کریم نازل ہو رہا تھا تو قرآن کریم اپنے مخاطبین کو جب ایمان و عمل کی ترغیب دے رہا تھا تو بجا طور پر سننے والوں کے دلوں میں یہ اندیشے لہرا رہے تھے کہ ایک ایسے دور میں جبکہ ہر طرف دل و دماغ کیلئے آلودگیاں بکھری ہوئی ہیں اور قدم قدم پر بداعمالیوں کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ دل و دماغ کی یکسوئی اور سیرت و کردار کی پاکیزگی کا ایسے ماحول میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ ایمان و عمل کی جو دعوت پیش کر رہے ہیں اسے قبول کر لیا جائے؟ یہی وہ احساسات ہیں جن کے ازالے کیلئے یہ جملہ یہاں لایا گیا ہے۔ مسلسل عبارت کو نامکمل چھوڑ کر اس طرح کسی جملے کا لانا جو اس عبارت سے پیدا ہونے والے خیالات کا ازالہ کر دے اس کو جملہ معترضہ کہتے ہیں چنانچہ انہی احساسات کا ازالہ کرتے ہوئے اور ان شبہات کا جواب دینے کیلئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہارا یہ سمجھنا کہ آج کے دور میں ایمان و عمل کے حکم پر عمل کرنا ممکن نہیں یہ سراسر کج فکری یا کوتاہ فہمی ہے اس لئے کہ جس پروردگار نے تمہیں پیدا کیا وہ خوب جانتا ہے کہ اس نے تمہاری فطرت کیسی بنائی ہے تمہیں کس طرح کی صلاحیتوں سے نوازا ہے تم کن باتوں کا تحمل کر سکتے ہو اور کن باتوں پر عمل کرنے سے تم عاجز ہو؟ اس لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمہارا خالق و مالک تمہیں ایسی باتوں کا حکم دے جن باتوں کو قبول کرنا اور عمل کرنا تمہارے لئے ممکن نہیں اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی ہے کہ ہم کسی کو بھی ایسے حکم کا پابند نہیں ٹھہراتے جس حکم کی تعمیل کی اس میں طاقت نہ ہو۔ اگر تم میں ایمان و عمل کی طاقت نہ ہوتی تو ہم تمہیں کبھی اس بات کا حکم نہ دیتے۔ رہی یہ بات کہ تم اسے اپنی ہمت سے بہت بڑا خیال کرتے ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ حکم تمہاری ہمت سے بڑھ کر ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تم نے اپنی ہمتوں کو بہت حد تک تباہ کر کے رکھ دیا ہے یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی مسلسل بیٹھ کر کام کرنے کی وجہ سے چلنے پھرنے میں دشواری محسوس کرنے لگے اور چند سو گز کا فاصلہ بھی اسے پہاڑ پر چڑھنا محسوس ہو تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ یہ چند سو گز کا فاصلہ انسانی ہمت سے بڑی بات ہے۔ یقیناً آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ جو آدمی مناسب عمر میں ہوتے ہوئے بھی یہ فاصلہ طے نہیں کر سکتا اس نے اصلاً خود اپنے آپ کو اس ہمت اور توانائی سے محروم کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اتنا فاصلہ طے کرنا انسانی ہمت کیلئے مشکل بات ہے جب کسی نوجوان کو فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے تو یہ دیکھ کے کیا جاتا ہے کہ وہ صحت مند آدمی ہو۔ لیکن جب شروع شروع میں ایسے نوجوان کو ٹریننگ سے گزارا جاتا ہے تو وہ چونکہ اس کا عادی نہیں ہوتا اس لئے بہت سارے لوگ اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ جب وہ اس ٹریننگ میں لگے رہتے ہیں تو ان کی ہمت ان کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ یہی حال پوری انسانی زندگی کا ہے کہ انسان غلط ماحول' غلط تربیت' خواہشات کی بالادستی کی عادت' ارادوں کی کمزوری اور اولوالعزمی کے فقدان کے باعث کسی بھی بڑے کام کی

Marfat.com

ہمت اپنے اندر نہیں پاتا بلکہ ایسے کام بھی جو انسانی زندگی کے معمولات میں داخل ہیں وہ بھی اس کو دوبھر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جو آدمی دن چڑھے تک رہنے کا عادی ہو جائے اس کیلئے علی الصبح اٹھنا آسان نہیں ہوتا حالانکہ دیر تک سوئے رہنا انسانی صحت کیلئے نقصان دہ ہے اور انسانی معمولات کیلئے الجھنو کا باعث ہے۔ یہاں بھی یہی بات فرمائی جا رہی ہے کہ ہم نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا جو انسانی فطرت پر گراں گزرتا ہو' جو انسانی طاقت کیلئے کلفت کا باعث ہو سکتا ہو لیکن تم اگر اپنے لئے مشکل محسوس کر رہے ہو تو یہ تمہاری اپنی پیدا کردہ ہے۔ اب اس کا علاج یہ نہیں کہ تم ایمان و عمل سے جی چراؤ بلکہ اس کا علاج ہے کہ تم اپنی بری عادتوں اور ناپختہ ارادوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرو۔ یہ جو کچھ کہا گیا یہ تو عام سطح کی انسانی زندگی کیلئے ہے۔ رہے وہ افراد یا وہ قوم جن سے کوئی بڑا کام لینا مقصود ہوتا ہے انہیں تو ہمیشہ ذمہ داریاں تفویض کرنے سے پہلے بڑی مشقتوں سے گزارا جاتا ہے جس طرح ہم اوپر فوج کی مثال دے چکے ہیں اور ان سے اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر اپنے آپ کو مشقتیں برداشت کرنے کا عادی بنائیں کیونکہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

ایسے ہی نوجوانوں کی تربیت چونکہ اقبال کے پیش نظر تھی اس لئے وہ ہمیشہ تمنا کرتا تھا کہ کاش نوجوانوں میں ایسی صفات پیدا ہو جائیں اس کبھی وہ ترغیب کے انداز میں کہتا

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اور کبھی حسرت سے کہتا

جو راہ کی سختی کو سامانِ سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی کمیاب ہے وہ راہی

حقیقت یہ ہے کہ کسی حکم کا نرم یا سخت' قابل عمل یا ناقابل عمل ہونے کا دارومدار بہت حد تک انسانی سوچ پر ہے جس سوچ پر اولوالعزمی غالب ہے اور جو اپنی منزل کو پہچان چکا ہے اور اس کیلئے ہمہ تن آمادۂ عمل ہو چکا ہے اس کیلئے کٹھن سے کٹھن حکم بھی ایک معمول کی بات معلوم ہوتی ہے حتیٰ کہ اس راستے میں اسے بڑی سے بڑی قربانی بھی اگر دینا پڑے تو وہ بڑی آسانی سے کر گزرتا ہے انسانی زندگی انسان کیلئے سب سے گراں سب سے قیمتی اور سب سے محبوب متاع ہے لیکن جن لوگوں کے پیش نظر ایسے مقاصد ہوتے ہیں جو انہیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہوں تو وہ اپنے مقاصد کے حصول میں زندگی کو بھی نہایت آسانی سے قربان کر دیتے ہیں صحابہ کی پوری زندگی اور شہدائے اسلام کی داستانیں ہمیں یہ سمجھانے کیلئے کافی ہیں وہ نہ صرف کہ زندگی قربان کر دینے کی ہمت اپنے اندر رکھتے تھے بلکہ اس کیلئے اللہ سے دعائیں مانگتے تھے اور جب کبھی ایسا موقع آتا تھا تو خوشی خوشی اپنی زندگی اللہ کے حوالے کر دیتے تھے۔ اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے کسی نے کہا تھا

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

قرون اولیٰ کی مثالیں تو بے شمار ہیں وہ تو بارگاہ نبوی کے تربیت یافتہ لوگ تھے یا ان تربیت یافتگان کے تربیت یافتہ تھے لیکن اس دور میں جن لوگوں نے اس راز کو پا لیا ہے ان کی مثالیں کم نہیں۔ افغانستان کی مثال ہمارے سامنے ہے وہاں ہزاروں شہداء کی فصل ہماری نظروں کے سامنے

Marfat.com

ہے۔ کشمیر، چیچنیا، فلسطین میں آج بھی اسی تاریخ کو دھرایا جارہا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سید قطب شہید کو جب پھانسی کیلئے لے جایا جارہا تھا تو میں نے ان کی تصویر دیکھی تھی وہ پیچھے پلٹ کے دیکھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ان کی تصویر کے نیچے کسی نے لکھا تھا

جس شان سے مقتل تک پہنچا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف یہاں اشارہ فرمایا گیا کہ جو لوگ جنت کے مسافر ہیں اور جنت کا حصول جن کی منزل ہے ان کیلئے ایمان و عمل کے تقاضوں کو پورا کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور جن کو یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی ہمتوں میں کمزوری ہے اور یہ کمزوری انہوں نے خود پیدا کی ہے ورنہ ہم نے کوئی حکم ایسا نہیں دیا جو ان کی فطری توانائیوں سے بڑھ کر ہو اور ویسے بھی جنت کوئی ایسی معمولی نعمت تو نہیں جسے آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہو جو نعمتیں عظیم ہوتی ہیں ان کیلئے قربانیاں بھی عظیم ہوتی ہیں

بہر غفلت یہ تری ہستی نہیں
دیکھ جنت اس قدر سستی نہیں

اگلی آیت کریمہ میں اہل جنت کو جو نعمتیں عطا فرمائی جائیں گی ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اہل جنت کے احساسات کو بھی ریکارڈ پر لایا گیا ہے جو بجائے خود ایک نعمت ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَ نَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهِمُ الۡاَنۡهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَ مَا کُنَّا لِنَهۡتَدِیَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَ نُوۡدُوۡۤا اَنۡ تِلۡکُمُ الۡجَنَّةُ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ○

''اور ان کے سینے کی ہر خلش ہم نکال دیں گے، ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے! تعریف ہے اس اللہ کیلئے، جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا۔ اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ بخشی ہوتی تو ہم تو ہدایت پانے والے نہ بنتے۔ ہمارے رب کے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے۔ ان کو پکارا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے، جس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے ہو''۔ 43

داخلی احساسات پر اللہ کی نوازش:

جو لوگ ایمان و عمل کا حق ادا کریں گے اللہ انہیں سب سے پہلے جنت جیسے انعام سے نوازے گا اور پھر جنت میں جانے کے بعد اللہ کی مزید نوازشات ان پر برسیں گی۔ ان نوازشات کا ذکر قرآن و سنت میں مختلف جگہوں پر کیا گیا ہے ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔ جنت میں سامانِ ضیافت کے بعد جو سب سے پہلی نوازش کی جائے گی وہ یہ ہوگی کہ ان کے دلوں میں اگر ایک دوسرے کے بارے میں کوئی خلش، کوئی رنجش یا کوئی بدگمانی ہوگی تو انہیں اس سے پاک کردیا جائے گا۔ یہ اللہ کی بیش بہا نعمت ہے کیونکہ کسی بھی بڑی سے بڑی ضیافت کے شرکاء بے شک اکل و شرب کے حوالے سے ہزاروں نعمتوں سے شادکام ہو رہے ہوں لیکن وہ ایک دوسرے سے اگر تکدر رکھتے ہیں اور تقریب میں شامل ہو کر بھی ایک دوسرے سے بات

Marfat.com

کرنا یا ایک دوسرے سے محبت سے پیش آنا اور گھل مل کر تقریب کی مسرتوں سے مسرور ہونا انہیں گوارا نہ ہو تو اس تقریب کی ساری نعمتیں ان کیلئے بے کار ہو جاتی ہیں اس لئے کہ جہاں اچھا کھانا پینا انسان کی ضرورت ہے وہیں خوشی اور مسرت کے دوسرے لوازمات بھی اس کی ایسی ہی ضرورت ہیں بلکہ بعض دفعہ دوسری چیزیں کھانے پینے سے بڑھ کر خوشی کا باعث بنتی ہیں اگر آپ کسی ایسی تقریب میں شامل ہوں جس میں ضیافت کا سامان تو بہت سادہ ہو لیکن وہاں ایسے لوگوں سے آپ کی ملاقات ہو جائے جن کی محبت آپ کیلئے حقیقی مسرت کا باعث ہو تو آپ محسوس کریں گے کہ اس تقریب میں آ کر آپ کو حقیقی خوشی حاصل ہوئی ہے اس لئے جب یہ اہل جنت جنت میں پہنچیں گے تو ان کی خوشیوں کو مکمل اور دوبالا کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ ان پر یہ احسان فرمائیں گے کہ جنت کے شرکاء میں اگر کوئی ایسے لوگ ہوں جنہیں ان سے یا انہیں اُن سے کچھ تحفظات ہوں' کچھ بدگمانیاں ہوں یا کچھ ان کی جانب سے طبیعت میں کچھ خلش پائی جاتی ہو' انہیں ان سے ملنا اچھا نہ لگتا ہو اور یا سابقہ زندگی میں کچھ حوادث کے باعث یہ ان سے گھل مل کے باتیں نہ کر سکتے ہوں تو یقیناً یہ جنت بھی ان کو حقیقی خوشی نہیں دے سکے گی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان تمام اہل جنت کو اس طرح کی تمام باتوں سے پاک صاف کر کے جنت میں بھیجیں گے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں جانے والے لوگ جب جنت کی طرف جا رہے ہوں گے تو راستے میں ایک نہر آئے گی۔ اس کا پاکیزہ پانی پینے کیلئے انہیں کہا جائے گا تو جیسے ہی اس کا پانی پئیں گے تو ان کے دل اور ان کے سینے ہر طرح کی ایسی بدگمانیوں سے پاکیزہ ہو جائیں گے۔ اب جب یہ جنت میں جائیں گے تو جن لوگوں سے کوئی ناراضگی رہی ہوگی یہ اسے بالکل بھول چکے ہوں گے اور ایک دوسرے سے پوری محبت اور مسرت سے پیش آئیں گے۔ روایات میں آتا ہے کہ اس آیت کو پڑھ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا کہ مجھے امید ہے کہ اللہ میرے اور عثمان اور طلحہ اور زبیر کے درمیان بھی صفائی کرا دے گا یعنی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد جس طرح کے واقعات صحابہ میں پیش آئے۔ حتیٰ کہ ان کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں تو واقعات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان واقعات کا سبب بلوائیوں کا ایک مخصوص گروہ تھا جنہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا اور وہی لوگ صحابہ میں اختلافات پیدا کرنے حتیٰ کہ جنگوں تک نوبت پہنچانے کا سبب بنے اور جب بھی بات صلح تک پہنچی انہوں نے رات کو چھپ کر جانبین کی فوجوں پر شب خون مار کر لڑائی کی آگ کو بھڑکا دیا اور دونوں طرف کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ دوسرے فریق نے عہد شکنی کی ہے۔ حالانکہ یہ سب کچھ کیا دھرا ان بلوائیوں کا تھا چنانچہ انہی حوادث میں حضرت زبیر اور حضرت طلحہ بھی شہید ہوئے جس کا حضرت علی کو بے حد رنج تھا اسی حوالے سے حضرت علی ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی لیکن یہاں ایک بات یاد رہنی چاہئے کہ دلوں کی یہ بدگمانیاں یا یہ خلشیں جو پروردگار اہل جنت کے دلوں سے نکال دے گا اس کا تعلق ان باتوں سے ہے جنہیں کرنے والوں نے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے نہ کیا ہو بلکہ بعض دفعہ بے خبری یا بدگمانی میں ایسا کچھ ہو گیا ہو اور پھر اس کے نتیجے میں طبیعت میں ایک انقباض پیدا ہوا ہو جس کا زندگی میں نکلنے کا موقع نہ آیا ہو تو قیامت کے دن ایسے لوگ اگر جنت میں جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اس طرح کے احساسات سے پاک فرما دے گا لیکن جو لوگ جان بوجھ کر ایک دوسرے کے حقوق پامال کرتے اور قصداً دوسروں کی دل آزاریاں کرتے ہیں انہیں تو بہرحال اپنے رب کے سامنے جواب دہی کرنا ہوگی البتہ اگر وہ وہاں اپنی نیکیاں دے کر معاف کرانے میں کامیاب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ ان سے بھی ایسا ہی سلوک فرمائے گا اور اگر معافی نہ مل سکی تو پھر وہی معاملہ ہوگا جو اللہ کے قانون کا تقاضا ہوگا۔

اہلِ جنت کا جذبۂ شکر وسپاس:

باہر کی نعمتیں جو جنت میں رواں دواں ہوں گی ان کا تو کوئی حد و شمار نہیں ہوگا البتہ ان سے محظوظ ہونے کیلئے جو طبعی رکاوٹ پیش آ سکتی تھی جب اسے بھی دور فرما دے گا تو اب مسرتوں کی ایک ایسی بہار چھا جائے گی جس کا تصور بھی دنیا میں کرنا ممکن نہیں۔ خوشیوں کا ایک سیلاب بہہ رہا ہوگا

Marfat.com

کے سوتے سینوں سے پھوٹ رہے ہوں گے لیکن باہر کی فضا کے حوالے سے پروردگار نے صرف ایک بات ارشاد فرمائی کہ اہل جنت کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اس کی حقیقی صورت کیا ہوگی یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن دنیا میں بھی ہم جانتے ہیں کہ ایسے محلات بادشاہوں نے بنائے جن کے دائیں بائیں اور نیچے سے بھی نہریں رواں دواں ہوتی تھیں۔ جس کا کسی حد تک نظارہ تاج محل میں کیا جا سکتا ہے جو اگر ایک طرف محلات کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی تھیں تو دوسری طرف وہاں کے مکینوں کے سینوں کو بھی اس طرح خوشی سے بھر دیتی تھیں جیسے یہ نہریں باہر نہیں بلکہ ان کے اندر بہہ رہی ہوں۔ خوشیوں اور مسرتوں کا یہ سیل جب اندر باہر اس طرح بہہ رہا ہوگا تو اہل جنت اس منظر سے مبہوت ہو کر بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ تعریف اور شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ورنہ ہم خود اس قابل کہاں تھے کہ جنت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے یہ بالکل اس طرح کا احساس اور ادائے شکر ہے جو کسی طویل اور پرصعوبت سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچنے والا مسافر ادا کرتا ہے۔ آپ ایک ایسے مسافر کو تصور میں لائیے جسے حالات نے کسی طغیانی میں آئے ہوئے دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا ہے وہ اپنی پوری توانائیاں بروئے کار لا کر ہاتھ پاؤں مارتا ہوا جب ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے پھر وہ ہانپتا کانپتا ساحل سے جب باہر نکلے تو وہ تو دل میں یہ محسوس کرے گا کہ زندگی تھی جو بچ نکلے اور یہ کرم تھا میرے اللہ کا کہ ساحل نصیب ہو گیا ورنہ آج تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ اچانک وہ دیکھے کہ ساحل کے ساتھ ہی ایک ایسا نعمتوں سے لدا ہوا باغ ہے جس میں مسرتیں اور شادمانیاں صرف اسی کیلئے سرتاپا انتظار ہیں اب جس طرح اس کی زبان اپنے محسن کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے میں رطب اللساں ہوگی اگر اس کا تصور کیا جا سکے تو کسی حد تک اس آیت کے مفہوم کا ادراک کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کا یہ سفر جو نجانے کتنے دریاؤں پر مشتمل ہے۔ آدمی ایک دریا پار کرتا ہے تو سامنے دیکھتا ہے کہ ایک اور دریا اس کا راستہ روکے کھڑا ہے اور وہ ہر قدم پر محسوس کرتا ہے

منجدھار میں ہے ناؤ شکستہ ہیں بادباں
کیسے لگیں گے پار ہوا سامنے کی ہے

خواہشات کے بے شمار بھنور ہیں جو ایمان کی کشتی کو نگل جانا چاہتے ہیں حوادث کے طوفان ہیں جو نیکیوں کے بادبانوں کو بے کار کیے دے رہے ہیں لیکن جب کشتی کھینے والا ہمت نہیں ہارتا تو توفیق ایزدی اس کو نہ صرف پار لگا دیتی ہے بلکہ ان نعمتوں کا مالک بنا دیتی ہے جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے جس طرح شکر کا اظہار ہوگا اس کو کسی حد تک یہاں زبان دی گئی ہے کہ وہ بے ساختہ یہ پکارے گا کہ یا اللہ یہ تیری جنت جو میری حقیقی منزل تھی بلکہ جو میرے جد امجد کی وراثت تھی اس لئے آگے اُورِثْتُمُوْهَا کا لفظ آ رہا ہے جس سے اس وراثت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ میں اس کو کسی طرح حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ الٰہی تیرا کرم ہے کہ تو نے اپنے رسول بھیجے وہ تیرا پیغام حق لے کر ہمارے پاس آئے۔ انہوں نے ہمیں خون جگر پی پی کر سمجھایا، ہم گالیاں دیتے تھے وہ دعائیں دیا کرتے تھے، ہم ان کی زندگی کے درپے تھے لیکن وہ ہمیں جنت کا وارث بنانا چاہتے تھے۔ یا اللہ تیرا کرم کہ تو نے ہمیں توفیق دی اور ہم تیرے رسولوں پر ایمان لائے۔ اگر تو اپنے رسول حق دے کر نہ بھیجتا تو ہم اس حقیقت کو کیسے پا سکتے تھے پھر تو اگر ہمیں ایمان کی توفیق نہ دیتا تو ہم اس حقیقت سے کیسے بہرہ ور ہو سکتے تھے۔ پھر شرعی احکام پر چلنا خواہشات کے مارے ہوئے لوگوں کیلئے کوئی آسان نہ تھا تو نے ہم پر کرم فرمایا اور ہمیں اس کی ہمت عطا فرمائی یہ تمام مراحل صرف تیری نظر کرم، تیری توفیق اور تیری عنایت سے ہم سر کر سکے ورنہ ہم اس قابل کہاں تھے کہ یہ سب کچھ ہم خود کر سکتے۔ کسی شاعر نے جہاز پر سفر کرتے ہوئے حج کو جاتے ہوئے بے ساختہ کہا تھا

کہاں میری قسمت عنایت ہے ان کی، سفینے پہ ان کے چلا جا رہا ہوں
ہواؤں کی بخشش لئے جا رہی ہے، حرم کی کشش کے مزے پا رہا ہوں

Marfat.com

یہ اہل جنت بھی ایسے ہی احساسات سے گراں بار ہو کر اللہ کی تعریف میں رطب اللساں ہوں گے اور اس کا شکر بجالائیں گے۔ اللہ کا مزید کرم یہ ہوگا کہ ایک ندا دینے والا ان کو ندا دے گا اور اہل جنت کی خوشیوں کو معراج تکمیل تک پہنچا دے گا کہ اے جنت کے باسیو یہ جنت جس کا تمہیں وارث بنا گیا ہے یہ یقیناً تمہیں اللہ کے فضل و کرم سے ملی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تم نے یہ درجہ اپنی خدمات کے صلہ میں پایا ہے اور یہ تمہاری اپنی محنت کی کمائی ہے جو تمہیں دی جارہی ہے اللہ کا فضل و کرم بے سبب نہیں ہوتا اس کا دنیا میں بھی قاعدہ یہ ہے کہ کوئی فصل کاشت کرتا ہے تو اس فصل کو پروردگار بار آور فرماتا ہے' کوئی درخت لگاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پھلوں سے گراں بار کر دیتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی آدمی نہ کاشت کرے نہ درخت لگائے اس کے گھر میں غلہ بھی آجائے اور پھل بھی اترنے لگیں۔ یہاں بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ تم بے شک کاشت کرتے رہتے اگر اللہ نہ چاہتا تو تمہاری محنتیں بے مزد رہتیں۔ تم بے شک گلستاں کھڑے کر دیتے لیکن اگر اللہ کو منظور نہ ہوتا تو تمہیں پھل کا ذائقہ چکھنا بھی نصیب نہ ہوتا لیکن اللہ بہت مہربان اور رحم والا ہے وہ کسی کی محنت کبھی ضائع نہیں کرتا تم نے محنت کی تو ہم نے تمہاری محنتوں کو پھل دیا۔ یہ جنت تمہاری محنتوں کا ثمرہ ہے جب اہلِ جنت یہ سنیں گے کہ کچھ ہمیں عطا ہوا ہے اس میں ہماری محنتیں بھی شامل ہیں تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی مسرتیں اور اس کی خوشیاں کہاں تک پہنچ جائیں گی۔ انسان کبھی توقع نہیں کرسکتا کہ میرے اعمال کو بھی اللہ تعالیٰ اتنا اونچا کر دیں گے کہ وہ جنت کی ابدی بادشاہی کو میرے اعمال کا نتیجہ قرار دے دیں گے۔

اہلِ جنت کے احساس اور پروردگار کی عطا سے ہمارے سامنے ایک حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ اہل دنیا اور اہل دین میں فرق یہ ہے اہلِ دنیا کو جو کچھ ملتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری قابلیت اور سعی و کوشش کا نتیجہ ہے اور اسی وجہ سے وہ ہر نعمت کے حصول پر اور زیادہ متکبر اور مفسد ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اللہ کے نیک بندوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اسے خدا کا فضل سمجھتے ہیں اس پر شکر بجالاتے ہیں۔ جتنا نوازے جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ متواضع' رحیم و شفیق اور فیاض ہوتے چلے جاتے ہیں پھر آخرت کے بارے میں بھی وہ اپنے حسن عمل پر غرور نہیں کرتے کہ ہم تو یقیناً بخشے ہی جائیں گے بلکہ اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتے ہیں۔ اپنے عمل کی بجائے خدا کے رحم اور فضل سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور ہمیشہ ڈرتے ہی رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے حساب میں لینے کی بجائے کچھ دینا ہی نہ نکل آئے۔ بخاری اور مسلم دونوں میں روایت موجود ہے کہ حضور نے فرمایا

اعلموا ان احدکم لن یدخله عمله الجنه ''خوب جان لو کہ تم محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں نہ پہنچ جاؤ گے۔

لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپ بھی؟ فرمایا ہاں میں بھی'

﴿ الا ان یتغمدنی اللہ برحمة منه و فضل ''الا یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل سے ڈھانک لے''۔ ﴾

میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو ایمان و عمل کا حق ادا کرنے میں اخلاص کے ساتھ زندگی بھر کوشاں رہا ہو اور اسی حال میں اسے موت آئی ہو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اسے نہ ڈھانپ لے لیکن اگر کوئی اپنے سارے ایمان و عمل کے باوجود اس غلط فہمی کا شکار ہو جائے کہ اب مجھے ا رحمت اور اس کے فضل کی کوئی ضرورت نہیں میرا ایمان و عمل کا سرمایہ میری بخشش کیلئے کافی ہے تو یہ ایک ایسی گمراہی ہے جس کا نتیجہ نہایت ہولناک ہے اسی وجہ سے اللہ کے پیغمبر جو معصوم پیدا ہوتے ہیں اور وہ یقیناً بخشے ہوئے ہیں ان کی نظر بھی ہمیشہ اللہ کی بے نیازی پر رہتی ہے اور وہ ہمیشہ اس کی کے طلب گار رہتے ہیں۔ اس طرح اگر کوئی آدمی محض فضل و کرم کی امید پر عمل سے بیگانہ ہو جائے اور بڑی جسارت سے احکامِ شریعت کو توڑے ا دلانے پر بھی یہ عذر پیش کرے کہ اللہ بہت غفور الرحیم ہے اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کریم میں ایک ہی جگہ دونوں باتیں فرمائی گئی ہیں ترجمہ یہ ہے کہ میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں غفور الرحیم ہوں اور یہ بھی خبر دے دو کہ میرا عذاب' عذاب الیم ہے کہ اگر تم ایمان و عمل کا سرمایہ گے تو مجھے غفور الرحیم پاؤ گے اور اگر شریعت سے لاپرواہی برتو گے پھر تمہیں میرے غضب کو بھی یاد رکھنا ہوگا۔ ظفر علی خاں نے ٹھیک کہا

Marfat.com

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

اگلی آیت کریمہ میں سابقہ آیت کے سیاق کلام کے مطابق اہل جنت کی جانب سے مزید خوشیوں کا اظہار ہے اور پروردگار کی طرف سے عطاو بخشش میں افزونی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ط قَالُوۡا نَعَمۡ ج فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ لَّعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ O الَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ یَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ج وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ کٰفِرُوۡنَ O

''اور جنت والے دوزخ والوں کو پکار کر پوچھیں گے کہ ہم سے جو کچھ ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا' ہم نے اس کو بالکل سچا پایا۔کیا تم نے بھی' جو کچھ تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا' اس کو سچا پایا؟ وہ جواب دیں گے ہاں۔پھر ایک منادی کرنے والا ان کے بیچ میں پکارے گا کہ اللہ کی لعنت ان ظالموں پر۔جو اللہ کی راہ سے روکتے اور ان میں کجی پیدا کرنا چاہتے تھے اور وہ آخرت کے منکر تھے''۔44-45

اہل جنت کی شان اور ان کی قوتوں کا عروج:

سب سے پہلے تو اس آیت کریمہ میں اللہ کے انعام و بخشش کے حوالے سے غور فرمائیے کہ اہل جنت وہی لوگ ہیں جو دنیا میں اہل دنیا کے ستائے ہوئے اور نظر انداز کیے ہوئے لوگ تھے جنہوں نے دینی زندگی گزارنے کیلئے نجانے کیسے کیسے دکھ اٹھائے اور قدم قدم پر ہر طرح کی محرومیوں سے واسطہ پڑتا رہا۔اب جبکہ وہ جنت میں پہنچ گئے ہیں تو اچانک ان کے دائرہ اثر' دائرہ کار' ان کی شخصیت کی وسعتوں اور ان کی توانائیوں میں حیرت انگیز وسعت پیدا ہوگئی ہے بلکہ ایک طرح سے انقلابِ حال واقع ہوگیا ہے کہ ان کی تمام توانائیوں' تمام حواس اور عقل و خرد میں ایک ایسا تغیر واقع ہوا ہے کہ ان کی یہ قوتیں جو دنیا میں طبعی قوانین کے مطابق نہایت محدود دائرے میں کارفرما رہ سکتی تھیں اب ان کے سامنے کوئی روک باقی نہیں رہی۔ان کی نگاہیں محدود حد تک دیکھ سکتی ہیں ان کی سماعتیں لامحدود حد تک سن سکتی ہیں یعنی دنیا میں جو طبعی قوانین کارفرما تھے وہ یکسر ختم کر دیئے گئے ہیں اب آخرت میں ایک نئی دنیا اور وہاں کے قوانین سے واسطہ ہے اور اہل جنت کو وہاں کے حالات کے مطابق نئی توانائیاں عطا کی گئی ہیں۔چنانچہ انہی حیرت انگیز قوتوں کے باعث وہ اہل جہنم کو اپنے سامنے پائیں گے حالانکہ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جنت کی وسعتوں کا حال یہ ہے کہ زمین و آسمان کی وسعتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں اور پھر جہنم اس سے نجانے کتنی دوری پر واقع ہے اور خود اس کی وسعتوں کا عالم کیا ہے لیکن ان کی قوتوں کے سامنے یہ تمام وسعتیں سمٹ جائیں گی اور نہایت آسانی سے اہل جہنم سے باتیں کر سکیں گے۔اگرچہ قرآنِ کریم کی بیان کردہ یہ باتیں حیران کن ہیں لیکن آج کے سائنسی دور میں ہمارے لئے یہ باتیں حیران کن نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ انسان نے قدرت کے محض چند ضمنی قوانین کو دریافت کر کے ایسی ایسی ایجادات کر لی ہیں جو سابقہ ادوار میں کبھی تصور بھی نہ کی جاسکتی تھیں۔ایسی دوربینیں ایجاد ہوگئی ہیں جن کے ذریعے سے ہزاروں میل کی مسافت پر دیکھا جاسکتا ہے۔ٹیلی فون کی ایجاد سے ملکوں کے فاصلے سمٹ گئے ہیں۔اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے کسی بھی ملک کے پروگرام ٹیلی ویژن سکرین پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ایسے آلات ایجاد ہو گئے ہیں جن

Marfat.com

سے لاکھوں میل کی مسافت سے نبض کی حرکت محسوس کی جاسکتی اور دل کی دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔ اگر اس دنیا میں یہ سب کچھ ممکن ہوگیا ہے تو آخرت میں جبکہ نئے قوانین نافذ ہوچکے ہوں گے اور قانون طبعی کی نارسائیوں سے انسان نکل چکا ہوگا تو اس میں قرآن کریم کے بیان کردہ احوال کو حیران کن کس طرح کہا جاسکتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اس آیت کریمہ میں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اہل جنت کی خوشی ان کی ایک ایک ادا سے پھوٹی پڑ رہی ہوگی وہ جنت کی نعمتوں اور اللہ کی بخششوں کو محسوس کرتے ہوئے خوشی سے جھوم رہے ہوں گے۔ اسی کیفیت میں قدرت جب ان کے سامنے اہل جہنم کو منکشف فرمائے گی خوشیوں کے اس طوفان میں ان کی زبان سے یہ سوال نکلے گا کہ او جہنم والو ہم سے تو اللہ نے جن باتوں کا وعدہ فرمایا تھا ہم نے ان میں سے ایک ایک بات کو سچا پایا ہے تو کیا تم نے بھی ان باتوں کو سچا پایا ہے جو عذاب کے سلسلے میں تم سے کہی گئی تھیں اور تمہیں بار بار اللہ کے نبی تنبیہ کرتے رہے تھے کہ اگر تم اپنی حالت نہ بدلی تو تمہیں جہنم کے ہولناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا تو اس کے جواب میں اہل جہنم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہاں۔ یہ ہاں کا مختصر جواب ان کے طویل سے طویل جواب پر بھی بھاری ہوگا کیونکہ جب کوئی مجرم اپنی سزا کو سامنے دیکھتا ہے تو تب اسے اپنے جرم کی سنگینی کا صحیح احساس ہوتا ہے۔ پھر وہ گردن جھکا لیتا ہے اور اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس کی ٹوٹی ہوئی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے چنانچہ یہ بھی اپنے جرم کے بوجھ تلے دبے ہوئے نعم کے سوا کچھ نہیں کہہ سکیں گے۔ لیکن اسی ایک مختصر جواب پر ان کا کیس مکمل ہوجائے گا تو ایک پکارنے والا ان کی سزا کا اعلان کرتے ہوئے کہے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔ لعنت کا مفہوم ہے اللہ کی رحمت سے دوری یہ انتہائی سزا ہے جو اللہ کی جانب سے کسی کو مل سکتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ہر طرح کا تعلق ان کے پروردگار سے ٹوٹ چکا ہے اب یہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہیں گے اور کبھی بھی اللہ کی رحمت ان کو نصیب نہیں ہوگی اس کے بعد اس کا سبب بیان کیا گیا ہے کہ یہ اتنی بڑی ہولناک سزا کو اس لئے پہنچے ہیں کہ ان کی فرد جرم بہت طویل ہے جن کے تین بڑے بڑے عنوانات ہیں اور یہ بات مشرکین مکہ سے سنا کے کہی جارہی ہے کہ تم بھی انہی جرائم کا ارتکاب کر رہے ہو۔ خوب اندازہ کرلو کل کو تمہیں بھی ایسی ہی صورت حال سے واسطہ پڑنے والا ہے وہ تین جرائم یہ ہیں۔

1- یہ لوگ اللہ کے راستے سے روکا کرتے تھے۔ 2- اللہ کے دین میں کجی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ 3- آخرت کے منکر تھے۔

یہ تینوں عنوانات ہیں جس میں بے شمار ذیلی جرائم شامل ہیں مثلاً اللہ کے راستے سے روکنا یعنی دین قبول کرنے سے روکنا اور اگر کسی طرح قبول کرلیا ہے تو اس کے امکانات پر پہرے بٹھا دینا۔ اذیتوں اور مظالم کی انتہا کر کے دین کی برکات کو ظاہر نہ ہونے دینا' محرکات شر کو فروغ دے کر قوتوں کے پھلنے پھولنے کے مواقع ختم کر دینا' دین کا راستہ مشکل بنا کر لوگوں میں اسے اجنبی بنا دینا' علی ہذا القیاس یہ ایک طویل فہرست ہے۔

جہاں تک دین میں کجی پیدا کرنے کا تعلق ہے اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جو قلب و نگاہ کو آلودہ کرنے اور فکری ژولیدگی پیدا کرنے کی جاتی ہیں۔ تعلیم اور ابلاغ کے واسطے سے دل و دماغ کو اس طرح پراگندہ کر دینا کہ صحیح راستے کی طرف سفر اس کیلئے ممکن نہ رہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ایسا مخلوط ماحول دینا جس میں جنسی آوارگی کو کھل کھیلنے کا موقع ملے۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے نام سے ایسی مصروفیات پیدا کر دینا جس سے انسانیت سرپیٹ کے رہ جائے' وضعی علوم کے ذریعے ایسے ایسے طریقے ایجاد کرنا جس سے فطری سادگی ختم ہوجائے اور ہر سیدھی بات کو بھی الجھا دیا جائے۔ جس طرح آنکھ کا فوکس بدل جائے یا آئینۂ نگاہ میں تبدیلی آجائے تو ہر چیز ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے اسی طرح جب سوچ کے زاویے بدل جائیں تو ہر فطری حقیقت الجھی ہوئی دکھائی دیتی ہے اس طرح کی کوئی کوشش بھی اللہ کے دین میں کجی پیدا کرنے کی کوشش کہلاتی ہے۔

Marfat.com

جہاں تک آخرت سے کفر کا تعلق ہے یہ تمام جرائم کی بنیاد اورام الامراض ہے کیونکہ انسان میں بگاڑ کی جتنی صورتیں پیدا ہوتی یا محکم ہوتی ہیں اس کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے جب آدمی اسی دنیا کی زندگی کو منزل قرار دے کر آخرت سے انکار کر دیتا ہے۔ اس خشت اول کے ٹیڑھا ہو جانے کے بعد پوری دیوار ٹیڑھی اٹھتی چلی جاتی ہے جب دنیوی زندگی اخروی زندگی سے کٹ جاتی ہے تو پھر بے خدا تہذیب' بے خدا تمدن اور بے مقصد زندگی کو پیدا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس ہی انسان کو برائی سے روکتا ہے جیسے ہی یہ تصور کمزور یا فنا ہوتا ہے تو ہر چیز فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے اس لئے ان تین جرائم کو بنیادی جرائم قرار دے کر اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور جہنم کو ان جرائم کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

اگلی آیات کریمہ میں جنت اور جہنم کے درمیان ایک دیوار کا ذکر کیا گیا ہے اور اس پر کچھ لوگوں کا بھی جو اہل جنت کو بھی دیکھیں گے اور اہل جہنم کو بھی باوجود اس کے کہ وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے لیکن ان کی سرخوشی پھر بھی چھپائے نہیں چھپے گی۔ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ○ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ ۙ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○

''اور ان دونوں گروہوں کے درمیان پردے کی دیوار ہوگی اور دیوار کی بلندیوں پر کچھ لوگ ہوں گے' جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر۔ یہ لوگ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے' مگر اس کے امیدوار ہوں گے۔ اور جب ان کو اہل دوزخ کی طرف توجہ دلائی جائے گی تو وہ کہیں گے' اے رب! ہمیں ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجئے''۔ 46-47

ہم اس آیت کی تشریح کے ضمن میں معارف القرآن سے استفادہ کرتے ہیں۔

جنت دوزخ والوں کے باہمی مکالمات کے ضمن میں ایک اور بات اس آیت میں بتلائی گئی کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جہنم سے تو نجات پا گئے مگر ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے البتہ اس کے امیدوار ہیں کہ وہ بھی جنت میں داخل ہو جائیں ان لوگوں کو اہل اعراف کہا جاتا ہے۔

اعراف کیا چیز ہے' اس کی تشریح سورۃ حدید کی آیات سے ہوتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں لوگوں کے تین گروہ ہوں گے۔ ایک کھلے کافر و مشرک ان کو تو پل صراط پر چلنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ پہلے ہی جہنم کے دروازوں سے اس میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ دوسرے مومنین ان کے ساتھ نور ایمان کی روشنی ہوگی۔ تیسرے منافقین' یہ چونکہ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ لگے رہے وہاں بھی شروع میں ساتھ لگے رہیں گے اور پل صراط پر چلنا شروع ہوں گے اس وقت ایک سخت اندھیری سب کو ڈھانپ لے گی' مومنین اپنے نور ایمان کی مدد سے آگے بڑھ جائیں گے اور منافقین پکار کر ان کو کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اٹھائیں' اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کہنے والا کہے گا کہ پیچھے لوٹو وہاں روشنی تلاش کرو' مطلب یہ ہوگا کہ یہ روشنی ایمان اور عمل صالح کی ہے' جس کے حاصل کرنے کا مقام پیچھے گزر گیا جن لوگوں نے وہاں ایمان و عمل کے ذریعہ یہ روشنی حاصل نہیں کی' ان کو آج روشنی کا فائدہ نہیں ملے گا' اسی حالت میں منافقین اور مومنین کے درمیان ایک دیوار کا حصار حائل کر دیا جائے گا' جس میں ایک دروازہ ہوگا' اس دروازہ کے باہر تو سارا عذاب ہی عذاب نظر آئے گا اور دروازہ کے اندر جہاں مومنین ہوں گے' وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مشاہدہ اور جنت کی فضا سامنے ہوگی۔ یہی مضمون اس آیت کا ہے:

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ ۚ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ

Marfat.com

فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا ؕ فَضُرِبَ بَیۡنَہُمۡ بِسُوۡرٍ لَّہٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُہٗ فِیۡہِ الرَّحۡمَۃُ وَ ظَاہِرُہٗ مِنۡ قِبَلِہِ الۡعَذَابُ O

اس آیت میں وہ حصار جو اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان حائل کیا جائے گا' اس کو لفظ سُور سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ لفظ دراصل شہر پناہ کیلئے بولا جاتا ہے جو بڑے شہروں کے گرد غنیم سے حفاظت کیلئے بڑی مضبوط' مستحکم' چوڑی دیوار بنائی جاتی ہے۔ ایسی دیواروں میں فوج کے حفاظتی دستوں کی کمین گاہیں بھی بنی ہوتی ہیں' جو حملہ آوروں سے باخبر رہتے ہیں۔

حجاب سے مراد؟

سورۃ اعراف کی آیت مذکورہ میں ہے ﴿ وَبَیۡنَہُمَا حِجَابٌ ۚ وَ عَلَی الۡاَعۡرَافِ رِجَالٌ یَّعۡرِفُوۡنَ کُلًّۢا بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ ﴾ ابن جریر اور دوسرے آئمہ تفسیر کی تحریر کے مطابق اس آیت میں لفظ حجاب سے وہی حصار مراد ہے جس کو سورۃ حدید کی آیت میں لفظ سُور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس حصار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے کیونکہ اعراف عرف کی جمع ہے اور عرف ہر چیز کے اوپر والے حصہ کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دور سے معروف وممتاز ہوتا ہے۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ جنت ودوزخ کے درمیان حائل ہونے والے حصار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے اور آیت اعراف میں یہ بتلایا گیا ہے کہ محشر میں اس مقام پر کچھ لوگ ہوں گے جو جنت ودوزخ دونوں طرف کے حالات کو دیکھ رہے ہوں گے اور دونوں طرف رہنے والوں سے مکالمات اور سوال وجواب کریں گے۔

اب یہ بات کہ یہ کون لوگ ہوں گے اور اس درمیانی مقام میں ان کو کیوں روکا جائے گا اس میں مفسرین کا اقوال مختلف اور روایات حدیث متعدد ہیں لیکن صحیح اور راجح جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے حسنات اور سیئات کے دونوں پلے میزان عمل میں برابر ہو جائیں گے' اپنے حسنات کے سبب جہنم سے تو نجات پالیں گے لیکن سیئات اور گناہوں کے سبب ابھی جنت میں ان کا داخلہ نہ ہوا ہوگا اور بالآخر رحمت خداوندی سے یہ لوگ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

صحابہ کرام میں سے حضرت حذیفہ' ابن مسعود' ابن عباس رضی اللہ عنہم کا اور دوسرے صحابہ وتابعین کا یہی قول ہے اور اس میں تمام روایات حدیث بھی جمع ہو جاتی ہیں جو مختلف عنوانات سے منقول ہیں امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اہل اعراف کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی' اس لئے جہنم سے تو نجات ہوگئی مگر جنت میں ابھی داخل نہیں ہوئے' ان کو اس مقام اعراف پر روک لیا گیا' یہاں تک کہ تمام اہل جنت اور اہل دوزخ کا حساب اور فیصلہ ہو جانے کے بعد ان کا فیصلہ کیا جائے گا اور بالآخران کی مغفرت ہو جائے گی اور جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے' (ابن کثیر)۔

ابن مردویہ نے بروایت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اہل اعراف کون لوگ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے والدین کی مرضی اور اجازت کے خلاف جہاد میں شریک ہوگئے اور اللہ کی راہ میں شہید ہوگئے تو ان کو جنت کے داخلہ سے ماں باپ کی نافرمانی نے روک دیا اور جہنم کے داخلہ سے شہادت فی سبیل اللہ نے روک دیا۔

اس حدیث اور پہلی حدیث میں کوئی تضاد نہیں بلکہ یہ حدیث ایک مثال ہے ان لوگوں کی جن کی نیکیاں اور گناہ برابر درجہ کے ہوں' کہ ایک طرف شہادت فی سبیل اللہ اور دوسری طرف ماں باپ کی نافرمانی' دونوں پلے برابر ہوگئے (کذا قالہ ابن کثیر)۔

Marfat.com

وَنَادَىٰٓ أَصْحَٰبُ ٱلْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُم بِسِيمَٰهُمْ
قَالُوا۟ مَآ أَغْنَىٰ عَنكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٤٨﴾ أَهَٰٓؤُلَآءِ
ٱلَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ ٱللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۚ ٱدْخُلُوا۟ ٱلْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ
عَلَيْكُمْ وَلَآ أَنتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٤٩﴾ وَنَادَىٰٓ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ أَصْحَٰبَ
ٱلْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا۟ عَلَيْنَا مِنَ ٱلْمَآءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ ٱللَّهُ ۚ قَالُوٓا۟
إِنَّ ٱللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٥٠﴾ ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُوا۟ دِينَهُمْ لَهْوًا
وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا ۚ فَٱلْيَوْمَ نَنسَىٰهُمْ كَمَا نَسُوا۟ لِقَآءَ
يَوْمِهِمْ هَٰذَا وَمَا كَانُوا۟ بِـَٔايَٰتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿٥١﴾ وَلَقَدْ جِئْنَٰهُم
بِكِتَٰبٍ فَصَّلْنَٰهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾
هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُۥ ۚ يَوْمَ يَأْتِى تَأْوِيلُهُۥ يَقُولُ ٱلَّذِينَ
نَسُوهُ مِن قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِٱلْحَقِّ فَهَل لَّنَا مِن
شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوا۟ لَنَآ أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ ٱلَّذِى كُنَّا نَعْمَلُ ۚ
قَدْ خَسِرُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَفْتَرُونَ ﴿٥٣﴾

پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ دیکھ لیا تم نے آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ بھی نہ دے گا؟

Marfat.com

داخل ہو جاؤ جنت میں' تمہارے لئے نہ خوف ہے نہ رنج۔ اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ پانی یا ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخش رکھی ہیں کچھ ہم پر بھی کرم فرماؤ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کیلئے حرام کر رکھی ہیں۔ ان کیلئے جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنایا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا پس آج ہم ان کو نظر انداز کریں گے جس طرح انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔ اور ہم نے ان کو ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علم قطعی کی بنیاد پر کی ہے' ہدایت ورحمت بنا کر ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔ یہ لوگ اس حقیقت کے انجام کے منتظر ہیں جس روز وہ انجام ان کے سامنے آجائے گا وہ لوگ جنہوں نے اس کو پہلے نظر انداز کئے رکھا، کہیں گے بیشک ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ وہ گھڑتے رہے تھے سب ہوا ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

گزشتہ آیات میں ہم نے یہ پڑھا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہو گی جس کی چوٹیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جنہیں اصحاب الاعراف کہا گیا ہے وہ وہاں سے جنت اور جہنم کو دیکھ سکیں گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن چونکہ دنیا کے طبعی قوانین کو ختم کر دیں گے اور آخرت کے و[...] حیرت انگیز قوانین نافذ ہوں گے جن کے نتیجے میں انسانی استعداد اور اس کے حواس میں بے پناہ وسعت پیدا ہو جائے گی آج جن چیزوں کو انسان نہیں دیکھ سکتا وہاں وہ بڑی آسانی سے بتمام وکمال ان چیزوں کو دیکھے گا اور جن آوازوں کو محدود حد تک سن سکتا ہے انہیں بے پایاں وسعتوں کے ساتھ سنے گا آ[...] غفلت اور بے خبری کا جو پردہ ہماری صلاحیتوں پر تنا ہوا ہے اسے اتار دیا جائے گا اور ہر انسانی قوت کی طرح نگاہ بھی نہایت تیزی سے کام کرے گی ہر او[...] کے پیچھے دیکھ سکے گی حتیٰ کہ عالم اسباب کے ماوراء جو کچھ ہے اسے بھی جھانک سکے گی۔ قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ كُنْتَ فِىْ غَفْلَةٍ مِنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ

''تو اس سے غفلت میں تھا پس ہم نے تجھ سے ہر پردے کو ہٹا دیا ہے آج تیری نظر نہایت تیز ہے''۔

چنانچہ جنت اور جہنم اپنی تمام وسعتوں اور مسافتوں کے باوجود اہل جنت اور اہل جہنم کیلئے سامنے کی چیزوں میں تبدیل کر دی جائیں گی۔ اہ[...] جنت اہل جہنم کو دیکھ سکیں گے اور اہل جہنم اہل جنت کو۔ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر سکیں گے اور ایک دوسرے کے احوال کو دیکھ سکیں گے۔ اسی طر[...] اصحاب اعراف بھی ان دونوں کو دیکھیں گے۔ سب سے پہلے ان کی نگاہ اہل جنت پر پڑے گی اور وہاں کے باسیوں کو وہ پہچانیں گے اور پھر ان کی نگاہ ج[...] کی طرف پھیری جائے گی تو وہ جہنم کی ہولناکیوں کو دیکھ کر اللہ سے دعا کریں گے کہ یا اللہ ہمیں ان سے محفوظ رکھنا اور پھر وہ جہنم کے بڑے بڑے لوگو[...] پہچان کر ان سے سوالات کریں گے۔ چنانچہ پیش نظر آیات میں انہی سوالات کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ○

Marfat.com

اَھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا یَنَالُھُمُ اللّٰہُ بِرَحۡمَۃٍ ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ O

''پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ دیکھ لیا تم نے آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ بھی نہ دے گا؟ داخل ہو جاؤ جنت میں، تمہارے لئے نہ خوف ہے نہ رنج''۔ 48-49

اہلِ جنت و جہنم کی علامات:

پیش نظر آیت کریمہ اور گزشتہ سے پیوستہ آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اصحاب اعراف اہل جنت کو ان کی علامتوں سے پہچانیں گے اور جہنم کے بڑے بڑے لوگوں کو ان کی علامتوں سے پہچانیں گے اور پھر ان سے کچھ سوال کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ان کو کس طرح پہچانیں گے؟ قرآن کریم سے بھی ہمیں اس کا جواب ملتا ہے اور احادیث پاک سے بھی۔ مسلم شریف کی ایک روایت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ حضور آپ ہمیں قیامت کے دن کس طرح پہچانیں گے فرمایا کسی کے گھوڑے اگر پنج کلیان ہوں (یعنی گھوڑے کی پیشانی اور اس کے چاروں پاؤں اگر سفید ہوں تو انہیں پنج کلیان کہا جاتا ہے) تو کیا باقی گھوڑوں میں سے انہیں پہچاننا مشکل ہے ظاہر ہے کہ ان کا پہچاننا مشکل نہیں بلکہ ان کی ان علامتوں سے باقی گھوڑوں میں سے ان کو آسانی سے پہچان لیا جائے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس امت کے نیک لوگوں اور نمازیوں کو پنج کلیان بنایا ہے یعنی ہم جو اپنے اعضا وضو میں دھوتے ہیں یعنی چہرہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں یہ پانچوں اعضا قیامت کے دن نہایت روشن ہوں گے۔ ان اعضا کی روشنی سے رسول پاک ﷺ اپنی امت کے نیک لوگوں کو پہچانیں گے اور اہل جنت بھی انہی علامتوں کے ساتھ جنت میں داخل کئے جائیں گے اور ہر دیکھنے والا انہیں انہی علامتوں سے پہچانے گا اسی طرح اہل جہنم کی بھی معلوم ہوتا ہے کچھ علامتیں ہیں مثلاً سورۃ لہب میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابولہب کی بیوی قیامت کے دن اس حال میں اٹھائی جائے گی کہ اس کی گردن میں لکڑیوں کا گٹھا باندھنے والی رسی ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے بھی اللہ کے رسول اور ان کے پیروکاروں کو جن اسباب کے تحت اذیتیں پہنچائی ہوں گی وہی ان کے ستم رانی کے طریقے ان کی علامت بنا دیئے جائیں گے۔ اس طرح قرآنِ کریم سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن صاحب ایمان لوگوں کے چہرے نہایت روشن اور تر و تازہ ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس کافروں کے چہرے نہایت سیاہ اور مکروہ ہوں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو بڑے بڑے کفار ہوں گے جنہوں نے آئمہ کفر کی طرح اپنا رول ادا کیا ہوگا وہ اپنے چہروں کی بڑھی ہوئی سیاہی اور چہروں پر پڑی ہوئی لعنت سے پہچانے جائیں گے۔ جتنا کوئی بڑا کافر ہوگا اس کا چہرہ اتنا ہی زیادہ سیاہ اور مکروہ ہوگا اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کے چہروں پر اور بھی کوئی ایسی علامتیں ہوں جن کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے کہ یہ ابوجہل ہے اور یہ ابولہب۔ ایسی ہی علامتوں سے اصحاب اعراف ان اہل جہنم کے بڑے بڑے کافروں کو پہچانیں گے اور پھر ان سے مختلف سوالات کریں گے۔ پہلا سوال ان کے رویے اور ان کے بعض مزعومات کے حوالے سے ہوگا ان کا رویہ یہ تھا کہ اسلام اور آنحضرت ﷺ کے مقابلے میں انہیں اپنی افرادی قوت، اپنی کثرت تعداد اور اپنے مال و دولت پر بڑا فخر اور ناز تھا اور وہ بات بات پر مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے تھے کہ تمہارا دین اگر سچا ہوتا تو کیا اس کے قبول کرنے والے تم جیسے بے بس اور بے کس لوگ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ اپنی سچائی کیلئے یقیناً ان لوگوں کو کھڑا کرتا جن کی بات میں وزن ہوتا، لوگ جنہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوتے۔ تم غریب لوگ جنہیں کسی مجلس میں بار نہیں ملتا، تمہاری بات سننے کا کوئی روادار نہیں، تمہیں معاشرے میں کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں،

Marfat.com

عزت اور اہمیت کی بات بھی تمہاری زبانوں پر آجانے کے بعد اہمیت کھو دیتی ہے' لوگ اسے سننے کے روادار نہیں ہوتے تو جس دین کو تم جیسے لوگ پسند کرتے ہیں یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس دین میں کوئی قابل قبول بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زاویہ نگاہ بدل جانے سے الفاظ کا مفہوم اور حقیقتوں کے مصداق بدل جاتے ہیں غریب لوگوں نے آگے بڑھ کر اسلام کو سینے سے لگایا تو اشراف مکہ کی نگاہ میں یہ بات اسلام کی سبکی کا باعث بن گئی اور اسی کو دلیل بنا کر انہوں نے اسلام کو سچا مذہب اور سچا دین سمجھنے سے انکار کر دیا لیکن یہی بات قیصر روم کی نگاہ میں بالکل ایک دوسرا مفہوم رکھتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جب خطوط کے ذریعے سلاطین عالم کو اسلام کی دعوت دی تو قیصر روم کو بھی اسی سلسلے میں آپ نے ایک مکتوب گرامی لکھا۔ چنانچہ جب اس کو یہ مکتوب ملا تو بجائے اس کے کہ وہ کسریٰ ایران کی طرح توہین آمیز رویہ اختیار کرتا اور اس مکتوب کو پھاڑ کر پھینک دیتا اس نے نہایت احترام سے اس کو وصول کیا اور کہا کہ یہاں کچھ عرب اگر تجارت کے سلسلے میں آئے ہوئے ہوں تو انہیں میرے پاس لاؤ تا کہ اس نبوت کے دعوے دار کے بارے میں میں ان سے تحقیق کر سکوں اتفاق سے ابوسفیان جو ان دنوں اسلام کے بدترین دشمن تھے وہ وہاں موجود تھے۔ انہیں ان کے ساتھیوں سمیت قیصر روم کے سامنے پیش کیا گیا۔ قیصر نے جہاں اور کئی سارے سوالات کئے وہیں ان سے یہ بھی ایک سوال کیا کہ اس نبی پر ایمان لانے والے کون لوگ ہیں امیر یا غریب؟ ابوسفیان نے جواب دیا کہ غریب لوگ ہیں۔ قیصر بجائے اس کے کہ اشراف مکہ کی طرح اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا کہ جس نبی کی دعوت غریب لوگ قبول کریں وہ اس قابل نہیں کہ اس پر غور بھی کیا جا سکے اس نے اس کے بالکل برعکس یہ کہا کہ اگر واقعی اس پر ایمان لانے والے غریب لوگ ہیں تو وہ اللہ کا سچا نبی ہے کیونکہ نبیوں پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ امراء تو اس وقت شریک ہوتے ہیں جب قافلہ بن جاتا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ امراء کا طبقہ چونکہ اپنے ساتھ بے شمار مالی مفادات رکھتا ہے معاشرے میں حاصل کردہ مقام و مرتبہ کے تحفظ کی اسے فکر رہتی ہے وہ جب دیکھتا ہے کہ نئے دین کی دعوت کو قبول کرنے کے نتیجے میں بہت سارے مالی مفادات کو چھوڑنا پڑے گا ہو سکتا ہے بہت کچھ ایثار کرنا پڑے تو مال و دولت کی محبت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شخصی بزدلی کے باعث وہ اسلام کی طرف آنے سے انکار کر دیتا ہے اور مال و دولت کے وہ پتھر جو اس کی ذات کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں وہ اسے ایثار و قربانی کے اس دریا میں اترنے سے روکتے ہیں وہ جانتا ہے کہ اگر میں ان پتھروں سمیت دریا میں اترا تو ڈوب جاؤں گا اس لئے کسی بھی انقلاب کے پس پردہ اگر آپ جھانک کے دیکھیں تو انقلاب کی جان اور انقلاب کی قوت ہمیشہ غریب کا طبقہ ہے۔ امراء میں ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہوتے ہیں جو شروع ہی میں پیغمبر کی دعوت کو قبول کر کے اپنے مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ کے یہاں بڑے مقام کے مالک بن جاتے ہیں لیکن طبقہ امراء کے بیشتر لوگ ہمیشہ انقلاب کی آگ سے دور رہتے ہیں بلکہ عموماً ان کا مقام اور ان کا اثر و رسوخ اور ان کا مال و دولت انقلاب کے رستے کی رکاوٹ بنتا ہے اور وہ اگر شریک ہوتے بھی ہیں تو اس وقت جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب یہ انقلاب اپنی کامیابیوں کی طرف بڑھ رہا ہے یہی حال اشراف مکہ کا بھی تھا وہ اپنے موجودہ مقام و مرتبہ' اپنی خوشحالی اور خوش عیشی کو کسی طرح چھوڑنے کو تیار نہیں تھے بلکہ اسے اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اس لئے سب سے پہلا سوال جو اصحاب اعراف ان اہل جہنم کے بڑے بڑے سرداروں سے کریں گے وہ یہی ہو گا کہ بتاؤ تمہاری یہ جمعیت اور تمہارا مال و دولت تمہارے کس کام آیا جسے تم اپنے سچا ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے اس دلیل نے تمہیں کیا فائدہ دیا اور دوسرا سوال ان کے استکبار کے حوالے سے ہو گا۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ دیکھو تم دنیا میں ہمیشہ مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور تم پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی غریب آدمی تمہیں مخاطب کرنے کی جرأت بھی کر سکے اور اسی تکبر کے نتیجے میں تم ان کی کسی بات کو وزن دینے کو تیار نہیں تھے بلکہ تم قسمیں کھا کھا کر یہ کہتے تھے کہ یہ غریب لوگ جن کو جنت کی طلب نے اندھا کر دیا ہے نجانے یہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں حالانکہ

Marfat.com

حقیقت یہ ہے یہ کبھی اللہ کی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے اگر یہ اس کی رحمت کے مستحق ہوتے تو دنیا میں اس بے سروسامانی کے ساتھ زندگی نہ گزارتے یہ نانِ شبینہ کے محتاج لوگ کیا اس قابل ہیں کہ انہیں جنت کا وارث بنا دیا جائے۔ اصحاب اعراف ان سے کہیں گے کہ دیکھو جن لوگوں کے بارے میں تم قسمیں کھا کر یہ کہتے تھے کہ یہ کبھی اللہ کی رحمت کے مستحق نہیں ہوں گے وہی آج جنت میں ہیں اور تم جہنم میں پڑے جل رہے ہو۔ بتاؤ تمہارے اس تکبر نے تمہیں آخر کیا فائدہ پہنچایا۔ اہل جہنم سے یہ سوال اصلاً مشرکین مکہ، مشرکین عرب اور دنیا بھر کی لادینی قوتوں سے کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ ہر جگہ کا کفر انہی دو امراض کا شکار ہے کہ یا ان کو اپنی جمعیت اور اپنے مال و دولت کی کثرت پر ناز ہے اور اسی کو وہ اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل بھی سمجھتے ہیں اور یا انہیں اپنی قوت کے باعث تکبر کا مرض لاحق ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو جنت کا مستحق بھی سمجھتے ہیں اور غریب مسلمانوں کو نہ وہ دنیا میں کسی قابل سمجھتے ہیں اور نہ آخرت کا سزاوار جانتے ہیں اور یہاں واقعاتی دنیا کو سامنے رکھ کر اور انجام سے پردہ اٹھا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کے یہاں نجات پانے اور کسی مقام کو حاصل کرنے کیلئے لاؤ لشکر کی کثرت اور دولت اور قوت کی فراوانی کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ وہاں جو چیز عزت حاصل کر سکے گی وہ ہر آدمی اور ہر قوم کا کا ایمان و عمل اور اس کا ذاتی کردار ہوگا۔

جنت میں داخل ہونے کا مفہوم کیا ہے؟ اور اس کے مخاطب کون ہیں؟

اس کے بعد فرمایا جنت میں داخل ہو جاؤ جنت میں جانے کے بعد نہ تمہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ حزن ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ یہ جنت میں داخلے کا حکم کسے دیا جا رہا ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے جس کی طرف ہمارے بیشتر مفسرین گئے ہیں کہ یہ حکم اصحاب اعراف کو ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو جہنم سے بچا لئے جائیں گے لیکن ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے دونوں کے درمیان اپنے بہتر انجام کی آرزو لئے منتظر ہوں گے انہی سے فرمایا جا رہا ہے کہ اب تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم اب تک جس خوف اور جن اندیشوں کا شکار رہے ہو آئندہ اس کا کوئی امکان نہیں ہوگا اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے مراد اہل جنت ہوں، ان کو جنت میں داخلے کا حکم دیا جا رہا ہے اگر یہ مراد لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل جنت تو جنت میں پہنچ چکے ان کو داخلے کا حکم دینے کا کیا مطلب؟ بات اصل میں یہ ہے کہ عربی زبان میں فعل ہر جگہ اپنے ابتدائی معنی ہی پر دلیل نہیں ہوا کرتا بلکہ بعض مواقع میں وہ تمکن و استمرار پر دلیل ہوتا ہے یعنی مقصود اس سے یہ نہیں ہوتا کہ یہ کام کرو بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کام کے جو حقیقی فوائد اور حقیقی مقاصد ہیں انہیں حاصل کرو اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے خاندان کو جب ان کے وطن سے مصر میں بلایا تو آپ کے بھائی اپنے والدین سمیت جب مصر میں داخل ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے باقاعدہ دربار میں ان کا استقبال کیا۔ والدین کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور اس کے بعد فرمایا، جس کو قرآن کریم بیان کرتا ہوا کہتا ہے:

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰٓی اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ

"پس جب وہ یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو ان شاء اللہ امن کے ساتھ" (یوسف:۹۹)

غور فرمایئے! انہیں مصر میں داخل ہونے کیلئے کہا جا رہا ہے حالانکہ وہ مصر میں داخل ہو چکے ہیں اس لئے اس کا مفہوم داخل ہونا تو مراد نہیں لیا جا سکتا یقیناً اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت یوسف علیہ السلام انہیں اس داخلے پر مبارکباد دے رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ یہ نہ سمجھئے کہ آپ مصر میں ایک مہمان کے طور پر تشریف لائے ہیں بلکہ یہ آپ کا وطن ہے اب آپ کو یہیں زندگی گزارنی ہے اس لئے یہاں ایک معزز شہری کے طور پر جو رول آپ کو

Marfat.com

ادا کرنا چاہئے اسے ادا کیجئے اور وطن کی جو نعمتیں آپ کی ضرورت ہوں اور آپ کو مطلوب ہوں انہیں آگے بڑھ کر حاصل کیجئے اور ان کا حق ادا کیجئے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی معلوم ہوتا ہے اہل جنت سے یہی کہا جا رہا ہے کہ اب آپ جنت میں اللہ کے فضل سے آچکے ہیں اس کی ایک ایک نعمت پر آپ کا حق ہے اب یہاں کبھی آپ کو اندیشے پریشان نہیں کریں گے یہاں سے کبھی آپ کو نکالا نہیں جائے گا بس یوں سمجھئے کہ یہ جنت آپ کیلئے ہے اور آپ اس کیلئے ہیں اب آپ کو یہاں خوش عیشی کی زندگی گزارنی ہے۔ بقول شاعر

مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے
بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

اہل جہنم اصحاب اعراف کے سوالوں کا سوائے خاموشی کے اور کوئی جواب نہیں دے سکیں گے لیکن اسی اثناء میں جب اللہ تعالیٰ اصحاب اعراف کو جنت میں داخلے کا حکم دیں گے تو ان کی محرومیاں اور بھڑک اٹھیں گی اور یہ بے ساختہ اہل جنت کو پکارنا شروع کر دیں گے۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اسی کا ذکر فرمایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی جہنم میں پہنچانے والے ان اعمال کا بھی ذکر کیا جا رہا ہے جن کی وجہ سے یہ لوگ جہنم میں پہنچے ہیں اور ہر زمانے کے لوگ ایسے ہی اعمال کے نتیجے میں جہنم میں پہنچیں گے اس لئے اس میں جہاں اہل جہنم کے انجام کو دیکھتے ہوئے عبرت حاصل ہوتی ہے وہیں ان کی فردِ جرم کو دیکھتے ہوئے ہر دور کا انسان اس سے بچنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ نَادٰٓی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝

''اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ پانی یا ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں بخش رکھی ہیں کچھ ہم پر بھی کرم فرماؤ وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں کیلئے حرام کر رکھی ہیں۔ ان کیلئے جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنایا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا پس آج ہم ان کو نظر انداز کریں گے جس طرح انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے''۔ 50-51

اصحاب النار کی فضیحت:

اہل جہنم، اہل جنت کو پکاریں گے کہ ہم تو ایک ناقابل بیان عذاب میں مبتلا ہیں اور تمہیں اللہ نے بے پایاں نعمتوں سے نوازا ہے کیا تم ہم پر مہربانی کرتے ہوئے پینے یا کھانے کی چیزوں میں سے تھوڑا بہت ہمیں عطا نہیں کرو گے۔ اس درخواست کے اسلوب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ جنت کی نعمتوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ان نعمتوں کا حاصل کرنے کیلئے استحقاق چاہئے اور وہ ایمان و عمل سے پیدا ہوتا ہے اس لئے ہمارے پاس ان نعمتوں کیلئے کوئی استحقاق نہیں اگر کوئی تھوڑا بہت استحقاق ہوتا یا ہم نے اللہ کے فضل و کرم کی امید پر کچھ بھی ایمان کا حق ادا کیا ہوتا تو ہم براہ راست اپنے اللہ کو پکارتے لیکن اس کا غضب آج جوش میں آیا ہوا ہے اس لئے وہاں تو غضب کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا۔ آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمیں ان نعمتوں میں سے کچھ تھوڑا بہت عطا کیجئے۔ بلکتے ہوئے لوگوں کو پانی کے چند گھونٹ بھی مل جائیں تو شاید انہیں عذاب کی شدت میں کمی محسوس

Marfat.com

تحریم کا مفہوم:

اس کے جواب میں اہلِ جنت جو سراپا خیر خواہی اور ہمدردی ہیں ان سے عذر کریں گے کہ ان نعمتوں میں سے ہم کوئی سی نعمت بھی تمہیں نہیں دے سکتے اس لئے کہ یہ اللہ نے تم پر حرام کردی ہیں۔ اب جس چیز کو تمہارے لئے اللہ نے حرام اور ممنوع قرار دے دیا ہے ہم اگر تمہیں اس میں سے کچھ دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اللہ کے حکم اور منشاء کی خلاف ورزی کی۔ خلاف ورزیاں کرنے کا نتیجہ تو وہ ہے جو تم بھگت رہے ہو ہم اس کی جسارت کس طرح کر سکتے ہیں اور یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں جو اللہ نے تم پر حرام کی ہیں یہ حرام ان معنوں میں نہیں ہیں جیسے شریعت میں کسی چیز کو حرام کیا جاتا ہے یعنی اس کا کرنا یا اس کا استعمال کرنا ممنوع اور ناجائز ہو جاتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں جہنم میں بھیج کر تمہیں جنت کی ہر نعمت سے محروم کر دیا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کیلئے فرمایا تھا کہ ارض مقدسہ یعنی ارض فلسطین بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کمزوریوں اور بزدلیوں کے باعث ان کیلئے ممنوع قرار دے دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سرزمین سے چالیس سال تک محروم کر دیا ہے۔ چالیس سال کے بعد ان کی جوان ہونے والی نسل اس کو فتح کرے گی اور اس کی خوشحالیوں سے متمتع ہو گی اور ان چالیس سالوں کے دوران چونکہ ہم ان کو محروم کر چکے اس لئے یہ ارضِ فلسطین تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے اور اس کی کوئی نعمت ان تک نہیں پہنچ سکے گی یہاں بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ ان نعمتوں سے ان کو محروم کر دیا گیا ہے اس لئے جس طرح یہ لوگ جنت میں داخل نہیں ہو سکتے اسی طرح کوئی جنت کی نعمت بھی ان تک نہیں پہنچ سکتی اس کے بعد پروردگار نے اہل جنت کے اس عذر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ سبب بیان کئے ہیں جس کی وجہ سے اہل جہنم کو جنت کی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔

جنت کی نعمتوں سے محرومی کے اسباب:

یہ دوسری آیت چونکہ اہل جنت کا قول نہیں بلکہ پروردگار کی طرف سے وضاحت ہے یہ وہ چیز ہے جس کو تضمین کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وضاحت کو صرف ان اہل جہنم کیلئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ جس طرح وہ اہل جہنم ان جرائم کی وجہ سے جہنم میں پہنچے ہیں اسی طرح اے مشرکینِ مکہ اور آئندہ آنے والے انسانو! اگر تم بھی ایسے ہی اعمال کرو گے تو تمہارا انجام بھی یہی ہو گا۔ چنانچہ ان بداعمالیوں میں سے صرف دو کا ذکر کیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام کافرانہ بداعمالیاں یا تمام علامات کفر انہی دو بنیادی خصلتوں سے پیدا ہوتے ہیں یہ دونوں باتیں تمام کفر کی علامتوں اور تمام کفر کے اعمال کیلئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں ان میں پہلی بات یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ جہنم میں جانے والوں کی پہلی خصوصیت یہ ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہولناک انجام کو پہنچے ہیں کہ ان لوگوں نے لہو و لعب کو اپنا دین بنالیا تھا۔ اسے سمجھنے کیلئے سب سے پہلے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ دین کی دولت دو مقاصد کیلئے عطا کرتا ہے۔ ایک یہ کہ انسانوں کو دین دینے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کی حقیقت اور زندگی کے حقیقی مقاصد سے بہرہ ور ہو جائیں وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ جمادات و نباتات کی طرح صرف ایک ضرورت کے تحت اور حیوانات کی طرح صرف طبعی مقاصد کیلئے پیدا نہیں کئے گئے بلکہ ان کی زندگی کے کچھ اختیاری اور اعلیٰ مقاصد ہیں جن کی وجہ سے اللہ نے ان کو زمین پر پیدا فرمایا ہے اور انہی مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے انہیں خلافت ارضی کا تاج پہنایا گیا ہے وہ صرف اس لئے دنیا میں نہیں آئے کہ کھا پی کر زندگی گزار دیں اور بالآخر موت کا شکار ہو کر فنا ہو جائیں ان میں ہر طاقت ور کمزوروں پر ظلم توڑتا رہے تو اسے بالکل احساس نہ ہو کہ مجھ سے کبھی کوئی اس کی باز پرس بھی کرے گا ان میں ہر دولت مند دولت کے نشے میں مخمور عیش و عشرت میں زندگی گزار دے اور اسے کبھی بھول کر بھی خیال نہ آئے کہ مجھے زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب بھی دینا ہے۔ ان میں ہر تخت

Marfat.com

اقتدار پر فائز ہونے والا لوگوں کے سروں پر مسلط رہ کر فرعونیت کی داد دیتا ہوا زندگی تمام کردے اور کبھی یہ خیال نہ آئے کہ مجھ سے اس حاکیت اور اقتدار کبھی حساب بھی مانگا جائے گا۔ دین آ کر انسانوں میں زندگی کے بارے میں سنجیدگی پیدا کرتا ہے وہ انہیں بتاتا ہے کہ تمہارے زمین پر آنے کے حقیقی مقاصد کیا ہیں۔ تم ازخود پیدا نہیں ہوئے ہو بلکہ تمہارا ایک خالق بھی ہے اس نے تمہیں عبث پیدا نہیں کیا کہ یونہی مَل دَل کے ختم ہو جاؤ بلکہ تمہاری زندگی کیلئے اس نے کچھ مقاصد مقرر کئے ہیں اور زندگی گزارنے کا ایک طریقہ اپنے انبیاء کی معرفت تمہیں عطا کیا ہے اس کے مطابق زندگی گزارو گے تو دنیا میں بھی تمہیں آسودہ زندگی ملے گی اور آخرت میں بھی تم کامیاب ٹھہرو گے اور اگر تم نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزاری تو تم انجام بہت ہولناک ہوگا۔ دوسرا سبب دین عطا کرنے کا یہ ہے کہ دین لانے والے اللہ کے نبی اہل دنیا کو یہ بات سمجھاتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے اندر کچھ امیال وعواطف رکھے ہیں، کچھ فعلی قوتوں سے تمہیں نوازا ہے، کچھ خواہشات وجذبات تمہارے اندر ودیعت کئے گئے ہیں، کچھ منفی قوتیں بھی تمہاری طبیعت میں پیدا کی گئی ہیں ان سب کو منضبط رکھ کر ایک طریقے سے زندگی گزارنا یہ تمہارے لئے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تم اللہ کے عطا کردہ دین کی راہنمائی قبول نہ کرو۔ تمہاری خواہشات اور تمہارے جذبات اگر بے قابو ہو کر تم پر حکمرانی کرنے لگیں تو تم انسانی سطح سے گر جاؤ گے اور اگر تمہاری قوتیں بے ہنگم طریق سے کام کرنے لگیں تو تم زمین کو فساد سے بھر دو گے۔ ان کو ٹھیک ایک نہج پر چلانے کیلئے ضروری ہے کہ تم اس اللہ کی راہنمائی کے مطابق زندگی گزارو جو تمہارا اور تمہارے احساسات، جذبات، خواہشات اور امیال وعواطف کا پیدا کرنے والا ہے جس نے تمہاری فطرت بنائی ہے وہ خوب جانتا ہے کہ تم کہاں کہاں ٹھوکر کھا کر گر سکتے ہو اور تمہیں کس طرح اس سے بچایا جاسکتا ہے اگر تم آزادروی کی بجائے اس قانون اور ہدایت کے مطابق زندگی گزارو گے تو تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی نہایت آسانی اور کامیابی سے گزرے گی۔ تمہارے گھر خوشیوں کے مرکز ہوں گے، تم اپنی ذات میں آسودگی محسوس کرو گے، تمہارا ماحول انسانی خیرخواہی اور ہمدردی کا نمونہ ہوگا تمہارے حکمران مہربان اور رحم دل ہوں گے، تم میں سے ایک ایک فرد جسے دوسروں سے بڑھ کر عطا ہوا ہے وہ اللہ کی عطا کردہ امانت کا امین ہوگا اور جو لوگ ان کی نگرانی میں کام کریں گے وہ حسد وبغض سے پاک انتہائی متوازن زندگی کے پیکر ہوں گے مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک گھر جو میاں بیوی اور اولاد پر مشتمل ہوتا ہے اگر اس گھر کے تینوں عناصر اللہ کے دین سے بغاوت کردیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بیوی شوہر سے خیانت کرے گی، شوہر بیوی پر ظلم توڑے گا، دونوں کی ناچاقی اولاد میں محرومی کا احساس پیدا کرے گی اور رفتہ رفتہ ان کو ماں باپ کا نافرمان بنادے گی۔ اندازہ فرمائیے! جس گھر میں اولاد نافرمان ہو، ماں باپ حقیقی شفقت سے گریزاں ہوں، بیوی شوہر سے خیانت کرنے والی اور شوہر بیوی سے غیرمخلص ہو تو اس گھر کو گھر کہنا کہاں تک صحیح ہے، گھر محض چاردیواری اور چند کمروں کا نام تو نہیں گھر تو وہ ہے جس میں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھ کے جیتے ہوں، ایک دوسرے کے حقوق وفرائض میں باہم دگر معاون ہوں اولاد ان کی آرزوؤں کا مستقبل ہو اور اولاد ماں باپ کے زیرسایہ جوان ہونے میں فخر محسوس کرے، احترام میں ڈھلی ہوئی شفقت کی پرچھائیں اور معصومیت اور محبت میں ابلتی ہوئی مسکراہٹیں گھر کو جنت کا نمونہ بناتی ہیں اور یہی گھر حقیقت میں گھر کہلانے کا مستحق ہے اور یہ گھر اس وقت وجود میں آتا ہے جب دین کے گہرے سائے اس گھر کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں اور جیسے جیسے یہ سائے سمٹتے جاتے ہیں ویسے ویسے وہ گھر حقیقی گھر ہونے سے محروم ہوتا جاتا ہے مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین زمین پر بسنے والے انسانوں کو اس لئے دیا جاتا ہے کہ ان کی زندگی میں مقاصد زندگی کا شعور پیدا ہو اور مزید یہ کہ ان کی زندگی میں ایک آسودگی پیدا ہو۔ لیکن جب کوئی قوم لھو ولعب کو زندگی کا مقصد بنالے تو پھر نہ تو اس کی زندگی میں سنجیدگی پیدا ہوتی ہے نہ وہ اپنے حقیقی مقاصد سے کبھی بہرہ ور ہوسکتی ہے اور نہ ان کی زندگی کامیابی وکامرانیوں سے ہمکنار ہوسکتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلی جس بات پر گرفت فرمائی جارہی ہے وہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے

Marfat.com

اپنی زندگی کے حقیقی مقاصد سمجھنے کی بجائے لھو ولعب کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ بچہ جب تک بچپن کی عمر میں رہتا ہے تو چونکہ وہ اس عمر میں زندگی کے حقیقی مقاصد کا شعور نہیں رکھتا تو وہ لھو ولعب میں شب و روز گزارتا ہے اور اس کو بچہ سمجھ کر اس کے والدین بھی اس کو کھیلتے کودتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ سکول جانے کی عمر کو پہنچتا ہے اب اس کے کھیلنے کودنے پر آہستہ آہستہ کمی آنے لگتی ہے بلکہ اس پر گرفت بھی شروع ہو جاتی ہے اور جب وہ اپنی بھرپور مقصدی زندگی کی عمر میں پہنچ جاتا ہے یعنی سکول کے بعد کالج یا یونیورسٹی کے دور میں داخل ہوتا ہے تو اب اگر لھو ولعب یا کھیل کود اس پر غالب آنے لگیں تو اس کے والدین اس کے نگران اور اس کے تمام ہمدرد اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ دیکھو کیوں اپنے دشمن ہوئے ہو کھیلنا یعنی غیر نصابی سرگرمیاں بھی زندگی کی ایک ضرورت ہیں لیکن زندگی کے مقاصد میں شامل نہیں۔ ایسی غیر نصابی سرگرمی جو مقصدِ حیات کو متاثر کرنے لگے کبھی بھی کوئی سمجھدار آدمی اس کی اجازت دینے کی غلطی نہیں کر سکتا یہ صرف ایک شعبہ زندگی کا حال ہے اور اگر زندگی کے تمام شعبوں میں زندگی کی حقیقی ضرورتوں کو پہچاننے کی بجائے قوموں پر لھو ولعب غالب آنے لگے وہ کبھی اس بات کو سوچنے کی زحمت نہ کریں کہ ہم دنیا میں کیوں بھیجے گئے ہیں کیا یہ زندگی کبھی ختم بھی ہو گی اور اگر ہو گی تو کیا اس کے بعد اس کی جواب طلبی بھی کی جائے گی اور خود زندگی کو آسودگی سے گزارنے کیلئے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے بلکہ ان کے پیش نظر سوائے لھو و لعب و عیش و عشرت کے اور کچھ نہ ہو تو پھر ایسے لوگوں کیلئے حسرت سے یہی کہا جا سکتا ہے

بے دلی ہائے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ شوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

اہل جہنم کو جن کرتوتوں نے جہنم میں پہنچایا ان کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ ان لوگوں نے اپنے دین کو لھو ولعب میں تبدیل کر دیا یعنی لھو ولعب کو دین بنالیا یعنی وہ یہ سمجھے کہ زندگی کا کوئی حقیقی مقصد نہیں بلکہ ہم یہاں صرف کھیل کود، عیش و عشرت اور خواہشات کو پورا کرنے کیلئے آئے ہیں جو جی چاہے سو کر گزارو جس طرح تمہاری نفسانی آرزوؤں کو تسکین ملے ان کے ارتکاب سے دریغ نہ کرو۔ تمہیں ہر صورت میں اپنی ذات کی خوشیاں عزیز ہونی چاہئیں چاہے اس کیلئے دوسروں کے گھروندے کیوں نہ مسمار کرنے پڑیں۔ یہ وہ رویہ ہے جس نے انہیں تباہ کر دیا مشرکین مکہ کو یہ بات سنا کر کہا جا رہا ہے کہ تمہاری زندگی کا رویہ بھی یہی ہے تو اس رویے نے پہلے لوگوں کو جس صورت حال سے دوچار کیا تم بھی اسی سے دوچار ہوتے رہو گے اور آئندہ آنے والے انسانوں کو بھی اسی سے متنبہ کیا جا رہا ہے اب سوال یہ ہے کہ یہ قرآن کریم چونکہ پوری نوع انسانی کیلئے کتاب ہدایت ہے تو کیا ہمیں یہاں رک کر یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ آج جو امت اس کتاب اور اس کی تعلیمات کی امین ہے اور وہ ملک جو اسی دین کے نام پر حاصل کیا گیا ہے خود اس کے رہنے والوں کا حال کیا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ اس ملک کے رہنے والے بھی لھو ولعب کو اپنا دین یعنی زندگی کا رویہ بنا چکے ہوں اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں اپنے انجام کی فکر کرنی چاہئے اور اگر ایسا نہیں تو پھر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اگر تو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے حقیقتیں بدل سکتیں تو میں کہہ سکتا تھا کہ اللہ کا شکر ہے ہم اس برائی کا شکار نہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جس ملک کے رہنے والے سر سے پاؤں تک قرض میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جس کا پڑوسی ملک محض مسلمان ہونے کی وجہ سے تباہ کیا جا چکا ہے اور پورے عالمِ اسلام میں مسلمانوں کا خون ارزاں ہو چکا ہے اور مغربی اور امریکی قوتیں دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں حتیٰ کہ ان کے ہاتھوں ہماری آزادی کو بھی خطرات لاحق ہو گئے ہیں اور خطرہ تیزی سے ہماری شہ رگِ حیات کی طرف بڑھ رہا ہے ان تمام خطرات کو دیکھتے ہوئے اگر حکومت کی سرپرستی میں جشن بہاراں اور بسنت کا ہندوانہ تہوار منایا جاتا ہے تو کیا یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم بھی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت لھو ولعب کو بنا چکے ہیں ورنہ جو ملک اس طرح کی صورت حال سے دوچار ہو کہ جنازے اٹھاتے اس کے کندھے شل ہو چکے ہوں وہ

Marfat.com

کبھی ایسے طور اطوار اختیار کرنے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہے؟ لیکن یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ بجائے اس کہ ہمیں اپنے رویے پر شرمندگی ہو ہم ان لوگوں کا منہ نوچ لینا چاہتے ہیں جو ہمیں آئینہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمارے مستقبل کے بارے میں فکرمندی کا اظہار کرتے ہیں ہمیں تو عیش و عشرت اور لھو ولعب اتنے عزیز ہو گئے ہیں کہ ہم شاید اس کے پردے میں قوم کو اصل خطرات سے بے بہرہ رکھ کر تباہ کر دینا چاہتے ہیں نتیجہ اس کا اس کے سوا کیا ہو گا۔

وہ شاخِ گل پہ زمزموں کی دھن تراشتے رہے
اور آشیاں پہ بجلیوں کا کارواں گزر گیا

دوسرا جرم یا بری خصلت جو اہل جہنم کی بیان کی گئی ہے وہ جرم بھی ہے اور پہلے جرم کا سبب بھی یعنی جب کسی قوم میں یہ خرابی پیدا ہوتی ہے تو پھر وہ متذکرۃ الصدر خرابی تک پہنچتی ہے۔ وہ خرابی یہ ہے کہ ان لوگوں کو حیات دنیا نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے اس فریب کا شکار ہو کر وہ اس صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں جس کا ابھی تفصیل سے ذکر ہوا مراد اس سے یہ ہے کہ جب کوئی فرد یا کوئی قوم اپنی دنیا کی زندگی کو اصل اور مستقل زندگی سمجھ لے اور اسے کبھی یہ خیال نہ آئے کہ ایک دن اس زندگی کو ختم بھی ہونا ہے اور پھر ایک دن قیامت بھی آئے گی جب اللہ کے حضور حاضر ہو کر اپنی پوری زندگی کے اعمال کا حساب دینا پڑے گا اس وقت تک وہ فرد یا قوم لھو ولعب سے ہٹ کر کسی سنجیدہ ذمہ داری کی طرف متوجہ ہونے کیلئے تیار نہیں ہو سکتے جب تک انہیں اس بات کا یقین نہ ہو کہ زندگی کا ہر عمل کبھی عدالت کے ترازو میں بھی تولا جائے گا اور اسی پر میری دنیوی اور اخروی زندگی اور اس کی کامیابیوں یا ناکامیوں کا دارومدار بھی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی یہ سمجھتا ہے جیسے مشرکین مکہ سمجھتے تھے کہ جس طرح ہم عیش و عشرت میں یہ دن کاٹ رہے ہیں یہی عیش و عشرت ہمیں آخرت میں بھی ملے گی اور جو لوگ یہاں خوشحال اور کامران ہیں یہی لوگ آخرت میں بھی کامیاب ہوں گے اور اگر ان کی یہ موجودہ زندگی اللہ کو ناپسند ہوتی تو وہ یقیناً اس پر گرفت کرتا یعنی ان کی خوشحالیاں اور ان کا اقتدار ان سے چھین لیتا جب وہ ایسا نہیں کر رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے اس رویے پر خوش ہے اور اگر قیامت آئی تو اسی رویے کے باعث وہ وہاں بھی ہمیں کامرانیوں سے نوازے گا یہ حیات دنیا کے بارے میں ان کا غلط رویہ وہ فریب ہے جس نے انہیں آخرت سے بے نیاز کر دیا ہے اور دنیوی زندگی کو لھو ولعب بنا دیا ہے اور اسی فریب کے نتیجے میں وہ اللہ کو اور اللہ کے سامنے حاضری اور جواب دہی کو بالکل بھول چکے ہیں اور جب انہیں کوئی یاد دلاتا ہے کہ ذرا سوچو قیامت کے دن تم کیا کرو گے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اللہ فرماتا ہے جب یہ لوگ قیامت کے دن ہمارے سامنے لائے جائیں گے پھر وہ عذاب کو سامنے دیکھ کر جب اللہ کی رحمت کو پکاریں گے تو ان کی پکار کا جواب نہیں دیا جائے گا وہ چیخیں گے ان کی چیخیں سنی نہیں جائیں گی وہ عذاب کی ہولناکیوں میں مبتلا ہو کر ہر چند واویلا کریں گے لیکن رحمت ہرگز ان کی طرف متوجہ نہیں ہو گی وجہ اس کی ظاہر ہے کہ انہوں نے چونکہ دنیا میں اللہ کو بھلا دیا تھا انہیں ہرگز اس بات کا خیال تک نہیں تھا کہ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اس نے یقیناً بیکار پیدا تو نہیں کیا ہو گا ہماری زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہو گا جب وہ ہم سے ہمارے مقصد کے بارے میں سوال کرے گا تو ہم کیا جواب دیں گے یہ تصور چونکہ کبھی ان کے قریب سے بھی نہ گزرا تھا اسی کی سزا کے طور پر اللہ فرماتا ہے کہ ہم ان کو بھلا دیں گے۔ بھلانے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ کو ان کے حالات کی خبر نہیں ہو گی کیونکہ کوئی واقعہ دنیا اور آخرت میں ایسا نہیں ہو سکتا جو اللہ کے علم سے باہر ہو۔ یہاں بھول جانے یا بھلا دینے سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کو نظر انداز کر دیں کیونکہ یہاں فعل کا معنی مطلوب نہیں بلکہ اس کا لازمی معنی مراد ہے کسی کو بھول جانے کا مطلب اسے نظر انداز کرنا ہوتا ہے تو قیامت میں ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بھی نظر انداز فرما دیں گے۔ وہاں چونکہ صرف اللہ کی حاکمیت ہو گی دنیا کی طرح کسی اور کو معمولی سے معمولی حاکمیت بھی میسر نہ

Marfat.com

ہوگی اس لئے جس کو اللہ تعالیٰ نظر انداز فرمادیں گے کوئی بھی اس کی مدد کرنے کیلئے تیار نہیں ہوگا۔ خونی رشتے ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ اگرچہ اللہ کا تعلق اپنی مخلوق سے اتنا گہرا ہے کہ باپ بیٹے کا رشتہ ٹوٹ سکتا ہے لیکن خالق اور مخلوق کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا لیکن وہاں یہ رشتہ بھی کام نہیں آئے گا جس پروردگار نے مخلوق کو اپنا عیال قرار دیا ہے وہ وہاں ان کو اس طرح نظر انداز کرے گا کہ انہیں پانی کے چند گھونٹ دینے کی بھی اجازت نہیں دے گا اور وجہ اس کی وہی ہے جو اس آیت کے آخر میں بیان کی گئی ہے کہ جس طرح انہوں نے دنیا میں ہماری مخلوق ہوتے ہوئے ہماری نعمتوں سے مزے لوٹتے ہوئے ہمارے دیئے ہوئے عہدہ و منصب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہماری اصل حیثیت کو ماننے سے انکار کیا ہم بھی آج ہر حیثیت سے انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے۔ مخلوق اپنے خالق سے رشتہ توڑ لے تو نقصان خالق کا نہیں مخلوق ہی کا ہوتا ہے لیکن اگر خالق اپنی مخلوق سے رشتہ توڑ دے تو مخلوق کا کچھ نہیں بچتا۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ دنیا میں پروردگار نے مہلتِ عمل بخشی ہے اس دنیا کو دارالعمل بنایا ہے دارالجزاء نہیں۔ یہاں بڑے سے بڑے پاپی کی بھی روزی بند نہیں کی جاتی اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کا فرش کھینچا نہیں جاتا' اس کے گھر میں بھی سورج اسی طرح چمکتا ہے جیسے ایک مومن کے گھر میں۔ اس کے صحن میں بھی اسی طرح چاندنی اترتی ہے جیسے ایک مومن کے گھر کے صحن میں۔ لیکن آخرت چونکہ دارالجزاء ہے اس لئے وہاں رشتہ کٹ جانے کے بعد ہر طرح کی رحمتیں ان سے منہ موڑ لیں گی یہ چیختے چلاتے بھی رہیں گے تو کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوگا۔ اس پورے ہولناک منظر کو دیکھتے ہوئے اگر کسی کے سینے میں دل ہے تو وہ کانپے بغیر نہیں رہ سکتا یقیناً یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کاش اس صورت حال سے نکلنے کے اگر کچھ اسباب ہوں تو آج انہیں اختیار کر لیا جائے اللہ چونکہ بہت کریم ہے اس نے سینہ سے اٹھتی ہوئی اس کسک کو محسوس کرتے ہوئے اگلی آیت کریمہ میں نکلنے کا راستہ دکھایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

''اور ہم نے ان کو ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علم قطعی کی بنیاد پر کی ہے' ہدایت و رحمت بنا کر ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں''۔ 52

دنیا و عقبیٰ میں ناکامی سے بچنے کا ذریعہ کتاب ہدایت سے وابستگی ہے:

اے مشرکینِ مکہ اور اے نوع انسانی کے لوگو! اگر تم واقعی یہ آرزو رکھتے ہو کہ جہنم میں جانے والوں کا جو تذکرہ تم نے پڑھا ہے تمہارا شمار ان میں نہ ہو اور تم اس ہولناک انجام سے دوچار نہ کئے جاؤ جس کا ایک منظر تم دیکھ چکے ہو تو پھر تمہارے لئے سنبھلنے اور راہ راست اختیار کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ اللہ نے تمہارے پاس ایک کتاب بھیجی ہے اس کی راہنمائی کو قبول کر لو اور وہ کتاب ایسی ہے کہ جس کی بنیادی صفات کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ اسی کتاب کی راہنمائی اور اسی کی تعلیمات انسان کو روشنی دکھا سکتی اور صحیح طرز عمل عطا کر سکتی ہیں اس کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کتاب یا اور کوئی راہنمائی اس قابل نہیں کہ انسان کا بگاڑ جس انتہا کو پہنچ گیا ہے اس سے نکالنے کیلئے کفایت کر سکے اور آئندہ بھی جب انسانیت بگاڑ کا شکار ہوگی تو اس کیلئے بھی اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوگا کہ وہ اسی کتاب کی راہنمائی کی طرف رجوع کرے یہاں اگرچہ تذکرہ صرف کتاب کا ہے اس پیغمبر کا نہیں جس پر کتاب نازل کی گئی ہے لیکن قرآن کریم کے اسلوب آشنا لوگ اچھی طرح اس بات کو سمجھتے ہیں کہ کتاب ہمیشہ پیغمبر ہی کی معرفت انسانوں کو ملتی ہے اسے یونہی انسانی گھروں میں نہیں اتار دیا جاتا اور نہ انسانی دلوں پر اسے نقش کیا جاتا ہے کیونکہ کوئی بھی کتاب پیغمبر کی راہنمائی سے ہٹ کر ماننے والوں کیلئے کافی

Marfat.com

رہنما نہیں ہوسکتی کتاب کا کام صرف اصولی تعلیمات تک محدود ہوتا ہے ان اصولی تعلیمات کی جزئیات فراہم کرنا' اس کے اجمالات کو کھولنا' اس کے ابہامات کو واضح کرنا اور اس کی تعلیمات کو انسانی زندگی پر منطبق کر کے دکھانا اور اس کی تھیوری کو عملی شکل دینا اور پھر اس کتاب کی تفہیم اور تبلیغ کیلئے جان جوکھوں میں ڈال کر اس کا حق ادا کرنا اور کتاب کے الفاظ کو زندگی کی رعنائی دے کر زندگیوں کیلئے قابل قبول بنانا یہ کام پیغمبر کرتا ہے اور اگر پیغمبر کو کتاب سے الگ کر دیا جائے تو کتاب موم کی ناک بن کے رہ جاتی ہے۔ اغراض کے بندے جیسے چاہیں گے اس کو عملی شکل دیں گے اور اس کا مفہوم متعین کریں گے۔ اس لئے جہاں بھی کتاب کا ذکر آتا ہے وہاں پیغمبر کا ذکر خود بخود آجاتا ہے اگر کوئی آدمی دھوپ کا ذکر کرتا ہے تو آفتاب کا ذکر خود بخود آجاتا ہے اور پھر قرآن کریم میں دوسرے مواقع پر اللہ نے پیغمبر کی تشریف آوری کو اپنے احسان عظیم کے طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ پیغمبر ہی کتاب کا باعث بنتا ہے اور اسی کی راہنمائی کتاب کی راہنمائی کو آگے بڑھانے اور عملی شکل دینے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لئے یہاں کتاب کو دیکھ کر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کے نبی کا ذکر اس کے ساتھ ساتھ موجود ہے چنانچہ کتاب کا ذکر فرما کر پھر اس کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ جب لوگ اس کتاب کی طرف رجوع کریں تو وہ اس اعتماد اور اطمینان کے ساتھ کتاب کی طرف رجوع کریں جو انسانی راہنمائی کیلئے انتہائی ضروری ہے انہیں اس بات کا پختہ یقین ہو کہ یہی وہ کتاب ہے جو انسانی زندگی کی الجھنوں اور اس کے قلب و نگاہ کی تاریکیوں کو روشنی میں تبدیل کر سکتی ہے کیونکہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی کتاب بھی دو عیوب سے قطعاً پاک نہیں ہوتی۔ ایک یہ کہ بڑے سے بڑا مصنف بھی کبھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ میں نے انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے کیلئے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ حرف آخر ہے اور میں انسانی زندگی کو بتمام و کمال سمجھتا ہوں جو نسلیں گزر چکیں ان کے تمام تجربے میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ آج کے انسانی زندگی کے مسائل اور ان کا حل پوری طرح مجھ پر واشگاف ہے اور قیامت تک آنے والی نسلیں جن جن مشکلات سے دوچار ہوں گی اور جو نئے مسائل پیدا ہوں گے میں ان تمام سے واقف ہوں کیونکہ بڑے سے بڑے انسان کا علم بھی نہایت محدود ہے وہ انسان کی پیچ در پیچ زندگی کو پوری طرح سمجھنے کا کبھی دعویٰ نہیں کر سکتا اور مزید یہ بات بھی کہ انسان کا ماضی حال اور مستقبل کبھی بھی کسی انسان کے علم کی گرفت میں نہیں آسکتا اس لئے انسانی زندگی کی مکمل راہنمائی کیلئے ایک ایسی ذات درکار ہے جس کے علم کے سامنے زمانے کی کوئی تقسیم نہ ہو جو ہر دور کی انسانی مشکلات کو پوری طرح سمجھ کر اس کے حل کرنے کی قدرت رکھتی ہے انسان سے متعلق کوئی چیز بھی اس کے علم کی حدود سے ماورا نہ ہو اور یہ شان ظاہر ہے صرف اللہ کی ہے اور اس شان کی حامل صرف اللہ کی کتاب ہوسکتی ہے اور دوسری یہ بات کہ انسان علمی نارسائی کے ساتھ ساتھ جذبات کا اسیر بھی ہے وہ اپنے انفعالات اور خارجی عوامل کے اثرات سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا اس لئے یہ ہرگز ممکن نہیں کہ جب وہ انسانی زندگی کے مسائل کے حل کرنے کی کوشش کرے تو اس پر اس کے ذاتی 'مذہبی' قومی اور بین الاقوامی حالات و تشخصات کے اثرات نہ ہوں۔ جو شخص اس قدر عوامل میں گھرا ہوا اور اس قدر حدود میں محدود ہے اور اس طرح ایک سے ایک بڑھ کر رکاوٹیں اس کے راستے میں حائل ہیں یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ پوری انسانی زندگی کی راہنمائی کا حق ادا کر سکے اس لئے اس کتاب کے بھیجے جانے کا احسان جتلاتے ہوئے پروردگار اس کی صفات کا ذکر فرما رہا ہے تاکہ انسان اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہر طرح اطمینان محسوس کرے۔

قرآنِ کریم کی صفات:

سب سے پہلی بات جو فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے اس کتاب کو نہایت مفصل بنایا ہے یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کیلئے راہنمائی اس کتاب میں موجود نہیں کیونکہ اس کتاب کے بھیجنے والے کا علم تمام حدود سے ماورا ہے اس نے اس کتاب کو بھیجتے ہوئے اس بات کا انتظام فرمایا ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے کو جس طرح کی راہنمائی درکار ہے اس کیلئے اس کتاب میں اصول مہیا کر دیئے جائیں اور دوسری بات یہ فرمائی کہ ہم نے اس

Marfat.com

کتاب کوانسانی زندگی کے مطابق مفصل بناتے ہوئے محض اندازوں اور انکل پچو سے کام نہیں لیا بلکہ اس کی ہر بات علم کے ترازو میں تولی گئی ہے اور علم بھی ایسا جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ اس کتاب میں اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ دنیا میں وضع کردہ قوانین کی طرح اس میں ترامیم کی ضرورت محسوس کی جائے اس میں جو بات کہہ دی گئی ہے وہ تاریخ کے ہزاروں عروج وزوال کے بعد بھی اپنی قطعیت اور اپنی حقانیت کے ساتھ قائم ہے اور جس بات کو مرور زمانہ کے ساتھ تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوسکتی ہے اس کیلئے اس بات کے اندر اشارے رکھ دیئے گئے ہیں کہ تم اس میں کہاں تک تبدیلیاں کر سکتے ہو اور پھر آنحضرت ﷺ کی راہنمائی نے اس میں سے ایک ایک چیز کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے جس کی روشنی میں فلسفہ قانون اور آئینی اور قانونی ضرورتوں کو مرتب اور مدون کرنا امت کے اہل علم کیلئے آسان ہو گیا۔ چنانچہ جو کتاب زندگی کے ہر شعبے کیلئے راہنمائی اپنے دامن میں رکھتی ہے اور جس کی راہنمائی اس سرچشمہ علم سے پھوٹی ہے جس میں نہ کوئی غلطی کا امکان ہے اور نہ نارسائی فکر کا۔ اسے یقیناً انسانی زندگی کیلئے راہنما ہونا چاہئے۔ چنانچہ اسی لئے اس کتاب کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ کتاب کتاب ہدایت ہے یعنی وہ زندگی کے ہر مرحلے میں تمہیں راہنمائی مہیا کرے گی کہ تمہیں اس وقت کیا کرنا چاہئے چاہے وہ مرحلہ قانون سے متعلق ہو چاہے آداب زندگی سے چاہے اس کا تعلق معاشرت سے ہو یا معیشت سے۔ اس کا دائرہ گھر ہو یا پبلک ادارے ہر صورت میں اس کتاب کا دائرہ راہنمائی کیلئے کشادہ رہتا ہے اور جب بھی آدمی کبھی اس کی طرف اس ارادے سے متوجہ ہوتا ہے تو وہ کبھی اپنے چاہنے والوں کو محروم نہیں کرتی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب جس نے بھی انسانی زندگی کی راہنمائی کا فرض انجام دیا ہے کسی نہ کسی ایک شعبے سے متعلق رہتی ہے لیکن یہ کتاب دنیا کی واحد کتاب ہے جس کا موضوع انسانی زندگی کا کوئی ایک گوشہ نہیں بلکہ پورا انسان ہے اس لئے اس کا اسلوب' اس کا طریق خطاب' اس کی مثالیں' اس میں بیان کردہ واقعات' کسی ایک چیز کو بھی لے لیجئے ہر جگہ آپ کو پورے انسان اور پوری انسانی زندگی سے بحث ملے گی پھر وہ بحث کرتے ہوئے یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا کہ محض چند احکام دے کر بات کو ختم کر دے بلکہ اس کا حیرت انگیز طریقہ یہ ہے کہ وہ کتاب تو اللہ کی ہے لیکن بحث وہ انسانی زندگی کے ایک ایک گوشے سے کرتا ہے اور بار بار انسانوں کے سامنے انسانی زندگی کو پیش کر کے سوچنے کی دعوت دیتا ہے وہ جب ایک اچھے انسان کی بات کرتا ہے تو اچھے انسانوں کی مثالیں دیتا ہے وہ جب تاریخی محاکمہ کرتا ہے تو اچھی اور بری قوموں کا تذکرہ کرتا ہے اور دونوں کے اعمال کا ایک منظر نامہ نگاہوں کے سامنے رکھ دیتا ہے جب وہ انسانی جذبات یا انسانی نفسیات کی اصلاح کرتا ہے تو انتہائی پاکیزہ صفات اور ان سے متشکل ہونے والے کرداروں کو نمایاں کر کے سامنے لے آتا ہے۔ غرضیکہ قرآن کریم پڑھتے ہوئے آدمی کو کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ میں خداوند ذوالجلال کا کلام پڑھ رہا ہوں بلکہ وہ انسانی قافلے میں اپنے آپ کو چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ کبھی وہ انسانی معاشرت کو دیکھتا ہے' کبھی انسانی معیشت کو' کبھی انسانی اعمال و خواص کو' کبھی انسانی زندگی میں پیش آنے والے حوادث کو' کبھی انسانوں پر مشتمل قوموں کے عروج وزوال کو' کبھی انسانی حاکمیت کی ناکامی اور کبھی اللہ کی نیابت کے فیضان کو۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاید پروردگار نے فرمایا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

''ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے کیا تم سوچتے نہیں ہو''۔

اقبال مرحوم نے اسی کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا

محمد بھی ترا' جبریل بھی' قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

Marfat.com

دوسری صفت اس کتاب کی یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ کتاب ہدایت ہونے کے ساتھ ساتھ رحمت بھی ہے یعنی اگر تم اس کتاب کی عطا کردہ تعلیمات پر عمل کرو گے اور اس کے مطابق زندگی گزارو گے تو یقین رکھو تم پر اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں گے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ رحمت صرف قیامت کو میسر آئے گی بلکہ اس کا تعلق دنیا سے بھی ہے یعنی جس طرح قیامت کے دن اس کتاب کے پیروکار اللہ کی رحمت کے سزاوار ٹھہریں گے اور اللہ انہیں جنت عطا فرمائے گا اور انہیں اپنی رضا سے نوازے گا اسی طرح وہ دنیا میں بھی اللہ کی رحمتوں سے نوازے جائیں گے۔ان کے گھروں میں' ان کے محلوں میں' ان کے بازاروں اور منڈیوں میں حتیٰ کہ ان کے ایوان ہائے حکومت میں بھی اللہ کی رحمت کا بسیرا ہوگا۔فرد سے لے کر قوم تک ایک ایسی آسودہ زندگی بہار بن کر چھا جائے گی کہ ہر آدمی دلوں میں ایک مسرت' معاملات میں خوش اطواری' تعلقات میں ہمدردی و غمگساری' قومی اور بین الاقوامی معاملات میں عدالت و مروت کی ہما ہمی محسوس کرے گا۔اللہ ان کے دین کو تمکن عطا کرے گا' ان کی حکومت کو وسعت عطا فرمائے گا اور انہیں خوف سے نجات دے کر صرف اپنے ڈر سے ہمکنار کرے گا۔دنیا کی کسی بڑی سے بڑی قوم یا بڑی سے بڑی افتاد سے ڈرنا ان سے کوسوں دور ہو جائے گا۔وہ نہایت سادہ زندگی گزاریں گے لیکن کھلی آنکھوں سے ان کے رزق کی وسعتیں دیکھی جاسکیں گی چنانچہ قرون اولیٰ کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ خلافتِ راشدہ اور بعد کے ایسے ادوار جن میں اللہ کی حاکمیت غالب رہی ان میں ہمیشہ اللہ کی طرف سے رزق میں کشادگی معمول کی بات تھی۔کھیتوں میں غلے کی فراوانی تھی۔پھل دار درختوں کو جو پھل لگتا وہ اپنے حجم اور رس میں بے مثال تھا ایک انار کے رس سے گلاس بھر جاتا تھا' جنگل سے دودھ دینے والے جانور پیٹ بھر کے لوٹتے اور ان کے تھنوں میں دودھ معمول سے کہیں زیادہ نکلتا اور یہ نتیجہ تھا اللہ کے اس وعدے کا کہ اگر لوگ اللہ پر ایمان لائیں اور تقویٰ کی زندگی اختیار کریں تو ہم آسمان کی برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیں گے اور دوسری آیت میں فرمایا کہ وہ اپنے اوپر سے بھی رزق کھائیں گے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی یعنی اوپر سے رزق برسے گا اور نیچے سے ابلے گا یہ اس کتاب ہدایت کی رحمت ہے جو اس کے پیروکاروں کو دنیا اور آخرت میں نصیب ہوتی ہے بس شرط صرف ایک ہے کہ وہ اس کتاب پر ایمان لانے والے ہوں اور ایمان کا حق ادا کرنے والے ہوں۔

اگلی آیت کریمہ میں بحث کو سمیٹتے ہوئے آخری بات فرمائی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۠

''یہ لوگ اس حقیقت کے انجام کے منتظر ہیں جس روز وہ انجام ان کے سامنے آجائے گا وہ لوگ جنہوں نے اس کو پہلے نظر انداز کئے رکھا کہیں گے بے شک ہمارے رب کے رسول بالکل سچی بات لے کر آئے تھے تو ہیں کوئی ہمارے سفارشی کہ ہماری سفارش کریں یا ہے کوئی صورت کہ ہم دوبارہ لوٹائے جائیں کہ اس سے مختلف عمل کریں جو پہلے کرتے رہے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ وہ گھڑتے رہے تھے سب ہوا ہو گیا''۔53

تمہاری بدنصیبی تمہارے انجام کی منتظر ہے:

کفر کے نتیجے میں جس طرح کی زندگی وجود میں آتی ہے اس کے فکری رشتوں' عملی صورتوں اور پھر ان کے انجام کو گزشتہ آیات میں پوری طرح کھول دینے کے بعد روشنی کی ایک کرن دکھائی گئی تھی وہ تھی اللہ کی کتاب جو انسانی زندگی کی بہتری اور کامیابی کی نوید لے کر آئی تھی اس کو پوری طرح بیان

Marfat.com

کردینے کے بعد اب فرمایا جارہا ہے کہ تمہیں نہ کفر کی بدصورتی سوچنے پر مجبور کرتی ہے' نہ اس کے برے کردار تمہارے رویے میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں اورنہ اس کی کتاب کے پیش کردہ حقائق تمہارے لئے کوئی بھلائی کا راستہ کھولتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اصلاً اس بات کا انتظار کررہے ہو کہ ہمارے کفر اور ہماری بداعمالیوں کا جو بھی نتیجہ ہوسکتا ہے اور جو انجام بھی ہمارا منتظر ہے وہ سامنے آتا ہے تو آہی جائے یعنی تم سوچنے سمجھنے سے اس حد تک معذور ہوگئے ہو اور خیروشر کے پیمانوں کو اس حد تک توڑ چکے ہو کہ تمہیں اب اس سے بھی غرض نہیں کہ اس کا انجام آخر کیا ہوگا تم تو نشے کے عادی لوگوں کی طرح اپنی بداطواریوں کی افیون کھا کر اس طرح مست ہوچکے ہو کہ تمہیں شاید تمہارا انجام ہی ہلاسکے تو ہلائے ورنہ اور کوئی چیز تمہیں حرکت نہیں دے سکتی لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جس دن وہ انجام تمہارے سامنے آجائے گا اور اس کی دو صورتیں ممکن ہیں ایک تو یہ کہ اللہ کے عذاب کا کوڑا تم پر برسے اور دوسری صورت یہ ہے کہ قیامت کے دن تم اللہ کی عدالت میں جواب دہی کیلئے کھڑے کئے جاؤ۔ دوسری صورت تو بہر حال ہوکے رہے گی ہوسکتا ہے پہلی صورت پیش آجائے یعنی دنیا میں ہی اللہ کا عذاب آجائے تو تم یقین رکھو کہ اس وقت جب تم اپنا انجام اپنے سامنے دیکھو گے تو آج جبکہ تم پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے اور تمہارا تکبر کسی بات کو خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں ہوتا اس دن تم بار بار چیخو گے اور بڑھ بڑھ کر اعتراف کرو گے کہ اللہ کے نبی جو تعلیم تمہارے پاس لے کر آئے تھے وہ بالکل سچ اور حق تھی۔ تم نے اسے قبول نہ کرکے خود اپنی عاقبت تباہ کی لیکن یہ تمہارا اعتراف اس وقت تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ قیامت کے دن تو اس لئے فائدہ پہنچنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ دارالعمل نہیں دارالجزاء ہے۔ عمل کا گھر یہ دنیا ہے جب اس دنیا سے گزر گئے تو عمل کا وقت ختم ہوگیا اور اگر اللہ کا عذاب دنیا میں آجاتا ہے تو وہ تمہارے لئے موت کا پیغام ہوگا اور موت جب سامنے آجاتی ہے تو پھر حق کو قبول کرنا بھی فائدہ نہیں دیتا' ہزار توبہ کی جائے قبول نہیں ہوتی۔ فرعون نے بحرقلزم میں ڈوبتے ہوئے کلمہ پڑھ کر ایمان لانے کی کوشش کی تھی تو حضرت جبرائیل نے تھپڑ مار کر یہ کہا تھا کہ اب تمہیں ایمان کی یاد آئی حالانکہ تم اس سے پہلے نافرمان اور مفسد رہے۔ اب جب کافر دیکھیں گے کہ ان کی توبہ کے قبول ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو پھر اپنے ان شفاعت کرنے والوں کو پکاریں گے دنیا میں جن کے بھروسے پر انہوں نے اسلام کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تھا پوچھیں گے کہ جن کو ہم نے اللہ کی صفات میں شریک ٹھہرایا کسی کو دیوتا مانا' کسی کو اوتار' کہیں بت پرستی ہوتی رہی اور کہیں مظاہر پرستی ان میں سے ایک ایک کو پکاریں گے کہ کیا آج ہماری کوئی سفارش کرے گا یا نہیں جب ادھر سے انہیں مکمل محرومی ہوگی تو پھر وہ آخری درخواست پیش کریں گے کہ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہمیں دنیا میں بھیج کر ایک اور موقع دیا جائے۔ اگر ایسا موقع ہمیں مل جائے تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ اب دنیا میں جاکر ہم اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کریں گے نافرمانی نہیں کریں گے۔ اللہ کی طرف سے آواز آئے گی کہ دنیا میں جہاں تک تمہارے سمجھانے بجھانے کا تعلق ہے وہ حق ادا ہوچکا تم پر پوری طرح اتمام حجت کردیا گیا لیکن اس وقت تم نے ایک نہ سنی جس کے نتیجے میں تمہارا سب کچھ تباہ ہوگیا اور جو کچھ تم دنیا میں کرتے رہے تھے ان میں سے ایک ایک چیز ہوا میں اڑ گئی ہے اور جو سکہ آخرت میں چل سکتا تھا اسے تم نے ہمیشہ نظرانداز کیا اس لئے آج تمہارے لئے یا ان سب کیلئے جو بھی تمہاری طرح یہ کفر کی زندگی گزار کر ہمارے پاس آئیں گے ناکامیوں اور محرومیوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ کاش تم نے دنیا میں ہمارے پیغمبر کی بات سنی ہوتی اس کی پیش کردہ تعلیمات کو قبول کیا ہوتا اور ہمارے آستانے پر سر جھکایا ہوتا اور بجائے فرضی معبودوں کو پکارنے کے اللہ کو پکارا ہوتا تو آج تمہارا یہ انجام نہ ہوتا۔

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

Marfat.com

إِنَّ
رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ
اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا
وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ
الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿54﴾ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ
خُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿55﴾ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ
بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ
قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿56﴾ وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا
بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰى اِذَا اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ
لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ
كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿57﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ
نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا كَذٰلِكَ
نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿58﴾

بے شک! تمہارا رب وہی اللہ ہے' جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا ہے۔ پھر وہ عرش اقتدار پر متمکن ہوا۔ وہ رات کو دن پر ڈھانکتا ہے' جو اس کا پوری سرگرمی سے تعاقب کرتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کئے' جو اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ خبردار! خلق اور امر اسی کیلئے خاص ہیں۔ بڑا ہی برکت والا ہے

Marfat.com

اللہ سارے جہانوں کا رب۔ پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔ اس کو پسند نہیں آتے حد سے آگے بڑھنے والے۔ اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو اور اسی کو پکارو بیم و رجا میں۔ بے شک! اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے۔ اور وہی ہے' جو بھیجتا ہے ہواؤں کو بشارت بنا کر اپنے ابر رحمت سے پہلے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادل کو اٹھا لیتی ہیں' ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب و گیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں۔ پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں' ہر قسم کے پھل۔ اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے' تا کہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ اور زرخیز زمین! وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین ناقص ہوتی ہے' اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اس طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں ان لوگوں کیلئے' جو شکر گزار بننا چاہیں۔

..................☆......☆......☆..................

تمہید:

گزشتہ رکوع کے اختتام تک شرک کے مختلف پہلوؤں پر تنقید اور اس کے دنیوی اور اخروی نتائج کی بحث کو مکمل کر دیا گیا ہے۔ پیش نظر آیات میں توحید کے دلائل کو ذکر فرماتے ہوئے شرک کے پیدا ہونے کے اسباب کو نہایت پہلودار طریقے سے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس بحث کو اگر سمجھ لیا جائے تو توحید کی حقیقت اور شرک کی مذمت پیش پا افتادہ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا لا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ط اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ O

"بے شک! تمہارا رب وہی اللہ ہے' جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا ہے۔ پھر وہ عرش اقتدار پر متمکن ہوا۔ وہ رات کو دن پر ڈھانکتا ہے' جو اس کا پوری سرگرمی سے تعاقب کرتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کئے' جو اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ خبردار! خلق اور امر اسی کیلئے خاص ہیں۔ بڑا ہی برکت والا ہے اللہ سارے جہانوں کا رب"۔ 54

اللہ وحدہٗ لاشریک ہے:

مشرکینِ مکہ اور دیگر مشرکینِ عرب بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ تمام کائنات کا خالق تو یقیناً اللہ کی ذات ہے۔ لیکن تمام کائنات کا رب وہ تنہا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اور بھی بہت سارے ارباب اور شرکاء موجود ہیں' جن کو خود اس نے اپنے ساتھ یہ حیثیت دے رکھی ہے۔ اگرچہ رب الارباب کی حیثیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ لیکن اس کی عطا کردہ ربوبیت کے حامل چھوٹے چھوٹے اور بھی بہت سے لوگ اور بہت سی قوتیں ہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کی بنیاد یہ تھی کہ یہ بات تو وہ کسی طرح مان چکے تھے کہ تمام کائنات کو خلق اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور وہی کائنات کا خالق ہے' لیکن یہ اتنی بڑی کائنات جس

Marfat.com

کے اور چھور کا کوئی اندازہ ہی نہیں' کیسے ممکن ہے کہ پوری کائنات کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں' اس میں بسنے والی مخلوقات کی رزق رسانی' ان کی ضروریات سے آگاہی اور پھر ہر ضرورت کو پورا کرنا' یہ سب کچھ تنہا اللہ کی ذات کر سکے؟ یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لئے پروردگار نے کائنات اور مخلوقات کے نظام کو ٹھیک رکھنے کیلئے اور ان کی ضروریات بہم پہنچانے کیلئے' یہ ضروری سمجھا کہ بہت ساری قوتوں کو ان انتظامی امور میں شریک کر لیا جائے۔ چنانچہ کسی کو رزق دینے' کسی کو اولاد عطا کرنے' کسی کو بیماریوں سے شفا دینے اور کسی کو بارش برسانے جیسی ذمہ داریوں پر لگا دیا گیا۔ اب اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی تمام ضروریات احسن انداز میں اسے ملتی رہیں تو پھر یہ بات نہایت ضروری ہے کہ وہ ان تمام قوتوں کی عبادت کرے' ان سے استمداد کرے' ان کی پوجا پاٹ کرے' تاکہ وہ قوتیں اس سے خوش ہو کر اس کی ضروریات کو پورا کرتی رہیں اور اس کو مصیبتوں سے بچاتی رہیں اور پھر انہی قوتوں کے واسطے سے اور انہی پاکیزہ صفات ہستیوں کے طفیل وہ اپنے اس عظیم رب کو' جس کو وہ اللہ کے نام سے پکارتا ہے' خوش بھی کر سکے۔ درحقیقت ان کے نزدیک اللہ کی حیثیت شہنشاہ کی طرح تھی۔ ایک شہنشاہ بہت بڑے ملک کا مالک تو ہو سکتا ہے' اس کا حکمران بھی کہلا سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ ایک ایک صوبے اور ایک ایک شہر کے انتظام کی براہ راست نگرانی کرے۔ اسے یقیناً اپنی ماتحتی میں بہت سارے کارکنوں کو بھرتی کرنا پڑتا ہے اور پھر انہیں اختیارات دے کر ان خدمات کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ یہی حال پروردگار عالم کا بھی ہے یہ وہ بنیادی وجہ تھی' جس نے اللہ کو رب الارباب مانتے ہوئے بھی انسان کو اور بہت سارے چھوٹے بڑے ارباب کو ماننے پر مجبور کیا اور پھر اسی پر بات رکی نہیں' وقت کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت ان کے ذہنوں میں مدھم ہوتی گئی کہ رب الارباب اللہ کی ذات ہے۔ ان کے ذہنوں پر جس خیال کا تسلط محکم ہوتا گیا وہ یہ تھا کہ جن سے براہ راست ہماری ضرورتیں متعلق ہیں اور جو ہماری ضروریات کو پورا کرنے کا اختیار بھی رکھتے ہیں' بس انہی کو رب مان کر انہی کی پوجا پاٹ اور عبادت کرنی ہے۔ یہاں پہلی بات تو یہ فرمائی جا رہی ہے کہ اے مشرکین عرب! اچھی طرح اس بات کو سمجھ لو کہ جو اس کائنات کا اور تمہارا خالق ہے' وہی تمہارا رب بھی ہے۔ تم نے اللہ کو ایک شہنشاہ قرار دے کر جس طرح دوسرے ارباب کیلئے ضرورت پیدا کی ہے' وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس لئے کہ ایک شہنشاہ' شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی اپنی ذات میں وہ ہمہ گیر صفات نہیں رکھتا' جس کے نتیجے میں وہ ہر ایک کی ضرورت سے آگاہ بھی ہو سکے اور ضرورت پوری کرنے پر قادر بھی ہو سکے۔ لیکن اللہ کی ذات کمال قدرت کی حامل ہے۔ اس کا علم بے پناہ ہے۔ اس کی ہر صفت اپنے اندر غیر محدود وسعتیں رکھتی ہے اس کیلئے تمام مخلوقات کو دیکھنا' ان کی ضروریات کو جاننا' پھر ان کی ایک ایک ضرورت مہیا کرنا کوئی مشکل نہیں۔ ہم جس طرح اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھتے ہیں اور اس کی ایک ایک لکیر کو پڑھ سکتے ہیں' پروردگار عالم اس سے بھی زیادہ آسانی سے پوری کائنات کو دیکھتے اور اس کی ایک ایک چیز کو سمجھتے ہیں۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ سمندروں کی گہرائیوں میں کوئی مچھلی اگر حرکت کرتی ہے تو وہ اسے دیکھتا ہے' جنگل میں کوئی پتہ گرتا ہے تو وہ اسے بھی جانتا ہے۔ ہر خشک و تر چیز اس کے علم کے خزانے میں محفوظ ہے۔ جس کی صفات اس قدر وسعتوں کی مالک ہوں اسے شہنشاہوں پر قیاس کر کے شرک کیلئے جواز پیدا کرنا سخت بے عقلی اور بے دانشی کی انتہا ہے۔

قرآن میں رب کی دو بنیادی صفات:

اس کے ساتھ ایک اور چیز بھی سمجھ لینی چاہئے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم جب رب کا لفظ استعمال کرتا ہے تو وہ اس سے دو چیزیں مراد لیتا ہے۔

1- ایک تو یہ کہ انسانی جسم' جسمانی صلاحیتیں' دل و دماغ کی رعنائیاں' فعلی اور انفعالی قوتیں' احساسات کی گہرائی اور ایسی ہی اور چیزیں' جن انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ضرورت درپیش ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے وا[لا] ہیں۔ ربوبیت کا مفہوم ہے انشاء الشی حالاً فحالاً الیٰ حدالتمام کسی چیز کو رفتہ رفتہ نقطہ کمال تک پہنچانا اور ہر مرحلے پر اس کی ضروریات کو فر[اہم]

Marfat.com

کرنا۔ مثلاً جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہے تو ماں کے پیٹ میں اس کو غذا پہنچانا' اس کی زندگی کا سروسامان کرنا' پھر ایک وقت مقرر پر اسے تخلیق کے عمل سے گزارنا اور پھر دنیا میں آنے کے بعد اس کی ماں کے سینے میں اس کی غذا کا چشمہ رواں کر دینا اور دنیا میں اس کے اترنے سے پہلے ماں کے اندر مامتا پیدا کر دینا اور باپ کے کندھوں اور دل و دماغ میں شفقت کا طوفان اٹھا دینا' ننھیالی اور ددھیالی رشتوں کو اس کی حفاظت کیلئے وجود میں لے آنا' پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کے اندر احساس کا چراغ روشن کرنا اور مزید آگے بڑھ کر اسے عقل کے نور سے منور کر دینا۔ بالکل ابتدا میں اس کا معدہ کسی ثقیل غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا تو ماں کے دودھ میں مائیت کے عنصر کو غالب رکھنا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دودھ میں دھنیت کو بڑھاتے چلے جانا' تاکہ بچے کی نمو د و پرداخت اور توانائی میں کام لیا جا سکے۔ اسی طرح پوری زندگی کو تصور میں لا کر اندازہ کیجئے کہ کس طرح اس کی ربوبیت کا عمل بچے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہ تو وہ ربوبیت ہے' جس کا تعلق انسان کے داخل سے ہے اور جہاں تک اس کی خارجی زندگی کا تعلق ہے۔ اس میں غور کر کے دیکھئے تو قدم قدم پر آپ کو ربوبیت بکھری ہوئی دکھائی دے گی۔ سورج کی روشنی' چاند کی حلاوت' ستاروں کی آنکھ مچولی' ہوا کا جسم سے چھو کر گزرنا' آکسیجن کا چاروں طرف پھیلا ہوا سمندر اور پھر زمین کو مختلف قسم کی غذاؤں اور قوت روئیدگی سے مالا مال کر دینا اور پھر زمین پر ابلتی ہوئی آبشاریں' برستی ہوئی بارشیں' بہتے ہوئے دریا' بل کھاتی ہوئی ندیاں' چھتری تانے ہوئے درخت' جھنڈوں کی طرح گڑھے ہوئے قد آور اشجار' چاندی کی طرح پگھلتی ہوئی برف اور پارے کی طرح رواں دواں چشمے' اس طرح بے شمار نعمتیں ہیں' جن سے انسان شب و روز فائدہ اٹھاتا ہے اور کوئی ضرورت ایسی نہیں' جو پیدا ہونے سے پہلے وجود میں نہیں آ چکی اور کوئی مطالبہ ایسا نہیں' جسکو پورا نہیں کر دیا گیا۔ یہ وہ ظاہری ربوبیت ہے' جو انسان کے خارج میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہمیں دکھائی دیتی ہے۔

2- لیکن اسی طرح ایک ربوبیت اور بھی ہے' جو خود اس ظاہری ربوبیت کا ایک لازمہ اور نتیجہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس اللہ نے یہ تمام نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور جس نے جسم و جان کی رعنائیوں سے انسان کو گراں بار کیا ہے۔ اگر وہ انسان کو یہ نہ بتاتا کہ ان تمام نعمتوں اور ان تمام قوتوں سے کام کس طرح لینا ہے۔ وہ زندگی دیتا اور زندگی کا مقصد متعین نہ کرتا۔ وہ انسانوں کو جنسی احساسات سے گراں بار کر دیتا' لیکن شرم و حیا کے نازک احساسات سے محروم رکھتا۔ وہ انسان کو دل دیتا' لیکن رحم و مروت' ہمدردی اور غمگساری جیسی اقدار کا اسے علم نہ دیتا۔ حتیٰ کہ انسان کو مسجود ملائک بناتا' لیکن زمین پر بھیجنے کے بعد اس کی ذمہ داریوں سے اس کو آگاہ نہ کرتا۔ تو آپ اندازہ فرمائیے کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی ادھوری ربوبیت نہ ہوتی؟ قرآن کریم نے جابجا اس کی طرف اشارے کیے۔ وہ جہاں بھی انسان کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے' وہیں اسے زندگی کے بارے میں ہدایت دینے کی بات بھی کرتا ہے۔ جہاں اس کی دنیا کا تذکرہ کرتا ہے' وہیں وہ آخرت کا بھی ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ جس طرح اس کی مخلوق میں ہر چیز کا ایک جوڑا پیدا کیا گیا ہے' دنیا کا جوڑا اس نے آخرت کو بنایا۔ اگر دنیا کی باتیں ہوتیں' لیکن آخرت کی تیاری کیلئے کوئی رہنمائی نہ دی جاتی تو یہ نامکمل ربوبیت ہوتی۔ اس آیت کریمہ میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ دیکھو! جس اللہ نے تمہیں اور باقی کائنات کو پیدا فرمایا ہے' وہ صرف تمہارا خالق نہیں' بلکہ وہ تمہارا رب بھی ہے۔ یعنی تمہیں اس نے زندگی کے امکانات اور زندگی کی ضروریات بھی دی ہیں اور پھر زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی' تمہیں عطا کیا ہے اور پھر انسانوں پر اپنے احسانات کا ذکر فرماتے ہوئے اپنی تخلیق کی تھوڑی سی وسعت بیان فرمائی ہے کہ تمہارا رب وہ ہے' جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا' اس لئے کہ پوری کائنات کو جس حصار میں محصور کیا گیا ہے اور اس کی ہمہ ہمی کو جس میدان میں برگ و بار لانے کا موقع دیا گیا ہے' وہ زمین و آسمان ہی ہیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ اس سے مراد پوری کائنات ہے مزید یہ فرمایا کہ ہم نے اس پوری کائنات کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا۔ اس میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں ایک تو یہ بات کہ چھ دنوں سے کیا وہ دن مراد ہیں جو دن اور رات کے تسلسل سے وجود میں آتے ہیں یا اس سے مراد خدائی دن ہیں۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد ہمارے دن نہیں بلکہ اللہ کے اپنے دن

Marfat.com

مراد ہیں اور قرآن پاک میں تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دن کبھی ایک ہزار سال کے ہوتے ہی اور کبھی پچاس ہزار سال کے برابر اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں چھ دنوں سے چھ ادوار مراد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چھ ادوار میں پیدا فرمایا اور یہی بات تورات نے بھی کہی ہے اور ہمارا فلسفۂ جدید تو بڑی شدومد سے اس کا دعوے دار ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا جدید فلسفہ کائنات کے وجود کو نظریہ ارتقاء کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کریم اس کے خلاف نہیں البتہ نظریہ ارتقاء کی تقریر جس انداز سے اس کے علمبرداروں کی طرف سے کی جاتی ہے اس میں چونکہ بہت سے منطقی خلا موجود ہیں اس لئے قرآن کریم اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ کائنات چھ ادوار میں مکمل ہوئی یعنی ایک ارتقا کے ساتھ اس کا تخلیقی عمل وجود میں آیا لیکن یہ بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں کہ انسان کو اولاد آدم ماننے کی بجائے بندر کی اولاد مانا جائے اور بندر سے پہلے اور بندر کے بعد جو جھول موجود ہے ان کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ انسانی ایجادات کو دیکھ لیجئے کہ انسان نے پہیہ ایجاد کیا اور اس کے بعد ایجادات کی دنیا میں حیرت انگیز انقلاب آیا۔ پھر قسم قسم کی چیزیں بنتی چلی گئیں لیکن ایک سواری کے بعد دوسری سواری نے جو شکل اختیار کی ہم اس سے اچھی طرح واقف ہیں کوئی آدمی اس کو ماننے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوگا کہ ہم چھکڑے سے اترے اور ہوائی جہاز اور راکٹ پر چڑھ گئے تو اسی طرح اس بات کو کون تسلیم کرے کہ انسان کے ارتقاء نے پہلے بندر کی شکل اختیار کی اور پھر یکلخت کوئی موجودہ انسان کی شکل اختیار کر گیا درمیان کی کڑیاں کہاں ہیں اس کا کوئی جواب نہیں۔

دوسری بات جو اس میں سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور قرآن کی تصریحات کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے یہ بات کوئی مشکل نہ تھی کہ وہ ایک کلمۂ کن سے تمام کائنات پیدا فرما دیتا تو پھر اس تدریجی عمل کی کیا ضرورت تھی کہ چھ ادوار میں کائنات کو تخلیق فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے خلق و تدبیر کے ہر شعبے میں جس طرح اپنی قدرت نمایاں فرمائی ہے اسی طرح اپنی حکمت اور ربوبیت اور رحمت کی شانیں بھی نمایاں فرمائی ہیں اور اس کی ان شانوں کا نمایاں ہونا بھی انسان کے کمال عقلی و روحانی کیلئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کے کمال قدرت کا نمایاں ہونا ضروری ہے۔ کہیں ہم اس کے کمال قدرت کے اظہار کو غالب دیکھتے ہیں اور کہیں حکمت، ربوبیت اور رحمت کے اظہار کو۔ پہاڑوں کے سلسلے اس نے یکلخت ہمارے سامنے کھڑے کر دیئے یعنی ہم نے ان کو دھیرے دھیرے وجود پذیر ہوتے نہیں دیکھا یعنی اس کا ایک ایک پتھر ہمارے سامنے جوڑا نہیں گیا اور پھر ان کو سر بفلک عمارت کی شکل نہیں دی گئی اس لئے جب ہم پہاڑوں کو دیکھتے ہیں تو اللہ کی قدرت یاد آتی ہے لیکن اس کے بالکل برعکس ہم جب دیکھتے ہیں کہ اس نے ہماری غذائی ضرورتوں کو کس طرح پیدا فرمایا ہے تو اس سے اللہ کی قدرت بھی یاد آتی ہے لیکن زیادہ تر اس کی رحمت کا فیضان نظروں کے سامنے نمایاں ہو جاتا ہے۔ کسان گندم کے دانے زمین کا سینہ چیر کر اس میں ڈالتا ہے۔ اب یہ یکلخت پودا بن کر دانے واپس نہیں کرنے لگتا بلکہ ایک سوئی نکلتی ہے جو بڑھتے بڑھتے ایک پودا بنتی ہے اس میں ایستادگی آتی ہے، ہوائیں اس کو لوریاں دیتی ہیں، موسم کے تغیرات اس کی نگرانی کرتے ہیں، سمندر سے سورج کرنوں کے ڈول بھر بھر کر کھینچتا ہے اور فضا میں ابر کی چادریں بچھا دیتا ہے۔ پھر ہوائیں انہیں کھینچتی ہوئی وہاں لے جاتی ہیں جہاں آبیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ دانے میں گداز پیدا کرنے کیلئے چاند اپنی حلاوت لٹاتا ہے اور اس میں پختگی پیدا کرنے اور اسے پکانے کیلئے سورج کی حدت اپنا کام کرتی ہے۔ اس طرح کائنات کا پورا کارخانہ اپنا اپنا فرض انجام دیتا ہے تب ہم اپنی غذا کی چند ضرورتوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر انسان اپنے تخلیقی مراحل سے گزرنے کی بجائے ایک بنا بنایا جوان رعنا کی صورت زمین پر اتار دیا جاتا تو اندازہ فرمایئے ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، بچے کی من موہنی ادائیں پھر بچوں کی آپس میں خوش فعلیاں اور گھر کی رونق اور آسودگی جو اللہ کی بیش بہا نعمت ہے یہ کہاں سے وجود میں آتیں اور ان کو دیکھ کر جس طرح اللہ کی رحمت اور اس کی حکمت یاد آتی ہے اس کو ہم کہاں تلاش کرتے تو زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کرنے میں یہی حکمت و دانش

Marfat.com

ربوبیت اور رحمت کا اظہار مقصود ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کہ پھر اللہ تعالیٰ عرش اقتدار پر متمکن ہوا۔ اس جملے سے مشرکین کی اس غلطی کا ازالہ فرمایا گیا ہے جس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے وہ شرک میں مبتلا ہوئے یعنی انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا خالق تو ہے لیکن تمام کائنات کا تنہا حاکم نہیں کیونکہ ایک بادشاہ اور ایک حاکم تنہا پوری کائنات کا نظام نہیں چلا سکتا اس لئے یہ بات ضروری ٹھہری کہ کائنات کے مختلف حصوں کو کچھ شرکاء کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس کا انتظام چلا سکیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے صرف زمین و آسمان کو پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا کہ اس کی حکمرانی سے ہمارا کوئی تعلق نہ ہو جیسے تم سمجھتے ہو یا بعض جاہل فلسفی دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ اللہ اس کائنات کی علت العلل یا علت اولیٰ ہے یعنی وہ پہلی علت ہے جس نے کائنات کے پہیے کو حرکت دی اور اس کے بعد اسے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا کہ وہ پہیہ اب تک اپنے زور پر گھوم رہا ہے اس کائنات کو یقیناً اللہ نے بنایا لیکن اس کے بعد اس نے انتظام و انصرام دوسروں کے حوالے کر دیا اور خود اس کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسا نہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ جس پروردگار نے یہ سارا کارخانہ اس تدریج و اہتمام کے ساتھ بنایا' سنوارا اور پھر اس کی تدبیر و انتظام سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں جا بیٹھا اس خلق کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کے تخت حکومت پر متمکن ہو کر اس کے تمام امور و معاملات کا انتظام بھی فرمائے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو واضح کرنے کیلئے بعض جگہ پروردگار نے ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے ساتھ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ بھی فرمایا ہے۔ ایک بادشاہ اگر بڑے اہتمام سے ملک حاصل کرے لیکن ملک حاصل کر کے کسی گوشے میں جا بیٹھے اس میں امن و عدل کا اہتمام نہ کرے۔ مفسدین اس میں دھاندلی مچاتے پھریں تو ساری دنیا اس کو نالائق بادشاہ کہے گی تو ایک معمولی بادشاہ کیلئے جو بات عیب میں داخل ہے' آسمان و زمین کے خالق و مالک کیلئے وہ بات کس طرح باور کی جا سکتی ہے۔

استواء کا مفہوم:

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا جو مفہوم ہم نے بیان کیا ہے اگرچہ اس کا تعلق تاویل سے ہے لیکن یہ ایسی تاویل نہیں جس میں تصنع داخل ہو اور بات بنانے کی کوشش کی گئی ہو اگر شریعت میں الفاظ کی حیثیت بنیادی ہے تو جس مفہوم کو الفاظ خود اچھال رہے ہوں اسے قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے البتہ یہ بات اپنی جگہ وزن رکھتی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے سادہ مفہوم پر اصرار کرے اور وہ یہ کہے کہ اللہ کا ایک عرش ہے اور وہ اس پر مستوی ہے اور اس استواء کی کسی خاص ہیئت پر اصرار نہ کرے تو ہم اس کی بات کو غلط نہیں کہیں گے۔ یہ آیت چونکہ اپنے مفہوم و مراد میں پوری طرح واضح نہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ متشابہات میں داخل ہے تو پھر عافیت اسی میں ہے کہ اس میں قیل و قال نہ کی جائے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر عمل کیا جائے۔ انہوں نے فرمایا تھا: الاستواء معلومٌ و مرادہٗ مجھولٌ وَ الایمان به واجب وَالسوال عنه بدعة کہ استوا تو معلوم ہے لیکن اس کی مراد واضح نہیں اس پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن اس میں قیل و قال اور بحث کرنا بدعت ہے۔

اللہ کی حاکمیت کی ایک جھلک:

اللہ تعالیٰ نے عرش اقتدار پر متمکن ہو کر جس طرح کائنات کا نظام چلایا ہے اس کے بعد اس کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ اس کی کائنات بے شمار وسعتوں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے لیکن اس کی بعض نعمتیں ایسی ہیں جس سے ہمیں ہر وقت واسطہ رہتا ہے انہی میں دن اور رات کا آنا جانا بھی ہے اور یہ انسان کی ایسی بنیادی ضرورت ہے کہ جس کے بغیر اس کی زندگی گزرنا محال ہے۔ دن انسان کی سرگرمیوں کیلئے ہے اور رات انسان کی آرام و راحت

Marfat.com

کیلئے ہے ان دونوں سے ہمیں ہمیشہ واسطہ رہتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ذرا اسی پر غور کرو کہ جہاں تک تمہارا علم کام کر رہا ہے کیا کوئی ایک نشان بھی تمہارے سامنے ہے جس سے تم یہ کہہ سکو کہ کبھی سورج کے غروب ہونے یا سورج کے طلوع ہونے یعنی رات کے چھا جانے یا دن کے چڑھ آنے میں کبھی وقت کی پابندی نہ کی گئی ہو اور کبھی انہوں نے اپنی ذمہ داری سے تخلف کیا ہو یہ دن اور رات کی آمد و رفت کا انتظام اتنا مستحکم ہے کہ ہم ہزاروں سال سے کیلنڈر کا ایک نظام رکھتے ہیں اس میں کبھی آج تک کمی بیشی نہیں ہوئی اگر رات اور دن کے آنے جانے میں چند منٹ کی کمی بیشی بھی ہوتی تو سارے حساب ناکام ہو جاتے اور تمام جنتریاں بےکار ہو جاتیں۔ کہا ذرا رات کو دیکھو کس طرح سرگرمی سے وہ دن کا تعاقب کرتی ہوئی آتی ہے اور یہی حال دن کا بھی ہے یہ تو وہ مشاہدہ ہے جو ہم زمین پر رکھتے ہیں اور جب ہم آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو بےشمار ستارے سیارے اور کواکب ہماری نظروں کے سامنے جھلملاتے ہیں لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ستاروں نے اپنے سفر میں کبھی غلطی کی ہو انہوں نے کبھی روشنی دینے سے انکار کر دیا ہو اور جو فرائض ان کے ذمے عائد کئے گئے ہیں کبھی اس کی ادائیگی میں تساہل ہوا ہو۔ انسان اپنی ایجادات میں کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا ہے لیکن اس کی کوئی ایجاد ایسی نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ کبھی خراب نہیں ہو سکتی یا کبھی یہ تباہ نہیں ہو گی۔ بڑی سے بڑی ایجاد حادثے کا شکار ہوتی ہے اور اس کے بنانے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ چند دن پہلے خلائی شٹل کا حادثہ پیش آیا ہے جس نے امریکہ جیسی قوت کو ہلا کر رکھ دیا ہے لیکن سورج چاند اور ستاروں میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے پابند اور مسخر ہیں تو جس پروردگار کی قوت تسخیر اور جس کی حاکمیت اتنی ہمہ گیر ہو اس کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ اس نے اپنے کوئی شرکاء بنا رکھے ہیں اور وہ ان کے واسطے سے کائنات کا نظام چلاتا ہے اور ایسا کرنے پر وہ مجبور ہے تو اس سے زیادہ احمقانہ بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط یہ اسی مضمون کی مزید تشریح ہے جو "استواء علی العرش" کے الفاظ میں مجملاً بیان کیا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ اللہ محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر اللہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیل و نہار کی گردش آپ سے آپ نہیں ہو رہی ہے بلکہ اللہ کے حکم سے ہو رہی ہے، جب چاہے اسے روک دے اور جب چاہے اس کے نظام کو تبدیل کر دے۔ سورج، چاند اور تارے خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں بالکل مسخر ہیں اور مجبور غلاموں کی طرح بس وہی کام کئے جا رہے ہیں جو اللہ ان سے لے رہا ہے۔

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ میں غایت درجہ مبالغہ کا مضمون پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے تَبٰرَكَ اللّٰهُ کے معنی ہوں گے بڑی ہی برکت و رحمت والی ہستی ہے اللہ۔ اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے خلق و تدبیر کی جو شانیں واضح فرمائی ہیں ان سے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، جس طرح اللہ کی قدرت و عظمت اظہار ہو رہا ہے اسی طرح اس کی رحمت و ربوبیت، اس کے جود و نوال اور اس کی کرم نوازی و فیض بخشی کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یہ اللہ کے باب میں اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جس میں مشرک قومیں بالعموم مبتلا ہوئیں کہ انہوں نے خدا کی عظمت و جبروت کا تصور اس قدر بڑھایا کہ اس کی صفات رحمت و برکت تصور اس کے نیچے بالکل دب کر رہ گیا۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کیلئے اللہ سے براہِ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائل و وسائل کی تلاش ہوئی جو اللہ سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ صفاتِ الٰہی کے باب میں یہ گمراہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش، بالخصوص ملائکہ کی پرستش، اسی وجہ سے شروع کی کہ یہ اللہ کی چہیتی بیٹیاں ہیں یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی اور پھر سارا جہان ہم پر مہربان ہو جائے گا۔ قرآن نے یہاں تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ

Marfat.com

الفاظ سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کائنات جس طرح اپنے خالق کی بے پایاں عظمت و جبروت پر شاہد ہے اسی طرح اس کی بے پایاں برکت ورحمت پر بھی گواہ ہے تو اس سے مانگنے کیلئے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہیں۔ خوف اور طمع' امید اور بیم ہر حال میں اسی کو پکارو اور اسی سے مانگو' جس طرح وہ اپنے جلال میں یکتا ہے اسی طرح اپنی رحمت میں بھی یکتا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ط اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ O

''پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔ اس کو پسند نہیں آتے حد سے آگے بڑھنے والے''۔55

دعا کا مفہوم:

آیت میں دعا اور اس کے آداب کا ذکر ہے۔ لفظ دعا عربی زبان میں کسی کو حاجت روائی کیلئے پکارنا کے معنی میں بھی آتا ہے اور مطلق یاد کرنے کے معنی میں بھی اور یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ مگر میں اس وقت صرف معنی کی حد تک گفتگو کو محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ دعا کے مکمل مفہوم کا سمجھنا' تین باتوں کے جاننے پر موقوف ہے: 1- جس سے دعا مانگی جا رہی ہے' اس کی حیثیت کا تعین۔ 2- دعا مانگنے کے آداب اور اس کی شرائط کا علم۔ 3- جو کچھ مانگا جا رہا ہے' اس کی حدود کا علم۔

پیشِ نظر آیت میں دوسری دو باتوں کو واضح کیا گیا ہے اور اس سے پہلے کی آیت میں پہلی بات کو۔ چنانچہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم اس سے مانگو' جو تمہارا رب ہے' جس کی ربوبیت کائنات کے ذرے ذرے کو زندگی اور بقاء کا سروسامان فراہم کر رہی ہے۔ اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ وہ تمہارے لئے اسباب معیشت فراہم کرے۔ اس نے محض اپنے فضل وکرم سے انسان کی زندگی کی تمام ضروریات کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ماں کی مامتا' جو اپنے بچے کی تربیت اور نگہداشت میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے' اسے بھی ربوبیت کی ہمہ گیری سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کی نگاہ بھی کبھی نہ کبھی بچے کی طرف سے تغافل کا شکار ہو جاتی ہے' اس کا دل بچے کے احساس کو سمجھنے میں کوتاہی کر جاتا ہے۔ مگر وہ ذات جو رب کائنات ہے' اس کی پرداخت کی نگاہ کبھی غافل نہیں ہوتی۔ وہ ضروریات کو نہیں' بلکہ ضروریات کے احساس تک کو جانتا ہے' وہ اپنی مخلوق کیلئے ماں سے کہیں بڑھ کر شفیق اور رحیم ہے۔ اس لئے مانگنا ہو تو اسی سے مانگو۔ دوسری اور کوئی ذات نہیں' جو اس قابل ہو اور انسان اپنی حاجت روائی کیلئے اس سے رجوع کرے۔ مزید فرمایا کہ وہ صرف رب ہی نہیں' بلکہ زمین وآسمان کا خالق بھی ہے۔ اسی کے حکم سے ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں۔ خلق اور امر' سب اسی کے اختیار میں ہے۔ کائنات کی ہر زندہ چیز اسی سے رزق پا رہی ہے۔ اس کے خزانے بے شمار ہیں' جن میں کبھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے جو اس سے مانگو گے' وہ ملے گا۔ اس طرح اپنی حیثیت کے تعین کے بعد حکم دیا: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ ''اپنے رب سے مانگو'' جس کی ربوبیت تمہاری ضرورتوں کو جانتی ہے اور جس کی قوت وعظمت ہر چیز کو پورا کرنے کیلئے کافی ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ مانگنے کے کچھ آداب وشرائط ہیں۔ اگر تم نے مانگتے ہوئے ان کا خیال نہ رکھا تو ممکن ہے تمہاری درخواست ٹھکرا دی جائے۔ اس لئے فرمایا: ''تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً'' اس میں آداب دعا کا ذکر ہے۔ تضرع کے معنی عاجزی' خوشامد' لجاجت اور تذلل کے اظہار کے ہیں اور خفیہ کے معنی ہیں پوشیدہ' چھپا ہوا۔ ان دونوں لفظوں میں مانگنے والے کی اصل حیثیت اس پر ظاہر کی گئی ہے کہ جب تک تمہیں اپنی اس حیثیت کا احساس نہ ہوگا' تم دعا کے آداب کو بھی ملحوظ نہیں رکھ سکو گے۔ تمہاری حیثیت یہ ہے کہ دینے والا جتنا عظیم ہے' تم اتنے ہی عاجز ہو۔ تمہاری حیثیت اس کے سامنے سرتاپا عجز وانکسار کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم جب اس سے مانگو تو تمہارے الفاظ بھی عجز کا اظہار کریں اور تمہارے جسم پر بھی اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے احساس سے کپکپی طاری ہو۔ تمہارا لب ولہجہ عاجزی کی تصویر ہو۔ تمہارا ہر بول زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔ آنکھوں سے

Marfat.com

آنسوؤں کی برکھا برسے اور دل اس یقین سے سرشار ہو۔

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہو گا
ہم کیا ہیں' جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو ہوا' ہوا کرم سے تیرے
جو ہو گا' تیرے کرم سے ہو گا

قلب ونظر کے اس احساس کے ساتھ ساتھ تمہاری ظاہری ہیئت وصورت بھی اس کے شکرگزار اور فرمانبردار فقیر کی ہونی چاہئے' جس کے سراپا پر اس کے احکام سے انحراف اور نافرمانی کی پرچھائیں بھی نہ پڑی ہوں۔ جیسا کہ حدیث میں کہا گیا ہے کہ ایک موقعہ پر حضور اکرم ﷺ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ ''ایک انسان دور دراز مقام کا سفر کرتا ہے۔ پراگندہ حالت اور پریشان صورت اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے کہتا ہے: اے رب! اے رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام کا ہے' لباس حرام کا ہے اور اس کے گوشت پوست کی پرورش بھی حرام سے ہوئی ہے تو اس کی دعا کیونکر قبول ہوگی؟'' اس لئے فرمایا کہ مانگتے ہوئے تمہیں تضرع کی تصویر بنا چاہئے اور تمہارے قول اور عمل' احساس اور عقیدہ میں کہیں بھی اللہ کے احکام سے انحراف نہ پایا جائے اور دوسرا لفظ فرمایا: خفیہ' یعنی جب اس سے مانگو تو چیخ کر اور چلا کر نہ مانگو' کیونکہ چیخنا اور چلانا اس کی عظمت کے آداب کے منافی ہے' وہ جو دل کی دھڑکنیں سنتا ہے۔

خاموش دعاؤں کو بھی سنتا ہے۔ چنانچہ خیبر کے موقعہ پر جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی آوازیں بلند ہوئیں تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے' بلکہ تمہارا مخاطب ایک سمیع وقریب ہے''۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعلانیہ دعا کرنے میں اور آہستہ دعا کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے۔ ایک روایت میں امام احمد بن حنبل نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ بہترین ذکر' ذکرِ خفی ہے۔ یہ شاید اس لئے بھی ہے کہ بلند آواز سے دعا مانگنے سے' اول تو تواضع اور انکسار کا باقی رہنا مشکل ہے۔ ثانیاً اس میں ریا اور شہرت کا بھی خطرہ ہے' جسے حدیث میں شرکِ خفی کہا گیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا: اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ''بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے''۔ یہاں حد سے آگے بڑھنے سے مراد دعا میں حد سے آگے بڑھنا ہے۔ یعنی مانگنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ دعا کی حدود کیا ہیں' تا کہ وہ ان حدود سے آگے نہ بڑھے۔ ان حدود سے آگے بڑھنے کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ لفظی تکلفات اور قافیہ وغیرہ اختیار کیا جائے اور شعروں کی صورت میں گا گا کر دعا مانگی جائے' جس کا نتیجہ یہ ہو کہ گانا تو باقی رہ جائے' دعا کی روح ختم ہو جائے اور دعا' دعا نہ رہے' ٹھمری بن جائے۔ اکبر مرحوم نے شاید ایسے ہی موقعہ کیلئے کہا تھا

عبادت سے محبت ہے انہیں' گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

دوسری صورت یہ ہے کہ دعا میں غیر ضروری شرطیں لگائی جائیں۔ جیسے حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ ان کا صاحبزادہ اس طرح دعا مانگ رہا ہے کہ یا اللہ! میں آپ سے جنت میں سفید رنگ کا داہنی جانب والا محل طلب کرتا ہوں۔ آپ نے اسے ٹوکا کہ دعا میں ایسی شرطیں حد سے تجاوز ہیں' جن کو قرآن وحدیث میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ تیسری صورت حد سے تجاوز کی یہ ہے کہ عام مسلمانوں کیلئے بد

Marfat.com

کرے یا کوئی ایسی چیز مانگے جو عام لوگوں کیلئے مضر ہو یا ایسی چیز کی دعا کرے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت' حکمت اور احکام شریعت کے خلاف ہو۔

حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جو دعا بھی خدائے عز و جل کی عظمت و رحمت کے تصور اور اپنی عاجزی اور سرافگندگی کے اعتراف اور دعا کے تمام تر آداب شرائط کے ساتھ مانگی جائے' وہ کبھی رد نہیں ہوتی۔ البتہ اس کی قبولیت کی تین صورتیں ہیں:

1- مانگنے والے کو وہی کچھ دنیا ہی میں عطا فرما دیا جاتا ہے' جس کیلئے اس نے اپنے مالک سے دعا کی تھی۔

2- مانگنے والا جو کچھ مانگ رہا ہے' وہ تو عطا نہیں کیا جاتا' البتہ اس کے عوض کوئی آنے والی بلا اور مصیبت اس سے ٹال دی جاتی ہے' مگر یہ اپنی کم علمی اور جہالت کے باعث یہی سمجھتا ہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی۔

3- تیسری صورت قبولیت کی یہ ہے کہ دنیا میں تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی' مگر دنیا کی یہ محرومی اس کیلئے ثمرۂ آخرت بن جائے گی اور جب اسے اچانک یہ نعمت غیر مترقبہ اجر و ثواب کی صورت میں عطا ہوگی تو وہ حیران رہ جائے گا اور تمنا کرے گا کہ کاش! دنیا میں اس کی کوئی دعا بھی قبول نہ ہوتی' تاکہ آج اسے اجر و ثواب کی صورت میں ایک خزانہ ہاتھ آتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ ہمارا پروردگار استار رحیم و کریم ہے کہ وہ اپنے بندوں کی دعائیں' جو آداب و شرائط کی کامل پابندی سے مانگی جائیں' کبھی رد نہیں فرماتا۔ البتہ اسکے یہاں قبولیت کی صورتیں مختلف ہیں' مگر بندہ اپنی بے خبری کے باعث بعض دفعہ بے صبر ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ مدت سے دعا کر رہا ہوں' مگر شنوائی نہیں ہوتی' دعا مانگنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ذرا سی بے صبری بہت بڑی محرومی کا سبب بن جاتی ہے' ممکن ہے جس وقت بندہ دعا مانگنا چھوڑ رہا ہو' وہی وقت اس کی قبولیت کا ہو یا پروردگار نے اس کی دعاؤں کو توشۂ آخرت بنانے کا حکم دے دیا ہو۔ دونوں صورتوں میں یہ بے صبری اور جلد بازی کیسے برے نتائج پیدا کر سکتی ہے؟ اس لئے بندہ کبھی بے صبر نہ ہو اور کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

اسی مضمون کی تائید ایک منفی پہلو سے:

اگلی آیت کریمہ میں اسی مضمون کی تاکید و توثیق منفی پہلو سے کی جا رہی ہے ان دونوں پہلوؤں کو بیک وقت سامنے رکھیں تو توحید اور تعلق باللہ کے تمام درجات مکمل ہو جاتے ہیں اور شرک کا ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ O

''اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو اور اسی کو پکارو بیم و رجا میں۔ بے شک! اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے''۔56

اس آیتِ کریمہ میں تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چار باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ 1- زمین یعنی ملک میں فساد برپا نہ کرو' 2- زمین کی اصلاح ہو جانے کے بعد' 3- اسی کو بیم و رجا دونوں میں پکارو' 4- اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک بات کی مقدور بھر وضاحت کرتے ہیں۔

سب سے پہلی یہ بات کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو اس سے کیا مفہوم ہے؟ اس سے دو باتیں مراد ہیں لیکن انجام کار پر دونوں باتیں ایک ہیں پہلی بات جو اس سے مراد لی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ زمین اس وقت فساد سے بھر جاتی ہے جب حاکمیت اعلیٰ کو چیلنج کیا جاتا ہے اور اقتدار اعلیٰ کی اہمیت ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لوگ یا تو خود اپنے اقتدار کے دعوے دار بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور یا اصل حاکم کی حکومت میں دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہیں کوئی سی بھی صورت ہو نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ جیسے ہی اقتدار اعلیٰ کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے جرائم کی کثرت ہو جاتی ہے۔ جرائم پیشہ لوگ دلیر ہو

Marfat.com

[illegible]

Marfat.com

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ زمین کی اصلاح ہو جانے کے بعد اس میں فساد برپا نہ کرو۔ زمین کی اصلاح ہو جانے کا کیا مطلب ہے؟ مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو زمین پر بھیجنے سے پہلے ان سے اور ان کی اولاد کی روحوں سے ایک عہد لیا تھا' پوچھا تھا کہ بتاؤ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو سب نے بیک زبان یہ کہا تھا کہ آپ ہی ہمارے رب ہیں اور پھر جب حضرت آدم کو زمین پر بھیج دیا گیا تو پھر انہیں بھی اور ان کے بعد ہر آنے والے رسول کے ذریعے سے امتوں کو یہ بات بتائی جاتی رہی کہ تمہاری غذائی ضرورتیں تو زمین سے پوری ہوں گی لیکن تمہارے مقاصد زندگی اور اس کے حصول کیلئے ہدایت اور زندگی گزارنے کیلئے قانون یہ تمہیں آسمان سے ملے گا یعنی رسولوں کی معرفت ہم تمہاری اس بنیادی ضرورت کو پورا کریں گے جس نے ہمارے رسولوں کی پیروی کی اور اس قانون کو اختیار کرلیا وہ قیامت کے دن سرخرو ہو جائے گا اور جس نے اس کی تکذیب کی یا انکار کیا تو ایسے لوگوں کو ہم جہنم میں ڈالیں گے۔ پھر مختلف اوقات میں اس عہد اور اس ہدایت کی یاددہانی کیلئے اللہ کے رسول بھیجے جاتے رہے اور جب بھی زمین میں اس عہد کے بھول جانے کی وجہ سے فساد پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھیج کر یا اس فساد کی اصلاح کردی اور یا اس امت کو عذاب کے ذریعے تباہ کر کے نئی نسل کو اس کی جگہ کھڑا کر دیا۔ اس طرح ہمیشہ اللہ کی طرف سے زمین کو فساد سے پاک کیا گیا۔ اب بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ اے مشرکینِ مکہ اور اے دنیا بھر کے لوگو! تمہیں خوب معلوم ہے کہ جن قوموں نے اللہ کے دین سے انحراف کا رویہ اختیار کیا اور اللہ کے رسولوں کی دعوت کو قبول نہ کیا ہمیشہ ان کا کیا انجام ہوتا رہا آج تمہارے پاس اللہ کے آخری رسول آچکے ہیں انہوں نے زمین میں فساد برپا کرنے والی ایک ایک چیز کی نشاندہی کر دی ہے اور تمہارے لئے صراط مستقیم کھول دی ہے۔ اب اگر تم اس صراط مستقیم پر چل کر اپنی دنیا اور آخرت اچھی بنانا چاہتے ہو تو یہ تمہارے لئے ایک سنہری موقع ہے اس کیلئے تمہیں اپنی زندگی کے رویے میں تبدیلی کرنا ہوگی وہ تبدیلی یہ ہے کہ تم آج تک اللہ سے انحراف کر کے نجانے کس کس کو پکارتے رہے ہو یعنی تم نے نجانے کس کس کو اقتدار کی مسند پر بٹھایا اور خود اس کی اطاعت کرتے رہے۔ تم نے ہمیشہ امیدیں دوسروں سے باندھیں' ہمیشہ دوسروں سے خوفزدہ ہو کر ان کی ہر بات کو تسلیم کیا اور ان کے دروازوں پر سجدہ ریز ہوتے رہے۔ اب تمہاری خیریت اس میں ہے کہ تم ہر آستانے سے سر اٹھا کر ہر دروازے سے منہ پھیر کر' ہر ایک سے اپنے دل خالی کر کے اور ہر راہنمائی کو دھتکار کر صرف اللہ کو پکارو اور تمہاری پکار کا محرک دو باتیں ہونی چاہئیں ایک تو یہ کہ تم ڈرو تو صرف اللہ سے ڈرو اور تمہیں اندیشہ ہو تو صرف اس بات کا کہ اگر میرا اللہ مجھ سے ناراض ہو گیا تو میں برباد ہو جاؤں گا نہ یہ دنیا میرے کام آئے گی اور نہ قیامت کے عذاب سے مجھے کوئی چھڑا سکے گا اور دوسری بات کہ تم اپنی ہر آرزو کا دامن اللہ کے ساتھ باندھو۔ اس بات کا یقین پیدا کرلو کہ تمہیں جو کچھ بھی ملے گا اللہ کے راستے سے ملے گا۔ تمہارا دست سوال صرف اسی کے سامنے دراز ہونا چاہئے تمہارے دل کی آبادی صرف اسی کی مناجاتوں اور اسی کی محبت سے ہونی چاہئے اور مزید یہ اطمینان رکھو کہ اگر میں نے صرف اپنے اللہ سے ڈرنا شروع کر دیا تو پھر مجھے اہل دنیا میں سے کوئی نہیں ڈرا سکے گا ہر طرح کے اندیشے میرے دل سے نکل جائیں گے اور اگر میری امید گاہ اور میری جائے پناہ صرف اللہ کی ذات بن گئی تو پھر مجھے کسی جہاں پناہ سے کوئی خواہش نہیں ہوگی۔ یہ امید و بیم مومن کا وہ ہتھیار یا وہ اثاثہ ہے جو اس کیلئے زندگی کی سب سے بڑی قوت بن جاتا ہے۔ اس کے سامنے اگر دولت کا ڈھیر لگا دیا جائے تو بھی اس کے پاؤں میں تزلزل نہیں آتا وہ جانتا ہے کہ امیدوں اور چاہتوں کی مرکز تو اللہ کی ذات ہے اور اس کے خزانوں میں کبھی کمی نہیں آئی اور اگر اس کا دشمن اس کے سر پر تلوار سونت کے بھی کھڑا ہو جائے تو وہ کبھی اس سے خوفزدہ نہیں ہوتا وہ جانتا ہے کہ اگر اللہ کو میری بہتری منظور ہے تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور جہاں تک عاقبت کا تعلق ہے اس میں بھی اس کا حال یہ ہوتا ہے جیسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ سب کو جنت میں بھیج دیں گے اور صرف ایک بدقسمت جہنم میں جائے گا تو مجھے ڈر یہ ہے کہ وہ بدقسمت کہیں میں نہ ہوں اور اگر یہ کہا جائے کہ

Marfat.com

تمام لوگ جہنم میں جائیں گے صرف ایک خوش قسمت جنت میں جائے گا تو تب بھی مجھے یہ امید ہوگی کہ وہ خوش قسمت میں ہی ہوں گا۔

آخری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ بیم ورجا یعنی خوف اور امید میں صرف اللہ ہی کو پکارنا یہی وہ چیز ہے جس کو مقام احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایسا کرنے والوں کو محسنین کہا گیا ہے تو یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی رحمت ہمیشہ محسنین یعنی نیکو کاروں کے قریب ہوتی ہے یعنی ان لوگوں کے قریب ہوتی ہے جو خوف ورجا میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی سے وابستہ رہتے ہیں کسی کا خوف انہیں اس آستانے سے اٹھا نہیں سکتا اور کسی کی کوئی طمع اور لالچ انہیں اللہ کے آستانے سے برگشتہ نہیں کرسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام تر انسانی اعمال انسانی احساسات کے تابع ہیں اور انسانی احساسات جن محرکات کے تحت تشکیل پذیر ہوتے یا جنم لیتے ہیں وہ بیم ورجا کے سوا کچھ اور نہیں انسان کی زندگی مادی ہو یا معنوی وہ ہر حال میں ان دونوں محرکات کے حصار میں رہتا ہے۔ کبھی اس کی زندگی پر امید حکومت کرتی ہے اور کبھی اس پر خوف کا پہرہ ہوتا ہے یہ دونوں محرکات اپنے حسب حال احساسات کو پیدا کرتے رہتے ہیں۔ احساسات کو پاکیزہ رکھنے اور انہیں صحیح نہج دینے کیلئے ضروری ہے کہ انسانی زندگی کے یہ محرکات پاکیزگی کی صورت اختیار کریں اگر امیدیں غلط رخ پر چل نکلیں اور ان کے اہداف پاکیزگی کھو بیٹھیں تو پھر امید کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساسات کبھی پاکیزہ نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح اگر خوف کا محرک پاکیزہ نہ رہے اور اس کا متعلق ایسی چیزیں قرار پائیں جو انسانیت کیلئے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساسات یقیناً انسانیت کیلئے مہلک ثابت ہوں گے۔ اس لئے قرآن کریم ان دونوں محرکات میں پاکیزگی پیدا کرنے کیلئے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ ان دونوں کا تعلق اللہ کی ذات سے جڑا رہے جب امیدیں سر اٹھانے لگیں تو ان کا آستانہ اللہ کے سوا کوئی اور نہ ہو اور جب خوف کے سائے گہرے ہونے لگیں تو ان کی پناہ گاہ بھی صرف اللہ کی ذات ہو۔ یہ کہنے کو معمولی تبدیلی ہے لیکن حقیقت میں یہ زندگی کا بہت بڑا راز ہے جس سے حیرت انگیز نتائج سامنے آتے ہیں جس کی امیدوں کا آستانہ اللہ کے سوا کوئی اور ہو اس میں پاکیزگی تلاش کرنا ایک کارِ عبث ہے۔ اس میں حلال وحرام کی پابندی' خیر وشر کا امتیاز' اخلاقیات کی بالادستی' کوئی چیز بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح خوف کا ہدف اگر بدل جائے تو پھر انسانیت کی پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے یہ خوف نہ صرف تخت وتاج سے نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے بلکہ تمام مظاہر قدرت زندگی کے راستے میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹیں' معمولی مفادات کی شکست وریخت' ایک ایک چیز خوف کا سانپ بن کر انسان کے دل میں اتر جاتا ہے اور وہ پوری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے بیم ورجا میں جہاں اپنی ذات کے ساتھ وابستگی کا حکم دیا ہے اور ہر حال میں دست سوال اسی کے سامنے دراز کرنے کا امر فرمایا وہیں اگلی آیت کریمہ میں اس کی ایک ایسی خوبصورت مثال بھی دی جس کا تعلق یوں تو عام انسانی زندگی سے ہے اور ہر جگہ کا رہنے والا انسان یقیناً اس سے ایک واسطہ رکھتا ہے لیکن عرب کی سرزمین میں یہاں آئے دن فاقہ زدگی کی نوبت آجاتی تھی اور لوگ پانی کی تلاش میں مارے مارے پھرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اس کی قدر وقیمت بے حد زیادہ تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

''اور وہی ہے' جو بھیجتا ہے ہواؤں کو بشارت بنا کر اپنے ابر رحمت سے پہلے۔ یہاں تک کہ جب وہ بوجھل بادل کو اٹھا لیتی ہیں' ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب وگیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں۔ پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں' ہر قسم کے پھل۔ اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے' تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو''۔57

Marfat.com

چار حقائق:

اس آیتِ کریمہ میں نہایت اعجاز کے ساتھ مختلف حقائق کو جمع کر دیا گیا ہے۔ مضمون چونکہ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کا چل رہا ہے اس لئے اس میں توحید کی دلیل بھی ہے اور ساتھ ہی انسان کے بنیادی احساسات جن پر بیم و رجا کی حکومت رہتی ہے اس کی اللہ سے وابستگی کی تاکید بھی ہے اس لئے اس کی مثال بھی ہے اور پھر آیت کے آخر میں اسی پورے مضمون کو انسان کیلئے زندگی بخش قرار دینے کی طرف اشارہ بھی ہے اور پھر اسی کو اثباتِ معاد کیلئے دلیل بنا دیا گیا ہے یہ چار چیزیں اس مختصر آیت میں بیک وقت موجود ہیں۔ ہم اختصار کے ساتھ ان میں سے ایک ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

عرب کی سرزمین میں چونکہ بارش بہت کم ہوتی تھی۔ موسم گرما کی بے پناہ شدت میں موسم کی تمازت تو ایک طرف رہی ہر چیز کے جل جانے کے باعث قحط سالی کی سی فضا پیدا ہو جاتی تھی جانوروں کے ریوڑ پانی اور چارے کی کمی کے باعث مرنے لگتے۔ عرب اپنی زندگی اور جانوروں کی زندگی کے بچاؤ کیلئے پانی کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ چلچلاتی دھوپ ان کے اندر خوف کے سائے دن بدن گہرے کرتی چلی جاتی۔ جیسے ہی کہیں سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آتا ان کے اندر امیدیں لہرانے لگتیں۔ یہی بیم و رجا کی کیفیت گرمیوں میں ان کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی اور یہی کیفیت بار بار انہیں آسمان کی طرف نگاہیں اٹھانے اور اللہ کی قدرت کو یاد کرنے پر مجبور بھی کرتی تھی۔ قدرت انہیں یاد دلاتی ہے کہ دیکھو تم نے جس پروردگار کو بھلا کر اپنی زندگی کو یکسر اس سے آزاد کر رکھا ہے اور اسی پر بس نہیں تم نے اس کے ساتھ نجانے شرک کی کیسی کیسی داستانیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ جب تم زندگی اور موت کی اس کشمکش میں مبتلا ہوتے ہو تو پھر تمہارے یہ شریک تمہیں پانی کے چند گھونٹ کیوں نہیں دے سکتے۔ گھاس کی چند پتیاں تمہارے لئے زمین سے کیوں نہیں نکال سکتے پھر تم بار بار آسمانوں کی طرف سر اٹھا اٹھا کر کیوں دیکھتے ہو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ اللہ کی قدرت بے پناہ ہے اس کے سوا کوئی تمہارے کام نہیں آ سکتا۔ جیسے جیسے گرمی اپنی شدت اختیار کرتی جاتی ہے یہ خوف تمہیں بار بار اللہ کی قدرت کی یاد دلاتا ہے اور تم بار بار اس سے رحمت کی امیدیں باندھتے ہو۔ دل لرزنے لگتا ہے تو اس سے بارش مانگنے لگتے ہو اور دعا کرنے کے بعد یہ امید ہی تمہیں جینے کا سہارا دیتی ہے کیا یہ بات تمہارے سمجھنے کیلئے کافی نہیں کہ تم زندگی کے باقی معاملات میں بھی ہر طرح کے خوف اور ہر طرح کی امید میں اللہ ہی سے مانگنا سیکھو اور اسی کے آستانے کو آخری آستانہ بناؤ اور مزید یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ذرا اس کی قدرت کا اندازہ تو کرو کہ جب آسمان پر دور دور تک بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا بھی دکھائی نہیں دیتا اور سورج دن بھر آگ برسا رہا ہوتا ہے کہ اچانک ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور تمہاری نگاہوں کے سامنے بادل جھوم کے اٹھتے ہیں جو گھٹا بن کر تمہارے سروں پر چھا جاتے ہیں ان میں بادل کا ایک ایک ٹکڑا منوں پانی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ذرا غور کرو یہ ٹھنڈی ہوائیں کون کھینچ کے لاتا ہے۔ پھر یہ منوں بوجھل بادل فضا میں کون پھیلا دیتا ہے پھر ہوائیں اتنے بوجھل بادلوں کو اس طرح اٹھائے ہوئے تمہاری نظروں کے سامنے بڑھ رہی ہوتی ہیں یوں لگتا ہے جیسے یہ منوں بوجھل بادل نہیں بلکہ روئی کے گالے ہیں جنہیں اٹھانے میں کوئی زحمت نہیں ہو رہی اور پھر ایسا بھی نہیں کہ یہ بادل جہاں چاہیں برس جائیں یا دنیا کی کوئی جابر قوت ان سے پانی زبردستی چھین لے یہ تو سراسر اللہ کی قدرت ہے وہ جہاں چاہتا ہے انہیں ہانکتا ہوا لے جاتا ہے اور پھر جب ان سے چھم چھم پانی برستا ہے تو دیکھو کس طرح جل تھل ایک ہو جاتا ہے تمہارے حوض بھر جاتے ہیں موت کا رقص رک جاتا ہے چاروں طرف زندگی کی چاندنی پھیل جاتی ہے۔ اس پوری صورتحال کو نگاہوں میں لایئے کس طرح اللہ کی قدرت کے اثبات سے اللہ کی توحید کو بیان کیا گیا ہے اور پھر انسان کی بیم و رجا کی کیفیت کو اللہ کی قدرت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے اور مزید یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ اس بارش کو دیکھو جب تک تم انتظار میں تھے اور بارش نازل نہیں ہوئی تھی تو تم پر ایک موت کی کیفیت طاری تھی ہر طرف دھول اڑ رہی تھی دور دور تک سبزے کا نشان نہیں تھا وہ آبی جانور جو جوہڑوں میں بولتے سنائی دیتے ہیں

Marfat.com

وہ ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتر چکے تھے لیکن اب جیسے ہی بارش نازل ہوئی دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں میں زمین نے ہری بانات کی وردی پہن لی' ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دینے لگا۔ ہر چیز کے چہرے پر رونق آ گئی آبی جانور ٹرانے اور بولنے لگے۔ ایسا لگا کہ موت میں سے زندگی پھوٹ نکلی ہے۔ جس طرح یہ بارش انسانی مادی زندگی کیلئے زندگی کا سامان ہے اسی طرح انسان کی معنوی اور روحانی زندگی کیلئے وحی الٰہی کو حیات بخش بنایا گیا ہے جس طرح انسان کی مادی زندگی دھوپ کی تمازت سے مرجھا جاتی بلکہ مرجاتی ہے اسی طرح شرک کی گندگی' اعمال کی خرابی' احساسات کا بگاڑ اور اخلاقیات کا زوال انسان کی معنوی اور روحانی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے جس طرح بارش انسان اور اس کے متعلقات میں مادی زندگی پیدا کرتی ہے اسی طرح اللہ کی وحی پیغمبر کی تشریف آوری اور کتاب خداوندی کا نزول انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے صور اسرافیل ثابت ہوتا ہے جس کے نتیجے میں نیا انسان' نیا معاشرہ اور نئی قوم وجود میں آتی ہے پھر اسی صورتحال کو آیت کے آخر میں قیامت اور معاد کیلئے دلیل بنایا گیا ہے۔ اشارہ فرمایا گیا کہ بارش سے پہلے کی زندگی سے تم واقف ہو کس طرح ہر چیز پر مردنی طاری تھی؟ اور اب بارش کے بعد کی زندگی تمہارے سامنے ہے ہر مردہ چیز زندہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ انقلاب تم ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو اور تمہیں کبھی کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ یہ زندگی کی نمود کیسے ہوگئی اور زندگی نے موت کو شکست کیسے دے دی لیکن یہ بات کبھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کہ جو پروردگار بارش کے ذریعے تمہاری مردہ زندگی میں زندگی کی رو دوڑا سکتا ہے وہ قیامت کے دن تمہیں دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا۔ اگر ایک مردہ زمین بارش کے نزول سے زندہ ہو سکتی ہے تو انسانی بستیاں قیامت میں دوبارہ زندہ کیوں نہیں ہو سکتیں؟ یہ بارش اس سے پہلے بھی بارہا مشاہدہ میں آ چکی ہے اگر تم اسی صورتحال پر غور کرو تو تمہارے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہ رہے کہ جس پروردگار کی قدرت آج زندگی کا انقلاب برپا کر سکتی ہے وہ قیامت کی صورت میں ایک نیا انقلاب بھی برپا کر سکتی ہے۔

ایک اور اہم حقیقت

اگلی آیت کریمہ میں ایک اور اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ○

"اور جو زمین زرخیز ہو وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین ناقص ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اس طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں ان لوگوں کیلئے جو شکر گزار بننا چاہتے ہیں"۔ 52

اس آیت کریمہ میں ایک اور حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جس سے ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ قرآن کریم اور دیگر آسمانی کتابوں کو بارش سے تشبیہ دی ہے اور حدیث پاک میں تو اس کے اثرات کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ بخاری اور مسلم کی ایک روایت ہے کہ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم و ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی تمثیل یہ ہے کہ کسی خطہ زمین پر بارش ہو تو جو ٹکڑا زرخیز ہوتا ہے وہ پانی کو قبول کر لیتا ہے اور خوب سبزہ اور نباتات اگاتا ہے اور اسی طرح کوئی ٹکڑا ایسا ہوتا ہے جو نباتات تو نہیں اگاتا لیکن پانی کو روک لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ لوگ اس سے پیتے ہیں کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں اور اپنی فصلیں بوتے ہیں اور اسی طرح کوئی ٹکڑا ایسا ہوتا ہے جو نہ تو نباتات اگاتا ہے نہ پانی روکتا ہے بلکہ محض چٹیل ہوتا ہے۔

Marfat.com

اس حدیث میں بھی آنحضرت ﷺ جو ہدایت لے کر آئے ہیں اس کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے اور انسانوں کے دل و دماغ کو مختلف قسم کی زمینوں سے۔ زمینوں پر بارش کے اثرات تو ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کا ابر کرم تو ہر خشک و تر پر برستا ہے لیکن ہر جگہ اس کے اثرات یکساں نہیں ہوتے بلکہ اس بارش کے فیض سے زمین کا ہر ٹکڑا بقدر استعداد فائدہ حاصل کرتا ہے جو زمین زرخیز ہوتی ہے وہ لہلہا اٹھتی ہے لیکن بنجر اور شور زمین یا تو کچھ اگاتی ہی نہیں اور اگر اگاتی بھی ہے تو اپنے اندر کی خباثتیں کانٹوں اور مختلف قسم کی مکروہات کی شکل میں نمایاں کر دیتی ہے۔ یہی حال انسانی دل و دماغ کا بھی ہے جن لوگوں نے کفر کے اثرات سے اگرچہ اپنے آپ کو مسموم کیا لیکن بالکل تباہ نہیں ہونے دیا وہ اپنی باقی استعداد کے مطابق وحی الٰہی اور نبوت کے فیض سے حصہ پاتے ہیں جتنی استعداد کسی میں ہوتی ہے وہ اتنی جلدی ایمان کے پھول اگانے لگتا ہے اور جو لوگ کفر اور حق سے عناد کے باعث اپنے آپ کو بالکل تباہ کر چکے ہوتے ہیں ان کے اندر وحی الٰہی سے کوئی تبدیلی نہیں آتی اور اگر کوئی تبدیلی آتی ہے تو وہ ان کے اندر کی دشمنیاں، عناد، انسان دشمنی، اللہ سے بغاوت کی صورت میں اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ کافروں میں ابوبکر جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی کبھی شرک نہیں کیا۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ خود آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے جس کسی کے سامنے بھی اسلام پیش کیا اس نے قبول کرنے میں تامل کیا یا حیل و حجت سے کام لیا صرف ایک ابوبکر تھے کہ ادھر میں نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا ادھر انہوں نے قبول کر لیا گویا ان کا آئینۂ دل پہلے سے اس قدر صاف تھا کہ نبوت کی ایک جھلک اس کی آب و تاب کا سامان کر گئی۔ لوگ اسے قسمت کا نام دیتے ہیں۔ میں اس کا یکسر انکار تو نہیں کرتا لیکن قسمتیں بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں بے سبب نہیں بنتیں اس کا زیادہ تر تعلق انسان کی اپنی استعداد اور اپنی طلب سے ہے۔ جس نے اپنے آپ کو بالکل محروم کر لیا ہے وہ ابوجہل اور ابولہب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہیں فرق صرف یہ تھا کہ جاہلیت اور کفر نے ان کی استعداد کو جو زنگ لگا رکھا تھا اسلام نے آکر اسے دھو ڈالا اور آنحضرت ﷺ کی کیمیا اثر نگاہ نے اس پیتل کو سونے میں تبدیل کر دیا۔ حالی مرحوم نے ٹھیک کہا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمی
نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اُس کے جوہر تھے اصلی
ہوئے سب تھے مل کر وہ مٹی میں مٹی
یہ تھا ثبت علمِ قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں

توجہ طلب بات:

میں اپنے گرد و پیش میں بھی ایسی بہت سی مثالیں دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہوں۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، وہ خود اپنی بداعمالیوں اور گمراہیوں کے ذاتی اسباب تلاش کرنے کی بجائے ہمیشہ اصلاحی قوتوں کو الزام دیتے ہیں۔ یہ تسلیم ہے کہ آج کا بڑے سے بڑا مصلح اور مبلغ بھی اللہ کے نبی جیسا اخلاص، خیر خواہی اور ہدایت کی تڑپ اپنے اندر کہاں سے لا سکتا ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ خود مصلحین اور علماء کے گروہ میں بھی بہت کمزوریاں بلکہ خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں لیکن اگر اصلاح طلب کرنے والے کی نیت میں جذبۂ خیر موجود ہو تو سمجھانے اور ہدایت دینے

Marfat.com

والے کی کمزوریوں کے باوجود بھی اصلاح قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی لیکن ہم اپنی کمزوریوں کو سمجھنے کی بجائے جب سارا الزام اصلاحی طبقے کو دینے لگتے ہیں تو یہ سراسر ناانصافی ہے اور خود اپنے ساتھ دشمنی بھی اگر قیامت کے دن دوسروں کو الزام دینا کام آ سکتا ہے تو بے شک یہ شوق جاری رکھنا چاہئے لیکن اگر وہاں اپنے اعمال کا جواب خود ہی دینا ہے تو پھر اپنی ذات کو الاؤنس دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اصلاحی کوششیں اس قدر جزوی اور وقتی ہیں اور ہم اس کیلئے اس قدر کم سے کم وقت نکالتے ہیں کہ ان کا مثمر اور نتیجہ خیز ہونا چاہے کم سے کم سہی معجزے سے کم نہیں۔ ذرا اندازہ فرمائیے کہ ہمارا سیکھنے کا سارا وقت اور ساری صلاحیتیں تعلیمی اداروں میں صرف ہو جاتی ہیں اور یہ کہنے کی بات نہیں کہ جتنا بڑا کوئی تعلیمی ادارہ ہے وہ اتنا ہی دین سے اگر برگشتہ نہیں تو دور ضرور ہے۔ اس میں صَرف کیا ہوا وقت دین کے قریب لانے کی بجائے اور دور لے جاتا ہے یہاں کی حاصل کردہ تعلیم سکول سے لے کر یونیورسٹی تک ایک مسلمان کو اسلامی تصورات' احساسات اور عقائد تک سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد عملی زندگی میں جن اداروں سے واسطہ پڑتا ہے ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ دین بیزاری پیدا کرتے ہیں یا دین سے محبت سکھاتے ہیں۔ عملی زندگی میں جیسے جیسے آدمی ذمہ داریوں سے گراں بار ہوتا جاتا ہے اور علائق دنیوی جیسے جیسے اسے بوجھل بناتے جاتے ہیں ویسے ویسے مکروہات دنیا کیلئے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا آسان ہوتا جاتا ہے۔ جو بات اسے تعلیمی زبانوں میں خیر وشر کے حوالے سے سمجھانا نسبتاً آسان ہوتا ہے وہ مفادات کے دلدل میں پھنس کر مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک طالب علم بڑی اچھی طرح یہ بات سمجھتا ہے کہ رشوت لینا بری بات ہے لیکن یہی طالب علم جب ایک افسر بن کر کسی منفعت بخش مسند پر بیٹھتا ہے تو اب اس کیلئے یہ بات سمجھنا ممکن نہیں رہتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ تعلیم اور عملی زندگی کی ناگواریوں کے یہ وہ تہہ در تہہ اندھیرے ہیں جو انسانی زندگی اور انسانی دل ودماغ کو بری طرح بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ اس میں ہر چیز باقی رہتی ہے لیکن خیر کے قبول کرنے کی صلاحیت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ ایسی صورتحال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر کسی کو آخرت یاد ہے تو وہ اس کی تیاری اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے کیلئے علماءِ حق کی طرف رجوع کرے اور اس کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت نکالے لیکن اگر معاملہ صرف یہاں تک رک جائے کہ ہفتے میں ایک دن جمعہ کی اذان سن کر مسجد کا رخ کیا جائے اور سمجھ یہ لیا جائے کہ عربی خطبہ سننا اور دو رکعت نماز پڑھنا صرف یہی جمعہ کی ادائیگی ہے اور باقی تمام ہفتے کے اوقات زندگی کے ان معمولات کیلئے وقف رہیں جس سے دین سے بیزاری تو پیدا ہوتی ہے دین سے محبت نہیں۔ ذرا غیر جانبداری سے فیصلہ کیجئے ایسی صورت میں کیا کوئی ہلکی پھلکی نصیحت بلکہ کوئی زوردار نصیحت بھی کیا ایسے اندھیروں میں دبے ہوئے دل ودماغ پر اثر انداز ہو سکتی ہے؟ ایسی صورت میں ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان اندھیروں سے نکلنے کی کوشش کی جائے اور دل ودماغ پر گمراہیوں اور غفلت کے جو ردے چڑھے ہوئے ہیں انہیں اتارنے کی سعی کی جائے۔ لیکن یہاں کام صرف مولوی کو گالی دینے سے پورا کیا جاتا ہے۔ اپنی کسی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا۔ آیت کے آخری جملے میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح کواڑ بند کر کے بیٹھ جانے والا آدمی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اس کیلئے بادِ بہاری بھی بے سود ثابت ہوتی ہے جس طرح قوت ذائقہ کھو دینے والا شخص لذیذ ترین کھانے کی لذت سے بھی محروم رہتا ہے اور جس طرح کھلے ہوئے چمن کی خوشبوؤں سے بھی وہ آدمی فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو قوتِ شامہ سے محروم ہو چکا ہو اس طرح تصریف آیات سے بھی اس آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جس میں شکر کا جذبہ نہ ہو۔ تصریف آیات ان لوگوں کیلئے کارآمد ہے جو شکر کا جذبہ رکھتے اور شکر ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شکر کیا ہے اللہ کی کم سے کم نعمتیں پا کر اس کی زیادہ سے زیادہ اطاعت کرنا اور اپنے دل ودماغ کو ہر وقت جذبۂ سپاس سے معمور رکھنا اور اپنا پسینہ اسی کے دین کی سربلندی کیلئے بہانا اور ضرورت پڑے تو خون اسی کی دین کی کھیتی کو سیراب کرنے کیلئے پیش کرنا مخلوق خدا کو اپنی خدمت سے بہرہ ور کرنا اور ان کی پریشانیوں کو اپنی پریشانیاں سمجھ کر دور کرنا جو شخص ان احساسات سے گراں بار نہیں اس کیلئے قرآن کر

Marfat.com

شاید ہدایت کا سامان نہ کر سکیں۔

جس طرح بارش کے برسنے کے بعد زمین دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اس کا ذرخیز حصہ تو گل ولالہ اگاتا ہے لیکن اس کا بنجر اور شور حصہ خار و خس کے سوا کچھ نہیں اگاتا اسی طرح وحی الٰہی کی بارش کے بعد اور اللہ کے نبی کی بعثت کے بعد انسانیت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ایک طیب حصہ جو فیضِ رسالت سے پھلتا پھولتا اور برگ و بار لاتا ہے اور دوسرا خبیث حصہ جو بجائے اس فیض سے حصہ پانے کے اپنی ساری کھوٹ نمایاں کر دیتا ہے اور زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے۔ اگلے رکوعوں میں مسلسل تاریخی شواہد سے یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے نبیوں کی دعوت سے فائدہ نہ اٹھایا اور بنجر اور خبیث زمین کی طرح خار و خس سے زمین کو بھر دیا اور اللہ کے نبی کی دعوت کو آگے بڑھنے سے قدم قدم پر روکنے کی سعی بھی کی دیکھو ان کا انجام کیا ہوا؟ سب سے پہلے اس سلسلے میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کے رویے کو بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ
فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ
فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ
مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَ
اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾
فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ ع

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے

Marfat.com

سوا تمہارا کوئی معبود نہیں' میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔اس کی قوم کے سرداروں نے کہا! ہم تو تجھے صریح گمراہی میں دیکھ رہے ہیں۔نوح نے کہا: اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں' تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں' تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے' جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاددہانی آئی' تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟۔پس ان لوگوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ کشتی میں اس کے ساتھ تھے' ان کو نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا' جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔بے شک یہ لوگ اندھے تھے۔

..................☆......☆......☆..................

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍO

''ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں' میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں''۔59

حضرت نوح اور قوم نوح کی مثال اور اس کی وضاحت:

اس تاریخی بیان کی ابتداء حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم سے کی گئی ہے کیونکہ قرآن کی رو سے جس صالح نظامِ زندگی پر حضرت آدم علیہ السلام اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے اس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں رونما ہوا اور اسکی اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور فرمایا۔ قرآن کے اشارات اور بائیبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔بابل کے آثارِ قدیمہ سے جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ان میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔پھر جو روایات کردستان اور آرمینیہ میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرۂ ابن عمر کے آس پاس' آرمینیہ کی سرحد پر کوہِ ارارات کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشان دہی اب بھی کی جاتی ہے اور شہر نخچیوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنا حضرت نوح علیہ السلام نے ڈالی تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان' مصر' ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے علاوہ ملایا' جزائر شرق الہند' آسٹریلیا' نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانہ سے چلی آ رہی ہیں۔اس سے صاف

Marfat.com

ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسلِ آدم کسی ایک ہی خطۂ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشان دہی کرتی ہیں اگرچہ مرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انہوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔ مختصر یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی تعلیم بحیثیت آدم ثانی اور داعیِ اول کے ایک مسلمہ حقیقت ہے اسی طرح جو عذاب اس دعوت کو قبول نہ کرنے کے نتیجے میں آیا وہ بھی تمام قوموں کے نزدیک ایک مانی ہوئی بات ہے اس لئے سب سے پہلے اسی عظیم پیغمبران کی دعوت اور اس کے قبول نہ کرنے کے نتیجے میں آنے والے عذاب کا تذکرہ مشرکین مکہ کو سنایا جارہا ہے تاکہ انہیں اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوجائے کہ وہ اپنے رویے کے ساتھ کہاں کھڑے ہیں۔ نوح علیہ السلام کی حیثیت وہی تھی جو آج رسول اللہ ﷺ کی ہے اور حضور وہی دعوت پیش کررہے ہیں جو نوح علیہ السلام نے پیش کی اور مشرکین مکہ کا ٹھیک ٹھیک وہی رویہ ہے جو نوح علیہ السلام کی قوم کا تھا اگر نوح علیہ السلام کی قوم اپنے اس رویے کے باعث عذاب کا شکار ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ مشرکینِ مکہ، مشرکینِ عرب اور دوسرے مذاہب کے لوگ اس عذاب سے بچ جائیں اسی طرف توجہ دلانے کیلئے یہ واقعہ ضمنی تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ البتہ! قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ کسی بھی واقعہ کو تاریخی انداز میں نہیں بلکہ دعوتی انداز میں پیش کرتا ہے تاریخ صرف داستان سرائی کا نام ہے وہ قصہ گوئی صرف قصہ گوئی کیلئے کرتی ہے لیکن قرآن کریم تاریخ سے استشہاد کرتے ہوئے اپنی دعوت پیش کرتا ہے۔ دعوت کیلئے جتنی شہادت کی ضرورت ہوتی ہے واقعات میں سے صرف اتنا حصہ ذکر کیا جاتا ہے اور باقی چھوڑ دیا جاتا ہے پھر کسی اور دعوتی پہلو کیلئے اسی واقعے کی دوسری تفصیلات کی اگر ضرورت پڑتی ہے تو ان کو بیان کردیا جاتا ہے مثلاً اگر یہ بتانا ہو کہ نوح علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں کیا مماثلت ہے تو ان کی دعوت اور اسلوب دعوت کو پیش کیا جائے گا اور اگر یہ بتانا ہو کہ انہوں نے اس پر کس طرح صبر دکھایا اور کس طرح مخالفین کی اذیتوں کا سامنا کیا تو اس کیلئے نوح علیہ السلام کی لمبی عمر اور آپ کی نو سو سالہ دعوت کا ذکر کیا جائے گا تاکہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو صبر کی تلقین بھی ہو اور حوصلہ بھی ملے کہ یہ تو وہ عظیم کام ہے جس کیلئے نو سو سال صرف کئے جاسکتے ہیں ہمیں تو ابھی صرف چند سال ہوئے ہیں کہ ہم اس وادیٔ پرخار میں داخل ہوئے ہیں چنانچہ یہاں سب سے پہلے نوح علیہ السلام کی دعوت کو پیش کیا جارہا ہے تاکہ یہ پتہ چلے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جب دنیا میں بگاڑ پیدا ہوا اور اللہ کے دین سے برگشتگی کے جذبات پیدا ہوئے تو نوح علیہ السلام نے لوگوں کی اصلاح کیلئے کیا دعوت پیش کی تھی اور مزید یہ بات بھی کہ اگر وہ دعوت وہی ہے جو آج حضور پیش کررہے ہیں تو پھر آپ سے آپ یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ہزاروں سال کے فاصلے کے باوجود دعوتی حقیقت نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس میں کس حد تک یکسانی پائی جاتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ جس ذات خداوندی نے نوح علیہ السلام کو انسانوں کی اصلاح کیلئے مبعوث فرمایا تھا اسی ذات والاصفات نے رسول اللہ ﷺ کو بھی بھیجا ہے۔

انبیاء کی دعوت کی وحدت:

آپ کی دعوت باقی انبیاء ورسل کی طرح ایک ہی دعوت ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اللہ کے سوا تمہارا کوئی الہٰ نہیں اس کے بعد بھی کئی رسولوں کی دعوت کا ذکر ہے اس میں بھی یہی بات بار بار دھرائی گئی اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام انسانی اصلاح کیلئے جو نسخہ اپنے ساتھ لے کر آئے وہ صرف یہ تھا کہ لوگو! بندگی صرف اللہ کی اور الوہیت صرف اللہ کی۔ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں فساد جب بھی پھیلا ہے اور جب بھی انسانی زندگی میں الجھنیں اور اڑچنیں پیدا ہوتی ہیں اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو الہٰ بنالیتے ہیں اور پھر اللہ کی بندگی کے ساتھ ساتھ یا اس کی بندگی کے توڑ پر غیر اللہ کی بندگی شروع کردی جاتی ہے اس کی تسہیل کیلئے میں چند مثالیں عرض کرتا ہوں جس سے آپ

Marfat.com

آسانی سے سمجھ جائیں گے کہ تمام انبیاء کرام نے اس مختصر سی بات کو انسانی اصلاح کی بنیاد کیوں بنایا؟ بات یہ ہے کہ ہم اگر کوئی سا بھی ادارہ چلانا چاہتے ہیں تو ہم اس کیلئے دو باتوں کا فیصلہ ضرور کرتے ہیں ایک یہ بات کہ اس ادارے کا سربراہ کون ہوگا؟ تا کہ اس کے انتظامی نظم ونسق میں رہنمائی کیلئے اسی کی طرف رجوع کیا جائے اور اسی کی ہدایات کی ہر ممکن اطاعت کی جائے کیونکہ اگر کسی ادارے میں سرے سے کوئی سربراہ نہ ہوتو وہ ادارہ اولاً تو تشکیل پذیر نہیں ہوسکتا اور اگر ہو جائے تو نہ چل سکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے۔ اس ادارے میں کام کرنے والے اگر اپنی اپنی بانسری بجاتے رہیں نہ تو کسی سے کوئی پوچھ سکے نہ کوئی کسی کے سامنے جواب دہ ہوتو اندازہ فرمائیے! یہ ادارہ کتنے دنوں تک چل سکتا ہے۔ اسی طرح دوسری بات جس کا فیصلہ کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اس ادارے کی غرض وغایت کیا ہے آخر اسے بنایا کیوں جا رہا ہے؟ جب یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ یہ تعلیمی ادارہ ہے تو پھر اس کی ساری کاوشیں تعلیم کی بہتری کیلئے ہوتی ہیں اور اگر یہ طے ہوجائے کہ یہ دفاعی ادارہ ہے تو پھر اس کی ساری تگ ودو ملک کے دفاع کیلئے وسائل بروئے کار لانے اور مساعی انجام دینے میں صرف ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس باقی تمام اداروں کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ پیغمبروں کی دعوت میں بھی انہی دو باتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے ایک تو یہ کہ اس بات کا فیصلہ کرو کہ تم اس کائنات کا ایک جزو ہو۔ اس کے بے شمار کروں میں سے ایک چھوٹے سے کرے کے تم باسی ہو۔ باقی کائنات کی طرح تمہیں بھی کسی نے پیدا فرمایا ہے۔ باقی مخلوق کی طرح تمہیں بھی کوئی رزق دے رہا ہے۔ تمہاری زندگی کے تمام وسائل، تمام ضرورتیں، تمام صلاحیتیں تمام امکانات کا عطا کرنے والا کوئی ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ اگر باقی کائنات نے اس کو پہچان کر اپنا سربراہ مان کر اور اپنا سب کچھ اسے سمجھ کر اس کے سامنے گردن ڈال دی ہے اور نہایت خاموشی سے اسی کی اطاعت میں سرگرم عمل ہے تو تم اگر اپنی زندگی میں باقی کائنات کی طرح اطمینان اور عافیت چاہتے ہو تو تم بھی اپنے مالک اور اپنے آقا کو پہچانو اور اسی کے سامنے اطاعت کیلئے گردن جھکا دو جس کے سامنے باقی کائنات جھکا چکی اور اسی کی اطاعت کا فیصلہ کرو جو تمہیں سب کچھ عطا کرنے والا ہے کیونکہ عقل کی بات ہے کہ جو جس چیز کو بناتا ہے اس سے کام اور خدمت لینا اسی کا حق ہے تمہیں اور باقی کائنات کو اگر اللہ نے بنایا ہے اور یقیناً اسی نے بنایا ہے تو پھر تمہاری یہ بات کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ تم اس کی مخلوق ہو کر اطاعت اور بندگی کسی اور کی کرو جس نے پیدا کیا ہے حکم دینے کا حق بھی اسی کو ہے اور جو مخلوق ہے اسے اپنے خالق ہی کا حکم ماننا چاہئے یہ فطرت کا وہ فتویٰ اور عقل کا وہ فیصلہ ہے جس سے انکار کرنا عقل سے بغاوت کر دینے کے مترادف ہے اور مزید یہ بات بھی کہ جب باقی پوری کائنات سورج، چاند، ستارے اور تمام ثوابت وسیارا اسی کی اطاعت میں سرگرم عمل ہیں اور اسی وجہ سے ہر ابتری اور ہر الجھن سے بچے ہوئے ہیں اور مسلسل ان کی گردن اللہ ہی کی اطاعت میں جھکی ہوئی ہے تو تم جو اسی کائنات اور مخلوق کا ایک حصہ ہو تو عجیب بات ہے کہ وہ تو اللہ کی اطاعت کریں اور تمہاری اطاعت کی جہت کسی اور طرف ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کائنات کا سفر اگر ایک سمت میں ہے اور تم دوسری سمت کے مسافر ہو تو یقیناً تصادم ہوگا اور اسی کے نتیجے میں تمہاری زندگیوں میں ایک ابتری پیدا ہوگی اس لئے ان دو باتوں کا فیصلہ کرنا تمہاری زندگی کی بقا، عافیت اور اطمینان کیلئے ازبس ضروری ہے کہ تمہاری زندگی اور اس انسانی ادارے کی سربراہ صرف اللہ کی ذات ہے اور تمہاری زندگی کا مقصد صرف اس ایک اللہ کی بندگی اور اسی کی رضا کا حصول ہے یہ وہ دعوت ہے جو نوح علیہ السلام نے باقی انبیاء کی طرح اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور یہی دعوت رسول اللہ ﷺ مشرکین کے سامنے پیش فرما رہے ہیں۔

دوسری بات حضرت نوح علیہ السلام نے یہ فرمائی کہ دیکھو اگر تم میری دعوت قبول نہیں کرتے ہو اور اس بالکل سامنے کی بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہو تو پھر یاد رکھو میں تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں اس عذاب سے دو طرح کے عذاب مراد ہوسکتے ہیں اور ان دونوں طرح کے عذابوں سے ہر پیغمبر اور ہر رسول دنیا کو ڈرانے کیلئے آتا ہے۔ ایک تو آخرت کا عذاب ہے جو دنیا کی بساط لپیٹ دینے اور قیامت کے

Marfat.com

وقوع پذیر ہو جانے کے بعد اللہ کے نافرمانوں کو پہنچے گا اور دوسرا وہ عذاب جو دنیا میں بھی کسی وقت آ سکتا ہے۔ اللہ کا رسول جب دنیا میں آتا ہے تو وہ اپنی ذات اور اپنی دعوت میں حجت کاملہ بن کر آتا ہے۔ اپنی قوم کے سامنے حجت تمام کرنے میں وہ کوئی کمی نہیں چھوڑتا۔ دعوت کے ابلاغ، تفہیم، تسہیل، تنفید، معجزات کے ذریعے ان کا اثبات ہر حوالے سے وہ اپنی بات کو دلوں پر کھول دیتا ہے۔ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اس کی دعوت کو قبول نہیں کرتے وہ بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ اس دعوت کے پہنچنے اور تفہیم میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ ان کا دل پکارتا ہے کہ بات وہی ہے جو یہ رسول کہہ رہا ہے لیکن حب دنیا، مفادات کی ہوس اور گروہ بندی کا حد سے بڑھا ہوا شوق انہیں پیغمبر کی دعوت قبول کرنے سے مانع ہو جاتا ہے اس طرح جب حجت تمام ہو جاتی ہے تب اللہ تعالیٰ کا رسول انہیں آنے والے عذاب سے ڈراتا ہے اور انہیں بار بار تنبیہ کرتا ہے کہ اللہ کا پیغام میں نے تمہیں پہنچا دیا ہے اور جہاں تک اس کا حق ادا کرنے کا تعلق تھا اس میں میں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی اس لئے اب مجھے اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ تم پر کہیں اللہ کے عذاب کا کوڑا نہ برس جائے۔ چنانچہ اللہ کا قانون یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب معاملہ یہاں تک پہنچتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اس کے متبعین کو وہاں سے نکال لیتا ہے اور انکار کرنے والوں کو عذاب کی نذر کر دیا جاتا ہے چنانچہ یہاں بھی نوح علیہ السلام انہی دونوں طرح کے عذاب سے اپنی قوم کو ڈرا رہے ہیں۔

ایک اشتباہ اور اس کا جواب:

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اللہ کے رسولوں کی دعوت کو قبول نہ کرنے کے نتیجے میں اگر ہمیشہ عذاب آتے رہے تو پھر آج کیوں نہیں آتے۔ دنیا کی بیشتر آبادی اللہ کے دین سے باغی ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ کی دعوت ان کیلئے ایک قصہ پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ مسلمانوں کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں ہر طلوع ہونے والا دن مسلمانوں کیلئے نئی افتاد لے کر آتا ہے ایسی صورت میں تو کافروں پر اللہ کا عذاب ضرور آنا چاہیے پھر آخر کیوں نہیں آتا؟ اس میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔

پہلی یہ بات کہ اللہ کا عذاب کبھی کسی قوم پر نہیں آتا جب تک اس پر حجت تمام نہیں ہوتی۔ آج مشکل یہ ہے امت مسلمہ جسے پیغمبرانہ دعوت کیلئے چنا گیا ہے اور جس نے پوری دنیا کے سامنے اللہ کی طرف سے حجت تمام کرنی ہے اس کا اپنا گھر اللہ کے دین کی بالادستی سے خالی ہے۔ عالم اسلام میں کوئی ملک ایسا نہیں جہاں اللہ کا دین پوری طرح نافذ ہو اور وہاں کے رہنے والوں اور ان کے حکمرانوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ پوری دنیا کے سامنے ہم نے اللہ کے دین کو اسی طرح پیش کرنا ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے پیش کیا تھا کہ خود کافر دنیا یہ سمجھے کہ اللہ کی طرف سے ان پر حجت تمام کر دی گئی ہے۔ ان کے فکری، تہذیبی، تمدنی، معاشی اور حکومتی ادارے اسلامی بالادستی کے سامنے دل و دماغ کو جھکتا ہوا محسوس کرنے لگیں۔ چلئے اگر یہ نہیں تو مسلمانوں کے کسی ملک میں مفکرین، علماء اور اہل دعوت کی ایک ایسی مضبوط جماعت اٹھے جو اپنے قول و عمل سے ہر دیکھنے اور سننے والے کو محسوس ہو کہ یہ اس دور میں صحابہ کی تصویر ہیں۔ نہ ان کے عمل میں کمی ہے اور نہ ان کے فکر میں کمزوری یہ وقت کے بڑے سے بڑے مسئلے کا سامنا کر سکتے ہیں اور بڑے سے بڑے خطرے اور بڑے سے بڑے لالچ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کی منزل صرف اللہ کی رضا ہے وہ نہایت خیر خواہی سے نوع انسانی کی بھلائی چاہتے ہیں۔ یہ لوگ غیر مسلموں کے سامنے بالکل پیغمبرانہ استغناء اور خیر خواہی کے ساتھ اللہ کا دین پیش کریں اور ان کے ذرائع ابلاغ کو علمی اور دعوتی طور پر بے بس کر کے رکھ دیں تو اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب اگر غیر مسلم دنیا اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی یا وہ اس کا راستہ روکنے اور اس کے کچلنے کیلئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے تو یقیناً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایسی صورت میں یہ لوگ بے شک مار دیئے جائیں لیکن غیر مسلم دنیا بھی اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکے گی۔ ان میں یا تو قبولیت کے راستے کھلیں گے ان میں خود ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اپنی اپنی قوموں میں تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیں گے اور یا اللہ تعالیٰ ان کو مٹا

Marfat.com

کر ایک ایسی قوم کو دین کی دعوت کیلئے اٹھائے گا جو ہر لحاظ سے اس کیلئے مناسب ہوگی۔ تاریخ نے بار بار اس حقیقت کو دھرایا ہے کہ مسلمانوں نے جب کبھی اپنی دعوتی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر سزا کا کوڑا برسایا ہے اور غیر مسلموں میں اپنے دین کے علمبردار اٹھا کھڑے کئے ہیں۔ فتنہ تاتار تاریخ کا ایک ایسا حادثہ ہے جس کو مسلمانوں کی تاریخ کبھی نہیں بھلاسکتی لیکن اس کا انجام کیا ہوا کہ خود تاتاریوں کو اللہ نے اسلام کی علمبرداری عطا کر دی۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

دوسری بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ اتمام حجت نہ ہونے کے باعث کافر قوموں پر اس طرح کے عذاب نہیں آتے جو ان کی جڑ کاٹ کے رکھ دیں لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ان پر عذاب بالکل نہیں آتے ان کو تنبیہ کرنے اور وارننگ دینے کیلئے چھوٹے موٹے عذاب آتے رہتے ہیں لیکن فرق صرف یہ ہے کہ پہلے جس طرح انبیاء کرام اور کتب آسمانی کی طرف سے ان عذابوں کے اخلاقی معنی کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی اور صاف صاف بتایا جاتا تھا کہ یہ اللہ کا عذاب ہے جو تمہاری بداعمالیوں کے سبب تمہیں متنبہ کرنے کیلئے آیا ہے اس سے سبق سیکھو ورنہ اندیشہ ہے کہ کسی بڑے عذاب کے ذریعے تمہاری جڑ کاٹ دی جائے اب مصیبت یہ ہوگئی ہے کہ ظاہر بیں سائنسدانوں اور حقیقت سے ناواقف مؤرخین وفلاسفہ کا ایک بہت بڑا گروہ نوع انسانی پر مسلط ہوگیا ہے جو اس قسم کے تمام واقعات کی توجیہ طبیعاتی قوانین یا تاریخی اسباب سے کر کے لوگوں کو فریب دیتا رہتا ہے اور انہیں یہ کبھی سمجھنے کا موقع نہیں دیتا کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو غلط کار قوموں کو پہلے مختلف طریقوں سے ان کی غلط کاری پر متنبہ کرتا ہے اور جب وہ اس کی بھیجی ہوئی تنبیہات سے آنکھیں بند کر کے اپنی غلط روی پر اصرار کئے چلی جاتی ہیں تو آخر کار انہیں تباہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

اگلی آیات میں قرآن کریم نے نوح علیہ السلام کی قوم کا رویہ اور نوح علیہ السلام اور قوم کے درمیان جو مکالمہ ہوا اس کو نہایت اختصار سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ O قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ O اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ O اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ O

''اس کی قوم کے سرداروں نے کہا! ہم تو تجھے صریح گمراہی میں دیکھ رہے ہیں۔ نوح نے کہا: اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں۔ بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں، تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے، جو تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی، تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟''۔ 60 تا 63

حضرت نوح اور آپ کی قوم کے درمیان مکالمہ اور معارضہ، مشرکینِ مکہ کیلئے آئینہ:

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جس طرح حضرت نوح علیہ السلام سے معارضہ کیا اور زبان کے تیر ونشتر سے جس طرح انہیں گھائل کر

Marfat.com

کی کوشش کی اور اس کے جواب میں جس صبر استقامت اور بالغ نظری کا حضرت نوح علیہ السلام نے ثبوت دیا یہ آنحضرت ﷺ اور مشرکین کے درمیان چلنے والی چپقلش کا ایک آئینہ ہے جو مشرکین مکہ کے سامنے رکھا جا رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے سب سے پہلی وہی بات کہی جو ہمیشہ گمراہ قومیں اپنے پیغمبروں کی دعوت میں کہتی رہی ہیں۔ انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ اے نوح ہم تو تمہیں صریح گمراہی میں دیکھ رہے ہیں یعنی تو ایک الجھا ہوا آدمی ہے خود گمراہ ہے گمراہی کی باتیں کر رہا ہے ہم تجھے اللہ کا رسول کیسے مان لیں؟ اس میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ کا ہر نبی اور رسول ذاتی طور اطوار میں نہایت شائستہ اور معاملات میں نہایت دل آویز ہوتا ہے اس کو صریح گمراہی میں قرار دینا یہ ایک عجیب سی بات ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قومیں اپنے پیغمبروں کو اسی طرح کے طعنوں سے ہمیشہ زخمی کرتی رہی ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ چند باتیں تھیں جو انہیں سمجھ نہیں آتی تھیں یا وہ انہیں سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ پہلی یہ بات کہ ان کے نزدیک سچائی اور حقیقت کا سب سے بڑا معیار ان کے آباؤ اجداد تھے جو بات انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی وہ چاہے اپنے اندر عقل رکھتی ہو نہ علم وہ ان کے نزدیک سو فیصد صحیح تھی وہ کبھی یہ بات سوچنے کو بھی تیار نہیں تھے کہ آباؤ اجداد سے بھی غلطی ہو سکتی ہے اس لئے جب حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم اور ان کے آباؤ اجداد کے مشرکانہ عقائد پر تنقید فرماتے تھے تو وہ یہ کہتے تھے کہ تم صرف ہماری مخالفت ہی نہیں کر رہے ہو بلکہ تم تو ہمارے اور اپنے آباؤ اجداد کو بھی گمراہ قرار دے رہے ہو وہ تو گمراہ نہیں ہو سکتے البتہ تم گمراہ ہو جو انہیں گمراہ قرار دیتے ہو اور دوسری یہ بات جو وہ سمجھنا نہیں چاہتے تھے وہ یہ کہ جب حضرت نوح علیہ السلام انہیں توحید کی دعوت دیتے اور یہ بتاتے کہ پوری کائنات کا نظام چلانے والا صرف ایک خداوند ذوالجلال ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں تو وہ حیران ہو کر یہ کہتے تھے کہ اتنی بڑی کائنات کا نظام ایک خدا کیسے چلا سکتا ہے؟ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی حیثیت ایک بادشاہ کی مانند تھی جس طرح بادشاہ اپنی مملکت کا نظام تنہا نہیں چلاتا بلکہ اس نے اپنے اختیارات میں بہت سارے اپنے عمال کو شریک کیا ہوا ہوتا ہے اور انہی کی مدد سے وہ مملکت کا نظام چلاتا ہے اس لئے لوگ اپنی ضرورتیں بادشاہ کے پاس نہیں بلکہ اس کے عمال کے پاس لے کر جاتے ہیں۔ یہی حال اللہ تعالیٰ کا بھی ہے وہ یقیناً کائنات کا خالق و مالک ہے لیکن کائنات کا نظام چلانے اور لوگوں کی ضروریات بہم پہنچانے میں وہ تنہا نہیں بلکہ وہ سارے شرکاء جو مشرکین مکہ نے بنا رکھے تھے وہ اس کے ساتھ شریک ہیں اس لئے انسانوں کو اپنی ضرورتوں کیلئے انہی شرکاء سے رجوع کرنا چاہئے۔ اب اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں تو یہ سراسر عقل کے خلاف بات ہے ایسا ہونا کسی طرح بھی ممکن نہیں اور تیسری جو بات ان کو سمجھ نہیں آتی تھی وہ یہ کہ جب پیغمبر ان کو یہ کہتا کہ اگر تم نے میری دعوت کو قبول نہ کیا تو دنیا میں بھی تم پر عذاب آ سکتا ہے اور قیامت کے دن بھی تم اللہ کے عذاب میں گرفتار کئے جاؤ گے تو وہ حیران ہو کر یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہے اور تم سے راضی ہے تو پھر ہونا یہ چاہئے خوشحالی اور مال و دولت تمہارے گھر میں ہو لیکن ہم تمہیں اور تمہارے متبعین کو جس بدحالی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہے اور ہم سے راضی ہے تو اللہ تعالیٰ کبھی ان کو سزا تو نہیں دے سکتا جن سے وہ راضی ہے اس لحاظ سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تم صریح گمراہی میں ہو۔ تم بلاوجہ اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھتے ہو۔ آباؤ اجداد کے رویے سے تم انحراف کر چکے ہو اور محض نادانی سے تم ایک اللہ کے قائل ہو چکے ہو۔ حالانکہ انسانی ضرورتیں پوری کرنا ایک اللہ کے بس کی بات نہیں اس لئے ہم یہ سمجھتے ہو کہ تم صاف اور صریح گمراہی میں مبتلا ہو چکے ہو۔ ان کی ان تکلیف دہ باتوں کے جواب میں اندازہ فرمائیے حضرت نوح علیہ السلام کس قدر تحمل اور بردباری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بجائے طیش میں آنے کے نہایت اطمینان سے فرماتے ہیں کہ اے برادرانِ قوم میرے ساتھ تو کوئی گمراہی کی بات نہیں۔ تم نے میرے اندر کون سی گمراہی کی بات دیکھی ہے البتہ جو باتیں تم کرتے ہو وہ ضرور گمراہی کی ہیں۔ میں گمراہی کی بات کیسے کر سکتا ہوں کیونکہ میں تو رب العالمین کا فرستادہ ہوں جس طرح وہ غلطیوں سے پاک ہے اس طرح اس کا فرستادہ بھی اس کا

Marfat.com

پیغام پہنچاتا ہوا اور اس کے دین کی دعوت دیتا ہوا کبھی غلطی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم بے شک میرا سینہ چھلنی کر ڈالو میں اس سے رکنے والا نہیں اس لئے کہ میں اپنی بات نہیں کہتا میں تو رب العالمین کا پیغام تم تک پہنچا رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ جو سلوک کر رہے ہو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے کہ میں پلٹ کر تمہاری شکل نہ دیکھوں اور تمہیں حالات کے حوالے کر کے یہاں سے ہجرت کر جاؤں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا اس لئے کہ مجھے بہر صورت اللہ کے پیغامات تم تک پہنچانے ہیں تم اگر مجھے گالیاں بھی دو گے اذیتیں بھی پہنچاؤ گے میں اپنی خیر خواہی میں کبھی کمی نہیں کروں گا کیونکہ مجھے رب العالمین کی جانب سے ایک ایسا علم دیا گیا ہوں جس سے تم واقف نہیں اور میں ان باتوں کو جانتا ہوں جن کی تمہیں ہوا تک نہیں لگی۔ میں چونکہ اللہ کا نمائندہ ہوں اس کے دیئے ہوئے علم کا حامل ہوں مجھے اپنی ذمہ داری کا شدید احساس ہے میں تمہاری خیر خواہی میں ہر اذیت برداشت کرنے کو تیار ہوں تو تم ہی سوچو اس میں گمراہی کی کون سی بات ہے۔ تمہیں اگر کوئی میری بات سمجھ نہیں آ رہی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بات گمراہی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میری حیثیت کو سمجھنے میں کوتاہی کر رہے ہو۔ میں تمہاری طرح آباؤ اجداد کا پیروکار نہیں بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے علم کا پیروکار ہوں مجھ پر تمہاری طرح نفسانیت کی حکومت نہیں بلکہ میں معصوم پیدا ہوا ہوں۔ تمہاری سوچ کی طرح میری سوچ ادھوری اور ناپختہ نہیں کیونکہ میرے علم کا رشتہ اللہ کے علم سے استوار ہے۔ تم میری اصل حیثیت کو پہچانو اور میری پیروی کر کے اپنی عاقبت تباہ ہونے سے بچا لو۔ تمہیں اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے جو نصیحت آئی ہے وہ تمہی میں سے ایک آدمی کے ذریعے کیوں آئی ہے اس میں غالباً تمہیں دو اشتباہ لاحق ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ نصیحت اور نبوت ایک آدمی پر کیوں اتری اسے تو کسی فرشتے پر اترنا چاہئے تھا کیونکہ ہر دور میں گمراہ قوموں میں یہ گمراہی موجود رہی ہے کہ وہ نبوت اور بشریت میں تضاد سمجھتے رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا اور بشر نبی نہیں ہو سکتا اور یہی حال قوم نوح کا بھی تھا اس لئے حضرت نوح علیہ السلام انہیں متنبہ کر رہے ہیں کہ یہ نہایت حماقت کی بات ہے۔ انسانوں کی اگر اصلاح مقصود ہے تو کوئی انسان ہی انسانوں کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اگر کسی فرشتے یا کسی جن کو نبی بنا کر بھیج دیا جاتا تو نہ وہ نظر آتا، نہ اس کا مزاج انسانوں سے ملتا، نہ اس کی ضروریات انسانوں جیسی ہوتیں، نہ وہ انسانوں کی طرح سوچتا، اس کے احساسات اور انفعالات بالکل انسانوں سے الگ ہوتے تو انسان آخر اس سے کیسے اصلاح پذیر ہو سکتے تھے اور مزید یہ بات بھی کہ نبی کو یقیناً کسی اعلیٰ ترین مخلوق میں سے ہونا چاہئے تھا اور یہ بات مسلمہ ہے کہ سب سے اعلیٰ ترین مخلوق وہ حضرت انسان ہے جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا البتہ غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ ایک بگڑا ہوا آدمی انسانیت کی حقیقت کو نہیں پہچانتا وہ اپنے آپ کو جب انسان دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ انسان ایسا ہی ہوتا ہے حالانکہ

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی اپنی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ قوم نوح نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَكَذَّبُوهُ فَأَنجَيْنَٰهُ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥ فِى ٱلْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا ٱلَّذِينَ كَذَّبُوا۟ بِـَٔايَٰتِنَآ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا۟ قَوْمًا عَمِينَ ۝

''پس ان لوگوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ کشتی میں اس کے ساتھ تھے ان کو نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا، جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ بے شک یہ لوگ اندھے تھے''۔64

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم وضاحت کرتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی طویل ترین تبلیغی کاوشوں اور انتہائی تھکا دینے والی مساعی کے باوجود قوم نوح نے آپ کی دعوت کو رد کر دیا۔ انہوں نے ہر چند کوشش کی کہ وہ آپ پر ایمان لا کر اللہ کے عذاب سے بچ جائیں لیکن وہ بجائے بات

Marfat.com

دینے کے آپ کے درپے آزار ہوگئے اور آپ کی جان لینے کے منصوبے باندھنے لگے لیکن حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی تبلیغی کاوشوں کو پھر بھی ترک نہیں کیا۔ رات دن اس کام میں جتے رہے اس کا اندازہ ہمیں سورۃ نوح کی ان آیات سے ہوتا ہے جس میں حضرت نوح علیہ السلام اللہ سے دعا مانگتے ہوئے اپنی تبلیغی رپورٹ بھی پیش کر رہے ہیں۔ پیغمبر سچائی کا پیکر ہوتا ہے اور پھر جب وہ اپنی تبلیغی مساعی کو اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس میں کسی کمی کا تو گمان ہو سکتا ہے مبالغے کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ اندازہ فرمائیے کہ خود حضرت نوح علیہ السلام اپنی تبلیغی کاوشوں کو کس طرح بیان فرما رہے ہیں۔ قرآنِ کریم کی زبان میں آپ نے فرمایا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا O فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا O وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا O ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا O ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا O فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا O

''بولا اے رب! میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن۔ پھر میرے بلانے سے اور زیادہ بھاگنے لگے اور میں نے جب کبھی ان کو بلایا' تا کہ تو ان کو بخشے' ڈالنے لگے انگلیاں اپنے کانوں میں اور لپیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑے اور ضد کی اور غرور کیا' بڑا غرور۔ پھر میں نے ان کو بلایا برملا' پھر میں نے ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے۔ تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے' بیشک وہ بخشنے والا ہے'' (نوح:۵-۱۰)

لیکن نوح علیہ السلام کے ہمدردی میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ بھی ان کی قوم کو راہ راست پر نہ لا سکے۔ وہ مسلسل اپنے عناد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہے جب آپ نے اپنی ساڑھے نو سو سال کی پیہم دعوت و تبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہ دیکھا تو سخت ملول و پریشان خاطر ہوئے تب پروردگار نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ O

''اور نوح پر وحی کی گئی کہ جو ایمان لے آئے وہ لے آئے۔ اب ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ پس ان کی حرکات پر غم نہ کر'' (ھود:۳۶)

جب حضرت نوح علیہ السلام کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے ابلاغ حق میں کوتاہی نہیں ہے بلکہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا قصور ہے اور ان کی اپنی سرکشی کا نتیجہ' تب ان کے اعمال اور کمینہ حرکات سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں یہ دعا فرمائی:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا O اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا یَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا O

''اے پروردگار! تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو یونہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان پیدا ہو گی'' (نوح:۲۷)

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور اپنے قانونِ جزاءِ اعمال کے مطابق سرکشوں کی سرکشی اور متمردوں کے تمرد کی سزا کا اعلان کر دیا اور حفظ ماتقدم کے لئے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں' تا کہ اسباب ظاہری کے اعتبار سے وہ اور مومنین قانتین اس عذاب سے محفوظ رہیں۔ جو خدا کے نافرمانوں پر نازل ہونے والا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جب حکم رب میں کشتی بنانی شروع کی تو

Marfat.com

کفار نے ہنسی اڑانا اور مذاق بنانا شروع کر دیا اور جب کبھی ان کا ادھر سے گزر ہوتا تو کہتے کہ خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تب تو اور تیرے پیرو اس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائیں گے' کیسا احمقانہ خیال ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام بھی ان کی انجام کار سے غفلت اور اللہ کی نافرمانی پر جرأت دیکھ کر ان ہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِىْ فِى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ○

''(اے نوح!) تو ہماری حفاظت میں ہماری وحی کے مطابق سفینہ تیار کیے جا اور اب مجھ سے ان کے متعلق کچھ نہ کہو' یہ بلاشبہ غرق ہونے والے ہیں'' (ھود: ۳۷)۔

آخر سفینۂ نوح (علیہ السلام) بن کر تیار ہو گیا۔ اب اللہ کے وعدۂ عذاب کا وقت قریب آیا اور حضرت نوح علیہ السلام نے اس پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر ان سے کیا گیا تھا' یعنی زمین کی تہہ میں سے پانی کا چشمہ ابلنا شروع ہو گیا۔ تب وحی الٰہی نے ان کو حکم سنایا کہ کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دو اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا ایک جوڑا بھی کشتی میں پناہ گیر ہو اور وہ مختصر جماعت (تقریباً اسی ۸۰ نفر) بھی جو تجھ پر ایمان لا چکی ہے کشتی میں سوار ہو جائے۔ جب وحی الٰہی کی تعمیل پوری ہو گئی تو اب آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برسنا شروع ہو اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ وہ پوری طرح ابل پڑیں۔

اللہ کے حکم سے جب یہ سب کچھ ہوتا رہا تو کشتی بھی اس کی حفاظت میں پانی پر ایک مدت تک محفوظ تیرتی رہی تا آنکہ تمام منکرین و معاندین غرق آب ہو گئے اور خدائے تعالیٰ کے قانون ''جزاءِ اعمال'' کے مطابق اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا یہ عذاب اللہ کی حکمت اور مصلحت کے مطابق جب اپنے اختتام کو پہنچا تو سفینۂ نوح ''جودی'' پہاڑ پر جا ٹھہرا۔ تورات میں ''جودی'' کو ''اراراط'' کے پہاڑوں میں سے بتایا گیا ہے۔ اراراط' درحقیقت جزیرہ کا نام ہے یعنی اس علاقے کا نام جو فرات اور دجلہ کے درمیان ''دیار بکر'' سے بغداد تک مسلسل چلا گیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے مطابق کفار کی جڑ کاٹ کے رکھ دی اور حضرت نوح علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کو محض اپنی رحمت سے نجات عطا فرمائی اور پھر انہی کی نسل سے سلسلہ نوع انسانی آگے بڑھا۔ آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ''بے شک یہ لوگ اندھے تھے''۔ یہاں اندھا ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ نورِ بصارت سے محروم تھے یعنی ان کی آنکھیں بینائی سے خالی تھیں اور وہ دیکھنے سے عاجز ہو گئے تھے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دل کے اندھے اور نور بصیرت سے محروم تھے اور یہ وہ اندھا پن ہے جو انسان کی گمراہی کا باعث بنتا ہے۔ آنکھوں کا اندھا ہونا اس کا ہدایت اور ضلالت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنکھوں والے ہدایت سے محروم رہتے ہیں اندھے ہدایت پا کر عبداللہ ابن ام مکتوم بن جاتے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ○

''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں' بلکہ سینوں میں دل اندھے ہوتے ہیں'' (الحج: ۴۶)

اقبال نے اسی کی روشنی میں نصیحت کرتے ہوئے کہا

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

Marfat.com

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ

هُوۡدًا ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ
اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰٮكَ
فِىۡ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ يٰقَوۡمِ لَيۡسَ
بِىۡ سَفَاهَةٌ وَّلٰـكِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمۡ
رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَاَنَا لَـكُمۡ نَاصِحٌ اَمِيۡنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ
ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ ؕ وَاذۡكُرُوۡۤا
اِذۡ جَعَلَـكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّزَادَكُمۡ فِى الۡخَـلۡقِ
بَصۜۡطَةً ۚ فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَۤاءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوۡۤا
اَجِئۡتَـنَا لِنَعۡبُدَ اللّٰهَ وَحۡدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ
فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدۡ وَقَعَ
عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ رِجۡسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوۡنَنِىۡ فِىۡۤ اَسۡمَآءٍ
سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ
فَانۡتَظِرُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِيۡنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ
مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعۡنَا دَابِرَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوۡا

Marfat.com

مُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۲﴾ ع

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے ان کو دعوت دیتے ہوئے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں' کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟۔ اس کی قوم کے بڑوں نے' جنہوں نے کفر کیا' جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم تم کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں خداوند جہاں کا رسول ہوں' تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمہارا دیانت دار ناصح ہوں۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمہارے رب کی یاددہانی آئی' تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے؟ اور یاد کرو کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تمہیں ان کا جانشین بنایا اور جسمانی اعتبار سے تمہیں وسعت وکشادگی عطا فرمائی۔ پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو' تاکہ تم فلاح پاؤ۔ وہ بولے! کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں' جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے؟ تم جس عذاب کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو اس کو لاؤ' اگر تم سچے ہو۔ حضرت ہود نے کہا کہ واقع ہو چکا ہے تم پر تمہارے رب کی جانب سے عذاب اور غضب۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو' جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں' جن کیلئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی؟ اچھا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ آخرکار ہم نے اپنی مہربانی سے ہود اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی' جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔

..................☆......☆......☆..................

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ط اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

''اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے ان کو دعوت دیتے ہوئے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں' کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟''۔65

قوم عاد کی تاریخ:

اس سے پہلے کہ ہم آیت کریمہ کے مندرجات کی وضاحت کریں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قومِ عاد کے بارے میں کچھ تفصیلات مہیا کر دیں۔ عا

Marfat.com

عرب کے قدیم قبیلہ یا امِ سامیہ کے صاحبِ قوت واقتدار افرادِ جماعت کا نام ہے' تاریخ قدیم کے بعض یورپی مصنفین عاد کو ایک فرضی کہانی (میتھالوجی) یقین کرتے ہیں مگر ان کا یہ یقین بالکل غلط اور سراسر وہم ہے' اس لئے کہ جدید تحقیقات کا یہ مسلم فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے کثرتِ افراد وقبائل کے اعتبار سے ایک باعظمت وسطوت جماعت کی حیثیت میں تھے جو عرب سے نکل کر شام' مصر اور بابل کی طرف بڑھے اور وہاں زبردست حکومتوں کی بنیادیں قائم کیں۔ اب فرق صرف اس قدر رہے کہ عرب ان باشندوں کو امِ بائدہ (ہلاک ہو جانے والی قومیں) یا عرب عاربہ (خالص عرب) اور ان کی مختلف جماعتوں کے افراد کو عاد' ثمود' طسم اور جدلیس کہتے ہیں اور مستشرقینِ یورپ (امِ سامیہ) نام رکھتے ہیں' پس اصطلاحات وتعبیرات کے فرق سے حقیقت وواقعہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو جاتی' اس لئے قرآن عزیز نے ان کو عادِ اولیٰ کہا ہے کہ یہ واضح ہو جائے تاکہ عرب کی قدیم قوم بنوسام اور عادِ اولیٰ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

اہلِ جغرافیہ کا قول ہے کہ لفظِ عرب دراصل عربہ تھا جس کے معنی صحرا اور بادیہ کے ہیں' خود عربی زبان میں اعراب اہلِ بادیہ کو کہتے ہیں اور اعرابہ کے معنی بدویت کے آتے ہیں اور بعض اہلِ تحقیق کی رائے یہ ہے کہ عرب اصل میں غرب (غین معجمہ کے ساتھ) تھا اور چونکہ اس کا جائے وقوع فرات کے غرب میں ہے اسلئے وہ آرامی قومیں (امِ سامیہ) جو کہ فراتِ غربی پر آباد تھیں' اول غرب اور پھر غین کے نقطہ کے سقوط کے بعد عرب کہلائیں۔

ان میں سے عرب کی وجہ تسمیہ جو بھی صحیح ہو یہ حقیقت ہے کہ یہ مقام قدیم امِ سامیہ یا بدوی جماعتوں یا عاد کا مسکن تھا۔ اس لئے عاد بغیر کسی اختلاف کے عرب نژاد تھے اور لفظ عاد عربی ہے نہ کہ عجمی جس کے معنی عبرانی میں ''بلند ومشہور'' کے ہیں' قرآن عزیز میں عاد کے ساتھ ارم کا لفظ لگا ہوا ہے اور ارم (سام) کے معنی بھی ''بلند ومشہور'' ہی کے ہیں' انہی عاد کو توراۃ کی غلط پیروی میں کہیں کہیں عمالقہ بھی کہا گیا ہے۔

عاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار سال قبل حضرت مسیح علیہ السلام مانا جاتا ہے اور قرآن عزیز میں عاد کو' مِنۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ '' کہہ کر قومِ نوح کے خلفاء میں سے شمار کیا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شام کی دوبارہ آبادی کے بعد امِ سامیہ کی ترقی عاد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

عاد کا مرکزی مقام ارضِ احقاف ہے یہ حضرموت کے شمال میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے شرق میں عمان ہے اور شمال میں ربع الخالی' مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور بعض مورخین کہتے ہیں کہ ان کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصہ حضرموت اور یمن میں خلیج فارس کے سواحل سے حدودِ عراق تک وسیع تھی اور یمن ان کا دارالحکومت تھا۔

عاد بت پرست تھے اور اپنے پیشرو قومِ نوح علیہ السلام کی طرح صنم پرستی اور صنم تراشی میں ماہر تھے' تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ان کے معبودانِ باطل بھی قوم نوح علیہ السلام کی طرح وَدٌ' سُواع' یغوث' یعوق اور نسر ہی تھے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اثر منقول ہے اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام صمود اور ایک کا نام ہتار تھا۔

عاد اپنی مملکت کی سطوت وجبروت اور جسمانی قوت وصولت کے غرور میں ایسے چمکے کہ انہوں نے خدائے واحد کو بالکل بھلا دیا اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود مان کر ہر قسم کے شیطانی اعمال بے خوف وخطر کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا حضرت ہود علیہ السلام عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرد تھے' سرخ وسپید رنگ اور وجیہ تھے' ان کی داڑھی بڑی تھی

ایک نکتہ کی وضاحت:

اس سے پیشتر کہ ہم حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کا ذکر کریں آیت کریمہ کے اس جملے میں ایک نقطے کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ یہاں حضرت ہود کو عاد کا بھائی کہا گیا ہے یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ ہود کوئی باہر کے آدمی نہیں تھے بلکہ وہ قوم عاد ہی کی برادری کے ایک فرد تھے۔ انہی میں سے ایک محترم قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ اصل میں ایک اصول کی طرف اشارہ ہے۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں مختلف جگہوں پر کیا گیا ہے وہ یہ کہ اللہ کا رسول دنیا میں حجت کاملہ بن کے آتا ہے اس کی ذات کی صورت میں اللہ تعالیٰ اس قوم پر حجت تمام کر دیتا ہے وہ قوم قیامت کے دن یہ نہیں کہہ سکتی کہ کسی نے ہمیں سمجھانے بجھانے کا حق ادا نہیں کیا۔ اللہ کا رسول اپنی ذات میں ایسی دل آویزی' ایسی وجاہت' ایسی ہدایت اور ایسی روشنی لے کر آتا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں لاتے وہ بھی دل سے اس بات کے قائل ہو جاتے ہیں کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یقیناً صحیح ہے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ ان پر حجت تمام کر دیتا ہے۔ قیامت کے دن جب یہ لوگ اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم ایمان کیوں نہیں لائے تو وہ ہرگز یہ عذر نہیں کر سکیں گے کہ ہماری طرف آپ کا کوئی رسول نہیں آیا تھا یا اگر آیا تھا تو ہم اسکی بات سمجھ نہ سکے تھے اور پوری طرح حق ہم پر واضح نہیں ہو سکا تھا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا اصل فریضہ اللہ کی طرف سے حجت تمام کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ رسول کی دعوت کو قبول کرنے سے جب انکار کر دیا جاتا ہے اور پھر اس انکار پر اس حد تک اصرار بڑھتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس قوم کی قبولیت کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں اور وہ استعداد کی آخری رمق سے بھی محروم ہو جاتی ہے تو تب اللہ کا عذاب آتا ہے اور اس قوم کو مٹا دیا جاتا ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ جس رسول کی بعثت پر اس کی مخاطب قوم کی زندگی کا دارومدار ہے اگر وہ رسول اس قوم کیلئے ایک اجنبی ہوتا' قوم اگر ایشیائی ہے تو رسول یورپی ہوتا دونوں کی زبانیں مختلف' دونوں کے مزاجوں میں بُعد' دونوں کے طور اطوار میں مغائرت' دونوں کے عرف ایک دوسرے سے بیگانہ' غرضیکہ اپنائیت کی کوئی شکل بھی نہ ہوتی جو فہم و افہام میں مددگار ثابت ہو اور جس سے ایک دوسرے پر اعتماد پیدا ہونے میں آسانی ہو تو ایسی صورت میں حجت تمام ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے اللہ کا یہ قانون ٹھہرا کہ وہ انسانوں کی طرف انسان کو بھیجتا ہے' کسی غیر انسان کو نہیں اور انسان بھی ایسا جو اسی قوم سے تعلق رکھتا ہو جس قوم کی طرف اسے بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی زبان بھی وہی ہو۔ قوم اس سے اور اس کے خاندانی پس منظر سے پوری طرح آگاہ ہو۔ وہ خوب جانتی ہو کہ یہ شخص جو رسالت کا دعویٰ کر رہا ہے اس کی خاندانی وجاہتیں' احترام کے لائق ہیں۔ اس نے اپنی گزشتہ زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ یہ شخص معاملات میں نہایت کھرا اور کردار کا نہایت اجلا رہا وہ بے شک اس پر ایمان نہ لائیں لیکن اس کے کردار کے بارے میں کبھی بدگمان نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ ایمان لوگ تو پیغمبر سے فائدہ اٹھاتے ہی ہیں' ایمان نہ لانے والے بھی دل سے اعتراف پر مجبور ہوتے ہیں وہ پیغمبر کی ایک ایک بات کو دل میں اترتا ہوا محسوس کرتے ہیں اسی وجہ سے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ پیغمبر کی دعوت اور اس پر اترنے والی کتاب کو نہ خود سنا جائے نہ دوسروں کو سننے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اس کتاب اور اس پیغمبر کے تاثر کی گرفت سے آزاد رہ سکیں۔ اللہ کے اسی قانون کے مطابق حضرت ہود علیہ السلام کو قومِ عاد کی طرف بھیجا گیا جو انہی کی برادری سے تعلق رکھتے تھے' انہی کی زبان بولتے تھے اور انہی جیسے قومی خصائص کے حامل تھے۔

حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت:

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے وہی دعوت پیش کی جو حضرت نوح علیہ السلام اور باقی انبیاء و رسل پیش کرتے رہے آپ نے فرمایا کہ اے برادرانِ قوم اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں۔ یاد رکھو! یہی دعوت اور یہی کلمۂ جامعہ انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح کی کلید ہے اور اسی کو چھوڑ دینے کا نتیجہ دنیا میں عذاب کی صورت میں اور آخرت میں دائمی عذاب کی صورت میں نکل سکتا ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ انسان کی زندگی باقی کائنات کی زندگی کا ایک جزو ہے انسان جس کرے پر آباد ہے یہ باقی کائنات کے بے شمار کروں کی طرح ایک

Marfat.com

کرہ ہے جس کا خالق و مالک باقی کائنات کی طرح اللہ تعالیٰ ہے۔ ہم تمام کائنات میں نہایت سکون‘ اطمینان اور ہمواری دیکھتے ہیں کوئی کرہ کسی دوسرے کرے سے نہیں ٹکراتا‘ کسی مخلوق کے افراد میں باہمی لڑائیاں نہیں ہوتیں‘ پوری کائنات میں کہیں فساد کے آثار نظر نہیں آتے‘ روز اول سے مخلوق کے جس فرد کو جس کام اور ڈیوٹی پر لگا دیا گیا ہے وہ کبھی اس سے سرتابی کی جرأت نہیں کرتا‘ سورج اپنی تمازت سے دنیا کو رزق پہنچا رہا ہے‘ چاند اپنی حلاوت کے خزانے لٹا رہا ہے‘ سمندر آب رسانی کا فرض انجام دے رہے ہیں‘ ہر سایہ دار درخت سایہ بہم پہنچاتا اور ہر پھل دار درخت پھل کی دولت لٹاتا ہے۔ زمین روئیدگی کی قوت سے مالا مال ہے اور وہ اپنی خدمت سے کبھی صرف نظر نہیں کرتی۔ پہاڑ مختلف قسم کی امانتوں کے امین ہیں انہوں نے اپنا سینہ کھولنے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ غرضیکہ پوری کائنات اپنے خالق و مالک کی اطاعت میں پوری طرح مصروف عمل ہے اس اطاعت کا نتیجہ یہ ہے کہ کائنات میں کہیں خلل اور فساد کا نشان تک نظر نہیں آتا۔ کائنات کا ایک ایک فرد اپنے مالک کو پہچانتا بھی ہے اور اس کا اطاعت گزار بھی ہے۔ اس کے برعکس نوع انسانی کے افراد انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں بری طرح افراتفری‘ بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار ہیں۔ ہر ایک دوسروں کے حقوق چھین رہا ہے‘ فرائض سے پہلوتہی کر رہا ہے‘ نفسانیت کا پرستار اور اپنے مالک سے منحرف۔ نتیجتاً پوری زمین فساد سے بھر گئی ہے۔ پیغمبر اس لئے دنیا میں تشریف لاتے ہیں کہ وہ لوگوں کو یہ بتلائیں کہ دیکھو پوری کائنات اللہ کو اپنا خالق و مالک مان کر اور اس کے احکام کی تعمیل کے نتیجے میں نہایت عافیت سے زندگی گزار رہی ہے تم اگر چاہتے ہو کہ تمہاری اس سرزمین پر بھی خوشی اور راحت کے گیت گائے جائیں اور تمہاری زندگی نہایت آسودگی سے گزرے تو تمہیں بھی باقی کائنات کی طرح اپنے خالق و مالک کو پہچان کر اسی کی اطاعت میں لگ جانا چاہئے۔ تمہاری ساری پریشانیوں کا باعث صرف یہ ہے کہ تمام کائنات کا سفر اللہ کی اطاعت میں جاری ہے اور تم بالکل اس کے برعکس اس کی الٹی سمت میں اس کی معصیت کے سفر پر رواں دواں ہو۔ جس کے نتیجے میں قدم قدم پر تمہیں تصادم سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ ایک ہی اللہ کو آقا مانو اور یہ یقین جانو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی آقا‘ کوئی مالک اور کوئی حاکم حقیقی نہیں۔ اسی کی بندگی اور اطاعت میں زندگی گزارنے کا عہد کرلو اور پھر اس عہد کی تعمیل میں جت جاؤ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ باقی کائنات کی طرح تمہاری زندگی بھی آسودہ ہو جائے گی۔ اس دنیا میں بھی تمہیں فلاح و کامرانی سے نوازا جائے گا اور آخرت میں فرشتے تمہارا استقبال کریں گے اور اللہ کی بے پایاں اور دائمی نعمتیں تمہارا مقدر ہوں گی لیکن تم اگر اس سادہ سی بات کو نہیں سمجھتے ہو اور تم اپنے خالق و مالک کی اطاعت اور فرمانبرداری کی بجائے اس کی نافرمانی کا فیصلہ کرتے ہو اور بجائے اس کی اطاعت کرنے کے تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کی اطاعت میں زندگی گزارتے ہو تو پھر یاد رکھو اللہ تعالیٰ اپنی زمین پر رہنے والی اپنی مخلوق کو زیادہ دیر تک بغاوت کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ تمہیں سمجھانے اور وارننگ دینے کیلئے اپنے نبی اور رسول بھیجتا ہے لیکن جب اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد بھی تم اپنا رویہ نہیں بدلتے ہو تو بالآخر اس کا عذاب کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

”اَفَلَا تَتَّقُوْنَ کیا تم ڈرتے نہیں ہو“ یعنی تمہیں اس بات کا خوف نہیں کہ اگر تم نے اللہ کی بغاوت سے توبہ نہ کی اور اس کی اطاعت میں تم نے زندگی نہ گزاری تو تم اس بات سے نہیں ڈرتے ہو کہ وہ تم پر عذاب نازل کر دے اور تم پر ایسی گرفت فرمائے کہ تمہارے کس بل نکل جائیں اور قیامت کے دن تمہیں ہمیشہ کیلئے جہنم میں پھینک دے؟ اگر تمہارے اندر کچھ بھی احساس کی دولت باقی ہے اور اگر تمہارے دماغوں میں کچھ بھی عقل موجود ہے تو تمہیں اس انجام سے سو دفعہ ڈرنا چاہئے۔

اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے اس کے چند اجزاء کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ O قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ

Marfat.com

سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ O اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ O

''اس کی قوم کے بڑوں نے، جنہوں نے کفر کیا' جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم تم کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے۔ بلکہ میں خداوند جہاں کا رسول ہوں' تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمہارا دیانت دار ناصح ہوں''۔ 66-68

حضرت ہود علیہ السلام اور آپ کی قوم کے درمیان مکالمہ:

حضرت ہود علیہ السلام کی نہایت حکیمانہ اور ناصحانہ دعوت کے جواب میں قوم نے جو کچھ کہا وہ ان کی انتہائی گمراہی اور بگاڑ پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے سامنے دو باتیں پیش کیں۔ ایک تو یہ بات کہ اس کائنات کا اور تمہارا خالق و مالک ایک ہی ہے۔ باقی کائنات کی طرح تمہاری عافیت بھی اسی میں ہے کہ تم اسی کی بندگی کرو اور دوسری یہ بات کہ اگر تم اس کی بندگی نہیں کرو گے بلکہ اس کے مقابل میں دوسروں کی بندگی کرو گے تو اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ تم پر اللہ کا غضب بھڑکے اور تم اس کے عذاب کا شکار ہو جاؤ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کی قوم نے ان دونوں باتوں کے جواب میں جو کچھ کہا وہ نہایت تعجب خیز ہے۔ وہ بجائے اس کے کہ پیغمبر کی دعوت کا جواب علم اور سنجیدگی سے دیتے انہوں نے اپنے پاس اس کا جواب نہ پا کر نہایت گری ہوئی بات کہی کہ تم جس طرح کی باتیں کر رہے ہو اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ تم احمق آدمی ہو تمہاری باتوں میں کوئی سمجھداری کی بات نہیں ان کا حضرت ہود علیہ السلام کو احمق کہنا اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک تو یہ بات کہ حضرت ہود علیہ السلام نے نہایت علمی انداز میں جو دعوت ان کے سامنے رکھی اس کو وہ سمجھ نہیں پائے اور نہ انہوں نے اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ رویہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بنیادی طور پر یہ لوگ عقل و خرد سے عاری تھے اور دنیا کا حال یہ ہے کہ جو شخص خود عقل و خرد سے عاری اور حماقت میں مبتلا ہوتا ہے وہ ہمیشہ ہر عقل مند کو بے وقوف اور احمق سمجھتا ہے۔ اس کے سامنے جتنی بڑی عقل کی بات کی جائے اس کی عقل کی گرفت سے باہر ہونے کے باعث اسے وہ اتنی بڑی بے وقوفی معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے یہ بات خود مشاہدہ کی ہوگی کہ دنیا کا ہر بے وقوف آدمی دوسروں کو بے وقوف سمجھتا ہے۔ اس کے سامنے بڑے سے بڑے عقل مند آدمی کی بات کر کے دیکھ لیجئے وہ برجستہ جواب دے گا کہ وہ تو بے وقوف آدمی ہے اسے کیا پتہ۔ اس قوم کا حال بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ان کو یہ بات کسی طرح سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اتنی بڑی کائنات کا نظام تنہا پروردگار کیسے چلا رہا ہے یہ کہنا کہ اس کا کوئی شریک نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے یہ سراسر نا قابل فہم بات ہے۔ بڑے سے بڑا بادشاہ بھی اپنی مملکت کا نظام تنہا نہیں چلا سکتا۔ وہ اپنی مملکت کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور ہر حصے کا ایک حاکم مقرر کر کے اس کے نظم کا اختیار اسے دے دیتا ہے پھر اس کے رہنے والوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں کیلئے اپنے حاکم سے رجوع کریں۔ اسی سے مدد طلب کریں اور اسی کی راہنمائی میں معاملات چلائیں۔ اسی طرح پروردگار نے بھی اس کائنات کے نظام کو چلانے کیلئے اپنے نجانے کتنے شرکاء بنا رکھے ہیں۔ کسی کو کسی بات کا اختیار دے رکھا ہے اور کسی کو کسی کا۔ اس لئے جب ہمیں کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو ہم مجبور ہیں کہ جس کو اس ضرورت کا اختیار دیا گیا ہے اسی سے رجوع کریں اور دست سوال اس کے سامنے پھیلائیں۔ پیغمبر جب انہیں دعوت دیتا ہے کہ تمہارا خالق و مالک ایک ہی ہے۔ تمہیں جو کچھ بھی مانگنا ہے اسی سے مانگنا ہے۔ تم نے بتمام و کمال بندگی اسی کی کرنی ہے۔ وہ اپنی کائنات کے نظام کیلئے بے شک کارکنانِ قضا و قدر سے کام لیتا ہے لیکن وہ اختیارات کے حامل نہیں ہیں اختیارات کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اس لئے وہ ہر ایک کو حکم دیتا ہے کہ تمہیں جو کچھ مانگنا ہے مجھ سے مانگو۔ کسی اور سے رجوع مت کرو۔ یہ بات ان قوم کو سمجھ نہیں آ رہی وہ اپنے بادشاہوں میں جس طرح علم اور قدرت میں جو ایک نارسائی اور محدودیت دیکھتے تھے اسی پر وہ اللہ کو بھی قیاس کرتے تھے

Marfat.com

جس طرح ایک بادشاہ ہرگز نہیں جان سکتا کہ اس کی مملکت میں رہنے والا ایک ایک فرد کس حال میں ہے اور اگر وہ جان بھی لے تو اس کی ضرورت پوری کرنا براہ راست اس بادشاہ کی قدرت میں نہیں اس لئے وہ مجبور ہے کہ اپنے لئے ماتحت معاونین رکھے اور انہی کو اختیارات دے کر اپنی رعایا کو ان سے رجوع کرنے کا حکم دے لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کی صفات کا تعلق ہے اس کی قدرتیں بے پناہ ہیں۔ اس کا علم حدود سے نا آشنا ہے وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بار بار کہتا ہے کہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ میری کوئی مخلوق دنیا میں کسی کونے میں بھی آباد ہو میں اس سے کیا اس کے خیالات تک سے واقف ہوں۔ اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنتا ہوں' سمندر کی تہہ میں کوئی مچھلی حرکت کرتی ہے میں اسے دیکھتا بھی ہوں اور اس کی حرکت کی آواز کو سنتا بھی ہوں۔ کوئی خشک و تر پتہ جنگل میں نہیں گرتا مگر میں اسے جانتا ہوں' زمین کے سینے سے کوئی گھاس کی پتی سر نکالتی ہے تو میں اسے دیکھ رہا ہوتا ہوں۔ تسہیلِ فہم کیلئے میں ایک مثال عرض کرتا ہوں جو اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب آگ تلاش کرتے ہوئے کوہِ طور پر پہنچے تو وہاں انہیں معلوم ہوا کہ وہ طور کی پاک وادی میں پہنچ گئے ہیں اللہ نے وہاں انہیں پیغمبری عطا فرمائی اور فرعون کی ہدایت کیلئے اس کے پاس جانے کا حکم دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا الٰہی میں جانے کیلئے مستعد ہوں لیکن مجھے اتنی مہلت دے دی جائے کہ راستے میں کسی پہاڑی درے میں میں اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ آیا ہوں اس یخ بستہ رات میں نجانے ان کا کیا حشر ہوا ہوگا مجھے اجازت دیجئے کہ ان کا کوئی ٹھکانہ بنالوں اور انہیں کہیں ٹھہرا کر اطمینان سے مصر کا سفر کروں اور اپنا وہ فرض انجام دوں جس کا آپ نے مجھے حکم دیا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے سامنے جو چٹان ہے اس پر اپنا عصا مارو آپ نے اس پر عصا مارا تو چٹان پھٹی اس کے اندر سے ایک چھوٹی چٹان برآمد ہوئی' پھر آپ نے پروردگار کے حکم سے اس پر عصا مارا تو نیچے ایک بڑا پتھر برآمد ہوا۔ حکم دیا گیا کہ اس پر عصا مارو آپ نے اس پر عصا مارا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ اس میں ایک جانور موجود ہے جو گھاس کی تازہ پتی کھا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ موسیٰ دیکھ رہے ہو ان تین پتھروں کے اندر یہ جانور موجود ہے بتاؤ اس کو یہ رزق کون دے رہا ہے۔ اندازہ فرمایئے جس کے علم اور قدرتوں کی وسعت کا عالم یہ ہے اسے بادشاہوں پر قیاس کر کے محدود قدرتوں کا مالک سمجھنا اور بے پناہ علم ہوتے ہوئے بھی اسے محدود علم کا حامل جاننا اسے بے وقوفی کے سوا اور کیا کہا جائے لیکن قربان جایئے وہ اپنی اس بے وقوفی کو سمجھنے کی بجائے حضرت ہود علیہ السلام کو بے وقوف قرار دے رہے ہیں۔

دوسرا سبب حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا آپ کو بے وقوف کہنے کا یہ تھا کہ تم ہمیں اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہو اور بار بار کہہ رہے ہو کہ اگر تم مجھ پر ایمان نہ لائے اور میری دعوت کو قبول نہ کیا تو تم پر خدا کا عذاب آ سکتا ہے۔ ہمیں تمہاری یہ بات محض حماقت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اللہ کا عذاب ان لوگوں پر آتا ہے جن سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ ہم سے تو خدا ناراض نہیں بلکہ ہم پر تو وہ مہربان ہے اور اس کی دلیل یہ ہے اس نے ہمیں ایک بڑے خطہ زمین پر اقتدار دے رکھا ہے' ہماری تجارت دور دراز ملکوں تک پھیلی ہوئی ہے' ہمیں اللہ نے جسمانی اور معنوی طور پر نعمتوں سے گراں بار کر رکھا ہے' ہم باقی قوموں کی نسبت زیادہ صحت مند اور زیادہ دولت مند ہیں اگر وہ ہم سے ناراض ہوتا تو یہ نعمتیں ہمیں کبھی نہ دیتا ان نعمتوں کی موجودگی یہ بتلانے کیلئے کافی ہے کہ وہ ہم سے خوش اور راضی ہے تو کیا خوش ہو کر بھی کسی کو سزا یا عذاب دیا جاتا ہے؟ عذاب کا اگر کوئی مستحق ہو سکتا ہے تو وہ تم یا تم پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔ کیونکہ تمہاری اس معاشرے میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ دنیوی وجاہتوں میں سے کوئی چیز تمہیں میسر نہیں تمہارے متبعین نہایت غریب لوگ ہیں کوئی انہیں اپنے پاس بٹھانا گوارا نہیں کرتا تم اگر اللہ کے مقرب بندے ہوتے تو تمہیں بھی ہماری طرح یہ نعمتیں میسر ہوتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہے اور ہم سے خوش ہے اس لئے تمہارا ہمیں عذاب سے ڈرانا اور خود اللہ کا مقرب بن کر بیٹھنا یہ بے وقوفی کے سوا اور کچھ نہیں۔

Marfat.com

دوسری بات انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام سے یہ کہی کہ ہم تو تمہیں جھوٹے لوگوں میں سے گمان کرتے ہیں اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ نبوت ورسالت ایک بڑا اعزاز ہے اور اعزازات ہمیشہ بڑے لوگوں کو ملا کرتے ہیں۔ ہود تو ایک غریب آدمی ہے اور غریب ہی ان پر ایمان لانے والے ہیں ان کو اتنا بڑا اعزاز کیسے مل سکتا ہے اس لئے اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں تو یہ دعویٰ سراسر جھوٹ پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی قوم خوب جانتی تھی کہ آپ کی گزشتہ زندگی نہایت سچی زندگی ہے آپ نے کبھی کسی معاملے میں جھوٹ نہیں بولا کیونکہ پیغمبر کبھی جھوٹ نہیں بولا کرتے لیکن ان کا یہ خود ساختہ عقیدہ کہ نبوت ورسالت کے حامل ہمیشہ بڑے دولت مند لوگ ہوتے ہیں اس عقیدے کی وجہ سے وہ حضرت ہود علیہ السلام کو جھوٹا قرار دینے پر مجبور تھے۔ غور فرمائیے کہ کسی صاحب کردار اور معزز شخصیت کو بے وقوف اور جھوٹا قرار دینا کتنی بڑی گالی ہے جسے کوئی بھی معزز شخص برداشت نہیں کر سکتا لیکن اللہ کے نبیوں کی شان ہی اور ہوتی ہے وہ اپنی نبوت ورسالت میں اپنی ذات کو گم کر دیتے ہیں ان کے پیش نظر لوگوں کی اصلاح کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر یہ مقصد دکھ اٹھا کر بھی پورا کر سکیں تو ان کیلئے عین راحت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اس طرح کے الزامات اور طعنے سنے تو بجائے برہم ہونے کے نہایت بردباری سے یہ فرما رہے ہیں کہ اے میرے برادرانِ قوم تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میرے اندر حماقت اور بے وقوفی والی کوئی بات نہیں تم بھی جانتے ہو نبوت سے پہلے تم ہمیشہ میرے علم ودانش کے قائل رہے ہو۔ اب یکا یک تمہیں مجھ میں حماقت نظر آنے لگی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ عارضہ مجھے لاحق ہو گیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو میں دعوت تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں جس پر تمہاری دنیا وآخرت کا دارومدار ہے اسے تم سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔ تم نے اپنے دل کے دریچے اس طرح اس پر بند کئے ہیں کہ تمہارے دلوں تک وہ دعوت پہنچ ہی نہیں پا رہی اور تمہارے دماغی سوتے تمہاری نفسانیت اور تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس طرح خشک ہوتے جا رہے ہیں کہ تم میری دعوت کو سمجھنے سے رفتہ رفتہ محروم ہوتے جا رہے ہو اس لئے بجائے اس کے کہ تم اپنی بے وقوفی کا ادراک کرتے اور اسے سمجھ اور عقل سے بدلنے کی کوشش کرتے تم الٹا مجھے بے وقوف بتاتے ہو یہ تو بالکل ایسے ہی ہے کہ کسی نے کسی حبشی کے سامنے آئینہ رکھ دیا اسے جیسے ہی اس میں اپنی شکل دکھائی دی تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی بدشکلی کا اعتراف کرتا اس نے اٹھا کر آئینہ پتھر پر دے مارا کہنے لگا کیسا برا آئینہ ہے جو میری شکل بگاڑ کے دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے خرابی آئینہ میں نہیں بلکہ اس حبشی کے دماغ میں ہے وہ بجائے اپنی بدصورتی کا اعتراف کرنے کے الزام آئینے پر دھر رہا ہے اسی طرح قوم ہود بھی بجائے اپنی بے وقوفی کے اعتراف کے حضرت ہود کو بے وقوف بتا رہی ہے اور رہا ان کا یہ الزام کہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں آپ نے اس کا جواب دینے کی براہ راست ضرورت محسوس نہیں فرمائی بلکہ اپنی اصل حیثیت کا اعلان فرمایا کہ تم مجھے جھوٹا کہو یا کچھ اور لیکن واقعہ یہ ہے میں رب العالمین کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں۔ تمہیں اگر میری باتیں پسند نہیں آتیں تو میں اس خیال سے کہ تم کہیں مشتعل ہو کر مجھے نقصان نہ پہنچاؤ یا میرا معاشرتی بائیکاٹ نہ کر دو میں اپنی دعوت پیش کرنے سے رک نہیں سکتا کیونکہ رسالت کی ذمہ داری ایک کٹھن ذمہ داری ہے کسی معمولی حکمران کا قاصد بھی اپنے فریضۂ ابلاغ سے کوتاہی کرنے کی جرأت نہیں کرتا میں تو رب العالمین کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں، میں اپنے فریضہ میں کس طرح کوتاہی کا ارتکاب کر سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری بداعمالیوں پر میری تنقید تمہیں گراں گزرتی ہے لیکن میں اس فریضہ کی ادائیگی کے ہاتھوں مجبور ہوں اور تمہاری ہمدردی کی وجہ سے بھی مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں بہرصورت اللہ کا پیغام تم تک پہنچاؤں کیونکہ آج کی یہ کڑوی کسیلی باتیں کل کو تمہارے لئے عافیت کا سامان بن سکتی ہیں اور اگر آج تم انہیں سننے سے انکار کر دو گے تو کل کے تمہارے پچھتاوے تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے اس لئے

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کرتا ہے کبھی کارِ تریاقی

Marfat.com

اور ساتھ ہی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ممکن ہے تم مشتعل ہو کر مجھے اور مجھ پر ایمان لانے والوں کو ختم کرنے کی کوشش کرو لیکن یہ اچھی طرح جان لو کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں کسی معمولی حاکم کے قاصد کو بھی نقصان پہنچایا جائے تو حاکم اسے اپنی عزت کا مسئلہ سمجھتا ہے تم اگر رب العالمین کے قاصد کو نقصان پہنچاؤ گے تو تمہیں خوب سوچ لینا چاہئے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے رسولوں کی حفاظت فرماتے ہیں اور جب کوئی قوم ان کی جان لینے کے درپے ہو جاتی ہے تو پھر عموماً یہی لمحہ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہجرت کا حکم دیتا ہے اور کافر قوم کو اپنے عذاب کے ذریعے تباہ کر دیتا ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں ان کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اور کچھ اپنے احسانات کا ذکر فرما کر انہیں سوچنے اور نصیحت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا:

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآئَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ط وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ج فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O

''کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی' تاکہ وہ تمہیں خبردار کرے؟ اور یاد کرو کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تمہیں ان کا جانشین بنایا اور جسمانی اعتبار سے تمہیں وسعت و کشادگی عطا فرمائی۔ پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو' تاکہ تم فلاح پاؤ''۔ 69

ایک اعتراض کا جواب:

اس آیت کریمہ میں سب سے پہلے قوم ہود کا ایک اعتراض نقل کیا ہے جسے وہ ازراہِ تعجب یعنی مذاق اڑاتے ہوئے پیش کیا کرتے تھے اور ایسا ہی اعتراض گزشتہ رکوع میں قومِ نوح کی طرف سے بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا اگرچہ جواب نہیں دیا کیونکہ یہ اعتراض اس قابل نہیں کہ اسے گفتگو کا موضوع بنایا جائے لیکن بین السطور میں اور قرآن پاک کی بعض دوسری جگہوں میں اس کا جواب بھی موجود ہے اور یہاں لِيُنْذِرَكُمْ سے اس جواب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ قومِ ہود کا اعتراض یہ ہے کہ نبوت و رسالت ایک بہت بڑا اعزاز اور ایک بڑا نازک منصب ہے جو شخص اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ حقیقت میں اللہ سے اپنے خاص تعلق کا دعویٰ کرتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ سے خاص تعلق کیلئے انسانوں سے بڑھ کر کسی مخلوق میں سے ہونا ضروری ہے کیونکہ انسانوں میں تو ایسی طاقت نہیں کہ وہ براہ راست اللہ سے خاص تعلق پیدا کر لیں اور ہود چونکہ ہماری طرح کے ایک آدمی ہیں جو خصوصیات اور صلاحیتیں ہم میں ہیں انہی کے حامل وہ بھی ہیں اس لئے ان کا یہ دعویٰ کہ اللہ کے ساتھ ان کا خاص تعلق ہے اور اللہ براہِ راست اپنا کلام ان پر اتارتا ہے یہ سراسر ایک تعجب خیز بات ہے۔ جس پر اعتماد کرنا بہت مشکل ہے۔ قرآن کریم نے مختلف جگہ اس کا جواب دیتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا ہے اور گزشتہ قوموں کی تاریخ کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ انسان بھی عجیب واقع ہوا ہے اس نے ہمیشہ نبوت اور بشریت میں تضاد محسوس کیا یہ سمجھتا ہے کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا اور بشر نبی نہیں ہو سکتا اور جب وہ اپنے جیسے ایک بشر کو نبوت کا دعویٰ کرتا ہوا سنتا ہے تو اسے نبی ماننے سے انکار کر دیتا ہے حالانکہ دو باتیں بالکل سامنے کی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ نبوت یقیناً ایک بہت بڑا منصب ہے اور یہ اسی کو ملنا چاہئے جو مخلوق میں سب سے اعلیٰ اور بلند ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا مخلوقات میں انسان سے کوئی بالاتر مخلوق بھی ہے؟ تمام مخلوقات میں تین مخلوقات سب سے فوقیت رکھتی ہیں۔ جنات' فرشتے اور انسان جہاں تک جنات

Marfat.com

اور فرشتوں کا تعلق ہے تخلیق آدم کے وقت ان دونوں کو حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان ان دونوں کا مسجود اور ان دونوں سے فائق ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اب اگر نبی ہونا ایک بڑے مرتبے کی بات ہے تو اسے یقیناً اشرف المخلوقات میں سے ہی ہونا چاہیئے اس لئے اللہ نے تمام انبیاء و رسل انسانوں ہی میں سے مبعوث کئے اور وہ سب انسان تھے۔ دوسری بات یہ کہ سوال اللہ کے قرب کا نہیں وہ تو جسے چاہے اپنے قرب سے نواز سکتا ہے سوال انسانوں کی اصلاح کا ہے غور فرمایئے اگر انسانوں کی اصلاح کیلئے کسی فرشتے یا جن کو بھیجا جاتا تو کیا انسان اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتے تھے؟ اور کیا وہ انسانوں کی زندگی کیلئے نمونہ بن سکتے تھے کیونکہ نمونہ بننے کیلئے ضروری ہے کہ نبی کے اندر وہی احساسات' وہی ضروریات' وہی فعلی اور انفعالی قوتیں اور وہی خواہشیں اور وہی داعیے ہوں جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں چنانچہ جب وہ انسانوں کے سامنے اپنی ضروریات پر ضبط کر کے دکھائے' اپنے احساسات پر پاکیزگی کا پہرہ بٹھائے' اپنی فعلی اور انفعالی قوتوں کو اللہ کی اطاعت کا امین بنا دے اور اپنے جذبات اور خواہشات پر تقویٰ کی مہر ثبت کر دے تو اس کی زندگی کا یہ رویہ اور اس کی یہ صفات یقیناً باقی انسانوں کیلئے اسوہ بن کر روشنی کا سامان کریں گی۔ اسے جب بھوک لگے گی اور وہ روزہ رکھ کر صبر کرے گا تو اس سے دوسرے انسانوں کو صبر کی تلقین ہوگی۔ اسے جب بھی بیماری آئے گی اور وہ بیماری میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرے گا تو اس سے انسانوں کو اللہ سے رجوع کرنے کا سلیقہ آئے گا۔ وہ جب زخمی ہو کر زخموں کا علاج کرے گا اور ساتھ ساتھ اللہ سے شفا بھی مانگے گا تو اس کا یہ رویہ انسانوں کیلئے سنت بن جائے گا اور اللہ سے شفا مانگنے کا طریقہ سکھائے گا۔ اسی طرح اگر اس کے سامنے دولت کے انبار لگا دیئے جائیں لیکن وہ پھر بھی زہد و استغنا کی تصویر بنا رہے تو اس سے اس پر ایمان لانے والوں کو زہد و استغنا کی وہ تعلیم ملے گی جس سے حب دنیا میں کمی آئے گی اور قناعت اور استغناء انسانی سیرت کا جوہر بن جائے گا غرضیکہ انسانوں کی اصلاح کیلئے یہ ضروری تھا کہ انسانوں ہی میں سے کسی کو نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کیا جاتا چنانچہ لِیُنۡذِرَکُمۡ سے انہی باتوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نبیوں کا انسان اور بشر ہونا اللہ کے قرب کے حصول میں رکاوٹ نہیں بلکہ یہ تمہاری اصلاح اور تمہاری زندگی کی راہنمائی کیلئے ایک بنیادی ضرورت ہے اس لئے تمہیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے بلکہ تمہیں اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے تمہاری تربیت اور اصلاح کیلئے تمہی میں سے ایک شخص کو اٹھایا ہے یہ تمہاری جنس اور نوع سے تعلق رکھتا ہے' تمہارے ہی قبیلوں میں سے کسی قبیلے کا فرزند ہے' تم اس کے شخصی اور خاندانی پس منظر سے واقف ہو' وہ تمہارے ہی ماحول میں پلا بڑھا ہے' وہ تمہاری معاشرت کا ایک نمائندہ فرد ہے' تمہارے ماحول نے ہر طرح کا رطب و یابس اس کے سامنے رکھا ہے۔ اسے بھی روایات اخذ کرنے اور زندگی گزارنے کے وہی امکانات ملے ہیں جو تمہارے سامنے ہیں اس کے باوجود وہ پتھروں میں اگر ہیرے کی مانند ہے تو یہ اس کے اللہ کے رسول ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے تو تمہیں آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینا چاہیئے اور اسے اپنے جیسا دیکھ کر اپنے اندر ایک اعتماد پیدا کرنا چاہیئے کہ جن اوصاف حمیدہ سے اللہ کا یہ عظیم بندہ متصف ہے مجھے بھی کوشش کرنی چاہیئے کہ میں کسی نہ کسی حد تک انہیں اپنے اندر پیدا کر سکوں۔

دوسرا احسان یہ ذکر فرمایا کہ لوگو! قوم نوح کے مٹ جانے کے بعد اللہ نے تمہیں اس کا جانشین بنایا ہے یعنی جس طرح اس زمین کے ایک بڑے حصے پر اللہ نے انہیں قیام کی سہولتیں بخشیں اور پھر اقتدار عطا کیا اسی طرح زمین کے ایک بڑے حصے پر آج تم آباد ہو۔ اللہ نے تم پر جسمانی اور معنوی نعمتوں کے دروازے کھولے ہیں۔ تم اپنے قد و قامت اور اپنی قوت و طاقت میں اپنے وقت کی نمایاں قوم ہو پھر اللہ نے تمہیں عقل و خرد کا ایسا جوہر عطا کیا ہے جس کی وجہ سے تم نے صنعت و ایجادات کی ایک دنیا کو وجود بخشا ہے۔ اس پر تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور آگے بڑھ کر اللہ کے نبی کی دعوت کو قبول کرنا چاہیئے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بجائے اس کے کہ تم اللہ کے ان احسانات کا شکر ادا کرو تم کفران نعمت کرتے ہوئے اللہ کے ساتھ ساتھ دوسروں

Marfat.com

شریک ٹھہراتے ہو اور تمہاری اصلاح و تربیت کیلئے جس نبی کو بھیجا گیا ہے تم اس کی دعوت قبول کرنے کی بجائے اسے اذیتیں پہنچا رہے ہو۔ تمہارے اندر اگر سوچنے سمجھنے کی کچھ بھی صلاحیت موجود ہے تو پھر اللہ کی نعمتوں اور اس کی قدرتوں کو یاد کرو اور اس کا جو منطقی نتیجہ ہونا چاہئے اس کے مطابق اپنی زندگی تبدیل کرو۔ یہی وہ کامیابی کا راستہ ہے۔ منعم کی نعمتوں کو دیکھتے ہوئے اور محسن کے احسانات کی احسان شناسی کرتے ہوئے زندگی گزارنا یہ فلاح و کامرانی کا راستہ ہے۔ تم اگر چاہو تو یہ راستہ تمہارے لئے روشن ہو سکتا ہے لیکن اگر تم نے اپنے اندر احسان شناسی اور شکرِ نعمت کا جذبہ پیدا نہ کیا تو پھر یقیناً تم اس نعمت سے محروم ہو جاؤ گے اس آیت کریمہ میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے بَصْطَۃً اور سورۃ البقرہ میں یہی لفظ سین کے ساتھ استعمال ہوا ہے دونوں ایک ہی لفظ ہیں اس کا معنی کشادگی، وسعت اور پھیلاؤ کے ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم ہود کو جسمانی و عقلی دونوں اعتبار سے تفوق اور برتری عطا فرمائی ہے۔ عرب کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قومِ عاد صحت جسمانی کے اعتبار سے بھی نمایاں تھی اور اپنے عقلی کارناموں کے اعتبار سے بھی اس کی بڑی دھوم تھی۔ آیت کریمہ کے آخری جملے میں آلَآءَ اللّٰہِ کا لفظ آیا ہے آلَآءَ جمع ہے اِلًی اِلَیٰ اَلًی کی۔ اس کے معنی نعمت کے بھی ہوتے ہیں اور کرشمہ شان، کارنامہ اور عجوبہ کے بھی ہیں۔ یہاں دونوں ہی معنی مراد لئے جا سکتے ہیں اور قرآن کریم میں اس لفظ کو انہی مختلف معانی میں استعمال کیا ہے مطلب یہ ہے کہ خدا کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو بھی یاد رکھو اور یہ بھی فراموش نہ کرو کہ وہ تم سے یہ نعمتیں چھین لینے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ اتنی واضح اور مؤثر ترغیب کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ قومِ عاد اپنے رویے پر شرمندہ ہوتی اور وہ اللہ کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو یاد کر کے صرف اسی کی اطاعت اور اس کی بندگی کا عہد کرتی لیکن قومیں جب بگڑتی ہیں تو ان کی محرومیاں بڑی شدید ہوتی ہیں اس قوم نے بھی نصیحت اختیار کرنے کی بجائے ہٹ دھرمی کا راستہ اختیار کیا اور کہنے لگی:

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

''وہ بولے! کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں، جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے؟ تم جس عذاب کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو اس کو لاؤ، اگر تم سچے ہو'' ۔70

قوم کا جواب اور ان کے استدلال کی حقیقت:

قوم کے جواب پر غور کیجئے! ان کا لب و لہجہ اور اسلوب کس قدر ناگوار ہے اس میں غصہ بھی ہے اور طنز بھی کہ اللہ کی نعمتیں اپنی جگہ، ہمیں اس سے انکار نہیں ہمیں اس بات سے بھی انکار نہیں کہ وہی اس دنیا کا خالق و مالک ہے لیکن تمہاری یہ بات ہمارے لئے قابل قبول نہیں کہ محض تمہارے کہنے پر ہم تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کی بندگی شروع کر دیں۔ ہمیں اس کی بندگی کا اقرار ہے لیکن صرف اسی کی بندگی تو کافی نہیں۔ اس نے جس طرح دوسروں کو اختیارات دے رکھے ہیں اور ہمارے بہت سارے کام انہی سے متعلق ہیں اگر ہم ان کی بندگی نہیں کریں گے تو وہ یقیناً ہم سے ناراض ہو کر ہمیں تباہ کر دیں گے جس کے پاس بارشیں برسانے کا اختیار ہے وہ بارشیں روک لے گا، جو اولاد دیتا ہے وہ ہمیں اولاد سے محروم کر دے گا، جو ہمیں خوشحالی عطا کرتا ہے وہ ہم پر بدحالی کی مصیبت مسلط کر دے گا۔ تم چاہتے ہو کہ ہم تمہارے کہنے پر اپنی دنیا اجاڑ لیں یہ تو ہم سے نہیں ہو سکتا یہ تو سراسر کم عقلی کی بات ہے اور مزید یہ بات بھی کہ ہم نے آج کچھ لوگوں کو اللہ کا شریک تو نہیں بنایا اور ہم نے آج پہلی دفعہ اللہ کے شریکوں کی بندگی شروع تو نہیں کی یہ کام تو ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسی صداقت ہے جس پر گزشتہ نسلیں بھی گواہ ہیں اب یہ تو عجیب بات ہے کہ

Marfat.com

ہم تمہاری بات مان کر اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کو چھوڑ دیں اور اس طرح سے ہم اپنے آباؤ اجداد کو گمراہ ٹھہرائیں کہ وہ لوگ شرک میں مبتلا تھے وہ گمراہ تھے انہیں کسی بات کا پتہ نہیں تھا ایک لے دے کر تم ہو جسے صداقت کا علم ملا ہے۔ ہم اس صورت حال کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے اور اپنے آباؤ اجداد کے طریقے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ قرآن کریم نے اور بھی بعض جگہ مشرکین کی اس دلیل کا ذکر کیا ہے کہ ان کے نزدیک سب سے بڑی دلیل آباؤ اجداد کا رویہ اور ان کا دینی ورثہ تھا۔ ان کے دل و دماغ میں یہ بات پیوست ہو چکی تھی کہ ہم تو غلطی کر سکتے ہیں لیکن ہمارے آباؤ اجداد غلطی نہیں کر سکتے حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ ہر نسل سے پہلی نسل آباء کہلاتی ہے اور موجودہ نسل آنے والی نسل کیلئے آباء بننے والی ہے۔ آج اگر یہ نسل زندگی میں غلطی کرتی ہے تو ان کے مرنے کے بعد انہی کی نسل اس دلیل کو دھراتے ہوئے کہے گی کہ ہمارے آباء تو کبھی غلطی نہیں کر سکتے تھے حالانکہ ہر نسل انسانوں ہی کا ایک مجموعہ ہے اور ہر دور کے انسان سے ہمیشہ غلطیاں ہوئی ہیں جو زندہ ہیں وہ بھی غلطیاں کرتے ہیں اور جو مرحوم ہیں ممکن ہے انہوں نے بھی غلطیاں کی ہوں۔ اس لئے کسی چیز کی صداقت معلوم کرنے کیلئے یہ کوئی دلیل نہیں کہ پہلے لوگ ایسا کیا کرتے تھے بلکہ کسی چیز کی صحت اور صداقت کیلئے صرف تین چیزیں دلیل بن سکتی ہیں ایک عقلِ سلیم' دوسرا علمِ صحیح اور تیسری ہدایت یہ چیزیں جس نسل کو بھی نصیب ہو جاتی ہیں وہ برسر ہدایت ہے اور جو نسل اس سے محروم ہو جاتی ہے وہ گمراہ ہے چاہے وہ نسل آج کی ہو یا پہلے گزر چکی ہو لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ بات جس قدر سادہ اور سہل ہے اسی قدر اس پر عمل ہمیشہ مشکل رہا ہے تعجب تو یہ ہے کہ جو لوگ زندگی میں اپنے والدین کا احترام کرتے ہیں نہ اطاعت۔ ان کے مرنے کے بعد وہ انہیں دلیل بنا کر پیش کرنے لگتے ہیں مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ زندگی میں جن کی باتیں قابل تسلیم نہ تھیں اور یہ کہا جاتا تھا کہ جنریشن گیپ نے ان کو اگلی نسل سے بہت پیچھے کر دیا ہے تو مرنے کے بعد وہی پسماندہ نسل نجانے کس طرح قابلِ تقلید اور واجب الاتباع ہو جاتی ہے۔ قومِ عاد بھی اسی المیہ کا شکار تھی ان کے نزدیک ان کے آباؤ اجداد ہر طرح کی غلطیوں سے مبرا اور خیر و شر میں سب سے بڑی دلیل تھے بلکہ ان کے حوالے سے یہ لوگ اس حد تک جذباتی تھے کہ ان کے اتباع کو چھوڑنا تو انہیں کسی طرح گوارا نہ تھا البتہ اگر اس رویے کے باعث ان پر اللہ کا عذاب آتا ہے تو وہ ان کیلئے قابلِ قبول تھا چنانچہ اسی آیت کے آخر میں ان کی طرف سے یہی بات کہی جارہی ہے کہ اے ہود تم ہمیں جس عذاب سے ڈرا رہے ہو اور بار بار ہمیں تنبیہ کرتے ہو کہ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو تم پر اللہ کا عذاب آ سکتا ہے تو ہم تو اپنا رویہ نہیں بدلیں گے اس لئے تم وہ عذاب لا سکتے ہو تو لے آؤ اگر تم واقعی عذاب کی دھمکی دینے اور اپنے آپ کو نبی کہنے میں سچے ہو۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں حضرت ہود علیہ السلام کی طرف سے اس کا جواب نقل کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ O

''حضرت ہود نے کہا کہ واقع ہو چکا ہے تم پر تمہارے رب کی جانب سے عذاب اور غضب۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں' جن کیلئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی؟ اچھا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں''۔ 71

آیت کریمہ کے پہلے جملہ میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے قَدْ وَقَعَ جس کا معنی ہے واقع ہو گیا یا واجب ہو گیا یہ فعل ماضی ہے جو کسی فعل کے وقوع پذیر ہونے پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ فعل آئندہ نہیں بلکہ ماضی میں ہو چکا ہے حالانکہ یہاں حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس عذاب کا تم تقاضا کر رہے ہو وہ مستقبل میں تم پر آ کر رہے گا لیکن اسے مستقبل کے صیغے کی بجائے ماضی کے صیغے سے ادا کرنا درحقیقت اس کی قطعیت

Marfat.com

کو ظاہر کرنا ہے یعنی اس عذاب کے آنے کو اس حد تک یقینی سمجھو کہ گویا وہ آ چکا ہے۔اسی طرح اس کے بعد لفظ استعمال ہوا ہے رجسؔ اس کے بھی تین معنی کئے جاسکتے ہیں۔اہل علم نے اس کے تینوں معنی مراد لئے ہیں ایک معنی ہے پھٹکار یعنی تم پر اللہ کی پھٹکار پڑ چکی ہے یہ گویا ہدایت سے تمہاری محرومی کا فیصلہ ہے جسکے نتیجے میں اللہ کا غضب بھڑکے گا اور تم پر اللہ کا عذاب آ جائے گا دوسرا معنی ہے عذاب کہ جس عذاب کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ یوں سمجھو کہ عذاب تم پر آ گیا اور اس عذاب کی شدت کا حال یہ ہے کہ وہ صرف عذاب ہی نہیں بلکہ اس میں اللہ کا غضب بھی شامل ہے۔تیسرا اس کا معنی ہے گندگی اور ناپاکی۔ اس سے مراد یہاں کفر و شرک اور اعمال وعقائد کی گندگی و ناپاکی ہے اور رجس اور غضب میں لازم وملزوم کا رشتہ ہے۔مطلب یہ ہے کہ جس عذاب کا تم مطالبہ کر رہے ہو اس میں اب دیر نہیں اس کو آیا ہی سمجھو اس لئے کہ جس ناپاکی اور گندگی سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لادلی ہے۔رجس کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب اللہ کے عذاب کو دور نہ سمجھو۔جس طرح کسی مکان میں گیس بھر جائے تو اب اس مکان کے جل جانے میں کوئی دیر نہیں ہوتی اگر کوئی اڑتا ہوا شعلہ بھی وہاں جا پڑا تو پورا مکان بھک سے اڑ جائے گا کیونکہ گیس ایک آتش پذیر مادہ ہے جس مکان میں بھی وہ پھیل جائے گا اس کے جل جانے میں تاخیر نہیں ہوگی۔اسی طرح شرک اللہ سے بغاوت اور اس کی بندگی کے سوا دوسروں کی بندگی' یہ بھی آتش پذیر مادہ کی طرح ہیں بلکہ اگر انہیں عذاب پذیر کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا عجیب بات یہ ہے کہ ان چیزوں کو جمع کرنے والا کبھی ان سے توبہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر تو ایسا کرنے والا کوئی ایک شخص ہے تو وہ تو اپنا انجام آخرت میں بھگتے گا لیکن اگر اس کا ارتکاب کرنے والی پوری قوم ہے تو ان پر اللہ کا عذاب آ جانا لازم ہو جاتا ہے یہی وہ بات ہے جو حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم سے فرما رہے ہیں کہ نادانو! تم آگ سے کھیل رہے ہو لیکن تمہیں اس کا بالکل اندازہ نہیں۔عذاب تمہارے سر پر تلا کھڑا ہے لیکن تم اپنی عیاشیوں میں مصروف ہو بلکہ تمہاری جسارتوں کا عالم یہ ہے کہ تم پیغمبر کی دعوت پر غور کرنے کی بجائے اپنے آباؤ اجداد کے عمل کو سب سے بڑی دلیل سمجھ بیٹھے ہو اور انہوں نے تمہارے سپرد جو مشرکانہ اعتقادات کئے ہیں جس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں تمہیں ان پر اصرار ہے۔انہی کا حوالہ دے کر یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تم مجھ سے ایسی چیزوں کے بارے میں بحث کر رہے ہو جن کے نام تو بے شک تم نے کچھ رکھ چھوڑے ہیں لیکن ان ناموں کا کوئی مسمیٰ موجود نہیں یعنی تم کسی کو بارش کا' کسی کو ہوا کا' کسی کو دولت کا' اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فی الحقیقت کسی چیز کا رب نہیں۔ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی دلیل نہ عقل وفطرت کے اندر موجود ہے نہ اللہ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے کہیں یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔پھر وہ کیا چیز ہے جس کی بناء پر تم ان کو معبود بنائے بیٹھے ہو اور ان کی حمایت میں مجھ سے لڑ رہے ہو۔

لمحہ فکریہ:

یہاں مجھے ایک عجیب سا احساس پریشان کر رہا ہے کہ یہاں قرآن کریم میں معذب قوموں کے مشرکانہ اعتقادات اور طور اطوار پر بحث ہو رہی ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ انہیں اپنے ان اعتقادات پر اصرار تھا اور پیغمبر کی دعوت کے مقابلے میں وہ کسی طرح بھی انہیں چھوڑنے پر تیار نہیں تھے حالانکہ یہ سراسر حقیقت سے خالی اسماء ہی تھے جن کی کوئی دلیل ان کے پاس موجود نہیں تھی اور یہی وہ باتیں اور یہی طرز عمل تھا جو ان پر عذاب آنے کا باعث بنا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہم ایک ایسی امت ہیں جو قیامت تک کیلئے توحید کی امین بنائی گئی اور انہوں نے پوری دنیا کے سامنے اللہ کی ذات وصفات کے صحیح تصور کو پیش کرنا ہے لیکن خود ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے ایسے ہی کچھ نام مقرر کر رکھے ہیں اور ہمیں ان پر اصرار بھی ہے لیکن ہمیں کبھی اس کا خیال نہیں گزرتا کہ یہ تو وہ باتیں ہیں جو پہلی امتوں پر عذاب کا باعث بنیں۔مثلاً ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی مشکل کشا نہیں لیکن ہم پھر بھی بعض بزرگوں کو مشکل کشا

Marfat.com

کہتے ہیں۔ہم یہ جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی خزانے عطا کرنے والا نہیں لیکن اس کے باوجود ہم نے گنج بخش نام رکھ چھوڑے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ رازق صرف اللہ کی ذات ہے لیکن ہم پھر بھی بعض مقدس ہستیوں کو داتا کہہ کر پکارتے ہیں۔ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ساری نوازشات کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے لیکن ہم جس کو چاہتے ہیں غریب نواز قرار دے دیتے ہیں۔ہمارا عقیدہ ہے کہ مصیبت میں فریادیں سننے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں اس کے باوجود ہم نے بعض بڑی شخصیتوں کو غوث یا غوث اعظم کا نام دے رکھا ہے جس کا معنی سب سے بڑا فریادرس ہے حالانکہ اللہ کے سوا فریادیں سننے اور پورا کرنے والا اور کون ہے؟ لیکن ہمارا حال وہی ہے جس کا ذکر مولانا الطاف حسین حالی نے بڑے دکھ سے اپنے مسدس میں کیا ہے

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کرشمہ جو کوکب میں مانے تو کافر
گرے آگ پر بہر سجدہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

حضرت ہود علیہ السلام کا جواب اور قوم ہود کا انجام:

اس آیت کے آخری جملے میں فرمایا کہ اے برادرانِ قوم اگر تمہیں میری دعوت کسی طرح قابلِ قبول نہیں اور تم شرک اور بداعمالیوں سے کسی طرح تائب ہونے کیلئے تیار نہیں ہو اور تمہاری جرأتوں کا حال یہ ہے کہ تم اللہ کے عذاب کا مطالبہ کرنے لگے ہو تو تمہارے کرتوتوں کے باعث عذاب آنا تو یقینی ہے البتہ وہ کب آتا ہے یہ میرے بس میں نہیں تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں لیکن یاد رکھو تمہارا یہ رویہ باقی رہا تو تمہیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان کی انتہائی شرارت وبغاوت اور اپنے پیغمبر کی تعلیم سے بے پناہ بغض وعناد کی پاداش اور قانونِ جزاء کا وقت آن پہنچا اور غیرتِ حق حرکت میں آئی اور عذابِ الٰہی نے سب سے پہلے خشک سالی کی شکل اختیار کی' عاد سخت گھبرائے پریشان ہوئے اور عاجز ودرماندہ نظر آنے لگے تو حضرت ہود علیہ السلام کو جوشِ ہمدردی نے اکسایا اور مایوسی کے بعد پھر ایک مرتبہ ان کو سمجھایا کہ راہِ حق اختیار کرلو' میری نصائح پر ایمان لے آؤ کہ یہی نجات کی راہ ہے' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ورنہ پچھتاؤ گے لیکن بدبخت وبدنصیب قوم پر کوئی اثر نہ ہوا' بلکہ بغض وعناد اور دوبالا ہو گیا۔تب ہولناک عذاب نے ان کو آگھیرا' آٹھ دن اور سات راتیں پیہم تیز وتند ہوا کے طوفان اٹھے اور ان کو اور ان کی آبادی کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا تو مند اور قو

Marfat.com

ہیکل انسان جو اپنی جسمانی قوتوں کے گھمنڈ میں سرمست تھے اس طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آتے تھے جس طرح آندھی سے تناور درخت بے جان ہو کر گر جاتا ہے' غرضیکہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ O

''آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے ہود اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی' جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے''۔72

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے اپنے اس اصول کا ذکر فرمایا ہے جس کے تحت قوموں پر عذاب آتا ہے اس میں تین باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک تو یہ بات کہ ہم کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں بھیجتے جب تک اس کے اندر قبولیتِ ایمان کے تمام سوتے خشک نہیں ہو جاتے۔ جب تک کچھ بھی ان میں ایمان کی قبولیت کی امید باقی رہتی ہے تو عذاب کو روکا جاتا ہے۔ ان کو پوری طرح دودھ کی طرح بلویا جاتا ہے اور جب تک مکھن کی آخری پھٹکی بھی باقی رہتی ہے یہ بلونا بند نہیں کیا جاتا۔ پیغمبر اپنی دعوت تمام موانع کے باوجود پوری قوت سے پیش کرتا ہے ان کی اذیتوں کو پورے صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے لیکن جب وہ اپنی قبولیت کی استعداد سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ کے عذاب کا کوڑا ان پر برستا ہے وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ سے اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ دوسری بات جو فرمائی گئی ہے وہ یہ کہ ہم جب عذاب نازل کرتے ہیں تو اللہ کے رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کو وہاں سے ہجرت کا حکم دیتے ہیں اور انہیں اپنی پناہ میں لے کر دشمنوں کی اذیت سے اور عذاب کے اثرات سے محفوظ کر دیتے ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی قوم پر عذاب آیا' اللہ کے رسول اور مومنین کو وہاں سے نکال لیا گیا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ حضرت ہود علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کو یا تو کسی قریبی سرزمین میں جانے کا حکم دیا گیا اور یا وہیں ان کو اپنی پناہ میں لے لیا گیا اور تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ عذاب کی صورت میں ہم کافر قوم کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتے ہیں کیونکہ وہ زمین کا ایک ایسا بگڑا ہوا عنصر بن چکی ہوتی ہے جن کے باقی رہنے سے زمین کی خرابی اور اہلِ زمین کے بگاڑ میں مزید وسعت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جس طرح کسی ناسور کو جسم میں باقی رکھنا پورے جسم کو فاسد کرنے کا باعث بنتا ہے اسی طرح بگڑی ہوئی قوموں کو باقی رکھنا بھی پوری زمین کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت قومِ عاد کا بھی اس طرح استیصال کیا کہ ان کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔ یہ بات خود اہلِ عرب کی تاریخی روایات سے بھی ثابت ہے اور موجودہ اثری اکتشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عاد اولیٰ بالکل تباہ ہو گئے اور ان کی یادگاریں تک دنیا سے مٹ گئیں چنانچہ مؤرخین عرب ان کو عرب کی امم بائدہ یعنی معدوم اقوام میں شمار کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی عرب کے تاریخی مسلمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصہ باقی رہا جو حضرت ہود کا پیرو تھا۔ انہی بقایائے عاد کا نام تاریخ میں عادِ ثانیہ ہے اور حصنِ غراب کا کتبہ انہی کی یادگاروں میں سے ہے اس کتبہ کو جسے تقریباً اٹھارہ سو برس قبل مسیح کی تحریر سمجھا جاتا ہے ماہرین آثار نے جو عبارت پڑھی ہے اس کے چند جملے یہ ہیں (ہم نے ایک طویل زمانہ اس قلعہ میں اس شان سے گزارا ہے کہ ہماری زندگی تنگی و بدحالی سے دور تھی۔ ہماری نہریں دریا کے پانی سے لبریز رہتی تھیں اور ہمارے حکمران ایسے بادشاہ تھے جو برے خیالات سے پاک اور اہل شر و فساد پر سخت تھے وہ ہم پر ہود کی شریعت کے مطابق حکومت کرتے تھے اور عمدہ فیصلے ایک کتاب میں درج کر لئے جاتے تھے اور ہم معجزات اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے) یہ عبادت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی قدیم عظمت و شوکت اور خوشحالی کے وارث آخر کار وہی لوگ ہوئے جو حضرت ہود پر ایمان لائے۔

آخر میں صرف ایک بات کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ ہے حضرت ہود علیہ السلام کی وفات۔ اہلِ عرب حضرت ہود علیہ السلام کی وفات اور ان کی

Marfat.com

قبر مبارک کے متعلق مختلف دعوے کرتے ہیں مثلاً اہل حضرموت کا دعویٰ ہے کہ عاد کی ہلاکت کے بعد وہ حضرموت کے شہروں میں ہجرت کر آئے تھے وہیں ان کی وفات ہوئی اور وادی برہوت کے قریب حضرموت کے مشرقی حصہ میں شہر تریم سے قریباً دو مرحلے پر دفن ہوئے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک اثر منقول ہے کہ ان کی قبر حضرموت میں کثیب احمر (سرخ ٹیلہ) پر ہے اور ان کے سرہانے جھاؤ کا درخت کھڑا ہے۔

اہل فلسطین کا دعویٰ ہے کہ وہ فلسطین میں دفن ہیں اور انہوں نے وہاں ان کی قبر بھی بنا رکھی ہے اور اس کا سالانہ عرس بھی کرتے ہیں۔

مگر ان تمام روایات میں سے حضرموت کی روایت صحیح اور معقول معلوم ہوتی ہے اسلئے کہ عاد کی بستیاں حضرموت ہی کے قریب تھیں لہٰذا قرینہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی تباہی کے بعد قریب ہی کی آبادیوں میں حضرت ہود علیہ السلام نے قیام فرمایا ہوگا اور وہیں پیغام اجل کو لبیک کہا اور وہ یہی حضرموت کا مقام ہے۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ
مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ
نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا
بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ
مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا
قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا
فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ
قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ
اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

Marfat.com

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٧٦﴾
فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا
بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٧٧﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ
فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ
لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ
النّٰصِحِيْنَ ﴿٧٩﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ
بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً
مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿٨١﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ
قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ
يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڮ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٨٣﴾
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٨٤﴾

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا' اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں' تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آ گئی ہے' یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی کے طور پر ہے' لہٰذا اسے چھوڑے رکھو کہ اللہ کی زمین میں چلتی پھرے اس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آ لے گا۔ یاد کرو! وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور ملک میں تم کو تمکن بخشا' تم اس کے میدانوں میں عالیشان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو تو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور ملک میں اُودھم مچاتے نہ پھرو۔ اس کی قوم کے ان بڑوں نے جنھوں نے گھمنڈ کیا'

Marfat.com

ان زیردستوں سے کہا جو ان میں سے ایمان لائے، کیا تم سمجھتے ہو کہ صالح اپنے رب کا فرستادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو اس پیام پر جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں۔ متکبروں نے کہا کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں، جس پر تم ایمان لائے ہو۔ تو انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی، اور بولے اے صالح! اگر تم خدا کے فرستادہ ہو تو وہ عذاب ہم پر لاؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو۔ پس ان کو کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتے ہوئے ان کی بستیوں سے نکل گئے کہ اے میری قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی، مگر کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں۔ اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ نہیں تھا اس قوم کا جواب مگر یہ کہ وہ کہنے لگے کہ نکالو ان لوگوں کو اپنی بستی سے بے شک یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ پس ہم نے لوط اور اس کے اہلخانہ کو نجات دی سوائے اس کی بیوی کے وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔ اور ہم نے ان پر بارش برسائی پھر دیکھئے کیسے ہوا انجام جرم کرنے والوں کا۔

..........☆......☆......☆..........

مشرکینِ مکہ اور باقی نوعِ انسانی کو یہ بات سمجھانے کیلئے کہ اگر تم رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کرو گے اور آپ کے مقابلے میں معاندانہ روش اختیار کرو گے تو تمہارا انجام بھی یقیناً وہی ہوگا جو اس سے پہلے ان قوموں کا ہو چکا جن کی طرف اللہ کے رسول آئے اور انہوں نے ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مختلف انبیاء کرام کی دعوت اور ان کی قوموں کی طرف سے معاندانہ جواب اور پھر ان پر اترنے والے عذاب کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے قوم نوح کا ذکر آیا اس کے بعد قوم عاد کا اب اسی غرض سے قوم ثمود کا ذکر کیا جا رہا ہے اور یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ اللہ کے یہاں ایک ہی ترازو میں ساری قومیں تلتی ہیں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں ہوتا۔ وہ عادل ذات ہے ہر ایک کے ساتھ عدل کا معاملہ کرتی ہے جس رویے نے سابقہ امتوں کو عذاب کا مستحق بنایا تم اگر وہی رویہ اختیار کرو گے تو یقیناً تم اس عذاب سے بچ نہیں سکو گے چنانچہ قوم ثمود کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝

”اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا، اس نے کہا: اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آ گئی ہے، یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی کے طور پر ہے، لہٰذا اسے چھوڑے رکھو کہ اللہ کی زمین میں چلتی پھرے اس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آ لے گا“۔ 73

Marfat.com

ثمود کی تاریخ:

قومِ ثمود کا ذکر قرآن کریم کی نو سورتوں میں کیا گیا ہے یہ قوم عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ عاد اور ثمود ایک ہی دادا کی اولاد تھے۔ ارم کے دو بیٹے تھے جن میں سے ایک بیٹے کی اولاد عاد کہلائی اور دوسرے کی ثمود۔ ثمود کو عادِ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ قومِ عاد کے بقایا ہیں جب اللہ کا عذاب قومِ عاد پر ٹوٹا تو جو لوگ اس عذاب سے محفوظ رکھے گئے آگے چل کر وہ قومِ ثمود کے نام سے معروف ہوئے کیونکہ ثمود ان کے جدامجد کا نام تھا۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ اسیریا کے کتبات اور یونان' اسکندریہ اور روم کے قدیم مؤرخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے۔ چنانچہ رومی مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے۔ اس قوم کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحجر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانہ میں مدینہ اور ترکی کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائن صالح کہتے ہیں یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانے میں حجر کہلاتا تھا۔ حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ کا جو میدان نظر آتا ہے یہ سب اس قوم کے مقام سکونت کا حصہ تھا اور آج کل فج الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں۔ ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں آج بھی موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا اور اس شہر خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے اس لئے اہل مکہ اور دوسرے عرب قومِ عاد کی طرح قوم ثمود کی تاریخ سے بھی واقف تھے۔ حجر کا یہ مقام جو حجر ثمود کہلاتا ہے شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبیٰ اس کے سامنے پڑتی ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کو اسی قومِ ثمود کی طرف اللہ نے رسول بنا کر بھیجا۔ حضرت صالح علیہ السلام نسب اور وطن کے اعتبار سے قومِ ثمود ہی کے ایک فرد تھے کیونکہ وہ بھی سام ہی کی اولاد میں سے تھے اس لئے قرآن کریم میں ان کو قومِ ثمود کا بھائی فرمایا ہے۔ ثمود بھی قومِ عاد کی طرح خدائے واحد کے علاوہ بہت سے معبودانِ باطل کے پرستار اور شرک میں مبتلا تھے۔ ان کا بنیادی مرض بھی شرک میں مبتلا ہونا تھا اور اسی بنیادی مرض کے باعث باقی مشرک قوموں کی طرح ان میں بھی سیرت و کردار میں ہزاروں عیوب پیدا ہو گئے تھے کیونکہ جب کوئی قوم توحید سے بیگانہ ہو جاتی ہے تو پھر وہ اللہ کی ذات ہی سے لاتعلق نہیں ہوتی بلکہ اس کی صفات سے بھی کٹ جانے کے باعث زندگی میں ایسے ایسے اخلاقی امراض کا شکار ہوتی ہے جس کا تصور بھی عام حالات میں نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی اصل حیثیت کا عرفان جو توحید کے عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے۔ انسان اس سے محروم ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں کبھی وہ کسی کے سامنے جھکتا ہے اور کبھی کسی کے سامنے۔ اولوالعزمی' حوصلہ مندی' قوت تسخیر اس طرح اس سے رخصت ہو جاتی ہیں کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت رکھتے ہوئے بھی انتہائی منفعل زندگی گزارتا ہے۔ ہر قوت سے خوف کھاتا ہے' ہر آستانے پر سر جھکاتا ہے اور زندگی کے اصل مقاصد کے علاوہ تمام چھوٹے بڑے مقاصد پر جان دیتا ہے اس لئے پروردگار عالم انسانی اصلاح کیلئے جب کسی پیغمبر کو بھیجتا ہے تو سب سے پہلے پیغمبر کی دعوت کا عنوان ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگو! ایک ہی اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ' تمام قوتوں کا مالک صرف ایک اللہ ہے اسی کو اطاعت مطلقہ زیب دیتی ہے۔ ہر طرح کی کبریائی اسی کیلئے مناسب ہے۔ وہ چونکہ تمہارا خالق ہے اس لئے حکم دینا بھی اسی کا حق ہے اور تم چونکہ اس کے مخلوق ہو اس لئے تمہارے لئے اس کے سوا کسی اور کا محکوم اور مامور ہونا ہرگز زیبا نہیں۔ اس تصور کے قبول کر لینے کے بعد انسان میں وہ بنیادی تبدیلی آتی ہے جو انسانی سیرت و کردار کی ضامن بنتی ہے۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام نے بھی ان کے سامنے یہی دعوت پیش کی اور اس قوم نے بھی سابقہ امتوں کی طرح

Marfat.com

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت سے وہی سلوک کیا جو سابقہ امتیں کر چکیں۔ نہ صرف کہ اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ حضرت صالح علیہ السلام کا راستہ روکنے کیلئے آپ کو ہر طرح کی اذیت کا نشانہ بنایا۔ آپ پر ایمان لانے والوں کو ہراساں کیا اور آپ کی ذات پر قسم قسم کے اتہامات باندھے۔ کبھی آپ کو جھوٹا کہا گیا' کبھی یہ کہا گیا کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ یعنی ہر ممکن طریق سے یہ کوشش کی گئی کہ لوگ آپ کی دعوت کے قریب نہ پھٹکیں اور جب دیکھا کہ ہماری ساری اذیتوں اور ہمارے سارے اتہامات کے باوجود صالح اپنی دعوت سے باز نہیں آتے اور لوگوں میں آپ کا اثر ورسوخ بڑھتا جا رہا ہے تو پھر انہوں نے آپ سے قسم قسم کے معجزات کا مطالبہ شروع کر دیا اور گمان یہ کیا کہ جب ہم آپ سے غیر معمولی قسم کے مطالبات کریں گے اور حضرت صالح اسے پورا نہیں کر سکیں گے تو خود بخود ان کی ہوا اکھڑ جائے گی اور لوگ ان کے قریب آنا چھوڑ دیں گے اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ مایوس ہو کر اور مخالفتوں سے تنگ آ کر دوبارہ اپنے آبائی دین میں پلٹ جائیں گے۔

اونٹنی کا معجزہ:

معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو غیر معمولی مطالبات کئے ان میں سے ایک مطالبہ غیر معمولی اونٹنی کا بھی تھا۔ انہوں نے آپ سے کہا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ہماری فلاں پہاڑی جس کا نام کاتبہ ہے اس کے اندر سے ایک ایسی اونٹنی نکال کر دکھائیے جو دس مہینے کی گابھن ہو اور قوی اور تندرست ہو اور اس چٹان سے نکلنے کے بعد وہ ایک بچہ بھی جنے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اگرچہ اس طرح کے مطالبات کرنا کوئی اچھی بات نہیں لیکن تم اگر اس پر اصرار کرتے ہو تو پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارا یہ مطالبہ پورا کر دیا تو تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے۔ چنانچہ ساری قوم نے آپ سے ایمان لانے کا وعدہ کیا تو صالح علیہ السلام نے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا مانگی کہ الٰہی آپ کی قدرت سے تو کوئی کام مشکل نہیں اگر آپ ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیں تو یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ایمان لے آئیں گے چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد پہاڑی کے اندر جنبش پیدا ہوئی اور اس کی ایک بڑی چٹان پھٹ کر اس میں سے ایک اونٹنی اسی طرح کی نکل آئی جیسا ان کا مطالبہ تھا۔ صالح علیہ السلام کا یہ کھلا ہوا حیرت انگیز معجزہ دیکھ کر ان میں سے کچھ لوگ تو مسلمان ہو گئے اور باقی تمام قوم نے بھی ارادہ کر لیا کہ ایمان لے آئیں مگر قوم کے چند سردار جو بتوں کے خاص پجاری اور بت پرستی کے امام تھے انہوں نے ان کو بہکا کر اسلام قبول کرنے سے روک دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم نے عہد شکنی کی اور خطرہ ہوا کہ ان پر کوئی عذاب نہ آ جائے تو پیغمبرانہ شفقت کی بناء پر ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ اس اونٹنی کی حفاظت کرو اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ پھر شاید تم عذاب سے محفوظ رہو ورنہ فوراً تم پر عذاب آ جائے گا۔ اس آیت کریمہ میں اسی معجزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا ہے کہ دیکھو تم نے جس معجزے کا مطالبہ کیا تھا وہ ناقۃ اللہ کی صورت میں تمہارے سامنے موجود ہے۔ تمہارے عہد کا تقاضہ تو یہ تھا کہ تم فوراً ایمان لے آتے لیکن اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اب بھی تمہیں مہلت دی جا رہی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ لیکن یہ یاد رکھنا کہ اس اونٹنی کو تکلیف نہ پہنچانا۔ یہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے جائے اور جہاں چاہے چارہ کھائے تم ہرگز اسے نہیں روکو گے۔ بلکہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی فرمایا گیا کہ جس کنویں سے تمہارے جانور پانی پیتے ہیں اسی کنویں سے یہ بھی پانی پیئے لیکن اب شرط یہ ہو گی کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے گی اور دوسرے دن تمہارے جانور پانی پئیں گے۔ قرآن کریم نے اونٹنی کو ناقۃ اللہ کہہ کر اس کو بطور ایک معجزہ کے پیش کیا ہے لیکن اس کے وجود میں آنے کا وہ واقعہ جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس کا ذکر ہمیں اخبار آحاد میں ملتا ہے یا اسرائیلی روایات میں لیکن ناقۃ اللہ کا لفظ اور بطور معجزہ کے اس کا ذکر کیا جانا اور پھر اس اونٹنی کا بے جھجک ہر جگہ گھومتے پھرنا اور مدت تک قوم کا اس اونٹنی کو برداشت کرنا یہ ضرور اشارہ کرتا ہے کہ اس اونٹنی کا وجود میں آنا یقیناً کسی محیر العقول طریقے سے ہوا ہو گا ورنہ حضرت

Marfat.com

علیہ السلام اگر کسی عام اونٹنی پر ہاتھ رکھ کر یہ فرما دیتے کہ آج سے یہ اونٹنی اللہ کی اونٹنی ہے دیکھنا تم اس کو گزند نہ پہنچانا ورنہ اللہ کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑے گا تو محض یہ بات حضرت صالح علیہ السلام کے ارشاد فرمانے کے باوجود قوم پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کہ وہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام کو اللہ کا پیغمبر ہی کب مانتے تھے کہ ان کی بات پر یقین کر لیتے وہ جو ایک مدت تک اونٹنی کو برداشت کرتے رہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ اونٹنی جس طرح وجود میں آئی ہے یقیناً اس کے پیچھے کوئی غیبی طاقت ہے اگر ہم نے اسے کوئی نقصان پہنچایا تو وہ غیبی طاقت ہمارا نقصان کرے گی۔ اس اندیشے نے انہیں مدت تک روکے رکھا۔ اگرچہ ہم نے ضروری حد تک یہ واقعہ بیان کر دیا ہے لیکن مزید تفصیل اور تحقیق کیلئے قصص القرآن کا ایک نوٹ نقل کرتے ہیں۔ اس کے مصنف لکھتے ہیں قرآن عزیز سے اس سلسلہ میں صرف دو باتیں ثابت ہیں' ایک یہ کہ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے نشان (معجزہ) طلب کیا اور حضرت صالح علیہ السلام نے ''ناقہ'' کو بطور نشانی پیش کیا' دوسرے یہ کہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس کو ضرر نہ پہنچائے اور پانی کی باری مقرر کر لے کہ ایک روز ناقہ کا اور دوسرا قوم کا اور اگر اس کو نقصان پہنچایا تو یہی قوم کی ہلاکت کا نشان ہوگا چنانچہ انہوں نے ''ناقہ'' کو ہلاک کر دیا اور خدا کے عذاب سے خود بھی ہلاک ہو گئے۔

اس سے زائد جو کچھ ہے اس کا مدار یا ان روایاتِ حدیث پر ہے جو اخبارِ آحاد کے درجہ میں شمار ہیں اور یا بائبل اور تاریخ قدیم کی روایات پر' جہاں تک اخبارِ آحاد کا تعلق ہے محدثین کے نزدیک ان میں سے بعض صحیح روایات ہیں اور بعض ضعیف' اس لئے حافظ عماد الدین ابن کثیر نے سورۃ اعراف کی تفسیر میں ''ناقۃ اللہ'' کے وجود میں آنے کی روایت کو سندِ روایات کے اصول پر نقل نہیں فرمایا بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی طرح تحریر فرمایا ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قومِ ثمود جب حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغِ حق سے اکتا گئی تو اس کے سرخیل اور سرکردہ افراد نے قوم کی موجودگی میں مطالبہ کیا کہ اے صالح! اگر تو واقعی خدا کا فرستادہ ہے تو کوئی نشانی دکھا تاکہ ہم تیری صداقت پر ایمان لے آئیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشانی آنے کے بعد بھی انکار پر مصر اور سرکشی پر قائم رہو' قوم کے ان سرداروں نے بتاکید وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئیں گے۔ تب حضرت صالح علیہ السلام نے انہی سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا نشان چاہتے ہیں' انہوں نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں سے یا بستی کے اس پتھر میں سے جو کنارہ پر نصب ہے ایک ایسی اونٹنی ظاہر کر کہ جو گابھن ہو اور فوراً بچہ دے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی اور اسی وقت ان سب کے سامنے پہاڑ یا پتھر میں سے حاملہ اونٹنی ظاہر ہوئی اور اس نے بچہ دیا۔ یہ دیکھ کر ان سرداروں میں جندع بن عمرو تو اسی وقت مشرف باسلام ہو گیا اور دوسرے سرداروں نے بھی جب اس کی پیروی میں اسلام لانے کا ارادہ کیا تو ان کے ہیکلوں اور مندروں کے مہنتوں ذؤاب بن عمرو اور جناب اور ان کے کاہن رباب بن صفر نے ان کو اس سے باز رکھا اور اسی طرح باقی دوسروں کو بھی اسلام لانے سے روکا۔

اب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے تمام افراد کو تنبیہ کی کہ دیکھو یہ نشانی تمہاری طلب پر بھیجی گئی ہے' خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ پانی کی باری مقرر ہو ایک دن اس ناقہ کا ہوگا اور ایک دن ساری قوم اور اس کے سارے چوپاؤں کا اور خبردار اس کو کوئی اذیت نہ پہنچے' اگر اس کو آزار پہنچا تو پھر تمہاری بھی خیر نہیں ہے۔

قوم نے اگرچہ اس حیرت انگیز معجزہ کو دیکھ کر ایمان قبول نہ کیا لیکن دلوں کے اقرار نے اس کو آزار پہنچانے سے باز رکھا اور یہ دستور جاری رہا کہ پانی کی باری ایک روز ناقہ کی رہتی اور تمام قوم اس کے دودھ سے فائدہ اٹھاتی اور دوسرے روز قوم کی باری ہوتی اور ناقہ اور اس کا بچہ بغیر روک ٹوک چراگاہوں میں چرتے اور آسودہ رہتے' مگر آہستہ آہستہ یہ بات بھی ان کو کھٹکنے لگی اور آپس میں صلاح و مشورے ہونے لگے کہ اس ناقہ کا خاتمہ کر دیا جائے

Marfat.com

تو اس باری والے قصے سے نجات ملے' کیونکہ ہماری چوپاؤں کیلئے اور خود ہمارے اپنے لئے یہ قید نا قابل برداشت ہے۔ یہ باتیں اگرچہ ہوتی رہتی تھیں لیکن کسی کو اس کے قتل کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی' مگر ایک حسین وجمیل مالدار عورت صدوق نے خود کو ایک شخص مصدع کے سامنے اور ایک مالدار عورت عنیزہ نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی کو قیدار کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ دونوں ناقہ کو ہلاک کردیں تو یہ تمہاری ملک ہیں' تم ان کو بیوی بنا کر عیش کرو۔ آخر قیدار بن سالف اور مصدع کو اس کیلئے آمادہ کرلیا گیا اور طے پایا کہ وہ راہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور ناقہ جب چراگاہ جانے لگے تو اس پر حملہ کردیں گے اور چند دوسرے آدمیوں نے بھی مدد کا وعدہ کیا۔

غرض ایسا ہی کیا گیا اور ناقہ کو اس طرح سازش کر کے قتل کر ڈالا اور پھر آپس میں حلف کیا کہ رات ہونے پر ہم سب حضرت صالح علیہ السلام اور اس کے اہل وعیال کو بھی قتل کردیں گے اور پھر اس کے اولیاء کو قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے کہ یہ کام ہمارا نہیں ہے۔

اور بچہ یہ دیکھ کر بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور چیختا اور بولتا ہوا پہاڑی میں غائب ہوگیا۔

حضرت صالح علیہ السلام کو جب یہ خبر ہوئی تو حسرت وافسوس کے ساتھ قوم کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا' اب اللہ کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تم کو تباہ کردے گا' اور پھر بجلی کی چمک اور کڑک کا عذاب آیا اور اس نے رات میں سب کو تباہ کردیا اور آنے والے انسانوں کیلئے تاریخی عبرت کا سبق دے گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ساتھ محدث ابن کثیر نے چند روایاتِ حدیثی بھی بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً

غزوہ تبوک کے موقعہ پر جب آپ ﷺ کا گزر حجر پر ہوا تو صحابہ نے ثمود کے کنوئیں سے پانی بھرا اور آٹا گوندھ کر روٹیاں تیار کرنے لگے۔ نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا تو پانی گرا دینے' ہانڈیاں اوندھی کر دینے اور آٹا بیکار کر دینے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ وہ بستی ہے جس پر اللہ کا عذاب ہوا' یہاں نہ قیام کرو اور نہ یہاں کی اشیاء سے فائدہ اٹھاؤ' آگے بڑھ کر پڑاؤ ڈالو ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی بلا میں مبتلا ہو جاؤ۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ان حجر کی بستیوں میں یا تو اللہ سے ڈرتے عجز وزاری کرتے اور روتے ہوئے داخل ہوا کرو ورنہ ان میں داخل ہی نہ ہوا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اپنی غفلت کی وجہ سے عذاب کی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور ایک رویت میں ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ حجر میں داخل ہوئے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے نشانیاں طلب نہ کیا کرو (دیکھو صالح علیہ السلام) کی قوم نے نشان طلب کیا تھا اور وہ ناقہ پہاڑ کی کھوہ سے نکلتی اور اپنی باری میں کھا پی کر وہیں واپس چلی جاتی اور جو اس کی باری کا دن تھا اس میں قوم ثمود کو اپنے دودھ سے سیراب کرتی تھی' مگر ثمود نے آخر کار سرکشی کی اور ناقہ کی کونچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کردیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے ان پر "چیخ کا عذاب" مسلط کردیا اور وہ اس عذاب سے گھروں کے اندر ہی مردہ ہو کر رہ گئے صرف ایک شخص ابو رغال نامی باقی بچا جو حرم میں گیا ہوا تھا لیکن جب وہ حدودِ حرم سے باہر آیا تو فوراً اسی عذاب کا شکار ہوگیا۔

حافظ ابن کثیر نے یہ تینوں روایات سند کے ساتھ مسندِ احمد سے نقل کر کے ان کی توثیق کی ہے۔

اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے کہ "ناقۃ اللہ" اللہ کا ایک نشان تھی اور اپنے اندر ضرور کوئی الی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسا نشان کہلا سکے جس کا ذکر قرآنِ عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے "هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً" یہ ناقہ تمہارے لئے نشان ہے اور پھر پانی کی باری جس طرح ناقہ اور قوم ثمود کے درمیان تقسیم فرمائی وہ خود ایک مستقل دلیل ہے کہ یہ "ناقہ" ضرور اپنے اندر ا حیثیت رکھتی تھی جو نشان الٰہی کہلا سکے۔ لیکن یہ بات کہ "ناقہ" کا وجود کس طرح ہوا اور کن وجوہ سے "نشانِ الٰہی" یا "معجزہ" بنی قرآنِ عزیز اس

ساکت ہے۔ البتہ مختلف صحیح اخبارِ آحاد سے اس واقعہ پر ضرور روشنی پڑتی ہے جس کی تفصیل ابن کثیر سے ابھی نقل ہو چکی مگر واقعہ کی تفصیلی صراحت و وضاحت وہاں بھی موجود نہیں ہے بلکہ کتب تفسیر میں اسرائیلیات سے منقول ہے یا ضعیف روایات سے اخذ کی گئی ہے' لہٰذا مناسب یہی ہے کہ واقعہ کے اجمال و تفصیل میں فرقِ مراتب کا ضرور خیال رکھا جائے' جس قدر قرآنِ عزیز نے تصریح کی ہے وہ بغیر کسی تاویل کے واجب الاعتقاد ہے اور جس قدر صحیح روایات سے (اگر چہ وہ آحاد ہی کے درجہ کی ہیں) اس اجمال کی تفصیل کا پتہ ملتا ہے وہ اجمال کی تفصیل کی حیثیت سے قابلِ قبول ہیں گو قرآنِ عزیز کی تصریحات کے درجہ کو نہ پہنچ سکیں اور ان سے زیادہ باقی تفصیلات کی حیثیت وہی ہے جو عام تاریخی وقائع اور اسرائیلیات کی حیثیت ہے۔

قوم نے اگر چہ ایمان نہ لا کر عہد شکنی کی لیکن جیسا کہ عرض کیا ان کو مزید مہلت دی گئی اور عذاب کے فوری وقوع کا فیصلہ نہیں فرمایا گیا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی تبلیغی کاوشیں مزید تیز کر دیں اور ہر اس پہلو سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی جس سے طبیعتیں متاثر ہو سکتی ہیں چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○

''یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور ملک میں تم کو تمکن بخشا' تم اس کے میدانوں میں عالیشان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو تو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور ملک میں اُودھم مچاتے نہ پھرو''۔ 74

ترغیب و ترہیب:

اس آیتِ کریمہ کے آغاز میں حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت فرماتے ہوئے ترغیب اور ترہیب دونوں سے کام لیا آپ نے انہیں اللہ کے شکر کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ تم قومِ عاد کے بقایا ہو اور تم جانتے ہو کہ قوم عاد پر اللہ کا ہولناک عذاب آیا جس سے نہ صرف ان کا اقتدار اور خوشحالی ختم ہوئی بلکہ انہیں ہر سطح پر فنا کر ڈالا گیا اور آج دنیا میں ان کا کوئی نام لیوا نہیں۔ ان کے کھنڈرات تک تباہ ہو گئے اور ان کی ایک ایک نشانی جس پر وہ فخر کرتے تھے۔ فنا کے گھاٹ اتر گئی۔ تم انہی کے چچازاد ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے کس طرح تمہاری نسل میں برکت دی اور تمہیں زمین کے ایک بڑے حصے پر تمکن عطا فرمایا۔ آج تم دنیا کی ایک طاقتور اور مضبوط قوم شمار ہوتے ہو اور پھر تمہاری سرزمین کو اللہ نے ایسا زرخیز بنایا ہے کہ قدم قدم پر اللہ کی نعمتوں کی بہار چھائی ہوئی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قومِ عاد اللہ کے کفرانِ نعمت اور ایمان نہ لانے کے نتیجے میں تباہ ہوئی تم ان سے توبہ کرتے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے عقیدہ و عمل کی اصلاح کرتے اور زمین پر اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارتے اور اہل زمین پر اسکے احکام نافذ کرتے لیکن تم نے اسکے بالکل برعکس تباہ ہونے والی قوموں کا انداز اختیار کر لیا ہے اور آج تم وہیں کھڑے ہو جہاں کبھی قوم عاد تھی اور تم نے اپنے آپ کو بالکل انہی اعمال کا رسیا بنا لیا ہے اور تمہارے اعتقادات میں وہ ساری خرابیاں جمع ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے قومِ عاد تباہ ہوئی اسلئے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور اس کا شکر بجالاتے ہوئے مجھ پر ایمان لاؤ اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد کرو۔

مزید غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ترہیب کا پہلو بھی ہے قوم کو ڈراتے ہوئے حضرت صالح علیہ السلام انہیں توجہ دلا رہے ہیں کہ دیکھو تم اس قوم عاد کی سرزمین پر بس رہے ہو اور اس کی تاریخ کے وارث ہو تمہیں خوب معلوم ہے کہ ان پر اللہ کا عذاب کیوں آیا تھا' ان کے کیا کرتوت تھے

Marfat.com

جن کی وجہ سے اللہ نے ناراض ہو کر ان کو تباہ کر دیا۔ اب اگر تم بھی وہی طور اطوار اختیار کرتے ہو اور اسی طرح اللہ کے ساتھ دوسری قوتوں کو شریک کرتے ہو اور اپنے عقیدہ وعمل میں وہ ساری خرابیاں پیدا کر لیتے ہو تو پھر میں تمہیں تمہارے انجام سے ڈراتا ہوا یہ نصیحت کرتا ہوں کہ یہ بات یاد رکھو اللہ کے یہاں کبھی ترجیحی فیصلے نہیں ہوتے۔ اس کے ترازو میں برابر کے تول تلتے ہیں۔ ایک ہی قانون عدل ہے جس کے ساتھ تمام قوموں کے معاملات فیصل ہوتے ہیں۔ جس رویے اور جس عقیدہ وعمل کے باعث قوم عاد تباہ ہوئی تو تم کیا سمجھتے ہو کہ اسی طرح کا رویہ اختیار کرنے کے باوجود تم اس عذاب سے بچ جاؤ گے یہ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے میں تمہیں آنے والے انجام سے ڈراتے ہوئے وارننگ دیتا ہوں کہ اپنے کردار وعمل کا جائزہ لو اور گزشتہ تاریخ سے سبق سیکھو تو بچ جاؤ ورنہ تم بری طرح جس تباہی کی طرف بڑھ رہے ہو اس کا انجام نہایت ہولناک ہے۔

ایک عمل پر تنقید:

اس کے بعد ان کے اعمال میں سے ایک عمل پر تنقید کی گئی ہے یہ کہنے کو تو ایک عمل ہے لیکن حقیقت میں یہ اس سوچ کا نتیجہ ہے جس سے بے تہذیب وجود میں آتی ہے جس سے وہ تمدن پھوٹتا ہے جس کی بنیاد صرف مادہ پرستی ہوتی ہے۔ جس سے وہ معاشرہ جنم لیتا ہے' جسے آخرت پر بالکل یقین نہیں ہوتا جس سے وہ فکر پروان چڑھتی ہے' جس کے پیش نظر نفع عاجل یعنی صرف دنیوی منفعت ہوتی ہے جو دل سے سوچنے کی بجائے پیٹ سے سوچتے ہیں۔ جن کی عبادت گاہیں ویران ہوتی اور ان کے ہوٹل آباد ہوتے ہیں۔ جن کے غریب سڑکوں پر مرتے ہیں لیکن ان کی کوٹھیاں اور محلات روز بروز ہوتے چلے جاتے ہیں اس رویہ پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا حال یہ ہے کہ ہر ہموار زمین پر تم عالیشان محلات اٹھاتے ہو اور ان محلات کا حد سے بڑھا ہوا شوق ہے جس کے نتیجے میں تم پہاڑ تراش تراش کر گھر بناتے ہو اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ محلات اور پہاڑوں میں تراشے ہوئے یہ گھر شاید تمہیں دوام عطا کر دیں گے اور تم اس سرزمین پر ہمیشہ رہو گے؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس نعمت کے نہ ہونے کی وجہ سے قوم عاد تباہ ہوئی تم اس کے حصول کی فکر کرتے۔ اس فکر سے بے بہرہ ہونے کے باعث وہ عذاب کا شکار ہوئے تم اس فکر سے اپنے آپ کو آراستہ کرتے۔ جس طرح وہ آخرت سے بے نیاز ہو کر اور صرف دنیا بنانے کی ہوس میں اندھے ہو کر عذاب کی نذر ہوئے تم اس سے توبہ کر کے اپنے آپ کو آخرت کا مسافر بناتے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ تم بھی اسی راستے پر چل نکلے ہو جو ترقی اور خوشحالی کا راستہ نہیں بلکہ تباہی کا راستہ ہے جو قومیں سیرت وکردار کی تعمیر کی بجائے عمارتوں کی تعمیر پر جان دیتی ہیں اور ان کو اپنی تہذیب وتمدن کی علامت سمجھتی ہیں وہ قومیں کبھی دیر تک زندہ نہیں رہتیں۔ عالیشان اور لق ودق عمارتیں بنانا قوم کے عروج کی نہیں بلکہ تمدن کے فساد اور قوم کے زوال کی نشانی ہے۔ یہی فلک بوس عمارتیں بالآخر ایسی قوموں کے عروج وکمال کے مقبرے اور مدفن بنتی ہیں اور ایک دن زاغ وزغن ان میں اپنے آشیانے بناتے ہیں۔ قوموں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے جب بھی مادی تہذیب' مادی تمدن اور مظاہر تہذیب قوموں کی ترقی کی علامت بن گئے وہ مسلمان بھی ہوں تب بھی تباہی سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اندلس میں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی لیکن بجائے اپنے فکری سرمائے کو بڑھانے سیرت وکردار کی تعمیر کیلئے کوشش کرنے اور قلب یورپ میں گھس کر اسلام کی نشر واشاعت کے انہوں نے جب مظاہر تہذیب کو اپنا مقصد بنا کر ایسی عمارتوں کو زندگی کی علامت سمجھ لیا تو نتیجہ سامنے ہے کہ دنیا کی نہایت ترقی یافتہ قوم ہوتے ہوئے بھی زوال اور ہلاکت سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اقبال نے ٹھیک کہا تھا

سبب کچھ اور ہے تو خود جسے سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

Marfat.com

جب بھی جوہر دنیا میں آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

قوت وطاقت کے سیلاب ہمیشہ ان جھونپڑوں سے نکلتے ہیں جن میں زندگی پروان چڑھتی ہے اور یہ بڑی بڑی عمارتیں اور محلات ہمیشہ ان سیلابوں میں بہتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔اس لئے حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو یاد دلایا کہ لوگو! اللہ کی شانوں اور اس کی عظیم قدرتوں کو یاد کرو اور اللہ کی زمین میں مفسد بن کر سر نہ اٹھاؤ۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اس واضح تنبیہ کے باوجود اور زندگی کے بارے میں اُن کے اہداف باطلہ پر تنقید کے باوجود اس قوم کے رویے اور سوچ میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وہ استکبار جو ان کی انفرادی اور اجتماعی شخصیت کا سب سے بڑا روگ بن گیا تھا اور کھل کر سامنے آیا اور انہوں نے اب صرف پیغمبر ہی کی مخالفت پر اکتفا کرنا کافی نہیں سمجھا بلکہ غریب مسلمانوں پر بھی مظالم توڑنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحقیر میں اور اضافہ کر دیا۔اگلی آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ O

''اس کی قوم کے ان بڑوں نے جنہوں نے گھمنڈ کیا' ان زیردستوں سے کہا جو ان میں سے ایمان لائے' کیا تم سمجھتے ہو کہ صالح اپنے رب کا فرستادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا: کہ ہم تو اس پیام پر جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں''۔75

متکبرین اور مومن مستضعفین میں مکالمہ اور بعض حقائق:

اس آیت کریمہ میں قوم کے ان بڑے لوگوں جنہیں ان کے تکبر اور گھمنڈ نے ہر طرح سے اندھا کر رکھا تھا اور وہ لوگ جن کو معاشی اور معاشرتی طور پر بری طرح دبا کے رکھا گیا تھا اور ان میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے تھے ان کے درمیان مکالمہ دکھایا گیا ہے۔امراء کا متکبر طبقہ ان پسے ہوئے کمین لوگوں سے مخاطب ہو کر حیرانی سے یہ کہتا ہے کہ تم نے جو صالح پر ایمان لانے کا اعلان کیا ہے تو کیا تم واقعی اسے اللہ کا پیغمبر سمجھتے ہو یعنی تمہاری یہ مجال کہ تم نے ایک ایسے شخص کو پیغمبر مان کر اس کا اتباع کرنا شروع کر دیا ہے جسے ہم کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں وہ ایک غریب فرد ہے اور غریبوں سے رشتہ رکھتا ہے اسے کسی طرح مالی یا شخصی تفوق حاصل نہیں۔ہم اپنے قبیلے اور اپنے ملک کے سربرآوردہ اور مقتدر لوگ ہیں اگر اللہ نے کسی کو رسول بنانا ہی ہوتا تو وہ یقیناً یہ منصب ہم میں سے کسی کو عطا کرتا۔صالح اپنی غربت اور کم مائیگی کے باعث تو کسی طرح اس کے مستحق نہیں اس لئے ہم نے انہیں ماننے سے انکار کر دیا ہے اور انہیں یہ بات سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تم اپنے آپ میں رہو اور اپنی چادر سے باہر پاؤں مت پھیلاؤ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ تم ہماری عظمتوں سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی اور ہمارے دست نگر ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے شخص کو پیغمبر تسلیم کر رہے ہو جسے ہم پیغمبر تسلیم کرنے سے انکار کر چکے ہیں یعنی تم ایک ایسا فیصلہ کر رہے ہو جو ہمارے فیصلے کے بالکل برعکس ہے تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ از خود فیصلہ کرو اور وہ بھی ایسا فیصلہ جو ہمارے فیصلے کے خلاف ہے کیونکہ قبائل کی زندگی یا غیر مہذب دنیا میں یہ ایک ناقابل یقین بات سمجھی جاتی ہے کہ کسی بستی کے پسماندہ' محکوم اور پسے ہوئے لوگ اپنے طور سے اپنی زندگی کے فیصلے کرنے لگیں اس روشنی کے دور میں آج بھی کسی گاؤں کے کمین چوہدری کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔کسی

Marfat.com

زمیندار کے مزارع، کسی وڈیرے کے ہاری کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم اپنے بڑے کی مرضی کے خلاف کوئی سا کام کر گزریں اور پھر اس بستی میں رہنے کے قابل بھی رہیں تو ہزاروں سال پہلے کے معاشرے میں اس کا تصور کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ اسی حوالے سے وہ متکبر لوگ بھی ان غریب مسلمانوں سے حیرت اور ڈراوے کے انداز میں یہ سوال کر رہے ہیں کہ کیا واقعی تم نے یہ نا قابلِ یقین فیصلہ کر لیا ہے؟ اس سے پہلے کہ ان غریب مسلمانوں کا جواب نقل کیا جائے ہم اس حقیقت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر نبی برحق کی دعوت کو سب سے پہلے پسے ہوئے اور غریب طبقے نے قبول کیا ہے۔ امیروں میں سے اگر کچھ لوگ آئے بھی ہیں تو بہت کم اور یا وہ لوگ جو طبقۂ امراء سے ضرور تعلق رکھتے تھے لیکن امارت اور دولت کے برے اثرات نے ان کے دل و دماغ کو مسموم نہیں کیا تھا ورنہ عموماً امراء کا طبقہ اور حکمرانوں کا گروہ ہمیشہ اللہ کے نبیوں کی دعوت کو نہ صرف کہ قبول کرنے سے انکار کرتا ہے بلکہ انہیں ناکام کرنے حتیٰ کہ ان کی زندگیاں چھین لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غربا کا طبقہ جب یہ دیکھتا ہے کہ ہم برسوں سے زندگی کے جس جہنم میں زندہ ہیں وہ زندگی نہیں بلکہ موت سے بدتر ہے۔ ہم انسانوں میں رہتے ہوئے بھی انسانوں کی طرح نہیں بلکہ حیوانوں سے بدتر زندگی گزارتے ہیں۔ اللہ کے نبی کی دعوت میں جب انہیں ایک انقلاب کی نوید سنائی دیتی اور انہیں اپنی قسمت سنورنے کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ یہ پیغمبر غریب اور امیر کیلئے یکساں اصولِ زندگی لے کر آیا ہے اور خود بھی غریبوں میں اٹھتا بیٹھتا اور غریبوں میں ہی رہنا پسند کرتا ہے تو یہ دعوت انہیں اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے اور پھر اس سے بڑی بات یہ کہ وہ پیغمبر کی دعوت کو ایک قوت کی علامت کے طور پر دیکھتے ہیں وہ جب یہ سنتے ہیں کہ عظمتوں اور قدرتوں کی مالک صرف اللہ کی ذات ہے۔ زندگی اور موت اس کے قبضے میں ہے، خوشحالی اور بدحالی کے فیصلے بھی وہیں سے ہوتے ہیں، کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی جب تک اللہ نہ چاہے اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا اور تمام انسانوں کو اللہ نے یکساں پیدا کیا ہے، پیدائشی طور پر نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، ذمہ داریاں کسی کو گراں بار تو کر سکتی ہیں اور صلاحیتیں کسی کو رہنما تو بنا سکتی ہیں اس سے اس کی زندگی میں فرائض کی ذمہ داری تو بڑھ سکتی ہے لیکن حقوق کے اعتبار سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فوقیت نہیں۔ پیغمبر کی دعوت میں اس طرح کی باتیں ان کے ضمیر میں ایک انقلاب بن کر اٹھتی ہیں وہ پسے ہوئے ہونے کے باوجود زخمی شیر کی طرح انگڑائی لے کر اٹھتے ہیں اور ان کی مخفی صلاحیتیں اور قوتیں جو آج تک سلا کر رکھی گئی تھیں بیدار ہو کر اپنا کام کرنے لگتی ہیں جس سے ان کو یہ ہمت ملتی ہے کہ وہ اپنے بڑوں کے سامنے نہایت جرأت اور جسارت کے ساتھ پیغمبر کا ساتھ دیتے اور کلمۂ حق کہتے ہیں لیکن ان کے بڑوں کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ لوگ جو کل تک ہمارے برابر بیٹھنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے آج ہمارے سامنے کھڑے کیسے ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں بھی ہمیں یہی حقیقتیں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اگرچہ آپ کی دعوت کو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ جیسے طبقۂ امراء کے لوگوں نے بھی آگے بڑھ کر قبول کیا لیکن زیادہ تر ایمان لانے والے غریب لوگ ہی تھے اور یہ حقیقت معلوم ہوتا ہے پیغمبر کی سچائی کی ایک علامت بن گئی تھی چنانچہ ہرقل شاہ روم نے ابوسفیان جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے ان سے پوچھا تھا کہ نبوت کے اس مدعی پر ایمان لانے والے لوگ ہیں یا غریب؟ ابوسفیان نے بتایا کہ غریب لوگ۔ تو ہرقل نے کہا کہ اللہ کے سچے نبیوں پر ہمیشہ غریب لوگ ہی پہلے ایمان لایا کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جنہیں پیغمبر کی دعوت سے قوت اور جرأت ملتی ہے جو پیغمبر کی دعوت کیلئے قوت کا سامان بنتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے ایمان لانے کا مشہور واقعہ ہے جب انہیں خبر ہوئی کہ میری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئے چھپٹتے ہوئے ان کے گھر پہنچے، دروازے پر دستک دی وہ دونوں حضرت خبابؓ سے قرآنِ کریم سیکھ رہے تھے خبابؓ کو اندر چھپا دیا بہنوئی نے دروازہ کھولا تو حضرت عمرؓ نے انہیں مار کر زخمی کر دیا بہن چھڑانے کیلئے آگے بڑھی تو اس پر بھی جھپٹے وہ بہن جو کبھی بھائی کے قدموں کی چاپ سے سراسیمہ ہو جایا کرتی تھی اور جس نے کبھی بھائی

Marfat.com

سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہیں کی تھی نہایت جرأت سے کہنے لگی جسے حفیظ نے شعر کی زبان دی ہے

بہن بولی عمر ہم کو اگر تو مار بھی ڈالے
شکنجوں میں کسے یا بوٹیاں کتوں سے نچوا لے
مگر ہم اپنے دینِ حق سے ہرگز پھر نہیں سکتے
بلندی معرفت کی مل گئی ہے گر نہیں سکتے

چنانچہ بہن کی یہ قوت اور خود اعتمادی سے بھرپور رعد آسا آواز تھی جس نے عمر کو ہلا کے رکھ دیا وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کے رہ گئے بالآخر نہایت انکساری سے بولے کہ مجھے وہ کتاب دکھاؤ جسے تم پڑھ رہے تھے اور جس نے تمہاری کایا پلٹ کے رکھ دی ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اس آیت کریمہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ غربت اور امارت اور چھوٹا اور بڑا ہونا یہ انسانیت کے بنیادی اوصاف نہیں یہ وقتی عوارض ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں وہ حقیقی عظمت جو چھوٹوں کو بڑا بناتی اور پھر اجتماعی شکل میں طوفان کا روپ دے دیتی ہے وہ اللہ کے نبیوں کی وہ دعوت ہے جس سے ان کے اندر بجلیاں کوندنے لگتی ہیں۔ وہ نہتے بھی ہوں تو مسلح لوگوں سے لڑ جاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت کبھی انہیں مرعوب نہیں کر سکتی اور اگر کسی فرد یا کسی قوم کے اندر مسلمان ہوتے ہوئے یعنی اللہ کے نبیوں کی دعوت سے تعلق رکھتے ہوئے بھی یہ جرأت اور یہ بسالت پیدا نہیں ہوتی اور خود اعتمادی کا دیا اندر روشن نہیں ہوتا تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ میرا اللہ سے اور اس کے نبی کی دعوت سے اولاً تو کوئی رشتہ نہیں اور اگر ہے تو محض واجبی سا ہے اس لئے اسے سب سے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے۔ اسے علم و دانش کے حوالے سے اپنی کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالنا چاہئے اور نہ زمینی اور معروضی حالات کے الفاظ سے کھیلتے ہوئے حقائق کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ امت مسلمہ کا یہ المیہ ہے کہ وہ اسلام کی دعوت کے بنیادی اوصاف سے محروم ہوگئی ہے اللہ سے اس کا رشتہ کٹ کے رہ گیا ہے اس کے دانشور بجائے دل سے سوچنے کے پیٹ سے سوچنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ان کے پیش نظر دنیا اور دولت دنیا کے سوا کچھ نہیں وہ آخرت کو محض ایک فریب سمجھتے ہیں اور اپنے اس آلودہ علم و دانش سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی شب و روز کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ ہمیں اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔

غریب مومنوں کا جواب اور اس کے متضمنات:

قوم کے بڑے لوگوں کے اس سوال پر کہ کیا تم واقعی صالح کو پیغمبر سمجھتے ہو جواب میں غریب لوگوں نے کہا پیغمبر سمجھنے کا کیا معنی وہ تو یقیناً اپنی ذات میں پیغمبر ہیں ان کی دلآویز شخصیت' قوم سے ان کی گہری ہمدردی' ان کا استغناء اور خودداری' محض لوگوں کی خاطر ان کی بھلائی کیلئے ان کے ظلم سہنا اور پھر ان کا بے عیب کردار جس کے تم بھی واقف ہو ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے وہ اگر پیغمبر نہیں تو اور کیا ہیں اس لئے یہ سوال تو خارج از بحث ہے کہ ہم ان کو پیغمبر کیوں سمجھتے ہیں ان کے تو طور اطوار خود بولتے ہیں کہ وہ یقیناً اللہ کے پیغمبر ہیں ہم تو ایک قدم آگے بڑھ کر آپ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم صرف انہیں پیغمبر ہی نہیں سمجھتے بلکہ جو کچھ انہیں دے کر بھیجا گیا ہے ان میں سے ایک ایک بات پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف بنیادی اعتقادات اور شرعی احکام ہی نہیں بلکہ ایک اور بہت اہم بات کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ دنیا میں جتنے بھی رسول آئے انہوں نے آکر ایک بات ضرور کہی اور ہمارے رسول پاک ﷺ نے بھی اسی بات کو زیادہ تفصیل سے بیان فرمایا وہ بات یہ ہے کہ ہر رسول اپنی قوم سے یہ کہتا رہا ہے کہ میں تمہاری طرف جو دعوت لے کر آیا ہوں اگر تم اسے قبول کرلو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی ساری خوشحالیاں تمہیں عطا کی جائیں گی' دنیا کی خلافت پر تم فائز

Marfat.com

کیے جاؤ گے۔ اس کی امامت وسیادت کا منصب تمہیں دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ آخرت کی سرافرازیاں بھی تمہارا مقدر ہوں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک سے زیادہ موقعوں پر یہ بات فرمائی کہ یہ کلمہ جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں یہ ایک مکمل دعوت ہے اگر تم اسے قبول کرلو تو تم عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم تمہارے سامنے جھک جائے گا اور قرآن کریم نے بھی واضح طور پر فرمایا کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور انفرادی اور اجتماعی زندگی اسی کے احکام کے مطابق گزارو اور اس کی زمین پر اس کی شریعت نافذ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں خلافت ارضی سے نوازے گا' تمہاری خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا اور تمہارے دین کو تمکن عطا فرمائے گا اور بعض جگہ یہاں تک فرمایا کہ اگر بستیوں والے ایمان لائیں اور تقویٰ کی زندگی اختیار کریں تو ہم ان پر آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیں گے۔ یہی وہ دعوت ہے جو ہر رسول نے پیش کی اور دنیا کو اسی انقلاب کی خبر دی۔ چنانچہ یہاں اسی جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے ہمیں جس انقلاب کی نوید سنائی ہے اور جس کی کامیابی سے حیرت انگیز تبدیلیاں آنے والی ہیں ہم ان میں سے ہر بات پر یقین رکھتے ہیں وہ وقت دور نہیں جب قیادتیں اور سیادتیں بدلیں گی۔ آنے والے وقت میں ہر غلط چیز مٹے گی اور ہر صحیح چیز کو اس کا جائز مقام ملے گا آج کے پسے ہوئے لوگ کل کے حکمران ہوں گے چنانچہ وہ طبقہ امراء اس طرح کی باتیں سن کر بجائے اثر قبول کرنے کے مشتعل ہو کر یا جھنجلا کر اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا:

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

''متکبروں نے کہا کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں' جس پر تم ایمان لائے ہو''۔ 76

یعنی جس انقلاب کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور تمہارے سینوں میں جو کروٹیں لیتا ہوا محسوس ہو رہا ہے ہم تو اس کو کسی طرح قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اس کی کامیابی کا مطلب تو یہ ہوگا کہ تم کل کو حکمران ہو گے اور ہم تمہاری چاکری کریں گے۔ کم از کم ہماری زندگی میں تو ایسا ہونا ممکن نہیں گمان یہ کہتا ہے کہ اس کے بعد ان کی جھنجلاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا ہوگا انہوں نے مسلمانوں کو ادھیڑنے کھدیڑنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہوگی۔ ہر جگہ ان کا تمسخر اڑایا ہوگا کہ ماشاءاللہ کیا بات ہے ان کی۔ یہ مستقبل کے حکمران ہیں جوتا پہننے کو نصیب نہیں کبھی ڈھنگ کے کپڑے انہوں نے نہیں دیکھے ایک وقت کھانے کو ملتا ہے تو دوسرے وقت فاقہ ہوتا ہے اور خواب یہ حکمرانی کے دیکھ رہے ہیں پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی جھنجلاہٹ اور ان کے غصے میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ انہوں نے وہ اقدام کر ڈالا جس نے امان کی وہ دیوار توڑ ڈالی جس کی وجہ سے وہ اب تک پناہ میں تھے اور عذاب کا وہ بند کھول دیا جس کے بند رہنے کی وجہ سے آج تک وہ اللہ کے غضب سے بچے ہوئے تھے چنانچہ قرآن کریم اس کی خبر دیتے ہوئے کہتا ہے:

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

''تو انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی' اور بولے اے صالح! اگر تم خدا کے فرستادہ ہو تو وہ عذاب ہم پر لاؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو''۔ 77

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اونٹنی کی پیدائش قوم کے مطالبے پر ہوئی تھی اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس طرح حیرت انگیز طریقے سے اونٹنی ایک چٹان سے نکل آئے اور وہ مطلوبہ صفات کی حامل بھی ہو تو ہم ایمان لے آئیں گے لیکن جب وہ اونٹنی کو اسی طرح دیکھ چکے جس طرح وہ چاہتے تھے تو بجائے ایمان لانے کے انہوں نے ایمان لانے سے انکار کر دیا اصولاً تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ اسی وقت اللہ کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑتا لیکن اللہ نے ان پر کرم فرمایا اور ان کو مہلت دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ اس اونٹنی کی حفاظت کرو اس کو کوئی گزند پہنچانے کی کوشش نہ کرنا اب تمہارے اور عذاب کے درمیان

Marfat.com

ٹنی ہے اگر تم نے اس کو نقصان پہنچایا تو عذاب تم پر ٹوٹ پڑے گا۔ اب جبکہ وہ یہ بھی کر گزرے تو اب تو انہیں کسی مزید مہلت کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت کرنے اور کرم فرمانے میں تو بہت جلدی فرماتے ہیں لیکن عذاب دینے میں ہمیشہ مہلت دینا پسند فرماتے ہیں اس لئے یہاں بھی بجائے فوری عذاب دینے کے تین دن کی مہلت دیتے ہوئے فرمایا کہ تین دن تک زندگی سے اور فائدہ اٹھا لو لیکن یہ آخری موقع ہے جو تمہیں دیا گیا ہے اس میں چاہو تو توبہ کر کے بچ جاؤ لیکن تین دن کے بعد تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ لیکن اس بگڑی ہوئی قوم کا حال یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ اللہ کی طرف رجوع کریں حضرت صالح علیہ السلام سے پوچھنے لگی کہ اس عذاب کی علامتیں کیا ہیں۔ آپ نے انہیں بتایا کہ کل جمعرات کو تمہارے چہرے زرد پڑ جائیں گے، جمعہ کو سرخ اور ہفتے کو سیاہ ہو جائیں گے اور اسی دن خدا کا عذاب آ جائے گا چنانچہ ہفتے کے دن ان پر خدا کا عذاب آیا۔ قرآن کریم اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتا ہے:

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ O

''پس ان کو کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے''۔ 78

عذاب کی کیفیت:

قرآنِ کریم نے اس عذاب کیلئے مختلف تعبیریں اختیار کیں یہاں رجفة سے تعبیر فرمایا جس کے معنی کپکپی کے بھی ہوتے ہیں اور زلزلے کے بھی اور دوسری جگہ اسے صیحة کا نام دیا جس کا معنی ڈانٹ اور چیخ کے ہیں۔ تیسری جگہ اس پر صاعقه کا لفظ بولا گیا جس کے معنی کڑکے کے ہیں اور سورۃ حاقہ میں اسے طاغیه سے تعبیر کیا جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی اور دہشت ناک ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی مرحوم نے ان چاروں تعبیرات کو سمیٹتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ انہوں نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے (اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے سرمائی بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب بھیجا چونکہ اصل تباہی ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر اثر سے مؤثر پر استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے سرما کے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہری کر دینے والی چیخ بھی چھپی ہوئی تھی جس طرح کہ قومِ عاد پر رعد و برق والے بادل بھیجے) مولانا نے تو رجفة کا معنی کپکپی کیا ہے اور اسی کو سامنے رکھتے ہوئے باقی الفاظ کو اس کا مؤید بنایا ہے لیکن رجفة کا معنی زلزلہ بھی غلط نہیں اگر یہی معنی مراد لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ثمود پر زلزلہ بھی آیا جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گر گئے اور ان پر تیز ہوائیں بھی چلیں جس نے ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیا اور یہ بھی ہم نے دیکھا ہے کہ زلزلے میں اگر شدت ہو تو اس میں سیٹیوں اور چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں عین ممکن ہے کہ ہوا کے طوفان اور زلزلے دونوں نے جمع ہو کر وہ شدت پیدا کی ہو جس کیلئے چار لفظ اختیار کئے گئے ہیں۔ اس طرح سے دنیا کی یہ سب سے مضبوط اور متمدن قوم عذاب کا شکار ہو کر تباہ ہو گئی اور عبرت کے طور پر اس کا ذکر باقی رکھا گیا۔

اس کے بعد کی آیت کریمہ میں حضرت صالح علیہ السلام کے آخری رویے اور آپ کے اظہارِ حسرت کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّىۡ وَ نَصَحۡتُ لَكُمۡ وَلٰـكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ O

''اور صالح یہ کہتے ہوئے ان کی بستیوں سے نکل گئے کہ اے میری قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی، مگر کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں''۔ 79

Marfat.com

پیغمبر کا اظہارِ حسرت:

اس آیت کریمہ کے بارے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم سے یہ بات عذاب آنے سے پہلے کہی یا بعد میں؟ دونوں باتوں کا امکان ہے اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا کہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو ان کی طرف آنے والے رسول اور ایمان لانے والوں کو وہاں سے ہجرت کا حکم دے دیا جاتا ہے یہاں بھی ممکن ہے ایسا ہوا ہو کہ جب انہیں تین دن کی مہلت دی گئی تو اس مہلت کا اعلان کرنے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام مسلمانوں کو ساتھ لے کر وہاں سے ہجرت فرما گئے اور جاتے ہوئے انہوں نے اپنی قوم سے یہ خطاب فرمایا۔ اور یہ تین دن کی مہلت دی گئی ہے اس میں بھی یہ مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ ان تین دنوں میں حضرت صالح اور ان کے ساتھی اس علاقہ سے اتنے دور نکل جائیں کہ عذاب کا کوئی اثر ان تک پہنچنے نہ پائے لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ خطاب عذاب سے پہلے کا ہے تو ترتیب بیان میں اسے عذاب کے ذکر کے بعد کیوں رکھا گیا؟ اس کا جواب بعض اہل علم نے یہ دیا ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضائے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اس کے نتیجہ فوری ظہور کو نمایاں کرنے کیلئے یہاں عذاب کو قتل ناقہ کے ساتھ متصل کر دیا اور حضرت صالح کی ہجرت کے ذکر کو پیچھے کر دیا گویا جونہی انہوں نے ناقہ کو گزند پہنچایا کر اللہ کو چیلنج کیا' عذاب آ دھمکا۔ عذاب کی یہ سبقت و مبادرت اچھی طرح ظاہر نہ ہوسکتی اگر بیچ میں کوئی اور بات ذکر میں آ جاتی۔

امکان اس بات کا بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح ترتیب میں اس بات کو عذاب کے بعد ذکر کیا گیا ہے واقع میں بھی ایسا ہی ہو یعنی اللہ تعالیٰ حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اسی علاقے میں کسی جگہ محفوظ رکھا ہو اور جب اس بدنصیب قوم پر عذاب مکمل ہو گیا تو حضرت صالح علیہ السلام نے ان کی لاشوں پر کھڑے ہوئے یہ بات فرمائی اور ہمیں اس کی مثال آنحضرت ﷺ کی زندگی میں بھی ملتی ہے کہ جنگ بدر کے بعد جب قریش کے مقتولین کی لاشوں کو ایک بند کنویں میں پھینک دیا گیا تو حضور تشریف لائے اور آپ نے اس کنویں کی منڈیر پر بڑے بڑے کافروں کا نام لے کر فرمایا کہ اب تو تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور میں جس بات کی تمہیں دعوت دیتا تھا وہ سچ اور حق ہے اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور یہ لوگ تو مردہ ہیں، آپ کی آواز کیونکر سن سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا تم سے زیادہ سنتے ہیں، البتہ! جواب نہیں دیتے۔ یہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنے مومن ساتھیوں کو یہ سنانے کیلئے تا کہ وہ آنے والی نسلوں کیلئے اسے عبرت کے طور پر زندہ رکھیں ان کی لاشوں پر کھڑے ہو کر اس حقیقت کا اعلان فرمایا کہ بدنصیبو! میں نے اللہ کے دین کو پہنچانے میں اور اس کی پیغام رسانی میں کوئی کمی نہیں کی تم نے ہر چند مجھے اذیتیں پہنچائیں لیکن میں نے اس کے جواب میں ہمیشہ تمہارے ساتھ خیر خواہی کی۔ تم گالیاں دیتے رہے' تکلیفیں پہنچاتے رہے لیکن میں نے ہمیشہ تم سے کلمۂ نصیحت کہا اور اللہ سے تمہاری ہدایت کی دعائیں مانگیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ تم اور تم جیسی اور بدنصیب قومیں ایسے بدنصیبی کے حصار میں ہیں کہ اس سے کبھی نکل نہیں سکتیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بدخواہ لوگ جو تمہاری دنیا بھی اجاڑتے ہیں اور تمہارے دین کے بھی دشمن ہیں تم ہمیشہ ان کی بات سنتے اور ان کے پیچھے چلتے ہو لیکن اپنے خیر خواہوں کو تم نے کبھی پسند کرنے کی زحمت نہیں کی۔ تم خوب جانتے ہو کہ میں نے ہر رسول کی طرح تمہارے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن تم نے میری کوئی بات مان کر نہیں دی۔ ہمیشہ ہر بات میں کیڑے ڈالے تم ہر دولت والے کے پیچھے چلتے ہو اور ہر ظالم اور جابر کے آگے دوڑتے ہو اور ان کی باتوں کی اطاعت کرتے ہوئے تمہیں کبھی خیال نہیں ہوتا کہ تم یہ کیا کر رہے ہو یہ ایک ایسا مرض ہے جس نے ہمیشہ قوموں کو تباہ کیا ہے۔ ٹھیک کہا حفیظ نے

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

Marfat.com

مشرکین مکہ اور دیگر نوع انسانی کو عبرت دلانے کیلئے مختلف معذب قوموں کے حالات بیان کئے جارہے ہیں تین قوموں کا تذکرہ ہو چکا اب چوتھی معذب قوم یعنی قوم لوط کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ ارشاد فرمایا جارہا ہے:

وَ لُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ O اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ O

''اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو''۔ 80-81

اس آیت کریمہ میں متعدد چیزیں وضاحت طلب ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کی تاریخ:

1- لوط علیہ السلام کون تھے؟ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ آپ نے نبوت ملنے کے بعد جب لوگوں کے سامنے اللہ کی دعوت پیش کی تو پوری قوم نے آپ کو جھٹلایا۔ آپ کے والد تک نے آپ کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ پر صرف دو شخص ایمان لائے ایک آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ اور دوسرے آپ کے بھتیجے حضرت لوط۔ انہوں نے اپنے عظیم چچا کے ساتھ گھر اور وطن چھوڑا ان کے ساتھ مل کر پردیس کی صعوبتیں اٹھائیں' مختلف ملکوں میں توحید کی دعوت کو عام کرنے کیلئے سفر کیا اور اسی سلسلے میں آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نگرانی میں تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دینے کی تربیت حاصل کرنے کا موقع بھی ملا۔ جب آپ نبوت کی عمر کو پہنچے تو اللہ نے آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔

2- آپ کس علاقے کی طرف مبعوث ہوئے؟ تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ آپ جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے وہ شام کے جنوبی علاقہ میں دریائے اردن کے اردگرد آباد تھی بلکہ عراق اور فلسطین کے درمیان جو علاقہ آج کل شرق اردن کہلاتا ہے یہی علاقہ اس قوم کا مسکن تھا۔ بائبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ اس سدوم کے ساتھ اس قوم کے چار اور بھی بڑے بڑے شہر آباد تھے جنہیں عمورہ' ارمہ' صبوبیم اور بالع یا صوغر ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے مجموعہ کو قرآن کریم نے مؤتفکہ اور مؤتفکات کہا ہے۔ یہ تمام شہر یا تو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھے اور یا اس جگہ واقع تھے جہاں اب بحیرہ مردار موجود ہے۔ تلموت میں لکھا ہے کہ ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہونے لگتی تھی مگر آج اس قوم کا نام ونشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کسی مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرہ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج تک بحر لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کو قوم کا بھائی قرار نہیں دیا گیا۔ کیوں؟

3- گزشتہ آیات میں حضرت نوح' حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اور ان تینوں کو اپنی قوم کا بھائی قرار دیا گیا ہے لیکن حضرت لوط علیہ السلام کے سلسلے میں یہ اسلوب بدل گیا ہے یہاں آپ کو ان کا بھائی کہہ کر ذکر نہیں فرمایا صرف اس قوم کو آپ کی قوم تو قرار دیا گیا ہے لیکن اس قوم کا بھائی آپ کو قرار نہیں دیا گیا ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ نسبی اور نسلی طور پر اس قوم کے فرد نہیں تھے البتہ آپ کا کوئی نہ کوئی

Marfat.com

رشتہ ان سے ضرور تھا جس کی وجہ سے اس قوم کو آپ کی قوم قرار دیا گیا ہے۔اب وہ رشتہ کیا تھا اس کو صراحت سے متعین کرنا مشکل ہے البتہ یہ بات تاریخی حقائق سے ثابت ہے کہ اس قوم سے آپ کا سسرالی رشتہ تھا یعنی آپ نے اس قوم میں شادی کی تھی اور آپ کی اہلیہ اس قوم کی بیٹی تھی ممکن ہے اس وجہ سے اس قوم کو آپ کی قوم قرار دیا گیا ہو۔ یہاں ذہن میں ایک اعتراض پیدا ہوسکتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون اس کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب بھی کوئی پیغمبر بھیجتا ہے تو اس کی اپنی قوم میں سے بھیجتا ہے۔جس سے اس کا نسب اور نسل کا تعلق ہوتا ہے وہ قوم اس کے آباؤ اجداد کو جانتی اور خود اسے بچپن سے لے کر نبوت کے دعوے تک پہچانتی ہے اس کی زندگی کا ایک ایک دور قوم کے سامنے ہوتا ہے اس لئے جب وہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو چونکہ دونوں میں اجنبیت کی کوئی دیوار نہیں ہوتی تو عموماً اجنبیت میں مخالفین اس طرح کی بے سروپا باتیں کیا کرتے ہیں۔ وقت کا پیغمبران سے محفوظ رہتا ہے پھر نسل اور نسب کے لحاظ سے زبان کی یکسانی کے اعتبار سے وطن کے حوالے سے چونکہ جانبین میں ایک اپنائیت موجود ہوتی ہے اس لئے بات کو سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی رہتی ہے جو لوگ ایمان لاتے ہیں پورے اعتماد کے ساتھ لاتے ہیں اور جو لوگ مخالفت کرتے ہیں وہ اپنی مخالفت میں مخلص نہیں ہوتے کیونکہ ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ پاکیزہ اطوار شخص یقیناً جھوٹ نہیں بولتا لیکن پھر بھی اگر وہ مخالفت سے باز نہیں آتے تو ان پر اتمام حجت ہو جاتا ہے جس کے بعد فیصلے کی گھڑی قریب آجاتی ہے۔ اللہ کے اس قانون کو دیکھتے ہوئے یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کو اجنبی قوم میں مبعوث کیوں فرمایا گیا؟ لیکن جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتراض میں کوئی گہرائی نہیں۔ اپنی قوم کی طرف مبعوث کئے جانے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اجنبیت افہام وتفہیم میں رکاوٹ نہ بن سکے جس طرح یہ رکاوٹ رنگ ونسل کے رشتے سے اور وطن اور زبان کی یکجائی سے دور ہوتی اسی طرح کسی قوم میں پیغمبر کا زیادہ عرصہ تک قیام اور اس قوم کے ساتھ رشتہ داری اور پھر زبان کا ایک ہونا یہ باتیں بھی اجنبیت کو دور کر دیتی ہیں۔ چنانچہ لوط علیہ السلام کی قوم اگرچہ آپ کا اپنا خاندان نہیں تھا لیکن آپ کی ان کے ساتھ رشتہ داری' آپ کا ان کے اندر طویل قیام اور پھر زبان کی یکسانی یہ اس مقصد کو آسانی سے پورا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے پیغمبر اپنوں میں مبعوث ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہیں کہ انہیں آل فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا جبکہ آپ اس خاندان میں سے نہیں تھے لیکن چونکہ آپ کا خاندان بنی اسرائیل ایک طویل عرصے سے ان کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا آپ کا بچپن اور جوانی بھی فرعون کے گھر اور آل فرعون میں گزری تھی اس لحاظ سے آپ ان کیلئے قطعاً اجنبی نہیں تھے۔ دعوت وتبلیغ کیلئے جس حد تک تعارف اور اپنائیت ضروری ہے وہ چونکہ آپ کو میسر تھی اس لئے آپ کو آل فرعون کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا۔ یہی حال حضرت لوط علیہ السلام کا بھی اس لئے اس اعتراض میں کوئی وزن باقی نہیں رہ جاتا کہ آپ کو ایک اجنبی قوم کی طرف کیوں بھیجا گیا۔

4- تمام انبیاء کرام کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دعوت ایک ہی رہی ہے وہ ہے توحید اور اللہ کی بندگی کی دعوت ہر پیغمبر نے مبعوث ہونے کے بعد اسی دعوت سے اپنے مشن کا آغاز کیا لیکن یہاں حضرت لوط علیہ السلام کے سلسلے میں اس بنیادی دعوت کا تذکرہ نہیں فرمایا گیا۔ آخر یہ اسلوب کلام کیوں بدلا گیا اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

(i) قرآن کریم نے دوسری جگہ اصولی طور پر یہ بات واضح فرما دی ہے کہ ہم نے ہر امت کی طرف رسول بھیجا ہے اور ہر رسول نے آکر یہ دعوت دی ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو یعنی تمہیں اللہ کی بندگی کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ تم کسی اور طاغوت کے سامنے سر جھکا سکتے ہو نہ اس کی اطاعت مطلقہ کا دم بھر سکتے ہو نہ اپنے سینوں کو صرف اسی کی محبت سے آباد کر سکتے ہو نہ اس کی قدرتوں پر آخری حد تک اعتماد کر سکتے ہو۔ یہ حقوق صرف اللہ کریم کے ہیں اس کی ذات' اس کی صفات' اس کے حقوق اور اس کے اختیارات میں کسی اور کو شریک کرنے کی اجازت نہیں یہ وہ

Marfat.com

اصولی بات ہے جو قرآن کریم میں وضاحت سے کہہ دی گئی ہے اس اصولی بات کو سامنے رکھیں تو یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ یہاں اگرچہ کسی مصلحت کے باعث اس بنیادی دعوت سے قوم لوط کا تذکرہ نہیں فرمایا جارہا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے یہ دعوت ضرور پیش کی ہوگی۔

اسلوبِ دعوت کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ:

(ii) بعض قباحتیں اور برائیاں جو چاہیں کتنی عظیم ہوں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی میں ان کے در آنے کا امکان موجود ہوتا ہے اور اسی وجہ سے قرآن کریم بار بار اس پر تنبیہ بھی کرتا ہے کہ دیکھنا تمہاری زندگی میں یہ قباحتیں کہیں داخل نہ ہو جائیں۔ ان قباحتوں میں سب سے بڑی قباحت شرک ہے جس کی طرف قرآن کریم بار بار توجہ دلاتا ہے کیونکہ اس برائی کے پیدا ہو جانے کے بعد دین سے بیگانگی اور سیرت و کردار میں خرابی ایک لازمہ کی حیثیت رکھتی ہے جنہیں کسی طور پیدا ہونے سے روکا نہیں جا سکتا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے انسانی طبیعت میں ہر وقت اس بات کا امکان موجود رہتا ہے کہ آدمی کبھی نہ کبھی شرک کی کسی نہ کسی صورت کا ارتکاب کر بیٹھے۔ انسان اپنی ذات میں کیسا بھی عظیم سہی لیکن اس کی فطرت میں ایک ان دیکھی ذات کی جو طلب رکھی گئی ہے اور اس کی ذات کی تکمیل کیلئے جس طرح خالق و مالک کی محبت کا جذبہ مضمر کیا گیا ہے اسے اگر صحیح راہنمائی نہ دی جائے تو اس کا غلط رخ اختیار کر جانا ہر وقت ممکن ہوتا ہے۔ توحید یقیناً مذہب کی بنیاد ہے لیکن شرک کیلئے ایک سے زیادہ امکانات موجود رہتے ہیں اس لئے انبیاء کرام نے انسانوں کو اس کمزوری سے بچانے کیلئے ہمیشہ اپنی دعوت کا اسے موضوع بنایا ہے لیکن اگر کسی شخص یا کسی قوم کو کسی ایسی برائی میں ملوث دیکھا جائے جس کیلئے اس کی زندگی میں کوئی امکانی اپیل موجود نہ ہو جس کی طرف اس کی فطرت کبھی میلان نہ رکھتی ہو۔ جس کا انسان کی سرشت سے کوئی تعلق نہ ہو تو یقیناً ایک داعی اور مبلغ اصل دعوت کی بجائے سب سے پہلے وہ اس پر تنقید کرتا ہے۔ اسے اس بات پر شدید دکھ ہوتا ہے کہ یہ شخص یا یہ قوم تو سرے سے اپنی فطرت اور اپنی سرشت بگاڑ چکی ہے اس لئے خلاف فطرت امور اس سے سرانجام پا رہے ہیں اگر اسے اس سے نہ روکا گیا تو اصل دعوت کے پیش کرنے کا کبھی موقع نہیں آئے گا۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آپ کسی کے پاس بلند اخلاق کی دعوت لے کر جائیں۔ آپ یہ چاہیں کہ آپ اس کو مکارم اخلاق سمجھائیں لیکن جب آپ اس کے پاس پہنچیں تو آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں کہ وہ بچوں کو ذبح کر رہا ہے' عورتوں کی چھاتیاں کاٹ رہا ہے' دودھ پیتے بچوں کو ماؤں سے چھین کر نیزوں پر اچھال رہا ہے' عورتوں کی عزتیں سب کے سامنے پامال کر رہا ہے تو آپ اس کے سامنے مکارم اخلاق کی دعوت نہیں رکھیں گے بلکہ اسے سب سے پہلے اس بات سے روکنے کی کوشش کریں گے یا آپ کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ نجاست کھا رہا ہے اور کسی دماغی فتور میں مبتلا بھی نہیں تو یقیناً آپ اس کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرنے سے پہلے اس کے اس گندے طرز عمل پر اسے توجہ دلائیں گے۔ یہاں بھی قرآن کریم نے حضرت لوط علیہ السلام کے سلسلے میں یہی اسلوب اختیار فرمایا کہ دعوت تو حضرت لوط علیہ السلام کی بھی وہی ہے جو باقی انبیاء کرام کی تھی لیکن آپ نے جب انہیں ایک فاحشہ میں مبتلا دیکھا جس میں انسان کم کم مبتلا ہوتے ہیں اور جو سراسر خلاف فطرت ہے تو آپ نے سب سے پہلے اپنی اصلاحی کاوشوں کا اسے موضوع بنایا۔ جس طرح ایک شرابی کو شراب کے نشے میں کوئی عقل کی بات نہیں سمجھائی جا سکتی اسی طرح خلاف فطرت امور میں مبتلا شخص کو کوئی فطری' عقلی' اخلاقی اور دینی بات نہیں سمجھائی جا سکتی۔ اس لئے جہاں اصل پانی مر رہا تھا آپ نے وہیں سے اصلاح کا آغاز فرمایا اور انہیں شرم دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم الفاحشہ کا ارتکاب کر رہے ہو۔ فاحشہ عربی زبان میں ایسی کھلی بے حیائی کو کہتے ہیں جس کے بے حیائی ہونے میں کسی حیادار کو شبہ نہ ہو اور پھر یہاں فاحشہ نہیں فرمایا بلکہ الفاحشہ فرمایا جبکہ سورۃ بنی اسرائیل میں زنا' جو سب سے بڑی اخلاقی برائی

Marfat.com

ہے اسے فاحشہ قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ زنا کتنی بڑی بے حیائی بھی ہو انسانی زندگی میں بہرحال اس کا امکان موجود رہتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کیلئے جنسی طلب رکھتے ہیں اور جیسے ہی اللہ کا خوف آدمی سے الگ ہوتا ہے تو جنسی طلب اسے اپنی طرف کھینچتی ہے تو پھر کسی وقت بھی اس بے حیائی کا ارتکاب ناممکن نہیں رہتا۔ قوم لوط کی جس بے حیائی کا تذکرہ ہو رہا ہے وہ اگرچہ اپنے نتائج کے اعتبار سے زنا کے برابر کی برائی نہیں لیکن چونکہ وہ اپنے اندر فطری طلب نہیں رکھتی بلکہ وہ فطرت سے ایک طرح کی بغاوت معلوم ہوتی ہے اس لئے جب کوئی آدمی اس کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا وہ فطرت سے جنگ کرتا ہے اس لئے یہاں اسے الفاحشہ قرار دیا گیا ہے یعنی ایک ایسی جانی پہچانی بے حیائی' کہ جس میں ذرہ برابر بھی شرم و حیا موجود ہے وہ اس سے کراہت محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید نے فرمایا کہ تم ایک ایسی بے حیائی کا ارتکاب کر رہے ہو جس کا اس سے پہلے کبھی کسی نے ارتکاب نہیں کیا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ قوم لوط سے پہلے دنیا میں اس برائی کا کوئی تصور نہیں تھا یہ وہ انتہائی بگڑی ہوئی قوم ہے جس نے سب سے پہلے اس برائی کو وجود دیا اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ برائی تو دنیا میں افراد کی حد تک ضرور موجود تھی اور آج بھی موجود ہے لیکن قومی سطح پر اس برائی کا ارتکاب اس سے پہلی کبھی کسی نے نہیں کیا یعنی ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ پوری قوم کی قوم اس میں ملوث ہو جائے اور ان کے سوچنے سمجھنے والے دماغ بھی بجائے اس کی مخالفت کرنے کے خاموش ہو جائیں یا حوصلہ افزائی کرنے لگیں۔ دنیا میں یہ پہلی قوم ہے جس نے انتہائی قابل کراہت اس برائی کو اجتماعی سطح پر قبول کیا اور رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ نہ صرف اس برائی کا برائی ہونا ان کی نگاہوں میں ختم ہو گیا بلکہ وہ اپنی مجلسوں میں اس برائی پر فخر بھی کرنے لگے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک ایسی قابل نفرت برائی جس کی وجہ سے پوری قوم تباہ کر دی گئی آج کے روشنی کے زمانہ میں جبکہ علم و ہنر اپنی معراج کو پہنچ چکے اور مغربی قومیں اپنی تہذیب پر ناز کرتے ہوئے نہیں شرماتیں نہ صرف کہ ان میں یہ برائی موجود ہے بلکہ انہوں نے قوم لوط اور یونانیوں کی طرح سرے سے اسے برائی ہی نہیں رہنے دیا برطانیہ کی پارلیمنٹ میں باقاعدہ تالیوں کی گونج میں اس مکروہ فعل کو سندِ جواز عطا کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کے بگڑے ہوئے ادیبوں اور فلسفیوں نے اس برائی کی تائید اور سپورٹ میں لٹریچر کا ایک ذخیرہ فراہم کر دیا۔ آپ کسی بڑی لائبریری میں چلے جائیے وہاں آپ کو (Gay Style of Life) کے عنوان سے الگ سیکشن ملیں گے جس میں اس انتہائی گھناؤنے جرم کی افادیت اور اہمیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ امریکہ میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اسے (Human Urge) قرار دیا گیا ہے۔ چند سال پہلے خلیج کی امریکی فوج میں سے ایک ہزار آدمی نکالے گئے تھے جو اس برائی میں ملوث تھے چنانچہ جب وہ امریکہ میں پہنچے تو وہاں کے پریس نے اس پر شدید احتجاج کیا کہ یہ کونسا جرم ہے جس کی بنیاد پر ان کو وہاں سے نکالا گیا یعنی اس کو جرم ماننے سے انکار تو ایک طرف رہا وہ تو اسے انسانی فطرت کی آواز قرار دے رہے ہیں۔ باقاعدہ اس کے کلب وجود میں آ چکے ہیں اور بعض گھروں میں ایسے جوڑے میاں بیوی کی طرح زندگی گزار رہے ہیں جو مرد اور عورت پر مشتمل نہیں بلکہ مردوں پر مشتمل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یورپ نے اپنے طور پر اللہ کے غضب کو دعوت دینے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن ان پر اللہ کا عذاب صرف اس لئے نہیں آ رہا کہ امت مسلمہ کی جانب سے ان پر اتمام حجت نہیں کیا گیا اور جب تک اتمام حجت نہ ہو اللہ کبھی کسی قوم کو عذاب نہیں دیتا۔

قوم لوط کی برائی کا صراحت سے ذکر اور اس کی وضاحت:

اگلی آیت کریمہ میں اس برائی کو صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ تمہارے بگاڑ کی انتہاء یہ ہے کہ عورتیں تمہاری جنسی ضرورت کیلئے پیدا کی گئی ہیں لیکن تم انہیں چھوڑ کر مردوں سے اپنی ضرورت پوری کرتے ہو اور پھر الرجال کا لفظ قابلِ توجہ ہے۔ رجال پختہ سن و سال کے مردوں کو کہتے ہیں اس کے استعمال سے ایک تو اس فعل کے گھناؤنے پن کا اظہار ہو رہا ہے۔ دوسرے اس سے اس دیوثیت کا اظہار ہو رہا ہے جو کسی قوم میں اس مرض خبیث

Marfat.com

عام ہو جانے کی صورت میں لازماً پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے عام ہو جانے کی صورت میں سن و سال کی تمیز بالکل اٹھ جاتی ہے پھر ہر عمر کے دیوث قوم میں پھیل جاتے ہیں اور ان کیلئے یہ لعنت عادت اور پیشہ بن جاتی ہے۔ من دونِ النساء کے الفاظ اس قلب ماہیت کو ظاہر کر رہے ہیں جو اس فسادِ طبیعت کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ یہ ایک صریح حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی حیات انواع میں نر و مادہ کا فرق محض تناسل اور بقائے نوع کیلئے رکھا ہے اور نوع انسانی کے اندر اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اس سے تمدن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کیلئے مرد اور عورت کی دو الگ الگ صنفیں بنائی گئی ہیں' ان میں ایک دوسرے کیلئے صنفی کشش پیدا کی گئی ہے' ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصدِ زوجیت کیلئے عین مناسب بنائی گئی ہے اور ان کے جذب و انجذاب میں وہ لذت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشاء کو پورا کرنے کیلئے بیک وقت داعی و محرک بھی ہے اور اس خدمت کا صلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس اسکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذت حاصل کرتا ہے وہ ایک ہی وقت میں متعدد جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اولاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں خللِ عظیم برپا کر دیتا ہے جس سے دونوں کے جسم' نفس اور اخلاق پر نہایت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ثانیاً وہ فطرت کے ساتھ غداری و خیانت کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ فطرت نے جس لذت کو نوع اور تمدن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا اور جس کے حصول کو فرائض اور ذمہ داریوں اور حقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا وہ اسے کسی خدمت کی بجا آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر چرا لیتا ہے۔ ثالثاً وہ انسانی اجتماع کے ساتھ کھلی بددیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کئے ہوئے تمدنی اداروں سے فائدہ تو اٹھا لیتا ہے مگر جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی بجائے اپنی قوتوں کو پوری خودغرضی کے ساتھ ایسے طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدن و اخلاق کیلئے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مضرت رساں ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خدمت کیلئے نااہل بناتا ہے اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا کرتا ہے اور کم از کم دو عورتوں کیلئے بھی صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اس جرم کی اسی شناعت اور ہلاکت آفرینی کے باعث اسلام نے اگرچہ اس پر حد جاری تو نہیں کی کیونکہ مسلمانوں کا اسلامی مزاج اسے کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتا لیکن اس کی ہولناکی کے باعث آنحضرت ﷺ نے تعزیر کے طور پر اس کی سخت سزا مقرر فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے دونوں کو قتل کر دو اور کبھی آپ نے فرمایا فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔ مسلمانوں کے مجموعی مزاج کے اسے قبول نہ کرنے کے باعث آنحضرت ﷺ کے زمانے میں کوئی ایک واقعہ بھی اس طرح کا پیش نہ آیا اس لئے اس کی کوئی سزا متعین نہ ہو سکی۔ اگر اس کی حیثیت حد کی ہوتی تو وہ بہرصورت متعین ہوتی۔ صحابہ کرام نے بھی اسے چونکہ تعزیر ہی جانا اس لئے ان میں اس سزا کے تعین میں اختلاف ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: کہ ایسا جرم کرنے والوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی لاشیں جلا دی جائیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غالباً یہ کہا کہ ایسے شخص کو کسی بلند عمارت یا پہاڑ پر کھڑا کر کے نیچے گرا دیا جائے اور اس پر وہ عمارت گرا دی جائے یا اس پر پتھر برسائے جائیں۔ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے صراحتہً اسے تعزیر قرار دیتے ہیں اور حالات کے مطابق اس کی سزا کے تعین کے قائل ہیں۔ اس تفسیر سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اہل علم کی نگاہ میں یہ ایک بدترین برائی ہے جس کا مسلمانوں میں کبھی چلن نہیں ہونا چاہئے اور اگر کہیں اس کے آثار نظر آئیں تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر ممکن طریق سے اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے کیونکہ جس برائی کے باعث اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا اسے کسی طرح بھی ہلکے انداز میں لینا ہرگز مناسب نہیں۔ اگلی آیت کریمہ میں اس جرم کی مزید شناعت اور اخلاقی تباہی اور اس کے نتائج کو بیان کیا گیا ہے کہ جب کوئی قوم اس عادت بد کا شکار ہوتی ہے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہر طرح کے اخلاقی مکارم سے محروم ہو گئی ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی

Marfat.com

جبلت اور سرشت اس حد تک تبدیل ہوگئی ہے جس کا ایک نقشہ اس آیت کریمہ میں کھینچا جارہا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ج اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ O

''نہیں تھا اس قوم کا جواب مگر یہ کہ وہ کہنے لگے کہ نکالو ان لوگوں کو اپنی بستی سے بے شک یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں''۔82

قوم لوط کے بگاڑ کی انتہا اور اس کے نتائج:

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے اس جواب پر غور فرمائیے کہ لوط علیہ السلام نے ہر ممکن طریق سے ان کے سامنے ان کی اخلاقی برائیوں کو واضح کرنے کی کوشش فرمائی۔نہایت مؤثر انداز میں انہیں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ تم جس عادتِ بد کا شکار ہوگئے ہو یہ ایک ایسا جرم ہے جسے اجتماعی شکل میں اللہ کی زمین پر کسی قوم نے اختیار نہیں کیا۔بڑی سے بڑی گناہگار اور پاپی قومیں گزری ہیں لیکن وہ اپنے تمام جرائم کے باوجود اس طرح کی مکروہ حرکت کے مرتکب کبھی نہیں ہوئے۔اس لئے تمہیں سوچنا چاہئے کہ تم نے جو طور اطوار اختیار کرلئے ہیں اس کا نتیجہ آخر کیا ہوگا؟ تمہاری نسلیں تباہ ہوجائیں گی۔تم اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوچکے ہو مزید برباد ہوجاؤ گے۔تمہاری عورتیں آوارہ ہوجائیں گی۔تم ہر طرح کے اخلاقی مفاسد کا شکار ہو کر رشتوں کی آبرو سے محروم ہوجاؤ گے لیکن حضرت لوط علیہ السلام کی کسی نصیحت کا ان پر اثر ہونا تو دور کی بات ہے انہوں نے ان کے وجود کو بھی اپنے لئے ناقابلِ برداشت محسوس کرنا شروع کردیا۔انسان کے بگاڑ میں ایک تدریج ہوتی ہے جس طرح اصلاح کا عمل آہستہ آہستہ اپنی معراج کو پہنچتا ہے اسی طرح بگاڑ کے سفر میں بھی کئی مدارج آتے ہیں جس کے اندر ذرہ برابر بھی خیر باقی ہوتا ہے وہ کہیں نہ کہیں جاکر رک جاتا ہے یا اور کچھ نہیں تو وہ یہ ضرور محسوس کرتا ہے کہ میں جو کچھ کررہا ہوں یہ ایک برائی ہے جب تک یہ احساس زندہ رہتا ہے وہ جرم چھپا کر کرتا ہے اور پھر ہر وقت اس بات کی امید رہتی ہے کہ شاید کبھی وہ راہ راست اختیار کرلے لیکن جب آدمی اس سفر پر رواں دواں رہتا ہے تو آخر ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسے برائی اچھائی معلوم ہونے لگتی ہے اور برائی سے روکنے والے لوگ اس کو اپنے دشمن معلوم ہوتے ہیں وہ برائی سے اس حد تک مانوس ہوجاتا ہے کہ اس سے روکنے والے اس کیلئے ناقابل برداشت ہوجاتے ہیں پھر اسے یکسوئی حاصل کرنے اور اپنی خوشیوں کو مکمل کرنے کیلئے اس کے سوا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا کہ وہ برائی سے روکنے والوں کی زبانیں بند کردے اور انہیں اپنے شہر سے نکال دے۔قوم لوط بھی معلوم ہوتا ہے اس برائی کے ارتکاب کے نتیجے میں برائی کے احساس سے محروم ہوگئی تھی بلکہ برائی اسے نیکی معلوم ہونے لگی تھی۔اب اس کیلئے حضرت لوط کا وجود ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا اسلئے جب آپ نے ان پر تنقید جاری رکھی تو بالآخر انہوں نے آپ کی تنقید کے جواب میں یہ کہا کہ ہم تو اپنا رویہ بدلنا نہیں چاہتے ہم نے اپنی خوشیوں کیلئے جو راستہ طے کرلیا ہے اسے چھوڑ دینا ہمارے لئے گوارا نہیں اور تم اگر ہماری بستی میں رہتے ہو تو تم یقیناً ہمیں اس سے روکو گے اس سے ہمارے رنگ میں بھنگ پڑے گا' ہماری خوشیاں گہنا کر رہ جائیں گی اس لئے اب ایک ہی راستہ ہے کہ تمہیں یہاں سے نکال دیا جائے۔آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ لوط اور اس پر ایمان لانے والے چونکہ اپنے آپ کو بڑا پاکباز سمجھتے ہیں، ہمارا ان سے نباہ نہیں ہوسکتا، اس لئے انہیں اس بستی سے نکال باہر کرو۔ان کا یہ کہنا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو پاکباز سمجھتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک پاکبازی ایک جرم بن کر رہ گیا تھا جس طرح ناک کٹوں میں ناک والا نکو بن کر رہ جاتا ہے اور تمام اسے اپنے مذاق کا نشانہ بنالیتے ہیں اسی طرح برائی میں ڈھل جانے والے لوگ نیکی کو ایک مذاق سمجھنے لگتے ہیں اور نیکی کا درس دینے والوں کو وہ اپنا دشمن خیال کرتے ہیں اور جو آدمی انہیں خیر خواہی میں بار بار انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ یا اسے قتل کردیتے ہیں اور یا اسے اپنے شہر سے نکال دیتے ہیں۔غالب نے عشق و محبت کے تناظر کے حوالے سے جو بات کہی وہ نیکی اور برائی کے رشتے کے حوالے سے بھی ایک حقیقت ہے اس نے کہا تھا

Marfat.com

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیۓ غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اللہ کا قانون:

اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب تک قومیں اللہ کے رسول کو برداشت کرتی ہیں وہ انہیں ڈھیل دیتا رہتا ہے اور جب قوموں کیلئے اللہ کا رسول اور اس کی دعوت نا قابل برداشت ہو جاتے ہیں تو پھر وہ پیغمبر کو ہجرت کر جانے کا حکم دیتا ہے اور قوم کو عذاب کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قومِ لوط نے بھی جب آپ کو شہر سے نکالنے کا فیصلہ کیا تو گویا انہوں نے خودکشی کا فیصلہ کیا کیونکہ پیغمبر اپنی قوم میں روح کی مانند ہوتا ہے جس طرح جسم سے روح نکل جائے تو جسم کو باہر پھینک دیا جاتا ہے اس طرح قوم جب رسول کی دعوت سے لاتعلقی کا اعلان کر دیتی ہے اور رسول کی ذات کو برداشت کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو پھر رسول کے وہاں سے ہجرت کر جانے کے بعد وہ قوم ایک مردار کی شکل اختیار کر لیتی ہے جسے باقی رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ قومِ لوط کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اللہ نے حضرت لوط علیہ السلام کو اس بستی سے نکلنے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھنا اب یہ بستی اور اہل بستی تباہ کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اسی کا تذکرہ فرمایا جا رہا ہے:

فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ O

''پس ہم نے لوط اور اس کے اہل خانہ کو نجات دی سوائے اس کی بیوی کے وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی''۔83

یعنی یہ پورا علاقہ اور اس پر بسنے والی یہ قوم اللہ کے عذاب کا شکار ہوئی صرف ایک حضرت لوط علیہ السلام کا گھر اس عذاب سے محفوظ رہا۔ اس گھر کے رہنے والوں کو سرِ شام ہی وہاں سے نکل جانے کا حکم ملا جب یہ لوگ اگلی صبح تک اس گھر سے اتنا دور نکل گئے کہ عذاب کے اثرات سے محفوظ رہ سکتے تھے تب اللہ کا عذاب اس قوم پر آ دھمکا اور اس بری طرح انہیں تباہ کیا کہ آج ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔ اس آیت کریمہ میں اہل کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام کے ساتھ صرف آپ کے اہل خانہ کو اس عذاب سے بچایا گیا تھا البتہ آپ کی بیوی چونکہ اسی قوم کی ایک فرد تھی تو قومی عصبیت نے اسے حق کو قبول کرنے سے روکا اور وہ بھی اپنی قوم کے ساتھ اس عذاب کا شکار ہوئی۔ اندازہ فرمایئے! اللہ تعالیٰ کے فیصلے کتنے بے لاگ ہیں کہ بچانے پر آتا ہے تو ہر اس شخص کو بچاتا ہے جس کے پاس ایمان کی دولت ہو چاہے وہ اپنی ذات میں کتنا بھی بے قیمت کیوں نہ ہو اور پکڑنے پر آتا ہے تو نہ پیغمبر کی بیوی بچتی ہے نہ پیغمبر کا بیٹا نہ پیغمبر کا چچا اور نہ پیغمبر کا باپ کیونکہ اس کی نگاہوں میں حقیقی قدر و قیمت صرف ایمان و عمل کی ہے اس آیت کریمہ کی پہلی آیت میں اُنَـاسٌ کا لفظ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اہل خانہ کے علاوہ بھی کچھ لوگ آپ پر ایمان لائے ہوں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ اور لوگ ایمان لائے بھی تھے تو ان کی تعداد بہت محدود تھی اور ان کا آپ سے تعلق قرابت داری کا تھا اس لئے ایک طرح سے وہ بھی آپ کے اہل خانہ میں ہی سے تھے اس لئے الگ سے ان کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس کے بعد عذاب کی ہلکی سی تفصیل بیان کی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ O

''اور ہم نے ان پر بارش برسائی پھر دیکھئے کیسے ہوا انجام جرم کرنے والوں کا''۔84

Marfat.com

قوم لوط پر عذاب کی وضاحت:

آیت کے پہلے جملے میں بارش برسانے کا ذکر ہے لیکن بارش کی تفصیل بیان نہیں فرمائی گئی البتہ دوسرے جملے سے اس بارش کی ہولنا کی کی طرف اشارہ ضرور ہے چنانچہ جب ہم قرآن پاک کی دوسری آیت کو دیکھتے ہیں تو اس سے ہمیں اس کی تفصیل معلوم ہوتی ہے ایک آیت میں ارشاد فرمایا گیا:

فَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةً

جب ہمارا حکم (عذاب) آ گیا تو ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر کے رکھ دیا اور ہم نے اس پر کھنگر کے پتھر برسائے تہہ بتہہ نشان زدہ

یعنی اس بستی پر اللہ کا عذاب اس طرح آیا کہ پہلے اس پوری بستی کو الٹ دیا گیا پھر اس پر ایسے پتھروں کی بارش کی گئی جو پکی ہوئی مٹی سے تیار ہوئے تھے اور اس زور کی بارش ہوئی کہ پتھروں کی تہہ لگ گئی اور ایک ڈھیر پر دوسرا ڈھیر کھڑا ہو گیا اور عجیب بات یہ کہ ان میں سے ہر پتھر پر کوئی نہ کوئی نشان لگا ہوا تھا۔ بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ ہر پتھر پر اس مجرم کا نشان تھا جس مجرم کے سر پر جا کر اس پتھر کو پڑنا تھا۔ اس طرح اس قوم کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم اپنے تمام شہروں سمیت بحر مردار کے نیچے دفن ہے اس لئے اس بحر مردار کو بحر لوط کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ اس قوم پر حاصب کا عذاب آیا تھا یعنی ان پر ایک زوردار آندھی آئی تھی جو صحرا سے اٹھی اور صحرائی سنگ ریزے اٹھاتی ہوئی اس قوم پر جا پڑی۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں مزید تیزی آتی گئی جس کی وجہ سے ان کی عمارتیں بھی ڈھے گئیں۔ ایک ایک شخص ان سنگ ریزوں کا شکار ہوا اور لاشیں ان کی عمارتوں کے نیچے دب گئیں اور پھر نجانے کب تک ان پر یہ سنگ باری ہوتی رہی اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمین پھٹی اور یہ اپنی بستیوں سمیت زمین کی آغوش میں سما گئے اور بحر مردار نے اوپر سے ان کو ڈھانپ لیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔

....

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ
وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ
بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَ
لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ

Marfat.com

اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا
فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ كَانَ
طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا
فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾
قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ
اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ
مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ
فِيْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ
عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ
اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ
اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ
فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ
لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾
فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ
لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

Marfat.com

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا شعیب نے کہا اے برادران قوم اللہ ہی کی عبادت کرو تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آ گئی پس پورا پورا ناپ تول کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی مت کرو زمین کی درستگی کے بعد اس میں فساد مت پھیلاؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور نہ بیٹھو ہر راستے پر کہ لوگوں کو تم ڈراؤ اور تم روکتے ہو اللہ کے راستے سے جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اور تم اس میں کجی تلاش کرتے ہو اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تم میں اضافہ کیا اور دیکھو کیسے انجام ہوا فساد مچانے والوں کا۔ اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور اس کی قوم کے بڑوں نے 'جنہوں نے تکبر کیا' کہا کہ اے شعیب! ہم تم کو اور جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال کے رہیں گے یا تم ہماری ملت میں پھر آ جاؤ۔ اس نے کہا کیا جب کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہوں تب بھی! ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنے والے ٹھہریں گے اگر ہم تمہاری ملت میں لوٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی۔ یہ ہم سے تو ہونے کا نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارے رب ہی کی مشیت ہو تو اور بات ہے۔ ہمارے رب کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ ان بڑوں نے جنہوں نے اس کی قوم میں سے کفر کیا کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو بڑے خسارے میں پڑو گے۔ پس ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے۔ اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ اے برادرانِ قوم میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبولِ حق سے انکار کرتی ہے۔

..................☆......☆......☆..................

مشرکین مکہ اور دوسرے لوگوں کو عبرت دلانے کیلئے چار معذب قوموں کا تذکرہ ہو چکا۔ اب پانچویں قوم قومِ شعیب کا تذکرہ کیا جا رہا ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ط قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا ط ذٰلِکُمْ

Marfat.com

خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ O وَ لَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ O

''اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا شعیب نے کہا اے برادران قوم اللہ ہی کی عبادت کرو تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آ گئی پس پورا پورا ناپ تول کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی مت کرو زمین کی درستگی کے بعد اس میں فساد مت پھیلاؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور نہ بیٹھو ہر راستے پر کہ لوگوں کو تم ڈراؤ اور تم روکتے ہو اللہ کے راستے سے جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اور تم اس میں کجی تلاش کرتے ہو اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تم میں اضافہ کیا اور دیکھو کیسے انجام ہوا فساد مچانے والوں کا''۔ 85-86

ان دونوں آیات کریمہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی اس دعوت کو بیان کیا گیا ہے جو آپ نے اپنی قوم کے سامنے پیش فرمائی۔ اس سے پہلے کہ اس دعوت کی تفصیل بیان کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قومِ شعیب جنہیں مدین کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس کے بارے میں کچھ ضروری باتیں کہہ دی جائیں۔

قومِ شعیب کی تاریخ اور حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت:

مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی قطوراء کے صاحبزادے مدیان کی اولاد ہیں۔ ان کی طرف منسوب ہونے کے باعث آل مدین یا آل مدیان کہلاتے ہیں اور کثرت استعمال سے صرف مدین استعمال ہونے لگا یہ پوری قوم مدیان کی اولاد پر ہی مشتمل نہ تھی بلکہ جو لوگ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے یا وہاں بس جانے کی وجہ سے اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرنے لگے وہ بھی مدین یا آل مدین کہلائے۔

مدین کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں، بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور ینبوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی اور ایک دوسری تجارتی شاہرہ جو عراق سے مصر جاتی تھی اس کے عین چوراہے میں ان کی بستیاں آباد تھیں۔ اپنے محل وقوع کی اہمیت اور افادیت کے باعث ان کے باقی متمدن ملکوں سے قریبی تعلقات بھی قائم تھے اور تجارتی روابط کے باعث ان کی مالی اور اقتصادی حالت نہایت مضبوط تھی۔ ان کا پیشہ چونکہ بنیادی طور پر تجارت تھا اس لئے جب ان میں عقیدے کی خرابی کے ساتھ ساتھ اخلاقی فساد پیدا ہوا تو وہ سارے عیوب ان میں در آئے جو عام طور پر کاروباری بے راہ روی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اسی وجہ سے حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی دعوت میں عقیدے کی خرابی کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کے کاروباری خرابیوں پر بطور خاص تنقید فرمائی چنانچہ قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کی جو تفصیل بیان فرمائی ہے اسے سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے سب سے پہلے وہی اصولی بات بیان فرمائی جس سے ہر پیغمبر اپنی دعوت کا آغاز کرتا رہا کہ اے میری قوم کے لوگو! تمہاری ساری برائیوں اور خرابیوں کی بنیاد یہ ہے کہ تم نے اس زمین پر اپنے آپ کو ایک خودرو پودا سمجھ لیا ہے جو کسی نہ کسی طرح وجود میں تو آ گیا ہے لیکن اس کے وجود کا کوئی مقصد نہیں اور نہ اسے کبھی کسی کے سامنے جواب دہی کرنی ہے وہ جب تک زندہ ہے تو محض زندگی کیلئے زندہ ہے اور اس کی زندگی کی ساری مصروفیات صرف ضروریات کے حصول یا ضروریات سے فائدہ اٹھانے کیلئے ہے دنیا میں جو شخص بھی آیا ہے اس کا کام یہ ہے کہ وہ کھائے پیئے، بہتر سے بہتر مکان بنائے، اچھی سے اچھی سواری تلاش کرے، خوبصورت بیوی سے نکاح کرے، اولاد کی خوشیاں دیکھے، اپنے پہلو میں جو خواہشات کا سمندر رکھتا ہے اس میں جب چاہے جیسے چاہے

Marfat.com

ڈبکیاں لگاتا پھرے اس کے ارادوں میں نیک و بد کی کسی تمیز کا سوال پیدا نہیں ہوتا' اس کی زندگی کی کوئی جہت ہے نہ کوئی منزل' وہ جس معاشرے میں رہتا ہے اس میں نہ کوئی حقوق ہیں نہ فرائض' اخلاق نام کی کسی چیز کا اس کے پاس گزر ہی ممکن نہیں' وہ ایک نباتاتی اور حیوانی زندگی گزارتا ہے اور جب بھی موت آئے گی تو اس کی زندگی کا آخری حرف بھی مٹ جائے گا۔ اس میں کسی آقا و مالک کا کوئی تصور نہیں جس کے سامنے جواب دہی کرنی ہو۔ اس زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا کوئی وجود نہیں' جس کیلئے تیاری کرنی ہو۔ حضرت شعیب نے اپنی قوم سے کہا کہ یہی وہ تصور ہے جس نے تمہاری زندگیوں کو نیکی کے نور سے محروم کر دیا ہے تمہاری انسانیت حیوانیت کی نذر ہو گئی ہے' تمہارے سامنے جلبِ زر کے سوا اور کوئی مقصد نہیں تم دوسروں سے بالا بلند رہنا چاہتے ہو چاہے اس کیلئے تمہیں دوسروں کا خون پینا پڑے۔ تمہارے زندگی کے اسی تصور نے اللہ کی زمین کو فساد سے بھر دیا ہے اس لئے جب تک تم اس بنیادی بات کو نہ سمجھ لو کہ تم کوئی خودرو پودا نہیں ہو تمہارا ایک خالق و مالک ہے اس حکیم ذات نے تمہیں ایک مقصدِ زندگی دے کر پیدا کیا ہے اس مقصدِ زندگی کو پورا کرنے کیلئے اس نے ایک قانون عطا کیا ہے اور اس قانون کو پہنچانے اور دنیا میں اسے برپا کرنے کیلئے اللہ نے اپنے رسول بھیجے انہوں نے آکر یہ تعلیم دی کہ تمہیں یہاں ہمیشہ نہیں رہنا' ایک دن تمہیں موت آئے گی اور یہ موت بھی آخری موت نہیں ہوگی پھر ایک دن ایسا آئے گا جسے قیامت کہتے ہیں۔ تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ہر شخص اللہ کے سامنے زندگی کے اعمال کا حساب دینے کیلئے پیش کیا جائے گا۔ کامیابی اسے ملے گی جس کی زندگی کے اعمال اچھے ہوں گے اور جس نے زندگی اپنے آقا کے احکام کے مطابق نہیں گزاری ہوگی وہ ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ آپ نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ تمہاری زندگی کی بہتری اور کامیابی صرف اس بات کو سمجھنے میں ہے کہ تمہارا ایک آقا اور معبود ہے اس کی آقائی اور بندگی میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس ایک تصور کو قبول کر لینے کے بعد تمہاری ایک ایک فکری کجی اور ایک ایک بے راہ روی کا علاج ہو جاتا ہے اور زندگی کی ایک ایک چول اپنی جگہ ٹھیک بیٹھ جاتی ہے۔ اسی بات کو سمجھانے کیلئے میں تمہارے پاس اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ رہی یہ بات کہ میں واقعی اس کا رسول ہوں یا نہیں اس کیلئے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے بینہ آ گیا ہے۔ اس بینہ سے دو باتیں مراد ہو سکتی ہیں یا تو یہ بات کہ حضرت شعیب علیہ السلام کو اللہ نے اسی طرح بہت نمایاں قسم کے چند معجزات عطا فرمائے تھے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائے گئے جنہیں دیکھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ شخص واقعی اللہ کا رسول ہے اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی ذات بجائے خود بینہ ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت' اس کی شخصیت کی دلآویزی' اس کی بے عیب زندگی' سچائی کے تول تلنے والا اس کا ہر عمل اور قول' وہ ان پتھروں کے ڈھیر میں چمکتے ہوئے ایک ہیرے کی مانند ہوتا ہے جسے دیکھنے والا ہر فرد اپنے دل میں یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یقیناً یہ شخص اللہ کا رسول ہے چاہے وہ اپنے جاہلی تعصبات کی وجہ سے ماننے سے انکار بھی کرے۔ حضرت شعیب بھی ایسے ہی تھے جو چلتے پھرتے اپنی قوم میں اللہ کی دلیل تھے اور جن کی ذات قوم کیلئے مینارۂ نور تھی اور ان کی زندگی ان گم گشتگان کیلئے ایک ایسا نور کا سامان تھی جس سے راستے کی ہر تاریکی دور ہو جاتی ہے۔

قوم شعیب کی دو نمایاں خرابیاں:

اس کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی اس نمایاں گمراہی کا ذکر فرمایا ہے جس کی وجہ سے وہ قوم دوسری قوموں کیلئے ایک عذاب بن گئی۔ چونکہ یہ قوم بنیادی طور پر ایک تجارت پیشہ قوم تھی اور اس زمانے کے متمدن ممالک کو جانے والی تجارتی شاہراہیں ان کے ملک سے ہو کر گزرتی تھیں یہ ان شاہراہوں پر قابض ہونے کی وجہ سے اگر ایک طرف تجارتی مفادات حاصل کرنے میں بڑی آسانی محسوس کرتے تھے تو دوسری طرف گزرنے والے تجارتی قافلوں کو مختلف طریقوں سے لوٹنا ان کا دل پسند مشغلہ بن گیا تھا۔ تجارت کوئی بھی ہو اس کی بنیاد لین دین کے طریقوں کا ٹھیک ہونا ہے جس

Marfat.com

یہ طریقے کیل اور وزن کے نام سے یاد کئے جائیں یا آج کی زبان میں کسی اور نام سے۔اس زمانے میں چونکہ لین دین زیادہ تر ناپ تول سے ہوتا تھا اس لئے بطور خاص اس کا ذکر کیا گیا ہے۔مقصود یہ ہے کہ تمہیں اپنے تجارتی معاملات میں دیانت و امانت کو اصول بنانا چاہئے۔اس لئے جب تم دوسرے لوگوں سے معاملہ کرو تو ان کی چیزوں میں کمی مت کرو۔یہ کوشش نہ کرو کہ جب لو تو پورا لو اور جب دینے کا وقت آئے تو کسی نہ کسی طریقے سے نقصان پہنچاؤ یعنی کوئی چیز اگر تول کر یا ناپ کر دو تو ہر صورت میں ڈنڈی مار لیتے ہوئے بھی خیانت کرو اور دیتے ہوئے بھی خیانت کرو اور یہ خیانت صرف ناپنے تولنے کی چیزوں میں نہیں بلکہ ہر طرح کے حقوق میں بھی مراد ہے۔ناپ تول میں کمی کو تطفیف کہا گیا ہے لیکن حضرت عمر فاروق ؓ نے اس لفظ کی معنویت میں وسعت پیدا فرمائی اور یقیناً انہوں نے یہ بات آنحضرت ﷺ سے سیکھی ہوگی آپ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جو تعدیل ارکان کا خیال کئے بغیر جلدی جلدی نماز پڑھ رہا تھا۔آپ نے اسے بلا کر فرمایا کہ تم نے تطفیف کا ارتکاب کیا ہے کہ نماز کے جو ارکان ہیں تم نے انہیں ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد' ان کو ٹھیک طرح سے انجام دینا اور معاملات میں ٹھیک ٹھیک اپنی ذمہ داری کا ادا کرنا اور ہر معاملے میں دیانت و امانت کو رہنما بنانا یہ وہ چیز ہے جس سے انسانی معاشرے میں ایک توازن اور اعتدال قائم ہوتا ہے اور اسی کے نتیجے میں معاشرہ متوازن ہوتا اور پھلتا پھولتا ہے۔جس طرح اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بغیر ستون کے توازن اور عدل کے سہارے کھڑا کیا ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی اسی توازن اور عدل کے نتیجے میں آسودہ ہوتی اور برگ و بار پیدا کرتی ہے۔جس گھر میں حقوق و فرائض میں توازن ہوتا ہے اس گھر میں خوشیوں کی پھوار پھوٹتی ہے اور جس معاشرے میں یہ توازن وسیع سطح پر قائم ہو جاتا ہے وہ معاشرہ جنت کا نمونہ بن جاتا ہے اور قوم شعیب بنیادی طور پر اس توازن کو چھوڑ چکی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ انکی بے اعتدالیوں سے زمین میں فساد پھوٹ پڑا تھا۔حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری اجتماعی زندگی اس فساد سے محفوظ رہے تو پھر تم اپنے معاشرے میں اس میزان کو قائم کرنے کی کوشش کرو اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین فساد سے بھر جائے گی حالانکہ تم جانتے ہو کہ اللہ کی اس زمین میں جب انسانی فساد انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ پھر زیادہ ڈھیل نہیں دیتے تم سے پہلی قوموں نے زمین میں فساد مچایا' حقوق و فرائض شکست کئے تو بالآخر وہ تباہ کر دی گئیں تو زمین کی اس درستی کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں اب موقع دیا ہے کہ تم زمین کے اس نظام کو باقی رکھو اور اس میں فساد نہ پھیلاؤ کیونکہ فساد پھیلانے والی قوم کے مٹ جانے کے بعد زمین فساد سے پاک ہو جاتی ہے تمہیں ایک اصلاح یافتہ زمین ملی لیکن تم دوبارہ اسے فساد سے بھرے دے رہے ہو تم اگر واقعی اپنے پہلو میں ایمان رکھتے ہو اور تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ پہلی قومیں اللہ کی نافرمانی کے باعث ہی عذاب کا شکار ہوئیں تو پھر میں جو کچھ تمہیں کہہ رہا ہوں تمہارے لئے اسے قبول کرنے میں ہی خیریت ہے۔یہاں ممکن ہے آپ کو یہ خیال پیدا ہو کہ وہ لوگ تو کافر تھے انہیں مومن کیوں کہا جا رہا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ یہ قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدیان کی طرف منسوب تھی اس لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہدایت کی کسی حد تک وارث بھی تھی وہ اگرچہ اپنے بگاڑ میں بہت دور نکل چکے تھے لیکن وہ ہدایت کی بنیادی باتوں سے بالکل تہی دامن نہ تھی۔یوں کہہ لیجئے کہ وہ اپنے دور کے بگڑے ہوئے مسلمان تھے،اس لئے انہیں مومن کہہ کر اصلاح کی طرف راغب کیا جا رہا ہے۔اگلی آیت کریمہ میں ان کے بگاڑ کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے کہ حبِ دنیا اور طلب منفعت کے جوش نے تمہارا یہ حال کر دیا ہے کہ تجارتی قافلے جن راستوں سے گزرتے ہیں تم ان راستوں پر بیٹھ کر زبردستی ان سے ٹیکس وصول کرتے ہو۔اور انہیں ڈرا دھمکا کر جو مفادات بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں انہیں حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔آج بھی آپ ملک کے بہت سارے حصوں میں دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی کسی وڈیرے یا ٹھیکیدار کو موقع ملتا ہے وہ ایک چوکی بنا کر چند لوگوں کو آنے جانے والی گاڑیوں سے نام نہاد ٹیکس وصول کرنے پر لگا دیتا ہے اور آزاد قبائل میں تو قدم قدم پر آپ کو ایسی صورتحال کا

Marfat.com

مشاہدہ کرنے کا موقع ملے گا۔ یہ قوم شعیب بھی معلوم ہوتا ہے اپنے محل وقوع سے فائدہ اٹھاتی ہوئی تجارتی قافلوں پر اسی طرح ظلم توڑتی تھی اور دوسری حرکت ان کی یہ تھی، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم اور آنے جانے والے لوگوں کے سامنے بھی اللہ کے دین کی دعوت پیش کرتے ہوں گے اور ان کی قوم کا حال یہ تھا کہ جہاں بھی انہیں خبر ہوتی کہ کوئی شخص حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لایا ہے تو وہ ہر ممکن طریقے سے اسے روکنے کی کوشش کرتے' ڈراتے دھمکاتے بھی اور فکری کج روی کا سامان بھی کرتے' مختلف غلط فہمیاں پیدا کرتے' عجیب وغریب سوالات اٹھاتے تاکہ لوگ بدگمان ہو کر حضرت شعیب کو چھوڑ دیں۔ تنبیہ کے اس انداز کے ساتھ ساتھ ترغیب کا انداز بھی اختیار فرمایا گیا کہ دیکھو تم ایک مختصر سے خاندان کی صورت میں اس جگہ پر آ کر آباد ہوئے تھے اور آج اللہ نے تمہیں ایک بڑی قوم میں تبدیل کر دیا ہے اور تمہیں جائے سکونت ایسی بخشی ہے جس کی وجہ سے تمہارا تمام متمدن ملکوں سے رشتہ ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ تم تاریخ سے ناواقف نہیں ہو تم خوب جانتے ہو کہ تم سے پہلے جن لوگوں نے تمہاری طرح زمین میں فساد پھیلایا ان کا انجام کیا ہوا۔ ایک طرف اللہ کی نعمتیں ہیں اور دوسری طرف تاریخ کا یہ ہولناک سبق ہے۔ کیا ان دونوں میں سے تم کسی سے بھی فائدہ نہ اٹھاؤ گے بلکہ ہر موقع پر تم کوئی نہ کوئی اعتراض کر کے پہلو بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتے ہو چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں ان کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اور اس جواب میں ان کا اعتراض جھلکتا ہوا صاف محسوس ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ج
وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ O

''اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے''۔ 87

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم آپ کی دعوت کے مقابلے میں اس مقام تک پہنچ گئی تھی جب آدمی کے پاس دلائل ختم ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اپنے انکار اور اپنی ہٹ دھرمی کو سخن سازیوں اور کٹ حجتیوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ حضرت شعیب کی مؤثر اور مدلل دعوت نے ان کی زبانیں بہت حد تک گنگ کر دی تھیں اور ان کا سرمایۂ استدلال بری طرح مفلس ثابت ہو رہا تھا۔ اب انہوں نے یہ رویہ اختیار کیا کہ بات بات میں الجھاؤ پیدا کرو اور سیدھی سادھی بات جو معمولی غور وفکر سے سمجھ میں آ سکتی ہو اس پر اعتراض کرو تاکہ سادہ دل لوگ اس دعوت کو قبول کرنے سے بچے رہیں چنانچہ اسی سلسلے کا ان کا یہ اعتراض بھی تھا کہ تم بار بار ہمیں یہ کہتے ہو کہ جس دعوت کو میں لے کر آیا ہوں اس کے قبول کرنے پر تمہاری دنیوی اور اخروی کامرانی کا دارومدار ہے اور اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو تم دنیا میں عذاب کا شکار کر دیئے جاؤ گے اور آخرت میں ہمیشہ کیلئے جہنم تمہارا ٹھکانہ ہو گا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ تمہاری قوم کا ایک حصہ تم پر ایمان لایا ہے اور دوسرے حصے نے تمہیں ماننے سے انکار کیا ہے لیکن انجام کے اعتبار سے دونوں اپنی اپنی حالت پر قائم ہیں۔ ایمان لانے والے پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایمان لانے سے ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جس طرح حالات کے ہاتھوں وہ پہلے مجبور تھے اب بھی مجبور ہیں۔ معاشرے میں جو عزت انہیں پہلے بھی حاصل نہیں تھی اب ان کی حالت اس سے بھی دگرگوں ہے رہا دوسرا گروہ تو وہ ایمان نہ لانے کے باوجود اسی طرح اپنی خوشحالیوں میں مست ہے ایسا نہیں ہوا کہ ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کے حالات بگڑ گئے ہوں وہ پہلے بھی معاشرے کا بااثر اور مؤثر طبقہ تھا اب بھی اسے وہی حیثیت حاصل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان وعمل کے حوالے سے تمہاری بات

Marfat.com

سخن سازی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر ان کی کوئی حقیقت ہوتی تو مسلمان آج سرفراز ہوتے اور کافر اپنے زخم چاٹ رہے ہوتے۔ اس کے جواب میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئیں۔ اس آیت کریمہ میں غور کرنے سے یہ دونوں باتیں سمجھ میں آتی ہیں ایک تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور دوسرا صاحب ایمان لوگوں کی خاص حیثیت کو واضح کیا ہے۔ ہدایت وضلالت کے معاملے میں اس کا قانون یہ ہے کہ جب اس کا کوئی رسول کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے تو اگر اس کی قوم اس کی تمام تر دعوتی کوششوں کے باوجود ایمان لانے سے یکسر انکار کر دے اور پھر وہ انکار پر اڑی رہے تو اللہ کے رسول کی جانب سے ان پر اتمام حجت ہو جانے کی وجہ سے جلدی ان پر اللہ کا عذاب آ جاتا ہے لیکن اگر صورتحال یہ ہو کہ قوم کا ایک حصہ ایمان لائے اور دوسرا اپنے کفر پر جما رہے تو اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں کو تا حد امکان مہلت دیتا ہے کیونکہ ایک طبقے کا ایمان لانا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سرزمین میں نمی باقی ہے اگر مزید محنت کی جائے تو ممکن ہے کچھ اور لوگ ایمان لانے کیلئے تیار ہو جائیں اس لئے انہیں مہلت دی جاتی ہے تاکہ پیغمبر اور اہل ایمان اپنی کوششوں کو مزید تیز کریں اور اس لسی (چھاچھ) میں اگر کچھ مکھن کے اثرات باقی ہیں تو مسلسل بلونے سے انہیں نکالنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن اگر ایمان لانے کا یہ سلسلہ بالکل رک جاتا ہے تو پھر پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے اور پیچھے رہ جانے والی کافر قوم پر اللہ کا عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تم پر چونکہ ابھی اللہ کا عذاب نہیں آیا تو تم اور صاحب ایمان لوگ برابر ہو ایسا نہیں بلکہ تمہیں ایمان لانے کیلئے مہلت دی جا رہی ہے کہ تم اگر آپ اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہو تو تمہیں اس مہلت سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور دوسری بات جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ موجود ہے وہ یہ ہے کہ اے کافرو لوگو! تمہیں اس کا احساس نہیں کہ تم پر جو اللہ کا عذاب ابھی تک نہیں برسا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے اور ان کی وجہ سے تمہاری مہلت دراز ہو گئی۔ تمہیں تو ان کا ممنون احسان ہونا چاہئے کہ تمہاری قیامت ان کی وجہ سے ٹلی ہوئی ہے اور ان کا وجود تمہارے لئے باعث نعمت ہے لیکن اگر اس نعمت سے تم نے فائدہ نہ اٹھایا تو مہلت اپنی طبعی عمر کے بعد ختم ہو جائے گی اور تم پر اللہ کا عذاب آ جائے گا اس لئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ اور انتظار کرو کہ کب اللہ تعالیٰ تم میں فیصلہ فرماتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھو کہ یہ فیصلہ ٹلنے والا نہیں لیکن اس کے اچھے یا برے ہونے کا دارومدار تمہارے اپنے فیصلے پر ہے چاہو تو ایمان لا کر دنیا اور آخرت کی کامرانیاں خرید لو اور چاہو تو کفر پر قائم رہ کر دونوں جہانوں کی روسیاہیاں مول لے لو۔

دعوتی استدلال اور ان کے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب جب اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے اور اس کے باوجود بھی پیغمبر کی قوم دعوت قبول کرنے کی بجائے نہ صرف کہ اپنی مخالفت سے باز نہیں آتی بلکہ اس کی مخالفت انتقام کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور وہ آخری اقدام پر تل جاتی ہے کہ یا تو اس پیغمبر کو قتل کر دیا جائے اور یا اسے اپنی بستیوں سے نکال دیا جائے کیونکہ ہماری اور اس کی زندگی میں جو بعد المشرقین ہے ان کا ایک ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ ہم اپنی زندگی کا رویہ بدل نہیں سکتے اور پیغمبر اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے ہم پر تنقید سے رک نہیں سکتے۔ ہمارے اعصاب آہستہ آہستہ اس تنقید کی برداشت سے جواب دیتے جا رہے ہیں اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ہمارا پسماندہ اور زیرنگیں طبقہ اس دعوت کے زیر اثر باغی ہوتا جا رہا ہے۔ اب ہمیں آخری اقدام کر ہی گزرنا چاہئے چنانچہ یہ وہ فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے جب اللہ کی جانب سے فیصلے کا وقت قریب آ جاتا ہے چنانچہ اگلی آیات کریمہ میں دعوت کے اسی مرحلے پر جو کچھ پیش آتا ہے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے اور پھر جس طرح اس کے نتیجے میں اللہ کا عذاب آ کر کافروں کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے اس کو بیان کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ

Marfat.com

مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوۡ كُنَّا كٰرِهِيۡنَ O قَدِ افۡتَرَيۡنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنۡ عُدۡنَا فِىۡ مِلَّتِكُمۡ بَعۡدَ اِذۡ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنۡهَا ؕ
وَمَا يَكُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّعُوۡدَ فِيۡهَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَىۡءٍ عِلۡمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡنَا ؕ
رَبَّنَا افۡتَحۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَ قَوۡمِنَا بِالۡحَقِّ وَاَنۡتَ خَيۡرُ الۡفٰتِحِيۡنَ O

''اور اس کی قوم کے بڑوں نے' جنہوں نے تکبر کیا' کہا کہ اے شعیب' ہم تم کو اور جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال کے رہیں گے یا تم ہماری ملت میں پھر آ جاؤ۔ اس نے کہا کیا جب کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہوں تب بھی! ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنے والے ٹھہریں گے اگر ہم تمہاری ملت میں لوٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی۔ یہ ہم سے تو ہونے کا نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارے رب ہی کی مشیت ہو تو اور بات ہے۔ ہمارے رب کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے''۔ 88-89

آیتِ کریمہ میں مضمر حقائق:

آیت کریمہ کے الفاظ پر غور کیجئے تو کئی حقیقتیں کھل کر سامنے آتی ہیں سب سے پہلی بات یہ کہ حضرت شعیب اور ان کے ساتھیوں کو جو لوگ ڈ[را] دھمکا رہے ہیں اور ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں وہ عام لوگ نہیں بلکہ اس قوم کا متکبر طبقہ ہے جن کی خوشحالی اور امارت نے ان کے دماغ میں خناس بھر دیا ہے وہ باقی قوم سے اپنے آپ کو الگ اور مراعات یافتہ طبقہ سمجھتے ہیں آج کی زبان میں یہ اس دور کے وی۔ آئی۔ پی لوگ ہیں۔ ان کی سوچ' ان کی معاشرت' ان کے طرز اطوار' ان کے تعلقات قوم کے دوسرے لوگوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ ان کی آبادیاں بھی دوسروں سے جدا ہوتی ہیں ان کی تقریبات میں غریب کو بار نہیں ملتا بلکہ ان کے اپنے جیسے اس میں مدعو کئے جاتے ہیں۔ اس لئے جب کوئی عوام میں سے اٹھ کر ان کی ہدایت کیلئے کوشش کرتا ہے اور ان کی غلطیوں پر انہیں ٹوکتا ہے تو شروع شروع میں تو وہ اسے درخور اعتناء نہیں سمجھتے لیکن رفتہ رفتہ جب یہ دعوت زور پکڑنے لگتی ہے تو پھر وہ سنجیدگی سے اس کا قلع قمع کرنے کیلئے تل جاتے ہیں۔ ایک تو وہ اپنی زندگی پر تنقید برداشت نہیں کر سکتے اور دوسری بات جو ان کو مشتعل کرتی ہے وہ یہ کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس پیغمبر کی دعوت نے پسماندہ طبقے میں زندگی کی حرارت پیدا کر دی ہے وہ لوگ جو کبھی ان کے نام سے کانپتے تھے اور ان کے پاؤں کی چاپ سے ان کی جان ہوا ہونے لگتی تھی وہی ان کے سامنے کھڑے ہو کر دوبدو باتیں کرنے لگے ہیں۔ انہیں حیرانی ہوتی ہے کہ یہ لوگ جو ہر طرح ہمارے دست نگر ہیں اور جنہوں نے ہمارے مظالم پر کبھی اف کرنا نہیں سیکھا آج انہیں کیا ہو گیا ہے کہ حقوق آشنائی کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں میں معرفتِ ذات کے دیئے جلنے لگے ہیں اور ان کے لہجے سے جرأت اور استقامت بولنے لگی ہے یہ چیز انہیں اور پریشان کرتی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری خاص حیثیت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے یہ طبقاتی تقسیم اب شاید باقی نہیں رہے گی اور یہ معصوم سا انقلاب اگر برپا ہو گیا تو آج کا بالادست طبقہ کل کو زیردستوں کے ساتھ کھڑا ہو گا یہ احساس انہیں ہضم نہیں ہوتا اور یہی اصل وہ سبب ہے جس کی وجہ سے وہ پیغمبر اور اہلِ ایمان کو برداشت کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا کا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ پیغمبر انہیں نیکی کی دعوت دیتے ہیں اور لوگ نیکی کے راستے پر چلنا نہیں چاہتے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بالادست طبقہ اور مراعات یافتہ گروہ اپنی حیثیت سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا۔ انہوں نے جس طرح سے اپنے جیسے انسانوں کو ایک مدت سے غلام بنا کر رکھا ہے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ آج کے غلام کل کے آقا بن سکتے ہیں۔ آلِ فرعون کا کوئی فرد کس طرح یہ

Marfat.com

آپ کو بنی اسرائیل کے برابر سمجھ سکتا ہے۔ شودر پڑھ کے ہزار لائق ہو جائے لیکن برہمن کبھی اسے اپنے برابر قبول کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا۔ ایک جاگیر دار اور ہاری' ایک وڈیرہ اور مزارع' مالک اور مزدور' امیر اور غریب یہ ایک ایسی تقسیم ہے جسے ختم کرنا کسی کے بس میں نہیں اور اللہ کے رسول اسی تقسیم کو ختم کرنے کیلئے دنیا میں تشریف لاتے ہیں۔ محروم طبقہ جب ان کی دعوت میں اپنی محرومیوں کا مرہم دیکھتا ہے تو وہ ان کے گرد اکٹھا ہونے لگتا ہے اور امراء کا طبقہ اسی اجتماعیت میں اپنے لئے موت محسوس کرتا ہے۔ حقیقت میں یہی کشمکش ہے جو بظاہر دین کے حوالے سے چلتی ہے لیکن حقیقت میں یہ معاشرتی اور سماجی کشمکش ہے۔ اس آیت کریمہ میں اسی کشمکش کی طرف اشارہ ہے کہ قوم کے بڑے لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ دعوت روز بروز نفوذ پیدا کرتی جا رہی ہے اور غریب لوگ اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں انہوں نے آنے والے خطرے کو محسوس کر کے آخری اقدام کا فیصلہ کر ڈالا۔ فرق صرف یہ ہے کہ بجائے قتل کے فیصلے کے انہوں نے ملک بدر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت شعیب کی قوم مختلف قبائل کا مجموعہ تھی قبائلی زندگی میں کسی ایک قبیلے کے کسی فرد کو قتل کر دینا بہت مشکل کام ہوتا ہے کیونکہ کوئی قبیلہ اپنے کسی آدمی کے مارے جانے پر قصاص لئے بغیر چین سے نہیں بیٹھتا اور قبائل کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ دین کے اختلاف کے باوجود بھی قبیلے آپس میں ایک دوسرے سے تعاون جاری رکھتے ہیں اور جب ایک لڑائی ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے تک متعدی ہوتی ہے تو پھر اس کے اثرات اور وسعت کو روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اس لئے قبائل کے سردار ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی قبیلے کا کوئی آدمی دوسرے قبیلے والے کے ہاتھوں نہ مارا جائے اور اگر ایسا ہو تو قصاص یا دیت سے یہ معاملہ حل ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ اس آگ کو پھیلنے سے روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے یہ سبب تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں نے حضرت شعیب اور آپ پر ایمان لانے والوں کو ملک بدر کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے دھمکی دیتے ہوئے یہ بات کی کہ دو راستے تمہارے سامنے ہیں یا تو تم اس نئے دین سے لاتعلقی کا اظہار کر دو اور اپنے پرانے دین میں واپس آ جاؤ اور اگر یہ منظور نہیں تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے۔ غور فرمایئے کہ حضرت شعیب کی قوم دو مطالبے پیش کر رہی ہے۔ دین سے برگشتگی یعنی ارتداد ورنہ ملک بدری۔ ان دونوں میں سے ہر سوچنے والا یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ دین کا معاملہ زیادہ آسان ہے۔ قبول کرنے کے بعد چھوڑا بھی جا سکتا ہے اور چھوڑ کر قبول بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ملک چھوٹ جانا یہ ایک بہت بڑا حادثہ ہے وطن تو انسان کی زندگی ہے اور وطن کی محبت انسان کی شریانوں میں دوڑتی ہے اس سے نکل جانے کا تصور بھی انسان کیلئے نہایت ہولناک ہے اس لئے ہونا یہ چاہئے کہ حضرت شعیب سب سے پہلے اس مطالبے پر بات کرتے کہ بھئی نظریاتی بحثیں تو چلتی رہیں گی میں نے تمہارے سامنے جو دعوت پیش کی ہے تم اسے قبول نہ کرو لیکن اس کو لڑائی تک پہنچا دینا تو کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ لیکن جہاں تک تعلق ہے ملک سے نکالنے کا تو یہ تو نہایت نامناسب بات ہے۔ ہم ایک مدت دراز سے اس ملک میں اکٹھے رہ رہے ہیں ہماری آپس میں بیسیوں نسبتیں ہیں تو کیا تم کسی نسبت کا بھی خیال کئے بغیر ہمیں ملک سے نکال دو گے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے ملک اور وطن سے حوالے سے کوئی بات نہیں کی بلکہ اس مطالبے کو مکمل طور پر نظر انداز فرمایا اور اگر کوئی بات کہی تو دین اور ملت کے حوالے سے کہی کہ تمہاری ملت اور تمہارا دین اگر قابل قبول ہوتا اور ہم اسے اس قابل سمجھتے کہ وہ اللہ کے یہاں قابل قبول ہو سکتا ہے تو ہم اسے پہلے ہی کیوں چھوڑتے۔ اب جبکہ ہم اسے غلط سمجھ کر چھوڑ چکے ہیں اور اس کے مقابلے میں اللہ کی طرف سے نازل کردہ سچے دین کو قبول کر چکے ہیں تو اب اگر اس سچے دین سے ہم پھر جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس سچ کی خاطر ہم نے جھوٹ کو چھوڑا تھا وہ سچ حقیقت میں سچ نہیں تھا ہم نے بلاوجہ اس کی نسبت اللہ کی طرف کی تھی یہ سراسر ایک جھوٹی دعوت تھی جو میں تمہارے سامنے پیش کرتا رہا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ آج تک میں نے جو کچھ کہا وہ سراسر اللہ پر ایک بہتان اور تہمت تھی ظاہر ہے یہ بات میں کسی طرح بھی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا بلکہ میں تو اس پر اللہ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے ہمیں

Marfat.com

اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آنے کی ہمت عطا فرمائی۔ جس غلط زندگی سے اللہ نے ہمیں نجات بخشی ہے تو تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اللہ کے اس احسان کو رد کر کے دوبارہ اندھیروں کا مسافر بن جاؤں اس لئے میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ تم کبھی اس کا تصور بھی نہ کرو کہ میں اور میرے ساتھی دوبارہ کبھی تمہارے باطل دین کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ اپنے اس عزم بالجزم کا اظہار کرنے کے بعد ایک عجیب بات فرمائی کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارا عزم تو راسخ ہے اس میں تو کسی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن میں اس عزم پر کلیۃً اعتماد نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ انسان اپنی ساری خود اعتمادی کے باوجود نہایت کمزور واقع ہوا ہے۔ اگر اللہ کسی کام کو نہ چاہے تو انسان کے سارے ارادے دھرے رہ جاتے ہیں اس لئے اللہ ہی نے ہمیں یہ بات سکھائی ہے کہ جب تم کسی بات کیلئے عزم کرو تو ہمیشہ اس پر اللہ کی توفیق مانگو اور ساتھ ہی یہ ضرور کہو کہ میں تو یہ کام کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا ہوں لیکن ساتھ ہی اللہ پر حقیقی اعتماد کا اظہار بھی کرتا ہوں۔ ایمان اصل میں انہی دونوں چیزوں کا نام ہے ایک عزم بالجزم کا دوسرا تفویض الی اللہ کا کہ آدمی اس بات کا پابند ہے کہ وہ ارادے کی پختگی کے ساتھ اور جسم و جان کی پوری توانائی کے ساتھ باطل سے ترک تعلق کرے اور حق سے اپنا رشتہ باندھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کا بھی پابند ہے کہ اپنے ارادوں کی باگ دوڑ پوری طرح اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرے بلکہ ہر بات کا اصل رشتہ اللہ ہی کے ہاتھ میں جانے اور اسی پر بھروسہ کرے یعنی اس کا یقین یہ ہونا چاہیے

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہو گا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو ہوا' ہوا کرم سے تیرے
جو ہوگا ترے کرم سے ہو گا

ارادے کی پختگی اور اللہ سے توفیق کی طلب کے بعد جب آپ نے محسوس کیا کہ میری قوم میری باتوں سے کوئی اثر لینے کیلئے تیار نہیں بلکہ اس کی دشمنی اور نامرادی اس انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ وہ آخری اقدام کئے بغیر رکنے والی نہیں تو پھر آپ نے اللہ سے دعا مانگی کہ یا اللہ میں اپنی امکانی کوششیں کر چکا ہوں میری قوم پر پوری طرح اتمام حجت ہو چکا اب میری قوم کو صرف آپ کی طرف سے فیصلے کا انتظار ہے اس لئے ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دیں۔ یہ اب قوت استعمال کرنے پر تل گئے ہیں میری بظاہر قوت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی اب تو آپ کی طرف سے آنے والا فیصلہ ان کی قسمتوں کا فیصلہ کرے گا کیونکہ آپ ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔

ایک اشتباہ کا جواب:

اس آیتِ کریمہ میں ہم نے دیکھا ہے کہ اپنے دین کو چھوڑ کر دوبارہ ان کے دین باطل میں داخل ہونے سے حضرت شعیب اپنی اور مسلمانوں کی طرف سے انکار فرما رہے ہیں اس کا مطلب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آپ پر ایمان لانے والے کفر سے نکل کر اسلام میں آئے تھے حضرت شعیب بھی اسی طرح کفر سے نکل کر اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ آپ کی زندگی میں کبھی کوئی وقت ایسا بھی گزرا ہے جب آپ بھی کفر اور شرک کا اعتبار کرتے تھے حالانکہ اللہ کا نبی معصوم پیدا ہوتا ہے وہ نبوت سے پہلے بھی فطرت کی راہنمائی کے مطابق زندگی گزارتا ہے اس لئے وہ کبھی کفر یا شرک میں آلودہ نہیں ہوتا تو یہاں حضرت شعیب کا یہ کچھ فرمانا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ حضرت شعیب اپنی طرف سے نہیں بلکہ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے یہ بات

Marfat.com

فرمارہے ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اگرچہ نبوت سے پہلے کبھی کفر یا شرک میں آلودہ نہیں ہوتا لیکن وہ مشرکوں کی کسی بات پر تنقید بھی نہیں کرتا وہ خود نہایت پاکیزہ زندگی گزارتا ہے لیکن نبوت سے پہلے پاکیزگی کا درس نہیں دیتا۔ اس صورت حال کی وجہ سے اس کی قوم یہ سمجھتی رہتی ہے کہ وہ شاید ہمارا ہم مذہب ہے، اس لئے حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کے خیال کے مطابق اہل ایمان کی طرف سے بات کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان سے الگ نہیں کیا اور مجموعی طور پر وہ بات کہہ دی جو ان کی دھمکی کے جواب میں کہی جانی چاہئے اور اپنے جواب میں اس کو پوری طرح واضح کر دیا کہ تم وطن سے نکالنے کی دھمکی دے کر یہ سمجھتے ہو کہ ہم وطن کی خاطر دین چھوڑ دیں گے حالانکہ ہمارے نزدیک اصل حیثیت دین کی ہے وطن تو بدلا جا سکتا ہے۔

مومن کیلئے وطن کی حقیقت:

ایک مومن کا وطن اصل میں وہ ہے جہاں اس کی زندگی محفوظ ہے اور جہاں اس کے دین کو خطرات لاحق ہو جائیں وہ پوری طرح اللہ کی بندگی انفرادی اور اجتماعی سطح پر کرنے کا موقع نہ پاتا ہو تو پھر اسے وطن کی قربانی دینا پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر دین کی خاطر ہجرت کرتا رہا اس نے ہمیشہ دین کی خاطر وطن چھوڑا ہے وطن کی خاطر دین کبھی نہیں چھوڑا اور یہی وہ بات ہے جس کو ہمارے قومی شاعر نے مختلف مواقع پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دنوں میں لوگوں کیلئے یہ بات سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ محض اسلامی زندگی گزارنے کیلئے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے جبکہ عبادات کی ادائیگی کی سہولت تو یہاں بھی میسر ہے؟ وہ دراصل اس بات میں فرق نہیں کر رہے تھے کہ اللہ کی بندگی اور عبادت صرف نماز نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں اللہ کے قانون کی بالادستی کا نام ہے جس طرح اللہ اور اس کے احکام کو بالادستی مسجد میں حاصل ہونی چاہئے اسی طرح اللہ کے دین کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ اس کا فرمان حکومت کے ایوانوں سے جاری ہو عدالت کی کرسی سے اس کے مطابق فیصلے ہوں' ملک کے ذرائع ابلاغ اس کی تبلیغ و دعوت کے ساتھ ساتھ اسی کے احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے لوگوں کو تفریح مہیا کریں' تعلیمی ادارے اسی کے مطابق ذہنی اور فکری تعمیر کا کام کریں' غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے پر اللہ کے دین کی بالادستی' یہ اصل مقصود ہے۔ اسی کی طرف اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اور دین کو وطن پر قربان کرنے کے تصور پر تنقید کرتے ہوئے اقبال نے کہا

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس مایوس کن اور دنداں شکن جواب کے بعد قوم آپ سے تو مایوس ہو گئی البتہ انہوں نے آپ پر ایمان لانے والوں کو وارننگ دی۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی کا ذکر فرمایا جا رہا ہے:

Marfat.com

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ O

''ان بڑوں نے جنہوں نے اس کی قوم میں سے کفر کیا کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو بڑے خسارے میں پڑو گے''۔90

مسلمانوں کو وارننگ:

اس وارننگ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ شعیب تمہیں جس زندگی کی دعوت دے رہے ہیں وہ اللہ کی بندگی کے سوا ہر بندگی سے بغاوت کی دعوت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک تم ہمارے دست نگر رہے ہو۔ پشتوں سے تم ہماری چاکری کرتے چلے آئے ہو۔ ہمارے فیصلوں کے خلاف سوچنے کی بھی تم نے کبھی ہمت نہیں کی' تمہاری زندگی کا کوئی فیصلہ ہماری مرضی کے خلاف کبھی نہیں ہوا لیکن شعیب کی دعوت تمہیں اللہ کی بندگی کے سوا باقی سب سے آزادی کی دعوت دے رہی ہے وہ تمہیں مساوات انسانی کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ اللہ نے سب انسانوں کو آزاد اور برابر پیدا کیا ہے اگر تم نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا ہم سے کھلا تصادم ہوگا اور پھر تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کس طرح کے نقصان اور خسارے میں پڑ جاؤ گے۔ تمہارے مستقبل کے ساتھ ساتھ تمہارے بچوں کا مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری زندگیوں کیلئے خطرات پیدا ہو جائیں۔ تمہاری خواتین کی عزتیں پامال ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے' تمہاری معاشی زندگی ایک عذاب بن کے رہ جائے اور تمہارے لئے زندگی کا سانس لینا زندگی کا سب سے مشکل مسئلہ بن جائے۔ اگر تم ان خطرات کا مقابلہ کر سکتے ہو تو پھر شوق سے شعیب پر ایمان لاؤ اور اس کی دعوت کو قبول کرو اور اگر ان خطرات کا مقابلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں تو پھر تمہیں ایمان لانے سے پہلے سو دفعہ سوچ لینا چاہیے۔

دوسرا اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ شعیب جس ایمانداری اور راست بازی کی دعوت دے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اصولوں کی پابندی کرانا چاہتا ہے' اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں اور ہم جو دنیا کی دو سب سے بڑی تجارتی شاہراہوں کے چوراہے پر بستے ہیں اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدن سلطنتوں کی سرحد پر آباد ہیں اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا بند کر دیں اور بے ضرر اور پرامن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جغرافی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ یہ بات صرف قوم شعیب کے سرداروں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق، راستی اور دیانت کی روش میں ایسے ہی خطرات محسوس کئے ہیں ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات جھوٹ اور بے ایمانی اور بد اخلاقی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ہر جگہ دعوتِ حق کے مقابلہ میں جو زبردست عذرات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے گی تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ دونوں مطالب میں سے کوئی مطلب بھی مراد لیا جائے مقصودِ قوم شعیب کا ان لوگوں کو ڈرانا دھمکانا اور وارننگ دینا تھا کہ اگر تم نے شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے کی غلطی کی یا ایمان لا کر ان کے اتباع پر ثابت قدم رہے تو پھر سوچ لو تمہارا انجام کیا ہوگا جب اس قوم کی جسارتیں اس حد تک پہنچ گئیں کہ پہلے حضرت شعیب علیہ السلام کو براہ راست دھمکی دی کہ اگر تم نے ہمارے دین کی مخالفت نہ چھوڑی اور نئے دین کی دعوت بند نہ کی تو ہم تمہیں اپنے شہر سے نکال دیں گے جب دیکھا کہ انہوں نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور ان کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا پھر مسلمانوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی گویا انہوں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب اس معاملے کو ختم کر کے ہی دم لینا ہے تو اللہ کا غضب جوش میں آیا اور اس کے دائمی قانون کے مطابق ان کی نافرمانی کے نتیجے میں اللہ کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا۔ اگلی آیات کریمہ میں اسی عذاب کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ O الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ج اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ O فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ ج فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ O

''پس ایک دہلا دینے والی آفت نے ان کو آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخرکار برباد ہو کر رہے۔ اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ اے برادرانِ قوم میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبولِ حق سے انکار کرتی ہے''۔ 91-92-93

قومِ شعیب پر آنے والا عذاب اور اس میں عبرت کا سامان:

قومِ شعیب پر جو عذاب آیا اس کی نوعیت اور کیفیت کیا تھی اس کیلئے جب ہم قرآن کریم میں اس واقعہ کی تفصیل پڑھتے ہیں تو مختلف آیات میں ہمیں تین الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ متذکرہ آیت میں عذاب کو الرجفۃ سے تعبیر کیا گیا ہے اور سورۃ ھود کی آیت نمبر ۹۴ میں اس کی تعبیر لفظ صیحۃ سے کی گئی ہے جس کے معنی ڈانٹ' کڑک اور چیخ کے ہیں۔ پھر سورۃ شعراء میں آیت نمبر ۱۸۹ میں اس عذاب کو عذاب یوم الظلۃ سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دور سے دیکھنے میں غبار یا دھویں کے ایک ستون یا پہاڑ کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ ان تمام تعبیرات کو سامنے رکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم پر پہلے زلزلہ آیا اس میں یخ بستہ ہوائیں بھی تھیں۔ زلزلے اور ہواؤں کی گونج اور بادل کی گرج نے ایسی صورتحال پیدا کر دی تھی جسے صیحۃ سے تعبیر کیا گیا ہے زلزلہ جب تیز رفتاری سے آتا ہے تو اس میں گونج پیدا ہوتی ہے اور یہی گونج بعض دفعہ دلوں کو پھاڑ دیتی ہے۔ ہوسکتا ہے اسی وجہ سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گر کے رہ گئے ہوں کہ زمین نے ان کو سہارا دینا چھوڑ دیا اور دلوں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور پھر اس زلزلے سے پہاڑوں کے پھٹنے کے باعث تیزی سے غبار اٹھا' آسمان پر ایسی خوفناک گھٹا اٹھی جس نے ایک پہاڑ کی شکل اختیار کر لی اور پوری قوم نے یوں محسوس کیا جیسے ایک سائبان کی مانند پہاڑ ان کے سروں پر چھا گیا ہے۔ زمین ان کو نگل جانا چاہتی ہے اور ساتھ بادلوں کی کڑک نے اس ہولناکی میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس پوری صورتحال کو اگر ذہن میں لانا ممکن ہو تو اس سے اس عذاب کی دھندلی سی تصویر ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہولناک عذاب کے بعد یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ قوم کس طرح کی ہمہ گیر تباہی کا شکار ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قوم کی تباہی مدت ہائے دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضرب المثل بنی رہی۔ چنانچہ زبورداؤد میں ایک جگہ آتا ہے کہ اے خدا فلاں فلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے لہٰذا تو ان کے ساتھ وہی کر جو تو نے مدیان کے ساتھ کیا اور یسع نبی ایک جگہ بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آشور والوں سے نہ ڈرو اگرچہ وہ تمہارے لئے مصریوں کی طرح ظالم بنے جا رہے ہیں لیکن کچھ دیر نہ گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسائے گا اور ان کا وہی حشر ہوگا جو مدیان کا ہوا۔ اگلی آیت کریمہ میں نہایت مؤثر انداز میں اس عذاب کا نتیجہ بیان کیا گیا۔ گزشتہ دو آیات میں قومِ شعیب کے بڑے لوگوں نے حضرت شعیب اور مسلمانوں کو دھمکی دیتے ہوئے دو باتیں کہیں ایک یہ کہ تمہیں ہم اپنے شہروں سے نکال دیں گے اور دوسری یہ بات کہ اگر تم نے شعیب کا اتباع نہ چھوڑا تو تم نقصان اٹھاؤ گے اور تباہ ہو جاؤ گے۔ اس آیت کریمہ میں تلمیح کے انداز میں دونوں باتوں کا ذکر فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے حضرت شعیب کی تکذیب کی ہم نے ان کی بستیوں کو اس طرح مٹایا کہ ان کی بستیوں سے گزرنے والا کوئی شخص دیکھ کر اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بستیاں کبھی آباد بھی رہی ہوں گی۔ اس قدر ہمہ گیر تباہی کہ وہ بالکل بے

Marfat.com

آباد کھنڈرات پر مشتمل ایک ویرانہ معلوم ہوتی تھیں جس میں زندگی کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا اور یہ تباہ ہونے والی اور مٹ جانے والی بستیاں ان لوگوں کی تھیں جو حضرت شعیب اور مسلمانوں کو وہاں سے نکالنا چاہتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے سر پر جو عذاب تلا کھڑا ہے چند دنوں کی بات ہے اس کے نتیجے میں وہ خود ان بستیوں سے نکال دیئے جائیں گے اور دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ شعیب کی قوم نے مسلمانوں کو دھمکاتے ہوئے یہ کہا کہ اگر تم نے شعیب کا اتباع نہ چھوڑا تو تم نقصان اٹھاؤ گے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اب ان بستیوں پر ٹوٹنے والے عذاب کو دیکھو اور اس کے نتیجے میں بستیوں کی تباہی ملاحظہ کرو اور پھر فیصلہ کرو کہ نقصان اٹھانے والا کون ہے۔ حضرت شعیب اور ان پر ایمان لانے والوں نے نقصان اٹھایا اور یا ان لوگوں نے نقصان اٹھایا جو انہیں نقصان کی دھمکیاں دیتے اور تباہی اور بربادی سے ڈراتے تھے۔ یہی وہ عبرت کی چیزیں ہیں کہ اگر آدمی کی آنکھوں کا پانی مر نہیں گیا تو قدم قدم پر اس کیلئے عبرت کا سامان موجود ہے اور اسی عبرت ہی کیلئے ان واقعات کو بیان کیا جا رہا ہے۔ اگلی آیت کریمہ میں سابقہ رکوع کی طرح حضرت شعیب کے طرز عمل کو بیان کیا گیا ہے اس سے پہلے میں بیان کر چکا ہوں کہ دونوں امکانات موجود ہیں۔ کہ یہاں جس طرز عمل کو زبان دی گئی ہے وہ عذاب سے پہلے کا ہے یا بعد کا۔ ممکن ہے کہ آپ نے عذاب آنے سے پہلے اس قوم سے آخری بات کہتے ہوئے منہ پھیرا ہو اور ہجرت کر کے ان بستیوں سے نکل گئے ہوں اور ان پر یہ بات واضح کر دی ہو کہ میں آج تک تمہارے غم میں گھلتا رہا اور تمہارے ساتھ خیر خواہی میں میں نے کمی نہیں چھوڑی لیکن تم ایک ایسی قوم ہو جنہیں خیر خواہوں کی خیر خواہی متاثر نہیں کرتی وہ اپنے کافرانہ طرز عمل کو کبھی بدلنے کیلئے تیار نہیں ہوتے پھر ایسے لوگوں پر اگر عذاب ٹوٹتا ہے تو میں اس پر کیا افسوس کروں اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تباہی مکمل ہو جانے کے بعد آپ نے ان کی لاشوں پر کھڑے ہو کر مسلمانوں اور آنے والے کے انسانوں کی نصیحت کیلئے یہ بات فرمائی کہ اے میری قوم کے لوگو! میں نے اللہ کا پیغام تمہیں پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور یہاں تک خیر خواہی کی کہ تمہاری گالیاں سن کر دعائیں دیتا رہا تم نے اپنے دروازے مجھ پر بند کیے لیکن میں نے اپنے دل کے دروازے ہمیشہ تمہارے لئے کھلے رکھے لیکن تم نے بجائے اس خیر خواہی کی قدر کرنے کے جو طرز عمل اختیار کیا اب اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ میں پہلے دن سے تمہیں تنبیہ کرتا رہا کہ اگر تم نے توبہ نہ کی اور مجھ پر ایمان نہ لائے تو وہ دن دور نہیں جب عذاب تمہاری کمر توڑ دے گا لیکن تمہیں اپنے کفر کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی اس لئے میں اگر تم پر غم کھاؤں تو کس بات کا غم کھاؤں؟ اس لئے کہ یہ سب کچھ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اللہ کا تو قانون ہی یہ ہے کہ جب بندے بھی حالت کی شکایت کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ انہیں اعمال کا جائزہ لینے کا حکم دیتا ہے۔ اکبر نے ٹھیک کہا

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

یہاں تک پانچ معذب قوموں کا تذکرہ ہوا اور کسی حد تک تفصیل سے بتایا گیا کہ یہ وہ قومیں ہیں جن کی طرف اللہ کے رسول آئے لیکن انہوں نے ان کی دعوت کو قبول کرنے سے جب انکار کیا تو اس کا نتیجہ عذاب کی صورت میں نکلا یہ محض تاریخی واقعات نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد مشرکین مکہ اور دیگر لوگوں نے جو رویہ آپ کی دعوت کے ساتھ اختیار کیا یہ واقعات انہی کے انجام کے آئینے کے طور پر پیش کئے گئے تاکہ مشرکین اور دوسرے لوگ اچھی طرح اس آئینہ میں اپنی شکل دیکھ لیں کہ جن قوموں پر اللہ کا عذاب آیا ان کی طرف بھی اللہ کے نبی اور رسول آئے تھے جس طرح آج ان کی طرف اللہ کے ایک رسول آئے ہیں۔ ان رسولوں نے ان کے سامنے اللہ کا پیغام رکھا تھا اور جب تک انہیں تبلیغ و دعوت کا موقع ملا انہوں نے کمال خیر خواہی، دلسوزی، ہمدردی اور جانسپاری سے وہ پیغام ان کے سامنے پیش کیا۔ جس طرح آج آنحضرت ﷺ ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں ان کی

Marfat.com

قوموں نے ان کی ہمدردی اور خیر خواہی کی قدر کرنے کی بجائے معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ ہر قدم پر ان کی تبلیغ و دعوت کے راستے میں روڑے اٹکائے' ان کیلئے معاشی دشواریاں پیدا کیں' ہر ممکن اذیتیں پہنچائیں ان پر ایمان لانے والوں کو بری طرح ایمان لانے کی سزائیں دیں حتیٰ کہ ان کا جینا دوبھر کر دیا اور جیسے جیسے پیغمبر تبلیغ و دعوت میں سرگرمی دکھاتے ویسے ویسے ان کی مخالفتوں میں شدت پیدا ہوتی جاتی حتیٰ کہ وہ پیغمبر اور مسلمانوں کو ملک بدر کرنے یا قتل کرنے کے منصوبے باندھنے لگے۔ بالکل اس طرح جس طرح مشرکینِ مکہ اور مدینے کے اہل کتاب نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ طرز عمل اختیار کیا کہ آپ کو سالوں تک کبھی ایک لمحے کیلئے چین نہ لینے دیا۔ آپ کے قتل کرنے کا ایک مکمل منصوبہ بنایا گیا لیکن اللہ نے آپ کی حفاظت فرمائی' آپ ہجرت کرنے میں کامیاب ہوگئے تو دار الہجرت میں بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ سابقہ کافر امتوں کے ساتھ مشرکین مکہ کی یہ یکسانی اور پہلے رسولوں کے ساتھ آنحضرت کی ہم آہنگی کیا یہ بتانے کیلئے کافی نہیں کہ یہ واقعات دوسروں کے پیرائے میں مشرکین مکہ اور دوسرے لوگوں کو سمجھانے کیلئے ہیں کہ وہ قومیں تمہاری طرح کا رویہ اختیار کر کے تباہ ہوگئیں تم اگر بچنا چاہتے ہو تو اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرو اور آنحضرت ﷺ پر ایمان لا کر دنیا اور آخرت بنا لو۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ

مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ
يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا
قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ
لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ
نَآئِمُوْنَ ﴿۹۷﴾ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ

Marfat.com

يَلْعَبُوْنَ ﴿٩٨﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩٩﴾

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی رسول بھیجا اس کے باشندوں کو مالی اور جسمانی مصائب سے آزمایا کہ وہ رجوع کریں۔ پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوشحالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ دکھ اور سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچے ہیں پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا کوئی گمان نہیں رکھتے تھے۔ اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔ کیا بستیوں کے لوگ اس بات سے بے خوف ہو گئے کہ آ دھمکے ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اور وہ سوئے پڑے ہوں یا بستیوں والے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر آ جائے ہمارا عذاب دن دھاڑے اور وہ کھیل کود میں ہوں تو کیا وہ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہیں تو یاد رکھو کہ اللہ کی تدبیر سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو نامراد ہونے والے ہوں۔

..................☆......☆......☆.................

گزشتہ آیات میں پانچ ایسی قوموں کا تذکرہ گزرا ہے جن پر اس لئے اللہ کا عذاب آیا کہ انہوں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت کو قبول کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اللہ کے رسول کی تمام تبلیغی مساعی کے مقابلے میں انہوں نے اذیت رسانی اور مخالفت کی انتہاء کر دی جب اللہ کی جانب سے ان پر اتمام حجت ہو گیا تو اللہ کا عذاب ان پر ٹوٹا اور وہ دنیا میں عبرت کی علامت بن کر رہ گئے۔ آئندہ آیات میں وہ اصول وضوابط بیان کئے جا رہے ہیں جن سے امتوں کو آزمایا جاتا ہے اور جو اتمام حجت کی بنیاد بنتے ہیں اور بالآخر اس کے نتیجے میں ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اگلی آیت کریمہ میں پیغمبر کی بعثت کے بعد سب سے پہلے جو آزمائش پیغمبر کی امت پر اترتی ہے اور جس سے انہیں سب سے پہلے آزمایا جاتا ہے اس کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ O

''اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی رسول بھیجا اس کے باشندوں کو مالی اور جسمانی مصائب سے آزمایا کہ وہ رجوع کریں''۔94

بأسا اور ضراء کا مفہوم:

اس آیت کریمہ کی وضاحت سے پہلے چند الفاظ کی وضاحت ضروری ہے۔ اس میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: اَلْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ یہ

Marfat.com

لفظ جب ایک دوسرے کے بالمقابل استعمال ہوں تو پہلے لفظ سے مالی آفتیں مراد ہوتی ہیں مثلاً قحط سالی' کساد بازاری' مہنگائی وغیرہ اور دوسرے لفظ سے جسمانی آفتیں مراد ہوتی ہیں مثلاً بیماریاں اور وبائیں وغیرہ لیکن جب ضَرَّ آء کا لفظ سَرَّ آء کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو یہ دونوں الفاظ ہر قسم کی بدحالی اور خوشحالی کے معنی دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سنت کا تذکرہ:

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک خاص سنت کو بیان فرمایا ہے جس کا ظہور ہمیشہ انبیاء کی بعثت کے ساتھ ہی ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی کسی پیغمبر کی بعثت ہوتی ہے اور وہ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں جب وہ انہیں اللہ کی طرف دعوت دینا شروع کرتے ہیں اور ان کے بگڑے ہوئے عقائد ملحدانہ خیالات اور ان کی بداعمالیوں پر تنقید شروع کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ نسلوں کے بگڑے ہوئے لوگ اور مدت کی بنی ہوئی عادتیں اور صدیوں کی گمراہیاں اور آبائی ورثے میں ملے ہوئے مشرکانہ اور ملحدانہ خیالات ایسے تو نہیں ہوتے کہ قوم انہیں چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے اور انسانی فطرت یہ ہے کہ جن اعتقادات اور اعمال کے ساتھ اس کا قلبی رشتہ مستحکم ہو جاتا ہے وہ اس پر تنقید کبھی گوارا نہیں کرتی بلکہ وہ تنقید کرنے والے کے ساتھ مرنے مارنے کیلئے تیار ہو جاتی ہے۔ ان کی غلط باتوں پر تنقید چاہے کیسے ہی علمی اور فطری اسلوب کے ساتھ کی جائے وہ انہیں ہمیشہ ناگوار گزرتی ہے اور وہ حتی الامکان ایسی زبان کھینچنے سے بھی گریز نہیں کرتے جس زبان سے ان کو ایسی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی مدد کیلئے یہ طریقہ اختیار فرماتے ہیں کہ اس قوم کو مختلف مالی اور جسمانی پریشانیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں کبھی ان پر قحط مسلط کر دیا جاتا ہے' کبھی سیلاب کے بند کھول دیئے جاتے ہیں' کبھی بارشیں منہ زور ہو جاتی ہیں' کبھی وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں' کبھی ان میں تعلقات کا بگاڑ خانہ جنگی تک پہنچ جاتا ہے یہ سب مصیبتیں ان پر اس لئے مسلط کی جاتی ہیں تا کہ ان کی اکڑی ہوئی گردن جھکنے پر مجبور ہو جائے اور وہ آہستہ آہستہ اس بات کو سوچنے لگیں کہ ہم جو آج تک ہر معاملے میں اپنے ہی دست و بازو پر بھروسہ کرتے رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حالات کا ہر رشتہ شاید ہمارے ہی ہاتھ میں ہے اور ہم سے بڑی کوئی اور طاقت نہیں اگر ایسا ہوتا تو ہم ان مصائب پر بھی قابو پالیتے۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے کہ ایک پریشانی دور ہونے میں نہیں آتی کہ دوسری حملہ آور ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اتنے طاقت ور اور قدرتوں کے مالک نہیں ہیں جتنا ہم اپنے آپ کو سمجھتے ہیں اور اس زمین پر صرف ہماری ہی طاقت نہیں اور صرف ہمارا ہی حکم نہیں چلتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل حکمران طاقت کوئی اور ہے چنانچہ جیسے جیسے ان مصائب کی وجہ سے ان کے اندر یہ احساس توانا ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ان کی گردن جھکتی جاتی ہے اور وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں اور پھر انہیں پیغمبر کی دعوت سمجھ میں آنے لگتی ہے کیونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ خوشحالی اور آسودگی انسان کو یا تو غافل بناتی ہے اور یا اسے من مرضی کی زندگی پر اکساتی ہے جس کے نتیجے میں خواہشات کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے اور اللہ کی زمین فساد سے بھر جاتی ہے لیکن مصیبتیں اور پریشانیاں عموماً بڑے بڑے بگڑے ہوئے لوگوں کو بھی کبھی نہ کبھی سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور وہ پریشانیوں سے مجبور ہو کر نصیحت کی باتوں پر کان دھرنے لگتے ہیں اور جب کوئی اور سہارا دکھائی نہیں دیتا اور کوئی ہاتھ دستگیری کیلئے آگے نہیں بڑھتا اور کسی مسیحا سے شفا نہیں ملتی تو پھر کبھی نہ کبھی دل میں اللہ کی یاد کسمسانے لگتی ہے اور زبان پر خواہی نہ خواہی اللہ کا نام آنے لگتا ہے۔ اسی لئے اہل اللہ کے یہاں مصیبت اور بیماری کو صحت اور راحت سے بڑھ کر اللہ کی نعمت سمجھا گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ اپنی مجلس میں یہ فرما رہے تھے کہ صحت بھی اللہ کی نعمت ہے اور بیماری بھی اللہ کی نعمت ہے لیکن بیماری صحت سے بڑی نعمت ہے۔ کسی نے پوچھا حضرت بیماری صحت سے بڑی نعمت کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نعمت اصل میں وہ ہوتی ہے جو منعم کی یاد دلائے جس سے اپنے محبوب کی یاد تازہ ہو جائے اور اپنے دوست کی یاد ستانے لگے۔ راحتیں اور نعمتیں آدمی کو اللہ

Marfat.com

جیسے منعم حقیقی اور محبوب برحق سے غافل کر دیتی ہیں لیکن مصیبتیں اور بیماریاں اس شفا دینے والے اور مصیبتیں دور کرنے والے کی یاد دلاتی ہیں تو جو چیز اپنے محبوب اور دوست کی یاد دلائے ظاہر ہے وہی بڑی نعمت ہوگی۔ آپ ابھی یہ باتیں فرما ہی رہے تھے کہ اچانک ایک شخص روتا ہوا مجلس میں داخل ہوا اور حاجی صاحب کو اپنی طرف متوجہ پا کر کہنے لگا کہ حضرت میں بیماری کے ہاتھوں اس حد تک بے بس ہو گیا ہوں کہ اگر خودکشی جائز ہوتی تو میں خودکشی کر لیتا اب یہ بیماری مجھ سے برداشت نہیں ہو پا رہی۔ آپ اللہ سے میرے لئے صحت کی دعا فرمائیں۔ سننے والے سوچنے لگے کہ دیکھئے حاجی صاحب اب فرماتے ہیں کیونکہ وہ تو ابھی بیماری کو صحت سے بڑھ کر نعمت قرار دے رہے تھے حاجی صاحب نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: یا اللہ صحت بھی تیری نعمت ہے اور بیماری بھی تیری نعمت ہے بلکہ بیماری بڑی نعمت ہے لیکن یہ بڑی نعمت ہونے کے ساتھ ساتھ بھاری اور مشکل نعمت بھی ہے جسے ہر کوئی برداشت نہیں کر سکتا ہم تیرے کمزور بندے ہیں تو اپنی سخت نعمت کو واپس لے لے اور اس کے بدلے میں نرم نعمت یعنی صحت عطا فرما اور ہماری کمزوریوں پر رحم فرما۔ صرف یہ ہے کہ ہر پیغمبر کی بعثت کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ اس قوم پر مصائب نازل فرماتا ہے تاکہ جب زمین و آسمان پیغمبر کی دعوت کے ساتھ ہم آہنگ ہو انہیں یہ بات سمجھانے لگیں کہ دیکھو تمہارے سروں پر ایک احکم الحاکمین کی ذات بھی ہے۔ تمہارا سب کچھ اس کے ہاتھوں میں ہے وہ جب چاہے تمہاری صحت چھین سکتا ہے، تمہاری آسودگی ختم کر سکتا ہے، تمہاری خوشحالیاں بدحالیوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔ تم اپنے طور پر اس کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے ہو۔ اسی نے تمہیں زندگی عطا فرمائی ہے اور وہی تمہیں ہر طرح کی نعمتیں عطا فرما رہا ہے یہ دونوں دعوتیں جب اکٹھی ہو جاتی ہیں تو لوگوں کو اللہ کی طرف جھکنے اور عاجزی اختیار کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ جو خوش نصیب ہوتے ہیں وہ فی الواقع اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور پیغمبر کی دعوت کو قبول کر کے اپنی دنیا اور عقبیٰ درست کر لیتے ہیں لیکن جو بدنصیب ہوتے ہیں وہ ان مصائب کا شکار ہو کر بھی راہ راست اختیار کرنے کی بجائے اور پتھر دل ہو جاتے ہیں اور ان کا بگاڑ بعض دفعہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ پیغمبر کو ان مصائب کا ذمہ دار سمجھنے لگتے ہیں اور مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پر مصیبتیں آ رہی ہیں یہ تمہاری نحوست ہے اور وہ اس صورت حال سے نصیحت حاصل کرنے کی بجائے ایک اور فتنے کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسے دلیل کے طور پر اپنے رویے کی تائید میں استعمال کرتے ہیں وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مصائب جو ہم پر نازل ہو رہے ہیں اس کا شکار صرف ہم ہی نہیں ہو رہے بلکہ یہ مصیبتیں برابر مسلمانوں کو بھی اپنا شکار کر رہی ہیں۔ اگر کساد بازاری ہمیں پریشان کر رہی ہے تو مسلمان بھی اس سے بچے ہوئے نہیں ہیں اور اگر قحط نے ہمیں زار نزار کر دیا ہے تو مسلمان بھی اس سے امان میں نہیں ہیں۔ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ اگر کہیں سائیکلون اٹھتا ہے تو بلا امتیاز نیک و بد سب کو بہا کر لے جاتا ہے اگر زلزلہ آیا ہے تو اس سے صرف کافروں کے مکان نہیں گرتے مسلمانوں کی عمارتیں بھی اس سے تباہ ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ اگر اس سے کلیسا و مندر گرے ہیں تو مسجدیں بھی محفوظ نہیں رہتیں۔ اس سے وہ یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ اگر ان مصائب کا نزول ہمارے کفر اور بداعمالیوں کے سبب سے ہوتا تو صرف ہم ہی اس کی گرفت میں آتے اور مسلمان اس سے محفوظ رہتے اور قحط اگر ہماری کمر توڑتا تو مسلمانوں کے گھروں میں تو من و سلویٰ اترنا چاہئے لیکن جب مصیبتوں کا شکار مسلم اور کافر دونوں ہو رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سراسر اتفاقات کا نتیجہ ہے اور قوموں پر ایسے سرد اور گرم دن آتے ہی رہتے ہیں اس کا کوئی تعلق نیکی اور بدی سے نہیں اس لئے بجائے اس سے اثر قبول کرنے کے ان کے انکار میں اور شدت آ جاتی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ تو کہ جو مصیبتیں آزمائش بن کر اترتی ہیں اس میں مومن اور کافر دونوں آزمائے جاتے ہیں لیکن کافر کو تو اس لئے مبتلا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کفر سے باز آ جائے لیکن مومن کو اس ابتلا سے جو فائدہ پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی سیرت و کردار میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اسے صبر جیسی عظیم دولت نصیب ہوتی ہے اسے ان مصائب سے گزار کر کندن بنایا جاتا ہے۔ اس لئے کفر جب کبھی اس کا امتحان لیتا ہے تو سیرت و کردار کی یہ تعمیر اس کی استقامت میں مدد ہم

Marfat.com

کرتی ہے وہ بڑے سے بڑے طوفان کے سامنے سینہ سپر ہونے کی جرأت رکھتا ہے۔ یہ تو وہ فائدے ہیں جو دنیا میں مومن کو نصیب ہوتے ہیں رہی آخرت تو اس دنیا میں اگر مومن نے کانٹے کی چبھن بھی سہی ہوگی تو آخرت میں یہ چبھن جنت کا پھول بن جائے گی۔ وہاں جب وہ دنیا میں گزرے ہوئے مصائب پر اجر وثواب دیکھے گا تو وہ تمنا کرے گا کہ کاش دنیا میں' میں اور بڑے مصائب سے گزرا ہوتا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت میں جب مومن مصیبتوں پر صبر کرنے کا صلہ پائے گا تو وہ تمنا کرے گا کاش میری کھال کو قینچیوں سے کاٹا گیا ہوتا۔ اس لئے بظاہر مومن اور کافر ایک ہی طرح سے مصائب کا شکار ہوتے ہیں لیکن انجام اور نتائج کے اعتبار سے دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد اس صورت حال کی وضاحت کیلئے کافی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

لا یزال البلاء بالمؤمن حتیٰ یخرج نقیاً من ذنوبہٖ' والمنافق مثلہ کمثل الحِمار لایدری فیم ربطہ اھلہ ولَا فِیمَ ارسلوہ

''مصیبت مومن کی تو اصلاح کرتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ اس بھٹی سے نکلتا ہے تو ساری کھوٹ سے صاف ہو کر نکلتا ہے لیکن منافق کی حالت بالکل گدھے کی سی ہوتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا کہ اس کے مالک نے کیوں اسے باندھا تھا اور کیوں اسے چھوڑ دیا''۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہئے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جس ضابطہ کا ذکر فرمایا ہے ٹھیک یہی ضابطہ نبی ﷺ کی بعثت کے موقع پر بھی برتا گیا اور شامت زدہ قوموں کے جس طرز عمل کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے ٹھیک وہی طرز عمل سورۃ اعراف کے نزول کے زمانہ میں قریش والوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ حدیث میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کی متفقہ روایت ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت کے بعد جب قریش کے لوگوں نے آپ کی دعوت کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا شروع کیا تو حضور ﷺ نے دعا کی کہ خدایا' یوسف کے زمانہ میں جیسا ہفت سالہ قحط پڑا تھا ویسے ہی قحط سے ان لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد کر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت قحط میں مبتلا کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ مردار کھانے لگے' چمڑے' ہڈیاں اور اون تک کھا گئے۔ آخر کار مکہ کے لوگوں نے' جن میں ابوسفیان پیش پیش تھا' حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے لئے خدا سے دعا کیجئے۔ مگر جب آپ کی دعا سے اللہ نے وہ برا وقت ٹال دیا اور بھلے دن آئے تو ان لوگوں کی گردنیں پہلے سے زیادہ اکڑ گئیں' اور جن کے دل تھوڑے سے پسیج گئے تھے ان کو بھی اشرارِ قوم نے یہ کہہ کہہ کر ایمان سے روکنا شروع کر دیا کہ میاں' یہ تو زمانے کا اتار چڑھاؤ ہے۔ پہلے بھی آخر قحط آتے ہی رہے ہیں' کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ اس مرتبہ ایک لمبا قحط پڑ گیا' لہٰذا ان چیزوں سے دھوکہ کھا کر محمد ﷺ کے پھندے میں نہ پھنس جانا۔ یہ تقریریں اس زمانے میں ہو رہی تھیں جب یہ سورہ اعراف نازل ہوئی ہے اس لئے قرآن مجید کی یہ آیات ٹھیک اپنے موقع پر چسپاں ہوتی ہیں اور اسی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے ان کی معنویت پوری طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب کسی قوم پر ان مصائب کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ ان کے دل پتھر اور کان بہرے ہو جاتے ہیں تو پھر یہ سنت الٰہی ایک دوسری شکل اختیار کر لیتی ہے جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ O

Marfat.com

''پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوشحالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ دکھ اور سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچے ہیں پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا کوئی گمان نہیں رکھتے تھے''۔95

دوسری سنتِ الٰہی:

جب کوئی قوم مصائب میں مبتلا ہو کر راہ راست اختیار کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور وہ ان سے نصیحت حاصل کرنے کی بجائے اور بگڑنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی دوسری سنت وجود میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بدحالی کو خوشحالی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مصائب اور دشواریوں کو دور کر کے پریشانیوں کو ہٹا کر ہر طرح کی آسودگی سے نوازنا شروع کر دیتا ہے۔ کاروبار سنبھلنے لگتے ہیں، فصلیں لہلہانے لگتی ہیں، صحتیں اچھی ہو جاتی ہیں، پھل دار درخت پھلوں سے لد جاتے ہیں، وقت پر بارشیں ہونے لگتی ہیں، مٹی کو ہاتھ لگاتے ہی سونا ہونے لگتی ہے۔ پہلے بدحالی سے انہیں آزمایا تھا اب ان کی آزمائش خوشحالی سے کی جاتی ہے۔ اس آزمائش کے دو پہلو ہیں ایک لحاظ سے یہ آزمائش ہے اور دوسرے لحاظ سے یہ اتمامِ حجت ہے۔ آزمائش اس لحاظ سے ہے کہ جس طرح برے حالات آدمی کو آزماتے ہیں اسی طرح دولت و راحت بھی آدمی کیلئے بہت بڑی آزمائش ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خوشحالی اور دولت کی فراوانی یہ بدحالی اور مصیبت سے بڑھ کر آزمائش ثابت ہوتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ مصائب کا مقابلہ استقامت سے کر لیتے ہیں لیکن جب انہیں عہدہ و منصب کا لالچ دے کر یا دولت کی چمک دکھا کر آزمایا جاتا ہے تو وہ ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ نہ جانے انسان میں ایسی کیا کمزوری ہے کہ وہ مصیبت کا سامنا کر لیتا ہے لیکن لالچ کا مقابلہ کرنا اس کیلئے مشکل ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں مسئلہ خلقِ قرآن کے حوالے سے ایک بہت بڑے فتنے کی سرگزشت بیان کی جاتی ہے جس میں بڑے بڑے علماء آزمائش کا شکار ہوئے ہیں۔ کوئی کامیاب ہوا اور کوئی ناکام لیکن سب سے زیادہ اس آزمائش کا نشانہ امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بنے۔ مامون الرشید کے زمانے میں انہیں گرفتار کیا گیا اور معتصم باللہ کے زمانے میں ان پر تشدد کی انتہاء کر دی گئی۔ جیل میں پابجولاں رکھا گیا۔ ایسے ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ہاتھی کو بھی مارے جاتے تو بلبلا اٹھتا۔ بار بار آپ سے خلیفہ وقت معتصم کہتا کہ احمد تم مجھے اپنے ولی عہد سے زیادہ عزیز ہو۔ اگر تم وہی بات کہہ دو جو میں کہہ رہا ہوں تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں گا۔ آپ جواب میں ایک ہی بات فرماتے تھے کہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے کوئی دلیل لاؤ تو میں سر جھکا لوں گا۔ اس کے علاوہ کوئی چیز اور کوئی تشدد میرا سر نہیں جھکا سکتا۔ آپ لہولہان حالت میں جب ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جا رہے تھے تو راستے میں انہیں ایک شخص ملا جس نے کہا امام احمد آپ مجھے پہچانتے ہیں۔ آپ نے انکار کیا تو اس نے کہا کہ میرا نام ابوالہیثم ہے میں مشہور چور اور ڈاکو ہوں میں کئی دفعہ چوری کے جرم میں پکڑا گیا اور میری پشت پر کم وبیش پندرہ ہزار کوڑے برس چکے ہیں لیکن میں نے چوری سے توبہ نہیں کی۔ آپ اس وقت سنت کی حمایت کیلئے اٹھے ہیں اور پوری امت کی نگاہیں آپ کی طرف ہیں کیا آپ ایک چور جتنا حوصلہ بھی نہیں دکھائیں گے؟۔ امام صاحب کے بیٹے کہتے ہیں کہ میں نے ابا جان کو آخری دنوں میں بار بار ابوالہیثم کیلئے دعا کرتے دیکھا۔ میں نے پوچھا ابا جان یہ ابوالہیثم کون ہے؟ تب انہوں نے یہ واقعہ سنایا اور فرمایا کہ جب تشدد سے میری ہمت جواب دینے لگتی تو مجھے اس کی یہ بات یاد آتی اور میں اپنے آپ کو ملامت کرتا کہ احمد کیا تم ایک چور جتنا حوصلہ بھی نہیں دکھاؤ گے لیکن جب معتصم کے بعد متوکل کا زمانہ آیا تو اس نے اس ساری صورت حال کو بدلنا چاہا اور نہ صرف امام صاحب کو رہائی دی بلکہ آج تک جتنا آپ پر ظلم ہوا اس کی تلافی کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ وہ بار بار آپ کی خدمت میں اشرفیوں کے توڑے بھیجتا لیکن آپ اسے ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ اصرار پر صرف یہ فرماتے کہ باہر لوگوں میں اسے تقسیم کر دو۔ اہل خانہ سے کہتے تھے کہ یہ متوکل کے توڑے میرے لئے معتصم کے کوڑوں سے زیادہ ناقابل برداشت ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کوڑوں کی

Marfat.com

تو سہ لیتا ہے لیکن جب توڑے ملنے لگتے ہیں یعنی جب لالچ دیا جاتا ہے تو اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں رہتا۔ پروردگار مصائب کے بعد جب دولت کی فراوانی اور آسانیوں کی ارزانی سے نوازتا ہے تو یہ بجائے خود ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ جب لوگوں نے مصائب میں ایمان کا راستہ اختیار نہ کیا وہ دولت کی ریل پیل میں ایمان کا راستہ کیا اختیار کریں گے وہ تو اپنے کفر میں اور پختہ ہوتے ہیں بلکہ وہ مسلمانوں کو طنز کرنے لگتے ہیں کہ تم ہمیں جو بار بار یہ کہتے تھے کہ یہ مصائب اور بدحالیاں تمہارے کفر اور بداعمالیوں کے سبب سے ہیں تو بتاؤ ہمارا کفر اور ہماری بداعمالیاں تو اسی طرح ہمارے ساتھ ہیں آخر ہمارے حالات کیوں بدل گئے ہیں پھر ان کے کج فہم رہنما ان کے ذہن میں تاریخ کا یہ احمقانہ تصور بٹھانے لگتے ہیں کہ حالات کا اتار چڑھاؤ اور قسمت کا بناؤ اور بگاڑ کسی حکیم کے انتظام میں اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہوتا بلکہ ایک اندھی طبیعت بالکل غیر اخلاقی اسباب سے کبھی اچھے اور کبھی برے دن لاتی ہی رہتی ہے لہٰذا ان مصائب اور آفات کے نزول سے کوئی اخلاقی سبق لینا اور کسی ناصح کی نصیحت کو قبول کر کے خدا کے آگے زاری وتضرع کرنے لگنا بجز ایک طرح کی نفسی کمزوری کے اور کچھ نہیں۔ یہ اچھے اور برے دن صرف ہم نے ہی نہیں دیکھے بلکہ ہمارے آباؤ اجداد بھی اس طرح کی صورت حال سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ ایسی ہی سوچ کے نتیجے میں وہ اپنے بگاڑ میں اور بڑھتے چلے جاتے ہیں جس سے ان پر اتمام حجت ہو جاتا ہے اور پھر اللہ کا عذاب ان کے سر پر منڈلانے لگتا ہے لیکن جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے جس طرح مصائب ان کی سیرت و کردار میں پختگی کا باعث بنتے ہیں اسی طرح خوشحالی اور آسودگی بھی ان کے اندر شکر کے جذبات کو اور فراواں کر دیتی ہے۔ وہ جس طرح مصائب کے مقابلے میں کبھی کمزوری نہیں دکھاتے اسی طرح ہر طرح کی راحت اور آسودگی میں بھی کبھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے برگشتہ نہیں ہوتے۔ وہ فاقے سے ہوں تب بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں اور انہیں تخت حکومت مل جائے تو تب بھی ان کی درویشی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بقول اقبال

ان کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنتِ اہلِ دیں فقر ہے شاہی نہیں

چنانچہ کافروں پر دونوں طرح کی آزمائش میں ناکامی سے جب اتمام حجت ہو جاتا ہے تو پھر اچانک اللہ کا عذاب ان پر آ ٹوٹتا ہے اور پھر اس طرح پروردگار کی پکڑ آتی ہے کہ وہ اپنے عیش وعشرت کے مزے لوٹ رہے ہوتے ہیں اور اس کا عذاب ان کی بے خبری میں آ کر ان کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

قابلِ توجہ بات:

یہاں یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ کسی قوم پر اللہ کا عذاب اللہ کی قدرت کا ظہور تو ہے اور اس کی حاکمیت کا لازمی نتیجہ بھی لیکن اس کی ترجیحات میں ہرگز شامل نہیں۔ اسے یہ بات قطعاً عزیز نہیں ہے کہ قومیں عذاب کا شکار ہوں بلکہ اس کی رحمت تو اس کے غضب پر ہمیشہ حاوی رہتی ہے وہ بار بار اس بات کا اظہار فرماتا ہے کہ تمہارا رب بندوں کیلئے ظالم نہیں ہے بلکہ وہ تو رحمان اور رحیم ذات ہے جس کی رحمت ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی ہے۔ اس لئے اگلی آیت کریمہ میں ان آیات کے مخاطبین کو سمجھاتے ہوئے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ ہم نے معذب قوموں کی داستان جو تمہیں سنائی ہے یہ اس لئے نہیں ہے کہ اللہ انہیں عذاب دینا چاہتا تھا بلکہ اسلئے ہے تاکہ تم اس سے عبرت پکڑو ورنہ اللہ کا جو پسندیدہ طریقہ ہے وہ تو وہ ہے جو اگلی آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ O

Marfat.com

''اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا''۔96

یعنی پہلی امتوں پر جو عذاب آئے وہ اس لئے نہیں آئے کہ ہم انہیں عذاب دینا چاہتے تھے بلکہ یہ ان کی بداعمالیوں اور بداعتقادیوں کے لازمی اور منطقی نتائج تھے۔ اگر وہ ہمارے پیغمبروں پر ایمان لاتے اور ان کی دعوت کے مطابق تقویٰ کی زندگی اختیار کرتے تو ہم انہیں اس طرح اپنی رحمت سے نوازتے کہ آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے یعنی آسمان سے ان پر رزق برستا اور زمین سے ان کیلئے رزق ابلتا۔ زمین اپنی روئیدگی کے خزانے ان کیلئے وقف کر دیتی اور آسمان ان پر اپنی رحمتیں نچھاور کرتا' وقت پر بارشیں ہوتیں جو ان کیلئے افزودگی کا باعث بنتیں' موسم ان کیلئے راحتوں کا پیغامبر بن کر آتے اور واقعہ یہ ہے کہ جب بھی انسانوں نے ایمان اور تقویٰ کی روش اختیار کی ہے اللہ نے ہمیشہ ان پر اپنا کرم فرمایا ہے۔ عرب کے رہنے والے لوگ جو ہمیشہ رزق کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے اور جن کی اکثریت کو کبھی دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی' حالات کی ستم ظریفی انہیں ہمیشہ اپنی گرفت میں رکھتی تھی' وہ دنیا کا انتہائی پسماندہ علاقہ تھا جو ایک جزیرہ نما کی شکل میں دنیا کی ہر طرح کی ترقی سے محروم تھا۔ اس کی زمین سوائے سنگریزوں کے اور کسی چیز کو جنم نہیں دیتی تھی اور اس کے موسم بادسموم اور بگولوں کی فصل پیدا کرتے تھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد جب اسی سرزمین پر اللہ کا دین غالب آیا تو اللہ نے ان کیلئے رزق کے دروازے کھول دیئے۔ جو لوگ دو وقت کی روٹی کو ترستے تھے وہ اپنے دامنوں میں زکوٰۃ کا مال لے کر پھرتے تھے انہیں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا جو سرزمین عداوتوں اور نفرتوں کا جہنم بنی ہوئی تھی وہاں مکارم اخلاق اور اخوت و محبت کی ایسی برکھا برسی جس کے نتیجے میں ایک ایسی بہار نے جنم لیا کہ صدیوں تک انسانوں نے اس کے ٹھنڈے سائے میں زندگی گزاری۔ مسلمانوں کی اس طویل وعریض مملکت میں کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوتا تھا جن کے امیر کو اس بات کی فکر رہتی تھی کہ اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے دن مجھے اس کا جواب دینا پڑے گا۔ اس دور کی پوری تاریخ اس صداقت کی عملی دلیل ہے کہ اگر زمین پر بسنے والے ایمان وتقویٰ کی روش اختیار کریں تو زندگی کی ہر آسودگی ان کے نصیب میں ہوگی لیکن جن معذب قوموں کا یہاں تذکرہ ہوا ہے ان پر اس لئے اللہ کا عذاب آیا کہ انہوں نے اللہ کے نبیوں کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر اس کی پاداش میں ان پر اللہ کی پکڑ آئی اور ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ مشرکین مکہ کو ان حوالوں سے یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اللہ کا یہ قانون اٹل اور حتمی ہے کہ وہ ایمان اور تقویٰ رکھنے والے لوگوں کو نوازتا ہے اور جو لوگ اس کے دین کی تکذیب کرتے ہیں ان کا وہی حشر ہوتا ہے جو سابقہ امتوں کا ہوا۔ اس کے یہاں ایک ہی ترازو ہے جس سے وہ سب قوموں کے اعمال تولتا ہے اس کے ترازو کے باٹ سب کیلئے یکساں ہیں۔ جن اصولوں سے پہلی قومیں تولی گئی ہیں تم بھی انہی اصولوں سے تولے جاؤ گے۔ اس لئے اس آئینہ میں اپنی قسمت دیکھنے کی کوشش کرو۔ اگر تم آپ اپنے دشمن نہیں ہوئے ہو تو ایمان وتقویٰ کا راستہ اختیار کر کے اپنی دنیا اور آخرت بنا لو ورنہ محض سرزمین حرم کا باسی ہونا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت ہونا تمہارے کام نہیں آئے گا۔

اگلی آیات کریمہ میں انہی معذب قوموں کی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے نہایت پہلودار باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں ارشاد ہوتا ہے۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ O اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ O اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ O

''کیا بستیوں کے لوگ اس بات سے بے خوف ہو گئے کہ آدھمکے ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اور وہ سوئے پڑے ہوں یا

Marfat.com

بستیوں والے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر آ جائے ہمارا عذاب دن دھاڑے اور وہ کھیل کود میں ہوں تو کیا وہ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہیں تو یاد رکھو کہ خدا کی تدبیر سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو نامراد ہونے والے ہوں"۔ 97-99

دو مفہوم:

ان آیات کے مفہوم کے دو محمل ہو سکتے ہیں لیکن انجام کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا ایک یہ کہ مشرکین مکہ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ دیکھو جن معذب قوموں کا ذکر تم نے سنا ہے انہیں بار بار اللہ کے عذاب سے ڈرایا گیا لیکن انہوں نے سنی ان سنی کر دی بجائے اپنی اصلاح کرنے کے پیغمبر کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور ہر طرح سے ان کی دعوت کو ناکام کرنے کی کوشش کی ایسا لگتا تھا کہ انہیں اللہ کی طرف سے عذاب آنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے وہ برابر اپنی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں کھوئے رہے۔ ذرا غور کرو کہ ان کی یہ بے خوفی اور ان کی یہ سرگرمیاں کیا انہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکیں۔ نہ دن کے وقت ان کی سرگرمیاں کسی کام آئیں نہ راتوں کی نیندوں میں ڈوبے ہوئے ان کی بے فکری کسی کام آئی۔ کبھی اللہ کا عذاب ان کی بے خبری میں آیا تو بے خبری انہیں لے ڈوبی اور کبھی دنیوی سرگرمیوں میں کھو جانے کے باعث اس حد تک وہ نڈر ہو گئے کہ دن کے وقت خدا کا عذاب دھاڑتا ہوا آیا لیکن وہ اس کے بچاؤ کیلئے کچھ نہ کر سکے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے عذاب کا جو قانون ہے جو اللہ کے نبیوں کی دعوت کی تکذیب پر ہمیشہ بروئے کار آتا ہے وہ ایسا اٹل اور حتمی ہے کہ کوئی قوم کسی حال میں بھی ہو وہ بہرحال اس کی گرفت میں آ کے رہے گی۔

اللہ کا عذاب بے امان ہوتا ہے:

دوسرا مطلب اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ اے مشرکینِ مکہ تم نے ان قوموں کا تذکرہ سن لیا جن پر خدا کا عذاب آیا تو کیا اب تم اس لئے اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو کر اپنی مصروفیات میں مگن ہو کہ تم نے اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچ لی ہے! اور تم کیا یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ عذاب انہی پر آنا تھا سو آ گیا ہم پر یہ عذاب کسی صورت میں نہیں آ سکتا حالانکہ تم نے گزشتہ قوموں کی تاریخ میں اچھی طرح یہ بات سن لی ہے کہ کوئی قوم کتنی بھی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو اور چاہے وہ اللہ کے دین سے کتنی بھی بے بہرہ کیوں نہ ہو وہ اللہ کی گرفت سے کبھی نہیں بچ سکتی۔ اس کے عذاب سے امان کسی کو نہیں وہ چاہے تو دن کو آ سکتا ہے اور چاہے تو رات کو۔ اگر حقیقت یہ ہے تو تم آخر اس سے بے خوف ہو کر کس طرح اپنے معمولات میں کھوئے ہوئے ہو؟ تمہارے سامنے یہ تاریخ اس لئے بیان کی جا رہی ہے کہ تم اس سے عبرت پکڑو اور اپنی زندگی درست کرنے کی کوشش کرو لیکن اگر تم اس سے کوئی سبق لینا نہیں چاہتے تو پھر تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اپنے انجام کی طرف سے یہ بے فکری اور اللہ کے عذاب سے بے خوفی یہ صرف اس قوم کا رویہ بنتی ہے جس کی قسمت پھوٹ گئی ہو اور جسے پروردگار نے دنیا اور آخرت کے اعتبار سے نامراد لوگوں میں لکھ دیا ہو اور یہ بھی تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ کی طرف سے جب گرفت آتی ہے تو وہ اتنی مخفی اور اس قدر دھیمے انداز میں آتی ہے کہ اس کی آہٹ تک سنائی نہیں دیتی اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب اس کا نشانہ بننے والی قوم پوری طرح اس گرفت میں آ چکی ہوتی ہے۔ یہ بنیادی بات سمجھانے کے بعد پھر براہ راست خطاب کیا گیا ہے مشرکین مکہ سے اور ایک طرح سے ان پر اتمام حجت کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

Marfat.com

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ
اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ
وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا
مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠١﴾ وَمَا وَجَدْنَا
لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ
بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا
بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ
اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى
اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ
بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٠٥﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٠٦﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٠٧﴾
وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾ ع

کیا سبق نہیں ملا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ابھی آ پکڑیں اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیں وہ سننے سمجھنے سے رہ جائیں۔ یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ ہم تمہیں سنا رہے ہیں ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو

Marfat.com

وہ ایمان لانے والے نہ بنے بوجہ اس کے کہ وہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے اسی طرح اللہ ٹھپہ لگا دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔ اور ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد کی استواری نہیں پائی ان میں سے اکثر بدعہد ہی نکلے۔ اور وہ بڑی پکی پکی قسمیں کھا کے یقین دلاتے ہیں کہ اگر کوئی معجزہ ان کو دکھایا جائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو کہ معجزے تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور تمہیں کیا پتہ کہ اگر معجزہ بھی آ جائے گا جب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں اور ہم ان کے دلوں اور ان کی بصیرتوں کو اسی طرح الٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے اور ان کی سرکشی میں ان کو بھٹکتا چھوڑ دیں گے۔ پھر ہم نے ان قوموں کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس رسول بنا کر بھیجا مگر انہوں نے بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا تو دیکھو ان مفسدوں کا انجام کیا ہوا۔ اور موسیٰ نے کہا اے فرعون میں خداوندِ عالم کا فرستادہ ہوں سزاوار ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کروں میں تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔ فرعون نے کہا کہ اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اس کو پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ تو اس نے اپنی لٹھیا ڈال دی وہ یکایک ایک سچ مچ کا اژدھا بن گئی اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ دفعتاً دیکھنے والوں کیلئے چمکتا ہوا نکلا۔

☆ ☆ ☆

اَوَلَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ۝

”کیا سبق نہیں ملا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ابھی آ پکڑیں اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیں وہ سننے سمجھنے سے رہ جائیں“۔ 100

دلوں پر مہر اللہ کے عذاب تمہید ہے:

اس آیت کریمہ میں نام لئے بغیر قریش سے خطاب فرمایا جا رہا ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اے قریش کے لوگو! تم جس سرزمین پر آباد ہو اس زمین پر تم سے پہلے دوسری قومیں آباد رہ چکی ہیں اور تم یہ بات سن چکے ہو کہ جب انہوں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا تو ہم نے انہیں کس طرح پکڑا؟ ان کی تاریخ بار بار تمہیں سنائی جا چکی ہے اور خود تمہارے اندر بھی آج تک ان کے انجام کے قصے سینہ بہ سینہ چلاتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود تم آخر یہ بات کیوں نہیں سوچتے کہ جس جرم کی پاداش میں تم سے پہلے لوگ پکڑے گئے اور وہ تمہارے لئے آج عبرت بنے ہوئے ہیں تم اگر وہی جرم کرو گے اور جیسا کہ کر رہے ہو اور اللہ کے آخری رسول کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرو گے جو انہوں نے کیا تھا تو تم آخر اللہ کی گرفت سے کیسے بچ جاؤ گے یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں ڈھیل دے رکھی ہے ورنہ پروردگار کیلئے یہ کیا مشکل ہے کہ وہ جب چاہے تمہیں آ پکڑے اس لئے تمہارے جرائم وہی

Marfat.com

ہیں جو سابقہ امتوں کے تھے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ڈھیل دینے میں بہت زیادہ نرم اور سخی واقع ہوئے ہیں اس لئے تم برابر ڈھیل پا رہے ہو لیکن یاد رکھو ہو سکتا ہے ابھی عذاب آنے میں کچھ وقت لگے لیکن تمہارے اس رویے کے باعث یہ بات تو کسی وقت بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ کی طرف سے تمہاری محرومی کا فیصلہ ہو جائے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دی جائے جس کے بعد تم قبولیت حق کی استعداد سے محروم ہو جاؤ کیونکہ ہر قوم پر عذاب آنے سے پہلے یہ سزا ہمیشہ اصل عذاب کا پیش خیمہ بنتی رہی ہے۔ تم اب تک اس عذاب سے بچے ہوئے ہو لیکن کسی وقت بھی تم اس سزا سے دوچار ہو سکتے ہو۔ اس وارننگ کے بعد اگلی آیت کریمہ میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے نہایت حکیمانہ انداز میں پھر وہ بنیادی باتیں دھرا دی گئی ہیں جو سراسر اللہ کے حلم اور بردباری پر دلالت کرتی ہیں کہ باوجود اس کے کہ قریش نے ہر طرح سے اپنے آپ کو عذاب کا مستحق بنا لیا ہے لیکن پھر بھی ان کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جا رہا ہے کہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اٹھا لو چنانچہ ان بنیادی حقائق کو دھراتے ہوئے ارشاد فرمایا:

تِلْكَ الْقُرٰی نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ج وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ج فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ط كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ O وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ج وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ O

"یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ ہم تمہیں سنا رہے ہیں ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ایمان لانے والے نہ بنے بوجہ اس کے کہ وہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے اسی طرح اللہ ٹھپہ لگا دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔ اور ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد کی استواری نہیں پائی ان میں سے اکثر بدعہد ہی نکلے"۔ 101-102

دلوں پر مہر کب لگتی ہے؟

گزشتہ آیت میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم جب کسی قوم پر عذاب بھیجنے کا ارادہ کرتے ہیں تو عذاب سے پہلے ان کے دلوں پر مہر لگا کر انہیں قبولیت حق کی استعداد سے محروم کر دیتے ہیں یہ گویا عذاب کی تمہید ہوتی ہے۔ پیش نظر دونوں آیتوں میں اسی بات کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے کہ ہم اچانک دلوں پر مہر نہیں لگاتے بلکہ اس سے پہلے ایک پراسس ہے جس کو بروئے کار لایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے ہدایت کیلئے رسول بھیجے جاتے ہیں وہ اپنی امکانی حد تک ان کی اصلاح کیلئے کوشش کرتے ہیں۔ مخالفین کی طرف سے ہر طرح کی مخالفت کا سامنا کرتے ہیں۔ ان کے برے سے برے سلوک کو برداشت کرتے ہیں وہ ہر طرح انہیں ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن رسول برابر ان کی بھلائی کیلئے اللہ کے دین کی دعوت ان کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں اور اپنی بات کی وضاحت کیلئے کبھی دلائل انفس سے کام لیتے ہیں کبھی دلائل آفاق سے، کبھی عام مشاہدے میں آنے والی مثالوں سے بات کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں پھر اپنے بے داغ کردار سے ان کے سامنے عملی شہادتیں بھی پیش کرتے ہیں لیکن جب ان کے مخاطب لوگ بجائے ان دلائل سے متاثر ہونے کے معجزات طلب کرنے لگتے ہیں اور ساتھ یہ وعدہ بھی کرتے ہیں کہ اگر یہ معجزہ دکھا دیا جائے تو ہم ضرور ایمان لے آئیں گے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں معجزات بھی دکھائے جاتے ہیں اور بعض دفعہ ان کی منہ مانگی نشانیاں بھی ظاہر کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کی قوم ان کی دعوت کا مسلسل انکار کرنے کی وجہ سے آخر اس حال کو پہنچ جاتی ہے کہ نہ تو ان پر کوئی دلیل اثر انداز ہوتی ہے اور نہ وہ اپنی مطلوبہ نشانیوں اور معجزات کو دیکھ کر راہ راست اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگانے کا فیصلہ فرما دیتے ہیں قرآن کریم نے جا بجا اس

Marfat.com

مثالیں بھی دی ہیں۔سورۃ الانعام میں ارشاد فرمایا:

وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ لَّيُؤۡمِنُنَّ بِهَا قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰيٰتُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَمَا يُشۡعِرُكُمۡ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ o وَنُقَلِّبُ اَفۡـئِدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ o

''اور وہ بڑی پکی پکی قسمیں کھا کے یقین دلاتے ہیں کہ اگر کوئی معجزہ ان کو دکھایا جائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو کہ معجزے تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور تمہیں کیا پتہ کہ اگر معجزہ بھی آجائے گا جب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں اور ہم ان کے دلوں اور ان کی بصیرتوں کو اسی طرح الٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے اور ان کی سرکشی میں ان کو بھٹکتا چھوڑ دیں گے''۔110-109

آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت میں بھی یہی حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے:

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيۡهِمُ الرِّجۡزُ قَالُوۡا يٰمُوۡسَى ادۡعُ لَـنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنۡدَكَ ۚ لَـئِنۡ كَشَفۡتَ عَنَّا الرِّجۡزَ لَـنُؤۡمِنَنَّ لَكَ وَلَـنُرۡسِلَنَّ مَعَكَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ o فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُمُ الرِّجۡزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمۡ بَالِغُوۡهُ اِذَا هُمۡ يَنۡكُثُوۡنَ o 134-135

''جب ان پر کوئی آفت آتی وہ کہتے اے موسیٰ ہمارے واسطے اپنے رب سے اس وعدے کی بنا پر جو اس نے تم سے کر رکھا ہے دعا کرو۔ اگر تم نے یہ بلا ہمارے سر سے ٹال دی تو ہم تمہاری بات ضرور مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ جانے دیں گے۔ پھر جب ہم اس آفت کو کچھ دیر کے لئے جس تک لازماً ان کو پہنچنا ہوتا ٹال دیتے تو وہ دفعتاً اپنا عہد توڑ دیتے''۔

بعد کی آیات کریمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کے دینی اور سیاسی عروج وزوال کی پوری تاریخ اجمال مگر نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرمائی گئی ہے۔ یہ سورۃ اگرچہ مکی ہے لیکن اہل مکہ اور مشرکین عرب بنی اسرائیل اور ان کی تاریخ سے ناواقف نہیں تھے اور مزید یہ بات بھی کہ عنقریب مسلمانوں کو یہود سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ اس لئے بھی ضروری تھا کہ مسلمان ان کی تاریخ سے بھی آگاہ ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ اگرچہ ابھی تک براہ راست اسلام کی دعوت کو بنی اسرائیل سے واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن وہ قریش مکہ کے واسطے سے برابر اس نئے دین کی تبلیغی کاوشوں سے آگاہ رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً قریش کو اس نئے دین سے برگشتہ کرنے اور بدگمانیاں پیدا کرنے کیلئے مختلف شوشے چھوڑتے رہتے تھے اور بعض دفعہ عجیب وغریب سوالات سجھاتے تھے تاکہ وہ ان سوالات کی مدد سے آنحضرت ﷺ کیلئے مشکلات پیدا کریں اور مسلمانوں کی یکسوئی کو ختم کریں۔ علاوہ ازیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کے آئینہ میں بعض باتیں قریش کے سوچنے کیلئے کہی جارہی ہیں جن میں بالکل ایک سامنے کی بات یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اثر واقتدار کے اعتبار سے نہایت مفلس واقع ہوئے ہیں۔ آپ کے خاندان کی ایک بڑی تعداد ابھی تک آپ کا دین قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوئی اور قریش بری طرح اس کا راستہ روکنے کیلئے کوشاں ہیں اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے بھی ہیں وہ نہایت غیر مؤثر لوگ ہیں۔ ایسی صورت حال میں اس دین کے آگے بڑھنے کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ اس واقعہ کے حوالے سے انہیں یہ بتایا جارہا ہے کہ دیکھو موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے بھائی کے سوا کوئی معاون اور مددگار اپنے ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ آپ جس قوم کے فرد تھے وہ غلامی کی ذلت برداشت کر رہی تھی اور آپ کو جن لوگوں سے واسطہ تھا یعنی فرعون اور آل فرعون سے وہ اپنے دور کے نہایت ظالم اور خونخوار کردار کے مالک تھے جن سے کسی طرح کی بھی شرافت کی امید نہیں کی جاسکتی تھی اس کے باوجود آپ نے براہ راست فرعون کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کی اور اس کی

Marfat.com

ساری جلالت وسطوت کونظرانداز کرتے ہوئے صاف صاف اسے بتایا کہ تم نے اگر میری دعوت قبول نہ کی تو تمہارا انجام اچھا نہیں ہوگا۔نتیجہ سامنے ہے کہ بے نوا اور بے یارومددگار موسیٰ علیہ السلام غالب وکامران رہے اور فرعون اپنی فوجوں سمیت بحرقلزم کی نذر ہو گیا یہ واقعہ قریش کو سمجھانے کیلئے کافی تھا کہ تم اپنی جس قوت وشوکت پر بھروسہ کئے بیٹھے ہو وہ فرعون اور آل فرعون کی قوت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی اور آنحضرت ﷺ حضرت موسیٰ کی طرح بیشک تنہا اور بے یارومددگار ہیں لیکن بہرحال قریش کے ایک معزز فرد ہیں اگر اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کی دعوت کو فرعون کے مقابلے میں غالب وکامران کر سکتا ہے تو آنحضرت کی دعوت کو بھی قریش مکہ کے مقابلے میں یقیناً کامیاب فرمائے گا۔اسی طرح اس واقع سے آنحضرت پر ایمان لانے والوں کو بھی حوصلہ دیا جارہا ہے کہ تمہیں اپنی قلت وکمزوری اور مخالفین کی کثرت وشوکت کو دیکھ کر ہراساں نہیں ہونا چاہئے۔اس کی مدد آنے کا ایک وقت ہوتا ہے جس کو وہ خود ہی جانتا ہے لیکن وہ ضرور آ کے رہتا ہے تمہیں بھی اطمینان رہنا چاہئے کہ وہ وقت آئے گا اور تمہیں اللہ تعالیٰ سرفرازی عطا فرمائے گا۔اس سے پہلے جن قوموں کا تذکرہ ہو چکا ان کی تاریخی ترتیب بھی وہی ہے جس ترتیب سے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی تاریخی ترتیب کا ایک حصہ ہیں حضرت شعیب کے بعد وہی عظیم پیغمبر ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا چنانچہ حضرت شعیب کے تذکرے کے بعد ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا جارہا ہے:

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ○

”پھر ہم نے ان قوموں کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس رسول بنا کر بھیجا مگر انہوں نے بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا تو دیکھو ان مفسدوں کا انجام کیا ہوا“۔103

فرعون کی تحقیق:

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف بھیجے گئے تھے۔فرعون اپنے وقت کا عظیم حکمران تھا لیکن یہ اس شخص کا نام نہیں بلکہ لقب تھا۔فرعون کے معنی ہیں سورج دیوتا کی اولاد۔قدیم اہل مصر سورج کو جوان کا مہادیو یا ربِ اعلیٰ تھا رع کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔اہل مصر کے اعتقاد کی رُو سے کسی فرمانروا کی حاکمیت کیلئے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ رع کا جسمانی مظہر اور اس کا ارضی نمائندہ ہو۔اسی لئے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسراقتدار آتا تھا اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا تھا اور ہر فرمانروا جب تخت نشیں ہوتا فرعون کا لقب اختیار کر کے باشندگان ملک کو یقین دلاتا تھا کہ تمہارا ربِ اعلیٰ یا مہادیو میں ہوں۔

یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے قصے کے سلسلے میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے ایک وہ جس کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور جس نے بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد کو قتل کرنے کا حکم دے رکھا تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام محض اللہ تعالیٰ کی قدرت سے نہ صرف کہ زندہ رہے بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص انتظام کے تحت فرعون کے محل میں پہنچا دیا گیا اور وہیں آپ نے پرورش پائی اور دوسرا فرعون وہ ہے جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔محققین کا خیال یہ ہے کہ پہلے فرعون کا نام رعمسیس دوم تھا اور دوسرا فرعون جس کا ان آیات میں ذکر کیا جارہا ہے اس کا نام منفتہ یا منفتاح تھا جو اپنے باپ رعمسیس دوم کی زندگی ہی میں شریک حکومت

Marfat.com

کا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک بنا۔ اسی دوسرے فرعون کے دربار میں آپ اللہ کے رسول کی حیثیت سے اللہ کے دین کی دعوت لے کر تشریف لے گئے۔ اس آیت کریمہ میں نہایت اجمال کے ساتھ پوری تاریخ کو سمیٹتے ہوئے تین باتیں فرمائی گئی ہیں۔

آیت میں بیان کردہ تین باتوں کی وضاحت:

پہلی یہ بات کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے اعیان حکومت کی طرف اللہ کے رسول کی حیثیت سے تشریف لے گئے اور آپ نے جب اپنی دعوت ان کے سامنے پیش کی تو باقی قوموں کی طرح انہوں نے بھی سب سے پہلے آپ سے یہی سوال کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو پھر معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے رسول ہونے کی تمہارے پاس نشانی کیا ہے اور ان کی طرف سے نشانی یا نشانیوں کا مطالبہ اس لئے بھی زیادہ قرین عقل ہے کیونکہ یہ فرعون اور اس کے سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوری طرح واقف تھے۔ آپ فرعون کے گھر میں پلے بڑھے اور یہ موجودہ فرعون آپ کے ساتھ ہی کھیلتا کودتا رہا۔ دونوں کا بچپن اور لڑکپن اکٹھا گزرا' اکٹھے جوانی کی حدود میں داخل ہوئے۔ جس طرح اس نے شہزادوں کی طرح تربیت پائی آپ بھی شہزادوں کی طرح پلے بڑھے اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہزادوں ہی کی طرح آپ کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا گیا اور جوان ہونے کے بعد آپ پر حکومت کی بعض ذمہ داریاں بھی ڈالی گئیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کو فوجوں کا جرنیل بنایا گیا اور آپ نے نہایت کامیابی سے بعض مہمات بھی سرانجام دیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس موجودہ فرعون اور اس کے سرداروں کے سامنے نہایت فعال زندگی گزاری۔ آپ سے اس بات کی تو امید کی جا سکتی تھی کہ آپ حکومت کے کسی عہدے کا مطالبہ کریں کیونکہ آپ ہر طرح اس کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن آپ خاص حالات میں مصر سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور کئی سالوں کے بعد آپ تشریف لائے ہیں تو آپ بجائے کوئی اور بات کہنے کے اپنے آپ کو اللہ کا نمائندہ قرار دے رہے ہیں تو اولاً تو ان کیلئے یہ بات کہ آپ فرعون کے سوا کسی اور کو رب قرار دیتے ہیں قابل تسلیم نہیں اور پھر اس کا نمائندہ ہونا یہ تو اور بھی عجیب بات ہے۔ اس لئے انہوں نے سب سے پہلے کسی اور کو رب کو ماننے کے بارے میں سوالات کئے اور پھر اس رب کے نمائندہ ہونے کے حوالے سے آپ سے نشانیوں کا مطالبہ کیا لیکن جب آپ نے ان کے سامنے وہ آیات اور نشانیاں ظاہر کیں جو باقی انبیاء کی طرح یقیناً دو قسم کی تھیں۔ ایک تو وہ فطری اور عقلی دلائل جس پر ہر پیغمبر کی دعوت مبنی ہوتی ہے اور دوسرے وہ حسی معجزات جو پیغمبر کی نشانی کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے جاتے ہیں۔ آپ نے بھی یہ دونوں طرح کی آیات ان کے سامنے پیش فرمائیں لیکن انہوں نے جو ان دلائل اور آیات کے ساتھ سلوک کیا اور ان کے مقابلے میں جو رویہ اختیار کیا۔ قرآن کریم اسے ظلم قرار دیتا ہے۔ ظلم کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دینا اور اس کو اس نگاہ سے نہ دیکھنا جس کی وہ حقیقی سزاوار ہوتی ہے۔ اللہ کے نبی کی اپنی سیرت اس کا بے داغ کردار اور پھر اس کے پیش کردہ معجزات کی جلالت اور سطوت اس کو سحر اور جادو قرار دے کر نظر انداز کرنا اسے ظلم کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ بجائے اس کے کہ فرعون اور اس کے ساتھی ان نشانیوں پر پوری طرح غور و فکر کر کے انہیں ٹھیک مقام دینے کی کوشش کرتے۔ انہوں نے ان کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ جب وہ بڑی سے بڑی چیز کو بھی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ نہیں لیتا بلکہ غیر سنجیدہ رویہ اختیار کرتا ہے تو وہ کبھی بھی بات کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ بڑی سے بڑی حقیقت بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتی ہے۔ اس لئے کہ سوچ کا انداز ہر چیز کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ فرعون اور اس کے سرداروں نے بھی جب یہی رویہ اختیار کیا تو وہ اسی انجام سے دوچار ہوئے جو ہمیشہ مفسدین کا انجام ہوتا رہا ہے اور جس انجام کی سرگزشت گزشتہ قوموں کی تاریخ میں اس سے پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ چنانچہ اس مختصری آیت میں یہ تینوں حوالے بیان کر دیئے گئے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کس شان کے ساتھ فرعون کے دربار میں آئے' کس طرح انہوں نے دعوت پیش کی' کس طرح اپنے رسول ہونے کے دلائل

Marfat.com

دیئے اور پھر کس طرح اپنی صداقت کی نا قابل انکار نشانیاں دکھائیں مگر جب دیکھنے والوں نے اس کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا تو آخر اس انجام کو پہنچے جو ہمیشہ مفسدین کا انجام رہا ہے۔ اس اختصار کے بعد اگلی آیات میں موسیٰ علیہ السلام کو دعوت پیش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور ان کی دعوت کے اہم نکات کو پیش فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ O حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ O

''اور موسیٰ نے کہا اے فرعون میں خداوند عالم کا فرستادہ ہوں سزاوار ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کروں میں تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے''۔ 104-105

دوسری آیت کریمہ میں حَقِيْقٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کا معنی سمجھ لینا چاہیے حَقِيْقٌ حَقَّ اور حُقَّ سے فعیل کا وزن ہے اور یہ مفعول کے معنی میں آتا ہے اس کے معنی ہیں لائق، اہل اور سزاوار۔ مثلاً کہیں گے هُوَ حَقِيْقٌ بِهٖ وہ اس کا اہل اور سزاوار ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا تعارف، ان کی اپنی زبانی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے سب سے پہلے اپنا تعارف کروایا کہ تم شخصی طور پر تو مجھے جانتے ہو لیکن اس وقت میں جس حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں اس کا جاننا تمہارے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ میں وہ موسیٰ نہیں ہوں جو تمہارے ساتھ کھیلتا رہا ہے بلکہ رب العالمین کا فرستادہ ہوں۔ تم اپنے آپ کو رب کہتے ہو حالانکہ تم انسانوں کی طرح ایک انسان ہو۔ تم خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی تم نے فریب دے رکھا ہے۔ تمہاری حیثیت ایک آدمی سے زیادہ نہیں۔ رب اصل میں وہ ہے جو صرف مصر کا رب نہیں بلکہ رب العالمین ہے وہ سارے جہانوں کا رب ہے میری حیثیت یہ ہے کہ مجھے اس رب العالمین نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے۔ مجھ پر اس نے اپنے پیغام نازل کیا ہے اور مجھے یہ ذمہ داری دی گئی ہے کہ میں تمہیں صحیح صورت حال سے آگاہ کروں اور تمہیں بتاؤں کہ پوری کائنات کا ایک رب ہے اس نے انسانوں کو صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ انہیں زندگی گزارنے کا ایک طریقہ بھی دیا ہے اور پھر وہ ایک ایسا دن لائے گا جس میں تمام انسانوں کو اکٹھا کیا جائے گا اور ہر انسان سے اس کی زندگی کے اعمال کا حساب لیا جائے گا پھر اس کے نتیجے میں کسی کو جنت عطا ہوگی اور کسی کو جہنم۔ میں اس کا نمائندہ بن کر تمہیں اس کا حقیقی پیغام پہنچانے آیا ہوں اور تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تم آخرت کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو میری دعوت کو قبول کرو اور اپنی حیثیت کی مزید وضاحت کیلئے فرمایا کہ یوں تو جھوٹ بولنا کسی کیلئے بھی روا نہیں لیکن بطور خاص وہ شخص جو رب العالمین کا رسول بن کے آیا ہو وہ تو اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ رب العالمین کے حوالے سے کوئی ایسی بات کہے جو صحیح نہ ہو کیونکہ جو رب العالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آتے ہیں وہ اپنے سیرت و کردار میں بے داغ ہوتے ہیں۔ اللہ انہیں معصوم پیدا فرماتا ہے۔ ان کی بے داغ زندگی اور ان کا اعلیٰ کردار ان کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل ہوتا ہے اس لئے میرے بارے میں تمہیں اطمینان ہونا چاہیے کہ میں رب العالمین کی طرف سے تمہیں جو بات کہوں گا اس میں کسی طرح کی غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر میں اس بات کو جانتا ہوں کہ تمہیں میری اس حیثیت کو تسلیم کرنا آسان نہیں اس لئے میں اپنے رب کی جانب سے ایسی نشانیاں لے کر آیا ہوں جس سے تمہیں یقین کرنے میں آسانی ہوگی

Marfat.com

کہ اگر میں اللہ کا رسول نہ ہوتا تو اس طرح کی نشانیوں کا ظہور مجھ سے کبھی نہ ہوتا۔ میرا مطالبہ تم سے یہ ہے کہ تم میری رسالت کو قبول کرو اور اللہ کا جو پیغام میں لے کر آیا ہوں اسے تسلیم کرو اور دوسری یہ بات کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔

صرف بنی اسرائیل کا مطالبہ کیوں؟

اب سوال یہ ہے کہ اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے صرف یہی ایک بات رکھی کہ تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجو حالانکہ اللہ کے رسول دنیا میں کسی ایک گروہ کو آزادی دلانے کیلئے تو تشریف نہیں لاتے وہ تو سب کی اصلاح کیلئے تشریف لاتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ آپ نے صرف بنی اسرائیل کی بات کی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ قرآن کریم میں انبیاء اور اقوام کی جو سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں وہ مختلف سورتوں میں سورتوں کے مرکزی مضمون کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان ہوئی ہیں۔ ہر سورت میں سرگزشت کا اتنا ہی حصہ زیر بحث آیا ہے جتنے کیلئے سورت کا مزاج مقتضی ہوا ہے یہ سورت چونکہ ان قوموں کے انجام کا تذکرہ کر رہی ہے جنہوں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت سے انکار کیا اس لئے یہاں بھی حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کا صرف وہی حصہ نمایاں کیا جا رہا ہے جو سورت کے موضوع کو اجاگر کرنے والا ہے۔ اس کے بقیہ اجزاء دوسری سورتوں میں بیان کئے گئے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تو قرآن کریم میں نہایت تکرار کے ساتھ ذکر ہوا ہے لیکن ہر جگہ اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے جس کی موقع محل کے مطابق ضرورت ہوتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کیلئے مطالبہ کیوں کیا تو اس کی دو وجہ سمجھ میں آتی ہیں ایک تو یہ وجہ کہ بنی اسرائیل فرعون اور آل فرعون کے ظلم کی چکی میں بری طرح پس رہے تھے۔ آپ جس طرح فرعون اور آل فرعون کی اصلاح کیلئے مبعوث ہوئے تھے اسی طرح بنی اسرائیل کی اصلاح بھی آپ کے پیش نظر تھی لیکن وہ آل فرعون کے ظلم کے باعث اس حال میں نہیں تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی دعوت ان کے سامنے پیش کر سکتے اور پھر وہ قبول یا عدم قبول کے حوالے سے اپنے طور سے کوئی فیصلہ کر سکتے۔ ان کی اصلاح کے حوالے سے یہ بات ضروری تھی کہ سب سے پہلے ان کو ظلم کی چکی سے نکالا جاتا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ حقیقت میں وہ آل فرعون کی طرح آخری درجہ کے کافر نہیں تھے۔ اگرچہ وہ اپنے اندر کفر اور شرک کے بہت سے اثرات رکھتے تھے لیکن اصلاً وہ بگڑے ہوئے مسلمان تھے ان کے سامنے دعوت پیش کرنے کا طریقہ یقیناً آل فرعون کے سامنے دعوت پیش کرنے سے مختلف تھا اس لئے ضروری تھا کہ پہلے ان کو ایک آزاد فضا مہیا کی جاتی اور پھر ان کے سامنے دعوت پیش کی جاتی اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے ہی مرحلے میں فرعون سے ان کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ ایک اور سوال یہاں یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ قرآن میں تو اس بات کی کوئی وضاحت نہیں لیکن تورات کی کتاب خروج کے مطالعہ سے جو صورت حال سامنے آتی ہے ہم اسے تدبر قرآن کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ

> حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ابتداءً یہ مطالبہ فرعون کے سامنے اس شکل میں رکھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ عبادت کے لیے جانے دے۔ فرعون نے اس مطالبہ کو ماننے سے صاف انکار کر دیا بلکہ غصہ میں آ کر بنی اسرئیل کی بیگار اور مشقت میں اس نے مزید اضافہ کرنے کے احکام جاری کر دیے کہ یہ کاہل اور کام چور ہو گئے ہیں اسی وجہ سے عبادت وغیرہ کے بہانے تلاش کر رہے ہیں۔ پھر حضرت موسیٰ کے معجزوں سے زچ ہو کر جب وہ ذرا نرم پڑا تو اس نے دریافت کیا کہ تم کہاں عبادت کے لیے جانا چاہتے ہو؟ یہ عبادت اسی شہر میں کیوں نہیں کر لیتے؟ حضرت موسیٰ نے جواب میں فرمایا کہ ہم اس عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جائیں گے یہاں ہم یہ عبادت اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہم جس چیز کی قربانی کرنا چاہتے ہیں اس کی قربانی اگر ہم نے یہاں کی

Marfat.com

تو یہ مصری ہمیں سنگسار کر دیں گے۔ یہ جھگڑا عرصہ تک حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان چلتا رہا۔ بالآخر ان آفتوں سے تنگ آ کر جو حضرت موسیٰ کے معجزوں سے ظاہر ہوئیں' درباریوں نے فرعون کو مجبور کیا کہ وہ بنی اسرئیل کو جہاں جانا چاہتے ہیں جانے دے ورنہ موسیٰ کے ہاتھوں مصر تباہ ہو جائے گا۔ فرعون نے مجبور ہو کر اجازت تو دے دی لیکن جب حضرت موسیٰ اپنی پوری قوم کے زن و فرزند' مال مویشی اور جملہ اسباب و سامان کے ساتھ لے کر نکلے تو اس کو احساس ہوا کہ یہ اجازت دینے میں اس نے غلطی کی چنانچہ اس نے اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا کہ مجبور کر کے ان کو واپس لائے لیکن یہ تعاقب اس نتیجہ پر منتہی ہوا کہ فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے اپنی پوری اسکیم واضح نہیں فرمائی تھی۔ صرف اتنا ظاہر کیا کہ وہ تین دن کی راہ بیابان میں جا کر اللہ کی عبادت اور قربانی کرنا چاہتے ہیں اور قربانی بھی خاص طور پر گائے کی کرنا چاہتے ہیں جس سے قبطیوں نے بنی اسرئیل کو اسی طرح محروم کر رکھا تھا جس طرح بھارت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو محروم کر رکھا ہے۔ حضرت موسیٰ نے چاہا کہ مصر کے غلامانہ ماحول سے الگ لے جا کر بنی اسرئیل کو منظم کریں اور ان کے اندر ان تمام دینی روایات کو از سر نو زندہ کریں جو مصر کی محکومانہ زندگی میں بالکل مردہ ہو چکی تھیں ہمارا قیاس ہے کہ اس مقصد کے لیے وہ سینا کے اسی علاقے میں جانا چاہتے ہوں گے جہاں انہوں نے مدین سے واپسی کے موقع پر اللہ کی تجلی دیکھی تھی اور پھر جہاں ان کو اس ہجرت کے سفر میں احکام عشرہ کی الواح عطا ہوئیں۔

حاصل کلام یہ کہ زیر بحث آیت کریمہ میں زیادہ زور اس بات پر تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے فرمایا کہ میں رب العالمین کی طرف سے تمہاری طرف رسول بن کر آیا ہوں اور پھر اپنے تعارف میں چند بنیادی باتیں ارشاد فرمائیں اور مزید یہ فرمایا کہ میں اپنے ساتھ چند نشانیاں بھی لے کر آیا ہوں کیونکہ فرعون کیلئے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول ماننا اس لئے بھی مشکل تھا کہ وہ خود اپنے آپ کو رب کہتا تھا تو اپنے دعویٰ ربوبیت کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کو رب تسلیم کرنے پر کیسے تیار ہو سکتا تھا اور جب اسے کسی اور کا رب ہونا ہی قابل تسلیم نہیں تھا تو وہ کسی کو اس کا رسول کیسے تسلیم کر لیتا اس لئے ضروری تھا کہ کوئی نہ کوئی ایسی نشانی ظاہر کی جائے جس میں ایک طرف رب العالمین کی قدرت کا ظہور ہوتا ہو اور دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی تصدیق ہوتی ہو۔ چنانچہ اس نے یہ سنتے ہی بنی اسرائیل کے مطالبے پر تو توجہ نہیں دی لیکن اس بات کا فوراً نوٹس لیا اور بے ساختہ پکارا جس کو آیت کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ O فَاَلۡقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ O وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ O

"فرعون نے کہا کہ اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اس کو پیش کرو' اگر تم سچے ہو۔ تو اس نے اپنی لٹھیا ڈال دی وہ یکایک ایک سچ مچ کا اژدھا بن گئی اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ دفعتاً دیکھنے والوں کیلئے چمکتا ہوا نکلا"۔ 106-108

ہر پیغمبر کے معجزات قوم کے مذاق کے آئینہ دار ہوتے ہیں:

پیشتر اس کے کہ ہم ان معجزات کی وضاحت کریں یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ معجزات کے بارے میں سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ وہ قوموں کے مذاق اور رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں کہ جس چیز کا ان میں عام چلن ہوتا ہے اور جسے عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور جس میں آگے بڑھنے اور

Marfat.com

حاصل کرنے کو کوئی بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا ہے پیغمبر کو اسی طرح کے معجزات دیئے جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں عربوں میں سب سے زیادہ قدر و عظمت کلام میں فصاحت و بلاغت کو حاصل تھی اور پوری عرب سوسائٹی پر خطیبوں اور شاعروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جب کوئی شخص پوری عرب سوسائٹی کی ذہانت کو چیلنج کرنا چاہتا تھا تو بیت اللہ کی دیوار پر اپنا کوئی نہ کوئی بے مثال قصیدہ یا خطبہ آویزاں کر دیتا تھا۔ یہ ایک طرح سے چیلنج ہوتا تھا کہ کوئی شخص اگر میرے جیسا با کمال ہے تو وہ اس جیسا قصیدہ یا خطبہ لکھ کر لائے۔ بڑے بڑے میلوں اور اجتماعات میں شاعری اور خطابت کے معرکے بپا ہوتے تھے اور اس میں فصاحت و بلاغت کے کمالات کا مقابلہ ہوتا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے تو آپ کو چونکہ اس صورت حال سے واسطہ پڑا اس لئے آپ کو سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم کی شکل میں عطا کیا گیا جس کی فصاحت و بلاغت نے تمام فصحاء و بلغاء کو عاجز و درماندہ کر دیا۔ ابھی اس کی چند ابتدائی اور مختصر سورتیں نازل ہوئی تھیں کہ عرب کے بڑے بڑے زبان آور گنگ ہو کر رہ گئے۔ شیخ سعدی نے ٹھیک کہا

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست

کتب خانہ چند ملت بشست

کہ حضور ایک ایسے یتیم تھے کہ ابھی ان پر پورا قرآن بھی نازل نہیں ہوا تھا کہ کتنی ملتوں کے کتب خانے اس کے سامنے درماندہ ہو گئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مصر کی سوسائٹی میں سب سے زیادہ زور سحر و شعبدہ کا تھا اور اس ماحول میں ساحروں کو بڑا مقام حاصل تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ معجزات عطا فرمائے جس نے سوسائٹی کے ان با کمال لوگوں کو درماندہ کر کے رکھ دیا اور بڑے بڑے ساحروں کا طلسم پاش پاش کر ڈالا۔ چنانچہ جیسے ہی فرعون نے آپ سے نشانی کا مطالبہ کیا تو آپ نے اللہ کے حکم سے اپنا عصا اس کے سامنے پھینکا جو کوئی خاص قسم کا عصا نہیں تھا بلکہ ایک عام قسم کی لکڑی تھی جس کے بارے میں قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور پہلی حاضری میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے تو آپ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری لٹھیا ہے میں بکریاں چراتا ہوا تھک جاتا ہوں تو کمر کے پیچھے اس کے اوپر ہاتھوں سے ٹیک لگا کر ستا لیتا ہوں اور درختوں سے اس کے ذریعے اپنی بکریوں کیلئے پتے جھاڑتا ہوں اور اور بھی کچھ کام اس سے لے لیتا ہوں یعنی چرواہے جس طرح کے عصا اپنے پاس رکھا کرتے تھے یہ بھی اسی طرح کا ایک عصا تھا لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے فرعون کے سامنے پھینکا تو وہ اچانک ایک سچ مچ کا اژدھا بن گیا۔ قرآن کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے قد و قامت میں تو ایک بہت بڑا اژدھا تھا لیکن اپنی چستی اور سرعت رفتار میں اتنا تیز تھا کہ دوڑتا ہوا چھوٹا سا سانپ معلوم ہوتا تھا حالانکہ جتنے بڑے جسم کا اژدھا ہوتا ہے وہ دوڑنے اور ہلنے میں اتنا ہی سست ہوتا ہے لیکن اس اژدھا کی صفات غیر معمولی تھیں اور پھر یہاں اس کیلئے ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض اس طرح کا اژدھا نہیں تھا کہ ہو تو وہ لاٹھی کی شکل کا لیکن ذرا سی حرکت اس میں پیدا ہو گئی ہو یا اس میں سر اور دم نکل آئے ہوں بلکہ وہ فی الواقع سچ مچ کا اژدھا تھا جس میں ایک اژدھا کی تمام صفات و خصوصیات موجود تھیں۔ دوسرا معجزہ آپ کو ید بیضا کی صورت میں عطا کیا گیا کہ آپ اپنا ہاتھ جو ہر لحاظ سے خوبصورت ہاتھ تھا کیونکہ ہر پیغمبر اپنے دور کا خوبصورتی کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اس لئے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ جیسے برص زدہ ہاتھ بالکل سفید ہوتا ہے شاید اس طرح آپ کا ہاتھ ہو۔ نہیں بلکہ آپ کا ہاتھ اس طرح تھا کہ جب آپ اسے بغل میں دبا کر نکالتے تو وہ اس طرح چمکتا کہ لوگ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ جاتے۔ اس کی چمک نہ تو آنکھوں کو چکا چوند کرتی تھی اور نہ بدنما معلوم ہوتی تھی بلکہ غیر معمولی معجزے کی شکل میں دیکھنے والوں کو حیران کر دیتی تھی۔ ناظرین کے لفظ سے ایک اور بات کی طرف بھی راہنمائی ملتی ہے وہ یہ کہ ہاتھ میں جو چمک

Marfat.com

ظاہر ہوتی تھی وہ محض فریبِ نظر کی نوعیت کی نہیں تھی جیسی عام طور پر سحر اور شعبدہ کی صورت میں ہوتی ہے بلکہ غور و تامل سے دیکھنے والوں کو اس کی تابا
چمک بالکل اصلی اور حقیقی معلوم ہوتی تھی۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ

فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ
اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي
الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ
فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ
وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ
اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ
النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى
مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ ۚ فَوَقَعَ
الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ۚ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا
صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ ۚ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾
رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ
اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ
اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ

Marfat.com

مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٢٤﴾ قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا
مُنقَلِبُونَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا تَنقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَتْنَا ۚ
رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿١٢٦﴾

قوم کے سرداروں نے کہا یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے نکال دے پس تم کیا رائے دیتے ہو۔ قومِ فرعون کے سرداروں نے کہا ابھی اس کو اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھو اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیجو جو تمام ماہر جادوگروں کو جمع کر کے تمہارے پاس لائیں۔ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے کہنے لگے بڑا صلہ ملے گا ہمیں اگر ہم ہی غالب رہے۔ فرعون نے کہا ہاں بے شک اور تم ہمارے مقربین میں بھی داخل ہو گے۔ بولے اے موسیٰ! یا تو پہلے تم پیش کرو یا ہم ہی پیش کرنے والے بنتے ہیں اس نے کہا تم ہی پیش کرو تو جب انہوں نے پیش کیا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان پر دہشت طاری کر دی اور بہت بڑا کرتب دکھایا۔ اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ تم اپنا عصا ڈال دو تو وہ دفعتاً نگلنے لگا اس کو جو وہ گھڑتے تھے تو حق ظاہر ہو گیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے وہ سب باطل ہو گیا تو تب وہ مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے۔ اور جادوگر سجدے میں گر پڑے اور پکار اٹھے کہ ہم اس رب العالمین پر ایمان لے آئے جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔ فرعون نے کہا تم اس پر ایمان لے آئے ہو اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دوں یہ یقیناً کوئی خفیہ سازش ہے جو تم نے شہر میں اس غرض سے کی ہے کہ اس کے باشندوں کو یہاں سے نکالو تو تم عنقریب جان لو گے میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی چڑھاؤں گا۔ انہوں نے جواب دیا بہرحال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آ گئیں تو ہم نے انہیں مان لیا اے رب ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں۔

..............☆......☆......☆..............

گزشتہ رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون اور آلِ فرعون کی طرف بعثت کے سلسلے میں جو تفصیل بیان کی گئی ہے ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ایک مکالمہ ہے اس میں جو اہم باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں اگرچہ وہ ان آیات کی وضاحت میں مذکور ہو چکیں لیکن آئندہ

Marfat.com

آیت سے ان کو مربوط کرنے کیلئے ایک ترتیب کے ساتھ میں ان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اے فرعون تم جو اپنے آپ کو اپنی رعایا کا سب سے بڑا رب قرار دے رہے ہو یہ سراسر ایک جھوٹ اور فریب ہے تمہارا اور تمہاری رعایا کا رب بھی وہی ہے جو رب العالمین ہے۔ وہ رب العالمین اپنی مخلوق سے کیا چاہتا ہے وہ بتانے کیلئے اس نے مجھے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس اہم بات کو سن کر فرعون کا چونک اٹھنا ایک فطری بات تھی۔ اس نے یقیناً نہایت حیرانی اور سراسیمگی کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھا جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو مجھے اس کا یقین نہیں آرہا۔ تم میرے ساتھ پلے بڑھے اور جوان ہوئے ہو۔ تم میری طرح کے ایک آدمی ہو تم نے میری ہی طرح تعلیم دربار میں تعلیم پائی ہے اور میری ہی طرح بعض مہمات میں شریک رہے تو یکایک یہ بات کیسے ممکن ہوگئی کہ تمہیں یہ معلوم ہوگیا کہ کوئی اور ذات رب العالمین ہے اور اس نے تمہیں اپنا رسول بنایا ہے۔ اس کی نگاہوں سے یہ سب کچھ پڑھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس علم کا میں نمائندہ بن کر آیا ہوں تم اس سے بالکل جاہل ہو۔ اس لئے میں تمہیں اس علمِ حقیقی کے حوالے سے بتاتا ہوں کہ جو اللہ کے رسول ہوتے ہیں وہ کبھی اللہ کے بارے میں غلط بات نہیں کہتے۔ تمہیں پہلے بھی تجربہ ہے کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اب اس عمر میں میں اللہ پر جھوٹ کیسے باندھ سکتا ہوں اور مزید یہ کہ میں اگر یہ دعویٰ کر رہا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو جہاں میری سیرت و کردار کی بلندی اور میری دیانت وامانت اس بات کا ثبوت ہے کہ میں واقعی اس کا رسول ہوں اسی طرح ایک اور بات بھی میری رسالت کا ثبوت ہے وہ یہ کہ میں اپنے ساتھ چند نشانیاں بھی لے کر آیا ہوں جنہیں دیکھ کر تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں واقعی اللہ کا رسول ہوں۔ وہ رسول کی حقیقت کو ویسے تو نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن یہ بات اس کیلئے قابل فہم تھی کہ تم واقعی اپنے ساتھ ایک شناخت بھی لے کر آئے ہو اور وہ چند نشانیاں ہیں جو تمہارے رسول ہونے پر دلالت کرتی ہیں تو انہیں ہمارے سامنے پیش کرو۔ چنانچہ عصا اور ید بیضا کی صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ نشانیاں اس کے سامنے پیش کیں جس سے وہ بھی اور اس کے اعیان حکومت بھی نہ صرف کہ حیران و ششدر ہوئے بلکہ بری طرح سے مرعوب اور مبہوت ہو کے رہ گئے۔ اب بجائے اس کے کہ وہ ان نشانیوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شناخت سمجھ کر آپ کو اللہ کا رسول مان لیتے وہ نہ صرف کہ انہیں سمجھنے سے قاصر رہے بلکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رسالت کے اس دعوے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ تم مجھ پر ایمان بھی لاؤ اور بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دو تو انہوں نے اس کے پردے میں اندیشہ ہائے دور دراز کی بو سونگھی اور وہ کچھ محسوس کرنے لگے جس کا ذکر انہوں نے باہمی مشاورت میں کیا۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں ان کی آپس کی مشاورت کا ذکر ہے اور پھر ان خدشات کا اظہار بھی ہے جس کو وہ اس گفتگو میں محسوس کرنے لگے تھے۔ ارشاد فرمایا جارہا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝

"قوم کے سرداروں نے کہا یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے نکال دے پس تم کیا رائے دیتے ہو"۔ 109-110

قوم فرعون کے سرداروں کی باہمی مشاورت اور اس کے پس پردہ معتقدات:

یہ قوم فرعون کی باہمی مشاورت ہے جو انہوں نے فرعون کو رائے دینے سے پہلے آپس میں کی ہے اور جس کے نتیجے میں وہ یہ رائے اختیار

Marfat.com

کرنے پر آمادہ ہوئے کہ موسیٰ جو اپنے آپ کو اللہ کے رسول کہتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے ہمارے سامنے دکھایا ہے اس کو وہ رسول ہونے کی نشانی بتاتے ہیں یہ سراسر غلط بات ہے وہ اللہ کے رسول نہیں بلکہ وہ ایک بہت بڑے جادوگر ہیں اور جو کچھ انہوں نے ظاہر کیا ہے وہ سراسر جادوگری کا اظہار ہے اور ساتھ ہی انہوں نے یہ نتیجہ بھی نکالا کہ انہوں نے یہ جو کہا تھا کہ میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجو تو اس سے ان کے سیاسی عزائم کا اظہار ہوتا ہے وہ صرف ہماری اصلاح نہیں کرنا چاہتے بلکہ حقیقت میں وہ ہم سے ہمارا ملک چھیننا چاہتے ہیں تو ایک شخص جو جادوگر ہو اور جادوگر بھی بہت کمال کا اور پھر اپنے ساتھ سیاسی عزائم بھی رکھتا ہو تو تم خود سوچو کہ وہ ہمارے لئے کتنا خطرناک ہوسکتا ہے۔ اس میں سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نشانیاں جو سراسر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات تھیں۔ قوم فرعون بجائے انہیں معجزات سمجھنے کے انہیں جادو قرار دے رہے ہیں۔ جتنی قومیں بھی گمراہ ہوئیں اور پھر اللہ کے رسول ان کی ہدایت کیلئے تشریف لائے' تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ہر قوم نے پیغمبروں کے معجزات کو سحر اور شعبدہ بازی قرار دیا۔ کسی نے یہ بات تسلیم نہیں کی کہ یہ معجزات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کے ہاتھ سے ان معجزات کا صدور ہو رہا ہے وہ واقعی اللہ کا رسول ہے اس لئے سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ قوم موسیٰ کی طرح ہر قوم کو یہ جو غلطی لاحق ہوتی رہی ہے اس کا آخر سبب کیا ہے۔ غور و فکر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی قوم کی طرف اللہ کا رسول آتا ہے تو اس وقت آتا ہے جب وہ قوم اللہ سے برگشتہ ہو چکی ہوتی ہے۔ اولاً تو وہ اللہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی اور اگر کرتی بھی ہے تو اس کی صفات سے یکسر بے بہرہ ہو چکی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب پیغمبر اللہ کا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر معجزات اس کے ہاتھ سے صادر ہوتے ہیں تو قوم یہ سمجھنے سے قاصر رہتی ہے کہ اس طرح کی خرق عادت باتیں کیا جادو کے علاوہ کسی اور طریق سے بھی ظاہر ہوسکتی ہیں ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ یہ کائنات جن قوانین کے تحت رواں دواں ہے اور جن قوانین اور اسباب کے تحت اعمال ظہور پذیر ہو رہے ہیں اور مخلوقات کا سفر جاری ہے۔ اس میں کسی طرح سے کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ سانپ یا اژدھا ہمیشہ سانپ کے انڈے سے نکلتا ہے۔ لکڑی سے اژدھا بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اسی طرح کسی اور چیز کا معمول سے ہٹ کر وجود میں آنا یا کسی چیز کے اثر کا اس سے منفک ہو جانا یا سبب اور مسبب کے رشتے کا شکست ہو جانا یہ انسانوں کی نگاہ میں ممکن نہیں وہ خواہی نہ خواہی اس یقین سے وابستہ ہوتے ہیں کہ جس طرح کائنات کا سفر جاری ہے اس میں کسی طرح کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ پیغمبر جب معجزات دکھاتا ہے تو وہ یہ ماننے کو تیار تو نہیں ہوتے کہ اللہ تعالیٰ سبب اور مسبب کے رشتے کو توڑ بھی سکتا ہے البتہ ان کے سامنے چونکہ سحر اور شعبدہ بازی سے بعض غیر معمولی چیزیں وجود پذیر ہوتی ہیں اس لئے وہ ہر معجزے کو بھی سحر اور جادو ہی کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ پیغمبر جن بنیادی باتوں کی اصلاح کیلئے آتا ہے ان میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ دنیا کو یہ بتائے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ان میں کوئی چیز بھی ذاتی طور پر کسی چیز کی مالک نہیں۔ پانی پیاس بجھاتا ہے' آگ جلاتی ہے' برف ٹھنڈک پہنچاتی ہے' بیج اگتا ہے' بارشیں آبیاری کا کام کرتی ہیں۔ ان تمام چیزوں کے اثرات ذاتی نہیں بلکہ اللہ کے عطا کردہ ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اپنے اثر اور تاثیر میں آزاد نہیں بلکہ ان میں سے ہر چیز کی تاثیر ہر فعل کی فعلیت' ہر سبب کی سببیت اللہ کے فیصلے کے تابع ہے۔ اسی نے پانی میں پیاس بجھانے کی صلاحیت پیدا کی ہے جس طرح وہ یہ صلاحیت پیدا کرنے پر قادر ہے اسی طرح چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ جس طرح سانپ انڈے سے نکلنے والے جرثومے سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح اللہ اگر چاہے تو لکڑی سے بھی سانپ وجود میں آسکتا ہے۔ آگ ہمیشہ جلاتی ہے لیکن اگر پروردگار کو منظور نہ ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کی قدرت نہیں رکھتی۔ چھری ہمیشہ کاٹتی ہے لیکن جب پروردگار نہ چاہیں تو وہ ابراہیم خلیل اللہ کے ہاتھ میں بھی کاٹنے سے معذور ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی مؤثر اور قادر مطلق ذات صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی ہے۔ جس طرح اشیاء کی تاثیر میں وہ قادرِ مطلق اور حاکم حقیقی ہے اسی طرح انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں راہنمائی دینا'

Marfat.com

مطلق اطاعت اور بندگی کروانا اور حاکمیت کیلئے آئین وقانون بہم پہنچانا یہ بھی اسی کی صفات ہیں اور ان میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ یہی باتیں ہر رسول اپنی قوم کو سمجھانے کیلئے آتا ہے۔ اس لئے جب وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ رب العالمین ہے تو دنیا میں ہر ایک کی حاکمیت کی جڑ کٹ جاتی ہے اور پھر جب وہ یہ کہتا ہے کہ میں اس کا رسول ہوں تو دنیا میں ہر راہنمائی کا ذریعہ اور ہر حاکمیت کا طریقہ آپ اپنی موت مر جاتا ہے۔ اس لئے دنیا جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی اس وقت تک وہ معجزات کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ چنانچہ فرعون اور آل فرعون بھی اسی مخمصہ میں گرفتار تھے جسے ان کی بے بصیرتی نے پیدا کیا تھا مزید ایک بات جو ان کیلئے پریشانی کا باعث تھی وہ یہ تھی کہ جب موسیٰ یہ کہتا ہے کہ میں رب العالمین کا نمائندہ ہوں تو اس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ جس طرح رب العالمین کی موجودگی میں کسی اور کی ربوبیت تسلیم نہیں کی جاسکتی اسی طرح اس کا نمائندہ بھی کسی اور کی حاکمیت قبول کرنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوسکتا۔ وہ حقیقت میں جب اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے تو وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم نے یہ جو حاکمیت کیلئے تخت اقتدار بچھا رکھا ہے اور تم نے اللہ کی مخلوق کو جس طرح اپنا غلام بنا رکھا ہے میرے آجانے کے بعد ان میں سے کسی کیلئے کوئی سند جواز نہیں۔ اب صرف رب العالمین کی حاکمیت ہوگی اور میں دنیا میں اس کا نمائندہ ہو کر اس کے ایمان لانے والے بندوں پر اور ان کے واسطے سے دوسرے لوگوں پر اس کی حاکمیت کو نافذ کروں گا۔ اس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ جب اللہ کی حاکمیت نافذ ہوگی اور موسیٰ اور اس پر ایمان لانے والے حکومت کریں گے تو پھر فرعون اور آل فرعون کیلئے کہاں گنجائش ہوگی۔ انہیں یا تو ایمان لانا ہوگا اور یا اس ملک سے نکل جانا ہوگا اور تیسری بات جس سے انہوں نے بڑی شدت سے خطرہ محسوس کیا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ مطالبہ تھا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دیجئے۔ اب اگر اس مطالبے کو تسلیم کر لیا جاتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی قوم جس کی تعداد لاکھوں میں ہے اور جو محض اس لئے مغلوب ہے کہ فرعونیوں نے اسے اپنا غلام بنا رکھا ہے اور غلامی نے نہ صرف ان کی تمام صلاحیتوں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے بلکہ ان کی اجتماعیت بھی دم توڑ چکی ہے' اولوالعزمی کا دور دور تک ان میں پتہ نہیں' وہ افراد کا ایک انبوہ ہے جس میں زندگی نام کی کوئی شے نہیں۔ اب اگر موسیٰ علیہ السلام جیسا ایک مضبوط اور بیدار مغز لیڈر ان کو میسر آجاتا ہے جو اپنی ذہنی عبقریت' اپنی علمی صلاحیت' اپنی انتظامی قابلیت اور اپنے تجربے کی بنیاد پر فرعون اور آل فرعون کے یہاں ایک مسلمہ حیثیت کا مالک ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ کس طرح شہزادوں کی طرح پلا بڑھا اور کس طرح اس نے اداروں کو چلانے کی تربیت پائی اور تلمود کی روایت کے مطابق افریقہ میں کس طرح وہ کامیاب لڑائیاں لڑ کر اپنے آپ کو ایک کامیاب جنرل ثابت کر چکا ہے تو لاکھوں پر مشتمل ایک قوم جب ایک ایسے عبقری کی راہنمائی میں زندگی کے آداب سیکھے اور وہ ان میں شیرازہ بندی کرنے میں کامیاب ہو جائے تو کیا قومی بقا کا خطرہ پیدا نہیں ہو جاتا؟ یہ وہ اندیشہ ہائے دور دراز تھے جس کی بنیاد پر انہوں نے یہ خدشہ محسوس کیا کہ موسیٰ اپنی پیغمبری کے پردے میں اصلاً اس ملک پر حکومت کرنا چاہتا ہے اس لئے ہمیں نہایت احتیاط کے ساتھ اس مصیبت کا کوئی حل نکالنا چاہئے۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ قوم فرعون نے اپنے لئے جن خطرات کو محسوس کیا ممکن ہے آگے چل کر وہ حقیقت ثابت ہوں لیکن موجود لمحوں میں تو اس کا دور دور کوئی امکان نہیں تھا۔ موسیٰ اور ہارون دو بے نوا افراد ہیں جن کی قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عصا اور ید بیضا کے سوا کوئی قوت نہیں۔ آخر فرعون اپنی پولیس کو کیوں حکم نہیں دیتا کہ تم ان دونوں کو قتل کر ڈالو تاکہ تمام خطرات کی جڑ کٹ جائے؟ اس کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ان کے مقابلے کا ڈول ڈالیں اور اس کے اعیانِ حکومت کیوں اس طرح کے اندیشوں میں گھر گئے ہیں جیسے ان کے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہو؟ بات اصل میں یہ ہے کہ فرعون اور اس کے سردار دونوں حضرت موسیٰ کے معجزات دیکھ کر انتہائی مرعوب ہو گئے تھے ان کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اگر ہم نے موسیٰ اور ہارون پر ہاتھ ڈالا تو وہ مافوق الفطرت قوت جو ان کی پشت پناہی کر رہی ہے وہ یقیناً ہمیں تباہ کرنے سے دریغ نہیں کرے گی۔ اس لئے وہ

Marfat.com

قوم معمول کے طریقوں سے ان کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ براہ راست ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔ چنانچہ قومِ فرعون کے سرداروں نے اس خطرے کے تعین کے بعد فرعون کو مشورہ دیا:

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ O يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ O

"قومِ فرعون کے سرداروں نے کہا ابھی اس کو اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھو اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیجو جو تمام ماہر جادوگروں کو جمع کر کے تمہارے پاس لائیں"۔ 111-112

اس آیت کریمہ میں اَرْجِهْ کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ اصل میں اَرْجِئْهُ ہے اِرْجَاء کے معنی ٹالنے' کسی معاملے کو کسی دوسرے وقت پر مؤخر کرنے اور کسی کو منتظر بنانے کے ہیں۔ قرآن میں اس کے مختلف صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں یہ ہمزہ کے حذف اور ہ کے سکون کے ساتھ آیا ہے۔ تلفظ کا یہ اسلوب اہل عرب کے قاعدے کے مطابق ہے بعض دفعہ وہ لفظ کو ہلکا کرنے کیلئے اس طرح کا تصرف کر دیتے ہیں۔

قومِ فرعون کے سرداروں نے فرعون کو مشورہ دیا کہ موسیٰ نے جو نشانیاں ہمارے سامنے پیش کی ہیں وہ اگرچہ سحر اور شعبدہ بازی کی قسم سے ہیں لیکن یہ عام قسم کا سحر اور جادو نہیں اس لئے ہمیں اس کے مقابلے میں کسی جلد بازی کا ثبوت نہیں دینا چاہئے۔ یوں تو اس شہر میں بھی بہت سے جادوگر ہوں گے لیکن ہو سکتا ہے وہ اس سطح کا جادو نہ کر سکیں۔ اس لئے مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ موسیٰ اور ہارون کو ابھی انتظار میں رکھیں اور ان سے کہیں کہ ہم چند دنوں کے بعد تم سے بات کریں گے اور ہم تمہارے ان معجزات کو دیکھیں گے کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے اور اس دوران آپ اپنے پورے ملک میں اپنے کارندوں کو بھیج دیجئے کہ وہ تمام ملک کے بڑے بڑے جادوگروں کو ایک متعین دن میں یہاں جمع کر دیں چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ بالآخر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے ساتھ طے پایا کہ تمہارے اس جادو کا مقابلہ ہمارے جادوگر کریں گے اور اس کیلئے ہم نے عید کا دن اور دوپہر کا وقت مقرر کیا ہے۔ اس وقت لوگ آسانی سے جمع ہو سکیں گے۔ چنانچہ بہت بڑے گراؤنڈ میں اس کا انتظام کیا گیا۔ خود مصر کا حکمران اور رب کہلانے والا فرعون بنفسِ نفیس تختِ حکومت پر فائز تھا اور تمام اعیان حکومت اس کے پہلو میں تھے۔ فوجیں دائیں بائیں پرے باندھے کھڑی تھیں درمیان میں بے پناہ انسانوں کا ہجوم تھا۔ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں جادوگر اپنی اپنی جگہ کھڑے حکم کے منتظر تھے اور ایک طرف تنہا حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کھڑے تھے کہ اچانک آگے بڑھ کر بڑے بڑے جادوگروں نے ایک التجا کی بلکہ اپنی آرزو کا اظہار کیا جس سے ان کی ذہنی سطح اور اخلاقی پستی کا اندازہ ہوتا ہے۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ O قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ O

"جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے کہنے لگے بڑا صلہ ملے گا ہمیں اگر ہم ہی غالب رہے۔ فرعون نے کہا ہاں بے شک اور تم ہمارے مقربین میں بھی داخل ہو گے"۔ 113-114

جادوگروں کی ذہنی سطح:

جادوگروں نے جس آرزو اور خواہش کا اظہار کیا ذرا اس پر غور فرمائیے کہ فرعون اور آل فرعون کے سامنے ملکی بقا کا سوال ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ

Marfat.com

موسیٰ اور ہارون ہم سے ملک اور حکومت چھین لینا چاہتے ہیں اتنے بڑے سنجیدہ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ملک کے نامور جادوگروں کو دارالحکومت میں آنے کی تکلیف دی ہے اور پھر یہ اعزاز ان کیلئے کیا کم ہے کہ خود بادشاہ سلامت انہیں دعوت دے رہے ہیں اور اپنے سامنے انہیں اپنے کمال فن کے اظہار کا موقع دے رہے ہیں لیکن ان کی دناءت اور خست کا عالم یہ ہے کہ وہ بالکل ہمارے میراثیوں اور بھانڈوں کی طرح آتے ہی اپنے مفاد اور اپنی طلب کا اظہار کرکے بھیک مانگنے لگتے ہیں کہ ہم تو اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ اگر آج کے معرکے میں غالب رہے تو بادشاہ سلامت ہمارے گھر دولت سے بھر دیں گے اور ہمیں اتنا نوازیں گے کہ ہماری نسلیں سدھر جائیں گی۔ بادشاہ نے ان کی ذہنی سطح کے مطابق جواب دیا کہ تم معاوضے کی بات کرتے ہو اگر تم نے یہ معرکہ جیت لیا تو ہم جو عطاؤ بخشش کی بارش کریں گے وہ تو اپنی جگہ رہی ہم تو تمہیں اپنے مقربین میں شامل کرلیں گے۔ ہمارے دربار میں تمہارے لئے کرسی رکھی جائے گی۔ تمہارا شمار ملک کے معزز ترین لوگوں میں ہونے لگے گا۔ قرآن کریم نے جادوگروں کی ذہنی سطح کا نقشہ کھینچ کر ہمارے سامنے کردار کے اعتبار سے انسان کی حقیقت کو کھول کر نمایاں کر دیا ہے کہ ذرا غور سے اس منظر کو دیکھو کہ جادوگر اتنے بڑے معرکے میں کامیابی کے بدلے میں کیا مانگ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان جن کا ہدف صرف حیاتِ دنیا ہوتی ہے ان کے اہداف اس سے مختلف نہیں ہوتے۔ ان کی آخری معراج عہدہ و منصب کی ہوس اور درہم و دینار کے انبار سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ چاہے کسی بھی فن کے عروج پر ہوں ہدف ان کا ہمیشہ یکساں رہتا ہے چنانچہ یہاں ہمیں اسی کا ایک آئینہ دکھایا گیا ہے اور آگے چل کر انہی جادوگروں کی ایک اور صورت آرائی کی گئی ہے جو اس سے بالکل مختلف ہے۔ جس سے ہمیں بہت سی باتیں سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ تھوڑا سا آگے بڑھ کر ہم وہ منظر بھی دیکھیں گے۔ یہاں تو صرف یہ بتایا جا رہا ہے کہ جادوگر جب فرعون کے جواب سے پوری طرح آسودہ ہو گئے تو اب وہ مقابلے کی طرف متوجہ ہوئے اور پیشہ وارانہ اخلاق کا اظہار کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ O قَالَ اَلْقُوْا ج فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ O

”بولے اے موسیٰ یا تو پہلے تم پیش کرو یا ہم ہی پیش کرنے والے بنتے ہیں اس نے کہا تم ہی پیش کرو تو جب انہوں نے پیش کیا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان پر دہشت طاری کر دی اور بہت بڑا کرتب دکھایا“۔ 115-116

جادوگروں کے جادو کی حقیقت:

جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ (علیہ السلام)! تم پہلے اپنے کمالِ فن کا اظہار کرو گے اور لوگوں کے سامنے اپنا ساحرانہ کارنامہ دکھاؤ گے اور یا تم چاہو تو ہم پہل کرنے کیلئے تیار ہیں یعنی ہمیں اپنی مہارت پر پوری طرح اعتماد ہے اور ہم تو ظاہر ہے کہ اسی کیلئے چل کر آئے ہیں تم چاہو پہل کرو چاہے ہمیں پہل کرنے کی اجازت دے دو اب یہ فیصلہ ہو ہی جانا چاہئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اللہ پر بے پناہ اعتماد رکھتے تھے انہوں نے محض اللہ کے بھروسے پر جواب دیا کہ تم ہی اپنے کرتب دکھاؤ کیونکہ میرے پاس تو کوئی کرتب نہیں۔ میں تو تمہارے کرتبوں کا توڑ کروں گا میں کوئی جادوگر تو نہیں کہ شعبدہ بازیاں دکھاؤں۔ میں تو جس طرح دنیا کا چلن بدلنے کیلئے اٹھا ہوں اسی طرح ہر غلط بات کو ختم کرنا بھی میری ذمہ داری ہے اس لئے تم جادو کے زور سے جس طرح لوگوں کو گمراہ کرتے ہو تم اپنا کام کرو میں تو اس کا ازالہ کروں گا۔ چنانچہ جادوگروں نے اپنے کمال فن کا اس طرح اظہار کیا کہ سینکڑوں کی تعداد میں انہوں نے لوگوں کے سامنے لاٹھیاں اور رسیاں بچھا دیں اور پھر کوئی منتر پھونکا تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تمام لاٹھیاں اور رسیاں سانپ

Marfat.com

کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ اندازہ فرمایئے کہ بے پناہ ہجوم کے درمیان ہزاروں لاٹھیوں رسیوں کا سانپوں کی طرح حرکت کرتے ہوئے لہرانے لگنا کس قدر وحشت ناک منظر ہوگا۔ لوگ سراسیمہ ہو رہے ہوں گا کہ اگر ان سانپوں نے ہماری طرف رخ کر لیا تو ہمارا کیا حال ہوگا اور جادوگر یقیناً اپنے کرتب پر اترا رہے ہوں گے اور فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت یقیناً فخر کر رہے ہوں گے کہ اتنے بڑے جادو کا توڑ کون کر سکتا ہے چنانچہ اسی کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ کریم کہتا ہے اور ساتھ ہی ان کے جادو کی حقیقت بھی واشگاف کرتا ہے کہ یہ جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا۔ ان کی آنکھیں یہی دیکھ رہی تھیں کہ میدان میں سانپ حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ منظر دیکھ کر ان کے دل دہشت زدہ ہو گئے تھے اور ان کے نزدیک واقعی جادوگر ایک بہت بڑا جادو لائے تھے جس سے بڑھ کر شاید ناظرین کی نگاہوں میں کسی اور جادو کا تصور بھی ممکن نہ تھا لیکن اس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ ان جادوگروں نے جو کچھ بھی کیا وہ فریب نظر کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ لاٹھیوں کی حقیقت بدلی تھی اور نہ رسیوں کی ماہیت تبدیل ہوئی تھی۔ صرف جادوگروں کے جادو کے اثر سے نگاہوں نے غلط دیکھنا شروع کر دیا تھا اور وہ وہ کچھ دیکھ رہی تھیں جو انہیں جادوگر دکھانا چاہتے تھے۔ جیسے آج کے دور میں ہپناٹزم اور میسمریزم کا بہت چرچا ہے۔ یورپ میں جابجا اس کا کھیل دکھانے والے نظر آتے ہیں بلکہ لوگ اس کے ذریعے روزی کماتے ہیں اور اس میں بھی اسکے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ ایک شخص دیکھنے والوں کو ہپناٹائز کر لیتا ہے اس کی توجہ کے اثر سے دیکھنے والے وہی کچھ دیکھتے ہیں جو وہ دکھانا چاہتا ہے اور بعض دفعہ وہ اپنی توجہ کے زور سے ایک شخص کو بیہوش کر دیتا ہے اور اسکی زبان سے وہی الفاظ ادا ہوتے ہیں جو ہپناٹائز کرنے والا اس سے کہلوانا چاہتا ہے اور بعض دفعہ ایک شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے اور ہپناٹائز کرنے والا شخص اس کے دل میں وہ بات ڈال دیتا ہے جس کی طرف وہ اسے لے جانا چاہتا ہے۔ یہ کھیل آج کی دنیا کا جانا پہچانا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں معلوم ہوتا ہے جادوگروں نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ انہوں نے کسی چیز کی ماہیت نہیں بدلی تھی البتہ ایک طلسم ضرور پیدا کر دیا تھا جس نے ناظرین کو مبہوت کر کے رکھ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے کہ اللہ کی طرف سے وحی آئی:

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَلۡقِ عَصَاکَ ۚ فَاِذَا ہِیَ تَلۡقَفُ مَا یَاۡفِکُوۡنَ O فَوَقَعَ الۡحَقُّ وَ بَطَلَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ O فَغُلِبُوۡا ہُنَالِکَ وَ انۡقَلَبُوۡا صٰغِرِیۡنَ O

''اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ تم اپنا عصا ڈال دو تو وہ دفعتاً نگلنے لگا اس کو جو وہ گھڑتے تھے تو حق ظاہر ہو گیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے وہ سب باطل ہو گیا تو تب وہ مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے''۔ 117-118-119

اللہ کے حکم کے مطابق جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر ڈالا تو وہ ایک اژدھا بن گیا لوگ جواب تک جادوگروں کی رسیوں اور لاٹھیوں کو سانپوں کی طرح لہراتا ہوا محسوس کرتے مبہوت اور مرعوب ہو رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات پر خوش بھی تھے کہ ہمارے جادوگر جیت رہے ہیں ہمارا نقطہ نگاہ غالب آ گیا ہے اب موسیٰ اور ہارون کو فرار کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ملے گا وہ اتنے بڑے جادو کے مقابلے میں کیا کر سکیں گے اور یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ موسیٰ اور ہارون نبوت اور رسالت کے نام پر جو کھڑاک رچا رہے تھے وہ سراسر ایک فریب تھا حقیقت میں وہ بھی جادوگر تھے اور ان کا جادو دوسرے عظیم جادوگروں کے مقابلے میں شکست کھا گیا لیکن جیسے ہی موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا اور وہ اژدھا بن کر سامنے آیا تو دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ سب کچھ نگل گیا جس سے جادوگروں نے ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ بعض لوگوں نے اس نگل جانے سے یہ مراد لیا ہے کہ وہ تمام رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل گیا لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جادو کسی چیز کی ماہیت کو تبدیل نہیں کرتا بلکہ نظروں پر اثر انداز ہو کر

Marfat.com

زاویہ نگاہ کو بگاڑ دیتا ہے جس سے چیز کی حقیقت اوجھل ہو جاتی ہے اور نظروں کو وہ کچھ دکھائی دیتا ہے جو جادوگر چاہتا ہے۔ یہاں بھی جادوگروں نے یہی کیا تھا، یہ اژدھا جب ان رسیوں اور لاٹھیوں کے اوپر سے گزرا تو جادوگروں نے جو طلسم برپا کر رکھا تھا جس کے نتیجے میں فریب نظر کی ایک کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ اس سارے طلسم کو ہڑپ کر گیا اور دیکھنے والوں کو نظر آنے لگا کہ یہ لاٹھیاں تو لاٹھیاں ہی ہیں اور رسیاں رسیاں ہی ہیں اور ہم جو سمجھ رہے تھے وہ فریبِ نظر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس انقلاب حال کے بعد آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیسی صورت حال پیدا ہو گئی ہو گی۔ فرعون' اس کے اعیانِ حکومت' اس کے امراء' اس کی فوجیں اور دیکھنے والوں کا جم غفیر فتح کی جس خوشی میں اب تک سرشار نعرے لگا رہا تھا وہ یکسر ختم ہو کر رہ گیا۔ نعروں پر اوس پڑ گئی' پہلے ایک سناٹا طاری ہوا پھرتنی ہوئی گردنیں جھکنے لگیں۔ ہر ایک نے نہایت ندامت اور شرمندگی محسوس کی اور دل اس بات کا اقرار کرنے لگے کہ واقعی حق وہی ہے جسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام پیش کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں عصا کی صورت میں اللہ کی تائید و نصرت کا ایک نشان اور اللہ کی جانب سے سندِ ماموریت ہے' جس کو یہ لوگ جادو کا کرشمہ سمجھ رہے تھے۔ اس طرح اس پورے ماحول اور دلوں کی گہرائیوں میں حق غالب آ گیا اور ان کی ساری کاوشیں باطل اور برباد ہو کر رہ گئیں۔ اب وہ زبان سے چاہے بولیں یا نہ بولیں لیکن فضا کی ایک ایک لہر بول رہی تھی کہ کس حد تک عبرت کا مقام ہے کہ اپنے آپ کو رب الاعلیٰ کہلانے والا کس ذلت سے دوچار ہو رہا ہے۔ وہ دو بے نوا فقیروں کے سامنے سر جھکائے بیٹھا ہے اور اس کی فوجیں جن کی شجاعت کی دھاک پوری دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی وہ نہایت سراسیمگی کی حالت میں کھڑی ہیں۔ اس طرح یہ پورا مجمع ذلت اور رسوائی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی رسوائی اور یہی ذلت اتنی بڑی تھی کہ فرعون اور اس کے حواریوں کو شرم سے ڈوب مرنا چاہئے تھا۔ لیکن ابھی وہ اس پر سوچ ہی رہے تھے کہ ذلت کا ایک اور زوردار حملہ ان پر ہوا جس نے انہیں بری طرح پامال کر کے رکھ دیا۔

وَ اُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیْنَ O قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ O رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ O

''اور جادوگر سجدے میں گر پڑے اور پکار اٹھے کہ ہم اس رب العالمین پر ایمان لے آئے جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے''۔ 120-121-122

فرعون اور اس کے عمائدین پر شکست کا دوسرا زوردار حملہ:

یہ وہ زوردار اور ناقابل برداشت حملہ تھا جو فرعون اور اس کے درباریوں پر ہوا اور جس نے پورے تماشائیوں کے ہجوم کو ہلا کر رکھ دیا کہ ملک بھر کے نامور جادوگر جنہیں پورے ملک سے تلاش کر کے لایا گیا تھا اور جن کے کمالِ فن پر بادشاہ اور پورے ملک کے لوگوں کو اس حد تک اعتماد تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کی شکست کو یقینی سمجھ رہے تھے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدھا بن کر جادوگروں کے سارے طلسم کو نگل گیا تو جادوگر اور ان کو لانے والے حق و باطل کے اس معرکے میں اس طرح پسپا ہوئے گویا ان کے مقابل فریق نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلے میں شکست کھائی یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے برسرِ حق اور فرعون اور اس کے ماننے والوں کے برسرِ باطل ہونے کی کافی دلیل تھی اور ایک ایسی چوٹ تھی جس کا مداوا کسی طرح ممکن نہیں تھا اور جس کو فرعون اور اس کے ساتھ باقی تمام لوگ ابھی تک بیٹھے سہلا رہے تھے کہ اس سے بڑی بدقسمتی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی کہ ان جادوگروں نے پسپائی اختیار کر کے اپنی شکست کا اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ سجدے میں گر کر انہوں نے دو باتیں تسلیم کیں ایک تو یہ بات کہ جس بات پر ہمیں اصرار تھا اس مقابلے نے ثابت کر دیا کہ وہ بات جھوٹی تھی اور موسیٰ اور ہارون حق پر تھے اور دوسری یہ بات کہ ہمارا اور موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا سرے سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ ہم انتہائی خاکباز لوگ ہیں اور وہ حقیقتوں اور صداقتوں کے آسمان کی رفعتوں کے شناور ہیں۔ ہم اس قابل نہیں کہ عظمت

Marfat.com

کے ان میناروں کے سامنے کھڑے رہ سکیں چنانچہ ہم ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔اس سجدے سے دو باتیں مراد لی جاسکتی ہیں ایک تو یہی بات جس کا ابھی ہم نے تذکرہ کیا۔کسی کی عظمت کے اعتراف میں سجدے میں گر جانا یا رکوع کی طرح جھک جانا مصریوں، عربوں اور اسرائیلیوں میں اس کا عام رواج رہا ہے۔چنانچہ اہل علم جانتے ہیں کہ عرب کے سات عظیم شاعروں میں سے ایک بہت بڑے شاعر لبید بھی ہیں جنہیں اللہ نے ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔حضور کی بعثت سے پہلے عربوں کے ایک مجمع عام میں ان کے ایک شعر پر ان کی عظمت کے اعتراف کے طور پر تمام حاضرین نے سجدہ کیا۔اس طرح سے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔یہاں معلوم ہوتا ہے جادوگر بھی اعتراف عظمت کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جھک گئے اور اس صورت حال کی تعبیر کیلئے اس آیت کریمہ میں اُلْقِیَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو مجہول کا صیغہ ہے۔جس سے بتانا مقصود ہے کہ جادوگروں کا یہ سجدے میں پڑنا حقیقت میں ان کے جذبۂ تعظیم واحترام سے مغلوبیت کا نتیجہ تھا۔وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احترام اور عقیدت میں اس حد تک سرشار ہوئے کہ ان کے سامنے کھڑا رہنا ان کیلئے مشکل ہو گیا اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزے کو دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا کہ یہ جادوگری نہیں بلکہ معجزہ ہے کیونکہ سحر اور معجزے میں امتیاز ایک جادوگر سے بڑھ کر کسے ہوسکتا ہے۔ایک جادوگر سحر کی حقیقت اور اس کی حدود کو خوب سمجھتا ہے چنانچہ جیسے ہی انہوں نے اس معجزے کو دیکھا وہ جادوگری کے فن مین مہارت کاملہ کے باعث اس یقین سے سرشار ہو گئے کہ یہ جادوگری نہیں بلکہ نبوت ورسالت کا اعجاز ہے۔چنانچہ جیسے ہی انہیں آپ کے نبی اور رسول ہونے کا یقین ہوا اور آپ کی دعوت پر اطمینان ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ رب العالمین وہی ہے جس کی طرف دعوت حضرت موسیٰ علیہ السلام دے رہے ہیں فرعون ہمارا رب نہیں وہ تو ہماری ہی طرح ایک محتاج بندہ ہے جس نے خواہ مخواہ رب ہونے کا دعویٰ کر رکھا ہے۔چنانچہ وہ بے ساختہ اللہ کے سامنے سجدے میں گر گئے۔جس سے اللہ کی کبریائی کا اعتراف بھی مقصود ہے اور ساتھ ہی اس بات کا شکر بھی کہ اللہ نے ہمیں راہ راست کی ہدایت عطا فرمائی۔اس لئے سر سجدے سے اٹھاتے ہی انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم اس رب العالمین پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔دوسرے لفظوں میں وہ ساری کائنات کا رب ہے۔اندازہ فرمائیے! فرعون اور آل فرعون کیلئے اس سے بڑھ کر چوٹ اور کیا ہوسکتی تھی کہ ابھی تک تو وہ میدان میں ہارنے کی ذلت کے صدمے ہی سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ جادوگروں کے ایمان لانے اور برسرِ میدان ایمان کا اعلان کرنے نے انہیں بالکل حواس باختہ کر کے رکھ دیا لیکن داد دینی چاہیے فرعون کو کہ اتنے بڑے حادثے میں بھی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور صورت حال کو سنبھالنے کی بھی کوشش کی اور تلملاتے ہوئے اس نے پینترا بدلا اور پھنکارتے ہوئے کہا:

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِى الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ O لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ O

”فرعون نے کہا تم اس پر ایمان لے آئے ہو اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دوں یہ یقیناً کوئی خفیہ سازش ہے جو تم نے شہر میں اس غرض سے کی ہے کہ اس کے باشندوں کو یہاں سے نکالو تو تم عنقریب جان لو گے میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی چڑھاؤں گا“۔123-124

فرعون کی ذہانت نے معاملے کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی:

فرعون نے کہا کہ تم نے ایمان لانے کیلئے میری اجازت کا انتظار ہی نہیں کیا اور میری اجازت سے پہلے ہی تم ایمان لے آئے ہو۔اس سے دو

Marfat.com

باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ بات کہ فرعون کے زیرِ حکومت لوگوں میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کی آزادی نہ تھی جس طرح ایک ہاری اپنے وڈیرے کے بغیر اور ایک مزارع اپنے زمیندار کی مرضی کے بغیر عموماً کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے کیونکہ یہ لوگ اپنے بڑوں کے سامنے غلامی کی زندگی گزارتے ہیں۔ فرعون کی رعایا کو بھی اس بات کا کوئی حق نہ تھا کہ وہ کوئی بھی فیصلہ اپنی آزادانہ مرضی سے کریں اور مذہب تبدیل کرنا تو عام فیصلوں سے بڑھ کر بات ہے۔ اس کی آزادی کا ایسے بند نظام میں تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے فرعون نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا کہ تم اسی ملک کے رہنے والے ہو تمہیں خوب معلوم ہے کہ یہاں کوئی کام میری مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا تو پھر تم نے اجازت لئے بغیر مذہب کی تبدیلی کا اعلان کیسے کر دیا۔ تمہیں یقیناً اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ غلام رعایا کے سامنے جنہیں آزادی کا کبھی سانس نصیب نہیں ہوتا جو قفس میں رہنا ہی اپنے لئے آزادی سمجھتے ہیں۔ فرعون کا اس طرح برہم ہونا کوئی قابل تعجب بات نہ تھی انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ صحیح مذہب کیا ہے اور غلط مذہب کیا ہے وہ تو صرف اتنا جانتے تھے کہ بادشاہ جو ہمارا رب بھی ہے اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات اختیار کرنا اور پھر اس کا اعلان کر دینا ایک بہت بڑی جسارت ہے جو قابل معافی نہیں اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ فرعون نے نہایت حکمت و دانش سے اس صورت حال کو سنبھالتے ہوئے ایک معتدل رویہ اختیار کیا۔ اس نے یہ کہا کہ مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ تم موسیٰ کی دعوت کو قبول کیوں کیا؟ یہ ساری مقابلہ آرائی تو اسی مقصد کیلئے تھی کہ اگر موسیٰ اپنی بات میں سچے ثابت ہوں تو ہم خود اس پر غور کریں اور لوگوں کو اسے قبول کرنے کی اجازت دے دیں لیکن تم نے ہماری اجازت کا انتظار کئے بغیر جس جلد بازی سے کام لیا ہے وہ اس لئے غلط ہے کہ ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہوا کہ موسیٰ اور ہارون اپنی بات میں سچے ہیں یا نہیں کیونکہ کسی ایک مقابلے میں کسی ایک جانب کا شکست کھا جانا فیصلہ کرنے کیلئے کافی نہیں ہو سکتا ہے کہ جن جادوگروں نے آج مقابلہ کیا ہے وہ موسیٰ کے پائے کے جادوگر نہ ہوں اور ہم جادوگروں کے انتخاب میں غلطی کر گئے ہوں اس لئے ضرورت ہے کہ مزید ماہرین فن کو تلاش کیا جائے اور ایک سے زیادہ مقابلوں سے پوری طرح یہ بات طے کرنے کی کوشش کی جائے کہ موسیٰ اپنی دعوت میں برسرِ حق ہیں یا نہیں لیکن تم نے اس پوری کشمکش کا نتیجہ نکلنے سے پہلے جس جلد بازی کا ثبوت دے کر ہمارے مؤقف کو رسوا کیا ہے اور ہماری اجازت کا انتظار نہ کر کے تم نے سرکشی کا مظاہرہ کیا ہے اور ساتھ ہی دوسری بات یہ کہی کہ تمہاری یہ سرکشی بے سبب نہیں تم اپنے طور سے کبھی نہ ہمت نہیں کر سکتے اصل بات یہ ہے کہ حقیقت میں موسیٰ کے ساتھی ہو وہ بھی تمہاری طرح ایک جادوگر ہے بلکہ وہ جادوگروں کا سرغنہ ہے تم نے آپس میں ملی بھگت کر کے ایک سازش تیار کی جس کا مقصد اس ملک کے اقتدار پر قبضہ کرنا ہے۔ تم نے جس پسپائی اور ایمان کا اعلان کیا ہے یہ تمہاری پہلے سے سوچی سمجھی ایک سکیم تھی کہ اس طرح اپنے مؤقف کو مضبوط کرو گے اور ہمارے نقطہ نگاہ کو کمزور کر دو گے اور دیکھنے والے یہ سمجھیں گے کہ تم واقعی موسیٰ کے سامنے شکست کھا گئے ہو اور وہ شخص جادوگر نہیں بلکہ واقعی اللہ کا نبی ہے لیکن ہم تمہاری اس سکیم کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور ہم جان گئے ہیں کہ یہ پہلے سے طے شدہ ایک منصوبہ تھا جس پر تم عمل کیا ہے۔ یاد رکھو! تم نے اگر اس سے توبہ نہ کی تو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم تمہیں اس کی کیا سزا دیتے ہیں اور پھر ہراس پیدا کرنے کیلئے سزا کا اعلان بھی کر دیا کہ میں خلاف ترتیب تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹوں گا یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں اور پھر اسی پر بس نہیں کروں گا پھر تمہیں سولی بھی دوں گا یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں میں میخیں گاڑوں گا اور صلیب پر کھڑا کر کے نیزوں سے تمہیں بھنبھوڑا جائے گا۔ یہ تمہاری سرکشی اور بغاوت کی سزا ہے جس کا تم نے آج اظہار کیا لیکن اس کے جواب میں جادوگروں نے جو کچھ کہا وہ بالکل ایک ناقابل یقین اور ناقابل داستان ہے یہ جادوگر وہی لوگ ہیں کہ جب انہیں مقابلے کیلئے میدان میں لایا گیا تو انہوں نے میدان میں پہنچتے ہی اور فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہی بھانڈوں، نقالوں اور مسخروں کی طرح اپنے فن کے مظاہرہ پر بھرپور انعام کی التجا پیش کی اور نہایت دناءت، خست اور پست اخلاقی کا ثبوت دیتے ہوئے

Marfat.com

چند ٹکوں کے حصول کو اپنی زندگی کی معراج ثابت کیا۔ گویا ان کے نزدیک سب سے بڑا اعزاز یا سب سے بڑا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انہیں بادشاہ کے ہاتھوں سے انعام کی صورت میں بڑی دولت ہاتھ آئے اور انہیں بادشاہ کا قرب نصیب ہو لیکن جیسے ہی ان کے دلوں میں ایمان داخل ہوا تو ہم اسی پست ہمت، پست اخلاق اور دولتِ دنیا کی پوجا کرنے والوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک ہی جست میں انسانی رفعتوں کی چوٹی پر جا کھڑے ہوئے اور نہایت بے خوفی سے کہتے ہیں:

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ○ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ○

''انہوں نے جواب دیا بہرحال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انہیں مان لیا اے رب ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں''۔ 125-126

جادگروں کا جواب جو ایمان کی رفعتوں کا امین ہے:

اے فرعون! تم ہمیں موت سے ڈراتے ہو اور سولی پر چڑھانے اور ہاتھ پاؤں میں میخیں گاڑھنے کی دھمکیاں دیتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جو لوگ اللہ رب العالمین پر ایمان لاتے ہیں وہ پہلے سے اس بات کا فیصلہ کر کے ایمان کا اعلان کرتے ہیں کہ یہ زندگی اللہ کی عطا ہے جب ضرورت پڑے گی اسی کیلئے اس کے دین کی خاطر قربان کر دیں گے۔ مرنا تو ہر ایک کو ہے لیکن ایک مومن کیلئے اس سے بڑی سعادت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کی موت اللہ کے دین کے راستے میں آئے وہ تو اس بات کے انتظار میں رہتا ہے کہ یہ سر کا بوجھ جو میں کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہوں یہ اللہ کی امانت ہے۔ کب وہ موقع آئے جب اللہ مجھ سے اس کا مطالبہ کرے اور میں اسے اس کے حوالے کر دوں یہ یقین وہ قوت ہے جو ایک مومن کو موت پر غلبہ دے دیتی ہے وہ موت کو لقائے رب کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتا ہے اور اللہ سے ملاقات ایک مومن کی معراج ہے اس لئے اس کے دین کی خاطر موت کی وہ اس لئے تمنا کرتا ہے تاکہ اللہ کے حضور حاضری کا موقع ملے اور وہ اپنے آپ کو اس بحرِ ناپیدا کنار میں شامل کر کے لافانی بنا لے۔ چنانچہ تم ہمیں جس چیز سے ڈرا رہے ہو وہ چونکہ ہمارا مقصود ہے اس لئے اس سے ڈر کیسا ہمارے لئے تو وہ نہ صرف عین سعادت ہے بلکہ ہمارا مطلوب بھی ہے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم اس حقیقت کو بار بار ایک زندہ قوت کے طور پر ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں کہ جب بھی کبھی لوگوں میں اللہ سے محبت کا شعلہ روشن ہوا ہے اور موت کے آئینہ میں انہوں نے روئے دوست کی جھلک دیکھ لی ہے تو پھر ان کیلئے زندگی دشوار اور موت آسان ہو گئی ہے۔ ہماری قریبی تاریخ میں اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے جرم میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ان میں ایک محمد یحییٰ تھانیسری اور ان کے ساتھی بھی تھے جب ان کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور اس کے چند دنوں بعد ان کے بارے میں رپورٹ مانگی گئی تو جیل کے آفیسرز یہ جان کر حیران رہ گئے کہ مولانا اور ان کے ساتھی پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند اور نہایت خوش و خرم شب و روز گزار رہے ہیں۔ انہیں حیرت ہوئی کہ پھانسی کے قیدی تو وقت سے پہلے ہی قریب المرگ ہو جایا کرتے ہیں۔ آخر ان کی خوشی اور صحت کا باعث کیا ہے۔ انہوں نے جب تحقیق کی تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ چونکہ شہادت کو اپنے لئے خوشی کا باعث سمجھتے ہیں اور یہی ان کی زندگی کا حقیقی مطلوب بھی ہے اس لئے جیسے جیسے شہادت کا دن قریب آتا جاتا ہے ان کی خوشیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جس عشق کی وارفتگیوں نے انہیں مسحور کر رکھا

Marfat.com

ہے اس میں موت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ان میں سے ہر ایک کا عزم یہ ہے

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اسی جذبہ سے سرشاران نو واردانِ ایمان نے فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ تم ہمیں جو جان لینے کی دھمکیاں دے رہے ہو آخر یہ کس جرم کی سزا ہے؟ ہم نے اس شہر میں کوئی قانون شکنی نہیں کی' کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا۔ ہمارا جرم اگر کوئی ہے تو صرف یہ ہے کہ ہمارے سامنے اللہ کی نشانیاں آئیں' اللہ کے دو بندوں کے ذریعے ہم نے اللہ کی وہ نشانیاں جب اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھیں اور ہمیں یقین ہو گیا کہ جن نشانیوں کو تم جادو سمجھ رہے ہو حقیقت میں وہ اللہ کے بندوں کی شناخت اور ان کی حقانیت کے دلائل ہیں جو اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ حقیقی رب اس کائنات صرف وہ اللہ ہے جو رب العالمین ہے اور یہ موسیٰ اور ہارون دونوں اس کے نمائندہ ہیں۔ ہم پر جب یہ حقیقت منکشف ہوئی تو ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے۔ ہم نے اس رب کو پہچان لیا جس کی طرف موسیٰ اور ہارون دعوت دے رہے ہیں یہ اگر جرم ہے تو ہمیں اس جرم کا اقرار ہے

خونے نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشقِ روئے تو گشتہ ایم

ترجمہ: (ہم نے کوئی جرم نہیں کیا اور نہ کسی کو قتل کیا ہے ہمارا جرم صرف یہ ہے کہ ہم تیرے روئے زیبا کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں)

یہ اگر جرم ہے تو ہمیں اس کا سو بار اقرار ہے ہم اس جرم کی خاطر ہر سزا برداشت کرنے کو تیار ہیں تو نے اس جرم کی اگر سزا کا اعلان کر دیا ہے ہم اس سے خوفزدہ نہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ ایمان کے نتیجے میں ایسی ہی قیامتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے البتہ ہمیں اپنے عجز کا بھی اعتراف ہے اس لئے اب ہم یہ معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں کہ یا اللہ ہم نے تیری رضا کی خاطر ایک اقدام کر ڈالا ہے لیکن اس کے نتائج برداشت کرنا ہماری ہمت سے فزوں تر ہے۔ اس کیلئے جس صبر کی ضرورت ہے وہ صبر صرف تیری بارگاہ سے ملتا ہے اس لئے تجھ سے التجا ہے کہ تو اس صبر کی دولت سے ہمارے دل مضبوط کر دے اور ہمیں اتنی قوت عطا فرما کہ اس راستے میں ہم جو آخری سانس لیں وہ سانس تیری اطاعت اور تیری فرمانبرداری میں آنا چاہئے۔

اس منظر کو دوبارہ اپنے تصور میں تازہ کیجئے کہ یہ وہی جادوگر ہیں کہ جب وہ فرعون کے دربار میں اپنے کمال فن کے اظہار کیلئے لائے گئے تو کس طرح انہوں نے بھانڈوں اور نقالوں کی طرح انتہائی دناءت اور کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے حق و باطل کے اس معرکے میں اپنی قیمت وصول کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی بلند نگاہی میں سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ انہیں دولت دنیا سے کچھ ہاتھ آ جائے اور بادشاہِ وقت کے تقرب کا سایہ انہیں نصیب ہو جائے لیکن اب یہی لوگ جب ایمان سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور ایمان کی روشنی ان کے دلوں میں پہنچتی ہے تو کس طرح ان کا دل اس روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے کہ پست ہمتی اور دنیا طلبی کی کوئی پرچھائیں بھی ان کے سیرت و کردار میں دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ حق کیلئے قربانی اور مصائب کے مقابلے میں استقامت کی وہ ایسی تصویر بن جاتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ وہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ ہیں اور ان کے دلوں سے دنیا کی محبت تو دور کی بات ہے اس فانی دنیا میں رہنے کی ہوس بھی اس طرح نکل جاتی ہے کہ وہ آخرت کو اپنی منزل بنا کر باقی ہر چیز سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں اور اس سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں جس سفر میں قدم قدم پر کھائیاں اور گھاٹیاں ہیں جس میں اللہ کی توفیق کے بغیر کوئی آدمی کبھی منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ اس لئے وہ دنیا سے ہر طرح کا تعلق توڑ کر صرف اللہ سے تعلق جوڑنے کی استدعا کرتے ہوئے اللہ ہی سے توفیق کے طلبگار ہوتے ہیں۔

Marfat.com

اس سے ہمیں ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اپنی ذات میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ وہ دنیا میں چاہے دنیا کے کیسے ہی عظیم منصب کو حاصل کرلے اور دولت دنیا سے بے شک اس کی تجوریاں بھر جائیں اور بے شک دنیا کی ہر نعمت اسے میسر آ جائے لیکن سیرت و کردار کی کوئی بلندی بھی اس کے قریب سے نہیں گزرتی۔ انسانیت ہمیشہ اس سے دامن کشاں رہتی ہے۔ وہ اللہ کی دھرتی پر اپنے آپ کو چاہے کتنا بڑا سمجھے لیکن حقیقت میں وہ دھرتی کے بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ حالات کا معمولی سا جھٹکا بھی اسے زمین پر ڈھیر کر کے رکھ دیتا ہے لیکن جب اسی شخص کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے تو وہ چیتھڑوں میں لپٹ کر بھی شاہوں کے تاج نوچتا ہے وہ فاقے میں ہو کر بھی سیر چشمی اور استغناء کی چلتی پھرتی تصویر ہوتا ہے۔ نہ اسے دولت اور عہدہ و منصب جھکنے پر مجبور کر سکتے ہیں اور نہ بڑی سے بڑی آزمائش کبھی اسے گرا سکتی ہے۔ وہ بظاہر نہایت نرم' نہایت سادہ اور نہایت متواضع ہوتا ہے لیکن اس کے اندر کا انسان پہاڑوں سے زیادہ بلند' سمندروں سے زیادہ گہرا' پھولوں سے زیادہ دلآویز اور آندھیوں سے زیادہ پرعزم ہوتا ہے۔

ٹھیک کہا جگر مراد آبادی نے کہ انسان کی ساری کہانی کا حاصل یہ ہے

گرے اگر تو بس ایک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

جادوگروں کی ساری سرگزشت ہمارے سامنے اسی حقیقت کو واشگاف کرتی ہے کہ انسان کی ضرورتیں بے شمار ہیں جن میں ایک بہت اہم ضرورت سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ہے لیکن اس کی حقیقی قوت سیرت و کردار کی وہ پختگی ہے جسے ایمان کہتے ہیں جب وہ آدمی میں نہیں ہوتا تو آدمی سے زیادہ حقیر شے کوئی نہیں ہوتی وہ ٹیکنالوجی کا بادشاہ بھی بن جائے تو وہ انسان نہیں درندہ بن کر تاریخ کے افق پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ ٹیکنالوجی کے ساتھ اگر ایمان جمع ہو جائے تو پھر وہ قوت وجود میں آتی ہے جو اسلام کا اصل مطلوب ہے۔

حق و باطل کے معرکے میں فرعون اور آل فرعون کی ناکامی اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی کامیابی سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے فوری طور پر کیا صورت اختیار کی؟ جادوگروں کو انتہائی سزاؤں کی دھمکی کے علاوہ قرآنِ کریم اور کسی چیز کا ذکر نہیں کرتا۔ یقیناً اس کے بعد حالات میں کشیدگی بڑھ گئی ہوگی ہو سکتا ہے مخالف قوتوں نے نئی حکمت عملی کی تیاری میں چند دن انتظار کیا ہو۔ اگلی آیت کریمہ سے انتظار ہی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے البتہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ حکومت اپنے زخم چاٹ رہی ہے لیکن عمائدین حکومت غصے میں جلے بھنے حکومت اور دوسرے لوگوں کو کوسنے دے رہے ہیں اسی کیفیت میں انہوں نے فرعون سے بھی ملاقات کی اور اسے حالات کی نزاکت سمجھاتے ہوئے یہ کہا:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ
قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ
يَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَاۗءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَاۗءَهُمْ
وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ

Marfat.com

اصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ
الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ
بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ
وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

قوم فرعون کے سرداروں نے فرعون سے کہا کیا تو اسی طرح موسیٰ اوراس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا کہ وہ ملک میں بدامنی پھیلائیں اور تجھ کو اور تیری مورتوں کو ٹھکرائیں اس نے کہا کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر پوری طرح حاوی ہیں۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو زمین اللہ کی ہے وہ جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اس کو وارث بناتا ہے اور انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کیلئے ہے وہ بولے ہم تو تمہارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی اس نے کہا توقع ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو پامال کرے گا اور تم کو ملک کا وارث بنائے گا کہ دیکھے تم کیا روش اختیار کرتے ہو۔

..................☆......☆......☆..................

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ط
قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ج وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ O

''قوم فرعون کے سرداروں نے فرعون سے کہا کیا تو اسی طرح موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا کہ وہ ملک میں بدامنی پھیلائیں اور تجھ کو اور تیری مورتوں کو ٹھکرائیں اس نے کہا کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر پوری طرح حاوی ہیں''۔127

شکست کے بعد عمائدینِ سلطنت کی بوکھلاہٹ:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی کامیابی کے بعد فرعون کے سرداروں پر بری طرح بوکھلاہٹ طاری تھی انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنی بڑی ناکامی اور رسوائی کے بعد ہم کس طرح حالات کو سنبھالیں اگر ہم خاموش رہتے ہیں تو حالات اور بگڑ جائیں گے اور موسیٰ علیہ السلام کی دعوت

Marfat.com

لوگوں میں اپنا اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اور اگر ہم کوئی پکڑ دھکڑ شروع کرتے ہیں تو سب لوگ یہ سمجھیں گے کہ ہم اپنی ناکامی کا انتقام لے رہے ہیں اور یہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ بالآخر انتقام کا جوش ان پر غالب آیا تو انہوں نے فرعون سے مطالبہ کیا کہ آپ موسیٰ اور اس کی قوم کے بارے میں کچھ کرنے کا حکم دیجئے۔ اگر آپ نے اسی طرح ان کو آزاد چھوڑے رکھا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ موسیٰ اور اس کی قوم بنی اسرائیل تمہاری گرفت سے نکل جائیں گے اور وہ زمین میں فساد پھیلاتے پھریں گے۔ فساد سے ان کی مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے احکام کی پرواہ نہیں کریں گے۔ نہ تمہارا احترام کریں گے اور نہ تمہارے بتوں کے سامنے سر جھکائیں گے۔ عام لوگوں کو یہ تاثر پیدا ہو جائے گا کہ فرعون کی حکومت اپنی گرفت کھو چکی ہے اب ہمیں مستقبل کی قیادت کے طور پر موسیٰ کی طرف دیکھنا چاہئے۔ اس لئے اس بات کی فوری ضرورت ہے کہ موسیٰ اور اس کی قوم کو قابو میں لایا جائے اور یہ جو ڈھیل ان کو دے رکھی ہے اسے ختم کیا جائے۔ فرعون نے اس کے جواب میں کہا کہ تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہئے۔ ہماری حکومت پوری طرح مستحکم ہے اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل اس ملک میں بغاوت کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ البتہ اب ہم ان پابندیوں میں اضافہ کئے دیتے ہیں جو پہلے عدم توجہ کے باعث کسی حد تک ناکامی کا شکار ہوئیں۔ یہ جو ہماری پرانی پالیسی تھی کہ ہم بنی اسرائیل کے بچوں میں لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے اور ذکور کو قتل کر دیتے تھے یہ دائیوں کی لاپرواہی کے باعث ناکام ہو گئی کیونکہ دائیاں عموماً بنی اسرائیل ہی سے تعلق رکھتی تھیں۔ بنی اسرائیل کے گھرانوں سے ان کا ہمدردی کا تعلق ایک فطری بات تھی جب فرعون کی حکومت نے ان دائیوں کو حکم دیا کہ جس گھر میں بھی لڑکا پیدا ہو اس کا گلا گھونٹ دیا جائے تو انہوں نے اس حکم کو نافذ کرنے میں بہت کچھ تامل کیا جہاں کہیں بچہ پیدا ہوتا وہ گھر والوں سے مل کر اسے چھپانے میں کامیاب ہو جاتیں اور پولیس کو اس کا سراغ نہ لگنے دیتیں اس طرح یہ پالیسی تقریباً ناکام ہو گئی۔ اب حق و باطل کے معرکے میں ناکامی کے بعد فرعون نے از سر نو حکم جاری کیا کہ کسی لڑکے کو زندہ نہ چھوڑا جائے لیکن اس حکم کی بجا آوری کی ذمہ داری دائیوں پر نہیں بلکہ عام لوگوں پر ڈالی کہ جہاں کہیں بھی ان کے علم میں یہ بات آئے کہ اسرائیلیوں کے گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے تو وہ اسے پکڑ کر دریا میں پھینک دیں تو فرعون نے اپنے سرداروں کو اطمینان دلایا کہ اس سزا کے پوری طرح نافذ ہو جانے کے بعد چونکہ کوئی بچہ زندہ نہیں رہے گا تو بنی اسرائیل میں یہ طاقت کہاں سے آئے گی کہ وہ بغاوت کر دیں اور مزید تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کے نفاذ کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا گیا کہ بنی اسرائیل کی بیگار میں سختی کی جائے۔ بیگار کے وقت میں اضافہ کر دیا جائے تاکہ وہ لمبی مشقت اور اذیت کے بعد کسی اور بات کے سوچنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ اس طرح سے ایک طرف ان کی نسل کشی کا سامان کیا گیا تاکہ آئندہ نسل وجود میں نہ آسکے اور جو زندہ نسل موجود تھی ان کو بیگار کی شدت میں کس کر اس قابل نہ چھوڑا جائے کہ وہ کسی بھی کام کے بارے میں سوچ سکیں یا اس کا ارادہ کر سکیں۔

اس آیتِ کریمہ میں سرداروں نے فرعون سے یہ کہا کہ اگر آپ نے موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں چھوڑے رکھا تو وہ زمین میں فساد پھیلائیں گے اور تجھے بھی چھوڑ دیں گے اور تیرے اٰلِھَہ یعنی تیرے معبودوں کو بھی چھوڑ دیں گے۔ یہاں اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرعون تو اپنے آپ کو سب سے بڑا رب قرار دیتا تھا اور اسی لئے اپنی قوم سے اپنی پوجا کرواتا تھا جو شخص اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہتا ہو وہ دوسرے کسی کو اپنا معبود کیسے مان سکتا ہے۔ اس لئے یہاں قوم کا یہ کہنا کہ یہ لوگ تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں گے آخر اس کا کیا مفہوم ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ فرعون اپنے زعم کے مطابق اپنے آپ کو مصریوں کے سب سے بڑے دیوتا یعنی سورج کا اوتار سمجھتا تھا اس طرح اس کی حیثیت اوتار بادشاہ کی تھی یعنی وہ بیک وقت مصریوں کا بادشاہ بھی تھا اور ان کے سب سے بڑے دیوتا کا مظہر اور اوتار ہونے کے سبب سے ان کا رب اعلیٰ بھی تھا اس نے اپنے بے شمار مجسمے (اسٹیچو) اور بت بنوا کر اپنی مملکت میں جابجا نصب کروا دیئے تھے اور رعایا کو حکم تھا کہ وہ ان کے درشن کیلئے جائیں اور ان کے سامنے ڈنڈوت بجالائیں۔ اس طرح بادشاہ کو بیک وقت رعایا پر

Marfat.com

خدائی اور شاہی دونوں کے اختیارات حاصل تھے۔انہی مجسموں اور بتوں کی طرف اشارہ کرکے قوم فرعون کے سردار فرعون سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ نے بنی اسرائیل کو ڈھیل دیئے رکھی تو یہ لوگ آپ کے مجسموں کا احترام کرنا چھوڑ دیں گے اور آپ کی عظمت ان کے دلوں سے نکل جائے گی۔اگر آپ کو اپنی عظمت کا احساس ہے اور یقیناً ہوگا کیونکہ اسی احساس پر آپ کی حکومت قائم ہے تو پھر آپ بنی اسرائیل پر اپنی گرفت میں شدت پیدا کیجئے اور انہیں اٹھنے کا موقع نہ دیجئے۔جب ان باتوں کی خبر بنی اسرائیل تک پہنچی تو انہیں یقیناً بہت فکر ہوئی کہ پہلے ہی ہماری زندگی جس اذیت سے گزر رہی ہے وہ بھی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے یہ فرعون کے نئے احکام تو ہمیں زندہ درگور کر دیں گے تو انہوں نے یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی ہوگی موسیٰ علیہ السلام نے ان مصیبتوں کا سامنا کرنا کیلئے اللہ کے حکم سے جو نسخہ تجویز کیا اس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں ہے۔ارشاد فرمایا:

قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ O قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَى رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ O

''موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو زمین اللہ کی ہے وہ جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اس کو وارث بناتا ہے اور انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کیلئے ہے وہ بولے ہم تو تمہارے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی اس نے کہا توقع ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو پامال کرے گا اور تم کو ملک کا وارث بنائے گا کہ دیکھے تم کیا روش اختیار کرتے ہو''۔128-129

فرعون کی اذیتوں پر اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو:

موسیٰ علیہ السلام نے ان سے یہ نہیں کہا کہ میں تمہارے پاس خوش عیشیوں' خوش حالیوں اور آرام طلبیوں کا سامان لے کر آیا ہوں اور میرے ساتھ چل کر تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ ان کو یہ تصور دیا کہ اللہ کے راستے میں چلنے والوں کو ہمیشہ مخالفتوں اور مصیبتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔تم اگر غلامی سے آزادی کا سفر کرنا چاہتے ہو اور فرعون کی ربوبیت چھوڑ کر اللہ کی ربوبیت کے سائے میں آنا چاہتے ہو تو یہ سفر پھولوں کی سیج پر نہیں ہوگا اس راستے میں تو قدم قدم پر دشواریاں ہوں گی۔مخالفتوں کا سامنا ہوگا اور فرعون اپنی قہرمانی طاقتوں سے تم پر ہر ممکن مصیبت لائے گا۔تمہیں اس راستے پر چلتے ہوئے استقامت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔یہ صحیح ہے کہ یہ مقابلہ آسان نہیں۔حکومتوں سے ٹکرانا اور مظالم برداشت کرنا بہت مشکل کام ہے ہوسکتا ہے تمہارے حوصلے جواب دینے لگیں اس لئے میں تمہارے لئے یہ نسخہ تجویز کر رہا ہوں کہ تم اس راستے میں چلنے کیلئے اللہ ہی سے مدد چاہو اور قرآن کریم کئی اور جگہ اس کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ نماز میں اللہ سے مدد مانگو۔نماز میں اللہ سے مدد دو طریقوں سے مانگی جاتی ہے ایک تو یہ کہ نماز کے آغاز سے کر اس کے اختتام تک حتیٰ کہ اس کیلئے اذان میں بھی مسلسل اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا دنیا میں کبریائی کسی کو زیب نہیں دیتی۔وہ ذات کبریا ہے جو ہر طرح کی عظمتوں کی مالک ہے۔اس کی قدرتیں بے پناہ ہیں'اس کی قوتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں وہی تخت وتاج کا مالک ہے جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔اللہ کی کبریائی کا تصور اور اس کی قدرتوں پر اعتماد جیسے جیسے پختہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے انسانی حکومتیں اور ان کی بڑائیاں نظروں میں ہیچ ہونے لگتی ہیں۔آدمی جب اس بات کا یقین کر لیتا ہے کہ ہر چیز کا مالک اللہ ہے تو بڑے سے بڑا صاحب جبروت بھی چیلوں سے زیادہ حیثیت کا مالک دکھائی نہیں دیتا جب کسی قوم کی نگاہوں میں اس طرح طاقت وقوت اور اقتدار کے پیمانے بدل جاتے ہیں اور زاویہ نگاہ

Marfat.com

تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر اس کیلئے بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرانا اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنا سفر جاری رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ صبر سے مدد حاصل کرو۔ صبر دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے ایک تو ہے اپنے مؤقف اور اپنے نقطہ نگاہ کی صداقت پر مکمل یقین اور دوسرا ہے اس راستے میں آنے والی مخالفتوں' مزاحمتوں اور اذیتوں پر استقامت۔ یہ دو چیزیں انسان کے اندر اس مضبوط شخصیت کو جنم دیتی ہیں جو کسی بھی مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے کبھی نہیں گھبراتی۔ خطرناک سے خطرناک حالات میں بھی جب اسے یقین ہوتا ہے کہ میں سچائی پر ہوں تو پھر اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ سچائی کی عظمت کیلئے مجھے جان دینا پڑے گی۔ وہ ہر حال میں استقامت کا ایک ایسا پیکر بن جاتا ہے جسے کسی طرح بھی ہلانا ممکن نہیں ہوتا۔ اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل سے یہی کہا گیا ہے کہ تم اللہ سے مدد مانگو اور اس راستے میں آنے والی مشکلات پر صبر کرو یعنی استقامت اور اللہ کی توفیق تمہارے لئے مشکل سے مشکل راستہ آسان کر دے گی۔ رہی یہ بات کہ فرعون یہ کہتا ہے کہ ہم بہر صورت ان پر غالب ہیں یہ ملک اور یہ حکومت ہم سے کبھی چھینے نہیں جاسکتے تو اس کا یہ کہنا خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ زمین اللہ کی ہے وہی اس کا مالک ہے وہ جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے لیکن انجام کے اعتبار سے اس کا یہ فیصلہ ہے کہ ہمیشہ متقی ہی سرافراز ہوتے ہیں۔ اللہ سے ڈرنے والے لوگ جو اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت کو نافذ کرنا چاہتے ہیں ان کی زندگی کا ہر لمحہ اسی کی اطاعت میں گزرتا ہے اور وہ بندوں میں بھی اسی کی اطاعت دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں قرآن کریم متقی کہتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بالآخر زمین کے وارث بنائے جاتے ہیں۔ جب تک وہ زمین کو فساد سے بچائے رکھتے ہیں اور اللہ کی اطاعت خود بھی کرتے ہیں اور اہل زمین سے بھی اللہ کی اطاعت کرواتے ہیں۔ اللہ ان کی سلطنت کو قائم رکھتا ہے لیکن جب وہ اللہ کے عہد سے برگشتہ ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ دوسرے لوگوں کو لے آتا ہے۔ رسولوں کے واسطے سے ہمیشہ اللہ کی اس سنت پر عمل ہوتا رہا ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کی طرف اللہ کے رسول اصلاح کی دعوت لے کر آتے ہیں وہ قوم اگر اسے ماننے سے انکار کر دیتی ہے تو انہیں مٹا دیا جاتا ہے اور وہ سرزمین دوسرے لوگوں کے حوالے کر دی جاتی ہے جو ان سے بہتر ہوتے ہیں۔ بنی اسرائیل کو یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم نہایت صبر سے اللہ کے دین کی دعوت دیتے رہو اور خود بھی اس پر چلتے رہو ایک وقت آئے گا جب تمہارے مخالفین کو مٹا دیا جائے گا اور تمہیں زمین کی حکومت دے دی جائے گی۔ بنی اسرائیل چونکہ غلامی کے مارے ہوئے لوگ تھے غلامی نے اجتماعی سیرت و کردار کی ہر خوبی سے انہیں تہی دامن کر دیا تھا وہ ان باتوں کی قدر و قیمت کو کیا سمجھتے؟ اس لئے وہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ! تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور تیرے آنے کے بعد بھی نہ صرف کہ ہم ستائے جارہے ہیں بلکہ ہماری تکلیفوں میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو تباہ کر دے گا اور تمہیں خلافت ارضی سے نوازے گا لیکن اس کیلئے شرط یہ ہے کہ تم نہایت اخلاص سے اللہ کی بندگی کا حق ادا کرتے رہو لیکن یہ یاد رکھو کہ جب تمہیں اللہ تعالیٰ خلافت ارضی سے نوازے گا آج جس طرح وہ دوسروں کو دیکھ رہا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں پھر وہ تمہیں دیکھے گا کہ تم اپنی ذمہ داریاں کس طرح ادا کر رہے ہو یہ دنیا تو دار العمل اور دار الامتحان ہے یہاں ہر ایک کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں۔ انہی کے حوالے سے ہر شخص اور ہر قوم کو نوازا جاتا ہے یا سزا دی جاتی ہے۔

وَلَقَدْ

اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ

Marfat.com

يَذَّكَّرُونَ ﴿١٣٠﴾ فَإِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَإِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوا بِمُوسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣١﴾ وَقَالُوا مَهْمَا تَاْتِنَا
بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ
وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿١٣٣﴾
وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا
عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ
مَعَكَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيلَ ﴿١٣٤﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى
اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿١٣٥﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ
فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غٰفِلِينَ ﴿١٣٦﴾
وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ
وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بٰرَكْنَا فِيهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى
عَلٰى بَنِيٓ اِسْرَآءِيلَ ۙ بِمَا صَبَرُوا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ
فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ﴿١٣٧﴾ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيٓ اِسْرَآءِيلَ
الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُونَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوا
يٰمُوسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ

Marfat.com

تَجْهَلُونَ ﴿١٣٨﴾ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ
قَالَ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِيكُمْ إِلَٰهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٤٠﴾
وَإِذْ أَنجَيْنَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ
يُقَتِّلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن
رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿١٤١﴾

ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آ ئے۔اور جب ان پر اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں اور جب ان پر برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لئے فالِ بد ٹھہراتے حالانکہ درحقیقت ان کی فالِ بد تو اللہ کے پاس تھی مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ تو ہمیں مسحور کرنے کیلئے خواہ کوئی نشانی لے آئے ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون، تفصیل کی ہوئی نشانیاں تو انہوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ تھے۔اور جب آتی ان پر کوئی آفت تو کہتے اے موسیٰ! تم اپنے رب سے اس عہد کے واسطے سے جو اس نے تم سے کر رکھا ہے ہمارے لئے دعا کرو اگر تم نے ہم سے یہ آفت دور کر دی تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے مگر جب ہم ان سے اس آفت کو دور کر دیتے ایک مدت کیلئے جس تک وہ پہنچنے والے ہوتے تو وہ دفعتاً عہد توڑ دیتے۔اب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ان سے بے پرواہ ہو گئے تھے۔اور جو لوگ دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث ٹھہرایا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی ساری تعمیرات اور ان کے سارے باغ و چمن ملیامیٹ کر دیئے۔اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا کہ ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ! جس طرح ان کے دیوتا ہیں اسی طرح کا ایک دیوتا تم ہمارے لئے بھی بنا دو' موسیٰ نے کہا ہم تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔ان لوگوں کا یہ سب کچھ جس میں

Marfat.com

یہ لگے ہوئے ہیں برباد ہونے والا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں نابود ہو کر رہے گا۔ اس نے کہا کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں، درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تم کو اہل عالم پر فضیلت بخشی۔ اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات دی جو تمہیں نہایت برے عذاب چکھاتے تھے وہ تمہارے بیٹوں کو بے دردی سے قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی ہی آزمائش تھی۔

☆ ☆ ☆

گزشتہ رکوع میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور قوم فرعون کے سامنے جب اپنی دعوت پیش کی اور اپنی تائید کیلئے معجزات دکھائے تو وہ بجائے اس کے کہ اس دعوت کو قبول کر کے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے انہوں نے مشتعل ہو کر فرعون سے بار بار موسیٰ اور بنی اسرائیل کو ختم کرنے یا انہیں زیادہ سے زیادہ ایذا پہنچانے کا مطالبہ شروع کر دیا ان کے اس مطالبے پر فرعون نے بنی اسرائیل پر وہ پابندیاں جو پہلے سے چلی آ رہی تھیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں ڈھیل پیدا ہو گئی تھی انہیں مزید سخت کرنے اور پوری طرح بروئے کار لانے کا حکم دے دیا اور اپنی قوم کو اس بات کا یقین دلایا کہ تم ان کی بڑھتی ہوئی افرادی قوت سے پریشان مت ہو ہم نے ان کی موجودہ نسل کو بیگار میں کس کر عضو معطل بنا کر رکھ دیا ہے اور آئندہ نسل کے بچوں کو ہم زندہ نہیں چھوڑیں گے تاکہ ان کی افرادی قوت میں اضافہ نہ ہو سکے۔ ایسی صورت حال میں وہ بجائے اپنی محرومیوں کو یاد کرنے اور اپنے زخم چاٹنے کے اور کچھ نہیں کر سکیں گے۔ ایک ستم رسیدہ اور محرومیوں کی ماری ہوئی قوم سے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہماری ایک مستحکم حکومت کے خلاف کوئی بڑی کاروائی کرنے کے بارے میں سوچ بھی سکے۔ اس طرح جب بنی اسرائیل پر سختیاں بڑھیں تو وہ پہلے سے ہی نہایت پریشان اور غمزدہ لوگ تھے نئی سختیوں نے انہیں بالکل ہلا کر رکھ دیا اس پر وہ مسلسل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کرنے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی ہدایت کے مطابق انہیں بہتر حالات کی امید رکھنے اور موجودہ حالات پر صبر کرنے کی ترغیب دی اور ساتھ ہی پروردگار نے اپنی اس سنت کو آگے بڑھایا جس کا تذکرہ اسی صورت کی آیت نمبر ۸۸ میں کیا گیا ہے چنانچہ اسی حکمت اور سنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ O

''ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے''۔ 130

اس آیت کریمہ میں سِنِیْنَ کا لفظ آیا ہے یہ سَنَةٌ کی جمع ہے۔ عام طور پر اس کا معنی سال کیا جاتا ہے لیکن یہ لفظ قحط اور مصیبت کے سال کے لئے بھی بولا جاتا ہے یہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ پروردگار نے اپنی سنت کے مطابق انہیں بھی مختلف کٹھن حالات سے دوچار کیا جیسے ہم اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ جب بھی کسی قوم کی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ اپنا رسول بھیجتے ہیں تو ایک طرف تو رسول اپنی ہمت اور اللہ کی توفیق کے مطابق بگڑی ہوئی قوم کو راہ راست کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے اس میں اس کی جسمانی اور روحانی کاوشیں بتمام و کمال اپنا فرض انجام دیتی ہیں۔ اس کی نہایت دلآویز شخصیت، اس کا مضبوط طریق استدلال، اس کا معجزانہ اسلوب دعوت، لوگوں کو راہ راست کی طرف لانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ کی طرف سے مختلف قسم کی آزمائشوں کی شکل میں اس کی معاونت کی جاتی ہے۔ مختلف مصائب اور مشکلات سے اس قوم کو دوچار کیا جاتا ہے تاکہ ان کی اکڑی ہوئی گردنیں اللہ کے سامنے جھکیں اور ان کے پھرے ہوئے دل اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔ جب بار بار وہ اس طرح کی مشکلات سے دوچار ہوں تو انہیں کبھی نہ کبھی یہ خیال ستانے لگے کہ اگر اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہ ہوتا اور ہم اپنے ارادوں میں پوری طرح مختار

Marfat.com

ہوتے تو پھر یہ حالات کا پھیر ہمیں پریشان کیوں کرتا اور آئے دن مشکلات ہمارے لئے زندگی مشکل کیوں بنا دیتیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً یہاں کسی بڑی ذات کی حکومت ہے جس کی طرف یہ اللہ کا رسول ہمیں بلا رہا ہے۔ اس طرح سے حالات کا بگاڑ اور مشکلات کا بار بار پیش آنا اللہ کے رسول کی دعوت کیلئے ایک طرح سے تائید و نصرت ثابت ہوتا ہے اور یہی اللہ کی سنت ہے۔ یہاں اسی بات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے آل فرعون کو بھی کئی سالوں تک کبھی پھلوں اور پیداوار میں کمی اور کبھی قحط سالی میں مبتلا کئے رکھا تاکہ وہ لوگ نصیحت پکڑیں اور ان تنبیہات کو سمجھتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کریں لیکن وہ بجائے اس کے کہ ان حالات سے عبرت پکڑتے اور موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر سنجیدگی سے غور کرتے انہوں نے عجیب و غریب رویہ اختیار کیا جس کا ذکر کرتے ہوئے پروردگار فرماتے ہیں:

فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ قَالُوۡا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝ وَقَالُوۡا مَهۡمَا تَاۡتِنَا بِهٖ مِنۡ اٰيَةٍ لِّتَسۡحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحۡنُ لَـكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۝

''اور جب ان پر اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں اور جب ان پر برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لئے فالِ بد ٹھہراتے حالانکہ درحقیقت ان کی فالِ بد تو اللہ کے پاس تھی مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔ انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ تو ہمیں مسحور کرنے کیلئے خواہ کوئی نشانی لے آئے ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں''۔ 132-131

یطیّروا۔ طائر کا مفہوم:

اس آیت کریمہ میں یَطَّیَّرُوۡا اور طٰٓئِرُ کے لفظ استعمال ہوئے ہیں تطیر طیر سے ہے۔ طیر چڑیوں اور پرندوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ توہم پرستوں میں چڑیوں اور پرندوں کے اڑنے سے فال لینے کا عام رواج رہا ہے اس وجہ سے تطیر کا لفظ فال لینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ پھر اس کا غالب استعمال فالِ بد کے معنی میں ہو گیا۔ اسی مادے سے طائر کا لفظ بھی ہے جو اس چیز کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جس سے کوئی نیک یا بد فال لی جائے اور پھر اسی مفہوم سے ترقی کر کے قسمت اور نصیب کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

گمراہ لوگوں کی سوچ بھی بگڑ جاتی ہے اور وہ صحیح نتائج اخذ کرنے سے محروم ہو جاتی ہے:

یہاں ان کے رویے کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ فرعون اور آل فرعون کا حال یہ تھا کہ ان پر آزمائشیں اور مشکلات اس لئے نازل کی جاتی تھیں تاکہ انہیں جھنجھوڑا جائے جس کے نتیجہ میں موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو سنجیدگی سے سوچنے سمجھنے کی کوشش کریں لیکن ان کی حماقت اور گمراہی کا حال یہ تھا کہ جب کبھی انہیں اچھے حالات پیش آتے۔ خوشحالی ان کے قدم چومنے لگتی اور زندگی کے ہر مرحلے پر ان کو کامیابیاں نصیب ہونے لگتیں تو وہ انہیں اپنے دست و بازو کی کاوشوں کا نتیجہ سمجھتے اور یہ کہتے کہ ہم چونکہ ذہین لوگ ہیں اور ہم نے اپنے ملک کو ایک اچھے نظام سے باندھ رکھا ہے اور ہمارے ہر کام میں ایک منصوبہ بندی ہے اس لئے یہ کامیابیاں تو ہماری ہی کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور ہم بجا طور پر اس کے مستحق ہیں اور اگر کبھی حالات بگڑنے لگتے فصلیں تباہ ہونے لگتیں' بارشیں رک جاتیں' پھل جھڑنے لگتے' کاروبار مندا پڑ جاتا' ہر طرف سے پریشانیاں گھیرنے لگتیں تو بجائے اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے وہ اسے موسیٰ علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کی نحوست قرار دیتے اور یہ سمجھتے کہ یہ جو ہمارے دین کے خلاف ایک نئے دین کی باتیں کرتے ہیں اور

Marfat.com

بجائے فرعون کو سب سے بڑا رب ماننے کے رب العالمین کی طرف دعوت دے رہے ہیں تو ان کی اس بے دینی کے باعث ارضی وسماوی دیوتا ان سے ناراض ہو گئے ہیں اور ہم چونکہ انہیں برداشت کر رہے ہیں اس لئے ان کی اس بے دینی کے نتیجے میں دیوتاؤں کی ناخوشی کا ہم بھی نشانہ بن رہے ہیں۔ چنانچہ جب تک یہ منحوس لوگ ہمارے اندر موجود ہیں اور یہ مسلسل نحوست پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں اس وقت تک ہم اپنے منحوس حالات سے نجات نہیں پا سکتے۔ اس کے جواب میں اس آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ اصل میں علم وآگہی سے کوسوں دور ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی قسمتیں کسی اور کے قبضہ میں نہیں۔ کسی اور کی قسمت کے باعث کوئی نحوست پیدا نہیں ہوتی بلکہ سب کی قسمتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ ہر ایک کی قسمت اپنی حکمت اور اس کے اعمال کے حوالے سے بناتا ہے ان کے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ ان کی بداعمالیوں اور بے ایمانیوں کا نتیجہ ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ حالات کی گرفت سے نکلنے کیلئے اپنی اصلاح کریں اور پیغمبر کی دعوت کی طرف متوجہ ہوں انہوں نے ایک جھوٹا عذر تلاش کر لیا ہے کہ ہمارے ساتھ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا سبب موسیٰ اور ان پر ایمان لانے والوں کی نحوست اور بے دینی ہے۔ اگلی آیت کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ انہوں نے اسی بات پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ نحوست کا طعنہ دے کر رہ جائیں بلکہ اپنی گمراہی کو انتہاء تک پہنچاتے ہوئے اور اپنی انتہائی بے بصیرتی کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم جیسی چاہو نشانی لے کر آ جاؤ اور کتنا بڑا معجزہ ہمیں دکھا دو اور چاہے دلائل کا انبار ہمارے سامنے لگا دو اور بے شک ہم تمہارے سامنے بے بس ہو کر رہ جائیں لیکن ہم تم پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ صرف سحر کا نتیجہ ہے یہ تمہارے جادو کا طلسم ہے بس سے تم نے ہمیں مسحور کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔ ہم یہ تمہاری کوشش کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

جب ان کا حق سے عناد اور باطل سے محبت اس حد تک پہنچ گئے کہ وہ ہر صحیح بات کو رد کرنے میں دلیر ہو گئے اور ان کا حال یہ ہو گیا کہ نہ ان پر کوئی دلیل اثر انداز ہوتی اور نہ اللہ کی طرف سے کوئی آزمائش انہیں صحیح رخ اختیار کرنے پر مجبور کرتی تو تب پروردگار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے انہیں ایسے بڑے بڑے معجزات دکھانا شروع کئے جو اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی تھے کہ موسیٰ اگر اللہ کے نبی نہ ہوتے تو یہ سب کچھ کیوں ظہور پذیر ہوتا اور ساتھ ہی ساتھ وہ معجزات ایسے تھے جس نے انہیں بری طرح ہلا کر رکھ دیا یعنی ایک طرف اگر ان معجزات میں دل ودماغ کو سوچنے کی دعوت تھی تو ساتھ ہی ساتھ ان میں ایک ہیبت بھی تھی جس سے گردنیں جھکائی جا سکتی تھیں چنانچہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ قف فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ O

"تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون، تفصیل کی ہوئی نشانیاں تو انہوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ تھے"۔133

آیاتِ مفصلات کا مفہوم:

اس آیت کریمہ میں دو لفظ آئے ہیں اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ اہل علم نے اس کے دو ترجمے اور دو مفہوم بیان کئے ہیں پہلا ترجمہ یہ ہے جدا جدا اور الگ الگ معجزات، جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں جتنے معجزات کا ذکر ہوا ہے یعنی طوفان، ٹڈی، جوئیں، مینڈک اور خون۔ یہ پانچ معجزات ایک ہی دفعہ ان کے ساتھ نہیں آئے بلکہ ان میں سے ہر ایک معجزہ اپنے اپنے وقت پر الگ سے انہیں دکھایا گیا چنانچہ جب ایک سے وہ راہ راست پر نہیں آئے تو پھر دوسری نشانی

Marfat.com

اور دوسرا معجزہ ان کے سامنے آیا۔ اس طرح سے مسلسل انہیں ہلانے جھنجھوڑنے اور سوچنے سمجھنے کیلئے پروردگار نے موقع فراہم کیا لیکن انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ دوسرا ترجمہ ہے یہ تمام نشانیاں جو تفصیل سے ذکر کی گئی ہیں یعنی یہاں تو ان نشانیوں اور معجزات کو نہایت اختصار سے بیان فرمایا گیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہیں اور ان کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے تو یہ قرینہ راہنمائی کر رہا ہے کہ یقیناً یہاں ظرف محذوف ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ان نشانیوں کو تورات میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس مفہوم کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم تورات سے اس کی تفصیلات ذکر کریں۔ تورات میں ایک ایک معجزے کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے چنانچہ جس ترتیب سے یہاں معجزات کو شمار کیا گیا ہے ہم اسی ترتیب سے تورات سے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

معجزات کی تفصیل:

1- طوفان:

تورات میں اس طوفان کی تفصیل اس طرح آئی ہے۔

''اور خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تاکہ سب ملک مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے اولے گریں اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اولے بھیجے اور آگ زمین تک آنے لگی اور خداوند نے ملک مصر پر اولے برسائے پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملک مصر میں ان کو جو میدان میں تھے' کیا انسان کیا حیوان' سب کو مارا اور کھیتیوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے اور میدان کے سب درختوں کو توڑ ڈالا''۔ (خروج باب ۹: ۲۲-۲۵)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ طوفان رعد' گرج' کڑک اور اولوں کا طوفان تھا۔ بارش اور ہوائے تند بھی اکثر اسکے ساتھ ہوتی ہے۔ اس میں آگ کا جو ذکر ہے یہ تورات کے مترجموں کی غلطی ہے۔ اس سے مراد ہماری عام آگ نہیں ہے بلکہ یہ وہ بجلی ہے جو اس طرح کے طوفان کے لوازم میں سے ہے۔

2- جراد (ٹڈیاں):

اس کی تفصیل تورات میں یوں آئی ہے۔

''تب خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں ملک مصر پر آئیں اور ہر قسم کی سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوئے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک مصر پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور ان کا دل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو ان سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ ان کے بعد پھر آئیں گی۔ کیونکہ انہوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا' ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انہوں نے اس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی''۔ (خروج باب ۱۰: ۱۲-۱۵)

Marfat.com

3-قمل (جوئیں):

یہ آفت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

"تب خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا' ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مارتا کہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارا اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہو گئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی"۔ (خروج باب ۸:۱۶-۱۷)

4-الضفادع (مینڈک):

ضفادع' ضفدع کی جمع ہے۔ ضفدع مینڈک کو کہتے ہیں۔ اس عذاب کی تفصیل یوں بیان ہوئی ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اس سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے کہ میری عبادت کریں اور اگر تو ان کو جانے نہ دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں سے بھر جائے گا اور وہ آ کر تیرے گھر میں اور تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور تیرے آٹا گوندھنے کے لگنوں میں گھستے پھریں گے اور تجھ پر اور تیری رعیت اور تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے۔ اور خداوند نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں' نہروں اور جھیلوں پر بڑھا اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھا لا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا اس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا"۔ (خروج باب ۸:۱-۶)

5-دَم (خون):

اس کے معنی خون کے ہیں۔ اس کے ظہور کی شکل اس طرح مذکور ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں جتنا پانی ہے یعنی دریاؤں' نہروں' جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھا تا کہ وہ خون بن جائیں اور سارے ملک مصر میں پتھر اور لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہی خون ہوگا اور موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا۔ اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا پانی سب خون ہو گیا اور دریا کی مچھلیاں مر گئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی نہ پی سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہو گیا"۔ (خروج باب ۸:۱۹-۲۱)

معجزات سے پھوٹنے والی باتیں:

موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے قوم فرعون کو جو معجزات دکھائے گئے یہ ان میں سے چند معجزات ہیں آپ نے تورات کے حوالے سے ان کی تفصیل پڑھی ہے اس میں دو باتیں تو بہت نمایاں نظر آتی ہیں ایک یہ کہ یہ معجزات کوئی ناگہانی واقعات نہیں تھے کہ اچانک پیش آ گئے بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے بارے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو پہلے وارننگ دی کہ اگر تم نے میری دعوت کو قبول نہ کیا اور اپنا رویہ نہ بدلا تو یہ

Marfat.com

مصیبت نازل ہوسکتی ہے چنانچہ جب اس نے ماننے سے انکار کر دیا تو چند دنوں کے بعد وہ مصیبت نازل ہوگئی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ انہیں اطلاع دینے کے بعد پروردگار انہیں ان مصائب میں مبتلا کرتا تھا تا کہ انہیں اچھی طرح اس بات کا یقین ہو جائے کہ موسیٰ علیہ السلام واقعی اللہ کے رسول ہیں اور یہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہورہا ہے یہ آپ کی دعوت کو قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے اور دوسری بات جو ان معجزات سے نمایاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی چھوٹی موٹی باتیں نہیں تھیں جن سے عام طور پر تو میں اثر قبول نہیں کرتیں بلکہ یہ تو ہلا دینے والے ایسے ہولناک مصائب تھے جن سے ہر چھوٹا بڑا متاثر ہوتا تھا اور ان کی ہولناکی کو دیکھ کر دل سہم سہم جاتے تھے ان دونوں باتوں کا نتیجہ تو یہ نکلنا چاہئے تھا کہ یہ لوگ فوراً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول کر لیتے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کی گردنیں جھکتیں وہ اللہ سے ڈرنے لگتے اور نتیجتاً پیغمبر کی دعوت کو قبول کر لیتے' بالکل اس کے برعکس انہوں نے تکبر اور غرور کا راستہ اختیار کیا کہ نہ تو پیغمبر کی دعوت کو قبول کیا' نہ پیغمبر کو اہمیت دی' نہ اللہ کا خوف ان کے دل میں پیدا ہوا اور نہ ان کی طرف سے بنی اسرائیل پر مظالم میں کوئی کمی آئی بلکہ ان کے ایک ایک بگاڑ میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ان کے اس تکبر کا سبب یہ تھا کہ یہ قوم مجرموں کا گروہ تھا۔ ایسے جرائم پیشہ لوگ جو کسی بھی حق بات کو قبول کرنے سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ کہیں خون بہتا ہو' کہیں سے سسکیاں بلند ہو رہی ہوں' کہیں چیخیں سنائی دیتی ہوں' کہیں فریادیں کی جارہی ہوں تو جس آدمی میں ذرا بھی انسانیت ہوتی ہے وہ ایسی صورت حال میں پگھل جاتا ہے اس کا دل کانپ اٹھتا ہے اولاً تو وہ مدد کیلئے آگے بڑھتا ہے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو ان مصائب کو دیکھ کر اس کا دل پسیجتا ضرور ہے لیکن جن لوگوں کو ہم جرائم پیشہ کہتے ہیں یعنی جرم جن کی گھٹی میں پڑ جاتا ہے وہ ایسے سنگدل ثابت ہوتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بات بھی ان کی طبیعت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ لوگوں کے آنسو' بچوں کی چیخیں' عورتوں کی سسکیاں ان کیلئے تفریح کا سامان ہوتی ہیں۔ بچوں کو نیزوں پر اچھال کر انہیں ایک طرح سے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ عورتوں کی عزتیں لوٹ کر انہیں جنسی آسودگی ملتی ہے۔ ہر طرح کا ظلم ان کے بہیمانہ جذبات کو تسکین دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں پر مشتمل قوم فرعون بھی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے بلکہ یہ سب کچھ ان کے ساتھ بیت رہا تھا لیکن ان کے دلوں کے پتھروں میں قبولیت کی کوئی جونک نہیں لگ رہی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان مصائب کو جو پیغمبر کی صداقت کے بینات تھے اور ان کیلئے سزا بھی تھے انہیں ایک کھیل بنا لیا تھا۔ جس سے ان کی ذہنیت کے بارے میں عجیب سا احساس ہونے لگتا ہے جس کی کوئی توجیہ آسان محسوس نہیں ہوتی۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی صورت حال کو بیان کیا جارہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ O فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ O

"اور جب آتی ان پر کوئی آفت تو کہتے اے موسیٰ تم اپنے رب سے اس عہد کے واسطے سے جو اس نے تم سے کر رکھا ہے ہمارے لئے دعا کرو اگر تم نے ہم سے یہ آفت دور کر دی تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے مگر جب ہم ان سے اس آفت کو دور کر دیتے ایک مدت کیلئے جس تک وہ پہنچنے والے ہوتے تو وہ دفعتاً عہد توڑ دیتے"۔ 134-135

یعنی جب بھی وہ عذاب کی گرفت میں آتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منت سماجت کرنے لگتے کہ اللہ کے یہاں جو آپ کو ایک خاص مقام حاصل ہے اسکی وجہ سے ہم آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ آپ اللہ سے دعا کر کے ہمیں اس عذاب سے نجات دلا دیں تو ہم آپ پر ایمان بھی لے آئیں

Marfat.com

گے اور بنی اسرائیل کو بھی آپ کے ساتھ جانے دیں گے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ یہ مصائب اللہ کی طرف سے آرہے ہیں اور اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا ہے اور مزید وہ یہ بات بھی سمجھتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا اللہ کے یہاں ایک خاص مرتبہ ہے یعنی وہ اللہ کے مقرب رسول ہیں۔ اللہ ان کی دعائیں سنتا ہے وہ جب اللہ سے التجا کریں گے تو یقیناً ہم سے اللہ تعالیٰ یہ عذاب واپس لے لیں گے۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ ایک طرف تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت کے قائل بھی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے یہاں ان کا ایک خاص مقام ہے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ مصائب ہم پر نازل ہو رہے ہیں اس کا سبب یقیناً موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لانا ہے لیکن اس کے باوجود وہ راہِ راست اختیار کرنے کیلئے تیار نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام سے التجا بھی کرتے ہیں لیکن در پردہ ذہن میں ان کا یہ خیال موجود رہتا ہے کہ ہم اس التجا کو صرف تکلیف دور کرنے کا ذریعہ بنا رہے ہیں' ایمان ہماری ضرورت نہیں۔ چنانچہ جب ان سے وہ تکلیف دور کر دی جاتی اور انہیں ایک مدت کیلئے مہلت مل جاتی ہے تو وہ پھر اپنے اصل رویے کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور جب مزید کوئی عذاب ان پر اترتا ہے تو پھر وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر دعا کیلئے التجا کرنے لگتے ہیں۔ یہ ان کا بار بار موسیٰ علیہ السلام سے ملتجی ہونا اور موسیٰ علیہ السلام کا ان کیلئے دعا کرنا اور پھر مصیبت کے جانے کے بعد ان کا اپنے وعدوں سے پھر جانا یہ ایسا حیرت انگیز رویہ ہے جس کی اس کے سوا کوئی توجیہہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے ناراض ہے تو اپنے قانون ہدایت کے مطابق انہیں مہلت پہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے لیکن جب وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو پھر انہیں ہدایت سے محروم رکھنے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے چنانچہ اس فیصلے کی گرفت میں آ جانے کے بعد وہ قوم ہدایت قبول کرنے سے یکسر عاری ہو جاتی ہے اور پھر چھوٹے موٹے عذاب ان پر کوئی اثر نہیں کرتے جس طرح ایک ڈھیٹ آدمی نصیحت یا چھوٹی موٹی تنبیہہ پر اثر قبول نہیں کرتا اسی طرح ڈھیٹ قومیں بھی اللہ کی تنبیہات سے اثر قبول نہیں کرتیں اس کا نتیجہ آخر یہ نکل کے رہتا ہے کہ وہ اللہ کے اس عذاب کا شکار ہوتی ہیں جس سے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ انہیں ہر ممکن طریقے سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی گئی انہیں مصائب میں مبتلا کر کے نرم کیا گیا۔ معجزات دکھا کر نبی کی حقانیت ثابت کی لیکن اس تمام صورتحال کے باوجود بھی ان کے رویے میں کوئی کمی نہیں آئی تو بالآخر اللہ کا آخری فیصلہ آ گیا جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا جا رہا ہے:

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ O

''اب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ان سے بے پرواہ ہو گئے تھے''۔136

فرعون اور آلِ فرعون کا انجام:

جب کسی کو سنبھلنے کیلئے مسلسل تنبیہات کی جائیں اور ساتھ ہی ساتھ اس پر عنایات کی بارش بھی ہوتی رہے اور دنیا کی ہر نعمت اس کو فراوانی سے عطا کی جائے لیکن وہ نعمتوں کا شکر ادا کرے اور نہ وہ تنبیہات کو درخور اعتنا سمجھے بلکہ اپنی جرأتوں اور جسارتوں میں اس حد تک آگے بڑھ جائے کہ زمین کو ظلم سے بھر دے اور انسان اس کے مظالم سے بلبلا اٹھے تو پھر قدرت ایسے عادی مجرم کو جو سزا دیتی ہے اسے انتقام ہی کہنا چاہئے چنانچہ اسی آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے پھر ان سے انتقام لیا یعنی ہم نے انہیں ان کے جرائم کی سزا دی کہ اللہ نے فرعون اور آل فرعون کو اس وقت کی معلوم دنیا کی سب سے بڑی حکومت عطا کی' ملک کو ہر طرح کی دولت سے مالا مال کیا' نعمتوں کی وہ فراوانی کہ کوئی ملک اور کوئی قوم اس معاملے میں ان کا

Marfat.com

مسر نہ تھا۔ بایں ہمہ! انہوں نے بنی اسرائیل کو اپنے مظالم سے زار و نزار کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کے قومی تشخص کو تباہ و برباد کیا اور ان کی نسلوں کو تہ تیغ کرنے سے باز نہ آئے۔ پھر جب اللہ نے مسلسل آزمائشوں میں مبتلا کر کے انہیں تنبیہات فرمائیں تو انہوں نے کسی تنبیہ کو بھی پلے نہیں باندھا بلکہ اپنے ظالمانہ رویے میں بڑھتے ہی چلے گئے تب اللہ کے انتقام کا کوڑا حرکت میں آیا کہ فرعون کو اس کی فوجوں سمیت سمندر میں غرق کر دیا۔ قرآنِ کریم نے اس کو نہایت اختصار سے بیان فرمایا ہے کہ جب فرعون کے مظالم کی انتہا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاؤ اور اپنے باپ دادا کی سرزمین یعنی فلسطین میں جا کر اللہ کی منشاء کے مطابق ان کی تربیت کرو اور اللہ کے دین کی بالادستی پر مبنی ایک ریاست قائم کرو۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام فلسطین یا ارض کنعان جانے کیلئے مصر سے رات کی تاریکی میں نکلے تو بجائے خشکی کا راستہ اختیار کرنے کے جو قریب بھی تھا آپ نے دور کا راستہ اختیار کیا جس کے راستے میں بحر احمر پڑتا تھا آپ چاہتے تھے کہ اس کو عبور کر کے بیابان شور اور سینا پہنچ جائیں یہ آپ نے دشوار گزار اور دور کا راستہ اللہ کے حکم سے اختیار کیا کیونکہ قریب کا اور خشکی کا راستہ اختیار کرنے میں اگرچہ آسانی اور سہولت تھی لیکن اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ فرعون کی فوجوں سے تصادم ہو جائے اور اگر ایسا ہو جاتا تو بنی اسرائیل جن کو صدیوں کی غلامی نے بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا وہ کسی طرح بھی فرعون کے مقابلے میں اس کی فوجوں سے لڑنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ تصادم اور مقابلے کی صورت میں یقیناً بنی اسرائیل کمزوری کا مظاہرہ کرتے۔ نتیجتاً اس نئی اٹھتی ہوئی اسلامی قوت کو بے پناہ نقصان پہنچ جاتا۔ تورات سے بھی اس توجیہ کی تائید نکلتی ہے۔ تورات میں مذکور ہے

"اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی تو خدا ان کو فلستیوں کے ملک کے راستہ سے نہیں لے گیا اگرچہ ادھر سے نزدیک پڑتا تھا کیونکہ خدا نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں بلکہ خداوند ان کو چکر کھلا کر بحر قلزم کے بیابان کے راستے لے گیا"۔ (خروج باب ۱۳:۱۷-۱۸)

مزید یہ بات بھی ہے کہ اگر خشکی کے راستے موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر خیریت سے فلسطین پہنچ جاتے تو سمندر کے پھٹنے بنی اسرائیل کے خیریت سے گزرنے اور فرعون اور آلِ فرعون کے تباہ ہونے کا جو حیرت انگیز معجزہ وجود میں آنے والا تھا اس کا اظہار نہ ہو سکتا اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کو لے کر بحر قلزم کے راستے پر نکلے تو پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کر دی تو اس نے اسی وقت ایک زبردست فوج کو ساتھ لیا اور صبح ہونے سے پہلے ان کے سر پر جا پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی تعداد اس وقت بچوں اور چوپایوں کے علاوہ چھ لاکھ تھی مگر پو پھٹنے کے وقت جب انہوں نے پیچھا مڑ کے دیکھا تو فرعون کو سر پر پایا' گھبرا کر کہنے لگے

"کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کیلئے بیابان میں لے آیا ہے تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا۔ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کیونکہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا" (خروج باب ۱۴:۱۱-۲۱)۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی بلکہ پورے ایمانی جلال کے ساتھ فرمایا:

﴿ كَلَّآ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ "ہرگز نہیں میرا رب میرے ساتھ ہے وہ ضرور مجھے راستہ دے گا" ﴾

یعنی یہ بحر قلزم میرا راستہ نہیں روک سکتا اور اللہ کے حکم کی موجودگی میں کوئی رکاوٹ میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی اس کے بعد آپ نے اللہ کی بارگاہ میں درخواست کی حکم آیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو۔ چنانچہ آپ نے اپنا عصا قلزم کے پانی پر مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی

Marfat.com

طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں سے راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اس میں اتر گئے اور خشک زمین پر چلتے ہوئے اس پار ہو گئے۔ فرعون نے یہ دیکھا تو اپنی قوم سے کہنے لگا یہ میری کرشمہ سازی ہے کہ بنی اسرائیل کو تم جا پکڑو لہٰذا بڑھے چلو۔ چنانچہ فرعون اور اس کا تمام لشکر بنی اسرائیل کے پیچھے اسی راستہ میں اتر گیا لیکن اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارے پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گیا پانی بحکم الٰہی پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور فرعون اور اس کا تمام لشکر جو ابھی درمیان ہی میں تھا غرق ہو گیا۔ جب فرعون غرق ہونے لگا اور ملائکۂ عذاب سامنے نظر آنے لگے تو پکار کر کہنے لگا کہ میں اسی ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں مگر یہ ایمان چونکہ حقیقی ایمان نہ تھا بلکہ گزشتہ فریب کاریوں کی طرح نجات حاصل کرنے کیلئے یہ بھی ایک مضطربانہ بات تھی اس لئے اللہ کی طرف سے یہ جواب ملا:

آٰلْئٰنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ

''اب یہ کہہ رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے جو اقرار کا وقت تھا اس میں تو نافرمان رہا تو درحقیقت مفسدوں میں سے تھا''۔

درحقیقت فرعون کی یہ پکار ایسی پکار تھی جو ایمان لانے اور یقین حاصل کرنے کیلئے نہیں بلکہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اضطراری بے اختیاری کی حالت میں نکلتی ہے اور مشاہدۂ عذاب کے وقت ایسی صدا اور ایسے ایمان پر بھی اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لئے اللہ کے ہاں اسے قبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ اس لئے فرعون کا ایمان تو قبول نہیں کیا گیا البتہ یہ ضرور فرمایا:

اَلْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً

''آج کے دن ہم تیرے جسم کو ان لوگوں کیلئے جو تیرے پیچھے آنے والے ہیں نجات دیں گے کہ وہ عبرت کا نشان بنا رہے''۔

چنانچہ اس کے نتیجے میں اگلے ہی روز سمندر نے فرعون کی لاش باہر اگل دی۔ مصریوں نے اسے وہاں سے اٹھایا اور نہلانے دھلانے کے اس کو حنوط کر کے دفن کر دیا لیکن اللہ نے اس نام نہاد رب کو ہر طرح کی تذلیل کا نشانہ بنا دیا کہ جو اپنے آپ کو مصر کے بحر و بر کا مالک سمجھتا تھا وہ سمندر کی موجوں سے اپنے آپ کو نہ بچا سکا اور پھر جو اپنی ناک اللہ کے سامنے زمین پر رکھنے کیلئے تیار نہیں تھا اسے ایسی ذلت کی مار پڑی کہ مچھلی اس کی آدھی ناک کھا گئی چنانچہ آج یہ ناک کٹا ذلت کی تصویر بنا مصر کے عجائب گھر میں لوگوں کیلئے عبرت بنا ہوا ہے۔

قرآنِ کریم نے اس حیرت انگیز واقعہ کو اختصار سے بیان فرمایا ہے لیکن واقعہ کے ضروری اجزاء جو باعث عبرت ہیں وہ اس اختصار میں موجود ہیں البتہ تورات میں قرآنِ کریم کے بیان کردہ واقعات کے علاوہ کچھ اور بھی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جو نصیحت و عبرت کے لحاظ سے اگرچہ ضروری نہیں لیکن دلچسپی کے حوالے سے ضرور قابل مطالعہ ہیں۔ تورات کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر جب اللہ کی بھیجی ہوئی آفات کا سلسلہ جاری ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق یکے بعد دیگرے ''نشانات'' کا ظہور ہونے لگا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلا کر کہا بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جا مگر ان کے چوپائے اور پالتو جانور یہیں چھوڑنے ہوں گے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ایک جانور بھی تو روکنے کا حق نہیں رکھتا' تو فرعون غضبناک ہو کر کہنے لگا کہ اب یہ کبھی نہ جا سکیں گے اور تو اب میرے سامنے کبھی نہ آنا ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو نے ٹھیک کہا اب میں کبھی تیرے سامنے نہ آؤں گا میرے اللہ کا یہی فیصلہ ہے اور اس نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ تجھ پر اور تیری قوم پر ایسی سخت آفت آئے گی کہ تیرا اور کسی مصری کا پہلوٹھا زندہ نہیں رہے گا۔

Marfat.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے یہ گفتگو کر کے دربار سے باہر نکل آئے اور پھر بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ خداوند خدا کا ارشاد ہے کہ فرعون کا دل سخت ہو گیا ہے وہ اب تم کو یہاں سے اس وقت تک نہ جانے دے گا جب تک مزید نشان نہ دیکھ لے کہ جس سے تمام مصریوں میں کہرام مچ جائے مگر تم کو تیاری کر لینی چاہئے کہ مصر سے نکلنے کا وقت آ پہنچا اور خدائے تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل کو نکلنے سے پہلے قربانی اور عید فسح کا بھی حکم دیا اور اس کا طریقہ اور شرائط بھی بتا دیں' حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنی عورتوں سے کہو کہ وہ مصری عورتوں کے پاس جائیں اور ان سے عید کیلئے سونے اور چاندی کے زیور اور قیمتی پارچہ جات مستعار مانگ لائیں اور مصری عورتوں نے آخر ان کو زیورات دے دیئے پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک رات فرعون سے لے کر معمولی مصری کا پہلوٹھا مر گیا اور تمام گھرانوں میں کہرام مچ گیا۔ یہ دیکھ کر مصری فرعون کے پاس دوڑے آئے اور اس کو مجبور کیا کہ اسی وقت تمام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال دے تا کہ یہ نحوست یہاں سے دور ہو' ہم پر یہ سب آفتیں انہی کی بدولت آتی رہتی ہیں۔

تب فرعون نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اسی وقت تم سب یہاں سے نکل جاؤ اور اپنے جانوروں' مویشیوں اور سب سامان کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ جب بنی اسرائیل رعمسیس (جشن کے شہر) سے نکلے تو بچوں اور جانوروں کے علاوہ وہ سب چھ لاکھ تھے اور جب وہ نکلے تو مصریوں کے زیورات کو بھی واپس نہ کر سکے اور مصریوں نے بھی مطالبہ نہ کیا۔

جب بنی اسرائیل نے جنگل کی راہ لی تو اب فرعون اور اس کے سرداروں کو اپنے فیصلہ پر سخت افسوس ہوا اور انہوں نے آپس میں کہا کہ ہم نے مفت میں ایسے اچھے چاکر اور غلام ہاتھ سے کھو دیئے اور فرعون نے حکم دیا کہ فوراً سرداروں' مصری نوجوانوں اور فوج کو تیاری کا حکم دو اور وہ کر و فر کے ساتھ رتھوں میں سوار ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔

بنی اسرائیل رعمسیس سے سکات اور وہاں سے ایتام اور پھر مڑ کر مجدال اور بحرِ احمر کے درمیان فی ہیخروت کے پاس بعل صفون کے سامنے خیمہ زن ہو چکے تھے' بنی اسرائیل کے اس پورے سفر میں خدا ان کے ساتھ رہا اور وہ نورانی ستون کی تجلی کے ساتھ رات میں بھی ان کی راہنمائی کرتا اور دن میں بھی آگے آگے چلتا' غرض صبح کی پو پھٹ رہی تھی کہ فرعون نے سمندر کے کنارے بنی اسرائیل کو آ لیا' انہوں نے پیچھا پھر کر دیکھا اور فرعون کو لاؤ لشکر کے ساتھ اپنے قریب پایا تو بزدل اور خائف ہو کر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑا کرنے لگے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بہت کچھ تسلی و تشفی دی اور بتایا کہ تمہارے دشمن ہلاک ہوں گے اور تم سلامتی و عافیت کے ساتھ نجات پاؤ گے اور پھر دربارِ خداوندی میں مناجات کرنے لگے:

''اور خداوند نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے' بنی اسرائیل سے کہو کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے...... پھر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

......اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوڑا پھر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیواروں کی طرح رہا۔

......اور اسرائیلیوں نے وہ بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے اور خداوند پر اور اس کے بندے

Marfat.com

موسیٰ پر ایمان لائے۔

تورات کی تفصیلات میں اگرچہ بہت زیادہ رطب و یابس اور دوراز کار باتیں بھی ضمناً آ گئی ہیں مگر تورات اور قرآن کریم دونوں اس بارے میں ہم آہنگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قہرمانیت کے مظالم سے موسیٰ اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان نشان کے ذریعہ نجات دی۔ قرآنِ عزیز یہی کہتا ہے کہ یہ معجزہ اس طرح ظاہر ہوا کہ اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے قلزم پر لاٹھی ماری اور دریا کا پانی بیچ میں خشکی دے کر دونوں جانب پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا اور تورات بھی اسی کی تائید کرتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض ایسے نیک نام افراد بھی ہیں جو اپنی قومی خدمات کے باعث نہایت عزت کے مستحق ہیں لیکن معجزات کے حوالے سے انہوں نے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ مثلاً سر سید احمد خان جو ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم نام ہے انہوں نے اس عظیم واقعے کو معجزہ ماننے سے انکار کیا ہے اپنی مشہور تفسیر میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ غرق فرعون اور نجاتِ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ معجزہ نہ تھا بلکہ عام دنیوی سلسلۂ اسباب و علل کے تحت بحر کے مدوجزر (جوار بھاٹا) سے تعلق رکھتا ہے یعنی صورتحال یہ پیش آئی کہ جس وقت بنی اسرائیل نے قلزم و عبور کیا تھا اس وقت اس کا پانی سمٹا ہوا تھا اور پیچھے کو ہٹ کر اس نے جزر اختیار کر رکھا تھا فرعون نے جب بنی اسرائیل کو اس آسانی سے پار ہوتے دیکھا تو اس نے بھی اپنی لشکر کو داخل ہو جانے کا حکم دے دیا مگر بنی اسرائیل پار ہو چکے تھے اور فرعونی لشکر ابھی دریا کی خشکی پر چل ہی رہا تھا کہ اس کے مد و آگے بڑھنے کا وقت آ پہنچا اور فرعون اور اس کے لشکر کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ وہ آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے اور سب غرق ہو گئے۔

سید صاحب نے اپنے اس مزعومہ خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے عبور کے متعلق ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل نے قلزم کے شمالی دہانے پر جا کر اس کو عبور کیا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قرآن عزیز کی تشریحات اس کا قطعی انکار کرتی ہیں اور سید صاحب کی بات کسی طرح بنائے نہیں بنتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ نقشہ پر نظر ڈالیں جہاں بحر احمر واقع ہے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ دراصل بحر عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمین عرب واقع ہے اور مغرب میں مصر، شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں ایک شاخ خلیج عقبہ جزیرہ نمائے سینا کے مغرب میں اور دوسری خلیج سویز اس کے مغرب میں واقع ہے یہ دوسری شاخ پہلی سے بڑی ہے اور شمال میں بڑی دور تک چلی گئی ہے بنی اسرائیل اسی کے درمیان سے گزرے ہیں اسی شاخ کے شمالی دہانہ کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے جس کا نام بحر روم ہے۔ قرآن کریم کی تمام تصریحات کو سامنے رکھیں تو وہ دو باتوں کو زیادہ صراحت سے بیان کرتا ہے ایک فلق یا فرقِ بحر یعنی دریا کا پھٹنا یا اس کا پھاڑ دینا اور دوسرے دونوں جانب پانی کا پہاڑ کی طرح کھڑا ہو جانا اور درمیان میں راستہ پیدا ہو جانا۔ عربی لغت میں فرق کے معنی دو ٹکڑے کر کے جدا کر دینے کے آتے ہیں اور فلق کے معنی بھی ٹکڑے کر دینا ہی ہے اور طود کے معنی بڑے پہاڑ کے ہیں ان معنوی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم کی آیات کو دیکھئے وہ کہتا ہے کہ ہم نے سمندر کو پھاڑا اور پانی دونوں طرف بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور درمیان میں راستہ نکل آیا اس سے تصور میں جو صورت حال بنتی ہے وہ اسی طرح ممکن ہے کہ بنی اسرائیل نے دریا کے ایسے حصے سے عبور کیا ہو جو دہانہ یا کنارے کے سامنے کا حصہ نہ ہو بلکہ پانی کا ایسا حصہ ہو جو درمیان سے پھٹ کر دو حصے بن سکتا ہو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ قرآن عزیز صاف صاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ بنی اسرائیل خشکی کے راستے سے قلزم کے دہانہ یا کنارے سے نہیں گزرے تھے بلکہ دریا کے کسی درمیانی حصہ کو عبور کر کے میدان سینا میں پہنچے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ مدوجزر طولانی حصہ میں دہانہ کی جانب ہوا کرتا ہے عرض میں اس طرح کبھی بھی نہیں ہوتا کہ پانی دونوں جانب سمٹ جائے اور بیچ میں خشکی کی راہ پیدا ہو جائے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان معجزہ کا انکار کرتے ہوئے اس کو روزمرہ کے مادی اسباب کے نیچے لانے کی سعی کرنا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف اور اس کی تحریف کے مترادف ہے۔

Marfat.com

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور آل فرعون جیسے جرائم پیشہ لوگوں کو ان کے جرائم کی سزا دی کہ انہیں سمندر میں غرق کر دیا اور یہ سزا ان کو اس لئے نہیں دی کہ پروردگار اپنے بندوں کیلئے ظالم ہے بلکہ اس لئے دی کہ انہوں نے نہ صرف پیغمبر کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا بلکہ اللہ کے ایک سے ایک بڑے نشان کو دیکھا' ایک سے ایک بڑھ کر عذاب ان پر آیا اور ان میں سے ہر عذاب اپنے منہ سے بول رہا تھا کہ میں اللہ کی قدرت کا ظہور ہوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کی دلیل ہوں لیکن ان ظالموں نے کسی سے بھی سبق سیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ ہر ایک کا مذاق اڑایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر سمجھنے کی بجائے ہمیشہ جادوگر سمجھا۔ ایسے لوگوں کا انجام اس سے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اللہ کی زمین کو ان سے خالی کرا دیا جائے۔ چنانچہ ان کو مٹا دینے کے بعد اللہ نے ان لوگوں کو زمین پر اقتدار عطا فرمایا جس کے ساتھ انہوں نے آج تک ظالمانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی کا تذکرہ فرمایا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ○

"اور جو لوگ دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث ٹھہرایا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی ساری تعمیرات اور ان کے سارے باغ و چمن ملیامیٹ کر دیئے"۔ 137

اس آیت کریمہ کے ایک ایک جملے پر غور کرنے کی ضرورت ہے سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ ہم نے ان کو وارث بنایا۔ وارث بنانے کا لفظ اشارہ کرتا ہے کہ جو قوم اس سے پہلے تھی ان کو ان کے منصب اور ان کی سرزمین سے محروم کیا گیا اور انہیں ان کی جگہ دی گئی اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کو ان کی سرزمین سے محروم کیا گیا ان کی محرومی کی وجہ کیا تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کی وجہ وہ ظلم تھا جس سے انہوں نے ان لوگوں کو اس طرح دبا رکھا تھا کہ سیاسی طور پر انہیں سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا گیا تھا' مذہبی طور پر یہ اس طرح کی پابندیوں کا شکار تھے کہ آزادانہ اپنے مذہب پر عمل کرنا تو دور کی بات تھی توحید پرست ہوتے ہوئے بھی وہ فرعون کے بتوں کی پرستش کرنے پر مجبور تھے اور زندگی کے وہی طور اطوار انہیں لازماً اختیار کرنے پڑتے تھے جس پر قوم فرعون عمل پیرا تھی۔ جہاں تک تہذیب اور تمدن کا تعلق ہے اس قوم کی اپنی کوئی تہذیب باقی نہیں رہی تھی کیونکہ تہذیب اس قوم کی باقی رہتی ہے جس کا مذہب' جس کی سوچ' جس کے فکری ادارے اور جس کے اجتماعی سرچشمے محفوظ ہوں۔ فرعون کے مظالم نے بنی اسرائیل کے پاس چونکہ کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا اس لئے یہ قوم تہذیب و تمدن سے بھی بہت حد تک عاری ہو چکی تھی۔ اولوالعزمی اور بلند ہمتی کا ان میں دور دور تک اس لئے نشان باقی نہیں رہ گیا تھا کیونکہ فرعون اور آل فرعون کی غلامی نے بری طرح ان کو پامال کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ تھی وہ ایک مجمل سی تصویر جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ فرعونیوں نے بنی اسرائیل کو اس طرح دبا کے رکھا ہوا تھا کہ وہ کسی طرح بھی ایک قوم کہلانے کے حقدار نہیں رہے تھے تو جن لوگوں کا ظلم اس انتہاء تک پہنچ جائے وہ اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں زمین پر زندہ چھوڑا جائے اس لئے انہیں مٹا دیا گیا اور بنی اسرائیل کو سر اٹھا کر چلنے کا موقع عطا فرمایا گیا۔ دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ جن لوگوں کو دبایا گیا تھا انہیں ہم نے زمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا اور آگے چل کر وارث بنائے جانے کی وجہ بھی بیان فرمائی وہ ہے بِمَا صَبَرُوْا اس سبب سے کہ انہوں نے صبر دکھایا۔ یعنی فرعونی تو اپنی ظالمانہ روش کے باعث تباہ ہوئے کیونکہ ظلم کا انجام ہمیشہ یہی ہوتا ہے لیکن

Marfat.com

بنی اسرائیل کا مظلوم طبقہ اس وقت سرفراز ہوا جب انہوں نے اپنی مظلومیت پر اکتفا کرنے سے انکار کر دیا اور وہ صبر کی قوت سے سرشار ہو کر اللہ کے پیغمبر کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے صحرا کی کلفتوں اور زندگی کی سنگینیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یعنی وہ خوب جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینا آسان کام نہیں۔ ہوسکتا ہے فرعونیوں سے مقابلے کی نوبت آجائے اور اگر بچ کے نکل بھی گئے تو جہاں ہم جانا چاہتے ہیں وہ سرزمین ہمارے انتظار میں تو نہیں وہاں بھی فرعون جیسے لوگ بستے ہیں اس لئے جب تک ان سے وہ زمین خالی نہیں کروائی جائے گی اس وقت تک ہم اس سرزمین میں داخل نہیں ہوسکیں گے اور مزید یہ بات بھی کہ صحرائی زندگی شہری زندگی کے مقابلے میں ایک نہایت تلخ زندگی ہے۔ شہروں میں پلے ہوئے لوگ اس کا تصور کرنے کی بھی ہمت نہیں کرسکتے لیکن جب اس قوم نے ایسے تلخ فیصلے کرنے کی ہمت کرلی اور جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے وہاں جب سرفرازی کا راستہ ان کے سامنے کھولا گیا تو پھر جب اس قوم کے بڑوں نے کمزوری دکھائی تو ان کو تو اسی صحرا میں مرنے کیلئے چھوڑ دیا گیا وہ چالیس سال تک یہیں سرگرداں رہ کر موت کا شکار ہوئے لیکن کامیابیوں کی منزل انہیں نصیب ہوئی جنہوں نے اسی صحرا میں زندگی کا سفر شروع کیا تھا' پہاڑوں کی بلندیوں میں آنکھیں کھولی تھیں' بلند ارادی کی تربیت پائی تھی اور ہر طرح کی صعوبت پر صبر کیا تھا تو بالآخر اللہ نے یوشع علیہ السلام کی راہنمائی میں انہیں فلسطین کی منزل عطا فرمائی اس سے ہمیں سبق یہ ملتا ہے کہ ظلم کی رات زیادہ دراز نہیں ہوتی لیکن ظلم کے مقابلے میں سر اٹھانے کا موقع انہیں ملتا ہے جو ظلم کی دیواروں سے سر ٹکرانے کی ہمت رکھتے ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ یہ راستہ دشوار ضرور ہے لیکن اس پر چلنے والے اگر کسی کمزوری کا شکار نہ ہوں تو کبھی نامرادی سے دوچار نہیں ہوتے۔

اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو جو دبا کے رکھے گئے تھے ان کو زمین کا وارث بنا دیا۔ بعض اہل تاویل نے یہ سمجھا کہ اس زمین سے مراد سرزمین مصر ہے کہ فرعون اور آل فرعون کی تباہی کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مصر کا اقتدار عطا فرمایا لیکن یہ بات نہ قرآن کریم سے ثابت ہوتی ہے اور نہ تاریخ اس کی تائید کرتی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ آخر وہ زمین کون سی ہے؟ اس آیت کریمہ میں اس کا جواب موجود ہے اس میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان کو اس سرزمین کا وارث بنایا جس کو ہم نے برکت دے رکھی تھی۔ قرآن کریم نے اور بھی بعض جگہ اسی سرزمین کو ارض مقدسہ اور برکت والی زمین کے نام سے یاد فرمایا ہے تمام اہل علم کے نزدیک ارض مقدسہ یا برکت والی زمین فلسطین کی سرزمین ہے یہاں اس زمین کی صفت لا کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ تمہیں ہم نے جس زمین کا وارث بنایا ہے وہ یہ سرزمین مصر نہیں کیونکہ یہاں سے تو تم کو ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا یہاں کا وارث کسی اور مظلوم قوم کو بنایا جائے گا تمہیں تو ہم اس سرزمین میں لے جانا چاہتے ہیں جس کا وعدہ تمہارے آباؤ اجداد سے کیا گیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بھی بنی اسرائیل کے ساتھ اس سرزمین کا وعدہ فرمایا گیا تھا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اُسی سرزمین پر اقتدار دینا مقصود تھا۔ رہی یہ بات کہ اس سرزمین کو برکت والی سرزمین کیوں کہا گیا ہے تو حقیقت کا علم تو اللہ کو ہے لیکن بظاہر اس کا سبب دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ فلسطین کی سرزمین وہ سرزمین ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کے نجانے کتنے مقرب بندے اور اس کے پیغمبر اور رسول آرام فرما ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام یہیں مدفون ہیں۔ اس کے علاوہ بھی فلسطین اور اس کے گردونواح میں بہت سارے انبیاء استراحت فرما رہے ہیں۔ جہاں کوئی اللہ کا نبی مدفون ہوتا ہے وہاں اللہ کی طرف سے رحمتیں اور برکتیں برستی ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے یہی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تک اللہ کے دین کی دعوت کا مرکز رہی ہے یہیں سے ہمیشہ توحید کی دعوت بلند ہوئی' اسی کو مرکز بنا کر پوری زمین تک اللہ کا پیغام پہنچا' اس سرزمین کو ہمیشہ مرکز دعوت ہونے کا شرف حاصل رہا اور پھر آگے چل کر اسی کے

Marfat.com

پہلو میں اللہ کا گھر تعمیر ہوا۔ چنانچہ یہی وہ برکتیں اور نسبتیں ہیں جس کی وجہ سے اس سرزمین کو تقدیس حاصل ہے۔ اب بنی اسرائیل کو اسی کا وارث بنایا جا رہا تھا ان کے سامنے ایک منزل کھول دی گئی تھی اور یہ ان کی ہمت کیلئے چیلنج تھا کہ کب وہ اپنے دست و بازو کی ہمت سے اس منزل کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کو یہ سرزمین عطا فرما کر اللہ نے اپنے وہ خوبصورت اور مقدس وعدے پورے فرما دیئے جو بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد سے کئے گئے تھے اور ساتھ ہی ان انعامات اور تاریخی نتائج کو سمیٹتے ہوئے فرمایا کہ ایک طرف تو ہم نے بنی اسرائیل جیسی مقہور اور مظلوم قوم کیلئے عزت اور سرفرازی کا راستہ کھولا اور دوسری طرف وہ قوم جنہیں اپنی قوت و شوکت اور اقتدار کا بہت زعم تھا انہیں ہم نے مٹا کر عبرت بنا دیا اور ان کی یادگاریں جو باغ و چمن اور عمارتوں کی شکل میں وہ چھوڑ گئے تھے ان میں سے ہم نے ایک ایک چیز کو ملیامیٹ کر دیا۔ ان کے باغات تو پہلے ہی مختلف عذابوں کی وجہ سے تباہ ہو چکے تھے لیکن فرعون نے بنی اسرائیل سے بیگار لے کر جو بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کر رکھی تھیں وہ بھی شاید کسی زلزلے کے نتیجے میں تباہ و برباد کر دی گئیں۔

یہاں تک تو بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہوا ہے جو مصر اور فرعون سے تعلق رکھتا ہے لیکن اگلی آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ حصہ بیان ہو رہا ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر لینے کے بعد کا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا کہ ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ جس طرح ان کے دیوتا ہیں اسی طرح کا ایک دیوتا تم ہمارے لئے بھی بنا دو' موسیٰ نے کہا تم بڑے ہی جاہل لوگ ہو۔ ان لوگوں کا یہ سب کچھ جس میں یہ لگے ہوئے ہیں برباد ہونے والا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں نابود ہو کر رہے گا“۔ 138-139

اس آیت کریمہ کے پہلے جملے پر غور فرمایئے! پروردگار کس شفقت اور پیار سے فرما رہے ہیں کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا یعنی اس طرح انہیں سمندر کے پار اتارا جس طرح پالکی اٹھانے والے کسی دلہن کو نہایت احترام اور آرام کے ساتھ کسی جگہ پہنچاتے ہیں۔ سمندر سرکش موجوں اور بپھرے ہوئے بھنوروں کا نام ہے جس کا تصور ہی کپکپا دینے کیلئے کافی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں جس سہولت کے ساتھ سمندر کے پار اتارا وہ اس کے کمال شفقت اور کرم نوازی کی دلیل ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا اثر بنی اسرائیل پر بھی یہی ہوا اسی لئے وہ خوشی میں سرشار ہو کر مسرت کے ترانے بجانے لگے۔ تورات میں ہے کہ جب بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ بحر قلزم کو پار کر گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے فرعون اور اس کی فوج کو غرق ہوتے اور پھر ان کی نعشوں کو ساحل پر تیرتے دیکھ لیا تو بتقاضائے فطرت بے حد مسرت اور خوشی کا اظہار کیا اور عورتوں نے خصوصیت کے ساتھ دف پر خوشی کے گیت گائے اور شادمانی اور خوش کامی کا ثبوت دیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو جمع کر کے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنی قوم سے کہو کہ وہ میں ہوں جس نے تم کو اس زبردست فتنہ سے نجات دی۔ سو میرا شکر ادا کرو اور میری ہی بندگی کرو۔ چنانچہ اللہ کا یہ فرمان بنی اسرائیل کو پہنچانے کے بعد موسیٰ علیہ السلام انہیں ساتھ لے کر جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ جنوب کے علاقے میں موجودہ شہر طور اور ابوزنیمہ کے درمیان تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں جن سے اہل مصر بہت فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کانوں کی حفاظت کیلئے مصریوں

Marfat.com

نے چند مقامات پر چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انہی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی مفقہ کے مقام پر جہاں مصریوں کا ایک بڑا بت خانہ تھا جس کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوبی مغربی علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اسکے قریب ایک اور مقام بھی تھا جہاں قدیم زمانے سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بت خانہ تھا۔ غالباً انہی مقامات میں سے کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل کو ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اس بت کدے میں ایک بہت بڑی تعداد میں لوگ بتوں کی پوجا میں بری طرح مشغول ہیں تو وہ دفعتاً اللہ کی ساری عنایات اور تجلیات جنہیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے بھول گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دو تاکہ ہم اسی طرح ان کی پرستش کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ان کا یہ مشرکانہ مطالبہ سنا تو بے حد ناراض ہوئے۔ بری طرح ڈانٹا' عار دلائی اور ملامت کرتے ہوئے کہا کہ بدبختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا پر مائل ہو رہے ہو اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے ہو جن کا مشاہدہ تم اپنی آنکھوں سے کر چکے ہو۔

قوموں کی حیاتِ اجتماعی کے بعض جھول:

قوموں کی حیاتِ اجتماعی میں بعض ایسے جھول دکھائی دیتے ہیں جن کی کوئی تاویل یا توجیہ کرنا بعض دفعہ ممکن نہیں ہوتا۔ بنی اسرائیل ہی کو دیکھ لیجئے وہ تقریباً ساڑھے چار سو برسوں سے مصر کے قاہر و جابر بادشاہوں اور مصری قوم کے ہاتھوں میں غلام اور مظلوم چلے آ رہے تھے اور غالب قوم کے سخت سے سخت مصائب و مظالم کا شکار بنے ہوئے تھے کہ اچانک ان جیسی مردہ قوم میں بجلی کی کڑک اور آفتاب کی چمک کی طرح ایک برگزیدہ ہستی سامنے آتی ہے اور اس کی صدائے حق اور اعلان ہدایت سے تمام قلمرو باطل لرزہ براندام ہو جاتی ہے اور ایوان ظلم و کفر میں بھونچال آ جاتا ہے وہ دنیا کی ایک زبردست متمدن طاقت کے مقابلے میں یہ اعلان کرتی ہے کہ میں خدائے واحد کا رسول اور ایلچی ہوں اور تجھے ہدایت کی پیروی اور مظلوم قوم کی آزادی کا پیغام سنانے آیا ہوں۔ فرعون کی طاقت اپنے تمام مادی اسباب کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہے مگر ہر مرتبہ شکست کا منہ دیکھتی ہے اور آخری بازی میں حق کی کامیابی اور باطل کی ہلاکت کا ایسا حیرت زا نقشہ سامنے آتا ہے کہ مادی طاقت قلزم میں غرق ہو جاتی ہے اور غلام و مظلوم قوم دنیوی اسباب و وسائل سے محروم آزادی کے گیت گاتی نظر آتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہی قوم جو ان تمام معرکہ ہائے حق و باطل کو آنکھوں سے دیکھ چکی ہے وہ آج موسیٰ علیہ السلام سے پہلا مطالبہ یہ کرتی ہے کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے جس طرح کہ یہ پجاری بت خانے میں بیٹھے پوج رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ بنی اسرائیل نبیوں کی اولاد تھے اور ابھی تک ان میں وہ اثرات ایک حد تک باقی بھی تھے جو ان کو باپ دادا سے ورثہ میں ملے تھے تاہم صدیوں سے مصری بت پرستوں میں بود و باش رکھنے اور ان کے حاکمانہ اقتدار میں غلام رہنے کی وجہ سے ان میں صنم پرستی کا جذبہ اس حد تک سرایت کر چکا تھا کہ مصر سے نکل آنے کے ستر برس بعد بھی اسے پوری طرح ختم نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اول حضرت یوشع بن نون اپنی آخری تقریر میں بنی اسرائیل کے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''تم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت کے ساتھ اس کی پرستش کرو اور ان دیوتاؤں کو دور کر دو جن کی پرستش تمہارے باپ دادا بڑے دریا کے پار اور مصر میں کرتے تھے اور خداوند کی پرستش کرو اور اگر خداوند کی پرستش تم کو بری معلوم ہوتی ہے تو آج ہی تم اسے جس کی پرستش کرو گے چن لو'' (یشوع باب ۲۴: ۱۴-۱۵)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چالیس سال تک حضرت موسیٰ کی اور اٹھائیس سال تک حضرت یوشع کی تربیت و راہنمائی میں زندگی بسر کر لینے کے بعد بھی یہ قوم اپنے اندر سے ان اثرات کو نہ نکال سکی جو فراعنہ مصر کی بندگی کے دور میں اس کی رگ رگ کے اندر اتر گئے تھے۔ پھر بھلا کیونکر ممکن تھا کہ مصر

Marfat.com

سے نکلنے کے بعد فوراً ہی جو بت کدہ سامنے آ گیا تھا اس کو دیکھ کر ان بگڑے ہوئے مسلمانوں میں سے بہتوں کی پیشانیاں اس آستانے پر سجدہ کرنے کیلئے بے تاب نہ ہو جاتیں جس پر وہ اپنے سابق آقاؤں کو ماتھا رگڑتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ تم بڑے ہی بے عقل، وہمی اور جذباتی ہو تمہیں اللہ تعالیٰ نے ایک زندگی بخش پیغام کی صورت میں آب حیات عطا کیا ہے لیکن تم اسے نظر انداز کر کے بتوں کی پرستش کرنا چاہتے ہو حالانکہ بتوں کی پرستش ایک فریب نظر اور طلسم باطل کے سوا کچھ نہیں۔ یہ سب کچھ خدا کے ہاں برباد اور پامال ہو جائے گا لیکن جو ہدایت و شریعت تمہیں ملی ہے اس کے نتیجے میں تمہیں یہاں بھی سرفرازیاں ملیں گی اور آخرت میں بھی سرخرو ٹھہرو گے لیکن تمہاری جہالت کی کیا انتہا ہے کہ تم اپنے لئے تباہی کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو۔ پھر اللہ کے احسانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرانی کے انداز میں فرماتے ہیں:

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ O وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ O

''اس نے کہا کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں، درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تم کو اہل عالم پر فضیلت بخشی۔ اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات دی جو تمہیں نہایت برے عذاب چکھاتے تھے وہ تمہارے بیٹوں کو بے دردی سے قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی ہی آزمائش تھی''۔ 141-140

موسیٰ علیہ السلام نے جیسا کہ عرض کیا گیا حیرت کے انداز میں فرمایا کہ کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں جبکہ تم اچھی طرح جانتے ہو اور تمہاری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں فرعون کو معبود ہونے کا دعویٰ تھا اور جابجا اس کے مجسموں کو معبودوں کی طرح پوجا جاتا تھا لیکن کیا اس کا معبود ہونے کا دعویٰ اور قوم کی طرف سے اس کی پوجا پاٹ انہیں تباہی سے بچا سکی نہ وہ معبود باقی رہا نہ اس کے پوجا کرنے والے۔ تم اپنی آنکھوں سے ایک معبود کا انجام دیکھ چکے ہو اور پھر یہ کیسا اندھا پن ہے کہ تم پھر مجھ سے ایک معبود بنانے کا مطالبہ کر رہے ہو۔ اگر اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو کیا مصریوں پر اسی طرح کبھی طوفان، کبھی ٹڈی دل، کبھی مینڈک اور کبھی خون کا عذاب آتا۔ دنیا کا سب سے بڑا متمدن ملک جس گمراہی کے سبب تباہی کو تمہارے سامنے پہنچ چکا تم وہی تباہی کا راستہ اپنے لئے اختیار کرنا چاہتے ہو اور مزید ستم یہ کہ مصر میں تم بدترین غلامی کی زندگی گزار رہے تھے تم پیغمبروں کی اولاد ہو کر بھی بدترین تذلیل کا شکار تھے۔ ایک مدت دراز سے ذلت اور نکبت تمہارا مقدر بن چکا تھا۔ اللہ نے ذلت کی اس دلدل سے تمہیں نکالا اور تمہیں دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کر دیا اب نہ صرف کہ تم اس پیغام حیات کے وارث ہو جسے میں لے کر آیا ہوں۔ بلکہ پوری دنیا تک تمہی نے اسے پہنچانا بھی ہے یعنی تمہاری آج حیثیت ایک غلام قوم کی نہیں بلکہ دنیا کی امام اور قائد قوم کی ہے تو کیا قائد ایسے ہوتے ہیں کہ جہاں کہیں کوئی بت خانہ نظر آیا تو اپنا سب کچھ بھول کر گمراہی میں ڈوب گئے۔ خدا کیلئے اپنی حالت پر غور کرو اور کچھ نہیں تو اپنے ان زخموں کو تو نہ بھولو جو ابھی تک مندمل نہیں ہوئے کہ تمہارے ساتھ فرعونی کیسا بدترین سلوک کرتے تھے، کیسے برے عذاب کے شکنجے میں تمہیں جکڑا جاتا تھا، تمہارے بیٹوں کو قتل کیا جاتا اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھا جاتا تھا۔ ایک طرف تمہارا دل خون ہوتا تھا اور دوسری طرف غیرت پامال ہوتی تھی۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم پر برے دن نہیں آئے ہوں گے۔ اللہ نے تم پر احسان کیا کہ تمہیں اس عذاب سے نکالا اور دنیا کی سیادت و قیادت کے منصب پر فائز کر دیا تم اور کچھ نہیں تو کم از کم ان زخموں ہی کو یاد رکھو پھر شاید تمہیں اللہ کے احسانات یاد آئیں اور تم اس کی عظمت و کبریائی کے سامنے ہمیشہ کیلئے سر جھکا دو۔

Marfat.com

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا
بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ
هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٤٢﴾
وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ
اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ
مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا
وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ
وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٤٣﴾ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى
النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ
الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً
وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا
بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ
الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ
اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ
سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ

Marfat.com

بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الۡاٰخِرَةِ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ‌ؕ هَلۡ يُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۷﴾

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا میری قوم میں میری جانشینی کرنا' اصلاح کرتے رہنا اور مفسدوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔ اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ سکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا پھر جب ہوش میں آیا بولا تو پاک ہے میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔ فرمایا: اے موسیٰ! میں نے تم کو لوگوں پر اپنے پیغام اور اپنے کلام سے برگزیدہ کیا تو میں نے جو کچھ تم کو دیا اس کو لو اور شکر گزاروں میں سے بنو۔ اور ہم نے اس کیلئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی پس اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو ہدایت کرو کہ اس کے بہتر طریقہ کو اپنائیں میں تم کو عنقریب نافرمانوں کا ٹھکانا دکھاؤں گا۔ میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پرواہی کرتے رہے' ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں۔

............☆......☆......☆............

تمہید:

بنی اسرائیل بحر قلزم کو عبور کرنے کے بعد جب صحرائے سینا میں داخل ہوئے تو ان کا رخ کوہ سینا کی طرف تھا بڑھتے بڑھتے جب وہاں پہنچے جو موجودہ نقشہ میں نبی صالح اور کوہ سینا کے درمیان وادی الشیخ کے نام سے موسوم ہے اور جو آج کل میدان الراحہ کہلاتا ہے۔ اس وادی کے ایک سرے پر وہ

Marfat.com

پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام ثمود کے علاقے سے ہجرت کر کے تشریف لے آئے تھے آج وہاں ان کی یادگار کے طور پر ایک مسجد بنی ہوئی ہے دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبل ہارون نام سے موسوم ہے تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے اور جس کی بلندی سات ہزار تین سو انسٹھ فیٹ ہے اس پہاڑ کی چوٹی پر آج تک وہ کھوہ زیارت گاہ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چلہ کیا تھا اس میدان الراحہ میں بنی اسرائیل موجود تھے جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کیلئے کوہ طور پر بلایا اور قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکلے ابھی صرف تین ماہ گزر رہے تھے چنانچہ اتنی مختصر مدت کے بعد جیسے ہی ان کو صحرا میں نسبتاً پرسکون ماحول میسر آیا اور وہ غلامانہ زندگی سے نکل کر اب اس قابل ہوئے کہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتے ہیں اور جس طریق زندگی اور زندگی کی راہنمائی کو قبول کرنا چاہیں اس کیلئے ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں اب وہ نہ صرف کہ فیصلے کرنے میں آزاد ہیں بلکہ ایک ایسی ریاست کا نظام بھی چلا سکتے ہیں جس میں صرف اللہ ہی کی بندگی کارفرما ہو اور اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت پر مجبور نہ کیا جائے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے خود ضرورت محسوس کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گزارش کی کہ آپ مصر میں ہم سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تمہیں مصر کی غلامی سے آزادی نصیب ہوگی تو تمہیں آزادانہ زندگی گزارنے کیلئے اللہ تعالیٰ کتاب عطا فرمائیں گے جس میں تمہارے انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے راہنمائی ہوگی چنانچہ اب اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ ہمیں وہ راہنمائی اور شریعت کتاب کی صورت میں عطا فرمائیں۔ چنانچہ اگلی آیات کریمہ میں اسی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان آیات کو پڑھیں چند باتیں ایسی ہیں جن پر توجہ دینا ازبس ضروری ہے سب سے پہلی بات یہ کہ جب بھی کبھی کوئی قوم اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوتی ہے تو یقیناً وہ اپنے وطن سے خالی ہاتھ نکلتی ہے زندگی کے وسائل کے حوالے سے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا اگر اسے نیا وطن نصیب ہو جائے تو اس کی سب سے پہلی ضرورت اس کی آبادکاری' اس کیلئے وسائل کی فراہمی اور زندگی کی ضروریات کا مہیا کرنا ہوتا ہے اور پھر آگے چل کر جیسے جیسے یہ ضرورتیں پھیلتی جاتی ہیں ان کی فکر دامن گیر ہوتی جاتی ہے اور بچوں کے مستقبل کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے پھر ان ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے اداروں کے وجود کو سب سے ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن ہمیں یہاں یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ اسرائیلی روایات کے مطابق چھ لاکھ افراد پر مشتمل یہ بنی اسرائیل کی قوم صحرا میں پڑی ہے جس میں رہنے کیلئے کوئی گھر نہیں زندگی کے وسائل بالکل نایاب اور زندگی کی ضروریات روز بروز افزوں تر۔ بایں ہمہ! ان میں سے اگر کھانے پینے کا مطالبہ ہوتا ہے تو چند چشموں کے اجراء اور من و سلویٰ کے نزول سے پورا کر دیا جاتا ہے اور موسم کی تمازت سے بچنے کیلئے سر پر بادلوں کا سائبان تان دیا جاتا ہے۔ بس اتنی سی ضروریات کی فراہمی کے بعد بنی اسرائیل کی طرف سے اگر کوئی مطالبہ ہوتا ہے تو وہ یہ کہ ہمیں اللہ کی کتاب چاہیے۔ اللہ سے ہمیں کتاب آئین لے کر دیں تاکہ ہم اس کی راہنمائی میں اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کیلئے زندگی گزار سکیں۔ اور یہ صرف ان کا مطالبہ نہیں بلکہ مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل تربیت اور تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ تمہاری اصل ضرورت تمہاری سیرت و کردار کی تعمیر ہے اور وہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک تمہیں تعمیر سیرت کا پروگرام مہیا نہ کیا جائے۔ اس سے ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ قومیں وسائل سے زندہ ضرور رہتی ہیں لیکن قوموں کی تشکیل ان کے مقاصد کا حصول اور ان کی سیرت و کردار کی تعمیر وہ وسائل سے نہیں ہوتی بلکہ وہ اللہ کی راہنمائی میں زندگی گزارنے اور اسی کے مطابق مسلسل تعلیم و تربیت سے ہوتی ہے اس لئے جو قوم بھی معنوی اور اخلاقی زندگی کی ضرورت محسوس کرتی ہے اس کا سب سے پہلے فرض یہ ہے کہ قوم اگر مکان میسر نہ ہوں تو خیمے لگا دیئے جائیں اگر پرتکلف ضروریات بہم نہ ہو سکیں تو سادہ سے سادہ زندگی پر کفایت کر لی جائے اور کم سے کم ضروریات اکتفا کرنے کا ذوق پیدا کیا جائے لیکن جہاں تک سیرت و کردار کی تعمیر کا تعلق ہے اس میں کسی طرح کا تساہل بھی ممکن نہیں۔ جیسے ہی زندگی کے معمو

Marfat.com

امکانات مہیا ہو جائیں تو سب سے پہلے اسی بات کی طرف توجہ دی جائے تاکہ قوم کی شیرازہ بندی ہو سکے' ایک مہذب انسان مہذب معاشرہ' مہذب سوسائٹی اور مہذب ریاست اور حکومت وجود میں آئے یہ ضرورت اگر پوری ہو جائے تو باقی ضرورتیں نہ صرف کہ تیزی سے پوری ہو جاتی ہیں بلکہ اس طرح پوری ہوتی ہیں کہ ہر ایک شخص دوسرے شخص کی ضرورت پورا کرنے میں لگ جاتا ہے اگر افراد سازی کا کام نہ کیا جائے اور تعمیر سیرت کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر قوم' قوم نہیں رہتی انسانوں کی بھیڑ بن جاتی ہے اور وسائل کی فراہمی میں سب سے بڑی رکاوٹ خود اس ملک کے رہنے والوں کی خود غرضی اور حد سے بڑھی ہوئی ہوس بن جاتی ہے ملک میں وسائل ہوں گے لیکن حسن کردار سے محروم لوگ اسے اپنی ذات کیلئے سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔ قوی' قوی تر ہوتا جائے گا اور کمزور' کمزور تر۔ رفتہ رفتہ یہ قوم طبقات میں تقسیم ہو جائے گی اور پھر خدانخواستہ اگر اس قوم کو کسی افتاد یا حادثے سے دوچار ہونا پڑے تو یہ ریت کا ایک انبار ثابت ہوگی۔

ہمارے لئے لمحہ فکریہ:

پاکستان بھی بنی اسرائیل ہی کی طرح غلامی کی ایک طویل رات سے آزاد ہونے کے بعد وجود میں آیا تھا اور ہندوستان سے ہجرت کرنے والے ہر فرد کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اب تم جس پاکستان میں جا رہے ہو وہ تمہارے لئے ایک ایسا خوبصورت ملک ہوگا جس میں ممکن ہے کہ وسائل میں کمی ہو لیکن محبت' خیر خواہی' انسان دوستی' اللہ کا خوف جیسی اقدار کی ایسی ہمہ ہمی ہوگی کہ تم ہزار مصیبتوں سے نکل کر جب وہاں پہنچو گے تو یوں محسوس کرو گے جیسے جنت میں پہنچ گئے ہیں وہاں کا ایک ایک فرد خود بھوکا رہ کر دوسرے کو کھلانے کی کوشش کرے گا' وہاں ملیں کپڑا بنیں گی تو وہ کپڑا ہر غریب اور امیر کی تن پوشی کے کام آئے گا وہاں کسی کو یہ گلہ کبھی نہیں ہوگا

ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں

وہاں کا ہر گھر' گھر سے محروم لوگوں کی پناہ گاہ ہوگا وہاں کی سڑکوں پر چلنے والے لوگ ایک دوسرے کی حفاظت کیلئے مستعد ہوں گے ایک روٹی کھانے والا بھی آدھی روٹی دوسرے کو دینے کیلئے بیتاب ہوگا' ہمیں یہ سراب دکھایا جاتا رہا لیکن جب ہم پاکستان میں آ گئے تو ہم یہ بات بھول گئے کہ اس سراب کو حقیقت بنانے کیلئے حسنِ کردار اور مضبوط سیرت کی ضرورت ہے اور وہ جس چیز سے وجود میں آتا ہے ہمیں سب سے پہلے اپنے وعدے کے مطابق اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے سبق سیکھتے ہوئے اسی کی فکر کرنی چاہئے لیکن ہم نے ہر چیز کی فکر کی بجز اس فکر کے جس میں ہماری بقا کی ضمانت تھی۔ نتیجہ سامنے ہے کہ آج ہم اپنے بکھیرے ہوئے کانٹوں کو پلکوں سے چننے میں لگے ہوئے ہیں لیکن وہ کانٹے ختم ہونے میں نہیں آتے۔ آج بھی یہ آیات کریمہ ہمیں اسی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ کاش! ہم آج بھی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہم نے 1948ء کی اسمبلی سے جو دھوکہ دینا شروع کیا تھا اور جس طرح ہم نے ہر موقع پر اس ریاست کے جواز کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اگر ہم نے اس رویے کو نہ بدلا تو اللہ بہتر جانتا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

دوسری بات جو ان آیات سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کیلئے کوہ طور پر طلب فرمایا لیکن اس سے پہلے چالیس دن تک انہیں اعتکاف میں رکھا گیا اور ان سے روزے رکھوائے گئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا دستور نامہ (تورات) بنی اسرائیل کی راہنمائی کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ آپ سے چالیس دن تک ایک لمبی مشقت لی جائے لیکن ہم جب دوسری کتابوں کے نزول کی تاریخ پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت نہیں بلکہ جب بھی کسی پیغمبر کو

Marfat.com

اللہ نے کتاب عطا فرمائی ہے تو پہلے اس پیغمبر کو اسی تربیت سے گزارا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہاڑی پر اعتکاف کرنا پڑا۔ ہمارے رسول پاک ﷺ حرا کی تنہائیوں میں مسلسل عبادت میں مصروف رہے۔ دن کو روزے سے رہتے رات کو اللہ سے لو لگائے بیٹھے رہتے۔ دنیا کی بے ثباتی' اپنی ذات کی دریافت' مخلوقِ خدا کی اصلاح اور نجانے کتنے سوالات بار بار دل میں اٹھتے رہے اور مسلسل اللہ کی طرف توجہ سمٹتی گئی۔ جب تربیت کا یہ عمل اپنی انتہا کو پہنچا تو تب آپ کی زبان مبارک پر قرآن پاک کا نغمہ سرمدی جاری ہوا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنا کلام نازل فرماتے ہیں اور زندگی کی راہنمائی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں تو اس کے تحمل اور قبولیت کی استعداد کو پہلے پیدا فرماتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں وہ نبوت سے پہلے بھی نخلِ فطرت کا سب سے خوبصورت ثمر ہوتے ہیں انہیں یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ کے احکام کیا ہیں لیکن اپنے گردوپیش میں پھیلے ہوئے تمام منکرات سے وہ فطرت کی راہنمائی میں ہر طرح سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے باوجود انہیں فوراً کتاب عطا نہیں فرمادی جاتی بلکہ مسلسل روزے اور اعتکاف کی تربیت سے ان کے دل و دماغ اور ان کی اندرونی قوتوں کو اتنا پاکیزہ اور اتنا مستعد بنادیا جاتا ہے جن سے ان کے اندر کلامِ خداوندی کے برداشت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کوئی اللہ کے کلام اور اس کی کتاب سے استفادہ کرنا چاہے گا تو اسے حتی المقدور اپنی فطرت' اپنی طبیعت اور اپنے احساسات کو پاکیزہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اللہ کے کلام سے موافقت پیدا کرسکے۔ جب اس کے انوار اس کے دل پر اتریں تو جس طرح آئینہ روشنی کو سمیٹتا ہے وہ فوراً ان انوار کو جذب کرسکے اور جس طرح صاف سلیٹ پر عبارت لکھی جاسکتی ہے اسی طرح قرآنِ پاک کی ایک ایک ہدایت اس کے لوح قلب پر کندہ کی جاسکے اور اگر ایسا ہو کہ قرآنِ کریم جن بنیادی تصورات اور بنیادی ہدایات کو زندگی کی تطہیر کیلئے عطا فرماتا ہے' دل و دماغ اسے قبول کرنے کی بجائے شک وارتیاب کی دیواریں کھڑی کردے وہ کردار و عمل کی جس عمارت کو استوار کرنا چاہتا ہے بے عملی کے غار اور بداطواری کے خودرو پودے اسے جگہ بنانے کا موقع ہی نہ دیں تو اللہ کی کتاب کو پڑھنے کے باوجود بھی آدمی اس کی ہدایت سے محروم رہتا ہے چنانچہ یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے ضمن میں ہمیں یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ لوگو! تمہاری سیرت سازی کا کام تمہاری انفرادی زندگی کی تعمیر' تمہاری اجتماعی زندگی کی استواری صرف اللہ کی کتاب کی راہنمائی سے ممکن ہے لیکن یہ دیکھنا کہ تمہارے تعلیمی ادارے تمہارے ذرائع ابلاغ اور تمہاری معاشرتی روایات اس راستے میں رکاوٹ نہ بننے پائیں تم جب تک قرآن پاک سے استفادہ کیلئے پہلے ان کی اصلاح کی فکر نہیں کروگے اس وقت تک اللہ کی کتاب سے استفادہ کرنا اور اس کی راہنمائی سے فیض پانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ ان دونوں بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھ کر آنے والی آیات کریمہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ج وَ قَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ O

''اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس مزید راتوں سے تو اس کے رب کی مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا میری قوم میں میری جانشینی کرنا' اصلاح کرتے رہنا اور مفسدوں کی روش کی پیروی نہ کرنا''۔ 142

واعدنا کا مفہوم:

اس آیت کریمہ کا پہلا لفظ ﴿وٰعَدْنَا﴾ وعدہ سے مشتق ہے اور وعدہ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کو نفع پہنچانے سے پہلے اس کا اظہار کردینا کہ ہم تمہارے فلاں کام کریں گے اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر اپنا کلام نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس کیلئے شرط لگائی کہ تیس راتیں کوہ طور پر اعتکاف

Marfat.com

ذکراللہ میں گزارو اور پھران تیس پراور دس راتوں کا اضافہ کر کے چالیس کر دیا۔لفظ ﴿وٰعَدْنَا﴾ کے اصلی معنی دوطرف سے وعدے اور معاہدے کے آتے ہیں۔یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاءِ تورات کا وعدہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تیس چالیس راتوں کے اعتکاف کا اسی لئے بجائے وعدنا کے واعدنا فرمایا۔

مدتِ موعود پر اضافے کا سبب؟

اس آیت کریمہ میں یہ بات تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کرنے کیلئے بلایا تھا اور اس کیلئے پہلے تیس راتوں کے اعتکاف کا حکم دیا اور پھر دس راتوں کا اضافہ فرما دیا۔سوال یہ ہے کہ یہ دس راتوں کا اضافہ کیوں فرمایا گیا؟ اہل علم کی جانب سے اس سلسلے میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔

1-ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ ''دیلمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا ایک ماہ کا اعتکاف ختم ہو گیا تو انہوں نے خدائے تعالیٰ سے ہم کلامی کی تیاری شروع کی چونکہ مسلسل ایک ماہ روزہ ہی میں بسر کئے تھے اس لئے منہ میں بو محسوس کرتے تھے لہٰذا انہوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ رب العالمین سے اس حالت میں ہم کلام ہوں اور انہوں نے ایک خوشبودار بوٹی کو چبالیا اور کھالیا' فوراً ہی وحی الٰہی نے ٹوکا 'موسیٰ! تم نے ہمکلامی سے پہلے روزہ کیوں افطار کرلیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی وجہ بیان کر دی تب حکم ہوا کہ موسیٰ اس مدت کو دس دن بڑھا کر چالیس دن کرو' کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے یہاں ایک روزہ دار کے منہ کی بو بھی مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے اور اس طرح یہ چلہ پورا ہوا''۔

اسی طرح بعض اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آخری روز منہ کی بو ختم کرنے کیلئے مسواک فرمائی تھی جس وجہ سے دس دن کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی روایات اسماء الرجال کی محققین کی نگاہ میں قابل اعتماد نہیں ہیں۔اس لئے ان روایات سے استشہاد کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا اور اس بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی بوٹی کھانے یا مسواک کرنے سے منہ کی جو بو دور ہو گئی تھی وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند تھی اس لئے مزید دس دن کے اعتکاف اور روزے کا حکم دیا گیا تھا۔

بعض اہل علم نے سورۃ طٰہٰ کی آیت نمبر ۸۴ سے استشہاد کرتے ہوئے اس کی ایک اور وجہ سمجھی ہے وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کو ساتھ لے کر وادیٔ ایمن کے دائیں طرف پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا پھر قوم کو وہاں چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کو وہاں پہنچنا تھا جہاں کوہ طور پر آپ کو نبوت عطا کی گئی تھی لیکن ابھی قافلہ راستے ہی میں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حضور حاضری کے حد سے بڑھے ہوئے شوق سے بے تاب ہو کر اکیلے ہی آگے بڑھ گئے اور قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری حضرت ہارون کے سپرد کر گئے چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس عجلت پر پروردگار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جواب طلبی کی کہ ''تم اپنی قوم کو پیچھے چھوڑ کر اکیلے کیوں چلے آئے'' تو موسیٰ علیہ السلام نے قرآن کریم کے بیان کے مطابق جواب دیا کہ ''اے میرے رب میری قوم کے لوگ بھی بس میرے پیچھے ہی ہیں اور میں وقت موعود سے ذرا پہلے تیری خوشنودی کیلئے چلا آیا''۔چنانچہ یہ عجلت جو سراسر اللہ سے محبت کے جوش میں وجود میں آئی تھی چونکہ ایک بڑے حادثے کا سبب بنی۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس عجلت و سبقت پر گرفت فرمائی اور اس کی حکمت تربیت مقتضی ہوئی کہ تیس دن کی مقررہ مدت بڑھا کر چالیس دن کر دی جائے اگرچہ آپ کی یہ عجلت جیسا کہ عرض کیا گیا محض فرطِ شوق کا نتیجہ اور خدا کی رضا طلبی کیلئے تھی اس پہلو سے یہ کوئی برائی نہیں بلکہ محبت الٰہی کا تقاضہ تھی لیکن یہی عجلت ان کیلئے ایک شدید آزمائش اور اس قوم کیلئے ایک سخت فتنہ بن گئی۔ان کی

Marfat.com

قوم کے اندر جو اشرار و مفسدین تھے انہوں نے اس غیبت سے فائدہ اٹھا کر قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا اور حضرت ہارون اپنی انتہائی کوشش کے باوجود صورتحال پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی خداداد ذہانت اور نور نبوت سے اچھی طرح اس بات کو سمجھتے تھے کہ ان کی قوم کا مزاج سخت منفعل واقع ہوا ہے اور مزید یہ کہ ان کی قوم میں منافقین اور مفسدین کا ایک گروہ موجود ہے جو ان کی غیر حاضری میں کوئی فتنہ اٹھا سکتا ہے اور یہ گروہ آپ کے جلال اور شخصیت کی ہیبت سے تو دبا رہتا تھا لیکن حضرت ہارون علیہ السلام کی نگرانی میں اس بات کا امکان بہر حال موجود تھا کہ وہ ان کی طبعی نرمی سے فائدہ اٹھا کر شاید کوئی گل کھلانے میں کامیاب ہو جائیں اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ضرور احساس ہوگا کہ میری چند روزہ غیر حاضری اس غیر تربیت یافتہ قوم کیلئے کسی حادثے کا سبب نہ بن جائے لیکن غلبہ شوق میں وہ ان پہلوؤں کو نظر انداز فرما گئے اور اس کا نتیجہ نہایت خطرناک شکل میں سامنے آیا۔

انبیاء کے معصوم ہونے کا مفہوم:

یہاں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بظاہر یہ تدبیر کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں ان سے اس غلطی کا صدور کیسے ہوا؟ بات یہ ہے کہ پیغمبر گناہوں کے ارتکاب سے تو بالکل معصوم اور پاک ہوتے ہیں لیکن اگر کبھی ان سے کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ اتباع ہویٰ کی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی وہ حق اور خدا کی رضا طلبی کی راہ میں حد مطلوب سے متجاوز ہو جاتے ہیں یہ چیز فی نفسہٖ کوئی برائی نہیں لیکن حضرات انبیاء علیہ السلام چونکہ میزان حق ہوتے ہیں اور ان کا ہر قول و فعل دوسروں کیلئے نمونہ ہوتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت فرماتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی اس عجلت پر گرفت ہوئی اور جس کی وجہ سے تیس راتوں کی بجائے دس راتوں کا اضافہ کر دیا گیا۔

حاصل کلام یہ کہ الفاظ میں گنجائش یقیناً اس احتمال کی ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے جس طرح اس سے پہلے پس منظر بیان کرتے ہوئے میں نے عرض کیا ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو کتاب ہدایت عطا فرماتے ہیں تو کتاب کے نزول سے پہلے کلام خداوندی کا تحمل پیدا کرنے اور کلام خداوندی سے طبعی موافقت پیدا کرنے کیلئے اس طرح کے تربیتی مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی ایسا ہی تربیتی مرحلہ تھا جس کی مدت پہلے تیس دن رکھی گئی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت تربیت سے اس میں دس دن کا اضافہ فرما دیا جس کی حقیقت کو پروردگار کے سوا کوئی نہیں جان سکتا لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ اس کا تعلق بہر حال تربیت سے تھا اور کسی چیز سے نہیں۔

اس آیت کریمہ کے آخری حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر جانے لگے تو آپ نے اپنی غیر حاضری میں حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنایا۔ ہارون علیہ السلام اگرچہ آپ سے تین سال بڑے تھے لیکن ان کی حیثیت آپ کے معاون اور ماتحت کی تھی کیونکہ انہیں نبوت آپ کی دعا کے نتیجے میں دی گئی تھی۔ جب کوہ طور پر آپ کو نبوت دی گئی اور آپ کو حکم دیا گیا کہ فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے فرض کی اہمیت و عظمت اور مشکلات کو دیکھتے ہوئے چند دعائیں مانگی تھیں ان میں سے ایک دعا یہ بھی تھی کہ یا اللہ میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے تاکہ اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے میں وہ میرے معاون ہوں اور میرے لئے دست و بازو ثابت ہوں۔ چنانچہ آپ کی یہ دعا قبول کی گئی اور حضرت ہارون علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی۔ اسی حیثیت کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو اپنا خلیفہ بنایا۔ جس سے بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی ذمہ داری ان تمام فرائض کو ادا کرنا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام بطور رسول ہونے کے

Marfat.com

ادا کرتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرمائی کہ بنی اسرائیل ابھی ایک ناتربیت یافتہ قوم ہیں قدم قدم پر انہیں اصلاح کی ضرورت ہے اس لئے ہر وقت ان کی اصلاح کی فکر اور مسلسل نگرانی کرنا۔ جہاں کہیں خرابی دیکھو اس کی درستی کی کوشش کرنا اور تیسری بات یہ فرمائی کہ اس قوم میں ایک مفسدین کا گروہ بھی پایا جاتا ہے دیکھنا وہ میری غیر حاضری سے فائدہ نہ اٹھانے پائیں۔ انہیں حتی الامکان کنٹرول کرنے کی کوشش کرنا اور اگر وہ زور پکڑ لیں تو تم ان کے راستے پر چلنے کیلئے کبھی تیار نہ ہونا یعنی پیغمبر دنیا میں باطل اور کفر کے ساتھ کبھی سمجھوتہ (Compromise) نہیں کرتا۔ اس کی اپنی ذات اس کی دعوت اور اس کے استدلال کا انداز ہمیشہ اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہے جس سے مسلسل حق کا اظہار ہوتا ہے۔ جس طرح روشنی اور تاریکی کبھی آپس میں ایک نہیں ہوتیں بلکہ ہر حال میں الگ الگ پہچانی جاتی ہیں اسی طرح پیغمبر اور اس کی دعوت ہمیشہ ایک مینارۂ نور بن کر انسانی ہدایت کا کام کرتے ہیں۔ یہ ہدایات دے کر اور حضرت ہارون علیہ السلام کو ذمہ داریاں سونپ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور کی طرف روانہ ہو گئے۔ چنانچہ جتنے دنوں کے اعتکاف کا حکم دیا گیا تھا اسے مکمل کرنے کے بعد بارگاہ حق میں جب حاضری دی تو وہاں جو کچھ پیش آیا اور جو گزارشات پیش کیں۔ اگلی آیت کریمہ میں اس کا تذکرہ فرمایا جا رہا ہے:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ O

''اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ سکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا پھر جب ہوش میں آیا بولا تو پاک ہے میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں''۔143

موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے لذتِ کیف وسماع کے بعد لذتِ دیدار کی خواہش:

وعدہ کے مطابق چلہ مکمل کرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بارگاہِ حق میں حاضر ہوئے اور مولا کریم سے شرف ہمکلامی حاصل ہوا تو طبیعت میں محبت کی جو چنگاری سلگ رہی تھی وہ شعلہ بن کر بھڑک اٹھی تو بے ساختہ زبان پر ایک ایسی درخواست آ گئی عام حالات میں جس کا تصور بھی شاید پیغمبر کیلئے مشکل ہو۔ غایتِ کیف وانبساط میں عرض کیا الٰہی جب تو نے مجھ کو لذتِ کیف وسماع سے نوازا ہے تو پھر لذتِ مشاہدہ ودیدار سے کیوں محروم رہوں اس سے بھی سرفراز فرما۔ پروردگار نے فرمایا موسیٰ تم مشاہدۂ ذات کی تاب نہ لا سکو گے اچھا دیکھو ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے۔ اگر یہ تجلی کو برداشت کر لے تو پھر تم یہ سوال کرنا اس کے بعد طور پر حضرتِ حق کی تجلی کا ظہور ہوا تو پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ بھی اس نظارہ کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے اور گر پڑے۔ تجلی کیلئے پہاڑ کو اس لئے متعین فرمایا تھا کہ جہاں تک تحمل و برداشت کا تعلق ہے مخلوقات میں پہاڑ اس صفت میں سب سے زیادہ متصف ہے۔ بڑے سے بڑے حادثے' بڑے سے بڑے دھماکے اور زلزلے کو برداشت کر لینا پہاڑوں ہی کا کام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دفعہ ان میں بھی دراڑیں پڑ جاتی ہیں لیکن وہ باقی مخلوقات کی طرح ان حوادث سے مسمار نہیں ہوتے۔ اب اگر پہاڑ بھی اپنی بے پناہ تحمل و

Marfat.com

برداشت کے باوجود ذات الٰہی کی معمولی تجلی کو بھی برداشت نہ کر پائے تو انسان جسے بڑی محدود قوت برداشت عطا کی گئی ہے وہ کیونکہ اسے برداشت کر سکتا ہے۔ انسانی آنکھ باوجود اس کے کہ آفتاب بھی ایک مخلوق ہے' کا تحمل نہیں کر سکتی۔ آفتاب پوری طرح چمک رہا ہو تو کھلی آنکھوں سے اس کا دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ حد سے زیادہ تیز روشنی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے بلکہ بعض اوقات بینائی ہی سلب ہو جاتی ہے۔ بجلی کا کڑکا ذرا حد سے بڑھ جائے تو کان کے پردے بیکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ معمولی مخلوقات ہیں جب ان کے سامنے انسان کی کمزوری کا یہ حال ہے تو اللہ کی وہ ذات جو نور مطلق اور تمام چون وچگوں سے ماوراء اور بالاتر ہے' انسان اس کی ذات کے مشاہدے کا متحمل کب ہو سکتا ہے۔ اس لئے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوش آیا تو انہیں اپنی جسارت کا احساس ہوا تو فوراً خدائے برتر کی حمد وثناء کی اور اپنی درخواست سے رجوع کرتے ہوئے معافی چاہی اور کہا کہ میں اقرار کرتا ہوں اور ایمان لاتا ہوں کہ تیرے جمال کی تجلی وعرفان اور نمودِ حق میں کوئی کمی نہیں نقصان صرف میری اپنی ہستی کے عجز اور بے چارگی کا ہے۔ کوئی اور اس عجز کا اعتراف تو مجھے دیکھ کر کرے گا میں سب سے پہلے سراپا عجز بن کر اس کا اعتراف کرتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ پیش آنے والا واقعہ بنی اسرائیل کی ایک بنیادی کمزوری کا علاج تھا جس کا وہ ہمیشہ شکار رہے۔ قرآن کریم اور سابقہ آسمانی کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل انبیاء کرام کی اولاد اور ان کی صحبتوں سے مستفیض ہونے کے باوجود محسوس پرستی کی سطح سے اجتماعی طور پر کبھی اوپر نہ اٹھ سکے بار بار وہ اللہ کو براہ راست دیکھنے کا مطالبہ کرتے رہے یا ایسے ایسے معجزات مانگتے رہے جس سے ان کی اس محسوس پرستی کو غذا مل سکے اور وہ بہت کم اس بات کو سمجھ پائے کہ مخلوقات میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا اپنے کانوں سے سن نہیں سکتا' اپنی قوت ذائقہ سے چکھ نہیں سکتا اور اپنے ہاتھوں سے چھو نہیں سکتا لیکن پھر بھی اسے تسلیم کرتا ہے اور بعض مخلوقات ایسی ہیں جنہیں محسوس کرنا بھی مشکل ہے لیکن ہم انہیں پھر بھی تسلیم کرتے ہیں اللہ کی ذات تو نور مطلق اور بے چون وچگاں ذات ہے جس کا ادراک کرنے سے عقل بھی عاجز ہے۔ چہ جائیکہ اسے احساس کی گرفت میں لانے کی کوشش کی جائے' اسے صفات کے آئینہ میں سمجھا جاتا ہے اور دل کے احساس سے مانا جاتا ہے اس کے سوا اس کی بارگاہ تک رسائی کی کوئی صورت نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس تجربے سے اس حقیقت کا ادراک کرانا مقصود تھا کہ انسان اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود پیغمبر ہو کر بھی اللہ کی بارگاہ میں ایک انسان سے زیادہ نہیں وہ اللہ کی ذات کے بارے میں صرف وہی کچھ جان سکتا ہے جو اللہ کو منظور ہو موسیٰ علیہ السلام پیغمبر ہوتے ہوئے شرف ہمکلامی سے باریاب کئے گئے کیونکہ اللہ نے انہیں یہ اعزاز دینا چاہا اگر وہ از خود چاہتے تو کبھی ایسا نہ کر پاتے انہوں نے پروردگار کو دیکھنے کی خواہش کی تو یہ چونکہ اس عالم ناسوت میں اللہ کے تکوینی نظام کے خلاف ہے اس لئے اسے منظور نہیں فرمایا۔ جب موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کے ساتھ اللہ کا معاملہ یہ ہے تو کوئی فرد یا کوئی قوم اگر اللہ کو دیکھنے کا دعویٰ کرے یا اس کے دیدار کو اپنی منزل قرار دے لے تو یہ ایک جسارت ہے جسے حدود سے تجاوز کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بنی اسرائیل اس حد سے چونکہ بار بار تجاوز کرنے والے تھے اس لئے پہلے ہی مرحلہ پر موسیٰ علیہ السلام کے اس تجربے سے ان کی راہنمائی کا سامان کر دیا گیا لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے اس راہنمائی سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا لیکن یہ شکایت صرف انہیں سے شائد مناسب نہ ہو یہ ایک ایسا مرض ہے جو ہر قوم میں کم وبیش موجود رہا ہے اسی مرض نے آگے بڑھ کر شرک کی مختلف صورتیں اختیار کیں اور اللہ کی بے مثال ذات کو اپنے حلقۂ تصور میں اپنی نا تمامیِ فکر کے مطابق سمیٹنے کی کوشش کی ہے جب بھی کسی مشرک قوم کی طرف اللہ کا کوئی نبی توحید کی دعوت لے کر آیا ہے تو انہیں اللہ کی ذات اور اس کی صفات کی یکتائی کو سمجھنے کے لئے یہی رکاوٹ پیش آئی۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر — مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

Marfat.com

یہ امت اسلامیہ جو توحید کی سب سے بڑی علمبردار ہے اس میں بھی ایسے صوفیاء گزرے ہیں جنہوں نے اپنی معراج' پروردگار کے دیدار کو ٹھہرایا اور وہ اسی بات کو انسانیت کی منزل قرار دیتے ہیں' حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس تجربے سے اچھی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس عالمِ ناسوت میں یہ سعادت کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے جو قوانین مقرر فرما دیئے ہیں وہ خود تو ان کا پابند نہیں لیکن انسان بہر حال ان کا پابند ہے۔ ان قوانین کی موجودگی میں کسی انسان کے بس میں یہ بات نہیں کہ وہ اللہ کے دیدار سے بہریاب ہو سکے۔ اس لئے اگلی آیت کریمہ میں موسیٰ علیہ السلام کا حقیقی تعارف پیش کیا گیا ہے تاکہ اس کے آئینہ میں انسان اپنی رسائی فکر اور تقرب خداوندی کی انتہاء کو جان سکے۔ ارشاد فرمایا۔

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۡ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ O

''فرمایا: اے موسیٰ! میں نے تم کو لوگوں پر اپنے پیغام اور اپنے کلام سے برگزیدہ کیا تو میں نے جو کچھ تم کو دیا اس کو لو اور شکر گزاروں میں سے بنو''۔144

انسان کی رسائیِ فکر اور تقربِ خداوندی کی انتہا:

اس آیت کریمہ میں حقیقت تو اللہ جانتا ہے بظاہر تین باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

1- اللہ کی ذات سے انسان کے تقرب کی جو انتہا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کسی انسان کو اپنی پیغامبری کے لئے چن لے اور اسے شرف ہمکلامی سے نواز دے اس سے زیادہ پیغمبر ہوتے ہوئے بھی کسی انسان کے بس کی بات نہیں اگر اس سے زیادہ کسی انسان کی استطاعت ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہمکلامی سے ممتاز فرمایا انہیں ضرور اپنے دیدار سے بھی مشرف فرماتے لیکن انہیں یہ کہہ کر کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے واضح فرما دیا کہ انسان اور اس کے پروردگار کے درمیان کچھ حدود ہیں جن سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ پیغمبروں کے علاوہ دوسرے انسان وہ تو اس وادی میں اجنبیوں کی مانند ہیں لیکن پیغمبر جو اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں جب ان کی رسائی اس خاص حد سے ناممکن ہے تو پھر دوسروں کو اللہ کریم کے معاملہ میں زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔

2- انسانوں نے جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کے معاملے میں ٹھوکر کھائی ہے اسی طرح نبوت کے معاملے میں بھی انسان ہمیشہ ٹھوکر کھاتے رہے ہیں کبھی انہوں نے اللہ کے نبیوں کو اتنا اوپر اٹھایا کہ اللہ کی صفات میں شریک کر ڈالا اور کبھی اتنا نیچے گرایا کہ انہیں نبوت کے قابل بھی نہ سمجھا یعنی کبھی تو یہ دعویٰ کیا کہ اللہ کے نبی انسان نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی نبوت کے مقام کے باعث انسان سے ماورا ہوتے ہیں اور کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ پیغمبر صرف انسان ہوتے ہیں ان کی صفات بھی ایک عام انسان کی صفات ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی پیغام رسانی کیلئے منتخب ضرور کرتا ہے لیکن ان میں ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ ان دونوں انتہاؤں کو متوازن کرتے ہوئے پروردگار یہاں فرما رہے ہیں کہ اے موسیٰ تم ہمارے برگزیدہ پیغمبر ہو لیکن یاد رکھو پیغمبر ہوتے ہوئے بھی تم اللہ کی ذات وصفات کے معاملے میں انسانی صفات سے بلند نہیں ہو سکتے۔ عالم ناسوت میں جن حدود و قیود کا تمہیں پابند بنایا گیا ہے ان حدود و قیود سے تجاوز کرنا تمہارے لئے کسی طرح جائز نہیں۔ پیغمبر ہونے کی حیثیت سے تمہارے مقام کی انتہا یہ ہے اور یہ بھی تمہارا امتیاز

Marfat.com

ہے کہ ہم نے تمہیں پیغام رسانی اور پیغمبری کے ساتھ ساتھ شرف ہمکلامی سے بھی نوازا ہے جبکہ دوسرے کسی پیغمبر کو یہ مقام حاصل نہیں۔ اس سے زائد کسی اور مرتبے کی خواہش کرنا تمہارے مقام و مرتبہ سے ماوراء چیز ہے اور اسی کے آئینہ میں نوع انسانی کو یہ درس دیا گیا ہے کہ پیغمبر انسان ہی ہوتے ہیں لیکن ان کا مقام و مرتبہ عام انسانوں سے اس لئے بالا بلند ہوتا ہے کہ اللہ انہیں اپنی پیغام رسانی کیلئے چنتا ہے اور چاہے تو شرف ہمکلامی سے بھی نوازتا ہے یہ دونوں باتیں پیغمبروں کے علاوہ کسی اور انسان کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتیں۔ اپنی ذاتی تگ و دو اور ذہنی صلاحیت سے کوئی آدمی چاہے کہ میں ان مقامات کو حاصل کر لوں تو یہ ہرگز ممکن نہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے اللہ کے نبیوں کے بارے میں دونوں افراط و تفریط پر مبنی تصورات کو متوازن کرتے ہوئے ایک معتدل تصور دیا جسے صراط مستقیم کہنا چاہیے۔

3- جن باتوں نے انسانی زندگی کو تباہ کیا ہے ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے اپنے طور سے راہنمائی کے اصول، راہنمائی کا طریقہ اور راہنمائی کے آداب متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کو اپنا حق سمجھ کر اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ اسے یہ بات گراں گزرتی ہے کہ اسے یہ کہا جائے کہ اجتماعی زندگی کی نزاکتیں ایسی ہیں جن کا ادراک انسانی عقل سے بالا ہے۔ انسان اپنے حواس اور اپنی عقل سے زندگی کے بہت سے مسائل کو حل کرتا ہے لیکن جہاں تک نوع انسانی کی اقدار حیات، اجتماعی تہذیب اور اصول بقاء کا تعلق ہے اس کا بہ ہمہ وجوہ ادراک کرنا انسانی عقل کیلئے ممکن نہیں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کیلئے راہنمائی نازل کی جائے۔ چنانچہ پروردگار نے محض اپنے فضل و کرم سے اس ذمہ داری کو اپنے سر لے لیا اور فرمایا:

﴿ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ''بے شک راہنمائی دینا ہماری ذمہ داری ہے'' ﴾

چنانچہ اللہ کی جانب سے راہنمائی کا مل جانا وہ انسانیت کی معراج ہے اسی سے انسانی زندگی کا سفر آسان ہوتا ہے اور زندگی نشیب و فراز کے ہچکولوں سے محفوظ ہوتی ہے اس کا ایک ایک شعبہ اور ایک ایک ادارہ ٹھیک ٹھیک کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے افراط و تفریط اور ناتمامی فکر کے اندیشے زندگی سے نکل جاتے ہیں اس لئے پروردگار جب اتنی بڑی دولت کسی قوم کو دینے کیلئے اپنے کسی بندے کا انتخاب کرتا ہے تو حقیقت میں وہ اتنے بڑے اعزاز سے نوازا جاتا ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور اعزاز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے یہ دولت تمہیں عطا کی ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ اس کی عظمت کے پیش نظر پوری قوت سے اس کا حق ادا کرنے کیلئے کمربستہ ہو جاؤ اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اتنے بڑے اعزاز کا مستحق جانا۔

اس کے بعد اگلی آیت کریمہ میں وہ دولت جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے عطا کی جارہی ہے اس کا ذکر فرمایا گیا ہے:

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ج فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ط سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ O

''اور ہم نے اس کیلئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی پس اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو ہدایت کرو کہ اس کے بہتر طریقہ کو اپنائیں میں تم کو عنقریب نافرمانوں کا ٹھکانا دکھاؤں گا''۔145

تورات کا تعارف اور اس کے مقتضیات:

اس آیتِ کریمہ میں متعدد باتیں ہماری توجہ کا تقاضہ کرتی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اس میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے موسیٰ کو تختیاں لکھ کے

Marfat.com

دی تھیں اس کا مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تورات تختیوں کی صورت میں تحریری شکل میں نازل کی گئی ورنہ عموماً پروردگار کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے رسول کے دل پر اپنا کلام اتارتا ہے اور پھر رسول اسے دوسروں کے ذریعہ سے لکھواتا ہے لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے تحریری شکل میں اپنی کتاب عطا فرمائی اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کو شریعت دینے کیلئے اللہ تعالیٰ نے خاص اہتمام فرمایا جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ دوسری امتوں کو تو زبانی تعلیم دی گئی لیکن بنی اسرائیل کیلئے تحریری تعلیم کا انتظام فرمایا تا کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی شریعت زیادہ محفوظ حالت میں ملے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ بنی اسرائیل قدم قدم پر جس طرح اپنی نااہلی اور لاپرواہی کا اظہار کر رہے تھے اس کے پیش نظر یہ اندیشہ تھا کہ اگر انہیں زبانی تعلیم کے ذریعے شریعت دی گئی تو یہ کہیں اسے ضائع نہ کر دیں اور دوسری اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے پیغمبروں کے سلسلے میں بالعموم یہ روایت رہی ہے کہ پیغمبر براہ راست اللہ کے شاگرد ہوتے ہیں۔ پہلے فطرت ان کو سکھاتی ہے اور پھر براہ راست اللہ کی جانب سے ان کی تعلیم و تربیت کا سامان کیا جاتا ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن اور لڑکپن میں مروجہ تعلیم سے بہرہ ور ہو چکے تھے انہوں نے شہزادوں کی طرح تربیت پائی اور دوسرے شہزادوں کے ساتھ اس زمانے کے اداروں میں مختلف علوم بھی حاصل کئے اور فوجی ٹریننگ بھی پائی اور پھر اسرائیلی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض اہم عہدوں پر فائز بھی رہے اور افریقہ کے بعض محاذوں پر ایک کمانڈر کی حیثیت سے داد شجاعت بھی دیتے رہے۔ اس لحاظ سے آپ چونکہ ایک پڑھے لکھے آدمی تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو لکھی ہوئی تختیوں کی صورت میں کتاب عطا فرمائی۔

دوسری بات: جس کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تختیوں کی صورت میں آپ کو جو کچھ دیا گیا تھا کیا یہ واقعی تورات تھی یا صرف احکام عشرہ تھے جو تختیوں پر کندہ کر کے آپ کو دیئے گئے تھے۔ علماء نصاریٰ میں سے بیشتر لوگ تو اسے صرف احکام عشرہ ہی قرار دیتے ہیں لیکن قرآن کریم سے اور یہود علماء کی وضاحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف احکام عشرہ نہیں بلکہ مکمل تورات تھی جس میں ہر طرح کی ضروری ہدایات اور تفصیلات موجود تھیں یعنی دین و شریعت کی جو باتیں بنی اسرائیل کی ہدایت کیلئے ضروری تھیں وہ سب اس میں موجود تھیں اور جماعتی تنظیم و تشکیل سے متعلق جو تفصیلات درکار تھیں وہ بھی ان الواح میں درج تھیں۔ اس لئے کتاب خروج میں یہ صراحت موجود ہے کہ تختیاں دو تھیں اور وہ دونوں اپنی دونوں جانب سے بھری ہوئی تھیں اگر ان میں صرف احکام عشرہ ہوتے تو تختیوں کا دونوں طرف سے بھرا ہونا کسی طرح بھی قرین عقل نہیں اور پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآن کریم نے تختیوں کیلئے الواح کا لفظ استعمال کیا ہے۔ الواح' لوح کی جمع ہے اور عربی زبان میں جمع کا اطلاق کم از کم تین افراد پر ہوتا ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں اس لئے تورات کے راویوں کا دو تختیاں روایت کرنا معلوم ہوتا ہے ترجمے کی غلطی ہے صحیح بات وہی ہے جو قرآن کریم نے کہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تختیاں تین یا تین سے زیادہ تھیں اور پھر اس کا سائز بھی یقیناً عام تختی کی طرح تو نہیں ہوگا۔ تورات کے مطابق یہ پتھر سے تیار کردہ تھیں اور یقیناً ان کا حجم ایسا ہوگا جس کے پیش نظر موسیٰ علیہ السلام کو اسے مضبوطی اور احتیاط سے اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسے خطاط موجود رہے ہیں جو چند اوراق میں پورا قرآن کریم لکھ دیتے تھے اگر انسانی صلاحیت سے یہ بات ممکن ہے تو چند تختیوں پر پوری تورات کا لکھا جانا بھی مستبعد نہیں سمجھنا چاہیے۔ جہاں تک قرآن کریم کی تورات سے متعلق صراحتوں کا تعلق ہے اس سلسلے میں قرآن کریم کی چند آیات کو دیکھ لینا ضروری ہے۔ جس میں تورات کی چند صفات کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً سورۃ البقرہ میں قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب نزول احکام کا تذکرہ کیا ہے تو اس کو کتاب اور فرقان کہا ہے اور یہ دونوں صفات قرآن عزیز میں تورات کیلئے بولی گئی ہیں احکام عشرہ کیلئے نہیں۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

Marfat.com

ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ O وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ O

''اور جب عہد کیا ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا پھر بنالیا تم نے اس کے پیچھے گوسالہ اور تم اس بارہ میں ظالم تھے پھر ہم نے اس کے بعد تم کو معاف کر دیا تا کہ تم شکر گزار بنو اور جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور حق و باطل میں فرق کرنے والی (فرقان) چیز عطا کی تا کہ تم راہ پاؤ''۔ (البقرہ:۶)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰی بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ O

''اور بے شک ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جو لوگوں کیلئے بصیرتیں مہیا کرنے والی اور ہدایت اور رحمت ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں''۔ (قصص:۵)

اور اگر چہ تورات (موجودہ بائبل) کے سفر خروج' استثناء اور کتاب یسوع میں موسیٰ علیہ السلام کے چلہ کے بعد احکام عہد یا شریعت کا لفظ پایا جاتا ہے لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانوی نوراللہ مرقدہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب اظہار الحق میں فارسی' عربی اور اردو قدیم تراجم کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ تورات کے ان نسخوں میں ان ہر دو الفاظ کی جگہ ''تورات'' لکھا ہوا پایا جاتا ہے چنانچہ مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تفسیر حقانی میں اردو فارسی بائبل مطبوعہ 1845ء و 1839ء سے حسب ذیل حوالے نقل کئے ہیں۔

(1) و بر آں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات را بخط روشن بنویس (استثناء باب ۲۷' آیت ۲۷)۔

(2) بنی اسرائیل نے بموجب حکمِ موسیٰ علیہ السلام کے ایک مذبح بنایا اور اس کے پتھروں پر توریت کو لکھ دیا۔ (یسوع: باب ۸' آیت ۱۸۴۵۱۵)

ان حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو الواح چلہ کے بعد دی گئیں وہ تورات کی تھیں' احکام عہد کی الواح نہیں تھیں اور انگریزی نسخہ کے ترجمہ میں لا (Law) اور عربی و اردو نسخوں میں شریعت کو بھی صحیح مان لیا جائے تو یہ لفظ بھی اپنے معنی کی وسعت پر تورات پر صادق آتا ہے اور تورات' شریعت اور قانون سب کا مصداق ایک ہی چیز ہے اور قدیم عیسائی دنیا میں یہی معنی سمجھے جاتے رہے ہیں اور احکام عہد اسی کا ایک جز ہیں اور اس کو مستقل قرار دینا بہت بعد کی پیداوار ہے۔

تیسری بات: موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اسے قوت سے پکڑیں اور اپنی قوم کو اس کا حکم دیں قوت سے پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی حفاظت کا انتظام کریں' خود اس پر پوری طرح عمل کریں' دوسروں کو اس پر عمل کرنے کیلئے کہیں اور پوری طرح اس کے احکام کو نافذ کرنے کی کوشش فرمائیں۔ اس سے پہلی بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جس پیغمبر پر کوئی کتاب اترتی ہے وہ سب سے پہلے اس پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے اس کی ایمانیات سب سے پہلے ایمان لاتا ہے اور اس کی شریعت پر عمل کر کے عمل کا نمائندہ بن جاتا ہے اور اگر کتاب میں کسی حکم کو مجمل بیان کیا گیا ہے تو پیغمبر کا عمل اس کی تفصیل مہیا کرتا ہے اور اگر کسی حکم کو مبہم بیان کیا گیا ہے تو پیغمبر کا عمل اس کی مراد واضح کرتا ہے اور اگر کسی حکم کا درجہ صرف اصول کا ہے تو پیغمبر اپنی سنت سے اس کی فروع طے کرتا ہے۔ غرضیکہ کتاب کا ایک ایک قول پیغمبر کے عمل سے زندگی کی روایت بنتا ہے اور آئین اور قانون کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم جس طرح کتاب کے احکام کی پابند ہوتی ہے اسی طرح جس رسول پر وہ کتاب اترتی ہے اس کی قوم اور امت اس رسول کی سنت

Marfat.com

حدیث کی بھی پابند ہوتی ہے۔ دونوں میں عمل کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ پیغمبر کی حیثیت صرف کتاب پہنچانے والے کی نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی ذات میں مبلغ، معلم، شارع، واجب الاطاعت سب کچھ ہوتا ہے۔ دوسری بات اس سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ پیغمبر کی یہ ذمہ داری بھی ہوتی ہے کہ اللہ کے نازل کردہ ایک ایک حکم پر اپنی قوم کو چلنے کا حکم دے اللہ کی شریعت کے مطابق احکام کا نفاذ کرے زندگی کی ضروریات کے حوالے سے ادارے قائم کرے اور ان اداروں میں اللہ کے احکام کو نافذ کرے اس طرح سے زندگی کا ایک ایک شعبہ اللہ کے احکام کے مطابق ڈھال کر اللہ کی زمین پر اللہ کی حاکمیت کو قائم کرنا پیغمبر کی ذمہ داری ہے۔

چوتھی بات: اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ اپنی قوم کو اس بات کا حکم دیجئے کہ وہ اس کتاب کے احسن کو اختیار کریں۔ اس کے دو مطلب مراد ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دنیا میں زندگی کی راہنمائی کیلئے انسانوں کے خود ساختہ وضعی قوانین اور ہدایات کی کمی نہیں۔ جو قوم جس خطے میں بھی آباد ہے انہوں نے اپنی راہنمائی کیلئے کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کر رکھا اور کوئی نہ کوئی نظام تشکیل دے رکھا ہے اور کوئی نہ کوئی قانون اس کی زندگی کو منظم اور مرتب کرنے کا فرض انجام دے رہا ہے لیکن حقیقت میں انسانوں کے بنائے ہوئے یہ تمام طریقے انسانی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ انسانی عقل اللہ کا سب سے بڑا انعام ہونے کے باوجود نارسائی اور غلطی سے مبرا نہیں۔ زندگی کے کتنے ایسے معاملات ہیں جس میں انسانی عقل بے بس ہو جاتی ہے اور کتنے ایسے ماؤف لمحے ہیں جس میں انسانی فکر، خواہشات، اشتعال اور مفادات کا شکار ہو کر غلط فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اس لئے اگر انسانی زندگی کی بھلائی مقصود ہے تو اس کیلئے صرف ایک ہی راستہ ہے وہ یہ کہ انسانی زندگی جس نے عطا کی ہے وہی سب سے بہتر اس کی ضرورتوں کو سمجھتا ہے اس لئے اسی کی عطا کردہ راہنمائی کو قبول کر لیا جائے یہاں اسی راہنمائی کو احسن قرار دیا گیا ہے۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ کی کتاب بھی انہی الفاظ سے وجود میں آتی ہے جو انسانی زبانوں میں متداول ہیں اور ان الفاظ کے معانی بھی وہی معتبر ہیں جو انسانوں کی مرتب کردہ ڈکشنریاں متعین کرتی ہیں۔ بایں ہمہ! ہم دیکھتے ہیں کہ جب نیت میں فتور پیدا ہوتا ہے اور مقاصد میں اختلال آتا ہے تو الفاظ کے نہ صرف کہ معانی بدلنے لگتے ہیں بلکہ مفہوم میں زمین و آسمان کا فرق آ جاتا ہے۔ ہم عدالتوں میں وکلاء کو بحث کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ موافق اور مخالف دونوں وکیل ایک ہی قانون سے استشہاد کرتے ہیں لیکن دونوں اپنے اپنے مطلب کی بات نکالنے کی کوشش کرتے ہیں الفاظ کا وہ مفہوم جو صاف اور سیدھا ہے جسے عقل عام بڑی آسانی سے متعین کر سکتی ہے زاویہ نگاہ کے بدلنے اور مفادات کی تبدیلی سے کچھ سے کچھ ہو کے رہ جاتا ہے یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اپنی قوم کو یہ حکم دیجئے کہ احکام الٰہی کا وہ صاف اور سیدھا مفہوم لیں جو عقل عام سے ہر وہ شخص سمجھ لے، جس کی نیت میں فساد یا جس کے دل میں ٹیڑھ نہ ہو یہ قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ جو لوگ احکام کے سیدھے سادھے الفاظ میں سے قانونی ایچ پیچ اور حیلوں کے راستے فتنوں کی گنجائش نکالتے ہیں کہیں ان کی موشگافیوں کو کتاب اللہ کی پیروی نہ سمجھ لیا جائے اس لئے جب بھی وہ کتاب اللہ کے کسی حکم کی مراد متعین کرنے لگیں تو اللہ سے ڈرتے ہوئے اسی کی رضا کو سامنے رکھتے ہوئے وہ مفہوم مراد لیں جسے ہر صاحب عقل آدمی آسانی سے سمجھ سکے۔ یہی اس کا احسن طریقہ اور یہی اس کی احسن مراد ہے۔

دارالفاسقین کا مفہوم:

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا ہے کہ میں تمہیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔ سوال یہ ہے کہ اس دار سے مراد کون سا مقام ہے؟ اس سلسلہ میں قصص القرآن کے مصنف کے مطابق کہنے والوں نے قیاس اور تخمین سے مختلف جواب دیئے ہیں (1) اس ''دار'' سے عاد و ثمود کے کھنڈر مراد ہیں (2) مصر مراد ہے کہ بنی اسرائیل دوبارہ اس میں داخل ہوں گے (3) قتادہ رحمتہ اللہ علیہ عنہ کہتے ہیں کہ اس سے شام کی مقدس سرزمین مراد ہے جہاں اس زمانہ میں

Marfat.com

عمالقہ کے جابر بادشاہوں کی حکومت تھی اور جہاں بنی اسرائیل کو داخل ہونا تھا۔ نجار نے اسی کو ترجیح دی ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے' رہا یہ امر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے بوڑھے ان بستیوں میں داخل نہیں ہو سکے۔ اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ارض مقدس میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور اسی طرح بنی اسرائیل کے بوڑھوں پر بھی آنے والی تفصیل کے مطابق اس کا داخلہ حرام کر دیا گیا تھا۔ تو آیت کی یا تو یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل کے نوجوانوں کا داخلہ جن کی اکثریت تھی سب کا داخلہ ہے اور اس طرح کا استعمال شائع ذائع ہے اور یا یہ مراد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع بن نون اور کالب بن یوفنہ اور چند بنی اسرائیل کے بہادروں کو ارض مقدس میں اس لئے بھیجا تھا کہ وہ وہاں کے مفصل حالات معلوم کر کے آئیں کہ ہم کس طرح دشمن کو شکست دے کر پاک سرزمین میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اور انہوں نے آ کر تمام حالات بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کئے تھے تو گویا ان معدودے چند افراد کا ارض مقدس میں داخل ہو کر اس کو دیکھ آنا اور پھر سب کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرنا' آیت میں اسی معاملہ کی جانب اشارہ ہے قتادہ رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے مقابلہ میں پہلا قول اس لئے مرجوح ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کبھی قومی اور جماعتی حیثیت سے مصر میں داخل نہیں ہوئے اور دوسرا قول اس لئے قابلِ اعتناء نہیں ہے کہ اگرچہ ثمود کے آثار وادی سینا کے قریب ضرور تھے مگر عاد کے آثار و کھنڈرات تو عرب کے مغربی حصہ میں واقع تھے جو وادیٔ سینا سے مہینوں کی راہ تھی تو ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بنی اسرائیل کو صرف ان محو شدہ آثار و کھنڈرات کو دکھانے کیلئے بھیجا جاتا اور اس کیلئے خدا کا وعدہ اس شان کے ساتھ بیان ہوتا؟ مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے جہنم مراد ہے اور کافروں کی تہدید کیلئے کہا گیا ہے۔

یہ اقوال اگرچہ باہم مختلف ہیں لیکن سب میں جو چیز قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے وہی حقیقت میں اس کا مفہوم ہے یعنی آگے چل کر تم لوگ مختلف قوموں کے آثار قدیمہ پر سے گزرو گے ان میں سے ہر قوم اللہ کے عذاب کا شکار ہوئی اور ان کی تباہی کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ اپنی روش میں اللہ کے نافرمان اور اس کے فاسق تھے اور انہوں نے خدا کی اطاعت و بندگی سے منہ موڑ کر غلط روی پر اصرار جاری رکھا تھا۔ ان کے تباہ شدہ کھنڈرات کو دیکھ کر تمہیں خوب معلوم ہو جائے گا کہ ایسی روش اختیار کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ تم نے اگر ان علاقوں سے گزرتے ہوئے واقعی عبرت حاصل کی تو یہ تمہاری آئندہ زندگی کی بقاء کی ضمانت ہوگی ورنہ تم بھی اسی انجام سے دوچار کئے جاؤ گے جس سے وہ فاسق قومیں دوچار ہوئیں۔

موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو کتابِ ہدایت دینے کے بعد اگلی آیت کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ تمہاری دنیوی اور اخروی سرفرازی کا دارومدار اسی کتاب کی دی ہوئی راہنمائی کے اتباع میں ہے لیکن یہ یاد رکھو اللہ کے کچھ مقرر کردہ ضابطے ہیں جو قوم ان ضابطوں کی پابندی نہیں کرتی وہ اللہ کی کتاب سے فائدہ اٹھانے سے ہمیشہ محروم رہتی ہے اس لئے تم اگر اس محرومی سے بچنا چاہتے ہو تو تمہیں اس آیت کریمہ کی روشنی میں ان ضوابط کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِيَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ۚ وَ اِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ۚ وَ اِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَيِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ۝ وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الۡاٰخِرَةِ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ ؕ هَلۡ يُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝

''میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی

Marfat.com

اس پر ایمان نہیں لائیں گے اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پرواہی کرتے رہے' ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں''۔147-146

انسان کی چند در چند غلط فہمیوں پر تنبیہ:

انسان کو جن عالمگیر غلط فہمیوں نے گھیر رکھا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں ہر کام کا ارادہ کرنے اسے نقطۂ کمال تک پہنچانے' اس کے اسباب فراہم کرنے اور اس کے نتیجہ خیز بنانے میں شائد پوری طرح آزاد ہوں۔ میں جس چیز کا چاہوں ارادہ کروں اور اپنی محنت اور صلاحیت سے جتنی ترقی کرنا چاہوں کر گزروں۔ کوئی چیز اس سے مجھے روکنے والی نہیں اسی طرح خیالات اور نظریات میں بھی میں پوری طرح آزاد ہوں' جسے چاہوں قبول کروں' جسے چاہوں رد کر دوں۔ بہتر سے بہتر رویہ میرے فیصلے کا محتاج ہے' اچھائی اور برائی' نیکی اور بدی یقیناً اپنے اندر ترغیب بھی رکھتی ہے لیکن حقیقت میں ان کا دارومدار میرے اپنے فیصلے پر ہے میں جسے چاہوں اور جب چاہوں اختیار کرلوں' نہ اختیار کرنے کے لئے کچھ ضوابط کی پابندی کرنا پڑتی ہے اور نہ چھوڑنے کے لئے کچھ چیزوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ یہ وہ غلط فہمی ہے جس کا دائرہ انسانی زندگی میں بہت وسیع ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو فی الجملہ ایک آزادی ضرور ملی ہے لیکن وہ اپنے معاملات پر غور کرے تو وہ خود محسوس کرے گا کہ اس کے اختیار اور آزادی کا سررشتہ کہیں نہ کہیں بندھا ہوا ضرور ہے لیکن اس کو پوری طرح سمجھنا انسانی فکر کے بس کی بات نہیں لیکن یہ اللہ کا بے حد کرم ہے کہ اس نے ہدایت وضلالت کے معاملے میں بعض ایسی بنیادی ہدایات عطا فرمائی ہیں' جس سے ہمیں اس معاملہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس آیت کریمہ میں اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ زندگی کے سفر میں ایسی کامیابی حاصل کرنے کے لئے جو دنیوی اور اُخروی کامیابیوں کی ضامن ہو انسانی راہنمائی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے وحی الٰہی کی راہنمائی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر بیسیوں قوموں کی تاریخ گواہ ہے اور عقلی اور نقلی دلائل اس کی تائید میں ہیں لیکن وحی الٰہی سے وابستگی اختیار کرنا اس کی راہنمائی میں زندگی گزارنا اور اس سے پوری طرح مستفیض ہونا۔ علی الاطلاق انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ اس راستہ پر چلنے کے لئے چند لازمی سنتوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے اور اگر ان سے صرف نظر کر لیا جائے تو پھر گمراہی انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسان اس بات کا فیصلہ کرے کہ میں اپنی زندگی اور اپنی گردوپیش میں کیا ایسی عظمتوں کا مالک ہوں؟ اور ایسی بڑائیاں مجھے حاصل ہیں کہ لوگ خود میری راہنمائی کے محتاج ہوں یا کم از کم ایسا ہو کہ مجھے کسی راہنمائی کی ضرورت محسوس نہ ہو اور میں کسی عظمت کو تسلیم کرنے پر مجبور نہ کیا جاؤں ظاہر ہے کہ کوئی انسان اگر بر خود غلط ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ وہ اس غلط فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہوتا اور اگر ہو جائے تو اس کی جگہ فرعون اور نمرود کے ساتھ ہو سکتی ہے شائستہ انسانوں میں نہیں ہو سکتی وہ جب بھی اپنی حالت پر غور کرے گا تو محسوس کرے گا کہ میں فکری طور پر قدم قدم پر فکر کی نارسائی کا شکار رہتا ہوں میری عقل بہت دفعہ نارسا ثابت ہوتی ہے اور بہت دفعہ غلط فیصلے بھی کرتی ہے پھر میں زندگی گزارنے میں بہت سی پابندیاں اختیار کرنے پر مجبور ہوں میں اپنے حواس اور عقل سے بالا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا اور معاشرتی پابندیاں قبول کئے بغیر معاشرہ کا حصہ نہیں بن سکتا آدابِ زندگی کے ضوابط کے بغیر شائستہ اور مہذب انسان نہیں کہلا سکتا اور تمدنی ضرورتوں کے لئے مجھے بار بار اداروں کی طرف رجوع کئے بغیر چارۂ کار نہیں ایسی صورت حال میں میں کس طرح اس وہم کا شکار ہو سکتا ہوں کہ میں اپنی ذات میں تمام عظمتوں کا مالک ہوں یقیناً میرے سر پر کوئی ایسی ذات کبریا ضرور ہے جس نے مجھے زندگی اور زندگی کے

Marfat.com

امکانات سے گراں بار کیا ہے اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ میری زندگی پر اس کی حکمرانی ہو اور وہی میری زندگی کی الجھی ہوئی گتھیوں کو حل کرنے میں میری رہنمائی کرے جب انسان اس بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اللہ کی ہدایت اور اس کی کتاب کی راہنمائی اس کے لئے اپنی آغوش کھول دیتی ہے لیکن وہ اگر اس کے برعکس فیصلہ کر کے دوسروں کے لئے طاغوت بن جاتا ہے اور یا اللہ کی راہنمائی سے اپنے آپ کو آزاد خیال کرنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں کہ یہ وہ تکبر اور خودسری ہے جس کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں وہ آخر کس بل بوتے پر اپنے آپ کو فرعون سمجھ بیٹھا ہے اگر وہ اس سے توبہ نہیں کرتا تو یقیناً کسی نہ کسی بحیرہ قلزم میں ڈوب کر مرے گا اور وہ یا اپنے آپ کو ہر طرح کی راہنمائی سے آزاد سمجھتا ہے۔ تو یہ رویہ جنگل کے کسی حیوان کا تو ہو سکتا ہے ایک مہذب اور متمدن معاشرہ میں تو اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ اگر یہ خطرناک تصور دل و دماغ میں راسخ ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے اندر خیر اور ہدایت کی جو رغبت اللہ نے پیدا فرمائی تھی وہ آہستہ آہستہ دم توڑنے لگتی ہے اور قبولیتِ حق کی استعداد فنا ہونے لگتی ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کے سامنے انفس و آفاق کی نشانیاں بھی بے اثر ٹھہرتی ہیں اور آیات قرآنی بھی اپنی ساری اثر آفرینی کے باوجود اس کے دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتیں وہ ایک ایک نشانی کو دیکھتا ہے ایک ایک آیت اس کے کانوں میں پڑتی ہے لیکن وہ کبھی اس کے ماننے اور ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے اگر ہدایت کا راستہ کھول دیا جائے تو وہ کبھی اس پر چلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ہاں گمراہی کے راستے کی طرف لپکتا ہوا جاتا ہے اور بگٹٹ دوڑتا نکل جاتا ہے یہ اس کی طبیعت کا فعل، اس کی فطرت اور جبلت کے بالکل برعکس ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے رویہ سے اپنے آپ کو اس سزا کا مستحق بنا دیا ہے جس کے حرکت میں آجانے کے بعد آدمی قبولیتِ حق کی استعداد سے محروم ہو جاتا ہے اور ہر باطل اور برائی اس کی محبوب بن جاتی ہے۔ جس طرح گندگی کا کیڑا نظافت اور خوشبو کو پسند نہیں کرتا بلکہ گندگی ہی اس کی غذا ہے جس طرح مردار خور جانور کبھی تازہ گوشت کا متلاشی نہیں ہوتا بلکہ مردار خوری ہی میں اس کی حقیقی خوشی مضمر ہوتی ہے اسی طرح ایسے شخص کا ذوق بھی اس طرح بگاڑ کا شکار ہوتا ہے کہ برائی اس کے لئے مرغوب بن جاتی ہے اور نیکی اسے مکروہ معلوم ہوتی ہے اور یہ سب اس کے ساتھ اس لئے ہوتا ہے کہ اس نے خود اپنی بنیادی صلاحیتوں کو بگاڑا۔ جو آیاتِ خداوندی اس کے لئے فکری راہنمائی کا سامان بن سکتی تھیں ان سے اس نے منہ موڑا اور زندگی کے حقائق سے تعلق جوڑنے کے بجائے غفلت اور مدہوشی میں ڈوبا رہا تو نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا تھا۔

آخری آیت کریمہ میں اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ تکذیب آیات کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی اس بات کا بھی انکار کر دیتا ہے کہ کبھی اسے اللہ کے سامنے حاضر بھی ہونا ہے اور وہاں اپنے اعمال کی جواب دہی بھی کرنا ہے چنانچہ جیسے ہی یہ تصور دل و دماغ سے نکلتا ہے تو پھر انسانی فکر اور انسانی اعمال پر کوئی قدغن اور کوئی نگرانی باقی نہیں رہتی وہ زندگی کے سفر میں ایک حیوان بن جاتا ہے یا درندہ نتیجتاً اس کے اعمال کی جہت اس حد تک بگڑتی ہے کہ اس کا ہر عمل نتیجہ خیزی سے محروم ہو جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جس کو اس آیت کریمہ میں اعمال کے ضائع ہونے سے تعبیر فرمایا گیا ہے کیونکہ اللہ کے ہاں انسانی سعی و عمل کے بار آور ہونے کا انحصار دو امور پر ہے ایک یہ کہ وہ سعی و عمل خدا کے قانونِ شرعی کی پابندی میں ہو اور یہ شخص چونکہ اپنے آپ کو کسی بالاتر قانون کا تابع نہیں سمجھتا تو وہ قانونِ شرعی کی پابندی کیوں کرے گا اور دوسرے یہ کہ اس سعی و عمل میں دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابی پیش نظر ہو اور یہ شخص چونکہ آخرت کو ہی تسلیم نہیں کرتا تو اس کی کامیابی اس کے پیشِ نظر کیسے رہ سکتی ہے تو یہ دو شرطیں جہاں وجود میں نہیں آئیں گی وہاں یقیناً اعمال ضائع ہوں گے اور اللہ کی جانب سے ان کی نتیجہ خیزی کو روک دیا جائے گا اور وہ اعمال ہر طرح کے اجر و ثواب سے محروم رہیں گے۔ اب اس کی قسمت اعمال کے ہاتھ میں ہوگی دنیا میں بھی وہ اپنے اعمال کے زخم چاٹے گا اور آخرت میں بھی انہیں اعمال کے شعلے اس کا مقدر بن جائیں گے۔

Marfat.com

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ
حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ
وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا
سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ
يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ
مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ
مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ
بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ
وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ
رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنالیا تھا' ایک دھڑ جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ نہ وہ ان سے بات کرسکتا ہے اور نہ ان کو راستہ دکھا سکتا ہے' اس کو وہ بنا بیٹھے اور وہ اپنے اوپر بڑے ظلم ڈھانے والے تھے۔ جب وہ پچھتائے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ بے شک گمراہ ہو گئے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ اور جب موسیٰ رنج اور غصہ سے بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف پلٹے تو کہا تم نے میرے پیچھے میری بہت بری جانشینی کی کیا تم نے اللہ کے حکم سے پہلے ہی جلد بازی کر دی اور اس نے تختیاں ایک طرف رکھ دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر

Marfat.com

اپنی طرف کھینچنے لگا وہ بولا اے میرے ماں جائے قوم کے لوگوں نے مجھے دبا لیا قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے تو میرے اوپر دشمنوں کے ہنسنے کا موقع نہ دے اور میرا شمار ظالموں کے ساتھ نہ کر۔ موسیٰ نے دعا کی اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما تو ارحم الرحمین ہے۔

☆ ☆ ☆

گذشتہ رکوع کی تصریحات سے یہ بات پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ پروردگار نے بنی اسرائیل کی تعلیم و تربیت کے لئے خصوصی انتظام فرمایا تھا انہیں عام معمول سے ہٹ کر الواح کی شکل میں تحریری کتاب عطا فرمائی اور پھر بار بار اس کتاب کو تھامنے اور اس پر عمل کرنے کی تلقین بھی فرمائی اور مزید یہ بات بھی کہ جس رویے کے باعث اللہ کی کتاب سے استفادہ اور استفاضہ میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے اسے بھی پوری طرح کھول کر بیان کر دیا تا کہ بنی اسرائیل کسی طرح بھی اللہ کی کتاب سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہ کریں اور اپنے عہد غلامی میں وہ جس طرح اپنے سیرت و کردار کو برباد اور اپنی فکری قوتوں کو تباہ کر چکے ہیں اس کی از سر نو تعمیر میں انہیں نہ صرف آسانی پیدا ہو بلکہ وہ بہتر سے بہتر سیرت و کردار کی تشکیل کر سکیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پروردگار کی ان تمام عنایات کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کیا اگلی آیت کریمہ میں اس کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ وَلَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ۝

''اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا لیا تھا' ایک دھڑ جس سے بھاں بھاں کی آواز نکلتی تھی کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ نہ وہ ان سے بات کر سکتا ہے اور نہ ان کو راستہ دکھا سکتا ہے' اس کو وہ بنا بیٹھے اور وہ اپنے اوپر بڑے ظلم ڈھانے والے تھے''۔ 148

ہم گذشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے تورات لینے کے لئے گئے اور جاتے وقت اپنی قوم سے کہہ گئے کہ میں تیس راتوں کے بعد واپس آ جاؤں گا وہاں حکمت خداوندی کے تحت انہیں چالیس راتیں قیام کرنا پڑا چنانچہ یہ جو دس دن کی تاخیر ہوئی اس سے فائدہ اٹھا کر مفسدین میں سے بعض لوگوں کو جو بنی اسرائیل میں موجود تھے اور ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتے تھے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا انہوں نے اپنے سردار سامری کو آگے بڑھایا اور سامری جو اپنے تعلقات اثر و رسوخ اور شعبدہ بازیوں کے باعث پہلے سے بنی اسرائیل میں معروف تھا اس نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم نے وہ زیورات جو آل فرعون کی بیگمات سے اپنے کسی تہوار میں پہننے کے لئے مستعار لئے تھے' اور پھر تم مصر سے نکل آنے کے باعث انہیں واپس نہ کر سکے اب اگرچہ وہ کفار کا مال ہونے کی وجہ سے تمہارے پاس مال غنیمت ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں چونکہ مال غنیمت کا استعمال کرنا حلال نہیں۔ اسلئے سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم شرعاً ان زیورات کو اپنے لئے استعمال نہیں کر سکتے وہ زیورات تم مجھے دو میں تمہارے لئے ایک خدا بناتا ہوں' چنانچہ اس نے بنی اسرائیل کے تمام سونے کے زیورات کو ڈھال کر بچھڑے جیسا ایک جسم تیار کیا اور اسے اس ترکیب سے تشکیل کیا کہ اس میں سے بھاں بھاں کی آوازیں نکلنے لگیں' سامری نے یہ بچھڑا لوگوں کو دکھاتے ہوئے کہا کہ موسیٰ تو نہ جانے کہاں گم ہو گیا لیکن وہ جس خدا کی تلاش میں گیا تھا وہ یہی تمہارا خدا ہے بنی اسرائیل چونکہ صدیوں تک مصر کی غلامی میں رہ کر مشرکانہ رسوم و روایات کو قبول کر چکے تھے اور انہوں نے

Marfat.com

بہت حد تک اپنے آپ کو مصریوں کے رنگ میں رنگ لیا تھا اور مصریوں میں گوسالہ پرستی کا عقیدہ قدیم عقیدہ تھا ہندوؤں کی طرح وہ گائے کو نہ صرف مقدس جانتے تھے بلکہ اس کی پوجا کرتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے ایک بڑے دیوتا حورس کا منہ گائے کی شکل کا تھا اور وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ کرۂ زمین گائے کے سر پر قائم ہے' چنانچہ غلامی کے مکروہ اثرات ابھی تک بنی اسرائیل میں باقی تھے اسلیئے وہ سامری کے بہکاوے میں آ گئے اور انہوں نے اس کے بنائے ہوئے گوسالہ کی پوجا شروع کر دی۔

سامری کون تھا؟ اور اس کے کارنامے کی حقیقت:

یہاں دو تین باتیں قابل وضاحت ہیں اسلیئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے ان کی وضاحت کر دی جائے 1- اس آیت کریمہ میں اگرچہ سامری کا نام نہیں لیا گیا جس نے بچھڑا تیار کیا تھا لیکن سورہ طٰہ میں اس کا نام لے کر اس کی کارگزاری کی تفصیل بیان کی گئی ہے اس لئے میں سب سے پہلے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ سامری کون تھا' اگرچہ اس کے بارے میں علما میں اختلاف ہے لیکن جو بات زیادہ قرینِ حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ' وہ ہے جسے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے' وہ لکھتے ہیں کہ سامری اس کا نام تھا یا قومیت کا لقب' قیاس کہتا ہے کہ یہاں سامری سے مقصود سمیری قوم کا فرد ہے، کیوں کہ جس قوم کو ہم نے سمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے۔ عربی میں اس کا نام قدیم سے سامری آ رہا ہے اور اب بھی عراق میں ان کے بقایا اسی نام سے پکارے جاتے ہیں' یہاں قرآن کا سامری کہہ کے اسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں ہے اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ وفرات کے دوآبے میں دو مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں ان میں سے ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی دوسری جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے اتری' سمیری تھی اسی قوم کے نام سے تاریخ قدیم کا شہر سامرہ آباد ہوا تھا جس کا محل اب ''تل العبید'' میں دریافت ہوا ہے اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے کے بنے ہوئے زیور اور سنہری ظروف برآمد ہوئے ہیں۔

سمیری قوم کی اصل کیا تھی؟ اس بارہ میں اس وقت تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے لیکن نینوا میں اشوری پال (متوفی ۶۲۶ قبل مسیح) کا جو کتب خانہ نکلا ہے اس میں تختیوں کا ایک مجموعہ لغت کی کتاب کا بھی ہے جس میں اکادی اور سمیری زبان کے ہم معنی الفاظ جمع کئے گئے ہیں' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمیری زبان کے اصوات' سامی حروف کے اصوات سے چنداں مختلف نہیں تھے یہ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی دراصل ان ہی قبائل کے مجموعہ سے کوئی بعیدی تعلق رکھتے ہوں جن کے لئے ہم نے تورات کی اصطلاح سامی اختیار کر لی ہے...... بہرحال سمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا، مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے' مصر کے ان سے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبلِ مسیح تک روشنی میں آ چکا ہے' پس معلوم ہوتا ہے اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی معتقد ہو گیا اور جب بنی اسرائیل نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا اسی کو قرآن نے ''السامری'' کے لفظ سے یاد کیا ہے' گائے' بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی۔

خوار کی تحقیق:

2- اس آیت کریمہ میں خوار کا لفظ آیا ہے اس کا معنی ہے بیل کے ڈکرنے کی آواز یعنی جس طرح بیل اور گائے بھاں بھاں کرتے ہیں اسی

Marfat.com

طرح یہ بچھڑا جو سامری نے بنایا تھا اس سے بھی اس طرح کی آواز نکلتی تھی بعض لوگوں کو اس کی وضاحت کرتے ہوئے مشکل پیش آئی ہے اس کی عجیب و غریب تاویلیں کی گئی ہیں' حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ سامری ایک ہوشیار اور عیار آدمی تھا وہ مصر میں رہ کر نہ صرف بت پرستی سیکھ چکا تھا' بلکہ بت گری میں بھی ماہر تھا جن شہروں اور جن ملکوں میں بت پرستی کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہاں بت گری کا فن بھی اپنے عروج پر ہوتا ہے مصریوں نے بھی معلوم ہوتا ہے بت گری کے فن میں کافی ترقی کی تھی یقیناً انہوں نے اس فن میں ایسی ایسی شعبدہ بازیاں کی ہوں گی جس سے لوگوں میں بت پرستی کو فروغ ملے اور بتوں کو محض بے جان اور پتھر کی مورتیاں نہ سمجھیں بلکہ ان کے اندر مختلف قسم کی قدرتوں کا بھی انہیں یقین آئے چنانچہ تاریخ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بت گری کے فن کے ساتھ ساتھ لوگوں نے ہمیشہ مختلف قسم کے عجائب و غرایب بھی پیدا کیے جس سے مقصود صرف لوگوں کی عقلوں کو دھوکہ دے کر بت پرستی کو قابل قبول بنانا ہوتا تھا' ہندوستان میں سب سے بڑا مندر اور اس کے اندر سب سے بڑا بت سومنات کے نام سے مشہور رہا ہے اور اس کی قدرتوں کا اس قدر چرچا تھا کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ بت باقی تمام بتوں سے زیادہ طاقتور ہے اور اس کی گستاخی کرنے والا بھسم ہونے سے کبھی نہیں بچ سکتا' چنانچہ جب محمود غزنوی نے اسے فتح کرنے کا ارادہ کیا تو پورے ہندوستان میں جہاں مقابلے کی تیاریاں ہونے لگیں وہیں خوشی کی ایک لہر بھی دوڑ گئی کہ اب محمود غزنوی اور اس کے ساتھیوں کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا' لیکن جب ہم سومنات کی اس شہرت اور بے پناہ قوت کا راز معلوم کرنے کوشش کرتے ہیں تو اس میں بھی ہمیں یہی شعبدہ بازی دکھائی دیتی ہے' کہا جاتا ہے کہ سومنات کا بت ایک بڑے ہال میں فضاء میں معلق تھا جب کہ اس کا وزن منوں تک پہنچتا تھا لیکن اسے نہ کسی سہارے نے اٹھا رکھا تھا اور نہ کوئی زنجیر اسے تھام رہی تھی بلکہ وہ بغیر کسی سہارے کے اس ہال کے عین وسط میں آلتی پالتی مارے فضا میں براجمان تھا۔ جو شخص اسے پہلی نگاہ میں دیکھتا وہ مبہوت ہو کر رہ جاتا کہ منوں وزن رکھنے والا یہ دھاتوں سے بنا ہوا بت اگر بے جان اور بے قوت ہے تو آخر فضاء میں کس طرح بغیر سہارے کے لٹک رہا ہے لیکن اس کی ساری قوت کا راز صرف ایک در پردہ ہوشیاری اور عیاری میں مضمر تھا اور وہ یہ بات تھی کہ اس ہال کی دیواریں مقناطیس سے بنائی گئیں تھیں اور اس کی چھت اور اس کے فرش میں بھی مقناطیس لگایا گیا تھا' چنانچہ اسی مقناطیس کی قوت نے اس دھات سے بنے ہوئے بت کو ہر طرف سے پوری قوت سے کھینچ کر فضاء میں معلق کر دیا تھا اب جب تک اس کا توازن باقی رہتا ہے اور کسی طرف کی کشش میں کمی نہیں آتی بت کے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ تکنیک آج بھی مختلف کھلونوں میں استعمال ہوتی ہے اور بڑی بڑی مشینوں میں بھی اب چونکہ یہ ایک جانی پہچانی بات ہے تو کسی کو تعجب نہیں ہوتا لیکن اس وقت ہر دیکھنے والا یہی سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ اس بت کی کرشمہ آرائی ہے چنانچہ محمود غزنوی کی ذہانت نے شائد اس کا اندازہ کر لیا' چنانچہ جیسے ہی انہوں نے اس بت کی ایک جانب گرز مار کر مقناطیسی قوت کو غیر متوازن کیا تو بت زمین پر دھڑام سے گر گیا۔

مصر کا اسوان بند وہاں تعمیر کیا گیا ہے جہاں کبھی ابوسمبل کا قدیم اور عظیم مندر قائم تھا چنانچہ بند کی تعمیر کے لئے جب اس کے ہٹانے کا وقت آیا' تو باقاعدہ بین الاقوامی اہتمام میں اسے دوسری جگہ منتقل کیا گیا کیونکہ اقوام متحدہ کے مستقل ممبران جو تمام کے تمام غیر مسلم ہیں وہ اگرچہ علم و ہنر کی روشنی کے دعویدار ہیں اور کبھی بھی بت پرستی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پوری غیر مسلم دنیا بالعموم اور مغرب بالخصوص کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ بتوں کو توڑا جائے وہ اسے آثار قدیمہ کا نام دے کر تحفظ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے سامنے لاکھوں انسانوں کا خون بہہ جائے عراق میں مسلمانوں کا اثاثہ تباہ ہو جائے مذہبی تبرکات جو ظاہر ہے صدیوں کا سرمایہ ہیں انہیں آگ لگا دی جائے انہیں کبھی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ ان کی اپنی فوج اس کی تباہی میں شریک ہوتی ہے لیکن اگر کہیں کسی بت کی ناک بھی پھوڑ دی جائے تو یہ سر تا پا غضب بن جاتے ہیں اگر انہیں آثار قدیمہ سے محبت

Marfat.com

ہوتی تو عراق ان کے سامنے کبھی نہ لٹتا۔ کیونکہ عراق میں ایسے ایسے تاریخی آثار موجود تھے جس میں صدیوں پہلے کے قرآنِ پاک کے نادر نمونے ہی نہیں بلکہ عراق میں بڑے بڑے بپاء ہونے والے حق وباطل کے معرکوں کی پوری تفصیلات مجسم شکل میں موجود تھیں اسلام اگرچہ ان چیزوں کوزیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن وہ یورپ کے ذوق کے بے حد قریب تھیں لیکن ان کو صرف اس لئے تباہ ہونے دیا کہ ان کا رشتہ اسلام سے تھا لیکن بت پرستی سے ان کا تعلق اس حد تک نازک ہے کہ افغانستان میں اگر بت کے مجسمے ٹوٹ جائیں تو یورپ کا پورا میڈیا سراپا احتجاج بن جاتا ہے اس لئے ابوسمبل کے اس عظیم مندر کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں دوسری جگہ منتقل کیا گیا اس حوالے سے جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ نے اس بات کو نمایاں کر کے شائع کیا کہ اس مندر میں بادشاہ (فرعون) اور اس کی ملکہ کے اسٹیچو ایسے زاویے سے نصب کئے گئے تھے کہ سال میں جو تاریخ بادشاہ کی ولادت کی ہوتی اس دن سورج کی پہلی کرنیں بادشاہ کی پیشانی پر پڑتیں یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ بادشاہ واقعی سورج کا اوتار ہے اس لئے اسے لوگوں سے اپنے آپ کو رب منوانے کا ہر طرح کا حق ہے اگر وہ واقعی اہلِ زمین کا رب نہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے یوم پیدائش پر سورج کی کرنیں اس کی پیشانی کو بوسہ دیتیں۔

ان حوالوں سے ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ بت پرستی کے دور میں بت گری کی صنعت اس طرح عروج پذیر رہی ہے کہ جس میں کرشمہ آرائیاں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں اور ان کرشموں کی مدد سے بتوں کی خدائی مستحکم کی جاتی رہی ہے اس لئے سامری نے اگر اپنی مہارت فن سے بچھڑے کے قالب میں اس طرح کی ترتیب قائم کی جس سے ہوا کے گزرنے سے بھاں بھاں کی آواز آنے لگی تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے غیر معمولی قدرت کا اظہار سمجھا جائے لیکن اس نے لوگوں کی عقلوں کو ماؤف کرنے کے لئے مزید یہ دعویٰ کیا کہ یہ جو بچھڑے میں زندگی کے آثار دیکھ رہے ہو کہ وہ تمہیں بھاں بھاں کرتا سنائی دیتا ہے تو وہ اس لئے ہے کہ جب تم بحرِ قلزم عبور کر رہے تھے تو میں نے جبریل علیہ السلام کو گھوڑے پر سوار وہاں سے گزرتے دیکھا تھا جہاں ان کے گھوڑے کا سم پڑتا تھا وہیں سبز گھاس اگ آتی تھی میں سمجھ گیا کہ قدرت نے اس کے پاؤں میں زندگی کا اثر رکھا ہے جو ہر اس چیز میں پیدا ہو جاتا ہے جس پر وہ اپنا پاؤں رکھ دے۔ چنانچہ وہاں سے میں نے مٹی کی ایک مٹھی اٹھالی اور وہ مٹی میں نے اس بچھڑے میں ڈال دی یہ اسی کا اثر ہے کہ وہ بولنے لگا ہے اس طرح اس نے اپنے مکاشفے کا اعلان کیا تاکہ لوگ صرف بچھڑے کی پوجا ہی نہ کریں بلکہ اس کی بزرگی کے بھی قائل ہو جائیں اس کی وضاحت میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ کافر اپنی قوم کو فریب دینے کی کوشش کر رہا ہے اور اسی سلسلے میں وہ اپنے مکاشفے کا بھی ذکر کرتا ہے' اس سیاق وسباق میں اس کافر کے مکاشفے کی حیثیت سوائے فریب کے اور کیا رہ جاتی ہے یقیناً اس نے ایک بات گھڑی تاکہ لوگ اس کی بات کو آسانی سے تسلیم کرلیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اپنے اس مکاشفے کا اظہار کیا تو بجائے اس کے کہ آپ اس کے مکاشفے کا نوٹس لیتے آپ نے اسے ہرگز درخورِ اعتناء نہیں سمجھا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ سراسر ایک جھوٹ اور فریب ہے آپ نے اس کے جواب میں جو فرمایا اس میں ایک طرف تو اس کی شخصیت کا بھرم کھولا اور دوسری طرف اس کے بچھڑے کی حقیقت واضح کی آپ نے فرمایا کہ تیرے لئے دنیا میں اب صرف یہ سزا تجویز کی گئی ہے کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے اور جب کوئی انسان تیرے قریب آئے تو اسے بھاگتے ہوئے یہ کہے کہ دیکھنا مجھ کو ہاتھ نہ لگانا یہ تو دنیوی عذاب ہے اور قیامت میں ایسے نافرمانوں اور گمراہوں کیلئے جو عذاب مقرر ہے وہ تیرے لئے وعدۂ الٰہی کی صورت میں پورا ہونے والا ہے یہ تو قرآن کریم کا بیان ہے لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس کی یہ حالت بنا دی کہ وہ کسی کو چھوتا تھا تو اسے بخار ہو جاتا تھا یا کوئی اسے چھوتا تھا تو وہ بھی بخار میں مبتلا ہو جاتا تھا اور یہ خود ہر وقت بخار میں پھنکتا رہتا تھا اور باہر جنگل میں جانوروں کے ساتھ گھومتا پھرتا' آبادی میں کوئی اس کو منہ لگانے کو تیار نہیں تھا اور جہاں تک تعلق ہے اس بچھڑے کا جسے خدا کے طور پر پیش کیا گیا تھا اس کے بارے میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے سامری یہ بھی دیکھ

Marfat.com

کہ تو نے جس گوسالہ کو معبود بنایا تھا اور اس کی پوجا کی طرف تو نے لوگوں کو دعوت دی تھی ہم ابھی اس کو آگ میں ڈال کر خاک کئے دیتے ہیں اور اس خاک کو دریا میں پھینکے دیتے ہیں تاکہ تجھ کو اور تیرے ان بے وقوف پیروکاروں کو معلوم ہو جائے کہ تمہارے معبود کی قدر و قیمت اور طاقت و قوت کا یہ حال ہے کہ وہ دوسروں پر عنایت و کرم تو کیا کرتا خود اپنی ذات کو ہلاکت و تباہی سے نہ بچا سکا۔

اللہ کی نعمتوں کی ناسپاسی عقل کو ماؤف کر دیتی ہے:

قرآنِ کریم نے اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کی بے وقوفی، عقلی بے مائیگی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ناقدری اور ناسپاسی کو ظاہر فرمایا ہے کہ ذرا اس قوم کا حال دیکھئے کہ اب تک کس طرح انہوں نے قدم قدم پر اللہ کی قدرتوں کا اظہار دیکھا، کس طرح صدیوں کی غلامی سے اللہ نے ان کیلئے نجات کا سامان پیدا فرمایا جب دشمن ان کے سر پر پہنچ گیا تو نہ صرف کہ اللہ نے ان کی حفاظت فرمائی بلکہ دشمن ان کی آنکھوں کے سامنے غرق کر دیا گیا پھر صحرائے سینا میں جہاں ضروریات زندگی کا کوئی اہتمام نہیں کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی ضروریات کو پورا فرمایا اور ایک پیغمبر کی بے مثال قیادت کس طرح ہر معاملے میں ان کی راہنمائی کرتی رہی لیکن کس قدر دکھ اور حیرانی کی بات ہے کہ ایک معمولی بچھڑے کو دیکھ کر یہ اپنے خدا کو بھول گئے اللہ کی تمام کرم فرمائیاں ان کی نگاہ سے اوجھل ہو گئیں اس کی بے پناہ قدرتوں کو بالکل ذہن سے نکال دیا اور عقل کے ایسے دشمن نکلے کہ ایک ایسا بچھڑا جس کو صحیح شکل بھی نصیب نہیں بلکہ ایک دھڑ کے سوا کچھ نہیں نہ وہ بات کر سکتا ہے نہ کسی کو راستہ دکھا سکتا ہے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ ایک اچھا بھلا آدمی اگر بولنے کی صلاحیت سے محروم ہو تو کوئی اس کو اپنا راہنما ماننے کو تیار نہیں چہ جائیکہ اپنا خدا مان لے اور یہ بچھڑا تو ایک حیوان بلکہ محض حیوان کا دھڑ جو انسان کی سطح کو بھی نہ پہنچ سکا اور وہ بولنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا اگر بول بھی سکتا تو زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے کہ وہ انسان کی منزل کو پہنچ گیا ہے اور پھر اس میں ایسی بھی کوئی صلاحیت نہیں کہ وہ لوگوں کو راستہ دکھا سکے اور کوئی راہنمائی کر سکے تو آخر ان بدبختوں نے بچھڑے کی پوجا کیا سوچ سمجھ کر کی۔ اس کے بعد کے جملے میں مزید ان کی حماقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ حماقت کرنے کو تو کر بیٹھے اور انہوں نے اس بچھڑے کو معبود بنا لیا لیکن جب سوائے بھاں بھاں کے ان کو اور کچھ سنائی نہ دیا تو اب وہ پریشان ہو کر سوچنے لگے اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم نے واقعی یہ حرکت کر کے اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم کیا ہے ہمیں اللہ نے عقل عطا کی تھی ہم نے یہ حرکت کر کے عقل پر بھی ظلم ڈھایا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے شرف انسانیت سے نوازا تھا اور اشرف المخلوقات بنایا تھا ہم نے ایک حیوان کے دھڑ کے سامنے جھک کر اپنا تمام شرف خاک میں ملا دیا۔ عام لوگ تو یہی سمجھ سکے کہ ہم نے ایک ظلم کا راستہ اختیار کیا ہے یعنی ہم نے اپنے ساتھ زیادتی کی لیکن جو نسبتاً سمجھدار لوگ تھے ان کے احساسات ان سے کچھ زیادہ بہتر تھے اس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْلَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○

"جب وہ پچھتائے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ بے شک گمراہ ہو گئے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے"۔ 149

اس آیت کریمہ میں سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ کا محاورہ استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم عام طور پر 'نادم ہونا' اور 'شرمندہ ہونا' ہوتا ہے لیکن اس کا لازمی نتیجہ چونکہ متنبہ ہونا بھی ہے اس لئے کبھی اس کا ترجمہ متنبہ ہونا بھی کیا جاتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ جو لوگ بالکل گئے گزرے

Marfat.com

ان کی تو خیر بات چھوڑیئے البتہ جن لوگوں میں سوجھ بوجھ موجود تھی وہ عوامی جوش میں مبتلا ہو کر بروقت صحیح فیصلہ کرنے سے تو محروم رہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ ہمارے سامنے ایک بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا ہے جسے معبود کہا جا رہا ہے تو وہ یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوئے اور انہیں اس بات پر انتہائی ندامت ہوئی کہ ہم عوامی جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے ایک ایسی حماقت کر بیٹھے ہیں کہ ایک ہوش مند آدمی سے کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی بات کو دل کی گہرائیوں سے قبول نہیں کرتے بلکہ محض رواروی میں کسی راستے پر چل پڑتے ہیں وہ عموماً ایسے حوادث کا شکار ہوتے ہیں۔ اجتماعی زندگی میں اس طرح کے واقعات کا پیش آنا کوئی تعجب خیز نہیں تاریخ میں ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی شیطان صفت لیڈر اٹھا اور اس نے عوام کے سامنے خواہشات کا ایسا جال پھیلایا اور جذبات سے ایسا ان کو اندھا کیا کہ وہ اندھوں کی طرح اس کے پیچھے چل پڑے اور جب تباہی سامنے نظر آئی تو پھر سوچنے سمجھنے والے لوگ پریشان ہوئے کہ ہائیں ہم کیا کر بیٹھے ان میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کو اس حادثے کے بعد ہوش آیا اب وہ اس بات کی تہہ کو پا گئے کہ ہم فریب کھا گئے اور ہم واقعی گمراہ ہو گئے۔ اب بجائے اس کے کہ اس پر تاویلوں کے پردے ڈالے جائیں سیدھا راستہ یہ ہے کہ ہم ایک بہت بڑی ٹھوکر کھا چکے ہیں اب ہمیں اس سے بچانے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اس لئے اس کے بعد انہوں نے اللہ سے التجا کرنا شروع کی اور کہا کہ اے رب اگر آپ نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارے اس جرم کو معاف نہ کیا تو ہم نامراد ہو جائیں گے ہماری دنیا بھی تباہ ہو جائے گی اور آخرت میں بھی بدترین عذاب کا شکار ہوں گے۔ کشمکش یہاں تک پہنچی تھی اور کچھ بہتری کے آثار نمودار ہونے لگے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس تشریف لے آئے۔ اگلی آیت کریمہ میں اس کا اور اس کے بعد کے حالات کا ذکر کیا جا رہا ہے:

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسٰى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا لا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْ بَعْدِیْ ج اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ج وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ط قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِیْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ O قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ O

''اور جب موسیٰ رنج اور غصہ سے بھرے ہوئے اپنی قوم کی طرف پلٹے تو کہا تم نے میرے پیچھے میری بہت بری جانشینی کی کیا تم نے خدا کے حکم سے پہلے ہی جلد بازی کر دی اور اس نے تختیاں ایک طرف رکھ دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا وہ بولا اے میرے ماں جائے قوم کے لوگوں نے مجھے دبا لیا قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے تو میرے اوپر دشمنوں کے ہنسنے کا موقع نہ دے اور میرا شمار ظالموں کے ساتھ نہ کر۔ موسیٰ نے دعا کی اے میرے پروردگار مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما تو ارحم الرحمین ہے''۔ 150-151

قرآنِ کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ طور پر ہی پروردگار نے موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا تھا کہ آپ کی قوم گوسالہ پرستی کے فتنے میں مبتلا ہو گئی ہے چنانچہ یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بے چین ہونا بلکہ غضب ناک ہونا تقاضائے فطرت تھا کیونکہ ہر پیغمبر کی دعوت کا عنوان توحید ہوتا ہے اور یہی پورے دین کی اساس بھی ہے ان کی ساری اصلاحی کاوشیں اسی نقطے پر مرتکز ہوتی ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں کئی سال تک اور اب صحرائے سینا میں آنے کے بعد شب وروز یہی تصور اور یہی عقیدہ بنی اسرائیل کے دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش فرمائی کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں لیکن عجیب بات ہے کہ وہ اب تک غلامی کے اثرات سے جان نہیں چھڑا سکے تھے اس لئے وہاں رہ کر جن غلط عقائد کو اختیار کر چکے تھے ان میں سب

Marfat.com

سے بڑا عقیدہ عجل پرستی کا تھا چنانچہ جیسے ہی موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں چند شر پسندوں نے ان کے سامنے اس کا امکان پیدا کیا تو وہ فوراً اس میں مبتلا ہو گئے چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ اپنی برسوں کی محنت لٹتی ہوئی دیکھی تو وہ سر تا پا غضبناک ہو گئے۔ اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ جب وہ واپس آئے تو وہ غصے میں بھڑک رہے تھے اور تاسف کا انتہاء درجہ شکار تھے۔ غصہ انہیں ان شر پسندوں کی کامیاب شرارت پر تھا اور غم وافسوس اپنی قوم کی نادانی اور جہالت پر، چنانچہ انہوں نے آتے ہی سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی جو اپنے اپنے قبیلوں میں ذمہ دار سمجھے جاتے تھے اور جنہیں قبیلے کی راہنمائی اور نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ انہیں ڈانتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تم نے میری جانشینی کا کیا خوب حق ادا کیا۔ کیا تم نے یہ سمجھ لیا کہ موسیٰ کے آنے میں اگر چند دن تاخیر ہو گئی ہے تو تمہیں یہ حق مل گیا ہے کہ تم اپنے طور سے جسے چاہو اپنا معبود بنا لو اگر پیغمبر کہیں غیر حاضر ہو تو کیا قوم کو اس بات کا حق مل جاتا ہے کہ وہ اس کی تعلیمات کے یکسر برعکس دوسرے طور اطوار اختیار کر لے تم نے آخر یہ جو کچھ کیا ہے تمہارے پاس اس کا کیا جواز تھا اور یا اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّكُمۡ کا دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ تم نے یہ سمجھ لیا کہ موسیٰ موت کا شکار ہو گئے اس لئے وہ واپس اب تک نہیں آئے اور اب وہ کبھی نہیں آئیں گے لہٰذا ہمیں اپنے طور سے فیصلہ کرنے کا حق مل گیا ہے اگر خدانہ کرے ایسا بھی ہوتا تو کیا تم اللہ کے پیغمبر کی تعلیمات کو یکسر الٹ دینے کے مجاز بن گئے تھے اس کے بعد غصے میں بھرے ہوئے حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف پلٹے کیونکہ اصلاً تو قوم کی نگرانی اور اصلاح کی ذمہ داری انہی پر تھی وہ اللہ کے نبی بھی اور موسیٰ علیہ السلام کے جانشین بھی۔ چنانچہ انہیں سر سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگے اور برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ قوم بگڑتی رہی حتیٰ کہ شرک کے کوئیں میں جا گری اور تم آرام سے انہیں دیکھتے رہے لیکن حضرت ہارون علیہ السلام نے نہایت شفقت، نرمی اور محبت کے ساتھ فرمایا کہ اے میری ماں جائے غلط سمجھ رہے ہو کہ میں نے انہیں روکنے میں کوئی تساہل کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی ہمت سے بڑھ کر انہیں روکنا چاہا ہے لیکن اس قوم نے نہ صرف کہ میری بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ وہ میرے قتل پر تل گئے۔ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر میں نے سختی سے انہیں روکنا چاہا تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے تو جان لو ہے کہ یہ فتنہ اٹھانے والے کون ہیں میں نے اپنی پوری توانائیاں ان کے روکنے میں استعمال کی ہیں تو یہ خیال نہ کر کہ میں نے ان شر پسندوں کا ساتھ دیا۔ تو میرے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس سے انہی شر پسندوں کو ہنسنے کا موقع ملے گا وہ در پردہ مذاق اڑائیں گے کہ دیکھو سب کچھ ہم نے کیا اور سزا ہارون کو ملی گئی۔

حضرت ہارون کی برأت:

یہاں قرآن مجید نے ایک بہت بڑے الزام سے حضرت ہارون کی برأت ثابت کی ہے جو یہودیوں نے زبردستی ان پر چسپاں کر رکھا ہے بائبل میں بچھڑے کی پرستش کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ

> جب حضرت موسیٰ کو پہاڑ سے اترنے میں دیر لگی تو بنی اسرائیل نے بے صبر ہو کر حضرت ہارون سے کہا کہ ہمارے لئے ایک معبود بنا دو اور حضرت ہارون نے ان کی فرمائش کے مطابق سونے کا ایک بچھڑا بنا دیا جسے دیکھتے ہی بنی اسرائیل پکار اٹھے کہ اے اسرائیل یہی تیرا وہ خدا ہے جو تجھے ملک مصر سے نکال کر لایا ہے پھر حضرت ہارون نے اس کے کیلئے ایک قربان گاہ بنائی اور اعلان کر کے دوسرے روز تمام بنی اسرائیل کو جمع کیا اور اس کے آگے قربانیاں چڑھائیں (خروج، باب ۳۲: ۹۰-۹۴)

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بصراحت اس غلط بیانی کی تردید کی گئی ہے اور حقیقت واقعہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس جرم عظیم کا مرتکب اللہ کا نبی ہارون نہیں بلکہ اللہ کا باغی سامری تھا۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سورۃ طٰہٰ آیات: ۹۰-۹۴)

Marfat.com

انبیاء سے متعلق بنی اسرائیل کا رویہ:

بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہی ان میں سے کسی کی سیرت کو بھی انہوں نے داغدار کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے اور داغ بھی ایسے سخت لگائے ہیں جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں' مثلاً شرک' جادوگری' زنا' جھوٹ' دغابازی اور ایسے ہی دوسرے شدید معاصی جن سے آلودہ ہونا پیغمبر تو درکنار ایک معمولی مومن اور شریف انسان کے لئے بھی سخت شرمناک ہے۔ یہ بات بجائے خود انتہائی عجیب ہے لیکن بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملہ میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ قوم جب اخلاقی و مذہبی انحطاط میں مبتلا ہوئی اور عوام سے گزر کر ان کے خواص تک حتیٰ کہ علماء و مشائخ اور دینی منصب داروں کو بھی گمراہیوں اور بد اخلاقیوں کا سیلاب بہالے گیا تو ان کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کے لئے عذرات تراشنے شروع کئے اور اسی سلسلہ میں انہوں نے وہ تمام جرائم جو یہ خود کرتے تھے' انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کر ڈالے تا کہ یہ کہا جاسکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملہ میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے، ہندوؤں میں بھی جب اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں' رشیوں' منیوں اور اوتاروں کی' غرض جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے ہوسکتے تھے ان سب کی زندگیاں بد اخلاقی کے تارکول سے سیاہ کر ڈالی گئیں تا کہ یہ کہا جاسکے کہ جب ایسی ایسی عظیم الشان ہستیاں ان قبائح میں مبتلا ہوسکتی ہیں تو بھلا ہم معمولی فانی انسان ان میں مبتلا ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں اور پھر جب یہ افعال اتنے اونچے مرتبے والوں کے لئے بھی شرمناک نہیں ہیں تو ہمارے لئے کیوں۔

القی الالواح کا مفہوم:

اس آیت کریمہ میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب غضب ناک حالت میں اپنی قوم کی طرف تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلے اپنی قوم کے معززین کو سرزنش کی اور اس کے بعد جن پر اصل میں بنی اسرائیل کی اصلاح کی ذمہ داری تھی یعنی حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں سر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا گویا زبان سے ہی نہیں ہاتھوں سے بھی غصہ کا اظہار کیا' ہاتھوں کو استعمال کرتے وقت انہیں ان الواح کو ہاتھوں سے رکھنے کی ضرورت پیش آئی جن پر تورات لکھی ہوئی تھی اور حضرت موسیٰ انہیں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھے اس کو قرآن کریم نے ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ اس کا بعض بزرگوں نے ترجمہ کیا ہے کہ موسیٰ نے تختیاں پھینک دیں اور پھر خود ہی سوال اٹھایا ہے کہ ان تختیوں پر چونکہ تورات لکھی ہوئی تھی اس لئے ان کا پھینکا جانا کتاب اللہ کی توہین کے مترادف تھا' اور کتاب اللہ کی توہین گناہ کبیرہ ہے اور موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں ان سے گناہِ کبیرہ کا صدور کیسے ہوگیا حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سارا غصہ اور غضب اس بات پر ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو زندگی کی راہنمائی کے لئے کتاب عطا فرمائی اور انہوں نے بجائے اس کا انتظار کرنے کے گوسالہ پرستی شروع کر دی اس طرح سے انہوں نے اللہ کی کتاب کی توہین کی چنانچہ آپ اسی توہین پر برافروختہ ہیں کس قدر عجیب بات ہے کہ آپ جس کتاب کی عزت و حرمت اور عظمت کی بحالی کے لئے اپنی قوم سے بلکہ اپنے بھائی سے الجھ رہے ہیں یہ سمجھ لیا گیا کہ خود حضرت موسیٰ نے اسے پھینک کر اس کی توہین کی حالانکہ معمولی غور و فکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اَلْقٰی کا ترجمہ جس طرح پھینکنا ہوتا ہے اسی طرح ایک طرف ڈال دینا بھی ہوتا ہے آپ نے حمیتِ حق میں ڈوبے ہوئے جب بھائی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ خالی کرنے کے لئے آپ نے تورات کو ایک طرف ڈال دیا تا کہ ہاتھ خالی ہو جائیں ظاہر ہے کہ کتاب کو ایک طرف ڈال دینا یا رکھ دینا

Marfat.com

اس میں توہین کی کوئی بات نہیں' اس مجہول بات کو تقویت تورات نے فراہم کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب تورات پھینکی تو وہ ٹوٹ پھوٹ گئی چنانچہ پھر دوبارہ آپ کو تورات دینے کے لئے کوہِ طور پر بلایا گیا' قرآنِ کریم نے آگے چل کر اس بات کی بھی اصلاح فرمائی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا جب غصہ فرو ہوا تو آپ نے ان الواح کو اٹھا لیا اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ الواح اگر ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکی ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام کس طرح اٹھا سکتے تھے۔

حضرت موسیٰ کی اللہ سے دعا:

حضرت ہارون علیہ السلام کی معذرت اور وضاحت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو اس بات پر اطمینان ہو گیا کہ آپ کے عظیم بھائی نے بنی اسرائیل کو سمجھانے اور گوسالہ پرستی سے روکنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس بات کا وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ نے گوسالہ پرستی میں شرکت یا حوصلہ افزائی کی ہو گی چنانچہ اس اطمینان کے بعد آپ اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور دعا فرمائی کہ یا اللہ! مجھے معاف فرما دے اور میرے بھائی کو معاف کر دے سب سے پہلے اپنے لئے دعا کی کیونکہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ اگر دوسرے کے لئے بھی دعا مانگنا ہو تو پہلے اپنے لئے دعا کرنا چاہیے' اور ممکن ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ احساس بھی ہو کہ میں نے کوہِ طور پر جانے میں جو جلد بازی کی شائد یہ اس کا نتیجہ ہے مجھے اچھی طرح پہلے اطمینان کر لینا چاہیے تھا کہ قوم کے اندر جو مفسدین اور منافقین کا گروہ ہے کہیں میرے بعد وہ کوئی فتنہ اٹھانے میں کامیاب تو نہیں ہو جائیں گے مجھے اس کا سدِ باب کر کے جانا چاہیے تھا اور دوسرا یہ خیال بھی ممکن ہے کہ آپ کو دامن گیر ہو کہ میں نے اپنے بھائی سے جو سختی کی اور یہ گمان کیا کہ انہوں نے قوم کو گوسالہ پرستی سے روکنے میں شائد تساہل سے کام لیا ہے' یہ سراسر میری بدگمانی تھی اور اپنی بدگمانی کی بنا پر میں نے اپنے بھائی سے جو بدسلوکی کی ہے اگرچہ وہ سراسر حمیتِ حق کی بنیاد پر ہے لیکن عین ممکن ہے کہ پروردگار اس پر میرا مواخذہ فرمائے اس لئے ان احساسات کے تحت آپ نے سب سے پہلے اپنے لئے مغفرت طلب کی اور اور پھر اپنے بھائی کے لئے کہ ہر چند میرے بھائی نے پوری طرح بنی اسرائیل کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ آپ سے معمولی درجے کا تساہل ہو گیا ہو کیونکہ آدمی کو اپنے اعمال کے بارے میں کبھی بھی خوش گمان نہیں رہنا چاہیے اپنی اور اپنے بھائی کے لئے مغفرت کی دعا کرنے کے بعد یہ گذارش کی کہ یا اللہ تو ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما کیونکہ تو ہی سب سے بڑا رحم فرمانے والا ہے بنی اسرائیل کو ہدایت کے راستے پر چلانا اور ہر قدم پر ان کی نگرانی کرنا یہ انتہائی کٹھن کام ہے ان کے مزاج کی خرابیوں اور سیرت و کردار کی ناہمواریوں کو دیکھتے ہوئے ہر وقت اندیشہ ہے کہ وہ پروردگار کے غضب کا باعث نہ بنیں اس لئے اے اللہ سلامتی اسی میں ہے کہ تو اپنی رحمت کا سایہ ہم پر تان دے مجھے اور میرے بھائی کو اپنے رحمت کی پناہ میں رکھ تیری رحمت ہی کی سہارے ہم یہ کٹھن کام انجام دینے کی توفیق پا سکتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید اور تقویت کے لئے پروردگار نے بنی اسرائیل کو وعید سنائی تا کہ وہ جس عظیم جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں انہیں اس کے نتائج کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ اگلی آیت کریمہ میں اس کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

....

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ

Marfat.com

سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ
بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَلَمَّا
سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَفِيْ نُسْخَتِهَا
هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَاخْتَارَ مُوْسٰى
قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ
رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ
السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ
تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ
الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ
اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ
وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ
النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ
وَالْاِنْجِيْلِ ؗ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ
يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ

Marfat.com

إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ
وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

بیشک جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے۔ ہم بہتان باندھنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں اور جو لوگ برے عمل کریں پھر اس کے بعد توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں تو اس کے بعد تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا اس نے تختیاں اٹھائیں اور اس کے نوشتہ میں ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں۔ اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا ہمارے وقت مقرر کے لئے جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آ پکڑا' تو موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے سرکار آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے' کیا آپ ہمیں ایک ایسے جرم کی پاداش میں ہلاک کر دیں گے؟ جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا' یہ تو بس آپ کی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعے سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں ہمارے کارساز تو آپ ہی ہیں' پس ہمیں معاف کر دیجئے اور آپ بہترین بخشنے والے ہیں۔ اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے او آخرت کی بھی ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا پروردگار نے ارشاد فرمایا سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے۔۔۔ جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی' جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے بدی سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اٹھاتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں' لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائے اور جو اس کا احترام بجالائے اور جنہوں نے اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے' وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

..........☆......☆......☆..........

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُفْتَرِيْنَ O وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O

Marfat.com

''بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے۔ ہم بہتان باندھنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں اور جو لوگ برے عمل کریں پھر اس کے بعد توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو اس کے بعد تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے''۔152-153

گذشتہ آیتِ کریمہ کے دوسرے جملے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام شائد اپنی ساری قوم کے لئے رحمت کی دعا مانگ رہے ہیں پروردگار نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بنی اسرائیل نے جو جرم کیا ہے وہ ایسا معمولی نہیں کہ بغیر انہیں سزا دیئے معاف کر دیا جائے' انہیں اس پر سزا بھی ملے گی اور ساتھ ہی وہ اللہ کے غضب کے بھی مستحق ہوں گے۔ سزا کا تعلق عموماً آخرت کی سزاؤں سے ہوتا ہے یعنی انسان جو بداعمالیاں کرتا ہے یا کفر کا رویہ اختیار کرتا ہے تو قیامت کے دن اللہ سزا کے طور پر ایسے شخص کو جہنم میں ڈالے گا لیکن جہاں کہیں قرآن کریم نے غضب کا لفظ استعمال کیا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اُخروی سزا کے ساتھ ساتھ دنیوی سزا بھی مراد ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے بارے میں جہاں دنیا میں ان کے لئے ذلت اور مسکنت کی پھٹکار کا ذکر کیا گیا ہے وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ ذلت اور مسکنت کی پھٹکار اس لئے ان پر ماری گئی ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ سے رحمت کی بجائے غضب لے کر لوٹے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام ان کے لئے رحمت کی دعا مانگ رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کی گوسالہ پرستی کی وجہ سے ان پر غضب فرما رہا ہے۔ اس غضب کے نتیجہ میں ان پر کیا کچھ گزر سکتی ہے اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے، البتہ! یہ ممکن ہے کہ اس کے اظہار کی ایک وہ صورت ہو' جس کا ذکر پہلے پارے میں ہو چکا ہے' جہاں ان کے جرم کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط یعنی اپنے آپ کو قتل کرو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود اپنی تلواروں سے اپنی گردنیں کاٹو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں جو لوگ اس فتنۂ شرک اور گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں اپنے اپنے قبیلہ کے ان لوگوں کی گردنیں اپنے ہاتھوں سے ماریں' جنہوں نے قوم کے لئے اس فتنہ کا راستہ کھولا یہ حکم ایک طرف تو اللہ کے غضب کا اظہار تھا لیکن ساتھ ہی یہ حکم ایسی عظیم مصلحتوں کا حامل تھا جس میں قوم کی اصلاح مضمر تھی سب سے پہلی مصلحت اس میں یہ تھی کہ اس طرح توبہ کرنے سے توبہ کی ایک اجتماعی شکل وجود میں آئے گی جس سے بنی اسرائیل کا اجتماعی ضمیر زندہ ہو گا اور اس زندگی کی علامت یہ ہوگی کہ اپنے اندر سے وہ ان لوگوں کو کاٹ پھینکیں گے جنہوں نے عہدِ توحید کو شکست کیا ہے دوسری مصلحت اس میں یہ تھی کہ اس طرزِ عمل سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہت پوری طرح نمایاں ہوگی' جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ شرک ایک ایسی برائی ہے کہ اگر آدمی کا بایاں ہاتھ بھی اس کا ارتکاب کرے تو داہنے ہاتھ کا فرض ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ پھینکے اور پھر بلاتخصیص اس سزا سے جہاں قبیلہ کی عصبیت پر چوٹ پڑی وہیں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ توحید اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ اس پر ہر نسبت کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

آیت کریمہ میں مزید یہ فرمایا گیا کہ گوسالہ پرستی کرنے والوں کو اللہ کے غضب کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سزا بھی ملے گی کہ وہ دنیا کی زندگی میں ذلیل ہو جائیں گے یعنی دنیا میں انہیں حقیقی عزت وعظمت اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک اس طرح کے جرائم سے مکمل طور پر اپنی زندگی کو پاک نہیں کر لیتے لیکن اب جب کہ انہوں نے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر لیا ہے تو کم از کم ارتکاب کرنے والے دوسروں کی نگاہوں میں بری طرح ذلیل ہو کر رہ جائیں چنانچہ پوری قوم کے سامنے ان کو قتل کیا جانا اور ان کے معبود کو جلایا جانا ایک ایسی ذلت کا اظہار ہے جس سے بڑھ کر ذلت کا تصور نہیں کیا جا سکتا البتہ اگلی آیت کریمہ میں پروردگار نے اپنے اس محکم اصول کو بیان فرمایا جو اس کی صفتِ رحمت کا ظہور ہے وہ یہ کہ جو لوگ اپنی اس انتہائی بغاوت سے توبہ کر لیں گے تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا رحم فرمائے گا لیکن اس توبہ میں ایمان کا اضافہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرنے والوں کی توبہ صرف یہ نہیں کہ وہ اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگیں بلکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ انہوں نے جو حرکت کی ہے اس

Marfat.com

کے بعد ایمان باقی نہیں رہتا' ایمان کی بنیاد تو اللہ کو ایک ماننا ہے جب کسی دوسرے کو خدا مان کر یا اس کا اوتار یا اس کا کچھ اور مان کر اس کی پوجا شروع کر دی جائے تو پھر سینے میں ایمان باقی نہیں رہتا اس لئے فرمایا کہ اب ان لوگوں کی توبہ صرف اسی صورت میں قبول ہوگی کہ یہ تجدید ایمان بھی کریں۔

آیئے اپنا جائزہ لیں:

یہاں رک کر قرآنِ کریم کی ان وضاحتوں کی روشنی میں اپنی قومی زندگی کا بھی جائزہ لینا چاہیے بنی اسرائیل پر ذلت کی پھٹکار ماری گئی حتیٰ کہ ان کے جرم کرنے والوں کو تہ تیغ کر دیا گیا، جرم ان کا کیا تھا صرف یہ کہ انہوں نے ایک بچھڑے کو اللہ کے مقابلہ میں معبود مان لیا تھا اور بجائے اللہ کی عطا کردہ کتاب کی راہنمائی کو قبول کرنے کے وہ اس بچھڑے کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ خدا کی ضرورت صرف اتنی ہے کہ اس کی پوجا پاٹ کی جائے اور اس کے سامنے سر جھکایا جائے رہی یہ بات کہ زندگی کا پورا سفر کس کی راہنمائی میں طے ہونا چاہیے' اور زندگی کے اصول وضوابط متعین کرنے کا حق کسے ہونا چاہیے اور ہماری پوری زندگی پر حکمرانی کا حق کسے ملنا چاہیے' تورات کا انکار اور بچھڑے کے سامنے سجدہ ریزی اس بات کا اعلان تھا کہ سجدہ صرف اپنے بنائے ہوئے معبود کو ہوگا اور زندگی میں ہم اپنی خواہشات اور اپنے فیصلوں کے تابع ہوں گے اس کی سزا جو انہیں دی گئی وہ ہمارے سامنے ہے لیکن اس کے مقابلے میں جب ہم اپنا قومی اور اجتماعی رویہ دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہمارا ایک پیغمبر ہے جس کی ذات آئیڈیل ذات ہے ہمارے پاس ایک کتاب ہے۔ جس میں ہمیں زندگی کی راہنمائی کے لئے ابدی قانون دیا گیا ہے ہمارے پاس اس قانون کی پوری تفصیلات' سنت کی شکل میں موجود ہیں۔ لیکن پورے عالمِ اسلام میں برسوں سے اس کتاب کو صرف تلاوت تک محدود رکھ کر اس کی باقی پوری راہنمائی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ ہماری معاشرت' معیشت' سیاست' تعلیم' آدابِ زندگی' حکومت' بین الاقوامی زندگی غرضیکہ زندگی کا ہر شعبہ نہ صرف کہ اس کتاب کی راہنمائی سے آزاد ہے بلکہ اس کے مقابلے میں دوسری قوموں سے مانگ تانگ کر یا اپنے بنائے ہوئے اصول وضوابط اور آدابِ زندگی کی پیروی ہو رہی ہے اور جہاں تک اللہ کے سامنے جھکنے کا تعلق ہے ہماری ایک بڑی محدود تعداد مسجدوں میں اس کے سامنے جھکتی ہے لیکن باقی زندگی کے ادوار میں وہ اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ہمارے دفاتر اس سے باغی ہیں ہماری بیوروکریسی اس کا نام تک سننے کی روادار نہیں ہماری عدالتیں ایک بالکل متوازی نظامِ قانون چلا رہی ہیں۔ ہماری حکومتیں اپنی مصلحتوں کے سائے میں چلتی ہیں۔ بنی اسرائیل نے ایک بچھڑا بنایا تھا ہم نے نہ جانے سر جھکانے کے لئے کتنے بچھڑے اور کتنے آستانے بنا لیے ہیں، ہم کتنے ملکوں کے سامنے اس لئے جھکتے ہیں کہ ان کی قدرتیں بے پناہ ہیں' وسائل رزق کی کنجیاں ان کے پاس ہیں۔ ہم اپنے پیغمبر کو دانائے سبل' ختم الرسل اور مولائے کل کہتے ہیں لیکن اس کی دی ہوئی تہذیب' اس کا عطا کردہ تمدن اور اس کی پیدا کردہ ثقافت کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں اس کی شخصی زندگی جو ہر لحاظ سے ایک بے عیب زندگی ہے ہم اس کا اتباع کرنے کی بجائے صرف اس کے حسن وجمال کی مدح وثناء پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ ہماری قومی اور اجتماعی زندگی کا ایک ہلکا سا خاکہ ہے۔ جس کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں قرآن کریم پڑھتے ہوئے ہم جب سابقہ امتوں کے احوال پڑھتے ہیں تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کے آئینے میں اپنی شکلیں پہچاننے کی کوشش کریں۔ آج ایسی کوشش کر لیں گے تو کل کے برے انجام سے بچ جائیں گے ورنہ آنکھیں بند کر لینے سے نہ کوئی خطرہ ٹلا ہے اور نہ ٹل سکتا ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں تورات کی حیثیت واہمیت کو ایک شرط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ

Marfat.com

یَرْھَبُوْنَ O

''جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا اس نے تختیاں اٹھائیں اور اس کے نوشتہ میں ہدایت ورحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں''۔154

موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے جس طرح برہم تھے اور پھر حضرت ہارون اور دوسرے قبائل کے سرداروں سے جس طرح دل گرفتہ تھے' جب پوری صورتِ حال کے واضح ہو جانے کے بعد آپ کی طبیعت میں اعتدال آیا تو آپ نے سب سے پہلے تورات کی تختیوں کو اٹھایا کیونکہ یہی تختیاں تھیں جو اللہ کی کتاب تھیں اور انہیں ہی بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے پروردگار نے عطا فرمایا تھا اور بنی اسرائیل نے انہی کو نظرانداز کر کے موسیٰ علیہ السلام کو غضب ناک کیا تھا اس لئے ضروری تھا کہ سب سے پہلے اس عظیم سرمائے کو سنبھالا جائے۔ چنانچہ آپ نے ان کو اٹھایا اور قوم کے سامنے مناسب ہدایت کے ساتھ پیش فرمایا پروردگار نے حضرت موسیٰ کے اس طرزِ عمل کو بیان کرتے ہوئے یہ ضروری خیال فرمایا کہ تورات کی اہمیت کو بھی بیان کر دیا جائے تاکہ بنی اسرائیل دوبارہ اس کو نظرانداز کرنے کی جرأت نہ کریں۔ اس لئے فرمایا کہ تورات کے نسخہ میں ہدایت اور رحمت ہے۔ نسخہ کسی تحریر کی حرف حرف نقل کو کہتے ہیں۔ تورات اصل میں انہیں الواح کی نقل ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں الواح سے بارہ نسخے تیار کروائے' اور ہر قبیلہ کے سپرد ایک ایک نسخہ کیا گیا اور پھر ایک الگ نسخہ بنی لاوی کو حفاظت کے لئے دیا گیا' غالباً یہی وہ نسخہ ہے جسے تابوتِ سکینہ میں رکھا گیا تھا' چونکہ یہ تمام کتاب کی جلدیں انہی الواح کی نقل تھیں اس لئے اس کو نسخہ سے تعبیر کیا گیا پھر اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کتاب میں ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی' ہدایت تو اس لحاظ سے کہ تمہیں پوری زندگی اس کی راہنمائی میں گزارنی ہے' عبادت اسی کی راہنمائی میں کرنی ہے معاشرت کے اصول اسی سے لینے ہیں معاملات اسی کی روشنی میں طے کرنے ہیں' انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام آداب اسی سے سیکھنے ہیں اگر تم نے پوری زندگی اس کی راہنمائی میں دے دی اور مکمل طور پر تم اس کے متبع بن گئے تو پھر یقین رکھو اللہ تعالیٰ تم سے رحمت کا سلوک فرمائے گا، یعنی دنیا میں تمہیں ایک اچھی زندگی اور خوشحال زندگی سے نوازا جائے گا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ تمہیں بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے اہلِ کتاب سے یہ کہا تھا کہ اگر اہلِ کتاب ایمان لائیں اور تقویٰ کی زندگی اختیار کریں تو ہم ان کے لئے آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیں گے اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ زمین سے ان کے لئے رزق ابلے گا اور آسمان سے بھی رزق ان کے لئے برسے گا۔ یعنی وہ اپنے اوپر سے بھی کھائیں گے اور پاؤں کے نیچے سے بھی' لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہیں اللہ انہیں غریبی میں رکھے یا امیری میں انہیں تخت و تاج عطا کرے یا صحرائی زندگی کی کلفتوں میں رکھے ہر حال میں انہیں اللہ سے ڈر کر اس کتابِ ہدایت کی پیروی کرنی ہے انہیں اللہ نیکی کی توفیق دے تو ان میں نیکی کا پندار پیدا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جو اللہ سے ڈرنے والا ہے وہ جانتا ہے کہ نیکی اللہ کی توفیق کے بغیر نہیں ہوتی اور اگر میں نے طلبِ توفیق میں کوئی بھی کمی کی تو بعید نہیں کہ نیکی کی توفیق مجھ سے سلب کر لی جائے اور یہ بات بھی واضح رہے کہ یہاں جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ بنی اسرائیل کی خصوصیت نہیں' بلکہ اللہ کے ہر رسول نے اپنی قوم کو اسی بات کی ہدایت کی ہے اور قرآن کریم تو ان ہدایات سے لبریز ہے اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کا عنوان ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ اگر تم اس دعوت کو قبول کر لو تو دنیا بھی تمہاری ہوگی اور آخرت بھی تمہاری۔ دنیا کی تمام نعمتوں اور سرفرازیوں کے تم مستحق بنا دیے جاؤ گے بلکہ ایک موقع پر فرمایا:

''اگر تم میری اس دعوت کو قبول کر لو تو تم دیکھو گے کہ تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمہارے سامنے جھک جائے گا''

تاریخ آج بھی گواہی دے رہی ہے کہ اللہ کے آخری رسول نے اس امت سے جتنے وعدے فرمائے تھے وہ سب حرف بہ حرف پورے ہوئے'

Marfat.com

اوراس وقت تک یہ امت دنیا کی غالب قوت رہی جب تک اس کی زندگی اللہ کی کتاب کی راہنمائی میں گزرتی رہی اوراس امت کا ہر چھوٹا بڑا افرد اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کے رسول سے محبت کرنے والا تھا۔لیکن جب سے یہ تعلق کمزور ہوا اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج یہ امت وسائل سے مالا مال ہے افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں دنیا کے ایک چوتھائی حصے پراس کا قبضہ ہے ہر قابلِ ذکر ساحل اس کی ملکیت میں ہے۔ ذہانتوں میں کوئی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود یہ امت دنیا کی سب سے ذلیل امت بن کررہ گئی ہے۔ ہراٹھتی ہوئی بجلی کوسب سے پہلے ہمارے کاشانے کی خبر ہوتی ہے بڑی قوتوں کے لئے ہم تر نوالہ ہوکررہ گئے ہیں وجہ اس کی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے ہماری کامیابیوں کو اپنے دین سے وفاداری کے ساتھ اور اللہ اور رسول سے تعلق کے ساتھ مشروط ٹھہرایا ہے ہم نے اس شرط کو کھودیا ہے اس لئے اس کی رحمتوں سے محروم ہوگئے ہیں۔

پس منظر:

گذشتہ رکوع میں ایک تسلسل کے ساتھ بنی اسرائیل کی دینی اور قومی تاریخ بیان کی جارہی ہے جس میں ان کی فکری اور عملی زندگی کی کوتاہیوں کے اہم واقعات کو ایک ترتیب کے ساتھ بیان کیا جارہا ہے۔سلسلۂ کلام یہاں تک پہنچا ہے کہ بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستی میں مبتلا ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام اللہ کی کتاب تورات لے کر کوہِ طور سے واپس آئے ان کی اس مشرکانہ حرکت پر انہیں ہر ممکن سرزنش فرمائی ان کے بگڑے ہوئے لوگوں پر سزا نافذ کی اور پھر اللہ کی کتاب کو ان کے سامنے پیش فرما کر انہیں حکم دیا کہ تم ایک بہت بڑی ٹھوکر کھا چکے ہو ایک تو اس پر شب وروز توبہ کرو اور دوسرے اس کتاب کی راہنمائی کو مضبوطی سے تھام لو اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کی ہر ممکن طریقے سے تعمیل کرو۔اگر تم نے یہ موقع بھی کھودیا تو پھر تم زندگی کے اندھیروں میں ڈوب جاؤ گے کیونکہ یہی وہ کتاب ہے جس میں اللہ نے تمہارے لئے ہدایت رکھی ہے اور جس کے نتیجے میں تم اس کی رحمت کے سزاوار ٹھہرو گے لیکن بنی اسرائیل اپنی صدیوں کی غلامی کے باعث اس طرح قومی اور ملی خصوصیات سے محروم ہوئے تھے کہ ان کے لئے کسی نئے طرز زندگی کو خوش دلی سے اختیار کرنا آسان کام نہ تھا وہ جانتے تھے کہ ہم گوسالہ پرستی کی صورت میں ایک بہت بڑے حادثے سے دوچار ہوچکے ہیں یہ اللہ کا شکر ہے کہ اتنے بڑے جرم کے نتیجے میں اس نے پوری قوم کو تباہ نہیں کیا اب بجائے لیت ولعل کرنے کے انہیں لپکتے ہوئے تورات کو تھام لینا چاہیے تھا لیکن انہوں نے اپنی قومی خصوصیت کے مطابق کہا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام)! ہم محض تیری بات مان کر کیسے یقین کرلیں کہ یہ کتاب واقعی اللہ کا کلام ہے جب تک ہم اپنے کانوں سے اللہ کا کلام نہ سنیں اور اپنی آنکھوں سے پروردگار کو بے حجاب نہ دیکھ لیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہرچند ان کی اس جسارت پر انہیں ملامت کی اور اس گمراہی سے انہیں تائب ہونے کے لئے کہا مگر ان کا اصرار بدستور قائم رہا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ان کی یہ بے جا ضد دیکھی تو آپ نے اللہ سے اجازت چاہی اور ستر آدمیوں کا انتخاب کرکے اپنے ساتھ لے گئے اور انہیں سمجھایا کہ تم کوہِ طور پر جا کر ایک تو گوسالہ پرستی کی اجتماعی توبہ کرو اور پوری قوم کی طرف سے معافی مانگو اور پھر یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تم کلام سن لو تاکہ تم واپس آکر قوم کے سامنے گواہی دے سکو کہ تورات واقعی کلامِ خداوندی ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان ستر سرداروں کو لے کر کوہِ طور جا پہنچے تو ایک سفید بادل کی طرح نور نے حضرت موسیٰ کو گھیر لیا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی شروع ہوگئی۔حضرت موسیٰ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ الٰہی تو بنی اسرائیل کے حالات کا دانا و بینا ہے میں ان کی ضد پر ستر آدمی انتخاب کرکے لے آیا ہوں کیا اچھا ہو کہ وہ بھی اس حجاب نور سے میری اور تیری ہم کلامی کو سن لیں اور قوم کے پاس جا کر تصدیق کرنے کے قابل ہوجائیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی دعا منظور فرمالی اور ان ستر افراد کو بھی حجابِ نور میں لے لیا گیا اور انہوں نے حضرت موسیٰ اور اللہ رب العالمین کی ہم کلامی کو سنا پھر جب پردۂ نور ہٹ گیا اور حضرت موسیٰ اور ان سرداروں کے درمیان آمنا سامنا ہوا تو سرداروں نے وہی اپنا پہلا اصرار قائم رکھا کہ جب تک بے حجاب اللہ کو

Marfat.com

دیکھ لیں ہم ایمان لانے والے نہیں اس احمقانہ اصرار اور ضد پر اللہ کا غضب بھڑکا کہ ایک ہیبت ناک کڑک اور زلزلے نے انہیں آلیا اور وہ مردہ ہو کر زمین پر گر گئے اب یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ فی الحقیقت موت کا شکار ہوئے یا بے ہوشی ان پر طاری ہو گئی لیکن دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت سے ہمکنار ہو چکے ہیں چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اسی واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاخْتَارَ مُوسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ O

''اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا ہمارے وقت مقرر کے لئے جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آ پکڑا' تو موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے سرکار آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے' کیا آپ ہمیں ایک ایسے جرم کی پاداش میں ہلاک کر دیں گے؟ جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا' یہ تو بس آپ کی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعے سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں ہمارے کارساز تو آپ ہی ہیں' پس ہمیں معاف کر دیجئے اور آپ بہترین بخشنے والے ہیں''۔155

بنی اسرائیل کے سرداروں کی سرکشی سے اللہ کا جلال بھڑکا تو موسیٰ علیہ السلام کی آہ وزاری:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ میرے ساتھ آنے والے تمام سردار اللہ کے غضب کا شکار ہو گئے اور اس کے جلال نے ان کو ہلاک کر دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بے حد پریشان ہوئے وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ ان سرداروں کے ہلاک ہو جانے کے بعد کس قدر خطرات پیدا ہو گئے ہیں میں اگر تنہا اپنی قوم میں جاتا ہوں تو بنی اسرائیل یہ سمجھیں گے کہ میں نے کسی سازش سے ان ستر لوگوں کو مروا دیا اور یہ کوئی عام لوگ تو نہیں یہ اپنے اپنے قبیلوں کے سردار اور نہایت معزز لوگ ہیں ان کے قبیلوں کے افراد اور ان کے زیر اثر لوگ وہ یقیناً مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور اگر کسی طرح میری جان بچ بھی گئی تو میں نے سالہا سال کی محنت سے جس طرح اس قوم کو اسلام کے راستے پر ڈالا ہے وہ میری ساری محنت ضائع ہو کر رہ جائے گی۔ یہ لوگ اپنے سرداروں کی محبت میں اللہ کے دین ہی کو خیر باد کہہ دیں گے اور ان کے اندر ایک ایسا اشتعال پیدا ہو گا جو نہ صرف دین کے رشتے کو بلکہ قومی شیرازے کو بھی منتشر کر کے رکھ دے گا ان خطرات کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے اللہ کے حضور گریہ زاری شروع کی اور فریاد کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ جلال تیرے غضب کا مظہر ہے اور تو نے ہمیں ہلاک کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے تو یہ کام تو اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی کر دیتا لیکن اب جب کہ تو نے ہمیں باریابی کا موقع عنایت فرمایا اور ہم یہاں حاضر ہو بھی گئے تو یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو ہمیں ہلاک کر دے پروردگار تو خوب جانتا ہے کہ یہ جو کچھ ہوا یہ جماعت کے اندر کچھ نادانوں کے بدبختی سے ہوا اور یہ بات بھی تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو چند نادانوں کے کسی جرم کی پاداش میں ہم سب کو ہلاک کر دے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تیری ایک آزمائش تھی اور تو ہمیشہ ایسی آزمائشوں سے افراد کی اصلاح فرماتا ہے تیری ہر آزمائش چھاچھ کی طرح لوگوں کو پھٹکتی ہے اس میں جو جوہر خالص ہوتا ہے وہ باقی رہتا ہے اور جو مادہ فاسد ہوتا ہے وہ چھٹ کر الگ ہو جاتا ہے اسی طریقے سے مخلص اور غیر مخلص پہچانے جاتے ہیں اور اسی طریقے سے کمزوریوں کی اصلاح ہوتی ہے اور خوبیوں کو بروئے کار آنے اور اپنی تکمیل کے مراحل طے کرنے میں مدد ملتی ہے جو صرف زبان کا تخی ہوتا

Marfat.com

ہے اس کے اندر کا افلاس کھل کر سامنے آجاتا ہے اور جو فی الحقیقت اپنے اندر خصائلِ حمیدہ رکھتا ہے اس کی ایک ایک خصلت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے جیسے جیسے مخالفتوں میں شدت آتی ہے ویسے ویسے استقامت کا جوہر جلا پاتا ہے جیسے جیسے فقر حملہ آور ہوتا ہے ویسے ویسے قناعت' کفایت اور صبر میں ترقی ہوتی ہے۔ دشمنوں کا سامنا ہوتا ہے تو جرات اور جسارت کو بروئے کار آنے کا موقع ملتا ہے۔ دولت اور خوشحالی آتی ہے تو شکر کا امتحان ہوتا ہے اس طرح ہر آزمائش انسانی اوصاف کو نشو ونما دینے کا باعث ہوتی ہے' اور کم ظرف اور تھڑدلے لوگوں کو جماعت سے الگ کر دیتی ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا: الٰہی! یہ بھی تیری ایسی آزمائش تھی لیکن کسی آزمائش میں بھی کامیابی تو تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہوتی تو جنہیں اپنی توفیق سے نوازتا ہے وہ ہدایت پاتے ہیں اور جنہیں تو اپنی توفیق سے محروم کر دیتا ہے وہ گمراہ ہو جاتے ہیں اور اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ تیری توفیق بے سبب نہیں ہوتی جس طرح پروردگار پانی پیدا فرماتا ہے اور ساتھ ہی پینے والے کے اندر پیاس بھی بھڑکاتا ہے تو جب تک پینے والا آگے بڑھ کر پانی پینے کی کوشش نہ کرے محض پانی کا وجود اس کی پیاس کو بجھا نہیں سکتا۔ روشنی ہر جگہ چمکتی ہے لیکن اس روشنی سے فائدہ صرف اسی کو پہنچتا ہے جو آنکھیں کھولتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے لذتِ کام ودہن سے سب کو نوازا جاتا ہے لیکن یہ لذت اس کے کام آتی ہے جو اسے استعمال میں لاتا ہے اسی طرح پروردگار کی توفیق سب کو اپنی طرف بلاتی ہے اور اس کی آزمائشیں سب کے لئے زرِ خالص بننے کے لئے معاون ہوتی ہیں لیکن ان کا فائدہ اسے پہنچتا ہے جو اللہ سے توفیق کا طلب گار رہتا ہے اور اپنی ہمت کو بروئے کار لاتا' اپنی شعوری کاوشوں کو حرکت دیتا اور اپنی تمام توانائیاں اس پر صرف کرتا ہے لیکن ان تمام قوتوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ بھروسہ اسے صرف اللہ کی توفیق پر ہوتا ہے وہ بار بار اس کے سامنے التجا کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہے تب پروردگار اسے اپنی توفیق سے نوازتا ہے اور اسے ہدایت کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ہر کس وناکس کے لئے آسان نہیں قدم قدم پر کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں' ارادوں کی ناتمامی منزل کو دور کر دیتی ہے۔ ہم ایسی ہی کمزوریوں کا شکار ہو کر تیری توفیق سے محروم رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم میں سے کتنے لوگ گمراہیوں کے بھنور میں پھنس گئے اب ہماری زندگی کی کشتی کو ان بھنوروں سے نکالنا پروردگار صرف تیرے ہاتھ میں ہے، کیونکہ تو ہی ہمارا ولی اور کارساز ہے پس تو ہماری مغفرت فرما اور ہم پر رحم فرما کیونکہ تو ہی سب سے بہتر بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

آزمائش دوگونہ نتائج کی حامل ہوتی ہے:

اس آیت کریمہ کے دروبست پر غور فرمائیں کہ بنی اسرائیل مختلف حوادث کا شکار ہو گئے جس میں ناکامی کے باعث وہ تباہی کے کنارہ تک پہنچ گئے یہاں اسے آزمائش قرار دیا گیا ہے پھر فرمایا گیا کہ تو جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیری آزمائشیں یقیناً انسانی سیرت وکردار کی تشکیل وتعمیر کے لئے ہیں لیکن اس میں کامیابی انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تو ہی ہمارا کارساز ہے تو ہی ہماری مغفرت فرما اور تو ہی ہم پر رحم فرما اس کا مطلب یہ ہے کہ ہدایت وضلالت اگرچہ تیرے قبضے میں ہے لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم ہدایت کے حصول میں جو ممکن مساعی ہو سکتی ہوں اس کے بروئے کار لانے میں تساہل نہ کریں تیرا کام یہ ہے کہ تو ہمارے لئے مختلف مواقع پیدا کرتا ہے جس سے ہمارے درمیان زرِ خالص اور زرِ فاسد کو بروئے کار آنے کا موقع ملتا ہے' اب ہمارا یہ فرض ہے کہ اپنی تربیت وتعمیر کے لئے جو کچھ ہم پر لازم کیا گیا ہے اس کو پوری طرح بجالانے کی کوشش کریں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ آخری حد تک کوششیں کرنا یہ ہمارا کام ہے لیکن ان کوششوں کو پھل کرنا اور نتیجہ خیز بنانا پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا نے جب سات کمروں میں بند کر کے گناہ کی دعوت دی تو اب بچ نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی لیکن انہوں نے سوچا کہ اس وقت میرا فرض یہ ہے کہ میں اس گناہ سے بچنے کے لئے ہر کمرے کے دروازے

Marfat.com

تک دوڑ کر پہنچوں اور اس کے تالے سے زور آزمائی کروں رہی یہ بات کہ وہ تالے کھلتے ہیں یا نہیں یہ میرے بس میں نہیں یہ اللہ کی توفیق سے ہوگا چنانچہ وہ ہر دروازے تک دوڑتے ہوئے گئے جب انہوں نے اپنا فرض انجام دے دیا تو پروردگار کی توفیق حرکت میں آئی اور ایک ایک قفل کھلتا چلا گیا اسی طرح اصحاب کہف کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ چند لڑکے بالے تھے جنہوں نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے زندگی کی بازی لگادی جب وقت کی حکومت نے ایمان کے ساتھ ان کے لئے زندگی ناممکن بنادی تو انہوں نے سوچا کہ حکومت کا مقابلہ کرنا ہمارے بس میں نہیں البتہ اللہ کے اعتماد پر شہر چھوڑ دینا اور کسی غار میں پناہ لے لینا یہ یقیناً ہمارے بس میں ہے اور ہم اسی کے مکلف ہیں چنانچہ جب غار تک جانے کا فرض انہوں نے انجام دے دیا تو اللہ کی توفیق نے ان کے لئے سلامتی کے راستے کھول دیئے یہی وہ حقیقت ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہاں کھلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اس آیت کے خاموش اختتام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ان ستر سرداروں کو زندہ فرمایا اور سورۃ بقرہ میں اس کا باقاعدہ ذکر بھی فرمایا گیا ہے اور پھر ان کی توبہ قبول فرمائی چنانچہ جب ان کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطمینان ہوگیا تو آپ نے اپنی پوری قوم کے لئے دعا فرمائی جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں ہے۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

''اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے او آخرت کی بھی ہم نے آپ کی طرف رجوع کرلیا پروردگار نے ارشاد فرمایا سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے''۔156

موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور اللہ کا جواب:

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوری قوم کے لئے دعا فرمائی اس لئے کہ پیغمبر جس قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے وہ اس کی دنیوی اور اخروی فلاح کا سب سے زیادہ حریص ہوتا ہے وہ اللہ سے ہمیشہ اس کے لئے ایمان وعمل کی دعائیں کرتا ہے دنیوی کامیابیاں مانگتا ہے اخروی فوز وفلاح کے لئے التجائیں کرتا ہے یہاں بھی موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے حسنۃ کی دعا مانگی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے جواب میں پرودگار نے اپنے کچھ اصول بیان فرمائے سب سے پہلے یہ بات فرمائی کہ میں جسے چاہتا ہوں عذاب دیتا ہوں اور قرآن کریم کی دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا چاہنا ہمیشہ اس کی صفتِ عدل کے مطابق ہوتا ہے' اس کے عدل کی روایت یہ ہے کہ وہ گناہ گار بندوں کو بھی جلدی سزا نہیں دیتا انتہائی بگڑے ہوئے معاشرے میں بجائے عذاب بھیجنے کے اپنے پیغمبر بھیجتا ہے اور پیغمبر ہمیشہ اللہ کی رحمت کی نوید بن کر آتے ہیں وہ زندگی کا ہر دکھ اٹھا کر ان تک اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں ہدایت کا ایک ایک راستہ ان کے سامنے روشن کرتے ہیں اچھائی اور برائی ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں وہ قوم اگر ان کی دعوت کو قبول کرلیتی ہے تو اللہ کی رحمتوں کی مورد بن جاتی ہے اور وہ اگر قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو تب بھی انہیں مہلت پر مہلت دی جاتی ہے کبھی انہیں مصیبتوں میں مبتلا کرکے اللہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ مصیبتوں کی وجہ سے ان کے دل نرم پڑیں اور وہ ایمان لے آئیں اور اگر یہ مصیبتوں کا

Marfat.com

نزول بھی انہیں ایمان کی طرف راغب نہیں کرتا تو پھر انہیں خوشحالیوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ شائد اس طرح اللہ کے احسانات کے ممنون ہو کر شکر گزار بن جائیں لیکن جب ان کی سرکشی اور تمرد انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور وہ پیغمبر کو قتل کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں تو تب اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا ان پر برستا ہے چنانچہ یہ وہ قانون ہے جس کو یہاں بیان کیا گیا ہے کہ میں جسے چاہتا ہوں عذاب دیتا ہوں یعنی میرا چاہنا میری صفتِ عدل کے تابع ہوتا ہے اور میرا عدل بندوں کو عذاب دینے میں کبھی جلدی نہیں کرتا انہیں ہر ممکن طریقے سے سمجھنے کا موقع دیتا ہے یہی قانون بنی اسرائیل کے ساتھ بھی ہے انہیں بھی آپ کی دعوت سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع دیا جائے گا جب تک وہ تمرد کی انتہاء کو نہیں پہنچیں گے ہمارا عذاب ان کی طرف متوجہ نہیں ہوگا اور دوسری بات فرمائی کہ میرا عذاب بندوں کی انتہائی سرکشی اور تمرد کے نتیجے میں آتا ہے ورنہ پروردگار کا عام طریقہ رحمت کا طریقہ ہے۔ اس کا نظامِ عالم اس کی رحمت پہ قائم ہے اس کا غضب تو صرف اس وقت نمودار ہوتا ہے جب بندے اپنی سرکشی کے باعث ہر طرح سے اپنے آپ کو اس کی رحمت سے محروم کر لیتے ہیں چنانچہ جب ہم دنیا کے نظام کو دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اللہ کی رحمت ہر چیز کو پہنچ رہی ہے جس کو بھی وجود کی نعمت ملی ہے جسے بھی زندگی کے امکانات میسر ہیں جسے بھی رزق سے نوازا جا رہا ہے یہ سب کچھ اس کی صفتِ رحمت ہی کا ظہور ہے اس نے زمین کو قوتِ روئیدگی سے مالا مال کیا ہے سورج کی کرنیں سمندر سے پانی کے ڈول بھر بھر کر فضاء میں ابر کی چادریں بچھاتی ہیں' درخت پھلوں سے لدے ہوئے لذتِ کام و دہن کو دعوت دے رہے ہیں چاروں طرف سبزے کی مخملی چادریں بچھادی گئی ہیں زمین سے چشمے ابال دیئے گئے ہیں مختلف قسم کے قدآور درخت چھتریاں تانے ٹھنڈک کا سامان کئے ہوئے ہیں' پہاڑوں سے آبشاریں گر رہی ہیں لہلہاتی فصلیں غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہر دم آمادہ ہیں یہ جو چاروں طرف ایک خوانِ کرم پھیلا ہوا ہے یہ سب کچھ اس کی رحمت کا ہی تو فیضان ہے پھر اس کے ساتھ ساتھ حواس کی نعمتِ بے پایاں، عقل جیسا جوہرِ کامل اور سب سے بڑھ کر وحی الٰہی سے انسانوں کی راہنمائی کا سامان یہ اس کی رحمت کی وہ سخاوت ہے جس سے ہر کس و ناکس کو نوازا گیا ہے اور اس پر بھی مزید یہ کہ جب کوئی آدمی غلطی کرتا ہے اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو فوراً اس کی طرف سے گرفت نہیں آتی اگر پروردگار ہر غلطی پر گرفت فرمانے لگتا تو قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ روئے زمین پر کسی زندہ انسان کو چلتا پھرتا نہ دیکھتے کیونکہ کونسا انسان ہے جو غلطیوں سے مبرا ہے؟ کونسی چال ہے جو لڑکھڑاہٹ سے پاک ہے؟ کونسا خیال ہے جس میں بھٹکنے کا اندیشہ نہ ہو؟ کونسا ارادہ ہے جس پر ناتمامی کا داغ نہ لگا ہو؟ اگر ان تمام کوتاہیوں پر پروردگار پکڑنے لگتا تو اندازہ فرمائیے اس کا نتیجہ ہوتا یہ اس کی رحمت کا ظہور ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے سنبھلنے کا موقع دیتا ہے اور اگر کبھی کسی کو پکڑتا بھی ہے تو فی الحقیقت وہ بھی اس شخص کی بھلائی پیش خیمہ ہوتا ہے میں نے ایک گوالے کو دیکھا وہ ایک حکیم صاحب کی دکان پر بیٹھا اول فول بک رہا تھا لوگ اسے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے کہہ رہے تھے اور اس کی جسارت کا عالم یہ تھا کہ وہ یہ کہتا تھا کہ شکر کس بات کا؟ بھینسیں میری، چارہ میرا، سنبھالنے والے آدمی میرے، دودھ نکالنے اور بیچنے والے میرے اپنے ملازم، تو پروردگار کا شکر کس بات پر ادا کروں؟ اچانک چھت سے ایک اینٹ پھسلی اور اس کے کندھے پر آ کر گری کندھا ٹوٹ گیا۔ ہسپتال پہنچایا گیا ڈاکٹروں نے کہا کہ اگر اس کا بازو فوراً نہ کاٹا گیا تو زہر پھیل جائے گا چنانچہ بازو کاٹ دیا گیا زخم مندمل ہونے کے بعد جب وہ بازار میں آیا تو جاننے والے سے کہتا تھا کہ اللہ کے غضب سے ڈرو۔ اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ اس کی گرفت آتے دیر نہیں لگتی۔ اندازہ فرمائیے کہ ایک اینٹ نے شخص کی زندگی تبدیل کر ڈالی اگر وہ اپنے ڈگر پر چلتا رہتا تو اپنی عاقبت تباہ کر لیتا اب اس کی دنیا بھی بچ گئی اور آخرت بھی بچ گئی۔ کہنا صرف یہ ہے کہ نظامِ عالم پر اصل حکمرانی اللہ کی رحمت کی ہے۔ چنانچہ دنیا کی بھلائی بھی اسی کی رحمت سے ہے اور آخرت بھی اسی کی بھلائی سے ہے لیکن جس طرح دنیا کی اس بھلائی اور اس رحمت کو حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے رزق اس کی رحمت ہے لیکن اس کے حصول کیلئے دوڑ دھوپ یہ انسان کا فرض

Marfat.com

علم اس کی کتنی بڑی رحمت ہے لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے راتوں کو جاگنا اور آنکھوں کو سینکنا پڑتا ہے اسی طرح آخرت میں بھی اس رحمت اور حسنۃ کو حاصل کرنے کے لئے زندگی کے وہ اطوار اختیار کرنے پڑتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے انسانوں کو عطا فرمائے ہیں۔ اس کا خلاصہ دیکھا جائے تو تین چیزیں ہیں جس کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے کہ میں آخرت کی بھلائی ان لوگوں کو دوں گا جو اپنے اندر تین صفات پیدا کریں گے۔ جن میں پہلی صفت تقویٰ ہے یعنی انسان اپنی فکری دنیا کو ہر طرف سے یکسو کر کے اپنے دل و دماغ میں ان بنیادی افکار کو بسا لے جنہیں ایمانیات اور اقدارِ حیات کہا جاتا ہے اور پھر ان کے سائے میں دل و دماغ کی اس طرح تربیت کرے کہ جس سے ہر فکری بت پاش پاش ہو جائے اور اللہ کی محبت کی جڑیں دل و دماغ میں پیوست ہو جائیں گناہ سے نفرت ہونے لگے اور نیکی کی طرف دل لپکتا جائے۔ اس طرح سے جب دل و دماغ کا تعلق ہر طرف سے کٹ کر اللہ ہی کے ساتھ جڑ جائے گا تو زندگی کی منزل متعین ہو جائے گی اس کے فکری رشتے اللہ کے ساتھ استوار ہو جائیں گے اس کا طرزِ حیات اللہ کے رسول کی سنت کا آئینہ دار ہو جائے گا اور اس کے حسن و قبح کے معیارات وہی ٹھہریں گے جنہیں وحیِ الٰہی کی سند حاصل ہو گی۔

انسانی زندگی پر فکری حکمرانی کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے وہ مال و زر کی محبت ہے یہ محبت حد سے بڑھ جائے تو سیرت و کردار کا بحران پیدا ہو جاتا ہے اس کا اعتدال پر رکھنا افکار کی صحت کے لئے بھی نہایت ضروری ہوتا ہے اور جہاں تک انسانوں کے درمیان رشتوں اور معاملات کا تعلق ہے اس کا تو بہت حد تک دار و مدار دولتِ دنیا کے ساتھ انسانی تعلق کے اعتدال پر ہے۔ اسی لئے آیتِ کریمہ میں تقویٰ کے بعد دوسری چیز جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ اپنے مال میں سے کچھ حصہ اللہ کے لئے نکال کر یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ مال میری ملکیت نہیں اللہ کی ملکیت ہے میرے پاس اللہ کی عطا کردہ امانت ہے۔ امانت چونکہ امانت رکھنے والے کی ہدایت کے مطابق رکھی جاتی ہے اور استعمال میں لائی جاتی ہے اس لئے میری بھی ذمہ داری ہے کہ میں اپنے مال کو اللہ کی امانت سمجھ کر اس طرح استعمال کروں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ چنانچہ اگر اس بات کو قبول کر لیا جائے تو حلال و حرام کے تمام رشتے اپنی اپنی جگہ درست ہو جاتے ہیں۔ مال و دولت کی محبت اعتدال پر آ جاتی ہے آدمی نہ اسراف کا شکار ہوتا ہے اور نہ بخل کا وہ اس لئے خرچ نہیں کرتا کہ اپنی نفسانیت کو غذا پہنچائے بلکہ اس لئے خرچ کرتا ہے تا کہ اللہ کی رضا حاصل کرے اور وہ مال جمع کرنے کے لئے مال روک کر نہیں رکھتا بلکہ وہ مال کو حرام مصارف سے روکتا ہے اس طرح انسانی زندگی کی یہ بہت بڑی قوت بجائے انسانی زندگی کو نقصان پہنچانے کے انسان کے لئے قوت کا سامان بن جاتی ہے اور تیسری چیز فرمائی کہ ہماری سب آیات پر بلا کسی استثناء اور تاویل کے ایمان لائیں، مطلق ایمان کے بغیر تو تقویٰ اور زکوٰۃ کا بھی تصور نہیں ہو سکتا اور مطلق ایمان کے دعوی دار تو اہل کتاب بھی تھے یہاں اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ تم ایمان لانے میں بھی تعصب اور جانبداری کا ثبوت دیتے ہو کہ ہم صرف اپنے پیغمبر پر اور اپنی کتاب پر ایمان لائیں گے اور ان باتوں کو مانیں گے جنہیں ماننے کا حکم ہمارے پیغمبر اور کتاب نے دیا ہے۔ لیکن یہ تمہارا ایمان درحقیقت گروہی عصبیت پر مبنی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ تم کسی نبی کو مانتے ہو کسی کا انکار کر دیتے ہو اور پھر اسی پر بس نہیں تم جس کتاب پر ایمان رکھتے ہو اس کے احکام میں سے صرف ان احکام کو مانتے ہو جن کا تمہاری معاشرتی' معاشی اور قومی زندگی میں چلن پایا جاتا ہے لیکن جو احکام تمہارے تعصبات اور تمہارے مفادات اور تمہاری خواہشات سے متصادم ہوں تم انہیں ماننے سے انکار کر دیتے ہو اور تمہارے اسی رویے کا یہ نتیجہ ہے کہ تم نے اپنی کتابوں میں تحریف کر ڈالی ہے تا کہ تمہیں کوئی اتنے بڑے جرم پر گرفت نہ کر سکے لیکن تم جب تک اللہ کے تمام احکام پر بغیر کسی تحفظ ذہنی کے ایمان نہیں لاؤ گے اس وقت تک تم دنیا اور آخرت کی بھلائی کے مستحق نہیں ہو سکتے بعض اہلِ علم نے اسلوبِ کلام پر غور کرتے ہوئے اسے ایک اور پہلو سے بھی دیکھا ہے، صاحب تدبر قرآن یہ کہتے ہیں کہ

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ کی وضاحت:

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ O آیت کا یہ ٹکڑا خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ یوں نہیں فرمایا کہ تَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا بلکہ اسلوب بدل کر فرمایا وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ اسلوب کی اس تبدیلی سے مبتدا پر خاص طور پر زور دینا مقصود ہے کہ خاص کر وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو لوگ قرآن کے نظائر پر نگاہ رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اس عہد و میثاق کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے انبیا پر ایمان لانے کے لئے لیا گیا تھا اور جس کی وضاحت مائدہ کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِىْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۱۲. مائدہ

''اور اللہ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کا اہتمام قائم رکھو گے، زکوۃ دیتے رہو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی تائید کرو گے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہو گے۔ اگر تم یہ کرو گے تو میں تمہارے گناہ تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ پس جو اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا۔''

یہ عہد یوں تو ان تمام نبیوں اور رسولوں پر مشتمل تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے لیکن اس میں خاص اشارہ اس نبی امی کی طرف تھا جس کی بعثت کی پیشین گوئی خود سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے، جیسا کہ بقرہ میں گزر چکا ہے، بڑی تصریح کے ساتھ فرمائی تھی۔ آل عمران میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۱۸. ال عمران

''اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے نبیوں کے باب میں میثاق لیا کہ ہم نے تم کو کتاب اور حکمت سے نوازا۔ پھر آئے گا تمہارے پاس ایک رسول تصدیق کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کی جو تمہارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس باب میں میری سونپی ہوئی ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اس پر گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔''

یہی عہد و میثاق ہے جس کی طرف وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ کے الفاظ میں اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی درخواست کے جواب میں یہ تصریح فرمادی کہ میری ابدی اخروی رحمت کے سزاوار وہ لوگ ٹھہریں گے جو میرے عہد شریعت پر قائم رہیں گے، آگے آنے والے نبیوں اور رسولوں کی تائید کریں گے اور ان میں سے جن کو میرے آخری رسول کی بعثت نصیب ہوگی وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے مددگار اور خدمت گزار بنیں گے۔

Marfat.com

حقیقت میں دونوں نقطۂ نظر میں انجام کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں اگر آیت کریمہ کے آخری حصہ میں ہم عہد شریعت کی طرف اشارہ مراد لیں تو تب بھی یہی مفہوم ہے کہ اب اہل کتاب کی نجات کا دارومدار رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لانے میں ہے اور اگر اس سے یہ مراد لیں کہ اب ان کی اپنی مرضی کے ایمان سے کام نہیں چلے گا بلکہ انہیں بغیر کسی تحفظ ذہنی کے اللہ تعالیٰ کی تمام آیات اور احکام کو ماننا ہوگا تو اب جب کہ حضور ﷺ تشریف لا چکے ہیں اور آپ کی بعثت ہو چکی اور آج کے بعد آپ قیامت تک کے لئے نبی اور رسول ٹھہرے تو باقی دنیا کی طرح اہلِ کتاب کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب صرف حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ پر ایمان لانا کافی نہیں ہوگا بلکہ اب تو سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اللہ کے آخری رسول پر ایمان لایا جائے چنانچہ اب وہی لوگ دنیا اور آخرت کی نعمتوں اور بھلائیوں کے مستحق ٹھہریں گے جو اس نبی امی پر ایمان لائیں اسلوبِ کلام اور سیاقِ کلام سے بات جب یہاں تک پہنچ گئی تو اگلی آیتِ کریمہ میں اسے کھول بھی دیا گیا اور بنی اسرائیل کو آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت بھی دے دی گئی۔ ارشاد فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ز یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞

''--جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی، جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے بدی سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اٹھاتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں، لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائے اور جو اس کا احترام بجالائے اور جنہوں نے اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' 157

موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے مصداق اور آنحضرت ﷺ کی صفات کی وضاحت:

اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت اور تمام انسانوں کو نجات کا راستہ دکھایا گیا ہے کہ اب فوز وفلاح ان لوگوں کو نصیب ہو گی جو اس رسول نبی امی پر ایمان لائیں گے یہاں آنحضرت ﷺ کا تذکرہ تین الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ تینوں الفاظ آپ کے تعارف کے لئے استعمال ہوئے ہیں یعنی اب جس آخری پیغمبر پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے وہ نبی بھی ہے رسول بھی ہے اور امی بھی ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے چونکہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے آیا ہے اور وہ اپنی قوم کو بنیاد بنا کر تمام انسانوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے اس لحاظ سے وہ اللہ کا نبی ہے لیکن اس کی اصلاح اور تربیت کا دارومدار کسی سابقہ شریعت پر نہیں کیونکہ اہلِ کتاب نے سابقہ شریعتوں اور آسمانی کتابوں کو ترمیم اور تحریف کے ذریعے غیر محفوظ کر دیا ہے اب ان کتابوں کی بنیاد پر دنیا کی اصلاح کرنا ممکن نہیں رہا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس نبی کو رسول بھی بنایا اور ان پر کتاب اتاری اور نئی شریعت عطا کی کیونکہ رسول وہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نئی کتاب اور نئی شریعت عطا فرماتا ہے اور مزید برآں یہ کہ نبی کی زندگی اور دعوت کے نتیجہ میں احقاقِ حق تو ضرور ہو جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ابطالِ باطل مکمل ہو جائے اور حق کو عمومی غلبہ نصیب ہو لیکن رسول کی بعثت سے یہ دونوں کام مکمل کر دیئے جاتے ہیں۔ حق کی دعوت اس قوت اور صراحت سے پیش کی جاتی ہے کہ اسے قبول نہ کرنے والے دلوں میں اس کی حقانیت کے قائل ہو جاتے ہیں اور باطل کو جھٹلانے اور پیغمبر کے خلاف انتہائی مخالفت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا وہ جب دیکھتا ہے کہ دلائل کی دنیا میں باطل کو لاجواب کر دیا گیا ہے تو پھر وہ پیغمبر کو قتل کرنے کے

Marfat.com

منصوبے باندھتا ہے یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہجرت کا حکم دیتا ہے اور دعوتِ حق کا انکار کرنے والوں پر عذاب نازل کرتا ہے اس طرح سے رسول جس انقلاب کی نوید بن کر آتا ہے وہ انقلاب مکمل کر دیا جاتا ہے' تو رسول کا لفظ کہہ کر یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ آنحضرت کو صرف نبی نہ سمجھنا کہ وہ تمہیں حق کی خبر دے کر واپس چلے جائیں گے بلکہ وہ اللہ کی طرف سے کامل حجت اور کامل عدالت بن کر تشریف لائے ہیں ان کے آنے سے تم پر حجت تمام کر دی گئی ہے اب اگر تم نے انکار کی روش نہ چھوڑی تو تمہیں تباہ کر دیا جائے گا اور تیسرا لفظ آپ کے لئے استعمال ہوا ہے (امی)' اس لفظ کے استعمال کا سبب یہ ہے کہ پہلی آسمانی کتابوں میں عموماً اسی لفظ کے ساتھ آپ کی تشریف آوری کی خبر دی گئی ہے یعنی یہ لفظ آپ کے لئے ایک شناخت کا درجہ بھی رکھتا ہے اور اعزاز کا بھی' شناخت سے مراد یہ ہے کہ امی کا لفظ تمام عربوں کے لئے عموماً اور قریش کے لئے خصوصاً اس لئے بولا جاتا تھا کہ قریش اور عرب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی پیغمبر بنی اسماعیل میں نہیں آیا تھا جب کہ بنی اسرائیل میں اس دوران سینکڑوں انبیاء تشریف لائے تو چونکہ ایک طویل مدت تک یہ سرزمین وحی الٰہی سے محروم رہی اس لئے قریش اور عرب کتاب وشریعت کی تعلیم سے یکسر نا آشنا رہے۔ انہوں نے اپنے رسوم ورواج کو اپنا دین سمجھ رکھا تھا وہ شریعت کے نام سے کسی چیز سے واقف نہیں تھے تو لکھنے پڑھنے سے ناواقفیت اور دین وشریعت سے جہالت کے باعث نہ صرف اہل کتاب ان کو امی کہتے تھے بلکہ خود عرب بھی اپنے آپ کو شناخت کے طور پر امی کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کو اپنی اس شناخت پر فخر تھا انہیں روایتی تعلیم وتعلم سے کوئی دلچسپی نہ تھی البتہ زندگی کے کمالات اور فضائل سے وہ ضرور آگاہ تھے جن انسانی فضائل کو وہ انسانیت کا جوہر سمجھتے تھے انہیں حاصل کرنا اپنے لئے ضروری جانتے تھے ایک عرب کو عزت حاصل کرنے کے لئے تلوار کا دھنی' دل کا غنی' ارادے کا مستحکم اور مسائل اور مشکلات کے مقابلے میں صبر مجسم زبان کا تیور شناس اور قومی احساسات میں حد درجہ حساس ہونا ضروری تھا انہیں چیزوں کو وہ حاصل کرنا اپنی زندگی کے لئے کافی سمجھتے تھے لیکن اہلِ کتاب امی کے لفظ کو ان کے لئے شناخت کے طور پر استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ تحقیر کے لئے استعمال کرتے تھے ان کا قومی فخر وغرور عربوں کو اپنے برابر سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا ان کے قومی پندار نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ وہ عربوں کو اپنے مقابل انسانی حقوق کا حامل بھی نہیں سمجھتے تھے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد ہیں اس لئے ہم عربوں کے کچھ حقوق دبا بھی لیں تو بھی عربوں کو اس پر شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں اور یہ خباثت معلوم ہوتا ہے یہود کے ذہنوں میں آج تک موجود ہے ان کے نیشنل پروٹوکول کے نام سے بعض در پردہ جو کتابیں چھپتی ہیں اور جس کی اشاعت بہت سارے تحفظات کے ساتھ کی جاتی ہے اس میں وہ دنیا کی کسی قوم کو اپنے مقابل سمجھنے کے لئے تیار نہیں اور اپنے آپ کو دوسری قوموں کے مقابلے میں ایک برتر مخلوق تصور کرتے ہیں جب آج روشنی کے زمانے میں ان کا یہ حال ہے تو اسوقت ان کے قومی فخر وغرور کا کیا عالم ہوگا اس کا اندازہ مشکل نہیں۔

جہاں تک آنحضرت ﷺ کے لئے اس لفظ کے استعمال کا تعلق ہے وہ صرف شناخت ہی نہیں اعزاز بھی ہے۔ اعزاز ان معنوں میں کہ اللہ کا رسول قریش کے انسانی قافلے کا ایک فرد ہے مکہ میں وہ پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا اسی کی فضاء میں اس نے شعور کی آنکھ کھولی بچپن بکریاں گزارتے گزرا' جوانی کی عمر میں چند تجارتی سفروں کے سوا باہر کی دنیا کو دیکھنے کا اتفاق تک نہیں ہوا اور مکہ کی سرزمین میں نہ کسی تعلیمی ادارے کا وجود تھا اور نہ تعلیمی فضاء میں تھی اور پھر آپ کی معلومات کے سرچشمے بھی وہی تھے جو باقی عربوں کے تھے بایں ہمہ چالیس سال کی عمر کو پہنچتے ہی غارِ حرا کی تنہائی سے نکلنے والی اس ذات عزیز کی زبان مبارک سے علم وحکمت کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ ایک ایسا کلام جس کے فصاحت وبلاغت کے سامنے سارے عرب کی فصاحت گنگ ہو کر رہ گئی جس کے علوم ومعارف نے دنیا بھر کے صاحبانِ علم وفضل کو سوچنے کی نئی نئی راہیں دیں اور راہنمائی کے وہ اصول بتا دیئے جس تک انسانی فکر کی رسائی

Marfat.com

نہ تھی انسانی زندگی کے وہ گوشے جو علم و دانش کے فیضان کے باوجود آج تک تاریک تھے انہیں معرفتِ ذات' معرفت کائنات' معرفتِ حقوق وفرائض اور معرفتِ حق کے نور سے منور کر دیا گیا اور دستور اور قانون کی زبان میں ایک ایسا آئین دیا گیا جس کی ہر ادا نئے بانکپن کی حامل اور جس کا ہر لفظ شعور و آگہی کا خزانہ ہے اور یہ سب کچھ اس زبان مبارک سے ادا ہو رہا ہے جس نے کسی ادارے میں علم حاصل نہیں کیا جس نے کسی شخص کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم آپ کو امی کے لفظ سے یاد کر رہا ہے تو یقیناً اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگو! اس شخص کے اعزاز کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو اور اس کی عظمت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ وہ تمہارے طرح ایک امی اور ان پڑھ ہے لیکن دنیا بھر کے علوم و معارف اس کی علمی عظمتوں کے سامنے سرنگوں ہیں اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو شائد یہ کمالات' کمالات ہوتے ہوئے بھی اس درجہ اعزاز کا مستحق نہ ہوتے اصل وجہ اعزاز تو یہ ہے کہ دنیا نے تعلیم و تعلم کے حوالے سے کوئی چیز اس کے حوالے نہیں کی لیکن اس نے امی ہوتے ہوئے بھی دنیا کو علوم کے خزانوں سے مالا مال کر دیا' مزید فرمایا کہ وہ ذات جو رسول نبی اور امی ہے امرِ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی نگاہوں نے تو اسے اب دیکھا ہے لیکن اہلِ کتاب تو اپنی کتابوں میں اسے صدیوں سے دیکھ رہے ہیں کیونکہ کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اس کی علامتیں موجود نہ ہوں اور کوئی رسول ایسا نہیں جس نے اس کے آنے کی خبر نہ دی ہو تورات اور انجیل میں اس کی علامتیں لکھی گئی تھیں اگر چہ اہلِ کتاب نے پوری کوشش کر ڈالی کہ کوئی علامت باقی رہنے نہ دی جائے لیکن ان کی ساری کوششوں کے باوجود آج بھی ان کی کتابوں میں ایسی آیات موجود ہیں جس سے آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی خبر ملتی ہے۔ ان میں سے چند کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

> ''خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا' تم اس کی سننا...... اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ استثناء ب ۱۸۔۱۵۔۱۹

اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰ ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسماعیل یعنی امیوں میں پیدا ہو گا اس لئے کہ اس سیاق میں' تیرے بھائیوں میں سے'' یا'' انہی کے بھائیوں میں سے کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہو گا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے گویا اسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی۔ تفصیلات اسکی بقرہ میں گزر چکی ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہو گا بلکہ رسول بھی ہو گا اس لئے کہ ''میری مانند'' اور ''تیری مانند'' سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مانند ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام' فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت ﷺ بھی اسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔

> ''خدا سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا' فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا' دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی''۔ استثناب ۳۳ ۲

''آتشی شریعت'' سے میرے نزدیک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے ظاہر فرمائی ہے کہ اس کے ہاتھ میں اس کا

Marfat.com

چھاج ہوگا' وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا' دانے کو بھس سے الگ کرے گا پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا یہ ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم کے لئے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اس کے ذریعے سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔

یسعیاہ نبی کی پیشنگوئی ان لفظاظ میں مذکور ہے۔

''دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا' بڑا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر رکھی وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا' اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا۔'' یسعیاہ ب ۴۲ (۱۔۴)

سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیشن گوئی ملاحظہ ہو

یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں پڑھا نہیں کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔'' متی ۲۱ (۴۲۔۴۴)

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا' تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے'' یوحنا ۱۴ (۱۷)

''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔'' یوحنا ۱۴ (۳۱)

ان پیشنگوئیوں پر غور کیجئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشنگوئیوں کا مصداق آنحضرت ﷺ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہو سکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا لیکن بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اس پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح علیہ السلام بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے لیکن جو شخص بھی ان پیشنگوئیوں پر انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آ سکتی ہیں تو صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد ﷺ پر ہی راست آ سکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔

اہل کتاب میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی روایت سے احادیث میں آنحضرت کی صفات نقل کی گئی ہیں جنہیں محدثین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے ان میں سے چند ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا وہ اتفاقاً بیمار ہو گیا تو آپ اس کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اس کا باپ اس کے سرہانے کھڑا ہوا تورات پڑھ رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے کہا کہ اے یہودی میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی ہے کہ کیا تو تورات میں میرے حالات اور صفات اور میرے ظہور کا بیان پاتا ہے؟ اس نے انکار کیا تو بیٹا بولا یارسول اللہ یہ غلط کہتا ہے تورات میں ہم آپ کا ذکر اور آپ کی صفات پاتے ہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی

Marfat.com

معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو حکم دیا کہ اب یہ مسلمان ہے انتقال کے بعد اس کی تجہیز و تکفین مسلمان کریں' باپ کے حوالہ نہ کریں۔ (مظہری)

اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے ذمہ ایک یہودی کا قرض تھا اس نے آ کر اپنا قرض مانگا آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں کچھ مہلت دو' یہودی نے شدت کے ساتھ مطالبہ کیا اور کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک میرا قرض ادا نہ کردو آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ تمہیں اختیار ہے میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں گا چنانچہ رسول کریم ﷺ اسی جگہ بیٹھ گئے اور ظہر' عصر' مغرب' عشا کی اور پھر اگلے روز صبح کی نماز یہیں ادا فرمائی صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین یہ ماجرا دیکھ کر رنجیدہ اور غضبناک ہو رہے تھے اور آہستہ آہستہ یہودی کو ڈرا دھمکا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ دے' رسول اللہ ﷺ نے اس کو تاڑ لیا اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے پوچھا یہ کیا کرتے ہو؟ تب انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اس کو کیسے برداشت کریں کہ ایک یہودی آپ کو قید کرے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھے میرے رب نے منع فرمایا ہے کہ کسی معاہد وغیرہ پر ظلم کروں'' یہودی یہ سب ماجرا دیکھ اور سن رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی یہودی نے کہا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اس طرح مشرف با سلام ہو کر اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے اپنا آدھا مال اللہ کے راستہ میں دے دیا اور قسم ہے خدا تعالیٰ کی کہ میں نے اس وقت جو کچھ کیا اس کا مقصد صرف یہ امتحان کرنا تھا کہ تورات میں جو آپ کی صفات بتلائی گئی ہیں وہ آپ میں صحیح طور پر موجود ہیں یا نہیں؟ میں نے تورات میں آپ کے متعلق یہ الفاظ پڑھے ہیں: ''محمد بن عبداللہ ان کی ولادت مکہ میں ہوگی اور ہجرت طیبہ کی طرف اور ملک ان کا شام ہوگا' نہ وہ سخت مزاج ہوں گے نہ سخت بات کرنے والے نہ بازاروں میں شور کرنے والے' فحش اور بے حیائی سے دور ہوں گے''۔

اب میں نے ان تمام صفات کا امتحان کر کے آپ میں صحیح پایا' اس لئے شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں اور یہ میرا آدھا مال ہے آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں خرچ فرمائیں اور یہ یہودی بہت مالدار تھا' آدھا مال بھی ایک بڑی دولت تھی اس روایت کو تفسیر مظہری میں بحوالہ دلائل النبوۃ بیہقی نقل فرمایا ہے۔

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ کعب احبار رحمتہ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ تورات میں آنحضرت ﷺ کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ ''محمد اللہ کے رسول اور منتخب بندے ہیں' نہ سخت مزاج ہیں نہ بیہودہ گو' نہ بازاروں میں شور کرنے والے' بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے بلکہ معاف فرما دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں' ولادت آپ کی مکہ میں اور ہجرت طیبہ میں ہوگی' ملک آپ کا شام ہوگا اور امت آپ کی حمادین ہوگی یعنی راحت و کلفت دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر ادا کرے گی ہر بلندی پر چڑھنے کے وقت وہ تکبیر کہا کرے گی وہ آفتاب کے سایوں پر نظر رکھے گی تاکہ اس کے ذریعہ اوقات کا پتہ لگا کر نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھا کرے' وہ اپنے نچلے بدن پر تہبند استعمال کریں گے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو وضو کے ذریعہ پاک صاف رکھیں گے ان کا اذان دینے والا فضا میں آواز بلند کرے گا' جہاد میں ان کی صفیں ایسی ہوں گی جیسے نماز کی جماعت میں' رات کو ان کی تلاوت اور

Marfat.com

ذکر کی آوازیں اس طرح گونجیں گی جیسے شہد کی مکھیوں کا شور ہوتا ہے'' (مظہری)۔

ابن سعد اور ابن عساکر نے حضرت سہل مولیٰ خیثمہ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت سہل نے فرمایا کہ میں نے خود انجیل میں محمد مصطفیٰ ﷺ کی یہ صفات پڑھی ہیں کہ ''وہ نہ پست قد ہوں گے نہ بہت دراز قد' سفید رنگ دو زلفوں والے ہوں گے ان کے دونوں شانوں کے درمیان ایک مہر نبوت ہوگی' صدقہ قبول نہ کریں گے' حمار اور اونٹ پر سوار ہوں گے' بکریوں کا دودھ خود دوہ لیا کریں گے' پیوند زدہ کرتہ استعمال فرمادیں گے اور جو ایسا کرتا ہے وہ تکبر سے بری ہوتا ہے وہ اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں ہوں گے' ان کا نام احمد ہوگا''۔

ابن سعد نے طبقات میں دارمی نے اپنے مسند میں بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی جو یہود کے سب سے بڑے عالم اور تورات کے ماہر مشہور تھے انہوں نے فرمایا کہ تورات میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں

''اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا ہے سب امتوں پر گواہ بنا کر اور نیک عمل کرنے والوں کو بشارت دینے والا' برے اعمال والوں کو ڈرانے والا بنا کر اور امیین یعنی عرب کی حفاظت کرنے والا بنا کر' آپ میرے بندے اور رسول ہیں' میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے' نہ آپ سخت مزاج ہیں نہ جھگڑالو اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے' برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک وفات نہ دیں گے جب تک ان کے ذریعہ ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کر دیں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں اور اندھی آنکھوں کو کھول دیں اور بہرے کانوں کو سننے کے قابل بنا دیں اور بند ھے ہوئے دلوں کو کھول دیں''۔

اس جیسی ایک روایت بخاری میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مذکور ہے۔

اور کتب سابقہ کے بڑے ماہر عالم حضرت وہب بن منبہ سے بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ

''اللہ تعالیٰ نے زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ اے داؤد! آپ کے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا' میں ان پر کبھی ناراض نہ ہوں گا اور وہ کبھی میری نافرمانی نہ کریں گے اور میں نے ان کیلئے سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں' ان کی امت امت مرحومہ ہے میں نے ان کو وہ نوافل دیئے ہیں جو انبیاء کو عطا کی تھیں اور ان پر وہ فرائض عائد کئے ہیں جو پہلے انبیاء پر لازم کیے گئے تھے یہاں تک کہ وہ حشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور انبیاء علیہم السلام کے نور کی مانند ہوگا' اے داؤد! میں نے محمد ﷺ اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی ہے' میں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطا کی ہیں جو دوسری امتوں کو نہیں دی گئیں اول یہ کہ خطا و نسیان پر ان کو عذاب نہ ہوگا جو گناہ ان سے بغیر قصد کے صادر ہو جائے اگر وہ اس کی مغفرت مجھ سے طلب کریں تو میں معاف کر دوں گا اور جو مال وہ اللہ کی راہ میں بطیب خاطر خرچ کریں گے تو میں دنیا ہی میں ان کو اس سے زیادہ دے دوں گا اور جب ان پر کوئی مصیبت پڑے گی اور وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہیں گے تو میں ہر اس مصیبت کو صلوٰۃ و رحمت اور جنت کی طرف ہدایت بنا دوں گا وہ جو دعا کریں گے میں قبول کروں گا کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے وہی دے دوں اور کبھی اس طرح کہ اس دعا کو ان کی آخرت کا سامان بنا دوں۔ (روح المعانی)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کی علامات:

نبی کریم ﷺ کی یہ وہ صفات و علامات ہیں جو پچھلی آسمانی کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں اور جو یہ صفات پروردگار نے اس آیت کریمہ میں بیان فرمائی ہیں اگرچہ ان کا تذکرہ دوسرے الفاظ میں سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی ہے لیکن یہاں پروردگار نے جس انداز سے ان کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے سب سے پہلی جو صفت بیان فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ

1۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر:

نبی امی ﷺ لوگوں کو معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ معروف کا لفظی معنی جانا پہچانا اور منکر کا لفظی معنی ناپسندیدہ اور جس سے جس کی پہچان میں ہچکچاہٹ محسوس کی جائے۔ یہاں معروف سے مراد وہ نیک کام ہے جو شریعت اسلامیہ میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور عقل اور سلامت فکر کی پہچان میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی اور منکر سے مراد وہ برے کام ہیں جن کا دین اور شریعت سے کوئی تعلق نہیں اور سلامت فکر اور عقل سلیم قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ ہم سورۃ انعام میں اس کا ذکر کر چکے ہیں ان دونوں کے حوالے سے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے آخری رسول معروف کا حکم دیں گے اور برائی اور منکر سے روکیں گے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ایک ایسی صفت ہے معروف کا حکم دینا اور برائی سے روکنا جو آنحضرت ﷺ کی خصوصیت نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا یہ فریضہ بھی تھا اور پہچان بھی۔ اس کے باوجود آنحضرت کے حوالے سے بطور خاص اس کا ذکر کیا جانا یقیناً اپنے اندر کوئی سبب رکھتا ہے غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ بات کہ اگرچہ یہ صفت تمام انبیاء کرام میں پائی جاتی ہے لیکن آنحضرت ﷺ میں اس صفت نے انتہائی کمال اور اعجاز کے ساتھ ظہور کیا ہے آپ نے اپنے بگڑے ہوئے معاشرے کو جس اسلوب کے ساتھ دعوت دی ہے اور رفتہ رفتہ جس طرح منکرات سے انہیں روکنے میں کامیابی حاصل کی ہے وہ یقیناً آپ کی ذات کا اعجاز بھی ہے اور آپ کی خصوصیت بھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام منکرات کو روکنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں آپ کی طبیعت میں غیر معمولی جلال ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو پرہیبت شخصیت بخشی ہے اس لیے آپ نے کبھی کسی منکر کو برداشت نہیں کیا اور نہایت سختی سے اسے روکا لیکن جب ہم نتائج پر غور کرتے ہیں تو وہ نہایت قابلِ تعریف ہونے کے باوجود اس درجہ تک نہیں پہنچے جس سطح تک آنحضرت ﷺ کا کام پہنچا ہے آپ نے معروف کی بھی آبیاری کی لیکن بنی اسرائیل نے عموماً آپ کی کوششوں کو ناکامی سے دوچار کیا ہے حتیٰ کہ تورات ایک سے زیادہ جگہ ہمیں اس بات کی خبر دیتی ہے کہ بنی اسرائیل کے اس رویے سے مایوس ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے شکایت کی لیکن اس کے برعکس ہم آنحضرت ﷺ کی مساعیٔ جمیلہ اور اس پر مرتب ہونے والی کامیابیوں کو دیکھتے ہیں تو ایک حیرت افزا صورت حال سامنے آتی ہے دشمنوں کی ہر چند مخالفتوں کے باوجود آپ نے انہی میں سے نہایت کامیابی سے ہیرے اور جواہر چنے ہیں۔ اور جیسے جیسے ان کی تعداد بڑھتی گئی ہے ان کی سیرت و کردار کا معیار بھی بلند سے بلند تر ہوتا گیا حتیٰ کہ آپ کی زندگی کے آخری سالوں میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں گناہ کا وجود صفر تک پہنچ گیا' معروف کی کہار چھا گئی اور منکرات کو اس سوسائٹی سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا' پھر یہ بات جانی پہچانی ہے کہ آپ کو جس قوم سے واسطہ پڑا تھا ان کی غالب اکثریت نہایت جاہل اور اکھڑ لوگوں پر مشتمل تھی انہیں کوئی بات سمجھانا' نیکی کی طرف مائل کرنا اور برائی چھڑوانا یہ بے حد مشکل کام تھا لیکن آپ نے بدو چرواہوں تک کو جس دل آویز طریقے سے نیکیوں کی طرف مائل کیا اور منکرات کو ان کی زندگی سے نکالا وہ آپ کی اس درخشاں صفت کی روشن مثال ہے' آپ ہر سطح کے آدمی کو سمجھانے کی غیر معمولی صلاحیت سے متصف تھے۔ اسی طرح دقیق سے دقیق مضامین کو بھی نہایت سادہ اور سہل الفاظ میں سمجھا دینا اور

Marfat.com

مشکل سے مشکل بات کو پانی کر دینا آپ کی طبیعت کا خاص جوہر تھا ہر سطح کے مخاطب سے اس کے فہم کے مطابق بات کرنا اور اس کے ذوق کا لحاظ کرتے ہوئے اسلوبِ کلام اختیار کرنا اس کا بھی بار بار آپ کی گفتگو اور آپ کے خطبات سے اظہار ہوتا ہے' شائد اسی غیر معمولی صلاحیت اور غیر معمولی اللہ کی رحمت کے باعث آپ کی اس صفت کو بطورِ خاص بیان کیا گیا ہے۔

دوسری بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک استعلاء برتری قوت اور اقتدار کے طالب ہیں کیونکہ امر اور نہی فہمائش' فرمائش' درخواست اور عرض کرنے کو نہیں کہتے' اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ تمہیں برائی سے روکا جا رہا ہے اور نیکی کا حکم دیا جا رہا ہے یہ نیکی تمہیں کرنا ہوگی اور برائی سے روکنا ہوگا اگر یہ نیکی نہیں کرو گے تو حکم عدولی میں پکڑے جاؤ گے اور برائی سے نہیں رکو گے تو مجرم سمجھ کر احتساب کے حوالے کر دیئے جاؤ گے یہ صفت اسی کو میسر آ سکتی ہے اور یہ صورتِ حال اسی وقت جنم لے سکتی ہے جب کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا اقتدار پر فائز ہو اس کی حیثیت صرف ایک رسول کی نہ ہو بلکہ سربراہِ ریاست کی بھی ہو اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس صفت کو بیان کر کے پروردگار اس بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ ہمارا آخری پیغمبر صرف داعی بن کر نہیں آئے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کی دعوت کو کامیابی عطا فرمائیں گے وہ جس انقلاب کی دعوت لے کر اٹھے گا اس انقلاب کو برپا ہونے کا موقع دیا جائے گا بالآخر یہ دعوت ایک ریاست کی شکل اختیار کر لے گی اور ہمارا پیغمبر ریاست کا سربراہ بن کر نیکی اور خیر کی قوتوں کو غالب کر دے گا اور برائی کو مغلوب کر کے جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس صفت کے بیان کرنے سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو بے ہمہ وجود جو کامیابی ملنے والی تھی اس کی خبر بھی دے دی گئی ہے اور آپ کی حیثیت کا تعین بھی فرما دیا گیا ہے۔

2۔طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرے گا:

اس کے بعد فرمایا گیا کہ وہ نبی امی جب آئے گا تو وہ لوگوں کے لئے طیبات کو حلال کرے گا اور خبائث کو حرام کرے گا۔ یہ دونوں باتیں بھی ہر رسول کی صفات میں شامل رہی ہیں لیکن آنحضرت ﷺ کی اس خصوصیت کو بطورِ خاص بیان کرنے کا درحقیقت ایک پس منظر ہے جس کا کسی حد تک ذکر سورۃ آلِ عمران' سورۃ مائدہ اور سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے' وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے صرف خبائث ہی کو حرام نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر بعض ایسی چیزیں بھی ان پر حرام کر دی گئی تھیں جو اگرچہ خبائث نہیں بلکہ طیبات میں داخل تھیں لیکن ان کا حرام کرنا بنی اسرائیل کے لئے ایک سزا تھا مثلاً تمام ناخن والے جانور اور گائے بکری وغیرہ کی چربی یہ اپنی ذات میں قابلِ حرمت نہ تھیں لیکن بنی اسرائیل کی سزا کے طور پر ان کو حرام کیا گیا۔ اسی طرح ان پر حلال و حرام کے سلسلے میں بعض ایسی پابندیاں لگائی گئیں جس کی وجہ سے بعض حلال جانور بھی ان پر حرام ہو گئے' مثلاً ان سے یہ کہا گیا کہ چوپایوں میں صرف وہ چوپائے حلال ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے ہوں اور وہ جو گالی بھی کرتے ہوں چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اونٹ' سافان اور خرگوش جیسے جانور بھی ان پر حرام ہو گئے۔

3۔بوجھ اتارے گا اور بیڑیاں کاٹے گا:

مزید فرمایا کہ وہ آنیوالا پیغمبر لوگوں سے بوجھ اتارے گا اور ان سے بیڑیاں کاٹ دے گا جو انہوں نے پہن رکھی ہیں اصر بوجھ اور بارِ گراں کہتے ہیں جس کی وجہ سے آدمی حرکت نہ کر سکے اور اغلال' غلو کی جمع ہے اس ہتھ کڑی کو کہتے ہیں جس سے مجرم کے ہاتھوں کو اس کی گردن کے ساتھ باندھ جاتا ہے اور وہ بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے یہاں ان دونوں چیزوں سے مراد وہ سخت احکام و واجبات ہیں جو اصل دین میں مقصود نہ تھے لیکن بنی اسرائیل

Marfat.com

کی سرکشی کے سبب انہیں ان کا حکم دیا گیا جیسا کہ ابھی اس کا کچھ ذکر ہوا ہے اور یا ان کے فقہاء نے اپنی فنی موشگافیوں کے باعث بلاوجہ بعض چیزوں کو اپنے اوپر لازم کر لیا' مثلاً اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ چربی حرام کی تھی جو گوشت کی جز کی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ کمر یا آنکھوں یا ہڈیوں سے آسانی سے الگ کی جاسکتی ہے لیکن تورات کی تفصیلات پڑھ کر دیکھئے انہوں نے مطلقاً اپنے اوپر چربی حرام کر لی یعنی وہ چربی بھی جسے جانور کے گوشت اور آنکھوں اور ہڈیوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ بالآخر اسی طرح کی چیزیں ان کے لئے زندگی کا بوجھ بن گئیں اور پھر وہ جب اس پر عمل نہ کر سکے اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو قدرت نے ان کی سرکشی کے علاج کے لئے ایسے سخت احکام ان کو دیئے جن پر چلنا آسان نہ تھا مثلاً ان کو حکم دیا گیا کہ کپڑا ناپاک ہوجائے تو اس کی پاکی کے لئے دھو دینا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ جس جگہ نجاست لگی ہو اسے کاٹ دیا جائے' اسی طرح جہاد کی صورت میں جو مالِ غنیمت انہیں ملتا تھا اس کو استعمال میں لانا مغلوب قرار دے دیا گیا' ہفتہ کے دن شکار کرنے پر پابندی لگا دی گئی' قتلِ عمد کی صورت میں قصاص واجب تھا خون بہا کی کوئی صورت نہیں تھی' اسی طرح کے سخت احکام ہیں جنہیں انہیں اصر اور اغلاط سے تعبیر کیا گیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ جب وہ مبعوث ہوں گے تو انسانوں کی گردنوں سے یہ طوق اتاریں گے اور ان کو اس بارِگراں سے نجات دیں گے' اس لئے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں جو دین لے کر آیا ہوں وہ آسان ہے' مشکل نہیں اور میں تمہارے لئے ایک سہل اور آسان شریعت چھوڑ کر جا رہا ہوں جس میں نہ کوئی مشقت ہے اور نہ گمراہی کا اندیشہ۔

اس کے بعد کامیابی کیلئے آنحضرت ﷺ پر ایمان اور مزید تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے:

خاتم النبیین ﷺ کی ان صفات اور کمالات کا ذکر فرمانے کے بعد بنی اسرائیل اور آنے والی نوع انسانی کو واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اب اگر کوئی کامیابی حاصل کرنے والا گروہ ہے تو وہ صرف وہ ہے جو اس آخری پیغمبر پر ایمان لائے اس طرح سے آنے والی دنیا کو کامیاب دنیا کی خبر بھی دی گئی ہے' پیشگوئی بھی فرمائی ہے اور ضمنی طور پر حکم بھی دیا جارہا ہے' اور پھر ایمان کے ساتھ ساتھ مزید چند احکام بھی دیئے گئے جن کی تعمیل کئے بغیر نہ ایمان کی حقیقت متحقق ہوتی ہے اور نہ ایمان کے فوائد مرتب ہوتے ہیں' اس لئے ایمان کے بعد تین باتوں کا ذکر فرمایا

1- تعظیم وتکریم 2- نصرتِ پیغمبر 3- قرآنِ کریم کا اتباع۔

- اب ایک ترتیب سے ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم سے ایمان کی وضاحت:

ایمان کا لفظ اگرچہ زبانی اقرار کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کا حقیقی معنی سچے دل سے ماننا اور یقین کرنا ہے لغت میں اٰمَنَ لَهٗ کا معنی ہے صَدَّقَهٗ وَاعْتَمَدَ عَلَيْهِ (اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا) اور اٰمَنَ بِهٖ کے معنی ہیں اَيْقَنَ بِهٖ (اس پر یقین کیا)۔ قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے اس کو ان آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا (الحجرات.١٥)

''مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر شک میں نہ پڑیں۔''

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ

Marfat.com

وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النسآء ٦٥)

''پس نہیں' (اے نبی) تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔''

ان سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرارِ ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ۔ (النسآء ١٣٦)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔''

انسان ایک عالمِ اصغر ہے اس کی فکری پیچیدگیوں اور احساس کی ناہمواریوں کو سمجھنا آسان نہیں جب کوئی نئی نظریاتی بات انسان کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو سب سے پہلے اس کی فکر اسے قبول کرنے سے انکار کرتی ہے وہ اپنے پہلے سے مانے ہوئے خیالات وتصورات میں کوئی ترمیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا طرزِ کہن اسے عزیز ہوتی ہے اور آئینِ نو سے اسے گھبراہٹ ہوتی ہے اس لئے ممکن حد تک وہ نہ صرف اسے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے بلکہ اس کے راستے میں رکاوٹیں بھی کھڑی کرتا ہے۔ اگر رفتہ رفتہ قبولیت کے دروازے تک پہنچتا بھی ہے تو درِ قبول پوری طرح کھلنے نہیں پاتا اس میں نئی طرح کی رکاوٹیں پیدا ہونے لگتی ہیں اب وہ بات کو کسی حد تک قبول کرتا ہے لیکن وہ گلے سے نیچے نہیں اترتی قبولیت کا اظہار کرتا ہے لیکن صرف زبانی اقرار کی حد تک، بڑی مشکل اور طویل تربیت کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ دل اور زبان میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے لیکن یہاں تک پہنچ کر بھی بعض دفعہ اس میں ایک اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے وہ یہ کہ جب وہ اللہ اور اللہ کے رسول کی بات کو بھی مانتا ہے تو تب بھی اس کے لئے وہ ذریعہ جس پر وہ اعتماد کرتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ ماننے پر مجبور ہوتا ہے وہ اس کی عقل ہوتی ہے یا وقت کا چلن ہوتا ہے جب عقلی طور پر کسی بات سے مطمئن ہو جاتا ہے تو اسے مان لیتا ہے یا جب وہ لوگوں کو دیکھتا ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس بات کو مان رہی ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان لوگوں کا ماننا بے سبب تو نہیں ہوگا اس لئے وہ بھی انسانی ریوڑ کے ساتھ چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اللہ اور رسول کے معاملے میں بھی وہ عموماً یہی رویہ اختیار کرتا ہے اور اسی کو ایمان کا نام دیتا ہے آپ نے اگر غور فرمایا ہے تو آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ ایمان کے سلسلے میں تین بنیادی کمزوریاں ہیں جس میں بالعموم انسان مبتلا ہوتا ہے۔

1- وہ زبانی اقرار کو ایمان سمجھتا ہے۔

2- اس کے نزدیک اصل معیار اور کسوٹی عقل ہوتی ہے وہ اسی پر اعتماد کرتا اور اسی کو بھروسے کے قابل سمجھتا ہے وہ اس کے اعتماد پر جس بات کو تسلیم کرتا ہے اس میں اسے غلط فہمی یہ رہتی ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا ہوں حالانکہ وہ اپنی عقل پر ایمان لاتا ہے کیونکہ عقل جس طرف راہنمائی کرتی ہے وہ اس طرف چلنا شروع کر دیتا ہے جس کو ماننے کی ترغیب دیتی ہے اسے ماننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے وہ بہت سی باتوں کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام ہیں لیکن عقل جب تک انہیں سندِ قبولیت عطا نہیں کرتی اس وقت تک وہ انہیں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ غور فرمائیے! ایسی صورت میں کیا یہ بات خود فریبی سے کم ہے کہ آدمی اسے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کا نام دے۔

3- انسانوں کی اکثریت یا انسانوں کے بالادست طبقے یا وہ لوگ جو ذرائع ابلاغ پر قابض ہیں' بالعموم انسان کی طبیعت پر حکمرانی کرتے ہیں جس طرف ان کا جھکاؤ ہوتا ہے انسان بلا سوچے سمجھے عقل کو زحمت دیئے بغیر ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی بات کو مان کر ان کی پیروی کرنے لگتا ہے یہ

Marfat.com

تین طریقے ہیں جس نے ہمیشہ انسانوں کو حقیقی ایمان سے دور رکھا ہے اللہ اور اللہ کے رسول پر جس ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور جس کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت بنایا گیا ہے وہ ایمان ان تینوں طرح کے ایمان سے بالا بلند ہے اللہ اور اس کا رسول جس ایمان کی دعوت دیتا ہے اس کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ اس کا دارومدار زبانی اقرار پر نہ ہو بلکہ دل کی تصدیق بھی اس میں شامل ہو اگر ایک بات زبان تک محدود رہتی ہے لیکن دل پر اثر انداز نہیں ہوتی اور دل سے اس کی تائید نہیں اٹھتی تو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں' اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الہ الا
لغتِ غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

اسی طرح دوسری شرط یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان عقل کی تائید کا محتاج نہیں جس بات کو ماننے کا حکم دیا گیا ہے اگر اسے عقل تسلیم کرتی ہے تو یہ عقل کے لئے سرمایۂ افتخار ہے لیکن اگر وہ عقل کی گرفت میں نہیں آتی تو پھر اس بات کا انتظار نہیں کیا جائے گا کہ عقل اسے تسلیم کرے تو اسے مانا جائے بلکہ اس کے ماننے کی بنیاد عقل پر اعتماد نہیں بلکہ اللہ کے رسول پر اعتماد ہے' عقل یقیناً عطیۂ الٰہی ہے لیکن ایک تو انسانوں کی عقل میں باہمی بے حد تفاوت ہے اور مزید یہ کہ عقل کی وسعتیں عالمِ محسوسات اور معقولات سے آگے نہیں بڑھ سکتیں اور دین کا تعلق تو عالمِ مابعد الطبیعات عالمِ الٰہیات اور عالمِ آخرت سے بھی ہے پھر انسانوں کے اجتماعی مسائل اور اقوام کے عروج و زوال کے اخلاقی ضوابط ایسے نازک معاملات ہیں جنہیں عقل جیسی نارسا قوت کے حوالے نہیں کیا جا سکتا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ عقل کی تمام خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ غلطیوں سے پاک نہیں وہ تو وہم اور اشتعال جیسے محرکات سے متاثر ہو کر غلطی کئے بغیر نہیں رہتی چہ جائے کہ اسے انسانی زندگی کے وسیع تر اور اجتماعی دباؤ کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکے اس لئے زندگی کے معاملات میں عافیت کا راستہ اس کے سوا ممکن ہی نہیں کہ اس کا دارومدار اس ذریعۂ علم پر رکھا جائے جو ہر طرح کی غلطی سے پاک ہر طرح کی نارسائی سے معرا اور ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہے یہ وہ ذریعۂ علم ہے جسے وحی الٰہی کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے رسول اسی ذریعہ علم کے پیغامبر بن کر تشریف لاتے ہیں اس لئے اعتماد کے لائق کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے تو وہ یہی ذریعہ ہے اور اسی کے اعتماد پر جس تسلیم و انقیاد کی بنیاد رکھی جائے گی' وہی زندگی کے سفر میں قابلِ اعتماد اور قابلِ نجات ہو گا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازمی شرط ہے کہ اللہ کے نبی کے اعتماد پر جس بات کو تسلیم کیا جائے' اس میں زبانی اقرار کے ساتھ ساتھ ایسی تصدیق شامل ہونی چاہیے جو یقین اور اذعان سے عبارت ہو کہ جس پر ماننے والے کو اس درجے کا یقین حاصل ہو کہ شک و ارتیاب کا کوئی کانٹا کبھی اس میں اپنی جگہ نہ بنا سکے دنیا اس میں ہزار شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ مضبوط ایمان یقین کی قوت سے بڑی آسانی سے اس کا مقابلہ کر سکے' یہی وہ قوت ہے جو انسان میں سیرت و کردار کی تعمیر کا باعث بنتی ہے' ہر طرح کی قربانی دینے پر آمادہ کرتی ہے اور بڑے سے بڑے نقصان کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا کرتی ہے۔ اس لئے اقبال نے کہا تھا

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

یہ انسانی کمزوری ہے کہ جب تک کسی حقیقت کا یقین اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا وہ اس کے لئے نہ تو عمل پر آمادہ ہوتا ہے نہ وقت دینے پر نہ مال صرف کرنے پر اور نہ کسی طرح کی قربانی دینے پر' اللہ کے نبی انسانی سیرت و کردار کی تعمیر اور انسانی زندگی کی اصلاح کے لئے تشریف لاتے ہیں ان کے پیشِ نظر زندگی کے ایک ایک شعبے کو تبدیل کرنا ہوتا ہے ہر غلط چیز کو نکال کر ہر صحیح چیز کو رواج دینا ہر برائی کو ختم کر کے ہر نیکی کو فروغ دینا خواہشات کو حدود

Marfat.com

میں محدود کر کے صالح جذبات کو قوت بخشا' انسانی معاشرے کے بالادست طبقوں کو انکسار سکھانا اور کمزور اور ناتواں طبقوں میں اٹھنے کی امنگ پیدا کرنا اس طرح سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو معاشرے اور سماج کے راستے سے ہوتے ہوئے ایوانِ ہائے حکومت تک بدل دینا یہ پیغمبر کے پیشِ نظر ہوتا ہے یہ اتنی بڑی تبدیلی ہے جس سے بڑی تبدیلی کا تصور بھی انسانی زندگی میں ممکن نہیں معمولی تبدیلی بھی انسان قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ اتنی بڑی تبدیلی کو گوارا کرلے اس تبدیلی کو بروئے کار لانے کے لئے ایک ہی زوردار جذبہ ہے جو کامیابی سے اس منزل کو آسان کر دیتا ہے وہ یہی یقین اور ایمان ہے جب ایمان لانے والا اپنے پیغمبر کی صداقت اس کی معصومیت اس کے علم کی بے پناہی اس کی بے لوث قیادت اس کے لائے ہوئے نظام زندگی کے بے عیب ہونے پر پوری طرح یقین پیدا کر لیتا ہے تو اس کے لئے اسے قبول کرنا دنیا اور آخرت کی کامیابیوں کے لئے اسے لازمی سمجھنا اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی دینا اور دنیا کے علمی فتنوں اور تہذیبی واہموں کا مقابلہ کرنا کوئی مشکل نہیں رہتا اس کی عقل اگر کسی وقت پیغمبر کی بات نہیں سمجھتی تو وہ عقل کو جھٹک کر پیغمبر کی بات کے سامنے سر جھکا دیتا ہے کیوں کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ عقل تو نارسا ہے لیکن پیغمبر کے علم کا رشتہ تو اللہ کے علم کے ساتھ جڑا ہوا ہے اگر کبھی کسی بھی دور کے علمی مسلمات پیغمبر کی تعلیم سے متصادم ہوتے ہیں تو وہ علمی مسلمات کو بڑی آسانی سے ٹھکرا دیتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ دنیائے علم نے آج تک بارہا ٹھوکریں کھائی ہیں لیکن پیغمبر کا علم ایسی ہر ٹھوکر سے مبرا ہے اگر دنیا کا چلن کبھی وحی الٰہی کے خلاف ہوتا ہے تو وہ پیروی صرف وحی الٰہی کی کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی نام نہاد صداقت غلط ہو سکتی ہے بلکہ ناممکن چیزیں بھی ممکن ہو سکتی ہیں لیکن اللہ کے پیغمبر کا علم اور اس کی راہنمائی کبھی غلطی قبول نہیں کرتی اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے جو صداقتیں عطا فرمائی ہیں اور جو خبریں دی ہیں یہ تو ممکن ہے کہ آدمی اس بات کو تسلیم کر لے کہ صبح سورج طلوع نہیں ہوگا یا پانی الٹی طرف بہنا شروع کر دے گا دریا کے دو کنارے مل جائیں گے' یا تاریخ کے دو باب جمع ہو جائیں گے لیکن یہ وہ کبھی قبول نہیں کرتا کہ اللہ کے رسول کی دی ہوئی راہنمائی کبھی غلط ہو سکتی ہے یہ وہ یقین ہے جسے ایمان کا نام دیا گیا ہے اور یہی یقین صحابہ کے رگ و پے میں سما چکا تھا جنگِ خندق میں جبکہ عرب کی پوری قوت صرف تین ہزار محدود افرادی قوت پر حملہ آور ہوئی تو دنیا کا کوئی مدبر بلکہ معمولی عقل رکھنے والا بھی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمانوں کی یہ معمولی قوت بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گی لیکن خندق کھودتے ہوئے جب آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو خبر دی کہ میں نے یہ جو چٹان پر تین ضربیں لگائی ہیں ان میں میں نے یمن، روم اور ایران کے محلات دیکھے ہیں تم وقت کی ان تینوں بڑی قوتوں پر غالب آؤ گے تو یہ لوگ جو حالات میں گھرے ہوئے اپنی زندگی تک کا یقین نہیں کر سکتے تھے ان میں سے کسی نے یہ خیال تک نہیں کیا کہ یہ خبر غلط ہو سکتی ہے انہوں نے پوری آمادگی سے دل و دماغ میں اس خبر کو بٹھایا اور اس یقین سے سرشار ہو گئے کہ واقعی ایک نہ ایک دن اللہ تعالیٰ ان بڑی طاقتوں پر ہمیں غلبہ عطا فرمائے گا کیونکہ رسول ﷺ کا ارشاد کبھی غلط نہیں ہو سکتا منافقین نے مسلمانوں کو ہر چند بہکانا چاہا کہ عرب بھر کے مشرک تم پر حملہ آور ہو گئے ہیں اب تم کسی طرح بچ نہیں سکتے آؤ ان سے کوئی معاملہ کر لیں قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ مسلمان بجائے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کے بے اختیار پکار اٹھے کہ یہ تو وہی باتیں ہیں جس کا اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا ہے چنانچہ بجائے سراسیمہ ہونے کے ان کے ایمانوں میں اور اضافہ ہوا۔

صحابہ کی پوری زندگی اسی یقین و ایمان کے مظاہر کی داستان ہے ہمیں قدم قدم پر ان کی زندگی میں ایمان کی قوت کی درخشاں مثالیں ملتی ہیں اور اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں اللہ کے بعد اللہ کے رسول کی زبان اور ان کی تعلیمات پر ایسا مضبوط یقین پیدا ہو گیا تھا جس نے ان کی پوری شخصیتوں کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا اس کے لئے انہیں کسی طرح قربانی دیتے ہوئے تامل نہیں ہوتا تھا کیونکہ یقین ایسی ہی قوت کا نام ہے جس میں جان بھی انسان کیلئے راحت سے کم نہیں ہوتا اور ایسے یقین سے تہی دامن ہو جانا غلامی سے بھی بدتر ہوتا ہے اقبال نے بالکل سچ کہا

Marfat.com

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

آج امتِ مسلمہ کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ ایمان کے دعوی داروں کی کمی نہیں لیکن ان کی اکثریت کا ایمان زبان کے اقرار سے آگے نہیں بڑھتا' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت کی اکثریت عمل کی قوت سے بے گانہ ہوگئی ہے مومن اور مسلمان ہونے کے دعوے بہت ہیں لیکن اسلامی تعلیمات اپنے ماننے والوں کے عمل کو ترستی ہیں مساجد روز بروز نمازیوں سے خالی ہوتی جارہی ہیں اور اجتماعی زندگی بہت حد تک اسلامی تعلیمات سے بے گانہ ہی نہیں باغی ہوتی جارہی ہے اور جو لوگ ایک قدم آگے بڑھ کر اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا ارادہ کرتے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ ہر اسلامی تعلیم اور آنحضرت کے ہر ارشاد کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں یعنی ان کے ایمان کا دارومدار آنحضرت کی ذات گرامی نہیں بلکہ اپنی عقل ہے جس بات کو عقل قبول کر لیتی ہے وہ اسے قبول کر لیتے ہیں اور جسے عقل قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے وہ چاہے کیسا ہی بنیادی حکم کیوں نہ ہو وہ اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ آئینی تہذیبی اور تمدنی مسائل میں بیرونی تعلیمی اور تہذیبی اثرات کے تحت بری طرح دماغی آوارگی اور قلبی ناآسودگی کا شکار ہے اور ہمارے اجتماعی ادارے بیرونی اثرات کے زیر اثر ہیں یا فکری انارکی کی گرفت میں ہیں اس کا علاج اس کے سوا ممکن نہیں کہ مسلمانوں کو دوبارہ حقیقی ایمان سے آشنا کیا جائے جس کا اس آیت کریمہ میں حکم دیا گیا ہے۔

ایمان کی تشریح حدیث سے:

ایمان کی تشریح وتفسیر کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے ہمیں مزید روشنی ملتی ہے جس سے ایمانی تفصیلات کو طے کرنا آسان ہو جاتا اور تکمیلِ ایمان میں مدد ملتی ہے آپ نے فرمایا

لا یومن احدکم حتی اکونَ احب الیه من والد ہ و ولدہ والناس اجمعین

''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے والدین سے اور اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہوجاؤں''

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ

''سفر کے دوران ایک گفتگو میں حضرت عمر فاروق ؓ نے گذارش کی کہ حضور آپ مجھے اپنے والدین اپنی اولاد اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیارے ہیں لیکن اپنی جان سے نہیں تو آپ نے فرمایا کہ عمر مجھے اپنے رب کی قسم ہے جب تک میں تمہیں تمہاری جان سے زیادہ پیارا نہیں ہوجاتا اس وقت تک تم کامل مومن نہیں ہوسکتے''

ان دونوں احادیث سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل ایمان کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ ہر صاحب ایمان اللہ کے آخری رسول ﷺ کو اپنے مال و دولت اپنے اعزہ واقربا اپنی اولاد اور اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا سمجھے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی آنحضرت ﷺ کی ذات اور ان مذکورہ چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو حضور کا انتخاب کرے اور دوسرے کو چھوڑ دے یعنی والدین ایسی بات کہیں جو اللہ کے رسول کے احکام کے خلاف ہو یا

Marfat.com

اولاد ایسی فرمائش کرے شریعت جس کی اجازت نہ دیتی ہو یا بیوی ایسا مطالبہ کرے آنحضرت نے جس بات سے روکا ہو یا آدمی کا نفس خلاف شریعت کسی کام کو کرنا چاہے تو اب رسول ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے احکام اور آپ کے ارشادات پر عمل کیا جائے اور باقی ہر چیز کو نظر انداز کر دیا جائے حتی کہ کبھی رسول ﷺ کی محبت تمام مال و دولت کے خرچ کرنے کا تقاضا کرے یا آپ کی محبت یہ چاہے کہ اپنی اولاد کو چھوڑ دو یا جان دینے کا مطالبہ کرے تو پھر آپ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ مال و دولت اولاد حتی کہ اپنی جان کو بھی قربان کر دیا جائے راحتیں اور محبتیں بھی اس حد تک باقی رہیں جس حد تک آنحضرت کے احکام اجازت دیتے ہیں اور آپ سے تعلق اس تعلق کو برداشت کرتا ہو اور اگر حال یہ ہو کہ خوشی کے ہر موقع پر آدمی اپنے نفس کا تابع ہو کر رہ جائے یا برادری اور احباب کا دباؤ اسے ان کے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر دے یا حالات کی گرفت اسے اپنے ڈھب پر چلنے کے لئے مجبور کرے اور ایمان کا دعویٰ دار اس بات کو بھول جائے کہ مجھے رسول ﷺ سے محبت کا دعویٰ بھی ہے اس لئے میں ان کی محبت سے متصادم کسی بات کو جائز نہیں سمجھ سکتا تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم نے محبت کے نام پر اپنے آپ کو دھوکہ دے رکھا ہے یا ہم دروغ گوئی کا شکار ہیں۔ یہ تو وہ کم سے کم مطالبات ہیں جو آنحضرت ﷺ کی محبت کا تصور کرتے ہی سامنے آ جاتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ جس سے آدمی کو محبت ہوتی ہے اس کی اطاعت آدمی کا مقصد بن جاتی ہے اس کی ایک ایک ادا قلب و نگاہ کے لئے تسکین کا باعث ہوتی ہے اس کی پسندیدہ چیزیں پسندیدہ بن جاتی ہیں اور ناپسندیدہ چیزیں ناپسندیدہ بن جاتی ہیں جو چیزیں اس کے یہاں مقاصد کا درجہ رکھتی ہیں وہ محبت کرنے والے کی نگاہ میں بھی مقاصد کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں جن چیزوں کی عزت و حرمت کے لئے اس نے جان کھپائی ہوتی ہے محبت کرنے والا بھی انہی چیزوں کے لئے جان کھپانا اپنا فرض سمجھتا ہے جو چیزیں اس کے یہاں ترجیح کے لائق ہوتی ہیں محبت کرنے والا بھی انہی کو ترجیح دینا ضروری سمجھتا ہے حتی کہ اس کا کھانا پینا اس کا اوڑھنا پہننا اس کا چلنا پھرنا اس کا سونا جاگنا جو سراسر انسانی عادتوں سے عبارت ہے وہ بھی محبت کرنے والے کے دل میں محبت کے پیغام سے کم نہیں ہوتا وہ اس کی ہر ادا کی نقل کرتا اور ہر ادا پر جان دینا محبت کا لازمی تقاضا سمجھتا ہے اور پھر یہ محبت چند دنوں کا معاملہ نہیں بلکہ زندگی بھر کا وظیفہ ہے جب تک محبوب زندہ ہے تب بھی یہی مشغلہ ہے اور جب محبوب دنیا سے چلا جاتا ہے تو عادات و اطوار مقاصد و ترجیحات اور حسن و قبح کے معیارات زندگی بھر کا معمول بن جاتے ہیں کوئی اور چیز زندگی سے نکل سکتی ہے لیکن محبوب کا یہ ورثہ زندگی سے الگ نہیں ہو سکتا ٹھیک کہا کسی نے

دریچے بند کر کے سونے والو
محبت عمر بھر کا رتجگا ہے

متذکرہ بالا چیزیں تو عام محبت کا حاصل ہیں لیکن یہاں ہم رسول ﷺ کی محبت کا ذکر کر رہے ہیں جو تکمیلِ ایمان کیلئے لازمی ہے اس پاکیزہ محبت کی عظمت کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی کیا کیا نزاکتیں ہوں گی؟ کم سے کم لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے

محمد کی محبت آنِ ملت شانِ ملت ہے — محمد کی محبت روحِ ملت جانِ ملت ہے
محمد ہے متاعِ عالمِ ایجاد سے پیارا — پدر مادر برادر مال جان اولاد سے پیارا
محمد کی غلامی، ہے سند آزاد ہونے کی — خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

تکمیل ایمان کے لئے آنحضرت ﷺ نے ایک اور بات کا بھی حکم دیا ہے جو اس محبت کا لازمی نتیجہ ہے ارشاد فرمایا

لا یومن احدکم حتی یکونَ ھواہ تبعاً لما جئت بہ

Marfat.com

''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ اس کی خواہشات اس (شریعت) کے تابع نہ ہوجائیں جسے میں لے کر آیا ہوں''

یعنی جب تک تمہاری زندگی کا ایک ایک عمل میری لائی ہوئی شریعت کی اطاعت اور پیروی میں نہ گزرے اور تم کوئی سا کام کرنے سے پہلے یہ نہ سوچو کہ اس بارہ آنحضرت ﷺ کے احکام کیا ہیں بلکہ جو جی میں آئے کر گزرو اور اگر تمہیں بتایا بھی جائے کہ اس کام سے متعلق حضور کی یہ یہ ہدایات ہیں تو تم اس کی پرواہ نہ کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کامل مومن نہیں حقیقت بھی یہ ہے کہ جو آدمی محبت کا دعویٰ کرتا ہے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے محبوب کے احکام کی خلاف ورزی کرے وہ تو اس کی اداؤں پر جان چھڑکتا ہے چہ جائے کہ اس کے احکام کی پرواہ نہ کرے کسی عرب شاعر نے کیا خوب کہا

تعصی الرسولُ و انتَ تظهر حبه   هذا لعمری فی الزمان بدیع

''تو رسول اکی نافرمانی کرتا ہے حالانکہ تو ان سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے مجھے اپنی بقاء کی قسم ہے زمانے میں یہ ایک نئی بات ہے''

لو کان حبك صادقاً لا طعته   ان المحب لمن یحب مطیع

''اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو رسول اکی ضرور اطاعت کرتا کیونکہ محب ہمیشہ اپنے محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے''

قرآنِ پاک میں ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے رسول دنیا کے کسی لیڈر کی طرح نہیں ہوتے کہ اس کی بات ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اللہ کے رسول کی فرماں برداری اور اس کی اطاعت بالکل اللہ کی اطاعت ہے اور اس کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے' ایک حدیث میں تو حضور نے اطاعت نہ کرنے والے کو ایمان سے خارج قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

کل امتی یدخلون الجنته الا من ابیٰ قالو یا رسول الله ومن ابیٰ قال من اطاعنی فقد دخل الجنة ومن عصانی فقد ابیٰ

''میری ساری امت جنت میں جائے گی ہاں وہ نہیں جائے گا جس نے انکار کیا لوگوں نے پوچھا اے اللہ کے رسول کس نے انکار کیا فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں گیا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے (مجھے ماننے سے) انکار کر دیا۔''

پھر یہ اطاعت زندگی کے کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ دین نام ہی اطاعت اور اتباع رسول کا ہے اور پھر اطاعت اس چیز کا نام نہیں کہ آپ نے جو حکم دیا اس کی تعمیل کر لی بلکہ اطاعت اس اتباع کو کہتے ہیں جس میں ہو بہو آپ کی زندگی کی نقل کی جائے حدیث شریف میں آتا ہے کہ چند آدمی ازواجِ مطہرات کی خدمت میں آئے تا کہ آنحضرت ﷺ کی رات کی عبادت کی تفصیل معلوم کر لیں چنانچہ انہیں بتایا گیا تو انہوں نے اسے کم جانا اور کہنے لگے کہ آنحضرت ﷺ کو تو عبادت کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ معصوم پیدا ہوئے ہیں وہ جتنی بھی عبادت کریں کافی ہے ہمیں تو اس سے زیادہ عبادت کی فکر ہونی چاہیے ایک صاحب کہنے لگے میں تو آج سے ہمیشہ روزے رکھوں گا دوسرے بولے میں کبھی رات بھر نہیں سوؤں گا بلکہ عبادت میں مصروف رہوں گا تیسرے صاحب نے کہا میں کبھی شادی نہیں کروں گا بلکہ طیبات سے کنارہ کش ہو کر اللہ کی عبادت میں لگا رہوں گا اسی اثناء میں حضور تشریف لے آئے آپ کو جب بتایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ سنو میں رات کو عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں بیویوں سے تعلق بھی رکھتا ہوں اور عبادت و زہد کا بھی حق ادا کرتا ہوں یہ میرا طریقہ ہے جس نے میرے طریقے کی خلاف ورزی کی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ اندازہ فرمایئے کہ آنے والے حضرات سراسر نیکی کے جذبے سے اپنی مرضی سے عبادت کرنا چاہتے تھے لیکن آپ نے ان پر یہ بات واضح فرمائی کہ عبادت بھی وہ معتبر ہے جو میرے طریقے کی پیروی میں ہے ورنہ اس کا کوئی اعتبار نہیں حدیث سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ کسی

Marfat.com

فرض حکم پر بھی اگر آنحضرت کی منشاء کے خلاف عمل کیا جائے تو وہ نافرمانی بن جاتا ہے مسلم شریف کی روایت ہے کہ آپ نے ایک سفر میں موسم کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے ایک ٹیلے پر چڑھ کر روزہ کھول دیا اور لوگوں کو بھی روزہ کھولنے کا حکم دیا حالانکہ یہ رمضان شریف کا روزہ تھا۔ سہ پہر کے بعد آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک شخص پر چادر تانے کھڑے ہیں آپ نے استفسار فرمایا تو معلوم ہوا کہ ان صاحب نے روزہ افطار نہیں کیا یہ سمجھے کہ میں روزہ پورا کر لوں گا اب گرمی کی شدت کی وجہ سے حالت غیر ہونے لگی ہے اس لئے لوگ ان کے سر پر سایہ کئے کھڑے ہیں آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ یہی لوگ نافرمان ہیں، یہی لوگ نافرمان ہیں حالانکہ اس شخص نے ایک فرض حکم کی اطاعت کے جذبے سے یہ تکلیف اٹھائی تھی جس میں نافرمانی کا کوئی تصور تک نہ تھا لیکن چونکہ یہ فرض کی ادائیگی آنحضرت کے حکم کے خلاف کی جارہی تھی اس لئے آپ نے اسے نافرمانی قرار دیا اس وضاحت سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اللہ کے رسول پر ایمان کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ ایمان کے ساتھ ساتھ محبت اور اطاعت شامل نہ ہو کیوں کہ جس ایمان میں محبت شامل نہیں اس ایمان میں کوئی گہرائی نہیں اور جس ایمان میں اطاعت شامل نہیں اس ایمان کا کوئی ثمر نہیں تو گہرائی سے خالی بے ثمر ایمان' ایمان کے دعوی دار کو زبانی جمع خرچ کے سوا اور کیا دے سکتا ہے۔ لیکن جب یہ دونوں جذبے ایمان کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تو پھر صاحب ایمان کے دل میں اللہ کے رسول کی عظمت و حرمت مچلنے لگتی ہے جس کے نتیجے میں تعظیم و توقیر اور احترام و ادب کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے اس لئے اس آیتِ کریمہ میں ایمان کے بعد احترام کا حکم دیا گیا ہے عزروہ'' تعزیر سے مشتق ہے۔ تعزیر کے اصلی معنی شفقت کے ساتھ منع کرنے اور حفاظت کرنے کے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے اس کے معنی تعظیم و تکریم کرنے کے بتلائے ہیں اور مبرد نے کہا کہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم کو تعزیر سے تعبیر کیا جاتا ہے قرآن کریم نے اس کے علاوہ بھی جابجا آنحضرت کی تعظیم و توقیر کے لئے ہدایات دی ہیں اور اس کے آداب سکھائے ہیں۔ اس آیت میں تو'' عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ '' کے الفاظ سے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی "وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ" آیا ہے اور کئی آیتوں میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایسی بلند آواز سے بات نہ کریں کہ آپ کی آواز سے بڑھ جائے "اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ" اور ایک جگہ ارشاد ہے "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" یعنی اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو یعنی جس مجلس میں حضور ﷺ تشریف فرما ہوں اور کوئی معاملہ پیش آئے تو آپ سے پہلے کوئی نہ بولے'

حضرت سہل بن عبداللہ نے اس آیت کے معنی یہ ملتے ہیں کہ آپ سے پہلے نہ بولیں اور جب آپ کلام کریں تو سب خوش ہو کر سنیں۔

ایک آیتِ قرآن میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو پکارنے کے وقت ادب کا لحاظ رکھیں اس طرح نہ پکاریں جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں "لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا''' آخر آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس کے خلاف کوئی کام بے ادبی کا کیا گیا تو سارے اعمال حبط اور برباد ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین باوجودیکہ ہر وقت' ہر حال میں آنحضرت ﷺ کے شریک کار رہتے تھے اور ایسی حالت میں احترام و تعظیم کے آداب ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ان کا یہ حال تھا کہ آیتِ مذکورہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت صدیق اکبر ؓ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ عرض کرتے تو اس طرح بولتے تھے جیسے کوئی پوشیدہ بات کو آہستہ کہا کرتا ہے یہی حال حضرت فاروقِ اعظم ؓ کا تھا۔ (شفاء)

حضرت عمرو بن عاص فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی مجھے دنیا میں محبوب نہ تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں آپ کی طرف نظر بھر کر د

Marfat.com

بھی نہ سکتا تھا اور اگر کوئی مجھ سے آپ کا حلیہ مبارک دریافت کرے تو میں بیان کرنے پر اس لئے قادر نہیں کہ میں نے کبھی آپ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔

ترمذی نے حضرت انس سے نقل کیا ہے کہ مجلسِ صحابہ میں جب آنحضرت ﷺ تشریف لاتے تھے تو سب نیچی نظریں کر کے بیٹھتے تھے صرف صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم آپ کی طرف نظر کرتے اور آپ ان کی طرف نظر فرما کر تبسم فرماتے تھے۔

عروہ بن مسعود کو اہل مکہ نے جاسوس بنا کر مسلمانوں کا حال معلوم کرنے کے لئے مدینہ بھیجا اس نے صحابہ کرام کو پروانہ وار آنحضرت ﷺ پر فدا ہوتے دیکھا واپسی پر رپورٹ دی کہ میں نے قیصرو کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں اور ملک نجاشی سے بھی ملا ہوں مگر جو حال میں نے اصحابِ محمد ﷺ کا دیکھا وہ کہیں نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ میں ہرگز کامیاب نہ ہو گے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کی حدیث میں ہے کہ جب آپ گھر میں تشریف فرما ہوتے تھے تو صحابہ کرام باہر سے آواز دے کر آنحضرت ﷺ کو بلانا بے ادبی سمجھتے تھے دروازہ پر دستک بھی صرف ناخن سے دیتے تھے تاکہ زیادہ کھڑکا اور شور نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی صحابہ و تابعین کا معمول یہ تھا کہ مسجدِ نبوی میں کبھی بلند آواز سے بات کرنا تو در کنار کوئی وعظ تقریر بھی زیادہ بلند آواز سے پسند نہ کرتے تھے اکثر حضرات کا عالم یہ تھا کہ جب کسی نے آنحضرت ﷺ کا نامِ مبارک لیا تو رونے لگے اور ہیبت زدہ ہو گئے۔

آپ ﷺ کا احترام:

اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ پر ایمان اور آپ کے احترام کے بعد آپ کی نصرت اور مدد کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے یعنی آپ سے تعلق کی جو بنیادیں ہیں یا آپ کے حقوق جو ہر امتی پر عائد ہوتے ہیں وہ صرف ایمان اور احترام سے مکمل نہیں ہوتے بلکہ یہ بات از بس ضروری ہے کہ آپ جو دعوت لے کر اٹھے ہیں اور جس انقلاب کو برپا کرنا آپ کے پیشِ نظر ہے اور آپ جس طرح سے نوع انسانی کی اصلاح کا کٹھن کام سرانجام دینا چاہتے ہیں اور آپ جس طرح انسانوں کو دوبارہ اللہ کے آستانے پر جھکانا چاہتے ہیں اس میں قدم قدم پر آپ کو تعاون اور مدد کی ضرورت ہے آپ ایک ایک آدمی کے پاس تنہا دعوت لے کر نہیں جاسکتے جاہلیت اور کفر کے جتھے اپنی گروہی عصبیتوں کے باعث کبھی بھی اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوسکتے وہ اسے روکنے کے لئے ہر ممکن طاقت استعمال کرتے ہیں ان کے سامنے تنہا پیغمبر کا جانا آسان کام نہیں اور ان کے تعصبات اور جاہلی حمیت کو روکنا اس سے بھی کٹھن کام ہے کہ پیغمبر اپنی دعوت میں اگرچہ بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر کرتا ہے اور اللہ ہی ہر حال میں اس کا معاون اور مددگار ہوتا ہے بایں ہمہ! اسباب کی دنیا میں بے حد ضروری ہے کہ انسانوں میں سے آپ کو ایسے جانثار اور سرفروش ملیں جو ہر ممکن طریقے سے آپ کی اور آپ کی دعوت کی نصرت کا فرض انجام دیں آپ کے ساتھ یا آپ کے حکم کے مطابق اس دعوت کو ہر شخص تک پہنچانے کی کوشش کریں دشمن جب حضور کی ذات کو نقصان پہنچانا چاہے تو مسلمان ان کے سامنے ڈھال بن جائیں اور پھر اپنی قربانیوں اور فداکاریوں سے نہ صرف کہ دین کی قوت کا باعث بنیں بلکہ اپنی استقامت سے انکار کرنے والوں کے انکار میں دراڑیں ڈال دیں وہ لوگ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ یہ معاشرے کے انتہائی پسماندہ اور کمزور لوگ جو کل تک ہماری آواز سے بھی خوف زدہ رہتے تھے آخر آج ان میں یہ قوت کس وجہ سے آئی ہے اگر اس کی وجہ اس دین سے وابستگی ہے تو یقیناً اس دین میں ایسی بات کوئی ضرور ہے جس سے کمزور توانا ہو جاتے ہیں اور متکبر متواضع ہو جاتے ہیں۔

آپ ﷺ کی نصرت:

پھر اگر کفر پیغمبر کو قتل کرنے کے منصوبے باندھنے لگے اور وہ آخری اقدام پر تل جائے تو مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ آخر حد تک نصرت کا

Marfat.com

فرض انجام دیتے ہوئے پیغمبر کی حفاظت کریں حکم ملے تو اس کے ساتھ ہجرت کر جائیں پھر اپنے نئے وطن کو اسلامی سوسائٹی اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست میں تبدیل کرنے کے لئے اپنے پیغمبر کی آخر حد تک مدد اور نصرت کریں اگر اس کے لئے جنگی معرکوں سے گزرنا پڑے تو دریغ نہ کریں اگر خود جان دینا پڑے یا بچوں کو ذبح کروانا پڑے تو اس کو نصرتِ پیغمبر کا لازمی حصہ سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کرلیں اور اس بات پر یقین رکھیں کہ ہماری دنیوی اور اخری کامیابی اسی نصرتِ پیغمبر اور نصرتِ دین میں مضمر ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام نے ایمان لاتے ہی اس حقیقت کی تہہ کو پالیا تھا حضرت صدیق اکبرؓ ایمان لانے کے بعد پوچھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اب تک جو کام میں تنہا کرتا تھا اب تمہیں اس کام میں نصرت کرنا ہوگی چنانچہ اس میں سب سے بڑا کام چونکہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانا اور ہر ممکن طریق سے انہیں دین کی طرف راغب کرنا تھا حضرت صدیق اکبرؓ نہایت خاموشی سے مکہ کے جگر گوشوں کی ایک معقول تعداد آنحضرت کی آغوش میں ڈال دی اور پھر جب مخالفت کا دور شروع ہوا اور آنحضرت اور مسلمانوں پر حملے شروع ہوگئے تو آپ کی حفاظت کے لئے سب سے پہلی مار صدیق اکبرؓ نے کھائی اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہ دعوت حق و باطل کے معرکے کی صورت اختیار کر گئی تو اس میں بھی صدیق اکبرؓ پیش پیش رہے۔ اسی مقصد کے لئے اپنا سارا مال آنحضرت ﷺ کی نذر کر دیا اپنی تین پشتیں اور ام والدین اسلامی قافلے کے مسافر بنا دیئے زندگی کا اصل غم اور اصل ہدف اسی دین کی بالادستی کو بنایا جس کے لئے حضور مبعوث ہوئے اور اس کی نصرت کرتے ہوئے ہر وہ قربانی دے ڈالی جس کی آنحضرت ﷺ نے ضرورت محسوس فرمائی یہ معاملہ حضرت صدیق اکبر کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر صحابی نے بقدر ہمت واستعداد اسی طرح اس فرض کو انجام دیا ایک صحابی جو جنگ احد میں شہید ہوئے انہوں نے جان دیتے ہوئے دوسرے صحابی سے کہا کہ آنحضرت کو میرا اسلام کہنا اور مسلمانوں کو میرا یہ پیغام پہنچانا کہ دیکھنا آنحضرت کی ذات کو اور آپ کے لائے ہوئے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچے آپ کی نصرت اور دین کی حفاظت مسلمانوں کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے اگر تم نے اس میں ذرا سی کوتاہی برتی تو یاد رکھو کہ قیامت کے دن اپنے پروردگار کا سامنا نہ کر سکو گے۔ مسلمانوں کے لئے نصرتِ پیغمبر اور نصرتِ دین ایک ایسا فریضہ ہے جس پر اللہ کے دین کی بقا کا دارومدار ہے اس لئے صحابہ کرام میں ایک ایک فرد کہ بچے تک بھی اسی جذبے سے سرشار تھے انہوں نے اپنا مال اپنا وطن اپنے کاروبار اپنا اثر ورسوخ حتی کہ اپنی جانیں بھی اسی فریضہ کے سپرد کر دی تھیں جب تک زندہ تھے تو آنحضرت اور آپ کے دین کے لئے وہ جان دیتے تھے تو اسی مقصد کی سربلندی کے لئے اور یہ مقصد اس طرح اس معاشرے میں رچ بس گیا تھا کہ ان کے بچے بھی شعوری عمر کو پہنچتے ہی اسی کو اپنی زندگی کا مقصد اور حاصل بنا لیتے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ جنگ بدر میں جب کہ جنگ زوروں پر تھی اچانک دو نوعمر لڑکوں نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ سے پوچھا کہ چچا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں ابوجہل کون ہے اور کہاں ہے؟ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے پوچھا کہ بیٹا تمہیں اس سے کیا کام ہے؟ وہ اس وقت اپنے محافظوں کے نرغے میں ہے اور پھر وہ عرب بھر کا مانا ہوا جنگجو بہادر ہے تم اس کا کیا کر سکتے ہو؟ بچوں نے بیک وقت بڑے جذبے سے کہا

قسم کھائی ہے مر جائیں گے یا ماریں گے ناری کو
سنا ہے گالیاں دیتا ہے وہ محبوب باری کو
یہ کہتے کہتے غیرت سے ہوئے منہ لال دونوں کے
شہادت کے لہو سے تمتمائے گال دونوں کے

یہ ان کے رخساروں کی سرخی ان کے اس جذبۂ بے پناہ کی عکاس تھی اور ان کا اپنی جان پر کھیل کر ابوجہل کو قتل کرنے کا جذبہ اس فریضہ کی تکمیل

Marfat.com

کی ایک مومنانہ کوشش تھی جسے یہاں نصرتِ پیغمبر سے تعبیر کیا گیا ہے جب تک حضور دنیا میں رہے صحابہ نے خون دے کر آپ کی حفاظت کا فرض انجام دیا اور آپ کے لائے ہوئے دین کی بالا دستی کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر ڈالی اور جب حضور اس دنیا سے تشریف لے گئے اور جاتے ہوئے اللہ کی کتاب اور اپنی سنت کی امانت صحابہ کے سپرد کر گئے تو پھر انہوں نے ان دونوں امانتوں کو نوع انسانی تک پہنچانے اور ان کے پیش کردہ دین کو دنیا پر غالب کرنے کے لئے کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا آج امتِ مسلمہ جو ایک ارب پچیس کروڑ کے قریب افرادی قوت سے مالا مال ہے اور دنیا میں ان کی ساٹھ کے قریب قریب حکومتیں ہیں یہ سب کچھ انہیں کوششوں کا صدقہ ہے لیکن یہ بات یہاں ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ فریضہ صرف صحابہ کرام کے ساتھ مخصوص نہیں یہ قیامت تک رہنے والی اس امت کے ایک ایک فرد کی ذمہ داری ہے وہ اپنے حالات کے مطابق اس ضرورت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر مقدور بھر اپنے تمام وسائل حتی کہ اپنی ذات بھی اس پر قربان کر دے۔ ٹھیک کہا تھا کسی نے

ہم کو بخشی ہیں خدا نے دوہری خدمتیں
خود تڑپنا ہی نہیں اوروں کو تڑپانا بھی ہے
خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام
ہم کو اس ظلمت کدے میں نور پھیلانا بھی ہے

قرآن کا اتباع:

آخری بات اس آیتِ کریمہ میں حضور پر ایمان لانے والوں کے لئے جو فرمائی جا رہی ہے وہ اس نور کا اتباع ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا مراد اس سے قرآن کریم ہے۔ آغازِ کلام میں آنحضرت ﷺ کے اتباع کا ذکر فرمایا گیا تھا اور یہاں قرآنِ کریم کے اتباع کا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس اتباع کا مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے وہ ان دونوں سے مل کر مکمل ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں پیغمبر جو کچھ فرماتا ہے اس کی بنیاد قرآنِ کریم یا وحی الٰہی ہوتی ہے وہ اپنی ہوائے نفس سے کبھی کوئی بات نہیں کہتا اور قرآن کریم اصول بیان کر کے فروع کو اللہ کے رسول پر چھوڑ دیتا ہے چنانچہ اس کی وضاحت اللہ کا رسول فرماتا ہے قرآن احکام جاری کرتا ہے لیکن ہر حکم کی ضمنی تفصیلات اور اس کی عملی شکل وہ اللہ کے پیغمبر کی ذات سے وجود میں آتی ہے مثلاً قرآنِ پاک نماز پڑھنے کا حکم دیتا ہے لیکن نمازوں کی تعداد نمازوں کے اوقات ہر نماز میں پڑھی جانے والی رکعتیں اور ہر رکعت میں پڑھی جانے والی دعائیں اور قرآنِ کریم پھر نماز کے آداب کی تفصیل یہ سب کچھ اللہ کے رسول کا عطا کردہ ہے قرآنِ کریم نے ان میں سے کچھ بھی بیان نہیں کیا بس اسی مثال پر قیاس کرتے ہوئے یوں سمجھ لیجئے کہ قرآن قول ہے اور آنحضرت کی سنت اس کا عمل ہے' قرآن متن ہے' سنت اس کی شرح ہے' قرآن ایک تھیوری ہے' سنت اس کا پریکٹیکل ورک ہے' قرآن میں کہیں اجمال ہے' تو سنت اس کی تفصیل ہے' کہیں ابہام ہے' تو سنت اس کی تفسیر ہے' اس طرح سے قرآن و سنت دونوں مل کر جو آئین' قانون' روایت اور نظام زندگی عطا کرتے ہیں اس کی پیروی کرنے کا یہاں ذکر فرمایا جا رہا ہے اور یہی وہ پیروی ہے جو ایمان محبت اطاعت احترام اور نصرت کے ساتھ مل کر ایک مکمل اسلامی زندگی کو جنم دیتی ہے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ وابستگی کے حق کو ادا کرتی ہے اور اسی پر دنیا اور آخرت کی کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے۔

Marfat.com

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِيْ لَهٗ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ
وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ
بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۚ وَ
اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ
الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۚ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ
مَّشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَ
السَّلْوٰى ۚ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا
مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ
لَكُمْ خَطِيْٓئٰتِكُمْ ۚ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ
قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ
بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

اے پیغمبر کہہ دیجئے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں وہ اللہ جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ اور

Marfat.com

موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہوا ہے جو حق کے مطابق راہنمائی کرتے اور اسی کے مطابق انصاف کرتے۔ اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں الگ الگ امتیں بنا دیا' اور ہم نے موسیٰ کی طرف جب کہ اس کی قوم نے پانی طلب کیا وحی کی کہ اپنا عصاء پتھر پر مارو' تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے' ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ متعین کر لیا' اور ہم نے ان پر بدلیوں کا سایہ کیا' اور ان پر من اور سلویٰ اتارا' کھاؤ ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزوں میں سے' اور انہوں نے کچھ ہمارا نہیں بگاڑا' بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ اور یاد کرو جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں رہو بسو' اس میں سے جہاں سے چاہو کھاؤ پیو اور توبہ استغفار کرتے رہو اور دروازے میں سر فگندہ داخل ہو تو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے' خوب کاروں کو ہم مزید نوازیں گے تو ان میں سے ان لوگوں نے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اس کو بدل دیا' کہی ہوئی بات سے مختلف بات سے' تو ہم نے ان پر ایک آفتِ سماوی بھیجی بوجہ اس کے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

..............☆......☆......☆..............

جس آخری پیغمبر کے اتباع پر دنیا اور آخرت کی کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے اب اسی پیغمبر کی زبان سے اگلی آیتِ کریمہ میں ایمان لانے کی دعوت بھی دی گئی ہے اور آپ کی اصل حیثیت کو بھی واضح فرمایا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ص فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ O

''اے پیغمبر کہہ دیجئے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں وہ اللہ جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر' جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو' تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔'' 158

اس آیتِ کریمہ میں متعدد باتیں غور و فکر کا تقاضا کرتی ہیں

تمام نوعِ انسانی کو ایمان لانے کی دعوت اور آیت کے مندرجات کی تشریح:

1- سلسلۂ کلام چونکہ بنی اسرائیل سے متعلق ہے اس لئے سب سے پہلے ان کی ایک غلط فہمی کو دور کیا جا رہا ہے جو ان کی گمراہی کی بنیاد بن گئی تھی وہ غلط فہمی یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے نبی اور رسول صرف بنی اسرائیل میں آتے ہیں ان کے علاوہ کسی اور خاندان یا کسی اور قوم میں نبی مبعوث نہیں ہوتا۔ اس لئے جو نبی یا رسول بنی اسرائیل میں آئے گا ہم اسے تو تسلیم کریں گے اور جو کسی دوسرے خاندان یا دوسری قوم میں پیدا ہو گا ہم اسے ہرگز قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنی اس غلط فہمی کو دور کرو اللہ نے تمام نوعِ انسانی کی ہدایت کا ذمہ لیا ہے اس ذمہ داری کے حوالے سے اس

Marfat.com

نے تمام دنیا میں ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے ہیں اور دنیا صرف بنی اسرائیل کا نام تو نہیں جہاں جہاں بھی انسان بستے ہیں وہاں وہاں اللہ کے نبی اور رسول آئے ہیں' اب میں اگرچہ بنی اسماعیل میں پیدا ہوا ہوں لیکن میری نبوت اور رسالت صرف بنی اسماعیل کے لئے نہیں بلکہ بنی اسرائیل اور باقی دنیا کے لئے بھی ہے جب میں سب کی طرف پیغمبر بن کر آیا ہوں تو اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف بھی پیغمبر ہو کر آیا ہوں اس لئے تمہیں بھی بنی اسماعیل کی طرح مجھ پر ایمان لانا ہوگا اور جس طرح ہر آنے والے پیغمبر پر ایمان لائے بغیر نجات نہیں ہوتی اسی طرح جب تک مجھ پر ایمان نہیں لاؤ گے تمہارا سابقہ نبیوں کو ماننا نجات کے لئے کافی نہیں ہوگا۔

-2 دوسری بات جو ارشاد فرمائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل کے لوگو! تمہیں یہ حسد کھائے جا رہا ہے کہ اللہ نے اپنا آخری رسول بنی اسماعیل میں کیوں بھیج دیا؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں کسی خاندان یا کسی قوم کا رسول ہو کر نہیں آیا اس لئے کسی خاندان کی نسبت سے تمہارے حسد کی آگ میں جلنا کسی طرح روا نہیں۔ میں تو تمام نوعِ انسانی کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں اس سے پہلے اللہ کے نبی اور رسول ایک محدود علاقے یا کسی ایک قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے لیکن میری بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے اب میرے آ جانے کے بعد نجات کا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ تم مجھ پر ایمان لاؤ اور میرا اتباع کرو' اور یہ سمجھ لو کہ میں جس طرح بنی اسماعیل کا رسول ہوں اسی طرح دنیا کی ہر قوم کا رسول ہوں میری رسالت کسی خاص قوم سے منسوب نہیں اس لئے ہر ایمان لانے والے کو یہ سمجھ کر ایمان لانا چاہیے کہ میری نبوت و رسالت سب کے لئے باعث افتخار ہے۔

-3 نبوت و رسالت جس طرح اللہ کا ایک انعام ہے جس کے نتیجے میں زمین' آسمان سے ہم کلام ہوتی اور یہ بے مایہ انسان اللہ کے پیغامات کا مستحق ٹھہرتا ہے اور اسے یہ عزت ملتی ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے واسطے سے اپنے اللہ کے پیغام کو وصول کرے اور اس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو اور وہ ہمیشہ اس بات پر ناز کرے کہ مجھے ہر روز زندگی کی الجھنوں سے نجات دینے اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے آسمانی راہنمائی نصیب ہوتی ہے میں ایک بے قدر و قیمت انسان ہوں میری حیثیت ایک مشتِ خاک سے زیادہ نہیں لیکن میرا خدا میرے پیغمبر کے واسطے سے مجھے خطاب فرماتا ہے گویا میں خالقِ کائنات کا مخاطب ہوں اس پر انسان جتنا بھی فخر کرے کم ہے اس لحاظ سے تو یہ نبوت و رسالت اللہ کا ایک انعام ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا امتحان بھی ہے۔ تصور کیجئے کہ ایک قوم اپنے پیغمبر کی ہدایات اور اس پر نازل کردہ کتاب اور شریعت پر بڑی یکسوئی سے عمل کر رہی ہے کہ اچانک ان میں ایک پیغمبر مبعوث ہو جاتا ہے اور وہ انہیں اپنی دعوت کو قبول کرنے اور اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور انہیں صاف صاف بتاتا ہے کہ تم جس پیغمبر اور رسول پر ایمان رکھتے ہو وہ یقیناً اللہ کے سچے رسول تھے اور جس شریعت پر عمل کر رہے ہو وہ یقیناً اللہ نے نازل فرمائی تھی لیکن اب میری رسالت کے بعد اور میری شریعت کے نازل ہو جانے کے بعد تمہاری نجات کے لئے سابقہ پیغمبر اور سابقہ شریعت پر عمل کرنا کافی نہیں تم جب تک مجھ پر ایمان نہ لاؤ اور میری شریعت پر عمل نہ کرو اس وقت تک تم اللہ کے ہاں نجات نہیں پا سکتے۔ اس لحاظ سے اس نئے رسول کا آنا اس قوم کے لئے ایک امتحان بن جاتا ہے وہ سوچ میں ڈوب جاتی ہے کہ سابقہ شریعت اور رسالت کی موجودگی میں ہم اس نئے رسول اور اس نئی شریعت پر ایمان کیوں لائیں؟ بہت سے لوگ اس عصبیت میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ مخالفت و دشمنی پر تل جاتے ہیں نتیجتاً اپنی دنیا و آخرت برباد کر لیتے ہیں پروردگار نہایت رحیم و کریم ذات ہے وہ بلا ضرورت کبھی اپنی مخلوق کو اس امتحان میں نہیں ڈالتی وہ اس وقت نئے پیغمبر اور نئی شریعت کو نازل کرتی ہے جب پہلی شریعت تحریف کا شکار ہو کر قوم کی اصلاح کی ضرورت کو پورا کرنے کے قابل نہیں رہتی ان کے بگڑے ہوئے علماء اس شریعت میں اس حد تک تبدیلیاں کر دیتے ہیں کہ اس پر محض اللہ کی خوشنودی کے لئے عمل کرنا اور صحیح دینی نتائج حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے ایسی صورت

Marfat.com

میں ضروری ہے کہ نیا رسول آئے اور نئی شریعت نازل ہو۔ چنانچہ یہاں تمام نوع انسانی کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ اب رسول اللہ ﷺ تمام نوع انسانی کی طرف اللہ کے رسول ہو کر آئے ہیں سابقہ شریعتیں بگڑ چکی ہیں نہ انجیل محفوظ رہی نہ تورات اور آئندہ آنے والے نئے نئے مسائل شدید تقاضا کر رہے ہیں کہ انسانی ہدایت کے لئے آسمان سے کوئی شریعت اترے چنانچہ اب اللہ نے کرم فرمایا ہے کہ اس نے انسانوں کو اس امتحان سے بچانے کے لئے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی راہنمائی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تمام نوع انسانی کی طرف ایک ہی رسول بھیج دیا ہے جس کی رسالت قیامت تک کے لئے ہے۔ رسول اس علاقے میں آتا ہے جہاں پہلے کوئی نبی اور رسول نہیں آیا ہوتا۔ اس لئے حضور کو پوری زمین کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا اس کا نتیجہ آپ سے آپ یہ نکلتا ہے کہ اب زمین کے کسی حصے پر کسی اور رسول کے مبعوث ہونے کی ضرورت نہیں اور مزید یہ کہ رسول اس وقت بھیجا جاتا ہے جب پہلی شریعت اور پہلی رسالت محفوظ نہیں رہتی اس لئے ضمناً یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اب یہ جو اللہ کا آخری رسول بھیجا جا رہا ہے اس کی شریعت ہمیشہ محفوظ رہے گی کیونکہ یہ تمام جن و بشر کی طرف قیامت تک کے لئے رسول بن کر آیا ہے اسی کو ختم نبوت سے تعبیر کیا گیا ہے یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلی امتوں میں جب شریعت میں تحریف ہوتی اور کتابوں میں قلم کاری ہوتی تو اس کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی نبی کو بھیج دیتا اب اس آخری نبی کے آنے کے بعد اگر کوئی نبی نہیں آئے گا تو اس آخری کتاب اور اس کی شریعت میں لوگوں نے اگر کمی بیشی کی تو اس کی اصلاح کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن و سنت سے ہمیں اس کے دو جواب ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اس سے پہلے اس نے اپنی کسی کتاب کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا کیونکہ ان کا قیامت تک محفوظ رکھنا اللہ کی مشیت کے پیش نظر نہیں تھا اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کی ضرورتیں بدلیں گی نئے نئے مسائل پیدا ہوں گے تو شریعت کے فروعی مسائل میں تبدیلیاں ناگزیر ہوں گی اور انسان کی فکری ضرورتیں نئی سے نئی راہنمائی کی محتاج ہوں گی اس لئے اس کی مشیت کا تقاضا ہوا کہ ایک خاص دور تک ہر کتاب کو محفوظ رکھا جائے اس کے بعد ضرورت کے مطابق نئی کتاب بھیجی جائے لیکن جب نبی آخر الزماں کا زمانہ آیا تو دنیا اپنے بلوغ کی عمر کو پہنچ گئی فکری کاوشیں توانا ہو گئیں انسانی سوچ اور فکر نے مستقل راستے تلاش کر لئے منتشر نوع انسانی ایک دوسرے کے قریب آنے کے لئے بے قرار ہونے لگی دنیا پھیلنے کے ساتھ ساتھ وسائل کی ہمہ ہمی کے باوجود ایک دوسرے کے قریب آ گئی اب ضرورت اس بات کی تھی کہ انسان کو آئے دن کی نبوت کی تبدیلیوں کے امتحان سے بچایا جائے اور انسانوں کو ایک آئیڈیل راہنما دے دیا جائے جو ہر دور کی راہنمائی کے لئے کافی ہو چنانچہ آنحضرت کی ذاتِ گرامی اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب قیامت تک کے لئے انسانی ضرورتوں کا سامان بن کر آ گئی۔

دوسری بات ہمیں حدیث سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی سنت کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک خاص انتظام فرمایا ہے آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایک جماعت ایسی قائم رہے گی جو دین میں پیدا ہونے والے سارے فتنوں کا مقابلہ اور دینی معاملات میں پیدا ہونے والے سارے رخنوں کا انسداد کرتی رہے گی کتاب و سنت کی تعبیر و تفسیر میں جو غلطیاں رائج ہوں گی یہ جماعت ان کو بھی دور کرے گی اور اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت و امداد اس جماعت کو حاصل ہوگی جس کے سبب یہ سب پر غالب آ کر رہے گی کیونکہ درحقیقت یہ جماعت ہی آنحضرت ﷺ کے فرائضِ رسالت ادا کرنے میں آپ کے قائم مقام ہوگی۔ امام رازی نے آیتِ کونوا مع الصادقین کی تشریح میں بتلایا ہے کہ اس آیت میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اس امت کے صادقین کی ایک جماعت ضرور باقی رہے گی ورنہ دنیا کو صادقین کی معیت و صحبت کا حکم نہ دیا جاتا۔ مندرجہ بالا حقائق پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت و رسالت قیامت تک آنے والی نسلوں اور پورے عالم کے

Marfat.com

لئے عام ہے جس میں اب کسی نبی اور رسول کی ضرورت باقی نہیں ممکن ہے یہاں یہ خیال پیدا ہو کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات میں یہ بتایا گیا ہے کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے اور یہ سب جانتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہ آسمانوں پر زندہ حالت میں موجود ہیں اور اسی طبعی زندگی کے ساتھ وہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو پھر یہ کہنا کہ حضور کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا یہ کیسے صحیح ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنحضرت کی اطلاع کے مطابق قیامت کے قریب یقیناً تشریف لائیں گے لیکن آپ کو صرف دجال کے مقابلے کے لئے بھیجا جائے گا آپ یقیناً اللہ کے نبی ہوں گے لیکن آپ کی نبوت کوئی نئی نبوت نہیں ہوگی آپ دنیا میں نبی ہوتے ہوئے بھی آنحضرت ﷺ کی شریعت کے مطابق ایک عادلانہ حکومت قائم کریں گے۔ آپ کی کوششوں کی برکت سے تمام دنیا پر اسلام غالب آجائے گا۔ عیسائیت اتمام حجت ہو جانے کے بعد ختم ہو جائے گی یہودیت کا قلع قمع کر دیا جائے گا آپ کی برکت سے خلافتِ راشدہ کا دور پلٹ آئے گا آپ ایک خلیفۂ راشد کے طور پر دنیا پر حکومت کریں گے اسی دوران آپ حج بھی کریں گے جب آپ کا آخری وقت آئے گا تو مسلمان ہی آپ کی تکفین و تدفین کریں گے اور رسول ﷺ کے پہلو میں آپ کو دفن کیا جائے گا۔ یہ ساری تفصیلات آنحضرت ﷺ پہلے بیان فرما چکے ہیں' اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تشریف لانے سے ختم نبوت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور مزید یہ بھی یاد رہے کہ اس آیتِ کریمہ سے اگرچہ ہم نے ختمِ نبوت پر استدلال کیا ہے' لیکن قرآن وسنت میں آپ کی ختمِ نبوت پر یہ واحد دلیل نہیں بلکہ اور بھی بہت سے واضح دلائل موجود ہیں۔ محض دلچسپی کیلئے ہم چند روایات کا ذکر کرتے ہیں۔

ابن کثیر نے بحوالہ مسندِ احمد سند قوی کے ساتھ روایت کیا ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر رسولِ کریم ﷺ نمازِ تہجد میں مشغول تھے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ اجمعین کو خوف ہوا کہ کوئی دشمن حملہ نہ کر دے اس لئے آپ کے گرد جمع ہو گئے جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ آج کی رات مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی رسول و نبی کو نہیں ملیں' اول یہ کہ میری رسالت و نبوت کو ساری دنیا کی کل اقوام کے لئے عام کیا گیا ہے اور مجھ سے پہلے جتنے انبیاء آئے ان کی دعوت و بعثت صرف اپنی اپنی قوم کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی' دوسری بات یہ ہے کہ مجھے میری دشمن کے مقابلے میں ایسا رعب عطا کیا گیا ہے کہ وہ مجھ سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہو تو میرا رعب اس پر چھا جاتا ہے' تیسرے یہ کہ میرے لئے کفار سے حاصل شدہ مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا حالانکہ پچھلی امتوں کے لئے حلال نہ تھا بلکہ اس کا استعمال کرنا گناہِ عظیم سمجھا جاتا تھا ان کے مالِ غنیمت کا صرف یہ مصرف تھا کہ آسمان سے ایک بجلی آئے اور اس کو جلا کر خاک کر دے' چوتھے یہ کہ میرے لئے تمام زمین کو مسجد اور پاک کرنے کا ذریعہ بنا دیا کہ ہماری نماز زمین پر ہر جگہ ہو جاتی ہے مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں بخلاف پہلی امتوں کے کہ ان کی عبادت صرف ان کے عبادت خانوں کے ساتھ مخصوص تھی اپنے گھروں یا جنگل وغیرہ میں ان کی نماز وعبادت نہ ہوتی تھی' نیز یہ کہ جب پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو' خواہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے یا کسی بیماری کے سبب سے تو وضو کے بجائے مٹی سے تیمم کرنا اس امت کے لئے طہارت و وضو کے قائم مقام ہو جاتا ہے' پچھلی امتوں کے لئے یہ آسانی نہ تھی پھر فرمایا اور پانچویں چیز کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں وہ خود ہی اپنی نظیر ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر رسول کو ایک دعاء کی قبولیت ایسی عطا فرمائی ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اور ہر رسول و نبی نے اپنی اپنی دعا کو اپنے خاص خاص مقصدوں کے لئے استعمال کر لیا وہ مقصد حاصل ہو گئے مجھ سے یہی کہا گیا کہ آپ کوئی دعا کریں میں نے اپنی دعاء کو آخرت کے لئے محفوظ کرا دیا وہ دعا تمہارے اور قیامت تک جو شخص لا الہ الا اللہ کی شہادت دینے والا ہو گا اس کے کام آئے گی۔

نیز امام احمد کی ایک روایت حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میرا مبعوث ہونا سنے خواہ وہ میری امت میں ہو یا یہودی نصرانی ہو اگر وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو وہ جہنم میں جائے گا۔

Marfat.com

صحیح بخاری میں اسی آیت کے تحت میں بروایت ابوالدرداءؓ نقل کیا ہے کہ ابوبکر و عمرؓ کے درمیان کسی بات میں اختلاف ہوا حضرت عمرؓ ناراض ہوکر چلے گئے یہ دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ بھی ان کو منانے کے لئے چلے مگر حضرت عمرؓ نے نہ مانا' یہاں تک کہ اپنے گھر میں پہنچ کر دروازہ بند کرلیا' مجبوراً صدیق اکبرؓ واپس ہوئے اور آنحضرتﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے ادھر کچھ دیر کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی اور یہ بھی گھر سے نکل کر آنحضرتﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنا واقعہ عرض کیا ابوالدرداءؓ کا بیان ہے کہ اس پر رسولﷺ ناراض ہو گئے جب صدیق اکبرؓ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پر عتاب ہونے لگا ہے تو عرض کیا یا رسول اللہ زیادہ قصور میرا ہی تھا' رسول کریمﷺ نے فرمایا کہ کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے ایک ساتھی کو اپنی ایذاؤں سے چھوڑ دو' کیا تم نہیں جانتے کہ جب میں نے باذنِ خداوندی یہ کہا کہ

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

تو تم سب نے مجھے جھٹلایا صرف ابوبکرؓ ہی تھے جنہوں نے پہلی بار میری تصدیق کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے آنحضرتﷺ کا تمام موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں، ہر ملک اور ہر خطہ کے باشندوں اور ہر قوم و برادری کے لئے رسول عام ہونا ثابت ہوا اور یہ کہ آپ کی بعثت کے بعد جو شخص آپ پر ایمان نہیں لایا وہ اگر چہ کسی سابقہ شریعت و کتاب کا یا کسی اور مذہب و ملت کا پورا پورا اتباع و تقویٰ احتیاط کے ساتھ بھی کر رہا ہو وہ ہرگز نجات نہیں پائے گا۔

رسول اللہﷺ کی تمام نوعِ انسانی کی طرف بعثت کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ میں اس ذات کی طرف سے رسول اور ایلچی بن کر آیا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے جس طرح زمین و آسمان کے مالک ہونے میں اس کا کوئی شریک نہیں بلکہ وہ مالک مطلق ہے اسی طرح یاد رکھو اب قیامت تک کے لئے میں رسول مطلق بن کر آیا ہوں اب میری رسالت میں کسی اور کی شرکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا اب قیامت تک جسے بھی اللہ کی خوشنودی منظور ہوگی اور وہ اس کے احکام پر عمل کرنا چاہے گا اس کے لئے میری ذات کے سوا کوئی ذریعہ نہیں جس کتاب کو میں لے کر آیا ہوں اور جس طرح میں نے اس کی تشریحات کی ہیں اور جس طرح میں نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا ہے وہی قیامت تک حرفِ آخر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ کے سوا جس کا میں رسول بن کر آیا ہوں کوئی الٰہ نہیں وہی اس کائنات کا حاکمِ حقیقی ہے جس طرح اس کی صفتِ خلق میں کوئی شریک نہیں اسی طرح اس کی الوہیت اور حاکمیت میں بھی کوئی شریک نہیں انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کوئی زندگی کا شعبہ ایسا نہیں جس میں اس کی حاکمیت کے سوا کسی اور کی حاکمیت قبول کی جائے۔ عبادت ہوگی تو اسی کی' معاشرت ہوگی تو اسی کے احکام کے مطابق' معیشت کی بنیادیں اٹھائی جائیں گی اور تمام مالی معاملات طے کئے جائیں گے تو اسی کی راہنمائی کے مطابق' حکومت چلے گی تو اسی ہدایت کے مطابق غرضیکہ پورا نظامِ زندگی اسی کی حاکمیت کے زیرِ اثر چلے گا اور انسانوں کے ہر معاملے پر انسانوں کی عبودیت اور اس کی الوہیت کی چھاپ ہوگی یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جسے دنیا کو سکھانے کے لئے میں اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ اس لئے آنحضرتﷺ پر مکی زندگی کے ابتدائی سالوں میں جو وحی اترتی رہی ہے اس میں اسی بات کو سب سے زیادہ نمایاں کر کے دل و دماغ میں اتارا گیا ہے۔ سورہ المدثر میں آنحضرت کو اسی تبلیغ و دعوت کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا

ربك فكبر "اپنے رب کی کبریائی بیان کرو۔"

کیونکہ دنیا میں گمراہی کی بنیاد صرف یہی ایک نقطہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر مرحلے میں بڑائی' قیادت و سیادت اور راہنمائی کسے حاصل ہے؟ کون ہے جو آئین اور قانون دینے کا حق رکھتا ہے؟ کون ہے جو مطاعِ مطلق ہے اور جس کی اطاعت ہر حال میں لازم ہے جس کی حیثیت اور جس

Marfat.com

کے حکم کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا نے اس کے نہ جانے کتنے جواب دیئے اور کتنے تجربات کئے؟ لیکن مذہب نے ہمیشہ اس کا ایک ہی جواب دیا ہے کہ ہر طرح کبریائی اور بڑائی اور سیادت وقیادت کا حق صرف خداوند ذوالجلال کے لئے ہے۔

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق — زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق — اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ — جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم — اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم — اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم

مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

مزید فرمایا وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے یعنی تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہاری زندگی اور موت اسی کے قبضے میں ہے وہی قوموں کے عروج وزوال کا مالک ہے اسی کے حکم سے قومیں عروج آشنا ہوتی ہیں اور اسی کے حکم سے قومیں تنزل کی کھائیوں میں گرتی ہیں میں تمہارے پاس اس حاکمِ مطلق اور تمہارے عروج وزوال کے مالک کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔ اسلئے کسی بے جا عصبیت کسی غلط اعتماد اور کسی بے بنیاد غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر میری نبوت اور رسالت کا انکار کر کے اپنی عاقبت تباہ کرنے کی کوشش مت کرو اور ایسا کرو گے تو سوچ لو کائنات کے اس حاکم کو آخر کیا جواب دو گے؟ اس طرح اپنی حیثیت کو واضح کرنے کے بعد انہیں ایمان لانے کی دعوت دی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسی چند باتوں کے اشارے بھی فرمائے جن کا تعلق بنی اسرائیل کی کتابوں میں منقول پیش گوئیوں سے تھا وہ چونکہ ان کی پیش گوئیوں کو جانتے تھے اس لئے اگر ان میں تھوڑا بہت حسن نیت پایا جاتا ہے تو وہ ایمان کی اس دعوت سے محروم نہیں رہ سکتے۔ فرمایا ''تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر'' ایمان کی دعوت کے لئے صرف رسول کہہ دینا کافی تھا کیونکہ اصل دعوت تو اسی حیثیت سے پیش کی جارہی ہے کہ میں اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں لیکن اس کے ساتھ نبی امی کا اضافہ بے سبب نہیں۔ سبب یہ ہے کہ پہلی آسمانی کتابوں میں جہاں بھی نبی کریم ﷺ کی بعثت کی خبر دی گئی ہے وہاں آپ کو نبی امی کہہ کر یاد کیا گیا ہے یہ گویا آپ کی ایک ایسی علامت ہے جس کے بغیر آپ کا تعارف مکمل نہیں ہوتا اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آپ کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں بلکہ بنی اسماعیل میں سے ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی شناخت کے طور پر اپنے آپ کو امی کہتے ہیں۔ تو یہاں آپ کو نبی امی کہہ کر ایمان کی دعوت دینا یہ گویا ان کی کتابوں سے استشہاد کرنا تھا کہ جس نبی امی پر ایمان لانے کی دعوت دی جارہی ہے اس کی شہادت تمہاری اپنی کتابوں میں موجود ہے دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ تم اور کسی کی نہیں سنتے تو اپنی کتابوں کی شہادت کے مطابق اس نبی پر ایمان لاؤ۔

دوسری بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے امی ہونے سے آپ کے نبی ہونے پر دلیل پیش کی جارہی ہے وہ اس طرح کہ اے دنیا کے پڑھے لکھے لوگو! اور اے بنی اسرائیل کے لوگو! تم جانتے ہو کہ جس رسول پر تمہیں ایمان لانے کی دعوت دی جارہی ہے وہ امی محض اور نوشت و خواند سے معرا ہے وہ اپنا نام تک نہیں لکھ سکتا اور اپنا لکھا ہوا نام پڑھ نہیں سکتا اور تاریخ اور حدیث میں اس کی مثالیں موجود ہیں اور اس نے کسی مدرسے یا کسی شخص کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا اس نے مکہ کے ماحول میں تربیت پائی جس میں علم کا نشان تک نہیں پایا جاتا اسے کبھی کوئی علمی ماحول میسر نہیں آیا۔

Marfat.com

ہیں ہمہ! اس کی زبان سے علم کا سوتا پھوٹ رہا ہے اس کا ایک ایک لفظ فصاحت و بلاغت کی آبرو ہے وہ جو بات کہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم کی ٹکسال سے ڈھل کر نکلی ہے اس کے پیش کردہ نظامِ زندگی نے دنیا بھر کی لائبریوں کو گنگ کر کے رکھ دیا ہے وہ امی محض ہوتے ہوئے یہ جو علم و حکمت کا دریا بہار ہا ہے اگر وہ اللہ کا رسول نہیں اور وحی الٰہی اس کی زبان سے نہیں بولتی تو بتاؤ اس علم و حکمت کا سبب کیا ہے؟ یہ وہ دلیل ہے جو امی کے لفظ سے خود بخود ابلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور مزید ایک بات جو بنی اسرائیل سے تعریض کے طور پر کہی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ تم نے ہمیشہ امیوں کا مذاق اڑایا ہے اور تمہارے اہلِ مذہب نے تمہیں یہ سکھایا کہ امیوں کا تم پر کوئی حق نہیں تم اگر ان کے حقوق کھا بھی جاؤ تو انہیں تم سے مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے تم نے کبھی انہیں اپنے ساتھ برابری کرنے کا حق نہیں دیا ہے تو اب ان سے کہا جا رہا ہے کہ جن امیوں کے ساتھ تم یہ توہین آمیز رویہ اختیار کرتے رہے ہو اب انہیں میں سے ایک امی کے ساتھ اللہ نے تمہاری قسمت وابستہ کر دی ہے اب چاہو تو اپنے پرانے خیالاتِ فاسدہ کے اسیر رہ کر اپنی عاقبت برباد کر لو اور چاہے اس امی کی پیروی کر کے اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی عاقبت بنالو۔

مزید فرمایا کہ یہ امی وہ ہے جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان لاتا ہے اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ یہ پیغمبر محض اپنی قومی برتری کے لئے نبوت کا دعویٰ نہیں کر رہا بلکہ حقیقت میں اسی سلسلۂ انبیاء کی یہ ایک کڑی ہے جس سے وہ سونے کی زنجیر مکمل ہوتی ہے کیونکہ وہ کسی الگ دھڑے کی دعوت لے کر نہیں اٹھا بلکہ وہ اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ اس کے تمام کلمات یعنی اس کی نازل کردہ کتابوں پر بھی ایمان رکھتا ہے بلکہ وہ ان کی صداقت کا مصداق بن کر آیا ہے وہ اپنی دعوت سے بھی ان کی تصدیق کرے گا اور اپنے عمل اور اپنی علامتوں سے بھی ان کی سچائی ثابت کرے گا اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس پیش گوئی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر میں اس سے پہلے کر چکا ہوں جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیان کیا تھا کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ آخری نبی جو ہوگا تو میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہ وہی لوگوں سے کہے گا مطلب یہ ہوا کہ نبی کے اس دعویٰ نبوت اور اس کی اس دعوت کو کسی وہم، کسی خیال اور دوسروں پر برتری اور سیادت حاصل کرنے کی کسی خواہش پر مبنی نہ سمجھو یہ تو وہی کچھ تمہیں سنا رہا ہے جو اللہ کی طرف سے آ رہا ہے، پیغمبر خود اللہ پر اور اس کی ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اسی ایمان کی دعوت تمہیں دے رہا ہے اور یہ اس کی اپنی کوئی ایجاد نہیں ہے اور دوسرے اس میں وہ دھمکی بھی مضمر ہے جو اوپر والی پیش گوئی میں مذکور ہے کہ چونکہ یہ اللہ کی بھیجی ہوئی چیز ہے اس وجہ سے اس میں پیغمبر کی طرف سے کسی کمی بیشی، کسی حذف و اضافہ کی گنجائش نہیں ہے اگر پیغمبر نے اس کی تبلیغ میں کوئی مداخلت برتی تو اللہ اس سے مواخذہ فرمائے گا اور اگر لوگوں نے اس سارے اہتمام کے باوجود اس کا حق نہ پہچانا تو ان سے مواخذہ ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کے اتباع کا حکم:

اس آیتِ کریمہ کے آخر میں آخری نبی ﷺ پر ایمان کے ساتھ ساتھ اتباع کا بھی حکم دیا گیا ہے تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس آخری نبی پر صرف ایمان لانا کافی نہیں بلکہ اس کی اطاعت اور اس کا اتباع بھی لازم ہے کیونکہ اس غلط فہمی کا تاریخ کی روشنی میں ضرور اندیشہ تھا کہ بنی اسرائیل آپ کو اگر پیغمبر بھی تسلیم کر لیتے تو ضروری نہیں کہ آپ کا اتباع بھی کرتے کیونکہ تاریخ میں ان کے لئے ایک مثال موجود تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے اوپر ایمان لانے والوں کو تورات کی شریعت پر عمل کرنے کا حکم دیا تھا اور انجیل جو اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھی اس میں حکمتِ شریعت تو بیان ہوئی تھی لیکن شریعت کا بیان نہیں تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں پر شریعت وہی لازم تھی جو تورات میں نازل کی گئی تھی بنی اسرائیل ہمیشہ سے نیت کے کھوٹے اور کام چور ثابت ہوئے تھے اس لئے ان سے اس بات کا شدید امکان تھا کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائیں لیکن

Marfat.com

اتباع اس شریعت پر کریں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی شائد اسی امکان کو بالکل ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے اتباع کے ساتھ ساتھ سابقہ آیت کے آخر میں قرآن کریم کے اتباع کا بھی حکم دیا تا کہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ آپ پر ایمان لانے کا مفہوم ہی یہ ہے کہ آپ کا اور آپ پر نازل کردہ کتاب کا اتباع کیا جائے مزید اس میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آپ کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اطاعت کا نہیں کیونکہ اتباع لفظ اطاعت کی نسبت زیادہ وسیع ہے اطاعت صرف احکام کی تعمیل کو کہتے ہیں۔ لیکن اتباع میں احکام کی تعمیل کے ساتھ ساتھ نقوشِ قدم کی جستجو اداؤں پر مٹنے کا جذبہ، شخصیت کے ایک ایک پہلو کی نقل اتارنے کی کوشش اور عشق و محبت کا سوز و گداز سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ اتباع نصیب ہو جائے تو اطاعت میں کمی نہیں رہتی لیکن صرف اطاعت، اتباع کی ضمانت نہیں دے سکتی جہاں قانونی حد تک اطاعت کارفرما ہو وہاں ایمان بھی محض زبان کا وظیفہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایمان میں یقین کی قوت اور اطاعت میں وارفتگی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اتباع کا جذبہ طبیعت میں موجزن ہوتا ہے ایمان اور اتباع جب دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو پھر زندگی کا وہ سفر جس کی منزل جنت اور اللہ کی رضا ہے آسان ہو جاتا ہے اس لئے آیت کے اختتام پر فرمایا کہ اگر تم ایمان کے بعد اس آخری پیغمبر ﷺ کا اتباع کرو تو پھر امید ہے کہ تم ہدایت پا جاؤ گے۔

قرآنِ کریم اللہ کی کتاب ہے اللہ کی کتاب میں افراط و تفریط کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا یہ معیار اگرچہ سخت ہے جس پر انسانی کتابوں پر اترنا محال ہے لیکن اللہ کی کتاب حرف بہ حرف اس معیار پر پورا اترتی ہے چنانچہ جہاں بھی بنی اسرائیل پر بحیثیت ایک امت کے ان کی بداعمالیوں پر تنقید کی گئی ہے وہیں روایت میں دیانت کی پابندی کرتے ہوئے اگر ان میں کوئی انسانی گروہ اچھے اعمال کا پیکر گزرا ہے تو اس کا بھی ذکر ضرور فرمایا گیا ہے چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں ایسے ہی ایک گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَمِنْ قَوْمِ مُوسٰى أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ O

''اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہوا ہے جو حق کے مطابق رہنمائی کرتے اور اسی کے مطابق انصاف کرتے''۔ 159

اہلِ کتاب کے صالحین کی تحسین:

گذشتہ ایک سے زیادہ مقامات پر بنی اسرائیل کی بداعمالیوں پر شدید تنقید کی گئی ہے ان کی عہد شکنیوں اور اس کے نتیجہ میں ملنے والی سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے اللہ کے انعامات پر شکر کی بجائے ان کی طرف سے کفرانِ نعمت پر شدید گرفت کی گئی ہے لیکن اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی اکثریت تو واقعی ہی ایسے لوگوں پر مشتمل تھی لیکن ان میں ہمیشہ ایک محدود تعداد ایسے لوگوں کی بھی رہی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی راہنمائی اور عدل کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے یعنی ان میں ایک بڑی تعداد اللہ سے ڈرنے والے علماء کی بھی تھی اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے والے قضاۃ کی بھی تھی یعنی بنی اسرائیل اپنے سارے بگاڑ کے باوجود نہ تو صالح اور حق گو اہلِ علم سے خالی ہوئے تھے اور نہ ان کی عدالتیں پوری طرح انصاف سے تہی دامن ہوئی تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی ساری بداعمالیوں کے باوجود اللہ کی طرف سے اجتماعی عذاب کا شکار نہیں ہوئے اور ان کو برابر سنبھلنے کی مہلت ملتی رہی کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب تک کسی قوم میں کسی حد تک بھی نیکی اور خیر کی صلاحیت باقی رہتی ہے اللہ اس قوم کو تباہ نہیں کرتا بلکہ انہیں آخر حد تک سنبھلنے کا موقع دیتا رہتا ہے اسی سے ہمیں بھی یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ہمارا اجتماعی بگاڑ اور انفرادی بداعمالیاں جس سطح تک پہنچ گئی ہیں اس کے بعد کسی خیر کی امید کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن چونکہ ابھی تک قوم میں نیکی کے کام کرنے والے گروہ موجود ہیں۔ نیکی

Marfat.com

مدارس کسی نہ کسی حد تک اپنا فرض انجام دے رہے ہیں' تبلیغ و دعوت کا کام کسی نہ کسی حد تک جاری ہے' لادینیت کا مقابلہ کرنے کے لئے ابھی تک سرپھروں کی تنظیمیں موجود ہیں' اٹھتے ہوئے علمی فتنوں کے سدِ باب کے لئے ہمارے اہلِ علم نے قابلِ قدر کوششیں کی ہیں یہ سارا کام اگرچہ ضرورت سے بہت کم ہے لیکن اللہ کے غضب سے شائد انہی محدود کوششوں نے ہمیں بچا رکھا ہے۔ عالمِ اسلام کو بار بار چرکے لگائے جا رہے ہیں قسم قسم کے مصائب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے' دو ملک تباہی کا شکار ہو چکے ہیں لیکن یہ امت اجتماعی عذاب سے شائد اسی لئے بچی ہوئی ہے کہ ہمیں مزید سنبھلنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو بھی اسی محدود گروہ کے باعث بار بار اپنی حالت کو بدلنے کا موقع دیا جاتا رہا۔ صالحین کا یہ گروہ معلوم ہوتا ہے کسی نہ کسی صورت میں ہر دور میں موجود رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت بھی بنی اسرائیل ایسے لوگوں سے بالکل خالی نہیں ہو گئے تھے اگرچہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی فطری نیکی اور دینی حس کے باعث آنحضرت ﷺ پر ایمان لائیں گے۔ چنانچہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ دونوں گروہوں میں سے جو لوگ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے وہ اسی صالح گروہ کے افراد تھے چاہے وہ عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی ہوں یا نجاشی اور اس کے ہم خیال عیسائی علماء کا گروہ۔ جیسے ہی انہیں آنحضرت ﷺ کی دعوت پہنچی اور انہوں نے قرآنِ کریم سنا تو وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ تو اسی چشمہ صافی سے نکلنے والی ہدایت کی کرنیں ہیں جہاں سے تورات اور انجیل کا ظہور ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے آگے بڑھ کر اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اس آیتِ کریمہ میں ان کا تذکرہ شائد انہی کی حوصلہ افزائی کے لئے کیا جا رہا ہے۔

بنی اسرائیل کی سرگزشت جاری تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں آنحضرت ﷺ کے ذکر کی تقریب پیدا ہو گئی۔ چنانچہ برسبیلِ تضمین آیت نمبر ۱۵۷ سے آنحضرت ﷺ کی علامات اور ان کی تشریف آوری سے بنی اسرائیل پر ہونے والے احسانات کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ اب اس تضمین کے ختم ہونے کے بعد پھر سلسلہ کلام بنی اسرائیل کی اسی سرگزشت سے جوڑا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اِذِ اسْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ○

''اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں الگ الگ امتیں بنا دیا' اور ہم نے موسیٰ کی طرف جب کہ اس کی قوم نے پانی طلب کیا وحی کی کہ اپنا عصاء پتھر پر مارو' تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے' ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ متعین کر لیا' اور ہم نے ان پر بدلیوں کا سایہ کیا' اور ان پر من اور سلویٰ اتارا' کھاؤ ہماری بخشی ہوئی پاکیزہ چیزوں میں سے' اور انہوں نے کچھ ہمارا نہیں بگاڑا' بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے''۔160

تضمین ختم، اصل سلسلۂ مضمون شروع۔ بنی اسرائیل کی تنظیم اور دیگر احسانات کا تذکرہ:

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے متعدد احسانات کا ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ احسانات زندگی کی ضروریات اور قومی زندگی کی بقاء کے لئے اس قدر بنیادی ہیں کہ ان کے بغیر وادی سینا میں ایک محدود عرصے کے لئے زندہ رہنا اور بطور ایک قوم کے اپنا قومی فرض انجام دینا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ان احسانات میں سے سب سے پہلے جس احسان کا ذکر کیا گیا ہے وہ بنی اسرائیل میں تنظیم پیدا کرنا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ

Marfat.com

کے حکم سے کوہِ سینا کے بیابان میں سب سے پہلے بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی پھران کے بارہ گھرانوں کو جوحضرت یعقوب علیہ السلام کے دس بیٹوں اورحضرت یوسف علیہ السلام کے دوبیٹوں کی نسل سے تھے' الگ الگ گروہوں کی شکل میں منظم کیااور ہرگروہ پرایک ایک سرداراورنقیب مقرر کیا تا کہ وہ ان کے اندر اخلاقی' مذہبی' تمدنی' معاشرتی اورفوجی حیثیت سے نظم قائم رکھےاوراحکام شریعت کا اجراء کرتا رہے نیز حضرت یعقوب کے بارھویں بیٹے لاوی کی اولادکوجس کی نسل سے حضرت موسیٰ اور ہارون تھے' ایک الگ جماعت کی شکل میں منظم کیا تا کہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمعِ حق روشن رکھنے کی خدمت انجام دیتی رہے اس طرح ان بارہ خاندانوں کوقومی لڑی میں پروکراورایک قوم کا تصوردے کرنئی اجتماعی زندگی کے لئے تیار کیا گیااور غلامی نے جس طرح ان کے اندر ہراجتماعی تصور کوتباہ کر کے رکھ دیا تھااس کوازسرِنو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ قوم اپنی گزشتہ کمزوریوں کی تلافی کرتی اور موسیٰ کلیم اللہ کی صحبت میں بلند ہمتی اوراولوالعزمی کا سبق پڑھتی اور بلند مقاصد کے انجام دہی کیلئے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کارلاتی لیکن غلامی نے چونکہ ایسے تمام خصائص سے انہیں عاری کردیا تھااس لئے ان کے یہاں ترجیح کے قابل وہ چیزیں تھیں جوانسان کی جسمانی ضرورتوں میں سب سے مقدم سمجھی جاتی ہیں اس لئے انہوں نے سب سے پہلے انہیں چیزوں کا مطالبہ کیا۔ بلاشبہ ان بنیادی ضرورتوں کے بغیرانسانی زندگی گزرنا ممکن نہیں لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ بڑی اہم ہے کہ جوپیغمبراس قوم کوبحرہ قلزم سے نکال کرلایا ہےاور جس پروردگار نے ان پر یہ احسانات کئے ہیں کیا وہ انہیں ان بنیادی ضرورتوں سے محروم رکھے گا؟ اب بجائے اس کے یہ معاملات اللہ اوراس کے رسول پرچھوڑ دیئے جاتے انہوں نے ایک ایک ضرورت کے لئے تورات کی وضاحت کے مطابق واویلا کرنا شروع کردیا۔تورات میں ان کی بےصبری اور بےچینی اوراللہ کی عنایت کو پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کتاب' گنتی باب بیس میں ہے۔

''اور پہلے مہینہ میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشت سین میں آگئی اور وہ لوگ قادس میں رہنے لگے......اور جماعت کے لوگوں کے لئے وہاں پانی نہ ملا۔سو وہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے خلاف اکٹھے ہوئے اورلوگ موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑنے اور یہ کہنے لگے کاش! ہم بھی اس وقت مرجاتے جب ہمارے بھائی خداوند کے حضورمرتے۔تم خداوند کی جماعت کواس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں اورتم نے کیوں ہم کومصر سے نکال کراس بری جگہ پہنچایا ہے؟ یہ تو بونے کی اور انجیروں کی اورتاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو پینے کے لئے پانی تک میسر نہیں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام جماعت کے پاس سے جا کرخیمۂ اجتماع کے دروازے پراوندھے منہ گرے' تب خداوند کا جلال ان کے اوپر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اس لاٹھی کولےاور تو اور تیرا بھائی ہارون علیہ السلام تم دونوں جماعت کواکٹھا کرواوران کی آنکھوں کے سامنے اس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دےاور توان کے لئے چٹان ہی سے پانی نکالنا۔ یوں جماعت کواوران کے چوپایوں کو پلانا۔چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے خداوند کے حضور سے اسی کے حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے جماعت کواس چٹان کے سامنے اکٹھا کیااوراس نے ان سے کہا سنو! اے باغیو! کیا ہم تمہارے لئے اس چٹان سے پانی نکالیں۔تب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اٹھایااوراس چٹان پردوبار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہہ نکلااور جماعت نے اوران کے چوپایوں نے پیا۔ (گنتی باب ۲۰' ۱۲-۱)

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے چٹان پرعصاء مارنے سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور بنی اسرائیل کے خاندان کیونکہ بارہ ہی تھے

Marfat.com

اسی لئے ہر خاندان نے اپنے اپنے گھاٹ الگ الگ متعین کر لئے اور اس چیز کا اندیشہ باقی نہیں رہا کہ پانی لینے پر کوئی جھگڑا ہوگا اگر اس بہتات کے ساتھ پانی نہ نکلتا یا پانی نکلتا لیکن بارہ الگ الگ چشمے نہ ہوتے تو صحرا کی اس گرمی میں جب پیاس کی شدت سے انسان اور حیوان بے قرار ہوتے تو ہر کوئی پانی کے چشمے کی طرف بھاگتا اور سب سے پہلے پانی لینے کی کوشش کرتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ روزانہ ان میں پانی لینے پر تلواریں نکلتی اور آپس میں خون ریزی ہوتی یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان تھا کہ انہیں صرف پانی ہی عطا نہیں فرمایا بلکہ بارہ خاندانوں کے لئے بارہ الگ الگ چشمے رواں کر دیئے تا کہ ان میں تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب قصص الانبیاء میں لکھا ہے کہ پانی کے وہ چشمے جن کا ذکر بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے بحرِ احمر کے مشرق بیابان میں سویز سے زیادہ دور نہیں ہیں اور اب بھی عیونِ موسیٰ (موسیٰ کے چشمے) کے نام سے مشہور ہیں ان چشموں کا پانی اب بہت کچھ سوکھ گیا ہے اور بعض کے آثار بھی قریب قریب معدوم ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں ان چشموں پر کھجور کے باغات نظر آتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں دوسرے جس احسان کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس صحرا میں کھلے آسمان کے نیچے جہاں نہ کوئی سایہ دار درخت تھا اور نہ مکانوں کی راحت میسر تھی۔ بنی اسرائیل نے محسوس کیا کہ یہ تپش اور تمازت تو ہماری زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔ چنانچہ پھر وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس شکایت لے کر گئے کہ پانی تو مل گیا ہے لیکن اس دھوپ اور گرمی کا کیا کریں؟ یہ تو ہمیں بالکل تباہ کر دے گی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی دعا قبول ہوئی اور آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہو گئے۔ بنی اسرائیل جہاں بھی سفر کرتے ہوئے جاتے بادلوں کا یہ سائبان ان کے سروں پر تنا رہتا اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دھوپ اور گرمی کی تمازت سے محفوظ فرمایا۔ تیسرا احسان جس کا پروردگار نے یہاں ذکر فرمایا ہے وہ خاص غذا کا فراہم کرنا ہے جو اس صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کو بغیر کسی مشقت کے مہیا کی گئی نہ انہیں اس کے لئے ہل چلانے پڑے نہ تخم ریزی اور آبپاشی کی زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ تورات میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے

﴿اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کے خیمہ کو ڈھانک لیا اور صبح خیمہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی جب اوس جو پڑی ہوئی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اس کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے من کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے؟ تب موسیٰ نے ان سے کہا یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے تمہیں کھانے کو دی ہے اور وہ ہر صبح کو اپنے کھانے کی مقدار کے مطابق جمع کر لیتے تھے اور دھوپ تیز ہوتے ہی وہ پگھل جاتی تھی﴾

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شبنم کی طرح ایک چیز زمین پر ٹپکتی تھی اور دھنیے کے بیج کی طرح زمین پر جم جاتی تھی۔ آفتاب کی تمازت بڑھنے سے پہلے پہلے اس کا جمع کر لینا ممکن ہوتا تھا تمازت بڑھنے کے بعد یہ دانے پگھل جاتے تھے۔ چونکہ یہ نعمت بغیر کسی زحمت و مشقت اٹھائے حاصل ہوئی تھی اور ایک ایسے بے آب و گیاہ صحرا میں حاصل ہوئی تھی جہاں فراہمی غذا کے اسباب و وسائل مفقود تھے اس وجہ سے اس کا نام ''من'' قرار پایا۔ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں قریب الماخذ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں زبانوں میں اس کا معنی احسان ہے۔ تو بنی اسرائیل نے خود اسے اللہ کا احسان قرار دیا۔ لیکن تورات کے مرتب کرنے والوں نے نہ جانے اس کو استفہام کی شکل دے کر کیوں اپنی بدمذاقی کا ثبوت فراہم کیا ہے؟ مزید موسیٰ علیہ السلام کی طرف جو تعبیر منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے اسے روٹی قرار دیا یہ بھی سراسر مترجمین کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے اسے رزق کہا ہوگا انہوں نے اس کا ترجمہ روٹی

Marfat.com

سے کر دیا۔ دوسری چیز جو ان کو کھانے کو ملی اسے قرآنِ کریم نے ''سلویٰ'' کا نام دیا ہے۔ من کی طرح لفظ سلویٰ بھی عربی میں اہلِ کتاب کے واسطے سے آیا ہے اور اہلِ عرب نے اس کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے یہ لفظ ان پرندوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سیناء میں بنی اسرائیل کی غذا کے لئے بھیجے۔ یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے اور بٹیروں ہی کی طرح ان کا شکار نہایت آسان تھا۔ خروج میں اس کی تفصیل اس طرح آئی ہے

(پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت ملک مصر سے نکلنے کے بعد دوسرے مہینے کی پندرھویں تاریخ کو سین کے بیابان جو ایلیم اور سیناء کے درمیان ہے پہنچی' اور اس بیابان میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت موسیٰ اور ہارون پر بڑبڑانے لگی اور بنی اسرائیل کہنے لگے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک مصر میں جب ہی مار دیئے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے کیونکہ تم تو ہم کو اس بیابان میں اسی لئے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مارو......اور خداوند نے موسیٰ سے کہا میں نے بنی اسرائیل کا بڑبڑانا سن لیا ہے سو تو ان سے کہہ دے کہ شام کو تم گوشت کھاؤ گے اور صبح کو تم روٹی سے سیر ہو گے اور تم جان لو گے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا) (خروج باب ۱۶'۱۔۱۳)

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے جو تم کو پاکیزہ نعمتیں بخشیں انہیں کھاؤ یعنی من اور سلویٰ جیسی پاکیزہ نعمتیں جو انہیں بے آب و گیاہ صحرا میں بغیر کسی محنت اور مشقت کے روزانہ تازہ بہ تازہ مل رہی تھیں ان سے فائدہ اور مزہ اٹھانے کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی یہ بات جو بین السطور میں جھلکتی ہے ضرور فرمائی گئی ہو گی کہ جس مقصد کیلئے تمہیں اس صحرا میں لایا گیا ہے اس مقصد کو کبھی نہ بھولو۔ یہ ضرورتیں یقیناً تمہارا حق ہیں لیکن تمہارا مقصد زندگی اس سے بہت ارفع ہے۔ کھانے پینے کے بعد تمہاری ساری صلاحیتیں اس مقصد کے حصول کے لئے صرف ہونی چاہئیں اور وہ مقصد کیا ہے؟ صرف یہ کہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اللہ کے شکر گزار بندے اور اس کے دین کے علم بردار سپاہی ثابت کریں لیکن آیت کے آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان نعمتوں سے فائدہ تو خوب اٹھایا لیکن ان کا حق ہرگز نہیں پہچانا وہ ان نعمتوں کو پا کر شکر گزار بننے کی بجائے ان کی ناقدری اور اللہ کی نافرمانی کرتے رہے یہ بات چونکہ سیاقِ کلام سے واضح ہے اس وجہ سے لفظوں سے واضح نہیں کی گئی بلکہ اس کی جگہ پر یہ بات کہہ دی گئی کہ انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اللہ کی کسی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے منتشر قبائل کو ایک تنظیم میں پرو کر ایک قوم کا تشخص عطا کرنا اور پھر ایک جزیرہ نما سیناء کے بیابانی علاقہ میں ان کی بنیادی ضروریات کا فراہم کرنا ایسے عظیم احسانات ہیں کہ اگر یہ تین اہم ترین ضروریاتِ زندگی کا بندوبست نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی اس علاقے میں بھوک پیاس سے بالکل ختم ہو جاتی۔ صاحبِ تفہیم القرآن نے بالکل صحیح کہا ہے کہ آج بھی کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ حیران رہ جائے کہ اگر یہاں پندرہ بیس لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ یکایک آٹھہرے تو اس کے لئے پانی' خوراک اور سائے کا آخر کیا انتظام ہو سکتا ہے؟ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نما کی آبادی ۵۵ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور آج اس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت وہاں پانچ چھ لاکھ فوج لے جانا چاہے تو اس کے لئے مدبروں کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردِ سر لاحق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے بہت سے محققین نے جو نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سیناء کے اس حصہ سے گزرے ہوں گے جس کا ذکر بائبل

Marfat.com

قرآن میں ہوا ہے۔ان کا گمان ہے کہ شائد یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصہ میں پیش آئے ہوں گے۔ جزیرہ نمائے سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے وہ اس ات کو بالکل نا قابل تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں ایک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گزر سکتی تھی' خصوصاً جب کہ مصر کی طرف سے اس کی رسد کا راستہ بھی منقطع تھا اور دوسری طرف خود اس جزیرہ نما کے مشرق اور شمال میں عمالقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے۔ان امور کو پیش نظر رکھنے سے صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن احسانات کا ذکر فرمایا ہے وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر بھی یہ قوم مسلسل ان نافرمانیوں اور غداریوں کی مرتکب ہوتی رہی جن سے اس کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

اگلی دو آیتوں میں اللہ کے مزید ایک احسان کا ذکر ہے اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کی اس خصلتِ بد کا بھی جس کا انہوں نے ہر موقع پر اظہار کیا۔

ارشاد فرمایا:

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ○ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ○

''اور یاد کرو جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں رہو بسو' اس میں سے جہاں سے چاہو کھاؤ پیو اور توبہ استغفار کرتے رہو اور دروازے میں سرفگندہ داخل ہو تو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے' خوب کاروں کو ہم مزید نوازیں گے تو ان میں سے ان لوگوں نے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اس کو بدل دیا' کہی ہوئی بات سے مختلف بات سے' تو ہم نے ان پر ایک آفتِ سماوی بھیجی بوجہ اس کے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے''۔161-162

ان آیات کے سلسلے میں متعین طور پر یہ بات کہنا مشکل ہے کہ ان کا شانِ نزول کیا ہے؟ بعض مفسرین کا خیال ہے جن کی تائید شاہد عبدالقادر صاحب بھی فرماتے ہیں کہ مَن و سلویٰ سے اکتا کر انہوں نے زمین سے اگنے والی بعض نعمتوں کا مطالبہ کیا تھا جس کا ذکر قرآنِ پاک میں سورہ البقرہ میں کیا گیا ہے۔اسی کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اس شہر میں داخل ہو جاؤ' صحرا میں چونکہ کاشت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں' شہر میں جا کر کاشتکاری کرو اور اپنے مطلب کی چیزیں اگا کر کھاؤ۔لیکن سورہ بقرہ میں چونکہ اس مطالبہ کا ذکر ایسی ہی آیاتِ کریمہ کے اگلے رکوع میں کیا گیا ہے اس لئے تکرار سے بچنے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کا ان نعمتوں کے بارے میں مطالبہ پہلے اجمالاً رہا ہوگا اس کے جواب میں انہیں شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا اور اس کے بعد انہوں نے زمین سے اگنے والی سبزیوں کا نام لے لے کر مطالبہ شروع کیا جس کا ذکر اگلے رکوع میں آ رہا ہے۔مطالبہ چونکہ دو مختلف موقعوں پر کیا گیا ہے اس لئے اس میں تکرار کا احتمال نہیں۔

قریہ کی وضاحت اور اس میں داخل ہونے کے آداب:

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں جس واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے اس کا تعلق جہاد سے ہے کسی خاص شہر کو فتح کرنے کا بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا اور فتح کرنے کے بعد اس میں داخلے کے آداب بھی سکھائے گئے تھے لیکن یہ اپنی عادات بد کے باعث ناشکری کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں اس شہر کو فتح نہیں کر سکے تھے پھر سالوں تک ان کی یہ محرومی پھیلتی گئی حتی کہ ان کی اگلی نسل نے حضرت یوشع علیہ السلام

Marfat.com

کے زمانے میں اس شہر کو فتح کیا۔ واقعہ کچھ بھی رہا ہو مقصود تو صرف یہ دکھانا ہے کہ اللہ نے ان پر کیسے کیسے انعامات کئے لیکن بنی اسرائیل کا رویہ ہر موقع ناشکری اور بدعملی کا رہا ہے۔

ان آیات کی وضاحت سے پہلے بعض الفاظ کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔ پہلی آیت میں قریہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قریہ کا معنی اصل لغت میں ''جمع ہونے کی جگہ'' کے ہیں۔ گاؤں یا شہر میں چونکہ لوگ جمع ہو کر رہتے اور آباد ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں قریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ چھو دیہات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور بڑے بڑے شہروں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

دوسرا لفظ اس میں استعمال ہوا ہے۔ ''سجداً'' اس کا اصل معنی سر جھکانا ہے۔ سر جھکانے کے چونکہ مختلف درجے ہو سکتے ہیں ایک درجہ وہ ہے ج ہم سجدے میں اختیار کرتے ہیں اور دوسرا درجہ وہ ہے جیسے ہم رکوع میں یا محض سر جھکا کر کسی کے احترام میں کرتے ہیں۔ عرب دونوں معنوں میں اس لفظ استعمال کرتے ہیں اس آیتِ کریمہ میں بھی دونوں ہی معنوں میں اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے صرف سر جھکا کر یعنی عاجزی سے شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہو یا خیمہ عبادت میں پہنچ کر سب سے پہلے اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔

تیسرا لفظ جو استعمال ہوا ہے وہ ہے حِطَّۃ۔ اس کا معنی ہے جھاڑ دینا۔ یہاں اس سے مراد گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ جسے ہم بخش دینے تعبیر کرتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے یہاں یہ استغفار اور توبہ کے کلمات میں سے تھا یہ اصلاً عبرانی لفظ ہے۔ وہیں سے یہ عربی میں منتقل ہوا۔ اس آیت میں یہ لفظ ایک جملے کے قائم مقام ہے۔ جسے زمخشری نے پورے جملے کی صورت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اصل جملہ اس طرح ہے مسئلتنا حطۃ ہماری درخواست حطۃ ہے۔

مفسرین کی وضاحت کے مطابق اس آیتِ کریمہ میں قریہ سے مراد سرزمین فلسطین کا کوئی شہر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد 'ریحا' یا یریحو ہو۔ حضرت ابن عباس اور ابن زید کی یہی رائے ہے۔ اس شہر کو فتح کرنے کے بعد داخلے کے آداب سکھائے گئے۔ سب سے پہلے تو یہ بات فرمائی گئی ہے کہ تم اس شہر میں داخل ہو جاؤ تو وہاں جو حلال اور طیب چیزیں ہیں انہیں شوق سے استعمال میں لاؤ لیکن یہ یاد رکھو کہ شکر گزاری میں کمی نہ آنے پائے۔ لیکن اس سے بھی پہلے جب تمہیں اس شہر میں داخل ہونے کا موقع ملے تو تم اس طرح سر جھکاتے ہوئے شہر کے دروازے سے داخل ہونا کہ دیکھنے والوں اندازہ ہو کہ یہ اللہ کے فرماں بردار اور عاجز بندوں کا گروہ ہے جو شہر میں داخل ہو رہا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس شہر میں یہ داخلہ فوجی قوت سے ہو یا کسی او ذریعہ سے جس کو بعض مفسرین نے زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے یہ بات تو ہر صورت میں طے ہے کہ سر جھکا کر عاجزی سے داخل ہونا اللہ کے بندوں کی شان ہے انہیں کسی صورت میں بھی غرور اور تکبر کے اظہار کی اجازت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب فتح مکہ کے موقع پر شہر میں داخل ہوئے ہیں تو آپ سر مبارک اس حد تک عاجزی سے جھکا ہوا تھا کہ بار بار کجاوے کی لکڑی سے ٹکرا جاتا تھا اور جس کجاوے پر آپ تشریف فرما تھے۔ مورخین کی روایت کے مطابق اس کی قیمت دو درہم سے زیادہ نہیں تھی حالانکہ مکہ کو فوجی قوت سے فتح کرنا عرب کی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا کیونکہ مکہ جزیرۂ عرب کا نہ صرف مرکزِ اعصاب تھا بلکہ قریش اور اس کے حلیف قبیلوں کی قوت کا مرکز بھی تھا اس شہر کا فتح ہونا پورے جزیرۂ عرب کے سرنگوں ہونے کے مترادف تھا لیکن رسول پاک ﷺ اتنی عظیم قوت مل جانے کے بعد بھی سر تا پا انکساری اور عاجزی کا مظہر تھے اسی طرح ان کو اس شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا اور فرمایا گیا تھا کہ تمہاری زبانوں پر حطۃ کا لفظ ہونا چاہیے۔ یعنی تم اپنے رویے کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی اللہ سے بخشش طلب کرتے ہوئے کرتے ہوئے شہر میں داخل ہونا لیکن ان اللہ کے بندوں نے اللہ کے عاجز بندے بننے کی بجائے ناشکرے اور ظالموں جیسا رویہ اختیار کیا

Marfat.com

پروردگار نے ان کو ظالم ٹھہراتے ہوئے ان کے رویے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ زبان سے جس لفظ کو انہیں کہنے کا حکم دیا گیا تھا انہوں نے اسے بدل ڈالا۔ متعین طور پر یہ بات کہنا بہت مشکل ہے کہ انہوں نے حطۃ کو کس لفظ سے بدلا' قرآنِ کریم نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی اہل تاویل سے مختلف اقوال منقول ہیں جن میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایک مشہور قول یہ ہے کہ ''انہوں نے حطۃ کو حنطۃ سے بدل دیا ''حنطۃ کا معنی ہے گندم۔ انہیں یہ کہا گیا تھا کہ تم استغفار کرتے ہوئے شہر میں داخل ہو لیکن یہ شہر میں گندم گندم کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ مقصود یہ ہے کہ مصر سے نکل کر صحرائے سیناء کی تکلیفیں اٹھانے کا مقصد ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تربیت تھی جس کے نتیجے میں ایک اولوالعزم قوم وجود میں آتی اور اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کا نظام قائم کر دیتی لیکن یہ حیوانی زندگی سے اوپر اٹھنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوئے ان کے پیغمبر انہیں آسمان کی رفعتوں کی تربیت دیتے رہے لیکن انہوں نے ہمیشہ خاک بازی کو ترجیح دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا ان پر غضب بھڑکا اور آسمان سے اس نے ان پر عذاب بھیجا تا کہ ان کی نافرمانی اور بغاوت کا انہیں صلہ دیا جائے۔ قرآنِ کریم نے اس عذاب کو مـن السمـــاء کے لفظ سے بیان فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ہولناک عذاب تھا کیونکہ ہولناک عذاب ہی کو قہر آسمانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ عذاب کیا تھا؟ صاحب تدبرِ قرآن نے لکھا ہے کہ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ البتہ تورات کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس دوران میں متعدد بار بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی شدید نافرمانیاں کیں اور ان نافرمانیوں کی پاداش میں وہ مختلف وباؤں کے شکار ہوئے۔ مثلاً جس زمانہ میں بنی اسرائیل شطیم میں (جوارض فلسطین کے بالکل پاس کا ایک شہر تھا) تھے تو ان لوگوں نے موآبی عورتوں کے ساتھ بدکاریاں کیں' ان کی دعوت پر یہ لوگ ان کی مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہونے لگے اور اس طرح بالواسطہ ان کے دیوتا ''بعل فغور'' کی پرستش شروع کر دی جس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں ان کے چوبیس ہزار نفوس ہلاک ہوئے۔

کتاب گنتی کے بات ۳۳ میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے موآب کے میدانوں میں بنی اسرائیل کو یہ ہدایت بھی دی تھی کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہونا تو تم یہاں کے سب مشرکوں کو نکال دینا' ان کی شبیہ دار پتھروں اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے اونچے مقامات کو مسمار کر دینا' اگر تم نے اس کے خلاف ورزی کی تو یاد رکھو کہ جیسا میں نے تم کو ان کے ساتھ کرنے کے لئے کہا ہے ویسا ہی تمہارے ساتھ کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے اپنی عادت کے مطابق پیغمبر کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں ان پر اسی قسم کی کوئی وباء آئی جس قسم کی وبا ان پر شطیم میں آئی تھی۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ
الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ
شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ

Marfat.com

مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ
وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ
عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً
خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَ
اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ
الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۟ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ
يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ
يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ
الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ
الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ
يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ
الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا
اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ

Marfat.com

تَتَّقُوْنَ (۱۷۱) ع

ان سے اس بستی کا حال پوچھئے جو سمندر کے کنارے واقع تھی جبکہ وہ لوگ ہفتہ کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور مچھلیاں ہفتہ ہی کے دن ابھرا ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور ہفتہ کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔اسی طرح ہم ان کی آزمائش کرتے تھے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے اور یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لئے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شائد یہ لوگ اس نافرمانی سے بچ جائیں آخرکار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دے دی جو برائی سے روکتے تھے اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا اور پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کئے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ بندر ہو جاؤ ذلیل اور خوار۔اور یاد کرو! جب تیرے رب نے فیصلہ کن انداز میں خبردار کیا کہ وہ روزِ قیامت تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت برے عذاب چکھاتے رہیں گے۔بے شک تیرا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔اور ہم نے ان کو منتشر کر دیا زمین میں گروہ گروہ کر کے۔ان میں کچھ نیک بھی ہیں اور کچھ اس سے مختلف بھی ہیں اور ہم نے ان کی آزمائش کی خوشحالیوں اور بدحالیوں سے تاکہ وہ رجوع کریں۔پھر ان کے بعد آئے ایسے نالائق جانشین جو کتاب کے وارث بنے جو اس دنیا کی متاع اختیار کرتے اور کہتے ہیں ہمارے لئے سب معاف کر دیا جائے گا اور اگر ایسا ہی کوئی اور سامان ان کو مل جائے تو اسے بھی لے لیں کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا؟ کہ وہ اللہ پر حق کے سواء کوئی اور بات نہ کہیں اور انہوں نے اچھی طرح پڑھا بھی ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کریں کیا تم سمجھتے نہیں۔اور جو لوگ کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز قائم کرتے ہیں تو ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے اور یاد کرو جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو معلق کر دیا گویا وہ سائبان ہے اور انہوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گرا ہی چاہتا ہے' (ہم نے کہا) پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی سے' اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم اللہ کے عذاب سے محفوظ رہو۔

..................☆......☆......☆..................

Marfat.com

بنی اسرائیل کے سامنے ان کی تاریخ کا آئینہ:

بنی اسرائیل کی مسلسل ناشکریوں اور نافرمانیوں کا بیان جاری ہے اور اسی سلسلہ میں ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جو عبرت کے طور پر بنی اسرائیل میں معروف تھا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدیوں تک بنی اسرائیل نے کس طرح اللہ کی نافرمانیاں جاری رکھیں اور کس طرح ان پر اللہ کے عذاب آتے رہے لیکن اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری پر ان کے اجتماعی رویے میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہ ہوئی چنانچہ اس مشہور واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ ۙ لَا تَأْتِيهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ ۚ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝

”ان سے اس بستی کا حال پوچھئے جو سمندر کے کنارے واقع تھی جبکہ وہ لوگ ہفتہ کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور مچھلیاں ہفتہ ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور ہفتہ کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ اسی طرح ہم ان کی آزمائش کرتے تھے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے اور یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لئے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شائد یہ لوگ اس نافرمانی سے بچ جائیں آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دے دی جو برائی سے روکتے تھے اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا اور پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ بندر ہو جاؤ ذلیل اور خوار“۔ 166-163

ان چار آیاتِ کریمہ میں ایک ایسا واقعہ اور اس کے نتیجے میں آنے والے عذاب کا تذکرہ کیا گیا ہے جو عبرت کے طور پر ہمیشہ تاریخ میں یاد رکھا گیا اور آئندہ بھی یاد رکھا جانا چاہیے۔ کیونکہ اس میں جس گناہ کا ذکر کیا گیا ہے گمراہ ہونے والی قومیں ماضی میں بھی اور آج بھی ہمیشہ اس کا ارتکاب کر رہی ہیں۔ ماضی میں تو وہ اس عذاب سے دوچار ہوئیں جس کا تذکرہ یہاں فرمایا گیا ہے لیکن حال اور مستقبل میں کیا ہوگا؟ اسے ان آیات کی مدد سے جا سکتا ہے اس لئے یہ آیات ہمارے لئے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ہم ایک ترتیب سے اس واقعہ کو بھی ذکر کرتے ہیں اور اس کے سبب آنے والے عذاب کو بھی اور ان نتائج کو بھی جو ایسی صورتِ حال میں ہمیشہ نکلتے رہے ہیں۔

اس واقع کے مسلّم ہونے کی دلیل:

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اتنا اہم واقعہ ہے تورات اور بنی اسرائیل کے مذہبی لٹریچر میں کہیں بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ جن لوگوں کو

Marfat.com

بنی اسرائیل کے مجرمانہ کردار پر رہی ہے ان کے لئے تو اس اہم واقعہ کا بیان نہ کرنا اور بنی اسرائیل کے لٹریچر کا مکمل طور پر اس سے خاموش رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی ہمیشہ یہ اجتماعی عادت رہی ہے کہ دوسری قوموں کے تنکے کو بھی انہوں نے شہتیر بنا کر پیش کیا لیکن اپنے اوپر آنے والے بڑے بڑے حوادث جن سے ان کے قومی کردار پر روشنی پڑتی ہے انہوں نے ہمیشہ انہیں تاریخ کے دلدل میں دفن کرنے کی کوشش کی اور اس فن میں وہ اتنے اتارو ثابت ہوئے ہیں کہ اللہ کی کتابیں بھی ان کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہیں۔ یہ ان کا سازشی رویہ اور غیر متوازن طرزِ عمل آج بھی پوری طرح موجود ہے اور دنیا کی سٹیج پر عجیب وغریب مسائل پیدا کرنے میں مصروف ہے۔ لیکن اس واقعہ کی صداقت پر باوجود اسرائیل کے لٹریچر کی خاموشی کے ایسے قرائن موجود ہیں کہ جن کی موجودگی میں اس واقعہ کی صداقت کا انکار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ان قرائن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے سورہ بقرہ میں اور یہاں بھی جس اسلوب میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود اس واقعہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ ’’ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبتِ‘‘ کہ تم خوب جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے سبت یعنی ہفتہ کے بارے میں اللہ کے احکام سے تجاوز کیا تھا اور اس آیتِ کریمہ میں ان سے اس واقعہ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے ان دونوں آیتوں کا اسلوب ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ یہود سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہاری کتابوں نے اگرچہ اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن یہ واقعہ اتنا معروف ہے کہ تم سب اس واقعہ سے باخبر ہو۔ اتنے واضح اسلوب میں کسی سے بھی بات کہی جائے تو اگر اس کے لئے وہ بات قابلِ قبول نہ ہو یا وہ اسے صحیح نہ سمجھتا ہو تو اس کا فوری ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ آپ جس واقعہ کی بات کر رہے ہیں میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ لیکن اگر وہ اس پر خاموشی اختیار کر لے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کے نزدیک وہ واقعہ صحیح ہے۔ چنانچہ ان آیاتِ کریمہ کے نازل ہونے پر بھی یہی صورتِ حال پیش آئی کہ یہود نے ان آیات کو سنا لیکن انکار کے لئے زبان نہیں کھولی انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ خاموش رہ کر اس بدنامی کو پھیلنے سے روکا جائے ہم تو جانتے ہیں کہ ہمارے بڑوں کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا لیکن آج کے دور میں ہمارے غیروں میں اسے کوئی نہیں جانتا۔ اگر ہم اس کا انکار کریں گے تو قرآنِ کریم اس کے ثبوت میں شائد کچھ کہے جس سے یہ واقعہ پوری طرح منظرِ عام پر آ جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرکینِ عرب جو ہمیں صاحبِ علم سمجھتے ہوئے اختلاف کے باوجود بھی ہمارا احترام کرتے ہیں ان پر ہماری قلعی کھل جائے گی اور وہ حیران ہوں گے کہ کیا ہم اس مکروہ تاریخ کے وارث ہیں؟ اس لئے بہتر ہے کہ اس پر خاموش رہا جائے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہود مستشرقین نے قرآنِ کریم کے بارے میں کیسی کیسی علمی ہرزہ سرائیاں کی ہیں؟ لیکن اس واقعہ کا انکار کرنے کی انہیں کبھی جرأت نہ ہوئی یہود کا یہ رویہ ایک واضح دلیل ہے کہ یہ واقعہ بالکل صحیح ہے۔

مقامِ واقعہ:

دوسری بات جو اس آیتِ کریمہ میں تحقیق طلب ہے وہ یہ ہے کہ یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا؟ قرآنِ کریم نے اگرچہ اس کی کوئی صراحت نہیں کی صرف اتنا کہا کہ ساحلِ بحر پر کوئی قریہ یعنی ایک شہر آباد تھا' جس میں یہ واقعہ پیش آیا لیکن یہ شہر کونسا تھا؟ اس کی وضاحت قرآنِ کریم نے نہیں کی۔ محققین کا غالب میلان یہ ہے کہ یہ مقام ''ایلہ یا ایلات یا ایلوت'' تھا۔ اسی کے قریب اردن کی مشہور بندرگاہ ''عقبہ'' واقعہ ہے اور اب اسرائیل کی یہودی ریاست میں اسی جگہ پر ایک بندرگاہ بنائی۔ بنی اسرائیل کی ترقی کے زمانے میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا' دریاؤں یا سمندروں کے ساحل پر جو بندرگاہیں ہوتی ہیں عموماً وہ بڑے شہروں میں تبدیل ہو جایا کرتی ہیں شائد اسی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بحرِ قلزم کے جنگی وتجارتی بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا۔ اسی جگہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبرت خیز واقعہ پیش آیا۔

Marfat.com

اجتماعی نافرمانی پر عذاب آتا ہے:

تیسری بات اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ساحلِ بحر پر رہنے والی یہ قوم جن کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا ان پر عذاب تو ان کی نافرمانیوں کے باعث آیا لیکن بطورِ خاص جس نافرمانی کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے اس کا تعلق ان کی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی سے ہے۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے سبت یعنی ہفتہ کے بارے میں خاص احکام دیئے تھے یہ دن ان کے لئے انتہائی محترم اور مقدس دن تھا اسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے عبادت کے لئے مخصوص کیا تھا اور اس دن کو اپنے اور اولادِ بنی اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی دنیوی کام نہ کیا جائے۔ گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے' چولہے نہ جھونکے جائیں' کھانا تیار نہ کیا جائے' غلاموں اور جانوروں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے اور اس میں یہاں تک تاکید فرمائی کہ اگر کوئی اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے تو اسے قتل کردیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے اپنی قومی خصوصیات کے مطابق ابتداء میں انفرادی طور پر اور آگے چل کر اجتماعی طور پر اس حکم کی خلاف ورزی شروع کردی۔ انہیں گھروں تک میں ہر طرح کے دنیوی کام کرنے سے روکا گیا ہے لیکن ان کی دیدہ دلیری یہاں تک پہنچی کہ یہ کھلم کھلا یروشلم کے پھاٹکوں سے چھکڑے بھر بھر کر سامان کے لانے لگے جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو یہودی لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف انبیاء نے مختلف وقتوں میں اللہ کی طرف سے انہیں تنبیہات کیں۔ چنانچہ ''یرمیاہ'' جو چھ سو اٹھائیس اور پانچ سو چھیاسی قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں انہوں نے ان کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کھلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نظر آتش کردیا جائے گا۔ اسی طرح ''حزقی ایل'' نبی بھی جن کا دور پانچ سو پچانوے اور پانچ سو چھتیس قبل مسیح کے درمیان گزرا ہے انہیں برابر تنبیہات کرتے رہے۔ یہاں بنی اسرائیل کے جس گروہ کا ذکر کیا جارہا ہے وہ چونکہ ساحل سمندر پر آباد تھے۔ ساحل پر رہنے کی وجہ سے یقیناً ان کی گزر بسر کا بڑا ذریعہ سمندر کی مچھلیاں تھیں۔ وہ بھی سبت کی بے حرمتی ہر طرح کی نافرمانی کے ذریعے کرتے ہوں گے لیکن جو چیز ان کے لئے آزمائش کا ذریعہ بن گئی وہ مچھلیوں کا شکار تھا اسی کے ذریعے ان کو آزمایا گیا کہ وہ سبت کا احترام کرتے ہیں یا نہیں۔ انہیں بھی یقیناً بار بار تنبیہ کی گئی ہوگی کہ تم سبت کے احترام میں کمی مت کرو لیکن جب یہ لوگ اپنی اس حرکت سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے تحت انہیں آزمائش میں مبتلا کردیا اس کا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم کو کسی خاص معاملے میں نافرمانی سے روکا جاتا ہے اور وہ قوم اس میں پورا نہیں اترتی تو پروردگار اسی معاملے کو ان کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور اس معاملے کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی یا ضرورت اس حد تک بڑھا دی جاتی ہے کہ اب ان کے لئے اس کا چھوڑنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں ہم نے اللہ کے حکم کی فرماں برداری کی تو شائد ہماری قومی اجتماعی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی اور ہم قومی توانائی سے محروم ہوجائیں گے کسی بھی قوم کے لئے یہ نہایت نازک لمحہ ہوتا ہے اس قوم کی گزر بسر کا چونکہ بڑا ذریعہ مچھلی کا شکار تھا اس لئے انہیں بطورِ خاص حکم دیا گیا کہ ہفتہ کے دن تم مچھلی کا شکار نہیں کرسکتے اور ساتھ ہی آزمائش میں شدت اس طرح پیدا کی گئی کہ مچھلیاں ہفتے کے دن اس طرح سر اٹھائے ہوئے سطح آب پر آتیں ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک شاہ سوار نیزہ سیدھا کئے ہوئے اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مچھلی کی فطرت یہ ہے کہ وہ زیر آب تیرتی ہے لیکن اب صورت حال یہ ہوگئی کہ ہفتہ کے دن وہ بہت بڑی تعداد میں آتیں ایسا لگتا ہے کہ کوئی برات اترتی ہوئی ہو اور سطح آب پر نمایاں ہوکر لوگوں کی طلب اور خواہش میں شدت پیدا کرتے ہوئے تیرتی پھرتیں۔ ممنوعہ چیز کو پروردگار کی جانب سے نمایاں کرکے پیش کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوجائے کہ ہر حال میں اللہ کے احکام کی فرماں برداری کرنے والا کون ہے؟ اور کون ہے جس کے اندر نافرمانی کے میلانات چھپے ہوئے ہیں؟ تاکہ وہ اس صورتحال میں پوری طرح کھل کر سامنے آجائیں ویسے بھی انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز سے اسے روکا جاتا ہے

Marfat.com

اس کی حرص اس کے اندر بڑھتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی بری طرح اس آزمائش میں جھنجھوڑے گئے۔ شروع شروع میں انہوں نے یہ کیا کہ مختلف حیلوں بہانوں سے مچھلیاں پکڑنا شروع کیں حوض بنالئے گئے۔ ہفتہ کے دن اس میں مچھلیاں بھر دی جاتیں اور اتوار کو پکڑ لی جاتیں اور یہ تاثر دیا جاتا کہ ہم ہفتہ کے دن تو شکار نہیں کر رہے یہ مچھلیاں تو ہم نے اتوار کو پکڑی ہیں اور پھر بڑھتے بڑھتے کھلم کھلا نافرمانی پر اتر آئے۔ آخر اللہ کا عذاب آیا اور یہ لوگ عبرت بن گئے۔ ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ مچھلی کوئی حرام جانور تو نہیں اور پھر پورا ہفتہ اس کا شکار کرنے کی اجازت بھی تھی۔ صرف ہفتہ کے دن شکار کی ممانعت میں آخر کیا حکمت تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ پروردگار اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے اس نے ہرامت کے لئے ہفتہ میں ایک دن مخصوص کیا جس میں اسے بطورِ خاص اللہ کی فرماں برداری کی تربیت دی جائے بندوں کو کبھی بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ بندگی کے تصور ہی کے خلاف ہے کہ ایک بندہ اللہ کی بندگی کا اعتراف بھی کرے اور پھر بار بار بندگی کی حدود سے نکل نکل بھی جائے۔ ہفتہ کے چھ دنوں میں زندگی کے معاملات میں مختلف لوگوں سے میل جول کے باعث قلب و دماغ پر ایسے اثرات ضرور پڑتے ہیں جس سے اللہ کا تعلق کمزور پڑتا اور بعض دفعہ بالکل ٹوٹنے لگتا ہے۔ چنانچہ پروردگار نے اس کا انتظام یہ کیا کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ یہ لوگ چھ دن میں جو کمی واقع ہو جاتی ہے اس کا نہ صرف ازالہ کرنے کی کوشش کریں بلکہ تعلق باللہ کو اتنا مضبوط بنالیں کہ باہر کے اثرات اس پر اثر انداز ہونے میں کامیاب نہ ہوں۔ چنانچہ عیسائیوں کو اتوار کا دن دیا گیا۔ یہود کو ہفتہ کا اور مسلمانوں کو جمعہ کا دن۔ مسلمانوں کے لئے اگرچہ ایسے شدید احکام نہیں دیئے گئے لیکن یہ تاکید ضرور کی گئی کہ جمعہ کو تذکیر و دعوت کے دن کے طور پر گزارنے کی کوشش کریں۔ عیسائیوں کا بھی یہی حال رہا وہ ہمیشہ اتوار کے دن کو اپنے مذہبی تصورات کے طور پر گزارتے رہے آج اگرچہ وہ بہت حد تک دینی احکام سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور دین کو بندے اور خدا کے درمیان ایک پرائیوٹ معاملہ بنا چکے ہیں۔ بایں ہمہ! وہ جس ملک میں بھی رہے ہیں انہوں نے ہمیشہ وہاں اتوار کی چھٹی کی ہے تاکہ اپنے قومی تشخص کو باقی رکھ سکیں۔ یہودیوں کیلئے بھی سبت کا دن ایسے ہی تصورات کا حامل تھا۔

دوسری آیتِ کریمہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ ہولناک واقعہ پیش آیا اس وقت بنی اسرائیل مکمل طور پر دین سے برگشتہ نہیں ہو چکے تھے بلکہ ان میں علماء وصلحاء کا ایک قابلِ ذکر طبقہ ضرور موجود تھا جنہوں نے نہ صرف اللہ کی نافرمانی نہیں کی بلکہ انہوں نے ان نافرمانوں کو روکنے کی بھی آخر حد تک کوشش کی۔ اس آیتِ کریمہ کی وضاحت میں مولانا مودودی نے جو نوٹ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے نقل کر دیا جائے۔ آپ لکھتے ہیں کہ

> اس بستی میں تین قسم کے لوگ موجود تھے ایک وہ جو دھڑلے سے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ تیسرے وہ جن کی غیرتِ ایمانی حدود اللہ کی اس کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہِ راست پر آجائیں اور اگر وہ راہ راست نہ اختیار کریں تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے اللہ کے سامنے اپنی برأت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورتِ حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو قرآنِ مجید میں لکھا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس سے بچایا گیا کیونکہ اسی نے اللہ کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا جس نے اپنی برأت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے۔

Marfat.com

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کے مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات پانے کی تصریح کی ہے لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ پھر ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ وہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے تھا' بعد میں ان کے شاگرد عکرمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا۔ لیکن قرآن کے بیان پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس کا پہلا خیال ہی صحیح تھا ظاہر ہے کہ کسی بستی پر خدا کا عذاب آنے کی صورت میں تمام بستی دو ہی گروہوں میں تقسیم ہو سکتی ہے ایک وہ جو عذاب میں مبتلا ہو اور دوسرا وہ جو بچا لیا جائے۔ اب اگر قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق بچنے والا گروہ صرف تیسرا تھا تو لامحالہ پہلے اور دوسرے دونوں گروہ نہ بچنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اسی کی تائید معذرۃ الی ربکم کے فقرے سے بھی ہوتی ہے جس کی توثیق بعد کے فقرے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس بستی میں علانیہ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری قابلِ مواخذہ ہوتی ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بناء پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اسے خدا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ وہ اپنی حدِ استطاعت تک اصلاح اور اقامت حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے کہ

وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً

ڈرو اس فتنہ سے جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہوں گے جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو

اور اس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

ان اللہ لا یعذب العامة بعمل الخاصة حتیٰ یروا المنکر بین ظھرا ینھم وھم قادرون علیٰ ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذٰلک عذب اللہ الخاصة والعامة'

''اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہارِ ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔''

مزید برآں جو آیات اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر اللہ کا عذاب دو قسطوں میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عذاب بئیس (سخت عذاب) فرمایا گیا ہے اور دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی پر اصرار کرنے والوں کو بندر بنا دیا گیا۔ ہم ایسے سمجھتے ہیں کہ پہلی قسط کے عذاب میں پہلے دونوں گروہ شامل تھے اور دوسری قسط کا عذاب صرف پہلے گروہ کو دیا گیا تھا۔ واللہ علم بالصواب۔ ان اصبتُ فمن اللہ وان اخطئت فمن نفسی واللہ عفورٌ رحیم۔

اس واقعہ پر تذکر کی نگاہ:

ان آیاتِ کریمہ پر تذکر کے نقطۂ نگاہ سے ایک دفعہ مزید نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل مسلسل اللہ کی نافرمانیاں کرتے رہے لیکن پروردگار انہیں ڈھیل پر ڈھیل دیتا رہا لیکن جب ایک متعین حکم کی خلاف ورزی نہایت دیدہ دلیری اور اجتماعی طور

Marfat.com

پر کی گئی تو پھر پروردگار نے مزید ڈھیل نہیں دی بلکہ اس کا عذاب حرکت میں آ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی اللہ کو ماننے والا کوئی گروہ اجتماعی طور پر نافرمانی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو اسے ان آیات کی روشنی میں سوچنا چاہیے کہ کہیں ہم بھی اسی انجام کی طرف تو نہیں بڑھ رہے۔ اقبال نے اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
مگر کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اللہ نے سود کو حرام کیا ہے اور اس کے ارتکاب کرنے والوں کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کی دھمکی دی ہے۔ اس کے باوجود ہم جس طرح بالائی سطح پر ہر طریقے سے اس کا تحفظ کر رہے ہیں اور اس عذاب سے نکلنے کی کوئی تدبیر بھی ہمارے پیشِ نظر نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کھلم کھلا اللہ کی نافرمانی ہمارے لئے اجتماعی عذاب کا پیش خیمہ بن جائے۔

دوسری بات جو نہات قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ کوئی قوم اللہ کی ناراضگی کی گرفت میں آتی ہے تو اس سے صرف وہ گروہ محفوظ رہتا ہے جو آخری حد تک لوگوں کو نافرمانی سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ نافرمانی چاہے پارلیمنٹ کے اندر ہو رہی ہو چاہے قانون کی شکل میں ہو چاہے اس کا ارتکاب ذرائع ابلاغ کر رہے ہوں۔ چاہے تجارتی طور اطوار اس کی گرفت میں ہوں چاہے تعلیمی ادارے اس گناہ میں شریک ہوں، جہاں کہیں بھی اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہے اسے مناسب طریقے سے روکنا اور اپنی ہمت کے مطابق آخری حد تک اپنی مساعی بروئے کار لانا یہ اللہ کے عذاب سے بچنے کے لئے ضروری ہے ورنہ اللہ کا قانون جیسے ان آیات سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب اس کی گرفت آئے گی تو گناہ کرنے والوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی پکڑے جائیں گے جنہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا آخر حد تک فرض انجام نہیں دیا ہوگا۔ پاکستان میں بطورِ خاص اللہ کی شریعت کا نفاذ سب سے پہلی ترجیح ہونا چاہیے اس کی مخالفت جہاں جہاں بھی ہو رہی ہے وہ اللہ سے بغاوت کے مترادف ہے چاہے اس کے لئے الفاظ کے کیسے ہی طوطے مینا اڑائے جائیں وہ بہر حال اللہ کی شدید نافرمانی ہے اس سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اہلِ علم ہر سطح پر اس صورتحال کو بدلنے کی کوشش کریں۔ علم کے زور سے بھی، قلم کے زور سے بھی، سیاست کے انداز میں بھی، نصیحت کے اسلوب میں بھی اور قانونی کاوشوں سے بھی۔ اسی طرح بے حیائی کو روکنا مسلمانوں کے فرائض میں نفاذِ دین کے بعد سب سے بڑا فریضہ ہے ہم آج جس طرح اس گناہ کی لپیٹ میں ہیں اس سے پہلے اس کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ ٹی وی کی سکرین پر شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا ہے۔ اخبارات کے مستقل صفحات اس گند کو روزانہ اچھالتے ہیں۔ سڑکوں پر جا بجا لگے ہوئے پورٹریٹ اور اشتہار اسلامی غیرت کے لئے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم اسلامی طرزِ تعلیم کا منہ چڑا رہی ہے۔ اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ احتیاط کے تمام پہلوؤں کے ساتھ اس صورتحال کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ ذہنوں میں لگے ہوئے جالے اتارے جائیں اور اسلامی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی جائے یہ محض میں نے چند باتوں کا حوالہ دیا ہے ورنہ ہماری پوری دینی زندگی داغ داغ ہو چکی ہے۔ اگر اللہ کے بندوں کا ایک بڑا طبقہ اسی جذبے سے سرشار ہو کر جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر ہوا ہے میدانِ عمل میں نہیں نکلے گا تو پھر ان آیات کی روشنی میں ہمیں اپنا انجام دیکھ لینا چاہیے۔

بنی اسرائیل اپنی تاریخ میں متعدد دفعہ اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے انہی میں سے ایک اہم واقعہ ابھی ہم نے پڑھا ہے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ بار بار کی سزاؤں اور حوادث کے باوجود ان کے اندر اصلاح کی تحریک پیدا نہ ہوئی۔ ہر حادثے نے انہیں جگانے کی بجائے مزید سلانے کا کام کیا۔ چنانچہ اسی سلسلۂ حوادث کے ضمن میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ان کے اندر پروردگار کی طرف سے آنے والے نبیوں نے مستقبل میں وقوع پذیر ہونے

Marfat.com

والے بڑے بڑے واقعات کی خبر دی اور انہیں جھنجھوڑا کہ اپنی حالت بدلو ورنہ تمہارے ساتھ ماضی میں پیش آنے والے حوادث سے زیادہ اندوہناک واقعات پیش آسکتے ہیں۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی آگاہی کو فیصلہ کن انداز میں بیان کیا جارہا ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○

''اور یاد کرو جب تیرے رب نے فیصلہ کن انداز میں خبردار کیا کہ وہ روزِ قیامت تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت برے عذاب چکھاتے رہیں گے۔ بے شک تیرا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا اور مہربان ہے''۔167

یہود پر ابدی لعنت کا اعلان:

اس آیت کریمہ کے آغاز میں تَاَذَّنَ کا لفظ آیا ہے۔ جس کا صحیح مفہوم کسی قطعی فیصلے سے آگاہ کرنا اور نوٹس دینا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے اپنے اندر مبعوث ہونے والے انبیاء ورسول کی نصیحتوں کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور اپنی اجتماعی زندگی میں اللہ کے دین سے ان کی برگشتگی بڑھتی ہی چلی گئی تو پھر ایک ایسا وقت آیا جب مختلف انبیاء کے واسطے سے انہیں نوٹس دیا گیا کہ تم نے اگر اپنا رویہ نہ بدلا اور اس بغاوت سے باز نہ آئے جو تم نے اختیار کررکھی ہے تو تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کیا جائے گا جو تمہیں اپنے اپنے عہد اقتدار میں بدترین عذابوں سے دوچار کریں گے۔ اور پھر یہ سلسلہ چند سالوں کا نہیں بلکہ یہ قیامت تک چلتا رہے گا تاوقتیکہ تم اللہ کے آخری نبی پر ایمان لاکر اپنی حالت نہ بدل ڈالو۔ جب ہم سابقہ آسمانی کتابوں میں اس فیصلے اور تنبیہ کا سراغ لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی تنبیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی انہیں بار بار فرمائی اور بعد کے نبیوں نے بھی نہایت واضح الفاظ میں انہیں اس سے آگاہ کیا۔ احبار میں ہے

''اگر تم میرے سننے والے نہ بنو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا..........اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہوگا اور تم دشمنوں کے سامنے قتل کئے جاؤ گے اور یہ جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں تم پر حکومت کریں گے۔''

(احبار باب ۲۶ ۱۴۔۱۷)

''اسی طرح کتابِ استثناء میں ہے تیرے بیٹے اور عزیز بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہوگا'' (استثناء باب ۲۸۔۳۲)

مختلف تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ارمیاہؑ حضرت شعیا اور حضرت حزقیل علیھم السلام انہیں متواتر جھنجھوڑتے رہے کہ اللہ کیلئے اپنی حالت درست کرو ورنہ ظالم حکمران تم پر مسلط ہوجائیں گے اور پھر تم اللہ کو پکارو گے لیکن تمہاری آواز سنی نہیں جائے گی۔

لیکن بنی اسرائیل نے ان بار بار کی تنبیہات سے کوئی اثر قبول نہ کیا بالآخر اللہ کا وعدہ پورا ہوگیا کہ بابل کا جابر بادشاہ بخت نصر ان پر قہر خداوندی بن کر نازل ہوگیا۔ یروشلم' بیت المقدس اور اس کے گردونواح سے بنی اسرائیل کا بیج مار دیا گیا۔ بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے ذبح کردیئے گئے۔ بادشاہ اور رہے سہے یہودی پابہ زنجیر بابل لے جائے گئے اور پچاس سال تک بخت نصر کی غلامی میں حسرت وندامت کے آنسو بہا کر اپنے دل

Marfat.com

کاٹتے رہے۔اس دورِغلامی میں ان کی کچھ آنکھیں کھلی اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے اللہ نے انہیں سنبھلنے کا ایک اور موقع دیا۔پانچ سو چھتیس قبل مسیح میں ایران کے بادشاہ خسرو نے بابل پر چڑھائی کر کے اسے فتح کر لیا اور بنی اسرائیل پر رحم کھا کر انہیں دوبارہ بیت المقدس تعمیر کرنے اور فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔بنی اسرائیل کو جیسے ہی آسودگی ملی عیش وعشرت کا دور آیا توان کی زندگی میں پھر بگاڑ کی تمام صورتیں زندہ ہوگئیں۔عیش ونشاط کی محفلیں لوٹ آئیں۔بت کدے پھر آباد ہونے لگے اللہ کا فیصلہ پھر حرکت میں آیا اب ان پر بختِ نصر کی جگہ روم کے بادشاہ اینٹوکس اپی فانیس نے ایک سو پینسٹھ قبل مسیح بیت المقدس پر حملہ کر کے دوبارہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔تورات کے تمام نسخے چن چن کر جلا دیئے بنی اسرائیل کو ایک ایک کر کے تہ تیغ کیا اور جو لوگ بچ گئے انہیں لوٹ کھسوٹ کر کے جلاوطن کر دیا۔تاریخ کے مختلف ادوار میں ان کو پھر سنبھلنے کا موقع ملا لیکن کسی خطے میں یک جا ہو کر عزت کی زندگی گزارنا ان کے لئے ممکن نہ ہو سکا اور ان کی عبادت گاہ بیت المقدس کی تعمیر پھر دوبارہ کبھی نہ ہو سکی۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد بنی اسرائیل کی ایک شاخ آپ پر ایمان لے آئی اس قوم کے اعمال یہودیوں کے مقابلے میں بسا غنیمت تھے ان میں ایک طرف عبادت گزاروں کی کثرت تھی دوسری طرف جہد وعمل کا جذبہ موجود تھا چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عروج آسمانی کے بعد تین سو سال کی طویل جدوجہد کے نتیجے میں بنی اسرائیل کی یہ شاخ روما کی عظیم سلطنت کی مالک بن گئی۔تقریباً چار سو سال تک عیسائیوں نے روم میں بڑے جاہ وجلال کی حکومت کی لیکن مرورِ ایام کے ساتھ اس قوم نے ایک طرف اپنے اصل دین کو بری طرح بگاڑ ڈالا اور دوسری طرف اس میں بھی رفتہ رفتہ یہودیوں کی سی خصلتیں پیدا ہونے لگیں۔
لیکن بنی اسرائیل کا وہ حصہ جواب تک یہودیت پر قائم تھا وہ برابر اللہ کی ناراضگی کا ہدف بنا رہا اور انہیں کبھی بھی اجتماعی زندگی کی آسودگی نصیب نہ ہو سکی مختلف علاقوں میں بٹی ہوئی یہ قوم زندگی گزارتی رہی حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت بھی انہوں نے راہِ راست اختیار کرنے کی کوشش نہ کی۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اللہ کے وعدے کے مطابق انہیں مدینے سے نکالا گیا پھر خیبر سے بھی نکال دیئے گئے پورا جزیرۂ عرب ان سے پاک ہو گیا اور دنیا کے مختلف ملکوں میں محکومانہ زندگی گزارتے رہے اور مختلف اوقات میں اللہ کے فیصلے کے مطابق حکمرانوں کے مظالم کا شکار ہوتے رہے۔اجتماعی طور پر ان کے ادھیڑ کھدیڑ کا آخری واقعہ ہٹلر کے زمانے میں پیش آیا اگر حالات مساعدت نہ کرتے اور مسلمان ممالک پناہ نہ دیتے تو ہٹلر ان کا قومی وجود ختم کر کے رکھ دیتا۔
مختصر یہ کہ ہر دور میں بنی اسرائیل اللہ کے اس اعلان کی گرفت میں رہے ہیں۔کبھی بھی انہیں کسی علاقے میں نہ حکومت کرنے کا موقع ملا اور نہ اجتماعی آسودگی نصیب ہو سکی یہ صحیح ہے کہ بیچ بیچ میں مہلت کے وقفے بھی ملتے رہے اور قرآنِ کا اسلوب بیان خود اس کا شاہد ہے لیکن مستقل طور پر یہ ایک قوت بن کر خود اپنی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں تاریخ میں اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی البتہ آج اسرائیل کے نام سے ان کی جو ریاست قائم ہے اس سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔اس میں دو باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہییں۔پہلی بات یہ کہ ارضِ مقدس میں ان کا یہ اجتماع ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے۔احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ آسمانوں سے تشریف لانے کے بعد دمشق کو اپنا مرکز بنا کر یہودیوں کے خلاف فوجی کاروائی کریں گے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہودی فتنے کی سرکوبی کے لئے بھیجا جائے گا اس وقت یہودیوں کا جنگی لیڈر دجال کے نام سے معروف ہوگا۔دجال کا معنی ہے بہت بڑا ڈپلومیٹ۔اس کے پاس فوجی قوت بھی ہوگی اور ڈپلومیسی بھی۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس کا فیصلہ کن معرکہ لد پہاڑی کے پاس جہاں تل ابیب کا ہوائی اڈا ہے ہوگا اور وہاں دجال مارا جائے گا۔عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری سے اتمام حجت ہو جانے کے بعد مسلمان ہو جائیں گے اور یہودیوں کو ایک ایک کر کے قتل کر دیا جائے گا۔موجودہ اسرائیل کی ریاست جس میں دنیا بھر کے یہودیوں کا اجتماع ہو رہا ہے معلوم ہوتا ہے اسی تباہی کے لئے ہے۔یہیں آخری معرکہ ہوگا اور یہیں ان کی تباہی مکمل ہوگی۔

Marfat.com

دوسری بات جو پیشِ نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ کسی بھی کافر معتوب قوم پر اللہ کا عذاب اس وقت آتا ہے جب مسلمان امت اپنی وحدت اور اپنے ایمان وعمل سے ایک قوت بن کر اٹھتی ہے اور علمی، سیاسی اور فوجی توانائی سے مخالفین پر اتمامِ حجت کر دیتی ہے لیکن خود اگر امتِ مسلمہ اختلاف اور افتراق کا شکار ہو اور ان کی ایمانی اور عملی زندگی اسلام کے لئے تہمت بن کر رہ جائے تو پھر نہ صرف کافر قوتوں کو مہلت ملتی رہتی ہے بلکہ ان سے مسلمانوں کو پٹوانے اور سزا دینے کا کام لیا جاتا ہے جس طرح ایک دور میں چنگیز سے مسلمانوں کو سزا دلوائی گئی اور پھر ایک وقت آیا یہی کام تیمور سے لیا گیا۔ اقبال نے ٹھیک کہا

تقدیر کے نشتر ہیں تیمور ہوں یا چنگیز

اسی طرح آج کل قدرت اسرائیل کے ذریعے عربوں کو سزا دے رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ پورا عالمِ اسلام بھی اس کی زد میں ہے کیونکہ عربوں اور مسلمانوں نے نہ صرف کہ اپنے آپ کو بہتر مسلمان ثابت نہ کیا اور اپنی حاملِ دعوت امت ہونے کی حیثیت کا احساس نہیں کیا بلکہ اس سے بھی بڑا جرم یہ ہے کہ انہوں نے اسرائیل کو برگ وبار پیدا کرنے، طاقت حاصل کرنے اور پاؤں جمانے کا موقع دیا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور روس تو براہِ راست اس ناجائز وجود کے ذمہ دار ہیں لیکن عربوں نے چند ٹکوں کے عوض اسرائیل کو اپنی زمینیں سپرد کیں اور اپنی بزدلی اور بے ہمتی سے برابر اسے اپنی حدود میں اضافہ کا موقع دیتے رہے۔ اسرائیل برابر فوجی طور پر مضبوط ہوتا رہا اس کی سرپرست طاقتیں مسلسل اس کو طاقت فراہم کرتی رہیں اس کے جابرانہ عزائم کبھی پردے میں نہیں رہے لیکن اس کے مقابلے میں عربوں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ قدرت نے انہیں بہترین قدرتی اور انسانی وسائل سے مالا مال کیا ہے۔ تیل پر موجودہ دنیا کی زندگی قائم ہے اور اس علاقے میں عربوں کو اس زرِ سیال پر تقریباً اجارہ داری حاصل ہے لیکن انہوں نے قدرت کی اس گراں بہا نعمت کو بہ تمام وکمال ان غیر مسلموں کے رحم وکرم پر چھوڑے رکھا اور اس تیل کی رائلٹی پر قناعت کر کے اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں گویا اس نعمت کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں پھر انہیں قدرتی وسائل کی صرف رائلٹی سے جو رقم حاصل ہوتی ہے وہ تناسب کے اعتبار سے دنیا کے امیر ترین ملکوں کی مجموعی آمدنی سے بھی زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق بینک آف انگلینڈ جیسے دولت مند بینک کی دو تہائی دولت صرف کویت کی جمع کروائی ہوئی رقم سے حاصل ہوتی ہے اور دوسرے دولت مند عرب ممالک یورپ اور امریکہ کے بینکوں میں جو رقمیں جمع کرواتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔ اندازہ کیجئے یہ سارا سرمایہ اسرائیل کو مضبوط کرنے میں صرف ہو رہا ہے اور خود عالمِ اسلام اس سے تہی دامن ہے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ عربوں نے اسے کبھی تمام مسلمانوں کا مسئلہ بننے کی اجازت نہیں دی وہ اس کو عربوں کا مسئلہ سمجھتے ہیں دوسرے مسلمان ممالک اپنے طور پر فلسطینی مسئلے کی حمایت کرتے ہیں اور ان میں بعض ممالک نے آج تک اسرائیل سے تعلقات بھی قائم نہیں کئے لیکن خود عرب ممالک کو مسلمانوں کے مسائل کی حمایت کرنے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ پاکستان جو ہمیشہ اسرائیل کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے۔ اسرائیل کا براہِ راست ہدف فلسطین کا سربراہ یاسر عرفات کبھی پاکستان کی شاہ رگ کشمیر کی حمایت نہیں کر سکا اسے ہمیشہ انڈیا کی دوستی کا دعویٰ رہا ہے۔ عرب ممالک سے گلہ اپنی جگہ پر، ترکی جو کبھی خلافتِ عثمانیہ کا وارث تھا اور گزری حالت میں بھی دنیائے کفر کو مسلمانوں کے کسی ملک پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اور پھر اسرائیل کے قیام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ خود سلطنتِ عثمانیہ تھی لیکن ترک نوجوانوں نے نیشنل ازم کا فتنہ اٹھا کر تفریق وتقسیم کا ایسا راستہ کھولا کہ خلافتِ عثمانیہ ختم ہو کر رہ گئی اور مسلمان ایک دوسرے کی معاونت سے محروم ہو گئے۔

عرب نظریۂ وطنیت کی تاریخ کا اگر ہم مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہاں اس نظریے کے اولین بانی تمام تر عیسائی اور یہودی تھے۔ جن

Marfat.com

نوجوانوں نے اس نظریہ وطنیت کو فروغ دینے اور خلافتِ اسلامیہ کو تاراج کرنے کو ہدف بنا کر کاوشیں شروع کی تھیں وہ تمام کے تمام عیسائی تھے اور بیروت کے سیرین پروٹسٹنٹ کالج کے پڑھے ہوئے تھے ان میں سے دو آدمی سب سے زیادہ نمایاں ہوئے ایک ناصف یازجی اور دوسرے بطرس بستانی یہ دونوں لبنان کے عیسائی تھے۔ بستانی ہی نے سب سے پہلے ایک حدیث گھڑ کر اسے نعرہ بنایا۔ حب الوطن من الایمان ۔وطن کی محبت جزوایمان ہے اور اس فتنہ اٹھانے کا مقصود صرف یہ تھا کہ مسلمانوں میں انتشار پیدا کر کے خلافتِ عثمانیہ کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے کمال پاشا اور اس کے ساتھیوں کو ساتھ ملایا گیا اور خلافتِ عثمانیہ پر ایک کامیاب وار کیا گیا کیونکہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کسی طرح اسرائیل کے وجود کا تصور کرنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جب برطانیہ نے یہودیوں کو یوگنڈا کے ایک علاقے کی پیش کش کی تو یہودیوں نے اسے نامنظور کر دیا اور وہاں آباد ہونے کی بجائے انہوں نے 1902ء میں تھیوڈور ہرزول کو قائد بنا کر ایک وفد خلافتِ عثمانیہ کے فرمانروا سلطان عبدالحمید ثانی کی خدمت میں بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ یہودیوں کو دوبارہ فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے اور ساتھ ہی یہ پیش کش کی کہ اس ''اجازت'' کے صلے میں ہم ترکی حکومت کے بیرونی قرضے ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

لیکن سلطان عبدالحمید ثانی نے اس درخواست کا جو جواب دیا وہ عرب نیشنلزم کے ان دلدادگان کے لئے سرمۂ بصیرت ہے جو ترکی خلافت کو اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کرتے ہیں۔ تھیوڈور ہرزل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ سلطان عبدالحمید کا جواب یہ تھا:

> ''ڈاکٹر ہرزل کو باخبر کر دو کہ وہ آج کے بعد فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنے کی ہر کوشش سے دستبردار ہو جائیں۔ یہودی فلسطین کو صرف اس صورت میں حاصل کر سکتے ہیں جب کہ خلافتِ عثمانیہ ایک خواب وخیال ہو چکی ہو۔''

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عربوں سمیت ترکوں نے بھی نظریۂ وطنیت کی معرفت اسرائیل کو وجود میں لانے کی بالواسطہ مدد کی' اور پھر عرب اپنی عیاشیوں کے باعث اسے مضبوط کرنے کا سبب بنتے رہے جن ملکوں نے اسے قائم کیا اور جو آج تک اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں عربوں کا سارا سرمایہ انہیں کی تحویل میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو قوم ایک راندۂ درگاہ قوم کو خود وجود دیتی اور خود اس کے استحکام کا باعث بنتی ہے اسے قدرت اگر خود ان کے استحصال اور تباہی کے لئے استعمال کرتی ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟

آخری بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے چوتھے پارے میں یہ بات واضح فرمائی ہے کہ یہود پر ذلت اور مسکنت کی پھٹکار ماری گئی ہے البتہ! اس سے نکلنے کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ مسلمان ہو جائیں پھر ان کی تاریخ یہود کی نہیں مسلمانوں کی تاریخ ہو گی اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی بڑی طاقت کے زیرِ سایہ اس کا دامن پکڑ کر زندگی گزاریں۔ آج اسرائیل کی تمام تر قوت اور اس کی ریاست کا استحکام امریکہ' برطانیہ اور روس کا مرہونِ منت ہے۔ آج اگر یہ تینوں ملک اس کے سر سے ہاتھ اٹھا لیں تو یہ ریاست اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ ''تیرا رب بڑی تیزی سے سزا دینے والا ہے اور وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے''۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ پروردگار کو دنیا کے معاملات سے الگ تھلگ نہ سمجھا جائے یہ خیال نہ کرو کہ دنیا میں جو چاہے ہوتا رہے پروردگار اس میں کبھی دخل نہیں دے گا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قوموں کو مہلت دینے اور بالآخر پکڑنے کے کچھ اصول وضوابط ہیں جب تک ان کا وقت نہیں آتا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شائد پروردگار دنیا کے نظام سے بے نیاز ہے لیکن جب وہ وقت آ جاتا ہے تو پھر وہ اہلِ دنیا کو مزید مہلت نہیں دیتا اور مزید فرمایا کہ وہ تیزی سے سزا دینے والا ہے تو اس سے ان لوگوں کو توجہ دلانا مقصود ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں شائد دیر ہی نہیں اندھیر بھی ہے یعنی کچھ ہوتا رہے یہاں کوئی پکڑنے والا نہیں ہے انہیں بتایا جا رہا

Marfat.com

ہے کہ قوموں کو جومہلت ملتی ہے وہ ایک دیر کی صورت تو ہوتی ہے اندھیر کی نہیں۔ جب اس کی گرفت آتی ہے تو تب پتہ چلتا ہے کہ چشمِ زدن میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کی ایک اور سزا کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا ج مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ز وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ O

''اور ہم نے ان کو منتشر کر دیا زمین میں گروہ گروہ کر کے۔ ان میں کچھ نیک بھی ہیں اور کچھ اس سے مختلف بھی ہیں اور ہم نے ان کی آزمائش کی خوشحالیوں اور بدحالیوں سے تاکہ وہ رجوع کریں''۔168

بنی اسرائیل کا قومی انتشار:

گزشتہ آیتِ کریمہ میں پروردگار نے انبیاء کرام کی معرفت بنی اسرائیل کو اس بات کو نوٹس جاری کیا تھا کہ اگر تم نے اپنی حالت نہ بدلی اور تم بداعمالیوں سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ تم پر ظالم حکمرانوں کو مسلط کرے گا وہ خود تمہارے اندر سے ہوں یا باہر سے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ بعض ظالم حکمران جو قوم کے اندر سے ہوں وہ اپنی قوم کو اپنی خواہشات کو پوری کرنے کے لئے ظلم کا نشانہ بناتے ہیں لیکن جب قوم اپنی حدود سے بالکل نکل جاتی ہے اور ہر طرح اجتماعی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور ان کا آپس کا ربط وضبط انتشار وافتراق میں بدل جاتا ہے تو پھر باہر سے ظالم لوگوں کو حملہ کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ بالعموم ایسی قوموں کی اجتماعی قوت کو توڑنے کے لئے انہیں منتشر کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ کی نافرمانی کے باعث ایسے ہی حوادث پیش آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصریوں کی غلامی سے نجات دلا کر صحرائے سیناء میں انہیں ایک قوم بنانے اور اس میں تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپ مسلسل اس کے لئے محنت فرماتے رہے لیکن یہ غلامی کی ماری ہوئی قوم آزاد قوم کی سی صلاحیت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ جب بھی انہیں قومی توانائی کا ثبوت دینے کے لئے کسی بھی امتحان میں ڈالا گیا تو یہ بری طرح ناکام ہوئے یہ چونکہ چار سو سال تک انسانوں کی چاکری کر کے روٹی کھانے کے ہنر کے سوا اور ہر قومی خصوصیت سے محروم ہو چکے تھے اس لئے اپنے اندر عزت اور وقار کی زندگی کا شعور پیدا کرنا اور قومی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ان کے لئے آسان نہ تھا وہ روٹی حاصل کرنے کے لئے مزدوری تو کر سکتے تھے اور اپنے آقا کی خوشنودی کے لئے ذلت آمیز بیگار سے بھی انہیں انکار نہ تھا لیکن قوموں کو اپنا وجود ثابت کرنے کے لئے ایثار وقربانی کی جن کٹھن وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے جواں ہمتی اور اولوالعزمی کی جو تاریخ رقم کرنا پڑتی ہے وہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام مسلسل محنت کے باوجود غلامی کی پروردہ نسل کو تو کسی تبدیلی سے آشنا کرنے سے معذور رہے البتہ جو نسل صحرا میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ان سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی تھیں وہ لوگ جب اپنی ذمہ داریوں کی عمر کو پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام تو اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن ان کے جانشینوں نے اس تنظیمی عمل کو آگے بڑھایا اور ان میں قومی شعور توانا کر کے ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تاریخ کا یہ سفر آگے بڑھتا رہا حتی کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل اپنی تنظیم اور قومی خصوصیات میں اپنی معراج کو پہنچے لیکن جیسے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کو پیارے ہوئے تو بنی اسرائیل کے زوال کا سفر شروع ہو گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر قوم جب اپنی ترقی کے معراج پر پہنچتی ہے تو بالعموم وہیں سے اس کے زوال کا سفر شروع ہوتا ہے کیونکہ جب کسی چیز کو حاصل کرنا پیشِ نظر ہوتا ہے تو محنت اور کوشش کی لگن رواں دواں رہتی ہے اس سفر کے ہر شریک کار کو مسلسل یہ خیال رہتا ہے کہ ہم لوگ ایک منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں

Marfat.com

ہم نے ذرا بھی محنت سے جی چرایا تو وہ منزل کبھی بھی ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی لیکن جب وہ منزل کے قریب پہنچتے ہیں یا جب منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر عموماً لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ محنت و کاوش، علم و دانش، ربط و تنظیم اور ایثار و قربانی ہر چیز اپنی صف لپیٹ دیتی ہے اب ان کے پیش نظر محنت نہیں بلکہ محنت کا پھل ہوتا ہے ہر ایک کوشش کرتا ہے کہ میں اس پھل سے زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کر سکوں۔ پہلے ان کا سرمایۂ سفر ارادے کی قوت، عمل پیہم، باہمی ارتباط اور دوسروں کے لئے ایثار ہوتا ہے لیکن منزل پر پہنچنے کے بعد ان کی منزل ان کے لئے خوانِ یغما بن جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی ہمت سے بڑھ کر ہاتھ مارنے اور سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے ایسی صورت میں خود غرضی، نفسانیت، مفاد پرستی اور ہوسِ زر کا دور دورہ ہو جاتا ہے ایسی صورت میں زوال اور انحطاط کے سوا کسی اور چیز کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ برصغیر میں مسلمانوں کے عروج کا دور اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ ہے۔ جیسے ہی عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئیں تو اس کے جانشینوں اور صوبوں کے امراء نے وہ لوٹ کھسوٹ مچائی کہ پورا ملک زوال کی گرفت میں آ گیا۔ خلافتِ راشدہ کے بعد بنی امیہ کی تاریخ، بنی امیہ کے بعد بنی عباس کی تاریخ اور پھر مختلف خاندانوں کی حکومتوں کی تاریخ ایک سے ایک بڑھ کر اس تاریخی حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دنیا سے جاتے ہی ان کا بیٹا ان کا جانشین ہوا اور اس نے اس زمانے کی سب سے اس بڑی حکومت کو اپنی میراث سمجھ کر اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھانا شروع کر دیا۔ پورے ملک میں فسق و فجور کو پھیلنے کا موقع مل گیا۔ امراء میں رقابت شروع ہو گئی ہر کوئی حکومت کا خواب دیکھنے لگا اس انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک غلام نے الگ حکومت بنا لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سلیمان علیہ السلام کی حکومت جس کی قوت و شوکت کے سامنے کبھی کسی دوسری ریاست کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی خلفشار کا شکار ہو گئی۔ ایک متحدہ سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی ایک کا نام اسرائیل ٹھہرا اور دوسری کا یہودیہ۔ ایک کا دارالحکومت سامرہ تھا اور دوسری کا یروشلم۔ اب ان دونوں حکومتوں میں تصادم شروع ہوا چنانچہ ۹۳۷ ق م سے لے کر ۵۸۶ ق م تک بنی اسرائیل کی تاریخ خانہ جنگی کی تاریخ ہے دونوں ریاستیں آپس میں ٹکراتی رہیں اور ان کے باہمی جنگ و جدل کے باعث قریبی ریاستوں کو یہ جرات ہوئی اور انہوں نے بار باران پر حملے کرنے شروع کئے کبھی مصر کا حکمران چڑھ دوڑتا اور کبھی صور و صیدا میں سے کوئی حکمران حملہ آور ہوتا لیکن بنی اسرائیل نے اس سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا حتیٰ کہ ان کا یہ اختلاف و انتشار اس وقت اپنی انتہاء کو پہنچ گیا جب بخت نصر نے ان پر حملہ کر کے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ان کے ہزاروں لوگ قتل ہو گئے۔ ہزاروں لوگوں کو اپنی ریاست کے مختلف شہروں میں تتر بتر کر دیا اور ہزاروں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا اور پھر ان کا یہ انتشار و افتراق اور مختلف ملکوں میں ان کا بکھیرا جانا ایک ایسی حقیقت ہے کہ موجودہ اسرائیلی حکومت سے پہلے جسے اپنی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا تھا اور اب بھی یہ بڑی طاقتوں کے سائے میں پلنے والا ناسور کسی لمبی عمر کی خبر نہیں دے رہا بلکہ اس کے طور اطوار یہ بتانے کے لئے کافی ہیں کہ قدرت کی طرف سے کوئی بھی فیصلہ دوبارہ انہیں ان کے انجام سے دوچار کر دے گا۔ چنانچہ اس پوری صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو زمین میں گروہ گروہ کر کے منتشر کر دیا۔

اجتماعی اصلاح کیلئے اہلِ خیر کا مضبوط ہونا ضروری ہے:

قطعنا تقطیع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، منتشر کر دینا۔ اور امم امت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک جماعت یا ایک فرقہ یا گروہ۔ ان الفاظ میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اس کے بعد دوسرا جملہ ہے:

﴿مِنۡهُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنۡهُمۡ دُوۡنَ ذٰلِكَ ان میں سے کچھ نیک لوگ تھے اور کچھ ان سے مختلف تھے۔﴾

اس جملہ میں بھی ایک بہت بڑی حقیقت منکشف کی گئی ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کا زوال جب آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے اور ان کی

Marfat.com

قومی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے اور ان میں ایک ایک کر کے قومی خصوصیات ختم ہوتی جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم میں تمام لوگ بگڑ چکے ہیں اور سرے سے ان میں کوئی صالح طبقہ موجود نہیں ہے بلکہ زوال پذیر اور بگڑی ہوئی قوموں میں بھی نیک لوگ بھی موجود ہوتے ہیں اس کے باوجود ان کا زوال بڑھتا چلا جاتا ہے اس کی وجہ کیا ہوتی ہے؟ اس وجہ کو بیان کرنے سے پہلے ہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قوم کے اندر صالح لوگوں کے ہونے سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب جس سے قوموں کی جڑ کٹ جاتی ہے اور خیر کے تمام سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور قدرت ایسی قوم کو دھرتی کا بوجھ سمجھ کر مٹا دیتی ہے ایسی قوم پر نہیں آتا جس میں کچھ نہ کچھ نیک لوگ موجود ہوں یعنی ان میں نیکی اور خیر کی دعوت دینے والے اور اپنی ہمت اور وسائل کے مطابق دین کی خدمات انجام دینے والے اور قوم کے انکار اور استہزاء کے باوجود انہیں آخرت یاد دلانے والے موجود ہوں ان کی وجہ سے قوم کا بڑا حصہ جو برائیوں میں مبتلا ہو چکا ہوتا ہے وہ فیصلہ کن عذاب سے بچا رہتا ہے اور قدرت ان کو ڈھیل دیتی رہتی ہے کہ تمہارے اندر خیر کی دعوت دینے والے ابھی تک موجود ہیں تمہارے لئے ابھی موقع ہے کہ ان کی دعوت قبول کر کے اپنے برے انجام سے بچ جاؤ۔ لیکن جہاں تک تباہی کی طرف بڑھنے کا سوال ہے یہ نیک لوگ اس سے انہیں نہیں روک سکتے وہ اپنی ساری کوششوں کے باوجود تباہی کی طرف جانے کے نتائج سے انہیں آگاہ تو کر سکتے ہیں لیکن ان کا رخ پھیرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وجہ اس کی یہ ہے کہ قوموں کو لیڈ اور فیڈ کرنے والے پالیسیاں بنانے والے پالیسیوں پر عمل کرنے والے قوم اور ملک کو جہتِ سفر دینے والے اور ان کے اعصاب اور ان کے مرکزِ اعصاب کو کنٹرول کرنے والے صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو طبقۂ خواص سے تعلق رکھتے ہیں، جو عدالتوں میں ججز کی کرسی پر بیٹھتے۔ ایوانِ حکومت میں حکمرانی کرتے' پارلیمینٹ میں قانون سازی کرتے' تعلیمی اداروں کو نصاب تعلیم دیتے' ابلاغ کو ابلاغ کی جہت دیتے، تربیتی اداروں میں مختلف شکلوں میں تربیت کا سامان کرتے اور انتظامی اداروں میں اختیارات پر قابض ہوتے اور انہیں استعمال کرتے ہیں۔ جب یہ طبقات بگڑ جاتے ہیں تو پھر عام لوگ آہستہ آہستہ ان کے رنگ میں رنگنا شروع ہو جاتے ہیں اور بے بسی کا شکار ہو کر ان کے اشاروں پر چلنے لگتے ہیں۔ زندگی کے مقاصد دم توڑ جاتے اور ضروریاتِ زندگی مقاصدِ زندگی بن کر عام آدمی کی زندگی میں حکمرانی کرنے لگتے ہیں اس صورتِ حال میں اگر ان میں کچھ نیک لوگ موجود بھی ہوں تو ان کی نیکی عبادت گاہوں یا چند دینی اداروں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ بنی اسرائیل اسی صورتحال سے دوچار تھے وہ مکمل طور پر برائی کی گرفت میں کبھی نہیں آئے ان میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی طبقہ نیکی اور خیر کے ساتھ وابستہ رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ اجتماعی عذاب سے بچے رہے۔ لیکن یہ انفرادی نیکی اجتماعی تباہی کا راستہ نہ روک سکی جس کے نتیجے میں نہ ان کا کوئی ملک محفوظ رہا نہ قومی زندگی محفوظ رہی۔ وہ انفرادی یا جماعتی طور پر دولت کمانے یا دوسروں کے خلاف سازشیں کرنے میں تو ضرور کامیاب رہے لیکن اپنی اجتماعی زندگی بروئے کار لانے اور اپنے فیصلے آپ کرنے سے محروم ہو گئے۔

بنی اسرائیل کی زندگی کا یہ وہ آئینہ ہے جس میں ہم اپنی قومی زندگی کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہم نے یہ مملکتِ خداداد اسلامی زندگی گزارنے اور اسلامی نظام نافذ کرنے کے لئے اللہ سے مانگ کر لی تھی اور اس کے لئے ہم نے اتنی بڑی قربانی دی کہ معلوم تاریخ میں اس کی مثالیں کم کم ملیں گی۔ لیکن جب ہم نے اللہ سے کئے ہوئے اس وعدے سے انحراف کیا بلکہ رفتہ رفتہ اس وعدے کے خلاف بغاوت کر دی اس کا سب سے پہلا نتیجہ وہی نکلا جو بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا کہ ہماری اجتماعی زندگی میں دراڑیں پڑیں حتیٰ کہ عالمِ اسلام کی یہ سب سے بڑی مملکت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں گروہوں میں منتشر کر کے رکھ دیا۔ آج آدھا پاکستان ہمارے پاس ہے لیکن اس میں بھی ہمارے صوبائی تعصبات' لسانی عصبیتیں' گروہی مفادات پوری طرح اپنا رنگ دکھا رہے ہیں قوم میں نیک لوگوں کی کمی نہیں لیکن آہستہ آہستہ ہمارے اجتماعی فیصلہ کرنے کے سرچشمے لادینیت کے قبضے میں جا رہے

Marfat.com

ہیں۔ ہماری پارلیمینٹ اولاً تو خیر کی نمائندہ نہیں رہی اور اگر اس کی کچھ امید بھی کی جاسکتی ہو تو ایک پیر تسمہ پا ہے جو ان کے سروں پر بیٹھا ان کو کچھ کرنے کی اجازت نہیں دے رہا ہمارے تعلیمی ادارے نہ صرف لادینیت کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں بلکہ جہاں کہیں دین کی کوئی تھوڑی بہت خدمت ہو رہی ہے اس کا برداشت کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ تو پوری طرح شیطانی قوتوں کے نرغے میں ہیں اور یہ شیطانی قوتیں شب و روز کروڑوں لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کا فرض انجام دے رہی ہیں۔ ہمارے اخبارات چند ایک کو چھوڑ کر نہ جانے کس کی خدمت بجا لا رہے ہیں اس طرح سے ہماری اجتماعی زندگی اس ملک کے مقصدِ وجود سے رفتہ رفتہ منحرف ہوتی جا رہی ہے ایسی صورتحال میں خدشات بڑھتے جا رہے ہیں اور بنی اسرائیل کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے اس آخری امت کے بارے میں تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہمیں بار بار بنی اسرائیل کی تاریخ سے سبق سیکھنے کا حکم دیا ہے اور قرآنِ کریم اسی لئے پلٹ پلٹ کر ان کی تاریخ ہمارے سامنے لا رہا ہے تاکہ یہ حاملِ دعوت امت سابقہ حاملِ دعوت امت کے زوال کے اسباب سے آگاہ ہو کر اپنے بچاؤ کی کوشش کر سکے۔

آزمائش کے دو طریقے:

اس آیتِ کریمہ میں تیسرا جملہ:

﴿ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ ہے۔

''اور ہم نے ان کو خوشحالیوں اور بدحالیوں سے آزمایا شائد وہ رجوع کریں''۔

بنی اسرائیل کو راہِ راست پر لانے کے لئے پروردگار نے دو طریقے اختیار فرمائے اور یہ بنی اسرائیل کی خصوصیت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہر قوم کو سمجھانے اور راہِ راست پر لانے کے لئے یہی دونوں طریقے اختیار فرماتے رہے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ کوئی قوم اللہ کے راستے سے انحراف اختیار کرتی ہے تو پروردگار اسے مصیبتوں اور تکلیفوں میں مبتلا کر کے غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور انہیں یہ بات باور کروائی جاتی ہے کہ تم اس زمین پر اس طرح زندگی گزار رہے ہو جس طرح ایک ایسی قوم زندگی گزارتی ہے جس کا کوئی خدا نہ ہو اور اسے یہ یقین ہو کہ اسے کبھی موت نہیں آئے گی اور اسے کبھی کسی کے سامنے جوابدہی نہیں کرنی وہ زمین ہی کو اپنا اول و آخر مسکن سمجھتی ہے اور اسی میں مرمٹنا اس کی زندگی کی انتہاء ہے جو اس کے جی میں آتا ہے وہ فیصلے کرتی ہے اور جو چاہتی ہے وہ اپنی منزل متعین کر لیتی ہے اس کی کامیابی اور ناکامی کے اپنے پیمانے ہیں کیونکہ اس کی زندگی اس کے اپنے گرد گھومتی ہے ان کو یہ بتلانے کے لئے کہ تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ تم یہاں ہر فیصلہ کرنے کے مجاز ہو تمہارے اوپر کوئی اور بڑی ذات بھی ہے جس نے تمہیں بے مقصد پیدا نہیں کیا اور پھر تمہیں اندھیرے میں بھی نہیں رکھا بلکہ اس مقصد سے آگاہی دینے کے لئے وہ بار بار پیغمبر بھیجتا رہا ہے اب یہ مصیبتیں، تکلیفیں، وبائیں، زلزلے اور بیماریاں بھیج کر وہ تمہیں توجہ دلانا چاہتا ہے کہ دیکھو! اگر تم اپنی زندگی اور اپنی قسمتوں کے خود مالک ہوتے تو تمہیں یہ حوادث پیش نہ آتے تم جب چاہتے ان حوادث کا راستہ روک لیتے یا انہیں اپنے سے دور کر دیتے لیکن تم اس پر قادر نہیں ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اوپر ایک اور ذات ہے جس نے تمہیں زندگی گزارنے اور زمین پر رہنے کی آزادی بخشی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم اس سے آزاد ہو کر زندگی گزار سکتے ہو اس کے احکام کو سمجھو قبول کرو اور اس کے مطابق زندگی گزارو۔ لیکن جب وہ قوم ان مصیبتوں کے باوجود بھی اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتی اور وہ اس کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اسے زمانے کے پھیر کا نتیجہ سمجھتی ہے تو پھر پروردگار اس سے سخت تر آزمائش میں انہیں مبتلا کر دیتا ہے یہ سخت آزمائش بظاہر نرم دکھائی دیتی ہے لیکن اس آزمائش پر پورا اترنا چونکہ زیادہ مشکل ہے اس لئے میں اس کو سخت تر کہہ رہا ہوں وہ آزمائش یہ ہے کہ اب پروردگار بجائے

Marfat.com

مصیبتوں کے انہیں راحتوں' آسانیوں' نعمتوں' آسائشوں' عشرتوں اور مسرتوں سے گراں بار کر دیتا ہے۔ ان کے کاروبار سنبھل جاتے ہیں۔ کھیتیاں سونا اگلنے لگتی ہیں بارشیں وقت پر ہونے لگتی ہیں' بین الاقوامی دنیا میں ساکھ بڑھنے لگتی ہے' مالی پریشانیاں کم ہونے لگتی ہیں اس تبدیلی کو دیکھ کر قوم یہ سمجھتی ہے کہ پہلے اگر پروردگار ہم سے ناراض تھا تو اب وہ راضی ہو گیا ہے یا پہلے زمانہ ہم سے بگڑا ہوا تھا تو وہ اب ہمارے موافق ہو گیا ہے اس لئے جیسے جیسے ان کی دولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ان کے عشرت کدے آباد ہونے لگتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کا کاروبار سنبھلتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ کی نافرمانی کے مراکز پھلنے پھولنے لگتے ہیں انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ دکھوں میں مبتلا ہو کر تو بعض دفعہ سوچنے لگتی ہے لیکن عیش و عشرت کی زندگی تو عموماً بگاڑ کا ذریعہ بنتی ہے۔ چنانچہ قدرت جس قوم کو اس آزمائش میں مبتلا کرتی ہے انہیں ایک طوفان سے وابستہ کر دیتی ہے۔ طوفان ان کے سر پر تلا کھڑا ہوتا ہے لیکن ان کی مستیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ بنی اسرائیل بھی انہیں دونوں آزمائشوں سے بار بار گزرتے رہے تا کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں اور اپنی زندگی کو بدل سکیں۔ لیکن بنی اسرائیل کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان آزمائشوں سے سبق سیکھنے کی بجائے وہ ہمیشہ اور بگڑتے چلے گئے اگر پروردگار نے انہیں بدحالیوں میں مبتلا کیا تو انہوں نے اللہ پر اعتراض کرنے شروع کر دیئے معلوم ہوتا ہے آج کل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں (یداللہ مغلولة) اور اگر انہیں خوشحالیوں سے نوازا گیا اور اس کے بدلے میں انہیں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی تو پکار اٹھے:

﴿ ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء ''بے شک اللہ تعالیٰ فقیر ہیں اور ہم غنی اور مال دار ہیں''۔ ﴾

یعنی نعمتیں ملیں تو انہوں نے شکر نہیں کیا اور مصیبت میں مبتلا ہوئے تو صبر نہ دکھایا حالانکہ شکر اور صبر ہی تو اسلامی زندگی ہے جسے انہوں نے اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اجتماعی زندگی اللہ کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کی آئینہ دار بن گئی۔

بنی اسرائیل کے زوال کا یہ سفر ایک طویل داستان ہے جس میں ہم مختلف نشیب و فراز دیکھتے ہیں اسی کا ایک پہلو جو کئی پہلوؤں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اگلی آیت کریمہ میں بیان کیا جا رہا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُلَنَا ج وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ط اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ط وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O

''پھر ان کے بعد آئے ایسے نالائق جانشین جو کتاب کے وارث بنے جو اس دنیا کی متاع اختیار کرتے اور کہتے ہیں ہمارے لئے سب معاف کر دیا جائے گا اور اگر ایسا ہی کوئی اور سامان ان کو مل جائے تو اسے بھی لے لیں کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا؟ کہ وہ اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہیں اور انہوں نے اچھی طرح پڑھا بھی ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کریں کیا تم سمجھتے نہیں''۔ 169

مشکل الفاظ کے معنی:

اس آیتِ کریمہ میں چند الفاظ وضاحت طلب ہیں۔ پہلا لفظ خَلَفَ مصدر خلافت سے مشتق ماضی کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں ''قائم مقام اور خلیفہ ہو گئے'' اور دوسرا لفظ خَلْفٌ مصدر ہے جو ''قائم مقام اور خلیفہ'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے' مفرد اور جمع دونوں کے لئے بولا جاتا ہے یہ اکثر برے خلیفہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مقابل نیک اور قابل خلیفہ کے لئے خَلَفٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ''عرض'' سامان کے معنی میں بولا جاتا ہے

Marfat.com

نقد کے بدلا میں خریدا جاتا ہے۔اور کبھی مطلقاً مال کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے خواہ نقد ہو یا سامان اور اس جگہ اسے مال کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ادنیٰ دُنُوّ سے بھی مشتق ہوسکتا ہے اس صورت میں ادنیٰ کا معنی ہوگا اقرب۔اسی کا مؤنث دنیا ہے۔جس کے معنی قریب کے ہیں آخرت کے مقابلے میں یہ جہاں چونکہ انسان کے زیادہ قریب ہے اس لئے اس کو ادنیٰ اور دنیا کہا جاتا ہے۔دوسرا احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ادنیٰ دناءۃ سے ہے اس کا معنی ہے ذلت' اس صورت میں ادنیٰ کے معنی ذلیل اور حقیر کے ہوجائیں گے' دنیا اور اس کے سب سامان چونکہ آخرت کے مقابلے میں حقیر اور ذلیل ہیں اس لئے اس کو ادنیٰ اور دنیا کہا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کے تدریجی زوال کے اسباب:

دریا کے جب کسی بند میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں تو ہوش مند لوگ فوراً اس کی فکر کرتے ہیں وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر ان دراڑوں کو برابر نہ کیا گیا اور بند کی کمزوریوں کو دور نہ کیا گیا تو کہیں نہ کہیں شگاف بھی پڑسکتا ہے لیکن اگر بند کے نگران اور اس کے آس پاس رہنے والے لوگ اسے معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کردیں کہ ابھی صرف دراڑیں ہی پڑی ہیں پانی باہر نکلنا تو شروع نہیں ہوا نا' تو پھر یہ بات یقینی ہے کہ یہ غفلت کسی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور ایک نہ ایک دن بند میں شگاف پڑ جاتا ہے۔شگاف بھی اچانک نہیں پڑتا شروع میں پانی رسنے لگتا ہے پھر آہستہ آہستہ بہنے لگتا ہے پھر کہیں کہیں سوراخ ہونے لگتے ہیں اور جب اس کی فکر نہیں کی جاتی تو پھر شگاف کھل جاتا ہے اور کھلتا ہی چلا جاتا ہے۔آغاز میں معمولی کوشش سے اصلاح ہوسکتی ہے لیکن جب شگاف بڑا ہوجائے تو پھر بعض دفعہ زندگیاں دے کر بھی اسے بند نہیں کیا جاسکتا یہی حال قوموں کی زندگی کا بھی ہے مقاصدِ زندگی کے حوالے سے جب ان میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں تو پیغمبر اس کی طرف متوجہ کرنے لگتے ہیں لیکن جب قوم ان کی بات نہیں سنتی تو پھر ایک تدریج کے ساتھ زوال کا عمل آگے بڑھنے لگتا ہے کہیں اخلاقی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں' کہیں عقائد کو گھن لگتا ہے' کہیں معاملات میں ناہمواری جنم لیتی ہے اور کہیں اجتماعی زندگی انتشار اور افتراق کا شکار ہوتی ہے لیکن جب قوم ان میں سے کسی بات کا بھی ادراک کرنے کو تیار نہیں ہوتی تو پھر زوال کا عمل بڑھتے بڑھتے ناقابلِ اصلاح ہوجاتا ہے۔بنی اسرائیل کے اسی تدریجی زوال کو ان آیات میں بیان کیا جارہا ہے ایک ایسی امت جس کی بنیاد اللہ کے دین پر استوار ہو اور جس کی اجتماعی زندگی کا دارومدار تعلق باللہ' اطاعت وخشیت اور خلقِ خدا کی خدمت پر ہو اس کے زوال اور تباہی کی تکمیل میں جو چیز سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جن مذہبی علماء اور راہنماؤں نے لوگوں کے اندر ان بنیادی اقدار کو زندہ رکھنا اور توانا کرنا ہے وہ خود ان بنیادی اقدار سے تہی دامن ہوجائیں ان کے اہداف اور مقاصد زندگی تبدیل ہوجائیں اور ان کی ترجیحات یکسر بدل کر رہ جائیں اس وقت اس قوم کا حال ایک ایسی گاڑی کا ہوجاتا ہے جس کے سٹیئرنگ پر کوئی ڈرائیور نہ ہو اور اگر ہو تو اسے بالکل معلوم نہ ہو کہ مجھے اس گاڑی اور اس کے مسافروں کو لے کر کہاں جانا ہے مسافر کہیں اور جانا چاہتے ہوں اور اس کا رخ کسی اور طرف ہو ایسی صورت میں ان کی تباہی کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کے زوال کی اسی آخری علامت کو بیان کیا جارہا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ قومی خصوصیات سے محروم ہوچکے تھے۔انتشار اور افتراق کے باعث ان کی اجتماعی زندگی تباہ ہوچکی تھی۔بایں ہمہ! ان میں خیر بالکل ختم نہیں ہوا تھا صالحین کا ایک گروہ ان میں باقی تھا جو ان کی اصلاح کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ان صالحین کے راہنما اور مقتداء یقیناً کتاب اللہ کے علماء ہوں گے جو کسی نہ کسی حد تک اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے لیکن اب ان کی بدنصیبی یہاں تک پہنچ گئی کہ اب کتاب کے جو وارث ہوئے اور جنہوں نے اللہ کی کتاب کے علم کو اپنی زندگی کا مقصد بنا کر لوگوں کی اصلاح کے فرض کو انجام دینا تھا ان کا حال یہ ہوگیا کہ اس کتاب نے ان کے لئے آخرت کے حصول کو مقصد زندگی ٹھہرایا تھا اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ تمہاری زندگی اس طرح گزرنی چاہیے کہ ہر

Marfat.com

دیکھنے والا محسوس کرے کہ یہ لوگ آخرت کے مسافر ہیں ہر کام کرنے سے پہلے تمہیں فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ اس بارے میں اللہ کی کتاب نے کیا احکام دیئے ہیں اور شریعت ہماری کیا راہنمائی کرتی ہے؟ تمہیں اپنی ضروریاتِ زندگی کے حصول میں ہر قدم پر سوچنا چاہیے کہ میرے لئے کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟ اور زندگی گزارتے ہوئے مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے میرا اللہ ناراض ہو جائے لیکن اب جو لوگ کتاب کے وارث اور حامل ٹھہرے ان کی زندگی کا رخ بالکل دوسری طرف ہو گیا وہ بجائے آخرت کے دنیا کو اپنا ہدف بنا چکے بجائے آخرت کے مسافر بننے کے وہ دنیا کے حریص ہو گئے بالکل دنیا داروں کی طرح انہیں رات دن یہ فکر رہنے لگی کہ ہم ایک پر تعیش زندگی کس طرح اختیار کر سکتے ہیں انہوں نے کتابِ خداوندی کو بھی دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیا اصحابِ اقتدار اور امرائے دولت کی خوشنودی کے لئے اگر اللہ کی کتاب میں انہیں تحریف اور ترمیم کرنا پڑی تو اس سے بھی دریغ نہ کیا اور عوام کو ایسے ایسے مذہبی فریب دیئے جس سے ان کی مالی زندگی مستحکم ہوتی گئی۔

دنیا کی روایت یہ ہے کہ جب کسی قوم کے مذہبی رہنماء سیرت و کردار سے عاری ہو جاتے ہیں یا ان کے کردار میں کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں عوام ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہب کا قلادہ گلے سے اتار پھینکتے ہیں اور حکمران جب دیکھتے ہیں کہ یہی ایک طبقہ تھا جو ہمیں روکتا تھا اور اب وہ خود دنیا کی دلدل میں دھنس گیا ہے تو پھر انہیں اپنے مقاصدِ مذمومہ کو حاصل کرنے میں کوئی روک نہیں رہتی نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ پوری قوم عقائد کی کمزوری' اخلاق کی خرابی اور معاملات میں ناہمواری کا شکار ہو کر بے دریغ تباہی کی طرف دوڑنے لگتی ہے۔ بنی اسرائیل نے بھی جب دیکھا کہ ہمارے مذہبی راہنما خود حبِ دنیا کے اسیر ہو کر کہاں سے کہاں جا پہنچے ہیں تو اب انہیں دنیا طلبی کی ناروا حدود تک پہنچنے سے کون روک سکتا تھا حقوق اللہ پہلے ہی تباہ ہو چکے تھے اب حقوق العباد بھی تباہ ہو گئے ہر چیز پر حبِ دنیا کے غلبے کے باعث ایک ایسی لوٹ کھسوٹ مچی جس نے اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا۔ دیانت امانت' حلال و حرام کی پابندی' قناعت اور سادگی' بے غرضی اور بے لوثی قصہ پارینہ بن کر رہ گئیں۔ اجتماعی زندگی ان کی پہلے ہی تباہ ہو چکی تھی رہی سہی کسر حبِ دنیا کے بحران نے پوری کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جب بھی قوموں کے عروج و زوال پر غور کرتے ہیں تو حیرت انگیز حد تک یہ بات سامنے آتی ہے کہ قوموں نے نامساعد حالات' وسائل کی کمی' آسانیوں کے فقدان اور مالی حالات میں ابتری کے دور میں ہی ترقی کی ہے یہی وہ دور ہوتا ہے جب ان کے اندر ہمت و شجاعت اور محنت و جانکاہی کا جذبہ ابلتا ہے۔ اولوالعزمی اور بلند ہمتی ان کا راستہ روشن کرتی ہے ان کے پیشِ نظر مقاصدِ زندگی اور قومی اہداف کے سواء اور کچھ نہیں ہوتا وہ نانِ شبینہ پر گزارا کرتے ہیں' پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں' جھونپڑوں میں سکونت رکھتے ہیں لیکن تخت و تاج ان کے پاؤں کی ٹھوکروں میں ہوتے ہیں زمین ان کے لئے سمٹنے لگتی ہے' سر اور دل ان کی عظمتوں کے سامنے جھکنے لگتے ہیں لیکن جیسے ہی ان کے اندر دنیا اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہوتی ہے اور مظاہرِ دنیا کو عزت و عظمت کی علامت سمجھنے لگتے ہیں زمین پر بیٹھنے کی بجائے تخت پر بیٹھنا اور تاج پہننا ان کی معراج بن جاتا ہے اور طاقت اور قوت سے لوگوں کی گردنوں پر سوار رہنا چاہتے ہیں اور درہم و دینار' دولت کی ریل پیل' معاشرت کا ٹھاٹھ باٹھ ان کا مقصود بن جاتا ہے تو پھر انہیں زوال کی طرف بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا قوت ہمیشہ جھونپڑوں سے نکلتی ہے اور محلات میں جا کر ڈوب جاتی ہے۔ سخت زندگی اولوالعزمی کو جنم دیتی ہے جس کے نتیجے میں فتوحات کا راستہ کھلتا ہے دنیا اور دولتِ دنیا سے محبت اور وابستگی ذلت اور نکبت کا سبب بنتی ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا ہے

سب کچھ اور ہے تو جسے خود سمجھتا ہے — زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
جب بھی میرا جوہر آشکار ہوا — قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

Marfat.com

بنی اسرائیل اپنے مقتداؤں اور راہنماؤں کی اسی کمزوری اور گمراہی کے باعث اپنے زوال کی انتہاء کو پہنچ گئے حتیٰ کہ ان کا یہ حال ہو گیا کہ اگر کبھی انہیں توجہ دلائی جاتی کہ تم ایک حاملِ دعوت امت ہو لوگوں کی اصلاح تمہاری ذمہ داری ہے تمہیں لوگوں کو دین سکھانا اور اللہ کی دھرتی پر دین کو قائم کرنا ہے تو عوام تو عوام ان کے مذہبی راہنما ایسی باتوں کے جواب میں کہتے کہ ہمیں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ ہمارا طرزِ عمل قیامت کے دن ہمارے لئے عذاب کا باعث ہو گا کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہم چونکہ انبیاء کرام کی اولاد ہیں اور ہمارا اللہ سے خاص رشتہ ہے اس لئے یقیناً ہماری مغفرت کر دی جائے گی اور کسی صورت بھی اللہ کا عذاب ہماری طرف متوجہ نہیں ہو گا لیکن اگر ایسی کوئی بات ہوئی بھی تو ہمارے آباؤ اجداد یقیناً ہمیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے۔ اندازہ فرمائیں! یہ ایسی امت ہے جن کے ہاتھوں میں اللہ کی کتاب موجود ہے اور اللہ کے کتنے انبیاء و رسل ان کی ہدایت کے لئے آ چکے ہیں۔ بایں ہمہ! اپنے گھڑے ہوئے غلط عقائد پر انہیں اس حد تک اعتماد ہے کہ وہ ایمان و عمل کو چھوڑ کر ایسے ہی عقائد کے سہارے مغفرت کو یقینی سمجھتے ہیں یہ باتیں پڑھ کر بظاہر حیرت ہوتی ہے لیکن اگر ہم امتِ مسلمہ کے بعض طبقات کی زندگی دیکھیں تو پھر یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ امتیں جب زوال پذیر ہوتی ہیں تو ان کا حال ایسا ہی ہوتا ہے۔ اندازہ فرمائیے اس امت کے پاس اللہ کی آخری کتاب موجود ہے اور پھر یہ واحد امت ہے جس کے پاس اللہ کے رسول کی سنت محفوظ ہے زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارے میں ہمیں واضح راہنمائی میسر نہ ہو بایں ہمہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے غلط علماء اور پیشواؤں نے عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کو یہ یقین دلا رکھا ہے کہ تمہیں اسلامی شریعت پر عمل کرنے اور ایمان کے تقاضوں کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تم نے جن لوگوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے یعنی جن کو اپنا پیر اور مرشد مانا ہے تمہیں بس ان کی خدمت کرنی چاہیے وہ تمہاری بخشش کے لئے کافی ہیں۔ چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں دیہات ہی میں نہیں شہروں میں بھی آپ کو ایسے پیرانِ کرام ملیں گے جن کی اپنی زندگی سراسر اسلامی تعلیمات سے بیگانہ ہے۔ بعض تو ایسے بھی مشہور بزرگ ہیں کہ جن میں تمام شرعی عیوب پائے جاتے ہیں لیکن عوام کی سادگی کا کیا کہنا کہ وہ سال بسال ان کے درشن کو اپنی بخشش کا ذریعہ سمجھ کر بے تابانہ وہاں پہنچتے ہیں اور جیسے ہی انہیں ایک جھلک دیکھنے کو ملتی ہے وہ اپنی ساری جمع پونجی ان کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں لیکن جو تعلیم یافتہ لوگ اس حد تک سادہ نہیں ان کی بے خبری کا بھی یہ عالم ہے کہ انہیں ایمان و عمل سے کوئی بڑا تعلق نہیں رہا ہے وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اعمال چاہے کچھ بھی ہوں قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہماری نجات کے لئے کافی ہے ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ارکانِ اسلام کے تارک ہیں ایسے بھی ہیں جن کی کمائی سراسر حرام کے ذرائع کی مرہونِ منت ہے اور ایسے بھی ہیں جنہیں نہ حقوق اللہ کی فکر ہے اور نہ حقوق العباد کی لیکن جب کبھی انہیں ان سے آخرت کی بات ہوتی ہے تو وہ بڑے اطمینان سے جواب دیتے ہیں کہ ہم جس رسولِ پاک ﷺ پر ایمان لائے ہیں وہ قیامت کے دن ہماری سفارش فرمائیں گے تو پھر ہمیں کسی عمل کی ضرورت کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کر لینا چاہیے کہ رمضان المبارک میں خیرات کر لی جائے، ربیع الاول میں میلاد کی محفلیں رچا دی جائیں، کسی مسجد میں قالین بچھا دیا جائے، شبِ برأت میں حلوہ پوری سے لوگوں کی تواضع کر دی جائے، یہ سب کچھ کر لینے کے بعد تو نجات میں کوئی شبہ ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح کے سہاروں نے بنی اسرائیل کی زندگی برباد کی تھی اور انہی سہاروں نے اس امت کی دینی زندگی تباہ کر دی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل کے لوگو! تم نے جن مفروضوں پر اپنی پوری دینی زندگی کو استوار کر لیا ہے اور جس میں آخرت کی بجائے دنیا طلبی تمہارا مقصود بن کر رہ گئی ہے۔ کیا تمہاری کتاب نے تمہیں یہی تعلیم دی تھی؟ اور آج بھی وہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس موجود ہے بتاؤ کیا اس میں یہ باتیں موجود ہیں؟ تمہیں خوب معلوم ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات موجود نہیں البتہ اسی کتاب میں تم سے یہ عہد ضرور لیا گیا تھا

Marfat.com

کہ تم اسی کتاب کے احکام کے مطابق زندگی گزاروگے اور اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر اس کتاب یعنی اللہ کی طرف منسوب نہیں کروگے۔ تم میں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جو اس کتاب کو پڑھتے بھی ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کتاب میں کیا ہے اور کیا نہیں حتیٰ کہ اس کتاب کو پڑھنے کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے یہ کتاب پڑھ پڑھ کر گھس ڈالی ہے کیونکہ یہاں ''دَرَسُوا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے درس کا معنی گھسنا ہے جب کوئی کتاب ہر سطر پر انگلی رکھ کر بار بار پڑھی جائے تو عموماً اس کے الفاظ گھس جاتے ہیں آج بھی آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ قرآنِ کریم پر انگلی رکھ کر پڑھتے ہیں اور تورات کے زمانے میں کتابت اور طباعت کے اتنے خوبصورت انتظام بھی نہیں تھے یقیناً اس وقت کتاب کو پڑھتے ہوئے ساتھ ساتھ انگلی بھی پھیرنا پڑتی ہوگی تاکہ کسی سطر کا اشتباہ نہ ہو جائے تو یہاں فرمایا جارہا ہے کہ تم نے کتاب پڑھ پڑھ کر گھس ڈالی ہے اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ اس کتاب میں تمہیں کیا تعلیمات دی گئی ہیں اور تمہارے لئے کیا ترجیحات قائم کی گئی ہیں اور کس طرح آخرت کو تمہارا مقصود ٹھہرایا گیا تھا لیکن تم نے اس کی بجائے دنیا کے مال کو اپنا مقصود بنایا اور اس پوری تبدیلی کے لئے ان تصورات میں پناہ لی جنہیں تم نے اپنی خواہش سے پیدا کیا۔ حالانکہ اس کتاب نے تمہیں کھول کر یہ بات بتائی تھی کہ بخشش اور آخرت کا گھر کسی کا ذاتی اور خاندانی اجارہ نہیں بلکہ یہ تو ان لوگوں کو ملے گا جو دنیا میں خداترسی سے کام کریں گے جس کی زندگی ایک متقی کی زندگی ہوگی وہ بجائے دنیا کو اپنا مطلوب بنانے کے آخرت کی تیاری کی فکر کریں گے لیکن تم نے اس بنیادی تعلیم سے منحرف ہو کر اور کتابِ خداوندی کی ہدایات کو نظر انداز کر کے نہ صرف دنیا طلبی کو اپنا محبوب اور مقصود بنایا بلکہ غلط عقائد اور تصورات گھڑ کر پوری دینی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا تمہارے نزدیک بنی اسرائیل میں سے ہونا نجات کے لئے کافی ہے اگر ایسا ہوتا تو پھر کتابیں اور پیغمبر بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی کیا تم اتنی معمولی بات کو نہیں سمجھتے کہ جو لوگ بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے انہیں اگر اپنے نسب کے اعتبار سے جنت میں جانا ہے تو ان کی طرف موسیٰ علیہ السلام کا تشریف لانا اور پھر ان پر تورات کا نازل ہونا اور پھر تورات کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے ان کا مصر سے نکل کر صحرائے تیہ اور وادیٔ سیناء میں آنا اور شہری زندگی کو چھوڑ کر صحرائی زندگی کو اختیار کرنا تاکہ اللہ کے دین کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے اس کی آخر کیا ضرورت تھی۔ اب بھی اگر تم سمجھنا چاہو تو ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ اللہ کے یہاں نجات اور بخشش کا دارومدار کس چیز پر ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کے ہاں مصلحین کہلا سکتے ہیں۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا:

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

''اور جو لوگ کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز قائم کرتے ہیں تو ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے اور یاد کرو جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو معلق کر دیا گویا وہ سائبان ہے اور انہوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گرا ہی چاہتا ہے' (ہم نے کہا) پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی سے' اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم خدا کے عذاب سے محفوظ رہو''۔ 170-171

نجات کا دارومدار تمسیک بالکتاب اور اقامتِ صلوٰۃ پر ہے:

اس آیتِ کریمہ کو سابقہ آیتِ کریمہ کے ساتھ ملا کر پڑھیں اور اس کی روشنی میں اس کے الفاظ پر غور کریں تو تب اس آیتِ کریمہ کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ گزشتہ آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا زوال بڑھتے بڑھتے یہاں

Marfat.com

تک پہنچ گیا کہ جس کتاب کے ذریعے سے انہوں نے دنیا کی امامت وقیادت کرنی تھی اور جس کے واسطے سے انہوں نے اپنی اور دنیا کی اصلاح کا کام کرنا تھا انہوں نے اس کتاب کو صرف تلاوت کی حد تک قبول کیا باقی پوری زندگی انہوں نے خواہشات کے حوالے کر دی ہماری طرح وہ بھی یہی سمجھتے رہے کہ اللہ کی کتاب کا حق صرف یہ ہے کہ اسے پڑھا جائے اور اس سے ثواب حاصل کیا جائے یا زیادہ سے زیادہ اس سے شفاء حاصل کر لی جائے یعنی تعویذ وغیرہ میں استعمال کیا جائے اور اگر بہت ہی زیادہ اس تعلق کو نبھانا ہو تو پھر اس سے ایصالِ ثواب کا کام لے لیا جائے رہی یہ بات کہ اس کتاب کو زندگی کا راہنما بنا کر اس کی راہنمائی میں زندگی گزاری جائے اسی کو آئین اور قانون کا درجہ دیا جائے جس طرح عبادت گاہوں میں اس کا چلن ہو اسی طرح زندگی کے ہر دائرے میں حتیٰ کہ عدالتوں اور ایوان ہائے حکومت میں بھی اسی کی حکومت ہو اس سے انہوں نے یکسر انحراف کر کے کتاب کو اپنے گھروں یا زیادہ سے زیادہ اپنی عبادت گاہوں تک محدود کر لیا اور اپنی زندگی کی باگ ڈور وضعی قوانین اور طاغوتی قوتوں کے ہاتھ میں دے دی۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تمام تر خرابی کا دارومدار اسی ایک تصور کے بگڑ جانے پر ہے کہ ہم نے تمہیں اس کتاب سے تمسک کا حکم دیا تھا اور اب بھی وہی لوگ اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے جو اس کتاب سے تمسک کریں گے۔

تمسک کا معنی ہے ''کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑ لینا یا تھام لینا''۔ کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لینے کا مطلب یہ ہے جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کتاب کو زندگی کی راہنماء بنایا جائے جس طرح عبادت کرتے ہوئے یہ کتاب راہنمائی کرے اسی طرح معاشرت، معیشت، تعلیم، سیاست، تفریح، حکومت، معاملات، آدابِ زندگی غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں کبھی اس کے ماننے والے اسے اپنے سے علیحدہ نہ کریں جس طرح جسم و جان میں موت سے پہلے علیحدگی نہیں ہو سکتی، جس طرح پھول اور خوشبو کبھی الگ الگ نہیں ہو سکتے، جس طرح چاند سے اس کی آب و تاب الگ نہیں کی جا سکتی، جس طرح پانی سے اس کا بہاؤ نہیں چھینا جا سکتا، جس طرح سورج سے اس کی کرنیں الگ نہیں کی جا سکتیں اسی طرح کتاب اور اہلِ کتاب کو بھی جدا جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس انتہائی قریبی تعلق اس وابستگی اور وارفتگی اور ایمان و عمل کے اس رشتے کو کتاب سے تمسک کا نام دیا گیا ہے اور پھر یہ دکھانے کے لئے کہ کتاب سے تمسک کے بعد انسان میں کیا تبدیلی آتی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو لوگ صاحبِ ایمان ہیں وہ کتاب سے تمسک کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں کیونکہ کتاب سے تمسک کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ بندے کو اس کے معبود سے جوڑ دیا جائے۔ بندے کا اپنے رب سے ٹوٹا ہوا رشتہ بحال ہو جائے انسان جو مختلف آستانوں پر سر جھکاتا پھرتا ہے یا بغاوت کا شکار ہو کر خود طاغوت بن بیٹھا ہے اسے اللہ کے آستانے پر جھکا دیا جائے جو انسان قوت اور طاقت کا مدعی بن کر لوگوں پر ظلم توڑنے لگا ہے اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی جائے کہ طاقت کا حقیقی سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اسی کی قدرتیں اور قوتیں بے پناہ ہیں اس کے سامنے کسی کی قدرت اور قوت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح جو لوگ تخت و تاج یا دولت و امارت کو عظمت و بلندی کا مصدر و منبع جان کر اس کی بندگی کرنے لگتے ہیں انہیں بتایا جائے کہ وہ ذات جو سب عظمتوں کی مالک، سب کبریائیوں کی حامل اور تمام بلندیوں سے بلند ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں عظمت و سطوت کی نمود دیکھتے ہو وہ فریبِ نظر کے سوا کچھ نہیں انسانوں کی کمزوریوں نے انسانوں کو خدا بنایا ہے، سر جھکانے والوں نے آستانوں کو وجود بخشا، جھکنے والوں نے دماغوں میں ربوبیت کا سودا پیدا کیا ہے۔ ان تمام کمزوریوں کا علاج صرف نماز سے ممکن ہے جس کا ایک ایک بول، جس کا قیام و قعود، جس کا رکوع و سجود، جس کی تسبیح و مناجات ایک ایک کمزوری کا علاج ہے۔ ایک نمازی جب نماز کے ارادے سے ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہتا ہے تو وہ اصل میں اعلان کرتا ہے کہ میں تمام دنیا کی قوتوں، شوکتوں، تمام دنیا کے لازموں اور تمام دنیا کے آستانوں کو ماننے سے انکار کرتا ہوں میں دنیا کے ہر فرعون اور نمرود کی عظمت کو پاؤں کی ٹھوکر پر اچھالتا ہوں، میں ساری دنیا کو اپنی

Marfat.com

پیٹھ پیچھے پھینکتا ہوں اور میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اللہ سب سے بڑا ہے وہ بادشاہوں کی عظمت سے بھی بڑا ہے اور مشیخیت اور تقدس کے دعوے داروں سے بھی بڑا ہے اس کائنات کے عناصرِ قدرت وفطرت اسی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ ایک ایک مخلوق اسی کی تسبیح میں لگی ہوئی ہے جہاں کہیں بھی عظمت و قدرت کی نمود ہے وہ سب اس کی دین ہے یہیں سے آدمی کو وہ رفعت و منزلت ملتی ہے جس سے وہ تمام مخلوقات سے بلند ہو کر اللہ سے جڑ جاتا ہے اب کوئی دیوتا یا اوتار یا کوئی قبہ یا کوئی دستار اسے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور نہیں کر سکتی' کائنات کی منہ زور قوتیں اس کے ذوقِ تسخیر کو انگیخت تو کر سکتی ہیں ہراساں نہیں کر سکتیں۔ اسے ایک طرف اپنی ذات کی معرفت نصیب ہوتی ہے تو دوسری طرف اپنے خالق و مالک اور اپنے آقا کی پہچان ملتی ہے۔ انسان کی تمام سرفرازیوں اور اس کی تمام ذلتوں کا راز صرف اسی ایک بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے آقا کو پہچانتا ہے کہ نہیں' وہ اس دولت سے بہرہ ور ہو جائے تو دنیا کی سب سے بڑی قوت بن جاتا ہے بے بہرہ رہے تو اس کی حیثیت مشتِ خاک سے زیادہ نہیں' جگر مرادآبادی نے ٹھیک کہا

گھٹے اگر تو بس ایک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

اپنے آقا کی معرفت اور اپنی ذات کا شعور یہی انسان کا حقیقی سرمایہ ہے اور نماز انسان میں یہی روح پوری توانائیوں کے ساتھ پیدا کرنے کا کردار ادا کرتی ہے۔ اللہ اکبر سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور پھر قدم قدم یہ شعور اور یہ معرفت آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اللہ کی کبریائی کے اعلان کے بعد ایک نمازی اس کی تسبیح و تحمید کرتا ہے' اس کی صفات کی تنزیہ کرتا ہے' اس کی برکتوں اور اس کی بزرگی کے تصور سے اپنے دل و دماغ کو روشن کرتا ہے اور ہاتھ باندھ کر پوری طرح اسی کی غلامی میں ڈوب جاتا ہے اور پھر جب اسے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ صرف ایک اللہ کی بندگی کرنا اس دنیا میں آسان نہیں تو پھر وہ فوراً اسی سے پناہ کا طلب گار رہتا ہے اور شیطانی قوتوں سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے اللہ کی رحمت کے سائے میں دعا کے لئے زمزمہ سنج ہو جاتا ہے اس کی ربوبیت کے اعتراف' اس کی بے پایاں رحمتوں کا شکر اور ساتھ ہی اس کی صفتِ عدالت کو یاد کرتے ہوئے پروردگار سے التجا کرتا ہے کہ الٰہی! تیری صفتِ عدل یقیناً میری زندگی کے اعمال کے مطابق میرے ساتھ معاملہ کرے گی تو نے اگرچہ مجھے حواس اور جوہرِ عقل کی دولت سے نوازا ہے لیکن انسانی معاملات' طبعی خواہشات' مفادات کا ہجوم' گروہی مفادات کا دباؤ' جبلت کی پیچیدگیاں' تعلقات کی ناہمواریاں' نفع وضرر کی نارسائیاں اور ذہن وخرد کی ناتمامیاں ایک ایسا گھنا اور خاردار جنگل ہے جس میں راستے کا تلاش کرنا اور کانٹوں سے بچ کر نکلنا تیری ہدایت کے بغیر ممکن نہیں میرے مالک تو مجھے اس ہدایت سے بہرہ ور فرما تاکہ میں زندگی کے راستے پر ان لوگوں کا طریقہ اختیار کروں جو تیرے انعامات کے مستحق ٹھہرے اور ان لوگوں کے طریقوں سے بچوں جو تیرے غضب کے مستحق ہوئے پروردگار اس کے جواب میں وہ کتابِ ہدایت کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے جس کی موجودگی میں زندگی کا کوئی بھی زاویہ الجھا ہوا نہیں۔ اس نے انسانی زندگی کے راستے پر اس طرح نور پھیلا دیا ہے کہ سوائے دلوں کے اندھوں کے کسی کے لئے ٹھوکر کھانے کا خوف نہیں ہے۔ ایک بندہ جب اس عظیم دولت سے بہرہ ور ہوتا ہے اور پھر اسے بار بار پڑھتا بھی ہے تو اللہ کی اس نعمت سے گراں بار ہو کر فوراً وہ اپنے مالک کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس کی تسبیح و تحمید کے زمزمے اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں پھر وہ اس کیفیت میں ایسا سرشار ہوتا ہے کہ حالتِ قیام میں اس کی زبان پر حمد وثناء کے ساتھ ساتھ اللہ کی جانب سے قبولیت کا بھی اعلان ہونے لگتا ہے زبان پر اس جملے کے آتے ہی طبیعت ایسی بے قابو ہوتی ہے کہ وہ سرتاپا بندگی بن کر اپنے آقا کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے' دیر تک اس کی حمد وثناء میں ڈوبا رہتا ہے طبیعت کو کچھ اطمینان ملتا ہے تو قعدہ میں اطمینان سے بیٹھ کر اپنی بندگی کا سارا اثاثہ' اپنی توانائیوں کا سارا خزانہ' اپنی قوتِ گویائی کی ساری جولانیاں اور اپنے کسب واکتساب کا سارا سرمایہ اللہ کے حضور نذر کرتے ہوئے

Marfat.com

کہتا ہے۔

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں　　مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز　　مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری　　امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

ایسے ہی احساسات میں ڈوبتا ابھرتا بندگی کی معراج کو چھوتا ہوا ایک بندہ نماز کو پورا کرتا ہے اور اسی سے اس کو وہ دولت نصیب ہوتی ہے جو تمسک بالکتاب کی حقیقی منزل ہے اور پھر یہ کوئی ایک دفعہ کا معاملہ نہیں بلکہ دن میں پانچ مرتبہ یہ مشق کروائی جاتی ہے۔ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے ان تأثرات کو دل و دماغ میں ابھارا جاتا ہے، بندے اور اس کے رب کے رشتے کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے ایک بندے کو اس کی اصل حیثیت کا احساس دلایا جاتا ہے تاکہ جب وہ دن کے وقت فرائضِ زندگی اور کاروبارِ معیشت کا آغاز کرے تو یہ احساسات اور تأثرات ہمہ وقت اس کے ہمرکاب اور ہم نشین رہیں اور جب وہ اپنے معمولات میں حدود سے تجاوز کرنے لگے' مسرت و شادمانی کے لمحات میں بہکنے لگے' ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے امانتوں میں خیانت کرنے لگے' اقتدار و حکومت کے نشے میں ظلم و تعدی پر آمادہ ہو' یا محکومیت و مظلومیت میں اپنے تئیں بے سہارا پا کر ڈولنے لگے تو اللہ کی کبریائی اور عظمت اور اپنی بندگی و اطاعت کا گہرا شعور ہر قدم پر اس کی دستگیری کرے۔ ہمارے پروردگار سے بڑھ کر ہماری کمزوریوں کو اور کون جانتا ہے اسے خوب علم ہے کہ نسیان و ذہول اور خواہشات و جذبات سے مغلوبیت ہمارا وطیرہ ہے۔ اس لئے نماز جیسی یاد دہانی اور ذکر کو صرف صبح تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہر بدلتی ہوئی حالت کا لحاظ فرماتے ہوئے بار بار اس کا حکم دیا۔ ہمارا سب سے زیادہ مصروفیت کا وقت سہ پہر اور شام کا وقت ہے جب کاروبارِ معیشت زوروں پر ہوتا ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ حبِ دنیا' ہوسِ زر اور دیگر عوامل کہیں اساسی مقاصد پر غالب نہ آ جائیں تو ظہر' عصر اور مغرب کی نمازیں فرض فرما کر اصل حیثیت اور حقیقی مقاصد کی یاد دہانی فرمائی اور انسانیت کو پستی میں ڈوب جانے اور غفلت میں بہک جانے سے بچایا اور پھر سونے سے پہلے عشاء کی نماز فرض فرما کر اور نسبتاً لمبی نماز پڑھا کر دن بھر کی کوتاہیوں پر استغفار اطاعت و خدمت پر استقامت کی صورت میں شکر کے اظہار اور آنے والے کل کے لئے دعا و مناجات کا موقع عطا فرمایا۔ اس طرح دن میں پانچ مرتبہ اللہ سے بندگی و عبودیت کا عہد لیا گیا اور اسلامی سیرت و کردار کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دی۔ جب تک اس عہد و پیمان میں شعور و آگہی کی کارفرمائی باقی رہے گی اسلامی سیرت و کردار میں ضعف پیدا ہو جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ بھی محسوس ہوتا ہے وہ یہ کہ تمسک بالکتاب اور اقامتِ صلوٰۃ سے جس سیرت و کردار کی تعمیر ہو گی اس کی روشنی صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہے گی بلکہ یہ ایک ایسا نور ہو گا جس سے قریب و بعید کا ماحول بھی روشن ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا نماز سے پیدا ہونے والے سیرت و کردار کے نتیجے میں ایک ایسا شعور جنم لے گا جس سے اصلاح کا عمل قوت پکڑے گا اور یہ لوگ اپنے ماحول کے مصلح بن کر رفتہ رفتہ اپنی قوم کو راہِ راست دکھائیں گے لیکن یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کی راہنمائی کو قبول کریں اور اپنی زندگیوں کو نماز کے نور سے روشن کریں کیونکہ یہی وہ حقیقی بنیاد ہے جو کسی بھی فرد اور قوم کی زندگی کی تعمیر کی بنیاد بن سکتی ہے اس لئے اگلی آیتِ کریمہ میں اسی بات کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ قومی زندگی میں کتابِ خداوندی کی راہنمائی کی حیثیت' اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور انہوں نے بنی اسرائیل کے سامنے اسے پیش کیا تو انہوں نے اس کے احکام کو دیکھتے ہوئے اسے قبول کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا تھا تو

Marfat.com

پروردگار نے ان کی اس کوتاہی کو نظر انداز کرنے کے بجائے کوہِ طور کو ان کے سروں پر معلق کر دیا اور یہ تصور دیا کہ اگر تم نے پورے اخلاص کے ساتھ اس کتاب کی دی ہوئی راہنمائی اور اس کی پیش کردہ شریعت کے مطابق زندگی کا چلن نہ بنایا تو تمہیں اس کوہِ طور کے نیچے مسل دیا جائے گا۔ کیونکہ جو زندگی اللہ کے اقرار اور اس پر ایمان کے باوجود کتاب اللہ کے راہنمائی سے عاری ہو اور کتاب کی پیش کردہ شریعت پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ ہو محض اقرار و ایمان نہ اس کی دنیا بنا سکتے ہیں اور نہ اس کے آخرت میں کام آسکتے ہیں بندگی کا بنیادی تقاضا ہی یہ ہے کہ زندگی کے ہر مرحلے اور ہر شعبے میں اللہ کی حاکمیت قائم کی جائے اس کے نازل کردہ احکام نافذ ہوں اور اس کی کتاب انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک مکمل طور پر حاوی ہو یہ ضرورت اور یہ تقاضا ظاہر ہے صرف ایمان لانے سے پورا نہیں ہوتا اس کے لئے تو اللہ کے دین کا نافذ ہونا ضروری ہے۔

یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تو دین میں جبر نہیں رکھا اسے یہ پسند نہیں کہ کسی کو زبردستی مومن بنایا جائے لیکن یہاں تو بنی اسرائیل پر جبر کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے تورات کو قبول نہ کیا تو تم پر پہاڑ گرا کر تمہیں تباہ کر دیا جائے گا حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل صحرائے سیناء میں آنے اور نزول کتاب سے پہلے ایمان لا چکے تھے اب سوال ان کے ایمان کا نہیں تھا بلکہ سوال یہ تھا کہ جس پروردگار اور جس رسول پر وہ ایمان لائے ہیں اس کے پیش کردہ صحیفۂ ہدایت کو قبول کرنے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ انکار کریں تو ان کا یہ انکار بغاوت کے مترادف ہوگا اور بغاوت کی اجازت تو دنیا کا کوئی مہذب آدمی نہیں دیتا۔

کوئی بھی مہذب قوم کسی شخص کو اپنے ملک کا شہری بننے پر مجبور نہیں کرتی لیکن جب کوئی شخص اپنی آزادانہ رائے سے کسی ملک کی شہریت کو قبول کر لیتا ہے تو پھر اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ تمہیں اس ملک کے قوانین کی پابندی بھی کرنا ہوگی اب اگر وہ شہری تو رہنا چاہتا ہے لیکن وہ ملک کے آئین اور قانون کا احترام اور اطاعت کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ اسے ماننے سے ہی انکار کر دیتا ہے تو اب اس پر ضرور جبر کیا جائے گا یہی صورتحال یہاں بھی ہے کہ یہ لوگ آزادانہ مرضی سے ایمان لانے کے بعد اطاعت اور عمل میں کوتاہی کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے جس پر انہیں تنبیہ کی گئی کہ تمہارا معاملہ ایک ایسے خداوند ذوالجلال سے ہے جو تمہیں سزا دینے پر بھی قادر ہے اور اس کی قوت کا معمولی سا اظہار یہ ہے کہ اس نے میلوں تک پھیلے ہوئے کوہِ طور کو تمہارے سروں پر معلق کر دیا ہے تو تم اگر اس کے جلال اور اس کے غضب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی نازل کردہ کتاب کے مطابق زندگی گزارو اس کے بغیر تم ایک کامیاب زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٧٢﴾

Marfat.com

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ
بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿١٧٣﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ
الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿١٧٤﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ
اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿١٧٥﴾
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ
هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ
تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ
فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿١٧٦﴾ سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٧٧﴾ مَنْ يَّهْدِ
اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٧٨﴾
وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ
لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ
لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٧٩﴾ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا
الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٨٠﴾
وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٨١﴾

Marfat.com

اور یاد کرو جب تیرے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پشتوں سے' ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر، پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا ہاں تو ہمارا رب ہے ہم اس کے گواہ ہیں یہ ہم نے اس لئے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے یا عذر کرو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل سے پیدا ہوئے تو کیا آپ ہمیں ہلاک کریں گے باطل پرستوں کے عمل کی پاداش میں۔ اور ہم اسی طرح نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں تا کہ وہ پلٹ آئیں۔ ''اے پیغمبر! ان کے سامنے اس شخص کی سرگزشت بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہشوں کا پیرو بنا رہا تو اس کی مثال کتے کی مثال ہے اگر تم اس کو دھتکارو تب بھی زبان لٹکائے رکھتا ہے یا چھوڑ دو تب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یہی مثال اس قوم کی ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو تا کہ وہ غور کریں۔ کیا ہی بری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور خود اپنی جانوں پر ظلم کرتی رہی جسے اللہ ہدایت بخشے وہی ہدایت پانے والا بندہ ہے اور جنہیں وہ گمراہ کر دے وہی ہیں جو نامراد ہوتے ہیں۔ ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں' ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں' ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں' یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔ اور اللہ کے لئے خوبصورت نام ہیں تو انہیں سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑو جو اس کی صفات کے بارے میں کج روی اختیار کر رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں عنقریب اس کا بدلہ پائیں گے۔ اور جن کو ہم نے پیدا کیا ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی راہنمائی اور اس کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔

..................☆......☆......☆..................

گزشتہ رکوع کی آخری آیت پر بنی اسرائیل سے خطاب ختم ہو جاتا ہے اب گفتگو کا رخ عام انسانوں کی طرف پھیرا جا رہا ہے روئے سخن اگرچہ اہلِ مکہ کی طرف ہے لیکن خطاب پوری نوع انسانی سے ہے اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ گزشتہ آیات میں ہم نے بنی اسرائیل سے بندگی و اطاعت اور اللہ کی کتاب سے وابستگی کا جو عہد لیا تھا وہ کوئی ان کی خصوصیت نہیں تھی بلکہ تم بھی اسی طرح اللہ کے ساتھ ایک میثاق میں بندھے ہوئے ہو اور تمہیں بھی ایک دن اس میثاق کے حوالے سے جواب دہی کرنی ہے وہ میثاق کیا ہے؟ اس کا ذکر اگلی آیاتِ کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ

Marfat.com

قَالُوْا بَلٰی ج شَهِدْنَا ج اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ O اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْ م بَعْدِهِمْ ج اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ O وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَلَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ O

''اور یاد کرو جب تیرے رب نے بنی آدم سے یعنی ان کی پشتوں سے اُن کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر، پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا ہاں تو ہمارا رب ہے ہم اس کے گواہ ہیں یہ ہم نے اس لئے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے یا عذر کرو کہ ہمارے باپ دادا نے پہلے سے شرک کیا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل سے پیدا ہوئے تو کیا آپ ہمیں ہلاک کریں گے باطل پرستوں کے عمل کی پاداش میں۔ اور ہم اسی طرح نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں تاکہ وہ پلٹ آئیں''۔ 174-172

''اذ'' کا مفہوم:

پیشتر اس کے کہ ہم اس عہدِ الست کا ذکر کریں جو ان آیاتِ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے چند الفاظ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ اذ۔ ذکر کا قائم مقام ہوتا ہے اس سے مخاطب کو کسی مسلمہ امر کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے عموماً یہ امر ایسا ہوتا ہے جو متکلم اور مخاطب دونوں کے نزدیک واجب التسلیم ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ متکلم تو اس امر کو یقینی سمجھتا ہے لیکن مخاطب اسے بھول چکا ہے ایسی صورت میں بھی اذ استعمال کیا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ میں جس امر کا ذکر کر رہا ہوں تم چاہو اسے فراموش کر دو یا اس سے منحرف ہو جاؤ لیکن میرے نزدیک اس کے وقوع میں کوئی شبہ نہیں چنانچہ یہاں بھی اس لفظ کا استعمال اسی اصول کے تحت ہو رہا ہے۔

بنی آدم کے بعد مِنْ ظُهُوْرِهِمْ کا اضافہ دراصل بنی آدم سے بدل ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ بنی آدم سے متعلق یہاں جو حقیقت بیان ہو رہی ہے وہ کسی خاص دور کے انسانوں سے مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک جتنے انسان بھی دنیا میں آئیں گے یہ حقیقت سب سے متعلق ہے یعنی یہاں جس عہد کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کی براہِ راست نسل سے نہیں لیا گیا تھا بلکہ وہ ہر دور کے نسلِ انسانی سے لیا گیا تھا اس لئے کسی دور کا انسان بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس عہد سے تعلق نہیں رکھتا۔

عہدِ الست کی یاد دہانی اور اس کا مفہوم:

عہد کے الفاظ پر غور کیجئے، پروردگار نے انسانوں سے پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ عہد لیتے ہوئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ یعنی پروردگار نے انسانوں سے اپنے اللہ ہونے کا عہد نہیں لیا بلکہ اپنے رب ہونے کے بارے میں پوچھا اور سب نے اقرار کیا کہ ہاں آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب پروردگار نے نوع انسانی سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا تو یہ بات از خود انسانوں پر واضح ہو گئی کہ جس عظیم ذات کے لئے ہم ربوبیت کا عہد کر رہے ہیں وہی ہمارا اللہ ہے اور یہ ایسی حقیقت تھی جس کا عہد لینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ گمراہی کی ابتداء جب بھی ہوئی ہے وہ اللہ کے انکار سے نہیں ہوئی بلکہ اس کے ربوبیت کے انکار سے ہوئی ہے دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس نے کبھی اللہ کے وجود سے انکار کیا ہو اور اگر کبھی پروپیگنڈے یا غلط تعلیم کے زور سے زبانوں پر انکار جاری کر بھی دیا جائے تو حقیقت میں انسانی فطرت

Marfat.com

اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے جب کبھی موقع آتا ہے اس کا اظہار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ تاریخ میں ہم جتنی قوموں کا ذکر پڑھتے ہیں وہ مختلف قسم کے شرک میں تو ملوث رہی ہیں لیکن کبھی کسی قوم کے بارے میں تاریخ نے یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے اللہ کے وجود سے انکار کر دیا ایک بڑی ذات جو کائنات کا مبداء و معاد ہے اسے ہر قوم نے قبول کیا چاہے اس کا نام کچھ بھی رکھا ہو البتہ اس کے نیچے بے شمار رب بنا لئے کیونکہ ان کا گمان یہ تھا کہ ایک ایسی ذات جو آسمانوں کی بلندیوں پر متمکن ہے زمین کے آخری گوشے تک رہنے والے انسانوں کے حالات سے نہ آگاہ ہو سکتی ہے اور نہ ان کے معاملات میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے اس لئے وہ اپنے اختیارات اپنے ماتحتوں میں تقسیم کر دیتی ہے تاکہ دنیا کا نظام چلتا رہے یہیں سے شرک کی ابتداء ہوتی ہے اس لئے یہاں یاد دلایا جا رہا ہے کہ ہم نے پہلے دن انسانوں سے اس بات کا عہد لے لیا تھا کہ تم میرے سوا کسی اور کو رب نہ ماننا یعنی میری ذات کے اقرار کے ساتھ ساتھ یہ کبھی حرکت نہ کرنا کہ میرے اختیارات اور میری صفات میں کسی اور کو شریک کر دو۔ مشرکینِ مکہ دنیا بھر کے مشرکین کی طرح اسی گمراہی کا شکار تھے حتی کہ بنی اسرائیل بھی حاملِ کتاب ہونے کے باوجود اس گمراہی سے محفوظ نہیں تھے اور آج کا انسان بھی روشنیِ علم و ہنر کے باوجود اسی گمراہی کا شکار ہے انہیں اللہ کے وجود سے انکار نہیں اس کی یاد بھی کسی نہ کسی حد تک زندہ رہتی ہے انتہائی بے بسی کے لمحوں میں اسی سے مدد بھی مانگی جاتی ہے اور کبھی کبھی اسی کے لئے قربانیاں بھی دی جاتی ہیں لیکن یہ بات کہ حاکمیتِ مطلقہ اسی کو زیب دیتی ہے حلت و حرمت کا اختیار صرف اس کے پاس ہے۔ اطاعتِ مطلقہ صرف اسی کا حق ہے یہ وہ بات ہے جسے دنیا کی اکثریت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اس کی ان صفات کو نہ جانے کن کن قوتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے کہیں یہ اختیار پارلیمنٹ کو دیا گیا ہے' کہیں بادشاہت کو' کہیں آمریت کو اور کہیں خواہشِ نفس کو۔ بنی اسرائیل بھی اسی گمراہی کا شکار تھے وہ اللہ کی ذات اور صفات کو مانتے تھے لیکن اللہ کی ربوبیت کا اختیار انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو دے رکھا تھا عدی ابنِ حاتم طائی جب مسلمان ہونے کے لئے مدینہ آئے اور اپنے اطمینان کے لئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ سے پوچھا کہ میں نے مسلمانوں سے یہ سنا ہے کہ قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو رب بنا لیا ہے۔ میں عیسائی ہوں اس لئے میں اہلِ کتاب کے عقائد کو جانتا ہوں۔ ہم نے کبھی اپنے علماء اور پیشواؤں کو رب نہیں بنایا، یہ سراسر ہم پر الزام ہے۔ آپ ﷺ نے عدی سے سوال کیا کہ کیا چیز حلال ہے اور کیا حرام؟ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز؟ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ اس کا فیصلہ آپ اللہ کی کتاب سے کرتے ہیں یا اپنے علماء اور اپنے پیشواؤں کو آپ نے یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ کتاب اللہ سے ہٹ کر جو فیصلہ بھی دے دیں آپ اسی کو دین کا درجہ دیتے ہیں؟ عدی نے جواب دیا کہ ہم نے یہ اختیارات واقعی اپنے علماء کو دے رکھے ہیں وہ اگر ایسا فیصلہ بھی کر دیں جو کتابِ خداوندی سے یکسر متصادم ہو تو ہم کتاب اللہ کو نہیں مانتے بلکہ انہیں کے فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہی معنی ہے کسی کو رب بنانے کا۔ مطلق قانون سازی' غیر مشروط حاکمیت اور غیر مشروط اطاعت یہ سراسر پروردگار کا حق ہے کیونکہ وہ ہمارا رب ہے جب یہ حق کسی اور کو دیا جائے گا تو وہ بھی رب بن جائے گا۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اسی بات کی یاددہانی کی جا رہی ہے کہ ہم نے تم سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہیں بناؤ گے لیکن تم نے جا بجا اس کے مقابلے میں رب بنا لئے جہاں منفعت کی امید نظر آئی یا کسی سے نقصان کا خوف ہوا تو اس کو اپنا رب بنا لیا چاہے وہ دودھ دینے والی گائے ہو' پیاس بجھانے والا پانی ہو' سایہ دینے والا پیپل کا درخت ہو' ضروریاتِ زندگی کی کفالت کرنے والی دولتِ دنیا ہو یا تختِ اقتدار پر فائز انسان ہوں یا تقدس کے پیکر ہوں ان میں سے ہر ایک چونکہ فیض رسانی اور فائدہ پہنچانے کی کسی نہ کسی صورت میں صلاحیت رکھتا ہے اس لئے اس کو ربوبیت کی سند دے دی گئی اور اگر کہیں سے خوف محسوس ہوا مثلاً سیلاب کی صورت میں تباہی پھیلانے والا پانی' کشتیوں کا راستہ روکنے والی چٹانیں' ڈسنے والے ناگ' تختِ اقتدار پر مسند نشیں فرعون اور نمرود' فضاء میں کڑکنے والی

Marfat.com

بجلیاں اور بادل' مظاہرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت اور ایسی تمام زمینی اور آسمانی قوتیں جو انسان کے لئے خوف اور دہشت کا سبب بن سکتی تھیں ان سب کو ربوبیت کی مسند پر فائز کر دیا گیا۔

امتِ مسلمہ جو قیامت تک کے لئے اس عہد کی مناد اور مبلغ بنا کر اٹھائی گئی ہے خود اس کا حال دیکھئے کہ پورے عالمِ اسلام میں ایک ملک بھی ایسا نہیں جسے اللہ کی ربوبیت یعنی اس کی حاکمیتِ مطلقہ کا عملی طور پر اعتراف ہو ہر جگہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں میں عبادات کا عمل جاری رہے' اخلاقیات زندہ رہیں' انفرادی سطح پر نیکی سے وابستگی باقی رہے تو اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بس یہی کچھ کافی ہے کوئی ضروری نہیں کہ ملک میں اسلامی قانون بھی نافذ ہو بلکہ مسلمانوں میں ایک ایسی معقول تعداد بھی موجود ہے جو سرے سے اسلامی قانون کے وجود ہی کی منکر ہے، حالانکہ اگر اسلامی قانون کے وجود سے انکار کر دیا جائے تو اس سے آپ سے آپ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کا اجتماعیت سے کوئی رشتہ نہیں ہم انفرادی زندگی میں مسلمان ہیں اور ہمیں اسلام کی انفرادی زندگی کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے رہے اجتماعی ادارے تو ان کے لئے ہمیں اللہ نے آزاد چھوڑا ہے انہیں اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح بھی چلایا جائے اس کا اسلام سے یا اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں یہی وہ گمراہی ہے جس کے ازالے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسانی کے آغاز میں یہ عہد لیا تھا اور قرآن کریم میں وضاحت کے ساتھ اس کی یاددہانی کرائی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ عہد کہاں لیا گیا تھا اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ حضرت عبداللہ ابن عباس ؓ کے حوالے سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ عہد حضرت آدم کے زمین پر بھیجنے کے بعد عرفات میں لیا گیا تھا لیکن بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ تخلیقِ آدم کے موقع پر پیش آیا اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے حضرت آدم کو سجدہ کرایا گیا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا اسی طرح پوری نسلِ آدم کو بھی جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔ حضرت ابی ابن کعب ؓ نے غالباً نبی کریم ﷺ سے استفادہ کر کے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس مضمون کی بہترین شرح ہے وہ فرماتے ہیں۔

> ''اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور (ایک ایک قسم یا ایک ایک دور کے) لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مرتب کر کے انہیں انسانی صورت اور گویائی کی طاقت عطا کی، پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انہیں جب اپنے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے عرض کیا ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ ٹھہراتا ہوں تا کہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا۔ میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جو کہ تم کو یہ عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو، یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے، آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں، آپ کے سوا کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود۔''

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ازلی میثاق فی الوقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعور اور حافظہ میں موجود ہے اور کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغازِ آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے یہ عہد لیا گیا تھا اور اگر کسی کو یاد نہیں تو پھر یہ عہد ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف باتیں کہی جا سکتی ہیں جن کا تعلق خارجی شواہد سے بھی ہے اور انسان کے اندر دبے ہوئے

Marfat.com

احساس سے بھی۔ جہاں تک خارجی شواہد کا تعلق ہے اس سلسلے میں گذارش یہ ہے کہ خود انسانوں میں بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جنہوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہمیں یہ عہد پوری طرح یاد ہے، حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ یہ عہد و میثاق مجھے ایسا یاد ہے گویا اس وقت سن رہا ہوں اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس میں کون کون لوگ موجود تھے، ہاں یہ ظاہر ہے کہ ایسے افراد شاذ و نادر کے درجہ میں ہیں، اس لئے عام لوگوں کے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو بالخاصہ اثر رکھتے ہیں، چاہے وہ کام کسی کو یاد رہے یا نہ رہے بلکہ اس کی خبر بھی نہ ہو مگر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں، یہ عہد و اقرار بھی ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ دراصل اس اقرار نے ہر انسان کے دل میں معرفتِ حق کا ایک بیج ڈال دیا جو پرورش پا رہا ہے چاہے اس کو خبر ہو یا نہ ہو، اور اسی بیج کے پھل پھول ہیں کہ ہر انسان کی فطرت میں حق تعالیٰ کی محبت و عظمت پائی جاتی ہے خواہ اس کا ظہور بت پرستی اور مخلوق پرستی کے کسی غلط پیرایہ میں ہو، وہ چند بدنصیب لوگ جن کی فطرت ہی مسخ ہو کر ان کا عقلی ذائقہ خراب ہو گیا اور میٹھے کڑوے کی پہچان جاتی رہی ان کے علاوہ باقی ساری دنیا کے اربوں انسان اللہ تعالیٰ کی دھن اور خیال اور عظمت سے خالی نہیں، چاہے مادی خواہشات میں مبتلا ہو کر یا کسی گمراہ سوسائٹی میں پڑ کر وہ اس کو بھلا دیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ وفی بعض الروایات عَلٰى هٰذِهِ الْمِلَّةِ (اخرجه البخاری و مسلم)

ہر پیدا ہونے والا دین فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو دوسرے خیالات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو حنیف یعنی ایک خدا کا ماننے والا پیدا کیا ہے پھر شیاطین ان کے پیچھے لگ گئے اور ان کو اس صحیح راستہ سے دور لے گئے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنے سارے بگاڑ کے باوجود جب کبھی حالات کی گرفت میں آتا ہے اور اس کے مزعومہ سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگتے ہیں تو پھر آخر ایک وقت آتا ہے کہ وہ تنہائی میں اس ان دیکھی ذات کو پکارتا ہے جسے اس کی عقل و دانش نے آج تک قبول کرنے سے انکار کیا تھا چونکہ اس کی عقل پر آج تک خواہشات' مفادات' وضعی علوم اور جدید فلسفوں کے پردے پڑے ہوئے تھے جس نے اس کی فطرت کو دبا رکھا تھا جیسے ہی تندیِ حالات کا ایک تیز جھونکا ان پردوں کو اٹھا کر دور پھینکتا ہے اور اس کی اصلی فطرت کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کے تحت الشعور میں دبا ہوا اللہ کا تصور ابھر کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور یہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے اگر تھوڑا سا بھی تامل کیا جائے تو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ اسی عہد الست کی صدائے بازگشت ہے۔

اس کا ایک جواب صاحب تفہیم القرآن نے نہایت بصیرت سے دیا ہے ہم فائدے کے لئے اس کو نقل کر رہے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں کہ

اگر اس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کو دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہو جاتا کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمائش و امتحان کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہ جاتے۔ لہٰذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا لیکن وہ تحت الشعور (Sub-conscious mind) اور وجدان (Intuition) میں یقیناً محفوظ ہے۔ اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری اور وجدانی علوم کا حال ہے۔ تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بالقوۃ (Potentially) موجود تھا۔ خارجہ محرکات اور داخلی تحریکات نے مل جل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوۃ تھا اسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر اور کوئی داخلی تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی جو اس کے اندر بالقوۃ موجود

Marfat.com

نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کرسکتی۔ اور اسی طرح یہ سب موثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کردیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ان چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بالقوۃ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کردیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کرسکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصل فطرت سے منحرف (Pervert) کردیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تمسیخات کے باوجود اندر موجود رہے گی ظہور میں آنے کے لئے زور لگاتی رہے گی اور خارجہ اپیل کا جواب دینے کے لئے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے۔

وہ سب ہمارے اندر بالقوۃ موجود ہیں اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت ان چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان سب کے ظہور میں آنے کے لئے خارجی تذکیر (یاددہانی) تعلیم، تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوۃ موجودات کی طرف سے ملتا ہے۔

ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر پردہ ڈال کر، منحرف اور مسخ کرکے کالعدم کرسکتی ہیں بالکل معدوم نہیں کرسکتیں اور اسی لئے اندرونی احساس اور بیرونی سعی دونوں سے اصلاح اور تبدیلی (Conversion) ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت اور خالقِ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے۔

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دور میں، زمین کے ہر خطہ میں، ہر بستی، ہر پشت اور ہر نسل میں ابھرتا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کردینے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔ اس کے مطابقِ حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ ابھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کارفرما ہوا ہے اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو ابھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لئے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے' چنانچہ انبیاء علیہم السلام اور کتبِ آسمانی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیانِ حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ اسی لئے ان کو قرآن میں مذکر (یاددلانے والے) ذکر (یاد) تذکرہ (یادداشت) اور ان کے کام کو تذکیر (یاددہانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء اور کتابیں اور داعیانِ حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اسی چیز کو ابھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔

نفسِ انسانی کی طرف سے ہر زمانہ میں اس تذکیر کا جواب بصورت لبیک ملنا اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ اندر فی الواقع کوئی علم چھپا ہوا تھا جو اپنے پکارنے والے کی آواز پہچان کر جواب دینے کیلئے ابھر آیا۔

پھر اسے جہالت اور جاہلیت اور خواہشاتِ نفس اور تعصبات اور شیاطین جن وانس کی گمراہ کن تعلیمات و ترغیبات نے ہمیشہ دبانے اور چھپانے اور منحرف اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں شرک، دہریت، الحاد، زندقہ اور اخلاقی و عملی فساد رونما ہوتا ہے۔ لیکن ضلالت کی ان ساری طاقتوں کے متحدہ عمل کے باوجود اس علم کا پیدائشی نقش انسان کی لوحِ دل پر کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے اور اسی لئے تذکیر و تجدید کی کوششیں اسے ابھارنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔

Marfat.com

بلا شبہ دنیا کی موجودہ زندگی میں جو لوگ حق اور حقیقت کے انکار پر مصر ہیں وہ اپنی حجت بازیوں سے اس پیدائشی نقش کے وجود کا انکار کر سکتے ہیں یا کم از کم اسے مشتبہ ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن جس روز یوم الحساب برپا ہوگا اس روز ان کا خالق ان کے شعور و حافظہ میں روزِ ازل کے اس اجتماع کی یاد تازہ کر دے گا جب کہ انہوں نے اس کو اپنا واحد معبود اور واحد رب تسلیم کیا تھا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت بھی ان کے اپنے نفس ہی سے فراہم کر دے گا کہ اس میثاق کا نقش ان کے نفس میں برابر موجود رہا اور یہ بھی وہ ان کی اپنی زندگی ہی کے ریکارڈ سے علی رؤس الاشہاد دکھا دے گا کہ انہوں نے کس کس طرح اس نقش کو دبایا، کب کب اور کن کن مواقع پر ان کے قلب سے تصدیق کی آوازیں اٹھیں، اپنی اور اپنے گردوپیش کی گمراہیوں پر ان کے وجدان نے کہاں کہاں اور کس کس وقت صدائے انکار بلند کی، داعیانِ حق کی دعوت کا جواب دینے کے لئے ان کے اندر چھپا ہوا علم کتنی کتنی مرتبہ اور کس کس جگہ ابھرنے پر آمادہ ہوا اور پھر وہ اپنے تعصبات اور اپنی خواہشات نفس کی بناء پر کیسے کیسے حیلوں بہانوں سے اس کو فریب دیتے اور خاموش کر دیتے رہے۔ وہ وقت جب کہ یہ سارے راز فاش ہوں گے حجت بازیوں کا نہ ہوگا بلکہ صاف صاف اقرارِ جرم کا ہوگا۔ اسی لئے قرآن مجید کہتا ہے کہ اس وقت مجرمین یہ نہیں کہیں گے کہ ہم جاہل تھے یا غافل تھے بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم کافر تھے، یعنی ہم نے جان بوجھ کر حق کا انکار کیا۔

وَشَهِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (الانعام، ۱۳۰)

عہد لینے کے اسباب:

اس آیتِ کریمہ کے آخر میں اور اس کی بعد کی آیت میں اس عہد لینے کے اسباب بیان فرمائے گئے ہیں۔ پہلا سبب یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ ہم نے نوع انسانی سے یہ عہد اس لئے لیا تا کہ وہ قیامت کے دن یہ عذر نہ کر سکیں کہ آپ ہم سے توحید اور بدیہیاتِ فطرت کا سوال کر رہے ہیں، ہمیں تو دنیا میں اس کے بارے میں کوئی علم نہیں دیا گیا تو ہم اپنی بے خبری کے باعث توحید کو ماننے اور فطرت کے تقاضوں کا جواب دینے سے معذور تھے اگر ہمیں اس سے آگاہی بخشی جاتی تو ہم ضرور اس کا اقرار کرتے تو آج ہمیں ایک ایسی بات میں ماخوذ کیوں کیا جا رہا ہے جس کا ہمیں علم نہیں دیا گیا اس کے جواب میں ان سے کہا جائے گا کہ ہم نے تمہاری تخلیق سے پہلے تمہارے جدِ امجد کی تخلیق کے وقت تمہیں اپنے سامنے حاضر کر کے اور تمہیں شعور اور جسم دے کر یہ عہد تم سے لیا تھا تو اس عہد کی وجہ سے آج تم سے یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ تم نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیوں نہ کیا اور کیوں اس سے بار بار انکار کرتے رہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسانوں کے کسی گروہ کے پاس اللہ کے نبیوں کی دعوت نہیں پہنچی تو وہ محض اس عہدِ الست کے باعث اللہ کی توحید اور بدیہیاتِ فطرت پر ایمان لانے کے پابند ہیں ان سے باقی عقائد اور اعمال کے بارے میں تو کوئی سوال نہیں ہوگا لیکن اس کا مواخذہ ان سے ضرور ہوگا کیونکہ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا ہے کہ اللہ نے انسانوں سے اپنی ربوبیت کا جو عہد لیا تھا وہ انسان کے تحت الشعور میں زندہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی کھلی آنکھوں سے کائنات کی نشانیوں کو دیکھنے کی کوشش کرے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ یہ عہدِ الست ہم نے تم سے اس لئے لیا ہے تا کہ قیامت کے دن تم اپنے آباؤ اجداد کے شرک کو عذر نہ بنا سکو یعنی تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد چونکہ شرک میں مبتلا تھے اور ہم ان کے گھر میں پیدا ہوئے ان کی تربیت اور گھر کے ماحول کے باعث ہم اسی شرک میں مبتلا ہوئے جس کو ہم نے اپنے گھر میں اور گھر سے باہر محسوس کیا جس بات کا ہم سے سوال کیا جا رہا ہے اس کا تو دور دور کہیں نشان

Marfat.com

نظر نہ آیا تو ہم اس کا اقرار کیسے کر سکتے تھے۔ اگر اس جرم کی کوئی سزا ہے تو اس کے مستحق وہ لوگ ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد یا ہم سے پہلے گزرے ہیں ہمیں تو کسی صورت میں اس میں ماخوذ نہیں کرنا چاہیے پروردگار انہیں بھی اسی عہد کی یاد دلا کر ان سے مواخذہ کرے گا کیونکہ جو چیزیں انسان کی فطرت میں داخل یا اس کے تحت الشعور میں موجود ہیں انہیں شعور میں لانا یہ انسان کی بہر حال ذمہ داری ہے انسان اگر اپنے گھر والوں کو جاہل دیکھتا ہے تو اس کے لئے جاہل رہنے کا جواز پیدا نہیں ہو جاتا وہ گھر میں غربت کے ڈیرے دیکھتا ہے تو وہ کبھی اس غربت پر قانع ہو کر نہیں بیٹھتا بلکہ غربت کو امارت میں بدلنے کے لئے ہر ممکن جدو جہد کرتا ہے۔ کیونکہ بہتری اور خیر کی تلاش اور تبدیلی کی خواہش انسان کی فطرت اور تحت الشعور میں موجود ہے اور ہم ہمیشہ اس کے مطابق لوگوں کو محنت کرتا ہوا دیکھتے ہیں اور کبھی کسی سے یہ عذر نہیں سنتے کہ میں اپنے گھر کی حالت کو کیوں بدلوں کیونکہ میں نے اپنے گھر کو ایسا ہی پایا ہے لیکن دینی احساسات کے بارے میں نہ جانے اس گمراہی کو سندِ جواز کیسے دی جاتی ہے اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن یہ عذر قبول نہیں کیا جائے گا البتہ اس کی بعد کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک احسان کا ذکر فرمایا ہے کہ قیامت کے دن اگرچہ یہ عہد الست ہر انسان کی جواب طلبی کے لئے کافی ہے لیکن یہ مزید اللہ کا احسان ہے کہ اس نے اس عہد کی یاددہانی کے لئے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا ان پر اپنی کتابیں اتاریں اور پھر اپنی نشانیوں (آیات) کو کھول کھول کر پوری تفصیل سے بیان کیا تا کہ کوئی شخص اگر ایسا ہی گیا گزرا ہے کہ اس کے اندر کے احساسات کبھی خیر کی طرف سفر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اس نے پوری طرح اپنے اندر کی دنیا کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے تو اس کی بھلائی اور خیر خواہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجے تا کہ وہ اس کے دبے ہوئے احساسات کو ابھارنے کی کوشش کریں اور اسے اس عہد کی یاد دلائیں جسے وہ بالکل فراموش کر چکا ہے ممکن ہے اس اتمامِ حجت کے بعد اسے اللہ کی طرف لوٹنے کی ہمت پیدا ہو اور اس طرح سے وہ اپنی دنیا اور عاقبت کو بنانے میں کامیاب ہو جائے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں بھی قریش ہی مخاطب ہیں سابقہ آیات میں انہیں عہدِ فطرت یاد دلایا گیا ہے اور اب انہیں مثال دے کر سمجھایا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اس عہدِ فطرت کی روشنی میں اللہ کے نبی کی دعوت کو قبول کر کے اپنی حالت نہ بدلی تو تمہارا انجام وہی ہوگا جس کا اس مثال میں ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اس مثال کے ضمن میں ان اسباب کو بھی ذکر کر دیا گیا ہے جو افراد یا اقوام کے بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ O وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ ج فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ج اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ط ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ج فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ O

"اے پیغمبر! ان کے سامنے اس شخص کی سرگزشت بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات عنایت کیں تو وہ ان سے نکل بھاگا آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا بالآخر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہشوں کا پیرو بنا رہا تو اس کی مثال کتے کی مثال ہے اگر تم اس کو دھتکارو تب بھی زبان لٹکائے رکھتا ہے یا چھوڑ دو تب بھی زبان نکالے رکھتا ہے یہی مثال اس قوم کی ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو تا کہ وہ غور کریں"۔ 175-176

Marfat.com

عہدِ الست سے منہ پھیرنے والے فرد یا قوم کی تمثیل اور اس کے نمایاں خدوخال:

اس آیت کریمہ میں چونکہ الذی کا لفظ آیا ہے جو معرفہ کے لئے آتا ہے اس لئے اس سے دو خیال وجود میں آئے ایک تو یہ کہ یہ مثال کسی متعین شخص کی مثال ہے اس لئے الذی کے ساتھ اس کا ذکر کیا جارہا ہے لیکن یہ اللہ اور اس کے رسول کی انتہائی اخلاقی بلندی ہے کہ اس کا نام لینا پسند نہیں فرمایا قرآنِ کریم تو کلام اللہ ہونے کی وجہ سے ہر لحاظ سے معیار سے بھی برتر کلام ہے اس لئے اگر اس میں کسی برے شخص کی مثال بیان کی گئی ہے تو اس کا نام ذکر کرنے سے اجتناب کرنا یقیناً اس کلام کی بلندی کا تقاضا ہے لیکن ہم رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو جب پڑھتے ہیں تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول بھی ہمیشہ اسی بلندی سے گفتگو فرماتے ہیں جب بھی کسی برائی پر تنقید کرنا مقصود ہوتا ہے تو آپ برائی کو تنقید کا ہدف بناتے تھے برائی کرنے والے کا کبھی ذکر نہیں فرماتے تھے بلکہ ہمیشہ آپ ﷺ کا انداز یہ ہوتا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ایسی ایسی برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اسی بلند اخلاقی کا لحاظ فرماتے ہوئے یہاں اس شخص کا نام نہیں لیا گیا اور کسی صحیح حدیث میں بھی ہمیں اس کا تذکرہ نہیں ملتا البتہ! مفسرین نے شائد بعض اسرائیلی روایات کے حوالے سے بعض اشخاص پر اس مثال کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں مختلف نام لئے گئے ہیں۔ کوئی بلعم بن باعور کا نام لیتا ہے "کوئی امیہ ابن ابی الصلت، اور کوئی صیفی ابن الرھب کا لیکن یقینی طور پر یہ کہنا کہ ان میں سے کون سا شخص مراد ہے یہ بہت مشکل ہے کیونکہ ہمیں قرآن وسنت میں ایسے کسی شخص کا نام نہیں ملتا اور نام میں رکھا بھی کیا ہے مقصود تو اس گمراہی کی طرف توجہ دلانا ہے جس کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ الذی اگرچہ معرفہ ہے لیکن تمثیلات میں ضروری نہیں کہ الذی سے اس کا ذکر کیا جائے اس سے کوئی معین شخص ہی مراد ہو بس اس اسلوبِ کلام سے متکلم کی غرض یہ ہوتی ہے کہ تمثیل میں جس گمراہی کا ذکر کیا جارہا ہے اس کو سہولتِ فہم کے لئے ایک ایسے سراپا کی صورت میں پیش کیا جائے جسے پڑھنے والا یوں محسوس کرے کہ میں اس برائی کو اپنی آنکھوں سے مجسم شکل میں دیکھ رہا ہوں اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ برائی پوری طرح سامع کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے اور اس طرح اسے اس گمراہی کو سمجھنا اور اس سے اجتناب کرنا آسان ہو جاتا ہے اسی غرض سے اس آیت کریمہ میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے مقصود اس سے کوئی متعین شخص نہیں بلکہ قوم بنی اسرائیل مراد ہے لیکن انہیں ایک متعین شخص کی صورت میں اس لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ ان کا بگاڑ اس حال کو پہنچ گیا تھا کہ ان کا ایک ایک فرد اس برائی کی سرتاپا تصویر بن گیا تھا۔ ان دونوں تصورات میں مآل اور انجام کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں مقصود دونوں کا ایک ہے کیونکہ اس مثال دینے سے قریشِ مکہ کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جب قومیں بگڑتی ہیں تو ان کے بگاڑ کی بڑی بڑی علامتیں یہ ہوتی ہیں اور پھر جب یہ بگاڑ بڑھ جاتا ہے تو ان کا ایک ایک فرد برائی کی تصویر بن جاتا ہے تم بھی اگر اپنے موجودہ رویے سے تائب ہوئے تو رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے تم عرصۂ محشر میں پہنچ گئے ہو اب تمہاری قسمت میزان میں ہے اگر تم نے اس دعوت کو قبول کیا تو دنیا اور آخرت کی سرافرازیاں تمہارا مقدر بن جائیں گی' لیکن اگر تم نے اس سے روگردانی کی اور اپنے موجودہ رویے پر قائم رہے تو پھر تمہارا انجام وہی ہوگا جس کا اس تمثیل میں ذکر کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ تمثیل کیا ہے جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے وہ تمثیل یہ ہے کہ آپ تصور میں ایک شخص کو لایئے جو زندگی کے سفر پر رواں دواں ہے، اسے اس سفر کے دوران معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ زندگی امانت ہے تو کس کی؟ زندگی کے اس سفر کی منزل کیا ہے؟ اور سمتِ سفر کیا ہونی چاہیے؟ اس راستے کے سنگہائے میل کیا ہیں؟ آدابِ سفر کیا ہونے چاہیں؟ اس سفر کا انجام کیا ہوگا؟ راستے میں آنے والی مشکلات سے کس طرح عہدہ برآ ہونا ہوگا؟ اگر ہمت جواب دینے لگے تو توفیق کس سے مانگنی ہوگی؟ خواہشاتِ نفس بہکانے لگیں تو صبر کی زنجیر کیسے پہنی

Marfat.com

گی؟ نفسانی آلودگیاں اگر راستہ گم کرنے لگیں تو روشنی کہاں سے حاصل کرنا ہوگی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن سے اس مسافر کو سابقہ درپیش ہے اور ان باتوں کا جواب درحقیقت اس کا رختِ سفر ہے اسی رختِ سفر کو اس آیتِ کریمہ میں آیات کے علم کا نام دیا گیا ہے کہ اس مسافر نے جب راستہ چلنا چاہا تو ہم نے راستے میں پیش آنے والی تمام ضروریات اور مشکلات کے حوالے سے اسے علم سے نوازا اور ایک ایک بات اس کے سامنے واضح کر دی تا کہ راستے میں وہ کسی الجھاؤ کا شکار نہ ہو لیکن وہ راستے کی مشکلات اور نفسانی خواہشات کی یلغار سے ہراساں ہو کر اللہ کے دیئے ہوئے علم کی پابندیوں سے نکل بھاگا اس نے جب دیکھا کہ انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی کرنا ایک گھاٹی چڑھنے کے مترادف ہے اس نے نفس کی سہولت کے لئے اس راستے پر چلنے سے انکار کر دیا پھر اس طرح اس سے نکل بھاگا جس طرح ایک کپڑے پہنا ہوا آدمی کپڑے اتار کر دیوانوں کی طرح بھاگ کھڑا ہوتا ہے اس آیت کریمہ میں فانسلخ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی کپڑے اتار کر نکل بھاگنا ہوتا ہے چنانچہ جیسے ہی اس نے سمتِ سفر بدلی اور غلط راستے کی طرف مڑا تو شیطان جو اس کے ساتھ ساتھ تعاقب میں تھا اور وہ برابر کوشش میں لگا ہوا تھا کہ مجھے موقع ملے تو میں اسے گمراہ کروں تو اللہ کے قانون کے مطابق اس کو وار کرنے کا موقع مل گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے۔

من یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطاناً فھو له قرین

جو خدائے رحمٰن کی یاد دہانی سے منہ پھیرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

اسی قانون کے تحت وہ شیطان کی گرفت میں آ گیا اب شیطان نے مسلسل اس کو اپنے راستے پر چلانا شروع کیا اس نے اللہ کے احکام سے آزاد ہو کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن شیطان نے آہستہ آہستہ اسے گمراہی کی آخری منزل تک پہنچا کر چھوڑا اب اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مقاصد اور اہداف یکسر بدل گئے۔ آیاتِ خداوندی نے اسے بلندیوں اور رفعتوں کا راستہ دکھایا تھا جس میں قدم قدم پر مشکلات ضرور تھیں لیکن اللہ کی رحمتوں کے سائے اور آسودگی کی جنتیں بھی ساتھ ساتھ چلتی تھیں لیکن اس نے ان بلندیوں سے منہ پھیر کر اپنے آپ کو پستیوں کا مسافر بنا لیا۔ بلند پروازیوں کی بجائے خاک بازی اس کا منتہائے مقصود بن گئی' وہ بجائے اوپر اٹھنے کے زمین ہی کی طرف جھکتا چلا گیا اب اس کے سامنے ہوائے نفس کی پیروی کے سوا کوئی راستہ نہ تھا دنیا کی حرص و طمع اس کے ارادوں پر غالب آ گئی اب شب و روز اس کی سوچ کا محور یہ تھا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ دنیا کس طرح سمیٹنی ہے۔ ہوسِ زر اور حرص و آز نے اسے ہر طرح کے اخلاق اور انسانی مکارم سے تہی دامن کر دیا دنیا طلبی کے لئے دوسروں کے گھروندے مسمار کر دیئے اپنے محلات اٹھانا اس کا دل پسند مشغلہ ٹھہرا۔ بڑی سے بڑی اخلاقی قدر کو بھی دولتِ دنیا کے حصول کے لئے ترک کر دینا اس کے لئے ایک معمول بن گیا' دنیا طلبی کے لئے اسے ہزار ذلتوں کا سامنا کرنا پڑے اسے اس سے دریغ نہ تھا اس کے لئے خونی رشتوں کی قربانی' وطن کی محبت سے دستبرداری' ملی تشخص کی بربادی' غرضیکہ کسی بھی بڑی سے بڑی انسانی قدر کی قربانی سے اسے انکار نہ تھا۔ اب اس کی مثال ایک کتے کی تھی جس کی ہر وقت لٹکی ہوئی زبان اور ٹپکتی ہوئی رال ایک نہ بجھنے والی آتشِ حرص اور کبھی بھی سیر نہ ہونے والی نیت کا پتہ دیتی ہے۔ آپ جب کبھی بھی اس کو چلتا دیکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ ہمیشہ زمین کو سونگھتا ہوا اور ہر پاک و ناپاک چیز کا اپنی ناک سے جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے' اس کی ناک زمین کو برابر سونگھنے میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بوئے طعام آ جائے۔ وہ ہمیشہ اپنی زبان نکالے رہتا ہے، اسے پیار کیجئے جب بھی اس کی یہی حالت رہے گی دھتکاریئے' جھڑک دیئے جب بھی اس کا یہی انداز رہے گا وہ بھوکا ہو جب بھی آپ اس کو اسی حالت میں پائیں گے' پیٹ بھر کر کھلا دیجئے جب بھی اسے اسی ہیئت میں دیکھیں گے بڑے لوگوں کے کتے مخملیں جھول' ریشمی پٹوں اور چاندی کے گھونگروؤں سے آراستہ ہوتے ہیں پیٹ بھر گوشت کھاتے اور دودھ پیتے ہیں لیکن کار کے اندر صاحب کی بغل میں بیٹھے ہوئے بھی زبان نکالے

Marfat.com

ہوئے رہیں گے اور پارک کے اندر سیر کرتے ہوئے بھی ان کی یہی کیفیت رہے گی۔ آپ کتے کو پتھر بھی ماریئے تو دوڑ کر پتھر کو بھی منہ سے پکڑ لے گا کہ شاید یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہو آپ اس سے منہ پھیر لیجئے یا اس کو جھڑک کر نکالنے کی کوشش کیجئے لیکن وہ لالچ کا مارا توقعات کی ایک دنیا دل میں لئے زبان لٹکائے ہانپتا کانپتا کھڑا ہی رہے گا۔ ساری دنیا کو بس پیٹ ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہیں کوئی بڑی سی لاش پڑی ہو جو کئی کتوں کے کھانے کو کافی ہو تو ایک کتا اس میں سے صرف اپنا حصہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ اسے صرف اپنے لئے ہی مخصوص رکھنا چاہے گا اور کسی دوسرے کتے کو اس کے پاس کھٹکنے نہ دے گا۔ بالکل یہی طور اطوار اس شخص کے ہو جاتے ہیں جو اللہ کی آیات سے نکل کر دنیا طلبی میں بڑھتا چلا جاتا ہے' وہ اگر ایک غریب آدمی ہے تو رات دن امارت کی تلاش میں ہے اور اگر امیر آدمی ہے تو ہر وقت امارت کو بڑھانے کی فکر میں ہے اسے عہدہ و منصب پر فائز کر دیجئے وہ ملک و ملت کا سودا کرنے سے بھی باز نہیں آئے گا۔ اگر کبھی اس کے جرائم کی پاداش میں اسے ذلت آمیز سزا بھی دے دی جائے تو جیسے ہی اس کی سزا ختم ہو گی وہ از سرِ نو کتے کی طرح زبان لٹکائے پھر دنیا کی طلب میں نکل کھڑا ہو گا یوں تو اس کی مثالیں آج بھی کم نہیں لیکن انگریز کی غلامی کے زمانے میں مسلمانوں کی پوری تاریخ پڑھ جایئے آپ کو قدم قدم پر اس کی مثالیں ملیں گیں۔ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی میں سب سے اہم رول اسی کتے کی خصلت یعنی دنیا کی ہوس نے انجام دیا۔ میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگ اسی دنیا طلبی نے پیدا کئے' جاگیرداروں کی ایک طویل فہرست اسی کی یادگار ہے۔ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں اس کی مثالیں بکثرت آپ کو ملیں گیں' حتی کہ بڑی بڑی مقدس مسندیں بھی اس سے بچی ہوئی دکھائی نہیں دیتیں۔ مسلمانوں نے معمولی فوائد کی خاطر کعبہ شریف پر گولیاں چلائیں' پردوں میں لپٹے ہوئے ترک سپاہیوں کو پکڑ کر ذبح کیا' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر فائرنگ کی' ہمارے بڑے بڑے لوگوں نے دنیوی مفادات کی خاطر ملک کی تاریخ کو غلامی کی لعنت سے داغدار کیا۔ چنانچہ ایک شخص کی صورت میں ننگِ انسانیت اس تمثیل کو پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ تمثیل دراصل بنی اسرائیل کی تمثیل ہے جو دنیا طلبی میں بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئے' کہ کتے کی طرح ان کی زندگی کا ہدف اور زندگی کی ترجیحات اور زندگی کے مقاصد اور زندگی کے مطلوبات دنیا طلبی میں ضم ہو کر رہ گئے۔ معالی امور کی طلب' کمالات کا حصول' روحانی زندگی کی تڑپ' کتاب اللہ کی بالادستی' دین کی اہمیت اور رضائے خداوندی کا حصول ان کے نزدیک خواب و خیال ہو کر رہ گیا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم جسے اللہ نے ساری قوموں پر فضیلت عطا فرمائی' وہ اللہ کی طرف سے پھٹکار اور غضب کا مورد ٹھہری اور دنیا کے لئے اسے عبرت بنا دیا گیا۔ اے مشرکینِ مکہ! تم بھی اسی راستے پر بڑھ رہے ہو تمہارے سامنے بھی دنیا طلبی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں تم دنیا کے لئے جیتے ہو اور دنیا کے لئے مرتے ہو اس کی خاطر تمہیں کچھ بھی کرنا پڑے تو تم اس سے دریغ نہیں کرتے لیکن آخرت کی طلب تمہارے لئے ایک افسانہ ہے اسی وجہ سے تم پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی بات سننے کے روادار نہیں۔

اگلی آیت کریمہ میں قریش کو مزید توجہ دلاتے ہوئے فرمایا

سَآءَ مَثَلَا نِالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ O مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ج وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ O

"کیا ہی بری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور خود اپنی جانوں پر ظلم کرتی رہی جسے اللہ ہدایت بخشے وہی ہدایت پانے والا بندہ ہے اور جنہیں وہ گمراہ کر دے وہی ہیں جو نامراد ہوتے ہیں"۔ 178-177

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مشرکین کیلئے تہدید و وعید:

مشرکینِ مکہ کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ جس قوم نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر اللہ کی آیات کی تعمیل سے نکل

Marfat.com

بھاگے اور اپنی خواہشات کے مطابق زندگی بسر کی ان کا انجام تم نے دیکھ لیا ہے کہ بالآخر اس زندگی تک پہنچے جس کو کتے کی زندگی کہا جاتا ہے کہ دنیا کی نگاہوں میں اور پروردگار کی نگاہوں میں بھی ذلیل سے ذلیل تر ہوتے گئے بار بار اللہ کے عذاب کے کوڑے برستے رہے اور دنیا کی طاقتور حکومتیں انہیں بار بار ادھیڑتی کھدیڑتی رہیں۔ بالآخر ملک ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا' حکومت چھین گئی' دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے لگے' قومی جمیعت تباہ ہوگئی' منتشر حالت میں مختلف ملکوں میں بکھر گئے لیکن کتے کی جو خصلت ان میں پیدا ہوگئی تھی اس میں کبھی کمی نہ آئی تاریخ کے ہر دور میں انہوں نے ہمیشہ دنیا کو اپنا معبود بنایا اور اس کی طلب میں دنیا سے چپٹے بھی رہے لیکن کبھی اپنا رویہ نہ بدلا بالکل کتوں کی طرح ہر وقت ان کی حرص و آز کی زبان لٹکتی رہی۔ مشرکینِ مکہ سے کہا جارہا ہے کہ اس قوم کا انجام اور ان کی بری مثال تمہارے سامنے ہے انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کر کے نہ جانے کیا سمجھا تھا لیکن انجام کار یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی ہی زندگی برباد کی اور اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہدایت کا رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے جو اس راستے کی طلب پیدا کرتا ہے اور اس کے لئے فکر مند ہوتا ہے تو اللہ اس کو ہدایت عطا فرماتے ہیں لیکن جو اس سے بے نیاز ہو کر دنیا کا کتا بن جاتا ہے تو پروردگار نہ صرف اس کو ہدایت سے محروم کر دیتا ہے بلکہ وہ ہر لحاظ سے دنیا میں نامراد زندگی گزارتا ہے اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے لئے تسلی بھی ہے اور قریشِ مکہ کے لئے تہدید و وعید بھی۔ آپ ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ یہ لوگ اگر ہدایت اختیار نہیں کر رہے تو آپ ﷺ ہرگز پریشان نہ ہوں کیونکہ ہدایت تو اسی کو ملتی ہے جو اس کا طلبگار ہوتا ہے اور اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کرتا ہے لیکن جو لوگ اپنی آنکھوں اور اپنے دل و دماغ پر خواہشات کی پٹی باندھ لیتے ہیں اللہ انہیں گمراہی کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں نامراد اور بدقسمت ہیں۔

گزشتہ بحث کا خلاصہ:

گزشتہ آیات میں بیان کردہ ارشادات پر اگر اجتماعی طور پر نظر ڈالی جائے تو جو صورت حال دکھائی دیتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے انسانی ہدایت کے لئے تخلیق آدم کے ساتھ ہی انسانوں سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا تھا اور پھر اسے ان کے تحت الشعور میں زندہ رکھا اور اس کی یاد دہانی کے لئے مختلف وقتوں میں انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے اور کتابیں نازل ہوتی رہیں جس سے نوع انسانی کو وہ حقیقی علم میسر آتا رہا جس سے وہ اپنی زندگی کے ہر بگاڑ کو درست کر سکتے تھے اور اپنی ہر تاریکی کو نور سے بدل سکتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بات بھی سمجھائی گئی کہ تمہاری زندگی کی راہنمائی کے لئے اصل ضرورت تو وہی علم الٰہی ہے جو تمہیں انبیاء اور کتابوں کی معرفت دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کو بھی یاد رکھو کہ صرف علم راہنمائی کے لئے کافی نہیں تاوقتیکہ اللہ کی توفیق بھی شاملِ حال نہ ہو تمہیں اگر ایک طرف علم کے حصول کے لئے مخلصانہ کوششیں کرنا ہیں تو ساتھ ہی اپنے اللہ سے ہمیشہ اس کی توفیق بھی مانگنی ہے اگر یہ دونوں باتیں تمہارے اندر جمع ہوں گی تو اللہ تعالیٰ تمہیں نہ صرف راہِ راست پر قائم رکھے گا بلکہ تمہاری دنیا بھی سنوارے گا اور آخرت میں بھی کامیابیاں عطا فرمائے گا لیکن اگر تم نے علم الٰہی سے منہ پھیر لیا تو تباہی سے بچنا ممکن نہیں رہے گا اور اگر علم سے تو بہرہ ور ہو گئے لیکن اللہ کی توفیق کے لئے اپنے اندر طلبِ صادق اور اخلاص پیدا نہ کیا تو یہ علم بجائے تمہیں منزل تک پہنچانے کے تمہاری منزل ہی بدل دے گا اور بجائے اللہ کے راستے کے مسافر بنانے کے تمہیں شیطان کے راستے کا مسافر بنا دے گا اور پھر اسے سمجھانے کے لئے شخصی مثال بھی دی اور قومی بھی تاکہ بات پوری طرح واضح ہو جائے اور ان مثالوں کے آئینے میں پوری طرح یہ بات مجسم شکل میں سامنے لا کر کھڑی کر دی گئی کہ دیکھو ہدایت و ضلالت کا اصل سر رشتہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جس میں ان دونوں صفات کو موجود پاتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے اور جس میں دونوں صفات یا دونوں میں سے ایک صفت کو مفقود پاتا ہے تو اس کو گمراہ کر دیتا ہے یعنی اس کو گمراہی کے راستے پر چلنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ اب اگلی آیت کریمہ میں اسی بات کو ایک مزید پیرائے میں بعض ضمنی سوالات

Marfat.com

کے ازالے کے ساتھ ساتھ واضح فرمایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ O

''ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں' ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں' ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں' یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں''۔ 179

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

یہ آیت اپنے اندر معنوی اعتبار سے بہت گہرائی رکھتی ہے اس لئے اسے گہرے تدبر اور بصیرت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آیت کے پہلے جملے میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے بہت سے لوگوں کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ ان کی پیدائش کا مقصد اگر جہنم میں بھیجنا ہے تو پھر ان سے ایمان یا عملِ صالح کی امید کیسے کی جا سکتی ہے؟ ایمان اور عملِ صالح تو اہلِ جنت کی صفات ہیں اور ان دونوں سے بہرہ ور لوگ جنت میں جائیں گے۔ جہنمی تو وہ لوگ ہوں گے جو ان دونوں صفات سے عاری اور بے بہرہ ہوں گے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں جہنم ہی میں بھیجنے کے لئے پیدا کیا ہے تو ان کے لئے انبیاء کی بعثت اور کتابوں کا نزول بھی بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا ہے اس لئے سب سے پہلے تو اس جملے پر غور کر لینا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اہلِ جہنم اور اہل جنت کو پیدا کس نے کیا ہے؟ تو اس میں تو دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ دونوں کا پیدا کرنے والا پروردگارِ عالم ہی ہے اس لئے اگر اس جملے میں اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ میں نے بہت سارے لوگوں کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اہلِ جہنم بھی یقیناً اسی کی مخلوق ہیں البتہ تعجب کا باعث یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ سمجھا جائے کہ اللہ کے پیدا کرنے کے سبب سے وہ جہنم میں جائیں گے تو اس آیت کا ہرگز مفہوم نہیں کیونکہ یہاں جہنم پر جو لام ہے وہ لام غایت کے لئے نہیں بلکہ عاقبت کے لئے ہے یعنی جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جہنم کے لئے پیدا نہیں کیا گیا پیدا تو ان کو ویسے ہی کیا گیا ہے جیسے باقی انسانوں اور جنوں کو کیا گیا ہے اور انہیں وہی خصوصیات عطا کی گئی ہیں جو باقی جنوں اور انسانوں کو دی گئی ہیں۔ البتہ! یہ وہ لوگ ہیں جو بالآخر اپنے کرتوتوں کے باعث انجام کار جہنم میں جائیں گے جس سے ایک بات یہ واضح ہوتی ہے کہ ہر چیز کا سررشتہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور دوسری یہ بات کہ ان کا جہنم میں جانا پیدائش کے اعتبار سے نہیں بلکہ زندگی کے طرزِ عمل کے انجام کے اعتبار سے ہے کیونکہ یہ اپنی طبعی' جبلی' فطری اور عقلی خصوصیات میں بالکل ویسے ہی ہیں جیسے باقی انسان ہیں۔ اس بات کا ذکر اگلے جملے میں کیا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے باقی انسانوں کو دل و دماغ' عقل و حواس دے کر پیدا کیا ہے اور جن کے صحیح استعمال سے وہ اپنی صحیح منزل تک پہنچیں گے وہی ساری نعمتیں ان کو بھی عطا کی گئی ہیں انہیں مشاہدات کی قوت بھی دی گئی ہے' سمعی ذرائع بھی بخشے گئے ہیں اور دل و دماغ کی قوتوں سے بھی نوازا گیا ہے لیکن ان کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ اپنی نگاہوں سے کام لیا جیسا لینا چاہیے تھا' نہ اپنی قوت سامع سے کام لیا جیسا اس کا حق تھا اور نہ اپنے دل و دماغ کی قوتوں کو استعمال کیا جس طرح انہیں استعمال کرنا چاہیے تھا نتیجہ واضح ہے کہ کسی شخص کو بہتر سے بہتر اسباب دے دیئے جائیں لیکن وہ انہیں استعمال نہ کرے تو اسے ناکامی کے سوا

Marfat.com

اور کچھ نہیں مل سکتا۔ ایک مسافر کو سواری کی ضرورت ہوتی ہے، آپ اسے ایک تیز رفتار گاڑی دے دیں لیکن اسے پیدل چلنے پر اصرار ہو تو آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی دور کی منزل کو کیسے پا سکتا ہے۔ پیدل چلنے والے سے بھی کبھی نہ کبھی منزل کے حصول کا گمان ہو سکتا ہے، لیکن جو سرے سے گھر بیٹھ رہے نہ پاؤں کو حرکت دے اور نہ گاڑی کو باہر نکلنے دے، اس کے بارے میں تو کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ان لوگوں کے بارے میں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ انہیں ہم نے حواس اور عقل کے حوالے سے وہ سب کچھ عطا کیا جس کی انسانی زندگی میں ضرورت ہے لیکن انہوں نے اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں سے یا تو کام لینے سے انکار کر دیا اور اگر ان سے کوئی کام لیا بھی تو وہ کام لیا جس کے لئے انہیں پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ اللہ نے انہیں آنکھیں عطا فرمائیں، ان کے سامنے سورج چمکتا رہا' چاند دمکتا رہا' ستارے ٹمٹماتے رہے' صبح حسن کی پیغامبر بن کر طلوع ہوتی رہی' شام پردۂ شب میں محجوب ہوتی رہی' رنگ و روپ کا سیلاب اپنی طرف متوجہ کرتا رہا' قوسِ قزح آنکھ مچولیاں کرتی رہی' پھول کھلتے رہے، کلیاں چٹکتی رہیں' زمین سبزے کے مخملیں لباس میں ملبوس ہوتی رہی' فصلیں نقرئی لباس پہنتی رہیں' گھٹائیں جھوم جھوم کر اٹھتی رہیں' بہار کے موسم میں ہوائیں اٹھکیلیاں کرتی رہیں' چشمے ابلتے رہے' آبشاریں گرتی رہیں، مختصر یہ کہ صوت و معنی کا ایک سیل اُمڈتا رہا لیکن انسان کی نگاہوں نے اس کائناتِ حسن کے پیچھے جھانکنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ اس نے گلاب کے پھول سے زیادہ سے زیادہ یہ تو جانا کہ اس سے گلقند بنائی جا سکتی ہے لیکن یہ کبھی غور نہ کیا کہ اگر اس سے صرف گلقند ہی بنانا ہوتی اور اس کی تخلیق کا صرف یہی مقصد ہوتا تو پھر پھول کی پتیوں پر باریک خطوط کھینچنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے ریشم سے زیادہ ملائم بنانے اور خوبصورت روپ دینے کی حاجت کیا تھی؟ کہیں اس سے یہ مقصود تو نہ تھا کہ پھول کی ایک ایک پتی سے اس کے خالق کے حسن کا نظارہ کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن انسان کی بے بصیرتی ملاحظہ ہو کہ اس کی آنکھوں نے ظاہر کا نظارہ ضرور کیا اور اس سے محظوظ بھی ہوا لیکن یہ جاننے کی کبھی کوشش نہ کی کہ پسِ آئینہ کیا ہے اسی طرح اللہ نے اسے قوتِ سماعت عطا فرمائی۔ اس نے فضاء میں رنگ کے ساتھ ساتھ آہنگ کا بھی ایک جہان آباد دیکھا اس نے انسانی گلے میں لحنِ داؤدی کے کرشمے دیکھے اس نے انسانی گلے سے نفرت و محبت کے نغمے پھوٹتے سنے اس نے جلال و جمال کے نظارے محسوس کیے' اس نے پرندوں کے زمزموں اور نغموں کے شور میں ابلتی ہوئی موسیقی سنی لیکن اس نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہ کی کہ ان نغموں' ان زمزموں اور موسیقی کے ان سازوں کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ اگر وہ اپنی قوتِ سماعت کو حقیقی طور پر استعمال کرتا تو اسے ایک ایک آواز کے ساتھ پیدا کرنے والے کی آواز بھی سنائی دیتی لیکن اس کی قوتِ سماعت نے وہ کبھی حقیقی کام نہ کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔

ٹالسٹائی روس کا ایک مشہور ادیب گزرا ہے عیسائی تھا پھر خدا کا انکار کر بیٹھا اور کمیونسٹ ہو گیا اپنی مشہور کتاب (اے کنفشن) میں لکھتا ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک شام میں ٹہلتا ہوا جنگل میں نکل گیا، سورج غروب ہونے کے قریب تھا، پرندے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے' سورج کی کرنیں چھن چھن کر درختوں سے نیچے اتر رہی تھیں' پرندوں کے نغموں' چہچہوں اور زمزموں نے موسیقی کا ایک جہان آباد کر دیا تھا۔ میں اس ترنم میں ایسا ڈوبا کہ اپنی ذات سے نکل کر کائنات کی وسعتوں سے نکلتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں سے یہ حسن پھوٹتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اندر سے مجھے آواز سنائی دی کہ تم جو خدا کا انکار کر رہے ہو اگر واقعی کوئی خدا نہیں تو بتاؤ یہ رنگ و نور اور یہ موسیقی کا جہاں کس نے پیدا کیا ہے؟ کہتا ہے کہ جیسے جیسے میں اس پر سوچتا گیا ویسے ویسے میرے دل کی سیاہی دور ہوتی گئی بالآخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ واقعی اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا بھی ہے اور اسی نے مجھے بھی پیدا کیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری نعمتیں اور یہ ساری صلاحیتیں عطا فرمائیں جن سے انہوں نے کبھی کام نہیں

Marfat.com

لیا اگر یہ ان سے کام لیتے تو یقیناً ٹالسٹائی کی طرح یہ بھی کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے تھے لیکن انہوں نے آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اللہ کی نعمتوں کو نہ دیکھا اور کان ہوتے ہوئے بھی اللہ کے پیغمبر کی آواز کو نہ سنا اور دل و دماغ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے کبھی سوچنے سمجھنے کی زحمت نہ کی کہ جس طرح یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوسکتی یقیناً اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا ہے۔ قرآن کریم نے ایک سے زیادہ جگہ اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ لوگ کسی نہ کسی حد تک اس بات کے قائل تو ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے لیکن وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ تم مکان رہنے کے لئے بناتے ہو' زمین کی کاشت غلہ حاصل کرنے کے لئے کرتے ہو' تجارت کی مشقتیں معاش پیدا کرنے کے لئے برداشت کرتے ہو' شادی بیاہ بچے پیدا کرنے کے لئے کرتے ہو یعنی تمہارے ہر کام کا اور تمہاری ہر محنت کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے لیکن اس بات کی طرف تم کبھی دھیان نہیں دیتے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی کائنات اور بطور خاص انسان کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا ہے اور پھر اس کا اگر کوئی مقصد ہے اور یقیناً ہے تو کیا اس کا پیدا کرنے والا اور اسے مقصد دینے والا کبھی اس سے جواب طلبی نہیں کرے گا۔ ارشاد فرمایا:

افحسبتم انما خلقنکم عبثاً وانکم الینا لا ترجعون

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور تم (جواب دہی) کے لئے ہمارے پاس لوٹائے نہیں جاؤ گے۔

حقیقت یہ ہے جسے اس آیت میں واشگاف کیا جارہا ہے کہ انسان اپنے حواس سے بھی کام لیتا ہے اور اپنی عقل سے بھی لیکن اس کا یہ کام لینا حیوانیت سے آگے نہیں بڑھتا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کو زندگی گزارنے کا طریقہ بھی سکھایا اور اس کے اسباب بھی عطا فرمائے۔ حشرات الارض سے لے کر جنگل کے بڑے بڑے جانوروں تک کوئی جانور ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے یہ نہ سکھایا ہو کہ اس نے بچے کس طرح پیدا کرنے ہیں، پھر بچے کس طرح پالنے ہیں، ضروریاتِ زندگی کہاں سے مہیا کرنی ہیں، اپنا گھر کیسے بنانا ہے، موسم کی شدت سے کیسے بچنا ہے' حشرات الارض کو اس نے رینگنا سکھایا ہے تو اسی کے مطابق ان کو ماحول بھی دیا ہے۔ پرندے اس نے فضاء میں بلند کئے ہیں تو انہیں اڑنا بھی سکھایا ہے' مچھلیوں کو پانی میں رکھا ہے تو انہیں تیرنا بھی سکھایا ہے' پرندے بھی اپنا آشیانہ بنا کر رہتے ہیں اور جنگل کے درندے بھی اپنے بھٹ یا اپنے کچھار میں رہتے ہیں یعنی ضروریاتِ زندگی کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہر طرح کے جانور اور ہر طرح کے حیوان کو اس کی ضروری راہنمائی دے دی گئی ہے اور اس کے اسباب مہیا کر دیئے گئے ہیں اور انہیں ضروریات کو ان کے لئے مقاصدِ زندگی بنا دیا گیا ہے۔ اس لئے انہیں مقاصد کے حصول اور انہیں کی بجا آوری میں وہ پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ انسان کو اللہ نے انسانی شرف دے کر ان سے مختلف ہدایت عطا فرمائی تھی اسے بتایا گیا تھا کہ تیرے اندر ایک تو حیوانی زندگی ہے اس کے لئے تو تم باقی حیوانوں کی طرح اپنے حواس سے کام لے کر انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرو گے لیکن ساتھ ساتھ تمہیں چونکہ عقل بھی دی گئی ہے اس لئے عقل کے ذریعے تم ان کے معیار کو یقیناً بہتر بناؤ گے۔ وہ اگر کچا گوشت' کچی سبزی' کچا پھل اور گھاس پھونس کھا کر گزارا کریں گے تو تم انہیں چیزوں کو بہتر شکل و صورت دے کر اور حسبِ حال بنا کر اپنی ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش کرو گے۔ وہ اگر کسی بل کو اپنی رہائش گاہ بنائیں گے یا کسی بھٹ میں گزارا کریں گے یا تنکوں کا آشیانہ بنالیں گے تو تم اپنے رہنے کے لئے بڑی بڑی بلڈنگیں اٹھاؤ گے۔ انہیں اگر پر دیئے گئے ہیں اڑنے کے لئے اور تیرنے کے لئے تو تم اپنی عقل کی مدد سے ان سے بہتر اڑ بھی سکو گے اور تیر بھی سکو گے۔ انہیں اگر دوڑنے کی ہمت تم سے زیادہ عطا کی گئی ہے تو تم ان سے تیز رفتار گاڑیاں ایجاد کرو گے لیکن یہ ساری وہی حیوانی ضرورتیں ہیں جنہیں حیوان اپنی سطح پر اپنے احوال کے مطابق بروئے کار لاتا ہے اور انسان انہیں بہتر سے بہتر صورت میں وجود دیتا ہے لیکن بنیادی خصوصیات میں دونوں میں کوئی فرق نہیں اب اگر انہیں ضروریات کا حصول حیوانوں کی طرح انسان کی پوری زندگی پر غالب

Marfat.com

آجائے وہ یہ سمجھے کہ میں علم اس لئے حاصل کررہاہوں تاکہ میں نوکری یا کاروبار کروں اور یہ نوکری یا کاروبار اس لئے کروں گا تاکہ اپنی حیوانی ضرورتوں کو بہتر سے بہتر طریقے سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں میرے پاس ایک خوبصورت گاڑی' خوبصورت کوٹھی اور اشیائے خورد ونوش کی بہتات اور دولت کی ریل پیل رہنی چاہیے تاکہ مجھے زندگی کی کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تو سوال یہ ہے کہ آپ اس کو معیار کے اعتبار سے جو بھی نام دے دیں حقیقت میں تو یہ وہی چیزیں ہیں جو حیوانی ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہیں اگر انسان کی ساری زندگی کا یہی چیزیں احاطہ کرلیتی ہیں تو یہ اس کی حیوانی زندگی کی معراج ہوئی انسانی زندگی کہاں ہوئی؟ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان ماشاءاللہ بہت اچھے حیوان بن گئے ہیں کوئی آدمی جتنا زیادہ پڑھا لکھا ہے کہہ لیجئے کہ وہ اتنا اچھا حیوان ہے۔ اکبرالٰہ آبادی مرحوم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

کیا کہوں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔ اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

ایک دفعہ ایک مغربی دانشور نے ایک مشرقی مفکر سے بڑے فخر کے ساتھ اپنی ایجادات اور کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو ہم نے ایسے ایسے جہاز بنائے ہیں جو ایک گھنٹے میں ہزاروں میل اڑ سکتے ہیں، ہم نے ایسی کاریں ایجاد کی ہیں جو ایک گھنٹے میں کئی سو میل سفر کرسکتی ہیں، ہم نے ایسے کیمرے ایجاد کئے ہیں جو سمندر کے نیچے تک کی تصویریں لے سکتے ہیں، اپنی محیر العقول کامیابیوں کا ذکر کرتا رہا اور مشرقی مفکر خاموشی سے سنتا رہا بالآخر اس مفکر نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو کہ تم نے پرندوں سے بہتر اڑنا سیکھ لیا' تم نے درندوں سے تیز دوڑنا سیکھ لیا' تم مچھلیوں سے بہتر پانی میں تیرنے لگے ہو' لیکن افسوس تمہیں انسانوں کی طرح چلنا نہ آیا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان لوگوں کی زندگی کا اصل حادثہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کو جتنی خصوصیات عطا فرمائی ہیں ان سے انہوں نے صرف یہ کام لیا ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ انعام کی طرح ہوگئے ہیں یعنی جو زندگی کا رویہ دنیا بھر کے حیوانوں کا ہے وہی ان کا ہے۔ وہ ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لئے پوری زندگی صرف کردیتے ہیں کیونکہ وہ اسی کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں چنانچہ ان کا ہدف بھی اس سے مختلف نہیں۔ کسی ان پڑھ یا پڑھے لکھے سے بات کرکے دیکھ لیجئے وہ زندگی کی ضروریات حاصل کرنے کے لئے جس طریقے کو اپنا چکا ہے اس سے ہٹ کر کسی اور کام کے لئے اس کے پاس وقت نہیں حیوان تو پھر پیٹ بھر کر آرام سے سوتا ہے اور ایک آشیانہ بنا کر اسے دوسرے کی کبھی ہوس نہیں ہوتی لیکن انسان ایک مکان پر کبھی قانع نہیں ہوتا وہ ہر سال ایک نئی کوٹھی بنانا چاہتا ہے۔ اس کی ضرورتوں کے لئے ایک کارخانہ کافی نہیں وہ دس کارخانے لگا کر بھی کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ بہتر سے بہتر گاڑی مل جاتی ہے تو تب بھی لمبی گاڑی کے حصول یا ماڈل بدلنے کے لئے بے چین رہتا ہے یعنی جو قناعت اور اطمینان حیوانوں کو میسر ہے انسان اس سے بھی تہی دامن ہے۔ البتہ جس طرح حیوان اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کے نقصان کی کبھی پرواہ نہیں کرتا اگر اس کے پاس اپنا بھٹ نہیں تو اپنے سے کمزور جانور کے بھٹ پر قبضہ کرلیتا ہے' اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کسی چھوٹے جانور کی جان لے لیتا ہے۔ انسان اس معاملے میں بھی حیوان سے بھی آگے ہے کہ وہ تو کسی ایک بھٹ پر قبضہ کرتا ہے لیکن اسے آبادیاں بھی کھنڈر بنانا پڑیں تو دریغ نہیں ہوتا' وہ تو پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ایک جانور کی جان لیتا ہے یہ تیل کے کنوؤں اور منڈیوں پر قبضہ کرنے کے لئے ملکوں کو تباہ کردیتا ہے اور کبھی اسے ملال نہیں ہوتا۔ اس لئے ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگ جو دل دماغ اور حواس سے ٹھیک طرح سے کام نہیں لیتے یہ حیوانات جیسے نہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ ان کا ظلم کہیں نہ کہیں جاکر رک جاتا ہے یہ بستیاں اجاڑ کر بھی نہیں رکتے وہ کبھی فوجیں بنا کر ملکوں پر یلغار نہیں کرتے ان کے اپنے نوکیلے پنجے ان کی درندگی کے لئے کافی ہیں لیکن انسان کی ٹیکنالوجی انسانی خدمت کے لئے کم' انسانی تباہی کے لئے زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ انسانوں نے کبھی

Marfat.com

اس بات پر غور نہیں کیا کہ کیا قدرت نے ہمیں زندگی اور زندگی کی نعمتیں دے کر بے مقصد اس زمین پر بھیجا ہے؟ اور اگر اس نے کوئی مقصد دیا ہے تو آخر وہ کیا ہے؟ اس کے جاننے کا ذریعہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ صرف اللہ کے نبی ہیں ان پر ایمان لا کر اور ان کی راہنمائی کو قبول کر کے حقیقی زندگی کا شعور حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ چونکہ مقصدِ زندگی سے بالکل بے بہرہ اور بے خبر ہیں اور اسی پر انہیں اصرار بھی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اللہ نے تو ان کو دل اور حواس عطا فرمائے تھے تاکہ وہ اس کے صحیح استعمال سے اپنی آخرت بنالیں لیکن انہوں نے آنکھوں سے صرف وہ کچھ دیکھا جو ان کی خواہشات کے لئے ضروری تھا اور کانوں سے صرف وہ سنا جن سے انہیں لذتِ گناہ میں مدد مل سکتی ہے اور دل سے صرف وہ باتیں سمجھنے کی کوشش کی جن کا تعلق ان کی دنیا سے تھا تو جب کوئی فرد یا کوئی قوم اس طرح صرف دنیا تک اپنے آپ کو محدود رکھ کر آخرت سے لاتعلق ہو جاتی ہے تو قرآنِ کریم انہیں غافل قرار دیتا ہے اور یہ بھی خبر دیتا ہے کہ یہی لوگ ہیں جو اللہ کے قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں چونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ ہماری عطا کردہ قوتوں سے کام لے کر جو حقیقی زندگی تک نہیں پہنچے گا ہم اس کو جہنم کا ایندھن بنادیں گے۔ چنانچہ ان لوگوں نے بھی جب یہی جرم کیا تو اللہ نے اپنے قانون کے تحت جہنم ان کا مقدر بنادیا اور یہ آخر کار چونکہ جہنم میں جائیں گے اور اللہ کے ازلی اور ابدی علم کے مطابق ان کا جہنم میں جانا چونکہ پہلے سے اللہ کے علم میں ہے اس لئے فرمایا کہ ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو جہنم کے لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی علامتیں بھی بیان فرمادیں تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اپنے ان کرتوتوں کے باعث جہنم میں جائیں گے نہ کہ ہمارے پیدا کرنے کی وجہ سے، کیونکہ ہم نے تو انہیں باقی انسانوں کی طرح یہ تمام صلاحیتیں دے کر پیدا کیا تھا وہ اگر چاہتے تو ان سے کام لے کر اپنے آپ کو جنت کا وارث بنا سکتے تھے۔

اگلی آیت کریمہ میں جس ذات سے بے خبری کے باعث لوگ جہنم کا ایندھن بنتے ہیں اس کے بارے میں ہدایات ارشاد فرمائی جارہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ص وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ط سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O

"اور اللہ کے لئے خوبصورت نام ہیں تو انہیں سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑو جو اس کی صفات کے بارے میں کج روی اختیار کررہے ہیں۔ وہ جو کچھ کررہے ہیں عنقریب اس کا بدلہ پائیں گے"۔ 180

اسمائے حسنہ سے ضروری باتیں:

گزشتہ آیتِ کریمہ کی وضاحت سے یہ بات تو معلوم ہوگئی ہے کہ انسانی زندگی کے سارے بگاڑ کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان اللہ کی عطا کردہ ان صلاحیتوں سے پوری طرح کام نہیں لیتا جن سے کام لے کر وہ گمراہی سے بچ سکتا ہے اور ہدایت کے راستے پر پہنچ سکتا ہے۔ البتہ اس کے برعکس وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف حیاتِ دنیا اور اس کی ضروریات کے لئے صرف کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی تباہی کے راستے پر پڑجاتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایک اور حقیقت بیان فرمائی جارہی ہے جو پہلی آیت میں بیان کردہ حقیقت کا لازمہ ہے جب کوئی فرد یا کوئی قوم اپنے حواس اور دل ودماغ کو حقیقت شناسی کے لئے استعمال نہیں کرتی بلکہ اس کی ساری تگ ودو ضروریاتِ زندگی میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں تو رفتہ رفتہ زندگی اور کائنات کی سب سے بڑی حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی ہے اور یہ حقیقت ایسی ہے کہ صحیح طریقے سے غور وفکر کیا جائے تو اس کی حیثیت ایک پیش پاافتادہ حقیقت کی ہے اور اگر اپنی صلاحیتوں کو مادی رنگ میں پوری طرح رنگ دیا جائے تو پھر یہ حقیقت نظروں سے ایسی اوجھل ہوتی

Marfat.com

ہے کہ کبھی دکھائی نہیں دیتی وہ حقیقت اللہ کے وجود کا یقین' اس کی صفات کی معرفت اور انسان اور اس کائنات کا اس سے تعلق ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر زندگی کے تمام حقائق کا دارومدار ہے یہ وہ خشتِ اول ہے جس پر دین کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے اگر یہ سیدھی ہے تو پوری عمارت سیدھی ہے اور اگر یہ کج ہو جاتی ہے تو پوری عمارت ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر دور کے گم کردہ راہ لوگوں کی گمراہی کا حقیقی سبب یہی رہا ہے کہ ان کے تصورات اللہ کریم کے بارے میں غلط ہوتے چلے گئے کسی نے سرے سے اس کا انکار کیا تو کائنات کی تخلیق کی عجیب وغریب توجیہات پیش کیں اور کسی نے اس کے ساتھ دوسری قوتوں کو شریک ٹھہرایا تو نتیجتاً اس کی معرفت میں بال آتے چلے گئے گمراہی کی سلوٹیں بڑھتی چلی گئیں اور خود انسانی زندگی قوت سے محروم ہو کر مختلف خانوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی اور پھر یہ گمراہی جیسے جیسے پختہ ہوتی گئی ویسے ویسے اس کی نئی نئی شکلیں بھی بنتی گئیں جن قوموں نے اللہ تعالیٰ کی تجسیم کی انہوں نے کبھی مظاہر فطرت کی پوجا کی اور کبھی طاقت اور قدرت کی مسندوں پر بیٹھنے والوں کو مظاہر فطرت کے اوتار اور دیوتاؤں کی صورت میں قبول کیا اور جن لوگوں نے تنزیہ کا راستہ اختیار کیا وہ تعطیل کی وادی میں داخل ہو گئے اور وضعی علوم اور عقل وخرد کے باعث خیالی اور غیر حقیقی وادیوں میں کھو کر رہ گئے لیکن انہی گمراہیوں کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ دوسری گمراہیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اللہ کے اسماء میں بھی ٹھوکریں کھائیں اور اپنے اپنے خیال کے مطابق اپنے مقرر کردہ ناموں سے اللہ کو پکارنے لگے کیونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ جب کسی شخصیت کے بارے میں انسانی تصور بگڑتا ہے تو اس کے دو نتیجے ضرور نکل کر رہتے ہیں ایک تو یہ کہ اس شخصیت کے بارے میں انسانی رویہ بدل جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے احساس کے مطابق اس کا کوئی نہ کوئی نام تجویز کرتا ہے اور یہ دونوں طرح کے بگاڑ انسانی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی بگاڑ کی اصلاح کے لئے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کو اسمائے حسنیٰ سے نہ صرف یاد کرنے کی تلقین کی گئی ہے بلکہ صاف طور پر حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو نام خود اس نے اپنی کتابوں میں مقرر کر دیئے ہیں اس کو انہیں ناموں سے پکارا جائے۔ اپنی طرف سے نام (جو دراصل اس کی صفات ہیں) کا تعین نہ کیا جائے۔ علماء نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام توقیفی ہیں۔ یعنی ان کے سوا اللہ تعالیٰ کو کسی اور نام سے یاد کرنا' پکارنا یا اسے اللہ تعالیٰ کا پاک نام سمجھنا جائز نہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو جواد کہہ سکتے ہیں سخی نہیں۔ نور کہہ سکتے ہیں ابیض نہیں۔ شافی کہہ سکتے ہیں طبیب نہیں کیونکہ یہ دوسرے الفاظ منقول نہیں۔ اگرچہ انہی الفاظ کے ہم معنی ہیں۔ اس آیت میں واضح طور پر فرمایا کہ ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اللہ کے نام رکھنے میں الحاد اختیار کرتے ہیں۔ الحاد کا معنی ہوتا ہے راستی سے انحراف کرنا اور کج روی اختیار کرنا۔ اسمائے الٰہیہ میں تحریف یا کج روی کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے لئے وہ نام استعمال کیا جائے جو قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت نہیں۔ یا اللہ تعالیٰ کے جو نام قرآن وسنت سے ثابت ہیں ان میں سے کسی نام کو نامناسب سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص ناموں کو کسی دوسرے شخص کے لئے استعمال کیا جائے مگر اس میں یہ تفصیل ہے کہ اسمائے حسنیٰ میں سے بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن وحدیث میں دوسرے لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے استعمال کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔ تو جن ناموں کا استعمال غیر اللہ کے لئے قرآن وحدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں جیسے رحیم' رشید' علی' کریم' عزیز وغیرہ۔ اور اسمائے حسنیٰ میں سے وہ نام جن کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں۔ ان کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا الحاد میں داخل اور ناجائز ہے۔ مثلاً رحمٰن' سبحان' رزاق' خالق' غفار' قدوس وغیرہ۔ پھر ان مخصوص ناموں کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا اگر کسی غلط عقیدہ کی بناء پر ہے اور اس کو ہی خالق یا رزاق سمجھ کر ان الفاظ سے خطاب کر رہا ہے تب تو ایسا کہنا کفر ہے اور اگر عقیدہ غلط نہیں محض بے فکری یا بے سمجھی سے کسی شخص کو خالق' رازق یا رحمٰن' سبحان کہہ دیا تو یہ اگرچہ کفر نہیں مگر مشرکانہ الفاظ

Marfat.com

ہونے کی وجہ سے گناہِ شدید ہے۔

قرآنِ کریم نے تو اس آیت میں صرف اسمائے حسنیٰ کا ذکر فرمایا اور ان سے اپنے مالک کو پکارنے کا حکم دیا مگر صحیح احادث میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے اور اس کے اجر و ثواب کا ذکر بھی ملتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب میں یہ حدیث نقل کی۔

حدثنا علی بن عبد الله حدثنا سفیان قال حفظنا عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هريرة رواية قال ان الله عزوجل تسعة و تسعين اسماً مائة الا واحدة لا يحفظها احد الا دخل الجنة وهو وتر يحب الوتر۔ (جلد هفتم ص ۵۷)

ہم سے علی بن عبداللہ نے حدیث بیان کی اور ہم سے سفیان نے حدیث بیان کی اور کہا کہ ہم نے ابوزناد سے انہوں نے اعرج سے انہوں نے ابو ہرۃ ﷺ سے یہ یاد کیا ہے کہ ابو ہریرۃ ﷺ روایت کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں۔ ایک کم سو۔ جس نے ان کو حفظ کرلیا وہ داخلِ جنت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ وتر ہے، وتر کو دوست رکھتا ہے۔

امام مسلم نے اپنی کتاب صحیح مسلم میں دوسندوں کے ساتھ معمولی لفظی تغیر کے ساتھ اسی حدیث کو ذکر فرمایا۔ امام ترمذی نے بھی اپنی کتاب صحیح ترمذی میں اسی حدیث کا ذکر کیا۔ جن سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار کے ۹۹ نام ہیں۔ جو آدمی ان کو یاد کرے گا اور پھر ان کی پوری گنتی کے ساتھ اللہ کو پکارے گا اور ان ناموں میں بیان کردہ صفات کا صحیح تصور اپنے دل و دماغ میں اس طرح راسخ کرلے گا کہ وہ اس کی زندگی کا جزو بن جائے تو یقیناً ایسے شخص کو پروردگار جنت عطا فرمائیں گے۔ البتہ! یہاں دو اشکال ایسے ہیں جن کا جواب بہت ضروری ہے۔

اسمائے خداوندی کی تعداد کے تعین میں دو اشکال اور اس کا جواب:

۱۔ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پرودگار کے نام ۹۹ نہیں بلکہ اور بھی ہیں۔ جن میں سے بعض کا ذکر پہلی آسمانی کتابوں میں کیا گیا حالانکہ ان حدیثوں میں متعین طور پر ۹۹ کے عدد کا ذکر آیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ متعین عدد دخولِ جنت کا ذریعہ ہے یعنی جو اتنی تعداد میں اللہ تعالیٰ کے ناموں کو حفظ کرے گا اور پھر اس کو دل و دماغ میں اتار کر اپنا عمل بنالے گا یقیناً وہ شخص جنت میں داخل ہوگا۔

۲۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان ۹۹ ناموں کا ذکر کیا اور امام ترمذی کی یہ حدیث تین طریقوں سے ہم تک پہنچتی ہے۔ پہلے طریقے کو طریق صفوان بن صالح کہتے ہیں۔ دوسرا طریقہ زہیر بن محمد کا ہے جسے ابنِ ماجہ نے بیان کیا ہے۔ تیسرا طریقہ عبدالعزیز بن حصین کا ہے جسے حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے۔ اس میں باعثِ اشکال بات یہ ہے کہ ان روایات میں ناموں کی گنتی تو وہی ہے لیکن ناموں کے تعین میں اختلاف ہے کہ کسی نے ایک نام لیا ہے تو کسی نے دوسرا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ سے ناموں کی گنتی منقول ہوتی تو اس میں اختلاف کیوں ہوتا؟ اور پھر اس کے ساتھ یہ بات بھی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سلف صالحین میں مختلف بزرگوں نے اپنے طور پر ناموں کو جمع کیا۔ اب اگر ان کے نزدیک یہ احادیث صحت کے معیار پر ہوتیں تو یہ یقیناً اسی پر اکتفا کرتے مثلاً خود حافظ ابنِ حجر نے فتح الباری میں اپنے طور پر اسمائے حسنیٰ جمع کئے اور انہوں نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ ابوزید لبغوی نے اسمائے حسنیٰ کا استخراج قرآن مجید سے کیا۔ پھر اس فہرست میں امام سفیان بن عینیہ نے اور امام جعفر صادق رحمہما اللہ تعالیٰ نے اضافہ فرمایا۔ اس اشکال کا جواب ہم اپنی طرف سے نہیں بلکہ حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھ رہے ہیں۔

Marfat.com

''ہرسہ طرق روایات اوراسمائے مبینہ پرغور کرنے کے بعد ایک متحقق و متجسس بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اسمائے حسنیٰ کی تعیین و تفصیل نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں۔ غالباً اسے بھی ایسے ہی مصالح دینیہ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسے لیلۃ القدر کی تاریخ یا یوم الجمعہ کی ساعتِ مقبولہ کو ترک کیا گیا۔''

اس عاجز کا گمان ہے کہ امام ترمذی کی روایت کردہ حدیث کی ایک توجیہہ یہ ہوسکتی ہے (علماء کرام اس پر غور فرمالیں) کہ حدیث کے ابتدائی حصہ میں ۹۹ کے تعین کا ذکر اور اس کی فضیلت کا ذکر ہے یہاں تک تو اس میں اور بخاری اور مسلم کی روایات میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ! اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسمائے الٰہی کا ذکر کرتے ہیں، اس عاجز کا گمان یہ ہے کہ یہ اسماء شاید انہوں نے اپنے طور پر ذکر فرمائے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی طرف سے نہیں۔ "واللہ اعلم واحکم بالصواب"

اب تک بحث سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ پروردگار کی پہچان کا صحیح طریقہ اس کی صفات کی معرفت ہے اور صفات کی معرفت کے لئے انسانی حواس اور انسانی عقل کفایت نہیں کرتی۔ جب بھی انسان نے اپنی عقل اور شعور سے کام لے کر اللہ کی صفات کے تعین کی کوشش کی ہے تو اس نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے۔ چنانچہ پروردگار نے اپنی صفات کے طور پر اپنے پیارے نام اپنے پیغمبروں کے ذریعے انسانوں کو تلقین فرمائے اور ساتھ ہی حکم دیا۔

"وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا۔"

اللہ کے لئے عمدہ اور خوبصورت نام ہیں۔ انہی ناموں سے اسے پکارو۔ یعنی اسے یاد کرو۔ اسی سے ضرورت کے وقت مدد مانگو۔ ہر حال میں اسی سے دعا مانگو۔ ہر حال میں اسی سے دعا کرو۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اللہ کو پکارنے کے کچھ آداب بھی ہوں گے۔ وہ آداب کیا ہیں؟ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے کلامِ پاک میں ہمیں ان آداب سے بھی بہرہ ور فرمایا۔ سورہ اعراف میں ارشاد فرمایا۔

"ادعوا ربکم تضرعاً وّخفیۃً انہ لا یحب المعتدین۔"

''پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔ اس کو خوش نہیں آتے حد سے آگے بڑھنے والے۔''

اس آیت میں اگر غور کیا جائے تو تین امور کی طرف راہنمائی ملتی ہے۔

۱۔ جسے پکارا جا رہا ہے اس کی ذات سے انسان کا تعلق۔

۲۔ پکارنے اور مانگنے کے آداب۔

۳۔ اور اگر کچھ مانگا جا رہا ہے تو اس کی حدود کا علم۔

محولہ بالا آیت کریمہ میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ تم جسے پکار رہے ہو وہ تمہارا رب ہے۔ جس کی ربوبیت کائنات کے ذرے ذرے کو زندگی اور بقاء کا سروسامان فراہم کر رہی ہے۔ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے انسان کی زندگی کی تمام ضروریات کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ماں کی مامتا جو اپنے بچے کی نگہداشت میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے اسے بھی ربوبیت کی ہمہ گیری سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کی نگاہ بھی کبھی نہ کبھی بچے کی طرف سے تغافل کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسکا دل بچے کے احساس کو سمجھنے میں کوتاہی کر جاتا ہے مگر وہ ذات جو ربِ کائنات ہے اس کی غور و پرداخت کی نگاہ کبھی غافل نہیں ہوتی۔ وہ ضروریات کو نہیں بلکہ ضروریات کے احساس تک کو جانتا ہے جو اپنی مخلوق کے لئے ماں سے کہیں بڑھ کر شفیق و رحیم ہے۔

Marfat.com

اس لئے مانگنا ہوتو اسی سے مانگو پکارنا ہوتو اسی کو پکارو اس کے علاوہ کوئی ذات اس قابل نہیں کہ انسان اپنی حاجت روائی کے لئے اس سے رجوع کرے۔ اس طرح اپنی حیثیت کے تعین اور انسان سے تعلق کی گہرائی کو واضح کرنے کے بعد "تضرعاً وخفیة" فرما کر مانگنے اور پکارنے کے آداب کو واضح فرمایا۔ تضرع کے معنی عاجزی' خوشامد' لجاجت اور تذلل کے اظہار کے ہیں اور خفیہ کے معنی ہیں پوشیدہ' چھپا ہوا' ان دونوں لفظوں میں مانگنے والے کی اصل حیثیت اس پر ظاہر کی گئی ہے کہ جب تک تمہیں اپنی اصل حیثیت کا احساس نہ ہوگا تم دعا کے آداب کو بھی ملحوظ نہیں رکھ سکو گے۔ تمہاری حیثیت یہ ہے کہ دینے والا جتنا عظیم ہے تم اتنے ہی عاجز ہو۔ تمہاری حیثیت اس کے سامنے سرتاپا عجز وانکسار کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم جب اس سے مانگو تو تمہارے الفاظ بھی عجز کا اظہار کریں اور تمہارے جسم پر بھی اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے احساس سے کپکپی طاری ہو جائے۔ تمہارا لب ولہجہ عاجزی کی تصویر ہو۔ تمہارا بول زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کے نکلے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا برسے اور دل اس یقین سے سرشار ہو۔

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا　　ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا

جو ہوا' ہوا کرم سے تیرے　　جو ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

قلب ونظر کے اس احساس کے ساتھ ساتھ تمہاری ظاہری ہیئت وصورت بھی اس کے شکر گزار اور فرمانبردار فقیر کی ہونی چاہیے۔ جس کے پر اس کے احکام سے انحراف اور نافرمانی کی پرچھائیں بھی نہ پڑی ہوں۔ جیسا کہ حدیث میں کہا گیا ہے کہ ایک موقعہ پر حضور ﷺ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک انسان دور دراز مقام کا سفر کرتا ہے۔ پراگندہ حالت اور پریشان صورت میں اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے کہتا ہے۔ ''اے رب اے رب'' حالانکہ اس کا کھانا حرام کا ہے' لباس حرام کا ہے اور اس کے گوشت پوست کی پرورش بھی حرام سے ہوئی ہے تو اس کی دعا کیونکر قبول ہوگی۔ اس لئے فرمایا کہ مانگتے ہوئے تمہیں تضرع کی تصویر بنا چاہیے اور تمہارے قول اور عمل' احساس اور عقیدہ میں کہیں بھی اللہ کے احکام سے انحراف نہ پایا جائے اور دوسرا لفظ فرمایا' خفیہ' یعنی جب اس سے مانگو تو چیخ کر اور چلا کر نہ مانگو کیونکہ چیخنا اور چلانا اس کی عظمت کے آداب کے منافی ہے۔ وہ جو دل کی دھڑکنیں سنتا ہے' خاموش دعاؤں کو بھی سنتا ہے۔ چنانچہ خیبر کے موقع پر جب صحابہ کی آوازیں بلند ہوئیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے بلکہ تمہارا مخاطب ایک سمیع وقریب ہے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اعلانیہ دعا کرنے اور آہستہ دعا کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے۔

ایک روایت میں امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت سعد بن وقاص ؓ سے نقل کیا ہے بہترین ذکر خفی ہے اور یہ شاید اس لئے بھی ہے کہ بلند آواز سے دعا مانگنے سے اول تو تواضع اور انکسار باقی رہنا مشکل ہے۔ ثانیاً اس میں ریا اور شہرت کا بھی خطرہ ہے۔ جسے حدیث میں شرکِ خفی کہا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا ﴿انه لا یحب المعتدین ''اور اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے''﴾ یہاں حد سے آگے بڑھنے سے مراد دعا یعنی پکارنے میں حد سے آگے بڑھنا ہے یعنی مانگنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دعا کی حدود کیا ہیں؟ تاکہ وہ ان حدود سے آگے نہ بڑھے۔ ان حدود سے آگے بڑھنے کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ لفظی تکلفات اور قافیہ وغیرہ اختیار کیا جائے اور شعروں کی صورت میں گا گا کر دعا مانگی جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گانا باقی رہ جائے گا دعا کی روح ختم ہو جائے گی اور دعا' دعا نہ رہے گی بلکہ ٹھمری بن جائے گی۔ اکبر مرحوم نے شاید ایسے ہی موقعہ کے لئے کہا تھا۔

عبادت سے محبت ہے انہیں گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

Marfat.com

دوسری صورت یہ ہے کہ دعا میں غیر ضروری شرطیں لگائی جائیں۔ جیسے حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل ﷺ نے دیکھا کہ ان کا صاحبزادہ اس طرح دعا مانگ رہا ہے کہ یا اللہ میں آپ سے جنت میں سفید رنگ کا داہنی جانب والا محل طلب کرتا ہوں۔ تو آپ نے اسے آنحضرت ﷺ کا حکم سنایا کہ دعا میں ایسی شرطیں حد سے تجاوز ہیں جن کو قرآن وحدیث میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

تیسری صورت حد سے تجاوز کی یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے بددعا کرے یا کوئی ایسی چیز مانگے جو عام لوگوں کیلئے مضر ہو یا ایسی چیز کی دعا کرے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت' حکمت اور احکامِ شریعت کے خلاف ہو۔

قبولیتِ دعا کی تین صورتیں:

حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جو دعا بھی خدائے عزوجل کی عظمت ورحمت کے تصور اور اپنی عاجزی اور سرافگندگی کے اعتراف اور دعا کے تمام تر آداب وشرائط کے ساتھ مانگی جائے وہ کبھی رد نہیں ہوتی۔ البتہ! اس کی قبولیت کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ مانگنے والے کو وہی کچھ دنیا میں ہی عطا فرما دیا جاتا ہے۔ جس کی اس نے اپنے مالک سے دعا کی تھی۔

۲۔ مانگنے والا جو کچھ مانگ رہا ہے وہ تو عطا نہیں کیا جاتا البتہ اس کے عوض کوئی آنے والی بلا اور مصیبت اس سے ٹال دی جاتی ہے۔ مگر یہ اپنی کم علمی اور جہالت کے باعث یہی سمجھتا ہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی۔

۳۔ تیسری صورت قبولیت کی یہ ہے کہ دنیا میں تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی مگر دنیا کی یہ محرومی اس کے لئے ثمرۂ آخرت بن جائے گی اور جب اسے اچانک یہ نعمتِ غیر مترقبہ اجر وثواب کی صورت میں عطا ہوگی تو وہ حیران رہ جائے گا اور تمنا کرے گا کہ کاش! دنیا میں اس کی کوئی دعا بھی قبول نہ ہوتی تاکہ آج اس اجر وثواب کی صورت میں ایک خزانہ ہاتھ آتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہمارا پروردگار انتہا رحیم وکریم ہے کہ وہ اپنے بندوں کی دعائیں جو آداب وشرائط کی کامل پابندی سے مانگی جائیں کبھی رد نہیں فرماتا۔ البتہ! اس کے یہاں قبولیت کی صورتیں مختلف ہیں مگر بندہ اپنی بے خبری کے باعث بعض دفعہ بے صبر ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ مدت سے دعا کر رہا ہے مگر شنوائی نہیں ہوتی، دعا مانگنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ ممکن ہے جس وقت بندہ دعا مانگنا چھوڑ رہا ہو وہی وقت اس کی قبولیت کا ہو یا پروردگار نے اس کی دعاؤں کو توشۂ آخرت بنانے کا حکم دے دیا ہو۔ دونوں صورتوں میں یہ بے صبری اور جلد بازی کیسے برے نتائج پیدا کرسکتی ہے اس لئے بندہ کبھی بے صبر نہ ہو اور کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

آخر میں ہم دو احادیث نقل کرتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے ہر طرح کی پریشانی میں بعض اسمائے حسنیٰ کے ذریعے دعا کرنے کا طریقہ سکھایا ہے بخاری' مسلم' ترمذی اور نسائی میں یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ جو بھی اپنی پریشانی میں ان کلمات کے ساتھ دعا مانگے گا اللہ تعالیٰ اس کی مشکلات دور فرمائیں گے۔ وہ کلمات یہ ہیں۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ

اور مستدرکِ حاکم میں بروایت انس رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ زہراء ﷺ سے فرمایا کہ تمہارے لئے اس سے کیا چیز مانع ہے کہ تم میری وصیت کو سن لو اور اس پر عمل کرو، وہ وصیت یہ ہے کہ صبح شام یہ دعا کرلیا کرو۔

Marfat.com

يَاحَيُّ يَا قَيُّومُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ أَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ وَلَا تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ

یہ دعا بھی تمام حاجات ومشکلات کے لئے بے نظیر ہے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں سابقہ آیات میں بیان کردہ طرزِ فکر کے حامل لوگوں کو مختلف لوگوں کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے تاکہ اللہ کے نیک بندوں کے حوصلے کا سامان ہو۔ ارشاد فرمایا:

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ع

''اور جن کو ہم نے پیدا کیا ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی راہنمائی اور اس کے مطابق فیصلے کرتے ہیں''۔181

امتِ مسلمہ کا حقیقی تعارف:

امام تفسیر ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ امت جس کا ذکر اس آیت میں ہے، میری امت ہے، جو اپنے سب جھگڑوں کے فیصلے حق وانصاف یعنی قانونِ الٰہی کے مطابق کریں گے اور لینے دینے کے تمام معاملات میں حق وانصاف کو سامنے رکھیں گے۔

عبد بن حمید کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ آیت تمہارے حق میں آئی ہے اور تم سے پہلے بھی ایک امت کو یہ صفات عطا ہو چکی ہیں، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ﴾ مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں بھی ایک جماعت ان صفات کی حامل تھی کہ لوگوں کی راہنمائی میں اور باہمی جھگڑوں کے تصفیہ میں حق یعنی شریعتِ الٰہیہ کا مکمل اتباع کرتی تھی اور امتِ محمدیہ ﷺ کو بھی حق تعالیٰ نے ان صفات میں خصوصی امتیاز بخشا ہے۔

خلاصہ اس کا دو خصلتیں ہیں ایک یہ کہ دوسرے لوگوں کی قیادت اور رہنمائی یا مشورہ میں شریعت کا اتباع کریں دوسرے یہ کہ اگر کوئی جھگڑا آپس میں پیش آ جائے تو اس کا فیصلہ شریعت کے قانون کے مطابق کریں۔

غور کیا جائے تو یہی دو صفتیں ہیں جو کسی قوم اور جماعت کی خیر وخوبی اور فلاح دنیا وآخرت کی ضامن ہو سکتی ہیں کہ صلح وجنگ اور دوستی اور عداوت کی ہر حالت میں ان کا نصب العین حق وانصاف ہی ہو اپنے دوستوں اور رفیقوں کو جو طریقہ کار بتلائیں اس میں بھی حق کا اتباع ہو اور دشمنوں اور حریفوں کے جھگڑوں میں بھی حق کے آگے اپنے سارے خیالات وخواہشات کو ترک کر دیں، جس کا خلاصہ ہے حق پرستی۔

امتِ محمدیہ ﷺ کی دوسری تمام امتوں پر فضیلت اور فوقیت کا راز اور ان کا طغرائے امتیاز یہی حق پرستی ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی کو حق کے تابع بنایا جس جماعت یا پارٹی کی قیادت اور راہنمائی کی وہ بھی خالصِ حق کے تقاضوں کے مطابق کی اپنی ذاتی خواہشات اور خاندانی یا قومی رسوم کو اس میں مطلق دخل نہیں دیا اور باہمی نزاعات میں بھی ہمیشہ حق کے سامنے گردن جھکا دی صحابہ وتابعین کی پوری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے اور جب سے اس امت میں ان دو خصلتوں کے اندر خلل اور نقصان آیا اسی وقت سے اس کا تنزل وانحطاط شروع ہو گیا۔

نہایت رنج وافسوس کا مقام ہے کہ آج یہی حق پرست امت خالص ہوا پرست بن کر رہ گئی ہے اس کی پارٹیاں اور جماعتیں بنتی ہیں تو وہ بھی

Marfat.com

خالص نفسانی اغراض اور دنیا کی حقیر و ذلیل منفعت کی بنیادوں پر بنتی ہیں ایک دوسرے کو جن امور کی پابندی کی طرف دعوت دی جاتی ہے وہ بھی خالص ہواءِ نفسانی یا خاندانی رسوم ہوتی ہیں کوئی ان کے خلاف کرنے لگے تو سب اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں لیکن حق و شریعت کے مطابق چلنے کا نہ کہیں معاہدہ ہوتا ہے نہ کوئی اس کی پیروی کرنے کے لئے کسی کو کہتا ہے نہ اس کی خلاف ورزی کرنے سے کسی کی پیشانی پر بل آتا ہے۔

اسی طرح باہمی جھگڑوں اور نزاعی مقدمات میں دنیا کے چندروزہ موہوم نفع کی خاطر اللہ کے قانون کو چھوڑ کر طاغوتی قوانین کے ذریعہ فیصلہ کرنے پر راضی ہیں۔اسی کا یہ انجامِ بد ہے جو ہر جگہ ہر ملک میں مشاہدہ میں آرہا ہے کہ یہ امت ہر جگہ ذلیل وخوار نظر آتی ہے۔الا ماشاء اللہ انہوں نے حق سے منہ موڑا، حق نے ان کی نصرت وامداد سے رخ پھیرلیا۔

حق پرستی کے بجائے ہوا پرستی اختیار کر کے شخصی طور پر کسی فرد کو جو دنیوی منافع مل گئے وہ اس پر مگن ہے، مگر پوری قوم وملت کی تباہی جو اس کا لازمی نتیجہ ہے اس کا کوئی دیکھنے، سننے والا نہیں۔اگر پوری امت کی فلاح و ترقی پیشِ نظر ہو تو اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ ان قرآنی اصول کو مضبوطی سے پکڑا جائے، خود بھی اس پر عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی اس کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔

.... ۞ ...... ۞ ...... ۞ ....

وَالَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٢﴾ وَاُمْلِيْ
لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿١٨٣﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ
مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٨٤﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى
اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٥﴾
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ﴿١٨٦﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا
عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ

Marfat.com

وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ
قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٧﴾ قُلْ
لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ
اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛۚ
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٨﴾

اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہو گی اور میں انہیں ڈھیل دوں گا بے شک میری تدبیر محکم ہے۔ کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا؟ کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو بس ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا ہے۔ کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام اور ان چیزوں پر غور نہیں کیا جو خدا نے پیدا کی ہیں۔ اور اس بات پر کہ کیا عجب کہ ان کی اجل قریب آ گئی ہو تو اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے۔ جن کو اللہ گمراہ کر دے ان کے لئے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ وہ ان کو ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ تم سے قیامت کے بارے میں سوال کر رہے ہیں کہ کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت کہہ دیجئے کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا بوجھل ہیں اس سے آسمان اور زمین وہ تم پر بس اچانک ہی آ دھمکے گی وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا اس کی تحقیق میں لگے ہوئے ہو۔ کہہ دو! اس کا علم تو بس اللہ کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ (اے پیغمبر! انہیں) بتلایئے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے اور برے کا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی میں تو بس ڈرانے والا ہوں (انکار کرنے والوں کو) اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایمان لانے والوں کو۔

.............☆.....☆.....☆.............

اسلوبِ قرآن کے فہم کیلئے ضروری ہدایات:

اگلی آیات کریمہ کی تشریح سے پہلے ضروری ہے کہ چند ایسی باتیں ذکر کر دی جائیں جن سے قرآن کریم کے اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے

Marfat.com

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے متنوع مضامین اور موضوعات کے اعتبار سے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کرتا ہے وہ کسی بھی موضوع پر جب اظہارِ خیال کرتا ہے تو کبھی تو ایک رواں دواں ندی کی طرح آگے بڑھتا ہے اور کبھی اس کے انداز میں دریا کی روانی سمٹ آتی ہے جو صرف ایک موضوع میں سمٹ کر نہیں رہ جاتی بلکہ انسانی طبیعت اور فطرت کے تنوع کو دیکھتے ہوئے ذیلی مضامین اور متعلقات کو بھی ساتھ ساتھ سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک ایک قاری کے ذہن میں موضوع کے تمام گوشے نہ ہوں وہ قرآن کریم کی بعض باتوں کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر سورت کے آخری چند رکوع میں عموماً چند خصوصیات نمایاں دکھائی دیتی ہیں جن میں ایک تو یہ کہ اس سورت کے نزول کے وقت دعوت کے مخاطبین کی جو ذہنی کیفیت ہوتی ہے اسے مختلف طریقوں سے کبھی خفی اور کبھی جلی طریقے سے زیر بحث لایا جاتا ہے۔ چونکہ لوگوں کی طبیعتوں میں ایک تفاوت قدرتی طور پر موجود ہے وہی تفاوت قرآن کریم کی آیات میں بھی ہمیں دکھائی دیتا ہے ان آیات میں چونکہ مختلف طبیعتوں اور صلاحیتوں کے حوالے سے بات کی جاتی ہے اس لئے ہر طبیعت اور صلاحیت کا حامل اپنے سے متعلق بات کو خود بخود سمجھتا چلا جاتا ہے لیکن دوسری طبیعت اور صلاحیت کا شخص بعض دفعہ اس کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتا اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک مخاطبوں کی ذہنی کیفیت' صلاحیتوں اور طبعی رجحانات کو پوری طرح نہ سمجھ لیا جائے قرآن پاک کی گفتگو کے ہدف کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کریم عام معمول کی کوئی درسی کتاب نہیں اور نہ ایسی دعوتی کتاب ہے جس میں اسلام کے تمام ضروری امور کی وضاحت کے بعد قارئین کو اپنے طور پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے بلکہ یہ تو ایک ایسی کتاب ہے جو خطبات کی شکل میں اللہ کے رسول پر ضرورت کے مطابق نازل ہوتی رہی ہے اور وہ اسی کی مدد سے قوم کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرتا رہا ہے چنانچہ دعوت کو پیش کرتے ہوئے اسے جس صورتحال سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور جن سوالات سے واسطہ پڑتا ہے اور جن جن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اور مخالفین کی جانب سے جیسے جیسے الجھاؤ پیش کئے جاتے ہیں، قرآن کریم کبھی تو ساتھ ساتھ ان تمام ضرورتوں کا تدارک کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن بہت ساری باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں دعوت کی روا روی میں پیش کرنا آسان نہیں ہوتا، وہ چونکہ گہرے غور و فکر کی متقاضی ہوتی ہے اور مخالفین غور و فکر تو دور کی بات ہے سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ اسلئے ایسے سوالات اور ایسی ضرورتوں کے حوالے سے ہر سورت کے آخر میں توضیحی آیات نازل کی جاتی ہیں جس میں ایسے تمام سوالات کے جوابات دیئے جاتے اور ذہنی الجھنوں کو دور کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو تسلی بھی دی جاتی اور استقامت کی تلقین بھی کی جاتی ہے۔

یہ باتیں تو وہ ہیں جنہیں تمام مفصل سورتوں کی آخری آیات کو پڑھتے ہوئے ذہن میں رکھنا چاہیے لیکن پیش نظر آیات کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں وہ حق و باطل کے درمیان شدید کشمکش کا وقت تھا مشرکین مکہ مخالفت میں شدت پیدا کر چکے تھے لیکن اسلام کے اثر و نفوذ سے خوف زدہ بھی تھے اس لئے اگر ایک طرف وہ سختی اور تشدد کے ذریعے مسلمانوں کو ہراساں کر کے اس دعوت کو روک دینا چاہتے تھے تو دوسری طرف عجیب و غریب سوالات اٹھا کر ذہنوں کو مسموم بھی کرنا چاہتے تھے اور اپنے معاشرے کے ہم مذہب لوگوں کو بدگمان کر کے اسلام سے دور رکھنے کی بھی کوشش کر رہے تھے۔ اس لئے ان آیات کریمہ میں ایسے ہی تمام سوالات کا جواب بھی دیا گیا ہے اور مسلمانوں اور آنحضرت ﷺ کو کامیابی کی نوید سنا کر تسلی بھی دی گئی ہے۔ اس رکوع کی سب سے پہلی آیات کریمہ میں ایسے ہی سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝

''اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہو گی اور میں

Marfat.com

انہیں ڈھیل دوں گا بے شک میری تدبیر محکم ہے"۔183-182

اس آیت کریمہ میں سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مصدر استدراج ہے۔ استدراج کا معنی درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ کوئی کام کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن وسنت کی اصطلاح میں استدراج اس کو کہا جاتا ہے کہ آدمی کے گناہ پر دنیا میں جلدی گرفت نہ ہو بلکہ جوں جوں وہ گناہ میں آگے بڑھتا چلا جائے دنیاوی مال واسباب اور منصب واقتدار میں اضافہ ہوتا جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسا شخص اپنی بدعملی اور بدکرداری میں اور پختہ ہو جائے گا اور وہ یہ سمجھنا شروع کر دے گا کہ اگر یہ میرے اعمال برے ہوتے تو مجھ پر اللہ کی یہ عنایات نہ ہوتیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

ان آیاتِ کریمہ میں ایک شبہ یا ایک سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں بعض دفعہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا اور آج بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر راست بازی کی زندگی اختیار کرنا اللہ کو پسند ہے اور اس کے تمام وعدے ایسے ہی لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ کے دین پر عمل کرتے ہوئے راست بازی کی زندگی گزارتے ہیں تو پھر ہونا یہ چاہیے کہ دنیا میں اللہ کی نعمتیں بھی ایسے ہی لوگوں کو نصیب ہوں اور جن لوگوں کی زندگیاں اس راستے سے بالکل متصادم ہیں وہ اسلامی تعلیمات کو نہ تسلیم کرتے ہیں اور نہ انہیں قابلِ عمل سمجھتے ہیں وہ اللہ کی نعمتوں سے نہ صرف محروم رہیں بلکہ دنیا ہی میں انہیں اس طرح اللہ کی گرفت میں آنا چاہیے کہ ہر دیکھنے والا محسوس کرے کہ یہ لوگ اللہ کے نافرمان تھے اس لئے اپنے پاداشِ عمل میں پکڑے گئے ہیں لیکن دنیا کے حالات دیکھتے ہوئے صاف نظر آتا ہے کہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ بڑے سے بڑا کافر اور مشرک اور بڑے سے بڑا اللہ کا باغی اس دنیا میں بڑے سے بڑے منصب پر فائز اور دنیا کے وسائل پر قابض ہے مسلمان قومیں روز بروز پستی کی طرف جا رہی ہیں اور کافر قومیں آئے دن ترقی کی طرف بڑھ رہی ہیں آخر یہ تضاد کیوں ہے؟ اس شبہ اور اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم جن لوگوں کو بظاہر بہت سرفراز اور نہایت خوشحال دیکھ رہے ہو یہ ان کے اعمال کا صلہ نہیں بلکہ انہیں انجام کی طرف لے جانے کی ایک ایسی تدبیر ہے جس کو نہ وہ سمجھتے ہیں نہ سرسری نگاہوں سے دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ راہِ راست سے ہٹے ہوئے لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف لانے کے لئے اللہ اپنے نبیوں کو بھیجتا اور اپنی کتابیں اتارتا ہے نبی ان کی اصلاح کے لئے اپنی امکانی مساعی کو بروئے کار لاتے ہیں لیکن جب وہ بگڑے ہوئے لوگ ان پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ انہیں مختلف قسم کے مصائب میں مبتلا کرتا ہے تاکہ وہ تکلیفوں سے پریشان ہو کر اللہ کے سامنے جھکیں اور اپنی سرکشی سے باز آجائیں لیکن جب یہ تکلیفیں اور مصیبتیں بھی انہیں راہِ راست پر لانے کے لئے کافی نہیں ہوتیں بلکہ وہ اس کی بھی کوئی نہ کوئی توجیہ کر کے اپنے آپ کو حق بجانب قرار دیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو دوسری آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے مصیبتوں کو ختم کر کے آسانیوں اور سہولتوں کے دروازے ان پر کھول دیتا ہے اور زندگی کی کامرانیاں اس طرح ان کی طرف بڑھتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیئے ہیں' کاروبار روز بروز چمکتا چلا جاتا ہے' فصلیں لہلہانے لگتی ہیں' صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے' لوگ جس چیز میں ہاتھ ڈالتے ہیں وہ سونا بن جاتی ہے ان نعمتوں سے سرشار لوگ دولت کی اس ریل پیل کو اپنے لئے کامیابی سمجھتے ہوئے اپنے رویہ میں مزید پختہ ہو جاتے ہیں اور پہلے اگر کوئی نصیحت کی بات سننے کی زحمت کر ہی لیتے تھے تو اب وہ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہماری زندگی کے طور اطوار اور ہمارے فیصلے بالکل صحیح اور حق بجانب ہیں۔ اس طرح ان کا حالات کے تاثر میں ڈوب جانا اور اپنی خواہشات کی گرفت میں آجانا یہ درحقیقت اللہ کی جانب سے ہلاکت کا وہ پھندا ہے جس کی طرف وہ قوموں کو آہستہ آہستہ لے کر جاتا ہے وہ مادی عیش وعشرت میں ڈوب کر اسے اپنی کامیابی سمجھتی رہتی ہیں حالانکہ وہ اپنی ہلاکت کی طرف بڑھ رہی ہوتی ہیں جس طرح مچھلی کا شکاری مچھلی کے

Marfat.com

شکار کے لئے جب کنڈی لگاتا ہے تو کنڈی پانی میں پھینکنے سے پہلے وہ اس کی نوک پر گوشت کا کوئی ٹکڑا بھی لگاتا ہے تاکہ مچھلی اسے اپنی خوراک سمجھے چنانچہ مچھلی جب اسے اپنی خوراک سمجھ کر آ کر کھانا شروع کرتی ہے تو وہ اپنی ڈور ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے مچھلی یہ سمجھتی ہے کہ آج مجھے بہت مزیدار خوراک ملی ہے لیکن شکاری خوب سمجھتا ہے کہ یہ بیوقوف مچھلی جسے خوراک سمجھ رہی ہے درحقیقت اس کی موت کا پروانہ ہے وہ جیسے جیسے منہ مارتی ہے ویسے ویسے وہ کانٹا اس کے حلق میں اترتا چلا جاتا ہے جب شکاری سمجھتا ہے کہ مچھلی نے خواہشِ نفس سے مغلوب ہو کر کانٹا حلق میں اتار لیا ہے تو وہ بڑی آسانی سے اسے کھینچ لیتا ہے مچھلی اگر ڈور سے زور آزمائی کرتی بھی ہے تو وہ شکاری اسے کھینچنے میں جلدی نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری ڈور اتنی مضبوط ہے کہ مچھلی ہزار کوشش سے بھی اسے توڑ نہیں سکتی۔ یہی حال ایسے افراد اور قوموں کا بھی ہے جو مادی ترقی اور وسائل کی ہمہ ہمی کو زندگی کی کامیابیاں سمجھ کر اسی کے حصول میں ڈوب جاتے ہیں اور پھر اسی کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں قدرت جیسے جیسے ان کو آگے بڑھنے کا موقع دیتی ہے وہ ویسے ویسے بدکردار اور بداطوار ہوتے چلے جاتے ہیں قدرت ان کو ڈھیل دیتی چلی جاتی ہے تاکہ وہ اچھی طرح اپنے پیمانے کو بھر لیں اور جب اللہ کی جانب سے پکڑ آئے تو پھر ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے لیکن اپنی پکڑ اور گرفت میں اللہ تعالیٰ کبھی جلدی نہیں کرتا کیونکہ جلدی وہ کیا کرتا ہے جسے شکار کے نکل جانے کا اندیشہ ہو یا وہ حکمران مجرموں کو پکڑنے میں بےصبری کا مظاہرہ کرتا ہے جسے یہ خطرہ ہو کہ مجرم اگر طاقت پکڑ گئے تو میری گرفت سے نکل جائیں گے اور پھر اگر میں کوشش بھی کروں گا تو ان پر قابو نہ پا سکوں گا اس لئے ان آیتوں میں فرمایا کہ تم جن قوموں کو بظاہر بہت خوشحال اور سرفراز دیکھ رہے ہو وہ تو استدراج کا شکار ہیں ہم انہیں آہستہ آہستہ ان کے انجام کی طرف لے جا رہے ہیں جب وہ اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے تو پھر اچانک ہم ان کو دبوچ لیں گے مزید فرمایا کہ میں ان کو مسلسل ڈھیل دیتا رہتا ہوں تاکہ وہ اپنے خبث نفس کو پوری طرح کھلنے دیں اور اپنے بغاوت کے سوتوں کو پوری طرح ابلنے دیں اور اپنی فائل کو اچھی طرح مکمل ہونے دیں تاکہ کل کو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے لیکن میری تدبیر ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور وہ اس قدر محکم ہے کہ یہ اس سے بچ کر نکل نہیں سکتے تم یہ سمجھ رہے ہو کہ پروردگار کا ان کو گرفت نہ کرنا شائد ان کے برسرِ حق ہونے کی دلیل ہے یا اللہ کے کمزور ہونے کی۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں وہ خود اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں پکڑنے میں اس لئے جلدی نہیں کرتا کیونکہ میری تدبیر نہایت محکم اور مضبوط ہے جب میں پکڑنا چاہوں گا تو اس وقت انہیں میری پکڑ سے کوئی بچا نہیں سکے گا۔

اس استدراج کے حوالے سے ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے وہ یہ کہ جس طرح استدراج کفار کے ساتھ ہوتا ہے جس کی تفصیل ابھی آپ نے پڑھی اسی طرح استدراج مسلمان گناہ گاروں کے ساتھ بھی ہوتا ہے جو اسی مرض کا شکار ہوتے ہیں جس مرض نے کافروں کو ان کے انجام تک پہنچایا وہ یہ ہے کہ جب ایک مسلمان، مسلمان کہلاتے ہوئے بھی اسلامی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلام سے سرکشی اور بغاوت میں بسر ہوتی ہے وہ فرائض کا تارک' واجبات سے لاپرواہ' حقوق العباد سے یکسر بے نیاز' حلال و حرام کی پابندیوں سے لاتعلق، اس کے ذہن پر صرف دنیا اور دولتِ دنیا کا بھوت سوار ہوتا ہے اور اسی میں شب و روز لگے رہنا اس کی زندگی کا معمول بن جاتا ہے ایسے لوگوں کے لئے استدراج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پکڑنے کی بجائے ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں وہ رشوت لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے رشوت کے اسباب اور پیدا فرما دیتے ہیں وہ ظلم کرتے ہیں تو اللہ ان کی رسی کھلی چھوڑ دیتا ہے ان کے عہدہ و منصب میں اور ترقی دے دیتا ہے وہ اپنی اس حالت میں ایسے سرشار اور گم ہو جاتے ہیں کہ کوئی نصیحت کی بات ان پر اثر نہیں کرتی ان کی اس حالت کا برقرار رہنا بلکہ روز افزوں ترقی ہونا یہ وہ استدراج ہے جس کے پھندے میں پھنس کر شائد ہی کوئی بدقسمت نکل سکا ہو۔ چنانچہ اسی کو محسوس کرتے ہوئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور سلف صالحین جب یہ دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ انہیں

Marfat.com

دنیا کی نعمتیں فراوانی سے عطا فرما رہا ہے تو وہ اللہ سے پناہ طلب کرنے لگتے اور اپنی حالت کا مسلسل جائزہ لینے لگتے کہ دولت کی یہ فراوانی اللہ کی جانب سے کہیں استدراج نہ ہو۔ اے کاش! امت مسلمہ کے سربر آوردہ لوگ اور طبقۂ امراء کے افراد کبھی اس طرف توجہ دینے کی زحمت کریں تو شائد ہماری قومی زندگی میں کچھ بہتری کے آثار پیدا ہو جائیں۔

اگلی آیت کریمہ میں قریش نے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو بے اثر کرنے کے لئے ایک اشغلاء چھوڑا تھا اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا سکتة مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ط اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ O

''کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا؟ کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو بس ایک کھلا ہوا ہوشیار کرنے والا ہے''۔ 184

نبی کریم ﷺ نے جب اہلِ مکہ کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کی تو شروع شروع میں تو قریشِ مکہ نے اسے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن رفتہ رفتہ جب اس دعوت نے نفوذ اختیار کرنا شروع کیا اور لوگ آہستہ آہستہ اس سے متاثر ہونے لگے اور ہر گھرانے اور خاندان میں یہ دعوت اپنے حامی پیدا کرنے لگی تو اب ان کو فکر ہوئی لیکن ان کے لئے مشکل یہ تھی کہ اس دعوت کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ اگرچہ نہایت بہترین عربی زبان جانتے تھے اور ان میں بڑے بڑے ادیب اور شاعر بھی پائے جاتے تھے اور ان کی فصاحت و بلاغت میں بھی کوئی شبہ نہ تھا لیکن قرآن کریم کے سامنے ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کی دل آویز شخصیت آپ کا بے عیب کردار آپ کی خاندانی وجاہت آپ کا زورِ بیان آپ کا دلوں میں اتر جانے والا اخلاق بجائے خود اپنے اندر بے پناہ دعوتی اثر رکھتا تھا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ جب آپ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تو چھوٹے بڑے اپنا دل تھام کر رہ جاتے قریش کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہم آخر اس دعوت کا راستہ کیسے روکیں آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں بھی قرآن پڑھا جائے اس کے قریب شور مچاؤ تاکہ لوگ قرآن کو سن نہ سکیں اور جہاں حضور ﷺ دعوت پیش کریں اس کا تمسخر اڑاؤ تاکہ لوگ اسے سنجیدگی سے لینے کے بجائے محض ایک مذاق سمجھیں لیکن جب اس کے باوجود بھی دعوت کے اثرات رکنے کی بجائے مزید آگے بڑھنے لگے تو اب انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد آنحضرت ﷺ کی ذات کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ آپ ﷺ کو ساحر یعنی جادوگر کہا گیا لیکن جب یہ بات نہ چل سکی تو پھر آپ ﷺ کو مجنون اور دیوانہ کہا جانے لگا۔

قرآن کریم نے ان کے اس الزام اور ان کی اس حرکت کا نہایت سنجیدگی اور دلیل کے ساتھ جواب دیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس جواب کو واضح کروں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ آنحضرت ﷺ کو کس بنیاد پر مجنون اور پاگل قرار دیتے تھے یا یہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ میں جنون کے آثار پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی آپ سے اس کا اظہار بھی ہونے لگتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن کریم نے دو باتوں کی طرف راہنمائی کی ہے پہلی بات یہ کہ قریش دیکھ رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ ان کے سامنے جو دعوت پیش کر رہے ہیں وہ کسی طرح بھی اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں حضور جیسے جیسے دعوت میں تیزی پیدا کرتے جا رہے ہیں ویسے ویسے قریش کی جانب سے مخالفت میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ حضور یا تو مایوس ہو کر دعوت بند کر دیتے اور یا دعوت کی تیزی میں کمی کر دیتے لیکن آپ نے اس کے بالکل برعکس دعوتی کوششوں میں اضافہ فرما دیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اب آپ صرف دعوت ہی پیش نہیں فرماتے تھے بلکہ یہ وارننگ بھی دیتے تھے کہ اگر تم نے میری دعوت کو قبول نہ کیا تو یاد رکھو تمہارا انجام وہی ہوگا جو اس سے پہلے قومِ عاد و ثمود کا ہو چکا ہے تم دنیا میں ہی اللہ کے عذاب کی گرفت میں آجاؤ گے اور اگر پروردگار نے تمہیں مزید ڈھیل دے بھی دی تو قیامت کے عذاب سے تم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ آپ کا تمام مخالفتوں اور اذیتوں کے باوجود نہایت ہمدردی، غم گساری اور جان کاہی کے ساتھ ایک ایک شخص تک دعوت

Marfat.com

پہنچانا اور اس کے اذیت ناک رویے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خون جگر پی پی کر راہِ راست پہ لانے کی کوشش کرنا یہ ایک ایسا طرزِ عمل تھا جو ایک طرف اگر قریش کے لئے ناقابلِ فہم تھا تو دوسری طرف عام افراد کے لئے اثر انگیز تھا ایک خالی الذہن آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ یہ ہمارے شہر کا ایک عالی نسب شخص جسے ہم سے کوئی غرض نہیں وہ ہم سے کسی معاوضہ کا طالب نہیں وہ محض ہماری بھلائی کے لئے جس طرح دکھ اٹھا اٹھا کر اور ٹوٹ ٹوٹ کر ہماری ہدایت کے لئے کوششیں کر رہا ہے آخر اس میں کوئی تو صداقت ہوگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ لوگ آنحضرت ﷺ کے اس رویہ کے باعث پہلے سوچنے پر مجبور ہوتے اور پھر ایمان کی طرف بڑھنے لگتے۔ قریش کو اس صورتِ حال نے پریشان کر دیا کہ آخر لوگوں کو اس دعوت کے اثر سے کیسے بچایا جائے انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ دیکھو تم محمد ﷺ کی دل آویز شخصیت اور اس کے خیر خواہانہ رویے پر نہ جاؤ بلکہ یہ دیکھو کہ وہ جس طرح بار بار تمہیں عذاب سے ڈرا رہا ہے اور کبھی آنے والی قیامت کی خبریں دیتا ہے اور پھر تم ہزار انکار کرو وہ کبھی اپنی بات کہنے سے نہیں رکتا۔ کسی عقلمند آدمی کا یہ رویہ تو نہیں ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس بات کا فوبیا ہو گیا ہے اور اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے اور اس نے ایک جنون کی شکل اختیار کر لی ہے وہ اپنی ذات میں چاہے کتنا ہی عظیم سہی لیکن بڑے بڑے لوگ بھی بعض دفعہ اختلالِ دماغ یا وہم کا شکار ہو جایا کرتے ہیں چنانچہ یہ بھی ایسے ہی کسی عارضہ میں مبتلا ہے جو باتیں وہ محض اپنے جنون کی وجہ سے کہہ رہا ہے تم اسے چنداں اہمیت نہ دو اور مجنون سمجھ کر اس کی بات کو ٹال دو اس طرح قریش نے وقتی طور پر آنحضرت ﷺ کی دعوت کو بے اثر کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کریم نے دو باتیں اس سلسلے میں ارشاد فرمائی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ تم جس شخص کے بارے میں جنون کا الزام لگا رہے ہو وہ کوئی اجنبی آدمی تو نہیں کسی دوسرے ملک یا کسی دوسرے شہر سے تو نہیں آیا وہ کسی دور کے خاندان سے تعلق بھی نہیں رکھتا تمہارے اپنے شہر کا رہنے والا ہے' تمہارے ہی قبیلے قریش کا ایک معزز فرد ہے' تمہارے سامنے اس کا بچپن' اس کا لڑکپن' اس کا بے داغ شباب گزرا تم ہمیشہ اس کے بے داغ کردار' اس کی اصابت رائے' اس کی سلامت روی' اس کی صداقت شعاری' اس کی بے غرضی' اس کی پاک بازی اور اس کی دانش و بینش کی پختگی کے ہمیشہ گواہ رہے ہو وہ جوان تھا تو تمہارے بڑے بوڑھے اپنے جوان بیٹوں کو اس کا حوالہ دے دے کر سمجھایا کرتے تھے' بنی ہاشم اس کی ذات اور اس کے طور اطوار پر فخر کیا کرتے تھے وہ عملی زندگی میں داخل ہوا اور تجارتی اسفار کئے تو اس کی تجارت کی دھوم مچ گئی اور اسی شہرت کی وجہ سے حضرت خدیجہ ؓ نے اپنا مال تجارت لے جانے کے لئے ان سے درخواست کی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تعمیر کعبہ کے وقت تم میں اس بات پر اختلاف پیدا ہوا کہ حجر اسود کو کون اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کرے؟ یہ چونکہ ایک یادگار بن جانے والا عمل تھا اور اس کے سبب سے ایک افتخار اور اعزاز ملنے والا تھا تو اس لئے ہر قبیلہ کے سردار کی خواہش تھی کہ یہ عزت میرے حصے میں آئے چنانچہ جب سب نے اسے حاصل کرنے پر اصرار کیا تو نوبت خون ریزی تک پہنچ گئی قریب تھا کہ تلواریں بے نیام ہو جاتیں کہ کسی نے مشورہ دیا کہ تم یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دو اور اس بات پر راضی ہو جاؤ کہ صبح سب سے پہلے جو شخص حرم میں داخل ہو اسے منصف بنا لیا جائے اور اس کے فیصلے کو قبول کر لیا جائے۔ چنانچہ صبح کے وقت اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ رسول ﷺ سب سے پہلے حرم میں داخل ہوئے آپ کو دیکھ کر تمام سردارانِ قریش خوشی سے چیخ اٹھے کہ الامین آ گیا اور الصادق آ گیا ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں چنانچہ آپ نے نہایت تدبر کا ثبوت دیتے ہوئے ایک ایسا فیصلہ کیا جس سے تمام سردارانِ قریش کو برابر کی عزت ملی اور ایک بڑا خطرہ جو بہت بڑا فتنہ بن سکتا تھا ٹل گیا۔ آپ نے اپنی چادر زمین پر بچھائی اس پر حجر اسود رکھا فرمایا کہ تمام سردار چادر کے پلو پکڑ کر اوپر اٹھائیں جب حجر اسود اتنا بلند ہو گیا کہ اسے اٹھا کر اپنی جگہ پر نصب کیا جا سکتا تھا تو آپ نے خود اٹھا کر اسے نصب فرما دیا۔ کہنا یہ ہے کہ جس ذات عزیز کے بارے میں نبوت سے پہلے تمہارے یہ تصورات تھے کہ تم اس کے سیرت و کردار اور اس کی اصابتِ فکر کے بارے میں دو رائے نہیں رکھتے تھے بلکہ پورا مکہ بیک زبان اس کی عقل و دانش کا معترف اور اس کے بے داغ سیرت و کردار کا گواہ تھا آج آخر ایسی بات کیا ہو گئی ہے کہ تم

Marfat.com

نے اس کو مجنون قرار دینا شروع کر دیا ہے۔ تمہارا یہ رویہ خود اس بات کا گواہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دماغ میں تو کوئی جنون نہیں البتہ تمہاری نیت میں فتور ضرور ہے۔

رہی یہ بات کہ تمہاری ساری مخالفتوں اور اذیتوں کے باوجود حضور ﷺ اپنی دعوتی کاوشوں میں کمی کرنے کی بجائے روز بروز اضافہ فرماتے جارہے ہیں تم ان سے بدسلوکی کرتے، گالیاں بکتے اور مذاق اڑاتے ہو اور ہر ممکن طریق سے ان کی دعوت کو بے اثر کرنے کی کوشش کرتے ہو لیکن ان کے اندر کوئی منفی رویہ پیدا نہیں ہوتا جس طرح ایک ماں اپنے بگڑے ہوئے بچہ کی بدتمیزیاں دیکھ کر ناراض ہونے کی بجائے آنکھوں میں آنسو بھر کر پھر اسے پکار کے اور سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ بھی ان کی ساری بدتمیزیوں کے باوجود اپنی اصلاحی کوششوں کو کسی طرح بھی روکنے کو تیار نہیں ہوتے تھے تو اس کا سبب کوئی جنون نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نذیر مبین بنا کر بھیجا ہے۔ عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ کسی طرف سے خطرہ محسوس کرتے تھے کہ شائد رات کی تاریکی یا ہماری غفلت میں فلاں قبیلہ ہم پر حملہ کر دے تو اس قبیلے سے آگاہ رہنے کے لئے کسی شخص کو مقرر کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ کسی بلند جگہ سے اس قبیلہ کی نگرانی کرے اور جب بھی اسے خطرہ کا احساس ہو وہ اپنی قوم اور اپنے قبیلے کو فوراً آگاہ کرے۔ چنانچہ جب اسے خطرہ کا یقین ہو جاتا اور وہ دیکھتا کہ فلاں قبیلہ ہم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو وہ کپڑے پھاڑ کر چیختا ہوا اپنی قوم کی طرف بھاگتا اور انہیں آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیتا قوم چونکہ اس سے بے خبر ہوتی لیکن یہ خبردار کرنے والا چونکہ اس خطرہ کو دیکھ چکا ہوتا اس لئے اپنی ساری صلاحیتیں اپنی قوم کو بچانے کے جذبے سے بروئے کار لاتا' چیختا چلاتا جو بھی اس سے ہوسکتا وہ قوم کو اس خطرے سے بچانے اور خبردار کرنے کے لئے کر گزرتا ایسے شخص کو عرب نذیر عریان یعنی برہنہ خبردار کرنے والا کہتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کے اسی تصور کے حوالے سے انہیں بتلایا ہے کہ ہمارے پیغمبر کی تمہارے لئے بے چینی اور بے کلی صرف اس لئے ہے کہ وہ نذیر مبین یعنی کھلا کھلا ڈرانے والا اور خبردار کرنے والا ہے۔ وہ جن خطرات سے تمہیں آگاہ کر رہا ہے جس عذاب سے تمہیں ڈرا رہا ہے جس آنے والی قیامت سے تمہیں ہوشیار کر رہا ہے یہ اس کے لئے دیکھی بھالی حقیقتیں ہیں وہ ان خطرات کا پوری طرح یقین رکھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ اگر تم نے غفلت نہ چھوڑی اور ان خطرات سے بچنے کی کوشش نہ کی تو آخر تم تباہ ہو جاؤ گے ہونا تو یہ چاہیے کہ تم اس کے اس خیر خواہانہ جذبے اور اس کے ہمدردانہ رویے کی قدر کرو اور اس کی دعوت کو قبول کر کے اپنی زندگی بنالو لیکن تم نے اس کی بجائے اسے مجنون کہنا شروع کر دیا ہے ہر پیغمبر اللہ کی جانب سے جب مبعوث ہوتا ہے تو وہ اللہ کی جانب سے ان صفات کا حامل ہو کر آتا ہے اور آنحضرت ﷺ تو تمام صفاتِ نبوت کے جامع تھے اور آپ نے جب عام دعوت کا آغاز کیا ہے تو اس کے لئے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے اس میں اسی حقیقت کا اظہار کیا گیا تھا آپ نے کوہِ صفا کی بلندی پر چڑھ کر تمام قبائل کو پکارا لوگ جب پہاڑ کے دامن میں جمع ہو گئے تو آپ نے سب سے پہلے ان سے یہی بات پوچھی کہ اے آلِ غالب تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے؟ تم مجھے ایک سچا آدمی سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ جب سب نے آپ کی سچائی کا اقرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم واقعی مجھے ایک سچا آدمی سمجھتے ہو تو میں تمہیں اگر یہ کہوں

کہ فوج گراں پشتِ کوہِ صفا پر پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر

تو بتاؤ تمہارا کیا جواب ہوگا؟

کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے
کہا گر مری بات یہ دل نشیں ہے تو سن لو خلاف اس میں ہرگز نہیں ہے
کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

Marfat.com

اس میں آپ غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ ایک بلند جگہ پر کھڑے ہیں اور تمام لوگ پستی میں بیٹھے ہیں اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ میں نبوت کے بلند مقام سے بول رہا ہوں جس سے میں سامنے بھی دیکھ رہا ہوں اور پیچھے بھی۔ تم اس پہاڑ کے پیچھے کچھ نہیں دیکھ سکتے میں تمہیں دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ کوئی حملہ آور ہے کہ نہیں۔ چنانچہ زندگی کے اس پہاڑ کے پیچھے دیکھ کر میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ قافلہ یہاں سے ایک نہ ایک دن چلا جائے گا یعنی سب کو ایک نہ ایک دن موت کا شکار ہونا ہے اور اس کے بعد اللہ کے روبرو حاضری ہوگی۔ حاصل کلام یہ کہ آنحضرت ﷺ چونکہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ آپ اللہ کی جانب سے جس عظیم منصب پر فائز ہوئے ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ نبی جو بات کہتا ہے وہ پورے یقین سے اور دیکھ کر کہتا ہے اس لئے جب لوگ اس کی بات کو قبول نہیں کرتے تو اس کی بے چینی اور بے کلی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے وہ دیکھ رہا ہوتا ہے خطرہ ان کے سر پر کھڑا ہے اور اگر انہوں نے اس کی فکر نہ کی تو یہ خطرے کا شکار ہو جائیں گے وہ جیسے جیسے انکار کرتے ہیں یہ ویسے ویسے خطرے کو محسوس کر کے بے چین ہوتا جاتا ہے۔ قریشِ مکہ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ حضور ﷺ کی یہ بے چینیاں اس لئے نہیں ہیں کہ آپ پر جنون کا اثر ہے بلکہ اس لئے ہیں کہ آپ کو اللہ نے نذیرِ مبین بنا کر بھیجا ہے۔

دوسری بات جس سے قریشِ مکہ کی مخالفت اور آپ کو مجنون کہنے کی حقیقت واضح ہوتی ہے اس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝

"کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام اور ان چیزوں پر غور نہیں کیا جو خدا نے پیدا کی ہیں۔ اور اس بات پر کہ کیا عجب کہ ان کی اجل قریب آ گئی ہو تو اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے"۔ 185

ایک دوسرے پہلو سے جنون کی تردید:

گزشتہ آیت سے یہ بات ہمیں معلوم ہو گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے اہل مکہ کی ایک ہر دلعزیز شخصیت تھے آپ کی دانش و بینش، آپ کی اصابت رائے اور معاملہ فہمی پر سب کو بھروسہ تھا اور آپ کی شخصیت کا ہر پہلو دوسروں کے لئے نمونہ کی حیثیت رکھتا تھا اور کبھی کسی نے چالیس سالہ زندگی میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ آپ کو کوئی جنون بھی لاحق ہے لیکن نبوت کے بعد جیسے جیسے دعوت آگے بڑھتی گئی ویسے ویسے مشرکینِ مکہ کی جانب سے نئے نئے اتہامات تصنیف ہونے لگے انہیں میں سے ایک تہمت یہ بھی تھی کہ آپ پر جنون کا اثر ہو گیا ہے اور آپ جنون کے تحت الٹی سیدھی باتیں کرتے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جس بات کی انہیں دعوت دے رہے تھے اور جو حقائق ان کے سامنے منکشف فرما رہے تھے اور جس انجام سے انہیں خبردار کر رہے تھے وہ ان کے لئے انہونی اور ناقابلِ فہم باتیں تھیں۔ بجائے اس کے کہ وہ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے انہوں نے آنحضرت ﷺ پر جنون کا الزام لگا کر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی بھی کوشش کی اور لوگوں کو بھی آپ کی دعوت کے اثر سے بچانا چاہا۔ قرآن کریم اس آیت کریم میں توجہ دلا رہا ہے کہ کیا یہ لوگ زمین و آسمان کے ملکوت اور اللہ کی مخلوقات میں غور نہیں کرتے اگر انہوں نے غور کیا ہوتا تو آنحضرت کی دعوت کو کبھی جنون کا نتیجہ قرار نہ دیتے کیونکہ آپ کی دعوت کی ایک ایک بات اور آپ کی تعلیمات کا ایک ایک پہلو ایسا ہے جس پر کائنات کا گوشہ گوشہ گواہ ہے اور ہر چھوٹی بڑی مخلوق اس کی منہ بولتی شہادت ہے۔ اس آیت کریمہ میں ملکوت کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لفظ کے دو معنی کئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ یہ ملک کے معنی میں مبالغہ کا صیغہ ہے اس کا معنی ہے ملکِ عظیم۔ اور دوسرا معنی ہے زمین و آسمان کا نظام اور اس کا بندوبست، دونوں حوالوں سے توجہ دلائی جا رہی ہے کہ کائنات کی وسعتوں کو دیکھو اور پھر اس بات پر غور کرو کہ یہ ساری کائنات اللہ کا ملک اس کی سلطنت اور اس کی زیرِ انتظام ہے۔ آسمان میں بے شمار کرے ہیں جو اللہ کے حکم کے

Marfat.com

تحت مصروف حرکت ہیں زمین و آسمان میں بے شمار مخلوقات ہیں جن میں سے بعض کو ہم جانتے ہیں اور بیشتر کو نہیں جانتے پھر اس پوری کائنات میں حکمت کا ایک خزانہ ہے جو غور و فکر کرنے والوں کے لئے اپنی آغوش کھولتا ہے اس میں بے شمار قوتیں کار فرما ہیں جو اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دینے میں ہر طرح کی کوتاہی سے مبرا ہیں ایک ایک مخلوق ایک ایک کرہ ایک ایک سیارہ ایک ایک پودا ایک ایک عنصر اپنی اپنی جگہ مصروف عمل ہے اور مجال نہیں کہ کوئی اپنے عمل میں سرتابی کرے سورج نے آج تک چمکنے سے انکار نہیں کیا، چاند نے دمکنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، ستارے جھلملانے سے کبھی نہیں رکے، چشموں نے ابلنے سے، آبشاروں نے گرنے سے، دریاؤں نے بہنے سے، زمین نے قوتِ روئیدگی کو بروئے کار لانے سے، پانی نے پیاس بجھانے سے، خوراک نے بھوک مٹانے سے، آگ نے جلانے سے اور برف نے ٹھنڈک پہنچانے سے کبھی دریغ نہیں کیا، پھر ان میں بے شمار مخلوقات ایسی ہیں جو اپنے خواص و افعال میں ایک دوسرے کے متخالف اور متضاد ہیں۔ بایں ہمہ! وہ اپنے مفوضہ فرائض انجام دینے میں باہم دگر موافق اور معاون ہیں۔ کائنات کی اس پوری صورتحال کو اگر سامنے رکھا جائے تو چند باتیں ہیں جو نمایاں دکھائی دیتی ہیں صاف نظر آتا ہے کہ اس کائنات کا جس طرح ایک خالق ہے اسی طرح وہ اس کائنات کا مالک و حاکم بھی ہے کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کی ملکیت اور حاکمیت کے تحت زندگی بسر کر رہا اور اپنے فرائض انجام دینے کا پابند ہے اور دوسری یہ بات کہ اس حاکم مطلق نے ان میں سے ہر مخلوق کے مقاصدِ زندگی متعین کر دیئے ہیں اور انہیں اس بات کا حکم دے دیا گیا ہے کہ تم جب تک زندہ ہو تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی زندگی اور وجود کے مقاصد کو اللہ کے قانون کے مطابق انجام دیتے رہو اور تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس پوری کائنات کی زندگی کا دارومدار اسی اطاعت اور بندگی پر ہے جب تک وہ اللہ کے قانون کے فرماں بردار ہیں اس وقت تک ان کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر ان میں سے ایک کرہ بھی اپنے محور سے باہر نکل جائے یا اپنی رفتار کو بدل لے یا اپنی سمت سفر تبدیل کر لے تو ایک ہمہ گیر تباہی ان کا مقدر بن کر رہ جائے گی تو اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم اس کائنات میں غور کرو اس کی ایک ایک مخلوق کو دیکھو کیا یہ ساری باتیں تمہیں اسے دیکھ کر خود بخود سمجھ نہیں آ رہیں اور اگر یہ باتیں واقعی کائنات کے ایک ایک ذرے سے نمایاں ہیں تو پھر پیغمبر تمہیں ایسی کونسی بات کہتا ہے جسے تم جنون کی علامت سمجھتے ہو وہ تمہیں یہی بات تو سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر کائنات کی ایک ایک مخلوق اللہ کی ملکیت اور اس کی اطاعت کی پابند ہے تو تم تو کائنات کے گلِ سر سبد ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ تم اللہ کی ملکیت سے نکل جاؤ اور اسکی اطاعت سے انحراف کا رویہ اختیار کر لو جب کہ پوری کائنات اس کی بندگی میں جکڑی ہوئی ہے اور پھر یہ بات بھی کہ جب کائنات کی ایک ایک چیز کا مقصدِ زندگی متعین کیا جا چکا اور وہ اپنے اپنے مقصد کو بروئے کار لانے میں لگے ہوئے ہیں اور اسی میں ان کی زندگی کا راز مضمر ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو اور تم اگر اس مقصد کا انجام دینے سے انکار کر دو اور تمہیں اس سے خبردار کیا جائے کہ اس کے نتیجے میں تم پر عذاب بھی آ سکتا ہے تو تم اس کو جنون کا نتیجہ سمجھو ذرا اندازہ کرو کہ اس میں جنون کی کیا بات ہے کائنات کی ایک ایک چیز نے تو فطری الہام سے اپنے مقصد کو پا لیا لیکن تم پر اللہ کا یہ خاص احسان ہے کہ اس نے تمہیں مقصد زندگی سمجھانے کے لئے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں اب بجائے اس کے کہ تم شکر گزاری کا ثبوت دیتے رہو آگے بڑھ کر اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ تم بجائے اپنے جنون کے علاج کے اسے جنون کا مریض قرار دے رہے ہو۔

تمہارے پاس سواری کے جانور ہیں، دودھ دینے والے جانور ہیں، بار برداری کے جانور ہیں، انہیں فطرت اور جبلت کے ذریعے یہ بات بتا دی گئی ہے کہ انسان تمہارا حاکم ہے اس کی خدمت انجام دینا تمہاری زندگی کا مقصد ہے انہوں نے جبلت کی راہنمائی قبول کرتے ہوئے اپنے مالک اور حاکم کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی اور زندگی اسی مقصد کو انجام دیتے ہوئے گزار دی اور تم رات دن ان سے یہی خدمت لے بھی رہے ہو لیکن تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ان جانوروں نے تو اپنے مالک اور حاکم کو پا لیا اور اپنے مقصد زندگی کو انجام دینے میں جت گئے لیکن ہمارا بھی کوئی حاکم اور مالک ہو گا اور ہماری زندگی کا بھی کوئی مقصد ہو گا کیا ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے یہی بات پیغمبر بار بار تمہیں سمجھا رہا ہے لیکن تم یہ بات سمجھنے کی بجائے اسے دیوانہ

Marfat.com

قرار دیتے ہو۔ مزید فرمایا کہ تم کائنات کی ایک ایک مخلوق پر غور کرو تم دیکھو گے کہ ہر چیز کی ایک ابتداء بھی ہے اور انتہاء بھی اور قدرت نے ہر مخلوق کی ایک اجل یعنی وقتِ مقرر طے کر رکھا ہے جب اس کی زندگی کا سفر ختم ہو جاتا ہے بالکل اسی قانون کے تحت انسانوں کی بھی ایک اجل ہے جس پر وہ موت کا شکار ہوتے ہیں اسی بنیاد پر پیغمبر یہ بات سمجھاتے ہیں کہ جس طرح ہر مخلوق اور خود انسان کی ایک اجل ہے کہ ایک ایک شخص اپنے وقت پر دنیا سے جا رہا ہے۔ یاد رکھو! اسی طرح اس پوری کائنات کی بھی ایک اجل ہے اور اس کے سفر کی ایک انتہاء ہے جب وہ اجل اور انتہاء آ جائے گی تو پھر پوری کائنات تباہی کا شکار ہو جائے گی اسی کو قیامت کہتے ہیں۔ لیکن یہ تباہی کائنات کی اصل انتہاء نہیں بلکہ اس کے بعد پھر ان مخلوقات کو زندہ کیا جائے گا جنہیں اللہ کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے جن میں سب سے پیش پیش یہ حضرت انسان ہے یہ باتیں اس قدر واضح ہیں کہ معمولی غور و فکر سے انسانی عقل اگر سمجھنا چاہے تو سمجھ سکتی ہے اور یہی وہ باتیں ہیں پیغمبر جن کی تبلیغ اور تفہیم کرتا ہے۔ چنانچہ ان حقائق کی طرف توجہ دلانے کے بعد ارشاد فرمایا اے مشرکینِ مکہ! تمہیں اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ ممکن ہے تمہاری اجل بھی قریب آ گئی ہو یہ اجل انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ انفرادی اس طرح کہ ایک ایک فرد اپنے اپنے وقت پر موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے تو اے اہلِ مکہ تم میں سے بھی ہر فرد موت کے نشانے پر ہے کوئی پتہ نہیں کب کس کی باری آ جائے اس لئے بجائے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو ناکام کرنے کے اپنے انجام کی فکر کرو تم میں سے جس کا وقت آ گیا اس کی مہلتِ عمل تو ختم ہو گئی یہ موت سے بے فکری ہی تمام گمراہیوں کی جڑ ہے اگر تم میں ہر شخص کو اس کا احساس ہونے لگے کہ میں موت کی طرف بڑھ رہا ہوں نہ جانے کب بلاوا آ جائے تو وہ ان خرمستیوں سے ضرور رک جائے جس میں تم مبتلا ہو اور ضرور سنجیدگی سے اللہ کے نبی کی دعوت پر غور کرنے لگے۔

اجتماعی اجل یہ ہے کہ اگر تم اپنے رویے سے باز نہیں آتے ہو اور آنحضرت ﷺ کی دعوت پر کسی طرح بھی توجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہو تو پھر سوچ لو کہ تمہارا انجام بھی کہیں وہ نہ ہو جو قوم عاد اور قوم ثمود کا ہو چکا ہے۔ انہیں بھی بار بار سمجھایا گیا کہ جب کوئی رسول کسی قوم کی طرف دعوت لے کر آتا ہے تو اس قوم کی زندگی کا دارومدار اس دعوت کے قبول یا عدمِ قبول پر ہوتا ہے اگر وہ قبول کر لیتی ہے تو سرفراز ہوتی ہے اور قبولیت میں تاخیر کرتی ہے تو اسے مہلت دی جاتی ہے لیکن جب مکمل طور پر رد کر دیتی ہے تو پھر اس کی وہ اجل آ پہنچتی ہے جس پر وہ اللہ کے عذاب کا شکار ہو جاتی ہے یہاں بھی یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اے اہلِ مکہ ممکن ہے کہ وہ تمہاری اجتماعی اجل قریب آ چکی ہو اور تمہارا آخری فیصلہ ہونے والا ہو اور تمہاری مہلتِ عمل اپنے انجام کو پہنچنے والی ہو۔ اگر واقعی ایسا ہو گیا تو پھر بتاؤ اس کے بعد کیا ہو گا؟ عذاب کے آ جانے کے بعد تو کسی کو ایمان لانے کی مہلت نہیں ملتی وہ ایمان کا اظہار بھی کرے تو قبول نہیں کیا جاتا تم اگر اسی اجل کے انتظار میں ہو تو اس کے آ جانے کے بعد تو سارا معاملہ ختم ہو کر رہ جائے گا اس لئے اس سے پہلے پہلے موقع ہے کہ اپنے آپ کو بچا لو اور اللہ کے انعامات کے مستحق بن جاؤ۔

اگلی آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے لئے تسلی بھی ہے اور مشرکین مکہ کے لئے آخری وارننگ بھی۔ ارشاد فرمایا:

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ O

''جن کو اللہ گمراہ کر دے ان کے لئے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ وہ ان کو ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے''۔ 186

آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی اور مشرکین کو وارننگ:

آنحضرت ﷺ کی مسلسل اور بے پناہ تبلیغی کاوشوں کے باوجود بھی جب مشرکین مکہ ایمان نہیں لاتے تھے تو آپ پر سخت انقباض کی کیفیت طاری ہوتی آپ نہایت مضمحل اور پریشان ہو جاتے اور کبھی کبھی آپ کو یہ فکرمندی ہوتی کہ شائد میری اور میرے ساتھیوں کی تبلیغی مساعی میں کوئی کمزوری ہے

Marfat.com

جس کی وجہ سے لوگ ایمان قبول نہیں کر رہے اس احساس کے ساتھ آپ کی پریشانیوں میں اور اضافہ ہو جاتا یہاں آپ کو اور مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لا رہے تو اس میں کسی کوتاہی کا دخل نہیں آپ نے اپنا فرض ہمت سے بڑھ کر ادا کیا ہے لیکن ہدایت وضلالت کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے وہ نہ چاہے اسے کوئی دوسرا ہدایت نہیں دے سکتا اور مزید یہ بات بھی کہ اللہ کسی کو نہ بے سبب ہدایت دیتا ہے اور نہ بے سبب گمراہ کرتا ہے اس نے ایک قانون نافذ کر رکھا ہے کہ جو آدمی اپنے فہم وشعور کو استعمال کر کے ہدایت اختیار کرنے کے لئے بڑھے گا میں اس کے لئے اسباب مہیا کر دوں گا وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا جائے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسانیاں فراہم کرتا جائے گا اسی طرح جو آدمی گمراہی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور اللہ کی عطا کردہ فہم وشعور کی قوتوں کو بروئے کار لا کر ہدایت قبول کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اس کا سفر الٹی سمت میں جاری رہتا ہے تو وہ اللہ کے اس قانون کے تحت ہدایت سے محروم کر دیا جاتا ہے وہ جیسے جیسے ہدایت سے دور ہٹتا جاتا ہے پروردگار اس کے لئے اور دوریاں پیدا فرماتے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ زبردستی کسی کو نہ ہدایت دیتے ہیں نہ گمراہ کرتے ہیں۔ آدمی اپنی آزادی اور سوچ سمجھ کے ساتھ جو راستہ اختیار کرتا ہے قدرت اسی راستے کے لئے اس کی مدد کرتی ہے چنانچہ یہاں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ انہوں نے اگر سرکشی اور روگردانی کو اپنا رویہ بنا لیا ہے تو آپ پریشان نہ ہوں یہ اللہ کے قانون کی گرفت میں آ چکے ہیں اس لئے اب ہدایت انہیں نصیب نہیں ہو سکتی اور جسے اللہ ہدایت نہ دے اسے دنیا میں اور کوئی شخص ہدایت نہیں دے سکتا اور ایک طرح سے مشرکین مکہ کو وارننگ بھی دی جا رہی ہے کہ ہم نے تمہیں اگرچہ مہلت دے رکھی ہے لیکن یہ مت سمجھو کہ اس مہلت سے کوئی فائدہ اٹھا سکو گے کیونکہ تمہاری بھلائی اور عاقبت کا دارومدار تمہارے اپنے رویے کی اصلاح پر ہے اگر تم اصلاح کی کوشش نہیں کرو گے تو تمہاری محرومی کا فیصلہ کر دیا جائے گا اس کے بعد تم ہر طرح کی ہدایت کے امکان سے محروم ہو جاؤ گے۔ پروردگار تمہیں تمہاری سرکشی کے حوالے کر دے گا تم اندھوں کی طرح ٹامکٹوئیاں مارتے پھرو گے لیکن تمہارے لئے کوئی راستہ نہیں کھلے گا۔

اگلی آیت کریمہ میں مشرکین مکہ کے ایک سوال کا ذکر اور اس کا جواب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ج لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ O

"وہ تم سے قیامت کے بارے میں سوال کر رہے ہیں کہ کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت کہہ دیجئے کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا بوجھل ہیں اس سے آسمان اور زمین وہ تم پر بس اچانک ہی آدھمکے گی وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا اس کی تحقیق میں لگے ہوئے ہو۔ کہہ دو! اس کا علم تو بس اللہ کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے"۔ 187

ایک سوال اور اس کا جواب:

اسلامی تعلیمات کا تمام تر دارومدار تین بنیادی عقائد پر ہے توحید، رسالت، آخرت۔ مکی سورتوں میں خاص طور پر عقائد پر زور دیا جاتا ہے لیکن پیغمبر جب دیکھتا ہے کہ اس کی قوم سنجیدگی سے اللہ کے دین کی دعوت پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں تو پھر وہ کبھی انہیں اس انجام سے ڈراتا ہے جس انجام

Marfat.com

سے قوم عاد و ثمود جیسی معذب قومیں دوچار ہوئیں اور کبھی قیامت کی ہولناکیوں کو ان کے سامنے ذکر کرتا ہے وہ انہیں بار بار سمجھاتا ہے کہ تمہاری زندگی کا ایک مقصد ہے اور تم اس مقصد کے حوالے سے اللہ کے سامنے جواب دہ ہو یہ زندگی ہمیشہ رہنے کی نہیں ایک دن ایسا آئے گا جب سب کو قبروں سے اٹھا کر اللہ کی بارگاہ میں جوابدہی کے لئے پہنچا دیا جائے گا اس دن ہر نیک عمل کا اجر ملے گا اور ہر برائی کی سزا ملے گی تم نے اگر اس دن کی جوابدہی کے لئے آج تیاری نہ کی تو سوچ لو کل کو اللہ کے سامنے کیا جواب دے سکو گے۔ جوابدہی کا احساس ہی انسان کو بدلنے پر مجبور کر سکتا ہے اس لئے پیغمبر سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیتا ہے۔ کبھی انہیں موت کی یاد دلاتا ہے، کبھی برزخی زندگی کا حوالہ دیتا ہے، کبھی قیامت کے احوال کو ذکر کرتا ہے، کبھی میزان عمل کے حوالے سے ایک ایک عمل کی طرف توجہ دلاتا ہے، مقصود ان سب باتوں سے یہ ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب اپنی زندگی کے رویے پر غور کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ بھی قیامت اور آخرت پر سب سے زیادہ زور دیتے تھے اور بار بار لوگوں کو تنبیہ فرماتے تھے کہ لوگو! موت سر پر تلی کھڑی ہے اور موت کے ساتھ ہی تمہاری مہلت عمل اپنی انتہاء کو پہنچ جائے گی اب اس کے بعد تمہارے پاس ایمان و عمل کے لئے کوئی موقع نہیں ہو گا اس لئے خدا کے لئے ابھی سے اپنی زندگی کو بدلنے کا آغاز کر و نہ جانے کل کا دن تم لوگ دیکھ سکو گے کہ نہیں۔ تمہارا ایک ایک سانس تمہاری زندگی ختم کرتا جا رہا ہے کچھ خبر نہیں کہ کب آخری سانس لینے پر مجبور ہو جاؤ دنیا کی ہر چیز کو ختم ہونے کے لئے ایک وقت لگتا ہے لیکن انسانی زندگی کے ختم ہونے میں تو کوئی وقت نہیں لگتا پانی کا بلبلا ٹوٹتے بھی ایک وقت لیتا ہے لیکن سانس کے رکنے کی تو خبر بھی نہیں ہوتی۔ امام فخر الدین رازیؒ نے لکھا ہے کہ میں ایک دن بازار سے گزر رہا تھا ایک برف بیچنے والا شور مچا رہا تھا کہ لوگو! رحم کھاؤ اس شخص پر جس کا سرمایہ گھلتا جا رہا ہے، اگر تم نے یہ برف خرید لی تو میرے دام کھرے ہو جائیں گے اور نہیں خریدو گے تو برف کا یہ بلاک گھل گھل کر ختم ہو جائے گا۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ برف کا بلاک تو گھلتے گھلتے وقت لے گا اور اسے اس کے گھل جانے کی فکر کھائے جا رہی ہے اور عمر کے اس سرمایہ کے گھل جانے کی تو کوئی مدت نہیں ہر روز اس کا ایک دن کم ہو جاتا ہے۔ لیکن کب یہ ختم ہو کر رہ جائے اس کا کھٹکا تو ہر وقت لگا رہتا ہے لیکن ہم منٹوں، سیکنڈوں کو گزرتے دیکھ کر بھی کبھی اس پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتے کہ میرا سرمایہ گھلتا جا رہا ہے۔ اگر اچانک اس کے خاتمہ کی فکر نہ بھی ہو تو اس کا ہر منٹ کے ساتھ کم ہونا تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کاش! ہمیں اس کی ہی فکر ہوتی۔ پیغمبر یہی فکر پیدا کرنے کے لئے دنیا میں تشریف لاتے ہیں وہ بار بار اس طرف توجہ دلاتے ہیں۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم	رفتہ رفتہ لحظہ لحظہ دم بہ دم
سانس ہے اک رہروِ ملکِ عدم	دفعتاً اک روز یہ جائے گا تھم
ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے	کر لو جو کرنا ہے آخر موت ہے

مشرکینِ مکہ بجائے اس کے کہ آنحضرت ﷺ کی قیامت کی بار بار یاد دہانی کے نتیجہ میں اپنے انجام کے بارے میں فکر مند ہوتے انہوں نے اسے بھی ایک مذاق بنا لیا۔ قیامت کے تذکرہ سے مقصود تو یہ تھا کہ ہر آدمی کو اس بات کی فکر ہوتی کہ قیامت جب بھی آئے میرے لئے تو عمر کی ایک متعین مدت ہے جب وہ مدت ختم ہو گئی تو میری قیامت تو آ گئی کیونکہ اس کے بعد مجھے مزید کوئی عمل کرنے یا اپنی زندگی کی اصلاح کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ قبر میں بھی کیسی ہی لمبی انتظار کروں عمل سے تو بہر حال محروم رہوں گا۔ فیصلہ کن جگہ تو بہر حال قیامت کا محشر ہے۔ مجھے جو بھی وقت ملا ہے مجھے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔ مجھے اس بات سے تعرض نہیں ہونا چاہیے کہ قیامت کے آنے کا وقت کیا ہے وہ جب بھی آئے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن مشرکین مکہ نے اصل مقصد کو نظر انداز کر کے اس بات کو موضوعِ سخن بنا لیا کہ جس قیامت کے آنے کا آپ بار بار تذکرہ کرتے ہیں اگر اس کا آنا ایسا ہی یقینی

Marfat.com

ہے تو معلوم تو ہونا چاہیے کہ وہ کب آئے گی اور پھر یہ سوالات کوئی تحقیق کے لئے نہیں بلکہ تمسخر اڑانے کے لئے تھے خود "اَیَّانَ" کا لفظ ہی بتا رہا ہے کہ ان کے سوال کرنے کا انداز کیا تھا کیونکہ ایان محض وقت سے متعلق سوال کے لئے نہیں آتا بلکہ یہ ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی چیز سے متعلق استغراب اور استنکار مقصود ہوتا ہے پھر اس سوال کے بعد مرسٰها کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مرسیٰ جہاز وغیرہ کے لنگر انداز ہونے کو کہتے ہیں وہ مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ آپ جو بار بار قیامت کے آنے کی خبر دے رہے ہیں معلوم تو ہو کہ یہ جہاز آخر کہاں رک گیا ہے؟ اگر کہیں سے روانہ ہوا تھا تو کہیں اٹک کیوں گیا ہے؟ اس ساحل پر کب لنگر انداز ہوگا؟ آپ نے پروردگار کے حکم سے نہایت سنجیدگی سے اس کا جواب دیا کہ قیامت کے آنے کا وقت کیا ہے، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے، میں تو تمہیں اس کے آنے کی یقینی خبر دے رہا ہوں اور یہ یقین تمہارے اندر پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ قیامت جب بھی آئے وہ یقیناً آئے گی وہ آج بھی آسکتی ہے اور صدیوں بعد بھی۔ تمہارا کام اس کے وقت کا کھوج لگانا نہیں بلکہ اس کی تیاری کرنا ہے لیکن وہ بار بار آپ سے وقت ہی کے بارے میں استفسار کرتے تھے اور اس طرح پلٹ پلٹ کر پوچھتے تھے جیسے آنحضرت ﷺ کو اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ وہ قیامت کی کھوج، کرید اور جستجو میں لگے رہیں۔ اس لئے دو دفعہ اس بات کو دہرایا گیا کہ تم اصل حقیقت کو جاننے اور میری حیثیت پہچاننے کی کوشش کرو۔ اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ تمہارے لئے جوابدہی کا ایک دن مقرر کر دیا گیا ہے وہ جب بھی آئے تمہیں اس سے یقیناً سابقہ پڑے گا اور میری حیثیت یہ ہے کہ میں تمہیں ان صداقتوں سے آگاہ کروں جنہیں اللہ نے مجھ پر نازل کیا ہے اور اپنے قول وعمل سے تمہارے اندر یقین کی قوت پیدا کرنے کی کوشش کروں اور اس خطرے سے تمہیں آگاہ کروں کہ تم قیامت کے وقت کی کھوج کرید میں لگے ہوئے ہو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ جب آئے گی تو اس کا آنا اس قدر اچانک ہوگا کہ کوئی اپنے آپ کو بچانے کی تدبیر نہ کر سکے گا۔

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے بخاری اور مسلم میں ایک حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیامت کے دفعتاً اور اچانک آنے کے متعلق فرمایا کہ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں ابھی معاملہ طے نہ کر پائیں گے کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ ایک شخص اپنی اونٹنی کا دودھ دوھ کر ابھی استعمال نہ کر پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ کوئی شخص کھانے کا لقمہ ہاتھ میں اٹھائے گا ابھی منہ تک نہ پہنچے گا کہ قیامت برپا ہو جائے گی۔ اس لئے وقت کے تعین کی بجائے اس بات کی فکر کرو کہ جس قیامت کا آنا اس قدر اچانک ہے اس کی تیاری کے لئے کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

مزید اس آیت میں اس دن کی ہولناکی، اہمیت اور عظمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ حادثہ قیامت آسمانوں اور زمین پر بہت بھاری ہوگا کیونکہ آسمانوں اور زمینوں کے ٹکڑے ہو جائیں گے، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے، ہر چیز موت کا شکار ہو جائے گی۔ لیکن بعض اہل علم نے اس کی وضاحت ایک دوسرے انداز میں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بوجھل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گھڑی آسمان اور زمین میں ایک بوجھ بنی ہوئی ہے اس میں اس حقیقت کی طرف ایک تلمیح ہے کہ جس طرح ایک حاملہ عورت، ولادت کے قریب بارِ حمل سے گرانبار ہوتی ہے، اگرچہ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ولادت کا صحیح وقت کیا ہے لیکن ہر آنکھیں رکھنے والا دیکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ یہ عورت جنے گی اور بہت جلد جنے گی وہی حال قیامت اور عذاب کے معاملے میں آسمان وزمین میں غور کرنے والے ارباب بصیرت کا ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین کو اس بوجھ سے گرانبار دیکھتے ہیں اور اگرچہ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس بوجھ سے کب سبکدوش ہوں گے لیکن جس طرح ایک حاملہ اپنے آخری مرحلہ میں اپنے بوجھ سے سبکدوش ہونے کے لئے منتظر اور بے قرار ہوتی ہے، وہی بے قراری آسمان وزمین کے اندر نمایاں ہے۔ اس میں اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو آسمان وزمین کے اندر قیامت اور عذاب کی نشانیاں نظر نہیں آرہی ہیں ان کو گویا آخری مرحلہ میں پہنچی ہوئی حاملہ کا حمل نظر نہیں آرہا ہے۔ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً یعنی اس کے

Marfat.com

علامات وآثار دیکھو اور نبی کو دیکھ کر اس کے آنے کا یقین کرو اور اس کے لئے تیاری کرو، اس کا ظہور جب بھی ہوگا، اچانک ہوگا، اس کے صحیح وقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن اس کے وقت کے نہ جاننے سے اس کے واقع ہونے کی نفی نہیں ہو جاتی۔ ایک حاملہ کے متعلق ہر شخص یقین رکھتا ہے کہ وہ جنے گی اگرچہ یہ نہیں جانتا کہ وہ کس وقت جنے گی۔

اس رکوع کی گزشتہ آیات کے مفاہیم کا خلاصہ:

اس رکوع کی گزشتہ آیات پر اگر ایک اجتماعی نظر ڈالیں تو سب سے پہلے جو چیز نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ قوموں میں عقائد کا بگاڑ اور پیغمبر کی دعوت کو قبول نہ کرنا بلکہ شریعت اور دین کے حوالے سے الجھتے چلے جانا اس کا سب سے بڑا سبب اللہ کے نبی کی حیثیت کو نہ سمجھنا ہے اس لئے ان آیات میں مختلف پہلوؤں سے قوموں کی اس فکری گمراہی کا ازالہ کرنے کی سعیِ بلیغ کی گئی ہے۔ سب سے پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے کا نتیجہ پیغمبر کی خبر کے مطابق ہمیشہ سرافرازی رہا ہے اور اس کو رد کر دینے کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کبھی کچھ نہیں ہوا لیکن تم جو پیغمبر کی دعوت کو رد کرنے والوں کو خوشحال اور بظاہر سرافراز دیکھتے ہو یہ حقیقت میں وہ استدراج ہے جس میں پیغمبر کی دعوت کو قبول نہ کرنے والے مبتلا کر دیئے گئے ہیں وہ خود بھی فریب نظر کا شکار ہیں اور تم بھی اس کی حقیقت سمجھنے میں کوتاہی کر رہے ہو۔

دوسری آیت کریمہ میں مشرکین مکہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے کہ تم پیغمبر پر جنون کا الزام دھرتے ہو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم پیغمبر کی حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ انسان کے ساتھ گہری ہمدردی اور اللہ کی طرف سے ہونے والے فیصلوں پر بے پناہ یقین اور دعوت کے نتائج سے پوری طرح آگاہی کے باعث جس دل سوزی، جانکاہی اور غم گساری کا ثبوت دے رہے ہیں تم انہیں اللہ کی نعمت اور پیغمبر کا احسان سمجھنے کی بجائے جنون سمجھ رہے ہو تمہاری حیثیت بگڑے ہوئے بچوں سے مختلف نہیں جو ماں اور باپ کو اپنے بگاڑ پر روتے ہوئے دیکھ کر ان کے رونے کا سبب جاننے کی بجائے انہیں دیوانہ قرار دینے لگتے ہیں۔

تیسری آیت میں اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ پیغمبر کی بات تمہیں اس لئے بھی جنون کا نتیجہ دکھائی دیتی ہے کہ وہ جن حقائق کو حقیقتِ ثابتہ کے طور پر تمہارے سامنے نمایاں کرتا ہے تم جہالت اور خواہشاتِ نفس کے غلبہ کے سبب انکا ادراک کرنے سے عاجز رہ جاتے ہو حالانکہ وہ پیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں لیکن کوئی حقیقت بھی غور وفکر کے بغیر تو قوت ادراک میں نہیں آتی اور تم اپنی بدنصیبی سے غور وفکر سے محروم ہو چکے ہو اسکا نتیجہ یہ ہے کہ پیغمبر کی اصل پہچان اسکی دعوت اور اسکی تعلیمات ہی ہوتی ہیں اور تم انہیں کو نظر انداز کر کے پیغمبر کی حقیقی شناخت سے بے بہرہ رہ جاتے ہو اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان حقائق کو اگر تم نے اب بھی سمجھ کر زندگی بدلنے کی کوشش نہ کی تو پھر وہ موقع کب آئے گا جب تم راہِ راست اختیار کر سکو گے۔

چوتھی آیت میں نہایت حسرت کے انداز میں ایک طرح سے وارننگ دیتے ہوئے فرمایا کہ تم اپنی کرتوتوں سے اللہ کے قانون کی گرفت میں آتے جا رہے ہو اگر ایسا ہو گیا تو پھر تمہاری بدقسمتی اور گمراہی کا علاج کسی کے بس میں نہیں ہوگا۔

پانچویں آیتِ کریمہ میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نبی کی حقیقی معرفت نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہاری اصلاح کے لئے جو بنیادی تصورات پیش کر رہا ہے جس میں ایک اہم تر تصور قیامت کا واقع ہونا ہے تم اسے سمجھنے اور یقین کرنے کی بجائے اس بحث میں الجھ گئے ہو کہ ہمیں قیامت کے آنے کا وقت بتایا جائے حالانکہ پیغمبر تم میں یہ فکر پیدا کرنا چاہتا ہے کہ قیامت آئے گی اور تمہیں اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا پڑے گا اب بجائے

Marfat.com

اسکے کہ تم اس فکری مندی کے باعث اپنے اعمال کے اصلاح کی فکر کرو تم اسے بالکل نظر انداز کر کے اس بحث کے درپے ہو کہ وہ قیامت کب آئے گی اور اس کا ٹھیک وقت کیا ہوگا جو اصل مقصود سے بالکل غیر متعلق بحث ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف اس بات کا کہ تم پیغمبر کی اصل حیثیت کو سمجھنے سے عاجز ہو۔

چھٹی آیت میں پیغمبر کی شناخت اور معرفت کے حوالے سے مشرکینِ مکہ جو کوتاہیاں کر رہے تھے انہیں میں سے مزید دو باتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝

''(اے پیغمبر! انہیں) بتلائیے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے اور برے کا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی میں تو بس ڈرانے والا ہوں (انکار کرنے والوں کو) اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایمان لانے والوں کو''۔188

پیغمبر کی شناخت کے ضمن بعض گمراہیوں کی اصلاح:

جب بھی کوئی پیغمبر کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے یا اللہ کا کوئی نیک بندہ کسی قوم کی اصلاح کے لئے اٹھتا ہے تو حیرت کی بات ہے کہ افرادِ قوم اس کی ہدایت اور اصلاح قبول کرنے کے لئے تو کم آتے ہیں البتہ بیشتر آنے والوں کا تعلق دو ہی حوالوں سے ہوتا ہے۔ کبھی تو وہ آنے والے حالات یا قسمت کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ میں کاروبار کر رہا ہوں مجھے بتایئے کہ میرا کاروبار کیسا رہے گا؟ بچوں کی شادیاں کرنی ہیں فلاں فلاں رشتے ان کے لئے کیسے رہیں گے؟ اللہ انہیں بیٹا دے گا یا بیٹی دے گا؟ مستقبل میں فلاں فلاں معاملے کے حوالے سے میرے ساتھ کیا ہوگا؟ اور یا پھر اس طرح کے مطالبات لے کر آئیں گے کہ آپ کوئی ایسا تعویذ دے دیں جس سے مجھے فلاں ملازمت مل جائے، میرے گھر میں دولت کی ریل پیل ہو جائے، میں فلاں فلاں نقصان سے بچ جاؤں، فلاں منصب اور عہدہ مجھے مل جائے، میں حکومت میں شامل کر لیا جاؤں یعنی نفع وضرر کے حوالے سے مختلف قسم کے مطالبات کئے جائیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ جسے اللہ نے نبی بنایا ہے یا جسے ہم ولی سمجھتے ہیں وہ تمام امورِ غیبیہ سے واقف ہوتے ہیں، ماضی اور مستقبل کی ایک ایک بات ان کے سامنے روشن ہوتی ہے اور نفع وضرر کے حوالے سے بھی وہ کلی اختیارات کے مالک ہیں، جسے جو چاہیں دے دیں اور جو چاہیں چھین لیں۔ اس آیتِ کریمہ میں اس بنیادی گمراہی پر توجہ دلاتے ہوئے پیغمبر کی اصل حیثیت کا اعلان خود پیغمبر سے کروایا گیا ہے کہ علم غیب اور تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ کی مخصوص صفت ہے اس میں کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانا خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی شرک اور ظلم عظیم ہے۔ اسی طرح ہر نفع اور نقصان کا مالک ہونا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت خاص ہے اس میں کسی کو شریک ٹھہرانا بھی شرک ہے اسی حوالے سے اس آیت کریمہ میں آپ سے یہ اعلان کروایا جا رہا ہے کہ میں اپنی ذات کے لئے نفع نقصان کا مالک نہیں ہوں تو دوسروں کے لئے نفع نقصان کا مالک کیسے ہو سکتا ہوں؟ اسی طرح میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ہر چیز کا علم ہونا میرے لئے ضروری ہے، اگر مجھے علم غیب ہوتا تو میں ہر نفع کی چیز کو ضرور حاصل کر لیا کرتا اور کوئی نفع میرے ہاتھ سے فوت نہ ہوتا اور ہر نقصان کی چیز سے ہمیشہ محفوظ رہتا اور کبھی کوئی نقصان مجھے نہ پہنچتا حالانکہ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں بہت سے کام ایسے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو حاصل کرنا چاہا مگر حاصل نہیں ہوئے اور بہت سی تکلیفیں ایسی ہیں جن سے آنحضرت ﷺ نے بچنے کا ارادہ کیا مگر وہ تکلیف پھر بھی

Marfat.com

آپ کو پہنچ گئی۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ آپ صحابہ کرام ﷺ کے ساتھ احرام باندھ کر عمرہ کا ارادہ کر کے حدودِ حرم تک پہنچ گئے مگر حرم میں داخلہ اور عمرہ کی ادائیگی ممکن نہ ہو سکی۔ قریش اڑ گئے جس کے نتیجے میں معاہدہ حدیبیہ وجود میں آیا آپ عمرہ کئے بغیر واپس لوٹ گئے اور آئندہ سال آ کر عمرہ کی قضاء کی۔ غزوۂ احد میں شکست کا زخم اٹھانا پڑا خود آنحضرت ﷺ زخمی ہوئے حتی کہ کافروں کی کھودی ہوئی ایک کھائی میں گر گئے اگر ہر چیز کے آپ جاننے والے ہوتے تو اس طرح کے واقعات کا صدور آپ کے حوالے سے کبھی نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے واقعات کے ظاہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ انبیاء علیہم السلام اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول اور افضل ہوتے ہیں مگر پھر بھی وہ خدائی علم و قدرت کے مالک نہیں ہوتے تاکہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں جس میں یہود اور نصرانی مبتلا ہوئے کہ اپنے رسولوں کو خدائی صفات کا مالک سمجھ بیٹھے اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علم کا جو حصہ انبیاء کرام کو دیا جاتا ہے وہ ساری مخلوقات سے بڑھ کر ہوتا ہے خصوصاً ہمارے رسول کریم ﷺ کو تو اولین اور آخرین کا علم عطا فرمایا گیا یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کو جتنا علم دیا گیا وہ سب اور اس سے بھی زیادہ آپ کو عطا فرمایا گیا اور اسی عطا شدہ علم کے مطابق آپ نے ہزاروں غیب کی باتوں کی خبریں دیں جن کی سچائی کا ہر خاص و عام نے مشاہدہ کیا۔ آپ نے آنے والے مختلف فتنوں سے ہمیں آگاہ کیا، ماضی کے ایسے واقعات کی خبر دی جس سے تاریخ بالکل بے خبر تھی۔ بعض واقعات کے نتائج سے اس طرح آگاہ فرمایا جو بظاہر اسباب بالکل ناممکن دکھائی دیتے تھے بعض دفعہ قبروں کے احوال کو واضح فرمایا، جانوروں نے آپ سے سرگوشیاں کیں، آپ نے لوگوں کو بتایا کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ ان باتوں کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ہزاروں غیب کی چیزوں کا علم عطا کیا گیا تھا مگر اس کو اصطلاحِ قرآن میں علم غیب نہیں کہتے کیونکہ آپ نے جو کچھ کہا اور جو خبر دی وہ اللہ کے بتلانے سے دی اور عالم الغیب وہ ہوتا ہے جس کو کوئی بتلانے والا نہ ہو اس کا علم ذاتی علم ہو اور وہ علم محیط کا مالک ہو یعنی علم کے حوالے سے کوئی چیز اس سے مخفی نہ ہو۔ چنانچہ ان باتوں کی وضاحت کے بعد آخری آیت میں اپنی اصل حیثیت اور فریضۂ منصبی کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تو نذیر اور بشیر بن کر آیا ہوں اور میری اصل حیثیت یہ ہے کہ جو میری دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرے میں ان کے برے انجام اور اللہ کے عذاب سے انہیں خبردار کروں اور جو مجھ پر ایمان لائیں اور راست باز زندگی اختیار کریں انہیں میں دنیوی سرافرازیوں اور آخرت میں سرخروئی کی بشارت دوں۔

.........اللہ......اللہ......اللہ.........

هُوَ الَّذِیْ

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ
اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ
اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ

Marfat.com

الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٨٩﴾ فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا ۚ
فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٩٠﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ
يُخْلَقُوْنَ ﴿١٩١﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٢﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ
سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿١٩٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا
لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٩٤﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ
لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۫
اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ
فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿١٩٥﴾ اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ
يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٩٦﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٧﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى
لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٩٨﴾
خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾ وَاِمَّا
يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿٢٠٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ

Marfat.com

تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَاِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی
الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا
اجْتَبَیْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ
مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَاِذَا
قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ
الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ﴿۲۰۵﴾ اِنَّ
الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ
وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ ع السجدة

وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اس سے تسکین پائے جب مرد عورت کو ڈھانک لیتا ہے تو وہ اٹھا لیتی ہے ایک ہلکا سا حمل پھر وہ اس کو لیے چلتی پھرتی رہتی ہے پھر جب وہ بوجھل ہو جاتی ہے تو دونوں اللہ (یعنی اپنے رب سے) دعا کرتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی تو ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے تو جب اللہ ان کو صحیح سالم اولاد دے دیتا ہے تو وہ اس کی بخشی ہوئی چیز میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگتے ہیں اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں؟ جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ نہ وہ ان کی کسی قسم کی مدد کر سکتی ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتی ہیں۔ اگر تم ان کو رہنمائی کے لئے پکارو تو وہ تمہارے پیچھے نہیں چلیں گے خواہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو۔ بے شک تم جن کو اللہ کے ماسوا پکارتے ہو وہ تو تمہارے ہی جیسے بندے ہیں پس ان کو پکارو اور انہیں چاہئے کہ وہ تمہیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں؟ کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں؟ کیا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں؟ کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ

Marfat.com

سنتے ہیں؟ کہہ دو! تم اپنے شریکوں کو بلاؤ پھر میرے خلاف چالیں چل کر دیکھو اور مجھے مہلت نہ دو میرا کارساز وہ اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ نیکو کاروں کی کارسازی فرماتا ہے۔ اور جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو نہ وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں اگر تم ان کو راہنمائی کیلئے پکارو تو وہ تمہاری بات نہیں سنیں گے اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمہاری طرف تاک رہے ہیں لیکن انہیں سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ اے پیغمبر! نرمی اور درگزر کی عادت بنالو، معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو اور اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ چاہو، بیشک وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ بیشک جو لوگ متقی ہیں جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے وہ اللہ کا دھیان کرتے ہیں اور دفعۃً ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔ اور جو ان ناخدا ترسوں کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں بڑھاتے ہیں پھر کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ اور تم جب ان کے پاس نشانی نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ اسے کیوں نہ گھڑ لائے۔ کہہ دیجئے! میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولنے والی آیات اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے۔ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ یاد کرو! اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو صبح اور شام اور غافلوں میں سے نہ بنو بے شک جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی کرنے سے تکبر نہیں کرتے وہ اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

..................☆......☆......☆..................

گمراہی کے دو سبب:

پیشِ نظر رکوع شروع کرنے سے پہلے دو باتیں ذہن نشین کر لینی چاہییں۔

1۔ قومیں جن اسباب سے گمراہی کا شکار ہوتی ہیں ان میں کبھی تو یہ سبب ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر کی حیثیت اور اس کے مقام کو نہ سمجھنے کے باعث اس پر ایمان لانے سے محروم رہتی ہیں اور اس سے وہ مطالبات کرتی چلی جاتی ہیں جن کا تعلق نبوت سے نہیں ہوتا اس لحاظ سے وہ نبوت اور الوہیت کو خلط ملط کر دیتی ہیں۔ پیغمبر ان کے لئے اسوۂ حسنہ بن کر آتا ہے اور وہ اسے الوہیت کے مقام پر فائز دیکھنا چاہتی ہیں۔ نتیجہ واضح ہے کہ یہ دونوں چیزیں چونکہ الگ الگ حقیقت رکھتی ہیں اس لئے دونوں کی پہچان کا دارومدار الگ الگ حقیقت کو سمجھنے پر ہے جب قومیں اس کے فہم سے عاجز رہتی ہیں تو وہ پیغمبر پر ایمان لانے سے محروم ہو جاتی ہیں اور کبھی گمراہی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر کی دعوت کی حقانیت کو محسوس کر کے ایمان تو لے آتی ہیں لیکن ان کے بعد کی آنے والی نسلیں رفتہ رفتہ پیغمبر کے کمالات کو دیکھتے ہوئے پیغمبر کی حقیقی شناخت کو گم کرنے لگتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر پر ایمان رکھتے ہوئے بھی اس کی تعلیمات کو نظر انداز کرنے کے باعث اسے اللہ کی صفات میں شریک کرنے لگتی ہیں کبھی اللہ کی کسی صفت کو اس کی طرف منسوب کرتی ہیں اور کبھی کسی

Marfat.com

صفت کو۔ بالآخر وہ اسی گمراہی میں جا پڑتی ہیں جس سے اللہ کے نبی کی تعلیمات نے ان کو نکالا تھا ان دونوں صورتوں میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی پیغمبر کی شناخت اور نبوت کی حقیقت کے فہم میں خرابی پیدا ہوئی ہے تو بالآخر عقیدۂ توحید کو نقصان پہنچا ہے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ عقیدۂ توحید دین کی بنیاد اور اہلِ دین کی معراج ہے۔ اسی لئے سورت کو ختم کرتے ہوئے گزشتہ رکوع میں نبوت کی ضروری صفات کا ذکر کیا گیا اور اب پیشِ نظر رکوع میں توحید کو دوبارہ دل و دماغ میں اتارنے کیلئے نہایت مؤثر انداز میں شرک کی تردید فرمائی گئی ہے۔

2۔ قرآنِ کریم کی اکثر سورتوں میں قرآنِ کریم کا یہ اسلوب نظر آتا ہے کہ وہ جن مضامین پر پوری سورت میں زور دینا چاہتا ہے انہیں پورے شرح وبسط سے پوری سورت میں ایک تسلسل سے اس طرح بیان کرتا ہے جس طرح دریا اپنی روانی کے ساتھ بہتا ہے، وہ دریا ہی کی طرح بحث کے ضمنی مضامین سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ بحث کے آگے بڑھنے سے جو سوالات پیدا ہوتے یا اشتباہات سر اٹھاتے ہیں ان کا بھی ساتھ ساتھ تدارک کرتا چلا جاتا ہے اور سورت کے آخر میں پہنچ کر بحث کے اصولی مضامین کو سمیٹ کر خلاصہ کی شکل میں بیان کرتا ہے تاکہ قرآنِ کریم کا قاری سورت کے آخر میں پہنچ کر ایک دفعہ پھر اس کے بنیادی مضامین کو ذہن میں تازہ کرلے اور یہ مضامین اس کے دل و دماغ میں راسخ ہو جائیں۔

اس سورت کا مرکزی موضوع عقیدۂ توحید ہے اور اس عقیدے کو جیسا کہ عرض کیا گیا سب سے زیادہ نقصان حقیقت رسالت اور عقیدہ رسالت میں قصورِ فہم سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے پیشِ نظر رکوع میں دونوں بحثوں کو خلاصے کی صورت میں بحث کو سمیٹتے ہوئے ازسرِنو بیان فرمایا گیا ہے۔ پہلے عقیدۂ توحید کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا اور اس ضمن میں نہایت گہرائی سے شرک کی مختلف شکلوں کی تردید کی گئی اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ سے خطاب فرما کر آپ کی ذمہ داریوں کا اس طرح ذکر فرمایا گیا جس سے مسلمانوں کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنے میں مدد ملی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ نبوت اور رسالت کی حقیقت کیا ہوتی ہے؟ اور نبی فی الحقیقت دنیا میں کیا فریضہ انجام دینے کیلئے آتا ہے؟

اس رکوع کی پہلی آیت میں عقیدۂ توحید کے بنیادی مقدمات کو بیان کرتے ہوئے عقیدۂ توحید کے متضاد پہلو یعنی شرک کو واضح کرتے ہوئے مشرکین کی مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ج فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ج فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ o فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ج فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ o اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ o وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ o

وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے تسکین پائے جب مرد عورت کو ڈھانک لیتا ہے تو وہ اٹھالیتی ہے ایک ہلکا سا حمل پھر وہ اس کو لیے چلتی پھرتی رہتی ہے پھر جب وہ بوجھل ہو جاتی ہے تو دونوں اللہ (یعنی اپنے رب سے) دعا کرتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں تندرست اولاد بخشی تو ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے تو جب اللہ ان کو صحیح سالم اولاد دے دیتا ہے تو وہ اس کی بخشی ہوئی چیز میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگتے ہیں اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں؟ جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ نہ وہ ان کی کسی قسم کی مدد کرسکتی ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کرسکتی ہیں۔ 189,192

Marfat.com

آیات میں بیان کردہ تین حقائق:

ان آیات میں مختلف باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جن کو ہم ایک ترتیب سے ذکر کرتے ہیں۔

1۔ مشرکینِ مکہ جس طرح اللہ کی ذات کے قائل تھے اسی طرح وہ اس کی بعض صفات کے بھی قائل تھے اس لئے سب سے پہلے ان کی تسلیم کردہ باتوں کا حوالہ دے کر انہیں بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، انہیں یاد دلایا گیا ہے کہ تم اس بات کے قائل تو ہو کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے جدِ امجد یعنی پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ان کی تخلیق میں اللہ کے ساتھ کوئی اور شریک نہ تھا اور اسی طرح تم یہ بھی جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیوی کو اپنی قدرتِ کاملہ سے انہی کی جنس سے پیدا فرمایا تھا اور ان کو پیدا کرنے میں بھی اللہ کے ساتھ کوئی اور شریک نہ تھا اور پھر اس دلیل کو مزید مؤثر بناتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ بھی تم جانتے ہو کہ اللہ نے جو پہلا انسانی جوڑا مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کیا ان میں نہایت سازگاری رکھی جس میں دو باتیں معمولی غور وفکر سے بھی سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد و عورت کے جسمانی اعضاء ان کے جسم کی ترکیب اور ان کی جسمانی ساخت واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کو الگ الگ ذمہ داریوں کے حوالے سے پیدا کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دونوں کے احساسات، دونوں کے طبعی خواص اور دونوں کی انفرادی کیفیات اور دونوں کی فعلی خصوصیات میں بھی بہت حد تک اختلاط بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔ بایں ہمہ! یہ حیرت کی بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے کیلئے سرمایۂ تسکین، راحتِ جان و دل اور اولاد کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کیلئے باہم دگر معاون و غمگسار ہیں۔ جس طرح مرد و عورت کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی کمالِ قدرت اور بے مثال کمالِ تخلیق پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے اسی طرح مرد و عورت کو ایک دوسرے کیلئے ناگزیر بنا دینا اور دونوں کو ایک دوسرے کیلئے یکجان اور دو قلب کر دینا اور دونوں میں ایک دوسرے کیلئے شدید طلب بلکہ بے چینی پیدا کر دینا یہ اللہ تعالیٰ کی شاید تخلیق سے بھی بڑی نعمت ہے اگر پروردگار دونوں میں انتہائی قرب کا تعلق اور انتہائی چاہت کا سامان اور ایک دوسرے کیلئے قربان ہونے کا ارمان پیدا نہ کرتا تو نہ نسلِ انسانی کا قافلہ آگے بڑھتا، نہ گھروں کی صورت میں آبادیاں وجود میں آتیں، نہ ہمسائیگی کے بڑھتے ہوئے تعلق سے معاشرے کی بنیاد پڑتی، نہ خاندان وجود میں آتے، نہ خاندانوں کے ملنے سے سیاسی نظام جنم لیتا اور نہ اجتماعی ضرورتوں کے وجود میں آنے سے تہذیب اور تمدن کی ضرورت پیش آتی اور نہ انسانوں کی نزاکتِ احساس کے انتقال سے ثقافت کو پیدا ہونے کا موقعہ ملتا۔ غرض یہ کہ انسانی زندگی کی تمام ہمہ ہمی اور معاشرتی زندگی کی تمام خوبصورتیاں اور معاشی زندگی کی تمام رونقیں اور تہذیبی زندگی کی تمام خوش اطواریاں اور تمدنی زندگی کے تمام برگ و بار کبھی وجود میں نہ آتے۔ اگر مرد اور عورت میں ایک دوسرے کیلئے یہ کشش اور تڑپ پیدا نہ کی جاتی جس نے ایک دوسرے کے لئے درد اور دوا کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ اپنے اس عظیم احسان کا ''لیسکن الیھا'' کے ساتھ ذکر فرما کر ان احسانات کی طرف اشارہ بھی کیا اور ساتھ ہی یہ بات بھی واضح فرمائی کہ تم یہ بھی مانتے ہو کہ جس طرح اللہ نے مرد و عورت کی تخلیق کی ہے اسی طرح یہ احسانات بھی اسی نے کئے ہیں اور دوسری یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرد و عورت کا اس طرح تخلیق پانا اور پھر ان کے اندر ایک دوسرے کیلئے ایسے نازک جذبات کا وجود عطا ہونا اور پھر اس سلسلۂ تخلیق میں کبھی کسی تبدیلی کا پیدا نہ ہونا کیا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ یہاں ایک ہی قادرِ مطلق ہے جس کا محکم ارادہ پوری کائنات میں تخلیق اور تدبیر سے کام لے رہا ہے اگر کوئی دوسرا ارادہ بھی یہاں ہوتا تو پھر یہ کائنات مختلف ارادوں کی آماجگاہ ہوتی اور یہاں کوئی بھی چیز اولاً تو پیدا نہ ہوتی اور اگر پیدا ہوتی بھی تو اپنی خصوصیات کو باقی نہ رکھ سکتی۔

''فلما تغشھا'' سے ایک تیسری بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ نسلِ انسانی کا سلسلہ مرد و عورت کی قوت سے قائم

Marfat.com

ہے۔اللہ نے پہلے انسانی جوڑے کو تو بغیر سبب کے اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمایا تھا اور تم اسے تسلیم کرتے ہو اسی طرح تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس کے بعد نسلِ انسانی کا سلسلہ مرد و عورت کے باہمی تعلق سے وجود میں آیا اور آج تک چل رہا ہے۔ چنانچہ جب کوئی مرد اپنی بیوی سے انتہائی قربت کا تعلق پیدا کرتا ہے تو اللہ کی قدرت کاملہ سے اس کی بیوی ایک آنے والی امانت سے اس طرح گراں بار ہو جاتی ہے کہ ابتدائی دنوں میں اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کیونکہ انسان کا مادۂ تولید پانی کی ایک بوند کی شکل میں رحمِ مادر میں منتقل ہوتا ہے تو پانی کی ایک بوند کا پیٹ میں چلے جانا کسی طرح بھی محسوس ہونے والی چیز نہیں۔اس لئے اس بوند کی امانت اٹھانے والی اسے اٹھائے چلتی پھرتی رہتی ہے اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ میں ایک امانت کی امین بنادی گئی ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اس کی رحمتیں برابر اپنا فیضان لٹاتی رہتی ہیں۔ یہ پانی کی ایک بوند پہلے خون کی شکل اختیار کرتی ہے پھر یہ خون گاڑھا ہو کر رفتہ رفتہ گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس گوشت کے لوتھڑے میں اعضاء جنم لینے لگتے ہیں۔انسانی نقوش ابھرنے لگتے ہیں، پھر اس میں جان پڑتی ہے، ان تبدیلیوں سے ماں کو بوجھ کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جب میاں بیوی ان تبدیلیوں کو محسوس کر لیتے ہیں کہ اب قدرت ہم پر ایک بچے کی صورت میں کرم فرمانے والی ہے تو ان کے دل میں جہاں اپنے مالک کے لئے شکر کے جذبات مچلنے لگتے ہیں وہیں اندیشے بھی سر اٹھانے لگتے ہیں کہ اللہ خیر کرے یہ بننے والا بچہ بھلا چنگا ہو، نین نقش سے درست ہو، خوبصورت پیارا ہو، اپاہج نہ ہو، اندھا نہ ہو، کانا نہ ہو، کیونکہ جس طرح اللہ کی قدرت نے اس خفیف سے حمل کو پرورش کر کے ایک بچے کی صورت دی ہے۔اسی طرح اس کیلئے یہ کوئی مشکل نہیں کہ وہ انسانی بچے کی بجائے کسی بندر سانپ یا کسی اور جانور کا بچہ پیدا کر دے یا اس میں کوئی جسمانی کمزوری رکھ دے یا اس سے دل و دماغ کی صلاحیتوں سے تہی رکھے۔ان اندیشوں کے پیدا ہوتے ہی ماں باپ اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں اور بار بار اس سے التجا کرتے ہیں کہ یا اللہ! ہمیں صحت مند اولاد عطا کرنا جو ہر طرح کے جسمانی نقص سے پاک ہو۔اسے دل و دماغ کی رعنائیاں بھی عطا کرنا اس کی قسمت اچھی بنانا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب تم اس طرح اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہو تو تمہیں پورا یقین ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ عطا کرنے اور ہماری دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا صرف اللہ ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں اس لئے تم ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہو کہ یا اللہ! اگر آپ نے ہماری دعا قبول فرمالی تو ہم تیرے شکر گزار بندے بن جائیں گے۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ تم اپنے جدِ امجد اور نسلِ انسانی کے باقی تمام افراد کا خالق اللہ ہی کو مانتے ہو اور مرد و عورت کے حوالے سے اس کی جو بے پایاں نعمتیں ہیں ان کا بھی اعتراف کرتے ہو اور پھر معمولی حمل سے لے کر بچے کی پیدائش تک جتنی تبدیلیاں عمل میں آتی ہیں اور جس طرح قدرت ماں کے پیٹ میں بچے کی نگہداشت کرتی ہے تم اسے بھی تسلیم کرتے ہو ان تمام مسلمات کے ہوتے ہوئے آخر یہ کیا بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام دعاؤں کو قبول فرماتے ہوئے جب تمہیں تمہاری دعاؤں کے مطابق اولاد عطا فرما دیتے ہیں تو تم اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتے ہو؟ اپنے تمام مسلمات کے برعکس کبھی تو تم یہ سمجھنے لگتے ہو کہ یہ بچہ اللہ نے نہیں، فلاں نے دیا ہے اور کبھی اسے کسی درگاہ، خانقاہ، کسی بزرگ یا کسی بت کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتے ہو؟ اور شکریہ کیلئے نذریں نیازیں کسی دیوی کسی اوتار کسی ولی یا کسی حضرت کے نام پر چڑھانا شروع کر دیتے ہو؟ اور یا بچے کو ایسے نام سے پکارنے لگتے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عنایت کا نتیجہ ہے یعنی کبھی اس کا نام عبدالعزیٰ رکھتے ہو اور کبھی عبدالشمس۔ یہ مشرکین کا ایسا رویہ ہے جس کی توجیہ بظاہر محال دکھائی دیتی ہے لیکن قرآن میں مختلف مواقع پر اس کی عقدہ کشائی اس طرح کی گئی ہے کہ انسان جب تک کسی ضرورت اور احتیاج کے حصار میں رہتا ہے تو وہ اللہ ہی کو پکارتا ہے، بیماری میں جب ڈاکٹر جواب دے دیتے ہیں تو اللہ ہی یاد آتا ہے، کشتیاں بھنور میں پھنس جاتی ہیں تو اللہ ہی سے التجا ہوتی ہے، زلزلے میں زمین لرزنے لگتی ہے تو بے اختیار اللہ ہی سے مناجاتیں کی جاتی ہیں۔لیکن جب انسان اس خطرے سے نکل جاتا ہے تو اسے اسباب اور وسائل کا کرشمہ قرار دینے

Marfat.com

لگتا ہے یا غیر اللہ کی طرف منسوب کرنے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت جب تک بیرونی آلائشوں سے محفوظ رہتی ہے یا مصائب کا ہجوم اس کی فطرت کو خالص رکھتا ہے (چونکہ اصل فطرت کے اندر اللہ ہی کا نقش ہے کسی اور کا نقش نہیں) تو فطرت اپنے اصل کے مطابق اللہ کی طرف رجوع کرتی ہے اور اپنے حقیقی مالک کو پہچان لیتی ہے۔ لیکن جب بیرونی آلودگیوں کو در آنے کا موقع ملتا ہے تو پھر اس کی فطرت پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اصل سے ہٹ کر آلودگیوں میں الجھ کر اپنے ہی مسلمات کے برعکس دوسرے طور اطوار اختیار کر لیتا ہے چنانچہ یہاں ان کی اسی فطری کجروی کو نمایاں کیا گیا ہے۔

مشرکینِ مکہ ایک طویل مدت سے وحیِ الٰہی سے بے بہرہ رہنے کی وجہ سے اپنے فطری خصائص گم کر چکے تھے اس لئے ان سے اس طرح کی فکری ناہمواریوں کا وجود میں آنا چنداں تعجب کا باعث نہیں لیکن اس امت کا کیا کیجئے ان کے پاس تو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کا اسوہ پوری طرح محفوظ اور مصئون ہے، اس کے باوجود اس امت کے افراد نہ صرف بچوں کو پیدا ہونے کے بعد دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں بلکہ اولاد بھی بسا اوقات اللہ کی بجائے غیر اللہ سے مانگتے ہیں اور پھر دوسروں کے انتساب سے ایسے ایسے نام رکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں شاید توحید کی دعوت بالکل نہیں پہنچی ورنہ جو امت عقیدۂ توحید کی علمبردار بنائی گئی ہو، اس امت کے افراد سے اس طرح کی کمزوریوں کا ظہور نہایت تکلیف دہ بات ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سارے لوگ اپنے بچوں کے پیراں دتہ، حسین بخش، پیر بخش اور عبدالرسول جیسے نام رکھتے ہیں جس کا معنی واضح ہے کہ یہ بچہ اللہ نے نہیں دیا بلکہ پیروں نے دیا ہے یا اسے حسین نے بخشا ہے یا کسی پیر کی مہربانی ہے اور مزید یہ کہ یہ پیدا ہونے والا بچہ اللہ کا بندہ نہیں بلکہ عبدالرسول یعنی رسول کا بندہ ہے حالانکہ قرآنِ پاک نے صاف طور پر ارشاد فرمایا کہ جب ہم کسی کو نبوت عطا کرتے ہیں تو وہ دنیا میں جا کر لوگوں کو ربانی بناتا ہے وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ تم میرے بندے ہو جاؤ کیونکہ ہر نبی نے دنیا میں سب سے زیادہ جس بات پر زور دیا ہے اور جو ان کی دعوت کا اصل موضوع رہا ہے وہ یہی ہے کہ ''اعبدوا اللہ'' اور یہی قرآنِ پاک میں سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کی پہلی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی کی بندگی کرو یعنی اس کے بندے بنو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اتنی واضح تعلیم کے بعد بھی اس امت کے لوگ اس طرح کا نام رکھ کر آخر کیا تاثر دینا چاہتے ہیں؟

اس آیتِ کریمہ کو سمجھنے میں بعض لوگوں کو غلط فہمی بھی ہوئی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا جائے ورنہ اس آیت کی تشریح کیلئے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آیت کے آغاز میں نوعِ انسان کی پیدائش ایک جان سے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، پھر اس کے بعد ایک مرد اور عورت کا ذکر شروع ہو گیا ہے۔ انہوں نے پہلے تو اللہ سے صحیح و سالم بچے کی پیدائش کی دعا کی اور جب بچہ پیدا ہو گیا تو اللہ کی بخشش میں دوسروں کو شریک ٹھہرالیا۔ بعض لوگوں کے اندازِ بیان سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ جن شریک کرنے والے میاں بیوی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ کوئی اور نہیں حضرت آدم اور حوا علیہما السلام ہی ہیں، پھر اس غلط فہمی کو بعض روایات سے بھی مدد ملی جس کے نتیجے میں پورا ایک قصہ وجود میں آ گیا کہ حضرت حوا کے بچے پیدا ہو کر مر جاتے تھے، آخر کار ایک بچے کی پیدائش کے موقعہ پر شیطان نے ان کو بہکا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس کا نام عبدالحارث (بندۂ شیطان) رکھ دیں، اس آیت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قصے کی کوئی اصل نہیں اور جن روایات کو اس کی تائید میں پیش کیا جا رہا ہے وہ یکسر غلط ہیں اور قرآنِ کریم کی عبارت بھی اس کی تائید نہیں کرتی۔ قرآن جو کہہ رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا پہلا جوڑا جس سے نسلِ انسانی کا آغاز ہوا، اس کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی تھا پھر ہر مرد و عورت کے ملاپ سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کا خالق بھی اللہ ہی ہے۔ اس میں

Marfat.com

کسی خاص مرد اور کسی خاص عورت کا ذکر نہیں بلکہ مشرکین میں سے ہر مرد و عورت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس پوری صورتحال کو سامنے رکھیں تو اس غلط فہمی کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی اور ویسے بھی اگر تھوڑا سا بھی عقل سے کام لیا جائے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ اس قصے کا انتساب حضرت آدم اور حضرت حوا کی طرف کیا گیا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت آدم اللہ کے نبی تھے اور اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے کسی گناہ کا صدور نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے لگیں۔ اگر اس قصے کو صحیح سمجھا جائے تو پھر حضرت آدم کی نبوت سے انکار کرنا ہوگا اور اگر آپ واقعی نبی ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر آپ اور آپ کی زوجہ محترمہ حضرت حوا سے اس قسم کے فعل کا صدور سراسر اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ برتر ہے ان چیزوں سے جن چیزوں سے یہ لوگ اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اللہ کی برتری اور بڑائی کا سب سے زیادہ ادراک اور معرفت اللہ کے نبیوں کو ملتی ہے، کوئی اور اس میں ٹھوکر کھائے تو تعجب نہیں لیکن نبی تو اسی راستے کے شناور ہوتے ہیں اس لئے ان سے کسی ایسی بات کا وہم بھی گناہ سے کم نہیں ویسے بھی تخلیق کے معاملے میں کسی کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا یہ تو ایسی بات ہے جسے معمولی عقل والا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے اگلی آیتِ کریمہ میں نہایت آسان انداز میں فرمایا کہ یہ لوگ ان چیزوں اور ان قوتوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں جو نہ صرف کسی کو پیدا کرنے پر قادر نہیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں کیونکہ اللہ کے علاوہ کائنات کی ہر چیز مخلوق ہے چاہے وہ مشرکوں کے دیوتا ہوں، اوتار ہوں یا فرشتے ہوں، جن کو یہ اللہ کی بیٹیاں سمجھتے ہیں یا وہ مقدس لوگ ہوں جن کے انہوں نے بت بنا رکھے ہیں، یہ سب اللہ کی مخلوق ہیں جو خود مخلوق ہوں وہ خالق کیسے ہوسکتا ہے؟ کسی کو پیدا کرنا تو غیر معمولی بات ہے، اس سے بہت چھوٹی بات یہ ہے کہ اسباب سے ماورائی ہو کر کسی کی مدد کی جائے۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ یہ کسی کو تو خلق کیا کریں گے یہ تو کسی کی مدد بھی نہیں کر سکتے۔ اگر تو ان سے مراد بت لئے جائیں جن کو مشرکین مکہ پوجتے تھے، وہ تو ہاتھ تک نہیں ہلا سکتے کسی کی مدد کیا کریں گے، وہ تو اپنی مدد نہیں کر سکتے۔ ان کے چہرے پر مکھی بیٹھ جائے وہ اڑا نہیں سکتے، کوئی انہیں توڑ پھوڑ دے وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتے، ان کے ماننے والے ان کے سامنے چڑھاوے چڑھاتے ہیں، کوئی ان چڑھاووں کو اٹھا کر لے جائے تو وہ انہیں روک نہیں سکتے، تو جو اس طرح بے دست و پا ہیں تم انہیں اللہ کا شریک کیسے ٹھہراتے ہو؟ اور اگر ان سے دوسری شخصیتیں مراد لی جائیں تو پھر مطلب یہ ہے کہ اسباب سے ماورائی اور ان سے بالا ہو کر تو نہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں، یہ شان تو صرف اللہ کی ہے کہ اسباب اس کے محتاج ہیں وہ کسی سبب کا محتاج نہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ یہاں ایک وضاحت کردی جائے۔ پیشِ نظر رکوع میں شرک اور مشرکین کی تردید ہورہی ہے لیکن اگر اس کی حقیقت کو پوری طرح نہ سمجھا جائے تو بعض آیات کو سمجھنے میں دشواری پیش آسکتی ہے۔ اس لئے یہ بات ذہن نشین کرلی جائے کہ شرک اور مشرکین کے حوالے سے پروردگار تین پہلوؤں سے تنبیہ فرما رہے ہیں۔

شرک کے تین پہلوؤں پر گفتگو:

1۔ مشرکین اپنے اعتقادات کے مطابق اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ بعض قوتیں ایسی ہیں جو اللہ کی بعض صفات میں شریک ہیں۔ کوئی ان میں اولاد دیتا ہے، کوئی بارش برساتا ہے، کوئی تکلیفیں دور کرتا ہے اور کوئی ہر طرح کی فریادیں سنتا ہے۔ چنانچہ جب وہ انہیں پکارتے تھے تو یہ سمجھ کر نہیں پکارتے تھے کہ یہ قوتیں اللہ کی ذات میں شریک ہیں بلکہ یہ سمجھ کر پکارتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے بعض اختیارات میں شریک کر رکھا ہے، اس لئے جب تک انہیں نہ پکارا جائے اس وقت تک ان سے متعلق ہمارے کام نہیں ہوسکیں گے۔

2۔ مشرکین نے انہی قوتوں کے مجسمے اور بت بھی بنا رکھے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ اصل قوتیں ان بتوں یعنی ان قالبوں میں حلول کر جاتی ہیں۔

Marfat.com

اس لئے بظاہر یہ پتھر یا سونے چاندی کے بت بے جان دکھائی دیتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ جن قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں ان کے اندران کی طاقت موجود ہے۔ اس لئے جب ہم ان کو پوجتے ہیں تو وہ اصل قوتیں خوش ہوکر ہماری مدد کرتی ہیں۔ مشرکینِ مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ بعض فرشتوں کو اللہ نے خاص اختیارات دے رکھے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے تصور کے مطابق فرشتوں کی مورتیاں بنا رکھی تھیں اور انہیں وہ اس لئے پوجتے تھے تاکہ وہ فرشتے خوش ہوکر ان کی مدد کریں۔ اسی طرح وہ جنات کو بھی انسانی معاملات اور انسانی قسمتوں میں دخیل سمجھتے تھے اس لئے وہ کبھی ان کے بت تراشتے تھے اور کبھی خاص جگہوں، ٹیلوں یا درختوں کی یہ تصور کرکے پوجا کرتے تھے کہ یہاں ان جنات کا بسیرا ہے اور ان کی نسبت سے یہ جگہیں مقدس ہوگئی ہیں اسی طرح وہ مظاہرِ فطرت میں سے بعض کو اللہ کا اوتار یا دیوتا قرار دیتے تھے۔ مشرکینِ مکہ میں اگرچہ یہ اعتقاد کم تھا لیکن بعض دوسرے مشرکین میں ان دیوتاؤں اور اوتاروں کی کثرت سے پوجا ہوتی تھی، کوئی ستاروں کو پوجتا تھا، کوئی چاند کو اور کوئی سورج کو۔ اس طرح انہوں نے بعض انسانوں کے بت تراش رکھے تھے جن کے بارے میں ان کا گمان تھا کہ وہ اللہ کے مقبول بندے تھے اور اپنی اس مقبولیت کے باعث وہ بہت سارے اختیارات کے بھی مالک تھے۔ چنانچہ اسی نسبت سے وہ ان بتوں کی پوجا کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے، ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور ہر طرح ان کے سامنے ڈنڈوت بجالاتے۔ میں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوجائے گی کہ مشرکینِ عرب کا ایک مشہور بت ''لات'' نامی تھا۔ اسے وہ بہت طاقت کا مالک سمجھتے تھے اور اس کی حقیقت یہ بیان کی جاتی تھی کہ لات عربی زبان میں ستو پلانے والے کو کہتے ہیں۔ تاریخ میں کوئی نیک نام شخص ایسا گزرا تھا جس کا معمول یہ تھا کہ عرب کی جھلسادینے والی گرمی میں وہ کسی برتن میں ستو گھول کر اور پانی لے کر صحرا کے کسی چوراہے میں بیٹھ جاتا اور آتے جاتے مسافروں کو ستو کھلاتا اور پانی پلاتا۔ عرب جیسے علاقے میں جہاں پانی کمیاب اور غذا کی ہمیشہ قلت رہی ہے سخت گرمی کے موسم میں جبکہ پیاس کے باعث حلق میں کانٹے اگنے لگتے ہیں، اس طرح کی نیکی یقیناً بہت بڑی نیکی سمجھی جاتی تھی۔ اسی نیکی کے باعث یہ صاحب مشہور ہوگئے اور لوگوں میں عزت اور تقدس کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ زندگی ہی میں ان کی شہرت ہوگئی، مرنے کے بعد ان کی اسی نیک نامی کے باعث ان کی یاد زندہ رہی، وقت کے ساتھ ساتھ اس یاد اور نیکی میں اضافہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ لوگوں نے ان کا مجسمہ بنایا۔ شروع شروع میں تو صرف یہ ایک یاد کا ذریعہ تھا لیکن پھر اس پر چڑھاوے چڑھنے لگے اور آخر پوجا شروع ہوگئی۔ اسی پر آپ باقی بتوں کا قیاس کرلیجئے۔ ہر بت کی اسی طرح کی ایک تاریخ ہے۔ پوری قوم کبھی عقل سے دیوالیہ نہیں ہوتی کہ وہ بتوں کی پوجا شروع کردے۔ آغاز میں کسی بڑی شخصیت کی عقیدت کے باعث بت بنتے ہیں اور ان بتوں کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے پھر ان کی پوجا شروع ہوجاتی ہے۔ پوجا کرنے والے اگرچہ ان کے سامنے جھکتے ہیں لیکن ذہن میں وہ شخصیت ہوتی ہے جس کا یہ بت ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ عوام اس پس منظر کو بھولتے چلے جاتے ہیں پھر یہ سامنے نظر آنے والا بت ہی ان کی عقیدت کا مرکز بن جاتا ہے اور وہ اسی کی پوجا کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ساری دنیا میں بت پرستی اسی طرح ہوتی ہے اور ہورہی ہے۔ اس لئے قرآن کریم پس منظر کی شخصیتوں پر بھی تنقید کرتا ہے کہ لیکن ساتھ ساتھ ان بتوں کو بھی تنقید کا نشانہ بناتا ہے کیونکہ جب قرآنِ کریم نازل ہورہا تھا تو یہ بت ہی اصلاً عقیدت اور عبودیت کا مرکز بن کر رہ گئے تھے۔

3۔ ان مشرکانہ افعال کے پیچھے ہمیشہ چند تصورات ہی رہے ہیں جو ان افعال کو سپورٹ بھی کرتے ہیں اور ان کی توجیہ بھی کرتے ہیں۔ تصورات تو کئی سارے ہیں لیکن ان میں سب سے اہم تصور جو ہمیشہ مشرکوں میں ایک دلیل کے طور پر کام دیتا رہا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو وحدہٗ لاشریک ہے ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے لیکن مشکل یہ ہے کہ کیا ایک ذات اپنی تمام عظمتوں کے باوجود پوری کائنات کا نظام چلاسکتی ہے؟ کائنات

Marfat.com

کی وسعتیں تو بے حد و بے کنار ہیں یہ زمین اس کائنات کا ایک چھوٹا سا کرہ ہے، اس میں بسنے والی مخلوق اس قدر بڑی تعداد میں ہے کہ ان کی تمام ضرورتوں کو ایک ذات کیلئے جاننا ممکن نہیں۔ ایک گھر کے افراد کو دیکھ لیجئے ہر ایک کی اپنی اپنی ضرورتیں، اپنی اپنی محرومیاں، اپنی اپنی خواہشات اور پھر اس سے جنم لینے والے اعمال سلسلہ در سلسلہ ایک ایسی تفصیل ہے کہ ایک گھر کی حد تک اس کا جاننا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے چہ جائیکہ پوری زمین پر بسنے والے انسانوں کی تمام ضرورتوں تمام خیالات اور تمام اچھے برے اعمال کی خبر ایک ذات کو ہر وقت اور ہر لحاظ سے رہے۔ یہ کسی طرح بھی عقل میں آنے والی بات نہیں۔ اس لئے یہ بات قرینِ عقل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض قوتوں کو اپنے اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں تا کہ تمام انسانوں کی ضرورتیں آسانی سے پوری ہوتی رہیں۔ چنانچہ جس طرح قرآنِ کریم نے بت پرستی اور شخصیت پرستی پر تنقید کی ہے، اسی طرح ان تصورات کا بھی پوری قوت سے ابطال کیا ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیات اور قرآنِ کریم میں بعض دیگر مواقع پر انہی تینوں باتوں کے حوالے سے تنقید کی گئی ہے۔ یہ تفصیل اگر ذہن میں رہے تو پھر قرآنِ کریم کی شرک پر تنقید کو سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔ سابقہ دو آیات اور اگلی آنے والی آیات سے معلوم ہوتا ہے مشرکین کی بت پرستی پر تنقید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ○

اگر تم ان کو راہنمائی کے لئے پکارو تو وہ تمہارے پیچھے نہیں چلیں گے خواہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو۔ 193

بت پرستی پر تنقید:

مخلوقات میں سے اللہ تعالیٰ نے جسے بھی خلق فرمایا ہے اس کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اس کیلئے زندگی گزارنے کا طریقہ کیا ہے اور یہ ضرورت ایسی ہے جس میں انسان کی تخصیص نہیں بلکہ ہر مخلوق اس ضرورت کی پوری طرح محتاج ہے۔ البتہ! یہ ضرور ہے کہ انسان اس ضرورت کے حوالے سے دوسری مخلوقات کی نسبت کچھ زیادہ ہی محتاج واقع ہوا ہے کیونکہ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو سب سے بے بس ہوتا ہے۔ بلی کا بچہ بھی آنکھیں کھلتے ہی اپنی ماں کو ڈھونڈتا اور اس کے پستان تلاش کر لیتا ہے، مرغی کا بچہ چند گھنٹوں کے بعد ہی ماں کی آواز پر پیچھے پیچھے چلنے لگتا اور دانہ چگنے لگتا ہے، بھینس کا بچہ چند گھنٹوں کے بعد لڑکھڑاتا ہوا ماں کے نیچے پہنچ کر دودھ پینے لگتا ہے، لیکن انسان کا بچہ اس طرح بے بس اور ناتواں پیدا ہوتا ہے کہ نہ اپنی ماں کو پہچانتا ہے اور نہ اپنے باپ کو۔ ماں اس کو اٹھا کر اگر اپنے سینے سے نہ لگائے تو وہ رونے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ باقی مخلوقات کے بچے بڑی تیزی سے بڑھتے، پروان چڑھتے اور طبعی قوتوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن انسان کا بچہ آہستہ آہستہ پروان چڑھتا ہے، کئی مہینوں کے بعد بیٹھنے لگتا ہے، پھر گھٹنوں چلنا سیکھتا ہے، پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور چلنے لگتا ہے۔ ایک وقت تک لوگ اس کی راہنمائی کرتے ہیں پھر جب ضرورت اس سے آگے بڑھتی ہے تو اس کی عقل اس کی راہنمائی کیلئے اپنا فرض انجام دینے لگتی ہے، لیکن انسانی ضرورتیں باقی حیوانات کی طرح صرف جسمانی ضرورتوں تک محدود نہیں بلکہ اس کی ذہنی ذوقی اور روحانی ضرورتیں بھی ہیں جو عقل کے بعد کسی اور راہنمائی کی بھی طالب ہوتی ہیں۔ ان پہلوؤں سے غور کیا جائے تو انسان کی ضرورتوں کی وسعت سمجھ میں آتی ہے کہ یوں تو اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی ضرورتوں کو پورا کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور اس کیلئے جس راہنمائی کی ضرورت ہے وہ ہمہ وقت ان کو فراہم کی جاتی ہے۔ حشرات الارض کو رینگنا سکھایا جاتا ہے۔ پرندوں کو اڑنا، مچھلیوں کو تیرنا اور جنگل کے جانوروں کو دوڑنا بھاگنا اور شکار کرنا سکھایا جاتا ہے، چھوٹے سے چھوٹا جانور بھی جانتا ہے کہ مجھے غذا کیسے حاصل کرنی ہے۔ بچے کیسے پیدا کرنے ہیں۔ انہیں پالنا کیسے ہے۔ اپنا گھر کیسے بنانا ہے۔ موسم کی شدت سے کیسے بچنا ہے۔ حوادث کے مقابلے میں اپنا تحفظ کیسے کرنا ہے۔

Marfat.com

لیکن انسانی ضرورتیں اور انسان کے لئے راہنمائی ان سے زیادہ وسعت رکھتی ہے کیونکہ وہ جبلت تک محدود نہیں رہتی، حواس پر کفایت نہیں کرتی، عقل بھی عالم محسوسات اور روحانی زندگی کے بعد ساتھ چھوڑنے لگتی ہے۔ اس لئے یہ سب سے زیادہ اس بات کا محتاج ہے کہ جب وہ کسی کو معبود مانے تو اس سے راہنمائی طلب کرے، گھر کی زندگی سے لے کر معاشرتی زندگی تک، مزدوری سے لیکر معاشی اداروں تک، باہمی معاملات سے لے کر ایوانِ حکومت تک، انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی تہذیب وتمدن تک، انسانی زندگی حقوق وفرائض اور فضائل ومکارم کے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ جب تک ان تمام حوالوں سے راہنمائی کی ضرورتیں پوری نہیں کی جاتیں انسان کی زندگی میں خوش اطواری پیدا نہیں ہوتی اور ان ضرورتوں کو پورا کرنا کماحقہٗ انسان کے بس کی بات نہیں، یہ تو سراسر اس ذات کا فیضان ہے کہ جس کو انسان اپنا معبود بنالیتا ہے۔ اس بنیادی ضرورت کے حوالے سے یہاں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ جن کو تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو ان کی بے بسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم انہیں اس راہنمائی کی ضرورت کے حوالے سے پکارو تو وہ تمہاری اس ضرورت کو تو کیا پورا کریں گے وہ تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر تمہارے پیچھے چلنے پر بھی قادر ہوسکیں اور پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہارے بار بار پکارنے سے شاید اس طرف متوجہ ہوسکیں تم انہیں ہزار مرتبہ پکارو، چیخو چلاؤ کہ ہم تمہارے سامنے سر جھکا چکے، دستِ سوال دراز کر چکے، عبودیت کا سرمایہ تمہارے آستانوں پر ڈھیر کر چکے، اب اگر تم ہماری یہ ضرورتیں پوری نہیں کرو گے تو کون کرے گا؟ لیکن تمہاری یہ آہ وزاری اور چیخ وپکار ان پر کوئی اثر نہیں کرے گی کیونکہ وہ سرے سے اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تو تم خود سوچو کہ تم نے آخر سرِ نیاز کس آستانے پر جھکایا۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی دلیل کو اور آگے بڑھایا جارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ○

بے شک تم جن کو اللہ کے ماسوا پکارتے ہو وہ تو تمہارے ہی جیسے بندے ہیں پس ان کو پکارو اور انہیں چاہئے کہ وہ تمہیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔ 194

شخصیت پرستی پر تنقید:

گزشتہ آیتِ کریمہ میں تنقید بت پرستی پر تھی اب شخصیت پرستی پر ہو رہی ہے۔ مشرکین سے فرمایا جارہا ہے کہ بت پرستی کے حوالے سے تمہارا عذر یہ ہے کہ ہم ان پتھر کے تراشے ہوئے بتوں کو نہیں پوجتے بلکہ ہم ان شخصیتوں کی پوجا کرتے ہیں جو ان بتوں کے اندر حلول کر جاتی ہیں اور وہ شخصیتیں زندہ شخصیتیں رہی ہیں اور آج بھی بعض ان میں سے تاحال باقی ہیں اور بعض کے اثرات باقی ہیں۔ اگر ہم فرشتوں کو پوجتے ہیں تو فرشتے تو اپنی تمام تر شان وشوکت کے ساتھ زندہ ہیں اور اس طرح مظاہرِ فطرت کی رعنائیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ رہے اللہ کے نیک بندے جو دنیا سے جاچکے ہیں تو روحیں تو ان کی بھی زندہ ہیں اور وہی ہماری مدد کرتی ہیں۔ مشرکین کی انہی معبود شخصیتوں کی طرف اشارہ کر کے قرآنِ کریم کہہ رہا ہے کہ تم جن شخصیتوں کی پوجا کرتے ہو، ان سے مدد مانگتے ہو اور ان کے نام پر قربانیاں دیتے ہو اور تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ بڑی قوتوں کی مالک ہیں اور تمہاری ہر طرح کی مدد کرنے پر قادر ہیں تم ان میں سے کسی ایک کا نام لے کر بتاؤ جو اللہ کے احکام کی پابند نہ ہو، تم مظاہرِ قدرت یا مظاہرِ فطرت کی بات کرتے ہو، ذرا انہیں غور سے دیکھو ان سے بڑھ کر اللہ کی بندگی میں جکڑا ہوا اور کون ہوگا؟ سورج تمہارے نزدیک سب سے بڑا دیوتا ہے لیکن کیا سورج کی مجال ہے کہ وہ اللہ کے حکم کی سرتابی کرے وہ وقتِ مقررہ پر طلوع ہوتا ہے اور وقتِ مقرر پر غروب ہوجاتا ہے، اللہ نے جو اس کے لئے محور اور مدار بنادیا ہے وہ کبھی اس سے نکلنے کی قدرت

Marfat.com

نہیں رکھتا۔ سورہ یٰسین میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ سورج کی مجال نہیں وہ چاند کو جا پکڑے اور رات کی یہ ہمت نہیں کہ وہ دن سے آگے نکل جائے۔ یہ تمام سیارے اور ستارے اللہ کے حکم سے اپنے اپنے مدار میں محوِ گردش ہیں انسان تو پھر عارضی طور پر ہی سہی اپنی مرضی کرنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن انسانوں نے جن کو اپنا دیوتا بنا کر پوجا کی ہے وہ تو اپنی مرضی کے ہرگز مالک نہیں بلکہ اللہ کی مرضی کے پوری طرح پابند ہیں تم فرشتوں سے مدد مانگتے ہو تو فرشتے تو سرے سے اللہ کے احکام سے سرتابی کا تصور بھی نہیں کر سکتے انہیں جس ڈیوٹی پر لگا دیا گیا ہے وہ کبھی اس سے سرِ موانحراف نہیں کر سکتے وہ اللہ کے عاجز بندے ہیں لیکن اللہ کے یہاں اپنی تسبیح و تقدیس سے عزت پائے ہوئے ہیں۔

مختصر یہ کہ کائنات کی کوئی چھوٹی بڑی چیز حتی کہ بڑے سے بڑا کرہ بھی بالکل اسی طرح بندگی میں جکڑا ہوا ہے جس طرح ہم سے بندگی کا تقاضہ کیا جاتا ہے تو جب وہ بھی ہماری طرح بندے ہیں، تو بندہ تو بندہ ہی رہتا ہے معبود نہیں ہو سکتا، تو تم نے ان کو معبود بنا کر کس طرح پکارنا شروع کر دیا ہے؟ چلئے! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ واقعی معبود ہیں اور وہ ہر طرح تمہاری مدد کرنے کی قدرت رکھتے ہیں تو جانے دیجئے اس بات کو کہ آج تک انہوں نے تمہاری مدد نہیں کی۔ تمہیں اصرار ہے کہ وہ تمہاری مدد کرتے رہے ہیں لیکن اب جبکہ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری اور قرآن کریم کے نزول کے بعد حق و باطل کا معرکہ سرگرم ہو گیا ہے اور آنحضرت ﷺ اور قرآن حق گوئی کی کسوٹی بن کر آ گئے ہیں اور ان کا فرمانا یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کسی کی مدد کرنے پر قادر نہیں سب اللہ کے بے بس بندے ہیں اور تمہیں اپنی اس بات پر بے حد اصرار ہے تو ایسی صورتحال میں جب کہ ایک طرف پیغمبر کی سچائی ہے اور دوسری طرف تمہارے اپنے برسرِ حق ہونے کا دعویٰ کہ مشرکین جن کو پکارتے رہے ہیں وہ محض مفروضہ نہیں تھا بلکہ واقعی کوئی ان کی حقیقت تھی۔ لیکن آج اگر تمہارے شرکاء نے تمہاری مدد نہ کی تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ تم جس بات کا دعویٰ کرتے تھے وہ جھوٹ اور گمراہی کے سوا کچھ نہ تھا اس لئے فرمایا گیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو پھر آج تو تمہارے مزعومہ معبودوں کو تمہاری مدد کر کے تمہیں برسرِ حق ثابت کرنا چاہئے۔ یہ بالکل اسی طرح کا چیلنج ہے جیسے پروردگار نے قرآن کریم کی حقانیت ثابت کرنے کیلئے عربوں کو قرآن کریم جیسی کتاب لانے کا چیلنج دیا تھا اور ساتھ ہی یہ فرمایا تھا کہ قرآن جیسی کتاب تو کیا لاؤ گے لیکن تم اگر قرآن کو اللہ کی کتاب نہ ماننے کے دعویٰ میں سچے ہو تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ یہاں بھی یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم اگر اپنے شرک میں سچے ہو تو پھر معبودوں سے کہو کہ وہ تمہاری مدد کریں لیکن جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو پھر اگلی آیتِ کریمہ میں ان کے نقطۂ نگاہ کا استخفاف کرتے ہوئے ان کی غیرت کو جھنجھوڑا گیا اور ساتھ ہی ان کے غلط تصورات کو چیلنج بھی کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ز اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ز اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ز اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ط قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَ كُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنَ ○ اِنَّ وَلِيِّ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ زلے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ○

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں؟ کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں؟ کیا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں؟ کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں؟ کہہ دو! تم اپنے شریکوں کو بلاؤ پھر میرے خلاف چالیں چل کر دیکھو اور مجھے مہلت نہ دو میرا کارساز وہ اللہ ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ نیکوکاروں کی کارسازی فرماتا ہے۔ 195,196

اس آیتِ کریمہ میں تنقید کا نشتر تیز ہو گیا ہے مشرکین کی غیرت کو جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ایک طرف تو تم یہ کہتے ہو کہ ہم جن کی پوجا کرتے اور جن سے مدد طلب کرتے ہیں وہ شخصیتیں بہت بڑی قوتوں کی مالک ہیں اور ان کی اللہ تک رسائی ہے وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں لیکن تمہارا معاملہ ان کے ساتھ یہ ہے کہ تم نے ان کے نام پر پتھر کے بت تراش لئے جن کی بے بسی خود تمہارے سامنے ہے ان کی بے بسی کا مذاق اڑاتے ہوئے انہیں جھنجھوڑا

Marfat.com

گیا ہے کہ تم ایک طرف اپنا تصور کرو اور ایک طرف اپنے معبودوں کا۔ عابد ہمیشہ کمزور اور بے بس ہوتا ہے اور معبود قدرتوں کا مالک۔ لیکن جن معبودوں کے تم نے بت یا مجسمے تراش رکھے ہیں ذرا غور کرو تم نے ان کے پاؤں بنائے ہیں، معمولی جانور کا بچہ بھی اپنے پاؤں سے چلتا ہے لیکن یہ تمہارے معبود پاؤں سے چلنے کے قابل نہیں۔ تم نے ان کے ایسے ہاتھ بنائے ہیں جن میں پکڑنے کی طاقت نہیں، وہ تمہیں تو کیا تھامیں گے تم انہیں اٹھا کر کبھی ادھر کبھی ادھر رکھتے ہو، پھر ان کی آنکھیں ایسی ہیں جن میں دیکھنے کی صلاحیت نہیں حالانکہ تم اور تم جیسے اور لوگ بھی دیکھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں ایسے ہی تم نے ان کے کان بنا رکھے ہیں جن سے وہ سن نہیں سکتے جبکہ معمولی سے معمولی شخص بھی قوتِ سماعت سے گراں بار ہے یعنی جو نعمتیں تمام انسانوں حتیٰ کہ حیوانوں تک کو میسر ہیں یہ تمہاری بڑی قوتوں والوں کے قالب اور ان کے مجسمے وہ ان قوتوں سے بھی محروم ہیں۔ اس سے بڑا فکری تضاد اور عقل کا فساد اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ جو قوتیں عقل تو بہت بڑی بات ہے معمولی احساس سے تہی دامن ہیں تم انہیں اپنا معبود بنا رہے ہو۔

یہ ایک ایسی تنقید ہے جسے سن کر ہر عقیدت مند برہمی کے اظہار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا یا تو وہ کہنے والے سے الجھ پڑے گا اور یا پھر صورتحال سے نکلنے کی کوشش کرے گا ایک باغیرت آدمی کیلئے ایسی صورت حال سے تو مر جانا بہتر ہوتا ہے۔ لیکن مشرکینِ مکہ کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ جب وہ اس طرح کی جارحانہ تنقید کا جواب نہیں دے سکتے تو ایک طرف تو وہ مخالفت میں شدت پیدا کر دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ داعیٔ حق کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر انہیں آئینہ دکھانے سے رک جائے۔ یہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسا ہی کیا آنحضرت ﷺ کو دھمکی دی جانے لگی کہ اگر تم اس تنقید سے نہ رکے اور تم نے ہمارے بتوں کی مذمت کرنا بند نہ کی تو ہم تمہیں تنبیہ کرتے ہیں کہ ہمارے معبودوں کی مار تم پر پڑے گی، ان کا غضب تم پر بھڑکے گا اور تم بھسم ہو کر رہ جاؤ گے، تمہارا سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ تم سے دلائل کا جواب اگر بن نہیں پا رہا تو تم مجھے نقصان پہنچانے کی جو تدبیر کر سکتے ہو کر گزرو مجھے ہرگز مہلت نہ دو کہ میں تمہاری اس تدبیر اور اس چال کا کوئی توڑ سوچ سکوں لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہارے عقائد چونکہ سراسر باطل ہیں تم نے سراب کو پانی سمجھ رکھا ہے تم نے ان سے امیدِ وفا باندھ رکھی ہے جو جانتے نہیں کہ وفا کیا ہے، تم نے ان سے امیدیں باندھ رکھی ہیں جن کی حقیقت سوائے پتھروں کے اور کچھ نہیں، تم نے محض مفروضوں کے سہارے حقیقتوں کا خون کر کے رکھ دیا ہے، تم نے اس مفروضے کی بنیاد پر پتھروں کے بت تراشے ہیں کہ ان میں تمہاری دیویوں اور تمہارے دیوتاؤں کی روحیں حلول کر جاتی ہیں اس لئے تم ان پتھروں کے واسطے سے ان کی پوجا کرتے اور ان سے مدد مانگتے ہو۔ اس بات کی حقیقت سوائے مفروضے کے اور کچھ نہیں، اس لئے کہ پتھر میں کسی کی قوت منتقل نہیں ہوتی اور پھر جن قوتوں کے سہارے تم نے شرک کا کاروبار رچا رکھا ہے، وہ بجائے خود اپنی کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ قوت کا سرچشمہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ شیطانی قوتیں بعض دفعہ اپنے ماننے والوں کو شرک میں مستحکم کرنے کیلئے تھوڑا بہت سہارا تو دیتی ہیں لیکن یہ سہارے صرف گمراہی کے سہارے ہوتے ہیں۔ جب حق و باطل کا معرکہ گرم ہوتا ہے اور اللہ کے نبی سے معاملہ پڑتا ہے یا نبیوں کے سچے پیروکاروں سے واسطہ پڑتا ہے تو پھر یہ شیطانی یا جناتی قوتیں بھی اپنے ماننے والوں کو کوئی مدد نہیں دے سکتیں۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں تمہارے کاہنوں نے بہت سارے غلط سہارے دے رکھے ہیں لیکن اب تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میرا کارساز اور میرا مددگار اور میرا حامی و ناصر اللہ ہے (یہاں ولی کا لفظ آیا ہے جس کے معنی حامی و ناصر اور مرجع و کارساز کے ہیں) اور جس کا ولی اور حامی و ناصر اللہ ہو اس کے مقابلے میں آنے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی اور اللہ اگر نہ چاہے تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا چنانچہ جنگِ بدر میں قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ شیطان نے مشرکین مکہ کو میدانِ بدر میں لانے تک اپنا کردار ادا کیا اور وہاں بھی ان کا حوصلہ بڑھاتا رہا لیکن جب اس نے فرشتوں کو دیکھا اور اللہ کی مدد اترتے ہوئے دیکھی تو ان سے ہاتھ چھڑا کر بھاگا اور کہنے لگا کہ جو میں دیکھ رہا ہوں وہ

Marfat.com

نہیں دیکھ رہے ہو اس لئے میں اللہ سے ڈرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ اس کا عذاب بڑا سخت عذاب ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطانی قوتیں بعض دفعہ اپنے ماننے والوں کو مدد تو دیتی ہیں لیکن جس کا ولی اللہ ہو اور وہ اس کے سہارے کفر و باطل کی قوتوں کے مقابلے میں تن کر کھڑا ہو جائے تو پھر اللہ کا قانون یہ ہے کہ تمام شیطانی قوتیں چاہتے ہوئے بھی نہ کافروں کا ساتھ دیتی ہیں اور نہ اہلِ حق کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں۔ مزید فرمایا کہ میرا کارساز میرا ولی وہ اللہ ہے جس نے نہایت اہتمام سے مجھ پر کتاب اتاری اور اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے کہ تم اپنے بتوں کو اگر راہنمائی کیلئے پکارو تو وہ تمہیں جواب تو کیا دیں گے وہ تمہارے ساتھ چلنے کو بھی تیار نہیں ہوتے حتیٰ کہ وہ اس قابل بھی نہیں ہیں کہ تمہاری پیروی کر سکیں لیکن جس اللہ کی بندگی میں کرتا ہوں اس نے میری راہنمائی کیلئے جہاں مجھے حواس اور جوہر عقل سے نوازا ہے وہیں مجھ پر کتاب بھی اتاری ہے اور دوسرا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تم نے جو میری دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے اور اس دشمنی میں تم ہر تعلق کو بھول چکے ہو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اللہ کی طرف سے ایک کتاب لے کر آیا ہوں جس میں زندگی گزارنے کا طریقہ، زندگی کیلئے شریعت اور زندگی کا ایک قانون دیا گیا ہے تمہیں دشمنی اصل میں اللہ کی اس راہنمائی سے ہے تم اپنی خواہشوں سے بھرپور زندگی کو چھوڑ کر اللہ کی بندگی کی طرف نہیں آنا چاہتے، اس لئے تم اس کا راستہ ہر طرح کی مخالفت سے روک دینا چاہتے ہو۔ میں چونکہ اللہ کے اسی دین کو تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں اس لئے تم اس دین کی وجہ سے میرے دشمن ہو گئے ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جس پروردگار کے دین کو میں شب و روز پیش کرنے میں لگا ہوا ہوں اور جس کی وجہ سے تم نے مجھے زندگی کا ہر دکھ پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کیا وہ تمہارے مقابلے میں میری مدد نہ کرے وہ یقیناً میری مدد کرے گا اس لئے مجھے تمہاری مخالفتوں کی کوئی پرواہ نہیں نہ تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو اور نہ یہ تمہارے دیوی، دیوتا میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ یہ بات صرف میرے ساتھ مخصوص نہیں کہ میں چونکہ اللہ کے دین کی سربلندی، اس کی تبلیغ و دعوت اور اس کے غلبہ کیلئے کام کر رہا ہوں اس لئے وہ میری مدد کرتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کا صالح بندہ اپنی زندگی اسی مشن کے لئے گزارے گا جس کیلئے میں گزار رہا ہوں اور وہ محض اللہ کیلئے دشمنوں کی دشمنیاں انگیخت کرے گا اور اپنی شخصیت کی نفی کرتے ہوئے اللہ کے دین میں اپنے آپ کو گم کر دے گا اور اس کی زندگی کا مقصد اللہ کے دین کی سرافرازی ٹھہرے گا تو اللہ یقیناً اس کی مدد کرے گا، اس کا حامی و ناصر ہوگا اور ہر طرح سے اس کی کارسازی فرمائے گا یہ اللہ کا ایک ایسا اٹل قانون ہے جسے اس نے قرآنِ پاک میں جابجا بیان فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے کام کرو گے تو اللہ تمہیں سربلند کرے گا تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اگر تم اس کے دین کی سربلندی اور اس کے نفوذ سے ہاتھ کھینچ لو گے اور اپنا تعلق اس سے توڑ لو گے تو اللہ تمہیں مٹا دے گا اور تمہاری جگہ ایک ایسی قوم کو لائے گا جو تم جیسی نہیں ہوگی یہ اس کا قانون ہے جو بار بار ہمیں قرآنِ پاک میں گونجتا ہوا سنائی دیتا ہے اور یہی بات آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں بار بار دہرائی تاریخ بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی اللہ کو اپنا کارساز اور ولی سمجھ کر اس کے راستے میں سب کچھ جھونک دیا تو اللہ نے ہمیشہ ان کی مدد فرمائی۔ ظفر علی خاں نے ٹھیک کہا تھا

یثرب سے اب بھی گونجتی ہے یہ صدا سنو!
وہ جو خدا کے ہوگئے ان کا خدا ہو گیا

ایک طرف مشرکین کی بے بسی اور بدنصیبی اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والوں کی اللہ کی جانب سے نصرت و حمایت کے ذکر پر بات ختم ہو جانی چاہیے کیونکہ شرک کی بے بضاعتی پوری طرح واضح ہوگئی اور دوسری طرف مسلمانوں پر اللہ کے احسانات کے فیصلے کا اعلان ہو گیا اس سے بڑی اتمامِ حجت کوئی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگلی دو آیتوں میں مشرکین سے ایک دفعہ پھر اسلوب بدل کر آخری بات کہی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

Marfat.com

وَالَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ نَصۡرَکُمۡ وَلَاۤ اَنۡفُسَہُمۡ یَنۡصُرُوۡنَ ○ وَاِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَی الۡہُدٰی لَا یَسۡمَعُوۡا ؕ وَتَرٰىہُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَہُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ○

''اور جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو نہ وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں اگر تم ان کو راہنمائی کیلئے پکارو تو وہ تمہاری بات نہیں سنیں گے اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمہاری طرف تاک رہے ہیں لیکن انہیں سوجھتا کچھ بھی نہیں''۔ 198,197

تم جن بتوں کو پکارتے ہو یا جن دیوی دیوتاؤں اور مقدس شخصیتوں سے مدد طلب کرتے ہو وہ اسی بنیاد پر کرتے ہو کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ تمہاری مدد کرنے کی طاقت رکھتے ہیں حالانکہ جہاں تک بتوں کا تعلق ہے وہ تمہاری مدد تو کیا کریں گے تم انہیں ہزار پکارو وہ تمہاری پکار بھی نہیں سن سکتے تم ان کے سامنے اپنا دکھڑا روؤ، وہ تمہارے رونے دھونے کو بھی جب سن ہی نہیں سکتے تو مدد کیا کریں گے؟ تم بظاہر یہ سمجھتے ہو کہ جب تم انہیں پکارتے ہو یا ان کے سامنے ڈنڈوت بجالاتے ہو یا ان کے سامنے کھڑے ہو کر بھجن گاتے ہو یا اپنی حاجتیں پیش کرتے ہو تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں کیونکہ تم نے ان کی ایسی آنکھیں بنا رکھی ہیں جو ہر وقت سامنے گڑی رہتی ہیں لیکن تم جانتے ہو کہ نہ وہ تمہیں دیکھتے ہیں اور نہ تمہاری بات سنتے ہیں ان میں حواس تک موجود نہیں عقل کا تو سوال ہی کیا ہے بلکہ ان میں زندگی کا احساس بھی ناپید ہے۔ کس قدر نادانی کی بات ہے کہ جن میں نہ زندگی ہے نہ احساس تم زندگی اور احساس رکھتے ہوئے بھی ان کے سامنے جھکتے ہو اور ان سے مرادیں مانگتے ہو۔

اگر ان سے دیوی دیوتا یا مقدس شخصیتیں مراد لی جائیں تو حقیقت یہ ہے کہ ان کی حقیقت بھی ماسوائے مفروضوں اور ماسوائے تمہارے رکھے ہوئے ناموں کے اور کچھ بھی نہیں یعنی تم نے اپنے تئیں کسی کو لکشمی دیوی، کسی کو جل دیوتا یا اسی طرح کے کچھ نام دے رکھے ہیں کسی کو تم لات کہتے ہو اور کسی کو منات اور کسی کو تم نے عزیٰ بنا رکھا ہے لیکن یہ تمہارے اپنے رکھے ہوئے نام ہیں ان کی حقیقت تو پتھروں کے سوا کچھ بھی نہیں تم نے جو صفات ان کی طرف منسوب کر رکھی ہیں وہ بھی تمہارے خود ساختہ انتساب کے سوا کسی حقیقت کی آئینہ دار نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مفروضہ اعتقادات کے نام سے شرک کا جو ایک کاروبار شروع کر رکھا ہے اس کی حقیقت سوائے جہالت، نادانی، خود فریبی، آباء پرستی کے سوا کچھ نہیں اور نتیجہ اس کا دنیا کی تباہی اور آخرت کی بربادی ہے۔ خود سوچ لو تم نے جو راستہ اختیار کر رکھا ہے اس میں کتنی معقولیت ہے۔

اگلی آیت کریمہ سے رکوع کا دوسرا حصہ شروع ہو رہا ہے جس میں آنحضرت ﷺ کو اور آپ کے واسطے سے مسلمانوں کو اس کٹھن فریضہ کو انجام دینے کی نزاکتیں سکھائی جا رہی ہیں اور ہدایات دی جا رہی ہیں جس کیلئے آنحضرت ﷺ مبعوث کیے گئے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

خُذِ الۡعَفۡوَ وَاۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰہِلِیۡنَ ○ وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ○

''اے پیغمبر! نرمی اور درگزر کی عادت بنالو، معروف کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو اور اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ چاہو، بے شک وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ 199,200

دعوتِ حق کی انجام دہی کیلئے ناگزیر ہدایات:

ان آیات پر غور کرتے ہوئے مختلف باتوں کی طرف راہنمائی ملتی ہے جن میں سے ایک بات دعوتی نقطہ نگاہ اور انسانی نفسیات کے حوالے

Marfat.com

سے اس قابل ہے کہ اسے سونے میں تولا جائے ہم میں وہ بصیرت تو نہیں جس سے ہم ان آیات میں بیان کردہ حکمتوں کو پوری طرح سمجھ سکیں تاہم جو باتیں ہم ناچیز لوگوں کے فہم وادراک میں آتی ہیں انہیں ہم ایک ترتیب سے ذکر کرتے ہیں۔

1۔ آیات میں بیان کردہ حکمتوں کو دیکھ کر سب سے پہلا تاثر جو دل ودماغ میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عظیم پیغمبر اور ان کے واسطے سے مسلمانوں کو ایک ایسے کام کی ہدایات ارشاد فرما رہے ہیں جو اپنی ذات میں نہایت کٹھن ہے جس کی نہایت گہری نزاکتیں ہیں جس میں ذرا سی بے احتیاطی تبلیغی مشن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کیلئے صرف علم کافی نہیں بلکہ جب تک علم کے ساتھ حکمت نصیب نہ ہو، انسانی نفسیات کا گہرا ادراک نہ ہو اور طبیعت پر بے پناہ قابو نہ ہو، اس وقت تک اس کام کا ارادہ کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسلامی علوم مطالعہ کرنے کا نام نہیں، یہ محض حکیمانہ طریقے سے مسلسل غور وفکر سے بھی انجام نہیں پاتا، اس کیلئے انسانوں سے ملنا، ان کے احساسات کو جاننا، ان کے ہر طرح کے ردعمل کو برداشت کرنا، طبیعت کے ہیجان پر قابو پانا، اپنی ذات کو اس کام میں گم کر دینا اور سب کچھ کر کے بھی کسی طرح کا ادعا پیدا نہ ہونے دینا یہ اس کے کم سے کم تقاضے ہیں، جس کے بغیر اس وادی میں داخل ہونا بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات کا پہلا تاثر یہ ہے کہ جس کام کیلئے یہ ہدایات دی جا رہی ہیں سب سے پہلے اس کام کا صحیح احساس دل ودماغ میں پیدا ہونا چاہئے۔

2۔ کوئی پیغمبر یا پیغمبر کا پیروکار ایسا نہیں گزرا جس نے اللہ کے دین کی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کی ہو اور پھر لوگوں نے اسے نہایت آسانی سے قبول کر لیا ہو بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہر پیغمبر اور ہر مصلح کو اپنے مخاطبوں کی جانب سے ہمیشہ شدید ردعمل سے واسطہ پڑا ہے اور اگر اللہ کے فضل وکرم سے لوگوں کی ایک معقول تعداد دعوت قبول کرنے کیلئے تیار ہو گئی ہے کہ تو ان کی تربیت کا کام بجائے خود ایسا کٹھن کام ہے جس میں پیغمبر اور مصلح کو قدم قدم پر اپنا خون جلانا پڑتا ہے، ان کی صدیوں کی روایات کو بدلنا، ان کی عادات کو تبدیل کرنا، ان کے معمولات میں تبدیلی لانا، ان کی ترجیحات میں انقلاب برپا کرنا بلکہ ایک ایک فرد میں نئی شخصیت پیدا کرنا اور ان کے واسطے سے ایک نیا معاشرہ جنم دینا، ایک ایسا مشکل ترین کام ہے جس کیلئے جب تک ان مذکورہ بالا ہدایات پر عمل نہ کیا جائے اس وقت تک اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

3۔ اللہ کے نبی معصوم پیدا ہوتے ہیں اور وحیِ الٰہی کا نور ان کا راستہ روشن رکھتا ہے اور ان پر ایمان لانے والے اس مینارۂ نور سے ہمیشہ اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔ بایں ہمہ! انہیں اس طرح ہدایت دی جا رہی ہیں جیسے انگلی پکڑ کر انہیں چلایا جا رہا ہے۔ ان ہدایات کیلئے تین عنوانات اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا ہے ﴿عفو﴾ مقصود یہ ہے کہ اے پیغمبر آپ کو اور آپ کی امت کو اپنا فرض انجام دینے کیلئے سب سے پہلی جو چیز اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ عفو کو اپنی عادت بناؤ یعنی ایسا نہیں کہ کسی ایک آدھ موقع پر عفو ودرگزر سے کام لو بلکہ یہ صفت تمہاری خصلت، تمہاری عادت اور تمہاری طبیعتِ ثانیہ بن جانی چاہئے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ عفو سے مراد کیا ہے؟ عربی لغت کے اعتبار سے عفو کے کئی معنی ہو سکتے ہیں اور اس موقع پر ہر معنی کی گنجائش ہے ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ عفو ہر ایسے کام کو کہا جاتا ہے جو آسانی کے ساتھ بغیر کلفت اور مشقت کے ہو سکے۔ مراد یہ ہے کہ اے پیغمبر! جس طرح آپ کا واسطہ غیر مسلموں سے ہے، اسی طرح اپنے فرماں برداروں سے بھی ہے۔ فرمانبرداروں کے حوالے سے یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ آپ کا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ اگر حقوق وفرائض کی تعمیل میں یا آپ کے اتباع واطاعت میں یا عبادت کی ادائیگی میں بظاہر مسلمانوں میں کچھ کمی بھی محسوس ہو تو آپ اسے قبول فرمائیں اور اعلیٰ معیار کا نمونہ دیتے ہوئے اس پر اصرار نہ فرمائیں آہستہ آہستہ یہ لوگ خود بخود اعلیٰ معیار کی گھاٹی پر چڑھتے چلے جائیں گے۔ لیکن فی الحال آپ کا رویہ ان کے ساتھ نہایت نرمی اور سہولت کا ہونا چاہئے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے نازل ہونے پر

Marfat.com

فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال واخلاق میں سرسری اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا ہے میں نے عزم کرلیا ہے کہ جب تک ان لوگوں کے ساتھ ہوں ایسا ہی عمل کروں گا۔اسی سے متعلق اس کا دوسرا پہلو بھی ہے کہ غیر مسلموں میں آپ کے بعض ایسے قرابت دار بھی تھے جن سے آپ کو معاملات پیش آتے رہتے تھے اور خود مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ تھے جو ابھی تک پوری طرح مکارمِ اخلاق کی تربیت نہیں پاسکے تھے اس لئے اخلاقی معاملات میں خود آنحضرت ﷺ کے ساتھ بعض دفعہ ان سے کوتاہیاں سرزد ہوتی تھیں۔چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں عفو کے ذریعہ سے آپ کو یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ آپ ان لوگوں کے معاملات میں حد درجہ نرمی اختیار فرمائیں کیونکہ یہی وہ اخلاق ہے جو آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں آپ کی محبت اور اسلام کے لئے استقامت پیدا کرے گا۔اسی چیز کو نبی کریم ﷺ نے ایک اور موقع پر اس طرح ارشاد فرمایا کہ

میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کرو جو مجھ سے کٹے، میں اس سے جڑوں، جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں اور جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کردوں۔

یہی وہ اخلاقِ کریمانہ ہیں جس نے عرب کے بدوؤں اور اجڈ لوگوں کو آہستہ آہستہ آپ کا گرویدہ بنا دیا لیکن ایسے اخلاق کا پیکر بننا اور ہر طرح کے حالات میں ایسے مکارمِ اخلاق کا ثبوت دینا یہ اللہ کے فضل وکرم کے سوا ممکن نہیں۔اس لئے پروردگار نے احسان کے طور پر اس کا ذکر فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کیلئے نرم ہو ورنہ اگر تم درشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔﴿آلِ عمران:۱۵۹﴾

انسانوں کو راہِ راست پر لانے اور ان میں مطلوبہ صفات پیدا کرنے میں اگرچہ حقیقی موثر عامل وہ الہامی تعلیم ہی ہے جو پیغمبر اللہ کی طرف سے انسانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں لیکن انسانوں میں اجتماعی شیرازہ بندی اور گہرا ربط وضبط وہ صرف الہامی تعلیم سے نہیں بلکہ پیغمبر، مصلح یا قائد کی خوش اخلاق شخصیت سے وجود میں آتا ہے، الہامی تعلیم کا راہنما اور مبلغ بھی اگر حسنِ اخلاق سے تہی دامن اور درشت خو ہو تو لوگ کبھی اس کے گرد جمع نہیں ہوں گے اور اگر برائی کی دعوت دینے والا بھی خوش اخلاق ہو تو اس کے گرد لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

ہجوم زیادہ ہے کیوں شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

عفو کا دوسرا معنی ہے درگزر کرنا اور معاف کردینا۔عربی زبان میں محض زبان سے معاف کرنا اور وقتی طور پر درگزر کرنا یعنی سزا نہ دینا لیکن دل سے معاف نہ کرنا عفو اس کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور دل سے معاف کردینے کیلئے بھی بولا جاتا ہے، یہاں دونوں ہی معنی مراد لئے جاسکتے ہیں۔اللہ کے پیغمبروں کو لوگوں کی جانب سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے جیسے دعوتِ دین کا کام آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے لوگوں کی جانب سے مخالفت میں شدت آتی جاتی ہے۔وہ زبان سے بھی پیغمبر کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہیں، اتہامات اور الزامات کا بھی طوفان اٹھاتے ہیں، سازشیں بھی کرتے ہیں، ہر طرح کی تکلیف پہنچانے کی تدبیریں بھی سوچتے ہیں، بس چلے تو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے، معاشی قطع تعلق بھی کرنا پڑے تو یہ بھی ان کے مشکل نہیں ہوتا، جسمانی تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے، غرضیکہ زندگی کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو پیغمبر کو اپنی قوم کی طرف سے برداشت نہیں کرنا پڑتا۔اس صورتحال میں یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر کی طبیعت میں اشتعال پیدا نہ ہو، ناگوار باتوں پر غصہ نہ آئے، تلخ گفتاری پر طبیعت میں ہیجان پیدا نہ ہو لیکن دعوت

Marfat.com

عمل ایسا صبر آزما عمل ہے کہ اس میں ان سب باتوں کو برداشت کرنا اس عمل کا لازمی تقاضہ ہے، اگر ان سب باتوں کو برداشت نہ کیا جائے تو آج کے دشمن کل کے خیر خواہ نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ یہاں اسی بات کا حکم دیا جارہا ہے کہ آپ کو ان تمام باتوں کے مقابلہ میں عفوو درگزر سے کام لینا ہے۔ مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی اور تکلیف دہ مزاحمت کا اظہار ہو آپ کو اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے درگزر ہی سے کام لینا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی پر عمل کرتے ہوئے نہ کبھی اہلِ مکہ سے انتقام لیا، نہ مدینہ کے یہود اور منافقین سے، آپ نے طائف کے پتھر کھائے لیکن بجائے انتقام لینے کے ان کیلئے ہدایت کی دعا فرمائی، جنگِ احد میں آپ کو بری طرح زخمی کیا گیا لیکن آپ نے ان کے لئے کوئی کلمۂ سخت کہنا بھی گوارا نہ کیا اور جب فتح مکہ کے بعد آپ کے دشمن اپنی تمام مخالفتوں، ہرزہ سرائیوں، ایذا رسانیوں اور تہمت تراشیوں کا پشتارہ اٹھائے آپ کے سامنے کھڑے تھے تو آپ نے صرف درگزر ہی نہیں کیا بلکہ دل سے معاف فرمایا اور یہ نتیجہ تھا اسی عفو کے حکم کا۔

اور دوسرا ہے ﴿وأمر بالعرف﴾ اور آپ انہیں معروف کا حکم دیں۔ معروف ایسی بات کو کہتے ہیں جو عقل اور فطرت اور معقول لوگوں کے نزدیک جانی پہچانی ہو اسلام کے بنیادی عقائد نیکی اور عدل کی تعلیمات اور تمام مکارمِ اخلاق یہ ایسی باتیں ہیں جو عقل وفطرت کی شہادت پر مبنی اور سلیم الفطرت طبائع کے لئے ان کے دل کی آواز ہیں اسی طرح ہر وہ اچھی اور مستحسن بات یا کام جو کسی بھی معاشرے میں سنجیدہ فکر اور صالح عمل لوگوں کے نزدیک پسندیدہ ہو اور شریعت اسلامی نے اس کی مخالفت نہ کی ہو اور اسلامی مزاج اس سے ابا نہ کرتا ہو وہ بھی معروف میں داخل ہے آپ کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپ ان لوگوں کی مخالفتوں کے باوجود معروف کا کام جاری رکھیں ہر اچھائی کی طرف ان کو بلائیں اور ہر نیکی کی انہیں ترغیب دیں آخر ایک وقت ایسا آئیگا کہ صالح طبیعتیں آپ کی دعوت پر استقامت اور دشمنوں کی شقاوت کو دیکھتے ہوئے سوچنے پر مجبور ہوجائیں گی کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق وانسانیت سے گری ہوئی تدبیریں کررہے ہیں تو رفتہ رفتہ انکے دل خود بخود داعیٔ حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ آخر کار میدانِ مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جن کے ذاتی مفادات نظامِ باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہیں یا جن کی گروہی مجبوریاں اور جاہلانہ تعصّبات اس روشنی کے قبول کرنے کی اجازت نہ دیں۔

معروف کا حکم دینے اور اس کی تبلیغ کرنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان کے سامنے اسلامی دعوت پیش کی جائے۔ فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کی بجائے سیدھے سادے طریقے سے بات سمجھانے کی کوشش کی جائے جسے لوگ اپنے دل کی آواز محسوس کریں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کا اسی ہدایت کے مطابق یہ مزاج بن گیا تھا کہ آپ دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں ہر شخص کی ذہنی سطح کے اور اس کے مدارج کا پورا پورا خیال فرماتے تھے۔ شہری لوگوں سے ان کے انداز اور معیار کے مطابق گفتگو فرماتے اور دیہاتی اور بدوی لوگوں سے ان کی ذہنیت کے مطابق بات کرتے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ نے اس سلسلے میں بنی فزارہ کے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بدوی تھا۔ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جو سیاہ رنگ کا ہے۔ میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا ہے کیونکہ ہم میاں بیوی میں سے کوئی بھی سیاہ رنگ کا نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی سمجھ اور پیشہ کے مطابق جواب مرحمت فرمایا۔ اس سے پوچھا: کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا: جی ہاں! آپ نے پھر دریافت فرمایا: وہ کس رنگ کے ہیں؟ اس نے کہا: سرخ رنگ کے۔ آپ نے پھر سوال کیا: ان میں کوئی خاکستری رنگ کا یا کم سیاہ رنگ کا کوئی اونٹ بھی ہے؟ اس نے کہا: ہاں ہے۔ حضور نے فرمایا کہ اب تم ہی بتاؤ کہ سرخ رنگ کے اونٹوں میں یہ سیاہی کیسے آگئی؟ اس نے اس کے جواب میں کہا ممکن ہے کہ

Marfat.com

اس کی نسل میں کوئی خاکستری یا سیاہ رنگ کا ہو اور اور یہ اس کی جھلک آ گئی ہو۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو آپ نے یہ فرما کر اس کے شک کو دور کر دیا کہ تمہارے بیٹے کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوسکتا ہے۔ یہ نسب کا کرشمہ ہے اور اس میں تمہاری بیوی کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اس طرح طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ قریش کا ایک نوجوان جو حیوانیت کے جذبات سے مغلوب تھا۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے بدکاری کی اجازت فرما دیجئے اس کا یہ کہنا تھا کہ حاضرین اس پر لپکے اور اس گستاخی پر اس کو خوب ڈانٹا۔ آپ نے یہ دیکھا تو فرمایا کہ اس سے تعرض نہ کرو اور اس کو قریب بلا کر پوچھا کہ کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ جن رشتوں کا تم احترام کرتے ہو ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی یہ بری حرکت کرے؟ اس نے کہا میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ تم جس برائی کا ارادہ کر رہے ہو وہ برائی بھی تو آخر کسی کی بہن، بیٹی کے ساتھ ہوگی۔ اس کے بعد آپ نے اس کے لئے مغفرت کی دعا فرمائی۔ وہ اس سادہ تفہیم کے انداز سے جو اس کی ذہنی سطح کے عین مطابق تھی اس قدر متاثر ہوا کہ ہمیشہ کیلئے اس سے تائب ہو گیا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اپنی دعوت میں آسانی، تیسیر اور تدریج کو ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ احکام اور مسائل میں تنگی پیدا نہ ہونے پائے اور اس کی خاطر اپنے اللہ سے دعا بھی فرماتے تھے اور جب دوسرے لوگوں کو تعلیم یا تبلیغ کیلئے بھیجتے تو ان کو بھی حکم دیتے کہ لوگوں کو تعلیم دو اور آسانی پیدا کرو اور مشکلات سے پرہیز کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ اغلوطات سے منع فرمایا کرتے تھے۔ امام اوزاعی کہتے ہیں کہ اس سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے مشکل و پیچیدہ مسائل بیان نہ کئے جائیں جن سے وہ کچھ اخذ نہ کر سکیں بلکہ صرف وہ باتیں بیان کی جائیں جن کو وہ آسانی سے سمجھ سکیں بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ حکمتِ تبلیغ کا دار و مدار چونکہ اس بات پر تھا کہ اپنی دعوت کو لوگوں کے دماغوں میں اتارا جائے۔ اس لئے آپ بعض دفعہ حسبِ ضرورت گفتگو میں اپنے مخاطب کے لب و لہجہ کا بھی خیال رکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ اس کا تعلق کس قبیلے سے ہے اور اس قبیلے میں کس نوعیت کی زبان رائج ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ نے عاصم الاشعری سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿ لیس من امبر امصیام فی امسفر ''سفر کے دوران روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے'' ﴾

حالانکہ اصل جملہ اس طرح ہے ﴿ لیس من البر الصیام فی السفر ﴾

عاصم چونکہ قبیلہ اشعر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی عادت یہ تھی کہ اکثر لام کو م کے ساتھ بدل دیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے انہی کے لب و لہجہ میں بات فرمائی اور مقصود صرف یہ تھا کہ مخاطب بات کو پوری طرح سمجھ سکے۔ صحابہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی عادت میں یہ بات بھی تھی کہ جب کسی اہم دینی بات کو دل و دماغ میں اتارنا چاہتے تو عموماً اسے تین مرتبہ دہراتے تاکہ بات دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اس معاملے میں آپ کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ جس طرح آپ لوگوں کے لب لہجہ اور احساسات کا خیال فرماتے تھے اسی طرح ان کی نفسیات کا بھی خیال فرماتے۔ انسانی فطرت ہے کہ آدمی ہر وقت بات سننے کیلئے تیار نہیں ہوتا اور اگر موقع بے موقع اسے بات سننے پر مجبور کیا جائے تو اس کا ذہن، اس کا دل اسے قبول نہیں کرتا۔ حضرت علی ؓ اسی حکمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''دلوں میں خواہشات اور میلانات ہوتے ہیں اور کسی وقت وہ بات سننے کے لئے تیار ہوتے ہیں اور کسی وقت وہ اس کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ لوگوں کے دلوں میں ان میلانات کے اندر داخل ہو کر اس وقت بات کہنی چاہیے جب وہ سننے کیلئے تیار ہوں۔ اس لئے کہ دل کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اور بات قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے''۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے اور ہر وقت اور موقع بے موقع وعظ و نصیحت سے احتراز فرماتے تھے۔ حضرت ابنِ مسعود ؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ وعظ و نصیحت میں تخول سے کام لیتے تھے یعنی وقفہ دے کر بات کرتے تھے تاکہ روزانہ اور ہر وقت کی نصیحت سے طبیعتیں اکتا نہ جائیں۔

Marfat.com

مختصر یہ کہ معروف کا حکم دینے سے مراد ہر بھلائی کی بات کا حکم دینا ہے، جس کی تفصیل آپ نے پڑھ لی ہے اور اسلوبِ دعوت کو ایسا رکھنا ہے جو عام معروف سے ہٹا ہوا نہ ہو بلکہ مخاطب کی حیثیت، اس کی ذہنی سطح اور اس کے احساسات کا پورا لحاظ بھی اس میں شامل ہونا چاہئے۔

تیسرا حکم دیا گیا ہے: ''واعرض عن الجٰھلین'' اور جاہلوں سے اعراض کیجئے۔ دعوتِ حق کا کام کرنے والوں کو ہمیشہ تین طرح کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک تو وہ ہوتے ہیں جو دعوت کو سنتے، اس پر غور کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کی قبولیت کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد اگرچہ تھوڑی ہوتی ہے دوسرے وہ لوگ ہیں جنہیں پیغمبر یا کسی بھی داعیِ حق کی بات سننا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ کہنے والی زبان بند کردی جائے اور لکھنے والا قلم چھین لیا جائے یعنی وہ خیر کے سرچشموں کو بند کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو نہ صرف اس دعوت کو قبول نہیں کرتے بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ دعوت اور داعی کے حوالے سے لوگوں کے ذہنوں میں جتنی غلط فہمیاں پیدا کرسکتے ہوں کریں۔ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی نیا شگوفہ چھوڑتے ہیں، نئے نئے الزامات لگاتے ہیں، نئی نئی الجھنیں پیدا کرتے ہیں اور نئے نئے مطالبات پیش کرتے ہیں۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ داعیِ حق کو اصل کام نہ کرنے دیا جائے بلکہ انہیں باتوں میں الجھا کر اس کی ساری قوت اور سارا وقت ضائع کردیا جائے۔ یہاں آنحضرت ﷺ اور آپ کے واسطے سے تمام داعیانِ حق کو یہ ہدایت دی جاری ہے کہ ایسے جاہل لوگ جن کا کام نئے نئے الجھاوے پیدا کرنا اور آپ کو انہیں میں الجھا کر منزل کھوٹی کرنا مقصود ہے۔ آپ ان سے اعراض کریں یہاں جاہل سے مراد بے علم نہیں بلکہ ایسا شخص مراد ہے جو جاہلیت قدیمہ اور قدیمہ میں، گروہی اور مذہبی تعصبات میں اس قدر شدید ہے کہ وہ اس سے ہٹ کر کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا وہ ہر بات کو انہیں جذبات کی نگاہ سے دیکھتا اور انہی جذبات سے پرکھتا ہے، یہ جاہلِ علم کے مقابلے میں نہیں بلکہ حلم کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ یہاں یہ توجہ دلائی جارہی ہے کہ ایک داعی کو اس معاملے میں نہایت محتاط ہونا چاہئے، اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کیلئے تیار ہوں، لیکن جب کوئی حجت بازی جھگڑالوپن اور طعن و تشنیع پر اتر آئے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کردینا چاہئے۔ اس لئے کہ اس جھگڑے میں الجھنے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ داعی کی جس قوت کو اشاعتِ دعوت اور اصلاحِ نفوس پر خرچ ہونا چاہئے وہ اس فضول کام میں ضائع ہوجائے گی۔ برصغیر کے ایک بڑے آدمی نے ایک موقع پر کہا تھا جس میں اسی ہدایت کا پرتو جھلکتا ہے کہ میں نے جوانی ہی میں اس بات کا عہد کرلیا تھا کہ جب کوئی مجھ سے الجھنا چاہے گا اور بے جواز مناظرہ بازی شروع کردے گا تو میں اس کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا بلکہ اپنے کام سے کام رکھوں گا یہاں بھی یہی فرمایا جارہا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایک واقعے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نصیحت کا تعلق صرف دعوتِ حق سے ہی نہیں بلکہ باہمی معاملات سے بھی ہے کیونکہ دعوتِ حق میں جس طرح جاہلوں سے واسطہ پڑتا ہے اسی طرح معاملات میں بھی ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ معاملات چاہے آپس کے ہوں چاہے حکومت و ریاست کے۔

صحیح بخاری میں ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم ﷛ کی خلافت کے زمانے میں عینیہ ابنِ حصن مدینہ میں آیا اور اپنے بھتیجے حر ابنِ قیس رضی اللہ عنہ کا مہمان ہوا۔ حضرت حر بن قیس ان اہلِ علم حضرات میں سے تھے جو حضرت فاروقِ اعظم ﷛ کی مجلس مشاورت میں شریک ہوا کرتے تھے۔ عینیہ نے اپنے بھتیجے حر بن قیس سے کہا کہ تم امیر المومنین کے مقرب ہو میرے لئے ان سے ملاقات کا کوئی وقت لے لو۔ حر بن قیس نے فاروقِ اعظم ﷛ سے درخواست کی کہ میرا چچا عینیہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ آپ نے اجازت دے دی مگر عینیہ نے فاروقِ اعظم ﷛ کی مجلس میں پہنچ کر نہایت غیر مہذب اور غلط گفتگو کی کہ نہ آپ ہمیں ہمارا پورا حق دیتے ہیں نہ ہمارے ساتھ انصاف کرتے ہیں فاروقِ اعظم ﷛ کو اس پر سخت

Marfat.com

غصہ آیا تو حر بن قیس نے عرض کیا کہ امیرالمومنین اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ﴿خذا لعفو وامر بالعرف واعرض عن الجھلین﴾ اور یہ شخص بھی جاہلین میں سے ہے۔ یہ آیت سنتے ہی فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا سارا غصہ ختم ہو گیا اور اس کو کچھ نہیں کہا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ عادت معروف و مشہور تھی کہ ﴿کان وقافا عند کتاب اللہ عزوجل ''کتاب اللہ کے احکام کے آگے گردن ڈالتے تھے''﴾ یہ مطلب بھی ہے جاہلوں سے اعراض کرنے کا۔

اس آیتِ کریمہ میں جن تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے اس کی تفصیل کسی حد تک آپ نے پڑھ لی ہے۔ ان پر عمل کرنا کسی بھی داعیِ حق کیلئے آسان نہیں۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اس مشکل کام کو آسان بنانے کی تدبیر بتائی گئی ہے اور اللہ سے قوت حاصل کرنے کا ذریعہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ بیشتر اس کے کہ میں اس کی وضاحت کروں اس کی اہمیت واضح کرنے کیلئے میں قرآنِ کریم کے دو مواقع سے چند آیات نقل کرتا ہوں جس سے اس بات کی اہمیت بھی واضح ہو جائے گی اور ساتھ ہی سابقہ باتوں کی تاکید بھی ہو جائے گی۔ ان مواقع میں سے ایک سورہ مومنون کی یہ آیتیں ہیں۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیٰطِیْنِ، وَاَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ (المومنون : ۹۷)

دفعہ کرو برائی کو بھلائی سے ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ کہا کرتے ہیں اور آپ یوں دعا کیجئے کہ اے میرے پروردگار میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے دباؤ سے اور اے میرے پروردگار میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔

ان مواقع میں سے دوسرا سورۃ حم سجدہ کی یہ آیتیں ہیں۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ ○ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ھُوَالسَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○

نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتیں آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کریں پھر یکا یک وہ شخص کہ آپ اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے ○ اور یہ بات انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحبِ نصیب ہے ○ اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے بلاشبہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے ○

پیشِ نظر آیتِ کریمہ کے ساتھ محولہ بالا آیات کو ملا کر پڑھیں تو آپ محسوس کریں گے کہ برائی کے مقابلے میں نیکی اور بڑی سے بڑی زیادتی کے مقابلے میں درگزر کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اس نصیحت پر عمل کرنا چنداں آسان نہیں اس پر عمل صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو بہت مستقل مزاج ہوں یا اللہ تعالیٰ نے جن کا نصیب بہت روشن بنایا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تبلیغِ دین اور دعوتِ حق کے کام کے سلسلے میں ایک داعیِ حق کو جو صورتحال پیش آتی ہے وہ یقیناً ایسی گنجلک اور ایسی پیچیدہ ہوتی ہے جن کی وجہ سے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں چوتھی ہدایت دی گئی جو پہلی تین آیات کیلئے کامیابی کی ضمانت فراہم کرتی یا انہیں آسان بنا دیتی ہے۔ ان دو باتوں میں سے پہلی بات یہ ہے کہ جب ایک داعی

Marfat.com

حق، حق کی دعوت لیکر اٹھتا ہے تو اس کے مخاطبین کی طرف سے شدید ردِعمل سامنے آتا ہے وہ اس کی دعوت کو قبول کرنا تو دور کی بات ہے سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے اور ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ دعوتِ حق کے اس سرچشمے کو بند کر دیا جائے یا اس کے بارے میں اتنی دھول اڑا دی جائے کہ داعیِ حق کی شخصیت اور اس کی دعوت اس میں گم ہو کر رہ جائے۔ اس بپھری ہوئی مخالفت کو دیکھ کر داعیِ حق کی طبیعت میں یقیناً ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے اندر شدید اشتعال محسوس کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے مخالفین کو اسی زبان میں جواب دوں جو زبان میرے لئے اختیار کر رہے ہیں اور میں بھی ہر ایسی ممکن تدبیر بروئے کار لانے سے دریغ نہ کروں جس سے مخالفین کا منہ بند کیا جاسکے۔ مخالفین کی کثرت اور قوت کے باعث اولاً تو ایک داعیِ حق کے لئے ایسی کسی تدبیر کا روبہ عمل لانا آسان نہیں ہوتا لیکن اگر ایسا ہو بھی سکے تو اس کا نتیجہ دعوت کے حق میں کبھی بہتر نہیں ہوگا۔ وہ دل جو صبر و تحمل کی قوت سے بھرتے ہیں اور داعی کے مضبوط کردار کو دیکھ کر متأثر ہوتے ہیں وہ تدبیر کی اس جنگ میں بدگمان ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اس لئے یہاں نصیحت فرمائی جارہی ہے کہ اگر تم اپنے دعوتی عمل کو آگے بڑھانا چاہتے ہو اور تمہاری یہ خواہش ہے کہ تم اللہ کے فضل و کرم سے انہی بند راستوں میں کوئی راستہ نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ اور لوگوں کی بند طبیعتیں تمہارے لئے کھلنے لگیں تو اس کیلئے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ اپنے اندر کے اشتعال کو قابو کرنے کی کوشش کرو اور یہ سمجھ لو کہ تم اپنے اندر جس اشتعال کو محسوس کر رہے ہو یہ حقیقت میں شیطان کی طرف سے ایک انگیخت ہے تاکہ تم بھی اسی راستے پر چل پڑو جس پر تمہارے مخالف چل رہے ہیں لیکن تمہیں اس کی بجائے ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے کہ مخالف کی گالی کے مقابلے میں دعا دی جائے اور ان کی تکلیفوں کے مقابلے میں اخلاقیات کے پھول نچھاور کئے جائیں ان کے بڑے سے بڑے حملے کے جواب میں صبر و تحمل کا ثبوت دیا جائے یہ نہ صرف ایک بہت مشکل کام ہے بلکہ بعض دفعہ انسان ہزار کوشش کے باوجود بھی اس پر اپنے کو قادر نہیں پاتا۔ اس لئے فرمایا جارہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم شاید اپنے طور پر اس پر عمل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکو اس لئے تمہارے لئے آسان کام یہ ہے کہ تم اللہ سے پناہ مانگو اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دو اور اس سے یہ دعا کرو کہ یا اللہ میں ایک انتہائی کمزور شخص ہوں میں شیطانی وسوسوں پر پوری طرح قابو نہیں پاسکتا میں اپنی طبیعت کے ردِعمل کو روک نہیں سکتا، ناخوشگوار بات پر برہم ہو جانا میری فطرت کا تقاضا ہے میں فطرت کے تقاضوں کو کب تک دبا کر رکھوں، اس لئے میری دعا ہے کہ تو مجھے اپنی پناہ میں لے لے، میری ناتوانیوں کو توانائیوں میں بدل کر میری کمزوری کو قوت میں تبدیل کر دے، نفسانی خواہشوں اور شیطانی اکساہٹوں کو مجھ پر غالب نہ آنے دے بلکہ اپنے خوف، اپنی محبت اور اپنے دین کے رستے میں استقامت کو میرے لئے مضبوط ڈھال بنا دے۔ اس دعا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ داعیِ حق کو اپنی پناہ میں لے لے گا۔

ان آیات میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ خطابِ واحد کے صیغے کے ساتھ یعنی آنحضرت ﷺ سے کیا جارہا ہے حالانکہ ان نصیحتوں کی ضرورت آنحضرت ﷺ سے زیادہ آپ کے بعد آنے والے داعیانِ حق کو ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وساوسِ شیطانی سے پہلے ہی محفوظ رکھا ہے اور آپ مکارمِ اخلاق کے سب سے بڑے مقام پر فائز ہیں لیکن آپ کو مخاطب کر کے یہ نصیحتیں فرمانا یہ اس لئے ہے تاکہ آپ امت کے داعیانِ حق کیلئے ایک اسوہ اور نمونہ بن جائیں انسان کی یہ فطری خصوصیت ہے کہ وہ حرف و صوت پر مشتمل نصیحتوں پر اتنا اثر قبول نہیں کرتا جتنا زندہ شخصیتوں سے کرتا ہے جب ان نصیحتوں کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ کی شخصیت ان کے سامنے ہوگی تو وہ یقیناً اس سے اثر بھی قبول کرے گا اور ایک حوصلہ بھی پائے گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اللہ کی توفیق سے جس طرح اس راستے میں زریں نقوش چھوڑے ہیں اور ان نصیحتوں پر عمل کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے، وہ انسانیت کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ پوری مکی زندگی میں زندگی کا کون سا دکھ ہے جو آپ کو پہنچایا نہ گیا ہو اور کونسی ایسی قلبی اذیت ہے جس سے آپ کو واسطہ نہ پڑا ہو اور کون سی ایسی اخلاقی گراوٹ ہے جس سے آپ کو سابقہ پیش نہ آیا ہو۔ بایں ہمہ! کسی ایک موقعہ پر بھی تاریخ آپ کے قدموں میں تزلزل محسوس نہیں کرتی بلکہ آپ کا عفو و درگزر

Marfat.com

اوراپنے مخالفین کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا معاملہ اور جاہلوں سے آپ کے اعراض کی روش ہمیشہ کیلئے ایک ضرب المثل بن کر رہ گئی ہے۔ طائف کا ہولناک واقعہ تاریخ کی ایک ایسی زندہ مثال ہے جس کی نظیر شاید تاریخ میں تلاش نہ کی جاسکے۔ آپ نے مسلسل تین میل تک پتھروں کی بارش میں لوگوں کے سامنے دعوتِ حق پیش کی اس وقت تک آپ انہیں سمجھاتے رہے جب تک آپ زخموں سے چور چور اور لہولہان ہوکر بیہوش نہیں ہوگئے۔ لیکن مخالفین کے اس بہیمانہ رویے کے باوجود جب پہاڑوں پر متعین فرشتہ آپ کے پاس یہ درخواست لے کر آیا کہ اگر آپ چاہیں تو میں دونوں پہاڑوں کو آپس میں ملا کر ان ظالموں کو کچل کر رکھ دوں تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں ان کی تباہی نہیں چاہتا میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ اگر یہ نہیں تو ان کی اولادیں ایمان لائیں گی آنحضرت ﷺ کا یہ اسوہ قیامت تک کیلئے داعیانِ حق کو مینارۂ نور بن کر روشنی دیتا رہے گا۔

اس پوری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اللہ سے پناہ مانگنے کا حکم اس لئے دیا جارہا ہے کیونکہ مخالفین کے طرزِ عمل کے باعث ایک داعیِ حق کو بار بار ایسے جذبات سے واسطہ پڑتا ہے جس پر قابو پانا اللہ کی مدد کے بغیر اس کیلئے ممکن نہیں ہوتا اور اس کی مدد اسی طرح طلب کی جاسکتی ہے کہ اس کی پناہ مانگی جائے لیکن اس حکم اور اس نصیحت کا سبب ایک دوسری بات بھی ہے جو بیان کردہ بات سے زیادہ سنگین ہے۔ اس سے میری مراد وہ صورتحال ہے جو ایک داعیِ حق کو اس وقت پیش آتی ہے جب اس کی دعوت کے نتیجے میں دعوت قبول کرنے والوں کا ایک قافلہ تیار ہوجاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ انہیں قوت بھی مل جاتی ہے۔ تو اب داعیِ حق اپنے اندر سے اٹھنے والے اشتعال کو روکنے میں دشواری محسوس کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ اس کے ساتھی اور اس کے پیروکار اسے بار بار مجبور کرنے لگتے ہیں کہ آخر ہم کب تک ان اذیتوں کو برداشت کرتے رہیں، لوگ ہم پر الزامات لگاتے رہیں اور ہم سنتے رہیں، وہ آگے بڑھ بڑھ کر ہماری کردارکشی کریں اور ہم ان کو مسلسل برداشت کریں، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے ہمیں ان کی مخالفت کا جواب مخالفت سے دینا چاہئے، یہ لوگ جس زبان میں بات کرتے ہیں اسی میں سمجھتے ہیں، اس لئے ہماری نصیحت کی باتیں ان پر اثر انداز نہیں ہوتیں، جب انہیں محسوس ہوگا کہ ان کی شرارتوں اور ان کی سازشوں کا سختی سے جواب دیا جاسکتا ہے تو پھر یہ اپنی حرکتوں سے خود بخود رکنا شروع کردیں گے۔ اپنوں کی طرف سے اس طرح کے مطالبات میں اس وقت اور شدت پیدا ہوجاتی ہے جب ان کو کوئی شرعی سہارے بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً وہ اس طرح کی باتیں کہنا شروع کردیتے ہیں کہ دیکھیں ظلم کا ہاتھ نہ روکنا ظلم کو تقویت دینے کے مترادف ہے۔ ہم جس چیز کو صبر کہتے ہیں وہ حقیقت میں ہماری کمزوری ہے، جس سے مخالفین کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے اور کبھی وہ یہ کہتے کہ ہمارے اس حد سے بڑھے ہوئے صبر نے اسلام کو لاوارث بنا کر رکھ دیا ہے۔ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ کمزور لوگ صبر کا نام لے کر اپنی کمزوریوں کو چھپانا چاہتے ہیں، جس اسلام نے ان میں جرأت اور غیرت وحمیت پیدا نہیں کی وہ اسلام باقی لوگوں کو کیا دے سکے گا؟ اس لئے بہتر ہے کہ اس سے دور ہی رہا جائے۔ اس طرح کی باتیں جو بظاہر شریعت کا تقاضا معلوم ہوتی ہیں ایک داعیِ حق کیلئے اور مشکل کا باعث بنتی ہیں۔ اب وہ اگر مخالفین کی مخالفت پر صبر کرنا چاہتا بھی ہے تو یہ صبر اس کے لئے آسان نہیں رہتا چنانچہ ایسے ہی مواقع کیلئے حکم دیا جارہا ہے کہ اب جبکہ تم تحمل اور برداشت میں دشواری محسوس کررہے ہو تو اللہ سے پناہ طلب کرو اور اپنے پیروکاروں کو بھی اس کی تعلیم دو تا کہ ان کے اندر بھی تحمل اور برداشت اور صبر کی اعلیٰ روایات پیدا ہوسکیں چنانچہ آنحضرت ﷺ کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا اسوہ اس معاملے میں بھی بہت واضح ہے غالباً غزوہ بنو مصطلق میں کنویں سے پانی لیتے ہوئے ایک انصاری اور مہاجر میں تکرار ہوگئی دونوں نے اپنے اپنے قبیلوں کو مدد کیلئے پکارا۔ اسلام نے اگرچہ مسلسل تربیت سے مسلمانوں سے اس عصبیت کو ختم کر ڈالا تھا لیکن اس کے جراثیم بعض کم تربیت یافتہ لوگوں میں ابھی تک باقی تھے۔ چنانچہ وہ لوگ تلواریں لئے اپنے اپنے آدمی کی مدد کیلئے پہنچ گئے قریب تھا کہ بات بڑھ جاتی آنحضرت ﷺ نے بروقت پہنچ کر اس معاملے کو سنبھالا اور دونوں کو ان کی غلطی پر فہمائش کی۔ عبداللہ بن ابی بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس

Marfat.com

جنگ میں شریک تھا۔ اس کو جب اپنے گروہ کے ساتھ الگ بیٹھنے کا موقعہ ملا تو اس نے اوس وخزرج کے لوگوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب کچھ تمہارا کیا دھرا ہے کہ تم نے ان مہاجرین کنگلوں کیلئے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے، ہر چیز ان کے حوالے کردی، اب وہ خوشحال ہو گئے ہیں تو تمہیں ہی آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کتے کو پالو تا کہ تمہیں ہی کاٹے۔ تم آج بھی ان سے ہاتھ کھینچ لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ مزید کہا کہ مدینہ واپس جاکر عزت والے ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔ مطلب یہ کہ ہم ان کو مدینے سے نکال باہر کریں گے۔ وہاں ایک نوعمر صحابی بھی موجود تھے انہوں نے جاکر آنحضرت ﷺ سے یہ باتیں کہہ دیں۔ عبداللہ بن ابی کو پتہ چلا تو فوراً آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور جاکر صفائیاں دینے لگا کہ خدانخواستہ میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہوں، اس لڑکے کو شاید میری بات سمجھ نہیں آئی۔ آنحضرت ﷺ نے اس کا عذر قبول کر کے معاملے کو ختم کرنا چاہا لیکن مسلمان جانتے تھے کہ یہ ایک جھوٹا شخص ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ حضور آپ اگر حکم دیں تو میں اس شخص کو قتل کر دوں۔ اندازہ کیجئے کہ اس نے کیسی دلوں کو پاش پاش کر دینے والی باتیں کہیں لیکن آنحضرت ﷺ نے بجائے اس کو سزا دینے کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ! تم کیا چاہتے ہو کہ لوگ یہ کہیں محمد (ﷺ) اپنے ہی ساتھیوں کو مروا دیتا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اس کے بعد مسلمانوں میں شامل ہونے کی کسے خواہش رہے گی۔ لوگ ہمیں بجائے اس کے کہ انسانوں کا امین سمجھیں وہ ہمیں ایک ظالم کی شکل میں دیکھیں گے۔ لیکن جب واپسی پر یہ لشکر مدینہ کے دروازے پر پہنچا تو عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے جن کا نام بھی عبداللہ تھا اور جو اپنے باپ کے انتہائی فرماں بردار مشہور تھے۔ وہ تلوار بے نیام کر کے اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہو گئے کہ جب تک تم یہ نہیں کہو گے کہ رسول اللہ اور مسلمان عزت والے ہیں میں اور میرے ساتھی ذلیل ہیں، میں اس وقت تک تمہیں مدینہ میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے حکم پر انہوں نے اپنے باپ کو مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ اس پر آپ نے حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تمہیں اندازہ ہوا کہ ہم نے اس کی گستاخی اور ایذا رسانی کو برداشت کیا اور اس معاملے کو اللہ کے سپرد کیا تو اللہ نے اس کو یہ سزا دی کہ وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے بچا۔ آنحضرت ﷺ کا یہ اسوہ ہمیں یہ بات سمجھانے کیلئے کافی ہے کہ داعیِ حق اور اس کے پیروکاروں کی قوت کمزور ہو اور مخالفین کی ایذا رسانیاں ناقابلِ برداشت ہو جائیں تو تب بھی انہیں اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور اگر داعیِ حق اور اس کے پیروکار قوت پکڑ لیں تو تب بھی ایسی صورتحال میں انہیں اپنے جذبات کو قابو رکھ کر ٹھنڈے دل ودماغ سے اللہ کی پناہ چاہتے ہوئے دعوتِ حق کے فریضہ کو انجام دینا چاہیے۔ یہی کامیابی کا راستہ ہے۔ اگر مخالفت کا جواب قوت سے دینا شروع کر دیا جائے تو جواب تو ضرور ہو جائے گا لیکن دعوتِ حق کا کام رک جائے گا لیکن صبر وتحمل سے مخالفین کی مخالفت کو برداشت کرتے ہوئے دعوتِ حق کا کام کرتے رہنا یہ اللہ سے پناہ طلب کیے بغیر ممکن نہیں کیونکہ ہم ہر دور کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ خود مسلمانوں کے اندر سے یا حکومتوں کی جانب سے جب کبھی داعیانِ حق پر ظلم ہوا ہے یا ان کی کردار کشی کی گئی ہے تو انہوں نے اگر صبر وتحمل لیکن ساتھ ساتھ دعوتِ حق کو پوری توانائی کے ساتھ پیش کرنے کے عمل کو جاری رکھا ہے تو ظلم کرنے والے ختم ہو گئے ہیں انکی دعوت اور ان کے پیش کردہ نظریات ایک قوت بن کر اٹھے اور مخالفین پر چھا گئے۔ لیکن جہاں کہیں بظاہر نیکی کا کام سمجھتے ہوئے قوت کا استعمال شروع ہوا تو وہیں شیطانی قوتوں کو اپنا کام کرنے کا موقع ملا۔ لیکن جیسا میں بار بار عرض کر رہا ہوں کہ یہ کام آسان نہیں کیونکہ اپنے لوگ ہی بار بار طنز کرنے لگتے ہیں کہ تمہاری کمزوریوں نے تو اسلام کو ذلیل کر کے رکھ دیا ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے ایک خاص دور میں جب کئی داعیانِ حق قتل ہوئے اور بعض نہایت محترم راہنماؤں پر بھی رکیک حملے کیے گئے اور داعیانِ حق نے صبر وتحمل اور دعوتِ حق سے اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو اس پر طنز کرتے ہوئے کہا گیا

Marfat.com

اس جماعت سے حرارت کی توقع ہے فضول
جس میں ملاں تو بہت ہیں چلبلا کوئی نہیں

اور بھی اس طرح کی بے شمار باتیں کہی گئیں لیکن صاحب بصیرت راہنماؤں نے کسی نہ کسی طرح یہ ظلم کا دور گزارا اور قافلہ حق کو کسی بڑے تصادم میں مبتلا کئے بغیر عافیت سے گزار کر لے گئے۔ لیکن اس کے مقابل میں ہم مشرقِ وسطیٰ میں دیکھتے ہیں کہ خیر اور بھلائی کی قوتوں کو جب ایسی ہی صورتحال سے واسطہ پڑا تو وہ زیادہ دیر تک اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے مجبوراً کہیں کہیں انہیں طاقت کا جواب طاقت سے دینا پڑا۔ لیکن شیطانی قوتوں کا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ جیسے ہی محسوس کرتی ہیں کہ قافلۂ حق کے لوگوں میں ہماری مخالفت کے ردِ عمل کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں تو ہمیشہ اپنے حملوں میں شدت پیدا کر دیتے ہیں، ان کے ترکش میں جو ممکن تیر ہو سکتے ہیں وہ ایک ایک کر کے چلانے سے دریغ نہیں کرتے اور ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ حق کے مسافروں کو اسی کام پر لگا دیا جائے وہ بجائے اصلاح اور خیر کے کام میں محنت کرنے کے مخالفت کا توڑ کرنے میں لگے رہیں اور جب ان کی طرف سے کبھی ظلم کا جواب طاقت سے دیا جانے لگے تو پھر ریاست کی قوت سے پوری طرح انہیں کچل دیا جائے۔ چنانچہ مشرقِ وسطیٰ میں بھی ایسا ہی ہوا کہ خیر کی وہ قوتیں جو مسلمانوں کی دینی زندگی کی ضمانت سمجھی جاتی تھیں ان سے جیسے ہی بعض مواقع پر قوت کے استعمال کا ثبوت ملا تو انہوں نے اسے بڑھا چڑھا کر بغاوت بنا ڈالا اور ریاست کی قوت سے انہیں پامال کر کے رکھ دیا اور جو بچ گئے انہیں پورے عالمِ اسلام میں بکھرنے پر مجبور کر دیا۔ اس لئے اگلی آیتِ کریمہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جو لوگ اسلامی تعلیمات میں ڈھل کر نکلتے ہیں ان کا ذوق محولہ بالا نصیحتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ان کا عمل اس کا عکاس ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝

بے شک جو لوگ متقی ہیں جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے وہ اللہ کا دھیان کرتے ہیں اور دفعۃً ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔ 201

گزشتہ آیات میں خطاب واحد کے صیغہ سے براہِ راست آنحضرت ﷺ سے تھا لیکن اس آیت میں جمع کے اسلوب نے یہ حقیقت منکشف کر دی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے واسطہ سے تمام مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں آنحضرت ﷺ کو چونکہ ایک نمونہ کے طور پر پیش کرنا تھا اس لئے سب سے پہلے ان سے خطاب فرمایا۔ اب اس آیت میں تمام امت مسلمہ کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ان میں جو ہدایات دی گئی ہیں اور جن کے بغیر دعوتِ حق کا کام کرنا ممکن نہیں ان پر عمل صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو بیان کردہ مکارمِ اخلاق کے پیکر ہوں اور کٹھن سے کٹھن جذبات کی وادی میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ کبھی نفسانیت کا شکار نہ ہوں۔ ان پر ہر وقت اللہ کے خوف کا غلبہ ہو اور وہ ہر سوچ اور ہر عمل سے پہلے اللہ کی شریعت اور اس کی رضا کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اصلاً راہِ حق کے مسافر ہیں اور ان کا حال یہ ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کا ذوق اس طرح بن جاتا ہے کہ جب کبھی حق و باطل کے معرکے میں جذبات برانگیختہ ہونے لگتے ہیں اور وہ اشتعال کی گرفت میں آ کر کوئی جوابی کارروائی کا سوچنے لگتے ہیں تو مسلسل تربیت کے نتیجے میں ان کے اندر پیدا کردہ ذوق اور اللہ کی حفاظت انہیں فوراً متنبہ کرتی ہے کہ دیکھو تم یہ کیا کر رہے ہو؟ چنانچہ وہ چونک جاتے ہیں اور اللہ کی یاد انہیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور ان کے دماغوں اور ان کی عقل و دانش پر جذبات کی برانگیختگی کے باعث جو غبار پڑ جاتا ہے وہ فوراً چھٹ جاتا ہے اور ان کا دماغ اور ان کی عقل پوری طرح بیدار ہو کر وہ کچھ دیکھنے لگتی ہے جو ایسے موقع پر انہیں دیکھنا چاہیے۔ قرونِ اولیٰ میں تو ہمیں اس کی

Marfat.com

مثالیں جابجا ملیں گی لیکن ہم قریبی تاریخ کے بھی اللہ کے عظیم بندوں میں اس کی مثالیں دیکھتے ہیں مولانا محمد قاسم نانوتوی جلیل القدر عالم اور اولیاء کبار میں سے ہیں، ایک دفعہ وہ تقریر ارشاد فرمار ہے تھے کہ ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ مولانا تقریر بعد میں کیجئے پہلے اپنا مسلمان ہونا تو ثابت کیجئے فلاں عالم نے آپ کو گستاخِ رسول قرار دیتے ہوئے آپ کی تکفیر کی ہے تو جب تک آپ اس الزام کو اپنے سر سے نہیں اتارتے ہم آپ کی تقریر کیسے سنیں؟ آپ نے ایسی تکلیف دہ بات پر برہم ہونے کی بجائے فرمایا کہ بھائی جس نے میری تکفیر کی ہے ہوسکتا ہے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے شدید محبت کے باعث ہی ایسا کیا ہو، میں بفضلہٖ تعالیٰ مسلمان ہوں اور اللہ کے رسول سے محبت وعقیدت رکھتا ہوں اور پھر بھی اگر میرے ایمان میں شبہ ہے تو میں آپ کے سامنے کلمہ شہادت پڑھ کر ایمان کی تجدید کر لیتا ہوں، چنانچہ آپ نے کلمۂ شہادت پڑھا اور کہا اب تو میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اندازہ فرمایئے! انہوں نے کس طرح اپنے جذبات کو قابو میں رکھا اور کس طرح ان کے دماغ نے ان کو صحیح راستہ دکھایا۔

شاہ اسماعیل شہید کا واقعہ اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے جو جامع مسجد میں تقریر فرمار ہے تھے کہ کسی شر پسند آدمی نے اٹھ کر کہا شاہ صاحب آپ تو حرامی ہیں۔ اندازہ فرمایئے کہ ایک آدمی جس کے ہزاروں عقیدت مند ہوں اور جو اسلام کا ایک بہت بڑا عالم اور بطلِ جلیل ہو اس کیلئے ایک ایسے فسادی کا منہ بند کرنا کیا مشکل کام تھا۔ لیکن آپ نے نہایت تحمل اور برداشت سے کام لیتے ہوئے اسے بھی ایک فقہی مسئلہ بنا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میرے والدین کے یہ نام ہیں اور لوگ ان کو عام طور پر جانتے ہیں، ان کے نکاح کے گواہ ابھی تک زندہ ہیں، جو ان کے نکاح کی گواہی دے سکتے ہیں اور میری ولادت کے بھی عینی شاہد موجود ہیں۔ آپ ان گواہوں سے مل کر میرے نسب کے بارے میں اطمینان کر سکتے ہیں۔ یہ وہ رویہ ہے جس کی یہاں نصیحت فرمائی جارہی ہے اور یہ صرف اسی شخص کو نصیب ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پوری طرح مکارمِ اخلاق میں ڈھال چکا ہو اور جس کا ذوقِ صحیح معنی میں ایک متقی کے ذوق میں ڈھل چکا ہو اور جس کا یہ حال ہو گیا ہو کہ برے خیال کا اگر ایک ذرا سا غبار بھی اس کے دل کو چھو جائے تو اسے ایسی کھٹک محسوس ہو جیسی کھٹک انگلی میں پھانس چبھ جانے یا آنکھ میں کسی ذرے کے پڑ جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ جہاں تک شیطانی قوتوں کا تعلق ہے ان کی برابر کوشش ہوتی ہے کہ وہ دعوتِ حق کو روکنے اور داعیانِ حق کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں اور جو لوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں انہیں مسلسل اس کام پر لگائے رکھیں چنانچہ اسی حوالے سے ارشاد فرمایا جارہا ہے:

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ۝

اور جو ان ناخدا ترسوں کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں بڑھاتے ہیں پھر کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ 202

اس آیتِ کریمہ میں اخوانھم کی ضمیر کا مرجع شیطان بھی ہو سکتے ہیں اور وہ جاہلین بھی جن کا گزشتہ آیت میں ذکر ہے۔ مراد یہ ہے کہ جنوں میں سے شیاطین ہوں یا انسانوں میں سے جو لوگ ان کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق رکھتے ہیں وہ جن سے فکری اکتساب کرتے ہیں یا ان کی مجالس میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے تہذیبی اثرات قبول کرتے ہیں یا ان کے ہم خیال ہونے کے باعث ژولیدہ فکری پیدا کرنے میں ان کی ہم نوائی کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ جن شیاطین سے ان کا تعلق ہے وہ ان سے اپنے ڈھب سے کام لینے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے وہ ہر ممکن طریقے سے انہیں دینی قوتوں کو بدنام کرنے، دینی اعتقادات کے بارے میں بدگمانیاں پھیلانے، مسلمان نوجوانوں میں فکری انتشار پیدا کرنے اور اسلامی تہذیب سے برگشتہ کرنے کیلئے مسلسل استعمال کرتے ہیں کبھی تو باقاعدہ انہیں معاوضہ دے کر یہ کام لیا جاتا ہے اور کبھی ان کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر ان سے یہ خدمت لی جاتی ہے۔ روشن خیالی کے نام سے انہیں برائیوں کی تاریکی پھیلانے میں لگایا جاتا ہے، فکری آزادی کے حوالے سے ان کے ذریعے نفس کی بندگی یا

Marfat.com

استعمار کی غلامی یا تہذیبی خود سپردگی کو عام کرنے کیلئے ان کی خدمات مستعار لی جاتی ہیں وہ بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تعلیم کی نشر و اشاعت میں بعض قوتوں کا ساتھ دے کر ملک کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں لیکن انہیں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم سے اصلاً تعلیم کے ذریعے سے مسلمان نوجوانوں کو گمراہ کرنے اور بگاڑنے کا کام لیا جا رہا ہے کیونکہ پورے مشرقِ وسطیٰ اور برصغیر میں جہاں جہاں بھی استعماری قوتوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں وہاں انہوں نے تعلیم ہی کے واسطے سے بالخصوص مسلمانوں کو ان کے مذہب، تہذیب اور ان کی ثقافت سے برگشتہ کرنے میں کامیابی حاصل کی کیونکہ انسانی اعمال کا دارومدار انسانی فکر پر ہے اور فکر ہمیشہ تعلیم کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک بچے کو ابتدائی تعلیم سے جب ایک خاص ڈھب پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ صاف دماغ ہونے کی وجہ سے اس کوشش کے مطابق پروان چڑھتا ہے اور جب وہ تعلیم مکمل کر کے تعلیمی اداروں سے نکلتا ہے تو وہ بالکل ویسا انسان ہوتا ہے جیسا تعلیم دینے والوں نے اسے بنانے کی کوشش کی ہو، وہ اپنے مذہب کا نام بھی لیتا ہے لیکن مذہب اس کی زندگی میں باقی نہیں رہتا۔ لارڈ میکالے نے یہی بات برطانوی پارلیمنٹ سے کہی تھی کہ تعلیم کے ذریعے سے ہم جن لوگوں کو تیار کر رہے ہیں وہ نام کے مسلمان ہوں گے لیکن حقیقت میں مسلمان نہیں ہوں گے۔ تعلیم سب سے بڑا ہتھیار ہے جس سے لوگوں کو بگاڑا جا سکتا ہے اور سنوارا بھی جا سکتا ہے اسی لئے اقبال نے کہا تھا ۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

انسانی قوتیں اسی تعلیم کے مقدس نام سے مسلمانوں کو بگاڑنے کا کام لیتی ہیں اور خود مسلمان اسے ایک عبادت سمجھ کر انجام دیتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم جہالت دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ جہالت دور کرنے کے ساتھ ساتھ ہم دین اور دین کے تمام متعلقات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح تفریح کے نام پر شیطانی قوتوں نے خود کو مسلمانوں ہی سے شرم و حیاء کو ختم کرنے کا جو کام لیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے جو لوگ اس کام کے رسیا ہو جاتے ہیں ان کی نفسانیت اس طرح ان کے ایمان بلکہ عقل پر بھی غالب آجاتی ہے کہ صرف تفریح ان کا مقصد بن جاتی ہے، چاہے اس کے نتیجہ میں شرم و حیاء کا جنازہ نکل جائے۔ انہی مثالوں پر قیاس کر کے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیطانی قوتوں نے تعلیم، تفریح، ذریعۂ ابلاغ، سیاست، فنونِ لطیفہ، آرٹ، ادب لٹریچر حتی کہ دین کو بھی اپنے مقاصد کیلئے اس طرح استعمال کیا ہے کہ مسلمان سادگی سے اسے نیکی سمجھتے رہے اور انہوں نے نہایت دانش مندی سے اپنے مقاصد حاصل کر لیے ان کا اور مسلمانوں کا معاملہ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی ہے
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے ہیں

اور کمال کی بات یہ ہے کہ جناتی قوتیں تو خیر چھپ کر کام کرتی ہی ہیں انسانی شیاطین بھی اس طرح پس پردہ رہ کر اور پاکیزہ اصطلاحات کی آڑ میں مسلمانوں کو بگاڑنے کیلئے کوششیں انجام دیتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں کھیلنے والوں کو کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم جن کاموں کو جائز اور نیک سمجھ کر کر رہے ہیں یہ تو ہم اصلاً شیاطین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے ادب اور سیاست میں استعماری قوتوں نے جس طرح ففتھ کالم تیار کئے اور پھر ان کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کیا وہ ایک ایسی کہانی ہے جو تاریخ پر گہری نظر رکھنے والا ہر شخص بڑی آسانی سے دیکھ سکتا ہے اور قومی بیداری اور اصلاح

Marfat.com

کے نام پر جس طرح کچھ لوگوں کو دینی مسلمات میں اختلافات پیدا کرنے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کیلئے استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ایک تکلیف دہ داستان ہے جس کے نتائج آج امت مسلمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جس طرح اللہ کی پناہ طلب کرنے والے اور ہر نا گفتہ بہ صورتحال میں محض اللہ کی توفیق سے کام کرنے والوں نے خدمات انجام دی ہیں اسی طرح شیطانی قوتوں نے اپنے ایجنٹوں اور گماشتوں سے اس طرح کام لیا ہے کہ کبھی اس میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں ہونے دی۔ اس لئے اللہ کے راستے میں کام کرنے والوں کی ہمیشہ دونوں باتوں پر توجہ رہنی چاہئے ایک تو اپنے آپ کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ ہمارے کام میں کہیں نفسانیت کا شائبہ تو نہیں اور دوسرے ان شیطانی عناصر پر گہری نگاہ رہنی چاہئے جو اپنے کام میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے اور ان کی کوششیں مسلمانوں کو بگاڑنے میں کبھی کمزوری نہیں دکھاتیں۔

گزشتہ آیات میں آپ نے دیکھا کہ سارا زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ شیطانی قوتیں حق کی مخالفت میں جو بھی کریں داعیانِ حق کو کبھی ان نصیحتوں کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہئے جو گزشتہ آیات میں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ اب اگلی آیتِ کریمہ میں دونوں باتوں کی مثال دی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حق کی مخالف قوتیں کس طرح داعیِ حق کو قلبی اور ذہنی اذیتیں پہنچاتی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں داعیِ حق کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے چونکہ آنحضرت ﷺ مسلمانوں کیلئے اسوہ کاملہ ہیں اس لئے یہ مثال آپ ہی کے حوالے سے دی جا رہی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ٥

اور تم جب ان کے پاس نشانی نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ اسے کیوں نہ گھڑ لائے۔ کہہ دیجئے! میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے آنکھیں کھولنے ولی آیات اور ہدایت ورحمت ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے۔ 203

اذیتوں کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کا اسوہ:

اس آیتِ کریمہ میں ایک لفظ آیا ہے اجتبیتھا۔ اجتباء اس کا مصدر ہے۔ اس کا لغوی معنی تو مجموعہ میں سے کسی چیز کو انتخاب کر لینا اور چھانٹ لینا ہے لیکن جب یہ لفظ طنز کے سیاق وسباق میں استعمال ہو تو اس کے معنی گھڑ لینے اور بنا لینے کے ہوتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے اس کی تصریح کی ہے اس لئے ہم نے اس آیت کریمہ میں اس کا ترجمہ گھڑ لینا اور بنا لینا کیا ہے۔ اس جملے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قریش مکہ کس طرح آنحضرت ﷺ پر نہایت گرے ہوئے اور رکیک حملے کرتے تھے اور ایسی باتیں کہتے تھے جس سے آنحضرت ﷺ کا دل خون ہو کر رہ جاتا ہوگا۔ اسی جملے کو آپ دیکھئے! اس میں دراصل قریش مکہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم نے ہمارے سامنے نبوت کا دعویٰ کیا ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں کہ ہم اس کو غلط ثابت کر سکیں تم نے اپنی طرف سے ایک غلط دعویٰ پیش کر دیا ہم سننے پر مجبور ہیں چاہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اسی طرح تم نے قرآن کریم کو اللہ کی کتاب کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے مجھ پر نازل ہو رہی ہے، ہم اس کا ہزار انکار کریں لیکن تمہیں اصرار ہے کہ یہ کتاب اللہ ہی نے مجھ پر نازل کی ہے اور یہ کام تمہارے لئے کوئی مشکل بھی نہیں کیونکہ تم نے ادھر ادھر سے اگلوں کے کچھ واقعات جمع کیے، کچھ باتیں کاہنوں

Marfat.com

سے سنیں، اہلِ کتاب کی کچھ باتیں کانوں میں پڑیں، تم چونکہ فصیح و بلیغ ذہین اور آدمی ہو اس لئے ان سنی سنائی باتوں کو جمع کر کے تم اس طرح لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہو کہ واقعی یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ہمارے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا کہ ہم تمہیں اس سے روک سکتے۔ لیکن اب جب کہ ہم نے تم سے مطالبہ کیا ہے کہ تم اللہ کی طرف سے فلاں معجزہ پیش کرو اگر تم واقعی اللہ کے نبی ہوتے اور تم پر واقعی اللہ کی کتاب نازل ہو رہی ہوتی تو یقیناً تم اپنے اللہ سے کہہ کر ایسی نشانی یا ایسا معجزہ بڑی آسانی سے پیش کر سکتے تھے۔ لیکن ہمارے معجزے کی طلب نے تمہیں خاموش کر کے رکھ دیا۔ تم بار بار اپنی دعوت تو پیش کرتے ہو لیکن ہمارا مطلوب معجزہ دکھانے سے عاجز ہو کیونکہ سنی سنائی باتوں سے مضمون تو بنایا جا سکتا ہے اور اسے اللہ کی کتاب بھی کہا جا سکتا ہے اور غلط سلط نبوت کے دعوئ بھی کیے جا سکتے ہیں لیکن معجزہ دکھانا تو اللہ کی تائید کے بغیر ممکن نہیں اس لئے اب تم خاموش ہو۔ بظاہر تو وہ صرف ایک نشانی یا معجزہ طلب کر رہے تھے لیکن یہ ایک ایسا زہر آلود طعنہ تھا جس سے زیادہ اور کوئی تکلیف دہ بات نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک مثال ہے ان لوگوں کے زہر آلود تیروں کی جو وہ اکثر آنحضرت ﷺ پر چلاتے رہتے تھے اور جس سے آپ کا دل زخمی ہوتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ کے دین کی دعوت دینے والوں کو کیسے کیسے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ آیت کے دوسرے حصے میں کفار کے اس طنز کا جواب ہے جو اللہ نے اپنے رسول سے دلوایا ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کفار کی طرف سے چاہے کیسا ہی رویہ اختیار کیوں نہ کیا جائے، اس کے جواب میں ایک داعی حق کو کس طرح صبر و استقامت کی تصویر بن جانا چاہئے بظاہر یہ جواب بڑا سادہ ہے لیکن درحقیقت ایسا باوقار اور بھرپور ہے جس سے زیادہ مؤثر جواب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے ان کے طنز و تعریض کا نوٹس تک نہیں لیا۔ اس جواب میں اس کا دور تک ذکر نہیں، البتہ جو بات کہی جانی چاہئے اسے نہایت اطمینان اور ٹھہرے ہوئے انداز میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ سراسر جہالت اور چھالے پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں ہے تم نے اپنی خباثت کو پوری طرح باہر نکال کر رکھ دیا ہے لیکن میں تمہاری ان باتوں کا حریف نہیں ہو سکتا۔ میں اس لئے دنیا میں نہیں آیا کہ میں شعبدہ بازیاں دکھاؤں اور تم جو نشانیاں مجھ سے مانگو وہ نشانیاں میں ضرور ظاہر کروں کیونکہ جہاں تک نشانی اور معجزات کا تعلق ہے، میں اب تک سینکڑوں کی تعداد میں دکھا چکا ہوں اور پھر یہ کہ پوری کائنات اللہ کی نشانیوں سے بھرپور ہے۔ تمہیں اگر نشانیاں دیکھ کر راہِ راست اختیار کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے میں تو اللہ کا پیغمبر ہوں اللہ کی جانب سے جو وحی مجھ پر اترتی ہے اس میں جو پیغام دیا جاتا ہے اسے بلا کم و کاست تم تک پہنچانا اور خود بھی اس پر عمل کرنا یہ میرا اصل فریضہ ہے اور میں اپنے اس فریضے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا۔ اب تک جو بھی حکم نازل ہوا ہے میں نے سب سے پہلے اس پر عمل کیا اور اس کے بعد لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ رہی یہ بات کہ تم نشانیاں دیکھنے پر اصرار کر رہے ہو تو یہ قرآن، میری نبوت میری حقانیت اور میری صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک آیت، ایک ایک ہدایت اور مجموعی طور پر زندگی کیلئے پوری راہنمائی اپنے اندر معجزہ کی صفت رکھتی ہے۔ اس کے اندر تمہارے رب نے تمہارے لئے آنکھیں کھول دینے والی بصیرتیں رکھی ہیں۔ تم اگر انہیں غور سے سنو اور پڑھو تو وہ تمہاری آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہیں۔ انسانی اصلاح کا آغاز ہمیشہ دل و دماغ کے خیالات کی اصلاح سے ہوتا ہے۔ اس لئے قرآنِ پاک قلبی اور ذہنی اصلاح پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ اس میں دل و دماغ کی پیچیدگیاں دور کرنے کیلئے ایسی بصیرت افروز ہدایات جاری فرمائی گئی ہیں جن میں غور کرنے سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور دل کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ سوجھ اور غور و فکر کی باتیں تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کی ہیں تم اگر واقعی کوئی نشانی دیکھنا چاہتے ہو تو اس سے بڑی اور کوئی نشانی نہیں ہو سکتی مزید فرمایا کہ زندگی کی دوسری ضرورت یہ ہے کہ یہ معلوم ہو کہ زندگی گزاری کیسے جائے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد جبلی اور فطری طور پر اس ہدایت سے بہرہ ور فرمایا۔ حشرات الارض سے لے کر کائنات کی بڑی سے بڑی چیز تک کوئی مخلوق

Marfat.com

ایسی نہیں جسے اللہ نے یہ بات الہام نہ کی ہو کہ تمہیں زندگی کی ضروریات کو کیسے حاصل کرنا اور زندگی کے معمولات کو کیسے انجام دینا ہے۔ اللہ نے حشرات الارض کو کوڑے کرکٹ میں پیدا کیا ہے تو انہیں رینگنا بھی سکھایا ہے اور اسی کیچڑ سے اپنی غذا حاصل کرنے کا طریقہ بھی سکھایا ہے۔ پرندوں کو ہوا میں پیدا کیا ہے تو انہیں اڑنا بھی سکھایا ہے۔ مچھلیوں کو پانی میں پیدا کیا تو انہیں تیرنا بھی سکھایا۔ جنگل کے جانوروں کو دوڑنا اور شکار کرنا سکھایا، ہر مخلوق کو توالد اور تناسل کی کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ رہنے کیلئے آشیانہ یا بھٹ بنانے کا شعور بخشا ضروریاتِ زندگی کے حصول سے بہرہ ور فرمایا۔ غرضیکہ ہر مخلوق کو زندگی گزارنے کیلئے جو اور جیسا علم درکار تھا اسے عطا فرمایا۔ انسان چونکہ کائنات کا گل سرسبد ہے، اس کی زندگی کا دائرہ دوسری مخلوقات کی نسبت زیادہ وسیع ہے، اس کے مقاصدِ زندگی صرف جسمانی نہیں ذہنی قلبی اور روحانی بھی ہیں۔ اسی لحاظ سے اسے باقی مخلوقات کی طرح جبلت اور فطرت بھی عطا فرمائی، حواس سے بھی نوازا اور باقی مخلوقات سے اسے ممتاز کرتے ہوئے جوہرِ عقل بھی عطا کیا اور روحانی زندگی کی تکمیل کیلئے وحیِ الٰہی کا نور بھی بخشا اور اس کے لئے پیغمبر مبعوث ہوئے اور کتابیں نازل کی گئیں۔ اسی کو ہدایت سے تعبیر کرتے ہوئے یہاں فرمایا جارہا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ذہنی ضرورتوں کیلئے بصیرتیں نازل فرمائی ہیں، اسی طرح انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ضرورتوں کیلئے اسی کتاب کے ذریعے ہدایت بھی عطا فرمائی۔ مزید فرمایا کہ اگر اس ہدایت کو قبول کرلیا جائے اور اس پر ایمان لایا جائے تو جس طرح اس ہدایت کے نتیجے میں حقوق و فرائض کا علم حاصل ہوگا، انسانیت کا شعور آئے گا، مکارمِ اخلاق اور تہذیب و تمدن کی دولت نصیب ہوگی، اجتماعی زندگی کی نزاکتوں کا شعور ملے گا، اسی طرح اس کے نتیجے میں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ کی رحمت نصیب ہوگی، دنیا کے رزق میں وسعت ہوگی، دلوں کو سکون ملے گا، دماغوں کو آسودگی نصیب ہوگی، گھر سے لے کر حکومت کے ایوانوں تک افراد ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار ہوں گے۔ اسی طرح آخرت میں اللہ کی جنت اور اس کی رضا نصیب ہوگی اور یہ وہ حقیقی کامیابی ہے جو انسان کا اصل ہدف ہے، یہ ہدایت و رحمت اصل میں وہ نشانی ہے جو تمہارا اصل مطلوب ہونا چاہئے، لیکن بجائے تم اسے طلب کرنے کے وہ نشانیاں طلب کرتے ہو جس کا تمہاری زندگی کی کامیابی میں کوئی دخل نہیں۔

اگلی آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ تم اگر واقعی اللہ کی ہدایت اور رحمت کے طلبگار بننا چاہتے ہو تو تمہیں ان آداب کو سیکھنا چاہئے جس سے تمہیں یہ نعمت نصیب ہوسکتی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ○

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ 204

اس آیتِ کریمہ میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک ہے فاستمعوا اس کا مصدر ہے استماع اور دوسرا ہے انصتوا اس کا مصدر ہے۔ انصات۔ استماع کا معنی ہوتا ہے "غور سے سننا" اور انصات کا معنی ہوتا ہے "خاموش رہنا"۔ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ تم اگر قرآنِ کریم کی ہدایت و بصیرت سے مستفید ہونا چاہتے ہو اور تمہاری یہ خواہش ہے کہ اللہ کی رحمت تم پر بھی برسے تو پھر ضروری ہے کہ جب قرآن پڑھ کر سنایا جائے تو اسے غور سے سنو اور جب تک پڑھا جاتا رہے ادھر کان لگائے رکھو اور زبان سے کوئی لفظ نہ نکالو۔ یہ ہدایت اس لئے دی جارہی ہے کہ مشرکین مکہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی نبی کریم ﷺ یا آپ کا صحابی انہیں قرآنِ کریم پڑھ کر سناتا تو وہ چونکہ اس کی اثر انگیزی سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اس کا ایک ایک بول دل میں ترازو ہوجاتا ہے اور چھوٹے بڑے اس کی قوتِ تاثیر سے بے نیاز نہیں رہ سکتے، اس لئے اپنے آپ کو اور لوگوں کو اس کے اثر سے بچانے کیلئے وہ لوگوں سے یہ کہتے کہ جب بھی قرآن پڑھا جائے تو تم شور مچاؤ اور گھپلہ ڈالنے کی کوشش کرو، اس طرح ممکن ہے کہ تم قرآن کی دعوت پر غالب آجاؤ۔ لیکن اگر تم نے

Marfat.com

اسے سننا شروع کر دیا یا لوگوں کو سنانے کی اجازت دے دی تو تم اس کی قوتِ تاثیر سے بچ نہیں سکو گے۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تم پر رحم کرے اور تم بھی اس کی رحمت کے مورد بنو تو پھر قرآن کو غور سے سننے اور چپ رہنے کی عادت ڈالو۔ سنو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ قرآن تم سے کیا کہتا ہے۔ چپ رہو گے تو اس کی تعلیم تمہارے دلوں میں اتر سکے گی اور اگر تم نے اس کے سننے سے بھی احتراز کیا تو پھر تمہیں کیسے اندازہ ہو سکے گا کہ تم اپنی مخالفت میں حق بجانب ہو کہ نہیں انصاف کا بھی تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی بات کی مخالفت سے پہلے اسے سنا جائے اور غور وفکر کے بعد اس کی موافقت یا مخالفت کا فیصلہ کیا جائے۔ بغیر سنے مخالفت شروع کر دینا اور جب وہ بات کہی جائے تو شور مچانا یہ تو اپنے غلط ہونے اور اپنی کمزوری کی دلیل ہے۔ یہاں اگرچہ خطاب مشرکین مکہ سے ہے لیکن خطاب کے الفاظ عام ہیں اس لئے اس ہدایت کا تعلق تمام سننے والوں سے ہے۔ کافروں سے تو اس لئے کہ وہ شاید اس نصیحت کو قبول کر لیں اور مسلمانوں پر اس حکم کی تعمیل فرض ہے کیونکہ وہ اسے واقعی اللہ کی کتاب سمجھتے اور اپنے آپ کو اس کا مومن قرار دیتے ہیں، اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ آدمی اس کے آداب سے آگاہ ہو۔ سب سے اہم ادب جب قرآن پڑھا جائے یہ ہے کہ اسے غور سے سنا جائے اور اس وقت کوئی دوسری بات نہ کی جائے۔ نماز کے اندر آدمی کھڑا ہو اور امام قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہو تو اسے غور سے سننا ضروری ہے، اسی طرح خطبۂ جمعہ اور خطبۂ عیدین میں بھی ضروری ہے کہ خطبہ کو از اول تا آخر غور سے سنا جائے اور چپ رہا جائے۔ خطبہ کے بارے میں حضور نے خاص طور پر فرمایا:

اذا خرج الامام فلا صلوۃ ولا کلام

جب امام خطبہ دینے کیلئے منبر کی طرف بڑھ رہا ہو تو اسی وقت سے خاموشی ضروری ہے۔ اس وقت نہ کوئی نماز ہے نہ کلام۔

ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ اس وقت کوئی شخص دوسرے کو نصیحت کیلئے زبان سے یہ بھی نہ کہے کہ خاموش رہو کیونکہ دورانِ خطبہ کسی قسم کا کلام حتی کہ تسبیح درود یا نماز وغیرہ بھی جائز نہیں۔ فقہاء نے کہا ہے کہ جو حکم خطبۂ جمعہ کا ہے وہی عیدین کے خطبے اور نکاح کے خطبہ کا بھی ہے اور اس وقت کان لگانا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ البتہ! نماز اور خطبہ کے علاوہ عام حالات میں کوئی شخص بطور خود تلاوت کر رہا ہو تو دوسروں کو خاموش رہ کر اس پر کان لگانا واجب ہے کہ نہیں اس میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض حضرات نے اس صورت میں بھی خاموش رہنے کو واجب اور اس کے خلاف کرنے کو گناہ قرار دیا ہے۔ اس لئے ایسی جگہ جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں یا آرام کر رہے ہوں، کسی کیلئے بلند آواز سے قرآن پڑھنے کو جائز نہیں رکھا اور جو شخص ایسے مواقع میں قرآن بلند آواز سے پڑھتا ہے اس کو گناہ گار قرار دیا گیا ہے۔ خاموش رہنے کی تاکید کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ علامہ ابنِ ہمام نے لکھا ہے کہ جس وقت امام نماز میں یا خطیب خطبہ میں کوئی مضمون جنت دوزخ سے متعلق پڑھ رہا ہو تو اس وقت جنت کی دعا اور دوزخ سے پناہ مانگنا بھی جائز نہیں کیونکہ اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا وعدہ اس شخص کیلئے جو تلاوت قرآن کے وقت خاموش رہے اور جو خاموش نہ رہے اس سے وعدہ نہیں البتہ! نفل نمازوں میں ایسی آیات کی تلاوت کے بعد آہستہ آواز کے ساتھ دعا مانگنا سنت سے ثابت ہے اور موجبِ ثواب ہے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں اسی بات کو ایک اور پہلو سے آگے بڑھایا جا رہا ہے اور ایک وارننگ بھی دی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِىْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ۝

یاد کرو اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو صبح اور شام اور غافلوں میں سے نہ بنو بے شک جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی کرنے سے تکبر نہیں کرتے وہ اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کو

Marfat.com

سجدہ کرتے ہیں۔205,206

گزشتہ آیتِ کریمہ میں جو نصیحتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں ان کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ دنیا کے بگاڑ کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان اس بات سے غافل ہو جاتا ہے کہ اللہ میرا رب ہے اور میں اس کا بندہ ہوں اس غفلت سے وہ نتائج پیدا ہونا شروع ہوتے ہیں جس سے ظلم کا دروازہ کھلتا ہے اور حقوق وفرائض کی تباہی وجود میں آتی ہے اور انسان بڑھتے بڑھتے گمراہی کی تمام منزلوں سے گزر جاتا ہے۔اس لئے انسان کی اصلاح کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ سے اس کی برگشتگی کو ختم کر کے اللہ سے اس کا تعلق جوڑ دیا جائے۔اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ انسان قرآنِ کریم سے اپنا تعلق پیدا کرے،اسے غور سے سنے سمجھے اور اس کے سامنے ہر طرح سے سپر انداز ہو جائے اور غفلت سے نکلنے کیلئے اللہ کی یاد کو اپنا وظیفہ بنا لے۔دنیا کا ہر کام کرنے سے پہلے وہ اپنے ذہن میں اللہ کا استحضار پیدا کرے۔ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان واقعی انسان بن جائے گا اور اس کا سفر اس کی حقیقی منزل کی طرف شروع ہو جائے گا۔اسی مرکزی مضمون کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ جو لوگ انسانی اصلاح کے کٹھن فریضہ کو انجام دینے کیلئے اٹھتے ہیں انہیں اپنے مخالفین کی جانب سے جن جن اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے ان پر قابو پانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کی پناہ میں آجائیں اور اللہ کی پناہ اس وقت تک میسر نہیں آتی جب تک پناہ طلب کرنے والا اس کی یاد کو دل میں بسا نہیں لیتا۔ان دونوں حوالوں سے پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں گفتگو سمیٹتے ہوئے اور مضمون کو لپیٹتے ہوئے اللہ کو یاد کرنے کا طریقہ اور اس کے آداب سکھائے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ وارننگ دی جا رہی ہے کہ دیکھنا اس ہدایت سے صرفِ نظر کر کے کہیں غافلوں میں سے نہ ہو جانا کیونکہ تمام انسانی امراض کا حقیقی سبب صرف یہی ہے۔

آیات کی تشریح سے پہلے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ان دونوں میں براہِ راست نبی کریم ﷺ سے خطاب کیا جا رہا ہے اور یہ بات بار بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس خطاب سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ یہ ہدایات صرف آنحضرت ﷺ کیلئے ہیں بلکہ حقیقت میں یہ تمام ہدایات امت کیلئے ہیں آنحضرت ﷺ سے تو خطاب اس لئے ہے کہ امت کو ان ہدایات پر عمل کرنے کیلئے ایک اسوہ اور نمونہ کی ضرورت ہے،وہ جب تک سامنے نہیں ہوگا تو ایسی ہدایات جن کا تعلق سراسر قلبی،ذہنی اور روحانی کیفیت سے ہے،الفاظ وحروف سے چاہے وہ اللہ ہی کے کلام کی صورت میں ہو صحیح ادراک نہیں ہو سکتا۔اس لئے آنحضرت ﷺ کو پہلے نمونہ کے طور پر امت کے سامنے اٹھایا گیا اور آپ کی گرامی قدر شخصیت کو ایسی تمام ہدایات اور مکارمِ اخلاق کی تصویر بنا کر لوگوں کے سامنے مینارہ نور کے طور کھڑا کر دیا گیا تاکہ لوگ اس کی روشنی میں ان ہدایات پر عمل کرنے میں آسانی محسوس کریں۔

پہلی آیتِ کریمہ میں اللہ کی یاد اور اس کے ذکر کے سلسلے میں چند آداب بیان فرمائے گئے ہیں اور اس کے بعد ذکر کے اوقات کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اور آیت کے آخر میں تنبیہ کی گئی ہے کہ دیکھنا غافلوں میں سے نہ ہو جانا۔بجائے اس کے کہ ہم ان آداب کا خود تذکرہ کریں معارف القرآن سے استفادہ کرتے ہوئے اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔

پہلا ادب ذکر کے آہستہ یا بلند آواز سے کرنے سے متعلق ہے اس کے بارے میں قرآنِ کریم نے اس آیت میں دو طرح کا اختیار دیا ہے۔

ذکرِ خفی اور ذکرِ جہر۔ذکرِ خفی کے بارے میں فرمایا:﴿واذکر ربک فی نفسک "اپنے رب کو یاد کیا کرو اپنے دل میں ﴾اس کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ بغیر زبان کی حرکت کے صرف دل میں دھیان اور خیال اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا رکھے جس کو ذکرِ قلبی یا تفکر کہا جاتا ہے۔دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان سے بھی آہستہ آواز میں اسمائے الٰہیہ کے حروف ادا کرے سب سے افضل اور بہتر صورت یہی ہے کہ جو ذکر کر رہا ہے اس کے مفہوم کو سمجھ کر دل میں بھی اس کا پورا استحضار اور دھیان ہو اور زبان سے بھی ادا کرے کیونکہ اس صورت میں قلب کے ساتھ زبان بھی ذکر میں شریک ہو جاتی ہے اور اگر

Marfat.com

صرف دل ہی دل میں دھیان اور تفکر میں مشغول رہے، زبان سے کوئی حرف ادا نہ کرے، وہ بھی بڑا ثواب ہے اور سب سے کم درجہ اس کا ہے کہ صرف زبان پر ذکر ہو اور قلب اس سے خالی اور غافل ہو۔ ایسے ہی ذکر کو مولانا رومی نے فرمایا ہے

برزبان تسبیح ودرِ دل گاؤخر

ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

مقصد مولانا رومی کا یہ ہے کہ قلب غافل کے ذکر کرنے سے ذکر کے آثار و برکات کامل حاصل نہیں ہوتے۔ اس کا انکار نہیں کہ یہ زبانی ذکر بھی ثواب اور فائدہ سے خالی نہیں کیونکہ بعض اوقات یہ زبانی ذکر ہی قلبی ذکر کا ذریعہ اور سبب بن جاتا ہے زبان سے کہتے کہتے قلب بھی متاثر ہونے لگتا ہے اور کم از کم ایک عضو تو ذکر میں مشغول ہے کہ وہ بھی ثواب سے خالی نہیں۔ اس لئے جن لوگوں کو ذکر و تسبیح میں دل جمعی اور دھیان اور استحضار نہیں ہوتا وہ بھی ایسے ذکر کو بے فائدہ سمجھ کر چھوڑیں نہیں جاری رکھیں اور استحضار کی کوشش کرتے رہیں۔

دوسرا طریقہ ذکر کا اسی آیت میں یہ بتلایا ﴿ ودون الجھر من القول ''زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ'' ﴾ یعنی ذکر اللہ میں مشغول ہونے والے کو یہ بھی اختیار ہے کہ آواز سے ذکر کرے مگر اس کا ادب یہ ہے کہ بہت زور سے چیخ کر نہ کرے متوسط آواز کے ساتھ کرے جس میں ادب و احترام ملحوظ رہے، بہت زور سے ذکر و تلاوت کرنا اس کی علامت ہوتی ہے کہ مخاطب کا ادب واحترام اس کے دل میں نہیں، جس ہستی کا ادب واحترام اور رعب انسان کے دل میں ہوتا ہے، اس کے سامنے طبعی طور پر انسان بہت بلند آواز سے نہیں بول نہیں سکتا۔ اس لئے عام ذکر اللہ ہو یا تلاوتِ قرآن جب آواز سے پڑھا جائے تو اس کی رعایت رکھنا چاہیے کہ ضرورت سے زائد آواز بلند نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے ذکر اللہ اور تلاوتِ قرآن کے تین طریقے حاصل ہوئے، ایک یہ کہ صرف ذکر قلبی یعنی معانی قرآن اور معانی ذکر کے تصور اور تفکر پر اکتفا کرکے، زبان کو بالکل حرکت نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان کو بھی حرکت ہو مگر آواز بلند نہ ہو جس کو دوسرے آدمی سن سکیں، یہ دونوں طریقے ذکر کے ارشاد ربانی واذکر ربک فی نفسک میں داخل ہیں اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ استحضار قلب اور دھیان کے ساتھ زبان کی حرکت بھی ہو اور آواز بھی، مگر اس طریق کیلئے ادب یہ ہے کہ آواز بھی زیادہ بلند نہ کرے، متوسط حد سے آگے نہ بڑھے، یہ طریقہ ارشاد قرآنی ودون الجھر من القول میں تلقین فرمایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت نے اس کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے۔ ولا تجھر بصلاتک ولا تخافت بھا وابتغ بین ذلک سبیلا۔ اس میں آنحضرت ﷺ کو حکم ہے کہ اپنی قرات میں نہ زیادہ جہر کیا کریں اور نہ بالکل اخفا بلکہ جہر اور اخفا کے درمیان کی کیفیت رکھا کریں۔

نماز میں قرأت قرآن کے متعلق آنحضرت ﷺ نے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو یہی ہدایت فرمائی۔

صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ آخر رات میں گھر سے نکلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز میں مشغول تھے مگر تلاوت آہستہ کر رہے تھے۔ پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ بہت بلند آواز سے تلاوت کر رہے ہیں۔ جب صبح کو یہ دونوں حضرات حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں رات تمہارے پاس گیا تو دیکھا کہ تم پست آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے جس ذات کو سنانا تھا اس نے سن لیا یہ کافی ہے۔ اسی طرح فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے انہوں نے عرض

Marfat.com

کیا کہ قرأت میں جہر کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ نیند کا غلبہ نہ رہے اور شیطان اس کی آواز سے بھاگے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ صدیقِ اکبر ؓ کو یہ ہدایت دی کہ ذرا کچھ آواز بلند کیا کریں اور فاروقِ اعظم ؓ کو یہ کہ کچھ پست کیا کریں۔

(ابوداؤد)

ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ ؓ سے آنحضرت ﷺ کی تلاوت کے بارے میں بعض حضرات نے سوال کیا کہ جہراً کرتے تھے یا سراً؟ انہوں نے فرمایا کہ کبھی جہراً کبھی سراً۔ دونوں طرح تلاوت فرماتے تھے۔

رات کی نفل نماز میں اور خارج نماز تلاوت میں بعض افراد نے جہر پسند کیا بعض نے آہستہ کو۔ اسی لئے امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تلاوت کرنے والے کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے تلاوت کرے۔ البتہ! آواز سے تلاوت میں چند شرائط سب کے نزدیک ضروری ہیں۔

اول یہ کہ اس میں نام ونمود اور ریا کا اندیشہ نہ ہو۔ دوسرے اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کو حرج یا تکلیف نہ ہو۔ کسی دوسرے شخص کی نماز وتلاوت یا کام میں یا آرام میں خلل انداز نہ ہو اور جہاں نام ونمود اور ریا کا یا دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل کا اندیشہ ہو تو سب کے نزدیک آہستہ ہی پڑھنا افضل ہے۔

جو حکم تلاوتِ قرآن کا ہے وہی دوسرے اذکار وتسبیح کا ہے اور آہستہ اور بلند آواز سے دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ آواز اتنی بلند نہ ہو جو خشوع و خضوع اور ادب کے خلاف ہو نیز اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل نہ آتا ہو۔

اس کا فیصلہ کہ سراً اور جہراً سے افضل کیا ہے۔ اشخاص اور حالات کے اعتبار سے مختلف ہے۔ بعض لوگوں کیلئے جہر بہتر ہوتا ہے بعض کیلئے آہستہ نیز بعض اوقات جہر بہتر ہوتا ہے بعض وقت سر۔ (تفسیر مظہری وروح البیان)

دوسرا ادب تلاوت وذکر کا یہ ہے کہ عاجزی اور تضرع کے ساتھ ذکر کیا جاوے جو نتیجہ اس کا ہوتا ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کی عظمت وجلال مستحضر ہو اور جو ذکر کر رہا ہے اس کے معنی ومفہوم پر نظر ہو۔

تیسرا ادب اسی آیت میں لفظ خیفۃً سے یہ بتلایا گیا کہ ذکر وتلاوت کے وقت انسان پر ہیبت اور خوف کی کیفیت ہونا چاہئے۔ خوف اس کا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور عظمت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کہ ہم سے کوئی بے ادبی ہو جائے نیز اپنے گناہوں کے استحضار سے عذابِ الٰہی کا خوف نیز انجام اور خاتمہ کا خوف کہ معلوم نہیں کہ ہمارا خاتمہ کس حال پر ہونا ہے۔ بہرحال ذکر وتلاوت اس طرح کیا جائے جیسے کوئی ہیبت زدہ ڈرنے والا کیا کرتا ہے۔

یہی آدابِ دعا اسی سورۃ اعراف کے شروع میں بھی ایک آیت میں اس طرح آئے ہیں۔

ادعوا ربکم تضرعاً وّخفیۃً اس میں خیفۃ کے بجائے خفیۃ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی آہستہ آواز سے ذکر کرنے کے ہیں۔ گویا ذکر وتلاوت کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ آہستہ پست آواز سے کیا جائے لیکن اس آیت نے اس کے معنی بھی واضح کر دیئے کہ اگرچہ آواز سے ذکر سے کرنا ممنوع نہیں مگر شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زائد آواز بلند نہ کرے نیز اتنی بلند نہ کرے جس میں خشوع وخضوع، عاجزی اور تضرع کی کیفیت جاتی رہے۔

آخر آیت میں ذکر وتلاوت کے اوقات بتلائے کہ صبح وشام ہونا چاہئے اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کم از کم دن میں دو مرتبہ صبح وشام ذکر اللہ میں مشغول ہونا چاہئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبح وشام بول کر تمام لیل ونہار کے اوقات ہوں۔ جیسے مشرق مغرب بول کر سارا عالم مراد لیا جاتا ہے اس

Marfat.com

صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ انسان پر لازم ہے کہ ہمیشہ ہر حال میں ذکر و تلاوت کا پابند رہے۔ حضرت عائشہ ﷺ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر وقت ہر حال میں اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔

آخر آیت میں فرمایا ﴿ولا تکن من الغفلین﴾ یعنی اللہ کی یاد کو چھوڑ کر غفلت والوں میں شامل نہ ہو جانا کہ یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ دوسری آیت میں لوگوں کی عبرت و نصیحت کیلئے مقربان بارگاہِ الٰہی کا ایک مخصوص حال بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کے پاس ہونے سے مراد اللہ تعالیٰ کا مقبول ہونا ہے۔ جس میں سب فرشتے اور تمام انبیاء علیہم السلام اور صالحین امت شامل ہیں اور تکبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھ کر ان عبادات میں قصور نہیں کرتے بلکہ اپنے کو عاجز اور محتاج سمجھ کر ہمیشہ اللہ کی یاد اور عبادت میں مشغول اور تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے رہتے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو دائمی عبادت اور یادِ خدا کی توفیق ہوتی ہے تو یہ اس کی علامت ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کے پاس ہیں اور اللہ تعالیٰ کی معیت ان کو حاصل ہے۔

بعض اہلِ علم کے نزدیک (جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں) سے اشارہ فرشتوں کی طرف ہے ان کی بابت فرمایا کہ وہ اللہ کی بندگی سے کسی وقت سرتابی نہیں کرتے۔ برابر اس کی تسبیح میں لگے رہتے اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ آیت ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں برابر سرگرم رہنے والوں کے زمرہ کو بتاتی ہے کہ جو لوگ اللہ کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں گو وہ رہتے بستے زمین میں ہیں لیکن ان کا تعلق فرشتوں کی بزمِ قدس سے ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہ جس طرح ہر وقت زمزمہ سنج تسبیح و تہلیل رہتے ہیں یہ بھی اسی طرح مصروف یادِ الٰہی رہتے ہیں دوسرے طرف اس میں مشرکین پر تعریض بھی ہے کہ یہ تو فرشتوں ہی کی سفارش کے بل پر اکڑتے پھرتے ہیں، نہ خدا کو خاطر میں لاتے ہیں نہ رسول کو۔ لیکن خود فرشتوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کی تسبیح اور سجود میں لگے ہوئے ہیں۔

اس مقام پر حکم ہے کہ جو شخص اس آیت کو پڑھے یا سنے وہ سجدہ کرے تا کہ اس کا حال ملائکہ مقربین کے حال سے مطابق ہو جائے اور ساری کائنات کا انتظام چلانے والے کارکن جس اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اسی کے آگے وہ بھی ان سب کے ساتھ جھک جائے اور اپنے عمل سے فوراً یہ ثابت کر دے کہ وہ نہ تو کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے اور نہ اللہ کی بندگی سے منہ موڑنے والا ہے۔

قرآنِ پاک میں ایسے چودہ مقامات ہیں جہاں آیاتِ سجدہ آئی ہیں۔ ان آیات پر سجدہ کا مشروع ہونا تو متفق علیہ ہے۔ مگر اس کے وجوب میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ سجدۂ تلاوت کو واجب سمجھتے ہیں اور دوسرے علماء نے اس کو سنت قرار دیا ہے۔ نبی ﷺ بسا اوقات ایک بڑے مجمع میں قرآن پڑھتے اور اس میں جب آیت سجدہ آتی تو آپ خود بھی سجدہ میں گر جاتے تھے اور جو شخص جہاں ہوتا وہیں سجدہ ریز ہو جاتا حتیٰ کہ کسی کو سجدہ کرنے کیلئے جگہ نہ ملتی تو وہ اپنے آگے والے شخص کی پیٹھ پر سر رکھ دیتا۔ یہ بھی روایت میں آتا ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے موقع پر قرآن پڑھا اور اس میں جب آیت سجدہ آئی تو جو لوگ زمین پر کھڑے تھے انہوں نے زمین پر سجدہ کیا اور جو گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار تھے وہ اپنی اپنی سواریوں پر ہی جھک گئے۔ کبھی آپ نے دورانِ خطبہ میں آیت سجدہ پڑھی تو منبر سے اتر کر سجدہ کیا اور پھر اوپر جا کر خطبہ شروع کر دیا۔ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے اس طرزِ عمل سے سجدۂ تلاوت کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور ویسے بھی اس آیتِ کریمہ میں آخر میں سجدہ کرنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی پر سورۃ کا اختتام ہوتا ہے۔ اس سے نفسِ سجدہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام ارکانِ نماز میں سجدہ کو خاص فضیلت حاصل ہے۔

Marfat.com

صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت ثوبان ؓ سے کہا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلایئے جس سے میں جنت میں جاسکوں۔ حضرت ثوبان ؓ خاموش رہے۔ اس نے پھر سوال کیا، پھر بھی خاموش رہے۔ پھر جب تیسری مرتبہ سوال کو دہرایا تو انہوں نے کہا کہ میں نے یہی سوال رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا آپ نے مجھے یہ وصیت فرمائی کہ کثرت سے سجدے کیا کرو کیونکہ جب تم ایک سجدہ کرتے ہو تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں اور ایک گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ یہ شخص کہتے ہیں حضرت ثوبان ؓ کے بعد حضرت ابو الدرداء ؓ سے ملا تو ان سے بھی یہی سوال کیا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ ؓ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب کے ساتھ سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب کہ بندہ سجدہ میں ہو۔ اس لئے تم سجدہ کی حالت میں خوب دعا کیا کرو کہ اس کے قبول ہونے کی بڑی امید ہے۔

یاد رہے کہ تنہا سجدہ کی کوئی عبادت معروف نہیں۔ امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک کثرتِ سجود سے مراد یہ ہے کہ کثرت سے نوافل پڑھا کریں۔ جتنی نفلیں زیادہ ہوں گی سجدے زیادہ ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی شخص تنہا سجدہ ہی کر کے دعا کر لے اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ سجدہ میں دعا کرنے کی ہدایت نفلی نمازوں کیلئے مخصوص ہے فرائض میں نہیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ [illegible]

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی [illegible]

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(جلد: ۳)

(سُورَةُ الْاَنْعَام) ...... تا ...... ([illegible])

مؤلف

مولانا ڈاکٹر [illegible]

[illegible]

Marfat.com